ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵



…وں میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی … نامہ جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو … انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو … بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اردو کے اساتذہ … اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/-

…ہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/-

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہد قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/-

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ۔ اردو … کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۲۶/-

… مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ … ایک بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔

فی الفور — یوسف …

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار … کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" … مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر …

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر سوانح … جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد … اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی … بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک … تاریخی دستاویز۔

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامین سیدین — مرتبہ: ڈاکٹر …

ممتاز ماہر تعلیمات خواجہ غلام السیدین … ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔

توفیق الحکیم — ڈاکٹر …

ناول نگار کا جائزہ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ … کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا …

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

جنوری ۱۹۹۸ء جلد ۳۸ شمارہ ۱

فی پرچہ 7/-
سالانہ 70/-
سرکاری تعلیمی اداروں سے 100/-
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک) 600/-

مدیر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
فیکس نمبر: 6842574
Tel Cum Fax No (011)-6910191
ٹیلی فون نمبر: 6910191

شاخیں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲

پرنٹر پبلشر سید [illegible] نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے [illegible] دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری (ادب) یعقوب یاور 175/:
قاسم امین کی سماجی اور ادبی خدمات (ادب) سطوت ریحانہ 200/
ہند کی مایہ ناز ہستیاں، (مضامین) لی۔ شیخ علی 31/
جنت سنگار (ادب) مرتبہ پروفیسر سیدہ جعفر 180/
اسلام معاشیات اور بنک کاری (مذہب) پروفیسر اوصاف احمد 120/
دین کا متوازی تصور (مذہب) ڈاکٹر محمد محسن عثمانی 70/
احکام و مسائل (اول) مذہب۔ سید احمد قادری 90/
مہربان کیسے کیسے (بچوں کا ادب) نذیر جوہر 160/
توضیح فنون ادب (رقص) ڈاکٹر صابر سنبھلی 60/
لسانی تناظر (لسانیات) مرزا خلیل 300/:
پیغمبر عالم ﷺ (مذہب) عبدالمجید خطیب 75/:
اقامت دین کا سفر ہندستانی تناظر میں (مذہب)
فضل الرحمٰن فریدی 23/.
کلن (نیا ڈائیجن) ناول بشریٰ رحمٰن 150/
روش روش (شعری مجموعہ) محمد یوسف پاپا 90/:
توقیق حکیم (ناول نگاری کا جائزہ) ڈاکٹر بدرالدین الحافظ 45/:
اندوختہ (شعری مجموعہ) راشد آزر 150/:
پھلوں اور پھولوں سے علاج (طب) حکیم امام الدین ذکائی 35/:
شہر بد نصیب (افسانے) اقبال مجید 100/
قرآن کریم کا اسلوب اور اعجاز (مذہب) پروفیسر نثار احمد فاروقی 6/
موج سراب (شعری مجموعہ) رہبر جونپوری 75/:
تحریک آزادی اردو (اردو ادب) ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن 10/:
قرآن عربی (مذہب) 150/:
چھپائی کی کہانی (فن طباعت) عظیم صدیقی 150/:
آگ اور انگارے (ناول) وسیم احمد 50/:
جنگل میں منگل (کہانیاں) بانو سرتاج 50/:
شناسائی فکر و تحقیق (تحقیق) محمد عبداللہ بھٹ 30/
حسن ہزار شیوہ (شعری مجموعہ) غوث محمد غوری 100/:
تجنیس (شعری مجموعہ) عبدالحمید انصاری 100/
حاشیے (ادبی کالم) جاوید اختر بھٹی 80/
شاید کسی قابل ہو (شعری مجموعہ)
گوردیال سنگھ بھایا عارف 150/

سرورق رضاء الجبار

لہروں کی صدا (شعری مجموعہ) ناز قادری 90/:
اقرالایمان (مضامین) محمد فیروز 150/:
اردو لغت نویسی کا پس منظر (تحقیق) مسعود ہاشمی 50/:
آبپار کا منظر (شعری مجموعہ) ظفر گورکھپوری 200/:
موسی پر دے (افسانے) اہل ظفر 100/:
ماہنامہ ضرب المیمن جالنہ (نومبر ۹۶ تا جولائی ۹۷ء) 7/:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی اہم پیش کش

پارہ عم

اردو اور انگریزی میں ترجمہ اور تشریح کے ساتھ
حکیم محمد سعید صاحب نے نوجوانوں کے مرتبہ فکر و فہم کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن حکیم کے ہر پارے کا اردو و انگریزی ترجمے مع تشریح علاحدہ علاحدہ پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آغاز کے طور پر قرآن حکیم کے تیسویں سیپارے کو لیا ہے۔ عربی متن کے ساتھ آسان اور توضیحی اردو ترجمہ دیا ہے جو نوجوان مغربی ممالک میں ہیں ان کے لیے انگریزی ترجمہ بھی دیا ہے جو متبحر عالم عبداللہ یوسف علی کا نتیجہ فکر ہے۔ ہدیہ 45/: روپے

اردو لغت نویسی کا پس منظر

ڈاکٹر مسعود ہاشمی

"اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ" کے بعد ڈاکٹر مسعود ہاشمی کی یہ دوسری اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں لغت نویسی کے اصول اور اردو لغت نویسی کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔

قیمت 50/:

چھپائی کی کہانی

عظیم صدیقی

کتاب کیسے چھپتی ہے؟ اس کی بہت دلچسپ کہانی ہے کہ یہ کہانی آپ کو بلیک اینڈ وائٹ اور رنگین طباعت کی تمام اہم معلومات دے گی۔ پوری کتاب رنگین تصاویر سے مزین ہے۔

قیمت 180/:

سماں دیر
رضاء الجبار
3311, Kingston Road
Suite No.901
Scarborough ONTATARIO
MIM IRI
CANADA

اشاریہ

کینیڈا میں اردو

کینیڈا کی سرکاری زبان

حکومت کینیڈا کی سرکاری زبانیں انگریزی اور فرانسیسی ہیں۔ ہر شہری کو دو میں سے ایک زبان آنی ضروری ہے۔ جنہیں دونوں زبانیں آتی ہیں ان لوگوں کی بڑی قدر ہے۔ معاشی اعتبار سے ان کی مانگ ہے۔ جس آدمی کو ایک زبان بھی یہاں کے لب و لہجے و مجبوریت کے ساتھ نہیں آتی اس کی مثال جسم کے اس عضو کی طرح ہے جس کی ہڈی سرک گئی ہو۔ وہ عضو تکلیف میں رہے گا۔ اس عضو کا فعل رکا ہوا رہے گا۔

اردو والوں کا تناسب :

ساؤتھ ایشیا سے آئے ہوئے لوگوں کا تناسب کینیڈا کی جملہ آبادی کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ کینیڈا کو آئے ہوئے امیگرنٹ کینیڈا کے چند بڑے شہروں اور ان شہروں کے اطراف پھیلے ہوئے مضافات میں زیادہ تر بسے ہوئے ہیں۔ ٹورانٹو کے مشہور و معروف اخبار روزنامہ "ٹورانٹو اسٹار" کی ایک رپورٹ کے مطابق ٹورانٹو عظمیٰ اور اس کے اطراف پھیلے ہوئے مضافات کی جملہ آبادی کے اندر مختلف ممالک سے آئے ہوئے لوگوں کا تناسب اس طور ہے

برطانوی اور فرانسیسی	۴۰٫۴ فی صد
اطالوی	۸٫۲ فی صد
چینی	۳٫۹ فی صد
سیاہ فام (افریقن ممالک کے لوگ)	۵٫۱ فی صد
ساؤتھ ایشین	۳٫۵ فی صد
یہودی	۳٫۲ فی صد

پرتگیزی	۹ء۲ فی صد
جرمن	۱ء۲ فی صد
یونانی	۱ء۲ فی صد
پالش (پولینڈ کے لوگ)	۵ء۱ فی صد
یوکرین کے باشندے	۴ء۱ فی صد
ڈچ	۰ء۱ فی صد
باقی دوسرے ملکوں کے لوگ	۳ء۲۴ فی صد
جملہ	۱۰۰ء۰

ساؤتھ ایشین کے ۵ء۳ فی صد کے اندر ہندستان، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال اور سری لنکا کی جملہ زبانوں کے بولنے والے لوگ ہیں جو یہاں راست یا بالراست آئے۔ اس طرح اردو بولنے والوں کی اقلیت تقسیم در تقسیم ہو کر ہمیں ملتی ہے۔ نتیجے کے طور پر یہ تعداد بہت کم ہو جاتی ہے۔

اقلیتوں سے متعلق سروے:

۱۹۹۲ء میں ترتیب دیے ہوئے ایک سروے میں نظر آنے والی اقلیتوں سے چند سوالات کیے گئے تھے۔ ساؤتھ ایشیا سے آئے ہوئے لوگوں کے دیے ہوئے جوابات کا خلاصہ یوں رہا۔ (ٹورانٹو اسٹار مورخہ ۲۸ جون ۱۹۹۲ء صفحہ نمبر A6)

سوال نمبر ایک: کیا آپ اپنے اس تصفیے پر مطمئن ہیں کہ کنیڈا کو آپ نے اپنی رہائش گاہ اور دوسرا وطن بنایا؟

سروے کا نتیجہ: ۵۲ فیصد لوگ اپنے طے شدہ تصفیے پر پوری طرح مطمئن ہیں۔ ۳۵ فیصد لوگ کسی حد تک مطمئن ہیں۔

۱۱ فیصد لوگ کسی حد تک مطمئن نہیں ہیں۔

۱ فیصد لوگ قطعی مطمئن نہیں ہیں۔

۱ فیصد لوگ تجزیہ نہیں کر سکے۔

سوال نمبر دو: کنیڈا کی کن جگہوں پر وہ کون ہیں جو تعصب پھیلا رہے ہیں؟

سروے کا نتیجہ: ۲۴ فیصد لوگ کہتے ہیں کہ ان کی ملازمت کی جگہوں پر ان کے ساتھی ملازمین ملزم ہیں۔

۱۷ فیصد لوگ کہتے ہیں کہ ان کی ملازمت کی جگہوں پر اپنے آجر پر الزام لگاتے ہیں۔

۱۰ فیصد لوگ کہتے ہیں پولیس پر الزام لگاتے ہیں۔
۸ فیصد لوگ اسکولوں کے اندر تعصب محسوس کرتے ہیں۔
۲۰ فیصد لوگ ڈیپارٹمنٹل اسٹور اور بازار کو تعصب کی جگہ بتاتے ہیں۔
۱۱ فیصد لوگ ہوٹلوں کو دوش دیتے ہیں۔
۱۶ فیصد لوگ ذرائع آمدورفت میں کام کرنے والوں سے خوش نہیں ہیں۔
۱۱ فیصد لوگ اپنے پڑوسیوں میں تعصب کا ماحول دیکھتے ہیں۔
۲۷ فیصد لوگ سڑکوں پر متعصب لوگوں کو پاتے ہیں۔
۷ فیصد لوگ سرکاری دفاتر کو تعصب کی جگہ سمجھتے ہیں۔

سوال نمبر تین: کیا آپ اپنے گروپ کے علاوہ دوسرے گروپ کے لوگوں کے ساتھ سماجی تعلقات کو بڑھانے کے حامی ہیں؟

سروے کا نتیجہ: ۹۱ فیصد لوگوں نے اثبات میں جواب دیا۔
۷ فیصد لوگوں نے نفی میں جواب دیا۔

سوال نمبر چار: اگر آپ کے گروپ کا کوئی فرد اپنے گروپ کی بجائے دوسرے گروپ کے فرد کے ساتھ شادی کرنے کا موقع حاصل کرلے تو کیا آپ اس عمل کو مناسب قرار دیں گے؟

سروے کا نتیجہ: ۶۲ فیصد لوگوں نے اس عمل کو مناسب سمجھا۔
۳۲ فیصد لوگوں نے نامناسب جانا۔

سوال نمبر پانچ: اگر آپ کے مذہب کا کوئی فرد اپنے مذہب کی بجائے دوسرے گروپ کے دوسرے مذہب کے فرد کے ساتھ شادی کرنے کا موقع حاصل کرلے تو کیا آپ اس عمل کو مناسب قرار دیں گے؟

سروے کا نتیجہ: ۴۸ فیصد لوگوں نے اس عمل پر اپنی منظوری دی۔
۴۷ فیصد لوگوں نے مخالفت کی۔

حکومت کینیڈا کے قانون رنگ، نسل، جسمانی فرق اور جنسی فرق سے پیدا ہونے والی نفرتوں کے خلاف ہیں لیکن قانون کے ہاتھ کبھی کبھی تعصب کی بنیاد پر دہشت پھیلانے والوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ اگر نئے تارکان وطن انگر[illegible] یا فرانسیسی زبان سے واقفیت و مہارت نہیں رکھتے تو حکومت ان کی مدد اس طرح کر[illegible] کہ وہ انگریزی سیکھنے کے مراکز میں روانہ کردیے جاتے ہیں۔ جب وہ وہاں سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو محسوس کرلیتے ہیں کہ

اب اڑان کے لیے ان کو بال و پر مل گئے ہیں۔

کنیڈا کی پالیسی ملٹی کلچرزم:

تیس ملین لوگوں کی آبادی کا یہ نیا ملک کنیڈا تارکان وطن کا بنایا ہوا ہے۔ دنیا کے تقریباً ایک سو پچاس ممالک کے لوگ یہاں آئے، اسے پسند کیا اور آباد ہو گئے۔ ان کے آنے کا سلسلہ جاری ہے۔ امیگرنٹ کے لیے حکومت کنیڈا کی پالیسی ملٹی کلچرزم ہے۔ اس ملٹی کلچرزم میں پیام یہ ہے کہ نقل مقام کر کے آئے ہوئے افراد اس ملک میں ملک کا حصہ ہیں۔ وہ اپنی مادری زبان اور اپنی تہذیب کو زندہ و آباد رکھیں۔ اس کی حفاظت کریں۔ زبان کی پالیسی کے تحت اگر کوئی ٹرینڈ مدرس کسی زبان کو سکھانے کے لیے کم از کم پندرہ آمادہ طلبہ کی فہرست مہیا کرتا ہے تو ملٹی کلچر کا شعبہ اس زبان کو سکھانے کی منظوری دے گا۔ بورڈ آف ایجوکیشن یا سٹی زن شپ وزارت کی طرف سے مدرس کی تنخواہ اور دیگر اخراجات کے لیے فنڈ مہیا کیے جائیں گے۔

اردو زبان سکھانے کے لیے کلاس کھولنے کی کوششیں ماضی میں ہوئی تھیں۔ حال میں بھی یہ کوشش جاری ہے۔ ابتدائی اردو کی کلاس شروع ہوتی ہے۔ طلبہ آتے ہیں اور اردو لکھنا پڑھنا سیکھتے ہیں۔ یہ عمل ٹورانٹو کے علاوہ اٹاوا، مونٹریال اور دوسرے شہروں میں جاری ہے لیکن اردو سیکھنے اور سکھانے کی یہ تحریک باقاعدگی کے ساتھ رواں دواں نہیں ہو سکی۔ اس کی معقول وجہ ہے۔ اس مضمون کے ابتدا میں جو مثالیں نوٹ کی گئی ہیں سروے کے سوالات اور نتیجوں کا تجزیہ، خصوصاً سوال نمبر ایک کے سروے کا نتیجہ توجہ چاہتا ہے۔ ۵۲ فیصد لوگ اپنے طے شدہ تصفیے پر مطمئن ہیں کہ کنیڈا کو انھوں نے اپنی رہائش گاہ اور دوسرا وطن بنایا۔ ۳۵ ان فیصد لوگ کسی حد تک مطمئن ہیں۔ اس ۳۵ فیصد میں وہ لوگ بھی شامل کیے جاسکتے ہیں جو مضمون کے ابتدائی مثالوں کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس طرح یہ ۸۷ فیصد وہ لوگ ہیں جو ملک کی معاشی، سماجی اور سیاسی بہاؤ میں دوسرے لوگوں کے دوسرے گروپ کے ساتھ شانہ بشانہ رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ملک کا حصہ بن کر ملک کی تعمیر میں حصہ لینے کا عزم رکھتے ہیں۔ یہ لوگ نہیں چاہیں گے کہ ان کے بچے اپنے اوقات اور اپنی ذہنی صلاحیتوں کو اردو زبان کے لیے وقف کر کے دوسرے مضامین میں کمزور ہو جائیں۔ والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچوں کی تمام تر توجہ یہاں کی زبانیں سیکھنے اور اسکول کے درجوں کے مضامین پر عبور حاصل کرنے پر مرکوز رہے۔ والدین چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اس نئے ملک میں کسی دوسرے گروپ کے بچوں سے پیچھے نہیں رہیں۔ نئی نسل کے بچے

اپنے والدین کی ان توقعات کو پورا کر رہے ہیں۔ ۳۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو یہاں آ کر اگرچہ اپنی رہائش کا ملک دوسرا وطن بنانے کے فیصلے پر کسی حد تک یا قطعی طور پر مطمئن نہیں ہیں۔ یہ لوگ اپنے چھوڑے ہوئے وطن اور اپنے ملک کی تہذیبوں سے اس قدر محبت اور شدت رکھتے ہیں کہ واپس جانے کی دُھن میں رہتے ہیں۔ وہ توقع رکھتے ہیں کہ جلد از جلد ان کے لیے مناسب وقت آجائے گا اور وہ اپنے وطن کو واپس لوٹنے کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید لیں گے۔ یہ لوگ یقینی طور پر چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اردو بولیں اور اردو میں گفتگو کریں۔

کینیڈا میں اردو اخبارات :

ملٹی کلچر کی پالیسی کے ذیل میں حکومت کینیڈا اور صوبائی حکومتیں ان اخباروں کی ہمت افزائی کرتے ہیں جو نقل مکانی کیے ہوئے لوگوں کی زبانوں میں نکلتے ہیں۔ اس طرح شہر ٹورانٹو سے پندرہ کے قریب اردو اخبارات نکل رہے ہیں۔ یہ اخبارات روزنامے نہیں ہیں بلکہ ہفتہ وار یا پندرہ روزہ ہوتے ہیں۔ چند اخبارات ہیں جو پچھلے پچیس سال سے زیادہ مدت سے بڑی پابندی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ مقامی تجارت پیشہ لوگ ان میں اپنی تجارت کے فروغ کے لیے اشتہارات دیتے ہیں۔ حکومتیں اپنی اطلاعات و اعلانات شائع کرواتی ہیں۔ چند سال قبل جب اردو کتابت کی دشواری یہاں تھی یہ اخبارات ہندستان، پاکستان کے مشہور اخبارات کے چربے استعمال کرتے تھے۔ اب کمپیوٹر کے پروگرام کتابت کرنے کے لیے آگئے ہیں تو بڑی سہولت ہو گئی۔ اور ان اخبارات کے حلیے ہی بدل گئے۔ تاجروں اور حکومت کے اداروں سے ان اخبارات کے مالکوں کو اچھی خاصی رقومات مل جاتی ہیں۔ کتابت و اشاعت کے اخراجات پورے ہو جاتے ہیں۔ کسی حد تک منافع بھی مل جاتا ہے۔ اب اخباروں کو اردو قارئین کے حلقوں میں فروخت کرنا باقی رہ گیا۔ فروخت ہوں گے تو مالکین کا ملنے والا منافع بڑھ جائے گا لیکن اردو کے قارئین کسی ایک علاقے میں نہیں رہتے بلکہ بہت بڑے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ فرداً فرداً ان اخبارات کو فروخت کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ہندستان و پاکستان کی دکانوں، مسجدوں، جلسہ گاہوں اور کمیونٹی سینٹر پر یہ اخبارات رکھ دیے جاتے ہیں جہاں سے خواہشمند بغیر کوئی قیمت دیے اسے اٹھا لیتے ہیں۔ اس طرح انھیں خرید کر پڑھنے کی عادت کو تقویت ملتی ہے اور اخبارات بھی اپنی عمومی و خصوصی اشاعتوں کے ساتھ رواں دواں رہتے ہیں۔ کینیڈا میں فی الحال ردی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اس لیے ایک قاری عموماً ایک نام کا ایک ہی اخبار اٹھاتا ہے۔

ادبی انجمنیں، لائبریریاں، جریدے:

غیر منافع بخش انجمنوں کو وفاقی و صوبائی حکومتوں کی جانب سے رقمی امداد بھی دی جاتی ہے خصوصاً ایسی تنظیموں کو جن کا مقصد تارکانِ وطن کے لائے ہوئے تہذیبی ورثے کو یا ان کی زبانوں کو سنبھالنا ہے۔ اردو کی انجمنیں اس زمرے میں آتی ہیں۔ اردو سیمینار، کانفرنس اور مشاعروں کا انعقاد اس مقصد کی تکمیل ہے۔ ٹورانٹو میں اردو کی تین ادبی انجمنیں ہیں۔ جب ان کے عمومی جلسے منعقد ہوتے ہیں تو بیس پچیس لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ نثری حصے میں مضامین، طنزیے، ترجمے یا افسانے پڑھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد شعرا اپنی نظمیں و غزلیں سناتے ہیں اور آراء حاصل کرتے ہیں۔ شہر ٹورانٹو اور اطراف کے مضافات کے اندر ایک ناول نگار، ایک مترجم، دو مضمون نگار، ایک ڈراما نگار اور چار افسانہ نگار مل جائیں گے۔ کینیڈا کے مختلف صوبوں میں تقریباً چالیس شعرا رہتے ہیں۔ مشاعرے ہوتے ہیں تو امریکا کے شہروں کے شعرا مہمان بن کر کینیڈا کے شہروں میں آتے ہیں اور کینیڈا کے شہروں کے شعرا بھی یوں ہی جاتے ہیں۔ ہندستان و پاکستان کے تمام ادبی جریدے اور پاپولر میگزین و اخبارات آتے ہیں پاپولر میگزین اور اخبارات، ہندستانی و پاکستانی دکانوں پر بھی فروخت ہوتے ہیں۔ اردو کتابوں کی فروخت کی دکانیں بھی ہیں۔ کینیڈا کے اردو اہلِ قلم افراد کے درمیان سیاستیں، رقابتیں، مخالفتیں اور پارٹی بازیاں اسی طرح کی ہوتی ہیں جیسا کہ ہندستان و پاکستان کے شہروں میں دکھائی دیتی ہیں۔

کینیڈا میں جگہ جگہ حکومت کی قائم کردہ لائبریریاں ہیں جہاں انگریزی و فرانسیسی کتابوں کے علاوہ نظر آنے والے اقلیتی گروپ (VISIBLE MINORITY) کی زبانوں کی کتابیں بھی رکھی جاتی ہیں۔ ٹورنٹو عظمیٰ کی بہت سی لائبریریوں میں اردو کی معیاری کتابیں بڑی تعداد میں دکھائی دیتی ہیں۔ ہندستان و پاکستان کے پاپولر رسائل بھی وہ لائبریریاں منگواتی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ ہندی فلموں اور پاکستانی ڈراموں کے ویڈیو ٹیپ مشہور اردو شاعروں کے کلام کے آڈیو ٹیپ بھی ان لائبریریوں سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ممبر شپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔

ہر سال نہ صرف مقامی تخلیق نگار کو ادبی تنظیموں کی طرف سے ادبی انعامات دیے جاتے ہیں بلکہ ہندستان و پاکستان کے دانشور اور نامور شعراء یہاں مدعو کیے جاتے ہیں اور انھیں رقمی انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ مقامی و، غیر مقامی فنکاروں کے ساتھ ادبی شامیں منانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ سیمینار و کانفرنس میں اگر ہندستان و پاکستان یا لندن سے آئے

ہوئے دانشور یا نامور قلم کار شرکت کر رہے ہوں تو حاضرین کی تعداد ڈیڑھ سو اور دو سو کے آس پاس ہو جاتی ہے۔ اگر سیمینار و کانفرنس کا داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہوتا ہے تو بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ٹکٹ خرید کر ایک ادبی کاوش کی سرپرستی کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

کینیڈا میں مشاعرے:

اونٹاریو میں بین الاقوامی مشاعرے بھی ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی مشاعروں میں شعراء نہ صرف ہندستان و پاکستان سے آتے ہیں بلکہ یورپ اور امریکا کے شہروں سے بھی بر آمد کیے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی مشاعرے کے لیے شاعروں کا انتخاب کرنا، انھیں ٹکٹ روانہ کرنا، ان کے رہنے سہنے اور ان کو کینیڈا کے مشہور مقامات کی سیر کا انتظام کروانا وغیرہ بہت محنت اور بڑی توجہ کا کام ہے۔ یہ کام اکثر و بیشتر مالی طور پر بڑے خسارے کا باعث ہوتا ہے۔ مشاعروں کے منتظمین کی کوشش ہوتی ہے کہ اس خسارے کو کم از کم سطح پر رکھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مشاعروں میں سنائے جانے والے عمدہ اشعار اردو ادب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ہندی، پنجابی، تلگو اور دوسری زبانوں کے ساؤتھ ایشین لوگ جو اردو سے ہلکا پھلکا لگاؤ رکھتے ہیں اردو محفلوں، سیمیناروں یا کانفرنس سے لگاؤ نہیں رکھتے لیکن مشاعروں میں ضرور آتے ہیں اور اردو کے پرستار بن جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو مشاعروں کے لیے مدعو کرنا مالی طور پر بھی فائدہ مند ہوتا ہے۔ وہ شعراء جو نامور، معیاری یا اے گریڈ مانے جاتے ہیں اتنی فصیح و بلیغ یا ایسی علامتی شاعری پیش کرتے ہیں جو محدود حلقے کے اہل ذوق کے لیے باعث مسرت ہوتی ہے ان لوگوں کے پلے نہیں پڑتی جو دوسری زبانوں کے ہیں اور مشاعرے کے نام پر دلچسپی بتاتی اور چلے آئے۔ کیا ہمیں ان لوگوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے؟ اگر ہم کینیڈا میں رہ کر چاہتے ہیں کہ مشاعرے اس انداز کے ہوں جیسا کہ سو ڈیڑھ سو سال مغل شاہوں کے دربار میں ہوا کرتے تھے تب ہمیں شاہوں کو ڈھونڈ کر لانا ہوگا اور ایسے سامعین کو بھی مہیا کرنا پڑے گا جو ڈیڑھ سو سال پہلے کا ذوق، تہذیب اور درباری آداب رکھتے تھے۔ ایسا خمیر رکھنے والے لوگ ہندستان و پاکستان کے ادبی حلقوں میں بھی خال خال ملیں گے، کینیڈا کے شہروں کی بات تو دور کی رہی۔ اس لیے بین الاقوامی مشاعروں کے منتظمین کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے شاعروں کو جمع کریں جو اپنے کلام میں مختلف رنگ لیے ہوں جن کی سطح و معیار مختلف ہو اور جن کے نقطۂ نظر میں فرق ہو، ترنم کے ساتھ پڑھنے والے بھی ہوں۔ شاعرات بھی ہوں۔

کینیڈا میں ادبی ذوق رکھنے والے شعر و شاعری کے ذوق کی تسکین عموماً چار طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔

(ا) نجی طور پر ترتیب دی ہوئی ادبی محفلیں: یہ محفلیں میزبان کے گھر کی نچلی منزل میں عموماً وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ شعر و شاعری سے قبل یا بعد میں تمام شرکاء کی تواضع ڈنر چائے یا مٹھائیوں سے ہوتی ہے۔

(ب) ادبی تنظیموں کی جانب سے منعقد کیے ہوئے جلسے: یہ جلسے کسی کیمونٹی ہال، لائبریری کے کمرے یا کسی کمرشیل بلڈنگ کے چھوٹے ہال کو کرایے پر لے کر ترتیب دیے جاتے ہیں۔ یہاں پر شرکاء کے لیے چائے پانی کا انتظام ہو سکتا ہے۔

(ج) اردو کے جریدے: ہندستان پاکستان یا کسی دوسرے ممالک سے آئے ہوئے عمومی یا خصوصی جریدے شاعری کے لیے مختص کیا ہوا گوشہ رکھتے ہیں۔ یہ رسائل راست منگوائے جا سکتے ہیں۔ پاپولر رسائل دکانوں پر مل جاتے ہیں۔ لائبریریاں بھی منگواتی ہیں۔ ادب دوست احباب کے درمیان تبادلے بھی ہوتے ہیں۔

(د) مقامی، قومی یا بین اقوامی سطح پر ترتیب دیے ہوئے مشاعرے: بین اقوامی مشاعروں میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہوتا ہے۔ بڑا ہال کرایے پر لیا جاتا ہے۔ یہ اجتماع عام ہے۔ ٹی وی اور ریڈیو کے اردو وہندی پروگراموں، اخبارات میں دیے ہوئے خبرناموں و اشتہارات کے ذریعہ مشاعرے کی تشہیر ہوتی ہے۔ جو آدمی ٹکٹ خرید تا ہے وہ شریک ہو کر سامع بننے کا حق رکھتا ہے۔

ادبی ذوق کی تشفی کے لیے یہ چار سرگرمیاں چار مختلف ماحول پیدا کرتی ہیں۔ ہر ماحول کا مذاق یا روش علاحدہ ہے۔ ہر تخلیق نگار کی ادبی شخصیت بنیادی طور پر اس کی فنی صلاحیتوں کی مرہون منت ہوتی ہے لیکن یہ چار مختلف ماحول بھی ایک شاعر کو قبولیت عطا کرنے میں اپنا رول عطا کرتے ہیں۔ نجی طور پر ترتیب دی ہوئی محفل میں وہ تخلیق نگار مقبولیت حاصل کر لیتا ہے جو فن خطابت میں اچھا مرتبہ رکھنے کی وجہ سے اپنے یا دوسروں کے ادبی پاروں کے گوشوں کو با وقار انداز میں پیش کرتا ہے۔ ادبی تنظیم کے اندر تنظیم کے صدر یا معتمد جو عموماً قلم کار ہوتے ہیں۔ تنظیم کی کارروائی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھتے ہوئے فوقیت حاصل کر لیتے ہیں۔ رسائل کے صفحات پر اس قلم کار کی شخصیت سامنے آتی ہے جو نہ صرف اپنی تخلیقات اشاعت کے لیے روانہ کرتا ہے بلکہ مدیروں کے نام اپنے کاغذی گھوڑوں کو دوڑاتا ہے اور دوسروں کی تخلیقات پر اپنی آرا سے اپنا رعب جماتا ہے۔ مشاعروں میں

سامعین ہوتے ہیں جو آناً فاناً کسی شاعر کو اچھال دیتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ شاعر جس کو سامعین نے اہمیت دی ہو ایسا شاعر ہو۔ ایک دوسرے درجے کا شاعر یا شاعرہ اپنے کہنے کے انداز، سادگی کلام، ترنم، حاضر جوابی یا ان میں سے چند یا تمام کیفیتوں کے باعث فوقیت حاصل کر لیتا یا کر لیتی ہے۔ بالفاظ دیگر مشاعرہ لوٹ لیا جاتا ہے۔

جب کسی کم عمر یا دوسرے درجے کے شاعر یا شاعرہ کے کلام کے کسی انداز کے باعث مشاعرہ لٹ جاتا ہے تو بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طرف سامعین ہوتے ہیں جو اصرار کرتے ہیں کہ وہ شاعر یا شاعرہ دوبارہ اپنا کلام سنائے بار بار سنائے، دوسری طرف وہ شعرا ہوتے ہیں جن کی باری ابھی نہیں آئی۔ وہ اپنے آپ کو زیادہ بلند درجے کا شاعر ہونے کی وجہ سے خار کھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ نچلے معیار کے شاعر یا شاعرہ کی کامیابی کو اپنی ہتک و بے عزتی سمجھتے ہیں۔ اس ہتک و بے عزتی سے جو درد پیدا ہوتا ہے اس کو مندمل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اپنے قلم کی نوک کی رگڑ سے گرما گرم جملے پیدا کرو اور ان جملوں کی مدد سے میزائل بناؤ۔ اب میزائل کو ان شاعر یا شاعرہ پر داغ دو۔ ہو سکے تو سامعین کو بھی لپیٹ میں لے لو۔ انھیں چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ ایسے میزائل کی تصویروں کی مجھے تلاش تھی جو اچھی حالت میں دستیاب ہو گئی ہیں۔ مہمان مدیر کا شاریہ بعنوان 'اردو کی نئی بستیاں' مطبوعہ ماہنامہ "کتاب نما" دہلی جنوری ۱۹۷۹ء ملاحظہ کریں۔ جناب ستیہ پال آنند نے ان میزائل کو نشانے پر لگایا وہ یہ ہیں۔

(۱) حیرت کی بات یہ ہے کہ ان مشاعروں میں ہارڈ کرنسی کی کشش سے کھنچے چلے آنے والے شاعر وہ بھی ہوتے ہیں جن کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ جب یہ قد آور شاعر ان گلوکار شاعروں کے ساتھ جو سطحی عشقیہ اور سفلی جذبات ابھارنے والے اشعار پڑھنے میں ملکہ رکھتے ہیں اسٹیج پر جلوہ افروز ہوتے ہیں تو ایک عجیب سا منظر پیش ہوتا ہے۔

(۲) تصور کیجیے ایک متشاعر کا یا ایک متشاعرہ کا، جو لٹک لٹک کر، ایک ماہر فن طوائف یا قوال گلوکارہ کی طرح "بھاؤ" بتاتی ہوئی "مرکیاں" ڈالتی ہوئی وہ غزل "گاتی" ہے جس کو "تیار" کرنے میں اس نے ریہرسل کے کئی رت جگے کاٹے۔

(۳) داد وصول کرتی ہوئی ساتھ ہی یہ اعلان کرنے سے بھی نہیں چوکتی، یہ غزل جس مجموعے میں شامل ہے اتفاق سے کچھ جلدیں

میرے پاس موجود ہیں۔ خواہشمند خواتین و حضرات مجھ سے لے سکتے ہیں
(۴)(امریکا، کینیڈا میں) شاعر و ہماظ میں کوئی تمیز دکھائی نہیں دیتی۔
(۵) ایسی محفلوں میں سنجیدہ لوگ نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔
(۶) یہ سماجی نوعیت کی نشستیں ہوتی ہیں جو صاحب خانہ کے دولت کدے ا
ور دستر خوان کی نمائش کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ عورتیں ملبوسات
اور زیورات کی نمائش میں پیش پیش رہتی ہیں اور مرد ثقافتی جانور ہونے کا
ثبوت دیتے ہیں۔
(۷) شاعر کے اسٹیج پر آتے ہی آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں کا کر سنایئے۔
(۸) عشقیہ اشعار پر سیٹیاں بجائی جاتی ہیں اور ناز و نخرے کے ہتھیاروں سے
لیس شاعرات اپنی آواز کے علاوہ جسم کی نمائش کرتی ہوئی جب اپنی
BODY LANGUAGE سے اردو شاعری کا پیغام نشر کرتی ہیں تو
مشاعرے کو ادبی مجرا سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

ستیہ پال آنند میرے دوست ہیں۔ میرے پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں۔ تقریباً د سال قبل ان سے پہلی بار ٹورانٹو سے ذرا باہر بین الاقوامی مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی۔ ہندستان پاکستان اور امریکا کے شعرا جمع تھے۔ اس مشاعرے میں ان کے بدلے ہوئے تیور کام یں نے مشاہدہ کر لیا تھا۔ اور اندازہ لگایا تھا کہ ان کے چٹ پٹے تحریری تاثرات کسی جریدے میں دیکھنے کو ملیں گے۔ کینیڈا کے ادبی حلقوں میں میرے مہ و سال کی تقریباً د دہائیاں گزری ہیں۔ یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں میں نے بھی اپنے تعمیری رول ادا کیے ہیں۔ اس لیے ان حلقوں سے واقف ہوں۔ سچ بات یہ ہے کہ کینیڈا کی سرزمین پر نقل مقامی کر کے آئے ہوئے ہم اردو کے لوگ سو فی صدی ایسے ہی ہیں جیسا کہ ہندستان و پاکستان کے درمیانہ طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ ویسی ہی غذا کھاتے ہیں۔ اپنے سماجی اور گھریلو ماحول میں وضع داری ویسی ہی ہے۔ انگریزی کی کتابیں اور رسائل خرید کر پڑھتے ہیں لیکن اردو کی کتابیں رسائل اخبارات اکثر و بیشتر مفت میں پڑھتے ہیں۔ اس ملک میں ہم خود بھی ہارڈ کرنسی کی کشش، اچھی معاشی زندگی، زندگی کی سہولتوں کو حاصل کرنے، اپنے ممالک کے کرپشن کی زد سے بچنے اور اپنے بچوں کو اعلا تعلیم دلانے کے لیے آئے ہیں۔ ہمارے بچے یہاں پر تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملک کی سماجی و معاشی دھارا میں کامیابی کے ساتھ ایسے رچ بس گئے ہیں کہ وہ ہمارے وطن کو واپس جانا نہیں چاہتے۔ اس لیے اپنے بچوں کی وجہ سے ہم بھی

کر واپس نہیں جائیں گے۔ ہمارے بیشتر بچوں کو اردو نہیں آتی۔ بہت سے بچے اپنے گھروں کے اندر اردو میں بات چیت بھی نہیں کرتے۔ اس امر کے باوجود یہ یقین ہے کہ اردو اگر ہمارے ملکوں میں ختم نہیں ہوگی تو یہاں سے بھی ختم نہیں ہوگی۔ اپنے چھوڑے ہوئے وطن کے عزیزوں کے ساتھ یہاں کے عزیزوں کے شادی بیاہ کے رشتے استوار ہوتے رہتے ہیں۔ مختلف صورتوں کے ساتھ امیگرنٹ آتے رہیں گے۔ ان کے دل و دماغ پر سوار ہو کر اردو کا لشکر آتا رہے گا اور یہاں پر موجود قافلے کو تر و تازگی دیتا رہے گا۔ ہماری زبان کے ہمارے بڑے شعرا بھی ہماری طرح اپنی ضرور تیں رکھتے ہیں۔ یہاں وہ ہارڈ کرنسی کی کشش میں آتے ہیں تو ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم انھیں کھیسہ زر پیش کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ادبی شامیں مناتے ہیں۔ فروخت کرنے کے لیے وہ اپنی کتابیں بھی لے آتے ہیں۔ اپنے وطن سے ادبی رسائل کے مدیر آتے ہیں۔ وہ رسائل فروخت کرتے ہیں۔ سالانہ خریدار بناتے ہیں اس نہج کے ساتھ اگر دوسرے درجے کے شاعر و شاعرات یہاں اپنی کتابیں لے کر آتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں تو اسے جرم قرار دینے والے ہم کون ہوتے ہیں؟ اگر ان کے پرستار ان کی کتابوں کو اپنے ذوق و شوق کی خاطر خریدتے ہیں تو یہ ان کا اپنا معاملہ ہے۔ سب ہی واقف ہیں کہ یہاں کی اکثریتی طبقے کی زندگی کا اسٹائل ہماری زندگی سے مختلف ہے۔ ہم جسے عریانیت، بے شرمی و بے حیائی کا نام دیتے ہیں وہ ان کی زندگی کے لطیف گوشے ہیں۔ شہر کی شاہراہوں پر، شاپنگ پلازہ میں، سینما ہاؤز، ٹی وی کے اسکرین اور یونیورسٹی کے کیمپس کے اندر ایسے لطیف گوشوں سے پر نظاروں کی اتنی بہتات ہوتی ہے کہ لوگوں کی عادی آنکھیں لطف اندوز نہیں ہوتیں۔ لوگ بس آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ ایسے ماحول میں ہمارے وطنوں کی آئی ہوئی شاعرات کا ہاتھ مٹکانا، بھاؤ بتانا، مرکیاں ڈالنا اور جسم کی نمائش کرنا اگر واقعی ظہور پذیر ہو رہا ہے تبھی ہمارے سفلی جذبات کو نہیں ابھارتا۔ یہ اچھی بات ہے کہ ہماری سماجی محفلوں میں ہمارے میزبان ہمارے مہمانوں کا استقبال خوش لباسی، لذیذ کھانوں اور خواتین زیورات کی نمائش سے کرتی ہیں۔ عریانیت، بے شرمی و بے حیائی کے نظاروں کے مقابلے میں کیا خوش لباسی، لذیذ کھانوں اور زیورات کی نمائش بہتر نہیں ہے؟ کینیڈا میں ہم ایسی پیش کش کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امریکا میں اگر مختلف ماحول ہو تو یہ ذمے داری اردو ماحول کے امریکن پر جاتی ہے کہ ان میں کا کوئی فرد ہمیں کچھ صورت حال سے واقف کرائے۔ کینیڈا کے طول و عرض میں تقریباً چالیس اردو شعرا کا مسکن ہے۔ انھیں اور اپنا کلام سنانے کے لیے آنے والے بیرونی شعرا کو ہم نہ بھانڈ کہتے ہیں

اور نہ سمجھتے ہیں۔ یہ اردو کے خدمت گار ہیں۔ ہمارے ملک کی شاعرات اور آنے والی مہمان شاعرات نہ ماہر فن طوائف کی طرح ہیں اور نہ قوال گلوکارہ کی طرح یہاں بھاؤ بتاتی ہیں۔ عوامی مشاعروں میں لطف لینے اور مزاح کا رنگ پیدا کرنے کی خاطر فقرے بازیاں چلتی رہتی ہیں۔ اگر کسی سامع نے اپنی بلند آواز میں کسی شاعر یا شاعرہ کو "گا کر سناؤ" کہہ دیا تو اس کا یہ مطلب نکالنا درست نہیں ہے کہ یہ اصطلاح کینیڈا کے اردو ادب کی دنیا میں رائج ہو چکی ہے اسی طرح تالیاں بجانے کی بات بھی ہے۔

یہ بات قابل تعریف ہے کہ جناب ستیہ پال آنند اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادب پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ اردو کے لیے بڑے اہم کام کر رہے ہیں اور اپنی آرا سے نوازتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے معزز ہیں۔ اردو ادب کے خوب صورت محل کے آگے ان کی ادبی شخصیت جھومتے ڈولتے ہاتھی کی طرح ہے لیکن جب ان کے قلم سے راست یا بالراست میزائل کی برسات ہونے لگتی ہے تو بڑا خوف سا پیدا ہوتا ہے۔

اختر سعید خاں
اندرون اتوارہ
بھوپال

غزل

ہوائیں اب وہ چلتی ہی نہیں ہیں صحنِ گلشن میں
چمن سے پھول جب ہنستے ہوئے آتے تھے دامن میں

بہت آئے گئے لیکن وہ بادل پھر نہیں برسے
برس کر جو لگا دیتے تھے ظالم آگ سی تن میں

جو نغمے تھے لبوں پر بن گئے ہیں دل کا سناٹا
کہیں کس سے کہ ہم بھی تھے نواسنجانِ گلشن میں

دلوں سے توڑ کر رشتے ملا کیا زندگی تجھ کو
سمٹ کر رہ گئی اک بے سکوں دنیا کے دامن میں

وہ نظریں پھر اسی انداز سے اٹھیں تو کیا ہوگا
ابھی رہنے دے اے شوریدگی اک موج خوں تن میں

یہ مانا چار تنکے جل بجھے بجلی کی چشمک سے
مگر اک عہدِ گل آسودہ ہے خاکِ نشیمن میں

دھواں اٹھتا ہے اختر ابھی خاک دل سے راتوں کو
شرر باقی ہے کوئی میرے آتش دیدہ خرمن میں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی تازہ مطبوعات

فراق دیار شب کا مسافر

مرتبین: شمیم حنفی، سہیل فاروقی

فراق کے غیر مطبوعہ مضامین، انٹرویو، شخصیت، شاعری اور نثری جائزے۔ معروف ادیبوں کے قلم سے۔
قیمت = 150/

لفظوں کی انجمن میں: ڈاکٹر سید حامد حسین

یہ کتاب آپ کے اس تجسس کو بڑی حد تک تشفی بخشے گی جب آپ کو یہ معلوم کرنے کی خواہش ہوگی کہ یہ لفظ کہاں سے اور کیسے ہماری زبان میں آیا۔

قیمت/135 روپے

تعبیر و تفہیم: ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم کا نام اب اردو دنیا کے لیے نیا نہیں ہے۔ موصوف کے کئی ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے مجموعے منظر عام پر آکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعے کے بھی بیشتر مضامین تحقیقی ہیں۔
قیمت = 135/

بیان اور — اختر سعید خاں

اردو کے ممتاز شاعر و ادیب اختر سعید خاں کے دس بلند پایہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت/144

فرہنگ اصطلاحات طب

GLOSSARY OF MADICAL TERMS

انگریزی۔ اردو

(ENGLISH-URDU)

مؤلف ڈاکٹر اختر امرتسری

نظر ثانی ترمیم و اضافہ مسعود احمد برکاتی

اس کتاب میں عام عربی فارسی اصطلاحی الفاظ کے بجائے اردو کے آسان الفاظ کو ترجیح دی گئی ہے۔ میڈیکل سائنس کے شعبے میں یہ اصطلاحی لغت ترجمے کی ضرورتوں کو یقیناً پورا کرے گا۔ طب کے اساتذہ و طلبہ کے لیے مفید لغت۔ قیمت/45 روپے

معاصرین و متعلقات مولانا ابو الکلام آزاد

عبد القوی دسنوی

پروفیسر عبد القوی دسنوی کا نام آزاد شناسوں کی صف میں خاصا نمایاں ہے۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کے ساتھ ساتھ ان کے معاصرین کا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ قیمت = 60

سلاخ ٹوٹتی ہے — کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کے پانچ ریڈیائی ڈراموں کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت = 90/

مخملہ — یوسف ناظم

اردو کے ممتاز مزاح نگار یوسف ناظم کے سولہ دلچسپ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت = 51/

جو رہی سو بے خبری رہی (خود نوشت)

ادا جعفری

بدایوں کی ایک بہت بڑی اور پرانی حویلی کی اونچی دیواروں کے درمیان پرورش پانے والی ایک ذہین اور حساس لڑکی کی آپ بیتی، جس کی حیثیت آج اردو شاعری میں خاتون اول کی ہے۔ قیمت/200 روپے

اخلاقیات طبیب — حکیم محمد سعید

حقیقت یہ ہے کہ طبیب کے لیے علم میں مہارت جتنی ضروری ہے اتنی ہی ضروری اخلاقی رفعت بھی ہے۔ یہ کتاب اس دور میں طب کے ہر عامل اور ہر طالب علم کے لیے ایک اخلاقی معلم کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر طریق علاج کے عاملین کے لیے مفید اور معتبر۔ قیمت/20 روپے

تصوف رسم اور حقیقت: خواجہ حسن ثانی نظامی

تصوف کی تاریخ، صوفیہ کے نظام حیات، تعلیمات، ہندوستانی سماج پر صوفیہ کے اثرات، اور ان سے بہت سے دوسرے سوالات پر روشنی ڈالنے والی اپنی نوعیت کی پہلی کتاب جس میں برصغیر ہندو پاک میں رائج جملہ صوفی سلسلوں کے مکمل شجرے بھی دیے گئے ہیں۔ قیمت/90 روپے

ترقی پسندی، جدیدیت، مابعدِ جدیدیت

ان تینوں میں سے میرا مسئلہ کوئی بھی نہیں، ترقی پسندی، جدیدیت نہ مابعدِ جدیدیت۔ لیکن اس وقت صورتِ حال کیا ہے، کیا ہو رہا ہے اور ہم کدھر جا رہے ہیں۔ نئی نسل کے لکھنے والے بالخصوص ستر پچھتر کے بعد ابھرنے والے شاعر و افسانہ نگار کیوں بار بار اپنی برأت کا اظہار کرتے ہیں، کیوں کہتے ہیں کہ وہ نہ جدیدیت کا حصہ ہیں نہ ترقی پسند تحریک کا، بلکہ ان کی پہچان الگ ہونی چاہیے کیونکہ وہ اگلوں سے الگ ہیں۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اگلوں کی صفوں سے جواب آتا ہے کہ وہ اگلوں سے الگ نہیں اور ان کی کوئی الگ پہچان نہیں اور وہ اگلوں ہی کا حصہ ہیں۔ اور نئے بہرحال یہ بالاصرار کہتے ہیں کہ وہ ان کا حصہ نہیں۔ یہ صورتِ حال دلچسپ ہو نہ ہو انوکھی ضرور ہے۔ اس سے پہلے جب جب بھی تحریکیں بدلی ہیں یا میلانات تبدیل ہوئے ہیں، کشاکش تو ہوئی ہے لیکن اس نوع کا کنفیوژن کبھی نہیں پھیلایا گیا۔ گویا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی بھی ہے اور نہیں بھی دہراتی کیونکہ اس طرح کی سچویشن فقط موجود کا مسئلہ ہے ماضی میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ایسے مضامین ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی برابر شائع ہو رہے ہیں جن میں جدید تر غزل یا جدید تر افسانے سے بحث کی جاتی ہے۔ ان میں جن خصوصیات پر زور دیا جاتا ہے ان میں سے

بعض مشترک بھی ہیں۔ اس کا بھی احساس عام ہے کہ ترقی پسند تحریک تو بہت پہلے دم توڑ چکی تھی اب جدیدیت بھی بے جان اور بے اثر ہو چکی ہے لیکن جدیدیت کے ایک حلقے سے اس کی تردید بھی کی جاتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی تحریک کے نام لیوا اس تحریک کی پسپائی کا اقرار کرنے کو آسانی سے تیار نہیں ہوتے۔ خصوصاً جب وہ اس کے قافلہ سالار بھی رہے ہوں۔ ایسے میں شمس الرحمٰن فاروقی کا سات آٹھ سال پہلے کا یہ بیان خاصا حوصلہ مندانہ تھا:

> " مجھے اس بات سے کوئی خوف نہیں آتا کہ نئے لکھنے والے جدیدیت سے انحراف کریں گے یا کرنا چاہیں گے۔ ادبی اصول و نظریات کو میں ترقی پسندوں کی طرح مطلق اور آفاقی اور ہمہ وقتی نہیں سمجھتا۔ میں امید کرتا ہوں کہ ادب کے بارے میں کئی طرح کے نظریات صحیح ثابت ہو سکیں گے۔ جدیدیت کوئی مذہب نہیں، کوئی الہامی فلسفہ نہیں، جس سے انحراف کفر ہو ... ایک دن وہ بھی ہوگا جب جدیدیت اپنا کام اچھا برا کر چکے گی۔ کوئی اور نظریۂ ادب اس کی جگہ لے گا۔ میں اس دن کا منتظر ہوں۔"

("ہماری ادبی صورتِ حال" شب خون)

یہ ۱۹۸۸ء کا بیان ہے۔ کیا ان سات آٹھ برسوں میں کوئی اور نظریۂ ادب سامنے نہیں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک نہیں کئی نظریۂ ادب زیرِ بحث رہے ہیں اور ان سب کا تعلق مابعدِ جدیدیت کے دور سے ہے۔ جہاں تک جدیدیت کا تعلق ہے جدیدیت تو دنیا میں دوسری جنگ عظیم کے بعد یعنی ۴۷-۱۹۴۶ء ہی سے رو بہ زوال ہو گئی تھی، لیکن ہر زبان میں رجحانات و میلانات ہوں یا تحریکیں، اس زبان کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر ہی پنپتی ہیں۔ اردو میں ان تحریکوں کے ماڈل لاکھ عالمی ہوں لیکن ان کے بعض ضابطے TIMINGS اور خاص ہمارے حالات کے مطابق ہوں گے۔ سامنے کی بات ہے کہ اردو میں جدیدیت

میں اس وقت شروع ہوئی جب وہ دنیا میں تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ مزید یہ کہ دنیا میں جدیدیت روشن خیالی کا حصہ تھی اور اس میں ترقی پسندی ایک جوہر تھا۔ اردو میں جدیدیت ترقی پسندی کی ضد کے طور پر ابھری اور مارکسزم دشمنی (بالخصوص ماسکو برانڈ مارکسزم دشمنی) اس کی اساسی پہچان تھی۔ سردست اس سے بحث نہیں کہ صحیح کیا اور غلط کیا تھا۔ ترقی پسندی کی طرح جدیدیت نے بھی بیس پچیس برس اردو کو سیراب کیا اور پھر اس کی قوت ختم ہو گئی۔ اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ جب تک اردو میں جدیدیت کا زور تھا، کوئی نظریاتی خلا نہیں تھا جیسے جیسے جدیدیت کمزور ہوتی گئی اور اس میں تکرار و تعمیم کی صورت پیدا ہوئی اور ذہن و شعور کو انگیز کرنے والی تازگی ختم ہو گئی، نظریاتی خلا پیدا ہوتا گیا۔ مابعد جدیدیت جو دنیا میں کئی دہائیاں پہلے شروع ہو چکی تھی اور کئی فکری کروٹیں لے چکی تھی، اردو میں اس نظریاتی خلا میں داخل ہونا شروع ہوئی۔ ادب میں بھی زندگی کی طرح چونکہ جدلیاتی عمل جاری رہتا ہے اور نئے پرانے کی کشمکش جاری رہتی ہے، بالآخر نئے نظریات پرانے نظریات کو رد کر کے یا ان کی تقلیب کر کے سامنے آ ہی جاتے ہیں۔ کبھی ان کی آمد کا اعلان زور شور سے ہوتا ہے اور ان کے مویدین شدت اور انتہا پسندی کا اظہار کرتے ہیں، کبھی یہ کام نسبتاً پرسکون اور گہرے طریقے پر ہوتا ہے لیکن ہوتا ضرور ہے۔ اس بات سے شاید ہی کسی کو اتفاق ہو کہ اردو ادب میں اس وقت نظریاتی خلا ہے یا شاعری یا فکشن کے تخلیقی رویوں میں تبدیلی نہیں آئی، یا ادبی تھیوری میں نئے نظریات کا خون شامل نہیں ہوا، یا ہماری شعریات میں جن باتوں پر ساٹھ کی دہائی میں اصرار تھا آج اس میں تبدیلی نہیں آئی۔ اگر یہ سب حقیقت ہے تو پھر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری شعریات بدل نہیں رہی اور نئے نظریات کا عمل دخل شروع نہیں ہو چکا ہے۔

جنریشن گیپ اور فوری پیشرؤوں سے انکار

نئی نسل کے ایک نمائندے کا یہ بیان خالی از دلچسپی نہیں:

" اردو ادب میں ایک ذہین، حساس اور باشعور نسل رفتہ رفتہ سامنے آ رہی ہے جو تحقیق، تنقید اور تخلیق تینوں سطحوں پر تازہ دم اور حوصلہ مند ہے۔ یہ نئی کھیپ ماضی کے صحت مند اقدار کی بازیافت حال کے ہمہ جہت عرفان اور مستقبل کی روشن سمت کے لیے مصروفِ ریاضت ہے"

(خورشید اکبر / دیباچہ مخدوم کی شاعری)

اس ضمن میں عمروں کا فرق یا زمانی بُعد بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ فاروقی نے بھی اس کا اقرار کیا ہے:

" ایسا تو نہیں ہے کہ ہمیں لوگ بڈھے ہو گئے ہیں، کیونکہ اس وقت ہمیں لوگ اعتراض کرتے تھے اپنے بزرگوں پر کہ صاحب آپ لوگ بوڑھے ہو گئے ہیں ... اور اب آپ لوگوں کو اپنی کرسیاں ہلتی ہوئی نظر آ رہی ہیں اور ویسے بھی پرانے ہو جانے کی بنا پر آپ کے نظریے میں وہ لچک نہیں ہے جس سے آپ ہم لوگوں کو پڑھ سکیں۔ کیا اس طرح کا الزام یا اعتراض ہم پر بھی عائد ہو سکتا ہے کہ اب تم بوڑھے ہو گئے ہو۔ لہٰذا تم لوگوں میں یہ کمزوری آ گئی ہے جو تمھارے پیشروؤں میں تھی کہ تم اپنے سامنے کی چیزوں کو نہیں پڑھ سکتے ... ہم لوگ کم از کم میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور اس لیے مجھے اپنے بعد والوں کی تحریریں دکھائی نہیں دے رہی ہیں جس طرح سے کہ ہم لوگ اپنے بزرگوں سے شکایت کیا کرتے تھے۔"

(ایوانِ اردو، اپریل ۹۵، ص ۱۶)

لیکن سچائی فقط اتنی نہیں۔ بیشک زمانی فاصلہ یا نسلی بُعد ایک عمومی حقیقت ہے، مذاق اور مزاج بدلتے ہیں اور اگلے پچھلوں کی بہت سی باتوں کو انگیز نہیں

کرسکے۔ لیکن اتنی ہی بڑی سچائی ، یہی ہے کہ جہاں بعض لوگ بعض رجحانات یا نظریات کا بُت بنا لیتے ہیں یا ان سے اس حد تک وابستہ ہو جاتے ہیں کہ ان خیالات کو دنیا کی آخری سچائی سمجھ لیتے ہیں، وہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو عمروں کے فرق کے باوجود اپنی کشادہ نظری کی بدولت سچ کی جستجو میں نہ صرف نئے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ خود بھی بدلتے ہیں اور نئے کی افہام و تفہیم میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ گویا زمانی بُعد فقط زمانی ہی نہیں، ہوتا یہ ذہنی بھی ہوتا ہے۔ سامنے کی مثال ہے کہ آل احمد سرور ترقی پسندوں میں پیش پیش تھے، اور بہت سے جدید ادیبوں کی بہ نسبت بزرگ تھے لیکن جب جدیدیت کا آغاز ہوا تو وہ جنریشن گیپ کا شکار نہیں ہوئے، بلکہ ان کا شمار جدیدیت کے ہراول دستہ میں ہوتا رہا اور انھوں نے جدیدیت کی افہام و تفہیم میں خاصا اہم حصہ لیا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم اور باقر مہدی بھی بہت سے جدیدیوں سے ایک آدھ نسل آگے تھے لیکن خود انھوں نے بھی زندگی بھر اپنے سے بعد کی نوجوان نسل کا ساتھ دیا اور سچائی کی تلاش میں اپنے موقف میں تبدیلی کو کبھی عار نہیں سمجھا، نتیجتاً ان کی معنویت برقرار رہی۔ اس کے برعکس جن لوگوں کے ذہنی رویوں میں کٹرپن یا سخت گیری تھی وہ اپنے بعد آنے والوں کے مسائل اور درد کو نہ سمجھ سکے اور جنریشن گیپ کا شکار ہو گئے۔

غالب نے بار بار اپنے معاصرین کے بارے میں لکھا ہے کہ فلاں کا قول وحی یا الہام نہیں ہے کہ اس کو ایمان کا درجہ دوں۔ ادب پنپتا ہے انحراف و اجتہاد و اختلاف سے۔ یہ کھیل ہی مجاز کا ہے، سو آڈن کا قول کہ "کوئی نسل اس وقت تک جدید ہو ہی نہیں سکتی جب تک وہ اپنے فوری پیشروں کا سراسر انکار نہ کرے" بھی ایسا فارمولا نہیں جس میں کوئی دراڑ نہ ہو۔ بعد کے آنے والے فوری اگلوں سے انحراف کرتے بھی ہیں اور نہیں بھی کرتے۔ اس کا کیا کیا جائے کہ اگلوں ہی میں بعض شخصیتیں تخلیقی رویوں کے اعتبار سے نو کرکے

بدل جاتی ہیں اور بعد والوں سے مل جاتی ہیں۔ سو اس صورت میں تمام اگلوں سے سراسر انکار کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر یہ انکار و اقرار EN BLOC بھی نہیں ہوتا، تخلیقی رویوں اور نظریاتی ترجیحات کی بنا پر ہوتا ہے۔ ورنہ کیوں جائیں جدیدیت نے جہاں بقول شخصے سردار جعفری یا مخدوم یا مجاز سے انکار کیا وہاں راشد یا میراجی سے انکار کیوں نہیں کیا جبکہ ان کا تعلق بھی 'فوری پیشروؤں' سے تھا۔ اسی طرح جہاں فیض کے لب و لہجے کو روایتی کہہ کر رد کیا گیا فراق و یگانہ کو رد نہیں کیا گیا، حالانکہ یہ بھی فوری پیشروؤں میں سے تھے۔ کم و بیش یہی صورت حال فکشن میں بھی جاری رہی کہ پریم چند اور کرشن چندر سے تو انکار کیا گیا، لیکن منٹو اور بیدی ہمیشہ IN رہے۔ غرضیکہ آڈن کے قول کو رہنما اصول بنا کر، آج کی صورتِ حال کو سمجھنا ممکن نہیں۔ یہ صورتِ حال میری حقیر رائے میں اتنی سادہ اور آسان بھی نہیں کہ سابقہ فارمولوں کی مدد سے اس کو انگیز کر سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی اگلوں میں سے کچھ کی سوچ میں لمحہ بہ لمحہ تبدیلی آ رہی ہو اور ان کے تخلیقی رویے بدل رہے ہوں اور نئی پیڑھی کے ادیب اور شاعر ان بدلتے ہوئے اگلوں میں ہوں اور اپنے رویوں میں زیادہ فرق نہ دیکھتے ہوں۔

کیا ہر تبدیلی یکتا نہیں ہوتی؟

اس کا اعتراف ایوانِ اردو والی بحث (اپریل ۱۹۹۵ء) میں اگلوں نے کیا ہے کہ نئی پیڑھی کے لوگ برابر کہہ رہے ہیں کہ وہ اپنے پیشروؤں سے الگ ہیں اور ان کا اعتراف الگ ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ نئی پیڑھی کے ادعا میں یہ بات بھی موجود ہے کہ اعتراف اس لیے الگ ہونا چاہیے کہ ہم لوگ اپنے پیشروؤں سے الگ ہیں۔ لیکن کیوں الگ ہیں؟ اس لیے کہ ان کے ایشو الگ ہیں اس لیے کہ ان کا تخلیقی رویہ الگ ہے اس لیے کہ ان کی سوچ الگ ہے۔ دوسرے لفظوں میں الگ ہونے کا احساس تو ہے لیکن شاید بہت سوں کے

ذہنوں میں تھیوریٹیکل فریم ورک واضح نہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب صورت حال ہے جس کی کوئی نظیر اس سے پہلے اردو میں نہیں ملتی۔ سرسید تحریک کی سماجی اور اصلاحی ترجیحات ذہنوں میں واضح تھیں۔ ترقی پسندی کا مقابلہ دقیانوسیت سے تھا اور ہندوستان کی آزادی اور عوامی جدوجہد کا تصور بھی خاصا واضح تھا اور تخلیقی ذہنوں کو پروگرام کرنے میں کوئی پیچیدگی یا دقت نہیں تھی۔ جدیدیت اس معنی میں آئیڈیولوجیکل نہ تھی جس معنی میں سرسید تحریک آئیڈیولوجیکل تھی یا ترقی پسند تحریک آئیڈیولوجیکل تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ غیر سیاسی ہے نیز وجودیت اور اجنبیت ALIENATION کا ایجنڈا ہر چند کہ پیچیدہ تھا، لیکن ترقی پسندی کے سیاسی یعنی مارکسی ایجنڈے کی تردید آسان راہ تھی، اسی لیے جدیدیت میں سب سے زیادہ زور اسی پر دیا گیا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ جدیدیت ترقی پسندی کے ردعمل کے طور پر ابھری اور جدیدیت کو اتنی نظریاتی تقویت وجودیت یا اجنبیت سے نہیں ملی جتنی ترقی پسندی کے اینٹی ایجنڈے سے ملی، بلکہ وجودیت یا اجنبیت کی نظریاتی بنیادوں کو بھی اس اینٹی ایجنڈے کے ایندھن کے طور پر استعمال کیا گیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سابقہ ادبی تحریکوں میں ایشو صاف تھے اور صف آرائی آسان تھی۔ اب صورتِ حال بہت مختلف ہے تبدیلی تو ہے لیکن صف آرائی بالکل نہیں۔ چنانچہ جن کو صف آرائی کی توقع ہے یا جو صف آرائی کے خواہاں ہیں، ان کی خواہش کے پورے ہونے کے آثار بھی نہیں۔ موجودہ حالات میں دو تین باتوں پر غور کرنا بہت ضروری ہے اول یہ کیا ہر ادبی تبدیلی یا انحرافی صورتِ حال کے لیے لازم ہے کہ وہ سابق کے پیرامیٹر کی پیروی کرے اور نوعیت کے اعتبار سے واضح متوازی خطوط پر عمل آرا ہو۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ ہر ادبی تبدیلی یا تحریک یکتا (UNIQUE) ہوتی ہے۔ یہ فقط تاریخ کا عمل ہے جو اسے سانچے میں بٹھا دیتا ہے۔ مثلاً سرسید نے جب اپنا تعلیمی مشن شروع کیا تھا جس کا حلقۂ اثر نصف صدی سے بھی

زیادہ زمانے کو محیط ہے تو تقریباً دو دہائیوں تک سرسید یا ان کے رفقا میں سے کسی نے ادعا نہیں کیا کہ یہ کوئی ادبی تحریک بھی ہے۔ جتنی تبدیلیاں بشمول حالی و آزاد کے جدید شاعری کے منشور کے یا نذیر احمد کی ناول نگاری کے واقع ہوئیں ان کو "سرسید تحریک" کا نام بہت بعد کو تاریخ نے دیا۔ اور تو اور شبلی کے نظریاتی اختلافات سرسید سے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، لیکن شمار شبلی کا بھی سرسید تحریک ہی میں کیا گیا۔ اسی طرح ترقی پسندی بھی اس اعتبار سے یکتا تھی کہ سرسید تحریک کے محرکات مقامی و مذہبی تھے۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے محرکات مقامی سے بڑھ کر بین الاقوامی، غیر مذہبی اور سیاسی تھے۔ ترقی پسندوں کو جہاں اس کا پورا احساس تھا کہ وہ شد و مد سے ایک سیاسی و ادبی تحریک میں شریک ہیں، جدیدیوں میں آج تک یہ بحث چلی آتی ہے کہ جدیدیت تحریک ہے یا میلان۔ آل احمد سرور نے ۱۹۹۵ء میں بھی اپنے 'ایوانِ اردو' والے انٹرویو میں اس بات کو دہرایا ہے کہ میں جدیدیت کو آج بھی ایک میلان سمجھتا ہوں۔ بہرحال اتنی بات تو معلوم ہے کہ جدیدیت نے بخلاف ترقی پسند تحریک کے نہ کوئی باضابطہ منشور جاری کیا نہ کوئی تنظیم بنائی، نہ عہدہ دار مقرر کیے، نہ آئے دن ریزولیوشن پاس کیے نہ مخالفین کو برادری باہر کیا۔ گویا سرسید تحریک ہو یا ترقی پسند تحریک یا جدیدیت، تغیر و تبدل کی ہر کروٹ کی یکتائی مسلم ہے۔ سب سے بڑی قدر مشترک نقطۂ نظر اور تخلیقی رویّے کی تبدیلی ہوا کرتی ہے جو تاریخی حالات کی اور خود ادب کے اپنے داخلی محرکات اور تقاضوں کی زائیدہ ہوتی ہے۔ باقی تمام تفاصیل تضادات کا مجموعہ ہوتی ہیں جنھیں ادبی تاریخ چھیل چھال کر ایک دور کا نام دے دیتی ہے۔ چنانچہ جدیدیت کے بے اثر ہو جانے کے بعد اگر نئی تبدیلیاں اور ان کے نقیب نئی پیڑھی کے لوگ اس شد و مد سے اگلوں سے انکار نہیں کر رہے یا ان میں جذباتی بغاوت کے وہ آثار نہیں تو یکتائی کے اصول کی رو سے کیا ایسا کرنا تبدیلی

کے جواز کے لیے لازم ہے؟ یہ کیا ضروری ہے کہ ہر تبدیلی نمایاں کیفیت کی حامل ہو؟ تغیر و تبدل کا ہر عمل چونکہ یکساں ہے، کبھی وہ بظاہر پرسکون اور قطعاً خاموش عمل کی صورت میں بھی رونما ہو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کسی آئندہ کے عمل تغیر کو پچھلے کے پیمانوں اور اصولوں سے ناپا جا سکے یہ ضروری نہیں۔ واضح رہے کہ ہر تبدیلی چونکہ اپنی خاص نوعیت رکھتی ہے اس لیے اپنا پیمانہ بھی وہ خود ہی ہوا کرتی ہے۔ اس کو دوسرے پیمانوں سے ناپنا مناسب نہیں۔ چنانچہ جدید تر تبدیلی کو بھی سابقہ پیمانوں کی مدد سے ناپا یا سمجھا نہیں جا سکتا۔

کیا موجودہ دور مابعد جدیدیت کا دور نہیں؟

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ مابعد جدیدیت ایک تاریخی دور بھی ہے جس میں دنیا داخل ہو چکی ہے اور اردو زبان بھی خواہ کسی ملک میں ہو اس سے باہر نہیں۔ برقیاتی میڈیا کی یلغار سے پوری دنیا زیر و زبر ہو رہی ہے۔ نئی تکنیکی ایجادات، مصنوعی سیاروں، ترسیل و تبلیغ کی بڑھتی ہوئی سہولتوں، کمپیوٹر ٹکنالوجی، کمرشل تقاضوں، صارفیت کی ریل پیل اور منڈی معیشت نے جہاں بظاہر نئی ترقیوں کے دروازے کھول دیے ہیں وہاں مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں جن کا کوئی آسان حل سامنے نہیں ہے۔ فیصلوں کی طاقت اب سیاسی قدروں سے زیادہ کمرشل قدروں کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔ یہ معمولی تبدیلی نہیں۔ جس انفارمیشن ہائی وے کا چرچا ہے ہم سب اس کی زد میں ہیں۔ خرید و فروخت، حصول علم، تجارت، ترسیل سب پر اس کا اثر پڑ رہا ہے۔ جب پوری زندگی، سماج کا ڈھانچہ، انسان کے رویے اور ثقافتی ترجیحات ہر چیز بدل رہی ہیں تو کیا زبان و ادب اس فضا سے الگ ہیں۔ پھر ہمارے اپنے مسائل بھی کم لرزہ خیز نہیں، کشمیر کا مسئلہ، بابری مسجد کا المیہ، پنجاب کی صورت حال، بمبئی بم دھماکے اور فسادات، قبائلی پہاڑی علاقوں کے مسائل، بڑھتی ہوئی آبادی، سکے کی گرتی شرح، بیروزگاری، کرپشن، سیاسی قدروں کی پامالی۔ بہرحال یہ ایک مختلف

تاریخی دور ہے اور اردو بھی اسی دور میں سانس لے رہی ہے۔ خارجی عوامل تو سب زبانوں کے لیے ایک جیسے ہیں اور یکساں ہو سکتے ہیں، لیکن ثقافتی ادبی رویے ثقافت و ادب کے اپنے مزاج اور داخلی تحرک کی بنا پر طے پاتے ہیں۔ اردو میں ضروری نہیں کہ مابعدِ جدیدیت کی تبدیلیاں مغرب کا چربہ ہوں یا مغرب کی زبانوں کا ظلِ ثانی ہوں۔ اردو میں رویوں کی تبدیلی اردو کے اپنے مخصوص حالات اور داخلی ضرورتوں اور مزاج و افتاد کی زائیدہ ہوگی اور یہ دست غور طلب بھی ہے۔ نیز یہ تبدیلیاں فقط اردو ہی میں نہیں، ہندوستان کی ہر زبان میں رونما ہو رہی ہیں۔

مابعدِ جدیدیت ردِ عمل نہیں بلکہ کشادہ ذہنی رویہ ہے

تیسرے یہ کہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جس طرح ترقی پسندی دقیانوسیت کی ضد تھی یا جدیدیت اور ترقی پسندی سیاسی اور غیر سیاسی ایجنڈے کی بنا پر ایک دوسرے کی ضد تھیں، مابعدِ جدیدیت، جدیدیت کی ضد نہیں ہے۔ یہ دونوں سابقہ تحریکوں کی طرح DIAMETRICALLY OPPOSED نہیں ہیں۔ مابعدِ جدیدیت بلاشبہ جدیدیت سے الگ بھی ہے اور اس سے انحراف بھی ہے لیکن اس میں لاحقہ 'مابعد' بے مصرف نہیں۔ یعنی زمانی اعتبار سے مابعدِ جدیدیت، جدیدیت کے بعد بھی ہے اور اس سے الگ بھی ہے۔ الگ اس معنی سے کہ اس کی ترجیحات کا انحراف اُس کی حاوی ترجیحات سے ہے۔ گویا اِس کے فلسفیانہ قضایا اُس کے فلسفیانہ قضایا سے نمو کرتے ہیں، اور اس کو سمجھنے کے لیے سابق کے قضایا کا حوالہ ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں مابعدِ جدیدیت کی متعدد انحرافی ترجیحات جدیدیت کی ترجیحات کی ارتقاعی صورت ہیں۔ یعنی ضروری نہیں کہ ہر ہر نکتے سے اختلاف کیا گیا ہو، لیکن جن نکات سے اختلاف و انحراف کیا گیا ہے، وہ اس درجہ بنیادی ہے کہ مابعدِ جدیدیت کا نظریاتی کردار جدیدیت سے الگ قرار پاجاتا ہے۔

مابعد جدیدیت کی وحدانی تعریف ناممکن، بت ہزار شیوہ

چوتھی بات یہ کہ ترقی پسندی کی طرح جدیدیت بھی نظریاتی اعتبار سے یک نوعی (MONOLITHIC) اور وحدانی تھی۔ اس کی تعریف اور تعین آسان تھا۔ مابعد جدیدیت کے جو روپ اب تک سامنے آئے ہیں، اس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مابعد جدیدیت نہ تو وحدانی ہے اور نہ یک نوعی۔ ترقی پسندی یا جدیدیت کا بنیادی محرک وحدانی نظریۂ ادب تھا جس کو دو اور دو چار کی زبان میں بیان کرنا ممکن تھا۔ جدیدیت کے بعد جو نظریۂ ادب سامنے آیا ہے اور ادبی تھیوری میں جو ترقی ہوئی ہے، اس کی کوئی نظیر سابقہ زمانوں میں نہیں ملتی یعنی موجودہ زمانہ کسی ایک نظریۂ ادب کا نہیں نظریہ ہائے ادب کا ہے: ساختیات ہو یا پس ساختیات، مظہریت ہو یا قاری اساس تنقید، تفہیمیت ہو یا رد تشکیل، نسوانیت ہو یا نئی تاریخیت، یہ سب ادبی نظریے کم و بیش اسی زمانے میں سامنے آئے ہیں یا ادب کی دنیا میں ان کا عمل دخل جدیدیت کے بعد ہوا ہے۔ ان نظریوں کی نشو و نما اور فروغ کی کہانی عالمی سطح پر جدیدیت کی پسپائی کی کہانی ہے۔ ادھر کے بیس پچیس برس فلسفۂ ادب میں کشمکش اور صف آرائی کے برس ہیں اور کئی مقامات پر یہ صف آرائی ہنوز جاری ہے۔ بہر حال مابعد جدیدیت سے ان نظریہ ہائے ادب کا ٹانکا بھڑا ہوا ہے اور اس اعتبار سے مابعد جدیدیت یک نوعی یا وحدانی نہیں۔ یہ متنوع اور تکثیری ہے۔ یعنی یہ واحد المرکز نہیں بلکہ کثیر المراکز اور رنگا رنگ ہے۔ نظریاتی اعتبار سے دیکھیں تو مابعد جدیدیت بت ہزار شیوہ ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت تک ہمارے ذہن سیدھی سادی وحدانی تعریفوں کے عادی رہے ہیں۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کی کوئی وحدانی یا بندھی ٹکی تعریف ممکن ہی نہیں۔

عام سوجھ بوجھ پر مبنی چلے آرہے فرسودہ مفروضات کو چیلنج

پانچویں اور آخری بات یہ کہ ادھر فلسفۂ معنی ہو کہ فلسفۂ حقیقت، ساری ترقی اسی بات میں ہوئی ہے کہ حقائق وہ نہیں ہیں جو نظر آتے ہیں۔ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ ـــ سوسیئر کا فلسفۂ لسان ہو یا ہوسرل کی مظہریت یا دریدا کی رد تشکیل؛ ان کا سیدھا وار عام سوجھ بوجھ پر مبنی یعنی COMMON SENSE مفروضات پر ہے۔ ہوسرل کو سب سے زیادہ اصرار اسی بات پر تھا کہ COMMON SENSE نے انسان کو اندھا کر دیا ہے حقیقت ہرگز وہ نہیں ہے جو نظر آتی ہے۔ انسان نے اپنی عام سوجھ بوجھ کی بنا پر جو مفروضات گھڑ لیے ہیں انھیں کے بل پر ہم جیتے ہیں حالانکہ وہ حد درجہ مغالطہ آمیز ہیں۔ صدیوں کے عمل نے انسان کو COMMEN SENSE کا اسیر بنا دیا ہے چنانچہ نئے فلسفوں کا براہِ راست چیلنج COMMON SENSE کے خلاف ہے جس کا سیدھا اثر فلسفہ ہائے ادب پر بھی پڑا ہے اور بہت سے سابقہ مفروضات رد ہو گئے ہیں، مثلاً معنی کا وحداتی ہونا، مصنف کا مقتدر ہونا، یا متن کی خود مختاریت یا خود کفالت، ادب اور آئیڈیولوجی یا ادب اور تاریخ کا رشتہ وغیرہ۔ ان مباحث میں پہلے سے چلے آرہے مفروضات پر جو ضرب پڑی ہے بہت سوں کو اس سے شدید صدمہ ہوتا ہے۔ چونکہ ہم میں سے بہت سے سابقہ مفروضات کے اسیر ہیں اور ان سے ہاتھ اٹھانے کو تیار نہیں، اس لیے نئے قضایا نے جو نئی روشنی دی ہے، اس کو اکثر لوگ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ تبدیلی کی نوعیت کو چونکہ وہ سمجھ نہیں سکتے، اس لیے اکثر و بیشتر ان کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ تبدیلی کو سمجھنے سے چونکہ وہ قاصر ہیں اس لیے ان کے نزدیک تبدیلی ہے ہی نہیں۔ مابعد جدیدیت کے اکثر قضایا چونکہ نئے فلسفۂ معنی اور نئے فلسفۂ حقیقت سے مربوط ہیں لیکن محمود ایاز بنگلوری ٹائپ لوگ جو اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتے، اپنے مفروضات اور تعصبات کے باعث نئے کو سمجھنے سے قاصر ہوں تو اس

پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ نئی تحریروں کو جتنا شدید اتنا صدمہ نہیں، جتنا صدمہ ان مفروضات کی شکست کے باعث پہنچتا ہے جن کے ہم اسیر ہیں۔ مختصر یہ کہ مابعد جدیدیت کے قضایا وہ نہیں ہیں جو ترقی پسندی کا یا جدیدیت کے ہیں یا سابقہ نظریوں کے تھے۔ جب تک ہم اُن مفروضات سے دستبردار نہ ہوں گے قدم قدم پر یہ مفروضات ہمارا راستہ روکیں گے اور ہم نئے کو سمجھ نہیں سکتے۔ مابعد جدیدیت کا چیلنج مشکل اور پیچیدہ اسی لیے ہے کہ ہم ایک غیر COMMON SENSE سچویشن کو COMMON SENSE مفروضات کی مدد سے جو رد ہو چکے ہیں سمجھنا چاہتے ہیں اور یہی وہ رویہ ہے جس کی نئے نظریہ ادب شدت سے نفی کرتے ہیں۔ یہ بالکل ویسی بات ہے کہ جب تک انسان نے یہ سمجھنا نہیں چھوڑا تھا کہ زمین چپٹی ہے اس وقت تک وہ یہ یقین نہیں کر سکا کہ زمین گول ہے اور وہ گردش کر رہی ہے۔

فلسفے کی دو بڑی روایتیں اور نیا ریڈیکل نقطۂ نظر

ان پانچ نکات کو ذہن نشین کرنے کے بعد آیئے دیکھیں کہ فلسفے میں یہ صف آرائی ہوئی کیسے اور کیسے ادب قدم بہ قدم اس میں شریک رہا۔ افلاطون و ارسطو سے کانٹ و ہیگل تک فلسفے کا سارا سفر دراصل شعورِ انسانی کو سمجھنے کا سفر ہے جس پر زبردست جلا مارکس نے کی اور ارتقائے انسانیت کو مہمیز کر کے تاریخ کو موڑنا چاہا۔ ہیگل اور مارکس کے بالمقابل نطشے ہے جو بالکل دوسری بات کہتا ہے یعنی ضروری نہیں کہ تاریخ کا سفر ہمیشہ انسانی ترقی کی راہ میں ہو۔ دیکھا جائے تو مارکس سے وہ تمام فلسفے وجود میں آئے جو انسانی ترقی میں اعتقاد رکھتے ہیں اور نطشے کے اثر سے وہ تمام فلسفے وجود میں آئے جو انسانی ترقی کو واہمہ قرار دیتے ہیں اور حقیقت کا دوسرا رخ دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ طرفہ لطیفہ یہ ہے کہ حقیقت کا دوسرا رُخ دکھانے کے عمل

میں خود مارکس بھی شریک ہے، کیونکہ خود مارکس نے تاریخ کے مانوس COMMON SENSE تصور کو بے دخل کر دیا اور اس کی کایا پلٹ دی۔ لگ بھگ اسی زمانے میں سوسیئر نے زبان کے مانوس تصور کو ہمیشہ کے لیے بے دخل کر دیا۔ ان بنیادی تبدیلیوں کے بعد تغیر کی ان قوتوں کو مہمیز کیا ہوسرل کی مظہریت نے اور اس کے بھی بعد لاکاں، فوکو، بارتھ اور آلتھیوسے کی غیر مقلدانہ پس ساختیاتی فکر اور جولیا کرسٹیوا اور دوسروں کی نسوانیاتی فکر نے، اور COMMON SENSE مفروضات کو پاش پاش کرنے کے اس تاریخی عمل کو انتہا تک پہنچایا دریدا کی ردتشکیل نے جس نے مانوس و نامانوس اور حاضر و غائب کو بیک وقت مسلسل گردش میں دکھا کر گویا تصورِ حقیقت اور معنی کی طرفوں کو ہمیشہ کے لیے کھول دیا اور ایک نئے ریڈیکل نقطۂ نظر کی طرح ڈالی۔

اس پس منظر میں دیکھیں تو نئے فلسفے کی رو سے سابق کی وہ تمام تحریکیں اور نظریے خواہ وہ کتنے باغیانہ اور انقلابی کیوں نہ رہے ہوں۔ وہ سب کے سب بشمول جدیدیت و ترقی پسندی جو اپنی ضابطہ بندی کرتے ہیں یا فارمولا سازی کرتے ہیں یا لائحہ عمل دیتے ہیں، وہ سب کسی نہ کسی منزل پر ادعائیت کا شکار ہو جاتے ہیں، اس لیے تخلیقیت اور آزادی کے منافی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال جدلیت اساس مارکسیت تھی جو اسٹالینت کی زد میں آ کر آزادی دشمن اور بے روح ہوتی چلی گئی۔ اردو میں ترقی پسندی نے جو اصلاً باغیانہ تحریک تھی، جب ضابطہ بندی اور سکہ بندی کا حصار کھینچا، تو گویا خود ہی ادعائیت کے خنجر سے خودکشی کر لی۔ جدیدیت بھی مزاجاً اتنی ہی باغیانہ تھی۔ اس نے ادیب کی آزادی کا نعرہ بھی دیا۔ لیکن ابہام و اشکال کو فارمولا بنا کر اور اجنبیت و مریضانہ داخلیت کو ایمان کا درجہ دے کر نیز سیاسی ڈسکورس کو یکسر شجرِ ممنوعہ قرار دے کر اور ادبی چھوت چھات کو فروغ دے کر کیا جدیدیت بھی اپنی فارمولا زدگی کی بدولت خشک اور بے جان نہیں ہوتی چلی گئی؟ غلط یا صحیح اس وقت صورتِ حال یہ

ہے کہ مابعد جدید فلسفۂ ادب کی تقریباً تمام شاخیں نظریاتی ضابطہ بندی کے سخت
خلاف ہیں اور کسی طرح کا نظام مرتب کرنے یا لائحۂ عمل دینے کے حق میں نہیں۔
دب آمیٹ اور فلسفۂ زندگی اور انسانی سوچ کے جزرومد سے نجڑے ہوئے ہیں؟
چنانچہ تخلیقیت زندگی کی طرح کسی ضابطے یا تعین یا درجہ بندی کی تابع نہیں۔
یہ ایک ریڈیکل رویہ ہے، سابقہ مارکسیت اور جدیدیت سے بھی زیادہ ریڈیکل
جن کے ماننے والوں نے ان نظریوں کو خانہ زاد کر کے گویا ان کو بے روح
کر دیا اور ان کی آزادی اور حرکیت کو ختم کر کے تخلیقیت کو نقصان پہنچایا۔
سو عجب نہیں کہ مابعد جدیدیت کے متنوع اور رنگا رنگ منظر نامے کی (جہاں
یک رنگ دوسرے کو کاٹتا ہے) کوئی ایسی تعریف متعین نہ ہو سکے جو ترقی پسندوں
یا جدیدیت پسندوں کی فارمولائی یا ضابطائی توقعات کو پورا کر سکے۔

میں یہ بات پورے وثوق سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تھیوری یعنی ادبی
نظریہ سازی یا فلسفۂ ادب ایک مکمل یا مثالی (آدرشی) صورتِ حال ہے، یعنی
IDEAL STATI، جبکہ ادیب و شاعر اپنی تخلیقات میں اس کو اپنے ذوق و
ظرف کی بنا پر فقط جزوی طور پر انگیز کرتے ہیں اور جدت و نادرہ کاری و
تازگی کی تلاش میں نئے تجربوں کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ یعنی نظریے
سے ادب اور ادبی تجربوں سے نظریہ سازی تشکیل پاتی رہی ہے۔ یہ دوہرا
تخلیقی عمل ہے جو ایک دوسرے کا ایندھن بنتا رہتا ہے اور ہمیشہ جاری و
ساری رہتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ زماں کی طرح رجحانات اور میلانات میں
بھی تسلسل ہے۔ کہیں کوئی وقفہ یا مکمل انقطاع نہیں۔ نئے میں پرانا برابر
ضم ہوتا رہتا ہے اور پرانا بھی نیا ہونے کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ اس
لیے کسی زمانے کے ادب کو تمام و کمال کسی ایک نظریے کا پابند سمجھنا اور اس
سے ضابطہ بندی کی توقع کرنا ایک ایسا عمل ہے جس کو جدید تر ذہن سادہ
لوحی ہی قرار دے گا۔

جدیدیت کی چار شقیں اور ان کا رد

البتہ ہر دور میں ایسے غالب رویے ضرور ملیں گے جن کی بنا پر ادبی ترجیحات کو APPROXIMATE کیا جا سکتا ہے یعنی قریب قریب اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان رویوں کا ذکر کرنے سے پہلے ان CATEGORIES کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ CATEGORIES جدیدیت کا امتیازی نشان تھیں اور اگر آج بھی یہ باقی ہیں تو گویا جدیدیت باقی ہے اور ختم نہیں ہوئی۔ قطع نظر اس سے کہ اگر ان امتیازی نشانات کے باوصف کچھ اور امتیازی نشانات ایسے بھی وجود میں آ گئے ہیں جو اُن کی نفی کرتے ہیں اور ان سے ہٹ کر ہیں تو خواہ یہ اندازہ ہو نہ ہو کہ کیا ختم ہوا کیا نہیں، اتنا تو پتہ چلتا ہی ہے کہ کچھ اور ہو رہا ہے اور منظر نامہ بدل چکا ہے۔ واضح رہے کہ مابعد جدیدیت کے پاس ایسا کوئی اینٹی ایجنڈا نہیں جیسا جدیدیت کے پاس ترقی پسندی کے خلاف تھا مابعد جدیدیت کا مسئلہ سرے سے کسی کا اینٹی ایجنڈا ہے ہی نہیں، اس کا مسئلہ زندگی اور انسان کا کرائسس ہے جس میں اکیلے جدیدیت کا رد کوئی مرکزی مسئلہ نہیں، اس لیے کہ بدلی ہوئی ترجیحات اور کامن سنس کے چیلنج میں جدیدیت تو اپنے آپ ہی کالعدم ہو جاتی ہے۔ بہر حال آیئے دیکھیں کہ جدیدیت کی وہ CATEGORIES کیا تھیں جن کو جدیدیت کی پہچان قرار دیا گیا۔ اوّل یہ کہ فنکار کو اظہار کی پوری آزادی ہے۔ دوسرے یہ کہ ادب اظہارِ ذات ہے، تیسرے یہ کہ فن کی تعیینِ قدر فنی لوازم کی بنا پر ہوگی نہ کہ سماجی اقدار کی بنا پر اور چوتھے یہ کہ فن پارہ خود مختار و خود کفیل ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ چاروں CATEGORIES آج بھی ترجیحی حیثیت رکھتی ہیں اور VALID ہیں۔ آیئے ان پر ایک نظر ڈالیں۔

سچائی یہ ہے کہ ان چاروں کا یا تو رد ہو چکا ہے یا ارتقاع ہو چکا ہے اور

ان میں سے کوئی بھی CATEGORY آج اپنی سادہ شکل میں صحیح یا قابلِ قبول نہیں۔ وقت کی یہی وہ گردش ہے جس کو ہم میں سے بعض اپنے سابقہ مفروضات یا مضمر مفادات کی بنا پر سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ادیب کی آزادی کا نعرہ ترقی پسندی کی کمٹ منٹ یا سیاسی ایجنڈے کی نفی میں دیا گیا تھا۔ دیکھا جائے تو آزادی کے اس نعرے کا مطلب سی پی آئی کے منشور سے آزادی یا ماسکو نواز مارکسیت سے آزادی تھا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں جدیدیت نے آزادیٔ اظہار پر زور دیا وہاں سیاسی موضوعات کو یکسر DOWNGRADE کرکے گویا ہر طرح کے آئیڈیولوجیکل ڈسکورس کو ادب سے خارج کردیا۔ اِکا دُکا آوازیں اٹھتی رہیں لیکن عام منظر نامہ یہ تھا کہ آئیڈیولوجیکل ڈسکورس کو یکسر نظروں سے گراکر گویا ادیب کی آزادی کے مویدین نے تخلیق کی آزادی پر بالواسطہ پابندی لگادی کہ آئیڈیولوجی کا رُخ نہ کیجو یہ سارے مسائل غیرادبی ہیں۔ ایک طرح سے یہ بھی لیک دینے کا ویسا عمل تھا جس سے ترقی پسندی بدنام ہوئی تھی۔ د: آزادی کو مشروط بناکر جدیدیت نے بھی وہی کیا یعنی ایں گنا ہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔ گویا جدیدیت کا آزادیٔ اظہار کا نعرہ اصلاً ایک خوبصورت مغالطہ تھا۔ ادھر نیا فلسفہ آزادی کے بارے میں جدیدیت کی دی ہوئی مغالطہ آمیز لیک کو یکسر رد کرتا ہے اور آزادی کے مسئلے کو بالکل نئی سطح پر لیتا ہے یعنی مسئلہ فقط اس موضوع یا اُس موضوع کے ادبی یا غیرادبی ہونے کا نہیں۔ آئیڈیولوجیکل ڈسکورس کے رد یا قبول کا سوال تو تب پیدا ہو جب ادیب کو اس کا اختیار ہو۔ ادیب اور ادب تو خود آئیڈیولوجی کے اندر ہیں یعنی متن آئیڈیولوجیکل فضا سے باہر ہے ہی نہیں۔ مزید یہ کہ جب ابہام و اشکال و اجنبیت و ذات شناسی کو فارمولا بنایا گیا تو یہ بھی تو ایک لیک تھی۔ جہاں لیک آئے وہاں آزادی کا فقدان لازمی ہے۔ مزید یہ واضح رہے کہ آئیڈیولوجی فقط مارکسیت ہی نہیں، ہر نظریۂ حیات یا ہر نظریۂ اقدار جس کی رو سے ہم گزران کرتے ہیں اور زندگی کو جھیلتے ہیں، وہ

کسی نہ کسی آئیڈیولوجی کے اندر ہے۔ گویا ہر ادیب کی کوئی نہ کوئی آئیڈیولوجیکل ترجیحات ہیں جو اس کے نظریہ جات میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں خواہ اس کو اس کا واضح احساس ہو یا نہ ہو۔ مختصر یہ کہ ادب اور آرٹ ہیں ہی آئیڈیولوجی کی تشکیل اور ادب اور آرٹ میں کوئی موقف خواہ وہ کتنا غیر آئیڈیولوجیکل محسوس ہو، وہ معصوم ہو ہی نہیں سکتا، یعنی آئیڈیولوجی سے عاری نہیں ہو سکتا۔ اور تو اور آئیڈیولوجی زبان کے اندر لکھی ہوئی ہے اور ادیب کے اظہار و اسلوب کا پیرایہ تک آئیڈیولوجی سے آزاد نہیں۔ پس واضح ہوا کہ ادب میں آزادی ہر ہر قدم پر مشروط ہے، غیر مشروط آزادی جس کا نعرہ جدیدیت نے دیا تھا اول و آخر ایک متھ ہے۔

دوسری بات یہ کہی گئی کہ ادب اظہارِ ذات ہے۔ حقیقتاً یہ شق ادیب کی آزادی والی پہلی شق کا لازمہ ہے اور اُسی کی طرح دیکھنے میں تو خوش آیند ہے لیکن تضاد سے خالی نہیں۔ یہ دراصل اجنبیت ALIENATION یعنی لامعنویت اور لغویت کے منفی فلسفے کی خوش آیند (EUPHEMISTIC) شکل ہے۔ ادب میں داخلیت اور باطنی منظرنامے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جدیدیت میں شکستِ ذات اور لامعنویت کی لے اس قدر بڑھائی گئی کہ ایک غیر صحت مند داخلیت کی تکرار ہونے لگی۔ زندگی کے فقط منفی پہلو پر زور دیے جانا اتنا ہی غلط ہے جتنا فقط رجائی پہلو کا راگ الاپتے رہنا۔ مزید یہ کہ ذات پر ساری توجہ مرکوز ہو جانے سے ادب موضوعیت کا اسیر ہو گیا۔ قطع نظر اس سے کہ یہ بھی ایک طرح کی لیک تھی اور آزادی کی نفی تھی، نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ حد درجہ انفرادیت اور ذات پرستی یک گونہ بورژوائیت کا پہلو بھی رکھتی ہے۔ نتیجتاً ادب ایک پُر تکرار داخلیت کا شکار ہو کر بڑی حد تک انسانی دردمندی اور اس تپش و حرارت سے محروم ہو گیا جو زندگی کے بے محابا عشق اور تڑپ سے پیدا ہوتی ہے۔

تیسرے یہ کہ اینگلو امریکی تنقید کی بنا پر خاصا زور اس بات پر دیا گیا کہ

فن کی تعیینِ قدر فنی لوازم کی بنا پر ہوگی نہ کہ سماجی اقدار کی بنا پر۔ بظاہر اس سے زیادہ اچھی بات کہی ہی نہیں جا سکتی کیونکہ ادب کی تعیینِ قدر اگر ادبی قدر کی بنا پر نہیں ہوگی تو کس بنا پر ہوگی۔ یہ تو ایک مسلمہ امر ہے جو ہر ادب کے لیے شرط ہے خواہ وہ سرسید تحریک کے زمانے کا ہو یا ترقی پسند دور کا یا جدیدیت کا۔ ادب اور غیر ادب میں مابہ الامتیاز بہرحال ادبی قدر ہی ہے۔ یعنی ادب کو ادب تو ہونا ہی چاہیے۔ اس میں فقط جدیدیت کی کیا تخصیص ہے۔ یہ امر تو مسلمہ ہے اور یہ بات تو محمد قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریاں کے زمانے سے چلی آتی ہے۔ مزید کہ میر کی شاعری ہو یا متنِ غالب، مضامینِ سرسید ہوں یا مسدسِ حالی یا اکبر کی شاعری، ان میں ادبی قدر ہے تبھی تو زندہ ہیں۔ ادبی قدر پر فقط جدیدیت کی اجارہ داری کیوں؟ جدیدیت میں اس پر اصرار اس لیے کیا گیا کہ ترقی پسندی نے ادب اور پروپگنڈہ کی تمیز اٹھا کر گویا ادبی قدر کو تحلیل کر دیا تھا۔ اگرچہ بعض ترقی پسندوں نے بھی ادب کے فنی تقاضوں کا لحاظ کیا اور اعلیٰ درجے کا ادب پیش کیا، لیکن اس میں کلام نہیں کہ عام فضا یہ تھی کہ ادب سے اشتہار کا کام لیا گیا۔ پس یہ کمی اور کوتاہی تھی جو ترقی پسندی میں واقع ہوئی، بعد میں ادب کے ادب ہونے کے لیے اس کوتاہی کو دور کرنا شرطِ اول ٹھہرا تو اس میں جدیدیت کا کمال کیا ہے؟ ادب کو ادب تو ہونا ہی چاہیے۔ غرض ادبی قدر جدیدیت کا مابہ الامتیاز نہیں، یہ تو ادب کا مابہ الامتیاز ہے۔ اس CATEGORY میں جدیدیت کا اضافہ اس کی دوسری شق ہے، یعنی تعیینِ قدر سماجی اقدار کی بنا پر نہ ہوگی۔ واضح رہے کہ ایسا جولاہے کی ضد میں ہوا۔ ترقی پسند ادیب بالعموم عوام، کسان، مزدور، طبقاتی کش مکش، پیداواری رشتے، انقلاب یعنی صرف موضوع ہی موضوع الاپتے تھے، جدیدیت نے موضوع کے الاپ کی مخالفت کی تو موضوع کے ساتھ معنی کو بھی العقط کر دیا گیا۔ کسی نے نہ سوچا کہ کیا ادبی قدر بے تعلقِ معنی ہے؟ اور اگر معنی زندگی یا سماج کے تجربے سے نہیں آتا تو کہاں سے آتا ہے؟ یعنی کیا فنی لوازم مقصود بالذات

ہیں یعنی فن اپنا مقصود خود ہے۔ یعنی استعارہ یا علامت یا پیکر قائم بالذات ہیں یا یہ معنی کے حُسن کو قائم کرنے کا ذریعہ ہیں؟ اگر یہ قائم بہ معنی نہیں ہیں تو پھر ان کا تفاعل کیا ہے؟ یہاں اس وضاحت کی ضرورت ہے کہ ادبی قدر اور فنی لوازم بالکل ایک چیز نہیں ہیں۔ فنی لوازم وسیلہ ہیں ادبی قدر کا، فنی لوازم بجنسہٖ ادبی قدر نہیں ہیں۔ مثلاً تشبیہ و استعارہ وسیلہ ہیں حسنِ معنی کا جو ادبی قدر ہے۔ یہ اگر حسنِ معنی میں شریک نہیں تو فقط تکنیکیں ہیں یعنی لوازم محض ہیں ادبی قدر نہیں۔ سامنے کی مثال ہے کہ ناسخؔ اور ذوقؔ نے بھی فنی لوازم کو برتا ہے اور خوب خوب برتا ہے۔ لیکن ان کے مقابلے میں میرؔ و غالبؔ کے یہاں فنی لوازم حسنِ معنی کے فروغ کا وسیلہ ہیں اور ادبی قدر کو قائم کرتے ہیں جبکہ ناسخؔ یا ذوقؔ کے یہاں یہ اپنا مقصود آپ ہو جاتے ہیں اور ان کا عمل فقط تکنیکی اور میکانکی رہ جاتا ہے۔ جدیدیت کے یک سُرے ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ مقصود بالذات فنی لوازم کو ادبی قدر کا بدل سمجھ لیا گیا اور زیادہ توجہ عروض و آہنگ و بیان اور تکنیکی ضرورتوں پر مرکوز ہوتی چلی گئی اور میکانکیت نے ادبی قدر کی جگہ لے لی جبکہ وسائل وسائل ہیں وہ قدر نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ معنی ہمیشہ زندگی کے تجربے سے، ثقافت سے یا سماج سے آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ادبی قدر کا مجرد تصور انتہائی مغالطہ آمیز اور گمراہ کن ہے۔ ادبی قدر معنی کے جزر و مد سے اس قدر مربوط ہے کہ جو ادبی وسیلہ معنی کے حُسن کو جتنا زیادہ قائم کرتا ہے یعنی جتنی زیادہ تاثیر یا جمالیاتی اثر پیدا کرتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ اہم ہے ورنہ مجرد فنی لوازم مثلاً استعارہ یا علامت یا پیکر یا تشبیہ یا اوزان محض فنی تکنیکیں ہیں۔ یہ ادبی حُسن کی افزائش کا وسیلہ اُس وقت بنتی ہیں جب یہ معنی کا نظام قائم کرتی ہیں ورنہ ذہنی ورزش سے زیادہ کچھ نہیں۔ جس شاعر کا نظامِ معنی یا جہانِ معنی جتنا تہ در تہ اور نیرنگِ نظر ہوگا، اتنا وہ فنکار بڑا ہوگا۔ ورنہ فنی لوازم تو ناسخؔ و ذوقؔ کے یہاں بھی ہیں اور شاید کچھ زیادہ ہی ہیں۔ لیکن افضل ٹھہرتے ہیں میرؔ و غالبؔ نہ کہ ناسخؔ و ذوقؔ۔ ادبی قدر کا حُسنِ معنی سے مربوط ہو کر عمل آرا ہونا اتنی کھُلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس بارے میں کسی بحث کی گنجائش

ہی نہیں۔ تاہم مغالطہ اس شد و مد اور پُراعتماد طریقے سے پھیلا اور سماجی قدر کو (بہ وجۂ مارکسیت) مذموم قرار دے کر اس قدر پیٹا گیا کہ کسی کا بھی دھیان اس طرف نہ گیا کہ کلاسیکی سرمایہ تو الگ رہا، سرسید ہوں یا حالی یا اکبر ان کی ادبیت کی بحث میں تو سماجی قدر برابر شریک رہتی ہے بلکہ ان کی ادبیت تو قائم ہی سماجیت اور قوم کے درد سے ہوتی ہے تو پھر جدید دور سے سماجی معنویت کا اخراج کیوں؟ کیا ہمارے سب دکھ درد اور مسائل حل ہو گئے ہیں۔ تعجب ہے کہ وہی لوگ جو کہتے تھے کہ معنی وحدانی ہے اور لفظ و معنی میں دوئی نہیں، اردو میں انھیں نے ادبی قدر اور سماجی معنی کے افتراق پر اصرار کیا، گویا ایک سانس میں جو بات کہی، دوسری سانس میں اس کی تردید بھی کر دی۔ طرفہ لطیفہ ہے کہ اس نظریاتی تضاد پر کسی کو اچنبھا نہیں ہوا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہی لوگ جو ادبی قدر کو بے تعلقِ معنی سمجھنے اور برتنے پر اصرار کرتے ہیں، غالب اور میر کی تفہیم و تشریح میں ان شعرا کی ادبی قدر سے بحث کرتے ہوئے ان کو سب سے زیادہ توجہ حسنِ معنی کی گرہ کشائی پر کرنا پڑی۔ میر و غالب کے یہاں حسنِ معنی خواہ وہ تصورِ عشق کا ہو یا تصورِ کائنات کا یا تصورِ انسان کا، کیا وہ اس زمانے کی مابعدالطبیعیاتی، ثقافتی یا سماجی قدر سے ہٹ کر ہے؟

اب رہی چوتھی CATEGORY یعنی فن پارے کا خود مختار و خود کفیل ہونا تو اس بارے میں میں اپنی کتاب میں اتنا لکھ چکا ہوں کہ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یوں بھی چونکہ یہ شق ادیب کی آزادی اور ادبی قدر کے تصور سے جڑی ہوئی ہے اور اسی موضوعیت (بورژوائیت) کی پیدا کردہ ہے جس سے ابھی اوپر ہم بحث کر آئے ہیں، مزید کچھ کہنے کی ضرورت بہت کم ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک خوش کلامی EUPHEMISM ہے لیکن دیکھا جائے تو ادب کو سیاسی شعبدہ گروں سے بچانے کے لیے بیشک اس کی ضرورت بھی تھی لیکن اب تو یہ طے ہے کہ فن خود آئیڈیولوجی کی تشکیل ہے اور فن پارے کا سفر تاریخ کے محور پر اور ثقافت کے اندر

ہے اور معنی وحدانی نہیں ہے یعنی معنی کی تعبیریں قرأت کے تفاعل سے بدلتی رہتی ہیں تو فن کی کُلی خود مختاری اور خود کفالت کا بھرم بھی ٹوٹ چکا ہے۔ غالب یا ناسخ کا متن معین ہے لیکن ناسخ کی اہمیت کم ہوتی گئی ہے اور غالب کی عظمت کا نقش روشن ہوتا گیا ہے جبکہ متن وہی کا وہی ہے۔ ہر قرأت نئی توقعات اور قاری کے ذوق وظرف و تجربے کی بنا پر ہوتی ہے اور اس میں ثقافتی ترجیحات اور تاریخ کا جزو مدشامل رہتا ہے۔ پچھلے تیس برسوں میں نئے فلسفۂ ادب کا سارا سفر فن پارے کی خود کفالت کے بھرم کے ٹوٹنے کا سفر ہے لیکن فن پارے اور تاریخ کا رشتہ اس طرح سے دو اور دو چار کا بھی نہیں جیسا ہمارے ترقی پسند احباب سمجھتے تھے۔ بائیں بازو کا فلسفی آلتھیوسے بھی اس کا اقرار کرتا ہے کہ سماجی تشکیل میں ادب (یا آرٹ) ایک طرف آئیڈیولوجی سے اور دوسری طرف سائنس وٹکنالوجی سے برابر فاصلے پر ہے۔ ادب ان دونوں سے الگ ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ دونوں سے متاثر بھی ہوتا ہے اور دونوں سے گریز بھی کرتا ہے اور دونوں سے آگے بھی جاتا ہے۔ گویا ادب کی خود مختاری اس کی مجبوری بھی ہے۔ یوں دیکھیں تو مابعد جدیدیت تک آتے آتے یہ CATEGORY جہاں رد ہوئی ہے وہاں اس کا ارتفاع بھی ہوا ہے۔

آپ نے دیکھا یہ ساری ترجیحیں اور شقیں یا تو رد ہوگئی ہیں یا بدل گئی ہیں۔ تبدیلی کا یہ عمل ذہنی اور فکری عمل ہے جو تھیوری کی بحثوں میں نسبتاً خاموشی سے ہو رہا ہے۔ اس کے لیے نہ تو کوئی نعرہ بازی کی گئی ہے نہ بغاوت کا پرچم لہرایا گیا ہے۔ یہ سیاسی مسائل نہیں یہ فلسفۂ ادب کے مسائل ہیں اور فلسفۂ ادب یعنی تھیوری کی سطح پر سطے پارہے ہیں۔ اردو میں ان مسائل کے سمجھنے میں وقت لگے گا۔ اس لیے کہ جب تک ہم سابقہ مفروضات سے ہاتھ نہیں اٹھائیں گے اور مانوس CATEGORIES سے ہٹ کر سوچنے کے لیے (جنھیں ہم نے ایمان کا درجہ دے رکھا ہے) خود کو تیار نہیں کریں گے ہم برابر مغالطوں اور خوش فہمیوں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ اس کی تازہ ترین مثال یہ ہے کہ 'ایوانِ اردو' کے جس مکالمہ کا ذکر اوپر آیا ہے اس کا ترقی پسندی کے ایک حیاتی عہدے دار پر

یہ اثر ہوا کہ وہ فوراً اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ جدیدیت کے زور ٹوٹنے اور متن کے آئیڈیولوجیکل تشکیل طے پا جانے کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ ترقی پسندی کو مراجعت کی راہ ہموار ہو گئی۔ حالانکہ ایں خیال است و محال است و جنوں!
ویسے انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ نہیں کہتے کہ . . . کے آس پاس یا بعد میں سامنے آنے والے فنکاروں پر ترقی پسندی کا لیبل لگایا جائے یا انھیں ترقی پسندوں کا جانشین گردانا جائے۔ سوال کسی کے لیبل لگانے یا نہ لگانے کا تو تب پیدا ہوتا ہے جب نئی پیڑھیاں اِس لیبل یا اُس لیبل کی روادار ہوں۔ ہمارے ترقی پسند دوست نے اس بات پر بہت خوشی کا اظہار کیا ہے کہ نئی پیڑھیوں نے نہایت بے رحمی کے ساتھ جدیدیت کے گمراہ کن رویوں سے انحراف کیا ہے۔ انھوں نے ناموں کی ایک لمبی فہرست پیش کر کے معلوم کیا ہے کہ "ان میں کون سا فنکار ایسا ہے جو شبخونی جدیدیت کے سایے میں پلا بڑھا ہو یا جس کی تخلیقات ابہام زدہ ہوں یا فہم سے عاری ہوں ... ان میں کسی نظریے اور منشور سے نہ سہی انسان کے مقدر اور انسان دوستی کی ارفع قدروں سے کمٹ منٹ ملتا ہے۔" اللہ رے یہ سادگی یہ وہ سادگی ہے جس پر مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ 'کمٹ منٹ' کا ایک خاص مفہوم تھا اور نظریہ و منشور کا بھی، اور یہ بات تاریخ کا حصہ ہے کہ اسی لیک کی بنا پر بدترین قسم کی جکڑبندی اور ادعائیت کو روا رکھا گیا، اور یہ منشور ہی کا تقاضا تھا کہ ادیبوں شاعروں کو پابند کر دیا گیا کہ وہ سیاسی انقلاب کی راہ ہموار کریں، یعنی ادیب اور پارٹی کارکن میں کوئی فرق نہ تھا بلکہ ادیب کے لیے یہ اعزاز تھا کہ وہ پارٹی کارکن کا رتبہ پا لے۔ سیاسی وابستگی بمنزلہ ایک فارمولے کے تھی اور اس سے انحراف گردن زدنی۔ ادب کی حیثیت ایک کھلے اشتہار کی تھی جس میں جتنی اشتہاریت زیادہ پائی گئی، اتنا زیادہ اس کو اچھالا گیا اور جو جتنا زیادہ زندگی کی اعلیٰ قدروں یا حسنِ معنی سے جڑا ہوا تھا، اتنا زیادہ اسے نظر انداز کیا گیا۔

ترقی پسندی کی خوش فہمیوں پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ ان کا ادنیٰ ذکر بھی تکرار کا پہلو رکھتا ہے۔ یہاں اس اشارے سے فقط یہ بتانا مقصود ہے کہ نئی پیڑھیاں جہاں جدیدیت سے انکار کرتی ہیں وہاں وہ ترقی پسندی کی جکڑبندی، ادعائیت اور خوش آیند تصورات کے کھوکھلے پن سے بھی خوب واقف ہیں اور اس کو بھی رد کرتی ہیں۔ وہ اِس یا اُس کے چکر ہی میں نہیں پڑتیں، بلکہ جیسا کہ کہا گیا ان کو احساس ہے کہ ان کا معاملہ الگ ہے، ان کے مسائل الگ ہیں اور ان کی پہچان الگ ہونا چاہیے۔ آل احمد سرور نے اس سلسلے میں بالکل صحیح کہا ہے:

" قدرتی طور پر ادب میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ایک میلان زور پکڑتا ہے اور اس کے بعد وہ اپنے عروج کو پہنچتا ہے۔ پھر اس کا ردعمل شروع ہوتا ہے اور دوسرا میلان سامنے آتا ہے۔ یہ گویا ادب کا قانون ہے کہ جو نئی رو آتی ہے وہ صرف پچھلی رو کی بازگشت نہیں ہوتی بلکہ کچھ اور نئی چیزیں لیے ہوتی ہے۔" (ایوانِ اردو، ص ۸)

مابعد جدیدیت: تخلیقیت کی نئی لہر

موجودہ منظرنامے پر جہاں ایک طرف پرانے ترقی پسند ہیں اور دوسری طرف جدیدیت کی جاتی بہار کا نظارہ کرنے والے اس کے مؤیّدین ہیں، وہاں ان دونوں کے بیچوں بیچ نئی پیڑھی کے ادیبوں/شاعروں کا کارواں اپنی آوازوں اور زمزمہ سنجیوں کے ساتھ وقت کی تال پر سر دھنتا ہوا مستانہ وار گزر رہا ہے۔ ان میں بہرحال کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو نئی تخلیقیت کا شدید احساس ہے اور جو آج کے دور کو 'تخلیقیت کی تیسری لہر' سے تعبیر کرتے ہیں:

" فی زمانہ روایتی ترقی پسندی بے معنی آموختہ اور روایتی جدیدیت بھولا ہوا حافظہ ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی کے اس اختتامیت انگیز ENDISM تناظر میں نہایت مثبت طور پر مابعد جدیدیت سے نئے عہد کی تخلیقیت کا بسیط دور ہے۔

اس میں نئی وجودیت، ساختیات، مابعد ساختیات، مظہریات، تفہیمات، رد تشکیل اور قاری اساس تنقید کی لہریں بیک وقت رواں دواں ہیں اور آہستہ آہستہ اپنے منفی عناصر کا ادغام کر کے نئے عہد کی تخلیقیت سے ہم آہنگ ہو رہی ہیں۔ ...
سکہ بند محدود معنوں میں فیشن گزیدہ جدیدیت کی جو تحریک ۱۹۵۳ء میں ادارہ رسیدہ ترقی پسندی کے آہن پوش معتقدات کی فصیلوں کی شکست و ریخت میں کامیاب ہوئی تھی، آج وہ خود حنوط شدہ دقیانوسیت، عصبیت اور ادعائیت کے مترادف ہو گئی ہے۔ یہ اپنے کو محفوظ گھونسلوں میں سمیٹنے کا ایک آسان وسیلہ بن چکی ہے، اور مابعد جدید منظر نامہ میں نئی فکر کی تازہ ہواؤں کو روکنے میں ناکام ہو کر خود اپنی شکست کی آواز ہو گئی ہے۔

مابعد جدیدیت موضوعاتی، اسلوبیاتی، ساختیاتی، لفظیاتی اور نحویاتی سطح پر بہت حد تک جدیدیت سے متغائر اور ممتائز ہے۔ اس کو اپنے فوری پیشروؤں سے سراسر انکار کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو خود ہی اختتامیت (ENDISM) بہ کنار ہیں۔ مابعد جدید تنقید کے نئے جمالیاتی اور اقداری معیار (موٹے طور پر) (۱) باغیانہ ریڈیکل کردار (۲) وفورِ تخلیقیت (۳) کثیر معنیات، (۴) متن کا لاشعور (۵) ادب میں سیاسی اور سماجی معنویت (۶) آئیڈیولوجی کی ہمہ گیر کارفرمائی (۷) قاری اور قرأت کا خلاقانہ تفاعل (۸) حسن پارہ کی تمام طرفوں کی واشگافی ہے۔ ان مابعد جدید ادبی اور فکری معیاروں اور قدروں کی نسبت جدیدیت گزیدہ، منجمد جمالیاتی فکر سے نہیں ہے۔ یہ یکسر متجسس، تازہ کار اور متحرک جمالیاتی اور اقداری فکر ہے۔ عصری سیاق میں نئی قدریں، نیا حسن، نیا آدمی، نئی دنیا اور نیا انصاف ہی یکسر غیر مرئی ہے۔ اس لیے آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ نئی فکر، معیار اور قدر کی بابت سمجھوتہ پرست اور مصلحت گزیدہ رویے اور برتاؤ کو ختم کیا جائے اور ہر نوعیت کے تنظیم پرور اور فرقہ پرست فکری اور فنی جمود سے بے محابا نبرد آزما ہوا جائے جو یکسر روایت (ادبی فرقہ واریت یا مردہ روایت) کے مترادف ہے۔ ان کے برخلاف اپنے قومی اور عالمی سیاق سے جڑ کر اپنی عظیم تر زندہ اور متحرک روایت کی روشنی میں مابعد جدید معاشرہ کی نوزائیدہ اور پروردہ نئی عہد کی تخلیقیت کی پرورش کی جا سکے۔"

(نظام صدیقی / ایوانِ اردو، فروری ۱۹۹۶ء)

جدید تر شاعری

اس نئی تخلیقی فضا میں پرورش پانے والی نئی نظم اور نئی غزل کا تذکرہ کئی لوگوں کی تحریروں میں آتا رہا ہے۔ وزیر آغا، حامدی کاشمیری، افضیل جعفری، قمر جمیل، نظام صدیقی، فہیم اعظمی، عتیق اللہ، مظفر حنفی اور کئی دوسرے حضرات جدید تر شاعری اور نئے رویوں پر بالعموم اظہارِ خیال کرتے رہے ہیں اور ان سب نے اپنے اپنے نتائج اخذ کیے ہیں جن سے اختلاف و اتفاق کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگوں نے البتہ بالخصوص نئی غزل پر توجہ کی ہے۔ ایسے مطالعات میں ڈاکٹر سید محمد عقیل (نئی غزل کا بدلتا ہوا رنگ۔ انداز۔ الٰہ آباد ۱۹۸۵ء) ڈاکٹر اسعد بدایونی (نئی غزل نئی آوازیں۔ علی گڑھ، ۱۹۸۷ء) ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی (جدید غزل کی صورتِ حال۔ قومی آواز، دہلی ۱۹۹۴ء) ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (جدید تر غزل کا رنگ و آہنگ۔ صریر کراچی ۱۹۹۵ء) ڈاکٹر شہپر رسول (جدید تر غزل کی شناخت۔ کتاب نما، دہلی ۱۹۹۵ء) اس اعتبار سے قابلِ ذکر ہیں کہ ان میں مثالوں کی روشنی میں جدید تر (مابعدِ جدید) غزل کے تخلیقی خدوخال کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ مضامین ایسے بھی لکھے گئے ہیں جن میں ساری توجہ پاکستان کی جدید تر غزل پر ہے، مثلاً یوسف حسن (اولین پاکستانی نسل کی غزل۔ اردو ادب اسلام آباد۔ جنوری ۱۹۹۴ء) خاور اعجاز (ستر کی دہائی کے چند غزل گو۔ اردو ادب، اسلام آباد ۱۹۹۴ء) قرۃ العین طاہرہ (نئے پاکستانی غزل گو۔ اردو ادب، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء)۔ ان مضامین میں جدید تر غزل کے خدوخال سے بحث کی گئی ہے اور امتیازی خصوصیات کا تجزیہ بھی ہے، نیز دونوں ملکوں سے بیسیوں نام گنوائے گئے ہیں۔ اگر نام دیکھنا مقصود ہوں تو ان مضامین سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ان کی تمام باتوں سے اتفاق ہو یا نہ ہو، اتنی بات اظہر من الشمس ہے کہ شاعری میں تبدیلی آ چکی ہے۔

جدید تر فکشن

چند الفاظ فکشن کے بارے میں۔ علاوہ ان تمام بدلتی ہوئی ترجیحات اور میلانات کے جن کا ذکر پہلے کیا گیا اور جن کا اثر ناول اور افسانے پر بھی پڑ رہا ہے، افسانے میں سب سے بڑی تبدیلی "کہانی کی واپسی" ہے۔ بعض لوگ اس کو بیانیہ کی واپسی بھی کہنے لگے ہیں جو صحیح نہیں۔ بیانیہ تو بیانیہ ہے جس میں کوئی بھی تجربہ جائز ہے۔ بیانیہ اکہرا یا رومانی یا حقیقت پسندانہ ہو سکتا ہے تو وہ علامتی یا تجریدی بھی ہو سکتا ہے۔ بیانیہ تو فکشن کا پیرایہ ہے۔ کہانی اس کا جز ہے بمعنی STORYLINE جو بیانیہ میں جاری رہتی ہے، یا جس سے پلاٹ بُنا جاتا ہے یا جو کرداروں یا واقعات یا مکالموں یا مناظر کی تشکیل کرتی ہے اور یہ سب مل کر بیانیہ بناتے ہیں۔ جدیدیت کی بعض انتہائی شکلوں میں کوتاہی یہ ہوئی کہ علامتیت اور تجریدیت کو حرفِ آخر سمجھ لیا گیا اور فیشن پرستی کی مقلدانہ روش کے تحت یہ لے اس قدر بڑھا دی گئی کہ دوسرے تیسرے درجے کے بعض فنکاروں کے ہاتھوں کہانی کی صورت ہی مسخ ہو گئی۔ اس میں افسانے کے فن اور صدیوں کے ثقافتی تقاضوں سے عمداً چشم پوشی بھی کی گئی۔ اس زمانے کا ایک عام نعرہ تھا کہ جدید افسانے کو جدید بنانے کے لیے اس سے کہانی پن کا اخراج ضروری ہے۔ کتھا کہانی اور حکایت کی جو روایت صدیوں سے ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ ہے اور ہمارے خون میں شامل ہے، اسے نظرانداز کیا گیا۔ ہر چند کہ کہانی پن افسانے سے کبھی پوری طرح غائب نہیں ہو سکا، (قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور سریندر پرکاش کی بعد کی کہانیاں اس کی روشن ترین مثالیں ہیں) لیکن جدیدیت کی تھیوریٹیکل ترجیحات میں کہانی کی بے حرمتی شامل رہی۔ ۱۹۸۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو افسانے پر جو ہند و پاک

سیمینار ہوا تھا، راقم الحروف نے اس میں پہلی بار جدیدیت کی اس کوتاہی کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ " اردو افسانہ ۔ روایت و مسائل" کا آخری مضمون " نیا افسانہ : روایت سے انحراف اور مقلدین کے لیے لمحۂ فکریہ" اسی مسئلے کو لے کر لکھا گیا تھا۔ پھر ۱۹۸۵ء میں میں نے جو سیمینار غالب اکادمی میں نئے اردو افسانے پر کرایا اُس میں شامل "نیا اردو افسانہ : علامت، تمثیل اور کہانی کا جوہر" میں بھی اسی نکتے کو بالتفصیل اٹھایا گیا۔ اب جو اردو میں بچّوں کو بھی اس کی خبر ہوگئی ہے تو سمجھا یہ جارہا ہے کہ بیانیہ کی واپسی ہورہی ہے اور اسے گویا ترقی پسند افسانے کی بحالی سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔ ترقی پسندی کے بعد جس چیز سے گریز تھا وہ تھی جذباتی رومانیت ، کھلی نعرے بازی، سیاسی تبلیغ و تلقین ، یا اکہری حقیقت نگاری جس کو 'سماجی حقیقت نگاری' کا خوبصورت نام دیا گیا تھا، چنانچہ "کہانی پن کی واپسی" کا مطلب اشتہارزدہ سیاہ و سفید میں زندگی کو دیکھنے والی سماجی حقیقت کی بحالی ہرگز نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ بعض لوگوں کی یہ خوش فہمی مبنی بر حقائق نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بلکہ مابعدِ جدید عہد کے عالمی تناظر میں بھی بے معنی اور بے مصرف تجریدیت ، ابہام و اشکال و اہمال کی منطق رد ہوگئی ہے۔ میلان کنڈیرا، گارسیا مارکیز، بورہس ، امبرٹو ایکو سامنے کی مثالیں ہیں۔ اردو اور ہندی ہی میں نہیں ، بنگالی ، گجراتی ، مراٹھی ، کنڑ ، ملیالم ہر جگہ واضح طور پر تبدیلی آرہی ہے۔ یہ تبدیلی نئے لکھنے والوں میں تو ہے ہی، پرانے لکھنے والے بھی بدل رہے ہیں۔

دوسری زبانوں میں کیا تبدیلی آرہی ہے، اگر اس میں کسی کو شبہ ہو تو رسالہ انڈین لٹریچر کا تازہ شمارہ (۱۶۴) دلچسپی کا خاصا سامان رکھتا ہے۔ اس میں گجراتی کے بارہ مشہور لکھنے والوں (کانجی پٹیل، موہن پرمار، ہمانشی شیلت، بالو شتھر، بھارت نائک، بھوپن کھاکھر، کرت دودھت، ہرشد ترویدی، اجیت ٹھاکر، جنک ترویدی، بندو بھٹ اور بپن پٹیل) کی منتخب کہانیاں شامل ہیں اور سمن شاہ نے گجراتی کہانی پر تنقیدی جائزہ لکھا ہے۔ اس پر انڈین لٹریچر کے مدیر ستچدانندن نے جو اداریہ سپردِ قلم کیا ہے، وہ ہم سب کے لیے توجہ طلب ہے۔ ستچدانندن کا

کہنا ہے کہ ان کہانیوں کے لیے انڈین لٹریچر کی خصوصی اشاعت وقف کرنے کا مقصد قارئین کو یہ بتانا ہے کہ گجراتی کہانی میں ایک مثبت تبدیلی رونما ہو چکی ہے اور کہانی بیمار منفیت اور شہری زندگی کی پر تصنع اور اوڑھی ہوئی اجنبیت کے آسیب سے نکل کر قصبے اور گاؤں کی کھری اور جینوین زندگی اور اس کے سچے مسائل کی طرف مڑ گئی ہے۔ سچدانندن نے اس رجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جدیدیت جس طرح شہری زندگی کی تنگ نائے اور منفی ذات پرستی کے حصار میں گھر گئی تھی کہانی میں نئی تبدیلی اس سے واضح انحراف ہے۔ سچدانندن نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نوع کی تبدیلی فقط گجراتی ہی میں نہیں ہوئی، دوسری زبانوں میں بھی فضا بدل رہی ہے۔ بنگال کی "اتر آدھونک" یعنی مابعد جدید کہانی بھی اپنے آس پاس کی بچی زندگی کی حرارت کو پیش کرنے لگی ہے۔ سچدانندن خود ملیالم کے ادیب اور شاعر ہیں۔ اپنی زبان ملیالم کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ملیالم کے نئے ادیب جدیدیت سے منحرف ہو چکے ہیں۔ جدیدیت مخالف نئے ملیالی ادیبوں کے موقف کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ غور طلب ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

"THE ANTI MODERNIST FICTION WRITERS OF MALAYALAM REFUSE TO SHARE THE MODERNIST IDEOLOGY OF SOLIPSISM EXILE ENNUI ABSURDITY FUTILITY AND ALIENATION"

سچدانندن نے مزید لکھا ہے کہ تمل، تیلگو، کنڑی اور اڑیا کے ادیب اپنی جڑوں سے کبھی دور نہیں گئے اور جہاں تک دلت لٹریچر کا تعلق ہے، دلت لٹریچر کی نوعیت ہمیشہ دیہی اور قصباتی اور دیہاتی رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دوسری زبانوں میں نیا رجحان بے یقینی سے یقین کی طرف، اجنبیت سے سماج کی طرف اور ذہنی تنہائی اور اکیلے پن سے جذباتی وابستگی کی طرف ادب کا سفر ہے۔ موضوعات اور تخلیقی رویوں میں بھی فرق آیا ہے اور ان تبدیلیوں کا اثر زبان اور اظہار و بیان پر بھی ہو رہا ہے۔ نئے آواں گارد نے اشکال سے مملو، یا فیشن گزیدہ تجریدی، علامتی، نیز پیچیدہ یا خواہ مخواہ مرعوب کرنے والی منجمد زبان کو بھی ترک کر دیا ہے اور عام زندگی کے تجربے سے ابھرنے والی زندہ، سچی، گرم اور دھڑکتی ہوئی زبان، نیز روزمرہ اور کہاوتوں اور بولیوں ٹھولیوں کو لے لیا ہے۔ ان نئے لکھنے والوں نے اہمال کی منطق کو رد کر کے کتھا کہانی کی صدیوں پرانی روایت یعنی کہانی پن کے تخلیقی تفاعل اور کہانی کہنے اور سننے کے عمل سے بھی از سر نو رشتہ جوڑا ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں مابعد جدیدیت کے جلو میں جو تبدیلیاں آ رہی ہیں، ان میں ایک واضح مثبت اور صحت مند فضا ہے۔ سچدانندن کا کہنا ہے کہ ان نئی تبدیلیوں سے کہانی ایک بار پھر ہندوستانی زندگی کی جدوجہد کے بڑے ڈسکورس سے جڑ رہی ہے

اور اس میں زمینی رشتوں کا گہرا پن آرہا ہے۔

آج اردو افسانہ نگاروں میں شاید ہی کوئی ہو جو بے مقصد ابہام یا فیشن گزیدہ تجرید و اہمال کی منطق کی تائید کرتا ہو یا کہانی پن کے خلاف ہو یا کہانی کی سماجی معنویت سے انکار کرتا ہو جیسے دیکھا جائے تو اردو میں تجربات کی زد میں افسانہ ہی زیادہ رہا ہے، ناول جس فنی حوصلہ مندی کا متقاضی ہے وہ ویسے ہی خال خال تھی، اردو ناول ترقی پسندی کے محدود اشتہاری دور سے قطع نظر زیادہ تر تاریخی ڈسکورس سے جڑا رہا ہے اور ناول کے سماجی منصب سے انکار کم ہی کیا گیا۔ پھر ایک بڑا HATERSHED قرۃالعین حیدر کی تخلیقی شخصیت بھی ہے جس کی جاری و ساری روح ہی تاریخ کا جزر و مد، وقت کا بہاؤ، اور ثقافتی اقدار کی وہ خوشنما دھنک ہے جس کے رنگوں میں ہندی اور اسلامی تہذیبی اقدار کا خون گھلا ملا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر انسانی مقدر کی کش مکش جس کا المیہ زماں کی گردش ہی میں رقصاں و گرداں نظر آتا ہے۔ انتظار حسین کا داستانی اسلوب بھی ثقافتی جڑوں کی تلاش کا عمل ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک ہزار برس کی تہذیبی تاریخ کے نقوش انتظار حسین کے ذہن میں مستحضر ہیں۔ ان کے یہاں ماضی اور حال دونوں ایک دوسرے کی طرف سفر کرتے ہیں۔ ادھر پاکستانی معاشرے کی ناولاتی تشکیل جیسی ان کے ناولوں میں ملتی ہے اور کہیں نہیں ملتی۔ ان کے علاوہ دوسرے لکھنے والوں کے یہاں بھی معاشرے کے تضادات اور مسائل پوری فنی آب و تاب سے نمایاں ہیں۔ کہنے کا مقصد ہے کہ ناول نے تحریکاتی اتھل پتھل میں اپنی راہ کھوئی کم ہی کی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ غیر ضروری تجریدیت تو اردو ناول کو کبھی ہضم ہوئی ہی نہیں، جو دو ایک مثالیں ہیں وہ بھی تمثیلی اور داستانی اسلوب کی زائیدہ ہیں مثلاً مظہر الزماں خاں کا 'آخری داستان گو'، غضنفر کا 'پانی' یا عشرت ظفر کا 'آخری درویش'، ان سب کی فضا ثقافتی ہے۔ اور داخلی استعاراتی پیرایہ اول و آخر داستانی ہے۔ قطع نظر ایسی خال خال مثالوں سے ادھر جو ناول سامنے آئے ہیں، مثلاً مکان (پیغام آفاقی) دو گز زمین، خوابوں کا

سویرا (عبدالصمد) فائر ایریا (الیاس احمد گدی) گیان سنگھ شاطر (گیان سنگھ شاطر) ندی (شموئل احمد) بیان (مشرف عالم ذوقی) کہانی انکل (غضنفر) یا بعض دوسرے ان میں کسی کا بیانیہ تجریدیت یا اشکال و ابہام کی منطق پر قائم نہیں، بلکہ سب کے سب مسائل ناول ہیں اور معاشرت کے ہلکے گہرے رنگوں سے گندھے ہوئے ہیں۔ ان تازہ ترین اردو ناولوں کی موجودگی میں ناول کے سماجی منصب سے یا آئیڈیولوجیکل تشکیل ہونے سے انکار کرنا اپنی ادب نافہمی کا ثبوت دینا ہے۔

جدید تر تنقید

رہی تنقید اور نئی تھیوری تو اس پر بہت کچھ پہلے عرض کر چکا ہوں۔ مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہے نہ ضرورت۔ فقط یہ کہ ادھر ایک کرم فرمانے لکھا کہ اینگلو امریکی تنقیدی ماڈل رد ہو چکا جو معروضی تھا تو کیا اب تنقید نظریاتی ہوگی۔ لیکن فلاں صاحب تو کہتے ہیں کہ تنقید نظریاتی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ سوال ایک بہت بڑے مغالطے کا حصہ ہے جس کو نوآبادیاتی ذہنیت برسوں تک پیدا کرتی اور پروان چڑھاتی رہی ہے۔ بہتوں کو اس کا اندازہ نہیں کہ جدید تنقید کی معروضیت نظر کا دھوکا ہے جو زندگی کی کشاکش کے زندہ ڈسکورس سے توجہ ہٹا کر تکنیکی بحثوں میں الجھاتی ہے۔ سوال کرنے والے کو یہ معلوم ہی نہیں کہ بنیادی طور پر اینگلو امریکی تنقید کا ماڈل موضوعی اور بورژوائی تھا اور اس لیے رد ہوا کہ معنی کے اُس نیرنگِ نظر کی جو ادب میں زندگی اور ثقافت اور تاریخ کے بڑے پینوراما سے آتا ہے، یہ تنقید متحمل ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ معنی وحدانی ہے ہی نہیں، سیال ہے اور وقت کے محور پر گردش میں ہے۔ ادبی حسنِ معنی کی بحثوں سے وقت اور ثقافت اور آئیڈیولوجیکل ڈسکورس کا اخراج ممکن ہی نہیں۔ یہ ادب کو بے روح کرنے کی آسان ترین اور خوش آیند راہ تھی جو نوآبادیاتی ذہنیت کو خوب راس آتی تھی۔ اب مابعد نوآبادیاتی عہد میں اگر یہ ہیئتی ماڈل رد ہو چکا تو کیا تنقید نظریاتی ہو جائے گی، یہ خدشہ ہمارے اسی ذہنی رویّے کا غماز ہے کہ اگر

یہ لیبل نہیں تو اس لیبل کی جگہ دوسرا لیبل لگانا ضروری ہے۔ یا یہ لیک نہیں تو کوئی دوسری لیک تو ہوگی ہی۔ یعنی جدیدیت نہیں تو مراجعت اور اگر ہیئتی نہیں تو پھر نظریاتی۔ اس کا ابھی اندازہ ہی نہیں کہ ادبی سوچ کے یہ دونوں زاویے رد ہو چکے ہیں اور اس کے بعد ادبی تھیوری کی نئی صورت ان جکڑ بندیوں اور فیشن و فارمولے سے ہٹ کر بھی ہو سکتی ہے۔ اوّل تو یہ ذہن نشیں رہے کہ اگر نظریے سے مراد نظریۂ حیات، نظریۂ اقدار یا آئیڈیولوجی ہے تو ادب ہے ہی یکسر نظریاتی اور جب ادب اس معنی میں نظریاتی ہے تو تنقید کیسے غیر نظریاتی ہو سکتی ہے۔ لیکن نظریاتی سے مراد پارٹی نوسٹ کی محتاج اور تبلیغ پر مامور اشتہار سازی بھی نہیں بلکہ واضح رہے کہ اپنے عہد کے ذہنی ڈسکورس سے آگاہ حریت کوش سوچ۔ نئی تھیوری کی سب سے بڑی دین اگر کچھ ہے تو یہ کہ اس نے ہر طرح کی کلیت پسندی اور جبریت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ وہ سرے سے لیبل لگانے کے، ضابطے بنانے کے یا لائحۂ عمل دینے کے خلاف ہے کیونکہ ضابطے خواہ وہ کیسے ہوں ادعائیت اور جبریت کی طرف لے جاتے ہیں یا اسٹیبلشمنٹ بناتے ہیں جو تخلیقیت کی آزادی کے منافی ہیں۔ نئی ادبی تھیوری نہ کوئی لائحۂ عمل دیتی ہے نہ کوئی نظریاتی تعریف ہی وضع کرتی ہے کیونکہ ایسا کرنا فکری و تخلیقی آزادی پر پہرہ بٹھانے کے مترادف ہے اس بات کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ نئی تھیوری تخلیق و تنقید کو لائحۂ عمل یا ضابطہ نہیں، نئی بصیرتوں کی روشنی دیتی ہے کہ ادب کیا ہے، زبان و معنی کی نوعیت کیا ہے۔ ادب بطورِ ادب قائم کیسے ہوتا ہے اور پڑھا اور سمجھا کیسے جاتا ہے یا لطف اندوزی اور جمالیاتی حظ کی نوعیت کیا ہے یا قاری اور قرأت کا تفاعل کیا ہے وغیرہ۔ اس کی سب سے بڑی یافت جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں زبان و ادب و ثقافت کی نوعیت و ماہیت کی وہ آگہی ہے جو معنی پر چلے آرہے جبر کو توڑتی ہے اور معنی کی طرفوں کو کھول دیتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تنقید اول تو قرأت کا استعارہ ہے۔ دوم ادب فہمی

کا وظیفہ ہے اور سوم ثقافتی عمل کا حصہ ہے۔ مابعدِ جدید عہد میں جو تنقید رائج ہوگی اس کی اصل آزمائش اسی میں ہے کہ وہ سکہ بند ترقی پسندی اور فیشن گزیدہ جدیدیت دونوں کے کلیشے آلود متعینہ معنی اور کُلیت پسندانہ تصورات سے آزاد ہو، اور نوعیت کے اعتبار سے غیر مقلدانہ ہو تاکہ کوئی ادبی اسٹیبلشمنٹ پہرہ نہ بٹھا سکے اور تخلیق کے لیے تازہ کار فکر و نظر کی راہ کھلی رہے۔

سیلِ وقت میں نئے پرانے کا ساتھ

آخر میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے کہ یہ بات معلوم ہے کہ ادبی رجحانات کلنڈر کے اوراق کی طرح نہیں بدلا کرتے۔ اور اکثر و بیشتر تحریکوں کے لیے جن سنین کا تعین کیا جاتا ہے، وہ رجحانات ان سے بہت پہلے اپنے قدم جمانا شروع کر چکے ہوتے ہیں۔ مثلاً محمڈن اینگلو اورینٹل کالج ۱۸۷۷ء میں قائم ہوا۔ مسدس حالی ۱۸۷۹ء میں لکھی گئی اور مقدمہ ۱۸۹۳ء میں منظرِ عام پر آیا لیکن سرسید تحریک ان سنگ میل کارناموں سے دہائیوں پہلے شروع ہو گئی تھی جب دہلی میں ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی اور ماسٹر رام چندر اور رفقا کی مساعی سے محب ہند اور فوائد الناظرین جاری ہوئے تھے، نیز جب ڈاکٹر اشپرنگر کے اشتیاق دلانے پر سید احمد خاں نے دہلی کی عمارتوں کا احوال بطور آثار الصنادید لکھنا شروع کیا اور کچھ بعد سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اسی طرح ترقی پسندی کا رسمی افتتاح خواہ ۱۹۳۶ء میں ہوا، لیکن انگارے تین برس پہلے منظرِ عام پر آکر شعلہ سامانی کر چکی تھی، مزید براں جوش کی 'گرمی اور دیہاتی بازار' یا 'کسان' جیسی نظمیں شعلہ و شبنم (اشاعت ۱۹۳۶ء) سے برسوں پہلے رسائل میں نکل چکی تھیں اور عوامی و انقلابی شاعری کی فضا سازی کر چکی تھیں۔ جدیدیت کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جدیدیت کا باقاعدہ آغاز تو آزادی کے بعد کی دہائی میں ہوا لیکن حلقۂ اربابِ ذوق نے بیج بہت پہلے ڈال دیا تھا اور اسی زمانے

کے ابھرنے والے میراجی اور راشد جدیدیت کے نمائندہ ترین شعرا قرار پائے۔
ایسی کچھ زمانی کیفیت مابعد جدیدیت کی بھی ہے۔ عالمی منظرنامہ تو اینگلو امریکی
موضوعی بورژوائیت کے رد ہوتے ہی بدلنا شروع ہوگیا تھا۔ اردو میں بھی نوآبادیاتی
ذہنیت سے چھٹکارا پانے اور دونوں تحریکوں کے متعینہ معنی کے جبر سے رہائی
پانے اور دی ہوئی لیک سے گریز کا عمل جدیدیت کے عروج ہی کے زمانے میں
شروع ہوگیا تھا اور دونوں رویوں سے ہٹ کر ایک متبادل تخلیقی فضا بھی بننا
شروع ہوگئی تھی، البتہ مسائل صاف ہونا شروع ہوئے نئی ادبی تھیوری کی
پیش رفت کے بعد جس کے کچھ مقدمات کا ذہن نشین ہونا ہنوز باقی ہے، اس
لیے کہ اس کی بہت سی بصیرتیں مثلاً آئیڈیولوجی اور ثقافت کا زبان میں نقش ہونا،
معنی کا وحدانی نہ ہوکر مسلسل گردش میں ہونا، فن پارے کا خودمختار یا خودکفیل نہ ہونا،
یا معنی کو موجود بنانے کے عمل میں مصنف کے علاوہ قاری اور قرأت کے
تفاعل کا شریک ہونا اور اس عمل کا تاریخ کے ڈسکورس کے اندر اور بدلتی ہوئی
ذہنی توقعات کے افق پر واقع ہونا ایسے مقدمات ہیں جن کو انگیز کرنے کے لیے
پہلے سے چلے آرہے سکہ بند مفروضات اور ذہنی تحفظات سے ہاتھ اٹھانا بہت
ضروری ہے۔ ویسے مابعد جدید چیلنج میں اکیسویں صدی کے قدموں کی چاپ
صاف سنائی دے رہی ہے۔ اس کے بہت سے ریڈیکل رویوں کا رخ ہی ہے
مستقبل کی طرف۔ جیسے وضاحت کی گئی وقت سے پہلے ہی آنے والے وقت
کی پرچھائیں پڑنے لگتی ہے گویا بیسویں صدی کی آخری دہائی ہی سے اکیسویں
صدی کا عمل دخل شروع ہوچکا ہے۔ ویسے تو نئے منظرنامے کی تشکیل اصلاً
نئی پیڑھی کے ہاتھوں ہو رہی ہے لیکن ادب چونکہ ایک سلسلہ جاریہ ہے، اس
میں نیا پرانا ساتھ ساتھ بھی چلتا رہتا ہے بالکل جیسے پریم چند اور ملک راج آنند
اور جوش بہت پہلے سے لکھ رہے تھے، پھر بھی لوگ نئے رجحان کے نقیب
بھی ٹھہرے، یا جیسے راشد یا میراجی یا آل احمد سرور نے اپنے بعد آنے والی

نوجوان نسلوں کا ساتھ دیا۔ اسی طرح جدیدیت کے بہت سے نامور شعرا اور فکشن لکھنے والوں میں بھی تبدیلی آچکی ہے اور اندر ہی اندر انھوں نے دونوں طرح کی لیک کو تخلیقی طور پر مسترد کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ عمل وقت کے ساتھ روشن تر ہوتا جائے گا۔ ویسے بھی ادب کی دنیا آزادی اور اختلاف کی دنیا ہے۔ مابعد جدیدیت یوں بھی ظرفوں کو کھولنے، ہر طرح کے جبر اور کلیت پسندی کو رد کرنے، اور تخلیق کے جشن بہاریہ میں سب کو شریک کرنے سے عبارت ہے۔ اس میں کسی طرح کے ردعمل، تنگ نظری، تشدد اور ادعائیت کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ یہ کسی نوع کی دشمنی یا مخاصمت کی بھی روادار نہیں بلکہ اس طرح کے رویوں کو بھی رد کرتی ہے۔ ادب میں متوازی دھاروں کا بہتے رہنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ جدیدیت کی مقبولیت کے زمانے میں ترقی پسند بھی اپنا کاروبار کرتے رہے بلکہ اب تک اپنے جشن چہل سالہ منا رہے ہیں۔ سو مابعد جدید چیلنج کے بعد اگر جدیدیت بھی اپنا جلوۂ جانانہ دکھاتی رہتی ہے تو اس میں حرج کی کوئی بات نہیں۔ ایک لطیفہ بلکہ واقعہ سن لیجیے۔ آل انڈیا ریڈیو میں جب اردو سروس کا آغاز ہوا تو ساغر نظامی ڈپٹی چیف پروڈیوسر بنائے گئے۔ سلام مچھلی شہری پروگرام کو ترتیب دیتے تھے۔ ایک سلسلہ شروع کیا گیا یادِ رفتگاں، جس میں مرحومین کا کلام ان کی آواز میں سنایا جاتا تھا۔ ایک بار اناؤنسر کی غلطی سے ساغر نظامی کا کلام یادِ رفتگاں میں نشر ہو گیا۔ اگلے دن صبح جب برآمدے میں ساغر نظامی گردفر سے سیاہ شیروانی پر سرخ پھول لگائے نمودار ہوئے تو بیچارے سلام کی سٹی گم۔ ساغر نے کہا چہ خوب، بازی بازی بہ ریشِ بابا ہم بازی۔ سلام نے کہا حضرت خیریت کیا ہوا۔ ساغر نے پوچھا ابے عقل ماری گئی ہے ہم تمھیں زندہ نظر نہیں آتے۔ سلام نے جواب میں کہا ساغر صاحب آپ زندہ ہیں تو کیا شاعری تو مرحوم ہو چکی! بعینہٖ یہی معاملہ تحریکوں اور ادوار کا ہے، رجحانات بدل جاتے ہیں، لیکن لوگ چلتے رہتے ہیں۔ یہ ادب کے پیے تو راما کا کمال ہے کہ جہاں

ایک طرف مجاز و مخدوم کی زمزمہ سنجیاں سنائی دے رہی ہیں، اسی اسٹیج سے استاد ناطق گلاؤٹھوی اور نوح ناروی بھی اپنا کلامِ معجز بیان عطا فرما رہے ہیں۔ ادب کی جمہوریت عجب جمہوریت ہے۔ اس میں نیا پرانا، ادنیٰ اعلیٰ، قدیم جدید، چھوٹا بڑا، جوانِ رعنا اور پیرِ فرتوت سب کی گنجائش ہے۔ وقت دیر سویر سب کا حساب کر دیتا ہے۔ ہم آپ نہیں، خیال خیال سے، دلیل دلیل سے اور ڈسکورس سے ڈسکورس ٹکراتا ہے، اور یوں فرسودہ اور از کار رفتہ اپنے آپ منہدم ہو جاتا ہے۔ نئی پیڑھی اگر آج اپنی شناخت الگ چاہتی ہے تو ہم آپ روکنے والے کون ہیں۔ یہ بہرحال بشارت کی گھڑی ہے اور اس کا خیر مقدم برحق ہے۔

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

ڈاکٹر مظفر حنفی
پروفیسر اقبال چیئر
کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ

غزل

سن کے ہمارے شعر کبھی تو ہنسا کرو
فطرت پہ اختیار نہیں، تم بھی کیا کرو

حساس ایک تم ہی نہیں، دوسرے بھی ہیں
بے وجہ دوستوں سے خفا مت ہوا کرو

بیٹھے بٹھائے لوگ مجھے گھورنے لگے
یوں اپنی انجمن سے نہ غائب رہا کرو

ویسے تو دستِ شوق سے بے حد خفا تھا وہ
لیکن نگاہ بول رہی تھی، خطا کرو

کانٹے نہیں کہ گرتے ہوئے تھام لیں تمہیں
آسان راستوں پہ سنبھل کر چلا کرو

پہلو بچا کے طنز مظفر نے یوں کیا
ہم سے نہیں تو خیر کسی سے وفا کرو

جلیل الٰہ آبادی
اورنگ آباد

غزل

آئینہ وقت کا دیکھا تو خدا یاد آیا
آخر انسان تھا سوچا تو خدا یاد آیا

جس کو پلکوں پہ سجائے ہوئے اک عمر کٹی
خواب وہ ٹوٹ کے بکھرا تو خدا یاد آیا

کیا مقدر ہے کہ سچ بول کے مجرم ٹھہرا
دیکھا انصاف کا چہرہ تو خدا یاد آیا

جس پہ پُرکھوں نے لہو اپنا لٹایا تھا کبھی
آج اسی راہ سے گزرا تو خدا یاد آیا

ہم بھی بے خوف فضاؤں میں اُڑا کرتے تھے
رُخ ہواؤں کا جو بدلا تو خدا یاد آیا

سانسوں پہ کھڑا ہے یہ خیالوں کا محل
رندگی کیا ہے یہ سوچا تو خدا یاد آیا

کتنے زخموں کو چھپائے ہوئے بیٹھے ہیں جلیل
جس کو بھی ٹوٹ کے چاہا تو خدا یاد آیا

ستیہ پال آنند

درد کا ہر ایک چہرہ

کیسا طائر ہے جو شاخِ جسم پہ بیٹھا ہوا
اپنے پروں کو نوچتا ہے!

کیسا دشمن ہے جو خود اپنی صفوں کو چیر کر
یلغار کرتا، اپنے خوں میں بھیگتا
پسپائی میں اپنے ہی پانو کاٹتا ہے!

کیسا مردم خور ہے، جو آپ اپنی
بوٹی بوٹی نوچ کر کھاتا ہے
پیاسا ہے، مگر اپنے لہو کا!

درد کا ہر ایک چہرہ میرا پہچانا ہوا ہے!!

مئی ۱۹۹۶ء میں ایک کار حادثے میں شدید طور پر زخمی ہونے کے بعد اسپتال میں لکھی گئی۔

ڈاکٹر سید محمود دیوان
لندن

صدری پرتاب گڑھی
۲۸، اسکول روڈ، پرتاب گڑھ یوپی

غزلیں

فریبِ نظر جس گھڑی یاد آئے
وہیں عاشقی کے قدم ڈگمگائے

بہاریں کہاں یہ ہیں گلچیں کے سائے
جو اتنا سمجھ لے وہ دھوکے نہ کھائے

بہت نفرتوں کے اندھیرے ہیں چھائے
خدارا کوئی شمعِ الفت جلائے

یہ موتی سے آنسو بڑے کام آئے
حسینوں کے دامن پہ ٹانکے سجائے

غمِ زندگانی بس اتنا سمجھ لو
خدا دشمنوں کو نہ یہ دن دکھائے

چلے آؤ اک دن نظر بھر کے دیکھوں
زمانہ ہوا ہے مجھے مسکرائے

تمھیں بھولنے کی دعا اور دیواں
جہاں ہاتھ اٹھائے کہ تم یاد آئے

کم نگاہی تھی سرابوں کو سمندر سمجھے
اک شکستہ سے درو بام کو ہم گھر سمجھے

زندگی کھل کے بھلا ہم سے کبھی ملتی کیا
ہم ہمیشہ اسے بیمار کا بستر سمجھے

ہر بلندی اسی انساں کا بنتی ہے نصیب
خود ستائی سے بچے حود کو جو کم تر سمجھے

سچ تو یہ ہے جنھیں احساس تحفظ نہ ملا
گھر میں رہتے ہوئے وہ اپنے کو بے گھر سمجھے

تیری محفل میں جب آئے تو ہوا یہ روشن
ہم رہے بونوں میں اور خود کو قد آور سمجھے

اپنی خلوت میں وہی شخص تھا حیواں جیسا
سادہ لوحی سے جسے لوگ پیمبر سمجھے

میرے لہجے نے مجھے کر دیا صدری بدنام
مجھ کو پرکھا نہیں احباب نے پتھر سمجھے

عمران عظیم
نیر کدہ، رمیش پارک
لکشمی نگر، دہلی ۹۲

غزل

فضول ہے سب یہ پڑھنا لکھنا بجا ہے زر بے شمار ہونا
یہ کیا کہ دانشوروں کی صورت عجوبۂ حرف زار ہونا

مسافروں سے کہو کہ رک کر قیام کرلیں تھکن مٹائیں
اگر انھیں ہو پسند میرے وجود کا سایہ دار ہونا

تمام سوچیں بدل گئی ہیں تمام قدریں بدل گئی ہیں
بہت ہی مشکل ہے اب ہمارے معاشرے کا سدھار ہونا

مخالفت سے مرے عزیزوں نے نام چمکا دیا ہے میرا
لکھا تھا قسمت میں کس لوا سے مرا بڑوں میں شمار ہونا

لہو کی رنگت ہوئی سفید اب عزیز ملتے ہیں مصلحت سے
گراں گزرنے لگا ہے بھائی کو بھی مرا مالدار ہونا

عظیم حق کی دہائی دو گے تو ناتواں تم کو سب کہیں گے
وہی تو حق ہے جو کر دے ثابت تمھارا بااختیار ہونا

شفیق سرونجی
۱۶۱ ہاتھی تھان
سرونج۔ ودیشہ۔ (ایم پی)

دوہے

یار ہمارے دیس میں ہے کیا اندھیر
ملنے والے دیکھ کر بن جاتے ہیں غیر

دھیرے دھیرے ہو گئی ساری دنیا ڈھیر
اب نہ ہوگا پانی میں مگر مچھ سے بیر

میری منزل دور ہے تیری منزل پاس
رستہ تو پُر خار ہے پھر بھی ہے کچھ آس

جانے کیسا ہو گیا دنیا کا دستور
پل دو پل میں کر دیے رشتے چکنا چور

رنگ جمایا دھوپ نے کہیں نہیں ہے چھاؤں
منزل کتنی دور ہے تھکنے کو ہیں پاؤں

پروین صدیقی
۹۳ر اقبال باغ، نزد عبداللہ کالج
ڈی روڈ، علی گڑھ یوپی

غزل

کیوں حالِ دل کہیں کسی نامہرباں سے ہم
واقف ہیں خوب فطرتِ سنگِ جہاں سے ہم

موج آئی ایک اور کنارے پہ لے گئی
اس کو بھی ناخدا سے لگے بدگماں سے ہم

آندھی یہ وقت کی ہمیں کس سمت لے اڑی
ٹکرائے جا کے پھر اسی نامہرباں سے ہم

بعدِ نماز دستِ دعا اٹھ کے گر گئے
اس درجہ ہیں ڈرے ہوئے اب آسماں سے ہم

یہ سوچ کر کسی کا اب احسان کیوں اٹھائیں
ہیں مطمئن بچھڑ کے بہت کارواں سے ہم

ہم وہ جلے ہیں دودھ کے پھونکے جو چھاچھ بھی
کھلنے نہ پائے وصل میں بھی رازداں سے ہم

پروین جانے آنے کے قائل نہیں کہ اب
ڈرتے ہیں میہماں تو کبھی میزباں سے ہم

مدیحہ فضل

(نثری نظم)

تقلید

میں نے ایک رنگ
کی دنیا دیکھی
ہر آدمی
ایک سمت
چلتا ہوا
ہر آدمی
ایک بات کرتا ہوا
ہر آدمی
ایک جگہ رکتا ہوا
ہر آدمی
ایک ہی
کام کرتا ہوا
ہر آدمی
ایک طرف
دیکھتا ہوا
یہ کیسی اندھی
تقلید ہے ......

غنی اعجاز
مومن پورہ
اکولہ (مہاراشٹر)

غزل

لطفِ ستم سرورِ جفا کو ترس گئے
ہم مجرمانِ شوق سزا کو ترس گئے

آلودگی کے زہر سے مسموم تھی فضا
وہ حبس تھا کہ تازہ ہوا کو ترس گئے

سب رہ گئی دھری کی دھری قدرتِ کلام
حد یہ ہوئی کہ حرفِ دعا کو ترس گئے

آبِ حیات پی کے جو مسرور تھے بہت
انجام کار اپنی قضا کو ترس گئے

عرصہ ہوا کہ پھر سے نہ آئی نوائے حق
کوہ دمن تو صوت و صدا کو ترس گئے

اہلِ حرم سے دیر تلک کی جو گفتگو
ان کی زباں پہ نامِ خدا کو ترس گئے

اپنے لہو سے جن کی ہتھیلی گلاب تھی
اعجاز اب وہ رنگِ حنا کو ترس گئے

عبدالرحیم نشتر
لوتری ماو ھیامک ودیامندر
لیمت، مہاراشٹر

غزل

دھوئیں کے بادل ہیں چاروں جانب
سلگتے جنگل ہیں چاروں جانب

قدم کہاں میں جماؤں آخر
زمیں پہ دلدل ہیں چاروں جانب

خدا فرشتے عظیم انساں
نظر سے اوجھل ہیں چاروں جانب

نہ کوئی سوچے نہ کوئی سمجھے
دماغ بوجھل ہیں چاروں جانب

جو تم سناؤ وہی سنیں گے
سبھی تو پاگل ہیں چاروں جانب

رہبر جونپوری
۲۲۴۔ ایم تھری، اے سیکٹر
گووند پورہ، بھوپال

غزل

غم صحرا نوردی کرب ویرانی سے کیا رشتہ
خرد والو تمہارا چاک دامانی سے کیا رشتہ

اندھیروں کے اشاروں جو بجھتی اور جلتی ہیں
وہ شمعیں نام کی ہیں ان کا تابانی سے کیا رشتہ

سیاست اور محبت کی حقیقت اپنی اپنی ہے
اسے بس یوں سمجھیے آگ کا پانی سے کیا رشتہ

غزل خوانی ہے جن کا مقصد اکل و معاش ان کا
نظیر و مصحفی و حسرت و فانی سے کیا رشتہ

سیاست ان کی فطرت ہے تصنع ان کا شیوہ ہے
ہمارے رہبروں کا قدر انسانی سے کیا رشتہ

وفا پیکر تو رہبر دار کی چاہت میں بھرتے ہیں
کسی منصور کا تختِ سلیمانی سے کیا رشتہ

عبیدالرحمٰن
ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ۲۵

غزل

نہ کیف کہیں کے بھی نظارے نہ رہیں گے
دنیا میں اگر عشق کے مارے نہ رہیں گے

دنیائے محبت میں چراغاں نہ ملے گا
پلکوں پہ اگر اشک ہمارے نہ رہیں گے

تم چھوڑ کے مت جاؤ مجھے شہر بلا میں
ورنہ مرے جینے کے سہارے نہ رہیں گے

طے کر لو سفر شب کا کہ موقع ہے غنیمت
پھر چرخ بریں پر یہ ستارے نہ رہیں گے

غم زیست کے افسانے کا عنوان حسین ہے
ہم ہوں گے کہاں غم جو ہمارے نہ رہیں گے

بے معنی نظر آئیں گے آنکھوں کے صحیفے
موجود اگر ان میں اشارے نہ رہیں گے

پھر کس پہ یقیں کیسا بھرم کیسی مروّت
اعضاء بھی ہمارے جو ہمارے نہ رہیں گے

مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

چہرہ در چہرہ مجتبیٰ حسین

مجتبیٰ حسین نے بلاشبہ شخصی خاکہ نگاری کو ایک نیا اسلوب اور نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ اردو کے بیس اہم شخصیتوں تک کے باغ و بہار خاکے۔ قیمت/51روپے

شعریات سے سیاسیات تک

غلام ربانی تاباں مترجم: اجمل اجملی

فرقہ واریت کے خلاف تاباں صاحب کے انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ۔ قیمت/51روپے

جھینی جھینی بنی چدریا: عبدل بسم اللہ

مترجم۔ وسیم حیدر عباسی

سویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور کیڈیا ایوارڈ یافتہ یہ ناول بنارس کے انصار بھائیوں کی تہذیب و تمدن کی ایک روشن تصویر ہے۔ جس کو ناول نگار نے دس سال بنکروں کے بیچ رہ کر انہی کی زبان اور کلچر پر قلم بند کیا ہے۔
قیمت/75روپے

کچھ مشرق سے، کچھ مغرب سے

ڈاکٹر سید تقی حسین جعفری

انگریزی عشقیہ شاعری کے فروغ میں اندلس اور عرب تہذیب و ادب کے بعض مصادر کی نشاندہی اور فراق اور شہریار کی شعری حسیات میں مغربی رجحانات کے بارے میں علمی مضامین 'گلستاں سعدی کے منظوم اردو تراجم'۔ دانشوری اور تصور مذہب'۔ میر' سودا اور ناصر کاظمی کی غزلوں کے تجزیے اور بعض اہم کتابوں پر تفصیلی تبصرے۔ قیمت/75روپے

تاثر نہ کہ تنقید صدیق الرحمٰن قدوائی

تنقید ادب کی ایک اہم شاخ ہے مگر اس کا ضرورت سے زیادہ چرچا بھی اچھا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص "نقاد" ہو جائے۔ ادب کو تنقید کے سوا بھی مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے جن کا انحصار پڑھنے والوں کے انفرادی مزاجوں پر ہے۔ یہ تصنیف ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک

نیا نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔ قیمت/51روپے

گوشے میں قفس کے دلیپ سنگھ

(طنزیہ و مزاحیہ مضامین)

دلیپ سنگھ کا نام اب طنزیہ مزاحیہ ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ "گوشے میں قفس کے" آپ کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ دلچسپ انسان کے نہایت دلچسپ مضامین کا مجموعہ۔
قیمت/46روپے

ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (ناول)

کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کا بھوپال گیس ٹریجڈی کے موضوع پر نیا ناول۔ انسانی رشتوں کے بننے 'استوار ہونے اور ٹوٹنے کی درد انگیز داستان' جو ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ قیمت/40روپے

سفر (ناول) رابعہ تبسم

رابعہ تبسم کا ایک اچھوتا رومانی ناول۔ روزانہ زندگی میں پیش آنے والی خوشیوں اور غموں کا سنگم۔ یہ انتہائی رنگین ہے اور سنگین بھی۔ قیمت= 27روپے

جمنا داس اختر :(شخصیت اور ادبی و صحافتی خدمات)

مرتبہ گربچن چندن

جمنا داس اختر کا نام اردو کی سنجیدہ صحافت کی آبرو ہے اس خصوصی شمارے میں ملک اور بیرون ملک سے ممتاز ادیبوں اور صحافیوں نے اختر صاحب کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ اس شمارے کی حیثیت تاریخ ہند کے اہم باب کی ہے۔ قیمت/90روپے

اردو افسانہ بمبئی میں (۱۹۷۰ء کے بعد)

مرتبہ الیاس شوقی

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں نئی نسل کے ۹ نمائندہ افسانہ نگاروں کا ایک ایک افسانہ شائع کیا گیا ہے۔ مرتب نے اپنے پیش لفظ کے آخر میں افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "۱۹۷۰ء کے بعد بمبئی کا افسانہ زندگی کی سچائیوں کی عمدہ مثال ہے"۔

قیمت/51روپے

مانگے کا اُجالا



اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

بڑے ادیب دنیا کی ہر زبان میں ہوتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ پر۔ اردو میں بڑے ادیب ناپید ہیں۔ اور اگر ہوتے بھی ہیں تو ڈنکے کی چوٹ والے نہیں، واوین اور قوسین والے۔ واوین والے بڑے ادیب وہ ہیں جن کے ناموں سے پہلے لفظ "بڑا" واوین میں لکھا جاتا ہے اور قوسین والے وہ ہیں جن کے نام کے بعد قوسین میں لکھنا پڑتا ہے کہ یہ بڑے ادیب ہیں۔ افسوس کہ اب اردو میں واوین اور قوسین کا استعمال بھی بہت کم ہوتا جا رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ کسی ادیب کی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے سوالیہ یا استعجابیہ نشانات سے کام لینا پڑتا ہے۔

یہاں تک لکھنے کے بعد ہم بھول گئے کہ کس موضوع پر لکھنے کے لیے یہ تمہید اٹھائی گئی ہے۔ یقیناً کوئی اہم مسئلہ ہوگا جو ذہن سے نکل گیا۔ آج کل اہم مسائل ذہن سے تو کیا چکنی مچھلی کی طرح ہاتھ سے بھی پھسل جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح احمد بشیر کی کتاب "جو ملے تھے راستے میں" کشور ناہید کے ہاتھ سے پھسل کر ان کے کالم میں گر پڑی ہے جو انھوں نے لاہور کے اخبار "جنگ" میں لکھا ہے۔ اس کے جواب میں احمد بشیر نے بھی اعلان جنگ کر دیا ہے اور کشور ناہید کے خلاف ایک بیان چھپوا لیا ہے۔ بڑے ادیبوں کی اس لڑائی میں ہم جیسے چھوٹوں کو دخل نہیں دینا چاہیے کہ بقول اسماعیل میرٹھی، جب دو بڑوں میں ہو کھٹ پٹ تو چھوٹوں کو شعر کے دوسرے مصرعے میں کی گئی نصیحت (اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ) پر عمل کرنا چاہیے لیکن ہمارے عمل کرنے سے پہلے ہی ان دونوں بڑوں نے اپنی لڑائی میں ہمیں گھسیٹ لیا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی صفائی میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

کشور ناہید بلاشبہ ہمارے ملک کی ذہین ترین خواتین میں سے ہیں بشرطیکہ ذہانت کا معیار وہی ہو جو ان کی شاعری کا ہے۔ شاعری میں انھوں نے جو نام پیدا کیا ہے وہ ان کا حق ہے۔ اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ مہ لقابائی چندا کے بعد وہ دوسری شاعرہ ہیں جنھوں نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے اپنا راستہ الگ نکالا ہے۔ شاید ایسے ہی کسی راستے کے بارے میں شاعر نے کہا تھا۔

ہر راستے کی ہے ایک منزل
اور گمرہی بھی اک راستہ ہے

کشور ناہید کی ذہانت نے کالم نگاری میں انفرادی شان پیدا کی ہے۔ وہ موجودہ دور کے بہترین کالم نگاروں میں سے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ہم کالم نگاری کے بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ کشور ناہید کی شاعری پر ان کی کالم نگاری کو اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ ان کا کبھی کوئی مصرع زبان زد خاص وعام نہیں ہوا مگر کالموں کے بعض بعض جملے غالب کے شعروں کی طرح، غالب ہی کے لفظوں میں (اور غالب ہی سے معذرت کے ساتھ) "محبوب خلائق" ہو جاتے ہیں۔ مثلاً پچھلے دنوں "یادیں کہ زہر پہ لگا ورق" کے عنوان سے انھوں نے جو کالم لکھا تھا اس کا ایک جملہ تو بازار ادب میں سکہ قلب کی طرح گردش میں ہے۔ فرماتی ہیں "احمد بشیر کو تو یہ ہنر آتا ہے وہ جس لفظ کو ہاتھ لگاتے ہیں وہ گالی بن جاتا ہے۔"

احمد بشیر نے اس کے جواب میں ایک اخباری بیان جاری کیا ہے جو ۳۰ رجون ۱۹۹۶ء کے روزنامہ "جنگ" لاہور میں شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے "کشور ناہید" کے بارے میں کوئی کلمہ خیر کیسے کہہ سکتا ہے۔ اس کی یہ بات درست ہے کہ میں گالی دیتا ہوں مگر وہ خود بھی تو گالی دیتی ہے۔ اس لیے میں اسے ماں صدقے ماں واری کیسے لکھ سکتا ہوں۔ وہ ایک باغی عورت ہے مگر لائق عورت بھی ہے۔ میں نے جو دیکھا اور محسوس کیا، وہی بلا کم و کاست اپنی کتاب میں لکھ دیا ہے، منافقت سے کام نہیں لیا۔"

کشور ناہید نے احمد بشیر کے بارے میں جو جملہ لکھا ہے وہ ایک خوب صورت شعر کی طرح معنی خیز ہے۔ احمد بشیر کا جواب بے مزہ ہے ایسا لگتا ہے جیسے وہ کشور ناہید کو کوئی نثری نظم سنا رہے ہوں اور وہ بھی خود کشور ناہید کی، ویسے موصوفہ نے جو بات کہی ہے وہ صد فی صد درست ہے کیونکہ احمد بشیر نے اپنی کتاب میں جس بھیانک انداز سے کشور ناہید کی کردار کشی کی ہے اس کی کوئی دوسری مثال کم از کم اردو زبان میں نہیں ملتی۔ کشور ناہید نے اسے "زہر پہ لگا ورق" کہا ہے حالانکہ یہ ورق پہ لگا زہر ہے۔ حد تو یہ ہے کہ احمد بشیر نے ان لوگوں کے

بارے میں بھی الٹی سیدھی باتیں کی ہیں جن کا ذکر کشور ناہید نے اپنی آپ بیتی (بری عورت کی کتھا) میں بڑی محبت سے کیا ہے۔ مثلاً اس کتاب کے ایک باب میں آٹھ عدد عشاق کا ذکر ہے۔ احمد بشیر ان عشاق کے بارے میں لکھتے ہیں مقتیا یہ آٹھوں نابینا ہوں گے۔ یہ صریحاً غلط بیانی ہے۔ یہ نابینا نہیں نارسیدہ تھے کہ ان سب سے خود کشی کرلی۔ ایسے مجانین کی مرگ ناگہاں پر میر تقی میر کی عقل گم ہوا کرتی تھی۔

اپنے کالم میں کشور ناہید نے احمد بشیر کے ساتھ انیس ناگی اور حمید اختر کو بھی آتش زیرپا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان دونوں کے بارے میں لکھتی ہیں " انیس ناگی کو یہ خبر آتا ہے کہ متنی رویوں کو ضرب کرتے کرتے بے حال ہو جاتے ہیں۔ حمید اختر ہر فقرے کو کسی اور شخصیت کی سند کے ساتھ پیش کرتے ہوئے التزام رکھتے ہیں کہ کوئی لطیفہ، سنسنی خیزی، ممنوعات کے حوالے مرحلہ وار پیش کرتے ہیں۔"

انیس ناگی کے خلاف تو کشور ناہید کو لکھنا ہی چاہیے تھا کہ اس سادہ مزاج نے اپنی آپ بیتی میں کشور ناہید پر چھینٹے اڑائے ہیں اور گیارھویں گریڈ سے ایک دم اکیسویں گریڈ میں چھلانگ لگانے کو تعجب و حیرت ہی کی نظر سے نہیں، رشک و حسد کی نگاہ سے بھی دیکھا ہے۔ مگر حمید اختر نے کیا جرم کیا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کشور ناہید نے ان کے خلاف جو فردِ جرم عائد کی ہے۔ اس کی زبان کا اسلوب پولیس کے روزنامچے جیسا ہے کہ لفظ موجود ہیں اور مفہوم مفقود "پیش کرتے ہوئے... ... پیش کرتے ہیں۔" جیسی زبان کی داد دیتے ہوئے حمید اختر کو بھی ایک اخباری بیان کے ذریعے اپنا دفاع کرنا پڑا۔ ان کا بیان احمد بشیر کے مندرجہ بالا بیان کے ساتھ شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے اپنی کتاب "آشنائیاں کیا کیا" کے حوالے سے کہا ہے "میری یہ کتاب آٹھ سال پہلے شائع ہوئی تھی لگتا ہے کہ کشور ناہید نے یہ کتاب نہیں پڑھی۔ محض اخباری تبصروں کو پڑھ کر رائے قائم کی ہے۔" حمید اختر بھی انیس ناگی کی طرح خاصے سادہ لوح معلوم ہوتے ہیں لوگ تو آج کی چھپی ہوئی کتابیں نہیں پڑھتے تو آٹھ سال پہلے کی چھپی ہوئی کتاب کون پڑھے گا اور پھر کتاب پڑھ کر رائے دینا کون سا کمال ہے۔ یہ کام تو ہر وہ شخص کر سکتا ہے جسے کوئی اور کام نہ ہو لیکن جو لوگ سرکاری خرچ پر ادبی، ثقافتی اور معاشرتی مسائل طے کرنے کے سلسلے میں زمین کا گز بن چکے ہوں ان کے لیے کتابیں پڑھ کر رائے دینا، ان کے منصب اور مرتبے کے شایانِ شان نہیں۔ مناسب یہی ہے کہ کشور ناہید نے حمید اختر کی کتاب کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اسے پتھر کی لکیر سمجھا جائے۔ لہٰذا حمید اختر کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ ۔

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

کشور ناہید نے زہر پہ ورق لگاتے ہوئے کالم نگاروں کا بھی حساب برابر کر دیا ہے۔ احمد بشیر حمید اختر اور انیس ناگی کی نگارشات کو "بے لگام تحریریں" قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں "بے لگام تحریروں کے اس سمندر کو فزوں کرنے والے کچھ وہ کالم نگار بھی ہیں جو اپنے حصے کے نام بھی بدلہ لینے کو کبھی بغض نکالنے اور کبھی سرخیاں بنانے کو نکال لیتے ہیں۔ ان پہ کیا اعتراض، یہ تو ان کی روزی روٹی کا مسئلہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کون جائے گا عدالت مقدمہ کرنے، کس کے پاس وقت ہے کہ عدالت میں بیٹھ کر پیروی کر سکے تو رہے گا یہی طوفان تحریر۔"

ہماری ناقص رائے میں اگر آپ کے پاس نثری نظمیں لکھنے اور زہر پہ ورق لگانے کے لیے وقت ہے تو پھر عدالت میں جانے کے لیے وقت نکالنا کون سا مشکل کام ہے۔ کالم نگاروں پر مقدمہ دائر کرنے سے پہلے احمد بشیر وغیرہ پر مقدمہ دائر کرنا چاہیے کہ انھیں لوگوں کی وجہ سے بعض شر پسندوں کو کالم آرائی کرنے کا موقع ملا ہے۔ ویسے ان شر پسندوں کی روٹی کا کوئی آبرومندانہ حل تلاش کرنے سے بھی در فتنہ بند کیا جا سکتا ہے۔ ان شر پسند کالم نگاروں کو اگر نیشنل بک فاؤنڈیشن یا پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس جیسے سرکاری خیراتی اداروں میں ملازمتیں مل جائیں تو یہ اپنی حرکتوں سے باز آ سکتے ہیں۔ کم از کم اپنی حد تک ہم یہ یقین دلاتے ہیں کہ اگر ہمیں کسی سرکاری خیراتی ادارے میں روزگار مل جائے تو ہم کالم نگاری چھوڑ کر شاعری شروع کر دیں گے۔ پھر ہم لوگوں کے قصیدے لکھ کر انھیں خوش کیا کریں گے۔

احمد بشیر نے کشور ناہید کی طرح خواہ مخواہ تیر نہیں چلائے، از رہ لطف و کرم ہمیں براہ راست ایک عدد عنایت نامہ محبت وشیفتہ سے سرفراز فرمایا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ اسے "تکبیر" میں شائع کر دیا جائے۔ ان کے ارشاد کی تعمیل میں یہ خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"میں نے اپنے آپ کو کبھی ادیبوں کے قبیلے میں شامل نہیں سمجھا مگر صحافت میں کوچہ گردی کے بعد یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ جب قاری کو یہ خیال گزرے کہ لکھنے والا فلاں شخص کے خلاف بغض رکھتا ہے اور ذاتیات پر اتر آیا ہے تو پھر وہ اس کی بات نہیں سنتا اور تحریر ضائع ہو جاتی ہے مگر پھر بھی آپ نے کرم کیا اور میری کتاب جو یونس جاوید نے مرتب کی، آپ نے تنی زبردست توجہ کی۔ لاہور کے تمام بڑے مولویوں نے جن میں مولانا عبد القادر آزاد، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا مرتضیٰ ملک فاضل مدینہ، مولانا عبد القدیر اور دوسرے علماء کرام نے اس روسیاہ کو اسی کتاب پر واجب القتل قرار دیا ہے اور

کتاب پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا ہے۔ شرعی حد جاری کی ہے اور اگر میں توبہ بھی کروں تو کوڑے مارنے کا حکم لگایا ہے۔

آپ نے کم از کم یہ تو نہیں کیا۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے؟

کیا "جو ملے تھے راستے میں" اتنی اہم کتاب تھی؟

آپ کا خوشہ چین نیاز مند

احمد بشیر

۵۰۔ای۔ عسکری ڈیفنس ہوا‏ئسن۔ لاہور

اب آپ صاحب دل و دماغ ہیں تو تکبیر میں اس خط کو شائع کر دلویں اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیں۔

اس گرامی نامے کا جواب ہم نے نہایت ادب سے لکھا تھا اور ۲۵ جون کو پوسٹ کیا تھا۔ اس میں عرض کیا تھا کہ آپ نے ذاتیات پر اترنے اور دل میں بغض رکھنے کا جو الزام لگایا ہے وہ ہمارے حق میں سخت ناانصافی ہے۔ آپ سے ہمیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ سرے سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تو پھر بغض ہو تو کیوں؟ ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ کالم اس خیال سے لکھا گیا تھا کہ اس کی سب سے زیادہ داد آپ سے ملے گی کیونکہ آپ بطور صحافی اپنے لیے ہی نہیں، دوسروں کے لیے بھی آزادی رائے کا حق طلب فرماتے رہے ہیں آپ نے دوسروں کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا، اپنی کتاب میں لکھا، کیا ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ آپ کی کتاب کے متعلق وہی کچھ لکھیں جو ہم نے محسوس کیا۔

احمد بشیر صاحب نے مذکورہ خط کالم کی پہلی قسط پڑھ کر لکھا تھا۔ توقع تھی کہ وہ ہمارے خط کے جواب میں دوسری قسط پر بھی اظہار خیال فرمائیں گے لیکن انھوں نے ہمیں ایک خط سے زیادہ کا مستحق نہ سمجھا۔ بہر حال موصوف سے گزارش ہے کہ ہم نے اپنے کالم میں کوئی غلط بات لکھی ہو تو اس کی نشاندہی فرما دیں۔ ہم اپنا غلط نامہ ہی نہیں معافی نامہ بھی شائع کر دیں گے۔

مجتبیٰ حسین
۲۰۰/۱۲ اکور اپارٹمنٹس
پٹ پڑگنج، نئی دہلی
ٹیلی فون نمبر :2424630

قدیر زماں کا رشوت نامہ

قدیر زماں ہمارے لگ بھگ نصف صدی پرانے دوست ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں ہمارے دوست وہاب عندلیب نے کچھ احباب کے ساتھ مل کر کاچی گوڑہ میں ایک گلبرگہ کالج قائم کیا تھا جہاں گلبرگہ سے آنے والے طلبہ امداد باہمی کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اس کالج کو چلایا کرتے تھے۔ اس امداد باہمی میں ہمارا حصہ "امداد" میں کم اور "باہمی" میں زیادہ ہوا کرتا تھا اگرچہ اس کالج میں سبھی گلبرگہ کے طلبہ رہتے تھے لیکن قدیر زماں غالباً اکیلے ایسے طالب علم تھے جن کا تعلق کریم نگر سے تھا۔ گلبرگہ میں کریم نگر کی اس ملاوٹ کے خلاف جب ہم احتجاج کرتے تھے تو وہاب عندلیب اپنی روشن خیالی اور وسیع المشربی کو ثابت کرنے کے لیے اقلیتوں کے حقوق اور ان کے تحفظ کے مسئلہ پر ایک لمبا چوڑا لیکچر دیا کرتے تھے گلبرگہ کے طلبہ کی اکثریت کے درمیان وہ قدیر زماں کریم نگری کو اقلیت سمجھتے تھے اور جی جان سے ان کا تحفظ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیر زماں شروع سے ہم سے بدکتے رہے ہیں اور ماشاء اللہ اتنی پرانی دوستی کے باوجود آج بھی بدکتے ہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو ان کا شمار ہمارے پرانے دوستوں میں ہوتا ہے جن کی تعداد اب دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے۔ اس لیے وہ ہمیں عزیز بھی ہیں۔ ہمارے دوست حیات لکھنوی کا ایک شعر ہے ؎

وہ برے ہوں کہ بھلے جو بھی ہمیں پیارے ہیں
اب نیا دوست کوئی ہم تو بنانے سے رہے

کسی پتھر پر پانی کے قطروں کے گرنے کا عمل لگاتار جاری رہے تو پتھر بھی گھسنے لگ جاتا ہے۔ اس مثال میں ہماری حیثیت پتھر کی سی اور قدیر زماں کی حیثیت پانی کے قطروں کی سی ہے غرض قدیر زماں سے اپنے دیرینہ مراسم کو بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے اور اس دفتر کو ہم پھر کبھی کھولیں گے۔ یوں بھی پنڈورا کے باکس کو کھولنا کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ آج ان کا ذکر کرنے کی ضرورت ہمیں اس لیے پیش آئی کہ پچھلے دنوں ہمیں ان کی لکھی ہوئی ایک انگریزی کتاب ملی جس کا عنوان "(BRIBERY)" ہے۔ اس کتاب کو پاکر ہمیں سب سے پہلی

خوشی تو یہ حاصل ہوئی کہ قدیر زماں اب اردو کی بجائے انگریزی میں لکھنے لگے ہیں۔ ماشاءاللہ وہ تو اتنی اچھی انگریزی لکھ لیتے ہیں کہ وہ انگریزی ادب کے "شمس العلماء" اور "لسان العصر" وغیرہ کہلائے جاسکتے ہیں۔ یہ تو ان کا کرم ہے کہ اتنی اچھی انگریزی جاننے کے باوجود اتنے برس تک خواہ مخواہ ہی اردو جیسی پسماندہ زبان میں اپنا وقت برباد کرتے رہے۔ ان کی جگہ ہم ہوتے تو کب کے اردو سے جاچکے ہوتے اور اردو والے ہمیں صدائیں دیتے رہ جاتے وہ تو اچھا ہوا کہ انگریز اپنے آپ ہی اس ملک کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اگر نہ گئے ہوتے تو قدیر زماں ہی انگریزی کو پڑھ کر ضرور چلے جاتے کہ میاں اب اس ملک میں ہمارا کیا کام۔ سنبھالو ہماری زبان اور اپنا راج پاٹھ۔ غرض قدیر زماں کو چونکہ اپنے بیان کے لیے کچھ اور وسعت چاہیے تھی تو وہ انگریزی ادب میں چلے گئے۔ یوں بھی زبان تو اظہار کا ایک ذریعہ ہی ہوتی ہے قدیر زماں کی خوبی یہ ہے کہ سماج میں جب بھی کوئی برائی دیکھتے ہیں تو اس کے خلاف آواز ضرور اٹھاتے ہیں اور اس وقت تک آواز اٹھاتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ خود اس برائی کا حصہ نہ بن جائیں۔ چنانچہ ان کی زیر نظر کتاب اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ قدیر زماں نے اس کتاب میں "رشوت ستانی" کے خلاف بڑے زور و شور سے آواز اٹھائی ہے اور ان رشوتوں کا بطور خاص ذکر کیا ہے جو انھوں نے مختلف موقعوں پر مختلف افراد کو دیں بلکہ یہ تک تسلیم کیا ہے کہ آج وہ جو کچھ ہیں رشوت دینے کی وجہ سے ہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں کلکٹر کریم نگر کے دفتر میں ایک عہدے دار کو پچاس روپے کی رشوت دینے کی وجہ سے ہی ان کا تقرر بحیثیت ٹائپسٹ عمل میں آیا تھا اور یہی پچاس روپے ان کی آنے والی زندگی کی عمارت میں سنگ بنیاد کی حیثیت اختیار کر گئے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ۱۹۹۱ء میں جب وہ کوآپریٹیو انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل کے باوقار عہدہ سے ریٹائر ہوئے تو انھیں اپنے وظیفہ کے بھاری بقایاجات کو حاصل کرنے کے لیے پھر موٹی رقم بطور رشوت دینی پڑی۔ گویا جس رشوت کی مدد سے اپنی سرکاری ملازمت کا آغاز کیا تھا اسی رشوت کے ذریعہ اپنی ملازمت کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونکی۔ پہلی رشوت اور آخری رشوت کے درمیان بھی انھیں اپنے کئی کاموں کے سلسلہ میں بار بار رشوت دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ انھوں نے ان رشوتوں کا بھی اس کتاب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

ہزاروں رشوتیں ایسی کہ ہر رشوت پہ دم نکلے

یوں لگتا ہے جیسے وہ سرکاری فرائض کم انجام دیتے رہے اور رشوت دینے کی "جینن ڈائری" زیادہ مرتب کرتے رہے۔ بہرحال جب وہ باعزت طور پر ریٹائر ہوگئے تو ان کے

ضمیر نے جاگنا شروع کر دیا۔ یوں بھی ہمارے ہاں ضمیر اسی وقت جاگتا ہے جب خود آدمی کو نیند آنے لگتی ہے یہاں ان کے ضمیر نے جب انھیں جھنجھوڑنا شروع کیا تو انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ اس کتاب کے ذریعہ ساری قوم کو جھنجھوڑا جائے۔ گویا ضمیر قدیر زماں کو جھنجھوڑ رہا ہے اور جواباً قدیر زماں قوم کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔ کریم نگر کے اس عہدے دار کو جس نے ۱۹۵۱ء میں قدیر زماں کو ملازمت دینے کے عوض ان سے پچاس روپے کی رشوت لی تھی اگر پتا چل جاتا کہ وہ بعد میں ایسے موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھیں گے تو بخدا وہ قدیر زماں کو الٹا رشوت دیتا کہ بھیا میں تمھیں اچھی سے اچھی ملازمت دیتا ہوں مگر وعدہ کرو کہ تم کوئی کتاب نہیں لکھو گے۔ ہمیں اس وقت ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک کنجوس مکھی چوس شخص مرنے کے بعد دوسری دنیا میں پہنچا اور جنت کے داروغہ سے ملتمس ہوا کہ اسے جنت میں جانے کی اجازت دی جائے۔ داروغہ جنت نے پوچھا "اگر تم نے پچھلی دنیا میں کوئی نیک کام کیا ہو تو بتاؤ تاکہ اس کی بنیاد پر تمھیں جنت میں بھیجا جاسکے۔" کنجوس آدمی نے دماغ پر بہت زور دیا مگر اسے کوئی نیک کام یاد نہیں آیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد جب اسے اپنا ایک نیک کام یاد آیا تو خوشی خوشی بولا "ایک بار ایک بڑھیا بھوک سے تڑپ رہی تھی تو میں نے اسے ایک چونی دی تھی۔" اس پر جنت کے داروغہ نے جنت کے چوکی داروں سے کہا "میاں! اس کی چونی واپس کردو اور اسے لے جاکر دوزخ میں ڈال دو۔" مبادا یہ نہ سمجھیے کہ قدیر زماں نے کوئی نیک کام نہیں کیا ہے۔ وہ کوئی برا کام تو کر ہی نہیں سکتے۔ (کتاب لکھنے کے سوائے) ان کا ایک نیک کام یہی کیا کم ہے کہ پچھلے کئی برسوں سے ہمارے دوست بنے ہوئے ہیں جبکہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جسے ہم جیسا دوست مل جائے اُسے کسی دشمن کی حاجت نہیں ہوتی۔ بزرلربات کی ایک بات' یہ کہ قدیر زماں اصل میں ایک سادہ لوح اور معصوم آدمی ہیں۔ وہ تو اتنے سادہ لوح ہیں کہ ایک بار ہم نے مذاق میں اپنی آواز بدل کر انھیں بی بی سی کے انگریزی لہجہ میں فون کیا اور کہا I am John Major from London I Want to talk to Kadeer Zamal (ان دنوں جان میجر برطانیہ کے وزیر اعظم تھے) قدیر زماں نے کسی قدر جھجک کر پوچھا "معاف کیجیے آپ کون بول رہے ہیں ؟"

ہم نے پھر جان میجر کا حوالہ دیا تو نہایت ادب کے ساتھ اپنی مخصوص انگریزی میں Gqod Morning. Your Excellency وغیرہ کہا۔ تب ہم نے اپنے اسی لہجہ اور اعتماد کے ساتھ کہا "مسٹر قدیر زماں ہم ہندستان اور برطانیہ کے تعلقات کو بہتر کرنا چاہتے ہیں اس سلسلہ میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔" اس پر قدیر زماں نے بے ساختہ کہا

ہم نے Your Excellency! My humble services are always at your disposal ان کا شکریہ ادا کیا اور ٹیلی فون رکھ دیا۔

شام میں وہ ہمیں ملے تو حسب معمول ان سے کسی بات پر اختلاف ہو گیا۔ تنگ کر بولے آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں؟ جس آدمی کے پاس جان میجر کے فون آتے ہوں وہاں آپ کی کیا حیثیت ہے اور ہم اپنی حیثیت پر کف افسوس ملتے رہ گئے۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا بہر حال یہ ان کی سادہ لوحی نہیں تو اور کیا ہے کہ جس ملک میں بوفورس اسکینڈل چل رہا ہو۔ جھاڑ کھنڈ مکتی مورچہ کے لیڈروں کو رشوت دینے کا معاملہ در پیش ہو، جہاں چارہ گھوٹالے میں کروڑوں روپیوں کے وارے نیارے ہوئے ہوں وہاں ان کے پچاس روپیوں اور ہزار ڈیڑھ ہزار روپیوں کی رشوتوں کو کون پوچھے گا۔ بھلا نقار خانہ میں کسی نے طوطی کی آواز سنی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ قدیر زماں خود اپنی ذات میں ایک ایسا طوطی ہیں جس میں ہر دم ایک سالم نقار خانہ گونجتا رہتا ہے۔ ان کی ابتدائی رشوت کا ایک واقعہ تو بہت ہی دلچسپ ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ایک دن وہ اپنے چچا کی نئی نویلی سائکل کو لے کر غفلت میں کاچی گوڑہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے تھے جہاں ریلوے پولیس کے ایک داروغہ نے ان کی سائکل ضبط کر لی اور اس کی رہائی کے لیے دو روپے رشوت دینے کا طلب گار ہوا۔ ان کے پاس اس وقت دو روپے بھی نہیں تھے۔ بہت پریشان ہوئے۔ آخر کار انھوں نے ضمانت کے طور پر اپنی شیروانی داروغہ کے پاس رکھوائی اور گھر جا کر دو روپے لے آئے۔ تب کہیں جا کر اپنے چچا کی سائکل اور اپنی شیروانی واپس حاصل کی۔ رشوت کے اس واقعہ کو انھوں نے ایسے کرب اور اذیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ لگتا ہے کہ ان کا قلم اب ٹوٹا کہ تب ٹوٹا۔ تاہم اس ناخوش گوار واقعہ کا ایک خوش گوار اثر یہ ہوا کہ قدیر زماں نے بعد میں شیروانی پہننا ہی ترک کر دیا۔ بش شرٹ اور شرٹ جیسے اوچھے لباسوں پر اتر آئے۔ پھر بھی اسے ان کی ہمت ہی کہنا چاہیے۔ ان کی جگہ ہم ہوتے تو سرے سے لباس پہننا ہی ترک کر دیتے۔ اس کتاب میں اور بھی کئی دلچسپ واقعات ہیں جن میں رشوت دینے کے نت نئے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قدیر زماں نے ایک عہدے دار کو رشوت دینے کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ وہ اس عہدے دار کے ساتھ تاش کھیلنے میں مصروف ہو جاتے تھے اور جان بوجھ کر اس وقت تک ہارتے رہتے تھے جب تک کہ رشوت کی مطلوبہ رقم قدیر زماں کی جیب میں سے نکل کر عہدے دار کی جیب میں منتقل نہیں ہو جاتی تھی۔ ایسی رشوتیں تو ہم نے بھی اپنی سرکاری ملازمت میں بہت سی دی ہیں ہمارے ایک عہدے دار بالا شاعر تھے اور جب بھی وہ ہمیں شعر سناتے تھے تو ہم اس پر

کچھ اس طرح داد دیتے تھے کہ لگتا تھا رشوت دے رہے ہیں۔ آخر ہمارے عہدے دار بالا کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس دنیا میں ان سے بڑا شاعر اور ہم سے بڑا سخن فہم پیدا ہی نہیں ہوا۔ اگر چہ قدیر زماں کی یہ کتاب رشوت ستانی کے خلاف ایک احتجاج کے طور پر شائع کی گئی ہے لیکن دیدہ بینار کھنے والے اصحاب اس کو بطور "ہدایت نامہ رشوت ستانی" کے طور پر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

آخر میں یہ عرض کرتے چلیں کہ اس کتاب کو لکھتے وقت قدیر زماں کی نیت بالکل صاف رہی ہے۔ انھوں نے وہی لکھا ہے جو ان کے ضمیر نے لکھوایا ہے مانا کہ انھوں نے جو رشوت دی ہے اس کی رقم بوفورس اسکینڈل وغیرہ کے مقابلہ میں بہت کم ہے لیکن قدیر زماں کوئی سیاست داں تو ہیں نہیں کہ بھاری رشوتیں لیتے اور دیتے رہیں۔ فوٹو گرافی میں ایک طریقہ تصویروں کو انلارج (Enlarge) کا بھی ہوتا ہے، آپ اس کتاب کو اپنے ذہن میں انلارج کریں تو آپ پر حقیقت آشکارا ہو گی۔

تو حضرات! ہمارے تھوڑا لکھے کو بہت جانیے اور آج ہی سے رشوت لینا اور دینا بند کر دیجیے۔ یہ بہت بری لعنت ہے۔ اتنی بری لعنت ہے کہ قدیر زماں جیسے ادیب کو کتاب لکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ چھی چھی چھی۔ اس کالم کے عوض ہم قدیر زماں سے کچھ نہیں چاہتے۔ بس اتنی سی گزارش ہے کہ جب بھی ہم حیدر آباد آئیں تو اپنی موٹر میں ہماری سیر کرا دیں۔ یوں بھی ہم ان کی موٹر میں اکثر گھومتے رہتے ہیں۔ نعوذ باللہ یہ نہ سمجھیے کہ قدیر زماں ہمیں اپنی موٹر میں گھما کر ہمیں رشوت دے رہے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ ان کا ضمیر تو اب جاگ گیا ہے۔

ریحان اختر عباسی
D-12 ملٹ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔25

نسیمِ چمن --- ایک تعارف

(دوسری قسط)

گلدستہ میں شامل غزلوں کا معیار کیا ہے، اس بارے میں ہو سکتا ہے، ناقدین فن بعض خامیوں کی طرف اشارہ کریں اور عروض کے پار کھی کچھ شعروں کے ہلکے بھاری ہونے کا فیصلہ سنائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ رعایتی نمبر دے کر سب کو پاس سرٹیفکٹ مل جائے۔ البتہ سطحی معلومات والا ایک عام اردو داں، اس گلدستہ میں شامل غزلوں کے بارے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہے کہ اس دور کے چلن کے مطابق حسن و عشق سے بھرپور روایتی شاعری اور اس کی جملہ کیفیتوں کے بے باکانہ اظہار کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہیں۔ یہاں تک کہ "ذوق سلیم پر گراں گزرنے والے" یا "تہذیب سے گرے ہوئے" "الزام کی لپیٹ میں آنے والے اشاروں کنایوں اور کہیں واضح انداز میں کچھ ایسے شعر اور بعض جگہ پوری پوری غزلیں بھی موجود ہیں جن پر تبصرہ کی گنجائش نہیں۔ البتہ اتنا ضرور بتا دیا جائے کہ ان سبھی چھ شماروں میں ایسے اشعار کی تعداد لو تیس چالیس کے آس پاس ہو گی۔ ناز و انداز، لاگ لپٹ، شوخیاں، شرارتیں، چھیڑ چھاڑ، نوک جھونک، حسرت و ملال، ہجر و وصال، سراپا نگاری اور پیکر تراشی جن کا ذکر غزل کی تعریف میں آتا ہے، وہ سبھی کچھ ہے ان میں۔ البتہ بڑی بات یہ ہے کہ ان سبھی میں اظہار بیان کے لیے فارسی عربی کے نامانوس الفاظ کی جگہ عام فہم اور بول چال والی زبان استعمال کی گئی ہے۔ روز مرہ اور محاوروں کے چٹخارے بھی ہیں ان میں۔ ایسے محاورے بھی ہیں جو خاص امروہہ کی دین ہیں اور جن کے پڑھنے اور سننے کا اپنا الگ ہی مزا ہے۔ البتہ مصرعِ طرح کی پابندی جس طرح الگ الگ شاعروں کے کلام میں انجانے میں یکسانیت لے آتی ہے، سو توارد والی بات کہیں کہیں یہاں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

۷۴ شاعروں کی ۲۷۱ غزلوں میں سے نمونہ کے طور پر اگر تین تین چار چار شعر بھی لیے جائیں تو یہ انتخاب ہی ایک چھوٹی موٹی کتاب کی شکل اختیار کر لے گا، اس لیے طوالت سے بچتے ہوئے، نیز 'شعروں کے انتخاب میں رسوائی' کے اندیشوں کے سائے میں، گلشنے از خروارے گنتی کے تعارف سے ہر شاعر کے چند اشعار کو اپنی اصل لکھائی کے مطابق پیش

کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خیال ہے کہ مطالعہ کے دوران کسی کسی کو کہیں کہیں پڑھتے پڑھتے اٹکنے، پلٹنے اور دوسرے ہی لمحے صحیح صحیح پڑھ لینے کے تجربے سے بھی دوچار ہونا پڑ سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو انھیں لاشعوری طور پر ایک دلنواز ذہنی آسودگی اور طمانیت ملے گی اور ایک خاص کیف و سرور بھی حاصل ہوگا جس سے مطالعہ کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔

<u>مصرع طرح: ہوا ہوں جب سے آشفتہ قد رعنائی دلبر کا</u>

وہ چہرہ شعلہ رو کا ہے یہ اک عالم پہ روشن ہے
کہ جس کے رشک سے منہ پھیر گیا ہے مہر خاور کا
قیامت ہے نہیں ڈرتے عذاب روز محشر سے
الٰہی ان بتوں کا دل ہے یا ٹکڑا ہے پتھر کا
مجھے بوسے لبوں کے دیکے وہ شیریں دہن بولا
مزہ ہوتا ہے ایسا ہی بھلا قند مکرر کا — محمد اعظم علی اعظم

بڑھا دست ہوس جب وصلمیں شوق فزوں تر کا
تو بولے ایسی بیتابی نہیں ہے چین دم بھر کا
مری آنکھوں پہ تم ظل مژہ مین سو رہو آکر
کہ ہے راحت فزا گرمی میں بنگلہ خس کے چھپر کا — محمد صدیق ارمان

میری بیتابی دل دیکھکر دوزخ بھی ٹھنڈا ہو
کہاں سوزش جگر کی ہے کہاں شعلہ ہے اخگر کا
وہی باتیں رہین تیری گنوائی جان بھی جسنے
نہ پگھلا او بت سنگین تیرا دل ہی وہ پتھر کا — سید حامد حسین حامد

کسی نازک بدن کے ہجر مین نکلی ہے جان میری
میرے لاشہ سے بار اوٹھتا نہین پھولونکی چادر کا
موذن نے شب وصل آہ مجھو ذبح کر ڈالا
مرے حقمین بنا خنجر الف اللہ اکبر کا — حکمت اللہ خاں حکمت

بھلا حصہ کسیکا کیوں کسیکو دے خالق
خوشی غیرونکی قسمت کی ہے غم میرے مقدر کا
شب غم میں اکیلے جان پر کیا کیا مصیبت ہے
جگر میں درد دل بے چین رونا دیدہ تر کا

ممکن باغ جنان تک کون آنے دیگا اسے واعظ
کنارہ جالیا رندون نے جسدم حوض کوثر کا — صدی علی ریاض

وہ بت پڑھ کر خدا چاہے تو میرا رام ہو جائے
یہ خط پہنچا دے اوسکو نامہ بر صدقہ پیمبر کا

سمجھ کر کچھ تو کوئی یار میں رکھا قدم ہمنے
جو کٹ جائے تو کٹ جائے ہمیں دھڑکا نہین سر کا

ہوئی مدت کہ بوسے عطر سے ابتک ہے مدہوشی
لیا تھا خواب مین اک رات بوسہ روے دلبر کا — سید فضل حسین سعید

مجھے ہر روز کی بیرحمیونسے ہوگیا ثابت
خدا کی شان سینہ مین بتونکے دل ہے پتھر کا

الٰہی خیر کیجو جان جانیکا بھی خطرہ ہے
ہمارا سامنا ہوگا صف مژگان کے لشکر کا — سلام اللہ خان سلامی

تماشہ رقص بسمل کا لوٹمہین مدنظر ٹہرا
خدا مالک میری جانکا خدا حافظ میرے سر کا

وہ کہنا وصل کی شب مین کسیکا یاد ہے ہمکو
ہٹو سرکو بچو دیکھو وہ پردہ کہل گیا در کا — سید خورشید حسین شمس

شب وصل صنم مین بھی نہین آرام کیصورت
کبھی دھڑکا عسس کا ہے کبھی اللہ اکبر کا

ہمارا طائر دل خال کے بوسہ نہ لے کیونکر
پہونچتا ہے ضروری دانہ جو ہوگا مقدر کا — سید اصغر حسین صابر

خداوندا بتونسے ظلم کا شیوہ چھڑوایا
کلیجہ لائین سینے کو کہانسے اپنا پتھر کا

کیجے گیسو و عارض کی ہمکو یاد رہتی ہے
ہمین کیا کام قصہ ہم سنین گل کا صنوبر کا

ہمارا جی لوچٹ جائیگا فوراً باغ رضوان سے
اگر یاد آگیا نقشہ ہمین وان یار کے گھر کا — صوفی علیم اللہ صوفی

مصرع طرح: اللہ رے کسقدر رنگینی سخن میں ہے

آؤ تو دل مین سیر کرو دیکھو رنگ ڈھنگ
کس کس طرح کا پھول ذرا سے چمن مین ہے
سید قصور حسین نادر

زلف سیاہ چہرۂ تابان پہ ڈال کر
بولے کہ دیکھ لو مہ کامل گہن مین ہے

اے عندلیب فکر فصاحت بیان ہو
آمد بہار کی مرے باغ سخن میں ہے
سید نجم حسن انجم

آتا بھی ہو تو کرتا ہے انکار وہ ضرور
دل توڑنے کی خو بت پیمان شکن مین ہے

آنکھوںمین دل مین سر مین سمایا ہوا ہے وہ
نور جمال یار مرے تن بدن مین ہے
زاہد حسین جوہر

سینہ پہ میرے ہاتھہ دھرے سو رہے ہین وہ
ٹھنڈک کلیجہ مین ہے ترلوت بدن مین ہے

بعد فنا بھی قبر مین تنہا نہین گیا
اک حسرتوں کی پوٹ ہمارے کفن مین ہے
محمد قدرت اللہ حباب

تشبیہ یار کے لب و دندان سے کسکو دون
ایسا یمن میں لعل نہ گوہر عدن مین ہے

برگ حنا جو ظاہر و باطن ہے سرخ و سبز
ثابت ہوا کہ رنج حسین و حسن مین ہے
سید ریحان حسین ریحان

رکھا غم فراق سے گردش میں عمر بھر
شیوہ یہ ظلم و جور کا چرخ کہن میں ہے

بوسہ یہ کیسے عارض گلرنگ کا ملا
خوشبو گلاب کی جو ہمارے بدن مین ہے
سید زائر حسین زائر

بیشک کیا ہے غصہ کی حالت مین اسنے یاد
یہ ہچکیون کے ساتھہ جو رعشہ بدن مین ہے

چہرہ پہ زلف بکھری ہے ایمیری جان جو آج
خیرات بوسہ دیجے کہ سورج گہن مین ہے
مہدی حسن سیف

ظلمات میں سکندر رومی عبث پھرا
آب حیات یار کے چاہ ذقن میں ہے
عاشق کی بود و باش کا کیونکر پتہ لگے
ہے روح پیش یار بدن پیرہن میں ہے — سید ضامن حسین سحر

ہاں ایک ہاتھ اور سکتا ہوا نہ چھوڑ
قاتل ابھی تو روح بدن کی بدن میں ہے
لہرا رہا ہے سانپ کہ ناگن پڑی ہے مست
یا پیچ ان کی زلف شکن در شکن میں ہے
اللہ رے شرم منہ سے تو کہتے نہیں کہ ہاں
اقرار وصل ہے پہ دہن کا دہن میں ہے — شبیر خاں شبیر

بو یعنی لوڑا کے صبا زلف یار کی
اسکی ہی یہ مہک ہے جو مشک ختن میں ہے
جسکی نظر پڑی وہی دل دیکھے رہ گیا
حور جناں سے بھی وہ زیادہ پھبن میں ہے — سید علی نظر لطف

اندھے کی قدر کیا ہو کہ کانا رقیب ہے
اک رگ بھلا سوا کہاں اس خستہ تن میں ہے
وہ مجھکو گھر میں ڈھونڈھ کے جلا کے کہتے ہیں
وہ اندھا دیدوں پھوٹا تو بزم سخن میں ہے — حافظ میت اللہ میتا (نابینا)

غیرت میں نکلی پھرتی ہے بوگل کی ہر طرف
خوشبو پسینہ کی ترے کیا پیرہن میں ہے
کیا خوشنما ہے عارض تاباں پہ زلف یار
اک قصہ ہے عجیب کہ سنبل سمن میں ہے — شمس الدین دوانی

ایک غیر طرحی شعر

کسی بت کے لیے روتی ہے کعبہ کی زمین ہر دم
رکھا ہے چاہ زمزم نام اسکے دیدۂ تر کا — سید حسین کامل

مصرع طرح: جھگڑے فضول ہیں یہ سوال وصال پر

غزوات کا جو نام بھی آیا زباں پر
نصرت نے آکے بوسہ دیا تیغ و ڈھال پر

اپنی ہی خیر حشر میں چاہے ہر اک نبی
اور ہو خیال آپکا امت کے حال پر
روح الامین نہ سدرہ سے آگے چلے ذرا
پاس ادب یہ بولا کہ بس بس سنبھال پر — منشی عبدالرحمن باقی و سالک

کچھ نگاہ مہر و کرم میرے حال پر
کچھ دیجئے جواب سوال وصال پر
اس سنگدل کے دلپہ خدایا اثر نہین
غیرون کو رحم آتا ہے مجھ خستہ حال پر
مردے بھی سر پٹکتے ہین اٹھ اٹھ کے قبر سے
زندے بھی جان دیتے ہین اس بت کی چال پر — بھگوانداس برہمن

مت کر غرور حسنِ سریع الزوال پر
پیارے زوال آتا ہے اکدن کمال پر
اس شعلہ خو کے کوچہ میں آنے لگا رقیب
کیونکر ہماری طبع نہو اشتعال پر — سید حسین رشید

تازہ ستم ہے آج دل پائمال پر
غیرون سے مشورہ ہے ہمارے سوال پر
روؤ نہ میری لاشہ پہ زلفین بکھیر کر
مردہ تڑپ اٹھے نہ تمہارے ملال پر — ضیاءالحسن سید

بیجا ہے ناز مال پہ ہو یا جمال پر
بیشک بجا ہے فخر اگر ہو کمال پر
سوتے مین دیکھا ہے کبھین عارض حضور
ناحق خیال ہے تمھین خواب و خیال پر — محمد مہدی حسن عباسی سیف

اے مرغ دل سنبھل نہ مچل مت نکال پر
دام ریا بچھا ہے نہ گر زلف و خال پر
میٹھی نگاہ غیر کی پہونچی ہے گال پر
بھنکینگی مکھیان ترے حسن و جمال پر
پستان پہ انکی اور سپستان ہوئی نمود
دمریز آرہی ہے مرے نونہال پر — محمد شبیر خان شبیر

ہم بھی کیا ملول جہان کی پڑی ہمیں
پھر پڑین ہمارے پرانے خیال پر

کیوں سر جھکائے بیٹھے ہو جانے دو چپ رہو
جو کچھ ہوا ہوا مین فدا انفعال پر
— سید خورشید حسین شمس

بوسہ پہ دل نہ مول لو اس گلفروش سے
مین جان بیچتا نہین تھوڑیسے مال پر

ہر اسپہ کیا فدا ہو وہ پھولوںمین جو رہے
دل آئیگا بھی تو کسی نازک خیال پر

ہولی مین میرے گل نے ملا گال پہ گلال
سرخی جو گال پر ہے وہی ہے گلال پر
— ہر سرن گلفروش گلزار

دو دن کی ہے بہار ہر اک نو نہال پر
پھولے نہین سماتے ہین گرو جمال پر

مردوں نے دی صدا کہ قیامت بپا ہوئی
قربان جاے حشر تری چال ڈھال پر

زاہد شراب پی کے ذرا کیف لے لوٹنا
بیفائدہ ہے بحث حرام و حلال پر
— سید مرتضی حسن مرتضی

چشم کو نصیب سے بہرا ملا ہے یار
دونوں کا پردہ فاش ہے ہر اک سوال پر

زاہد ہمین شراب کا پینا نہین گناہ
ہو آنکھ تو نظر ہو حرام و حلال پر

حافظ کو اے بتو کہین اندہا نجانیو
ہم عین شب مین ماردین تلوار ڈھال پر
— حافظ میت اللہ میتا (نابینا)

مصرع طرح: قیامت ہے کہ ہم آسان کو دشوار کر بیٹھے

نظر آئیگی اب کیا وصل کی صورت ہمین ایدل
کسیکی یاد مین آنکھون ہی کو بیکار کر بیٹھے

ہمین دیکھو کہ دل سی چیز دیدی اک اشارہ مین
تم اک بوسہ کو جو کچھ شے نہ تھی انکار کر بیٹھے

ہوا کے مرغولے پر [illegible] تھا
مرا خون منت میں تم اپنے سر پہ بار کر بیٹھے
حکیم محمد راحت علی حاذق

ادب مانع ہے مجھکو مین تجھے کس شکل سے دیکھون
یہ موسیٰ تھے جو کوہِ طور پہ دیدار کر بیٹھے

مزا بوسوں کا کھویا جان جان حرفِ شکایت نے
کہ ہم گویا لبون کے درمیان دیوار کر بیٹھے
مہدی علی ریاض

سواری کو براق برق وش فردوس سے آیا
عجائب حسن سے بالائے زین خیرالبشر بیٹھے

یقین ہے دولت ایمان سے مالا مال ہوجائے
مزار پاک پہ جو شوق سے جاکر بشر بیٹھے

کھلیگا حال اسدن بخشش امت کا عالم کو
برائے مغفرت جب باندہ کر حضرت کمر بیٹھے
سلام اللہ خاں سلامی

اگرچہ انکے دل مین دہیان تھا وعدہ وفائی کا
مگر بیچ آپڑی بیساختہ انکار کر بیٹھے

یہ کیا معلوم تہا اٹھتے ہی وہ محشر اٹھائیگا
قیامت کی کہ اس فتنہ کو ہم بیدار کر بیٹھے
سید ضیاء الحسن سید

وہ ہمسے عار کرتے تھے پہر آخر پیار کر بیٹھے
پہر آئے پاس میرے ہار کر جھک مار کر بیٹھے

طلب بوسہ کیا تھا ہنے یا کچھہ اور کہتا تھا
بس اتنی بات پہ تم جوتی اور پیزار کر بیٹھے

ہماری قتل کی تاریخ تہی اک اور کم کردی
سنیچرپن تو دیکھو پیر کا اتوار کر بیٹھے
محمد شبیر خان شبیر

کیا تھا وعدہ سر دینے کا قاتل سے سو حاضر ہون
کہو وہ تیغ ابرو کو ذرا تیار کر بیٹھے
سید تاج الحسن شرف

شب وصلت بہی شوخی سے نہ باز آئے نہ باز آئے
ہمارے سامنے آنچل سے وہ دیوار کر بیٹھے
سید صغیر حسن صغیر

اگر محبوب پایا ہے [illegible] صورت آفت کا — تماشہ [illegible] سے [illegible] اٹھا کر بیٹھے

لب بوسہ میں یہ شوخی ہے منہ [illegible] — ہمارے سامنے غافل سے وہ [illegible] کر بیٹھے

[illegible] تم خوش ہو کے [illegible] — تمہیں [illegible] جان کو آزار کر بیٹھے

طلب بوسہ اگر [illegible] تو خوش ہو کے [illegible] — طلب [illegible] عاشق شیدا سے [illegible] کر بیٹھے

تمنا [illegible] ہے [illegible] ہو گیا حاصل — کہ اپنے [illegible] عشق کو [illegible] کر بیٹھے

صوفی جناب شیخ علیم اللہ صاحب مرحوم دہلوی تلمیذ حضرت ذوق دہلوی

کہا جو منہ سے میری وصل کا اقرار کر بیٹھے — کہا [illegible] تو وہ انکار کر بیٹھے

سمجھ کر ہمکو آج وہ تکرار کر بیٹھے — جنہیں دشمن [illegible] سمجھے تھے انہیں [illegible] کر بیٹھے

پیام وصل جو لیکر گیا ہے نامہ بر میرا — کہیں قاصد سے وہ [illegible] انکار کر بیٹھے

بڑا شکوہ ہے یہ ہم کو تم سے [illegible] — ہمارے سامنے [illegible] ستم [illegible] کر بیٹھے

دماغ [illegible] — جو ہمکو آج غیروں میں [illegible] بیٹھے

[illegible] اپنی وحشت سے — جنوں [illegible] دامن کا [illegible] تار کر بیٹھے

[illegible] — [illegible] دل [illegible] بیٹھے

نصیب [illegible] اپنے کیے کا [illegible] صوفی — گلا کر دل [illegible] اقرار کر بیٹھے

عالم جناب سید عالم حسین امروہوی تلمیذ حضرت یاور امروہوی

اگر [illegible] کبھی بوسہ تو صاف انکار کر بیٹھے — ہزاروں گالیاں [illegible] کر بیٹھے

سوال وصل پر [illegible] کی شکایت کیا — مگر شکوہ [illegible] دشمن سے [illegible] اقرار کر بیٹھے

کہا تھا ایک دن [illegible] کہ غیروں سے نہ ملیے گا — بس اتنی بات پر تلوار [illegible] کر بیٹھے

جو پوچھا [illegible] خفا [illegible] عاشق مضطر [illegible] — کہا [illegible] کیوں [illegible] کر بیٹھے

رہا عریاں [illegible] میں ہی بدن وحشت [illegible] — جنوں میں [illegible] اپنے [illegible] کر بیٹھے

[illegible] عالم — [illegible] دل [illegible] جان [illegible] فدا [illegible] کر بیٹھے

غنی جناب سید غنی حسن صاحب [illegible] دہلوی تلمیذ مولانا [illegible] حضرت [illegible]

تمنا تو دل [illegible] ہم [illegible] کیوں اظہار کر بیٹھے — تعجب کیا ہے گر وہ وصل سے انکار کر بیٹھے

جو پوچھا کچھ خطاے عاشق مضطر بھی بتلائے
کہا ملتے نہ ملتے آپ کیون اصرار کر بیٹھے
ہوے دو چار دن میں ایسے عاشق حضرت عالمؔ
نہ دل رکھا نہ جان رکھی فدائے یار کر بیٹھے — سید عالم حسین عالم

مصرع طرح: ناصح مرا رسول نہیں ہے خدا نہیں

اے دل اگر وہ عیسی دوران خفا نہیں
بیمار جان بلب کو وہ کیون پوچھتا نہیں
اک بوسہ کی طلب پہ ستمگر کے ہاتھ سے
ہیہات خون بہا مرا پر خوںبہا نہیں
اعظم علی وصی پیمبر ہین واقعی
ساری خدا کی شان ہے لیکن خدا نہیں — سید محمد اعظم اعظم
کیا پوچھتے ہین آپ مرے دل کی آرزو
جز حسرت وصال کوئی مدعا نہیں
ہم محو ایسے ہوگئے اک بت کے عشق مین
بھولے سے بھی زباںپہ یاد خدا نہیں
پیش آتی ہے وہی جو جبین بشر مین ہے
قسمت میں جو لکھا ہے کسی سے مٹا نہیں — نجم حسن، انجم
دشمن پہ ظلم کرتے ہو یہ رشک ہے ہمین
بیجا عنایتین یہ تمہاری بجا نہیں
من مار مار دلپہ تری زلف رہ گئی
موسیٰ پہ زور سامری کا کچھ چلا نہیں — محمد صدیق، ارمان
تقدیر کا لکھا کہ وہ خط غیر کو دکھائین
فقرہ وہ پڑھ دیا ہے جو اسمین لکھا نہیں — سید اعجاز حسین اکمل
کیون بے اثر ہے مجھکو مری آہ کیا ہوا
پھٹکر فلک زمین پہ ابھی تک گرا نہیں
اس سخن کی دولت دیدار چاہیے
کچھ اور میرے سر مین ہوس کی ہوا نہیں — حکیم محمد راحت، علاق

کٹتے ہیں راتدن یہ انہیں کے فراق میں
دل سے تو ایکدم کو وہ ہوتے جدا نہیں
عاشق ہیں ہمتو آپ کے غصہ نسوچیے
جانان کسی پہ جان کے ہوتے خفا نہیں — حامد علی حامد
باتون سے اسکی ہوش اوڑے جاتے ہیں مرے
کہتا ہے وہ جو ہوشربا میں ترا نہیں
کیسی ہوائے گل میں ہے ٹھوو بنی ہوئی
ہوش و حواس باد صبا کے بجا نہیں — مولوی قدرت اللہ حباب
وہ تم نہیں وہ ناز نہیں وہ ادا نہیں
وہ دل نہیں وہ لطف نہیں وہ مزا نہیں
جوبن کی وہ بہار خزان ہوگئی حضور
یہ بھولنا فضول ہے اب وہ ہوا نہیں
قسمت ہے اپنی اپنی کسیکا گلا نہیں
ہان کہدیا رقیب سے ہم سے کہا نہیں — مہدی علی ریاض
کہتا ہے ہر سوال پہ وہ دلربا نہیں
لفظ اور اس کو یاد نہیں کے سوا نہیں
اک جام مے ہی کافی ہے لا جلد ساقیا
میں بادہ نوش صاحب حرص و ہوا نہیں
گرچہ گناہ اپنے سلامی ہین بیشمار
کچھہ کم مگر عنایت و فضل خدا نہیں — سلام اللہ خان سلامی
تصویر مین وہ بات وہ ناز و ادا نہیں
انکی کشش کا نقش کسی سے کہنچا نہیں
کچھہ شوخی کلام کا مضمون ملا نہیں
دل سے عروس نظم کا گھونگٹ کھلا نہیں
پتھر وہ دل ہے درد سے جو آشنا نہیں
وہ آنکھہ بے سود ہے جسمین حیا نہیں
مرتا ہون ہجر مین مجھے اسکا گلا نہیں
مرنا فقط یہ ہے مرے بس مین قضا نہیں — بی فردوسی جان شکیل (پردہ نشین)

کیا خاک کنا کے بیٹا ہے دشمن تمہارے گھر
کمبخت کے نصیب میں اک کوسنا نہیں
باتوں میں لطف اور مزا چوسنے میں اور
ظالم تری زبان میں کیا کیا مزا نہیں
اللہ رے نازکی مرے دل میں ہزار بار
ایسے چلے پھرے کہ کہیں نقش پا نہیں
دل تمکو دیگیا کوئی مطلب ضرور ہے
یاور ہے ہوشیار کوئی باؤلا نہیں — سید محمود علی یاور

چہرہ بھی خوب آنکھہ بھی خوب اور ادا بھی خوب
سب خوبیاں ہین آپ مین لیکن وفا نہین
کہتے ہین اپنے غیر سے وعدہ وفا کیا
ہمنے تو آجتک کبھی ایسا سنا نہین
زاہد شراب پینے کو کیون منع کرتا ہے
کچھہ اس سے عقد دختر رز کا بندھا نہین — سید قمر حسین ہزار

مضمون کمر کا اُسکی جو باندھا نہ بندہ سکا
کس کس جگہ خیال ہمارا گیا نہین — سید علی نذر لطف

رویگا بیکسی پہ مری کون بعد مرگ
افسوس پانوںمین بھی کوئی آبلا نہین — شیخ محمد ہادی ہادی

اکتوبر ۱۸۹۵ء کے شمارے میں 'اطلاع طرح' کے ذریعے ۱۵ر نومبر تک مصرعۂ طرح "قیامت ہے کہ ہم آسان کو دشوار کر بیٹھے" پر غزلیں بھیجنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، اس طرح پر دسمبر کے شمارے میں غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ البتہ اسی اعلان میں ۱۵ر دسمبر، ۱۵ر جنوری اور ۱۵ر فروری کے لیے جو مصرعۂ طرح دیے گئے تھے، اس کے مطابق جنوری اور فروری کے شماروں میں غزلیں شائع نہیں ہوئیں۔ ایسا کیوں ہوا، اس پر کوئی نوٹ نہیں چھپا ہے، بلکہ جنوری اور فروری، دونوں شماروں میں تقریباً تمام غزلیں 'ناصح مرا رسول نہیں ہے خدا نہیں" پر ہی شائع کی گئی ہیں۔ ہو سکتا ہے اس مصرعۂ طرح پر بہت زیادہ غزلیں آجانے کی وجہ سے ایسا کیا گیا ہو۔ اور اعلان شدہ دوسرے مصرعۂ طرح پر غزلیں، فروری کے بعد کے شماروں میں شائع ہوئی ہوں، جو دستیاب نہ ہو سکے۔

پروین [illegible]
نرسری جامعہ نگر، نئی دہلی

نرسری ایجوکیشن میری نظر میں

میں جس گھر میں بڑھی اور جہاں پیدا ہوئی اس کا ماحول ہر اعتبار سے ایسا ہی خوشگوار اور سازگار تھا جیسا کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے ماہرین اب تک بتاتے چلے آرہے ہیں۔ یعنی ہمارا گھر صاف ستھرا تھا۔ گھر کا پورا سامان نہایت سلیقے کے ساتھ مناسب اور مقررہ جگہ پر رکھا رہتا تھا۔ ماں باپ اور دیگر عزیز و اقارب کے درمیان اچھے اور محبت بھرے تعلقات تھے غرض کہ ہمارے گھر کا ماحول سیکھنے سکھانے کے لیے کودنے اور رہنے سہنے کے لیے بہت ہی اچھا تھا۔

میں نے آنکھیں کھولتے ہیں فطری طور پر سیکھنا شروع کیا۔ پہلے ماں کی گود کو پہچانا۔ پھر اپنے ابا کو پہچانا۔ دوسرے عزیزوں کو پہچانا۔ جب چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو گھر کے ماحول سے خود بخود صاف ستھرا رہنا سیکھا۔ والدین اور عزیزوں کے کھانے پینے، بولنے چالنے اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے اور رہنے سہنے کے طریقوں کی نقل کرنا سیکھا۔ جب کوئی تین برس کی ہوئی تو میری امی مجھے جامعہ کے نرسری اسکول لے گئیں میں نے وہاں جاتے ہی اسکول کے خوشگوار اور خوب صورت ماحول کو دیکھ کر ان کھلونوں کو لینے کی کوشش کی جو وہاں چاروں طرف رکھے ہوئے تھے۔ میری امی اسکول کی ڈائرکٹر محترمہ مشیر فاطمہ صاحبہ اور ان کی رفیقہ کار ممی باجی سے باتیں کر رہی تھیں اور وہ دونوں چپکے چپکے میری طرف دیکھ کر میرے شوق اور میری دلی خواہش کو پہچان رہی تھیں۔ چنانچہ ممی باجی نے مجھے امی کی گود سے لے کر اپنی گود میں لے لیا اور ایک گڑیا دے کر ایک چھوٹی سی سائکل پر بٹھادیا۔ بس اب کیا تھا میں امی کی گود کی گرمی بھول گئی اور ممی باجی کے پیار اور کھلونوں کے لالچ میں آکر اسکول کی طالب علم بن گئی اور امی کے ساتھ روزانہ اسکول جانے لگی۔ بس وہ دن اور آج کا دن میں برابر یہ سوچتی رہتی ہوں کہ ان غریب بچوں اور بچیوں کی خوشیوں امنگوں کا کیسا خون ہوتا ہے جو دیہاتوں اور غریبوں میں رہتے اور پلتے بڑھتے ہیں۔

اب تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لینے اور جامعہ نرسری اسکول میں کام کرتے

رہنے کی بدولت ہوا ہے یہ خیال آتا رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے دیش کو مختلف قسم کی
دولت دے کر امیر بنایا ہے لیکن ہم غریب ہیں تعلیم کی کمی کے سبب ہم اپنے دیش کی
قدرتی دولت سے جو زمین کے اندر دبی پڑی ہے اور وہ دولت جو زمین کے اوپر ہے او
وہ دولت جو زمین پر چلتی پھرتی نظر آتی ہے، فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔ ہم غریب ہیں
اور غریب رہیں گے اگر ہم نے ہماری سرکار نے ننھے منے بچوں کی تعلیم کا خاطر خوا
انتظام نہ کیا۔ ہمارے بچوں کو بچپن میں اچھا ماحول اور اچھی تعلیم و تربیت نہ ملنے کی وجہ
سے ہمارے ملک میں غریبی اور جہالت ہے۔ ہمارے بچے اپنی ماؤں کی غریبی اور
جہالت کی وجہ سے بچپن میں ہی ذہنی اعتبار سے مفلوج اور تعلیم سے محروم ہو جاتے ہیں
ضرورت ہے کہ نرسری ایجوکیشن کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور ملک کے گوشہ گوشہ
میں نرسری اسکول کھولے جائیں تاکہ وہ گھر کا اچھا نعم البدل بن کر گھر کی کمی کو پورا
کر سکیں۔ ابھی ہم اس قابل نہیں ہوئے ہیں کہ گھر میں وہ سب چیزیں فراہم کر سکیں
جس کا مطالعہ ننھے منے بچے کی نشو و نما میں مددگار ثابت ہو لیکن ان چیزوں کو مناسب
ماحول کے ساتھ حکومت کے ذریعے نرسری اسکول میں فراہم کیا جاسکتا ہے۔ جب یہ
ہو جائے گا تب ہی یہ کہا جاسکے گا کہ ہمارے بچے ملک کے لیے مفید شہری بن کر ملک
کی دولت بن سکتے ہیں۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ انسان اپنے ماحول سے سیکھتا ہے۔ اس کا ماحول تغیر پذیر، نمو پذیر اور لامحدود ہوتا ہے۔ اس کو جاننے، اس کو سمجھنے اور اس سے مطابقت پیدا کرانے کے خیال سے نرسری، ابتدائی ثانوی اور اعلا تعلیم کے مدرسے کھولے گئے ہیں اور تعلیم و تربیت کی مدت کو خاصا طویل رکھا گیا ہے اور ہر منزل پر یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ بچہ بچپن سے جوانی تک کے زمانے میں اپنی ذاتی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کے مطابق ضروری تعلیم حاصل کر سکے اور ذہنی، اخلاقی اور جسمانی اعتبار سے اچھا انسان بن سکے۔

میرا ذاتی مطالعہ اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ نرسری ایجوکیشن دراصل بچے کو اس کے سماجی ماحول سے مطابقت پیدا کرانے کی پہلی اور اہم منزل ہے۔ نرسری اسکول میں بچے کو ذہنی اور جذباتی اعتبار سے ابتدائی تعلیم کے لیے تیار کیا جاتا ہے اتنا تیار کہ وہ ابتدائی اسکول میں جاکر روز اول سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ خوش رہ سکے۔ صرف اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نرسری اسکول کو نہایت خوب صورت، صاف ستھرا کھلا ہوا

...ر دل کش بنائے رکھنے کے لیے کوشش کرنا چاہیے۔ مختلف قسم کے ماحول کو سیکھنے
...کھانے کے لیے سازگار بنانا چاہیے۔ نرسری ایجوکیشن سے متعلق استانیوں کو درج ذیل
...لیمی اغراض کو پورا کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

۱۔ بچوں کو حفظانِ صحت کے بنیادی اصول سکھانا، مثلاً غسل خانوں، بیت
...لا کو ٹھیک سے استعمال کرنا، کھانے پینے، سونے جاگنے اور کھیلنے کودنے نیز آپس
...ں ملنے جلنے سے متعلق اچھی عادتیں پیدا کرنا اور اپنی اور اسکول کی چیزوں کو صحیح
...ریقے سے استعمال کرنا اور استعمال کے بعد انھیں مقررہ جگہوں پر رکھنا۔

...۔ بچوں کو ماحول سے مطابقت پیدا کرانا۔ اور آدابِ محفل سکھانا مثلاً جب اپنے بڑوں اور
...اتھیوں سے ملیں تو سلام کریں۔ دوسروں کی دلچسپیوں کا خیال رکھنا۔ بہن بھائیوں
...ے ساتھ پیار محبت سے پیش آنا۔ جلسے میں اپنی جگہ پر خاموشی سے بیٹھے رہنا۔ ادب
...ے ساتھ بات کا جواب دینا۔

...۔ جماعتی کھیلوں اور کاموں کے ذریعے بچوں میں امدادِ باہمی اور تعاون کی عادت پیدا
...نا۔ اپنے ساتھیوں اور بزرگوں کے آرام اور حقوق کا خیال رکھنا۔

...۔ بچوں کو جذبات کو ظاہر کرنے اور دوسروں کے جذبات کو سمجھنے اور جذبات پر قابو
...نے کی تربیت کرنا۔

...۔ بچوں میں ذوقِ جمال پیدا کرنا تاکہ انھیں اچھی اور خوب صورت چیزوں سے محبت
...ر خراب اور گندی چیزوں سے نفرت ہو۔

...۔ بچوں میں تلاش اور تحقیق کا شوق پیدا کرانا تاکہ وہ اپنی ننھی دنیا کی قدرتی اور مصنوعی
...لت کو جاننے اور تلاش کرنے کے خواہش مند ہوں۔

...۔ اظہارِ خیال کے لیے دلچسپ مواقع فراہم کرنا تاکہ بچوں میں خود سے کچھ کرنے۔
...ہ بتانے کچھ لینے اور کچھ دینے کا شوق پیدا ہو۔

...۔ بچوں کو جسمانی صحت بنانے، اچھی طرح چلنے پھرنے، بھاگنے دوڑنے اور ضروری
...یاء کی مدد سے کھیلنے کا شوق دلانا۔

...۔ بچوں کو اچھی اور آسان کہانیاں اور گانے سنا کر اور یاد کرا کر مادری زبان میں بے
...لک بولنے اور اپنے خیالات ظاہر کرنے کے قابل بنانا۔

...۔ بچوں کو چھوٹے پیمانے پر سماجی زندگی کا تجربہ کرانا تاکہ ان کو اپنے اسکول، گھر اور
...اردگرد پیش سے محبت ہو سکے۔

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

[redacted]

گیلا ایندھن

شاعرہ : بلقیس ظفیرالحسن
تبصرہ نگار : رضوان اللہ
صفحات : ۱۷۶
قیمت : ۷۵ روپے
تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

شعری ادب کی جو رویں ۶۰ء کے عشرے میں رواں ہوئیں انہی کے ساتھ ساتھ "گیلا ایندھن سلگنا شروع ہوا تو سلگتا ہی جا رہا ہے۔ پہلے رگوں میں خون کی حرارت اشتعال کا کام کرتی رہی اب سوز دروں۔

"گیلا ایندھن" محترمہ بلقیس ظفیرالحسن کے کلام کا انتخاب ہے جو ان کی لائق بیٹی نغمہ ظفیر نے مرتب کیا ہے۔ یہ تقریباً ساٹھ جدید نظموں اور اسی قدر روایتی غزلوں پر مشتمل ہے۔

جدید شاعری ماضی سے رشتہ جوڑے رکھنا چاہتی تھی، اس کی بنیادی اقدار کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھی لیکن اس سے گریزاں بھی تھی۔ مزید براں کچھ نیا کر دکھانے کے جذبے سے سرشار بھی تھی۔ اس کے سامنے ایک تو کلاسیکی شاعری کے شاہکار تھے۔ دوسرے ماضی قریب کی وہ شاعری تھی جو خود کو ماقبل سے ممیز کرنے کے اعلان کی غرض سے خود کو ترقی پسند کہنے کہلانے پر اصرار کرتی تھی۔ ادب میں جتیں تلاش کرنا نہ تب عیب تھا نہ اب لیکن جب ترقی پسند شاعری ایسا نعرے بازی بن گئی کہ سننے والے اوب گئے تو پھر نئی نسل نے پلٹ کر ماضی بعید میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی اور قدیم و جدید کے امتزاج اور اس میں اپنے عہد کے تجربات و مشاہدات کی آمیزش سے نئے ادب کی تخلیق کی کوشش کی جسے کامیابی کے ساتھ نبھانے کے لیے ایسی فنکارانہ مہارت کی ضرورت تھی جو سب کے بس کا کام نہ تھا۔

بلقیس ظفیر الحسن کی شاعری میں بہت سے شعری رنگ دیکھے جا سکتے ہیں الفاظ کے خوبصورت استعمال کے ساتھ ہی فکر کی ندرت اور ایک تیکھا انداز احتجاج اس پر مستزاد ہیں جو اس مجموعۂ کلام کا پہلا ورق کھولتے ہی پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ مختصر سی پہلی نظم دراصل حمد ہے لیکن اس پر کوئی روایتی عنوان نہیں قائم کیا گیا ہے۔ بیشتر نظمیں بلا عنوان ہی ہیں۔ خدا دیتا نہیں دکھ / کسی کے نفس کی وسعت سے زیادہ / مرے دل میں سما کر اس نے / زمینوں آسمانوں سے بھی بڑھ کر / وسعتیں رکھ دیں۔

بلقیس ظفیر الحسن کی شاعری میں نظم ہو یا غزل احتجاج کا رنگ غالب ہے۔ صنف نازک کا احتجاج۔ ان کا احتجاج کہیں لفظوں کے غلاف میں لپٹا ہونے کے باوجود جھلکتا ہے تو کہیں شمشیر برہنہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک بلا عنوان نظم کی یہ سطور۔ خودکشی کرنے کے کئی طریقے ہیں / ایک سے ایک بھیانک / اور آسان / مگر سب سے بھیانک ہے۔ جیتے جی مر جانا / جس میں کسی کو پتا نہیں چلتا اور آدمی مر جاتا ہے / یہ کوئی نیا طریقہ نہیں ہے / مجھ سے پہلے بہتوں نے اسے آزمایا ہے اور کامیاب ہو گئے ہیں / سب سے اچھی بات اس میں یہ ہے / کہ زندہ رہنے کا اس میں کوئی امکان نہیں رہتا۔

ان کے احتجاج میں کہیں کہیں خاصی تلخی ہے اور طنز کے تیر چبھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ایک بلا عنوان نظم کے جستہ جستہ ٹکڑے

جنتی ہے وہ بیوی جو شوہر کے آنے سے پہلے سجے اور سنورے / موہوم موتیوں کو پروئے / اشتہا انگیز خوشبو بھرے قاب کھانوں کے تیار رکھے / روٹیاں گرم، اور نرم بستر کا ہو اہتمام / آفتابہ / سبو اور گرم پانی کے موجود ہوں / .... اور ہاں بیبیو! اک چھڑی بید کی۔ خوب مضبوط سی پاس ہی رکھنا دیکھو ذرا.... کہنے والی نے اتنا کہا اور چپ ہو گئی / ... مگر ایسا شوہر کہاں جائے گا۔ اس کی بابت کسی کو خبر کچھ بھی بتلا خدایا خدایا / صف بصف نسل در نسل بے مول کی یہ کنیزیں / انھیں ان کے ہونے کا احساس / تو ہی عطا کر

زیر تبصرہ مجموعے میں نظموں اور غزلوں کی آنکھ مچولی ہے یعنی انہیں الگ الگ حصوں میں اکٹھا نہیں کیا گیا ہے بلکہ یکے بعد دیگرے دو دو چار چار نظمیں یا غزلیں رکھی گئی ہیں۔ ان کی ترتیب یا بے ترتیبی کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ممکن ہے ان کی ترتیب زمانی ہو کیونکہ آخری اور اختتامی نظم کا عنوان ہے "۲۸ / جولائی ۱۹۹۵ء" جو ظفیر الحسن صاحب کی وفات کی تاریخ ہے۔ اس نظم میں جذبات کا ایک طوفانی وفور ہے۔

بلقیس ظفیر کی غزلوں میں بڑی پختگی ہے اور ان میں غزل کی شائستہ روایات بھی واضح نظر آتی ہیں لیکن چونکہ تند و تیز احتجاج کے لیے انھوں نے نظموں کا لباس منتخب کیا ہے اس کی جگہ غزلوں میں درد کی گھلاوٹ ہے اور کہیں احساس بے چارگی ہے لیکن ایک ایسے سوز دروں کے ساتھ [illegible]

احتیاط کے باوجود تقلید کے پھندے سے باہر بھی کر رہا محسوس ہوتا ہے کہیں کہیں اشعار حسن سادہ کی تصویر نظر آتے ہیں لیکن ان کی اس سادگی میں بھی نوک نشتر موجود ہوتی ہے مناسب ہوگا کہ چند اشعار بطور نمونہ پیش کر دیے جائیں گو ایک سرتاسر منتخب کلام سے جزیا انتخاب مشکل ہے۔

سوز و فورِ اشک کے پھونکے ہوئے ہیں ہم   کیا جانتے تھے پانی کے اندر چھپی ہے آگ

سنگ رکھتے ہیں ہم جنوں کے ساتھ
ہاں کوئی سنگ آزما دیکھے

یوں چپ رہا کرے سے تو ہوجاتا ہے جنوں   زخم نہاں کرید کے کچھ رو لیا کرو

زخم کو پھول کہیں نوحے کو نغمہ سمجھیں
اتنے سادہ بھی نہیں ہم کہ نہ اتنا سمجھیں

دیپک دیپک روز جلوں میں   روز دھواں ہو کر بکھروں میں

شل ہوئے بلقیس کاندھے زندگی کے بوجھ سے
ہم کہاں پھینکیں اسے یہ لاش اب ڈھوتی نہیں

راہ کا پتھر ہوں ہیش و پیش نہ کر   ایک ٹھوکر اور محوِ سفر

زبان کا لطف ہے، محاوروں کا لطف ہے مختصر یہ کہ غزل کی کسک کا لطف ہے بلقیس ظفر کے کلام میں۔

صبحِ فردا

شاعر: سید اختر علی اختر
مبصر: ایس، ایس، بھٹناگر شاداب
قیمت ۵۰ روپے   صفحات ۱۳۲
ناشر: مرکز ادب بھوپال (ایم پی)
ملنے کا پتا: بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال، ایم پی

مرحوم سید اختر علی اختر کا یہ دوسرا مجموعۂ کلام منظر عام پر آیا ہے۔ افسوس کہ یہ مرحوم کی حیات میں نہ شائع ہو سکا۔ اختر صاحب کے صاحبزادے نے اس مجموعے کو چھاپ کر اپنے والد مرحوم کی خواہش کو پورا کیا۔ اس کے لیے وہ ستائش کے مستحق ہیں۔ اختر صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام "نکہت گل" کے نام سے ان کی زندگی میں دسمبر ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ زیر نظر شعری مجموعہ غزلوں کا گلدستہ ہے جس کا پیش لفظ پروفیسر آفاق احمد نے تحریر کیا ہے اور پروفیسر حامد جعفری، شرقی خالدی اور اقبال مسعود نے اختر صاحب کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ اختر صاحب کی بیٹی صالحہ

سلطان نے مرحوم کا تعارف بڑے جذباتی انداز میں رقم کیا ہے۔ اختر صاحب کی شاعری میں کرب اور درد کی تاثیر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے

یہ اک خاص رچاؤ کے ساتھ دلوں سے نکلتا ہے — تم آ سکے تو گھر سے بھی اک دن لوٹیں گے

ہو گئی ہے زندگی اک تنگ خانے کا نام — موت کیا ہے پردۂ دنیا کے اٹھ جانے کا نام

ہم شعلہ زمانے ذرا لطف تو سہی — کبھی غریب کو دنیا میں کب نہیں آئی

ہم نے اک شمع مجسم سے یہی سیکھا ہے — تند جھونکوں میں بھی جو اپنا جلائے رکھنا

— اپنی غزلوں میں اختر صاحب نے حسن و عشق کی روایت کو بھی برقرار رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں عروض کے بنیادی اصولوں سے کہیں بھی انحراف نہیں کیا ہے۔ عشق کا روایتی تصور بھی ان کے شعروں میں ہے اور ان کے عہد میں جذبوں اور احساسات کی تصویریں بھی

ساقی کی انجمن کا انوکھا نظام ہے — مینا ہی رقص میں ہے نہ گردش میں جام ہے

ان کی نگہ پر جہاں بھی نظر ہو گئی — درد دل بڑھ گیا آنکھ تر ہو گئی

لاکھ پوشیدہ رکھی محبت مگر — دیدۂ تر سے اختر خبر ہو گئی

پیش نظر کتاب میں ماضی کی روایت کا عصری اسلوب میں اظہار اس مجموعے کے اشعار کی خصوصیت ہے۔ اختر صاحب جیسے بزرگ شاعر کے کلام میں عہد کی فکر کا تقاضا واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔

آفسیٹ پر عمدہ طباعت کے ساتھ ہر ورق مع معیاری جلد بہت دلکش ہے۔ کتاب کا گٹ اپ دیدہ زیب ہے۔ ان سب باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے قیمت بھی بہت مناسب ہے۔

اختر الایمان: جمالیاتی تجزیہ

مصنف: شکیل الرحمن
مرتب: جابر حسین
مبصر: ڈاکٹر ثوبان فاروقی، پٹنہ
قیمت: 100/
ناشر: اردو مرکز، عظیم آباد، پٹنہ

اردو مرکز، عظیم آباد پٹنہ کے اشاعتی سلسلے کی ایک اہم کتاب "اختر الایمان: جمالیاتی تجزیہ" خصوصی طور پر اس اعتبار سے بھی قابل توجہ ہے کہ اختر الایمان کی شاعری کے جمالیاتی پہلو پر

تک کوئی مبسوط تحریر وجود میں نہیں آسکی ہے۔ اس کتاب کے مصنف شکیل الرحمٰن ہیں جو بہ ذات خود جمالیاتی طرز تنقید میں ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب جیسا کہ بہار قانون ساز کونسل کے چیرمین جابر حسین صاحب کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے موصوف ہی کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔ ایسی معرکۃ الآرا تصنیف کی ترتیب واشاعت پر جابر حسین صاحب خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

یہ کتاب لگ بھگ پونے دو سو صفحات پر محیط اور تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب "رومانیت" ہے۔ شکیل الرحمٰن کا دعوا ہے کہ اخترالایمان کی نظموں سے ایک نئی رومانیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ باب اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں اخترالایمان کے ان مکاتیب کے اقتباسات دیے گئے ہیں جو مصنف کے بعض استفسارات کے جواب میں ہیں۔ ان اقتباسات سے اخترالایمان کے ذہنی افتاد اور شعری موقف کی صراحت ہوتی ہے۔ دوسرے باب کا عنوان "لاشعور کی عکس ریزی" ہے اس باب کی ابتدائی سطور میں اجتماعی لاشعور اور "آرچ ٹائپ" پر تفصیلی بحث ہے۔ اخترالایمان کی نظموں میں لاشعور علامتوں کی تلاش، بنیادی اساطیری رجحان کا سراغ اور آرچ ٹائپس کی شناخت جیسے دقیق وباریک مرحلے سے شکیل الرحمٰن بہ سلامت روی گزرے ہیں۔ تیسرے اور آخری باب میں اخترالایمان کی چند نظموں کا تجزیہ ہے۔ یہ تجزیے عملی تنقید کے اعلا نمونے ہیں۔ اس باب میں اخترالایمان کی تقریباً ساری نمایندہ نظمیں زیر بحث آئی ہیں۔ ان نظموں کے تجزیے میں شکیل الرحمٰن نے انہی جمالیاتی وروحانی اقدار و معیار کو بروئے کار رکھا ہے جن کی پیش بندی وہ کتاب کے پچھلے دو ابواب میں کر چکے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ باب اخترالایمان کی شاعری کے علامتی نظام کو سمجھنے سمجھانے کی ایک گراں قدر کاوش ہے۔

"اخترالایمان: جمالیاتی لیجنڈ" ایک قابل قدر اور وقیع تنقیدی کارنامہ ہے۔ اخترالایمان کی شعری جمالیات کی تفہیم کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔

ماہنامہ "انشاء"

نیاز فتح پوری نمبر

لائبریر: ف۔ س، اعجاز
مبصر: جی۔ ڈی چندن
قیمت:: 200/روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

نیاز فتح پوری ہمارے منفرد اور مجتہد دانشور تھے۔ وہ بیسویں صدی کے وسط میں سامنے آنے والے اردو ادیبوں میں صف اول کے لکھنے والے اور صاحب فکر و نظر تھے۔ انھوں نے اردو نظم و نثر کی مختلف اصناف کے علاوہ سماجی "ثقافتی، مذہبی، سیاسی، تاریخی، جنسی، عمرانی اور دیگر موضوعات پر بڑی ذہانت سے لکھا اور اپنے خیالات و نظریات سے ایک پورے دور کو متاثر اور متحرک کیا۔ ان کا امتیاز صرف نگارخانے سے نکلا خ

زمین میں نئے خیالات کی کاشت کاری کرنے ہی میں نہیں تھا بلکہ اپنے خیالات سے فرد کو جدید عقل و فکر کو بچہ تک لے اور منتقل کرنے میں بھی تھا۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر چالیس سے اوپر کتب شائع کیں لیکن ان کا شاہکار کارنامہ ماہنامہ "نگار" تھا جس نے ادبی صحافت کی قابلِ رشک معراج حاصل کی۔ ان کے دور کا ہر بڑے سے بڑا ادیب اور شاعر اس میں چھپنے کے لیے کوشاں رہا۔ امر واقعہ یہ تھا کہ :ع

وہی بلند ہوا جو نیاز مند ہوا

وہ تقریباً ۸۲ برس تک جیے جن میں سے ۷۸ برس ہندستان میں اور آخری چار برس پاکستان میں گزرے۔ پاکستان کو ان کی دانستہ ہجرت کی وجہ سے ہمارے بعض حلقوں نے انھیں پاکستان کی ادبی ملکیت کا رکن تصور کر لیا اور ان کی وفات کی زائد از تیس برس کی مدت میں بھی ہمارے کسی اخبار یا رسالے نے ان کے مرتبے کے ہم پلہ کوئی نمبر نہ نکالا۔

اس خلا کو اب کلکتے کے ماہنامہ "انشاء" نے پُر کر دیا ہے۔ اس کی اشاعت آزادی کے بعد کی ہماری ادبی صحافت کا ایک وقیع سنگ میل ہے۔ فاضل لائق مرتب ف۔ س اعجاز نے اپنے پر مغز اداریے میں لکھا ہے "ہندستان کے اہلِ صحافت پر نیاز کا جو قرضِ دانشوری ہے یہ نمبر اسے اتارنے کی اولین کوشش ہے۔"

ماہنامہ انشاء پچھلے قریب بارہ سال سے اردو ادب کی آبیاری کر رہا ہے اور اب تک نصف درجن خاص نمبر اور کئی خصوصی گوشے شائع کر چکا ہے۔ جو تمام کے تمام اردو ادب اور صحافت کا مایہ ناز سرمایہ ہیں۔

نیاز فتح پوری نمبر تقریباً پانچ سال کی محنت شاقہ سے تیار ہوا ہے اور اس میں ہندستان و پاکستان کے ممتاز مضمون نگاروں کے چالیس وقیع مضامین، نامور شعرا کے منظوم خراجِ عقیدت، بیسیوں مشاہیر کے جواہر صفت اقتباسات اور خود نیاز کی چند نہایت اہم تحریروں کے منتخبہ حصے شامل ہیں۔

مضمون نگاروں میں ڈاکٹر محمد حسن۔ پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر خلیق انجم، محمد خورشید عاصم، ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ، انور ظہیر خاں، پروفیسر ریاض صدیقی، شمیم رضوی، نواب تسنیم، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، شیخ سلیم احمد، معین الدین راہی اور ڈاکٹر سید حی، پروفیسر اے۔ بی اشرف، ڈاکٹر قمر رئیس، محترمہ اختر یزداں محسن، ڈاکٹر مجید بیدار، اسلم کاوینی، عبدالقوی ضیا (علیگ) افتخار احمد، مسرور قیصر، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، محمد طفیل، شمس کنول، حکیم محمد سعید، ضیا حسنی، ڈاکٹر محمد نعمان، تاراچرن رستوگی، راشد انور راشد، ڈاکٹر وقار راشدی وغیرہ۔

ان کے علاوہ درجنوں منتخبہ مکتوبات کے فوٹو عکس ہیں جو نیاز مرحوم نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور کرامت علی کرامت کو لکھے۔ اس پر بھی مستزاد ۱۹۱۴ء تا ۱۹۶۰ء نیاز کے آٹھ مرحلوں کی تصویریں ہیں جن سے ان کی شخصیت کے تغیر و تبدل کا دلچسپ مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس نمبر میں چار تحقیقی مقالے ہیں جو مدیر انشاء کی فرمائش پر لکھے گئے ہیں۔ ان کی بدولت یہ نمبر معدن نوادرات بن گیا ہے۔ یہ مقالے حسب ذیل ہیں۔

(۱) ہندستانی اکیڈمی الہ آباد (قیام ۱۹۲۷ء) کے تعلق سے نیاز فتح پوری، پریم چند اور دیازائن نگم کے مابین بحث بنائی گئیں۔ مرتبہ مالک رام، نیز نیاز فتح پوری کی کتاب "جذباتِ بھاشا" (مطبوعہ ۱۹۱۵ء) پر ماہنامہ زمانہ

(۲) ادبی تعلق کی کسوٹی پر نیاز فتح پوری کے ادبی رسالے (نگار ۱۹۲۱ء تا ۱۹۶۲ء) کا جائزہ، عشرت رحمانی، روزنامہ قومی تنظیم، پٹنہ
(۳) من و یزداں کا انتخاب (نگار کے کچھ پچاس سے زیادہ مضامین سے ماخوذ جو کے ایڈیشن سے خیالات جن پر ان کے زمانے میں ہنگامے برپا ہوئے) از رئیس الدین فریدی، مدیر روزنامہ
(۴) علامہ نیاز کی ادبی صحافت میں نگار کے خاص نمبروں پر ایک نظر، از اسلم کاشمیری
ان میں سے پہلے تین مقالے آج بھی پڑھنے کی چیز ہیں اور قارئین ان سے بہت سے نئے پہلو اخذ کر سکتے ہیں۔ باقی متعدد مضامین میں بھی یہ کیفیت موجود ہے اور علامہ نیاز کی تحریکوں اور تحریک خلافت کے روشن پہلو ہیں۔
اڈیٹر انشاء نے لکھا ہے کہ "علامہ نیاز کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہی ہیں یا پیدا کی جاتی رہی ہیں۔ آج ان کے بنیادی مذہبی اور تنقیدی افکار کو عصری مسائل کے تناظر میں دیکھا جائے تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔"
فاضل مدیر کا یہ جواب حوصلہ افزا بخشش ہے لیکن عملاً یہ آزمائشی قیاس ہی ہے جیسا کہ انور ظہیر خاں نے کہا ہے (مولانا مسیز اور علامہ نیاز فتح پوری) نیاز اپنے تضادات اور تشکیک پسندی کی وجہ سے اپنے دور کی ایک اختلافی شخصیت بن گئے تھے۔ "لیکن انھیں اختلافات سے ابھرنے کا ہنر آتا تھا۔ ان کا اعتقاد راسخ تھا۔ ذہن اجتہادی تھا اور وہ مذہب میں عقل آرائی پر مصر تھے۔ وہ اپنے ادبی ماہنامہ نگار کو انقلابیہ "عقل پرستوں اور آزاد مفکروں کا ترجمان" کہتے تھے۔ انھوں نے قدیم اور جدید شاعری کا محاکمہ اور محاسبہ کیا اور بڑے بڑے شاعر کی دستار فضیلت کھول دی۔ جس ہم عصر سے وہ کسی طرح آزردہ یا ناراض ہوتے اس کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ چنانچہ پریم چند، دیا نرائن نگم، سیماب، عبدالماجد دریابادی، جوش ملیح آبادی، اصغر، جگر مراد آبادی کسی کو نہیں بخشا۔ آن کے عزیز دوست مجنوں گورکھپوری نے کہا تھا کہ وہ نگار کے کاروبار میں تیزی لانے کے لیے خوب ان چھیڑ اور سنسنی خیزی بھی کیا کرتے تھے۔
اس محبوب مشغلے کی انھوں نے سزا یا جزا بھی خوب پائی۔ اس کی ایک نمایاں مثال پریم چند اور دیا نرائن نگم کے جوابات تھے جو انھوں نے ہندوستانی اکیڈمی کی کارروائی پر نیاز کے اعتراضات کے دیے۔ بہرحال خیالات اور نظریات کے مباحثے میں نیاز ہارنا نہیں چاہتے تھے اور آزادی فکر پر کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے۔
بہرحال نیاز کی ہشت پہلو شخصیت کے ادراک کے لیے انشاء کا نمبر ایک گراں قدر اور معلوماتی دستاویز ہے۔

کھلے خطوط

☆ بھگوان پوپلی باتھی، مجیو گڑھ، نئی دہلی

زیر مطالعہ دسمبر کا شمارہ تھوڑا تاخیر سے ملا ہے۔ ”کھلے خطوط“ میں نومبر ۹۷ء کتاب نما کے مہمان مدیر زبیل تدیم کے اشاریہ کے رد عمل میں کئی خطوط نظر نواز ہوئے۔ مسائل کتنے پیچیدہ کیوں نہ ہوں زبانیں اور دریا اپنا راستہ خود استوار کرتے ہیں جس زبان کی جتنی مخالفت ہوگی اس کی جڑ اتنی زیادہ مضبوط ہوں گی، مثال کے طور پر انگریزی کو دیکھیے

- عبدالقوی دستوی، پرنس کالونی، عید گاہ ہلز، بھوپال

کتاب نما کے شمارے میں ڈاکٹر توقیر احمد خاں کا مضمون ”پروفیسر امیر عارفی سے ایک ملاقات“ پڑھا۔ خوشی ہوئی۔ انھوں نے اردو کے سلسلہ میں ایک اچھا مضمون قلم بند کیا۔ پروفیسر امیر عارفی نے اردو اور اہل اردو کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ توقیر احمد خاں جیسے اردو کے نوجوان اساتذہ سارے ہندوستان میں ”اردو پڑھو اور پڑھاؤ“ کو ایک جاندار تحریک میں بدل دینے کی کوشش کریں۔ اگر اہل اردو جاگ جائیں گے اور اپنے گھروں میں اردو کو عزت کی جگہ۔

نہیں ہے ... ٹوٹل وقت اردو کا اطلاق نہیں ہو سکے گا ... ہی ہوتا ہے اس طرح یہ کہیں اقبال متین کا ذکر آیا ہے۔ بڑا درد والے ان کے اقبال مرحوم کہیں زیادہ مناسب تھے۔

اس طرح کا سلسلہ جاری رکھیں تو دوسرے اساتذہ کو بھی اردو کی خاطر دوسرے نوجوان اساتذہ کو بھی اس طرف توجہ کریں تاکہ اردو کے حلقے میں ایک فضا تیار ہو جائے اور لوگ اردو کے لیے کچھ نہیں بہت کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں یہ ناممکن نہیں ہے بقول اقبال۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

توقیر صاحب کے اس مضمون میں پروفیسر امیر عارفی صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے لیے وہ قابل مبارکباد ہیں۔ سچ کو سچ بولنا بھی بڑی ہمت کا کام ہے۔

☆ شجاع الدین خاں غوری، جدہ، سعودی عرب

اکتوبر ۱۹۹۷ء کے شمارے میں ڈاکٹر توقیر احمد خاں لکچرر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی پروفیسر امیر عارفی، صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی سے ایک ملاقات کو پڑھ کر انتہائی دکھ کے ساتھ یہ لکھنا پڑتا ہے کہ تحریر و تقریر میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے آج سے ۳۰-۴۰ سال قبل اسکول کا ایک ادنیٰ سا طالب علم بھی اس قدر بے بس و مجبور نہ رہا ہوگا جتنا کہ آج کا ایک لکچرر اور

چودھری ہے۔ آج کے لیکچرر و پروفیسر کے
پاس اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اردو
کے مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ وہ ایک محدود
ذخیرۂ الفاظ کا مالک ہے۔ اس پوری ملاقات
میں جو کہ اردو کے دور جدید اساتذۂ کرام کے
درمیان تھی ایک محتاط اندازہ کے مطابق ان
الفاظ کو چھوڑ کر جو مشرف بہ اردو ہو چکے ہیں
۷۰ تا ۸۰ الفاظ ٹھیٹ انگریزی کے
بلاضرورت استعمال ہوئے ہیں جبکہ اردو میں
ان الفاظ کے بہت خوب صورت متبادل
موجود ہیں۔ بات ہے استعداد کی۔ قارئین
کرام اس ملاقات کے چند جملے ملاحظہ فرمائیے
اور بتائیے کہ "یہ اردو کیسی اردو ہے؟"
"علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے
فرسٹ ڈویژن میں کیا۔ ایم۔ اے میں
فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن تھی۔"
"علی گڑھ میری زندگی کا ٹریننگ پوائنٹ
ہے۔"
"اردو کو جیسے جیسے ختم کرتے گئے ویسے ویسے
وہ ماحول ڈاؤن ہوتا گیا۔"
"ان میں جب تک EFFICIENCY نہ
لائیں گے۔"
"اردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے
INTRODUCE کر لیا۔"
"جو اردو ٹیچرس ہیں وہ دوسرے سبجیکٹ پڑھا
رہے ہیں۔"
گورنمنٹ، کالجز اور یونیورسٹیز میں بڑی
پوسٹیں منظور کر رہی ہے۔"
"اکادمیز کھول دیں۔ بڑی بڑی گرانٹیں دے

دلی ایک طرف [illegible] کام کر رہے
بالیائی کارپوریشن بنا رہے۔"
"شمالی ہندوستان میں اردو کے ایکسپرٹ کو
بہت کم بلایا جاتا ہے۔ دلی کا مجھے ایکسپیرینس
ہے۔ لیکچر کے تقرر کے لیے ایکسپرٹ کا کوئی
PANEL نہیں سبجیکٹ میں باقاعدہ
ایکسپرٹ بلایا جاتا ہے۔"
"اردو ایزائے سبجیکٹ نہیں ہے۔"
"بڑی بات نہ تھی وہ AGREE کر گئے
تھے۔"
"علی گڑھ جو اردو کا بڑا اسینٹر تھا۔"
"سبجیکٹ کو Comulsary کر سکتے تھے۔"
"ستیہ وتی میں انھوں نے پوسٹ لی۔ دیال سنگھ کا
لج میں انھوں ان سے مورننگ ایوننگ میں
خالصہ کالج مرانڈہاؤس میں پوسٹ نہیں تھی۔
اس کا انتظام کیا۔ COrrespondence کی
ایک پوسٹ لی وہاں Correspondence
کے ذریعے اردو پڑھانے کا .."
"ایک قسم کا کرائی سس آرہا ہے۔"
"جب میڈیم ۱۹۵۰ میں چینج ہوا تو
ٹیچرس "
"اردو ادب میں Parrallel دو لہریں چل
رہی ہیں۔ بہار میں شاعر اور افسانہ نگار بہت
اچھے Introduce ہو رہے ہیں اور جو علاقے
بہار کی Anexy بن گئے ہیں۔"
"نقادوں کی دوسری Generation ..."
"علی گڑھ کے ڈگریوں کو ریکگنائز کر لیں"
صاحب کہاں تک لکھیں، اس طرح کے
جملوں سے پورا مضمون بھرا پڑا ہے۔

اردو کے سابقے کے ساتھ خالص انگریزی کا لاحقہ اور خالص انگریزی کے لاحقے کے ساتھ اردو کا سابقہ یہ زبان اور اردو کی قواعد کا کون سا طریقہ یا قاعدہ ہے یہ بات وہ محترم استاد ہی بتا سکیں گے۔

حیرت اور تعجب اس بات پر ہے کہ جس سے ملاقات ہو رہی ہے اور جو ملاقات کروا رہا ہے دونوں ہی اردو کے معروف و محترم استاد ہیں۔ جن اساتذہ کرام کا اردو زبان و بیان پر "قدرت" کا یہ حال ہو وہ اپنے شاگردوں کو کیا دیتے ہوں گے۔

. . . .

☆ بسمل عارفی، سمستی پور بہار

بہت دنوں بعد ایک تازہ اداریہ "اردو کا سوال جمہوریت کا سوال ہے" پڑھنے کو ملا۔ مہمان مدیر جناب نریش ندیم نے کافی کھل کر (کھول کر بھی) اردو کے ساتھ ہو رہی ناانصافی کی کہانی بیان کی ہے۔ ہمارے نام نہاد بہی خواہ جو اردو کے غم میں دبلے پتلے ہوتے جا رہے ہیں جن کی آنکھوں پر حکومت کی پٹی اور جیب میں کاڑھا ہوا رومال ہے انھیں اس "اداریہ" کو پڑھ کر اپنے گریبان میں (اگر ہو تو) جھانکنا چاہیے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کا تاثراتی مضمون پسند آیا۔ جگن ناتھ آزاد صاحب کی غزل شعری حصے کی جان ہے۔ بہار کی سیاسی صورت حال پہ لکھی گئی کہانی میں کہانی کار نے اپنے تجربے و مشاہدے کو بڑی خوب صورتی سے کہانی میں سمو دیا ہے جس سے

کہانی شہر کی ہے مگر عنوان گاؤں کا ہے۔

نصرت ظہیر نے شیر خاں مشیر "کنالوالے" کے حوالے سے دھاک جمائی اور داد و تحسین وصول کیا۔ موصوف سے گزارش ہے کہ وہ "کتاب نما" کے لیے مستقل لکھا کریں۔ خامہ بگوش اور مجتبیٰ حسین کے کالموں نے بھی امید پر پانی نہیں پھیرا۔ کتاب نما کا یہ شمارہ مجموعی اعتبار سے اس سال ۱۹۹۷ء نکلنے والے گیارہ شماروں میں نمبر ون ہے۔

. . . .

☆ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی، فاطمہ منزل، ڈگی روڈ، علی گڑھ

ڈاکٹر امام اعظم (سید اعجاز حسین) کا تحقیقی مقالہ "مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ" کی ایک جلد میری نظر سے گزری اور مظہر امام کے معتقدات کے سلسلے میں ان کی یہ فکر سامنے آئی۔

تھی اس کی فتنہ زائی وجہ بربادی ہند
جس خدا کو صانع کون و مکاں سمجھا تھا میں

اس ناپاک اور تکلیف دہ شعر کو پڑھ کر بے حد تکلیف ہوئی۔ شاعری میں خدا سے شوخی و شرارت کا مضمون کوئی نیا نہیں۔ مغربی شاعری سے قطع نظر، خود اردو میں غالب، اقبال اور جوش جیسے بڑے شعرا کے یہاں اس رنگ کے اشعار ملتے ہیں۔ غالب تو اس رویے میں ان دونوں سے بہت آگے چلے جاتے ہیں مگر شوخیاں تہذیب کے اندر ہیں جو ایمان اور اعتقاد کا خون نہیں کرتیں۔

ہے۔ [illegible] مظہر امام نے [illegible]
انھوں نے [illegible] سے [illegible] ہے۔ قابل غور
بات یہ ہے کہ زندیق اور ساتھ ہی [illegible] کیا
فرق ہے۔ مظہر امام نے خدا کی تحقیر کا ذکر کی
خصوصیت کو زندیق کہا ہے۔ اس طرح خاکم
بدہن ہم اللہ اور شیطان کو اس لحاظ سے ایک سطح
پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ مظہر امام اگر خدا کو
نہیں مانتے ہیں اور اپنے کو مسلمان نہیں کہہ
سکتے تو وہ جس طرح چاہیں جس لفظ میں چاہیں
خدا کی بے عزتی کریں۔ مگر مسلمان کہہ کر،
خدا کی شان میں اس قسم کی بیہودگی کو اسلام
پرست برداشت نہیں کر سکتے۔

تعجب یہ ہے کہ ان کے تحقیقی مقالہ
میں اس منددرج شعر مقالہ نگار کے
کسی EXaminers کی نگاہ نہ گئی اور نہ کسی نے
یہ ہدایت دی کہ Thesis کی مطبوعہ شکل
میں اس شعر کو خارج کر دیں۔

مقالہ نگار کا اصلی نام جو ان کے
والدین نے پسند کیا اور رکھا اعجاز حسین ہے
مگر انھوں نے اس اچھے خاصے نام کو اپنے علم
و فضل کی رعونت میں بدل کر نام اعظم رکھ
دیا۔ کیا دنیائے اسلام کی اس بزرگ اور مقدس
محترم شخصیت کے ساتھ مصنف کا یہ رویہ
ان کی توہین نہیں؟ ارباب علم اس کا فیصلہ
کریں۔

☆ شمیم احمد قرار

غزل کی اشاعت کے لیے شکریہ۔ چوتھے
شعر پر سہو کتابت کی مہربانی نے "رس بوچھار"

[illegible] ہو چکا ہے۔ صرف
ایک لفظ کی [illegible] نے شعر کی روح ہی کو
مجروح کر دیا ہے [illegible]
جو صرف [illegible] کرنے کے لیے پیدا ہوئے
ہیں کہیں وصال نہ ہو جائیں۔ اصل شعر اس
طرح ہے:

[illegible]

ادبی تہذیبی خبریں

پروفیسر نعیم جیراجپوری اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر

مورخ اسلام مولانا اسلم جیراجپوری کے پوتے اور ڈاکٹر معظم جیراجپوری کے صاحبزادے پروفیسر نعیم جیراجپوری اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے پہلے شیخ الجامعہ مقرر ہوگئے۔ پروفیسر نعیم جیراجپوری کا شمار ملک کے ممتاز سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ بین اقوامی سطح پر بھی موصوف کی سائنسی خدمات کو سراہا گیا ہے۔ ادارہ کتاب نما پروفیسر نعیم جیراجپوری کو دلی مبارکباد پیش کرتا اور ان کی کامیابی کے لیے دعاگو ہے۔

پروفیسر ایڈورڈ سعید کو ڈاکٹر آف لیٹرز کی اعزازی ڈگری

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک خصوصی جلسۂ تقسیم اسناد منعقدہ ۱۳ر دسمبر ۹۹ء کو مشہور امریکی عالم، محقق اور تنقید نگار ایڈورڈ سعید کو ڈاکٹر آف لیٹرز کی اعزازی سند تفویض کی گئی۔ پروفیسر ایڈورڈ سعید کولمبیا یونیورسٹی میں تقابلی لسانیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔ پروفیسر ایڈورڈ سعید کو ۱۹۷۸ء میں Orientalism جیسی معرکۃ الآرا کتاب لکھنے پر دانش کی دنیا میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کتاب نے اہل یورپ کی مشرق میں دلچسپی اور اس کی کثیر الجہات نوعیت جو بعد میں پورے مشرق کو ہدف بنانے اور بعد میں نوآبادیات بنانے کے باعث ہوئی، کا بھرپور تجزیہ کیا [illegible] میں بھی ایڈورڈ سعید نے مغرب اور مشرق کے رشتے پر بحث کی ہے۔ ایڈورڈ سعید فلسطینی ہیں اور ان کی پیدائش یروشلم میں ہوئی۔ انھوں نے فلسطینی عوام کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کا بھرپور تجزیہ کیا ہے اور اپنی تحریروں اور کتابوں کے حوالے سے مغربی دانشوروں پر شدید تنقید کی ہے۔ وہ ۱۹۹۱ء تک فلسطینی قومی کونسل کے رکن رہے لیکن اوسلو Oslo میں کیے جانے والے معاہدے کے بعد انھوں نے قومی کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا لیکن وہ فلسطینی عوام کی بیداری اور حق خود ارادیت کے لیے برابر کوشاں رہے۔ ایڈورڈ سعید کی ایک اور تالیف Covering Islam مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منظم پروپیگنڈے کا سخت احتساب پیش کرتی ہے۔

اس موقع پر وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ لیفٹیننٹ جنرل ذکی نے معزز مہمان کا خیر مقدم کیا اور پروفیسر زاہد حسین زیدی نے Citation پڑھ کر سنایا۔ اعزازی ڈگری کے تفویض ہونے کے بعد پروفیسر ایڈورڈ سعید نے اپنے خطاب میں جامعات کے مقام اور ذمہ داری کے منصب پر بڑی فکر انگیز باتیں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ جامعات کا سیاست اور اہل اقتدار سے کوئی لینا دینا نہیں ہونا چاہیے۔ استاد کا کام ہے کہ وہ کلاس میں اور کلاس کے باہر سوالات قائم کرے لیکن حتمی جواب دینے سے گریز کرے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یونیورسٹی کا استاد اپنی بنیادی ذمہ داریوں سے یہ کہہ کر گریز نہیں کر سکتا کہ

عالمی مسئلہ اس کی پیش رفت روکنے والوں کے دائرہ کار سے باہر ہے۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی ڈاکٹر آدم شیخ نئے ڈائرکٹر مقرر

انجمن اسلام ممبئی کے انتظامیہ نے ڈاکٹر نظام الدین گوریکر کی سبک دوشی پر ڈاکٹر آدم شیخ ایم اے، پی ایچ، ڈی، ڈی لٹ کو انسٹی ٹیوٹ کا نیا ڈائرکٹر مقرر کیا ہے۔ ڈاکٹر گوریکر، پروفیسر ایمرٹس کی حیثیت سے اس ادارے سے وابستہ رہیں گے۔

اقبال برکی کو پی ایچ، ڈی کی ڈگری تفویض

ڈاکٹر اقبال برکی کو پونے یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان تھا "خواجہ غلام السدین کی علمی اور تعلیمی خدمات" یہ مقالے ڈاکٹر اقبال برکی نے پروفیسر اے، ایچ انصاری پرنسپل آرٹ، سائنس اور کامرس کالج مالیگاؤں کی نگرانی میں کیا۔

جامعہ ملیہ سے وابستہ ممتاز شہری

نئی دہلی۔ ۴ دسمبر، حکومت دہلی نے جن ممتاز شہریوں کو عزت افزائی کے لیے منتخب کیا ہے ان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چار حضرات شامل ہیں ان کے نام پروفیسر اشوک چکردھر (ہندی ادب) پروفیسر ماجد حسین (جغرافیائی مطالعات) پروفیسر فیضان احمد (بائیو سائنسز) اور مسٹر نعمت حسین (یونیورسٹی انتظامیہ) تدریس سے وابستہ تینوں افراد کو عالمی شہرت حاصل ہے۔

پانچویں انٹر نیشنل کانگرس برائے ایڈز میں ڈاکٹر افضال احمد کو ایوارڈ کے لیے مبارکباد

علی گڑھ۔ ۴ دسمبر آئی ڈی پی ڈی (انڈین ڈاکٹرس فار پیس اینڈ ڈیولپمنٹ) کے زیر اہتمام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک خصوصی نشست میں ڈاکٹر افضال احمد (ریڈر اجمل خان طبیہ کالج علی گڑھ) کو ان کے تحقیقی مقالہ "ایڈز صحت اور متبادل طب" پر انٹر نیشنل کانگرس مغربی بنگال کی جانب سے ایوارڈ برائے نمایاں خدمات حاصل کرنے پر مبارکباد پیش کی گئی اور ان کی علمی اور تحقیقی کوششوں اور کاوشوں کو سراہا گیا۔

واضح ہو کہ یہ ایوارڈ ڈاکٹر موصوف کو یکم دسمبر ۹۷ء کو کلکتہ میں ایک پانچ ستارہ پارک ہوٹل کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں دیا گیا۔

ضلع بجنور میں سیمینار و کل ہند مشاعرہ

نئی دہلی۔ ۴ر دسمبر، مرکز علم و دانش نئی دہلی کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں ایک روزہ سیمینار بعنوان "ادبی صحافتی ثقافتی اور صنعتی ترقی میں اہل بجنور کا حصہ" منعقد ہوا۔ سیمینار کا افتتاح جناب جولواحمد صدیقی نے فرمایا۔ انھوں نے کہا کہ حب الوطن کا جذبہ بڑا مبارک ہے۔ اپنے ضلع کی محبت بھی ملک سے محبت کی دلیل ہے۔

اس موقع پر مشہور شاعر اور ادیب جناب رفعت سروش (نگینوی) نے کہا کہ اتر پردیش میں بجنور ایک پسماندہ ضلع ہے اور یہاں بہت کام ہونے کی گنجائش ہے۔

اس سیمینار میں پہلے سیشن میں آٹھ مقالے پڑھے گئے۔ دوسرے اجلاس میں چار مقالے پڑھے گئے۔ اس اجلاس کے ختم ہونے سے پہلے مرکز علم و دانش کے سکریٹری جناب ابرار کرتپوری نے اعلان کیا کہ آج سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالوں کے علاوہ بھی کم و بیش

تمہیں خیالات کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔
حسب پروگرام رات میں ایک پر وقار مشاعرہ زیر صدارت جناب ایس فاروق منعقد کیا گیا جبکہ ایس ایم آصف نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر محسن شاداب نے کی۔

سہ ماہی اسباق پونے کا نیا پتا

NAZIR FATEHPURI

EIDTOR ASBAQUE SAIRA MANZIL

230-16/102 VIMAN DARSHAN

LOHGAON ROAD PUNE-411032

اردو ماہیا کا پہلا مشاعرہ

گذشتہ دنوں حلقہ ادب بھاگل پوری کے زیر اہتمام اردو میں پہلی بار ماہیا مشاعرہ بہار اگریکلچر کالج سبور کے آڈیٹوریم میں بزرگ شاعر محی الدین غنی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرہ کے صدر شعبہ اردو پروفیسر طلحہ رضوی برق نے شرکت کی۔ اپنی نوعیت کے اس پہلے مشاعرہ کو سننے کے لیے کئی سو باذوق حضرات موجود تھے۔ اس ماہیا مشاعرہ کی شمع روشن ہونے سے قبل حلقہ ادب کے صدر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اس صنف سخن کا تعارف کرایا۔

معرکہ تیغ و گلو کی رسم اجرا

آج مورخہ ۱۵ دسمبر ۹۷ء کی شام غالب اکیڈمی نئی دہلی میں مقبول اور ممتاز شاعر شنزلو معصومی کی کتاب مراثی "معرکہ تیغ و گلو" کی رسم اجرا جناب گلشن نشاد مرکزی وزیر نے ادا فرمائی۔ انھوں نے کہا "معرکہ تیغ و گلو" میں خیر اور شر کی شکتیوں کا بیان ہے۔ انکی بات عجب ہے کہ شاعر نے خیر کی شکتیوں کا سرا لیا ہے۔ خود امام حسین ان شکتیوں کے پرتیک تھے۔ جلسہ کی صدارت سابق وزیر صحت پروفیسر شکیل الرحمن نے فرمائی۔ انھوں نے اس موقع پر کہا کہ شنزلو معصومی ایک بڑے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے مراثی میں زندگی زمانے اور فن کی اعلا قدروں پر زور دیا ہے۔ اس موقع پر پروفیسر عنوان چشتی نے جلسہ کا سارے شرکاء کے استقبال کیا اور شنزلو معصومی صاحب کے مراثی کو اردو زبان و ادب کے لیے نیک فال اور بڑی کتاب قرار دیا۔ "معرکہ تیغ و گلو" محض کسی ایک فرقے کے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ یہ ایک زندگی کی اعلا قدروں کا بے مثال اشاریہ اور حضرت امام حسینؓ کی شہادت کی تفسیر ہے الہ آباد کے ممتاز نقاد نظام صدیقی نے کہا کہ شنزلو معصومی نے "جدید تخلیقیت" کے فروغ میں حصہ لے کر ثابت کیا ہے کہ وہ خیر و شر کی جنگ میں محض تماشائی نہیں ہیں بلکہ فن اور زبان کی اونچی روایات کے بہترین علمبردار ہیں اس موقع پر بہار اردو اکادمی کے سابق صدر شعیب احمد شعیب نے کہا کہ شنزلو معصومی ایک اعلا پایے کے شاعر ہیں۔ دوسرے مقررین میں جناب رضوان احمد سکریٹری بہار اردو اکادمی، جناب سید شریف الحسن نقوی سابق سکریٹری اردو اکادمی دہلی، شری جوگیندر پال شامل ہیں۔ ڈاکٹر تنویر چشتی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے شری محمود ہ ڈاکٹر ارشاد (پٹنہ) شری عون معصومی (پٹنہ) اور شری علو (دہلی) نے بے حد کوشش کی۔ خاص طور پر عادل صاحب کی کوششوں کو نہ سراہنا سراسر ناانصافی

[illegible] کا اہتمام [illegible] سفارت خانے کے [illegible] صاحب نے فرمایا کہ اس تقریب میں جناب شیخ عطا، سفیر برائے ہندوستان کو ازبکستان کی شرکت نے فرمانے کا بڑا احسان ہے۔ انھوں نے بھی کتاب کی رونمائی فرمائی۔

معروف شاعر پروفیسر حفیظ بنارسی کو ملت سوسائٹی کی طرف سے شان ملت ایوارڈ

بنارس ۱۴ ستمبر ۱۹۹۷ء ملت سوسائٹی وارانسی کی جانب سے ہندوستان کی آزادی کے جشن زریں کے موقع پر شہر بنارس کی اہم شخصیتوں کو ان کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں ۱۹۹۷ء کا ملت ایوارڈ پیش کیا گیا۔ مقامی [illegible] کالج کے وسیع ہال میں ایک خوب صورت تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت مشہور ماہر تعلیمات جناب ڈاکٹر [illegible] نے فرمائی۔ جلسے کی نظامت خلیق الزماں نے اپنے مخصوص انداز میں فرماتے ہوئے پروفیسر حفیظ بنارسی کی حیات اور شاعری اور ادبی خدمات پر ایک پُر مغز تقریر فرمائی۔ حفیظ صاحب کو ایک خوبصورت ٹرافی کے علاوہ ایک توصیفی سند بھی پیش کی گئی۔ ملت سوسائٹی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اردو شعرا و ادبا نے جنگ آزادی میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے اور ان کی گرانقدر خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

جلسے میں کئی دیگر حضرات کو بھی ان کی خدمات کے لیے انعامات دیئے گئے جن میں مشہور شاعر اور صحافی تاج الدین اشعر رام نگری کا نام نامی بھی شامل ہے۔

[illegible]

[illegible] کے زیر اہتمام اردو کتابوں کی نمائش [illegible] مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے تعاون سے [illegible] پر اردو کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا [illegible] ذوق حضرات نے اس نمائش کو پسند کیا۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے [illegible] انچارج جناب سرور حسین [illegible] نمائش کی کامیابی [illegible] نمائش ۸ دسمبر تا [illegible] دسمبر [illegible] جناب سرور حسین کے بیان کے مطابق اس نمائش میں بچوں کی کتابوں کی فروخت توقع سے کہیں زیادہ ہوئی جو اردو کے لیے ایک اچھی علامت ہے۔

نوآبادیاتی فکر کے منفی اثرات اردو زبان اور ادبی نظریات پر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت فروغ انسانی وسائل شعبہ تعلیم (حکومت ہند) کے زیر اہتمام تین روزہ قومی سیمینار ۱۷ تا ۱۹ نومبر ۱۹۹۷ء نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ سیمینار کا عنوان تھا۔

نوآبادیاتی فکر کے منفی اثرات اردو زبان اور ادبی نظریات پر

یہ سیمینار اردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر مقالہ خوانی کے پانچ اجلاس اور اردو کے فروغ کے جامع منصوبے پر بحث کے دو اجلاس پر مشتمل تھا جن میں ملک کے نامور ادیبوں، دانشوروں، تخلیق کاروں اور صحافیوں نے شرکت کی۔

سیمینار کا افتتاح فرماتے ہوئے صدر

جلسہ عزت مآب ایس۔ آر بومئی وزیر فروغ انسانی
وسائل حکومت ہند (جو قومی کونسل کے چیئرمین
فروغ اردو زبان) نے فرمایا کہ ان کی حکومت اردو
کی ترقی و بقا کے لیے ہمیشہ کوشاں رہی ہے اور اردو کو
ذریعۂ تعلیم بنانے کی ضرورت پر زور دیتی رہی ہے
جس کی ایک اہم کڑی حیدرآباد میں قائم ہونے والی
مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی ہے۔ افتتاحی اجلاس
کے مہمان خصوصی معروف شاعر و ادیب جناب
علی سردار جعفری نے اردو زبان و ادب کی تہذیبی
عظیم کی حیثیت پر دلی گفتگو کے دوران صدر جلسہ
عزت مآب ایس۔ آر بومئی اور نائب صدر قومی کو
نسل برائے فروغ اردو زبان اور معروف مجاہد اردو
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی توجہ اس جانب مبذول کرائی
کہ ملک کے جن صوبوں میں ہندی بولی جاتی ہے
ان میں اردو کی تعلیم کو لازمی قرار دینے کے لیے
موثر اقدامات کیے جائیں۔

افتتاحی جلسے کے آغاز میں ڈاکٹر حمید اللہ
بھٹ ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
نے تمام مہمانوں اور سامعین کو خوش آمدید کہا۔ فکر کی ماہیت
اور اردو کے بیش قیمت تہذیبی و ثقافتی سرمایے کے
حوالے سے سیمینار کے اغراض و مقاصد سے آگاہ
کیا۔

سیمینار کے مرکزی موضوع کا احاطہ
مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت کیا گیا تھا۔
۱۔ ہندوستان کا مشترکہ لسانی کلچر اور اردو زبان
۲۔ اردو ادبیات میں ہندوستانیت کی عکاسی
۳۔ ہندوستانی لسانیات کی روایت کی بازیافت
۴۔ مشترکہ تہذیب اور قومی زبان کا مسئلہ
۵۔ ہندوستانی فکر میں مشرقی علوم کی تصورات

... اردو بھی قومی تشخص کا مظہر ہے
جلسے کے لیے دو اہم اجلاس میں تمام مقالہ
نگاروں کے علاوہ معروف دانشوروں اور سامعین نے
بحث میں شرکت کی۔ دو گھنٹے تک بحث اور غور و فکر کے
بعد بعض تجاویز منظور ہوئیں اور یہ طے پایا کہ ان
تجاویز کو اردو کی ترقی کے لیے ایک جامع منصوبہ کی
شکل میں وزیر فروغ انسانی وسائل عزت مآب ایس
آر بومئی اور عالی جناب وزیر اعظم اندر کمار گجرال
کے سامنے پیش کیا جائے۔ تجاویز حسب ذیل
ہیں۔

☆ جن علاقوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد دس
فیصد ہو وہاں اردو کے ذریعے تعلیم کا انتظام کیا جائے
☆ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو ایک
مانیٹرنگ ایجنسی کی حیثیت دے کر اردو کے ذریعے
تعلیم اور اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے انتظامات کی
نگرانی سونپی جائے۔
☆ اردو کے اساتذہ کی تربیت کے لیے مراکز
کھولے جائیں۔
☆ اردو سکھانے والے مراکز میں کمپیوٹر اور انٹر
نیٹ جیسی سہولت فراہم کی جائیں۔
☆ جن مراکز میں خطاطی سکھانے کا کام ہو رہا ہے
ان کو ترقی دے کر اپ گریڈ کیا جائے۔
☆ اردو میں بچوں کے ادب کی تخلیق اور اس کو عام
کرنے کی مہم پر خاص توجہ دی جائے۔
☆ حوالہ جاتی کتب اور دیگر ضروری معلومات کے
سلسلے میں اردو کا ایک ڈیٹا بیس مرکز قائم کیا جائے
اور اسے انٹرنیٹ سے جوڑا جائے۔
☆ مدرسوں کے تعلیمی نظام کی عصر کاری کرنے کے
لیے معقول مالی امداد کا انتظام کیا جائے۔

مادھو کالج انجمن میں یوم اردو

انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی تحریک پر ۱۱ نومبر ۱۹۹۷ء کو شعبہ اردو مادھو کالج انجمن کے زیر اہتمام مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش پر "یوم اردو" منایا گیا۔ اس میں انجمن کی مختلف درس گاہوں کے اساتذہ اور طلبہ نے شرکت کی۔ اس موقع پر اردو زبان کی طویل شاندار تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے مادھو کالج کے صدر شعبہ پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو سارے ہندستان میں بولی، سمجھی اور پسند کی جاتی ہے۔ اس زبان کا ادبی سرمایہ عظیم ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب اور بے مثال دانشوری کی گرانقدر ایسی دولت ہے جس پر ہم بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔

گورنمنٹ گرلس کالج میں شعبہ اردو کے صدر پروفیسر عبدالواجد قریشی نے اردو کی اہمیت اور مقبولیت پر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مالوہ کا علاقہ اگرچہ ہندی کا علاقہ ہے لیکن ایک طویل مدت سے یہاں اردو رائج ہے اور یہاں کے لوگوں میں اردو سے دلچسپی میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

شعبہ اردو کالی داس گرلس کالج کی استاد پروفیسر شہناز قریشی نے مدھیہ پردیش میں اردو درس و تدریس کا جائزہ لیا اور بتلایا کہ آزادی کے بعد مالوہ کے علاقہ میں اردو میڈیم اسکولوں کا اضافہ ہوا ہے۔

بھوپال میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی نئی تعمیر شدہ عمارت جسے پچھلی سرکار نے اردو دوستوں اور اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کے اراکین کے شدید احتجاج کے باوجود ۱۱ ستمبر ۱۹۹۲ء کو سنسکرتی وبھاگ کو سونپ دی تھی اس سلسلہ میں جلسہ میں موجودہ حکومت کے حالیہ فیصلہ کا خیر مقدم کیا گیا موجودہ حکومت نے اب یہ عمارت مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی تحویل میں دینے کا فیصلہ کرکے اور اردو اکادمی کے سالانہ بجٹ میں اضافہ کرکے اور اس کے علاوہ وزیر اعلا دگ وجے سنگھ صاحب نے اس سال کے آخر تک بارہ سو اردو اساتذہ کی تقرری کا اعلان کرکے اردو کے فروغ کے لیے جو قدم اٹھایا ہے جلسہ کے تمام شرکاء نے اس پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

جلسہ میں اتفاق رائے سے حکومت مدھیہ پردیش سے ذیل کے مطالبات کی تجاویز پیش کی گئیں۔

۱۔ اردو کی اعلا تعلیم کے فروغ کے لیے مدھیہ پردیش کی یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم کیے جائیں۔

۲۔ مدھیہ پردیش کے جن کالجوں میں اردو اساتذہ کی آسامیاں خالی ہیں ان پر جلد سے جلد اساتذہ کا تقرر کیا جائے تاکہ اردو طلبہ کی تعلیم کا مناسب انتظام ہو سکے۔

۳۔ دیواس، مندسور، رتلام، شاجاپور اور مہو کے کالجوں میں اردو کی اعلا تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۴۔ پبلک سروس کمیشن سے اردو کی جو آسامیاں مشتہر کی جاتی ہیں ان کی درج فہرست ذاتوں کے لیے مقررہ کوٹے کے امیدوار نہ ملنے کی صورت میں اس کوٹے میں پسماندہ طبقے کے لوگوں کو موقع دیا جائے۔

۵۔ مدھیہ پردیش میں ہائر سکنڈری اسکولوں میں

دوسرے مضامین کی طرح اردو لیکچرر کی اسامیاں قائم کی جائیں اور ان پر اردو لیکچرر کا تقرر کیا جائے تاکہ ہائر سیکنڈری سطح پر اردو تعلیم کا معیار بہتر ہو سکے۔

جلسے کے آخر میں شعبہ اردو کے ایم اے سال آخر کے طالب علم شمس الحسن قادری نے اس جلسہ کی افادیت کا جائزہ لیتے ہوئے شرکا کا شکریہ ادا کیا

پروفیسر خلیق احمد نظامی کو خراج عقیدت

سرسید فاؤنڈیشن کا تعزیتی جلسہ

سرسید فاؤنڈیشن دہلی کے زیر اہتمام ایک تعزیتی جلسہ بروز جمعہ ۱۲ دسمبر کو دہلی میں منعقد کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت خواجہ حسن ثانی نظامی نے فرمائی انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں خلیق احمد نظامی اور ان کے بزرگوں کی علمی اور تحقیقی خدمات کا اعتراف کیا۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر نظامی نہ صرف قرون وسطیٰ کی تاریخ کے ماہر تھے بلکہ انھوں نے جدید تاریخ، خاص طور پر جنگ آزادی اور ملک کی تقسیم کے متعلق بھی اہم تحقیقی کام کیا تھا جو ابھی تک چھپ کر سامنے نہیں آیا ہے۔ خواجہ نظامی نے کہا کہ ہم سب کی ذمے داری ہے کہ اس علمی اور تحقیقی کام کو چھپوا کر عوام کے سامنے پیش کریں۔ پروفیسر نظامی کی صوفیائے کرام سے جو عقیدت تھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی علمی خدمات کو بھی سراہا گیا۔ پروفیسر نظامی اپنے ذاتی ذرائع سے مستحق لوگوں کی مالی مدد فرمایا کرتے تھے۔ ان کو کتابوں کا بہت شوق تھا اور ان کی ذاتی لائبریری میں علم ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہے۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے نیشنل میوزیم کے ڈاکٹر نسیم اختر نے بتایا کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے عہد وسطیٰ میں ملفوظات کی اہمیت کو اجاگر کیا اور اس کا اپنی تحقیقات میں استعمال کیا۔ جامعہ ہمدرد کے ڈاکٹر شکیل تمنا نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر نظامی ایک بہت اعلا پائے کے منتظم تھے انھوں نے اپنے انتظامی دور میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اہم خدمات انجام دیں۔ پروفیسر نظامی کو طالب علموں کی خوشنودی کے بجائے ان کی بہبود منظور تھی۔ وہ طالب علموں سے بے حد محبت اور شفقت رکھتے تھے اور ہمہ تن ان کی فلاح اور بہبود کے لیے کام کرتے رہتے تھے۔ مسٹر ظفر الدین خاں فیضان، سابق صدر مسلم یونیورسٹی اسٹوڈینٹ یونین اور رکن یونیورسٹی کورٹ نے اپنے اظہار خیال میں اس دور کے یونیورسٹی کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر پروفیسر نظامی مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ پر فائز رہتے تو یونیورسٹی کے بہتر سربراہ ثابت ہوتے۔

محمد اسلم خاں، ذاکر حسین کالج نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ نظامی صاحب علی گڑھ کے ایک ممتاز استاد تھے اور وہ علی گڑھ کی روایتوں اور تہذیب کے ایک زندہ مثال اور نمائندہ تھے۔ سرسید فاؤنڈیشن کے صدر خواجہ محمد شاہد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر نظامی اگرچہ علی گڑھ کے طالب علم نہیں تھے لیکن انھوں نے سرسید کے پیغام اور علی گڑھ تحریک کے فروغ کے لیے اہم خدمات انجام دیں۔ وہ سرسید کے سچے عاشق اور ان کی تحریک کے علمبردار تھے انھوں نے سرسید ہاؤس اور سرسید اکیڈمی قائم کیں۔ سرسید کی سوانح لکھ کر ان کو جدید ہندستان

کے شعور کی وسعتوں میں شامل کیا۔ علی گڑھ مسلم
یونیورسٹی کی تاریخ میں ان کی خدمات کو سنہری
حروف سے لکھا جائے گا۔ دیگر مقررین نے بھی
پروفیسر نظامی کی خدمات بطور استاد، محقق، مورخ،
دانشور، منتظم اور سفارت کار کا اعتراف کیا۔ میٹنگ
میں ایک تعزیتی قرارداد پاس کی گئی۔ پروفیسر نظامی
کے اچانک ۵ دسمبر ۱۹۹۷ء کو علی گڑھ میں انتقال
پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔

محسن اردو کا انتقال

برار۔ بالاپور میں دس دسمبر ۱۹۹۷ء کو صبح چار بج کر
پچپن منٹ پر محسن اردو قبلہ حضرت سید ہادی
نقشبندی حسنی الحسینی کا انتقال ہو گیا۔ موصوف کی
نماز جنازہ گیارہ دسمبر ۱۹۹۷ء کو صبح دس بجے خانقاہ
نقشبندیہ کے وسیع میدان میں ادا کی گئی۔

آپ کو اردو ادب سے دلی لگاؤ عشق کی حد
تک تھا۔ برار میں آپ اردو کے روح رواں تھے
موصوف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارغ تھے۔
دور طالب علمی میں آپ انگریزی سہ ماہی
AWAKENING اور اخبار (بیداری) شائع
فرماتے تھے اور یونیورسٹی میگزین کے شعبہ ادارت
سے وابستہ تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے
دست راست تھے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کمیٹی کے
رکن تھے۔ طالب علمی کے بعد کے دور میں برار
میں انجمن [illegible] سوسائٹی کے صدر، کل ہند صوفی
کانفرنس کے نائب صدر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
کے [illegible] کے ممبر، [illegible] کے
صدر اور مختلف اداروں سے وابستہ تھے۔ آپ چونکہ
دینی و ملی کاموں سے سفر پر رہا کرتے تھے۔ آپ کو
خدمت خلق کا بہت شوق تھا۔

[illegible] پر شائع [illegible]

یہ خبر بڑے دکھ سے سنی گئی کہ شاعر شباب کی [illegible] کہ
شری آزاد [illegible] ۱۷ دسمبر ۱۹۹۷ء بروز
بدھ سورگباش ہو گیا۔ ان کی آتما کو شانتی ملے۔

موج سراب کی رسم اجرا

بھوپال ۲۶ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو بزم اقبال اور
مدھیہ پردیش راشٹر بھاشا ایکتا سمیتی کے مشترکہ تعاون
سے آزادی کے جشن زریں کے سلسلے میں بھوپال
کے پریہ درشنی پارک میں شاندار کل ہند مشاعرہ
منعقد کیا گیا۔ جس کے مہمان خصوصی تھے عزت
مآب جناب محمد شفیع قریشی گورنر مدھیہ پردیش۔
اس موقع پر معروف شاعر جناب رہبر جونپوری
کے دوسرے شعری مجموعہ "موج سراب" کی
رسم اجرا گورنر مدھیہ پردیش کے ہاتھوں انجام پائی
مشاعرے کی صدارت مشہور شاعر حضرت رفعت
سروش نے فرمائی۔ جبکہ نظامت کے فرائض
نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ڈاکٹر سہیل فاروقی
نائب مدیر جامعہ نے انجام دیے۔

جناب ایل۔ ایس۔ ہرودیہ اور جناب
اقبال بیدار کی کوششوں سے یہ مشاعرہ کامیابی کے
ساتھ ۲ بجے شب میں اختتام پذیر ہوا۔ جن شعراء
نے اس مشاعرے میں شرکت فرمائی ان کے
اسمائے گرامی ہیں۔ حضرات رفعت سروش، ڈاکٹر
سہیل اختر فاروقی، رہبر جونپوری، نعیم اختر افضل
منگلوری، جمیل خیر آبادی، [illegible] کلیم، نور
شاہجہاں پوری، محترمہ شبانہ [illegible] انجم بارہ بنکوی،
عاشق نیازی، [illegible] شریف شفائی، اقبال بیدار،
اقبال افسر، محمد جعفر [illegible] بھوپالی۔

لسانُ الصدق
مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل، اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے، اہم علمی خزانہ۔ ۷۵/=

نظامِ رنگ
ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ کا ادبی خاکہ — یہ اس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر انسانیت کو وقار بخشا۔ ۱۵/=

شہیدِ جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)
پروفیسر ضیاالحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مردِ درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مردِ مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۷۵/=

پرانی بات ہے (سلسلۂ وار نظمیں)
زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے وہ ہمارے ... عہد کی سچائیاں ہی نہیں سچائیاں ...

... (طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے)
ادا جعفری

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر ... خاں سیاح تک کے کلام کا جامع انتخاب اور ... ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا ... قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۲۸۰ ...

سازِ سخن
ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتونِ اوّل محترمہ ادا ... کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے انداز ... سے ایک ایسی قوتِ ارادی مترشح ہے جس کے بغیر ادب کے کسی معمار کا پیام موثر نہیں ہو سکتا۔ ... /=

ترجمۂ قرآن
پروفیسر رشید ...

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش) پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۲۰ اکتوبر ... کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔

نذرِ مختار
مالک ...

مجموعۂ مضامین بو ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر مختار الدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما نائب صدر جمہوریۂ ہند کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا جس میں ... کے ممتاز محققین اور ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں ...

Regd. with R.N.I. at No 4967/60 January, 1998.
Regd. No. DL 16016/97
Licence No. U[SE]-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

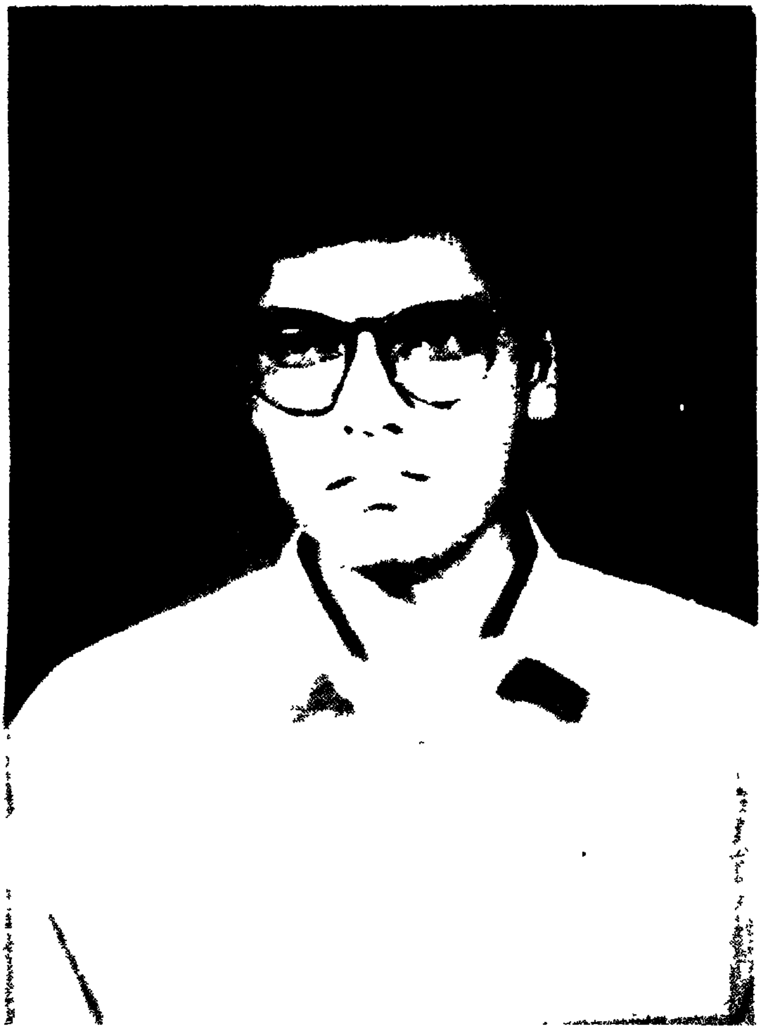
JAMIA NAGAR NEW DELHI · 110025



ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵



اردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو تشخیصی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ، اُردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱۸/=

فی الفور — یوسف ناظم

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۲۰/=

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک تاریخی دستاویز۔ /=

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیّدین — مرتبہ: ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

ممتاز ماہرِ تعلیمات خواجہ غلام السیّدین کے علمی ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔ /=

توفیق الحکیم — ڈاکٹر بدر الدین الحافظ

نادل نگاری کا جائزہ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

فروری ۱۹۹۸ء — جلد ۳۸۔ شمارہ ۲

فی پرچہ	7/:
سالانہ	70/:
سرکاری تعلیمی اداروں سے	100/
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک)	500/

مدیر

شاہد علی خاں

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فیکس نمبر: 6842574

Tel Cum Fax No (011)-6910191

ٹیلی فون نمبر۔ 6910191

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ۔ ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات فقد و تبصرے کے ذمے دار خود مصنفین ہیں ادارہ کتاب نما کا ان سے اتفاق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلیشر سید و سیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اداریہ

مضامین

کہانی

نظمیں / غزلیں

طنز و مزاح

نئی مطبوعات

آخرکار (طنز و مزاح) مجتبیٰ حسین 60/=
الجھن (نفسیاتی مضامین) عبداللہ ولی بخش قادری 60/=
حیات البشیر (سوانح) مجیب اشرف۔ 150/=
اعتبار حرف (تنقیدی ادبی) اقبال مسعود۔ 50/-
رباعیات قوس (شاعری) ناوک حمزہ پوری 50/=
صدائے موسم گل (رر) طارق بٹ 120/=
نگارستان تاریخ (رر) کلیم رونجی 40/=
انکشاف (رر) س۔ یونس 150/=
شناخت (شاعری) کریم متودھوی۔ 30/-
نواب سید محمد خاں رند (تنقید) رقیہ جعفری 150/=
رقص بتان آذری (تنقید) شکیل الرحمٰن 50/-
طلسم حرف (شاعری) م۔ اخلاق 100/-
شاخ لرزیدہ (رر) اندر سروپ سریواستو 80/=
قندیل (رر) احسان جعفری 75/=
ناتمام (رر) حسن داد خاں 60/=
غنی اعجاز (سوانح) فصیح اللہ نقیب 40/-
ہمارے نبیؐ (سوانح) عبدالعزیز عرفان 15/-
ایک خواب عام آدمی کا (ڈراما) رر رر 5/-
خاور گل (شاعری) اطہر غوری۔ 150/=
شام بے سحر (شاعری) سیدہ نسیم چشتی 250/=
مغرب کے اردو افسانے (مضامین) سعید انجم 9/=
غبار شمس (شاعری) شمس رضوی 150/=
بری عادتیں (طب) حکیم محمد مختار اصلاحی 100/=
شاعر کا پیغام میر 100/=
دستاویز ۵ جابر حسین۔ 25/=
آل احمد سرور (سوانح) امتیاز احمد 150/-
شمالی ہند کی اردو شاعری (ادب) حسن احمد نظامی
میں ابہام گوئی 175/-
رائے بنی نرائن دہلوی (سوانح) ڈاکٹر حنیف نقوی 70/

سرورق جمال اویسی

افکار تازہ (ادبی مضامین) ڈاکٹر عبدالباری 100/-
تنقید کے مثبت رویے (ادبی تنقید) نکہت ریحانہ 250/
شیخ عبدالقادر جیلانی (سوانح) مولانا سید محمد قاسم 35/
ابوالکلام آزاد (سوانح) شکیل الرحمٰن 90/=
سوغات ۱۲ (مجلہ) ترتیب مریم اعجاز 125/=
رابطہ (ناول) جوگندر پال۔ 90/=
منتخب افسانے ۱۹۹۶ء (افسانوں کا انتساب)
مرتبہ کشور وکرم 90/-
مشاہیر کے خطوط (خطوط) انصاری اصغر جمیل 75/=
بلی کی چیخ (ناول) ابن صفی 40/=
رائی کا پہاڑ (ناول) ابن صفی۔ 40/=
تابوت (ناول) ابن صفی 40/=
مباحث (مضامین) ڈاکٹر برج پریمی۔ 180/=
تاثرات (مضامین) پریمی رومانی 180/
صادق الخیری (سوانح) ڈاکٹر شکیل ہما 200/=
دعوت اسلام (مذہب) مولانا وحید الدین خاں 50/=

دعوت حق	رر	رر	40/=
تصویر ملت	رر	رر	85/=
دین انسانیت	رر	رر	60/=

مہمان تحریر
جمال اویسی
لکچرر ڈپارٹمنٹ آف اردو
ملت کالج۔ دربھنگہ 846004

اشاریہ

نیا شاعر۔ محرم رموز حیات

نئے شاعر کا سفر وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں پہنچ کر اردو ادب کے دو قومی رجحانات اپنا دور ختم کر دیتے ہیں۔ ترقی پسندی اور جدیدیت آپس میں مفاہمت کرنے لگتی ہیں۔ دونوں کو اپنے طویل ادبی سفر کے بعد پڑاؤ کی حاجت محسوس ہونے لگتی ہے۔ دونوں تحریکوں کے جید رہنما ایک دشوار گزار راستے سے آتے ہوئے نئے جیالے مسافروں کو کن انکھیوں سے دیکھنے لگتے ہیں اور آپس میں کھسر پھسر شروع کر دیتے ہیں۔ یہ نئے شعرا ہیں یعنی ہم لوگ ہیں۔ ابھی ہم لوگوں نے نصف راستہ بھی طے نہیں کیا ہے۔ ایک شاعر اپنی تمام زندگی میں اس سفر کو پورا طے بھی نہیں کر پاتا۔ راستے کبھی سنگلاخ تو کبھی دلدل سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ پاؤں کا تھک جانا فطری ہو جاتا ہے۔ اعصاب جواب دے دیتے ہیں۔

کچھ برس قبل میں نے اپنے ہمسفر شاعر خالد عبادی پر ایک مضمون لکھا تھا جو خرام کانپور کے شمارہ جولائی ۱۹۹۶ میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون میرے نزدیک بہت اہم تھا۔ اس میں میں نے نئی شعریات کے تعلق سے کچھ نکتے پیش کیے تھے اور پورا مضمون نئی شعریات کی روشنی میں لکھا گیا تھا۔ کہیں کہیں اس شعریات کے واضح اشارے تھے اور کہیں باریکیاں تھیں مگر میرے دوستوں نے اس مضمون کی پذیرائی نہیں کی اور یہ اچھے رسالے میں چھپا بھی نہیں۔ جس رسالے میں اسے چھاپا گیا اس کا مزاج اور معیار ہی متعین نہیں۔ میرا مضمون کسی اہم رسالے میں شائع ہوتا تو اچھا خاصا Response ملتا۔ مجھے ان باتوں کا ذکر یہاں اس لیے کرنا پڑ رہا ہے کہ ایک بار پھر ۸۰ء کے بعد کی شاعری پر اظہار رائے کی ٹھانی ہے۔ نئی شاعری کے سفر کو شروع ہوئے آج تقریباً سترہ اٹھارہ سال ہو رہے ہیں۔ یہ مدت کسی پود کے جوہر کو دریافت کرنے کے لیے کم نہیں ہوتی۔ مگر ہمارا دور سب سے بدقسمت دور ہے کہ اب تک ہمارے نقاد یا تو راشد، میراجی، فیض احمد فیض وغیرہ کی قدر متعین کرنے میں لگے ہوئے ہیں یا پھر منٹو، بیدی، کرشن چندر، انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کے ادبی مرتبہ کو اُجاگر کرنے میں مصروف ہیں۔ راشد، میراجی، فیض، منٹو، بیدی

انتظار حسین، قرۃالعین حیدر وغیرہ کا بہترین (Best) آج سے کم از کم پینتیس چالیس برس پہلے آچکا تھا۔ میراجی کی وفات کو ہی ۱۹۴۸ء سال ہو گئے یا نصف صدی کہیے۔ پھر ان لوگوں کے بعد ایک لمبی قطار شاعروں اور ادیبوں کی نظر آتی ہے جس میں کھرا ہر فنکار کسی قول فیصل کا منتظر ہے۔ ہمارے ہاں تنقیدی صورت حال عجیب ہے لیکن میرے اندر ایک الگ پھانس ہے۔ میں اپنی نسل کے نمایندہ فن کاروں کو پہلے سے لگی ہوئی بھیڑ کے آمنے سامنے لا کھڑا کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ شعر و ادب کی تخلیق کے سترہ اٹھارہ سال گزار دینا میرے نزدیک ہنسی مذاق نہیں۔ ہم لوگ عمر کی اس منزل سے گزر رہے ہیں جہاں پہنچ کر میراجی مر گئے تھے۔ شیلی، کیٹس بائرن وغیرہ تو نسبتاً کم عمری ہی میں مر گئے تھے اور ان فن کاروں کے شاہکار مرنے سے قبل لکھے جا چکے تھے۔ میراجی کی نظم "سمندر کا بلاوا" شیلی کی ADONAIS کیٹس کی LAMIA وغیرہ ثبوت کے طور پر موجود ہیں۔

جن لوگوں نے ۱۹۸۰ء سے ذرا سا قبل اور ذرا تاخیر کے بعد شاعری شروع کی وہ اپنے قریبی پیش روؤں سے یکسر مختلف ہیں۔ ہماری بزرگ نسل نے ملک کی تقسیم کا تجربہ اپنے لڑکپن میں کیا: پھر تہذیبی و ثقافتی سطح پر وہ ہمیشہ کشمکش کا شکار رہے۔ بہت سے علوم اس وقت (جس وقت ہماری بزرگ نسل پروان چڑھ رہی تھی) ترقی یافتہ نہیں تھے۔ کہیں کہیں سے زمینداری کا خاتمہ تو ضرور ہو رہا تھا مگر اس کے تہذیبی اور روایتی نقوش برابر دیکھنے میں آرہے تھے۔ ہمارے بیشتر شعرا و ادبا کا تعلق مٹتے ہوئے زمیندار گھرانوں سے تھا۔ کچھ بہت اوسط گھرانوں سے آئے تھے تو ان کے اندر ہمیشہ ایک جذباتی کشمکش پیدا رہی۔ ایسے لوگ اپنی تحریروں میں زمینداری اور سرمایہ داری کے خلاف رہے مگر طرز رہائش کی سطح پر متمول بننے کی کوشش بھی کی۔ یہ نسل کئی رویوں میں تقسیم ہوئی اور بعد میں ایک سوچے سمجھے فارمولے کے تحت ادب و شعر کی خدمت کرنے لگی۔ ہمارے بزرگ ہمیشہ تشکیک اور ایمان، یقین اور شبہ کے درمیان پھنسے رہے۔ ان کی اخلاقی قدریں مذہب سے جڑی تو تھیں مگر بسا اوقات لوگوں نے مذہب سے انکار بھی کیا۔ نئے اور جدید خیالات کی ہمک میں بزرگوں نے ٹائی کوٹ پہن کر اور جام ہاتھ میں لے کر سارتر اور ایلیٹ بننے کی کوشش بھی کی مگر شخصیت اندر سے غیر مستحکم رہی کہ ان کے اندر کسی مرکزی قوت کا فقدان تھا۔ ان کی مٹی بار بار اپنی طرف کھینچ کے لے جاتی تھی۔ یہ جاتے تھے اور پھر لوٹ بھی آتے تھے۔ ان کا ایمان کبھی سائنس پہ ہوتا تو کبھی یہ مذہبی افکار کے سائے میں آکر پناہ لیتے۔ مذہب، علوم اور سائنس کی کشاکش سے ہماری بزرگ نسل فکری طور پر خود کفیل نہ ہو سکی۔ اس نے ہمیشہ اپنے خارج سے سہارا مانگا۔ کبھی مارکس، فرائڈ، ہیگل، ڈارون نطشے تو کبھی کامیو، سارتر، کرکے گارد وغیرہ سے فکر کی شمع جلائی گئی۔ مجھے اپنے بزرگوں کی

شاعری میں سچائی تو نظر نہیں آتی مگر ان کا خلوص ضرور نظر آتا ہے جو ادب لکھنے کے تئیں کار فرما تھا۔ میرا مقصد یہاں ترقی پسند شاعری یا جدید شاعری کا تنقیدی محاکمہ کرنا نہیں ہے بلکہ اپنی نسل کے شعراے اپنے پیش رو شعرا کی ذہنی و فکری نامطابقت کو واضح کرنا ہے۔ ذیل میں چند نکات پیش کیے جاتے ہیں جو نئے شعرا کی شناخت کا حصہ ہیں اور جو ماقبل فن کاروں کے یہاں نہیں ملتے۔

(۱) نیا شاعر ادب کو ادب ہی سمجھتا ہے۔ صحافت یا سیاست نہیں لیکن صحافت اور سیاست اس کی آگہی کا وسیلہ ضرور بنتی ہیں۔

(۲) نیا شاعر مطالعہ کو ضروری سمجھتا ہے۔ وہ نئے علوم اور نئے افکار سے متاثر ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے لیکن تخلیق شعر کے وقت وہ صرف اپنے مشاہدے، تجربے اور احساس و ادراک کو رہنما بناتا ہے۔ یعنی وہ چو طرفہ معلومات کا نچوڑ دری کی سطح پر کرتے ہوئے اپنے تجزیاتی ذہن سے کام لیتا ہے اور جو اچھا سمجھتا ہے لکھتا ہے۔

(۳) نیا شاعر علامت، استعارہ، کنایہ کی سطح پر پہلے سے طے کیے ہوئے پروگرام کے تحت نہیں لکھتا شعر تخلیق کرتے وقت اسے پتہ چلتا ہے کہ کس سطح سے وہ کلام کرے گا۔

(۴) نیا شاعر بیانیہ اور خود کلامی کے برعکس ہم کلامی کا عادی ہے۔ اس کی تخلیق میں کسی دوسرے فرد کے شرکت لازمی ہوتی ہے۔

(۵) نیا شاعر ارسطوئی فکر کو پورے طور پر مسترد کرتے ہوئے حقیقت اور تخیل، انقلاب اور رومان کو ملا کر ایک نئی شکل دیتا ہے۔ اس کے لیے رومان بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا انقلاب، اور کوئی بھی انقلاب اپنی پہلی شکل میں ایک رومانی تصور ہی ہوتا ہے۔

(۶) نیا شاعر اصناف سخن میں کسی ہیئتی تجربہ کا قائل نہیں۔ اس نے دیکھ لیا کہ آزاد غزل نے اُردو ادب کے ماحول کو ایک عرصے سے کتنا آلودہ کر رکھا ہے۔ آزاد غزل کے ساتھ ساتھ وہ نثری غزل، سانیٹ ترائیلے، دوہے ماہیے ہائیکو جیسی بیکار اور بے جان ہیئتوں کو قبول نہیں کرتا۔ اپنے اظہار کے لیے وہ غزل، نظم، رباعی اور

مثنوی کو ہی بہترین اصناف سمجھتا ہے۔

(۷) نئے شاعر کا اظہار دراصل اس کی ذات کا اظہار ہے۔ اس معاملہ میں وہ انتہائی خود کفیل ہے اور جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔

نئے شاعر کا ذہن متاثر اور متعصب ذہن نہیں۔ وہ اپنے دماغ کو ہر طرح کی فکری غلامی سے آزاد رکھ کر ہی کوئی بات سوچتا ہے۔ غور و فکر کے درمیان وہ اپنے مزعومات پر کئی کئی بار نظر دوڑا لینے کا قائل ہے۔ اسی لیے نئے شاعر کو کسی بھی طرح اگر کوئی چاہے تو متاثر نہیں کر سکتا۔ ایں معنی کہ دھونس نہیں جما سکتا۔ نیا شاعر ولیم بلیک (William Blake) کا وہ حیران بالک ہے جو اپنی تجسس نگاہوں سے دنیا کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا ہے اور اشیا کو کرید کرید کر علم حاصل کرتا ہے۔ اس طرح اس کا ذہن ایک تجرباتی ذہن بن جاتا ہے۔ تجرباتی ذہن کو قید کرنا یا مرعوب کرنا نہایت مشکل کام ہے۔

نئی شاعری کا رول کیسا ہونا چاہیے؟ اس کا مستقبل کیا ہے؟ اس کے اور انسانی معاشرہ کے درمیان کتنا فاصلہ ہے اور کیا نزدیکیاں ہیں؟ ان باتوں کو بہتر سمجھنے کے لیے انگریزی نقاد میتھیو آرنلڈ کے مشہور زمانہ مضمون "The Study of Poetry" سے ایک اقتباس یہاں پیش کرتا ہوں جس کے آئینہ میں نئی شاعری کا مقصد بھی نظر آجائے گا۔ ملحوظ رہنا چاہیے کہ یہ وہی مضمون ہے جس سے متاثر ہو کر کسی زمانے میں پروفیسر کلیم الدین احمد نے اس کا ایک اقتباس "اردو شاعری پر ایک نظر" میں دیا تھا۔ میں نے "The Study of Poetry" کی بالکل ابتدا سے اپنے مطلب کے چند خیالات چنے ہیں۔ اور یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ اس اقتباس میں ایک نقاد نے کسی تنقیدی تھیوری کو زاویۂ فکر نہیں بنایا ہے بلکہ شاعری کو تخلیق کی سطح سے دیکھنے کی مخلصانہ کوشش ہے۔ نقاد کے سامنے تنقیدی حربے اہم نہیں ہیں بلکہ وہ شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے اور اس کے صحیح کردار پر روشنی ڈال رہا ہے (کیوں کہ نقاد خود شاعر ہے اور شاعری کے منصب سے آگاہ ہے):—

"The future of Poetry is immense, because in poetry, where it is worthy of its high destinies, Our race, as time goes on, will find an ever surer and surer stage. Our religion has materialised itself in the fact, in the supposed fact; it has attached its emotion to the fact, and now the fact is failing it. But for poetry the idea is everything, the rest is a world of illusion, of Divine Illusion. Poetry attaches its emotion to the idea: the idea is the fact. The strongest part of our religion today is its unconscious poetry."

-Mathew Arnold (the Study of Poetry)
Book · Essays incriticism

مثلاً ارسطو سے ذرا سا الگ کے شاعر پی بی شیلی (P.B. Shelley) کے خیالات بھی جان لینا اہم ہوگا۔ شیلی کی حیثیت انگریزی ادب میں ایک نقاد کی بھی ہے۔ اس نے ارسطوئی فکر سے پریشان ہو کر اور اس کو مسترد کرتے ہوئے شاعری کی حمایت کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا مگر یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ پیشہ ور نقاد نہیں تھا اور شاعری کی حمایت کرتے کرتے بعض مرتبہ نہایت تاثراتی انداز اختیار کر لیتا ہے، نیز ارسطوئی فکر سے مکمل آزاد بھی نہیں ہو پاتا لیکن میرے نزدیک اس کے مقالے کی مندرجہ ذیل باتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک سچا اور فطری شاعر چاہے وہ کسی زبان کا ہو ایسے خیالات رکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ میرا بھی شیلی کے بعض خیالات سے اتفاق کرنا ایسا ہی ایک فطری حادثہ ہے۔ دیکھیے وہ کیا کہتا ہے۔

(i) Poetry, in a general sense, may be defined to be the expression of the imagination, and poetry is cannot with the origin of man. than is an instrument over which a series of external and internal impressions are driven, like the alternations of an ever-changing wind over an Aeolian lyre, which move it by their motion to ever-changing melody.

(ii) A poet is a nightingale, who sits in darkness and sing: tocheer its own solitude with sweet sounds, his auditors are as men entranced by the melody of an unseen musician, who feel that they are moved and softened. Yet know not whence or why?

-A DEFENCE OF POETRY
(P.B SHELLEY)

ہماری نئی شاعری جو ۱۹۸۰ء کے بعد شروع ہوتی ہے دنیا اور معاشرہ کے اندھیرے میں بیٹھے ہوئے اس انسان کے تحیر آفریں خیالات سے مزین ہے جو مسلسل کرید کرید کر ٹٹول ٹٹول کر کسی Object کا معائنہ کر رہا ہے۔ نیا شاعر سچائی کو جاننے اور پرکھنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ حقیقت کیا ہے اس کا ادراک اس کے لیے بڑا قیمتی تجربہ ہوگا۔ اس امید کے ساتھ میں نئی شاعری کا دیباچہ ختم کرتا ہوں۔

اس ماہ میں بجلی نے ایسے ایسے کرشمے دکھائے کہ کئی اہم مضامین، غزلیں، نظمیں یہاں تک کہ خامہ بگوش بھی شائع ہونے سے رہ گیا آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔

باقر مہدی

ایک کالی غزل

(نئے سال کے نام!)

سناٹے میں صدائے فغاں گونجتی رہی
احوال کیا سناؤں میں خانہ خراب کا!
آنسو ٹپک ٹپک کے بنے کاغذی گلاب
قصے سنا رہا تھا وہ اپنے شباب کا!
سادے ورق پہ ٹوٹی لکیریں سوال ہیں
معنی سمجھ گیا ہوں میں، اس کے جواب کا!
رقصاں تھے سال نو کی خوشی میں ہجوم تھا
میں دیکھتا تھا سارا --- تماشہ سراب کا!
کچھ نام ہے پتا ہے نہ کوئی نشان ہے
جانے کہاں سے آیا ہے تحفہ شراب کا؟
ہنگامے، قتل وخون ہر اک شہر میں ہوئے
نعرہ کوئی لگاتا نہیں ---انقلاب کا،
یہ دھوم دھام اور یہ شہرت حضور کی
کل تک غریب دوست تھا باقر نواب کا!

اطہر راز ـــ لندن

خودی غالب سے اقبال تک

وہ ایک قطرہ سمندر میں
خودی کے خول سے باہر
وجود اس کا طلسمِ خواب کا حامل
جہاں میں رقص کرتا ہے
بقا کے بادلوں میں رنگ بھرتا ہے
یکایک پھر خودی کی سرحدیں
آخر فنا کے ساحلوں میں ڈوب جاتی ہیں
خودی اک برف کا تودہ فقط پانی میں پانی ہے
سمندر میں سمندر کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا
فنا بردوش جزو کُل میں
سمانے کے لیے بیتاب رہتا ہے
یہی غالب بھی کہتا ہے
مگر اقبال کا دعویٰ
وہ اک قطرہ خودی کے جال میں قیدی
تشخص ذات کا جوہر
صدف کے دل میں موتی ہے
خودی اس کو پروتی ہے

سوغات ۱۲

شائع ہو چکا ہے

☆ مدیر اعلیٰ: مریم محمود لیاز
☆ مجلس ادارت: مغنی تبسم، خلیل مامون، عزیز اللہ بیگ

اس کتاب میں:

☆ بانی مدیر محمود لیاز مرحوم کی یاد میں ایک گوشہ ———— جس میں: باقر مہدی، عرفان صدیقی، شکیب رضوی اور سردار لیاغ کی منظومات، حمید نسیم، آل احمد سرور، شہریار، شفیق فاطمہ شعریٰ، مغنی تبسم، خلیل مامون، شائستہ یوسف، ماہر منصور، سید منظور احمد، سید حبیب احمد، نیر مسعود، فضیل جعفری، شمس الحق عثمانی کے مضامین اور تاثرات شامل ہیں۔ ان کے علاوہ محمود لیاز کے منتخب مضامین، نظمیں اور غزلیں۔

☆ خصوصی مطالعے کے تحت شفیق الرحمٰن کی شخصیت اور فن پر مضامین، شفیق الرحمٰن کے تحریروں کا انتخاب جس میں فکاہیہ، خاکہ، افسانہ، پیروڈی اور سفر نامے شامل ہیں۔

☆ دیگر مشمولات: حمید نسیم کی کتاب: "علامہ اقبال ہمارے عظیم شاعر" پر آل احمد سرور کا طویل تبصرہ۔ اسلم فرخی کا تحریر کردہ خاکہ۔ "لذت آشنائے تلخی دوراں" ہندی افسانوں کے تراجم، صلاح الدین محمود، جمال اویسی اور راہی کی نظمیں، ضیا جالندھری، شفیق فاطمہ شعریٰ، احمد جاوید، روشن لال روشن، ذکی بلگرامی اور شکیل اعظمی کی غزلیں۔

☆ باز گشت میں: آل احمد سرور، نیر مسعود، مغنی تبسم، شان الحق حقی، حمید نسیم، ضیا جالندھری، مرزا نجیم بیگ، آفتاب احمد خاں، شفیق فاطمہ شعریٰ، سید محمد اشرف، انور خاں، عرفان صدیقی، مسعود الحق، چودھری محمد علی ردولوی، جمال اویسی اور خالد سعید کے خطوط۔

صفحات: سات سو   قیمت: ایک سو پچیس روپے

ملنے کا پتہ: ۴۸ تھرڈ مین، ڈیفنس کالونی اندرا نگر، بنگلور۔ ۵۶۰۰۳۸
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

پروفیسر عبدالخالق نقوی مرحوم
ترتیب: ڈاکٹر سید حامد حسین بھوپال
۱۵ اسلو رلپد منشن اے سیکٹر (بی۔ڈی۔اے)
کوہ فضا۔ بھوپال

زبان و بیان

۷۵۔۱۹۷۳ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں سے زبان و بیان کے عنوان سے پروگراموں کا ایک سلسلہ نشر کیا گیا تھا جو بہت مقبول ہوا تھا۔ اس پروگرام کے پروڈیوسر عمیق حنفی مرحوم تھے اور اس میں حنفی صاحب کے سوالات کے جواب پروفیسر عبدالخالق نقوی دیا کرتے تھے۔ پروفیسر نقوی جن کا ۱۹۷۵ء میں انتقال ہوا وزارت دفاع کے دہلی میں واقع اسکول آف فارن لینگویجز میں عربی کے پروفیسر تھے۔ زبانوں کے تقابلی مطالعے میں ان کی خاص دلچسپی تھی۔ عربی فارسی اور اردو زبانیں تو ان کا خاص میدان ہی تھیں، یورپ کی زبانوں پر بھی اچھی نظر رکھتے تھے۔ اور زبان و بیان کے دلچسپ نکات ان کی گفتگو کا اہم حصہ ہوتے تھے۔ ان سے گفتگو کے جن نو پروگراموں کی رکارڈنگ دستیاب ہوئی ہے ان میں سے دو کو نیچے تحریری شکل میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ بریکٹوں کے اندر دی گئی عبارت مرتب کی ہے۔ چند امور کی وضاحت آخر میں حواشی کے ذیل کی گئی ہے۔

سید حامد حسین

(۱)

عمیق حنفی: مولانا یہ بات تو آپ کے علم میں ہو گی کہ ہمارے یہاں شعرا میں جوش ملیح آبادی الفاظ کے صحیح تلفظ اور نشست و برخاست کے بارے میں بہت زیادہ نفاست سے کام لیتے ہیں اور بہت زیادہ اس کا خیال رکھتے ہیں۔ تو ایک نظم ان کی شائع ہوئی تھی جس میں شاید "عِجز بیان" (عجز عین پر زیر کے ساتھ) اس کا عنوان تھا۔ انھوں نے اس پر حرکات لکھ دی تھیں اور نوٹ بھی نیچے لکھا تھا کہ صحیح تلفظ اس لفظ کا عَجز (عین پر زبر کے ساتھ) ہے جب کہ عام طور پر عِجز (عین پر زیر کے ساتھ) کہا جاتا ہے۔ میں صحیح تلفظ کو ترجیح دے رہا ہوں۔ یہ اردو میں کیوں کہ عام طور پر عِجز (عین پر زیر کے ساتھ) بولا جاتا اور لکھا بھی جاتا ہے تو آپ کا کیا خیال ہے۔

پروفیسر نقوی: جہاں تک بولنے کا تعلق ہے آپ صحیح فرماتے ہیں کہ عِجز (عین پر زیر کے ساتھ) بولا جاتا ہے لکھنے کا تو صرف اہتمام کیا کہ عین کے اوپر فتحہ انھوں نے لکھا اور نوٹ لگایا کہ بجائے عِجز (عین پر زیر کے ساتھ) لوگ عَجز (عین پر زبر کے ساتھ) استعمال کریں اور صحیح لفظ عَجز (عین پر زبر کے ساتھ) ہے۔ یہی صحیح بھی ہے کہ صحیح لفظ عَجز (عین پر زبر کے ساتھ) ہے اور عَجز کے معنی مجبوری یا کمزوری ہے اور عربی میں تو عِجز کی معنی گھاٹے، خسارے DEFICIT کے معنی بھی ہوتے ہیں لیکن اگر اس کے اوپر قیاس کر لیا جائے کہ صحیح لفظ استعمال کرنا ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم بجائے ہِجر (ہے پر زیر کے ساتھ) کے ہَجر (ہے پر زبر کے ساتھ) استعمال کریں کیوں کہ صحیح لفظ تو عربی میں ہجر (زبر کے ساتھ) ہے لیکن کیوں کہ ایک لفظ "ہجرت" بھی ہے اور ایک لفظ اسی معنی میں ہجر کے معنی میں ہِجراں (ہے پر زیر کے ساتھ) بھی ہے۔ ہِجراں جسے عربی میں کہتے ہیں لیکن فارسی والوں نے اسے ہجراں استعمال کیا ہے۔

عاشق نشد لذت ہِجراں نہ کشیدی (یا زحمت ہِجراں نہ کشیدی)

کس پیشِ تو نامہ نرساں بکشاید

ہم لوگوں نے قیاس کر لیا کیونکہ ہِجراں موجود ہے اس لیے یہ لفظ بھی ہجر (زیر کے ساتھ) ہوگا لیکن بغیر الف نون کے یہ لفظ ہِجر (زیر کے ساتھ) نہیں، ہَجر (زبر کے ساتھ) ہے لیکن ہمارے یہاں ہِجر (زیر کے ساتھ) ہی استعمال ہوتا ہے۔ اب اگر ہم ہَجر (زبر کے ساتھ) استعمال کرنا شروع کر دیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ نامناسب نہیں ہوگا اور اب ہم اتنی دور نکل آئے ہیں کہ پھر واپس پیچھے جانا مشکل ہو گیا ہے۔

حنفی: اسی طرح یہ حاتم اور حاتِم۔

نقوی: میرا خیال یہ ہے کہ حنفی صاحب جو اسمائے اعلام ہیں یا معرفہ نہیں بلکہ علم جنھیں PROPER NOUN کہتے ہیں انگریزی میں ان میں تصرف کرنا درست نہیں۔ وہ لفظ اسی طرح استعمال ہونا چاہیے جس طریقے سے کوئی نام کسی کا رکھا گیا ہے۔ اکثر اس میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر میں آپ سے عرض کروں کہ بہت دنوں تک لوگوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ UNITED NATIONS کے سکریٹری جنرل کا صحیح نام کیا ہے۔ ان سے پہلے اور ان سے پہلے والے جو سکریٹری جنرل جن کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا (دیکھیے حاشیہ ۱) ان کے نام کے بارے میں بھی لوگ بہت پس و پیش میں رہتے تھے اور موجودہ سکریٹری جنرل ہیں ان کے نام کے بارنے میں بھی لوگوں کو

نہیں معلوم کہ کُرٹ (کاف پیش کے ساتھ) KURT ہے کہ کَرٹ (کاف پر زبر کے ساتھ) ہے یا کیا ہے۔ والڈ ہائیم WALDHEIM ہے یا والڈ ہیم (ہ+ی+م) ہے یا والڈ ہئم (ہ+یم) ہے۔ مختلف طریقے سے لوگ اس کا تلفظ کرتے ہیں صحیح تلفظ وہی مانا جائے گا جو نام والا بتلائے کہ وہ نام کیا ہے۔ چونکہ صحیح لفظ تو حاتَم (تے پر زبر کے ساتھ) ہی ہے اس لیے بہتر اور مناسب یہی ہوگا کہ حاتَم (ت زبر کے ساتھ) استعمال کیا جائے۔ حاتِم (تے پر زیر کے ساتھ) استعمال نہ کیا جائے۔ مگر آپ یہ کہیں گے کہ میں نے خود پڑھا ہے امیر مینائی جیسے شخص نے جن کو بہت زیادہ اس بات کا خیال رہتا تھا کہ صحیح الفاظ استعمال کیے جائیں اور تلفظ صحیح ہو۔ انھوں نے کئی جگہ حاتِم (تے پر زیر کے ساتھ) استعمال کیا ہے اور ان کے استاد مظفر علی اسیر نے بھی حاتِم (تے پر زیر کے ساتھ) ہی استعمال کیا ہے تو صحیح لفظ تو حاتَم (تے پر زبر کے ساتھ) ہی ہے۔ اور ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ عوام الناس کی زبان پر کوئی لفظ اگر غلط آگیا ہے تو پڑھے لکھے لوگوں کو خاص طور پر شعر وادب میں ذرا خیال رکھنا چاہیے۔

حنفی: اسی طرح خِضْر (ضاد ساکن) اور خِضَر (ضاد پر زبر) ہے۔

نقوی: یہ دونوں طریقے سے درست ہے۔ خِضْر (ضاد ساکن) بھی اور خِضَر (ضاد پر زبر) بھی۔ عربی میں بھی دونوں تلفظ صحیح ہیں۔ خِضْر (ضاد ساکن) بھی اور خِضَر (ضاد پر زبر) بھی۔ بلکہ مجھے خیال آیا کہ شاید حالی کا ہی شعر ہے کہ

اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خِضَر (ضاد پر زبر) کی صورت
اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہوشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خِضَر کی صورت

اُنکی مشہور غزل ہے: اُن کے جاتے ہی کیا ہو گئی گھر کی صورت، دیوار کی صورت

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

اور خِضْر (ضاد ساکن) بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً "خضرِ راہ" جو اقبال کی نظم ہے۔ اس میں خِضْر (ضاد ساکن) ہی کہا ہے اور خِضَر (خ پر زیر اور ض پر زبر) اور خَضِر (خ پر زبر اور ضاد پر زیر) بھی کہا ہے:

وہ خَضِر (خ پر زبر، ض پر زیر) یا وہ خِضَر (خ پر زیر ض پر زبر) بے برگ و ساماں،
وہ سفر بے سنگ میل

یہاں خِضَر (خ پر زیر ض پر زبر) پڑھے یا خَضِر (خ پر زبر، ض پر زیر) پڑھے

حنفی: خَضِر (خ پر زبر ض پر زیر) بھی صحیح ہے؟

نقوی: خَضِر (خ پر زبر، ض پر زیر) تو زیادہ صحیح ہے بجائے خِضَر (خ پر زیر ض پر زبر) پڑھنے کے۔ اگرچہ عام لوگوں کی زبان پر خِضَر (خ پر زیر ض پر زبر) لیکن بہتر ہے کہ اس کو خَضِر (خ پر زبر، ض پر زیر) پڑھا جائے۔

حنفی: لیکن حالی نے تو خِضَر (خ پر زیر اور ض پر زبر) ہی باندھا ہے۔

نقوی: جی ہاں انھوں نے خِضَر (خ پر زیر، ض پر زیر) باندھا ہے اس لیے کہ وہ تو قافیہ وہاں بتلا رہا ہے۔

حنفی: یہاں اقبال کا ذکر آگیا تو ایک مشہور اور میں تو یہ کہوں گا کہ اقبال کی بہترین دو تین نظموں میں سے ایک "مسجد قُرطُبہ" (قاف اور ط پر پیش کے ساتھ) ہے لیکن اسے عام طور سے میں نے دیکھا ہے کہ بہت اچھے اچھے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ قَرطَبہ (ق اور ط پر زبر کے ساتھ) کہتے ہیں۔

نقوی: جی ہاں یہ قَرطَبہ (ق اور ط پر زبر کے ساتھ) صحیح نہیں ہے۔ قُرطُبہ (ق اور ط پر پیش کے ساتھ) صحیح ہے۔

حنفی: شاید یہ عربی لفظ نہیں۔ سپانوی لفظ کی تعریب ہے۔

نقوی: وہ تو ہے لیکن جس لفظ کی تعریب ہے اس کی مجھے...

حنفی: CORDOBA

نقوی: میں نہیں عرض کر سکتا کہ اسپین میں لوگ اس کا کس طرح تلفظ کرتے ہیں۔

حنفی: اسپین میں اس کو "کوردوبا" کہتے ہیں۔

نقوی: کوردوبا اگر کہتے ہیں تو قُرطُبہ (ق اور ط پر پیش کے ساتھ) ہی ہونا چاہیے۔ انگریز لوگ اس کو CORDOVA کہتے ہیں۔ تو زیادہ صحیح تو قُرطُبہ (ق اور ط پر پیش کے ساتھ) ہی ہے۔ اب وہیں اسپین کا ایک دوسرا شخص مشہور مورخ ہے بلکہ ساری دنیا کا مشہور مورخ ہے۔

حنفی: ابن خلدون۔

نقوی: اس کو لوگ ابن خلدّون کہتے ہیں، لام کی تشدید کے ساتھ حالانکہ اس کا صحیح نام ابن خلدون ہے لام کے سکون کے ساتھ۔

حنفی: ایک لفظ ہے: "واقعہ"۔ اب یہ ہمارے یہاں کبھی تو حقیقت کے معنی میں آتا ہے اور کبھی

یعنی حقیقت اصلیت اور کبھی FACT کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

نقوی: یہ بالکل ٹھیک ہے FACT کے معنی میں یا حقیقت کے معنی میں یا کوئی چیز جو پیش آئے یعنی EVENT اس کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ باعتبار اپنے لغوی معنی کے اس کا استعمال کسی گڑھے یا غار کے معنی میں یا کسی ایسی چیز جیسے دلدل یا کوئی مصیبت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً حافظ نے کہا ہے:

باز گویم نہ دریں واقعہ حافظ تنہاست
غرقہ گشتند دریں بادیہ بسیار دیگر

"غرقہ گشتند" تو معلوم یہ ہوا کہ واقعہ کوئی ایسی چیز ہے کہ جس میں کوئی گر ڈوب جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے :واقعہ۔ وہاں بھی کسی بہت اہم زبردست واقع کے لیے اس کا استعمال ہوا ہے۔ غالباً قیامت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اذا وقعت الواقعہ۔ واقعہ بمعنی قیامت۔

حنفی: یہ مشہور مصرع ہے کہ "شاید کہ پلنگ خفتہ باشد" اس پر کسی نے کہہ دیا تھا کہ یہاں "خفتہ" نہیں "خفیہ" ہے۔

نقوی: جی ہاں یہ بھی ایک لطیفہ بن گیا ہے کہ سعادت علی خاں کے زمانے میں، غالباً انشاکا دور ہی تھا۔ انشا ان کے درباری شاعر تھے۔ تو کسی نے کہا کہ حضور یہ "خفتہ" نہیں۔ یہاں تو "خفیہ" ہوگا کہ شیر سویا ہوا ہو جنگل میں "خفیہ" زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

حنفی: چھپا ہوا۔

نقوی: چھپا ہوا ہی ہے۔ اسی پر انشا نے طنز کے طور پر کہا: جی ہاں بالکل درست ہے اس لیے کہ جو دوسرے مصرعے ہیں وہ بھی یہی ظاہر کرتے ہیں۔ خفتہ نہیں خفیہ ہوگا اور وہ یہ کہ

تا مرد سخن نہ گفیہ (گ۔ف۔ی۔ہ) باشد
عیب و ہنرش جہفیہ (ن۔ہ۔ف۔ی۔ہ) باشد
ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست
شاید کہ پلنگ خفیہ (خ+ف+ی+ہ) باشد

تو بادشاہ نے اس سے بہت لطف اٹھایا کہ بڑے خوبصورت انداز میں انھوں نے اس غلطی کی نشاندہی کی۔

حنفی: ایک لفظ جو ہمارے یہاں CUNNING کے مترادف استعمال ہوتا ہے۔ چالاک تو اس کو ہشیار کے معنی ہیں یا اس کے CUNNING جیسے معنی آتے ہیں۔ مکرو فریب جس

میں مثال اور عیاری۔

نقوی: یہ تو حنفی صاحب بالکل ظاہر ہے جیسا آپ نے فرمایا کہ مکار یا عیار کے معنی میں چالاک کا استعمال کرتے ہیں اور خالی صرف ذہین نہیں بلکہ جس میں کچھ مکر و فریب کا بھی دخل ہو گا۔ لیکن مجھے ابھی اس وقت یاد آرہا ہے کہ چالاک SMART اور خوبصورت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے فارسی میں۔ میں نہیں عرض کر سکتا کہ اردو والوں نے یہ لفظ چالاک خوبصورت کے معنی میں استعمال کیا یا نہیں۔ لیکن فارسی میں تو استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر وہ حافظ کا ایک شعر یاد آیا کہ

چوں گل از نکہت اوجامہ قبا کن حافظ
زیں قبادر رہ آں قامت چالاک انداز

تو قامت کی صنعت یہاں چالاک استعمال ہوئی تو قامتِ چالاک سے مراد ہے خوبصورت قد۔ وہ حسین قامت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ SMART کے معنی میں۔

حنفی: تو اچھا صاحب ایک لفظ استعمال ہوتا ہے "مخمصہ" یہ الجھن پریشانی یا کبھی کبھی تذبذب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا صحیح لغوی معنی کیا ہے۔

نقوی: مخمصہ۔ یہ بھی بہت دلچسپ سوال کیا آپ نے اس وقت میرا خیال ہے کہ سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے یا جن کو جستجو، تلاش رہی ہے یا جنھوں نے عربی پڑھی تو ہے لیکن وہی جستجو کی بات۔ وہ تو OFF-HAND بتلا سکیں گے۔ ورنہ مشکل ہے۔ مخمصہ کے معنی ہیں پیٹ کا خالی ہونا۔ بھوکا ہونا۔ بھوک کے معنی میں ہے مخمصہ لیکن ہم لوگ کسی الجھن چکر پریشانی کے لیے کس مخمصے میں کس چکر میں کس الجھن میں پڑ گئے۔

حنفی: ارے صاحب اور یہ ایک "نفسی نفسی" جو کہا جاتا ہے۔

نقوی: نفسی نفسی...

حنفی: نفسا نفسی اردو میں۔

نقوی: نفسا نفسی تو بگڑی ہوئی شکل ہے۔ صحیح لفظ تو تھا نفسی نفسی یعنی ایسا ایک ہنگامہ جب کے کسی کو دوسرے کی پروانہ ہو صرف اپنے بچاؤ کی فکر ہو۔ ایسے موقع کے اوپر آدمی چاہتا ہے کہ بس میں بچ جاؤں۔ میرا یہ ہو جائے۔ میرا یہ کام ہو جائے۔ تو اس کو نفسی نفسی کہنا درست ہے۔ اور پھر اس کی شکل بگڑ کر نفسا نفسی ہو گئی یعنی خود غرضی کے معنی میں۔ اور غالباً اسی کا ترجمہ یا اس سے قریب "ہم" جو ہے وہ یعنی WE کے معنی میں PLURAL یا جمع "میں" کی جمع "ہم" تو شاید یہ "ہماہمی" بھی اسی طرح بنا جس طرح

"لفسا نفسی" تھا تو یہ ہما ہمی یعنی جو کچھ ہے وہ یہ کہ سب سے پہلے ہم میں ہم کو ترجیح ملنا چاہیے۔ کسی موقعہ پر پھر اس "ہما ہمی" کو میں سنتا ہوں کچھ لوگ شاید "ہما ہمی" کہتے ہیں مگر اس سے پہلے کبھی سننے میں آتا تھا یہ لفظ بالکل غلط ہے۔ ہما ہمی کوئی چیز نہیں ہے۔ غالباً "ہما ہمی" ہی درست ہے۔

(۲)

حنفی : مولانا یہ ایک زبان سے دوسری زبان میں الفاظ کا لین دین شروع ہی سے ہوتا رہا ہے لیکن جو لسانیات کے ماہرین ہیں، ان میں ایک عرصے سے یہ بحث ہوتی آئی ہے کہ کس زبان نے کونسا لفظ کس زبان کو دیا تو الفاظ کے حسب نسب کے تعین کے لیے کیا اصول ہیں۔ مثلاً ایک لفظ ہے "رفض" اور اسی کے ہم معنی لفظ ہے انگریزی میں REFUSE تو ان میں جو صوتی مماثلت ہے اس کی بنا پر کیا یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ یہ لفظ انگریزی سے عربی میں گیا ہے یا انگریزی سے عربی میں آگیا ہے۔

نقوی : الگ الگ زبانوں میں ایک ہی جیسے الفاظ ایک ہی جیسی آوازیں قدرتی طور پر پیدا ہو جاتی ہیں۔ مجھے اس وقت ایک کتاب کا حوالہ یاد آیا۔ "اُمّ الالسنہ" ایک کتاب ہے خواجہ کمال الدین کی جو لندن میں جن کا قیام تھا اور وہ کنگ کی جو شاہجہانی مسجد ہے وہاں وہ امامت بھی کرتے تھے اور اسلام کی تبلیغ بھی کرتے تھے، انھوں نے ایک کتاب اُمّ الالسنہ" لکھی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس کتاب میں تحقیق سے زیادہ غالباً عقیدت کو محبت کو زیادہ دخل ہے جو ان کو عربی زبان سے تھی۔ وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دنیا کی اکثر زبانیں یا بیشتر زبانیں عربی زبان سے نکلی ہیں اور عربی زبان نے ہی ان کو جنم دیا ہے۔ اسی لیے وہ عربی کو اُمّ الالسنہ یعنی تمام زبانوں کی ماں کہتے تھے۔ اب آپ نے یہ بات اٹھائی کہ لفظ REFUSE اور رفض کیا ان دونوں کی اصل ایک ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ان دونوں میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ محض ایک اتفاق کی بات ہے کہ ان میں صوتی مماثلت ہے۔ اس قسم کے اور بہت سے الفاظ آپ کو مل سکتے ہیں۔ ایک مثال میں آپ کو دیتا ہوں۔ "جھاڑو" مثلاً ایک لفظ ہے۔ اب اس سے بالکل ملتا جلتا فارسی میں لفظ ہے "جاروب"۔ "جا" اور پھر وہاں روفتن یا روویدن سے روپ بنایا "روب" بالکل دو الگ چیزیں ہیں لیکن صوتی مماثلت ہے۔ عربی میں ایک روٹ (ROOT) ہے یا مادہ ہے : ج۔ ر۔ ف۔ اس سے ایک لفظ بن گیا "جاروف" "فاعول" کے وزن پر۔ تو

جاروف، جاروب اور جھاڑو۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ تینوں لفظ اصل کے اعتبار سے ایک ہیں حالانکہ اصل کے اعتبار سے تینوں مختلف ہیں۔ اور یہ ایک محض اتفاقی امر ہے کہ ان سب کی صوتی شکل ایک ہی ہے۔ یا صوتی مماثلت ان میں پائی جاتی ہے۔

حنفی: صاحب ایک یہ لفظ ہے "حرام" تو یہ عام طور پر جس معنی میں استعمال ہوتا ہے وہ تو PROHIBITED کے معنی میں ہے کہ یہ چیز ممنوع ہے۔ یہ حرام ہے تم پر۔ لیکن یہ "حرمت" سے بنا ہے یہ لفظ تو یہ اتنا بڑا فرق اس میں کیسے پیدا ہو گیا۔

نقوی: جی ہاں یہ بہت ہی لطیف فرق ہے اور بہت دلچسپ بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ROOT تو وہی ہے اصل تو وہی ہے جو آپ نے ابھی بتلایا کسی چیز کا محترم ہونا اور حرام ہونا۔ یہاں تک کہ بیت اللہ کو اس کو، بھی بیت الحرام کہتے ہیں

حنفی: محرم الحرام ۔ ؟

نقوی: محرم الحرام بھی کہتے ہیں۔ تو وہ چیز جس کی حرمت کی وجہ سے جس کی پاکیزگی یا جس کی عظمت کی وجہ سے بہت زیادہ جس کے قریب نہ جایا جا سکے، جس کو ہم اپنی قربت سے اس کو نجس یا گندہ یا مبتذل حس کو نہ کر سکیں، تو اس لیے ہم اس کو حرام کہتے ہیں تو پھر یہ لفظ جو اتنا مقدس، اچھا اور پاکیزہ تھا کہ احترام کے طور پر نہیں بلکہ شائستگی کے لیے ان چیزوں کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا جو اچھی نہیں ہیں لیکن جن کے قریب جانا مناسب نہیں ہے۔ تو اس لیے ان میں یہ مماثلت پیدا ہو گئی۔ مثلاً ایک لفظ ہے "عذاب" عربی میں۔ اس کی ROOT جو ہے یا اس کی اصل اس کا مادہ ع۔ ذ۔ ب۔ ہے جس کے معنی ہیں مٹھاس شیرنی۔ اور یہاں "عذاب" کے معنی ہیں TORTURE، PUNISHMENT سزا کے تو ان دونوں میں آپس میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ لیکن کیونکہ ایسے کام کہ جن کے اوپر سزا مرتب ہوتی ہے یا جس کے نتیجہ میں انسان کو سزا ملتی ہے، TORTURE ملتا ہے یا ملے گا آئندہ آخرت میں۔ وہ در حقیقت اس دنیا میں وہ کام انسان کے لیے بہت پسندیدہ ہوتے ہیں اور ان میں انسان لذت محسوس کرتا ہے۔ ان میں شیرینی محسوس کرتا ہے۔ یہ آپس میں ان دونوں کی مماثلت اور مطابقت کی شکل ہے۔

حنفی ۔ یہ "حرام" کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حرمت معکوس ہے یعنی تم اپنے کو ان چیزوں سے حرمت میں رکھو۔

نقوی: جی یہ کہ تم اپنے آپ کو ان سے بچاتے رہو۔ دور رہو۔ جی ہاں۔ اور "محرومی" بھی ہے

ایک لفظ ہے کہ کسی کا کسی چیز سے محروم ہونا یعنی کسی کا کسی چیز سے جیسے انگریزی میں کہتے ہیں DEPRIVED تو وہ مشکل بھی ہے لیکن یہ وہی سب ملتے جلتے معنی ہیں جیسا کہ ابھی میں نے آپ سے عرض کیا جس کی تفصیل بتائی کہ اصل معنی تو وہی تھے حرمت کے اور تعظیم کے۔ لیکن پھر بعد میں کیوں کہ جس طریقہ سے ایک بہت ہی محترم شخص کے ایک دم قریب جانا ہم مناسب نہیں سمجھتے۔ ہم جب کسی سے مخاطب ہوتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ جناب نے ایسا فرمایا حالانکہ "جناب" کے معنی تو آستانے اور چوکھٹ کے ہیں۔ یعنی براہ راست ہم آپ سے مخاطب کرنے کو ذرا کچھ آپ کی کس شان سمجھتے ہیں اور اپنے لیے کوئی بڑی بات سمجھتے ہیں۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ اس لیے ہم جناب کہہ کر آپ سے مخاطب کرتے ہیں۔ حالانکہ جناب کے معنی تو صرف آستانے اور چوکھٹ کے ہیں۔ اسی طرح سے یہ لفظ حرام جو تھا جس کے معنی تو بہت اچھے تھے یعنی وہ چیز جو کہ محترم اور مقدس ہے لیکن پھر اس کا اطلاق ان چیزوں پر بھی ہونے لگا کہ جن سے دور رہنا، جو بری ہیں اور جن سے دور رہنا بہتر ہے اور اچھا ہے۔

حنفی: یہ چند الفاظ جن کے تلفظ اور ہجے کے متعلق میں آپ سے معلوم کرنا چاہوں گا۔ وہ نام ہیں دو بہت مشہور فلاسفہ کے اور علموں کے۔ ایک تو ابن مسکویہ۔ تو عام طور اس کو لوگ "ابن مَس۔ کو۔ یہ" پڑھتے ہیں۔

نقوی: یہ تو بالکل غلط ہے۔ مَس۔ کو۔ یہ" تو غلط نہیں ہے۔ یہ "مَسک۔ وَیہ" ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے "وَیہ" ہے آخر میں۔ اسی طریقہ سے "سیبَ ویہ" ایک مشہور GRAMMARIAN یا عربی کا نحو کا عالم تھا وہ "سی بِ۔ وَیہ" "مسک۔ ویہ" "نمر ز۔ ویہ"۔ لیکن ان سب کی اصل ROOT وہ فارسی زبان میں ہے اور فارسی سے عربی میں لیے گئے ہیں۔ فارسی میں ان کی کیا شکل تھی وہ تو میں OFF-HAND اس وقت آپ سے عرض نہیں کر سکتا۔ لیکن اب بحالتِ موجودہ ان کا تلفظ اسی طریقے سے ہے۔

حنفی: اور یہ لام تعریہ؟

نقوی: "تے۔ ری۔ یہ۔" یہ دوسری یے جو ہے وہ تخفیف کے ساتھ نہیں بلکہ تشدید کے ساتھ ہے "تے۔ ریَہ" غالباً اس میں نسبت کا تعلق ہے اس کا۔ مثلاً ہند ہے۔ اب اگر ہند کی طرف نسبت ہم کریں گے تو ہو جائے گا ہندی اور پھر FEMININE اس کا یا مونث ہو جائے گا 'ہندیہ' (ہن۔ دی۔ یہ)۔ لیکن عربی میں ایسے بہت سے الفاظ ہیں جن میں

آخر میں علامتِ تانیث ہے لیکن وہ مونث کے لیے نہیں بولے جاتے۔ ان کا اطلاق مذکر پر ہوتا ہے جیسے لفظ حمزہ ہے عربی میں۔ آخر میں گول تے (ۃ) موجود ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ کسی لڑکی کا نام ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ آنحضرتؐ کے عم بزرگوار کا نام تھا۔

حنفی: اچھا صاحب یہ "تن یت"۔ ہے یا تنی۔ یت" ہے۔

نقوی: تن۔ یت" ہے یہ "تن یت"۔ "تنی۔ یت" اسے کہنا بالکل غلط ہے۔ "تثنیت"" "حرمت" کے وزن پر،

حنفی: اچھا یہ "ہدیہ"۔ تحفے کے معنی میں۔

نقوی: صحیح لفظ تو ہے "ہدی۔ یہ" اور اس کی جمع ہے ہدایا۔ جیسے عطیہ (عطی۔ یہ) GIFT اس کی جمع عطایا۔ لیکن ہمارے یہاں شعراء نے ہدیہ (ہد۔ یہ) اس کو باندھا ہے اور روزمرہ میں بھی اس کا استعمال "ہدیہ" ہے۔ ہدیّہ (ہدی۔ یہ) کوئی بھی نہیں بولتا۔ غالب نے کیا کہا ہے۔

ہدیہ جگر داغ -- -- -- -- --

مبارکباد اسد غم خوار جان درد مند آیا

لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ غالب کا وہ دیوان جو بمبئی میں ہمارے یہاں چھپا ہے (دیکھیے حاشیہ ۲) اور اس کے ساتھ اس کے ایک صفحہ پر اردو رسم الخط اور دوسرے صفحہ پر ہندی رسم الخط میں غالب کی غزلیں شائع ہوئی ہیں، اس غزل میں ہندی کا جو اس کا TRANSLITERATION ہے یا رسم الخط ہے اس میں ہدیّہ (ہدی۔ یہ) لکھا گیا ہے۔

حنفی: یعنی بالکل صحیح عربی قاعدے کے مطابق۔

نقوی: صحیح قاعدے کے مطابق تو ہے مگر مشکل یہ ہے کہ وہاں وزن قائم نہیں رہتا غیر موزوں ہو جاتا ہے۔

حنفی: بعض عبارتوں میں جملے کے بعد "الخ" لکھ دیتے ہیں؟

نقوی: یہ "الیٰ آخرہ" یا "الیٰ آخرھا" کی ایک مختصر شکل ہے۔ یعنی آپ ایک شعر لکھ رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ سامع یا قاری یا پڑھنے والا باقی کو بھی جانتا ہے یا اس کو پورا کر لے گا خود، تو آپ نے "الخ" لکھ دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "الیٰ آخرہ" یعنی اسی طریقے سے اس کو پڑھتے چلے جائیے۔ انگریزی میں اسے کہتے ہیں AND SO ON

حق: اور یہ "ولہ" کمعنی بتاتے ہے؟

نقوی: ؤلہ (وَ۔ل۔ہٗو)۔ آپ نے اس وقت بہت دلچسپ بات چھیڑی۔ مجھ کو ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک صاحب نے ایک غزلیات کا مجموعہ لیا جس میں غالباً ذوق کی، امیر مینائی کی اور داغ کی غزلیں تھیں۔ انتخاب تھا۔ تو داغ کی مثلاً ایک غزل لکھی اس کے بعد داغ کی دوسری غزل، پھر تیسری داغ کی غزل اور پھر اگلی غزل داغ کی اور ہر غزل کے بعد اس میں لکھا تھا "ولہ" (وَ۔ہُو) یعنی انھیں کی غزل یہ ہے۔ پھر انھیں کی غزل، پھر انھیں کی غزل ہے۔ پھر امیر مینائی کی غزلیں شروع ہوئیں اور ان کے بعد پھر وہی "ولہ"، "ولہ"، "ولہ" ہر غزل کے پہلے۔ تو وہ صاحب جنھوں نے یہ کتاب پڑھی تھی جب وہ اسے واپس دینے آئے ان صاحب کے پاس جن سے مستعار لی تھی تو کہنے لگے کہ صاحب اس میں داغ کی اور امیر مینائی کی غزلیں تو کم ہیں۔ کوئی شاعر واللہ ہوا ہے اس کی غزلیں بہت ہیں۔ تو یہ در حقیقت "ولہ" (وَ۔ل۔ہٗو) ہے۔

حواشی

۱۔ یہاں اقوام متحدہ کے دوسرے سکریٹری جنرل ڈاگ ہمیر شولڈ (DAG HAMMARSKJOL) جو 1961 میں کانگو میں ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہوئے تھے۔ (حامد)۔

۲۔ یہاں سردار جعفری کے مرتب کیے ہوئے دیوان غالب کی جانب اشارہ ہے۔ (حامد)۔

شان الحق حقی

رازوں کا دفینہ

"صاحب میری بیوی حلیم بہت اعلا پکاتی ہے۔ ایک دن آپ کو لا کر کھلاؤں گا" اسلم نے کہا۔ وہ میرے دفتر میں کام کرتا تھا۔ انٹرپاس ہوشیار، قدرے پست قد، سانولہ سا تیس بتیس برس کا آدمی۔ ہاتھ پانو کا اچھا، باتونی بلکہ چہلا بھی۔ میرے کمرے میں آنے کے بہانے ڈھونڈتا اور کوئی نہ کوئی بات چھیڑ کر جم جاتا کہ ذرا دیر بات چیت کر سکے۔ ویسے کام بہت اچھا کرتا تھا بلکہ کوئی غیر حاضر ہو لیا کام کا بوجھ زیادہ ہوا تو ہاتھ بٹانے میں دریغ نہ کرتا، دوسروں کا کام بھی سنبھال لیتا۔

ایک دن وہ حلیم لے ہی آیا۔ کچھ بہت تحفہ تو نہ تھی اچھی طرح گھوٹی نہیں گئی تھی۔ پیاز بھی داغ کر کے نہیں ڈالی گئی تھی۔ خیر نیبو ادرک گرم مسالہ ساتھ تھا۔ بھوک میں بری نہیں لگی۔ اسی طرح وہ ایک دفعہ شب برات کا حلوہ لے آیا پھر عید پر سویاں، گاجر کی تری وغیرہ۔ بعض چیزیں میں گھر بھی لے جاتا اور اس سے کہتا کہ بیگم نے بھی پسند کیا ہے۔ اس نے کہا میں کسی دن امینہ کو بیگم صاحبہ کے پاس سلام کرانے لے جاؤں گا بلکہ وہ ان کے باورچی خانے میں ان کی پسند کا کوئی کھانا پکا دے گی یا اپنے ہاتھ کا خاص ٹوٹا قورمہ۔ مگر اس کی نوبت کبھی نہ آئی۔ میری بیوی اس کے ہنر کی زیادہ قائل نہ ہوئیں۔ ایک بار میں پشاور کے دورے پر گیا تو باڑے کی مارکیٹ سے عمدہ کپڑا خرید لایا تھا۔ اس میں سے اپنی بیوی کی صلاح سے انتخاب کر کے میں نے چند گز کپڑا اسے بھی دے دیا کہ یہ اپنی بیوی کو انعام میں دے دینا۔ اس نے کہا صاحب اسکا نام امینہ ہے۔ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا۔ وہ بہت خوش ہوگی اور اگلے دن آکر کہا کہ اس نے بہت بہت شکریہ اور سلام عرض کیا ہے

میں ان دنوں پرانی کوئینز روڈ کے ایک نو تعمیر دو منزلہ کشادہ اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ علاقہ اچھا تھا مگر یہاں کوئی محلے داری یا ہمسایہ داری نہیں تھی۔ یہ ایک لحاظ سے تو اچھا تھا کہ زیادہ میل جول سے رفاقت تو تھوڑی ہی سی ملتی ہے، مسئلے زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور ایک لحاظ سے نہیں بھی اچھا تھا کہ کوئی کسی کے دکھ درد کا شریک نہیں ہوتا۔ میرا چھوٹا سا کنبہ تھا۔ ایک بیوی دو بچے، ایک لڑکا ایک لڑکی۔ ایک ماما جو بیوی کے ساتھ مل کے کھانا بھی پکاتی بچوں کو بھی سنبھال لیتی۔ ایک چھوٹا سا لڑکا کوئی بارہ برس کا۔ اوپر کی ٹہل، جھاڑ پونچھ کرنے اور چھوٹا موٹا سودا سلف لانے کے لیے۔

عید کے بعد میری بیوی اپنے بھائی کی شادی میں گانو گئیں تو انھیں میرے کھانے کی بڑی فکر تھی کیونکہ ماما بھی ساتھ جا رہی تھی۔ وہ رہنے والی بھی اسی گانو کی تھی مگر میں نے اطمینان دلایا

کہ ناشتے وغیرہ کا تو مسئلہ ہی نہیں۔ یہ توس کا بھی تیار کر لیتا ہے، میں خود بھی کر سکتا ہوں۔ کھانا میں زیادہ تر ایک ہی وقت کھاتا ہوں۔ کلب میں کھالیا کروں گا۔ ان دنوں کلب میں بڑا سستا کھانا ملتا تھا۔ ساڑھے سات روپے میں تین کورس کا لنچ جو اب بڑھ کر ستر سے بھی اوپر ہو گیا ہے۔ کلب اور ہوٹل میں فرق نہ رہا۔ یہ بھی کاروباری ادارے بن گئے ہیں۔

دفتر میں بیوی کے گاؤں جانے کی اطلاع ہوئی تو اسلم کو بھی میرے کھانے کی فکر ہوئی بولا صاحب امینہ پکا کر بھیج دیا کرے گی۔ میں خود لا دیا کروں گا۔ دفتر کا ڈرائیور بھی لا سکتا ہے۔ وہ تو آپ کے اپنے باورچی خانے میں بھی آکر پکا سکتی ہے۔ تھوڑے ہی دن کی تو بات ہے۔ کئی کھانے تیار کر کے ٹھنڈی الماری یا ٹھنڈے صندوق میں رکھ دیا کرے گی (اسے ریفریجریٹر کہنا چاہیے مگر یہ لفظ ہمارے ہاں نہ معلوم کب سے چمڑے کے بکس کے لیے چلا آرہا ہے) میں اس کے چھچھور پن کو مروتاً برداشت کرتا رہا تھا مگر اس دفعہ میں نے ڈانٹ دیا کہ تم فضول باتیں بہت کرنے لگے ہو۔ میرے کھانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

اس پر اس ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا اور لیجیے اگلے اتوار کو وہ امینہ کو ساتھ لے کر میرے گھر پر آدھمکا۔ وہ پہلے ایک بار دفتر میں بھی آچکی تھی۔ گویا اپنے کھانوں اور ہنر کی زبانی دلو لینے بلکہ میں نے محسوس کیا کہ اسلم کو اپنی بیوی کی بھولی صورت پر بھی بڑا ناز ہے۔ وہ شاید اس کی بھی داد چاہتا ہے۔ میں نے دل میں کہا، چلو ٹھیک ہے جو چیز جس شخص کو نصیب ہو اس پر اترانے کا اسے حق ہے۔ اب جو یہ دونوں گھر پر آئے بلا وجہ بلا اطلاع، تو مجھے تاؤ تو آیا لیکن گھر آئے مہمان سمجھ کر جو ویسے بھی میری ہمدردی میں میری خدمت کے لیے آئے تھے چپ ہو رہا۔ اور میں نے باورچی خانہ ان دونوں کے حوالے کر دیا۔ وہ خود بھی کچھ سٹر پٹر کرنے لگا۔ امینہ انڈوں کا سالن تیار کرنے میں لگ گئی کیونکہ گوشت نہیں تھا اور مارکیٹ دور۔ اسلم نے تو کہا کہ میں آن کی آن میں لے کر آجاتا ہوں مگر میں نے روک دیا کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔

میں ناشتہ تو کر چکا تھا۔ اخباروں کے سنڈے ایڈیشن ابھی ادھورے پڑے تھے۔ کوئی دو گھنٹے بعد اوپر کے بیڈ روم سے نیچے اترا۔ امینہ باورچی خانے میں اکیلی تھی۔ میں نے اسلم کو پوچھا۔ امینہ بولی "جی وہ تو لانڈھی چلے گئے۔"

"لانڈھی؟" میں حیرت زدہ ہو کر بولا "اتنی دور بغیر پوچھے، بغیر بتائے۔ یہ بھی کوئی حرکت ہے۔ آج ہی وہاں بھی جانا تھا۔ آخر کیوں؟

"جی وہ کہتے تھے کوئی دوست بیمار ہے۔ اس نے بلایا ہے کچھ بہت ضروری کام ہے۔"

"تو مجھے کیوں نہیں بتایا کہ جا رہا ہوں"

"جی وہ کہتے تھے صاحب کو ڈسٹرب مت کرو۔"

ڈسٹرب کی بھی ایک ہی رہی ایسی کی تیسی" اور میں نے اسلم کو اس کی غیبت میں اس کی بیوی کے سامنے بہت باتیں سنائیں۔ وہ سنجیدہ ستا ہوا سا چہرہ بناتے ہوئے بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے تکتی رہی، پھر نظریں جھکالیں اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر اس طرح کھیل گئی کہ مجھے معاً یہ شعریاد آگیا، جو مونالیزا کی یاد دلاتا ہے ؎

تھی بس اک برق تبسم کہ تکلم نہ بنی
جنبش لب تھی مگر جنبش مژگاں کی طرح

میں اوپر کے لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اینہ درانہ اوپر چلی آئی اور پوچھا "صاحب آپ کھانا کب کھائیں گے؟" میں نے کہا میں اس وقت کھانا نہیں کھاؤں گا۔ تم خود کھالو لڑکے کو کھلادو اور جو پکایا ہے وہ فرج، فرج، فرج میں رکھ دو، ٹھنڈی الماری میں۔ میری زبان ناحق لڑکھڑا گئی۔

"ہاں چائے میں پی لوں گا" میں نے کہا "لڑکے سے کہو چاؤ چا، چائے بنادے یا تم چاہو تو تم خود بنالو۔ خود بھی چم خود بھی تم چاہو تو پیو۔ میں بس ایک پیاری پیوں گا۔ ایک ہی بڑی پیالی۔ وہ جو میرا مگ ہے بغیر پرچ والا۔ لڑکا جانتا ہے۔ وہ بتادے گا۔ لڑکا بتادے گا۔ لڑکا بتادے گا۔"

وہ سر جھکائے سنتی رہی یا تو مجھے خود اس سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہ پڑی یا اس کا حجاب حائل رہا۔ وہ آہستہ آہستہ کچھ ٹھٹکتے ہوئے قدموں سے واپس چلی گئی۔

چائے بسکٹ لڑکا لے کر آیا تو میں نے انسانی ہمدردی کی راہ سے دل میں سوچا کہ دیکھو اس غریب کو نہ تو اسکول جانا نصیب ہے نہ کوئی چھٹی ملتی ہے۔ اس کے لیے اتوار پیر سب برابر ہیں۔ میں نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا "بیٹے تمھاری ماں بیمار تھیں اب کیسی ہیں" وہ بسورنے لگا، صاحب وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ گوگی (اس کے محلے کا لڑکا) آیا تھا کہتا تھا بہت بخار ہے گوگی کی ماں خود آکے دیکھ کے گئی ہے" میں پوچھنے ہی والا تھا کہ ماں کے پاس اور بھی کوئی ہے مگر پوچھتے پوچھتے رہ گیا خیال آیا کہ اگر اس نے کہا کوئی نہیں تو پھر اس کو از رلو ہمدردی چھٹی دینی پڑے گی یا کم از کم کہنا پڑے گا کہ ماں کو دیکھ آئے۔ اس وقت مجھے اس کو باہر بھیجنا ٹھیک نہیں لگا۔ مگر پھر خیال آیا کہ یہ تو بڑی خود غرضی اور کٹھور پن کی بات ہے کہ اپنی مصلحت کی بنا پر اس کی ماں کو اکیلا پڑے پڑے مرنے دوں۔ انسان کتنا شقی القلب ہے۔ اپنی ذرا سی اونچ نیچ کے پیچھے دوسرے کی جان تک کی پروا نہیں کرتا۔ تو کیا بھیج دوں اسے، ٹھیک ہے، نہیں ٹھیک نہیں ہے

یہ دھکڑ پکڑ جاری تھی کہ لڑکا نیچے سے خود پلٹ کر آیا اور بولا گوگی پھر آیا ہے کہتا ہے تیری

ماں تجھے یاد کر رہی ہے۔ صاحب کوئی کام ہو تو پکانے والی بی بی بیٹھی ہیں۔ میں ہو آؤں ؟" میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اسے جانے دوں۔ مجھے اپنے اوپر پورا اعتماد تھا۔ خیال صرف یہ تھا کہ امینہ میرے پاس اکیلی رہی تو اس کے میاں کو شبہ نہ گزرے۔ کوئی ناخوش گواری نہ پیدا ہو جائے۔ اسلم پر پھر غصہ آنے لگا کہ مجھے ناحق قصے میں ڈال گیا مگر پھر سوچا کہ دیکھو اس شخص کو مجھ پر کتنا بھروسا ہے۔ میں نے اس کے لیے تحسین کا جذبہ اور ممنونیت سی محسوس کی۔ بڑا اچھا آدمی ہے مخلص، خدمت گزار۔ گیا ہے تو کسی مجبوری ہی کے تحت گیا ہو گا وہاں بھی تو کوئی بیمار ہی پڑا ہوا ہے۔ نہ معلوم کس کیفیت میں پڑا ہو گا۔ اسلم تو سبھی کا خیال رکھتا ہے۔ آخر دوست سے ملنے کیوں نہ جاتا۔ جبکہ وہ جانتا تھا کہ امینہ میرے گھر میں بالکل اپنے گھر کی طرح محفوظ ہے۔ وہ خود نہیں تو کیا ہوا اس کی جگہ میں جو موجود ہوں۔ اس کی جگہ میں ہوں مگر لوگ بڑے بد گمان ہوتے ہیں ان کی بد گمانی سے در اصل ان کی بد گمانی سے ڈرتا ہوں۔

گھنٹہ بھر اور اسی خلفشار میں گزر گیا۔ کچھ خط لکھنے تھے وہ بھی نہیں لکھے جا سکے دل میں کہا کہ دیکھو وہ آیا تو میری ہمدردی میں تھا یا شاید خوشنودی حاصل کرنے، مگر الٹا نقصان کر دیا۔ پورا دن ضائع ہو گیا۔ پھر بھی کہوں گا کہ ہے وہ بھلا ہی آدمی۔ ہوشیار بھی اور کچھ ذرا بیوقوف بھی، بے احتیاط بھی۔ اپنے گھر کی عزت ایک غیر آدمی کو سونپ گیا۔ لڑکی بھی سانولی سلونی خیر مجھ پر بھروسا کر لیا تو کر لیا لیکن کوئی اور ہوتا تو اس موقع سے عجب نہیں کہ فائدہ اٹھاتا۔ لڑکی شرمیلی ہے مگر کسی کسی وقت تو خوب آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیتی ہے آنکھیں بھی خوب صورت ہیں۔ جسم متناسب دبلا پتلا، بالکل کنواری لڑکیوں جیسا۔ میری بیوی کا جسم تو اب کافی سے زیادہ پھیل گیا ہے، ناک نقشہ اچھا ہے رنگ گورا۔ نزاکت نہیں اور وہ لوچ جو اس وحشی ہرنی میں ہے۔ ہرنی کے سے طرارے نہیں بس ہرنی کا سا بھولا پن ہے مثل ہے جیسی اور کیسی۔ بیگم تو اور اب بتیس سے بھی اوپر ہیں۔ گئی ہیں تو تیس بتیس دن سے پہلے کیا آئیں گی۔ خیر ان کے بغیر ہی گزارا کرنا پڑے گا۔ کل رات کو نیند اچٹ گئی تو بڑی دیر سے آنکھ لگی۔ آج بھی کچھ ایسے ہی آثار ہیں۔ نیند خراب ہو گی۔ دل اڑا اڑا سا ہو رہا ہے "

میں نے نیچے اتر کر امینہ سے پوچھا اسلم کیا کہتے تھے کب تک آئیں گے ؟

"جی انھوں نے تیم تو کوئی نہیں بتایا تھا"

میں پھر جلدی سے پلٹ کر اوپر بالکنی میں آکر بیٹھ گیا اور صورت حال پر غور کرنے لگا۔ یہ آج نہ آتی تو میں اس وقت کلب جاتا۔ وہاں کچھ اچھی صورتیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں مگر پھر آج گھر میں بھی ایک اچھی سی صورت موجود ہے۔ اسے تو کسی سنگھار کی بھی ضرورت نہیں۔ بڑی صاف

[illegible] سی ہے۔ بات چیت لب و لہجہ بھی اچھا ہے۔ مگر لبی ہونٹ بڑے رسیلے سے لگتے ہیں۔ چلتی آہستہ ہے موج صبا کی طرح۔ کام کرنے میں جھپاکا نہیں بس ایک طرح کا قرینہ ضرور محسوس ہوا۔ کھڑے کھڑے کام کرتی رہی۔ اس کے گھر میں تو امریکی کچن نہیں ہوگا۔ اکڑوں بیٹھتی ہوگی۔ گھٹنے پیٹ کو لگتے ہیں۔" شاید یہ مثل ایسی ہی نشست یا حالت کو دیکھ کر گڑی گئی ہوگی ہماری ماما مریم تو فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھتی ہے پانو پسارے۔ لوگ عورتوں کے سینے کو اشتیاق انگیز سمجھتے ہیں۔ شاعری میں بھی اسی پر زیادہ زور ہے۔ میں کہتا ہوں پچھاڑی کچھ کم مُدکشش نہیں ہوتی۔ دکن کی عورتوں کا جسم کس غضب کا لوچ دار ہوتا ہے اور چال کیسی کہ دیکھتے ہی رہو۔ آگے بڑھ کر نظر کرو تو ساٹھ برس کی بڑھیا۔

امینہ پھر بغیر کسی آہٹ کے اوپر آگئی۔ میں جلدی سے بالکنی سے اندر کمرے میں آگیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے اس کے ساتھ بالکنی میں دیکھے۔ میں نے کہا ہاں کہو کیا وہ آگئے ؟

"جی نہیں" وہ بولی "وہ نہیں آئیں گے۔"

ہیں یہ کیا ؟ یہ کیوں ؟ میں نے گھبرا کر کہا۔ وہ بولی "انھوں نے کہا تھا میں نہیں آؤں گا۔ تم رات کو یہیں سو جانا۔"

میرا اعصابی دباؤ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ بات کر رہی تھی تو میری بیوی کی تصویر اس کے پیچھے سامنے کی دیوار پر تھی۔ شادی کے دن کی تصویر تھی۔ دونوں چہرے ایک ساتھ میرے مقابل تھے۔ میں نے کہا تمھارے پاس گھر کی چابی ہے تو میں تمھیں گھر چھوڑ آؤں ؟ اس نے کہا۔ چابی نہیں ہے ۔ میں نے کہا " مضائقہ نہیں ہم قفل توڑ دیں گے۔ اس نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا "وہاں جی وہاں کوئی تالا نہیں لگا ہے۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا یہ کیوں ؟ وہ بولی "اس لیے کہ وہ خود وہیں پر ہیں۔ کہیں نہیں گئے۔" میں نے کہا "اس بہانے بازی کا مطلب ؟ دیکھو تم مجھے سچ سچ بتاؤ۔ نہیں تو اچھا نہیں ہوگا۔" میں دل میں ڈرا کہ یہ کوئی سازش ہے مجھے پھانسنے کی۔ بلیک میل کیا جا رہا ہوں۔ یہ لوگ تو بڑے فتنہ نکلے۔ میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا "صاحب ان سے تو میں آپ کو سچی بات بتادوں۔ میں نے اطمینان دلایا کہ واقعی سچ بولو گی تو میں کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جس سے تمھیں نقصان پہنچے۔ وہ کچھ لمحے اور دھکڑ پکڑ میں رہنے کے بعد بالآخر بولی "ہماری شادی کو دو سال ہوئے مگر ہم میاں بیوی کی طرح نہیں رہتے ہیں" یہ ایک اور اچنبھے میں ڈالنے والا انکشاف تھا۔ میں نے کہا یہ بات تو تم نے کسی کو کیوں نہیں بتائی۔ تمھارے ماں باپ تمھیں اس سے چھڑا کر تمھاری شادی کہیں اور کر سکتے تھے میری جرح پر اس نے انکشاف کیا کہ ماں باپ پہلے ہی گزر چکے

ے۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ رہتی تھی اور بہنوئی کا تبادلہ دور کے شہر کا ہو گیا تو اس سے بھی کوئی ابطہ نہیں رہا۔ وہ لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتی۔ میاں نے پکی قسمیں بھی دے رکھی تھیں اور کہا تھا ۔ وہ اپنا علاج کروا رہا ہے۔ یہ وقتی بات ہے تھوڑے دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ چپ رہی اس لیے کہ کوئی دوسرا ٹھکانا نہیں تھا اسے یہ کہتے شرم بھی آتی تھی کہ جیسے روٹی کپڑا اس کے لیے کافی ہیں ہے

میں نے کہا تو اس کا مطلب یہ کہ تم اب تک کنواری ہو ؟ کیا یہ سچ ہے بتاؤ کیا یہ سچ ہے ؟ ے حیرت پر حیرت ہوتی چلی جارہی تھی کہ آخر یہ انکشاف بھی ہوا کہ اس کا بہنوئی بہن کی غیر اضری یا گہری غافل نیند کا کئی بار فائدہ اٹھا چکا تھا۔ کیونکہ اسے بھی روٹی کپڑا مہیا کرتا تھا۔ امینہ نے یک طرح سے شکر بھی کیا تھا کہ شوہر پر یہ راز کھلنے نہ پایا جس سے وہ شادی سے پہلے ڈر رہی ی۔"

امینہ کا سینہ رازوں کا دفینہ تھا۔ ابھی اس کے سینے میں ایک راز اور بھی تھا جو رفتہ رفتہ کھلا۔ ہ پر ایک اور بجلی گری۔ اس نے آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان مجھے ڈرتے ڈرتے اور قسم دے بتلایا کہ وہ کہتا ہے تجھے اولاد کا ایسا ہی شوق ہے تو صاحب کے ساتھ جا کے سو رہ اور مجھے بھی ترقی لا دے۔ ان سے کہہ کے کسٹم میں لگوا دے۔ وہ لگوا سکتے ہیں۔ پھر ہمارے وارے نیارے و جائیں گے۔

ہم ٹہل ٹہل کر باتیں کر رہے تھے۔ اس عرصے میں میری بیگم کی تصویر کبھی میرے قابل آجاتی کبھی پس پشت چلی جاتی۔ حسن و شباب کا وہ مسکراتا ہوا مرقع اس جیتے جاگتے مگر افسردہ ے مجسمے سے زیادہ رعنائی کا حامل تھا اگرچہ موہوم ہو چکا تھا۔ ہماری گفتگو جاری رہی

یہ ادھوری کہانی راقم الحروف کو پرانے کاغذات کے ایک انبار میں سے کوٹھری میں پڑے وئے ناقص فائل میں ملی جس کا آخری حصہ غائب تھا۔ یہ مکان میں نے اپنے ایک واقف کار زرگ کے ورثا سے ان کے اچانک انتقال کے بعد خریدا تھا جبکہ ورثا نقل مکانی کر کے پردیس جا چکے تھے۔ آپ اس کہانی کو اپنے ظن یا ذوق کے مطابق مکمل کر سکتے ہیں سچ پوچھیے تو بعض آب زدہ یا عدوم حصے میں نے اپنے قلم سے اپنے تخیل کے مطابق بند کیے ہیں کہ کہانی کا تسلسل نہ ٹوٹے۔ یسے بھی کہانی کار کا مقصد پڑھنے والے کے تخیل کو اکسانا ہی ہوتا ہے۔ قاری اکثر اپنے آپ کو کسی ردار سے ملا کر اپنے طور پر سوچتے ہیں کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا یا میں ہوتا تو کیا کرتا۔ اتنا عرض ردوں کہ مرحوم ایک نیک نام انسان تھے جن کی ذات سے کوئی اسکینڈل وابستہ نہیں تھا اگرچہ در عہد جوانی چناں کہ افتد و دانی۔

پروفیسر [illegible] اللہ
سرسید نگر علی گڑھ

"بیاض غالب" کی بحث

میں نے ایک ضرورت سے غالب نامہ کا "مولانا امتیاز علی عرشی نمبر" نکالا۔ اس میں پروفیسر گیان چند جین صاحب کا مقالہ "بیاض غالب۔ تحقیقی جائزہ، کا تحقیقی جائزہ" سامنے آگیا تو اسے بھی پڑھ ڈالا۔ جو خیال ذہن میں پیدا ہوئے بے کم و کاست لکھ کر بھیجتا ہوں۔

محمد انصار

استاد مرحوم قاضی عبدالودود صاحب فرماتے تھے کہ مضمونوں اور کتابوں کے چھپنے پر پابند عائد کر دینی چاہیے۔ اب خیال ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کی یہ رائے بالکل صحیح تھی۔ ہمار۔ زمانے کا حال یہ ہے کہ ذاتی تاثرات، مفروضات اور تعصبات کو تحقیق کے نام سے شائع کر۔ رہنے کا چلن سا ہوتا جارہا ہے بلکہ بڑی بڑی بد عنوانیاں بعض بڑوں کے قلم سے ظاہر ہو ہیں۔ اس صورت حال میں اردو تحقیق نہ صرف رسوا ہو رہی ہے بلکہ اس کا معیار بھی گرتا جا ہے۔

ذاتی طور پر میں پروفیسر گیان چند صاحب کے نیاز مندوں میں ہوں اور ان کا نہایہ احترام کرتا ہوں اس لیے ان کے قلم سے جب کوئی غیر محتاط اور غیر ذمہ دارانہ تحریر سامنے آ ہے تو رنج زیادہ ہوتا ہے۔ کمال احمد صدیقی کی "بیاض غالب۔ تحقیقی جائزہ" سے متعلق ان مقالے سے بھی کچھ ایسی ہی کیفیت دل و دماغ پر گزر گئی۔ مقالے کی ابتدا ان کلمات سے ہو ہے:

"1969 میں دریافت شدہ مخطوطہ دیوانِ غالب کو عام طور سے بخط غالب تسلیم کیا گیا۔ صرف ڈاکٹر انصار اللہ نظر، ڈاکٹر سید حامد حسین اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے اسے بخطِ غیر ٹھہرایا۔"

بخطِ غالب اور بخط غیر تسلیم کرنے نہ کرنے کی بحث کیا ایسی تھی جس میں عوام اور عامی بھی لیتے؟ مخطوطے کو سب سے پہلے امتیاز علی خاں عرشی صاحب نے (بغیر دیکھے) اس کے لا والے کو "جبرئیل" اور اسے بخط غالب فرما دیا تھا۔ کسی نے بھی اس کے بخط غالب ہونے ہونے پر علمی اور تحقیقی اعتبار سے غور نہیں کیا تھا۔ پہلی مرتبہ اس بحث کا آغاز انصار اللہ

ے کیا تھا۔ کچھ لوگوں نے تائید کی اور کچھ نے بڑے زور شور سے انصار اللہ کی تردید کی۔ تردیدی
نے والوں میں زیادہ جوش و خروش انھوں نے دکھایا تھا جن کے اس نسخے سے براہ راست اور
واسطہ مفادات وابستہ تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی شخصیت استثنائی تھی۔ باوجود یہ کہ نسخہ
شی زادہ کا انھوں نے تعارف لکھا تھا، ہماری زبان میں جامعین کے مراسلے ان کی ایما سے شائع
تے رہے۔ پروفیسر گیان چند نے اوپر کے اقتباس میں صرف تین نام لیے ہیں حالانکہ
سرے ہی جملے میں انھیں ایک چوتھا نام لینا پڑا ہے۔ ہماری زبان کے اوراق میں اور بھی نام
ں گے۔ ایک بہت اہم نام پروفیسر لطیف الزماں خاں صاحب کا بھی جو اس نسخے کو جعلی قرار
ینے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے بلکہ سچ یہ ہے کہ ان کے تائیدی خطوں نے ہی اس بحث میں
ن ڈال دی تھی۔ فریق مخالف کی تعداد کو کم کر کے پیش کرنا اور اس جماعت کے ایک نہایت
ن کو سہواً یا عمداً قلم انداز کر دینا صریحاً جانبداری ہے۔ اس طور پر جو بحث کی جائے گی وہ جیسی
ی ہو "تحقیقی" ہرگز نہیں ہو سکتی۔

مذکورہ دو جملوں کے بعد جین صاحب کا تیسرا جملہ یہ ہے کہ "ڈاکٹر انصار اللہ اور اس
ے مندرجات کو کلام غالب ہی تسلیم کرتے ہیں۔" اس جملے کی ساخت اور صحت کے بارے
ں کچھ عرض کرنا غیر ضروری ہے۔ جین صاحب خود ملاحظہ فرمالیں۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے
. اپنے مفروضات کو دوسرے کے سر منڈھ دینا تحقیقی نقطۂ نظر سے تو غیر مستحسن ہے ہی، عام
لاقی آداب کے بھی خلاف ہے۔ ہماری زبان کے صفحات گواہ ہیں کہ میں نے تذکرۂ خوشگو
ں منقول غزل کے بارے میں یہ لکھا تھا کہ وہ مرزا غالب کی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ بے شک
ال احمد صدیقی صاحب نے اس بات کو زیادہ زور شور سے کہا ہے لیکن انھیں منفرد یا تنہا خیال
. لینا خوش فہمی بلکہ خود فریبی ہے۔

کہتے ہیں کہ لیلا سے عشق کا تقاضا یہ ہے کہ سگ لیلا کے لیے بھی عاشق اپنے دل میں
یسے ہی جذبات پیدا کر لے۔ جین صاحب بڑے عالی مرتبت اور اظہار معاملات میں نہایت
ص ہیں۔ وہ پورے خلوص کے ساتھ بیاض غالب کے موید حامی اور طرفدار ہیں۔ انھوں
نے نسخۂ عرشی زادہ کے "نرخ بالا" کے لیے تین وجوہ بیان کیے ہیں اور کمال احمد صدیقی صاحب
ا کتاب کو "سخن کاسہ" قرار دے کر اس کے لیے لکھا ہے کہ یہ "ان سب اوصاف سے عاری
ہے۔"

جین صاحب اگرچہ بخیال خویش "تحقیقی جائزہ" قلمبند فرما رہے تھے، سامنے کی اس
یقت سے نگاہیں صاف بچا گئے کہ نسخۂ عرشی زادہ کے طابع و ناشر کو کتاب کے اصل متن کی

کتابت پر کوئی رقم تحریر نہیں کرنی پڑی تھی جبکہ کمال صاحب کو پوری کتاب کی کتابت کے ساتھ ساتھ کئی صفحے کسی منجھے ہوئے کاتب سے نہایت اہتمام کے ساتھ ایک منتعین اندازِ خط پر لکھوانے پڑے تھے۔ ان چند صفحات کی پیشکش ان لوگوں کے لیے جو دیانت کے ساتھ قلمی تحریروں کا جائزہ لینا چاہیے ہیں بڑی اہم ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب فرماتے تھے کہ اگر تم کوئی بات نہیں جانتے تو اُس کا اعتراف کرنے میں ہرگز نہ شرماؤ۔ اسی طرح اگر کوئی بات تم جانتے ہو تو جہاں ضرورت ہو' بغیر کسی تامل کیے اس کا اظہار کرو۔ کمال احمد صدیقی صاحب کی تنقید و تحقیق ہی نہیں' نثر نویسی سے بھی تعلق نہیں رہا تھا لیکن جب ان کے سامنے معاملہ آیا تو جس طرح بھی بن پڑا بلا جھجک نہایت انکساری سے اپنے خیالات قلم بند کر دیے۔ بیاضِ غالب جیسے متنازع موضوع سے متعلق انھوں نے خیال انگیز کتاب پیش کر دی۔ ان کی علمی جسارت بہر حال داد طلب ہے۔

پروفیسر گیان چند جین نے اپنے "تحقیقی جائزے" کو ان جملوں پر ختم کیا ہے:

"مصنف کی غیر معمولی محنت اور کوشش کے باوجود میں قائل نہ ہو سکا کہ نسخہ غالب کی تصنیف نہیں۔ اس کے اشعار پکار پکار کر اپنے خالق کا اعلان کر رہے ہیں۔ اردو میں اور کون ایسا کج فکر و ژلیدہ بیان ہو سکتا ہے۔"

جین صاحب نے ان اشعار کی "پکار" سن کر ان کے موافق فیصلہ سنا دیا۔ بالکل یہی بات مولوی عبدالباری آسی الدنی نے بھی غالب کے اس غیر مطبوعہ کلام کے بارے میں کہی تھی جو کسی بیاض میں ان کو دستیاب ہوا تھا۔ لکھا ہے:

"جب ہم سمجھ چکے ہیں کہ یہ کلام مرزا کے کلام کے سوا اور کسی کا ہو ہی نہیں سکتا تو پھر کسی اور کاوش کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کہیں سے بہم پہنچا ہو اور کسی طرح پہنچا ہو، بہر صورت کلام ان کا ہے۔"

(مکمل شرح کلام غالب ص ۴۳)

لیکن جین صاحب نے آسی کی بات کو نہیں مانا۔ ان کے نزدیک آسی نے جو کلام پیش کیا تھا وہ قطعاً جعلی اور وضعی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں۔ چت بھی میری اور پٹ بھی میری۔ یاد رہے کہ آسی کے موذین میں مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتحپوری جیسے صاحب نظر تھے اور مخالفت میں اس زمانے میں کوئی معتبر آواز نہیں ابھری تھی۔

شاید کوئی صاحب یہ کہنا چاہیں کہ زمانہ مابعد میں جلیل قدوائی صاحب نے آسی کے پیش کردہ کلام منسوب بہ غالب سے متعلق "اعتراف" شائع کر دیا تھا تو عرض ہے کہ وہ جلیل

قدوائی صاحب کی خوبی اور نیکی تھی لیکن کیا ضروری ہے جس بیاض غالب کی حمایت جین صاحب فرما رہے ہیں اسے بھی کوئی جلیل قدوائی میسر آہی جائے۔ ویسے نیک دل نیک طبع اب کہاں ؟ آج تو پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنی بات پر اڑے رہنا ہی کمال تحقیق ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اسی بیاض غالب کے سلسلے میں پروفیسر گیان چند جین نے مجھے ایک خط لکھا تھا۔ میں نے اپنے موقف کی تائید میں اس کا ایک اقتباس شائع کر دیا تو جین صاحب نے لکھا کہ :

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے انصار اللہ صاحب کو خط میں لکھ دیا کہ غالب ہمیشہ ض کو گول پیٹ کے ساتھ لکھتے تھے۔"

(ہماری زبان یکم دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۵)

میں اس واقعہ کو بھی نہیں بھول سکتا کہ بیاض غالب سے متعلق بحث چھیڑ دینے کے جرم میں اس بات کی بھی کوشش کی گئی کہ مجھے ملازمت سے برطرف کرا دیا جائے۔

پروفیسر جین صاحب نے میرے ایک مضمون میں سے ایک جملہ نقل کیا تھا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ میرے جیسے لوگ اپنے بزرگوں کی شان میں کس حد تک گستاخ ہو سکتے ہیں لیکن شاید جین صاحب نے انھیں بزرگ کے حلقے سے شائع ہونے والا وہ مضمون نہیں دیکھا کہ جس کے خاتمہ میں کہا گیا تھا کہ اگر اس فتنے (محمد انصار اللہ) کو اسی وقت کچل نہ دیا گیا تو کل بڑی مشکل ہو گی۔ سچ ہے جب علم و استدلال ساتھ نہ دے تو یہی کرنا چاہیے؟

آخر میں طرز بیان اور رنگ کلام وغیرہ کی شناخت سے متعلق بھی دو باتیں عرض کرتا ہوں :

(الف) ہمارے محققین بالاتفاق اور بغیر کسی شک و شبہ کے نصف صدی سے زاید مدت تک معراج العاشقین کو خواجہ بندہ نوازؒ کی تصنیف کی حیثیت سے پڑھتے اور پڑھاتے رہے ہیں۔ ایک دو ہی سہی لیکن ہمارے یہاں ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں جب ہم نے آدمی کو کتاب اور کتاب کو آدمی تسلیم کیا ہے۔

(ب) پروفیسر مجنوں گورکھ پوری نے لکھا ہے کہ :

"اس طرح کے اشعار بھی نظر آجاتے ہیں جو تربیت یافتہ ذوق کو گراں گزرتے ہیں اور جو اگر غالب کے دیوان میں نہ ہوتے تو وہ غالب سے کبھی نہ منسوب کیے جا سکتے"

(غالب شخص اور شاعر ص ۴۳)

اس کے برخلاف دوسرے شاعروں کے یہاں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جو اس حد تک غالب کے "رنگ" میں ہیں کہ خواہی نخواہی انھیں غالب کے کلام میں شامل کرنے کو ناقدین کا دل چاہتا ہے مثلاً مجنوں صاحب ہی فرماتے ہیں کہ :

اس شعر پر غور کیجیے اگر یہ غالب کا ہی شعر ہے۔

روائی کی نہ دی تقدیر نے مقصد کو منظوری
بہم رہنے لگے دونوں تمنا اور مجبوری

(غالب شخص اور شاعر ص ۴۹)

تلاش کیجیے تو معتبر ناقدین کے یہاں بھی دوسرے کے شعر کو غالب سے منسوب کیے جانے کی مثال مل سکتی ہے۔

مرزا غالب غزل گو شاعر تھے اور غزل کے بہت بڑے ناقد پروفیسر یوسف حسین خاں صاحب ہوئے ہیں۔ ان کی ضخیم و جحیم کتاب اردو غزل میں ذوق کے جو اشعار نقل ہوئے ہیں ان میں دو شعر قصیدے کے ہیں، غزل کے نہیں ہیں۔

(اردو غزل طبع چہارم ص ۴۹۵)

ان حالات میں کسی صاحب کی شناخت یا ذوق سلیم پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے اس کا فیصلہ پروفیسر گیان چند صاحب بہتر کر سکتے ہیں۔

پروفیسر گیان چند صاحب نے اپنے تحقیقی جائزے کی ابتدا میں صرف تین نام گنائے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تحقیقی جائزہ بھی کوئی ایسا طرز حکومت ہے جس میں ع

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ظہیر غازی پوری
ہاشمیہ کالونی ہزاری باغ

غزل

نئی سحر بھی نیا آفتاب بھی ہو گا
شعور و فکر میں جب انقلاب بھی ہو گا

بدل ہی جائے گا پھر موسم حیات اپنا
سکوں کے ساتھ اگر اضطراب بھی ہو گا

تپش، سراب، تھکن، پیاس، کرب، بیتابی
سفر کے ساتھ سفر کا عذاب بھی ہو گا

سمجھ سکو تو تقاضائے زندگی سمجھو
جو دل ہے زندہ تو آنکھوں میں خواب بھی ہو گا

لبوں پہ ہوں گے سلگتے ہوئے سوال تو پھر
شرر فشاں مرا اک جواب بھی ہو گا

دل و نگاہ کو جو شعلہ تاب کرتا ہے
ہمارے نام ہی وہ احتساب بھی ہو گا

فساد و قتل میں رہتا ہو جس کا ہاتھ ظہیر
وہی تو شہر میں عزت مآب بھی ہو گا

بابا سرو استوار ند ساغری
آر۔۱۶ سیکٹر ۱۱ نوئیڈا (یوپی)

غزل

روایتوں کے خداؤں میں جنگ ہے کچھ اور
مگر سنو تو صدائے ملنگ ہے کچھ اور

نہ جانے کون سا طوفان آنے والا ہے
سیاہ رات کے بہنے کا ڈھنگ ہے کچھ اور

گلاب رُت کی شفق منظری کا کیا کہنا
بسنت رُت کا مگر داو رنگ ہے کچھ اور

ہمارے ہم سفروں کی اڑان منزل تک
مگر ہمارے تو دل میں ترنگ ہے کچھ اور

روایتوں کی شکستہ حدود سے ہٹ کر
ہماری اہلِ زمانہ سے جنگ ہے کچھ اور

یہ مانا شام بچھائے گی سرئی چادر
تمتمتی دھوپ میں لیکن امنگ ہے کچھ اور

سفید بالوں میں مہندی رچائے پھرتے ہو
جناب رند تمہارا بھی ڈھنگ ہے کچھ اور

بشیر فاروقی

غزل

آدمی صورتِ نظارہ سے ڈر جاتا ہے
ورنہ ہر سیلِ بلا آکے گزر جاتا ہے

لوٹ لیتے ہیں خود اس کے ہی ارادے اس کو
وہ مسافر کہ جو رستے میں ٹھہر جاتا ہے

سارے دن بانٹ کے دنیا کو اجالے اپنے
شام کو چہرۂ خورشید اتر جاتا ہے

سر بچاتا ملوں تو لگتا ہے کہ دستار گری
اور دستار بچاتا ہوں تو سر جاتا ہے

لذتِ زخمِ وفا کیا ہے یہ ہم جانتے ہیں
ہم کو وہ زخم نہ دو تم کہ جو بھر جاتا ہے

ان دنوں وہ کسی الجھن سے پریشاں تو نہیں
بار بار آج یہ کیوں ذہن ادھر جاتا ہے

ایک بھی پھل کسی اک شاخِ شجر سے نہ گرا
پھینکتا ہوں میں جو پتھر وہ کدھر جاتا ہے

زندگی مشک کی صورت ہے نہاں ہم میں بشیر
ڈھونڈتے ڈھونڈتے آہو جسے مر جاتا ہے

زاہد نظر
جی ۲۳ بنگلہ بستی گارڈن ریچ
مٹیابرج کلکتہ ۷۰۰۰۲۴

غزل

نظر سے ہوتا ہے جب بھی مباحثہ کوئی
بڑا لطیف سا ہوتا ہے حادثہ کوئی

فصیلِ جسم پہ روشن ہزار چہرے ہیں
تلاش پھر بھی نہ کرپایا راستہ کوئی

تلاشِ گمشدہ منزل کی جستجو لے کر
ہر اک نفس میں اٹھاتا ہے زلزلہ کوئی

یہ قیدِ شش جہت تک نہیں سفر میرا
مرا تو تا بہ نظر کا ہے راستہ کوئی

فصیلِ جسم کے باہر کھڑا ہوا ہوں میں
دکھا رہا ہے ضرورت کا آئینہ کوئی

خلا کا بوجھ کہاں تک زمیں اٹھائے گی
ملادے دونوں کا دنیا سے راستہ کوئی

ڈاکٹر وہاب قیصر
وائس پرنسپل ممتاز کالج
ملک پیٹ، حیدر آباد500036

انٹرنٹ

دوسری جنگِ عظیم کے دوران امریکہ میں شدت کے ساتھ ایک ایسے مواصلاتی نظام کی ضرورت محسوس کی گئی جو ملک کے کسی حصے پر دشمن کی بمباری کی صورت میں فوجی عہدیداروں کے درمیان ربط قائم رکھنے میں مدد دے سکے۔ کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد ہی اس ضرورت کی تکمیل ممکن ہو سکی جب کہ پال بارن(Paul Baran) نے1962ء میں ایک ایسا طریقہ ڈھونڈ نکالا جس میں مواصلاتی نظام کو جال کی شکل میں قائم کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کے کہیں سے ٹوٹ جانے پر بھی مواصلاتی مراکز کا آپسی ربط برقرار رہ سکے۔

رے ٹام لنسن(Ray Tomlinson) نے1972 میں پیامات کی تیز رفتار کے ساتھ ترسیل عمل میں لانے کے لیے الکٹرانک میل(Electronic Mail) کو ایجاد کیا۔ اس کے بعد اطلاعات کی ترسیل کے لیے ایک مواصلاتی جال قائم کیا گیا جو ارپانٹ(ARPANET) کہلاتا ہے۔ ارپانٹ کو پہلے پہل امریکی جامعات میں اور فوج کو درکار عصری اسلحہ جات کی تحقیق کرنے والے اداروں کے درمیان قائم کیا گیا تھا۔ الکٹرانک کی تیز تر ترقی کی بدولت ارپانٹ مختلف مراحل سے گزرتا ہوا1982 میں ایک نئے مواصلاتی اور تفصیلی نظام انٹرنٹ پروٹوکال(I.P) یعنی تبدیل ہو گیا جو عام اصطلاح میں انٹرنٹ (INTERNET) کہلاتا ہے۔ یہاں یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ لفظ انٹرنٹ انگریزی زبان کے دو الفاظ Interconnection اور Network کو ملا کر مدون کیا گیا ہے۔

الکٹرانک میل آج بھی انٹرنٹ کی ابتدائی سروس کے طور پر مستعمل ہے۔ جس کو عام طور پر ای۔ میل(E-Mail) کہا جاتا ہے۔ ابتدا میں اس کو صرف تعلیمی سرگرمیوں سرکاری امور اور صنعتی تحقیقات کی حد تک ہی استعمال کیا جاتا تھا لیکن اب یہ دنیا بھر میں ہر اس شخص کے استعمال میں ہے۔ جس کا کمپیوٹر انٹرنٹ سے جڑا ہوا ہے۔ کسی بھی کمپیوٹر کو انٹرنٹ سے جوڑنے کے لیے ماڈیم(Modem) ٹیلی فون لائن اور انٹرنٹ سروس مہیا کرنے والے ادارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماڈیم ایک ایسا الکٹرانک آلہ ہوتا ہے جو کسی کمپیوٹر کی تمام اطلاعات اور اعداد و شمار کو خاص اشاروں میں تبدیل کر کے ٹیلی فون لائن کے ذریعہ ایک مخصوص رفتار کے ساتھ ارسال کر دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ ایسی تمام اطلاعات اور اعداد و شمار پر مشتمل اشاروں کو حاصل

بھی کرتا ہے جو اس سے منسلک کمپیوٹر کے لیے ترسیل کیے جاتے ہیں۔

الکٹرانک میل میں انٹرنٹ کی ایسی سہولت موجود رہتی ہے جس کی بدولت کوئی بھی شخص کسی بھی طرح کا پیام صرف چند منٹوں کے وقفہ میں دنیا کے کسی بھی حصے میں بھیج سکتا ہے۔ ان بیانات کی ترسیل اسی وقت ممکن ہوتی ہے جب کہ دوسرے شخص کا ای۔ میل پتہ (E-Mail Address) معلوم ہو۔ ای میل پیام کی ترسیل کا بہت ہی سستا نظام ہے۔ اس میں سہولت بھی موجود رہتی ہے کہ ٹیلکس یا فیکس مشین رکھنے والے شخص کے لیے بھی ای میل کے ذریعہ پیام بھیجا جاسکتا ہے۔ البتہ ٹیلکس یا فیکس مشین رکھنے والا شخص ای میل کے ذریعہ پیام نہیں بھیج سکتا۔

انٹرنٹ حقیقت میں کمپیوٹروں کے ذریعہ قائم کیا گیا مواصلاتی نظام کا ایک بہت بڑا نٹ ورک ہے۔ جس میں ہزاروں چھوٹے اور کئی بڑے نٹ ورک شامل رہتے ہیں۔ گویا الکٹرانک جالوں کا ایک جال سارے براعظموں کو مواصلاتی لائنوں پر جوڑ دیا گیا ہے۔ اس کی بدولت کئی ممالک کے لاکھوں افراد براہِ راست ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ 1990ء کی ابتدا تک انٹرنٹ زیادہ تر سائنس کی تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک مواصلاتی جال کی طرح عمل پذیر رہا جس میں سائنسی ماہرین کے مابین تحقیق کردہ نتائج کی ترسیل عمل میں لائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے بھی ایک دوسرے سے تعلیمی ربط قائم رکھتے تھے۔ انٹرنٹ کی سہولت دنیا بھر میں ہر ایک کے لیے اس وقت سے دستیاب ہونے لگی جب الکٹرانک میل کے ساتھ ساتھ ورلڈ وائڈ ویب WWW کی سہولت کا احیا عمل میں آیا۔ WWW انفارمیشن ٹکنالوجی کی وہ سروس ہے جس کے ذریعہ ترسیل کی سہولت کو ایک نٹ ورک سے دوسرے نٹ ورک پر منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اس سروس میں تحریری مواد تصاویر اور آواز کی ترسیل عمل میں لائی جاتی ہے۔ کوئی شخص ورڈ وائڈ ویب کو اسی وقت استعمال کرسکتا ہے جب کہ اس کے لیے Web Sight حاصل ہو جائے۔

الکٹرانک میل اور ورلڈ وائڈ ویب کے علاوہ انٹرنٹ پر کئی ایک دوسری سہولتیں بھی دستیاب رہتی ہیں جن میں فائل ٹرانسفر پروٹوکال (FTP)' ٹیل نٹ (Telnet) اور یوزنٹ (Usenet) قابل ذکر ہیں۔

فائل ٹرانسفر پروٹوکال 'انٹرنٹ کی ایک ایسی سہولت ہے جس میں کسی دور مقام پر موجود کمپیوٹر میں محفوظ کسی اطلاع کی نقل حاصل کرلی جاسکتی ہے جب کہ ٹیل نٹ میں دور کے کسی کمپیوٹر کو بالکل اسی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے جس طرح کہ مقامی کمپیوٹر کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یوزنٹ

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

چہرہ در چہرہ — مجتبیٰ حسین

مجتبیٰ حسین نے بلاشبہ شخصی خاکہ نگاری کو ایک نیا اسلوب اور نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ اردو کے بیس اہم شخصیتوں کے باغ و بہار خاکے۔ قیمت/51 روپے

شعریات سے سیاسیات تک

غلام ربانی تاباں۔ مترجم اجمل اجملی

فرقہ واریت کے خلاف تاباں صاحب کے انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ۔ قیمت/51 روپے

جھینی جھینی بینی چدریا۔ عبدالبسم اللہ

مترجم۔ وسیم حیدر عباسی

سویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور کیندریا ایوارڈ یافتہ یہ ناول بنارس کے انصار بھائیوں کی تہذیب و تمدن کی ایک روشن تصویر ہے۔ جس کو ناول نگار نے دس سال بنکروں کے بیچ رہ کر انہی کی زبان اور کلچر پر قلم بند کیا ہے۔

قیمت/75 روپے

کچھ مشرق سے، کچھ مغرب سے

ڈاکٹر سید نقی حسین جعفری

انگریزی عشقیہ شاعری کے فروغ میں اندلسی اور عرب تہذیب و ادب کے بعض مصادر کی نشاندہی اور فراق اور شہریار کی شعری حسیات میں مغربی رجحانات کے بارے میں علمی مضامین 'گلستاں سعدی کے منظوم اردو تراجم'۔ 'دانشوری اور تصور مذہب'۔ میر' سودا اور ناصر کاظمی کی غزلوں کے تجزیے اور بعض اہم کتابوں پر تفصیلی تبصرے۔ قیمت/75 روپے

تاثر نہ کہ تنقید — صدیق الرحمٰن قدوائی

تنقید ادب کی ایک اہم شاخ ہے مگر اس کا ضرورت سے زیادہ چرچا بھی اچھا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص "نقاد" ہو جائے۔ ادب کو تنقید کے سوا بھی مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے جن کا انحصار پڑھنے والوں کے انفرادی مزاجوں پر ہے۔ یہ تصنیف ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک باعث تفریح بھی کرتی ہے۔ قیمت/51 روپے

گوشے میں قفس کے — دلیپ سنگھ

(طنزیہ و مزاحیہ مضامین)

دلیپ سنگھ کا نام اب طنزیہ و مزاحیہ ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ "گوشے میں قفس کے" آپ کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ دلچسپ انسان کے نہایت دلچسپ مضامین کا مجموعہ۔

قیمت/45 روپے

ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (ناول)

کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کا بھوپال گیس ٹریجڈی کے موضوع پر ناول۔ انسانی رشتوں کے بننے، استوار ہونے اور ٹوٹنے کی دردانگیز داستان، جو ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ قیمت/40 روپے

سفر (ناول) رابعہ تبسم

رابعہ تبسم کا ایک اچھوتا رومانی ناول۔ روزانہ زندگی میں پیش آنے والی خوشیوں اور غموں کا سنگم۔ یہ انتہائی رنگین ہے اور سنگین بھی۔ قیمت = 27 روپے

جمنا داس اختر: (شخصیت اور ادبی و صحافتی خدمات)

مرتبہ۔ گربچن چندن

جمنا داس اختر کا نام اردو کی سنجیدہ صحافت کی آبرو ہے اس خصوصی شمارے میں ملک اور بیرون ملک کے ممتاز ادیبوں اور صحافیوں نے اختر صاحب کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ اس شمارے کی حیثیت تاریخ ہند کے اہم باب کی ہے۔ قیمت/90 روپے

اردو افسانہ بمبئی میں (۱۹۷۰ء کے بعد)

مرتبہ — الیاس شوقی

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں نئی نسل کے ۹ نمائندہ افسانہ نگاروں کا ایک ایک افسانہ شائع کیا گیا ہے۔ مرتب نے اپنے پیش لفظ کے آخر میں افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "۱۹۷۰ء کے بعد بمبئی کا افسانہ زندگی کی سچائیوں کی عمدہ مثال ہے"۔

قیمت/51 روپے

200، اگور اپارٹمنٹس
پٹ پڑ گنج۔ دہلی۔ 110002

سردار جعفری، اردو ادب اور گیان پیٹھ انعام

۔سردار جعفری ہندستانی شہری نہیں ہیں۔
۔سردار جعفری شاعر نہیں ہیں۔
۔سردار جعفری نقاد نہیں ہیں۔
۔سردار جعفری سیکولر نہیں ہیں۔
۔سردار جعفری سچے انقلابی نہیں ہیں۔

پتہ نہیں سردار جعفری خود اپنے بارے میں لوگوں کے اس قسم کے خیالات اور تاثرات نہ جانے کب سے سنتے آئے ہیں۔ خود ہم نے لگ بھگ پچھلی نصف صدی میں ادبی محفلوں میں ان کے بارے میں لوگوں سے اکثر ایسی باتیں سنی ہیں۔ بڑے ادیبوں اور فنکاروں کے خلاف ایسی باتوں کی تردید تو عموماً آنے والا وقت ہی کرتا ہے۔ اور ادب میں آنے والا وقت اپنے آنے میں خصوصاً بہت دیر لگادیتا ہے۔ خود غالب کو اس کے دور میں پہچانا نہیں گیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ آنے والے وقت نے مولانا حالی کے ہاتھ میں اپنی ترازو تھمادی۔ غالب جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کی شہرت یا بدنامی جو کچھ بھی تھی وہ کچھ ایسی تھی کہ جواری ہے، شرابی ہے، ڈومنی کے عشق میں گرفتار ہے، سربراہان مملکت کی شان میں قصیدے کہتا ہے وغیرہ لیکن غالب کے مرنے کے بعد جب ادب میں اس کے جینے کا وقت آیا تو احساس ہوا کہ غالب تو ہماری تہذیب اور ہمارے ادب کا سب سے مہذب، شائستہ اور شریف انسان تھا۔ منٹو کو بھی اپنی مختصر سی زندگی میں ایسی ہی باتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چونکہ ادب میں "اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے" والا سودا نہیں چلتا اس لیے ادب کے اکثر فیصلوں کو وقت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

پچھلے ہفتہ جب سردار جعفری کو ہندوستان کے سب سے بڑے ایوارڈ "گیان پیٹھ" کے ملنے کی اطلاع آئی تو سردار جعفری کے ایک پرستار کی حیثیت سے ہمیں اس بات کی خوشی ہوئی کہ ہندوستانی ادب کے لیے ان کی دین کے بارے میں فیصلہ کرنے والا وقت خود ان کی زندگی میں ہی چلا آیا ہے۔ یہ اور بات ہے

کہ اس کے لیے انھیں چند ہمعصر شعرا اور نقادوں سے عمر بھر 85 برسوں کی زندگی گزارنی پڑی۔ سردار جعفری اپنی بات پر اڑے رہنے، ڈٹے رہنے اور قائم رہنے کے لیے شہرت تو رکھتے ہی ہیں لیکن ہمیں ان کے اس قدر ضدی ہونے کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ آنے والے وقت کو بھی اپنی آنکھوں کے سامنے ہی آنے پر مجبور کر دیں گے۔

بلاشبہ سردار جعفری ہمارے ادب کی سب سے فعال، متحرک، توانا مگر ساتھ ہی ساتھ متنازعہ شخصیت رہے ہیں ان کے مخالفین تو انھیں نزاعی شخصیت مانتے ہی رہے ہیں ان کے مداح اور چاہنے والے بھی اس معاملہ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ تین برس پہلے ممبئی کے انتظامیہ نے انھیں ایک نوٹس جاری کر کے کہا تھا کہ وہ اپنے ہندوستانی شہری ہونے کا ثبوت فراہم کریں۔ ہم نے اس پر ایک کالم لکھا تھا جس میں ہم نے ان سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا تھا کہ جعفری صاحب کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ شمس الرحمن فاروقی انھیں شاعر نہیں مانتے اور باقر مہدی انھیں نقاد اور دانشور نہیں مانتے اور اب تو حد ہو گئی کہ ممبئی کا انتظامیہ انھیں ہندوستانی شہری بھی ماننے کو تیار نہیں ہے۔ آخر وہ کہاں تک اپنے ہندوستانی شہری ہونے، شاعر ہونے اور ناقد ہونے کے دستاویزی ثبوت فراہم کرتے رہیں گے۔ بابری مسجد جب تک نہیں گری تھی تو ہندی اور انگریزی کے اخبارات بربنائے مصلحت اسے "متنازعہ ڈھانچہ" لکھا کرتے تھے۔ ایک بار ہم نے مذاق مذاق میں دوستوں کی ایک محفل میں کہا تھا کہ جعفری صاحب بھی اردو ادب کا ایسا ہی ایک "متنازعہ ڈھانچہ" ہیں۔

اب جبکہ انھیں ملک کا اعلیٰ ترین ادبی انعام مل چکا ہے تو ہمیں یقین ہے کہ اب جعفری صاحب کو اپنے طور پر اپنے ہندوستانی شہری ہونے، شاعر اور ناقد سیکولر ہونے کے دستاویزی ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی (ابھی پچھلے مہینے مہاراشٹر اردو اکادمی نے ان پر فرقہ پرست ہونے کا الزام عائد کرتے ہوئے اپنا انعام دینے سے انکار کیا تھا)۔ سردار جعفری نے اس صدی کی پہلی دہے کے تین برسوں بعد دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں اور اب بیسویں صدی کے ختم ہونے میں صرف تین برس باقی رہ گئے ہیں۔ گویا پوری بیسویں صدی کے لگ بھگ سارے اہم واقعات اور حوادث کو انھوں نے برصغیر کے تناظر میں پورے ہوش و حواس اور فہم و ادراک کے ساتھ جھیلا ہے۔ بیسویں صدی انسانی تاریخ میں ایک سنگین اور عجیب و غریب تضادات والی صدی کے روپ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ دو عظیم جنگیں اسی صدی میں سردار جعفری کی آنکھوں کے سامنے لڑی گئیں۔ نو آبادیاتی نظام کے پرخچے اڑ گئے۔ برصغیر آزاد ہوا۔ سائنس نے ایسی حیرت انگیز ترقی کی کہ انسان خلا کی وسعتوں پر قابض ہونے اور دسترس رکھنے کے خواب

دیکھنے لگا۔ انقلاب روس بھی اسی صدی میں آیا اور اسی صدی میں اس کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ بیسویں صدی نے انسانیت کو نئے نئے خواب دیے اور اسی صدی میں یہ خواب چکنا چور بھی ہوئے۔ اس صدی میں پیدا ہونا اور پیدا ہو کر پل پل ایک حساس آدمی کی طرح زندہ رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ سردار جعفری نے اسی پُر آشوب صدی میں زندگی جی ہے اور ایسی بھرپور زندگی جی ہے کہ ان کے جینے پر رشک آتا ہے۔ کتنے شعلے تھے جو وقت کی دھار پر چلتے چلتے بجھ گئے یا مدھم پڑ گئے لیکن سردار جعفری نے اس صدی کے ایک ایک پل کے ساتھ جینا نہیں چھوڑا۔ اصل میں سردار جعفری نے ادب سے اپنے سروکار کو کچھ ایسا مستحکم اور اٹوٹ بنالیا کہ بھلے ہی کوئی انھیں شاعر، ادیب اور دانش ور نہ مانے پھر بھی انھوں نے ادب اور سراسر ادب کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا بنالیا۔ ادب سے ایسا والہانہ سروکار شاید ہی اردو کے کسی اور ادیب کی زندگی میں نظر آئے۔ یہ ضرور ہے کہ زندگی اور اپنے مخالفین سے نبرد آزما ہوتے وقت انھیں پینترے بدلنے پڑے۔ انھوں نے پینترے ضرور بدلے لیکن تھک ہار کر نہیں بیٹھ گئے۔ وہ اصل میں کل وقتی ادیب ہیں ہماری طرح جز وقتی ادیب نہیں جنھیں ادب لکھنے کے ساتھ ساتھ بجلی، پانی اور ٹیلی فون کے بل جمع کرنے پڑتے ہیں بال بچوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ سودا سلف لانے کے لیے بھی جانا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی بال بھی بنوانے پڑتے ہیں اور کبھی کبھی مجبوری میں ادبی محفلوں میں بھی جانا پڑتا ہے۔

پچھلے چالیس برسوں میں ہم نے جب بھی سردار جعفری کو دیکھا ادب اور سماج کی کسی نہ کسی گتھی کو سلجھانے یا بعض اوقات سلجھی ہوئی گتھی کو پھر سے الجھانے میں مصروف پایا۔ ان کی شخصیت کی جہتیں بھی کئی ہیں کہانی کار ہیں (سردار جعفری نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا) شاعر ہیں ناقد ہیں بے مثال مقرر ہیں دانشور ہیں۔ سیاست سے بھی واسطہ رہا ہے۔ گویا ایک ہمہ جہتی شخصیت ہیں۔ جہاں وہ حافظ رومی 'غالب' اقبال' کبیر اور ٹیگور کے شیدا ہیں وہیں ایلیا اہرن برگ لوئی اراگاں اور پابلو نرودا کے عاشق ہیں مارکس اور اینگلز سے ان کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ ہمارے ایک دوست اکثر کہا کرتے ہیں کہ اگر مارکس اور اینگلز سردار جعفری سے پہلے پیدا نہ ہوئے ہوتے تو سردار جعفری کو کچھ اپنے کام بھی کرنے کا موقعہ مل جاتا۔ اب تو آن کی زندگی کا بڑا حصہ ان دونوں کی مدافعت میں ہی گزر جاتا ہے۔ یوں بھی سردار جعفری کے نزاعی ہونے میں خود ان کا اتنا ہاتھ نہیں ہے جتنا کہ مارکس اور اینگلز کا ہے۔ سردار جعفری نہ صرف عالمی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ہندستانی زبانوں کے ادب سے بھی کماحقہٗ واقف ہیں۔ وہ اردو کی دو تین ادبی شخصیتوں میں سے ہیں جن کی شناسائی ہندستانی زبانوں کے سارے ادیبوں اور فنکاروں سے ہے۔ سردار جعفری اگرچہ مشاعروں میں بھی پابندی سے شرکت کرتے ہیں لیکن ہم انھیں "مذاکروں" میں سننا زیادہ

پسند کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی موضوع پر جب بولتے ہیں تو نکہ اس طرح بولتے ہیں کہ سننے والوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں۔ بات سے بات نکلتی ہوئی، منطق کے سرے تلاش کرتی ہوئی، آگہی کی راہوں پر چلتی ہوئی، کہیں رکتی ہوئی، گاہ گاہ پیچھے مڑکر دیکھتی ہوئی، پھر سرپٹ دوڑتی ہوئی، تاریخ اور مذاہب عالم کے حوالے دیتی ہوئی، فلسفہ کو اپنی آغوش میں سمیٹتی ہوئی، دانش کے گلے میں باہیں ڈالتی ہوئی۔ ان کی باتوں سے آپ کو اختلاف بھی ہو تو آپ ان کی جادو بیانی کے سحر میں ڈوب کر بہت دور تک چلے جائیں گے (ہمیں تو بعض اوقات ان کی تقریر کو سننے کے بعد اپنے گھر واپس جانا بھی دشوار نظر آیا) سردار جعفری نے نہ صرف اس صدی کی سوچ کو اپنے اندر سمولیا ہے بلکہ اس صدی کی سوچ کی تشکیل میں بھی حتی المقدور اپنا حصہ ادا کیا ہے۔

سردار جعفری کی ایک شاہکار نظم ہے۔ "میرا سفر"۔ اس نظم کو مایہ ناز رقاصہ شوبھنا نارائین نے نہایت خوبصورت ڈھنگ سے کتھک رقص میں بھی پیش کیا ہے۔ وہ ایک بار خود جعفری صاحب کے ساتھ ہم نے یہ پروگرام دیکھا ہے اور اس کے بارے میں اپنے کالم میں لکھا بھی ہے۔ سردار جعفری نے اس نظم میں بنیادی خیال یہ پیش کیا ہے کہ زندگی ایک ایسا تسلسل ہے جس میں زندگی چولے بدل بدل کر وقت کے کینوس پھر سے نمودار اور غائب ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح وقت اور نسل انسانی کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ سردار جعفری کی اس طویل نظم کے کچھ مصرعے کسی تسلسل کے بغیر ملاحظہ فرمایئے۔

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے ذہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا

بہت عرصے پہلے ممبئی کی ایک ادبی محفل میں سردار جعفری یہ نظم سنا رہے تھے۔ اتفاق سے ہم اس محفل میں ممبئی کی ایک ایسی ادبی ہستی کے ساتھ گئے تھے جنہیں موقعہ بے موقعہ سردار جعفری کو چھیڑنے میں مزہ آتا ہے اور وہ تفنن طبع کے طور پر جعفری صاحب کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہتے رہتے ہیں۔

سردار جعفری نے جب یہ مصرعے پڑھے جن میں وہ کہتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں پھر آئیں گے۔ بچوں کے ذہن سے بولیں گے اور پھول بن کر دنیا کو دیکھیں گے تو موصوف نے بے ساختہ کہا "یار! کیا کہا؟ یہ پھر آئیں گے! پھر بولیں گے۔ کیا اب تک انھوں نے کچھ کم بولا ہے جو آگے بھی بولیں گے۔"

ہم نے کہا "حضور! انھیں آنے دیجئے اور بولنے دیجیے آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ تو اس وقت ہوں گے نہیں"

قہقہہ لگا کر بولے "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تو پھول بن کر آئیں اور میں کانٹا بن کر ان کے ساتھ نہ آؤں۔ یار! یہی تو زندگی کا تسلسل ہے جسے بہر حال جاری رہنا چاہیے"

- غرض سردار جعفری نہ صرف اردو ادب بلکہ ہندستانی ادب کی ایک نہایت معتبر ہستی ہیں اور انھیں "گیان پیٹھ" ایوارڈ کا ملنا صرف ان کے لیے نہیں بلکہ اردو زبان کے لیے بھی ایک بڑے اعزاز کی بات ہے۔ سردار جعفری کے ایک پرستار کی حیثیت سے ہم انھیں مبارک باد دیتے ہیں۔

بقیہ صفحہ ۳۶

میں دنیا بھر کی اہم خبروں اور اطلاعات سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔

انٹرنٹ اس دور کی ایک اہم ایجاد بن کر رہ گئی ہے جس کا ساری دنیا میں کثرت سے استعمال ہو رہا ہے۔ اس کی مدد سے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے دوستوں اور رشتہ داروں سے بات چیت کی سہولت حاصل رہتی ہے۔ تازہ ترین خبروں سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔ عا معلومات فراہم کی جا سکتی ہیں۔ علم کے خزانوں سے آن واحد میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ تفر طبع کے ذرائع فراہم ہو سکتے ہیں ۔ فنی ماہرین اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی تشہیر کر سکتے ہیں۔ صنعتی پیداوار کنندگان اپنی پیداوار کو بین اقوامی بازار میں پہنچا سکتے ہیں۔ وہ اس بات کا بھی لگا سکتے ہیں کہ بین اقوامی مارکٹ میں مخصوص صنعتی پیداوار سپلائی کرنے والی کون کون کمپنیاں ہیں۔ دنیا بھر کے مختلف سرکاری، نیم سرکاری اور خانگی ادارے باہمی طور پر تعلق اشتراک کا قیام عمل میں لا سکتے ہیں۔ غرض انٹرنٹ انفارمیشن ٹکنالوجی کی ایک ایسی سہولت جو مستقبل میں ہمارے اور آنے والی نسلوں کی زندگیوں کو سنوارنے میں مددگار ثابت ہو گی۔

نصرت ظہیر
4/5 کھچڑی پور کالونی۔ نئی دہلی 91

باادب باملاحظہ

ابھی دو تین مہینے پہلے کی بات ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہماری آزادی کی گولڈن جوبلی پر انگلستان کی ملکہ الزبتھ پاکستان اور ہندستان تشریف لائی تھیں۔ آپ کہیں گے کہ ان دنوں جب دہلی کا درجۂ حرارت اور ہندستانی روپے کی قیمت دونوں کا ایک ہی حال ہے اور دونوں کو ایک جیسا زوال ہے تو اچانک یہ ملکہ الزبتھ کا خیال کیوں؟ تو بات اصل میں یہ ہے جناب کہ نہ موسم کی چال پر اپنا بس ہے نہ روپے کی قیمت کے فال (FALL) پر، تب ایسے میں اپنی بے بسی پر کڑھنے سے تو اچھا ہے کہ بیتے ہوئے اچھے دنوں کو یاد کر کے ہی جی بہلا لیا جائے۔ بس اسی خیال سے خادم اکتوبر کے ان دنوں کا ذکر کر رہا ہے جب ملکہ الزبتھ اپنی سابق رعایا کا حال جاننے کے لیے یہاں آئی ہوئی تھیں اور ان کے تشریف لانے سے تقریباً ہر شخص مسرور تھا۔ ہر طرف ان کی آمد کا غلغلہ تھا۔ ماحول میں رنگینی تھی، ہوا مہکی ہوئی تھی اور فضائیں کچھ اس طرح مرتعش تھیں کہ تخیل کے کان لگا کر سنو تو سماعتیں کسی نقیب خوش خلیب و بانصیب کی صداؤں سے گونجنے لگتی تھیں۔

جنبش مکن، ہوشیار باش!
سجدہ میں نگاہ رہے!
تمام ہوش و خرد پیش عالیجاہ رہے!
نازش لوح و قلم
صاحبۂ عالم
ملکۂ ذیشان
زینت تخت انگلستان
مہارانی الیزبتھ دوئم
جلوہ افروز ہوتی ہیں۔ ایں۔ ایں۔:
ڈھم۔ ڈھم۔ ڈھوں!

اب یوں تو مہارانی اس سے پہلے بھی دو مرتبہ تشریف لا چکی تھیں لیکن اس دفعہ وہ کچھ زیادہ ہی تشریف لے کر آئیں۔ ان کے قدم رنجہ فرمانے سے ہر شخص خوش تھا یہاں تک کہ راشن کی لائن میں خوش نظر آنے والے ایک ریٹائرڈ بزرگ سے جب میں نے ان کے خوش ہونے کا سبب پوچھا تو انھوں نے بھی راشن میں دیوالی کی ایک کلو چینی زائد ملنے کا ذکر کیے بغیر چھوٹتے

ہی کہا۔ میاں انگریزوں کی ملکہ ہندستان آئی ہوئی ہے۔

"آئی ہوئی ہے تو کیا ہوا؟ وہ تو اس سے پہلے دو دفعہ آچکی ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن اس سے پہلے ہماری آزادی کو پچاس برس نہیں ہوئے تھے۔" بڑے میاں نے کہا اور پھر کسی قدر افسوس سے کہنے لگے۔ "مگر آہ۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانا

وہ باغ کی بہاریں چڑیوں کا چہچہانا

اس وقت تو بڑے میاں کے اس شاعرانہ اظہار تاسف کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن بعد میں کئی اور بڑے میاؤں، یعنی بزرگوں سے بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ سب کے سب یادش بخیر یا یعنی ناسٹلجیا کے شکار تھے۔ دوردرشن اور اخبارات میں ملکہ کا چہرہ دیکھ کر سب کو اپنا اپنا ماضی یاد آرہا تھا اور سب کے سب غلامی کے سنہرے دنوں کی یادوں میں گم تھے۔

ایک بزرگ کہنے لگے۔ "واہ صاحب کیا دور تھا وہ بھی۔ ہر چیز کھلی ملی تھی۔ انگریز کے دور میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔"

پھر یہ بتائے بغیر کہ وہ گھاٹ کون سا تھا اور کس شہر میں واقع ہوا تھا بزرگ نے ایک زور کی چھینک ماری اور بولے بلکہ میرا خیال ہے کہ ان دنوں مکھیاں بھی بہت کم ہوتی تھیں۔"

ایک ریٹائرڈ بزرگ سرد آہ بھر کر بولے "کاش ہم آج بھی غلام ہوتے اور غلامی کا دو سو سالا جشن منا رہے ہوتے!"

ایک اور ریٹائرڈ بزرگ نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور فرمایا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آزادی کے پچاس سالا جشن سے غلامی کا دو سو سالہ جشن ہر لحاظ سے بہتر رہتا لہٰذا میں آپ کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ آٹھ سال بعد ہمیں سرکاری طور پر آزادی کے خاتمہ کا ہی اعلان کر دینا چاہیے۔"

"آٹھ سال بعد؟ وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"بھائی آٹھ سال بعد ہماری آزادی 58 برس کی ہو جائے گی نا۔ اس لیے" بزرگ نے ناک میں نسوار رکھتے ہوا کہا۔

"لیکن اٹھاون سال بعد ہی کیوں؟ اٹھاون میں کیا راز ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"توبہ ہے!" ایک تیسرے بزرگ ناگواری سے منہ بنا کر بولے "اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ سرکاری طور پر ریٹائرمنٹ کی عمر 58 سال ہوتی ہے۔ اس لیے آزادی بھی اٹھاون سال بعد بے کار ہو جائے گی۔"

"بیشک!" چوتھے بزرگ نے اعلان کیا۔ "آزادی کو ریٹائر کر کے ہمیں ایک بار پھر سرکار انگلشیہ کا غلام ہو جانا چاہیے کہ آزادی کی بے چین ملازمت سے غلامی کی پُر سکون پنشن زیادہ اچھی ہوتی ہے۔"

اور واقعی ٹھیک بھی ہے کرپشن، بے ایمانی، سیاسی لوٹ مار، ناانصافی اور افراتفری والی آزادی سے تو وہ بے درد غلامی ہی اچھی تھی جس کی یاد ملکہ نے دلادی تھی! صاحب، انگریز کتنا بھی ظالم تھا لیکن تھا وطن پرست۔ تاج برطانیہ کا فائدہ کس بات میں ہے کس میں نہیں، اس کا ہمیشہ خیال رکھتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں ہم نے وطن پرستی کے نام پر آزادی کے لیے ایک چھوڑ، دو دو لڑائیاں لڑیں لیکن وطن کے بھی دو ٹکڑے کر دیے۔

آزادی تو ملی لیکن کیسے؟ غلامی اور آزادی میں بس اتنا ہی تو فرق آیا کہ پہلے تو اس دیس کو انگریز لوٹتا تھا۔ آج ہم لوٹ رہے ہیں۔

خیر قصہ مختصر یہ ہے کہ ملکہ کے آنے سے سبھی خوش تھے لیکن کچھ لوگ ان کے قدم رنجہ فرمانے سے خفا بھی تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ملکہ ہماری آزادی کی پچاسویں سالگرہ سے اتنی خوش ہیں تو انہیں ہندستان میں برطانوی دور حکومت کی زیادتیوں کے لیے معافی بھی مانگنی چاہیے۔ اس سلسلہ میں جلیاں والا باغ کے ستم ایجاد جنرل ڈائر کی حیوانیت کا حوالہ بھی دیا گیا۔

کچھ لوگ تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ مطالبہ کرنے لگے کہ ہمارا کوہ نور ہیرا واپس کیا جائے جسے توڑ کر ملکہ برطانیہ کے تاج میں جڑ دیا گیا ہے!

صاحب یہ کوہ نور بھی خوب ہیرا تھا۔ جس کے پاس رہا اس پر نحوست لایا۔ مغل بادشاہ محمد شاہ کے پاس تھا تو اس پر نادر شاہ نازل ہو گیا۔ نادر شاہ کے پاس آیا تو اس کے ملازم نے ہی اسے قتل کر دیا۔ پھر اسی طرح سکھ راجاؤں کے پاس پہنچا تو ان پر بھی مصیبتیں لاتا رہا۔ آخر جب انگریز کے پاس آیا تو اس کی نحوست دور ہوئی اور کوہ نور کو پہلی بار معلوم ہوا کہ دنیا میں کوئی اس سے بھی زیادہ منحوس شئے موجود ہے! یوں سمجھیے کہ کوہ نور تو ساری دنیا پر نازل ہوتا رہا، مگر خود اس پر انگریز نازل ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ہیرے کے تیرہ ٹکڑے کر دئے اور ملکہ کے تاج میں جڑ کر کہا۔ "اب بول بیٹا کیا کرے گا!؟"

تاہم مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ آخر ملکۂ برطانیہ ہماری آزادی کی پچاسویں سالگرہ سے اتنی خوش کیوں تھیں کہ پہلے پاکستان میں خوشی منانے گئیں پھر ہمارے یہاں آکر منانے لگیں!

حسب معمول اپنی حیرت رفع کرنے کے لیے میں نے میاں عبدالقدوس سے رجوع

کیا۔ ساری بات سنتے ہی کہنے لگے۔

"میاں راز کی بات یہ ہے کہ ملکہ محترمہ ہماری آزادی کی نہیں بلکہ اس کے پردے میں اپنی آزادی کی خوشی منارہی ہیں۔"

"اپنی آزادی کی؟ کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ برصغیر میں پچھلے پچاس برسوں میں جو کچھ خرافات اور غارت گری ہوئی ہے۔ اسے دیکھ کر وہ یہی سوچتی ہوں گی کہ اچھا ہوا ان سنتالیس میں اس بلا سے بھی پیچھا چھوٹ گیا تھا ورنہ یہ ملک اگر آج بھی ان کا غلام ہوتا تو انگریز بیچارا دن بھر پریشان ہی رہتا کہ کہاں مندر بنائے کہاں مسجد گرائے۔ کیسے کرپشن ہٹائے اور کس طرح بے ایمانوں کو پکڑ کر جیل بھجوائے۔ ویسے بھی معصوم ملکہ سے ایک ڈائنا تو سنبھلی نہیں اتنا بڑا ملک کیسے سنبھالتیں یوں سمجھو کہ سنتالیس سے پہلے ہم انگریز کے غلام تھے۔ مگر آج عملاً انگریز ہمارا غلام ہوتا! پس ثابت ہوا کہ ہماری گولڈن جبلی اصل میں انگریزوں کی گولڈن جبلی ہے؟ اور انھیں اس جوبلی پر خوش ہونے کا ہم سے زیادہ حق پہنچتا ہے!" ●

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی تازہ مطبوعات

فراق دیار شب کا مسافر

مرتبین شمیم حنفی سہیل فاروقی

فراق کے غیر مطبوعہ مضامین، انٹرویو، شخصیت، شاعری اور نثری جائزے۔ معروف ادیبوں کے قلم سے۔ قیمت = 150

لفظوں کی انجمن میں ۔ڈاکٹر سید حامد حسین

یہ کتاب آپ کے اس تجسس کو بڑی حد تک تشفی بخشے گی جب آپ کو یہ معلوم کرنے کی خواہش ہوگی کہ یہ لفظ کہاں سے اور کیسے ہماری زبان میں آیا۔

قیمت۔/135 روپ

تعبیر و تفہیم :ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم کا نام اب اردو دنیا کے لیے نیا نہیں ہے۔ موصوف کے کئی ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے مجموعے منظر عام پر آکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعے کے بھی بیشتر مضامین تحقیقی ہیں۔ -/135

معاصرین و متعلقات مولانا ابوالکلام آزاد

عبدالقوی دسنوی

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا نام آزاد شناسوں کی صف میں خاصا نمایاں ہے۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کے ساتھ ساتھ ان کے معاصرین کا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ قیمت= 60

سلاخ ٹوٹتی ہے کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کے پانچ ریڈیائی ڈراموں کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت= 90

مخملہ یوسف ناظم

اردو کے ممتاز مزاح نگار یوسف ناظم کے سولہ دلچسپ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت= 51

جو رہی سو بے خبری رہی (خودنوشت)

ادا جعفری

بدایوں کی ایک بہت بڑی اور پرانی حویلی کی اونچی دیواروں کے درمیان پرورش پانے والی ایک ذہین اور حساس لڑکی کی آپ بیتی، جس کی حیثیت آج اردو شاعری میں خاتون اول کی ہے۔ قیمت۔/200 روپ

خالد عبادی
بہار اردو اکیڈمی، چوہٹہ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۳

سو معذرت بھی کیوں؟

زبان و ادب، ایوان اردو اور آجکل میں یکے بعد دیگرے ظفر ہاشمی، نظام صدیقی اور ساحل احمد اور اس سے قبل کتاب نما اور شب خون میں کرامت علی کرامت اور ابو الکلام قاسمی کے جو مضامین شائع ہوئے ان پر موصولہ رد عمل کو دیکھتے ہوئے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ تخلیق کاروں کے ایک حلقے نے انھیں جانبدارانہ اور غیر منصفانہ قرار دیا۔ یہاں حلقہ سے کوئی سکہ بند، فکری، علاقائی یا مخصوص حلقہ نہیں بلکہ ایسے لکھنے والوں کا حلقہ مراد ہے جن کے نام یا حوالے ان مضامین میں شامل نہیں۔ اس لیے اس حلقے کو (جو مذکورہ مضمون نگاروں کے قبیلے سے تعلق نہیں رکھتا) روایتی انداز میں نرغانے یا خاموش کرنے کی کوشش بے سود ہوگی۔

اس سے قطع نظر کہ ان مضمون نگاروں میں سے بعض کھلے یا ڈھکے 'علاقائیت' سے منتخب کیے جا چکے ہیں۔ یہاں تو بس یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ آخر معاملہ کیا ہے کہ تنقیدی تجزیاتی مضامین سے بے اطمینانی بڑھتی جا رہی ہے (خواہ ان کے لکھنے والے فاروقی ہوں یا نارنگ) تنقید بالعموم جس ادیب یا شاعر کے بارے میں بلند بانگ دعوے کرتی ہے ان میں سے بیشتر کی ادبی حیثیت عامۃ الادبیہ کی نظروں میں دو کوڑی سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔ کیا یہ ہماری تنقید کے لیے لمحہ فکریہ نہیں۔

میں جس وقت یہ سطریں قلم بند کر رہا ہوں میرا شعور اس حقیقت کی گرفت میں ہے کہ انصاف اور صداقت کا غیر جانبداری سے کوئی علاقہ نہیں کیوں کہ جہاں غیر جانبداری ہوگی وہاں انصاف اور صداقت جیسے الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک لفظ اپنی معنوی پہنائیوں کے ساتھ تمام تر رواجی مصطلحات پر ملتوی ہو جاتا ہے اور وہ لفظ ہے "وقوعہ" جیسے کسی کا کسی کو دیکھ کر مسکرانا، تو یہاں اصل چیز مسکراہٹ ہوئی نہ کہ اس کا طنزیہ دوستانہ اور رسمی وغیرہ ہونا۔ مختلف الناس اس "مسکراہٹ" کو کوئی بھی معنی پہنا دیں لیکن آخر آخر تک وہ صرف مسکراتا رہتا ہے (یعنی مسکراہٹ کا وقوعہ) وقوعہ کو اس معنی میں "مبتداء المنتہا" قرار دینا عین منطق ہوگا۔ لیکن نہ تنقید لکھنے والے اس حقیقت سے واقف ہوتے ہیں نہ عامۃ الادبیہ۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے مضامین پر اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور یہ ورودہ ایک خاص حلقے (مذکورہ تناظر کو بہ طور خاص ذہن میں

رکھیں) کی نظر میں حق بہ جانب ہوتا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ نقاد اور تنقید نقاد دونوں اپنی اپنی جگہ درست و مستحکم ہیں۔

ایک طرح سے گفتگو یہاں پر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ مقاطع بہرحال بے اطمینان و لاحاصلی پر منتج ہوگا۔ اس لیے یہ سوچنا نقاد اور فنکار دونوں کا فرض بنتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور اس کے پس پشت کون سے عوامل کار فرما ہیں۔

مضمون نگار یا ناقد سے غیر جانبداری کا مطالبہ اس لیے نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا میں غیر جانبداری نام کی کسی شے کا وجود نہیں۔ خود غیر جانبداری کا مطالبہ ایک طرح کی جانبداری ہے۔ پس ناقد یا مضمون نگار کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اسے کون سی کتاب اچھی لگتی ہے۔ کون سا شاعر یا ادیب پسند آتا ہے۔ جدت یا روایت کو وہ کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور کس کے حق میں فیصلے صادر کرتا ہے۔ یہ ساری باتیں موضوعی (Subjective) ہیں۔ اگر ان میں کہیں معروضیت (Objectivity) نظر آتی ہے تو یہ سب ماورائے وصف دیدن کچھ نہیں۔

غور کریں تو آج تنقید سے جو عمومی بے اطمینانی پائی جاتی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ تنقیدی گہما گہمی اور تحرک کا ماحول نہیں۔ بیشتر نئے لکھنے والے یا تو شعر لکھ رہے ہیں یا فکشن' تنقید نگاری سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ نظر بزرگ و باراں دیدہ نقادوں کی طرف ہی جاتی ہے اور ان کے لکھنے کی رفتار یہ ہے کہ سال دو سال میں "مجبور تقاضا" یا "محور تماشا" ہو کر کچھ لکھ دیا۔ اس طرح سال میں دس لکھنے والے بہ مشکل چھ سات مضامین ہی لکھ پاتے ہیں۔ ان میں ایک دو مضامین ہی ایسے ہوتے ہیں جن میں نئے یا ابھرے ہوئے قلم کاروں کے نام یا حوالے ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہی ایک دو مضامین بے اطمینانی کا سبب بنتے ہیں اور ایسے قلمکار ہی (جن کے نام یا حوالے نہیں آپاتے) ان مضامین کو جانبدارانہ یا غیر منصفانہ قرار دے "بیٹھتے" ہیں۔ اگر یہ صورت حال ختم ہو جاتی ہے اور تنقیدی مضامین کا اوسط بڑھ جاتا ہے تو سال میں کم از کم ایسے دس مضامین شائع ہوں گے جن میں نئے اور ابھرتے ہوئے شاعروں اور ادیبوں کا ذکر ہوگا۔ اس طرح بیشتر سنجیدہ لکھنے والے حوالے میں آجائیں گے' ہاں ان میں معدودے چند ایسے بھی ہوں گے جن کا ذکر ان کے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ شد و مد کے ساتھ کیا جائے گا۔ اس طرح موضوعی معروضی (معروضی نہیں) انداز میں یہ بھی طے کیا جاسکے گا کہ آج کے پسندیدہ اور نمائندہ قلم کار کون کون سے ہیں۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ عمومی شکوہ شکایت کا ماحول ختم ہو جائے گا بلکہ مجروح کو اپنے مجروح اور جذبی کو اپنے جذبی ہونے پر قناعت کرنا پڑے گا کہ تنقیدی گہما گہمی بالعموم ایک عمومی ادبی فضا سازی میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے لازم آتا ہے کہ

نئے لکھنے والے تنقیدی فرائض سے آنکھیں چار کریں کہ غفلت کی اس کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں کہ وہ آدمی کے غافل ہونے کا اعلانیہ ہوتی ہے۔ یوں بھی اب بزرگ وباراں دیدہ نقادوں پر اعتبار و اعتماد کے دن لد گئے۔

اگر ہم ایسا مان کر نہیں چلتے (کہ بزرگ وباراں دیدہ نقادوں پر اعتبار و اعتماد کے دن لد گئے) تو یہ مان کر چلنا ہوگا کہ میر کی طرح غالب بھی ہمارا بڑا شاعر ہے۔ راشد اور میراجی کی طرح مجید امجد اور اختر الایمان بھی ٹرینڈ ساز شاعر ہیں۔ منٹو اور بیدی کے ہم پہلو کرشن چندر اور عصمت کو بھی نشستیں فراہم کرنا ہوں گی۔ فیض اور سردار کے ساتھ جذبی اور پرویز شاہدی وغیرہ کو بھی ڈھونا پڑے گا اور محمد علوی کی غزلوں اور ندا فاضلی کی نظموں کے لیے بھی زحمت تحسین اٹھانا ہوگی۔ مجھے ایسا ہونے یا ایسا ہی ہونے پر جو سخت اعتراض ہے وہ اس لیے کہ فی الواقع ایسا نہیں۔ اور اس لیے بھی... کہ عرفان صدیقی، صلاح الدین پرویز (شاعر) حسین الحق اور سید محمد اشرف (افسانہ نگار) اور ان کے بعد جمال اویسی، عالم خورشید (شاعر) شرف عالم ذوقی اور شاہد اختر (افسانہ نگار) اپنے پیشرو پیش رووں سے عمدہ اور جاندار لکھ رہے ہیں۔ باوجود اس کے بوڑھی تنقید اپنی عینک کے شیشے کی تبدیلی پر آمادہ نہیں۔

کیا صرف تنوع غالب کو میر کی صف یا اس کے فوراً بعد کی صف میں ممکن دلا سکتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ میر نے جو شاعری عرش سے کی ہے فانی نے وہی شاعری فرش سے کی ہے۔ کیت کی کمی بیشی سے جو فرق پیدا ہوتا ہے یہاں میں اس سے انکار کرنا نہیں چاہتا لیکن تب اس سے بھی انکار کرنا نہیں چاہتا کہ میر کے بعد دوسرا بڑا شاعر فانی ہے نہ کہ غالب۔ راشد نے شاعری کو عجمی دانش اور عصری آفاقیت سے متصف کیا تو میراجی نے فکری (ذہنی سے کام نہیں چل سکتا) آزادہ روی اور ذاتی مکاشفات سے۔ کیا مجید امجد اور اختر الایمان یہ کام یا اسی پائے کا کوئی دوسرا کام انجام دے سکے ہیں۔ منٹو نے اکڑوں بیٹھ کر افسانے لکھے اور نظام دہر کو مضحکہ خیز کر دکھایا۔ بیدی نے افسانہ نگاری کو حبس دم سے سادھ کے ایک عجب طرح کے احتمال و انضباط کو ہم زاویہ کیا۔ کرشن چندر افسانے کو میلانیت سے آگے نہ بڑھا سکا اور عصمت کو تو چٹخارے کی ایسی لت تھی کہ وہ عریانیت کی بگھار کے بغیر ایک سرکا تک نہ لگا سکی۔ فیض نے اپنی کمزوریوں کے باوجود نو افلاطونی شعری فضا سازی میں کامیابی حاصل کی تو سردار نے اقبالیت کو مارکسیت سے ہم رشتہ کرکے شاعری کو خون گرم دہقاں سے سرخ رو کیا۔ جب کہ جذبی مشرقی انفعالیت اور پرویز تقلیدی خطابت سے آگے نہ بڑھ سکے۔ محمد علوی کی غزلوں کا حال یہ ہے کہ ناصر کاظمی کی "پہلی بارش" والی غزلوں کو پڑھ لیں تو ان کی غزلیں کسی جاپانی فوٹو اسٹیٹ مشین کی زیراکس کاپی سے زیادہ نہیں معلوم ہوتیں۔ ندا فاضلی کی نظمیں عمر کی اس منزل میں بھی مشاعراتی وادیابی سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ لیکن

کیا تنقید ہمیں یہ سب بتاتی ہے۔ یہ ہماری خود انکار نسل کو ہاتھ میں قلم تھام کر سوچنا ہوگا۔

۶۰ کے بعد جو تماشے ہوئے اس میں مداری ہی زیادہ چمکے۔ افتخار جالب، عادل منصوری، بشیر بدر، محمد علوی ـــــ احمد ہمیش، بلراج مین را، سریندر پرکاش اور انور سجاد جو جدیدیت کے سرکردہ شاعر و افسانہ نگار سمجھے جاتے ہیں ان کے فلک ادب پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکنے کی اس کے سوا کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ان میں اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں مداری پن زیادہ تھا۔[۱] ظفر اقبال کا نام میں ان کے ساتھ اس لیے نہیں لے رہا ہوں کہ وہ اتنا مداری نہیں بنا جتنا "سیمیا گر" بنا۔ پرکاش فکری، وحید اختر، عزیز قیسی، حسن نعیم اور غیاث احمد گدی، نیر مسعود، انور عظیم اور جوگندر پال جو مذکورہ بالا سرکردہ شعرا اور افسانہ نگاروں کو اپنی برق فکر و فن سے بے آشیاں کر دینے کی اہلیت رکھتے ہیں جدید تنقید نے ان کے لیے کیا کیا۔ کیا یہ پوچھنے کا وقت اب بھی نہیں آیا۔

۷۰ کے بعد جو ہوا اور ۸۰ کے بعد جو کچھ ہو رہا ہے اس پر گفتگو پھر کبھی کہ شہسواری تو ہمیں اسی میدان میں کرنی ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس دشت و صحرا اور وادی و آبادی سے تو گزرنا ہی ہوگا جو ہمارے مصاف ادب کے راستے میں پڑتی ہیں۔

---

[۱] ظفر اقبال کے لیے "سیمیا گر" کی اصطلاح حسین الحق سے مستفاد ہے۔ (عبادی)

سلیم انصاری
۵۵۹، موتی نالہ۔ جبلپور

ستیہ پال آنند کا تخلیقی شعور اور عالمی عصری آگہی

(لہو بولتا ہے کے حوالے سے)

آزاد و نثری نظم اردو شاعری کی ایسی اصناف ہیں جو اپنے جنم سے لے کر آج تک معتوب ہی ٹھہری ہیں جس کی ایک وجہ تو غالباً یہ ہے کہ ہماری بیشتر ناقدین شعر و ادب نے ذہنی طور پر غزل کی صدیوں پرانی تہذیبی روایتوں کے حصار سے آزاد ہونے کی کوشش ہی نہیں کی۔ دوسری وجہ ہمارے یہاں اچھے نظم نگاروں کا فقدان ہے۔ اردو شاعری کے تخلیقی سفر میں ن۔م۔ راشد، میراجی، قاضی سلیم، بشر نواز، شہریار، محمود سعیدی، بلراج کومل، محمد علوی، اختر الایمان، ندا فاضلی، اور ستیہ پال آنند کے علاوہ چند نام ہی ایسے ہیں جنھیں اردو نظم کے تخلیقی حوالوں میں خود اعتمادی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

نظم شاعری کی آفاقی صنفِ سخن ہے لہٰذا بلا امتیاز زبان و رنگ و نسل اگر ہم عالمی ادب پر گفتگو کریں تو ہمارا دائرہ نظم تک ہی محدود رہے گا۔ اردو نظموں کی تخلیقی صداقتوں کو عالمی سطح پر متعارف کرانے میں ستیہ پال آنند کی سنجیدہ کوششوں کو ہی اولیت حاصل ہے۔

"لہو بولتا ہے" ستیہ پال آنند کا تازہ ترین شعری اظہار ہے جسے تفہیم و ترسیل کے عالمی سیاق سباق میں معتبر حوالے کی حیثیت حاصل ہے۔

ستیہ پال آنند کے یہاں نظمیں اظہار کے آفاقی میڈیم تلاش کرتی ہیں۔ اردو نظموں کے حوالے سے اکثر یہ بات کہی جاتی رہی ہے کہ یہ ابھی تک خود کو غزلوں کے مزاج اور ڈکشن سے آزاد نہیں کر سکی ہے جبکہ ان کے درمیان فکر و اظہار کی سطح پر واضح فرق ہے اگر ہم عالمی نظموں کے حوالے سے گفتگو کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں تخلیق کی جانے والی نظموں کی سوچ اور اظہار کا کینوس وسیع ہوتا ہے جبکہ اردو نظموں کی صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔

ستیہ پال آنند کی نظموں کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں نظموں کی تخلیقی فضا میں ایک طرح کا کھلا پن ہے۔ ان کے ڈکشن میں نظموں کے مرکزی خیال کو مختلف جہتوں میں روشن کرنے اور ان کی سوچ کی زیریں لہروں کو پرت در پرت منعکس کرنے کی صلاحیت ہے۔ ان کے یہاں جدید اردو نظموں میں مسلسل استعمال ہونے والے لفظ بھی نئی معنویتیں خلق کرنے پر قادر ہیں۔

بقول ڈاکٹر وزیر آغا

"ستیہ پال آنند کی نظموں میں یہ موجودی رویہ اپنی تمام تر گہرائی، سندرتا اور تنوع کے ساتھ اس طور پر سامنے آیا ہے کہ شاعر کے شعری امیجز حتیٰ کہ اسکی نظموں میں برتے جانے والے الفاظ بھی جیسے جاگ اٹھے ہوں۔"

ستیہ پال آنند کی سوچوں اساس ماضی بعید میں روشن اساطیری حوالوں اور ماضی قریب کے وسیع تجربات و مشاہدات کے علاوہ موجودہ عہد کی کربناک صورتِ حال اور مستقبل کی عرفان و آگہی پر ہے۔ اپنی نظموں کی تخلیقی صداقتوں کو روشن کرنے کے لیے ستیہ پال آنند کبھی ماضے کے اساطری کرداروں اور حوالوں سے روشنی کشید کرتے ہیں کبھی اپنے بچپن کی معصوم یادوں اور تمناؤں کے تخلیقی عناصر کو بروئے کار لاتے ہیں اور کبھی تیزی سے تبدیل ہوتے عالمی عصری منظر نامے ان کی شعری فکر و شعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔

"لہو بولتا ہے" کی نظموں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ستیہ پال آنند کی نظمیں جدید سے جدید تر کی سمت ایک معتبر پیش رفت ہیں۔ ان کی نظموں کا سفر اپنے عہد کے تخلیقی عوامل کا سفر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں "سفر" ایک خوبصورت اور مضبوط تخلیقی علامت کی صورت نمودار ہوتا ہے۔ سفر جو کبھی خارج سے باطن کی طرف ہوتا ہے اور کبھی باطن سے خارج کی طرف، ہر دو صورت میں ستیہ پال آنند اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر تخلیق کے عالمی منظر ناموں کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں۔ مثلاً ایک نظم "راستہ اور میں" پیش کرتا ہوں۔

راستہ ہنس کر مجھے کہتا ہے 'میں بھی
تو تمھارے ساتھ چلتا آ رہا ہوں
راستہ ہو تم یہیں ٹھہرے ہوئے ہو
کیسے چل سکتے ہو؟ میں پھر پوچھتا ہوں
راستہ کہتا ہے اچھا یہ بتاؤ
اس طرح تم کب سے چلتے آ رہے ہو؟
کیا تمھیں احساس ہے ہر ایک پڑاؤ
تم کو منزل سا لگا ہے۔
عارضی دم بھر ٹھہرنے سانس لینے کی جگہ سا
تم کہیں ٹھہرے نہیں ہو!

اور میں یعنی تمہارا ہم سفر
اس آبلہ پائی سے واقف
جو تمہارے پاؤں کا زیور ہے دیکھو
آج تک بڑھتا چلا آیا ہوں اب بھی
تازہ دم ہوں

(راستہ اور میں)

ستیہ پال آنند کے یہاں سفر راستہ اور مسافر تینوں لازم و ملزوم ہیں۔ راستہ جو منزل کی وصولیابی کا ذریعہ ہے، ایک ایسے ہم سفر کی حیثیت سے نمودار ہوا ہے جو مسافر کی صعوبتوں اور مشکلوں سے واقف بھی ہے اور اسے ارتقا کی جانب گامزن رہنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔

ستیہ پال آنند کے یہاں سفر کا ایک ایسا تصور بھی موجود ہے جس میں انسان اپنے ذہن میں گذشتہ یادوں اور لمحوں کے ساتھ مسلسل سفر میں رہتا ہے۔ ان کی ایک نظم "یہاں بیٹھیں رکیں دم بھر" میں لمحوں کو پکڑنے اور تحلیل ہونے کے درمیان موجود نظم کا خوبصورت جواز پیش کیا گیا ہے۔

یہاں بیٹھیں رکیں دم بھر
ٹھہر کر سانس لیں
ستائیں دو گھڑیاں
کہ یہ لمحہ
ہمارا ماضی مطلق سے حال پاگریز اس تک
دبے پاؤں چلا آیا ہے
اپنے ساتھ چپکے سے
یہاں بیٹھیں ٹھہر کر سانس لیں، ستائیں دو گھڑیاں
کہ اس سے پیشتر یہ لمحہ موجود
مستقبل کی جانب اک قدم آگے بڑھے
تحلیل ہو جائے
کہیں لاوقت کی ازلی تواتر میں

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ ستیہ پال آنند نے اپنی بعض نظموں کا خمیر اپنے اساطیری وراثت سے تیار کیا ہے۔ انھوں نے اساطیری کرداروں اور حوالوں کو نئے عصری شعور

کے تناظر میں نئی معنویتوں سے آشنا کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظمیں "قید دوام کا ساتھی' زندہ در گور بنتِ زمین' میں جد امجد پتامہ بھیشم' نٹ راج' بالمیکی' سارتھی اہلیہ وغیرہ پیش کی جا سکتی ہیں۔

قید دوام کا ساتھی میں ستیہ پال آنند نے لکشمن ریکھا کو علامت بنا کر ایک ایسی عورت کے کرب کا اظہار کیا ہے جو اپنے محبوب کے انتظار میں یگوں یگوں سے اپنی لکشمن ریکھا کے دائرے میں قید ہے۔ یہاں لکشمن ریکھا عورت کے جذبہ ایثار اور وفاداری کی علامت بن گئی ہے۔

مگر وہ گم جسم
ڈری ہوئی کانپتی غزالہ سی
اپنی لکشمن لکیر کے دائرے کے اندر
کھڑی ہوئی اس اجاڑ رستے پر ٹکٹکی باندھے
تک رہی تھی
نہ جانے کتنے یگوں سے کسی کی وہ منتظر تھی!

(قید دوام کا ساتھی)

نظم "زندہ در گور بنتِ زمیں" ستیہ پال آنند نے رام' راون' اور دُشاسن جیسے اساطیری کرداروں کے حوالے سے یہ بات کہنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ دروپدی ہو کہ سیتا' ہر دور میں عورت مظلوم و محکوم رہی ہے۔

"میں جد امجد پتامہ بھیشم" میں ستیہ پال آنند نے مہان اساطیری کردار "پتامہ بھیشم" کے حوالے سے دو بھائیوں / دو ملکوں کے مابین رشتوں کے نشیب و فراز کو عصری تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوپاک کے موجودہ سیاسی پس منظر میں ستیہ پال آنند کی یہ نظم سنجیدہ تفہیم کے نئے دریچے روشن کرتی ہے۔

جو راستے بن ہو گئے ہیں
جو قفل تم نے لگا دیے ہیں
میں آنے والے دنوں کے بابوں کی
چابیاں تم سے مانگتا ہوں

(میں جد امجد پتامہ بھیشم)

ستیہ پال آنند کی تخلیقی سوچوں کی ایک کھڑکی ان کے بچپن کے آنگن میں کھلتی ہے۔ ستیہ پال آنند کبھی بچپن کی خود کلامی کی بازگشت سنتے ہیں اور کبھی اپنے بچپن کے آنگن میں کھوئی ہوئی

پری شہزادی کی تلاش کرتے ہیں۔ انھیں اپنے بچپن کے گھر کے آنگن بخوبی یاد ہیں جہاں آم کا پیڑ ہے اور اس کے پھلوں کا کھٹا میٹھا ذائقہ سب کچھ ان کے ذہن میں محفوظ ہے۔ اب جو ان کے بچوں کے قدم ان کے گھر کے کچے آنگن میں پڑے ہیں جو کچا آنگن سکڑ گیا ہے۔
ستیہ پال کی نظمیں پڑھ کر اپنے بچپن اور اپنی مٹی سے ان کی شدید ذہنی اور جذباتی وابستگی کا احساس ہوتا ہے۔

مرے گھروندے کا کچا آنگن
جہاں میرے ننھے ننھے پاؤں کبھی پڑے تھے
جہاں پہ اب میرے اپنے بچوں کے پاؤں کے نقش پڑ رہے تھے
وہ کچا آنگن سکڑ گیا تھا
پری کو شاید لگا تھا کم ہے زمین گھر کی
اسے کھلے گھر کی ہے ضرورت

(کھوئی ہوئی پری)

ستیہ پال آنند کا گمشدہ بچپن انھیں بار بار یہ آواز دیتا ہے لیکن شاید اپنے بچپن میں واپس لوٹنا ایک غیر فطری عمل ہے۔ حالانکہ بچپن سے وابستہ یادیں معصوم جذبے اور تمنائیں کسی بھی انسان کے لیے متاع بے بہا کی حیثیت رکھتے ہیں۔

وہ تارے اور موتی
جو کبھی ننھی سی مٹھی میں دبائے
تم شعور و فکر کی دنیا میں لے کر کھیلنے نکلے تھے
بچپن سے جوانی کے گزرنے تک
کہیں گم ہو گئے تھے
اب انھیں اک بار پھر ڈھونڈو
کہ ان گہرائیوں میں تارے اگتے ہیں
چمکتے موتیوں کی کھیتیاں ہیں
اور میں
یعنی تمہارا گمشدہ بچپن
ابھی زندہ ہوں آؤ
میں تمھاری واپسی کا منتظر ہوں

(توتلے لفظوں کی بازگشت)

ستیہ پال آنند کی شاعری ایک وسیع مطالعہ کی متقاضی ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ان کی شاعری کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ ان کے یہاں فکر و اظہار کے تنوع کے ساتھ ساتھ نئی نئی علامتیں / استعارات اور اصطلاحات وضع کرنے کا جو عمل ہے وہ انھیں عالمی عصری شعری تناظر میں ایک اہم تخلیق کار کی حیثیت سے پیش کرنے کا جواز ہے۔

دیگر اداروں کی مطبوعات

اقبال ایک مسلم سیاسی مفکر ۔ ڈاکٹر مشیر الحق

مرتبہ ماہ طلعت علوی

اس کتاب میں پروفیسر مشیر الحق مرحوم (سابق وائس چانسلر کشمیر یونی ورسٹی) کے چھے اہم مضامین شامل ہیں جن سے علامہ اقبال کے سیاسی فکر پر گہری روشنی پڑتی ہے اور کئی تاریک گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ اقبال کے سیاسی فکر کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بہت اہمیت رکھتی ہے۔

قیمت = 100/

ڈاکٹر مشیر الحق مرتبہ شاہ عبدالسلام

(شخصیت اور فکری بصیرت)

ڈاکٹر مشیر الحق مرحوم (سابق وائس چانسلر کشمیر یونی ورسٹی) کی دلفریب شخصیت اور فکری بصیرت پر اردو کے ممتاز ترین ادیبوں کے اہم مضامین کا مجموعہ۔ قیمت = 300/

خواب اور حقیقت ۔ پروفیسر عبدالسلام

ترتیب و ترجمہ زاہد حسین زیدی۔ اقبال احمد خاں

اس کتاب میں ممتاز سائنس داں پروفیسر عبدالسلام کے منتخب مضامین کو اردو کا جامہ بڑے سلیقے سے پہنایا گیا۔ چند مضامین ایسے بھی ہیں جن سے پروفیسر کی شخصیت اور ان کے اہم کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔ قیمت = 250/

نقد ملفوظات پروفیسر نثار احمد فاروقی

تصوف اسلامی اور ہندستانی صوفیائے کرام کے حالات و ملفوظات پر چند تنقیدی، تحقیقی مضامین کا اہم ترین مجموعہ

قیمت = 65/

سلاخ ٹوٹتی ہے (ڈرامے)

کشمیری لال ذاکر

ادب، خواتین اور سماج

ڈاکٹر صادقہ ذکی

صنف نازک کے دکھ درد، ان کی الجھنوں، کمزوریوں، محرومیوں پر لکھے ہوئے ۱۴ مضامین کا مجموعہ۔

قیمت = 125/

بھوپال ادب کے آئینے میں : ڈاکٹر محمد نعمان

بھوپال کی ادبی تاریخ اور تہذیبی سرگرمیوں کے مختلف مگر اہم پہلوؤں سے متعلق لکھے گئے دس اہم مضامین کا مجموعہ۔

قیمت = 55/

گیلا ایندھن بلقیس ظفیر الحسن

(شعری مجموعہ)

بلقیس ظفیر الحسن کا شمار صف اول کی شاعرات میں ہوتا ہے زیر نظر مجموعہ آپ کی غزلوں، نظموں کا ایسا گلدستہ ہے جس میں پھول ہی پھول ہیں ذہن و دل کو معطر کرنے والے۔

قیمت = 75/

معروضات : ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی

اردو کے جواں سال ادیب اور نقاد ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ قیمت = 100/

اردو خود نوشت وہاج الدین علوی

(فن اور تجزیہ)

اس کتاب کے تین باب ہیں۔ پہلے باب میں سوانحی اصناف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرا باب ادبی خود نوشتوں کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ تیسرے باب میں سیاسی اور سماجی خود نوشتوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ آخر میں خود نوشت کے تدریجی ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت = 125/

کشمیری لال ذاکر کے پانچ ریڈیائی ڈراموں کا تازہ مجموعہ۔ قیمت ۹۰/ روپے

کوثر مظہری،
شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۲۵

جوش کی فکری کشمکش

جوش کا نام آتے ہی "شاعر انقلاب" اور "یادوں کی برات" یہ دو چیزیں ذہن میں ابھرتی ہیں۔ اگر اختصار سے کام لیا جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ چوں کہ ان کی شعری کائنات میں جوش وولولہ، شوکت و طنطنہ ہے اس لیے انھیں شاعر انقلاب کہا گیا ہے۔ دوسری طرف "یادوں کی برات" ان کی زندگی کے نشیب و فراز اور سچ اور جھوٹ کا کچا چٹھا ہے۔ یہ دونوں مذکورہ چیزیں جوش سے اسی لیے منسوب ہیں۔ یہاں "یادوں کی برات" سے دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں :

(۱) شخصیت شناسی بھی بڑی جان لیوا چیز ہوتی ہے اور سالہا سال کی بے تکلف ہم نشینی کے بعد بھی اس کا شرمیلا پن کم نہیں ہوتا۔۔۔ مجھ سے اگر آپ یہ پوچھیں کہ تو اپنے آپ کو بھی جاننے کی طرح جانتا ہے؟ تو میں یہ جواب دوں گا کہ ہر چند بچپن سے لے کر پیرانہ سالی تک میں علی الاتصال و بہر دقیقہ اپنے ساتھ رہا ہوں، لیکن قطعیت کے ساتھ یہ کہہ نہیں سکتا کہ در حقیقت میں ہوں کیا:

ہمارے حال کو دنیا بھلا کیا جان سکتی ہے
بسا اوقات جب ہم خود غلط اندازہ کرتے ہیں

(ص ۱۹۹)

(۲) "جی ہاں میں نے عیاشی کی ہے، جی بھر کر۔ لیکن عشق بازی کی ہے جی سے گزر کر۔ عیاشی نے میرے جسم کی کھیتیاں لہلہائیں۔ عاشقی نے میرے ذہن کی کلیاں چٹکائیں۔ عیاشی نے لذت حواس سے دوچار کیا۔ عاشقی نے نشاط شعور سے سرشار کیا۔ عیاشی نے گردن کو نقرئی بانہوں سے اجالا۔ عاشقی نے گردن میں قوس قزح کا زریں ہار ڈالا۔"

(ص ۶۳۰)

جوشؔ کا ذہنی میلان اور افتادِ طبع دونوں سمجھ سکتے ہیں۔ جوشؔ پوری زندگی گزار کر وہ بھی علی الاتصال بہر دقیقہ، یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ کون ہیں۔ مگر جوشؔ صاحب کو یہ اندازہ نہیں ہوگا وہ جس قطعیت کے ساتھ خود کو جاننا چاہتے تھے وہ عرفانِ ذات کی منزل ہے۔ یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ جولانیٔ حواس اور جسم کی کھیتیاں لہلہانے کی غرض سے عشق اور عیاشی کرے اُسے اپنا عرفان کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ بات سطحی عشق کی ہے۔ ذوق بازاری ہے خواہ خوبصورت اور ریشمی لفظوں کے پیرہن ہی میں کیوں نہ پیش کیا جائے۔ ورنہ خود کو پالینا تو انسانی عمل کی معراج ہے۔ مَن عَرفَ نفسہ فقد عرفَ ربّہ اسے میر تقی میرؔ نے کہا۔

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں ہی دور تھا

یہ وہی چیز (خودی) ہے جس کے گرد شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کی فکر اور شاعری گردش کرتی ہے۔ مان لیا جائے کہ جوشؔ سطحی شاہد باز تھے مگر مشرقی تہذیبی قدروں کے پیشِ نظر اپنے برے تجربات کا یوں کھلا اظہار ضروری نہ تھا۔ یہ جرأت کی بات بھی ہو سکتی ہے۔

آیئے جوش کے چند اشعار دیکھیں۔

جھومتی جب کبھی اٹھتی ہے گھٹا جنگلے سے
اپنی بیتی ہوئی راتوں کا خیال آتا ہے

جس حال میں ہوں، حسن مرے پیشِ نظر ہے
لیلائے شب تار ہے یا حورِ سحر ہے

پروفیسر شکیل الرحمٰن جوشؔ نمبر (آجکل ۱۹۹۵) میں لکھتے ہیں:

"جوش نے حسن کو ایک مثبت اثر تصور کیا ہے جو جمالیت کی پیداوار ہے، حسن سے انبساط حاصل ہوتا ہے تو اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ یہ خدا ہے، خالق ہے، حسن خدا ہے اور خدا حسن، ہر شے میں اسی کی تصویر نظر آتی ہے۔" (آجکل، اپریل ۹۵ء۔ ص ۶۴)

اب ذرا غور کریں کہ شکیل الرحمٰن صاحب نے جس متصوفانہ تصورِ حسن کا ذکر یہاں کیا ہے، کیا اس کا اطلاق جوشؔ جیسے ڈیڑھ درجن عشق فرمانے والے شاعر پر ہو سکتا ہے؟ اس کے ذیل میں یہ ذکر کرنا کہ حسن سے انبساط اس لیے حاصل ہوتا ہے کہ حسن خدا ہے اور خدا حسن یعنی اللہ جمیل ویحب الجمال۔ پھر یہ بھی کہنا کہ ہر شے میں اسی کی تصویر نظر آتی ہے، درست نہیں کیوں کہ یہ خالصتاً تصوف کا مسئلہ ہے جو جوش کی حدِ فکر سے باہر ہے۔ جب کہ یہ بات بھی مطالعے سے سمجھ میں آتی ہے کہ مذہبی اور سماجی قدریں

جوش کی زندگی میں تقوے کے مترادف تھیں۔ اب اسے کیا کہیں گے، مگر انھوں نے لکھا ہے:

"میرے باپ نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی مجھ کو "وہ" (ملحد) بنا دینے میں۔ میرے باپ کی تمنا پوری نہیں ہوئی اور قدرت کی حکمت و غیرت نے یہ بات کسی طرح بھی گوارا نہیں فرمائی کہ میں شاعر کے بجائے مولانا بخش اللہ بن کر رہ جاؤں۔ مضراب کو چھوڑ کر موذن سے دل لگاؤں۔ مکھڑے کے تلوں سے نظر پھیر کر تسبیحوں کے دانے گھماؤں۔ صہبا کے شیشوں سے قرابت کا رشتہ کاٹ کر استنجوں کے ڈھیلوں سے اپنا شجرۂ نسب ملاؤں۔ شراب کے پیمانوں میں تیرنے کے بدلے وضو کے بدھنوں میں غوطے کھاؤں اور کالی زلفوں کی چھاؤں سے بھاگ کر سفید داڑھیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جاکر بیٹھ جاؤں۔"

(بہ حوالہ: سلیم اختر۔ جوش کا نفسیاتی مطالعہ اور دوسرے مضامین۔ ص ۲۱)

جملوں میں عجیب ربط ہے مگر بذیاں سرائی بھی اسی کا نام ہے۔ مذہبی رواداری کا فقدان تو قابل گرفت نہیں مگر اس طرح مذہبی اقدار کی پامالی قابل توجہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کٹر دہریہ شاعر بھی ایسی مربوط بذیاں سرائی کر سکتا ہے۔ ناکامی اور انفعالیت اگر ان کی شاعری میں نہیں تو تعجب نہیں۔ یاس اور غم میں آنسوے بہانا جناب جوش کا کام نہیں۔ اگر ان کی شاعری میں آہ و فغاں اور سوز و گداز نہیں تو اس کے اسباب میں انھوں نے ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے اٹھارہ بڑے عشقوں میں سے سترہ عشق ایسے رہے تھے جن کا محبوبوں کی طرف سے بھرپور جواب دیا گیا۔ اس کا اظہار انھوں نے پروفیسر احتشام حسین کو لکھے ایک خط میں کیا تھا جو اُن کی کتاب "ذوقِ ادب اور شعور" میں موجود ہے۔ اس طرح کے بیانات سے اور "یادوں کی برات" کے صفحات سے جوش کی شخصیت کا جو روپ ہمارے سامنے آتا ہے وہ ایک طفلک دلبر اور شوخ و شنگ عاشق کا روپ ہے، جس کی ذہنی ساخت میں آزاد خیالی اور سماجی قیود نیز مذہبی عوامل کی بندشوں سے بے فکری ظاہر ہوتی ہے۔ استنجوں کے ڈھیلوں، تسبیحوں کے دانوں اور وضو کے بدھنوں سے اپنا رشتہ جوڑنا کارِ عبث تو سمجھتے ہی ہیں ساتھ ہی اس ڈگر پر چلنا "وہ" یعنی "ملحد" بننے کے مترادف تصور کرتے ہیں۔ ان کا نظریۂ خودی اقبال کی طرح نہیں کہ اعلان کرتے پھریں۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ   خودی کا تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

اور نہ ہی جہانِ عشق و محبت میں میر تقی میر کی طرح منہ لٹکائے کوبہ کو بھٹکنے کے قائل۔

گیا تھا اُس کی گلی سو پھر نہ پلٹا میر   میں میر میر کر اُس کو بہت پکار رہا
جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے   اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

جوش کے یہاں دراصل "عشق" کا مفہوم "عیاشی" ہے۔ میر کے یہاں عشق کو "عشق" کہتے ہیں بلکہ کہیں کہیں "عبادت" کے برابر ہے۔ شاید اسی لیے میر زندگی بھر گھل گھل کر پگھلتے رہے اور جوش اٹھارہ میں سے ۱۷ (سترہ) معشوقوں کی نقرئی بانہوں کے ہالے میں محصور رہے۔ جسم کی کھیتیاں لہلہاتی رہیں اور تحت الشعور سے سرشار ہوتے رہے۔

میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ جوش کی شخصیت مجروح کی جائے۔ میں نے جو کچھ بھی کہا ہے اس کا جواز جوش کی شعری اور نثری تحریروں میں موجود ہے۔ چند خطوط بھی اس نقطۂ نظر کی غمازی کرتے ہیں۔ مگر ان منفی رویوں کے باوجود جوش کی فطرت کا عقدہ کھلتا نہیں۔ انھوں نے جس طرح اسلامی عقائد اور عوامل کا مذاق اڑایا ہے اس سے لگتا ہے کہ ان کے دل پر مہر سی لگ گئی تھی۔ مگر جب وہ اللہ کی آیات و صفات کا ذکر کرتے ہیں تو ایک بار پھر اپنے نقطۂ نظر پر غور کرنا پڑتا ہے۔ اشعار دیکھیں ؎

یہ سب ایک ہی اصل کے ہیں جہات
تجلیات، آیات، اسماء، صفات

یہ تابندہ شبنم، یہ رخشندۂ آب
یہ گل ریز گلشن، یہ گلگلوں سحاب

یہ اعلان و اظہار و کشف و ظہور
یہ دراج و طاؤس و مرغ و طیور

خیابان و بستان و کوہ و کمر
یہ لؤ لؤ و مرجان و لعل و گہر

قوالی اور عرس بھی اسلامی تہذیب کا حصہ تصور کیا جاتا ہے جب کہ اسلامی زندگی میں اور رسولؐ اللہ یا صحابہ کرام کے زمانے میں ان باتوں کا گزر نہیں۔ جوش کو بھی یقین ہے کہ اس سے وحدانیت مجروح ہوتی ہے اور ربوبیت کا چہرہ مسخ ہوتا ہے۔ جوش نے کاری ضرب لگائی ہے قوم کے ٹھیکہ داروں کی اس روش پر۔ ان کی نظم "کافر نعمت مسلماں" (شعلہ و شبنم سے ماخوذ) سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ ؎

آج کتراتا ہوا وحدانیت کی راہ سے
یہ مرادیں مانگتا ہے کون غیر اللہ سے

جھومتا ہے کون قوالوں کے ہر اک بول پر
کون یہ عرسوں میں پیروں ناچتا ہے ڈھول پر

مومن و مسلم کا بخشا تھا تمھیں اُس نے خطاب
شیعہ و سنّی کا نازل کرلیا تم نے عذاب

بندگی اصنام کی ٹھہرائی تھی اُس نے حرام
اور تم ہر مقبرے کو جھک کے کرتے ہو سلام

اس کے علاوہ جوش ماتم حسین کرنے والوں کو بھی متنبہ کرتے ہیں جہاں سیاسی رنگ میں شور و شین دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی نظم "اے مومنان لکھنؤ" سے ایک شعر ؎

منبر سبط نبیؐ پر اور سیاسی شور و شین
مجھ سے آنکھیں تو ملاؤ سوگواران حسینؑ

"امام باڑہ" آج بھی سیاحوں کی تفریح گاہ ہے۔ بلکہ آج تو لال قلعہ کے ساتھ ساتھ دلی کی جامع
جد بھی ناپاک غیر ملکی سیاحوں خواہ مرد ہوں یا عورت، سب کے لیے سیر گاہ بن گئی ہے۔ جوش امام باڑوں
ا حرمت کو پامال ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ محرم کی آٹھویں اور نویں کو چراغاں کیا جانا اور بڑے
ا نے پر امام باڑے میں اہتمام کیا جانا اور صاحب لوگوں کے لیے مخصوص ہونا، ایک عبرت ناک پہلو ہے۔
ش کی نظم "متولیان وقف حسین آباد سے خطاب" سے یہ اشعار دیکھیں۔

علوں میں جس جگہ خونِ شہیداں کا ہو رنگ　　سیر کرنے کو بلائے جائیں وہ اہل فرنگ
تملق، یہ خوشامد، یہ زبوں اندیشیاں　　غم کدہ مسلم کا ہو نصرانیوں کا بوستاں
نہائے دل میں کھولا جائے میخانہ کا باب　　تہقیے ہوں آنسوؤں کی انجمن میں بار یاب
م شیون پر کھلے موج تبسم کا علم　　خون کے قطروں پہ اور ارباب عشرت کے قدم
تی صہبا چلے اہل وفا کے خون میں　　آخری ہچکی بھری جائے گریبو فون میں

جوش کے دل میں کہیں نہ کہیں اسلامی تہذیب اور ثقافت نیز یکی وحدانیت کی تصویر چھپی تھی جو
عر کرنہ آسکی وہ رسول اللہ سے عقیدت بھی رکھتے ہیں۔

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کافری
رعشہ خوف بن گیا رقص بتانِ آزری

جب بے اللہ کے آیات و صفات کا شمار کرنے کے بعد بھی وہ کہتے ہیں۔

مگر اے خدا وند رب جلیل　　ملی مجھ کو اب تک نہ ایسی دلیل
کہ ہو جس سے آئنہ راز صفات　　کہ ثابت ہو جس سے تری پاک ذات

اور آگے بڑھیں تو ہم پھر وہیں چلے آتے ہیں جہاں سے جوش کے ذہنی میلان کا ذکر شروع ہوا
ما۔ عجیب طرح کی کشمکش موجود ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ جوش پوری زندگی تذبذب اور کشمکش کے دائرے
سے باہر نہیں آسکے۔ کبھی وحدانیت اور رسالت کا اقرار ہے تو کبھی کھلم کھلا انکار۔ جسے لوگ جوش کی
غلابیت کہتے ہیں دراصل اس آدمی کی ذہنی تہذیب کا المیہ ہے کہ جگنو کبھی اس ڈال پر چمکتا ہے تو کبھی اس
ل پر۔ جوش پھر وہیں آجاتے ہیں جہاں سے چلے تھے۔

یقین بن کے جب تک نہ آئے گا تو　　تو اے وہم دیرینہ اہل ہو
رہ کفر کی خاک چھانے گا جوش　　نہ مانا ہے تجھ کو نہ مانے گا جوش

تجمل حسین خاں
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

جامعہ میں مذہبی نثر کا ارتقاء

خالقِ کائنات نے جب اس کائنات کو بنایا۔ اور اس دنیا میں انسان کو بھیجا اور جب انسان دنیا میں آیا تو اس کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے کچھ چیزوں کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ کائنات میں خالقِ باری نے جسمانی احتیاجات کو پورا کرنے کے لیے پہاڑ، دریا، پیڑ پودے وغیرہ عطا کیے ہیں۔ اور وسائل کا ایک ایسا خزانہ ودیعت کیا ہے کہ جو کبھی ختم نہ ہونے والا ہے۔ انسان نے اپنی بنیادی ضرورتیں کائنات کے توسط سے پوری کیں۔ اور اس کے علاوہ اس نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ بھی عطا کیا۔ جس کی رو سے انسان تمام جانداروں میں سب سے افضل ہے کیونکہ انسان کو عقل کی دولت سے بھی سرفراز کیا گیا۔ اور انسان نے اپنی عقل اور سمجھ بوجھ کے بل بوتے پر تمام کائنات کو مسخر کیا۔

مذہب کا تصور انسان میں ابتدائے آفرینش سے قائم ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے انسان مظاہر فطرت کی جانب راغب ہوا اور جن چیزوں سے اسے خوف محسوس ہوا، یا جو شے اسے اچھی لگی، یا جن سے اس کو محبت ہوئی اس نے اس کے آگے اپنا سر خم کر دیا۔ لیکن جیسے جیسے انسان باشعور ہوتا گیا اس کے ان خداؤں کی تعداد میں کمی واقع ہوتی رہی۔

مذہب کی تعریف کرنا خاصا مشکل کام ہے کیونکہ دنیا میں اصولوں اور نظریات کی کثرت کی بنا پر مذہب کی کوئی ایسی تعریف کرنا ناممکن سا لگتا ہے۔ کیونکہ مذہب کا تصور ہر انسان کا علاحدہ علاحدہ ہے لیکن موٹے طور پر ہم مذہب کی یہ تعریف کر سکتے ہیں کہ انسان اپنی انفرادی زندگی بسر کرنے کے لیے جو نظامِ حیات بناتا ہے اسے مذہب کہتے ہیں۔ کیونکہ بغیر کسی نظام یا اصول کے اچھی زندگی کو بسر نہیں کیا جا سکتا۔ بغیر کسی ضابطۂ حیات کے انسان زندگی کو کامیابی کے ساتھ نہیں گزار سکتا۔ عبدالرشید صاحب مذہب کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ۔

"انسان انفرادی اور معاشرتی زندگی کے لیے جن اصولوں کا انتخاب کرتا ہے انھیں مذہب کا نام دیا جاتا ہے، خواہ وہ اصول انسانی وضع کردہ ہوں یا خالق کائنات کی طرف سے ودیعت کیے گئے ہوں"[1]

دنیا کی تاریخ میں کوئی بھی دور ایسا نہیں رہا جس میں مذہب کا تصور نہ ہو، بلکہ آثار قدیمہ اور جغرافیائی تحقیقات نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانوں کی جماعتی، قومی اور تہذیبی زندگی میں مذہب موجود تھا۔ مذہب کو ہر زمانے میں مرکزیت حاصل رہی ہے۔ اس سے کسی کو مفر نہیں، حالانکہ اس کا اظہار مختلف عقائد، مخصوص اعمال کے ذریعے کیا گیا لیکن اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مذہب اور مذہبی احساس انسان کی زندگی اور دلوں میں ہمیشہ رہا ہے۔ مذہب کی حقیقت سے متعلق جناب آزاد فاروقی فرماتے ہیں کہ۔

"... بنیادی اعتبار سے مذہب کی حقیقت دو خانوں میں تقسیم محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ مذہب کے ان دونوں پہلوؤں کے درمیان ایک اندرونی ربط پایا جاتا ہے لیکن اپنی خاص کیفیت اور زندگی کے دو الگ میدانوں سے متعلق ہونے کے لحاظ سے دونوں کا فرق بھی بہت واضح ہے۔ مذہب کا ایک خانہ یا اس کا ایک پہلو فرد کی باطنی زندگی سے تعلق رکھتا ہے جہاں وہ مذہب کی حقیقت سے بطور ایک احساس اور باطنی واردات کے دوچار ہوتا ہے، یہی وہ دنیا ہے جہاں مذہب اپنی اصل حقیقت میں بے نقاب ہوتا ہے اور انسان کا اس سے براہ راست تعلق قائم کرتا ہے اسی لیے یہی وہ سطح ہے جہاں باطنی تجربہ میں آکر مذہب انسان کی مذہبی تشنگی کو دور کرنے کا سبب بنتا ہے"[2]

مذہب کی دوسری صورت یا اس کا دوسرا پہلو فرد کی جماعتی زندگی سے متعلق ہے، یہاں مذہب ایک ایسی مخصوص روایت کی شکل میں سامنے آتا ہے جو ایک طرف تو افراد کی مذہبی اجتماعیت کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے اور دوسری طرف اپنے تعلق سے فرد کے لیے مذہب کے عملی اور اجتماعی اظہار کو بھی ممکن بناتی ہے۔"[3]

مذہب انسانی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے تو سارا جسمانی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور انسان سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ بالکل اسی

ہ ادیان و مذہب کا تقابلی مطالعہ، عبدالرشید، ۱۹۸۶ء، صفحہ ۲۱۔

ہ دنیا کے بڑے مذاہب۔ عماد الحسن فاروقی، ۱۹۸۶ء صفحہ ۷۔

ہے جس کی بنیادیں عالمگیر برادری پر قائم ہوں۔ ایسا معاشرہ جس میں رنگ، نسل، قبیلہ، تعصب اور وطنی و لسانی حد بندیاں نہ ہوں بلکہ سب میں باہمی اخوت و مساوات کا رشتہ ہو۔ اس لیے اسلامی نظام معاشرت کی بنیادیں مساوات، اخوت، اور ذمہ داری کے تصور، احترام روایات خاندانی معاملات اور باہمی حقوق و فرائض پر قائم ہیں۔ اخوت اور مساوات وہ بنیادی اقدار ہیں جن سے کسی بھی معاشرے میں اصلاح لائی جا سکتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں مذہب اسلام ایک عالمگیر مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس مذہب کی انفرادی اور اجتماعی اقدار بڑی ٹھوس اور پائیدار ہیں۔

مذہب کی تعریف کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہبی نثر کیا ہے۔ ہم موٹے طور پر مذہبی نثر کی تعریف یہ کر سکتے ہیں کہ جس میں مذہب سے متعلق تمام امور، مسائل اور حالات و واقعات کو بیان کیا جاتا ہے اسے مذہبی نثر کہتے ہیں لیکن مذہبی نثر کے اور بھی تقاضے ہیں۔ مذہبی نثر میں زبان کی سب سے بڑی اہمیت ہے۔ اس میں ہم عام زبان نہیں برت سکتے بلکہ وہی لفظ لکھ سکتے ہیں جن کا تعلق اس مذہب سے ہو۔ ہمارے یہاں دنیا میں ہر مذہب کی تاریخ موجود ہے۔ اور اس تاریخ کی بنا پر ہی ہمارے یہاں جو مصنفین ہیں انھوں نے نثر لکھی اور الفاظ وہی استعمال کیے جو کہ مذہبی نوعیت کے حامل ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام مذہب کی تاریخ کو محدثین اور ارباب سیر نے لکھا ہے۔ انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کسی بھی گوشے کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اسلام کی مقتدر ہستیوں کو بھی متعارف کرایا ہے۔ ان تمام لوگوں کا جن کی تعداد سیکڑوں نہ تھی بلکہ لاکھ کے قریب تھی ان شخصیات کو متعارف کرانے کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔ اس دور میں علوم کو سیکھنا اور اسے محفوظ رکھنا بڑی سعادت کی بات ہوتی تھی۔ اس لیے ہزاروں صحابہ کرام نے جو کچھ مشاہدہ کیا اور جو کچھ سیکھا اسے آیندہ نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے انھوں نے اسے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا۔ دوسرے عربوں کا حافظہ بہت زیادہ قوی تھا۔ وہ ہر چیز کو بہ آسانی یاد کر لیا کرتے تھے چاہے سیکڑوں اشعار کے قصائد وغیرہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح انھوں نے احادیث کو بھی یاد کیا اور قرآن کریم کو بھی حفظ کیا۔ اور اس کے بعد وہ احادیث کو ضابطۂ تحریر میں لائے۔ یہی ہمارا مذہبی سرمایہ ہیں۔ اب اس مذہبی سرمایے کو لکھنے کے لیے مذہبی نثر لکھی گئی اور اس میں الفاظ اور اصطلاحیں وہی لکھی گئیں جو کہ مذہبی نوعیت کی تھیں۔

لہٰذا مذہبی نثر نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے اور اگر یہ مذہبی نثر وجود میں

طرح مذہب کی بھی اہمیت ہے کہ اگر انسانی زندگی سے مذہب کو الگ کر دیا جائے تو انسان اپنی زندگی کو صحیح ڈھنگ وطریقے سے نہیں چلا سکتا۔ مذہب سے انسان نے ضابطۂ حیات سیکھا بنیادی ضروریات کے ساتھ ساتھ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اصول ہر دور میں بتائے گئے ہیں اور انسان نے اس سے ہر دور میں استفادہ بھی کیا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو انسان آج بھی خانہ بدوشوں کی زندگی گزار رہا ہوتا اور جنگلوں میں جنگلی جانوروں کا شکار کر رہا ہوتا لیکن خالق کائنات نے انسان کو ہر اعتبار سے اعلا اور افضل بنایا ہے۔ اسے عقل وشعور کی وہ دولت عطا کی ہے کہ جس سے اس نے اپنے آپ کو ترقی کی راہوں پر گامزن کیا ہے۔ مذہب نے اسے زندگی گزارنے کے قوانین اور اصول سکھائے جس سے اس کی زندگی میں سلیقہ اور ڈھنگ آگیا۔

بحیثیت مسلمان کے ہمارے مذہب اسلام کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجا اور ان کے بعد ایک کے بعد ایک اور دوسرے انبیائے کرام دنیا میں تشریف لاتے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام دنیا والوں کو دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تک تمام انبیائے کرامؑ نے ایک ہی مذہب کی تبلیغ فرمائی جسے اسلام کا نام دیا جاتا ہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں نے اس مذہب کی اصلیت کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ اسی لیے اللہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ان پر مذہب کو مکمل بھی کر دیا اور حضرت محمدؐ کے بعد نبوت ختم ہوئی ان کے بعد دنیا میں اب کوئی نبی نہ آئے گا اور مذہب اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر مکمل ہو گیا اور اس مذہب میں یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ یہ ہر دور کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے یعنی مکمل اور جامع ضابطۂ حیات۔

اسلام کے لفظی معنی اطاعت کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کرنا۔ اس لحاظ سے کائنات کی ہر شے سورج، چاند، ستارے، سیارے، ہوا، پانی اور نباتات وغیرہ سب ہی اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع ہیں، اسلام کے بنیادی عقائد توحید رسالت اور عقیدۂ آخرت ہیں اور اس کے علاوہ کچھ فرائض بھی ہیں پانچوں وقت اللہ تعالیٰ کے آگے سر بہ سجود ہونا، سال میں ایک ماہ روزے رکھنا، اور راہ خدا میں لازمی دولت خرچ کرنا۔ اس طرح کے نظریۂ حیات کو اپنا کر ہر انسان دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ چاہے وہ کسی بھی مسلک، نسل، قوم یا طبقہ سے تعلق رکھتا ہو۔

مذہب اسلام ایک مکمل مذہب ہے۔ اس میں انفرادی اور اجتماعی دونوں ہی زندگی گزارنے کے ضابطے اور قوانین موجود ہیں۔ اسلام معاشرہ کے قیام کی اہمیت پر زبردست زور دیتا

ہ آئی تو ہم مذہب کی تاریخ سے بھی محروم ہو جاتے۔ مذہبی نثر کی بھی اتنی اہمیت ہے جتنی مذہب کی۔ کیونکہ مذہبی نثر کا ماخذ اور موضوع مذہب ہی کے گرد گھومتا ہے۔ مذہبی نثر میں زبان ایک مرکزی حیثیت کی حامل ہے کیونکہ اس سے ہی ہم عام نثر اور مذہبی نثر میں فرق کر سکتے ہیں۔ مذہبی نثر میں موضوعات، زبان، اصطلاحیں وغیرہ سب مذہب پر ہی مبنی ہوتی ہیں۔ اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں رہنے والے مذاہب کی تاریخ، حالات و واقعات سے واقفیت حاصل کریں اور اپنی زندگی کو کامیاب بنائیں۔ جیسا کہ ہم نے مضمون کے آغاز میں کہا کہ مذہب مکمل ضابطۂ حیات کا نام ہے۔ یہ ضابطۂ حیات تبھی مستحکم اور مضبوط ہو سکتا ہے جب ان سے متعلق انسان کو معلومات ہوں۔ ہمارے علمائے کرام اور محدثین کرام نے قرآنی تعلیمات، حضورؐ کے اقوال و اعمال کو مختلف انداز سے لکھا ہے۔ لیکن ماخذ قرآن کریم کو ہی بنایا ہے۔ اس میں کوئی بھی بات ہم اپنی جانب سے نہیں لکھ سکتے کیونکہ قرآن مجید موجود ہے لیکن عام لوگ اس کو نہیں سمجھ سکتے اس لیے صرف اس کی تشریح و توضیح مختلف مثالوں کے ذریعہ ہی کر سکتے ہیں لیکن اپنے نقطۂ نظر سے کسی بھی آیت یا اقوال کو غلط نہیں کہہ سکتے۔ انہی تمام باتوں کو مذہبی نثر لکھتے وقت ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے نہیں تو وہ نثر مذہبی نثر کے دائرے سے خارج ہو جائے گی۔

مذہبی نثر کو تمام دنیا میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ لکھا گیا۔ مختلف اداروں نے اس کی اشاعت و تبلیغ کی۔

ہندستان ایک عظیم ملک ہے۔ یہاں پر مختلف مذاہب، ذاتوں اور اقوام کے لوگ بستے ہیں اور یہاں کی تہذیب کی خوبی یہ ہے کہ یہاں وحدت میں کثرت کے جلوے نظر آتے ہیں۔ چاہے کوئی بھی شخص کسی بھی مذہب، ذات، قبیلے یا قوم سے تعلق رکھتا ہو لیکن وہ اصل میں ہندستانی ہے۔ ہندستان میں مذہبی نثر خوب لکھی گئی۔ مذہبی نثر میں جہاں ندوۃ العلوم اعظم گڑھ اور دیوبند نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ وہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مذہبی نثر کی روایت کو آگے بڑھایا اور کارہائے نمایاں انجام دیے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندستان کے ان نامور اداروں میں سے ایک ہے جنھوں نے ملک و ملت کی خاطر کافی پریشانیاں اور صعوبتیں جھیلیں اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں عمل میں آیا لیکن اس کو قائم کرنے میں بہت سی صعوبتیں اور پریشانیاں اُٹھانی پڑیں کیونکہ ہندستان کا نظام تعلیم مکمل طور پر انگریزوں کے زیر نگیں تھا۔ انگریزوں نے کبھی بھی ہندستان کے تعلیمی نظام کی جانب توجہ نہ کی بلکہ اس لیے اپنے مفاد کے پیش نظر انھوں نے

تعلیمی پالیسی بنائی۔ ان کا مقصد ہندستانیوں میں سے پڑھے لکھے ملازم اور کلرک بنانا تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے مشرقی علوم کو عصر جدید کے رنگ میں رنگنے پر زور دیا لیکن لارڈ میکالے نے اس خیال کو مسترد کر دیا اور اس نے یہ نظریہ دیا کہ ہندستانیوں کو مغربی علوم کی تعلیم انگریزی ذریعۂ تعلیم کے ذریعہ دی جائے۔ مسلم عوام اس قسم کے نظریۂ تعلیم سے متنفر ہوگئے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ایسی تعلیم جو ان کی مذہبی اور تہذیبی روایات سے بالکل بے تعلق ہو وہ کس طرح مفید ثابت ہو سکتی ہے اس لیے انھوں نے اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں داخل کرانے کے بجائے انھیں عربی مدارس میں مشرقی علوم کی تعلیم دلانا پسند کیا لیکن ان مدارس کی حالت بڑی خستہ تھی اور ان کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ اس طرح مسلمانوں نے شروع دن سے ہی مغربی علوم کی تعلیم کو نہ اپنایا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی تعلیمی حالت بے حد ابتر تھی۔ اگر کچھ دن اور مسلمان نئے نظام تعلیم سے بے توجہی برتتے تو ہو سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے تعلیمی اعتبار سے پچھڑ جاتے۔ لیکن ایسے میں سرسید نے مسیحائے قوم بن کر اپنی قیادت میں ایک تعلیمی تحریک شروع کی اور انھوں نے مسلمانوں کو مغربی دنیوی تعلیم کی طرف راغب کرایا اور ساتھ ہی دینی تعلیم پر بھی توجہ کی۔ سرسید نے ان ہنگامی حالات میں علی گڑھ میں ایک کالج محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے نام سے کھولا اور اس طرح سے انھوں نے مسلمانوں کی وقتی ضرورت کو پورا کیا لیکن وہ اسے مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کا حل نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ آزاد یونی ورسٹی کا قیام چاہتے تھے کیونکہ جب تک مسلمانوں کی تعلیم حکومت کی مداخلت سے آزاد نہ ہوگی تب تک قوم و ملت کو فائدہ نہیں پہنچ سکے گا۔ اس ضمن میں سرسید نے بہت کوششیں کیں اور ایک اسکیم سید محمود سے مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق تیار کروائی مگر ان کی یہ کوششیں کارگر ثابت نہ ہو سکیں کیونکہ کالج کے اور دوسرے لوگوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء میں ہندستان کے رہنما جب جیل سے باہر آئے تو دنیا میں مسلمانوں پر آفت آئی ہوئی تھی اور مسلمان ایک انتشار سے گزر رہے تھے۔ اتحادی ممالک ترکی کے حصے کرنے میں لگے تھے۔ خلافت ترکی میں قائم تھی اور صدیوں سے مسلمانوں کی شیرازہ بندی چاہے برائے نام ہی خلافت کے ذریعے ترکی انجام دے رہا تھا۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کے دلوں میں اس کے لیے زبردست عقیدت و احترام تھا۔ اور جو ممالک ترکی اور دوسرے مسلم ممالک کی آزادی چھیننے کے درپے تھے وہ اسلام دشمن تھے۔ انگریزی حکومت مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے میں سب سے زیادہ پیش پیش

تھی اس لیے ہندستانی مسلمانوں میں حکومت کے خلاف غم و غصہ بھڑک گیا اور انھوں نے احتجاج میں ملک کے ہر کونے میں حکومت کے خلاف جلسے کیے اور انھوں نے ۲۰ر نومبر [illegible] میں خلافت کمیٹی دلی میں قائم کرلی اور اس کمیٹی نے ملک گیر پیمانے پر حکومت برطانوی کا مقابلہ کرکے اور منصب خلافت کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کو منظم و متحد کرنا شروع کردیا۔ اور یہ کام اتنے جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانوی حکومت کی بنیادیں نیست و نابود ہوجائیں گی ہندستان کے ہر کونے میں سیاسی بیداری کی زبردست لہر پیدا ہوگئی۔ اسی وقت گاندھی جی کی قیادت میں تحریک عدم تعاون شروع ہوگئی اور پھر یہ دونوں تحریکیں باہم مل گئیں ملک گیر پیمانے پر برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا گیا سرکاری اداروں سے استعفے دیے گئے۔ ایسے میں علی گڑھ کالج کے بہت سے طالب علموں کو خلافت تحریک سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور انھوں نے علی برادران کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی کہ وہ ترک موالات کا پیغام دیں۔ علی برادران اور گاندھی جی علی گڑھ گئے اور وہاں انھوں نے ترک موالات کا پیام سنایا۔ لیکن اس جلسے میں بدعنوانی پھیلائی گئی مقررین پر فقرے کسے گئے لیکن جس وقت علی برادران نے یہ کہا کہ۔

"علی گڑھ ہمارا روحانی گھر تھا ہم یہاں بڑے ارمان لے کر آئے تھے بہت دل شکستہ جاتے ہیں خدا حافظ۔ نوجوانوں کا مجمع چلا چلا کر رو رہا تھا۔ بہتوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں ایک کہرام تھا۔ دل پگھل پگھل کر آنکھوں سے نکلے پڑے تھے۔ اس عالم میں علی برادران ہال سے چلے گئے۔"[1]

علی برادران کے جانے کے بعد ذاکر صاحب نے تقریر کی جو کہ اس وقت وظائف لکچرار تھے۔ انھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد دیگر سبھی لوگوں نے اپنے عہدے چھوڑے اور وظائف نہ لینے کا عہد کیا۔ اور ایک علاحدہ ادارے کی تجویز پر غور کیا گیا۔ اس کے بعد حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا حسرت موہانی اور دوسرے مسلم رہنماؤں اور سیاسی کام کرنے والوں نے طلبہ کے اس مطالبے کو قبول کرلیا اور ایک علاحدہ ادارہ کھولنے کی تجویز کو منظور کرلیا گیا۔ چنانچہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں بروز جمعہ جامعہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور اس طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام خلافت تحریک اور عدم تعاون تحریک کے سنگم کی بدولت وجود میں آگیا۔ اس موقع پر مولانا محمود الحسن کا یہ تاریخی خطبہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

---

[1] ہندستانی مسلمانوں کی قومی تحریک۔ شمس الرحمان محسنی صفحہ ۱۲

"ہاں ضرورت اس کی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے کلیتاً آزاد ہو۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات کے اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبار اوضاع و اطوار کے ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔
ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونی ورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا، اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ بغداد میں جب مدرسہ سلطانیہ کی بنیاد اسلامی حکومت کے ہاتھوں رکھی گئی تو اس دن علماء نے جمع ہو کر علم کا ماتم کیا، کہ افسوس آج سے علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لیے پڑھا جائے گا۔ تو کیا آپ ایک ایسے کالج سے فلاح قومی کی امید رکھتے ہیں۔ جس کی امداد اور نظام میں بڑا قوی ہاتھ ایک غیر اسلامی حکومت کا ہو۔
ہماری قوم کے سربر آوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درس گاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلا تعلیم دی جاتی ہے اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول و فروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں اور ان میں اپنی ملت اور اپنے ہم قوموں کی حمیت نہایت ادنادرجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درس گاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔
اس لیے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونی ورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علاحدہ اور جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔"[1]

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مقاصد تعلیمی آزادی، دینی اور دنیاوی علوم کی ہم آہنگی اردو زبان میں تعلیم، وطن پرستی اور متحدہ قومیت، صنعت و حرفت، سادگی اور کفایت شعاری اور میانہ روی وغیرہ تھے۔ جامعہ کے یہ مقاصد ہمیں جامعہ میں جاری و ساری نظر آتے ہیں۔ حالانکہ دینی اور دنیاوی علوم کی ہم آہنگی جامعہ کے مقاصد میں شامل ہیں اور جامعہ کے نصاب میں اسلامیات کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ غیر مسلم

---

[1] مستقبل کی طرف، مرتبہ خواجہ محمد شاہد، خالد کمال فاروقی ۱۹۹۵ء صفحہ ۳۷

کے لیے ان کے مذہب کی تعلیم کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ جامعہ کے نام سے ظاہر ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۱۲ دسمبر ۱۹۲۲ء کو اپنی ایک تقریر میں کہا ہے کہ۔

"میرے نزدیک جامعہ ایک اسلامی ادارہ ہے۔ جس کا مقصد ہندستان کے مسلمانوں کی تعلیم ہے۔ اس تعلیم کی بنیاد دین اسلام اور تمدن اسلام ہے۔ دین اسلام سے مراد وہ دین ہے جو غیر اللہ کی عبادت سے نجات دلاتا ہے خدا کی عبادت کا پابند کرتا ہے اور اس طرح ایک عالمگیر برادری کی بنیاد ڈالتا ہے۔ تمدن اسلام سے مراد وہ روایات ہیں جو آنحضرتؐ نے نمونے کے طور پر ہمارے لیے قائم کی ہیں۔ ماحول کی رعایت سے اس بڑے مقصد میں چند اور مقاصد شامل ہو جاتے ہیں وہ یہ ہیں۔ آزادی کی خواہش، یہ وطن کی پوجا کے لیے نہیں بلکہ غیر اللہ سے ہٹ کر اللہ کی طرف راغب ہونے کے لیے۔ اردو کی خدمت، وہ اردو جیسے مسلمانوں کا انصاف پسند طبقہ قائم رکھنا اور پھیلانا چاہتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جامعہ کی بنیاد، اسلامی تعلیمات آزادی کی خواہش اور اردو کی خدمت ہے۔"[1]

جامعہ سے متعلق ذاکر صاحب "جامعہ کیا ہے" کے کتابچے میں فرماتے ہیں

جامعہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی آیندہ زندگی کے اس نقشے کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب بنائے اور اس کے مطابق ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں تعلیم دے۔ جامعہ علم محض روزی کی خاطر جو ہمارے ملک کی جدید تعلیم کا اصول ہے اور علم محض علم کی خاطر جو قدیم تعلیم کا اصول تھا دونوں کو بہت تنگ اور محدود سمجھتی ہے۔ وہ علم زندگی کی خاطر سکھانا چاہتی ہے، جس کے وسیع دائرے میں مذہب، حکمت اور صنعت، سیاست اور معیشت سبھی کچھ آجاتا ہے۔ وہ اپنے طلبہ کو اس قابل بنانا چاہتی ہے کہ قومی تہذیب اور عام انسانی تہذیب کی ہر شاخ کی قدر و قیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایک شاخ میں اس طرح کام کریں کہ ان کا کام کسی نہ کسی حد تک مجموعی زندگی کے لیے مفید ہو۔"[2]

---

[1] ہندستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک از محسنی، ۱۹۸۶ء صفحہ ۱۱

[2] ایضاً ص ۱۷ تا ۲۷۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مذہبی نثر کی روایت قیام جامعہ سے قائم ہوگئی تھی یہاں کے مصنفین نے مذہبی نثر میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ مذہبی نثار جنھوں نے مذہبی نثر لکھی ان میں اسلم جیراجپوری، عبدالواحد سندھی، الیاس احمد مجیبی، رئیس احمد جعفری، نذیر نیازی، محمد حسین حسان، مولانا محمد عبداللہ محمد بن یوسف سورتی، غلام السیدین، عبدالعلیم، عبدالحلیم ندوی، عبدالملک، عبدالسلام قدوائی، مشیرالحق، ضیاءالحسن فاروقی وغیرہ خاص ہیں۔ انھوں نے مذہبی نثر بڑے جوش و خروش کے ساتھ لکھی۔ (جاری)

دیگر اداروں کی مطبوعات

مغربی افریقہ میں اسلام :

علمی تہذیبی اور ثقافتی مطالعہ

ڈاکٹر شیث محمد اسمٰعیل اعظمی

اردو میں اپنے موضوع پر منفرد اور معلومات افزا کتاب۔ جس میں اوائل اسلام سے دور حاضر تک کی علمی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا احاطہ نائجیریا کے خصوصی حوالے سے کیا گیا ہے۔ مصنف کے ۲۵ سال تک مغربی افریقہ میں قیام اور عربی و مقامی زبانوں سے ان کی واقفیت نے اس کتاب کو اور مستند بنا دیا ہے۔ قیمت=/200

فارسی میں ہندی الفاظ

تحقیق و تالیف۔ عبدالرشید

اس کتاب میں مولف نے فارسی لغات فرہنگ جہانگیری، فرہنگ شعوری، فرہنگ آنند راج، غیاث اللغات، لغت نامہ، معجم، فرہنگ فارسی وغیرہ سے ہندستانی الفاظ اور ان کی شرح و توضیح استخراج کر کے فرہنگ تیار کی ہے جو سات ابواب پر مشتمل ہے۔ مولف کا مقدمہ مفصل بھی ہے اور اہم بھی۔ قیمت= 200

اردو مرثیہ ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی

(میر انیس کے بعد)

ڈاکٹر سید طاہر حسین نے اس کتاب میں مرثیہ کی تاریخ کو سماجی و ادبی پس منظر میں مرتب کیا ہے اور عہد حاضر تک مرثیہ نگاری کا تنقیدی جائزہ مفصل طور پر لیا ہے۔

قیمت= 250

آسماں محراب

نیا مجموعہ کلام (۱۹۷۶ء تا ۱۹۹۶ء)

شمس الرحمن فاروقی

"نامکمل سوانح حیات" اور "قصیدہ شہر آشوب" کے علاوہ نظموں، غزلوں کے تراجم میں بھی ذہن رسا کے جوہر اپنی آب و تاب دکھاتے ہیں۔ غزل میں بھی ایک انفرادی نظر ہے۔ شعری مجموعوں میں ایک خوشگوار اضافہ۔

قیمت= 210

مت سہل ہمیں جانو .انور ظہیر خاں

اردو کے سات ممتاز ادبی شخصیتوں پر لکھے ہوئے خاکوں کا مجموعہ۔ یہ شخصیتیں ہیں۔ ڈانصاری، سردار جعفری، اختر الایمان، باقر مہدی، حسن نعیم، عزیز قریشی، اور ندا فاضلی۔ ان شخصیتوں کو خاکہ نگار نے قوس بدل بدل کر دور و نزدیک سے دیکھا ہے۔ قیمت= 120

فاصلوں میں بٹی زندگی رشید انجم

(دو طویل ڈرامے)

"فاصلوں میں بٹی زندگی" اور "شجاع الدولہ" ان دو ڈراموں میں رشید انجم نے انسانی نفسیات کی گرہوں کو کھولنے اور رشتوں کی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

قیمت= 175

متاعِ ہنر محمود سروش

محمود سروش الفاظ کے مزاج داں ہیں، صداقت، جذبات اور خلوص اظہار ان کی ندرت کلام کے ضامن ہیں ان کی شاعری میں ایک لطیف جمالیاتی کیف ہے۔

قیمت= /120

ڈاکٹر نثار احمد
شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

خالدہ حسین کے افسانے : چند پہلو

۱۹۶۰ء کے بعد اردو میں علامتی و تجریدی افسانہ نگاری کا چلن عام ہوا جس نے افسانے کی جمالیات کو بدل کر رکھ دیا۔ اب وضاحت کی جگہ دھند اور اسرار کی کیفیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگئی۔ کہانی پن کا تصور بدلا۔ پُراسرار کیفیت و فضا کی تخلیق کے لیے زمان و مکاں کی قید کو ختم کیا گیا، واقعات کی منطقیت کو رد کیا گیا۔ کرداروں کو پرچھائیں اور نشانات کی طرح بنا دیا گیا۔ جزئیات نگاری اور فضا سازی کو افسانہ بدر کردیا گیا لیکن باشعور افسانہ نگاروں نے انھیں فنکارانہ طور پر استعمال کر کے اپنی کہانیوں کو قاری سے قریب تر کیا۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے تو سماجی و سیاسی موضوعات کو کم کرنے کی کوشش کی گئی اور فرد کی ذات اور اس کے باطن کے اتھل پتھل کو موضوع بنایا گیا۔ اس سلسلے میں وجودیت کے نظریوں سے مدد لی گئی۔ فرد کے باطن کی پیشکش کے لیے تکنیک کے تجربے کیے گئے چنانچہ شعور کی رو، داخلی خود کلامی اور خود کلامی کی تکنیکوں کو استعمال کیا گیا۔ روایت سے انحراف کے لیے اسالیب کے تجربے کیے گئے چنانچہ داستانی اور تجریدی اسالیب میں افسانے لکھے گئے۔ اس کے لیے ایک طرف داستانوں، لوک کہانیوں، آسمانی صحائف، کتھاؤں اور بودھ جاتکوں سے واقعات اور کردار مستعار لے کر انھیں جدید زندگی سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا گیا۔ داستانوں سے فوق الفطرت واقعات اور کردار اور کہانی در کہانی کے فن کو اختیار کیا گیا لیکن افسانہ نگاروں نے داستانوں سے سب کچھ نہیں لیا بلکہ کچھ چیزوں کو چھوڑ بھی دیا مثلاً داستانوں میں مصیبت کے وقت نجات دہندہ آتا ہے لیکن علامتی کہانیوں میں نجات دہندہ نہیں آتا۔ علامتی افسانوں میں تجریدیت کی طرف زیادہ جھکاؤ ملتا ہے۔ تجرید پیدا کرنے کے لیے افسانے کے نہ صرف پلاٹ کو توڑ دیا گیا بلکہ زبان و بیان اور افسانے کے دوسرے صنفی تقاضوں میں تبدیلی پیدا کی گئی اور صرف لفظوں کی تصویروں کے سہارے مافی الضمیر کو قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ کچھ کہانیاں ریاضی اور اقلیدس کی شکلوں کے ذریعے بنی گئی جو کہانی کی

ترسیل میں پوری طرح ناکام رہیں۔ بہرکیف وہی علامتی کہانیاں کامیاب رہیں جن میں کہانی پن کسی نہ کسی سطح پر ضرور رہا ہو۔

علامتی و تجریدی افسانے کو جن فنکاروں نے معیار و اعتبار عطا کیا ان میں ایک اہم نام خالدہ حسین کا ہے۔ ان کے تین افسانوی مجموعے "پہچان" (۱۹۸۱ء) "دروازہ" (۱۹۸۴ء) "مصروف عورت" (۱۹۸۹ء) ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کا چوتھا افسانوی مجموعہ بھی منظر عام پر آگیا ہے۔ ان کے افسانوں کا انگریزی، ہندی اور گجراتی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ خالدہ حسین کی کہانی کا آغاز روز مرہ کے بیان سے ہوتا ہے لیکن دھیرے دھیرے ایک عجیب و پُراسرار فضا پیدا ہونے لگتی ہے۔ چہرے شناسا ہوتے ہوتے اجنبی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مانوس چیزیں نامانوس معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ان کی بعید بھری کہانیوں میں جو تکنیک، ابہام، بے یقینی اور استعجاب کی فضا ملتی ہے اس حوالے سے خالدہ حسین کا کافکا، سارتر اور کامو سے اثر پذیری کا ذکر عام طور پر ناقدین نے کیا ہے۔ خالدہ حسین پلاٹ کے توڑ پھوڑ اور کہانی کے دوسرے صنفی عناصر کو کم کرنے اور باطن کے اُجاڑپن کی پیشکش کی حیثیت سے ضرور تجریدی افسانہ نگار ہیں لیکن وہ "تلقارمس" (سریندر پرکاش) کمپوزیشن سیریز کے افسانے (بلراج مین را) کی اہمال پسند تجریدیت سے بری ہیں۔ ان کے یہاں کہانی پن پایا جاتا ہے جس کو شدت پسند تجریدی افسانہ نگاروں نے روایتی کہہ کر افسانہ بدر کر دیا تھا۔ بعض ناقدین نے خالدہ حسین کے افسانوں میں موت کے احساس کو مرکزی احساس قرار دیا ہے۔ بہرکیف اس مضمون میں خالدہ حسین کی بعض ان کہانیوں کے مختصر تجزیے کے ذریعے ان کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی جو اپنی اشاعت سے اب تک بحث و مباحثے کا موضوع بنتی رہی ہیں۔

"سواری" اس اعتبار سے اہم کہانی ہے کہ اسے عام طور پر خالدہ حسین کی پہچان کے وسیلے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ کہانی اپنے سیاسی و سماجی ماحول سے قوت کشید کرتی ہے اور پاکستان کی فوجی آمریت کی انتہائی حد تک پہنچی ہوئی دہشت کو پیش کرتی ہے۔ کہانی سامنے کی باتوں سے شروع ہوتی ہے اور دھیرے دھیرے ایک بھید بن جاتی ہے۔ یہ بھید کہانی کے اختتام تک پہنچ کر اور طاقتور بن جاتا ہے۔ کہانی واحد متکلم راوی کی تکنیک میں بیان کی گئی ہے جس کے ذریعے خالدہ حسین بعض غیر ضروری اندراجات سے بچ گئی ہیں۔ کہانی کا واحد متکلم شام کو گھر واپسی کے وقت ایک دن اچانک پل پر تین پُراسرار اجنبی لوگوں کو دیکھتا ہے جو غروب آفتاب کا منظر دیکھتے ہیں اور اس منظر کو دیکھ کر ان کے چہرے زرد پڑ جاتے ہیں۔ یہ تین پُراسرار لوگ کون ہیں؟ کہانی کے آخر تک یہ راز نہیں کھلتا۔ خالدہ حسین نے یہ تینوں کردار ایک اسرائیلی روایت سے مستعار لیے ہیں اور اس میں

تھوڑی سی تبدیلی کر کے ایک نیا مفہوم پیدا کیا ہے۔ روایت یہ ہے کہ تین مجوسی ایک ستارہ دیکھ کر ایک مبارک خبر کے ساتھ بیت اللحم میں داخل ہوتے ہیں لیکن خالدہ حسین کے یہ تین پُراسرار کردار کوئی مبارک خبر لے کر نہیں آتے ہیں بلکہ ان پر ایسا راز منکشف ہوتا ہے کہ جس کی دہشت سے ان کے چہرے زرد پڑ جاتے ہیں۔ کہانی آگے بڑھتی ہے اور واحد متکلم کے حواس پر یہ تین پُراسرار لوگ چھا جاتے ہیں اور وہ بھی اس راز کو جاننے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے۔ پھر اچانک شہر میں ایک پُراسرار سواری داخل ہوتی ہے جس میں سے ایک عجیب و غریب قسم کی مہک کی لہریں نکلتی ہیں۔ واحد متکلم اس تلوار کی سی کاٹ رکھنے والی مہک کو محسوس کرتا ہے۔ دھیرے دھیرے شہر کے لوگ بھی اس کو محسوس کرنے لگتے ہیں اور پھر اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر خالدہ حسین نے لوگوں کی بے حسی پر زبردست طنز کیا ہے۔ یہ پُراسرار سواری کیا ہے؟ دراصل یہ پُراسرار سواری داستانوں سے ماخوذ ہے لیکن اس میں تبدیلی کر کے ایک نیا مفہوم پیدا کیا گیا ہے۔ داستانوں میں ایک پُراسرار سواری آتی ہے اور بستی والوں سے اپنے حصے کی چیزیں لے کر واپس ہو جاتی ہے۔ پھر ایک خطر پسند شہزادہ آتا ہے اور بستی والوں کو اس اجتماعی آشوب سے نجات دلاتا ہے لیکن خالدہ حسین کی اس کہانی میں کوئی نجات دہندہ نہیں آتا۔ اس کے ذریعے خالدہ حسین یہ تاثر دینا چاہتی ہیں کہ اس دورِ انتشار میں کوئی نجات دہندہ پیدا نہیں ہوتا اور جو نجات دہندہ بننے کی کوشش کرتا ہے اس کا انجام ان تین پُراسرار لوگوں کے انجام سے مختلف نہیں ہوتا جو سواری میں جب جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں تو ایک خوفناک چیخ کے ساتھ ان کی زبان تالو سے چپک جاتی ہے اور وہ گونگے ہو جاتے ہیں گویا فوجی آمریت کے رازوں سے جو لوگ واقف ہونا چاہتے ہیں ان کی زبان بند کر دی جاتی ہے۔ کہانی میں سواری سے جو بدبو آتی ہے وہ دراصل اس سڑے گلے نظام کی علامت ہے جس کو واحد متکلم محسوس کرتا ہے یا پھر وہ تین پُراسرار لوگ۔ شہر کے لوگ اس کے عادی ہو چکے ہیں اور وہ ہر وقت مفاہمت کے لیے تیار رہتے ہیں لیکن یہ چاروں خطر پسند اس سے مفاہمت نہیں کر پاتے۔ یہاں خالدہ حسین نے عوام کی بے حسی پر زبردست طنز کیا ہے۔ کہانی ان جملوں پر ختم ہوتی ہے۔

"کوئی دن رات کے اندر بولتا ہے" "اب تمہاری باری ہے' اب تم دیکھو گے اور آج میں اس پل پر آن کھڑا ہوں۔ اس سواری کے انتظار میں۔"

اس طرح خالدہ حسین نے کہانی ان جملوں میں ختم کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ خطر پسندوں کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے ہے اور اسی طرح ہمیشہ رہے گا۔ اس طرح خالدہ حسین نے کہانی کو دائروی بنا دیا ہے۔ خالدہ حسین نے جزئیات نگاری کے ذریعے جس طرح یہ خوف و دہشت کی فض

تیار کی ہے اس طرح کی جا بکدستی ایک دو کے علاوہ کسی اور فنکار کے یہاں نہیں ملتی۔ خالدہ حسین نے سواری کی آمد، اس کی بناوٹ اور اس کے ہانکنے والوں کی ہیئت اور وضع قطع کو جس طرح DEPICT کیا ہے اس کے ہر جزو سے پُراسراریت ٹپکتی ہے جو خوف و دہشت کی فضا کو تقویت بخشتی ہے۔ اسی طرح کی پُراسرار فضا سریندر پرکاش نے "گاڑی بھر رسد" میں تیار کی ہے۔
جزئیات نگاری فطرت پسند افسانہ نگار بھی کرتا ہے اور وجودیت پسند افسانہ نگار بھی۔ لیکن جہاں فطرت نگار وہ تمام تفصیلات درج کرتا ہے تاکہ ماحول کی باز آفرینی ممکن قطعیت کے ساتھ ہو سکے وہاں وجودی فنکار تفصیلات میں انتخاب کرتا ہے اور انہی چیزوں کا ذکر کرتا ہے جن سے وجودی صورت حال منور ہو سکے۔ خالدہ حسین کا رویہّ وجودی ہے۔ خالدہ حسین نے اس کہانی میں کہیں بھی اس فوجی آمریت کی طرف واضح اشارہ نہیں کیا، اس طرح انھوں نے کہانی کو ایک مخصوص ماحول سے آزاد کر کے آفاقی بنا دیا ہے۔ اس کہانی کی بالکل دوسری تعبیر بھی ہو سکتی ہے مثلاً اس کا موضوع صنعتی دور کی لعنتیں بھی ہو سکتا ہے اور سواری سے اٹھنے والی بدبو، ان لعنتوں کی علامت بن سکتی ہے اور تین پُراسرار اجنبی قوت باصرہ، قوت شامہّ اور قوت سامعہ کی علامت بن سکتے ہیں۔

خالدہ حسین کی وہ دوسری اہم اور مشہور کہانی "ہزار پایہ" ہے جو علامتی و تجریدی کہانی کے سر سے اس الزام کو ساقط کرتی ہے کہ وہ ذات کے حصار میں قید اور سیاسی و سماجی مسائل سے فرار اختیار کرتی ہے۔ پاکستان کے ناقد نذیر احمد نے اس کہانی پر سارتر کی NAUSEA کا اثر تلاش کیا ہے۔ کہانی کا موضوع پاکستان کے سیاسی و سماجی اور تہذیبی نظام کا کھوکھلا پن ہے۔ کہانی واحد متکلم راوی کے ذریعے پیش کی گئی ہے۔ مرکزی کردار گلے کے کسی مہلک مرض میں گرفتار ہے۔ وہ مرض کینسر بھی ہو سکتا ہے۔ اسی رعایت سے کہانی کا عنوان "ہزار پایہ" رکھا گیا ہے چونکہ کینسر اپنی جڑیں انسان کے جسم میں اس طرح پھیلاتا ہے جیسے ہزار پایہ اس کے اندر رینگ رہا ہو۔ افسانے میں بعض ایسے اشارے دیے گئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو شخص گلے کے کینسر کا مریض ہے وہ محض ایک فرد نہیں بلکہ پاکستان کا سیاسی نظام کی علامت ہے۔ ظلم کے خلاف احتجاج کی آواز کو دبانا کسی بھی نظام کے بد ترین ہونے کی دلیل ہے۔ گلے کے کینسر کا اثر بھی براہ راست آواز پر پڑتا ہے اور مریض کی آواز ختم ہو جاتی ہے۔ کہانی کے شروع ہی میں خالدہ حسین نے اخبار "نوائے وقت" اور "پاکستان ٹائمز" کا تذکرہ کر کے سیاسی حالات کی طرف ہماری توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ افسانے کا واحد متکلم جو مرکزی کردار بھی ہے ڈاکٹری معائنہ کے بعد جب بازار سے گزرتا ہے تو انسانوں، دکانوں، تفریح گاہوں اور سرکاری دفتروں پر نظر ڈالتا ہے اور ان کی ظاہر چمک دمک اور اندرونی انتشار کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے قلم کی طاقت کے ذریعہ

اندرونی انتشار اور کھوکھلے پن کو دکھانا چاہتا ہے لیکن سروست وہ لکھنے سے باز رہتا ہے۔ مزید م
و مشاہدہ کے بعد وہ قلم اٹھانے کا ارادہ کرتا ہے۔

"پھر میرے گلے اور سینے میں کسی چیز نے کروٹ لی۔ یہ وہی کیڑا ہے جو میرے اندر پل رہا ہے۔ اس کیڑے نے اپنے لمبے لمبے پنجے میری شہ رگ میں گاڑ دیئے۔ مفہوم محض کا سیال اندھیرا سامنے اُمڈا۔ عین وقت پر میرے ہاتھ نے بڑھ کر آئینہ اٹھالیا اور آئینہ کو دیکھ کر مجھے ناموں کے بے فائدہ ہونے کا یقین آیا۔ میں خود اپنے ساٹھ برسوں سے زندہ تھا اور اب تک محض نام سے اپنے آپ کو پہچانتا تھا مگر یہ پہچان اوپری تھی۔ سخت چھلکے کے اندر بیج کا گودا اور اس گودے کی کوئی شکل نہیں ہوتی اس لیے اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔"

مرکزی کردار کی اس کیفیت کے ذریعے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمارا معا[شرہ] سیاسی ڈھانچہ اور سرکاری محکمے بظاہر صحت مند ہیں لیکن بباطن ایک ہی جیسے کھوکھلے ہیں۔ مر[کزی] کردار جب اپنے پرانے ایکسرے کو دیکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ سب انسانوں کے ڈھا[نچے] ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کھوکھلے اور بے روح جن کی اپنی کوئی پہچان نہیں ہوتی۔ بس کونے پر لکھے سے انہیں پہچانا جاتا ہے یعنی یہاں عام آدمی اور خواص یعنی وزیر اور افسر اور سیاست داں سب یہی حال ہے۔ ڈاکٹر مریض کو مشورہ دیتا ہے۔

"اس ہزار پائے کو ختم کردو — اسے ہلاک کردو۔"

یعنی اس مرض کا علاج صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اسے گلے سڑے حصے کو آپریشن کے ذر[یعے] الگ کردیا جائے۔ یہاں افسانہ نگار قاری کے ذہن میں کئی سوال پیدا کرتی ہیں۔ وہ ہزار پایہ جو ا[س] کی شخصیت کا حصہ بنتا جارہا ہے، اسے آسانی سے جسم سے دور کیا جاسکتا ہے؟ کیا اس کی جڑ[یں] اب پورے جسم میں نہیں پھیل گئی ہیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو مریض کی کیفیت کیا ہوگی؟ کیا وہ آسا[نی] سے ہزار پائے کو جسم سے الگ کروانے پر راضی ہوجائے گا؟ بہرکیف کہانی میں مرکزی کردار ا[س] کشمکش سے گزرتا ہے اور اسے آپریشن تھیٹر لے جایا جاتا ہے جہاں وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں اپنی اس ذہنی کشمکش کا اظہار کرتا ہے۔

خالدہ حسین نے واحد متکلم راوی کے ذریعے کہانی بیان کرکے دو مثبت پہلوؤں کو پیش کیا۔ ایک تو یہ کہ مریض کو اپنے مرض کی شدت کا احساس ہے اور دوسرا یہ کہ جب کہانی واحد متکلم راوی کی زبان سے اختتام پذیر ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپریشن کامیاب رہا یعنی تمام خرابیوں کا علاج ممکن ہے۔ پوری کہانی میں خالدہ حسین کا وجودی سروکار نظر آتا ہے۔

علامتی تجریدی افسانہ نگاروں کا ایک محبوب موضوع تنہائی کا احساس ہے۔ اس احساس

وجودی فلسفے سے متاثر ہے۔ خالدہ حسین کی کہانی "ایک بوند لہو کی" اسی تھیم پر مشتمل ہے۔
نی کے آغاز ہی سے اس کا وجودی مزاج متعین ہو جاتا ہے۔ کہانی کے شروع ہی میں کہانی کا
رزی کردار جو کہانی کا واحد متکلم بھی ہے اپنے دوستوں کے ساتھ چائے خانے میں بیٹھے بیٹھے یہ
سوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے دوستوں اور دوسرے اجنبی لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔
رزی کردار یہ سمجھ نہیں پاتا ہے کہ اس کو کون سا دکھ لاحق ہے۔ اور وہ ایک طرح کی بے گانگی سی
سوس کرتا ہے اس لیے وہ کامیو کے مرسال (بیگانہ) کی طرح اپنے بیمار بھانجے کی عیادت کو جانے
ے بجائے ہوٹل میں اپنے دوستوں کے ساتھ غپ ہانکتا ہے۔ اس کی ماں بیمار ہے لیکن اس کو ماں
ی بیماری کا احساس تک نہیں ہے۔ اس کا دوست ایک حادثے میں ہلاک ہو جاتا ہے تو وہ اس کے
ھر جاتا ہے لیکن وہاں نہایت بے تعلق سا رہتا ہے۔ وہ گھر آکر اپنی انگلی زخمی کر کے دیکھتا ہے لیکن
سمجھ نہیں پاتا کہ کون سا دکھ اسے اندر سے کھائے جا رہا ہے۔ کہانی کے آخر میں جب وہ گھر پہنچتا
ہے گھر کو سنسان پاتا ہے اس کا بھانجا ایک دلخراش چیخ کے ساتھ اس کے گلے سے لگ کر روتے
وئے یہ کہتا ہے کہ سب لوگ اسے تنہا چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ یہاں آکر واحد متکلم کو اپنے دکھ کا
راغ ملتا ہے اور ایک دوسرے تنہا انسان کو دیکھ کر اسے اپنے دکھ کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل
لدہ حسین کہانی کے ذریعے یہ تاثر دینا چاہتی ہیں کہ جب تک آدمی کو دکھ کا تجربہ نہیں ہوتا وہ
وسرے کے دکھ محسوس نہیں کر پاتا ہے۔ اس کہانی میں بھی اس طرح کی تجریدیت نہیں ہے جس
طرح کی تجریدیت بلراج مینرا اور انور سجاد کے یہاں پائی جاتی ہے۔

عدم تحفظ کا احساس بھی وجودی مسئلہ ہے اور اس تھیم پر بے شمار کہانیاں لکھی گئی ہیں۔
الدہ حسین کی کہانی "شہر پناہ" بھی اسی موضوع پر مشتمل ہے۔ کہانی کی واحد متکلم ایک بے حد
ساس لڑکی ہے جو ابتداء میں اپنے والدین اور اپنی باجی کی پناہ میں خود کو محفوظ خیال کرتی ہے لیکن
ب بلوغ کی منزل سے گزرتی ہے تو وہ خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگتی ہے اور والدین کی پناہ اسے ناکافی
سوس ہوتی ہے اس لیے جب اس کے بھائی کا دوست ظفر اسے تحفظ عطا کرتا ہے تو وہ مطمئن
جاتی ہے۔ ظفر بھی ایک بے حد حساس لڑکا ہے اور وہ بھی عدم تحفظ کے احساس سے دوچار ہے۔
ں لیے وہ اس لڑکی سے کہتا ہے "اپنے آپ کو اتنا محفوظ مت سمجھو۔ دراصل کوئی بھی محفوظ
ں ہے۔ سب اندھیرے کے گول چکنے گنبد سے ننگے پانو پھسل رہے ہیں" ظفر کا یہ بیان ہی اسے
ودی کردار ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ نفسیاتی کہانی معلوم
تی ہے۔ بہر کیف کہانی میں جس طرح عدم تحفظ کے احساس کو ابھارا گیا ہے اس کا ایک سرا
ستان کی سیاسی و سماجی صورت حال سے ضرور ملتا ہے حالانکہ اس بات کا کہیں اشارہ کہانی میں

نہیں ہے۔

شناخت کا مسئلہ بھی وجودی فلسفے سے تعلق رکھتا ہے اور اس تھیم پر علامتی تجریدی افسانہ نگاروں نے بے شمار کہانیاں لکھی ہیں۔ خالدہ حسین کی کہانی "پہچان" بھی اسی موضوع پر مبنی ہے۔ اس موضوع کو پیش کرنے کے لیے خالدہ حسین نے نمائش گاہ کو پس منظر بنایا ہے۔ کہانی میں تین نسلوں کو ایک واضح فرق کے ساتھ شناخت کے مسئلے سے دوچار دکھایا گیا ہے۔ تائی جی پرانی نسل سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے شناخت کا مسئلہ ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ واحد متکلم اور اس کی سہیلیاں موجودہ نسل اور متاجدید تر نسل کے نمائندے ہیں۔ کہانی کے شروع ہی میں یہ دکھایا ہے کہ واحد متکلم خود اپنے گھر میں بھی شناخت کے مسئلہ سے دوچار ہے۔ عام طور پر شوہر اپنی بیوی کو اور بیوی اپنے شوہر کو اور ماں اپنے بچے کو اور بچہ اپنی ماں کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتے لیکن کہانی کے شروع ہی میں واحد متکلم ایک خواب بیان کرتی ہے جس میں اس کا شوہر اس کو نہیں پہچانتا۔ نمائش جاتے وقت سڑک کے کنارے چائے کی دکان پر ایک ایکٹریس کی تصویر لگی ہے اور اسی جگہ سے ایک جنازہ گزرتا ہے گویا ایکٹریس کی تو ایک شناخت ہے لیکن اس جنازے کی کوئی شناخت نہیں ہے۔

اس طرح نمائش گاہ میں سرکس کا بے ہیئت بونا اور سرکس کی سجی سنوری لڑکیاں، موت کنویں کی پتلون شرٹ پہننے اور سگریٹ پینے والی لڑکی اور خود پر آگ لگا کر اوپر سے نیچے کودنے والا آدمی سب کو متوجہ کرتے ہیں یعنی معاشرے میں عام آدمی کی شناخت ختم ہو چکی ہے اور اگر کسی کی شناخت باقی ہے تو پھر وہ عجیب و غریب لباس پہننے والے، مضحکہ خیز ہیئت اختیار کرنے والے اور مضحکہ خیز حرکتیں کرنے والے لوگ ہیں۔ کہانی میں ایک جگہ بچہ گم ہو جاتا ہے اور پھر تلاش کے بعد مل جاتا ہے۔ واحد متکلم اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کون تھی جس کے ساتھ تم چلے گئے تھے تو بچہ جواب دیتا ہے "پہلے اماں تھی پھر نہیں تھی" اس کے آگے خالدہ حسین نے یہ جملہ بھی لکھا کہ "متاصدیوں تک یہی جواب دے گا" اس کے ذریعے خالدہ حسین یہ کہنا چاہتی ہیں کہ جدید تر نسل اور آئندہ آنے والی نسلیں شناخت کے مسئلے سے سب سے زیادہ دوچار رہیں گی۔ مختلف ہیئت، لباس اور حرکت ہی اس نئے زمانے میں انسان کی پہچان کے لیے ضروری ہیں۔ یہ زمانے کا المیہ ہے۔ باقی سب کی شناخت مٹ چکی ہے۔

خالدہ حسین کی ایک اہم کہانی "سایہ" ہے جس میں انہوں نے جدید دور کے آدمی کے اس المیے کو موضوع بنایا ہے کہ آج کا انسان زمانے کے بنائے ہوئے طور طریقوں اور قدرت کے اصولوں کا اس حد تک پابند ہو کر رہ گیا ہے کہ یہ طور طریقے اور قدرت کے اصول ہی زندگی کی

اصل حقیقت میں گزر گئے ہیں اور [illegible] انسان [illegible] کرتا ہے۔ [illegible] حال میں زمانے کے بنائے ہوئے اصولوں کا پابند رہنا ہے چاہے اس پابندی میں اس کی آزادی سلب کیوں نہ ہوتی ہو اور وہ "ہڈیاں گداز کرنے والی اس تھکن" کا شکار کیوں نہ ہوتا ہو جو ایک مکمل، اٹل، 'لا انتہا' سپردگی" کا تقاضا کرتی ہے۔ کہانی کا واحد متکلم بے ضابطگی کے ساتھ اسٹیشن پہنچتا ہے چونکہ وہ زمانے کے طور طریقے توڑ کر آیا ہے اس لیے ایک قسم کی آزادی محسوس کرتا ہے اور اس کی لاٹھی پلیٹ فارم پر پھسلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اسٹیشن کی ہر چیز اسے بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ ایک ایرکنڈیشنڈ ڈبے میں بیٹھ جاتا ہے۔ اچانک اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ٹرین تو رکی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسری ٹرین چل رہی ہے۔ یہ بات اس کے ہمسفر بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہ احساس دراصل اس لیے ہوتا ہے کہ ایرکنڈیشنڈ ڈبہ چونکہ چاروں طرف سے بند ہوتا ہے اور رات کے وقت اس کے شیشوں پر باہر کے گھپ اندھیرے کا لیپ چڑھا ہوتا ہے۔ اس لیے جب بلب اندر روشن ہوتا ہے تو اس ڈبے کے مسافروں کا عکس شیشوں پر پڑتا ہے جس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ ایک دوسرا ڈبہ بھی چل رہا ہے گویا اصل ڈبہ تو وہ ہے جس میں وہ سوار ہیں اور دوسرا ان کا سایہ ہے۔ بہرکیف وردی پوش ٹکٹ چیکر اس سے ٹکٹ طلب کرتا ہے اور ٹکٹ نہ ہونے کی وجہ سے اسے گرفتار کرکے ڈبے سے باہر نکال دیتا ہے۔ اس طرح اس کی آزادی سلب ہوجاتی ہے اور وہ زمانے کے بنائے ہوئے اصول کی زد میں آجاتا ہے اس لیے اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے پاؤں ریت میں میلوں دھنستے چلے جارہے ہیں۔

خالدہ حسین نے "پرندہ" میں جھوٹی انا کے مسئلہ کو موضوع بنایا ہے۔ کہانی میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹی انا کے مریض ہوتے ہیں وہ دوسروں کی ترقی اور مقبولیت کو دیکھ کر حسد میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور یہ حسد کے کیڑے چاٹ کر ان کو تباہ کردیتے ہیں۔ کہانی کا واحد متکلم ایک ایسا شخص ہے جس کی بیوی اپنے عہد کی مشہور و مقبول مصنفہ ہے۔ جس کا زیادہ وقت سیمناروں اور ادبی محفلوں میں صرف ہوتا ہے۔ واحد متکلم اپنی بیوی کی ترقی اور مقبولیت کو دیکھ کر حسد میں مبتلا ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے گھر میں اکثر دونوں کے درمیان تو تو میں میں ہوجاتی ہے۔ واحد متکلم کے اس رویے کو اس کے والدین ناپسند کرتے ہیں لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ یہاں تک کہ دونوں میں مفارقت ہوجاتی ہے۔ کہانی کو بیان کرنے کے لیے خالدہ حسین نے ایک پیچیدہ تکنیک کا سہارا لیا ہے۔ تکنیک یہ ہے کہ خالدہ حسین نے واحد متکلم کو مریض دکھلایا ہے جو نرس کا شدت سے انتظار کررہا ہے۔ نرس اس کی ہر ضرورت کا بے حد خیال رکھتی ہے۔ نرس کی ہر ادا اسے اپنی چھوڑی ہوئی بیوی تک پہنچا دیتی ہے۔ اس طرح کہانی میں کبھی نرس آجاتی ہے اور کبھی اس کی بیوی

آجاتی ہے۔ اس طرح کہانی ماضی وحال کے واقعات کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ کہانی کو علامتی رنگ دینے کے لیے خالدہ حسین نے واحد متکلم کو مریض دکھایا ہے جب کہ وہ ذہنی مرض کا شکار ہے۔ خالدہ حسین نے کہانی واحد متکلم کے ذریعے بیان کی ہے۔ چونکہ واحد متکلم اپنی بیوی کے رویے کو ناپسند کرتا ہے اس لیے ایک واقعہ میں بالواسطہ طور پر وہ یہ کہتا ہے کہ عورت کا کام گھر میں رہنا اور مردوں کی سیوا کرنا ہے اور مرد کا کام ناراض ہونا اور عورت پر کڑی نگاہ رکھنا ہے۔ اس واقعے میں واحد متکلم کے نقطہ نظر کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اس کہانی کے علاوہ خالدہ حسین کی ہر قابل ذکر کہانی میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ہر لفظ اور ہر واقعے سے کوئی نہ کوئی کام ضرور لیتی ہیں۔ اس کہانی میں بھی خالدہ حسین نے مثبت رویہ اپنایا ہے یعنی واحد متکلم کو اپنی غلطی کا احساس دلایا ہے۔ بعض ناقدین نے اس کہانی کو خالدہ حسین کی ذاتی زندگی سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس خیال کو تقویت شادی کے بعد خالدہ حسین کا ادبی منظر نامے سے کم و بیش تیرہ سال تک غائب رہنے سے ملتی ہے۔ بہر کیف اگر یہ حقیقت بھی ہو تو کہانی میں کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس سے کہانی کی معنویت محدود ہو جائے اور یہی اس کہانی کی بڑائی ہے۔

ان کہانیوں کے کردار ڈرے، سہمے اور خوف زدہ ہیں اور ان میں عجیب وغریب ہول کی فضا ہے اس لیے بعض کردار روتے ہوئے دکھائے گئے ہیں جن کے رونے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں بتائی گئی ہے۔ غالباً یہ کہانیاں برصغیر کے معاشرتی زندگی کی علامت کے طور پر ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کہانیوں میں گھریلو زندگی کو پس منظر بنایا گیا ہے یہاں تک کہ "سواری" جیسی پراسرار کہانی میں بھی یہ بات دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی نسل کے دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں یہ کیفیت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ غالباً خالدہ حسین چونکہ خود گھریلو زندگی سے زیادہ مانوس ہیں اس کا اظہار افسانوں میں اس صورت میں ہوا ہے۔ خالدہ حسین کو الفاظ اور واقعات کے انتخاب، کردار کی پیشکش اور موضوع کے مطابق افسانے کی فضا سازی پر قدرت حاصل ہے۔ وہ کافکا کی طرح عام طور پر کہانیوں کا آغاز سامنے کی باتوں سے کرتی ہیں پھر اس سے گریز کر کے کہانی کو خواب آسا انجام تک پہنچاتی ہیں۔ وہ کافکا کی طرح حقیقی تجربے کی خوب صورت پیشکش پر قدرت رکھتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی جزئیات کے اندراج میں احتیاط سے کام لیتی ہیں۔ وہ کہانی کے ہر لفظ اور ہر واقع کے ذریعے مرکزی خیال پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کی کم و بیش تمام کہانیوں میں موضوع کا عنوان سے براہ راست تعلق ہوتا ہے لیکن یہ تعلق آسانی سے قاری پر منکشف نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر خورشید احمد کا خیال ہے کہ خالدہ حسین نے کہانی کہنے کا یہ فن کافکا سے سیکھا ہے اور وہ سارتر سے بھی متاثر ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب وجودی اسلوب کے قریب ہے۔

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

مصنف: ڈاکٹر محمد اکرام خاں

تبصرہ نگار: عبداللہ ولی بخش قادری

ڈسپلن کی تعلیم و تربیت　　　قیمت: 90روپے صفحات: 123 مجلد

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی 110025

اس کتاب کا دیباچہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کا رہینِ منت ہے جس کا آغاز یوں ہوتا ہے: "یہ دیباچہ لکھتے وقت مجھے جھجک تو بہت ہو رہی ہے مگر قلم رُک بھی نہیں رہا۔ استاد کا حکم ماننا سعادت مندی کا تقاضا ہے مگر شاگرد کا اعزاز کو قبول کرنے کا ہو تو اس کی تعلیم تمام تر فخر ہے۔ اکرام صاحب ابتدائی مدرسے میں میرے استاد اور اتالیق رہے مگر اس کے بعد بھی کبھی میری نگرانی میں کمی نہ کی"۔ اور اکرام صاحب اپنے اس شاگرد رشید کے بارے میں "پیش لفظ" میں رقم طراز ہیں کہ "میں بہت خوش ہوں کہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے میرے اصرار پر کتاب کا دیباچہ لکھا۔ میری طرح قارئین بھی یہ جان کر خوش ہوں گے کہ ڈسپلن کی تعلیم و تربیت کا دیباچہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی سے محض اس لیے نہیں لکھایا گیا ہے کہ وہ ان طلبہ میں سے ایک ہیں جن کی تعلیم و تربیت سے متعلق مثالوں کا کتاب میں حوالہ دیا گیا ہے بلکہ اس لیے لکھایا ہے کہ انھوں نے بچپن ہی سے آزادی کے ساتھ اپنے جذبات کو عقل کا تابع بنا کر اپنی شخصیت میں وہ اوصاف بدرجہ اتم پیدا کیے ہیں جن کی بدولت اُن کا شمار اپنے عہد کے بہترین انسانوں میں کیا جاتا ہے۔" اگرچہ اکرام صاحب نے اپنے قارئین کو اپنی خوشی میں شریک کر لیا ہے اور اس طور ہم بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں لیکن ہمیں مزید خوشی اس بات کی بھی ہے کہ ہم بیچ کے آدمی ہیں۔ اکرام صاحب کے رفیق کار ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ لہٰذا ہم دونوں کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں کیوں کہ ہمارے خیال میں دیباچہ اور پیش لفظ نہ صرف اپنے موضوع کی طرف خاطر خواہ متوجہ کرتے ہیں بلکہ انسانی روابط کی قابلِ تقلید مثال ہیں۔

تعلیم کے میدان میں اکرام صاحب بخوبی متعارف ہیں۔ گذشتہ آٹھ دس سال میں انھوں نے تقریباً اتنی کتابوں سے نوازا ہے جتنی کہ مدت انھیں اپنے فرائض منصبی سے شک

دوش ہوئے گزری ہے۔ نئی زمانہ زندگی کے اس دور میں داخل ہونے والے "از کار رفتہ" ہی قرار پاتے ہیں اور ہم جیسے اس کے نمائندے آسانی سے گرد و پیش میں دیکھے جا سکتے ہیں لیکن اس برادری میں اکرام صاحب اپنی مثال آپ نظر آتے ہیں کیوں کہ انھوں نے اپنی تعلیمی سرگرمی کی ابتدا جامعہ کے مدرسہ ابتدائی سے کی' پھر اعلا تعلیم کی اسناد امریکہ اور انگلستان سے حاصل کرنے کے بعد جامعہ ٹیچرس کالج (سابق استادوں کا مدرسہ' موجودہ فیکلٹی تعلیم) میں تربیت اساتذہ کا درس یک سوئی کے ساتھ دیتے رہے لیکن جب تقریر سے باز آئے تو تحریر کو پکڑ لیا اور ہنوز گرفت پکی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کہ نام سے عیاں ہے ڈسپلن سے متعلق ہے۔ اس انگریزی لفظ کے معنی انگریزی۔ اردو ڈکشنری (مولوی عبدالحق) میں حسب ذیل درج ہیں: (1) تعلیم کا کوئی شعبہ فن (2) ذہنی اور اخلاقی تربیت۔ وہ معیت جس سے تزکیہ نفس ہو۔ (3) فوجی تربیت قواعد۔ (4) حسن تربیت' تربیت یافتگی (5) طالب علموں' فوجوں کا انضباط (6) دستور العمل۔ (7) ارکان کلیا کا نظام عمل (8) تادیب (9) ریاضت۔

تعلیمی میدان میں جب ڈسپلن کی بات آتی ہے تو بالعموم مرادِ اسکول ڈسپلن یعنی ضبطِ مدرسہ سے ہوتی ہے اور ڈسپلن کے معیار و منہاج کے باب میں ضبط نفس کا تصور پیش کیا جاتا ہے۔ لائق مصنف کا زور بجا طور پر ضبط نفس کی طرف ہی ہے اور انھوں نے اس کی راہِ راست کی نشان دہی میں اپنے دور کے مدرسہ ابتدائی جامعہ کی زندگی سے بچی اور اچھی باتیں دُوہرائی ہیں۔ اس طور جامعہ کی عظمت رفتہ کے کچھ نقوش بھی ابھر کر سامنے آجاتے ہیں جو کہ نہ صرف اہل جامعہ کے لیے بلکہ تعلیمی دنیا کے ہر راہرو کو چشم بصیرت وا کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

میرے نزدیک تعلیم کے سلسلے میں ڈسپلن کا مفہوم وہی ہے جس کا تعلق معنی نمبر 5 سے ہے اور جس کے حصول میں معنی نمبر 2 آتا ہے۔ لہٰذا اس کتاب کے عنوان کی ترکیب مجھے کھٹکتی ہے۔ یوں بھی ضبط کا مروّج لفظ موجود ہوتے ہوئے عنوان میں ڈسپلن کی پیوند کاری گراں گزرتی ہے۔ لیکن اس شخصی ادراک سے صرف نظر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اکرام صاحب نے اپنے موضوع کا احاطہ مندرجہ ذیل ابواب میں کیا ہے: ابتدائیہ۔ ڈسپلن کا مقصد، ڈسپلن کا مفہوم۔ ڈسپلن داخلی اور خارجی۔ ڈسپلن برائے جمہوریت طرز زندگی۔ شخصیت کی نشو نما۔ شخصیت کی پہچان۔ اصول اور ضابطے کا تعین۔ چند اصلاحی تدابیر۔ والدین کے لیے چند ہدایات۔ اساتذہ کے لیے چند ہدایات۔ لازمی نتیجے پر مبنی طریقے کا استعمال کیا ہے۔ اکرام صاحب نے جسے خود آموز ڈسپلن سے ادا کیا ہے اور **Self discipline** کا اُردو انگریزی

جوڑ ہے وہی مفہوم ضبط نفس سے ادا ہوتا رہا ہے اور سیرت کی تشکیل کے سلسلے میں خصوصیت سے ذکر آتا ہے۔ دور حاضر میں جس طور اقدار کی پامالی نظر آتی ہے اور اس ضمن میں تعلیم کی بے بسی دکھائی دیتی ہے' اس کے پیش نظر اکرام صاحب کی یہ کاوش اساتذہ اور والدین کے لیے مشعل راہ کے مصداق ہے۔ اس کا پیرہن سادگی و شائستگی کی کشش اور کمپیوٹر کی طباعت کی صحت و صفائی رکھتا ہے۔

مرتب: پروفیسر نثار احمد فاروقی

کتاب نما خصوصی شمارہ — مبصر: ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

محبوب حسن جگر — قیمت: 90روپے

(شخصیت صحافتی خدمات) — ناشر: ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

ماہنامہ "کتاب نما" (دہلی) نے حیدر آباد کے نامور صحافی اور روزنامہ سیاست کے "جوائنٹ ایڈیٹر" محبوب حسن جگر مرحوم کے لیے نذرانہ عقیدت کے طور پر ایک خصوصی شمارہ شائع کیا ہے جسے مشہور ادیب پروفیسر نثار احمد فاروقی نے مرتب کیا ہے اس شمارے میں پروفیسر نثار احمد فاروقی کے پیش لفظ کے علاوہ جو خود ایک مضمون اور نذرانہ عقیدت کی حیثیت رکھتا ہے کوئی 18 ممتاز شخصیتوں کے مضامین شامل ہیں۔ جن میں جناب سید حامد صاحب جناب ہاشم علی اختر جناب خواجہ حسن ثانی نظامی' یوسف ناظم صاحب' سید محمد مہدی رفعت سروش صاحب' ڈاکٹر یوسف سرمست' آمنہ ابوالحسن صاحبہ، ڈاکٹر سید محمد حمید الدین شرفی نظامی' پروفیسر محمد طیب انصاری' ڈاکٹر خورشید خضر' رشید الدین صاحب' فیروز بخت احمد صاحب' کے مضامین شامل ہیں۔ مرحوم کے برادر عزیز اور ملک کے ممتاز طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کا مضمون ہے۔ ادارہ سیاست کے سربراہ زاہد علی خاں ایڈیٹر سیاست اور ان کی صاحب زادی سیاست کی سب ایڈیٹر سیدہ فاطمہ کے مضامین ہیں۔ راقم الحروف کا بھی ایک مضمون ہے۔ اور ان کے علاوہ جناب اندر کمار گجرال کا تعزیت نامہ اور قمر ساحری (پاکستان) کا منظوم خراج عقیدت بھی شامل ہے۔ پھر خود محبوب حسین جگر مرحوم کا اپنے بھائی کے نام آخری خط بھی شائع کر دیا گیا ہے اور مرحوم کا ایک افسانہ، مخدوم پر ایک مضمون جو "نگار" میں شائع ہوا تھا اور جو مخدوم پر پہلا مضمون ہے۔ یوم مخدوم کے موقع پر کی ہوئی ایک تقریر اور ڈاکٹر گوپال ریڈی کے انتقال پر ملال پر جگر مرحوم کی آخری تحریر بھی کتاب بھی شامل ہے۔

خواجہ معین الدین نے اپنے تعزیت نامے کے ساتھ محبوب حسین جگر کی ایک غزل بھی بھیجی ہے جسے شائع کر دیا گیا ہے۔ جناب شاہد علی خاں صاحب ایڈیٹر کتاب نما کی جتنی بھی

ستائش کی جائے وہ کم ہے کہ انھوں نے جگر کی یاد کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دینے کا یہ اہتمام کیا کہ اپنے موقر جریدہ کا خاص نمبر شائع کیا جس میں ممتاز شخصیتوں کے مضامین اکٹھا کر دیے گئے ہیں۔

ان مضامین سے جگر مرحوم کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ عابد علی خاں صاحب مرحوم اور ان کے اہل خاندان سے محبوب حسین جگر کا لگاؤ ان مضامین کے علاوہ سیدہ فاطمہ (زاہد علی خاں) کی دختر نیک اختر اور سیاست کی سب ایڈیٹر کے مضمون سے خوب ظاہر ہے سبھی مضامین سے جگر کی صلاحیتوں اور خصوصیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو عابد کے ساتھ سیاست کے لیے وقف کر دیا تھا۔ 16 گھنٹوں تک سیاست کے دفتر میں کام کرتے رہتے تھے۔ پھر رات میں بھی فون پر آگاہی حاصل کرتے تھے اور ہدایتیں دیتے تھے۔

ان مضامین سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ پولیس ایکشن کے بعد حیدر آباد کے مسلمانوں کے سامنے جو حالات تھے اور شور و غوغا کی سیاست کے خاتمہ کے بعد وہ جو بے سہارا محسوس کر رہے تھے۔ ایسے میں عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر نے سرکاری ملازمتوں کو خیر باد کہہ کر 15 اگست 1949 سے روزنامہ سیاست جاری کیا۔ تو یہ ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ سیاست نے عوام کے سامنے جمہوریت اور سیکولرزم کی نئی راہوں سے اپنے قارئین کو آشنا ہی نہیں کیا بلکہ سماجی انصاف کے حصول کے لیے جو راہیں کھل گئی تھیں ان کو عزم و استقلال سے اختیار کرنے کی راہ دکھائی۔

ان مضامین کے لکھنے والوں نے جگر صاحب کی اس خصوصیت کو اچھی طرح اجاگر کیا ہے کہ وہ ڈسپلن کے پابند ہوتے ہوئے ظاہرا سختی بتلاتے تھے لیکن اندر سے وہ ایک نرم دل اور ہمدرد انسان تھے۔ ان کی اس خصوصیت کی خواب داد دی گئی ہے۔

مگر اس کے پڑھنے سے تشنگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جگر کو جاننے والے بھی سوچیں گے کہ شائد وہ انھیں پوری طرح نہیں جانتے اس لیے وہ ایک مستقل کتاب کا مطالبہ کریں گے جو ان کی سوانح حیات بھی ہو اور ان کے خیالات اور ان کے کارناموں کی تاریخ بھی ہو۔ اس پورے طوفانی دور کا جائزہ بھی ہو جس سے ہم گزرے ہیں پھر یہ بھی محسوس ہوگا کہ جگر شاعر تھے۔ افسانے انھوں نے لکھے تنقیدی مضامین لکھے اور سیاست کے صفحات پر انھوں نے صحافتی ادب میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ مگر ان کا نام کہیں نہیں ہے۔ کیوں نہ ان سب کو اکٹھا کر کے کتابی شکل میں پیش کیا جائے؟

یوسف سرمست نے اپنے مضمون میں کہا ہے کہ ان کا کوئی شاگرد ایم فل کے لیے جگر پر کوئی مقالہ تیار کر رہا ہے اور اس کے لیے جگر سے کچھ انٹرویو بھی لیے ہیں۔ اس مقالے کو زاہد علی

خاں سے اور مجتبیٰ حسین کی مدد سے ان سب باتوں کا احاطہ کر کے مکمل کیا جاسکتا ہے۔

تبصرہ: ڈاکٹر توقیر احمد خاں

مصنف: ڈاکٹر صادق

اوب کے سروکار

صفحات: ۱۴۴ قیمت: 100روپے

تقسیم کار: پبلیشرز اینڈ ایڈورٹائزر ۔ ۶ کرشن نگر دہلی 110001

ادبی دنیا میں ڈاکٹر صادق کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے بطور ایک شاعر، ادیب اور تنقید نگار کے ان کی حیثیت مسلم ہے مزید براں وہ فن مصوری میں بھی بدرجہ اتم کمال رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے عہد کی جامع الکمالات شخصیات میں سے ایک ہیں۔ ادبی معاملات میں ان کا ذہن شفاف اور اسلوب نہایت سادہ ہے۔ وہ جو بات کہتے ہیں بالکل صاف اور اغلاق سے پاک ہوتی ہے۔ "ادب کے سروکار" ڈاکٹر صادق کے ان گراں قدر تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ضبط تحریر میں آئے۔ ان میں بعض مضامین تو وہ ہیں جنھوں نے اردو زبان وادب کو اساسی نظریہ عطا کیا ہے اور بعض اپنی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کی بنا پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے انھوں نے تاریخ ادب اردو کے لیے بنیادی کام انجام دیا ہے۔ مثلاً یہ نظریہ کہ ہندوستانی زبانوں میں افسانہ سب سے پہلے اُردو زبان میں لکھا گیا ڈاکٹر صادق ہی کا قائم کیا ہوا ہے انھوں نے اپنے دعوے کی توثیق میں مفصل دلائل دیے ہیں اور یہ ثابت کردیا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلا افسانہ اُردو میں لکھا گیا جس کے مصنف سرسید احمد خاں تھے۔ انھوں نے اس نظریہ کی بھی تغلیط کی ہے کہ اُردو میں افسانہ مغرب کی تقلید میں لکھا گیا۔ اس کے برعکس ان کا خیال ہے کہ اُردو زبان میں افسانہ طبع زاد صنف ہے اُردو زبان اس کی ساخت کے لیے کسی غیر زبان کی ممنون کرم نہیں ہے۔ اُردو زبان میں مختصر افسانہ تخلیق کرنے کی صلاحیت موجود تھی اور اُس نے اس صلاحیت کی بنا پر افسانہ پیدا کیا جو مختصر افسانے کی تمام خصوصیات اور شرائط پر پورا اترتا ہے۔ ڈاکٹر صادق کا یہ گراں بہا نظریاتی مضمون بھی اسی کتاب "ادب کے سروکار" میں شامل ہے۔ جس کا عنوان "اردو کا اولین افسانہ" ہے۔ اس مضمون کے علاوہ اس کتاب میں دو درجن مضامین۔ جن میں آزادیٔ اظہار کا مسئلہ اور مرزا غالب۔ اردو فکشن بارہ دہائیوں کا سفر۔ اقبال کے چند شخصی معروضی تلازمے۔ اردو افسانے اور پریم چند کی روایت۔ عصمت چغتائی کا افسانوی فن۔ اختر الایمان تخلیقی سروکار۔ ترقی پسند افسانہ کے پچاس سال۔ افسانہ زندہ ہے۔ عمیق حنفی ایک انسان ایک فن کار۔ اور نئی اُردو قواعد شامل ہیں۔ ڈاکٹر

صادق کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور شاید فن مصوری نے ان کے علم کو اور بھی زیادہ ادبی ذوق عطا کر دیا ہے اس لیے جو لکھتے ہیں بجا طور اور واضح لکھتے ہیں۔ ہر ایک مضمون کسی نہ کسی زاویے سے لکھا گیا ہے اور اپنا ایک نیا تحقیقی نظریہ قائم کرتا ہے۔ ان مضامین میں پرانے حقائق کی روشنی میں نئے تخمیس قائم کئے گئے ہیں جو اردو تحقیق و تنقید میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں اس بات کی صداقت کا اندازہ ڈاکٹر صادق کے ایک مضمون "علم بیان" سے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ علم بیان بے حد مشکل اور فرسودہ موضوع ہے اور اس پر کسی علم کا اضافہ کرنا ممکن اگر نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ڈاکٹر صادق کی نظر جس حقیقت پر گئی ہے اس کا انکشاف درج ذیل کلمات سے ہوگا۔

"اگرچہ ہمارا علمائے بلاغت نے اس مسئلہ کی تصریح نہیں کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تشبیہ استعارہ مجاز مرسل اور کنایہ شعر کا جوہر ہیں یہ محض ظاہری خوبصورتی بڑھانے کا کام نہیں کرتے بلکہ شعر کا عمل ہی ان کا مرہون منت ہوتا ہے۔"

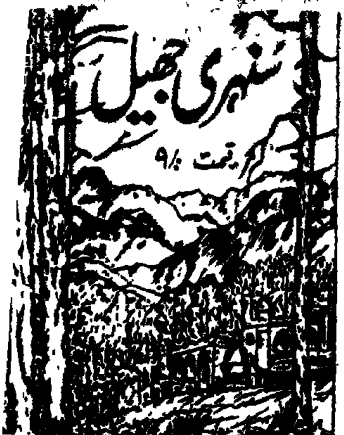
کتاب "ادب کے سروکار" کتابت صاف ستھری اور طباعت بے داغ ہے۔ کاغذ سفید چمکدار اور دبیز استعمال کیا گیا ہے۔ جلد نہایت خوبصورت اور مضبوط بندھی ہے۔ سرورق سادہ اور دلکش ہے۔ اسی گراں قدر اور دلچسپ ادبی کاوش کی قیمت بھی کم ہے اس کتاب کی اشاعت پر وہ بجا طور پر شکریہ کے مستحق ہیں توقع ہے یہ کتاب ادبی دنیا میں اپنا اہم مقام پیدا کرے گی۔

معذرت قبول فرمائیں

رمضان شریف میں بجلی نے جو کرشمے دکھائے ہیں وہ بیان کے باہر ہیں۔ محترمہ نے دن دن بھر اپنی جھلک نہیں دکھائی۔ کئی اہم مضامین شامل ہونے سے رہ گئے۔ غلطیاں درست کرنے تک کا موقع نہیں دیا۔ اس لیے معذرت قبول فرمائیں۔ (ادارہ)



جادوگری
قیمت
۹/



سنہری جھیل
قیمت ۹/



خلائی
طبیب
قیمت ۸/



سونے کی
چوری
قیمت ۴/



بونوں کا
جزیرہ
قیمت
۸/



جلتا ہوا مکان
قیمت ۵/

کھلے خطوط

☆امیر حمزہ ثاقب' ۵۰۹ دھامنگر تاکہ بھیونڈی

تازہ شمارہ دسمبر ۹۷ء میں پروفیسر حامدی کاشمیری کا مضمون اقبال کی شاعری کا استعاراتی نظام وقیع و پر مغز ہے۔ نامی انصاری کے مضمون "پاکستان میں اردو کی صورت حال" کا یہ جملہ ذہن سے چپک کر رہ گیا۔ اردو زبان ایک ایسی ناقابل تقسیم اکائی کی حیثیت رکھتی ہے جو دنیا بھر میں اپنی اسی حیثیت میں تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کو ملک اور مذہب کے خانوں میں بانٹنے کا تصور گمراہ کن بھی ہے اور بے حد نقصان رساں بھی۔

☆عروج احمد عروج فلٹر بیڈس روڈ' نیا جالنہ

کتاب نما پابندی سے مل رہا ہے۔ دسمبر ۱۹۹۷ء کے شمارے میں ظفر اقبال کی اختراع پر نامی انصاری کا جوابی مضمون بہت مدلل اور جامع ہے۔ مہمان مدیر نور پرکار کا اداریہ بھی بہت فکر انگیز ہے۔ خامہ بگوش مجتبیٰ حسین اور نصرت ظہیر اس شمارہ کی جان ہے۔ راجندر بہادر موج کا مضمون بھی پسند آیا لیکن اپنے مضمون میں انھوں نے جو شعر شکیل بدایونی کا بتایا ہے۔ زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے۔ بج رہا ہے اور بے آواز ہے۔

دراصل یہ شعر شکیل کا نہیں کمال امروہوی کا ہے۔ اس بار چند کو چھوڑ کر شعری حصہ بھی بہت جاندار ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ افسانوں کی تعداد بڑھا دیں۔

☆عبداللطیف اعظمی' ذاکر نگر' جامعہ نگر' نئی دہلی

مولانا محمد علی جوہر

پہلے بانی جامعہ کو خراج عقیدت

عظیم مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں اولین بانی اور پہلے شیخ الجامعہ تھے۔ ان کی شخصیت کا ایک تابناک پہلو یہ ہے کہ جب وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن تشریف لے گئے تو لندن ہائیڈ پارک ہوٹل میں یہ اعلان کیا کہ میں غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔ برطانوی حکومت یا تو ہندستان کی آزادی کا اعلان کردے یا میری قبر کے لیے یہیں پر انتظام کرے۔ اولین صورت کے لیے حکومت برطانیہ تیار نہیں تھی اس لیے صرف دوسری صورت باقی تھی۔ چنانچہ یوں ہی ہوا۔ ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو اتوار کے دن ساڑھے نو بجے صبح کو اپنی جان جان آفریں کو سپرد کردی اور مسجد عمر بیت المقدس میں سپرد خاک کیے گئے۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو شاید ہی ہندستان کے کسی بڑے سے بڑے مسلمان کو نصیب ہوا ہو۔

☆نور الدین نشاط ادیب، زیب منزل، حیدر آباد

دسمبر ۹۷ء کے شمارے میں حصہ مضامین بہت بھاری ہے۔ اشاریہ میں مہمان مدیر نور پرکار نے ترجمہ نگاری اور اردو زبان کی دوسری علاقائی زبانوں سے ربط کے بارے میں غور طلب بحث کی ہے۔ ہم اردو والوں کو علاقائی زبانوں کے ادب کو اردو میں اور اردو ادب پاروں کو علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کی جانب شدت سے توجہ دینا چاہیے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری اور پروانہ ردولوی کے مضامین بھی خوب ہیں۔ چراغ دیر اور غالب کا سومنات پر ان دونوں بہت لکھا جارہا ہے۔ اگست ۹۷ء کے شمارے میں جناب قیوم خضر نے بھی اس پر مبصرانہ نظر ڈالی ہے۔ چراغ دیر کا ترجمہ آج سے کئی سال پہلے نامور شاعر، صحافی مترجم اختر حسن مرحوم نے بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر نیر جہاں کا مضمون 'الفاروق' بھی خوب ہے۔ محترمہ نے نقد و تبصرہ کے اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے الفاروق کے محاسن کے ساتھ ساتھ اُس کے معائب کی جانب بھی مودبانہ و سنجیدہ انداز میں اشارہ کیا ہے۔ حصہ شعر میں پروفیسر عبدالستار دلوی کی نظم بے حد اچھی ہے۔ غزلوں میں ادا جعفری، باقر مہدی، شہپر رسول، عباس رضا نیر اور اصغر رضوی کی تخلیقات نے متاثر کیا۔ زیر نظر شمارے میں حصہ مضامین کی طرح اب کی بار حصہ طنز و مزاح بھی بہت بھاری ہے۔

جنوری ۹۸ء کے شمارے میں میرے اپنے قدیم ترین ادیب دوست رضاء الجبار کا مہمان اداریہ "اردو کی نئی بستیاں" ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ موصوف نے اس میں اعداد و شمار کے ساتھ جو تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے وہ واقعی دستاویزی اہمیت کا حامل ہے۔ اس شمارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مقالہ ترقی پسند جدیدیت اور مابعد جدیدیت پرچے کی جان ہے۔ موصوف نے اردو ادب کی تمام تحریکات اور رویوں پر مدلل اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ نظموں اور غزلوں میں اختر سعید خاں، مظفر حنفی، ستیہ پال آنند اور ماریہ فضل کی تخلیقات پسند آئیں۔ سائنس کا اجالا خامہ بگوش اور طنز و مزاح میں جناب مجتبیٰ حسین کی تخلیقات بھی خوب لطف دیتی ہیں۔

....

☆جاوید عالم، ساؤتھ ٹی ٹی نگر بھوپال

دسمبر ۹۷ء کا شمارہ متنوع اور جاندار ہے لیکن بحیثیت مجموعی طنز و مزاح کا پلڑا سب سے بھاری ہے۔ خصوصاً ڈاکٹر سید حامد حسین کا "قاضی کامیاب" واقعی کامیاب ہے۔ تحقیق و تنقید کے ساتھ انھیں اس میدان میں بھی اپنے جوہر دکھاتے رہنا چاہیے۔ مشجرہ مجتبیٰ حسین کا شاہکار ہے۔ اب وہ جن بلندیوں پر ہیں وہاں تک پہنچنا ہر کسی

کے بس کی بات نہیں۔ مزید برآں یہ کہ وہ اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ طنز و مزاح لکھنے کو تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے مگر لگتا ہے مجتبیٰ حسین اس کے عادی ہو چلے ہیں۔ انھیں مبارک باد۔ نصرت ظہیر کی تازہ کار کاوش کلون اور فوائد کلون' ان کے مخصوص طرز و اسلوب کی نمایندگی کرتی ہے۔ شکر کہ اب وہ رسائل میں شائع ہونے کی جانب بھی متوجہ ہوئے۔ خامہ بگوش تو پھر خامہ بگوش ہیں۔ مسعود حسین خاں پر مرزا خلیل احمد بیگ کا مضمون معلوماتی ہے۔ شاعری میں ادا جعفری اور باقر مہدی کی غزلیں ان کے مخصوص رنگ میں ہیں۔ ادا جعفری کی غزلیں کتاب نما میں بڑے اہتمام سے شائع ہو رہی ہیں۔ اس طرح رسالے میں اچھی شاعری کی کمی کا شکوہ نہیں رہتا۔ پروفیسر عبدالستار دلوی کی نظم متاثر کن اور ان کے جذبات کی عکاس ہے۔

. . .

صابر رومانی' تھاوے (گوپال گنج) بہار

کتاب نما کا تازہ شمارہ اکتوبر نظر نواز ہوا۔ اسے بہ نظر غائر پڑھا اور محظوظ ہوا۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی نظم "مرڈر کیپٹل آف دی ورلڈ" سرمایہ دارانہ نظام پر ضرب کاری ہے۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ترقی کی معراج پر پہنچنے کے باوجود بنی نوع انسان کی اکثریت آج بھی حیوانیت کا مظاہرہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے' یہ کتنی شرم کی بات ہے۔ زیر نظر شمارے میں "تانگے کا اجالا" حسب سابق کافی دلچسپ ہے۔

. . .

☆ عبدالرحمٰن' سرائے میر' اعظم گڑھ (یوپی)

اکتوبر ۱۹۹۷ء میرے پیش نظر ہے۔ یوں تو پورا شمارہ مفید معلومات سے پُر اور لائق ستایش ہے مگر چند مضامین نے خاص طور پر مجھے اپنی طرف کھینچا" میں دلیپ سنگھ کو نہیں جانتا" زبیر رضوی "صغرا آپا وظیفہ یاب ہوئیں" ڈاکٹر خالد محمود' مجتبیٰ حسین زیدی (مرحوم) عبداللطیف اعظمی' سخن ہائے ناگفتنی' خامہ بگوش' سحاب قزلباش کا ماضی' مجتبیٰ حسین وغیرہ۔

جامعی ہونے کے ناتے میں صغرا آپا' سید مجتبیٰ حسین زیدی' عبداللطیف اعظمی اور سحاب قزلباش' کو بہت قریب سے جانتا ہوں اور باقی کو بہت قریب سے پڑھا ہے۔

گل بھی وہی چمن وہی فرق نظر نظر کا ہے

جامعہ ملیہ میں میرا زمانہ طالب علمی ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۳ء تک رہا ہے۔ آج بھی جامعہ سے میرا قریبی تعلق قائم ہے۔ میرا ایک لڑکا انجینئر انیس الرحمٰن ناصر خاں' جامعہ کے شعبۂ انجینئرنگ میں الکٹرانک لکچرر ہے۔ اس لیے میں جامعہ کو کبھی بھول نہیں پاتا ہوں۔ دیکھیے میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا؟ معاف کیجیے گا جاننے والوں کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

ادبی خبریں

علی سردار جعفری کو گیان پیٹھ ایوارڈ
ادبی حلقوں میں خوشی کی لہر

نئی دہلی' علی سردار جعفری کو گیان پیٹھ ایوارڈ دینے کے اعلان سے ملک کے ادبی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے اور اخبارات کے دفتر میں مبارک باد کا سلسلہ جاری ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ' دہلی یونی ورسٹی اور جے این یو کے شعبہ اردو کے اساتذہ اور مکتبہ جامعہ کے کارکنوں نے اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے اردو کے احترام کے تئیں ایک بہترین جذبہ قرار دیا ہے اور علی سردار جعفری کو گیان پیٹھ ایوارڈ کے لیے منتخب کیے جانے پر مبارک باد دی ہے۔

ممتاز ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری کو ۱۹۹۷ء کا گیان پیٹھ ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ گیان پیٹھ ایوارڈ کمیٹی کی ایک میٹنگ آج ڈاکٹر کرن سنگھ کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ۱۹۹۷ء کا ۳۳واں گیان پیٹھ ایوارڈ علی سردار جعفری کو ان کی اپنی روشن خیالی تحریروں کے ذریعہ ہندستانی ادب میں گراں قدر اضافہ کے اعتراف میں دیا جائے گا۔ اردو ادب کی ترقی پسند تحریک کے ایک قافلہ سالار ۸۵ سالہ علی سردار جعفری ۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء کو اتر پردیش کے بلرام پور قصبے میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن وہیں گزارا اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔

اس کے بعد اعلا تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی پہنچے۔ علی گڑھ میں حصول علم کے دوران سامراجیت اور فسطائیت کے خلاف لڑائی میں عملی طور پر شریک ہوگئے اور تب سے اب تک انسانی معاشرے کی آزادی اور انسان کی سربلندی کی لڑائی لڑتے رہے ہیں۔ علی سردار جعفری نے اپنے قلم کو انسانی زندگی کی بہتری کے لیے ایک طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ علی سردار جعفری سماجی' سیاسی اور ادبی تحریکوں میں مقدور بھر حصہ لیتے رہے ہیں اور اسی کے ساتھ انھوں نے اپنی تخلیقی کاوشوں کے ذریعہ پورے ملک میں اپنی پہچان بنائی ہے۔

۱۹۳۸ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ "منزل" شائع ہوا اور تب سے اب تک کاغذ پر پھول کھلانے کا عمل مسلسل جاری ہے۔ یوں تو سردار جعفری نے کہانیاں بھی لکھیں اور ڈرامے بھی مگر ان کی صحیح پہچان ان کی شاعری میں ہے اور انھیں ترقی پسند تحریک کے اہم شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے شعری مجموعے "پرواز" (۱۹۴۳ء) "نئی دنیا کو سلام" (۱۹۴۸ء "خون' (۱۹۴۹ء) "ایشیا جاگ اٹھا' (۱۹۵۱ء) "پتھر کی دیوار (۱۹۵۳ء) "ایک خواب اور" (۱۹۵۴ء) "پیراہن شرر" (۱۹۶۵ء) اور "لہو پکارتا ہے" (۱۹۷۸ء) ہیں۔

علی سردار جعفری نے کہانیاں اور ڈرامے بھی لکھے ہیں اور رپورتاژ بھی۔ "منزل" (۱۹۳۸ء) "یہ کس کا خون ہے" (۱۹۴۳) اور "لکھنو کی پانچ راتیں" (۱۹۶۵ء)

تیوں مذکورہ بالا استثناء میں ان کی اہم تخلیقات ہیں۔ اپنی ان تخلیقی سرگرمیوں کے علاوہ انھوں نے میر، غالب اور کبیر کے کلام کو خوش اسلوبی کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ سردار جعفری کی تخلیقات کا دیگر ہندستانی اور غیر ہندستانی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ ان کی ساری زندگی ایک جہد مسلسل کی علامت ہے۔ انھیں صرف اردو کا قلم کار نہیں سمجھا جاتا بلکہ وہ ایک ہندستانی ادیب کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور ان کی یہ پہچان ہندستان کی سرحدوں کے باہر بھی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔

علی سردار جعفری ان کروڑوں عوام کے نمائندہ شاعر ہیں جو سماج میں ظلم اور ناانصافی کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ علی سردار جعفری اردو زبان کے تیسرے ادیب ہیں جنھیں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا جارہا ہے۔ ان سے پہلے فراق گورکھپوری کو ۱۹۶۹ء میں اور محترمہ قرۃ العین حیدر کو ۱۹۸۹ء میں گیان پیٹھ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ایک سپاس نامہ 'واگ دیوی' (سرسوتی) کے کانسہ کے مجسمہ اور ڈھائی لاکھ روپے نقد پر مشتمل ہے۔

گیان سنگھ شاطر کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ

نئی دہلی۔ اردو میں اس برس کا ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ گیان سنگھ شاطر کو ان کے سوانحی ناول "گیان سنگھ شاطر" پر دیا گیا ہے۔ اکیڈمی کے صدر پروفیسر یو آر اننت مورتی کی صدارت میں آج یہاں منعقد ساہتیہ اکیڈمی ایگزیکٹیو بورڈ کی میٹنگ میں مختلف زبانوں کے ۲۱ ادیبوں کو ایوارڈ دیے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان ادیبوں کا انتخاب ہر زبان کی تین رکنی جیوری کی تجویز کردہ کتابوں کی روشنی میں کیا گیا۔ یہ انعام یادگاری تختی اور ۵ ہزار روپے نقد پر مشتمل ہوتا ہے۔

دیگر ایوارڈ یافتگان میں لیلا دھر جاگوری (ہندی شاعری) جسونت سنگھ کنول (پنجابی ناول) شیام دیو پراشر (سنسکرت شاعری) نیرون بھٹاچاریہ (بنگالی ناول) رفیق راز (کشمیری شاعری) لکھمن سیکیا (آسامی مختصر کہانی) شیو دیو سنگھ سشیل (ڈوگری ناول) اشوک پوری گوسوامی (گجراتی ناول) وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کونکنی، میتھلی، ملیالم، منی پوری، مراٹھی، نیپالی، اڑیا، راجستھانی، سندھی، تمل اور تلگو زبانوں کے ادیبوں کو بھی منتخب کیا گیا ہے۔ ان سبھوں کو راجدھانی دہلی کے ایک خصوصی جلسے میں یہ ایوارڈ دیے جائیں گے۔ ترجمے کے ایوارڈ کا بعض تکنیکی وجوہ کی بنا پر فی الحال اعلان نہیں کیا گیا ہے۔ ایوارڈ سے متعلق اردو کی تین رکنی جیوری میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی پروفیسر وارث علوی اور جیلانی بانو شامل تھے جبکہ ان کے کنوینر عبدالصمد تھے۔

مجاہد آزادی، شاعر، صحافی مولانا سعید اللہ خاں رزمی کو گراں قدر خراج عقیدت

بھوپال۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے جنگ آزادی کے مجاہد شاعر اور صحافی مولانا سعید اللہ خاں رزمی کو یہاں گراں قدر خراج عقیدت پیش کی۔ صوبے کے گورنر جناب محمد شفیع قریشی نے مہمان خصوصی کی

حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مولانا رزمی نے ملک کی آزادی کے لیے اپنا سب کچھ نثار کردیا لیکن اس کے بدلے میں کچھ نہیں چاہا۔ ان جیسے سرفروشوں کی قربانیوں سے ہمیں ایک آزاد مملکت بطور امانت ملی ہے جس میں خیانت نہیں ہونا چاہیے۔

لوکل سیلف اور اردو اکادمی کے وزیر سردار تونت سنگھ کیرنے کہا کہ رزمی صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہمیں فرقہ پرست طاقتوں سے مورچہ لینا چاہیے۔ خصوصی مقرر کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے سابق وزیر و رکن پارلیمنٹ عزیز قریشی نے مولانا رزمی کے عہد اور ان کی قربانیوں کو یاد کیا اور ان کی ولولہ انگیز زندگی پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے رزمی صاحب کی یادگار قائم کرنے پر زور دیا جسے فوراً تسلیم کرتے ہوئے وزیر لوکل سیلف نے تاج المساجد کے مقابل سڑک کا نام رزمی صاحب کے نام پر رکھے جانے کا اعلان کیا۔

اس موقع پر اردو اکادمی کی شائع کردہ کتاب "کلام رزمی" کی بھی گورنر صاحب نے رسم اجرا سرانجام دی۔ رزمی صاحب کی غزلوں کو شہر کے مقبول گلوکاروں نے ساز سنگیت کے ساتھ پیش کیا۔ آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر منعقدہ اس تقریب میں اکادمی کے سکریٹری پروفیسر آفاق احمد نے اسے اکادمی کے لیے عین سعادت قرار دیا کہ وہ رزمی صاحب کے تین دہائیوں پر مشتمل کلام کی اشاعت اور ان کی یاد میں جلسہ کا انعقاد کرنے میں کامیاب رہی۔

سید خالد نے قوم کا سر پھر فخر سے اونچا کردیا

بارسی ناگل۔ غلام نبی آزاد آرٹ کامرس کالج کے بی۔اے سال دوم کے ہونہار طالب علم سید خالد نے امراوتی یونی ورسٹی کے تحت ہونے والے انٹر یونی ورسٹی مقابلوں میں دوسرے نمبر کی عظیم الشان کامیابی حاصل کرکے اپنا اوراپنے کالج اپنے اساتذہ 'اپنے والدین' اپنے گانو اور اپنی قوم کا سر فخر سے پھر ایک بار اونچا کردیا۔ مفلوک الحال مزدور مسلم گھرانے سے تعلق رکھنے والا قوم کے ہونہار فرزند نے گذشتہ سال بھی یونی ورسٹی سے دوسرا انعام حاصل کیا تھا۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر محبوب راہی' پروفیسر انیس خاں' پروفیسر آگاشے اور خالد کے احباب نے خالد کو اس کامیابی پر پرخلوص مبارک باد پیش کی ہے۔

جلیل الرحمن صدیقی کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

برکت اللہ یونی ورسٹی بھوپال نے جلیل الرحمن صدیقی کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ آپ کے مقالے کا موضوع تھا۔ "اردو ادب کی ترقی میں مفتیان بھوپال کا حصہ۔" اس مقالے میں آپ نے مفتی خیر اللہ صدیقی کی مثنوی "فقہ ہندی" سے لے کر آج تک تقریباً تین سو سال کی مفتیان بھوپال کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ آپ نے یہ مقالہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے سکریٹری پروفیسر آفاق احمد کی زیر نگرانی تحریر کیا۔

پروفیسر عبدالستار دلوی مہاراشٹر اردو اکیڈمی سے احتجاجاً مستعفی

ممبئی۔ مشہور اردو اسکالر اور ماہر لسانیات اور سابق صدر شعبہ اردو ممبئی یونی ورسٹی پروفیسر عبدالستار دلوی جو گزشتہ دو سال سے مہاراشٹر اردو اکیڈمی کے چیرمین بھی تھے' اردو اکیڈمی کی چیرمین شپ سے استعفیٰ دیدیا ہے۔ پروفیسر دلوی کے ساتھ ڈاکٹر رام پنڈت' جناب قاسم امام' ڈاکٹر یونس اگاسکر اور ندا فاضلی نے بھی اپنی ممبر شپ سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ پروفیسر دلوی اور ان کے ساتھیوں نے غیر ادبی اور غیر علمی شخص جناب یامین فاروقی کی من مانیوں' بدکلامی اور نازیبا حرکتوں کی شکایتوں کے باوجود ان کو سکریٹری نامزد کرنے اور ان کی کارکردگی کے خلاف احتجاجاً استعفیٰ دیا ہے۔ پروفیسر دلوی نے یامین فاروقی کی ممتاز دانشور اور شاعر ڈاکٹر علی سردار جعفری کو حکومت مہاراشٹر کے گیانیشور ایوارڈ کے سلسلے میں سازش اور حکومت مہاراشٹر کی اس انعام کے تعلق سے سردار جعفری کی نظم 'اجودھیا' کی بنیاد پر نظر ثانی کو بھی اپنے استعفے کی وجہ بتائی ہے۔ پروفیسر دلوی کے مطابق نظم صاف، ستھری احتجاجی نظم ہے جو اجودھیا کے تعلق سے کہی گئی ہے اور اس میں رام کی عظمت کا پاس رکھا گیا ہے جو اردو شعراء ادب کا مزاج ہے۔ ان کی رائے میں علی سردار جعفری نے عمر بھر سیکولرزم اور ادب کے ذریعے لسانی اور قومی یکجہتی کے لیے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور انھیں اس انعام سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ پروفیسر دلوی خود لسانی اور ادبی یکجہتی میں کوشاں ہیں اور اردو مراٹھی اور اردو اور ہندی کو تراجم اور تحقیق کے ذریعہ قریب لانے اور جذباتی و قومی ہم آہنگی پیدا کرنے میں پیش پیش ہیں۔

بھوپال میں علامہ اقبال کے فکر و فن پر سیمینار منعقد

کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز کے زیر اہتمام اقبال کے فکر و فن پر منعقد سیمینار میں کرسی صدارت سے تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر عزیز قریشی سابق وائس چیئرمین کونسل برائے فروغ اردو نے اقبال کی شاعری کے پس منظر کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کے یہاں ہمیں جو سوز و گداز نظر آتا ہے وہ حقیقت میں ملت اسلامیہ کے چھ سو سالہ زوال اور ادبار کا درد ہے کیونکہ وہ اپنی قوم میں ایسے دیوانے پیدا کرنا چاہتے تھے جو ملت کو فکر و عمل کے زوال سے اوپر اٹھا سکیں۔

اس سیمینار میں ڈاکٹر نعیم حنفی' پروفیسر صغری مہدی' ڈاکٹر عبیدالرحمٰن ہاشمی' ڈاکٹر محمد صابرین اور ڈاکٹر خالد محمود نے اپنے پرچے پیش کیے۔ جن میں اقبال کی شاعری اور فلسفے نے حیات انسانی کو جو ربط باہم' تازگی' ولولہ اور شگفتگی عطا کی نیز جس طرح قوم کی شیرازہ بندی کی کوشش کی ان پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مغرب کے مقابلے میں مشرق کی روایات کے استحکام کے لیے ان کے قلمی جہاد اور اقبال کی نظموں کے تلمیحاتی اور اشاراتی پہلوؤں اور ان کی معنویت کا بھی جائزہ لیا گیا۔ اکبر اور اقبال کے ہم آواز اور ہم فکر نکات کے ساتھ

اقبال کی نظم "جبریل و ابلیس" کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا گیا۔ ملا رموزی سنسکرتی بھون بھوپال میں منعقدہ اس "مجلس ممنون" میں مرکز کے سکریٹری پروفیسر آفاق احمد نے فاضل مقالہ نگاروں کا تعارف کرایا اور مرکز کی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا۔ مرکز کے چیرمین مرزا فہیم بیگ صاحب کی طرف سے شکریہ ادا کیا گیا۔

شعبہ اردو ممبئی یونی ورسٹی میں توسیعی لیکچر

شعبہ اردو ممبئی یونی ورسٹی کی دعوت پر اردو کے ممتاز اسکالر پروفیسر نثار احمد فاروقی نے "غالب کی امیجری" کے موضوع پر توسیعی خطبہ دیا جس میں شعبہ اردو کے اساتذہ، طلبہ اور دیگر ادب نواز حضرات نے شرکت کی۔ پروفیسر فاروقی نے کلام غالب پر بیدل اور میر تقی میر کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مشکل پسندی سے سہل پسندی کی طرف ان کے فنی سفر کی نشان دہی کی۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی سے قبل شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے سابق صدر پروفیسر اقتدار حسین صدیقی نے "اردو شاعری میں تصوف" کے موضوع پر لیکچر دیا۔ پروفیسر صدیقی نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے تاریخی ارتقا اور اردو شاعری پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا۔

ابتدا میں شعبہ اردو کے انچارج ڈاکٹر یونس اگاسکر نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے تعارفی کلمات کہے اور طلبہ و اساتذہ کے لیے توسیعی خطبات کی اہمیت کو واضح کیا۔ پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے رسم شکریہ ادا کی۔

محسن اردو حضرت نقشبندی قبلہ کا وصال

بالاپور (وور بھ) ۱۰ اردسمبر ۲۰۰۷ء کو ہادی ملت محسن اردو کامل بزرگ ہستی حضرت مولانا ہادی نقشبندی قبلہ کا وصال فجر کے وقت ہوا۔ نماز جنازہ ۱۱ اردسمبر کو صبح دس بجے ادا کی گئی۔ یہ عظیم شخصیت علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے فارغ تھی۔ وہ مسلم یونی ورسٹی کے کورٹ ممبر رہ چکے تھے۔ آپ نے طالب علمی دور میں انگریزی سہ ماہی اردو اخبار "بیداری" شائع کیا تھا اور یونی ورسٹی میگزین کے شعبہ ادارت سے وابستہ رہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے دست راست رہے۔ آپ دینی و ملی کاموں کے سلسلہ میں اکثر دوروں پر رہتے تھے۔ آپ کے مضامین برصغیر کے مختلف اخباروں و رسالوں میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ خاص کر برار میں آپ نے اردو کی بہت زیادہ خدمت کی۔ مختلف جلسوں و کانفرنس کے آپ قائد رہے تھے۔ آپ کل ہند صوفی کانفرنس کے نائب صدر تھے۔ آپ ہمارے دوست طلحہ نقشبندی القادری کے ابا حضور (تایا) تھے۔ حضرت قبلہ کو ہزاروں عقیدت مندوں و مریدین کی موجودگی میں سپرد خاک کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اہل خانہ کو صبر عطا فرمائے۔

لسان الصدق — مدیر: مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ۔ ۷۵/-

نظامِ رنگ — ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ کا ادبی خاکہ۔ یہ اُس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہوکر انسانیت کو وقار بخشا۔ ۱۵/-

شہیدِ جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) — پروفیسر ضیاالحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مردِ درویش تھے جس کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مردِ مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۷۵/-

پرانی بات ہے (سلسلہ وار نظمیں) — زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے وہ ... کی ... سچائیوں

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ ...

خاں سیتاب ... کے کلام کا جامع انتخاب ادا جعفری نے برسوں کی محنت ... بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ... قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۲۸۰

ساز سخن

جدید شاعری کی خاتون ... کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری ... سے ایک ایسی قوت ارادی متشرح ... ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ...

ترجمہ قرآن

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی ... پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ ... کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک ... میں پیش کیا گیا۔

نذرِ مختار

مجموعۂ مضامین جو ممتاز محقق ... مختار الدین احمد کو عالیجناب شنکر ... جمہوریۂ ہند کے دستِ مبارک ... کے ممتاز محققین ادیبوں کا ...

Regd. with R.N.I. at No 4967/60
Regd. No. DL 16016/97
Licence No. U[SE]-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025

کتاب نما



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی

کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/-

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/-

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/-

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ۔ اردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/-

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت
مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک
بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔

فی الفور

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا ش
کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آ
مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظف

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگ
جیسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق است
اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احم
بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے
تاریخی دستاویز۔

دیگر اداروں کی کتاب

مضامینِ سیّدین — مرتبہ: ڈاکٹر عظیم

ممتاز ماہرِ تعلیمات خواجہ غلام السید
ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔

توفیق الحکیم — ڈاکٹر بدر ال

ناول نگاری کا جائزہ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول
کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

مارچ ۱۹۹۸ء — جلد ۳۸ — شمارہ ۳

فی پرچہ	7/:
سالانہ	70/:
سرکاری تعلیمی اداروں سے	100/
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک)	500/

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
فیکس نمبر: 6842574
Tel Cum Fax No (011)-6910191
ٹیلی فون نمبر: 6910191

شاخیں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

اردو غزل اور تقسیم ہند	تحقیقی مقالہ	محمد قمر الحق	100/-
ویدک ادب ایک مطالعہ	تحقیق	چرن جیت سنگل	200/-
سدھا بین انجم اپنے کلام کے آئینہ میں	ادب	عرش صہبائی	100/-
جمیل مظہری بحیثیت نثر نگار	سوانح	ڈاکٹر سید نعمت اللہ	80/-
منڈی	افسانے	مشرف عالم ذوقی	110/-
شہروں کا [illegible]	شعری مجموعہ	خالد عبادی	60/-
سوئی کی نوک پر رکا لمحہ	افسانے	حسین الحق	60/-
ذہن جدید 24	مجلہ	زبیر رضوی	25/-
شیر ہندستان ٹیپو سلطان	تاریخ	سید خورشید مصطفیٰ رضوی	55/-
فکر و تحقیق شمارہ ۲	مجلہ	قومی کونسل نئی دہلی	35/-
اردو لغت نویسی کا پس منظر	ادب	ڈاکٹر مسعود ہاشمی	50/-
قرابادین قادری	طب	حکیم محمد اکبر ارزانی	150/-
کاروان خیال	تحقیقی مضامین	غلام نبی خیال	300/-
انشاء اللہ نیا ایڈیشن	مزاحیہ	شوکت تھانوی	70/-
صحبت با اولیا	مذہب	مولانا تقی الدین	100/-
ہنسے اور پھنسے نیا ایڈیشن	مزاحیہ	ابراہیم جلیس	45/-
سب رس پر ایک نظر	تنقید	سہیل بخاری	40/-
شکوہ جواب شکوہ تشریح	"	سید عابد علی عابد	35/-
میرے حصے کا زہر	شاعری	فیاض رفعت	100/-
نوائے سروش	"	محمود سروش	100/-
تذکرۂ مفسرین ہند	مذہب	محمد عارف اعظمی عمری	60/-
تذکرۂ الفقہاء حصہ اول	"	محمد زبیر صدیقی دریابادی	95/-

آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح	ادب	نامی انصاری	/-
اردھ ناریشور	ناول	وشنو پربھاکر	/-
اردو فکشن کے ارتقا میں [illegible]	ادب	ڈاکٹر محمد اشرف	/-
تاریخ جمالیات	ادب	مجنوں گورکھپوری	
اقبال کی صحت زبان	اقبالیات	ڈاکٹر اکبر حیدری	/-
خس و خاشاک	مزاحیہ مضامین	ہاشم عظیم آبادی	/-
بازدید نیا اضافہ شدہ ایڈیشن	مضامین	مخمور سعیدی	/-
تحریر کے رنگ	مضامین	خالد محمود	10/-

اعتبار حرف

اقبال مسعود

اردو ادب کے وہ قابل احترام فنکار جنھوں نے حرف اعتبار قائم کیا۔ ان پر تحقیقی و تنقیدی مضامین کا نئے زاویہ سے تعارف کرایا ہے۔ قیمت: -/0

دلی جرف حرف دلی

عظیم اختر

قلمی خاکوں پر مبنی موجودہ دہلی کی تہذیبی، سماجی اور ادبی زندگی کی ایک اہم تاریخی دستاویز۔ اردو خاکہ نگاری میں ایک اہم اضافہ۔ قیمت -/210

غالب کی شخصیت اور شاعری

پروفیسر رشید احمد صدیقی

یہ نظام اردو خطبات کا چوتھا خطبہ ہے جس کو ملک کے مایہ ناز طنز و مزاح نگار رشید احمد صدیقی صاحب نے پیش کیا۔

(تیسرا اڈیشن) قیمت =/5

سرورق محمد شاہد پٹھان

مہمان مدیر
محمد شاہد پٹھان
شعبہ اردو و فارسی
راجستھان یونیورسٹی، جے پور

اشاریہ

اردو تحقیق --- مسائل اور تجاویز

تحقیق ایک مستقل ذوق تجسس، غیر معمولی دیدہ ریزی، یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ نام و نمود سے دور رہتے ہوئے کسی خاص موضوع کے متعلق حقائق کی دریافت اور باز یافت کا نام ہے۔ ادبی تحقیق کے لیے محقق کے مطالعہ میں ہمہ گیری، ذہنی بیداری و بالیدگی، حق شناسی اور اعلا تنقیدی شعور و عرفان کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ جو ریسرچ اسکالرز مذکورہ اوصاف سے متصف ہوتے ہیں وہی واقعتاً وادیٔ تحقیق سے کامراں و شاداں گزر سکتے ہیں۔ ع انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیادہ قاضی عبدالودود نے اس سلسلے میں بڑی اہم بات کہی ہے کہ کسی ملک کے باشندوں کا معیار اخلاق پست ہو اور وہ کام کرنے سے جی چراتے ہوں تو وہاں بالعموم تحقیق کا معیار پست ہوگا۔

مذکورہ بالا قول کی روشنی میں اگر ہم ہماری دانش گاہوں کی تحقیقی سرگرمیوں پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ موجودہ دور میں اردو شعبہ جات میں معتبر اور معیاری کام کی بہ نسبت سطحی اور بھرتی کا کام زیادہ داخل ہو رہا ہے اس کے لیے دراصل سہل انگار اور کم عیار ریسرچ اسکالرز نیز نگران کار ہی نہیں بلکہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے ممتحنین بھی کسی حد تک ذمے دار ہیں کیونکہ ان سب کے اپنے اپنے مسائل اور مفادات ہوتے ہیں اس لیے ہر فریق فرض کی ادائیگی اور دیانت داری پر بہر طور مطلب براری کو ترجیح دیتا ہے۔ ریسرچ اسکالر چونکہ فکر معاش میں بھی گرفتار رہتے ہیں اس لیے تحقیق کے دوران انھیں ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں جن کی آمدنی سے ان کی گزر بسر ممکن ہو سکے۔ علاوہ ازیں انھیں اس بات کا احساس بھی رہتا ہے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی سند ملنے کے بعد بھی ان کی ملازمت یقینی نہیں ہے چنانچہ ریسرچ کے دوران انھیں دوسرے مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاریوں میں بھی وقت صرف

کرنا پڑتا ہے اس طرح ریسرچ اسکالرز تحقیقی کام کے لیے خاطر خواہ وقت نہیں نکال پاتے بعض اسکالرز تو کہیں ملازمت مل جانے کے بعد ریسرچ سے بالکل کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور بعض اسکالرز اپنے مہربان نگراں کو خوش کر کے تحقیقی کام کی تمام ذمے داری انھیں کے سپرد کر دیتے ہیں اور محترم نگراں آخرش سال چھ مہینوں میں پی۔ایچ۔ڈی۔ تھیسس (thesis) خود مکمل کر کے شعبہ میں داخل کر دیتے ہیں البتہ کچھ ریسرچ اسکالرز دیانت دار اور جفاکش بھی ہوتے ہیں جو اپنا کام خود مکمل کرتے ہیں۔

موجودہ عہد کی ذہنیت سیاست کے ناجائز استعمال اور استفادہ پر زیادہ ہی مائل ہے۔ زندگی کے تمام شعبے سیاست کی زد میں آچکے ہیں۔ ہر سرکاری اور نیم سرکاری ادارے ' محکمات اور ملازمتیں سیاسی داؤ پیچ کی شکار ہیں۔ ہماری دانش گاہیں بھی سیاسی کرتبوں کی جولان گاہ بنتی جا رہی ہیں۔ یہاں علمی و ادبی کاموں سے زیادہ غیر علمی و غیر ادبی امور کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ ہر شعبہ میں چند اساتذہ اور طلبہ کو چھوڑ کر زیادہ تر حضرات مشقت کوشی سے زیادہ مصلحت پسندی اور کام سے زیادہ نام آوری پر مائل ہیں۔ انھیں ریسرچ اسکالرز کے کیریر سے زیادہ اپنے کیریر کی فکر دامن گیر ہوتی ہے چنانچہ وہ اپنا بیشتر وقت اور صلاحیت ایسے کاموں میں صرف کرتے ہیں جن سے ان کی نجی شہرت میں چار چاند لگتے ہیں اور تصانیف و تالیفات میں اضافہ ہوتا ہے تاکہ وہ جلد از جلد لیکچرر سے ریڈر اور ریڈر سے پروفیسر بن سکیں غرض کہ نگراں حضرات کے پاس اسکالرز کی تربیت و رہنمائی کے لیے اتنا وقت نہیں ہوتا کہ یہ مظلوم طبقہ ان سے کسبِ فیض کر سکے۔ نتیجتاً ریسرچ اسکالرز اپنی عمر عزیز کے پانچ سات برسوں میں جیسے تیسے ڈاکٹر تو بن جاتے ہیں یا بنا دیے جاتے ہیں لیکن بچارے محقق اور کامیاب استاد بننے سے تاعمر محروم رہتے ہیں۔

اسی طرح پی۔ایچ۔ڈی کے ممتحنین بھی ہر معیاری اور غیر معیاری قسم کی تھیسس کی بہتر سے بہتر رپورٹ دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ اتنی جراءت و زحمت بھی نہیں کرتے کہ سطحی اور غیر معیاری کام کی کچھ اصلاح اور تحقیق کے اصول و ضوابط کے مطابق از سر نو ترتیب دینے کی بات اپنی رپورٹ میں لکھ سکیں۔ اگر یہ ممتحنین حضرات اس ضمن میں مصلحت اندیشی اور پاس خاطر احباب کے بجائے حق شناسی اور دیانت داری کا ثبوت دیں تو یہ جو ہماری جامعات میں پی۔ایچ۔ڈی کے نام پر بھرتی کا مواد بھی داخل ہو رہا ہے اس کی قدرے روک تھام ممکن ہو سکتی ہے۔ ایلئٹ نے کہا ہے ''اسکالر پیدا نہیں ہوتے بنائے جاتے ہیں۔'' اس سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ تحقیق جانفشانی اور عرق ریزی کی متقاضی ہے جبکہ

موجودہ وقت میں ہماری دانش گاہوں میں ایسے اسکالرز اور نگراں بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں جو محنت پیہم سے کام کرتے اور کراتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انھیں معدودے چند اساتذہ اور اسکالرز کے دم سے ہی دانش گاہوں میں تحقیق کا بھرم قائم ہے۔ علاوہ ازیں ہماری دانش گاہوں کے کاروبار تحقیق میں ایک تجارتی رجحان بھی دیکھنے کو ملتا ہے جس کی اصلیت و نوعیت پر رضا نقوی واہی کی نظم "تحقیقی مقالہ برائے فروخت" سے واشگاف انداز میں روشنی پڑتی ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پیش رفت اردو ادب کی تیز کرنے کے لے
خشک ہوتے کھیت کو زرخیز کرنے کے لیے

ملک میں دو نمبری دھندوں کی برکت دیکھ کر
اور چھٹی جیبوں کی اپنی قدر و قیمت دیکھ کر

جامعہ کے چند استادوں کی سوجھی دور کی
من چلوں نے کھول ڈالی اک نئی انڈسٹری

اس نئی انڈسٹری میں تھیسس ڈھلنے لگیں
اور ریسرچ اسکالروں کی گاڑیاں چلنے لگیں

ایسے ایم اے پاس لڑکوں کی بھی قسمت کھل گئی
اہلیت جن کی کلرکوں کے برابر بھی نہ تھی

ان کو نقلی ڈاکٹر بننا سکھانے کے لیے
خود مقالے لکھ کے پی ایچ ڈی بنانے کے لیے

فیس استادوں نے رکھی فی مقالہ دس ہزار
جس سے سودا پٹ گیا بیڑا ہوا جھٹ اس کا پار

دے کے پیسے ختم ہو جاتا ہے شاگردوں کا کام
حضرت استاد کرتے ہیں بقیہ انتظام

تیل کیوں بیچے کوئی پڑھ لکھ کے اردو فارسی
مل ہی جائے گی کسی کالج میں اس کو نوکری

اس مقالہ ساز صنعت سے ہے دہرا فائدہ
ایک کو اجرت ملی اور ایک روزی سے لگا

نسل نو کو درس کیا دیں گے یہ نقلی ڈاکٹر
کس کو فرصت ہے جو اس نکتے پر ڈالے اک نظر

کس نے تحقیقی مقالہ لکھا کس کے نام سے
کون دلی جا کے پوچھے گا یہ مالک رام سے

جیب استادوں کی اچھا ہے رفو ہوتی رہے
اور برج بانو یوں ہی بے آبرو ہوتی رہے

ہماری دانش گاہوں اور اساتذہ کے اعمال و رویوں پر شمس الرحمان فاروقی کے قصیدہ شہر آشوب' کے درج ذیل اشعار بھی بھرپور انداز میں روشنی ڈالتے ہیں جن کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ لکھتے ہیں۔ دوسری تصویر فاروقی صاحب نے کھینچی ہے جو مقام عبرت کم' حقارت آمیز زیادہ ہے۔ اساتذہ نے طلبہ کی ذہنی تربیت اور علمی خدمت کی بجائے درس گاہوں کو جہالت کی کارگاہوں میں بدل دیا ہے جہاں چاپلوسی کینہ توزی' دھڑے بازی اور مسابقانہ سیاست کے داؤ پیچ سکھائے جاتے ہیں۔ مسابقانہ مصاحبت کی تعلیم دی جاتی ہے اور حاشیہ نشینی کا فن سکھایا جاتا ہے۔ ذاتی مقاصد کو پورا کرنے کی غرض سے طلبہ کو بہتر ملازمتوں کے خواب دکھائے جاتے ہیں انھیں اپنا آلۂ کار بنا

یا جاتا ہے۔ فاروقی صاحب کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ مثل بوم مسلط ہیں درس گاہوں پر ہے کون سی حرکت جو اساتذہ نہ کریں
ہے پوچ بانی سوا کام کیا جو لاہوں کا کریں بھی کیا جو عمل عنکبوت سا نہ کریں
تمام اداروں میں قایم شکار گاہ ان کی غراب و کرگس و گنجشک کا نشہ نہ کریں
کوئی شکار ہو ہلکا نہیں ہے ان کے لیے ہو زاغ یا کہ زغن فرق بے حیا نہ کریں
جو آگے پیچھے نہ پھرتا ہو ان کے مثل سگاں ملازمت اسے شعبے میں یہ عطا نہ کریں

سطور بالا میں سندی تحقیق کے متعلق بعض بدنظمیوں اور خامیوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے چنانچہ ان کے انسداد و اصلاح کے لیے اور تحقیق کی معیار افزائی کے لیے میرے خیال سے درج ذیل تجاویز پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

اول: یہ کہ ابتداء سے اب تک ملکی اور غیر ملکی دانش گاہوں میں جن جن موضوعات پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے لکھے گئے ہیں ان سب کی مکمل فہرست شائع کی جائے چونکہ اس کی عدم موجودگی کے سبب کئی موضوعات دہرائے جا رہے ہیں۔ اس فہرستِ موضوعات کی اشاعت سے ادبی تاریخ کے کئی نئے گوشے اور موضوعات بھی سامنے آئیں گے جو ہنوز تشنۂ تحقیق ہیں۔ تحقیقی مقالات کی اس فہرست میں ہر سال ملک کی مختلف دانش گاہوں اور کالجوں میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے منظور شدہ موضوعات کا اندراج بھی پابندی کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ بعض دانش گاہوں کے اردو شعبوں نے اپنے یہاں تحقیق شدہ مقالات کی فہرستیں شائع کی۔ ہیں علاوہ ازیں ادارہ تحقیقات پٹنہ نے بھی اس ذیل میں پیش رفت کی ہے

دوم: یہ کہ یو۔ جی۔ سی بعض سینئر پروفیسرز کا ایک اردو ریسرچ بورڈ قائم کرے جو مختلف دانش گاہوں میں ہر سال پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے منظور شدہ موضوعات کا معائنہ کرے نیز اس بورڈ کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ کسی بھی موضوع کو پی۔ ایچ۔ ڈی کے لائق نہ سمجھے یا اس میں کچھ کمی پائے تو اسے رد کر دے یا قدرے ترمیم و اصلاح کر کے اسے اس قابل بنا دے جو پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے شایان شان ہو۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر شعبے میں جس بے دریغ انداز سے غیر معیاری اور غیر ادبی موضوعات پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں دی جا رہی ہیں ان پر روک لگ سکے گی۔ بالعموم دیکھنے میں آتا ہے کہ ہماری درس گاہوں میں معیاری موضوعات کی بہ نسبت ایسے موضوعات پر پی۔ ایچ۔ ڈی سطح کا کام کیا جا رہا ہے جو کسی بھی اعتبار سے اس اعلاترین ڈگری کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ ایسے موضوعات پر زیادہ

ے زیادہ محض ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح زندہ شخصیات پر تحقیق کرانے کا رجحان بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمارے اساتذۂ کرام ہر متوسط درجے کے ادیب، شاعر، ایڈیٹر ا یب کسی بڑے عہدے پر فائز ہر کہ دمہ شخصیت پر پی۔ ایچ۔ ڈی کرانا ضروری سمجھتے ہیں یونکہ ان میں سے بعض اساتذہ خود اپنی حیات و خدمات پر بھی کسی واقف کار استاد یا اپنے شاگردوں کی نگرانی میں تحقیقی کام کروا رہے ہوتے ہیں۔ انھیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ جس شخصیت پر وہ تحقیقی کام کروا رہے ہیں اس کے ادبی کاموں کا معیار و مقام کیا ہے یا یہ کہ کام کس زبان و ادب اور موضوع سے متعلق ہے۔ دراصل کوئی بھی زندہ ادبی شخصیت اپنے آخری ایام میں ادبی و فکری نقطہ نظر سے رد و قبول کے عمل سے گزر سکتی ہے چنانچہ ایسی شخصیات پر کیا گیا تحقیقی کام بہت حد تک نامعتبر و نامکمل رہتا ہے۔ پھر ایسے کاموں میں دیانت داری سے زیادہ مصلحت اندیشی اور عقیدت مندی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ ایک شخصیت پر ہی مختلف یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام کیا اور کروایا جاتا ہے۔ اس طرح نگراں حضرات کے نجی مراسم، مفادات اور مصلحتوں کی تکمیل کے لیے غریب اسکالرز کو قربانی کا بکرا بننا پڑتا ہے۔

سوم: یہ کہ جس طرح یو۔ جی۔ سی۔ نے ۱۹۹۳ء کے بعد لیکچرر شپ کے لیے Net یا Slet کا امتحان پاس کرنا لازمی قرار دیا ہے اسی طرح ملک گیر پیمانے پر ایک پی۔ ایچ۔ ڈی ایڈمشن ٹسٹ پاس کرنا لازمی قرار دیا جائے جس کا نصاب اردو زبان و ادب کی مختلف اصناف کے تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی مطالعات پر مشتمل ہو۔ اس ٹیسٹ کی ضرورت در حقیقت اس لیے ہے کہ اب تمام ایم۔ اے پاس طلبہ پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ لینا اپنا قانونی حق سمجھتے ہیں اور جو طلبہ ریسرچ میں داخلہ نہیں لینا چاہتے انھیں بعض اساتذہ کرام اپنی گروہ بندی، سیاست اور اقربا پروری کے تحت داخلہ دلوا دیتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایم۔ اے پاس طالب علم تحقیق کے لیے درکار ذوق و شعور کا حامل نہیں ہوتا۔

چہارم: یہ کہ پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلے سے قبل ایم۔ فل کی ڈگری لازمی قرار دی جائے چونکہ اس میں ہر طالب علم کو ٹرم پیپر اور تحقیقی مقالہ لازمی طور پر لکھنا ہوتا ہے چنانچہ ان کاموں سے طلبہ کی تحقیق کے تعلق سے کافی مشق و مزاولت ہو جاتی ہے جو پی۔ ایچ ڈی۔ کے دوران قندیل کا کام دیتی ہے۔ علاوہ ازیں اساتذہ کرام کو ایم۔ اے کے دوران طلبہ کو Dissertation لکھنے کی جانب بھی راغب کرنا چاہیے۔

پنجم: یہ کہ ابتدا سے تا حال تحریر شدہ تحقیقی مقالات کو یکجا کیا جائے۔ اس کی ایک ا

مکانی صورت یہ ہے کہ تمام مقالات کا ایک ایک نسخہ متعلقہ دانش گاہوں سے طلب کرکے یو۔جی سی۔ کی قائم کردہ اردو ریسرچ لائبریری یا کسی اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ و مجتمع کیا جائے۔ اس سے ایک اہم فائدہ یہ ہوگا کہ مختلف موضوعات پر تحقیق کرنے والے ریسرچ اسکالرز بآسانی اپنے کام کا مواد حاصل کر سکیں گے۔ علاوہ ازیں انھیں اس بات کا اندازہ بھی ہوگا کہ کس مقالہ نگار نے کس موضوع پر کس نوعیت و معیار کا کام کیا ہے چونکہ اردو کے تمام تحقیقی مقالات میں سے بیشتر محروم اشاعت ہیں (بعض مقالہ نگار دانستہ طور پر اپنے مقالات کو شائع نہیں کرانا چاہتے وہ اپنی سابقہ صلاحیتوں کو پردہ خفا میں ہی رکھنا چاہتے ہیں) دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ بعض یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالات بے ترتیب و بے حفاظت پڑے ہوئے ہیں وہ مزید تباہ ہونے اور غذائے کرم بننے سے بچ سکیں گے۔

ششم: یہ کہ جس طرح سے ریسرچ میں داخلے کے لیے عموماً ایم۔اے۔ میں طلبہ کے لیے پچپن فیصد نمبر لازمی قرار دیے گیے ہیں اسی طرح سے پی ایچ ڈی۔ کے نگران کار کے لیے بھی پی ایچ۔ڈی۔ ڈگری یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ کم از کم ۲۵ مطبوعہ تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات یا کسی تحقیقی و تنقیدی نوعیت کی مطبوعہ کتاب کا مصنف ہونا لازمی قرار دیا جانا چاہیے۔ ابھی تک یو۔جی۔ سی (U.G.C.) نے پی ایچ۔ڈی۔ کا نگراں بننے کے لیے اساتذہ کے لیے ایم۔اے۔ درجات کے صرف پانچ سالہ تدریسی تجربے کی شرط کر رکھی ہے جو اس منصب کے لیے نہایت ناکافی ہے۔

ہفتم: یہ کہ ایک اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں لایا جائے جس میں ملکی اور غیر ملکی اردو ریسرچ اسکالرز کے قیام کے لیے ہوسٹل اور ایک اطمینان بخش لائبریری قائم کی جائے جس میں اردو کی معیاری کتب اور قلمی نسخے نیز مخطوطات کی فراہمی کا خاص اہتمام کیا جائے۔

ہشتم: یہ کہ پی ایچ۔ڈی کی اہمیت و افادیت کو عام روزگار سے وابستہ کیا جائے ابھی تک اس کی اہمیت صرف لیکچر شپ تک محدود ہے دوسری سرکاری ملازمتوں میں اس اعلا ترین ڈگری کے حامل طلبہ کو کوئی ترجیح نہیں دی جاتی مثلاً ایک طالب علم بی۔اے۔ کے بعد ایک سال کی بی۔ایڈ ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد سرکاری ٹیچر بننے کا حقدار ہو جاتا ہے جبکہ ایک ایم۔ فل اور پی ایچ۔ڈی۔ ڈگری یافتہ امیدوار بی۔ایڈ ڈگری کے بغیر سرکاری ٹیچر بننے کا مجاز قرار نہیں دیا جاتا۔ چونکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہر ایم۔ فل اور پی ایچ۔ڈی ڈگری یافتہ امیدوار یونیورسٹی اور کالج میں لیکچرر نہیں بن سکتا پھر اردو کی آسامیاں بھی

ہمارے ملک کی دانش گاہوں میں بدقسمتی سے بہت کم ہیں چنانچہ دانش گاہوں کے جملہ مضامین کے اسکالرز کو اجتماعی طور پر ملک گیر پیمانے پر گورنمنٹ سے اس بات کا تقاضا کرنا چاہیے کہ تمام ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی ڈگری یافتہ امیدواروں کو بی۔ ایڈ کے بغیر سرکاری ملازمت پانے کا مستحق قرار دیا جائے اور اگر امیدوار ایم۔ فل کے ساتھ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی رکھتا ہے تو اسے اس کا الگ سے انکری منٹ دیا جائے علاوہ بریں دوسری تمام سرکاری ملازمتوں میں بھی ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی ڈگری یافتہ امیدوار کو ترجیح دیے جانے کا مطالبہ کیا جانا چاہیے تاکہ لیکچرر شپ نہ ملنے پر امیدوار بے سروسامانی کی زندگی نہ گزارے اور کسی بھی سرکاری شعبے سے وابستہ ہو کر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے۔

نہم: یہ کہ نمایاں اکیڈمک رکارڈ کے حامل ریسرچ اسکالرز کو شعبہ جاتی سطح پر معقول وظیفہ دیا جائے تاکہ وہ فکر معاش سے آزاد رہتے ہوئے اپنی تمام و کمال توجہ اور صلاحیتوں کو تحقیقی کام کے لیے وقف کر سکیں۔ اگرچہ بعض دانش گاہوں میں شعبہ جاتی سطح پر ہر سال ایک یا دو ریسرچ اسکالرز کو وظیفہ دیا جاتا ہے لیکن اسکی رقم بہت ہی قلیل ہے مزید بر آں بین اقوامی سطح کے موضوعات پر تحقیق کرنے والے ریسرچ اسکالرز کو متعلقہ ممالک کے اسفار کے جملہ اخراجات یو۔ جی۔ سی (U.G.C.) سے ملنے چاہئیں اس سے بین اقوامی سطح کے کام اطمینان بخش اور معیاری ہو سکیں گے۔ اسکے علاوہ جن دانش گاہوں میں پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری تفویض کی جاتی ہے ان میں پروفیسرز اور ریسرچ ایسوسی ایٹ (R.A.) کی آسامیاں قائم کی جانی چاہئیں۔ مذکورہ بالا تمام مسائل و تجاویز سندی تحقیق سے متعلق ہیں جن کا تعلق ہماری دانش گاہوں کی تحقیقی سرگرمیوں، کمزوریوں اور ضرورتوں سے ہے۔ ان تجاویز کو اگر ہم یو۔ جی۔ سی اور متعلقہ ادارت تک پہنچائیں اور اپنے مطالبات کے لیے اجتماعی سطح پر کوشاں ہوں تو مفید اور کارآمد نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ بحوالہ تحقیق کا فن صفحہ ۱۹۳ ڈاکٹر گیان چند جین ۱۹۹۰ء یوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ

۲۔ ایضاً صفحہ ۲۰۶

۳۔ کتاب نما دہلی صفحہ ۱۲ شمارہ مارچ ۱۹۹۷ء

۴۔ ایضاً صفحہ ۱۵۔۱۴

نوٹ۔ یہ مقالہ شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں منعقدہ دو روزہ کل ہند سمینار بعنوان۔ "اردو تحقیق مسائل اور امکانات" میں پڑھا گیا۔ (بتاریخ ۲۔۳ مارچ ۱۹۹۷ء)

احمد ندیم قاسمی

غزل

سر تا پا صحرا ہوں، اور خاصیت دریا رکھتا ہوں
میں تو فصیل شب میں بھی روشن، دن کا دریچہ رکھتا ہوں

روتے روتے رات کٹے اور گاتے گاتے دن گزرے
مر مر کر جیتے رہنے کا ایک سلیقہ رکھتا ہوں

میں بھی عجب مٹّی سے بنا ہوں، ریت کو ریشم تک کہہ دوں
ناممکن کی سوچ میں بھی امکان کا دردا رکھتا ہوں

شکر ہے، دورِ رواں کے سفر میں میری انا محفوظ رہی
ٹھوکر پر ٹھوکر کھا کر بھی، خود پہ بھروسا رکھتا ہوں

میرے نقادوں کو بتاؤ، میرا بھٹکنا کھیل نہیں
دائیں بائیں گھوم آتا ہوں، سمت کو سیدھا رکھتا ہوں

میں نے خلا کو چھو لیا ہے، چاند کو چھو کر دیکھا ہے
اب اس سے بھی کچھ آگے جانے کا ارادہ رکھتا ہوں

میرا فرشتوں سے کیا ناتا، میری صفات ہی یکتا ہیں
میں لب گویا، دیدۂ بینا، سوزِ تمنا رکھتا ہوں

میری انجمن آرائی پر طعنہ زنی کا جواز غلط
بھیڑ میں ہوتا ہوں تو جب بھی ذہن کو تنہا رکھتا ہوں

باغِ بہشت انسانوں کی ہے متروکہ جاگیر ندیمؔ
پھر سے ان کنجوں میں جا بسنے کا سودا رکھتا ہوں

رضا نقوی واہی
۱۴۸ گردنی باغ۔ پٹنہ

عظیم آباد

ہمارا شہر ملک میں عظیم و بے مثال ہے
یہ سرزمینِ شادؔ ہے یہ مولدِ خیالؔ ہے

اشوک کا نگر ہے یہ قدیم و کہنہ سال ہے
جہاں پہ آبِ گنگ کا جمال باجلال ہے

اسی نگر کا آج کل مگر عجیب حال ہے
جدھر نظر اٹھائیے کھٹال ہی کھٹال ہے

اشوک راج پتھ ہو یا ہیما ہیم کا نواس
جہاں بھی ہے کھلی جگہ غلاظتوں کی ٹال ہے

نگر نگم کے منتظم تو لوک پال تھے کبھی
اب اس کی دیکھ ریکھ پر لگا مویشی پال ہے

جگالی کرتے رہتے ہیں سڑک پہ بیٹھے جانور
کہیں پہ گھاس ہے پڑی کہیں رکھا پوال ہے

ہزار ہارن دیجیے وہ راستہ نہ چھوڑیں گے
انھیں ہٹائے راہ سے کسی کی کیا مجال ہے

نگر کا چپہ چپہ ان کے واسطے ہے لیٹرن
پڑا ہوا ادھر ادھر تمام تازہ مل ہے

یہ تازہ تازہ مال بھی وہ آتشہ سے کم نہیں
کہ اس میں حل کیا ہوا مثانہ کا ابال ہے

چھنی ہوئی ہے بول اور براز میں ہوائے شہر
ترقیات شہر کی یہ اک نئی مثال ہے

گلی کی کیا بساط ہے جو شاہراہ عام ہے
وہاں بھی جابجا بنا کھٹال ہی کھٹال ہے

کہیں ہے جھیل بول کی کہیں ہے تو وہ براز
گزرنا اس مقام سے محال صد محال ہے

ہو داغ داغ جس طرح کسی کا جسم برص سے
یونہی تمام شہر میں قدم قدم کھٹال ہے

غرض کھٹال مسئلہ بنا ہوا ہے شہر کا
اسی سے منسلک مگر اک اور بھی سوال ہے

بہ چشمِ غور دیکھیے تو صاف آئے گا نظر
ہمارا جو سماج ہے وہ خود بڑا کھٹال ہے

ہماری شہری زندگی کے جتنے شعبہ جات ہیں
ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں خستہ حال ہے

کہیں پہ ذات پات ہے، کہیں گروہ بندیاں
کہیں پہ فرقہ واریت بدرجۂ کمال ہے

درندگی قدم قدم پہ سدِّراہ ہے بنی
ذرا ذرا سی بات پر جدال ہے قتال ہے

کبھی تو عدل گھوس کی ترازو پر تلا کرے
کبھی نشانِ عدل کا 'ریوالور' کی نال ہے

جناب واہی جب معاشرہ ہی داغ داغ ہو
تو کس شمار میں ہمارے شہر کا کھٹال ہے

عنوان چشتی
۲۵۵-غفار منزل (آشرم) اسٹریٹ نمبر ۸
غفار منزل کالونی جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

غزل

مرنا جینا، ہنسنا رونا تیرے نام
جیون کا ہر رنگ سلونا تیرے نام

شب کو جاگنا، دن کو سونا تیرے نام
خوابوں کو پلکوں میں پرونا تیرے نام

تجھ سے ملنے، خالی ہاتھ میں کیا آتا
روح کا پارہ، جسم کا سونا تیرے نام

تنہائی ہو یا سناٹا تیرے لیے
باتوں میں موتی سے پرونا تیرے نام

اول و آخر، ظاہر و باطن ایسے ہو
میرا ہونا اور نہ ہونا تیرے نام

اپنے پرائے غم ہیں ہزاروں دل ہے ایک
کوزے میں دریا کو سمونا تیرے نام

قتل بھی میں، قاتل بھی میں، مقتول بھی میں
ہاتھ اپنے ہی خون سے دھونا تیرے نام

راہِ طلب میں ہوش نہیں ہے سجدوں کا
سمتوں کا احساس بھی کھونا تیرے نام

یوں ہی کیا کم بوجھ تھا تن کی مٹی کا
من کی چادر غم سے بھگونا تیرے نام

میرے لیے ہے اسم اعظم نام ترا
اپنے نام سے وحشت ہونا تیرے نام

تجھ کو دیکھ کے غیر کو دیکھوں، ناممکن
سوئیاں سی آنکھوں میں چبھونا تیرے نام

تیرے نام سے خود کو پکاروں اے عنواں
اپنی یاد میں پاگل ہونا تیرے نام

زہرا نگار

مسلم مسلم فسادات

صبح دم جو دیکھا تھا
کیا ہرا بھرا گھر تھا
ڈانٹتی ہوئی بیوی
بھاگتے ہوئے بچے
رسیّوں کی بانہوں میں
جھولتے ہوئے کپڑے
بولتے ہوئے برتن
جاگتے ہوئے چولھے
اک طرف کو گڑیا کا
ادھ بنا گھروندا تھا
دور ایک کونے میں
سائکل کا پہیّہ تھا
مرغیوں کے ڈربے تھے
کابکیں تھیں، پنجرا تھا
تیس گز کے آنگن میں
سب ہی کچھ تو رکھا تھا

ایک پل میں یہ منظر
کیوں بدل سا جاتا ہے
اک دھواں سا اٹھتا ہے
ہاں مگر دھندلکے میں
کچھ دکھائی دیتا ہے

جانماز کا کونا
جھاڑیوں میں الجھا ہے
صفحۂ کلام پاک
خاک پر لرزتا ہے

ساتھ اور خبروں کے
یہ خبر بھی چھپتی ہے
لوگ اس کو پڑھتے ہیں
باتیں ہوتی رہتی ہیں
کام چلتے رہتے ہیں
ایمبولینس ایدھی کی
بین کرتی آتی ہے
سب جلی کٹی لاشیں
ساتھ لے کے جاتی ہے
صبح تک سبھی لاشیں
دفن کردی جاتی ہیں
عورتوں کی، بچوں کی
بوڑھوں اور جوانوں کی
مسجدوں سے ہوتی ہیں
بارشیں اذانوں کی
لاالٰہ الا اللہ
لاالٰہ الا اللہ

اعجاز رضوی

اپنی گمشدگی کی کہانی

وصل کی کہانی میں
جس قدر بھی چہرے ہیں
میرے اپنے لگتے ہیں
میرے اپنے چہرے ہیں
جس قدر بھی شکنیں ہیں
دوستوں نے ڈالی ہیں
دوستوں کے ہاتھوں میں
جس قدر بھی پتھر ہیں
دشمنوں نے بانٹے ہیں
دشمنوں کی آنکھوں میں
جس قدر بھی نفرت ہے
دوستوں نے ڈالی ہے'
میری جھولی خالی ہے!
وصل کی کہانی میں
میرا اتنا حصہ ہے
دوستوں کی راہوں سے
خار چنتا رہتا تھا
پیار بنتا رہتا تھا'
پھر یہ کیا ہوا یکسر
وصل کی کہانی سے
وصل گم ہوا یکسر
ہجر چھا گیا سر پر
سارے پوچھتے ہیں اب
وصل کی کہانی میں
وصل کیوں نہیں ملتا!
وصل کی کہانی کا
اختتامی منظر بھی
ہجر کی کہانی سے
مختلف نہیں لگتا
وصل کی کہانی بھی
کیا عجب کہانی ہے
اولین منظر سے
اختتامی منظر تک
میں کہیں نہیں ملتا
یار کھو گئے یا پھر
میں بچھڑ گیا ان سے
راز اس سیاست کے
مجھ پہ کیوں نہیں کھلتے!
اتنے سارے لوگوں میں
یار کیوں نہیں ملتے!

منصورہ احمد

پہچان

سنا ہے اک جہاں گردش میں ہے
سنا ہے چاند، سورج اور ستارے تک سفر میں ہیں
تو پھر میرا ازل کیوں منجمد ہے؟
مری آنکھوں کا منظر کیوں نہیں بدلا؟
وہی خوں تھوکتی گلیاں
وہی تحت الثریٰ میں رینگتے انساں
جو عمروں کے تسلسل میں
جڑوں کی گیلی مٹی سے کبھی اوپر نہیں اٹھتے
کبھی اندھے کنوؤں میں گوندھے منہ لیٹے ہوئے
اک بے سہارا بے ستارہ آسماں کو دیکھتے ہیں
جہاں پہلے بشارت کا خدا تھا
کبھی وحشے سروں میں ان زمیں زادوں سے
میٹھی بات کرتا تھا
سہارا دے کے مٹی سے اٹھاتا تھا
نجانے اب کہاں ہے؟

عجب سروپ بستی نے بھرا ہے
کوئی انساں کی قامت میں نہیں ہے
کروڑوں پیٹ کے بل رینگتے ہیں
جڑوں کی گیلی مٹی چاٹتے ہیں
اور ان کے درمیاں کچھ آہنی سر
آسماں چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں
کسی موسم کی شدت
ان کے فولادی بدن کو خم نہیں کرتی
سنا ہے ان کی ہر اک سانس کی خاطر
کروڑوں جاگتی سانسوں کی قربانی ضروری ہے
یہ جب چلتے ہیں
ان کے پاؤں کی ٹھوکر تلے
لاکھوں سروں کی فصل کچلتی ہے
زمیں کا رزق بنتی ہے

خداوندا!
تو کیا جنات اور حشرات کی اس سرزمیں پر
اب کوئی انساں کی قامت میں نہیں ہوگا؟
تو پھر ان کے لیے کچھ فیصلہ کر
جنہیں گیلی زمیں کو چاٹنا اور آسماں چھونا نہیں آتا
بتادے وہ کدھر جائیں
یہاں تو ان کے حصے کی ہوا مصلوب رہتی ہے
بتا وہ سانس لینے اب کدھر جائیں
یا ان کو تو ہی بوسہ دے
کہ وہ بے نام بے پہچان مر جائیں؟

عبدالاحد ساز
محمد حاجی آدم اینڈ کمپنی
84۔چکلہ اسٹریٹ ممبئی3

سردار جعفری کی نظم ــ نئی ساعتوں کے درمیان

اگر نظریاتی اور زمانی حد بندیوں سے ماورا ہو کر دیکھا جائے تو کسی بھی زبان کے نمایندہ اور عہد آفریں ادیبوں کی حیثیت اُس موج کی سی ہوتی ہے، جو پورے سمندر کی وقعت کا اظہار کرتی ہے اور اُن کی تخلیقات اُس زبان کے شعر و ادب کی بھرپور توانائیوں اور بلیغ ترامکانات کا مظہر ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر علی سردار جعفری بلاشبہ اُردو کے ایسے ہی محترم شعرا میں سے ہیں جن کی شاعری کو ہم نہ صرف تاریخ ادب اُردو کے زرّیں صفحات میں رکھتے ہیں بلکہ عالمی شاعری کے تناظر میں اُردو شاعری کے مقام کی دلیل و توثیق کے طور پر اعتماد کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

آج جب کہ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے اندرونی حصار سے باہر نکل کر ہمیں گذشتہ پچاس ساٹھ برسوں کی شاعری کو کھلے اُفق پر کشادہ نظروں سے دیکھنے کا موقع میسر آرہا ہے، تو ہمیں مجاز کی نظم 'آوارہ' فیض کی 'ملاقات' ساحر کی 'پرچھائیاں' یا سردار جعفری کی 'میراسفر' اسی طرح روشن دکھائی دیتی ہیں جس طرح اختر الایمان کی 'ایک لڑکا' یا ن۔م راشد کی 'ایران میں اجنبی'۔ اس ضمن میں ہر دو صف کے کئی اہم شاعروں کے شہ پاروں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ آخر ہمیں اساتذہ سے لے کر آج تک جو خطیر سرمایۂ سخن ملا ہے ہم اسے disown کیوں کریں؟ اس سے دست بردار کیوں ہوں؟ اجتہاد و اختلاف کی راہیں تو بہر حال کشادہ ہیں مگر روایت سے انکارِ محض یا انحراف برائے انحراف اک ایسا منفی عمل ہے جو زندگی کائنات اور آرٹ کے راستے میں خواہ مخواہ رکاوٹیں پیدا کرنے کے مترادف ہے۔

جب ہم نے اپنے ساتھ کے شعر کہنے والے دوستوں سے تبادلۂ خیال کے طور پر پوچھا کہ وہ اپنے تخلیقی سفر کے آغاز میں اپنے شعری مطالعات کی ابتدا میں کن شعرا سے متاثر ہوئے تھے تو رات بھر کی گفتگو کے بعد صبح تک جو حرفِ وفا ڈھل کے آیا وہ یہ تھا کہ صاحب اسکول کے آخری ایام میں یا کالج کے زمانے میں درسی کُتب کے باہر جو شاعری ہوئی تھی اور جو ہماری جذباتی و ذہنی نشو و نما اور فکر و شعور کی ساخت و پرداخت کا حصہ بنی، اُس میں ترقی پسند

معاصرین کی شاعری کا بڑا رقبہ تھا اور اس کے ساتھ جدید شاعری کے بدلتے ہوئے معاشرے کے منظر نامے میں فرد کے جس استفہامیے سے ہمیں آشنا کیا تھا، وہ بھی ہمارے جذبہ و فکر کے لیے اس قدر اہم اور متوجہ کن تھا۔ آج اگر غور کریں تو اُس عہد کی شاعری اور ہماری بدلی ہوئی تخلیقی ترجیحات کے مابین رابطے کے جو تار اب تک تنے ہوئے ہیں اُن میں فیض اور سردار جعفری کی شاہکار نظموں کے ارتعاشات خصوصی توسط رکھتے ہیں۔

جعفری صاحب کی نظم کے دو تین اسالیب ہیں جن کے ذیلی اسالیب اور بھی ہیں۔ ان دو میں سے ایک اسلوب ہمارے لیے زیادہ اہم اور توجہ طلب ہے۔ اس سے چند سطروں بعد بحث کریں گے۔ سر دست اپنے مطالعے کا یہ اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً جب ہم نے سردار جعفری کو پڑھا تھا اُس وقت اُن کی شاعری کے پیچھے تاریخی سیاسی سماجی شعور اُردو فارسی انگریزی ادبیات و شعریات کے مطالعے اور فلسفۂ دانش کا ہمیں زیادہ اندازہ نہ تھا پھر ہمارے شعوری و شعری سفر کے ساتھ ساتھ جعفری صاحب کی نظموں کے اُفق بھی ہم پر اُجاگر ہوتے گئے اور کینوس بھی پھیلتا چلا گیا۔ پہلے مجموعۂ کلام 'پرواز' سے لے کر "نئی دُنیا کو سلام" "خون کی لکیر" "امن کا ستارہ" "پتھر کی دیوار" "ایشیا جاگ اٹھا" "ایک خواب اور" "پیراہن شرر" "لہو پکارتا ہے" اور تاحال نئی نظموں تک ہم اُن کا برابر تعاقب کرتے آرہے ہیں۔ ہم نئے لکھنے والوں کو جعفری صاحب کے ساتھ جس سطح پر اُنسیت اور ربط و رغبت کا احساس زیادہ ہوتا ہے وہ اُن کا ایک منفرد اسلوب نظم ہے۔ یوں تو اُن کا بنیادی اسلوب: زبان کی وضاحت و روانی، الفاظ کی سیّال نغمہ ریزی، مصرعوں کی منضبط دروبست، نظم آرائی کے خوب صورت قرینوں اور فنّی و معنوی ہم آہنگی کی بنا پر دور سے پہچانا جاتا ہے، لیکن اس بنیادی اسلوب کے دو قابلِ امتیاز حصّے ہیں۔ پہلا وہ ہے جو فارسی تراکیب اور لفظیات سے مزین ہے جس میں روایتی شاعری کے مسلّمات بڑی قدرت کے ساتھ انقلابی و عصری معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ اس لب و لہجے میں وہ اپنی انفرادیت کے ساتھ انیسؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور کہیں کہیں فیضؔ کے قبیل کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ اس پیرایۂ اسلوب کا ہم احترام و قدر کرتے ہیں مگر دور سے اور ایک طالب علم کی طرح۔ خود اپنے شاعر ہونے کی حیثیت میں یہ پیرایہ ہمارے تخلیقی لمحوں میں جذبوں سوچوں اور فنّی کشاکشوں میں ہمارا ساتھ نہیں دیتا۔ دوسرا اسلوب وہ ہے جس کے خطوط قوسین اور زاویے ہمیں بڑے مانوس اور اپنے سے لگتے ہیں۔ یہاں الفاظ میں ایک دھیما بہاو، نرم رو شگفتگی، تازگی اور سہانا پن ہے۔ فارسی تراکیب اور مسلّماتِ سخن کے بجائے اپنی بات انوکھی اور اچھوتی امیجری کے ذریعے کہی گئی ہے۔ نظموں کی ہیئت اور ڈرافٹ میں ایک غنائی اثر

آفرینی ہے۔ مفاہیم کی رو سے بھی یہ نظمیں ہمیں اپنی عصری فضا میں رچی بسی لگتی ہیں۔

یہ دونوں پیرایۂ بیان سردار جعفری کے کلام میں آغاز ہی سے ملتے ہیں۔ ابتدا تو روایتی آب و رنگ ہی سے ہوئی تھی مگر بہت جلد ہی اُنھوں نے موخر الذکر اسلوب کو بھی اپنا لیا تھا۔ چنانچہ "پتھر کی دیوار" کی زیادہ تر نظمیں، "نئی دُنیا کو سلام" اور "ایشیا جاگ اُٹھا" ہمیں اسی اسلوب میں ملتی ہیں، "پتھر کی دیوار" سے نظم "اودھ کی خاکِ حسین" کا ایک خوبصورت ٹکڑا ملاحظہ کیجیے۔

یہ سیدھے سادے غریب انسان نیکیوں کے مجسمے ہیں
یہ محنتوں کے خدا، یہ تخلیق کے پیمبر؛
جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں
لُہار کے گھن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے
کمہار کا چاک چل رہا ہے
صُراحیاں رقص کر رہی ہیں
سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہرے چولھوں میں آگ کے پھول کھِل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھویں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں۔

بعد کی شاعری میں کافی عرصے تک اوّل الذکر یعنی فارسی آمیز اسلوب نمایاں ہے، لیکن دوسرا پیرایہ بھی گاہے گاہے متوازی خطوط پر کھنچتا چلا آتا ہے، خصوصاً "ایک خواب اور" کی نظموں میں ان دونوں اسالیب کو متبادل تواتر کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلے اوّل رویّے کی دو مثالیں دیکھیے۔

مژدہ ہو مہ جبینانِ افلاک کو　　بزمِ گیتی کا صاحب نظر آ گیا
تہنیت حسن کو بے نقابی کی دو　　دیدہ ور آ گیا، پردہ دار آ گیا
بزمِ سیّار گانِ فلک سیر میں　　اِک ہنر مند سیّارہ گر آ گیا
(نظم: سرِ طور)

گاہ غرورِ تاجدار، گاہ شکستِ شہر یار
گاہ سرورِ اہلِ دل، گاہ شعورِ دستکار

گاہ طلسمِ رنگ و بو گاہ فریبِ چشمِ یار
گاہ فروغِ جلوۂ ماہ وشاں ہے زندگی (نظم: زندگی)

اور اب اس روّیے کی دو مثالیں جو ہمیں زیادہ محبوب ہے۔

خاموش ہیں یہ خاموشی سے جو بربط و چنگ بناتے ہیں
تاروں میں راگ سلاتے ہیں، طبلوں میں بول چھپاتے ہیں
جب ساز میں جنبش ہوتی ہے، تب ہاتھ ہمارے گاتے ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو (نظم: ہاتھوں کا ترانہ)

جنگلوں میں وہی آوارہ ہوا گاتی ہے
کسی بھٹکے ہوئے رہرو کی صدا آتی ہے
کشتیاں خوش ہیں سمندر کی گزرگاہوں سے
تیرے ساحل بھی جواں رہتے ہیں ملاحوں سے
تیری آغوش میں بھی دہلی و شنگھائی ہیں
تیری محرابیں بھی تہذیب کی انگڑائی ہیں (نظم: مشرق و غرب)

"پیراہنِ شرر" اور "لہو پکارتا ہے" میں بھی اسالیب کا یہی متبادل التزام ہے، اگرچہ فارسی آمیز اسلوب کا رنگ غالب ہے۔ ہاں اس کے بعد سے اب تک جو تازہ نظمیں ہیں اور جو ابھی کسی مجموعے کی شکل میں یک جا نہیں ہوئیں صرف رسائل اور مشاعروں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں اُن میں اُن کا وہی خوبصورت پیرایۂ اظہار نئی توانائی اور کشش کے ساتھ لوٹ آیا ہے۔ اس باب میں نظم 'کربلا' آبلہ پا' دولتِ دُنیا کا حساب، زیرِ تخلیق طویل نظم 'نومبر ——— میرا گہوارہ' اور چند ایک نظموں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ نظم 'کربلا' کا ایک بند دیکھیے۔

یہ مدرسے' دانش کدے
علم و ہنر کے میکدے
ان میں کہاں سے آگئے
یہ کرگسوں کے گھونسلے
دانش وراں بے یقیں
غیروں کے دفتر کے امیں

الفاظ کے خواجہ سَرا
ان کے تصرف میں نہیں
خونِ حیاتِ جاوداں
برہم ہے ان سے رنگِ گل
آزردہ ہے بادِ صَبا
اے کربلا۔ اے کربلا!

کسی بھی اہم شاعر کو پڑھنے کا اِدّعا اُس کے افکار، نظریات یا موضوعات ہو سکتے ہیں مگر یہ اِدّعا پیدا تب ہی ہوتا ہے، جب اُس کا کلام قاری کو پہلی قرأت میں اپنا سکے اور باندھ سکے یہ معاملہ طرزِ ادا یا کرافٹ کا ہے۔ یہاں اظہار اور مدعا کی ثنویت کی بحث چھیڑنا مقصود نہیں۔ ظاہر ہے الفاظ و معانی کا رشتہ بدن اور پیراہن کا نہیں بلکہ جسم و روح کا ہوتا ہے۔ فن پارہ اس وقت ظہور میں آتا ہے جب 'کیا کہا گیا' اور 'کیسا کہا گیا' ایک دوسرے کے ساتھ محض آمیزے کی شکل میں یک جان نہ ہوں' بلکہ ایک ہی تخلیقی تجربے کے سیال مرکب میں ڈھل جائیں۔ سردار اس کیمیاوی تجربے میں اکثر نہایت کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے لطیف ذوقِ جمال اور نفیس غنائی شعور کی بنا پر ترسیل کی ایک ایسی فریکوینسی Frequency اخذ کر لیتے ہیں جو شاعر کے قلم سے قاری کے دل و دماغ تک رابطے کے غیر مرئی تاروں کو مرتعش کر دیتی ہے۔ ان مرتعش لہریوں میں وہ اپنے افکار و خیالات کی رو بڑی آسانی سے دوڑا دیتے ہیں اور نظمیں اپنے پورے ڈرافٹ کے ساتھ قرأت یا سماعت میں اُتر جاتی ہیں۔ ذرا اور ڈوب کر پڑھیں تو ان نظموں کے پیچھے ایک غیر مرئی حِسّی و بصری فضا کا بھی احساس ہوتا ہے، جو شاید اپنے عہد اور معاشرے کی فہم' مشاہدۂ فطرت اور زندگی کی سائنسی آگہی کے درمیان کسی جمالیاتی ارتباط سے بنتی ہو۔ یوں تو یہ فضا غیر محسوس سی ہے، لیکن اگر ہم چند لحظہ آنکھیں بند کر کے اس abstract فضا کو سوچیں، تو ذہن میں کچھ Visuals اُبھر آتے ہیں۔ جس طرح فیضؔ کی شعری فضا کو سوچتے ہوئے ذہن میں شہر کی شام' چاندنی' در و بام' فصیل' روشن محلوں اور مغموم حُسن کا ماحول اُبھر آتا ہے، اس طرح سردار جعفری کی شاعری ہمارے تحت الشعور میں چند ثانیوں کے لیے آسمان کی نیلاہٹوں، سمندر کے دور تک پھیلے ہوئے ساحل، لہلہاتے ہوئے کھیت اور آفتاب کی سنہری شعاعوں کی چمکیلی مسرّت کا کیف پیدا کرتی ہے۔

جعفری صاحب کی نظموں سے ہم جو اک خاص قربت محسوس کرتے ہیں اس کی ایک اہم وجہ صوتی و سمعی تشکیل کے ساتھ منظر اور مفہوم کی بصری و حِسّی پیکر تراش بھی ہے موضوع بسا اوقات اپنے جمالیاتی پس منظر ہی میں کھلتا اور پھلتا ہے، فکر کی تابندگی اور جذبے کی گرمی حِسّی و بصری کیف کے ساتھ گھل مِل کر ہی سرشار کرتی ہے۔ ایسی امیجری کی مثالیں ان کی نظموں میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔

تری کتاب رخ جواں پر
کہ جو غزل کی کتاب ہے اب
زمانہ لکھے گا اک کہانی
اور ان گنت جھرّیوں کے اندر
میری محبت کے سارے بوسے
ہزار لب بن کے ہنس پڑیں گے
(نظم، حسین تر)

جاڑوں کی ہوائیں دامن میں
جب بادِ خزاں کو لائیں گی
رہرو کے جواں قدموں کے تلے
سوکھے ہوئے پتوں سے میرے
ہنسنے کی صدائیں آئیں گی
(نظم: میرا سفر)

"نئی دُنیا کو سلام" کے پانچویں حصّے میں نیند کے حِسّی کیف کو بحر کے خاص فن کارانہ برتاؤ اور لفظوں کے دھیمے دھیمے بہاؤ کے ساتھ اس طرح اُبھارا گیا ہے کہ پڑھتے ہوئے اک غنودگی کی سی فضا طاری ہوتی ہے۔

نیند ہے اک حسینہ
سرمئی آنکھیں ہیں، نیلگوں اس کا سینہ
اس کی پلکوں کے سایے میں خوابوں کی مدہوش پرچھائیاں کھلتی ہیں
وہ غریبوں کی غم خوار، دُکھیوں کی دلدار ہے
اور فرقِ مراتب سے بیزار ہے
رات کو آتی ہے
تھپکیاں دے کے سارے جہاں کو سُلا جاتی ہے
بچّوں کو لوریاں دیتی ہے
پھولوں کو پیار کرتی ہے اور سارے عالم پہ جادو بھری آنکھوں سے
چھڑکتی ہے شبنم!

جیسا کہ مضمون کے ابتدائی حصّے میں عرض کیا گیا سردار جعفری کی نظمیہ شاعری ہماری نسل کی شاعری ہے، کہیں دعوت کا، کہیں کشش کا کہیں مصالحے کا، کہیں ہم کلامی کا اور کہیں کہیں سرگوشی کا بھی واسطہ رکھتی ہے۔ ہمارے نئے ہم عصر شعرا کے دوڈھائی دہائیوں کے شعری سفر میں بعض مقامات پر جعفری صاحب کے قدموں کی چاپ کہیں کہسار میں گونجتی ہوئی صدا کی طرح اور کہیں زیرِ سنگ رواں پانیوں کے ترنّم کی مانند سنائی دیتی ہے۔ ان کے موقفِ فکر اور نظریے سے اتفاق یا اختلاف کی بات دوسری ہے، مگر فنّی و شعری سطح پر، احساس

و آگہی کی رو سے ادبی وژن کے ضمن میں، نگاہ کی وسعتوں اور ذوقِ حسن کی لطافتوں کے باب میں ہم جعفری صاحب کی نظموں کے ساتھ بھی grow ہوئے ہیں۔ اُن کی پرانی نظموں سے نئی نظموں تک ہمیں باور ہوا ہے کہ یہ شاعری صرف اپنے عہد کے دائرے میں محدود ہو جانے والی نہیں، بلکہ اس حصار سے باہر نکل کر آئندہ زمانوں کی کھلی ہواؤں میں پرواز کرنے والی، آنے والی نسلوں کے شعر و ادب پر اپنے سایے دراز کرنے والی اور اپنی نگاہوں کا عکس اُردو، شعریات کی پیشانی پر چھوڑ جانے والی شاعری ہے۔ یہ شاعری روایتوں کی امین بھی ہے اور جدتوں کی نقیب بھی۔ ہم نئے معاصرین اُن کے ساتھ نہ صرف قدر و منزلت کا بلکہ شوق و رغبت کا بھی آہنگ رکھتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ وہ اور بہت عرصے تک ہمارے ساتھ تازہ ہم کلامیاں جاری رکھیں ۔

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے

حالات و خدمات مشائخ چشتیہ صابریہ
ڈاکٹر رضی احمد کمال

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہندستان میں تصوف سیاسی، سماجی اور تہذیبی بے عملی کا شکار رہا ہے۔ لیکن یہ خیال ایک طرفہ اور غیر معروضی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ کس طرح صوفیا نے دین کے ساتھ دنیا کے میدان میں بھی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ قیمت=/-25

مت سہل ہمیں جانو
انور ظہیر خاں

اردو کے سات ممتاز ادبی شخصیتوں پر لکھے ہوئے خاکوں کا مجموعہ۔ یہ شخصیتیں ہیں۔ ظ۔ انصاری، سردار جعفری، اختر الایمان، باقر مہدی، حسن نعیم، عزیز قیسی اور ندا فاضلی۔ ان شخصیتوں کو خاکہ نگار نے فوکس بدل بدل کر دور و نزدیک سے دیکھا ہے۔ 120/=

بھوپال ادب کے آئینے میں
ڈاکٹر محمد نعمان

بھوپال کی ادبی تاریخ اور تہذیبی سرگرمیوں کے مختلف مگر اہم پہلوؤں سے متعلق لکھے گئے دس اہم مضامین کا مجموعہ۔ قیمت=/55

اردو مرثیہ
ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی

(میر انیس کے بعد)

ڈاکٹر سید طاہر حسین نے اس کتاب میں مرثیہ کی تاریخ کو سماجی و ادبی پس منظر میں مرتب کیا ہے اور عہد حاضر تک مرثیہ نگاری کا تنقیدی جائزہ مفصل طور پر لیا ہے۔ قیمت=/250

حیات البشیر
مجیب اشرف

'حیات البشیر' اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ کے بانی' ہفتہ وار 'البشیر' کے اڈیٹر خان بہادر ڈاکٹر مولوی محمد بشیر الدین کی اٹاوہ تحریک' ان کی زندگی' قومی خدمات' شخصیت اور کردار پر نہ صرف پہلی تحقیقی کتاب ہے بلکہ ان کی جہد مسلسل کی ایک ناقابل فراموش داستان بھی ہے۔ قیمت۔/۱۵۰

متاعِ ہنر
محمود سروش

محمود سروش الفاظ مزاج داں تھے 'صداقت' جذبات اور خلوص اظہار ان کی ندرت کلام کے ضامن ہیں ان کی شاعری میں ایک لطیف جمالیاتی کیف ہے۔ قیمت=/120

شہر زاد کی موت

شہر زاد نے ایک ہزار ایک راتوں میں خیر سے ہزار سے اوپر کہانیاں سنائیں اور تین بیٹے جنے۔ کہنے والے کا بھلا سننے والے کا بھلا۔ کہنے والی شہر زاد جس کی ان کہانیوں کے صدقے میں جان بخشی ہوئی اور اس کے صدقے میں سلطنت کی ان انگنت کنواریوں کی جانیں بچ گئیں جنھیں باری باری ایک رات کی ملکہ بننا تھا اور صبح ہونے پر ان کا سر قلم ہونا تھا۔ سننے والوں میں دنیازاد اور بادشاہ شہریار جس کی ان کہانیوں نے کایا کلپ کر دی۔ عورت ذات کی طرف سے دل پر جو میل آگیا تھا وہ دھل گیا۔ سو وہ جو اس نے وتیرا پکڑا تھا کہ روز رات کو ایک دوشیزہ سے بیاہ رچایا اور صبح کو اس کا سر اڑوا دیا۔ اس سے اس نے توبہ کی۔

اس خوشی میں سلطنت میں جشن منایا گیا۔ شہر کی آرائش ہوئی۔ سدا برت لگ گئی۔ رعیت نہال ہو گئی۔ مگر شہر زاد کا یہ حال تھا کہ بھونچکی ہو کر ارد گرد دیکھتی تھی کہ شب و روز اچانک کیسے بدل گئے۔ ایک ہزار ایک راتوں والی خوف بھری فضا جب وہ موت کے سایے میں کہانی سنایا کرتی تھی، اس پر ایسی چھائی تھی کہ اس سے نکل ہی نہیں پا رہی تھی۔ اور جب اسے تھوڑا اعتبار آیا کہ وہ راتیں واقعی گزر گئیں تو اسے ایک حیرت نے آلیا۔ سوچتی تھی اور حیرت کرتی تھی کہ اچھا میں نے اتنا لمبا رتجگا کیا تھا اور اتنی کہانیاں سنائی تھیں۔ اتنی کہانیاں مجھے سوجھیں کہاں سے۔ غیب ہی سے آئی ہوں تو آئی ہوں۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ ایک رات دنیا زاد کو اپنے پاس بٹھایا اور بولی "اے میری بہن دنیازاد' اب میں سوچتی ہوں تو میری عقل چکرا جاتی ہے۔ ایک ہزار ایک راتیں میں نے کہانیاں کہہ کہہ کر کاٹ دیں۔ کچھ تو ہی مجھے سمجھا کہ یہ سب ہوا کیسے۔"

دنیازاد بولی "اے میری ہمشیرۂ ہزار داستان۔ میں تو خود دریائے حیرت میں غرق ہوں کہ میری بہن کے حافظے میں کہانیوں کا اتنا بڑا خزانہ دبا ہوا تھا۔ عزیز بہن' ویسے تو وہ راتیں خوف کی راتیں تھیں' دل کو دھڑکا لگا رہتا تھا کہ صبح ہو گئی تو کیا گل کھلائے گی، موت مستقل آس پاس منڈلاتی نظر آتی تھی۔ مگر یہ کالی ڈراؤنی راتیں' اے میری عزیز بہن' تیری کہی ہوئی

کہانیوں سے جگمگ جگمگ کر رہی ہیں۔ جب کہانی شروع ہو جاتی تھی تو پھر پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کتنی رات گئی اور کب ختم ہوئی۔ اور بادشاہ کا یہ حال کہ مبہوت بیٹھا رہتا تھا۔"

شہرزاد بولی "بہنوں، مجھے تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کہانی کہنی ہے اور زندہ رہنا ہے۔ پھر میں کہانیوں میں ایسی کھو گئی کہ زندہ رہنے کا خیال بھی پیچھے چلا گیا۔ لے دے کے ایک ہی لگن لگی رہتی تھی کہ جو کہانی شروع کی ہے اسے انجام تک پہنچانا ہے۔"

سو بی بی وہ انجام کو پہنچ گئی۔ اور کیا خوب انجام کو پہنچی کہ بادشاہ کی کایا ہی بدل گئی۔ کہاں عورت ذات سے اتنی نفرت کہ روز ایک نسوانی سر قلم ہوتا تھا۔ کہاں اب جو تمہارے پیر دھو دھو کے پیتا ہے۔" پھر دونوں نے مل کر ان راتوں کے خوف و اندیشہ کو اور دکھ کو یاد کیا اور خوب روئیں۔ پھر آنسو پونچھے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ مصیبت کی گھڑیاں کٹ گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہانیاں کہنے کی توفیق عطا کی اور ان کہانیوں کے طفیل جان بچی۔

دنیازاد کی باتیں سن کر، کچھ رو دھو کر شہرزاد کا جی ہلکا ہو گیا۔ اب جشن بھی تمام ہو چکا تھا۔ سلطنت کا کاروبار معمول کے مطابق چلنے لگا۔ ایک ہزار ایک راتیں بھی قصہ ماضی بن چکی تھیں۔ شہرزاد بادشاہ شہریار کی چہیتی ملکہ اور تین ہونہار شہزادوں کی ماں بن کر محل میں راج کرنے لگی۔ دنیازاد نے بہن کی چاہت میں شادی بیاہ کا خیال دل سے نکالا۔ بہن کا سایہ بن کر محل میں رہنے لگی۔

بیٹے بڑے ہوئے۔ دھوم سے ان کی شادیاں ہوئیں۔ چاند سی بہوئیں گھر میں آئیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں باری باری ان کی کوکھ ہری ہوئی۔ پھول سی بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ یہ بچیاں جب ذرا بڑی ہوئیں تو دنیازاد نے دیکھا کہ ان کا جی کھیل کود میں کم اور کہانیاں سننے میں زیادہ لگتا ہے۔ ان کا یہ شوق دیکھ کر ان سے کہا کہ بچیو' کہانیاں سننے کا تمھیں ایسا شوق ہے تو اپنی دادی سے سنو۔ کہانی سنانے میں ان کا دنیا کے پردے پر کوئی ثانی نہیں۔

یہ سن کر تینوں بچیاں شہرزاد کے گرد اکٹھی ہو گئیں اور لگیں ضد کرنے کہ ہم تو آپ سے کہانی سنیں گے۔

بچیوں کی ضد دیکھ کر شہرزاد بہت سٹپٹائی۔ وہ تو ملکہ بن کے بھول ہی گئی تھی کہ کبھی وہ کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ بچیوں کو ٹالنے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ کہاں ٹلنے والی تھیں۔ ادھر دنیازاد نے بہن کو ٹوکا "اے بہن، مجھے بولنے کا حق تو نہیں۔ دادی پوتیوں کے بیچ میں میں بولنے والی کون۔ مگر انصاف کی بات تو کہنی ہی پڑتی ہے۔ آخر یہ تمہاری پوتیاں ہیں۔ گھر میں دادی بیٹھی ہے جو کہانیاں سنانے میں طاق ہے۔ پوتیاں آخر دادی کے فیض سے کیوں محروم رہیں۔ اور گھر

چھوڑ کر کس دروازے کو کہانیوں کے لیے کھٹکھٹائیں۔"

شہرزاد بہن کی بات سن کر پسیجی۔ پوتیوں سے بولی "اے چندا' میں تمہارے قربان جاؤں۔ کہانی تمھیں نہیں سناؤں گی تو کسے سناؤں گی۔ مگر ابھی تو دن ہے۔ کہانی دن میں سنائی جائے تو مسافر رستہ بھول جاتا ہے۔ رات ہو جانے دو پھر میں تمھیں کہانی سناؤں گی۔"

کہانی سننے کی آس میں رات کا کس شدت سے انتظار کیا گیا۔ رات آئی اور تینوں پوتیاں شہرزاد کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ دنیازاد بھی قریب آن بیٹھی۔ کتنے زمانے بعد اسے ایک مرتبہ پھر شہرزاد سے کہانی سننے کا موقع مل رہا تھا۔

مگر عجب ہوا۔ شہرزاد نے بہت سوچا، بہت یاد کیا۔ اسے کوئی کہانی یاد ہی نہیں آئی پریشان ہو کر دنیازاد سے بولی "اے دنیازاد' میرے تو حافظہ پر پتھر پڑ گئے۔ کیا سناؤں۔ مجھے تو کوئی کہانی یاد ہی نہیں آ رہی۔"

"لو بھلا یہ کیا بات ہوئی" دنیازاد بولی "تم نے اپنے سرتاج کو اتنی کہانیاں سنائی تھیں' انھیں میں سے کوئی کہانی ان بچیوں کو سنا دو۔"

"مگر کونسی سناؤں۔ مجھے تو کوئی کہانی یاد نہیں آ رہی۔"

"اے بہن' وہ جو تم نے پہلی رات کو سنائی تھیں۔ سوداگر اور دیو کی کہانی' وہی سنا دو۔"

"سوداگر اور دیو کی کہانی۔" شہرزاد بڑبڑائی اور یاد کرنے لگی کہ وہ کیا کہانی تھی۔ کچھ یاد نہ آیا تو پریشان ہو کر بولی۔ "اے دنیازاد' سوداگر اور دیو کی کہانی میں کیا ہوا تھا۔ مجھے تو کچھ یاد نہیں آ رہا۔"

"اے لو اپنی کہی ہوئی کہانی بھول گئیں۔ اس میں یہی تو ہے کہ سوداگر نے چھوارا کھا کر گٹھلی پھینکی۔ گٹھلی کا پھینکنا تھا کہ دھواں اٹھا' دھوئیں میں سے ایک دیو برآمد ہوا۔ گرجنے لگا کہ تیرے چھوارے کی گٹھلی میرے بیٹے کے سینے میں جا کر لگی۔ وہ مر گیا۔ اب میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ مرنے کے لیے تیار ہو جا۔"

شہرزاد نے غور سے سنا۔ پھر یاد کرنے کی کوشش کی کہ آگے کیا ہوا تھا۔ جب کچھ یاد نہ آیا تو دنیازاد سے بولی کہ "میری بہنوں دنیازاد، مجھے تو اب کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ مگر لگتا ہے کہ تجھے یہ کہانی پوری یاد ہے۔ پھر تو ہی کیوں نہیں سنا دیتی۔"

دنیازاد نے سوچا اور بولی کہ "بلبل ہزار داستان تو تم ہو۔ بیان میں تم جو جادو جگاتی تھیں وہ تو میں نہیں جگا سکتی۔ جیسی تم سے سنی اسے اپنے ٹوٹے پھوٹے انداز میں سنائے دیتی ہوں۔ مگر اس شرط پر کہ کل اس سے آگے کی کہانی تم سناؤ گی۔"

شہر زاد نے یہ شرط مان لی۔ اور دنیازاد نے بچوں کو خوب مزے لے لے کر سوداگر اور دیو کی کہانی سنائی۔ کہانی سن کر تینوں بچی تینوں کھل اٹھیں۔ دنیازاد نے کہا "بچو، میری زبان میں شہر زاد والا جادو کہاں۔ جب تم کل رات اپنی دادی سے کہانی سنو گی تب دیکھنا تمہیں کتنا لطف آئے گا۔"

دنیازاد سے کہانی سن کر شہر زاد کے حافظہ میں ہلچل مچ گئی۔ ساری کہی ہوئی کہانیاں اس کے دل و دماغ میں منڈلانے لگیں لیکن ٹکڑوں، نوالوں کی صورت میں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اس نے اطمینان کی ایک کیفیت کے ساتھ سوچا، میرا حافظہ جاگ اٹھا ہے۔ کل جب کہانی کہنے بیٹھوں گی تو انشاء اللہ سب کچھ یاد آجائے گا۔ سو دوسری رات وہ بہت اعتماد کے ساتھ اپنی پوتیوں کو لے کر بیٹھی۔ دنیازاد بھی اس کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ شہر زاد کو بس اتنا یاد آیا کہ اگلی کہانی جو اس نے سنائی تھی وہ ماہی گیر اور دیو کی کہانی تھی۔ اس سے آگے اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ دنیازاد نے لقمہ دیا کہ "اے بہن ہوا یوں تھا کہ ماہی گیر دل نے دریا میں جال ڈالا۔ جال بھاری ہوا تو اس نے سمجھا کہ کوئی موٹی مچھلی پکڑی گئی۔ مگر جب جال کھینچا تو اس میں تو پیتل کی ایک سر بمہر لٹیا پھنسی ہوئی تھی۔ مہر حضرت سلیمانؑ کی تھی۔ مہر کو توڑ کر لٹیا کا منہ کھولا تو اس میں سے ایسا کالا دھواں نکلا کہ اندھیرا چھا گیا۔ اور اس دھوئیں کے بیچ سے ایک لحیم شحیم دیو دڑو نکلتا ہوا نکلا۔"

شہر زاد حیرت سے بولی "دنیازاد لگتا ہے کہ کہانی بھی تجھے پوری یاد ہے۔ پھر تو سنا دے۔ مجھے تو کہانی کی کوئی بات یاد نہیں آرہی ہے۔"

دنیازاد تو اب ماشاءاللہ چل نکلی تھی۔ اس نے ماہی گیر اور دیو کی کہانی شہر زاد والی شان سے شروع کی اور صبح ہوتے ہوتے پوری کہانی سنادی۔ اور شہر زاد نے کہانی ایسے سنی جیسے وہ بہی دنیا زاد کی کہی ہوئی کہانی۔ وہ تو بس سننے والیوں میں ہے۔ تینوں کا جی بھی کہانی سن کر باغ باغ ہو گیا۔

اگلی رات شہر زاد کو یقین تھا کہ اسے اگلی کہانی یاد آئے گی۔ جب وہ کہانی یاد نہ آئی تو اس نے دوسری کہانیوں کی طرف ذہن دوڑایا۔ الہ دین کے چراغ والی کہانی اسے جہاں سے تہاں یاد آئی مگر کڑی سے کڑی نہیں مل رہی تھی۔ پھر دنیازاد ہی کو وہ کہانی سنانی پڑی۔

بس پھر تو شہر زاد کو مساوات پڑ گئی۔ وہ کہانی یاد کرنے کی کوشش کرتی۔ اسے تو کہانی یاد نہ آتی۔ مگر اس کی فرمائش پھر دنیازاد کہانی سنانا شروع کر دیتی۔ بس اسی طرح دنیازاد نے ساری الف لیلہ سنا ڈالی۔

شہر زاد نے ڈوب کر یہ کہانیاں سنیں۔ یہ سب کہانیاں میں نے سنائی تھیں! اسے حیرت

ئی۔ پھر رفتہ رفتہ حیرت کی جگہ اداسی نے لے لی۔ اسے ایک ایک کر کے وہ ساری راتیں یاد ئیں' ایک ہزار ایک راتیں جب اس نے یہ کہانیاں سنائی تھیں۔ ہر رات یوں لگتا کہ اس کی ندگی کی آخری رات ہے۔ مگر اب ان میں سے ہر رات یوں دکھائی دے رہی تھی کہ وہی اس ، زندگی کا حاصل تھیں۔ وہ راتیں ایک سحر بن کر اس پر چھائی چلی گئیں۔ اصل میں تو میں نے نہیں راتوں میں زندگی کو پایا تھا۔ اس نے اداس ہو کر سوچا۔ اور ایک دفعہ پھر وہ سوئی ہوئی اتیں جاگ اٹھیں اور اس کے ارد گرد منڈلانے لگیں۔ رات جتنی بھیگتی چلی جاتی کہانی کا جادو ہا گتا جاتا۔ وہ اس جادو میں گم ہوتی چلی جاتی۔ پھر وہ اپنے کرداروں کے ساتھ اجنبی جزیروں، مندروں، صحراؤں میں بھٹکتی پھرتی۔ اتنی دور نکل جاتی کہ موت اور زندگی کے سارے ندیشے اور وسوسے کہیں بہت پیچھے رہ جاتے۔ پھر جب پو پھٹتی اور مرغ سحر کی بانگ سنائی دیتی تو و کس اعتماد سے کہانی کو اگلی رات پر موقوف کرتی کہ موت سہم کر پیچھے ہٹ جاتی۔

شہرزاد کتنی دیر تک ان کہانیوں سے لبریز راتوں کے سحر میں کھوئی رہی۔ اس سحر سے نکلی تو اب کی راتوں کا خیال آیا۔ اور اب، اس نے سوچا اب میری راتیں ویران ہیں۔ صرف فالی ہیں اور لمبی ہیں۔ ان کا جادو رخصت ہو چکا ہے۔ میری راتیں جو بانجھ ہو چکی ہیں، اس نے لمبا ٹھنڈا سانس بھرا اور گہری اداسی میں ڈوب گئی۔

جب بادشاہ محل میں آیا تو دیکھا کہ شہرزاد خلاف معمول چپ چپ ہے۔ صورت سے اداسی ٹپکتی ہے۔ خیر اس دن تو وہ چپ رہا۔ مگر جب دیکھا کہ شہرزاد کی طبیعت بحال ہونے ہی میں نہیں آ رہی اور اداسی گہری ہوتی چلی جا رہی ہے تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ آخر رہا نہ گیا اور ایک روز پوچھ ہی لیا کہ "اے شہرزاد' میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ نہ وہ پہلی سی شوخی نہ طراری۔ نہ ہنسنا نہ بولنا۔ طبیعت افسردہ۔ چہرے کی رنگت پھیکی پھیکی۔ یہ کیسا حال ہے۔ کون سا غم ہے کہ تجھے گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے؟"

اس پر شہرزاد نے ضبط کا دامن چھوڑا۔ روئی اور بولی "اے مرے سرتاج تو کس شہرزاد کا حال پوچھتا ہے۔ جو شہرزاد چہکتی بولتی کہانیاں سناتی تیرے محل میں آئی تھی وہ تو کب کی مر چکی۔"

بادشاہ یہ سن کر سٹپٹایا۔ پریشان ہو کر بولا "یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ اگر طبیعت پہ کوئی ملال ہے تو اس کی وجہ تو معلوم ہونی چاہیے۔"

"اے بادشاہ' اے مرے سرتاج" شہرزاد غم زدہ آواز میں بولی "تو نے میری جان بخش دی۔ مگر مجھ سے میری کہانیاں چھین لیں۔ مگر میں تو انھیں کہانیوں میں زندہ تھی۔ وہ کہانیاں ختم ہوئیں تو سمجھو کہ میری کہانی بھی ختم ہو گئی۔"

رئیس انور
پرانی منصفی لین
در بھنگہ۔ 846004

سالکؔ لکھنوی۔ ایک منفرد ترقی پسند شاعر

عام طور پر فیض، سردار، جذبی، مخدوم، کیفی، ساحر وغیرہ ہی اہم ترقی پسند شاعر قرار دیے جاتے ہیں لیکن ان کے علاوہ ایسے ان گنت شاعر ہیں جنھوں نے ترقی پسندانہ خیالات کی قابل رشک ترجمانی کی ہے۔ اس ضمن میں کلکتہ کے کئی شاعروں کے نام بلا تامل لیے جاسکتے ہیں۔ پرویز شاہدی، سالک لکھنوی، اشک امرتسری اور ابراہیم ہوش کے ہاں عصری آگہی، سماجی شعور، سیاسی سوجھ بوجھ اور فنی برتاؤ کا وہی رخ سامنے آیا ہے جو مذکورہ معروف شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے لیکن بیسویں صدی کے ادبی رجحان کے مطابق انھیں تنقید و تجزیہ اور مرتبہ سازی کا متاوزی سہارا نہیں ملا، جس کی وجہ سے عصری ادبی تاریخ ان شاعروں کے ذکر سے خالی ہے۔ پرویز شاہدی جیسے فنکار بھی بین السطور سے اوپر نہ اٹھ سکے۔ جس کا لامحالہ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند شعری منظرنامہ محدود ہو گیا اور تنقیدی ادب کے ذریعہ ترقی پسند تحریک کے ہندستان گیر پھیلاؤ کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہ رہا۔

کلکتہ میں مقیم بزرگ شاعر اور ادیب سالک لکھنوی کی ادبی خدمات سے اردو دنیا اچھی طرح واقف ہے، اگر کمی ہے تو تحریری اعتراف کی۔ اس معاملے میں ناقدوں اور دوسرے قلمکاروں نے بخل سے کام لیا ہے۔ حالانکہ سالک لکھنوی کی تخلیقی و تحریری سرگرمیاں کم و بیش پچاس برسوں پر محیط ہیں۔ انھوں نے تاثراتی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے، دامن نثر میں طنز و مزاح کے گل بوٹے بھی ٹانکے، اپنی شعر فہمی کا تحریری مظاہرہ بھی کیا، ادارت کے فرائض بھی انجام دیے لیکن طبعاً انھیں شعر و سخن سے خاص لگاؤ ہے۔ نظر اور عمل میں انھوں نے اپنے جذبات و احساسات، فکر و شعور اور نظریۂ حیات کی لگاتار آئینہ داری کی ہے جو نہایت دل نشیں منضبط اور منظم ہے۔

سالک لکھنوی اپنے طویل شعری سفر میں ترتیب و تہذیب اور رد و قبول کے مختلف مراحل سے گذرے ہیں۔ ترقی پسندانہ موضوع و اسلوب کو اپنانے میں تو اردو کی شاندار کلاسیکی روایت سے بیزار نہیں ہوتے بلکہ اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اپنے وسیع مطالعے کا نور بکھیرتے ہیں۔ فکر و خیال ہو یا الفاظ و اصطلاحات کا استعمال، ترکیبوں اور اشعار کا انتخاب ہو یا صنعتوں اور رعایتوں کا لحاظ، حزن و نشاط کی ملی جلی کیفیت ہو، لب و لہجہ ہو یا آہنگ، ہر جگہ کلاسیکیت کی مانوس و شیریں لہریں موجود ہیں:۔

گراں نہیں ہے یہ سودا کہ دوستی میں تری — خریدلی ہے اک عالم کی دشمنی میں نے

ندامت لالہ و گل کو، پریشاں بوئے پیراہن — ہمیں معلوم ہے اس گلستاں سے کون گزرا ہے

خیال گل، جمال گل، ہجوم آرزوئے گل — ہیں کتنی بجلیاں بیتاب میرے آشیانے میں

وہی دل ہے مگر اب دل کو پاسِ رنگ محفل ہے
مہذب ہے جنوں اس کا خرد مندوں میں شامل ہے
کسی گرد اب میں رقصاں ہو یا طوفاں سے ٹکرائے
یہ کشتی کیوں وہاں ڈوبے جہاں مغرور ساحل ہے

عشق ایک مقدس جذبہ ہے۔ یہ تکمیل شخصیت کا وسیلہ بھی ہے اور خود شناسی و خدا شناسی کا ذریعہ بھی۔ کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ غالب کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا لیکن سالک نے کسی تاویل کے بغیر اس مقدس جذبے کی ترجمانی کی ہے اور بڑی سادگی کے ساتھ اقرار کیا ہے کہ وہ کانٹوں بھری اس راہ سے گزرے ہیں اور اپنا دل لہو لہان کیا ہے جس کے حسین نقش و نگار ابتدا سے لے کر حال تک کے کلام میں موجود ہیں:۔

کہنا تو بہت چاہا تھا کچھ کہہ نہ سکا — جذبات کی یلغار میں گم ہوگئے الفاظ

میں کیسے بھول سکتا ہوں عنایت ان کے تیروں کی
ابھی تک دامنِ دل کی پڑی ہیں دھجیاں رنگیں
پشیماں کرگئی آخر دریدہ دامنی میری
کسی کی زیرِ دنداں ہوگئی تھیں انگلیاں رنگیں

رہ رہ کے آہی جاتی ہے سالک کسی کی یاد — دل وعدۂ وفا سے پشیماں ہے ان دنوں

وہی یہ دل ہے وہی لطف درد پیہم ہے　　کرم ترا کہ ابھی تک عنایت غم ہے

درد کی آہٹوں کو ہر ساعت　　دل کے دروازے نیم باز ملے

سالک کے عشقیہ جذبات میں خارجیت اور ہوا و ہوس کا دور دور تک پتا نہیں ملتا بلکہ نظم و ضبط، تہذیب و شائستگی اور سلوک و سلیقہ کا پر وقار حسن نظر آتا ہے جو اُن کی شخصیت کا پر تو ہے۔ وہ اس معاملے میں میر کے پیرو ہیں اور اپنے سلیقے سے محبت میں نباہنا جانتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے لہجے پر بھی ایک نوع کی دل گرفتگی، افسردگی اور حزن کی تہہ چڑھی ہوئی ہے:۔

دھوئیں کو کیا سمیٹنا، دھواں اٹھا تو کیا ہوا
میں اک چراغ تھا جسے خود آپ نے بجھا دیا

زخم پر کیوں نمک چھڑکتے ہو　　اب تو باقی نہیں ہے کوئی آہ

رہِ تاریک میں سالک وہ جب بھی یاد آتے ہیں
تو جیسے روشنی سی ہو گئی ہے حدِ منزل تک

شاد عظیم آبادی نے حیات و کائنات کے تعلق سے اپنے مشاہدے کا نچوڑ کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے ۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی　　نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

سالک بھی ذات کے حوالے سے کائنات کا محاسبہ کرتے ہیں ۔

یونہیں مٹیں گے اور بنیں گے زندگی کے نقش پا
یہ سلسلہ دراز ہے نہ ابتدا نہ انتہا

یوں تو سالک لکھنوی کی تخلیقی شخصیت سے پھوٹنے والے رنگ و نور میں بڑا تنوع ہے پھر بھی کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسندانہ رنگ کچھ زیادہ گہرا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ ان کی ترقی پسندی نری اشتراکیت نہیں ہے اور نہ نظریۂ اشتراکیت کا پرچار ہے۔ وہ ترقی پسندی کا ایک وسیع تصور پیش کرتے ہیں، جس میں زندگی کی تعمیر نو، سماجی انصاف، باہمی میل جول اور قومی اخوت کے علاوہ آزادیٔ خیال اور تحفظ وجود بھی شامل ہے:۔

بیدار ہوئی محنت، سرمایے کی نیند اجڑی　　پھر تیشہ زنی جاگی، لرزاں ہوئی پرویزی

ابھی سے جیب و دامن پر بھلا مشقِ جنوں کیسی
ابھی تو سر سلامت ہے، ابھی دیوارِ زنداں ہے

شاید گزر گیا ہے کوئی کاروانِ شوق   ہر نقشِ پا ہے ایک گلستاں لیے ہوئے

ایک دور میں اکثر ترقی پسندوں کے ہاں جدوجہد میں اتنی شدت آگئی تھی اور آویزش کی ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ مبادیاتِ شعر پر ضرب آنے لگی تھی مگر سالک نے رواداری اور ضبط سے کام لیتے ہوئے اعتدال پسندانہ رویہ اختیار کیا۔ وہ بورژوائی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے جھیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجتاً کھری اور کھردری سچائیوں میں بھی گھلاوٹ آگئی ہے اور کلاسیکی اسلوب اختیار کرنے کی بنا پر شعری حسن مزید نکھر گیا ہے:۔

یونہی چلتے رہو یارو، مبارک آبلہ پائی   انھیں قدموں سے ہو جائے گی اک دن رہ گزر پیدا

تصور کی نگاہوں میں درخشاں ہے کوئی منزل
اگر راہوں میں تاریکی ہے تو روشن ہے میرا دل

کسے معلوم ہے کہ ناتوانانِ قفس اک دن
زہے ظلم و ستم کرلیں گے اک دن بال و پر پیدا

کہیں کہیں انھوں نے کج کلاہی اور بانکپن کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ ایسے موقعوں پر ان کا لہجہ بڑا تیکھا اور البیلا ہو گیا ہے۔

سمجھ لے، سوچ لے اور خود کو آزما کے چلے   جو میرے ساتھ چلے اپنا گھر لٹا کے چلے
نہیں غرور کہ اونچا ہے اپنا سر، لیکن   جو کھیلے دار سے وہ کیسے سر جھکا کے چلے

غزل کی صنف میں بڑے امکانات ہیں۔ سالک لکھنوی نے غزل کے اشاراتی اور ایمائی نظام سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ساتھ ہی اس صنف کی نزاکت اور نفاست کا خیال رکھا ہے۔ نظموں میں ان کے نظریات کچھ زیادہ کھل کر سامنے آئے ہیں۔ نظم "سورج کی تھالی" میں منظری ارتقا کے علاوہ فکری سلسلہ اور ہیئتی ارتباط موجود ہے۔ دلکش اشاروں کے تانے بانے سے نظم کا فنی حسن جاگ اٹھتا ہے:۔

اس رات کی محفل میں مجھ کو کل دن کے سندیسے ملتے ہیں
کچھ جھنکاریں سی ہوتی میں یوں تار جو دل کے ملتے ہیں

یہ رات گزر ہی جائے گی یہ رات گزرنے والی ہے
وہ دیکھو گگن کے ہاتھوں میں سورج کی چمکتی تھالی ہے
سورج کی چمکتی تھالی نے کچھ ایسا رنگ بکھیرا ہے
ذروں کے دلوں میں گرمی ہے پھولوں کے لبوں پر لالی ہے
جب باغ پہ لیکن رنگ آیا جب پھول بسنتی کھلنے لگے
جب پت جھڑ کے دن بیت گئے جب شاخوں کو پھل ملنے لگے
وہ مالی بن کر آ بیٹھے جو باغ کا سودا کرتے تھے
پھولوں کا خون بہاتے تھے کلیوں کو مسلا کرتے تھے

سپنے ٹوٹے، تعبیریں گم، امیدیں بے راس گئیں
سورج کی تھالی سب کو ملی ہے کرنیں کس کے پاس گئیں

"بنیاد کی اینٹیں" ایک ایسی نظم ہے، جس میں شاعر نے خالص ترقی پسندانہ رجائی انداز اپنایا ہے۔ وہ زندگی کی کربناکیوں کو جھیلنے کی ترغیب دیتا ہے اور مستقبل کی تابناکی کی پیش گوئی کرتا ہے۔

دن آج بھی جیسے کٹ جاتے ہیں، کل بھی دن کٹ جائیں گے
یہ ظلمت کے جو بادل ہیں، اک جھونکے میں چھٹ جائیں گے
جو راہ میں حائل ہیں اب تک وہ سارے گڑھے پٹ جائیں گے
جو نیچے ہیں وہ ابھریں گے، جو رستم ہیں، ہٹ جائیں گے
جب اپنی محنت کے حاصل خود محنت میں بٹ جائیں گے

"سناٹا" اچھی نظم ہے۔ انقلاب اور تغیر کی جہد مسلسل کے بعد ایک مقام ایسا بھی آیا جب حالات بڑی تیز رفتاری کے ساتھ بدل گئے۔ سیاسی کروٹ سے نہ صرف ترقی پسند تحریک میں بکھراؤ آیا بلکہ اس کے رہنما انگشت بدنداں رہ گئے۔ ان کی آواز پر کان دھرنے والے کم ہوتے گئے اور ایک طرح کی مسموم خاموشی چھانے لگی۔ پرویز شاہدی نے اس صورت حال کی کیا خوب ترجمانی کی تھی۔

خاموشی بحران صدا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ — سناٹا تک چیخ رہا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
دل والوں کی خاموشی ہی بار سماعت ہوتی ہے — بے آوازی کرب فضا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

سالک لکھنوی اس مقام پر پہلے قدرے مایوس ہو جاتے ہیں۔

نہ اب یقین، نہ کوئی گماں، نہ کوئی جنوں
نہ آرزو کہ کسی رخ کی جستجو کرلوں
نہ اضطراب کوئی ہے نہ خواب ہے نہ سکوں

ہے تخ رسیدہ دل داغدار کیا کیجے
چراغ گل ہے دھوئیں کا شمار کیا کیجے

پھر دل گرفتگی کا شدید رد عمل سامنے آتا ہے اور شاعر کی ترقی پسندی حاوی ہونے لگتی ہے۔

ملا جو اب کوئی پتھر اسے اٹھالوں گا
اور اس سے توڑوں گا شیشہ میں اس زمانے کا

بلا سے شیشہ ہستی بکھر کے رہ جائے
کسی کرچ میں تو صورت کوئی نظر آئے
کہیں تو میرا جنوں کوئی ہم سفر پائے
کوئی تو ہو جو مری راہ سے گزر جائے

ایک خاص نظریے کے ساتھ تقریباً پچاس سال گزرانے، طرح طرح کے آزمائشی مرحلوں سے گزرنے اور قید و بند کی صعوبت اٹھانے کے باوجود سالک لکھنوی مایوس نہیں ہوتے۔ ہر چند انھیں اپنی ناتوانی اور سفر گزیدگی کا احساس ہے لیکن وہ اپنی آتش بکفوں کو نئی نسل تک پہنچانا ایک فریضہ سمجھتے ہیں:۔

کسی کے رکنے سے کار جہاں نہیں رکتا
کوئی رکے تو رکے، کارواں نہیں رکتا

وہ وقت آئے گا جب دور جور سے اک دن
کوئی تو اپنا خراج شباب مانگے گا
کروڑوں ہونٹوں پہ ابھریں گے زندگی کے سوال
کوئی تو ہوگا جو ان کا جواب مانگے گا

ہجوم ظلم سے سہمی ہوئی فضاؤں میں
کوئی تو ہوگا جو اک انقلاب مانگے گا

تھکی نگاہوں کو اب رخصت سکوں مل جائے
جواں دلوں کو مری آتش جنوں مل جائے
(خدا کرے کہ انھیں جذب اندروں مل جائے)
سفر گزیدہ مسافر کو نیند آئی ہے!

(نظم: "لوحِ تربت" ۱۹۸۴)

ترقی پسند تحریک کے پہلے دہے میں اردو شاعری کا مزاج بدلنے کی ایسی منصوبہ بند کوشش ہوئی کہ نئی شاعری چند مخصوص موضوعات کا غلغلہ اور گنے چنے الفاظ کا گورکھ دھندا ہو گئی۔ راگ الاپنے کا ڈھنگ بھی یکساں ہو گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ تحریک سے وابستہ ناقدوں نے بے سود اشاعری کا ایسا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کیا کہ کئی شاعر گمراہ ہوئے اور ان کا ذہن اشتراکی نظریے کا محدود دفتر بن کر رہ گیا۔ سینکڑوں سال تک بھانت بھانت کے تجربات و محسوسات کی جمالیاتی عکاسی کرنے کے باوجود غزل بورژوا کلاس کی ترجمان ٹھہری۔ اس کی عظمت سے انکار اور امکانات سے چشم پوشی کی بنا پر جو مسموم فضا بنی، اس میں سالک لکھنوی نے بڑی احتیاط اور ہوش گوش کا ثبوت دیا۔ انھوں نے نہ ایسے انتہا پسندانہ نظریۂ شاعری سے اتفاق کیا، نہ صنف غزل سے رشتہ ناتا توڑا اور نہ ہم مسلکوں کی طرح اپنے قلم پر پہرے بٹھائے۔ وہ جماعتی آمریت اور نظریاتی کٹر پنتی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ انھیں انسان کے بنیادی حقوق سے پوری آگاہی ہے۔ اس لیے انھوں نے بلا خوف و خطر مصلحت کی ریکھاؤں کو بار بار پار کیا ہے اور رہنماؤں کی بالادستی اور من مانی کی پکڑ کی ہے اور اپنے اندیشہ ہائے دور دراز کا دلنشیں غزلیہ طرز میں اظہار کیا ہے:۔

بھٹک گئے رہبران منزل، بکھر گئے کارواں کے ساتھی
دلوں کی قندیلیں بجھ گئی ہیں، وہ روشنی اب نہیں رہی ہے

چلے چلو کہ کسی راہزن کا خوف نہیں   کہ راہ اہل جنوں ہے ہمیشہ بے رہبر

بس اتنی سی بات پر ہیں برہم، سفر کے آداب کے مرتب
پہنچ گئے ہیں سواد منزل پہ ہم سفر رہنما سے پہلے

اب احتیاج رہبر منزل نہیں مجھے ۔۔۔ پھر وہ قدم جو اٹھ گیا منزل نشاں ہے آج

کھا کھا کے فریب راہ براں اور اپنی راہوں سے نالاں
ہر موڑ پہ ایسے لوگ ملے جو تنہا تنہا ساتھ چلے

بتائیں کیا کہ لٹا کیسے قافلہ اپنا ۔۔۔ بس اتنی بات کہ ہم ساتھ رہنما کے چلے

مافی الضمیر کی آزادانہ ترجمانی ایسی جرأت رندانہ ہے جس میں ان کے ہم نوا بہت کم ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ خود کو بالکل اکیلا محسوس کرتے ہیں۔ انھیں اپنی آواز کی تنہائی کا گہرا احساس بے چین بھی کرتا ہے:۔

ڈرتا رہتا ہوں ہم نشینوں میں ۔۔۔ ایک پتھر ہوں آبگینوں میں
کیوں نہ یہ بات ایک بار کریں ۔۔۔ دشمنوں کا بھی اعتبار کریں
ہم سفر جو تھے آج کہتے ہیں ۔۔۔ یہ ہماری ہے، وہ تمھاری راہ

ترقی پسندوں کے نزدیک ذاتی و انفرادی احساس، خوف، تھکن یا مایوسی کا اظہار بڑا معیوب بھی تھا اور رجعت پسندی کا مترادف بھی۔ ایک عرصے تک اظہار و بیان پر رجائیت کی مصنوعی نقاب ڈالنا از بس کہ ضروری تھا۔ حالاں کہ اختلاف و اتفاق، بیم و رجا اور حزن و نشاط انسانی سرشت میں داخل ہیں، ان سے نجات ممکن نہیں۔ سالک لکھنوی نے اس نہج پر بھی اپنی انفرادی پہچان بنائی ہے اور غزل کی اشاریت و ایمائیت سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے شعری منظر نامے پر منفرد نقش ابھارے ہیں:۔

تیرے در و بام کی اور حقیقت ہے کیا ۔۔۔ میری جبیں کا نیاز، میری نظر کی تھکن
نہ زلف یار کی خوشبو نہ عارضوں کی سحر ۔۔۔ تھکا تھکا سا تصور، بجھی بجھی سی نظر
دیکھو نہ حقارت سے مرے دل کی تھکن کو ۔۔۔ اس دل سے زمانے نے بڑا کام لیا ہے
تھک گئی راہ زندگی سالک ۔۔۔ شاید اب آگئی مری منزل

سالک لکھنوی کے طویل شعری سفر میں کئی اہم فکری موڑ آئے ہیں جہاں ان کا انفرادی لہجہ ابھرتا نظر آتا ہے۔ عشق کا مثبت و منفی رنگ ہو یا انقلاب آفریں ولولہ یا تحفظ ذات کا مسئلہ، ہر جگہ ان کا تخلیقی ذہن عصری رجحان کی نری تقلید سے گریز کرتا ہے اور منفرد رنگ اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فنی سطح پر بھی انھوں نے اپنی سلیقہ مندی کا حتی المقدور ثبوت دیا ہے۔ اس لیے اہم ترقی پسند شاعروں کے درمیان ان کی شناخت ایک وسیع النظر، باوقار اور منفرد شاعر کی حیثیت سے کی جاسکتی ہے

قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی
صدر شعبہ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ

سجاد سید۔ کوچۂ میر میں

سب ہٹادو مرے سرہانے سے
میر کی اک کتاب رہنے دو

میرؔ کی روایت سخنوری سے وابستگی اور تقلید کا رجحان عرصۂ دراز سے چلا آرہا ہے۔ میر سے سجاد سید کی وابستگی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے بلکہ مجھے تو سجاد سید کی شعری کائنات میں ایسے مقامات اور ارتعاشات بھی نظر آتے ہیں جن کے سبب اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے نئے دور میں اپنے مخصوص انداز میں میر اکی بازیافت کرنے کی کوشش کی ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ تاہم اگر اس اعتراف میں کچھ تامّل بھی ہو تو یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ سجد سید کی شاعری اپنے مخصوص حزنیہ آہنگ اور ذہنی و جذباتی جھکاؤ کے سبب سودا کے بجائے میر کے لہجے سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ اسی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں زندگی کی موجود اور معلوم صداقتوں کے تئیں شاعر کے ادراک میں غیر معمولی معروضیت ہے، وہ حاضر و موجود کے بارے میں کسی غیر ضروری واہمے یا التباس کا شکار ہونے کے بجائے اور اپنے گرد کوئی مصنوعی نشاطیہ حصار کھینچنے کے بجائے خارجی مناظر کے باطن میں داخل ہوکر ان کی عقدہ کشائی کا حوصلہ رکھتا ہے۔ چنانچہ سجاد سید جب یہ کہتے ہیں کہ ؎

وہ جو رہتے ہیں ہر اک بزم کی رونق بن کر
یوں بھی دیکھا ہے تو تنہائی میں رونا چاہیں

تو میرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ عہدِ حاضر نے انسانی زندگی کو کس طرح دولخت کردیا ہے اس کا اندازہ ہجوم میں گھرے ہوئے اور تنہا انسان کی زندگی اور اس کی زبوں حالی کے لگایا جاسکتا ہے اس عہد میں تنہائی ہی شاید حساس انسان کا مقدر بن گئی ہے جہاں آنسوؤں کے سوا اُس کا کوئی

دوسرا رفیق نہیں ہے۔

اس نوع کے مضامین کی بازگشت سجاد سید کے تخلیقی سفر میں ہمیں بار بار اپنی طرف متوجہ کرتی ہے چنانچہ جب وہ کہتے ہیں ۔

سایہ بھی روشنی کا وفادار ہے میاں
تاریکیوں میں خود کو اکیلا ہی پاؤ گے

تو ایک بار پھر نئے عہد میں اُن کا تخلیقی رشتہ میر سے استوار ہو جاتا ہے۔ سایہ روشنی تاریکی اور تنہائی کے تار و پود سے تعمیر کی گئی اس تخلیقی کائنات کی پوری فضا کس قدر افسردہ اور سوگوار ہے اس کا کچھ تعلق ان صحت مند اور ایجابی قدروں کی شکست اور پامالی سے بھی ہے جن کو دیکھنے کے لیے آج آنکھیں ترستی ہیں اور ہم صرف ان کے ماتم گسار ہو کر رہ گئے ہیں۔

اسی تنہائی اور کرب کی داستان اِس شعر میں بھی شاعر نے دہرائی ہے ۔

تنہائی کا قصہ لکھنا
لمحہ لمحہ دُکھتا لکھنا

اس عہد کی ایک پہچان اجنبیت یا Alienation بھی ہے، شاعر یہاں بھی تنہائی کی چِتا میں جلتی ہوئی فرد کی زندگی کے ذریعہ نئے عہد کے مزاج اور سرشت کا تعارف کرانا چاہتا ہے۔

مذکورہ مضمون مزید آگے بڑھتا ہے۔ شاعر ایک نئے پیرایے میں زندگی کے خروش پر استفسار کرتا ہے ۔

کبھی سوچوں کہ ہے یہ زندگی کیا
کبھی پوچھوں کہ ہے یہ زندگی کیوں

میر کے لہجے کی بازیافت کے ماسوا شاعر نے یہاں خود انسانی وجود کی ماہیت اور قدر و قیمت سے متعلق جو سوالات اٹھائے ہیں وہ عام حالات میں ذہن کے دریچے پر دستک نہیں دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان آج اپنے وجود کی تمام تر معنویت کھو چکا ہے۔ وہ مادّی زندگی کے سیل بلاخیز میں ایک حقیر تنکے کی مانند بہتا ہوا نیستی کے سفر پر روانہ ہے۔

سجاد سید کے تخیل و تصور کی سرزمین بیشتر آباد خرابوں کا مسکن ہے۔ ایک اور منظر ملاحظہ کریں ۔

تصور کا موسم بھی ویران ہے
نہیں شاخِ دل پر بھی غنچہ نیا

یہاں تصور کے موسم کی ویرانی سے شاعر کے تفکّر کی ندرت اور عمیق بصیرت کا سراغ ملتا ہے۔ یہ انکشافِ حقیقت اس شاعرانہ نظر کا فیضان ہے جو زندگی کے مانوس جلووں کی چکاچوند سے خیرا ہو جانے کے بجائے اس کی معنویت کو آشکارا کرتی ہے۔ نئے عہد میں میر کے لہجے کی

بازیافت مختلف شعری اسالیب اور پیرایے میں کی گئی ہے چنانچہ اس کی ایک صورت یادِ ماضی Nostalgia بھی ہے، اس عہد نے انسان کو مکان تو دیا ہے، گھر نہیں دیا ہے۔ گھر کا تصور اپنی معنوی وسعت اور تہہ داری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو محض ایک Space کا نام نہیں ہے بلکہ زندگی کی بعض جامع اقدار رشتوں، قرابتوں اور رفاقتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جن سے اِس عہد کا انسان تقریباً کٹ گیا ہے۔ اسی لیے اس کی زندگی میں ایک مہیب خلا ہے، دیکھیے شاعر یہاں کس طرح اپنی روحانی ہستی سے ہمکلام ہو رہا ہے ؎

زرد موسم میں گھرے ہیں ورنہ شاخِ گلبار رہے ہیں ہم بھی

یہاں شاعر کے پیشِ نظر صرف دو مختلف زمانے نہیں ہیں بلکہ دو نظامِ اقدار ہیں۔ یعنی ماضی سے وابستہ ہر قدر کی نفی تو کی گئی لیکن حال میں اس کی تلافی کی کوئی صورت نہ نکالی جا سکی۔

یادِ ماضی کی ایک دوسری نہایت دلآویز صورت ملاحظہ کریں ؎

شب کی دیوار پہ اک بھولی ہوئی یاد کا نقش
آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ

شاعرانہ زندگی میں اِس نوع کی معصومیت اپنے اندر اک عجب سامانِ لطف رکھتی ہے۔ یادوں کے نقوش بنتے بھی ہیں اور آپ ہی آپ مٹ بھی جاتے ہیں لیکن مٹتے مٹتے خود شاعر کی ہستی کو بھی مٹائے بغیر نہیں رہتے اس لیے کہ وہ تو خود اسی دیس کا باسی ہے، اُس کا تخیل بھی انھیں وادیوں میں خیمہ زن ہوتا ہے، اُس کی پناہ گاہ، اس کے روحانی زخموں کا مداوا تو انھیں وادیوں کی تازہ ہواؤں میں ہے اس لیے یادوں سے کنارہ کش ہو کر زندہ رہ جانا اس کے لیے کس طرح ممکن ہے۔

یہاں شب کی دیوار کے ساتھ یادوں کے نقوش کا رشتہ ایک طویل استعارہ ہونے کے سبب جہاں شاعر کی خلاقانہ اور جمالیاتی بصیرت پر روشنی ڈالتا ہے وہیں پر ہمارے سامنے معنی کی ایک کہکشاں روشن کر دیتا ہے۔

اِس مختصر سے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ سجاد سیّد نے اپنی کم سخنی کے باوجود اپنے انفرادی تفکر اور مخصوص پیرایۂ اظہار کے وسیلے سے اپنے ہمعصروں میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ وہ اُن معدودے چند شاعروں میں ہیں جن کا دل کائنات کے دل کے ساتھ دھڑکتا ہے، ان کے ہاں جو گدازِ قلب، تپش اور سوزِ دروں ہے اور انسانی درد سے رشتہ استوار کرنے میں جس نوع کا جذباتی وفور ہے، اُس کے ماسوا ان کی مجموعی شاعرانہ فضاؤں میں اُداسی اور افسردگی سے پیدا شدہ جو ایک کسک ہے اس کے سبب سجاد سیّد کی غزلیں واضح طور پر میر کے شعری آہنگ سے قریب ہو جاتی ہیں۔

سخن در سخن
خامہ بگوش

مانگے کا اُجالا

سفر نامہ یا معذرت نامہ

جس طرح بعض لوگ ایک موزوں مصرع بھی لکھنے کی توفیق نہیں رکھتے مگر نثری نظموں کے دیوان کے دیوان لکھ ڈالتے ہیں' اسی طرح سفر نامہ عموماً وہ لوگ لکھتے ہیں جو سفر کے دوران آنکھیں بند رکھتے ہیں اور قلم کو فیل بے زنجیر کی طرح کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ آنکھیں بند رکھنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ سفر کتنا ہی بے مزہ کیوں نہ ہو' سفر نامہ مزے دار بن جاتا ہے۔ آنکھیں بند ہوں تو آدمی خواب دیکھتا ہے' سفر نامے کو انھیں خوابوں سے سجایا جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسودہ جب مطبوعہ صورت میں سامنے آتا ہے تو وہ سفر نامے کی بجائے سفر کی معذرت بن جاتا ہے۔ آج کل اردو زبان کے کمزور کندھوں پر ایسے ہی سفر ناموں یعنی معذرت ناموں کا بوجھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ شاعر طرح دار و خوش بیان جمیل یوسف نے بھی اردو زبان کے کمزور کندھوں پر اپنے حصے کا بوجھ لاد دیا ہے اور ایک عدد سفر نامہ تصنیف ہی نہیں کیا' زیور طبع سے آراستہ بھی کر دیا ہے۔ دنیائے ادب میں آرائشگی کے لئے اب یہی زیور رہ گیا ہے۔ وہ زمانہ گیا جب لکھنے والے اپنی تحریروں کو علم اور فنی بصیرت سے مُزیّن کیا کرتے تھے۔ اب تو لے دے کے زیور طبع ہی عیب پوشی کے کام آتا ہے۔

ہم نے جمیل یوسف کو شاعر طرح دار و خوش بیان کہا ہے ممکن ہے اس پر بعض لوگ اعتراض کریں کہ ہم نے بہت زیادہ تعریف کر دی ہے۔ معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ جس کام کے کرنے میں گرہ سے کچھ نہ جاتا ہو' اس کے کر گزرنے میں کوئی حرج نہیں۔ واضح رہے جب ہم کسی کی تعریف کرتے ہیں تو ہمیشہ کے لیے نہیں کرتے' کر کے بھول بھی جاتے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ لیکن ہمارا حافظہ اتنا بھی کمزور نہیں ہے کہ اپنے دعوے کی دلیل میں جمیل یوسف

[illegible] خوبصورت شعر [illegible] نہ کر سکیں۔ سنئے اور سر دھنیے (اپنا نہ کہ شاعر یا سنانے والے کا):

☆ دل میں حرص آئی نہیں' لب پہ سوال آیا نہیں
☆ مجھ کو دنیا سے نمٹنے کا کمال آیا نہیں

☆ اس کی سب شوخیٔ رفتار تھی میری خاطر
☆ راہ میں پھر نہ کوئی پھول کھلا میرے بعد

☆ میں سوچتا ہوں سفر کا حساب کیا دوں گا
☆ کہ میرے پاس تو گردِ رہِ سفر بھی نہیں

☆ ان سرابوں سے کوئی موجِ رواں بھی ابھرے
☆ خشک صحرا کے ورق پر کوئی دریا لکھ دے

☆ انہی سے پاؤں مرے عمر بھر رہے زخمی
☆ بکھر گئے جو کئی خواب ٹوٹ کر میرے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے عمدہ شعر کہنے والے کو سفر نامہ لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ہمارے خیال میں یہ ایک نامناسب سوال ہے۔ جس طرح ایک ہزار شعروں کے مجموعے سے پانچ شعر کام کے نکل سکتے ہیں' اسی طرح اگر ڈھائی سو صفحوں کے سفر نامے سے ڈھائی جملے بھی کام کے نکل آئیں تو سودا برا نہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے جمیل یوسف کے سفر نامے میں ڈھائی سے زیادہ جملے کام کے ہیں۔ خصوصاً وہ جملے جو سہوِ قلم کی وجہ سے لکھنے سے رہ گئے ہوں گے۔ اچھا شعر کہنے والے پر سفر نامہ نہ لکھنے کی پابندی عائد کرنا' ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ اگر جمیل یوسف اچھے شعروں کے خالق نہ ہوتے تو انھیں سفر کرنے کا موقع ہی نہ ملتا اور جب سفر کا موقع مل جائے تو سفر نامہ لکھنے کا موقع کھو دینا کوئی عقل مندی کی بات نہیں ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جمیل یوسف کی شاعری کے قدردان زیادہ تر ڈنمارک ہی میں پائے جاتے ہیں۔ ان قدردانوں نے انھیں وہاں کے ایک مشاعرے میں مدعو کیا۔ وہاں جا کر جمیل یوسف نے شاعری سنائی اور بعد ازاں سفر نامہ لکھ دیا۔ پھر اسے کتابی سورت میں محفوظ بھی کر دیا۔ جو کچھ لکھا جاتا ہے' اسے محفوظ کرنے کا آج کل یہی طریقہ مروج ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ بعض تحریریں کتابی صورت میں محفوظ ہو کر بھی ضائع ہو جاتی ہیں یعنی ہم تک پہنچ جاتی ہیں۔

اب جب کہ یہ سفر نامہ "جل پری کے دیس میں" کے نام سے شائع ہو کر ہم تک پہنچ ہی گیا ہے تو اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑے گا۔ لکھنا ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں کہ زندگی

اس میں ضائع کی ہے' مگر کسی کتاب پر لکھنے میں مشکل یہ ہے کہ اسے پڑھنا بھی پڑتا ہے۔ وہ اڑھائی سو صفحوں کی کتاب پڑھنا کوئی آسان کام نہیں۔ جناب مصنف کا بے حد شکریہ کہ انھوں نے اس مشکل کام کو ہمارے لیے خاصا آسان بنادیا ہے' وہ یوں کہ سفر نامے میں انھوں نے کثرت سے شعر درج کیے ہیں۔ زیادہ تر اپنے اور کم تر دوسروں کے۔ ہم نے شعروں کو چھوڑ کر صرف نثر پڑھنے تک اپنے آپ کو محدود رکھا تو ڈھائی سو صفحوں میں سے صرف سو صفحے خواندگی کے لائق نکلے۔ ہم نے یہ سو صفحے اتنی ہی دیر میں پڑھ لیے جتنی دیر میں مصنف نے لکھے ہوں گے۔ مصنف کا دعوا ہے کہ یہ اردو میں ڈنمارک کا پہلا سفر نامہ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ یہ اردو کا آخری سفر نامہ بھی ہو' تاکہ جو خوشگوار اثر اس کے پڑھنے سے ہمارے ذہن پر ہوا ہے' اسے کوئی اس سے بہتر سفر نامہ زائل نہ کر سکے۔ ہاں اگر یہ اثر خود بخود زائل ہو جائے تو یہ ہماری کوتاہی ہوگی کہ ہم زیادہ دیر تک کسی ایک رائے پر قائم نہیں رہتے۔ اپنی اس متوقع کوتاہی پر ہم پیشگی معذرت طلب کرتے ہیں۔ جناب مصنف کو معذرت خواہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے' اس مقصد کے لیے سفر نامہ ہی کافی ہے۔

اس سفر نامے میں بے شمار خوبیاں ہیں جو دوران مطالعہ ہمارے سامنے آئیں۔ ہم ان خوبیوں کو ایک کاغذ پر نمبر وار لکھتے گئے۔ افسوس کہ اب جب کہ کالم لکھنے بیٹھے ہیں تو وہ خوبیوں والا کاغذ کہیں گم ہو گیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کاغذ کے ساتھ سفر نامے کی خوبیاں بھی گم ہو گئیں۔ اب قارئین کرام کو خود ہی زحمت کرنی ہوگی کہ سفر نامہ پڑھ کر اس کی خوبیوں کا اندازہ کرنا ہوگا۔ آخر پرانے زمانے میں پانی پینے کے لیے کنواں کھودا ہی جاتا تھا تو یہ کام آج کیوں نہیں ہو سکتا۔ بہر حال بے شمار خوبیوں میں سے جو ایک دو خوبیاں ہمیں یاد رہ گئی ہیں' انھیں ہم اپنے کالم میں محفوظ کیے دیتے ہیں۔

اس سفر نامے کی سب سے پہلی خوبی یہ ہے کہ اس کی طباعت نہایت عمدہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جناب مصنف اسے ڈنمارک ہی سے چھپوا کر ساتھ لائے ہوں۔ سفید کاغذ پر سیاہ حروف اس طرح چمکتے ہیں جیسے اندھیری رات میں جگنو۔ معاف کیجیے گا یہ تشبیہ کچھ غلط بلکہ الٹ ہو گئی۔ سیاہ رات اور سفید کاغذ میں نیز جگنوؤں میں اور سیاہ حروف میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کتاب میں بعض الفاظ و تراکیب کے املا میں بھی اسی قسم کی کاریگری سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً تقریباً ایک درجن مقامات پر "چاق چوبند" کو "چاک وچوبند" لکھا گیا ہے۔ مصنف کی چاک گریبانی کی رعایت سے یہی املا درست ہے۔ چاک گریبانی کا قصہ یہ ہے کہ موصوف نے جہاں کہیں بھی ڈنمارک کی خواتین کا ذکر کیا ہے' گریبان کے ساتھ ساتھ اپنا سینہ بھی چاک چاک کرتے نظر آتے ہیں۔

ایک جگہ یہ واقعہ لکھا ہے: "شام کو مٹر گشت کرتے ہوئے ہم ایک جگہ سر راہ رک کر کوک اور سیون اپ سے تازہ دم ہونے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک چھ فٹ لمبی لڑکی' بشرٹ' نیکر اور

جو گرز پہنے ہلکے پھلکے ریس کی سائیکل پر سوار ہمارے قریب آکر رکی۔ سائیکل پر بیٹھے بیٹھے اس نے کوک مانگا۔ اس سے پہلے کہ دکاندار کوک کا ٹن کھول کر اسے پکڑاتا' میں نے وہ ٹن دکاندار سے لے کر حسینہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس نے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے مجھے تھینک یو کہا اور کوک کا ڈبہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔۔۔۔۔ اور پھر اس کے ہونٹ ڈبے سے پیوست ہوگئے۔۔۔۔۔ میں تجریدی آرٹ کے اس زندہ اور متحرک شاہکار کو دیکھتا رہا۔ جس طرح دبلی پتلی اس کی سائیکل تھی' اسی طرح دبلی پتلی وہ خود تھی۔ مجھے کبھی کوک کے اس ٹن پر رشک آتا تھا جو اس کے ہونٹوں سے پیوست تھا' کبھی اس سائیکل پر رشک آتا تھا جس پر وہ سوار تھی۔"

خدا کا شکر ہے کہ معاملہ رشک سے آگے نہیں بڑھا۔ اگر خدانخواستہ حسد کا جذبہ بیدار ہو جاتا تو جناب شاعر کوک کے ٹن اور سائیکل دونوں کی ہجو لکھ دیتے۔

اپنی دنیا سنوارنے کے ساتھ ساتھ جناب مصنف نے غالب کی عاقبت خراب کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ جب موصوف ڈنمارک سے سویڈن گئے تو وہاں انھیں غالب بہت یاد آئے۔ سفر نامے میں پورا ایک باب "مرزا غالب سویڈن میں" کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اسٹاک ہوم میں گھومتے ہوئے کئی جگہوں اور موقعوں پر شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ ہو نہ ہو غالب ضرور یہاں آیا تھا اور انہیں جگہوں اور موقعوں پر اس نے اپنے بعض مشہور شعر کہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اسے ان اشعار کی تحریک یہیں سے ہوئی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ کیوں کر ہوا کہ اس نے ایسے شعر جو یہاں آئے بغیر کہے ہی نہیں جا سکتے۔ دہلی میں غالب نے ایسے حسین و جمیل پری پیکر کہاں دیکھے ہوں گے جن پر صحیح معنوں میں پریوں کا گمان ہو۔"

اس کے بعد غالب کے متعدد ایسے شعر پیش کیے گئے ہیں جو سویڈن کی حسیناؤں کو دیکھ کر لکھے گئے تھے۔ ان شعروں کو اور ان کی تشریح پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے غالب' جمیل یوسف کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں بلکہ جمیل یوسف جیسے کھیل ہی کھیلتے رہے ہیں۔

شعروں اور ڈنمارک کی خواتین کے تذکروں کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو بھی اس سفر نامے میں بہت کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ اگرچہ ڈنمارک میں مصنف کا زیادہ وقت اپنے ہم وطنوں کے درمیان سیخ کباب اور چکن پیس کھانے میں اور مشاعرے پڑھنے میں گزرا' لیکن جو تھوڑا بہت وقت سیر و سیاحت اور وہاں کے باشندوں سے ملنے جلنے میں صرف ہوا' اس کے بیان نے سفر نامے کو اچھا خاصا خبر نامہ بنا دیا ہے۔ مصنف نے بتایا ہے کہ ڈنمارک کے ارباب اختیار نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ہمارے ارباب اختیار کی طرح اقتدار کو عیاشی کا وسیلہ نہیں بناتے۔ وہاں ملکی دولت کا بے جا مصرف نا قابل معافی جرم ہے۔ کسی بھی وزیر کو محض اس بنا پر برطرف کیا جا سکتا ہے کہ اس نے سرکاری خرچ پر کسی مہنگے ہوٹل میں قیام کیا۔ جمیل یوسف بتاتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو اپنے دور اقتدار میں ڈنمارک گئے

تو انھوں نے اپنے ایک سو ساتھیوں کے ساتھ سب سے مہنگے ہوٹل میں قیام کیا۔ اس پر وہاں کے ایک اخبار نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا: "جس ملک کا اتنا لمبا چوڑا سرکاری وفد اتنے مہنگے ہوٹل کے ایک پورے فلور کو اپنے قیام کے لیے بک کرا سکتا ہے' اس ملک کو بھلا بیرونی امداد کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو بے حد امیر ملک ہے۔ ایسے ملک کو تو ڈنمارک جیسے ملک کو امداد دینی چاہیے۔

پاکستانی شاعر غیر ملکوں میں جا کر جس طرح دردر کی گدائی کرتے ہیں' اس کی عبرت ناک تفصیلات بھی سفر نامے میں ملتی ہیں۔ جمیل یوسف لکھتے ہیں: "ہمارے ملک کے اکثر اردو شعرا چاہے خود کسی کو ساری عمر اپنے گھر کا رستہ تک نہ دکھائیں مگر دوسروں کے ہاں مہمان بننے میں ہمیشہ بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک سینیر شاعر نے (جو نوجوان نسل کا مقبول ترین شاعر ہے اور اپنے آپ کو پاک و ہند کا نمبرون شاعر سمجھتا ہے) تو کمال ہی کر دیا۔ اگست ۹۴ء میں لندن سے اقبال اختر کو پیغام بھجوایا اگر میں کوپن ہیگن کی سیر کو آؤں تو آپ مجھے کتنے پیسے دیں گے؟ اقبال اختر نے بے ساختہ کہا' ان سے پوچھیں آپ کو بلا کون رہا ہے۔"

اسی طرح ایک پاکستانی ادیب کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے میزبان کے خرچ پر بادہ وساغر کے شغل کو انتہا تک پہنچا دیا تو ایک ایسی چیز کی فرمائش کی جسے پورا کرنا میزبان کے لیے ممکن نہ تھا۔ حرفِ معذرت سُن کر نشے میں دھت مہمان نے میزبان سے کہا: "اچھا تو مجھے پیسے دے دیجیے' میں خود ڈھونڈ لاؤں گا۔"

اس قسم کے واقعات پڑھ کر اس سفر نامے کو اگر عبرت نامہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

سفر نامے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں پاکستان کے نامور ادیب سید ضمیر جعفری کا ذکر جابجا ملتا ہے۔ جمیل یوسف نے انھیں کی رفاقت میں ڈنمارک کا سفر کیا تھا۔ جعفری صاحب جس محفل میں ہوں' اپنی شاعری اور خوبصورت فقروں کی وجہ سے جانِ محفل بن جاتے ہیں۔ زیرِ نظر سفر نامے میں ان کے شعر اور فقرے' مصنف کے شعروں اور فقروں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہوں گے۔ سفر نامے کے بارے میں جعفری صاحب کی رائے یہ ہے: "جمیل یوسف کے سفر نامے میں اگر کوئی خوبی نہ ہوتی تو بھی مجھے یہ سفر نامہ اردو کے تمام سفر ناموں سے زیادہ پسند آتا کیونکہ اس کے ہر دوسرے صفحے پر میرا ذکر ہے اور اپنے ذکر کو بھلا کون پسند نہیں کرتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں میرے ذکر کے علاوہ بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ اس کتاب کا اسلوبِ بیان اتنا سحر طراز ہے کہ پہلے صفحے ہی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔"

ہم جعفری صاحب سے اختلاف کی جرات تو نہیں کر سکتے۔ مگر یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ جب ڈنمارک میں کوئی "مطلوبہ چیز" گرفت میں نہ آئی تو پاکستان آ کر قاری کو گرفت میں لے لیا۔ آہ بے چارہ قاری!

یوسف ناظم
۹ ڈی۔ الہلال۔ باندرہ
ریکلمیشن۔ ممبئی۔ ۵۰

دیکھنا تقریر کی قسمیں

تقریر کرنا بڑی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک ضرورت کی چیز ہے اور اس کے کچھ فواید بھی ہیں۔ پہلے تقریریں قلمبند کی جاتی تھیں اب اِن کی صدا بندی ہوتی ہے۔ پہلے کہا سنا معاف کر دیا جاتا تھا اب اِس کی گنجایش نہیں رہی ہے۔ قلمبند کی ہوئی تقریر کے بارے میں فقرہ کہہ سکتا تھا کہ اس میں لکھنے والے نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے لیکن جس تقریر کی صدا بندی کی گئی ہو؟ اس سے جان بچانا مشکل ہے لیکن کچھ تقریریں بے حد خوشگوار ہوتی ہیں۔ کسی جلسہ گاہ میں بالمشافہ اور بالراست سنی جائے تو تقریر سننے والوں کو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی آواز ان کے کانوں میں گنے کا رس گھول رہی ہے۔ وہ جلسہ گاہ میں شہ نشین سے اتنی دور ہوتے ہیں اور درمیان میں اتنی گردنیں حائل ہوتی ہیں کہ وہ مقرر کی صورت نہیں دیکھ سکتے لیکن تقریر ہے ہی سننے کی چیز دیکھنے کی نہیں۔ تقریر میں آواز اور کب و لہجے کی کافی اہمیت ہوتی ہے۔ لب اگر نظر نہ آئیں تو کوئی حرج نہیں۔ لہجہ بھی کافی سکون پہنچاتا ہے۔ صورت تو بعد میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ آٹوگراف لینے کے بہانے۔ (آٹوگراف لیتے وقت اگر آپ فاؤنٹین پین سے دستخط کرا رہے ہوں تو پین کے اوپر کا حصہ اپنے ہی پاس رکھیں۔ کسی بھی مقرر کا آٹوگراف اتنا قیمتی نہیں ہوتا کہ آپ اس کے لیے اپنا ایک پین قربان کردیں۔ تقرر اگر کوئی خاتون ہو تو بات دوسری ہے) جس زبان میں تقریر فراہم کی جارہی ہے اگر وہ زبان، مقرر کی مادری یا علاقائی زبان نہ ہو تو لہجہ زیادہ مزا دیتا ہے۔ سننے والوں کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ اکثر لوگ تو تقریر نہیں لہجہ سننے ہی کے لیے ضروری کام چھوڑ کر تقریر سننے جاتے ہیں اور گھر واپس پہنچنے پر ضروری کام بھول جانے کا مزا چکھتے ہیں۔ کھانا تو دور رہا بیوی بھی گھر پر عدم موجود ہوتی ہے۔ اور سنو لمبی لمبی تقریریں اور اس کے بعد آٹوگراف بھی لو۔

رواں دواں تقریر جس میں مقرر کی زود بیانی کسی چھوٹے موٹے سیلاب سے مقابلہ کرتی دکھائی دے سامعین کو ششدر رہ کر سراسیمہ کردیتی ہے اور کئی سامعین میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتے ہیں۔ مضبوط دل کے سامعین البتہ ڈٹے رہتے ہیں اور ان میں سے اکثر تو مقرر کے چند جملوں کی تالیوں اور واہ واہ کے نعرہ ہائے تحسین سے داد بھی دینا چاہتے ہیں لیکن ان کے سوچ سونچ تک مقرر ان کے پسندیدہ جملوں کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل جاتا ہے۔ شاعری سنتے وقت تو مکرر ارشاد کی فرمائش کی جاسکتی ہے جو شاعر کی رگوں میں دوڑنے پھرنے والے خون کی مقدار اور رفتار میں اضافے کا باعث ہوتی ہے لیکن تقریر کے معاملے میں اس قسم کے تفریحی مشاغل کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔ تقریر سنی ہے تو وقت کی قدر کرنی پڑتی ہے یہ نہیں کہ اچھے خاصے مقرر کو بھی ایک شاعر کی طرح ونس مور، ونس مور کی آوازوں سے نوازا اور بار بار اسٹیج پر بلایا جارہا ہے۔ شعری محفلوں میں بھی یہ ونس مور، ونس مور اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس سے دوسرے شاعروں کی کتنی دل شکنی ہوتی ہے اس کا اندازہ کسی کو نہیں ہوتا۔

اچھی تقریر وہ ہوتی ہے جو پیمائش کے اعتبار سے متناسب الاعضا ہو اور گھڑی پر نظر رکھ کر اور عینک اُتار کر کی جائے۔ اس مقرر میں دور اندیشی کا پہلو نمایاں رہتا ہے۔ عینک اُتار کر تقریر کرنے کا فایدہ یہ ہوتا ہے کہ تقرر اپنے زور بیان کے سلسلے میں مکمل آزادی کے ساتھ اپنی گردن کو بھی زحمت سخن دے سکتا ہے۔ ایسے عالم وارفتگی میں اگر عینک لگی رہے تو اس کا اپنے مرکز سے جدا ہوکر پوڈیم پر گر جانا یقینی ہوتا ہے۔ عینک پوڈیم پر گرے تو ٹھیک ہے مالی نقصان نہیں ہوگا۔ بڑے سے بڑے سیمی نار میں مقرر کو صرف تقریر کا معاوضہ دیا جاتا ہے عینک کا نہیں دیا جاتا۔ (بعض جوشیلے اور تقرر جو اپنی تقریر کرنے کے دوران، چہرے سے سُرخ ہوجاتے ہیں، اکثر یہ نکتہ بھول جاتے ہیں۔ جن جلسوں میں پوڈیم یعنی تقریری اسٹینڈ کا انتظام نہیں ہوتا، ان جلسوں میں مقرر کے سامنے، ایک مائیکروفون کے علاوہ ایک میز بھی رکھ دی جاتی ہے جس پر تقرر اپنی تقریر کو پُر اثر بنانے کی غرض سے دو چار مرتبہ گھونسہ ضرور آزماتا۔ (تکلیف خود ہی کو ہوتی ہے) گھونسے کی ضرب سے میز پر رکھا ہوا پانی کا گلاس بھی سامعین کے پیمانۂ صبر کی طرح چھلک جاتا ہے اور بعض صورتوں میں تو جوشیلے مقررین کو قابو میں لانا مشکل ہوجاتا ہے۔ منتظمین اور صدر جلسہ کو پریشانی لاحق ہوجاتی ہے۔ میز پر ضرب پڑنے کی آواز سے صدر کی غنودگی تو متاثر ہوتی ہی ہے لیکن ساتھ ساتھ جلسے میں انتشار کی کیفیت کی پیدا ہوجاتی ہے۔ کچھ سامعین آنکھ بچاکر پنڈال چھوڑ دیتے ہیں یا اپنی اپنی کرسیوں ہی پر اپنی استراحت کا انتظام کرلیتے ہیں جس کے نتیجے میں چند کرسیاں بھی دم توڑ دیتی ہیں۔ کسی

بھی تقرر کو اس بات کی خبر نہیں ہوتی کہ اس کی تقریر کتنی مضرت رساں تھی۔ کرسیوں پر بار بار پینترے بدلے جائیں تو مضبوط سے مضبوط کرسی بھی جواب دے دے گی۔ جلسہ گاہ میں بے آواز نیند صرف مشاق لوگوں کا کام ہے۔ نو واردانِ بساط کو اس کام میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ کچھ سامعین تو جلسہ گاہ میں آتے ہیں سونے کی غرض سے ہیں۔ مقرر کی تقریر ان کے آرام میں خلل نہیں ڈالتی خواہ سامنے رکھی ہوئی میز پر حملہ کتنا ہی زبردست کیوں نہ ہو۔

تقریر گوئی جب تک صلاحیت کی حد میں رہتی ہے ملک و قوم کے لیے مفید ہوتی ہے اور عوام الناس کا ایک بڑا طبقہ جسے فرصت زیادہ ہوتی ہے، گھر کے باہر ہی تقریریں سننا پسند کرتا ہے لیکن جب تقریر صلاحیت کی حدیں توڑ کر عادت اور خصلت بن جاتی ہے تو عوام مقرر سے خوف کھانے لگتے ہیں اور کم سے کم بیرونی حملوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خطابت کے میدان میں ایسے واقعات عام ہیں ورنہ ایسے بھی تقرر گزرے اور گزر رہے ہیں جنھیں عوام نے اپنے کاندھوں پر بٹھایا ہے (یعنی اُٹھایا ہے) زندگی میں کاندھوں پر اٹھایا جانا، زندگی کا یادگار لمحہ ہوتا ہے اور کم لوگوں کی زندگی میں ایسا لمحہ آتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تنہا اُسی شخص کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں جو کاندھوں پر سوار ہوتا ہے۔ یہ خوشی کے آنسو ہوتے ہیں۔ اور یہ شبنم کی طرح کا رونا ہوتا ہے ایسے موقعوں پر دریا نہیں بہائے جاتے۔ چند ثانیوں کے لیے دریا کا انتظام ممکن ہی نہیں ہوتا۔ مقررین کے کئی نمونے ہوتے ہیں کچھ مقررین، تقریر کرتے وقت اپنی عینک ہاتھ میں تھام لیتے ہیں اور ان کی گرفت عوام پر کم اور اپنی عینک پر زیادہ مضبوط ہوتی ہے اور کچھ مقررین جن کے دونوں ہاتھ خالی ہوتے ہیں اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے مائیکروفون تھام لیتے ہیں حالانکہ سمع خراشی کو دور دور تک پہنچانے والا یہ آلہ عصائے پیری نہیں ہوتا۔

حالانکہ کہنہ مشق اور جہاں دیدہ قسم کے مقررین کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن انسان جبلی طور پر سہارے ڈھونڈتا ہی رہتا ہے۔ چند تقریریں اپنے دوران کے لحاظ سے بڑی نپی تلی ہوتی ہیں۔ ان میں سے ہر تقریر ۴۵ منٹ کی ہوتی ہے خواہ موضوع کچھ ہو تقریر کا پینتالیس منٹ تک جاری رہنا ضروری ہے۔ مقررہ وقت کی تقریریں کرنے والے حضرات، عام طور پر معلمین ہوتے ہیں ۴۵ منٹ ہو جانے پر تقریر نادانستہ طور پر نقطۂ اختتام پر پہنچ جاتی ہے۔ ان کا انداز بھی تفہیمی ہوتا ہے۔

وہ تقریریں جو پڑھی جائیں عام طور پر سرکاری ہوتی ہیں۔ ان میں صرف آواز مقرر کی ہوتی ہے خیالات سرکار کے ہوتے ہیں۔ یہ تقریریں خاص خاص موقعوں پر پیش کی جاتی ہیں

کتاب نما
مجتبیٰ حسین
200۔انکور اپارٹمنٹس
پٹ پڑ گنج دہلی۔۲

کچھ امجد اسلام امجد کے بارے میں

صاحبو! یہ تو ہم کہنا ہی بھول گئے کہ دوبئی سے واپسی کے سفر میں ہم نے کچھ گھنٹے لاہور میں بھی گزارے تھے۔ وہ لاہور جس کے بارے میں کہاوت ہے کہ "جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا"۔ ہمیں اچانک بتایا گیا کہ دوبئی سے واپسی کے لیے ہماری نشست پی آئی اے کی جس پرواز میں بک کرائی گئی ہے وہ پسنجر ٹرینوں کی سی شان رکھتی ہے۔ گویا یہاں نکلی وہاں ڈوبی' وہاں ڈوبی یہاں نکلی والا معاملہ ہے۔ پتہ چلا پہلے تو یہ پرواز پشاور جائے گی اور وہاں سے لاہور جائے گی۔ پھر لاہور میں آٹھ دس گھنٹے آرام کرے گی اور وہاں سے دہلی کے لیے رخت سفر باندھے گی۔ منتظمین نے سوچا تھا کہ ہم اس پیدل جانے والی پرواز کی بابت جان کر یقیناً ناراض ہوں گے لیکن یہ سن کر ہماری باچھیں کھل اٹھیں، تو پوچھا "آپ کی اس غیر متوقع خوشی کا راز کیا ہے؟" ہم نے کہا "اس خوشی کا راز یہ ہے کہ لاہور میں ہمارا دوست امجد اسلام امجد رہتا ہے۔ اس بہانے اس سے ملاقات ہو جائے گی۔ یہ نہ ملے تو احمد ندیم قاسمی' انتظار حسین' منیر نیازی' انور نوید' اظہر جاوید' اجمل نیازی کتنے نام گنائیں۔ کوئی نہ کوئی تو مل ہی جائے گا" ہمارا طیارہ لاہور پہنچا تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ ہم نے امیگریشن عہدیدار سے کہا "یہاں! ہمیں چاہے جس ہوٹل میں بھی ٹھہراؤ لیکن وہاں پہنچانے سے پہلے ہماری ایک خواہش کی تکمیل کرو یعنی ہمارے دوست امجد اسلام امجد سے ذرا ہماری بات کرادو۔" پوچھا "آپ امجد صاحب کو جانتے ہیں؟" ہم نے اثبات میں جواب دیا، تو بولا جناب ایسی بات ہے تو آپ بھی میری ایک خواہش کی تکمیل کریں۔ جب آپ امجد صاحب سے بات کریں تو آخر میں میری بات بھی کرادیں وہ میرے پسندیدہ رائٹر ہیں" امیگریشن افسر نے امجد کے گھر فون ملایا تو پتہ چلا کہ اس دن لاہور میں ہونے والی کسی سائنسی نمائش کے انتظامات کے سلسلہ میں امجد صبح صبح گھر سے

نکلا ہے۔ (امجد ان دنوں اردو سائنس بورڈ پاکستان کا ڈائرکٹر جنرل ہے۔ ہمارا دوست ہے تو کیا ہوا بڑی توپ چیز ہے) ہم نے اس کی بیٹی کو اپنا حال سنایا اور بتایا کہ پی آئی اے والے ہمیں نہ جانے کہاں ٹھہرائیں گے یہ ہم نہیں جانتے امجد سے کہنا وہ پتہ کرلے اور دن میں تین بجے سے پہلے ہم سے مل لے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی ورنہ یہ پنچھی اڑ جائے گا۔ امجد کے گھر فون کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ امیگریشن افسر نے کسی سے کچھ کہا اور ہمیں ہوٹل ایگزیکٹو کے اس کمرہ میں ٹھہرایا گیا جو خصوصی مہمانوں کے لیے مختص ہوتا ہے۔ یہ انگریزوں کے زمانہ کا ہوٹل لگتا ہے۔ کمرہ کے رکھ رکھاؤ اور فرنیچر وغیرہ سے ایسا لگتا تھا جیسے انگریز ابھی ابھی کمرہ سے باہر گیا ہے اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر کہے گا "ویل! تم ادھر میں کیسا آگیا' چلو بھاگو یہاں سے"۔

امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی لاہور شہر کی "دو ایسی کنجیاں ہیں جو ہمیشہ ہمارے پاس رہتی ہیں ورنہ ڈپلیکیٹ چابیاں تو کئی ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کے بارے میں تو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اب پاکستان کا سفیر بن کر ناروے چلا گیا ہے (یوں بھی وہ پاکستان میں رہتا کب تھا۔ ہمیشہ باہر ہی گھومتا رہتا تھا) یہ اچھا ہی ہوا کہ اس کا تقرر ناروے میں عمل میں آگیا ورنہ اسے مجبوراً بار بار پاکستان واپس آنا پڑتا تھا۔ دس برس پہلے ہم لاہور آئے تھے تو ہمارا قیام عطاء الحق قاسمی کے پاس ہی تھا۔ عطاء الحق سے ہماری ملاقات سترہ اٹھارہ برس پہلے دہلی میں ہوئی تھی جب وہ غالباً اقبال کے مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے ہندستان آیا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد عطا پھر دہلی آیا تو امجد اسلام امجد بھی اس کے ہمراہ تھا۔ قہقہہ بر دوش اور خندہ بر لب عطا اور امجد کی دوستی بلکہ جوڑی بڑی پرانی ہے گویا دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ان کے ایک "کرم فرما" تو یہاں تک کہتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے الزام اور ملزم کا درجہ رکھتے ہیں' موسیقی میں جس طرح شنکر جے کشن اور کلیان جی آنند جی وغیرہ کی جوڑیاں مشہور ہیں اسی طرح اردو ادب میں عطا اور امجد کی جوڑی بھی مشہور ہے۔ دونوں ایسے فقرے باز اور لطیفہ باز ہیں کہ دونوں کسی جگہ موجود ہوں تو ان دونوں کے سوائے کسی اور کا سنجیدہ رہنا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ ہمیں دہلی اور لاہور کی ایسی بیسیوں محفلیں یاد ہیں جن میں ان دونوں یاران طرحدار کی رفاقتیں ہمیں میسر آئیں (عطاء الحق قاسمی تو حیدرآباد بھی آچکا ہے) ایسی ہی ایک محفل کے بعد ہمارے پیٹ میں سچ مچ کچھ اتنے بل پڑ گئے کہ انھیں کھلوانے کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا' اس پر ڈاکٹر نے کہا تھا "زندگی میں پہلی بار پتہ چل رہا ہے کہ ہنسی صحت کے لیے مضر بھی ہو سکتی ہے"۔ امجد اسلام امجد پاکستانی ادب کا بہت بڑا نام ہے، وہ ایک پُر گو شاعر صاحب طرز نثر نگار' ڈرامہ نگار، سفرنامہ نگار، کالم نگار اور کئی طرح کا نگار ہے۔ اس کا لکھا

ہوائی دی سیریل "وارث" اتنا مقبول ہوا کہ اب یہ سیریل اس کی بنیادی شناخت بن گیا ہے۔ بہت برس پہلے دلی میں جب امجد سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو ہم نے کہا تھا "یوں تو اسلام ہر جگہ خطرہ میں اور سخت مشکل میں ہے لیکن تمھارے نام میں تو یہ کچھ زیادہ ہی مشکل میں نظر آتا ہے کیونکہ تم نے اسے دو امجدوں کے بیچ میں پھنسا کر اس کا "سینڈوچ" بنا رکھا ہے۔ ہنس کر بولا "میں نے اسے حفاظت کی خاطر دو ناموں کے بیچ میں رکھا ہے تاکہ جو بھی آنچ آئے تو وہ میرے نام پر آئے اسلام پر نہ آئے"

ہوٹل ایگزیکٹو پر پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ ہمارے کمرہ کا ٹیلی فون کام کر رہا ہے۔ ہم نے مخدومی احمد ندیم قاسمی کو فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ گیارہ بجے کے بعد دفتر آئیں گے۔ انتظار حسین کو فون کیا تو خود انھوں نے فون اٹھالیا۔ جب ہم نے بتایا کہ ہم لاہور سے بول رہے ہیں تو حیرت میں پڑ گئے۔ پھر جب یہ پتہ چلا کہ ہم بہ وجوہ ان سے ملنے سے قاصر ہیں تو دکھی بھی ہوئے۔ بار بار کہتے تھے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم لاہور آؤ اور مجھ سے نہ ملو۔ ان سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔ ہم نے فون رکھا ہی تھا کہ امجد اسلام امجد کا فون آگیا۔ بولا "یار! تمھارا فون کب سے مصروف ہے۔ میں تو ملا ملا کر تھک گیا۔ پتہ نہیں تم کن غیر ضروری لوگوں سے باتیں کرنے میں مصروف ہو۔ جب ہم نے بتایا کہ انتظار حسین صاحب سے باتیں ہو رہی تھیں تو خوب ہنسا۔ بولا "ابھی کچھ دیر پہلے میری بیٹی نے سیلولر فون پر تمھاری آمد کے بارے میں بتایا تو پی آئی اے کے سارے بڑے عہدیداروں کو پریشان کر کے تمھارے ٹھکانے کا پتہ لگایا ہے۔ میں ابھی تمھارے پاس آرہا ہوں۔

پھر دس برس پہلے لاہور میں گذاری ہوئی کتنی ہی محفلیں یاد آئیں۔ لاہور میں ہماری اکثر شامیں منیر نیازی کے گھر پر گزرتی تھیں جو راوی کے اس پار اور کسی حد تک امرتسر سے قریب واقع ہے۔ پورے چاند کی ایک رات کو ہم برادر عزیز اجمل نیازی کے اسکوٹر پر منیر نیازی کے گھر سے واپس ہو رہے تھے کہ راوی کے کنارے اجمل کا اسکوٹر پھسل کر گر پڑا۔ ہمارے پانوں میں ہلکی سی چوٹ بھی آئی تھی اور اجمل نیازی اس چوٹ سے اس قدر حواس باختہ ہو گیا تھا کہ لگتا تھا یہ چوٹ ہمارے پانوں میں نہیں دل میں لگی ہے۔ دس برس پہلے کا یہ واقعہ یاد آیا تو ہمیں ہنسی بھی آگئی۔ اجمل اس رات تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہمارے کمرہ میں آتا تھا اور ہماری چوٹ کا حال پوچھ کر چلا جاتا تھا۔ کیا مجال جو اس رات اس نے ہمیں ذرا بھی سونے دیا ہو۔ ایک مرحلہ پر تو ہمیں کہنا پڑا "یار اجمل چوٹ میں تو ویسے کوئی تکلیف نہیں ہے لیکن تم جس طرح اس کا حال پوچھ رہے ہو تو اس سے اب چوٹ کا درد بڑھنے لگا ہے" کہتے ہیں عقلمند کو اشارہ کافی

ہوتا ہے لیکن اجمل ایسا عقلمند نکلا کہ اشارہ بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ دوسرے دن ہم نے عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، حسن رضوی اور سعادت سعید کو یہ قصہ سنایا تو سب کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ ہم کتنے ہی کرم فرماؤں اور دوستوں کو فون ملانے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ امجد آندھی کی طرح آ گیا اس دن اردو سائنس بورڈ پاکستان کی طرف سے دن میں گیارہ بجے سائنسی کتابوں کی نمائش کا افتتاح ہونے والا تھا۔ کہنے لگا "تم فوراً میرے ساتھ چلو، نمائش میں بھی شرکت کر لینا، پھر ہم دوستوں کی طرف چلیں گے اور وہاں تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کی 145 سائنسی کتابوں کے مسودے بھی اس نمائش میں رکھے گئے ہیں۔ کم از کم اب تو چلو، یوں امجد نے ہماری علاقائی عصبیت کو بھی چھیڑنے کی کوشش کی۔ امجد اپنی تازہ تصانیف کے ساتھ آیا تھا کہنے لگا تمھیں کچھ اور چاہیے تو بتانا۔ ہم نے کہا یار! تمھارے نوجوان مزاح نگار یونس بٹ ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ اس میں حس مزاح اتنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ پتہ نہیں وہ خود اپنے آپ میں کس طرح اور کہاں رہ لیتا ہے۔ بس ذرا زبان کے استعمال کے معاملہ میں محتاط اور چابک دست ہو جائے تو کیا کہنے۔ امجد نے ہنس کر کہا "اچھا تو اب تم جیسا حیدر آبادی بھی اہل زبان ہونے کا دعوا کرنے لگا" ہم نے کہا "25 برس تک دہلی میں رہنے کا یہی ایک نقصان عظیم تو ہوا ہے" پانچ دن پہلے دہلی سے دوبئی جاتے ہوئے ہم نے طیارہ میں "جنگ" کے ایک شمارہ میں پڑھا تھا کہ امجد نے احمد ندیم قاسمی کے بارے میں ایک دستاویزی فلم بنائی ہے۔ ہم نے اس دستاویزی فلم کے بارے میں پوچھا تو اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے بولا "میں تو بھول ہی گیا۔ تمھیں تو یہ فلم ضرور دینی ہے۔ تم کسی طرح اب میرے ساتھ چلو بلکہ کچھ دن لاہور میں رک جاؤ میں بندوبست کرا دیتا ہوں۔ ہم نے کہا "یہاں امجد تم اردو سائنس بورڈ کے ڈائرکٹر جنرل ہو اور اب سے کچھ دیر بعد تمھارے دفتر میں سائنسی کتابوں کی نمائش ہو رہی ہے وہاں جاؤ اور اپنے فرائض منصبی کو پورا کرو" ہنس کر بولا "تم یہ بات اس طرح کہہ رہے ہو جیسے بالکل نہیں جانتے کہ برصغیر میں عہدیداران اعلا اپنے فرائض منصبی سے کس طرح عہدہ بر آ ہوتے ہیں" ہم نے امجد کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے بھی ہمارے لیے اتنا سارا وقت نکال لیا۔ امجد کے جانے کے بعد ہم نے کچھ دیر آرام کرنا چاہا تو دروازہ پر دستک ہوئی، یہ امجد کا ڈرائیور تھا جس کے ذریعہ امجد نے احمد ندیم قاسمی سے متعلق دستاویزی فلم روانہ کی تھی۔ وہ گیا تو تھوڑی دیر بعد پھر دروازہ پر دستک ہوئی۔ اس بار لاہور کے گورا پبلشرز کے مینیجنگ ڈائرکٹر افتخار احمد کا آدمی ہاتھوں میں کتابوں کا بھاری بنڈل اٹھائے کھڑا تھا۔ پتہ چلا امجد نے افتخار احمد کو یونس بٹ کی کتابوں میں ہماری دلچسپی کے

بارے میں بتادیا تھا یہ آدمی ہیں پچیس کتابوں کا بھاری بنڈل اٹھائے کھڑا تھا ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ یونس بٹ اتنا کثیر التصانیف ادیب ہے۔ ہونہار بروا کے پات چکنے تو ہو سکتے ہیں لیکن یہ اتنے بھی چکنے ہو سکتے ہیں یہ نہیں سوچا تھا۔ بہر حال چند گھنٹوں میں امجد نے جو محبت ہم پر نچھاور کی وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ جی تو بہت چاہا کہ ہم لاہور میں کچھ دن رک جائیں۔ لاہور صحیح معنوں میں پاکستان کا ادبی ثقافتی اور سماجی مرکز ہے۔ کیسی کیسی نامور ہستیاں اس شہر نے پیدا کی ہیں۔ ان کے تصور ہی سے یہ شہر ہماری ذات میں پھیلنے لگ جاتا ہے۔ ہم نے ان سب کو یاد کیا اور لاہور سے اڑان بھرنے کے پانچ دس منٹ بعد ہی ہم ہندستان کی فضاؤں میں داخل ہو گئے سوچنے لگے آخر یہ کیسی قربتیں ہیں اور کیسے یہ فاصلے ہیں۔

بقیہ صفحہ ۴۶

تہنیتی تقریریں چونکہ رسمی ہوتی ہیں اس لیے لوگ انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ سالانہ بجٹ کے موقع پر جو تقریر کی جاتی ہے اس سے عوام کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور اس میں سرکار خصوصی طور پر دلچسپی لیتی ہے۔ خسارے کے کاموں سے سرکار کا شغف لائق تحسین ہے۔

اور ایک تقریر وہ ہوتی ہے جو یہ کہنے کے لیے کی جاتی ہے کہ تقریر مت کرو کام کرو۔ یہ تقریر سن کر عوام فوراً کام کرنا شروع کر دیتے ہیں اور پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ اس تقریر پر تنقید کرتے ہیں۔

نصرت ظہیر
4/15 کھچڑی پور کالونی
نئی دہلی-91

نہ ہو جب دل ہی سینے میں

یہ تو ہم نے سنا تھا کہ اپنے ملک کے ڈاکٹر کافی ذہین ہیں لیکن وہ اتنے ذہین ہیں اس کا اندازہ نہیں تھا۔ خبر ممبئی کی تھی مگر بنگلور سے آئی۔ اٹھارہ سال کا ایک ان پڑھ غریب اور بے روزگار لڑکا مستان کام دھندے کی تلاش میں ممبئی چلا گیا۔ جگہ جگہ دھکے کھائے۔ کام تو نہیں ملا البتہ حاجی علی کی درگاہ مل گئی جہاں روز لنگر چلتا ہے۔ میاں مستان صبح شام لنگر میں ملنے والا کھانا کھاتا اور رات کو فٹ پاتھ پر سو جاتا۔ ایک روز غریب کو بخار ہو گیا اور ایسا بخار ہوا کہ کچھ سدھ بدھ نہ رہی ایسے میں ایک شخص فرشتہ بن کر اس کے پاس آیا اور اسے ٹیکسی میں بٹھا کر ایک پرائیویٹ اسپتال لے گیا۔

وہاں ڈاکٹروں نے اسے کچھ گولیاں دیں، جانچ کے لیے کچھ خون لیا اور اس کے بعد۔ چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ چار دن بعد ہوش آیا تو مستان نے دیکھا اس کے پیٹ میں ٹانکے لگے ہوئے ہیں اور وہ اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتا۔ ڈاکٹروں سے سبب پوچھا۔ انھوں نے سمجھایا کہ بھائی تمھارے معدے میں مواد بھر گیا تھا، سو ہم نے آپریشن کر کے اسے نکال دیا ہے۔

آٹھ دس روز بعد ڈاکٹروں نے اسے پانچ ہزار روپے دیے اور کہا کہ بس اب اپنے گھر کی راہ لو۔ وہ ٹھیک سے چل نہیں سکتا تھا اس لیے ایک آدمی اسے ریلوے اسٹیشن لے جانے کے لیے بھیجا گیا۔ اس کے سہارے نحیف و نزار مستان کسی طرح ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ آدمی کو کچھ نذرانہ دے کر اس نے پوچھا بھیا سچ بتاؤ میں اتنا کمزور کیوں ہو گیا ہوں؟۔

آدمی نے بتایا، تمھارا ایک گردہ نکال لیا گیا ہے۔

ادھر مستان بنگلور اپنے گھر پہنچا۔ یہ سن کر بڑا بھائی اسے وہاں کے ایک سرکاری انسٹی

ٹیوٹ میں لے گیا۔ انسٹی ٹیوٹ میں الٹرا ساؤنڈ اسکیننگ سے پتہ چلا کہ یچ مچ اس کا ایک گردہ غائب ہے۔ سارا قصہ سننے کے بعد انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹروں نے شرم سے سر جھکالیا۔

المیہ در المیہ یہ کہ مستان کو اس پرائیویٹ اسپتال کا اتہ پتہ بھی معلوم نہیں جہاں اس کا گردہ چوری ہوا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر بھی صرف اتنا سراغ دے سکے کہ چونکہ گردے کو عام حالات میں زندہ آدمی کے جسم سے نکالنے کے 15 منٹ کے اندر دوسرے آدمی کے جسم میں لگانا پڑتا ہے اس لیے مستان کا آپریشن یقینی طور پر کسی ایسے پرائیویٹ اسپتال میں ہوا ہے جہاں کم از کم دو آپریشن تھیٹر موجود ہیں!

یوں تو یہ ایک اہم سراغ تھا اور اس کی مدد سے ممبئی کی پولس چاہتی تو ایک دو دن میں ہی اس اسپتال کا پتہ چلا سکتی تھی لیکن ان دنوں اسے ندیم خان کے خلاف ثبوت جٹانے کے لیے فلمی ستاروں کی پوچھ تاچھ ہی سے فرصت نہیں تھی! بچاری بس اسی فکر میں تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے گلشن کمار کو کون قتل کر گیا۔

اور اگر بالفرض محال، میاں مستان ممبئی کی پولس کے پاس پہنچ بھی جاتا تو ساری شکایت سننے کے بعد غالباً اس کا جواب یہی ہوتا کہ ۔۔۔ لگتا ہے اس میں بھی داؤد ابراہیم کا ہاتھ ہے لہٰذا صبر کرو۔

دراصل آج کل ممبئی میں جو کچھ ہو رہا ہے بلکہ ممبئی کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی جو کچھ ہو رہا ہے، داؤد ابراہیم کے ہاتھ سے ہی ہو رہا ہے۔ تاریخ میں اس قسم کی حکمرانی کی کوئی اور مثال نہیں ملتی اور ایسا کوئی حکمراں ذہن میں نہیں آتا جس نے ہندستان سے باہر رہ کر اس طرح ہندستان حکمرانی کی ہو۔ ایک ہمایوں تھا، مگر جب وہ جان بچا کر ایران بھاگا تو ملک میں سکتہ شیر شاہ کا ہی چلا۔

اس دنوں ممبئی کا یہ حال ہے کہ کہیں کوئی بم پھٹے، کوئی ڈکیتی ہو، کسی کا قتل ہو جائے اور چاہے کوئی ٹرین ہی کیوں نہ پٹری سے اتر جائے سب میں داؤد کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی کو کسی بات پر تھپڑ بھی مار دے اور معاملہ پولس کے پاس پہنچ جائے تو وہاں بھی تھپڑ مارنے والے کو یہی کہا جائے گا۔ "کیوں بے سالے؟ داؤد کے لیے کام کرتا ہے؟"

ایک صاحب نے ممبئی کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"آج کل اتنے سارے معاملوں میں داؤد کا ہاتھ ہے کہ خود داؤد کو بھی پتہ نہ ہوگا۔ دوبئی میں ہندستانی اخبار پڑھتا ہوگا تو ہر خبر پر اچھل پڑتا ہوگا کہ ارے میں نے بنک میں ڈکیتی

ڈالوادی! فلاں فلمی ستارے سے کروڑوں روپے بھی اینٹھ لیے اور فلاں ٹرین بھی پٹڑی سے اتروادی۔ کمال ہے! میں نے اتنا سب کچھ کر دیا اور مجھ کو خبر نہیں۔ لعنت ہے مجھ پر!"

اور میاں عبدالقدوس نے تو کمال ہی کر دیا۔ ایک دن کہنے لگے۔

"بھائی خدا محفوظ رکھے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بال ٹھاکرے کی حکومت کے پیچھے بھی داؤد کا ہاتھ ہے۔ پھر کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ "کبھی کبھی یہ سوچ کر دل لرز جاتا ہے کہ اگر داؤد کا ہاتھ نہ رہا تو ممبئی کی پولس بچاری کیا کرے گی؟ کس کے گھر جائے گا طوفان بلا میرے بعد؟"

معاف کیجیے۔ بات ڈاکٹروں کی چل رہی تھی اور ہم جا نکلے دوبئی اور ممبئی کی طرف! ذکر ہو رہا تھا اپنے ملک کے ڈاکٹروں کی ذہانت کا کہ انھوں نے دنیا کو جینس اور ڈی این اے کے بارے میں بتایا۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ انسان کے جسم میں جانور کا دل لگا کر نام کمایا۔ دل بدلنے میں وہ مہارت حاصل کی کہ بار بار دل بدلنے میں ماہر سیاست داں بھی اپنے پیشے میں حاصل نہ کر سکے۔

لیکن وہ انسان کے گردے بھی چوری کر سکتے ہیں' اس کا اندازہ ہمیں نہیں تھا۔

اردو شاعری کے معشوق کو ضرور یہ وصف حاصل کر رہا ہے کہ وہ اکثر عاشق کا دل چرا لیا کرتا ہے۔ فلمی شاعری کے معشوق نے اس معاملے میں ذرا ترقی کی تو "جانے کہاں میرا جگر گیا جی!" جیسی شکایتیں بھی سننے کو ملنے لگیں۔ لیکن گردے پھیپھڑے کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ اس معاملے میں ممبئی کے ڈاکٹر یقینی طور پر اپنا دونوں معشوقوں سے بازی لے گئے ہیں اور اب جا کر پتہ چلا ہے کہ دل اور جگر کس طرح چوری ہوتے ہیں!

ماضی میں جب ڈاکٹر حضرات ذہنی ارتقا کی اس منزل کو نہیں پہنچے تھے تو خود اپنی ہی چیزیں مریض کے جسم میں چھوڑ دیا کرتے تھے۔ کوئی مریض کے معدے میں قینچی بھول گیا۔ کسی نے پھیپھڑوں میں روئی چھوڑ دی۔ کسی کے دل میں نشتر پڑا رہ گیا اور وہ تڑپ تڑپ کر پکارتا رہا' بلکہ پکار پکار کر تڑپتا رہا کہ

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو

کچھ ڈاکٹر زیادہ چالاک اور کائیاں ہوتے تو وہ مریض کے جسم کو سیف ڈپازٹ کے طور پر استعمال کر لیتے تھے۔ یعنی ایک آپریشن میں کچھ سامان اندر چھوڑ دیا اور کچھ عرصہ بعد دوسرے آپریشن میں واپس نکال لیا۔ بلکہ مریض میں اب بھی کچھ جان باقی رہی تو آلات سرجری پھر اسی طرح محفوظ کر دیے تاکہ تیسرے آپریشن میں فوراً ادھر ادھر نہ بھاگنا پڑے۔

لیکن اب ہمارے ڈاکٹر زیادہ سیانے ہو گئے ہیں۔ دل کا آپریشن کریں تو چپکے سے گردہ

چرا لیتے ہیں۔ گردے کا آپریشن ہو رہا ہو تو جگر اڑا لیتے ہیں۔ اور جگر کا آپریشن چل رہا ہو تو علیٰ ہذا القیاس۔

جیسے جیسے عمل جراحی کی میڈیکل سائنس ترقی کر رہی ہے انسانی اعضا کی قیمت اور اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ صرف پانچ چھ ہزار روپے خرچ کر کے ڈاکٹروں نے مستان کا جو گردہ چوری کیا تھا اسے اگر مستان خود کھلے بازار میں بیچتا تو دو لاکھ سے پانچ لاکھ روپے تک حاصل کر سکتا تھا۔

اب خدا نخواستہ سائنس نے کہیں اور ترقی کر لی تو گردے کی طرح پھیپھڑے، کلیجی، زبان اور مغز وغیرہ بھی فروخت ہونے کی نوبت بھی آسکتی ہے اور پھر اس کے بعد۔ یہ منظر بھی دکھائی دے سکتا ہے کہ مریض ٹانگ کا آپریشن کرانے کے لیے آپریشن تھیٹر میں جا رہا ہے اور جب واپس آتا ہے سر پر ہاتھ پھیرتے ہی پتہ چلتا ہے کہ دلیاں کان غائب ہے' یا ایک آنکھ چوری ہو گئی ہے' یا کسی نے ناک صاف کر دی وغیرہ وغیرہ۔

آپ ہی بتایئے اگر ٹی وی پر ریڈیو پر یہ فلمی گانا آرہا ہو کہ۔

چرا لیا ہے تم نے جو دل کو نظر نہیں چرانا صنم

تو ہمیں ایسے صنم سے خوف کھانا چاہیے یا نہیں!؟ ●

فارم حسب قاعدہ

بابت "کتاب نما" نئی دہلی ۲۵

۱۔ مقام اشاعت. جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۲۔ وقفہ اشاعت ماہنامہ۔

۳۔ پرنٹر کا نام سید وسیم کوثر ہندوستانی پتا. جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

۴۔ پبلشر کا نام: " "

۵۔ اڈیٹر کا نام شاہد علی خاں

مالکان کا نام اور پتے. مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

چیرمین کا نام. ڈاکٹر سید ظہور قاسم اے۔۱۵ ڈیفنس کالونی' نئی دہلی ۲۴

۱۔ ڈائریکٹر. نواب اقبال محمد خاں۔ کف پریڈ کولابہ' ممبئی ۵۔

۲۔ لفٹیننٹ جنرل ایم۔ اے۔ ذکی وی۔ سی۔ لاج جامعہ نگر' نئی دہلی ۲۵۔

۳۔ خواجہ محمد شاہد ڈی ۱۱/۳ قدوائی نگر ویسٹ نئی دہلی ۲۵۔

۴۔ صدیق الرحمٰن قدوائی۔ باغ شفیق' جامعہ نگر' نئی دہلی ۲۵۔

کمپنی کے سرمایے کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصے دار جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔ اسلام جیم خانہ کینڈی سی فیس ممبئی ۷

میں سید وسیم کوثر تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

مارچ ۱۹۹۸ء دستخط

سید وسیم کوثر

تجمل حسین خاں
شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

جامعہ میں مذہبی نثر کا ارتقاء

اسلم جیراجپوری نے مذہبی نثر کی روایت میں زبردست اضافہ کیا۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں جو بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ارکان اسلام، تاریخ الامت، سیرۃ رسول، خلافت بنی امیہ، خلافت عباسیہ، عباسیہ مصر، تعلیمات قرآن: اصول دین وعقائد، آل عثمان، تاریخ نجد، تاریخ اسلام اور قرآن، تاریخ قرآن، تعلیمات قرآن مجید: عقائد، جواہر ملیہ، خواتین، الدراستہ فی الاسلام، زیدان: علوم عرب ترجمہ، سیرۃ عمرو بن عاص، فاتح مصر، شمع ملت، عربی خط، محجوب الارث، مجوب الارث: یتیم پوتوں کی روایت کا مسئلہ، مقالات اسلم، نکات قرآن، نوادرات ہمارے دینی علوم وغیرہ ان کی مذہبی نثر کی دین ہیں۔

الیاس احمد مجیبی نے بھی مذہبی نثر میں طبع آزمائی کی۔ ان کی تصانیف آں حضرتؐ، حبیب خدا، حضرت نظام الدین اولیاؒ، خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ، دس جنتی، سرکار کا دربار، شہید کربلا، اصحابہ کرام، صدیق اکبرؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، عمر فاروقؓ، کرشن کنہیا وغیرہ خاص ہیں۔

عبدالواحد سندھی نے بھی مذہبی نثر میں کئی کتابیں لکھیں۔ اسلام کے مشہور امیر البحر، اسلام کیسے پھیلا، قرآن پاک کیا ہے اور اس نے کیا کر دکھایا، وغیرہ ہیں۔

محمد حسین حسان کی مذہبی نثر میں صرف دو کتابیں یادگار ہیں اول سرکار دو عالم، دوم ناموران اسلام۔

عبدالملک صاحب نے بھی مذہبی نثر میں خاصی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی کتابیں تعلیمات قرآن مجید: اخلاق، تعلیمات قرآن مجید: عبادت، تعلیمات قرآن مجید: معاملات، زکوٰۃ ضروری مسائل، قصص قرآن مجید۔ ۲ حصے، کعبہ شریف، مدینہ منورہ، نکاح: ضروری مسائل، نماز دو حصے، دعوت اسلام کا کام عالم کی حیات وغیرہ خاص ہیں۔

سعد الدین انصاری نے بھی کئی کتابیں مذہبی نثر میں لکھی ہیں جیسے درس القرآن والحدیث،

اور محاسن اسلام ہیں۔
بدرالدین حافظ نے ایک کتاب دو حصوں میں مذہبی نثر میں لکھی جس کا عنوان اسلامی معلومات ہے۔
جعفر رضا بلگرامی نے بھی دو کتابیں لکھیں اوّل حسین اور نظام حیات دوئم کربلا کی زندگی۔
محمد سرور نے بھی کئی کتابیں لکھیں مثلاً مولانا عبید اللہ سندھی: حیات زندگی تعلیمات اور سیاسی افکار، ولی اللہ: تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ تاریخ، ولی اللہ: تصوف کے آداب اشغال اور ان کا فلسفہ، ولی اللہ: مشاہدات و معارف، عبید اللہ: خطبات مولانا عبید اللہ سندھی، وغیرہ ہیں۔
عبدالعلیم ندوی نے بھی ایک کتاب مذہبی نثر میں لکھی جو زبان عربی میں ہے۔
عبدالعلیم صاحب نے مذہبی نثر میں خاصا اضافہ کیا۔ مثلاً سیرۃ نبوی اور مستشرقین، عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ اور ہندوستان میں عربی ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس و تحقیق وغیرہ۔
رئیس احمد جعفری جامعہ کے مذہبی نثار میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے بھی مذہبی نثر میں کافی اضافہ کیا۔ اسلام اور رواداری، اسلام اور عدل و احسان، فاخرہ، ابن قیم: زاد المعاد (ترجمہ) عباس محمود: فارابی، محمد ابوزہرہ: حیات امام احمد بن حنبل وغیرہ۔
مشیر الحق صاحب نے بھی مذہبی نثر کی روایت کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اسے استحکام بخشا۔ ان کی کتابیں مذہبی نثر میں متعدد ہیں۔ مثلاً ترجمہ قرآن: منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت ابوذر غفاری، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، حضرت طلحہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ فرید الدین گنج شکر، مذہب اور جدید ذہن، مذہب اور ہندوستان مسلم سیاست کل اور آج، مسلمان اور سیکولر ہندوستان، نیک بیٹیاں، ابوالحسن علی ندوی: شرق اوسط میں کیا دیکھا (ترجمہ)، اسمتھ: اسلام دور حاضر میں (ترجمہ، مرتب)، برکات احمد: رسول اکرم اور یہود حجاز، لیوی: اسلامی سماج (ترجمہ)، قدوائی: چند تصویر نیکاں (مرتب) وغیرہ ہیں۔
ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے بھی مذہبی نثر میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اور مختلف مذہبی موضوعات کو مذہبی نثر میں لکھا۔ ان کی کتابیں اسلام اور بدلتی دنیا، اسلام میں راسخ الاعتقادی۔ بیچ کی راہ، اشخاص و افکار، حضرت جنید بغدادی، محمد رسول اللہ:

دو خطبے، مسلمانوں کا تعلیمی نظام، مولانا ابوالکلام آزاد، فکر و فن کی چند جہتیں، وغیرہ ہیں۔

جامعہ کی مذہبی نثر لکھنے والوں کا یہ مختصر سا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ان نثاروں نے ایسی کتابیں لکھیں جو کہ بے حد شاندار اور معلوماتی نوعیت کی ہیں۔ یہ وہ نثر نگار ہیں جنھوں نے اپنے مذہبی نثر کے سفر کو مکمل کر لیا ہے۔ ہم ان ہی مذہبی نثاروں میں چیدہ نثاروں کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

مذہبی نثر کو جامعہ میں جن نثاروں نے متعارف کرایا اور اس میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ان میں سرفہرست مولانا اسلم جیراجپوری کا نام آتا ہے۔

مولانا اسلم جیراجپوری جامعہ کی ان اہم شخصیات میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنا تن، من، دھن سب جامعہ کی راہ میں قربان کر دیا اور تمام زندگی جامعہ کے لیے وقف کر دی۔ علوم اسلامی اور عربی و فارسی زبان و ادب میں مولانا اسلم جیراجپوری کی بڑی گہری نظر تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے قرآن و قرآنی علوم کی تفہیم و تشریح میں کافی کچھ لکھا اور تاریخ اسلام کا موضوع ان کے لیے کافی دلچسپ تھا۔ تاریخ اور سوانح بھی مولانا نے بڑی زبردست لکھی ہیں۔

مولانا کو بچپن سے ہی لکھنے کا بے حد شوق تھا۔ اپنی تصنیف سے متعلق مولانا اپنے مضمون "میری طالب علمی" میں رقمطراز ہیں۔

"لکھنے کا شوق مجھے بچپن سے ہے۔ جب میری عمر ۱۲ سال کی تھی اس وقت فارسی قواعد میں ایک مختصر رسالہ فارسی زبان میں "قواعد اسلمیہ" کے نام سے لکھ کر بھوپال کے سرکاری مطبع سے شائع کرایا تھا، مگر میری تصنیفی زندگی دراصل علی گڑھ کالج سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے وہاں میں نے ۱۳۲۵ھ [۸-۱۹۰۷ء] میں تاریخ القرآن لکھی جو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نیز علی گڑھ کالج میں دینیات کے نصاب میں داخل کی گئی اور عرصے تک رہی۔"[1]

مولانا اسلم جیراجپوری نے جامعہ میں علمی کام انجام دیئے۔ جامعہ کے مقاصد میں دینی و دنیاوی علوم میں ہم آہنگی کی بدولت جو لوگ جامعہ کو دینی تعلیم کا ادارہ اور دینی غور و فکر کا مرکز سمجھتے تھے ان کے نزدیک مولانا اسلم جیراجپوری کی تصانیف جامعہ کے علمی کاموں میں شمار ہوتی تھی کیونکہ ان کے خیالات میں جامعہ کی دینی سرگرمیاں نظر آتی تھیں۔

---

[1] میری طالب علمی، اسلم جیراجپوری، مولانا جیراجپوری نمبر، رسالہ جامعہ (دہلی) ۱۹۸۲ء، مارچ تا مئی، ص ۴۶

مولانا اسلم جیراجپوری نے جامعہ کے لیے بہت کام کیے۔ انھوں نے جامعہ کی زیادہ سے زیادہ ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی اور ہمیشہ اپنی طبیعت میں توازن کو برقرار رکھا۔

مولانا جامعہ میں اسلامیات کے مدرس تھے۔ اور انھوں نے ہمیشہ بڑی ایمانداری کے ساتھ طالب علموں کو پڑھایا۔ وہ نصاب کو وقت مقررہ سے قبل ہی مکمل کرا لیا کرتے تھے۔ مولانا اسلم جیراجپوری کو مولانا محمد علی جامعہ لائے تھے۔ اس کی غایت یہ تھی کہ جامعہ میں دینی تعلیم کے جدید اصولوں اور نئی بنیادوں پر انتظام کرنا چاہتے تھے۔ اور مولانا کی نظر نہ صرف علوم اسلامی بلکہ اس کے درس و تدریس پر بھی زبردست تھی۔ سعید انصاری اسلم جیراجپوری سے متعلق فرماتے ہیں۔

"مولانا قدیم نصاب تعلیم میں سرے سے کلی انقلاب چاہتے تھے۔ اور جدید درس گاہوں میں اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کا وجود خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہاں طلبا کو عربی زبان پختہ طور پر پڑھا کر خالص قرآن و سنت یعنی عمل بالقرآن کی تعلیم دینا مقصود تھا، اور بس! اس کے بعد ان کو زندہ دنیاوی علوم سکھانے کا پروگرام تھا تاکہ وہ روزی پیدا کر سکیں اور دین کو دنیا کمانے اور ملت میں تفرقہ ڈالنے کا ذریعہ نہ بنائیں[1]۔"

"تاریخ القرآن" مولانا کی یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں انھوں نے قرآن کے نزول، اس کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے اور قرآن کی تاریخ کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن و حدیث، ترتیب قرآن، ربط قرآن، حفاظت قرآن، جمع قرآن، شیعہ اور قرآن، حروفِ مقطعات اور نسخ آیات جیسے اہم مسئلوں پر بھی بحث کی ہے اور یہ بحث بڑی ہی کارآمد ہے۔ اس میں مولانا نے اپنے قلم سے وہ موشگافیاں کی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مولانا نے اپنے اڈیشن پر نظر ثانی کر کے اسے دوبارہ شائع کیا۔ انھوں نے اس کتاب کو لکھتے وقت قرآن ہی کو ماخذ بنایا اور اسی سے مدد لی۔ مشیر الحق ان کی کتاب "تاریخ القرآن" کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

"مولانا بھی دوسرے اہل علم کی طرح وحی کی چار صورتیں بتاتے ہیں۔ (۱) رویائے صادقہ (جس کے ذریعہ اصول شریعت کی تلقین نہیں ہوتی" ص ۱۳) (۲) احکام کا بلاواسطہ نبی کے دل پر القا (۳) نبی سے براہ راست تخاطب (۴) فرشتے کے ذریعہ تنزیل۔ عام علما اور

---

[1] مولانا اسلم جیراجپوری اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، سعید انصاری، "مولانا اسلم جیراجپوری نمبر" رسالہ جامعہ (دہلی) ۱۹۹۲ء صفحہ ۱۳۵۔

محققین اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کا نزول سات مختلف لغات میں ہوا ہے (خلاصہ جو سورۃ الزخرف ۴۳: آیات ۵۱، ۵۲ کی تشریح "ترجمہ قرآن مجید" از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن، لاہور ص ۱۲۳۱) مولانا اسلم کو اس خیال سے اتفاق نہیں تھا۔ انھوں نے وحی کی مذکورہ بالا چاروں قسموں کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد قرآن کی مختلف آیات کا سہارا لیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ قرآن صرف چوتھے طریقے کے مطابق جبریل امین کے ذریعہ آں حضرت صلعم پر نازل کیا گیا تھا۔"[1]

"تاریخ القرآن" میں شیعہ حضرات سے متعلق بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں۔

"قرآن کے حرفاً حرفاً محفوظ رہ جانے پر عقیدہ رکھنے کے باوجود اکثر یہ بات سننے میں آئی ہے کہ حضرات شیعہ موجودہ قرآن کو نامکمل مانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جمع و ترتیب قرآن کے وقت ان آیات کو خارج کر دیا گیا جن میں حضرت علی اور اہل بیت کے فضائل بیان کیے گئے تھے۔ مولانا اس خیال کی شدت سے تردید کرتے ہیں اور اپنے اس دعوے کو کہ موجودہ قرآن مکمل ہے اور اس میں کمی بیشی قطعاً نہیں ہوئی ہے۔ داخلی اور خارجی شواہد کی بنیاد پر ثابت کرتے ہیں۔ اولاً تو وہ مختلف دور کے شیعہ علماء کی رائے نقل کرتے ہیں جن میں یہ بات تو پوری شد و مد سے کہی گئی ہے کہ موجودہ قرآن مکمل ہے اور اس میں کسی قسم کی قطع و برید نہیں ہوئی۔ (ص ۶۲، ۶۷)"[2]

"سیرت عمرو بن عاص" یہ کتاب بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی سیرت سے متعلق لکھا ہے۔ اور اس کی زبان سادہ اور سلیس اختیار کی ہے۔ ان کی ولادت، تربیت، پیشہ وغیرہ سے متعلق بھی معلومات فراہم کرائی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی فتوحات شام، فتوحات مصر کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اسکندریہ پر ان کی فوج کشی، کتب خانہ اسکندریہ وغیرہ پر خاصی طوالت سے لکھا ہے۔ ان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں روانی غضب کی ہے۔ اور دوسرے یکسوئی کے ساتھ تمام واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ کہیں بھی بے کیفی و بے ربطی محسوس نہیں ہوتی۔ انتظام

---

[1] مولانا اسلم کی تاریخ القرآن: ایک جائزہ۔ مشیر الحق "مولانا اسلم جیراجپوری نمبر" رسالہ جامعہ (دہلی) ۱۹۸۳ء ص ۱۱۷۔

[2] ایضاً ص ۱۱۹ تا ۱۲۰۔

مصر، عہد عثمانؓ، امیر معاویہؓ و عمرو بن عاصؓ، صفات عمرو بن عاصؓ کے عنوان سے یہی انھوں نے اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ ان کی سوانح عمری سے متعلق اسلم جیراجپوری فرماتے ہیں کہ :

"حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جو فتوحات اسلامیہ کے ایک عظیم الشان بطل اور دولت عربیہ کے ایک زبردست رکن تھے جماعت صحابہ میں اپنی اس خصوصیت میں نمایاں تر ہیں کہ میدان شجاعت اور مضمار سیاست دونوں کے شہ سوار ہیں۔ اگر ایک طرف جنگ و جہاد میں وہ حضرت خالد بن ولیدؓ اور سعد بن وقاصؓ کے دوش بدوش ہیں تو دوسری طرف حزم و تدبیر میں حضرت عمرؓ اور امیر معاویہؓ کے پہلو بہ پہلو ہیں۔ اس لیے میں نے چاہا کہ اردو میں ان کی سوانح عمری لکھ دوں تاکہ یہ زبان اس نامور فاتح اور حامی اسلام کے حالات سے خالی نہ رہے اور میرے بھائی اس سے نفع اٹھائیں۔"[1]

حضرت عمرو بن عاصؓ بہادر اور نامور فاتح تھے۔ انھوں نے کئی فتوحات حاصل کیں۔ فتوحات شام اس لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ خطرہ اس ملک شام سے تھا کیونکہ وہاں حضرت اسامہؓ کی تاخت و تاراج کی وجہ سے وہاں کے عوام کے دلوں میں انتقام کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔ اور دوسرے وہ پوری طاقت سے مسلمانوں کی افواج کو نیست و نابود کرنے کے درپے تھے۔ لیکن عمرو بن عاصؓ نے شام کی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

"اس فوج کی کثرت کا حال سن کر عمرو بن عاصؓ کے ساتھیوں میں خطرہ پیدا ہوگیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں خوف زدہ ہیں اس لیے جب رومی مقدمۃ الجیش قریب آیا تو ایک ہزار سوار عبداللہ بن عمرؓ بن خطاب کو دے کر ایک طرف بھیجا انھوں نے بے دریغ حملہ کر دیا۔ دوسری طرف ایک ہزار سواروں کو لے کر خود بڑھے اور صفیں چیرتے ہوئے جا کر رومی سردار کے سینہ پر ایسا نیزہ مارا کہ پار ہوگیا اس کے ساتھ ہزیمت اٹھا کر بھاگے ان کا سارا ساز و سامان مسلمانوں کو غنیمت میں ملا اور ان کی ہمتیں قوی ہوگئیں۔"[2] (جاری)

---

[1] حضرت عمرو بن عاصؓ۔ اسلم جیراجپوری، ۱۹۸۳ء ص ۱۱۔
[2] ایضاً ص ۱۹۱۔

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

اعلا تعلیم

مترجم: مسعود الحق
مبصر: ڈاکٹر نیر جہاں
صفحات: ۱۷۶
قیمت: ۱۲۰ روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ترجمہ کی تعریف یہ ہے کہ کسی مصنف کے ذاتی خیالات کو اپنی زبان کا جامہ پہنا کر اور اپنے الفاظ و محاورات کا سانچا عطا کر کے اہل اردو کے سامنے اس انداز سے پیش کرنا کہ ترجمے اور تخلیق میں کوئی فرق نہ معلوم ہو۔ اس تعریف کو مد نظر رکھتے ہوئے جب ہم Dy-namic University کے اردو ترجمے کا جائزہ لیتے ہیں تو اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ مسعود الحق نے ذاکر صاحب کے خطبات کو اردو کا قالب عطا کر کے اردو ادب اور تعلیمی دنیا پر احسان کیا ہے۔ انھیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یقیناً قدرت حاصل ہے۔ وہ اپنے ترجمہ میں ذاکر صاحب کے لہجہ اور انداز کو برقرار اور ان کے مفہوم کو کامیابی کے ساتھ اردو زبان میں منتقل کر سکے ہیں۔ البتہ اصل متن کے جملوں کی ساخت اور تراکیب کی پیروی کرنے کے سبب جملے کہیں کہیں طویل ہوگئے ہیں۔ لیکن قاری اس ترجمہ کو پڑھ کر کسی ابہام کا شکار نہیں ہوگا بلکہ جو بات ذاکر صاحب اپنے خطبات میں کہنا چاہتے تھے اس تک قاری کے ذہن کی رسائی ہو جاتی ہے۔ وہ اصل عبارت کے الفاظ ہی نہیں اس کے بین السطور کو بھی قاری کے سامنے لے آئے ہیں اور ایک مترجم کی کامیابی کا سارا دارومدار اسی پر ہے اور اس لحاظ سے مسعود الحق مبارک باد کے مستحق ہیں۔

یوں تو ذاکر صاحب نے اپنے تعلیمی خطبات میں زیادہ تر ابتدائی و ثانوی تعلیم کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ لیکن Dynamic University میں وہ عام طور سے اعلا تعلیم سے بحث

کرتے ہیں۔ اس کتاب میں بارہ خطابات Dynamic University کے ہیں جب کہ دو خطبے Dent Zakir Husains Speeches سے لیے گئے ہیں۔ کل چودہ خطبات مجیب صاحب کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔

"اعلا تعلیم" کے بیشتر خطبات میں قومی تعلیم، بنیادی تعلیم، ثانوی تعلیم، تربیتی پروگرام، کردار سازی کے پروگرام، اچھے استاد کی خوبیاں وغیرہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ذاکر صاحب کا زور ہے کہ قومی تعلیم قومی کنٹرول میں ہونی چاہیے، ورنہ تعلیم ملکی مفادات کے بجائے غیر ملکی مفادات کی تکمیل کرے گی۔ تعلیم کا لازمی جزو عملی اور انسانی کام ہے۔ ہماری تعلیم اور ہمارے استاد کا رابطہ داخلی کے ساتھ خارجی دنیا سے بھی ہونا چاہیے۔ اپنے سماج سے ہونا چاہیے۔ تعلیم ہمارے نوجوانوں کو نہ صرف ایک اچھا طالب علم بنائے بلکہ مفید شہری بنانے کا فرض بھی انجام دے سکے تاکہ وہ ملک و قوم کے کام آسکیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں اپنے نصاب پر بھی نظر ثانی کرنی چاہیے اور اس میں انقلابی تبدیلی لانی چاہیے۔ درس و تدریس کے طریقہ کار پر بھی غور و فکر ہونا چاہیے اور بہت سارے سوالات، مثلاً لیکچر کا طریقہ مناسب ہے یا گروہی تبادلہ معروضی جانچ کا طریقہ مفید ہے یا روایتی امتحان کا یا دونوں کا۔ استادوں کا انتخاب تحقیق کے لیے ہو، تدریس کے لیے یا تدریس و تحقیق دونوں کے لیے، اس قسم کے بہت سے سوالات اپنے جواب کے منتظر ہیں۔ انھوں نے اکثر خطبات میں تعلیم اور اس کے مختلف مسائل، معلم کے فرائض، یونی ورسٹی کی کارکردگی پر بے اطمینانی اور نوجوانوں کی ذہنی پراگندگی جیسے موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

ذاکر صاحب کے مخاطب صرف طالب علم نہیں، معلم بھی ہیں۔ ایک اچھا طالب علم استاد کی کوششوں کا نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ اچھا استاد اپنے طالب علم کے ذوق و شوق کو ابھارتا ہے۔ اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتے ہے اور گمراہ ذہن کی رہنمائی کرتا ہے۔ اچھا استاد بچوں میں مثالی انسان بننے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ استاد کو چاہیے کہ وہ خود کو ہمیشہ ایک طالب علم تصور کرے۔ اسی خیال سے انھوں نے جامعہ میں اساتذہ کی تربیت کے لیے ایک کالج قائم کیا تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین جہد مسلسل اور عمل پیہم کا مکمل نمونہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ زندگی لگاتار عمل کا نام ہے اور عمل ہی زندگی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ساری زندگی عمل کی راہ پر گامزن رہے۔ خواہ وہ ایک طالب علم رہے ہوں، ایک استاد، ایک ماہر تعلیم یا گورنر، نائب صدر یا پھر صدر جمہوریہ ہند۔ حرکت میں زندگی اور سکوت میں موت ہے۔ اس مقولہ پر وہ زندگی

پھر عمل کرتے رہے اور موت کو گلے لگا لینے کے بعد ہی سکوت کو خود پر طاری ہونے دیا۔

لیکن ان کے میدان عمل کا جائزہ لیا جائے تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کی ساری زندگی تعلیم، تعلیمی منصوبے، تعلیمی مراکز، معلم اور طالب علم کے ارد گرد ہی گھومتی رہی۔ اچھی اور بہتر تعلیم' وہ تعلیم جو صرف کتابی نہ ہو' جو انسان کو اجتماعی طور پر بدل کر رکھ دے' اسے مفید شہری بننے کی ترغیب دے سکے۔ تعلیم نام ہے دماغ' جسم اور روح کی تربیت کا' تعلیم نام ہے ذہن کی پرورش کا' اور تعلیم نام ہے کردار سازی کا۔ انھوں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "تعلیم وہ عمل ہے جس کے ذریعے فرد کے ذہن کی ممکنہ اور مکمل نشوونما کی جاسکتی ہے۔" تعلیم انسان کو مشین بنانے کا کام انجام نہیں دیتی بلکہ سماج میں برسر عمل قوتوں سے بھی واقف کراتی ہے۔ ایک انجینئر صرف مشینوں کے کل پرزوں کا علم ہی نہ رکھے بلکہ اسے انسانی رشتوں کا بھی پاس ولحاظ ہونا چاہیے۔ وہ مشین گر ہی نہ ہو' خوبصورت اشعار' دلکش مناظر اور دلنشیں موسیقی سے بھی لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ غرض کہ یہ تعلیمی خطبات ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ان خطبات کی ہر بات بامقصد' بامعنی کارآمد اور دلوں کو چھونے والی اور روح کو سرشار کرنے والی ہے۔ ان خطبات کی روشنی میں ہم اپنے تعلیمی مسائل کا حل تلاش کرسکتے ہیں۔

طلوع

مصنف: منصورہ احمد
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
صفحات: ۲۳۲
قیمت: ۱۶۰ روپے
ناشر: اساطیر ۴۵ ۱ اے مزنگ روڈ' لاہور

"طلوع" منصورہ احمد کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں منصورہ احمد کی دلکش غزلیں' نظمیں اور قطعات شامل ہیں۔ غزلوں اور قطعات کی تعداد کم ہے لیکن پوری کتاب میں آزاد اور معریٰ نظموں کا گلزار کھلا ہوا ہے۔ ان نظموں میں بعض طویل بھی ہیں اور بعض چھوٹی اور پر اثر' جن کے موضوعات دلچسپ اور خیالات گہرے ہیں۔ انداز بیان سادہ اور زبان شستہ ہے۔ کتاب کا دیباچہ خود مصنفہ کا تحریر کردہ ہے جس کا عنوان "اثاثہ" رکھا گیا ہے اس سے شاعرہ کے شعری سرچشموں اور علمی مآخذ کا علم ہوتا ہے۔ "اثاثہ" سے قبل ایک نہایت جامع مقدمہ "منصورہ کی شاعری" کے عنوان سے اردو کے مایہ ناز ادیب احمد ندیم قاسمی کا لکھا ہوا ہے۔ دیباچہ میں "طلوع" کی شاعری کی جملہ خصوصیات کا احاطہ کیا گیا

ہے اور منصورہ کو "منفرد لحن" اور "بڑے ویژن" کی شاعرہ کہا گیا ہے منصورہ نے بھی کئی نظمیں اپنے بابا کے نام لکھی ہیں جو حیرت اور استعجاب کی حد تک متاثر کرتی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے مقدمہ میں منصورہ کی شاعری کا بڑا ہی خوبصورت فنی اور شعری جائزہ لیا گیا ہے انھوں نے مصنفہ کی شاعری کمالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "اس نے محسوس اور جانے پہچانے پیکروں کو نئے پیرہن دے کر اردو شاعری کو ایک انتہا درجے کی معنی خیز امجری سے نوازا ہے اور وہ بھی فارسی عربی کی بھاری بھرکم تراکیب اپنائے بغیر۔"

اس دیباچہ میں ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ

> "منصورہ بیسویں صدی کی آخری حصہ کی شاعرہ ہے جس کا لہجہ منفرد اور جس کا لحن مستقبل گیر ہے۔ سچی اور معیاری شاعری کے متوالے منصورہ کے فن سے جتنی بھی امیدیں وابستہ کریں' وہ میرے اندازوں کے مطابق حرف بحرف پوری ہوں گی کہ وہ مثبت معنوں میں ایک غیر معمولی فنکار ہے۔ آنے والے سب دنوں پر پھیلا ہوا مستقبل اس کا ہے۔

کتاب کی کمپوزنگ اغلاط سے پاک اور چھپائی بے داغ ہے۔ طباعت اور کاغذی عمدگی نے اسے اور بھی زیادہ خوبصورت اور معیاری بنا دیا ہے۔ سرورق رنگین اور سادہ ہونے کے باوجود بے حد دلکش ہے۔ کتاب کا عنوان یعنی لفظ "طلوع" خط نستعلیق کا عمدہ نمونہ ہے جس میں سنہری روشنائی استعمال کی گئی ہے بس یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جلی قلم سے سونے کا پتر کا ٹکر لگا دیا گیا ہو۔ اردو کی کتابوں میں اتنے من موہک اور دیدہ زیب ٹائیٹل شاذ ہی دیکھنے کو ملیں گے۔ گرپوش کے آخری صفحہ یعنی کتاب کی پشت پر مصنفہ کی تصویر ہے منصورہ احمد کی شاعری کا یہ طلوع ہے اور یہ آفتاب تازہ ایک دن ضرور نیر درخشاں بن کر ابھرے گا۔ توقع یہ کتاب ادبی دنیا میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

مضامین مقبول

مصنف: پروفیسر مقبول احمد
مبصر : عبدالطیف اعظمی
طباعت: ۱۹۹۷ء
قیمت : ۲۲۰ روپے
ملنے کے پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' جامعہ نگر' نئی دہلی ۲۵
دار المصنفین شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ (یوپی)

زیر تبصرہ کتاب کے فاضل پروفیسر مقبول احمد صاحب خوش قسمتی سے میرے ہم وطن ہیں اور شبلی اکیڈمی (اعظم گڑھ) سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ رفیق دارا لمصنفین مولانا عمیر الصدیق ندوی نے اپنے تاثرات میں لکھا ہے کہ "ان کا آبائی شہر و مولد بنارس اور آباؤاجداد کا وطن اعظم گڑھ ہے۔" چونکہ موصوف کے آباؤاجداد کے وطن سے میرا گہرا اور پائندار تعلق ہے۔ اس لیے شاید اسی لیے انھوں نے زیر تذکرہ کتاب کے لیے مجھ خاکسار کو یاد کیا۔ لہٰذا ان کے حکم کی تعمیل میں اپنا تبصرہ و تعارف پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں۔ ملاحظہ ہو۔

کتاب کا حرف آغاز خود مصنف کے قلم سے ہے جو صرف ایک صفحے پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد ملک کے مشہور اور ممتاز دانشور مرحوم پروفیسر خلیق احمد نظامی کا پیش لفظ ہے جو مختصر ہونے کے باوجود قابل قدر ہے۔ بعد ازاں برادرم مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا پیش گفتار اس کے بعد مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے سرجری کے ریٹائرڈ پروفیسر نسیم انصاری صاحب کا چھ صفحے کا تعارف ہے اور بعد ازاں مولانا عمیر الصدیق ندوی رفیق دارا لمصنفین کے "چند تاثرات" ہیں۔ پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو مختلف ابواب پر مشتمل ہے۔ مثلاً (۱) مذہبیات (۲) دنیائے اسلام اور مغرب (۳) ہندستانی مسلمانوں کے مسائل (۴) تعلیم و تربیت (۵) اصلاح معاشرہ (۶) سائنس اور طنز و مزاح۔

باوجود اس کے کہ فاضل مصنف بقول مولانا ضیاء الدین اصلاحی "کلکتہ کے پروفیسر مقبول احمد ایک ماہر و حاذق ڈاکٹر اور کامیاب سرجن کی حیثیت سے عالمی شہرت کے حامل ہیں۔" پھر بھی خاکسار تبصرہ نگار کو تعجب ہے کہ ان تمام خوبیوں اور اوصاف کے باوجود فاضل مصنف وسیع اور متنوع موضوعات پر اظہار خیال کی وسیع قدرت رکھتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ فاضل مصنف کی ہر دالعزیز شخصیت کی طرح ان کی کتاب کو بھی حسن قبول عطا کرے۔ آمین

تعبیر و تفہیم

مصنف: ڈاکٹر خلیق انجم
مبصر: ڈاکٹر رضیہ حامد
قیمت: ۱۳۵ روپے
صفحات: ۱۵۹
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ڈاکٹر خلیق انجم اردو زبان ادب کے صف اول کے نقاد ہیں۔ انکا شمار ماہر غالبیات میں بھی ہوتا ہے

اردو زبان وادب کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری ہیں۔ انھوں نے اس کو خود کفیل اور مستحکم کر دیا ہے۔ اپنی بناہ بے معروفیات کے باوجود ڈاکٹر خلیق انجم کی قلم سے دوستی برقرار ہے اور تحقیق و تنقید، اوڑھنا بچھونا۔ تعبیر و تفہیم" کے زیادہ تر مضامین مختلف سیمیناروں کے لیے لکھے گئے ہیں اردو ہندستان و پاکستان کے مختلف ادبی رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔

ماہر غالبیات ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کتاب میں غالب سے متعلق مضامین میں، پہلے مضمون "حالی اور غالب" کے تعلق کو بتاتے ہوئے یادگار غالب لکھنے کے سلسلہ میں حالی کا تذبذب اور اس کی وجہ بتائی ہے۔ حالی کی تحریر کردہ دوسری سوانح حیات جاوید ہے جس کو حیات دوام حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے مضمون میں غالب اور حالی کی اس خط و کتابت کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے جو حالی نے مذہب کے سلسلہ میں غالب کو لکھے تھے اور غالب نے ان کا جواب دیا تھا۔ رسالہ حیات نو، میں مرزا غالب کے خطوط شائع ہوئے تھے ان رسائل کی تلاش اور ناکامی کا ذکر بھی کیا ہے۔

مضمون جو مرزا غالب کی رنگارنگ بزم آرائیاں، میں ڈاکٹر خلیق انجم کا پیرایہ بیان تمام مضامین سے منفرد ہے۔ انھوں نے غالب کے خطوط کے ذریعہ ایک بزم سجائی ہے اور انداز ڈرامائی ہے جو نہایت پرکشش، دل فریب اور دلکش ہے۔ اختتام ملاحظہ ہو۔

"غالب خاموش لیٹے ہیں کبھی کبھی اپنا ایک مصرع

"اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے۔ پڑھ لیتے ہیں اور کبھی یہ شعر ورد زبان ہوتا ہے ۔

دم واپسیں بر سر راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

چراغ کی روشنی مدہم ہوتی جارہی ہے۔ اہل محفل کے چہروں کی اداسی بڑھ رہی ہے وہ وقت نزدیک تر آتا جارہا ہے جس کا بہت دن سے خوف تھا۔ روشنی مدھم اور مدھم، لیجیے چراغ گل ہو گیا۔ اللہ بس باقی ہوس انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غالب سے متعلق تیسرے مضمون اردو مکتوب نگاری کی ابتدا اور دہلی میں اردو نثر کی ابتدائی تاریخ اور بتدریج ترقی بتائی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم اپنے مضمون میں ایک نتیجہ پر پہنچتے ہوئے غالب کے متعلق لکھتے ہیں۔

"جدید نثر کی ابتدا غالب سے ہرگز نہیں ہوتی، ہاں جدید نثر میں غالب کی حیثیت ایک صاحب طرز کی ہے جس نے اپنی جدت طبع اور ذہانت سے فن مکتوب نگاری کو عروج پر پہنچایا۔"

داغ کی شخصیت و سیرت میں داغ کا سوانحی جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ ان کے شاعرانہ خطوط کے اقتباسات سے مدلل طور پر بیان کیے ہیں۔

مضمون انیس کی رباعیاں، میں ڈاکٹر خلیق انجم مرثیہ اور رباعی کا ربط واضح کرتے ہیں۔ انیس، ایک مرثیہ گو شاعر تھے۔ اردو میں رباعی کو مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ فروغ حاصل ہوا۔ مرثیہ پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ مرثیہ گو شاعر پہلے ایک دو رباعیاں، سلام اور پھر مرثیہ پڑھتے تھے۔ ان رباعیوں کو رثائی رباعی کہتے ہیں ڈاکٹر خلیق انجم نے مدلل طور پر بتایا ہے کہ ان رثائی رباعی کے فروغ اور ان کی مقبولیت میں انیس کا بہت بڑا

حصہ ہے۔

اگلے دو مضمون متنی تنقید اور متنی نقاد سے متعلق ہیں، قاضی عبدالودود سے قبل اردو تحقیق اور متنی تنقید اور مولانا عرشی اردو کے پہلے متنی نقاد۔" ان مضامین میں ڈاکٹر خلیق انجم اردو تحقیق اور متنی تنقید کے ابتدائی نقوش بتاتے ہوئے سر سید کی آثار الصنادید، کو اردو تحقیق کے لیے مشعل راہ قرار دیا ہے۔ سر سید کی آئین اکبری، کو جو فارسی میں ہے، متنی تنقید کا پہلا بہترین نمونہ کہا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے بتایا ہے کہ اردو تحقیق و تدوین مولوی عبدالحق پہلے محقق ہیں جنھوں نے پچاس سال مسلسل اردو تحقیق و تدوین کا کام انجام دیا۔ انھوں نے محمود شیرانی کے تحقیقی تبصروں کی خوبیاں بھی بیان کی ہیں اور تحقیق کے متعلق محمود شیرانی کے علم کا اعتراف کیا ہے۔ امتیاز علی عرشی تنقید کس نہج پر گامزن تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے امتیاز علی عرشی کے تیار کردہ متنی تنقید کے پہلے کارنامے "مکاتیب غالب" کا منظر غائر مطالعہ پیش کیا ہے۔ امتیاز علی عرشی نے کئی متنوں کے سائنٹفک طریقہ سے تنقیدی اڈیشن تیار کیے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ان کو اردو ادب کا 'پہلا متنی نقاد' قرار دیا ہے۔

اگلا مضمون مولانا سید سلیمان ندوی کی ادبی خدمات ہے۔ سید سلیمان ندوی کو مختلف علوم و فنون پر قدرت حاصل تھی۔ اس مضمون میں ڈاکٹر خلیق انجم نے ان کی لسانی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ سلیمان ندوی ساختک اصولوں سے کماحقہ واقف نہ تھے اس کے باوجود ان کے تحریر کردہ مضامین اور کتب غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں جو اردو کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔

کتاب کا آخری مضمون 'حسن نعیم کی ۲۵ غزلیں، ہے ڈاکٹر خلیق انجم اس مضمون کو تاثراتی قرار دیتے ہیں۔ یہ مضمون کراچی کے ایک رسالہ تخلیقی ادب کے لیے لکھا گیا تھا جس کے ساتھ حسن نعیم کی ۲۵ غزلیں بھی شائع ہوئی تھیں۔ وہ غزلیں اس کتاب کے مضمون میں شامل نہیں ہیں۔

کتاب 'تعبیر و تفہیم' صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے بہت خوب ہے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی ہر کتاب بہت اچھی چھپی ہوئی ہوتی ہے ۱۵۹ صفحات کی آفسیٹ پر چھپی ہوئی کتاب کی قیمت ۳۵ روپے اس گرانی کو دیکھتے ہوئے زیادہ نہیں۔ ●

ادبی و تہذیبی خبریں

رفعت سروش کی کتاب "پانی پت" کا رسم اجرا

دہلی۔ ۹ نومبر، کچھ عرصہ قبل رفعت سروش نے انجمن ترقی اردوب کے زیر اہتمام ایک خصوصی جلسے میں اپنی طویل نظم "پانی پت" کے کچھ بند سنائے تھے تو یہ نظم بے حد پسند کی گئی تھی۔ اب یہ نظم کتابی صورت میں سامنے آئی ہے۔ ۸ نومبر کو اردو گھر (نئی دہلی) کتاب "پانی پت" کا اجرا ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس جلسے کی صدارت سابق گورنر ہریانہ جناب مظفر حسین برنی نے فرمائی۔ انھوں نے صدارتی کلمات میں کہا کہ رفعت سروش کی یہ نظم ان کی خلاقانہ عظمت کا ثبوت ہے۔ یہ نظم ہندستان کی تاریخ کے پانچ ہزار سال کو پانی پت کے حوالے سے پیش کرتی ہے۔ اس میں ڈرامائی کیفیت ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے اسٹیج پر پیش کیا جائے۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے ڈاکٹر سیدہ سیدین نے نہایت جذباتی انداز میں کہا کہ میں خانوادہ حالی سے ہوں اور رفعت سروش نے مولانا حالی اور پانی پت کے لیے جس عقیدت کا اظہار اس نظم میں کیا اس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے نظم کے کچھ حصے بہت موثر انداز میں سنائے۔ جلسے کا آغاز ڈاکٹر اسلم پرویز کی تعارفی تقریر سے ہوا۔ اس کے بعد ابو الفیض سحر نے سیر حاصل مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر رضیہ حامد نے نظم کے شعری محاسن کا احاطہ کیا۔

پروفیسر شارب ردولوی نے نہایت اثر انگیز تقریر کی۔ انھوں نے کہا رفعت سروش کو بیانیہ پر قدرت حاصل ہے۔ پروفیسر امیر عارفی نے بھی مقالہ پڑھا اور رفعت سروش کی قادر الکلامی اور اس طویل نظم کی ادبی عظمت پر روشنی ڈالی۔ مظہر امام نے اپنے مختصر مضمون میں کہا کہ رفعت سروش کی "پانی پت" ایک وسیع کینوس پر لکھی ہوئی نظم ہے جس میں بیانیہ کے ضروری اوصاف مثلاً تسلسل، منطقی ترتیب، ارتقا اور پھیلاؤ موجود ہیں۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے اپنے طویل مقالے کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے اور کتاب کے محاسن اور اس کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا رفعت سروش کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت قلم کی ہے۔

رنگ صدا کی رسم اجرا

نئی دہلی۔ منفرد لب و لہجے کے ممتاز شاعر عمران عظیم کے شعری مجموعہ "رنگ صدا" کا اجرا بدست جناب سی ایم ابراہیم مرکزی وزیر برائے شہری ہوا بازی، آل انڈیا مسلم ڈیموکریٹک کونسل کے زیر اہتمام ۲۱ نومبر ۹۷ء کو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں ہوا۔

سیاسی، سماجی اور منصبی شخصیتوں کے علاوہ اردو کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے کثیر تعداد میں حصہ لیا اور عمران عظیم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور شعری کاوشوں پر روشنی ڈالی اجرا کے مہمان خصوصی عالمی امن کمیٹی یوپی کے صدر نیر قریشی گنگوہی صدر ڈاکٹر ایس فاروق اور مہمان اعزازی ایم محسن اسرائیلی ایڈوکیٹ تھے مرکزی وزیر سی ایم ابراہیم نے "رنگ صدا" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ عہد حاضر میں بھی

لگن اور سنجیدگی سے شعر وادب کی خدمت کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ عمران عظیم نے وکالت جیسے معروف ترین پیشے میں رہ کر شعر و سخن کی زلفیں سنوارنے کا اہم کام کیا ہے۔ ان کے یہاں عصری مسائل بھی ہیں اور قومی یکجہتی کی جھلک بھی۔ میں انھیں اس خوبصورت مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں۔

بہار برقی ایڈوکیٹ نے کہا کہ عمران عظیم میرے دوست ہیں اور میں انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے جانتا ہوں۔ یہ سبھی دوستوں سے خلوص سے ملتے ہیں۔ یہی مزاج انھوں نے اپنی شاعری میں رکھا ہے۔ انھیں شعر وادب سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ ہے ۔ وصی احمد نعمانی ایڈوکیٹ نے کہا کہ عمران عظیم بحیثیت انسان بھی اچھے ہیں اور بحیثیت شاعر بھی۔ ان کی شاعری میں "ماں" کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ نئی لفظیات، نئے استعارے اور نئی تشبیہات ان کے یہاں موجود ہیں۔ ان کے یہاں فکر کی گہرائی اور گیرائی ملتی ہے۔

ڈاکٹر شہپر رسول نے کہا کہ "رنگ صدا عمران عظیم کا تازہ اور خوب صورت شعری مجموعہ ہے۔ عمران عظیم کا شمار نئی غزل کے ایسے شعراء میں ہوتا ہے جو شعری شغف اور بے پناہ لگن کے سبب سب سے پہلے ہی پڑاؤ پر اہل ادب کو متوجہ کر لیتے ہیں۔ مختصر مدت میں تخلیقی رفتار کے ساتھ شعری کاوشوں کا منظر عام پر آنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ زیڈ۔کے۔ فیضان ایڈوکیٹ نے کہا کہ عمران عظیم ایک سچا شاعر ہے۔ یہ کاروبار زیست میں معروف رہ کر بھی وسیع سے وسیع تر کینوس شاعری کو دے چکے ہیں۔ انھیں فنی قدرت حاصل ہے۔

مہمان خصوصی نیر قریشی گنگوہی نے کہا کہ عمران عظیم نے عصری تقاضوں پر ہمیشہ نظر رکھی ہے۔ انھوں نے شعری مزاج کو سمجھا ہے، پرکھا ہے اور اپنے کلام کی تازگی کو برقرار رکھا ہے۔ مہمان اعزازی جسٹس سردار علی نے کہا کہ عمران عظیم کے شعری گلدستے میں بہت سے حسین اور تازہ پھول ہیں۔ خدا کرے کہ ان پھولوں کی تازگی اور مہک پورے ادبی سماج میں پھیل جائے ان کی شاعری کے مطالعے سے میرا دل اور دماغ دونوں روشن ہو گئے۔

رات ساڑھے آٹھ بجے کل ہند مشاعرہ ہوا۔ مشاعرہ کے مہمان خصوصی حاجی انیس دہلوی مدیر اعلا فلمی ستارے دہلی، صدر حاجی نسیم احمد گنگوہی اور مہمان اعزازی جسٹس سردار علی تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ایم۔ آر۔ قاسمی نے انجام دیے۔ مخمور سعیدی، سیماب سلطان پوری، راج نرائن راز، نیر قریشی گنگوہی، انور ایوبی گنگوہی اسلام، رام پرکاش راہی، فرحت احساس، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر خالد محمود، ایم قمر الدین، انیس احمد انیس، حاجی انیس دہلوی، محترمہ ثریا رحمٰن، عمران عظیم، ریاض ساغر، ایم آر قاسمی، محترمہ شگفتہ فرحت، محترمہ گلناز پروین، محترمہ فریدہ خاں، مشتاق صدف، کوثر مظہری اور سکندر عاقل وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ اس طرح تقریب کا اختتام شب ۱۰ بجے ہوا۔

ڈاکٹر کیول دھیر کو ایوارڈ

اردو کے ممتاز افسانہ نگار ڈاکٹر کیول دھیر کو بھاشا وبھاگ کے زیر اہتمام پنجاب سرکار نے سال رواں کے لیے صوبائی سطح کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ "شرومنی اردو ساہتیہ کار" دینے کا اعلان کیا ہے جس میں ۵۱ ہزار کی رقم کے علاوہ طلائی میڈل، شال اور توصیفی سند شامل ہیں۔

اردو، ہندی شعری انتخاب کا اجراء

مورخہ ۷ دسمبر ۹۷ء بروز اتوار "مجلس ادب" رانچی کے زیر اہتمام ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں سرور ساجد کا مرتبہ کتابچہ "اردو کے ۹۷ منتخب اشعار" کا اجرا پروفیسر ش اختر کے ہاتھوں ہوا کتابچے کا اجرا کرتے ہوئے ش اختر صاحب نے فرمایا کہ رانچی میں ادبی سرگرمی کا مرکز سرور ساجد کا مکان ہے۔ موصوف نے آگے فرمایا کہ سرور ساجد خود ایک نوجوان شاعر ہیں اور تنظیمی صلاحیت کے مالک بھی اس لیے امید ہے کہ نئی نسل کی رہنمائی رانچی میں سرور ساجد آیندہ بھی کرتے رہیں گے۔

ڈاکٹر جمشید قمر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ "اردو کے ۹۷ منتخب اشعار" کی اشاعت پر سرور ساجد قابل مبارک باد ہیں اور اس کتابچے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں اشعار اردو کے ساتھ ہندی میں شائع کیے گئے ہیں جس سے اس کتابچے کی ریڈر شپ میں اضافہ ہوگا۔

مجلس ادب کے صدر سہیل سعید نے حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اس کے بعد ایک مخصوص شعری نشست کا انعقاد ہوا جس میں سہیل سعید، سرور ساجد، اظفر جمیل، سمیع اللہ شفق، قمرالزماں قمر، مجیب الرحمٰن بزمی اور حیرت فرخ آبادی نے اپنے کلام سنائے۔

شعری نشست کی صدارت حیرت فرخ آبادی نے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر جمشید قمر اور سرور ساجد نے انجام دیے۔ شریک شرکاء میں ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی، ایم۔ ایف رحمٰن، محمد کفیل، محمد شمشاد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر

علی گڑھ۔ ۱۸ دسمبر اردو بورڈ علی گڑھ کے رجسٹرار محمد عمر خاں ثمر چھتاروی نے پروفیسر شمیم جے راجپوری کو ان کے اردو یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہونے پر مبارک باد دی۔

محمد عمر خاں ثمر نے کہا کہ پروفیسر شمیم صاحب جے راجپوری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک لمبے عرصے سے منسلک رہے ہیں اور ان کی خدمات بیش بہا ہیں۔ ان کو انتظامی امور کا بے حد تجربہ ہے۔ صدر جمہوریہ نے ان کو وائس چانسلر مقرر کرکے قابل تحسین رول ادا کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پروفیسر شمیم جے راجپوری اردو یونیورسٹی کی ترقی اور اس کے فروغ کے لیے ایک اہم رول ادا کریں گے۔ پروفیسر شمیم جے راجپوری ایک بین اقوامی سائنس داں ہیں اور ان کو یونیورسٹی کے تمام شعبوں کے طریق عمل کا پورا تجربہ ہے۔

اقبال کی فکر جائزہ تہذیبی ورثے کی جستجو ہے

علامہ اقبال کے ۱۲۰ ویں یوم ولادت کے موقع پر غالب اکیڈمی اور اقبال اکیڈمی ہند کے زیر اہتمام ۲۶ نومبر ۱۹۹۷ء کو ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ جلسے میں خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے شریف الحسن نقوی نے اعلان کیا کہ اقبال اکیڈمی نے

ہونہار طلبہ کو وظائف دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس موقع پر جناب خواجہ حسن نظامی ثانی صاحب نے اپنی تقریر کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا کہ علامہ اقبال کے ذہن میں پاکستان کا تصور کیا تھا۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے اپنی تقریر میں خطبات اقبال کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ اقبال کے دور میں یہ تصور تھا کہ مسلم اکثریت کی ریاستوں میں اقتصادی آزادی ملنی چاہیے، ان کے زمانے میں علاحدہ ملک بنانے کا تصور نہیں تھا۔

اس موقع پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر عبید الرحمٰن ہاشمی نے شعر اقبال کی اقداری جہات کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں فنی، جمالیاتی اور تخلیقی اقدار سیاسی اور سماجی اقدار، مذہبی اور روحانی اقدار کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال ہمارے ان دانشوروں میں سے ہیں جن کی سیاسی بصیرت سے پوری طرح اتفاق کیے بغیر بھی اتنی بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ زندگی کے مجموعی نقشے اور خاکے میں الوہی اور روحانی اقدار کا رنگ بھرا ہوا دیکھنا چاہیے تھے۔

اس موقع پر مرکزی وزیر جناب سیف الدین سوز نے اپنی تقریر میں کہا کہ اقبال کے ساتھ تین دہائیوں سے ناانصافی ہو رہی ہے۔ اقبال کو عوامی سطح پر لانے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے سب کے کام کی شاعری کی ہے۔ وطن، ہندو، اسلام اور اشتراکیت کی باتیں بھی کلیات اقبال میں ملتی ہیں۔ سیف الدین سوز نے اس موقع پر فتح پوری اسکول کے طالب علم محمد اسلم اور رابعہ اسکول کی طالبہ نصرت بانو کو اسکالرشپ سے نوازا۔

جلسے کی صدارت جناب حکیم عبدالحمید اور جناب سید مظفر حسین برنی نے فرمائی۔ مظفر حسین برنی نے اپنی تقریر میں کہا کہ علامہ اقبال کو سمجھنے کے لیے جدید سائنس اور جدید فلسفے کو سمجھنا پڑے گا۔ اس موقع پر معروف شاعر متین امروہوی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

دہلی گھرانے کے مشہور فن کار استاد اقبال احمد خاں نے کلام اقبال موسیقی کے ساتھ پیش کیا۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر عقیل احمد سکریٹری غالب اکیڈمی نے کی اور شکریہ سید شریف الحسن نقوی نے ادا کیا۔

اردو کی میں یوم مجاز کا مشاعرہ

مہمان خصوصی غیاث الدین قدوائی نے یہاں ۱۲ر دسمبر کی یخ بستہ شب میں باذوق سامعین سے چھلکتے ہوئے پنڈال میں یوم مجاز کے ۲۹ویں کل ہند مشاعرہ کا افتتاح کیا۔ انھوں نے کہا کہ شبینہ کلب نے اس مشاعرہ کو آزادی کی ۵۰ویں سالگرہ سے منسوب کیا ہے لیکن اس سال کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ پورے سال فراق صدی تقریبات بھی منائی جارہی ہیں۔ لہٰذا میں فراق کے اس شعر سے مشاعرہ کے افتتاح کی رسم انجام دے رہا ہوں۔ ع

سرزمین ہند پر اقوام عالم کے فراق
قافلے بستے گئے اور ہندوستان بنتا گیا

اس موقع پر فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی یوپی کے چیرمین نہال رضوی نے مجاز یادگاری مجلّہ کا اجرا کیا۔ شبینہ کلب کے صدر چندر کمار ترویدی نے مہمانوں کا استقبال اور کنوینر مشاعرہ احترام علی نمو نے شعرا سامعین اور ان تمام حضرات کا

شکریہ ادا کیا جن کے تعاون سے یہ مشاعرہ کامیاب ہوا مشاعرہ کی صدارت تقی شبر نے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر بشیر بدر نے انجام دیے۔ مشاعرہ میں جن شعراء نے شرکت کی ان کے نام یہ ہیں۔ ڈاکٹر بشیر بدر، وسیم بریلوی، امیر آغا قزلباش، موج رامپوری، حبیب ہاشمی، راحت اندوری، شاعر جمالی، انجم رہبر کانپوری، چرن سنگھ، بشر رئیس انصاری، منظر بھوپالی، طاہر فراز، ندیم نیر، شیاں سنگھ صبا، انجم بارہ بنکوری، ہما پردین، واصف فاروقی، اثر بہرائچی، شبینہ ادیبی، عرفی فیض آبادی، اقبال ردولوی، ساغر فیاضی، حسن کاظمی، راجیور راز، حامد بہرائچی، رفیق شادانی، شکیل ردولوی۔

کلکتہ میں دو صد سالہ جشن غالب تقریبات

کلکتہ کے تاریخی ادارے مسلم انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ۱۸ تا ۲۰ دسمبر ۱۹۸۷ء سہ روزہ کل ہند سیمنار اور مشاعرہ کا انعقاد دو صد سالہ جشن غالب تقریبات کے تحت عمل میں آیا۔ ۱۸ دسمبر کو مغربی بنگال میں اردو کا سفر اور غالب کے موضوع کے تحت تصاویر اور کتب و رسائل کی نمائش کا اہتمام کیا گیا جس کا افتتاح وزیر اقلیتی امور محمد امین نے کیا۔

۱۹ دسمبر سیمنار کے تین سشن ہوئے۔ پہلے سشن میں مولانا اے۔ ایم۔ کے معصومی نے دیوان غالب نسخہ حسین مرزا، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے گنجینہ معنی کے طلسم اور ڈاکٹر عنوان چشتی نے "غالب اور تصوف" موضوعات کے تحت مقالے پیش کیے۔ صدارت علقمہ شبلی نے فرمائی جبکہ کوارڈینیٹر کے فرائض نور الہدیٰ نے انجام دیے۔ پروفیسر مظفر حنفی، مظہر امام، ڈاکٹر محبوب راہی، زرینہ پروین اور تسیم منان نے بحث میں حصہ لیا۔ دوسرے سشن کی صدارت جناب سالک لکھنوی چیرمین اردو اکادمی نے کی جبکہ کوارڈینیٹر کے فرائض پروفیسر مظفر حنفی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر محبوب راہی نے "غالب عصر حاضر کا شاعر" مظہر امام نے "غالب اور وحشت" تیر ڈاکٹر انیس اشفاق نے "غالب اور ہم" عنوانات پر مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر اسعد بدایونی اور پروفیسر عتیق اللہ نے بحث میں حصہ لیا۔

تیسرے اور آخری سشن کی صدارت پروفیسر مظفر حنفی نے کی جبکہ علقمہ شبلی نے کوارڈینٹر کے فرائض انجام دیے۔ پروفیسر عتیق اللہ، ملک زادہ منظور احمد اور ڈاکٹر اسعد بدایونی نے مقالات پیش کیے مظہر امام، ڈاکٹر محبوب راہی اور ڈاکٹر انیس اشفاق نے بحث میں حصہ لیا۔ آخر میں سیمنار کے جنرل سکریٹری پروفیسر محمد سلیمان خورشید نے رسم شکریہ انجام دی۔

۲۰ دسمبر کو سالک لکھنوی کی صدارت میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی نظامت میں کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ بین اقوامی شہرت کے حامل بنگلہ شاعر شری سبھاش مکھرپادھیائے اور وزیر اقلیتی امور محمد امین مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ملک کے جن مشاہیر شعرائے نے شام ۸ بجے سے صبح ۵ بجے تک شعر و سخن کہ اپنی حرارت سخن سے گرمائے رکھا ان میں ڈاکٹر بشیر بدر، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر محبوب راہی، ڈاکٹر مظہر امام، ڈاکٹر وسیم بریلوی، ڈاکٹر راحت اندوری، ڈاکٹر نواز دیوبندی، والی آسی، ڈاکٹر

آفاق فاخری، جوہر کانپوری، جمیل خیر آبادی، رونق نعیم، شاعر جمالی، نظر ایٹوی، شمس جالنوی، ڈاکٹر اسعد بدایونی، خواجہ جاوید اختر، جلال عظیم آبادی، انجم بارہ بنکوی، ماجد دیوبندی، جوہر بلیاوی، جلال کاکوی، ڈاکٹر انیس اشفاق، انجم رہبر ترنم کانپوری، سنبل فیضانی اور شبینہ ادیب قابل ذکر ہیں۔ میزبان شعرائے کرام میں پروفیسر مظفر حنفی، ڈاکٹر علقمہ شبلی، نصر غزالی، حبیب ہاشمی، مشہود عالم آفاقی، انجم عظیم آبادی، پرویز انجم، شمیم آنولوی، ارشاد آرزو اور ممتاز عارفی نے نمائندگی کا حق ادا کیا۔

دلیپ سنگھ اردو کے منفرد مزاح نگار تھے

اردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار دلیپ سنگھ مرحوم کو ۱۴؍ جنوری کو مختلف ادیبوں اور دانشوروں نے شاندار خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انھیں اردو کا منفرد طنز نگار قرار دیا۔ غالب اکیڈمی میں حلقہ ارباب ذوق کی جانب سے ماہنامہ انشاء کے "دلیپ سنگھ نمبر" کی رسم اجراء کے موقع پر پروفیسر نثار احمد فاروقی نے کہا کہ دلیپ سنگھ کے مزاح میں آمد ہی آمد تھی اور تصنع اور کھینچ تان سے وہ کبھی مزاح پیدا نہیں کرتے تھے ڈاکٹر خلیق انجم نے دلیپ سنگھ کو اس بنا پر ایک منفرد ادیب قرار دیا کہ وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے لکھنے کے بعد عمر کے آخری دور میں ادبی دنیا میں آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے اپنا ایک الگ مقام بنالیا۔ سپریم کورٹ آف انڈیا کے سینئر جج جسٹس ایس صغیر احمد نے دلیپ سنگھ نمبر کی رسم اجراء انجام دینے کے بعد کہا کہ اتوار کے "قومی آواز" میں وہ سب سے پہلے دلیپ سنگھ کا ہی کالم پڑھا کرتے تھے۔

انھوں نے کہا کہ دلیپ سنگھ کے انتقال سے انھیں اس قدر صدمہ پہنچا تھا کہ ان کے کالم "گل گفت" کی جگہ شائع ہونے والے "بقلم خود" کو انھوں نے کئی ہفتوں تک نہیں پڑھا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے پنجابیت اور دہلویت کے تعلق سے دلیپ سنگھ کے اسلوب بیان پر ایک نہایت دلچسپ اور منفرد مضمون پڑھا۔ تقریب کے مہمان خصوصی اور برصغیر کے مشہور شاعر قتیل شفائی نے اپنی جذباتی تقریر میں دلیپ سنگھ سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا۔ ماہنامہ انشاء کے مدیر ف۔ س۔ اعجاز نے دلیپ سنگھ کی زندگی اور شخصیت کے انسانی اور ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور منظور خراج عقیدت بھی پیش کیا۔ دلیپ سنگھ نمبر کے مرتب کے ایل نارنگ ساقی نے ایک دلچسپ مضمون پڑھا جس میں انھوں نے انکشاف کیا کہ وہ پہلے ۱۳؍ جنوری کو یہ تقریب کرنا چاہتے تھے لیکن بعد میں مسز دلیپ سنگھ نے بتایا کہ ۱۴؍ جنوری مرحوم دلیپ سنگھ کا یوم پیدائش بھی ہے تو تقریب کا دن بدل دیا گیا۔ نور جہاں ثروت اور نصرت ظہیر نے دلیپ سنگھ کی یاد میں لکھے گئے مضامین پیش کیے۔ تقریب کی صدارت ہندی اور اردو کے معمر ترین ۹۰ سالہ ادیب دیویندر ستیارتھی نے کی جنھوں نے صدارتی تقریر میں اپنی زندگی کے چند دلچسپ واقعات سنائے۔ دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری مخمور سعیدی نے دلچسپ اور عالمانہ انداز میں تقریب کی نظامت کی اور آخر میں ملک کے معروف طنز و مزاح نگار اور تقریب کے مہتمم مجتبیٰ حسین نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

۱۹۹۷ء کا ادبی جائزہ

ماہنامہ صریر میں "۱۹۹۶ء کی ادب کہانی" اب قریب الاختتام ہے۔ ڈاکٹر انور سدید ۱۹۹۷ء کا ادبی جائزہ لکھنے کے لیے مواد جمع کر رہے ہیں۔ اہل قلم سے درخواست ہے کہ وہ ڈاکٹر انور سدید کو ۱۹۹۷ء کے دوران اپنے ادبی کام کی تفصیلات سے مطلع کریں۔

پتا ۲-۱۷۷ ستلج بلاک اقبال ٹاؤن۔ لاہور

بین المدارس مباحثہ

صدر مسلم لائبریری ناگپور میں گذشتہ اتوار کو تیئسواں بین المدارس منشی عبدالجبار خاں مقابلہ مباحثہ زیر صدارت جناب ایڈوکیٹ مشیر حسین رضوی صاحب منعقد ہوا۔ جلسہ کا آغاز تلاوت قرآن مجید سے کیا گیا اور بارگاہ رسالت میں نعت پیش کی گئی۔ لائبریری کے نائب صدر جناب عبدالقدیر صاحب، سابق کارپوریٹر نے پھولوں سے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس کے بعد لائبریری کے سکریٹری محمد نسیم الدین صاحب نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور گذشتہ سال کے مباحثہ کی رپورٹ پڑھ کر سنائی۔

صدر جلسہ نے اپنی صدارتی تقریر میں طلبہ وطالبات کی تقریروں کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ انھیں اپنے حریفوں کی دلیلوں کو رد کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیے۔ آپ نے کہا کہ اگرچہ کہ موضوع کی مخالفت کرنا بہت مشکل تھا لیکن پھر بھی شرکاء مباحثہ نے بھرپور کوششیں کیں۔ مباحثہ کا موضوع تھا "امتحان میں شاندار کامیابی کے لیے کوچنگ کلاسیز ضروری ہیں۔" مقابلہ میں ناگپور و کامٹی کی بارہ اسکولوں نے حصہ لیا۔ کامٹی کی خدیجہ ہائی گرلز ہائی اسکول کی طالبات شارقہ ناز و رقیہ ناز نے اول انعام پایا اور کامٹی ہی کی سیٹھ کلن ہائی اسکول کی طالبات روبینہ ممتاز و روبینہ ممتاز کو دوسرا انعام ملا۔ انفرادی طور سے خدیجہ ہائی گرلز اسکول کی شارقہ ناز نے اول انعام پایا اور سیٹھ کلن ہائی اسکول کی روبینہ ممتاز کو دوسرا انعام ملا۔

جناب رضوری ظفر صدیقی صاحب، ڈپٹی کمشنر، ناگپور میونسپل کارپوریشن نے طلبہ وطالبات کو انعامات تقسیم فرمائے۔ پروفیسر جلال الدین، پروفیسر محمد وسیم اور ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن نے جج کے فرائض انجام دیے۔ جناب صغیر احمد نے جلسہ کی نظامت کی اور ایڈوکیٹ حبیب الدین احمد صاحب نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پروفیسر س۔ یونس کے شعری مجموعہ انکشاف کا جلسہ اجراء

صدر مسلم لائبریری ناگپور کے وسیع وعریض ہال میں پروفیسر س۔ یونس کے شعری مجموعہ انکشاف کی رسم اجراء عالی جناب سید شہزاد حسین ڈویژنل کمشنر ناگپور کے دست مبارک سے ۲۰ر دسمبر ۱۹۹۷ء کی شب میں استقبالیہ کمیٹی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک پرشکوہ جلسہ میں عمل میں آئی۔ کتاب کا اجراء کرتے ہوئے موصوف نے صاحب تصنیف کی ادبی خدمات کو سراہا اور انکشاف کو دنیائے شعر وادب میں ایک خوشگوار اضافہ قرار دیا۔

جلسہ کی صدارت ممبئی ہائی کورٹ کے سابق جسٹس عالی جناب قاضی محمد مجیب الدین صاحب نے فرمائی۔ اپنے صدارتی خطبہ میں موصوف نے انکشاف کے شاعر پروفیسر یونس کی

شعری تخلیقات پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کتاب کے مختلف گوشوں پر عالمانہ روشنی ڈالی۔ موصوف نے فرمایا کہ پروفیسر یونس نہ صرف یہ کہ انگریزی کے مقبول و معروف استاد رہے ہیں بلکہ وہ ایک مفکر و دانشور بھی ہیں۔

شعرائے کرام سے کھچا کھچ بھرے ہال میں مستند اہل قلم ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر نے اپنا بصیرت افروز مقالہ بعنوان "بھیڑ سے الگ" پیش فرمایا۔ معروف مورخ و محقق ڈاکٹر محمد شریف الدین ساحل اور جلسہ کے ناظم جدید شاعر ڈاکٹر بدر جمیل نے اپنے عالمانہ مقالات پیش کیے۔ بزرگ شاعر ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء نے منظوم ہدیہ تہنیت پیش کیا اور مزاح نگار انصاری اصغر جمیل نے دلچسپ خاکہ پیش کر کے حاضرین جلسہ میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ ایڈوکیٹ حبیب الدین احمد جو شاعر یونس کے یار غار رہے ہیں' نے اپنی دلچسپ تقریر میں شاعر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر جلال الدین احمد نے انگریزی زبان میں سیر حاصل مقالہ پیش کیا۔

اعزازی مہمانوں میں جناب انیس احمد خاں صاحب ایڈوکیٹ سپریم کورٹ خاص طور پر دہلی سے تشریف لائے تھے۔ آپ نے بھی کتاب کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور اس کی صوری و معنوی خوبیوں پر اظہار مسرت فرمایا۔ ان کے علاوہ عالی جناب تقدس مآب امیرالدین ملک صاحب مہدی باغ اور عالی جناب ڈاکٹر سید عبدالرحیم صاحب سابق ڈائریکٹر وسنت راؤ نائک انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز بھی بحیثیت مہمانان خصوصی ڈائس پر رونق افروز تھے۔

پروفیسر یونس نے اپنی جوابی تقریر میں جذباتی انداز میں اپنے تمام کرم فرماؤں کی غیر معمولی محبت و خلوص کا شکریہ ادا کیا۔ اور اعلان کیا کہ کتاب کی فروخت سے ہونے والے منافع کو صدر مسلم لائبریری ناگپور کے حق میں بطور عطیہ تفویض کر دیا جائے گا۔

جلسہ اجراء کا آغاز تلاوت کلام ربانی سے ہوا۔ پروفیسر یونس کی تحریر کردہ نعت پروفیسر جلال الدین احمد نے مترنم آواز میں پیش کر کے سماں باندھ دیا۔ ڈاکٹر سید ناظم' ڈاکٹر سید الیاس' ڈاکٹر محمد غیاث الرحمٰن اور ایڈوکیٹ حبیب الدین احمد صاحبان نے پھولوں کے ہار پہنا کر مہمانوں کا استقبال کیا۔ جلسہ کی نظامت کی ذمہ داریاں ڈاکٹر بدر جمیل نے بہ حسن و خوبی نبھائیں۔

دوسرے دور میں شعری نشست کا آغاز ہوا۔ جس کی صدارت مہمان شاعر و ادیب عالی جناب انیس احمد خاں ایڈوکیٹ سپریم دہلی نے فرمائی۔ جن شعراء نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ ان کے اسمائے گرامی ہیں۔ ڈاکٹر منشاء' شاہد کبیر' عبدالرحیم نشتر' پروفیسر یونس' ظفر کلیم' محفوظ اثر' شکیب غوثی' حسن بھائی' ڈاکٹر بدر جمیل' بختیار قیسی' لطیف یاور' جملوا انصاری' نظیر نخشب اور منظر مجی مظفر' جناب صدر کے صدارتی کلام کے بعد یہ عظیم الشان اور یادگار جلسہ تقریباً چار بجے اختتام پذیر ہوا۔ مشاعرہ کی نظامت آکاش وانی سے منسلک جناب کلیم احمد صاحب نے فرمائی۔

ڈاکٹر محمد شفیع بورڈ آف اسٹڈیز کے صدر

سیوا سدن کالج برہانپور (ایم۔پی) کے پروفیسر اور شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر محمد شفیع کو

دیوی اہلیہ یونی ورسٹی اندور (ایم ۔ پی) کے بورڈ آف اسٹڈیز کا صدر منتخب کیا گیا ہے جس سے اردو کے ادبی اور تعلیمی حلقوں میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ڈاکٹر شفیع ساگر یونی ورسٹی بورڈ کے صدر اور یو جی سی بورڈ بھوپال کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ موصوف نے اردو میں پی۔ایچ۔ڈی اور ہندی میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کر کے نہ صرف قومی یکجہتی کی ایک مثال قائم کی ہے بلکہ ایک نیا رکارڈ بھی بنایا ہے۔ آپ کی سات کتابیں منظر عام پر آکر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں اور اتنے ہی طلبہ آپ کی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی حاصل کر چکے ہیں۔

طنز و مزاح کے ممتاز شاعر دلاور فگار نہیں رہے

کراچی سے موصولہ ایک اطلاع کے مطابق طنز و مزاح کے نامور شاعر دلاور فگار کا گذشتہ ہفتہ انتقال ہو گیا۔ ۸ر جولائی ۱۹۲۸ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام دلاور حسین رکھا گیا لیکن اردو دنیا میں وہ دلاور فگار کے نام سے مشہور ہوئے۔ دلاور فگار نے معاشرتی مسائل پر اظہار خیال کے لیے بڑا ہی پر اثر مزاحیہ انداز اختیار کیا۔ ان کے کلام کی انفرادی خصوصیت یہ تھی کہ جہاں وہ مشاعروں کے شاعر تھے وہیں ان کو پڑھا بھی خوب جاتا تھا اور پڑھنے میں بھی وہ ویسا ہی لطف دیتے تھے جتنا سننے میں ان کی طنز میں شوخی تو تھی مگر ساتھ ہی بلندی اور گہرائی بھی تھی زبان آسان اور عام فہم ایسی کہ ہر کوئی سمجھ لے۔ ان کا پہلا مجموعہ "حادثے" ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ یہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ مزاحیہ کلام کا ان کا پہلا مجموعہ "ستم ظریفیاں" ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں دوسرا مزاحیہ مجموعہ "شامت اعمال" اور ۱۹۶۶ء میں "آداب عرض" منظر عام پر آئے۔ دلاور فگار نے ۱۹۵۸ء میں ایک طویل مزاحیہ نظم "شاعر اعظم" کہی جس سے ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ دلاور فگار کی بعض نگارشات نثر میں بھی بڑی مقبول ہوئیں۔ ۱۹۹۳ء میں طنز و مزاح کی ایک نشست میں اپنا مزاحیہ خاکہ "صدارت کا شوق" پڑھا جس میں فرشتے کی زبان سے یہ کہلوایا تھا کہ ان کو ۱۹۹۸ء میں آسماں پر اٹھالیا جائے گا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ۱۹۹۸ء لگتے ہی فرشتہ اجل نے ان کو اٹھالیا۔ دلاور حسین نے ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے اور اس کے بعد معاشیات سے ایم۔اے کیا۔ اہل بدایوں ان پر فخر کرتے ہیں۔ دلاور فگار یوپی میں پیدا اور سندھ میں سفر آخرت اختیار کیا' لیکن ان کی بدلہ سنجی نے ان کو برصغیر کا ممتاز شاعر بنا دیا اور وہ پوری اردو دنیا میں مقبول و محترم تھے۔ ان کی وفات کی اطلاع پر دہلی کے ادبی حلقوں میں سناٹا سا چھا گیا۔

اظہار تعزیت

ہریانہ کے شاعر پروفیسر آر۔پی شوخ کا ۱۷ر دسمبر کو انتقال ہو گیا۔ یہ خبر سن کر بے حد افسوس ہوا۔ مرحوم کا ہریانہ کے ممتاز شعراء میں شمار ہوتا تھا۔ ان کے انتقال پر ہریانہ اردو اکادمی میں ایک تعزیتی میٹنگ ہوئی اور اردو زبان و ادب سے ان کے بے لوث لگاؤ کو یاد کیا گیا۔ ایک شاعر اور ادیب کے طور ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ ہریانہ اردو اکادمی ان کے انتقال پر افسوس کرتی ہے اور پسماندگان سے اظہار ہمدردی کرتی ہے۔

ضروری اعلان: آئندہ سے صرف وہی خبریں شائع کی جائیں گی۔ جو مختصر ہوں اور جن میں غیر ضروری تعریف و توصیف نہ ہو۔

کھلے خطوط

☆بلقیس ظفیر الحسن روہنی۔ دہلی ۱۱۰۰۸۵

فروری کا کتاب نما سچ مچ نظر نواز ہوا۔ خامہ بگوش صاحب کی غیر موجودگی کے باوجود۔ جناب نصرت ظہیر اور محترم مجتبیٰ حسین نہ ہوتے تو شاید یہ کمی بہت کھلتی۔ محترم جناب جمال اویسی اور جناب خالد عبادی اردو تنقید کے اس رویے سے جو بہت سے بہت اچھا نیا لکھنے والوں کے لیے اس نے اپنا رکھا ہے، بہت شاکی نظر آتے ہیں۔ مجھے بھی ہوتی ہے، یہ جھلاہٹ۔ کتاب نما کے اس شمارے میں شامل جناب ستیہ پال آنند اور خالدہ حسین کے فن سے متعلق مضامین سے ان کے غصے کا پارہ کچھ نہ کچھ تو ضرور کم ہو گا۔ اگر نئے قلمکاروں کا سفر وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں ترقی پسندی اور جدیدیت ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے نقاد بھی وہیں سے نمودار ہو گا۔ "دو قومی رجحانات" کی حامل تنقید سے امید۔ کم از کم مجھے تو نہیں ہے۔

شعری حصہ اس بار مختصر بھی ہے اور نا تشفی بخش بھی۔ مگر اس کی ذمے دار تو بجلی خانم ہیں۔ ان کی کرم فرمائیاں کس پر نہیں ہیں۔؟ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔

☆خالد عرفان۔ بنگلور

کتاب نما "بابت ماہ جنوری ۹۸ء نظر نواز ہوا۔ دیگر نگارشات کے علاوہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے طویل مقالے "ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت" کی شمولیت نے اس شمارے کو وقیع بنا دیا ہے۔ "بادبان" کراچی شمارہ ۴ میں، میں نے اس مضمون کو پہلی بار پڑھا تھا تو میرے ذہن میں کئی سوال ابھرے تھے، انھیں کو میں دہرا رہا ہوں۔ امید ہے موقر "کتاب نما" کے ذریعہ ان سوالوں کا جواب مل جائے گا۔

نارنگ صاحب کا کہنا ہے۔ "ادب بنتا ہے انحراف و اجتہاد و اختلاف سے" سوال ہے کیا منفی رجحانات ہی ادب کی ترقی کے ضامن ہیں؟ کیا مثبت رجحانات ادب کے بننے میں ممد و معاون نہیں ہوتے؟ آگے چل کر انہوں نے لکھا ہے "ساختیات ہو یا پس ساختیات، مظہریت ہو یا قاری اساس تنقید، تفہیمیت ہو یا رد تشکیل، نسوانیت ہو یا نئی تاریخیت یہ سب ادبی نظریے کم و بیش اسی زمانے میں سامنے آئے ہیں یا ادب کی دنیا میں ان کا عمل دخل جدیدیت کے بعد ہوا ہے"۔ میرا اپنا خیال ہے بہت تصورات تو اردو ادب کے اولین دور میں نہیں تو بعد کے سبھی ادوار میں کسی نہ کسی شکل میں اردو ادب کا حصہ بنے رہے تھے۔ ان کو صرف جدیدیت سے جوڑنا کچھ صحیح نہیں لگتا ممکن ہے آج ان کے لیے واضح اصطلاحات استعمال کیے جانے لگے ہوں جن کو یہاں گنایا گیا ہے اور یہ بھی ہوا ہے کہ آج ان کو خوب بڑھاوا ملا ہے۔

آگے چل کر نارنگ صاحب نے محمود ایاز پر جو الزام لگایا ہے کہ وہ اور ان کی ٹائپ کے لوگ اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھتے اور یہ کہ وہ اپنے مفروضات اور تعصبات کے باعث نئے کو سمجھنے سے قاصر ہیں، مجھے بالکل غلط لگا۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے، محمود ایاز نے ہر نئی تحریک کی پذیرائی اس وقت کی جب کسی اور کی نگاہ وہاں تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی بات کو منوانے میں شدت کا شکار ہو جایا کرتے تھے۔ اب اگر کوئی ادب کے جاندار اقدار کے تعلق سے بنیادی سوال اٹھانے لگے یا فلسفیانہ گورکھ دھندوں میں الجھ جائے تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟

نارنگ صاحب نے لکھا ہے "غلط یا صحیح، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مابعد جدیدیت فلسفہ ادب کی تقریباً تمام شاخیں نظریاتی ضابطہ بندی کے سخت خلاف ہیں اور کسی طرح کا نظام مرتب کرنے یا لائحہ عمل دینے کے حق میں نہیں' سوال یہ ہے کہ کیا یہ ایک صحت مند رویہ ہے؟! یہاں پھر سے اقدار حیات کو درمیان میں گھسیٹا جا سکتا ہے!

نارنگ صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "مابعد جدیدیت کے پاس ایسا کوئی اینٹی ایجنڈا نہیں جیسا جدیدیت کے پاس ترقی پسندی کے خلاف تھا۔" اور کیا یہ بھی حقیقت نہیں ہے کہ یہی امر جدیدیت کی سب سے بڑی کمزوری رہی ہے۔ اگر جدیدیت ترقی پسندی کی جو حقیقت نگاری کی مترادف ہے، مخالفت نہ کرتی تو آج نہ وہ خود روبہ زوال ہوتی اور نہ مابعد جدیدیت کا دور شروع ہوتا! خصوصاً اس لیے کہ اگر یہ مخالفت نہ ہوتی تو فرد اور سماج کے درمیان ایک ایسا سلسلہ علاحدگی کی ضرورت نہ پڑتی اور اس طرح دونوں کی انفرادیت برقرار رہتی۔

بات کو آگے بڑھا کر جب جدیدیت کی پہچان کے لیے چار شقوں (Categories) کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ ان چاروں شقوں کا تورد ہو چکا ہے یا ارتفاع ہو چکا ہے تو ٹھہر کر سوچنا پڑتا ہے کہ کیا آج بھی ان چار شقوں میں سے کم از کم دو، ادب کی، خواہ وہ ترقی پسند ہو، جدید ہو کہ مابعد جدیدیت کا حامل ہو، پرکھ اور کسوٹی نہیں ہیں؟ میرا اشارہ فنکار کی لابدی ضرورت "اظہار آزادی" اور ادب کے "اظہار ذات" ہونے کی طرف ہے۔

اظہار آزادی پر جب بحث کی جاتی ہے اور آئیڈیالوجی کی بات کی جاتی ہے تو کئی دوسرے پہلو معرض بحث میں آجاتے ہیں۔ ان سے قطع نظر جب کہا جاتا ہے کہ "ادب اور آرٹ میں کوئی موقف خواہ وہ کتنا غیر آئیڈیالوجیکل محسوس ہو وہ معصوم ہو ہی نہیں سکتا، تو سوچنا پڑتا ہے کہ کیا معصومیت کسی آئیڈیولوجی کی معنویت کی کسوٹی ہے؟ یا ہو سکتی ہے؟ یا ہونی چاہیئے؟ جہاں تک "ادیب کے اظہار و اسلوب کے پیرایہ تک آئیڈیولوجی سے آزاد نہیں" کا مسئلہ ہے قابل غور نکتہ یہ

ہے کہ اسلوب کے پیرایہ کی حد تک جو پابندیاں ہیں وہ خود ادیب مسلط کر لیتا ہے، آئیڈیولوجی اس پر مسلط نہیں کرتی! ادب کی موضوعیت کے تعلق سے بات کی جاتی ہے تو پوچھنا پڑتا ہے کہ آیا موضوعیت ادب کی، بلکہ کسی بھی فن پارہ کی خوبی ہے کہ خامی؟ اور اسی طرح یہ بھی کہ کیا زندگی سے بے محابا عشق اور تڑپ ادب کی مستقل قدر نہیں ہے؟

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے، نارنگ صاحب نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ ادب اور غیر ادب میں مابہ الامتیاز بہر حال ادبی قدر ہی ہے (خواہ اس کا تعلق کسی زمانہ سے ہو یا اس پر کسی طرح کا لیبل چسپاں کیا جائے)۔ اسی حقیقت اور کسوٹی کی طرف محمود ایاز کیا، ہر حساس تخلیق کار اور نقاد فن اشارہ کرتا رہا ہے! اس کے لیے کسی پر ناک بھوں چڑھانا ہوشمندی کی دلیل نہیں ہے۔

جہاں تک فنی لوازم کی سماجی اقدار پر برتری کا سوال ہے اس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے کیونکہ سماجی اقدار سے زندگی کی حقیقتوں کا صحیح مقام متعین ہوتا ہے اور اس طرح ان اقدار کو یکسر نہیں بھلایا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں نارنگ صاحب نے نہایت کار آمد باتیں کہی ہیں اور ان سے پورا اتفاق کیا جاتا ہے، انہوں نے اس سلسلہ میں ہمارے ناقد و شارحین ادب کے دو رخی طریق کار کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

جدید تر شاعری اور فکشن کے تجزیہ میں محض اردو نہیں بلکہ دیگر ہندستانی زبانوں کے ادب کا محاسبہ بھی (خواہ اجمالی ہی کیوں نہ ہو) کیا گیا ہے جو مستحسن اقدام ہے اور اس مقالہ کا تقاضہ بھی۔

"سیل وقت میں نئے اور پرانے کا ساتھ" اس مقالہ کا حاصل ہے، اس کے ذریعہ نارنگ صاحب نے اپنی طویل و پر مغز و مدلل بحث کو نہایت جامع طور پر اس کے صحیح انجام کو پہنچایا ہے۔ اس مقالہ کے مطالعہ سے ادب کی ان تینوں تحریکوں کے بارے میں اردو ادب کے پس منظر میں نہایت کار آمد بنیادی امور پر بحث سے قاری کو اپنا ذہن بنانے میں بڑی مدد ملتی ہے، نارنگ صاحب اور "کتاب نما" دونوں اس مقالہ کے لیے قابل مبارکباد ہیں۔

☆ حکیم حسین خاں شفا جیل روڈ رام پور

فروری ۹۸ کا کتاب نما نظر نواز ہوا اس میں نیا شاعر پر جمال اویسی کا اشاریہ اور زبان و بیان پر پروفیسر عبد الخالق صاحب کا مضمون خوب ہے۔ انصار اللہ نظر صاحب تحقیق و تدریس کے میدان میں اردو زبان و ادب کے مانے ہوئے استاد ہیں لیکن بیاض غالب کی بحث کچھ بالکل ذاتی نوعیت کی ہو گئی ہے اور بیاض غالب بخط غالب اس کی دریافت گمشدگی تدوین ہندو پاک میں اور پھر اس سلسلے میں بھوپال اور دیگر شہروں میں مقدمے بازیاں ایک لمبی کہانی ہے اور بقول رضا علی عابدی اب یہ بیاض کسی ایسے اندھے کنویں میں ہے کہ جس کی بر آمدگی آسان معلوم نہیں ہوتی۔ بہر حال انصار اللہ صاحب کے اس مضمون نے اس بحث کو پھر سے تازہ کر دیا ہے۔

آج سے تقریباً ۷۴ سال پہلے مکتبہ جامعہ معمولی دکان کی حیثیت سے قائم کیا گیا تھا لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ آج یہ اردو کا ایک بڑا اشاعتی مرکز ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس ۷۴ سال کے اس طویل عرصے میں مکتبہ نے دنیا کے سرد و گرم کا مقابلہ کیا اور ہر دور میں ادب کی شمع کو نہ صرف فروزاں رکھا بلکہ اس کو مشعل راہ بھی بنایا۔ اردو زبان کی خدمت اور ملک کو آنے والی ضرورتوں کے مطابق بنانے کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند قومی احساس کی بیداری ہمارا نصب العین رہا ہے اور ہمیں اس منزل تک پہنچنے کے لیے دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ہم نے اب تک چھے ہزار سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں جو ہر طبقے میں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

آج جبکہ قلمی اور ادبی کاموں کی راہوں میں دشواریاں بڑھتی جارہی ہیں۔ مکتبہ نے ایک نئی قوت اور تازہ عزم کے ساتھ کام شروع کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جس طرح پہلے بھی ہم نے مشکلات کا صرف سامنا ہی نہیں کیا بلکہ ان کے درمیان راہیں ڈھونڈ نکالیں، اسی طرح آج بھی ان چٹانوں پر تیشہ زنی کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے اور پہلے کی طرح ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

جنوری ۱۹۹۸ء

یادداشت

☆ براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اپنا نام اور پتا اردو اور انگریزی میں صاف تحریر فرمایئے۔

☆ڈاک خانے اور مقام کا نام انگریزی میں لکھ سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔

☆اپنے آرڈر کے ساتھ کم از کم چوتھائی رقم پیشگی ضرور بھجوایئے۔ آرڈر کی تعمیل کرتے وقت یہ رقم بل میں سے کم کر دی جائے گی۔

☆اس مختصر فہرست کتب میں آپ کی مطلوبہ کتاب موجود نہ ہو تب بھی براہ کرم آپ ہمیں خط ضرور بھیجئے۔ ہم مطلوبہ کتاب فراہم کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔

☆ مصارف ڈاک وریل وغیرہ حسب قاعدہ خریدار کو ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنی سہولت کے پیش نظر آرڈر میں اس کی وضاحت ضرور کر دیجئے کہ کتابیں ڈاک سے بھیجی جائیں یا ریل سے۔

☆کتابیں بذریعہ سواری گاڑی منگوانے کی صورت میں قریبی ریلوے اسٹیشن کا نام ضرور لکھ دیجئے۔

☆کاغذ کی گرانی کی وجہ تقریباً ہر ادارے نے اپنی کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے اس لیے آرڈر کی تعمیل کے وقت وہی قیمت چارج کی جائے گی جو اس وقت مقرر ہو گی۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے دفاتر

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' جامعہ نگر۔
نئی دہلی110025
ٹیلی فون نمبر 6910191
شاخیں.
مکتبہ جامعہ لمٹیڈ۔ اردو بازار جامع مسجد۔
دہلی110006
ٹیلی فون نمبر 3260668
مکتبہ جامعہ لمٹیڈ۔ پرنس بلڈنگ۔
ممبئی400003
ٹیلی فون نمبر3774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' یونیورسٹی مارکیٹ
علی گڑھ202002
فون نمبر406142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نزد ڈاک خانہ۔
جامعہ نگر، نئی دہلی110025

مطبع
لبرٹی آرٹ پریس' ۱۵۲۸ پٹودی ہاؤس۔
دریا گنج، نئی دہلی110002
ٹیلی فون نمبر:3276018

لبرٹی آرٹ پریس پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دریا گنج نئی دہلی110002 میں چھپوا کر شائع کیا

مکتبہ جامعہ بک کلب

کا ممبر بن کر اردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے۔

ہمیں یقین ہے کہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

قواعد و ضوابط

1۔ بک کلب کی فیس رکنیت دس روپے (-/Rs.10) ہے۔ (ممبر بننے کے لیے کسی فارم کی ضرورت نہیں۔ فیس کی رکنیت بھیج دینا کافی ہے۔

2۔ بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ زر تعاون -/70 روپے ہے) صرف -/65 روپے سالانہ زر تعاون لیا جائے گا۔

3۔ ممبر کو مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) %25 اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اردو کی کتابوں کی خریداری پر %10 کمیشن دیا جائے گا (ہر فرمائش پر بک کلب کی ممبری کا حوالہ دینا ضروری ہوگا)

4۔ بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جا سکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کا ممبر نہیں بن سکتی۔

5۔ ممبری کے دوران ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔

6۔ کتابیں بذریعہ وی پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجات روانگی کتب ممبر کے ذمے ہوں گے۔

7۔ گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر پچھلا حساب صاف کرے اور آیندہ کے لیے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔

8۔ بک کلب کی رکنیت کی مدت پوری ہو جانے کے باوجود اگر کسی نے اپنی طرف سے کتابوں کا آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتاب بھیج کر حساب صاف کر دیں گے۔

ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یا اس کی کسی بھی شاخ سے حاصل کر سکتے ہیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ 202002

پانچ جدید شاعر

اس مجموعے میں اردو کے پانچ جدید شاعر فیض احمد فیض' میراجی' حامد مدنی.ن.م. راشد اور ضیاجالندھری کا تعارف ' شخصیت و کردار کی کچھ جھلکیاں ان کا' مختصر کلام اور کلام پر تبصرہ شامل ہے۔ قیمت:-/210

اعلا تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین

مترجم: مسعودالحق

اس کتاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے ایسے ۱۴ خطبات شامل ہیں جو موصوف نے ہندستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں جلسہ تقسیم اسناد کے موقعہ پر دیے تھے۔ یہ خطبات تعلیم سے متعلق ہیں۔ یہ 'خطبات عام لوگوں کے لیے عموماً اور تعلیم کا کام کرنے والے حضرات کے لیے خصوصاً بڑے مفید ثابت ہوں گے۔ قیمت -/120

اردو زبان وادب کے فروغ میں

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ مرتبہ: صغرا مہدی

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ابتدا ہی سے اردو کی تعلیم اور فروغ میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اس مجموعہ مضامین میں جامعہ کے اساتذہ اور قدیم طلبہ نے بتایا ہے کہ جامعہ نے صحافت' تحقیق' نثر نگاری 'ڈراما نگاری اور بچوں کے ادب کے لیے کس پایے کا کام کیا ہے۔ قیمت:-/75

ڈسپلن کی تعلیم وتربیت: ڈاکٹر محمد اکرام خاں

اس کتاب کا مرکزی نقطہ بچے کی 'داخلی ڈسپلن" ہے۔ اس کے لیے والدین اور اساتذہ میں روشن خیالی کے ساتھ ساتھ جس صبر و ضبط کی ضرورت ہے اس کو واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ قیمت :-/90

آخر کار مجتبی حسین

عہد حاضر کے سب سے زیادہ مقبول مزاح نگار کے مضامین کا نیا مجموعہ۔ جسے ایک بار پڑھنے کے بعد بار بار پڑھنے کو دل چاہے گا۔

قیمت -/60

الجھنیں عبداللہ ولی بخش قادری

یہ کتاب قاری کو نہ صرف اپنی ذات اور اپنے ماحول کو سمجھنے اور برتنے کے لیے آمادگی پیدا کرے گی بلکہ نفسیاتی تہہ داری نیز ان کی موجودہ الجھنوں کو رفع کرنے اور نئی الجھنوں سے بچانے کا موجب بھی ہو سکتی ہے۔ قیمت.-/60

طب یونانی اور چیلنجز حکیم اشہر قدیر

اس تصنیف کا مقصد یہ ہے کہ حلقہ طب اجتماعی طور پر ان مسائل سے واقف ہو جو طب کے مقابل چیلنج بن کر کھڑے ہیں اور مشترکہ طور پر اس فن کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں۔ اپنی نوعیت کی اہم کتاب۔ قیمت: /60

فراق: دیار شب کا مسافر

مرتبین: شمیم حنفی / سہیل اختر فاروقی

فراق کے غیر مطبوعہ مضامین انٹرویو' شخصیت'

شاعری' نثری جائزے۔ معروف ادیبوں کے قلم سے۔ قیمت:-/150

لفظوں کی انجمن میں ڈاکٹر سید حامد حسین

یہ کتاب آپ کے اس تجسس کو بڑی حد تک تشفی بخشے گی جب آپ کو یہ معلوم کرنے کی خواہش ہوگی کہ یہ لفظ کہاں اور کیسے ہماری زبان میں آیا۔ قیمت : -/120

بیاں اور اختر سعید خاں

اردو کے ممتاز شاعر اور ادیب اختر سعید خاں کے دس بلند پایہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت:-/144

تعبیر و تفہیم ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم کا نام اب اردو دنیا کے لیے نیا نہیں ہے۔ موصوف کے کئی ادبی' تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے مجموعے منظر عام پر آکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں بھی بیشتر مضامین تحقیقی ہیں۔ قیمت:/135

فرہنگ اصطلاحات طب

(انگریزی۔ اردو۔)

GLOSSARY OF MEDICAL TERMS

(ENGLISH-URDU)

مصنف: ڈاکٹر اختر امر تسری

نظر ثانی ترمیم و اضافہ: مسعود احمد برکاتی

اس کتاب میں عام عربی' فارسی' اصطلاحی الفاظ کے بجائے اردو کے آسان الفاظ کو ترجیح دی گئی ہے۔ میڈیکل سائنس کے شعبے میں یہ اصطلاحی لغت ترجمے کی ضرورتوں کو یقیناً پورا کرے گا۔ طب کے اساتذہ و طلبہ کے لیے مفید لغت۔ قیمت: /45

معاصرین و متعلقات مولانا ابوالکلام آزاد

عبدالقوی دسنوی

پروفیسر عبد القوی دسنوی کا نام آزاد شناسوں کی صف میں خاصا نمایاں ہے۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کے ساتھ ساتھ ان کے معاصرین کا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ قیمت: /60

سلاخ ٹوٹتی ہے کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کے پانچ ریڈیائی ڈراموں کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت: /90

مخملہ یوسف ناظم

اردو کے ممتاز مزاح نگار یوسف ناظم کے سولہ دلچسپ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ پڑھیے اور سر دھنیے۔ قیمت: /51

جو رہی سو بے خبری رہی ادا جعفری

(خود نوشت)

بدایوں کی ایک بہت بڑی اور پرانی حویلی کی اونچی دیواروں کے درمیان پرورش پانے والی ایک ذہین اور حساس لڑکی کی آپ بیتی' جس کی حیثیت آج اردو شاعری میں خاتون اوّل کی ہے۔

قیمت: /200

اخلاقیات طبیب حکیم محمد سعید

حقیقت یہ ہے کہ طبیب کے لیے علم میں مہارت جتنی ضروری ہے اتنی ضروری اخلاقی

رفعت بھی ہے۔ یہ کتاب اس دور میں طب کے ہر
عامل اور ہر طالب علم کے لیے ایک اخلاقی معلم کی
حیثیت رکھتی ہے۔ قیمت: 20/

تصوف: رسم اور حقیقت خواجہ حسن ثانی نظامی

تصوف کی تاریخ: صوفیہ کے نظام
حیات، تعلیمات، ہندوستانی سماج پر صوفیہ کے
اثرات، اور ان سے متعلق دوسرے سوالات پر
روشنی ڈالنے والی اپنی نوعیت کی پہلی کتاب جس میں
برصغیر ہندوپاک میں رائج جملہ صوفی سلسلوں
کے مکمل شجرے بھی دیے گئے ہیں۔ قیمت: 90/

مستقبل کی طرف

مرتبین: خواجہ محمد شاہد : خالد کمال فاروقی

مولانا محمود حسن کے خطبہ تقسیم اسناد
(جامعہ ملیہ اسلامیہ) سے لے کر آج تک کے ایسے
تمام خطبات کا مجموعہ۔ ایک اہم تاریخی دستاویز۔
قیمت: 150/

قلم اور قدم سید حامد

ہمارے تہذیبی، تعلیمی، لسانی، معاشرتی
مسائل کا بے لاگ اور ہمدردانہ تجزیہ۔ ہمارے
عہد کے ایک ممتاز دانشور اور سماجی مبصر کے
قلم سے۔ ان مضامین کا اہم ترین پہلو جیتی جاگتی
زندگی کے مسائل اور معاملات سے ان کا گہرا تعلق
ہے۔ قیمت: 75/

مفکرین تعلیم ڈاکٹر محمد اکرام خاں

تعلیم کا کام درحقیقت پیغمبرانہ کام ہے
اس اہم اور نیک کام کے لیے جن اہم ۱۴ ملکی و غیر
ملکی ماہرین تعلیم نے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا
ہے اس کتاب میں ان کے خیالات، ان کا فلسفہ، ان
کی سوانح مختصر مگر جامع انداز میں پیش کی گئی ہے۔
قیمت: 120/

استادوں کی تعلیم و تربیت مسعود الحق
(ایک زاویہ نگاہ)

مسعود الحق ایک صاحب فکر معلم ہیں۔
موصوف نے اپنے تجربات کی روشنی میں بتایا ہے
کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر
ٹیچر ایجوکیشن کے نظریے اور عمل میں کس قسم کی
تبدیلیاں درکار ہیں؟ قیمت: 60/

سرسید سے اکبر تک

مرتبین: شمیم حنفی / سہیل فاروقی

سرسید اور ان کے عہد کا مطالعہ ہمارے
اجتماعی حال اور مستقبل کے مطالعہ ہے۔ یہ کتاب
سرسید کے عہد کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے نہایت
مددگار ثابت ہوگی۔ قیمت: ۹۰/

سیاہ فام ادب

مرتبین: شمیم حنفی / سہیل فاروقی

ایک نئی، زندہ اور متحرک حسیت کا منظر
نامہ، سیاہ فام جمالیات اور سیاہ فام ادب پر اردو میں
اولین کاوش۔ آج کے ادبی مزاج کو سمجھنے کے لیے
اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے قیمت: 40/

خامہ بگوش کے قلم سے

۱۹۸۳ء تا ۱۹۹۰ء کے طنزیہ مزاحیہ کالموں کا انتخاب، جلد اول۔

مرتبہ: مظفر علی سید

عہد حاضر کے سب سے زیادہ مقبول اور
سب سے زیادہ پڑھے جانے والے کالموں کا

مجموعہ، جس کا اردو والوں کو بڑی بے چینی سے انتظار تھا جو رنگین بھی ہے اور سنگین بھی۔

قیمت مجلد: /150 عام ایڈیشن: /80

انوار قرآن پروفیسر نثار احمد فاروقی

یعنی اسلامی تصوف کے حوالے سے

قرآن فہمی کے چند پہلو۔ یہ مضامین اگرچہ مختصر ہیں اس کے باوجود ان کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ اندازہ ضرور ہوگا کہ ہمارے بزرگ صوفیا کو قرآن کریم سے کتنا گہرہ شغف تھا اور اس کے لطیف نکات کو کیسے سمجھتے اور سمجھاتے تھے (نیا اڈیشن' اضافے کے ساتھ) قیمت: /30

رنگ، خوشبو، روشنی قتیل شفائی

قتیل شفائی کی آواز شاعری کی اسی جادو اثری کی آواز ہے جس نے اندھیرے میں بھی ایک جوت جلا رکھی ہے۔ قتیل شفائی کے چودہ شعری مجموعوں کا انتخاب۔ قیمت: /80

گاہے گاہے رولین: لارنس

اردو کسی خاص مذہب یا کسی خاص طبقے کی زبان نہیں، یہ ان کی زبان ہے جو حساس دل رکھتے ہیں لارنس ریاضی داں ہیں عیسائی مذہب کے پیرو ہیں۔ اردو میں لگ بھگ ۴۰۔۴۵ سال سے شاعری کر رہے ہیں۔ اشعار پڑھیں گے تو جھوم جھوم جائیں گے۔ اس شعری مجموعے کا مقدمہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے سپرد قلم کیا ہے۔ -/30

اشارات قلب پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم

اشارات قلب میں ڈاکٹر سید اسلم صاحب نے سادہ و سلیس زبان میں دل کی صحت، تکالیف، اسباب، متعلقہ مسائل نہایت اختصار کے ساتھ مع ضروری ہدایات پیش کیے ہیں۔ -/6

مولانا ابوالکلام آزاد: پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

(فکر و نظر کی چند جہتیں)

اس کتاب میں مولانا آزاد کے افکار و خیالات اور ان کی علمی و عملی سرگرمیوں کے قومی و ملی محرکات کو نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یقیناً ان مضامین میں قارئین کو مولانا سے متعلق بعض نئی معلومات بھی ملیں گی۔

قیمت۔ -/60

صحرا میں لفظ فضیل جعفری

فضیل جعفری کا شمار آج کے عہد کے سنجیدہ اور ذمے دار نقادوں میں ہوتا ہے۔ دور حاضر کے شاعروں پر لکھے ہوئے موصوف کے ۲۴ نہایت اہم مضامین کا مجموعہ۔ قیمت: -/90

جدید ادبی تحریکات و تعبیرات

ڈاکٹر سید حامد حسین

اس مجموعے میں ۲۲ مضامین شامل ہیں جو ۱۹۶۴ سے ۱۹۹۴ء کے عرصے میں لکھے گئے ہیں اور اس دوران اردو کے ادبی منظر نامے میں جن تحریکات و تعبیرات کی کارفرمائی نظر آتی ہے ان کے بعض اہم پہلوؤں کو بحث کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے۔ قیمت: /51

طراز دوام اختر سعید خاں

غزل کا فن نرم آنچ سے جلا پاتا ہے' بھڑکتے شعلوں سے نہیں۔ وہ ایک آنسو ہے پلکوں

پر ٹھہرا ہوا۔ ایک تبسم ہے ہونٹوں پر پھیلا ہوا۔ کبھی اس کے تبسم میں اشک کی نمی ہوتی ہے تو کبھی اشکوں میں تبسم کی جھلک۔ یہ ساری خوبیاں اس شعری مجموعے میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ 51/

فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ

ڈاکٹر مومن محی الدین

ڈاکٹر مومن محی الدین کا شمار جدید فارسی ادب کے اسکالرز میں ہوتا ہے' موصوف نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ فارسی داستان نویسی کی تاریخ مرتب کی ہے جو مختصر بھی ہے اور جامع بھی۔ قیمت: 45/

سیر کر دنیا کی غافل — ڈاکٹر صغرا مہدی

ڈاکٹر صغرا مہدی کا نام اردو دنیا میں اب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مندرجہ بالا کتاب آپ کے پانچ سفرناموں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر خالد محمود کا ان سفرناموں پر تبصرہ اور یوسف ناظم کا ایک دلچسپ خاکہ بھی شامل ہے۔ 51/

ٹیلی ویژن نشریات — انجم عثمانی

(تاریخ تحریر' تکنیک)

اردو میں ٹیلی ویژن نشریات پر پہلی کتاب جو ایسے حضرات کے لیے نہایت اہم کتاب ہے جو ٹیلی ویژن کے لیے لکھنا یا کوئی اہم کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ قیمت: 90/

کاسۂ خیال — عبدالمعروف خاں چودھری

معروف صاحب حقیقی شاعر ہیں جو خیال کو جذبے میں تبدیل کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے یہاں فکر اپنی تجریدی شکل میں نہیں ملتا۔ ان کا تشبیہی تخیل علامتوں' استعاروں اور حسی پیکروں میں اپنی کارفرمائی دکھاتا ہے جس کا آپ بخوبی اندازہ اس شعری مجموعے کے مطالعے سے لگا سکتے ہیں۔ قیمت۔ 51/

اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ : ابراہیم یوسف

اس مجموعے میں اردو ڈرامے کی تنقید کی محرکات اور رجحانات جو ابتدا سے تاحال کارفرما رہے ہیں۔ پیش کیے گئے ہیں۔ قیمت:-45/

انشائے غالب مرتبہ: رشید حسن خاں

مرزا غالب نے ضیاء الدین خاں کی فرمائش پر نثر و نظم کا انتخاب تیار کیا تھا۔ مرزا غالب کے قلم کی تصحیحات ہیں جو ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (مرحوم) کے پاس محفوظ تھی انہوں نے اس کے حواشی لکھ لیے تھے لیکن مقدمہ نہیں لکھ پائے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مالک رام صاحب نے اس کا مقدمہ لکھا اور مزید حواشی لکھے۔ رشید حسن خاں نے اب مختصر پیش لفظ کے ساتھ اس انتخاب کو سارے متعلقات کے ساتھ مرتب کیا۔ آخر میں اصل خطی نسخے کا عکس بھی شامل ہے۔ 60/

حضرت محمدؐ اور قرآن — ڈاکٹر رفیق زکریا

مترجم۔ ڈاکٹر مظہر محی الدین

ڈاکٹر رفیق زکریا کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ' اس کتاب میں سلمان رشدی کے ناول "شیطانی آیات" کا مدلل اور عالمانہ جواب دیا گیا ہے (زیر طبع)

وسط ایشیا: نئی آزادی، نئے چیلنج آصف جیلانی

سابق سوویت یونین کی نو آزاد مسلم جمہوریاؤں کے سفر کے تجربات و مشاہدات پر مبنی بی بی سی لندن کی اردو نشریات سے نشر ہونے والے سلسلہ وار پروگراموں پر مشتمل ایک دستاویز۔ /51

معیار اردو: مرتبہ نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

یہ کتاب زبان اردو کے محاورات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے طلبہ اور ریسرچ اسکالرز محاورات کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ -/21

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم

پروفیسر اختر الواسع

پروفیسر اختر الواسع نے ۱۸ جون ۱۹۹۱ء کو انجمن اسلام ممبئی کی دعوت پر "معین الدین حارث یادگاری سیرت لیکچر" کے سلسلے میں مندرجہ بالا عنوان کے تحت جو خطبہ دیا تھا، اسے اب کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ /10

تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات

ڈاکٹر سید جمال الدین

زیر نظر کتاب میں اردو کے قاری کو ۹ بلند پایہ مورخین اور ان کے فن تاریخ نگاری سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ان میں یونان، عرب، جرمنی، برطانیہ اور ہندوستان کے مورخین شامل ہیں۔ قیمت۔ /51

محاورات ہند سبحان بخش

بہ تصحیح و ترتیب۔ محبوب الرحمٰن فاروقی

محاورات کے اس مجموعے کا پہلا اڈیشن ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا تھا اس میں دہلی کے گرد و نواح کے محاورے اکٹھا کر کے بہ حروف تہجی جمع کر دیئے گئے ہیں۔ قیمت /51

تذکیر و تانیث: نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

جانشین امیر مینائی حافظ جلیل نے اس قیمتی کتاب کے ذریعے زبان اردو میں تذکیر و تانیث کا ایک فتاویٰ مدون کیا ہے۔ اس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث بتائی گئی ہے اہل اردو کے لیے ایک قیمتی تحفہ۔ قیمت -/75

عبارت کیسے لکھیں؟ رشید حسن خاں

یہ کتاب اس لیے مرتب کی گئی ہے کہ ہمارے طالب علموں کو املا کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہو سکے اور ان کی ان خرابیوں سے محفوظ رہ سکے جس سے عبارت میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ قیمت۔ /18

آگے سمندر ہے (ناول) انتظار حسین

انتظار حسین کا شمار اردو کے صف اول کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے "آگے سمندر ہے" آپ کا تازہ ترین ناول ہے۔ قیمت: /150

تفہیم رشید حسن خاں

اردو کے بلند پایہ محقق، دانشور اور زبان کے پارکھ جناب رشید حسن خاں کے اہم ترین مضامین کا نیا مجموعہ۔ قیمت۔ /75

چہرہ در چہرہ مجتبیٰ حسین

مجتبیٰ حسین نے بلاشبہ شخصی خاکہ نگاری کو ایک نیا اسلوب اور نیا آہنگ عطا کیا ہے اردو کی بیس اہم شخصیتوں کے باغ و بہار خاکے۔ -/51

فی البدیہہ   یوسف ناظم

اردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار یوسف ناظم کے ۱۶ دلچسپ اور قہقہوں سے بھرپور مضامین کا نیا مجموعہ۔ قیمت: 45/

تعلیم و تعلم   محمد اکرام خاں

ڈاکٹر محمد اکرام خاں کا تعلق درس و تدریس سے رہا ہے "تعلیم" کے موضوع پر موصوف کی کئی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب آپ کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ 75/

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں: عبد القوی دسنوی

اس کتاب میں اردو کے گیارہ شاعر (اکبر، حالی، چکبست: سید سلیمان ندوی، پرویز شاہدی، فراق، ساحر، جاں نثار اختر، فیض احمد فیض اور مجروح) کی شاعری اور فن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت: 75/

انشا اور تلفظ: رشید حسن خاں

یہ کتاب آپ کے لیے اردو کے ممتاز محقق اردو و زبان کے پارکھ جناب رشید حسن خاں نے لکھی ہے۔ اس کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ جملہ یا عبارت کس طرح لکھی جائے اور اس کی خوبیاں اور خرابیاں کیا ہیں۔ قیمت :/ 12

شعریات سے سیاسیات تک   غلام ربانی تاباں

مترجم : اجمل اجملی

فرقہ واریت کے خلاف تاباں صاحب کے انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ۔ قیمت: 51/

سر سید اور روایت کی تجدید: پروفیسر مونس رضا

سر سید اور اردو یونیورسٹی: پروفیسر مسعود حسین خاں

مرتبہ: خواجہ محمد شاہد

سر سید یادگاری خطبات کا سلسلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسو سی ایشن دہلی نے ۱۹۸۶ء میں شروع کیا تھا۔ اب تک چار ممتاز دانشوروں کے خطبات شائع کیے جا چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ بھی اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ 10/

آدم خور چیتا: ریاض احمد خاں

اس کتاب میں شکار کی جتنی کہانیاں ہیں سب سچی اور آنکھوں دیکھی ہیں۔ حیرت انگیز اور دل دہلا دینے والی کہانیاں۔ قیمت: 45/

جھینی جھینی بینی چدریا: عبدل بسم اللہ

مترجم: وسیم حید رہاشمی

سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور کیڈیا ایوارڈ یافتہ یہ ناول بنارس کے انصار بھائیوں کی تہذیب و تمدن کی ایک روشن تصویر ہے جس کو ناول نگار نے دس سال بنکروں کے بیچ رہ کر انہی کی زبان اور کلچر پر قلم بند کیا ہے۔ قیمت: 75/

انداز گفتگو کیا ہے :   شمس الرحمن فاروقی

اس کتاب میں شامل اکثر مضامین گفتگو کا موضوع رہے ہیں اور اس بنا پر ان کے ذریعے کچھ پرانے مسائل پر نئی گفتگو کا آغاز ہوا۔ اس کے تمام مضامین میں شاعروں اور شاعری کو ہی معرض بحث میں لایا گیا۔ قیمت: 75/

دستک اس دروازے پر: وزیر آغا

اس کتاب میں موجودیت کا فلسفہ اور اس

سلسلے میں مغرب کے فلسفے' تصوف اور اردو ادب کی مختلف تحریکوں کا بیان ہے۔ عارفانہ تجربے اور تخلیقی تجربے کا فرق ہی اس کتاب کا موضوع ہے۔
قیمت: 51/

مٹی کا بلاو (ڈرامے) : شمیم حنفی
سب سے بڑا ڈراما خود انسانی زندگی ہے۔
شمیم حنفی کے یہ ڈرامے زندگی کے ڈرامے کا ایک منظر بہ ترتیب دیتے ہیں۔ ایک نئے تہذیبی اور سماجی زاویہ نظر کا عکس 'ان میں بیشتر ڈرامے ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی نشریات کے ذریعے مقبول ہو چکے ہیں۔ (دوسرا اڈیشن) قیمت: 45/

شناس و شناخت: انور صدیقی
پروفیسر انور صدیقی کے بارہ اہم ادبی و تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ جس کے مضامین اردو ادب کے طلبہ اور اساتذہ کی معلومات میں اضافہ کریں گے۔ قیمت: 60/

کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے
ڈاکٹر تقی حسین جعفری
انگریزی عشقیہ شاعری کے فروغ میں اندلسی اور عرب تہذیب و ادب کے بعض مصادر کی نشان دہی اور فراق اور شہریار کی شعری حسیات میں مغربی رجحانات کے بارے میں علمی مضامین' گلستان سعدی کے منظوم اردو تراجم' دانشوری اور تصور مذہب' میر' سودا اور ناصر کاظمی کی غزلوں کے تجزیے شامل ہے۔ قیمت: 51/

صحرا نورد کے خطوط میرزا ادیب
صحرا نورد کے خطوط آج سے کم و بیش تیس برس پہلے شائع ہوئی تھی۔ اب تک اس کے بارہ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کے کسی افسانوی مجموعے کو اس قدر مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی صحرا نورد کے خطوط کو ہوئی۔
قیمت 75/

اسرار خودی ترتیب: شایستہ خان
(فراموش شدہ اڈیشن)
علامہ اقبال کی "اسرار خودی" کے پہلے اڈیشن میں گیارہ اشعار پیش کش سے نکال کر تمہید میں منتقل کر دئے گئے۔ کون سے اشعار حذف کیے اور وہ کہاں گئے؟ اور وہ اشعار کون سے تھے؟ یہ آپ کو اس کتاب کے عکسی اڈیشن سے معلوم ہوگا۔
قیمت -/75

مسلمانوں کا تعلیمی نظام: ضیاء الحسن فاروقی
اس کتاب میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام سے متعلق چار اہم مضامین ہیں جن میں قیام مدارس کی تحریک، بغداد کا مدرسہ نظامیہ اور مسلمانوں کا نظام تعلیمی (عہد وسطی کے ہندستان میں) خاصی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ 45/

جام جہاں نما گربچن چندن
ہندستان میں اردو صحافت کے آغاز کے بارے میں نئی دریافتوں کی حامل یہ کتاب پہلی بار ان حقائق کو پیش کرتی ہے جو اب تک نیشنل آرکائیوز آف انڈیا اور برٹش لائبریری کے شعبے مستشرق میں مستور تھے۔ مصنف نے اوریجنل ریکارڈ کے مشاہدے کے بعد مسلمہ نظریات کا بیباک جائزہ لیا ہے اور اردو کے اس اولین مطبوعہ اخبار کے حقیقی موقف، کردار اور مرتبے کی صراحت کی نشان دہی

کی ہے جو ۱۹ویں صدی میں ہندستان اردو صحافت کی پیش رفت میں جام جہاں نما نے ڈالا۔ 75/

حمورابی اور بابلی تہذیب تمدن: مالک رام

دنیا کے علم و فن ، آئین و قوانین ، حکومت نسق ، مذہب، معاشرت، غرض کہ زندگی کے ہر شعبے کی تشکیل و ترقی اور ترویج میں بابل کا جو مقام رہا ہے اس کی تفصیل آپ کو اس کتاب میں ملے گی۔ قیمت: 75/

اپنے دل کی حفاظت کیجئے:

ڈاکٹر لیفٹیننٹ کرنل کے۔ ایل چوپڑا۔

ترجمہ: نذیر الدین مینائی

خدانہ کرے کسی کو دل کا دورہ پڑے۔ اور کچھ نہیں احتیاطی تدابیر تو کر ہی سکتے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر کے۔ ایل چوپڑا نے دل کا فعل۔ دل کا دورہ قلبی انجوگرافی۔ بائی پاس سرجری سبھی کچھ بیان کر دیا ہے۔ کتاب باتصویر ہے۔ 25/

تذکرہ ماہ و سال: مالک رام

اس مجموعے میں اردو کے بیشتر ادیب، شاعر، نقاد، کالم نگار، صحافی اور دوسرے اہم عمائد (جنہوں نے اردو ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے) کی تاریخ ولادت اور جو ہماری بدقسمتی سے انتقال کر چکے ہیں ان میں سے اکثر کی تاریخ وفات بھی درج ہے۔ کسی بھی اہم ادیب پر مضمون لکھتے وقت، اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ 125/

شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان

تالیف: مولانا حکیم محمود احمد برکاتی

اس کتاب میں برکاتی صاحب نے حضرت مولانا شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ نیز ان کی تصانیف، تلامذہ، مریدین شاہ ولی اللہ کا تعارف بھی ہے۔

قیمت. 45/

افکار اقبال: محمد عبد السلام خاں

اس اہم کتاب میں علامہ اقبال کے حالات زندگی، ان کے اردو اور فارسی کلام پر سیر حاصل بحث، ان کے مذہبی اور سیاسی افکار اور کچھ ایسے اہم واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جو اب تک اندھیرے میں تھے۔ قیمت 125/

تحقیق نامہ: مشفق خواجہ

مشفق خواجہ ' اردو کے وہ واحد محقق ہیں جو ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی اہمیت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی خلا کو پُر کرتے ہوں زیر نظر مجموعے میں ایسے ہی اہم ترین مضامین شامل ہیں: قیمت: 125/

مرضیات: حکیم نعیم الدین زبیری

بیماریوں کے اصول یا اسباب اور ان کی وجہ سے افعال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعے یعنی ماہیت الامراض (پیتھالوجی) پر جامع اور آسان بحث، طب کے طلبہ کے علاوہ اطبا کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔ قیمت: 75/

تاثرنہ کہ تنقید: صدیق الرحمٰن قدوائی

تنقید ادب کی اہم شاخ ہے مگر اس کا ضرورت سے زیادہ چرچا بھی اچھا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص نقاد ہو جائے ' ادب کو تنقید کے سوا بھی مختلف

زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ جن کا انحصار پڑھنے والوں کے انفرادی مزاجوں پر ہے۔ یہ تصنیف ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔ قیمت:/51

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے: طاہر مسعود
(۱۹ادیبوں کے انٹرویو)

طاہر مسعود نوجوان صحافی اور کالم نگار ہیں۔ آپ نے عہد حاضر کے ۱۹ادیبوں کے انٹرویو لیے ہیں اس میں طاہر مسعود کے چبھتے ہوئے سوالات اور ادیبوں کے چونکا دینے والے جوابات شامل ہیں۔ قیمت:/66

گوشے میں قفس کے: دلیپ سنگھ
(طنزیہ مزاحیہ مضامین)

دلیپ سنگھ کا نام اب طنزیہ مزاحیہ ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، گوشے میں قفس کے" آپ کے طنزیہ مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ قیمت:/45

سحر کے پہلے اور بعد: میرزا سعید الظفر چغتائی

یہ ایک قصبے کی سماجی اور سیاسی تناظر میں لکھی ہوئی کہانی ہے جس میں مصنف کے بچپن کی گلیاں 'سعدیؒ کے گلستاں کی طرح حسین و نوجوان نظر آرہی ہیں۔ دلچسپ جگ بیتی۔ قیمت /51

تحریریں: اسلم پرویز

اردو کے جانے مانے ادیب اور نقاد ڈاکٹر اسلم پرویز کے اہم مضامین کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت:/51

ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کا بھوپال گیس ٹریجڈی کے موضوع پر نیا ناول۔ انسانی رشتوں کے بننے، استوار ہونے اور ٹوٹنے کی درد انگیز داستان! جو ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ -/40

سفر (ناول): رابعہ تبسم

رابعہ تبسم کا ایک اچھوتا رومانی ناول۔ روزانہ زندگی میں پیش آنے والی خوشیوں اور غموں کا سنگم۔ قیمت /27

خواب اور خلش (شعری مجموعہ) آل احمد سرور

شاعری ذات سے کائنات تک کا سفر ہے۔ یہ خوابوں کے ذریعے حقائق کی توسیع کا نام ہے۔ بڑی شاعری تجربے سے مدد لیتی ہے مگر وہ روایت اور تجربے میں ایک توازن رکھتی ہے۔ آل احمد سرور کی شاعری صرف الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ اس میں معانی کا ایک سمندر ہے جس کی تہہ میں پہنچ کر ہی موتی نکالے جاسکتے ہیں۔ -/66

غبار منزل: غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں نظموں اور قطعات کا تازہ ترین مجموعہ جس میں سازلرزاں، ذوق سفر، اور نوائے آوارہ، کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت /45

فرید و فرد و فریدؒ: ڈاکٹر اسلم فرخی

شیخ کبیر فرید الدین مسعودؒ اور شیخ نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہی کے روحانی سفر کی روداد۔
قیمت:/27

اردو کے طلبہ کے لیے سستی کتابوں کا نیا سلسلہ

اقبال کے اردو کلام کے مجموعے

بانگ درا — قیمت:/12

بال جبریل — قیمت:/8

ضرب کلیم. مع ارمغان حجاز (اردو نظمیں) — قیمت /8

پیامی قواعد اردو

قواعد جیسے خشک مضمون کو سمجھنے، سمجھانے اور برتنے کے لیے نہایت آسان زبان میں ترتیب دی ہوئی یہ قواعد اساتذہ اور طلبہ کے لیے نہایت مفید ہے۔ قیمت./6

طلبہ اڈیشن ۔ قیمت /3

پہچان اور پرکھ: پروفیسر آل احمد سرور

اس مجموعے میں پروفیسر آل احمد سرور کے جو مضامین شامل ہیں ان کا تعلق زیادہ تر شاعروں اور شاعری کی خصوصیات سے ہے۔ میر، غالب، انیس، حسرت 'فانی' جوش اور فراق کی شخصیات اور شاعری پر بھرپور مضامین کا اہم مجموعہ۔ قیمت:/51

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم:

ڈاکٹر سلامت اللہ

اس کتاب میں مسلمانوں کی تعلیم کے جن مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے وہ مصنف کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے اس کے تاریخی اور حالیہ شواہد موجود ہیں۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ کی اہم ترین تصنیف۔ قیمت -/51

اقبال کا نظریہ خودی: عبدالمغنی

اس کتاب میں نظریہ خودی کو مرکزی نقطہ فرض کر کے اقبال کے پورے نظام فکر کی تلاش کی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی شاعری کی حقیقی جہت واضح ہو اور دوسری طرف آج کی انسانیت کو اپنے ارتقاء کی صحیح سمت دریافت کرنے میں سہولت ہو۔ قیمت:/150

پت جھڑ کی آواز: قرۃالعین حیدر

برصغیر کی ممتاز ترین افسانہ نگار قرۃالعین حیدر کی اہم کہانیوں کا مجموعہ۔ یہ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور زندگی کی صحیح عکاسی بھی کرتی ہیں۔
قیمت:/75

جدید افسانہ اور اس کے مسائل: وارث علوی

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔ قیمت./36

قلندر بخش جرأت (خطبہ) جمیل جالبی

اردو کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک نہایت اہم خطبہ جو موصوف نے ۸ر نومبر ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے سیمینار میں پیش کیا تھا۔ قیمت:/10

میں سمندر ہوں: فرحان سالم

شعری مجموعوں کی بھیڑ میں سب سے الگ، منفرد اور دل کے تاروں کو چھیڑنے والا شعری مجموعہ۔ قیمت:/30

انجینیرنگ کے طلبہ کے لیے

EXPERIMENTS
IN
ENGINEERING CHEMISTRY

(FOR UNDERGRADUATE ENGINEERING STUDENTS)

EDITED BY

DR MASOOD ALAM

Sr. Lecturer College of Engg Techolo-
Jamia Millia Islamia (New Delhi)

Rs 51/

کتاب نما کے خصوصی شمارے

محبوب حسین جگر (شخصیت اور صحافتی خدمات)

مرتبہ: پروفیسر نثار احمد فاروقی

جگر صاحب کی شخصیت ایک مقصد کے لیے ان کی قربانی، ان کا بلند کردار اور "روزنامہ سیاست حیدر آباد" کے ذریعے اردو صحافت میں ان کی مثالی خدمات اپنی مثال آپ ہیں۔ اس شمارے یں ملک کے لگ بھگ بیس اہم ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔ قیمت 75/.

جمنا داس اختر مرتبہ گربچن چندن

(شخصیت اور ادبی و صحافتی خدمات)

جمنا داس اختر کا نام اردو کی سنجیدہ صحافت کی آبرو ہے اس خصوصی شمارے میں ملک اور بیرون ملک کے ممتاز ادیبوں اور صحافیوں نے اختر صاحب کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ اس شمارے کی حیثیت تاریخ ہند کے اہم باب کی ہے۔ قیمت 90/.

شمس الرحمٰن فاروقی مرتبہ: احمد محفوظ

(شخصیت اور ادبی خدمات)

اردو کے معتبر ادیب، نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اردو کے ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا اہم مجموعہ۔ 80/-

اردو افسانہ ممبئی میں مرتبہ الیاس شوقی

(۱۹۷۰ء کے بعد)

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں نئی نسل کے ۹ نمایندہ افسانہ نگاروں کا ایک ایک افسانہ شائع کیا گیا ہے۔ قیمت 51/

مغیث الدین فریدی: مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں فریدی صاحب کی شخصیت، شاعری، تاریخ گوئی اور تضمین نگاری پر اردو کے نامور ادیبوں نے اپنے بہترین خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قیمت 45/

خواجہ حسن نظامی مرتبین نثار احمد فاروقی رریحان احمد عباسی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

اردو کے صاحب طرز ادیب، صحافی، خاکہ نگار، مترجم و مفسر قرآن خواجہ حسن نظامی کے فن اور شخصیت پر اردو کے ممتاز ترین ادیبوں کی نگارشات کا اہم مجموعہ۔ قیمت 75/

مولانا عبد الوحید صدیقی۔ مرتبہ۔ پروانہ رودولوی

(شخصیت اور صحافتی خدمات)

اردو کے بے باک اور حق شناس صحافی مولانا عبد الوحید صدیقی کی ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں ملک کے بزرگ صحافیوں اور اہل

علم کی نگارشات کا مجموعہ۔ قیمت:-/51

غلام ربانی تاباں (شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبین: اجمل اجملی، ڈاکٹر صغری مہدی، عذرا رضوی

اردو کے ممتاز غزل گو شاعر غلام ربانی تاباں مرحوم کی شاعری اور فن پر اردو کے ممتاز اہل قلم کی نگارشات کا مجموعہ۔ قیمت:/75

پروفیسر نثار احمد فاروقی مرتبین: خلیق انجم، ایم حبیب خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

عربی، فارسی کے اسکالر اور اردو کے معتبر ترین ادیب، نقاد اور محقق پروفیسر نثار احمد فاروقی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ملک، بیرون ملک کے بلند پایہ مصنفین کے مضامین کا مجموعہ۔ -/51

اختر سعید خاں مرتبہ: ڈاکٹر سید حامد حسین

(شخصیت اور ادبی خدمات)

اختر سعید خاں نے جہاں غزل کی روایت کا احترام سیکھا وہیں شعر کے تخلیقی منصب کی پاسداری بھی سیکھی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انھیں زندگی کا ایک واضح شعور بخشا۔ اردو کے ممتاز غزل گو شاعری کی شخصیت اور فن پر ایک اہم شمارہ۔

قیمت:/51

پروفیسر آل احمد سرور :مرتبہ: خلیق انجم

(شخصیت اور ادبی خدمات)

پروفیسر آل احمد سرور اردو کے ایک مشفق اور مقتدر استاد بھی ہیں اور صاحب طرز انشا پرداز بھی۔ ادب کے اعلا نقاد بھی ہیں اور زبان کے نباض بھی۔ قیمت:/45

خواجہ احمد فاروقی مرتبہ: خلیق انجم

(شخصیت اور ادبی خدمات)

اردو کے نامور ادیب، ممتاز نقاد، سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی (جن کے عہد میں شعبہ اردو، اپنے کارہائے نمایاں کے لیے پورے ہندستان میں مشہور تھا) کی علمی، ادبی خدمات کا اعتراف نہ صرف ان کے شاگردوں نے بلکہ ممتاز ادیبوں نے بھی کیا ہے۔ قیمت:/45

عابد علی خاں مرتبہ: مجتبیٰ حسین

(شخصیت اور ادبی خدمات)

عابد علی خاں مرحوم ایک انجمن کا نام ہی نہیں ایک تحریک کا نام بھی تھا۔ اس خصوصی شمارے میں ملک کے ممتاز ادیبوں نے مرحوم کی علمی، ادبی، سماجی اور صحافتی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ -/45

ڈاکٹر اجمل اجملی (حیات اور ادبی خدمات)

مرتبین: ڈاکٹر علی احمد فاطمی، عذرا رضوی

اردو، ہندی کے ممتاز ادیبوں کے اہم نگارشات کا مجموعہ جس میں ڈاکٹر اجمل اجملی کی ادبی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ہے۔ -/45

پروفیسر گوپی چند نارنگ (شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبین: پروفیسر شہریار، پروفیسر ابوالکلام قاسمی

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں پروفیسر نارنگ کی علمی، ادبی سرگرمیوں کے نمایندہ پہلوؤں سے متعلق مضامین، تاثرات، تنقیدی آرا اور ادبی مسائل پر مکالمہ، سے ان کی دلچسپیوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ قیمت:/60

علی سردار جعفری: ترتیب ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
(شخصیت اور ادبی خدمات)

سردار جعفری کی شخصیت میں بیک وقت کئی شخصیتیں سانس لے رہی ہیں۔ وہ کون سا میدان ہے جہاں سردار جعفری اپنے فکر و نظر کی جولانیاں دکھاتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ صحافت ہو یا ادب، فلم ہو یا ٹی وی، ریڈیو ہو یا اسٹیج، خطابت ہو یا شاعری، ان کی [illegible] شخصیت کا بھرپور جائزہ۔ 45/

فرمان فتح پوری : مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم
(شخصیت اور ادبی خدمات)

فرمان فتح پوری کا خاکہ جن رنگوں سے بنا ہے وہ طرح دار، دلکش، دلربا، تابناک اور پائدار ہیں۔ کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں انہیں رنگوں کی جھلک پیش کی گئی ہے۔ قیمت: 25/

خلیق انجم مرتبہ: ایم حبیب خاں
(شخصیت اور ادبی خدمات)

ڈاکٹر خلیق انجم کی شخصیت، ادبی اور لسانی خدمات پر ہند اور بیرون ہند کے ممتاز ادیبوں کے مضامین کا مجموعہ۔ جس میں خلیق انجم کی علمی فتوحات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ قیمت: -/90

نئی نظم کا سفر: مرتبہ: ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی
صلاح کار: ڈاکٹر منیب الرحمن/ ڈاکٹر وحید اختر

اس انتخاب میں ۱۹۳۶ء کے بعد شعرا کا مطالعہ اس زاویے سے کیا گیا ہے کہ اقبال اور جوش کے عہد تک کی نظم جس منزل تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا بھرپور جائزہ پیش کیا جاسکے۔ طلبہ کے لیے مفید کتاب۔ قیمت: 45/

صالحہ عابد حسین
ترتیب: عزیز قریشی/ ذکیہ ظہیر/ صغری مہدی

ہندوپاک کے ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا مجموعہ، بیگم صالحہ عابد حسین کی شخصیت اور فن پر ایک جامع کتاب۔ قیمت: 45/

مطبوعات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک نظر میں

ادب، تنقید، انشاء

پانچ جدید شاعر — حمید نسیم — 210/-
قاری سے مکالمہ — شمیم حنفی — 150/-
اعلا تعلیم — خطبات ڈاکٹر ذاکر حسین — 120/-
اردو زبان ادب کے فروغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ
مرتبہ پروفیسر صغرا مہدی — 75/
فراق دیار شب کا مسافر — مرتبہ پروفیسر شمیم حنفی — 150/-
بیاں اور — اختر سعید خاں — 144/-
لفظوں کی انجمن میں — ڈاکٹر سید حامد حسین — 120/-
تعبیر و تفہیم — ڈاکٹر خلیق انجم — 135/-
معاصرین و متعلقات مولانا ابوالکلام آزاد
عبدالقوی دسنوی — 60/-
سرسید سے اکبر تک — مرتبہ شمیم حنفی — 90/-
سیاہ فام ادب — مرتبہ شمیم حنفی — 40/
خامہ بگوش کے قلم سے — مرتبہ مظفر علی سید — 80/
مجلد — 150/-
الحمیں (نفسیاتی مضامین) — عبداللہ ولی بخش قادری — 60/-
جو رہی سو بے خبری رہی خود نوشت — ادا جعفری — 200/-
قلم اور قدم — سید حامد — 75/-
مستقبل کی طرف —
(خطبات جلسہ تقسیم اسناد جامعہ اسلامیہ) — 150/-
مرتبہ خواجہ محمد شاہد، خالد کمال فاروقی
مولانا ابوالکلام آزاد فکر و نظر کی چند جہتیں۔
پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — 60/-
جدید ادبی تحریکات — ڈاکٹر سید حامد حسین — 51/-

صحرا میں لفظ — فضیل جعفری — 90/-
فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ — ڈاکٹر مومن محی الدین — 45/-
ٹیلی ویژن نشریات تاریخ تحریر تکنیک — انجم عثمانی — 90/-
انشائے غالب — مرتبہ رشید حسن خاں — 60/-
اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ — ابراہیم یوسف — 45/-
تاریخ نگاری قدیم و جدید رجحانات — ڈاکٹر سید جلال الدین — 51/-
انداز گفتگو کیا ہے — شمس الرحمن فاروقی — 75/-
دستک اس دروازے پر — ڈاکٹر وزیر آغا — 51/-
سرسید یادگاری خطبات — مونس رضا مسعود حسین خاں — 10/-
تفہیم — رشید حسن خان — 75/-
اردو شاعری کی گیارہ آوازیں — عبدالقوی دسنوی — 75/-
کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے — تقی حسین جعفری — 51/-
شناس و شناخت — انور صدیقی — 60/-
سائنس کی ترقی اور آج کا سماج — ڈاکٹر سید ظہور قاسم — 10/-
سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم — اختر الواسع — 10/-
آزمائش کی گھڑی — سید حامد — (زیر طبع)
حموربی اور بابلی تہذیب و تمدن — مالک رام — 75/-
جام جہاں نما — گربچن چندن — 75/-
اردو ناول میں عورت کا تصور — فہمیدہ کبیر — 45/
اسرار خودی (فراموش شدہ ایڈیشن) — شایستہ خان — 75/-
تاثر نہ کہ تنقید — صدیق الرحمن قدوائی — 51/-
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے — طاہر مسعود — 66/-
تحریریں — ڈاکٹر اسلم پرویز — 51/-
انشائیہ کے خدوخال — وزیر آغا — 35/-
افکار اقبال — عبدالسلام خان — 125/-
تذکرہ ماہ و سال — مالک رام — 125/-
تحقیق نامہ — مشفق خواجہ — 125/-
سحر کے پہلے اور بعد — سعید اظفر چغتائی — 51/-
پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور — 51/-
اقبال کا نظریہ خودی — عبدالمغنی — 150/-
قلندر بخش جرأت — جمیل جالبی — 10/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث علوی — 36/-

تاریخ اودھ	قاسم علی بینا پوری	27/-
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	ڈاانصاری	33/-
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	60/-
کچھ مولانا آزاد کے بارے میں	مالک رام	51/-
لسان الصدق	مولانا ابوالکلام آزاد	75/-
اردو میں کلاسیکی تنقید	پروفیسر عنوان چشتی	48/-
تفہیم و تنقید	پروفیسر حامدی کاشمیری	48/-
نذر مختار	مرتبہ مالک رام	101/-
تحقیقی مضامین	مالک رام	60/-
خسرو نامہ	مجیب رضوی	21/-
تحفۃ السرور	مرتبہ شمس الرحمٰن فاروقی	75/-
جائزے	مرتبہ مظفر حنفی	45/-
نقد بجنوری	صدیقہ بیگم	25/-
ادبی سماجیات	ڈاکٹر محمد حسن	15/-
الفاظ کا مزاج	غلام ربانی	24/-
تقریر و تعبیر	محمد ہدایت اللہ	15/-
اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	(زیر طبع)
افسانہ کی حمایت میں	شمس الرحمٰن فاروقی	(زیر طبع)
علامتوں کا زوال	انتظار حسین	36/-
تذکرۂ معاصرین دوم	مرتبہ مالک رام	14/-
تذکرۂ معاصرین سوم	مرتبہ مالک رام	22/-
تذکرۂ معاصرین چہارم	مرتبہ مالک رام	40/-
لغت نویسی کے مسائل	مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ	35/-
معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	30/-
اردو کی تہذیبی معنویت	پروفیسر علی محمد خسرو	6/-
تحلیل نفسی کے پیچ و خم	ڈاکٹر سلامت اللہ	35/-
اثبات و نفی	شمس الرحمٰن فاروقی	40/-
نقد حرف	پروفیسر ممتاز حسین	48/-
اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغرا مہدی	(زیر طبع)
انشائیات	ڈاکٹر عابد حسین	(زیر طبع)
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	12/-
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	12/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	11/-

کچھ نثر میں بھی	آنند نارائن ملا	21/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ عبداللطیف اعظمی	12/50
حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	7/50
مسالک و منازل	ضیاء احمد بدایونی	22/-
قدیم دلی کالج	مرتبہ مالک رام	4/50
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	16/-
کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	24/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	5/50
جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ	ضیاء الحسن فاروقی	4/-
نظر اور نظریے	آل احمد سرور	
مسرت سے بصیرت تک	آل احمد سرور	75/-
تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	27/-
باتیں کچھ سریلی سی	داور رہبر	36/-
اردو ایسیز	مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی	36/-
روح تہذیب	خواجہ غلام السیدین	6/-
نئی شعری روایت	پروفیسر شمیم حنفی	(زیر طبع)
دراسات	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	15/-
دبستان آتش	شاہ عبدالسلام	21/-

تعلیم

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	ڈاکٹر سلامت اللہ	51/-
ڈسپلن کی تعلیم و تربیت	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	90/-
الجھنیں	عبداللہ ولی بخش قادری	60/-
مفکرین تعلیم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	120/-
استادوں کی تعلیم و تربیت	مسعود الحق	60/-
تعلیم و تعلم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	75/-
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	ضیاء الحسن فاروقی	45/-
مشقی تدریس کیوں اور کیسے	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	45/-
معاشیات کے اصول	عزیز احمد قاسمی	21/-
آسان اردو ورک بک	شکیل اختر فاروقی	24/-
تعلیم و تربیت اور والدین	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	51/-
تعلیم اور رہنمائی	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	35/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں	معین الدین	54/-
ہم کیسے پڑھائیں	ڈاکٹر سلامت اللہ	33/-

تعلیمی خطبات	ڈاکٹر ذاکر حسین	36/-
سرسید کی تعلیمی تحریک	اختر الواسع	60/-
تعلیم اور اس کے وسائل	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	36/-
آسان اردو (ہندی کے ذریعے)	شکیل اختر فاروقی	12/-
تعلیم، نظریہ اور عمل	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	36/-
تعلیم فلسفہ اور سماج	ڈاکٹر سلامت اللہ	60/-
بنیادی استاد کے لیے	ڈاکٹر سلامت اللہ	12/-
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	12/-
عبارت کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	18/-
انشا اور تلفظ	رشید حسن خاں	12/-
تاریخ کیسے پڑھائیں	مسرور ہاشمی	36/-
بچوں کا آرٹ	عبید الحق	24/-

تذکرہ، سوانح، شخصیتیں

جو رہی سو بے خبری رہی (خود نوشت)	ادا جعفری	200/-
دلّی کی بیگماتی زبان	محی الدین حسن	15/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو	کشمیری لال ذاکر	36/-
دلّی کی چند عجیب ہستیاں	اشرف صبوحی	51/-
چند تصویر بتاں	مولانا عبد السلام قدوائی	45/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	پروفیسر آل احمد سرور	8/-
صاحب جی، سلطان جی	ڈاکٹر اسلم فرخی	20/-
ہندستانی مسلمان آئینہ ایام میں	ڈاکٹر عابد حسین	75/-
شہید جستجو	ضیاء الحسن فاروقی	75/-
مولانا آزاد کی کہانی	ڈاکٹر ظفر احمد نظامی	18/-
نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیاؒ)	ڈاکٹر اسلم فرخی	15/-
حیات جامیؒ	مولانا اسلم جیراجپوری	12/-
نقش ذاکر	مرتبہ عبد الحق خاں	51/-
مالک رام ایک مطالعہ	مرتبہ علی جواد زیدی	50/-
عبد اللطیف اعظمی حیات و خدمات	مرتبہ انور صدیقی	18/-
یادوں کا جالا بھگوان سنگھ	مترجم شمیم حنفی	40/-
مجیب صاحب احوال و افکار	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	90/-
حیات عابد (خود نوشت ڈاکٹر عابد حسین)	ڈاکٹر صغرا مہدی	45/-
سلسلہ روز و شب (خود نوشت)	صالحہ عابد حسین	65/-
وحید شاعر اور شخص	مرتبہ یوسف ناظم	25/-
شہر نگاراں	بیگم انیس قدوائی	27/-
فراق شخص و شاعر	مرتبہ شمیم حنفی	(زیر طبع)
حیات حافظ	اسلم جیراجپوری	15/-
افکار رومی	مولانا عبد السلام خاں	40/-
امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری	پروفیسر ممتاز حسین	(زیر طبع)
مکالمات افلاطون	مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین	36/-
غلام ربانی تاباں، حیات اور شاعری	شفیق النساء بیگم	10/-
اب جن کے دیکھنے کو	بیگم انیس قدوائی	12/50
شاد عارفی شخصیت اور فن	ڈاکٹر مظفر حنفی	24/-
حیات اسماعیل حیات و خدمات	ڈاکٹر سیفی پریمی	18/-
مفتی صدر الدین آزردہ	عبد الرحمن پرواز اصلاحی	12/-
میر انیس سے تعارف	صالحہ عابد حسین	7/-
ہمارے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی	25/-
اشخاص و افکار	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	1/50
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	عبد اللطیف اعظمی	6/50
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	45/-
کیا خوب آدمی تھا	مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین	15/-
قدسیہ زیدی	کرنل بشیر حسین زیدی	25/-
انشاء	مرزا فرحت اللہ بیگ	4/-
ذاکر صاحب اپنے لفظ و معنی میں	ضیاء الحسن فاروقی	45/-
روسی ادب اوّل دوم	پروفیسر محمد مجیب	60/-
مرحوم دلّی کی ایک جھلک	شمیم احمد	10/-

طنزیات، مزاحیات

آخر کار	مجتبیٰ حسین	60/-
جملہ	یوسف ناظم	51/-
خامہ بگوش کے قلم سے	مظفر علی سید مجلد 150/- غیر مجلد	80/-
فی البدیہہ	یوسف ناظم	45/-
چہرہ در چہرہ	مجتبیٰ حسین	51/-
طنزیات و مضحکات	رشید احمد صدیقی	60/-
گوشے میں قفس کے	دلیپ سنگھ	45/-
فی الحقیقت	یوسف ناظم	45/-

فی النور	یوسف ناظم	30/-
گول مال	شفیقہ فرحت	18/-
فی الحال	یوسف ناظم	18/-
رانگ نمبر	شفیقہ فرحت	16/-
بالقابات	یوسف ناظم	18/-
برکت ایک چھینک کی	وجاہت علی سندیلوی	15/-
ذکر خیر	یوسف ناظم	21/-
بے پر کی	حضرت آوارہ	(زیر طبع)
خنداں	رشید احمد صدیقی	36/-
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	45/-
دیوار قہقہہ (مزاحیہ شاعری)	محمد یوسف پاپا	15/-
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	15/-

طب. ایلوپیتھی

طب یونانی اور چیلنج	حکیم اشہر مدیر	60/-
فرہنگ اصطلاحات طب	ڈاکٹر اختر امر تسری	45/-
اخلاقیات طبیب	حکیم محمد سعید	20/-
اشارات قلب	پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم	6/-
مرضیات	حکیم نعیم الدین زبیری	75/-
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	ترجمہ نذیر الدین مینائی	25/-
ذیابیطس	ڈاکٹر محمد شعیب اختر	(زیر طبع)

سفرنامے، رپورتاژ

سیر کر دنیا کی غافل	صغرا مہدی	51/-
وسط ایشیا	آصف جیلانی	51/-
کولمبس کے دیس میں	جگن ناتھ آزاد	45/-
پشکن کے دیس میں	جگن ناتھ آزاد	25/-
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز	بیگم صالحہ عابد حسین	18/-
سخن دلنواز (خطوط کا مجموعہ)	خواجہ غلام السیدین	30/-
رہ نورد شوق	ڈاکٹر سید عابد حسین	14/50
یادوں کے سائے	عتیق صدیقی	18/-

شعری مجموعے

طراز دوام	اختر سعید خاں	51/-
گاہے گاہے	رولینڈ لارنس	30/-
رنگ، خوشبو، روشنی	قتیل شفائی	80/-
کاسۂ خیال	عبدالمعروف خاں	51/-
میں سمندر ہوں	فرحان سالم	30/-
اسرار خودی (فراموش شدہ ایڈیشن) شائستہ خاں		75/-
بانگ درا	اقبال	12/-
بال جبریل	اقبال	8/-
ضرب کلیم مع ارمغان حجاز	اقبال	8/-
خواب اور خلش	آل احمد سرور	66/-
غبار منزل	غلام ربانی تاباں	45/-
انیس کے	۳۲ غیر مطبوعہ مرثیے	90/-
پرانی بات ہے	زبیر رضوی	30/-
ساز سخن	ادا جعفری	45/-
غزل نما (غزلیات کا انتخاب) مرتبہ ادا جعفری		75/-
دائروں میں پھیلی لکیر	کشور ناہید	30/-
آنکھ میں سمندر	زاہد ڈار	30/-
آنکھ اور خواب کے درمیان	ندا فاضلی	30/-
رات کے مسافر	انور سجاد	28/-
گداز شب	معین احسن جذبی	40/-
ایک خواب اور	علی سردار جعفری	40/-
حرف حرف روشنی	حمایت علی شاعر	35/-
لفظوں کا آسمان (اڑیا نظمیں)	مترجم کرامت علی کرامت	20/-
دوہے	جمیل الدین عالی	12/-
کلیات عرش ملسیانی	مرتبہ مالک رام	75/-
راہوار	ساقی فاروقی	20/-
پتھر کی زبان	فہمیدہ ریاض	15/-
شام کا پہلا تارا	زہرا نگاہ	21/-
مثنوی نہ سپہر (امیر خسرو)	مترجم محمد رفیق عابد زاہدی	28/-
شام شہر یاراں	فیض احمد فیض	6/-
جستہ جستہ	خورشید الاسلام	18/-

گل افشانی گفتار — کشور واحدی — 5/-
کرب آگہی — آنند نرائن ملا — 10/50
نوائے آوارہ — غلام ربانی تاباں — (زیر طبع)
اردو گیت — ڈاکٹر قیصر جہاں — (زیر طبع)
انتخاب حالی (نیا ایڈیشن) — سفارش حسین رضوی — 15/-
شہر آشوب مرتبہ — ڈاکٹر نعیم احمد — 8/50
دوق سفر — غلام ربانی تاباں — 5/-
کوبہ کو — سلمان جہاں نثار اختر — 7/-
دیوار قہقہہ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا — 15/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

تصوف۔ رسم اور حقیقت — خواجہ حسن ثانی نظامی — 90/-
انوار قرآن — پروفیسر نثار احمد فاروقی — 30/-
حضرت محمدؐ اور قرآن — ڈاکٹر رفیق زکریا — (زیر طبع)
مسلمانوں کا تعلیمی نظام — ضیاء الحسن فاروقی — 45/-
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان — محمود احمد برکاتی — 45/-
فرید و فرد فریدؒ — اسلم فرخی — 27/-
اسلام میں راسخ الاعتقادی ہی کی راہ — ضیاء الحسن فاروقی — 8/-
اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سر سید احمد کا مرتبہ
سید مقبول احمد — 8/-
فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل — مولانا مجیب اللہ ندوی — 14/-
نقد ملفوظات — نثار احمد فاروقی — 65/-
خطبات عیدین — مولانا تقی امینی — 21/-
تاریخ اودھ — قاسم علی نیشاپوری — 27/-
قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف — 12/-
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست — پروفیسر مشیر الحق — 8/-
ہمارے دینی علوم — مولانا اسلم جیراجپوری — 18/-
ترجمۂ قرآن منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش
پروفیسر مشیر الحق — 8/-
مسلمانان ہند سے وقت کے مطالبات — ریاض الرحمٰن شیروانی — 8/-
دنیا کے بڑے مذہب — عماد الحسن آزاد فاروقی — (زیر طبع)
ہندستان میں اسلامی علوم و ادبیات — عماد الحسن آزاد فاروقی — 40/-
ہندستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک — شمس الرحمٰن محسنی — 50/-

رسول اکرمؐ اور یہود حجاز — سید برکات احمد — 40/-
محبوب الارث — مولانا اسلم جیراجپوری — 4/-
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء — عماد الحسن آزاد فاروقی (زیر طبع)
اسلام دور حاضر میں — مترجم پروفیسر مشیر الحق — 38/-
اسلامیات — مالک رام — 27/-
عمرو بن عاصؓ — مولانا اسلم جیراجپوری (زیر طبع)
حضرت جنید بغدادیؒ — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — 75/-
روح القرآن — مولانا عبدالسلام قدوائی — (زیر طبع)
عشق اور بھگتی — عماد الحسن آزاد فاروقی (زیر طبع)
عورت اور اسلامی تعلیم — مالک رام — 30/-
مسلمان اور روقت کے تقاضے — عبدالسلام قدوائی — 8/-
عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا — محمود الحسن — 15/-
سماجی تبدیلیاں مترجم — قاضی عبیدالرحمٰن — 2/-
مذہب اور جدید ذہن — پروفیسر مشیر الحق — (زیر طبع)
ہندستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں — ڈاکٹر سالم قدوائی — (زیر طبع)
کتاب و سنت کے جواہر پارے — مولانا جمال الدین اعظمی — (زیر طبع)
مسلمان اور سیکولر ہندستان — پروفیسر مشیر الحق — (زیر طبع)
اسلامی عقائد و مسائل مذہب — مولانا جمال الدین اعظمی — (زیر طبع)
اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی) ڈاکٹر رشید الوحیدی — 25/-
تاریخ الامت، سیرت رسولؐ حصہ اول — مولانا اسلم جیراجپوری — 21/-
تاریخ الامت، خلافت راشدہ حصہ دوم — مولانا اسلم جیراجپوری — 24/-
تاریخ الامت، خلافت بنی امیہ حصہ سوم — مولانا اسلم جیراجپوری — 18/-
تاریخ الامت، عباسیہ حصہ چہارم — مولانا اسلم جیراجپوری — 18/-
تاریخ الامت، عباسیہ حصہ پنجم — مولانا اسلم جیراجپوری — 27/-
تاریخ الامت، عباسیہ مصر حصہ ششم — مولانا اسلم جیراجپوری — 27/-
تاریخ الامت، آل عثمان حصہ ہفتم — مولانا اسلم جیراجپوری — 18/-
تاریخ الامت، عباسیہ حصہ ہشتم — مولانا اسلم جیراجپوری — 28/-
فکر اسلامی کی تشکیل جدید — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — 30/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد سائز) — قاری محمد اسمٰعیل — 3/-
قاعدہ یسرنا القرآن (کلاں سائز) — قاری محمد اسمٰعیل — 6/-
بکھرے ورق — سینتی کمار چٹرجی — 4/-
تاریخ انگلینڈ (۱۹۰۱ء/۱۴۸۵ء) — سید محمد عزیز الدین حسین — 9/-

ناول

آگے سمندر ہے	انتظار حسین	150/-
جھینی جھینی بینی چدریا	عبدالبسم اللہ	75/-
صحرا نورد کے خطوط	مرزا ادیب	75/-
نوٹوں کی تلاش	ایاز سعید ہاروی	60/-
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	کشمیری لال ذاکر	48/-
سفر	رابعہ تبسم	27/-
سمندری خزانہ	ماریہ رحمٰن	27/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	ڈاکٹر صغرا مہدی	24/-
مٹی سے ہیرا	سیّد مقبول احمد	10/-
تذکرہ	انتظار حسین	54/-
ریت کی دیواریں	رفعت سروش	21/-
بنجر بادل	کشمیری لال ذاکر	33/-
فرار	ظفر پیامی	40/-
ڈوبتے سورج کی کتھا	کشمیری لال ذاکر	36/-
لمحوں میں بکھری زندگی	کشمیری لال ذاکر	18/-
مہکتی بہاریں	کوثر چاند پوری	18/-
راگ بھوپالی	صغری مہدی	15/-
دھرتی سدا سہاگن	کشمیری لال ذاکر	7/50
پُروائی	صغرا مہدی	9/50
گوری سوئے سیج پر	صالحہ عابد حسین	(زیر طبع)
انگوٹھے کا نشان	کشمیری لال ذاکر	7/-
ایک مہم دو دل	خالدہ رحمٰن	10/-
اپنی اپنی صلیب	صالحہ عابد حسین	60/-
پرائی دھرتی اپنے لوگ	جتندر بلو	12/-
ایک مٹھی ہندوستان	سیّد شمیم اشرف	6/-
ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	18/-
آلپس کے گیت مترجم	قرۃ العین حیدر	3/-
چنار کا پتا	سلطان آصف فیضی	3/-
پابہ جولاں	صغرا مہدی	(زیر طبع)
بیوہ	منشی پریم چند	24/-
گئودان (نیا ایڈیشن)	منشی پریم چند	75/-
میدانِ عمل (نیا ایڈیشن)	منشی پریم چند	75/-
یودوکیہ ترجمہ	قرۃ العین حیدر	2/-
شکستِ ناتمام	زہرہ سیّد بن	2/-
پُراسرار مقدمہ کافکا	مترجم م ح علی الہاشمی	12/50

افسانے

صحرا نورد کے خطوط	مرزا ادیب	75/-
پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر	75/-
آوازوں کا میوزیم	ساگر سرحدی	45/-
سدابہار چاندنی	رام لعل	30/-
دل دریا	شرون کمار	25/-
تین چہرے تین آوازیں	صالحہ عابد حسین	18/-
درد دل	ستارہ جعفری	18/-
مکتی بودھ	راجندر سنگھ بیدی	25/50
نیلی ساری	خواجہ احمد عباس	(زیر طبع)
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	30/-
کوکھ جلی	راجندر سنگھ بیدی	18/-
ریت سمندر اور جھاگ	ہرچرن چاولہ	12/75
تیوری	امر سنگھ	14/75
قلی نمبر ۳۹۹	وجاہت علی سندیلوی	14/75
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	27/-
اپنے پرائے	اوم پرکاش بجاج	9/-
نئی دھرتی نئے انسان	خواجہ احمد عباس	(زیر طبع)

ہاتھ ہمارے قلم ہوئے — راجندر سنگھ بیدی — 30/-
واردات — پریم چند — 21/-
راستے اور کھڑکیاں — انور خاں — 6/-
جو میرے دوراجاکے نہیں — صغرا مہدی — 10/
اپنے دکھ مجھے دیدو — راجندر سنگھ بیدی — 21/-

ڈرامے

بازار میں نیند — شمیم حنفی — 60/-
سلاخ ٹوٹتی ہے — کشمیری لال ذاکر — 90/-
الجھاوے — ابراہیم یوسف — 51/-
زندگی کی طرف — پروفیسر شمیم حنفی — 36/-
زوال کا عروج — مترجم: انور عظیم — 36/-
مجھے گھر یاد آتا ہے — پروفیسر شمیم حنفی — 21/-
انٹی گونی — سوفوکلیز مترجم قیصر زیدی — 9/-
خانہ جنگی — پروفیسر محمد مجیب — 6/-
حبہ خاتون — پروفیسر محمد مجیب — 6/-
تاریخ کے آنچل میں — رفعت سروش — 18/-
اداس موڑ — ابراہیم یوسف — 12/-
انٹنی اور کلوپیٹرا — ولیم شیکسپئر — 16/50
مٹی کا بلاوا — شمیم حنفی — 45/-
سات کھیل — راجندر سنگھ بیدی (زیر طبع)
غالب کون — سید محمد مہدی — 8/50
خیال کی دستک — ساگر سرحدی — 12/75
دیا بجھ گیا — کرتار سنگھ دگل (زیر طبع)
آزمائش — پروفیسر محمد مجیب — 6/-
انجام — پروفیسر محمد مجیب — 6/-
کھیتی — پروفیسر محمد مجیب — 6/-
ہیروئن کی تلاش — پروفیسر محمد مجیب — 5/50

پردۂ غفلت — ڈاکٹر سید عابد حسین — 9/-
دروازے کھول دو — کرشن چندر — 7/50
آکیرا ایام — بے بریشٹ مترجم: خلیق انجم — 4/50
قتل آخر — اشتیاق حسین قریشی — 2/25
نشریات اور آل انڈیا ریڈیو — ڈاکٹر اخلاق اثر — 10/-

اقبالیات

افکار اقبال — محمد عبدالسلام خاں — 125/-
اقبال کا نظریۂ خودی — عبدالمغنی — 150/-
اقبال جادوگر ہندی نژاد — شفیق صدیقی — (زیر طبع)
اقبالیات کی تلاش — عبدالقوی دسنوی — 35/-
فلسفۂ اقبال (خطبات کی روشنی میں) — سید وحیدالدین — 30/-
نقد اقبال — میکش اکبرآبادی — 25/50

غالبیات

ذکر غالب — مالک رام — (زیر طبع)
گفتار غالب — مالک رام — 48/-
غالب اور صفیر بلگرامی — مشفق خواجہ — 36/-
تلامذۂ غالب — مالک رام — 75/-
فسانۂ غالب — مالک رام — 16/50
غالب اور شاہان تیموریہ — ڈاکٹر خلیق انجم — 9/50

معیاری سیریز

موازنۂ انیس و دبیر — مرتبہ: رشید حسن خاں — 24/-
نیرنگ خیال — مالک رام — 15/-
یادگار غالب اردو — مالک رام — 30/-
یادگار غالب فارسی — مالک رام — 9/-
انتخاب مضامین سرسید — انور صدیقی — 16/-
حیات سعدی — مرتبہ: رشید حسن خاں — 36/-

فسانۂ آزاد (تلخیص)	ڈاکٹر قمر رئیس	75/-
فردوس بریں	عبدالحلیم شرر	16/-
انتخاب مضامین شبلی	مرتبہ: رشید حسن خاں	75/-
انتخاب ناسخ	مرتبہ رشید حسن خاں	51/-
مثنوی بحر المحبت مرتبہ	عبدالماجد دریاآبادی	5/-
شریف زادہ	ڈاکٹر قمر رئیس	20/-
امراو جان ادا	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	28/-
فسانہ مبتلا	ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی	45/-
توبتہ النصوح	مالک رام	36/-
باغ و بہار	رشید حسن خاں	27/-
ابن الوقت	ڈاکٹر خلیق انجم	51/-
مجالس النساء	صالحہ عابد حسین	24/-
گذشتہ لکھنو	رشید حسن خاں	75/-
قصہ حاتم طائی	اطہر پرویز	75/-
انتخاب ولی	مرتبہ ظہیر الدین مدنی	20/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی	مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن	15/-
انتخاب مراثی انیس و دبیر	رشید حسن خاں	36/-
انتخاب نظیر اکبر آبادی	رشید حسن خاں	45/-
انتخاب اکبر الہ آبادی	صدیق الرحمٰن قدوائی	21/-
انتخاب کلام میر	ڈاکٹر محمد حسن	(زیر طبع)
دیوان درد	رشید حسن خاں	30/-
انتخاب سودا	رشید حسن خاں	75/-
انتخاب قلی قطب شاہ	محمد اکبر الدین صدیقی	27/-
انتخاب ذوق	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	24/-
مثنوی سحر البیان	رشید حسن خاں	36/-
مثنوی گلزار نسیم	رشید حسن خاں	16/-
افادات سلیم	ڈاکٹر خلیق انجم	30/-
مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ: رشید حسن خاں	27/-

جیبی کتابیں

بیاض مریم	سکندر علی وجد	15/-
لہو پکارتا ہے	سردار جعفری	15/-
پتھر کی دیوار	سردار جعفری	15/-
ایک خواب اور	علی سردار جعفری	15/-
آتش گل	جگر مرادآبادی	12/-
پچھلے پہر	جاں نثار اختر	7/50
رومانی غزلیں	ثمینہ حجاب	12/-
انتخاب اکبر الہ آبادی	صدیق الرحمٰن قدوائی	15/-
ساتواں آنگن	صالحہ عابد حسین	8/-
دھوپ	رابعہ تبسم	5/-
گھر	ہادیہ رحمٰن	8/-
واپسی کا سفر	عبداللہ حسین	5/-
راگ بھوپالی	ڈاکٹر صغرا مہدی	7/-
نشیب	عبداللہ حسین	5/-
موت کا بازار	آفتاب ہلالی	8/-

کتاب نما کے خصوصی شمارے

محبوب حسین جگر نمبر	مرتبہ پروفیسر نثار احمد فاروقی	75/-
جمناداس اختر نمبر	مرتبہ: گر بچن چندن	90/-
شمس الرحمٰن فاروقی نمبر	مرتبہ: احمد محفوظ	80/-
اردو افسانہ ممبئی میں	مرتبہ: الیاس شوقی	51/-
مغیث الدین فریدی نمبر	مرتبہ: ظہیر احمد صدیقی	45/-
خواجہ حسن نظامی نمبر	مرتبہ: نثار احمد فاروقی و ریحان احمد عباسی	75/-
عبدالوحید صدیقی نمبر	مرتبہ: پروانہ ردولوی	51/-
غلام ربانی تاباں نمبر	مرتبہ: اجمل اجملی	75/-
اختر سعید خاں نمبر	مرتبہ: ڈاکٹر سید حامد حسین	51/-
نثار احمد فاروقی نمبر	مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم	51/-

پروفیسر گوپی چند نارنگ نمبر مرتبہ: شہریار / ابوالکلام قاسمی 60/-
ڈاکٹر خلیق انجم نمبر مرتبہ: ایم حبیب خاں 90/-
خواجہ احمد فاروقی مرتبہ: خلیق انجم 45/-
عابد علی خاں مرتبہ: مجتبیٰ حسین 45/-
پروفیسر مسعود حسین خاں ایم حبیب خاں 45/-
ڈاکٹر اجمل اجملی مرتبہ: علی احمد فاطمی / عذرا حبیب 45/-
زمان فتح پوری نمبر مرتبہ: خلیق انجم 25/-
سردار جعفری نمبر مرتبہ: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی 45/-
صالحہ عابد حسین نمبر مرتبہ: عزیز قریشی 45/-
نئی نظم کا سفر مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی 45/-
مشرقی علوم و السنہ پر تحقیق حامد حسین 3/-
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر کرنل بشیر حسین زیدی 16/-
مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر (مکتبہ جامعہ) 1/50
مرزا سلامت علی دبیر نمبر مرتبہ: عبدالقوی دسنوی 7.\50
جگن ناتھ آزاد نمبر مرتبہ: ایم حبیب خاں 51/-
عرش ملسیانی نمبر مالک رام 12/50
سکندر علی وجد نمبر یوسف ناظم 25/-
لغت نویسی کے مسائل نمبر پروفیسر گوپی چند نارنگ 35/-
عبداللطیف اعظمی نمبر (مکتبہ جامعہ) 18/-
مشفق خواجہ نمبر مرتبہ. ڈاکٹر خلیق انجم 30/-
جائزے مرتبہ: مظفر حنفی 45/-

قواعد، محاورے، کہاوتیں اور لغات

تذکیر و تانیث (۷ ہزار الفاظ) جلیل مانک پوری 75/-
معیار اردو جلیل مانک پوری 21/-
محاورات ہند مرتب محبوب الرحمٰن فاروقی 51/-
عبارت کیسے لکھیں 18/-
انشا اور تلفظ 12/-
بیاضی قواعد اردو طلبہ ایڈیشن 3/-
بیاضی قواعد اردو کلاں 6/-
بیاضی اردو انگریزی ڈکشنری 21/-
بیاضی بیسک انگلش اردو ڈکشنری 15/-
ہمارے محاورے سہیل بریلی 12/50
کہاوت اور کہانی سہیل بریلی 9/-

کالج کے طلبہ کے لیے درسی کتب

شعور ادب (مکتبہ جامعہ) 21/-
نیا اردو نصاب اوّل محمد ذاکر 10/-
آئینہ ادب ڈاکٹر محی رضا / ڈاکٹر آدم شیخ 21/-
انوار ادب پروفیسر فصیح الدین / ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی 8/50

تعلیم بالغان کے سلسلے کی کتابیں

کفن دفن 1/-
حیات اللہ انصاری 1/-
چیچک مشتاق احمد 1/-
آستین کا سانپ محمد حسین حسان 1/-
چاند محمد حسین حسان 1/-
دیمک محمد حسین حسان 1/-
کتنی زمین محمد حسین حسان 1/-

ہندی کی دوسری کتابیں

موسموں کا کھیل 1/-
پرم پرا 1/-
اپنا گھر 1/-
امریکہ 1/-
دہلی 1/
منور نجم اور کام 1/-
چاندی کا چمچہ 1/-

مکتبہ پیام تعلیم کی مذہبی کتابیں

پارہ عم مع اردو، انگریزی ترجمہ و تشریح		45/-
سورۂ رحمٰن	مع اردو ترجمہ	6/-
صراط مستقیم		7/50
سورۂ رحمٰن (ترجمہ مع تشریح)		6/-
حضرت شیخ مخدوم علی مہائمی		4/50
اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں		9/-
نماز پڑھیے		4/50
السلام علیکم		7/50
حضرت یوسف علیہ السلام		4/50
حدیث کیا ہے		4/-
حضرت عمر فاروقؓ		6/-
نقوش سیرتؐ	حصہ اوّل	5/-
نقوش سیرتؐ	دوم	5/-
نقوش سیرتؐ	حصہ سوم	5/-
نقوش سیرتؐ	حصہ چہارم	5/-
نقوش سیرتؐ	حصہ پنجم	5/-
رسالہ دینیات	اوّل	3/-
رسالہ دینیات	دوم	4/-
رسالہ دینیات	سوم	5/-
رسالہ دینیات	چہارم	5/-
رسالہ دینیات	پنجم	6/-
رسالہ دینیات	ششم	6/-
رسالہ دینیات	ہفتم	6/-
رسالہ دینیات	ہشتم	6/-
حضرت آدم علیہ السلام		4/-
حضرت یحییٰ علیہ السلام		3/-
بزرگان دین		4/-

امت کی مائیں	[illegible]/50
خوب سیرتؐ اوّل	[illegible]/-
خوب سیرتؐ دوم	[illegible]/-
اچھی باتیں	[illegible]/50
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں	[illegible]/50
سلطان جیؒ	[illegible]/50
سیرت پاکؐ مختصر مختصر	3/-
کمسن صحابی	5/-
نوجوان کا مہمان	5/-
اسلام کے جاں نثار	5/-
نور کے پھول	9/-
سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	3/50
حضرت ابو بکر صدیقؓ	6/-
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	3/-
حضرت طلحہؓ	3/-
حضرت ابوذر غفاریؓ	3/-
حضرت سلمان فارسیؓ	3/50
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	3/-
حضرت محبوب الٰہیؒ	3/50
حضرت معین الدین چشتیؒ	3/-
حضرت فرید گنج شکرؒ	3/-
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	3/-
نیک بیٹیاں	3/50
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	3/-
حضرت حمزہؓ	3/-
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	4/50
حضرت ابوہریرہؓ	4/-
اللہ کے نبی	2/50

...کا گھر	4/50
...کے خلیلؑ	3/50
رسول پاکؐ کے اخلاق	4/-
قرآن پاک کیا ہے؟	5/-
اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل	6/-
اسلام کے مشہور سپہ سالار دوم	6/-
اسلام کے مشہور امیر البحر	9/-
اسلام کیسے پھیلا حصہ اوّل	7/50
اسلام کیسے پھیلا حصہ دوم	7/50
اسلام کیسے شروع ہوا	7/50
رسول پاکؐ	7/50
...س جنتی	7/50
سرکار کا دربار	7/50
چار یار	9/-
آں حضرتؐ	4/50
ہمارا دین حصہ اوّل	8/50
ہمارا دین حصہ دوم	8/50
ہمارا دین حصہ سوم	8/50
تحسین القرآن	(زیر طبع)
منہاج القرآن	4/50
ائمہ اربعہ	(زیر طبع)
ارکان اسلام	4/-
عقائد اسلام	4/50
خلفائے اربعہ	18/-
نبیوں کے قصے	7/50
ہمارے رسولؐ	7/50
مسلمان بیبیاں	6/-
ہمارے نبیؐ	4/-

سرکارِ دو عالم	9/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد)	3/-
قاعدہ یسرنا القرآن (کلاں)	6/-

سوانح

بچوں کے خواجہ الطاف حسین حالی	6/-
بچوں کے نظیر اکبر آبادی	6/-
بچوں کے "ظ" انصاری	6/-
بچوں کی آپا جان (گیرڈا فلپس)	6/-
بچوں کی شفیقہ فرحت	4/50
بچوں کے عابد علی خاں	4/-
بچوں کے علی سردار جعفری	4/-
بچوں کے یوسف ناظم	4/-
چارلی چیپلن اور کیتھو ایڈرسن	9/-
بچوں کے مولانا حسرت موہانی	4/-
بچوں کے میر امّن دلی والے	4/50
بچوں کے محمد حسین آزاد	4/-
بچوں کے مرزا غالب	4/-
بچوں کے رنگا رنگ خسرو	4/50
بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد	4/-
بچوں کے سلطان جی	4/50
بچوں کے مولانا شبلی نعمانی	4/50
بچوں کی صالحہ عابد حسین	4/-
بچوں کے ڈاکٹر سید عابد حسین	4/-
بچوں کے بابائے اردو مولوی عبدالحق	4/50
بچوں کے میرزا ادیب	4/50
بچوں کے غلام السیدین	5/-
بچوں کے اسمٰعیل میرٹھی	21/-
بچوں کے ذاکر صاحب	7/-

بابو اشہرو 6/-
اندرا گاندھی کی کہانی 6/-
محمد شفیع الدین نیر 7/50
ہمارے عظیم سائنس داں 9/-
چند مشہور طبیب اور سائنس داں 9/-
مولانا آزاد کی کہانی 18/-
جوہر قابل 4/50
بچوں کے چار بزرگ دوست 3/50
گاندھی بابا کی کہانی 10/-
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں 2/-
میر انیس 2/-
امیر خسروؒ 4/50

سائنس، طب اور عام معلومات

باتوں باتوں میں معلومات 10/-
کہانی بھی، معلومات بھی 6/-
چیزوں کی کہانی 7/50
یہ کیسا بخار ہے 6/-
آپ کا جسم 6/-
گندا پانی 4/-
کیوں اور کیسے؟ 6/-
سائنس کی دنیا 8/-
کمپیوٹر کیا ہے 8/-
عجائب گھر 10/-
ذرّے کی کہانی 21/-
علاج میرا دشمن 6/-
پرواز کی کہانی 4/50
غذا کی کہانی 3/-
رنگوں کی بستی 5/-

غذائیں دوائیں 8/-
دلی کی چند تاریخی عمارتیں 4/50
صحت کے ۹۹ نکتے 3/-
صحت کی الف بے 5/-
سنہرے اصول 5/-
پرندوں سے جانوروں تک 4/50
دہلی 2/50
انوکھا عجائب خانہ (۳ حصے) 1/50
سماجی زندگی حصہ سوم 4/90
بیامی قواعد اردو طلبہ کے لیے 3/-
بیامی قواعد اردو (بڑا سائز) 6/-

نظمیں

پھلجھڑیاں 6/-
مولانا اسمٰعیل میرٹھی 21/-
بتاشے (نرسری گیت باتصویر) 7/50
مہکتی کلیاں (زیر طبع)
ٹوٹے کھلونے 6/50
سہانے ترانے 4/50
بچوں کے افسر 6/-
بچوں کے اقبال 7/50

ننھے منے بچوں کے لیے

بتاشے (باتصویر) 7/50
جاں نثار دوست (باتصویر کہانیاں) 7/50
شیر اور بکری (باتصویر کہانیاں) 9/-
چاند کی بیٹی (باتصویر کہانیاں) 8/-
بھیڑیے کا گانا (باتصویر کہانیاں) 7/50
جادو کی ہنڈیا (باتصویر کہانیاں) 7/50

چالاک بلی	(باتصویر کہانیاں)	7/50
دم کٹی لومڑی	(باتصویر کہانیاں)	7/50
بونے کا خواب	(باتصویر کہانیاں)	8/50
گدھے نے بجائی بانسری		7/50

بڑے بچوں کی دلچسپ کہانیاں

الف لیلیٰ کے چار ڈرامے		9/-
ننھی جل پری		7/50
مستانی آواز		7/50
جادو نگری		9/-
سبری جھیل		9/-
خلائی طبیب		8/-
بونوں کا جزیرہ		8/-
بلتا ہوا مکان		5/-
سونے کی چوری		4/-
روشنی ہی روشنی		10/-
خطرناک سگنل	پہلا حصہ	10/-
لاش چل پڑی	دوسرا حصہ	10/-
کالا جنگل نیلی موت	تیسرا حصہ	10/-
خلائی سرنگ	چوتھا حصہ	10/-
وہ خلا میں بھٹک گئے	پانچواں حصہ	10/-
خلائی مخلوق بمبئی میں	چھٹا حصہ	10/-
موت کی شعاعیں	ساتواں حصہ	10/-
خطرناک فارمولا	آٹھواں حصہ	10/-
تابوت سمندر میں	نواں حصہ	10/-
خلائی مخلوق کا حملہ	دسواں حصہ	10/-
عمران کی زندہ لاش	گیارہواں حصہ	10/-
شہر پتھر بن گیا	بارہواں حصہ	10/-
ایلس کی دنیا		10/50

پتھر کا خرگوش	10/-
سرخ موت	4/50
دنیا کی عجیب و غریب کہانیاں	7/50
انمول کہانیاں	4/50
پتھر کی گڑیا	7/50
ریل کے بچے	4/-
افریقیا کی کہانیاں	9/-
۸۰ دن میں دنیا کا چکر	3/-
ہزاروں خواہشیں	9/-
مونٹی کرسٹو کا خواب	9/-
گلی ور کے تین حیرت انگیز سفر	6/-
جادوئی چقماق کی ڈبیہ	4/50
گیارہ ہنس اور ایک شہزادی	4/-
دادی اماں کی کہانیاں	6/-
سفر کے قصے	5/-
پہاڑی مہم	4/50
تین بندوقچی	10/-
ہم بنے کمانڈو	5/-
ایک تھا مرغا ککڑوکوں	6/-
پریوں کی کہانیاں	6/-
سمندر کا بادشاہ ہار گیا	4/50
چوں چوں بیگم	4/-
ماسٹر شامت	6/-
تھوڑی تارا تھے چاند	4/-
پکڑے گئے	7/50
درویش کا تحفہ	6/-
موراسے فرار	7/50
بکرے کی تعریف میں	6/-

جمیل کا راز	6/-	شہنشاہ نے کہا میں مفلس ہوں	6/-
قصر صحرا اوّل	7/-	سام پر کیا گزری	3/50
قصر صحرا دوم	10/-	جنگل کی بلی	3/-
قصر صحرا سوم	8/-	چالاک خرگوش کے کارنامے	9/-
عقلوں کی تباہی	7/50	چور پکڑو	3/50
پیار کا پنچھی	4/-	بہادر علی	8/50
ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش	7/50	خالی ہاتھ	9/-
پادری کی کاروج	4/-	کھلونا گھر	7/50
ٹھگ نے ٹھگا ٹھگ کو	4/50	حاجی بابا کی ڈائری	7/50
گدھا کہانی	9/-	قصہ اژدھا پکڑنے کا	6/-
خفیہ سرنگ	6/-	ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	6/-
بڑھیا کی بھینس	4/50	ابو علی کا جوتا	6/-
تیس مار خاں	4/50	ننھا سراغ رساں	6/-
چالاک خرگوش کی واپسی	15/-	پُر اسرار غار	6/-
غریب لکڑہارے کی کہانی	6/-	ظالم ڈاکو	6/-
نردولی کا آدم خور	6/-	عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	7/50
ہمت کے کرشمے	6/-	دلی کی شادی	4/-
خلائی مسافر	6/-	رحمت شہزادہ	4/50
ابو خاں کی بکری	15/-	اندھے کا بیٹا	4/50
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی	6/-	پانچ جاسوس	10/-
نرالے گویے	4/50	جنگل کی ایک رات	7/50
باتونی کچھوا	4/50	اچھی کہانیاں	3/-
جادو کا تھیلا	3/-	ہرن کا دل	3/-
جادو کی سارنگی	3/-	دریا کی رانی	3/-
بدر شہزادی	6/-	گوہر شہزادی	4/50
سمندری طوفان اور تین لڑکے	6/-	شریر شیرا	3/50
ننھا سیاح	8/50	پری رانی	3/-
زیور	6/-	خطرناک سفر	3/50

ننھا جمبرو	3/50	لومڑی کا گھر	3/50
مرغی کی چار ٹانگیں	4/50	گلابو چوہیا اور پری زاد	5/-
بابا ناچ	3/-	جادو کا گھر	3/50
سلامہ و صصامہ	5/-	بی مینڈکی اور کوا	3/50
پہاڑ کی چوٹی پر	6/-	تاک دنادن تاکے سے	3/50
شرارت	4/-	روٹی کس نے پکائی	3/50
ننھا فرشتہ	6/-	پھر میں چکوں کیا خاک	3/50
ایک کھلا راز	3/50	پانچ بونے	3/50
مچھیرا اور اس کی بیوی	3/50	چیونٹی رانی	3/50
بھوتوں کا جہاز	7/50	بچوں کی کہانیاں	3/50
ہار کی تلاش	6/-	پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	3/50
خرگوش کی چال	4/-	پکڑو دم کٹے کو	3/50
آؤ ڈرامہ کریں	4/-	مدورانا پردیس چلے	3/50
خرگوش کا سپنا	9/-	بچہ جتو	3/50
نیلا ہیرا	6/50	سرخ جوتے	4/50
ایک کچوری تیل میں	(زیر طبع)	پلک نہ مارو	6/-
شیر خاں	4/-	ایک دیس ایک خون	3/50
بھیڑیے کے بچے	3/-	جادو کے کھیل	(زیر طبع)
لومڑی کے بچے	3/-	انعامی مقابلہ	3/25
میاں ڈھینچو کے بچے	4/-	دعوت ملاجی	(زیر طبع)
بہادر	4/50	جیت کس کی؟	4/-
ہرن کے بچے	3/50	چینی کی گڑیا	(زیر طبع)
اس نے کیا کرنا چاہا	3/50	بہادر سیاح	4/-
کتنا لمبا ہاتھ	7/50	چچا غالب	(زیر طبع)
سنگھ گر کا راجا	(زیر طبع)	تاتیل خاں	3/-
جی دار اور ننھا فرشتہ	(زیر طبع)	جن حسن عبدالرحمٰن اول، دوم	5/-
سرکس (کارٹون)	1/50	چوری کی عادت	3/50
بندر اور نائی	4/50	غیر ذمہ دار لڑکا	(زیر طبع)

جب اور اب	(زیرِ طبع)
سندر چنار	1/50
گلابو چو ہیا اور غبارے	1/50
لال مرغی	4/-
چڑیاں	3/-
تین اناڑی	6/-
چمپاوت کا آدم خور شیر	1/50
ننھا ٹٹو	3/-
چنبیلی	1/20

ہماری درسی کتابیں

اردو قاعدہ		5/-
اردو کی پہلی کتاب		8/-
اردو کی دوسری کتاب		11/-
اردو کی تیسری کتاب		13/-
اردو کی چوتھی کتاب		14/-
اردو کی پانچویں کتاب		17/-
اردو کی چھٹی کتاب		18/-
اردو کی ساتویں کتاب		20/-
اردو کی آٹھویں کتاب		22/-
اردو خوش خطی	حصہ اوّل	4/-
اردو خوش خطی	حصہ دوم	4/-
اردو خوش خطی	حصہ سوم	4/-
اردو خوش خطی	حصہ چہارم	4/-
ہمارا ملک بھارت		19/-
بھارت اور سنسار		19/-

PAYAMI
BASIC ENGLISH-URDU
DICTIONARY 16/-

مطبوعات خدابخش لائبریری پٹنہ

عربی اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم۔ حصہ اول 100/-
(سیمینار کی روداد)
عربی اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم۔ حصہ دوم 100/-
عربی اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم۔ حصہ سوم 50/-
عربی اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم۔ حصہ چہارم 60/-
ذاکر صاحب ذاتی یاد میں (مرتبہ ادارہ)۔ نمبر ۲ 100/-
تعین زمانہ قاضی عبدالودود 50/-
درد و سودا قاضی عبدالودود 50/-
ابن امین اللہ طوفان کا تذکرۂ شعرا قاضی عبدالودود 50/-
غالب بہ حیثیت محقق قاضی عبدالودود 150/-
کچھ شاد عظیم آبادی کے بارے میں قاضی عبدالودود 75/-
اردو میں ادبی تحقیق قاضی عبدالودود 50/-
زبان شناسی۔ اردو / فارسی قاضی عبدالودود 100/-
والعصر مولانا آزاد 10/-
حجۃ ابراہیمی مولانا آزاد 40/-
رباعیات باخرزی سیف الدین باخرزی 30/-
سکھ مت میجر بلبیر سنگھ 25/-
ہندستان کے عہد وسطی پر مقالات۔ 200/-
پروفیسر سید حسن عسکری
تاریخ بنگال و بہار (سدہ سیزدہم) ۔ کرم علی 300/-
مکتوبات صدی مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ 300/-
دیوان مصحفی (دیوان ہشتم) 200/-
اردو رسائل ۱۹۹۴ء میں نمبر ۴ (ادارہ) 200/-
اردو رسائل ۱۹۹۴ء میں نمبر ۵ (ادارہ) 250/-
خدابخش جنرل ۹۶ میں نمبر ۵ (ادارہ) 75/-
پاکستان نیشنل میوزیم (کراچی کے اردو مخطوطات)
مرتبہ ڈاکٹر ظفر اقبال 125/-
خدابخش لائبریری کے اردو مخطوطات کی فہرست۔ (ادارہ) 100/-

(المجلد الرابع) 50/-
فہرست مخطوطات فارسی۔ رام پور رضا لائبریری
تقدیم شایستہ خان 300/-
غزلیات شبلی (شبلی نعمانی) 50/-
قاضی سدید الدین غزنوی کی جوامع الحکایات کے بارے میں
(انگریزی) سید حسن عسکری 25/-
علی گڑھ ہندو مخطوطات۔ ڈاکٹر جعفر رضا شیلیش زیدی 50/-
علامہ سلیمان ندوی کی تحقیقات الفاظ اردو۔
مرتبہ ڈاکٹر سید حامد حسن 40/-
مسدس حالی (خدابخش اڈیشن) 30/-
اردو رسائل کا ذخیرہ۔ رام پور رضا لائبریری میں 20/-
پٹنہ یونیورسٹی کے اردو تھیسس کا جائزہ۔ احمد یوسف 10/-
سوانح حیدر علی (فارسی) علی ابراہیم خاں 50/-
سوانح چیت سنگھ مہاراجا بنارس (فارسی)
علی ابراہیم خاں 20/-
اسلامیان ہند کے مسائل (روداد علی گڑھ سیمینار) 30/-
احوال منازل نجار (فارسی) حافظ محمد فاضل خاں 100/-
مولانا آزاد اور مدارس اسلامیہ مرتبہ، قمر آستان خاں 50/-
ہندو مت حصہ اول (۱) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 50/-
ہندو مت حصہ دوم (۲) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 60/-
ہندو مت حصہ سوم (۳) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 80/-
بدھ، جین، سکھ اور رادھا سوامی (۴) رسالہ زمانہ کانپور
سے انتخاب 40/-
ہندو مسلم مسئلہ (۵) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 40/-
اسلامیان ہند (۶) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 40/-
تاریخ ہند (۷) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 60/-
پریم چند افسانے (۸) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 50/-
پریم چند مزید افسانے (۹) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 60/-
پریم چند ادبیات (۱۰) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 40/-
پریم چند متفرقات (۱۱) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 40/-

- مشاہیر ادب اردو حصہ اول (۱۲) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 150/-
- مشاہیر ادب اردو حصہ دوم (۱۳) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 150/-
- مشاہیر ادب اردو حصہ سوم (۱۴) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 200/-
- مشاہیر ادب اردو چہارم (۱۵) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 125/-
- نیا ہندستان مشاہیر کے آئینے میں حصہ اول (۱۶) رسالہ زمانہ کانپوری سے انتخاب 150/-
- نیا ہندستان مشاہیر کے آئینے میں حصہ دوم (۱۷) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 151/-
- سیاست ہند حصہ اول (۱۸) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 100/-
- سیاست ہند حصہ دوم (۱۹) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 175/-
- ممالک اسلامیہ جاپان اور دوسرے ممالک (۲۰) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 100/-
- ادبیات ہندی (۲۱) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 50/-
- زمانہ کی غالبیات (۲۲) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 50/-
- ادبیات فارسی۔ رسالہ زمانہ نمبر (۲۳) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 50/-
- ادب، زبان، قواعد رسالہ زمانہ کانپور نمبر (۲۴) کانپور سے انتخاب 50/-
- ہندستانی زبان کا مسئلہ رسالہ زمانہ کانپور نمبر (۲۵) 125/-
- اخبارات ورسائل نمبر (۲۶) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 75/-
- ہندو مسلم یونیورسٹیاں ر کتب خانے ر علمی خبریں (۲۷) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 75/-
- فنون لطیفہ نمبر (۲۸) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 50/-
- مذہب نمبر (۲۹) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 50/-
- ۱۹۴۳ء—۱۹۴۹ء کا ایک انتخاب نمبر (۳۰) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب 100/-
- قصائد و قطعات تاریخ۔ مرتبہ ڈاکٹر علی احمد جلیلی 20/-
- مآثر۔ مرتبہ قاضی عبدالودود 50/-
- مولانا آزاد اور رفاقت قرآنی۔ مولانا آزاد سمینار 50/-
- اردو غزل (۱۹۴۰ء کے شعرا کے تناظر میں) 40/-
- شاد عظیم آبادی۔ قیس رضوی عظیم آبادی 40/-
- ہمدرد میں اردو رسائل اور اخبارات

- مرتبین شکیل احمد شمی ر محمد ذاکر حسین 50/-
- شہر میں کرفیو (ناول) وبھوتی نارائن رائے 25/-
- قاضی سید رضا حسین — مولوی سید عبدالمغنی 50/-
- اردو زبان (مسائل اور حل) — خطبہ سید ہاشم علی 5/-
- محمود ایاز کے سوغات کا اشاریہ ڈاکٹر سلمان عابد 20/-
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو رسائل کا اشاریہ مرتبہ ڈاکٹر عطا خورشید 5/-
- شاہ کمال علی کمال اور ان کی تصانیف۔ قاضی عبدالودود 20/-
- روہیل کھنڈ اور لغت — رئیس رام پوری 20/-
- اردو جرائد۔ خدا بخش میں (ایک صدی کا ذخیرہ) 50/-
- دیوان ابوالکلام آزاد۔ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل 25/-
- عقائد ہندواں (دبستان مذاہب متعلقہ ابواب) ذوالفقار موید 50/-
- "نگار" وضاحتی اشاریہ۔ مرتبہ عطا خورشید 200/-
- آثار آزاد (مولانا آزاد کے اوائل عمر کی خود نوشت تحریریں) سید قدرت اللہ فاطمی 20/-
- رسالہ "جامعہ" عہد اول (۱۹۲۳ء۔۱۹۴۷ء) کا اشاریہ 50/-
- جہان غالب۔ قاضی عبدالودود 100/-
- اردو رسائل کا ذخیرہ (خدا بخش لائبریری بھی) 100/-
- عہد وسطیٰ کی ہندی ادبیات میں مسلمانوں کا حصہ پروفیسر سید حسن عسکری 75/-
- عبدالحق بحیثیت محقق — قاضی عبدالودود 125/-
- قواعد اردو — پروفیسر فدا علی خاں 100/-
- کلام شاد (انتخاب) — قاضی عبدالودود 125/-
- کچھ غالب کے بارے میں (حصہ اول)۔ قاضی عبدالودود
- کچھ غالب کے بارے میں (حصہ دوم)۔ قاضی عبدالودود
- اردو رسائل ۱۹۹۳ء (نصف اول) نمبر ۲ 200/-
- اردو رسائل ۱۹۹۳ء (نصف اول) (جولائی تا دسمبر) 200/-
- بہار اردو لغت — احمد یوسف 100/-
- مرآۃ الاحوال جہاں نما (سفرنامہ ہند)۔ احمد بہبہانی -00/-

مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری (احوال و افکار) 200/-
سیّد ضمیر الدین احمد 75/-
قرآن مجید کی تفسیریں (چودہ برس میں) 200/-
چار بیت (تعارف و انتخاب) شبیر علی خاں شکیب 125/-
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں اردو مخطوطات۔
ترتیب ڈاکٹر عطا خورشید 200/-
تفسیر القرآن اول۔ سر سیّد احمد خاں
تفسیر القرآن دوم۔ سر سیّد احمد خاں مکمل سیٹ 250/-
تحریر فی اصول التفسیر۔ سر سیّد احمد خاں
سکوں پر اشعار 175/-
جدید غزل گو (ادارہ) 175/-
دیوان نوازش نوازش لکھنوٴ 50/-
دیوان راسخ عظیم آبادی غلام علی راسخ عظیم آبادی 100/-
اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد 15/-
ایک نادر روزنامچہ۔ مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی 30/-
ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایت۔ بی۔ این پانڈے 5/-
تاریخ نادر العصر مؤلفہ منشی نول کشور 25/-
من موہن کی باتیں شاہ فضل الرحمٰن گنج 15/-
پیام (ہفتہ وار) مولانا ابوالکلام آزاد 100/-
باقیات عظیم الدین احمد۔ ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ 15/-
رسالہ "زبان" مدیر خوشتر منگرولی 50/-
دیوان رضا عظیم آبادی قاضی عبدالودود 10/-
بہار اردو لغت (جلد اول)۔ سیّد سیف الدین احمد بلخی 15/-
معیار تحقیق-۱ (مجلّہ) ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ 100/-
معیار تحقیق-۲ (مجلّہ) ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ 250/-
کانٹے (کشمیری انشائیے) ڈاکٹر محمد زماں آزردہ 15/-
فرہنگ زفان گویا۔ جلد اول۔ تالیف بدر ابراہیم 50/
مغربی تعلیم کا تصور رشید احمد صدیقی 20/-
طلسم ہوشربا اول 100/-
طلسم ہوشربا دوم 100/-

طلسم ہوشربا سوم 100/-
طلسم ہوشربا چہارم 100/-
طلسم ہوشربا پنجم (اول و دوم) 200/-
طلسم ہوشربا ششم 100/-
طلسم ہوشربا ہفتم 100/-
باقیات طلسم ہوشربا (اول و دوم) 200/-
مقدمہ طلسم ہوشربا 20/-
مکمل سیٹ (۱۰۲۰ء) 1020/-
چند اہم اخبارات و رسائل قاضی عبدالودود 30/-
جین دھرم کے مقدس مقامات بابو نیمی داس 40/-
تہذیب، زبان، ادبیات (خطبات جلد دوم) 75/-
ہندو مذہب پنڈت منوہر لال زتشی 10/-
شری کرشن، گوتم بدھ اور دوسرے رہنما۔ نارائن پرشاد 50/-
پیر علی (ناول) شاد عظیم آبادی 25/-
کچھ ہندو مت کے بارے میں (ادارہ) 40/-
کبیر صاحب پنڈت منوہر لال زتشی 25/-
اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں (ادارہ) 100/-
ہندوؤں کے تیوہار لالہ بالکشن بترہ ابر 40/-
ہندوؤں کے اوتار لالہ بالکشن بترہ ابر 25/-
کرنل محبوب احمد 25/-
پٹنہ کے کتبے فصیح الدین بلخی 50/-
جامع الشواہد مولانا ابوالکلام آزاد 40/-
اردو ادب۔ رسالہ ہندستانی ۱۹۳۱-۱۹۴۸ء سے انتخاب 50/-
اردو لغت۔ رسالہ ہندستانی ۱۹۳۱-۱۹۴۸ء سے انتخاب 40/-
چند ادبی مشاہیر کی تحریریں۔ رسالہ ہندستانی ۱۹۳۱-۱۹۴۸ء
سے انتخاب 70/-
اردو ہندی ہندستانی رسالہ ہندستانی ۱۹۳۱-۱۹۴۸ء سے 40/-
ہندی ادبیات ۔ رسالہ ہندستانی ۱۹۳۱-۱۹۴۸ء سے 60/-
تاریخ ۔ رسالہ ہندستانی ۱۹۳۱-۱۹۴۸ء سے انتخاب 60/-
سائنس۔ رسالہ ہندستانی ۱۹۳۱-۱۹۴۸ء سے انتخاب 60/-

یادگار روزگار	سید بدر الحسن	200/-
گیتا اور قرآن	پنڈت سندر لال	25/-
جواہر لال نہرو کا سفر روس	جواہر لال نہرو	20/-
شخصیات و واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا۔	جنید احمد	45/-
تحفۃ السعداء	خواجہ کمال	20/-
خطبہ صدارت موتی لال نہرو		10/-
شر سمد بھگوت گیتا	مہاتما گاندھی	20/-
محبوب الالباب	خدا بخش خاں	200/-
قطعات دلدار	مرتبہ قاضی عبدالودود	20/-
میرا مذہب	محمد علی ردولوی	20/-
لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری ۔	قاضی عبدالغفار	40/-
صراط مستقیم	مرتبہ قمر آستاں خاں	40/-
حکایات لقمان	ایس فیلس	45/-
ہندو دھرم اکبر کے عہد میں	ابوالفضل	100/-
مجمع النفائس	سراج الدین علی خاں	15/-
تصوف بر صغیر میں	خدا بخش سیمینار	150/-
اعمال نامہ	سر رضا علی	100/-
گاندھی جی اور ہندو مسلم ایکتا	نقش علی	15/-
باغ معانی۔ مؤلفہ نقش علی تصحیح و ترتیب عابد رضا بیدار		15/-
بھگوت گیتا یا نغمہ خداوندی	محمد اجمل خاں	20/-
جوگ بسشٹ منہاج السالکین دارا شکوہ		40/-
ہندو دھرم ہزار برس پہلے	البیرونی	100/-
دیوان مصحفی	۔مرتبہ امیر لکھنوی/امیر مینائی	50/-
داستان میری	ڈاکٹر اقبال حسین	30/-
خدا بخش جرنل ۶۳_۶۸		15/-
خدا بخش جرنل ۶۹_۷۴		15/-
جنید احمد کی آٹوگراف بک	جنید احمد	20/-
ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت۔	منشی رام پرشاد ماتھر	30/-

شعری مجموعے

روشن دل
محمد یوسف پاپا

پاپا کا پہلا سنجیدہ شاعری کا مجموعہ۔ اس مجموعے میں شامل غزلیں اپنے لب و لہجے اور انداز و ادا کے اعتبار سے کلاسیکی رنگ و آہنگ کی حامل ہے۔ قیمت=/90

بے آسماں
عبداللہ کمال

"میں" کے بعد اردو کے منفرد لب و لہجے کے شاعر عبداللہ کمال کا دوسرا شعری مجموعہ "بے آسماں" شائع ہوگیا۔ اس مجموعے میں ۱۹۷۸ء سے ۱۹۹۷ء تک کے غزلوں کا انتخاب ہے۔

قیمت=/200

روشنی بے چراغ راتوں کی
انجم رومانی

انجم رومانی کی شاعری مجموعی طور پر نشاط غم کی شاعری ہے۔ شاعری کی سطح پر ایک نشاط انگیز رنگ ضرور ہے۔ مگر تہہ در تہہ زیریں لہروں میں درد کا ایک تلاطم موجزن ہے۔=/100

آسماں محراب
نیا مجموعہ کلام (۱۹۷۶ء تا ۱۹۹۶ء)

شمس الرحمٰن فاروقی

اس شعری مجموعے میں "نا مکمل سوانح حیات" اور "قصیدہ شہر آشوب" کے علاوہ نظموں، غزلوں کے تراجم میں بھی ذہن رسا کے جوہر اپنی آب و تاب دکھاتے ہیں۔ غزلوں میں بھی ایک انفرادی نظر ہے۔ قیمت=/210

صدائے شکست دل
نثار جیراج پوری

نثار جیراجپوری ایک نئے لب و لہجے اور رنگ و آہنگ کے شاعر ہیں۔ مشاہدہ و تجربہ وسیع اور نظر عمیق ہے۔ نثار صاحب کا یہ شعری مجموعہ ان کی منتخب غزلوں پر مشتمل ہے۔ قیمت=/80

مطبوعات نیشنل بک ٹرسٹ

اردو طباعت و اشاعت کے مسائل۔ مرتبہ انور کمال حسینی 7/-
شاعر مترجم پر میش کمارڈے 8/75
ہنگرواڑی مترجم عرش ملسیانی 5/25
پہلا راجا، آدھے ادھورے۔ مترجم قیصر قلندر 11/-
اڑیا افسانے مترجم ڈاکٹر مظفر حنفی 11/25
ماہم کی کھاڑی مترجم غلام بن رزاق 11/75
شری اربندو مترجم نواجاتا 4/50
نئی فصل مترجم رنجن بھٹاچاریہ 8/65
نیل کنٹھ پاکھی کی کھوج مترجم راشد سہسوانی 15/-
گنگوا گنگا مائی مترجم عبدالحی 14/-
بادل چھٹ گئے مترجم رضوان احمد 10/50
پنجابی کے یکبابی ڈرامے۔ مترجم ایس۔ ایم۔ شاہنواز 12/-
گجراتی کے ۱۱ ڈرامے۔ مترجم مظفر حنفی 12/50
آدھی گھڑی۔ مترجم ڈاکٹر سیفی پریمی 15/-
سفر تمام ہوا مترجم مخمور سعیدی 11/50
ریل گاڑی مترجم سید آل رسول 10/-
دور چراغ محفل مترجم بگی بابو 14/25
سوامی رام تیرتھ مترجم مخمور جالندھری 8/-
سردار ولبھ بھائی پٹیل مترجم وشنو پربھاکر 7/50
جے کانتن کی کہانیاں مترجم ذکی انور 11/75
پورن کمبھ مترجم شانتی رنجن بھٹاچاریہ 16/75
دیمک مترجم رفعت سروش 7/75
سورٹھ تیرا بہتا پانی۔ مترجم مظہر الحق علوی 13/-
ہیروں کی آواز مترجم راج نرائن راز 19/50
چک دیر راجندر مترجم راج سہسوانی 22/50
چار دیواروں میں۔ مترجم ظفر ادیب 7/50
گنگا چیل کے پنکھ۔ مترجم رضیہ سجاد ظہیر 6/75
آئینہ مترجم کنہیا لال گاندھی 14/25

یہ ہماری زندگی مترجم رتن سنگھ 6/-

انجمن ترقی اردو ہند کی پرانی مطبوعات

جائزہ زبان اردو 10/-
تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ 10/-
خمسہ کنگلی 2/-
معمار اعظم 10/-
تنقید عقل محض 35/-
پرتھی راج راسا 25/-
دیوان بہرام 15/-
مرحوم دہلی کالج 15/-
مشاہیر یونان و روما (چہارم) 30/-
نسل اور سلطنت 10/-

اقبالیات

دیوان

بانگ درا (طلبہ اڈیشن) علامہ اقبال 12/-
بال جبریل (طلبہ اڈیشن) علامہ اقبال 8/-
ضرب کلیم مع ارمغان حجاز۔ (طلبہ اڈیشن) علامہ اقبال 8/-
ارمغان حجاز (عکسی) (مجلد اڈیشن) (علامہ اقبال) 10/-
بانگ درا (عکسی) (مجلد اڈیشن) علامہ اقبال 30/-
بال جبریل (عکسی) (مجلد اڈیشن) علامہ اقبال 20/-
ضرب کلیم (عکسی) (مجلد اڈیشن) علامہ اقبال 15/-
شکوہ، جواب شکوہ (عکسی) (مجلد اڈیشن) علامہ اقبال 5/-
کلیات اقبال اردو (عکسی) (مجلد اڈیشن) علامہ اقبال 75/-
کلیات اقبال اردو (ڈی لکس) علامہ اقبال 100/-
شرح بانگ درا یوسف سلیم چشتی 85/-
شرح بال جبریل یوسف سلیم چشتی 85/-
شرح ضرب کلیم یوسف سلیم چشتی 80/-
شرح ارمغان حجاز یوسف سلیم چشتی 80/-

اقبالیات

افکار اقبال — محمد عبدالسلام خاں — 125/-
اقبال کا نظریہ خودی — پروفیسر عبدالمغنی — 150/=
دانشور اقبال — آل احمد سرور — 125/-
اقبال ایک مسلم سیاسی مفکر۔ ڈاکٹر معزالحق
مرتبہ ماہ طلعت علوی — 100/-
اقبال اور ائے دیر و حرم۔ سلیمان اطہر جاوید — 75/-
اقبال کے مطالعہ حرف راز۔ حامدی کاشمیری — 100/-
محمد اقبال — شکیل الرحمن — 150/-
اسرار خودی — شائستہ خاں — 75/-
روزگار فقیر جلد اول — سید وحید الدین — 40/-
روزگار فقیر جلد دوم — سید وحید الدین — 85/-
علامہ اقبال اور قرون اولی کے مسلمان مجاہدین۔
عبدالغفور طارق — 70/-
اقبال شاعر اور سیاست داں۔ ڈاکٹر رفیق ذکریا — 100/-
افکار اقبال — صابر ابوہری — 75/-
شعریات بال جبریل — ڈاکٹر توقیر احمد خاں — 200/-
اقبال شاعر و مفکر — نور الحسن — 85/-
اسلوبیات اقبال — طارق سعید — 70/-
اقبال کا تصور دین — شفیق الرحمن — 95/-
اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی۔ ڈاکٹر توقیر احمد خاں — 80/-
اقبالیات کی تلاش — عبدالقوی دسنوی — 35/-
اقبال کا ذہنی ارتقاء — ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار — 50/-
اقبال بحیثیت شاعر — پروفیسر رفیع الدین ہاشمی — 75/-
اقبال کا فن — گوپی چند نارنگ — 150/-
اوراق گم گشتہ — رحیم بخش شاہین — 35/-
کلام اقبال میں قرآنی آیات و احادیث۔ محمد منظور عالم — 80/-
محب وطن اقبال — سید مظفر حسین برنی — 25/-
اقبال اور اس کا عہد — جگن ناتھ آزاد — 40/-
اقبال اور دارالاقبال بھوپال۔ عبدالقوی دسنوی — 30/-

آموزگار اقبال — اکبر رحمانی — 60/-
اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں۔ اسلوب احمد انصاری — 150/-
اقبال اور نظریۂ خودی — سید محمد سید قادری — 35/-
اقبال اور محبت رسول — محمد طاہر فاروقی — 40/-
برہان اقبال — 100/-
اقبال اور تحریک آزادی کشمیر۔ غلام نبی خیال — 200/-
ابتدائی کلام اقبال — ڈاکٹر گیان چند جین — 125/-
اقبال آئینہ خانے میں — مرتبہ: اخلاق احمد — 40/-
تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ مرتبہ: اخلاق احمد — 60/-
اقبال کی اردو نثر — عبادت بریلوی — 20/-
نقد اقبال — میکش اکبر آبادی — 25/50
نقوش اقبال — ابوالحسن علی ندوی — 50/-

دیگر اداروں کے معیاری رسائل

سہ ماہی لمحے لمحے — عشرت کرتپوری نمبر — 200/-
فن و شخصیت کنش بہاری طنز نمبر۔ مدیر صابر دت — 100/-
فن و شخصیت — مقبول شعراء نمبر — 250/-
صابر دت نمبر مرتبہ: سریندر پرکاش — 300/-
انشاء۔ دلیپ سنگھ نمبر۔ مدیر۔ ف۔ س۔ اعجاز — 50/-
انشاء عالمی اردو افسانے۔ مدیر ف۔ س۔ اعجاز — 150/-
انشاء ادیبوں کی حیات معاشقہ۔ نمبر — 200/-
انشاء۔ نیاز فتحپوری نمبر۔ ف۔ س۔ اعجاز — 200/-
انشاء اسکنڈے نیویائی ادب نمبر مدیر۔ ف۔ س۔ اعجاز — 300/-
سوغات ۱۲ (محمود ایاز کی یاد میں) مدیر اعلا۔
مریم محمود ایاز — 125/-
فکر و آگہی بیکل اتساہی نمبر۔ رضیہ حامد — 100/-
فن اور شخصیت غزل نمبر۔ صابر دت — 250/-
فکر و فن — آگہی بشیر بدر نمبر — 50/-
اردو ادب اختر انصاری نمبر۔ خلیق انجم — 25/-
خدا بخش لائبریری جرنل ۵۷۔۶۰ — 150/-
خدا بخش لائبریری جرنل ۶۹۔۷۴ — 150/-

خدابخش لائبریری جرنل ۷۵۔۷۷ — 75/-
خدابخش لائبریری جرنل ۷۸۔۸۰ — 75/-
خدابخش لائبریری جرنل ۸۱۔۸۳ — 75/-
خدابخش لائبریری جرنل ۸۴۔۸۶ — 75/-
خدابخش لائبریری جرنل ۹۳۔۹۵ — 75/-
ناول کتاب نما دہلی ۱۹۹۳ء — 80/-
ناول کتاب نما دہلی ۱۹۹۴ء — 80/-
شور نمبر ۶ — 60/-
معیار و تحقیق (ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ) نمبر ۱ — 100/-
معیار و تحقیق (ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ) نمبر ۲ — 25/-
پیام ہفتہ وار — مدیر مولانا آزاد — 100/-
ایوان اردو تبصرہ نمبر — دہلی اردو اکیڈمی — 12/-
فن اور شخصیت (ساحر نمبر)۔ ترتیب صابردت — 200/-
فن اور شخصیت قتیل شفائی نمبر۔ ترتیب صابردت — 150/-
فن اور شخصیت کوائف نمبر۔ ترتیب صابردت — 150/-
فن اور شخصیت قطعہ نمبر۔ ترتیب صابردت — 125/-
فن اور شخصیت کشمیر لال ذاکر نمبر۔ ترتیب صابردت — 150/-
تحریر نمبر ۴۵ — اڈیٹر مالک رام — 5/-

غالبیات

غالب اور ذکا — ضیاءالدین اور شکیل — 6/-
تفہیم غالب — شمس الرحمن فاروقی — 90/-
جائزہ کلام غالب — طالب کاشمیری — 25/-
اسرار غالب — سید قدرت نقوی — 60/-
نذر غالب — عطا کاکوی — 10/-
بیان میر تقی اور غالب — شرف الدین ساحل — 50/-
تفتہ اور غالب — ضیاءالدین انصاری — 35/-
فیضان غالب — عرش ملسیانی — 22/-
گفتار غالب — مالک رام — 84/-
تلامذۂ غالب — مالک رام — 75/-
غالب اور شاہان تیموریہ — خلیق انجم — 9/50

عظمت غالب — عبدالمغنی — 35/-
غالب سے اقبال تک — ایم حبیب خاں — 35/-
دیوان غالب — (انجمن) — 32/-
دیوان غالب — ایوان غالب ایڈیشن — 60/-
گل رعنا (انتخاب کلام فارسی)۔ مرتبہ مالک رام — 25/-
دیوان غالب ہندی ایڈیشن — (ایوان غالب) — 75/-
دیوان غالب — نورالحسن نقوی — 35/-
دیوان غالب — (غالب اکیڈمی) — 150/-
غالب بہ صد انداز ترجمہ (انگلش ہندی اردو،
پبلی کیشن ڈویژن) — 500/-

خطوط

خطوط غالب اول تا چہارم مکمل
مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم — 390/-
عود ہندی — غالب — 13/50

تنقید

غالب اور انقلاب ۱۸۵۷ء — معین الرحمن — 60/-
غالب پر چند تحریریں — ڈاکٹر سعادت علی صدیقی — 35/-
یادگار غالب (اردو) — مالک رام — 30/-
غالب اور صفیر بلگرامی — مشفق خواجہ — 36/-
غزلیات غالب (اردو) — یوسف حسین خاں — 96/-
غزلیات غالب (فارسی) — یوسف حسین خاں — 80/-
نقد قاطع برہان مع ضمائم — پروفیسر نذیر احمد — 60/-
غالب شخص اور شاعر — مجنوں گورکھپوری — 25/-
احوال غالب — مختار الدین آرزو — 45/-
مقالات بین الاقوامی غالب سیمنار۔ انگریزی — 10/-
مقالات بین الاقوامی غالب سیمنار۔ اردو — 20/-
غالب فکر و فن — فخرالاسلام اعظمی — 25/-

شرحیں

مرآۃ الغالب شرح — بیخود دہلوی — 60/-

بیان غالب شرح (دیوان غالب)۔ آغا محمد باقر 100/-

شرح دیوان غالب یوسف سلیم چشتی 125/-

نذریں

نذر مختار مالک رام 101/-

نذر ذاکر اردو مالک رام 700/-

نذر ذاکر انگش مالک رام 40/-

نذر عبدالحمید اردو ترتیب مالک رام 70/-

نذر عبدالحمید انگلش ترتیب مالک رام 101/-

نذر کرنل زیدی اردو مرتبہ مالک رام 51/-

نذر کرنل زیدی انگلش مرتبہ مالک رام 51/-

ارمغان مالک اردو جلد دوم 30/-

ارمغان مالک انگریزی 30/-

لغات

اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری بابائے اردو عبدالحق 400/-

القاموس الجدید عربی اردو مولوی وحید الزماں کیرانوی 145/-

القاموس الجدید اردو عربی " " 166/-

بیالی بنیادی انگلش اردو ڈکشنری 15/-

بیالی ہوم اردو انگلش ڈکشنری، (ادارہ) 21/-

فیروز اللغات کلاں سائز مولوی فیروز الدین 35/-

ایڈوانس نوتنہ سچری ڈکشنری۔ انگریزی اردو 180/-

اسٹینڈرڈ نوتنہ سچری ڈکشنری۔ اردو انگریزی 180/-

کنسائز نوتنہ سچری ڈکشنری۔ انگریزی اردو 75/-

کنسائز نوتنہ سچری ڈکشنری۔ اردو انگریزی 85/-

جیم پاکٹ نوتنہ سچری ڈکشنری۔ اردو انگریزی 35/-

جیم پاکٹ نوتنہ سچری ڈکشنری۔ انگریزی اردو 35/-

جدید تعلیم اللغات جیبی ۔ انگریزی اردو 35/-

فروز اللغات (جیبی) اردو سے اردو 35/-

فرہنگ عامرہ فارسی، عربی، ترکی الفاظ کا با تلفظ معنی 90/-

اردو ہندی ڈکشنری ترتیب انجمن ترقی اردو 120/-

اے نیو ہندستانی ایس۔ ڈبلو فیلن 90/-

فیروز اللغات درمیانی 80/-

المنجد عربی سے اردو ڈکشنری 300/-

ماڈرن پرشین انگلش اردو ڈکشنری۔ ایف ڈی راز ی 70/-

ہندی اردو لغت ابو محمد رام نگری 35/-

اردو ہندی لغت ابو محمد رام نگری 35/-

بہار اردو لغت (جلد اول) یوسف الدین بلخی 15/-

بحر المعانی دکنی اردو لغت ڈاکٹر جاوید وشسٹ 10/-

کریم اللغات فارسی نول کشور پریس 38/-

ہندستانی ڈکشنری (انگلش اردو)۔ ڈنکنس فاربس 112/-

لغات کشوری نول کشور پریس 120/-

پاپولر عربی اردو اردو عربی لغت 120/-

جدید تسیم اللغات سید قاسم رضا نسیم امروہوی 175/-

آسان لغات القرآن عبدالکریم پاریکھ 60/-

القاموس المدرسی (انگلش عربی) 40/-

القاموس المدرسی (عربی انگلش) 50/-

فرہنگ انیس جلد ۲ نائب حسن نقوی 80/-

بہار اردو لغت احمد یوسف 100/-

مختصر اردو لغت (ترقی اردو بیورو)۔ 280/-

جامع انگریزی اردو لغت۔ قومی اردو کونسل جلد اول -/400۔ جلد دوم تا چہارم۔ فی۔ -/600

اردو اکیڈمی دہلی کی مطبوعات

زمستان سرد مہری کا (آخری شعری مجموعہ) اختر الایمان 35/-

اس آباد خرابے میں (سوانح) اختر الایمان 60/-

فرحت اللہ بیگ۔ مرتب ڈاکٹر صلاح الدین 23/-

دلی والے (جلد اول)۔ مرتب ڈاکٹر صلاح الدین 36/-

قلعہ معلی کی جھلکیاں۔ مصنف عرش تیموری۔ مرتب ڈاکٹر اسلم پرویز 17/-

مرحوم دلی۔ مصنف. سید احمد دہلوی۔ مرتب ڈاکٹر خلیق انجم 28/-
بزم آخر۔ مصنف منشی فیض الدین۔ مرتب ڈاکٹر کامل قریشی 21/-
داغ دہلوی حیات اور کارنامے۔ " " " 50/-
عالم میں انتخاب دلی۔ مصنف مہیشور دیال 50/-
دلی کی تہذیب مرتب ڈاکٹر انتظار مرزا 17/-
دیوان حالی۔ مقدمہ رشید حسن خاں 30/-
اردو صحافت۔ مرتب انور علی دہلوی
دلی کے اسکولوں میں اردو نصاب کے مسائل
مرتب صدیق الرحمان قدوائی 23/-
نوبت پنج روزہ یعنی وداع ظفر۔ مصنف علامہ راشد الخیری
مرتب ڈاکٹر تنویر احمد علوی 23/-
دلی کی آخری بہار مصنف علامہ راشد الخیری
مرتب سید ضمیر حسن دہلوی 20/-
ایوان اردو کے منتخب افسانے۔ مرتب مخمور سعیدی، زبیر رضوی 80/-
نذیر الدین فراق دہلوی مرتب ڈاکٹر انتظار مرزا 21/-
مرزا محمود بیگ کے مضامین کا انتخاب۔ مرتب ڈاکٹر کامل قریشی 31/-
نیا اردو افسانہ تجزیہ اور مباحث۔ مرتب پروفیسر گوپی چند نارنگ 60/-
انتخاب کلام داغ مرتبہ بیگم ممتاز میرزا 35/-
دلی اور اس کے اطراف۔ مرتبہ ڈاکٹر صادقہ ذکی 25/-
حواشی ابوالکلام آزاد۔ مرتب. سید مسیح الحسن 65/-
اردو میں بارہ ماسے کی روایت۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی 49/-
اشاریہ آج کل۔ مرتب جمیل اختر۔ 77/-
دلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر
مصنف. پروفیسر محمد حسن 26/-
مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین۔ ڈاکٹر اسلم پرویز 40/-
آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل۔ پروفیسر عنوان چشتی 50/-
دلی اور طب یونانی۔ مرتب حکیم سید ظل الرحمان 80/-
انشاء ہادی النساء۔ مصنف سید احمد دہلوی 22/-
واقعات دارالحکومت دہلی (تین جلدوں میں)
مصنف مولوی بشیر الدین احمد 600/-

آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ۔ پروفیسر قمر رئیس 50/-
آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق۔ تنویر احمد علوی 30/-
آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ۔ نصیر احمد خاں 45/-
آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید شارب ردولوی 40/-
آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ شمیم حنفی 30/-
مولانا ابوالکلام آزاد (خصوصی نمبر) 10/-
اردو مرثیہ۔ مرتب ڈاکٹر شارب ردولوی 50/
پنڈت جواہر لال نہرو (خصوصی نمبر) 12/-
ایوان اردو۔ فائل برائے سال ۱۹۸۸ تا ۱۹۹۵ (مجلد) 60/-
آدمی نامہ ۔ مصنف پروفیسر مونس رضا 40/-
عجائب مشین (بچوں کا ادب)۔ مصنف سراج انور 16/-
عقلمند بادشاہ (بچوں کا ادب)۔ مصنف قیصر زاہدی 16/-
انتخاب کلام حاتم مرتب ڈاکٹر عبدالحق 45/-
انتخاب کلام میر سوم مرتب ڈاکٹر ارتضیٰ کریم 40/-
مضامین نہرو۔ مرتب اور مترجم آنند نرائن ملا 40/-
اوراق معانی (غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ)
مترجم، مرتب ڈاکٹر تنویر احمد علوی 70/-
انتخاب کلام سودا۔ مرتب ڈاکٹر شارب ردولوی 35/-
نیا افسانہ مسائل و میلانات مرتب قمر رئیس 48/-
نمائندہ پنجابی افسانے مرتب و مترجم رتن سنگھ 85/-
معاصر اردو غزل مرتب پروفیسر قمر رئیس 70/-
معاصر اردو تنقید۔ مرتب ڈاکٹر شارب ردولوی 45/-
اردو ادب کو خواتین کی دین، پیشکش۔ اردو اکادمی، دہلی 50/-
ہند اسلامی تعمیر (دو جلدوں میں) ضیاء الدین احمد 200/-
سفر ناموں میں دلی (دو جلدوں میں) تنویر احمد علوی 90/-
اردو تھیٹر کل اور آج مخمور سعیدی، انیس اعظمی 75/-
شہید۔ ناول نگار ملک راج آنند 45/-
اردو نظم ۱۹۶۰ کے بعد۔ پیشکش اردو اکادمی، دہلی 40/-
ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعراء۔ مرتبین پروفیسر گوپی
چند نارنگ اور عبداللطیف اعظمی 200/-

دیگر اداروں کی مطبوعات

ادب، تنقید، انشا

افکار تازہ ڈاکٹر سید عبدالباری 100/-
ابوالکلام آزاد شکیل الرحمٰن 90/-
اختر الایمان محمد فیروز 150/-
اُردو لغت نویسی کا پس منظر۔ مسعود ہاشمی 50/-
اعتبار حرف اقبال مسعود 50/-
اُردو نظم اور اس کی قسمیں ساحل احمد 25/-
اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ سنبل نگار 70/-
اصلاح سخن شوق سندیلوی 12/50
اردو گائڈ شاہانہ ارم 80/-
اردو شاعری پر ایک نظر کلیم الدین 60/-
اردو کی ادبی تاریخ عبدالقادر سروری 50/-
انشائے مومن ظہیر احمد صدیقی 25/-
ادب کے جہات رفعت اختر 75/-
اردو ناول کا نگار خانہ کے کے کھلر 40/-
آواز دوست صالحہ عابد حسین 125/-
افکار محروم مالک رام 70/-
ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی خدمات فارسی ڈاکٹر خالدہ حسینی 200/-
ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ جلد اول عتیق اللہ 600/-
اردو غزل میں شاہد بازی ظہور شہداد 90/-
اردو محاورے فخر الدین صدیقی 230/-
ایک نوجوان ہندوستانی مسلمان کی ڈائری عابد رضا بیدار 50/-
اردو میں خودنوشت سوانح حیات صبیحہ انور 60/-
ابوالکلام آزاد عرش ملسیانی 40/-

انتخاب طلسم ہوشربا محمد حسن عسکری 16/-
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی 75/-
اردو شاعری میں خودداری۔ سلام سندیلوی 10/-
اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا ممتاز فاخرہ 100/-
ایک لہر آتی ہوئی مظہر امام 150/-
اردو تنقید حالیؔ سے کلیم تک۔ سید محمد نواب کریم 125/-
اردو مدارس کے معیار تعلیم کا مسئلہ اکبر رحمانی 15/-
اتر پردیش میں اردو افسانہ عبیداللہ چودھری 100/-
اسلامی ہند میں فن خطاطی۔ شوکت علی خاں 5/-
آتی جاتی لہریں مظہر امام 40/-
اردو غزل کے اہم موڑ شمس الرحمٰن فاروقی 55/-
اردو ادب اطفال کے معمار خوشحال زیدی 125/-
انداز آگہی شعیب راہی 50/-
امیر اللہ شاہین شخصیت اور فن جلال انجم 100/-
اردو ماس میڈیا مرتبہ پروفیسر فضل الحق مرحوم 80/-
اخبار نویسی کے ابتدائی اصول۔ بلجیت سنگھ مطیر 15/-
اوپیرا نگاری مرتبہ ڈاکٹر رضیہ حامد 60/-
ادب کے سروکار ڈاکٹر صادق 100/-
ازبکستان انقلاب سے انقلاب تک ڈاکٹر قمر رئیس 100/-
ادب کی آبرو دیویندر اسّر 70/-
ادب خواتین اور سماج ڈاکٹر صادقہ ذکی 125/-
ادبیات جدید ایران ڈاکٹر منظر امام 125/-
آل احمد سرور امتیاز احمد 150/-
امیر خسرو کی جمالیات شکیل الرحمٰن 150/-
اردو اسٹیج ڈراما تاریخ و تنقید۔ ڈاکٹر جے دیو سنگھ 150/-

افکار میر ایم حبیب خاں 150/-

اسلوب اور اسلوبیات۔ طارق سعید 250/-

اردو کے چند نامور ادیب اور شاعر حامد اللہ ندوی 200/-

ارمغان نارنگ پروفیسر عبدالحق 250/-

اسرار غالب سید قدرت اللہ نقوی 60/-

اقبال ایک مسلم سیاسی : ڈاکٹر مشیر الحق

مرتبہ ماہ طلعت علوی 100/-

افکار اقبال صابر ابوہری 75/-

اردو نقاد کی حیثیت سے فراق کا جائزہ ڈاکٹر مہتاب عالم -/100

اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ/خالد محمود 250/-

ادبی مراحل خیر النسا مہدی 75/-

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں عبد القوی دسنوی -/75

اردو زبان کی تاریخ ڈاکٹر خلیل 100/-

اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ سنبل نگار 50/-

اقبال کی شعری زبان ایک مطالعہ ڈاکٹر سید صادق علی -/50

اردو ڈرامے کا تنقیدی جائزہ۔ ابراہیم یوسف 45/-

اردو صحافت ترجمہ و ادارت۔ سید ضیاء اللہ 80/-

ابلاغ و ترسیل۔ پروفیسر محمد یوسف خورشیدی 50/-

البیرونی قیام الدین 51/-

اردو اور سیکولرزم اقبال خاں 95/-

اسلوب و تنقید پروفیسر عبد المغنی 90/-

استاد رجب علی خاں عمیق حنفی 60/-

آوارگی کا آشنا (سفر نامہ) دلیپ سنگھ 100/-

ادب نقد حیات ڈاکٹر یوسف سرمست 100/-

آغا شاعر قزلباش شخصیت شاعری/سید فیضان حسن 100/-

اردو کے علاوہ مذہب کی ترویج میں اردو کا حصہ محمد عزیز -/50

انتخاب افسانہ اردو اکیڈمی لکھنو 10/-

اردو میں قصیدہ نگاری ام ہانی اشرف 30/-

اردو مثنوی کا ارتقا عبد القادر سروری 20/-

اردو ناول کی تاریخ اور تنقید علی عباس حسینی 50/-

اشاریہ ایوان اردو فاروق انصاری 80/-

اردو تنقید نگاری عبادت بریلوی 40/-

اور بستی نہیں یہ دلی ہے رفعت سروش 200/-

اکثر یاد آتے ہیں مظہر امام 75/-

آگ کا دریا تفہیم و تجزیہ۔ محمد ایوب خاں 45/-

اردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ نگہت ریحان خاں -/120

انجمن آرزو حامدی کاشمیری 75/-

اجنبی شہر عبد القوی دسنوی 15/-

اردو مثنویوں میں جنسی تلذذ محبوب علی قریشی 125/-

اردو ناول میں عورت کا تصور فہمیدہ کبیر 45/-

آدی باسی تہذیب و ثقافت عبد الباری ایم اے 25/-

ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ڈاکٹر سید عبد اللہ -/85

اقبال اور مودودی کا تقابلی مطالعہ

عمر حیات خاں غوری/سید عبد اللہ 55/-

اردو میں تمثیل نگاری۔ مظہر اعظمی 72/-

امیر خسرو اور ان کا ہندوی کلام پروفیسر گوپی چند نارنگ -/120

احمد شوقی ایک مطالعہ محمد اظہر 20/-

اردو مرثیہ کی سرگذشت۔ ڈاکٹر اسد اریب 60/-

اردو میں رپورتاژ کی روایت طلعت گل 50/-

ادبی فیچر اور تقریریں پروفیسر شمیم حنفی 100/-

آپ دیکھیں ہرچرن چاولہ 150/-
افکار و انشا پروفیسر وارث کرمانی 80/-
اردو زبان و سماجی سیاق پروفیسر عبدالستار دلوی 100/-
اردو صحافت کا استغاثہ۔ پروانہ ردولوی 60/-
افسانے کے معمار ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی 40/-
ادب نما فخر الاسلام اعظمی 25/-
ادبی زاویے فخر الاسلام اعظمی 35/-
ادب کا مطالعہ اطہر پرویز 30/-
اسلام ابدی خطوط اور نئے زاویے شمیم اختر 80/-
ایک مشرقی کتب خانہ۔ خدا بخش 10/-
ادبی جائزے راج بہادر گوڑ 65/-
ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش پروفیسر عبدالمغنی 50/-
اردو کیسے پڑھائیں سلیم عبداللہ 20/-
اردو زبان و ادب مسعود حسین خاں 12/50
اردو مرثیہ نگاری اشرف ام ہانی 25/-
ابر نیساں سیدہ طیبہ بیگم 20/-
انشاء اللہ خاں انشاء ایم حبیب خاں 15/-
اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاء کا کام مولوی عبدالحق 15/-
آرٹ سید مجید اللہ 10/-
اردو ساخت کے بنیادی عناصر نصیر احمد خاں 100/-
اختر انصاری شخص اور شاعر ڈاکٹر خلیق انجم 35/-
انگریزی ادب کی مختصر تاریخ ڈاکٹر محمد یٰسین 90/-
اردو فکشن میں طوائف ڈاکٹر وی پی سوری 25/-
انشائیہ کے خدوخال ڈاکٹر وزیر آغا 33/-
اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء الطاف فاطمہ 40/-

اردو میں واسوخت نگاری ایس ایم زین العابدین 75/-
اردو ناول آزادی کے بعد۔ ڈاکٹر اسلم آزاد 40/-
اردو گیت بیگم بسم اللہ نیاز احمد 250/-
اردو شاعری کا مزاج ڈاکٹر وزیر آغا 25/-
انشائیہ اور انشائیے پروفیسر سید محمد حسنین 40/-
اردو ادب میں طنز و مزاح وزیر آغا 35/-
اردو ادب مختصر ترین تاریخ ڈاکٹر سلیم اختر 125/-
اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت کا ارتقا
روشن اختر کاظمی 150/-
اردو تنقید کا ارتقاء عبادت بریلوی 50/-
آج کا اردو ادب ابواللیث صدیقی 25/-
اردو تنقید پر ایک نظر کلیم الدین احمد 60/-
اردو کی تین مثنویاں خان رشید 20/-
اردو ادب پر ذرائع ترسیل عامہ کے اثرات
ڈاکٹر قیصر شمیم 100/-
ادب کی پرکھ ڈاکٹر نریش 75/-
اردو لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری 30/-
اوراق بصیرت افروز/ ڈاکٹر آمنہ خاتون 11/25
آب کوثر شیخ محمد اکرم 75/-
اردو ادب کی تاریخ عظیم الحق جنیدی 30/-
اردو میں رپورتاژ نگاری عبدالعزیز 60/-
ایلیٹ کے مضامین جمیل جالبی 75/-
احساس و ادراک منیر احمد صدیقی 22/-
انیس شناسی ڈاکٹر افضل امام 16/-
ادب میں جمالیاتی اقدار ایک مطالعہ ظہیر احمد صدیقی 10/-

آئینہ ابوالکلام آزاد عتیق صدیقی -/20

اردو خود نوشت فن اور تجزیے ڈاکٹر وہاج علوی -/125

اسلوبیاتی مطالعے منظر عباس نقوی -/50

اقبال شناسی مرتبہ ڈاکٹر مصطفیٰ فطرت -/10

اردو ادب کی ایک صدی ڈاکٹر سید عبداللہ -/40

ادبی تنقید اور اسلوبیات پروفیسر گوپی چند نارنگ -/120

انتخاب خطوط غالب۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم -/20

اردو میں ادبی نثر کی تاریخ ڈاکٹر طیبہ خاتون -/150

اسلوب و معنی ڈاکٹر اعجاز علی ارشد -/50

اردو کی تہذیبی معنویت علی محمد خسرو -/6

اردو غزل کے نشتر پروفیسر مسعود حسین خاں -/60

اردو شعریات پروفیسر آل احمد سرور -/60

ادبی کلچر اور مسائل خاور خلیل -/80

اردو کہاوتیں یونس اگاسکر -/250

ابوالکلام آزاد عبدالقوی دسنوی -/20

ادبی نثر کا ارتقا ڈاکٹر شہناز انجم -/80

ادب گزیدہ معین اعجاز -/25

اردو کی لسانی تشکیل مرزا خلیل بیگ -/40

اردو، ہندی دانشوروں کی نظر میں ڈاکٹر حامد حسین -/20

ادب کی تلاش بلراج کومل -/30

اردو مثنوی شمالی ہند میں اوّل دوم

ڈاکٹر گیان چند جین فی حصہ -/45

اردو ناول میں طنز و مزاح ڈاکٹر شمع افروز زیدی -/100

اردو سفرنامے انیسویں صدی میں ڈاکٹر قدسیہ بیگم -/80

ادبی و لسانی تحقیق عبدالستار دلوی -/50

اردو مصدر نامہ حفیظ الرحمٰن واصف -/60

اردو بھول بھلیاں حفیظ الرحمٰن واصف -/25

ادبی تناظر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ -/24

بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری کی تنقیدی مطالعہ

فرحانہ شاہین -/295

بیان میرٹھی حیات و شاعری شرف الدین ساحل -/25

بہار و خزاں نعیم احمد -/35

۴۴ نظمیں ایک روایت ایک بغاوت محمد صدر الدین -/15

بھگود گیتا شان الحق حقی -/70

بڑی عورت کی کتھا کشور ناہید -/150

بہار کی اردو شاعری پر ترقی پسند تحریک کا اثر شمس الضحیٰ -/100

بزم یاراں صغرا مہدی -/195

بیاں اور اختر سعید خاں -/144

بھوپال ادب کے آئینے میں ڈاکٹر محمد نعمان -/55

بہار میں اردو طنز و ظرافت سلطان آزاد -/50

بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء اختر اورینوی -/18

بہار میں اردو افسانہ نگاری ڈاکٹر وہاب اشرفی -/60

بات سے بات چلے یعقوب راہی -/30

باقیات عظیم الدین احمد عابد رضا بیدار -/15

باتیں کچھ سریلی سی داود رہبر -/36

بیدی نامہ شمس الحق عثمانی -/150

بہادر شاہ ظفر ڈاکٹر اسلم پرویز -/70

بابائے اردو عبدالحق بحیثیت تنقید نگار و جیب الرحمٰن -/75

باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں -/175

بہادر شاہ ظفر کا افسانۂ غم عبداللہ فاروقی -/22

پہچان اور پرکھ	آل احمد سرور	51/-
پریم چند حیات نو	مانک ٹالا	250/-
پریم چند کا فن	شکیل الرحمٰن	100/-
پریم چند	پرکاش چندر گپت	15/-
پریم چند فکر و فن	قمر رئیس	8/-
پس پردہ	آغا حیدر دہلوی	15/-
پل دو پل کا شاعر	احتشام حسین ٹانڈوی	25/-
پروفیسر مسعود حسین خاں ایک جامع شخصیت۔	ڈاکٹر خلیق انجم	50/-
پتہ پتہ بوٹا بوٹا	رفعت سروش	80/-
پانی پت	ڈاکٹر محمد اقبال	200/-
پریم چند شناسی	پروفیسر آفاق احمد	50/-
پطرس کے خطوط	پطرس بخاری	30/-
پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	خلیل احمد بیگ	45/-
پریم چند قلم کا سپاہی	امرت رائے	200/-
پنڈت آنند نرائن ملا کی ادبی خدمات	خلیق انجم	40/-
ترقی پسند ادب	عزیز احمد	45/-
تلخیاں	شمر امام	40/-
تفہیمات	کلام حیدری	25/-
تنقیدی جائزے	سید احتشام حسین	25/-
تنقیدی مطالعے	شارب ردولوی	30/-
تذکرہ خوش معرکہ زیبا	شمیم انہونوی	50/-
تاریخ تحقیق و تذکرہ شعرائے برج پردیش۔	مقبول عرشی	60/-
تنقیدی تناظر	سید طلعت حسین	100/-

تنظیم کثیر رنگی	عارف خورشید	25/-
تعین و تقدیر	حمیرا خاتون	50/-
تلاش و تعبیر	منظر اعظمی	36/-
ترقی پسند تحریک اردو شاعری	یعقوب یاور	75/-
تنقید و تبصرہ	تاراچند رستوگی	00/-
تحقیق اور حاصل تحقیق	سید حامد حسین	14/-
تاریخ جامعہ اردو	پروفیسر مقصود حسین خاں	50/-
تذکرہ شعرائے فرخ آباد	شگفتہ موج	40/-
تاریخ ریاست ٹونک	مان سنگھ	50/-
تحقیق و تنقید	اختر اورینوی	25/-
تنقید اور مجلسی تنقید	وزیر آغا	75/-
تحریک آزادی اردو نثر اور مسلم ادباء۔	ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی	00/-
تاثرات	ڈاکٹر پریمی رومانی	80/-
تنقید کے مثبت رویئے	ڈاکٹر نکہت ریحانہ	50/-
توضیح فنون ادب	ڈاکٹر صابر سنبھلی	60/-
تاثر نہ کہ تنقید	پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی	51/-
تعبیر و تفہیم	خلیق انجم	135/-
تحقیق تصورات	پروفیسر عبدالحق	300/-
تنقیدی بصیرت	مشتاق احمد	35/-
تفہیم و تعبیر	سرور کریم	80/-
ترقی پسند تحریک اور اردو غزل	سراج اجملی	150/-
تعبیر و تحلیل	پروفیسر قمر رئیس	150/-
تقویم ہجری و عیسوی	ابو النصر محمد خالدی	35/-
تعمیری ادب تحریک و مسائل	پروفیسر احمد سجاد	135/-

یکین قریشی کلام اور خطوط کے آئینے میں
رتبین حکیم سیف الدین ڈاکٹر حسین ماجد 100/-
ریخ نگاری قدیم و جدید رجحانات
اکٹر سید جمال الدین 51/-
تفہیم رشید حسن خاں 75/-
ذکرہ نکات الشعرا ترجمہ حمیرہ خاتون 50/-
وضیحی اشاریہ غالب نامہ (اشاریہ) فاروق انصاری 60/-
تحت اللفظ نصرت ظہیر 60/-
تاریخ ساز جوانیاں محمد جاوید خالد 40/-
تاریخ مشاعرہ علی جواد زیدی 100/-
تفہیم البلاغت پروفیسر عبدالوہاب اشرفی 15/-
تنقید نامہ پروفیسر عنوان چشتی 80/-
تخلیق عمل اصول و مسائل طارق سعید 70/-
تاریخ ادبیات عالم حصہ اوّل
عبدالوہاب اشرفی 400/-
تلاش آزاد عبدالقوی دسنوی 40/-
تحریر ہمہ رنگ محمد اسد اللہ 20/-
ترجمہ نگاری کا فن مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم 55/-
تذکرہ ماہ و سال مالک رام 125/-
تحقیق نامہ مشفق خواجہ 125/-
تحریریں ڈاکٹر اسلم پرویز 51/-
توبرات قیوم خضر 30/-
تحلیل نفسی اور ادبی تنقید کلیم الدین احمد 22/-
تنقید اور جدید اردو تنقید ڈاکٹر وزیر آغا 60/-
تلوک چند محروم رام لعل نابھوی 15/-

توضیح اشکیم ناول نگاری کا جائزہ ڈاکٹر بدر الدین 45/-
تحقیقی مباحث پنڈت دتن چنڈوری 75/-
تلاش و تعبیر رشید حسن خاں 45/-
تنقید ابعاد مظفر حنفی 150/-
تحقیقی مضامین مالک رام 60/-
تذکرہ شوکت نادری شاہ عبدالسلام 31/-
تاریخ ادب (جلد اول، دوم) جمیل جالبی 65/-
تلاش فن سید رضا زیدی 6/-
تلاش میر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی 65/-
ٹوٹے ہوئے تارے شاہ محمد عثمان 40/-
جگت موہن رواں اور ان کی شاعری
ڈاکٹر محمد اشفاق عارف 200/-
جوش کی منظری شاعری ڈاکٹر محمد کوثر اعظم 150/-
جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ قمر رئیس 150/-
جدید شاعری ظہیر احمد صدیقی 80/-
جام جہاں نما اردو صحافت کی ابتدا / جی ڈی چندن 75/-
جدید افسانہ اردو ہندی طارق چھتاری 100/-
جدید ہندی شاعری خورشید اکبر 80/-
جموں و کشمیر کے گوجر آر مجوریہ 30/-
جانے پہچانے لوگ قمر یورش 25/-
جدید عربی تنقید عبدالحق 40/-
جدید مغربی ڈرامے کے اہم رجحانات
زاہدہ زیدی 10/-
جنت سنگھار پروفیسر سیدہ جعفر 180/-
جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ مرتبہ خلیق انجم 100/-

جدید ہند کے سیکولر معمار ڈاکٹر مجیب اشرف 50/-
جہات و جستجو پروفیسر مظفر حنفی 30/-
جدید شعری و منظر نامہ ڈاکٹر حامدی کشمیری 125/-
جوش بنام ساغر (خطوط) مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم 30/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل وارث علوی 36/-
جہان افکار سید مجاور حسین 45/-
جدید اردو نظم نظریہ اور عمل ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی 90/-
جمیل مظہری کی شاعری کا مطالعہ ڈاکٹر فضیل احمد 250/-
جواہر آئینہ (جائزہ کلام غالبؔ) طالب کشمیری 30/-
چند اہم نثر نگار فخر الاسلام 15/-
چکبست سرسوتی سرن کیف 30/-
چند ہم عصر مولوی عبد الحق 19/-
چند شعراء سے ملاقاتیں ہاشم عظیم آبادی 40/-
حسرت موہانی ایک سیاسی ڈائری
اثر بن یحییٰ انصاری 50/-
حیدر آبادی جو کبھی تھا رئیس احمد جعفری 80/-
حبیب جالب شخصیت اور شاعری نند کشور وکرم 150/-
حرف شیریں رام لعل 75/-
حافظ محمود شیرانی پروفیسر نذیر احمد 60/-
حسرتؔ سے فراق تک ایم۔ حبیب خاں 35/-
حیات محروم جگن ناتھ آزاد 45/-
حرف حرف روشنی رفیعہ شبنم عابدی 45/-
حامد اللہ افسر میرٹھی حیات شخصیت اور کارنامے
ڈاکٹر سید مقصود حسن 75/-
حیات وجہی ڈاکٹر م۔ ن۔ سعید 50/-

خاموش آواز جاں نثار اختر 25/-
خواب شیریں جے کرشن چودھری 10/-
کنز المخطوطات محمد عمران خاں 69/-
خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید نگاری
ڈاکٹر عفت آرا 200/-
خواب باقی ہیں خود نوشت
پروفیسر آل احمد سرور 150/-
خواجہ میر درد تنقیدی و تحقیق مطالعہ
مرتبہ ثاقب صدیقی 150/-
خدیجہ مستور بحیثیت ناول نگار
پروفیسر محمد ممتاز حسین 50/-
خوشبو کا سفر (سفر نامہ) ڈاکٹر کیول دھیر 100/-
خلیل الرحمٰن اعظمی اسلام عشرت 50/-
خندہ ہائے بیجا وارث علوی 51/-
خسرو نامہ مجیب رضوی 21/-
خطبہ صدارت موتی لال نہرو 10/-
داستان تاریخ اردو حامد حسن قادری 360/-
دلت مراٹھی ادب شناسی انیس چشتی 40/-
دہلی میں اردو افسانہ ڈاکٹر ظل ہما 200/-
دبستان عشق کی مرثیہ گوئی ڈاکٹر جعفر رضا 300/-
دہلی کی آخری شمع فرحت اللہ بیگ 25/-
دلی کے مشاعرے سے سرور تونسوی 150/-
دو حالی ظفر ادیب 15/-
دار الترجمہ عثمانیہ کی علمی اور ادبی خدمات
ڈاکٹر مجیب الاسلام 80/-

دیس دیس کے اجالے (مقالات) ڈاکٹر محمد الحسن -/50
دبیر الفنس آباد محمد صادق -/20
دیدہ ور ضیاء الحق فوقی -/10
داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا
پروفیسر شکیل الرحمن -/200
دکنی ادب کی تاریخ ڈاکٹر محی الدین قادری زور -/15
دنیا میرا گاؤں (سفرنامے) خواجہ غلام السیدین -/60
دریائے لطافت مولوی عبدالحق -/40
ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت و معمار ڈاکٹر فہمیدہ بیگم -/75
ڈاکٹر رشید جہاں (حیات و خدمات)
ادریس احمد خاں -/100
ڈاکٹر سید عابد حسین قاضی عبیدالرحمن ہاشمی -/15
ڈاکٹر مشیر الحق (شخصیت اور فکری بصیرت)
مرتبہ شاہ عبدالسلام -/300
ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی مرتبہ رشید حسن خاں -/22
ڈاکٹر زور پروفیسر سیدہ جعفر -/150
ڈراما فن اور روایت ڈاکٹر محمد شاہد حسین -/120
ڈاکٹر شفیق الرحمن ایک مطالعہ ریحانہ پروین -/100
ڈاکٹر عندلیب شادانی حیات اور کارنامے
کلثوم ابوالبشر -/120
ذکر و زبان دور آفریدی -/12
ذوق و جستجو خواجہ احمد فاروقی -/34
سلام مچھلی شہری حیات اور شاعری محمد اختر الحسن -/25
ساز عہد نصر وارثی -/20
ساغر نظامی حیات اور ادبی خدمات سلمیٰ شاہین -/100

سخن گسترانہ ڈاکٹر منصور عمر -/100
سفرنامہ خواجہ حسن نظامی ڈاکٹر منصور عمر -/75
سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے
پروفیسر خلیق احمد نظامی -/85
سید احتشام حسین کچھ یادیں کچھ باتیں
پروفیسر نذیر احمد -/80
سرسید سے خطوط غالب تک فخر الاسلام اعظمی -/15
سن تو سہی عبدالقادر ادیب -/30
سید احمد خاں خلیق احمد نظامی -/35
سائنس سب کے لئے انور بیتائی -/30
سخنوران شاہجہان پور مبارک شمیم -/150
سید مسعود حسین رضوی ادیب، حیات اور ادبی جذبات
ڈاکٹر وسیم آرا -/150
رائے بینی نارائن دہلوی ڈاکٹر حنیف نقوی -/70
روپ رس جاوید وششٹ -/15
روشن لکیر اختر بستوی -/50
رقعات رشید احمد صدیقی محمود حسن -/20
ردِ عمل پریمی رومانی -/150
رسالہ تذکران گارسین دتاسی -/35
رابندر ناتھ ٹیگور بنرجی -/80
رفعت سروش بحیثیت نثر نگار مرتبہ رضیہ حامد -/50
رفعت سروش شخصیت اور فن مرتبہ رضیہ حامد -/100
راج ترنگنی اول و دوم ترجمہ ٹھاکر اچھر مید -/400
رشید احمد صدیقی کے خطوط پروفیسر آل احمد سرور -/180
رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ

خواجہ محمد اکرام الدین 60/-
راج بہادر گوڑ حیات اور ادبی کارنامے خلیق انجم 70/-
راحت آرا بیگم کی افسانہ نگاری ڈاکٹر فہمیدہ بیگم 90/-
رقص بتاں آوری شکیل الرحمٰن 50/-
زبان کیا ہے خلیل صدیقی 100/-
زبان اسلوب و اسلوبیات مرزا خلیل بیگ 30/-
ساحر ہوشیار پوری ایک مطالعہ ڈاکٹر خورشید عالم 100/-
سید مسعود حسین رضوی ادیب پروفیسر نذیر احمد 60/-
سیماب امروہی شخصیت اور فن سید فیضان حسن 100/-
سب رس کا تنقیدی جائزہ منظر اعظمی 15/-
ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات
گوپی چند نارنگ 290/-
سر سید احمد خاں اور ان کا عہد پروفیسر ثریا حسین 200/-
سب رس سے مضامین رشید تک
مرتبہ فخر الاسلام اعظمی 35/-
سلولائڈ کی دنیا پریم پال اشک 35/-
ستاروں سے آگے نور جہاں 25/-
سحر سے پہلے اور بعد مرزا سعید الظفر چغتائی 51/-
سحر البیان ایک تنقیدی مطالعہ
ڈاکٹر عبادت بریلوی 15/-
سر راہے مسعود مفتی 60/-
سید سلیمان ندوی مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم 40/-
سبق آموز نشانی ہائے فطرت اسمٰعیل حسین نقوی 16/-
سروجنی نائڈو پدمنی سین گپتا 17/-
سات سمندر کا شاعر مرتب ساحر شیوی 75/-

سیر المصنفین، محمد یحییٰ تنہا مرتبہ اسیر اللہ خاں شاہین 25/-
میر المنازل مرزا تمکین بیگ 45/-
شمالی ہند کی اردو شاعری میں ایہام گوئی
حسن اختر نظامی 175/-
شہاب نامہ قدرت اللہ شہاب 225/-
شیشوں کے درمیان خلیق صدیقی 50/-
شاخیں علیم اللہ حالی 80/-
شورش دوراں حمیدہ سالم 250/-
شباب کشمیر محمد دین فوق 50/-
شبلی کی علمی ادبی خدمات ڈاکٹر خلیق انجم 150/-
شہر آشوب ایک تجزیہ ڈاکٹر سید امیر عارفی 125/-
شیر دریا رضا علی عابدی 150/-
شام کی منڈیر سے وزیر آغا 250/-
شخصیات سید محمود الحسینی 19/-
شہکار عروض بلاغت انور مینائی 40/-
شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری
پروفیسر وہاب اشرفی 150/-
شعاع نقد نادم بلخی 80/-
شہید بھگت سنگھ کے کے کھلر 150/-
شاہ عارفی ایک مطالعہ پروفیسر مظفر حنفی 175/-
شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں
شہاب الدین دسنوی 25/-
صولت پبلک لائبریری کے پچاس برس
سید نذر الحسن قادری 100/-
صاحب نظر پریم چند/ڈاکٹر للت شکل 60/-

صحت الفاظ — بدر الحسن — 18/-
صحبتیں اگلی — صغرا مہدی — 200/-
صحافتی زبان — سہیل وحید — 200/-
صادق الخیری — ڈاکٹر ظل ہما — 200/-
ضرب آگہی — محمد اتفاق صدیقی — 48/-
ضیاء فتح آبادی شخصیت و شاعری
مرتبہ مالک رام — 15/-
صفدر آہ بحیثیت شاعر — ڈاکٹر زرینہ ثانی — 16/-
صحیفہ خوش نویساں — احترام الدین شاغل — 12/-
طلسم ہوشربا مع مقدمہ سات جلدیں اول تا ہفتم
خدا بخش لائبریری پٹنہ — 1020/-
ظہیر دہلوی حیات اور فن — ڈاکٹر مختار شمیم — 100/-
عصمت چغتائی شخصیت اور فن
جگدیش چندر ودھاون — 250/-
عالمی اردو ادب نمبر ۱۹۹۵ء — نند کشور وکرم — 150/-
عالمی اردو ادب ۱۹۹۴ء — نند کشور وکرم — 150/-
عصمت چغتائی کی ناول نگاری — شبنم رضوی — 50/-
عزیز احمد کی ناول نگاری — سلیمان اطہر جاوید — 60/-
علامہ اقبال اور محبت رسول — محمد طاہر فاروقی — 40/-
عزمی دہلوی حیات و ناول نگاری — خالد اشرف — 75/-
عبدالحق — مختار الدین احمد — 15/-
عکس زار — سید علی احمد دانش — 30/-
علمی انتقادیات — ڈاکٹر سید عقیل — 60/-
عربی ادب کی تاریخ — م م عبدالحلیم ندوی — 60/-
علیم صاحب — محمد سالم قدوائی — 200/-

عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول — عبدالسلام — 15/-
علامت قدیم ہندوستانی جمالیات کی روشنی میں
شکیل الرحمٰن — 5/-
عالمی اردو ادب اور ندیم قاسمی نمبر — نند کشور وکرم — 200/-
علی سردار جعفری اپنی بہنوں کی نظر میں
کالی داس گپتا رضا — 40/-
علامہ خضر برنی شخص اور شخصیت — نظر برنی — 20/-
عوامی ذرائع ترسیل — اشفاق محمد خاں — 21/-
غزل کا عبوری دور — ڈاکٹر شیخ عقیل احمد — 150/-
غالب پریم چند تحقیقی مقالے — پروفیسر نذیر احمد — 60/-
غالب نامہ سلور جوبلی نمبر — پروفیسر نذیر احمد — 50/-
غالب کے چند نقاد — سلیمان اطہر جاوید — 60/-
غبار کارواں — ڈاکٹر محمد زماں آزردہ — 40/-
غزل کے نئے جہات — پروفیسر محمد عقیل — 70/-
غبار خاطر — ابوالکلام آزاد — 100/-
غزل کی سرگزشت — اختر انصاری — 12/-
فراق دیار شب کا مسافر — شمیم حنفی سہیل احمد فاروقی — 150/-
فارسی ادب کے ارتقا میں پانی پت کا حصہ
ڈاکٹر محمد اقبال — 150/-
فکر روشن — آل احمد سرور — 150/-
فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ — ڈاکٹر مومن — 45/-
فن تاریخ گوئی — رتن پنڈوری — 15/-
فسانہ کہیں جسے — سید عاشور کاظمی — 150/-
فراق اور نئی نسل — امیر عارفی — 70/-
فکر نظر — م م مسعودی — 175/-

ق

فکر و نظر/خورشید نعمانی 25/-

فیض اپنی شاعری کے آئینے میں ممتاز حسین 20/-

فارسی میں ہندی الفاظ عبدالرشید 250/-

فکر آگہی انجمن آراء 60/-

قلم شناسی پریم پال اشک 50/-

فراز دار کلام حیدری 38/-

فن افسانہ نگاری وقار عظیم 25/-

فن تنقید اور تنقید نگاری نورالحسن نقوی 35/-

فن شاعری بوطیقا عزیز احمد 25/-

فصیح الدین بلخی حیات اور کارنامے ڈاکٹر ظفر بلخی 100/-

فسانہ عجائب ترتیب رشید حسن خاں 70/-

فن اور فن کار صالحہ عابد حسین 35/-

فکر تونسوی حیات اور کارنامے شمع افروز زیدی 100/-

فراق گورکھپوری مرتبہ انجمن ترقی اردو 45/-

فلسطین کے چار ممتاز شعرا عبدالحق حقانی 60/-

فرہنگ انیس دوم نائب حسین نقوی 80/-

قاضی عبدالغفار ایک ممتاز نثر نگار
مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم 100/-

قاضی عبدالغفار شخصیت اور فن
پروفیسر امیر عارفی 175/-

قطرہ قطرہ محمد شرف الدین ساحل 50/-

قومی تعمیر کی دستاویز ڈاکٹر عبدالاحد 40/-

قاری اساس تنقید پروفیسر گوپی چند نارنگ 15/-

قومی یکجہتی اور نصابی کتابیں اکبر رحمانی 30/-

قواعد اردو مولوی عبدالحق 35/-

قانون حق تملیک ڈی۔ایس۔ کلکرنی 20/-

قاضی عبدالودود پروفیسر نذیر احمد 60/-

قاسم امین کی سماجی اور ادبی خدمات سلطانہ ریحانہ 200/-

کہانی کے روپ پروفیسر وہاب اشرفی 65/-

کوکن کا مفتی پرویز باغی 30/-

کردار کے غازی قاضی محمد عدیل عباسی اختر بستوی 30/-

کارنامہ نذیر ریحانہ خاتون 500/-

کاغذی ہے پیرہن عفت چغتائی 65/-

کینوس کے رنگ سلمان عباسی 60/-

کارواں ہمارا کوثر چاند پوری 10/-

کہتا ہوں سچ شرف کمالی 50/-

کرشن چندر اور اشتراکیت پروفیسر عبدالسلام 15/-

کرشن چندر شخصیت اور فن جگدیش چندر ودھاون 250/-

گئودان کا تنقیدی مطالعہ انور کمال حسینی 8/-

گاندھی اور نہرو کی راہ ڈاکٹر سید عابد حسین 195/-

گفت و شنید ظفر ادیب 30/-

گفتار اور کردار فوق کریمی 15/-

گوپال متل اور مطالعہ محمد عبدالحکیم 15/-

گلشن ہند مختار الدین احمد 25/-

گارسیں دتاسی اور خدمات علمی کارنامے ثریا حسین 30/-

گئودھول (خودنوشت) سید محمد عقیل 200/-

قلندر بخش جرات جمیل جالبی 10/-

قصہ مہر افروز دلبر سید مسعود حسن خاں 50/-

قدیم اردو جلد دوم مسعود حسن خاں 13/-

قرۃالعین حیدر کا فن عبدالمغنی 125/-

قرۃالعین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور
خورشید انور 75/-
کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے
ڈاکٹر سید تقی حسین جعفری 51/-
کتب خانہ رضا علی عابدی 100/-
کلید عروض زار علامی 150/-
کلام حیدری بحیثیت افسانہ نگار ڈاکٹر اسلام عشرت 20/-
کامیاب استانیاں رضیہ فرحت 2/50
کلام اقبال میں قرآنی آیات واحادیث اور مذہبی
اصطلاحات کا جائزہ محمد منظور عالم 80/-
کرشن چندر کے افسانوی ادب میں حقیقت نگاری
ڈاکٹر شکیب نیازی 250/-
کالی داس ایک مطالعہ شہانہ شبنم 45/-
کاشف الحقائق ایک مطالعہ وہاب اشرفی 50/-
کولمبس کے دیس میں جگن ناتھ آزاد 45/-
کروناا ور درد کے دھنی مہاکوی انیس (ہندی)
مرتبہ صالحہ عابد حسین 25/-
کربل کتھا کا لسانی مطالعہ گوپی چند نارنگ اور خلیق انجم 25/-
کرشن چندر جیلانی بانو 15/-
گوپی چند نارنگ اور ادبی نظریہ سازی
مرتبہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی 250/-
گزشتہ حیدرآباد رائے محبوب نارائن 15/-
گوپی چند نارنگ حیات وخدمات
مرتبہ ڈاکٹر حامد علی خاں 290/-
گلکرسٹ اور اس کا عہد عتیق صدیقی 25/-

لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری کا تنقیدی مطالعہ
امیر عارفی 50/-
لوکاچ اور مارکسی تنقید اصغر علی انجینئر 30/-
لسانی تناظر مرزا خلیل 300/-
لفظوں کی انجمن میں سید حامد حسین 135/-
لسانیات کے بنیادی اصول ڈاکٹر اقتدار حسین 40/-
لائبریری تنظیم وتربیت کے مسائل
ڈاکٹر رام شوبھت 200/-
مت سہیل ہمیں جانو انور ظہیر خاں 120/-
مولانا حسرت موہانی اور تحریک آزادی محمد طیب 200/-
مظہر امام کی تنقید نگاری محمد رضا کاظمی 50/-
مصور سبزواری شخصیت اور فن ڈاکٹر نسیم الظفر 150/-
مطالعہ مثنویات مصحفی ڈاکٹر سعید وارثی 100/-
منور لکھنوی ایک مطالعہ شباب للت 350/-
مفسرین ابوالکلام آزاد عبداللطیف اعظمی 361/-
مختصر اردو افسانے کا سماجیاتی مطالعہ عائشہ سلطانہ 150/-
محمد عثمان عارف شخصیت اور فن عمر جہاں 100/-
مبادیات صحافت ڈاکٹر جاوید حیات 60/-
میں زندہ ہوں محمد ایوب واقف 60/-
مضامین خالد محمد خالد عابدی 50/-
مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی حیات اور ادبی کارنامے
سید سکندر آغا 65/-
مشتاق اور یوسفی ایک مطالعہ مظہر احمد 150/-
ماجرائے وطن شبیر حکیم 40/-
مزامیر کلام حیدری 13/-

جھلک او جھلک ڈاکٹر سیدہ جعفر 125/-
مولانا اعجاز علی عرشی پروفیسر نذیر احمد 60/-
مختصر تاریخ کشمیر محمد امین پنڈت 25/-
مظفر پور علمی ادبی اور ثقافتی مرکز محمد عابد علی خاں 40/-
مطالعہ اختر انصاری بشیر احمد 70/-
محیط اردو حصہ اول عرفان الحق 75/-
مسلمان سائنس داں اور انکی خدمات ابراہیم عمادی 50/-
مثنوی کتھا ڈاکٹر برج پریمی 200/-
مجروح سلطان پوری شخص و شاعر ڈاکٹر آدم شیخ 50/-
مضامین گجرال اندر کمار گجرال 22/-
میر کی آپ بیتی (ذکر میر کا اردو ترجمہ مع فارسی متن)
ڈاکٹر نثار احمد فاروقی 125/-
محاورات فارسی ڈاکٹر منظر امام 15/-
مقالات فارسی ڈاکٹر منظر امام 50/-
معاصر اردو تنقید مسائل و میلانات
پروفیسر شارب ردولوی 45/-
مذہب مسلمان اور سیکولرزم
ڈاکٹر اشفاق محمد خاں 200/-
مقدمے اور تبصرے پروفیسر گیان چند جین 40/-
مقالات انجمن اساتذہ 15/-
منشورات جمیل مظہری اعجاز علی ارشد 50/-
مغرب کے نغمے کرشن مراری 75/-
مباحث ڈاکٹر برج پریمی 180/-
متعلقات انشاء عابد پشاوری 80/-
مومن شخصیت اور فن ظہیر احمد صدیقی 300/-

مضامین فرحت عظیم امروہوی 150/-
میزان قدر ظہیر احمد صدیقی 100/-
مسلمانوں کا تعلیمی نظام پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی 25/-
مرزا یگانہ شخصیت اور فن مرتبین مشفق خواجہ و دیگر 100/-
مولانا آزاد سرسید اور علی گڑھ
محمد ضیاء الدین انصاری 65/-
مولوی عبدالحق ادبی اور لسانی خدمات
مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم 90/-
مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایات
ابوالکلام قاسمی 100/-
مقالات حالی حالی پانی پتی 20/-
معیار نظر ارشد کاکوی 30/-
مکاتیب قمر محمد ایوب واقف 20/-
مولانا ابوالکلام آزاد ذہن کردار پروفیسر عبدالمغنی 30/-
مقالات سرسید سے مضامین رشید تک
فخر الاسلام اعظمی 18/-
مرحوم دہلی کی ایک جھلک عظیم احمد 10/-
مکاتیب جلیل علی احمد جلیلی 15/-
ملا وجہی جاوید وششٹ 15/-
مرزا محمد رفیع سودا قاضی افضال حسین 15/-
نکڑ سے پارلیمنٹ تک ڈاکٹر عزیز اندوری 30/-
نواب سید محمد خاں رند حیات اور شاعری رقیہ جعفری 150/-
نقد نو عیار ڈاکٹر سید عبدالباری 50/-
نوابین اودھ اور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی سیاسی رشتے
ڈاکٹر مصطفےٰ حسن نظامی 150/-

ناگپور کا مسلم معاشرہ اول — محمد شرف الدین ساحل — 75/-
ناگپور کا مسلم معاشرہ دوم — محمد شرف الدین ساحل — 75/-
فاشی عرف ہیر حق — سید مرتضیٰ پرشوی — 5/-
نفسیات اور تعلیمی مسائل — عبدالاحد شاہ — 20/-
نگارشات — حکیم سید قمر الحسن — 15/-
نایاب ہیں ہم — آوارہ سلطان پوری — 100/-
منٹو نوری نہ ناری — ممتاز شیریں — 100/-
مقدمہ کلام آتش — خلیل الرحمن اعظمی — 30/-
مال تلکر — شبر امام — 50/-
محمد قلی قطب شاہ — ڈاکٹر مسعود حسین خاں — 15/-
مضامین سید ین — ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی — 40/-
مکتوبات شہباز — مرتبہ سید صابر حسن — 22/-
مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین — مرتبہ اسلم پرویز — 47/-
محمد حسین آزاد کی تنقید نگاری — محمد خالد اقبال صدیقی — 30/-
مصحفی — نور الحسن نقوی — 15/-
مومن خاں مومن — ظہیر احمد صدیقی — 15/-
مالک نامہ — کرنل بشیر حسین زیدی — 40/-
مور پنکھ — غالب چکوالی — 30/-
مقدمہ تاریخ زبان اردو — پروفیسر مسعود حسن خاں — 50/-
موج کوثر — شیخ محمد اکرام — 60/-
مالک رام ایک مطالعہ — علی جواد زیدی — 50/-
مضامین رشید — رشید احمد صدیقی — 35/-
مثنویات میر کا تہذیبی مطالعہ — شاہد بلال — 45/-
محمد مجیب حیات اور خدمات — ڈاکٹر صادقہ ذکی — 50/-
مضامین ڈاکٹر عبدالودود — مرتبہ صفیہ ودود — 30/-

مولوی نذیر احمد کی کہانی — فرحت اللہ بیگ — 8/50
مختصر تاریخ ادب اردو
ڈاکٹر اعجاز حسین — 45/-
محی الدین قادری زور حیات و خدمات — ڈاکٹر خلیق انجم — 50/-
نیا اردو افسانہ ایک نیا انتخاب — رام لال، محمد خلیل — 52/-
نقوش بھوپال — ڈاکٹر رضیہ حامد — 500/-
نئی سمتوں کا شعور — ڈاکٹر خورشید سمیع — 80/-
نقد بیدر — ڈاکٹر قیوم صادق — 50/-
نصرتی کی شاعری — طیب انصاری — 10/-
نگارستان فارس — مولانا محمد حسین آزاد — 80/-
نقد ملفوظات — نثار احمد فاروقی — 65/-
نجیب محفوظ اپنی نگارشات کے آئینے میں
بدر الدین الحافظ — 65/-
نوبت پنج روزہ — راشد الخیری — 28/-
نقش ذاکر — مرتبہ عبدالحق خاں — 51/-
نقد ادبیات فارسی — ڈاکٹر سمیع الدین احمد — 30/-
نقد حرف — پروفیسر ممتاز حسین — 48/-
نیا افسانہ — وقار عظیم — 40/-
نصرتی — مولفہ مولوی عبدالحق — 40/-
ورطۂ خیال — مظہر احمد — 60/-
وضاحتی کتابیات جلد سوم
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی — 135/-
ولی سے آتش تک — ایم حبیب خاں — 40/-
ہندوستانی رنگ — پروفیسر محمد حسن — 75/-
ہندوستان کی تصویریں خسرو خاندان کا حصہ

جمشید آغا 20/-
ہمری خیال عمومی و صنعتی انتظامیہ عبدالباسط 25/-
ہندوستانی وفاق پروفیسر رشید الدین خاں 80/-
ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے علیم اللہ حالی 50/-
ہندی ڈرامے کا ارتقاء ابراہیم یوسف 21/-
ہندوستانی اقتصادی مسائل سید ساجد علی ٹونکی 25/-
ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر ڈاکٹر محمد عمر 127/-
ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ
ابراہیم فکری 200/-
ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعراء کی ڈائریکٹری
گوپی چند نارنگ و عبداللطیف اعظمی 200/-
ہائیکو تنقیدی جائزہ رفعت اختر 75/-
ہو بہ ہو (خاکے) پروانہ ردولوی 50/-

ہماری تعلیمی صورت حال آل احمد سرور 4/-
ہندی ادب کی تاریخ ڈاکٹر محمد حسین 30/-
بے دلی پوشیدہ ڈاکٹر اشفاق محمد خاں 100/-
ہمارے کنور صاحب مرتبہ کے ایل نارنگ ساقی 80/-
ہندوستان کدھر آل احمد سرور 3/-
یادگار روزگار سید بدر الحسن 200/-
یادگار حالی صالحہ عابد حسین 40/-
یادگار نظر مرتبہ جگر بریلوی 15/-
یوسف حسین خاں مسعود حسین خاں 15/-
یہ لوگ سری نواس لاہوتی 35/-
یگانہ شخص اور شاعر ممتاز حسین 15/-
یادگاری خطبات مرتبہ نثار احمد فاروقی 15/-
یادوں کا جشن کنور مہندر سنگھ بیدی سحر 170/-

میراث ہنر

قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ دلآویز ادبی نثر اور افکار کی تازگی لیے منظر عام پر آ چکا ہے
قیمت=/200

فارسی میں ہندی الفاظ

تحقیق و تالیف۔ عبدالرشید

اس کتاب میں موئف نے فارسی لغات فرہنگ جہانگیری، فرہنگ شعوری، فرہنگ آنند راج، غیاث اللغات، لغت نامہ، دہخدا، فرہنگ فارسی وغیرہ سے ہندوستانی الفاظ اور ان کی شرح و توضیح استخراج کر کے فرہنگ تیار کی ہے جو سات ابواب پر مشتمل ہے۔ مولف کا مقدمہ مفصل بھی ہے اور اہم بھی۔ 200/-

ادب، خواتین اور سماج: ڈاکٹر صادقہ ذکی

صنف نازک کے دکھ درد، ان کی الجھنوں، کمزوریوں، محرومیوں پر لکھے ہوئے ۱۴ مضامین کا مجموعہ۔ =/125

اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ

خالد محمود

سفرنامے اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک پرکشش صنف ادب تسلیم کیے جاتے ہیں۔ خالد محمود صاحب نے اس تحقیقی مقالے میں سفر ناموں کے ارتقاء اور ادوار پر نہ صرف سیر حاصل بحث کی ہے بلکہ قابل ذکر سفر ناموں کا تاریخی پس منظر بھی پیش کیا ہے۔
قیمت=/250

اقبال ایک مسلم سیاسی مفکر: ڈاکٹر مشیر الحق

مرتبہ: ماہ طلعت علوی

اس کتاب میں پروفیسر مشیر الحق مرحوم (سابق وائس چانسلر کشمیر یونی ورسٹی) کے لکھے اہم مضامین شامل ہیں جن سے علامہ اقبال کے سیاسی فکر پر گہری روشنی پڑتی ہے اور کئی تاریک گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔
قیمت=/100

شعری مجموعہ

آرپار	ظفر گورکھپوری	200/-
آسمانی محراب	شمس الرحمان فاروقی	210/-
انکار	پروین شاکر	55/-
اجالے	کالیداس گپتا رضا	10/-
انگوٹھا چھاپ	ہلال سیوہاروی	25/-
ایک صفحہ پر نم	زاہد الہرول	16/-
اندوختہ	راشد آذر	150/-
ایک مضطرب خوشبو	انور شمیم انور	100/-
کیلی	شبنم عشائی	30/-
رمغان شیدا	مرزا کمال الدین شیدا	35/-
نگار مہری	مکارم الحق مکارم	50/-
لہرانے لگے	ہلال سیوہاروی	50/-
منتخب کلام جگن ناتھ آزاد	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	50/-
آئینہ سیما	ڈاکٹر شرف الدین ساحل	75/-
آئینہ دل	دل ایوبی	60/-
اجنبی ہوا	شباب للت	75/-
آہنگ آفاق	ظفر حمیدی	50/-
اگلی رُت کے آنے تک	رفیعہ شبنم عابدی	100/-
احساس کی فصل	رئیس بلوی	35/-
آب	منظور ہاشمی	40/-
آسمان کا پیرہن	یوسف اعظمی	20/-
اعجاز سخن	ماہر آکہانی	50/-
اپنا وطن (سندی اردو)	سیدہ تسنیم چشتی	125/-
افکار سوداگر	عبدالقادر سوداگر	20/-

انتخاب کلام حاتم	ڈاکٹر عبدالحق	45/-
انتخاب کلام فائز	پروفیسر محمد حسن	40/-
انتخاب میر سوز	ڈاکٹر مرتضیٰ کریم	40/-
انتخاب غزلیات میر حسن۔ پروفیسر مظفر حنفی		45/-
انتخاب کلام حسرت	مرتبہ خلیق انجم	46/-
آسماں حیران ہے	رئیس الدین رئیس	80/-
آب نیساں	فریدی پربتی	150/-
آخری صلیب	شان بھارتی	24/-
آئینہ احساس کے	اسد رضا	50/-
آنچل اور پرچم	سروش یزدانی	22/-
انیس 33 غیر مطبوعہ مرثیے	انیس کیفی	90/-
انتخاب کلام حسرت	ڈاکٹر فضل امام	9/-
انتخاب کلام داغ	بیگم ممتاز مرزا	35/-
ارمغان کندن	کندن لال کندن	30/-
آنکھ اور خواب کے درمیان۔ ندا فاضلی		30/-
انامل	راہی فدائی	30/-
انتخاب یگانہ چنگیزی	انجمن ترقی اردو	10/-
انتخاب فانی	انجمن ترقی اردو	10/-
انتخاب فیض احمد فیض۔ پروفیسر شمیم حنفی		13/-
انتخاب کلام میر	مرتبہ مولوی عبدالحق	30/-
انتخاب فراق گورکھپوری	انجمن ترقی اردو	15/-
انتخاب	اختر انصاری	5/-
انتخاب	شمیم کرہانی	5/-
انتخاب	جذبی	5/-
افکار صہبا	قاسم صہبا جمیل	20/-

اپنا چمن (ہندی/اردو)	سیدہ تسنیم چشتی	125/-	بوستاں مترجم	سعدی شیرازی	0/-
اندرونم	نورالحسن ہاشمی	15/-	پیش انداز موسم	احمد فراز	5/-
آئینہ در آئینہ	عزیز قیسی	40/-	پانچواں آسمان	ساحر شیوی	0/-
آئینہ اخلاق	خواجہ دل محمد	20/-	پہلی بارش	ناصر کاظمی	0/-
الہامات مست	دینا ناتھ مست	35/-	پیش رفت	محبوب راہی	0/-
اعتراف جنوں	شاکر خلیق	100/-	پنچھی رخصت ہوئے	جاوید ندیم	0/-
اک سخن اور	مظفر مجاز	80/-	پہلا زخم	ندیم الرحمٰن خاں ندیم	0/-
انتخاب کلام فراق گورکھپوری	ابوالکلام قاسمی	120/-	پانی پت (طویل نظم)	رفعت سروش	0/-
اردو شاعری کا انتخاب	محی الدین قادری زور	75/-	پتھروں کی رہگذر	رضا اشک	0/-
انتخاب کلام شہ زور کاشمیری	فرید پربتی	125/-	پیرہن جاں	مظفر شہاب	0/-
بوئے رسیدہ	جگن ناتھ آزاد	90/-	پیغمبر اسلام	دیانند	4/-
بے نام شجر	نورجہاں ثروت	175/-	پس مرگ	سلطان نقشبندی	0/-
بے زبانی کا ہنر	ڈاکٹر سجاد سیّد	80/-	ترکش	جاوید اختر	0/-
بے آسماں	عبداللہ کمال	200/-	تخیل	من موہن تلخ	0/-
بازگشت	محبوب راہی	50/-	تصرف	عزیز وارثی	5/-
باپو کے چرنوں میں	پریم گوپال متل	100/-	تعمیر وطن	نند ورائی دہلوی	5/-
باطنی ارتعاش	نادم بلخی	50/-	تلخیاں (عام اڈیشن)	ساحر لدھیانوی	0/-
بکھرے بکھرے خواب۔	گلشن کھنہ	60/-	تنہائیاں	ساحر لدھیانوی	5/-
بیت بازی	عرفان خلیل	20/-	تجسس	عبدالحمید ی انصاری	0/-
بھرتری ہری اردو میں (منظوم ترجمہ)	یوسف ناظم	5/-	تصویر وطن	مسعودہ حیات	5/-
بانگ اثر	عتیق احمد اثر	20/-	جدید جاوداں	رشید کوثر فاروقی	0/-
باقیات شہباز	ڈاکٹر حسن	25/-	جمال ابھنا جلال ہمالہ	سکندر علی وجد	0/-
بزم و رزم فطرت	ڈاکٹر سید عبدالمجید	12/-	جادۂ ملا	آنند نرائن ملا	5/-
برگ نے	ناصر کاظمی	25/-	جنوں کنارہ	اسعد بدایونی	0/-
بزم خیال	سیدہ فرحت	2/-	جوشاندہ	جہلوانصاری	0/-

...پی صاحب	خواجہ دل محمد	55/-	دھوپ، سائباں	زبیر رضوی	30/-
...ے شیر	آنند نرائن ملا	25/-	دریا رواں ہے	حیات لکھنوی	50/-
...وا آسمان	محمد علوی	50/-	دیوان بکرو	ڈاکٹر شمیم احمد	25/-
...ادنی کا درد	منصور اعجاز	50/-	دل کی گیتا	خواجہ دل محمد	55/-
...ثم میگوں	حضرت دیوان	100/-	دیوان مصحفی	غلام ہمدانی مصحفی	50/-
...رف آئندہ	ڈاکٹر مظہر علی خاں	100/-	دوہا درپن	شمس فرخ آبادی	30/-
...راکی روشنی	شرف الدین ساحل	15/-	دیوان غالب (ہندی)	نور نبی عباسی	60/-
...رف باریاب	افتخار عارف	95/-	دیوان غالب (نسخہ حمیدیہ)	نقی انوار الحق	32/-
...دیث دل	قیصر عثمانی	30/-	دیوان غالب	نور الحسن نقوی	35/-
...رف مکرر	عظیم مسرور	14/-	دیوان غالب (ڈی لکس)	غالب اکیڈمی	150/-
حیات دوام	مرتبہ اسماعیل حسنین نقوی	10/-	دیوان سیماب امروہوی شخصیت اور فن		
خواب گل پریشاں ہے	احمد فراز	45/-		سید فیضان حسن	100/-
خواب و خیال	جگدیش نور	200/-	دام خیال	سید محمود دیوان	100/-
خوشبو	پروین شاکر	90/-	دھول کی شال	عارف خورشید	25/-
خود کلامی	پروین شاکر	50/-	دعوت صد نشتر	ظہیر غازی پوری	40/-
خدا جھوٹ نہ بلوائے	دلاور فگار	25/-	دو آتشہ	حضرت سر پر کابری	30/-
خود شناسی	عتیق آفریدی	100/-	دیوان نین سکھ	مرتبہ ظفر اقبال	35/-
خود کلامی	یوسف عثمانی	20/-	دیوان ظفر	ترتیب ابو اللیث صدیقی	50/-
خزاں میرا موسم	ڈاکٹر فریاد آزر	50/-	دھنک احساس کی	راج نرائن راز	45/-
خار و گل	اظہر غوری	150/-	دھوپ سایہ اور میں	وقار واسطی	15/-
خار ہزار دشت	جرفی	50/-	دائرے	امان اللہ خالد	50/-
خوابوں کے گلاب	پرکاش ناتھ پرویز	15/-	دیوان عرش	ایم حبیب خاں	40/-
دست فرہاد	شاذ تمکنت	30/-	دیوان بہرام	مسلم ضیائی	15/-
دہلیز پر اترتی شام	منصور سبزواری	80/-	دیوان حالی	مرتبہ رشید حسن خان	30/-
دل کی آواز	صادق علی ٹونکی	30/-	دست نارسا	ڈاکٹر یعقوب عامر	25/-

دست زلیخا	سلمیٰ جاوید	12/-
دیوان رضا عظیم آبادی	مرتبہ عبدالودود	10/-
دیوان غالب (ایوان غالب اڈیشن)		60/-
دیوان	ناصر کاظمی	25/-
دیوان حضور	مرتبہ مختار الدین آرزو	10/-
دست صبا	فیض احمد فیض	10/-
دیوان حافظ	حافظ شیرازی	90/-
دیوان اثر	ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی	18/-
دشت آرزو	غنی اعجاز	20/-
دریچہ سیم وگمن	فضا ابن فیضی	50/-
دست تہہ سنگ	فیض احمد فیض	10/-
ذائقہ میرے لہو کا	شمیم فاروقی	30/-
رنگ صدا	عمران عظیم	65/-
روشنی بے چراغ راتوں کی	انجم رومانی	100/-
روشنی کس جگہ سے کالی ہے	فضل تابش	60/-
روشنی دھوپ چاندنی	اسد بھوپالی	50/-
رقص صبا	جیالال دتا رفیق	50/-
روش دل	محمد یوسف پاپا	90/-
رباعیات قوس	ناوک حمزہ پوری	50/-
رشک فارسی	شجاع خاور	60/-
رقص خیال	محمد یعقوب عامر	25/-
ریزۂ الماس	سیما نقمی	40/-
رازونیاز	راز لائل پوری	25/-
روشنی اے روشنی	نامی انصاری	80/-
رامائن فراقی دوم	فراق دریاوی	12/-

رت جگے	رحمت امروہوی	40/-
زخموں کے سچے نام	سدیب بنرجی	90/-
زخم خنداں	ایس۔اے۔مہدی	25/-
زنداں نامہ	فیض احمد فیض	10/-
زخموں کے سلسلے	عبدالصمد تپش	28/-
ستاروں سے ذروں تک	جگن ناتھ آزاد	70/-
سنہری اُداسیاں	شاہد ماہلی	100/-
سبزہ شرر	نعمان امام	35/-
ساز مغرب (متفرق حصے)	حسن الدین احمد فی حصہ	20/-
سراجاً منیرا	منشاء الرحمٰن منشاء	25/-
ساگر	راجندر بہادر موج	25/-
سیپیاں	فصیح اللہ نقیب	50/-
سیف سبو	جوش ملیح آبادی	60/-
سرگذشت آصف	ہارون رشید	12/-
سنگ لرزاں	شہنشاہ مرزا	12/-
سچے بول	گوپال متل	30/-
سورج خیال	طلعت عرفانی	25/-
سمندر پھر بلاتا ہے	عرفی آفاقی	20/-
سوز حیات	ملک اسماعیل خاں	100/-
سمندر خلاف رہتا ہے	خورشید اکبر	80/-
سحر نما	عشرت قادری	15/-
سیر کہسار	ڈاکٹر زبیر فاروق	30/-
سورج نما	محمد علی تاج	12/-
سمندر آشنا	خالد محمود	15/-
سبزۂ گفتار	ڈاکٹر یعقوب عامر	20/-

شعلۂ احساس	کرشن مراری	26/-	صد برگ	پروین شاکر	75/-
شعلۂ خس پوش	یعقوب عامر	30/-	طلسم سفر	شام رضوی	20/-
شکوہ جواب شکوہ مع تشریح	علامہ اقبال	5/-	طلوع وجدان	ظفر حمیدی	75/-
شعلۂ گل	سردار الہام	40/-	عالم نشاط	داؤد نشاط	50/-
شرار نغمہ	گوپال متل	25/-	عظمت ہند	شاکر رامپوری	200/-
شب گزیدہ سحر	رفعت شمیم	40/-	عشق نامہ	عرفان صدیقی	100/-
شاہنامہ ہند	سریر کابری	25/-	عکس حیات	جوار جھولسی	25/-
شفق کا ایک اور رنگ	نور پرکار	50/-	عام سا ردعمل	شارق کیفی	50/-
شہر سراب	ایس۔ انصاری	15/-	غبار حول	غلام ربانی تاباں	45/-
شرار جستہ	شرف الدین ساحل	10/-	غزلیں	وزیر آغا	25/-
شہر خوں آشام	مرتبہ شمیم حنفی	40/-	غزل ہی غزل	ساجد صدیقی	50/-
شعلہ و شبنم	جوش ملیح آبادی	45/-	غبار سفر	ڈاکٹر محمد مسیح اللہ اسد	50/-
شاید کسی قابل ہو	گوروپال سنگھ عارف	150/-	فصیل شب	کوثر صدیقی	90/-
شام بے سحر	سیّدہ نسیم چشتی	250/-	فردوس تخیل	خلد آشیانی	100/-
شاخ لرزیدہ	امرسروپ سریواستو	80/-	فکر نجات	کمال ہمدانی	50/-
شاہنامۂ اسلام	حفیظ جالندھری	125/-	فرودات	حمید الماس	50/-
شناخت	تبسم نشاط	10/-	فردوس خیال	دینا ناتھ مست کشمیری	65/-
شعر تیرے ہزار رنگ	فخر الاسلام اعظمی	25/-	قربتوں کی دھوپ	امام اعظم	100/-
شعر و سنگ	ڈاکٹر رزاق اثر	60/-	قریۂ فکر	اسلم عمادی	60/-
شعلۂ حق	انوار احمد خاں تشنہ	30/-	قصر جوش	جوش ادیب	10/-
شعاع فکر	وکیل بھوپالی	13/-	کھویا ہوا سا کچھ	ندا فاضلی	100/-
صلیب کا درد	ڈی۔اے۔ ہیرسن قرباں	20/-	کلیات اختر شیرانی	مرتبہ گوپال متل	200/-
صدائے تیشہ	کنور ہریانوی	30/-	کلیات گوپال متل	ترتیب پریم گوپال متل	250/-
صد گلستان	منظور عثمانی	200/-	کلیات شاد عارفی	مظفر حنفی	75/-
صدا ابھرتی ہے	محمد رئیس علوی	40/-	کلیات ولی	نور الحسن ہاشمی	330/-

کلیاتِ فاروق	ڈاکٹر شمیم فاروق	150/-
کلیاتِ اقبال	اقبال	75/-
کلیاتِ فانی	مرتبہ ظہیر احمد صدیقی	53/-
کلیات مخمور دہلوی	بدر مخموری	100/-
کاغذ	وحید پرواز	15/-
کلام حامد	حامد سعید خاں	12/-
کانچ کی چادر	مریم غزالہ	40/-
کلیات عزیز وارثی	مرتبین ثاقب صدیقی انیس احمد	150/-
کاروانِ خیال	عطا کاکوی	15/-
کلام نقش	مہیش چندر نقش	60/-
کلیات ذوق	تنویر احمد علوی	40/-
کاغذی حکم	علیم جہانگیری	20/-
کرب لنا	اکرم جاوید	50/-
کتاب صحرا	حنیف ترین	100/-
کرب احساس	نظمی سکندر آبادی	30/-
کلیات عرش ملسیانی	مرتبہ مالک رام	75/-
کلام فیض	فیض احمد فیض	45/-
کلیات اصغر	اصغر گونڈوی	15/-
کلیات شکیل	شکیل بدایونی	50/-
گیلا اینڈ حسن	بلقیس ظفیر الحسن	75/-
گورکھ دھندا	نظر برنی	80/-
گلشن ناز (نعتیہ کلام)	ڈاکٹر سیّد محمود دیوان	50/-
گلہ صفورہ	شفیق فاطمہ شعریٰ	36/-
گلزار فلسفی	اصغر امام	30/-
گرد باد	عزیز قیسی	30/-

گنگا جمنا	بھگوان داس اعجاز	40/-
گلستاں مترجم	سعدی شیرازی	60/-
گل رعنا	مرتبہ مالک رام	25/-
گستاخی معاف	نظر برنی	100/-
گیلی مٹی	اکمل امام	30/-
گرد سفر	غنی اعجاز	50/-
گل و افکار	خواجہ محمد یوسف ھما	50/-
گل خودرو	شائستہ یوسف	30/-
گلدستہ نعت و منقبت	ساجد صدیقی	75/-
گرم ریت کا سفر	ظفر تابش	50/-
لالہ زار صبح	ناشر نقوی	40/-
لمعات نور	حکیم سیوہاروی	10/-
لمیات نظیر کی نظر	عنبر بہرائچی	100/-
لمحوں کی صدا	ناز قادری	85/-
لمحات سہا	مولانا سہا مجددی	18/-
لہو پکارے گا	اندر سروپ دت نادان	40/-
لَو	تسنیم فاروقی	100/-
لہو بولتا ہے	ستیہ پال آنند	150/-
لہو کی آنچ	علی احمد جلیلی	60/-
لوحِ محفوظ	سیماب اکبر آبادی	50/-
لفظوں کا آسمان	ستیا کانت مہاپاتر	20/-
لمحوں کا لمس	مہر گیرا	20/-
لمحوں کا سفر	نرمدیشور پرشاد	20/-
لمحہ لمحہ پیاس	کیلاش ماہر	50/-
لمحوں کی خوشبو	ڈاکٹر تنویر علوی	45/-

لہریں	راجیندر بہادر موج	30/-
لمس ہوا	کیلاش ماہر	10/-
مثنوی اسرار محبت	ڈاکٹر نسیم احمد	50/-
میری درس گاہ	رفیعہ شبنم عابدی	50/-
متاع ہنر	محمود سروش	120/-
مٹی موسم رنگ	مشتاق علی شاہد	50/-
مصرع ثانی	شجاع خاور	50/-
مجالس رنگین	اسد یار خاں رنگین	35/-
مراثی شاد	نقی احمد ارشاد	50/-
منظر منظر	علی احمد جلیلی	20/-
مسدس حالی	مولانا حالی	20/-
مثنویات غالب	ظ۔ انصاری	60/-
میرے خواب ریزہ ریزہ	احمد فراز	15/-
میراثی جرات	عبادت بریلوی	20/-
ماتم سالک	جگن ناتھ آزاد	1/-
ماہ تمام	پروین شاکر	200/-
مزامیر جلد ۲	اثر لکھنوی	15/-
محو سجود	آم کلمی	100/-
متاع کلیم	کلیم احمد آبادی	10/50
مہر و نیم	افتخار عارف	60/-
موج سراب	رہبر جونپوری	75/-
موج سحر	ڈاکٹر انجنا سدھیر	40/-
ملن کی آس	شمس فرخ آبادی	15/-
موسم زرد گلابوں کا	شاہد میر	25/-
میں تنہا شاعر	محمد یوسف ہما	70/-
منزلیں ستاروں کی	ثاقب عباسی	80/-
مصحف عصر	عمر انصاری	125/-
مثنوی مولانا روم (جلد ۱ تا ۲)	ترجمہ قاضی سجاد حسین	460/-
موج شفق موج غبار۔ نور پرکار		15/-
نوا فاران	عاقل مراد آبادی	30/-
نرمرو	سلیم زاہد	75/-
نگار حکمت	محمد فضل الرحمٰن	6/-
نسخہ ہائے وفا	فیض احمد فیض	110/-
نگاہ	اختر سعید خاں	20/-
نکہت خیال	دیپک امرتسری	60/-
نوائے سرور	سید محمد سرور	25/-
نقش نور	نورالدین قادری نور	30/-
نوائے راز	خلیل الرحمٰن راز	60/-
نوائے شوق	صابر ابوہری	40/-
نقش فریادی	فیض احمد فیض	10/-
نوائے بلبل	سروجنی نائڈو	8/-
نقش نوا	مبارک شمیم	10/-
نوائے کبیر (منظوم)	یوسف ناظم	25/-
نگار معنی انتخاب اشعار فارسی	ضیاء الحسن فاروقی	35/-
وسیلہ	حیات لکھنوی	80/-
وادین	شجاع خاور	25/-
وطن میں اجنبی	جگن ناتھ آزاد	80/-
وقت لاوقت	ستیہ پال آنند	120/-
ہوا کی تان پر موسم	سرشار بلند شہری	100/-

ناول، افسانے، ڈرامے

اترن	واجدہ تبسم	30/-
الجھن	شفیع ایم خاں	45/-
آتشِ چنار	شاہد بارک پوری	50/-
آشادیپ	ست پرکاش سنگھ	60/-
آشیانہ	دیبا خانم	35/-
ایک عورت ہزار دیوانے	کرشن چندر	150/-
الٹے قلم سے	تمنا مظفرپوری	25/-
آخری داستان گو	مظہر الزماں خاں	60/-
احساس کا زخمی مجسمہ	عارف خورشید	100/-
اس کے پار	بانو سرتاج	60/-
ایک غیر مشروط معافی نامہ	خورشید اکرم	60/-
اپسرا	ایم اے راحت	50/-
ابھی تو درد باقی ہے	شمشیر پردیپ	90/-
اوٹ پٹانگ	مختار ٹونکی	60/-
الفاخرہ	آصف نظر	50/-
البم	ہرچرن چاولہ	75/-
اب میں کیا کروں	مصطفیٰ تاج	17/-
ایک گرجا ایک خندق	کرشن چندر	130/-
افق کی مسکراہٹ	اسلم جمشید پوری	60/-
آنگن	خدیجہ مستور	50/-
آدھا مرد آدھی عورت	ایم اے راحت	40/-
آدھا مرد آدھی عورت ۲	ایم اے راحت	40/-
اجنبی فاصلے	انور عظیم	200/-
ایک اور نروان یاترا	مہدی ٹونکی	75/-

آواز سرگوشیوں کی	ویریندر پٹواری	75/-
آشیانوں کے متلاشی	اسلم راہی	80/-
الٹا درخت	کرشن چندر	35/-
آبِ گم	مشتاق احمد یوسفی	125/-
آشا پرست تاریخی کہانیاں	الیاس سیتاپوری	15/-
اندر کا آدمی	الیاس سیتاپوری	10/-
اینٹی گونی منظوم ڈراما	محمد سمیع الحق	20/-
اتفاق (ڈرامے)	ڈاکٹر نریش	75/-
ان داتا (ناول)	کرشن چندر	35/-
آگ، راکھ اور کندن (افسانے)	بلراج ورما	100/-
امرکرن	شنکر سروپ بھٹناگر	20/-
احساس	مینا ناز	55/-
آنکھوں کے شہتیر	رفیع الدین احمد	10/-
ایک پھول ہزار غم	زلیخا حسین	60/-
ابھی سویرا ہے	ارشاد امر وہوی	32/-
اُجلے دامن	ابن حیات	70/-
آخری تحفہ	منشی پریم چند	32/-
اولوتا	عبدالستار دلوی	40/-
آئینہ صفی	ابن صفی	40/-
اردو کے مختلف افسانے	ڈاکٹر حسن آرزو	50/-
انتون چیخوف کے ڈرامے	زاہدہ زیدی	95/-
ابلیکا (۱۰ حصے)	اسلم راہی فی حصہ	45/-
اجنبی چہرے	قمر جہاں	45/-
آوارہ گرد (چھ حصے)	ابن آدم فی حصہ	50/-
آتش سنگ	ابراہیم اختر	20/-

یفسانے	پٹھان بہت نایک	11/50
ئینہ	پی کیتھو دیو	9/50
پنی اپنی صلیب	صالحہ عابد حسین	60/-
بھاوے	ابراہیم یوسف	51/-
دمی گھڑی	پار پر تو	15/-
نتخاب افسانہ ۱۹۸۹ء	انیس امروہوی	60/-
اچھوت	ملک راج آنند	50/-
ایک اور دن کو پرنام	رام لعل	60/-
اندھیرے میں	رابندر ناتھ ٹیگور	40/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو	کشمیری لال ذاکر	38/-
آوازوں کا میوزیم	ساگر سرحدی	45/-
انتہا	رضیہ بٹ	80/-
آزادی	قاضی مشتاق احمد	30/-
اکیلی	سلمیٰ کنول	60/-
آدمی اور سکے	زلیخا حسین	40/-
اوپر نیچے درمیان	سعادت حسن منٹو	60/-
اکڑے ہوئے لوگ	رام لعل	50/-
آبلے	احمد ندیم قاسمی	40/-
آوارہ	اسماء اعجاز	125/-
ایک لڑکی	وحیدہ نسیم	60/-
اندھیری رات کے مسافر۔ نسیم حجازی		60/-
انسان اور دیوتا	نسیم حجازی	45/-
اڑتے لمحے	سنتوش بترا	25/-
آخری چٹان	نسیم حجازی	60/-
اور تلوار ٹوٹ گئی	نسیم حجازی	70/-

اور تمنا بے تاب	زہرہ رضویہ	60/-
انیسہ	فیاض نیازی	50/-
آگ	شمیم نقوی	60/-
اوتھیلو	شیکسپیر	20/-
انار کلی	امتیاز علی تاج	15/-
آگ الاؤ صحرا	قمر احسن	25/-
ایک خلش سی	حامد واسطی	40/-
افسانے اور ڈرامے	سعادت حسن منٹو	35/-
بازیافت	فرحت خاں	15/-
بچھڑی دلھن	قیام نیر	60/-
باسی ہونٹ	اوم کرشن راحت	100/-
بنتِ حلب	صادق سردھنوی	90/-
برج بانو (مضامین)	کنہیالال کپور	25/-
بالا خانے کی دلھن	الیاس سیتاپوری	15/-
بیمار بلبل (افسانے)	حکیم سہسرامی	18/-
بازی گر (ناول) ۵ حصے	شکیل عادل زادہ فی حصہ	50/-
بکواس	شوکت تھانوی	40/-
بگولے	کوتیا ورما	30/-
بارش میں ایک آدمی	گلشن کھنہ	60/-
بادل چھٹ گئے	محمودہ بشیر	50/-
برزخ	ہاجرہ شکور	40/-
بہادر شاہ کی کنیز	مائل ملیح آبادی	8/-
بکھرے موتیوں کی مالا	من موہن چھابڑا	100/-
بس اسٹاپ	سید معز الدین	50/-
بڑا دائرہ	سمن تھانوی	30/-

بھوکا السقوریا	مشرف عالم ذوقی	110/-	پارسائی کا خمار	الیاس سیتاپوری	20/-
بیان	مشرف عالم ذوقی	100/-	(تاریخی کہانیاں)		
بنی	رضیہ بٹ	80/-	پرندے اب کیوں نہیں اڑتے		
بائی فوکل	آمنہ ابوالحسن	100/-	(افسانے)	دیویندر راسر	70/-
بشریٰ	مینا ناز	50/-	پرچھائیاں	امتا گھوش	170/-
بھولے ہوئے راہی	محمد فیض	10/-	پریم چند کے نمائندہ افسانے	قمر رئیس	40/-
بے گھر	ش۔ صغیر ادیب	50/-	پکھیرو	رام لعل	75/-
بندر کے پنجے	سنگھ تیاگی	100/-	پتھر کی صلیب	ستیہ پال آنند	60/-
بند کمروں کی کھلی کھڑکیاں	ہاجرہ شکور	20/-	پریم چند کے سو افسانے	مرتبہ گوپال متل	280/-
بے چہرہ شام	یونس اگاسکر	40/-	پہلی نسل کا گناہ	صفیہ صدیقی	50/-
بنجر بادل	کشمیری لال ذاکر	33/-	پھندے	سعادت حسن منٹو	35/-
بے نام موسموں کا نوحہ	عوض سعید	30/-	پھول جیسے لوگ	انور خاں	40/-
بہادر دوشیزہ	صادق سردھنوی	30/-	پاکستان سے دیار حرم تک۔ نسیم حجازی		15/-
بھنور	سلمیٰ کنول	75/-	پاگل خانہ	حجاب امتیاز علی	80/-
بازار حسن	پریم چند	50/-	پیار کا طلن	دیبا خانم	25/-
بارہ آنے	شیام سندر پرویز	20/-	پتھروں کے گیت	محمود بالیسری	25/-
بے نشان راستے	بلقیس ظفر	70/-	پہچان کی نوک پر	جتیندر بلو	25/-
بے چہرہ لوگ	اوصاف احمد	15/-	پرندے کا سفر	مسرور جہاں	35/-
بونسائی	تسنیم کوثر	100/-	پت جھڑ کے مسافر	مسرور جہاں	30/-
پیاسا صحرا اول دوم مکمل	اسلم راہی	140/-	پونم کا چاند	رضیہ فرحت	50/-
پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر	75/-	پرندہ شامی	فہد راہی	22/-
پاتال	مشتاق احمد قریشی	50/-	تازہ روئی کی مہک	مہدی ٹونکی	00/-
پرواز	ویریندر پٹواری	150/-	پتے کی بات	ابراہیم جلیس	30/-
پہچان	صغرا مہدی	75/-	پرشور خاموشی	آفاق احمد	22/-
پتھروں کا شہر (ناول)	ڈاکٹر نریش	35/-	پتنگ	اسلم پرویز	50/-

پیاسا سمندر	عقیلہ تبسم	60/-
پتھر ۲ حصہ	محی الدین نواب	90/-
پُراسرار ہیبت	ایم اے راحت	50/-
پرایا جسم ۴ حصے	کنور حشمت علی	180/-
پیاسا ۲ حصے	ایم اے راحت	100/-
تنہائی کا کرب	قیام نیر	30/-
ترچھے راستے	معین اشرف	60/-
توبہ	شنکر سروپ بھٹناگر	40/-
تین اور تیس ہزار	اسلم واحدی	20/-
تین ناٹک	ٹیگور	25/-
تذکرہ	انتظار حسین	54/-
تین چہرے تین آوازیں	صالحہ عابد حسین	18/-
تم آئے بہار آئی	فرحت جبین	30/-
تلخیاں	رشید اختر ندوی	10/-
ترکی کا مرد مجاہد	ثروت صولت	70/-
تعاقب	سیدہ نسیم چشتی	300/-
تیزاب	مقبول حسن خاں	60/-
ٹوٹتے لمحوں کا کرب	جعفر عباس	30/-
ٹوٹے بندھن	رضیہ بٹ	100/-
ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	75/-
ٹوٹے ہوئے تارے	کرشن چندر	60/-
ٹک ٹک دیدم ٹوکیو	بشریٰ رحمٰن	90/-
جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب	جوگندر پال	80/-
جانگلوس	شوکت صدیقی	240/-
جوش جہاد	صادق حسین سردھنوی	75/-

جنگ اصفہان (ناول)	صادق حسین سردھنوی	30/-
جان عالم کی پری خانہ	الیاس سیتاپوری	15/-
جونک	پروانہ ردولوی	25/-
جلسہ	شیخ سلیم احمد	50/-
جو اکثر یاد آتے ہیں	ڈاکٹر دیویندر گپتا	10/-
جو کہا نہیں جاتا	عظیم اقبال	25/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	صغرا مہدی	24/-
جگنوؤں کی دنیا	قرۃ العین حیدر	60/-
جوئے لداخ (سفرنامہ)	ستش بترا	35/-
جوش اسلام	صادق سردھنوی	35/-
جواب دوست	تسیم انصاری	30/-
جولیس سیزر (ڈراما)	شیکسپئر	15/-
جلوۂ ایثار	پریم چند	40/-
چٹانوں کا راز	ابن صفی	40/-
چاروں موسم	ساجدہ زیدی	150/-
سچ خف کی دنیا	انوار رضوی	100/-
چاند رانی	ست پرکاش سنگر	75/-
چاند کا خدا	الیاس سیتاپوری	15/-
چھوٹی بہو	ابن فرید	25/-
چراغ چراغ اندھیرا	گلشن آنند	40/-
چاند کا داغ	وقار وا	15/-
چغد	سعادت حسن منٹو	30/-
چار ناولٹ	قرۃ العین حیدر	50/-
چوتھا کانٹا	اسلم واحدی	20/-
حور مراقش	صادق سردھنوی	45/-

حجاز کی آندھی (ناول)	عنایت اللہ التمش	90/-	دعا گو	ابن صفی	0/-
حرم سرا کا محبوب	الیاس سیتاپوری	15/-	درد کا رشتہ	مہندر ناتھ	0/-
حرم سرا	الیاس سیتاپوری	15/-	دھند میں لگا پیڑ	آشا پربھات	0/-
خطرناک بوڑھا	ابن صفی	40/-	دادر پل کے بچے	کرشن چندر	16/-
خوابوں کا سویرا	عبد الصمد	20/-	داستان مردان حر	عنایت اللہ التمش	60/-
خراشیں	شہناز فاطمہ رشید	60/-	دیوار پر لکھی ہوئی عبارت	آسی رام نگری	75/-
خونخوار لڑکیاں	ابن صفی	35/-	دوسری کرن	وریندر پٹواری	35/-
خوامخواہ (مضامین)	شوکت تھانوی	45/-	دل نشیں	مشرف تمیز	00/-
خواب کی پرچھائیاں	تسکین زیدی	60/-	درد کے فاصلے	رضیہ جمیل	25/-
خرم	وسیم بانو قدوائی	25/-	دل اور پتھر	دیبا خانم	50/-
خطرناک منصوبہ	ابن صفی	40/-	دوسری عورت	مینا ناز	30/-
خوشبو بن کے لوٹیں گے	دیویندر اسر	80/-	دل ایک منزل	سیمی رانا	50/-
خاموش حسن	ٹیگور	40/-	دوسرا کمرہ (ڈراما)	زاہدہ زیدی	70/-
خواب رو	جوگندر پال	40/-	دادی کی چارپائی (ڈراما)	عائشہ احمد	35/-
خطا	قیسی رامپوری	45/-	دہشت (افسانے)	ظفر پیامی	50/-
خوشبوؤں کا باغ	انور سجاد	30/-	دو آدھے افسانے	شمیم نکہت	60/-
خاک پروانہ	منشی پریم چند	15/-	دوسرا کنارا (ڈراما)	غلام جیلانی	45/-
دوسرا بھورو خاں	نور پرکار	75/-	دل دریا تن صحرا	رفعت سراج	50/-
دختر ابلیس	محمد شبیر علی	60/-	دردانہ	نادرہ خاتون	50/-
درندوں کی بستی	ابن صفی	35/-	دھنک کے سائے	عصمت عذرا	30/-
دیہات کے افسانے	پریم چند	15/-	داستان مجاہد	نسیم حجازی	30/-
دستک سی در دل پر	رفیعہ منظور	40/-	دل دریا	شرون کمار ورما	30/-
دائروں کے قیدی	بانو سرتاج	60/-	داستان ایمان فروشوں کی (اول تا پنجم)	التمش	65/-
دل دریا	دلیپ سنگھ	100/-	دیوتا (۳۹ حصے)	محی الدین نواب (فی حصہ)	15/-
دم بخود	محمد فاروق نشتر	60/-	دروازہ	کرشن چندر	15/-

دکھ سکھ	سلمیٰ کنول	90/-
ڈارسے بچھڑے لوگ	سید محمد اشرف	100/-
ڈراکیولا کی واپسی	مظہر الحق علوی	44/-
ڈرامار تناولی (ڈراما)	پی۔ پیام	90/-
ڈاکو طے کریں گے	م ناگ	40/-
ذہن جدید کی بہترین کہانیاں	زبیر رضوی	150/-
رہگزر	ڈی اے ہریسن قربان	40/-
رشتے ناطے	رضیہ بٹ	100/-
رقص درویش	اسلم راہی	80/-
روزی کا سوال	واجدہ تبسم	15/-
رہنما و رہرو	منظور احمد	10/-
رفیق حیات	غلام محمد سوداگر	20/-
رابی	رضیہ بٹ	100/-
رن آنگن	ڈاکٹر عبدالستار دلوی	40/-
ریزہ ریزہ	شیریں نیازی	25/-
راگ کا بدن	الیاس سیتاپوری	10/-
ریت کا دیوتا	ابن صفی	40/-
رشتوں کا کرب	محمد قیوم میو	30/-
ریت کی دیوار	رفعت سروش	21/-
رشتے کا روگ	زلیخا حسن	40/-
راگ بھوپالی	صغریٰ مہدی	15/-
روشنی کی رفتار	قرۃ العین حیدر	50/-
زندگی کے موڑ پر	کرشن چندر	35/-
زمین کا بیٹا	ششر سروپ بھٹناگر	40/-
زخم تمنا	فریدہ انیس	45/-

زاویے	ہربنس	30/-
زخم دل	سلطانہ جبین	50/-
زوال کا عروج	مترجم انور عظیم	36/-
زادراہ	پریم چند	25/-
زندگی کے کھیل (ڈراما)	صالحہ عابد حسین	50/-
سلاخ ٹوٹتی ہے (ڈراما)	کشمیری لال ذاکر	51/-
سنگ اٹھانے کا حوصلہ	رضاء الجبار	80/-
سپنے میرے اپنے	میناناز	60/-
سمندر کا بیٹا (ناول) ۳ حصے		
ایم اے راحت	فی حصہ	45/-
زرد زرد دھوپ	نعیم زبیری	50/-
زندگی ایک سفر	رفعت سروش	80/-
زہریلی جونک	ابن صفی	40/-
سلو سلائیڈ کی دنیا	پریم پال اشک	25/-
سرراہے	مسعود مفتی	60/-
سرکنڈوں کے پیچھے	سعادت حسن منٹو	30/-
سفر	رابعہ تبسم	27/-
سرحد کوئی نہیں (ڈراما)	ساجدہ زیدی	75/-
سلگتے خواب	ڈی اے ہیرسن قربان	20/-
ساوتری	مترجم عبدالستار دلوی	25/-
سنہری ریت	روبی ٹھاکر	45/-
سمندری خزانہ	ماریہ رحمان	47/-
ستارہ جو ٹوٹ گیا اوّل (تاریخی ناول)		
	عنایت اللہ التمش	46/-
ستارہ جو ٹوٹ گیا دوم	"	26/-

سدابہار چاندنی	رام لعل	30/-
سفید جزیرہ	نسیم حجازی	35/-
ساتواں آنگن (جیبی)	صالحہ عابد حسین	8/-
سوز وطن	پریم چند	25/-
سپنوں کی شام	ڈاکٹر برج پریمی	100/-
سفر بے منزل	ریوتی سرن شرما	150/-
سامون ۳ حصے	ایم اے راحت فی حصہ	50/-
شہر چپ ہے	مشرف عالم ذوقی	80/-
شاہین	شبر امام	150/-
شکست	کرشن چندر	100/-
شہزادی کا نیلام	الیاس سیتاپوری	15/-
شبو	رضیہ بٹ	100/-
شمشیر دستاں	دلیش چترکار	75/-
شیشوں کا مسیحا	ڈاکٹر نکہت ریحان خان	70/-
شکاری عورتیں	سعادت حسن منٹو	20/-
شعلہ کاہن	شیخ سلیم احمد	10/-
شمیم	منشی فیاض علی	150/-
شکست	کرشن چندر	40/-
شہناز	ترجمہ: حبیب اشعر	15/-
شاہی کنیز	رحمٰن حیدری	10/-
شب گزیدہ	قاضی عبدالستار	30/-
شکستہ پر	کوثر مظہری	50/-
شہزادہ	کرشن چندر	130/-
شہنشاہ ۲ حصے	ایم اے راحت فی حصہ	50/-
شمع	اے آر خاتون	250/-

شہر بدنصیب	اقبال مجید	100/-
شمشیر بے نیام (اول دوم)	عنایت اللہ	130/-
شیبہ	سلمیٰ اعوان	50/-
صموزالہ	ایم اے راحت	45/-
صاحبو	ڈاکٹر سہیل احمد	15/-
صلاح الدین ایوبی	قاضی عبدالستار	30/-
صفیہ	سلمیٰ محبوب	15/-
ضدی	عصمت چغتائی	15/-
طارق بن زیاد	اسلم راہی	100/-
طرفہ تماشا	مسیح انجم	40/-
عربی دوشیزہ	صادق حسین سردھنوی	100/-
عرشی	عابدہ نسرین	100/-
عرفانہ	نادرہ خاتون	50/-
عفراء	عابدہ نسرین	100/-
عالمی افسانوں کا انتخاب	مرتبہ نعیم احمد	125/-
غیاث احمد گدی کے افسانے	جمشید قمر	90/-
قالیچہ	ایڈیٹر رگھوناتھ گھئی	60/-
غالب خستہ کے بغیر	جمیل شیدائی	20/-
فاصلوں میں بٹی زندگی	رشید انجم	175/-
فائر ایریا	الیاس احمد گدی	150/-
فضائی ہنگامہ	ابن صفی	35/-
فرعون	رشید انجم	75/-
فرات	حسین الحق	100/-
فرار	ظفر پیامی	40/-
قندوزقند	فیاض احمد فیضی	50/-

م کہانیاں(افسانے)	بشریٰ رحمٰن	125/-
ہلالہ حجاز	نسیم حجازی	75/-
یصر و کسریٰ	نسیم حجازی	90/-
مت کے خریدار	فریدہ رحمت اللہ	20/-
وال آدمی اور سمندر	عوض سعید	50/-
الا جادو (ناول) ۳ حصے	ایم۔اے۔راحت فی حصہ	45/-
گلی (ناول)	غضنفر	60/-
نگ لیر (ڈراما)	شیکسپئر	25/-
رکن کے افسانے	مرتبہ انجم عباسی	100/-
بھی ایسا بھی ہوتا ہے	شکیل شاہجہاں	40/-
ہی ان کہی	اوم کرشن راحت	40/-
کارخانہ اور آیندہ زمانہ	محمد فضل الرحمٰن	20/-
کستوری کنڈل	ڈاکٹر نریش	100/-
کربلا سنڈ	انور قمر	20/-
کلا	جوگندر پال	125/-
کون کسی کا	ٹیگور	40/-
کتھا	خالد اگا سکر	80/-
کفن سے کرتے تک	فکر تونسوی	35/-
کتھا نگر	جوگندر پال	36/-
کالی شلوار	سعادت حسن منٹو	20/-
کھلاڑی اول تا یازدہم	الف صدیقی (فی حصہ)	35/-
کلیسا اور آگ	نسیم حجازی	50/-
کوئی درد آشنا بھی نہیں	صغرا مہدی	1/50
گنجے فرشتے	سعادت حسن منٹو	50/-
کانڈیر	سجاد ظہیر	12/-
گیتا	شوکت تھانوی	50/-
کبھی دھوپ کبھی سایہ	ارشاد امروہوی	60/-
کبوتر کے خط	کرشن چندر	120/-
کنیادان	ڈاکٹر صادق	60/-
کن فیکون	رضوان احمد	90/-
کچوکے	پرویز ید اللہ مہدی	65/-
کشکول	حمید کاشمیری	135/-
کالے پھول	علیم الحق حقی	50/-
گھر داماد	وکیل احمد ہاشمی	10/-
گل صحرا	قمر طحیان	60/-
گونگی لڑکی	عادل رشید	40/-
گدھے کی واپسی	کرشن چندر	75/-
گلوں میں رنگ بھرے	سنت پرکاش سنگر	75/-
گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو	کرشن چندر	30/-
گل بن	سیدہ نسیم چشتی	125/-
گرد کارواں	کنہیا لال کپور	25/-
گونگی توپ	قطب اللہ	15/-
گئودان	منشی پریم چند	75/-
گورا	ٹیگور	50/-
لہو کے رنگ	شہناز فاطمہ رشید	125/-
لکشمن ریکھا	منظر کاظمی	100/-
لمحوں کے سراب	رضیہ نور محمد	30/-
لمحوں کی قید	کشور سلطانہ	40/-
لویزا	بلقیس صادق علی	80/-
لیزا	پروین شریف	50/-

لاؤڈ اسپیکر	منٹو	40/-	محبت ایک سچائی	رضیہ بٹ	60/-
لمحوں میں بکھری زندگی	کشمیری لال ذاکر	18/-	موت کے بعد	اظہار اثر	30/-
منڈیر پر بیٹھا پرندہ	احمد صغیر	50/-	منزل سے دور	ست پرکاش سنگر	60/-
منتخب افسانے ۱۹۹۵ء	نند کشور ورما	80/-	مدار	حیات اللہ انصاری	20/-
	سلمیٰ کنول	150/-	میری یادوں کے چنار	کرشن چندر	75/-
لیکن جزیرہ نہیں	تبسم فاطمہ	50/-	معظم علی	نسیم حجازی	60/-
لمحوں کی گرفت	نفیس احمد	70/-	مریخ کی سمت	مرزا حسن تاجر	50/-
لمحوں کا سفر	رضیہ حامد	15/-	معتوب وقت	الیاس سیتاپوری	35/-
لہو لہو آرزو	عارف خورشید	25/-	معتبر	سلام بن رزاق	25/-
لو آج ہم بھی	شفیقہ فرحت	12/-	میرا شہر ادھورا سا	کشمیری لال ذاکر	125/-
مہرباں کیسے کیسے	نذیر جوہر	160/-	مکتی بودھ	راجندر سنگھ بیدی	25/-
مقدس دیوداسی	اسلم راہی	80/-	مہکتی بہاریں	کوثر چاندپوری	18/-
مکڑی	کرشن چندر	60/-	میرے بہترین افسانے	منشی پریم چند	35/-
مسکراہٹیں (مضامین)	شوکت تھانوی	35/-	نفرت کی چٹان	الیاس سیتاپوری	40/-
موم سے جڑے پنکھ	مشتاق رضا	30/-	نازنین عرب	صادق حسین سردھنوی	90/-
منٹو کے یادگار افسانے	منٹو	12/-	نقشی کٹورا	ملا عبدالغنی	80/-
منتخب افسانے ۱۹۹۰ء	نند کشور ورما	60/-	نتھ اترائی (ناول)	واجدہ تبسم	30/-
منتخب افسانے ۱۹۹۴ء	نند کشور ورما	70/-	نچا ہوا البم (افسانے)	اقبال متین	30/-
منٹو کے نمائندہ افسانے	اطہر پرویز	35/-	نورینہ (ناول)	رضیہ بٹ	50/-
متحرک منظر کی فریم	معین الدین عثمانی	26/-	نوٹوں کی تلاش	محمد عاقل ایاز	60/-
منزل نہ ملی	عبدالقادر سوداگر	25/-	نقش اول	نور جہاں	25/-
میدان عمل	پریم چند	75/-	نامہ بر	سید وکیل اور ساگر	20/-
مسرت	کرشن چندر	60/-	نتھ کی عزت	واجدہ تبسم	30/-
محبت بھی قیامت بھی	کرشن چندر	80/-	نواب حیدر علی	ڈاکٹر عبدالوحید	10/-
منتخب افسانے ۱۹۸۹ء	نند کشور ورما	44/-	نوشین	پدما سچدیو	200/-

نیل کی ناگن	اسلم راہی	45/-
نئی فصل	بچن بھشا چاریہ	8/05
نمرود کی خدائی	سعادت حسن منٹو	20/-
نتھ کا بوجھ	واجدہ تبسم	30/-
نیشاپور کا شاہین	اسلم راہی	50/-
نیتو	فریدہ حق	50/-
نرملا	پریم چند	20/-
وہ بات	رفعت نواز	5/-
وہ لڑکی	شیام سندر پرویز	5/-
واپسی	افتخار عالم	12/-
ویزا	قطب اللہ	20/-
ہیرے کا جگر	رفعت صدیقی	80/-
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	کشمیری لال ذاکر	48/-
ہمارے پسندیدہ افسانے	اطہر پرویز	30/-
ہینگر پر لٹکی زندگی	اکرم فاروقی	40/-
ہلاک فریب	مترجم اثر لکھنوی	2/50
ہیملٹ	شیکسپیئر	20/-
ہندی کہانیاں	بھیشم ساہنی	300/-
یادش بخیر	آمنہ ابوالحسن	200/-
یہ جہاں اور ہے	ابن فرید	90/-
یادبسیرے (افسانے)	انور خاں	40/-
یادوں کا اجالا	بھگوان سنگھ	40/-
یادوں کی لکیریں	آمنہ شوکت	15/-
یادوں کے کھنڈر	نند کشور وکرم	50/-
یہ دھواں کہاں سے اٹھتا ہے	منصور بیزواری	80/-

یہ شام بھی کہاں ہوئی	عارف خورشید	25/-
یادوں کے سائبان	〃	20/-
یوسف بن تاشفین	نسیم حجازی	60/-
یادوں کے چراغ	اقبال جعفری	15/-
یوکلپٹس کی ڈالی	کرشن چندر	15/-
یگ جو بیت گیا	ظفر ادیب	15/-

طنزیہ و مزاحیہ ادب

آخر کار	مجتبیٰ حسین	60/-
چہرہ در چہرہ	〃 〃	51/-
بہرحال	〃 〃	15/-
جاپان چلو	〃 〃	24/-
تخلہ	یوسف ناظم	51/-
فی البدیہہ	〃 〃	45/-
فی زمانہ	〃 〃	40/-
فی الحقیقت	〃 〃	45/-
فی الفور	〃 〃	30/-
فی الحال	〃 〃	18/-
بالکلیات	〃 〃	18/-
امریکہ میری عینک سے	〃	50/-
آب گم	مشتاق احمد یوسفی	125/-
چراغ تلے	〃 〃	80/-
خاکم بدہن	〃 〃	95/-
زرگزشت	〃 〃	60/-
بہ قلم خود	نصرت ظہیر	200/-

تحت اللفظ	نصرت ظہیر	100/-
پطرس کے مضامین	پطرس	15/-
خواہ مخواہ	شوکت تھانوی	40/-
بکواس	〃	40/-
مسکراہٹیں	〃	35/-
گول مال	شفیقہ فرحت	18/-
رانگ نمبر	〃	16/-
لو آج ہم بھی	〃	12/-
گوشے میں قفس کے	دلیپ سنگھ	45/-
دل دریا	〃	100/-
اردو کی آخری کتاب	ابن انشا	85/-
نگری نگری پھرا مسافر	〃	60/-
ادیبوں کے لطیفے	کے،ایل،نارنگ	150/-
بزم آرائیاں	کرنل محمد خاں	90/-
بسلامت روی	〃	120/-
بجنگ آمد	〃	100/-
گورکھ دھندا	نظر برنی	80/-
شر نوشت	ماسٹر محمد فاروق	45/-

عروض و قواعد

مسلمات فن	زار علامی	50/-
کلید عروض	زار علامی	150/-
فن شاعری	اخلاق دہلوی	36/-
توضیح فنون ادب	ڈاکٹر صابر سنبھلی	60/-
تفہیم البلاغت	وہاب اشرفی	15/-

پیامی قواعد طلبہ ایڈیشن۔(مکتبہ)		3/-
پیامی قواعد	(مکتبہ)	6/-
اردو صرف	محمد انصار اللہ	12/-
اردو نحو	〃	8/-
اردو مصدر نامہ	حفیظ الرحمٰن	45/-
اردو صرف و نحو	مولوی عبدالحق	15/-
نسیم البلاغت	سید جلال الدین	17/50
مفتاح القواعد	محمد محی الدین جعفری	6/-
اردو زبان و قواعد (اول)	شفیع احمد صدیقی	24/-
اردو زبان و قواعد دوم	شفیع احمد صدیقی	27/-
اچھا خط کیسے لکھا جائے	محمد صہیب	3/50
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	12/-
قواعد اردو	بابائے اردو عبدالحق	35/-
اردو صرف و نحو	اقتدار حسین	16/-
درست اردو	پروفیسر آسی ضیائی	20/-
وضع اصطلاحات	وحید الدین سلیم	18/-
مقدمہ شعر و شاعری	حالی	27/-
گلدستہ مضامین انشا پردازی	محمد عارف	48/-
شہکار عروض و بلاغت	انور مینائی	40/-

مولانا ابوالکلام آزاد تصانیف کے آئینے میں

معاصرین و متعلقات	عبدالقوی دسنوی	60/-
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	ظ۔ انصاری	33/-
لسان الصدق	مولانا آزاد	75/-
مولانا آزاد کی کہانی	ظفر احمد نظامی	18/-

کچھ مولانا آزاد کے بارے میں	مالک رام	51/-
مولانا ابوالکلام آزاد فکرونظر کی چند جہتیں	ضیاالحسن فاروقی	60/-
مولانا آزاد شخصیت، سیاست، پیغام	رشیدالدین خان	24/-
معترضین ابوالکلام آزاد	عبداللطیف اعظمی	36/-
ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت	رشیدالدین خاں	58/-
مولانا ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش	پروفیسر عبدالمغنی	50/-
تلاش آزاد	عبدالقوی دسنوی	40/-
فائل الہلال مکمل	مولانا آزاد	600/-
تذکرہ	مرتبہ مالک رام	100/-
غبار خاطر	〃 〃	100/-
خطبات آزاد	〃 〃	80/-
خطوط ابوالکلام آزاد	〃 〃	100/-
ترجمان القرآن ۳ حصے	〃 〃	600/-
مولانا ابوالکلام آزاد مجموعہ مضامین		18/-
مسلمان عورت	مولانا آزاد	30/-
مسئلہ خلافت	〃 〃	40/-
حواشی ابوالکلام آزاد	مرتبہ مسیح الحسن	62/-
مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے	ڈاکٹر خلیق انجم	48/-
ابوالکلام آزاد نمبر	ایوان اردو (دلی)	10/-
مولانا ابوالکلام آزاد ذہن و کردار	عبدالمغنی	30/-
ہفتہ وار پیغام	مولانا آزاد	100/-

ام الکتاب	مولانا ابوالکلام آزاد	50/-
قول فیصل	〃 〃	15/-
عزیمت و دعوت	〃 〃	10/-
اصحاب کہف	مولانا ابوالکلام آزاد	15/-
آزاد کی تقریریں	〃 〃	40/-
حضرت یوسف علیہ اسلام	〃 〃	15/-
تحریک آزادی	مولانا ابوالکلام آزاد	30/-
ہجر و وصال	〃 〃	18/-
جامع الشواہد	〃 〃	40/-
فلسفہ	〃 〃	15/-
عیدین	〃 〃	10/-
ولادت نبیؐ	〃 〃	10/-
صدائے حق	〃 〃	10/-
قرآن کا قانون عروج و زوال	〃 〃	15/-
انسانیت موت کے دروازے پر	〃 〃	30/-
انڈیا ونس فریڈم مع ۳۰ صفحات انگریزی	〃	85/-
ہماری آزادی	ترجمہ شمیم حنفی 〃	85/-
ترجمان القرآن کا تحقیقی مطالعہ	مولانا اخلاق حسین قاسمی	100/-
مآثر مولانا آزاد	خلیق احمد نظامی	15/-
شہید اعظم	مولانا آزاد	12/-
آئینہ ابوالکلام آزاد	عتیق صدیقی	10/-

تعلیمی کتب

ڈسپلن کی تعلیم و تربیت	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	90/-

الجھنیں	عبداللہ ولی بخش قادری	60/-
استادوں کی تعلیم وتربیت	مسعود الحق	60/-
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	پروفیسر ضیاالحسن فاروقی	45/-
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	[illegible] اللہ	51/-
مشقی تدریس کیوں اور کیسے	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	45/-
معاشیات کے اصول	عزیز احمد قاسمی	21/-
آسان اردو ورک بک	شکیل اختر فاروقی	27/-
آسان اردو	شکیل اختر فاروقی	12/-
تاریخ کیسے پڑھائیں	سرور ہاشمی	36/-
نئی تعلیمی پالیسی	دلی اردو اکیڈمی	30/-
تعلیم وتربیت اور والدین	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	51/-
اشارات تعلیم	آسٹن	35/-
تعلیم اور اس کے وسائل	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	36/-
اصول تعلیم	ڈاکٹر ایس۔ ایم ضیاء الدین	35/-
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خان	12/-
اصول تعلیم اور عملی تعلیم	خلیل الرحمٰن سیفی	16/75
تعلیم تشکیل نو کے مسائل	غلام السیدین	10/-
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویئے	مسرت زمانی	45/-
تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر	ڈاکٹر سلامت اللہ	10/75
تعلیم سماج اور کلچر	اے کے ایس اوناوے	10/-
سماج اور تعلیم	عبدالقادر عمادی	6/50
بچوں کی نفسیات	ڈاکٹر عبدالرؤف	30/-
ہماری تعلیمی صورت حال	پروفیسر آل احمد سرور	40/-
فن تعلیم وتربیت	افضل حسین	45/-

جدید تعلیمی مسائل	ڈاکٹر ضیاء الدین	45/-
مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک	شمس الرحمٰن محسنی	50/-
تدریس جغرافیہ	محمد ضیاالدین علوی	20/-
تعلیم کی نفسیاتی اساس	عبداللہ ولی بخش قادری	65/-
کامرس کیسے پڑھائیں	محمد شریف خاں	14 50
زبان، زندگی، تعلیم	خواجہ غلام السیدین	10/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں	معین الدین	54/-
ہم کیسے پڑھائیں	ڈاکٹر سلامت اللہ	33/-
تعلیمی خطبات	ڈاکٹر ذاکر حسین	36/-
بنیادی استاد کے لیے	ڈاکٹر سلامت اللہ	12/-
بچوں کا آرٹ	عبیدالحق	24/-
تعلیم اور رہنمائی	ڈاکٹر محمد اکرام، خاں	35/-
ٹیچرز ایجوکیشن ان جامعہ اسلامیہ	باقر مہدی	15/-

طبی کتب

طب یونانی کے چیلنجز	حکیم اشہر قدیر	60/-
اخلاقیات طبیب	حکیم محمد سعید	20/-
فرہنگ اصطلاحات طب	ڈاکٹر اختر امرتسری	45/-
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	نذیر الدین مینائی	25/-
نباتات قرآن	اقتدار فاروقی	100/-
علاج الغرباء	(نول کشور لکھنؤ)	45/-
مجرّبات حکمائے ہندوپاک	حکیم محمد اسماعیل	15/-
امراض جلد اور علاج نبوی	ڈاکٹر خالد غزنوی	75/-
مطب عملی مسیح الملک	حکیم محمد اجمل خاں	57/-
آداب مباشرت (اردو)	ڈاکٹر آفتاب احمد شاہ	14/-

آداب مباشرت (ہندی)	ڈاکٹر آفتاب احمد شاہ	12/-
امرت ساگر	پنڈت پیارے لال	70/-
پانی سے علاج	کے۔ ایل۔ شرما	12/-
دودھ سے علاج	قمر تسکین	15/-
بیماریوں کا روحانی علاج	محمد اسلم	13/-
مرد عورت	سلطان عظیم	12/-
زنانہ امراض اور ان کے علاج	حکیم نور محمد	20/-
حمل سے پیدائش تک	سعید لخت	15/-
طب نبویؐ	حافظ اکرام الدین	15/-
بیاض مسیحا	حکیم محمد حسن قریشی	60/-
امراض العین	حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی	150/-
علم الادویہ اول دوم	حکیم طاہر محمود بٹ	80/-
تجربات لقمانی	حکیم عبدالرحیم جلیل	75/-
امراض نسواں	حکیم وسیم احمد اعظمی	100/-
علم القابلہ	حکیم محمد سلیم احمد	20/-
قدیم علم الامراض	حکیم ملک واثق امین	12/-
تجربات بو علی سینا	شیخ الرئیس ابن سینا	75/-
نشے کی لت موت کا سایہ	اکرام اللہ	100/-
کنز المجربات اول تا سوم	حکیم عبداللہ	250/-
بیماریوں کا رنگ و روشنی سے علاج	خواجہ شمس الدین	15/-
کلیات امور طبیعہ	حکیم تسخیر احمد	45/-
معالجات اطفال	حکیم شجاع الدین حسینی	50/-
معالجات	حکیم وسیم احمد اعظمی	58/-
نزلہ کھانسی، دمہ، نمونیہ گائیڈ	حکیم عبدالجبار	13/-

بستان المفردات	حکیم عبدالحکیم	50/-
ہماری غذا	شکیل احمد	9.50
یونانی ادویہ مفردہ	حکیم سید صفی الدین	34/-
مرضیات	حکیم نعیم الدین زبیری	75/-
علم الصیدلہ	حکیم وسیم احمد اعظمی	50/-
درد علامت اور علاج	ابو سعدی خالد جاوید	17/-
مبادیات طب پر ایک تحقیقی نظر	حکیم الطاف احمد	11/-
مخزن حکمت اول دوم	حکیم غلام جیلانی	600/-
چائینیز طب آکیوپنکچر اور موکسی بوشن	ڈاکٹر محمد ظہیر الدین	12/-
قرابادین اعظم	حکیم اعظم خاں	250/-
سلک مروارید	شفاء الملک	90/-
طب یونانی میں گھریلو ادویہ	حکیم عبدالرزاق	13/-
شراب نوشی اور منشیات	حسین فاروقی	8/-
علم الجراحت	ڈاکٹر انور علی	15/-
طب کوتز	حکیم عبدالقادر	12/-
امراض نسواں و اطفال گائیڈ	ڈاکٹر عبدالجبار	30/-
ہندوستان کے مشہور اطباء	حکیم حافظ سید حبیب الرحمٰن	18/-
تشریح الہیکل اول	حکیم کمال الدین	11/-
ترجمہ کبیر (چار جلد میں)	حکیم کبیر الدین	300/-
کتاب المرکبات	حکیم غلام جیلانی	125/-
سکون قلب اور اخلاقی بیماریاں	علی اصغر چودھری	14/-
علم الولادت	مسعود حنیظ فاروقی	75/-

رموز کیمیا حکیم نور محمد چوہان	50/-	جنسیات کی پہلی کتاب	25/-
تشخیص الامراض	125/-	جنسی امراض کا علاج	90/-
مخزن المرکبات و معلم دوا سازی	125/-	دقائق الکلیات	100/-
مخزن الجواہر طبی و ڈاکٹری لغت	250/-	کنز التکلیس	25/-
بیاض اجمل تجویز و تشخیص	75/-	تحفظی و سماجی طب	100/-
مطب [illegible]	20/-	علم القابلت	100/-
اکسیری نسخے	20/-	کلیات امور طبعیہ	60/-
طلسمی نسخے	20/-	نظام اعصاب	150/-
بیاض مسیحا مسیح الملک حکیم اجمل خاں	60/-	نئی جوانی کنور کرشن دت شرما	25/-
حفظان صحت (ہائی جین)	60/-	رخ الکیمیا حکیم محمد اسمٰعیل	20/-
حمیات قانون	75/-	جراحت صغیرہ	50/-
طب قانونی و علم سموم	40/-	رموز کیمیا نور محمد چوہان	50/-
ہندوپاک کی جڑی بوٹیوں کے عجیب و غریب فوائد مع		کیمیا اور کیمیاگری نور محمد چوہان	575/-
رنگین تصاویر (پانچ جلدیں)۔	200/-	کشتہ جات کی پہلی کتاب۔ حکیم محمد عبداللہ	20/-
لقمانی گائیڈ	75/-	پرہیز اور غذا 〃 〃	10/-
مجربات فخر الاطباء	40/-	پھلوں اور پھولوں سے علاج	
مختصر الکلیات جدید القانون	25/-	حکیم اکرام الدین	35/-
مقدمہ علم الادویہ	75/-	سنت نبویؐ اور جدید سائنس	
افعال الاعضاء	125/-	طارق محمود چغتائی	90/-
یونانی میڈیکل پریکٹیشنر	50/-	چند مشہور طبیب سائنس داں۔ ادارہ	9/-
ماہیت الامراض (پیتھالوجی)	30/-	جدید رہنمائے ادویہ حکیم عبدالجبار	70/-
ذیابیطس قابل علاج ہے	15/-	جدید رہنمائے علاج 〃	60/-
صحت اور حفظان صحت		بیاض کبیر حصہ اول تا سوم	
تعلیمات نبویؐ کی روشنی میں	15/-	حکیم محمد کبیر الدین	160/-
طبی عربی ریڈر	50/-	دل کی بیماریوں کا علاج۔ مغیث انجم	15/-

حاذق	حکیم اجمل خاں		90/-
طب نبویؐ	نول کشور پریس		12/-
کنزالمرجان	حکیم محمد		20/-
بچوں کی بیماریاں اور علاج	میاں نذیر احمد		5/-
دوا اور دعا سے علاج	خواجہ شمس الدین عظیمی		7/-
مخزن المفردات	حکیم محمد اشرف سرگودھی		60/-
موجز القانون	کوثر چاندپوری		26/-
رہبر تندرستی	مسرت زمانی بیگم		25/-
صحت و زندگی	ادارہ بیسویں صدی		25/-
پھلوں سے علاج	حکیم محمد عبداللہ		20/-
سبزیوں سے علاج	ڈاکٹر بلیغ الدین		20/-
بالوں کی بیماریاں اور ان کا علاج	پروین اختر		15/-
گھر کا ڈاکٹر	ڈاکٹر نیازی		15/-
حفظان صحت	حکیم مسعود رفاعی		60/-
امراض اذن وانف وحلق	حکیم وسیم احمد		75/-
نیو میڈیکل ڈکشنری انگریزی اردو	حکیم مسعود حفیظ		100/-
قرابادین قادری	حکیم محمد اکبر ارزانی		150/-

کتاب النبض	اجمل خاں	40/-
طاعون رحمت یا زحمت	مختار احمد ندوی	8/-
پاک و ہند جڑی بوٹیاں	صوفی لچھمن پرشاد	100/-
طب نبویؐ اور جدید سائنس جلد نمبر ۱		50/
طب نبویؐ اور جدید سائنس جلد نمبر ۲		70/
تمباکو نوشی کے نقصانات۔	عبدالرحمٰن کوندر	25/-
حیات ازدواج فی التفسیر۔	حکیم حبیب الرحمٰن	75/-
پاکٹ میڈیکل ڈکشنری		30/-
غذائیں دوائیں	سرمد فاؤنڈیشن	8/-
کاشف رموز کیمیا	حکیم عبدالعزیز کامل	100/-
تشریح المفاصل	ایم۔اے لاری	75/-
میزان طب	حکیم محمد اکبر	32/-
نظر کی کمزوری اور اس کا سدباب	اے ایس۔ صدیقی	13/-
پھولوں سے علاج	ادارہ	15/-
کلیات ادویہ	حکیم وسیم احمد اعظمی	100/-
منافع الاعضاء	مسعود رفاعی	60/-
تشریح البدن	〃 〃	60/-

حیات البشیر — مجیب اشرف

'حیات البشیر' اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ کے بانی' ہفتہ وار 'البشیر' کے اڈیٹر خان بہادر ڈاکٹر مولوی محمد بشیر الدین کی اٹاوہ تحریک 'ان کی زندگی' قومی خدمات ہے بلکہ ان کی جہد مسلسل کی ایک ناقابل فراموش داستان بھی ہے۔ قیمت: 150/

شعریات بال جبریل — توقیر احمد خاں

اقبال کے فن اور فکر پر ڈاکٹر توقیر احمد خاں کا تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ اقبالیات میں نادر اضافہ۔اقبال کے طلبہ کے لیے نہایت 200/-

ڈاکٹر مشیر الحق — مرتبہ شاہ عبدالسلام

(شخصیت اور فکری بصیرت)

ڈاکٹر مشیر الحق (سابق وائس چانسلر یونیورسٹی کی دلفریب شخصیت اور فکری بصیرت پر اردو کے ممتاز ترین ادیبوں کے اہم مضامین کا مجموعہ قیمت =300/

مذہب تاریخ سوانح اور اسلامیات

ایران کی چند اہم فارسی تفسیریں کبیر احمد جاسی /200
الرحیق المختوم مولانا صفی الرحمن /130
ایک منٹ کا مدرسہ مولانا محمد اختر - /25
اسرار [illegible] اول شیخ عبد القادر شاہ /50
اسلامی [illegible] مولانا شاہد حسن /105
آلات جدیدہ کے شرعی احکام مولانا شاہد حسن /45
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (جلد اول تا سوم) /165
محمد یامین قریشی
ام الکتاب مولانا ابوالکلام آزاد /50
آداب زندگی محمد یوسف اصلاحی /65
اشارے منزل کی طرف شاہ محمد عثمانی /40
اسلام ابدی خطوط اور نئے زاویے شمیم اختر /80
اصول فقہ کا نچ عبد الحمید مدکور /15
اختلافات اسباب آداب جمال سلطان /25
انتخاب نظر عبد المجید خلیب دہلوی /30
الواح الصنادید جلد ۱ عطاء الرحمن قاسمی /100
الواح الصنادید جلد ۲ عطاء الرحمن قاسمی /100
الوعظ الاعظم جلد ۲ /56
اکسیر ہدایت امام غزالی /200
اسلامی معلومات حصہ اول حافظ بدر الدین /8
اسلامی معلومات حصہ دوم حافظ بدر الدین /9
اسلامی معلومات حصہ سوم حافظ بدر الدین /9
اوراد فتحیہ مترجم /10
اخلاقی سبق ماتا کرشنا لاری /6
اسلام کے بنیادی عقائد علامہ شبیر عثمانی /12
آپ آسان تقریر کیسے کریں مولانا جمیل /15

اسلامی نام خلیل الرحمن نعمانی /12
اسلامی رسمیں اور تہوار شجاعت اللہ صدیقی /6
امت مسلمہ کا انحطاط اور اس کی تعبیر نو غلام محمد /50
آداب دعاء سید مجیب الرحمن /20
الغزالی شبلی نعمانی /25
آمنہ کا لال علامہ راشد الخیری /18
آپ حج کیسے کریں منظور نعمانی /25
بائبل قرآن اور سائنس موریس بوکائیے /65
بیاض الاولیا مفتی شبیر حسن چشتی /35
بائیس خواجہ چوکھٹ دلی خواجہ حسن نظامی /10
بچوں کے لیے قرآن ڈاکٹر عبد الرؤف 12/50
بہشتی زیور مولانا اشرف علی تھانوی /60
بچوں کے لیے حدیث ڈاکٹر عبد الرؤف 12/50
پردہ مولانا ابو الاعلی مودودی /55
تذکرہ جلیل سوانح حیات مخدوم جناب کلیری
حاکم علی پیرزادہ /30
تذکرہ نظامی خواجہ حسن ثانی /10
تجلیات قرآن کے چند عجائبات امتہ الکریم /35
تاریخ الاولیا محمد مستحسن فاروقی /25
تصوف کی باتیں ڈاکٹر ظہور الحسن شاداب /20
تعبیر نامہ خواب علامہ محمد بن سیرین /45
تعلیم التجوید قاری رضوان /6
تعلیم الاسلام مفتی کفایت اللہ /18
تکملہ (قرآن حکیم کی تعلیم پر آخری لفظ)
جلد اول دوم عنایت اللہ مشرقی /72
تحفۃ العوام سید محسن /60
تاریخ السلام سید امیر علی /40
تاریخ السلام اردو ترجمہ سید الطاف حسن گیلانی /175

تاریخ الاسلام جلد اول تا سوم	مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی	235/	سیرت حضرت یوسفؑ	مولانا خورشید حسن	20/
تحریک دعوت و تبلیغ	عبدالمجید خطیب	25/	سیدہ کالال	علامہ راشد الخیری	25/
تحسین اخلاق	عبدالمجید خطیب	8/	سید الکونین	حکیم محمد صادق	90/
تلقین	عبدالمجید خطیب	10/	سلحات	حضرت شاہ ولی اللہ	25/
جادۂ اعتدال	عبدالمجید خطیب	60/	سیرت النبی (منظوم)	سید عابد علی	25/
جنات کے پراسرار حالات	شبیر حسن چشتی	30/	شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل	حضرت شاہ ولی اللہ	25/
حج مسنون کا طریقہ	مومن محی الدین	35/	شاہنامہ کربلا	پروانہ ردولوی	20/
حکایات صحابہ	مولانا زکریا	25/	شمس المعارف الکبری	شیخ ابو العباس	160/
حدیثی اصول	وجیہ الدین خاں	15/	شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی	فرید الوحیدی	250/
حالات مشائخ	مولانا سردار شاہ خاں	20/	شمع شبستان رضا	امام احمد رضا خاں	65/
حادثہ کربلا کا پس منظر	ڈاکٹر محسن عثمانی	75/	علم دین اول تا سوم	عبدالمجید خطیب	50/
خم خانہ تصوف	ظہور الحسن شارب	70/	علم وراثت۔ احکام۔ مسائل	عبدالمجید دہلوی	60/
خطبات الاحکام	مفتی محمد شفیع	35/	عوارف المعارف	شیخ شہاب الدین سہروردی	150/
خواجہ فخر الدین ابو الخیر چشتی	ظہور الحسن شارب	12/	عثمان و حیدر	ع۔ س۔ صدیقی	30/
خواجہ معین الدین چشتی	شعائر اللہ خاں	25/	عورتوں کی نماز	مولانا گوہر رحمن	7/
خوب رنگ	ڈاکٹر عالی جعفری	85/50	عملیات محبت	انوار حسن خاں	15/
دار العلوم کا ایک فتوی اور اس کی حقیقت	قاری محمد طیب	5/	غیبی آواز	شبیر حسن چشتی	30/
داعی اعظم	محمد یوسف اصلاحی	12/	فن اسماء الرجال	ڈاکٹر تقی الدین ندوی	50/
دلی کے بائیس خواجہ	ظہور الحسن شارب	45/	فیوضان وزیریہ	وجیہ الدین خاں	30/
دلی کی تاریخی مساجد جلد اول	عطاء الرحمن	200/	فوائد الفواد کا علمی مقام	مولانا اخلاق قاسمی	120/
ذکر طیب (سوانح طیب صاحب)	حافظ محمد اکبر	30/	فضائل قرآن	مولانا زکریا	12/
رسول اللہ کی سنتیں	مولانا محمد اختر	6/	فضائل تہجد	قاری مظفر حسین	18/
روضۃ الاولیا	پروفیسر نثار احمد فاروقی	52/	فضائل و تاریخ قربانی	مفتی محمد شفیع	8/
روح عذاب قبر اور سماع موتی	مولانا عبدالرحمن کیلانی	20/	قوام العقائد	پروفیسر نثار احمد فاروقی	60/
رسول عربی	فرید الوحیدی	24/	قانون شریعت	مولانا شمس الدین	80/
روح تصوف	خواجہ سید محمد گیسو دراز	36/	قرآنی عربی (قرآن کریم کے ذریعے		
رحمت عالم	سید سلیمان ندوی	15/	بنیادی عربی کی تعلیم)	حافظ اسماعیل سورتی	150/
سفرنامہ حج	ضیاء عبداللہ ندوی	50/	قبر کی پہلی رات	صوفی محمد اسماعیل	15/

قصہ اصحاب کہف	مولانا محمد زبیر قریشی	8/
کربلا کی بہادر خواتین	پروانہ رودولوی	35/
کربلا کے بعد قاتلانِ حسین کا عبرتناک انجام	پروانہ رودولوی	25/
کامل نماز سے مسائل واحکام نماز	حافظ نذر احمد	50/
مسائل شریعت اول تا چہارم	مولانا سردار شاہ	20/
مسلمان کیا کریں	جمیل مہدی	5/
معین الہند	ظہور الحسن شارب	28/
مقالات الحافظ قرآنیات	بدرالدین الحافظ	45/
مکتوبات ہدایت	سید حسین احمد مدنی	10/
معین التجوید	مولانا محمد حسین ن	6/
مسلمان بچوں کے نام کیا رکھیں	ابوالعمران محمد اسلم	10/
مسلمان بچوں کے اسلامی نام	محمد الیاس عادل	20/
مسلمان بچوں کے پیارے نام	الیاس عادل	40/
ماں باپ کے آداب وحقوق	عبدالمجید خطیب	15/
محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے	ڈاکٹر تقی الدین ندوی	100/
مدارج النبوت جلد دوم	شیخ عبدالحق دہلوی	350/
مقدمۃ القرآن یعنی تفسیر اصول	وجیہ الدین احمد	4/
نعت پاک کی اہمیت	ساجد صدیقی	90/
نقوش علمائے دیوبند	مولانا محمد عمران قاسمی	30/
نکات قرآنی	ابوالاعلیٰ مودودی	90/
نور الشیوخ	پیر و محمد شاہ	25/
نقش سلیمانی	خواجہ اشرف علی لکھنوی	47/
نبیوں کے حالات	ابو سلیم محمد عبدالحی	12/
لطائف الابرار	مولانا فرمان علی	36/
وحید الدین خاں کی گمراہیاں	کلیم اجمل خاں	35/
وحید الدین خاں علماء اور دانشوروں کی نظر میں	ڈاکٹر محسن عثمانی	70/

ہندوستان کی دینی درسگاہیں	ڈاکٹر قمر الدین	200/
ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت جلد ۱	سید مناظر حسن گیلانی	100/
یاد وجیہ	ڈاکٹر شعائر اللہ خاں	50/
معاشیات کے اصول	عزیز احمد قاسمی	21/
روزگار شرح سود وزر	ابو سالم	8/50

خانہ داری

سو ذائقے	شبنم وحید	60/
رضیہ کا شاہی دستر خوان	شبنم آراء	25/
رہبر صحت	مسرت زمانی	20/
کامیاب مرغی خانہ	زینب انور	20/
علم خانہ داری	مسرت زمانی	30/
مہندی کے دوسو نقش	ڈیزائن	20/
زنانہ کپڑوں کی کٹنگ	فرزانہ نجاری	15/
کامیاب درزی خانہ	زینت علی	15/
مغل شاہی دستر خوان	شاہین آصف	30/
پروین	کشیدہ کاری	40/
نزہت	کشیدہ کاری	40/
حسین	کشیدہ کاری	40/
دلہن	کشیدہ کاری	40/
پوجا	کشیدہ کاری	25/
نیہا	کشیدہ کاری	25/
آرتی	کشیدہ کاری	25/
وندنا	کشیدہ کاری	25
تاجر	"	70/
شاہین	"	40/

لسانُ الصدق — مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل، اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ۔ -/45

نظامِ رنگ — ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کا ادبی خاکہ — یہ اُس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر انسانیت کو وقار بخشا۔ -/15

شہیدِ جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مردِ درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مردِ مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ -/45

پرانی بات ہے (سلسلہ اوّار نظمیں) — زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں، بس سچائیوں

(طلبہ اور ... کے لیے)

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ ...

... خاں سیاح تک کلام کا جامع ... اداجعفری نے برسوں کی محنت اور ... بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے اداجعفری ... قرار دیا جائے گا۔ صفحات ...

سازِ سخن — ادا ...

جدید شاعری کی خاتونِ اوّل ... کے کلام کا جامع انتخاب۔ اداجعفری ... سے ایک ایسی قوتِ ارادی تشریح ... ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہو ...

ترجمۂ قرآن — پروفیسر ...

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی ...) پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ ... کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک ... میں پیش کیا گیا۔

نذرِ مختار

محمد غر مضامین ... مختار الدین احمد کی عالمانہ ... جمہوریہ ہند کے دستِ مبارک ... کے ممتاز محققین ادیبوں کی ...

gd. \ ith R.N.I. at No 4967/60 MARCH 98
gd. I.o. DL 16016/98
nce No. U(SE)-22 to Post without pre-payment of postage

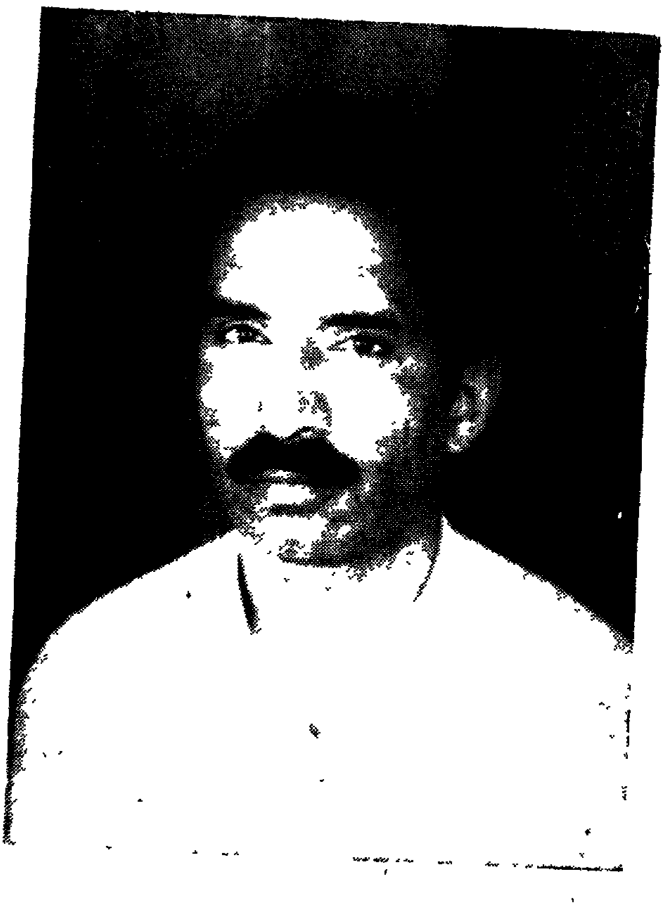
KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025

ماہنامہ

نئی دہلی ۲۵

کتاب نما



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

...ر جوان ... کا ... تنقیدی و ...
...میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو
...از میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید
...اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو
...روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ
...طالبعلموں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

...و تنقید
حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے
...مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار
...شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

...ہندوستان کی ...سیکولر روایات
ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی
...اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات
...حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے
...کیا ہے۔ ۱۲/=

...کی طشتر
شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی
...اور رویوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ، اُردو
...روایت کا ایک اہم موڑ ... ۱۲/=

... نہیں
۱۸/=

فی الفور
یوسف ناظم

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صفِ اوّل
کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ
مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۳۰/=

مولانا آزاد کی کہانی
ڈاکٹر ظفر احمد نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح
جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈمک
اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے
بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک اہم
تاریخی دستاویز ہے۔ ۱۸/=

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیدین
مرتبہ: ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

ممتاز ماہرِ تعلیمات خواجہ غلام السیدین کے علمی،
ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔ ۴۰/=

توفیق الحکیم
ناول نگاری کا جائزہ
ڈاکٹر بدر الدین الحافظ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق الحکیم
کی ناول نگاری کا ... [illegible]

نظریاتی تکراؤں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

اپریل ۱۹۹۸ء جلد ۳۸ شمارہ ۴

فی پرچہ 7/:

سالانہ 70/:

سرکاری تعلیمی اداروں سے 100/

غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک) 500/

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فیکس نمبر: 6842574

Tel Cum Fax No (011)-6910191

ٹیلی فون نمبر: 6910191

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ۔ ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرے کے ذمے دار خود مصنفین ہیں ادارہ کتاب نما کا ان سے اتفاق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

طنز و مزاح

افسانے

جائزے:

نئی مطبوعات

پنڈت رتن ناتھ سرشار کے تراجم (ایک تنقیدی جائزہ)
ڈاکٹر عبدالرشید صدیقی 100/
موج کوثر کا تنقیدی مطالعہ (تنقید) محمد معظم الدین 200/
نواب بیگم (ناول) محمد شبیر علی 100/
طلوع ساحلی میری یادوں کے سائے میں
کنول تمن پرواز 150/
قدم بہ قدم (شعری مجموعہ) انیس دہلوی 120/
سایہ دار درخت (افسانوی مجموعہ) ضیاء حسنی 220/
عالمی اردو ادب ۹۷ء (ادب) نند کشور وکرم 200/
کسی دن (ناول) اقبال مجید 80/
جدید ناول کا فن اردو تناظر میں ۔ سید محمد عقیل 150/
گل نغمہ فراق گورکھپوری 200/
لہو کے رنگ شہناز فاطمہ رشی 125/
واقعات کشمیر (تاریخ) خواجہ محمد اعظم دیدہ مری 300/
ارمغان دعوت اسلام نمبر مجلہ (مذہب)
مدیر وصی سلیمان ندوی 100/
حضرت عیسی کی قبر کشمیر میں نہیں ہے (مذہب)
عبدالرحمن کوندو 60/
صحبت با اولیا حضرت مولانا تقی امینی 100/
سفر نصیب (مضامین) مختار مسعود 60/
شجرہ نسب۔ پرویز شہاب الدین روشن 60/
گجرال کمیٹی (عام ایڈیشن) ترتیب خلیق انجم 175/
درد کاکوروی۔ حیات اور کارنامے۔ (تحقیق)
ڈاکٹر فرقان علی 140/
اردو گلشن کے ارتقا میں عصمت چغتائی کا حصہ ڈاکٹر محمد اشرف 150/
سانس کی دھار (شعری مجموعہ) قیصر شمیم 100/
شرف الدین ساحل ۔ شخصیت اور علمی و ادبی خدمات۔
کلیم احمد 75/
ظہیر غازی پوری۔ شخص، شخصیت، شاعری،
حنیف ترین 126/

سرورق: جمیل اختر

شعرائے بدایوں، دربار رسول میں (تذکرہ نعت گویاں)
ڈاکٹر شمس بدایونی 100/
نیا ورق (دوماہی) اکتوبر تا مارچ ۹۸ء الظفر ساجد رشید 35/
کتھا (ہند و پاک کے پندرہ منتخب افسانوں کا مجموعہ
مرتبین۔ محمد علی صدیقی رسنکر تاپال کمار 175/
غالب نامہ جلد ۱۹۔ شمارہ ا۔ مدیر اعلا پروفیسر نذیر احمد 60/
دارالعلوم لطیفیہ ویلور کا ادبی منظر نامہ۔
ڈاکٹر راہی فدائی 125/
عہد سلطنت کے فقہا، صوفیا اور دانشوروں کی نظر میں
ہندو کی حیثیت۔ ڈاکٹر شیخ محمد اسماعیل اعظمی 45/
اظہر حسین مرحوم۔ ایک تہذیب ایک شخصیت۔
ڈاکٹر انور حسین خاں 501/

مہمان مدیر
ڈاکٹر جمیل اختر
۳۱۲۔ اے بی ر ۲ منیر کا
بدھ وہار۔ نئی دہلی ۶۷

اردو میں حوالہ جاتی کتب

اردو میں حوالہ جاتی کتب کی بے حد کمی ہے اوراس کی تیاری کی طرف کوئی منصوبہ بند کوشش ہمیں کم از کم ہندستان کی سطح پر تو دکھائی نہیں دیتی ہاں البتہ پاکستان میں اس کی طرف توجہ دی گئی ہے اور وہاں منصوبہ بند کوشش بھی ہوئی ہے۔ جس کے تحت بہت سی حوالہ جاتی کتب تیار ہوئی ہیں لیکن ہندستان میں اس کی طرف نہ کوئی توجہ دی گئی اور نہ کوئی منصوبہ بند کوشش ہی کسی بھی ادارے کی طرف سے ہو رہی ہے۔ جب کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے اس دور میں جہاں معلومات کی فراہمی کے تیز تر ذرائع کی دریافت ہو چکی ہے اور سارا عالمی نظام ریڈیائی لہروں کی زد میں آچکا ہے۔ جدید مواصلاتی نظام انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا بھر کی معلومات منٹوں میں ایک ٹیبل پر فراہم کی جارہی ہیں ایسے میں اردو میں معلومات کی فراہمی کا کوئی ذریعہ یا نظام ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس جدید ابلاغیاتی دور میں بھی ہمیں تلاش و جستجو کے جاں کاہ مرحلوں سے گزرنا پڑ رہا ہے اور دوسرا کوئی ذریعہ معلومات کی بہ آسانی فراہمی کا ہمارے پاس نہیں ہے اور نہ اردو والوں کی توجہ اس طرف مرکوز ہوتی دکھائی پڑ رہی ہے جب کہ اس دور میں اس طرح کے معلوماتی ذرائع کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے جس سے قاری اور محقق کے قیمتی وقت کو ضائع ہونے سے بچایا جاسکے۔

حوالہ جاتی کتب 'اشاریے' وضاحتی کتابیات دراصل ذخیرہ معلومات سے معلومات کی فراہمی کا وہ آسان اور سائنٹی فک ذریعہ ہیں جس کی مدد سے ہم اپنے مشکل سے مشکل مرحلے کو بہ آسانی حل کر سکتے ہیں اور معلومات کے انبوہ ذخیرے سے اپنی مطلوبہ چیزوں تک منٹوں میں رسائی حاصل کر سکتے ہیں جو اس کے بغیر ہفتوں اور برسوں میں

بھی حاصل ہونی مشکل ہے۔ اس قدر مفید اور کار آمد ذرائع معلومات کی تیاری کی طرف ہماری توجہ کا نہ ہونا افسوس ناک ہے۔ اور یہ ایک طرح کی مجرمانہ غفلت ہے۔ آج جب کہ ہندستان میں تحقیق و تنقید کا بازار گرم ہے۔ ترقی اردو کے بڑے بڑے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے دن رات سرگرم عمل ہیں اور موٹی موٹی رقمیں مختلف طرح کے غیر ضروری کاموں میں خرچ کی جارہی ہیں کسی بھی ادارے کا اس طرح کے مفید کاموں کی طرف ملتفت نہیں ہونا نہ صرف افسوس ناک ہے بلکہ ہماری بے حسی اور غفلت کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس طرح کی بنیادی سہولتوں کو فراہم کرنے کی کوشش ایک منصوبہ بند طریقے سے کی جائے تاکہ اردو کا محقق دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں فراہم کردہ سہولتوں کی طرح اردو میں بھی وہ سہولت پاسکے اور جدید عہد کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے اہل ہوسکے جس کے خطرات ہر لمحہ ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں اور ہم ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے اہل یوں نہیں ہیں کہ ہم نہتے ہیں ہتھیار سے لیس نہیں ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہم دوسروں کے مقابل کھڑے ہوسکیں۔

مغربی زبانوں اور علوم میں یہ کام ایک صدی قبل سے ہی ہورہا ہے۔ ان لوگوں نے بہت پہلے ہی اس کی اہمیت وافادیت کو نہ صرف محسوس کرلیا تھا بلکہ اس کے دوررس نتائج سے بھی آگاہ ہوچکے تھے۔ جب ہی جدید طرز فکر کے تحت اس طرح کے کاموں کا نہ صرف ایک منصوبہ بنایا بلکہ ایک نظام بھی وضع کیا تاکہ اس طرح کے کاموں میں ایک طرح کی یکسانیت ہو اور ہر سطح پر اس کی افادیت یکساں طور پر قائم رہے۔ مغرب کی طرح خود ہندستان میں بھی انگریزی اور دوسرے علوم میں حوالہ جاتی کتب بہت قبل سے تیار کی جارہی ہیں۔ خاص طور پر سائنس اور سوشل سائنس میں ریفرینس میٹریل کی کمی نہیں ہے۔ آج بھی ہندستانی علوم میں حوالہ جاتی کتب کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر اس کی طرف خاص توجہ کی جارہی ہے۔ لیکن اگر توجہ نہیں ہے تو صرف اردو میں آج بھی اس طرف کوئی پیش رفت ہوتی دکھائی نہیں پڑرہی ہے۔ کم از کم ہندستان کی سطح پر تو یہ بات ہم بہ آسانی کہہ سکتے ہیں۔ پاکستان میں صورت حال اس کے برعکس بہتر ضرور ہے۔

ہندستان میں کتابوں کی فہرست سازی کا آغاز بیسویں صدی کے نصف اول میں ہوا لیکن وضاحتی کتابیات کی تیاری اور موضوعاتی اشاریوں کی تیاری کی طرف توجہ بہت

بعد میں دی گئی۔ میرے خیال میں کوئی دس برس قبل سے ہی اس کی شروعات ہوئی ہے۔ اور کچھ چیزیں منظر عام پر آئی ہیں۔ جو کیت اور حجم کے لحاظ سے اتنی کم ہیں کہ ہم انھیں صرف ایک آغاز ہی کہہ سکتے ہیں۔ یا تاریکیوں کے بیچ روشنی کی ایک ٹمٹماتی ہوئی کرن سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ بھی مستقل جاری رہتا تب تو کچھ مزید پیش رفت کی توقع کی جاسکتی تھی۔ مگر سلسلے کے بند ہو جانے سے وہ موہوم امید بھی جاتی رہی۔ بہر حال اب بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس سمت میں حوصلے اور ہمت کے ساتھ پیش رفت کی ضرورت ہے تاکہ منقطع سلسلے کی پھر سے ابتداء ہو سکے۔

ویسے اردو میں سب سے پہلے مولانا شبلی نعمانی نے اس کی اہمیت وافادیت کو محسوس کیا اور انجمن ترقی اردو کے قیام کے فوراً بعد محمد سجاد مرزا بیگ کو مولانا نے کتابوں کی فہرست سازی کا کام سونپا۔ سجاد مرزا نے پوری لگن کے ساتھ اس کام کو انجام دیا اور "الفہرست" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جو ۱۹۲۳ء میں نظام دکن پریس حیدر آباد سے شائع ہوئی۔ یہ ۸۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ پھر ایک طویل عرصے تک اس طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ اس جمود کو بابائے اردو مولوی عبدالحق نے توڑا۔ مولوی عبدالحق کو اس کام کی اہمیت وافادیت کا شدید احساس تھا چنانچہ انھوں نے کراچی جانے کے بعد کل اردو مطبوعات کی فہرست سازی کا کام شروع کیا۔ اسکی پہلی جلد "قاموس الکتب" کے نام سے ۱۹۶۱ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع ہوئی۔ اس میں صرف مذہبیات سے متعلق کتابوں کی تفصیل ہے۔ اس کتاب میں صرف اسلام ہی نہیں "مذاہب عالم" پر اردو میں شائع ہونے والی کتابوں کو ۱۶۸ عنوانات قائم کر کے اس کے تحت درج کیا گیا ہے۔ اس کی ضخامت تقریباً ۱۲۰۰ صفحات ہے۔ دوسری جلد "تاریخیات" سے متعلق ہے جس میں فلسفہ تاریخ، تہذیب وتمدن، تعلیم وثقافت، فنون لطیفہ، جغرافیہ ہند، جغرافیہ عالم، آثار قدیمہ، سوانح عالم، مذہبی شخصیات، فلسفی اور سائنس داں گویا تاریخ ہند وتاریخ عالم سے متعلق اردو کتابوں کو مختلف موضوعات وعنوانات کے تحت درج کر کے ایک مربوط ومبسوط فہرست تیار کی گئی ہے۔ اس کی ضخامت تقریباً ۶۰۰ صفحات ہے۔ تیسری جلد "سماجیات" سے متعلق ہے۔ جس میں سماجیات، معاشیات مالیات، تجارت، صنعت وحرفت، زراعت، مواصلات، سیاسیات، قانون تعلیم، فلسفہ، دیگر علوم وفنون کے جلی عنوانات اور پھر ان سب کے ذیلی عنوانات کے تحت اندراجات ہیں۔ اور اس کی ضخامت بھی سات سو صفحات ہے۔ اب تک اس کی یہی تین

جلدیں شائع ہوئی ہیں۔

سنٹرل ریفرنس لائبریری کلکتہ (نیشنل لائبریری) نے اس سمت میں بے حد اہم قدم اٹھایا ہے۔ یہ لائبریری ہر سال لائبریری میں آنے والی مختلف زبانوں اور علوم وفنون کی کتابوں کی ایک فہرست اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع کرتی ہے۔ جس میں اردو میں شائع ہونے والی مختلف علوم وفنون کی کتابوں کی فہرست مع تفصیلات ہوتی ہیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۸ میں شروع کیا گیا تھا اور اب تک پابندی کے ساتھ جاری ہے۔

آزاد ہندستان میں تاخیر ہی سے سہی اس قسم کے کام کی اہمیت وافادیت کو سب سے پہلے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے محسوس کیا۔ اور ترقی اردو بیورو کے پراجیکٹ کے تحت وضاحتی کتابیات کی تیاری کا کام شروع کرایا۔ اس کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی جلد میں ۱۹۷۶ء میں مطبوعہ کتابوں کی وضاحتی فہرست ہے۔ دوسری جلد میں ۱۹۷۷۔۷۸ء میں مطبوعہ کتابوں کی فہرست ہے اور اس میں بلا تخصیص موضوعات ہر طرح کی کتابیں شامل ہیں۔ اس کی درجہ بندی صنف کے اعتبار سے کی گئی ہے اور الفبائی ترتیب کے تحت ہر صنف کی کتابوں کی فہرست دے دی گئی ہے۔ دوسری ترتیب سبجکٹو ہے یعنی طب، سائنس ودیگر سبجکٹ کی کتابیں اس عنوان کے تحت دی گئی ہیں۔ یہ بھی ایک طریقہ ترتیب ہے اور اسے ہم سہل طریقہ ترتیب کہہ سکتے ہیں۔ موضوعات کی درجہ بندی کر کے اس فہرست کو مزید سائنٹفک اور مفید بنایا جا سکتا تھا۔ مگر پتا نہیں کیوں اسے ایک عمومی فہرست ہی بنایا گیا۔ بہر حال یہ کام جس نوعیت کا بھی ہو ایک اچھی شروعات کہی جائے گی۔ جمود اور تعطل کی فضا کو توڑ کر اس طرح کے کاموں کا حوصلہ کرنا بھی بڑی بات ہے۔ اس کتاب سے محقق کو بہت کچھ سہولت فراہم ہوگی۔ لیکن افسوس کہ یہ سلسلہ بھی جاری نہیں رہ سکا اور تین جلدوں کے بعد یہ کام بند ہو گیا۔

چند سال قبل اردو اکادمی دلی نے اردو ناشروں اور تاجروں کی ڈائرکٹری شائع کی ہے۔ جو ہندستان میں اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔ اس میں ہندستان بھر کے اردو ناشروں اور تاجروں کا مکمل پتا درج ہے۔ اس ڈائرکٹری سے ہر طرح کے لوگوں کو کافی سہولت فراہم ہوگئی ہے۔ اس سے قبل ساہتیہ اکادمی دہلی نے ہندستانی زبانوں کے ادیبوں کی ایک ڈائرکٹری شائع کی تھی۔ لیکن یہ ڈائرکٹری اردو والوں کی ضروریات کو مکمل طور پر پورا کرنے کی اہل نہیں تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر ایک ایسی جامع ڈائرکٹری کی ضرورت عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی جو اردو ادیبوں اور فن کاروں کا

مکمل احاطہ کر سکے۔ اس خلا کو پورا کرنے کے لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ اور عبدالطیف اعظمی نے مل کر اردو ادیبوں اور شاعروں کی ڈائرکٹری تیار کی جو دلی اردو اکادمی نے شائع کر دی ہے۔ اب اس کا نظر ثانی شدہ اڈیشن بھی جلد ہی منظر عام پر آنے والا ہے۔

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے ۱۹۸۳ء میں "دستاویز" کے نام سے مصنفین کی ایک ایسی ڈائرکٹری شائع کی تھی جس میں ۳۰۰ مصنفین کے خود نوشت خاکے شامل ہیں۔ اس دستاویز کی تاریخی اہمیت یوں بھی مسلم ہے کہ یہ مصنفین کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی معلومات ہیں۔ یہ ایک بہتر کوشش تھی مگر اس کی دوسری جلد ہنوز شائع نہیں ہو سکی ہے۔ جس سے افادیت سے بھرپور اس کام کو ایک اور دھچکا لگا ہے۔

دنیا کی تمام اہم زبانوں میں انسائیکلو پیڈیا موجود ہے اور اردو میں عرصے سے اس کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی۔ چونکہ یہ کام بے حد مشکل تھا لہٰذا کوئی بھی ادارہ اس کام کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ مبارک باد کے مستحق ہیں اردو کونسل کے لوگ کہ انھوں نے اس اہم اور افادیت سے بھرپور کام کا نہ صرف بیڑا اٹھایا بلکہ اسے انجام تک پہنچا دیا اور بارہ جلدوں میں اس مخزن علوم کو تیار کر کے اردو والوں کی دیرینہ خواہش کو پورا کر دیا۔ اس پراجیکٹ کو ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد کے حوالے کیا گیا تھا۔ اس میں تفصیلی مقالے اور مختصر اندراجات مختلف علوم کے ماہرین نے سپرد قلم کیے ہیں۔ یہ انسائیکلو پیڈیا کولمبیا انسائیکلو پیڈیا کے خطوط پر تیار کیا گیا ہے۔ البتہ جہاں ضروری ہوا ترمیم واضافہ کر کے اہل اردو کے مزاج اور ضرورت کے مطابق بنایا گیا ہے۔

یہ مخزن علوم ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے اس کی ابتدائی چار جلدیں سائنسی بشریاتی علوم کی مبادیات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ باقی آٹھ جلدوں میں اجمالی مضامین ہیں جو تقریباً تمام علوم کی شاخوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔ پہلی جلد آثار قدیمہ، انجینئرنگ، ارضیات اور ادبیات کے بارے میں ہے۔ ان میں کلیدی مبادیاتی مضامین ہیں، دوسری جلد میں حیاتیات، تعلیم، جغرافیہ، جنگلات، اسلامی تاریخ، ہندستانی تاریخ، عالمی تاریخ اور حیوانات سے متعلق مبادیاتی مضامین ہیں۔

تیسری جلد میں زراعت، ریاضیات، ادویہ، طبیعیات، فلسفہ، نفسیات، پولیٹکل سائنس اور ساجیات سے متعلق مبادیاتی مضامین ہیں۔ چوتھی جلد میں فلکیات، فنون، قانون، کیمیا، لائبریری سائنس، مذاہب، معاشیات، معدنیات، نباتات نشرواشاعت اور

نظم و نسق سے متعلق کلیدی مضامین ہیں۔ مخزن علوم میں مناسب اور بر محل نقشے، خاکے اور تصاویر وغیرہ بھی شامل ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا کا کام ۷۳-۱۹۷۲ء میں شروع کیا گیا تھا۔ مسلم یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر فضل الرحمٰن اسکے ایڈیٹر ان چیف اور پروفیسر ایم۔ اے۔ خسرو ادارتی بورڈ کے صدر ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا کی پہلی اور دوسری جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور بقیہ جلدوں کے جلد ہی شائع ہونے کی امید ہے۔

ان کے علاوہ ہندستان میں کچھ موضوعات پر بھی کام ہوئے ہیں اور ان کے اشاریے تیار کیے گئے ہیں۔ فاطمہ راجا نے "اردو فکشن کی وضاحتی فہرست" تیار کی ہے۔ جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۷ء تک شائع ہونے والے ناولوں، افسانوی مجموعوں اور افسانوی تراجم پر محیط ہے۔ اس میں ناولوں اور افسانوں کی تمام قسموں کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ فہرست گرچہ مختصر ہے اور اس میں اس مدت میں شائع ہونے والی تمام فکشن کتب شامل بھی نہیں ہیں پھر بھی یہ کتاب ریسرچ کو ایک عمدہ ببلو گرافی فراہم کرتی ہے اور افادیت سے بھرپور ہے۔ "ترقی پسند ادب۔۔ وضاحتی کتابیات" کو ڈاکٹر ارتضیٰ کریم اور ڈاکٹر توقیر احمد خاں نے مل کر مرتب کیا ہے۔ "آزاد غزل کا اشاریہ" مظہر امام نے مرتب کیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے اردو مثنوی پر کام کیا ہے۔ انھوں نے اردو کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مثنویوں کی تفصیلات جمع کی ہیں۔ ان کی کتاب "کتابیات اردو مثنوی" میں ۲۵۲ مثنوی نگاروں کی تقریباً پانچ سو مثنویوں کی تفصیلات مع لائبریری کیٹلاگ کے درج ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی اثر نے دکنیات کو موضوع بنایا ہے اور "دکنی اور دکنیات" کے نام سے کتابوں کی وضاحتی فہرست تیار کی ہے۔ یہ دونوں فہرستیں ۸۲-۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی ہیں۔

تنقیدی مضامین پر مشتمل ایک اشاریہ "اشاریہ تنقید" کے نام سے پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے مرتب کیا ہے۔ یہ اشاریہ ۱۸۴ مصنفین کی ۲۸۸ تنقیدی مجموعوں کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین کو مختلف موضوعات کے تحت موضوع وار تقسیم کر کے درج کیا گیا ہے۔ ہر موضوع کے ذیل میں مصنفین کے ناموں کی الفبائی ترتیب دی گئی ہے۔ ہر مقالے کے سامنے اس کتاب کا نام درج ہے جس میں وہ مقالہ شامل ہے۔ اس طرح مطلوبہ مواد تک متلاشی کی رسائی بہ آسانی ہو سکتی ہے۔ اس کتاب میں پچاس موضوعات قائم کیے گئے ہیں جس کے تحت ۲۸۸ کتابوں کے مقالات کو ترتیب

دے دیا گیا ہے۔ گرچہ مرتب کا کہنا ہے کہ ۱۹۸۵ء تک شائع ہونے والے تمام تنقیدی مجموعوں کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ دعوا مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ ۱۹۸۵ء تک شائع ہونے والی تنقیدی کتابوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ البتہ علی گڑھ کی لائبریری میں موجود تنقیدی مجموعوں کی تعداد شاید صرف اتنی ہی ہو۔ ورنہ یہ تعداد ہندوپاک کو ملا کر کئی گنا زیادہ ہوگی۔ اگر اس کام کو مزید وسعت دے کر تمام تنقیدی مجموعوں کی مدد سے اس اشاریہ کو دوبارہ مرتب کیا جائے تو یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا اور محقق کے لیے ایک بڑی نعمت، ویسے افادیت کے لحاظ سے یہ مختصر اشاریہ بھی اپنی جگہ بے حد مفید ہے اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے کے لائق ہے۔

قاموس الادب' کے نام سے ایک کتاب جالب مظاہری نے مرتب کی ہے۔ ادھر شخصیات پر بھی چند اچھے اشاریے تیار ہوئے ہیں۔ کچھ تو کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور کچھ مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ اشاریے غالب 'اقبال' پریم چند اور آزاد پر شائع ہوئے ہیں۔ غالب پر نثار احمد فاروقی 'ڈاکٹر انصار اللہ نظر' ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی اور ابن قیصر نے اقبال پر عبدالقوی دسنوی 'ایم حبیب خان اور پریم چند پر عبدالقوی دسنوی نے اشارے تیار کیے ہیں۔ "قاموس الاقبال" کے نام سے عبدالجبار شاکر نے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ جس میں اقبالیات پر شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست ہے۔ "علامہ محمد اقبال" محمود الحسن نے اور "کلید اقبال" نذیر احمد ملک نے مرتب کی ہے۔ جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کا معین الرحمان نے جائزہ لیا ہے۔ کتابیات اقبال کے نام سے ایک کتاب رفیع الدین ہاشمی نے بھی مرتب کی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندستان میں مختلف موضوعات پر کتابوں کی فہرست سازی کا کام کسی منصوبہ بند طریقے سے ابھی تک نہیں ہو سکا ہے اور نہ ہی حوالہ جاتی کتب کی تیاری کی طرف کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔ ایک تو اس ملک میں اس طرح کے اہم اور مفید کام کی طرف توجہ بہت تاخیر سے کی گئی۔ اس کے باوجود اس سمت میں کوئی خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہو پا رہی ہے۔ ہر محقق اور ناقد اس کی ضرورت محسوس تو کرتا ہے لیکن اس کام کے لیے کوئی بھی اپنے آپ کو جوکھم میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ جب کہ تحقیقی کاموں کے سلسلے میں وضاحتی فہرستوں اور حوالہ جاتی کتب کی جس قدر ضرورت ہوتی ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی حیثیت بنیادی ٹولس کی ہے۔ کسی بھی موضوع پر تحقیق کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس موضوع پر موجود تمام مواد محقق

کے پیش نظر رہے۔ تب ہی صحت مند اور معتبر تحقیق کا فریضہ انجام دیا جاسکتا ہے۔ اور اس سمت میں ہماری بہتر رہنمائی حوالہ جاتی کتب اور اشاریہ ہی کر سکتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف موضوعات پر اشاریے اور وضاحتی کتابیات کی فہرست سازی کا کام ایک خاص منصوبے کے تحت منظم طریقے سے کیا جائے۔ تاکہ اس سائنٹفک دور میں ہم تحقیق کی ضروریات اور مطلوبہ معیار کو پورا کرنے کے اہل ہو سکیں۔

ہندستان کی بہ نسبت پاکستان میں اشاریہ سازی کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے اور بہت بڑے پیمانے پر وہاں یہ کام انجام دیا گیا ہے۔ ہر موضوع پر الگ الگ ببلوگرافیاں تیار کی گئی ہیں۔ نیشنل بک سنٹر آف پاکستان نے ۷۳-۱۹۷۲ء میں عالمی سال کتاب" منایا اسی موقع پر مختلف موضوعات کے تحت پاکستان میں شائع ہونے والی تمام کتابوں کی ببلوگرافیوں کا بھی ایک جامع منصوبہ بنایا گیا اور ہر موضوع پر الگ الگ ببلوگرافی تیار کی گئی۔ اس منصوبے کے تحت پاکستان میں اب تک مندرجہ ذیل موضوعات پر ببلوگرافیاں تیار کی جا چکی ہیں۔ جو اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہیں۔

تنقید اور تاریخ ادب' شاعری کی کتابیں' تاریخ کی کتابیں' سیرت رسول' بچوں کی کتابیں' سائنس، انجینئرنگ اور ٹکنالوجی' زراعت مرغبانی مویشیات' پنجابی کتابیں' بلوچی وبراہوی کتابیں' پشتو کتابیں' فارسی کتابیں' عربی کتابیں' سندھی کتابیں' تاریخ' سوانح' ناول' افسانہ ڈرامہ' خلفائے راشدین، ہنر اور پیشے' قرآن وحدیث و تفسیر' پاکستان میں عادات مطالعہ' فقہ تصوف' مباحث' علمی کتابیں اول ودوم' طبی کتابیں' حوالہ جاتی کتابیں' ارکان واصول اسلام' پشتو شاعروں کی ڈائرکٹری' پاکستانی مصنفین کی ڈائرکٹری' پنجابی مصنفین کی ڈائرکٹری' لاہور بک ٹریڈ ڈائرکٹری' اسلامیات اول ودوم' اردو کتابوں کی ڈائریکٹری' اسی ادارے نے اردو ببلوگرافی اور ڈائرکٹری کے علاوہ انگریزی میں سولہ ببلوگرفیاں اور ڈائرکٹریاں تیار کرائی ہیں۔

"مقتدرہ قومی زبان" پاکستان نے بھی حوالہ جاتی امور کی طرف خصوصی توجہ دی ہے اور اپنے مخصوص منصوبوں کے تحت مختلف موضوعات پر حوالہ جاتی کتب شائع کی ہیں۔ مقتدرہ کی جانب سے اب تک درج ذیل حوالہ جاتی کتب شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔

"کتابیات قواعد اردو" کتابیات اردو املا اور دوسرے مسائل" کتابیات اردو تفاسیر اردو میں زرعی کتب" کتابیات اردو مطبوعات ۱۹۸۳ء' ۱۹۸۴ء' ۱۹۸۵ء' ۱۹۸۴ء قرآن

کریم کے اردو تراجم (کتابیات) "کتابیات تراجم اول دوم "کتابیات اردو فارسی اصطلاحات سازی "کتابیات تعلیم "کتابیات قانون اردو' احادیث کے اردو تراجم "کتابیات پاکستان کے اردو اخبارات ورسائل ' پاکستان کے اردو اخبارات ورسائل' اول دوم' پاکستان میں مخطوطات کی فہرست 'فہرست کتابیات اسلام' اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ ' ہمارے کتب خانے "کتابیات لغات اردو'

درج بالا فہرست سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پاکستان کے اردو اداروں نے اس طرف کتنی منصوبہ بند کوشش کی ہے۔ جس کے نتیجے میں اردو کے حوالے جاتی ذخیرے میں نہ صرف بیش قیمت اضافہ ہوا ہے بلکہ تحقیق کے طالب علموں کے لیے آسانیاں بھی فراہم ہوئی ہیں۔

نیشنل بک سنٹر آف پاکستان اور مقتدرہ قومی زبان دونوں ہی نے جس منظم اور منصوبہ بند طریقے سے اس کام کو کیا ہے وہ لائق تحسین ہے اور دوسرے اداروں کے لیے مشعل راہ' ان اداروں کی منظم اور منصوبہ بند کوششوں سے اس سمت میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس نے حوالہ جاتی کتب سے اردو کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ اب بھی ایسے بہت سے موضوعات ومضامین ہیں جن پر اس طرح کا کام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام ایک پیش رفت ضرور ہے لیکن اسی پر اکتفا کرلینا مناسب نہیں، بلکہ نئے نئے موضوعات پر اسی طرح کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کام کی افادیت اس کے انجام پانے کے بعد ہی زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ درج بالا حوالہ جاتی کتب میں بہت سے ایسے موضوعات ہیں جن کی طرف عام آدمی کا ذہن کبھی جاتا بھی نہیں۔ لیکن آپ ان حوالہ جاتی کتب کا مطالعہ کریں تو حیرت انگیز انکشافات ہوں گے اور آپ حیرت زدہ ہو جائیں گے کہ اردو میں کن کن موضوعات پر کتابیں موجود ہیں اور ہمیں ان کی معلومات بھی نہیں۔ مثال کے لیے میں صرف ایک موضوع پر ترتیب دی گئی دو کتابوں کا ذکر کردینا مناسب سمجھتا ہوں جو سائنسی ادب سے متعلق ہے تاکہ قارئین کو اس کی افادیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

"اردو میں سائنسی ادب" کے نام سے ایک کتاب حمید الدین شاہد کی ۱۹۶۹ء میں باب الاسلام پریس کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ سائنسی ادب کے اشاریے کی یہ پہلی کتاب ہے۔ اس میں ادوار کی تقسیم کرکے کتابوں اور رسائل کی فہرست دی گئی

ہے۔ پہلا دور (۱۵۹۱ـ۱۸۴۲) دوسرا دور (۱۸۴۳ـ۱۸۷۷) تیسرا دور (۱۸۴۳ـ۱۸۵۳) چوتھا دور دہلی کالج (۱۸۴۱ـ۱۸۵۷) پانچواں دور سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ (۱۸۶۲ـ۱۸۷۷) چھٹا دور رڑکی کالج (۱۸۵۶ـ۱۸۸۸) اس کے بعد ۱۸۴۶ سے ۱۸۷۰ تک کے اخبارات ورسائل کا جائزہ اور فہرست ہے۔ پھر ۱۸۴۳ تا ۱۹۰۰ تک کی گئی انفرادی کوششوں کا تذکرہ ہے۔ اور اس کی مکمل فہرست دی گئی ہے۔ پھر آخر میں شمس العلماء منشی محمد ذکاء اللہ کی سائنسی کتابوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ گویا سائنسی ادب کی مکمل تاریخ از اول تا ۱۹۰۰ تک کتابوں کی فہرست کے ذریعے مرتب کردی گئی ہے۔ جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اردو میں سائنسی ادب کا رجحان کس قدر قبل سے موجود ہے اور آج کی نسل اس سے بالکل ناواقف ہے۔ یہ فہرست اردو دانوں کی احساس کمتری کو دور کرنے میں بھی مدد کرے گی اور جدید دور میں سائنسی علوم کی تعلیم اردو میڈیم کے ذریعے ممکن بنانے میں مایوس افراد کو حوصلہ فراہم کرے گی۔ اس لیے کہ اردو میں اصطلاحات بہت قبل سے ہی موجود ہیں صرف ان کے تجدید کی ضرورت ہے۔ تاکہ عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔

اس ضمن میں دوسری کتاب "اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ" ابو اللیث صدیقی (۱۹۸۱ء) کی ہے۔ میں یہاں اس کتاب میں مندرج موضوعات کی فہرست دے رہا ہوں جن پر اردو میں کتابیں موجود ہیں جو اس اشاریہ میں شامل ہیں۔

(۱) طب: اصول فن: اصول فن، اصول تشخیص و تجویز، امتحان بول و براز، نبض، اصول و قواعد، تاریخ و طریقہ ہائے علاج۔ تاریخ اور مختلف طریقہ ہائے علاج، انجکشن، ایلوپیتھی، بایوکیمک، جراحی، علاج بالحیوانات، علاج بالکیمیا، نفسیاتی طریقہ علاج، ویدک، ہومیوپیتھی۔

(۲) دواسازی: اصول و فن، مرکب ادویہ، مفرد ادویہ، نسخہ جات۔

(۳) امراض: اعصابیات، امراض پیرانہ سالی، امراض مخصوصہ، امراض مستورات، بخار و بحران، جانوروں کا کاٹنا اور اس کا علاج۔ جنسیات، سانس، سرطان، منشیات،

(۴) وبائی امراض: عام وبائی امراض، چیچک، طاعون، ہیضہ۔

(۵) مختصر اعضائے جسمانی اور ان کے امراض: چشم، دانت، دل، زبان، سر کان۔ پھیپھڑے،

(۶) علم تشریح: علم تشریح، فعلیات، جسم، جوڑ، عروق شریان عضلات۔

(۷) علم الولادت: فن قبالت، بچوں کی پرورش، ضبط تولید۔

(۸) متفرقات (طب): اصطلاحات ولغات طب آلات غذا' پہلی طبی امداد' تیمارداری' حفظان صحت' غذا و خوراک' قانون طب' ورزش حیاتیات' نباتیات' حیاتیات' حیوانیات' طبی جغرافیہ' موسمیات' طبیعات' کیمیا۔

(۹) زراعت: مٹی کا علم' کھاد' اصول وہدایت اور طریقہ ہائے کاشت زراعت وباغبانی' بیج آلات زراعت' پانی' کھاد' پودوں کی بیماریوں اور کیڑوں سے بچاؤ۔

(۱۰) مختلف فصلیں: اصول وہدایت کاناج چاول' گندم وجو' مٹر' مکئی۔

(۱۱) سبزیاں: طریقہ ہائے کاشت' موسم سرما کی سبزیاں' موسم گرما کی سبزیاں متفرق سبزیاں۔

(۱۲) نقدی فصلیں: پٹسن' تمباکو' کپاس' گنا' متفرق فصلیں۔

(۱۳) جنگلات:

(۱۴) باغات: باغبانی' پھول' پھل' مختلف پھل اور ان کی کاشت۔

(۱۵) پھولوں کی بیماریاں اور ان کا انسداد:

(۱۶) مویشی اور ان کی پرورش: بھیڑ' بکری' عام مویشی' خوراک' بیماریاں اور علاج۔

(۱۷) زرعی ودیگر مصنوعات: مصنوعات: اچار' چٹنی' مربے' ڈیری فارمنگ' مصنوعات پھل' متفرقات۔

مرغیاں اور انڈے: اصول وہدایت' مرغیوں کی خوراک' مرغیوں کی بیماری اور ان کا علاج۔

(۱۸) شہد کی مکھیاں اور ریشم کے کیڑے پالنا: ماہی پروری۔

(۱۹) تعمیرات: عام اصول وفن' پل بنانا' سڑکیں بنانا' سیاکش' ریلوے۔

(۲۰) ہائیڈرالک انجینئرنگ: دریا اور نہریں' پانی کی نکاسی۔

(۲۱) سواریاں: موٹر' موٹر سائیکل' جہاز' ہوائی جہاز۔

(۲۲) انجینئرنگ: مکینکل انجینئرنگ' ورکشاپ انجینئرنگ' موٹر سیل اور بیٹریاں' برقی انجینئرنگ۔

(۲۳) مواصلات: عام اصول' ریڈیو' ٹیلی وژن' ٹرانسمیٹر' ٹیلی فون' ٹیلی گراف' وائرلیس۔

(۲۴) انجن: آئل اور گیس انجن' دیگر انجن۔

(۲۵)گھریلو مشینیں(۲۶)خزاو(۲۷)فوجی انجینئرنگ۔

اس اشاریہ کو دیکھ کر معلومات میں جو اضافہ ہوگا وہ تو الگ ہے۔ لیکن ذرا غور کیجیے اردو کے کتنے قاری کو ان موضوعات پر اردو میں کتابوں کے موجود ہونے کا علم ہے۔ کیا یہ اشاریہ ان کے دل ودماغ کو منور نہیں کردیتا۔ اگر یہ اشاریہ نہیں ہوتا تو ہم اردو میں ان موضوعات پر کتابوں کے موجود ہونے کا اس قدر وسیع علم حاصل نہیں کرسکتے۔ یہ تو ایک مضمون کا معاملہ ہے۔ بقیہ دوسرے مضامین کا بھی یہی حال ہے۔ دراصل اس کے بغیر ہم تاریکی میں ناٹک ٹوہیا کرتے رہتے ہیں اور ہمیں صحیح معلومات حاصل نہیں ہوپاتی۔ حوالہ جاتی کتب کی یہی افادیت ہے کہ وہ ہمیں اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے آتی ہے۔ اور ہماری معلومات میں بے پناہ اضافہ کردیتی ہے۔ ایک اشاریہ کی تیاری میں کئی برس لگ جاتے ہیں لیکن استفادہ کرنے والا منٹوں میں برسوں کی محنت کا فائدہ اٹھالیتا ہے۔ اس قدر افادیت سے بھرپور امور کی طرف ہماری بے توجہی زبان وادب کی ترقی کے راستے میں کس قدر رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ ہمیں اس سمت میں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ان دونوں اداروں کے علاوہ پاکستان میں اور اداروں نے بھی اس سمت میں مثبت قدم اٹھائے ہیں اور اسی نوعیت کے کچھ دوسرے کام کیے ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے کتابیات: پاکستانی ادب ۱۹۹۰ء کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں اردو' پنجابی' سرائیکی' سندھی' پشتو' بلوچی زبان کی کتابوں کی فہرست ہے جو ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی ہیں۔ اسی ادارے نے پاکستانی اہل قلم کی ڈائرکٹری بھی شائع کی ہے۔ ایک اور ڈائرکٹری "ہمارے اہل قلم" کے نام سے زاہد حسین انجم نے مرتب کی ہے جسے ملک بک ڈپو لاہور نے شائع کیا ہے۔ مغربی پاکستان اردو اکادمی لاہور نے فہرست ذخیرہ کتب حکیم محمد موسیٰ امرت سری کے نام سے شائع کی ہے۔ فہرست کتابیات اسلام مرتبہ جمیل احمد صدیقی بھی اسی ادارے نے شائع کی ہے۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں ایک بہت ہی اچھا کام سید افتخار حسین بلگرامی کی نگرانی میں ہوا ہے۔ "ارمغان حق" کے نام سے یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوچکی ہے۔ اس میں ۱۴۰۰ کتب سیرت کی وضاحتی فہرست بے حد سلیقے سے دی گئی ہے۔ جس میں کتاب کا نام' نام مصنف' صفحات' سال اشاعت' ایڈیشن' قیمت' ناشر کا نام وپتا' نام کتب خانہ یا مالک کتاب' ودیگر کوائف، یعنی تمام ضروری

علومات فراہم کردی گئی ہے۔ دیگر کوائف میں کتاب کا مختصر تعارف دیا گیا ہے۔ یہ باب ایک آئینہ ہے اس طرح کا کام کرنے والوں کے لیے۔ سیرت پر میرے خیال میں اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے جس میں ۱۴۰۰ کتب سیرت کی تفصیلات دی گئی ہے جو تلف زبانوں میں شائع ہوئی ہیں۔ اس میں اردو، پنجابی، پشتو سرائیکی، سندھی، فارسی، عربی، چینی، بلوچی، براہوی، گجراتی، ہندی، بنگلہ، انگریزی، فرنچ، جرمن، اطالوی ترکی زبانوں میں شائع ہونے والی کتب سیرت کی تفصیلی فہرست ہے۔ یہ فہرست ہر طرح سے مکمل ہو ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ان کے محدود وسائل میں جو کام ہو سکتا تھا وہ انھوں نے کرلیا ہے۔ لیکن اس سلسلے کی یہ پہلی اور اچھی کوشش ہے۔ سیرت پر کام کرنے والے افراد کے لیے یہ کتاب ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ مختلف موضوعات پر اسی طرح کا کام کرنے کی ضرورت ہے۔

کچھ اور اداروں نے بھی اسی نوعیت کے کچھ کام کیے ہیں۔ سندھ میں اردو مطبوعات 'مرکزی اردو بورڈ لاہور نے شائع کی ہے۔ یہ ۵۰۷ صفحات کی ہے۔ سیرت پر دوسری ضخیم کتاب "فہرست کتب سیرت کے نام سے مجلس اسلامیات اسلامیہ کالج لاہور (۱۹۶۳ء) نے شائع کی ہے۔ "مرأۃ التصانیف" محمد عبدالستار قادری کی کتاب ہے جو مکتبہ قادریہ لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں ہند وپاک کے ۸۷۹ اہل قلم کی ۶۵۳۳ تصانیف کا اجمالی تعارف ہے جو مختلف موضوعات پر ہیں۔

اس طرح پاکستان کے مختلف اداروں نے اپنی بساط بھر اس سمت میں کوشش کی ہے اور لوگ اس معاملے میں وہاں زیادہ حساس ہیں۔ اور اس طرح کے کاموں کی اہمیت وافادیت سے کماحقہ واقف ہیں۔ کاش ہندستان میں چند ایسے حساس افراد پیدا ہوتے اور کچھ ادارے اپنے وسائل ان کو فراہم کرتے تو یہ کام چنداں مشکل نہیں تھا۔ بلکہ ایک حوصلہ افزا پیش رفت اس سمت میں ہوتی۔

آج اردو میں اس نوع کے کام کو کرنے کی بے حد شدید ضرورت ہے تاکہ اردو کے محقق اور قاری دونوں ہی کو سہولت ہوسکے اور موجودہ عہد کے تیز رفتار مواصلاتی نظام کے تحت معلومات کی منٹوں میں فراہمی کا نظم ہو جائے۔ اور وہ وقت جو تلاش بے جا میں صرف ہوتا ہے اس کا بہتر استعمال ہوسکے۔ اور اردو کو دنیا کی جدید ترقیاتی زبانوں کی صف میں شامل ہوکر اور ترقی کرنے کا موقع مل سکے۔

مظہر امام
۱۷۶۔ بی پاکٹ امیور وہار، نئی دہلی۔۹۱

۱۹۹۷ کی اردو شاعری

(شعری مجموعوں کی روشنی میں)

عام خیال یہ ہے کہ اردو میں شعری مجموعوں کی پیداوار حشرات الارض کی طرح ہے۔ اسکے لیے خاص طور پر اکیڈمیوں، کمیٹیوں وغیرہ کو موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے جن کے مالی تعاون سے اتنی بڑی تعداد میں یہ مجموعے شائع ہوتے ہیں۔ کچھ دل جلے حضرات تو سال میں شائع ہونے والے اردو کے شعری مجموعوں کی تعداد ایک ہزار یا اس سے زیادہ بتاتے ہیں۔ کتب فروشوں کا کہنا ہے کہ شعری مجموعے فروخت نہیں ہوتے، کیونکہ ان کے قاری معدوم ہیں۔ فکشن کے قاری کی شکایت نہیں کی جاتی، لیکن شاعری کے ساتھ ساتھ نزلہ فکشن پر بھی نازل ہوا ہے۔ حکومت ہند کی وزارت ترقی انسانی وسائل کے محکمہ تعلیم کی جانب سے بڑے پیمانے پر اردو مصنفین کی کتابیں خرید کی جاتی ہیں لیکن اس نے شعری مجموعوں اور فکشن کی کتابوں (افسانہ اور ناول) کی خریداری پر قدغن لگا رکھی ہے۔ یعنی "دیوان غالب" کی خریداری نہیں ہوسکتی لیکن غالب پر لکھی ہوئی ادھ کچری کتابیں فراخ دلی سے خریدی جاسکتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ناول نہیں خریدے جاسکتے لیکن ان پر لکھی ہوئی زبان وبیان کی غلطیوں سے پر کتاب بے تکلفی سے خریدی جاسکتی ہے۔ "ذی علم" حضرات کی بالادستی کے دور میں صرف "علمی" کتابوں کی خریداری ہی ممکن ہے۔ تنقید اور تحقیق کے نام سے چھاپی گئی نیم خواندہ مدرسوں اور طالب علموں کی کتابیں "علمی" ہیں، زراعت اور باغبانی کی کتابیں "علمی" ہیں۔ انھیں کون بتاتا پھرے کہ شعر کہنے، افسانہ اور ناول تخلیق کرنے کے لیے علم ہی نہیں، تخیل، مشاہدہ، تجربہ اور بصیرت کی بھی ضرورت ہے۔

کلیم الدین احمد نے اپنے انتقال (۱۹۸۳ء) سے چند سال پہلے یہ مشورہ دیا تھا کہ کم از کم دس سال کے لیے غزل گوئی پر پابندی لگادینی چاہیے۔ دوسری اصناف سخن سے بے اعتنائی اور غزل کی افراط اور بہتات کو دیکھتے ہوئے یہ مشورہ کچھ ایسا بے جا بھی نہیں تھا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ پروفیسر محمد انصار اللہ کے بیان کے مطابق قاضی عبدالودود

نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "مضمونوں اور کتابوں کے چھپنے پر پابندی عائد کردینی چاہیے۔" (کتاب نما فروری ۱۹۹۸ء) ظاہر ہے کہ ان کا اشارہ تنقیدی اور تحقیقی کتابوں ہی کی طرف تھا!

شاعری پر لعنت ملامت کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ شاعری کے علاوہ جو کچھ لکھا جارہا ہے وہ سب "میٹھا میٹھا" ہے!

خیر یہ تو غیر ضروری باتیں تھیں جو تمہید میں در آئیں۔ مجھے علم نہیں کہ ۱۹۹۷ء میں کتنے شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ساری کتابوں تک رسائی ممکن نہیں۔ کچھ مجموعے جو مجھ تک پہنچے یا جن تک میں پہنچ سکا ان کا سرسری تعارف بغیر کسی تنقیدی ادعا کے پیش ہے۔

سب سے پہلے میں دو شعری مجموعوں کا ذکر کرنا چاہوں گا جن پر ہر چند ماہ اشاعت دسمبر ۱۹۹۶ء درج ہے لیکن وہ پڑھنے والوں تک ۱۹۹۷ء میں ہی پہنچے ہیں۔ میری مراد عادل منصوری اور بلقیس ظفیر الحسن کے مجموعوں سے ہے۔

حشر کی صبح درخشاں ہو　　عادل منصوری

اردو کے جدید شاعروں میں عادل منصوری کا نام ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ وہ ۱۹۶۰ء کے بعد ابھرنے والے شاعروں میں معتبر مقام رکھتے ہیں لیکن اب تک ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ چونکہ ہماری توجہ تخلیقی ادب اور خصوصاً شاعری کی جانب کم ہو گئی ہے شاید اسی لیے یہ مجموعہ بھی بے توجہی کا شکار ہے۔ ویسے عادل منصوری کا کلام ہمیشہ سے ترسیل کے لیے ایک مسئلہ بنا رہا ہے۔ بے توجہی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ عادل منصوری نے اسلامی تاریخ کے حوالے سے کئی نظمیں کہی ہیں لیکن کہیں کہیں اسلامی تاریخ کو منظوم کرنے کی کوشش بھی ملتی ہے جیسے "قلم اٹھا لیے گئے" میں۔ ان کی نظموں کی عام فضا کا اندازہ لگانے کے لیے یہ چند سطریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس نظم کا پہلا مصرع نظم کا عنوان بھی ہے:

لہو سبز سیلاب آوا گمن
ظفر جاحتی تیرگی تالیاں
کمر چٹے ہیں خوابوں کو ناخن نظر
مگر
مفلسی
راگنی کاہ جنگلوں میں رطوبت طرب

شاعری کے اس رویے کو بقول شمس الرحمٰن فاروقی "میر کی نظم سے [illegible] خود کار تحریر، جذبے کے آزاد تلازمات پر مبنی ہوئی وضع سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔"

غزلوں کے بعض اشعار میں نیا پن اور اظہار کی بے باکی ہے لیکن اکثر غزلوں میں ناہمواری کا احساس ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں یہ اشعار بہت مشہور ہوئے تھے:

چاروں طرف سے بریکیں لگیں، ہودن بج اٹھے
رستے کے بیچوں بیچ وہ لڑکی ٹھہر گئی

بسمل کے تڑپنے کی اداؤں میں نشہ تھا
میں ہاتھ میں تلوار لیے جھوم رہا تھا

گیلا ایندھن　　　بلقیس ظفیر الحسن

مجموعے کا انتساب ہے:

"اپنی ماں اور ان تمام عورتوں کے نام جنھیں اپنی محنتوں کا صلہ جس کی وہ مستحق ہیں، کبھی نہیں ملتا۔"

اس انتساب سے ہی شاعرہ کے مزاج کا اندازہ لگانے میں مدد مل سکتی ہے۔ گیلا ایندھن جس میں آگ کم ہوتی ہے، دھواں زیادہ ہوتا ہے۔ اور شاید یہی عورت کا مقدر رہا ہے۔ اس احساس کی بازگشت بلقیس ظفیر الحسن کی کئی نظموں میں سنائی دیتی ہے۔ حالات حاضرہ پر ان کے تبصرے بھی نہایت معنی خیز ہیں لیکن کہیں کہیں واشگاف لہجہ بھی در آیا ہے جو گراں گزرتا ہے۔ انھیں اظہار پر غیر معمولی قدرت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے جوہر غزلوں سے زیادہ نظموں میں کھلتے ہیں۔ وہ نظموں کی بہت اچھی شاعرہ ہیں۔ کسی زمانے میں وہ بلقیس رحمانی بانو کے نام سے افسانے لکھا کرتی تھیں۔ لہذا ان کی کئی نظموں میں ایک افسانوی فضا موجود ہے۔ اس مجموعے پر توجہ دی جانی چاہیے۔

زمستاں سرد مہری کا　　　اختر الایمان

کلیات "سر و ساماں" اور مجموعہ نظم "زمین زمین" کے بعد ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۶ء کے دوران لکھی ہوئی نظموں کا مجموعہ اختر الایمان کے انتقال کے بعد ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا ہے۔ اسے سلطانہ ایمان اور بیدار بخت نے مرتب کیا ہے۔ ابتداء میں سلطانہ ایمان کی ایک تحریر ہے جو گہرے تاثر کی حامل ہے۔ اس سے اختر الایمان کی شخصیت کے کئی پہلو

اجاگر ہوتے ہیں۔ آخر میں بیدار بخت کا ایک طویل بہت محنت سے لکھا ہوا مضمون ہے جو ایک طرح اخترالایمان کی شاعری کا محاکمہ ہے۔ اس سے شاعر کے تخلیقی عمل کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔ "کاتا اور لے دوڑی" پر عمل کرنے والے شاعروں اور ادیبوں کے لیے یہ اطلاع اہم ہے کہ اخترالایمان کی مشہور نظم "ایک لڑکا" اٹھارہ بیس سال میں مکمل ہوئی۔ پہلے ایک خیال ذہن میں آیا۔ پھر ایک پیٹرن بنا پھر آہنگ بنا۔ مجموعہ مختصر ہے۔ مگر آخری دور کا اور دوران علالت کا سارا محفوظ کلام اس میں آگیا ہے۔ کچھ چیزیں شاید نامکمل ہیں اور اخترالایمان نے انھیں شائع کرنا ضروری نہیں سمجھا ہوگا۔ کئی نظموں پر کوئی عنوان نہیں ہے۔ جیسے نظم نمبرا سے نظم نمبر۷ تک۔ ذکر مغفور، تشخیص، بچھڑا ہوا آدمی، رام راج بجنور میں، عزم، وغیرہ نظمیں فوری طور پر متوجہ کرتی ہیں۔

کف آئینہ　پروین شاکر

"ماہ تمام" میں پروین شاکر کے چاروں مجموعے شامل تھے۔ ان کا پانچواں اور آخری مجموعہ ان کی بہن نسرین شاکر کی نگرانی میں شائع ہوا ہے۔ مظہر الاسلام، توصیف تبسم اور امجد اسلام امجد کے زیر اہتمام۔ مجموعے کا نام پروین شاکر نے اپنی زندگی میں ہی طے کیا تھا۔ اپنے شوہر کی بے وفائی اور بے التفاتی کا انھیں ہمیشہ رنج رہا۔ اس مجموعے میں بھی یہ شعر ملتا ہے:

بہت رویا وہ ہم کو یاد کر کے　　ہماری زندگی برباد کر کے

ان کی ایک بے عنوان نظم میں میرابائی کی سی خود سپردگی دیکھی ہی لفظیات میں ملتی ہے، جو پروین شاکر کی شاعری کے عمومی ڈکشن سے الگ ہے۔ مثلاً

منوہر رکیا واروں تجھ پر / میری جیون تھالی میں تو رشیش نہیں کوئی دیوٹ / بس نیناں رہتے ہیں / جلے ہوئے سپنوں کا تحت / ماتھے تیرے کیا تلک لگاؤں / راکھ بھی مری مانگ / لوک میں تیری کیا جل ڈاروں / میں سمپورن پیاس۔

پروین شاکر اپنی شہرت اور ہر دلعزیزی کے بام عروج پر تھیں کہ موت کے جابر ہاتھوں نے انھیں ہم سے چھین لیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کو اور شاید خود کو بھی "ماہ تمام" سے تعبیر کیا تھا۔ لیکن لگتا ہے انھیں اپنا انجام معلوم تھا۔ "کف آئینہ" ہی میں یہ دلدوز شعر بھی ہے:

ستاروں کے لیے بہت کڑی تھی　　یہ رخصت ماہ کی گھڑی تھی

عجب اک مسکراہٹ   وزیر آغا

وزیر آغا ہمارے برگزیدہ شاعروں میں ہیں۔ ۳۸ نظموں کے اس مجموعے میں ساری نظمیں ایک آہنگ میں مربوط دکھائی دیتی ہیں۔ بحروں میں غیر ضروری تنوع روا نہیں رکھا گیا۔ عموماً سادہ اور سبک الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ علامتیں معنی کے کئی مدوجزر پیدا کرتی ہیں۔ مگر کہیں دور از کار نہیں' اس لیے ترسیل کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ تحریت اور معنوی صلابت کا ایسا خوش آہنگ امتزاج وزیر آغا کے یہاں ہی مل سکتا ہے۔ آنکھ اور خواب ان کے محبوب استعارے ہیں۔ کھلی آنکھوں کی حیرت سے زیادہ خوابوں کے طلسم میں کھو جانے کی خواہش ان کی سوچ کا ایک نیا زاویہ ابھارتی ہے:

ہزاروں بار یہ سوچا ہے میں نے
اگر ہم اپنی آنکھیں کھول دیتے
تو حیرت کی جلن ہم کو بھی ملتی
مگر خوابوں کا کیا ہوتا

عشق نامہ   عرفان صدیقی

عرفان صدیقی موجودہ اردو غزل کی ایک نہایت معتبر آواز ہیں۔ ان کی غزلیں ایک خاص اہتزازی کیفیت سے آشنا کرتی ہیں۔ ان کے طرزِ اظہار میں نفاست اور دل آسائی ہے۔ وہ غیر معمولی تخلیقی قوت اور طباعی کے مالک ہیں۔ عشق ان کے لیے طاقت اور حوصلے کا سرچشمہ ہے۔ "عشق نامہ" کی غزلوں میں عشق کا ایک تہذیبی تصور نمایاں ہوا ہے۔ کسی گہرے تجربے کے بغیر ایسی شاعری نہیں ہوسکتی۔

پہلے ہم پچھلی رتوں کے درد کا کرلیں حساب
اس برس کے سارے زخموں کا شمار اگلے برس

عجیب روشنیاں تھیں وصال کے اس پار   میں اس کے ساتھ رہا اور ادھر چلا بھی گیا

سخن میں رنگ تمھارے خیال ہی کے تو ہیں
یہ سب کرشمے ہوائے وصال ہی کے تو ہیں

شعر آسمان   حکیم منظور

حکیم منظور نئی غزل کے معماروں میں ہیں۔ لیکن انھیں ہماری تنقید نے قبول

نہیں کیا۔ کیونکہ وہ کبھی تحریک یا لابی سے وابستہ نہیں رہے۔ "شہر آسمان" ان کے کلام کا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس سے تازگی اور تازہ کاری کا وہ احساس نہیں ہوتا جو ان کے ابتدائی مجموعوں سے ہوتا ہے۔ لیکن اس میں زیادہ منائی زیادہ صلابت اور زیادہ رکھ رکھاؤ ہے۔ کشمیر کے المیے کا اظہار بھی جذبے کی صداقت اور تہذیبی آگہی کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ شعر شاعر کی تخلیقی توانائی کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے:

زمین جب تک نہ اپنا حصہ ادا کرے گی
گلاب کھلتے نہیں ہوا کی سفارشوں سے

حکیم منظور کی قادرالکلامی ان کی غزل "وہ مسافت، راستوں کے راستے سونے لگے" سے ظاہر ہے۔ چودہ اشعار کی اس غزل کے اٹھائیس مصرعوں کا آغاز مختلف قافیوں سے ہوتا ہے۔

وہ نفاست خوشبوئیں بھی چھو نہیں پائیں اسے
وہ نزاکت گل پہ شاخ و برگ شرمانے لگے

آرپار کا منظر — ظفر گورکھپوری

ظفر گورکھپوری ہمارے معدودے چند اچھے غزل گویوں میں ہیں۔ ترقی پسند ادبی تحریک سے ان کا تعلق رہا ہے۔ لیکن وہ کسی خاص رویے کے پابند نہیں ہیں۔ نئے مضامین کو تازہ اسلوب میں پیش کرنے کا انھیں خاص سلیقہ ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ "تیشہ" ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ تیسرے مجموعے "گوکھرو کے پھول" کو نقادوں کی جانب سے پذیرائی ملی۔ اپنے نوجوان بیٹے کی المناک موت سے متاثر ہو کر انھوں نے دل کو چھو لینے والی جو غزلیں کہیں، ان کا مجموعہ "چراغ چشم تر" کے نام سے شائع ہوا۔ "آرپار کا منظر" ان کا پانچواں مجموعہ ہے جو دس سال کے وقفے کے بعد منظر عام پر آیا ہے:

یوں ہی تو زمانے کے نشانے پہ نہیں ہم
کچھ بھی نہ کیا ایسا نہیں، کچھ تو کیا ہے

ہمیں زمین، ہمیں خشت اور ہمیں دیوار گری جو ہم پہ وہ دیوار بھی ہماری تھی۔

پانی پت — رفعت سروش

ہمارے یہاں طویل نظموں کی بڑی کمی ہے۔ اس لیے اگر اتفاقاً کوئی طویل نظم ہمارے سامنے آتی ہے تو بے اختیار نگاہیں اٹھتی ہیں۔ رفعت سروش اردو ادب کا ایک

نہایت معتبر اور مستند حوالہ ہیں۔ "پانی پت" ان کی ایک طویل تاریخی نظم ہے جو سوا سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ہندستان کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کو پانی پت کے حوالے سے پیش کرتی ہے۔ اس میں بیانیہ کے ضروری اوصاف مثلاً تسلسل، منطقی ترتیب، ارتقا اور پھیلاؤ موجود ہیں۔ اس میں نظم کی کئی ہئیتیں استعمال کی گئی ہیں۔ پابند، معرا، آزاد، اس میں غیر معمولی شعری قوت صرف ہوئی ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ اردو میں پہلی نظم ہے۔

لہو بولتا ہے   ستیہ پال آنند

"دست برگ" اور "وقت لاوقت" کے بعد ستیہ پال آنند کا تیسرا مجموعہ نظم "لہو بولتا ہے" کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ جس میں ۸۸ نظمیں ہیں۔ ابتدا ایک نعتیہ نظم "حاضری" سے ہوتی ہے۔ اس میں شاعر کا خلوص پوری طرح اجاگر ہوا ہے۔ "رنگ اکثر بولتے ہیں" "آنے والی سحر بند کھڑکی ہے" "گول پتھر" وغیرہ اچھی نظمیں ہیں۔ کئی نظموں کے عنوانات انگریزی میں ہیں جیسے Still Birth اور My Identity Crisis کتاب میں وزیر آغا اور اختر الایمان کی رائیں بھی شامل ہیں۔ ستیہ پال آنند روش عام سے ہٹ کر کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ غزل کی افراط اور اردو نظموں کے غزلیہ اسلوب سے برگشتہ ہیں۔ ان کی کئی نظمیں پیکر خلق کیے جانے کا تاثر دیتی ہیں۔ اور کچھ محض کسی واقعے کے بیان کا۔ کہیں کہیں طنزیہ لہجہ بھی در آتا ہے۔ ان پر الزام ہے کہ وہ منصوبہ بند طور پر نظموں کا تانا بانا بنتے ہیں اور اس لیے ان کی اکثر نظمیں بیان کی بے ساختگی سے محروم ہیں لیکن ان کی نظمیں ایسی نہیں جن پر خط تنسیخ کھینچ دیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ نظم کی ساخت کا ایک تصور رکھتے ہیں اور وہ اردو میں نظم نگاری کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ "لہو بولتا ہے" میں بحروں کا تنوع بھی ہے جو "دست برگ" میں نہیں تھا۔

سانس کی دھار   قیصر شمیم

قیصر شمیم (یہ دہلی کے ڈاکٹر قیصر شمیم نہیں ہیں) کا پہلا مجموعہ کلام "ساعتوں کا سمندر" اردو اور ہندی دونوں رسم خط میں ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا۔ وہ مغربی بنگال کے پہلے شاعر ہیں جو جدیدیت کے زیر اثر آئے اور جنھوں نے دوسروں کو اس رجحان سے قریب کیا۔ انھیں مغربی بنگال کے واحد گیت نگار ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ ستائیس سال کے طویل وقفے کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ "سانس کی دھار" کے نام سے

شائع ہوا ہے۔ پہلا مجموعہ نظموں اور غزلوں دونوں پر مشتمل تھا۔ دوسرے مجموعے میں صرف غزلیں ہیں۔ یہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۹۲ء تک کہی ہوئی سو غزلوں کا انتخاب ہے۔ قیصر شمیم کی پوری زندگی ناسازگار حالات سے نبرد آزمائی میں گزری ہے اور انھوں نے کبھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان کے کلام کا ایک نمایاں وصف خوش آہنگی ہے۔ خیال میں تازگی اور بیان میں لوچ اور نرمی ہے۔ ابتدائی دور کی غزلوں میں بھی ایک خاص نوع کا چٹیلا پن ہے۔ وہ انسانی زندگی کے رمز آشنا اور انسانی تجربات کے مزاج شناس ہیں۔

حسن ہزار شیوہ — غوث محمد غوثی

غوث محمد غوثی معروف شاعر نہیں ہیں لیکن بہت سے نامور شاعروں سے اچھا کہتے ہیں۔ گوشہ نشیں ہیں۔ صد فصد علی [illegible] کے زائیدہ اور پروردہ ہیں۔ ان کے اشعار میں ندرت اور تازگی ہے۔ زبان کی حرمت کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔

آگے جانے سے پہلے کیوں نہ مل کر دیکھ لیں　　دل کے تہہ خانے میں کوئی چور دروازہ نہ ہو
دھواں دھواں نظر آتی ہے بزم فن غوثی　　یہاں چراغ زیادہ ہیں روشنی کم ہے

کربلا کا تخلیقی استعاراتی اور خلاقانہ استعمال کرنے والوں میں وہ اولین شعراء میں ہیں یعنی افتخار عارف اور عرفان صدیقی سے پہلے ہی انھوں نے یہ شعر کہا تھا:

لب فرات عجب شان سرفرازی تھی
گماں تھا دشت میں نیزوں کے سر نکل آئے

بیاضیں کھو گئی ہیں — شین۔ کاف۔ نظام

شین۔ کاف۔ نظام کے پانچ شعری مجموعے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ "بیاضیں کھو گئی ہیں۔" ان کا چھٹا مجموعہ ہے۔ ادب اور زندگی کی بابت ان کا رویہ ایک سوچنے والے ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ رسم و رہ عام سے ہٹ کر چلنے کی کوشش ان کی نظموں اور غزلوں دونوں میں نمایاں ہے۔ ان کی شاعری نئے ذہن کے المیہ تجربوں کی رومانیت سے عبارت ہے۔ ان کی کم گوئی میں بڑی معنویتیں پنہاں ہیں۔ وہ بہت کچھ ان کہا چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر بھی معنی کا افق منور رہتا ہے۔ ہمارے اقدار، ہمارے باہمی رشتوں کے انحطاط اور زوال پر ان کا یہ دردمندانہ اظہار خیال دیکھیے:

بیاضیں جن میں رات دیکھے پرندوں کے پتے لکھے
پہاڑوں کے رموز اور آبشاروں کی زباں لکھی

اپریل ۱۹۹۱

بیاضیں جن کے سینے مثل سمندر اور برج کی عداوت کے تھے افسانے
پرندوں اور پیڑوں کے رقم تھے باہمی رشتے
ہمارے ارتقا کی انجمنیں جن سے منور تھیں
بیاضیں کھو گئی ہیں
اب لغت ہم سے پریشاں ہے!

زخموں کے پرند — سلیم آغا قزلباش

"زخموں کے پرند" سلیم آغا قزلباش کی نثری نظموں کا مجموعہ ہے۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار اور انشائیہ نگار ہیں۔ لہٰذا ان کی نظموں میں بھی افسانہ اور انشائیہ کی ملی جلی کیفیت ہے۔ ان کے مکالمے سے ایک ایسے شاعر کا کردار ابھرتا ہے جسے کئی علوم سے آگاہی ہے۔ ان نظموں میں ایسے امیجز موجود ہیں جن میں حیاتیات' ارضیات' نباتیات وغیرہ علوم یکجا ہو گئے ہیں۔ "زخموں کے پرند" نام کی نظم میں زخموں کے بھوکے پرندے فکر و احساس کو روحانیت کے اس مقام پر لے جاتے ہیں جہاں خود اذیتی باعث تسکین ہوتی ہے۔

اس نے پلٹ کر دیکھا ر خود اس کا بدن ایک لوح تھا
ازل اور ابد کے درمیاں معلق ر مکاں سے لامکاں تک پھیلا ہوا
اور زخم تھے کہ بھوکے پرندوں کی طرح راس پر دیوانہ وار جھپٹ رہے تھے،
اسے بوٹی بوٹی کر رہے تھے راسے اپنی چونچوں میں بھر بھر کر رکہیں دور لے جا رہے تھے

حرف مکرر — غلام مرتضٰی راہی

غلام مرتضٰی راہی جدیدیت کے فروغ کے زمانے میں اپنی انفرادی آواز کا لانے میں کامیاب ہوئے تھے اور تفکر اور تجسس کے شاعر کے طور پر ان کا نام ادبی جائزوں میں بڑی محبت اور توقعات کے ساتھ لیا جا رہا تھا کہ وہ ایک شدید حادثے کا شکار ہو گئے اور ایک طویل عرصے تک ادبی منظر نامے سے غیر حاضر رہے۔ ان کے دو شعری مجموعے "لامکاں" اور "لاریب" یکے بعد دیگرے ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئے۔ اب انہوں نے دونوں مجموعوں کو ترمیم و اضافے کے بعد "حرف مکرر" کے نام سے یکجا کر کے پیش کیا ہے۔ ہم ایک فراموش کار دور میں سانس لیتے ہیں۔ اس لیے شاید بہتوں کے ذہن سے غلام مرتضٰی راہی کے کلام کا رنگ و آہنگ محو ہو گیا ہو۔ "حرف مکرر" ان

کے شاعرانہ اوصاف کی بازیافت ہے۔ اب انھوں نے پھر سے اپنی تخلیقی سرگرمیاں تیز کر دی ہیں۔ خدا کرے وہ ہماری غزل کو مزید نئی جہتوں سے آشنا کرتے رہیں۔ معاصر غزل کا مطالعہ "حرف مکرر" کے بغیر نامکمل رہے گا:

بات بڑھتی گئی آگے مری نادانی سے کتنا ارزاں ہوا میں اپنی فراوانی سے
دکھا رہے ہیں مجھے ہاتھ پاؤں مار کے سب کسی سے ڈوبتے بنتا نہیں بچاؤں کیا

زندگی وصل ہے انیس انصاری

انیس انصاری سول سروس میں ایک ممتاز عہدے پر فائز ہیں۔ شعر گوئی ان کی پہلی محبت ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ ۱۹۸۱ء میں چھپا تھا۔ دوسرا ۱۹۸۷ء میں۔ "زندگی وصل ہے" ان کا تازہ مجموعہ ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع بہ اک نظر متوجہ کرتا ہے۔ اظہار میں روانی اور بے تکلفی ہے۔ غزلوں میں بھی انھوں نے قابل لحاظ شعر نکالے ہیں۔ مگر ان کا تخلیقی جوہر ان کی نظموں میں ہی ظاہر ہوا ہے۔ نظموں میں اختر الایمان اور بعض دوسرے شعراء کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کی صلاحیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ توقع حق بجانب ہے کہ وہ جلد ہی اپنی انفرادی شناخت قائم کرلیں گے۔ "میں کیسے ہجر بیان کروں" "میں سورج اور زمین تو" "رات ذرا سے بہت ڈرتی ہے" "پیاس سمندر" وغیرہ اچھی نظمیں ہیں۔ مجموعے کی ظاہری پیش کش میں بھی خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔ مجموعے کی ابتداء میں متکلم کو غائب مان کر انیس انصاری نے "انیس انصاری کی شاعری اور شخصیت" کے عنوان سے عمدہ مضمون لکھا ہے۔

ایک جام اور فرحت قادری

فرحت قادری کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ابر احسنی کے حلقہ تلامذہ میں شامل رہے ہیں۔ ان کے چار پانچ مجموعے بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ "ایک جام اور —" میں صرف غزلیں اور آزاد غزلیں ہیں۔ زبان پر انھیں قدرت ہے۔ عروض پر دسترس ہے۔ اس مجموعے میں شامل ان کی چودہ آزاد غزلیں اس صنف سے ان کی بھرپور وابستگی اور اس کی تکنیک سے ان کی پوری واقفیت کا اظہار ہیں۔ آزاد غزل کی تکنیک میں انھوں نے دو قابل قدر نئے تجربے کیے ہیں۔ ایک تجربے کی صورت یہ ہے کہ ہر مصرعے میں ایک رکن کا اضافہ ہوتا رہتا ہے' یعنی اس غزل کا پہلا مصرع ایک "فعولن" کے وزن پر دوسرا مصرع دو (۲) "فعولن" کے

وزن پر، اور تیسرا تمیں "فعولن" کے وزن پر ہے۔ حتیٰ کہ آٹھواں مصرع آٹھ بار "فعولن" کی تکرار سے مکمل ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک اور آزاد غزل کی ہیئت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی پہلی غزل میں مصرعے زینہ بہ زینہ اوپر چڑھتے ہیں۔ دوسری آزاد غزل میں مصرعے زینہ بہ زینہ نیچے اترتے ہیں۔ یہاں بھی ہر مصرعے میں ایک رکن کی کمی کی گئی ہے۔ پہلے مصرعے میں آٹھ بار "مفعلن" ہے اور آخری مصرعے میں ایک بار۔

لمحوں کی صدا — ناز قادری

ناز قادری عرصے سے شعر کہہ رہے ہیں، مگر ان کا پہلا مجموعہ اب منظر عام پر آیا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں کا سخت انتخاب کیا ہے۔ ان کا کلام الفاظ کے دروبست کے اعتبار سے نفاست کا حامل ہے۔ وہ تراکیب کی خوش آہنگی کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ کلام میں ایک خاص طرح کی ہمواری ہے جو بذات خود ایک وصف ہے۔ یہ صفت مشق وریاضت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ جذبے کی لطافت ان کی فکر کو منور کرتی ہے۔ ان کے موضوعات میں زندگی کی مثبت قدروں کی بحالی اور بازیابی کو ترجیحی حیثیت حاصل ہے۔

حقیقت منتظر — رام پرکاش راہی

رام پرکاش راہی اب زیادہ تر اپنے تبصروں کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں، لیکن ان کی شاعری کی عمر خاصی طویل ہے اور ان کی بنیادی شناخت شاعری کی ہے۔ "حقیقت منتظر" ان کا پہلا مجموعہ ہے اور اسے "دیر آید درست آید" کے مصداق سمجھنا چاہیے۔ راہی غزلیں اور نظمیں دونوں ہی کہتے ہیں اور شاید نظم سے ہی انھیں زیادہ مناسبت ہے۔ "غزل زدگی" کے اس دور میں یہ ایک فال نیک ہے۔ انھوں نے موضوعاتی نظمیں کافی تعداد میں لکھی ہیں، جن میں کچھ خاصی طویل ہیں۔ ایسی نظموں میں، میرا خیال ہے، "اے وادی کشمیر" سب سے اچھی نظم ہے اور راہی کی پہچان اگر ہو سکتی ہے تو اسی نظم سے ہے۔

گم شدہ آدمی کا انتظار — چندر بھان خیال

چندر بھان خیال کا پہلا مجموعہ "شعلوں کا شجر" ۱۹۷۹ء میں نئی نسل کے کئی معتبر قلم کاروں کی آراء کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ اب تقریباً اٹھارہ سال کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ "گم شدہ آدمی کا انتظار" کے خوبصورت اور معنی خیز نام کے ساتھ منظر عام پر آیا

ہے۔ کمار پاشی مرحوم کی قربت نے خلیل کے شعری شعور کو جلا بخشی۔ ان کی زیادہ تر نظمیں پابند ہیں اور ان کی لفظیات پر پیش رو شاعروں کا خاصا اثر ہے۔ ان کے یہاں ترقی پسند اور جدید دونوں شعری رویے ملتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کے حاوی رجحان کے پیچھے نہیں دوڑے۔ موضوعات کے انتخاب میں انھوں نے تازگی اور جدت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے یہاں موجودہ نظام اور اس کے عوامل مثلاً فرقہ پرستی کے خلاف شدید احتجاجی انداز ملتا ہے۔ اور شاید اسی صفت سے ان کا کلام پہچانا جاسکتا ہے۔

اجنبی ساعتوں کے درمیان   نعمان شوق

نعمان شوق کا شمار ۱۹۸۰ء کے بعد کے نمایاں شاعروں میں ہوتا ہے۔ ایک مختصر عرصے میں انھوں نے اپنی شعری صلاحیتوں کا خاطر خواہ استعمال کیا ہے۔ وہ کھلی نظر کے شاعر ہیں اور اپنے آپ کو کسی ادبی تحریک یا رجحان کے نظریاتی حصار میں قید کرنا نہیں چاہتے۔ غزل کے ساتھ انھیں نظم سے بھی مناسبت ہے۔ "اجنبی ساعتوں کے درمیان" صرف غزلوں پر مشتمل ہے جو ان کے حسی تجربات کی زائیدہ ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ جدید ترین غزل کے جائزے میں اس طرح کے اشعار سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

تجھ سے پہلے غم کی اس درجہ فراوانی نہ تھی   دل ملے تو درد کا آنگن کشادہ ہو گیا
بنیں گے مال غنیمت میں حصہ دار تو سب   لہولہان فقط میں ہی معرکے میں ہوں

نہروں کا جال   خالد عبادی

خالد عبادی کا شعری سفر ۱۹۸۶ء سے شروع ہوتا ہے یعنی وہ مابعد جدیدیت کے دور کے شاعر ہیں۔ وہ دوسروں کے ہم قدم ہو کر چلنا نہیں چاہتے۔ نہ اپنے پیش رووں کے، نہ اپنے معاصرین کے۔ کچھ نیا کہنے کی شعوری کوشش ان کے یہاں صاف نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری امکانات کی حامل ہے۔ غزل اور نظم دونوں میں انھوں نے اپنی طباعی اور ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس طرح کے اشعار متوجہ کرتے ہیں:

ابھی اپنی شمع جلاؤ   کب تک چاند اور چاند سا چہرہ
وہ داغ دل جو چھوٹے ہو چکے ہیں   انھیں دھونے کا موسم آگیا ہے

عبادی شہر کی حالت تو دیکھو
کوئی دشمن کا کوئی دوست کا ہے

۱۹۹۷ء میں کئی اور اچھے مجموعے بھی منظر عام پر آئے ہیں۔ ان سب میں ہمیں قابل

لحاظ شاعری ملتی ہے اور کئی اشعار یا نظموں پر نظریں ٹھہرتی ہیں۔ ان پر الگ الگ اظہار خیال صفحات اور وقت کی تنگ دامانی کے باعث ممکن نہیں۔ "خار و گل" اور "غبار شمس" دونوں میں میرے تاثرات شامل ہیں۔ اس لیے ان کا اعادہ یوں بھی غیر ضروری ہے۔ ۱۹۹۷ء کی شاعری کی مجموعی رفتار کا اندازہ لگانے کے لیے بہر حال ان مجموعوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

"خار و گل" (اظہر غوری) عبارت سر دیوار (فاروق ارگلی) ریگ رواں (سعید الظفر وسیم) سواد جاں (مبارک عظیم)' لمس کا سورج (رمیش کنول) ' لو پھر بہار آئی (طالب شملوی)' سلسلے (مدہوش بلگرامی)' ستاروں بھرا آسمان (تسلیم عارف)۔

آخر میں ایسے دو مجموعوں کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کی اشاعت کا مجھے علم تو ہے اور جن پر میں نے تبصرے بھی دیکھے ہیں' مگر جن سے مطالعے کا مجھے موقع نہیں ملا۔ ایک من موہن تلخ کا مجموعہ "تکمیل" ہے اور دوسرا عبداللہ کمال کا "بے آسمان۔" من موہن تلخ خاصے پرانے شاعر ہیں' لیکن گذشتہ دنوں وہ کافی عرصے تک اردو کے ادبی قافلے سے جدا رہے۔ اب پھر وہ اس طرف لوٹ آئے ہیں اور وہ بھی جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں Witha Vengeance! عبداللہ کمال نہایت [illegible] غزل گو ہیں۔ انھوں نے اپنے پہلے مجموعے "میں" سے ہی اپنے امکانات کا ثبوت دیا تھا۔ [illegible] نامانوس بحروں میں کہنے کا شوق ہے۔ حالانکہ ان کے اچھے اشعار مانوس بحروں میں ہی ہیں۔

۱۹۹۷ء کے شعری مجموعوں کے مطالعے سے ایک بار پھر یہی ظاہر ہوتا ہے کہ غزل دیگر تمام اصناف سخن پر اب بھی حاوی ہے۔ ممکن ہے اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ یہ صنف فکر سخن کے لیے آسانیاں بھی فراہم کرتی ہے۔ اس سال کے زیادہ تر مجموعے صرف غزلوں پر مشتمل ہیں۔ جن مجموعوں میں غزلیں اور نظمیں دونوں ہیں ان میں بھی غزل کی بالادستی قائم ہے۔ اس سال ایک ہی طویل نظم منظر عام پر آئی اور وہ رفعت سروش کی "پانی پت" ہے۔ خالص نظموں کے تین مجموعے شائع ہوئے۔ اخترالایمان کا "زمستاں سرد مہری کا" وزیر آغا کا "عجب اک مسکراہٹ" اور ستیہ پال آنند کا "لہو بولتا ہے۔" ویسے انیس انصاری' چندر بھان خیال' شین کاف نظام' رام پرکاش راہی اور خالد عبادی کے یہاں بھی نظموں کی تعداد خاصی ہے۔ نثری نظموں کے دو مجموعے سلیم آغا قزلباش کا "زخموں کے پرند" اور تسلیم عارف کا "ستاروں بھرا آسمان" نظر سے گزرے۔ آزاد غزلیں صرف فرحت قادری کے مجموعے "ایک جام اور" میں دکھائی دیں۔

محمد اکرام خاں
جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

تعلیمی مرکز میری نظر میں

۱۹۲۶ء میں جب ڈاکٹر ذاکر حسین اپنی اعلا تعلیم سے فارغ ہو کر جرمنی سے واپس آئے تو ۱۹۲۰ء کی جامعہ جاں بہ لب تھی۔ آپ نے اس کے نیم مردہ جسم میں تازہ روح پھونکنے اور اس کے بنیادی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کارکنانِ جامعہ سے مشورہ کیا۔ باہمی مشورہ سے فیصلہ کیا گیا کہ فی الحال جامعہ کو اعلا تعلیم کی طرف کم اور ابتدائی تعلیم اور ثانوی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دینا چاہیے۔ اس فیصلہ کی روشنی میں ابتدائی تعلیم کے لیے قرول باغ میں جو مدرسہ کھولا گیا اس کا نام ہے تعلیمی مرکز نمبر ایک اس لیے کہ شہر کے اور بھی کئی مقامات پر ایسے ہی تعلیمی مرکز کھولنے کا ارادہ تھا لیکن وہ ارادہ عمل کے کپڑے پہننے سے محروم ہی رہا۔

کیا خوب تھے وہ دن بھی جب میں اگست ۱۹۴۸ء میں "استادوں کا مدرسہ" (موجودہ آئی۔ اے۔ ایس۔ ای) میں بنیادی قومی تعلیم کے تربیتی کورس میں داخل ہوا تھا اور اسے کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کے بعد اگست ۱۹۴۹ء میں تعلیمی مرکز نمبر ۱ کے استادوں کی۔ جماعت میں شامل کر دیا گیا تھا۔ اس تقرر کے لیے مجھے نہ تو درخواست دینا پڑی تھی اور نہ ہی کسی سے سفارش کرانے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ ان دنوں تعلیمی مرکز نمبر ۱ میں استاد کا تقرر اشتہار کے ذریعہ نہیں بلکہ اراکین جامعہ کی ذاتی واقفیت اور رائے کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ جب کوئی تقرر کرنا ہوتا تو امیدوار کو اس کی مرضی کے مطابق کسی ایک جماعت کے ساتھ کام کرنے کا موقع دے کر اس کی شخصیت کے علمی اور سماجی پہلوؤں کو دیکھ لیا جاتا تھا اور دیکھنے والے ہوتے تھے خود ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید عابد حسین، نگراں مدرسہ عبدالغفار مدھولی صاحب یا سید احمد علی صاحب، یہ مطمئن ہوتے تو امیدوار کا بحیثیت استاد تقرر ہو جاتا، نہیں تو اسے کسی اور کام میں لگا دیا جاتا تھا۔ مجھے اس مرحلہ سے اس لیے نہیں گزرنا پڑا تھا کہ میں ان سب کے لیے پہلے سے جانا پہچانا تھا۔

اپنے تقرر کے بعد جب میں پہلے پہل تعلیمی مرکز گیا تو نگران مدرسہ سید احمد علی صاحب نے نہایت تپاک اور خندہ پیشانی سے مجھے گلے لگایا۔ صبح کے ترانے پر تمام طلباء سے میرا تعارف کرایا۔ اس کے بعد مرکز کے کرم چاری چپراسی، چوکیدار، بس ڈرائیور اور دفتر کے منشی صاحب سے ملایا۔ وقفہ میں چاء پر اپنے تمام رفقاء کار سے یہ کہہ کر ملایا کہ "ہماری جماعت میں آج ایک اور رکن کا اچھا اضافہ ہوا ہے۔" ان سب نے نہایت محبت، بے تکلفی اور قبولیت کے ساتھ مجھے اپنایا اور اگست ۱۹۴۴ء تک برابر اپنائے رکھا۔ میں ان سے اس وقت جدا ہوا جب مجھے جامعہ نگر کے مدرسہ ابتدائی میں بلا لیا گیا تھا۔

گاندھی جی کے اس نظریہ تعلیم کو کہ تعلیم برائے زندگی اور بذریعہ زندگی ہو، تعلیمی مرکز کے استاد دل سے مانتے اور جی جان سے اس پر عمل کرتے تھے۔ وہ طلباء کے مشورہ سے اپنے اسباق کے لیے جو تعلیمی منصوبہ بناتے یا تعلیمی سرگرمی استعمال کرتے اس میں برابر یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ علم تو اصل تعلیم کا محض ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لیے جو کچھ پڑھایا جائے، اس طرح پڑھایا جائے کہ طالب علم میں پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ اس میں سوچنے سمجھنے، دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے اور کام کرنے نیز زندگی کو خوش گوار بنانے کی عادت پیدا ہو۔

میں نے ابھی ابھی یہ کہا ہے کہ تعلیمی مرکز نمبر ا کے استاد تعلیم برائے زندگی اور بذریعہ زندگی کے اصول پر جی جان سے عمل کرتے تھے۔ واقعی ایسا ہی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سیکھنے اور سکھانے کے عمل میں استاد اور طالب علم کے درمیان کتنی یگانگت اور کتنی قربت رہنا چاہیے۔ ان دونوں کو اپنا اپنا کام خوش اسلوبی سے کرنے کے لیے کیسے سازگار ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ سازگار ماحول کے بنانے میں استاد اور طالب علم کا کیا رول ہوتا ہے۔ جب ماحول کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس میں استاد کی شخصیت کے علاوہ مدرسہ کے کمرے، کمروں کی دیواریں، مدرسہ کا صحن، کھیل کا میدان، تختہ سیاہ، نوٹس بورڈ، میز کرسیاں فرشی نشست کتب خانہ، چپراسی کرم چاری، چوکیدار، غسل خانے اور دیگر تعلیمی سامان شامل ہے۔ جب بچے کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کی شخصیت، اس کی دلچسپیاں، اس کی ضرورتیں اور خواہشات شامل ہوتی ہیں۔ اگر مدرسہ کا ماحول اور بچے کی شخصیت ایک دوسرے کو اپنانے اور ایک دوسرے کو قریب لانے کے قابل ہوتے ہیں تو طلبا میں کام کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور کام کے ذریعہ ان کو صحیح تعلیم دی جاتی ہے۔ کام سے مربوط تعلیم ہی تو بچوں کو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیت سے مفید اور کار آمد زندگی

بسر کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس [illegible] کے [illegible] کہ
تعلیمی مرکز نمبرا کے ماحول میں اس کے طلبا کھیل کود [illegible] سے [illegible]
رہ کر اپنا کام کرتے تھے۔

تعلیمی مرکز نمبرا کے ماحول میں کھیل کے میدان کے سوا سب کچھ بہت اچھا تھا۔ کھیل کے میدان کی کمی کو فرشی کھیلوں اور دیگر دلچسپ کاموں سے پورا کیا جاتا تھا۔ تعلیمی مرکز کے استاد بھی اچھے تھے اور طلباء بھی اچھے تھے۔ استاد اس اعتبار سے اچھے تھے کہ وہ اپنے پیشہ کا خود بہت احترام کرتے تھے۔ انھیں اپنے طلباء سے والہانہ محبت تھی۔ وہ ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ ان کی دلچسپیوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نئے نئے منصوبے اور کام کراتے تھے اور یہاں آپس میں مل جل کر کام کرتے تھے۔ طلبا اس لحاظ سے تو اچھے تھے ہی کہ وہ اچھے گھرانوں سے آتے تھے لیکن اس لحاظ سے اور زیادہ اچھے تھے کہ صاف ستھرے رہتے تھے۔ وقت کی پابندی کرتے تھے۔ مل جل کر کام کرتے تھے اور جو کام کرتے تھے اسے نہایت خوبصورتی اور لگن کے ساتھ پورا کرتے تھے۔ اس طرح استادوں اور طلباء کی وجہ سے مرکز کا ماحول سیکھنے سکھانے کے لیے بڑا ہی سازگار تھا۔

مرکز کے ماحول کو سازگار بنانے اور بنائے رکھنے میں نگراں مدرسہ سید احمد علی صاحب کا بھی بڑا حصہ تھا۔ وہ بڑے ذمہ دار، باعمل، بڑے ایماندار، بڑے صاف گو اور محنتی استاد تھے۔ یقیناً وہ اچھے استاد بھی تھے اور اچھے نگراں بھی۔ وہ اپنے رفقاء کار کی ہمت افزائی اور دلجوئی کے لیے ان کے ہر چھوٹے بڑے کام کی دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ انھیں تنقید کرنے کی عادت نہ تھی۔ مدرسہ کے ہر کام کا بہ نظر غائر جائزہ لیتے رہتے تھے اور اپنے رفقاء کار میں باہمی محبت اور اشتراک عمل کا جذبہ بیدار رکھنے کے لیے ان کے ساتھ شیر و شکر کی طرح مل کر رہتے تھے۔ وہ ہر شخص سے اس کے متعلقہ کام کا خود ہی محاسبہ کراتے اور کمزوریوں اور خامیوں کو دور کرنے میں اس کی مدد کرتے تھے۔ غرض یہ کہ ان کے دوستانہ اور ہمدردانہ سلوک کی وجہ سے مدرسہ کے تمام اساتذہ اور طلبا اس طرح سر جوڑ کر کام کرتے تھے کہ کامیابی کام پورا ہونے سے پہلے ہی ان کے قدم چومنے کو تیار رہتی تھی۔

زندگی کو سنوارنے اور زندگی میں کام آنے والی تعلیم زندگی کے تجربوں، مشغلوں، جزوں اور مشاہدوں کے ذریعہ ہی حاصل ہوتی ہے۔ تعلیمی مرکز میں پہلی جماعت سے چھٹی جماعت تک کتاب کو نہیں بچے کو مرکز تدریس بنایا جاتا تھا۔ بچے کی

دلچسپیوں ضرورتوں اور صلاحیتوں کو سمجھنے اور سمجھ کر ابھارنے کے لیے مختلف قسم کے مشغلوں اور کاموں سے مدد لی جاتی تھی۔ سلیبس اور کریکولم یعنی نصاب اور درسیات کے فرق کو ذہن میں رکھتے ہوئے پورے سال کے لیے چھوٹے چھوٹے اور بڑے کاموں کا خاکہ تیار کر لیا جاتا تھا۔

نصاب سے مراد علم کا وہ ضروری حصہ ہے جس کو مدرسہ میں عام طور سے بتدریج درسی کتابوں اور لیکچروں کے ذریعہ پورا کرا کر تعلیمی سال کے آخر میں امتحان دلایا جاتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ کتابی علم کو حاصل کرنے یا رٹ لینے سے شخصیت کی نشوونما میں براہ راست مدد ملتی ہے۔ اس کے برعکس درسیات سے مراد ہے وہ تمام نظری اور عملی تجربات اور کام جو استاد کی نگرانی میں مدرسہ کے اندر اور مدرسہ سے باہر پڑھائے جاتے یا کرائے جاتے ہیں۔ ان کا مقصد طالب علم کی دلچسپیوں اور ضرورتوں کو پورا کر کے اس میں سوچنے سمجھنے اور سوچ سمجھ کر کام کرنے کی عادت پیدا کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ مدرسہ میں اچھا طالب علم، گھر میں اچھا اور ذمہ دار رکن پڑوس اور ساتھیوں میں اچھا ساتھی اور بازار میں اچھا خریدار اور اچھا دکاندار ثابت ہو سکے۔ درسیات میں علم کو عمل کا شریک اور عمل کو علم کا ذریعہ بنا کر طالب علم کی شخصیت کی ہمہ جہت نشوونما میں مدد کی جاتی ہے۔

تعلیمی مرکز میں کام یا مشغلہ اس وسیع صورت حال کو کہا جاتا تھا جو کسی بچے یا بچوں کی جماعت کے مخصوص مقصد کے لیے پیدا کی جاتی ہے تاکہ وہ اس قابل تحسین اور مفید نتیجے پر جس کو وہ خود پسند کرتے ہیں پہنچ سکیں اور اس کے ذریعہ زندگی کے مسئلوں کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے میں مدد مل سکے۔ مختصر طور پر یوں سمجھیے کہ درسیات سے مراد مدرسہ کے جملہ کاموں کا وہ خاکہ ہے جو اساتذہ اور طلبہ کے مشورہ سے خوب سوچ سمجھ کر مرتب کیا جائے اور اس کے ذریعہ مختلف عمر کے بچوں کی تعلیمی، نفسیاتی اور سماجی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

تعلیمی مرکز کے کام

تعلیمی مرکز کے مشغلوں یا کاموں کی فہرست بہت بڑی ہے ان سب کو نام بنام گنانے یا دہرانے کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ ہی اس کا موقع۔ البتہ یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ وہاں کام دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک وہ جو مدرسہ کے اندر کرائے جاتے تھے جیسے باغبانی اور گتے کا کام، بچوں کی دکان، بچوں کا خوانچہ، بچوں کی مجلس کے عہدہ داروں کا انتخاب اور جلسہ یوم قرآن وغیرہ۔ دوسرے وہ جو مدرسہ سے باہر جا کر کرائے جاتے

نے۔ جیسے تاریخی مقامات کی سیر' گندی بستیوں کی سیر گانو کی سیر' ریڈیو پروگرام اور دلی کے کارخانوں کی سیر وغیرہ۔ ان کاموں کی تعلیمی اہمیت اور افادیت کا اندازہ کرانے کے لیے باغبانی اور گتے کا کام اور جلسہ یوم قرآن نیز ریگو پورہ' بھنگی بستی اور سوہنا گانو کی سیر کے حالات کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ سوہنا گانو کی سیر:

یہ سیر چوتھی جماعت کے طلبہ کے لیے تھی۔ اس جماعت میں گتے کا کام سکھایا جاتا تھا۔ اس کام کے سلسلے میں بچے صدر بازار اور بلی ماران وغیرہ کے ان کارخانوں کو دیکھ چکے تھے جن میں دس گیارہ برس کی عمر کے بچے گتے کے ڈبے وغیرہ بناتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ریگو پورہ اور بھنگی بستی میں رہنے والے غریب مزدوروں کو بھی دیکھ چکے تھے۔ صبح کے ترانے میں باری باری سے ایسی نظمیں پڑھی جاتی تھیں جن کو سن کر اور دہرا کر بچوں میں اپنے وطن اور انسانیت سے محبت پیدا ہو جیسے سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا یا یہ میرا وطن ہے میرا وطن' یا میں بچہ ہوں میں بچہ ہوں کبھی میں بھی بڑا ہوں گا۔ ایک روز ترانے میں پانچویں جماعت کے بچوں نے یہ نظم پڑھی "جب کھیت سے دہقان آتا ہے اور سوکھی روٹی کھاتا ہے۔ جی بچوں سے بہلاتا ہے' اس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے' اس وقت یہ شبنم موتی ہے" تو ترانے کے بعد اردو کے پیریڈ میں ایک طالب علم نے سوال کیا۔ "دہقان کسے کہتے ہیں اور وہ کہاں رہتا ہے؟" میں نے کہا آپ کے پاس نور اللغات ہے۔ اس میں اس لفظ کے معنی دیکھ لیجیے۔ معنی دیکھے گئے تو دہقان اور گانو دکھانے پر اصرار ہوا۔ یہ اصرار میرے لیے اس لیے اہم اور بامعنی تھا کہ جماعت کے سب ہی طلبا صحیح معنوں میں دلی والے تھے۔ اس طرح گانو کی سیر کے لیے صورت حال پیدا ہو گئی۔

دوسرے روز باہمی مشورہ سے طے پایا کہ سوہنا گانو کی سیر کی جائے راستہ میں بڑکل لیک بھی دیکھ لی جائے گی۔ اس فیصلے کے بعد طلبا کو خاص طور سے نجی اور کاروباری خطوط کا فرق سمجھانے کے لیے طے پایا کہ:

۱۔ نگراں مدرسہ کو درخواست لکھ کر سوہنا گانو جانے کی اجازت لی جائے۔

۲۔ جامعہ لاری بک کرانے کے لیے ناظم لاری صاحب کو درخوات دی جائے۔

۳۔ والدین کی اجازت حاصل کرنے کے لیے انھیں خطوط لکھے جائیں۔

۴۔ سوہنا گانو کے چودھری صاحب کو سیر کے پروگرام سے مطلع کیا جائے۔

۵۔ سوہنا گانو میں رہنے اور کھانے پینے کے لیے ضروری سامان کی فہرست مرتب

کی جائے اور پھر سامان فراہم کیا جائے۔

۶۔ کھانا پکانے کے لیے باورچی کا انتظام کیا جائے۔

۷۔ سیر سے متعلق اخراجات کے لیے جو روپے جمع کیا جائے اس کا حساب رکھا جائے اور اس حساب کے لیے خازن کا انتخاب کیا جائے۔

۸۔ سوہنا گانو میں ایک رات کیمپ فائر ضرور کیا جائے اور اس میں گانو والوں کو بلایا جائے۔

۹۔ سیر کے بعد سیر سے متعلق مضامین لکھے جائیں۔

۱۰۔ طے کیا جائے کہ گانو میں کیا کیا دیکھا جائے گا۔

۱۱۔ سوہنا جھیل دیکھنے چھ چھ طلبا ایک ساتھ جائیں گے۔

پروگرام کے مطابق سوہنا گانو کی سیر کی گئی۔ بچوں نے اپنے مضامین میں گانو والوں کی محبت اور خلوص کی بہت تعریف کی۔ انھوں نے اس بات کی بہت تعریف کی کہ ان کو گانو والوں نے اپنا مہمان بنایا اور ان کے لیے بہت بڑی مقدار میں دودھ جمع کیا۔ بچوں نے گانو کے کسانوں کی محنت، سادگی اور غریبی کی بھی اچھی تصویریں پیش کیں۔ اس طرح سیر کی مدد سے اردو، اسلامیات، ریاضی اور سماجی علوم سے متعلق جو تعلیم ہوئی وہ بامعنی اور زندگی میں کام آنے والی تھی۔

گتے کا کام:

گتے کا کام چوتھی جماعت میں بطور حرفہ کرایا جاتا تھا۔ اس حرفہ میں بچوں کو بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ ان میں صدر بازار اور بلی ماران کے کارخانوں میں اپنی عمر کے بچوں کو کام کرتے دیکھ کر یہ اعتماد پیدا ہو گیا تھا کہ وہ بھی گتے سے اچھی اچھی چیزیں بنا سکتے ہیں۔ اس کام کے ذریعہ بچوں کو اپنا کام صبر و تحمل سے کرنے اور کام کو باقاعدگی اور نفاست کے ساتھ کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ ان کے ذوق جمال اور قوت تخلیق کی خوب تربیت ہوتی تھی۔ انھیں لال، پیلے اور نیلے رنگوں کو ملا کر کئی طرح کے رنگ بنانے اور ان سے اپنی پسند کی ابریاں بنانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر بنیادی قومی تعلیم سے متعلق تعلیمی سامان کی نمائش ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۴۳ء کے اجلاس میں چوتھی جماعت کے بچوں کی بنائی ہوئی ابریوں کا فائل بھی تعلیمی سامان کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ اس فائل کی ابریوں کو گاندھی جی نے بہت پسند کیا ان کی پسند کی چند ابریاں انھیں پیش کر دی گئیں۔ بہت خوش ہوئے۔ نمائش سے واپس آنے پر نگراں مدرسہ نے یہ خبر

صبح کے ترانہ پر مرکز کے سب بچوں کو سنائی۔ اس خبر کا سننا تھا کہ سب طلبا نے خوشی میں اتنی تالیاں بجائیں کہ مرکز کا صحن تالیوں سے گونجنے لگا مرکز کی طرف سے چوتھی جماعت کے طلبا کو مبارک باد دی گئی۔ اس طرح اس کام کی وجہ سے بچوں کی ہمت افزائی ہوئی اور ان میں خود اعتمادی پیدا کی گئی۔

باغبانی: یہ وہ حرفہ ہے جس میں مرکز کے سب ہی طلبا کو غیر معمولی دلچسپی تھی۔ لیکن اسے باقاعدہ حرفہ اور پروجیکٹ کے طور پر چھٹی جماعت کے طلبا اختیار کرتے تھے۔ اس جماعت کے استاد سید احمد علی صاحب تھے۔ وہ عام طور سے موسم کی سبزیاں اور پھول اگانے پر زور دیتے تھے۔ سبزیوں اور پھولوں کو فروخت کرنے سے جو آمدنی ہوتی اس کو تعلیمی سیر پر خرچ کیا جاتا تھا۔ ان دونوں حرفوں کی اہمیت تعلیمی' نفسیاتی' سماجی اور اقتصادی اعتبار سے مسلمہ ہے۔

جلسہ یوم قرآن:

رمضان المبارک کا مہینا شروع ہونے سے ایک ہفتہ قبل مولانا فضل الرحمٰن صاحب استاد دینیات کے ایما پر استادوں کا جلسہ ہوا اس جلسہ میں طے پایا کہ یوم قرآن منایا جائے اور طلبا کو قرآن کی متعلقہ آیتوں کی مدد سے توحید اور اخلاق حسنہ کا سبق پڑھایا جائے۔ اس فیصلے میں بچوں کی مجلس کے صدر کے ذریعہ طلبا کو بھی شریک کیا گیا۔ طلبا کی تعلیمی استعداد کے مطابق جماعت وار کاموں کی تقسیم کے بعد پروگرام کے مطابق کام شروع ہوا۔ بچوں نے مضامین بھی لکھے اور خوبصورت چارٹس بھی بنائے۔ عید سے دو روز قبل یوم قرآن سے متعلق جلسہ ہوا۔ بچوں کے کاموں کی نمائش ہوئی۔ جلسہ میں بچوں نے مضامین پڑھے۔ جلسہ کی صدارت جناب مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب نے کی۔ جلسہ کا افتتاح چھٹی جماعت کے طالب علم منظور عبدالرحمٰن کی تلاوت سے ہوا۔ جلسہ کے انتظام اور پروگرام کو دیکھ کر حاضرین جلسہ اور صدر جلسہ نے جو تعریف کی اس سے بچوں کی ہمت افزائی ہوئی اور ان میں کام کرنے اور کام کے ذریعہ سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

انتظامیہ مدرسہ

مدرسہ کے انتظام اور نظم وضبط میں نگراں مدرسہ' طلبا کو برابر شریک رکھتے تھے۔ نگرانی جمہوری طرز پر تعمیری ہوتی تھی۔ نگراں مدرسہ استادوں کو اپنا کام بہتر طریقہ پر کرنے اور متوقع نتائج حاصل کرنے میں ہر ممکن مدد دیتے تھے۔ وہ طلبا اور اساتذہ کو وقت

کی پابندی کرنے اور وقت کی قیمت سمجھانے کے لیے ہر عملی صورت اختیار کرتے۔ وقت کی پابندی کے اصول کی خلاف ورزی کو عبدالغفار مدھولی صاحب تو بالکل نہیں برداشت کرپاتے تھے۔ کیسی دلچسپ بات ہے یہ کہ ان کے زمانہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین، شیخ الجامعہ بھی مرکز میں روزانہ ایک پیریڈ لیا کرتے تھے۔ انھیں اپنی انتظامی ذمہ داریوں کی وجہ سے کبھی دیر ہو جاتی تو عبدالغفار صاحب نگراں مدرسہ اپنی ڈائری میں نوٹ کرلیتے تھے کہ کتنے منٹ دیر سے پیریڈ لیا گیا ہے اور مہینے کے آخر میں دیر سے آنے والے وقت کا حساب لگا کر دفتر محاسبی کو مطلع کر دیتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی تنخواہ سے اتنے وقت کی تنخواہ کم کردی جائے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ڈاکٹر ذاکر حسین، شیخ الجامعہ کو مدرسہ کے سالانہ جلسہ کی صدارت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ ذاکر صاحب جلسہ شروع ہونے کے مقررہ وقت پر نہ پہنچ سکے۔ عبدالغفار صاحب نے بچوں کی مجلس کے صدر کو جلسہ کا صدر بنا کر جلسہ شروع کردیا۔ جب ذاکر صاحب تشریف لائے تو وہ عبدالغفار صاحب کے اس انتظام کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور معذرت کے ساتھ صدارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے پاس طالب علم صدر کو بھی بٹھائے رکھا۔ یہ تھا عبدالغفار صاحب مدھولی کا وقت کی پابندی کرنا سکھانے کا طریقہ۔

عبدالغفار صاحب مدھولی اور سید احمد علی صاحب دونوں کے زمانے میں یہ معمول تھا کہ تعلیمی سال شروع ہونے سے دو تین روز قبل تمام اساتذہ سر جوڑ کر بیٹھتے اور پورے سال کے لیے جملہ کاموں کا خاکہ مرتب کرلیتے تھے۔ تمام کاموں کی ذمہ داری مختلف استادوں کو دے دی جاتی تھی۔ بچوں کی مجلس کا صدر نگراں مدرسہ کا مددگار اور معاون سمجھا جاتا تھا۔ جماعت مانیٹر کا جو ہر مہینے بدلتا رہتا تھا یہ کام تھا۔

۱۔ جماعت کے تمام طلبا کی حاضری لینا اور استاد جماعت کو بروقت غیر حاضر طلبا کے نام بتا دینا۔

۲۔ حرفہ اور کھیل سے متعلق سامان اور اوزاروں کو کام کے اوقات میں طلبا میں تقسیم کرنا اور کام ختم ہونے پر واپس لے کر مقررہ جگہوں پر باقاعدہ رکھنا۔

۳۔ طلبا کی وقتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نگراں مدرسہ کا تعاون حاصل کرنا۔

۴۔ غسل خانوں اور پینے کے پانی کی نگرانی کرنا اور ان کی صفائی اور صحیح استعمال کی طرف توجہ دلانا۔

۵۔ مدرسہ کے صحن اور دیواروں وغیرہ کی صفائی کا خیال رکھنا۔

Dr. GYAN CHAND JAIN
3262 Oakleaf Chino Hills
California 91709

گیان چند جین کا خط

میں ہندستان سے ہجرت کرکے ۷؍جنوری ۱۹۹۸ء کو امریکہ پہنچا۔ چلنے سے پہلے دو رسالوں کا ہوائی ڈاک سے بھیجنے کا چندہ دے آیا تھا۔ ان میں ایک کتاب نما تھا۔ اس کا فروری ۱۹۹۸ء کا شمارہ اردو کا پہلا ادبی رسالہ ہے جو امریکہ میں مجھے دیکھنے کو ملا۔ اس کے طفیل جنت گم شدہ کی سیر کرنے کو ملی۔ اس میں پروفیسر ڈاکٹر انصار اللہ نظر کا مضمون "بیاض غالب کی بحث" نظر سے گزرا۔ میں اپنی منتخب کتابوں کی چار پیٹیاں دہلی میں چھوڑ آیا ہوں۔ انھیں بحری جہاز سے منگانا چاہتا ہوں لیکن ہنوز اس کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا۔ نتیجتاً میرے پاس اردو کی کوئی کتاب نہیں، اپنی لکھی ہوئی ایک کتاب بھی نہیں۔ میں نے بیاض غالب پر مضمون ۷۲-۱۹۷۱ء میں لکھا ہوگا۔ اب نہ وہ مضمون سامنے ہے نہ اس کے مشمولات یاد ہیں اس لیے میں انصار اللہ صاحب کی تحریر پر چند الفاظ ہی کہہ سکتا ہوں۔

غالب نامہ عرشی نمبر کے لیے کسی نے مجھ سے کوئی مضمون نہیں مانگا۔ مجھے یہ پرچہ کئی سال کے بعد دیکھنے کو ملا۔ معلوم نہیں بیاض غالب پر میرا مضمون کیوں عرشی نمبر کے لیے منتخب کیا۔ عرشی صاحب سے اس مضمون کا براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ ۲۵-۲۰ سال پہلے کے مطبوعہ مضمون کو دوبارہ چھاپنا مناسب نہ تھا۔ اگر میرا کوئی سابق مضمون لینا بھی تھا تو ایک دوسرا مضمون "نسخۂ عرشی کی قرآتیں" لے سکتے تھے۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ مجھ سے کوئی نیا مضمون لکھنے کو کہا جاتا۔

نسخۂ غالب کی دریافت کے دور میں مولانا عرشی اور جناب مالک رام سب سے بڑے ماہر غالبیات تھے۔ وہ دونوں اس نسخے کو غالب سے منسوب کرتے تھے۔ غالب کے خط تحریر کے بارے میں مولانا عرشی سے بڑا ماہر اور کوئی نہ تھا۔ میں نے ان علماء کے فیصلے قبول کیے۔ اس موضوع پر اس زمانے میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔ اب میرے پاس مزید کہنے کو کچھ نہیں۔ تحقیق میں سب کا ہم خیال ہونا ضروری نہیں۔ معلوم نہیں انصار اللہ صاحب نے تقریباً ۲۷ سال بعد کیوں اس بحث کو اٹھایا جس کے بارے میں وہ یا میں کوئی نئی دلیل نہیں لا سکتے۔ ان کے مضمون میں نئی بات ہے تو میرے لیے ان کا لہجہ ہے جو سابق میں ہمیشہ احترام کا ہوتا تھا، اب جارحانہ ہے۔

گیان چند

احمد صغیر صدیقی
۱۰۲-اے مرجیبہ کمپلکس گلشن اقبال
بلاک نمبر ۱۳-بی کراچی

غزل

غمِ ایام ہو کر رہ گئے ہیں
سحر تھے، شام ہو کر رہ گئے ہیں

یقیں کو پختگی دینے چلے تھے
خیالِ خام ہو کر رہ گئے ہیں

کبھی تھے ہم ہی ہم ہر سمت اور اب
برائے نام ہو کر رہ گئے ہیں

بہت حیرت میں ہیں، اک راز تھے ہم
کہ طشت از بام ہو کر رہ گئے ہیں

پئے اندازۂ ایجاز وابہام
حدیثِ عام ہو کر رہ گئے ہیں

یہاں تو سب کے سب تھے برگزیدہ
سو اک دشنام ہو کر رہ گئے ہیں

ہے یہ بھی اک طرح کی کامیابی
اگر ناکام ہو کر رہ گئے ہیں

ز مہدی

مرگ ہم نوا

(آخری رفیق دیرینہ علی حماد عباسی کی پہلی برسی کے موقع پر لکھی گئی)

اک تثلیث کے نکتے۔۔ تین۔۔!
مولانا۔۔ حماد۔۔۔ اور میں

ایک اکیلا۔۔۔ نوحہ گر
تنہا تنہا۔۔۔ چپ چپ!

سوکھی سوکھی آنکھوں سے
کیا دیکھے۔۔۔ کیا سوچے گا؟

سارے بچپن کے ہمدم
چھوڑ کے مجھ کو۔۔۔ چلے گئے!

سانس نہیں۔۔۔ ٹوٹی اب تک
جینے کے بندھن سے مجھ کو
کون بھلا۔۔۔ آزاد کرے؟

صدمے گن گن۔۔۔ عمر کٹی ہے
ہر لمحہ۔۔۔ اک تیر ہے جیسے!

ا۔ حماد ہمیشہ خلیل الرحمٰن اعظمی کو مولانا کہتا تھا۔ علی گڑھ میں اکثر ہم تینوں ساتھ تھے۔

حیدر قریشی
AUF DER ROOS 7 65795
Hathersheim]Germany

غزل

موسم کی بے مہر فضا میں گرتے ہیں
سوکھے پتے سرد ہوا میں گرتے ہیں

رہتی ہے پرواز کی خوش فہمی ان کو
جو اپنے اندر کے خلا میں گرتے ہیں

گرتے ہیں تو گرتے ہی جاتے ہیں پھر
اہل ستم جب مکروریا میں گرتے ہیں

گیت سناتے ہیں جھرنے کے گرنے کا
حرف جو خاموشی کی صدا میں گرتے ہیں

تم نے وہ منظر ہی کب دیکھیں ہیں، جب
درد سمندر، دل دریا میں گرتے ہیں

یا آنکھوں میں خاک برستی تھی حیدر
یا اب پیہم اشک دعا میں گرتے ہیں

...تر ضیائی
13-HOL STREET LONDO...
E-1745D U.K

غزل

اک دو گھڑی کی ان سے ملاقات بھی گئی
مقطع میں آپڑی تھی جو وہ بات بھی گئی

پایا جب سے زیست نے اندوہِ کائنات
دنیا کے ساتھ کشمکشِ ذات بھی گئی!

یہ کیا کہ پھر فریب اندھیرے نہیں چھٹے
تاروں کا قتل عام ہوا رات بھی گئی

ویسے تو سب کو پار اترنے کا شوق تھا
موجوں کی زد میں شدتِ جذبات بھی گئی

کچھ بھی ہوا نہ ترکِ مکانی کا فائدہ!
ہمراہ اپنے گردشِ حالات بھی گئی

پہلے سا اب نہیں ہے چراغانِ آرزو
دل بجھ گیا تو بزمِ خیالات بھی گئی

عہدِ شباب زہرہ جبینوں کی بھیڑ تھی
ساون گیا تو رنگ کی برسات بھی گئی

اختر بدل گئی ہے وہ چشمِ فسوں طراز
صبحِ نشاط و شامِ غزلہات بھی گئی!

اقبال مسعود
۱۹۔بی احمد آباد پیلس
بھوپال۔۴۶۲۰۰۱

نذر سودا

جھومتی ہے چمن شعر کی ڈالی سودا
ندرت فکر تیری سب سے نرالی سودا
تیرے اشعار کی تاثیر کمالی سودا
آبرو اردو زباں نے بھی بڑھالی سودا
تیری عظمت کو کیا میر نے بھی دل سے قبول
ڈھائی شاعر میں ہے رتبہ ترا عالی سودا
تیرے انداز بیاں سے ہوئے حیراں غالب
تیرا دیوان' یعنی گنجینہ مثالی سودا
فیض مجبور ہوئے اس میں غزل کہنے کو
کس غضب کی یہ زمیں تو نے نکالی سودا
استفادہ تری تخییل سے بھی سب نے کیا
در پہ بننا ہی پڑا تیرے سوالی سودا
گلشن حسن تغزل ہے خزاں سے محفوظ
کیوں نہ ہو جبکہ ہے اس باغ کا مالی سودا

ڈاکٹر اختر بستوی
صدر شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی
گورکھپور، یوپی

غزل

افسردہ لبوں پر بھی ہنسی دیکھ رہا ہوں
انساں کا احساس خودی دیکھ رہا ہوں

افلاک کی آغوش میں پلتی ہوئی قسمت
ہاتھوں کی لکیروں میں چھپی دیکھ رہا ہوں

بے سود روایات کی بے رنگ حویلی
تہذیب کی نگری میں کھڑی دیکھ رہا ہوں

میں، وقت کے صحراؤں میں بھٹکا ہوا راہی
ملتی ہے کہاں چھانو گھنی دیکھ رہا ہوں

امید کے مدفن پہ تصور کی نظر سے
اک شاخ ثمر دار جھکی دیکھ رہا ہوں

اختر ترے اشعار کی زنجیر میں جکڑی
خوابوں کے جزیرے کی پری دیکھ رہا ہوں

یوسف ناظم
الہلال ۳۳، باندرہ ایکسٹنشن ممبئی

ووٹ دینا معیوب کام ہے

کیوں؟ معیوب کیوں ہے۔ معیوب اس لیے ہے کہ یہ کام چھپ کر کیا جاتا ہے۔ پس پردہ۔ علی الاعلان کھل کر ووٹ دینے کی بات کبھی آپ نے سوچی ہے۔ اپنی رہائشی عمارت کی سوسائٹی کی میٹنگ میں تو آپ کھل کر ووٹ نہیں دے سکتے۔ چونتیس میں سے ۱۹ ممبر فی الفور آپ کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ بات چیت تو دور رہی سلام تک کے روادار نہیں ہوتے تو آپ عام انتخابات میں کیسے کھل کر ووٹ دے سکتے ہیں۔ دے کر دیکھیے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ کھلا دماغ کسے کہتے ہیں۔ (سر کھل جانا یقینی ہے)

ووٹ دینے کے لیے خاص طور پر ایک حجرہ بنایا جاتا ہے اور اس کے گرد پولس کی جمعیت کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ آپ اس حجرہ تنہائی میں یکہ و تنہا داخل ہوں۔ (یہ حجرہ صرف رائے دہی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے)

حجرے میں بھی آپ کی حرکات و سکنات پر نگرانی جاری رہتی ہے۔ یہ ذرا زیادہ کڑی ہوتی ہے' انتخابات کا وقت ہوتا ہی کڑا وقت ہے۔

حجرے میں داخل ہوتے وقت آپ کے ہاتھ میں ایک کارڈ کا ہونا ضروری ہے۔ یہ کارڈ امیدواروں کی طرف سے بھیجا ہوا خود آپ کا تعارفی کارڈ ہوتا ہے۔ (ایسے کئی کارڈ آپ تک پہنچتے ہیں جن میں سے کوئی ایک کارڈ جو اپنی دبازت اور حسن طباعت کی وجہ سے چندے آفتاب چندے ماہتاب ہو۔ آپ چن لیں) اس کارڈ پر آپ کی عمر اور صنف درج ہوتی ہے۔

حجرۂ رائے دہی میں سرکاری عملے کے ۴ مستعد افراد کے علاوہ چھ سات غیر سرکاری افراد بھی موجود ہوتے اور ہوتی ہیں ان کی نشست سرکاری عملے کے افراد کے پیچھے ہوتی ہے یہ لوگ امیدواروں کے نمائندے ہوتے ہیں جو وہیں بیٹھے بیٹھے بلبلوں کے کاروبار یہ خندہ ہائے گل بکھیرتے رہتے ہیں۔ ان سب کو اپنے اپنے حدود میں یا ادب بالملاحظہ رکھنے کی غرض سے حجرے میں ایک اور شخص اعزازی نشست پر متمکن رہتا ہے جس کا سرکاری لقب پریسائڈنگ افسر ہے۔ اس شخص کے چہرے پر تردد تفکر اور

پریشانی کے آثار زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کا فرض منصبی خاصا کوفت آمیز (بورنگ) اور سر پر ایک بوجھ کی طرح ہوتا ہے۔ اس افسر کو دیکھ کر آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہونا ضروری ہے۔ (ویسے آپکی مرضی) وہ بھی آپ کو دیکھتا ہے لیکن اس کا چہرہ بے شکن اور سپاٹ رہتا ہے۔ تاثر سے مبرا غم اور خوشی سے مبرا۔

آپ کے اس حجرے میں داخل ہوتے ہی سارے افراد متحرک ہو جاتے ہیں کہ دیکھیں یہ کون مجرم آیا ہے اور سرکاری عملے کا پہلا رکن' آپ کے ہاتھ سے کارڈ لے کر آپ کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھ کر پہلے آپ کی صنف اور آپ کی عمر کے بارے میں اپنا اطمینان کر لیتا ہے۔ (صنف پر زیاد توجہ دیتا ہے۔ عمر میں کیا رکھا ہے اس میں کی بیشی سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا) صنف اور عمر کے دو اہم نکات سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد وہ آپ کے نمبر اور نام کا باآواز بلند اعلان کرتا ہے۔ یہ نمبر آپ کو سرکار عطا کرتی ہے۔ اس اعلان پر سارے نگراں کار اپنے اپنے کاغذات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کچھ نام سن کر سرکاری عملے اور دیگر افراد اپنی اپنی سانس روک لیتے ہیں کیونکہ یہ نام مشکل بھی ہوتا ہے اور تھوڑا بہت طویل بھی۔ سب لوگ اپنے اپنے رجسٹر میں آپ کے نام کے آگے ٹک کا نشان لگا دیتے ہیں۔ یہ نشان نقطے سے ذرا بڑا اور شاعر کے تخلص پر لگائے جانے والے نشان سے کافی چھوٹا ہوتا ہے۔ اس عمل کو ٹک کرنا کہا جاتا ہے اور یہ ایک عام عمل ہے۔ آج تک پتا نہیں چلا کہ یہ ٹک کرنا' انگریزی ہے' ہندی ہے یا اردو اور آیا یہ ترکیب' رومن لٹریچر سے درآمد کی گئی ہے یا رشین نژاد ہے۔

اب عملے کا دوسرا فرد اپنے ذخیرہ کاغذات میں سے ایک پرچہ رائے دہی چیک کرتا اور آپ کے حوالے کرتا ہے۔ اس پرچے کا بالائی سرا رجسٹر ہی میں رہ جاتا ہے جس پر آپ کو (اگر لکھنا آتا ہے) تو پرچہ رائے دہی کی وصولیابی کے ثبوت کے طور پر دستخط کرنے ہوتے ہیں (یہ کون سی خفیہ رائے دہی ہوئی)۔ اس پرچہ رائے دہی کے طول و عرض کا رکھنا امیدواروں کی بہتات پر ہوتا ہے۔ پرچے پر ان کی شبیہہ تو نہیں ہوتی لیکن ان کا نام اور نشان انتخاب (فتور) درج ہوتا ہے۔ نشان انتخاب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یا تو کوئی عظیم الجثہ جانور جیسے ہاتھی' اونٹ' بیل یا کوئی نازک پھول جیسے گلاب' کنول (گیندے کے پھول کو ابھی یہ وقار حاصل نہیں ہوا ہے کہ اسے نشان انتخاب بنا دیا جائے۔ یہ پھول گلے کے ہار میں تو شامل کیا جا سکتا ہے لیکن الیکشن کمشنر کے دفتر میں نہیں۔ اسلحہ میں تیر کمان' برچھے بھالے بھی نشان انتخاب ہو سکتے ہیں لیکن ڈاکٹری کے اوزار و ہتھیار یا غیر مضرت رساں آلات کے جیسے نشتر' مقراض' اسٹیتھسکوپ تھرمامیٹر

وغیرہ بھی خارج از بحث ہیں۔ سرکاری عملے کا یہ رکن دوم پرچہ رائے دہی کو پوری طرح تہہ کرکے آپ کے حوالے کرتا ہے۔ یہ بتانے کے لیے اسے رائے دہی کے بعد کس حالت میں سپرد صندوق کرنا ہے۔ (صحیح معنوں میں سپرد خاک کرنا ہوتا ہے) ان دو مرحلوں سے گزرنے کے بعد آپ سرکاری عملے کے رکن نمبر ۳ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی ایک انگلی پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ شخص جو کافی افسردہ دکھائی دیتا ہے۔ آپ کی پیش کردہ انگلی پر ایک نہ مٹنے والی روشنائی کا ایک سرکاری نقطہ لگادے گا۔ (اسے بھی تک کرنا ہی کہہ لیجیے اسے ٹٹی کی آڑ سے شکار کھیلنا بھی کہا جاتا ہے یہ لفظ ہمیں بار بار کھٹک رہا ہے۔ تک کا لفظ تو ہم نے میر کے ایک مصرع میں پڑھا تھا۔ ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے لیکن یہ تک بہر حال اس نقطہ انجماد کو ہم کافی دیر تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے اور اس خفیہ جگہ پر چلے جاتے ہیں جہاں ہمیں سب سے چھپ کر وہ کام کرنا پڑتا ہے جس کا سب کو علم ہوتا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ کیونکہ آپ کا ووٹ کسی نہ کسی امیدوار کی تمناؤں کا خون کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ آپ پردے کے پیچھے چھپ کر اس غریب کی ضمانت ضبط کرواتے ہیں۔ (اب زر ضمانت کی رقم ہماری عقل کی طرح موٹی سے موٹی تر ہوتی جارہی ہے پھر بھی سرکاری خزانہ خالی کا خالی ہے) پرچہ رائے دہی پر آپ کی مہر بالعموم غلط جگہ لگ جاتی ہے۔ یہ مہر اگر صحیح جگہ پر نہ لگی ہو تو آپ کی ساری محنت' سرکار کے کیے ہوئے سارے انتظامات پولس کا کیا ہوا بندوبست اور بے ضرورت صرف کی ہوئی بے پناہ دولت' یہ ساری چیزیں اکارت جاتی ہیں۔ محنت اور دولت کے اکارت جانے کے سارے کام ہم کتنی خوشی سے انجام دیتے ہیں۔

ووٹ دینا ہمارا جمہوری حق ہے اور جمہوریت کو لوگ اس لیے پسند کرتے ہیں کہ اس میں ہر شخص کو منسٹر' چیف منسٹر اور پرائم منسٹر بننے کا موقع حاصل ہوتا ہے اور اسی جمہوریت کو لوگ اسی لیے ناپسند بھی کرتے ہیں کہ جسے دیکھو اسے منسٹر' چیف منسٹر اور پرائم منسٹر بننے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ (میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی)۔

ووٹ دینا جمہوری حق ہے لیکن صرف اس لیے معیوب ہے کہ چھپ کر دیا جاتا ہے (یہ رفع دولت و فرصت ہے) اور کتابوں میں آیا ہے کہ جو کام چھپ کر کیا جائے وہ معیوب ہوتا ہے۔ (اب اس مقولے پر عمل جراحی نہ فرمائیے۔ خود ہی شرما جائیں گے کیونکہ اسے اڈلٹ فرنچائز (بالغانہ رائے دہی) بھی کہا جاتا ہے۔

مجتبیٰ حسین
۱۲۰۰کور پار ٹمنٹس
پٹ پڑ گنج، دہلی۔ ۹۲

دلاور فگار کی یاد میں

ان دنوں جب کہ تک بندی کے نام پر مزاحیہ شاعری کا لائسنس ہر جگہ دستیاب ہونے لگا ہے، اچھے خاصے لطیفوں کو توڑ مروڑ کر نہایت بھونڈے ڈھنگ سے انھیں منظوم کرنے کو مزاحیہ شاعری کہا جانے لگا ہے، اسٹیج پر اچھل کود کرنے، بھانڈپن کا مظاہرہ کرنے اور زبان کی مٹی پلید کرنے کو مزاحیہ شاعری کا خاص وصف سمجھا جانے لگا ہے دلاور فگار جیسے طنز و مزاح کے بلند پایہ شاعر کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا اردو ادب کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، ہمارے یہاں یہ معمول سا بن گیا ہے کہ کوئی چھوٹا موٹا شاعر بھی اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو ہم یہ جانے بغیر کہ ہمارے یہاں اکثریت ایسے شاعروں و فنکاروں کی ہے جن کے مرنے سے ادب میں اتنا خلا پیدا نہیں ہوتا جتنا کہ ان کے زندہ رہنے سے پیدا ہوتا ہے، رسماً یہ جملہ کہہ دیتے ہیں کہ مرحوم کے گزر جانے سے ادب میں خلا پیدا ہو گیا ہے۔ نعوذ باللہ پچھلے دنوں ہم نے دوستوں کی ایک محفل میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ بیشک قدرت نے اس کائنات کی تخلیق کی ہے لیکن اس کائنات میں آپ کو ہر طرف جو وسیع و بسیط خلا نظر آتا ہے اسے اردو شاعروں نے پیدا کیا ہے جسے اب تک پر نہیں کیا جا سکا۔ اگر اردو شاعر نہ مرتے تو خلا پیدا نہ ہوتا اور خلا پیدا نہ ہوتا تو امریکہ اور روس کو خلا کی تسخیر کے لیے اتنے بڑے پیمانہ پر مہم چلانی نہ پڑتی۔ دہلی میں ہمارے ایک شاعر دوست ہیں جن کے بارے میں ہم نے کچھ عرصہ پہلے ایک خاکہ لکھا تھا جس میں ہم نے انھیں اردو کا "خلا یافتہ شاعر" قرار دیا تھا۔ ہم نے ایک محفل میں یہ خاکہ پڑھا تو موصوف نے پوچھا "بھئی تم نے اپنے مضمون میں مجھے "خلا یافتہ شاعر" قرار دیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟" ہم نے کہا خلا یافتہ' کا مطلب بھی وہی ہے جو "انعام یافتہ" "شہرت یافتہ" یا "سزا یافتہ" وغیرہ کا ہو سکتا ہے۔ اس کا ایک سیدھا سادا مطلب یہ بھی ہے کہ تم ادب کی ایک ایسی ہستی ہو جس نے زندہ رہ کر بھی اردو ادب میں خلا پیدا کیا ہے اور انشاء اللہ مرنے کے بعد بھی خلا ہی پیدا کرو گے اور ہمارے یہاں ادب

میں خلا پیدا کرنے کو ہمیشہ ادب پیدا کرنے سے کہیں زیادہ اہم ضروری اور مستحسن کام سمجھا گیا ہے۔ ہمارے اس سمجھائے ہوئے مطلب سے کچھ ایسے مطمئن ہوئے کہ اب اپنے طور پر بھی اپنے نام کے ساتھ "خلایافتہ" لکھنے کے معاملہ میں خود مکتفی ہو چکے ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بات دلاور فگار کی ہو رہی تھی اور ان کی بات ہی الگ تھی۔ وہ جب تک زندہ رہے اردو ادب میں اکبر الٰہ آبادی کے خلا کو پر کرنے کی بھرپور سعی کرتے رہے اور جب گزر گئے تو اپنے پیچھے خود ایک بڑا خلا چھوڑ گئے۔

پچھلے دنوں برطانیہ کا اردو ہفتہ وار "راوی" ہمارے پاس آیا تو اس میں چھپی ہوئی ایک چھوٹی سی خبر سے پتا چلا کہ دلاور فگار اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ جنوری کے تیسرے ہفتہ کی ایک صبح کو ہشاش بشاش بستر سے اٹھے، اپنی نواسی کے لیے دودھ لانے کی خاطر گھر سے باہر نکلنا چاہتے تھے کہ ان کا بلاوا آگیا اور وہ دودھ کے ڈپو کی طرف جانے کی بجائے اس دنیا کے طرف نکل گئے جہاں دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی ہیں۔ ایسی خبریں پڑھ کر عموماً آدمی کو دھکا سا لگتا ہے یا اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا البتہ یہ ضرور محسوس ہوا کہ دنیا اچانک کچھ سونی سونی سی ہو گئی ہے اور کہیں کسی چیز کی کمی واقع ہو گئی ہے۔ تب احساس ہوا کہ اچھا اسی کیفیت کو خلا کا پیدا ہونا کہتے ہیں۔ دلاور فگار سے ہماری پرانی یاد اللہ تھی۔ ۱۴ر مئی ۱۹۶۶ء کو حیدر آباد میں ان سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی اور ۲۲ر ستمبر ۱۹۹۷ء کو دوبئی کے رائل ایمپائر ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ناشتہ پر ان سے ہماری آخری ملاقات ہوئی تھی، گویا ان سے لگ بھگ تین دہوں کے شخصی مراسم تھے۔ مئی ۱۹۶۶ء میں زندہ دلان حیدر آباد کی پہلی کل ہند طنز و مزاح کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس کے ہم جنرل سکریٹری تھے۔ حیدر آباد میں اردو طنز و مزاح نگاروں کا اس سے بڑا اجتماع نہ پہلے کبھی منعقد ہوا اور نہ ہی بعد میں۔ اس کانفرنس کا افتتاح مخدوم محی الدین نے کیا تھا اور اس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرشن چندر نے کی تھی۔ البتہ اس کے کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کی صدارت کے منظوم فرائض دلاور فگار نے انجام دیے تھے۔ ان دنوں دلاور فگار اسلامیہ کالج بدایوں میں اردو کے استاد تھے اور ایک مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے ان کے نام کو خاصی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی مگر دکن میں وہ ابھی اتنے مقبول نہیں ہوئے تھے۔ مزاحیہ مشاعرہ میں ان کی شرکت کو پکا کرنے کے لیے ہم نے علامہ حیرت بدایونی سے بھی ایک خط ان کے نام لکھوایا تھا اور ہمارے دو کرم فرماؤں قبلہ

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور جناب وی شنکر آئی ایس ایس (سابق ڈیفنس سکریٹری حکومت ہند) سے بھی کہا تھا کہ وہ دلاور فگار کو اس مشاعرہ میں شرکت کے لیے ضروری ہدایت فرمادیں (دلاور فگار ان دونوں حضرات کا بے حد احترام کرتے تھے اور جب تک وہ ہندستان میں رہے ان دونوں حضرات نے ان کی بھرپور سرپرستی فرمائی) اس تاریخی مزاحیہ مشاعرہ کی خوبی یہ تھی کہ نہ صرف صدر مشاعرہ کا خطبہ منظوم تھا بلکہ صدارت کی تحریک اور تائید بھی، جسے علی الترتیب سلیمان خطیب اور مسافر ملکنڈوی نے پیش کیا تھا منظوم تھی۔ یوں تو دلاور فگار کا منظوم خطبہ صدارت خاصا طویل تھا لیکن اس کے وہ حصے ملاحظہ فرمایئے جو انھوں نے حیدر آباد اور اہل حیدر آباد کے بارے میں کہے تھے

اے زندہ دلان حیدر آباد　　اے دیدہ وران حیدر آباد
اے شہر غزل کے شہریارو　　اے ملک ادب کے تاجدارو
اے ارض دکن کے خوش دماغو　　اے بزم کے خوشنما چراغو
اے بزم جہاں کے خوش نصیبو　　اے عالمو، شاعرو، ادیبو
اے شعر و سخن کے نکتہ چینو　　اے علم و ادب کے نبض بینو
اے خوش نظر و جواں خیالو　　اے دیدہ وررو، نگاہ والو
اے عالمو، اے ادب نوازو　　بیمار ادب کے چارہ سازو
ذروں کو قمر بنانے والو　　فانی کو امر بنانے والو
بلوا کے ظریف شاعروں کو　　معقول و شریف شاعروں کو
تم نے جو مشاعرہ کیا ہے　　جدت کا مظاہرہ کیا ہے

اس منظوم خطبہ صدارت کی سارے برصغیر میں دھوم ہوئی۔ اس کے بعد دلاور فگار ادبی ٹرسٹ اور زندہ دلان حیدر آباد کے مشاعروں میں شرکت کے لیے کئی بار حیدر آباد آئے اور ان سے بیسیوں ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ شاعری میں جتنے پرگو تھے نجی محفلوں میں اتنے ہی کم گو تھے مگر جن سے کھل جاتے تھے ان سے بے تکان باتیں کرتے تھے۔ انھیں اساتذہ کے بے شمار اشعار یاد تھے اور اردو کے کلاسیکی ادب پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ انھوں نے آگرہ یونی ورسٹی سے اردو اور معاشیات میں ایم۔اے کیا تھا۔ ہندستان میں جب ان کی مقبولیت نقطہ عروج پر تھی تو وہ اچانک پاکستان منتقل ہوگئے۔ ۱۹۸۹ء میں جب جدہ میں جشن مزاح کا انعقاد عمل میں آیا تو اس میں شرکت کے لیے دلاور فگار بھی جدہ آئے تھے۔ اس طرح طویل عرصہ کے بعد ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ ان سے آخری ملاقات ستمبر ۱۹۹۷ء کے تیسرے ہفتہ میں ہوئی جب وہ ہمارے جشن کے سلسلہ

میں منعقدہ مشاعرہ میں شرکت کے لیے دوحۃ آئے تھے۔ ۱۸ ستمبر کو جب ہم کچھ دیر کے لیے کراچی میں رکے تو ماہنامہ "ظرافت" کے مدیر ضیاء الحق قاسمی ہم سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے اطلاع دی کہ وہ خود تو امریکہ کے کسی مشاعرہ میں شرکت کے لیے امریکہ جارہے ہیں البتہ دلاور فگار اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے دوحۃ کے مزاحیہ مشاعرہ میں شرکت کرنے سے قاصر ہیں مگر جب ہم دوحۃ جانے والے ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے لیے کراچی ہوائی اڈہ پر پہنچے تو دیکھا کہ پاکستانی مزاحیہ شعراء کے قافلہ میں دلاور فگار بھی موجود ہیں۔ عرصہ بعد ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے کہنے لگے۔ "یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ کا جشن ہو اور ہم نہ آئیں۔" اگرچہ صحت کے اعتبار سے کچھ کمزور سے دکھائی دیے لیکن باتیں کرنے کا وہی بانکپن برقرار تھا۔ حیدرآباد کی کئی ادبی شخصیتوں کو یاد کیا۔ علامہ حیرت بدایونی' عابد علی خاں' محبوب حسین جگر' ایل این گپتا' کنول پرشاد کنول اور زندہ دلان حیدرآباد کے کئی احباب کو یاد کرتے رہے۔ پھر ایک آہ بھر کر بولے۔ "اب وہ محفلیں ایک خواب کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔" ہم نے ہنس کر کہا "آدمی جب خود ایک خواب بننے لگتا ہے تو محفلیں بھی خواب کی طرح دکھائی دینے لگتی ہیں۔" ہنس کر خاموش ہوگئے۔ پاکستان کے روزنامہ "نوائے وقت" میں روزانہ وہ ایک مزاحیہ قطعہ لکھا کرتے تھے جو قارئین میں بے حد مقبول تھا۔ دلاور فگار نے مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے بے پناہ شہرت حاصل کی۔ مزاحیہ شاعری کے نام پر ان دنوں جس طرح کی تک بندی ہونے لگی ہے اس کے وہ سخت خلاف تھے۔ جب بھی کوئی ایسا مزاحیہ شاعر مشاعرہ میں اپنا کلام سناتا تو ان کی شکل پر ایسے آثار پیدا ہو جاتے تھے جو نہایت کڑوی کسیلی دوا کو پی لینے کے فوراً بعد کسی چھوٹے بچے کے چہرہ پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شکل پر نمودار ہونے والے آثار سے بعض شعراء کو سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ اگرچہ ہم یہ مانتے ہیں کہ اردو کے طنز و مزاحیہ ادب میں اکبر الہ آبادی نے جو جگہ چھوڑی تھی وہ اب بھی خالی ہے لیکن موجودہ دور میں برصغیر کے تین بڑے مزاحیہ شاعروں ضمیر جعفری' رضا نقوی واہی اور دلاور فگار نے اکبر الہ آبادی کی روایت کو جاری رکھنے کی نہایت کامیاب اور بھرپور کوشش کی ہے۔ ضمیر جعفری اور رضا نقوی واہی دونوں ہی اب اسی کے پیٹے میں ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ وہ تادیر ہمارے درمیان سلامت رہیں۔ دلاور فگار کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جیسے آداب عرض' ستم ظریفیاں' شامت اعمال' مطلع عرض ہے' انگلیاں فگار اپنی' خدا جھوٹ نہ بلوائے' وغیرہ دلاور فگار زندگی بھر اس روتی بسورتی دنیا کو مسکراہٹیں فراہم کرنے کا نیک کام انجام دیتے رہے اور اس حوالہ سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

نصرت ظہیر
4/15 کھجوری پور کالونی نئی دہلی 91
فون:2474425

ایک مباحثے کی پیروڈی

دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں ایک آئی پی ایس ادیب کے اولین ناول "دکان" پر مذاکرہ ہو رہا تھا۔

آئی پی ایس ادیب کی اصطلاح پر چونکیے نہیں۔ جیسے جیسے ادیبوں میں شرح خواندگی بڑھ رہی ہے ان کا معیار بھی بلند ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ جس طرح پہلے مولوی اور مولانا ادیب ہوتے تھے، بعد میں اسی طرح بی اے اور ایم اے ادیب پیدا ہو گئے اور اب آئی پی ایس، آئی اے ایس اور آئی ایف ایس ادیب جنم لینے لگے ہیں۔

مباحثے کی ویڈیو فلم بھی بنائی جا رہی تھی چنانچہ ایک گوشے میں ویڈیو فلم بنانے والے اپنے کیمرے اور فلیش لائٹیں لیے کھڑے تھے۔ جیسے ہی کیمرے اور لائٹیں آن ہوئیں بحث شروع ہو گئی۔

ایک نقاد نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اپنی ٹائی درست کرتے ہوئے بولا۔

"ناول دکان میں فاضل مصنف نے جس طرح عصر حاضر اور عصر غیر حاضر کے نفسیاتی اعصابی اور روحانی بحران کی عکاسی کی ہے اس کی دوسری مثال اردو ادب تو کیا افریقی ادب میں بھی مشکل سے ملے گی۔ ناول کا مرکزی کردار اپنی پان بیڑی سگریٹ کی دکان کو میونسپل کارپوریشن کے ڈیمالیشن اسکواڈ (انہدامی دستہ) سے بچانے کے لیے جس طرح دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی، میونسپل اور اینٹی کرپشن ڈپارٹمنٹ والوں کی مدد سے یکے بعد دیگرے [illegible] کے بدعنوان افسروں کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر اخباروں میں سنگل کالمی خبریں چھپواتا ہے اسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مصنف وجودیت کے فلسفے میں گہرا یقین رکھتا ہے جو ایک قابل تحسین بات ہے"

وجودیت کے ذکر پر دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے ایک نقاد کے کان کھڑے ہو گئے، جو اول الذکر نقاد کے مخالف گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے فوراً اپنے سامنے رکھے مائک کا بٹن دبایا اور بولا۔

"معاف کیجیے صاحب! مجھے اس سے سخت اختلاف ہے ناول دکان میں وجودیت کے فلسفے کا نہیں بلکہ عدم وجودیت کے فلسفے کا اثر زیادہ ہے کیونکہ مصنف نے دکھلایا ہے کہ تمام خارجی عناصر پان بیڑی سگریٹ کی دکان کے وجود کو عدم وجود میں تبدیل کرنے پر تلے ہوئے ہیں بلکہ ایک خارجی عناصر تو وہاں چھوٹے بھٹورے کی دکان کھولنا چاہتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ـــــــ"

یہ سنتے ہی پہلے والے نقاد کا پارہ چڑھ گیا۔ مخالف گروپ کے نقاد کی بات کاٹتے ہوئے اس نے کہا۔

"اس سے قطعی ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ عدم وجودیت کی بات ہے۔ ناول کا مرکزی کردار جو کہ ایک یتیم اور بظاہر بے آسرا اتھار بنے والی قبول صورت لڑکی ہے، اپنی دکان کے وجود کو قائم رکھنے پر مصر ہے۔ لوگ کہتے ہیں عورت ذات کا بیڑی سگریٹ سے کیا تعلق؟ اس سے لڑکی کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہ بپھر جاتی ہے اور خارجی عناصر کی تمام داخلی کوششوں کو ناکام بنا دیتی ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے ــــ"

"آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ جدید انٹرپریٹیشن بالکل غلط ہے۔ لڑکی کی کوششیں داخلی نہیں خارجی ہیں ــــ"

"داخلی ہیں۔"

"خارجی ہیں۔"

"دل۔ دل۔ داخلی ہیں۔"

"خا۔ خا۔ خا۔ خارجی ہیں:" دوسرے نقاد نے مائک کو ہی پٹخ دیا۔

"قطع کلام معاف صاحبان!" مباحثے کے ماڈریٹر نے کہا۔ "ایسا لگتا ہے کہ ناول دکان پر ہونے والی بحث داخلی رجحانات کے وسیع دائروں میں محدود ہوتی جا رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں ہمیں مصنف کے طرز تحریر پر بھی گفتگو کرنی چاہیے کہ اس پر جدید اور قدیم لسانی رجحانات کا کتنا اثر ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہماری اس محفل میں پروفیسر جلی توس ــــ معاف کیجیے پروفیسر جالی نوس بھی موجود ہیں جو لسانیات کے ایک بڑے ماہر ہیں اور حال ہی میں اردو زبان پر بحر اوقیانوس کی زبانوں کے لسانیاتی عمل اور رد عمل کے بارے میں تحقیق کر کے ہونولولو سے واپس آئے ہیں لہٰذا میں پروفیسر لولو ــــ معاف کیجیے پروفیسر جالی نوس سے درخواست کروں گا کہ وہ مصنف کے لسانی رجحانات پر روشنی ڈالیں۔"

دعوت سخن ملتے ہی پروفیسر [illegible] نے جیب سے رومال نکال کر ناک صاف کی، منہ صاف کیا، دانت چمکائے، بالوں کو [illegible] سہلایا اور کیمرے کا رخ اپنی جانب تبدیل ہونے کا

انتظار کرنے لگے۔ جیسے ہی کیمرے اور لائٹوں کا رخ ان کی جانب ہوا انھوں نے ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار کی طرح مسکرا کر دانت دکھائے اور بولنے کے لیے منہ کھولنے ہی والے تھے کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔

"میں پروفیسر صاحب سے پورا اتفاق رکھتا ہوں۔"

"مگر قبلہ میں نے تو ابھی کچھ کہا ہی نہیں۔" پروفیسر صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں مجھے معلوم ہے آپ کیا کہنے والے ہیں۔ گزشتہ پانچ مذاکروں سے آپ ایک ہی بات گھما پھرا کر کہہ رہے ہیں۔"

اس پر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ وہ تھما تو ایک ناقد نے جو بلا کا نقاد تھا، کہا:

"صاحبان میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ناول دراصل ناول ہے ہی نہیں۔ یہ محض ایک منظر نامہ ہے۔ ناول وہ ہوتا ہے جس میں واقعات ہوں۔ جبکہ اس ناول میں جو کچھ ہے وہ ہر روز ہوتا رہتا ہے اور جو ہر روز ہوتا ہے وہ واقعہ ہرگز نہیں ہو سکتا ہے۔ مثلاً میں روز صبح بیت الخلا جاتا ہوں، پھر ناشتہ کرتا ہوں۔ تو کیا یہ کوئی واقعہ ہوا۔ نہیں۔ لیکن کبھی کبھی بدہضمی بھی ہو جاتی ہے چنانچہ واقعہ رونما ہو جاتا ہے۔ اسے کہتے ہیں واقعہ پس ثابت ہوا کہ یہ ناول نہیں ہے۔"

تبھی ایک مبتدی ناقد نے جو بہت کم نقاد تھا کہا۔ "حضرات میری بھی سنیے۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس ناول کا مرکزی کردار، البرٹ کامو کے آؤٹ سائڈر کے مرکزی کردار مارسال سے بہت مشابہ ہے!"

ایک مغربی ادیب کا ذکر آتے ہی محفل میں زلزلہ سا آگیا۔ سینئر نقادوں کی بھنویں تن گئیں۔ ان سے کم سینئر نقادوں کے کان کھڑے ہوگئے۔ ایک مہیب سی خاموشی چھاگئی۔

آخر اس خاموشی کو توڑتی ہوئی ایک آواز آئی۔

"مارسال نہیں مارسا"

"جی نہیں مرسال۔ بلکہ مرسالے" کسی اور نے کہا۔

"نہیں صاحب مرسلاں" تیسرا بولا۔

"مرسلاں نہیں مرسلین کہیے۔" چوتھے نے کہا۔

"میں نے پورا ناول پڑھا ہے۔ اس کا نام مارسال ہی ہے۔" مبتدی نقاد نے کہا۔

"مجھے آپ کے دعوے پر شبہ ہے۔" ایک [illegible]ری نقاد نے کہا۔ "مرسا عرف مارسا مشاہدۂ نفس کا عادی اور داخلیت پسند کردار [illegible] ہے داخل ہو جاتا ہے اور مصنف کا نام بھی البرٹ نہیں البیئر کامو ہے [illegible] ہے۔ اگر آپ نے کامو کو صحیح

بچ پڑھا ہوتا تو یہ غیر ذمہ دارانہ بیانات ہرگز نہ دیتے۔ میرے خیال سے تو مکان کے مرکزی کردار میں نہیں بلکہ تمام ماحول پر جارج ایلیٹ کے مڈل مارچ کا زیادہ اثر ہے۔"

"جارج ایلیٹ نہیں جناب ٹی ایس ایلیٹ کہیے۔" ایک نئی آواز نے سب کو چونکا دیا۔

سب کی نگاہیں آواز کی طرف مڑ گئیں۔ اس نقاد کو پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ یہ بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کسی پروفیسر کے گروپ کا ہے۔ چند لمحے خاموش رہ کر اس نے بات آگے بڑھائی۔ "آپ غالباً جارج واشنگٹن سے کنفیوز کر گئے۔ بہر کیف مجھے لگتا ہے ٹی ایس ایلیٹ کے کانفیڈینشل کلرک سے ہمارا مصنف خاصا متاثر معلوم ہوتا ہے اور کہیں کہیں اس نے روسو کے کنفیشن کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ کئی جگہوں پر تو اس کا ذہن کانٹ کے کریٹک آف پیور ریزن کی طرف بھی بھٹک گیا ہے بلکہ صفحہ چار سو بیس کے تیسرے پیراگراف میں تو اس نے تھامس ہارڈی کے میئر آف کاسٹربرج کا ایک مشہور منظر بھی دہرا دیا ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے میرا اشارہ کس طرف ہے؟"

سب نقادوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ظاہر ہے نفی میں گردن ہلانے کے مضمرات و خطرات سے وہ بخوبی واقف تھے۔

"یہ وہی منظر ہے دوستو۔" نیا نقاد کہے جا رہا تھا۔ "جو کنز، ہیوگو کے لا مزریبل میں کئی جگہ آیا ہے۔ تاہم ایک کمی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ الیگزینڈر دوما کے کاؤنٹ آف دی مونٹے کرسٹو سے لے کر ماریو پوزو کے گاڈ فادر تک مغربی ادب میں قدروں اور تہذیب کے انحطاط کی جن زیریں اور بالائی سطحوں کی نشاندہی کی گئی ہے ان سے مصنف یکسر بیگانہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر فاضل مصنف نے مولیئر کے دی مائزر اور ڈی ایچ لارنس کے سنس اینڈ لورز کے اسلوب سے کچھ سبق لیا ہوتا اور سیتھے سے کافکا تک شعور تحت الشعور اور ماتحت الشعور کی رو نے جو سفر طے کیا ہے اس پر ــــــــ"

میں نے دیکھا، محفل کے آدھے نقاد بے ہوش ہو کر لڑھک چکے تھے اور باقی لڑھک کر بے ہوش ہونے والے تھے۔

جانتے ہیں یہ نقاد کون تھا؟

جی ہاں۔ آپ نے ٹھیک پہچانا۔

یہ تھے میاں عبدالقدوس، جنھوں نے میرے علم کے مطابق ابن صفی، اظہار اثر اور اکرم الہ آبادی کے علاوہ زندگی میں کسی کا ناول نہیں پڑھا تھا۔

(پیغام آفاقی کے ناول "مکان" پر ہونے والے ادبی مباحثے سے متاثر ہو کر لکھا گیا)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

حیات غالب سنین کے آئینے میں

یہ کوائف غالب کی صد سالہ برسی ۱۹۶۹ء میں مرتب کیے گیے تھے، جو سب سے پہلے میرے مرتبہ دیوان غالب نسخۂ طاہر کے غالب نمبر میں بھی شامل کیے گئے اب ان کوائف پر نظر ثانی کی گئی ہے اور اس سلسلے میں عیار غالب مرتبہ مالک رام جاگیر غالب از پرتھوی چندر اور واقعات غالب از پروفیسر سحر انصاری کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔

۱۷۹۷ء: پیدائش ۲۷ر دسمبر مطابق ۸رر جب ۱۲۱۲ھ اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ ولد عبداللہ بیگ بن مرزا قوقان بیگ ، بمقام آگرہ۔

۱۷۹۹ء: غالب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف علی خاں ولادت

۱۸۰۲ء: وفات عبداللہ بیگ ، غالب اپنے چچا نصراللہ بیگ کی سرپرستی میں آئے۔

۱۸۰۳ء: لارڈ لیک نے دہلی کو فتح کیا۔

۱۸۰۵ء: غالب کے چچا نصراللہ بیگ کو لارڈ لیک کی سفارش پر سونسا کا پرگنہ دیا گیا۔

۱۸۰۶ء: غالب کے چچا مرزا نصراللہ بیگ کی وفات جنہوں نے غالب کو اپنا بیٹا بنا رکھا تھا۔ غالب اپنے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان رئیس آگرہ کی سرپرستی میں آئے۔

۱۸۰۶ء: شاہ عالم کی وفات اور اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی۔

۱۸۰۶ء: (۴ر مئی) نواب احمد بخش خاں کی سفارت پر انگریزوں نے نصراللہ بیگ کے پسماندگان کا وظیفہ دس ہزار روپے مقرر کیا۔ (پہلا شقہ)

۱۸۰۶ء: (۷۔جون) خاندانی پینشن کی رقم دس ہزار سے پانچ ہزار روپے سالانہ کردی گئی۔ غالب کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سالانہ مقرر ہوا۔

۱۸۰۹ء: دوسری روایت کے مطابق اس سال سے شعر گوئی کا آغاز کیا اور رنگ بیدل کو اپنایا۔

۱۸۱۰ء: نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی اور نواب احمد بخش خاں والی فیروز پور جھرکہ ؤ جاگیر دار لوہارو کی

بھتیجی امراؤ بیگم سے شادی ہوئی۔

۱۸۱۰ء: نواب حسام الدین خاں حیدر نے ان کا کلام میر تقی میر کے سامنے پیش کیا۔

۱۸۱۰ء: (۲۰ ستمبر) میر تقی میر کی لکھنؤ میں وفات۔

۱۸۱۱ء: عبدالصمد کی شاگردی۔

۱۸۱۳ء: آگرے سے دہلی میں آمد اور قیام۔

۱۸۲۱ء: اردو کلام کی تدوین بہ ترتیب ردیف (یہی دیوان غالب نسخہ بھوپال کی تاریخ کتابت ہے)۔

۱۸۲۲ء: فارسی شاعری کا آغاز۔

۱۸۲۲ء تا ۱۸۵۰ء فارسی نظم و نثر۔

۱۸۲۵ء: فارسی زبان میں پہلی نثری تصنیف۔ رسالہ قواعد نیز پنج آہنگ تصنیف ہوئی۔

۱۸۲۵ء: (نومبر۔ دسمبر) میرزا یوسف خاں کی بیماری دیوانگی کا آغاز۔

۱۸۲۶ء: (اکتوبر) نواب احمد بخش خاں کی فیروزپور جھرکہ اور لوہارو کی حکومت سے دستبرداری۔

۱۸۲۶ء: پنشن کی حصول کے لیے کلکتے کا سفر۔ مرزا الٰہی بخش معروف خسر غالب کی وفات۔

۱۸۲۶ء: دلی سے کلکتے کی طرف روانگی۔ انتخاب دیوان اردو۔

۱۸۲۷ء: لکھنؤ کا سفر۔ لکھنؤ سے کانپور اور پھر باندہ۔

۱۸۲۷ء: نواب احمد بخش خاں کی وفات۔

۱۸۲۸ء: وردو کلکتہ۔ معرکہ حامیان قتیل، دربار انگریزی کا آغاز۔

۱۸۲۸ء: پنشن کے مقدمے کا آغاز۔

۱۸۲۹ء: دہلی میں مراجعت (۱۸۲۸ء تا ۱۸۲۹ء۔ انتخاب کلام فارسی و اردو موسوم بہ "گل رعنا" کی تدوین، بفرمائش مولوی سراج الدین احمد۔)

۱۸۳۱ء: پنشن کا دعویٰ جسے ولیم ہنٹنگ نے خارج کیا۔

۱۸۳۲ء: انتخاب کلام اردو دیوان مروج۔

۱۸۳۳ء: لارڈ ولیم ہنٹنگ کے حکم سے سرکاری دفاتر میں فارسی کی جگہ انگریزی زبان کو لازمی قرار دیا گیا۔

۱۸۳۵ء: فریزر کا قتل۔ نواب شمس الدین خاں کو سزائے موت۔ کلیات فارسی میخانہ آرزو کے نام سے مرتب ہوا۔

۱۸۳۶ء: پنشن کے مقدمے میں غالب کے خلاف فیصلہ۔

۱۸۳۶ء: کلیات غالب فارسی کی تدوین۔

۱۸۳۷ء: اکبر شاہ ثانی کی وفات۔ بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی۔

۱۸۴۰ء: دلی کالج میں مدرس فارسی کے عہدے کی پیش کش اور غالب کا انکار۔

۱۸۴۱ء: دیوان غالب اردو کے پہلے اڈیشن کی طباعت، مطبوعہ سید المطابع، دہلی قمار بازی کے الزام میں پہلی باز پرس۔

۱۸۴۳ء: دہلی کالج میں پروفیسری کی پیشکش اور غالب کا انکار۔

۱۸۴۵ء: دیوان فارسی "میخانہ آرزو" کا پہلا اڈیشن مطبع دار لسلام دہلی سے شائع ہو۔

۱۸۴۷ء: دیوان غالب کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت مطبع دار السلام دہلی، قمار بازی کے الزام میں کوتوال شہر فیض الحسن کے ہاتھوں گرفتار ہو کر تین ماہ تک قید میں رہے۔

۱۸۴۹ء: پنج آہنگ فارسی کا پہلا اڈیشن شائع ہوا۔

۱۸۵۰ء: بہادر شاہ سے نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب اور پچاس روپے ماہوار تنخواہ تاریخ نویسی پر تقرر۔ ولی عہد شہزادہ فتح الملک کی استادی ریختہ گوئی کا دور ثانی۔ زین العابدین عارف کے لڑکے حسین علی خاں شاداں کی ولادت۔

۱۸۵۱ء: مرزا جواں بخت کی شادی اور غالب وذوق کی کشیدگی۔

۱۸۵۴ء: "مہر نیمروز" لکھی۔ وفات زین العابدین عارف۔

۱۸۵۴ء: استاد شہ مقرر ہوئے۔ چار سو روپے سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔

۱۸۵۵ء: مہر نیمروز کا پہلا حصہ شائع ہوا۔

۱۸۵۶ء: قادر نامہ کی اشاعت اول۔

۱۸۵۶ء: رسل برک نے لندن سے غالب کو اطلاع دی کہ تحقیق کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے انھیں خلعت اور اعزاز دیا جائے گا۔

۱۸۵۷ء: جنگ آزادی۔ دیوان اردو ترتیب دیا اور اس کا ایک نسخہ رامپور بھیجا۔ دربار رامپور سے تعلق۔ وفات مرزا یوسف، علی خاں، برادر غالب۔

۱۸۵۸ء: دستنبو کا پہلا اڈیشن۔ مطبع مفید الخلائق آگرہ۔

۱۸۵۹ء: نواب رامپور نے سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی جو وفات تک ملتی رہی۔ سفر میرٹھ۔

۱۸۶۰ء: نواب کی دعوت پر رام پور گئے ترتیب کلام غالب بدست ناظر حسین مرزا۔ قاطع برہان لکھی۔

۱۸۶۰ء: انگریزی پنشن کا دوبارہ اجراء۔

۱۸۶۱ء: دیوان اردو کا تیسرا اڈیشن، مطبع احمد دہلی۔ مرزا صاحب درد

تو نج میں مبتلا ہوئے۔ ترتیب کلیات فارسی۔

۱۸۶۲ء: دیوان اردو کا چوتھا اڈیشن، مطبع نظامی کانپور۔

۱۸۶۳ء: حکومت انگلیشیہ سے خلعت عطا ہوئی۔ "نگارستان سخن" مرتبہ ظہیر دہلوی میں انتخاب کلام غالب کی طباعت (اس مجموعے میں ذوق، مومن اور غالب کے کلام کا انتخاب تھا اور یہ مطبع مفید الخلائق آگرہ میں باہتمام منشی شیو نرائن چھپا۔ کلیات فارسی کا دوسرا اڈیشن منشی نولکشور نے شائع کیا۔

۱۸۶۳ء: مثنوی ابر گہربار اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوئی۔

۱۸۶۵ء: نواب یوسف علی خان کے انتقال پر نواب کلب علی خان جانشین ہوئے تو غالب نے رامپور کا سفر کیا۔ قاطع برہان نظر ثانی اور اضافوں کے بعد درفش کاویانی کے نام سے شائع ہوئی۔ لطائف غیبی اور سوالات عبدالکریم شائع ہوئیں۔

۱۸۶۵ء: نواب یوسف علی خاں والی رامپور کا انتقال (۷ر اکتوبر) مرزا غالب کا سفر رامپور۔ دستنبو کے دوسرے اڈیشن کی اشاعت۔

۱۸۶۶ء: آخری انتخاب کلام، بفرمائش خلد آشیاں نواب کلب علی خاں والی رامپور۔ حواس باختگی کا اقرار۔

۱۸۶۷ء: مولوی امین الدین کی ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ "سبد چین" کے نام سے فارسی کلام مطبع محمدی، دہلی سے شائع ہوا۔ تیغ تیز شائع ہوئی۔ نکات ورقعات غالب شائع ہوئی۔ حسین علی خان متبنیٰ کی نواب احمد بخش خاں کے حقیقی بھائی کی پوتی سے نسبت۔ تیغ تیز اور سبد چین شائع ہوئی۔

۱۸۶۸ء: عود ہندی کا پہلا اڈیشن۔ مطبع مجتبائی، میرٹھ۔ کلیات نثر فارسی و پنج آہنگ دستنبو، مہر نیمروز، منشی نولکشور نے پہلی مرتبہ مرزا غالب کی اجازت سے شائع کی۔ ادائے قرض کے لیے والی رامپور سے اعانت کی درخواست کی۔

۱۸۶۹ء: (۱۵ر فروری) وفات غالب ۱۵۔ فروری مطابق ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ پیر کے دن ظہر کے وقت۔ نظام الدین اولیاء کے جوار میں دفن ہوئے۔

۱۸۶۹ء: (۶ مارچ) اردوئے معلیٰ کی پہلی اشاعت۔

۱۸۶۹ء: شمشیر تیز تر از مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کی اشاعت۔

۱۸۷۰ء: غالب کی بیوی امراؤ بیگم کا انتقال۔

۱۸۷۶ء: باقر علی خاں بن زین العابدین عارف کا انتقال۔

۱۸۸۰ء: حسین علی خاں بن زین العابدین عارف کا انتقال۔

شاداب ذکی
ریسرچ اسکالر
سوتھا، بدایوں

فانی بدایونی کا پہلا مشاعرہ

شاعری کے فروغ کا ایک ذریعہ مشاعرے بھی ہیں اور بعض شاعروں کی شہرت کا سبب بھی یہی مشاعرے ہیں لیکن ان کے ذریعہ کچھ ایسے لوگ بھی شہرت پاگئے جو اس کے مستحق ہی نہیں تھے اور یہ روایت آج بھی برقرار ہے۔ مشاعروں کی اسی صورت حال کے متعلق سیماب اکبر آبادی نے انجمن معراج ادب آگرہ کے سالانہ جلسے دسمبر ۱۹۴۵ء میں کہا تھا۔

"شعر و ادب کا عروج دیکھنا ہو تو مشاعروں میں نہیں، اساتذہ فن کے مجموعوں میں نظر آئے گا۔ ہمارے مشاعرے تو ابھی بہت ذلیل و پست ہیں جہاں اہل و نااہل شاعر و متشاعر سب کو دوش بدوش بیٹھنے اور رطب و یابس اشعار سننے اور سنانے کی اجازت ہے۔ مشاعروں میں ہمارے ادب کا مظاہرہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ادب کو ان مشاعروں سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اِلا ماشاء اللہ۔ اگر مشاعروں کا معیار ادب سے متوازن ہو جائے تو البتہ یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ہم مشاعروں میں ادب اردو کی صحیح رفتار دیکھ لیں لیکن ایسے مشاعرے ابھی ذہنوں میں محفوظ ہیں اور ان کے رواج کو ایک زمانہ چاہیے۔"

لیکن ماضی میں اکثریت ایسے شعراء کی ہی رہی ہے جو واقعی شاعر تھے۔ ان میں بہت سے لوگوں کا طوطی ان کی مشاعروں میں شرکت سے برسوں پہلے بولنے لگا تھا۔ لوگ ان کی غزلوں کو پڑھ کر سر دھنتے تھے۔ ایسے ہی شعراء کی صف میں فانی بدایونی کا شمار ہوتا ہے۔

فانی کی شاعری کا آغاز ۹ سال کی عمر میں ہو گیا تھا لیکن عمر کے گیارہویں سال میں جب ان کے والد شجاعت علی خاں (متوفی ۱۹۱۷ء) کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے فانی

و شاعری سے باز رہنے کو کہا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ۱۹۰۶ء تک انھوں نے کئی دیوان
ور کتابیں (انگریزی ڈراموں کے تراجم) مرتب کیں۔ جو طباعت سے پہلے ہی یا تو والد
کے ہاتھوں نذر آتش کر دی گئیں یا بدخواہوں نے چوری کر لیں وہ ان حادثات کی تاب
نہ لا سکے اور انھوں نے دل برداشتہ ہو کر شاعری ترک کر دی۔ دس گیارہ سال انھوں
نے اس طرف بالکل توجہ نہ کی لیکن وحید احمد مسعود کے الفاظ میں "۱۹۱۷ سے از
سر نو نالہ و فریاد لب تک آکر نغمہ نواز ہونے لگا۔" یعنی فانی کی شاعری کا دوسرا دور
۱۹۱۷ء سے شروع ہوا البتہ اس سے پہلے وہ اپنی پہچان بحیثیت شاعر بنا چکے تھے لیکن کسی
مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ پہلی مرتبہ انھوں نے حضرت منشی سید فضل
رسول واسطی سندیلوی کے ۳۸ویں عرس کے موقع پر ہونے والے مشاعرے میں
شرکت کی تھی۔ یہ مشاعرہ ۲۰؍ رجب المرجب ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۳؍ مئی ۱۹۱۷ء کو
مندرجہ ذیل مصرعہ طرح پر ہوا تھا ع

عرش تک جاتے ہیں نالے اب مری زنجیر کے

ق ر

اس مشاعرے کا گلدستہ شائع ہوا تھا۔ گلدستے کے سرورق پر تحریر ہے۔

۷۸۶

''گلدستہ کلام ہے یہ یادگار عرس گلزار بے خزاں سے نہیں کم بہار عرس

بہار عرس

یعنی

گلدستہ مجموعہ غزلیات ی ہشتم

مشاعرہ عرس شریف حضرت منشی سید فضل رسول صاحب

متخلص بہ واسطی سندیلوی نور اللہ مرقدہ واعلی اللہ مقامہ

گلدستے کے مرتب حضرت واسطی کے فرزند منشی سید حسن شائق تھے۔ اور یہ
باہتمام سید مقبول حسین مقبول بلگرامی "مقبول المطابع ہردوئی میں طبع ہوا تھا۔
مشاعرے میں ۱۱۳ شعراء نے شرکت کی تھی۔ شائق نے دیباچہ میں فانی کے متعلق لکھا
ہے۔

"جناب شوکت علی خاں فانی بی اے ایل ایل بی وکیل ہائی کورٹ نے شرکت مشاعرہ کی
ابتداء اسی مشاعرے سے کی۔ اگرچہ آپ ایک کہنہ مشق شخص ہیں مگر کبھی کسی

مشاعرے میں اس سے پہلے شریک نہ ہوئے تھے۔ اہل مشاعرہ نے آپ کے کلام کو بہت پسند کیا۔"

فانی نے اس مشاعرے میں جو طرحی غزل پیش کی تھی وہ یہاں درج کی جاتی ہے۔

کیا ہوا باندھی ہے صدقے نالہ شبگیر کے
آسماں پر اکڑے جاتے ہیں قدم تاثیر کے

بے مروت بن کے لب کیا سوئے صحرا جایئے
لوٹتے ہیں پاؤں پر حلقے مری زنجیر کے

ضبط باقی غم سلامت ہے تو سن لینا کبھی
آہ گھبرا کر نکل آئی کلیجہ چیر کے

وصل سے محروم میں ہوں ورنہ گستاخی معاف
بوسے لیتا ہے تصور آپ کی تصویر کے

مجھ کو مضطر دیکھ کر کہتا ہے قاتل پیار سے
آ ادھر سایے میں سو جا دامن شمشیر کے

ساتھ جائے گا مری میت کے سامان خلش
دل میں رکھ چھوڑے ہیں پیکاں میں نے تیر کے

مرتے مرتے ہی دل بیتاب کو چین آگیا
زندگی صدقے میں اتری گردش تقدیر کے

سعی درماں بے اثر فکر دوا بے فائدہ
زخم دل لے چارہ گر قائل نہیں تدبیر کے

پاس کے آتے ہی درماں دل سے یہ کہہ کر چلے
ہم نہیں ساتھی تری بگڑی ہوئی تقدیر کے

دیکھیے کیا ہو وہ اور آزردہ گی بے سبب
ہم خطا ناکردہ خوگر عذر بے تقصیر کے

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

فانی کی یہ غزل دیوان فانی (۱۹۲۱ء) بدایوں باقیات فانی (۱۹۲۶ء) آگرہ اور عرفانیات فانی (۱۹۳۹ء) دہلی میں شامل ہے۔ کلیات فانی (۱۹۹۳ء) مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی میں یہ غزل صفحہ ۱۷۲ پر درج ہے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے اس غزل کا سال تصنیف ۱۹۲۰ء تحریر کیا ہے۔ جو اس جدید تحقیق کی روشنی میں درست نہیں ہے۔ یہ مذکورہ مشاعرے کے اعتبار سے مئی ۱۹۱۷ء کی تخلیق ہے۔

اس مشاعرے میں فانی کے ساتھ پہلی مرتبہ ندرت میرٹھی بھی شریک ہوئے تھے۔ ان کی یادگار غزل کے دو شعر پیش ہیں۔

سخت جانوں پر نہیں چلتی تو اس میں کیا قصور
ہاتھ دھو کر تم تو پیچھے پڑ گئے شمشیر کے

یاس کیا امید کیا، غم کیا خوشی کیا عشق میں
شعبدے ہیں آسماں کے کھیل ہیں تقدیر کے

درجہ بالا سطور فانی کے پہلے مشاعرے کے سلسلے میں تحریر کی گئی ہیں۔ یہاں ان کے
ن بدایوں میں پہلے مشاعرے کا ذکر بھی غیر ضروری نہ ہوگا جس کے ذریعہ فانی اور
ایوں کے تعلق سے کچھ اہم معلومات روشنی میں آئیں گی۔

فانی اور قمر بدایوں کے دو ایسے شاعر ہیں کہ ان پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے۔
بلے ہی فانی کے مقابلے میں قمر کے نام سے آج بہت کم لوگ واقف ہیں لیکن قمر کی
یات میں ان کی شہرت کسی طرح کم نہ تھی۔ اس وقت کے اساتذہ کرام بھی انھیں
ی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ دونوں کا انداز شاعری جداگانہ ہے۔ فانی ہمیشہ سے
واص پسند رہے ہیں جبکہ قمر کو عوام میں بھی مقبولیت حاصل تھی۔

قمر کا سال پیدائش یکم مارچ ۱۸۷۶ء اور فانی کا ۱۳ر ستمبر ۱۸۷۹ء تھا اس طرح قمر
انی سے تقریباً ساڑھے تین سال بڑے تھے۔ لیکن دونوں ہم جماعت تھے۔ بشر علی
دیقی کے بیان کے مطابق۔

"قمر نے انگریزی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں میں حاصل کی جس میں
شوکت علی خاں فانی آپ کے ہم جماعت تھے۔"

فانی اور قمر میں ایک اتفاقی بات یہ ہے کہ دونوں کا سال وفات ایک ہی ہے۔
قمر نے یکم جولائی ۱۹۴۱ء کو اس دنیا کو خیر باد کہا اور فانی نے ۲۷ر اگست ۱۹۴۱ء کو رحلت
کی۔ دونوں کے درمیان خوشگوار مراسم تھے۔ یہی وجہ تھی کہ قمر کے انتقال پر ان کے
صاحبزادے ارشدی بدایونی کو تعزیتی خط (مرقومہ مورخہ ۸ر جولائی ۱۹۴۱ء) میں فانی
نے لکھا تھا۔

"میاں یہ تمہارا باپ ہی دنیا سے رخصت نہیں ہوا میرا عزیز بھائی بھی رخصت
ہوا۔ افسوس میں بدایوں پہنچ کر ان سے ملنے کا کتنا متمنی تھا۔

اٹھ گئے دنیا سے فانی اہل ذوق
ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے

قمر بدایونی کا دوسرا مجموعہ کلام آئینہ جذبات' ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں
نے بیشتر غزلوں پر زمانہ تصنیف اور جس مشاعرے میں وہ پڑھی گئیں ان کا مختصر حال
بھی تحریر کیا ہے۔ جیسا کہ وہ دیوان کی ابتدا میں بھی لکھتے ہیں۔

"بیرونجات یا بدایوں کے ان مخصوص مشاعروں میں سے جن میں شعرائے
بیرونجات شریک ہوئے جن کی بابت جو کچھ یاد آسکا اور دریافت ہوسکا اس کو غزلوں

کے تحت میں فٹ نوٹ کے طور پر درج کر دیا ہے۔"

اس دیوان کے صفحہ ۱۱۴ پر درج غزل نمبر ۱۱۶ پر فٹ نوٹ میں تحریر ہے۔
"سب سے پہلی مرتبہ فانی صاحب بدایوں کے اسی مشاعرے میں شریک ہوئے اگرچہ شاعر بہت پہلے سے تھے۔ مشہور بھی تھے۔ صفی صاحب لکھنوی بھی اس مشاعرے میں شریک تھے۔"

قمر بدایونی نے اس غزل کا سال تصنیف ۱۹۱۷ء تحریر کیا ہے۔ انھوں نے تاریخ وماہ کی نشان دہی نہیں کی ہے لیکن یہ بات ان کے (فانی) پہلے مشاعرے (سندیلہ) کی تاریخ کی روشنی میں کہی جا سکتی ہے کہ بدایوں کا یہ مشاعرہ ۱۳ مئی ۱۹۱۷ء کے بعد منعقد ہوا ہوگا' اس مشاعرے کے لیے طرح تھے ع

زہر دیتا ہے وہ بے رحم دوا کے بدلے

ق ر

"باقیات فانی" (۱۹۷۷ء طبع سوم) میں اس طرح پر غزل صفحہ ۱۶۷ پر دی گئی ہے اور کلیات فانی میں یہ غزل نمبر ۲۶۳ (صفحہ ۱۸۴) پر ہے یعنی فانی نے بھی غزل بدایوں کے اپنے پہلے مشاعرے میں پڑھی تھی۔ اس غزل میں سات شعر ہیں۔ ملاحظہ کریں۔

کی وفا یار سے اک ایک جفا کے بدلے
ہم نے گن گن کے لیے خون وفا کے بدلے

کی سپرد در بت خانہ اجل نے مری خاک
کس کو سونپا مجھے ظالم نے خدا کے بدلے

لطف بیداد حیا غصہ تغافل شوخی
رنگ کیا کیا نہ تلون نے ادا کے بدلے

ہائے میں کشتۂ انداز ہوں یارب کس کا
حور آئی مجھے لینے کو قضا کے بدلے

تیر سے تیغ سے خنجر سے سناں سے مارا
کئی پہلو مرے قاتل نے قضا کے بدلے

کفن اے گرد لحد دیکھ نہ میلا ہو جائے
آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں نہا کے بدلے

عشق اللہ بچائے وہ مرض ہے فانی

زہر بیمار کو دیتے ہیں دوا کے بدلے

یہاں ہم بطور یادگار قمر بدایونی کی غزل بھی نقل کرتے ہیں۔

نزع میں کرنے چلے ہیں دعا کے بدلے — زہر دیتا ہے وہ بے رحم دوا کے بدلے
دل بھی دو، جان بھی دو، جرم وفا کے بدلے — دو سزائیں تو نہ دو ایک خطا کے بدلے
میں وہ بے کس ہوں کہ روتی ہے مجھے تنہائی — حسرتیں نکلی ہیں اہل عزا کے بدلے
ایک تو یہ کہ حسینوں کی جفائیں جھیلوں — اور اس پر یہ مصیبت کہ وفا کے بدلے
میری حالت تو حقیقت میں ردی ہے لیکن — تم تو نفرت نہ کرو خوف خدا کے بدلے
دل دکھاتے ہیں یہ بت جور و ستم کرتے ہیں — چاہ شادی کے عوض مہر و وفا کے بدلے
ہائے دشمن سے چلا بس نہ رہ الفت میں — راہزن سا ٹھہرا رہ نما کے بدلے
کچھ ٹھکانہ بھی ہے ظالم کی ستم گاری کا — سیکڑوں ظلم کیے ایک وفا کے بدلے

یہاں ہم بطور یادگار قمر بدایونی کی غزل بھی پیش کرتے ہیں۔
ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے بدایوں کے مشاعرے کی غزل کا سال تصنیف ۱۹۱۷۔۱۹ء
تحریر کیا ہے۔ یعنی یہ غزل ۱۹۱۷ء تا ۱۹۱۹ء کی درمیانی مدت کی ہے قمر کے بیان اور اس
میں درج سال تصنیف سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ غزل ۱۹۱۷ء میں ہی کہی گئی
تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کلیات میں شامل غزلوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ لکھتے
ہیں۔

"قدیم سے مراد ۱۹۰۶ء سے قبل کہی جانے والی غزلیں اور جدید سے ۱۹۱۷ء کے
بعد کی غزلیں ہیں۔"

قدیم وجدید کی شاعری (کلیات فانی میں) فہرست میں درج مصرعوں کے
سامنے کی گئی ہے۔ بدایوں اور سندیلہ کے مشاعروں کی غزلیں ۱۹۱۷ء کی تخلیق ہیں جو
جدید غزلوں میں ہی آتی ہیں۔ اس لیے ہمارے خیال میں جدید سے مراد ۱۹۱۷ء سے کہی
جانے والی غزلیں لینا چاہیے۔ یقینی طور پر فانی نے اس سال میں کچھ غزلیں اور بھی کہی
ہوں گی۔

حواشی

۱۔ تاریخ مشاعرہ مصنفہ علی جواد زیدی طبع دوم ۱۹۹۲ء صفحہ ۲۴۷
۲۔ "مجلہ بدایوں" کراچی (فانی نمبر) بابت نومبر دسمبر ۱۹۹۱ء صفحہ ۳۲

۳۔ "دیوان فانی" مرتبہ وحید احمد مسعود بحوالہ کلیات فانی مرتبہ ظہیر احمد صدیقی صفحہ ۳۱
۴۔ اس مشاعرے میں ۱۱۳ شعراء شریک ہوئے تھے اور ۱۱۵ غزلیں پڑھی گئی تھیں۔ دو اصحاب نے غزل اور ہزل دونوں پیش کی تھیں۔
۵۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے سنہ کا یہ تعین مغنی تبسم کے تحقیقی مقالے "فانی بدایونی حیات شخصیت اور شاعری" کی مدد سے کیا ہے۔
۶۔ مشہور و مقبول ناقد، عالم و شاعر مولانا شوکت علی میرٹھی کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۸۸ء سال پیدائش ہے۔ طباعت اور صحافت سے منسلک تھے۔ چار دیوان "خونیابہ دل" حصہ اول (۱۹۲۴ء) حصہ دوم (۱۹۳۶) صحیفہ ندرت (۱۹۴۲ء) اور لوح و قلم (۱۹۵۲ء) شائع ہوئے۔ ان کا کلام اس وقت کے مشہور جرائد، گلدستوں اور انتخابات میں بکثرت شائع ہوتا تھا۔ جون ۱۹۵۴ء میں انتقال ہوا۔ (تذکرہ شعرائے اتر پردیش جلد ۶ مصنفہ خان عباسی (۱۹۸۳ء) صفحہ ۲۹۶ کی مدد سے)
۷۔ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ بابت جنوری، فروری ۱۹۸۲ء صفحہ ۷۵
۸۔ فانی کا انتقال ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء کو تدفین ۲۸ اگست کو ہوئی۔ ظہیر احمد صاحب نے کلیات میں تاریخ وفات ۲۶ اگست درج کی ہے۔
۹۔ مجلہ بدایوں (کراچی) بابت نومبر دسمبر ۱۹۹۱ء صفحہ ۴۲
۱۰۔ آئینہ جذبات "مصنفہ قمر بدایونی صفحہ ۱
۱۱۔ اصل لکھنوی کی اس مشاعرے میں شرکت سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے مشاہیر شعراء بھی شریک ہوئے ہوں گے۔
۱۲۔ یہ شعر باقیات فانی (۱۹۷۷ء) میں نہیں ہے۔
۱۳۔ "کلیات فانی" مرتبہ ظہیر احمد صدیقی صفحہ ۲۸

شری پاد جوشی
ترجمہ ڈاکٹر اکبر رحمانی
کاشانہ سہیل ۔ ۳ بھوانی پیٹھ جلگاؤں

مراٹھی کہانی

رکھیل

اب تک یہی سنتے اور دیکھتے آرہے ہیں کہ سوسائٹی کے چند متمول اور عیاش لوگ دل بہلانے کے لیے کسی طوائف یا ناچنے گانے والی کو رکھ لیتے ہیں اور سدا اس پر مہربان رہتے ہیں اور خوب دولت لٹاتے ہیں۔ ایسی عورت داشتہ یا رکھیل کہلاتی ہے۔ پرانے زمانے میں امیروں، نوابوں اور جاگیرداروں کے یہاں داشتائیں رکھنے کا چلن عام تھا۔ زمانے کی قدریں جیسے جیسے بدلتی گئیں یہ چلن کم ہوتا گیا لیکن ختم نہ ہوا۔ اس رواج کو کل بھی اور آج بھی مردانگی میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ مرد جو بیوی کے غلام ہوتے ہیں انھیں زن مرید کہہ کر ہدف ملامت بنایا جاتا ہے۔ اب سوسائٹی میں ایسا انقلاب آرہا ہے کہ اب مرد عورت کا غلام یا رکھیل بننے میں خوشی محسوس کرتے ہیں اور اسے اپنی توہین ماننے کی بجائے اس پر فخر کرتے ہیں۔ میرے مکان کے قریب چوراہے پر ایک کرانہ دکان ہے۔ اس کا مالک شنکر پاٹل ہے جس کا شمار ایسے ہی داشتہ مردوں میں ہوتا ہے۔ دکان چھوٹی ہے لیکن سامان سے بھری رہتی ہے۔ پاٹل خوب محنت کرتا ہے۔ وقت پر دکان کھولتا ہے۔ کوئی ملازم نہیں۔ خود دکان کی جھاڑو دیتا ہے اور صفائی کرتا ہے۔ اپنے گاہکوں سے اس کا سلوک بہت اچھا ہے۔ وہ ہمیشہ خوش و خرم نظر آتا ہے۔ میں ہر ماہ کرانہ سامان اسی کی دکان سے خریدتا ہوں اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہیں۔

جب یہ بات لوگوں کی زبانی معلوم ہوئی کہ شنکر پاٹل ایک تماشا تھیٹر میں کام کرنے والی رقاصہ و مغنیہ شکنتلا بائی کا رکھیل ہے تو سخت تعجب ہوا۔ یہ سن کر میں تو پانی پانی ہو گیا۔ جب بھی کرانہ دکان کے سامنے سے گذرتا نہ چاہتے ہوئے بھی نظریں پاٹل بوا کی طرف اٹھ جاتیں۔ بار بار دکان پر جانے سے بے تکلفی بڑھتی گئی۔ اب یہ حالت تھی کہ جب ایک دوسرے کو دیکھتے خیر و عافیت ضرور پوچھتے۔ میں نے کبھی شنکر پاٹل کی زندگی میں جھانکنے کی

کوشش نہیں کی لیکن کسی مرد کا رکھیل ہونا عجیب ضرور لگا۔ دل میں یہ خیال اکثر آیا کہ اس مسئلہ پر شنکر پاٹل سے کھل کر بات چیت کروں مگر ہمت نہ ہوئی۔ کسی کی ذاتی زندگی کے بارے میں کریدنا ٹھیک نہ معلوم ہوا۔

آج اخبار کے دفتر میں زیادہ کام نہ تھا۔ صرف ایک مہیلا منڈل کے سیمینار کی رپورٹنگ کرنا تھی۔ سیمینار کا موضوع بڑا دلچسپ تھا۔ "اکیسوں صدی میں آزادیٔ نسواں کو درپیش چیلنج"۔ سیمینار میں شریک خواتین میں اکثریت اونچے طبقے کی تھی اور مقررین میں بھی اعلا تعلیم یافتہ سماجی کارکن تھیں۔ آزادیٔ نسواں پر بڑھ چڑھ کر باتیں ہوئیں۔ ایک خاتون رہنما نے تو یہ پیش گوئی کی کہ اکیسوی صدی کا معاشرہ عورتوں کی مکمل آزادی اور مردوں کی غلامی کا ہوگا۔ میں نے رپورٹنگ کرتے وقت اسی بات کو مین سرخی بنایا تھا۔ یہ لکھتے وقت میرا ذہن شنکر پاٹل کی طرف چلا گیا۔ جس اقدام سے میں ہچکچا رہا تھا اب میرا دل اس کے لیے مجبور کر رہا تھا۔ میں ایک نئے عزم کے ساتھ دفتر سے نکلا اور میرے قدم شنکر پاٹل کی دکان کی طرف بڑھنے لگے۔

دکان آدھی بند اور آدھی کھلی ہوئی تھی۔ کوئی گاہک بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ دکان پر ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا "آج دکان بند ہے"۔ شنکر پاٹل تنہا بیٹھا ہوا حساب کتاب کرنے میں مگن تھا۔

"کیوں پاٹل بھائی۔۔۔ خیریت تو ہے۔ آج دکان کیوں بند ہے؟" میں نے دکان میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"جوشی صاحب۔ آج مہینہ کا آخری دن ہے نا۔ مالکن بائی کو ہر ماہ حساب دینا پڑتا ہے اس لیے دکان بند کر رکھی ہے۔۔۔

آؤ اندر آکر بیٹھو کہیے چائے پیو گے یا کافی؟"

"آج کچھ نہیں۔۔۔ بس تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ کیا تم تھوڑا وقت دو گے؟"

یہ ارادہ کر کے آیا تھا کہ آج شنکر پاٹل کی ذاتی زندگی کے بارے میں ضرور پوچھوں گا۔

" تھوڑا سا وقت کیوں؟ جو پوچھنا ہے پوچھ لو" شنکر پاٹل نے کہا اور سامنے پڑے حساب کتاب کے رجسٹر بند کر دیے میں نے اپنے آپ کو تیار کیا۔ ہم دو کے سوا کوئی نہ تھا۔ آخر میں نے وہ بات پوچھ لی جو مجھے ایک عرصہ سے پریشان کیے ہوئے تھی۔

"کیوں پول۔۔۔ کیا یہ بات سچ ہے کہ اس بائی کے تم۔۔۔۔"

"زرخرید غلام ہو، یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ!" میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی شنکر پائل نے اسے پورا کر دیا تھا۔

"ہاں! میں زرخرید ہوں اور اس زندگی سے بہت خوش ہوں" پائل نے کہا۔

"کیا تمھیں عجیب سا نہیں لگتا۔۔۔ تمھیں اپنی ذات میں کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا"۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کس بات کی کمی؟"

پائل میرے سوال کو سمجھ نہیں سکا اس لیے وضاحت کرنا پڑی۔ "میرا مطلب ہے مرد ہو کر تم کسی عورت۔۔۔ میری بات ناگوار ہو تو معاف کرنا۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ارے جوشی صاحب۔ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں" پائل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی زندگی سے شرمندہ نہیں ہوں بلکہ بے حد خوش ہوں۔۔۔ میں اپنی عزت و وقار میں کوئی کمی محسوس نہیں کرتا۔"

"تعجب ہے پول!!۔۔۔ تمہارے جیسا محنتی، کڑیل اور ہنرمند مرد ایک عورت کی غلامی کرے۔۔۔ چھی چھی!!" میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"جوشی صاحب۔ آپ میرے ظاہر کو دیکھ کر اندازہ نہ لگایئے۔۔۔ اگر واقعی مجھ میں کسی طرح کی لیاقت اور اہلیت ہوتی تو یہاں عیش و عشرت میں کیوں پڑا رہتا؟ دوسری جگہ کام نہ کرتا!"

"لیکن پول!! تم تو خوب محنت کرتے ہو۔۔۔ اور۔۔۔ اور یہ دکان جو اتنی ترقی کر گئی ہے صرف اور صرف تمھاری محنت کا نتیجہ ہے پھر بھی تم کہتے ہو۔۔۔"

"قطع کلام معاف جوشی صاحب! ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ یہاں میری حیثیت ایک کٹھ پتلی کی سی ہے جس کی ڈور مالکن کے ہاتھ میں ہے۔ دکان کی یہ بھر بھراہٹ سب مالکن بائی کی بدولت ہے۔ میرا کوئی حصہ نہیں۔ اگر مالکن بائی نے ڈور چھوڑ دی تو میں ان بے جان اشیا کی طرح دھڑام سے گر جاؤں گا۔"

"مگر پائل پول۔۔۔ تمہاری مالکن بائی بے حد حسین ہے، وہ کیا کہتے ہیں "تم چودھویں کا چاند ہو۔۔۔ میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ میری بات سن کر پائل ہنس پڑا۔

"جوشی صاحب! بائی کے حسن ہی کا تو اسیر ہوں۔ تھوڑے توقف کے بعد پائل نے

کہا" مگر سچائی یہ ہے کہ بائی کو مجھ جیسے بے غرض اور ایماندار مرد کی ضرورت تھی اور مجھے بھی اس جیسی حسین اور کماؤ عورت کی ـــــ اور جوشی صاحب! جب دو ضرورت مند ملتے ہیں تو اس ملاپ میں بڑا مزا آتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے پاٹل کا چہرہ اور کھل اٹھا۔

"لیکن پوا ـــ پھر تم نے آپس میں شادی کیوں نہیں کی؟" میں نے دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

"جوشی صاحب! میں تو شادی کرنا چاہتا تھا۔ اور آج بھی اس کے لیے تیار ہوں لیکن بائی کو شادی کی بیڑیاں پسند نہیں تھیں۔ شادی کو وہ ایک فضول رسم سمجھتی ہے۔ واقعی یہ ایک فضول رسم ہے ـــ جوشی صاحب! ذرا غور کیجیے۔ آخر بائی کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ حسن ہے، ہنر ہے، دولت ہے، اتنی ساری دولت جس کے پاس ہو وہ مرد کی غلامی کیوں کرے؟ ـــ اور عمر بھر مرد کی لاتیں کیوں کھائے؟" جوں ہی پاٹل نے اپنی بات ختم کی۔ میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"تم بھی کمال کرتے ہو پوا۔ تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ دنیا کے سب شوہر اپنی بیویوں کو لاتوں سے مارتے ہیں۔ کیا تم کو بیوی سے ڈرنے والے مجھ جیسے شوہر نہیں دکھائی دیے؟"

"جوشی صاحب! آپ میری بات نہیں سمجھے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ شادی ایک جوا ہے۔ کبھی داؤ لگ گیا تو خیریت ہے ورنہ عمر بھر پچھتانا پڑتا ہے ـــ ہماری بائی شادی کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی!" اتنا کہہ کر اس نے ایک سگریٹ جلائی اور ایک دو کش لے کر دھواں اڑاتے ہوئے کہا" جوشی صاحب! میرے یہاں آنے سے پہلے بائی چار مردوں کو گھر سے باہر نکال چکی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ سب دولت کے لالچی تھے ـــ میں بائی کا پانچواں مرد ہوں۔" اور پھر وہ ہنسنے لگا۔ مجھے بھی ہنسی آگئی۔

"اس کا مطلب یہ کہ تمھاری بائی 'دروپدی' کے درجے پر پہنچ گئی ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ پاٹل بھی زور زور سے ہنسنے لگا پھر میں نے سنجیدہ ہو کر کہا "فرض کرو ـــ کسی دن بائی تم کو بھی گھر سے نکال دے تو پھر تم کیا کرو گے؟"

پاٹل پوا کچھ دیر سوچ میں ڈوب گیے۔ میں گھبرا گیا کہ کہیں میری بات نے دل کو ٹھیس نہ پہنچائی ہو اس لیے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "پوا ـــ معاف کرنا، میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ برسوں سے تم بائی کے یہاں کام کر رہے ہو ـــ اور اب تمھاری عمر بھی کافی ہو چکی ہے۔ ایسی حالت میں اگر بائی نے تمھیں بھی گھر سے نکال دیا تو پھر تم

مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے !"

پائل یہ سن کر فوراً بول اٹھا، جوشی صاحب اسی اندیشہ کے پیش نظر میں تھوڑا بہت جوڑ کر رکھ رہا ہوں ـــــ

لیکن مجھے نہیں لگتا کہ بائی میرے ساتھ ایسا سلوک کرے گی ـــــ اور وہ بھی ایسے وقت ـــــ میری طرح اس کی عمر بھی ڈھلتی جا رہی ہے ـــــ بھلا اب کون نوجوان اس کی طرف متوجہ ہوگا ؟ سچ بات یہ ہے کہ اب وہ بھی پیا ہوس نہیں رہی۔ اس پر تھکاوٹ طاری ہو چکی ہے ـــــ اب تو وہ بھی ریٹائرڈ لائف گزارنا چاہتی ہے اس لیے وہ مجھے چھوڑ نہیں سکتی ـــــ دوسری اہم بات یہ کہ بائی اچھی طرح جان گئی ہے کہ میں دولت کا لالچی نہیں ہوں۔ وہ مجھے ہر طرح آزما چکی ہے اور اب وہ مجھ پر زیادہ وشواش کرتی ہے ـــــ اس لیے مجھے یقین ہے ہم آیندہ بھی اسی طرح ہنسی خوشی زندگی گزاریں گے۔"

"تمھارے سوچنے کا ڈھنگ تو بالکل یورپی ہے یول سنتے ہیں یورپ اور امریکہ میں مرد اور عورت شادی کے بندھن سے آزاد، دوست بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ وبا اب ہماری سوسائٹی میں بھی پھیل رہی ہے۔" میں نے اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ پائل اپنے خیال میں مگن تھا۔ اس نے شاید میری معلومات افزا بات نہیں سنی۔ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر یوں گویا ہوا۔

"جوشی صاحب۔ سوسائٹی کے رسم و رواج پر کبھی آپ نے غور کیا ہے؟"

"کیسی رسم؟" میں نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"جوشی صاحب۔ ہماری نئی سوسائٹی میں اگر کوئی مرد عورت کو چھوڑ دے تو وہ پاگل ہوتی ہے نہ خودکشی کرتی ہے۔ رونے بسورنے کی بجائے وہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے ـــــ فرض کرو، بائی نے مجھے گھر سے نکال بھی دیا تو میں خودکشی نہیں کروں گا نہ واویلا مچاؤں گا۔ اب تو مجھے دکانداری کا تجربہ ہو چکا ہے۔ اب میں کسی بھی آفت کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔"

میں نے بات کا رخ پلٹتے ہوئے کہا۔ پائل پیارے مجھے تمھاری اتنی فکر نہیں ـــــ ہاں تمھارے بچوں کے مستقبل کے بارے میں ضرور فکرمند ہوں۔

"جوشی صاحب۔ ہمارے بچوں کی فکر کرنے کی بجائے اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر کیجیے" پھر پائل نے ہنستے ہنستے کہا "بچوں کے ساتھ ان کی ماں کی صحت کی بھی فکر کریں ـــــ"

پائل نے ہنستے ہنستے زبردست چوٹ کی تھی۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے

کہا "جوشی صاحب! آپ کے گھر کا پالنا ہمیشہ ہلتا رہتا ہے۔ سال پورا نہیں ہوتا کہ نئے مہمان کی آمد کا مژدہ سنائی دیتا ہے۔ ہماری بھابی بیچاری کس قدر دُبلی ہو گئی ہے۔ ٹی بی کی مریضہ معلوم ہوتی ہے۔ بڑا ترس آتا ہے۔ بھابی کی عمر تو ہے ۳۰ سال اور وہ ۵۰ برس کی دکھائی دیتی ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟"

شرم کے مارے میں نے گردن جھکالی۔ پاٹل بولتا رہا: "اس لیے جوشی صاحب! ہمارے بچوں کی فکر کرنے کی بجائے آپ کو اپنے بچوں کے مستقبل اور ان کی ماں کی صحت کے بارے میں زیادہ فکر کرنا چاہیے۔" پاٹل نے نصیحت آمیز لہجہ میں کہا۔ انھوں نے اپنی بات جاری رکھی "ہماری مالکن کو دیکھیے ۴۰ برس کی عمر ہے لیکن اب بھی دکھائی دیتی ہے ایسی جیسے ۲۵ برس کی دوشیزہ ہو حالانکہ ہمارے گھر میں آپ کے گھر سے زیادہ بچے ہیں لیکن سب کو کھانا، کپڑا اور انھیں اچھی تعلیم دینے کی طاقت مالکن میں ہے۔۔۔ اور صاحب اب تو ہماری مالکن نے آیندہ بچہ نہ ہونے کا انتظام کر لیا ہے۔۔۔؟

"اوہو۔۔۔ تم تو بہت آگے نکل گئے ہو یوا!" میری بات کو سن کر وہ مسکرلیا۔

شنکر پاٹل زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اس کے خیالات ماڈرن تھے۔ اس کے ترقی پسندانہ خیالات سن کر میں خود کو اس کے مقابلے میں دقیانوسی سمجھ رہا تھا۔ زمانہ بدل رہا تھا۔ زمانے کے تقاضے بدل رہے تھے۔ سماجی قدریں بدل رہی تھیں اور ہم اب بھی فرسودہ سماجی نظام کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔

"کس سوچ میں پڑ گئے جوشی صاحب۔" پاٹل یوا کی آواز کانوں سے ٹکرائی تو میں اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آیا اور پاٹل کی طرف دیکھنے لگا۔ پاٹل کے لبوں پر فتح مندانہ مسکراہٹ تھی۔ اپنے احساسات چھپاتے ہوئے پاٹل سے دریافت کیا۔

"یوا۔۔۔ آپ کے یہاں جو اتنے سارے بچے دکھائی دیتے ہیں کیا وہ سب تمہارے ہیں"

"اتنے سارے بچے میرے کیسے ہو سکتے ہیں صاحب!" پاٹل نے کہا۔

"پھر یہ کس کے بچے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"چند میرے ہیں، چند مالکن کے اور چند ہم دونوں کے۔"

"میری تو سمجھ میں کچھ نہ آیا؟"

"جوشی صاحب۔ اب جو کہتا ہوں اسے غور سے سنیے۔ یہاں آنے سے پہلے میری شادی ہو چکی تھی۔ پہلی بیوی سے جو بچے پیدا ہوئے وہ میرے ہیں جب میں یہاں آیا تو پہلے

مردوں سے مالکن کو جو بچے ہوئے تھے وہ مالکن کے ہیں اور میرے یہاں آنے کے بعد جو بچے ہوئے وہ ہم دونوں کے ہیں" اس تشریح کو سن کر مجھے ہنسی آگئی۔ پاٹل بھی ہنسنے لگا۔ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"پھر یہ بچے اپنے باپ کا نام کیا لکھتے ہیں؟"

"صرف میرے بچے میرا نام لکھتے ہیں۔۔۔ میرے بچوں سے مراد پہلی بیوی سے ہونے والے بچے۔۔۔ باقی تمام بچے مالکن کا نام لگاتے ہیں۔۔۔ اور جوشی صاحب! میں تو اس خیال کا ہوں کہ اگر میرے بچوں کے نام کے ساتھ میری بجائے مالکن کا نام لگ گیا تو کوئی قیامت نہ آئے گی" پاٹل نے واضح انداز میں کہا۔

"تم تو بڑے 'وہ' دکھائی دیتے ہو یار! کیسی عجیب باتیں کرتے ہو۔ مرد کو تو بھگوان نے عورت پر برتری اور فوقیت دی ہے۔ تم تو مردوں جیسی باتیں نہیں کرتے ہو۔ ایسا لگتا ہے تم میں مرد ہونے کا احساس ہی فنا ہو گیا ہے"۔ میں نے اس کی مردانگی پر چوٹ کی تھی۔ توقع تھی کہ اس کا مردانہ پن جاگ اٹھے گا۔ لیکن پاٹل پر اس کا ذرا اثر نہ ہوا۔

"ارے جوشی صاحب۔ آپ کس یگ کی بات کر رہے ہیں 'برتری' "فوقیت" یہ الفاظ اپنے معنی کھو چکے ہیں۔ عورت ہمیشہ سے مردوں کے ظلم و ستم کا شکار رہی ہے۔ شادی ہو جانے کے بعد اسے اتنی بھی آزادی نہیں ہوتی کہ اپنے نام کی تبدیلی کے خلاف آواز بلند کر سکے۔۔۔ اسے مذہب کے نام پر خریدا ہوا بے زبان جانور سمجھ لیا جاتا ہے"۔

"مگر پاٹل یار۔ یہ نہ بھولیے کہ ہزاروں سال سے ہمارا سماج مردوں کے تفوق کی بنیاد پر قائم ہے"۔

"جوشی صاحب! آپ تو مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ دانشور یعنی Intellectual کہلاتے ہیں۔ کیا آپ نے پڑھا نہیں کہ دنیا کی مشہور تہذیبیں یونان، مصر، روما اس جہاں سے کیوں مٹ گئیں؟ اس کا ایک ہی سبب تھا۔ غلامی!۔۔۔ آج ہماری ہندو تہذیب کیوں پارہ پارہ ہو رہی ہے؟ اس کا بھی وہی سبب ہے۔۔۔ عورتوں اور شوہروں کی غلامی!"

میں نے تالی بجاتے ہوئے کہا "واہ واہ پاٹل یار۔ تم تو یک مفکر اور سماج سدھارک کی طرح تقریر کر رہے ہو۔۔۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا رشتہ بنے رہنا کسی مجبوری کے تحت نہیں ہے بلکہ یہ ایک شعوری اقدام ہے" پاٹل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن پاٹل یار!۔۔۔ کبھی تم نے اس بات پر غور کیا کہ جن لڑکوں اور لڑکیوں کے

باپ کا پتہ نہیں ان سے شادی کون کرے گا؟

جوشی صاحب۔ آج ہمارے سامنے بچوں کی شادی کا مسئلہ نہیں ہے اور ہم اس بارے میں فکر مند بھی نہیں ہیں۔ ذات پات اور خاندان کا مسئلہ اتنا اہم نہیں رہا۔ آج شادی کی منڈی میں ان فرسودہ رواجوں کی کوئی قیمت نہیں رہی۔۔۔ اور جب تک ہمارے بچے جوان ہوں یعنی پندرہ بیس برس بعد تو ان کی قیمتوں میں اور گراوٹ آجائے گی اور جوشی صاحب کے لڑکے اعلا تعلیم یافتہ، لائق اور ہنر مند ہوئے تو اونچی ذات اور خاندان کی لڑکی بھی شادی کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی۔۔۔ رہا لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ تو یہ بھی اتنا پریشان کن نہیں ہے۔ ہماری مالکن کے پاس بے شمار دولت ہے۔ مختلف کمپنیوں میں سرمایہ لگا ہوا ہے۔۔۔ حصص خریدے جا چکے ہیں۔۔۔ اور پھر ہم اپنی لڑکیوں کو اعلا تعلیم بھی دے رہے ہیں۔۔۔ وہ تعلیم کی کسی نہ کسی منزل پر اپنا جیون ساتھی خود ہی چن لے گی۔۔۔ اور۔۔۔"

"نہیں تو ماں کے نقش قدم پر چل کر دھندا کرے گی" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"جوشی صاحب۔ ایسا کرتے ہوئے بھی وہ شرمائے گی نہیں۔۔۔ ہم نے اپنی لڑکیوں کو پوری آزادی دے رکھی ہے۔ وہ اپنی مرضی کی آپ مالک ہیں۔ وہ جو چاہے راستہ اختیار کریں"

"اس طرح تو تمھاری زندگی بھی 'آئیڈیل' نہیں کہی جا سکتی؟" میں نے ذرا تلخ انداز میں کہا۔

"اسے آپ آئیڈیل کیسے کہہ سکتے ہیں۔۔۔ ابھی تو ہم تجربہ کر رہے ہیں۔۔۔ ابھی تو کئی مراحل سے گزرنا ہے لیکن جوشی صاحب برسوں سے آپ جس خاندانی نظام پر عمل پیرا ہیں اسے بھی 'آئیڈیل' نہیں کہا جا سکتا۔۔۔ آج دنیا میں کہیں بھی، آئیڈیل لائف، نظر نہیں آتی۔۔۔ صاحب مثالی زندگی کی تعمیر کے لیے بار بار تجربے کرنے پڑتے ہیں۔ ہر تجربے کے بعد خامیوں کا پتہ لگتا ہے پھر ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے دوسرا تجربہ کرنا پڑتا ہے تب جا کر مثالی زندگی ملتی ہے"۔

"پاٹل بوا۔ اگر لوگ تمھاری طرح تجربے کرتے رہے تو پھر اس دنیا میں انارکی پھیل جائے گی" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن آپ ہماری زندگی اور تجربہ کو نیا اور عجیب کیوں سمجھتے ہیں؟۔۔۔ کیا آپ کو

معلوم نہیں کہ آج بھی ہمالیہ کے دامن میں ایسی قومیں اور ذاتیں ہیں جن کی عورتیں بیک وقت کئی مردوں سے شادیاں کرتی ہیں۔ وہاں تو اس طرز زندگی سے کوئی آفت نہیں آئی؟"

پوا کی باتوں میں تلخی آگئی تھی۔ "جوشی صاحب! ذرا ان عورتوں کے کیر کٹر کو بھی دیکھیے جو سماج میں عیاشی پھرتی ہیں۔ ان کے شوہر تو برائے نام ہوتے ہیں۔ یہ ایک اوپن سیکرٹ ہے جسے دنیا جانتی ہے۔ کیا یہ آنکھوں میں دھول جھونکنا نہیں ہے۔ اس سے اچھی تو ہماری بائی ہے جو کھلم کھلا دھندا کرتی ہے۔" پاٹل نے طنز آمیز لہجہ میں کہا۔ اس کی باتوں نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔ دل و دماغ میں ایک طوفان بپا تھا۔ بظاہر پاٹل پوا ایک معمولی اور سیدھا سادہ دکان دار دکھائی دیتا تھا مگر اس کے سوچنے کا ڈھنگ نرالا تھا۔ اس کے خیالات اونچے اور ماڈرن تھے۔ وہ ایک جہاں دیدہ انسان تھا۔ جس کے ترقی پسندانہ خیالات سے میں شکست کھانے والا نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا۔

پول۔۔۔ آپ کا یہ تجربہ کہیں مرد کی برتری اور تفوق کے خلاف رد عمل تو نہیں؟۔۔۔ جتنا مرد کا تفوق سوسائٹی کے لیے نقصان دہ ہے اتنا بلکہ اس سے کہیں زیادہ عورت کی غلامی سوسائٹی کو نقصان نہیں دے سکتی ہے"۔۔۔ سچ تو یہ ہے عورت اور مرد کی شخصیتیں الگ الگ اور آزاد ہیں۔ ان میں سے کوئی کسی کا غلام نہیں۔ دونوں کا دائرہ کار جدا جدا ہے۔ پھر مرد کا عورت کی غلامی کرنا ترقی پسندی کی بات نہیں۔۔۔" میرا جواب سن کر پاٹل ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی میں گہرا طنز تھا جیسے وہ میرے خیالات کا مذاق اڑا رہا ہو۔

"جوشی صاحب! یہ تو بتایئے کہ آج آزاد ہے کون؟ ہر شخص کسی نہ کسی کا غلام ہے۔ کوئی انسانوں کا تو کوئی ذات اور برادری کا، کوئی مذہب کا تو کوئی وطن کا۔۔۔ میں نے تو اتنے سارے بھگوانوں کو چھوڑ کر صرف ایک دیوی کی غلامی اختیار کی ہے۔۔۔ آپ جس خاندانی نظام میں بندھے ہوئے ہیں وہ بھی تو غلامی کے تصور پر قائم ہے۔۔۔ شوہر بیوی کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے تو بیوی شوہر کو اپنی ملکیت سمجھتی ہے۔ وہ تو اپنے شوہر کا کسی پرائی عورت کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ یہی حال مردوں کا ہے۔ اگر مرد نے اپنی بیوی کو کسی غیر مرد سے بات چیت کرتے ہوئے دیکھ لیا تو اس بیچاری کی خیرت نہیں۔۔۔ مرد آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور اپنی شریک حیات کو طلاق دے دیتا ہے یا قتل کر دیتا ہے۔ اس سے نجات پانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ عورت اور مرد کو اپنی شخصیت کی نشوونما کی پوری آزادی ہو اور مردوں کے دلوں سے احساس برتری، کا خاتمہ ہو۔۔۔ اس نقطہ نظر

سے ہم جو تجربہ کررہے ہیں وہ بڑا اہم ہے"۔

اس موضوع میں گمبھیرتا آتی جارہی تھی اور تلخی بھی بڑھتی جارہی تھی۔ پاٹل یوا کی باتوں سے میرا بھی احساس برتری ٹوٹ رہا تھا اور مردانگی کا جذبہ سرد ہو رہا تھا اس لیے خیریت اسی میں سمجھی کہ یہاں سے چلا جائے۔ اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ارے باتوں میں وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔۔۔ کافی وقت ہو گیا ہے۔ شریمتی جی پریشان ہو رہی ہوں گی۔۔۔ اچھا یوا پھر کبھی، اب اجازت دیجیے۔"

میں گھر آیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی پاروتی نے پوچھا "آج اتنی دیر کیوں لگا دی؟ کب سے انتظار کر رہی ہوں؟"

"اری بھاگیہ وان۔ اپنا وہ پاٹل ہے نا۔۔۔ کرانہ دکاندار۔۔۔ بس اسی کی دکان پر بیٹھا تھا۔ بات چیت میں وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا۔ بڑی دلچسپ باتیں ہوئیں۔ تم سنو گی تو دانتوں میں انگلیاں دبا لو گی"۔

پاروتی نے کہا! ذرا ہمیں بھی بتایئے۔" اور پھر جوشی نے پاروتی کے اصرار پر اسے پوری کہانی سنائی۔ پاروتی بے ساختہ بول اٹھی "چھی چھی! یہ کیسا مرد ہے! جو عورت کی غلامی کرے وہ مرد کہلانے کا مستحق ہے؟ مجھے تو بڑی شرم آتی ہے۔۔۔" پاروتی کی یہی باتیں تو میں سننا چاہتا تھا۔ اسے سن کر دل میں گدگدی سی پیدا ہو رہی تھی۔ ایک عجیب حسرت محسوس ہو رہی تھی اور وہ احساس جو پاٹل کی باتوں سے سرد پڑتا جا رہا تھا اب وہ پھر جاگ رہا تھا۔۔۔ لیکن پھر میرا دل پاروتی کی غلامی سے نفرت محسوس کر رہا تھا۔

ڈاکٹر اقبال مہدی
عابد ولا۔ جامعہ نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

پھلرواکی ڈالی

چودھری عرفان ہر نماز بعد سجدے میں گر گر اپنی کھچڑی اور پان کی پیک سے رنگی داڑھی رو رو کر بھگویا کرتے کہ خدا انھیں بیٹا دے دے۔ بڑے میاں کی سرمہ لگی آنکھیں کچھ تو بڑھاپے اور کچھ اکثر رونے کے سبب مچندھی رہا کرتیں۔ ایک رات جانے کیسا خواب دیکھا، ایک دم چونک کر اٹھ بیٹھے۔ ٹھیا سی پڑی بیوی کو جگا دیا۔

"بیگم۔ بیگم!"

"الٰہی خیر! کیا ہوا؟" وہ آنکھیں ملتی اٹھیں سمجھیں میاں چلے۔

"میں سوچتا ہوں اگر ہمارے یہاں لڑکا ہوا تو جان عالم نام کیسا رہے گا؟"

"اے اوئی! یہ بڑا اچھا وقت نکالا پوچھنے کا' آدھی رات کو لے کے جنجھوڑ ڈالا۔ خود چین سے سوئیں نہ سونے دیں۔ لو بھلا! ہرے دھان سوکھ کر چوڑا ہو گئے تو میاں لگے الٹے سیدھے خواب دیکھنے۔ کلمہ پڑھو۔ ہوش کے ناخن لو۔ اے ہاں سوت نہ کپاس چلے ہیں نام رکھنے۔ سو پڑ کر!" جمیلہ خاتون نے میاں کو جھڑکا اور کروٹ بدل لی مگر۔ میاں نے بیوی کی حسرتوں کو جو چھیڑا تو پھر نگوڑی کو نیند کہاں؟

نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی کہ بڑے میاں کا خواب سچ نکلا۔ ایک صبح جمیلہ خاتون جو سو کر اٹھیں تو وے ابکائی پہ ابکائی، ہلکان ہو گئیں۔ سوچا بد ہضمی ہو گی رات ارہر کی دال جو کھائی تھی، مگر وہاں تو آثار ہی اور تھے۔ جمیلہ خاتون تو سناٹے میں آ گئیں۔ بات ایسی آ پڑی کہ کہیں تو کس سے کہیں؟ سوچا میاں نے سن گن لے لی تو خوشی کے مارے ٹیں نہ ہو جائیں۔ وہ لگے لگے پڑوسن کو ایسے میں اس چڑیل کو بھی آنا تھا۔ اس کی نظر جو پڑی تو آنکھیں چمک اٹھیں۔ دائی کی نظر رکھتی تھی حرافہ! دس بچے جن کر ساری علامتیں پہچانتی تھی۔ فوراً تاڑ گئی۔ لاکھ جمیلہ خاتون بات کو ربر باتی رہیں۔ کم بخت

گھاسلیٹ کی بوتل تھی۔ لو بوا! بات کو ٹھوں کوٹھوں پورے محلے میں پھیل گئی کہ چودھرائن کا پیر بھاری ہے۔ ٹھیک تو ہے چودھری عرفان چھکڑوں دولت لے کر کیا قبر میں جائیں گے؟ خدا کی شان! وارث کی آس تو ہوئی۔

بوڑھے منہ مہاسے۔ جمیلہ خاتون سے یہ خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ ارے دکھیا نے اس دن کے لیے کیا کیا نہ جتن کیے۔ مسجدوں میں طاق بھرے، مزاروں پر ڈورے باندھے، امام باڑوں میں علم پکڑ کر روئیں، ہرے درختوں میں کیلیں ٹھونکیں، معصوم بچوں کو صحنک کھلائی، بی بی کی نیاز کے کونڈے بھرے۔ اے کیا نہیں کیا! بڑھاپا سرہانے آکھڑا ہوا، کچھ نہ ہونے سے نہ ہوا۔ ان صدمات نے وقت سے پہلے بُڑھا دیا۔

اب جو یہ نئی بات ہوئی جو سنتا دانتوں تلے انگلی دباتا۔ اے سچ پوچھو تو جمیلہ خاتون نگوڑی خود حیران۔ لو بھلا! پہاڑ جیسی جوانی کم بخت مرادیں مانگتے، سر پٹختے گزری۔ ادھر ساس الگ گود گود کے اللہ کو پیاری ہو گئیں مگر ایک چھچھوندر کا بچہ پیدا نہ ہوا۔ اب جب بال پک گئے۔ ذرا نماز روزے میں جی بھٹکایا تو پتہ چلا بیچ بیچ سوکھے دھان ہرے ہو گئے۔ محلے والیاں، کم بختی ماریاں یوں چلی آ رہی تھیں جیسے شہر میں سرکس آیا ہو۔ جمیلہ خاتون مارے شرم کے گڑی گڑی جا رہی تھیں۔ عورتیں خدا کی پناہ! خدائی خوار چیل کی نظر رکھتی تھیں۔ کوئی مُردار یقین نہ کرے۔ بعض دشمنوں کی جنیوں نے، ڈوبیوں نے یہاں تک اڑا دیا تھا "توج! بڑھاپے میں بھلا کیسی اولاد' اے پیٹ میں رسولی ہوگی۔" یہ سب سنتیں تو چودھرائن کو ہول کے دورے پڑنے لگتے۔ خدا نہ کرے کسی بے سُوا' بانجھ' کٹنی کا پرچھاواں پڑ گیا اور کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو وہ یہ جھٹکا نہ برداشت کر پائیں گی۔ خدا برا چاہنے والیوں کا ناس پیٹے' کل کی آتی آج آجائے نگوڑ ماریوں کو۔ ادھر بڈھو چودھری عرفان کے جھانکڑ جیسے بدن میں کسی نے روح پھونک دی ہو۔ سوکھا درخت ہرا ہو گیا۔ بیوی پہ صدقے، قربان۔ منہ سے پوری بات نکلی نہیں پوری ہوئی۔ جلنے والیاں، مُرداریں دیکھتیں تو جل جل مرتیں کہ انھوں نے درجنوں بچے پیدا کر ڈالے مگر ناس پیٹے خصموں نے ذرا پروانہ کی۔ یہ بڑھیا چودھرائن موئی بڈھے مُردوے کو کیسے تگنی کا ناچ نچا رہی ہے اور پھر کون جانے کچھ ہوگا بھی یا بی ہوّیوں ہی ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو جائیں گی۔ جمیلہ خاتون دکھیا ایسے پھونک پھونک کر قدم رکھتیں جیسے بتاشوں پر چل رہی ہوں۔ وہ تو گھر کی نوکرانیوں تک سے خائف تھیں۔ نہ جانے کون میا بیٹی، گھر کی بھیدی بن، چار اور گھروں میں ڈھنڈورا پیٹ آئے۔

چلو خدا خدا کر کے چودھرائن ہاتھ پیروں سے فارغ ہوگئیں، بیٹا پیدا کر کے وہ سرخرو ہوئیں۔ پر نہ جانے کن مال زادیوں کی بد دعا لگی کہ ادھر چھگل جیسے بیٹے نے پہلی بار کاؤں کی آواز منہ سے نکالی اور ادھر چودھرائن، چودھری عرفان کو غموں تلے دبا اوپر سدھاریں۔ ایک تو بڑھاپا پھر بیوی کا غم بڑے میاں ادھ موئے ہوگئے۔ خود ان میں بھی کیا رکھا تھا۔ جھگڑا تو ہو ہی گئے تھے۔ مگر چار دن کے لوتھڑے کو بیوی کی نشانی سمجھ اپنی اکھڑتی سانسوں کو سنبھالا لیکن اب فکر لاحق ہوئی بچے کی پرورش کی۔ وہ تو بھلا کرے ان کے دوست کا، اسی کو کہتے ہیں وقت پر کام آنا۔ ایک ادھیڑ بیوہ سے دو بول پڑھوا دیے۔ نام ارجمند۔ مگر ایک اچھال چھکا موئی! مگر تھی ہوشیار۔ چودھری عرفان کے نکاح میں کیا آئی اس کی تو زندگی کا رخ بدل گیا۔ ایک دم بیگم بن گئی۔ بڑے میاں نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر جمیلہ خاتون تو نہ پا سکیں مگر ہاں ارجمند پا گئی۔

اس طرح جان عالم عرف مون ارجمند کے زیر سایہ پلنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مون گول مٹول ہو گیا اور ارجمند کی آنکھ کا تارہ بن گیا۔ چودھری عرفان بیٹے کے سہرے کا ارمان لیے جلتے بجھتے دیے کی مانند جی رہے تھے۔ بھلا ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ اچانک بڑے میاں کو ملیریا کے بخار چڑھا اور دوسرے ہی دن بیٹے کے سہرے کی لڑیوں کے سارے پھول ٹوٹ کر باپ کے جنازے پر بچھ گئے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ دونوں میاں بیوی بچے کو پیدا ہی شاید اس لیے کر گئے تھے کہ ارجمند اس کی نگہبانی کریں۔ ارجمند پہلے تو گھبرائی۔ ایک بڈھے پھونس میاں کا نام تھا، پر تھا تو سہی! اب تو وہ بھی نہیں رہا۔ سہاگن کے نام پر چار چوڑیاں کلائیوں میں پڑی تھیں۔ اب ہاتھ ننگے سہی مگر ایک چھت تو تھی، ایک لڑکا تو تھا۔ اپنی کوکھ سے نہیں جنا تھا تو کیا ہوا۔ اے پالے پوت کی محبت بھی کم نہیں ہوتی۔ یہی سوچ بیوگی کی چادر سر پہ برابر کی اور بچے کو گلے سے لگا لیا۔

مون کی اپنے بس بھر اور سمجھ کے مطابق تربیت کی اور تعلیم دلوائی۔ دیکھتے دیکھتے بی ارجمند کے بالوں کی رہی سہی سیاہی بھی رخصت ہوئی اور ادھر جان عالم جوان ہوگئے۔ جب وہ "مام" کہہ کر ماں کو مخاطب کرتے تھے تو جاہل لٹھ ارجمند پلکیں جھپکتی رہ جاتی۔ "اے دیکھو تو! کل تک جسے اپنے پیروں پر بٹھلا کر جھجھو جھوٹے جھلاتی، اس کے ساتھ اٹکن بٹکن کھیلا کرتی، وہی جان عالم اتنا قابل ہو گیا" وہ چٹ چٹ بلائیں لیتی۔ اللہ دشمنوں کی بد نظر سے بچائے۔ آخ تھو۔۔ تھو۔۔!

سہرے کے وہ خواب جو چودھری عرفان اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اب وہی

ارجمند کی آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ زندگی نگوڑی کا کیا بھروسہ ؟ اسے کوئی قیامت کے بوریے تو سمیٹنا نہیں تھے۔ موت جانے کب دستک دیوے اور چپ چپاتے نہ جانے کس دن ارجمند چار کاندھوں پر رخصت ہو جاوے۔ اس کی زندگی میں حویلی میں دلہن آجائے۔ ورنہ قیامت کے دن بڑے میاں ارجمند کا دامن پکڑ سوالی ہوئے تو وہ کیا جواب دے گی اور دوزخ میں جھونکی جائے گی وہ الگ!

اب جو نظر گھما کر دیکھا تو لو بیوی! لڑکے کی شادی دشوار! دتی کی لڑکیاں ایک تیز طرار، ایسی بُرذ دگی کہ خدا کی پناہ! ایک وہ زمانہ تھا کہ دلی سے باہر رشتے ناتے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ مثل مشہور تھی کہ دلی کی بیٹی، متھرا کی گائے، کرم پھوٹے تو باہر جائے۔ مگر اب یہ زمانہ آگیا کہ بھنورے میں بلے موں کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ ویسے ارجمند کو لڑکی خوبصورت چاہیے تھی۔ غلافی آنکھیں، میدا شہابی رنگ، چھلا سی کمر، گاؤدُم پنڈلیوں تک پڑی چوٹی میں گندھی کالی بھونرا سی زلفیں۔ سلیقہ مند ایسی کہ جس گھر جائے لوگ کہیں اتنی سی ہلدی، سارے گھر میں مل دی۔ گھر کو جنت بنا دے۔ اے رواں دواں پھرنے والی پچھل پائیاں نہیں۔ جب دتی میں دال گلتی نظر نہ آئی تو ایک دم اسے حیدر آباد میں موں کی سگی خالہ کا دھیان آیا۔ خود تو جانے کی ہمت نہ پڑی۔ لاکھ وہ چودھری عرفان کی نکاحی بیوی تھی مگر پھر بھی جھاڑو پھروں نے رکھیل مشہور کر رکھا تھا۔ موں کو سمجھایا کہ اس کی خالہ کی ایک بیٹی بھی ہے، سنا ہے بہت خوبصورت ہے۔ کیا خبر تیری مراد وہیں پوری ہو جائے۔ ارجمند نے دل میں یہ بھی سوچا دور رشتہ کرنے میں بہت سی اونچی نیچی باتیں ڈھک جاتی ہیں اور دوسرے اللہ ماریوں، بیریوں، کان بھرنے والیوں سے بھی نجات ملے گی۔ حیدر آباد میں تو غریب مسلمان لڑکیوں کا ویسے بھی برا حال ہے۔ آئے دن عربوں کی حرم سرا میں داخل ہوتی رہتی ہیں، بھلے ہی ہر سال کار کی طرح بیوی بدل لیں۔ یہ سوچ موں کو حیدر آباد بھیج دیا۔

ادھر کے اور ہی قضیئے تھے۔ شبانہ ایم۔اے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کے والد پولس داروغہ، نہایت غصے ور۔ جب سے بیٹی جوان ہوئی تھی تو منہ سے غصے میں جھاگ تو نکلتے تھے مگر گالیوں کو گھونٹ کر پی لیتے تھے۔ ماں گھریلو، سیدھی سادی خاتون تھیں۔ آج بھی میاں غصے میں بھنائے گھر میں داخل ہوئے۔ دروازہ اس زور سے پٹخا کہ بیوی کے ہاتھ سے کوفتوں کا قیمہ زمین پر گر پڑا۔ شبانہ اچھل کر سیدھی ہو بیٹھی۔ ادھر میاں کے کمرے کا دروازہ بند ہوا اور ادھر بیوی کا منہ کھلا۔

"دیکھتی ہو اپنے باوا کو! سٹھیا گئے ہیں پورے۔ چپ رہتی ہوں ناں!"
خوب! بہت خوب! ہو چکی پڑھائی۔ ہر وقت کی دانتا، کل کل۔ چولھے میں جائیں اور بھاڑ میں جائے پڑھائی۔ لیا! وہ اخود کام کریں گے تو پتا چل جائے کہ یہ بیٹی ہی مار جائے لیاں ہیں جو ایرے غیرے نتھو خیرے کو پیچھے لگا لیتی ہیں۔ اب کچھ کہیں تو صاحب جان کا عذاب مول لے لیا۔"

"اے شبانہ! تو یہ کیا کہتی ہے۔ میں گئی تھی اس کو گھر سے بلانے۔ میرے بکھیڑے یوں ہی کیا کم ہیں کہ اپنی بوٹیاں نچوانے اور سینے پہ مونگ دلنے کو اس عذاب کو گلے منڈھ لیتی۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں تیرے باوا کیوں گرج رہے ہیں۔ جب سے یہ موا آیا ہے ان کا مزاج برہم ہے۔" وہ بڑبڑا رہی تھیں۔ "یہ لڑکا، نگوڑا تو میرے جی کا جنجال ہو گیا ہے۔ ایک طرف بیٹی ہے اس پر پڑھائی سوار، دوسرے باوا ہیں جن کے مزاج ہر وقت ساتویں آسمان پر اور ایک وہ کم بختی مارا جو مقابلۂ حسن جیتنے کی فکر میں! جب سے اس کے سبز قدم گھر میں آئے ہیں۔ بس میری مرن ہے۔ ہائے! آپا! خدا تمھیں جنت نصیب کرے۔ زندگی بھر اولاد کو ترستی رہیں اور بڑھاپے میں پیدا بھی کی تو دو دن جی بھر کے دیکھا بھی نہیں اور اللہ کو پیاری ہو گئیں اور دولھا بھائی بھی اس معصوم کا ہاتھ کسی کم ذات کو تھما گئے۔ ارے! اس وقت میں یاد نہ آئی، مر جو گئی تھی۔ اگر میں نے پالا ہوتا تو انسان کا بچہ تو کہلاتا۔ اب وہی ارجمند ہی اس کو سنگوائے۔ خدا سمجھے اسے! جیسی لو حال ڈھینگوی خود ہے نا اسی طرح لونڈے کو بھی اٹھایا ہے اور اب ساری دولت پر ناگن کی طرح کنڈلی مارے بیٹھی ہے۔ میاں کی آدھی کمائی تو پان کھا کر تھوک دی، بڑی آئی آن بان والی جھاڑو پھری۔ اے آپا! جیتے جی تم بے چین رہیں، مرنے کے بعد بھی تمھاری روح ہائے! کیسی چھپٹار ہی ہوگی!" وہ کونوں میں بھنے چنے ملاتے رو پڑیں۔

"لایئے! مجھے دیجیے!" تھیلا لیتے ہوئے شبانہ نے نرمی سے کہا۔

"تو چھوڑ! جا کر پڑھائی کر۔ امتحان سر پر ہے۔" ماں کو بیٹی پر رحم آگیا۔

"اور وہ جو دوسرا امتحان آپ پر آ پڑا ہے اس کا کیا ہو گا اماں؟" شبانہ مسکرائی۔

"شبانہ دیکھ! ایسی باتیں کر کے میرا جی نہ جلا۔ وہ تو میرے جی کا جلاپا ہے ہی۔ اے ارجمند! تجھ پہ خدا کی سنوار! نہ ملتا نہ جلتا۔ نگوڑ ماری جس کے حسب نسب کا پتہ نہیں اس مُردار سے کیسے مل کر خوار ہوتا ہے۔ آپا ختم ہو گئیں۔ دولھا بھائی نے دوسری کر لی کیا خبر رکھ چھوڑی۔ ہمارا تعلق تو ختم ہو چکا۔ ہم کیا جانیں۔ ارجمند کون؟ غرض پڑی تو میا بیٹی

نے پارسل بھیج دیا، وہ بھی سرخی پاؤڈر میں لپا پتا۔ لو بھلا! ایسے لڑکوں کو کون اپنی بیٹی دے گا اور کسی عقل کے کورے اور آنکھوں کے اندھے نے بیاہ بھی دی تو زندگی بھر جھیکے گی یا میکے جا بیٹھے گی۔ دیکھو تو سہی! عورتوں پر سبقت لے گیا ہے۔ رگ رگ پھڑکتی ہے، جیسے پارہ بھرا ہو اور چال تو ایسی جیسے مٹکر وا کی ڈالی لچک لچک جائے۔ دلی میں ہی کہیں کھپا دیا ہوتا یہاں کون سمیٹے گا؟ اپنی اولاد سب کو پیاری۔ اے غلق کا حلق کس نے بند کیا۔ کسی نے ایسی ویسی بات کہہ دی تو شبانہ تیرے باوا تو میر اگلا ہی دبا دیں گے۔"

"اماں! لباس دیکھیے! ایک سے بڑھ کر ایک شوخ تو بہ! سویرا ہوا اور میڈونا کے گانے، ایک تو وہ میڈونا زہر لگتی ہے اوپر سے ان کی اچھل کود! میں ادھر سے گزری تو منہ ٹیڑھا کر کے کہنے لگے۔ "شوبی! یو نو۔ میں کیسے سانگ لائک کرتا ہوں۔ تم نے سنے؟" وہ بل کھا کر بولے۔

"اللہ اماں! ایسا لگ رہا تھا جیسے منہ کو لقوہ مار گیا ہو۔" مجھے کیا معلوم آپ کے پسندیدہ گانے۔ نہ مجھے دل چسپی! ویسے شور ہنگامہ تو میں آپ کی اچھل پھاند کے ہر وقت سنا ہی کرتی ہوں۔"

"شبانہ! ایسی باتیں تو نہ کیا کر۔ ایک تو وہ کیسا بھی سہی، تجھ سے بڑا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ تیرے گھر مہمان ہے۔ مہمانوں کی عزت کرنا چاہیے اور دوسرے صبر و تحمل سے پیش آنا چاہیے۔" ماں نے بیٹی کو نصیحت کی۔

"جی اماں! میں بد تمیزی نہیں کرتی سچ! ہنستی بھی نہیں۔ اب کل شام گہری نیلی اور لال قمیض، کندھوں تک لمبے بال، ماتھے پر بینڈ، کہنے لگے۔ "اوہ گاڈ! شوبی۔ بڑی گرمی ہے۔ پلیز کوئی سوفٹ ڈرنک پلاؤ!" جی چاہا کہہ دوں۔ "زہر پلاؤں؟" مگر اماں کے خیال سے چپ رہی اور نیبو پانی لا کر دیا۔ ایسے پی رہے تھے کہ جیسے دم آخر ہے اور میں نے آب حیات پلا دیا ہو، وہ تو ایک بل کھا اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر میں نے سختی سے کہا۔۔۔

"اور یہ شوبی۔۔۔ شوبی۔۔۔ کیا کہا کرتے ہیں؟ میرا نام شبانہ ہے۔ سمجھے مون بھائی! آپ میرا پورا نام لیا کریں۔ دوسرے یہ جو آپ کے کتھا کلی انداز ہیں پلیز ان کو قابو میں رکھا کیجیے۔ شاید کوئی لڑکی آپ سے ایک آدھ بات کر لے!"

"یو ناٹی! لٹل ڈول۔۔۔ تم نے مائنڈ کیا۔ سوری۔۔۔ آں؟" وہ انگریز کی دُم خالہ کی لٹل بے بی بولتا رہا اور شبانہ دھڑ سے دروازہ بند کر کے چلی آئی۔

اپنی تہذیب چھوڑ کر، غلامانہ ذہنیت لیے مغربی تہذیب کے دلدادہ۔۔۔ اپنی

تہذیب سے نابلد یہ نو دولتیے لوگ ___ آج ہم کس ترقی کی بات کر رہے ہیں؟ کیا ہم لوگ اپنے ملک کے اقتصادی اور معاشیاتی بحران سے نہیں گزر رہے؟ ___ پچاس سالہ جشن منارہے ہیں۔ کیا کیا ہے ہمارے دیس نے؟ اپنی تہذیب کو پرے دھکیل کر مغربی تہذیب کا رنگ ہم پر غالب آتا جارہا ہے ایک ٹڈی دل کی تیزی کے ساتھ جس نے ہماری معصومیت، ہماری شرافت، ہمارے شب و روز ___ چھین لیے۔ ڈسکو۔ پاپ ___ مہمل اور عریاں فلمیں، غیر مہذب اشتہارات ___ بے ہودہ طور طریقے، بگڑتی نسل ___ فیشن شوز، مس انڈیا ___ مس ورلڈ ___ مس یونی ورس کی طرف دوڑنے والے لوگ ___ بھوکے، ننگے، فاقہ زدہ، غریب لوگوں کو کچلتے روندتے ___ کس طرف جارہے ہیں؟ ہماری منزل تباہی ہے۔ یہ نادان نہیں جانتے!" شبانہ اپنی جگہ پیچ و تاب کھارہی تھی۔

شام کو جان عالم گھوم پھر کر آئے ___ "آنٹی! آنٹی ___ آپ کہاں ہیں؟ آنٹی! آج تو ہم نے بہت انجوائے کیا!"

"کہاں رہ گئے تھے بیٹا! بہت دیر کردی، تیرے خالو دو تین بار پوچھ چکے ہیں۔" یہ اماں ہماری بھی کیا چیز ہیں"۔ اب دیکھو کیسی اپنائیت سے بات کر رہی ہیں۔ میکہ ہو یا سسرال عورت کمال خوبصورتی سے دونوں جگہوں کا بھرم رکھتی ہے۔

"اوہ پور اولڈ مین!" اس نے کمر لچکا کر کہا۔ انھیں شاید پتہ نہیں تھا کہ وہ اولڈ مین گھر میں موجود نہیں تھے ورنہ ینگ مین کی ہڈیوں کا سرمہ بنا کر انھیں کی آنکھوں میں دنبالے کھینچ دیتے۔

"میں محسن ساگر دیکھنے گیا تھا آنٹی!" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ شبانہ کے جی میں آیا کہ کہہ دے "وہیں ڈوب مرتے۔" مگر اماں کے ڈر کے مارے چپ رہی۔ ابا گھر میں داخل ہوئے اور بیوی کو آواز دی۔ وہ سخت غصے میں تھے "خوب خاطریں ہو رہی ہیں۔ مذاق ہے بھانجا آیا ہے۔ خالہ جان کو فتے، بریانی، کباب بنا بنا کر کھلائیں۔ پھر تو وہ مسخرہ جاتا رہا، لاٹ صاحب کا بچہ۔ بھلا کس نے اس گھر کا راستہ دکھا دیا۔ کچھ ایسا ویسا کہہ دوں گا تو خالہ بھانجے کو برا لگے گا۔ شبانہ! کہہ دو اپنی ماں سے میرے سامنے نہ آیا کرے۔ باپ ساری پونجی اس لیے چھوڑ گئے تھے کہ وہ کم ذات ارجمند ان کے لاڈلے کو لاڈلی بنا کر پالے۔ لاحول ولا قوۃ! اور پھر ڈیرے والیوں سے امید بھی کیا کی جاسکتی ہے؟ کون اپنی لڑکی دے گا اس کو کہ دیکھنے والے تالی بجا کریں۔ تعلیم پائی ہے یا

جھک مارا ہے ۔ دو چار الفاظ انگریزی کے پڑھے، اپنی زبان چھوڑ ایک ست پھوہڑی زبان اپنالی اور تعلیم یافتہ لوگوں میں شامل کیے جانے لگے۔ آنکھوں کے اندھے، نام نین سکھ بی۔ اے کیا کر لیا قابل ہوگئے۔ ایک ڈگری ہے جو کل سرمایہ حیات ہے۔ ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے ۔۔۔"

"اے خدا کے واسطے چپ ہو جایئے۔ جو منہ میں آتا ہے بولے چلے جاتے ہیں۔ بہت کہہ چکے۔ بھلا میں اسے گھر سے پکڑ کر لائی تھی۔ لوگ خوامخواہ گلے پڑ جائیں تو کوئی کیا کرے؟ اب آ گیا ہے تو چلا بھی جائے گا۔" بیوی نے میاں کے غصے کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"شبانہ!"

"جی ابّا!"

"ذرا بیٹی میرے کمرے میں آؤ۔" انھوں نے بیٹی کو کمرے میں بلایا اور جھلا کر بولے۔

"اس بلائے ناگہانی سے نجات کا کوئی طریقہ ہے؟ آخر کیوں آیا ہے؟ میرا روزہ، نماز بے دھیانی میں ہو رہا ہے۔"

"ابا! شادی کے لیے، لڑکیاں دیکھنے!"

"تو پھر دکھا دو، دو چار گھر، لڑکیاں دیکھ کر ہی بدک جائیں گی۔ پھٹے منہ اور پھر کہو دفعان ہو۔"

شبانہ نے بہت سی لڑکیوں سے بات کی۔ دو چار کو دکھا یا بھی، سب کو نہ کرتے دیر نہ لگی۔ بلکہ الٹا ہر ایک پوچھتی ۔۔۔ "شبانہ! یہ چیز ہے مزے دار، مگر تمھارے گھر کیسے؟" اور شبانہ بچاری کو ہر ایک کے سامنے خفت کا سامنا کرنا پڑتا۔

"یہ کیا بات ہے مون بھائی! جو لڑکی آپ سے ملتی ہے، شادی کے لیے ناں کر دیتی ہے؟"

"ان فیکٹ شوبی! اوہ! میرا مطلب ہے شبانہ۔ یہ ساری گرلز بہت گھریلو ہیں اور میرے اسٹینڈرڈ کی نہیں ۔ یو سی!" جان عالم کا دل بجھ گیا۔ وہ سوچنے لگے ۔۔۔ "اماں خوامخواہ سوچ رہی تھیں کہ خالہ کی ایک لڑکی ہے۔ خوبصورت ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔ مگر بس!"

"دراصل مون بھائی! میری للو چپو کرنے کی عادت نہیں۔ یہ ہندستان کی مسلمان لڑکیاں ہیں ناں یہ مشرقی لڑکیاں ہیں۔ جن کا متوسط گھرانوں سے تعلق ہے اور

جو دراصل ہمارا آپ کا طبقہ ہے۔ ہماری اپنی تہذیب، اپنے طور طریقے ہیں۔ یہ لڑکیاں ابھی بھی ملک میں تیزی سے بڑھتی ہوئی مغربی تہذیب کے اثرات سے بہت دور ہیں۔ آپ نے دیکھا۔ وہ پڑھی لکھی، روشن خیال، سوجھ بوجھ رکھنے والی لڑکیاں ہیں۔ گھر سے باہر بھی نکلتی ہیں، نوکریاں بھی کرتی ہیں۔ ترقی کیا ہے اس کا مطلب بھی جانتی ہیں۔ مگر یہ لڑکیاں ہمبرگر اور سانچو نہیں کھاتیں، کراس چین نہیں پہنتیں، بال نہیں رنگتیں، شاید اسی لیے آپ کو گنوار لگی ہوں لیکن آہستہ آہستہ اس طبقے میں بیداری پیدا ہو رہی ہے ہر طرح کی علمی، ادبی، سماجی، اقتصادی یہاں تک کہ قانونی۔ اب آسانی سے لڑکیاں عرب شیوخ کی قربان گاہ پر دم نہیں توڑیں گی۔۔۔۔"

"مون بھائی! آپ نے پڑھا لکھا ضرور ہے، گستاخی معاف! آپ نے سیکھا کچھ نہیں۔ خدا جانے ارجمند خالہ نے آپ کو ان سب فضول باتوں کی اجازت کیسے دے دی۔ آپ کی تو کوئی اپنی شناخت ہی نہیں۔ آج کی لڑکیاں مون بھائی اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ تی ہیں ۔۔۔۔ پلیز! آپ لوٹ جائیے، آپ کی پسند کی لڑکیاں نہیں ملیں گی۔۔۔" شبانہ تیزی سے کمرے سے نکل آئی۔

ابا شام کو گھر میں آئے تو فوراً شبانہ بولی۔۔۔ "مون بھائی گئے ابا!"

"یوں اچانک کیوں" ابا نے حیرت سے کہا۔ "اچانک کیوں؟ یہ تو باپ بیٹی کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ وہ غریب تو صبح سے اداس تھا، پژمردہ کھویا کھویا سا۔ آپ جو چیخ چیخ کر صلواتیں سناتے تھے، برا بھلا کہتے تھے موہی سب سن لیا ہوگا۔ :" اماں اداس تھیں۔ کیسا ہی سہی آخر کو تھا تو بہن کا خون اور وہ بھی یتیم!

"اچھا ہوا چلا گیا!" ابا نے اطمینان ظاہر کیا۔

"ہاں اور کیا اگر چار دن اور رہ گیا ہوتا تو آپ تو مجھے بھی اُس کے ساتھ گھر سے نکال دیتے۔" اماں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور آنسو پونچھ ڈالے۔

شبانہ مون کے کمرے میں گئی تو پورا کمرہ خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ڈھیروں ڈھیر انواع واقسام کے پرفیومز، کولون، رنگ برنگے ہیئر بینڈ، چین، کڑے، لال پیلی قمیص۔۔۔ سب ایسے ہی چھوڑ گئے تھے اور شبانہ سوچ رہی تھی۔

"مون بھائی! آپ یہاں جو اپنی کینچلی اتار کر گئے ہیں۔ خدا کرے وہ آپ کو کبھی نہ یاد آئے!!"

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

حیات البشیر

مصنف: مجیب اشرف
ناشر: مجیب اشرف
مبصر: مظفر عالم
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی
سکریٹری، اسلامیہ ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اٹاوہ

زیر تبصرہ کتاب "حیات البشیر" پروفیسر مجیب اشرف صاحب کی تازہ ترین تحقیقی کاوش کا نتیجہ ہے۔ دس ابواب اور ۲۸۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب اس اعتبار سے قابل صد قدر اور ستائش ہے کہ ابھی تک اس موضوع پر کوئی سیر حاصل تحقیقی کام نہیں ہوا تھا اور یہ اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے۔ مصنف نے یہ کتاب اپنے تایا زاد بھائی ڈاکٹر خلیل الرحمٰن سیفی سے منتسب کی ہے۔ یہ انتساب محض قرابت کی وجہ سے نہیں کیا گیا ہے بلکہ سیفی صاحب نے اس ادارے میں تقریباً ۶ سال تک بحیثیت استاد کام کیا تھا اور انھوں نے ادارے کے بگڑتے ہوئے حالات کو سنوارنے میں ایک اہم کردار نبھایا تھا۔ بعد کو اٹاوہ اسکول ہی کے فارغ التحصیل طالب علم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ادارے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آخر وقت بے لوث خدمات انجام دیتے رہے۔

حیات البشیر کا تعارف مولوی بشیر الدین صاحب کے منجھلے پوتے جناب امتیاز الدین زبیری نے لکھا ہے۔ امتیاز صاحب ایک ماہر نقاد ہیں۔ علم سے گہرا شغف رکھتے ہیں اور مولوی صاحب کی زندگی کے کم و بیش ہر پہلو سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے تعارف سے کتاب کے واقعات کی سچائی پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔ تعارف میں امتیاز صاحب فرماتے ہیں:

"میں نے کتاب کے تقریباً پورے مسودے کا مطالعہ کیا ہے۔ مجیب اشرف

صاحب نے مولوی صاحب کی زندگی کے ہر گوشے پر نظر ڈالی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے پہلی بار اس موضوع پر اصل ماخذ کا مطالعہ کر کے ایک قابل قدر کام کیا ہے۔ حوالاجات اور حواشی سے کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ کتاب ہر اعتبار سے مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم کی عظمت کے شایان شان ہے اور ان کے مرتبہ کا صحیح تعین کرنے کی سمت میں پہلی کوشش ہے۔

ملک کے مشہور اور معروف ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب اس کتاب کے پیش لفظ میں تحریر فرماتے ہیں:

”پروفیسر مجیب اشرف مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے بزرگ کے سوانح حیات کو یکجا کر کے کتابی شکل میں پیش کر دیا جس نے انسانی اقدار کی خدمت میں اپنی پوری زندگی گزار دی۔ مصنف نے جس کاوش اور لگن سے مواد فراہم کیا ہے، اصل دستاویزات کی تلاش و جستجو میں وقت صرف کیا ہے وہ ایک سچے مورخ ہی کا منصب ہے۔ یہ کام اس لحاظ سے اور زیادہ مستحسن ہے کہ تاریخی ریسرچ کرنے والے عام طور پر ایسے واقعات یا شخصیات پر ہی اپنا وقت اور محنت صرف کرتے ہیں جو شہرت حاصل کر چکے ہیں اور خاموشی سے کام کرنے والوں کو قابل توجہ نہیں سمجھتے۔ مجیب اشرف صاحب نے اس روایت سے ہٹ کر تحقیقی کام کیا ہے اور ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔“

میری رائے میں یہ کام اس لیے بھی قابل ستائش ہے کہ مصنف نے مسلم قوم کی علاقائی تحریکوں کی تحقیق میں پیش رفت کی ہے جنھیں مورخین نے عموماً نظر انداز کر رکھا تھا اور جو مرکزی تحریکوں کے لیے باعث تقویت تھیں۔

کتاب کے پہلے باب میں اٹاوہ شہر کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر پیش کیا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ ایک غیر معروف شہر اٹاوہ علی گڑھ کی طرح تعلیمی مرکز بن کر ابھرا جس کو مشترکہ تہذیب کا نیا مرکز بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کی ترقی میں دیگر ہستیوں کے علاوہ مولوی بشیر الدین نے نمایاں کردار نبھایا تھا۔ اس لحاظ سے کتاب کے مخصوص ابواب سے پیشتر اٹاوہ شہر کے ماحول کا جائزہ لینا عین سیاق و سباق کے مطابق اور نہایت موزوں ہے۔

باب دوم میں مصنف نے مولوی بشیر الدین کی زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو اب تک ابہام کا شکار تھے۔ مثلاً پہلی بار ان کی صحیح تاریخ پیدائش کا تعین کیا گیا ہے۔ اس باب میں مصنف نے تفصیلی طور پر ان سماجی اور مذہبی رجحانات کی عکاسی بھی کی

ہے جو مولوی صاحب کے کردار اور شخصیت کی تشکیل میں معاون ثابت ہوئے۔ مولوی بشیر الدین کو شروع ہی سے صحافت سے گہری دلچسپی تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اسی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور بعدہ یہی فن ان کی زندگی کے تعلیمی مشن میں بیحد کارگر ثابت ہوا۔ مجیب اشرف صاحب نے مولوی صاحب کے فن صحافت کا تیسرے باب میں تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ مجیب صاحب مولوی صاحب کے ہمعصر صحافیوں کے بیانات کی روشنی میں ان کا شمار چوٹی کے صحافیوں میں کرتے ہیں۔ اپنے اخبار 'البشیر' میں ایک طرف تو وہ حکومت وقت کی کمیوں اور زیادتیوں کی بے جھجک نکتہ چینی کرتے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم کے ضمیر کو مسلسل جھنجوڑتے رہتے تھے۔ گراں باری ایام کے باوجود وہ تقریباً ۷۱ سال تک مسلسل پہلے نجم الاخبار اور بعد کو ہفتہ وار البشیر نکالتے رہے۔

باب چہارم میں مجیب اشرف صاحب نے مولوی بشیر الدین اور سر سید احمد خاں کے مابین تعلقات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ بقول اشرف صاحب مولوی صاحب کے تعلیمی مشن کے دو خاص مقاصد تھے۔ اول علی گڑھ تحریک کو فروغ دینا جو کام انھوں نے اپنے آخری سانس تک کیا اور دوم اپنے اسکول کو اس اعلا پیمانے پر چلانا جو دوسروں کے لیے نظیر بن سکے۔ مولوی صاحب کو ان دونوں مقاصد میں زبردست کامیابی ملی۔ سر سید احمد خاں سے کچھ معاملات میں اختلاف بھی تھے مگر مقاصد اور دیگر کئی معاملات میں اتنی مماثلت تھی کہ مولوی صاحب کو لوگ چھوٹے اسکیل کا سر سید کہنے لگے تھے۔ مصنف نے کئی ابواب میں اس موضوع پر خاصی بحث کی ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

ابواب پنجم اور ششم مولوی صاحب کے مایہ ناز اسکول سے متعلق ہیں۔ اس اسکول میں اسلامی تعلیم وتمدن اور عصری تعلیم کے بہترین انتظام کے ساتھ ساتھ اقامت گاہوں میں تربیت دی جاتی تھی۔ تعلیم وتربیت کے اعتبار سے اس دور میں یہ اسکول اپنی مثال آپ تھا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں نادار طلبہ کے لیے کم خرچ کا ہوسٹل رواق منزل قائم کیا گیا جس کی تقلید علی گڑھ یونی ورسٹی نے بھی کی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے سربراہ اٹاوہ اسکول کے پاس شدہ طلبہ کو داخلوں میں نہ صرف ترجیح دیتے تھے بلکہ وظائف بھی مقرر کرتے تھے۔ اس اسکول سے تعلیم پانے والے متعدد طلبہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام سرفہرست ہے۔ مجیب اشرف صاحب نے اسکول سے متعلق کچھ غلط روایات' واقعات اور ان کی تاریخ سال کو

درست کرکے بڑا کام کیا ہے۔ مثلاً اب تک مسٹر جسی دھر کو اس اسکول کا پہلا ہیڈ ماسٹر سمجھا جاتا رہا ہے۔ مجیب صاحب نے ثابت کیا ہے کہ پہلے ہیڈ ماسٹر مولوی سید ولایت حسین صاحب تھے۔ انھوں نے اسکول کے قیام اور دیگر واقعات تاریخ و سال بھی درست کردیے ہیں۔

باب ہفتم اسلامیہ انٹر کالج سے متعلق ہے۔ بقول مصنف اسکول کی تاریخ کی کچھ جھلکیاں تو مولوی صاحب کے معاصرین کے مضامین اور کتابوں میں مل جاتی ہیں مگر ۱۹۴۲ء سے اب تک کی اس ادارے (کالج) کی تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے یہ باب بالکل نیا ہے۔ مجیب اشرف صاحب خود بھی اس کالج میں تعلیم پاچکے ہیں۔ لہٰذا کالج کے دور کے نشیب و فراز کے وہ خود بھی چشم دید گواہ ہیں بالخصوص جس زمانے میں اس کالج کی انتظامیہ کی بد نظمی کے خلاف زبردست اسٹرائک ہوئی تھی چنانچہ مصنف کے ذاتی مشاہدے اس باب کے واقعات پر مزید شہادت کا کام کرتے ہیں۔

باب ہشتم میں مجیب اشرف صاحب نے مولوی صاحب کے تعلیمی مشن کو ایک تحریک کی شکل میں پیش کیا ہے اور ان نظریات نیز اسکول کے طریقہ تعلیم کے اثرات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جن کا دیگر اداروں پر بھی اثر پڑا۔ اس باب میں وہ دیگر اثرات کا جائزہ لینے کے علاوہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اٹاوہ اسکول جامعہ ملیہ اسلامیہ کا پیش رو تھا اور یہ کہ ڈاکٹر ذاکر حسین جو نہ صرف اٹاوہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین صاحب بلکہ بانی اور منیجر مولوی بشیر الدین صاحب کے نظریات سے بھی بے حد متاثر تھے۔ ان دونوں اداروں کے نظام طریقہ تعلیم و تربیت کے طریقوں اور مشاغل میں مجیب اشرف صاحب نے مماثلت کے پہلوؤں پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ اس ضمن میں مصنف کا مشاہدہ اور رائے کافی حد تک صداقت پر مبنی ہے۔ یہ بات دیگر معاصرین کی تحریروں کے علاوہ ذاکر صاحب کے بیان سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ میری رائے ہے کہ آیندہ جامعہ کی تاریخ لکھتے وقت اس پہلو کو بھی زیر غور رکھا جائے۔

باب نہم میں مولوی صاحب کے سیاسی تصورات کا تذکرہ ہے۔ صاحب کتاب کے بقول مولوی صاحب نے فعال سیاست سے ہمیشہ گریز کیا، مگر اس دور میں کسی بھی قومی بہی خواہ کا سیاست سے گریز ناممکن تھا اس لیے مولوی صاحب نے عملی سیاست کے بمقابلہ تحریری طور پر قومی تحریک کے تمام مرحلوں اور اہم واقعات پر اپنے ردعمل

اور تاثرات کا اپنے اخبار 'البشیر' میں بے باکانہ اور پر زور طریقے سے اظہار کیا ہے۔ مصنف نے بڑی سچائی سے مولوی بشیر الدین کی سیاسی کروٹوں کی جانب نشاندہی کی ہے جو بدلتے حالات میں ہر مسلم قومی رہنما کے لیے لازمی ہو گیا تھا۔ مگر بنیادی طور پر وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی اور ہندستان کی آزادی کے خواہاں تھے۔ تقسیم ہند سے انھیں بہت تکلیف پہنچی۔

آخری باب میں مصنف نے مولوی صاحب کے مرتبہ اور مقام کا تعین ان کے معاصرین احباب کی آراء کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کی اپنی رائے ہے کہ مولوی صاحب اپنے دور کے قومی بہی خواہوں کی کہکشاں کے درمیان قطب رہنما کا درجہ رکھتے تھے۔

حالانکہ کتاب میں مصنف نے مولوی صاحب کی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے مگر میرے خیال میں چند دیگر پہلوؤں پر مزید تحقیق کرنے کی ضرورت ہے جو تشنہ رہ گئے ہیں مثلاً مولوی صاحب کا اردو زبان کے فروغ اور ترقی میں حصہ' ان کے مکتوبات مرکزی اور صوبائی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں ان کا کردار وغیرہ وغیرہ۔ مجیب اشرف صاحب اگر ان موضوعات پر کام کر سکیں تو مولوی صاحب کی زندگی کے تمام پہلوؤں اور گوشوں کا مطالعہ پایۂ تکمیل پر پہنچ جائے گا اور نئی نسل کے مورخین بھی اس سے سبق حاصل کر سکیں گے۔

کتاب کی طباعت کی ذمہ داری مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے بڑی خوبی سے نبھائی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مکتبہ جامعہ نے اردو نگارش کی معیاری طباعت میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔ زیر نظر کتاب کا گیٹ اپ (ٹائٹل کور) بے حد پر کشش اور بامعنی ہے' بالخصوص دلکش رنگوں میں سرورق پر مولوی صاحب کی پر وقار شخصیت کی تصویر اور ان کی تعمیر کرائی ہوئی عمارت کا خاکہ نہایت دلآویز انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

مجیب اشرف صاحب نے اپنی تمام تر تحقیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر مولوی بشیر الدین صاحب کی سوانح حیات شائع کر کے نہ صرف اپنا نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے بلکہ انھوں نے علاقائی تحریکوں کی جانب مورخین کی توجہ بھی مبذول کرادی ہے۔ یہ کام ہر لحاظ سے تاریخی ادب میں قابل تحسین اضافہ سمجھا جائے گا۔

دوہا درپن

مصنف: شمس فرخ آبادی
تبصرہ نگار: ڈاکٹر سعید عارفی
صفحات: ۱۷۰
قیمت: ۷۰ روپے
ناشر: بیگم محمودہ ناز کتاب گھر، سحر و منزل، گولہ گنج، لکھنو

'دوہے' بھی اب گیت کی طرح اردو شعر وادب میں کوئی نئی صنف سخن نہیں رہے۔ گیت کی طرح یہ بھی ہندی اصناف سخن میں سے ایک ہے۔ غزل یوں تو خالص فارسی اور اردو کی صنف سخن ہے مگر ادھر چند برسوں میں جس طرح ہندی میں غزل گوئی کی روایت نے قدم جمائے ہیں اسی طرح اردو میں دوہا نگاری کو فروغ حاصل ہوا ہے اور بہت سے شعرا اس کی جانب خصوصی طور پر متوجہ ہوئے ہیں۔ جب کہ کچھ عرصہ پہلے تک اردو جرائد میں دوہے خال خال دیکھنے کو ملتے تھے اور دوہا نگاروں کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ گیت جو عوامی سطح پر کافی مقبول بھی ہے اس کی جانب شعراء کی توجہ کم ہے' وہی پہلے سے جانے پہچانے چند نام ایک دو کے اضافے کے ساتھ اب بھی موجود ہیں اور دوہا نگاروں کی ایک بھیڑ سی امڈ آئی ہے۔ اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں' ایک تو یہ کہ گیت میں طویل تخلیقی سفر سے گزرنا پڑتا ہے اور دوہوں میں بات صرف دو مصرعوں تک رہتی ہے لوگوں نے اسے ایک آسان صنف سخن سمجھ لیا ہے جب کہ باہر سے سیدھی سادی دکھائی دینے والی یہ صنف شاعری اندر سے نہایت پیچیدہ اور دشوار ہے۔

میرے خیال سے اردو میں دوہا نگاری کی جانب متوجہ زیادہ تر لوگ فنی اعتبار سے دوہے کے سلسلے میں غلط فہمیوں کے شکار ہیں اور وہ الگ الگ مطلعے کو دوہے کا نام دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں کسی کا نام لینا نہیں چاہتا مگر غور کیا جائے تو حالت کچھ ایسی ہی ہے۔ ان دنوں اردو رسائل میں جو دوہے برابر شائع ہو رہے ہیں ان کے مطالعے سے میری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔ میں اس بات کی تفصیل میں بھی نہیں جانا چاہتا کہ فنی اعتبار سے دوہا کیا ہے اور ہندستانی شعریات کے ماہرین نے اس کی کیا تعریف کی ہے۔ اس کے کیا اصول و ضوابط مرتب کیے ہیں۔ یہاں اس گفتگو کا موقع بھی نہیں ہے۔ ہاں یہاں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ دنیا کی دوسری زبانوں کی شعری اصناف کو ادھر

اردو شاعری میں قبولیت کی سند ملی ہے اس سے اردو شاعری کے امکانات اور بھی وسیع تر ہوئے ہیں۔ کسی بھی زبان کے ادب کے لیے یہ ایک خوش آئند بات ہے اور اردو میں دوہے کی مقبولیت کو بھی ایک خوشگوار عمل تصور کرتا ہوں۔

آج اردو میں جہاں کہیں 'دوہے' مکمل فنی لوازمات اور پورے اصول وضوابط کے ساتھ نظر آجاتے ہیں تو وہ ہمارے دل ودماغ کو اپنی جانب ضرور متوجہ کرتے ہیں اور ہم ٹھہر کر سوچنے اور غور کرنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔ میں یہاں اردو دوہوں کے سلسلے میں ایک بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ ہم کسی بھی صنف ادب کو اس کی ساخت اور لفظیات کے اعتبار سے شناخت کرتے ہیں۔ دوہے پر بھی اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے مگر آج اردو میں جو دوہے لکھے جارہے ہیں وہ زیادہ تر ساخت کے اعتبار سے دوہے ضرور ہیں مگر لفظیات کے اعتبار سے ان کا شمار اردو کے دوہوں میں نہیں کیا جاسکتا' وہ ساخت اور لفظیات دونوں ہی سطح پر پوری طرح ہندی کے دوہے ہیں۔ ہم دوہے کی ساخت کو تو تبدیل نہیں کرسکتے مگر لفظیات کی سطح پر انھیں اردو کا دوہا ضرور بناسکتے ہیں جس طرح ہندی والوں نے غزل کو فارم کے اعتبار سے تو نہیں مگر لفظیات اور خیالات کی سطح پر اسے پوری طرح ہندی کا بنادیا ہے۔ آج اردو دوہا نگاری میں تخلیقی سطح پر اس جانب سخت توجہ کی ضرورت ہے۔ اسی وقت یہ دوہے اردو کے دوہے ہوں گے۔

"دوہا درپن" شمس فرخ آبادی کے دوہوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دوہا نگاری کے لیے بنیادی طور پر جس فنی اہتمام والتزام' ریاضت' اسلوب' زبان اور انداز کی ضرورت ہوتی ہے اس پر شمس فرخ آبادی کو مکمل دسترس حاصل ہے۔ وہ ان شعری نزاکتوں' جمالیاتی اقدار اور وسیلہ اظہار سے پہلو تہی نہیں کرتے جن سے کسی بھی عہد کی دوہا نگاری کے خدوخال چمک اٹھتے ہیں۔ اسی طرح اس صنف شاعری کے لیے تخلیق کار کو مظاہر حیات وکائنات کی جس رنگا رنگی کا ادراک وعرفان ہونا چاہیے شمس فرخ آبادی اس منزل اور مقام پر بھی کھرے اور سچے نظر آتے ہیں۔

درحقیت دوہے مفرد شعری اظہار کا ذریعہ ہیں' جس میں بڑی توانائی اور دھار ہے' دوہے میں یہ وصف ایک طویل مسافت کے بعد پیدا ہوا ہے اور جو تخلیق کار اس وصف سے ناآشنا ہے وہ اچھے دوہے کی تخلیق نہیں کرسکتا۔ ہندی اور ہندستان کی دوسری

علاقائی زبانوں میں دوہے کی روایت نہایت ہی قدیم ہے اور وہیں سے یہ اردو میں منتقل ہوئی ہے۔ دو مصرعوں میں کسی خیال کو مکمل طور پر شعری لوازمات اور ترتیب کے ساتھ بیان کر دینا تخلیقی سطح پر ایک بہت ہی دشوار عمل ہے۔ یوں تو عروضی اعتبار سے دوہے کے اوزان فارسی اور اردو کے نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق ہندی کے ماترک چھند سے ہے جس کے سلسلے سنسکرت شعریات سے ملتے ہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ اردو کے قارئین کو دوہوں کی فضا کچھ غیر مانوس لگے۔

"دوہا درپن" میں شمس فرخ آبادی نے مختلف عنوانات کے تحت دوہوں کو ترتیب دیا ہے اور ان عنوانات کا تعلق انسانی زندگی، معاشرے، حالات اور تضادات سے ہے۔ یہ دوہے عصری آگہی اور احساسات کے بھی غماز ہیں گہرے عصری شعور کی کارفرمائی نے "دوہا درپن" کے دوہوں کو اور بھی وقیع بنادیا ہے۔ قاری کو فکر و خیال کی گہرائیوں تک رسائی میں کسی قسم کے دشوار مراحل سے نہیں گزرنا پڑتا۔ "دوہا درپن" کے دوہوں میں حیات و کائنات اور انسانی رشتوں کے اسرار و رموز کا جس طرح اظہار کیا گیا ہے وہ ہمیں ٹھہر کر سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ "دوہا درپن" کے دوہوں کو پڑھ کر مجھے اس بات پر بھی خوشی ہوئی کہ اس میں شامل دوہوں میں بڑی تعداد ایسے دوہوں کی ہے جنھیں ہم اردو کے دوہے کہہ سکتے ہیں۔ شمس فرخ آبادی دوہا نگاری کے رمز اور مزاج آشنا ہیں ان کے دوہوں میں وہ تمام اوصاف اور محاسن نظر آتے ہیں جن کی بنیاد پر کسی بھی دوہے کو اچھا اور کامیاب دوہا قرار دیا جاسکتا ہے۔ شمس فرخ آبادی نے "دوہا درپن" کی صورت میں اردو کی شعری دنیا کو ایک نہایت ہی خوبصورت تحفہ عطا کیا ہے۔ جو ہر اعتبار سے قابل تعریف و توجہ ہے۔ مثال کے طور پر کچھ دوہے پیش ہیں:

دل کو داغ سادے گیا، دے گیا کچھ الزام
اک جذبے کا کام تھا، عمر ہوئی بدنام

لیے غبارے گلی گلی، جب کوئی صدا لگائے
ایک بچہ کچھ سوچ کے، سسکی لے رہ جائے

سات سمندر ناپ چکے، لیا فلک بھی ناپ
اب اپنے کو ناپیے، تب سمجھیں کچھ آپ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

فکر انسانی کا سفر ارتقا

(نظام اردو خطبات ۱۹۶۶ء)

پروفیسر غلام السیدین

نظام اردو خطبات کا آغاز ۲۵ر فروری ۱۹۶۷ء کو ہوا۔اس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا اور صدارت ڈاکٹر سی' ڈی' دیش مکھ وائس چانسلر دہلی یونی ورسٹی نے فرمائی۔ ملک کے دیدہ ور ماہر تعلیم پروفیسر غلام السیدین نے مندرجہ بالا عنوان پر دو لیکچرر دیئے جن کا اب تیسرا اڈیشن شائع کیا جارہا ہے۔

قیمت =/45

غالب کی شخصیت اور شاعری

پروفیسر رشید احمد صدیقی

یہ نظام اردو خطبات کا چوتھا خطبہ ہے جس کو ملک کے مایہ ناز طنز ومزاح نگار رشید احمد صدیقی صاحب نے پیش کیا۔

(تیسرا اڈیشن) قیمت =/45

پارہ عم

اردو اور انگریزی میں ترجمہ مع تشریح اور عربی متن

حکیم محمد سعید صاحب نے نوجوانوں کے مرتبہ فکر وعلم کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن حکیم کے تیسویں پارے کا آسان اردو اور انگریزی ترجمہ اور تشریح مع عربی متن پیش کیا ہے۔انگریزی ترجمہ متجر عالم عبداللہ یوسف علی کا نتیجہ فکر ہے۔

آج کا نونہال خواہ اردو میڈیم کا طالب علم ہو یا انگریزی میڈیم کا' پارہ عم کو پڑھنے اور سمجھنے میں اسے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اپنے نونہالوں کو پارہ عم تحفے کے طور پر پیش کیجیے۔ ہدیہ =/45

۱۰۰ ذائقے

(نوجوان بچیوں کے لیے)

شمیم وحید

کھانا پکانا ایک فن ہے اور لڑکیوں کو یہ فن آنا چاہیے ۔ کھانا خوش ذائقہ ہو' صحت مند ہو اور خوبصورتی سے پیش کیا جائے تو غذا جزو بدن بن جاتی ہے اس کتاب میں سو کھانے ہیں اور سو ہی ذائقے۔ نونہال اور نوجوان بچیوں کو کھانے پکانے کا فن سیکھنے میں اس سے یقیناً مدد ملے

قیمت =/60

شمیم حنفی کی نئی کتاب

قاری سے مکالمہ

فکشن' شاعری اور تنقید و تخلیق کے مضمرات پر مضامین کا مجموعہ

قیمت =/150

کھلے خطوط

☆ڈاکٹر ثوبان فاروقی حاجی پور

کتاب نما (جنوری ۹۸ء)

"اخترالایمان: جمالیاتی لیجنڈ" پر آپ نے میرا تبصرہ شائع کیا۔ اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

ابھی ابھی فروری ۹۸ء کا شمارہ میرے پاس پہنچا ہے۔ اشاریے کے تحت جمال اویسی کا مضمون "نیا شاعر۔ محرم رموز حیات" پڑھ کر سخت حیرت زدہ ہوں۔ جمال اویسی پڑھے لکھے آدمی ہیں اور ادب کے ایک استاد کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ اس بات کو اب تک کیوں نہیں سمجھ سکے کہ ادب ایک فن لطیف ہے اور فن ہمیشہ ایک طویل مجاہدے کا متقاضی ہوتا ہے۔ فن کے لا مختتم سفر میں سترہ اٹھارہ سال کی قلیل مدت گرگر کر سنبھلنے میں صرف ہو جاتی ہے اور جناب ہیں کہ اسی مدت سخن کو کمال فن کا سدرۃ المنتہیٰ سمجھتے ہیں، حالانکہ لوگ تو ریاضت سخن میں عمریں بسر کر دیتے ہیں۔ جمال اویسی کی منطق یہ ہے کہ شیلے، کیٹس، بائرن، میراجی وغیرہ چونکہ نہایت کم عمری میں اپنا شاہ کار چھوڑ کر فوت ہو گئے تھے، اس لیے ۸۰ء کے بعد کی اردو پود کی تعیین قدر بھی اسی مختصر مدت کو ذہن میں رکھ کر ہونی چاہیے۔ گویا ۸۰ء کے بعد کی نسل کا ہر تخلیق کار شیلے، کیٹس، بائرن اور میراجی کا ہم پلہ ہے۔ ہے تو یہ بڑی خوشی کی بات، مگر سوال یہ ہے کہ کیا مذکورہ پود کے پاس بھی اسی مرتبے کے شاہ کار موجود ہیں جن کی بنا پر ہمارے ناقدین ظن و تخمین کی زحمت گوارا کر سکیں۔ صاحبِ مضمون کی قبل از وقت عجلت پسندی میری سمجھ سے باہر ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جمال اویسی حتذکرہ نسل کے مستقبل سے مایوس ہوں اور انھیں اس بات کا خطرہ لاحق ہو کہ اس نسل کی تخلیقی سرگرمیاں شاید دیرپا ثابت نہ ہوں ورنہ انھیں نئی پود کے "رقص شرر" کی داو طلبی کی آخر جلدی کیا ہے۔ مضمون کے ابتدائی پیراگراف کی یہ عبارت ملاحظہ ہو: "ابھی ہم لوگوں نے نصف راستہ بھی طے نہیں کیا ہے۔ ایک شاعر اپنی تمام زندگی میں اس سفر کو پورا طے بھی نہیں کر پاتا۔ راستے کبھی سنگلاخ تو کبھی دلدل سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ پاؤ کا تھک جانا فطری ہوتا ہے۔ اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔" خدا خیر کرے۔ آغاز سفر میں ہی

ایسی علامات کا نمودار ہو جانا کسی بھی مسافر کے لیے اچھا شگون نہیں۔ نصف راستہ طے کرنے میں ہی اعصاب جواب دینے لگیں تو نقاد ایسے مسافران ادب کے حق میں کیا فیصلہ کرے گا، یہ خود جمال اویسی کے سوچنے کی بات ہے۔ ان کا اپنی بزرگ تر نسل پر اعتراض ہے کہ وہ فکری طور پر خود کفیل نہیں رہی ہے۔ کہتے ہیں: "اس نے (بزرگ نسل نے) ہمیشہ اپنے خارج سے سہارا مانگا۔ کبھی فرائڈ۔ ہیگل۔ ڈارون، نطشے تو کبھی کامیو، سارتر، کرکے گار وغیرہ سے فکر کی شمع جلائی گئی۔" یہ کون سی نئی بات ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اپنے دعوے کی دلیل میں خود ان کو بھی تو میتھیو آرنلڈ اور شیلے سے کسب نور کرنا پڑا۔ اب ان کا یہ کہنا کہ نیا شاعر فکری غلامی سے آزاد رہ کر ہی کوئی بات سوچتا ہے بجائے خود ایک تضاد کا حامل ہے۔ اسی طرح نئی شاعری کی تعریف میں انھوں نے جو کچھ رقم فرمایا ہے، وہ بھی حیران کن ہے۔ لکھتے ہیں: "ہماری نئی شاعری جو ۱۹۸۰ء کے بعد شروع ہوئی ہے، دنیا اور معاشرے کے اندھیرے میں بیٹھے ہوئے اس انسان کے تحیر آفریں خیالات سے مزین ہے جو مسلسل کرید کرید کر ٹٹول ٹٹول کر کسی Object کا معائنہ کر رہا ہے۔ نیا شاعر سچائی کو جاننے اور پرکھنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔" سچائی کی پرکھ کے لیے دنیا اور معاشرے کے اندھیرے میں بیٹھنے کی کیا معذوری ہے اور آنکھیں رکھتے ہوئے بھی کسی Object کو ٹٹول ٹٹول کر معائنہ کرنے کی کیا مجبوری ہے، یہ میری فہم سے بالاتر ہے۔ یہ تو بصارت اور بصیرت دونوں کا خلل ہوا۔ غور کیجیے تو نئے شاعروں اور Dark age کے قدیم انسانوں میں کتنی گہری مماثلت ہے۔ بھائی، آپ نے سائنس اور ٹکنالوجی کا زریں عہد پایا ہے اور ابھی تک آپ ٹٹولنے کے دور سے باہر نہیں نکل سکے، حیرت ہے۔ ٹٹولنا تو مادّی لمس کا اشاریہ ہے۔ آج سائنس نے اشیا کے مادّی وجود سے ہی انکار کر دیا ہے۔ چلیے ٹٹولنے کی بھی افادیت نہ رہی۔ ٹٹول کر معائنہ کرنے سے تو بس ہاتھی کی دُم ہاتھ لگے گی یا سونڈ یا پھر کان یا پاؤں، پورے ہاتھی کا تجربہ تو دیکھنے سے ہی ہوگا۔ پھر نئے شاعروں کی شناخت کے سلسلے میں انھوں نے جو سلسلہ وار نکات پیش کیے ہیں، وہ سب کے سب اتنے عمومی ہیں کہ بہ آسانی ہر دور اور ہر نسل کے سچے اور فطری شاعروں پر منطبق

ہو سکتے ہیں یہ تو شاعری کی آفاقی قدریں ہیں جنھیں انھوں نے زبردستی نئے شاعروں کا مابہ الامتیاز وصف قرار دیا ہے۔ ایک جگہ وہ نئے شاعر کی شناخت کی بابت یہ نکتہ بیان کرتے ہیں: "نئے شاعر کا اظہار دراصل اس کی ذات کا اظہار ہے۔ اس معاملہ میں وہ انتہائی خود کفیل ہے اور جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔" مگر ان کے پورے مضمون میں نئی شاعری کو قبل ازوقت منوالینے کی جو عجلت ہے، وہ قدم قدم پر عیاں ہے۔ عجلت پسندی منطقی سوچ کو کس طرح بے دخل کردیتی ہے، یہ مضمون اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ انھیں نئی شاعری کے Recognition کی جلدی تھی، سو یہ کام وہ کرگئے، مگر دلائل کی کمزوری کی وجہ سے نئی شاعری کی شبیہ ابھر کر سامنے نہیں آسکی۔ حالانکہ ۸۰ء کے بعد کی نئی پود خوش آیند امکانات سے لبریز ہے۔ اس کے وجود میں چھپی ہوئی پرزور اور بے قرار تخلیقی لہروں کو میں دور سے محسوس کرسکتا ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے نئے شعرا اعتراض واعتراف کے عارضی دکھ سکھ کی پروا کیے بغیر یقین واعتماد اور صبر و تحمل کے ساتھ اپنا تخلیقی سفر جاری رکھیں۔ وقت سب سے بڑا نقاد ہے۔ اس وقت کا انتظار کریں۔

....

☆ سید تقیلا اختر، پٹیالہ، پنجاب

کتاب نما (فروری ۹۸ء) میں مہمان مدیر کی تحریر کے صرف دوسرے پیراگراف کو لیں تو درج ذیل واضح رجحانات بھی ملتے ہیں۔

(۱) مضمون نگار (نیا شاعر) اپنے مضمون کو بہت اہم سمجھتا ہے۔

(۲) وہ اپنے مضمون پر اپنے دوستوں کی پذیرائی ضروری سمجھتا ہے ورنہ وہ شکوہ بھی کرتا ہے۔

(۳) پذیرائی نہ ہو تو مضمون چھاپنے والا رسالہ اچھا نہیں رہتا۔

(۴) کوئی ردعمل نہ ہو تو متعلقہ رسالہ کا مزاج اور معیار ہی غیر متعین کہلاتا ہے۔

(۵) وہ اپنے مضمون کو اچھے خاصے Response کا ملنا لازمی امر گردانتا ہے ورنہ وہ رسالہ اہم نہیں ہوتا۔

پتہ نہیں خام ذہن اور خام قلم کے باوجود، ابتدائی مشق پر ہی بلند بام پر نظر آنے کی، کچھ نئے اہل قلم کی خواہش انھیں کیا فائدہ پہنچائے گی۔ سوال یہ ہے کہ اگر متعلقہ رسالہ اچھا اور اہم نہیں تھا تو پھر "اپنے بہت اہم مضمون" کی اشاعت کے لیے اس رسالہ کو ہی منتخب کیوں کیا گیا تھا؟

ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "مجھے اپنے بزرگوں کی شاعری میں سچائی تو نظر نہیں آتی مگر ان کا خلوص ضرور نظر آتا ہے۔" کیا سچائی کے بغیر خلوص کا تصور ممکن ہے؟ سچائی کے بغیر عمل کو ہم تصنع یا ریاکاری کہہ سکتے ہیں، خلوص تو ہرگز نہیں۔ مضمون نگار (جمال اویسی) نے اپنے ہم سفر شاعر خالد عبادی پر مضمون لکھا، چھپوایا اور مہمان مدیر کے طور پر لکھے مضمون میں بھی اس کا ذکر ضروری سمجھا۔ اس شمارہ میں خالد عبادی کا بھی مضمون شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے جن دو شاعروں کو عمدہ اور جاندار لکھنے والوں میں شمار کیا ہے، اس میں جمال اویسی کا نام بھی ہے۔ ظاہر ہے، من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو، کی اس سے زیادہ سامنے کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے جو ۸۰ء کے پہلے کے شاعروں کی طرح ۸۰' کے بعد کے شاعروں پر بھی لاگو ہوتی ہے؟

☆سید احتشام اللہ رسول منزل دربھنگہ

مہمان مدیر سے اشاریہ لکھوانے کا سلسلہ اہم قدم ہے۔ اس کے ذریعہ روایت اور روایت شکن ذہن تک بڑی آسانی سے رسائی ہو جاتی ہے۔ اس میں مضامین اور خیالات کی تازہ کاری کے علاوہ طالب علم کے لیے غور و فکر کی راہیں وا ہوتی ہیں۔

"کتاب نما" فروری ۹۸ء کا اشاریہ "نیا شاعر۔ محرم رموز حیات" اور مضمون "سو معذرت بھی کیوں" پڑھ کر چند بے رابطہ سی باتیں ذہن میں کوند گئیں۔۔۔۔ بھگوان بدھ نے حی خاموشی (مونیہ ست) پر عمل پیرا ہو کے لیے مستقل مزاجی کو ضروری بتا ہے اور بہت ساری مثالیں دیتے ہو ایک جگہ کہا۔۔۔۔ "جس خواہش یا لا کے ماتحت عام انسان راستے سے بھٹک جاتا ہے۔ اس خواہش یا لالچ کو خیر باد کہ کر چشم بینا رکھنے والا شخص ہی اس جہنم عبور کر کے اس پار جاتا ہے" اور حقیقت بھی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے سردا جعفری کی ۸۵ برسوں کی لگاتار جد و جہ اور علم و ادب کی لگاتار خدمت کے صل میں آخر انہیں "گیان پیٹھ انعام ملا۔ حقیقت ہے ادب میں اس ہاتھ دے او اس ہاتھ لے" والا سودا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بڑے صبر اور آزمائش ک ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے سارا فیصل آنے والے وقت کے حوالے چھوڑ د چاہیے۔ ہم نے بھی بہت سارے ادیبوں کو دم پر کھڑا ہوتے اور کرتے دیکھا ہے لیکن وقت نے ثابت کر دیا۔۔۔۔ یہ د ہے، یہ دکھ کا سبب ہے اور یہ دکھ انسداد کی تدبیر ہے۔" کیا اس کے علا قد کو بلند کر کے دکھانے والے کے حص میں کچھ آیا۔ یہ شمارہ نئے ادباء اور شعر کے مزاج کو سمجھنے اور سمجھانے کا بہتر وسیلہ ثابت ہوگا۔ جمال اویسی اور خا عبادی بڑے ذہین اور غور و فکر کر والے تھے بڑی بے باکی اور تیکھے انداز میں بہت ساری حقیقتوں کی نقاب کشا کی ہے اور ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے لیکن انتظار ہے اور کرنا ہوگا۔۔۔۔ کیو قطرے کو گوہر ہونا ہے!؟!

ادبی تہذیبی خبریں

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں

منعقدہ یک روزہ سیمینار

نئی دہلی ۱۴ مارچ ہماری بدنصیبی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کے بعد اور کوئی ادارہ قائم نہیں ہو پایا جو آزاد اور جدید تعلیم کے نظریے اور مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کے حل کے لیے کام کرتا۔ ان خیالات کا اظہار مہمان خصوصی سابق مرکزی وزیر سلمان خورشید نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کانفرنس ہال میں ڈاکٹر ذاکر حسین صدی تقریبات کے موقع پر شعبہ اردو کی جانب سے منعقد ایک روزہ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں کیا۔ سلمان خورشید نے اردو کے حوالے سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ذاکر صاحب نے اپنا قیمتی وقت اور دلچسپی اردو تحریک کو زندہ رکھنے میں لگائی۔

اجلاس کے صدر پروفیسر طاہر محمود چیرمین اقلیتی کمیشن نے ڈاکٹر ذاکر حسین پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ذاکر حسین جیسی شخصیتیں صدیوں میں جنم لیتی ہیں۔ ذاکر حسین نے ملک و قوم کی جو خدمات انجام دیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ پروفیسر قاضی عبدالرحمان ہاشمی نے استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر ہاشمی نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو عظیم علمی، سماجی اور سیاسی شخصیت قرار دیا۔ استقبالیہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر سلامت اللہ نے ذاکر صاحب سے اپنے قریبی مراسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ذاکر صاحب میں ایک خاص حس تھی کہ وہ جان لیتے تھے کہ کون آدمی کس کام کا ہے اور پھر وہ اسی کے مطابق اس سے کام لیتے تھے۔

استقبالیہ اجلاس کو پروفیسر ظفر احمد نظامی ڈاکٹر سید فاروق اور ڈاکٹر سید جمال الدین نے بھی خطاب کیا۔ سیمینار کی کنوینر اور جامعہ کی ایڈوائزر ڈاکٹر صادقہ ذکی نے استقبالیہ اجلاس کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

سیمینار کا پہلا اجلاس پروفیسر عظیم الشان صدیقی کی صدارت میں شروع ہوا۔ اسلم جمشید پوری نے نظامت کی۔ ڈائس پر پروفیسر حنیف کیفی اور ڈاکٹر شہپر رسول بھی موجود تھے۔ اس اجلاس کے آغاز میں مقالے بھی پڑھے گئے ریسرچ اسکالر فرزانہ کنول تحسین عثمانی ارشاد نیازی ارشاد احمد اور اجلاس کا آخری مقالہ جامعہ کے ایم اے کے طالب علم حقیق اللہ خان نے پیش کیا۔

دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض نسرین کنول نے ادا کیے۔ ڈائس پر صادقہ ذکی اور فرحت احساس بھی موجود تھے۔ اس میں جن مقالہ نگار نے مقالے پڑھے ان کے نام ہیں مشتاق صدف، مشاہد ارم، اسلم جمشید پوری شاہ عالم ریاض احمد فیروز احمد ان کے علاوہ مولا بخش انصاری نسرین کنول سہیل وغیرہ نے مقالہ پڑھے۔

مسلم یونیورسٹی میں سیمینار

علی گڑھ ۱۰ مارچ غالب کی شاعری حقیقت کو اپنے طور پر دریافت کرنے کے عمل کو ظاہر کرتی ہے اور ان کی شاعری کا استعارہ ہی آج کے

جدید ذہن کو بہت اپیل کرتا ہے۔ان تاثرات کا اظہار ممتاز ادیب اور سرسوتی سمان ایوارڈ یافتہ ناقد پروفیسر شمس الرحمن فاروقی نے مسلم یونیورسٹی میں غالب کی دوسو سالہ تقریبات کے سلسلے میں منعقد دوروزہ قومی سیمنار میں کیا۔

غالب تنقید کے سو سال پر منعقدہ قومی سیمنار کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر فاروقی نے کہاکہ ہمارے ذہن میں جو بے شمار الجھنیں اور مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کا پرتو غالب کے کلام میں ملتا ہے اور اسی باعث غالب کے بہت سے اشعار ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئے ہیں انھوں نے یادگار غالب اور محاسن کلام غالب کا ذکر کرتے ہوئے کہاکہ غالب کے مطالعہ کا آغاز ہی مغربی طرز فکر کی روشنی میں ہوتا ہے۔ غالب اردو کے پہلے ایسے سب سے بڑے شاعر ہیں جنھوں نے پہلی بار اظہار کی نارسائی کا شکوہ کیا ہے۔

سیمنار کا افتتاح کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے کہاکہ غالب کے کلام کو ان کی شخصیت کے حوالے سے نہ پڑھنا چاہیے انھوں نے غالب کے کلام کے تقابلی مطالعہ پر زور دیتے ہوئے اقبال، نظیری، ورڈسورتھ، ملٹن اور شیکسپیئر کا غالب سے موازنہ کیا۔ ممتاز ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مہمان خصوصی کے طور پر تقریر کرتے ہوئے کہاکہ غالب کو عوام اور خواص میں یکساں مقبولیت حاصل ہے اور وہ ہندستان کے تہذیبی اور دانشورانہ دھارے کا اہم ترین حصہ بن چکے ہیں انھوں نے کہاکہ غالب کے حوالے سے پوری اردو شاعری کا معنی خیز مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

فارسی ادبیات کے ممتاز عالم پروفیسر نذیر احمد نے اپنے کلیدی خطبہ میں کہاکہ ہر چند کہ غالب کو زندگی میں ناقدری کا احساس تھا مگر اب دنیا کا تقریباً ہر ملک ان کے کلام سے واقف ہوگیا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد نے دستنبو میں مستعمل فارسی الفاظ کا محاسبہ کرتے ہوئے کہاکہ غالب دساتیر کو مستند ماخذ سمجھتے تھے جبکہ یہ سراسر جعلی کتابیں ہیں۔ انھوں نے غالب کی لغت شناسی پر بھی تفصیلی گفتگو کی۔

صدر شعبہ اردو پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہاکہ غالب کا استعاراتی لب و لہجہ ہر عہد میں نئی تعبیر کا تقاضہ کرتا ہے انھوں نے غالب کو صرف اردو کے سیاق و سباق میں پڑھنے کے بجائے اعلا ترین مشرقی اور مغربی شاعری کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت پر زور دیا پروفیسر قاسمی نے کہاکہ غالب نے اپنے خطوط میں بعض اشعار کی تشریح کرکے تعبیر و تشریح کی ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالی ہے۔

سیمنار کے کوآرڈینیٹر پروفیسر قاضی افضال حسین نے کہاکہ اس دوروزہ سیمنار کا مقصد غالب تنقید تحقیق اور تعبیر و تشریح کی پیش رفت کا مبسوط جائزہ لینا ہے۔

سیمنار کے افتتاحی اجلاس کے بعد پہلا اجلاس نقد غالب کے موضوع پر ہوا جس میں پروفیسر شفیق اللہ، پروفیسر منیر مسعود، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر قاضی افضال حسین، اور ڈاکٹر آصف نعیم نے مقالے پیش کیے۔ اس سیمنار کے اہم شرکاء میں پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر نقی حسین جعفری، پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر تنویر احمد علوی، پروفیسر آصفہ زمانی، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر ناہید صفوی، ڈاکٹر قاضی جمال حسین، ڈاکٹر شہاب الدین شامل ہیں۔

اس سے قبل یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں غالب سے متعلق تصانیف اور جرائد کے خصوصی شماروں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا جس کا افتتاح یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے کیا۔ یونیورسٹی لائبریرین پروفیسر نور الحسن کے مطابق لائبریری میں ۱۵ سو سے زائد کتابوں کو نمائش میں رکھا گیا ہے۔

شعاع فاطمہ ایوارڈ

ویمنس کالج کی یاسمین الفاروق کو

نئی دہلی فروری: ویمنس کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سکینہ یاسمین الفاروق کو اس برس کا شعاع فاطمہ ایوارڈ دیا گیا ہے۔ شعاع فاطمہ تعلیمی وفلاحی ٹرسٹ کی جانب سے قائم یہ ایوارڈ پروفیسر شفیق رئیس احمد کے ہاتھوں گزشتہ دنوں ویمنس کالج کی یوم تاسیس تقریب میں دیا گیا، جس کی صدارت وائس چانسلر مسٹر محمود الرحمٰن (پدم شری) نے کی۔

سکینہ یاسمین الفاروق بی۔اے فائنل کی طالبہ ہیں جبکہ ان کا تعلق یونی ورسٹی کے تی ڈبلیو ہاسٹل سے ہے۔ انھوں نے ہائی اسکول (۷۱ فیصد) سینیر سکنڈری (۶۹ فیصد) بی اے پارٹ ایک (۷۰ فیصد) اور بی اے پارٹ (۶۸ فیصد) میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھیں دوڑ، لانگ جمپ اور مضمون نویسی کے انعامات بھی مل چکے ہیں۔

حبیب عالم کو خاموش خدمتگار ایوارڈ

کھنڈوہ کی معروف درس گاہ جوہر ہائی اسکول کے سرگرم عمل اور مقبول خاص وعام پرنسپل حبیب عالم صاحب کو حال ہی میں خاموش خدمتگار کے پروقار اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں میں کسی ایک کو بوہرہ جماعت کھنڈوہ کے وسیلے سے عابد بھائی لوکھنڈ والا کی جانب سے یہ اعزاز دیا جاتا ہے۔

یوپی اردو اکیڈمی کا ممبر نامزد

لکھنؤ ۴ر مارچ کانپور کے معروف طبیب واویب حکیم سید حبیب الرحمٰن کو حکومت یوپی نے یوپی اردو اکادمی کی مجلس منتظمہ کا خصوصی ممبر مقرر کیا ہے۔

حکیم حبیب الرحمٰن اس سے قبل وزارت صحت وخاندانی بہبود حکومت ہند کی تنظیم سینٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن میں صوبہ یوپی سے ممبر منتخب ہو چکے ہیں۔

مدارس کی تعلیم کو روزگار سے جوڑا جائے

نئی دہلی ۵ر فروری قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان مدرسہ تعلیم کو روزگار سے جوڑنے کے لیے سنجیدہ اقدامات کرنے پر غور کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں کونسل کے دفتر میں یہاں ۲۳ر فروری کو عربی فارسی زبانوں کے فروغ کے لیے مالی معاونت کی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں مدرسہ نظام تعلیم کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے ایک مربوط منصوبہ تیار کرنے کے لیے اقدامات پر غور کیا گیا۔ کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مدرسہ تعلیم میں دینی تعلیم کی مرکزیت کو برقرار رکھتے ہوئے دنیوی علوم کی گنجائش پیدا کی جانی چاہیے۔

میٹنگ کے شرکاء نے مدرسوں کے لیے قومی سطح پر نصاب تعلیم تیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا جس میں بنیادی مذہبی تعلیم

کے ساتھ ساتھ جنرل سائنس ، سماجیات معاشیات کی تعلیم کا بھی نظم ہو اور جسے مدرسے خود اپنی ضرورت کے مطابق ترمیم واضافہ کے ساتھ اختیار کر سکیں۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ قومی اردو کونسل سے دی جانے والی امداد کے ساتھ ساتھ مدرسے کے اساتذہ کو حسب ضرورت تربیت بھی دی جائے تاکہ معیار تدریس میں بہتری آسکے۔

میٹنگ میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ کونسل ہذا ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اس بات کی کوشش کرے کہ مدرسہ ایجوکیشن کے لیے یکساں معیار متعین ہو۔

اب ٹیلی فون پر آل انڈیا ریڈیو سے خبریں

نئی دہلی ۲۶ر فروری آل انڈیا ریڈیو (اے آئی آر) نے آج سے ٹیلی فون اور انٹرنیٹ پر راست ٹیلی کاسٹ کے ذریعہ خبریں فراہم کرنا شروع کر دیا۔

انٹرنیٹ

HTTP:// W W W .

ALL INDIA RADIO.CON

اور فون نمبر

HTT://AIR.KODE.NET

3354682, 3354680

(011) 3354643, 3354649

رات دن دنیا میں کہیں سے بھی خبروں تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

سننے والے اختیاری جھلکیوں اور دوسری خبروں کے علاوہ موسیقی ، ڈرامہ اور دوسرے علاقائی پروگرام ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں سن سکتے ہیں ۔ آج سہ پہر کو براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے اسٹوڈیو میں ان دونوں سروسوں کا افتتاح کرتے ہوئے آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل لوپی کیریوال نے کہا کہ بیرون ہند سننے والے ان دونوں سروسوں سے بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آل انڈیا ریڈیو کے عملے کی تیار کردہ دونوں سروسیں اعلا معیار کی ہیں۔ انٹرنیٹ سروس کے لئے اپریل سے معمولی سبسکرپشن فیس لی جائے گی۔

تعلیمی مقابلہ میں انعام

عبد السلام ڈگری کالج مراد آباد کی طالبہ عظمیٰ پروین (بنت ڈاکٹر عتیق صدیقی خطیب مسجد حاجی نیب ، نواب پورہ مراد آباد) جو حال میں منعقد دینی جنرل نالج مقابلہ میں اول قرار دی گئی۔ عظمیٰ کے علاوہ اس مقابلے میں ناصر حسین (فلاح دارین کالج) عبید الرحمن (یتیم مسلم انٹر کالج) روبی حارث (سوھیبری ایجز گرلس کالج) گلفشاں جمیل (کوشلیا کالج) اور انتظار حسین (آرادین اسکول) کو بھی انعامات دیے گئے۔

سراج اجملی اور رشید حسین کو پی ایچ ڈی

نئی دہلی یکم مارچ دہلی یونیورسٹی کا ۷۵ واں جلسہ تقسیم اسناد زیر صدارت جناب صدر جمہوریہ ہند عزت مآب کرشن کانت منعقد ہوا اس موقع پر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر وی آر مہتہ نے اردو کے دو اسکالرز سمیت ۱۴۸ اسکالرز کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔

اردو کے جن دو اسکالرز کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ان میں ڈاکٹر سراج اجملی کے مقالے کا موضوع "غزل کے ملامتی نظام کا سماجیاتی وتہذیبی تناظر" ہے جب کہ رشید حسین نے "نواب الٰہی بخش خاں معروف کی شخصیت وفن"

...مقالہ پیش کیا۔ یہ دونوں مقالات پروفیسر ...یس کی نگرانی میں لکھے گئے۔

صغیر اختر کو مرزا غالب پرائز

نئی دہلی یکم مارچ مظہر الاسلام سکنڈری ...ول کے استاد اور دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ ...کالر صغیر اختر نے ۱۹۹۷ء کے ایم اے اردو ...متحانات میں اول مقام حاصل کیا ہے جس کے ...لیے انھیں آج دہلی یونیورسٹی کے ۷۵ ویں کو...کیشن میں نائب صدر جمہوریہ مسٹر کرشن کانت ...کے ہاتھوں مرزا غالب پرائز دیا گیا۔

...گورنمنٹ بوائز سینئر سیکنڈری اسکول

جامع مسجد کے استاد کے اعزاز میں استقبالیہ

نئی دہلی ۲۶ر فروری گورنمنٹ بوائز سینئر سیکنڈری اسکول جامع مسجد کارہائے نمایاں انجام دینے کے اعتراف میں ریاستی، قومی اور بین اقوامی تنظیموں کی جانب سے دیے گئے ایوارڈ کے لیے اسکول میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ جن تنظیموں نے انھیں ایوارڈ سے سرفراز کیا ہے ان میں ورلڈ پاپولیشن ڈے کے موقع پر اسٹیٹ لیول ایوارڈ سرو شکشا ابھیان کمیٹی کی جانب سے دیا گیا۔ دہلی سرکار کی جانب سے بہترین تعلیمی خدمات کے لیے ایوارڈ اور انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف ایجوکیشن فار ورلڈ پیس ایمبیلینڈ آف یو این کی جانب سے ایوارڈ شامل ہیں۔

اس موقع پر اسکول کے اساتذہ جن میں خالد پرویز، نعمان احمد، وائس پرنسپل نواب علی آئی جوزف وغیرہ نے اکبر علی کو مبارکباد پیش کی جلسہ کے صدر اور اسکول کے پرنسپل مسٹر ...لک نے اکبر علی میں [illegible]

[illegible]

جہاں انھیں سے لوشت خدمات کا صلہ ملا وہیں اسکول کا بھی نام روشن ہوا۔

محمد حسین صاحب کا جواہر ہائی اسکول کو بیش بہا عطیہ

شہر کھنڈوہ کی معروف اور قدیم شخصیت محمد حسین فلمکس والے نے اپنی ذاتی لائبریری (عربی لائبریری) کی تمام بیش بہا ادبی کتابیں جواہر ہائی اسکول کھنڈوہ کی اسکول لائبریری کو بطور عطیہ عنایت فرمادی ہیں جن میں قرون اول تا حال کئی شعراء کے دواوین، صف اول کے فنکاروں کے شہرۂ آفاق ناول، افسانوی مجموعہ اور نثری شہ پارے شامل ہیں ان میں کچھ کتابیں تو آج بازار میں نایاب نہ سہی کمیاب ضرور ہیں۔ ہزاروں روپے کی قیمت کے اس انمول ذخیرے کو محمد حسین صاحب نے ایک ترقی یافتہ تعلیمی ادارے کو سونپ کر برسوں کے لیے محفوظ کر دینے کا مستحسن اقدام کیا ہے جس کے لیے وہ تمام اردو دنیا بالخصوص جواہر ہائی اسکول کے اراکین کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

حبیب عالم پرنسپل جواہر ہائی اسکول کھنڈوا

دو صد سالہ غالب تقریبات کھنڈوہ میں شفیقہ فرحت کی شرکت

پچھلے دنوں کھنڈوا میں دو صد سالہ جشن غالب تقریبات کا انعقاد انجمن ترقی اردو ہند شاخ کھنڈوا کے زیر اہتمام عمل میں آیا جس کے تحت ٹاؤن ہال میں ایک کل ہند مشاعرہ اور ...ک لائبریری میں غالب سیمینار منعقد ہوئے۔ سیمینار کی صدارت انجمن کے صدر [illegible]

[illegible]

مشہور طنز و مزاح نگار ادیبہ اور مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو کی جنرل سکریٹری محترمہ شفیقہ فرحت بطور خاص شریک ہوئیں۔ ڈاکٹر محبوب راہی، ڈاکٹر یحییٰ نشیط، شہود عالم آفاقی، جاوید عالم اور قاضی حسن رضا نے غالب کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشے اجاگر کیے۔ شہود عالم آفاقی کی صدارت اور شبیر بدر کی نظامت میں منعقدہ کل ہند مشاعرے میں ہندستان گیر شہرت کے حامل جن شعراء نے شرکت کی ان میں مذکورہ بالا کے علاوہ ڈاکٹر محبوب راہی اختر۔ گولیاری اشوک ستاول انجم بارہ بنکوی شمس جالنوی سلطان سلیم نعیم اختر اور شیاما سنگھ حیا قابل ذکر ہیں۔
پروگرام کی کامیابی پرنسپل حبیب عالم ستار کھنڈوی الحاج منشی آزاد اور سلام عذری کی انتھک کاوشوں کی مرہون منت ہے۔

حبیب بن حیات قاضی پورہ کھنڈوا

رابعہ بیگم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

متھلا یونیورسٹی دربھنگہ (بہار) نے محترمہ رابعہ بیگم اہلیہ جناب مشتاق احمد شکری ضلع مدھوبنی کو ان کے تحقیقی مقالہ بعنوان "سہیل عظیم آبادی کی تخلیقات میں نسوانی کردار" کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ انہوں نے یہ مقالہ ڈاکٹر رئیس انور، ریڈر شعبہ اردو ایل۔این متھلا یونیورسٹی کی نگرانی میں مکمل کیا۔ ان کے دیگر ممتحن پروفیسر وہاب اشرفی اور پروفیسر حافظ محمد طاہر علی، شانتی نکیتن (مغربی بنگال) تھے۔

عرعر سعودی عرب میں جشن یوم جمہوریہ اور عید ملن مشاعرہ

امسال چونکہ ۲۶ جنوری کا خصوصی حسین دن رمضان المبارک کے آخری عشرے میں پڑا لہذا بزم نے یوم جمہوریہ اور عید ملن، دونوں خوشیوں کو یکجا کر کے ایک عظیم الشان مشاعرے کی شکل میں اردو منزل میں منایا، جس میں شہر عرعر (جس کو شمالی سعودی کی دلہن کہلانے کا فخر حاصل ہے) میں مقیم اردو بولنے والوں کی ایک کثیر تعداد نے حصہ لیا۔ اس مشاعرے میں نہ صرف عرعر کے شعراء نے بلکہ مثال معطقے کے دوسرے شہر جیسے سکاکا، الجوف الطریف دومۃ الجندل اور عقیلہ میں مقیم شعرا بھی حصہ لیا۔ صدارت کے فرائض جناب ڈاکٹر ولی میکو جیا صاحب اور نظامت راقم الحروف نے انجام دی۔
بزم کے مستعد کارکنان، امتیاز اعظمی، وصی اللہ بستوی، رئیس احمد لکھنوی، رئیس الدین میرٹھی، محمد پاشا محمد ظہیر الدین، نواب احمد۔ محمد علی الدین۔ محمد شکیب، محمد اقبال، نعیم بیگ، خواجہ سرور حسین اور شمشاد احمد وغیرہ نے راقم الحروف کا ساتھ اس کے انتظامات میں تعاون دیا۔

مشاعرہ بعد تلاوت قرآن پاک شروع ہوا جس میں حمد، راقم نے اور نعت رسولؐ پاک امتیاز احمد اور مہدی حسن مجور نے یکے بعد دیگر پیش کی۔ اس کے بعد قومی ترانہ پیش کیا گیا جس میں رئیس میرٹھی، نعیم بیگ، محمد اقبال اور محمد کلیم نے حصہ لیا۔ کلیم اللہ اور محمد پاشا نے ملی نغمے پیش کیے۔ اس بار امتیاز اعظمی اور ناصر نوح نے

اپنے خوبصورت کلام اور خوش گلوئی سے مشاعرہ لوٹ لیا۔ جن شعرا کی سامعین نے داد تحسین کھل کر دی وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ حنیف ترین، رحمت اللہ جری، امتیاز اعظمی، رئیس لکھنوی، ذاکر حسین ذاکر، خواجہ مسرور حسین، دلاور خان نثار، وصی اللہ بستوی، رئیس الدین میر ٹھی، مہدی حسن مجبور، محمد ناصر نوح، محمد طارق کشمیری، سرفراز احمد ظریف، محمد نسیم بجلی، ان کے علاوہ جن مقامی شعراء نے اپنا کلام پیش کیا ان میں محمد احمد احمد، عطاء اللہ خاں عطا رامپوری، محمد ہارون، پشاوری محمد حسن خمار، زاہد علی خاں موج کے نام قابل ذکر ہیں۔

رپورٹر حنیف ترین صدر بزم احباب سخن عرعر سعودی عربیہ

اردو گرمائی جماعتیں مراکز میں تعلیم کا آغاز

حیدرآباد ۸ ؍فروری ۱۹۹۸ء کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہونے والے امتحانات کی تیاری کے لیے گرمائی اردو کلاسوں کے قیام کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ اس امتحان میں شرکت کے خواہشمند، تعلیمی مراکز مدارس اور اداروں سے خواہش کی جاتی ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے نام عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کے دفتر میں رجسٹر کرائیں۔

آنسہ روحی ڈپٹی کلکٹر

مدھیہ پردیش ریاستی پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والی آنسہ روحی ماجد ڈپٹی کلکٹر بننے والی ریاست کی تیسری خاتون ہیں۔ وہ ایک صحافی حافظ ماجد حسین کی صاحبزادی ہیں۔

"آخر کار" کی رسم اجراء

حیدرآباد ۸ ؍فروری ۱۹۹۸ء کو "آخر کار" کی رسم رونمائی اردو ہال کے وسیع و عریض مرکزی آڈیٹوریم میں پروفیسر شمیم جیراجپوری وائس چانسلر مولانا آزاد اردو یونی ورسٹی کے دست مبارک سے عمل میں آئی۔ جلسے کی صدارت صدر زندہ دلان حیدرآباد نے فرمائی۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے برطانیہ سے آئے عباس زیدی اور تقی تنویر نے شرکت فرمائی مقررین میں شکوہ کے علاوہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال' پروفیسر مغنی تبسم' طالب خوندمیری شامل تھے۔ یہ جلسہ زندہ دلان حیدرآباد اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے مشترکہ زیر اہتمام منعقد ہوا۔ جلسہ کی کارروائی نصرت محی الدین نے چلائی۔ شکریہ طالب خوندمیری نے ادا کیا۔

ایم حبیب خاں کا انتقال

اردو کے معروف ادیب اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے اسسٹنٹ سکریٹری جناب ایم۔ حبیب خاں ۲؍مارچ ۱۹۹۸ء کی صبح سویرے علی گڑھ میں اپنی قیام گاہ پر انتقال فرما گئے۔ ایم۔ حبیب خاں صاحب پچھلے دو ماہ سے جگر کے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ وہ گیارہ جولائی ۱۹۳۴ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اردو اور تاریخ میں ایم۔ اے کیا تھا۔ وہ پچھلے تقریباً چالیس سال سے انجمن ترقی اردو (ہند) سے وابستہ تھے۔ جناب ایم۔ حبیب خاں تقریباً دو درجن کتابوں کے مصنف اور مرتب تھے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اپنی کتاب اردو

کے کلاسیکی شعراء پر تنقیدی مضامین' کی ترتیب
سے کیا تھا جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کا
خاص میدان کلاسیکی ادب تھا۔ وہ کئی بیرونی
ممالک کا دورہ [illegible] بھی کر چکے تھے۔
انھیں
میر اکادمی



لکھنؤ' دلی اردو اکادمی اور اتر پردیش اردو اکادمی
نے انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا تھا۔

ادارہ "کتاب نما" مرحوم کے لیے
مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی
دعا کرتا ہے۔

قاری محمد حسنین کو صدمہ

قومی آواز کے شعبہ کتابت کے رکن
قاری حسنین کی والدہ کا انتقال آج یہاں تکیہ تدن
شاہ محلہ کھدرا میں تقریباً ساڑھے دس بجے انتقال
ہو گیا اطلاع کے مطابق وہ عرصے سے علیل تھیں

قیوم خضر کی رحلت

یہ خبر انتہائی غم واندوہ کے ساتھ سنی
جائے گی کہ معتبر صحافی اور ممتاز ادیب وشاعر
جناب قیوم خضر ۱۲ مارچ ۱۹۹۸ء بروز جمعرات
بوقت گیارہ بجے دن حرکت قلب بند ہو جانے
کے سبب اس دار فانی سے کوچ کر گئے انا للہ
وانا الیہ راجعون

مرحوم نصف درجن کتابوں کے
مصنف تھے۔ برسوں ماہنامہ "اشارہ" کی ادارت
فرمائی تادم حیات ماہنامہ "کتاب نما" کے قدر داں
تھے اپنی تخلیقات کی اشاعت کے لیے بیشتر
پر "کتاب نما" کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ دوستوں
کے اصرار پر اپنی سرگذشت لکھ رہے تھے کہ
موت نے راہ مسدود کر دی۔ سفر آخرت سے
قبل حال میں انھوں نے بیٹوں سے ملاقات کی
خاطر اپنی شریک حیات کے ساتھ گجرات'
پنجاب اور دلی کا سفر کیا تھا۔

مرحوم کو سات بجے شام شاہی عیدگاہ
کے احاطہ میں واقع قبرستان میں سپرد خاک کیا
گیا۔ سوگواروں میں کثیر تعداد نے ان کی رہائش
گاہ سے گورستان تک پیدل چل کر حق دوستی اور
قرابت ادا کی۔ چیئرمین بہار قانون ساز کونسل
پروفیسر جابر حسین' بہار اردو اکادمی کے چیئرمین
احمد یوسف' نصف درجن خانقاہوں کے سجادگان
کے نمائندگان' پروفیسر محمد علی' پروفیسر شکیب
ایاز' پروفیسر اعجاز علی ارشد' ماہر تعلیم و پرنسپل
ڈاکٹر علی امام تدفین تک سوگواروں کے ساتھ
رہے نماز جنازہ سید شاہ برہان الدین نے پڑھائی۔

الہلال مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل۔ اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ۔ ۷۵/-

غلام رنگ ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کا ادبی خاکہ — یہ اُس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر انسانیت کو وقار بخشا۔ ۱۵/-

شہیدِ جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) پروفیسر ضیاالحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مردِ درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مردِ مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۷۵/-

پرانی بات ہے (سلسلہ وار نظمیں) زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں، بس سچائیاں

قدیم شعرا از قلی قطب شاہ تا ...

خاں سیماب تک کلام کا جامع انتخاب اور تعارف ... ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعہ ... بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۲۸۰ ... /۰

سازِ سخن ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتونِ اول محترمہ ادا ... کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے انداز ... سے ایک ایسی قوتِ ارادی مترشح ہے جس کے بغیر ... ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہو سکتا۔ ...

ترجمۂ قرآن پروفیسر رشید ...

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش) پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ... اکتوبر ... کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔

نذرِ مختار مالک ...

مجموعۂ مضامین جو ممتاز محقق اور دانشور مختار الدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما ... جمہوریۂ ہند کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا ... کے ممتاز محققین اور ادیبوں کی نگارشات شامل ...

Regd. with R.N.I. at No 4967/60 APRIL 98
Regd. No. DL 16016/98
Licence No. U[SE]-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025

ماہنامہ

کتاب نما



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہد قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ۔ اردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۲۶/=

گول مال — شفیقہ فرحت

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱۸/=

فی الفور — یوسف ناظم

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صف اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۳۰/=

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور کیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۱۸/=

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ ستیدین — مرتبہ ڈاکٹر حسیم شاہ صدیقی

ممتاز ماہر تعلیمات خواجہ غلام السیدین کے علمی ادبی مضامین کا مجموعہ۔ ۴۰/=

توفیق الحکیم
ناول نگاری کا جائزہ — ڈاکٹر بدر الدین الحافظ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق الحکیم کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۷/=

[illegible]

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

مئی ۱۹۹۸ء	جلد ۳۸	شمارہ ۵

فی پرچہ	7/:
سالانہ	70/:
سرکاری تعلیمی اداروں سے	100/
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک)	500/

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر.

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' جامعہ نگر' نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فیکس نمبر :6842574

Tel Cum Fax No (011)-6910191

ٹیلی فون نمبر. 6910191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' اردو بازار' دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' پرنس بلڈنگ۔ ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرے کے ذمے دار خود مصنفین ہیں ادارہ کتاب نما کا ان سے اتفاق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس' پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

طنز و مزاح

اور

کھلے خطوط / جائزے / ادبی خبریں

نئی مطبوعات

باتیں فراق سے (ادب) ست پرکاش شوق -/200
اقبال کی صحت زبان (ادب) اکبر حیدری کشمیری -/250
سائنس اور زندگی (سائنسی مضامین) ڈاکٹر اعظم شاہ خاں -/150
احباب نامے (خطوط) صغرا مہدی -/200
مشعلِ نساء (امراض نسواں) طبیبہ سہیل فاطمہ -/75
عرش وطیبہ (حمد و نعت) کوثر مظہری -/10
اسلامی ٹکنالوجی (تاریخ) مترجم: تسیم احمد
مولانا ابوالکلام آزاد (تنقید) ضیاء الدین اصلاحی -/110
متاع فکر و نظر (تنقید) علی جواد زیدی -/125
تنقیدات غالب (تنقید) مرتب پروفیسر نذیر احمد -/150
غالب کی آپ بیتی (سوانح) پروفیسر نثار احمد فاروقی -/40
غالب کی شناخت (تنقید) کمال احمد صدیقی -/80
فخر نامہ (سوانح) مرتبین عبدالقوی دسنوی محمد نعمان
دشت تنہائی (شاعری) سیدہ نسرین عباس -/100
المحبوب (سوانح) محمد نصیرالدین ہاشمی -/95
اثبات (شاعری) فرید پربتی -/150
سایہ دار درخت (افسانہ) ضیا حسنی -/60
سفیر اردو (لندن) (رسالہ) معراج جامی ساحر شیوی -/50
اقبال اور تحریک آزادی ہند (تنقید) یعقوب شمیم -/50
قدم بہ قدم (شاعری) انیس دہلوی -/120
جستجو (رسالہ) پروفیسر عبدالغنی میر
محمد شفیع خان بشیر احمد بٹ
تاریخ (تمثیلی نظم) (شاعری) اختر پیامی -/25
مضامین مقبول (اصلاحی مقامین) ڈاکٹر مقبول احمد -/200
کشمکش (شاعری) رحمان عباسی -/80

گلشن (جنوری۔اپریل) (رسالہ) احمد آباد (ابرا گجر) -/25
عہد نامہ سہ ماہی (رسالہ (ا)) سرور ساجد -/20
ترسیل سہ ماہی (رسالہ) یونس اگاسکر -/20
معارف (مارچ ۹۸ء) ضیاء الدین اصلاحی -/7
جذبات وجیہ (نعتیہ کلام) مولانا شاہ وجیہ الدین احمد خاں -/20
اسلام مکمل نظام حیات (مذہب) مفتی محمد صدرالحق قاسمی -/50
نظام رامپوری حیات اور شاعری ادب مرتبہ ڈاکٹر شعائراللہ خاں عام ایڈیشن
خرم مراد کی آخری وصیت (مذہب) ادارہ اسلامی -/8
دیوان غالب دیوناگری (غالبیات) علی سردار جعفری -/500

مہمان مدیر
اعجاز علی ارشد
شعبۂ اردو، بی۔ این کالج
(پٹنہ یونیورسٹی) پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۴

ادب کی غیر معنویت

میں نے اکثر خود سے یہ سوال کیا ہے کہ ادب کس حد تک دنیا کے حالات بدلنے میں معاون ثابت ہوا ہے؟ جواب، جو مجھے اپنے آپ سے ملتا رہا ہے، وہ میرے لیے تو تلخ ہے ہی، ادب کے پرستاروں کے لیے تلخ تر ثابت ہو سکتا ہے۔ اور جواب یہ ہے کہ ادب حال، ماضی اور مستقبل ہر دور میں سماجی، اخلاقی، تمدنی اور معاشی تبدیلیاں لانے میں ناکام رہا ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر زمانے میں ادب کا ایک رول رہا ہے اور اس نے معاشرے کے 'تغیر و تبدل' میں گراں بہا خدمت انجام دی ہے مگر جن لوگوں نے اس احساس کو دعوے کے طور پیش کیا ہے، انھیں واضح ثبوت پیش کرنے میں کبھی کامیابی نہیں ملی۔ اصل میں بات قطعی دوسری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانی شعور نے جب پہلی انگڑائی لی تھی، اس وقت سے لے کر آج تک انسانی قدریں اپنی تشکیل آپ کرتی رہی ہیں جس میں متعلقہ علاقے اور وطن کے کلچر کا رول اہم ترین رہا ہے۔ ادب نے عام طور سے اپنے زمانے کے کیف و کم کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے مگر معاشرے کو تبدیل کرنے کی اس کی کوششیں ہمیشہ ناکام رہی ہیں۔ مثال کے طور پر جرم ہر معاشرے میں سرزد ہوئے ہیں، غیر اخلاقی عوامل کارفرما رہے ہیں۔ اور قدروں کی شکست و ریخت بھی سماج کے بدلتے ہوئے نظام کے تحت ہوتی رہی ہے۔ ادب زیادہ سے زیادہ اس صورت حال کی آئینہ داری کے فرائض انجام دیتا رہا ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ایک شکسپیر کو دیکھیے۔ اس نے کئی ڈرامے ایسے لکھے ہیں جن میں اخلاقی گراوٹوں کو آئینہ بنا کر کرداروں کو جاوداں کیا گیا ہے یا اس کی ضد کے طور پر کرداروں میں محاسن بھر دیے گئے ہیں۔ لیکن کیا او تھیلو کے اثرات کسی معاشرے میں تبدیلی کا سبب بنے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح کیا لیڈی میکبتھ کی تخلیق کرکے شکسپیر عالم انسانیت کو برائیوں سے نجات دلا

سکا ہے؟ یونانی المیوں میں برے کرداروں کی بھرمار ہے جس سے اسفل جذبات کے رد کے بہت سے شاخسانے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر کیا وہ سب کچھ آج تک رد ہو سکا ہے؟ جواب یہاں بھی نفی میں ہے۔ انگریزی کے طنز نگار ایک عرصے تک انسانی شیطنت، اس کی کمزوریوں اور خامیوں کو نشانہ بناتے رہے ہیں، دنیا کے اکثر اہم لکھنے والوں نے عورتوں کی عزت وناموس کی حفاظت چاہی ہے اور اس موضوع پر سیکڑوں افسانے، ناول اور ڈرامے قلمبند کیے ہیں۔ مگر کیا یہ طنز نگار کسی انسان کی جبلت کو بدلنے میں کامیاب ہوئے ہیں اگر کوئی ایسا سوچتا ہے کہ اس طرح کی ادبی تخلیقات کا مطالعہ کر کے لوگوں کے ذہن بدل جاتے ہیں اور وہ غلط کاریوں سے پرہیز کرنے لگتے ہیں، تو یہ ایک یوٹوپیائی تصور ہے۔ ایسا ہوتا نہیں ہے۔ گلیورس ٹریولس کے پردے میں کتنے ہی اسباق ملتے رہے ہیں مگر کیا کوئی ایک سبق بھی کسی انسانی جماعت کی ذہنی تبدیلی کا باعث ہوا ہے؟ اٹھارویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک ایسے ناولوں کا ایک انبار ہے جن میں پاک وصاف زندگی بسر کرنے کی تلقین ملتی ہے۔ لیکن کیا ادب کا یہ بہت بڑا ذخیرہ انسانوں میں پاکی کا تصور بیدار کر سکا ہے؟ ان تمام سوالوں کا جواب اثبات میں نہیں نفی میں ہے۔

اردو ادب کی طرف رجوع کیجیے تو میری بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ نذیر احمد کے اخلاقی ناول ہزار اخلاقیات کا سبق دیں لیکن ان کے مطالعے کے بعد شاید ہی کسی مرد و زن نے گناہوں سے توبہ کی ہو۔ 'ایامیٰ' آج بھی پڑھا جا رہا ہے، مگر بیوہ عورتوں سے نکاح کرنے والے کتنے لوگ سامنے آرہے ہیں؟ اور آتے بھی ہیں تو کن شرطوں کے ساتھ؟ بالکل نئے دور میں لکھے جانے والے ہندستانی فکشن پہ نظر ڈالئے تو اس میں فسادات کا موضوع تواتر کے ساتھ پیش ہوتا رہا ہے۔ اردو کے علاوہ دوسری ہندستانی زبانوں کے ناولوں اور افسانوں میں بھی فسادات کی مذمت کی گئی ہے۔ مگر کیا یہ مذمت فسادات کو روکنے میں کامیاب ہوئی ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان اس موضوع پر مطالعہ کرتے کرتے تھک چکے ہیں مگر ان کی خو نہیں بدلی۔ جہاں کہیں بھی فرقہ وارانہ کیفیت ابھرتی ہے، فسادات بھڑک اٹھتے ہیں اور ان ناولوں کے اسباق پس پشت رہ جاتے ہیں۔ ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کے لیے یہ موضوعات بڑے درد بھرے ہیں بلکہ ایک طرح سے ان کی فکری اور تخلیقی قوت کو مہمیز کرنے کا باعث بھی ہیں لیکن ان سے حالات میں کوئی تبدیلی نہ پیدا ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ اور یہ صورت صرف نثر نگاری کے ساتھ مخصوص نہیں۔ پچھلی ایک صدی کے دوران مدس حالی کے متعدد ایڈیشن

منظر عام پہ آچکے ہیں مگر قوم کی بدحالی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ مرثیہ لکھنے والوں نے واقعات کربلا کی تفصیل بڑے فنکارانہ انداز سے ہمارے سامنے لائی ہے اور لارہے ہیں۔ یہاں تک کہ مرثیہ نگاری کی ایک ارتقاء پذیر تاریخ مرتب ہوچکی ہے۔ مگر آج بھی یزید اور شمر معاشرے میں موجود ہیں، حق پرستوں پہ دانہ پانی بند ہے اور ہر دم ایک کربلا برپا ہے۔

یہاں میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ادب سے میری مراد خالص ادب ہے نہ کہ مذہبی ادب، مذہبی کتابوں نے یا سیاسی اور مذہبی لٹریچر اور اقتصادی افکار نے جتنی تبدیلیاں لائی ہیں اور یہ ہر زمانے میں محسوس کی جاتی رہی ہیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک مذہبی کتاب قرآن پاک نے جو کام کیا ہے وہ تمام ادبی کتابیں مل کر بھی انجام نہیں دے سکی ہیں۔ یہی نہیں، جو اثر مہابھارت اور رامائن کا ہوا ہے (بطور مذہبی کتب نہ کہ ادبی) وہ ایک نمونہ ہے۔ ان کتابوں کے ادبی محاسن ادیبوں کے لیے ہیں، عوام کے لیے نہیں، جب کہ ان کا مذہبی پیغام دوررس رہا ہے، اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ مذہبی لٹریچر کو ہمیشہ فوقیت حاصل رہی ہے۔ ایک ادیب جو بڑا مذہبی ادب تخلیق کرتا ہے وہ انقلاب لانے کا باعث بھی بنتا ہے۔ جب کہ خالص ادبی نقطۂ نظر اس کے مقابلے میں ہمیشہ پیش پا افتادہ رہا ہے۔ جس سے نہ کسی ملک کا اخلاق بدلا ہے نہ وہاں کے عوام کے کردار پر اثر ہوا ہے۔ اسی طرح سیاسی یا سماجی نظریہ سازی کی بنیاد پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی موثر رہا ہے۔ چینی ادب کا ایک بڑا حصہ یا انقلاب فرانس سے قبل کا نظریاتی ادب اس کی مثال ہے مگر خالص ادب کبھی معاشرے پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوا۔ مارکس کی 'Das kapital' سے انقلاب آیا ہے مگر یہ بات ٹالسٹائی کی "وار اینڈ پیس" (War and peace) کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی، گرچہ دونوں کا عہد کم و بیش ایک ہے۔ اینیمل فارم (Animal Fasm) ایک بہت پر اثر ناول کہا جاسکتا ہے مگر یہ کبھی نہیں کہا جاسکتا کہ جارج آرویل نے باضابطہ طور پر کوئی انقلاب برپا کیا ہے۔ عہد حاضر پہ نگاہ ڈالیے تو احساس ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی، جناح، سبھاش چندر بوس، مولانا آزاد اور سردار پٹیل جیسے سیاسی لیڈروں کے افکار نے ہندستانیوں کا ذہن اور ہندستان کی قسمت بدلنے میں کامیابی حاصل کی ہے مگر کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانے کا ادب بھی اسی طرح عوام کے دل و دماغ کو بدلنے کا سبب بنا ہے؟ میرے خیال سے کوئی 'ادب کا طرف دار بھی یہ دعوا نہیں کرسکتا کہ پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ "سوز وطن" سرکار نے ضبط نہ کیا ہوتا تو

ہندستان دس پانچ سال قبل آزاد ہو گیا ہوتا۔ یہ بات بھی شاید ناقابل تردید ہے کہ مولانا آزاد کے 'الہلال' و 'البلاغ' نے جو کچھ کیا ہے وہ غبار خاطر سے نہیں ہو سکا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ہمہ گیر اثرات کا آج باربار ذکر کیا جاتا ہے مگر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جب ترقی پسند ادب کی تخلیق میں انقلابی خود شریک ہو گئے یا ترقی پسند ادیب عملی طور پر انقلابی بن گئے تب ہی معاشرے پر اس کے نمایاں اثرات مرتب ہوئے۔ ورنہ محنت کشوں اور کسانوں کے شب وروز کا دردناک بیان تو آٹھویں صدی قبل مسیح کے شاعر ہیوڈ نے بھی اپنے گیتوں میں کیا تھا (دیکھیے تاریخ ادبیات عالم جلد اول از پروفیسر وہاب اشرفی)۔ مگر اس طرح کے گیتوں سے کسانوں کی تقدیر کہاں بدلی؟ کاشتکاری کے پھیلاؤ اور کسانوں کی خوشحالی کا سبب یا تو سائنسی ترقیات کو قرار دیا جا سکتا ہے یا متعلقہ فکری کتابوں کو جن کا براہ راست ادب سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ تو ادب کے مثبت اثرات کی بات ہوئی مگر واقعہ یہ ہے کہ کسی سوسائٹی پر اس کے منفی اثرات بھی کم ہی مرتب ہوئے ہیں۔ دور کیوں جایئے، اپنے گردوپیش کی دنیا پر ہی نظر ڈالیے تو شاعری اور نثر نگاری کے نہ جانے کتنے پست نمونے دکھائی دیں گے، مگر یہ سب اپنے عہد کے آئینہ دار رہے ہیں، رہنما نہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ان کے مطالعے سے کوئی عہد اور معاشرہ اخلاقی پستی کا شکار ہو گیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ آج کے زمانے میں 'شیطانی آیات' پڑھنے کے بعد کوئی ایک مسلمان بھی ملحد ہو گیا ہو جب کہ بعض غیر اسلامی تحریکیں ہر دور میں ایمان میں خلل پیدا کرنے میں کسی نہ کسی حد تک کامیاب رہی ہیں۔ اسی طرح کسی سیاسی لیڈر یا ماہر اقتصادیات کی ایک غلطی ملک و قوم کی زبوں حالی کا سامان بن سکتی ہے، جب کہ ہزاروں بری کتابوں کا بھی یہ اثر نہیں ہو سکتا۔ اب رہی بات دوسرے فنون لطیفہ یا ذرائع ابلاغ سے ادب کے مقابلے اور موازنے کی، تو اس سلسلے میں بھی اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ آج کے دور میں جو کام صحافت یا میڈیا کے دوسرے ذرائع مثلاً ٹی۔ وی، ریڈیو، انٹرنیٹ وغیرہ انجام دے رہے ہیں وہ ادبی کتابیں ہرگز ہرگز نہیں کر رہی ہیں اور نہ کر سکتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ایک مائکل جیکسن کے رقص کے اثرات نہ صرف ہماری معاشرتی زندگی پہ رونما ہو رہے ہیں بلکہ اس کے سبب مختلف فنون میں ایک 'آزادانداز' پیدا ہو رہا ہے جسے روکنے میں اکثر ادبی کتابیں ناکام ہیں۔ فیشن کی دنیا ہو کہ نئی زندگی کے دوسرے شعبے، سائنس اور ٹکنالوجی کی نئی جہتوں کا ان پہ اثر پڑ رہا ہے۔ ادب ایک تماشائی ہے اور ادیب بس اس تماشے کو اپنی تخلیقات میں جگہ

دے رہا ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب ادب سوسائٹی میں تغیر و تبدل لانے کے اعتبار سے اس قدر بے معنی رہا ہے، تو پھر بعض ادبی کتابیں حکومت کی طرف سے کیوں ضبط کی جاتی رہی ہیں؟ ایسا کیوں ہے کہ خالص ادیب بھی شہر بدر کیا جاتا ہے؟ کیا ان کتابوں کے اثرات کا خوف حکمرانوں کے دلوں میں رہتا ہے؟ یا ان کے اپنے "نقطۂ نظر" پر چونکہ ان کتابوں سے ضرب پڑتی ہے، اس لیے وہ ان کے خلاف محاذ آرائی کرتے ہیں؟ یہ دونوں باتیں درست ہیں۔ حکمراں عام طور سے یہی سمجھتے ہیں کہ یہ خالص ادبی فکر بھی ان کے تصور پر ضرب لگا رہی ہے، اس لیے کوئی نہ کوئی تادیبی کارروائی کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ ادبی کاوشیں عوام و خواص تک پہنچتی رہیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

تو پھر خالص ادب کا رول کیا ہے اور یہ کیوں لکھا جاتا رہا ہے؟ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ اس کی کارکردگی حالات اور زمانے کی روش کی عکاسی اور آئینہ داری تک محدود رہی ہے۔ یہ کام تاریخ بھی کرتی ہے مگر تاریخ دانوں کے لیے جزیات کی فراہمی دشوار ہے۔ ادیب کی آئینہ داری سے متعلقہ عہد کے نشیب و فراز اور کیف و کم کا آئندہ نسلوں کو بہتر اندازہ ہوتا ہے۔ یہی ادب کا دائرہ ہے۔ چاہیے تو اس دائرے میں اظہار ذات (Self Expression) کی اس خواہش کو بھی داخل کر لیجیے جو کم و بیش ہر فنکار کے دل میں جاگزیں رہتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر ہم انبساط و مسرت کے حصول کو ہی معنویت سے تعبیر کریں تو ادب کی معنویت ہے اور رہے گی۔ لیکن ادبا اور شعرا زمانے کے چلن کو نہیں بدل سکتے۔ اور یہ کام کسی بھی زمانے میں نہیں ہوا ہے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی
دہلی یونی ورسٹی

اقبالیات : یورپ میں

یورپ سے علامہ اقبال کا تعلق تو ان کے زمانہ طالب علمی سے ہی قائم ہو چکا تھا اور اس کا ذریعہ سر تھامس ڈاکٹر آرنلڈ (SIR THOMAS W.ARNOLD) ہوئے۔ یہ اینگلو محمڈن کالج علی گڑھ میں بھی فلسفے کے استاد رہے تھے اور جیسا سر عبدالقادر نے "بانگ درا" کے پیش لفظ میں لکھا ہے: یہاں انھوں نے علامہ شبلی نعمانی کے مذاق علمی کو پختہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ۱۸۸۸ء سے سر سید کی وفات ۱۸۹۸ء تک وہ علی گڑھ میں رہے۔ خود سر سید کی تحریک سے متاثر تھے اور نہایت خاموشی سے اس تحریک کے فروغ میں بھی کوشاں رہے۔ فلسفے کے علاوہ انھیں اسلامیات کے مطالعے کا بھی ذوق تھا اور انھوں نے غیر جانب داری سے اسلام کا مطالعہ کیا تھا جس کا ثبوت ان کی کتاب PREACHING OF ISLAM ہے جو ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

۱۸۹۸ء میں پروفیسر طامس آرنلڈ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے استاد کی حیثیت سے آئے، یہاں وہ اورینٹل کالج کے پرنسپل اور ڈین آف دی اورینٹل فیکلٹی بھی رہے۔ اسی زمانہ میں علامہ اقبال کو ان سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ فروری ۱۹۰۴ء میں وہ ریٹائر ہو کر لندن گئے اور انڈیا آفس لائبریری میں ڈپٹی لائبریرین ہو گئے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ کا انتقال ۹ر جون ۱۹۳۰ء کو ہوا۔ علامہ اقبال نے ۶ا جولائی ۱۹۳۰ء کو لیڈی آرنلڈ کے نام تعزیت کا خط لکھا تھا۔ اس میں کہتے ہیں "یہ نقصان میرے لیے ذاتی نوعیت کا ہے اس لیے کہ یہ انھیں کا فیضان تھا جس نے میری روح کی تربیت کی اور مجھے علم کی راہ دکھائی۔" اقبال سر تھامس سے بے حد متاثر تھے ان سے برابر خط و کتابت کرتے رہے بلکہ ان کی بیٹی نینسی (NANCY) کو بھی خط لکھتے رہتے تھے۔ اقبال نے اپنی کتاب DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA) یعنی "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا" پروفیسر آرنلڈ کے نام معنون کرتے ہوئے لکھا تھا:

> "یہ چھوٹی سی کتاب اس ادبی اور فلسفیانہ تربیت کا پہلا ثمر ہے جو پچھلے دس برسوں میں مجھے آپ سے ملی ہے۔"

اقبال نے معاشیات کے موضوع پر ایک کتاب "علم الاقتصاد" بھی لکھی تھی جو

ان کی پہلی مطبوعہ کتاب تھی اور اس کے دیباچہ میں انھوں نے اقرار کیا ہے، اس کو لکھنے کی تحریک پروفیسر آرنلڈ نے کی۔

اقبال کا اسلامیات سے تعلق، مشرقی فلسفے اور مابعد الطبیعیات کا ذوق، ملی معاملات و مسائل میں دلچسپی اور دلسوزی، فکر و نظر میں وسعت اور ارتقائی شان ہے یہ سب پروفیسر آرنلڈ کی تربیت ہی کا فیضان سمجھنا چاہیے۔

پروفیسر آرنلڈ نے خود کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ یہاں انھوں نے متعدد مشرقی اور مغربی زبانیں سیکھیں اور تھیوڈور بیک (THEODOR BECK) سر تھیوڈور ماریسن اور والٹر ریلے (SIR WALTER RALEIGH) جیسے نامور مستشرقین سے استفادہ کیا تھا۔

علم و تحقیق کی روایت اس طرح مضبوط ہوتی ہے اور پھلتی پھولتی ہے کہ ایک عالم اپنے جانشین پیدا کرتا ہے۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں کی صلاحیت کا اندازہ لگا کر ان کی تربیت، رہنمائی اور امداد کرتا ہے افسوس ہے کہ مشرق میں یہ دستور ختم ہو گیا۔ ہندستان میں علامہ شبلی آخری عالم تھے جنھوں نے اپنے جانشین پیدا کرنے کا اہتمام کیا۔ سر تھامس آرنلڈ ۱۹۰۴ء میں لندن چلے گئے مگر یہاں ان کے شاگردوں میں جو باصلاحیت تھے انھیں بھولے نہیں۔ انھوں نے اقبال کو کیمبرج میں داخلہ لینے کا مشورہ دیا اور ستمبر ۱۹۰۵ء میں اقبال ٹرنٹی کالج میں داخل ہوئے۔ یہ وہ کالج ہے جس میں نیوٹن، بائرن، ٹینی سن اور برٹرنڈرسل جیسی مشہور آفاق ہستیوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اقبال بھی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک بی اے کے طالب علم رہے۔ ۱۹۰۸ء میں بار ایٹ لا ہوئے اور اسی مدت میں انھوں نے میونخ سے پی ایچ ڈی کی سند بھی حاصل کر لی۔ ۱۹۰۸ء میں وہ چند مہینے تک پروفیسر آرنلڈ کی جگہ لندن یونیورسٹی میں عربی بھی پڑھاتے رہے۔ اس سے پہلے ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۵ء تک وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی فلسفہ اور عربی کے لکچرر رہے تھے۔ یہ بھی پروفیسر آرنلڈ کی ہمت افزائی اور قدردانی کی بدولت ہوا تھا۔

آرنلڈ کا اردو شعر و ادب اور ہندستانی فارسی ادب پر بھی بڑا احسان ہے۔ سر عبد القادر نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۸ء میں اقبال نے شعر گوئی ترک کرنے کا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ شاعری کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر اپنا وقت اور صلاحیت "کسی اور مفید کام" میں صرف کریں گے۔ انھیں اس ارادے سے طامس آرنلڈ نے ہی باز رکھا ورنہ اقبال بقول خود کوئی اور "مفید کام" میں لگ جاتے تو اندازہ لگائیے ادب کا کتنا نقصان ہوتا۔

یورپ میں اقبال کا تعلق جرمنی سے بھی ان معنوں میں رہا کہ انھوں نے میونخ یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی اور اس کے لیے انھیں جرمن زبان سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کا تعارف ایما ویگیناسٹ FRAULEIN EMMA WEGENAST سے ہوا۔ اس خاتون کی وفات ۱۹۶۴ء میں ہوئی۔ اقبال کی ان سے خط و کتابت بھی رہی ان کے ۲۷ خطوط دریافت ہوئے ہیں جن میں ۱۷ خطوط مکمل جرمن زبان میں اور دس خطوط انگریزی میں ہیں۔ ان خطوں کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

اقبال کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا" بھی لوزک اینڈ کمپنی لندن نے ۱۹۰۸ء میں شائع کیا (بعد میں اس کا اردو ترجمہ فلسفہ عجم کے نام سے حیدر آباد سے چھپا تھا۔)

کیمبرج میں اقبال کے اساتذہ میں ڈاکٹر میک ٹیگارٹ (MC TAGGART) پروفیسر سورلی W.R.SORLEY اور پروفیسر آر اے نکلسن (R.A NICHOLSON) تھے پروفیسر نکلسن کا خصوصی میدان تحقیق تصوف اسلامی تھا جلال الدین رومی کی مثنوی کا انھوں نے انگریزی ترجمہ کیا اور رومی کی حیات و افکار پر وہ سند کا درجہ رکھتے تھے۔ اقبال اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہیں کہ ان کی مثنوی اسرار خودی جو ۱۹۰۵ء میں لاہور سے چھپی تھی اس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر نکلسن نے کیا جو ۱۹۲۰ء میں میک ملن اینڈ کمپنی لندن نے شائع کیا۔ ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ کسی استاد نے اپنے شاگرد کی تصنیف کو اتنی اہمیت دی ہو۔ ڈاکٹر نکلسن کا انتقال ۱۹۴۵ء میں ہوا۔ ان سے بھی اقبال کی خط و کتابت ہوتی رہی۔

ایک شاعر اور مفکر کی حیثیت سے اقبال کا تعارف یورپ کی علمی دنیا سے ڈاکٹر نکلسن ہی نے کرایا۔ بعد میں کیمبرج یونی ورسٹی کے ایک اور نامور فرزند A.J.ARBERRY آرتھر جان آربری نے اقبال کی کئی فارسی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ پروفیسر وکٹر کیرنن بھی ٹرینٹی کالج کیمبرج کے تعلیم یافتہ ہیں انھوں نے اقبال کی اردو غزلوں اور نظموں کا انتخاب کر کے انگریزی میں ترجمہ کیا یہ POEMS OF IQBAL کے نام سے شائع ہوا۔

کیمبرج میں علامہ اقبال کا قیام تین چار گھروں میں رہا۔ ان کی پہلی اقامت گاہ نمبر ۱۷ پرتگال پلس تھی اس پر ۲۲ جون کو ایک کتبہ لگا دیا گیا ہے جس کی نقاب کشائی سر ماسٹیگو بٹلر کے صاحبزادے نے کی، وہ علامہ اقبال کے دوست تھے اور برطانوی حکومت کے زمانے میں صوبہ جات متوسطہ کے گورنر کی حیثیت سے ناگپور میں رہے تھے لارڈ بٹلر ان کے بیٹے ہندستان ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

۱۹۴۸ء میں پہلی بار انگلستان میں یوم اقبال منایا گیا۔ اس میں سر مانٹیگو بٹلر نے بھی شرکت کی تھی۔ ۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر سعید اختر درانی (برمنگھم یونیورسٹی) اور IAN STEPHANS سابق اڈیٹر THE STATESMAN کی کوشش سے کیمرج یونیورسٹی میں اقبال چیر آف اسلامک اسٹڈیز بھی قائم ہو گئی ہے۔ اسی طرح ۱۹۷۹ء میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں اقبال چیر قائم ہوئی اس کے لیے پروفیسر انا ماری شمل اور منیر احمد شیخ نے کوشش کی تھی۔ پروفیسر شمل نے اقبالیات کے موضوع پر بہت قابل قدر کام کیا ہے۔ ہائیڈالبرگ کے جس مکان میں علامہ اقبال ۱۹۰۷ء میں رہے تھے اس پر بھی جرمنی کی حکومت نے ۱۹۹۶ء میں ایک یادگاری پتھر نصب کراویا ہے۔ یہ مکان دریائے نیکر کے کنارے واقع ہے اس جگہ کا نام بھی IQBAL UFFER یعنی "ساحل اقبال" رکھ دیا گیا ہے۔ اقبال نے اپنی نظم "ایک شام" اسی جگہ ٹہلتے ہوئے لکھی تھی۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی   شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش   کہسار کے سبز پوش خاموش

اب اقبال کی متعدد تصانیف کی ترجمے انگریزی کے علاوہ دوسری یورپی زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔ اقبال کے موضوع پر کئی بین اقوامی سیمینار انگلستان، فرانس، جرمنی اور اسپین میں ہوئے ہیں، سب سے زیادہ متحرک اور فعال شخصیت ڈاکٹر سعید اختر درانی کی ہے جو اگرچہ سائنس داں ہیں اور چاند سے لائی گئی مٹی اور دوسری معدنیات پر ان کا تحقیقی کام ہے مگر وہ اقبال کے عاشق ہیں، یورپ میں اقبالیات کو روشناس کرانے اور اقبال شناسی کو فروغ دینے میں اگر عصر حاضر کی کسی ایک شخصیت کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ پروفیسر درانی ہی ہیں۔ یورپ میں اقبالیات کے موضوع پر آج ہم جو کچھ جانتے ہیں اس کا بڑا حصہ ڈاکٹر درّانی کی ان تھک محنت اور تحقیق کی بدولت ہی ہم تک پہنچا ہے۔

ڈاکٹر سید حامد حسین
بھوپال

عارف عزیز کی تبصرہ نگاری

عارف عزیز نے گذشتہ بیس سال میں بھوپال کے ایک صاحب نظر صحافی کی حیثیت سے اپنی پہچان بنائی ہے۔ وہ جس تسلسل اور تواتر کے ساتھ سیاسی' سماجی' معاشی' علمی اور ادبی مسائل پر لکھ رہے ہیں ان کی بنا پر اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ عارف عزیز کے قلم کے اندر روشنائی نہیں' ایک لہریں مارتا ہوا دریا ہے لیکن جس بات نے ان کی تحریرات کو امتیاز بخشا ہے وہ موضوعات کا حیرت انگیز تنوع اور رائے کا توازن ہے۔ اس توازن کا اصلی سبب یہ ہے کہ عارف عزیز نے خود کو کسی خاص حلقہ فکر یا کسی مخصوص سیاسی رجحان سے وابستہ کرنے میں احتیاط برتی ہے۔ اس طرح انھوں نے جس غیر جانب دارانہ صداقت کو اپنا مطمح نظر بنایا ہے' اس کی بنا پر وہ اپنے قارئین کا پورا اعتماد حاصل کر پانے کے اہل ہیں۔

ابھی تک عارف عزیز کے مضامین کے دو مجموعے "ذکر جمیل" اور "نبض دوراں" کے عنوان سے سامنے آچکے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان مجموعوں کا سلسلہ نسب کہیں کشتی نوح سے جا کر ملتا ہے۔ ایک دنیا ہے کہ ان میں سمائی ہوئی ہے۔ "ذکر جمیل" تقریبا چالیس شخصی خاکوں پر مشتمل ہے اور اسے مدھیہ پردیش کی اردو اکیڈیمی نے شائع کیا ہے۔ "نبض دوران" میں تقریبا ستر سیاسی' سماجی اور عصری موضوعات پر مضامین ہیں۔ "ذکر جمیل" میں "مشائخ و مصلح' سیاسی و سماجی رہنما' ادیب وصحافی' اور احباب ورفقا' کے ذیل میں بھوپال سے تعلق رکھنے والی ایسی اہم شخصیتوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے بیسویں صدی میں' بالخصوص گذشتہ نصف صدی کے دوران بھوپال کو افتخار بخشا ہے۔

"نبض دوراں" کی تحریروں میں عصریت کا پہلو نمایاں ہے لیکن وہ اکثر جن مباحث کا احاطہ کرتی ہیں وہ بنیادی اہمیت کے مالک ہیں اور قارئین کو دعوت فکر دیتے ہیں

'جیسے اکثریت واقلیت کا جھگڑا' مذہب کی سیاست سے علاحدگی' میڈیکل سائنس کی دودھاری تلوار' لڑکیوں کی نسل کشی' خواتین کی زبوں حالی' عصر حاضر اور اسلامی تعلیمات' مغربی معاشرے میں نسل پرستی' سماج میں اساتذہ کا رول وغیرہ۔ اس کے علاوہ عارف عزیز نے جہاں ناوابستہ تحریک کی معنویت' دولت مشترکہ کے کردار' سارک کے علاقائی تعاون اور جنگ کے خلاف عالمی ردعمل' جیسے موضوعات پر عالمی تناظر میں بحث کی ہے وہیں انھوں نے مسلم ووٹ بینک کا شوشہ' قومی سیاست میں دل بدل' لوک عدالتوں کا تجربہ' پنچایتی راج کی افادیت' لسانی ریاستوں کی تشکیل جیسے عصری اہمیت رکھنے والے مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔

عارف عزیز نے نہ صرف نبض دوراں کی دھڑکن کو پہچان کر عوارض دوراں تک پہنچنے کی سعی کی ہے۔ بلکہ ان کے پس پردہ کارفرما سلسلہ اسباب وعلل کو بھی دریافت کرنے کا جتن کیا ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریر کو نظریاتی موشگافیوں سے گرانبار نہیں ہونے دیا ہے۔ عارف عزیز اپنے قاری کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں بصیرتیں فراہم کرتے ہیں۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اخبار کا عام قاری خبر کو جزو حکایت اور نظریے کو لقمہ نرم کی حیثیت سے قبول کرنے کا عادی ہے۔ عارف عزیز اپنے قاری کو مایوس نہیں ہونے دیتے۔ ان کی تشریح وتوجیہ یوں غیر منطقی اور سطحی تو نہیں ہوتی' لیکن وہ اپنی صحافتی تحریرات میں قاری کو منطق کی لاٹھی سے ہانکنے میں احتیاط برتتے ہیں۔ وہ ایک ایسی فضا استوار کرتے ہیں کہ قاری خود ان کی دلیل کی انگلی پکڑ کر چلنے میں اطمینان محسوس کرے۔

عارف عزیز چونکانے کو اپنے لیے معراج فن نہیں سمجھتے۔ لیکن انھیں اپنے قاری کے شعور کو تحریک بخش کر اسے فکری طور پر مطمئن کرنے کا ہنر آتا ہے۔ عارف عزیز نے گوکہ عصری مسائل کے مبصر کا کردار ادا کیا ہے لیکن وہ قاری کی ذہانت کو کئی سطحوں پر چھیڑنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ کہیں وہ واقعات کی منطقی ترتیب سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو کہیں سلسلہ اسباب ونتائج کے انکشاف کے ذریعے قاری کو اپنا ہم خیال بناتے ہیں اور کہیں بصیرتوں کے نئے آفاق کو اجاگر کرکے موضوع کو نئی معنوی وسعت بخشتے ہیں۔

عارف عزیز کی تحریرات کو ایک خاص توانائی ان کے اسلوب تحریر سے حاصل ہوتی ہے۔ ان کی نثر میں ایک ایسا علمی وقار ہے جو رسمی قسم کی اسلوبیاتی تحریر کا متحمل نہیں۔ ان کے انتخاب الفاظ کو نہ تو اس سہل پسندی کی پیداوار کہا جاسکتا ہے جس پر سطحیت کا

الزام آئے اور نہ ہی وہ اس گنجلک پن کو جنم دیتا ہے جس سے اس پر کسی اصطلاحاتی اسلوب کا چربہ ہونے کا شبہ ہو۔ عارف عزیز کی تحریر کو دو اوصاف خاص اعتبار بخشتے ہیں۔ ایک تو اس کی شستگی اور دوسری ان کی جامعیت۔ ان کی صحافتی تحریرات رپورٹنگ کے اکہرے پن سے مبرا ہیں کیونکہ ان کے کلمات میں جس ایک خاص قسم کی معنوی دبازت کا تجربہ ہوتا ہے وہ ان اظہار کو رسمیت سے بالاتر فکری جواز مہیا کرتی ہے۔

"قدر و قیمت" عارف عزیز کا تیسرا مجموعہ ہے جو ان کے ڈھائی درجن تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین کا تعلق بھوپال کے قابل توجہ شعرا کی تخلیقی کاوشوں سے ہے۔ ان میں جہاں شعری بھوپالی' شفاء گوالیاری' تاج بھوپالی' نجمی سیہوری' اور عرشی بھوپالی کے کلام کا تعارف اور اس پر تبصرہ شامل ہے۔ وہیں عشرت قادری' سرفراز دانش' متین نیاز' مرتضٰی علی شاد کے شعری کمال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جہاں عبید اللہ علیم' خالد محمود اور اسد محمد خاں جیسے شعراء کا تذکرہ ہے جن کی شہرت ملک کی سرحدیں پار کر چکی ہے' وہیں بختیار ضیا' سیفی سرونجی اور افسر صہبائی جیسے ایک دوسرے سے منفرد شعراء کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مختصراً "قدر و قیمت" گزشتہ نصف صدی کے دوران بھوپال میں اردو شاعری کی تاریخ' اس پر تبصرہ اور اس کا نمائندہ انتخاب پیش کرتی ہے۔

"قدر و قیمت" کے بیشتر مضامین تعارف اور تبصرے کی دوہری ضرورت کو پورا کرتے ہیں' عارف عزیز نے ایک قدر شناس تعارف نگار اور نکتہ رس مبصر کا کردار ادا کیا ہے انھوں نے جس عہد کے شعرا کو اپنا موضوع بنایا ہے وہ اپنے رویوں اور روایتوں سے اپنے تعلق کے اعتبار سے تضادات کی حد تک رنگارنگی کا مالک ہے۔ اتنے مختلف نظریات کی نمائندگی کرنے والی شاعری کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے نظر میں بڑی وسعت اور فکر میں بڑی لچک کی ضرورت ہوتی ہے جس کا مشاہدہ عارف عزیز کے مضامین میں ہوتا ہے انھوں نے قدیم و جدید' رسمیت اور انقلابیت' نظریاتی یکسانیت اور جرات مندانہ تجرباتیت کو سمجھنے اور ان کی قدر کرنے میں ایک قابل ستائش غیر جانبداری اور حیرت انگیز تحمل کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

شعری بھوپالی کے بارے میں عارف عزیز لکھتے ہیں:

"حضرت شعری بھوپالی نے قصر غزل کی آرائشگی میں اپنے اسلاف کے نقش قدم کی پیروی کی ہے اور ان کے ذہن رسا اور نکتہ سنج دماغ نے غزل کے پیکر جمیل میں بھی فن کاری کے معیاری نمونے پیش کیے۔ تغزل کی رنگین بزم کو محض تماش گاہ اور زلف

و گیسو، عارض و رخسار کی فرسودہ حکایات تک محدود نہ رکھا بلکہ اس سے درس و پیام کا کام لیا۔

شفا گوالیاری کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ:

"شفا گوالیاری کے یہاں مقصدیت صحافیانہ تنگ بندی نہیں۔ نہ انھوں نے بزن بزن کشمکش کا لہجہ اپنایا ہے بلکہ انسان اور انسانیت کی تلاش کے ساتھ دنیا اور اس کے مسائل ان کا موضوع رہے ہیں ان کے اس نوع کے اشعار اگرچہ کم ہیں مگر سماجیاتی پس منظر کو مرحلہ در مرحلہ ابھارتے ہیں۔"

تاج بھوپالی کی شاعری پر تبصرے میں عارف عزیز کی سخن فہمی نے بڑا دلفریب انداز اختیار کیا ہے:

"اگرچہ انھوں نے شعری جوہر کے اظہار، دسترس اور غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کی بنا پر ہر طرح کے شعر کہے ہیں لیکن ان کی شاعری کا عام تخاطب عوام سے ہے، جس میں وہ کبھی سماجی نابرابری کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو کبھی انقلاب کے سینے میں دبی جوالا مکھی کی نشاندہی، کبھی کچلے ہوئے انسانوں کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں تو کبھی زندگی کے تقاضوں کی ہم نوائی، چنانچہ ان کے اشعار میں وقت اور حالات کے قدموں کی دھمک صاف سنی جاسکتی ہے کہنے کو وہ ایک غیر سیاسی آدمی تھے لیکن انھوں نے سیاست کو شجر ممنوعہ نہیں سمجھا بلکہ اپنے یہاں ایسے مضامین کو نمائندگی دی مگر ان میں بھی سیاست کی خشکی کا گزر نہیں۔"

عشرت قادری کی انفرادیت کا جائزہ لیتے ہوئے عارف عزیز بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی بات کہہ گئے ہیں:

"اردو شاعری گذشتہ تین چار دہائیوں میں جس شکستن و رستن کی گردان سے گزری ہے اسمیں چاہے سب کچھ ہو، یافتن بمشکل ہی کسی صینغے میں نظر آیا اس عرصہ میں بہت کم شعرا ایسے دکھائی دیے جو جدیدیت کے طوفان سے دوچار ہو کر ادب کی صحیح و سالم اقدار کی منزلوں سے گزر گئے لیکن جذبات و تخیلات کی پاک دامنی برقرار رہی۔ اس دامن تر کا کیا کہنا جسے نچوڑا جائے تو فرشتے وضو کریں۔"

نور محمد یاس کی غزلیہ شاعری پر بحث کرتے ہوئے وہ اینٹی غزل کے بارے میں اپنے تاثرات اس طرح پیش کرتے ہیں:

"روایتی غزل کی ضد میں شعرا کی ایک نسل نے اینٹی غزل کی فارم اختراع کی اور اس اینٹی

غزل کی عمارت میں جو کڑی کے جالے تن گئے تھے یا بام و در پر جو گرد و غبار چھانے لگا تھا اسے صاف کرنے کے بجائے ایوان غزل پر ہی اپنی غزل کا بلڈوزر چلانا شروع کر دیا۔"

"قدر و قیمت" کے تبصروں میں ایسی بصیرتیں اچانک ابھر آتی ہیں اور زیر بحث موضوع کے نظروں سے اوجھل بعض اہم گوشوں کو روشن کرتی ہیں۔

تبصرہ نگاری کے شریفانہ فن کو عارف عزیز کی طبعی شرافت سے ایک نئی توانائی حاصل ہوئی ہے ان کے مضامین تہذیب فکر و نظر کا ایک ایسا نادر نمونہ ہیں جن کو تبصرہ نگار کی خوش سلیقہ مروتوں نے سامان لطف فراہم کیا ہے ان تحریرات میں عارف عزیز کا کردار کسی نقطہ نظر کے مبلغ یا وکیل کا نہیں ان کا رجحان فنکار کے ساتھ دوست داری اور فن کی جانب طرف داری کا ہے۔ تنقیدی احتیاجات کے ساتھ ان کا رواداری کا برتاؤ ہے لیکن تنقیص ان کے کاروبار فکر میں جنس غیر کا حکم رکھتی ہے وہ نکتہ چینی کر کے نقائص کو نمایاں کر کے لطف نہیں لیتے۔ اس کی جگہ ادب پاروں میں جواہر ریزوں کی تلاش ان کا محبوب مشغلہ ہے یہی وجہ ہے کہ "قدر و قیمت" کے بیشتر مضامین خوبصورت اشعار کا ایک حسین گلدستہ ہیں ان تنقیدی مضامین میں عارف عزیز نے ادب کی جانب اپنے ایک ایجابی اور اثباتی رویے کو اظہار بخشا ہے جس کے نتیجے میں انھوں نے مستحکم شہرتوں کو اعتبار اور لائق تعارف فنکاروں کو جائز مقام دلانے کی کامیاب سعی کی ہے۔

عارف عزیز نے بھوپال کی قابل ذکر ہستیوں کے تذکرہ کو تاریخ کے صفحات پر محفوظ کر دینے کی مستحسن خدمت سر انجام دی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی ان کی تصنیف "ذکر جمیل" تھی اور اب "قدر و قیمت" میں انھوں نے بھوپال کے شعری فنکاروں کے فنی کمال پر بحث کرتے ہوئے اُن کے مرتبے کے تعین کے لیے مناسب بنیاد فراہم کی ہے۔●

اختر سعید خاں
بھوپال

غزل

پلٹ آتی ہیں راہیں بیدلی سے
سفر کٹتا نہیں تنہاروی سے
ملا تھا وہ کچھ اس وارفتگی سے
کہ اب ملتا نہیں ہے دل کسی سے
ابھی آنکھوں میں آجاتے ہیں آنسو
ابھی محکم ہے رشتہ زندگی سے
ٹپکنے کو ہے چہرے سے غم دل
پریشاں ہوں میں اپنی خامشی سے
دلوں کی بھی کوئی تدبیر یارو
کبھی فرصت جو ہو صورت گری سے
یہ دنیا دور تک تھی لائق دید
مجھے شکوہ ہے اپنی ماندگی سے
جھکانے سے کہیں جھکتا نہیں سر
میں خوش ہوں اپنی شوریدہ سری سے
بدلتے موسموں کے رنگ اختر
پشیماں ہیں گلوں کی سادگی سے

اختر سعید خاں
بھوپال

غزل

ٹپکتا ہے لہو حرف دعا سے
حیا آنے لگی ہے التجا سے

شکست دل نہ آہ نارسا سے
میں چپ ہوں پاس ناموس وفا سے

سحر اس رات کی قسمت نہیں کیا
مجھے کہنا ہے کچھ بادصبا سے

نہ دے اے زندگی اذن تماشا
الجھنا کیا دل بے مدعا سے

کہاں وہ اور کہاں حرف تسلی
فقط اک چھیڑ ہے مجھ بے نوا سے

غرض لوٹا دیے آنکھوں نے وہ خواب
ملے تھے جو کبھی اک خوش ادا سے

اٹھا ہے دل کے سناٹے سے جو حشر
نہ اٹھا شورش زنجیرپا سے

جیے جاتا ہے ہر عالم میں اختر
عجب رشتہ ہے دردبے دوا سے

انیس انصاری
آیوک چکبدری لکھنو

غزل

کس کو خط لکھیں کسے القاب میں پیارا کہیں
ہیں سبھی ہجرت زدہ کس کو قطب تارا کہیں

مجھ میں ایسا پیڑ اگا ہے جس کے پھل پتھر کے ہیں
بیج کی تاثیر ایسی ہے کہ انگارا کہیں

ڈائری کے سب ورق محفوظ ہیں لیکن پتے
اب پرانے ہو چلے تفصیل دوبارا کہیں

کون کس کو چاہتا ہے سب تلاش خود میں ہیں
اور بھٹکیں تو مقدر ہجر کا مارا کہیں

وصل کے سارے مسافر منزلوں میں جا بسے
ہجر من کا جوگ ہے ٹوٹا ہوا تارا کہیں

اک پرانا پیڑ چپکے سے زمیں پر گر پڑا
شاخ کے اجڑے پرندے اب کسے پیارا کہیں

بھگوان داس اعجاز

آئینہ

آنکھیں دیواروں کو دے، ہم روئے پچھتائے
پتہ نہ تھا کہ آئینہ، گھر ننگا کر جائے

اندھے کے گھر آئینہ، تھا گونگا حیران
اندھا سندر ہے بہت، کیسے کرے بیان

ہم ناٹک کرتے رہے، ہمیں ٹوکتا کون
ہاتھ میں پتھر دیکھ کر، رہا آئینہ مون

نہیں دیا اچھا کیا، ہوتا پل میں چور
ہاں! بچوں کے ہاتھ سے، رہے آئینہ دور

ابھی پتہ چل جائے گا کیا کیا کرتے نیچ
رکھ کر دیکھو آئینہ دو بندر کے بیچ

مسکاتا ہے آئینہ کھاتا نہیں کھر ونچ
کا ہے مکھڑا دیکھ کر، چڑیا توڑے چونچ

کبھی نہ ٹوٹے آئینہ ہوئے کانچ کی ہار
پانی پالش تیل میں درپن سدا بہار

شبیر احمد قرار
فجی

غزل

کس امید پہ گھر سے نکلیں ہر منظر حیرانی ہے
شہر بھی رستہ بھول گیا اب جنگل بھی سیلانی ہے

شکر کے سجدے آخر کس دن پیشانی پر چمکیں گے
پیاسی فصل کا رونا تھا اب سر سے اونچا پانی ہے

دریا آپ گنوا بیٹھا اب قطرے موج میں آئے ہیں
یہ بے چارے کیا جانیں کس آگ میں کتنا پانی ہے

سر پہ فلک محلوں میں پگڑی تھام کے آنا جانا کیا
یوں بھی کچے گھر میں پتھر لمحوں کی من مانی ہے

دھم دھم، دھڑ دھڑ، دھائیں دھائیں ہائے ہائے یا اللہ
اب راون کے ہونٹوں پر یہ کیسی رام کہانی ہے؟

خالی جیب تو پھوٹی مٹکی منہ میں پانی ڈالے کون
ساون ہاتھ سے ہو تو ظالم دنیا خوب سہانی ہے

میرو میرا کی دنیا میں سونا چاندی مٹی دھول
کندن تفتگی سر آنکھوں پر ٹھوکر میں سلطانی ہے

اوشا کھدوریہ
۳۰/۲۹-۳س-ہوسٹل ۲
پیپلانی بھوپال

غزل

کالی راتیں خوابوں کو مہکاتی ہیں
تجھ کو لیکن مجھ تک کب پہنچاتی ہیں

یادیں تیری تنہائی پہناتی ہیں
دل کو چھوتے ہی آنسو بن جاتی ہیں

مہکاتے ہیں پھول کہاں بیتے موسم
پانی پر کچھ تصویریں بن جاتی ہیں

منزل ہو تو چلنا اچھا لگتا ہے
اندھی راتیں اکثر یہ سمجھاتی ہیں

ایسا لگتا ہے تو نے دستک دی ہے
سرد ہوائیں کھڑکی سے ٹکراتی ہیں

تیری قربت پاون گنگا کی دھارا
تیری باتیں سانسوں کو نہلاتی ہیں

اندھی دنیا کی ساری کالی رسمیں
سب کو اک ٹوٹا درپن دکھلاتی ہیں

پیاسی دھرتی پر یہ سوکھی برساتیں
جانے دل کو کیا کیا یاد دلاتی ہیں

چھو کر سانسیں تیری خوشبو کا سایہ
اوشا گہرے ساگر میں کھو جاتی ہیں

عطا عابدی
اردو شعبہ بہار قانون
ساز کونسل پٹنہ-۱۵

غزل

کسی کی مہربانی ہو گئی ہے
عیاں دل کی کہانی ہو گئی ہے

ہرے موسم کی پہلی خواہشیں، اف!
خوشی غم کی دیوانی ہو گئی ہے

سبھی افراد گھر کے سو گئے ہیں
بہت لمبی کہانی ہو گئی ہے

روایت کا ہے اب بھی سحر قائم
ہر اک جدت پرانی ہو گئی ہے

بس چہرہ ملا اک اور چہرہ
عقیدت پانی پانی ہو گئی ہے

اچانک بھی کوئی ہوتا ہے بوڑھا؟
کلی گھر کی سیانی ہو گئی ہے

زمانے میں ہوا اخلاص عنقا
روا داری کہانی ہو گئی ہے

غزل مقطع پہ آ پہنچی ہے، لیکن
عطا کی ترجمانی ہو گئی ہے؟

جدیدیت سے جدیدیت تک

چند حقایق چند سوالات

☆ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے پاس ایک تہذیبی اور سماجی پس منظر موجود تھا۔

یعنی

ترقی پسندی کا آغاز تب ہوا جب تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی۔

اور

☆ جدیدیت تب وجود میں آئی جب برصغیر مابعد آزادی اور تقسیم کی صورت حال سے دوچار ہوا۔

☆ جدیدیت ترقی پسند خوابوں کی شکست کے بطن سے پیدا ہوئی۔ لہٰذا وہ ترقی پسندی کا رد عمل ہونے سے زیادہ اس عصر کے تقاضوں کے پیش نظر ایک فطری ضرورت تھی۔

☆ جدیدیت کا کام نہ بت توڑنا تھا نہ بت بنانا تھا بلکہ احتجاج کے پردے میں نئی صورت حال کا سامنا کرنا تھا اور ایک سچا ادب جو اس عہد کی زندگی کا آئینہ دار ہو پیش کرنا تھا۔

☆ جدیدیت انکار نہیں تھی بلکہ ایقان تھی برصغیر کے ایک نئے عہد کا جو آنسوؤں سے لکھا گیا تھا۔

☆ اردو ادب میں داخل ہونے والی جدیدیت کا مغربی جدیدیت سے کچھ لینا دینا نہیں تھا کیونکہ ایک تو عرصہ پہلے وہ رخصت ہو چکی تھی دوسرے یہ کہ برصغیر کے اردو ادب کی کفالت کرنے کی اس کے اندر صلاحیت تھی نہ ہی ترقی پسندی کے زوال کی پس ماندہ ہماری نئی ادبی کش مکش سے اس کی ہم آہنگی تھی۔

☆ جدیدیت کوئی مینی فیسٹو لے کر وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ فکری اور فنی مرگ انبوہ کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی۔ منفی رجحانات اس کا منبع نہیں تھے بلکہ خط منحنی پر چلتے ہوئے وہ دراصل خط مستقیم کی تلاش میں تھی۔

☆ جدیدیت کوئی فیشن نہیں تھی۔ جنھوں نے اصلاً جدیدیت کو قبول کیا، سمجھا اور پہچانا، وہ ایک افسردہ اور کس مپرس ماحول سے بچے انسانی جذبوں کا اظہار تلاش کرنے والے لوگ تھے۔ وہاں تجربوں کی وہی نوعیت تھی جو المیہ ڈرامے میں Tragic Relief کی ہوتی ہے۔

☆ تجربوں کو اگر کرتب بازی کا نام دیا جائے گا تو کیا مغرب اور کیا مشرق سارا ادبی اور فنی منظر نامہ داغ دار ہو جائے گا۔

ہر دہائی میں ادب و فن کے ابعاد بدلتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے پہلے کی جدیدیت اور ۱۹۶۰ء کے بعد کی جدیدیت میں فرق تھا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد اور ۱۹۸۰ء کے بعد بھی جدیدیت نے الگ الگ ابعاد تلاش کیے اور اب تازہ کار نسل ۱۹۹۰ء کے بعد بھی جدیدیت کے نئے ڈائمنشن کی تلاش میں ہے۔ اسے ہم ترقی پسند جدیدیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ سارا سفر جدیدیت کا ہے۔ مابعد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوال تب پیدا ہوتا جب جدیدیت نے اپنا کام پورا کر لیا ہوتا۔

☆ آزادی اور تقسیم ہند کے بعد ہم ایک سماجی کرب سے دوچار ہوئے اور جدیدیت کی شکل میں ایک جہان نو کی تلاش شروع ہوئی۔ ہم نے اب تک وہ جہان نو تشکیل نہیں کیا ہے۔

☆ جدیدیت کا سفر جس افسردگی اور بے یقینی کے عالم میں ہوا اس میں ادعائیت یا رجعت پسندی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

تو اب سوالات یوں سر اٹھاتے ہیں

کہ

☆ جب جدیدیت کا کام پورا ہوا ہی نہیں تو یہ مابعد جدیدیت نام کی کون سی چیز تعارف کے مرحلے میں ہے؟

☆ شے عجیب موسوم بہ مابعد جدیدیت کا تہذیبی اور سماجی پس منظر کیا ہے؟

☆ کیا برصغیر کی اردو ادبی دنیا میں مابعد جدید صورت حال پیدا ہو چکی ہے؟

☆ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے اپنے تہذیبی شناختی کارڈ تھے۔ کیا مابعد جدیدیت کے پاس بھی کوئی شناختی کارڈ ہے؟

☆ کیا مابعد جدیدیت کی شناخت مغربی ڈسکورس میں پنہاں ہے؟

☆ کیا مابعد جدیدیت مشرق کی بازیافت سے خوفزدہ ہو کر پھر مغرب کی بازیافت کے کام میں مصروف ہے؟

☆ کیا مابعد جدیدیت پس نو آبادیاتی اسٹیبلشمنٹ کی تلاش میں ہے؟

☆ ان لوگوں کو جو کل تک جدیدیت کی ہموائی کر رہے تھے اور 'شب خونی ادب' لکھنے کے لیے ہراساں اور پریشاں تھے اچانک جدیدیت کے خاتمے اور مابعد جدیدیت کی پیدائش کا مژدہ کس نے سنایا اور کیوں؟ چند دنوں قبل تک یہی لوگ جدیدیت کے نئے نئے رنگوں کی تلاش کر رہے تھے اور جس فیشن کی بات کی جا رہی ہے تو یہی حضرات جدیدیت کو فیشن کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ آج انھیں اپنا مرض سنجیدہ اور جینوئن جدیدیت پسندوں کے یہاں کیوں کر نظر آنے لگا؟

☆ معنوی اسلوبی بلکہ موضوعی سطح پر بھی جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے بیچ کون سا خط امتیاز کھینچا جا سکتا ہے؟ آپ جسے مابعد جدید ادب کہہ رہے ہیں کیا اسے جدید کہنا بلکہ ثابت کر دینا کوئی مشکل کام ہے؟

☆ کیا مابعد جدیدیت کی اشتہار بازی چند ذاتی آرزومندیوں کے لیے نہیں کی جا رہی ہے؟ جن میں دارالسلطنت کے سمنیاروں میں شرکت اور ایک قد آور ناقد کے مضامین میں ناموں کی شمولیت بھی شامل ہیں؟

☆ کیا ہندستان میں مابعد جدیدیت کا استعمال ایک طرح کی تہذیبی افتراق پسندی کی ترویج کے لیے کیا جا رہا ہے؟

☆ کیا ہندستان میں کسی نو آبادیاتی نظام کی کاٹ کے لیے ایک پس نو آبادیاتی نظام کی تشکیل کا خاکہ تیار کرنے کی گنجائش ہے؟

☆ کیا مابعد جدیدیت ملکی مسائل کے حل کے لیے اپنے پاس کوئی نسخہ رکھتی ہے یا ہندستان کی عصری سماجی اور معاشرتی صورت حال سے اس کی کوئی ہم آہنگی ممکن ہے؟

☆ ترقی پسندی کا کام ایک حد تک پورا ہونے کے بعد جدیدیت دراصل شعر و ادب کا ایک آٹومیٹک ایکشن تھا۔ اس کے لیے نہ کوئی منصوبہ بنایا گیا نہ مینی فسٹو تیار کیا گیا۔ ادب نے ایک نیا اسلوب 'لہجہ یا بہت زیادہ کہہ سکتے ہیں رجحان دریافت کیا جو فطری طور پر جدید تھا۔ اس کے برعکس مابعد جدیدیت کے تعارف اور تشریح و تعبیر کے لیے پروپیگنڈا مشینری استعمال کرنے کی ضرورت کیوں پڑی؟

☆ کیا کسی مردم شماری کے ذریعہ یہ علم حاصل کیا گیا کہ اب ادیب جدیدیت سے برگشتہ ہو چکا ہے اور مابعد جدیدیت کی آغوش میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے؟

☆ ترقی پسند اور جدید ادب کی طاقت زبان اور ادب کے اندر موجود تھی لیکن کیا ایسا نہیں

محسوس ہوتا کہ مابعد جدیدیت کی طاقت زبان وادب سے الگ کچھ اور ہے؟ کیا یہ کوئی سیاسی طاقت ہے؟ میری مراد استعماریت اور پس نو آبادیاتی نظام کی سیاست ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں؟

☆ کیا مابعد جدیدیت کا پہلا حوالہ مغرب کی تہذیبی لسانی اور بین اقوامی غلبہ پسندی نہیں ہے؟ ورنہ دریدا سوسیر اور فوکویا آکستو سے کے افکار پر اپنی ادبی اور تہذیبی عمارت قائم کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ (میں اس دقیانوسیت کا حامی نہیں کہ مغرب سے استفادہ کیا ہی نہ جائے۔ واجب اور جائز طور پر علم و دانش کے تمام سوتوں سے سیرابی حاصل کرنی چاہیے۔ لیکن استفادے کی حد تک اسے ایسی ظلمت پسندی کی شکل نہیں دینی چاہیے کہ اس کے ماسوا اپنا ادبی و تہذیبی سرمایہ ہیچ نظر آنے لگے۔ جدیدیت کا رجحان فی نفسہ اسی طرح کی اجارہ داری کے خلاف رونما ہوا اور اس کا کام آج بھی جاری ہے۔)

☆ کیا مابعد جدیدیت کچھ مخصوص شخصیتوں پر ضرب لگانے کی کوشش ہے؟ جس کی طرف مابعد جدیدیت کے افتتاحی سیمنار میں شرکت کرنے والے ایک جدید شاعر نے اثبات و نفی کے شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۹۶ء میں اشارہ کیا ہے؟

☆ کیا مابعد جدیدیت کے طرف داروں کی کوئی خود ساختہ فہرست تیار کی گئی ہے اور اس میں اپنے اطمینان کے لیے ایسے ناموں کو بھی شامل کر لیا گیا جو براہ راست جدیدیت سے تعلق رکھتے ہیں؟ اس کی طرف بھی اشارہ مذکورہ جدید شاعر نے اپنے اسی مضمون میں کیا ہے۔

تتمہ کلام

☆ اردو ادب میں جدیدیت اپنے تمام تصورات و تجربات کے ساتھ جاری ہے اور مابعد جدیدیت کے نام سے کھڑے کیے جانے والے سیاسی ہنگامے خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ جدیدیت زندہ ہے۔

☆ تازہ کار نسل کے ذریعے لکھے جانے والے ادب کو مابعد جدیدیت پسند ناقدین اکثر جدید تر کے نام سے بھی پکارتے ہیں یعنی یہ جدیدیت کا اگلا قدم یا اس کا ایکسٹنشن ہے۔

☆ مابعد جدید غزل 'کی روانی جس معنوی تفہیم کے شوربے میں ڈبونے کی بات کی جارہی ہے وہ بھی باستثنائے چند جدید غزل کا ہی اثاثہ ہے۔

☆ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ جدید تریا مابعد جدید غزل کو کائنات کو روحانی حوالوں سے دیکھنا چاہتا ہے تو یہ بھی دراصل جدید غزل کو کا طرہ امتیاز ہے۔ یہ آج کی کوئی نئی بات نہیں۔

☆ داخلی وابستگی، ذہنی وابستگی، ہجرت، شخصی اظہار میں پوشیدہ معاشرتی کرب یہ سارے
آزمودہ راستے ہیں جن سے جدیدیت پہلے ہی گزر چکی ہے یعنی مابعد جدیدیت کے نام سے
انگیز کرنے کے لیے کچھ بچتا ہی نہیں ہے۔
☆ تمام الفاظ اپنی تمام ترجہات کے ساتھ جدید شاعری اور ادب میں استعمال ہو چکے ہیں
اس لیے جو بھی نئی تخلیقات ہوں گی ان کا حوالہ جدیدیت ہی ہے۔
☆ تاریخی حقیقت دراصل یہ ہے کہ جدیدیت کے اسالیب اور ترقی پسندی کے افکار
(شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر) باہم آمیز ہو کر آج بھی نئے جہان معنی کی تلاش میں
سرگرداں ہیں۔ ایسے میں مابعد جدیدیت کا 'کنفیوژن' صرف گمراہ کن ہے اور بس۔

انیس احمد چشتی
۱۹۷، گنج پیٹھ، پونہ ۴۲

گھر: بچوں کا قاتل یا مسیحا؟

[انیس چشتی صاحب کا شمار جدید ماہرین تعلیم اور مصنفین میں ہوتا ہے۔ حکومت مہاراشٹر کی متعدد اعلا سطحی تعلیمی کمیٹیوں میں آپ کام کر چکے ہیں۔ کئی کتابوں اور مضامین کے مصنف ہیں۔ ان دنوں مرکزی حکومت نے آپ کو دفاعی افواج اور آئی اے ایس افسران کی تربیت کے لیے نامزد کیا ہے۔ جہاں آپ اسلامیات اور اقدار و اخلاقیات سے متعلق درس دیتے ہیں۔ عالم انسانی کے تازہ ترین رُخ پر آپ کی نظر ہے۔ ذیل کا مضمون اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔]

گھر بچوں کا قاتل بھی ہے اور مسیحا بھی۔ اچھے تعلیمی عمل کے لیے اگر ہم کم سے کم لوازمات جوڑنا چاہیں تو اس کے لیے کسی لمبی چوڑی تقریر یا کسی مشکل فلسفے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی بلکہ صرف دو چیزوں پر دھیان دینے کی ضرورت ہوگی (۱) ماحول اور (۲) توجہ۔ سر دست ہم ماحول کا جائزہ لیں گے۔

تالاب میں کنول یہاں ماحول سے مُراد "تعلیمی ماحول" Educational Environment سے ہے۔ جب اسکول اور کالجوں کا رواج نہیں تھا اس زمانے میں اکثر ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوا کرتی تھی۔ مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی سے لے کر ابوالکلام آزاد تک اور محمد حسین آزاد سے لے کر خواجہ الطاف حسین حالی تک آپ کو گھر پر ہی پڑھتے ہوئے ملیں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ گھر بڑی حد تک تعلیمی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ اس جملے کو ذرا بدل کر اور مزید ذمہ دارانہ طور پر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ، "گھر ہی بڑی حد تک تعلیمی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔" اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ، "بچہ گھر کے تالاب میں ایک چنچل مچھلی نہیں بلکہ خوبصورت کنول ہے۔"

نغمے بیتاب ہیں ---اگر تعلیمی ضروریات کا تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اسے بھی کم از کم دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا (۱) تعلیمی عمل (۲) تعلیمی وسائل۔

یونیفارم، کتابیں، کاپیاں، عمارت، تختۂ سیاہ، انتظامیہ (Administration)، نقشہ سائنسی آلات اور لائبریری وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب تعلیمی وسائل ہیں اور اتفاق سے سب کے سب جامد ہیں۔ اگر انھیں استعمال میں نہ لایا جائے تو یہ بجائے خود کوئی تدریسی عمل انجام نہیں دے سکتے۔ گویا یہ سب نقارے اور چوب ہیں۔ ستار اور اس کے تار ہیں۔ کوئی نقارے پر چوب مارے اور ستار کے تاروں کو چھیڑے تو دیکھیے موسیقی کیسے جھنجھنا اٹھتی ہے۔

اس کے برعکس تعلیمی عمل (Educational Process) ایک غیر جامد اور غیر معروضی (Abstract) کیفیت اور عمل کا نام ہے۔ جو وسائل کی مُنڈیر پر بیٹھ کر ذہن کے کنویں میں جھانکتا ہے، تاکتا ہے، اترتا ہے، پیرتا ہے اور ذہن کو ذہن رسا اور فکر کو پرواز بخشتا ہے: اس کی ابتدا مالم یعلم (نہیں معلوم) سے ہوتی ہے اور انتہا علم بالقلم (قلم کے ذریعے لکھنا سکھادیا) پر ہے۔ یعنی تعلیمی وسائل اور تعلیمی عمل ایک سکّے کے دو رخ ہیں، لیکن تعلیمی عمل کی اہمیت بہر حال زیادہ ہے۔

بستے میں گھر: "گھر" اسی تعلیمی عمل کا سب سے اہم رکن ہے۔ "گھر" انسانی زندگی میں آنے والی ایک ناقابلِ فراموش حقیقت ہے۔ بچّہ ہوتا کہیں ہے لیکن اس کا گھر اس کے ساتھ ضرور رہتا ہے۔ بچّہ اسکول جاتے وقت اپنے گھر کو بھی ساتھ لے جاتا ہے۔ وہ چھٹی ہونے تک اسے سنبھال کر اپنے پاس رکھتا ہے اور گھنٹی بجتے ہیں اپنے آپ کو گھر کے حوالے کر دیتا ہے۔ البتہ اس کی خواہش رہتی ہے کہ "اسکول" کسی صورت میں اس کے ساتھ اس کے "گھر" نہ جانے پائے۔ کیونکہ تعلیم ایک غیر مسّرت بخش عمل ہے۔ جبکہ گھر ایک مسّرت زا تجربے کا نام ہے۔ اس لیے بعض تعلیمی مفکرین نے سوچا کہ "گھر کو اسکول بنادیا جائے اور اسکول کو گھر" لیکن ہمارے نزدیک یہ ایک بے ترتیب بلکہ بدترتیب عمل کا نام ہوگا۔ بہتر ہے اگر گھر کو اسکول نہیں بنا سکتے تو کم از کم گھر کو گھر رہنے دیا جائے۔ یہی زیادہ اچھا ہے کہ بچّہ اپنے گھر کو روزانہ اپنے بستے میں لپیٹ کر اسکول لے جایا کرے۔

چار سال چار ماہ چار دن: تعلیم کو اچھی طرح سمجھنے والا بچہ "ہونہار" کہلاتا ہے لیکن بچّے کو اچھی طرح سمجھنے والے ماں باپ "ہونہار ترین" افراد ہوتے ہیں۔ بزرگ کہتے ہیں کہ جب تک بچّہ چار سال، چار ماہ اور چار دن کا نہ ہو جائے اس کی بسم اللہ خوانی نہ کی جائے۔ یعنی اسے پڑھنے کے لیے نہ بٹھایا جائے۔ یعنی آج کے الفاظ میں اُسے تو نرسری میں بھرتی کروایا جائے اور نہ ہی باگی واڑی، مانٹیسری یا کے جی

(KG) میں --- آج کے ماں باپ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ بچہ جتنی جلدی اسکول جائے گا اتنی ہی جلدی ترقی کر سکے گا لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس کے نازک دماغ اور غیر پختہ ذہن پر اسکول کا نام ہتھوڑے چلاتا ہے۔ اسکول کیا ہے؟ "مُرادوں کے دنوں" سے جدائی کا نام ہے۔ ماں ماں ہے اور ٹیچر ٹیچر۔ اس نازک مرحلے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم اپنے گھر کو سمجھ لیں۔

ہر صبح نیا طور ---- بچہ اس دنیا میں نووارد ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نئی دنیا کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اُس کا ذہن "یہ فلاں ہے!" سے زیادہ "یہ کیا ہے؟" میں یقین رکھتا ہے۔ اسے ہر وقت تبدیلی (Change) چاہیے۔ تعلیم متنوع لیکن ایک مربوط عمل کا نام ہے۔ اس لیے اسکول میں یکسانیت (Monotony) کا پایا جانا لازمی ہے۔ ذہین بچے تو اس ماحول سے بہت جلد اکتا جاتے ہیں۔ جو اکتاتے نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا گھریلو ماحول اسکول سے پست ہے۔ پھر پڑھاکو بچے بھی نہیں اکتاتے۔ ضروری نہیں کہ پڑھاکو (Studious) بچے ذہین بھی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اوسط بچے کے متلون ذہن کو اسکول کی بہ نسبت گھر زیادہ بھاتا ہے کیونکہ گھر کا ماحول ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ وہ کبھی ایک رجحان (Attitude) پر قائم نہیں رہتا۔ ایک اوسط گھر کا یہ منظر دیکھیے۔

۱۔ چھوٹا بھائی شاخ سے رویا۔ ۲۔ تلے جانے والی شے کی مہک سارے گھر میں پھیل گئی ہے۔ ۳۔ قریب کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ ۴۔ کانچ کی پلیٹ چھنا کے سے ٹوٹی۔ ۵۔ دادی اماں بیمار ہیں۔ ۶۔ آج ملازمہ نہیں آئی۔ ۷۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ۸۔ بجلی فیل ہو گئی۔ ۹۔ ڈاکیے نے خط دیا۔ ۱۰۔ ابّو کام پر جا چکے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

دفعہ ۱۴۴ ان واقعات کا اسکول میں گزر نہیں۔ ان میں سے صرف ایک واقعے "ٹیلی فون کی گھنٹی بجی"۔ کا تجزیہ کریں گے۔

۱۔ امی ہاتھ کا کام چھوڑ کر ٹیلی فون اٹھانے دوڑی آئیں۔
۲۔ ٹیلی ویژن یا ریڈیو کی آواز دھیمی کی گئی۔
۳۔ بچوں کے شور پر قابو پایا گیا اور ان پر دفعہ ۱۴۴ نافذ کی گئی۔
۴۔ گفتگو کے آداب کا غیر شعوری طور پر Demonstration ہوا۔
۵۔ رشتے اور حسبِ مراتب کا لحاظ برتا گیا۔
۶۔ ضروری معلومات بہم پہنچائی گئیں۔
۷۔ بچے کو ٹیلی فون اٹھانے سے منع کیا گیا۔

۸۔ بات کرنے والا اگر بچے کا واقف کار تھا تو اس سے بھی بات کروائی گئی اور بچہ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں کسی اور دنیا میں پہنچ گیا۔
۹۔ بچے کے ذہن میں فاصلے (Distance) کا تصور جاگا۔
۱۰۔ بچے کے ذہن میں وقت کا شعور (Timesense) پیدا ہوا۔
۱۱۔ وسائل (Communication) کی دنیا سے واقفیت بڑھی۔
۱۲۔ بچے کے کھلونے اور ٹیلی فون میں فرق محسوس کیا گیا۔

تعلیمی مشرک

گھر کے ہر وقت بدلتے رہنے والے ماحول میں سے صرف ایک جز نے بچے کو اتنا کچھ دے دیا جس میں بیک وقت مہارت (Skill) صلاحیت Competancy اثر انگیزی اور اثر پذیری کا مربوط عمل ہے۔ یہی وہ مبارک لمحہ ہے جو پورے تعلیمی عمل کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور نقطۂ انجام بھی۔ چنانچہ بچے کو "ماحولی شرک" اور "تعلیمی کفر" سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ داخلے کے وقت صرف "اچھے اسکول کا انتخاب" اتنا ضروری نہیں جتنا "صحیح اسکول کا انتخاب" لازمی ہے۔ اگر موقع ہوتا تو میں ضرور قسم کھا کر کہتا کہ بچے کے لیے "صحیح اسکول کا انتخاب" -- "شادی کے لیے صحیح بر" کی تلاش سے زیادہ مشکل عمل ہے۔ جھونپڑپٹی کے چند بچے جب کانوینٹ اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور اچھے گھروں کے زیادہ بچے جب پست اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں تو اوّل الذکر جھونپڑپٹیوں کے غنڈے اور سماجی ناسور بن جاتے ہیں اور اچھے گھروں کے بچے کل کے بدچلن بالغ شہری بن کر سماج میں دندناتے پھرتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ بچے کو اسکول میں داخل کرنے سے پہلے کسی اچھے، سمجھ دار اور پڑھے لکھے شخص سے مشورہ ضرور کرلیں چاہے آپ اپنے خاندان کا "تعلیمی مشیر" نہیں تو "تعلیمی پیر" ہی کیوں نہ تسلیم کرلیں۔ ایک اور بات یہ کہ ضروری نہیں کہ وہی اسکول اچھا ہے جس کا ssc کا رزلٹ (نتیجہ) اچھا ہو۔ کیونکہ اچھی تربیت صرف تعلیم کا نام نہیں۔

پروفیسر شکیل اختر فاروقی
فیکلٹی تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ

۱۹۴۷ء کا جشنِ آزادی۔ جامعہ کے تعلق سے چند یادیں

محمد یوسف صاحب جامعی (ایڈیٹر، شاہراہ) اور عبداللطیف اعظمی صاحب کی کوششوں سے جب انجمن طلبائے قدیم کا ازسر نو احیاء ہوا تو میں بھی اس کے سرگرم ممبروں میں سے تھا۔ لطیف اعظمی صاحب ناظم بنے۔ ان کے بعد سید مجاہد حسین زیدی صاحب نے یہ ذمہ داری سنبھالی، انھوں نے نظامت سے دامن چھڑایا تو لوگوں نے یہ کام اس خاکسار کے سپرد کر دیا۔ پھر نہ جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھا۔ کافی عرصے کے بعد خبر آئی کہ آج کل "جلال[1] بھی ہے، جمال[2] بھی ہے یہ انجمن کا کمال کہیے "اب تو ممبر بن جاؤ" پر طبیعت ادھر نہ آئی۔ غرض اب تک اس سعادت سے محروم ہوں۔ آج ایک عرصے بعد حاضر ہوں اپنی کچھ پرانی یادوں کے ساتھ۔

چند ایسے بھی موضوعات ہوتے ہیں کہ ذرا سی تحریک پر قلم خود بخود حرکت میں آجاتا ہے۔ یہ موضوع بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ مجھ سے جب فرمائش کی گئی کہ میں جامعہ کے تعلق سے یوم آزادی ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کی کچھ یادیں تحریر کروں تو میں نے فوراً حامی بھر لی اور پھر اسی وقت ذہن کے پردے پر یادوں کی پرچھائیاں ابھرنے لگیں۔ لکھنے کا وقت کم تھا پھر بھی کچھ باتیں قلم برداشتہ قلم بند کر لایا ہوں۔ اس کا یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ ہے آنکھوں دیکھی ہے سنی سنائی بالکل نہیں۔

میرے خیال میں ملک کی آزادی اور فرقہ وارانہ فسادات کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اسی لیے ان یادوں میں آزادی اور فسادات دونوں سے متعلق

---

[1] جلال الدین۔ موجودہ صدر انجمن طلبائے قدیم

[2] پروفیسر جمال الدین۔ موجودہ ناظم انجمن طلبائے قدیم

باتیں شامل ہیں۔

تو بات کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے کہ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء سے قبل آزادی کے لیے نعرے لگانے والوں میں میں بھی پیش پیش تھا۔ اپنے گھر میں اکثر قومی رہنماؤں کا ذکر سنتا رہتا تھا کیوں کہ میرے والد جناب اختر حسن فاروقی صاحب نے تحریک ترک موالات میں حصہ لیا تھا وہ گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے ہمراہ جیل بھی گئے تھے۔ والد صاحب آرٹسٹ تھے' قومی رہنماؤں کی تصویریں بنانا اور جمع کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ شاید اسی لیے میں جامعہ کی سلور جوبلی کے خاص اجلاس میں تشریف لائے مولانا ابوالکلام آزاد کی کار کے پیچھے بھی گنتی کے چند لوگوں کے ساتھ دوڑا تھا۔ اس دن میں نے بہت قریب سے اس رہنما کو دیکھا تھا جس کو اب تک محض تصویروں میں دیکھ پایا تھا۔ میں اپنے جذبات سے ایسا مغلوب ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے 'ابوالکلام آزاد زندہ باد' کا نعرہ لگا دیا' اسی وقت دوسرے راستے پر محمد علی جناح کی کار کے پیچھے ایک جم غفیر تھا' ایسے میں ابوالکلام آزاد زندہ باد کا نعرہ' محمد علی جناح زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں میں دب کر رہ گیا۔ یہ رہنما جوبلی کے اس خاص اجلاس سے لوٹ رہے تھے جس میں ذاکر صاحب کی معرکتہ الاراء تقریر ہوئی تھی۔ چھپتے چھپاتے میں بھی اسٹیج کے ایک کونے تک جا پہنچا اور ذاکر صاحب کی تقریر بغور سننے لگا۔ اپنی تقریر کے آخر میں انھوں نے جب اپنے ساتھیوں اور ان کے بچوں کا ذکر کیا تو میں نے دیکھا کہ تمام اساتذہ و کارکنان جامعہ کے دل بھر آئے ہیں' اس وقت مجھے بھی اپنی آنکھوں کے گوشوں میں نمی کا احساس ہوا۔

جوبلی کے ہنگامے ختم ہوئے تو کچھ عرصے بعد جامعہ میں تعطیلات گرما شروع ہو گئیں' اس وقت تعطیلات گرما جولائی اور اگست میں ہوا کرتی تھیں۔ آزادی سے کئی سال قبل ۱۹۴۲ء میں ایسی ہی تعطیلات گرما نے میری والدہ کو مجھ سے چھین لیا تھا اس لیے میں اپنے نانا' نانی اور خالہ کی خواہش پر لکھنو چلا جاتا تھا۔ آزادی ملی تو میں جامعہ سے دور اپنے خالو صاحب کے ساتھ علی گڈھ کے ایک گانو میں چھٹیاں گذار رہا تھا۔ خالو صاحب محکمہ نہر میں اورسیر تھے۔ جھال سمیرا کے پاس جہاں ان کی پوسٹنگ تھی وہاں دو تین اور مسلمان بھی سرکاری ملازم تھے۔ یوم آزادی آیا' تو ہر گھر کی چھت پر لہرانے کے لیے قومی جھنڈا ملا۔ خالو صاحب نے میرے جذبہ حب الوطنی کو دیکھتے ہوئے جھنڈا لہرانے کا کام مجھ سے کرلیا۔ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق جھنڈا چھت پر نصب کر دیا۔ لوگوں کی نظریں جب جھنڈے پر پڑیں تو دوڑے دوڑے خالو صاحب کے پاس آئے اور انھیں بتایا کہ جھنڈے کا

سبز رنگ اوپر اور نارنجی رنگ نیچے ہو گیا ہے۔ بات تھی تو قابل گرفت مگر کسی طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اب جو واقعہ سنانا چاہتا ہوں اس کا تعلق اگر چہ جامعہ سے نہیں ہے مگر ہے بڑا دل دہلا دینے والا۔ محکمہ نہر کے نزدیک ایک پاور ہاؤس تھا اس کے ایک مسلمان انسپکٹر انسپکشن کے لیے کہیں گئے ہوئے تھے۔ ان کے ہمراہ ایک ہندو چپراسی بھی تھا۔ اچانک ایک ٹرک آکر رکا جس میں کچھ مسلح لوگ سوار تھے انھوں نے جو داڑھی والا مسلمان دیکھا تو ٹرک سے اتر آئے اور انسپکٹر کو شہید کر دیا۔ ہندو چپراسی کو بنا تراشیدہ' دیکھ کر اسے تو چھوڑ دیا اور فرار ہو گئے۔ وہ بے چارہ ہندو چپراسی ڈرا سہا بھاگا گھر پہنچا اور اس حادثے کی اطلاع دی۔ ٹرک روکنے کی کوشش بھی ہوئی مگر بے کار۔ ایک کہرام مچ گیا۔ پورے علاقے میں اس واقعے سے دہشت پھیل گئی مگر وہاں کے مقیم ہندو اور مسلمانوں کا اتحاد نہ ٹوٹا۔ ادھر سارے ملک میں ہر طرف قتل و غارت گری کا ننگا ناچ ہو رہا تھا' میں نے بزرگوں کے ذریعے جو کچھ سنا تھا اس سے میں بھی خاصا پریشان اور سہا ہوا تھا۔ لہٰذا میں نے والد صاحب کو خط لکھا کہ 'مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ آپ کے پاس پہنچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہے، خالو صاحب بھی پاکستان جانے کی باتیں کر رہے ہیں۔" ان کا جواب آیا کہ میں کسی طرح مسلم یونیورسٹی میں ٹونکی صاحب کے پاس پہنچ جاؤں وہاں سے کوئی نہ کوئی دہلی پہنچا دے گا۔ میں ٹونکی صاحب کے پاس تو نہیں جا سکا لیکن اپنے نانا' نانی کے ساتھ لکھنؤ پہنچ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب والد صاحب دہلی اور جامعہ کے دوسرے رفقاء کے ساتھ غالباً مولانا آزاد کی بلائی ہوئی انڈین مسلم نیشنل کانفرنس میں شرکت کے لیے لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ واپسی پر میں بھی ان کے ساتھ دہلی چلا آیا۔ ریلوے کے ایک مخصوص مسلم کمپارٹمنٹ میں سوار ہو کر ہم فوجی پہرے کے ساتھ دہلی پہنچے۔ جامعہ آئے تو مدرسہ ابتدائی کے مرکزی گنبد پر چند مسلح فوجی جوان جامعہ کی حفاظت کے لیے تعینات تھے۔ جامعہ کا ماحول اس وقت بڑا کشیدہ نظر آیا۔ کچھ لوگ پاکستان جا چکے تھے' کچھ جانے والے تھے اور باقی ماندہ خوف زدہ اور پریشان۔ طالب علموں کی تعداد بہت کم تھی' بس چند طلبہ خطرات سے بچتے بچاتے جامعہ آگئے تھے۔ جامعہ والوں اور جامعہ کی خیر و عافیت دریافت کرنے ایک بار گاندھی جی کا تشریف لانا بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

جامعہ کے اساتذہ دن میں درس و تدریس کا کام کرتے اور رات میں سینئر طلبہ کے ساتھ پہرہ دیا کرتے تھے۔ جامعہ کالج کے پرنسپل ای ' جے کیلاٹ صاحب کے پاس جامعہ کی تمام بندوقیں جمع کر دی گئی تھیں ' پہرے کا سارا انتظام انھیں کے سپرد تھا۔ مدرسہ

جامعہ کے نگران جناب ڈاکٹر حبیب صاحب نے بھی ان حلقے میں بڑی بہادری اور مستعدی کا ثبوت دیا تھا۔

میں جب بورڈنگ نمبر ا کے اتالیق کے کوارٹر میں پہنچا جس میں ہم لوگوں کی رہائش تھی تو میں نے دیکھا کہ الماری کے ایک خانے میں کاغذ سے لپٹے کچھ سکے رکھے ہیں۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا' دولت مندی کے تصور سے گردن اکڑ گئی' اپنے اوپر قابو رکھنا مشکل ہو گیا جلدی جلدی کاغذ کی تہیں کھولیں تو اندر سے جشن آزادی کے موقع پر تقسیم کرنے کے لیے بہت سارے تانبے کے تمغے بر آمد ہوئے کنگال سے دولت مند اور پھر دولت مند سے کنگال بن جانے کا سفر کتنی جلدی طے ہو گیا۔

آزادی ملتے ہی فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ خدمت خلق کے لیے نکل پڑے۔ پرانے قلعے اور ہمایوں کے مقبرے کے رفیوجی کیمپ میں لوگوں کی مدد کرنے اور ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنے میں دوسرے سماجی اور رفاہی کام کرنے والوں کے ساتھ جامعہ والے بھی شریک ہو گئے۔ جانے والے چلے گئے اور جن کو رکنا تھا وہ رک گئے۔ پرانے قلعے اور کالکاجی سے کچھ غیر مسلم طلبہ کو جامعہ والے جامعہ لے آئے اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ ان طلبہ کو کالکاجی سے لانے کے لیے روز صبح صبح جامعہ لاری جاتی تھی۔ یہ کام لاری کے ڈرائیور نورالدین صاحب بڑی پابندی سے کیا کرتے تھے۔ چند روز میں یہ غیر مسلم طلبہ جامعہ کے دوسرے طالب علموں کے ساتھ شیر و شکر ہو گئے۔ ایک سکھ طالب علم تارا سنگھ کو میں اب تک فراموش نہیں کر سکا ہوں' جس نے اس کے باوجود کہ جناح صاحب بانی پاکستان تھے ان کی تصویر بنائی تھی۔ فسادات میں ترلوک سنگھ اپنا ایک ہاتھ گنوا آئے تھے مگر ہمیں کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ ان کے دل میں بدلے کی کوئی بھاونا ہے۔ بلکہ وہ شکر گزار تھے کہ جامعہ جیسے مسلم ادارے میں ان کی تعلیم ہو رہی ہے۔ جتندر کمار آنند تو ہمارے گھر کے ایک فرد تھے۔ مسلمان طلبہ جس وقت نماز پڑھتے اس وقت ادھر ادھر گھومنا جتندر کمار کا معمول تھا۔ والد صاحب نے اس وقت انھیں پوجا کرنے کی تلقین کی۔ اب ہمارے گھر کے ایک کونے میں جانماز رہتی تو دوسرے گوشے میں جتندر کمار کے لیے پوجا کی سامگری بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ ایک اور طالب علم تھے پتمبر دت شرما۔ انکے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ مسلمان طالب علموں کے ساتھ نماز میں شریک ہو جاتے۔ انھیں بھی والد صاحب نے سمجھایا کہ وہ ایسا نہ کریں دیکھنے والے نہ جانے اس کا کیا مطلب نکالیں۔ ست پال اور ریش پال بھی ہمارے اچھے دوست تھے۔ پریم

[illegible] بھی جامعہ سے منتظر ہو کے [illegible] ان کے پاس سردیوں میں اوڑھنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ ذاکر صاحب کو کسی نے تحفے میں ایک کمبل دیا تھا انھوں نے وہ کمبل ہم پرکاش کو دے دیا۔ اب ہم آپ کو کیا بتائیں کہ سردی سے بچنے کے لیے اس وقت ہمارے پاس بھی کوئی گت کی چیز نہ تھی۔

ملک کی آزادی کے ساتھ جڑی ہوئی تھی گاندھی جی کی شہادت۔ اس سانحے سے جامعہ میں لوگ بہت افسردہ تھے اور کچھ لوگ خوف زدہ بھی تھے۔ افسردہ اس لیے کہ اکثر لوگوں نے گاندھی جی کی رہنمائی میں آزادی کی لڑائی لڑی تھی اور ان کے ساتھ کام کیا تھا یا جیل کی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ خوف زدہ اس لیے کہ اس قتل میں اگر کسی مسلمان کا ہاتھ ہوا تو ہندوستانی مسلمانوں کو ترک وطن کے لیے مجبور کر دیا جائے گا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا تھا۔

'قتل گاندھی اصل میں تھا قتلِ عام　　　وہ تو یہ کہیے کہ قاتل مل گیا'

گاندھی جی کی تعزیت میں ایک جلسہ طلبائے قدیم کی عمارت میں جو اس وقت جامعہ کالج کے پاس تھی منعقد ہوا۔ ذاکر صاحب کی تقریر سن کر لوگوں کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ کم عمری کے باوجود میں بھی اپنے آپ کو نہ سنبھال سکا۔

جامعہ نگر دہلی شہر سے دور بسایا گیا تھا۔ یہاں تک پہنچنے کا واحد ذریعہ 18 نمبر بس تھی۔ جو خلاف معمول اگر پابندی سے چلتی تو بھی اسٹیشن سے آتے آتے ایک گھنٹہ لے لیتی۔ فسادات میں بس پر آنا جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ جس کے سبب جامعہ میں کھانے کی قلت ہو گئی۔ لہٰذہ مطبخ سے ملنے والے سالن، دال، روٹی میں تخفیف کر دی گئی۔ روٹی کے لیے آٹا مفقود ہو گیا۔ اس وقت ماسٹر عبدالحیٔ صاحب ناظم مطبخ تھے۔ ان کو یہ احساس کہ جامعہ والوں کا پیٹ بھرنا ان کا فرض ہے لہٰذا آٹے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ جمنا پار سے کچھ انتظام ہو سکا تو خود آٹے کی بوری اپنی پیٹھ پر لاد کر جامعہ لائے اور یوں جامعہ کے طالب علموں اور دوسرے کارکنوں کے کھانے کا انتظام ہو پایا۔

یہ تھیں وہ چند تلخ و شیریں یادیں جو ذہن کے کسی گوشے میں دفن رہتیں اگر ان کے لکھنے کی تحریک نہ ملتی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ وقت گزر جاتا ہے اور وقت کی سب سے بڑی خوبی بھی یہی ہے کہ وہ گزر جاتا ہے۔ مگر گزرے ہوئے وقت کی صرف چند یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ حال اور مستقبل دونوں کا انجام ماضی ہے۔ بس ماضی ہی ایک حقیقت ہے۔ شاید اسی لیے ماضی کی یادوں سے تسکین حاصل ہوتی ہے۔

"بڑی ٹھنڈک ہے ماضی کی حسین یادوں کے سایے میں"

عبد القوی دسنوی
(۲۔ پرنس کالونی۔ عیدگاہ ہلز۔ بھوپال۔۱)

جنگ آزادی میں اُردو شاعری کا حصہ

مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ اردو زبان سے تمھیں اس قدر لگاؤ کیوں ہے؟ تو میں یہی کہوں گا کہ یہ میری مادری زبان ہے، اور اگر کوئی یہ پوچھے کہ اسے اس قدر پسند کیوں کرتے ہو، تو کہوں گا کہ یہ محبت کی زبان ہے، میل ملاپ کی زبان ہے۔

لیکن کوئی مجھ سے پوچھے کہ اردو کے دشمن اگر اسے مٹانے میں کامیاب ہوگئے تو کس کا نقصان ہوگا؟ تو میں نہایت بلند آواز سے کہوں گا کہ سب سے بڑا نقصان ہمارے وطن ہندستان کا ہوگا۔

اس لیے کہ

☆اردو اتفاق واتحاد کی زبان ہے
☆ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب کی محافظ ہے
☆قومی یکجہتی کی علمبردار ہے
☆ہندو مسلم، سکھ، عیسائی سب کی ترجمان ہے
☆یہ کشمیر سے کنیا کماری تک پورے ہندستان میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے
☆اس میں ہندستان کا ماضی بھی ہے حال بھی اور مستقبل کے خواب بھی ہیں
☆اس میں ہندستان کی روشن تاریخ بھی ہے اور اس کی موہنی تصویر بھی ہے
☆اس میں دور غلامی کے آنسو بھی ہیں، اضطراب بھی ہے انقلاب کی جھنکار بھی ہے۔
☆اس میں آزادی کے ترانے بھی سنائی دیتے ہیں، فتح ونصرت کے ڈنکے کی آواز بھی کھنکتی ہے اور جشن آزادی کے نغمے بھی گونجتے ہیں۔

یہ زبان اس لیے بھی عزیز ہے کہ یہ

☆ہندستانیوں کے درمیان اٹوٹ رشتہ کی علمبردار ہے۔
☆وطن کے لیے بے پناہ محبت پیدا کرنے کا ذریعہ بنی رہی ہے۔

اس نے امن و آشتی کے زمانے میں محبت کے گیت گائے ہیں، غلامی میں یہ حکمران کے خلاف آواز بلند کرتی رہی ہے، ہمیں دشمنوں کو للکارنے کی ادا سکھاتی رہی ہے اور خود غاصبوں اور حاکموں کے خلاف کبھی جنگجو سپاہی بن کر ابھری ہے اور کبھی نیزہ، کبھی تلوار اور کبھی توپ و تفنگ بن کر برسی ہے اور اس وقت تک برستی رہی ہے جب تک دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ نہ گئے ہیں۔

دراصل ہندستان کی جنگ آزادی کی کہانی طویل بھی ہے، تابناک بھی ہے اور بے مثال بھی ہے جسے اس زبان نے محفوظ کر لیا ہے اور جو اس کا قیمتی سرمایہ ہے۔

ہماری اس جنگ آزادی کی کہانی ———— وطن دوستی کے اس جذبے سے شروع ہوتی ہے جس کی طرف اردو کے ادیبوں نے ماضی میں اہل ہند کو متوجہ کیا تھا۔

انھوں نے اپنے رشحات قلم سے اپنی جائے پیدائش کی قدر و قیمت بتائی۔ اس کے پہاڑوں جنگلوں، میدانوں، دریاؤں سے والہانہ لگاؤ پیدا کیا، وطن کے بزرگوں کا احترام سکھایا وطن کے محلات، کھنڈرات کا قدرداں بنایا ہم وطنوں کے درمیان خلوص اور رواداری کا مضبوط رشتہ قائم کیا، وطن کی مختلف زبانوں اور تہذیبوں کے لیے دل میں جگہ پیدا کی اور آپس میں بھائی بھائی بن کر رہنے کا سلیقہ سکھایا۔

یہ بات درست ہے کہ ابتدا میں حب الوطنی کا جذبہ ہندستان گیر نہیں تھا بلکہ مقامی تھا لوگ اپنے شہروں اور آبادیوں سے محبت کا اظہار کرتے تھے، یہ اس دور کا تقاضا تھا عام طور سے ان کے لیے دلی یا لکھنؤ یا چند اور شہر میں سارا ہندستان تھا، اس لیے اس دور کے شعرا ان کی عظمت کا گیت گاتے ہوئے یا ان کی تباہی پر آنسو بہاتے ہوئے ملتے ہیں۔ میر نے دلی کا ماتم اس طرح کیا ہے:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو! ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

میر کے علاوہ سودا، غالب اور دوسرے شعرا بھی تباہی پر اپنے کلام میں اشکبار نظر آتے ہیں۔ لیکن حالی کے یہاں حب الوطنی کا یہ محدود جذبہ وسعت اختیار کرتا ہے، وہ اپنی نظم "حب وطن" کی ابتدا اس شعر سے کرتے ہیں:

اے وطن اے میری بہشت بریں کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

اور پہلے بند کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے:

تیری اک مشت خاک کے بدلے　　لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جبتک نہ ہو بدن سے جدا　　کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

دوسرے بند میں اتحاد اور اتفاق کا سبق اس طرح دیتے ہیں:

ہوں مسلمان اس میں یا ہندو　　بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو　　سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد　　شہر ہیں اتفاق سے آباد

اقبال "ہمالہ" کی عظمت کا گیت گاتے ہوئے آتے ہیں اور وطن کی محبت کا ایسا ترانہ سناتے ہیں کہ سارا ہندستان جھوم اٹھتا ہے۔ یہ ترانہ اثر و تاثیر کے لحاظ سے بے مثال ہے اس نے ہمارے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ تیز کرنے میں بڑی مدد کی ہے اس کے یہ اشعار سن کر آج بھی اہل ہند سر دھنتے نظر آتے ہیں ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں　　سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا　　ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندستاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری　　صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

یہ اشعار وطن دوستی کے ساتھ بے تعصبی اور اپنی عظمت کا زبردست احساس جگاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ملک کے اس وقت کے حالات سے اقبال مضطرب بھی نظر آتے ہیں اور اشک بار بھی دکھائی دیتے ہیں تصویرِ درد کے یہ اشعار کیا کچھ نہیں کہتے ؎

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو　　کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑا باغ میں گلچیں　　تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے　　عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں　　یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

یا　جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں　　غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا
یا　محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے　　کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

اور اس نظم کا یہ شعر ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!　　تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال کی طرح پنڈت برج نرائن چکبست بھی حب الوطنی کا نغمہ ایک خاص انداز

سے چھیڑتے ہیں ؎

یہ پیاری انجمن ہم کو مبارک یہ الفت کا چمن ہم کو مبارک
وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک
یہاں کی خاک ہم کو کیمیا ہے یہ سونے سے بھی قیمت میں سوا ہے
وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

اور اپنی نظم "خاک ہند" میں، اپنے اس خیال کا بھی اظہار کرتے ہیں:

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سوربیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

ادھر جوش ملیح آبادی نہایت جوش و خروش کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کے لیے فکر مند ہوتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں:

کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لانے کے لیے اک نیا سنگم بناؤں گا، زمانے کے لیے

اور حفیظ جالندھری نہایت فخر کے ساتھ کہتے ہیں:

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

تو آنند نرائن ملا یاد دلاتے ہیں:

کیسے آئے گا آج اس کا یقیں
اشوک اور اکبر کی ہے سرزمیں
ترے در پہ گھستی تھی دنیا جبیں
کبھی تو ہی تھی سجدہ گاہِ زمن
زمین وطن! اے زمین وطن!!
(زمین وطن)

علی سردار جعفری "ہندستان" میں وطن کا تعارف یوں کراتے ہیں:

یہ ہندوستان رشک خلد بریں اگلتی ہے سونا وطن کی زمیں
کہیں کوئلے اور لوہے کی کان کہیں سرخ پتھر کی اونچی چٹان
کہیں سنگ مرمر کے شفاف سل پھسلتا ہے جس کی صفائی پہ دل
بہت سے عزیز ہیں اس خاک میں ہزاروں دفینے ہیں اس خاک میں

حب الوطنی کے جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری میں معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالی جاتی رہی ہے البتہ ابتدا میں سیاسی حالات اشاروں میں ملتے ہیں۔

راجہ رام نرائن موزوں کا شعر جو انھوں نے سراج الدولہ کی وفات پر کہا تھا اس کی ایک اہم مثال ہے:

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اور شاہ مبارک کا یہ شعر اپنے دور کے امراء کی حالت زار کا تعارف کراتا ہے:

زبانی ہے شجاعت ان سبھوں کی
امیر اس جگ کے ہیں سب شیر قالین

میر تقی میر کے اس شعر سے بھی اُس دور کے معاشی حالات پر روشنی پڑتی ہے:

نہ بیٹھ اب امیروں کی صحبت میں میر
ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

دلی کے ساتھ اودھ کی تباہی بھی کم دردناک نہ تھی، سعادت علی خاں نے انگریزوں سے مل کر جو نقصان پہنچایا تھا اس کے خلاف جرأت نے جرأت مندی سے کام لیتے ہوئے کہا تھا:

سمجھیں نہ امیر ان کو اہل توقیر
انگریزوں کے ہاتھ سے قفس میں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں وہی منہ سے بولیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اُردو شاعروں اور نثر نگاروں نے جہاں وطن کی تباہی کا ماتم کیا، وقت کے حالات اور تقاضے سے آگاہ کیا وہیں ذمہ داریوں کی طرف بھی مختلف انداز سے متوجہ کیا، حب الوطنی کے جذبات میں مختلف انداز سے شدت پیدا کرنے کی کوشش کی، وطن کی غلامی اور اس کے برے نتائج سے باخبر کرنے کی سعی کی، اس کے خلاف نعرے بھی لگائے، اتحاد کی اہمیت بھی بتائی اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے آمادہ بھی کیا۔ ان میں حالی نے مغربی اثرات کے خلاف آواز اس طرح بلند کی:

دوستو، شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب
آرہی ہے روشنی مغرب سے اٹھتی اک لہر
روترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیروزبر
دستکاری کو مثاتی صنعتوں کو روندتی
علم وحکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر

مولانا شبلی نے "شہر آشوب اسلام" لکھا اور لکھنؤ کے ایک جلسہ میں پڑھا تو سماں ایسا بندھ گیا کہ خود بھی روئے اور ساری محفل کو رلایا۔

مولانا محمد علی بھی غلامی پر ہمیشہ غم زدہ رہے اور اس کے خلاف ہندستانیوں کو بیدار کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح اس کے لیے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

اور یہ انداز بھی اختیار کرتے ہیں:

یہ بھی کیا پیروی حق ہے کہ خاموش ہیں سب
ہاں اناالحق بھی ہو، منصور بھی ہو، دار بھی ہو

ادھر اکبر الہ بادی نے "دربار دہلی" کا جلوہ کچھ اس طرح دکھلایا کہ لوگ مضطرب ہوگئے؛ انھوں نے بتایا:

اوج برٹش راج کا دیکھا پرتو تخت [illegible]ج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا رخ کرزن مہراج کا دیکھا

اور

پہنچے پھاند کے سات سمندر تخت میں ان کے بیسیوں بندر
حکمت ودانش ان کے اندر اپنی جگہ، ہر ایک سکندر

اور ایک "قطعہ" میں اتحاد واتفاق پر اس طرح زور دیا ہے:

محرم اور دسہرہ ساتھ ہوگا نباہ اس کا ہمارے ہاتھ ہوگا
خدا ہی کی طرف سے ہے یہ سنجوگ تو کیوں رکھیں نہ باہم صلح ہم لوگ

پھر اقبال شاعر مشرق بن کر اٹھے، انھوں نے نئے دور کی آمد آمد کی طرف اشارہ کچھ اس انداز سے کیا کہ ہندستانی متوجہ بھی ہوئے اور مضطرب بھی ہوئے انھوں نے ایک خاص انداز سے مزدور کو آواز دی:

اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اور حسرت موہانی بھی مزدور کو خوشخبری دیتے ہوئے آواز بلند کرتے ہیں:

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی نہ حکّام کا جور بے جا رہے گا
زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں کسی کا نہ محنت پہ دعوا رہے گا

ادھر "شعاع فانوس ہند" کے تحت ظفر علی خاں نے کہا:

زندگی اُن کی ہے، دین ان کا ہے، دنیا ان کی ہے
جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہو گئیں

برج نرائن چکبست نے "آوازۂ قوم" میں ہوم رول کا ذکر اس طرح چھیڑا:

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار ہمالیہ سے اٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار ہوئی ہے خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے، زور ہوم رول کا ہے

جوش بھی اپنی پُر جوش نظموں سے ہندستانیوں کے دلوں کو گرماتے ہیں اور غلامی و آزادی کا فرق "ندائے آسمانی" میں اس طرح بتاتے ہیں:

سنو اے ساکنان خاک پستی ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیات جاوداں سے

اور غلامی کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں اور اپنی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" کو اس شعر پر ختم کرتے ہیں:

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سُرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی

جگن ناتھ آزاد اپنی نظم "سبھاش چندر بوس" میں یقین دلاتے ہیں:

میں تری کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لاؤں گا
اور ترے مرقد پہ نصرت یاب ہو کر آؤں گا

جب "تحریک خلافت" اور "ترک موالات" کی وجہ سے ہندستان کی سیاست میں بڑی گرمی آگئی تھی اور حریت پسندوں میں نیا جوش و خروش چل رہا تھا اس وقت اُردو کے شعرا بھی اپنے آپ کو نئے موڑ پر محسوس کر رہے تھے اور نہایت ہمت اور ولولہ کے ساتھ اہل ہند کو بیدار کرنے اور جنگ آزادی کے راستے پر چلنے اور آگے بڑھنے کے لیے

مستحکم کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے تھے۔
ظفر علی خاں نے "اعلان جنگ" کے ساتھ کہا:

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کردیا باطل سے حق کو دست و گریبان کردیا
ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونک کر آزادیٔ حیات کا سامان کردیا
دے کر وطن کو ترک موالات کا سبق ملت کی مشکلات کو آسان کردیا
شیخ اور برہمن میں بڑھایا وہ اتحاد گویا انھیں دو قالب یک جان کردیا
تن من کیا نثار خلافت کے نام پر سب کچھ خدا کے نام پر قربان کردیا

اور جوش ملیح آبادی کی نظم "شکست زنداں کا خواب" کے اشعار ہندستانیوں کو اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہے:

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آآ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

اور

کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

ادھر حسرت موہانی مضطرب ہو کر آواز بلند کرتے ہیں:

رسم جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے حب وطن مست خواب دیکھئے کب تک رہے
ہے تو کچھ اکھڑا ہوا بزم حریفاں کا رنگ اب یہ شراب و کباب دیکھئے کب تک رہے

اور اہل وطن کو اس طرح "دعوت عمل" دیتے ہیں:

اے کہ نجات ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمت سربلند سے یاس کا انسداد کر

اسی کے ساتھ خود غرض رہنماؤں سے ہشیار کرتے ہیں:

حق سے بہ عذر مصلحت وقت پہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر

۱۹۲۱ء کی خلافت کانفرنس میں جب علی برادران و دیگر [illegible] تقریروں کی بنا پر
دو سال کے لیے [illegible] گئیں [illegible]

انھیں دنوں یہ "صدائے خاتون" عوام کی زباں پر عرصہ تک رہی:

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا — کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا

اس کے آخری دو شعر تو غضب کے ہیں:

حشر میں حشر برپا کروں گی — پیش حق تم کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعوا کروں گی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

ادھر لالا لال چند فلک "بیداری ہند" کی اطلاع اس انداز سے دیتے ہیں:

مبارک ہند کی بیدار قسمت ہوتی جاتی ہے
نمایاں ہندیوں میں اب اخوت ہوتی جاتی ہے

اور احسان دانش "ترانہ جہاد" بلند کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مجاہدین صف شکن بڑھے چلو، بڑھے چلو

ساغر نظامی بھی بلند آواز میں کہتے ہیں:

گلشن ہندوستاں آزاد ہو — جنت برباد پھر آباد ہو

جوش ملیح آبادی نے "نظام نو" کی آمد کی اطلاع دیتے ہوئے اعلان کیا:

مسکرانے کے لیے بے چین ہے صبح وطن

حامد اللہ افسر بھی "طلوع خورشید" کے منتظر ہوئے تو یہ کہے بغیر نہ رہ سکے:

عہد گل آنے کو ہے پھولوں کی بارش کے لیے
ختم دور برق و باروو و شرر ہونے کو ہے

شورش کاشمیری ذرا صبر کی تلقین کرتے ہوئے آگاہ کرتے ہیں:

اک نئے دور کی ترتیب کے ساماں ہوں گے
دست جمہور میں شاہوں کے گریباں ہوں گے

مجاز "انقلاب" کی آمد کی خبر اس انداز سے دیتے ہیں:

آرہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے

اور فیض احمد فیض یقین کے ساتھ کہتے ہیں:

لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

سول نافرمانی، نیا قانون اور اگست ۱۹۴۲ء کی بغاوت سے اُردو شاعری بہت زیادہ

متاثر نظر آتی ہے۔ تلوک چند محروم "ہندی نوجوانوں سے" مخاطب ہوئے، آنند نرائن ملا نے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگایا، ساغر نظامی نے اپنے "عہد" کا اعلان کیا، مخدوم محی الدین نے "آزادی وطن" کا نغمہ بیداری" کے ساتھ جنگ آزادی میں شریک ہوئیں، جوش ملیح آبادی نے فرنگیوں کے خلاف گرجتے ہوئے کہا:

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

اور مجاز "بدیسی مہمان" یعنی فرنگیوں کو بھاگنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ کیفی اعظمی "آخری مرحلہ" میں ہندستان کے بہادر سپاہیوں سے ملاتے ہیں۔

اور آزادی کی صبح میں اقبال سہیل "نغمہ بے تاب" سناتے ہیں اور "مبارکباد آزادی" پیش کرتے ہوئے، بہ آواز بلند کہتے ہیں:

آزاد ہوا، عہد غلامی سے وطن آج

ابتک میں نے جنگ آزادی کے سلسلے میں اُردو کی خدمات پر جس قدر روشنی ڈالی ہے بہت سرسری ہے اور "مشتے از خروارے" ہے۔ اگر ہندستان کی جنگ آزادی کی کہانی صرف اُردو شاعری کی زبانی قلمبند کی جائے تو سینکڑوں صفحات پر مشتمل کتاب تیار ہو جائے گی۔ اسی طرح جنگ آزادی میں اُردو کے صحافیوں نے جو حق ادا کیا ہے اور اُردو نثر کی دوسری اصناف کے ذریعہ ہندستان کی آزادی کے لیے، ہندستانیوں کے درمیان اتحاد واتفاق کے لیے، ہندستان کی تعمیر اور ترقی کے لیے جو خدمات انجام دی گئی ہیں انھیں بھی اگر یکجا کیا جائے تو دوسری سیکڑوں صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی، میرا ذاتی خیال ہے کہ ہندستان کی دوسری کوئی زبان اتنا بڑا اور اہم ذخیرہ پیش نہیں کر سکتی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کام کو اردو کی انجمنیں یا اکیڈمیاں تکمیل کو پہنچاتیں یا حکومت کی توجہ سے یہ کام بحسن وخوبی انجام پاتا، لیکن جہاں انجمنیں اور اکیڈمیاں اُردو کی اصل ضروریات کی طرف عام طور سے متوجہ نہیں رہی ہیں وہاں حکومت بھی اس کے حقوق کو پورا کرنے میں ناکام رہی ہے اسی لیے جہاں اُردو، انجمنوں اور اکادمیوں سے یہ شکایت کرتی ہوئی ملتی ہے:

سب میرے چاہنے والے ہیں مرا کوئی نہیں

وہاں حکومت کو عاصم شہنواز شبلی کی زبان میں اپنا دکھڑا سناتی رہتی ہے:

میں وطن میں بھی ہوں بے وطن کی طرح
یہ ہے ہندوستاں یا خدا یا خدا

مجتبیٰ حسین
۲۰۰ انکور اپارٹمنٹس
پٹ پڑ گنج دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

جگن ناتھ آزاد کا اعمال نامہ

ماہر اقبالیات، شاعر، نقاد، محقق، دانشور، مقرر اور استاد کی حیثیت سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد وہاں وہاں بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں جہاں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ وہ ہمارے بزرگ اور کرم فرما ہیں بلکہ زندگی میں پہلی بار ہم نے جس شاعر کو اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ دیکھا وہ جگن ناتھ آزاد ہی تھے۔ ان کے علمی اور ادبی کارناموں کا احاطہ کرنا ہمارے بس کی بات تو کجا شاید خود ان کے بس کی بات بھی نہ ہو۔ پچھلے دنوں ہمیں ایک انگریزی کتاب ملی ہے جس کا عنوان ہے A JAGAN NATH AZAD CHRONOLOGY اپنے قارئین کی سہولت کے لیے ہم نے اس کا آسان اُردو ترجمہ "جگن ناتھ آزاد کا اعمال نامہ" کیا ہے۔ ان کا یہ اعمال نامہ بھی ان کی تصانیف کی طرح خاصا ضخیم ہے۔ اس میں جگن ناتھ آزاد کی پیدائش (5/ڈسمبر 1918) سے لے کر آج تک ان کے علمی اور ادبی کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ بخدا ہم نے بھی ابھی حال ہی میں محض اس خیال سے کہ اب ہم اپنی تاریخ پیدائش سے کافی دور نکل آئے ہیں اور تاریخ وفات کی آمد آمد ہے اپنا اعمال نامہ مرتب کیا ہے۔ یقین مانیے دو ہی صفحوں کے بعد ہمارے اعمال نامہ کی سانس اکھڑ گئی بلکہ ایک دوست نے دو صفحات پر مشتمل اس اعمال نامہ کو بھی طویل قرار دیتے ہوئے یہاں تک کہا کہ "میاں تم صرف اپنی تاریخ پیدائش لکھ دیتے تو کافی تھا۔ تاریخ وفات تو ہم بعد میں بڑھالیں گے (وہ بھی اس لیے کہ اس وقت تم موجود نہ ہوگے)۔ تاریخ پیدائش سے لے کر آج تک تم نے جو کچھ کیا ہے اور تاریخ وفات تک جو کچھ کرو گے وہ ایسا کام تو

ہے کہ ان کے ذکر سے آنے والے زمانہ کے سینہ پر مونگ دلنے کا کام کیا جائے"
بعض لوگ بزعم خود اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ آنے والا مورخ پیدا ہی اس لیے ہوگا کہ وہ ان کے کارناموں کا جائزہ لے سکے۔ ہم اپنا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں کرتے ہیں، مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے کارناموں کے حوالہ سے آنے والی تاریخ کے لیے ایک اثاثہ بن جاتے ہیں اور ان کا ذکر آنے والے وقت کو چیرتا ہوا آگے ہی آگے نکلتا چلا جاتا ہے۔ بلاشبہ جگن ناتھ آزاد کا شمار بھی ہمارے ادب کی ایسی ہی ہستیوں میں ہوتا ہے جو پیدا ہوتے ہی کچھ ایسے کام کرنے لگ جاتے ہیں کہ تاریخ انھیں ہمیشہ یاد رکھے۔ ماشاء اللہ جگن ناتھ آزاد کا اعمال نامہ پورے سو صفحوں پر مشتمل ہے اور اس کے مرتب ڈاکٹر اسد اللہ وانی ہیں (اسد اللہ وانی نے جس محنت، مشقت اور عرق ریزی کے ساتھ جگن ناتھ آزاد کا اعمال نامہ مرتب کیا ہے وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو خود ڈاکٹر اسد اللہ وانی کے شخصی اعمال نامہ کو بھاری بھرکم اور دقیع بناتا ہے) اس اعمال نامہ کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلا کہ جگن ناتھ آزاد کی ساٹھ سے زیادہ تصانیف اور تالیفات ہیں۔ انھیں جو اعزازات اور انعامات ملے ہیں ان کی تعداد 157 ہے۔ انھوں نے دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں جو توسیعی خطبات دیے ہیں ان کی تعداد 67 ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے مختلف اداروں اور سیمیناروں میں جو مقالات پڑھے ہیں ان کی تعداد 216 ہے۔ ہندوستان کے علاوہ انھوں نے بیرونی ممالک کے جن ریڈیو اسٹیشنوں اور ٹیلی ویژن مراکز پر اپنے متعدد پروگرام پیش کیے ہیں ان کی تعداد 32 بنتی ہے۔ مشاعروں میں تو وہ آئے دن شرکت کرتے رہتے ہیں اور ان کی تعداد یقیناً ہزاروں میں ہوگی لیکن پھر بھی جن اہم مشاعروں میں انھوں نے شرکت کی ہے ان کی تعداد صرف 115 بتائی گئی ہے (کفایت شعاری کی بھی ایک حد ہوتی ہے) جگن ناتھ آزاد نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ تو اپنی جگہ پر ہیں ہی لیکن ان کتابوں کی وجہ سے دوسروں کی جو مزید کتابیں وجود میں آئی ہیں یعنی خود جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور فن پر جو کتابیں لوگوں نے لکھی ہیں اور مختلف رسالوں نے جو خصوصی نمبر شائع کیے ہیں ان کی تعداد بھی ایک درجن سے زیادہ ہے۔ تفصیلات تو خیر اور بھی بہت سی ہیں۔ ہم نے اوپر جتنی باتیں لکھی ہیں وہ اس اعمال نامہ کی صرف موٹی موٹی باتیں ہیں اور خود ڈاکٹر اسد اللہ وانی نے بھی اس ضخیم اعمال نامہ میں صرف موٹی موٹی باتوں سے ہی مطلب رکھا ہے۔ اگر وہ مزید باریکیوں میں جاتے جس کے ہم عادی ہیں تو اس اعمال نامہ میں جگن ناتھ آزاد کے ان مداحوں اور عقیدت مندوں کی فہرست بھی شائع کی جا سکتی تھی جن کی تعداد

انعام مل جائے گی۔ انھیں مشاعروں میں بے پناہ داد کے علاوہ جو معاوضہ ملا ہوگا اس کا تخمینہ بھی پیش کیا جاسکتا تھا۔ جگن ناتھ آزاد نے اپنے احباب کو جو خطوط لکھے ہیں ان کی فہرست بھی مرتب کی جاسکتی تھی (خود ہمارے پاس جگن ناتھ آزاد کے سو سے زیادہ خطوط محفوظ ہیں) غرض اور بھی کئی باتیں ہیں جن کا ذکر اس اعمال نامہ میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اسد اللہ وانی کی کچھ مجبوریاں بھی رہی ہوں گی اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا جبھی تو وہ تفصیل میں نہیں گئے۔ تاہم ہمیں ایک شخصی شکایت یہ ہے کہ اس اعمال نامہ میں اس کل ہند مشاعرہ کا کوئی ذکر نہیں ہے جسے ہم نے 1952 میں گلبرگہ میں منعقد کیا تھا۔ ان دنوں ہم گلبرگہ کے انٹرمیڈیٹ کالج کی بزم اردو کے جنرل سکریٹری تھے اور اس مشاعرہ کی صدارت قبلہ جگن ناتھ آزاد نے ہی فرمائی تھی۔ گلبرگہ کی تاریخ کا بلکہ دیکھا جائے تو خود ہماری شخصی تاریخ کا یہ پہلا بڑا مشاعرہ تھا جس میں مجروح سلطان پوری' کیفی اعظمی' شاہد صدیقی' سلیمان اریب' لطیف ساجد اور عزیز قیسی وغیرہ نے شرکت کی تھی۔ ہم نے نہ صرف جگن ناتھ آزاد کو بلکہ اردو کے شاعروں کو بھی پہلے پہل وہیں دیکھا تھا۔ اس مشاعرہ کو ہم نے کتنی مشکلوں سے منعقد کیا تھا اس کا اندازہ اسد اللہ وانی کو تو خیر کیا ہوگا لیکن جگن ناتھ آزاد کو تو ہونا چاہئے تھا۔ پھر اس مشاعرہ کی صدارت بھی تو ہم نے ان سے کروائی تھی۔ اگرچہ اس زمانہ کے کلکٹر گلبرگہ اقبال چند اس مشاعرہ کے سرپرست تھے لیکن اس مشاعرہ کے اخراجات کی پابجائی کے لیے گلبرگہ کے اہل علم اور مخیر حضرات سے چندہ مانگنے کا کام تو ہم نے اور ہمارے ساتھیوں نے انجام دیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے کے ایس شفیق صاحب کی کتاب "یادوں کی رہ گزر" پڑھی تو اندازہ ہوا کہ ان دنوں وہ بھی گلبرگہ کے لیبر آفیسر کے عہدہ پر فائز تھے۔ یقیناً انھوں نے بھی چندوں کی وصولی میں ہماری مدد کی ہوگی اب ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ یوں بھی لیبر آفیسر چندوں کی وصولی کے معاملہ میں بڑے کار آمد ہوتے ہیں۔ اس یادگار مشاعرہ کے ذکر کو جگن ناتھ آزاد کے اعمال نامہ میں نہ پاکر ہمیں اس لیے بھی تکلیف ہوئی کہ ان کے عام اعمال نامہ کے ہمارے ذاتی اعمال پر گہرے اور دوررس اثرات مرتب ہوئے تھے کیونکہ اس مشاعرہ کے بعد ہی ہم نے نہ صرف چندہ مانگنے سے بلکہ احباب سے ادھار مانگنے سے بھی توبہ کرلی تھی۔ یہ اسی مشاعرہ کا فیض ہے کہ مالی مشکلات اور وسائل کی تنگی کے باوجود آج بھی ہم ایک باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔ دوسری طرف اس مشاعرہ کی وجہ سے ہمیں شعر و ادب کا ایسا چسکہ لگا کہ آج تک اس سے نجات نہ پاسکے۔ اس کے بعد کئی برسوں تک جگن ناتھ آزاد' مجروح سلطان پوری'

کیفی اعظمی اور سلیمان اریب وغیرہ کے شعر گنگنانا اور وہ بھی خاص طور پر غسل کرتے وقت گنگنانا ہمارا محبوب مشغلہ بن گیا۔

یوں جگن ناتھ آزاد سے ہمارا سمبندھ خاص پرانا ہے۔ پھر دہلی آنے کے بعد تو ان سے ایک طرح کے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ یہ ان کی بڑائی نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ چھوٹوں کو بھی اپنا دوست ہی سمجھتے ہیں' جب تک وہ سری نگر میں حکومت ہند کے ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر رہے یہ معمول سا بن گیا تھا کہ وہ جب بھی دہلی آتے (جو وہ اکثر آتے رہتے تھے) تو پہلے سے ہمیں اطلاع دے دیتے تھے کہ فلاں تاریخ کی شام تمھارے لیے خالی رکھی ہے۔ کشمیر گیسٹ ہاؤس پر چلے آنا۔ اگر ہم ان شاموں کی تفصیل ہی اختصار کے ساتھ جمع کر دیں تو ان کے اعمال نامہ میں مزید پچاس ساٹھ صفحات کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ آزاد صاحب ہم سے کم و بیش سولہ برس بڑے ہیں۔ شروع ہی سے وہ ہمیں عزیز رکھتے آئے ہیں۔ ان کی صحبت میں وقت کچھ ایسی تیزی سے گزر جاتا ہے کہ آدمی کو چٹکی بجانے کی مہلت بھی نہیں دیتا۔ انھوں نے دنیا کو ہر زاویہ سے دیکھا ہے۔ ادب کی کیسی کیسی عظیم ہستیوں سے ان کا سابقہ رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اب ہم جیسوں کی صحبت پر گزارہ کرنے پر مجبور ہیں۔ بلاشبہ انھیں اپنے اور اساتذہ کے لاکھوں اشعار یاد ہیں' کتنے ہی لطیفے ہیں جنھیں ہم نے آزاد صاحب کی زبان سے ہی سنا۔ وہ ہمارے ادب کی ایک ایسی متاع عزیز ہیں جس پر ہم سب کو فخر کرنا چاہیے۔ اقبالیات کے ماہر کی حیثیت سے ان کا ڈنکا چہار دانگ عالم میں بجتا ہے۔ یہ جگن ناتھ آزاد ہی ہیں جنھوں نے اپنی تحقیق کے ذریعہ ایسے حالات پیدا کیے کہ علامہ اقبال 9/نومبر 1877 کو اس دنیا میں پیدا ہو سکے ورنہ اس سے پہلے لوگوں نے علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش 22/فروری 1873 مقرر کر رکھی تھی۔ مانا کہ جگن ناتھ آزاد کی تحقیق سے علامہ اقبال کی عمر میں اچانک چار برسوں کی کمی واقع ہو گئی لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ جگن ناتھ آزاد نے بھلے ہی علامہ اقبال کا عرصۂ حیات تنگ کیا لیکن اس کمی کے باوجود ان کے شعری سرمایہ اور ان کی قدر و منزلت میں کوئی کمی واقع نہ ہونے دی۔ اقبال کے وہ سچے عاشق ہیں' تبھی تو ہر دم اپنی خودی کو اتنا بلند کیے رکھتے ہیں کہ ہم جیسوں کو ان سے گڑگڑا کر پوچھنا پڑتا ہے کہ آخر ان کی رضا کیا ہے۔ ان کی حس مزاح بھی نہایت تیز ہے' ایک بار ہم نے یونہی کہیں لکھ دیا کہ اگر علامہ اقبال "حکیم الامت" تھے تو ہوا کریں ہمیں کم از کم "نیم حکیم الامت" ہی تسلیم کر لیجیے۔ چنانچہ اب وہ ہمیں "نیم حکیم الامت" ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد اب ماشاء اللہ 80 برس کے ہونے جا رہے ہیں لیکن ہم

نے ان میں کام کرنے کی جو توانائی اور لگن دیکھی وہ خود ہم اپنے میں نہیں پاتے۔ وہ ہمارے ادب کا ایک ایسا قیمتی اثاثہ ہیں جس کی جی جان سے حفاظت کرنا ہم سب کا فرض ہے اور انھیں بجا طور پر اپنے کارناموں پر فخر کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ اس اعمال نامہ کو پڑھ کر ہمیں ان کے بارے میں کئی نئی معلومات بھی حاصل ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ وہ جب میانوال (پاکستان) میں چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے تو انھوں نے خوشی محمد ناظر کی طویل نظم "جوگی" زبانی سنائی تھی۔ اس سے متاثر ہو کر راولپنڈی کے انگریز انسپکٹر آف اسکولز مسٹر ولسن نے انھیں ایک روپیہ بطور انعام دیا تھا (گویا بچپن ہی سے انھیں اعزازات حاصل کرنے کا شوق رہا ہے) پھر اس کے دو سال بعد جب وہ نو برس کے تھے تو انھوں نے ایک مشاعرہ میں اپنے والد محترم تلوک چند محروم کی نظم "ہندو مسلمان" سنائی تھی۔ اس نظم کو موثر ڈھنگ سے پیش کرنے پر انھیں جو انعام ملا تھا ویسا انعام آج تک کسی اور شاعر کو نہیں ملا۔ اعمال نامہ کے مطابق انھیں ایک نہایت قیمتی "لنگی" بطور انعام دی گئی تھی جس کی رائج الوقت قیمت اُن دنوں پندرہ روپے تھی (آج کے ڈیڑھ ہزار روپے فرض کر لیجیے) لیکن افسوس کہ جگن ناتھ آزاد اس لنگی کو استعمال نہیں کر سکے کیونکہ وہ شروع ہی سے پٹھانی سوٹ پہننے کے عادی رہے ہیں۔ ہمارے ہاں انعاموں میں ہمیشہ یہ گھپلا ہوتا ہے کہ انعام پانے والے کی پسند اور ناپسند کو نظر میں نہیں رکھا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے ہمیں بھی کچھ عرصہ پہلے بطور اعزاز ایک شال پیش کی گئی تھی۔ شال ہم نے کھولی تو دیکھا کہ یہ ایک جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔ منتظمین سے شکایت کی تو بولے "جناب! شال پر نظر ڈالنے سے پہلے ذرا اپنی خدمات پر بھی تو نظر ڈال لیجیے۔ جیسی خدمات ہے ویسی ہی شال بھی دی گئی ہے"۔ اسی اعمال نامہ سے اندازہ ہوا کہ جگن ناتھ آزاد جتنی مرتبہ پاکستان گئے ہیں اتنی مرتبہ تو ہم دہلی سے حیدر آباد بھی نہیں گئے ہونگے۔ ڈاکٹر اسد اللہ وانی نے جگن ناتھ آزاد کا جو اعمال نامہ مرتب کیا ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ اس سے کراماکاتبین کا کام خاصا آسان ہو گیا ہے۔ جو کام اصولاً کراماکاتبین کو کرنا چاہیے تھا وہ کام ڈاکٹر اسد اللہ وانی نے انجام دے دیا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے ایک عقیدتمند کی حیثیت سے ہماری دعا ہے کہ وہ برسوں ہمارے درمیان رہیں اور اپنے "اعمال نامہ" میں اضافہ کرتے رہیں۔ آمین ثم آمین

نصرت ظہیر
۴۰-۱۵ کھچڑی پور دہلی ۹۱
فون-۲۲۷۴۴۲۵

قصہ "مشتبہ صاحب کے سوویز کا!

صحافی کے جب برے دن آتے ہیں تو وہ طنز و مزاح نگار ہوتا ہے۔ اور جب طنز و مزاح نگار کے اچھے دن آتے ہیں تو اسے دوبئی سے دعوت نامے ملنے لگتے ہیں۔ اس حساب سے ہمارے آپ کے جو مجتبیٰ حسین صاحب ہیں ان کے اچھے دنوں کی شروعات کو کافی دن ہو چکے ہیں کیونکہ خلیج فارس سے آنے والی نمکین ہوائیں اکثر ان کے لیے دعوت سخن کے پیغام لاتی رہتی ہیں۔

مجتبیٰ صاحب جنھیں قبلہ پروفیسر نثار احمد فاروقی، مرحوم کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے حوالے سے مشتبہ صاحب کہتے ہیں، پہلے صحافی تھے۔ فاروقی صاحب کا کہنا ہے کہ انھیں ان کے مزاج پر اکثر مرثیہ کا اور ان کی ہنسی میں آنسوؤں کے چھپے ہونے کا شبہ ہوتا ہے جو یقیناً مزاح کی معراج ہے حیدر آباد کے "سیاست" اخبار میں سب ایڈیٹری کرتے تھے اور اگر ان کے ہی ایک شگفتہ جملے کا سہارا لیں تو گوشہ گمنامی میں بڑے آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن فلک بے تاب کو ان کا یہ سکون ایک آنکھ نہ بھایا اور "سیاست" سے وابستہ بڑے بھائی محبوب حسین جگر نے (جن کا گذشتہ سال انتقال ہوا ہے) ایک دن انھیں ڈرا دھمکا کر اخبار کا کالم نگار بنا دیا!

چند ماہ پہلے، مجتبیٰ صاحب کا ایک جشن دوبئی میں بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ یہ جشن دوبئی میں تو ایک ہی دن میں ختم ہو گیا مگر یہاں ہندستان کے اخبارات و رسائل میں ایک ڈیڑھ مہینے تک جاری رہا۔ بلکہ کئی رسالوں میں تو یہ اب بھی منایا جا رہا ہے اور جو رسالے ماشاء اللہ ان سے بھی زیادہ تاخیر سے شائع ہوتے ہیں ان میں امید ہے اس سال بھی منایا جاتا رہے گا۔

دوبئی میں ایک صاحب ہیں ڈاکٹر اطہر علی زیدی۔ جشن کا یہ سارا قصہ ان ہی سے شروع

ہوتا ہے۔

اب یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ زیدی صاحب کس قسم کے ڈاکٹر ہیں۔ انجکشن دینے والے یا ادب کی نبض ٹٹولنے والے۔ البتہ اردو طنز و مزاح سے متعلق ان کی سرگرمیوں کا جو احوال ہم تک پہنچا ہے، اسے سن کر ایسا لگتا ہے کہ جو کیا کرکٹ کے ساتھ کیری پیکر نے وہی کرنے جا رہے ہیں زیدی صاحب اردو طنز و مزاح کے لیے۔ آپ میں سے جو لوگ تھوڑی عمر کے ہیں، انھیں یاد ہوگا کہ بیس بائیس سال پہلے کیری پیکر نے ڈے اینڈ نائٹ کرکٹ کی باقاعدہ شروعات کی تھی تو ناقدین نے اس طرح کے کرکٹ کو ایک سرکس کا نام دیا تھا۔ لیکن بعد میں یہی قدم پوری دنیا میں کرکٹ کے پھیل جانے کا باعث بن گیا۔ خدا کیری پیکر کی مغفرت کرے۔

مجتبیٰ صاحب کے حالیہ جشن، اور ان سے پہلے طنز و مزاح کی دوسری شخصیتوں کے جشنوں کا جو احوال ہم نے سنا اور پڑھا ہے، اسے دیکھ کر ہمیں شبہ ہو چلا ہے کہ زیدی صاحب اردو طنز و مزاح کے کیری پیکر بننے جا رہے ہیں۔ خدا انھیں بھی معاف فرمائے۔

کہتے ہیں کہ زیدی صاحب ہر سال دوبئی میں اردو طنز و مزاح کا ایک کارنیوال لگاتے ہیں، جس میں دنیا بھر سے بھانت بھانت کے مزاح نگار پکڑ کر لائے جاتے ہیں، ایک مشاعرہ ہوتا ہے اور ایک شاعر کا جشن منالیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اب تک دلاور فگار اور ضمیر جعفری جیسے معتبر مزاح نگاروں کے جشن ہو چکے ہیں۔ اس سال زیدی صاحب اور ان کے ساتھیوں کی ٹیم نے سوچا کہ شاعر تو بہت ہوئے، کیوں نہ اس مرتبہ نثر کے کسی آدمی کو نشانہ بنایا جائے۔

چنانچہ سب سے پہلے اردو کے آج تک کے سب سے بڑے اور پرانے مزاح نگاروں میں سے ایک شفیق الرحمٰن صاحب رابطہ کیا گیا۔ انہوں نے معذرت کی تو کرنل محمد خاں سے پوچھا گیا۔ بعد میں انہوں نے اس دور کے سب سے بڑے طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی صاحب سے رجوع کیا۔ یوسفی صاحب نے انہیں مجتبیٰ حسین کا پتہ بتا دیا۔ بس یوں جشن مجتبیٰ کی بنیاد پڑ گئی اور دنیا کو یہ بھی پتہ چل گیا کے جتنا بڑا دل سچے مزاح نگاروں کا ہوتا ہے، اتنا کسی اور کا نہیں ہوتا!

پھر جس شان و شوکت اور تزک و احتشام سے یہ جشن ہوا، اس کا جواب دینے والا کم از کم ہندستان میں تو کوئی نہیں ہے (عالمی اردو کانفرنس والے علی صدیقی کے سوا، جنھیں مرحوم ظ۔ انصاری علامی صدیقی کا لقب دے گئے تھے) تمام شاعر اور مجتبیٰ صاحب فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ٹھہرائے گئے اور جشن کی تقریب یوں ہی نہیں بلکہ ۲۵ درہم کا ٹکٹ لگا کر ہوئی۔

یوں ٹکٹ لگا کر جشن منانے کا اپنے یہاں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ پچیس کیا ایک درہم کا بھی ٹکٹ لگا دیں تو پورا جشن درہم برہم ہو جائے۔ اس ملک میں تو جناب جشن والے خود اپنی جیب سے رقم دیتے ہیں اور اہل کار سخن کو بلا کر کہتے ہیں کہ للہ ہمارا جشن منالیجیے!

ان خبروں سے جب ہمیں معلوم ہوا کے دوبئی میں مجتبیٰ صاحب کو ٹکٹ لگا کر دکھایا گیا ہے تو خود اپنی قسمت پر بڑا رشک آیا کہ ہم دوبئی میں نہیں دہلی میں رہتے ہیں۔ ساتھ ہی مجتبیٰ صاحب کی شرافت کا بھی قائل ہو جانا پڑا کہ پچھلے دس بارہ برسوں میں ہزاروں نہیں تو سیکڑوں بار ان سے ملے، ان کی صورت دیکھی، ان سے باتیں کیں اور بہت کچھ ان سے سیکھا مگر مجال ہے جو انہوں نے ایک مرتبہ بھی ہم سے ٹکٹ دکھانے کو کہا ہو۔ ۲۵ درہم فی ملاقات کے حساب سے اگر حساب لگایا جائے اور مجتبیٰ صاحب ہم سے حساب بے باق کرنے کو کہنے لگیں تو یقین کیجیے گھربار بیچ کر اور پراویڈنٹ فنڈ دے دلا کر بھی چھٹکارا نہ ملے۔ مگر واہ مجتبیٰ صاحب! حساب مانگنا تو دور رہا ہے۔ کئی بار تو پریس کلب میں چائے بھی اپنی جیب سے پلا دیتے ہیں۔ (جی ہاں۔ یہاں چائے سے ہماری مراد بیچ مچ چائے ہے۔ کچھ اور نہیں)

کہتے ہیں اس روز تین چار ہزار اردو والوں نے مجتبیٰ صاحب کو ٹکٹ لے کر دیکھا۔ ہمارا مشورہ ہے کہ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ وہ دوبئی ضرور ہو آیا کریں۔ اور کچھ نہیں تو ہمارے غیر ملکی زرمبادلہ میں ہی کچھ اضافہ ہوتا رہے گا!

لیکن یہاں، دہلی میں، جشن سے زیادہ اس سوونیر کا چرچا رہا ۔ جو اس موقع پر اطہر علی زیدی صاحب کی تنظیم نے مجتبیٰ صاحب کے اعزاز میں شائع کیا ہے۔ شہر میں اس سوونیر کی آج کل اس قدر ڈیمانڈ ہے کہ اسمگلنگ مافیا کے لوگ دوبئی سے سونے کی بجائے یہ سوونیر اسمگل کرنے کی سوچنے لگے ہیں۔ ہم تک بھی یہ سوونیر ایک اسمگلر کے ہی ذریعے پہنچا ہے۔ کہتے ہیں مجتبیٰ صاحب کے پاس دو تین کاپیاں اس سوونیر کی موجود ہیں، جن پر انہوں نے سخت پہرہ لگا دیا ہے۔ حالانکہ ہم ان کی جگہ ہوتے تو موقع کا پورا فائدہ اٹھاتے اور سوونیر کو اور کچھ نہیں تو کرائے پر ہی چلا دیتے۔

ناظرین، وزن میں یہ سوونیر اتنا وزنی ہے کہ ایک وقت میں ایک شریف آدمی ایک ہی سوونیر اٹھا کر چل سکتا ہے۔ سائز سوا فٹ بائی پون فٹ۔ صفحات اتنے کہ کئی بار گننے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ یا تو صفحات ختم ہونے سے پہلے گنتی ختم ہو گئی یا ہم تصویروں اور مضمونوں میں کھو گئے۔ طباعت، اتنی عمدہ اور چمکدار کہ آنکھیں خیرہ

ہو جائیں۔ کئی تصاویر چشمہ آتارنے کے بعد نظر آئیں۔ بلکہ کچھ تصویروں کو دیکھنے کے لیے تو بلا مبالغہ ، کمرے کی روشنی کم کرنی پڑی۔

یوں تو سوونیز اپنے دیس میں بھی خوب چھپتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر سوونیز اس قدر سوونیز ہوتے ہیں کہ انھیں پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور پھر ان میں پڑھنے کے لیے کچھ ہوتا بھی نہیں۔ ایسے سوونیز دیکھتے ہی ردی والے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ سوونیز اگر آپ کے پاس ہے تو یقین کیجیے ، اسے دیکھ کر خود ردّی والا آپ کے انتظار میں بیٹھ جائے گا اور شاید مہینوں بیٹھا رہے گا! کیونکہ اس میں کاغذ نہایت نفیس لگایا ہے۔

اس سوونیز میں دیکھنے اور پڑھنے کے لیے اتنا بہت کچھ ہے کہ ہم ایک ہفتے سے اسے پڑھ رہے ہیں اور ابھی ایک سال تک اسے پڑھنے کا ارادہ ہے۔ مجتبیٰ صاحب کے بارے میں حیدر آباد کے "شگوفہ" نے کئی برس پہلے ایک شاندار نمبر نکالا تھا۔ اس کے بعد ان کی شخصیت پر سب سے اچھا مجلّہ ، اس سوونیز کی صدارت میں ہی سامنے آیا ہے ، جس میں انتظار حسین۔ شمس الرحمٰن فاروقی ، مظہر امام ، پروفیسر قمر رئیس ، سید ضمیر جعفری ، مخمور سعیدی ، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور ڈاکٹر وحید اختر جیسے مشاہیر کے مجتبیٰ صاحب کے بارے میں لکھے ہوئے کئی معلوماتی مضامین تو ہیں ہی ، خود مجتبیٰ صاحب کے تحریر کردہ کئی مشہور خاکے بھی شامل ہیں۔ پھر اشتہار بھی بہت ہیں۔ اور یوں زیدی صاحب نے ادب پسندوں کے ساتھ بے ادب پسندوں کا بھی پورا خیال رکھا ہے کہ ادبی مضامین ان کے پلے نہ پڑیں تو اپنے مطلب کی چیزیں ان خوبصورت اشتہارات میں ڈھونڈیں۔

حال ہی میں ایک ملاقات میں (جو حسب معمول بے ٹکٹ تھی) ہم نے مجتبیٰ صاحب کے مشورہ دیا کہ حضور ایک جشن تو اتنا خوبصورت سوونیز شائع ہونے پر بھی منایا جا سکتا ہے! سنتے ہی مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے۔ پوچھا۔ "سچ بتاؤ ، تم تک سوونیز کیسے پہنچا؟" ہم نے اسمگلنگ والی بات بتا دی۔ اس وقت تو وہ خاموشی سے چلے گئے۔ اگلے روز فون پر کہنے لگے ---" میاں میں سب جانتا ہوں۔ ہمارے گھر سے ایک سوونیز غائب ہے!"

یقین کیجیے ، ، مجتبیٰ صاحب سے پیار تو ہمیں تب سے تھا جب چوتھائی صدی پہلے ہم نے ان کے مضامیں پہلی بار پڑھے تھے۔ لیکن جب سے یہ سوونیز ہم نے پڑھنا شروع کیا ہے ، ان سے پیار اور بڑھ گیا ہے۔ خدا ہم سب پر اور اردو طنز مزاح پر ان کا سایہ تا قیامت سلامت رکھے ، اور ہمیں مستقبل میں ایسے ہی اور بہت سے مجلّے ان کے بارے میں پڑھنے کو ملتے رہیں۔ آمین!

رشید الدین
رشید گلشن سنتوش نگر کالونی
مہدی پٹنم' حیدر آباد۔۲۸

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال۔اردو کے آدمی

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال ۲۸ / فروری ۱۹۹۷ء کو اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔وہ انوار العلوم کالج حیدر آباد میں صدر شعبہ اردو تھے۔یوں تو انوار العلوم کالج ایک اقلیتی خانگی کالج ہے مگر اپنے وسیع و عریض کیمپس اس پر کھڑی عمارتوں اور کئی شعبوں نیز اضلاع میں اس کی شاخوں اور پوسٹ گریجویٹ کلاسوں کی وجہ سے یہ ایک منی یونیورسٹی ہے جس کی وجہ سے عثمانیہ یونیورسٹی نے اسے ایک خود مختار تعلیمی ادارہ کی حیثیت دے دی ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صرف اردو کے ریڈر ہی نہیں تھے بلکہ وہ اور بھی بہت کچھ تھے بلکہ ہیں۔وہ اردو کے ادیب اور صحافی ہیں۔اردو کے بہی خواہ ہیں اور اس کے ایک باعمل سپاہی ہیں۔وہ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی آندھرا پردیش میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں اور ان کی مرتبہ کتابیں بی۔اے کے نصاب میں شامل ہیں۔وہ اردو کے پرچہ سوالات مرتب کرتے اور ان کے جانچنے کا کام بھی انجام دیتے تھے۔

وہ پچھلے ۲۹ سال سے پابندی سے اردو کا یک تخی رسالہ شگوفہ پابندی سے مرتب اور شائع کر رہے ہیں اور یہ رسالہ اردو کی مزاحیہ صنف کا ہے۔اس رسالہ میں نظم اور نثر کا سارا مواد مزاحیہ ہوتا ہے۔وہ ہر سال اس کا ایک سالنامہ بھی شائع کرتے ہیں اور ایک سوویز بھی نکالتے ہیں جو زندہ دلان حیدر آباد کی سالانہ سہ روزہ تقاریب کے پہلے دن ادبی اجلاس میں ٹکٹ کی بجائے شرکاء کو دیا جاتا ہے۔

زندہ دلان حیدر آباد کا ذکر آگیا تو اس کا تفصیلی تعارف بھی ضروری ہے۔یہ مزاحیہ شاعروں اور ادیبوں کی ایک انجمن ہے جس کے پابندی سے سالانہ انتخابات ہوتے

ہیں اور یہ ایک بے حد فعال انجمن ہے۔ اس کے موجودہ صدر جناب نریندر لوتھر (آئی اے ایس ریٹائرڈ) ہیں جو خود بھی ایک مزاح نگار ہیں۔ قبل ازیں ایک طویل عرصہ تک اس کے صدر بھارت چندکھنہ تھے جو خود بھی ایک آئی اے ایس عہدے دار اور مزاح نگار تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ آندھراپردیش اردو اکیڈمی کے پہلے سکریڑی بنے۔ افسوس کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے اور پٹیالہ میں ان کا انتقال ہو گیا جہاں وہ مستقل سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

آندھراپردیش اردو اکیڈمی کا ذکر آ گیا تو یہاں اسی کا تذکرہ بے جا نہ ہو گا کہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اس سے شروع ہی سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے اور آج بھی اس کے بہی خواہوں میں شامل ہیں۔ اردو اکیڈمی ہی کیا وہ اردو کی ہر تحریک اور کاز کے بہی خواہ ہیں اسی لیے میں نے انھیں اردو کا آدمی کہا ہے۔ برسوں تک وہ انجمن تحفظ اردو آندھراپردیش کے سکریڑی رہے جس کے معتمد صدر سریواستو تھے جو مسلسل دو میعادوں کے لیے آندھراپردیش اردو اکیڈمی کے سیکریڑی رہے اور ایک ممتاز اردو صحافی اور محبّ اردو ہیں۔

افسوس کہ یہ انجمن اب اتنی فعال نہیں رہی لیکن ماضی میں آندھراپردیش میں اردو کے تعلق سے اس کا رول نہایت سرگرم رہا اور ڈاکٹر چناریڈی اور سابق وزیر و رکن پارلیمنٹ جناب باگاریڈی جیسی سیاسی قایدین کی اسے سرپرستی حاصل رہی بلکہ باگاریڈی تو اب بھی اس کے صدر ہیں۔ کوئی عجب نہیں کہ یہ انجمن پھر فعّال ہو جائے اور آندھراپردیش میں (جہاں اردو کے لیے فضا بیحد سازگار ہے) کوئی بڑا کام کر گزرے۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اردو کے ایک صحافی بھی ہیں۔ وہ برسوں سے اردو صحافت سے وابستہ رہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ وہ زمانہ طالب علمی سے ہی اردو صحافت اور اردو تحریکات سے وابستہ رہے ہیں۔ کسی زمانہ میں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کی سرکردگی میں ہر سال ایک شاندار اردو فیسٹول منعقد ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں جو فیسٹول ہوا تھا اس میں مصطفیٰ کمال نے نہایت سرگرمی سے حصہ لیا تھا اور اس فیسٹول میں اس وقت کے وزیر اعلا نیلم سنجیوا ریڈی نے (جو بعد میں اسپیکر لوک سبھا اور صدر جمہوریہ ہند بھی بنے) اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا تھا جس پر بعد میں کسی وجہ سے عمل نہ ہو سکا۔

مصطفیٰ کمال سائنس کے گریجویٹ ہیں اور ان کے والد کی بڑی خواہش تھی کہ

وہ ایم بی بی ایس کر کے ڈاکٹر بن جائیں لیکن وہ سائنس کے ڈاکٹر تو نہ بن سکے مگر آیندہ لٹریچر کے ڈاکٹر ضرور بن گئے۔ البتہ ان کے چھوٹے بھائی نے ان کے والد کی خواہش ضرور پوری کی اور آج وہ شہر حیدر آباد کے ایلو پیتھی کے ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں۔ ان کے والد محکمہ جنگلات میں منتظم تھے اس لیے بی ایس سی کے بعد انھوں نے محکمہ جنگلات میں رینجر بنا دیا جس میں آگے ترقی کے بہت مواقع تھے۔

لیکن اردو کے دیوانے کا عادل آباد کے گھنے جنگلات میں دل نہیں لگا اور انھوں نے دو سال کے اندر ہی یہ ملازمت چھوڑ دی اور ایم۔ اے (اردو) میں داخلہ لے لیا اور درجہ اول میں کامیابی حاصل کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ وہ سائنس کالج میں تھے اس وقت بھی سائنس کالج سے نکلنے والے اردو رسالہ سائنس کے ایڈیٹر تھے۔ جب انھوں نے ایم۔ اے میں داخلہ لیا تو اس وقت بھی وہ جامعہ عثمانیہ کے مشہور میگزین مجلہ عثمانیہ کے ایڈیٹر رہے اور اس کا شاندار اور ضخیم دکنی ادب نمبر نکالا۔

گولڈ میڈل اور مجلہ عثمانیہ کی ایڈیٹری کے علاوہ ایم۔ اے کے دوران مصطفیٰ کمال کا ایک اور کمال بھی ہے اور وہ ہے فصاحت جنگ جلیل کی شخصیت اور شاعری پر ایک تحقیقی مقالہ لکھنا۔ یہ مقالہ اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا لیکن جب بھی ہوگا اردو زبان وادب میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوگا۔ ایم۔ اے کے بعد شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ سے انھوں نے پی ایچ ڈی بھی کیا۔ اس بار ان کا موضوع تھا حیدر آباد میں اردو کی ترقی تعلیمی وسرکاری زبان کی حیثیت سے۔ یہ بڑا وقیع اور جامع مقالہ ہے اور کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے جس کی ایک جلد انھوں نے از راہ دوست نوازی مجھے بھی عنایت کی۔ اس پر اتر پردیش اردو اکیڈمی اور آندھرا پردیش اردو اکیڈمی سے انعامات بھی مل چکے ہیں۔

مذکورہ بالا دو مقالوں کے علاوہ بھی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے بہت سے علمی وادبی مضامین بھی لکھے اور آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے نشر بھی کیے۔ ان کی بے پناہ مصروفیات ان کے ایم۔ اے کے مقالے اور مضامین کے مجموعہ کی اشاعت میں حائل رہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب جب کہ انھیں ملازمت کی مصروفیات سے فراغت مل گئی ہے وہ ان دونوں کتابوں کے مسودات کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوں گے۔

مصطفیٰ کمال ایک نہایت ہی فعال شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے اردو اور شگوفہ کے سلسلہ میں بہت سے بیرونی ممالک کے دورے کیے ہیں جن میں پاکستان' سعودی عرب اور عرب امارات شامل ہیں۔ ممکن ہے مستقبل میں وہ امریکہ اور برطانیہ

وکینیڈا کا بھی دورہ کریں۔ ان ممالک میں انھوں نے اردو کے جلسوں میں شرکت کی۔ انھیں مخاطب کیا اور شگوفہ کی توسیع اشاعت کے سلسلہ میں مساعی کیں۔ ماہنامہ شگوفے کی اوورسیز کمیٹیاں بھی ہیں جو سعودی عرب' عرب امارات' امریکہ اور آسٹریلیا میں سرگرم عمل ہیں اور ان کمیٹیوں کی کوشش سے ان کا رسالہ ان ممالک میں بھی پہنچنے لگا ہے۔ اس سلسلے میں اوورسیز ایڈیٹر ڈاکٹر عابد معزز (جو خود بھی ایک مزاح نگار ہیں) کی سعودی عرب میں کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مصطفیٰ کمال ایک نہایت محنتی آدمی کا نام ہے۔ وہ ایک اچھے استاد' کامیاب ایڈیٹر' قابل ریسرچ اسکالر' مخلص دوست اور ذمہ دار شوہر اور باپ بھی ہیں۔ میری اور ان کی دوستی کوئی تیس سال پرانی ہے اور شگوفہ کے دفتر میں میرا مستقل آنا جانا ہے۔ میں زندہ دلان حیدر آباد سے بھی وابستہ ہوں اور اس تنظیم کا جوائنٹ سکریڑی ہوں۔ مزاح لکھنے کی وجہ سے میں مصطفیٰ کمال کے قریب آیا اور میری مزاحیہ مضامین کی کتاب خواہ مخواہ کے پبلشر زندہ دلان حیدر آباد ہی ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت اور تین دیگر کتابوں کی اشاعت پر انھوں نے مجھے بہت سے مفید مشورے دیے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اردو کی کتابت' طباعت اور اشاعت کے معاملہ میں غیر معمولی تجربہ رکھتے ہیں۔ اب تو خیر کمپوٹر کا دور آگیا لیکن پہلے حیدر آباد میں کتنے کاتب ہیں اور کون کیسا ہے' کون وقت پر اور ذمہ داری کے ساتھ مسودہ واپس کرتا ہے اور کون مع مسودہ کے غائب ہو جاتا ہے۔ یہ ساری معلومات انھیں حاصل تھیں۔ کون پریس کیسا ہے' وقت پر کام کر کے دیتا ہے اور کہاں چھپائی کا کام اچھا ہوتا ہے اور کس اسٹیشنری کی دکان پر کاغذ اچھا ملتا ہے' کون بائنڈر کیسا ہے اور لیتھو میں ایک کتاب کتنے میں چھپ سکتی ہے۔ یہ تمام باتیں انھیں معلوم ہیں اور وہ اپنے دوستوں کو اس سلسلہ میں مفت مشورے دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات انھیں بدنام کاتبوں کے شکنجہ سے بچا بھی لیتے ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال ایک عملی آدمی ہیں اور ان میں تنظیمی صلاحیتیں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ قرآن پاک کی ایک آیت کا ترجمہ ہے جس کو دانائی ملی اس کو بڑی نعمت ملی۔ ایک اور آیت ہے۔ دانائی اور نادانی بھی منجانب اللہ ہے۔ مجھے انھیں دیکھ کر یہ آیتیں یاد آجاتی ہیں۔ وہ تدبر اور فراست میں یکتا ہیں۔ جہاں بولنا ہے وہیں بولتے ہیں ورنہ خاموش رہتے ہیں گویا وہ اس حدیث کی عملی مثال ہیں کہ جس نے خاموشی اختیار کی اس نے نجات پائی۔ زندہ دلان حیدر آباد کی سہ روزہ سالانہ تقاریب میں ان کی منصوبہ بندی دیکھنے

کے لائق ہوتی ہے۔ ان تقاریب کے لیے تین دن مختص ہیں۔ پہلے دن ادبی اجلاس سے تقاریب کا آغاز ہوتا ہے جس میں حیدر آباد کے علاوہ بیرون حیدر آباد کے مزاح نگار مضامین سناتے ہیں۔ دوسرے دن محفل لطیفہ گوئی ہوتی ہے اور تیسرے دن رات میں کل ہند مزاحیہ مشاعرہ ہوتا ہے جس پر یہ تقاریب اختتام کو پہنچتی ہیں۔ یہ تینوں اجلاس ٹکٹوں سے ہوتے ہیں۔ اس عرصہ زندہ دلان حیدر آباد کا مالیہ بہت مستحکم ہے۔

ان تمام تقاریب میں اور لوگوں کے علاوہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی شخصیت مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر وہ سب کام پس پردہ رہ کر کرتے ہیں۔ انھیں اپنے نام و نمود اور شہرت سے زیادہ اس بات کی فکر رہتی ہے کہ یہ تقاریب اچھے پیمانہ پر ہوں اور کوئی بد انتظامی یا غیر معیاری چیز نہ ہونے پائے۔ ادبی اجلاسوں اور لطیفوں کی محفلوں میں بھی وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ معیاری چیزیں سنائی جائیں۔ اس معاملہ میں وہ تعلقات یا دوستی کو کبھی آڑے نہیں آنے دیتے۔ خاص طور پر کل ہند مزاحیہ مشاعرہ میں ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی شاعر سوقیانہ چیز نہ سنانے پائے۔ نمائش میدان سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے اور ہزاروں کا مجمع ٹکٹ خرید کر آتا ہے لیکن کیا مجال جو کوئی ہوٹنگ یا ہڑبونگ ہونے پائے۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ مصطفیٰ کمال نہایت محنتی آدمی ہیں اس کے ساتھ ہی وہ خود دار بھی بہت ہیں۔ ایم۔ اے کرنے کے دوران بھی وہ اپنے گھر والوں پر بوجھ نہیں بنے بلکہ روزنامہ رہنمائے دکن حیدر آباد کا ادبی صفحہ مرتب کرتے رہے۔ انھوں نے بھارت نیوز سروس کو بھی اپنی خدمات محض اردو کے لیے اعزازی طور پر دیں اور تمام ادبی جلسوں کی رپورٹنگ کی اور فیچر پر بھی کام کیا۔ وہ اچھے مترجم، صحافی اور رپورٹر بھی ہیں۔ وہ جو بھی کام کرتے ہیں دل لگا کر کرتے ہیں۔ ان میں احساس ذمہ داری بہت زیادہ ہے اور ان کی وجہ سے کسی کا نقصان ہو، یہ انھیں گوارا نہیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال حیدر آباد کے ایک معزز سید گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اہل سادات میں سے ہونے کی وجہ سے ان میں بعض نہایت اعلا اوصاف آگئے ہیں۔ انھیں زیادہ کی ہوس اور کم کا شکوہ نہیں۔ ویسے وہ اور ان کے گھر والے ایک معیاری زندگی گزارتے ہیں اور ان کا ہاتھ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ موٹر سائکل کے علاوہ وہ اہل کار یعنی موٹر نشین بھی ہیں اور برسوں سے انکم ٹیکس ادا کر رہے ہیں۔ وہ اور ان کے گھر والے اچھا پہنتے، اچھا کھاتے اور اچھی زندگی گزارتے ہیں۔

ہر شام ان کے دفتر یعنی شگوفہ پر حیدر آباد کے اردو شاعروں اور ادیبوں کا اجتماع رہتا ہے جن میں مزاحیہ شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ سنجیدہ لکھنے والے ادیب و شاعر، تعلیم کے شعبہ سے وابستہ افراد اور بعض اہل غرض بھی شامل ہوتے ہیں کیونکہ ان کا حلقہ رسوخ بہت وسیع ہے۔ ان کا دفتر مجرد گاہ و جس کا انگریزی ترجمہ بیچلرس کوارٹرس ہے تین منزلہ ہاؤزنگ بورڈ کی عمارت کی سب سے اونچی منزل کے آخری سرے پر ہے لیکن اس کے باجود لوگ ان کے خلوص میں کم و بیش ۸۰ سیڑھیاں چڑھ کر جاتے ہیں اور اترتے ہیں۔ اس عمارت کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں شگوفہ سے قبل اردو کے دو اور پرچے مسلم ضیائی مرحوم کا ماہنامہ تارے (بچوں کا رسالہ) اور سلیمان ادیب مرحوم کا نہایت معیاری ادبی ماہنامہ صبا برسوں نکلتے رہے۔

مقامی ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ ان کے دفتر میں بیرون حیدر آباد بلکہ بیرون ملک سے آنے والے شعرا اور ادبا بھی آتے ہیں۔ ایک لحاظ سے ان کے رسالے شگوفہ کا دفتر اردو کا ایک مرکز ہے اور اتفاق سے یہ شہر حیدر آباد کے بہت ہی مرکزی مقام پر واقع ہے۔ ان کے دفتر میں تبادلہ میں اردو کے بہت سے پرچے (نہ صرف ہندستان اور پاکستان بلکہ امریکہ اور برطانیہ کے) بھی آتے ہیں جنھیں وہ میز ہی پر رکھتے ہیں تاکہ ان کے پاس آنے والے دوست احباب ان کی ورق گردانی کر سکیں اور پتے نوٹ کر سکیں۔

ڈاکٹر مصطفی کمال کو میں نے اردو کا آدمی کہا ہے اور کوئی غلط نہیں کہا۔ شہر حیدر آباد میں ہر شاعر، ادیب، اہل قلم اور اہل علم سے ان کی شناسائی ہے اور اکثر ایسے لوگ پابندی سے ان سے ملنے کے لیے آتے ہیں۔ ان کے دم سے حیدر آباد میں اردو کی ایک فضا اور ماحول بنا ہوا ہے۔ اور اب جب کہ وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے تعلق سے ان کی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہوگا اور وہ اپنے رسالہ شگوفہ کی طرف زیادہ توجہ دے سکیں گے جو ہندستان اور پاکستان تو کیا ساری اردو دنیا میں طنز و مزاح کا واحد رسالہ ہے جو پچھلے ۲۹ سال سے پابندی سے ہر ماہ کی ۹ تاریخ کو شائع ہوتا ہے جو اس کی پوسٹنگ ڈیٹ ہے۔ اس کی وجہ سے حیدر آباد میں اردو کے اتنے مزاحیہ شاعر اور ادیب جمع ہو گئے ہیں جو ہندستان اور پاکستان کے کسی اور شہر میں نہیں ہیں۔

عبداللطیف اعظمی

سید شہاب الدین دسنوی
کی
تعلیمی خدمات اور تنظیمی صلاحیت

دسنوی صاحب ریاست بہار کے ایک مردم خیز گانو دسنہ میں ۲/جولائی کو پیدا ہوئے۔ مکتب کی تعلیم وہیں حاصل کی۔ چھ سات سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ دسنہ سے مونگیر آگئے' جہاں وہ سرکاری ملازم تھے۔ مونگیر آنے کے بعد دسنوی صاحب کو سرکاری اسکول میں داخل کردیا گیا۔ یہاں سے میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ پٹنہ آگئے اور بہار نیشنل کالج میں سائنس میں داخلہ لیا۔ یہاں سے سائنس میں انٹرمیجیٹ کرنے کے بعد سنیٹ زیوزس میں بی۔ ایس۔ سی میں داخلہ لیا اور مقررہ مدت میں بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کرلیا۔ دسنوی صاحب کے ماموں جان نجیب اشرف صاحب اس وقت ممبئی میں تھے اور اسمٰعیل یوسف کالج کے شعبہ اردو میں لکچرر تھے۔ انھوں نے دسنوی صاحب کو ممبئی میں بلالیا اور ان کی کوششوں سے انجمن اسلام ہائی اسکول میں ان کا ٹیچر کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔ یہیں سے ان کی زندگی کا رخ بدل گیا اور دن دونی رات چوگنی ان کی ترقی شروع ہوگئی۔

چنانچہ اپریل ۱۹۴۰ء کے آخری ہفتے میں انھیں انجمن اسلام ہائی اسکول کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔

اس کے بعد ملک کے قابل فخر اور ہر دلعزیز تصنیفی اور اشاعتی ادارہ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) سے ان کا گہرا اور پائدار تعلق پیدا ہوا۔ اگرچہ اس کے بانی علامہ شبلی نعمانی رحمتہ اللہ علیہ تھے لیکن اس کی شہرت اور ترقی علامہ نعمانی کے شاگرد رشید اور دسنہ (بہار) کے قابل فخر فرزند مولانا سید سلیمان ندوی کی مرہون منت تھی۔ آگے چل کر سید شہاب الدین دسنوی صاحب کو جو شہرت اور ترقی حاصل ہوئی' اس میں دسنہ سے ان کے وطنی تعلق کو بھی حاصل ہے۔ چنانچہ اپنی خودنوشت سوانح حیات دیدہ وشنیدہ کے ذیلی عنوان

"دارالمصنفین" کے تحت موصوف نے لکھا ہے کہ: "اپنے ہم وطن اور بزرگ مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولوی سید ابو ظفر ندوی اور جناب نجیب اشرف ندوی کی وابستگی سے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے ہوش سنبھالتے ہی ایک خصوصی تعلق رہا۔ ان بزرگوں کے چلے جانے کے بعد میرے ایک دوسرے ہم وطن اور عزیز سید صباح الدین عبد الرحمٰن' جنھوں نے ان تینوں بزرگوں کی صحبت اٹھائی تھی دارالمصنفین کے جوائنٹ سکریٹری اور مولانا شاہ معین الدین ناظم بنے۔ ان کی عنایت سے مجھے دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکنیت کی عزت نصیب ہوئی۔ سب سے پہلی بار تو میں اعظم گڑھ ۱۹۳۲ء میں گیا تھا۔ جبکہ وہ ادارہ اپنے عروج پر تھا۔ جس کی مثال ہندستان میں کہیں اور نہیں دکھائی دیتی تھی۔ دسنوی صاحب مزید لکھتے ہیں: "سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی آرزو رہی کہ ریٹائر ہو کر پٹنہ میں رہنے کے بجائے میں شبلی منزل (اعظم گڑھ) میں رہوں اور دارالمصنفین کا انتظامیہ شعبہ سنبھالوں اور ان میں صرف علمی کاموں کے لیے چھوڑ دوں۔ مگر یہ میرے لیے ممکن تھا اور نہ قرین مصلحت "مزید لکھتے ہیں: "مولانا علی میاں ندوی صاحب (دارالمصنفین کی مجلس عاملہ کے صدر) کے حکم سے میں عارضی طور پر اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی کو ناظم دارالمصنفین مقرر کیا گیا۔ دفتر کا چارج لینے کے بعد پہلا مسئلہ میرے سامنے یہ تھا کہ جو رقم پاکستان سے آئی تھی (اور جو تقریباً ساڑھے دس لاکھ رہ گئی تھی) اس کا کیا جائے۔ بینک میں رکھ کر سود لیا نہیں جاسکتا تھا۔ یونٹ ٹرسٹ کی تجویز تو پہلے منظور ہو چکی تھی۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ ٹرسٹ بھی سود پر قرض دیتا ہے تو وہ بھی خارج از بحث ہو گیا۔ نقد کی شکل میں رقم کا رکھنا قطعی خطرناک اور نامناسب تھا۔ کافی غور کرنے کے بعد میں نے مجلس انتظامیہ کو اس پر رضامند کرلیا کہ یہ سرمایہ ماسٹر شیئر میں لگایا جائے۔ یہ اسکیم نئی نئی تھی اس لیے لوگ خریدتے ہوئے جھجکتے تھے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر پٹنہ کے ایک بروکر دلال کے ذریعے گیارہ لاکھ کے شیئر خرید لیے۔ بروکر نے از راہ عنایت دارالمصنفین کا ایک غیر تجارتی ادارہ ہونے کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے کمیشن کا بڑا حصہ بھی دے دیا۔ اب الحمدللہ یہ رقم محفوظ ہو گئی۔"

انجمن اسلام سے رفعت کے ذیلی عنوان کے تحت دسنوی صاحب لکھتے ہیں: "انجمن اسلام کا نیا دستور ۱۹۴۸ء سے عمل میں آیا' جس کی رو سے میرا انتخاب جنرل سکریٹری کے طور پر ہوا۔ اس وقت سے ۱۹۷۳ء سے جب میں صابو صدیق پالی ٹکنک سے ریٹائر ہوا تو پورے وقت کے لئے جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا۔"

پٹنہ کے ذیلی عنوان کے تحت دسنوی صاحب لکھتے ہیں: "ممبئی سے رخصت ہو کر

۱۲؍اپریل ۱۹۷۷ء کو ہم پٹنہ پہنچے۔ ہم تقریباً ۴۵ سال کے بعد پٹنہ آئے۔ اس لیے امید نہیں تھی کہ یہاں ہمارے جاننے والے ملیں گے۔ پھر تھوڑے ہی دنوں میں یہاں کی ادبی۔ تعلیمی اور ثقافتی زندگی میں اجنبی نہ رہا۔ میرے مضامین اور ریڈیو کے پروگرام کی وجہ سے لوگ غائبانہ طور پر متعارف تھے۔"

اس کے بعد "ہمدرد نگر دلی" کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں: "۱۴؍اکتوبر ۱۹۷۹ء کو پٹنہ میں حکیم صاحب کا تار موصول ہوا کہ دلی پہنچوں۔ چنانچہ ۱۶؍ کو دلی پہنچا تو ایئرپورٹ پر حکیم صاحب خود اور ارشد علی قدوائی (ان کے فنانس کے مشیر) موجود تھے۔ رات تغلق آباد میں ان کے گیسٹ ہاؤس میں گزار دی۔ اگلے دن حکیم صاحب تشریف لائے اور پورے کیمپس کی سیر کرائی۔ اس کے بعد انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہاں میں ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے آجاؤں۔ معقول تنخواہ کے علاوہ چار کمروں کا فلیٹ فرنیچر کے ساتھ تھا۔ میں اسپیش کش کو فوراً قبول نہ کرسکا۔ اولاً کام کی نوعیت میرے لیے نئی تھی۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد آزادانہ زندگی گزارنے لگا تھا۔ اب یہ دوبارہ پابندی عائد ہوجائے گی۔ لیکن بالآخر موصوف نے اس نئی ذمہ داری کو قبول کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی دسنوی صاحب کی خودنوشت کا "حرف آخر بھی آگیا۔ موصوف لکھتے ہیں: "اس داستان کو کہیں تو ختم ہونا تھا۔ کہنے کی جتنی باتیں تھیں۔ بہت کچھ کہہ چکا اور بہت کچھ باقی بھی ہیں۔ زندگی کی ۷۸ منزلیں طے کرنے کے بعد اب اس کی امید نہیں کہ اور کوئی کام انجام پائے جس کی اس داستان میں گنجائش نکلے۔ البتہ ایک بات اور رہ گئی ہے جو دوسروں کے لکھنے کی ہے۔ اس کا وقت کب آئے گا' نہیں کہا جاسکتا ہے۔" راقم الحروف کا کہنا ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے۔ چنانچہ ۵؍اپریل کے قومی آواز میں یہ افسوسناک اور رنج دہ خبر شائع ہوئی ہے:

"سید شہاب الدین کی وفات پر جامعہ ہمدرد میں اظہار رنج و غم۔ جس کی تفصیل یوں ہے: "پٹنہ ۴؍اپریل ۱۹۹۸ء ہندستان کے نامور معلم۔ اردو کے ادیب اور منتظم سید شہاب الدین دسنوی صاحب کا ۳۰؍مارچ کو رات میں ۱۰ بجے پٹنہ میں انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۹۰ برس کے قریب تھی۔"

غالبیات

تلامذۂ غالب	مالک رام	75/
فسانۂ غالب	مالک رام	16/50
یادگار غالب (اردو) مرتبہ مالک رام		30/
یادگار غالب (فارسی)	مالک رام	9/
گفتار غالب	مالک رام	48/
احوال غالب	پروفیسر مختار الدین احمد	45/
غالب کچھ مضامین	ڈاکٹر خلیق انجم	40/
غالب کے خطوط (اول)	ڈاکٹر خلیق انجم	120/
غالب کے خطوط (دوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	120/
غالب کے خطوط (سوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	75/
غالب کے خطوط (چہارم)	ڈاکٹر خلیق انجم	120/
غالب اور شاہان تیموریہ	ڈاکٹر خلیق انجم	9/50
عظمت غالب	ڈاکٹر عبد المغنی	35/
غالب پر چند تحریریں	ڈاکٹر سعادت علی صدیقی	35/
غالب	ڈاکٹر خورشید الاسلام	40/
غالب تقلید اور اجتہاد	خورشید الاسلام	30/
غالب اور انقلاب ستاون	ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	60/
غزلیات غالب (اردو)	یوسف حسین خاں	95/
پرشین غزل آف غالب	یوسف حسین خاں	250/
تفتہ اور غالب	ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری	35/
دیوان غالب	نور الحسن نقوی	35/
دیوان غالب	ایوان غالب	50/
غالب اور ذکا	ضیاء الدین احمد شکیب	6/
غالب اور سرور	ایم۔ حبیب خاں	25/
غالب سے اقبال تک	ایم حبیب خاں	25/
غالب اور صفیر بلگرامی	مشفق خواجہ	36/
غالب اور فن تنقید	اخلاق حسین عارف	25/
دیوان غالب	غالب اکیڈمی	150/
تفہیم غالب	شمس الرحمٰن فاروقی	90/

انتخاب اردو کلیات غالب	شمس الرحمٰن فاروقی	90/
غالب اور تصوف	سید محمد مصطفیٰ صابری	60/
غالب کی رہگذر	واجد سحری	35/
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	25/
غالبیات اور ہم	ڈاکٹر ابو محمد سحر	50/
جوہر آئینہ (جائزہ کلام غالب)	طالب کشمیری	25/
بین الاقوامی سمینار	یوسف حسین خاں	20/
انتخاب مضامین غالب نامہ تحقیقات	پروفیسر نذیر احمد	150/
نقد قاطع برہان	پروفیسر نذیر احمد	60/
غالب پر چند تحقیقی مطالعے	پروفیسر نذیر احمد	60/
غالب احوال و آثار	حنیف نقوی	60/
مثنویات غالب (فارسی) اردو ترجمہ	ڈاکٹر ظ۔ انصاری	60/
نادرات غالب	سید آفاق حسین آفاقی	30/
ریختہ غالب	نور الحسن ہاشمی	5/
فیضان غالب	عرش ملسیانی	22/
یادگار غالب۔ ایک جائزہ	سید حیدر عباس رضوی	8/
دیوان غالب (ہندی)	ثاقب صدیقی نفیس احمد	80/
غالب اردو غزل	ڈاکٹر یعقوب مرزا	90/
غالب اور اردو غزل	عبد الرحمٰن عباسی چڑیاکوٹی	100/
شرح دیوان غالب	یوسف سلیم چشتی	125/
غالب کون ہے	سید محمد مہدی	8/50
انشائے غالب	رشید حسن خاں	60/
گفتۂ غالب	ڈاکٹر محمد سیادت نقوی	60/
غالب پر چند مقالے	پروفیسر نذیر احمد	60/
انتخاب مضامین غالب نامہ تنقیدات	پروفیسر نذیر احمد	100/
دیوان غالب جدید	(نسخہ حمیدیہ)	32/
غالب کے چند نقاد	سلیمان اطہر جاوید	60/
غالب کی بعض تصانیف	کالی داس گپتا رضا	80/
توضیحی اشاریہ غالب نامہ	فاروق انصاری	60/
غالب کی شناخت	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	80/
غالب کی آپ بیتی (اردو)	پروفیسر نثار احمد فاروقی	40/

ادبی تہذیبی خبریں

انجمن طلبائے قدیم کے اہتمام میں سمپوزیم

جامعہ انجمن طلبائے قدیم کے اہتمام میں اردو استادوں کے مدرسہ کے اولین اور سابق پرنسپل ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب کی صدارت میں ۸/مارچ کو یوم آزادی ۱۵/اگست ۱۹۴۷ کے حوالے سے ایک سمپوزیم منعقد ہوا، جس کا آغاز کلام پاک کی تلاوت سے ہوا۔ سب سے پہلے انجمن کے سکریٹری اور شعبہ تاریخ کے پروفیسر سید جمال الدین صاحب نے حاضرین جلسہ کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد سمپوزیم کے ڈائرکٹر پروفیسر مجیب اشرف صاحب نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے سب سے پہلے مختصر طور پر موضوع کا تعارف کرایا۔ بعد ازاں حسب ذیل حضرات نے مختصر مقالے پڑھے۔

جامعہ کے قدیم طالب علم محمد طالب صاحب نے ۱۹۴۷ء کے فسادات اور جامعہ کے عنوان سے جامعہ کے سابق استاد مرحوم عبدالغفار مدھولی صاحب کے مشاہدات کی روشنی میں مقالہ پڑھا۔ اس کے بعد عبداللطیف اعظمی، پروفیسر عبدالحلیم ندوی، خواجہ حسن ثانی نظامی، جناب منظور عبدالرحمٰن، جناب ستیندر ناتھ، پروفیسر شکیل اختر، جناب غلام حیدر اور اسرار جامعی نے مقالے پڑھے۔ آخر میں ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب نے کلمات صدارت سے نوازا اور پروفیسر سید جمال الدین کے شکریے پر جلسہ ختم ہوا۔

مجروح سلطان پوری کو ولی دکنی ایوارڈ

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے 96-1995ء کا ولی دکنی قومی ایوارڈ اردو کے ممتاز شاعر جناب مجروح سلطان پوری کو دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا، جس کا جلسہ تقسیم انعامات ناگپور میں منعقد کیا گیا تھا، اپنی علالت کے سبب وہ اس پروگرام میں شرکت نہیں کر سکے تھے، 21/ مارچ 98ء کو وزیر ثقافتی امور و صدر اردو اکادمی شری پرمود نولکر کے ہاتھوں یہ ایوارڈ جناب مجروح سلطان پوری کو ان کی رہائش گاہ پر پیش کیا گیا، اس موقع پر انھوں نے مجروح صاحب کو ٹرافی، سند، شال گل دستہ کے علاوہ تیس ہزار روپے کا چیک بھی پیش کیا، مجروح سلطان پوری نے اس اعزاز پر اپنی مسرت و اطمینان کا اظہار کیا، اس مبارک موقع پر ممتاز موسیقار نوشاد علی، سیکرٹری ثقافتی امور شریمتی ستیہ نارائن اردو اکادمی کے کارگزار صدر ڈاکٹر عبدالستار دلوی، ڈائرکٹر کلچر، جناب نذیر پٹیل اور دوسرے عہدے داران شریک تھے۔

بھوپال کے بابائے صحافت حکیم سید قمرالحسن

مدھیہ پردیش ارو اکادمی نے اپنے مستقل پروگرام "یادرفتگاں" میں بھوپال کے بابائے صحافت حکیم سید قمرالحسن کو یاد کیا۔ اس

جلسہ کے مہمانانِ خصوصی جگن ناتھ آزاد اور اختر سعید خاں تھے جبکہ صدارت عزیز قریشی نے کی۔

حکیم صاحب مرحوم نے روزنامہ "قدیم" کے ذریعہ اردو صحافت کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ مقررین نے انھیں اردو تہذیب کا نمایندہ اور اس نسل سے تعلق رکھنے والا صحافی قرار دیا جس نے مولانا آزاد، عبدالماجد دریا بادی اور ظفر علی خاں کے ساتھ اپنی شناخت رکھی ہے۔ حکیم صاحب کی نثر نگاری کو ان کی تصنیف "نگارشات" کے حوالے سے یاد کیا گیا۔ تقریب کا آغاز قمرالحسن صاحب کی ایک تحریر کو پڑھ کر کیا گیا۔ اردو اکادمی کے سکریٹری آفاق احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقع پر حکیم صاحب کے صاحب اوگان عارف حسن، نورالحسن پرویز مینیجنگ ایڈیٹر ندیم اور صاحبزادی شاہدہ حسن کے علاوہ کافی تعداد میں صحافی، ادیب اور شاعر موجود تھے۔

ڈاکٹر یونس اگاسکر اردو بورڈ آف اسٹڈیز کے چیئرمین

گزشتہ دنوں ممبئی یونیورسٹی نے اردو مراٹھی کے ادیب ڈاکٹر یونس اگاسکر کو اردو بورڈ آف اسٹڈیز کا چیئرمین نامزد کیا ہے۔ اس نامزدگی کے ساتھ انھیں یونیورسٹی کی دو اہم انتظامی مجلسوں۔ ایک اکیڈمک کونسل اور دوسری فیکلٹی آف آرٹس کی رکنیت بھی تفویض ہوئی ہے۔

کویت میں تیلگو شاعر ہرش وردھن کے اعزاز میں الوداعی تقریب و مشاعرہ

تیلگو زبان کے معروف شاعروی۔ ہرش وردھن جو کویت میں انڈیا کی انشورنس کمپنی کے منیجر بھی ہیں اور مستقل طور پر وطن واپس جارہے ہیں، کے اعزاز میں ایک الوداعی تقریب و مشاعرہ اردو کے معروف کہانی کار، شاعر اور مراٹھی کے پہلے مترجم نور پرکار کے زیر اہتمام انور قادری کی رہائش گاہ سالمیہ پر منعقد کیا گیا۔ مہمان خصوصی کویت خانہ ہند کے قونصلر عزیزالدین احمد عثمانی تھے جبکہ صدارت کا فریضہ کویت ٹائمز کے اردو ایڈیٹر سعید صفدر نے انجام دیا۔ نظامت کے فرائض نور پرکار نے انجام دیے۔ دوران مشاعرہ وہ شعراء اور سامعین ہر دو کی دلچسپی برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ نور پرکار ہر آنے والے کی حوصلہ افزائی ہر جانے والے کو الوداع کہنے کی روایت رکھتے ہیں۔ ہرش وردھن نے تیلگو ادب و روایات کو ہندستانی عوام کے سامنے پیش کر کے ایک مثال قائم کی ہے۔ وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ سعید صفدر اور عزیز الدن احمد عثمانی نے جہاں ہرش وردھن کی خدمات کو سراہا، وہیں مشاعرہ کے نظم و ضبط خدمت و احترام و پرتکلیف عشائیے کی بھرپور تعریف کی۔ ہرش وردھن نے اپنی مختصر گفتگو میں شرکاء محفل اور میزبان انور قادری کا شکریہ ادا کیا اور اردو زبان کے حسن پر گفتگو کی۔ یہ خوبصورت ادبی نشست

نصف شب کے اختتام کو پہنچی۔ تقریب مشاعرہ میں جن شعراء نے اپنا کلام پیش کیا' ان میں باقی احمد پوری' نور پرکار' مسرت حسین زیبا' اسلم عمادی' محمد کمال اظہر' محمد علی وفا' جسبیر سنگھ دیمان' سعید روشن' رشید میواتی یو۔ اس' شرملا ارونہ رینا' افتخار شہزاد اعظمی' منور کانپوری' عمر حیات رضوی' ایوب راز' مدثر غلام رسول' نظر اکبر بریلوی اور غزالہ بانو کے نام قابل ذکر ہیں۔ بطور یادگار ہرش وردھن کو انور قادری اور نور پرکار کی جانب سے ایک ادبی شال بھی پیش کی گئی۔

دہلی اُردو اکادمی کی جانب سے نامی انصاری کے اعزاز میں جلسہ

دہلی اُردو اکادمی کی جانب سے ممتاز ادیب نامی انصاری کی دلّی آمد پر اکادمی کے آڈیٹوریم میں ایک خصوصی جلسہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس جلسے میں نامی انصاری نے غالب کے فنِ گفتگو پر اپنا مقالہ پیش کیا جس میں غالب کے خطوط کے حوالے سے ان کے اندازِ گفتگو کے مختلف اسالیب پر سیر حاصل بحث کی گئی۔ اس موقعے پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نامی انصاری کی نئی کتاب "آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح" کی رونمائی کی رسم بھی انجام دی۔ پروفیسر نارنگ نے طنز و مزاح کی روایات کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب کے مندرجات پر اظہار خیال کیا اور کہا کہ اس موضوع پر نامی انصاری نے پہلی کتاب پیش کی ہے کیونکہ ہندو پاک میں ابھی تک اس موضوع پر تاحال کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ نامی انصاری نے اپنا نقطۂ نظر مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان کا اسلوب بھی بہت جاندار اور طرح دار ہے۔

شرکاء جلسہ میں پروفیسر شریف' پروفیسر عبدالحق' مجتبیٰ حسین' انوار احمد خاں' پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو' شاہد ماہلی' نور جہاں ثروت' بسمل ساحنی' کیول سوری وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آخر میں مخمور سعیدی نے صدر جناب نامی انصاری اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

بل بھیم کالج' بیڑ میں ہمہ لسانی مشاعرہ

بزم اردو ادب بل بھیم آرٹس' سائنس وکامرس کالج' بیڑ کے زیر اہتمام مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے تعاون سے ۲۲؍مارچ ۹۸ء کو چار بجے سہ پہر کالج کے سیمینار ہال میں ایک ہمہ لسانی مشاعرے کا انعقاد ہوا۔

وائس پرنسپل ڈی۔ بی۔ گور صاحب نے چھ زبانوں کے اس منفرد مشاعرے کی صدارت فرمائی۔ مہمانِ خصوصی تھے۔ این کشور صاحب جنھوں نے اپنے خصوصی خطاب میں کہا کہ ہمارے ملک میں زبانوں کے اختلاف اور کثرت کے باوجود ہمارے جذبات کی زبان ایک ہے۔ انھوں نے اس طرح کے پروگرام کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کیا اور تلنگی میں اپنی دلچسپ

نظم سناتے ہوئے مراٹھی میں اس کی وضاحت بھی کی۔ پروفیسر تلنگے اور مس جیوتی کلیان کرنے اپنی مراٹھی کویتائیں پیش کیں۔ ہندی کے کوی تھے ڈاکٹر ہیمنت پاٹل۔ ڈاکٹر شکانت نرمل نے اپنی انگریزی پوئمس سنائیں۔ سنسکرت میں پروفیسر کے۔ اے گوفرے نے اپنی مترنم رچنائیں پیش کیں اور مراٹھی میں ان کا مطلب بھی مختصراً واضح کیا۔ پروفیسر سید سجاد اختر اور پروفیسر شاہ حسین نہری نے اپنی اردو تخلیقات سے سامعین کو محظوظ کیا۔

ڈی۔ بی۔ گور صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ پچھلی دو دہائیوں سے زیادہ کے عرصے سے بل بھیم کالج میں اردو کے مختلف بڑے اور اچھے پروگرام ہوتے رہے ہیں۔ ہمہ لسانی مشاعرے کی یہ تقریب بھی ایک شاندار اور دلچسپ تجربہ ہے۔ شعبۂ اردو کو اس منفرد پروگرام کے انعقاد پر انھوں نے بطور خاص مبارک باد دی۔ اس دلچسپ اور منفرد تجربے کو باذوق سامعین نے بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، بہت لطف اندوز ہوئے اور داد و تحسین کے پھول برسائے۔

بل بھیم کالج کے شعبۂ اردو کے لیکچرر اور بزم اردو ادب کے نگران شاہ حسین نہری صاحب نے نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے اور آخر میں صدر مشاعرہ، مہمانِ خصوصی، شعراء، سامعین، دیگر معاونین اور اردو اکادمی کا شکریہ ادا کیا۔

کویت میں اپکار کا سالانہ معیاری مشاعرہ

کویت میں ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے معروف ہندوستانی تنظیم اپکار کے زیر اہتمام گذشتہ ہفتے سفارت خانہ ہند کے آڈیٹوریم میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس کی صدارت معروف کہانی کار ڈاکٹر عمر بیگ نے کی۔ جبکہ معروف ماہر تعلیم اور سکالر محترمہ ڈاکٹر صالحہ جواد موسیٰ تھیں۔ اپکار کے نائب صدر منظر عالم نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ سفارت خانہ ہند کے قونصلر عزیز الدین احمد عثمانی نے علم و ادب کے حوالے سے جو باتیں کیں وہ بے حد سراہی گئیں۔ مہمانِ خصوصی محترمہ ڈاکٹر صالحہ جواد موسیٰ نے اپکار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اپکار نے شعر کہنے سننے کی راہ ہموار کی۔ اس کامیاب مشاعرے کی نظامت اپکار کے روایتی ناظم معروف کہانی کار شاعر اور مراٹھی کے پہلے مترجم نور پرکار نے کی۔ وہ اپنے سابقہ اطوار اور طرز ادا سے اس مشاعرے کو خوب نبھا گئے۔ ادبی حوالوں سے ان کے برجستہ جملے شعروں کے انتخاب اور صوتی آہنگ نے سماں باندھ دیا۔ شاعروں کا بھرپور تعارف نور پرکار کا خاصہ رہا ہے۔ اس مشاعرے میں سامعین کی کثیر تعداد موجود تھی۔ اس مشاعرے میں جن شعراء نے اپنا کلام پیش کیا ان میں نور پرکار، عبداللہ ساجد، ایوب قاسم کرجگر، اسلم عمادی، عامر قدوائی، مظہر عالم، جسبیر سنگھ دھیمان، محمد علی وفا، حشمت اللہ شاہین، عنبر فتحپوری، سعید روشن، نظر اکبر

بریلوی، ڈاکٹر اردو مدہینا، سید قمر منظور اور حقی فرید آبادی کے نام شامل ہیں۔

آخر میں صدر مشاعرہ جناب عمر بیگ نے پیش کیے گیے اشعار کی تعریف کرتے ہوئے مشاعرے کی روایت کو جاری رکھنے کی تاکید کی۔

جیلانی بانو اور انتظار حسین کو مجلس فروغ اردو ایوارڈ

اردو کی ممتاز ہندوستانی ادیبہ جیلانی بانو کو اس سال اردو کے سب سے بڑے ادبی انعام' مجلس فروغ اردو ایوارڈ' کے لیے منتخب کیا ہے۔ محترمہ جیلانی بانو کو یہ ایوارڈ ان کی گراں قدر ادبی خدمات کے لیے دیا جارہا ہے۔ پاکستان کے مشہور ناول نگار انتظار حسین کو بھی اس ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں آج یہاں یہ اعلان ایوارڈ کو آرڈینیٹر برائے ہندوستان ادریس دہلوی نے کیا۔

یہ ایوارڈ آج سے دو سال قبل مجلس فروغ اردو ادب (دوحہ) نے اردو زبان اور ادب کے فروغ کے لیے قائم کیا تھا۔ اس سال ایوارڈ کی رقم بڑھادی گئی ہے۔ دونوں انعام یافتگان کو ایک لاکھ ۲۵ ہزار روپے اور طلائی تمغے دیے جائیں گے۔ یہ ایوارڈ اس سال ۷ ستمبر کو اردو کی ممتاز ادبی شخصیتوں، سفیروں اور دیگر اہم شخصیات کی موجودگی میں پیش کیا جائے گا۔

محترمہ جیلانی بانو کو ایوارڈ دینے کا فیصلہ اردو ادیبوں کے ایک پینل نے کیا جس کے سر براہ پروفیسر گوپی چند نارنگ تھے۔ پینل کے دوسرے اراکین میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور مسٹر ادریس دہلی شامل تھے۔ ایک دوسرے پینل نے جو پاکستانی ادیبوں پر مشتمل تھا انتظار حسین کا انتخاب کیا۔

محترمہ جیلانی بانو ۱۴ جولائی ۱۹۳۶ کو پیدا ہوئیں اور بہت کم عمری میں ہی افسانے اور ناول لکھنے شروع کر دیے ان کی اب تک ۱۸ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

مجلس فروغ اردو ایوارڈ ۱۹۹۶ میں آل احمد سرور (ہندوستان) اور احمد ندیم قاسمی (پاکستان) کو دیا گیا تھا۔

دہلی یونیورسٹی میں فخر زماں کے اعزاز میں ایک جلسہ

شعبۂ اردو' دہلی یونیورسٹی میں ۱۸ ر فروری ۱۹۹۸ء کو پاکستان کے معروف شاعر اور ناول نگار فخر زماں کے اعزاز میں ایک جلسہ کا انعقاد کیا گیا۔

پروفیسر امیر عارفی نے اپنے تعارفی کلمات میں فرمایا کہ فخر زماں بہ یک وقت ادب اور سیاست دونوں میدانوں میں فعال رہے ہیں۔ انھوں نے پنجابی اور اردو میں شاعری کی ہے۔ اور اہم ناول بھی لکھے ہیں۔ پاکستان کے جدید ناول نگاروں میں انکا نام نمایاں ہے۔ بعد ازاں فخر زماں نے اپنی دل چسپ اور معلوماتی تقریر میں پاکستان کی موجودہ ادبی و سیاسی صورتحال پر روشنی ڈالی۔

فخر زماں کی تقریر کے بعد سوال و

جواب کا سلسلہ شروع ہوا جس میں پروفیسر امیر عارفی، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر خالد اشرف نے شرکت کی۔

پروفیسر عتیق اللہ نے شکریہ کے کلمات ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ احتجاجی ادب کی اپنی جگہ اہمیت ہے لیکن ایسا ادب زندہ نہیں رہتا بلکہ ایسی تخلیق جلد ہی مر جاتی ہے۔ ادب اسی وقت زندہ رہتا ہے جب اس میں جمالیاتی قدروں اور عصری مباحث و مسائل کے ساتھ ساتھ معنوی ابعاد کا بھی خیال رکھا جایے۔ انھوں نے مہمان محترم کے علاوہ دیگر شرکا کا شکریہ ادا کیا اور بعد ازاں جلسہ اختتام کو پہنچا۔ اس جلسے میں پروفیسر صادق، ڈاکٹر فرحت فاطمہ، ڈاکٹر نگہت ریحانہ خاں، ڈاکٹر خواجہ اکرام، ڈاکٹر رضی الرحمٰن اور جناب مولا بخش کے علاوہ اسکالرز اور طلبہ نے شرکت کی۔

"دلی حرف حرف چہرے" دلی کی تاریخی دستاویز ہے

انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام گزشتہ شام مولوی عبدالحق اڈیٹوریم میں عظیم اختر کی تازہ ترین تصنیف "دلی حرف حرف چہرے" پر ایک مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں شہر کے متعدد ادبی سیاسی و سماجی شخصیتوں، صحافیوں، نوجوانوں اور بزرگ قلم کاروں نے شرکت کی اور عظیم اختر کے فن اور ان کی کتاب پر اظہار خیال کیا۔ مذاکرے کی صدارت بزرگ محقق و نقاد پروفیسر تنویر علوی نے کی، انھوں نے کہا کہ عظیم اختر کے خاکے اتنے اچھے ہیں کہ یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اردو ادب کو ایک نیا خاکہ نگار مل گیا ہے۔ انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے شرکائے مذاکرہ کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ عظیم اختر کی نئی کتاب "دلی حرف حرف چہرے" دلی کی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے نقطہ نظر سے ایک اہم کتاب ہے اور اس پر کھل کر اظہار خیال کرنا ضروری ہے۔ مذاکرے کی ابتداء میں عظیم اختر نے کتاب میں شامل ایک خاکہ بعنوان "بھائی تقو" پڑھ کر سنایا۔ جس کی نشتریت کو سامعین نے کافی پسند کیا۔ اظہار اثر نے عظیم اختر کے خاکوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ خاکہ لکھنا بہت مشکل کام ہے اسی لیے عام قلم کار اس صنف میں قدم رکھنے سے کتراتے ہیں۔ لیکن عظیم اختر نے زندہ شخصیتوں پر خاکے لکھ کر خاکے کا حق ادا کیا ہے۔

دلی وقف بورڈ کے چیئرمین سراج پراچہ کا خیال تھا کہ عظیم اختر نے متعدد خاکوں میں اس خوبصورتی سے چٹکیاں لی ہیں کہ صاحب خاکہ کو اس چٹکی کا احساس تک نہیں ہوتا، ہفت روزہ دلی سوسائٹی کے مدیر سعید خاں نے ادیبوں اور شاعروں سے شکوہ کیا کہ دہلی یعنی شاہ جہاں آباد کا مخصوص تعمیراتی نقشہ تباہ و برباد کیا جارہا ہے لیکن وہ خاموش ہیں۔ صحافی نور جہاں ثروت نے کتاب کے پیش لفظ سے عظیم اختر کے الفاظ کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ خاکے حرف آخر

نہیں ہیں۔ دلی کے تئیں قرض چکانے کی ایک کوشش اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے آپ کی تہذیبی سماجی اور ثقافتی زندگی کی تاریخ قلم بند کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

ماہنامہ "فلمی ستارے" کے مدیر حاجی انیس دہلوی کا خیال تھا کہ عظیم اختر کے ان خاکوں کی قدر و منزلت کا احساس شاید آج نہ ہو لیکن اگلے بیس سالوں کے بعد ادب کے قارئین کو ان خاکوں کی اہمیت کا احساس ہوگا۔ ذاکر حسین کالج کے استاد ڈاکٹر محمود فیاض ہاشمی نے کہا کہ ان خاکوں میں واقعات اور خیالات کی تکرار گراں گزرتی ہے۔ جلسہ میں قاسم سید، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ڈاکٹر صلاح الدین اور دوسروں نے بھی کتاب کی ستائش کی۔

جواہر ہائی اسکول کھنڈوہ میں عید ملن

حال ہی میں جواہر ہائی اسکول کھنڈوہ میں عید ملن کی تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ صدارت صدر جواہر ایجوکیشن سوسائٹی شری تروِن کمار ناگڑا نے فرمائی جبکہ بوہرا جماعت کے عامل عالی جناب طاہر بھائی گودھرا والا بطور مہمان خصوصی شریک رہے۔

اس پر مسرت موقع پر شری ناگڑا جی نے قاضی حسن رضا صاحب کو ان کی کتاب میثاق کو مغربی بنگال اردو اکادمی کا انعام پانے پر شال اور شری پھل دے کر اعزاز کیا۔ اسی طرح طاہر بھائی کو ڈاکٹر منیش مشرا (صدر انجمن ترقی اردو کھنڈوا) نے اسماعیل جوہر کو عظیم ہاشم صاحب نے شالیں پیش کر کے ان کے اعزاز کیے۔ اسماعیل جوہر صاحب نے اپنے والد مرحوم عبدالقادر صاحب کے نام پر ۵۵۵۲ روپے نیز اپنے مرحوم بھتیجے برہان الدین حسین کے نام پر ۵۵۵۲ روپے اسی طرح حاجی شیخ منصور صاحب نے نماز میڈیکل ایجنسی کی جانب سے ۱۱۰۰ روپے کے عطیات جواہر ہائی اسکول کی تعمیر و ترقی کے لیے دیے۔

عید کے موضوع پر جن حضرات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ان میں نیشنل ایوارڈ یافتہ پرنسپل قاضی حسن رضا۔ شریمتی کملا راؤت، ایڈوکیٹ عبدالشکور، گوپی ناتھ کال بھور اور صحافی کیلاش پالیوال قابل ذکر ہیں۔ نظامت حبیب عالم صاحب پرنسپل اسکول ہذا نے فرمائی جبکہ ڈاکٹر منیش برا نے شکریے کی رسم انجام دی۔

قمر حیات کا شاندار استقبال

ناگپور (بذریعہ ڈاک) "رنگ دھنک" ناگپور کی علمی ادبی و ثقافتی ادارے کے زیر اہتمام سہ روزہ تقاریب کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحی تقریب گاندھی اسمارک بجاج نگر ناگپور میں منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت ڈاکٹر بھانجی بھائی پانکر صاحب نے فرمائی ناگپور کے میئر جناب دیورسندر فڑنویس صاحب مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک جلسہ تھے۔

اس موقع پر جناب محمد قمر حیات صاحب کا استقبال بھی کیا گیا مراٹھی حلقوں میں

اردو کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے موصوف کی خدمت میں ادارے نے ایک شال اور میمنٹو پیش کر کے ان کا استقبال کیا۔

واضح ہو کہ گذشتہ ۱۸ر دسمبر ۹۷ء کو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے جلسہ تقسیم انعامات میں وزیر اعلیٰ مہاراشٹر مرلی منوہر جوشی صاحب نے قمر حیات کی اردو خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے "اسپیشل ایوارڈ" سے نوازا۔ یہ ایوارڈ ۲۵ ہزار روپیے اور ایک میمنٹو پر مشتمل ہے۔

اسلامک اسٹڈیز طلبا کے لیے قومی ورکشاپ ضروری

عصری تناظر میں اسلامک اسٹڈیز پر کتابوں کی کمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، ہندستان بھر کی جامعات میں اسلامک اسٹڈیز کے طلبا و طالبات کی درسی ضرورتوں کے لیے ایسی کتابوں کی تصنیف، تالیف اور ترجمہ کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام ایک ورکشاپ منعقد کیے جانے کی خواہاں ہے جہاں ملک بھر کے اہم ترین عالم اور استاد سر جوڑ کر بیٹھیں اور موضوعات و نوادر کتب کی طرف رہنمائی کریں۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے آج یہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے اساتذہ طلباء اور طالبات کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔

اس سے قبل شعبہ کے صدر پروفیسر اختر الواسع نے اردو زبان میں اسلامک اسٹڈیز کے طلبا و طالبات اور عام قاری کے استفادے کے لیے اسلامک اسٹڈیز میں مختلف موضوعات اور بالخصوص عصری تناظر میں کتابوں کی کمی کی طرف توجہ دلائی۔ فیکلٹی آف ہیومنٹز اینڈ لینگویجز کے ڈین پروفیسر عماد الحسن آزاد فاروقی نے اسلامک اسٹڈیز کے تحت مطالعہ کی نہج اور موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اسلام کی مذہبی تعلیمات کے ساتھ مسلمانوں کے تہذیبی و ثقافتی ورثے اور ان علمی خدمات سب کا احاطہ اسلامک اسٹڈیز کا مضمون کرتا ہے۔

پروفیسر اختر الواسع نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کو یقین دلایا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر کی منظوری کے بعد شعبہ اسلامک اسٹڈیز مطالعات اسلامی کے سلسلے میں کتابوں کی تیاری کے لیے ایک کل ہند ورکشاپ ضرور منعقد کرلے گا۔ اس جلسے کے اہم شرکاء میں طلباء و طالبات کے علاوہ ڈاکٹر رضی احمد کمال، ڈاکٹر اقتدار محمد خاں مسٹر محمد اسحٰق، ڈاکٹر فریدہ خانم، ڈاکٹر سید شاہد علی اور ڈاکٹر صفیہ عامر کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اردو اکادمی باجپئی کی سوانح عمری شائع کرے گی

دلی اردو اکادمی جلد ہی وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی کی سوانح عمری اردو میں شائع

کرے گی۔ اور ۱۵ ر اگست کو ایک شاندار تقریب کے دوران یہ کتاب وزیر اعظم کو پیش کی جائے گی۔ یہ فیصلہ دلی اردو اکادمی کی نئی تشکیل شدہ گورننگ کونسل کی میٹنگ میں کیا گیا جس کی صدارت اکادمی کے چیئرمین اور وزیر اعلا مسٹر صاحب سنگھ نے کی۔

اردو اکادمی کے اردو ٹیچروں کو موسم گرما کی چھٹیوں کے دوران بھی تنخواہیں دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ تجویز مسٹر ہارون یوسف نے رکھی تھی جو وزیر اعلا صاحب سنگھ کو پسند آئی۔

اردو اکادمی کے ڈپٹی چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تجویز بخوشی منظور کرتے ہوئے وزیر اعلا نے اکادمی کے سالانہ بجٹ میں ۲۵ فیصد کے اضافہ کا اعلان کیا ہے۔ گزشتہ برس اردو اکادمی کا کل سالانہ بجٹ (پلان اور نان پلان) تقریباً سوا کروڑ روپے تھا۔

اترپردیش اردو اکادمی کی گولڈن جبلی

اترپردیش اردو اکادمی کی مجلس انتظامیہ کا ایک جلسہ ۳۰ ر مارچ کو اردو اکادمی میں منعقد ہوا۔ چیرپرسن نے کہا کہ سب سے بڑا اور اہم کام یہ ہوا کہ آزادی کی پچاسویں سالگرہ تقریبات کے سلسلے میں حکومت سے چار کتابوں قومی شاعری، قومی نظمیں، آزادی سے متعلق مضامین کا انتخاب کی اشاعت کے لیے حکومت نے بہت کم وقت میں شائع کرنے کی امداد ۲ لاکھ روپیہ منظور کی۔ جنگی پیمانے پر اس کام کی تکمیل کی گئی اور کتابیں پریس بھیج دی گئیں ہیں۔

ڈاکٹر شمیم رضوی نے اراکین کو یہ اطلاع دی کہ اترپردیش اردو اکادمی کی سلور جبلی تقریبات کے لیے حکومت نے دس لاکھ روپے کی رقم منظور کر دی ہے جس کے افتتاح کے لیے وزیر اعظم ہند سے ۱۰ مئی کی تاریخ مانگی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس موقع پر آل انڈیا اردو اکادمیوں کی کانفرنس، شام افسانہ، خواتین کا مشاعرہ، سیمینار اور ڈراما کا بھی انعقاد اپریل تا جون میں کیا جائے گا۔

پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر اختر بستوی، ڈاکٹر انیس اشفاق، ڈاکٹر ایم۔ آر خان آفریدی، ڈاکٹر ممتاز عرش، ڈاکٹر اے۔ اے صدیقی، ڈاکٹر فہمیدہ خاں، ڈاکٹر انور رضوی ڈاکٹر مہیندر ناتھ اشک، جناب صادق علی، جناب راز اعظمی، ڈائرکٹر اردو اور سکریٹری اردو اکادمی۔

اردو اکادمی دہلی کا سب سے بڑا ایوارڈ شہریار کو

شجاع خاور، پیغام آفاقی اور جی ڈی چندن بھی اعزاز والوں میں شامل

دہلی اردو اکادمی کی جانب سے ۹۸۔ ۱۹۹۷ کا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ اردو کے ممتاز شاعر شہریار کو دیا گیا ہے۔ اس کا اعلان آج اکادمی کے ایک پریس نوٹ میں کیا گیا یہ کل ہند نوعیت کا ایوارڈ ہے جو ۵۱ ہزار روپے، ایک شال اور ایک ٹرافی پر مشتمل ہے اس کے علاوہ شاعری کا ایوارڈ

منفرد لب ولہجہ کے شاعر شجاع خاور کو اور اردو فکشن کا پیغام آفاقی اردو صحافت کا ایوارڈ جی ڈی چندن کو، تنقید و تحقیق کا ایوارڈ جگدیش چندر ودھاون کو اور بہترین استاد کا ایوارڈ محمد فیروز خاں کو دیا گیا ہے یہ پانچوں ایوارڈ ۲۱ ہزار روپے فی کس، شال اور ٹرافی پر مشتمل ہیں۔ بقیہ ایوارڈ گیارہ گیارہ ہزار روپے کے ہیں، سائنس ادب کا ایوارڈ اظہار اثر کو، ترجمے کا خصوصی ایوارڈ کے سی کانڈا کو، اردو خطاطی کا ایوارڈ فیض محمد (آرٹسٹ) کو دینے کا اعلان ہوا ہے۔

بہترین ناشر کے لیے منشی نول کشور ایوارڈ انجمن ترقی اردو (ہند) کو دیا گیا۔ اکادمی کی گورننگ کونسل نے ۱۹۹۷ کی ۷ نئی کتابوں کو بھی انعامات کے لیے منتخب کیا۔ یہ انعامات ۵۱ سو اور ۲۵ سو روپے کے ہیں انعامات کے لیے جو کتابیں منتخب کی گئیں وہ یہ ہیں۔

۵۱ سو روپے

(۱) روشن دل، محمد یوسف پاپا (۲) دارا شکوہ، محمود علی (۳) حالات و خدمات مشائخ چشتیہ صابریہ، رضی احمد کمال (۴) میراث ہنر، قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی (۵) اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل، ممتاز الحق (۶) صادق الخیری، ڈاکٹر ظل ہما (۷) تشخیص الامراض، شمس الآفاق (۸) وصال موسم، شہباز ندیم (۹) حیات البشیر مجیب اشرف (۱۰) غالب کی شناخت کمال احمد صدیقی (۱۱) قدم بہ قدم، حاجی انیس دہلوی

۲۵ سو روپے

(۱۲) سائنسی شعاعیں۔ ڈاکٹر احرار حسین، (۱۳) تعلیم و تربیت محمد اکرام خان (۱۴) خار و گل اظہر غوری (۱۵) گستاخی معاف نظر برنی (۱۶) الجنیں، عبداللہ ولی بخش قادری (۱۷) حیات سر دیوار، فاروق ارگلی۔

اس کارروائی سے پہلے انھوں نے اکاڈمی کی کتابوں کے نئے ایڈیشنوں کلیات مکاتیب اقبال (جلد چہارم) ڈاکٹر ذاکر حسین میلوں لمبا پل، داغ دہلوی حیات اور کارنامے دہلی کی آخری شمع اردو غزل اور عالم میں انتخاب دلی کی۔ رسم اجرا انجام دی اور اکاڈمی کو اس بنیادی نوعیت کے کام پر مبارک باد دی۔

بزم اردو ادب کا یادگار مشاعرہ

گزشتہ ماہ بتاریخ ۱۹ ر مارچ ۱۹۹۸ء کو اسلامی گائیڈنس سنٹر پورٹ بلیر کے ہال میں، بزم اردو ادب پورٹ بلیر کے زیر اہتمام بھارت کے پچاسویں یوم آزادی کے سلسلہ میں ایک شاندار محفل مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ محترم لفٹنٹ گورنر انڈمان و نیکوبار جناب آئی۔ پی۔ گپتا مہمان خصوصی کی حیثیت سے شمع مشاعرہ روشن کی۔ جناب پی۔ عبدالسلام صدر بزم اردو ادب پورٹ بلیر نے اپنی استقبالیہ تقریر کے ذریعہ بزم اردو ادب پورٹ بلیر کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ مشاعرہ کی نظامت جناب اکبر آفاقی نے انجام دی۔ جن شعرا و شاعرات نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا ان میں، حافظ محمد اسحاق، شمیم احمد شمیم، سکینہ سراج، محمد عیسیٰ پی عبدالسلام

سلام' راز الٰہ آبادی' ہمسر جونپوری' عبدالسلام' محمد اسحاق' وجے کمار شرما' ہریش چندر رائے۔ اور شرر غازی پوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ جناب اکبر آفاقی کے ہدیۂ تشکر کے بعد مشاعرہ نہایت ہی حسن وخوبی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

جامعہ اردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن تشکیل نو

جامعہ اردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن' کی ایک اہم میٹنگ جناب کوثر مظہری کی صدارت میں ہوئی۔ میٹنگ میں نئی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ بہ اتفاق رائے کوثر مظہری کو صدر' تحسین عثمانی کو نائب صدر' اسلم جمشید پوری کو جنرل سکریٹری' ابوالکلام عارف اور شاہ عالم کو جوائنٹ سکریٹری اور نسرین عقیل کو خزانچی منتخب کیا گیا۔

محترمہ شاہانہ ارم' فرزانہ خلیل' سہیلہ محمد ریاض' نجم السحر کو مجلس عاملہ کے اراکین کے طور پر منتخب کیا گیا۔

غیر اردو داں طبقے کو اردو سے روشناس کرانا

یکم اپریل شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی میں پارٹ ٹائم کورسیز کے اختتام پر اردو سرٹیفکٹ کورس ڈپلوما اور ایڈوانس ڈپلوما کے تمام طلبہ و طالبات کے لیے ایک الوداعی نشست ہوئی جس میں شعبہ کے تمام اساتذہ کے علاوہ پروفیسر انصار اللہ نظر اور ساقی نارنگ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ کے ایل ساقی نارنگ ہر سال سرٹیفکٹ ڈپلوما اور ایڈوانس ڈپلوما میں امتیازی نمبروں سے پاس ہونے والے طلبہ و طالبات کو انعام سے نوازتے ہیں اس سال بھی انہوں نے دس انعامات تقسیم کیے اور اب مستقل طور پر ان کورسیز کے طلبا و طالبات کے لیے نارنگ ساقی بک ایوارڈ قائم کرنے کا اعلان کیا اس کے علاوہ پروفیسر عتیق اللہ' پروفیسر شمیم نکہت ڈاکٹر فرحت فاطمہ اور ڈاکٹر علی جاوید کی طرف سے مختلف طلبا و طالبات کو خصوصی انعامات دیے گیے عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدر آباد' جو اردو درس و تدریس اور زبان کے فروغ کے لیے قابل تحسین کام کر رہا ہے اس ٹرسٹ نے جواہر اردو' اودو زبان دانی' پنچ تنتر کی کہانیاں اور اردو قواعد ان کتابوں کے سوسیٹ شعبہ کو ان طلبا کے لیے بھیجے بھیجے پروفیسر امیر عارفی نے تمام طلبا و طالبات کو خصوصی تحفے کے طور پر پیش کیا اور زاہد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" حیدر آباد کا شکریہ ادا کیا۔

مدھیہ پردیش اکیڈمی کے انعامات

بھوپال ۳۰ / مارچ گورنر محمد شفیع قریشی نے آج مقامی ملار موزی سنسکرتی بھون میں اردو ادیبوں کو اعزازی رقم توصیف نامہ اور شال پیش کر کے اعزاز سے نوازا۔ کل ہند میر تقی میر جموں توی کے پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور حکیم الحسن قومی اعزاز روزنامہ ندیم کے مدیر۔ جناب قمر اشفاق (بھوپال) کو دیا گیا تقریب کی صدارت وزیر اعلیٰ دگ وجے سنگھ نے کی صوبائی

انعامات جہاں قدر چغتائی بھوپال کو محمد یوسف قیصر اعزاز جناب حسن ریولی کو سہا مجددی اعزاز مرحوم نسیم بھوپالی کو سراج میر خاں سحر اعزاز پروفیسر آفاق حسین صدیقی اجین نواب صدیق حسن خاں اعزاز ماسٹر عتیق اللہ خاں مجددی برہانپور کو کیف بھوپالی اعزاز اور شری رام پرکاش کپور' درگ کو سمبھودیال سخن اعزاز دیا گیا تقریب میں شب غزل پروگرام بھی پیش کیا گیا تقریب کا انعقاد مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے ذریعہ کیا گیا اور یہ انعامات مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے ذریعے دیے گیے تھے اس موقع پر اپنی تقریر میں گورنر جناب قریشی نے کہا کہ جن لوگوں نے یہ اعزاز حاصل کیا ہے ان سے مدھیہ پردیش اردو اکادمی اور ریاست کی عزت بڑھائی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری ثقافت عظیم ہے جس تہذیب کے لوگ زندہ اور عمل پذیر ہوتے ہیں ان کی زبان کو کوئی تباہ نہیں کر سکتا اور ان کی تہذیب کو نقصان نہیں پہنچایا جاسکتا۔

وزیر اعلی دگ وجے سنگھ نے اعزاز تقریب کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی سرکار ریاست میں اقلیتوں کی بہبود اور اردو زبان کو مقبول بنانے کے لیے پر عزم ہے۔مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے صدر جناب عزیز قریشی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو اکادمی کو مزید سرگرم اور نئی شکل دینے کی ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اردو زبان کے شعبے میں عظیم کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور طلباء کو وہ ساری سہولت دی جائیں جن سے وہ اپنے کو عظیم بنا سکیں۔ اس موقع پر اردو اکیڈمی کے سکریٹری جناب آفاق احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اور مرحوم سراج میر خاں سحر کے پوتے نے ناخون سے بنائی گئی سراج میر خاں سحر کی تصویر گورنر جناب قریشی کو پیش کی جس کو گورنر اور وزیر اعلا نے بہت پسند کیا آخر میں اردو اکادمی کے نائب چیئرمین منوہر کیشو نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

طلعت رضوان کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری

محترمہ طلعت رضوان کو پٹنہ یونیورسیٹی نے ان کے تحقیقی مقالے غبار بھٹی فن اور شخصیت پر پی ایچ ڈی سے نواز نے کا فیصلہ کیا ہے۔ محترمہ طلعت رضوان نے اس مقالے کی تکمیل پروفیسر ممتاز احمد سابق صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسیٹی کی نگرانی میں کی تھی اور اس کے ممتحن پروفیسر گوپی چند نارنگ دہلی یونیورسیٹی اور پروفیسر مظفر حنفی کلکتہ یونیورسیٹی تھے جنہوں نے اپنی رپورٹ میں اس مقالے کی ستائش کی اور اسے پی ایچ ڈی کی سند کے لائق قرار دیا۔

واضح ہو کہ محترمہ طلعت رضوان مشہور صحافی اور ادیب بہار اردو اکیڈمی کے سکریٹری جناب رضوان احمد کی اہلیہ ہیں اور قادر الکلام کہنہ مشق اور منفرد لب ولہجہ کے شاعر مرحوم غبار بھٹی رضوان احمد کے والد تھے۔

جن کے کلام کے نصف درجن مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا آزاد اردو یونیورسٹی تین علاقائی مرکزوں کی منظوری

مرکزی حکومت کی وزارت فروغ انسانی وسائل نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو تین ریجنل سینٹر قائم کرنے کی اجازت دے دی ہے اور اس سلسلے میں ابتدائی گرانٹ بھی منظور ہو گئی ہے۔ یہ مراکز دہلی، پٹنہ اور بنگلور میں قائم کیے جائیں گے۔

پروفیسر جیراجپوری نے کہا کہ ان تین مراکز کے علاوہ بعض دیگر شہروں مثلاً ممبئی بھوپال، علی گڑھ، کلکتہ اور لکھنؤ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے اور یہ کوشش رہے گی کہ حکومت کی طرف سے ان جگہوں پر بھی مراکز قائم کرنے کی اجازت مل جائے تاکہ ان علاقوں کے اردو میڈیم طلبا کو یونیورسٹی سے مستفید ہونے میں زیادہ سے زیادہ آسانی ہو۔

یہ مراکز اپنے علاقوں میں یونی ورسٹی کے پروگرام عام کرنے اور طلبا کو اسٹڈی میٹریل پہنچانے میں کلیدی رول ادا کریں گے اور امید ہے کہ یونیورسٹی کی اس پیش رفت سے اردو کے بڑے طبقے کو فائدہ پہنچے گا۔

ہم غم میں برابر کے شریک ہیں

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق استاد محمد اسماعیل خاں کا انتقال

۱۵ر اپریل۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے تربیت اساتذہ کالج کے سابق استاد اور سابق یونیورسٹی پراکٹر محمد اسماعیل خاں کا آج رات انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔ ان کے پسماندگان میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ وہ جامعہ کے ابتدائی دور سے ہی وابستہ تھے۔

اردو کے مشہور و معروف شاعر اور ادیب ڈاکٹر محمد سلمان عباسی کا ۲۸ر مارچ ۱۹۹۸ء کو لکھنؤ میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم پچھلے کافی دنوں سے بیمار تھے۔

ڈاکٹر سلمان عباسی ۲۰ر نومبر ۱۹۳۴ء کو بارہ بنکی میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اردو اور فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ پھر فارسی ہی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ انھوں نے کئی کتابیں بھی تصنیف و تالیف کی تھیں۔ چند۔ کے نام ہیں (۱) یادگار آزادی (۲) شش جہت (۳) یادوں کے گلاب (۴) بدیسی کہانیاں (۵) لمحوں کا سفر (۶) غزالی مشہدی (۷) دس بجے رات کے بعد (۸) نوشتے وغیرہ۔

سلمان عباسی صاحب کو اتر پردیش اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی اور میر اکادمی لکھنؤ نے انعامات سے نوازا تھا۔ عباسی صاحب بڑے ملنسار اور خوش مزاج شخص تھے۔

اردو کے ممتاز ادیب اور محقق پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمٰن کاکوی کا ۲۰ر مارچ ۱۹۹۸ء کو پٹنہ میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۹۴ سال کے تھے۔ مرحوم نے اردو اور فارسی میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا تھا۔ وہ اختر اورینوی اور شاد عظیم

آبادی وغیرہ کے سلسلے کی آخری کڑی تھے۔
انہوں نے تقریباً سو سے زیادہ کتابیں تصنیف و تالیف کیں جن میں ساقی نامہ' مطالعہ تغزل' حیرت زار' تحقیقی مطالعے' مطالعہ حسرت' مطالعہ شاد' فلسفیانے مضامین' اثار کاکو' بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی ادبی اور علمی خدمات کے اعتراف میں مختلف اردو اکادمیوں اور اداروں نے انعامات اور اعزازات سے نوازا تھا۔ صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے سند اعزاز اور تاحیات وظیفہ بھی عطا کیا گیا۔

دارالعلوم کے استاد حدیث مولانا زبیر احمد کا انتقال

۱۵ر اپریل دارالعلوم کے استاد حدیث مولانا زبیر احمد کا آج یہاں انتقال ہو گیا۔ وہ ۷۳ سال کے تھے۔ وہ صبح کچھ خریداری کرنے کے لیے گئے تھے اور دارالعلوم گیٹ کے نزدیک گر کر جاں بحق ہو گئے۔ ان کے پسماندگان میں ۲ بیٹے اور ۶ بیٹیاں ہیں آج رات قاسمی قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔

نیشنل ہیرالڈ اور قومی آواز کے ملازم کا انتقال

یکم اپریل۔ ایسوسی ایٹڈ جرنلز لمیٹیڈ کمپنی سے وابستہ درجہ چہارم کے ملازم رفیق احمد کا جمعہ کو یہاں انتقال ہو گیا وہ گزشتہ کئی برس سے دمہ کی بیماری میں مبتلا تھے۔ ان کی عمر ۴۲ برس تھی پسماندگان میں آٹھ بچے اور اہلیہ ہیں۔ یونین کے صدر مسعود اختر نے ان کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے پسماندگان سے ان کے گھر پر آج تعزیت کی انہوں نے ان کو یونین اور کمپنی کی جانب سے ہر ممکن امداد و تعاون کی یقین دہانی کرائی اور مرحوم کے ایک صاحبزادے کو ان کی جگہ ملازمت بھی دلوانے کا وعدہ کیا۔

اتر پردیش اردو اکادمی کے ۱۹۹۷ء کے ادبی انعامات کا اعلان

۳۰ مارچ اتر پردیش اردو اکادمی کی انعامی کمیٹی نے آج اپنے ۱۹۹۷ء کے سالانہ انعامات اور اعزازات کا اعلان کیا ہے جس کے تحت یوپی اردو اکادمی کا سب سے اہم اور پروقار اعزاز مولانا ابوالکلام آزاد اردو کے معروف ناقد اور ادیب رشید حسن خاں کو ان کی مجموعی ادبی خدمات پر دیا گیا ہے جو ایک لاکھ گیارہ ہزار روپے پر مشتمل ہے۔

ان کے علاوہ عرفان صدیقی اور بشیشر پردیپ کو اکیاون ہزار روپے مجموعی ادبی خدمات کے لیے اور روزنامہ قومی آواز کے نوجوان صحافی نافع قدوائی کو دس ہزار کا صحافت انعام دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ جو مولانا عبدالوحید صدیقی ایوارڈ کے نام سے معروف ہے۔

اکادمی کی مجلس انتظامیہ نے میٹنگ میں سال ۱۹۹۷ کی موصولہ اردو کتابوں پر بھی ایوارڈ اردو اکادمی کی جانب سے دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کی تفصیل درجہ ذیل ہے اس فیصلے کے تحت مجموعی طور پر تقریباً ۳۶۰۰۰۰ تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے کے انعامات تقسیم کیے جائیں گے۔

یہ اعلان ایک پریس اعلامیہ میں اکادمی کی چیئرمین ڈاکٹر شمیم رضوی نے کیا ہے خدمات کا اعتراف صرف خصوصی توصیفی سند ڈاکٹر آصفہ زمانی مسٹر اکبر علی خاں عرشی زادہ (پس از مرگ) پانچ

پانچ ہزار کے چار انعامات:۔ ایک لہر آتی ہوئی مظہر امام، دہلی۔ جدید ناول کا فن، سید محمد عقیل، الہ آباد، جنت سنگسار، سیدہ جعفر، حیدر آباد، شہر بد نصیب، اقبال مجید، لکھنؤ۔ تین تین ہزار کے ۱۶ انعامات۔

افکار تازہ، عبدالباری، سلطانپور۔ آخر کار، مجتبی حسین دہلی۔

آزادی کے بعد اردو میں طنز و مزاح، نامی انصاری، کانپور۔ ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری، یعقوب یاور بنارس تنقیدی معیار، فضل امام الہ آباد۔ رتنقید و تعبیر، قاضی جمال حسین، علی گڑھ، جدید اردو افسانہ، محمد شاہد احمد، علی گڑھ، عصری نعت۔ پروفیسر عبدالحق، دہلی' قاضی محمد عدیل عباس، اختر سیوی، گورکھپور۔

دو دو ہزار کے انعامات:

اصلاح نامہ، عنوان چشتی دہلی۔ پانی پت، رفعت سروش نوئیڈا۔ تنقید اور توجیہ، حنیف کیفی، بریلی۔ جذب و فکر، مسعود انور علوی علی گڑھ۔ حسن ہزار شیوہ، غوث محمد غوثی علی گڑھ، خود شناسی، شفیق آفریدی، رامپور' شاعر دانشور فراق، علی احمد فاطمی' الہ آباد، شام بھی تھی دھواں دھواں، شمیری لال ذاکر، چنڈی گڑھ۔ شرت چندر شخصیت اور آخری سوال۔ انوار رضوی، میرٹھ۔

۱۰۰۰ روپے (۳۱) انعامات:

اقبال اور چند دیگر شعرا محمد طہ صدیقی بستی۔ اردو اور اشبانہ نوید دہلی اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل ممتاز الحق نئی دہلی۔

اعتبار حرف اقبال مسعود بھوپال "انجنیں" عبداللہ ولی بخش قادری نئی دہلی آزادی کے بعد دہلی میں اردو کے مسائل کا تنقیدی جائزہ شعب رضا وارثی دہلی بشیشر پر دیپ بحیثیت افسانہ نگار جبری کبیر لکھنؤ۔ بیان میرٹھی اور غالب شرف الدین ساحل ناگپور۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے سراجم عبدالرشید صدیقی علی گڑھ۔ شاعائے فاطمہ فاطمہ وصیہ جائسی لکھنؤ۔ حالات و خدمات مشائخ چشتیہ ڈاکٹر رضی احمد کمال دہلی۔ "حرا" رئیس الشاکری ردولی فیض آباد۔ دعوت صد تطہیر غازی پوری ہزاری باغ۔ دم بخود محمد فاروق شتر بنگلور۔ دھوپ کے ٹکڑے اودے سرن ارمانی مراد آباد۔ ڈسپلن کی تعلیم ڈاکٹر محمد اکرام نئی دہلی۔ روش دل یوسف بابا دہلی۔ روہیل کھنڈ اور اردو نعت رئیس رام پوری رام پور۔ سائنس سب کے لئے انور خان انور مناقی کولار سرد ہوا، شکیب رضوی کانپور سیرت حضرت مخدوم شاہ مینا محمد کاظم ایوبی لکھنؤ "شاخ چراغ" مونس بریلوی نینی تال۔ "شام بے سحر" سید شمیم چشتی نئی دہلی۔ "شکن در شکن" شاہد صدیقی لکھنؤ۔ "غبار" درخشان انعام لکھنؤ "کیسے کیسے لوگ" سید حبیب اکبر نقوی لکھنؤ۔ "مغربی افریقہ میں اسلام" محمد اسماعیل دہلی۔ "نوائے سروش" آئی۔ اے حیدری۔

لکھنؤ "نیاز عشق" محمد ذکی خالدی لکھنؤ۔

فسانہ عجائب ایک خاص ایڈیشن۔ سلیمان حسین لکھنؤ۔ "کن فیکون" رضوان احمد پٹنہ۔ "گم شدہ آدمی کا انتظار" چندر بھان خیال دہلی۔ "لہجہ" شاہد جمالی جونپور۔ "مٹھی بھر احساس" عتیق الہ آبادی الہ آباد۔ مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ امام اعظم، دربھنگہ۔ "میراث ہنر" قاضی عبیدالرحمن ہاشمی سدھارتھ نگر، میر نذر علی درد کاکوروی حیات اور کارنامے ڈاکٹر فرقان علی علانی کاکوری مخمور کاکوروی۔ صفات زندگی سعید اظفر چغتائی علی گڑھ۔ اردو فکشن کے ارتقا میں عصمت چغتائی کا حصہ محمد اشرف گورکھپور۔ ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے (۱۳) انعامات اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ غلام رسول ساحر بمبئی۔ اردو مرثیہ میر انیس کے بعد۔ طاہر حسین کاظمی میرٹھ۔ باغبانی اور کسانی نقی علی عابدی لکھنؤ بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر فرحانہ شاہین گیا۔ تنقیدی تناظر۔ طلعت حسین نقوی سلطانپوری جائزاد جاوید برنی لکھنؤ۔ حرف آغاز فرخ جعفری الہ آباد۔ حرف بے لباس طاہر تلہری شاہجہانپور۔ خانوادہ کاظمیہ کا ادبی خدمات ڈاکٹر کمال الدین لکھنؤ شاخ لرزیدہ اندر سروپ فتحپوری شہر آسماں حکیم منظور سری نگر۔ قدم بقدم انیس دہلوی دہلی۔ لمحوں کی صدا، ناز قادری مظفرپور۔

انعام برائے ناشر (پارہ عم)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۱۰۰۰۰ جامعہ نگر، نئی دہلی انعام برائے کاتب (طلسم حرف) سلام فیضی گھوسی پور، گورکھپور ۵۰۰

☆نگر ڈگر (افسانے) آصف نقوی -/100 روپے

یہ آصف نقوی کی پہلی تخلیقی پیشکش ہے۔ ان کے افسانے موجودہ دور کے روزمرہ کے مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔

☆ڈگر سے ہٹ کر (سوانح) سعیدہ بانو احمد -/200 روپے

ڈگر سے ہٹ کر سعیدہ بانو کی زندگی کی کہانی ہی نہیں ہے بلکہ تین چوتھائی صدی کے عرصے پر محیط بھوپال' لکھنؤ اور پھر دلی کی تہذیبی اور سماجی زندگی کی تصویر بھی ہے۔ جسے بے حد دلچسپ انداز میں مصنفہ نے سنایا ہے۔

☆جدید مغربی ڈرامے کے اہم رجحانات (لیکچر) پروفیسر زاہدہ زیدی -/10 روپے

زاہدہ زیدی نے شاعری کے علاوہ ڈراموں پر بھی خاص توجہ دی ہے اور جدید مغربی تہذیب میں ڈراموں میں اہم رجحانات پر روشنی بھی ڈالی ہے۔

☆احباب نامے (مجموعہ خطوط) بیگم صالحہ عابد حسین

صغرا مہدی

تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے یہ ذخیرہ مکاتیب بلاشبہ ایک حوالہ جاتی دستاویز ہے۔ اس سے نصف صدی سے زیادہ عرصے کے وہ حالات بھی روشنی میں آتے ہیں جو اس وقت کے اعلیٰ سماجی حلقوں کا مرکز فکر و نظر تھے۔ -/200 روپے

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

اعلا تعلیم

مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین
مترجم: مسعود الحق
تبصرہ نگار: عبداللہ ولی بخش قادری
صفحات: ۱۷۶
قیمت: ۱۲۰؍ روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

ہمارے عظیم مفکرِ تعلیم اور معلم کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین نے عالمی شہرت و مقبولیت پائی۔ اُن کے تعلیمی افکار، پہلی مرتبہ تعلیم، تعلیمی خطبات، کے نام سے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، نے ۱۹۴۵ء میں شائع کیے۔ انھیں غیر معمولی شرف قبول حاصل ہوا۔ بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں تعلیمی مسائل سے متعلق کسی اور کتاب کو اتنی مدت تک اور اس قدر اشاعت نصیب نہیں ہوئی اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ ذاکر صاحب کا یہ کارنامہ، جامعہ مکتبہ اسلامیہ دہلی کی سربراہی تقریباً انیس سال کرنے بعد، حصولِ آزادی سے قبل منظر عام پر آیا۔ پھر آزادو وطن کے تقاضوں نے انھیں جامعہ کو خیر باد کہہ کر اپنی مادرِ علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، گورنر بہار، نائب صدر جمہوریہ اور صدر جمہوریہ کے یکے بعد دیگرے مناصب سے سرفراز کیا۔ اس دوران انھوں نے ملک کی مختلف دانش گاہوں کو اپنے خطبات سے نوازا۔ ان کی زندگی کے اِس آخری دور میں ۱۹۶۴ء تک کے تعلیمی خیالات کا یہ مجموعہ ان کے نائب صدر جمہوریہ تک کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے جو ڈائنامک یونیورسٹی Dynamic Univer-sity) کے نام سے ۱۹۶۹ء میں منظر عام پر آیا۔ ذاکر صاحب کے تعلیمی خطبات، کا پیش لفظ پروفیسر محمد مجیب کا لکھا ہوا ہے اور انھیں ذاکر صاحب نے اردو میں ہی پڑھا تھا۔ ڈائنامک یونیورسٹی، کے خطبات بوجوہ انگریزی میں ہی دیے گئے۔ اِن خطبات کا پیش لفظ بھی پروفیسر محمد مجیب ہی کی جنبشِ قلم کا نتیجہ ہے۔ ابھی تک اردو طبقہ ان سے فیض یاب نہیں ہو سکا تھا۔ مزید بر آں اِس ترجمے میں اصل سے زائد دو خطبات بھی شامل ہیں جو ڈائنامک یونیورسٹی کی اشاعت کے بعد پڑھے گئے تھے اس طور اعلا تعلیم میں خطبات کی تعداد ۱۴ ہو گئی ہے۔ اس گراں قدر اضافے کے لیے ہمیں مترجم کو خلوص دل سے مبارک باد دینی چاہیے تعلیمی خطبات، اور اعلا تعلیم، دونوں کے پیش لفظ اپنی جگہ پر بے مثال ہیں اور ذاکر صاحب و مجیب صاحب دونوں دانش وروں کی شخصیت و بصیرت کی بیک وقت

ہمیں ایک جھلک دکھاتے ہیں۔

مسعود الحق صاحب ایک اچھے اور پکّے فرزند جامعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ابتدائی جماعت سے لے کر اعلا تعلیم تک تمام منازل یہیں طے کیں، یہیں فیکلٹی تعلیم میں اپنی خدمات پوری کر کے آج بھی جامعہ کی فضا میں ہی سانس لیتے ہیں۔ ان کی جامعہ اور تعلیم سے وابستگی بھرپور ہے۔ انھوں نے انگریزی سے متعدد کتب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور ابھی حال ہی میں ان کی اپنی کتاب استادوں کی تعلیم و تربیت، منظر عام پر آئی ہے۔ عام قاری اور وابستگانِ تعلیم کے لیے اعلا تعلیم، کی حیثیت ایک تحفے کی سی ہے جو حسنِ اتفاق سے ذاکر صاحب کی پیدائش کے صد سالہ جشن کے دوران ہمیں نصیب ہوا اور جو تعلیمی خطبات، کی طرح مکتبہ کی نوازش، کا ہی نتیجہ ہے۔

اعلا تعلیم، کے خطبات میں آزاد ہندستان کی تعلیمی کیفیت پر بالعموم اور اعلا تعلیم کے باب میں بالخصوص بصیرت افروز اور بے لاگ خیالات و محسوسات کا اظہار ملتا ہے۔ ذاکر صاحب نے اسی کتاب میں ایک جگہ صاف صاف کہا ہے کہ "مجھے اکثر یہ محسوس ہوا ہے کہ ہمارا آج کا سارا تعلیمی نظام ٹال مٹول کا ایک وسیع اور نہایت نفیس کام ہے۔" انھوں نے ایک خطبے میں، 'تخصیص' کا سوال بھی اٹھایا ہے۔ اور اپنی گفتگو کا نچوڑ اس ایک جملے میں سوال کے طور پر پیش کر دیا کہ "تخصیص یقیناً ناگزیر ہے، مگر سوال یہ ہے کہ یہ تخصیص، تعلیم کی کس منزل پر ہو۔" ایک اور خطبے میں نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے، ذرا غور فرمایئے، کیا خوب کہا ہے اور کیسی پتے کی بات کہی ہے کہ "جوانی کوئی اکتساب نہیں، یہ ایک موقع ہے، اس موقع کو اپنے ہاتھ سے نکلنے نہ دینا۔" تعلیم اور اس کے مسائل، کا ذکر کرتے ہوئے سوال اٹھایا گیا ہے کہ "کون سے نظریات و خیالات اور کون سے اصول ہیں جو ہندستانی تعلیم میں حقیقی روح پھونکتے ہیں۔" اور خود ہی جواباً فرمایا ہے کہ "دو خصوصی اصول نظر آتے ہیں ایک کام کا اصول اور دوسرا سماجی سمت کا"— "تعلیمی لحاظ سے مفید کام، بنیادی طور پر ذہن کا کام ہوتا ہے۔" "مفید کام نئے نئے خیالات کو جنم دیتا ہے یا موجودہ خیالات کی ترتیب کو ممکن بناتا ہے۔ یہ ایک منظم اور بامقصد سرگرمی ہے۔" یہی کام ذاکر صاحب تعلیم کا مقصد گردانتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی انتباہ کیا ہے کہ "یہ راستہ کسی بھی ملک کے لیے واجب نہیں ہے کہ وہ اپنے تمام اراکین کے یک رنگ فروغ سے اپنی ہمہ جہت سرگرمیوں کا اہتمام کرے۔" ان کی ایک بات اور سنیے۔ "بلندی پر چمکنے والے ستاروں سے ہم کلام ہونے کے لیے ہمیں مستحکم بنیادوں پر اپنے پانو جما کر کھڑا ہونا سیکھنا چاہیے۔" اسی طرح اُن کے سب خطبات بلندی فکر اور جذبۂ خلوص سے سرشار ہیں اور اردو ترجمے میں بھی جگہ بہ جگہ جملوں میں 'اقوالِ زریں، کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

مسعود الحق صاحب نے صرف اصل انگریزی عبارت کی بخوبی اردو میں معنوی طور پر ترجمانی ہی نہیں کی ہے بلکہ زبان و بیان کو بھی بہت کچھ ذاکر صاحب کی اردو تحریر کے مماثل بنا دیا ہے۔ اس بات کی داد وہ قاری کما حقہ دے سکتے ہیں جنھوں نے ذاکر صاحب کی اردو نثر کا لطف اٹھایا ہے۔ اس

مفید پیش کش کے لیے مکتبہ جامعہ دلی مبارک باد کا استحقاق رکھتا ہے۔

سہ ماہی جہات

مدیر اعلیٰ حامدی کاشمیری ۔ مبصر:۔ توقیر احمد خاں
صفحات: ۱۲۶
قیمت: پچاس روپے
پتہ: کمپیوٹر سٹی راجباغ سری نگر کشمیر

سہ ماہی جہات پروفیسر حامدی کاشمیری کی ادارت میں نکلنے والا وقیع مجلہ ہے۔ اور تخلیقی ادب کے اعلا علم بردار کی حیثیت سے منظر عام پر آیا۔ رسالہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا مقصد ایک عمدہ اور معیاری ادب پیدا کرنا اور اردو ادب کو اپنی جڑوں سے جوڑے رکھنا ہے۔ اس بات کی وضاحت مجلہ کے مذکورہ پہلے شمارہ میں جو جنوری ۱۹۹۸ء کا شمارہ ہے ان الفاظ میں کردی گئی ہے۔

"آج کے ٹیکنالوجیکل اور صارفانہ دور میں علوم انسانیہ اور ادب کے وجود کو جو خطرہ پیش ہے اس کی بنا پر ادبی اقدار کی شناخت اور استحکام کی ضرورت فزوں سے فزوں تر ہورہی ہے۔ اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ہم نے سہ ماہی جہات کا اجراء کیا ہے ۵ صفحات ہر اس قلم کار کے لیے وقف ہے جو ادب کے آزادانہ تخلیقی کردار کا مؤید ہو اور اس کی زمینی اصل کا احترام کرتے ہوئے اس کی باطنی یا روحانی لانہایت کا داعی ہو۔"

جہات کے اس شمارہ میں جو تنقیدی و تحقیقی مضامین شامل ہیں وہ نہایت اعلا پایہ کے ہیں ان میں " تنقید بطور زباں "از رولاں بارتھ "مابعد جدید تنقید ۔ از ابوالکلام قاسمی۔ منٹو افسانہ اور اقدار از شمیم کاف نظام۔ اردو زبان جموں و کشمیر میں از نشاط انصاری اور اُردو نظم کی دریافت از حامدی کاشمیری خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو اپنے بھرپور مواد اور مضبوط نظریہ کی بنا پر امتیاز رکھتے ہیں ان کے علاوہ عبدالصمد کا افسانہ آسمان ہی آسمان اختر محی الدین کے کشمیری افسانہ کا ترجمہ "تم ہی ہو تم ہی ہو "فیاض رفعت کا افسانہ کہرے میں لپٹا ہوا شہر۔" اور سعید انجم کا افسانہ دھوپ کی وسعت شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نصف صد سے زاید نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ جن کا انتخاب میں معیار کا خیال رکھا گیا ہے۔ رسالہ کا آخری حصہ نئی کتابوں پر تبصروں کے لیے مخصوص ہے اور اس کا عنوان نئی مطبوعات رکھا گیا ہے۔ آخری حصے میں نقطہ نظر کے عنوان سے قارئین کے خطوط بھی شامل ہیں۔ اس طرح یہ ایک جامع ادبی مجلہ ہے جس کی طباعت کاغذ اور چھپائی نہایت عمدہ ہیں۔ پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب اس رسالہ کے اجراء پر یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ توقع ہے یہ رسالہ اردو ادبی دنیا میں مقبول ہوگا۔

اطہر حسین مرحوم
ایک تہذیب، ایک شخصیت

مصنف: ڈاکٹر انور حسین خاں
مبصر: پروانہ رُدولوی
قیمت: پچاس روپے
ملنے کا پتہ: دانش محل۔ امین آباد۔ لکھنؤ

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے اپنے ایک مضمون میں (مرزا بہادر) مرزا عباس علی خان جگر پسر آغا علی خان ناظم سلطان پور بہ عہد شاہانِ اودھ، کے جد امجد مرزا غلام محمد خاں بہادر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ وہ "دربار دہلی کی ابتر حالت دیکھ کر مستعفی ہوگئے اور دہلی سے جانب مشرق روانہ ہوئے۔ ارادہ تھا کہ نواب شجاع الدولہ بہادر کی سرکار میں شرف انتساب حاصل کریں، ہنوز فیض آباد نہیں پہنچنے پائے تھے کہ قصبہ ردولی میں گزر ہوا جہاں اکثر مسلمان شرفا و روسا آباد تھے اور زمینداری کی خاموش اور بے آزار زندگی بسر کرتے تھے۔ مرزا صاحب کو یہ جگہ اور یہاں کے رہنے والوں کا طرز زندگی کچھ ایسا پسند آیا کہ یہیں کی سکونت اختیار کرلی۔"

مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنی "کتاب آغائی صاحب" میں لکھا ہے کہ "مرزا غلام محمد خان صاحب وارد لکھنؤ ہوئے تو نواب شجاع الدولہ غالبًا فیض آباد میں تھے جس کے باعث بجائے لکھنؤ میں اقامت گزیں ہونے کے انھوں نے فیض آباد کا ارادہ کیا۔ دو تین دن کے سفر میں ۵۵ میل کی مسافت طے کی تھی اور فیض آباد ابھی ۲۳ میل باقی تھا کہ قصبہ رُدولی میں گزر ہوا جہاں مسلمان شرفا کثرت سے آباد تھے۔ اکثر شرفا کے قبضہ میں تھوڑی بہت زمین تھی جس کی بدولت سب کے سب کمال اطمینان و فارغ البالی سے قناعت و اطمینان کی خاموش و بے ضرر زندگی بسر کر رہے تھے۔ مرزا غلام محمد خان کو یہ زندگی نہایت پسند آئی یکایک کچھ ایسے خیالات پلٹے کہ جس طرح دہلی کو خیرباد کہا تھا، اُس طرح فیض آباد کو بھی دور ہی سے سلام کیا اور رُدولی میں گوشۂ عافیت اختیار کرلیا۔" ان دونوں اقتباسات سے رُدولی اُس سے جڑے ہوئے گانو اور قصبات کی تہذیبی عظمت اور اس علاقہ کے باشندگان کی شرافت انسان دوستی، مہمان نوازی اور پُر سکون زندگی کی کشش کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اسی رُدولی سے جڑتا ہوا ایک گانو نیورہ ہے جس کے تعلقہ دار خاندان کی ایک ممتاز شخصیت اطہر حسین مرحوم تھے۔ زیر تبصرہ کتاب انہیں کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اطراف رُدولی کے ایک ابھرتے ہوئے قلم کار ڈاکٹر انور حسین خان نے لکھی ہے جو اطہر حسین مرحوم کے فرزند ارجمند ہیں۔ اردو کے سوانحی ادب میں یہ کتاب ایک اضافہ ہے جس کے ذریعہ ایک بیٹے نے اپنے مرحوم باپ کو خراج عقیدت ہی نہیں پیش کیا ہے بلکہ اودھ کے ایک ایسے خطہ کی تاریخ اور جغرافیہ، طرز معاشرت اور گنگا جمنی روایات کا تعارف بھی کرایا ہے جسے رُدولی کی نواحی بستی ہونے کا شرف حاصل ہے۔

کھلے خطوط

یہ خط صف ایک غلط فہمی کے ازالے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ مجھے اس بات کا قلق ہے کہ اردو کی نئی بستیاں، کے عنوان سے میرے مہمان اداریے پر میرے کچھ عزیز دوستوں کو اعتراض ہے۔ رضاء الجبار صاحب کا مہمان اداریہ اسی رد عمل کا اظہار ہے۔ مجھے یہ بات لکھنے میں قطعاً کوئی پیش وپس نہیں ہے کہ اس اداریے سے مجھے کسی کی دل شکنی مقصود نہیں تھی، لیکن اگر مجھ سے سہوا ایسا ہوا ہے، تو میں معذرت خواہ ہوں۔

میرا اداریہ صرف امریکا کے حوالے سے تھا۔ کینیڈا میں اردو کی صورتحال یقیناً امریکا سے بہتر ہے۔ اور اس کے لیے نہ صرف کینیڈا کے آئین کو اور اس کی Pluri- Cultural اور Multi-Ethnic لسانی پالیسی کو پورا کریڈٹ ملنا چاہیے۔ بلکہ رضاء الجبار صاحب جیسے کئی دیگر احباب کی کوششیں بھی اس حوالے سے قابل تحسین ہیں۔ دراصل میرے اداریے میں سے ایک پورا پیراگرف شاید شامل اشاعت ہونے سے رہ گیا تھا، جس میں، (خصوصی طور پر ٹورونٹو کے حوالے سے) میں نے وہاں کے اردو ادیبوں کی انجمن "رائٹرز فورم" کی نشاندہی کی تھی اور لکھا تھا کہ ماضی میں جوش ملیح آبادی جیسے بزرگ شعرا اور حال میں عابد جعفری اور منیر پرویز جیسے نوجوان اہل قلم اردو کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ نشستیں، مشاعرے تو خیر کسی بھی انجمن کے پروگرام میں شامل ہوتے ہیں، کینیڈا میں مختصر قیام کے لیے آئے ہوئے اردو شعرا اور دانشوروں کو سننے کے لیے بھی خصوصی طور پر اس فورم کے تحت اقدام کیے جاتے ہیں۔

☆ ستیہ پال آنند (سمر لینڈ، امریکہ)

تازہ کتاب نما (فروری ۱۹۹۸ء میں نئی نسل کے نمائندہ تخلیق کار جمال اویسی کا اشاریہ "نیا شاعر۔ محروم رموز حیات" قابل توجہ ہے اور نئی نسل کی تخلیقی شناخت وتلاش میں خوشگوار پیش رفت بھی۔

جمال اویسی نے اگرچہ ۱۹۸۰ء کے بعد نمایاں طور پر ابھرنے والی نسل کی تخلیقی شناخت کے حوالے سے چند اہم نکات پیش کی ہیں تاہم ان کی یہ رائے کہ "نیا شاعر سانیٹ، ترائیلے، دوہے اور ہائیکو جیسی بے جان ہیتوں کو قبول نہیں کرتا اور اپنے اظہار کے لیے وہ غزل، نظم، رباعی وغیرہ اصناف سخن تو نئے شاعر کے اظہار کا وسیلہ ہیں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ مثنوی جیسی روایتی صنف سخن کو نئے شاعر نے اپنے اظہار کا میڈیم بنایا ہے۔ اس کے برعکس سانیٹ، ترائیلے، دوہے اور ہائیکو وغیرہ کو نئے شاعر نے تخلیقی سطح پر نہایت خوش سلیقگی سے برتا ہے لہٰذا انھیں بے جان کہنا کسی طور مناسب نہیں۔

جمال اویسی قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے ۱۹۸۰ء کے بعد والی ادبی نسل کے حوالے سے، شناخت وتلاش کے نئے زاویے مقرر کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ آج جدید تر نسل کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے پاس ناقدین کا فقدان ہے۔ جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہماری پیش رو نسل کے ناقدین شعر وادب ہماری نسل کے جینوئن، سنجیدہ اور ذہین تخلیق کاروں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے اپنے تخلیق کاروں میں ناقدین شعر وادب کی تعداد بھی قابل ذکر ہو۔۔ مجھے خوشی ہے کہ اب جدید تر

کے تحقیق کاروں نے اس طرف توجہ دی ہے۔ جمال اویسی، کوثر مظہری اور دیگر نوجوان تخلیق کاروں سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ نئی نسل کے ذہین فنکاروں کی تلاش شناخت اور نشاندہی میں اہم رول ادا کریں گے۔

☆ سلیم انصاری جبل پور

اپریل کا "کتاب نما" نظر نواز ہوا۔ میرے لیے تو یہ نہایت ہی اہم شمارہ ہے کہ جناب مظہر امام کا مضمون اس میں شامل ہے جس میں "۱۹۹۷ء کی اردو شاعری" میں میرے شعری مجموعے کا ذکر ہے۔ میں جناب مظہر امام کی نہایت ممنون ہوں یہ واقعہ ہے کہ کئی اچھی کتابیں صرف اس وجہ سے عام قاری تک نہیں پہنچ پاتیں کہ ان کے بارے میں جب خواہ معلومات انھیں نہیں حاصل ہوتی ہیں جیسے مجھے ہی اس مضمون میں مذکور کئی کتابوں کے اشاعت پذیر ہونے کا علم اس مضمون کو پڑھنے کے بعد ہی ہوا اس بار غزلیں بھی بہت اچھی لگیں۔ خاص طورر پر حیدر قریشی صاحب اور اختر ضیائی صاحب کی ـــ شری پدر جوشی کی مراٹھی کہانی چونکا دینے والی ہے۔ ذہن وفکر کے لیے نئے دریچے وا کرنے والی۔ ترجمہ بہت خوب ہے۔ اور جناب نصرت ظہیر کی پیروڈی مباحثے کی تو مزاہی دے گئی۔ بڑا لطف آیا۔ نوک قلم کو نشتر بنا کر تکلیف دہ پھوڑوں کی جراحی میں ان کی روز بروز بڑھتی مہارت قابل داد ہے۔ اللہ کرے زور قلم ـــ

☆ بلقیس ظفیر الحسن سیکٹر ۱۵ روہنی۔ نئی دہلی ۸۵

کتاب نما کا جنوری کا شمارہ مجھے کچھ تاخیر سے ملا لیکن اس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا عالمانہ مقالہ " ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، "پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی اور ذہن ودل میں ایک تازگی کا احساس ہوا۔ ۳۵ صفحے کو محیط اس مقالے کا میں نے ایک ایک لفظ پڑھا اور گوپی چند نارنگ کی دانشورانہ بصیرت اور فلسفیانہ ادراک کا مزید قائل ہوا۔ اس میں سب سے بڑی بات خیالات کا شفاف اور دو ٹوک ہونا ہے یعنی clarity of Thought اور میں کسی بھی مقالے یا کتاب میں اس نکتے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔

گوپی چند نارنگ نے بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ "میر وغالب کے یہاں یہ اپنا مقصود آپ بن جاتے ہیں اور ان کا عمل فقط تکنیکی اور میکانکی رہ جاتا ہے۔" ذوق وناسخ کے بارے میں یہی بات کچھ غیر واضح انداز میں میرے ذہن میں عرصے سے تھی لیکن ابھی حال میں ایک صاحب کا یہ فرمان پڑھ کر میں دم بخود رہ گیا کہ ناسخ، آتش سے اچھے شاعر تھے!!!

ڈاکٹر نارنگ کے اس عالمانہ مقالے کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے اور یہ صرف وہی لکھ سکتے تھے۔

☆ نامی انصاری ۲۰ فروری ۹۸ء

میرے مضمون "اردو تحقیق ـــ مسائل اور تجاویز" (مطبوعہ مارچ ۹۸ء) میں کچھ صفحات پر کمپوزنگ کے دوران بعض خامیاں راہ پا گئی ہیں۔ اس میں حوالوں کے نمبر شمار اور جملوں کی درست صورت اس طرح سے ہے۔

صفحہ نمبر۔ ۳۔ پر قاضی عبدالودود صاحب کا قول حوالہ نمبر اول کے تحت ہے۔

صفحہ۔ ۴۔ پر ایلٹ کا قول حوالہ نمبر دوم کے تحت ہے۔

صفحہ۔ ۵۔ پر درج نظم حوالہ نمبر سوم کے تحت ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ صاحب کی رائے اور فاروقی صاحب کے اشعار

صفحہ نمبر ۳ پر حوالہ نمبر چہارم کے تحت ہیں۔
صفحہ ۸ پر "پانچ سالہ تدریسی تجربے کی شرط عائد کر رکھی ہے" اور "مخطوطات کی فراہمی کا خاص اہتمام کیا جائے" ہے۔
صفحہ نمبر ۹ پر آخر میں متعلقہ وزارت تک پہنچائیں

☆محمد شاہد پٹھان شعبہ اردو و فارسی جے پور

'کتاب نما' کا تازہ شمارہ (فروری) مطالعہ سے گزرا۔ سب سے پہلے تو میں آپ کو اس بات کے لیے مبارکباد دوں کہ آپ نے اس شمارے میں نئی نسل کے کئی فن کاروں کے مضامین ایک ساتھ شائع کر کے بحث و مباحثہ کے لیے فضا ہموار کر دی ہے۔ نئی نسل کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کے اندر اعتماد پیدا کرنا ایک اہم ضرورت ہے کہ آئندہ اسی کو ادب کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔

اشاریہ کے تحت نئے ادب کے حوالے سے جمال اویسی کا مضمون توجہ چاہتا ہے اور بحث و مباحثہ کے لیے نئے دریچے وا کرتا ہے۔ ۸۰ء کے بعد کی نسل کے فن کاروں کے نمایاں رجحانات اور ادبی موقف پر اندنوں خوب ادبی بحثیں ہو رہی ہیں۔ یہ شاید پہلا موقع ہے کہ اس نسل کے کسی فن کار نے اس موضوع پر باضابطہ بحث کے لیے قلم اٹھایا ہے اور ان نکات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جن کے حوالے سے اس نسل کی شناخت قائم ہو سکتی ہے۔ جمال اویسی ادب کے ایک سنجیدہ طالب علم' استاد اور فن کار ہیں اس لیے ان کی باتوں پر سنجیدگی سے غور وخوض ہونا چاہیے۔ میں پیش رو ادیبوں، فن کاروں سے درخواست کروں گا کہ وہ ان امور پر اپنے خیالات کا اظہار کریں تاکہ اس نسل کو معلوم ہو کہ وہ جو سوچ رہی ہے وہ کسی حد تک درست ہے اس کی تخلیقات میں کیا کیا خوبیاں رخامیاں ہیں اور اسے کہاں کہاں اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔

خالد عبادی کا مضمون بھی بحث طلب ہے۔ انہوں نے ادب کے حوالے سے کئی بنیادی سوالات اٹھائے ہیں جن پر گفتگو ہونی چاہیے۔ اس طرح سلیم انصاری، کوثر مظہری اور ڈاکٹر نثار احمد کے مضامین بھی متاثر کرتے ہیں۔ زبان وبیان کے حوالے سے عمیق حنفی مرحوم اور عبدالخالق مرحوم کی گفتگو بے حد معلوماتی ہے۔ اس سلسلے کو جاری رہنا چاہیے کہ مجھ جیسے کم علموں کے معلومات میں اضافہ ہو سکے۔ طنز و مزاح کے تحت مجتبیٰ اور نصرت ظہیر کی تخلیقات نے خامہ بگوش کے کالم کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔

کیا ہی اچھا ہو اگر آپ شعری تخلیقات پر بھی اتنی ہی توجہ دیں جتنی توجہ آپ مضامین پر دیتے ہیں۔ یہ میری ہی نہیں عام قاری کی شکایت ہے کہ اس حصے میں کوئی تخلیق بہت معیاری ہوتی ہے تو کوئی بالکل یونہی سی۔

آخر میں ایک درخواست یہ کروں گا کہ مذکرہ مضامین کے حوالے سے جو خطوط آپ کے پاس آئیں انہیں آپ ضرور شائع کریں یعنی بحث و مباحثہ کو سمیٹنے کی جگہ پھیلائیں تاکہ نیا ادب صحیح سمت کی طرف گامزن ہو سکے۔

کتاب نما کو دہلی سے پٹنے کے اسٹالوں تک پہنچنے میں تو تقریباً ایک ماہ لگ جاتے ہیں کیا دلی اب تک اتنی ہی دور ہے۔

☆عالم خورشید، پٹنہ

کا ممبر بن کر اردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے۔

ہمیں یقین ہے کہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

قواعد و ضوابط

1۔ بک کلب کی فیس رکنیت دس روپے (-/Rs.10) ہے۔ (ممبر بننے کے لیے کسی فارم کی ضرورت نہیں۔ فیس کی رکنیت بھیج دینا کافی ہے۔

2۔ بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ زر تعاون -/70 روپے ہے) صرف -/65 روپے سالانہ زر تعاون لیا جائے گا۔

3۔ ممبر کو مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) 25% اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اردو کی کتابوں کی خریداری پر 10% کمیشن دیا جائے گا (ہر فرمائش پر بک کلب کی ممبری کا حوالہ دینا ضروری ہوگا)

4۔ بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جاسکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کا ممبر نہیں بن سکتی۔

5۔ ممبری کے دوران ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔

6۔ کتابیں بذریعہ وی پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجات روانگی کتب ممبر کے ذمے ہوں گے۔

7۔ گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر پچھلا حساب صاف کرے اور آیندہ کے لیے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔

8۔ بک کلب کی رکنیت کی مدت پوری ہو جانے کے باوجود اگر کسی نے اپنی طرف سے کتابوں کا آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتاب بھیج کر حساب صاف کر دیں گے۔

ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یا اس کی کسی بھی شاخ سے حاصل کر سکتے ہیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ 202002

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

لسانُ الصدق
مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل۔ اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم تحقیقی دستاویز =/۷۵

نظامِ رنگ
ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہی کا ادبی خاکہ ــ یہ اس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہوکر انسانیت کو وقار بخشا۔ =/۱۵

شہیدِ جستجو
(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) ترتیب ضیاالحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مردِ درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مردِ مومن تھے۔ ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ =/۷۵

پرانی بات ہے
(سلسلہ وار نظمیں) زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پرسے پردہ اٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں۔ ان سچائیوں کے روپ بدل گئے ہیں۔ =/۳۰

غزل نما
تصحیح و ترتیب ادا جعفری

(اظہار و بیان کا سفر جاری ہے)

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کلام کا جامع انتخاب اور تعارف جس کو ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ یہ ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۴۸۰ =/۷۵

سازِ سخن
ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتونِ اول محترمہ ادا جعفری کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے طرزِ بیان سے ایک ایسی قوتِ ارادی مترشح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام موثر نہیں ہو سکتا۔ =/۴۵

ترجمۂ قرآن
پروفیسر مشیر الحق

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش)

پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔ =/۸

نذرِ مختار
مالک رام

مجموعہ مضامین بر تقریب محقق اور دانشور پروفیسر مختار الدین احمد کو عالیجناب سکندر دیال شرما نائب صدر جمہوریہ ہند کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا جس میں اردو کے ممتاز چھبیس ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ =/۱۰۱

Regd. with R.N.I. at No 4967/60 May 98
Regd. No. DL 16016/9 8
Licence No. U[SE]-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

جون ۱۹۹۸ء	جلد ۳۸	شمارہ ۶

فی پرچہ 7/:

سالانہ 70/:

سرکاری/تعلیمی اداروں سے 100/

غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک) 500/

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فیکس نمبر 6842574.

Tel Cum Fax No (011)-6910191

ٹیلی فون نمبر: 6910191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرے کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

غزلیں / نظمیں

طنز و مزاح

اور

کھلے خطوط، جائزے، ادبی خبریں

نئی مطبوعات

شاعری سے مکالمہ (تنقیدی مضامین) شمیم حنفی -/150
دوسرے دن کا سورج (شعری مجموعہ) اندر موہن کیف -/75
بدرالدین طیب جی (سوانح) لئیق فتح علی -/26
نیتاجی سبھاش چندر بوس (سوانح) سسر کمار بوس -/37
جنت سے نکالی ہوئی حوا (آپ بیتی) نفیس بانو شمع -/150
قطرہ قطرہ (منی افسانے) قاضی مشتاق احمد -/50
نقوش ذاکر حسین (مضامین) عبدالغفار شکیل -/75
کتاب نورس مرتبہ و مترجم پروفیسر نذیر احمد -/75
تلوک چند محروم کی شاعری ڈاکٹر درخشاں تاجور -/100
منفرد (افسانے) نعیمہ ضیاالدین -/160
تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ تقی رحیم -/300
میر شناسی۔ شکیل الرحمن۔ ترتیب جابر حسین -/50
دستاویز ۲ ترتیب جابر حسین -/50
سیرت مسیحؑ مولف پیشون محمد مترجم طیب سلیم -/100
صف ریحاں (شعری مجموعہ) ڈاکٹر اصغر علی عالم -/50
نیا سفر (ادبی رسالہ) (۹-۱۰) مرتبین سید عاشور کاظمی / علی احمد فاطمی -/50
انتساب (سہ ماہی) (۳۴/۳۵) ایڈیٹر۔ ڈاکٹر سیفی سرونجی -/25
پیغمبر اعظم و آخرؐ (سیرت پاکؐ) ڈاکٹر نصیر احمد ناصر -/100
دعوت حق (مذہب) مولانا وحیدالدین خاں -/50
دعوت اسلام (مذہبی مضامین) مولانا وحیدالدین خاں -/50
رائے بہادر (ناول) عارف صدیقی -/25
تامل ناڈو میں اردو -/135
رباعیات انیس ۔ علی جواد زیدی -/85
ہندوستان کا شاندار ماضی۔ اے۔ ایل باشم -/145
تاریخ ٹیپو سلطان محب الحسن -/120

سرورق۔ کوثر مظہری

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار مرزا جعفر حسین -/110
خوشبو مہکتی رہی (شاعری) ست پرکاش شوق -/200
باتیں فراق سے (انٹرویو) ست پرکاش شوق -/200
قمر رئیس ایک زندگی (مضامین) مرتبہ سلمیٰ شاہین -/250
ترکش (نیا ایڈیشن) (شاعری) جاوید اختر -/130
گھنگرو (شاعری) قتیل شفائی -/250
بے اصطلاح (تنقیدی مضامین) جوگندر پال -/90
خمکدۂ خیام رباعیات عمر خیام -/80
قلم برداشتہ (قطعات) اعزاز افضل -/50
"مجلس ممنون" (عاشق اقبال ممنون حسن خاں پر مجلہ)
ترتیب پروفیسر آفاق احمد -/100
"مطالب الغالب" (شرح غالب) سہا مجددی -/150
"پرچھائیوں کا پیچھا" (ڈرامے) ابراہیم یوسف -/80

غیر ممالک کی مطبوعات

ہر ملک ملک ماست (سیر و سیاحت) اطہر غوری -/150
خدا کے منتخب بندے (تاریخ یہودی قوم) اطہر غوری -/100
مشعل۔ گولڈن جوبلی نمبر (۱۹۴۷-۹۷) مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

مکتبہ جامعہ کی اہم کتاب

شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام

نظام اردو خطبات کا 19واں خطبہ

داستان امیر حمزہ

"داستان، زبانی بیانیہ، بیان کنندہ اور سامعین"

کے عنوان سے

اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر شمس الرحمن فاروقی نے
شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں فروری ۱۹۹۸ء میں
پیش کیا۔ اب یہ اہم خطبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شائع کر
رہا ہے۔ (زیر طبع)

مہمان مدیر
کوثر مظہری
شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی-۲۵

اشاریہ

جواز

۸۰ء کے بعد کی شاعری کا

میرا تو ماننا ہے کہ ادب میں کسی بھی رجحان کی بالکلیہ موت نہیں ہوتی بلکہ اس کی لہریں ہر دور میں جاری و ساری ہوتی ہیں۔ نہ کلاسکی رجحان ختم ہوا ہے اور نہ ترقی پسند رجحان اور نہ ہی جدیدیت پوری طرح ختم ہوئی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی نیا رجحان سامنے آتا ہے تو اس میں چمک دمک زیادہ ہوتی ہے مگر امتداد زمانہ کے بعد اس پر پردہ (چشم پوشی کا، بے اعتنائی کا، بحث و تمحیص کا) پڑتا جاتا ہے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ ہر عہد میں سماجی، اقتصادی اور تہذیبی منظر نامہ بدلتا رہتا ہے۔ نئی نسل نئی سوچ لے کر آتی ہے اور اپنے پیش رو نسل سے فکری نہج پر اس کے اختلافات شروع ہو جاتے ہیں اور پیش رو نسل نووارد نسل کی توانائی اور قوائے فکر سے مات کھا جاتی ہے جو ایک فطری Phenomenon ہے۔ اس پر حیرت ناکی باعث تحیر ہے۔

جدیدیت ۶۰ء کے آس پاس شروع ہوئی۔ آج بھی اس کی رمق موجود ہے۔ حالاں کہ فاروقی صاحب کا ماننا ہے کہ ہر نسل بیس پچیس برسوں میں اپنا کام کر چکتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو جدیدیت بھی اپنا کام کر چکی۔ میرا ماننا ہے کہ جدیدیت بھی دوسرے رجحانات کی طرح (تحریک کا ذکر عمداً نہیں کر رہا ہوں) آج بھی زندہ ہے۔ البتہ ۸۰ء کے آس پاس اور بعد میں جس نسل نے بساط ادب پر قدم جمانا شروع کیا اس کی شاعری اور اس کی فکر اپنے پیش رووں سے مختلف ہے۔ یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ ۷۰ء کے آس پاس کی نسل کا ذکر بھی گاہے گاہے آتا رہا ہے جو نہایت ہی مضحکہ خیز ہے۔ اگر دس دس سالوں میں یہ شعری بساط سمٹتی گئی تو ۷۰ والی نسل بھی جا چکی۔ اس کے لیے جناب شوکت حیات نے احتجاجاً اپنے موقف کا اظہار کیا تھا، کتاب نما میں اداریہ (اگست ۹۷ء) بھی چھپا جو حال ہی میں ایوان اردو میں عنوان بدل کر نئے مضمون کی شکل میں (اپریل ۹۸ء) شائع ہوا ہے اگر ۷۰ء والی نسل نے ۶۰ء والی نسل کا گلا گھونٹ دیا ہے تو فطری طور پر ۸۰ء والی نسل ۷۰ء والی نسل کا خاتمہ کر دے گی پھر ۹۰ء والی نسل ۸۰ء والی

نسل کا خاتمہ کردے گی۔ یہ شعری عمل ہے یا نسل کشی؟ یہ کریہہ رویہ ہے جسے کسی طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ۷۰ء والی نسل کے چند نام اس طرح لیے جا سکتے ہیں۔ شہپر رسول، اسعد بدایونی، عین تابش، شاہد کلیم، رووف خیر، شمیم قاسمی، منظر اعجاز، سلیم انصاری، خالد محمود، شمیم طارق، شاہد جمیل وغیرہ۔ یہ شعرا آج بھی پوری توانائی سے شعر کہہ رہے ہیں جو ۸۰ء کے بعد کی نسل کے پیش رو بھی ہیں اور قافلے کے شریک سفر بھی۔ ان شعراء کو بھی خوشی سے اپنی شناخت کا مدار ۸۰ء والی نسل کو تصور کر لینا چاہیے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ ۸۰ء والی نسل انھیں outdated کرنا چاہتی بھی نہیں اور نہ ۸۰ء کے بعد ابھی کسی دوسری نسل کی آمد کی آہٹ ہے۔ ابھی تو ۸۰ء والی نسل کی شاعری پر کھل کر بات بھی نہیں ہو پائی ہے، ابھی اس کے بعد کی نسل کا سوال کہاں اٹھتا؟ کوئی بعید نہیں کہ دو تین سالوں کے بعد کچھ لوگ اپنی شناخت ۸۰ء کے بعد علاحدہ منوانے کی تحریک چھیڑ دیں۔ مجھے کسی مابعد جدیدیت کے تصور سے بالکلیہ اختلاف ہے۔ جدیدیت کے بعد جتنی بھی تحریکیں اور جتنے بھی رجحانات آئیں گے سب کے سب مابعد جدیدیت کے زمرے میں آئیں گے۔ پھر تو وجہ تسمیہ کی تعبیر و تشریح مشکل ہو جائے گی اور اس کی میعاد پچاس سال سو سال اور ہزار سال بھی ہو سکتی ہے۔ اس مدت میں سماجی ڈھانچے میں تہذیبی اور انسانی شعور میں بے شمار تبدیلیاں واقع ہوں گی اس کے بعد جدیدیت کی معنویت کیا رہ جائے گی؟

آج کی نسل (۸۰ء کے بعد) جو شاعری کر رہی ہے اس کا رنگ اپنے پیش رووں (جدیدے) سے جداگانہ ہے۔ کیوں کہ آج کی شاعری اپنی لفظیات خود وضع کر رہی ہے، جس کے لیے اپنا منطقی جواز ہے۔ جن موضوعات کو جن عوامل کے ساتھ شعری پیکر میں پیش کیا جا رہا ہے وہ مستعار نہیں۔ بات اپنی ہے اور اپنے رنگ میں ہے۔ دکھ اپنا ہے اور مداوا بھی اپنا، فکر بھی اپنی اور شعور بھی اپنا۔ ایسا نہیں ہے کہ ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

جیسے جدیدیوں کے یہ اشعار جن میں ذہنی ناپختگی اور ادھ کچری فکر ملتی ہے ؎

تھوڑی دیر میں اک جراغوں کی تھالی   کالی بلی سر پر رکھ کر آئے گی   (بشیر بدر)
پھیلا ابد کا پھیلا ہوا سا چہار سمت   ابلیس گھات گھات اک آدم کی باس کے   (منصور سبزواری)
روز پکتی ہے شاعری کی بلغ   خوب شب خون کا چلا مطبخ   (ظفر اقبال)

[illegible]
شاعری میں معنوی گہرائی ہوتی ہے جو ابہام سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر جب ابہام کی دبیز پرت جم جائے تو معنویت مفقود ہو جاتی ہے مدعا یہ کہ شعری فن پارہ ایک تجلی بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے شاعری اس لیے پڑھی جاتی ہے کہ ذہن کو آسودگی بھی ملے اور شعور کا ظلمت کدہ منور ہو سکے، کائنات کی پوشیدہ سطحوں کا ادراک بھی ہو اور شاعر کے افکار سے قارئین استفادہ بھی کر سکیں۔ شاعری کو معاشرے سے بھی سروکار ہے اور شاعر اسی معاشرے کا فرد ہوتا ہے۔ ممکن نہیں کہ شاعر معاشرے میں رہ کر اس کے اثرات قبول نہ کرے۔ اگر وہ یہ ناٹک کرے کہ اس کی شاعری بھی الہامی ہے اور اس کے موضوعات بھی، تو یہ جہل بھی ہے اور معصوم قارئین کو دھوکا دینے کا انوکھا فن بھی، جس طرح ۸۰ء کے پہلے والی نسل خود پر لبادۂ مسخری ڈالے رہی۔

آج کی نسل نے خود کو سمجھا ہے۔ معاشرے سے اپنی نسبت جوڑی ہے۔ ان کی شاعری کا مرکز، اپنی فکر اور اپنا معاشرہ ہے۔ معاشرہ سے سروکار رکھتے ہوئے بھی یہ شاعری نام نہاد مسبوقہ ترقی پسندی نہیں کہ شاعر شاعری کو مداری کے مثل ایک ڈھول کی طرح گلے میں لٹکائے ہوئے جمہورے سے پوچھتا پھرے کہ ---اس بابو کی جیب میں کیا ہے؟ اس بابو کے ہاتھ میں کیا ہے؟ اس بابو نے سر پر کیا رکھا ہے؟ وغیرہ، اور سب کا جواب "جمہورے" صحیح صحیح دیتا جائے اور ناظرین حیرت زدہ اور دم بخود دیکھتے رہ جائیں۔

بتی جلا کے دیکھ لے سب کچھ یہیں پہ ہے
بنیان میرے نیچے ہے شلوار اس طرف

۸۰ء کے بعد والی نسل نے اپنی بنیان اور اس کی شلوار کی نمائش نہیں لگائی ہے۔

اس کا آئینہ ادراک مصفّا اور مجلّا ہے۔ یہ اشعار۔

مطمئن ہو گئے آداب شہیری لے کر ہم نے کچھ بھی نہ لیا اوج فقیری لے کر (راشد طراز)

روایت کا ہے اب بھی سحر قایم ہر اک جدت پرانی ہو گئی ہے (عطا عابدی)

اسے دوستوں پر بھروسہ نہیں مخالف سب اس کے مشیروں میں تھا (ظہیر رحمتی)

یعنی یہ نسل تشکیک اور التباس کے حصار سے باہر آچکی ہے۔

آج کی نسل جدید علوم حاصل کرتے ہوئے خلا میں معلق ہو کر شاعری نہیں کر

[illegible]

[illegible] ہے۔ اس کے سامنے کئی [illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] اور ذریعہ اظہار میں یہ نسل خود مکتفی ہے ساگے کا اجالا پر گزر بسر نہیں کرتی۔ اپنا مطالعہ ہے اور اپنی سوچ، اور اس سوچ کے لیے اپنا جواز بھی ہے۔

زباں کا زاویہ لفظوں کی خو سمجھتا ہے   میں اس کو آپ پکاروں وہ تو سمجھتا ہے   (شہپر رسول)

سوچ تو سب کی اپنی ہوتی ہے، اصل چیز یہ ہے کہ اپنی اس سوچ کے لیے اپنا جواز بھی ہے کہ نہیں، یا پھر سوچ اپنی اور جواز (legitimacy) پڑوسی سے مستعار؟ اگر خود جوازیت کو سمجھنا ہو تو مذکورہ بالا شعر پر اس کا اطلاق کریں۔ ظاہر ہے "آپ" پکارنے پر "آپ" ہی سمجھا جانا چاہیے مگر شاعر نے جواز یہ پیش کیا کہ لفظوں کی ادائگی کے وقت زبان کا جو زاویہ بنتا ہے، اس سے مخاطب (محبوب) واقف ہے اور لفظوں کی "خو" بھی اس پر واضح ہے لہذا "آپ" کا مفہوم "تو" ہو جانا بعید نہیں۔ بات خلا میں نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے میرا ماننا ہے کہ اگر اس نسل کا نام ہو تو خود جواز نسل ہو کہ مابعد جدیدیت سے بات نہیں بنتی اور عقدہ لا ینحل رہ جاتا ہے۔ خالد عبادی کا یہ شعر دیکھیں جو اپنے معنوی امکانات کے لیے جواز بھی رکھتا ہے۔

ترے سینے سجانا چاہتا ہوں   میں سر پر شامیانہ چاہتا ہوں

تحیر نہیں، اور اگر ہے تو اس کا جواز ہے۔ سپنا اگر حسِ شامیانہ ہے تو اس کا جواز ہے۔ لہذا یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ ۸۰ء کے بعد کی ادبی نسل نے اپنے شعری اظہار کا جواز تلاش کیا ہے جو کسی "نئے منظر نامہ" یا نئی دنیا کی بازیافت سے کم نہیں۔ اس نسل کو نقاد کی تلاش نہیں ہے۔ نقاد خود اس نسل کی تخلیق تک پہنچنے کے لیے پر تول رہا ہے۔ شاعر اور نقاد کے تنازعہ سے کیا حاصل؟ ڈاکٹر اسعد بدایونی نے ایک جگہ لکھا ہے:

"ناقد کو اپنا منصب پہچاننا چاہیے کہ وہ ادب کا اہم ترین شخص نہیں ہے بلکہ ایک طفیلی گروپ کا آدمی ہے...... نئی نسل کے فنکار تنقید کی حکم رانی سے قطعی طور پر انکار کرتے ہیں۔"   (دائرے۔ ۱۹۸۸ء)

حالاں کہ ناقد کو محض طفیلی گروپ کا آدمی کہنا اس کی اہمیت سے صرف نظر کرنا ہے، جو انتہا پسندی کے مترادف ہے۔

جمال اویسی نے بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ نئے اور جدید خیالات کی ہمک میں بزرگوں نے ٹائی کوٹ پہن کر اور جام ہاتھ میں لے کر سارتر اور ایلیٹ بننے کی کوشش بھی کی مگر شخصیت اندر سے غیر مستحکم ہی رہی کہ ان کے اندر کسی مرکزی قوت کا فقدان

[illegible] نئی نسل میں بھی کہیں کہیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ غزلوں میں بعد کو ان کے سامنے سگریٹ کے کش لے کر مرغولے بنانا بھی اسی قبیل کا عمل ہے۔ مجھ سے ساتھی اس ڈگر پر قائم ہیں جو اخلاقی، سماجی اور تہذیبی معیاروں کے منافی ہے۔ شاعر یا ادیب سماج اور اخلاق کے اجزاء و عناصر کو اپنی فکر کا حصہ تصور کرتا ہے۔ مرکزی قوت بھی تو ہے۔ میں سمجھتا ہوں خارجی سہارے سے قطع نظر اگر اپنی کوئی اساس ہے تو یہی قدریں ہیں جو اس نئی نسل کی کمائی کہی جا سکتی ہیں۔ چند اشعار دیکھیں پھر ان کی مشترکہ توجیہ۔

سبھی کے اپنے مسائل ہیں اپنی تدبیریں — کوئی چراغ جلاتا کوئی بجھاتا ہے (مصحف اقبال)

خود کو سنبھالنا بھی قیامت ہے ان دنوں — اب ہم ہیں اور آگ بجھنے کے مرحلے (رؤف خیر)

جگا دیا مجھے کس نے اچھال کر پتھر — میں اپنے آپ میں سویا ہوا سمندر تھا (رحمٰن [illegible])

فصیل شعلوں کی اٹھانا چاہتا تھا شہر میں — لپک کر جو آگ کل مجھ سے وہ راہی لے گیا (سلیم انصاری)

گنہ کے بوجھ سے یہ ہاتھ ہی نہیں اٹھے — لبوں پہ ورنہ ہمیشہ دعا مچلتی رہی (عالم خورشید)

اب کسی پیکر فردوس پہ تکیہ کیسا — کس کو معلوم تھا کشمیر بدل سکتا ہے (خورشید اکبر)

سجدہ کرتے ہیں روایت کے غلام — دل جھکایا تو جبیں کچھ بھی نہیں (جمال اویسی)

نہ قافلے سے الگ ہوں نہ قافلے میں ہوں — غبار راہ کی مانند راستے میں ہوں (نعمان شوق)

سواری لیل کی کب جانے یلغار کر دے — مرے بچے ابابیلوں کا لشکر چھوڑ دینا (خورشید طلب)

جو سراپا التجا بن کر ملا تھا پہلے روز — اتنی جلدی پھر خفا ہو جائے گا سوچا نہ تھا (سراج اجملی)

غیرت داروں کے زخموں پر مرہم مت رکھنا — ہمدردی کا اک رخ دل آزاری ہوتا ہے (شکیل جمالی)

لپک رہے تھے شرر نفرتوں کے میری طرف — کھڑا ہوا میں وفاؤں کے سائبان میں تھا (عاصم شہنواز)

نام جن عقل کہاں رشتۂ دنیا ہے کہاں — چھوڑ دو یار اسے اور بھی الجھو گے (احمد محفوظ)

ترے بن یوں سلگتی رہی زندگی — کہ لکڑی کوئی جلتی چھوڑ دے ([illegible])

میں بوڑھا ہو چلا ہوں پھر بھی ماں تاکید کرتی ہے — مرے بچے نہ جانا گھر سے باہر شام ڈھلتے ہی (راشد انور راشد)

حاصل ہے ہم کو لذت توبہ خطا کے بعد — بہتر ہے، آدمی ہیں فرشتہ نہیں ہیں ہم (طارق متین)

ملے ہیں عظمت کردار پہ انہیں طعنے — فنا میں لوگ جو حرمت کا ذہن رکھتے ہیں (عمران عظیم)

ایک ماں نے "سچ" رکھا ہے مستقل کام — ایک چادر دو کے کشمیر میں گم ہو گیا (عادل حیات)

خواب بننے کا ہنر اپنا ہے۔ جن موضوعات کو شاعری میں پیش کیا گیا ہے، ان کی دلیل اور اس کا [illegible]

[illegible] کرتے ہوئے [illegible] ہے۔ یہ نسل [illegible] کہ
اس کا رشتہ زمین سے ہے، اس نے اپنے پیروں پر چلنا خود سیکھا ہے۔ خارجی بیساکھیوں کا سہارا لے کر اپنی تہذیبی اور سماجی قوت کا مذاق نہیں اڑایا ہے۔ اور اگر کسی نے یہ گستاخی کی ہے تو وہ بھی شعری اور ادبی سراب میں محض ایک قطرۂ آب کی جستجو میں سرگرداں ہے جو سعیِ لا حاصل سے آگے کچھ نہیں۔ نئے تیور سے کہے ہوئے تازہ کار اشعار کو کسی تنقیدی بیساکھی کی ضرورت بھی نہیں۔ یہاں رؤف خیر کا موقف دل چسپی سے خالی نہ ہوگا:

"نئی نسل کے فنکار کو ناقد کی مشفقانہ اور بزرگانہ قسم کی مسکراہٹ کھلتی ہے۔" (دائرے۔ ۴: ۱۹۸۸ء ص ۱۷)

یہ سچ ہے کہ تخلیقی فنکار کو کسی نقاد کی مشفقانہ مسکراہٹ (جو ایک بیساکھی ہے) گراں گذرتی ہے۔ ہاں اُن تخلیقی فنکاروں کے لیے اس "مسکراہٹ" کی اہمیت فزوں تر ہو جاتی ہے جو خود طفیلی فنکار ہوتے ہیں یا جن کے یہاں originality نہیں ہوتی۔ موجودہ غزل کے حوالے سے نامی انصاری اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں۔

"موجودہ غزل جس ڈگر پر چل رہی ہے وہ جدیدیت کے حامیوں کی مرضی و منشا کے مطابق یقیناً نہیں ہے۔" (نیا سفر ۹۔۱۰: ۱۹۹۸ء، ص ۲۲۳)

۸۰ء کے حوالے سے جو شاعری ہو رہی ہے (واضح ہو کہ یہاں غزلوں کے تعلق سے گفتگو ہو رہی ہے) اس کی اپنی شناخت ہے۔ موضوع کے لحاظ سے بھی اور ڈکشن کے لحاظ سے بھی۔ کچھ دوستوں نے کھردرے اور لچر الفاظ وتراکیب کا استعمال کیا ہے مگر ایسے کم شعرا ہیں۔ جناب مین تابش نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ تمام الفاظ اپنی تمام ترجہات کے ساتھ جدید شاعری اور ادب میں استعمال ہو چکے ہیں اس لیے جو بھی نئی تخلیقات ہوں گی ان کا حوالہ جدیدیت ہی ہے۔ (کتاب نما مئی ۹۸۔ ص ۲۶)

تمام الفاظ جب خرچ ہو چکے تو یہ نئی نسل کیا کرے؟ خلا میں ٹکٹکی لگائے رہے کہ آسمان سے نئے الفاظ اتریں تو مشقِ سخن کی گاڑی آگے بڑھے۔ تمام الفاظ اپنی تمام جہات کے ساتھ استعمال ہو چکے۔ کوئی جہت بھی نہیں۔ صاحب! آپ نے تو اس نئی نسل کو فرہنگ نکالا کر دیا۔ پھر آج کی تخلیقات کا حوالہ جدیدیت کو ماننا بے تکی سی بات ہے۔ زمانہ آگے بڑھتا جا رہا ہے آپ اسے پیچھے گھسیٹ رہے ہیں۔ جدیدیت کی جو اعلا اور لائق اعتنا قدریں ہیں یہ نسل خود قبول کرتی ہے۔ اختلاف اس بنیاد پر نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو یہ کہ ـــــ یہ نسل وہ ہے جو ماضی کی دوسری نسلیں نہیں تھیں۔ یہی اس کی شناخت بھی ہے۔ اگر ایک خارجی سہارا میں بھی لوں تو سوسیر کے بقول:

Every sign is to be what others are not

گرچہ یہ لسانی بحث نشان، معنی نما اور تصورِ معنی کے ذیل میں کیا گیا ہے مگر یہاں بھی اگر sign کو Generation تصور کریں تو بات صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔●

ساختیات

[redacted]

جدید ساختیات یا اسٹرکچرلزم کا بانی سوسئر ہے۔ اس کا اصل نام فرڈیننڈ ڈی سوسئر ہے اور اس کا شمار عمرانیات کے ماہر درخائیم اور جدید نفسیات کے بانی سگمنڈ فرائڈ کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی اس کا شمار کارل مارکس کے بعد تین اہم ترین سائنسی ماہرین میں ہوتا ہے۔ ان تینوں ماہرین کے خیالات کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو علم کی جستجو میں تاریخی واقعات کے تاریخی اسباب دریافت کرنے تک اپنے آپ کو محدود نہیں کرنا چاہیے بلکہ علوم کے سلسلے میں سماجی پس منظر کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ سماجی حقائق ہمیشہ رسوم و رواج اور اقدار کے بندھنوں میں بندھے ہوتے ہیں اور انسان انھی رسوم و رواج کے سہارے زندگی گزارتا ہے۔ اگر ہم یہ معلوم کریں کہ وہ کون سے رسوم رواج ہیں جن کے ذریعے ہم اپنے خیالات دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور دوسروں کے خیالات ہم تک پہنچتے ہیں تو ہم یہ جان جائیں گے کہ یہ بنیاد ہمیں زبان فراہم کرتی ہے۔

اگر زبان نہ ہوتی تو ہم ایک دوسرے تک خیالات نہیں پہنچا سکتے تھے۔ معاشرے کے پس منظر میں ہمیں حقائق تک پہنچنا چاہیے۔ اس کا سبق ہمیں ان تینوں مفکروں نے دیا ہے یعنی درخائیم، فرائڈ اور سوسئر نے۔ سوسئر نے سب سے زیادہ اہم یہ بات کہی ہے کہ اشیا کو اپنے جوہر Essence میں نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اشیا کو ایک دوسرے کے باہمی رشتے میں دیکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انسان میں چیزوں کو منظم کرنے کی بنیادی صلاحیت موجود ہے۔ اس کا اظہار زبان کے سلسلے میں بھی ہوا ہے۔ اس سلسلے میں اہم ترین انکشافات سوسئر نے کیے ہیں۔ سوسئر سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا تھا۔ یونیورسٹی آف جنیوا میں پروفیسر کی حیثیت سے اس نے عمومی لسانیات پر ۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۱ء کے درمیان لیکچر دیے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے شاگردوں اور ساتھیوں نے اس

(Course in General Linguistic)

سوسیئر کے مطابق کہ اگر ہم زبان کا تجزیہ کرنا چاہیں تو ہمارے ذہن میں زبان کے عناصر یا زبان کی اکائیوں کا تصور واضح طور پر ہونا چاہیے۔ سوسیئر کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے نشان اور نشانات کے نظام پر یعنی System اور Sign System بڑے واضح انداز میں لکھا ہے۔ اس طرح بتا دیا ہے کہ انسانی تجربے کی زبان کے سلسلے میں کس طرح تنظیم کی جاسکتی ہے اس طرح سوسیئر ہمارے ماضی قریب کا ایک اہم مفکر ہی نہیں ہے بلکہ آج کی انٹیلکچول دنیا میں بھی اس کی موجودگی ذرا بھی کم نہیں ہوئی ہے۔

سوسیئر سے پہلے لسانیات کا علم ابتدائی منزلوں میں تھا۔ ان بنیادوں کو استوار کرنے والا شخص سوسیئر ہے۔ سوسیئر نے زبان کی وہ بنیاد تلاش کی جو زبان کو با معنی بناتی ہے۔

سوسیئر کے بتائے ہوئے ماڈل پر علم البشریات کے ماہر لیوی اسٹراس نے بڑے اضافے کیے اور ایک نئے علم ساختیاتی بشریات کی بنیاد رکھی۔ لاکاں نے جو علم نفسیات کا ایک عظیم ماہر تھا اس نے زبان اور لاشعور کے اسٹرکچر کو ایک ہی قسم کا اسٹرکچر بتایا۔ ان تینوں کو یعنی درخائیم، فرائڈ اور سوسیئر کو (Seminal) مفکر کہا جاتا ہے، یعنی ایسے مفکر جنھوں نے عہد جدید میں از سر نو علم کے بیج بوئے۔

سوسیئر کا انتقال ۱۹۱۳ء میں ہوا تھا۔ وہ فرانسیسی، لاطینی، یونانی، جرمن، سنسکرت اور انگریزی زبان جانتا تھا۔ اس کا مقالہ ہند و یورپی زبانوں میں Vowels کی اہمیت کے بارے میں تھا۔ یہ مقالہ اس نے اکیس برس کی عمر میں لکھا تھا۔ لائپزگ میں جب وہ عرصے کے بعد آیا تو ایک پروفیسر نے پوچھا۔ "کہیں آپ سوئٹزرلینڈ کے مشہور ماہر لسانیات سوسیئر کے عزیز تو نہیں ہیں؟"

نشانیوں یعنی Signs کے بارے میں سوسیئر نے بڑی اہم باتیں کی ہیں مثلاً یہ کہ یعنی Sign میں زبان اور تصور کا میل ہوتا ہے مثلاً درخت اگر Signifier ہے تو درخت کا تصور Signified ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ نشانات بلا جواز اور من مانے ہوتے ہیں مثلاً پیڑ کے لیے دنیا کی مختلف زبانوں میں جو الفاظ ہیں وہ من مانے اور بلا جواز ہیں۔ پیڑ کو درخت کہتے ہیں۔ فارسی میں اور عربی میں شجر کہتے ہیں انگریزی میں Tree کہتے ہیں۔ اس طرح گائے کو اردو میں گائے اور فارسی میں گاؤ کہتے ہیں۔ انگریزی میں Cow اور فرانسیسی میں Vache۔ یہ سب الفاظ اپنی زبان میں اپنے مقام سے متعین ہوتے ہیں۔

نظر [illegible] Synchronic [illegible]
کے لیے Diachronic رویہ کا حامل ہے، ہمارا لسانیاتی مطالعہ یک زمانی ہونا چاہیے۔ سوسئیر کا خیال تھا کہ حقیقت کا یہ زمانی اظہار ہی حقیقت کا اصل اظہار ہے۔

سوسئیر نے زبان کی تقسیم گفتار Parole اور Langue لسان میں کی ہے۔ Parole مخصوص گفتار یا مکالمہ کو یا کسی خاص گفتگو یا اسپیچ کو کہتے ہیں اور Langue پوری زبان کے اس ذخیرہ کو کہتے ہیں جس میں زبان کے قواعد و ضوابط بھی شامل ہے۔ یہ ہمیں نظر نہیں آتا لیکن Parole تو ہمارے سامنے ہوتا ہے، Langue ہمیں نظر نہیں آتا اس کا انحصار ہماری لسانی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ گفتار یا Parole ہماری اسی لسانی صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے۔

لفظوں کے باہمی رشتوں کی وضاحت کے سلسلے میں سوسئیر نے دو قسم کے رشتوں کی بہت اہمیت ظاہر کی ہے۔ ایک کو وہ افقی رشتے کہتا ہے اور دوسرے کو عمودی رشتے۔ افقی رشتوں کو (Syntagmatic) اور عمودی رشتوں کو (Paradigmatic) کہتا ہے۔

افقی رشتے ان الفاظ کے رشتوں کو کہتے ہیں جو کسی کلمے میں ایک کے بعد ایک آتے رہتے ہیں۔ لفظوں کا افقی رشتہ جو پہلے اور بعد میں آنے والے لفظوں سے مل کر بنتا ہے اس سے جو نحوی ترکیب بنتی ہے وہ کلمہ میں معنی پیدا کرتی ہے مثلاً ایک کلمہ ہے قمر نے صفیہ کو دیکھا۔ جب تک آخری لفظ دیکھا نہ آجائے معنی مکمل نہیں ہوتے۔ یا احمد نے ایک پھول پھینکا، جب تک آخری لفظ پھینکا نہ آجائے، معنی مکمل نہیں ہوتے، الفاظ کی اس قسم کی ترتیب کی بنیاد افقی رشتہ پر ہوتی ہے، افقی رشتہ جس میں لفظ ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں اس کو افقی یعنی Syntagmatic رشتہ کہتے ہیں، مثلاً ایک کلمہ ہے، احمد نے محمود کو دیکھا۔ اس کلمہ میں دیکھا کی بجائے مارا یا لوٹا یا قتل کیا کہہ سکتے ہیں۔ ان مختلف الفاظ میں سے صرف ایک لفظ چن لیا جاتا ہے، اس کو عمودی رشتہ کہتے ہیں۔

سوسئیر کا یہ دعویٰ ہے کہ سارا لسانی نظام افقی رشتہ اور عمودی رشتے کی تمثیل میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

سوسئیر نے لسانیات کے سلسلے میں جو باتیں بہت اہم لکھی ہیں ان میں ایک بات تو یہ ہے کہ زبان مثبت اظہار سے خالی ہے۔ دوسری یہ کہ الفاظ binary Opposition کے رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں مثلاً دن کے تصور کے ساتھ رات کا تصور ہے۔ اسی طرح

[illegible] اور
عورت کا تصور مرد کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح دن اور رات کا تصور ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح اگر آپ دیکھیں تو پوری زبان Binary Op-position یعنی مخالف باہمی کا ایک جال ہے۔ ایک ایسا جال جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ قائم بالذات نہیں ہوتا بلکہ قائم بالغیر ہوتا ہے مثلاً

روشنی	اندھیرا
بہار	خزاں
خیر	شر
ازل	ابد
داخل	خارج
اندر	باہر

سوسیئر کے خیال میں زبان ایک خود ملکیتی نظام ہے جو اپنے اندرونی قوانین سے عمل پیرا رہتی ہے اور لفظ ایسا نشان ہے جسے معاشرے میں من مانے طور پر قائم کیا جاتا ہے۔ ہر لفظ کا وجود دوسرے الفاظ سے مختلف ہونے پر قائم ہے۔ نشان معنی کی بنیادی اکائی ہے۔ لسانی نشان (Sign) کے دو رخ ہوتے ہیں، ایک تو اس کی آواز یا اس کی تحریر، جس کو معنی نما یا Signifier کہتے ہیں اور دوسرے اس کا خیال جس کو تصور معنی یا Signified کہتے ہیں۔ معنی نما اور تصور معنی دونوں ایک ساتھ ظہور کرتے ہیں۔ یہ دونوں بلا جواز ہوتے ہیں ان میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا یعنی فطری رشتہ نہیں ہوتا۔ دریا کے لفظ کے ساتھ ہی دریا کا تصور بھی آجاتا ہے۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ زبان میں آواز کو خیال سے الگ نہیں کیا جا سکتا مثلاً ہم نے دریا کہا تو دریا کی آواز کے ساتھ ہی دریا کا تصور بھی آجائے گا۔ زبان کا موازنہ کاغذ کے ایک ٹکڑے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ خیال اس کے سامنے کا حصہ ہے اور آواز اس کی پشت کی حیثیت رکھتی ہے۔

کاغذ میں سے کوئی سامنے کے حصے کو پشت کے حصے کی بغیر کاٹ نہیں سکتا۔

زبان کے دو حصے ہیں ایک کو سوسیئر گفتار یا Parole کہتا ہے اور دوسرے کو لسان یا Langue۔ یہ غیر مرئی رہتا ہے۔ سوسیئر نے زبان کے ساتھ ہمارے رویے کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک کو وہ دو زمانی Diachronic کہتا ہے۔ دو زمانی سے مراد لسانیات کا وہ تصور

ہے [illegible]

ی ساختیات کے مطالعے کے لیے کافی ہے۔

[redacted]

روس کے انقلاب سے ایک دو برس پہلے روس میں ایک تحریک چلی جسے ہیئت پرستی کی تحریک کہتے ہیں لیکن یہ تحریک سیاسی حالات کی وجہ سے بہت جلد ختم ہو گئی لیکن ساختیات میں یورپ میں عام طور پر دلچسپی بڑھ گئی۔ ہیئت پسندی کے ماہرین کو بھی اس مسئلے سے دلچسپی تھی کہ شاعری کی زبان اور عام زبان میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ماسکو لنگوسٹک سرکل ۱۹۱۵ء میں قائم ہوا تھا اور Opojaz یعنی انجمن برائے مطالعہ شعری پیٹروگراڈ میں ۱۹۱۶ء میں قائم ہوا تھا۔ ان اداروں کے ماہرین بھی عام بول چال اور شعری زبان کے فرق کو سمجھنا چاہتے تھے۔

یہ بات تو سب پر واضح ہے کہ عام زبان بول چال میں کام آتی ہے اور عام لوگوں کے خیالات کو ایک دوسرے تک پہنچاتی ہے اور ادبی زبان بول چال کی زبان نہیں ہوتی بلکہ عام مشاہدے کی چیزوں کو ذرا سے مختلف انداز سے دکھاتی ہے۔

روسی ہیئت پسندوں کا خیال تھا کہ جو چیز ادبی زبان کو عام زبان سے مختلف بناتی ہے وہ اس کا بنا ہوا اسلوب ہوتا ہے۔ یہ خصوصیات ہمارے یہاں غالب، اقبال اور ن۔ م راشد کے کلام میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اس کی کچھ مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں۔ مثلاً

قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے — غالبؔ

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل — اقبالؔ

نیند آغازِ زمستاں کے پرندے کی طرح
خوف دل میں کسی موہوم شکاری کا لیے
اپنے پر تولتی ہے چیختی ہے
بے کراں رات کے سناٹے میں — ن۔ م راشد

ان تمام مصرعوں کا بنا ہوا اسلوب بہت نمایاں ہے۔ ہیئت پسندوں کا خیال تھا کہ شاعری ادبی زبان کا [illegible] ہوتی ہے۔ روسی ہیئت پسندوں کا یہ قول آج تک [illegible]

ہے کہ شاعری زبان کے ساتھ [illegible] تشدد کی ہے تاکہ معنی [illegible] [illegible]
سکے۔ اس بچے تلے تشدد کی مثالیں غالب، اقبال اور راشد کے کلام سے دوبارہ پیش کرتا ہوں۔

قیس قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی — غالب

خودی کی موت سے مہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام — اقبال

قہوہ خانے کے شبستانوں کی خلوت گاہ میں
آج کی شب تیرا دزولیدہ [illegible]
عشق کا ہیجان، آدھی رات اور تیرا شباب
تیری آنکھ اور میرا دل
عنکبوت اور اس کا بیچارہ شکار — ن۔ م راشد

یہ مثالیں میں نے غالب اقبال اور راشد کے کلام سے دی ہیں۔ اب شاعری کے بنے ہوئے ہونے کی مثالیں میر کے کلام سے ملاحظہ کیجئے

مت پوچھ کس طرح کٹی رات ہجر کی
ہر نالہ میری جان کو تیغ کشیدہ تھا

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

روسی ہیئت پسندوں کا خیال تھا کہ ادب کا نامانوس ہونا ضروری ہے جو ادب پڑھنے والے کو اجنبی لگے وہ ادب کیسے ہو سکتا ہے یہی نامانوسیت ادب کی جان ہے۔

ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

اس شعر کی ہزار خوبیوں سے الگ اس کی ایک نامانوسیت بھی ہے جس کی دلکشی نے اس کے حسن کو اور بڑھا دیا ہے۔ روس کے ہیئت پسندوں کا خیال تھا کہ ادب کے سلسلے میں اجنبیانے Defamilirization کا عمل ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ [illegible] طور پر شکلووسکی کا خیال تھا کہ روزمرہ کی زندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ [illegible]
[illegible] اور [illegible] باقی [illegible]

[illegible]
محروم ... [illegible]
ہم نے ... [illegible] ... کر دی ہے۔

آرٹ دوبارہ ہمیں اس تازگی سے ملا دیتا ہے جو ہم صرف خواب ہی میں دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ آرٹ کا عمل ہے۔ انسانی شعور کا اتفاقی تجربہ نہیں ہے جو فطرت کی تازگی اور خواب ہی میں حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم اس تجربے کی بازیافت آرٹ ہی کی صورت میں کر سکتے ہیں۔ آرٹ ہمارے تجربہ کی تازگی کو دوبارہ اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ تکنیک کس طرح آرٹ کو زندہ کر دیتی ہے یہ بتاتے ہوئے شکلووسکی نے لکھا ہے۔

"عادت اتنی بری چیز ہے کہ ہر نئے پن کے احساس کو مار دیتی ہے۔ کپڑے، فرنیچر، بیوی، بچے سب اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کی زندگیاں تو صرف لاشعوری طور پر زندہ رہتی ہیں۔ بے کیف۔ لیکن آرٹ زندگی کے احساس کو، زندگی کے کیف کو دوبارہ زندہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔ پتھر کے پتھریلے پن کو دوبارہ محسوس کرنے میں مدد دیتا ہے۔ آرٹ کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے اندر چیزوں کا وہ احساس دوبارہ پیدا کر دے جیسا وہ اس وقت تھا جب ہم نے ان چیزوں کو پہلی بار دیکھا تھا۔ آرٹ کی تکنیک ہی یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے چیزوں کو اجنبی اور نامانوس بنا دے۔ اسٹائل کو اس طرح مبہم کر دے کہ ہمیں ان کے ادراک میں وقت پیش آئے اور دیر ہو۔ آرٹ میں ادراک کا عمل ہی اس کا مقصد ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو زیادہ طویل ہونا چاہیے۔ آرٹ میں تکمیل کا عمل ہی اہم ہوتا ہے کوئی تکمیل شدہ چیز ہی اپنی جگہ اہم نہیں ہوتی۔

آرٹ کا مقصد ہی یہ ہے کہ اشیا جس طرح محسوس کی جاتی ہیں اسی طرح محسوس کرائی جائیں۔ اس طرح نہیں جس طرح وہ جانی جاتی ہیں۔ آرٹ کی تکنیک یہ ہے کہ وہ چیزوں کو دوبارہ اجنبی بنا دے۔ فورم (Form) میں اشکال پیدا کر دے تاکہ محسوس کرنے اور دیکھنے کے عمل میں کسی طرح وقت پیدا ہو جائے اور کچھ وقت زیادہ صرف ہو کیونکہ محسوس کرنے کا عمل جمالیاتی احساسات کا کام ہوتا ہے اور اس کو طول دینا ضروری ہو

[illegible] کی کر

[illegible] جہاں [illegible] ہوتا ہے کہ [illegible]

[illegible] کسی شاعر کا پیغام کہاں ہے۔ لیکن عام زبان [illegible] ہوتی [illegible] ہوتی ہے لیکن شاعری کی زبان میں کئی زبان ہوتی ہے۔ [illegible] کے حوالے [illegible] حوالے سے جو اور کچھ بھی ہے۔ اس میں خود مرکزیت ہوتی ہے۔ [illegible] کی [illegible] اپنی طرف منعطف کراتی ہے۔

یعنی ادبی اوصاف کی جانب توجہ مبذول کرا دیتی ہے۔ یہ ادبی اوصاف لفظوں اور لفظوں کے باہمی رشتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ لسانیات ان ادبی آوازوں اور [illegible] اوصاف کا تجزیہ کرتی ہے۔ شعری لسانیات کے اصول و قواعد ایسے ہوتے ہیں جن کی مدد [illegible] کے عناصر کی شناخت قائم کی جا سکتی ہے۔

[illegible] وڈاری نے لکھا ہے کہ ادب زبان کی ایک [illegible] ہے اور زبان کی کچھ خصوصیات کا اطلاق (Application) ہے تو ماہر لسانیات کی [illegible] مرکزی اہمیت حاصل کر سکتی ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں جب یہ ظاہر [illegible] کی کون سی خصوصیات کسی متن میں سب سے زیادہ عمل پیرا ہیں اور کس [illegible] ہے اور کس طرح ان کو دوبارہ منظم کیا جاتا ہے۔ اس مطالعے کو [illegible] مرکزی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ روسی ہیئت پسندوں، [illegible] کے مطالعے [illegible] اور ہم عصر ساختیات کے ماہرین کے خیالات سے ظاہر ہوتا ہے اور ان [illegible] فکر کے درمیان رومن جیکب سن کو [illegible] کی کڑی کی حیثیت حاصل ہے اور [illegible] لفظوں کے تجزیے کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ رومن جیکب سن کا کہنا ہے کہ [illegible] Functioning [illegible] پیغام کو صرف اس پیغام کی خاطر اہمیت دینا [illegible]

[illegible] focus on the message for its [illegible] جیکب سن کے [illegible]

[illegible] ہے وہ صرف پیغام [illegible] forms [illegible]

[illegible]

"The function of poetic language in the maximum forgraounding consists of the utterance"

رومن جیکب کہتا ہے کہ جس طرح مصور رنگ کو اپنے استعمال میں لاتا ہے شاعر زبان کو بھی اسی طرح استعمال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شاعری کا کام یہ نہیں ہے کہ اس میں نشان کو تصور معنی کی جگہ استعمال نہ کرے یعنی وہ کہتا ہے کہ شاعر یا نظم کا قاری مصرعے سے شاعر یا نظم کے قاری کا رویہ مراد نہ لے۔ یعنی مصرعے کو شاعر کا حقیقت کے بارے میں مظہر نہ بنائے بلکہ اس مصرعے سے زبان کے سلسلے میں شاعر کے رویے کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ تب ہی قاری زبان کے سلسلے میں شاعر کے رویے کو سمجھ سکتا ہے اور وہ اشعار کے World View کو سمجھ سکتا ہے۔ اسی صورت میں جیکب سن اور دوسرے ہیئت پرستوں کا نقطۂ نظر واضح ہو سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ نظم یا ادبی تخلیق کی شعریت اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب ہم قاری کی حیثیت سے جانیں کہ شاعر کا لسانی رویہ کیا ہے مثلاً الفاظ کی تکرار یا قافیوں کا استعمال زبان کی شدت کا اظہار ہے۔

ادب بھی ہمیشہ ایک جدلیاتی عمل کا شکار رہتا ہے۔ ان معنوں میں کہ ہم ادب اسی کو کہتے ہیں جو ہمارے لیے چیزوں کو اجنبی بنادے اور جب کسی چیز سے ہم مانوس ہو جاتے ہیں تو اسے ترک کر دیتے ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ادب کی تاریخ اسی جدلیت کا شکار رہتی ہے۔

رومن جیکب سن نے شعری زبان کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ شاعری میں زبان کا جمالیاتی عنصر اس کے ترسیلی عنصر پر غالب آجاتا ہے۔ شعری زبان میں لفظ خارجی حوالوں سے آزاد ہو جاتے ہیں اور لفظ معنی سے معنی پیدا کرنے کے ایک لامتناہی کھیل میں حصے دار ہو جاتے ہیں۔ شاعری میں معنی خیزی کا یہ عمل اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

ہیئت پسندوں کا یہ کہنا بڑی حد تک درست ہے کہ امیج ہو یا علامت یا استعارہ اپنی جگہ خود ان کی موجودگی کافی نہیں ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کا تخلیقی استعمال کیا گیا ہے یعنی شعری اثر پیدا کرنے میں امیج یا علامت یا استعارے سے کام لیا گیا ہے۔

ہیئت پسندوں کا یہ خیال ہے کہ شاعری لفظوں سے بنتی ہے۔ موضوعات سے نہیں۔ شعری زبان اپنے وجود کا احساس خود دلاتی ہے۔ شعری زبان خود آگاہ اور خود شناس ہوتی ہے۔ شعری زبان اپنے موضوع یا پیغام سے بلند ہو کر اپنا اظہار خود کرتی ہے۔ شعری زبان میں لفظ، جذبہ یا خیال کی ترسیل کا ذریعہ نہیں رہتے بلکہ خود محسوس حقیقت بن جاتے ہیں یعنی لفظ صرف نشان نہیں رہتے بلکہ خود شے کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ●●

غالبیات

تلامذۂ غالب	مالک رام	75/
فسانۂ غالب	مالک رام	16/50
یادگار غالب (اردو) مرتبہ	مالک رام	30/
یادگار غالب (فارسی)	مالک رام	9/
گفتار غالب	مالک رام	48/
احوال غالب	پروفیسر مختار الدین احمد	45/
غالب کچھ مضامین	ڈاکٹر خلیق انجم	40/
غالب کے خطوط (اول)	ڈاکٹر خلیق انجم	120/
غالب کے خطوط (دوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	120/
غالب کے خطوط (سوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	75/
غالب کے خطوط (چہارم)	ڈاکٹر خلیق انجم	120/
غالب اور شاہان تیموریہ	ڈاکٹر خلیق انجم	9/50
عظمت غالب	ڈاکٹر عبدالمغنی	35/
غالب پر چند تحریریں	ڈاکٹر عبادت علی صدیقی	35/
غالب	ڈاکٹر خورشید الاسلام	40/
غالب تقلید اور اجتہاد	خورشید الاسلام	30/
غالب اور انقلاب ستاون	ڈاکٹر سید معین الرحمن	60/
غزلیات غالب (اردو)	یوسف حسین خاں	95/
پرشین غزل آف غالب	یوسف حسین خاں	250/
نقد اور غالب	ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری	35/
دیوان غالب	نورالحسن نقوی	35/
دیوان غالب	ایوان غالب	50/
غالب اور ذکا	ضیاء الدین احمد شکیب	6/
غالب اور سرور	ایم۔ حبیب خاں	25/
غالب سے اقبال تک	ایم حبیب خاں	25/
غالب اور صفیر بلگرامی	مشفق خواجہ	36/
غالب اور فن تنقید	اخلاق حسین عارف	25/
دیوان غالب	غالب اکیڈمی	150/
تفہیم غالب	شمس الرحمن فاروقی	90/
انتخاب اردو کلیات غالب	شمس الرحمن فاروقی	90/
غالب اور تصوف	سید محمد مصطفیٰ صابری	60/
غالب کی رہگذر	واجد سحری	35/
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	25/
غالبیات اور ہم	ڈاکٹر ابو محمد سحر	50/
جوہر آئینہ (جائزہ کلام غالب)	حامد کاشمیری	25/
بین الاقوامی سیمنار	یوسف حسین خاں	20/
انتخاب مضامین غالب نامہ تحقیقات	پروفیسر [illegible]	150
نقد قاطع برہان	پروفیسر نذیر احمد	60
غالب پر چند تحقیقی مطالعے	پروفیسر نذیر احمد	60/
غالب احوال و آثار	حنیف نقوی	60/
مثنویات غالب (فارسی) اردو ترجمہ	ڈاکٹر ظ۔ انصاری	60
نوادرات غالب	سید آفاق حسین آفاقی	30/
ریختۂ غالب	نورالحسن ہاشمی	5
فیضان غالب	عرش ملسیانی	22
یادگار غالب۔ ایک جائزہ	سید حیدر عباس رضوی	8
دیوان غالب (ہندی)	ثاقب صدیقی	80/
غالب اور غزل	ڈاکٹر یعقوب [illegible]	90/
غالب اور اردو غزل	عبد [illegible] چریاکوٹی	100
شرح دیوان غالب	یوسف سلیم چشتی	125
• غالب کو [illegible]	سید محمد مہدی	8/50
انشائے غالب	رشید حسن خاں	60
گفتۂ غالب	ڈاکٹر محمد سیادت نقوی	60
غالب پر چند مقالے	پروفیسر نذیر احمد	60/
انتخاب مضامین غالب مع تنقیدات	پروفیسر نذیر احمد	100
دیوان غالب جدید	(نسخۂ حمیدیہ)	32
غالب کے چند [illegible]	سلیمان اطہر جاوید	60/
غالب کی بعض تصانیف	کالی داس گپتا رضا	80/
توضیحی اشاریہ غالب نامہ	فاروق انصاری	50/
غالب کی شناخت	ڈاکٹر [illegible] احمد صدیقی	80/
غالب کی آپ بیتی (اردو)	پروفیسر نثار احمد فاروقی	40

محسن احسان
3-9-85 حیات آباد
پشاور

غزل

دریائے محبت میں روانی ہے زیادہ
غرقاب کنارے ہیں کہ پانی ہے زیادہ

ممکن نہیں اب حرفِ ہنر سے بھی اجالا
اس عہد میں تعمیرِ معانی ہے زیادہ

واعظ کا فقط زورِ خطابت ہے وگرنہ
قرآن قرأت میں کہانی ہے زیادہ

کچھ اب کے پرندوں کی اڑانیں بھی ہیں اونچی
کچھ دل میں شکاری کے بھی ٹھانی ہے زیادہ

اٹھتا ہوں جو بستر سے، تو لگتا ہے دمِ صبح
کل صبح سے، یہ صبح سہانی ہے زیادہ

ہیں خواہشیں گرداب کی مانند ہر اک سو
یہ اب ہیں اور تشنہ دہانی ہے زیادہ

آنکھوں میں کئی دن سے ہے برسات کی جل تھل
لگتا ہے کہ ان جھیلوں میں پانی ہے زیادہ

ہے یوں کہ بہت رنج زمانے نے دیے ہیں
ہے یوں کہ دلِ سادہ نے مانی ہے زیادہ

کیوں خوف سا ہے ہر در و دیوار پہ محسن
کیوں شہر سے اب نقل مکانی ہے زیادہ

باقر مہدی

ایک کالی نظم

(میری مددگار اندو کدم کے نام!)

"مجھ سے اک دن اندو بولی
"ایک بھکارن دیکھ کے مجھ کو
میری ماں یاد آتی ہے
بھوک میں جل جل کر
اس نے مجھ کو پالا تھا
ایک زمانہ بیت گیا
میرے بچے۔۔۔ الگ الگ شہروں میں رہ کر
آخر مجھ کو بھول گئے۔!
۔۔ اور میں۔۔" 'چھوٹا کام' میں
سارا سارا دن۔۔۔ گھر گھر پھرتی رہتی ہوں
تب جا کر۔۔۔ یہ روٹی۔۔۔ کپڑا ملتا ہے
فٹ پاتھ پر سو کر۔۔۔ رات بتاتی ہوں
میلے کچیلے کپڑے پہنے
دھنوانوں کے کپڑے دھوتی رہتی ہوں!
جانے کب یہ جیون۔۔۔ آپرم پار لگے گا۔؟
کیا۔۔۔ میں بھی۔۔۔ بوڑھی ہو کر
ایک بھکارن بن جاؤں گی"۔؟
میں۔۔۔ اک مریل بوڑھا شاعر
کیا کہتا۔۔۔؟

مخمور سعیدی

غزل

وہ رہگذر تھی، کہ تنہا ہمیں گزرتے تھے
سفر کے گم شدگاں کو تلاش کرتے تھے

کب اتنی تیرہ و تاریک تھی فضا دل کی
یہ وہ زمیں ہے، ستارے جہاں اترتے تھے

اک اجنبی کی طرح آج ہم گزر آئے
وہاں تو بڑھتے قدم خود بخود ٹھہرتے تھے

وہ آئنہ ترے ہاتھوں سے چور چور ہوا
جس آئنے میں ترے خال و خد سنورتے تھے

مسافرانِ غمِ دل کی منزلیں تھیں عجب
جہاں ٹھہرنا نہ ہوتا وہیں ٹھہرتے تھے

یہ شہر جانے کس آسیب کے اثر میں تھا
کہ لوگ اپنی ہی پرچھائیوں سے ڈرتے تھے

نہ جانے کس کی دعا دور دور رکھتی تھی
بہت قریب سے کچھ حادثے گزرتے تھے

حیاتِ شوق، یہی اضطرابِ دیدہ و دل
ہمیں سکون کے لمحے گراں گزرتے تھے

نہ وہ تلاطمِ موجِ نفس نہ شورشِ شوق
سفینے ڈوب رہے تھے، کہ پار اترتے تھے!

دیارِ دل کے مکیں تھے عجب سیانے
خموشیوں کی زباں میں جو بات کرتے تھے

ہوا سمیٹ رہی تھی، بکھیر دیتی تھی
نہ ہم سمٹ ہی رہے تھے نہ ہم بکھرتے تھے

بتا رہے ہیں نشاناتِ رہگذر مخمور
نواحِ غم سے بھی کچھ قافلے گزرتے تھے

حیدر قریشی
Auf Der Roos 7,
65795 Hatters HeimI
Germany

ماہیے

عاشق، محبوب ہوا
کھیل انوکھا تھا
جاذب، مجذوب ہوا
○
کس نور کا درشن تھا
سامنا ہوتے ہی
روشن مرا تن من تھا
○
کثرت کی زبانی ہیں
کعبہ کی دیواریں
وحدت کی نشانی ہیں
○
پوچھو نہ مزہ ہم سے
پیاس بجھائی تھی
جب بئر زم زم سے
○
لطف آ گیا جینے میں
نور مناظر کا
جب بھر گیا سینے میں
○
قربت میں کمال ہوا
ناز قبول، اور عجز
بلند اقبال ہوا
○
جو یار سے دور ہوا
عجز، ریا اس کا
اور ناز غرور ہوا
○
("بئر زم زم"۔ زم زم کے کنوئیں پر عربی میں
ایسا ہی لکھا ہے۔ عربی کنوئیں کو بئر کہتے ہیں)

عاصی کاشمیری
788 - Wood Borourgh Road
Nottiw Gham (U K) NG 35QJ

غزل

علاج گردشِ لیل و نہار کیسے کروں
خزاں کی رُت کو میں فصلِ بہار کیسے کروں

نکا لنا ہے حدود و قیود سے، خود کو
سمندروں کی طرح بے کنار کیسے کروں

جو میری جان کا دشمن بنا ہے اب اُس سے
میں کوئی عہدِ وفا استوار کیسے کروں

رہا ہے تم سے تعلق طویل مدت تک
میں دشمنوں میں تمھارا شمار کیسے کروں

وصال و ہجر کے موسم گزر گئے عاصی
کسی کے وعدے پہ اب اعتبار کیسے کروں

راجندر بہادر موج
موج مارگ۔ فتح گڑھ یو۔پی۔

غزل

ہے فصل گل مگر یہ ست ہے رنگ خزاں پھر بھی
ستم یہ ہے کہ ہیں غفلت میں اہل گلستاں پھر بھی

اگر خاموش ہوں ہوتا ہے نظروں سے عیاں پھر بھی
چھپائے سے نہیں چھپتا مرا راز نہاں پھر بھی

محبت اور یکجہتی کی ہے تبلیغ زوروں پر
محبت کا یہاں ملتا نہیں نام و نشاں پھر بھی

چمن اپنا چمن کے غنچہ و گل خار سب اپنے
فضائے گلستاں لگتی ہے کیوں نامہرباں پھر بھی

وہ واقف ہیں مرے دل سے مرے جذبات الفت سے
تعجب ہے مری جانب سے ہیں نامہرباں پھر بھی

رہ حق میں جہاں میری خودی نے مجھ کو پہنچایا
پہنچ سکتے نہیں دیر و حرم والے وہاں پھر بھی

نہ دل اپنا نہ جاں اپنی نہ ذہن و فکر بھی اپنے
مشیت لے رہی ہے آدمی کا امتحاں پھر بھی

وہ جس کے نور کے بکھرے ہوئے ہیں ہر طرف جلوے
وہی رہتا ہے انساں کی نگاہوں سے نہاں پھر بھی

برابر آندھیاں آتی رہیں باد مخالف کی
زبانوں پر چڑھی ہے آج بھی اردو زباں پھر بھی

زمانے نے بہت کی کوششیں ہم کو مٹانے کی
وقار اپنا بڑھاتا ہی رہا ہندوستاں پھر بھی

کہاں بے مہری ساحل کہاں اے موج یہ طوفاں
سکوں محسوس ہوتا ہے مرے دل کو یہاں پھر بھی

ڈاکٹر اختر بستوی
صدر شعبہ اردو۔ گورکھپور یونیورسٹی
گورکھپور (یو۔پی)۔ ۲۷۳۰۰۹

غزل

نور کی موجیں ہیں یوں احساس کے ظلمات میں
جیسے جمنا میں دیئے تیریں اندھیری رات میں

اس کے سب سدھ ہو گئی دل و جوش کی [illegible]
زہر ہے تلخی کا باقی رہ گیا جذبات میں

حسن کی ہر سرزمیں سے سنگ کا تحفہ ملا
چاند سے بھی چند پتھر آئے ہیں سوغات میں

صبح جو شہروں میں پژمردہ سی آتی ہے نظر
تازگی اس کی ذرا دیکھے کوئی دیہات میں

کیوں اکیلے پن کا ہو احساس تصور کو مگر
انجمن خوابوں کی ہے تنہائی کے محلات میں

مجھ کو جس دشمن کی تھی باہر کی دنیا میں تلاش
پالیا میں نے اسے آخر خود اپنی ذات میں

اب تو اے اختر یہی گفتار کی معراج ہے
سیکڑوں معنی چھپے ہوں ایک مہمل بات میں

غزلیں

ڈاکٹر سحر سعیدی

وہ جو آمادۂ پیکار نہیں ہو سکتا
فتحِ ذیشاں کا حقدار نہیں ہو سکتا

عشق کیا چیز ہے اسرارِ محبت کیا ہیں
چند الفاظ میں اظہار نہیں ہو سکتا

حق و باطل میں جو تفریق نہ محسوس کرے
وہ کبھی صاحبِ کردار نہیں ہو سکتا

راست بازی میرا مقصود ہمیشہ سے رہی
خود پسندی میرا معیار نہیں ہو سکتا

کامیابی کی ضمانت ہے مسلسل کوشش
کوئی جذبہ کبھی بیکار نہیں ہو سکتا

جس کو خود اپنی ہے پروا نہ زمانے کی خبر
کوئی غافل ہے وہ بیدار نہیں ہو سکتا

اپنے ہم ذوق کے فن کو نہ سراہے جو سحر
اور کچھ ہو گا وہ فنکار نہیں ہو سکتا

حکیم سید قسیم سہسرامی
فقیری دواخانہ، اسٹیشن روڈ، موہنیاں
ضلع کیمور، بہار

ان کے رخ پہ نقاب کیا معنی
وصل کی شب حجاب کیا معنی

جانے کس وقت ختم ہو جائے
زندگی کی کتاب کیا معنی

پھول کھلتے ہیں اور بکھرتے ہیں
آرزوئے شباب کیا معنی

صفحۂ زندگی پہ لکھتے ہیں
درد کا انتساب کیا معنی

سادہ کاغذ ملا لفافے میں
یہ ہے خط کا جواب کیا معنی

گھر کے کانٹوں میں مسکراتا ہے
کوئی تازہ گلاب کیا معنی

اپنی سانسیں شمار کرتا ہوں
زندگی کا حساب کیا معنی

ترک الفت تو کر چکے ہو قسیم
پھر بھی یہ پیچ و تاب کیا معنی

رحیم انور فیروز آبادی
۲۹۔ چوک حاجی پورہ فیروز آباد

"برگِ نے" کا شاعر۔ ناصر کاظمی

"برگِ نے" کے ابتدائی صفحات میں احمد ندیم قاسمی "برگِ نے" کے شاعر ناصر کاظمی کے تعارف میں رقمطراز ہیں۔

"عین اس دور میں جب صنفِ غزل اپنی بعض پابندیوں اور حد بندیوں کے باعث اور اصنافِ سخن کے مقابلے میں دبنے لگی تھی۔ ناصر کاظمی غزل ہی کا علم بلند کر کے اٹھا اور اپنی جیتی جاگتی شاعری سے غزل کے وقار کو بحال کر گیا۔"

احمد ندیم قاسمی کی مندرجہ بالا تحریر میں "جیتی جاگتی شاعری" بظاہر ایک سادہ سی بات ہے لیکن سادہ سی اس بات میں معنوی گہرائی اور وسیع تر مشاہدے کی ایک کائنات پوشیدہ ہے۔

ہم جس ماحول میں سانس لے رہے ہیں، زندگی جن تغیرات اور تبدیلیوں سے گزر رہی ہے، شاعری اگر ان کی آئینہ دار نہیں تو ہرگز "جیتی جاگتی شاعری" کہلانے کی حقدار نہ ہوگی۔

ناصر کاظمی بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے اور جب ہم اسے غزل کا شاعر کہہ رہے ہیں تو ہماری مراد اس غزل سے ہے جسے رشید احمد صدیقی نے "اردو شاعری کی آبرو" قرار دیا۔

ولی دکنی سے لے کر میر غالب اور مومن تک مختلف صورتوں میں غزل نے اپنا ارتقا جاری رکھا لیکن روایت پرستی کی مدقوق فضا میں صحت مند افکار و واردات کی تازہ ہواؤں سے ایسی محروم ہوئی کہ مولانا حالی کو اس میں عفونت محسوس ہونے لگی اور کلیم الدین احمد نے تو اسے 'نیم وحشی صنفِ سخن' کہہ کر سرے سے ہی قابل گردن زدنی قرار

دے دیا لیکن ناصر غزل ہی کا علم بلند کر کے اٹھا اور اسی "نیم وحشی صنف سخن" کو اپنے جذب کی سچائی اور اسلوب کی ندرت سے تقدس بخشا اور مہذب بنایا۔ مخمور سعیدی کا کیا عمدہ بیان ہے۔

"غزل بہت آسان صنفِ سخن ہے۔ محض غزل کہنے کی رسم پوری کرنی ہو تو چند قافیے کاغذ پر لکھ لیجیے مضمون وہ خود ہی سجھادیں گے۔ لیکن غزل اگر ذمے داری سے کہی جائے اپنے ذاتی تجربے اور اظہار کا ذریعہ بنایا جائے تو اس سے زیادہ صبر آزما کوئی دوسری صنف سخن نہیں۔ رسمی غزل کہنے والے کے مقابلے میں ایک ذمے دار غزل گو شاعر کے لیے یہی سہولتیں مشکلات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں کیونکہ اسے تو اپنی بات اپنے لہجے میں کہنی اور اس طرح کہنی ہے کہ اس کی آواز الگ پہچانی جائے۔"

مخمور سعیدی کے اس نقطۂ نظر کی روشنی میں اگر ناصر کاظمی کی شاعری کا بہ نظرِ امعان جائزہ لیا جائے تو اعتراف کرنا ہوگا کہ ناصر کاظمی نے ایک ذمے دار غزل گو شاعر کی طرح قوافی اور ردیف کو اپنے تابع کیا شاعرانہ تن آسانی کا شکار نہ ہو کے اپنی بات اپنے لہجے میں کہی اور اس طرح کہی کہ اپنی آواز کی ایک الگ شناخت قائم کر دی۔

وہ دل نواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
مرا علاج میرے چارہ گر کے پاس نہیں

گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے
خدا کرے کوئی تیرے سوا نہ پہچانے

ناصر کو جدید غزل کا شاعر کہتے ہوئے اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ غزل کی روایت کو ناصر نے نگاہِ تعصب سے نہیں محبت کی نظر سے دیکھا ہے اور روایت کی مفلس زمین کو خونِ جگر پلا کر جدت کی گل کاریوں سے مالا مال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جدید شعراء نے اپنے اور اپنے قارئین کے درمیان ناقابلِ فہم تشبیہ و علامات اور استعارات کی ایک آہنی دیوار کھڑی کر دی تھی ناصر کے سلیس اسلوب کی اثر انگیزی اور لہجہ کی شگفتگی و تازگی نے اسے منہدم کر دیا اور قارئین کو ناصر کے کلام میں عمیق جذبات کا نشہ اور ندرت فکر کی خوشبو کے ساتھ ہوا کے تازہ جھونکوں کا احساس ہوا۔ واضح طور پر ناصر کے یہاں غزل کی صحت مند روایت کا احترام اور عصری حسیت کے خیر مقدم کا ایک دلکش امتزاج نظر آیا۔

حالانکہ غزل نے "ترقی پسند تحریک" کا ہاتھ تھامے ہوئے بھی کئی سمت وجہات کا سفر کیا گئی وسعتوں سے آشنا ہوئی لیکن ناصر کے یہاں اظہار کی جو خوش سلیقگی ہے اس میں غزل جدت کی رنگینیوں سے ہی نہیں روایت کی عطر فشانی سے بھی سرشار نظر آتی ہے ۔

اے دوست ہم نے ترک محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

گزر رہے ہیں عجب مرحلوں سے دیدہ و دل
سحر کی آس ہے تو زندگی کی آس نہیں

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انہی راتوں میں عمر بھر کے مجھے

کس کے جلووں کی دھوپ برسی ہے
آج تو شام بھی سحر سی ہے

یہ اشعار ناصر کی عشقیہ شاعری کا نمونہ ہیں لیکن یہ اس کے اسلوب کی ندرت ہے جو روایت کی تپتی زمین پر ٹھنڈی ٹھنڈی بارش کی طرح گرتی ہے اور ایک سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں بکھر جاتی ہے۔

ناصر کے مضامین میں عصر حاضر کے عشق کا معیار ہے۔ نئے حالات نئے مسائل کا رنگ ہے نئی آواز اور نئی لے ہے وہ آواز جس میں تصنع کی جھجک نہیں بے تکلفی کی توانائی ہے ۔

تڑپ رہے ہیں زباں پر کئی سوال مگر
مرے لیے کوئی شایان التماس نہیں

مجھے یہ ڈر ہے تری آرزو نہ مٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت مری اداس نہیں

ترے جلو میں بھی دل کانپ کانپ اٹھتا ہے
مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں

ناصر کی غزل میں نوجوان نسل کی بھرپور نمائندگی ہے نئے ذہن میں پلنے والے خیالات کی موثر ترجمانی ہے۔ بات کو منفرد اسلوب میں کہنے کا سلیقہ ہے ۔

خموشی انگلیاں چٹخا رہی ہے
تری آواز اب تک آ رہی ہے

ناصر کے لہجے کی یہی روانی اور گھلاوٹ یہی رچاؤ اور یہی سرشاری ہے جس نے ن
غزل کے سر پر قبول عام کا تاج رکھا۔ روایت غزل کی اساس موضوع عشق پر قائم ہے او
بلاشبہ شعرائے اردو کا قافلہ زیادہ تر اسی موضوع کی پر پیچ وادیوں میں مصروف سفر رہا ہے ناصر
نے بھی اس ہمہ گیر موضوع سے پہلو تہی نہیں کی لیکن وہ پامال راستوں کا مسافر نہیں وہ جس
سمت گیا اپنا ایک الگ راستہ بنایا۔ ناصر کے یہاں عشق کی واردات و کیفیات کی عکاسی ضر
ہے لیکن ایک منفرد انداز میں۔ ناصر کے یہاں زندگی کا حسن بھی ہے عشق کی سرشاری بھ
لیکن شعور کا ایک وسیع تر سلسلہ بھی ہے۔ خوابوں کے آسمان پر سچائیوں کی قوس و قزح کے
ہنستے مسکراتے رنگ بھی ہیں اور سچائیوں کی تیز و تند دھوپ میں خوابوں کی شبنم کا ٹھنڈا ٹھنڈا
احساس بھی ۔

کیا خبر کب کوئی کرن پھوٹے
جاگنے والو جاگتے رہنا

ناصر کا لہجہ ایک نئی نغمگی سے آشنا ہے اس کے احساس میں جہاں کھلتی ہوئی کلیوں
تبسم ہے وہیں نوکِ خار کی چبھن بھی ہے جہاں چڑھتے سورج کے انداز کو پہچاننے کی دعوت
ہے وہیں ڈوبتے دن کی صدا پر گوش بر آواز رہنے کا مشورہ بھی ہے ۔

چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان
ڈوبتے دن کی ندا غور سے سُن
کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سر شام
روح کے تار ہلا غور سے سُن

سر شام دریا کے ٹھہراؤ نے ناصر کی روح کے تار ہی نہیں ہلائے اس کی روح نے
کلیوں کی چٹک اور صبا کی نغمگی کو بھی براہِ راست محسوس کیا ہے۔ ناصر کو معلوم ہے کہ رنگ
کی زبان آواز کی محتاج نہیں ۔

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں
کیا سناتی ہے صبا غور سے سُن
رنگ منت کشِ آواز نہیں
گل بھی ہے ایک نوا غور سے سُن

ناصر کاظمی کے مزاج میں حسن و عشق کا رچاؤ تھا لیکن عصری حسیت کا درد بھی دل
میں موجزن تھا۔

ناصر جب منصۂ شہود پر آیا وہ زمانہ بڑا پُر آشوب اور قیامت خیز تھا۔ ناصر کاظمی کی پیدائش ۱۹۲۵ء میں انبالہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم انبالہ اور پھر لاہور میں ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد کئی ملازمتیں کیں۔

"اوراق نو"۔ "خیال" اور "ہمایوں" کی ادارت کی "محکمہ دیہات سدھار" میں بھی ... بائے نمایاں انجام دیے۔ اسی زمانے میں رسالہ "ہم لوگ" مرتب کرکے رسالے ... بنے کو آگے بڑھایا۔ شاعری کا آغاز ۱۹۴۱ء میں کیا۔ ۱۹۴۷ء میں وہ دھماکہ خیز حالات ... ئے جنھوں نے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا یہی وہ پُر آشوب اور قیامت خیز زمانہ تھا جب ... گی اور موت دست و گریباں تھیں۔ پھولوں کے روشن چہرے بجھ چکے تھے چمن چمن سے ... ی کی رمق ختم ہو رہی تھی چار سو تاریکیاں ہی تاریکیاں مسلط تھیں۔ ایسے میں کون کس ... سے ملا کون بچھڑا یہ ہوش کہاں تھا۔ اور پھر نفسی نفسی کے عالم میں کسی سے بچھڑنے کا قلق ... ن ہوتا ہے حکومت انگلشیہ کے ظلم و تشدد کی ستائی ہوئی قوم باہمی تفریق و نفرت کا شکار ... چکی تھی۔ افراتفری کا دور دورہ تھا۔ ایک عالم بدحواسی تھا۔ ویرانیوں نے شہر اور شہر کی ... یرانیوں نے ناصر کاظمی کے دل کو اداسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیا تھا۔ ... کی ... غیت کا ایک موثر اظہار ہے ناصر کے یہاں ؎

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

بھٹک رہا ہے جہاں قافلہ جنوں کا
کبھی ہجوم تھا ان راستوں میں پھولوں کا

گھر لٹ کر وطن میں جی نہ لگا
پھر کسی انجمن میں جی نہ لگا

سانیت سوز واقعات اور روح فرسا حالات نے ناصر کو ہلا کر رکھ دیا ہے ؎

یہاں تک بڑھ گئے آلام ہستی
کہ دل کے حوصلے شل ہو گئے ہیں

کہاں تک تاب لائے ناتواں دل
کہ صدمے اب مسلسل ہو گئے ہیں

انھیں صدیوں بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

بجھا نہ دیں یہ مسلسل اداسیاں دل کو
وہ بات کر کہ طبیعت کو تازیانہ لگے
جو گھر اجڑ گئے ان کا نہ رنج کر پیارے
وہ چارہ کر کہ یہ گلشن اجاڑ سا نہ لگے

خطاب اور خود کلامی کے امتزاج نے اشعار کی تاثیر کو دو آتشہ کر دیا ہے ناصر کے نغمے میں گرتے ہوئے آبشار کی گھن گرج نہیں، موجوں کے ترنم کی آہنگی ہے۔ دریا کا شور نہیں سمندر کا سکوت ہے۔ تھکے ماندہ عزائم اور یاس گرفتہ خوابوں کی حوصلہ افزائی کا کیا خوبصورت انداز ہے۔

یہ رات تمھاری ہے چمکتے رہو تارو
وہ آئیں نہ آئیں مگر امید نہ ہارو

ناصر نے وقت کی آندھیوں کا اثر ضرور قبول کیا ہے لیکن دہشت زدہ ہو کر نہیں بلکہ جوش عمل اور جہد مسلسل کی توانائیوں کے ساتھ ناصر کے تخلیقی سرمایے میں نفسیاتی اور جمالیاتی قدروں کا ایک، دلکش امتزاج ہے۔ اس کے کلام میں حسن صراحت کی خوشگوار دھوپ بھی ہے رمزیت کی روح نواز چاندنی بھی۔ ذاتی تجربہ بھی ہے اور ایک آفاقی شعور بھی اور یہیں وہ انفرادیت ہے جو ناصر کے کلام کی شناخت بن گئی۔ "برگ نے" میں "تعارف" کے عنوان سے احمد ندیم قاسمی نے بڑی سچی بات کہی ہے

"غزل کو اتنا سادہ رکھ کر اتنی دور کی اتنی گہرائی کی باتیں کہہ جانا اردو کے غزل گو شعرا میں صرف ناصر کاظمی کا کام تھا۔"

احمد ندیم قاسمی کا یہ دعویٰ روایتی قصیدہ خوانی پر نہیں سچائی پر مبنی ہے دلیل کے طور پر ناصر کی کوئی بھی غزل پیش کی جا سکتی ہے۔
مثلاً۔

نت نئی سوچ میں لگے رہنا
ہمیں ہر حال میں غزل کہنا
صحن مکتب میں ہمسنوں کے ساتھ
سنگریزوں کو ڈھونڈتے رہنا
گھر کے آنگن میں آدھی آدھی رات
مل کے باہم کہانیاں کہنا
دن چڑھے چھاؤں میں ببولوں کی
رم آہو کو دیکھتے رہنا

ابر پاروں کو سبزہ زاروں کو
دیکھتے رہنا سوچتے رہنا

شہر والوں سے چھپ کے پچھلی رات
چاند میں بیٹھ کر غزل کہنا

ریت کے پھول آگ کے تارے
یہ ہے فصلِ مراد کا گہنا

سوچتا ہوں کہ سنگِ منزل نے
چاندنی کا لباس کیوں پہنا

کیا خبر کب کوئی کرن پھوٹے
جاگنے والو جاگتے رہنا

پوری غزل نئے مزاج نئے ذہن اور نئے جذبات کی آئینہ دار ہے۔ آزادی کے بعد جو دل شکن حالات رونما ہوئے، دو مصرعوں میں ان کی بھرپور ترجمانی کا حق ادا کیا ہے اور وہ بھی سادگی و سلاست کی تمامتر رعنائیوں کے ساتھ۔

ریت کے پھول آگ کے تارے
یہ ہے "فصلِ مراد" کا گہنا

واقعتاً غزل کو اتنا سادہ رکھ کر اتنی دور کی اتنی گہرائی کی باتیں کہہ جانا ناصر کاظمی کا حصہ تھا۔ یہ "فصلِ مراد"۔ یہ "ریت کے پھول"۔ یہ "آگ کے تارے" (جو "فصلِ مراد" کا گہنا" ہیں) آزادی اور آزادی کے بعد کے حالات کا اتنا زبردست اور موثر استعارہ (اور وہ بھی زندگی سے اتنا قریب تر) ناصر کاظمی کی ندرتِ فکر کا جیتا جاگتا اظہار ہے۔ ناصر کاظمی نے بالکل سچ کہا تھا۔

ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفلِ سخن میں
ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا

کا ممبر بن کر اردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے۔

ہمیں یقین ہے کہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

قواعد و ضوابط

1۔ بک کلب کی فیس رکنیت دس روپے (-/Rs.10) ہے۔ (ممبر بننے کے لیے کسی فارم کی ضرورت نہیں۔ فیس کی رکنیت بھیج دینا کافی ہے۔

2۔ بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ زر تعاون -/70 روپے ہے) صرف -/65 روپے سالانہ زر تعاون لیا جائے گا۔

3۔ ممبر کو مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) 25٪ اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اردو کی کتابوں کی خریداری پر 10% کمیشن دیا جائے گا (ہر فرمائش پر بک کلب کی ممبری کا حوالہ دینا ضروری ہوگا)

4۔ بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جاسکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کا ممبر نہیں بن سکتی۔

5۔ ممبری کے دوران ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔

6۔ کتابیں بذریعہ وی پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجات روانگی کتب ممبر کے ذمے ہوں گے۔

7۔ گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر پچھلا حساب صاف کرے اور آئندہ کے لئے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔

8۔ بک کلب کی رکنیت کی مدت پوری ہو جانے کے باوجود اگر کسی نے اپنی طرف سے کتابوں کا آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتاب بھیج کر حساب صاف کر دیں گے۔

ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یا اس کی کسی بھی شاخ سے حاصل کر سکتے ہیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ 202002

ڈاکٹر وہاب قیصر
وائس پرنسپل
ممتاز کالج، ملک پیٹ حیدرآباد

قدرتی بیاٹریاں

1960ء کی بات ہے۔ رائل سوسائٹی لندن کے قیام کا تین سالہ جشن منایا جارہا تھا۔ اس موقع پر ایک سائنسی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس نمائش میں سائنس کے ایسے مظاہرے بھی پیش کیے گئے تھے جن کی حقیقت سائنسدانوں کے لیے چیلنج بنی ہوئی تھی۔ چناں چہ نمائش میں رکھا گیا ایک بڑا Aquanu ہر ایک کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جس میں Electnc Rayt کی مچھلی تیر رہی تھی۔ Aquanum کی مخالف دیواروں پر دو برقیرے (Electrode) لگے ہوئے تھے۔ جنھیں برقی تاروں کی مدد سے ایک وولٹ پیا (Voltmeter) سے جوڑ دیا گیا تھا۔ وولٹ پیا وہ آلہ ہوتا ہے جو کسی دو برقی سروں کے درمیان واقع ہونے والے وولٹیج کی پیائش کرتا ہے۔ نمائش دیکھنے والوں کو اس Aquanum میں خاص بات یہ نظر آئی کہ جب مچھلی حالت سکون میں رہتی تو وولٹ پیا کی سوئی صفر وولٹیج بتلاتی' اور جب وہ حالت حرکت میں رہتی تو وولٹ پیا کی سوئی 400 وولٹ دکھلاتی اس سے صاف ظاہر ہے مچھلی کی حرکت کی بدولت Aqunum میں 400 وولٹ کی برقی طاقت پیدا ہو رہی تھی۔ اس واقعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ Electnc Ray ایک مچھلی ہوتی ہے جو تیرنے کے دوران بلند وولٹیج کی برق پیدا کرتی ہے۔

زمانہ قدیم کے واقعات کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ 2600 سال قبل مسیح کے مصری لوگ مچھلیوں میں برق اور اس کے اثرات سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے Cat fish اور Malaterurus مچھلیوں میں سب سے پہلے برق کے پیدا ہونے' مشاہدہ کیا تھا۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان مچھلیوں کو چھونے سے الکٹرک شاک لگتا ہے قدیم مصری' یونانی اور رومی لوگ مچھلیوں سے الکٹرک شاک کھا کر مسرور ہوتے تھے۔ ا مرگی اور گٹھیا کے مریضوں کے علاج کے لیے انہی مچھلیوں سے الکٹرک شاک دلواتے تھے

پرانے سر درد اور دوسرے ناقابل برداشت دردوں سے چھٹکارہ پانے کے لئے Eel نامی مچھلیوں کو چھو کر الکٹرک شاک بھی لیتے تھے۔ یہاں تک کہ قدیم چینی باشندے لقوی کے علاج میں اور ایک ایسا مرض جس میں آنکھوں کے پپوٹے نیچے آکر آنکھیں بند ہو جاتی ہیں' اس کے علاج میں مچھلیوں کے برقی شاک کو استعمال کیا کرتے تھے۔

برق پیدا کرنے میں صرف مچھلیاں ہی اس خصوصیت کی حامل نہیں ہوتیں' بلکہ جاندار خلیے (Cells) بھی برق پیدا کرتے ہیں۔ چناں چہ جاندار خلیے کے مائیہ حیات (Cytoplasm) اور خلیے کے بیرونی حصے میں پائے جانے والے سیال مادے کے درمیان 25,20 ملی وولٹ کی برقی طاقت پائی جاتی ہے۔ جس کو عام طور پر Membrane Potential یا Resting Potential کہاجاتا ہے۔ حشرات الارض' جل تھلیوں (Amphebians) اور دودھ پلانے والے جانوروں (Mammals) کے عضلاتی خلیوں (Muscle Cells) میں (-50) تا (-100) ملی وولٹ کی برق موجود رہتی ہے۔ خلیوں کے بیرونی حصوں کے مقابلے میں اندرونی حصوں کا وولٹیج منفی ہوتا ہے۔ اسی لئے اوپر دی گئی قیمتیں منفی اعداد میں ظاہر کی گئی ہیں۔ Squid اور Cuttle Fish مچھلیوں' جھینگے' کھیکوے' مینڈک اور بلیوں کی رگوں اور نسوں کے خلیوں میں بھی (-50) تا (-100) ملی وولٹ کی برق پائی جاتی ہے۔ مینڈک کی جلد کے خلیوں میں اور اس کے معدہ کے لعاب (Gastric Mucosa) کے خلیوں میں بھی برق کے وجود کا پتہ لگایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ سمندر کی تہہ میں پائے جانے والے بناتات کے خلیوں میں بھی برق موجود رہتی ہے۔ چنانچہ مشترک قلوی (Coenocytic) سمندری کائی' کاس بلوط (Valonia)' Halicystis اور Nitella نامی سمندری پودوں کے خلیوں میں سیال مادوں اور بیرونی واسطے کے درمیان (-140) ملی وولٹ کا برقی وولٹیج پایا جاتا ہے۔ حالیہ عرصے میں ٹشو کلچر کردہ واحد خلیے میں بھی اتنا ہی وولٹیج رکھنے والی برق کے وجود کا پتہ لگایا گیا ہے۔

جانداروں میں برق کو دریافت کرنے کا سہرا اطالوی سائنسداں Galvani کے سر جاتا ہے۔ وولٹ پیما کی ایجاد نے Matteucci نامی ماہر حیوانات کے لیے عضلات (Muscles) میں برقی وولٹیج کے پیدا ہونے کی تصدیق کرنے میں مدد دی۔ اس نے عضلات کی دو ڈوریوں کو وولٹ پیما کے دونوں سروں پر باندھ کر یہ مشاہدہ کیا کہ ان عضلاتی ڈوریوں میں 10 تا 80 ملی وولٹ کا وولٹیج پیدا ہو رہا ہے۔ اس عجیب وغریب واقعہ کی

تصدیق جرمن محقق Du Bois Reymond اور Hermann اور روسی محقق -Cha govets نے کیا، خرگوش، چوہا اور پرندوں کے عضلات پر تجربات کے ذریعہ کی۔ 1993ء میں امریکی سائنسدانوں نے بنیادی رگوں اور ریشوں کے بیرونی -Mem brance اور اندرونی حصوں کے درمیان وولٹیج کے واقع ہونے کی اطلاع دی۔ ان کے مشاہدے کے لحاظ سے یہ وولٹیج 40 تا 50 ملی وولٹ تھا۔ جب کہ دوسرے محققوں نے 70 تا 80 ملی وولٹ کے وولٹیج کا مشاہدہ کیا۔

ہمارے دل، دماغ اور جسمانی رگوں اور ریشوں سے مسلسل برقی اشارے نکلتے رہتے ہیں۔ زندہ ریشوں کے برقی عمل کا یہ مطالعہ Electrography کہلاتا ہے۔ ہمارا قلب جن برقی اشاروں کو خارج کرتا رہتا ہے اس کا وولٹیج ایک ملی وولٹ (وولٹ کا ہزارواں حصہ) پر مشتمل ہوتا ہے۔ Cardialogist ان ہی برقی اشاروں کو ECG کی مدد سے ریکارڈ کر کے مریض کی قلبی کیفیت کا پتہ لگاتے ہیں۔ اگر مریض کی حرکت قلب ڈوب رہی ہو تو برقی اشاروں کا نکلنا بند ہو جاتا ہے۔ اور ECG میں موجی شکل کی بجائے ایک لکیر ظاہر ہوتی ہے۔ دماغ سے نکلنے والے برقی اشاروں کی طاقت ایک وولٹ کا دس ہزارواں حصہ ہوتی ہے۔ یعنی قلب سے نکلنے والے برقی اشاروں کے مقابلے میں ان اشاروں کا وولٹیج دس گنا کم ہوتا ہے۔ دماغ کے ڈاکٹر مریض کی ذہنی کیفیت کا مطالعہ کرنے کے لیے EEG کے ذریعہ دماغی اشاروں کو حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح جسمانی رگوں اور ریشوں سے نکلنے والے برقی اشاروں کو ریکارڈ کرنے کے لئے EMG آلے کو استعمال کیا جاتا ہے۔

بہت کم طاقت کی برق پیدا کرنے والی مچھلیوں میں Mormyrids, Ordinary Ray Skates اور Elephant nased Fish مچھلیاں شامل ہیں۔ جب کہ -Star grazer مچھلیوں میں 6 وولٹ، چند Torpedos میں 60 وولٹ اور چند میں ہزار وولٹ، Electnc Cat Fish میں 300 وولٹ اور Knife Fish میں 600 وولٹ کی برق پیدا ہوتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ گھروں میں استعمال ہونے والی برق کا وولٹیج 220 وولٹ ہوتا ہے۔

برق پیدا کرنے والی Eel مچھلی تقریباً 9 فٹ لانبی ہوتی ہے۔ اس کو چھونے پر 600 وولٹ کا برقی شاک لگتا ہے۔ یہ مچھلی نہ صرف اپنے شکار کو الکٹرک شاک کے ذریعہ

بے ہوش کر دیتی ہے۔ بلکہ دشمن پر اس کے ذریعہ حملہ آور بھی ہوتی ہے۔
Gymnarchus مچھلی کا تعلق ہے وہ عام طور پر 2 فٹ لانبی ہوتی ہے۔ مچھلی دیکھنے میں بڑی نفیس دکھائی دیتی ہے۔ یہ گدلے پانی میں رہنے والی مچھلی ہے۔ اس میں بہت ہی کم وولٹیج کی برق پیدا ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا اطراف ہمیشہ برقی میدان (Electric Field) پیدا ہوتا ہے۔ اس برقی میدان کی مدد سے یہ مچھلی اپنے قریب واقع کسی جاندار یا بے جان شئے کے وجود کا پتہ لگالیتی ہے۔ کیوں کہ کسی شئے کی وجہ سے اس کے برقی میدان میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں یہ مچھلی اس قدر حساس ہوتی ہے کہ برقی میدان میں 0.03 ملی وولٹ کے فرق تک کا پتہ لگالیتی ہے۔ Electric Ray قبیل سے تعلق رکھنے والی تمام مچھلیاں برق پیدا کرتی ہیں۔ جسمیں زیادہ سے زیادہ 600 وولٹ تک کی برق پیدا ہوتی ہے۔ یہ مچھلیاں اکثر سمندر کی تہہ میں ہی رہتی ہیں۔ اور بہت کم رفتار سے تیرتی ہیں۔ ان کا گذارا صرف مچھلیوں پر ہوتا ہے۔ جنھیں یہ سب سے پہلے اپنے الکٹرک شاک کے ذریعہ بے ہوش کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد انھیں چٹ کر جاتی ہیں۔

قدرت میں ایسی مچھلیاں بھی پائی جاتی ہیں جو برق کا پتہ لگانے کے معاملہ میں بہت حساس ہوتی ہیں۔ ان کے جسم کے مختلف حصوں میں ایسے خلیے ہوتے ہیں جو کمزور طاقت کی برق تک کو محسوس کر لیتے ہیں۔ ان میں شارک 'Bichirs 'Lung Fish 'Sturgeons Peddle Fish اور Cat Fish شامل ہیں۔ جہاں تک شارک کا تعلق ہے وہ غیر برقی مچھلیاں ہوتی ہیں۔ ان کے دہانے کے نیچے سوراخ ہوتے ہیں۔ جسم میں پائے جانے والے خلیے کمزور سے کمزور برق کے لیے حساس ہوتے ہیں۔ شارک مچھلیاں غذا کے طور پر Flat Fish مچھلیوں کو استعمال کرتی ہیں' جن کے جسم سے بہت ہی کم وولٹیج کے وبرقی اشارے نکلتے رہتے یں۔ Flat Fish مچھلیاں اپنی جان بچانے کے لیے اپنے آپ کو سمندر کی تہہ میں ریت کے اندر دفن کر لیتی ہیں۔ اس کے باوجود شارک مچھلیاں اپنے حساس خلیوں کے ذریعہ پتہ لگالیتی ہیں کہ یہ مچھلیاں کس مقام پر دفن ہیں۔ اس طرح شارک مچھلیاں ریت ہٹا کر اپنا شکار حاصل کر لیتی ہیں۔

برقی حس رکھنے والی مچھلیوں میں آفریقہ کی Mormyrids اور جنوبی امریکہ کی Knife Fish سب سے آخر میں دریافت ہونے والی مچھلیاں میں۔ 1951ء میں برطانیہ کے ماہر حیوانات Hans Lissmann نے اس بات کا پتہ لگایا کہ Mormyrids اور

Gymnarchus مچھلیاں اپنی دم سے مسلسل برقی اشارے آزاد کرتی رہتی ہیں۔ یہ مچھلیاں چوں کہ گدلے پانی میں رہتی ہیں اس لئے برقی اشارے پانی میں راستے کے تعین کرنے میں اور دوسری مچھلیوں سے مواصلات میں مدد دیتے ہیں۔

حالیہ عرصے میں علم طب اور حیاتیات میں مچھلیوں کی برق کے استعمال کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ الکٹرک Rays' Eels اور Cat Fish مچھلیوں کے حالت تماس میں آنے سے ہونے والے عضلاتی سکڑاؤ' الکٹرک شاک کا بیّن ثبوت ہے۔ انگریز ماہر حیاتیات John warlish نے تجربات کی روشنی میں Ray مچھلی کے شاک کی برقی نوعیت کو معلوم کیا۔ جب کہ Hunter کی Anatomist نے اس میں برق پیدا کرنے والے متعلق حصوں کی تفصیلات بیان کی۔

فی البدیہہ — یوسف ناظم

اردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار یوسف ناظم کے ۱۶ دلچسپ اور قہقہوں سے بھرپور مضامین کا نیا مجموعہ۔ قیمت: 45/

تعلیم و تعلم — محمد اکرام خاں

ڈاکٹر محمد اکرام خاں کا تعلق درس و تدریس سے رہا ہے "تعلیم" کے موضوع پر موصوف کی کئی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب آپ کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ 75/

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں: عبدالقوی دسنوی

اس کتاب میں اردو کے گیارہ شاعر (اکبر' حالی' چکبست: سید سلیمان ندوی' پرویز شاہدی' فراق' ساحر' جاں نثار اختر' فیض احمد فیض اور مجروح) کی شاعری اور فن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت: 75/

وسط ایشیا نئی آزادی' نئے چیلنج — آصف جیلانی

سابق سوویت یونین کی نو آزاد مسلم جمہوریاؤں کے سفر کے تجربات و مشاہدات پر مبنی بی بی سی لندن کی اردو نشریات سے نشر ہونے والے سلسلہ وار پروگراموں پر مشتمل ایک دستاویز۔ 51/

معیار اردو۔ مرتبہ نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

یہ کتاب زبان اردو کے محاورات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے طلبہ اور ریسرچ اسکالرز محاورات کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ -/21

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم

پروفیسر اختر الواسع

پروفیسر اختر الواسع نے ۱۸ جون ۱۹۹۱ء کو انجمن اسلام ممبئی کی دعوت پر "معین الدین حارث یادگاری سیرت لیکچر" کے سلسلے میں مندرجہ بالا عنوان کے تحت جو خطبہ دیا تھا' اسے اب کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ 10/

یوسف ناظم

میر امینی فسٹو

عزیزان حلقہ انتخاب نمبر ۷۴۰

میر امنی فیسٹو دیر سے شائع ہو رہا ہے ہر طرح سے درست ہے میں آپ کے حلقے کا پرانا خدمت گار ہوں۔ پہلی مرتبہ پارلیمانی انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو رہا ہوں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ آزاد ہندستان میں صرف آزاد امیدوار کو انتخاب میں کھڑے ہونے کا حق ہے۔ ایک آزاد ملک کی شان آزاد امیدواروں میں ہے اور اگر آزاد امیدوار ہر حلقے سے منتخب ہو کر پارلیمنٹ میں جمع ہوں تو ان کا متحد ہونا آسان ہے کیونکہ یہ ایک دوسرے سے اجنبی ہونے کی وجہ سے کسی بات پہ لڑتے ہی نہیں اور ان میں ٹکٹ حاصل کرنے کے موضوع پر تو کوئی جھگڑا ہی نہیں اس لیے عزیزان گرامی مجھ میں وہ نقص اور کوتاہی تو ہو ہی نہیں سکتی جو کسی پارٹی کے نامزد کردہ امیدوار میں ہوتی ہے یعنی میں دوست سب کا ہوں دشمن میرا کوئی نہیں۔ میرا دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ایک مستحکم حکومت کے لیے ملک کو آزاد خیال، آزاد منش اور آزادانہ طور پر کام کرنے والے نمایندوں کے علاوہ اور کیا چاہیے۔ ایسے نمایندے جنھوں نے کسی پارٹی کی حاشیہ برداری اور پارٹی کے صاحبان اقتدار یا بیگمات با اختیار کی مدح سرائی میں اپنی عمر ضائع نہ کی ہو ملک کی خدمت کے لیے منتخب کیے جانے چاہئیں۔ جس نمایندے کی وفاداری کٹی پھٹی اور بٹی ہوئی ہو وہ کیا ملک کی خدمت کرے گا۔ کسی بھی آزاد امیدوار نے یہ دعوا نہیں کیا کہ وہ پرائم منسٹر بنے گا۔ ایسے دعوے صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو زمین پر بیٹھ کر سمجھتے ہیں کہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ہیں۔ بندوق ہاتھ میں ہے نہیں لیکن نشانہ باندھے ہوئے ہیں۔ چار قدم پہلے کبھی چلے نہیں لیکن پدیاترا ہو رہی ہے۔ سماجی شادی کی نہیں سیاسی شادیاں رچائی جا رہی ہیں۔ سیاسی شادیوں میں برادری دیکھی جاتی ہے نہ برابری، سانپ اور نیولے کی شادی کی کنڈلیاں بھی تیار ہو جاتی ہیں۔ کوئی آزاد امیدوار ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر نہیں بھاگتا۔ عزیزان گرامی یہ تو میرے نظریے ہوئے۔ اپنے منی فیسٹو میں میں نے اپنے آپ کو اپنے حلقہ انتخاب کی حد تک محدود رکھا ہے۔ اور یہ میرا منی فیسٹو بھی صرف میرے حلقے ہی کے رائے دہندگان کے لیے ہے۔ میں وعدہ کرتا

ہوں کہ

۱۔ اپنے حلقۂ انتخاب میں بے مکان لوگوں کے لیے ۳ سال کی مدت میں ۱۲ لاکھ مکان کھڑے کروں گا۔ جو امیدوار ووٹروں کے لیے مکان نہیں کھڑا کر سکتا اس کو الیکشن میں کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ ان مکانات کا کرایہ بھی نہیں لیا جائے گا۔ جب ایم پی اپنے مکانوں کا کرایہ ادا نہیں کرتے تو انھیں دوسروں سے کرایہ لینے کا کیا حق ہے۔ مکان کی مرمت، داغ دوزی، رنگ کاری یہ سب کچھ مکان دار کے ذمہ ہوگا۔ احاطے میں اسے ترکاری پیدا کرنے اور گھر کے آنگن میں مرغیاں پالنے کی اجازت ہوگی۔ یہ مکان خود کفیل ہوگا۔ ترکاریوں کے بیج مفت فراہم کیے جائیں گے۔ مرغیاں البتہ خود خریدنی یا پیدا کرنی ہوں گی۔

۲۔ ہر گھر میں صبح سویرے ایک لیٹر دودھ پہنچا دیا جائے گا۔ یہ ہوگا بچوں کے لیے لیکن دوسرے افراد خاندان بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے۔

۳۔ گھر کے ہر بچے کے لیے ایک بابا سوٹ بچے کی سالگرہ پر تحفے کے طور پر دیا جائے گا۔ اسکول جانے والے بچوں کے لیے ایک مضبوط بستہ ہر سال فراہم کیا جائے گا۔ اسکولی بستہ کسی دوسرے مصرف میں نہیں لایا جائے گا۔ اسکول میں ناشتہ یا کھانا فراہم کرنے کے ہم سخت مخالف ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ان نمائشی کاموں کا فائدہ کسے پہنچتا ہے۔

۴۔ بابا سوٹ اور یونیفارم دھونے کے لیے ہر ماہ ہر گھر میں صابن فراہم کرنے کی ذمہ داری ہماری یعنی میری ہوگی۔

۵۔ ہر محلے میں ووٹروں کو سڑک کے بیچ میں کھڑے ہو کر اخبار پڑھنے اور شہری مسائل پر غور کرنے کے لیے "تفریحی اڈے" بنائے جائیں گے۔ ان اڈوں کے اوقات کار مقرر کرنے کا اختیار اہل محلّہ کو ہوگا۔ اس بات کی پہلے ہی سے صراحت کر دی جاتی ہے کہ ان اڈوں پر نشست کا کوئی بندوبست نہیں ہوگا اور نہ اس کی اجازت ہوگی۔

۶۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میرے تعمیر کیے ہوئے محلوں میں کوئی شخص بے روزگار نہیں رہے گا۔ میں بے روزگار شخص کو محلے کو ہرا بھرا رکھنے اور سندر بنانے کے کام پر لگا دوں گا۔ زبردستی لیکن معاوضے کے ساتھ۔

۷۔ میرے حلقۂ انتخاب میں گداگری قطعی ممنوع ہوگی یہ کام میں خود کروں گا۔

۸۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ملک میں قانون بہت ہو گئے ہیں۔ میں عارضی طور پر ایک محکمہ قائم کروں گا محکمہ برائے منسوخیٔ قوانین۔ اس کے علاوہ ایک اور محکمہ قائم کروں گا

جس کا نام ہوگا محکمہ برائے پابندی قوانین۔ ان دونوں محکموں میں خواتین کا تناسب ۷۰ تا ۷۵ فیصد ہوگا اس سے کم نہیں۔ یہ محکمے کرکٹ کے مقابلوں ہی کی طرح "ڈرے اینڈ ٹائیٹ" ہوں گے۔

۹۔ میرے حلقے میں ٹیلی فون کے رانگ نمبر کے اخراجات ٹیلی فون محکمے کے ذمے ہوں گے۔ جن گھروں میں غلط گھنٹیاں بجیں گی ان کا بھی حساب رکھا جائے گا اور رانگ کال کی زحمت دہی کے لیے مناسب ڈسکاؤنٹ دیا جائے گا۔

۱۰۔ میں کسی اسٹیبل گورنمنٹ کے حق میں نہیں ہوں۔ (اسٹیبل کے معنے میں نے لغت میں دیکھے تو معلوم ہوا Stable طویلے کا انگریزی نام ہے)

۱۱۔ فی الحال اتنے وعدے کافی ہیں ان میں سے میرے جو وعدے آپ کو پسند نہ آئیں ان کے لیے میں پہلے ہی معافی مانگتا ہوں۔ بعد میں موقع ملے نہ ملے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ معافی مانگنا بھی ایک اچھی رسم ہے۔ اس کا تو تہوار بھی منایا جاسکتا ہے۔

میرا انتخابی نشان ہے "ہوا" اور نعرہ ہے:

"آزاد رہو آزاد۔ گھات میں ہے صیّاد"

[illegible]

پارہ عم

اردو اور انگریزی میں ترجمہ مع تشریح اور عربی متن

حکیم محمد سعید صاحب نے نوجوانوں کے مرتبہ فکر و علم کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن حکیم کے تیسویں پارے کا آسان اردو اور انگریزی ترجمہ اور تشریح مع عربی متن پیش کیا ہے۔ انگریزی ترجمہ متبحر عالم عبداللہ یوسف علی کا نتیجہ فکر ہے۔

آج کا نونہال خواہ اردو میڈیم کا طالب علم ہو یا انگریزی میڈیم کا 'پارہ عم' کو پڑھنے اور سمجھنے میں اسے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اپنے نونہالوں کو پارہ عم تحفے کے طور پر پیش کیجیے۔ ہدیہ: 45/-

۱۰۰ ذائقے

(نوجوان بچیوں کے لیے)

کھانا پکانا ایک فن ہے اور لڑکیوں کو یہ فن آنا چاہیے۔ کھانا خوش ذائقہ ہو، صحت مند ہو اور خوبصورتی سے پیش کیا جائے تو غذا جزو بدن بن جاتی ہے اس کتاب میں سَو کھانے ہیں اور سَو ہی ذائقے۔ نونہال اور نوجوان بچیوں کو کھانے پکانے کا فن سیکھنے میں اس سے یقیناً مدد ملے گی۔

قیمت 60/-

مجتبیٰ حسین
۱۲۰۰ انکور اپارٹمنٹس
پٹ پڑ گنج ۔ دہلی ۔ ۱۱۰۰۹۲

انتظار حسین، جیلانی بانو اور نجم الحسن رضوی کو مبارکباد

(دوحہ قطر کی تنظیم مجلس فروغ ادب نے برصغیر کے دو ادیبوں انتظار حسین اور جیلانی بانو کو اپنے سالانہ انعام سے نوازنے کے علاوہ اس سال سے کسی ایسے ادیب کو بھی انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے جو برصغیر سے باہر کسی بیرونی ملک میں مقیم ہو۔ اس طرح کا پہلا انعام افسانہ نگار نجم الحسن رضوی (دوحہ) کو دیا گیا ہے۔ اس موقعہ پر مندرجہ بالا ادیبوں کے بارے میں پیش ہے مجتبیٰ حسین کی تحریر۔)

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دوحہ قطر کی ادبی تنظیم مجلس فروغ ادب ہر سال اردو کے دو ادیبوں کو انعامات دیتی ہے جن میں سے ایک انعام پاکستان کے کسی ادیب کو اور دوسرا انعام ہندستان کے کسی ادیب کو دیا جاتا ہے۔ اس بار یہ انعام ہندستان کی افسانہ نگار جیلانی بانو اور پاکستان کے افسانہ نگار انتظار حسین کے حصہ میں آیا ہے۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ پہلے ہی سے ہمارے جی کو یہ دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ اس بار انعاموں کے اس موسم میں ضرور کوئی بڑا انعام کسی ایسے ادیب کو ملے گا جس سے ہمارے قریبی مراسم رہے ہوں۔ اس انعام کا اعلان ہوا تو احساس ہوا کہ یہاں تو معاملہ یک نہ شد دو شد والا ہے۔ انتظار حسین اور جیلانی بانو ہمارے نہ صرف پسندیدہ افسانہ نگار ہیں بلکہ ان دونوں سے ہمارے قریبی مراسم بھی رہے ہیں۔ ایک اور بات کی وضاحت ہم پہلے ہی کر دینا چاہتے ہیں کہ جب دوستوں کو انعامات ملتے ہیں تو ہمیں سب سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ ہماری یہ خوشی خود ان اصحاب کی خوشی سے بھی زیادہ ہوتی ہے جنھیں یہ انعامات ملتے ہیں۔ یوں بھی ہم بے انتہا ذکی الحس واقع ہوئے ہیں اور بھلے ہی دوستوں کا دکھ درد نہ بانٹ سکیں ان کی خوشیوں میں تو بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ خود ہمیں کوئی بڑا انعام آج تک نہیں ملا، ویسے ہمیں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ جو دے اس کا بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ پیسہ اور مال و متاع سے ہمیں یوں بھی کوئی خاص رغبت نہیں ہے۔ ہم نے پیسہ کو ہمیشہ ہاتھ کا میل سمجھا (بشرطیکہ یہ میل دوسرے کے ہاتھ پر ہو) اس ضمن میں ہماری بے نیازی اور استغنا مسلمہ ہے۔ البتہ جب دوستوں کو

انعامات ملتے ہیں تو ہم ان سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ آپ نے اس ماں کا واقعہ تو سنا ہوگا جو اپنے لاڈلے کو اسکول میں بھرتی کرانے کے لیے گئی تو کلاس ٹیچر سے کہا "محترمہ! میرا بیٹا بڑا حساس اور جذباتی ہے۔ اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو خدارا آپ اسے کوئی سزا نہ دیں البتہ اس کے برابر بیٹھنے والے طالب علم کو سزا دے دیں تو یہ اپنے آپ راہ راست پر آجائے گا" ہمارا بھی یہی حال ہے کہ ہمارے کسی ادیب دوست کو انعام ملتا ہے تو ہم بے پناہ خوش ہوتے ہیں اور خود بخود راہ راست پر آجاتے ہیں۔ پھر انتظار حسین اور جیلانی بانو یہ دونوں ہمارے ادب کی ایسی ہستیاں ہیں جنھوں نے ایوارڈ حاصل کرنے کی دوڑ میں کبھی سنجیدگی سے حصہ نہیں لیا ورنہ آپ تو جانتے ہیں کہ ان دنوں ہمارے بعض ادیب دوست انعامات حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ دوڑتے ہی رہتے ہیں۔ اردو کے ایک ادیب اور دانشور کے بارے میں تو یہاں تک سنا ہے کہ انھیں ہر ہفتہ ہی نہیں بلکہ ہر روز کوئی نہ کوئی انعام مل جاتا ہے۔ ایک دن ان کی بیوی نے ہمارے سامنے یہاں تک کہا تھا کہ "اگر آج شام میں گھر واپس ہوتے وقت آپ کے ہاتھ میں انعام کی کوئی ٹرافی 'شیلڈ یا سند وغیرہ نہ ہو تو بازار سے گھر کے لیے ایک کلو گوشت لے آیئے۔ آپ کے ہاتھ چونکہ خالی نہیں رہتے اسی لیے میں آپ کو سودا سلف لانے کے لیے نہیں کہتی" دروغ بر گردن راوی ایک بار یہ بیمار ہو گئے اور جب ان کے فیملی ڈاکٹر کو فون پر ان کی علالت کی اطلاع دی گئی تو ڈاکٹر نے پوچھا "موصوف کو اس ہفتہ کتنے انعامات ملے ہیں؟" جواب ملا "اتفاق سے اس ہفتہ تو انھیں ایک بھی انعام نہیں ملا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا' پریشانی کی کوئی بات نہیں' میں ابھی ایک ٹرافی لے کر آپ کے ہاں آرہا ہوں۔ انشا اللہ ' وہ فوراً صحت یاب ہو جائیں گے۔"

ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ مجلس فروغ ادب نے اس سال سے ایوارڈ کی رقم فی کس ایک لاکھ روپے سے بڑھا کر سوا لاکھ روپے کر دی ہے۔ مگر یہ سوا لاکھ کی رقم ہمیں جچی نہیں کیونکہ اردو محاورہ کے حساب سے ہمارے ہاں تو مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ زندہ ادیبوں کا کچھ تو خیال رکھا جاتا۔ رقم کو بڑھانا ہی تھا تو ڈیڑھ لاکھ کر دیتے۔ اس طرح اردو محاورہ پر آنچ نہ آتی۔ سانپ بھی نہ مرتا اور لاٹھی بھی ٹوٹ جاتی۔ خیر!

انتظار حسین اور جیلانی بانو دونوں سے ہماری پرانی یاد اللہ ہے۔ بیس برس پہلے انتظار حسین ایک سیمینار میں شرکت کے لیے ہندستان آئے تھے تو ان سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے وہ کئی بار ہندستان آچکے ہیں اور ہمیں ان کی صحبت سے مستفید ہونے کے بیسیوں مواقع مل چکے ہیں' وہ ہمارا کتنا خیال رکھتے ہیں اس کا اندازہ اس

بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بار ہم نے ان سے کہا کہ وہ ہماری خاطر مزاح نگار بن جائیں تو وہ فوراً بن گئے اور ہمارے ساتھ زندہ دلان حیدرآباد کے ادبی اجلاس میں نہ صرف شرکت کی بلکہ لطیفہ گوئی کی محفل میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ویسے انتظار حسین پاکستان کے معروف کالم نگار بھی ہیں۔ اب تو اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی کالم لکھتے ہیں (ہمارے بارے میں بھی دو تین کالم لکھ چکے ہیں) ان کے ناول "بستی" کی برصغیر میں بڑی دھوم ہوئی۔ ہندی میں بھی ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں بلکہ ہمیں تو وہ ہندی حلقوں میں زیادہ مقبول نظر آئے۔ انتظار حسین نے پرانی داستانوں کے کرداروں اور ان کی فضا کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ آج کی کہانی میں پھر سے رائج کیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں یہ کردار ایک طاقتور استعارہ بن گئے ہیں۔ انتظار حسین اگرچہ نہایت کم گو اور کم آمیز ہیں لیکن اپنی کہانیوں میں جب وہ بولنا شروع کرتے ہیں تو ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کی گونج ان میں صاف سنائی دیتی ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے وہ میرٹھ میں رہتے تھے مگر اب میرٹھ ان کی کہانیوں میں رہتا ہے۔ لاہور میں بھی انھیں نیم کے وہ پیڑ اکثر یاد آتے ہیں جنھیں وہ اپنی نوجوانی کے دنوں میں میرٹھ میں چھوڑ گئے تھے۔ کوئی اپنی محبوباؤں کو بھی اس طرح یاد نہیں کرتا جس طرح وہ نیم کے پیڑوں کو یاد کرتے ہیں۔ میرٹھ ہم بھی کئی بار گئے ہیں اور محض انتظار حسین کی خاطر ہم نے وہاں نیم کے پیڑوں کو بغور دیکھا ہے۔ ہمیں تو کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ لیکن انتظار حسین کی کہانیوں میں پہنچ کر ان پیڑوں کی خاصیت بدل جاتی ہے۔ انتظار حسین کی نیم چڑھی کہانیوں کی بات ہی الگ ہوتی ہے۔ انتظار حسین اپنے NOSTALGIA کے لیے بھی بڑی شہرت رکھتے ہیں اور اس شہرت کے حوالے سے ان کی "ہجرت کی خوشبو" بھی خاصی مشہور ہو گئی ہے۔

جیلانی بانو کے بارے میں ہم کیا عرض کریں۔ ان سے ہمارے کئی رشتے ہیں۔ ایک رشتہ تو یہی ہے کہ وہ حیدرآبادی ہیں اور کسی حیدرآبادی کا حیدرآباد میں رہ کر نام کمانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں عزت اسی کو ملتی ہے جو وطن سے نکل جاتا ہے (جیسے ہم نکل گئے تھے۔ خیر اس کے بعد بھی عزت نہیں ملی یہ ایک الگ کہانی ہے) دوسرا رشتہ یہ ہے کہ وہ ہمارے بزرگ اور مشفق علامہ حیرت بدایونی مرحوم کی صاحبزادی ہیں، تیسرا رشتہ یہ کہ ان کے دو چھوٹے بھائی پروفیسر افضل محمد اور احمد جلیس مرحوم ہمارے بے تکلف دوست رہے ہیں، چوتھا رشتہ یہ کہ ان کے شوہر پروفیسر انور معظم عثمانیہ یونیورسٹی میں اگرچہ ہم سے کچھ سینئر رہے لیکن ان سے ہمارے برسوں کے دوستانہ مراسم ہیں، پانچواں رشتہ یہ کہ ضرورت شعری کے تحت وہ مزاح نگاری بھی کرلیتی ہیں، چھٹا رشتہ یہ کہ

انھوں نے بھی حیدر آباد کے اس ہنگامہ پرور ادبی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں جن میں ہم نے بھی ڈرتے ڈرتے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ یوں بھی اس زمانہ میں علمی و ادبی گھرانوں میں پیدا ہونے کا فیشن عام تھا۔ یاد ش بخیر! نوجوانی کے دنوں میں ایک دوست سے ہماری اس بات پر ان بن ہو گئی تھی کہ ہم دونوں میں سے کس نے علمی و ادبی ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں۔ ایک مرحلہ پر ہم نے اپنے دوست سے پوچھا "اچھا یہ بتاؤ' تمھاری پیدائش کس جگہ ہوئی تھی؟" اس نے کہا "میری پیدائش وکٹوریہ زنانہ اسپتال میں ہوئی تھی۔" اس پر ہم نے اپنا سینہ تان کر کہا تھا "کھا گئے نا مات بھیا! ہم تو آصفیہ لائبریری میں پیدا ہوئے تھے جہاں ہمارے چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔" بہر حال یہ ماننا پڑے گا کہ جیلانی بانو باکمالوں TALENTED PERSONS کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ان کے ایک بھائی آرٹسٹ اور فوٹو گرافر ہیں اور فرزند میاں فرحان کمپیوٹر انجینئر ہیں' ایسا خاندان ٹیلی ویژن سیریل بنانے میں ہمیشہ بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ جیلانی بانو نے بھی ایک ٹی وی سیریل بنایا جس کی کہانی' مکالمے اور اسکرین پلے تو خود جیلانی بانو نے لکھے تھے۔ پس منظر میں آواز پروفیسر انور معظم کی تھی۔ ہمارے دوست احمد جلیس مرحوم نے اس میں ویلن کا کردار ادا کیا تھا۔ آرٹ ڈائریکشن اور فوٹو گرافی کے فرائض ان کے بھائی نے انجام دیئے تھے اور فرزند میاں فرحان نے ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔ حد تو یہ کہ اس سیریل میں ایک بلی بھی دکھائی گئی تھی جو ان ہی کے گھر میں پلی ہوئی تھی۔ ہمہ خاندان آفتاب است اسی کو کہتے ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا ان کے سیریل میں ایک غیر ملکی خاتون کا رول بھی تھا' اتفاق سے ان دنوں ہماری روسی دوست ایرینا ہندستان آئی ہوئی تھیں۔ جیلانی بانو کو ایرینا کے بارے میں بتایا تو کہا ایرینا کو فوراً حیدر آباد روانہ کرو۔ چنانچہ ایرینا حیدر آباد گئیں اور سیریل میں اداکاری بھی کی۔ مگر اس سیریل کا کلائمکس اس وقت رونما ہوا جب اسے ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔ بخدا ہمارے ایک دوست نے ایرینا والے سین کو دیکھ کر ہم سے نہایت معصومیت کے ساتھ پوچھا تھا "کیا جیلانی بانو کے خاندان کے کسی فرد نے کسی روسی خاتون سے شادی کی ہے؟" خیر یہ تو ایک ایسی بات تھی جو ہمیں اچانک یاد آگئی۔ کیا کریں ہمیں باتیں بھی تو ایسی ہی یاد رہتی ہیں۔ جیلانی بانو کی تحریروں میں ہمیں حیدر آباد جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ ان کا مشہور ناول "ایوان غزل" تو حیدر آباد کے پورے ایک دور کی جیتی جاگتی تصویر کو پیش کرتا ہے۔ جیلانی بانو عوامی سطح پر بھی سرگرم عمل رہی ہیں۔ کچھ برسوں پہلے جب فرقہ پرستی نے سر ابھارنا شروع کیا تھا تو انھوں نے ادیبوں اور فنکاروں سے اپیل کی تھی کہ وہ خاموش نہ رہیں اور سڑکوں پر نکل آئیں۔ ہم تو خیر شروع ہی سے

سڑکوں پر پائے جاتے رہے ہیں۔ اسی لیے ہمیں سڑک پر آنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی' دوسروں کا حال ہم نہیں جانتے۔ البتہ دو چار شاعروں کے بارے میں اتنا ضرور جانتے ہیں کہ انھوں نے جیلانی بانو کی اپیل کی روشنی میں شعر کہنے کی رفتار بڑھادی تھی۔ پہلے ہفتہ میں ایک غزل کہتے تھے تو اب روزانہ دو چار غزلیں کہنے لگے۔ اس پر ہم نے انھیں سمجھایا کہ بھیا! تمھارے شعری سرمایہ میں جس طرح اضافہ ہو رہا ہے اس سے بہتر تو یہی ہے کہ ملک میں فرقہ پرستی پھیل جائے۔ فرقہ پرستی کا تو ہم کسی طرح مقابلہ کرلیں گے لیکن تمھاری شاعری کو برداشت کرنا اور اس کا مقابلہ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ جیلانی بانو نے لگ بھگ پچھلی نصف صدی کو نہایت باشعور ڈھنگ سے تخلیقی سطح پر برتا اور محسوس کیا ہے اور اس کا بھرپور اظہار ان کی کہانیوں میں ہوا ہے۔ ان کا تخلیقی سرمایہ بلاشبہ ہمارے عصری ادب کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس موقع پر ہم نہ صرف جیلانی بانو کو بلکہ خود اہلِ حیدرآباد کو بھی مبارک باد دینا چاہتے ہیں کیونکہ یہ اعزاز نہ صرف جیلانی بانو کے حصہ میں آیا ہے بلکہ حیدرآباد کے حصہ میں بھی آیا ہے۔

نجم الحسن رضوی! تم کہاں ہو؟

نجم الحسن رضوی سے ۱۸ر ستمبر ۱۹۹۷ء کو دوبئی کی ایک ایک محفل میں ملاقات ہوئی تھی جہاں دوبئی کی کئی ادب دوست اور اردو نواز ہستیاں موجود تھیں۔ ڈاکٹر اظہر زیدی ڈائرکٹر آرٹس پروموشن بیورو نے یہ محفل اصل میں اس مقصد سے بلائی تھی کہ دوسرے دن ہونے والے بین الاقوامی مزاحیہ مشاعرہ کی تفصیلات کو قطعیت دی جاسکے۔ محفل میں خاصے لوگ تھے جن میں سے اکثر کو ہم نہیں جانتے تھے۔ اس وجہ سے بہت سے لوگ ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے اور ہم ان سے کہیں زیادہ حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں ایک صاحب نے ہم سے کہا "جناب! مجھے نجم الحسن رضوی کہتے ہیں"

ہم نے کہا "اچھا تو آپ ہی نجم الحسن رضوی ہیں۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" ہم نے یہ جملہ یوں ادا کیا جیسے وہ ٹونی بلیر ہوں، یاسر عرفات ہوں یا بل کلنٹن ہوں یا کوئی ایسی مشہور شخصیت ہوں جنھیں پہلے سے جاننا ہم پر فرض بنتا ہو۔ لوگوں کی بھیڑ میں جب لوگ آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو ایسے ہی رسمی اور مصنوعی جملوں سے نپٹاتے ہیں۔ اس وقت ہمارا ذہن اس طرف بالکل نہیں گیا کہ نجم الحسن رضوی پاکستان کے ایک طرحدار افسانہ نگار کا بھی نام ہے جس کے افسانے پچھلی ڈھائی تین دہائیوں میں پاکستانی رسائل میں کبھی کبھار ہماری نظر سے گزرتے اور ہم سے خاموش داد بھی وصول کرتے

رہے ہیں۔ ایسی صورت حال سے بچنے کے لیے ہی اکثر شاعر اور ادیب اپنے والدین کے رکھے ہوئے ناموں سے کنارہ کش ہو کر اپنے قلمی نام اختیار کر لیتے ہیں۔ آج کون جانتا ہے کہ ساحر لدھیانوی کا اصلی نام عبدالحی تھا۔ آج کے ندا فاضلی اپنے گھر میں مقتدا حسین کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ظ۔ انصاری اپنے والدین کی نظر میں صرف ظلِ حسنین تھے۔ یوں بھی ماں باپ جو نام رکھ دیتے ہیں انھیں ادب کی دنیا میں مشہور کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ خود ہماری مثال لیجیے کہ والدین نے ہمارا نام "مجتبیٰ حسین" رکھ کر کہہ دیا کہ بیٹا جاؤ اور اس نام کو دنیا میں روشن کرو۔ چنانچہ ایک سعادت مند بیٹے کی طرح ہم غفلت میں اپنے اصلی نام کے ساتھ ہی ادب میں چلے آئے۔ اب جو ہم نے اس نام کو مشہور کرنے کی کوشش شروع کی تو پتہ چلا کہ عوام الناس ہمارے نام کا صحیح تلفظ ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ چنانچہ بیشتر عوام الناس آج بھی ہمیں "مشتبہ حسین" کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ والدین سے مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو کوئی نہ کوئی مشکل کام سونپ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر بھی ہمیں داد دیجیے کہ ہم نے اپنے اس مشکل نام کو اتنا مشہور کردیا کہ کچھ برس پہلے جب پاکستان کے مشہور نقاد مجتبیٰ حسین کے انتقال کی خبر ریڈیو سے نشر ہوئی تو ہماری اہلیہ کے نام سینکڑوں تعزیتی خطوط وصول ہوئے جن میں خدا سے دعا مانگی گئی تھی کہ وہ ہماری اہلیہ کو صبر جمیل کا مادہ (قبل از وقت) عطا کرے۔ (حالانکہ ادیبوں اور شاعروں کے گزر جانے کے بعد ان کی بیواؤں کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے کسی صبر جمیل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ صبر جمیل کی ضرورت تو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب ادیب اور شاعر زندہ ہوں)

بہرحال اس محفل میں یہ احساس ہی نہ ہوا کہ نجم الحسن رضوی اپنے والدین کے رکھے ہوئے نام کے ساتھ ہی ادب میں چلے آئے ہیں۔ نجم الحسن رضوی تو کسی کا نام بھی ہو سکتا ہے جیسے ہمارا نام ہے۔ پھر پاکستان کے افسانہ نگار نجم الحسن رضوی کا بھلا دوبئی میں کیا کام۔ کچھ دیر بعد محفل میں پھر آمنا سامنا ہوا تو نجم الحسن رضوی بولے "میں خلیج ٹائمس کا اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوں" اس پر ہم نے مزید گرم جوشی سے کہا "اچھا تو آپ خلیج ٹائمس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں" اس بار ہم نے خلیج ٹائمس پر زور دے کر اپنا جملہ یوں ادا کیا جیسے ہم خلیج ٹائمس کے سب سے پرانے قاری ہوں بلکہ اُس وقت کے قاری ہوں جب یہ اخبار نکلنا بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ ہماری اس غیر ضروری گرمجوشی کو بھانپ کر نجم الحسن رضوی نے کہا "جناب میرا تعلق بھی آپ ہی کے قبیلہ سے ہے۔"

ہم نے کہا "اچھا تو آپ کا تعلق بھی وسط ایشیا کے اس قبیلہ سے ہے جس سے

ہمارے آباؤ اجداد کا تعلق رہا ہے۔ سنا ہے کہ اس قبیلے نے تیرھویں یا چودھویں صدی میں وسط ایشیا میں بڑا قہر برپا کر رکھا تھا۔ لوگ اس قبیلے سے پناہ مانگتے تھے بلکہ خود ہمارے جد اعلا اس قبیلے کی بدنامی سے بچنے کے لیے سولہویں صدی میں درہ خیبر کے راستے سے ہندستان آ گئے تھے اور یہاں آتے ہی اپنا لبادہ اتار کر اچانک نیک اور پاکباز بن گئے تھے۔ آدمی کو بگڑتے دیر تھوڑی لگتی ہے۔" نجم الحسن بولے۔ "نعوذ باللہ! بھلا میرا تعلق اس قبیلے سے کیوں ہونے چلا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا تعلق بھی "قلم قبیلہ" سے ہے۔ کچھ لکھتا لکھاتا رہتا ہوں" ہم نے ہنس کر کہا "یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ آپ ایک اخبار کے اور وہ بھی انگریزی اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں تو قلم تو چلائیں گے ہی، اگر آپ کسی اردو اخبار کے صحافی ہوتے تو بات مختلف ہوتی کیونکہ اردو کے اکثر صحافی قلم کا کم اور قینچی کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ ویسے آپ نے جس "قلم قبیلہ" سے میرا اور اپنا تعلق پیدا کر رکھا ہے وہ بھی کچھ کم قہر انگیز نہیں ہے" نجم الحسن ہماری بات پر ہنسنا ہی چاہتے تھے کہ ایک صاحب انہیں کسی ضروری کام سے بلا کر اپنے ساتھ لے گئے، پھر محفل برخاست ہو گئی۔

الغرض دوسرے دن ہمارے جشن کی تقریب شروع ہوئی تو ڈاکٹر اطہر زیدی کے اعلان سے معلوم ہوا کہ ہمارے یہی ہم قبیلہ جناب نجم الحسن رضوی ہمارے بارے میں ایک مضمون پڑھیں گے۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ نجم الحسن اردو میں بھی لکھ لیتے ہیں۔ اب جو نجم الحسن رضوی ہماری تعریف میں رطب اللسان ہوئے تو اس بیش بہا تعریف سے سامعین کا متفق ہونا تو بہت دور کی بات ہے خود ہمارا متفق ہونا بھی مشکل نظر آنے لگا۔ پھر بھی ہم نے ان کا مضمون محض اس لیے نہایت اشتیاق سے سنا کہ بہت خوبصورت اردو میں لکھا ہوا تھا۔ ہم نے سوچا بھئی یہ ہمارے ہم قبیلہ تو قبیلے کے سردار نکلے۔ انگریزی کے صحافی ہیں لیکن ذرا دیکھیے تو سہی کہ کتنی خوبصورت اردو لکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دوبئی میں بیٹھ کر اپنی خوبصورت اردو کو ہم جیسے بدصورتوں پر ضائع کر رہے ہیں۔ بہرحال جب ہم میں ان سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا تو معلوم ہوا کہ اپنا مضمون سنانے کے بعد وہ اگلے دن کا خلیج ٹائمس نکالنے کے لیے چلے گئے ہیں۔ جس رات ہمیں دوبئی سے دہلی کے لیے روانہ ہونا تھا وہ دن ہم نے حیدرآبادی عزیزوں کے درمیان گزارا۔ ہوائی اڈہ جانے سے عین آدھا گھنٹہ پہلے ہوٹل پر سامان اٹھانے کے لیے بھاگم بھاگ آئے تو دیکھا کہ نجم الحسن رضوی ہوٹل کی لابی میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم قبیلہ ہونے کے ناتے ہم ان سے ایسی گرم جوشی کے ساتھ بغلگیر ہوئے جیسے انھیں کبھی اپنی بغل سے آزاد نہ کرنے کا

ارادہ رکھتے ہوں۔ لیکن کیا کریں آدھا گھنٹہ بعد ہمیں وہاں سے روانہ ہونا تھا اور اپنا سامان سفر بھی باندھنا تھا۔ معلوم ہوا نجم الحسن رضوی بڑی دیر سے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ جان کر اور بھی شرمندگی ہوئی۔ نجم الحسن رضوی نے ہمیں اپنے افسانوں کے مجموعے "ہاتھ بیچنے والے" اور "پرے کا موسم" اور مزاحیہ مضامین کا ایک مسودہ بھی دیا جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ ہم نے عجلت میں نجم الحسن رضوی سے کہا "اچھا تو آپ افسانہ نگار بھی ہیں۔ یہ تو ہمیں معلوم نہ تھا"۔ پھر ہم نے عجلت میں شکریہ ادا کیا اور اس سے کہیں زیادہ عجلت کے ساتھ ان کتابوں کو اپنے سامان سفر میں رکھ لیا۔ جب ہمارا طیارہ تیس ہزار فیٹ کی بلندی پر پہنچ گیا تو ہم نے اپنا حفاظتی بند کھولا اور اپنے سامان میں سے نجم الحسن رضوی کے مجموعے نکالے۔ ہماری نظر "لوڈشیڈنگ" والے افسانے پر پڑی تو معاً خیال آیا کہ یہ افسانہ تو ہم نے کہیں پڑھ رکھا ہے۔ پھر اس افسانہ کا ایک جملہ بھی ہمیں یاد آگیا۔ "جس شہر میں لوگوں کو زندہ سلامت گھر پہنچنے کی ضمانت نہ دی جاسکے وہاں عورتیں بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتیں۔" ہم نے بڑے اشتیاق کے ساتھ ان افسانوں کو پڑھنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ ان میں سے بعض افسانے نہ صرف ہماری نظر سے گذر چکے ہیں بلکہ ہم ان افسانوں کے سحر میں بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔ ہم اپنا ماتھا پیٹ کر رہ گئے کہ یہ تو وہ نجم الحسن رضوی ہیں جن کے افسانوں کے ہم قتیل رہ چکے ہیں اور ہم انھیں خواہ مخواہ ہی "خلیج ٹائمس" کا اسسٹنٹ ایڈیٹر سمجھ کر دوبئی میں ٹال آئے۔ ان سے تو ہمیں ڈھیر ساری باتیں کرنی تھیں۔ مگر اب پچھتائے کیا ہووت کیونکہ وہ تو ہماری پہنچ سے سینکڑوں میل پیچھے رہ گئے تھے۔ ہماری ذہنی کیفیت ان والدین کی سی ہوگئی جن کے بچے بعض اوقات کسی بات پر روٹھ کر گھر سے چلے جاتے ہیں تو والدین اخباروں میں اشتہار چھپواتے پھرتے ہیں کہ بیٹا تم کہاں ہو۔ تم بلاوجہ ہم سے روٹھ کر چلے گئے۔ فوراً واپس چلے آؤ۔ تم سے کچھ بھی نہیں کہا جائے گا۔ جب سے تم گئے ہو تمہاری والدہ کی حالت تشویشناک ہوگئی ہے۔ کھانا پینا بند کر رکھا ہے۔ آئسکریم تک نہیں کھا رہی ہیں"۔ غرض اس ذہنی کیفیت سے نکلنے کے لیے ہم نے نجم الحسن رضوی کی دونوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔

نجم الحسن رضوی کا افسانہ سچ مچ کا افسانہ ہوتا ہے۔ لکھتے تو وہ بھی دل بے قرار کا افسانہ ہی ہیں لیکن کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ دل کو خود بخود قرار آجاتا ہے۔ ہمارے بیشتر جدید افسانہ نگاروں کے افسانوں میں اور تو سب کچھ ہوتا ہے لیکن افسانہ نہیں ہوتا۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو وہ کچھ ایسی چابکدستی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ افسانہ کتاب سے نکل کر آپ کی فکر کا حصہ بن جاتا ہے۔ وہ ان افسانہ نگاروں میں نہیں ہیں جن کے

افسانے کتابوں میں محفوظ رہ جاتے ہیں کیونکہ یہ افسانے بعد میں پڑھنے والے کے زاویہ نگاہ کو متعین کرتے ہیں۔ علامتیں ایسی نہیں ہوتیں کہ علامتی افسانہ ملامتی افسانہ بن جائے۔ نجم الحسن رضوی کو طنز و مزاح سے بھی خاصا شغف ہے اور جلد ہی ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ چھپ کر آنے والا ہے۔ اس میدان میں ان کا خصوصی رجحان "پیروڈی" کی طرف ہے۔ نثر میں ہمارے ہاں پیروڈیاں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں شفیق الرحمن، کنھیالال کپور اور احمد جمال پاشا کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ نجم الحسن رضوی کے بیشتر مضامین جیسے "اردو ادب کا جغرافیہ" "موسیقی کا پلاؤ" "پرچہ بے حساب" وغیرہ پیروڈی کے زمرہ میں ہی آتے ہیں۔ انہوں نے ایک ٹیلی ویژن مذاکرہ کی ایک خوبصورت پیروڈی بھی لکھی ہے۔ یہ مذاکرہ اصل میں "معاشی نظام" کے بارے میں ہے جس کا عنوان نجم الحسن رضوی نے "ہمارا بد معاشی نظام" رکھا ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ برصغیر کا معاشی نظام دراصل "بدمعاشی" کے اطراف ہی گھومتا ہے۔ بظاہر یہ بالکل سامنے کی بات ہے لیکن جب تک نجم الحسن رضوی اس "معاشی نظام" کا نام ہی بد معاشی نظام نہیں رکھ دیتے تب تک یہ کھلی بات واضح نہیں ہو پاتی۔ نجم الحسن رضوی لفظوں کے نباض ہیں اور ان سے کھیلنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ ہمیں اب رہ رہ کے یہ افسوس ہو رہا ہے کہ دوبئی میں نجم الحسن رضوی سے تفصیلی ملاقاتیں کیوں نہ ہو پائیں۔ محفلوں سے اب جی اسی لیے گھبراتا ہے کہ محفلوں میں ہجوم سے تو ملاقات ہو جاتی ہے لیکن فرد سے ملاقات نہیں ہو پاتی۔

نصرت ظہیر ۳-۱۵ کھچڑی پور۔ دہلی ۹۱
ٹیلی فون۔ ۲۲۷۴۴۲۵

ایک تردیدی مضمون

حد ہو گئی صاحب! پچھلے ہفتے ایک اور ستم ہو گیا۔

ایک اور یوں کہ ہمارے اوپر پہلے بھی کئی ستم ڈھائے جا چکے ہیں۔ مثلاً پہلا ستم تو ہمارے گھر میں اس وقت ہی ڈھادیا گیا جب ہمارا نام نصرت ظہیر رکھا گیا۔ شروع میں اس نام کے مضمرات اور ممکنہ اثرات، نیز اس میں چھپے ہوئے خطرات کی جانب کسی کا دھیان نہیں گیا۔ لیکن جب سن بلوغت کو پہنچ کر ہم لکھنے لکھانے لگے تو اس نام نے بعض قارئین کو طرح طرح کی غلط رخوش فہمیوں میں مبتلا کر دیا۔ کئی لوگ سوچنے لگے کہ ہم لکھتے نہیں لکھتی ہیں۔ چنانچہ غلط فہمیاں تو کم ہی رہیں، خوش فہمیاں زیادہ ہو گئیں۔

پھر ایک ستم تب ہوا جب ہماری ایک کتاب کو اتر پردیش کی اردو اکادمی نے انعام سے نوازا اور جب ہمیں اس انعام کا سرٹیفکٹ دیا گیا تو اکادمی کی چیرپرسن صاحبہ نے اس میں لکھے ہوئے محترم / محترمہ، سے ہمارا محترم کاٹ کر، ہمارے بارے میں ایک قسم کا آفیشیل شک وشبہ پیدا کر دیا اور ہمارا راشن کارڈ، نیز ووٹ دینے کا حق تک خطرے میں پڑ گیا۔

خیر ان ستم ہائے بالا ستم کے سلسلے میں ہم نے کئی مضمون لکھے، جگہ جگہ اس مضمون کو چھپوایا، اپنی کتابوں پر اپنی ہی تصویر نمایاں طور پر یہ لکھ کر چھاپی کہ یہ ہماری اپنی تصدیق وتوثیق شدہ اصلی تصویر ہے، اور یوں بڑی حد تک اپنے تئیں خوش فہمیوں سے محفوظ ومامون کر لیا۔

لیکن پچھلے دنوں جو ستم ہوا وہ اوروں نے نہیں خود ہمارے ہی اخباری دفتر کے ایک پیسٹر صاحب نے ڈھایا۔ (اللہ، پیسٹر کو کسی لذیذ پیسٹری کا مذکر نہ سمجھ لیں، دراصل یہ وہ صاحب ہوتے ہیں جو کتابت شدہ مضامین چپکا کر اخبار کی کاپی تیار کرتے ہیں۔) ہوا یہ کہ اخبار کے اتواری ضمیمہ میں "بقلم خود" کے عنوان سے ہم جو کالم لکھتے ہیں، اس میں ہم

نے اپنے پرائمری اسکول کے استاد اور شہر سہارنپور کے مشہور و معروف شاعر ماسٹر محمد یاسین ارم سہارنپوری کے بارے میں بڑی عزت واحترام کے ساتھ ایک مضمون لکھا، اور مضمون میں قارئین کو یہ اطلاعات بہم پہنچائیں کہ کس طرح اس مشفق استاد نے ہمیں نہایت شفقت سے مرغا بنا کر اور بڑی محبت سے پٹائی کر کے ہمیں اردو ڈیسک ریڈر پڑھائی' اور شہر کی آدھی آبادی میں خواندگی پھیلانے میں ان کا کتنا ہاتھ ہے۔ پرنٹر صاحب نے بقول خود سہواً اور بعض دوسروں کے بقول سازشاً و شرارتاً، اس مضمون پر ہماری بجائے امریکہ میں مقیم اردو کے مشہور ادیب جناب افتخار نسیم کا نام بطور مصنف چسپاں کر دیا۔ ضمیمہ میں نسیم صاحب کا اپنا لکھا ہوا بھی ایک مضمون موجود تھا مگر عجیب بات یہ ہے کہ دونوں پر نسیم صاحب کا ہی نام چلا گیا!

بظاہر یہ غلطی معمولی معلوم ہوتی ہے لیکن جو حضرات افتخار نسیم صاحب سے ان کے خیالات و نظریات سے اور عادات واعمال سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس معمولی سہو کے کتنے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ خاص طور سے ماسٹر ارم صاحب کے حق میں! افتخار صاحب سنا ہے کہ خود بھی "گے" اور "ہومو" ہیں اور اعلانیہ کہہ چکے ہیں کہ اگلے جنم میں وہ عورت بن کر پیدا ہونا چاہتے ہیں اور دروغ برگردن مجتبیٰ حسین لوگ تو ان کے (نسیم صاحب کے) بارے میں یہاں تک کہتے ہیں کہ "سنا ہے کم بخت 'گے' میں بھی 'دے' ہے۔" ہم نے پوچھا قبلہ آپ کہیں گے کو "دے" کہنے والے بچوں کی تتلاہٹ کی نقل تو نہیں اتار رہے ہیں تو انھوں نے حلفیہ کہا کہ میں دال بے زیر دے کہہ رہا ہوں۔

خیر، ہمیں نسیم صاحب کے "گے" اور "ہومو" ہونے پر کوئی اعتراض نہیں اور نہ ہی ہم اگلے جنم میں ایک خاتون بن کر پیدا ہونے کی ان کی خواہش پر معترض ہیں بلکہ سچ پوچھیے تو ان کی یہ خواہش ہمیں ابھی سے پر لطف معلوم ہونے لگی ہے اور ہم دعا کرتے ہیں کہ کاش ان کا دوسرا جنم، ہمارے اسی جنم میں، ان کی خواہش کے مطابق ہو جائے تاکہ ہمیں بھی امریکہ میں رہنے والی ایک آزاد خیال خاتون ادیبہ سے محظوظ و ملطوف ہونے کا موقع مل سکے۔ چنانچہ [illegible] (خواہش ان کی ہے اور مزا ہمیں آرہا ہے۔

بہرکیف، اور باتوں کے باوجود ہمیں اس بات کا بھی بڑا احساس ہے کہ ہماری [illegible]

[illegible]

افتخار صاحب جیسے پختہ کار وبلند پایہ ادیب کے ادبی مرتبہ اور عزت و آبرو پر ہی زیادہ حرف آیا ہوگا.... لیکن بات ادیب کی حیثیت اور درجے کی نہیں، اس کے خیالات، نظریات اور ارادوں کی ہے، جن کی وجہ سے ہماری تو نہیں البتہ ساٹھ پینسٹھ کے لپیٹے میں آئے ہوئے بزرگ استاد ماسٹر ارم عمرپوری کی عفت و عصمت ضرور خطرے میں پڑ گئی ہے جن کا بڑھاپا ابھی لڑکپن کے دور میں داخل ہی ہوا ہے!!

جن قارئین نے بھی ہمارے مضمون کو افتخار نسیم کا مضمون سمجھ کر پڑھا ہوگا وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ ارم صاحب نسیم صاحب کے استاد ہیں بلکہ بعض نے تو یہ سمجھ لیا ہوگا کہ وہ نسیم صاحب کے بھی استاد ہیں یعنی ان سے دو قدم آگے! جب کہ ارم صاحب ماشاء اللہ ایک باعزت خاتون کے ساتھ شادی شدہ ہیں، آل اولاد والے ہیں، پورا شہر ان کی شخصیت بزرگی اور شاعری کی عزت کرتا ہے۔ اگر کسی نے کچھ اور سمجھ لیا، اور کسی ادبی محفل میں یہ اعتراض جڑ دیا کہ ایک ماہر اغلامیات آپ کا شاگرد ہے جو آپ کی شان میں مضمون بھی لکھتا ہے، لہٰذا آپ کو شرم آنی چاہیے، تو بچارے ارم صاحب تو پانی پانی ہو جائیں گے! مزید یہ کہ کہیں اس کم سن بڑھاپے میں ان کا نکاح نہ خطرے میں پڑ جائے! اولاد باغی ہو جائے!!

چنانچہ ہم نے پیسٹر صاحب سے شدید احتجاج کیا، انھیں ان کے سہو کے عوامل وعواقب سے آگاہ کرکے عبرت دلانے کی کوشش کی، مگر موصوف شرمندہ ہونے کی بجائے مسلسل مسکراتے رہے۔ ہم نے اس تبسم بے جا کا سبب پوچھا تو کہنے لگے.... جناب والا شکر کیجیے کہ آپ کے مضمون پر افتخار نسیم صاحب کا نام چپک گیا ہے۔ کہیں خدانخواستہ افتخار نسیم صاحب کے مضمون پر آپ کا نام چلا جاتا تو پھر سوچتے آپ کا کیا حشر ہوتا! اور پھر آپ تو رہنے والے بھی مدرسوں کے شہر کے ہیں چنانچہ سب یقین کر لیتے کہ یہ مضمون آپ ہی کا ہے۔ لہٰذا آپ کو میرا ممنون و متشکر ہونا چاہیے کہ میں نے صحیح غلطی کی۔ اگر غلط غلطی ہو جاتی تو آپ کہیں کے نہ رہتے۔ اس سہو صحیح نے آپ کو بچالیا۔

یہ بیان سن کر ہم سناٹے میں آگئے اور سوچنے لگے، واقعی ظالم سچ کہہ رہا ہے۔ اگر خدانہ کرے، دشمن کا منہ کالا، جھوٹے پر شیطان کی مار اور بُری نظر والے پر سو جوتے، افتخار صاحب کے مضمون سے ہمارا نام بطور مصنف منسلک ہوگیا ہوتا تو، ہماری تو بیوی ہی

ہمیں دھکے دے کر گھر نکال دیتی۔ حالانکہ عام طور سے جن مضامین پر وہ ہمارا نام دیکھتی ہے، انھیں قصداً اور ارادتاً نہیں پڑھتی، لیکن ہمیں یقین ہے کہ ایسے مضمون کو وہ ضرور پڑھتی، بار بار پڑھتی اور پھر ہمیں کہیں کا نہ چھوڑتی۔ بچیاں حقارت سے دیکھتیں سو الگ! اور والد بزرگوار تو حق یہ ہے کہ حقہ پانی ہی بند کر دیتے اور کہتے کہ لعنتی اور دوزخی مردود یہ خیالات اور ارادے ہیں تیرے، اسی دن کے لیے تجھے پال پوس کر بڑا کیا تھا!؟

یہی نہیں، محلے میں نکلنا تک دوبھر ہو جاتا۔ آس پڑوس کے لڑکے جیسے ہی ہمیں دیکھتے، اپنی گولیاں، کنچے اور گلی ڈنڈے چھوڑ کر چیخیں مارتے اور بھاگ جایا کرتے۔ لڑکیاں ہم پر "دور ہو، دور ہو" کے آوازے کستیں۔ دوست احباب ہم سے محفوظ فاصلے پر رہنے لگتے۔ کسی دوست سے ملنے اس کے گھر جاتے تو باہر سے ہی کہلوادیا کرتے کہ ------جی وہ انڈے لینے بازار گئے ہیں، کل آئیں گے۔ اور یہ بات بھی کسی نوجوان آدمی سے نہیں بلکہ کسی بوڑھے بزرگ سے کہلوائی جایا کرتی!

تاہم کچھ ہمدردی ہمیں افتخار نسیم صاحب سے بھی ہے جو مرد اور مرد میں زنانہ تعلقات کے زبردست مبلغ ہیں اور قوانین قدرت و ضوابط فطرت میں دخل اندازی کو انسان کا بنیادی حق مانتے ہیں۔ ہم اپنی ذات سے متعلق تمام تر اندیشہ ہائے دور و دراز کے باوجود اس بات کے لیے اپنے چیسٹر صاحب کی طرف سے معذرت خواہ ہیں کہ ہمارے بے مزہ، بے لطف و بے لوطی مضمون پر ان جیسے اعلا ادیب و مفکر کا نام چلا گیا۔ افتخار صاحب پاکستانی مردوں کی (واضح رہے یہ مرد کی جمع ہے مُردے کی نہیں) بے ذوقی سے تنگ آکر امریکہ کے سازگار ماحول میں جا بسے ہیں۔ ان کے حامیوں کو ہمارے مضمون میں (جو انھوں نے ان کا سمجھ کر پڑھا ہوگا) "گے" یا "ہومو" کی بات نہ آنے سے، ان کے فلسفے اور فکر کے بارے میں کئی طرح کے شبہات پیدا ہو گئے ہوں گے اور ان کے مداح سوچنے لگے ہوں گے کہ خدانخواستہ وہ راہ راست کی طرف تو نہیں پلٹ آئے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہوا ہے تو افتخار صاحب کو ہمارا مشورہ ہے کہ ہمارا یہ تردیدی مضمون ان صاحبوں کو ضرور پڑھوا دیں تاکہ یہ بات صاف ہو جائے کہ وہ مضمون ان کا نہیں تھا اور یہ کہ وہ بفضل خدا اپنے خیالات و نظریات پر پوری طرح قائم ہیں۔

ہمیں یاد آتا ہے، ایسا ہی ایک مشورہ ہم نے اپنے ہم وطن دوست اشرف خطیب کو بھی دیا تھا۔ وہ نثری شاعری کے زبردست حامی ہیں اور ہمیشہ غیر منظوم شاعری کرتے

ہیں چنانچہ اکثر ان کے ساتھ دوران گفتگو بھی ایسا ہی لگتا ہے جیسے وہ کوئی نثری نظم سنا رہے ہیں۔

پتہ نہیں کیوں ہمیں نثری شاعری بھی شاعری کے ساتھ وہی "کام" لگتی ہے جو امرد پرست حضرات ضابطۂ فطرت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب ہم نے انھیں ایک مشاعرے میں نثری نظمیں پڑھتے سنا تو کچھ مصرعوں پر ہمارے کان کھڑے ہوئے۔ مشاعرے کے بعد ہم نے انھیں ان کی نظموں پر مکرر داد دی اور کہا — "لیکن معاف کیجیے' آپ کی کچھ نظموں میں کچھ عیب اور نقص بھی ہے۔ براہ کرم اسے دور کرلیجیے۔"

سنتے ہی وہ سٹپٹا گئے۔ غصہ سے کہنے لگے۔ "کیسا عیب، کیسا نقص۔"

ہم نے کہا، "جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں

"کہو" انھوں نے غصے سے تقریباً کانپتے ہوئے کہا

"آپ کے کچھ مصرعے غلطی سے وزن اور بحر میں آگئے ہیں۔ لہٰذا براہ کرم اپنی نظموں پر خود یا کسی اور ماہرِ عروض سے نظر ثانی کرالیا کریں!"

جہاں تک افتخار صاحب کی بات ہے تو انھیں کوئی اصلاحی صلاح دینے کی ہم جرأت نہیں کرسکتے۔ البتہ یہ ضرور کہیں گے کہ ہمارے شہر سہارنپور میں ایک کہاوت بڑی مشہور ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی مرد قانون قدرت کے ساتھ نثری شاعری کرتا ہے تو دھرتی ہلنے لگتی ہے! سہارنپور ویسے ہی دینی مدرسوں کا شہر ہے چنانچہ اس قول کی صداقت کے بارے میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہم اس پر یقین کامل رکھتے ہیں اور اس حد تک رکھتے ہیں کہ کبھی کبھی جب دہلی میں زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوتے ہیں تو ہمیں یہی گمان رہتا ہے کہ ہو نہ ہو افتخار صاحب امریکا میں بیٹھے یا لیٹے ہوئے نثری شاعری کررہے ہوں گے۔ ویسے بھی زمین کے گولے پر امریکا دہلی کے عین عقب میں واقع ہے! چنانچہ وہاں کے جھٹکے یہاں محسوس ہوتے ہی ہیں!

فیاض احمد فیضی
۵ ۱۳/۳۳ اپاتے باپو راؤ مارگ
ممبئی — ۸

کالی داس گپتا رضا

غالب جن کی کمزوری ہے

ہم آج بھی جب کسی محقق اور دانش ور کا تصور کرتے ہیں تو ذہن میں ایک ایسے ادھیڑ عمر اور پریشان حال شخص کی تصویر ابھرتی ہے جس کے چاروں طرف سیکڑوں کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ جن کے مطالعہ کے شوق نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہو جس کے لیے بال بار بار اس کی عینک کے موٹے شیشوں کو ڈھک کر اسے مطالعے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ جس کے ایک ہاتھ میں نازک سا قلم اور دوسرے ہاتھ میں محدب عدسہ تو کبھی بھاری بھر کم پائپ ہو جس سے اٹھتا ہوا دھواں اس کی دانشوری کی غمازی کر رہا ہو اور جو سر کی جنبش سے اپنے بالوں کو پیچھے کی طرف دھکیلے اور بہ یک جنبش قلم اپنے پیش رووں کی تحقیق کو رد کرنے میں مصروف ہو۔ ایسے "تردیدی محققین" سے ہم ہمیشہ مرعوب رہتے ہیں اور ان کی دل سے عزت کرتے ہیں لیکن ہمیں بڑا رشک آتا ہے اور کبھی کبھی ہم حسد بھی کرتے ہیں یونیورسٹی اور کالج کے ان اساتذہ حضرات سے جو کبھی اپنی تو کبھی اپنے شاگردوں کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی خاطر محض دو عدد تحقیقی کتابوں کے مطالعہ کے بعد تیسری تحقیقی کتاب وجود میں لے آتے ہیں۔ ان کے بھی ایک ہاتھ میں قلم ہوتا ہے لیکن دوسرے ہاتھ میں محدب عدسہ یا پائپ کی بجائے قینچی ہوتی ہے جس کا استعمال وہ کسی سرجن کی سی مہارت کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ اپنے پیش رووں کی تحقیق کو رد نہیں کرتے بلکہ اس پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں اور "تصدیقی محقق" کہلاتے ہیں۔ یہ مختلف ناموں سے تحقیقی کارنامے انجام دیتے ہیں اور ہر کارنامے کے بعد ان کی عینک پہلے سے زیادہ سنہری اور جسم اور بینک بیلنس پہلے سے زیادہ فربہ ہو جاتا ہے۔

لیکن آج سے تقریباً دس برس پہلے جب ہم نے پہلی مرتبہ مشہور محقق ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا کو دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ کوئی دانشور جسمانی اور ذہنی طور پر اتنا صحت مند اور پرکشش بھی ہو سکتا ہے۔ وہ مال وزر اور علم کی دولت کی فراوانی کے باوجود اتنا حلیم اور منکسر المزاج بھی ہو سکتا ہے۔ ورنہ ہم نے ایسے نہ جانے کتنے شاعر وادیب دیکھے ہیں جن کی گردن فٹ پاتھ سے فلیٹ اور گم نامی سے شہرت کی منزل تک سفر کے دوران اکڑتی جاتی ہے۔ پاؤں زمین چھوڑ دیتے ہیں، نگاہ تکبر سے بلند ہو جاتی ہے اور دل نوازیٔ سخن منافقت کی مرہونِ منت ہو جاتی ہے۔ گپتا جی سے ہماری ملاقات ایک ایسے تہنیتی جلسے میں ہوئی تھی جو انھیں غالب ایوارڈ ملنے پر منعقد کیا گیا تھا۔ وہیں ہمیں پتہ چلا کہ وہ چار درجن سے زاید کتابوں کے مصنف، مولف اور مرتب ہیں اور اپنی ادبی خدمات کے عوض درجن بھر ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں لیکن ہماری اِس بے خبری کی وجہ ہماری کم علمی سے زیادہ ان کی گوشہ نشینی تھی جو آج بھی انھیں محفلوں سے دور رکھتی ہے اور خود اپنی پبلسٹی اور پی آر شپ کے گُر بھی نہیں سیکھنے دیتی۔

اِس کے بعد یوں ہوا کہ اگلے برس ہی حکومت کی نااہلی اور سیاست دانوں کی غلط فہمی کے سبب ہمیں ریاستی اردو اکادمی کا ممبر اور جوائنٹ سکریٹری مقرر کر دیا گیا۔ اکادمی کی پہلی میٹنگ میں ہم علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری اور کالی داس گپتا رضا جیسے بزرگوں کی موجودگی میں تقریباً خاموش ہی بیٹھے رہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ نہ صرف ہماری تہی دامنی کا راز افشا نہیں ہوا بلکہ ہم گپتا جی کو بھی اپنی سعادت مندی سے متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد گپتا جی کے مکان پر، اکادمی کی میٹنگوں میں اور ٹیلی فون کے ذریعے ان سے طویل ملاقاتیں ہوتی رہی۔ بعد میں فیکس کی آمد پر ان کی طویل گفتگو فیکس سے بھی درآمد ہونے لگی اور ان کی تہہ در تہہ شخصیت کی پرتیں ہم پر کھلنے لگیں۔ ہماری اپنی شخصیت کی پرتیں کھولنے میں گپتا جی البتہ کامیاب نہ ہو سکے اس لیے کہ اس میں پرتوں کا وجود بھی نہ تھا۔

کالی داس گپتا رضا ایک نامور محقق اور اچھے شاعر ہونے کے باوجود ایک اچھے انسان بھی ہیں ورنہ پتہ نہیں کیوں بہت سے اچھے شاعر ذاتی زندگی میں اپنے ہر فعل سے اپنی ہی شاعری کی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے اعمال کا کفارہ شاعری کے ذریعے ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔ یوں تو قدرت نے گپتا جی کو دولت سے بھی نواز رکھا ہے لیکن وہ بھی انھیں بگاڑنے میں ناکام نظر آتی ہے۔ ایک کامیاب

بزنس مین ہونے کے باوجود حیرت انگیز طور پر وہ ایماندار اور لین دین میں کھرے ہیں۔ تجارتی لین دین میں کبھی کسی سے کمیشن نہیں لیتے لیکن اردو اکادمی نے مہاراشٹر کی لائبریریوں کے لیے ان کے اشاعتی ادارے سے کتابیں خریدنی چاہیں تو انھوں نے انتہائی فیاضی کے ساتھ نہ صرف کتابوں پر زیادہ سے زیادہ کمیشن دیا بلکہ اپنی جانب سے زائد کتابیں ان لائبریریوں کو بھیجنے کی تجویز رکھی اور اس پر عمل بھی کیا۔ سچ پوچھیے تو ان سے ملنے کے بعد ہم پر یہ عقدہ کھلا کہ اپنی گاڑھی کمائی کو اردو زبان کی اشاعت پر لٹانے اور اردو ادیبوں شاعروں کی چوری چھپے امداد کرنے کے عمل کو اردو کی خدمت کہا جاتا ہے ورنہ ہم اس سے پہلے یہی سمجھتے رہے تھے کہ اردو کی خدمت کے معنی یہ ہیں کہ اردو کو روزگار کا ذریعہ بنایا جائے۔ اور ریڈیو، ٹیلی ویژن کے پروگراموں، اکادمی کے سیمناروں اور مشاعروں میں شرکت کے ذریعے اور اپنی تصنیفات پر حکومت سے امداد اور انعامات حاصل کرکے زیادہ سے زیادہ روپیہ کمایا جائے۔ اور اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے اردو زبان کی کس مپرسی کا رونا رویا جائے۔

جو لوگ کالی داس گپتا رضا کو جانتے ہیں انھیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ مرزا غالب، رضا صاحب کی کمزوری ہیں لیکن سچ پوچھیے تو ضرورت مند شعرا اور ادبا کی مدد کرنا ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی روز وہ غالب کے متعلق بالکل نہ سوچیں لیکن یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی دن ایسا گزر جائے جب انھوں نے کسی ضرورت مند کی چشم نم کو تر ہونے سے بچایا نہ ہو۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ایک صاحب لکھنؤ سے ممبئی تک کا سفر سال میں ایک سے زائد مرتبہ طے کرکے کبھی اپنی کتاب کی اشاعت کے لیے، کبھی مطبوعہ تصنیف کی نکاسی کے لیے اور کبھی بیٹی کی شادی کے لیے رقم اکٹھا کرنے آتے تھے اور ظاہر ہے رضا صاحب کے در پر ضرور صدا لگاتے تھے جہاں ان کا استقبال معزز مہمانوں کی طرح کیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ موصوف نے گپتا جی کے ہاں سے بامراد لوٹنے کے بعد اپنے کسی شناسا سے ان کے بارے میں کوئی نازیبا بات کہہ دی جس کی بھنک گپتا جی کے کانوں تک بھی کسی طرح پہنچ گئی۔ اس کے چند مہینوں بعد لکھنوی شاعر دوبارہ ممبئی آدھمکے اور چونکہ وہ اپنی غیرت مندی کو لکھنؤ ہی میں طاق پر چھوڑ آئے تھے اس لیے دوبارہ گپتا جی کے ہاں حاضر ہوگئے۔ ہم خوش ہوئے کہ اب ان کی اچھی سرزنش ہوگی لیکن تو بہ کیجیے جناب کیسی سرزنش اور کہاں کی گوشمالی۔ انھیں تو حسب سابق ہر مطلوبہ شے سے سرفراز کیا گیا اور وہ اپنا حق محنت وصول

کر کے ہی لوٹتے۔ اس روز ہماری سمجھ میں آگیا کہ گپتا جی غالب کو صرف گھول کر پی نہیں گئے ہیں بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہیں۔

نہ سنو گر برا کہے کوئی نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو، گر غلط چلے کوئی بخش دو، گر خطا کرے کوئی

الغرض رضا صاحب میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو ایک ادیب و شاعر کے لیے قطعی غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں اور جن کی موجودگی ایک تاجر کو دیوالیہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ ہم نے جب ان سے دریافت کیا کہ اب تک اپنے آپ کو دیوالیہ ہونے سے انھوں نے کیسے بچائے رکھا ہے تو کھل کر ہنسے اور کہنے لگے "نہیں میاں" کئی مرتبہ زبردست نقصان اٹھائے مگر ظاہر نہیں کیا اور محنت کر کے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔" کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد گویا ہوئے ساری عمر ادب اور تجارت کا ایسا امتزاج قائم رکھا کہ تجارت کے منفی اثرات ادبی سرگرمیوں پر کبھی نہیں پڑے لیکن ادب کے مطالعے نے اعلا انسانی اقدار کا جو درس دیا اس کا اطلاق تجارت پر بھی کرنے کی سعی کی اور بہت کم ناکامی حاصل کی۔" ہم نے کچھ کہنا چاہا تو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور گویا ہوئے۔ "دراصل بہت زیادہ دولت ہونا اپنے آپ کو انسانی قدروں سے دور کر دیتا ہے اور زردار دنیا میں اچھے کام نہیں کرپاتے اس لیے میں دولت کے پیچھے کبھی ہاتھ دھو کر نہیں پڑا۔" اتنا کہہ کر انھوں نے سچ بولنے والی بتیسی منہ سے نکال کر پیالی میں رکھ دی اور پھر مسکرانے لگے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب گفتگو ختم اور محفل برخاست ہوئی۔

راستہ بھر ہم یہی سوچتے رہے کہ یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ رضا صاحب کو کمیونسٹوں سے بالکل رغبت نہیں ہے پھر بھی ان کی بات کارل مارکس کے اس قول سے کتنی مطابقت رکھتی ہے کہ "بورژوا سوسائٹی ہم سے انسانی صفات چھین لیتی ہے اور اس کے عوض ہمیں دولت دے دیتی ہے۔"

گو کہ گپتا جی ذہنی طور پر سرمایہ داروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر کارل مارکس آج کے عہد میں پیدا ہوا ہوتا اور اس کی ملاقات گپتا جی سے ہو جاتی تو یقیناً سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کے متعلق اس کی رائے کسی حد تک تبدیل ہو جاتی یا کم از کم اس کی شدت میں ضرور کمی ہو جاتی۔

شرافت اور تجارت رضا صاحب کو ورثے میں ملی ہے اس لیے ان دونوں چیزوں کے لیے انھیں مورد الزام ٹھیرانا مناسب نہیں ہے۔ حیرت البتہ کی جا سکتی ہے کہ جو شخص جالندھر کے نسیا گم نام قصبے مکند پور کے ایک کٹر مذہبی اور ساہوکار گھرانے میں پلا بڑھا ہو ادبی تحقیق کی طرف کس طرح مائل ہوا ہوگا۔ اور جس شخص کا خاندانی پیشہ سودی کاروبار رہا ہو وہ ظالم اور بے رحم ہونے کی بجائے حلیم الطبع اور نرم مزاج کیسے ہو سکتا ہے۔ اُسے سماج کے کمزور اور مظلوم طبقے سے ہمدردی کیوں کر ہو سکتی ہے۔ گپتا جی کے والد آریہ سماجی تھے اور انھوں نے سوامی شردھانند سے تعلیم پائی تھی۔ ایسے کٹر گھرانے کا چشم و چراغ جس نے دس برسوں تک آر ایس ایس کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہو، جس کے تعلقات گرو گولوالکر تک سے خوشگوار رہے ہوں وہ اتنا سیکولر اور وسیع المشرب کیسے ہو گیا کہ اس کے مہمانوں کی اکثریت مسلمان ادیب، شاعر اور صحافیوں (یہاں تک کہ مذہبی رہنما بھی!) پر مشتمل ہوتی ہے۔ سچ پوچھیے تو ایک عرصے تک ہم بھی ان کے متعلق تذبذب کا شکار رہے لیکن دسمبر ۹۲ء میں جب ممبئی کے غریب مسلمانوں اور وردی پوش ہندوؤں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات نے زور پکڑ لیا تھا تو ہمیں سب سے پہلے گپتا جی کا فون ہی موصول ہوا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے "اگر آپ اپنے علاقے میں محفوظ نہ ہوں تو بلا تکلف اپنی فیملی کے ساتھ میرے غریب خانے پر تشریف لا سکتے ہیں۔"

اس کے بعد ۱۴ر جنوری ۱۹۹۳ء کا دن تو ہم کبھی بھول نہیں سکتے جب حکومت کی سرپرستی میں ممبئی کے مسلمانوں کی جان و مال کی ہولی جلائی جا رہی تھی اور ہم اسی فرقہ پرست حکومت کے اعزاز یافتہ ممبر سکریٹری اردو اکادمی بنے بیٹھے تھے۔ ہمارے ساتھ کئی ممبران اکادمی نے طے کیا کہ حکومت کے رویے کے خلاف احتجاجاً اکادمی سے استعفیٰ دے دینا چاہیے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اکادمی کے دو ممبران غیر مسلم ہیں اگر وہ بھی اس احتجاج میں شامل ہو جاتے تو اردو ادیبوں، شاعروں اور سرگرم خدمت گزاروں کے سیکولر کردار کا حکومت کو بھی ثبوت مل جاتا۔ پہلے جس معزز ممبر کو فون کیا گیا ان کے اردو ادیبوں پر بہت احسانات ہیں لیکن اس روز ان کی تجارتی مصلحتیں، اردو کے عشق پر غالب آ گئیں اور وہ صاف انکار کر گئے۔ ہم نے مایوس ہو کر بادل ناخواستہ گپتا جی کا فون ملایا۔ انھوں نے خلاف توقع ہمیں ڈانٹ دیا اور کہنے لگے "آپ کو اس سلسلے میں سب سے

پہلے مجھے فون کرنا چاہیے تھا۔ میں خود کئی روز سے اِس مسئلے پر غور کر رہا تھا اور اب میں دل وجان کے ساتھ آپ حضرات کے ساتھ ہوں۔" اس کے بعد انھوں نے اپنے لیٹر ہیڈ پر فوراً استعفیٰ لکھ کر ایک گھنٹے کے اندر بھیج کر ہمیں شرمندہ کر دیا۔

ہم نے پچھلے دنوں ہمت کر کے گستاخی سے پوچھ ہی لیا۔" آپ کے اس سیکولر کردار کی تشکیل آر ایس ایس کی تربیت اور گروگولوالکر کی صحبت کا نتیجہ تو ہو نہیں سکتی پھر آپ کا یہ مزاج کیسے بنا؟"

یہ سن کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر کہنے لگے۔" میں ۲۳ برس کی عمر میں افریقہ چلا گیا تھا۔ جہاں میں تقریباً ۲۲ برس رہا۔ وہاں کیمبرج کے امتحانات پاس کرنے، بیرسٹری کرنے اور ذاتی کاروبار کرنے کے علاوہ میں نے دوسرے مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا جس نے کشادہ ذہنی پیدا کی اور ادھر ۴۵ برسوں سے میں مذہبی تو ضرور ہوں لیکن کٹر پنتھی نہیں۔ دوسرے مذاہب کی تعلیمات کی دل سے قدر کرتا ہوں اور آریہ سماج اور آر ایس ایس دونوں اصولوں سے اب کوئی یگانگت نہیں۔ دراصل فرقہ پرستی کو وہی اپنا سکتا ہے جس نے اپنے مذہب کا بھی مطالعہ ٹھیک سے نہ کیا ہو۔ جہاں تک اردو ادب کے مطالعہ کا سوال ہے، میں دوسروں کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرے مزاج کی تشکیل میں خصوصاً اردو شاعری کے مطالعے نے اہم کردار نبھایا ہے۔"

ہم نے موقع ملتے ہی کہا" آپ نے اردو کلاسیکی اور جدید شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ آپ داغ اسکول کے آخری معتبر شاعر اور ماہر غالبیات بھی ہیں۔ پھر بھی آپ نہ صرف مے نوشی سے کوسوں دور ہیں بلکہ آپ کی شاعری اور زندگی دونوں ہی میں وارداتِ قلب کی شدت بھی نظر نہیں آتی۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟"

مسکراتے ہوئے کہنے لگے" جناب، مے نوشی تو میں نے بوجہ مجبوری بھی کبھی نہیں کی البتہ تجارتی میٹنگوں میں شراب کے بل ضرور ادا کیے ہوں گے۔ ادھر ۲۰ برسوں سے تو میں مکمل طور پر سبزی خور بھی ہو گیا ہوں۔ مرغ وماہی تو دور اب تو انڈے میں بھی کشش نہیں رہی۔ آپ کی یہ بات صحیح ہے کہ وارداتِ قلب کی شدت سے میں نے پرہیز کیا ہے۔ یوں بھی میں شاعری میں نمائش عشق کے اظہار پر وجدان کو

ترجیح دیتا ہوں۔

مجھ کو وجدان کا ایک لمحہ بہت
یوم یا کچھ نہیں، سال یا کچھ نہیں

جہاں تک عملی زندگی کی بات ہے۔ یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ انھوں نے شاعری، سنگیت، شطرنج، ہاکی، فٹ بال، اقبال، غالب، داغ اور ساوتری (بیگم گپتا) کے علاوہ کسی سے عشق نہیں کیا۔

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ گپتا رضا صاحب جوش ملسیانی کے باقاعدہ شاگرد رہ چکے ہیں اور وہ شاعر اور محقق ہونے کے علاوہ اردو فارسی کے عالم بھی ہیں اور وقت ضرورت اردو فارسی کے علما کی رہ نمائی بھی کرتے رہتے ہیں لیکن یہ بات کم لوگ ہی جانتے ہیں کہ وہ فن عروض کے ماہر بھی ہیں اور تقریباً دو درجن سے زاید شعرا ان کے باقاعدہ شاگرد ہیں۔ ہمارے خیال میں گپتا جی کا ایک احسان اردو ادب پر یہ بھی ہے کہ انھوں نے تنقید کی بجائے تحقیق کو اپنا میدان چنا۔ یوں بھی ایک شریف النفس اور ایمان دار شخص سب کچھ بن سکتا ہے، لیکن ایک کامیاب تنقید نگار نہیں بن سکتا۔ خود گپتا جی کے مطابق "تنقید میں کوئی حتمی بات نہیں ہوتی۔ شمس الرحمٰن فاروقی جسے اچھا کہتے ہیں، گوپی چند نارنگ اسے برا کہتے ہیں جبکہ تحقیق حتمی فیصلہ کر دیتی ہے۔" کالی داس گپتا رضا صاحب نے اردو ادبی تحقیق کو شگفتہ اور سادہ نثر سے متعارف کرانے کا کارنامہ بھی انجام دیا ہے لیکن اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ نثر اتنی شگفتہ نہ ہو جائے کہ وہ مزاحیہ تنقید سے میل کھانے لگے۔ وہ نثر میں زبان و بیان کی فصاحت اور شاعری میں عروض کی باریکیوں کا احترام اور لحاظ کرنے والے آخری لوگوں میں سے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد یہ لوگ ہمارے لیے تبرک ہو جائیں گے۔ ان کا تازہ کارنامہ دیوانِ غالب کی اشاعت ہے جسے انھوں نے تاریخ وار ترتیب دیا ہے۔ اسے وہ اپنی زندگی کا آخری اہم کام قرار دیتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں وہی موت سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسان کی موت نہیں ہوتی۔ جسم مرتا ہے اور روح چولا بدلتی ہے اس لیے وہ اس تبدیلی سے نہیں ڈرتے۔

حیات و موت سے ہوں خوب واقف
بہت اس راہ سے آیا گیا ہوں

ڈاکٹر توقیر احمد خاں

اردو کا کلاسیکی ادب

"کلاسک" کا لفظ اردو زبان وادب میں کوئی غیر معروف نہیں ہے بلکہ بعض مواقع پر بولا جانے والا ایک نہایت جامع اور خوبصورت لفظ ہے۔ ادب و تنقید کے شناور اس لفظ کی معنویت کو بخوبی سمجھتے ہیں اور اس کو باقاعدہ ایک تنقیدی رجحان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس لفظ کے محل استعمال سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ لفظ جدید کا اُلٹا ہو۔ یعنی ہر اس شے کا اطلاق جو پرانی اور اعلا شان والی ہو کلاسک پر کر دیا جاتا ہے۔ اس لفظ کا استعمال تاریخ، تہذیب اور سماجی اعتبار سے بھی کیا جاتا ہے۔ شعر وادب میں اس سے ایک خاص قسم کا ادب جس میں قدامت پائداری اور نفاست پائی جاتی ہو مقصود ہوتا ہے۔ جس طرح "کلاسک" کے تصور کے ساتھ پرانے زمانے کی قیمتی سے قیمتی مضبوط اور منقش چیزیں، ڈرائنگ روم میں سجاوٹ کا بیش قیمت سامان مقصود ہوتا ہے اسی طرح کلاسیکی ادب کے تصور سے ایک عمدہ نمونے کا ادب پارہ ذہن میں ابھرتا ہے۔ دراصل "کلاسیکی ادب" انگریزی اصطلاح "کلاسیکل لٹریچر" کا مورد ہے جو انگریزی لفظ کلاس یا کلاسک سے مشتق ہے۔ اصطلاح ادب میں لغوی اعتبار سے کلاسک کے معنی اول درجہ کے مصنف کے ہیں جس کا اسلوب نگارش صحیح اور شستہ ہو۔

An author of the first rank , A writer Whose style is correct and elegant, لغت میں کلاسک کے کچھ اور معنی بھی ملتے ہیں جیسے long establishd, Excellent standard اس طرح صاف ظاہر ہے کہ اس اصطلاح میں قدامت کا مفہوم پوشیدہ ہے اور اس میں اُس کی عمدگی نمایاں ہے۔ ام ہانی اشرف نے اپنی کتاب "کلاسیکیت و رومانیت" میں کلاسک کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ازمنہ قدیم کے یونانی و لاطینی ادب کو اُس دور میں کلاسیکی موسوم کیا گیا۔ کلاسیکی، لاطینی زبان کے لفظ classicus سے مشتق ہے جو اسم صفت ہے اور جس سے کسی بھی شے بالخصوص ادب پارے کی خوبی یا عمدگی مراد ہوتی ہے۔ لغوی طور پر "کلاسیکی" کا مفہوم طبقہ

اشراف سے منسوب و متعلق ہے۔ طبقۂ اعلا سے منسوب ہونے کی بنا پر کسی بھی شے کی خوبی مسلم ہے اس لیے اشیاء کی عمدگی کے تصور کو ظاہر کرنے کے لیے ان کو کلاسیکی کہا جانے لگا۔"

چنانچہ ظاہر ہوا کہ قدامت پسندی کلاسیکت کا خاص عنصر ہے۔ اس میں ازمنۂ قدیم کی طرف عقیدت مندانہ جذبہ بھی کار فرما ہوتا ہے۔ کلاسکیت کی اسی خصوصیت کی بنا پر ہر اس شے کو جو قدیم ہو کلاسیکی سمجھا جانے لگا ہے اور اس طرح گویا کلاسیکی کے معنی ہوئے اعلیٰ درجہ کا مستند، قدیم، تاریخی اور ممتاز۔ کلاسکیت کے دور کے بعد نوکلاسکیت کا جو دور شروع ہوا اس میں بعض اضافوں کے ساتھ کلاسکیت کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور نوکلاسکیت کلاسکیت کی حمایت تھی جسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ نوکلاسکیت ایک طرح سے کلاسکیت کی تجدید تھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تنقیدی رجحان میں کلاسیکی اصولوں کی بازیافت کی کوشش پائی جاتی ہے۔ ادب کو گرتے ہوئے معیار سے بچانا اس میں بصیرت، شعور، تہذیب نفس اور شائستگی پیدا کرنا اور فن پارے میں یک گونہ نفاست کا شائبہ شامل کرنا اس کا اولین مقصد ہے۔ نوکلاسکیت کے ماہرین نے اسے جس طرح سمجھا اور سمجھایا اور اس میں جن اجزا کا ذکر کیا گیا اور جن عناصر کو لازمی قرار دیا گیا ان کو اس طرح مختصراً بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ "نوکلاسکیت کے فلسفیوں نے استدلال عقل کو بالاتر سمجھا۔ اس طرح گویا کائنات فہمی کے عمل میں تخیل کا خاتمہ ہو گیا۔
۲۔ نوکلاسیکی شاعری میں فارم کی اہمیت مقدم ہے۔ نوکلاسیکی تنقید نے مروجہ ہیئتوں مثلاً رزمیہ، المیہ، مرثیہ، قصیدہ وغیرہ کی ایک مقررہ نشاندہی کر رکھی تھی۔
۳۔ نوکلاسکیت اور طنز نگاری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔
۴۔ نوکلاسیکی ادب ایک لحاظ سے قدیم جاگیردارانہ نظام اور جدید تجارتی طرز زندگی کے مابین مفاہمت کا نتیجہ تھا۔
۵۔ نوکلاسکیت کا عام رجحان ادب و شعر میں لفظی صحت اور صنائع و بدائع کی پابندی کی طرف تھا۔
۶۔ نوکلاسکیت رومانیت کے خلاف تھی۔"

اصطلاحاً کلاسیکی ادب سے وہ ادب پارے مراد لیے جاتے ہیں جو اعلا درجے کے معیاری اور مستند ہوں اور جن کا شمار اس زبان کے ادب عالیہ میں کیا جاتا ہو۔ میر

درد، غالب، داغ اور اقبال وغیرہ اردو زبان کے وہ مستند شعراء ہیں جن کے ہاں فکر و فن کی پختگی کچھ اس طرح سمائی ہوئی ہے کہ ان کے کلام پر انگلی رکھنے کی گنجایش کم ہی ملے گی۔ گوئٹے کا فاوسٹ دنیا کا بہترین شاہکار مانا گیا تو کیا ادب کا اس قسم کا سرمایہ جو نادر ونایاب نمونہ ہو اور زبان وادب کا عمدہ ترین ادب شمار کیا جاتا ہو اس کو اعلا معیاری ادب کا کلاسیکی لٹریچر کہا جائے گا؟ جیسے عربی میں دور جاہلیت کے قصیدے یا فارسی میں فردوسی کا شاہنامہ۔ اردو زبان میں میر امن رجب علی بیگ سرور، غالب، رنگین، نذیر احمد، سر سید حالی، شبلی اور ابوالکلام آزاد کے نثری کارنامے اس زبان کی بے حد شستہ اور خوش نما تحریریں ہیں۔ اس طرح کیا یہ سب اردو کا کلاسیکی سرمایہ ہیں؟ کیونکہ ادب عالیہ زیادہ تر قدیم دور کی پیداوار ہیں اور اس کی وجہ شاید یہ رہی ہوگی کہ اُس دور کے ادیبوں نے زبان کو بنانے سنوارنے کے لیے جو محنت کی اور اعلا اصول مقرر کیے وہ مدت دراز کے بعد اس زبان کا لازمی جز قرار پائے اور انھیں اصولوں اور ضابطوں کی روشنی میں نثر و نظم کا جولا جواب نمونہ سامنے آیا وہ بعد میں نا قابل قبول ہولہ بعد کے اصولوں نے یا تو انھیں ناقص قرار دیا، یا پھر اس نوع کے اصولوں کے نفاذ کی گنجایش نہ رہی۔ اس طرح کلاسک کا تعلق قدیم ادبی شہ پارے سے نہ ہوتے ہوئے بھی عہد قدیم سے وابستہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عہد قدیم کا ہر کارنامہ کلاسیکی ادب ہے اور ہر فن پارہ نادر نمونہ ہے۔ اردو شاعری میں زیب وزینت کے لیے جو لازمی اجزا قرار دیے گئے ان کی رو سے قصیدہ، مسدس، مخمس، رباعی اور مثنوی وغیرہ بے حد جمال آفریں ہیں۔ اس طرح بزرگانِ ادب نے اور جو اصول وضوابط صنائع بدائع قائم کیے اور جو بیان، بدیع اور عروض کا علم وجود میں آیا وہ فصیح وبلیغ اعلا ادبی شاہکاروں کی تخلیق کا باعث بنا اور انھیں جامع اصولوں کی روشنی میں جو ادب پیدا ہوا کیا وہ اعلا معیاری ادب اور کلاسیکی ادب نہ تھا؟ اب اس طرح ایک بات اور صاف ہو جاتی ہے کہ کلاسیکی کا مطلب صرف قدیم ہونا نہیں۔ بعض ادب پارے عہد قدیم کی پیداوار ہوتے ہوئے بھی شاید کلاسیکی ادب میں شمار ہونے سے محروم ہیں۔ مثلاً جعفر زٹلی نے جو نظمیں لکھیں وہ اس زمانے کے اشراف کے رسم ورواج اور اصولوں کے دائرہ سے باہر تھیں اس لیے اس کی کاوشوں کو لائق اعتنا نہیں سمجھا گیا اور اس کو عامیانہ وسوقیانہ کہہ کر نظر انداز کیا گیا ہو۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ وہ ہلکی پھلکی تحریریں جن میں جامعیت اور وزن ووقار نہ ہو اور وہ تحریریں جو محض عوامی اور سطحی ہوں ان کو اعلا معیاری ادب اور مستند ادب میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس

کے برعکس کیا حسرت، فانی اور جگر وغیرہ کی شاعری کلاسیکی اقدار کی حامل ہے جن کے شعور واحساس میں کلاسیکی بنیادوں کا رچاؤ محسوس ہوتا ہے اور فکر وفن کے جو اصول کلاسیکی شاعری کی جڑ بنیاد استوار کرتے ہیں ان کا رنگ و آہنگ ان شاعروں کے یہاں دکھائی دیتا ہے یا جیسے پریم چند کے ناول اور افسانے زبان وبیان کی صحت اور درستگی کے ساتھ ساتھ اعلا خیالات کے حامل بھی ہیں۔ کیا اردو کی افسانوی دنیا میں ان کو کلاسک کے درجہ میں رکھا جائے گا یا جیسے اقبال کی نظم اور نثر حالی اور آزاد کے بعد جدید دور کی ہوتے ہوئے بھی اردو زبان وادب کا نایاب سرمایہ اور اعلا شاہکار ہے اور ان کی شاعری بعض جدید رجحانات کی حامل ہوتے ہوئے بھی فکر وفن کی پختگی کے لحاظ سے کیا اردو کا کلاسیکی سرمایہ ہے۔؟ چونکہ کلاسک کا لفظ کلاس یعنی درجہ سے بنا ہے اس لیے کلاسیکی کا مطلب درجہ بندی ہوا اور وہ ادب جو اپنا نمایاں درجہ اور ممتاز مقام رکھتا ہے اعلا معیار رکھتا ہے کلاسیکی ادب ہے؟۔ اس نوع کے تمام موضوعات بڑے غور وفکر کے متقاضی ہیں اور جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ (باقی آئندہ)۔

کھلے خطوط

یہاں مجھے رضا لجبار صاحب کی مہربانی سے اپریل کا شمارہ دیکھنے کو ملا۔ ڈاکٹر جمیل اختر نے اردو میں حوالہ جاتی کتب کے بارے میں کافی معلوماتی اداریہ سپرد قلم کیا ہے اور ایک اہم ضرورت کی طرف اردو والوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف ادبی مراکز میں جو ادب تخلیق ہو رہے موضوعات کی ترتیب کے ساتھ' اس کا اشاریہ ترتیب دیا جانا ضروری ہے۔ برکت اللہ یونیورسٹی میں ایک ریسرچ اسکالر بھوپال کی اردو مطبوعات پر تحقیقی کام کر رہی ہیں۔

اب مجھے فروری کے کتاب نما میں ڈاکٹر انصار اللہ نظر کے مضمون "بیاض غالب کی بحث" کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ ناقد یا محقق کا فرض ہے کہ اگر وہ کسی چیز کو درست نہیں سمجھتا ہے تو ضرور اس پر قلم اٹھائے۔ اور وہ جو کچھ صحیح سمجھتا ہے اسے ضرور منظر عام پر لائے۔ ڈاکٹر انصار اللہ سے ان کا یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا لیکن اس قسم کی تحریروں میں جارحانہ انداز اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔ استاد محترم ڈاکٹر گیان چند جین صاحب اردو کے ان بزرگ محققوں میں سے ہیں جن کی کاوشوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ بزرگوں کے احترام کا ہماری اردو تہذیب میں ہمیشہ خیال رکھا گیا ہے۔ جین صاحب کی رائے یا تحقیق سے اختلاف کیا جا سکتا تھا' لیکن اس کے لیے اتنا جارحانہ لہجہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے ذاتی طور پر انصار اللہ صاحب کی اس تحریر سے تکلیف پہنچی ہے۔

☆ پروفیسر آفاق احمد (ٹورنٹو۔ کینیڈا)

کتاب نما باقاعدگی سے ملتا رہتا ہے۔ اپریل کے شمارے میں آپ نے مجھ ہیچ میرز کے مراسلے کو مضامین کے ذیل میں نمایاں طریقے سے شائع کیا' مجھے اعزاز دیا۔ مشکور ہوں۔

مجھے پرچہ اپنی دختر و داماد کے پتے پر ملتا ہے۔ اب میں زیادہ تر اپنے لڑکے کے پاس رہتا ہوں جسکا پتا مندرجہ ذیل ہے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن از راہ کرم بے پایاں مجھے لڑکے کے پتے پر پرچہ بھیجنے لگیں۔ اس پتے میں OAK LEAF سڑک کا نام ہے اور چینو ہلس' لاس انجلز کی ایک مضافاتی بستی ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ پتا بدلنے کے لیے آپ کو رجسٹر میں ترمیم کرنی پڑے گی۔ کیا کروں اس تکلیف دہی کے لیے شرمندہ ہوں۔

ڈاکٹر جمیل اختر کا اشاریہ بہت معلومات افزا ہے۔ یوں بھی آپ کی زیر ادارت کتاب نما ہر طرح سے اردو کے چوٹی کے رسالوں میں ہے۔ امید ہے آپ سب حضرات بخیر ہوں گے۔

☆ نیاز کیش گیان چند

ڈاکٹر گیان چند کا نیا پتہ

Dr Gain Chand Jain
3262 Oakleaf [illegible]
Chino Hills, CA 91709 (U S A)

مارچ کے شمارہ میں تحقیق کے معیار افزوں کے لیے کچھ اہم تجاویز پیش کی گئی ہیں تجویز ہشتم میں کہا گیا کہ بغیر پی۔ایچ کے ایم۔ فل۔ اور

پی۔ایچ۔ڈی یافتہ شخص کو ٹیچر کے حیثیت سے معمور کرنے پر گورنمنٹ سے قائضہ کیا جائے تاکہ وہ اگر لیکچرر نہ بن سکے تو کم از کم ٹیچر بنے۔ اس تجویز سے میں متفق نہیں ہوں۔ بی۔ایڈ کی ڈگری ایک فنی ڈگری ہے۔ جس کا تعلق خاص کر بچوں کی تربیت سے واسطہ ہے۔ جس طرح لیکچرر کے لیے ایم۔اے اور اس سے بڑھ کر ڈگری کا حاصل کرنا ضروری ہے اسی طرح ٹیچر بننے کے لیے بی۔ایڈ کا کرنا ضروری ہے۔ بغیر بی۔ایڈ کے ٹیچر بنانے کی تجویز بچوں کی تربیت کے اہمیت کو گھٹاتا ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی بی۔ایڈ کرنے کے بعد بھی ٹیچر نہ بن سکے اس کو لیکچرر بننے کا موقع کیوں نہ دیا جائے۔ برسر روزگار سے زیادہ ڈگری کی اہمیت کو دیکھنا چاہیے۔

☆ کے۔ رامارائو، حیدر آباد

اپریل ۹۸ء کا شمارہ موصول ہوا اس شمارے میں جس قدر جاندار و شاندار مضامین ہیں ان کے انتخاب کے لیے میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ ڈاکٹر جمیل اختر صاحب کا اشاریہ اردو میں حوالہ جاتی کتب بے حد اہم معلوماتی اور ایک اہم دستاویز ہے اس میں ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان پاکستان اور اردو دنیا میں حوالہ جاتی کام پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بے حد اہم ہے چونکہ ہندوستانی کتب خانوں میں حوالہ جاتی کام تو ہو رہے ہے لیکن اس کی اشاعت نہیں ہو پارہی ہے اس وجہ سے اس کا ذکر نہ ہونے کا شکوہ بھی نہیں کرسکتے اس کے ساتھ مظہر امام صاحب کا مضمون "اردو شاعری ۱۹۹۷ء میں" تفصیلی مرکز میری نظر میں" محمد اکرام کا مضمون حیات غالب کی سیل وغیرہ بھی حوالہ جاتی مضامین ہیں یقیناً اہل علم آپ کے اس شمارے کو حوالہ جات کی کتابوں میں ہی شمار کریں گے۔

☆ حکیم حسین خاں شفا، رامپوری

مہمان مدیر ڈاکٹر جمیل اختر نے اردو کے ایک اہم مسئلہ کی طرف محققین، ناقدین اور تحقیقاتی اداروں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پاکستان میں مختلف موضوعات پر حوالہ جاتی کتب، وضاحتی کتابیات اور مضامین کے اشاریوں پر کام زیادہ ہو رہا ہے کیونکہ وہاں اس قسم کے کاموں کے لیے مالی و دیگر وسائل کی کمی نہیں۔ اس لیے اس ضمن میں پاکستان سے مقابلہ کرنا درست نہیں۔ تاہم ہندوستان میں جو کام ہو رہا ہے وہ قابل قدر ہے۔ اردو اکاڈمیوں اور تحقیقاتی اداروں کو ان کاموں کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ ڈاکٹر جمیل اختر نے صفحہ ۹ پر جالب مظاہری مرحوم کی کتاب قاموس الادب کا ذکر اس خیال سے کیا ہے کہ شاید یہ کتاب اسی طرح کا تحقیقی و حوالہ جاتی کام ہے جے انجمن ترقی اردو پاکستان نے قاموس الادب کے نام سے شائع کیا ہے بعض اس کتاب کی حیثیت حوالہ جاتی نہیں ہے بلکہ یہ صرف و نحو کی بنیادی معلومات فراہم کرتی ہے اور ثانوی مدارس اور کالجوں کے طلبہ کی رہنمائی کے لیے تحریر کی گئی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (لاہور) ممتاز ماہر اقبالیات ہیں اور ہر سال وہ اقبال کی شخصیت افکار، نظریات، سوانح اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں

پر شائع ہونے والی مضامین کا اشاریہ اور کتابیات شائع کرتے رہے ہیں۔

"اردو میں سائنسی ادب" کے موضوع پر حمیدالدین شاہد (ایڈیٹر ماہنامہ سب رس کراچی) کا کام قابل تعریف ہے لیکن دہلی سے بھی ایک کتاب "اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب" شائع ہوئی ہے۔ تحقیقی اعتبار سے دونوں کتابیں اعلیٰ درجے کی ہیں مگر حقیقت ہے کہ اردو میں اس نوع کے حوالہ جاتی کاموں کی اشد ضرورت ہے۔ نصرت ظہیر نے "ایک مباحثے کی پیروڈی میں مغرب زدہ نقادوں پر بڑا گہرا طنز کیا ہے آجکل جدید نقادوں میں یورپی اور مغربی نقادوں کی بیساکھیوں کے سہارے اپنا قد اونچا کرنے کا رجحان بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔

☆ڈاکٹر اکبر رحمانی' جلگاؤں

مئی ۹۸ء کا کتاب نما پیش نظر ہے۔ جناب اعجاز علی ارشد کے مہمان اداریے "ادب کی غیر معنویت" میں جو سوالات اٹھائے ہیں وہ بحث طلب ہیں۔

عوامی زندگی پر ادب کے براہ راست اثر انداز نہ ہونے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ادب کا عام آدمی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ادب کے پڑھنے والے محدود ہوتے ہیں اور کسی اہم تبدیلی کے لیے خواہ وہ سماجی' سیاسی یا اقتصادی ہو' عوام کی شمولیت ناگزیر ہے۔ دوسری بات یہ کہ ادب فہمی کے لیے جس صلاحیت کی ضرورت ہے وہ عام آدمی میں مفقود ہے۔ چونکہ ادیب کا لہجہ خطیبانہ نہیں ہوتا۔ لہذا ہر قاری ادب سے اپنے اپنے طور پر اثرات قبول کرتا ہے۔ ان سے یقیناً ان کے افکار میں تبدیلی آتی ہے جو اس عہد کے معاشرتی تبدیلی کا محرک ثابت ہوتی ہے۔

☆ عمر یوسفی چھاتاباد' دھنباد

مئی کے کتاب نما کا پہلا مضمون پڑھنے کے بعد دل پہ کچھ بوجھ سا محسوس کیا۔ اگر چہ میں اردو زبان کا نہ طالب علم رہا اور نہ ہی میں نے کہیں باضابطہ نصابی تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ تو اردو زبان کا جادو ہے جس سے مسحور ہو کر اپنی تعلیمی سفر ختم کرنے کے بعد "ہندی اردو ٹیچر" کے ذریعے اردو زبان کے ابجد کا علم حاصل کیا اور چند دوستو و احباب کی مدد و اشتراک سے اس زبان سے آشنا ہوا۔ بغیر کسی استاد یا ادارہ کی مدد سے اردو سیکھنے کی میری سرگردانی اس امر کی شاہد ہے کہ میں اردو کا رسیا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میرا مطالعہ عمیق نہیں۔ اردو کیا ہندی یا دیگر زبانوں کا بھی مطالعہ قدرے قلیل ہے۔ تاہم یہ میری جرات مندی ہے کہ مہمان مدیر ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے مضمون "ادب کی غیر معنویت" پہ نکتہ چینی کر رہا ہوں۔ وہ ماہر استاد' دانش مند اور ادب نواز ہیں پھر بھی ان کی اس تحریر نے مجھے قلم برداشتہ کچھ قلمبند کرنے کو راغب کیا۔ اگر میری یہ حقیر رائے شائع ہو جائے تو میرے لیے باعث فخر بات ہوگی۔ یہ میرا نقش اول ہی ہے۔

میرا دل ادب کو غیر معنوی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ جو معاشرہ ادب سے رشتہ نہیں رکھتا اسے مہذب کہلانے کا حق نہیں۔ یہ ادب کی خدمت ہے جو خیال و فکر میں گداز پیدا کرتی ہے۔

دل سے دل کو جوڑتی ہے۔ مہمان مدیر Das
Capitalکو ادب کے زمرے میں نہیں رکھتے
لیکن میں اسے ادب کا ہی حصہ مانتا ہوں' جس نے
تمام دنیا کے دماغ کے دریچے کھول دیے۔ ایک ہوا
داخل ہوئی جو جبر آمریت 'استحصال' نابرابری سے
مسلسل نبرد آزما ہے اور دنیا کو اس برائی سے چھٹکارہ
دلانے کے لیے کوشاں ہے۔

ادب کا اہم کام دماغ کو غذا فراہم کرنا
ہے۔ معیاری تفریح بھی ادب کا کام ہے۔ فہیم و
ادراک کے دائرہ کو وسیع کرتا ہے۔ تنگ نظری اور
تعصب دور کرتا ہے۔ کسی بھی زبان کا ادیب تنگ
نظر نہیں ہو سکتا ہے۔ اس سے کوئی بڑا کام سرزد
نہیں ہو سکتا ہے۔ سماج کے لیے یہ کام کیا کم اہم
ہے؟ ادیب فکر و خیال میں پیار کی دولت لٹاتا ہے
اسے آپس میں بانٹتا ہے۔ مہمان مدیر کا خیال ہے کہ
ادب برائی دور کرنے میں معاون نہیں ثابت ہو سکتا
ہے۔ اصل میں ادب کا کام راہ راست دکھانا ہے۔
انسان کے خیال میں لطیف و پاکیزہ تصور پیدا کرنا
ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ سے دکھی ہونا' خوشی
ہے خوش ہوتا ہے۔ انسان انسان کے جذبات کا
احترام کرنا سکھاتا ہے۔ اس کا کام Policeکا نہیں
جو سماج میں جرم ختم کرنے مجرم کو سزا دینے کا
انتظام کرتا رہے۔

☆ اشوک کمار راے۔ پٹنہ

ماہنامہ کتاب نما کے پچھلے شمارہ بابت ماہ
مئی میں خاکسار کا ایک مضمون۔ مرحوم سید شہاب
الدین دسنوی صاحب کے بارے میں شائع ہوا ہے'
مگر باوجود کوشش کے مجھے دہلی میں اطمینان بخش
معلومات نہ مل سکیں۔ اس لیے میں نے پٹنہ کے
ایک اہم ادارہ خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر جناب
حبیب الرحمٰن چغانی صاحب کو لکھ کر مرحوم کے
شخصی اور خاندانی حالات معلوم کرنے کی کوشش
کی۔ خدا کا شکر ہے کہ موصوف نے فوری توجہ کی
اور بعض ایسی معلومات سے سرفراز فرمایا کہ شکر گزار
فرمایا جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوئی ہے۔ مرحوم
کے خاندانی اور شخصی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے
لکھا ان کی تین اولاد ہیں۔ ایک بیٹا سید امتیاز دسنوی
صاحب جو ابوظہبی میں کام کرتے ہیں۔ مرحوم کی
دو لڑکیاں ہیں ایک یہاں ہندوستان میں ہیں اور
دوسری پاکستان میں۔

میرے پچھلے مضمون میں اس کا ذکر آچکا
ہے کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے مرحوم کا
طویل اور گہرا تعلق تھا۔ اس کا اثر مرحوم کے
صاحبزادے کو بھی رہا ہوگا۔ چنانچہ دارالمصنفین کے
ناظم اور ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) کے ایڈیٹر
مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے میرے نجی خط
میں لکھا ہے کہ "۱۰ر اپریل کو ان کے صاحبزادے
جناب امتیاز دسنوی کا یہ تار آیا کہ میرے اباجان
۳۰ر مارچ کو انتقال فرما گئے۔" اس سے راقم
الحروف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ موصوف ابوظہبی
سے ۱۰ر اپریل کو تشریف نہ لا سکے اور ان کے والد
مرحوم کی جملہ کاروائیاں ان کی عدم موجودگی میں
ہوئیں۔

جناب چغانی صاحب نے دسنوی صاحب

کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے ایک ایسی بات لکھی ہے جس کا علم شاید بہت کم لوگوں کو ہو۔ وہ اپنے تخی محلہ میں وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس وقت ڈاکٹر سیمل (Samal) جو ماہر امراض دل ہیں، دل کی رفتار کا گراف تیار کر رہے تھے۔ یعنی Cardiogram پر حرکت قلب دیکھ رہے تھے کہ دس بجے دسنوی صاحب کی روح پرواز کر گئی اور مشین رک گئی۔" وفات بہت سے لوگوں کی ہوتی ہے مگر ایسا بہت کم ہوا ہے کہ ماہر امراض قلب ابھی معاینہ ہی کر رہا ہے کہ روح پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆عبد اللطیف اعظمی، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

"کتاب نما" (مئی ۱۹۹۸ء) میں پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب کا مضمون "اقبالیات یورپ میں" نظر سے گزرا۔ فاروقی صاحب نے بہت اختیار سے کام لیا ہے۔ حقیقت میں یہ موضوع بہت وسیع ہے ڈاکٹر سید اختر درّانی، اس سلسلے میں دو کتابیں ("اقبال یورپ میں" اور "نوادر اقبال یورپ میں") شائع کر چکے ہیں۔ مگر اب بھی اس موضوع کے متعدد پہلو تشنۂ تحقیق ہیں۔ درّانی صاحب مارچ اپریل میں (بطور وزٹنگ پروفیسر، قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی تحقیق جاری ہے اور وہ بعض نئے پہلوؤں پر مضامین لکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میں نے ان کی موعودہ تیسری کتاب کا نام "آثار اقبال یورپ میں" تجویز کیا ہے۔ دیکھیے یہ کتاب کب مکمل ہوتی ہے اور شائع ہوتی ہے درّانی صاحب، برمنگھم یونی ورسٹی کی ملازمت سے وظیفہ یاب ہو چکے ہیں اس لیے توقع ہے اب وہ اقبالیات کو زیادہ دے سکیں گے۔

حال ہی میں دوسری گول کانفرنس سے واپسی پر علامہ اقبال کے دورۂ اطالیہ (۱۹۳۲ء) کے سلسلے میں مزید تفصیل سامنے آئی ہے۔ نومبر ۱۹۹۷ء کی بین الاقوامی کانفرنس گینٹ، بلجیم میں (جس میں راقم کو بھی شریک ہونے کا موقع ملا) اطالوی مندوب پروفیسر وتیو سالیرنو نے اپنے مضمون میں انکشاف کیا کہ انھوں نے وہ وزٹر بک تلاش کر لی ہے، جس میں علامہ اقبال نے مسولینی سے ملاقات کے موقع پر، اپنے دستخطوں کے ساتھ کچھ اندراجات کیے تھے۔ درّانی صاحب نے بھی یہاں ایک لیکچر میں اس کا ذکر کیا۔

اب فاروقی صاحب کے محولہ بالا مضمون کے حوالے سے دو ایک باتوں کی وضاحت انھوں نے لکھا ہے: "ہائیڈل برگ کے جس مکان میں علامہ اقبال ۱۹۰۷ء میں رہے تھے، اس پر بھی جرمنی کی حکومت نے ۱۹۲۶ء میں ایک یادگاری پتھر نصب کرا دیا ہے۔ یہ مکان دریائے نیکر کے کنارے واقع ہے اس جگہ کا نام Iqbal Uffer یعنی ساحل اقبال ہے" (ص ۱۱)۔ اس بیان میں دو باتیں تصحیح طلب ہیں اوّل: یادگاری پتھر کی تحریک و تنصیب اور تقریب کا اہتمام ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی انجمن طلبائے پاکستان اور سفارت خانہ پاکستان نے کیا تھا: نہ کہ حکومت جرمنی نے۔ البتہ حکومت نے اجازت دی تھی اور بلدیہ ہائیڈل برگ نے تعاون کیا

تھا۔ دوم: مکان دریا کے جس کنارے واقع ہے اس سڑک کا نام نوئین ہائمر لنڈ سٹراسے (Neuen-hieimer Landstrasse) ہے۔ ساحل اقبال (Iqbal Uffer) دریا سے نیکر کے اس پار دوسرے کنارے واقع ہے راقم کو گزشتہ نومبر میں ہائیڈل برگ کے ان دونوں مقامات کی زیارت کا موقع ملا۔ میرے دوست ڈاکٹر تحسین فراقی بھی میرے ہمراہ تھے۔(اس موقع کی دو تصاویر' آپ کے ملاحظے کے لیے ارسال ہیں)۔(تصاویر مل گئیں۔ بہت بہت شکریہ)

پروفیسر نثار احمد فاروقی نے یورپ میں منعقدہ کئی بین اقوامی سیمیناروں کا ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ انگلستان' سپین (اور بلجیم) میں ایسے کئی سیمینار منعقد ہو چکے ہیں لیکن جرمنی اور فرانس میں کسی بین اقوامی اقبال مذاکرے کا انعقاد' راقم کے علم میں نہیں ہے۔ البتہ یہ درست ہے یورپ میں اقبالیات پر تحقیق اور اس کے فروغ میں ڈاکٹر سعید اختر درانی کی کاوشوں کا دخل سب سے زیادہ ہے۔ کیمرج میں اقبال چیر کا قیام' پرتگال پلیس کیمبرج پر یادگاری تختی کی تنصیب ایما ویگے ماسٹ کے نام خطوں کی اشاعت متعدد اقبال کانفرنسوں کا اہتمام' کلام اقبال کے آڈیو کیسٹ کی تیاری' اور حال ہی میں ٹرنٹی کالج کے ہال میں گل جی کے بنائے ہوئے اقبال پورٹریٹ کی تنصیب بنیادی طور پر انھی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ وہ اقبال اکادمی انگلستان کے صدر نشین ہیں اور اقبال فاؤنڈیشن یورپ کے نائب صدر۔ یورپ میں اقبالیات کے فروغ میں' مذکورہ فاؤنڈیشن کا ذکر ضروری ہے۔ اس کی صدر معروف مستشرق اور اقبال شناس پروفیسر این مری شمل ہیں۔ نومبر ۱۹۹۷ء میں فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام بلجیم کے شہر گینٹ میں دو روزہ بین اقوامی اقبال کانفرنس منعقد ہوئی۔ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام پروفیسر کیلے ورث انگریزی میں کتابیات اقبال کے ایک منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔ یہاں جناب توحید احمد کا ذکر نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔ وہ یورپ کے کئی ممالک میں سفارت کار رہے ہیں آج کل ملائیشیا میں پاکستانی ہائی کمشنر ہیں۔ اقبال فاؤنڈیشن یورپ کے قیام میں ان کی فعال شخصیت نے مرکزی کردار ادا کیا۔ مختصر یہ کہ یورپ میں اقبالیات تحقیق کا بڑا اہم موضوع ہے' مگر اس کے لیے وسائل' وقت اور صلاحیت کی ضرورت ہے اور تینوں امور کی یکجائی آسان نہیں۔

☆ رفیع الدین ہاشمی' یونیورسٹی اورینٹل کالج' لاہور

تبصرہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

شاعر: عبداللہ کمال
تبصرہ نگار: یوسف ناظم
قیمت: ۲۰۰ روپے
ناشر: اقراء اکادمی' اندھیری ویسٹ' ممبئی

بے آسمان

کتاب کھولتے ہی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ ۱۲ حسین اور جذبۂ عبودیت میں ڈوبے ہوئے اشعار پر مشتمل ایک حمد آپ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

حرف آغاز سے پہلے جو نام ہے وہ تیرا نام ہے
جس سے عرض ہنر حسن انجام ہے وہ ترا نام ہے
ذات میری ترا حسن تمثیل ہے تجھ سے تکمیل ہے
اے خدا جس سے مشتق مرا نام ہے وہ ترا نام ہے

جس خضوع و خشوع سے شاعر نے یہ حمد کہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اشعار شاعر کے بدن میں خون کی گردش بن کر دوڑ رہے ہوں گے۔ حمد پڑھنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ نظریں اٹھا کر ایک مرتبہ آسمان کی طرف دیکھ لیا جائے اور پھر اس مجموعۂ کلام بے آسمان کا مطالعہ کیا جائے۔

عبداللہ کمال کا پہلا مجموعہ کلام "میں" کے عنوان سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا۔ ۲۰ سال کے بعد غزلوں پر مشتمل اس مجموعے کی اشاعت نے غزلیہ شاعر کا درک رکھنے والوں پر یہ واضح کیا کہ غزل یوں کہی جاتی ہے اور یہ کمال صرف ایسے شاعر کو حاصل ہو سکتا ہے جو غزل صرف کہتا نہیں جیتا ہے۔ یہ شعر دیکھیے۔

میں نے جی بھر غزل لکھا کیا ہے
زندگی کا یہ تجربہ کیا ہے

عبداللہ کمال نے برسوں جی جلایا اور خون تھوکا ہے تب کہیں جا کر غزل کہنے کے فن پر

نہیں دسترس حاصل ہوئی ہے بلکہ میں تو یہ تک کہوں گا کہ غزل کہنا شاعر کا کام ہے
لیکن غزل جینا عارف کا کام ہے۔ شاعر فنافی الغزل ضرور ہوا ہے لیکن اس کی "میں" وہی
تا حسب سابق برقرار ہے۔

میر و غالب کے گھر میں رہتی تھی اب مرے گھر میں آگئی ہے غزل

عبداللہ کمال نے اس فقوبہ کی بڑی خدمت کی اپنے حسن کلام کے گہنوں سے لاد دیا اور اپنی
والہانہ محبت میں نہلا دیا۔ شاعر نے اپنے آپ کو ہر پہلو سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ میں اپنی
ڈار سے بچھڑا ہوا پرندہ ہوں۔ مری اڑان ابھی دور کی نواح میں ہے

فشارِ درد میں تنہا کبھی دل کو دھواں رکھنا
مجھے بھی آگئی اے عشق غم کو کہکشاں رکھنا

شاعر نے اپنے لیے دولت غم ہی کو اپنے لیے بہشت جانا اور خود کو نصیحت کی کہ

نہ اشک آنکھوں سے نیکے نہ آہ دل سے اٹھے
بہشت غم کو کبھی بے وقار مت کرنا

عبداللہ کمال شخصی طور پر یعنی ایک حیثیت سے ہمیشہ نبرد آزما قسم کے آدمی رہے ہیں
لیکن شاعر کی حیثیت سے وہ بے حد مختلف آدمی نظر آتے ہیں۔ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ
باندھے تو نہیں لیکن بہرحال مستعد کھڑے رہتے ہیں۔ اب معاشرے ہی میں نہیں ادب
میں ادب کہاں رہا ہے۔ انھیں تراکیب سازی کا گر بھی آتا ہے اور وہ اس گر کو اس
چابکدستی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ اس پر تصنع کا گمان تک نہیں ہوتا۔ تاہم جہاں
بھی ان کا شعر تراکیب کے سایے میں آگیا' شعر کا حسنِ ذاتی' صفاتی ہو گیا شاعر نے
بہرحال اپنی بالا قامتی کو بڑے عزم و استقلال اور حزم و احتیاط کے ساتھ برقرار رکھا ہے۔
ہر شاعر کا ایک ڈھب ہوتا ہے عبداللہ کمال نے سلاست پر ہمیشہ نفاست کو ترجیح دی
ہے۔ وہ ایک اچھے میزبان ہیں۔ دستر خوان لگاتے نہیں چنتے ہیں۔ کھانوں کے مروجہ نسخے
بھی استعمال کرتے ہیں لیکن اپنی طرف سے کسی نہ کسی اضافے کے ساتھ یہ ان کی
انفرادیت کا سمبل ہوتا ہے۔ سمبل شعر کو سمبل بنانا بھی ہنرمندی ہے خاص طور پر
اس وقت جب شاعر تغزل کے موڈ میں ہو۔

مری بھی ضد ہے کہ اب کے میں تیری پلکوں پر
سمیٹ پائے نہ تو اس طرح بکھر جاؤں
نفس نفس تو مرے ساتھ ساتھ رہتی ہے
ترے بغیر جیوں بھی تو جیسے مر جاؤں

اور یہی شاعر جب اپنا لہجہ بدلتا ہے تو کہتا ہے ۔

مجھے قرار نہ دے تو پس غبار نفس
میں شہ سوار ہوں میدان بھی کشادہ دے

مانگنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے عبداللہ کمال نے مانگا بھی تو کیا مانگا۔

ہاتھی والوں نے پھر یورش کی ہے تیرے گھر پہ
ننھے پرندوں کے پنجوں میں پھر سے کنکر دے دے

"بے آسماں" میں (شاید جواز کی خاطر) آسمان کی ردیف میں کہی ہوئی ایک غزل بھی شامل ہے۔ فکر اور سوچ کے دائروں میں گھری ہوئی شاعر کی وفا کی بولتی تصویر دو شعر اس کے بھی پیش ہیں۔

چاند تارے ہیں کہ جیسے زخم ہیں مرے دل کا عکس ہے یا آسماں
میں وہ سیارہ کہ محور پہ نہیں ڈھونڈ مجھ کو آسماں تا آسماں

عبداللہ کمال نے اس دور بے غزل میں اپنے آپ کو زندہ و تازہ اور ایک مکمل غزل گو شاعر کی حیثیت بلند قامت رکھی ہے۔ بڑی بات ہے اب سوچ اور فکر کی شاعری کے دن رہے نہیں ہیں۔ اس حقیقت کا احساس رکھتے ہوئے وضعدار شاعری کے موضوعات پیش کرنا دل گردے کا کام ہے۔ اس مجموعہ کلام کی تہہ داری اور طرح داری دونوں قابل داد ہیں۔ عبداللہ کمال کا نام سنجیدہ شاعری کے لیے ضمانت ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ شاعر بلا خوف تردید کہہ سکتا ہے۔

میں ہنر میں اپنے یگانہ تھا مری فوج یک نفری رہی

•

"صد گلستاں"
۱۰۰(سو) موضوعات پر
مشتمل شعری مجموعہ

مرتب ناشر: منظور عثمانی۔ سابق پرنسپل شفیق میموریل دہلی
مبصر: انجم عثمانی
قیمت: -/200
ملنے کا پتہ: ۶۱۷ ہملٹن روڈ کشمیری گیٹ دہلی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

عام حالات میں نہ تحقیق اور تالیف و ترتیب میں انہماک 'بے تخلیقیت' کا رد عمل معلوم ہوتا ہے۔ مگر کچھ شخصیتیں، کچھ کتابیں تحقیق و ترتیب میں انہماک کے باوجود تخلیقیت کا ثبوت اس طور بہم پہنچاتی ہیں کہ بیچ بیچ تخلیق کا لطف آ جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک

کتاب "صد گلستاں" ہے جو کہ تکنیکی اعتبار سے تو تحقیق و ترتیب کے زمرہ میں آتی ہے لیکن لطف اور تاثر کے اعتبار سے تخلیقی تجربہ سے ہمکنار کرتی ہے۔ ایسا تب ہی ممکن ہے جب مرتب و محقق بلند تخلیقی ذوق کا حامل ہو اور تخلیق کو نہ صرف پرکھنے بلکہ اس سے لطف و حظ حاصل کرنیکی صلاحیت اور ذوق سلیم بھی رکھتا ہو صد گلستاں کے مرتب منظور عثمانی صاحب اپنے بہت سے مضامین کے ذریعہ جو ملک کے مختلف جرائد میں ادبی و سماجی موضوعات پر شائع ہوتے رہتے ہیں؛ اپنی شگفتہ بیانی اور پر لطف افادیت کا ثبوت دے چکے ہیں۔ قارئین ان کی تحریروں سے واقف بھی ہیں اور گرویدہ بھی۔

زیر نظر کتاب "صد گلستاں" سے پہلے مرتب کی اسی زمرہ کی ایک کتاب "چمن در چمن" شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے جس میں تقریباً ۱۵۰۰ اشعار حروف تہجی کے تحت دیئے گئے تھے اور ۷۰۰ اشعار "غالب کی شگفتہ بیانی اور اکبر کے تیر و نشتر کے تحت جمع کیے گئے تھے۔ بقول مرتب اس کتاب کا مقصد بھی وہی ہے مگر الگ انداز سے۔ اس بار اشعار تقریباً ۱۰۰ موضوعات کے تحت دیے گئے ہیں۔ ان کی تعداد چار ہزار ہے۔

اپنے ہر طرح کے اشعار تو سب ہی سنبھال کر رکھتے ہیں بلکہ بہت سے تو دوسرے کے مال کو بھی یوں باندھ کر رکھتے ہیں کہ جیسے سچ مچ یہ مال انہی کا ہو۔ مگر دوسروں کے اشعار کو دوسروں کے لیے نہ صرف جمع کرنا بلکہ انھیں انہی کے ناموں سے قارئین تک پہنچا دینا اس دور انحطاط میں ادبی دیانت داری کی قابل تقلید مثال ہے۔ جتنے اشعار مرتب نے جمع کیے ہیں اس سے کہیں کم میں تو کئی "طبع موزوں" صاحب دیوان بن سکتے تھے مگر اس کو کیا کہیے کہ قرب قیامت کے باوجود ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں جس نے دیانت، شرافت بلکہ موجودہ معاملے میں تو ظرافت تک کا بھرم باقی ہے "ایں سعادت بزور بازو نیست"۔

کچھ لوگ اس کتاب کو شاید بیت بازی کے کام کی چیز سمجھیں مگر ایسا ہے نہیں۔ بیت بازی وغیرہ میں تو یہ بہت کام کی ہے ہی مگر اس طرح کے انتخابات کے اور بہت سے فائدے اور لطف بھی ہیں۔ کیا یہ کم بڑی بات ہے کہ بہت سارے معیاری اور اچھے اشعار آپ کو یکجا مل جائیں اور آپ غزل کے کئی بھرتی کے اشعار سے محفوظ اور حاصل غزل اشعار سے محظوظ ہو سکیں۔ اس کتاب کی بڑی خوبی حسن ترتیب کے علاوہ بلند ذوق بھی ہے نہ صرف موضوع کے تحت اشعار یکجا کر دینے کا کام ہی نہیں بلکہ بہت سے بلند معیار اشعار کی یکجائی کا معاملہ بھی ہے اس لحاظ سے "صد گلستان" ایک منفرد کتاب ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے مفید بھی ہے اور پر لطف بھی ورنہ "گلدستہ" کے چکر میں بھی

"گل" ایسا غائب ہوتا ہے کہ 'قند' کی کڑواہٹ کے سوا کچھ نہیں بچتا یا پھر "قند" ایسا غائب ہوتا ہے کہ رنگ و لوئے گل بھی ہاتھ نہیں لگتا۔

"صد گلستاں" میں مقصد اور لطف اس طرح موزونیت سے یکجا کیے گئے ہیں کہ تحقیق و ترتیب کا حق بھی ادا ہو گیا ہے اور تخلیق کا لطف بھی دوبالا ہو گیا ہے اور یہ بہت بڑی سعادت بھی ہے اور خدمت بھی۔

کتاب کے شروع میں مشہور نقاد، مصنف اور استاد ڈاکٹر سریف احمد کا مبسوط اور پر لطف دیباچہ بھی شامل ہے جو بذاتِ خود بہت سوں کے لیے آگاہی اور خاص طور پر طلبہ کے لیے افادیت کا حامل ہے۔

'حرفِ آغاز' میں خود مرتب نے بہت سی معلومات بہم پہنچانے کے علاوہ تحریر کی اس شگفتگی اور شریفانہ بے تکلفی کو باقی رکھا ہے جس کے لیے وہ مضامین کی دنیا میں پہنچانے جاتے ہیں۔

"صد گلستاں" سچے اردو والے کے ایک درد مند دل، ایک بلند ذوق کے حامل شخص اور ایک مشفق استاد کی ایسی کاوش ہے جسے سراہا جانا چاہیے مبارکباد۔

یقین ہے کہ یہ کتاب مشہور بھی ہو گی اور مقبول بھی۔

"قدم بہ قدم"

شاعر: حاجی انیس دہلوی
مبصر: ڈاکٹر خالد محمود
قیمت: -/60روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' نئی دہلی ۲۵

"قدم بہ قدم" حاجی انیس دہلوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جسے رہبر آفسیٹ پرنٹر نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ حاجی انیس دہلوی بنیادی طور پر ایک صحافی ہیں اور کئی ادبی معاشرتی فلمی اور جاسوسی رسائل کے بانی' سرپرست' نگران یا مدیر اعلیٰ ہونے کی وجہ سے اس میدان میں طویل تجربہ اور شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت کثیر الجہات ہے دہلی کی سیاسی اور سماجی زندگی سے لے کر دنیائے اردو کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں تک حاجی صاحب اپنی ایک مخصوص اور منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ انھیں اپنے وطن اور اپنی زبان اردو دونوں سے بڑی محبت ہے۔ اردو کے تعلق سے انھوں نے بہت سے کام انجام دئے ہیں اور آج بھی جبکہ ان کی عمر ستر برس کی ہے جوانوں سے زیادہ

کام کرتے نظر آتے ہیں ادب دوست خوش مزاج اصول پسند اور وضعدار انسان ہیں۔ اصول پسندی مروت اور وضعداری جیسی متضاد خصوصیات کو حاتی صاحب جس خوش اسلوبی سے نبھاتے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے اردو زبان وادب سے انھیں صرف پیشہ ورانہ تعلق ہی نہیں قلبی لگاؤ بھی ہے اسی قلبی لگاؤ نے انھیں ایک حساس دل شاعر بنادیا ہے۔ زیر نظر شعری مجموعہ ان کے احساسات کا پہلا تعارف ہے۔

حاتی صاحب کی شاعری میں بڑی تازگی اور توانائی ہے۔ ان کا شعری رویہ اردو شاعری کی غزلیہ روایت کا تسلسل ہے ادب فکری سطح پر وہ عہد حاضر کی معروف و متقابلہ جاتی زندگی کے مختلف اور متضاد رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ پامال زمینوں اور ازکار رفتہ موضوعات کے چمن میں نئے پھول کھلانا بڑا مشکل کام ہے مگر حاتی صاحب دوسرے مشکل کاموں کی طرح اسے بھی آسان کر دکھاتے ہیں چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

جو دل باندھے وہ جادو جانتا ہے
مرا محبوب اردو جانتا ہے

قدموں کو مری خاک وطن باندھے ہوئے ہے
بنجارے کو الفت کا چلن باندھے ہوئے ہے

بڑے حساس ہیں قلل الکی لوگ کہتے ہیں
کبھی کھڑکی سے لیکن جھانک کر باہر نہیں دیکھا

چمکنے لگے میری پلکوں پہ موتی
مری آنکھ شاید صدف بن رہی ہے

ذرا اس کو ڈھانے کی تدبیر سوچو
جو دیوار چاروں طرف بن رہی ہے

طاق میں بجھتے چراغوں کا دھواں رکھتا ہے
جسم بوڑھا ہی سہی دل تو جواں رکھتا ہے

انیس رہتا ہوں ہندستان کے دل میں
خوشا نصیب کہ دلی نگی ہے گھر میرا

ایسی اچھی شاعری 'معنی خیز تاثیل' جاذب نظر کتابت، روشن طباعت اور اس کے ساتھ دنیا بھر کی ادبی، ثقافتی سیاسی، سماجی اور فلمی شخصیات کے ساتھ حاتی صاحب کی بے تکلف تصاویر۔

ادبی تہذیبی خبریں

پروفیسر صغریٰ مہدی کو تخلیقی ادب کل ہند اعزاز

بھوپال ، یکم جون (بذریعہ ڈاک) مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے 98-1997ء کے لیے اپنے کل ہند اور صوبائی اعزازات دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ان میں تخلیقی ادب، تحقیق و تنقید، درس و تدریس اور صحافت کے اعزازات شامل ہیں۔ 98-1997 سے طنز و مزاح کا ایک صوبائی اعزاز "جوہر قریشی اعزاز" کے نام سے ہے اس میں 10,000 روپے کا اضافہ کیا گیا ہے۔

تخلیقی ادب کا کل ہند میر تقی میر اعزاز ممتاز ادیب پروفیسر صغری مہدی (دہلی) کو اور صحافت کا کل ہند حکیم سید قمر الحسن اعزاز کلکتہ کے روزنامہ "آزاد ہند" کے مدیر احمد سعید ملیح آبادی (کلکتہ) کو پیش کیا جائے گا۔ دیگر صوبائی اعزاز یافتگان میں، عبدالحمید خاں جوہر باسودوی (گنج باسودہ) کو "سوراج میر خاں سحر اعزاز" شاہد میر (سرونج) کو "سہا مجددی اعزاز" محترمہ فرحت جہاں (بھوپال) کو "نواب صدیق حسن خاں اعزاز" شامل ہیں۔ کل ہند اعزاز میں اکیس ہزار روپے نذرانے کے ساتھ سند توصیف، پلیک اور شال دیا جاتا ہے جبکہ صوبائی اعزازات میں سند توصیف پلیک اور شال کے ساتھ ساتھ پندرہ ہزار روپے نذرانہ کے پیش کیے جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ محترمہ اختر انسا (جبل پور) کو "کیف بھوپالی اعزاز" محمود اردو لسانی فنکار کو "سمبھو دیال سخن اعزاز" سندر لال (بھوپال) کو اور 98-1997 سے قائم ہوا طنز و مزاح کا "جوہر قریشی صوبائی اعزاز" نسیم انصاری (بھوپال) کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان اعزازات دس ہزار روپے کے علاوہ سند توصیف پلیک اور شال دیا جاتا ہے۔ اعزاز دئے جانے کا فیصلہ کرنیوالی جیوری میں عزیز قریشی چیرمین، میر تقی میر اعزاز یافتہ اور ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد (جموں)، میر تقی میر اعزاز یافتہ اور اردو کے ممتاز ڈرامہ نگار ابراہیم یوسف (بھوپال) سراج میر خاں سحر صوبائی اعزاز سے سرفراز اور مشہور شاعر عشرت قادری (بھوپال) پروفیسر اظہر راہی (بھوپال) سراج میر خاں سحر صوبائی اعزاز سے سر فراز، پروفیسر آفاق حسین صدیقی (اجین) فتح اللہ خاں ممبر کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز اور حکیم قمر الحسن اعزاز یافتہ ایڈیٹر ندیم، جناب قمر اشفاق شامل تھے۔

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی تشکیل جدید

بھوپال مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے نئے دستور کے تحت اس کی تشکیل جدید عمل میں آئی ہے۔ وزیر اعلیٰ شری دگ وجے سنگھ اور وزیر محکمہ اقلیتی بہبود شری تونت سنگھ کر اس کے سرپرست اعلیٰ ہوں گے۔ جبکہ سابق رکن پارلیمینٹ ڈاکٹر عزیز قریشی کو چیرمین شری منوہر کبشو کو وائس چیرمین اور پروفیسر آفاق احمد کو ممبر سکریٹری نامزد کیا گیا ہے۔ اکیڈمی کے اراکین میں پروفیسر ڈاکٹر ابو محمد سحر

جناب ابراہیم یوسف، ڈاکٹر بشیر بدر، جناب عشرت قادری، پرنسپل شاہجہاں مخفی، پروفیسر اظہر راہی، جناب دیوی سرن، محترمہ مہرالنساء پرویز (بھوپال) ڈاکٹر عبدالباقی، سردار رتن سنگھ (جبل پور) ڈاکٹر شاہد میر (سرونج) جناب رام پرکاش کپور (درگ) جناب مقبول احمد (ستنا) ڈاکٹر مختار شمیم (اندور) ڈاکٹر فدا المصطفیٰ (ساگر) جناب کیہ سن سارتھی۔ محترمہ اسماء منان (بھوپال) ڈاکٹر الدین (برہان پور) جناب حفاظت علی (کھنڈوا) شامل ہیں۔ اس کمیٹی کی مدت کار تین سال ہو گی۔ اس کمیٹی میں محکمہ ثقافت، محکمہ مالیات، محکمہ اقلیتی بہبود اور محکمہ اسکول تعلیم کے سکریٹری کے علاوہ ساہتیہ پریشد کے سکریٹری اس کے بہ اعتبار عہدہ رکن ہوں گے۔

مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے مجلے

علی گڑھ ۳۱ مئی: ڈاکٹر محمود الرحمٰن مسلم یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے شائع ہونے والے مجلوں کی رسم اجراء کی تقریب کو خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اس ادارہ میں علوم اسلامیہ، دینیات، عربی، فارسی اور اردو کے شعبوں کو مزید فعال اور مستحکم بنایا جائے گا انھوں نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی نور کا ستارہ ہے۔ وائس چانسلر نے بتایا کہ امسال یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں اس ادارہ کے صرف چھ طلبہ ہی آئی اے ایس کے امتحان میں کامیاب ہوئے ہیں رسم اجرا کی تقریب کے مہمان خصوصی مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر مسٹر سید حامد نے کہا کہ جو توقعات ملک و ملت نے اس ادارہ سے وابستہ کر رکھی ہیں وہ پوری ہونی چاہئیں۔ شعبہ اسلامیات کے چیئرمین پروفیسر یاسین مظہر صدیقی نے شرکاء کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ علمی اور تحقیقی کام سے ہی ادارہ کی نیک نامی ہوتی ہے اور اس شعبہ نے علمی اور تحقیقی کام کرنے کا آغاز کیا ہے انھوں نے ڈائرکٹری کو گرانقدر مالی امداد فراہم کیے جانے پر وائس چانسلر کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر عبدالوحید خاں اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر

نئی دہلی یکم جون: اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالوحید خاں نے آج اپنے عہدے کا چارج لے لیا۔ اوپن یونیورسٹی کے ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ ڈاکٹر خان اپنے نئے عہدہ پر فائز ہونے سے پہلے ریگوور (کناڈا) میں مواصلات کے خصوصی ماہر کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی میں کئی سال تک پروفیسر اور مواصلات کے شعبے کے ڈائرکٹر رہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بین الاقوامی ترقیاتی اداروں میں کئی سال تک ذمے دار عہدوں پر خدمات انجام دی ہیں۔

جیلانی بانو کی شخصیت سادگی اور شیرینی کا حسین امتزاج

حیدرآباد ۳۰ مئی۔ مولانا آزاد نیشنل اردو

یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر شمیم جیراجپوری نے کہاکہ جیلانی بانو کی شخصیت سادگی اور شیرینی کا حسین امتزاج ہے پروفیسر جیراجپوری آج یہاں یونیورسٹی کی اعلا سطحی کمیٹی کے ارکان کی موجودگی میں انھیں ادارہ فروغ اردو قطر کی طرف سے ملنے والے عالمی ادبی ایوارڈ کی مبارکباد دے رہے تھے۔ پروفیسر جیراجپوری نے اردو کی شہرہ آفاق ناول نگار جیلانی بانو کو اردو یونیورسٹی کی طرف سے گلدستہ پیش کرتے ہوئے انھیں ایوارڈ ملنے پر مبارکباد پیش کی انھوں نے کہاکہ یہ ایوارڈ کسی ادیب کی خدمات ا عالمی سطح پر اعتراف کی علامت ہے اس لیے اس کی انتخابی کمیٹی میں بر صغیر ہندوپاک کے ممتاز ناقدین صاحب نظر حضرات شامل ہوتے ہیں پروفیسر جیراجپوری نے جیلانی بانو سے اردو یونیورسٹی کے فروغ کے ہر مرحلے میں تعاون دینے کی اپیل کی۔

اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوء جیلانی بانو نے کہاکہ تہذیبیں صرف لکھنے والوں سے نہیں بلکہ پڑھنے والوں سے زندہ رہتی ہیں ہم اردو والوں کی یہ خوش بختی ہے کہ حیدر آباد میں مولانا آزاد یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ہے جو بلاشبہ لاکھوں کی تعداد میں اردو پڑھنے والے پیدا کرے گی جیلانی بانو نے مزید کہاکہ پروفیسر شمیم جیراجپوری انتہائی نیک مقصد کے تحت یہاں آئے ہیں لہذا اس شہر کے ہر اس شخص کو ان کے ساتھ تعاون کا جذبہ رکھنا چاہیے جو اردو دوستی کا دعوا کرتا ہے حیدر آباد میں ان کی آمد علم دوست حضرات کے لیے فال نیک ہے۔

انجمن اساتذہ اردو کرالہ کی دوروزہ کانفرنس

انجمن اساتذہ ارو کرالہ (Kerala . Urdu Teachers Association) کا سالانہ اجتماع بمقام ترور (Tarur) ضلع ملاپرم میں منعقد ہوا دو روزہ کانفرنس کا افتتاح انجمن ترقی ارو کی کرالہ شاخ کے صدر ایم۔پی۔ عبدالصمد صمدانی صاحب نے کیا۔اس موقع پر ایک مجلہ "دلکش" اور اردو نظموں کا ایک کیسٹ ""چندا ماما" بھی شائع کیا۔

افتتاحی تقریر میں جناب صمدانی صاحب نے فرمایا کہ اردو کو اپنے جائز حق دلانے میں انجمن کی تائید کی جائے گی۔ پلس ٹو (+2) میں اردو' عربی' سنسکرت جیسی زبانوں کے ساتھ ناانصافی کی جا رہی ہے موجودہ قانون کے مطابق کرالہ کے کسی بھی ہائر سکنڈری اسکول میں اردو کی پڑھائی کی کوئی گنجائش نہیں۔ ملیالم اور ہندی کے علاوہ ایک سٹر میں محض ایک زبان کو اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ ایسے میں یہ مقام عربی یا سنسکرت کو حاصل ہوگا۔ اس ناانصافی کو دور کرنے کی انھوں نے سرکار سے اپیل کی۔ جناب ای۔ٹی۔ محمد بشیر صاحب نے صدارت کی ۔ انھوں نے کہاکہ ان کے زمانہ حکومت میں (SIE) میں اردو کے لیے ایک افسر خاص کو مقرر کی گیا مختلف کالجوں میں اردو میں بی۔اے' اور ایم اے کورس کو شروع کیا۔ آئندہ بھی اردو کی خدمت کرنے کے لیے تیار رہیں گے۔ انھوں نے اساتذہ کرام کا شکریہ اس لیے ادا کیا کہ

کرالہ میں اساتذہ اردو کے لیے ایک ہی انجمن ہے جو کسی بھی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

ایسوسی ایشن کے سکریٹری احمد کٹی نے خطبہ استقبالیہ ادا کیا۔ ضلعی پنچایت کی صدر محترمہ لاوکیٹ مریمہ ' کے۔ٹی۔اے' مجید ایم۔ایل۔اے۔ ڈپٹی ڈاکٹر کڑپلی شمر رامن ' کے۔یو۔ٹی کے صدر پی۔ محمد الدین کٹی S.L.ERT کے اردو پروفیسر عبدالغفور صاحب کے۔پی۔ دیلا جیپ وغیروں نے تقریر کی خازن شوکت علی نے شکریہ ادا کیا۔

شام کے سات بجے شام غزل منعقد کیا گیا۔ عشرت با' تنزیل بیگم' اشا' صبا وغیرہ نے مختلف غزلیں بڑے ترنم سے پیش کیں۔ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری جناب ابن محمد الدین کٹی بڑے فن کاروں کا تعارف کیا۔

دلی اور یوپی اردو اکادمی کے انعامات انیس دہلوی کی شعری مجموعے "قدم بہ قدم" کے نام

حاجی انیس دہلوی کے شعری مجموعے "قدم بہ قدم" کو اردو دنیا میں بیحد سراہا گیا ہے۔ گذشتہ دنوں اترپردیش اردو اکادمی کی چیرپرسن ڈاکٹر شمیم رضوی نے باوقار انعام کا اعلان کیا اس کے بعد دلی اردو اکادمی نے بھی کتاب کو -/5100 روپے انعام سے سرفراز کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان دنوں حاجی انیس دہلوی کی غزلوں کو نہ صرف پسند کیا جارہا ہے بلکہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔ ہندوپاکستان کے اخبارات و جرائد کے علاوہ سعودیہ ' بحرین ' کناڈا اور دیگر ممالک میں بھی آپ کا کلام شائع کیا جارہا ہے۔ جلد ہی آپ کی دو کتابیں "دست صبا" اور "سرگوشی" بھی منظر عام پر آنے والی ہیں۔ آپ کی دو غزلوں کو بے پور کے غزل سنگر تحسین ریاض نے اپنے نئے البم "یہ کیا ہوتا ہے" میں شامل کیا ہے۔

اسی طرح ایک روحانی فلم ہدایت کار رامن لال ایپانی نے اپنی فلم "جمن مجھ پا تو نے" میں فلمبند کیا ہے۔

پروفیسر جعفر رضا اسکارٹ میں زیر علاج

نئی دلی 30 مئی اردو، ہندی دونوں زبانوں کے نامور ادیب و محقق اور ہندی اور اردو پر یکساں قدرت کے حامل پروفیسر جعفر رضا آج کل اسکارٹ ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر مہدی کی جاری کردہ پریس ریلیز کے مطابق موصوف بہار پبلک سروس کمیشن میں تقرری کے سلسلے میں پٹنے تشریف لے گئے تھے' اچانک انہیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ بہار قانون ساز کونسل کے چیرمین جابر حسین کو جیسے ہی پروفیسر رضا کی علالت کی اطلاع ملی وہ فوراً انہیں بہار ہارٹ ہسپتال لے گئے اور ابتدائی معالجے کے بعد انہیں 25 مئی کو اسکارٹ ہارٹ ہسپتال نئی دلی منتقل کر دیا گیا۔ سردست ماہرین امراض قلب ان کی طبی معائنہ میں مشغول ہیں اور فی الحال ان کی حالت خطرے سے باہر بتائی گئی ہے۔

سید احمد قادری کو "مین آف دی ایئر ۹۸ء" کا امریکی اعزاز

پٹنہ اردو کے معروف افسانہ نگار اور صحافی

جناب سید احمد قادری کو "امریکن بائیو گرافیکل انسٹی ٹیوٹ (امریکہ) نے ادب میں گرانقدر خدمات کے اعتراف میں ۱۹۹۸ء کے لیے "مین آف دی ایئر (Man of the year) کے باوقار اعزاز سے نوازا ہے۔ ۱۹۹۵ء کے لیے جناب قادری کو انگریزی روزنامہ "ٹائمز آف انڈیا" نے "بہاری آف دی ایئر" کا اعزاز دیا تھا۔

جناب سید احمد قادری گذشتہ دو دہائیں سے مسلسل اردو ادب و صحافت کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جس کے صلہ میں انھیں اب تک کے۔کے۔ برلا فائنڈیشن اور حکومت ہند کے محکمہ ثقافت نے فیلوشپ ایوارڈ کے ساتھ ساتھ بہار اردو اکادمی اور اترپردیش اردو اکادمی وغیرہ سے بھی ایوارڈ مل چکا ہے۔ کئی قومی اور بین اقوامی سیمیناروں میں بھی جناب قادری بہار کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ ان کی اب تک نصف درجن کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہوئی ہیں۔

اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ادبی جلسہ

نوئیڈہ (نواح دہلی) ۴ر مئی ۹۸ء۔ اردو فاؤنڈیشن، کے زیر اہتمام مخمور سعیدی کی صدارت میں ایک ادبی جلسہ ہوا جس کا انتظام و نظامت رفعت سروش نے کی۔ ابتدا میں پاکستان سے آئی ہوں ادیبہ زہرا داؤدی کا استقبال کیا گیا۔ مظہر امام نے ان کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ موصوفہ پٹنے کے ایک علمی اور انقلابی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں، زہرا داودی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ترقی پسند خیالات رکھنے کی پاداش میں انھیں کراچی یونیورسٹی سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے اپنی خودنوشت کے کچھ اوراق سنائے۔ شیخ سلیم احمد نے جو حال ہی میں امریکہ سے واپس آئے ہیں اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے امریکہ کی خوش حالی کا ذکر فراخ دلی سے کیا۔ ان کے مقالہ پر خوشگوار بحث ہوئی جس میں رفعت سروش، مخمور سعیدی اور ملک زادہ جاوید نے حصہ لیا۔ بعد ازاں محفل شعر منعقد ہوئی جن میں شعرائے کرام نے حمد، نعت اور سلام پیش کیے ان کے اسمائے گرامی ہیں۔ اسرار کرتپوری، ملک زادہ جاوید، محبوب امین، وصی احمد وصی، پی۔پی سری واستو رند، ابوالفیض سحر، رفعت سروش، مظہر امام، ڈاکٹر سجاد سید، کفیل آزر اور مخمور سعیدی۔

نوئیڈہ کی یہ شام اپنی نوعیت کے اعتبار سے یادگار ادبی شام تھی۔

'ٹھہرے ہوئے لوگ' کی رسم اجراء

نئی دہلی ۲۵ر اپریل۔ انجم عثمانی نے اردو فکشن کو نئی فضا، نیا ماحول دیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں میجیکل ریلزم کا عنصر نمایاں ہے۔ کئی کہانیاں پر اسرار 'مدرسہ لائف کا خوب صورت اشاریہ ہیں" ان خیالات کا اظہار اردو کے ممتاز افسانہ نگار جوگندر پال نے غالب اکیڈی، میں انجم عثمانی کے تیسرے افسانوی مجموعے 'ٹھہرے ہوئے لوگ' کی تقریب رونمائی میں کیا۔

کتاب کا اجراء کرتے ہوئے قومی اقلیتی کمیشن کے صدر پروفیسر طاہر محمود نے فرمایا کہ اردو

افسانوں کی دنیا میں اس دیوبندی ستارے نے جو روشنی بکھیری ہے وہ آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے"

اس موقع پر اردو کے ممتاز ناقد بلراج کومل نے انجم عثمانی کے افسانوی سفر کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ انجم کی ایک مخصوص دنیا ہے جو ان کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے ترتیب پاتی ہے۔ اردو اکادمی دلی کے سکریٹری اور ممتاز شاعر مخمور سعیدی نے کہا کہ انجم عثمانی قاری کو نظر انداز کرکے افسانے نہیں لکھتے۔ ان کی کہانیوں میں قصباتی زندگی کا کینوس پھیلا ہوا ہے۔ معروف افسانہ نگار پیغام آفاقی نے انجم عثمانی کے اس افسانوی مجموعہ کو ایک چیلنج قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس پر عام ادبی معیاروں کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ محمود ہاشمی نے کہا کہ انجم کا افسانہ ہمارے عہد کے آدمی کی نفسیات، ضمیر اور تضادات کا افسانہ ہے۔ اس میں ہمارے زمانے کی حقیقتیں ہیں۔ معروف خاتون افسانہ نگار پروفیسر صغری مہدی نے انجم عثمانی کے افسانوی فن پر گفتگو کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا کہ ان کا کوئی گاڈ فادر نقاد نہیں ہے اس لیے اچھا لکھ رہے ہیں۔ اردو فکشن کے اہم ناقد ڈاکٹر ارتضی کریم نے کہا کہ خانقاہی نظام، عصری حسیت اور استحصال یہ تین مرکزی نکتے ہیں جن پر انجم عثمانی کی کہانی آگے بڑھتی ہے۔

اس تقریب میں تین دل چسپ مزاحیہ خاکے / مضامین بھی پڑھے گئے۔ نصرت ظہیر نے اپنے دل چسپ انداز میں انجام عثمانی کی منکسر المزاجی، کسر نفسی کا بیان کرتے ہوئے کہا کہ انجم عثمانی کے افسانے ہمارے باطن کی خلا کو بھرنے کی تڑپ سے اٹھتے ہیں۔ مظہر عباس نے یہ اعتراف کیا کہ انجم عثمانی اچھے افسانہ نگار ہی نہیں اچھے آدمی بھی ہیں۔ ممتاز مزاح نگار مجتبی حسین نے انجم عثمانی سے اپنے دیرینہ تعلقات کا منظر نامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے شہر اور قصبوں کے بیچ بٹتے ہوئے جذباتی فاصلوں کو بڑی خوب صورتی سے اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ تقریب کے مہمان خصوصی اور سابق ایم پی۔ م۔ افضل نے اس خوب صورت افسانوی مجموعہ پر انجم عثمانی کو مبارکباد دی۔

آخر میں تخلیق کار پبلشرز کے روح رواں انیس امروہوی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب میں ادیبوں اور عمائدین شہر کی بڑی تعداد موجود تھی۔

صلاح الدین پرویز کی کتاب "پرماتما کے نام آتما کے پتر" کا اجراء

نئی دہلی صلاح الدین پرویز کی نظموں میں ایک مقدس دیوانگی کا احساس ملتا ہے ان کی نظمیں پڑھ کر ایک عجب عالم حیرت کا تجربہ ہوا۔ ان خیالات کا اظہار اردو کے ممتاز ناقد پروفیسر شمیم حنفی نے صلاح الدین پرویز کی تازہ ترین کتاب کی تقریب رونمائی میں کیا۔ کتاب کا اجراء جناب یونس دہلوی اور ادریس دہلوی نے مشترکہ طور پر کیا۔

اس کتاب کے حوالے سے اردو کے معروف نقاد محمود ہاشمی نے کہا کہ ان کی سابقہ کتابوں کی طرح اس میں بھی غیر معمولی انفرادیت پائی جاتی ہے۔ صلاح الدین پرویز کا ذہن ہمیشہ اپنے

ماضی اور ہندوستان کے ماضی میں سفر کرتا ہے۔

انگریزی کے ممتاز صحافی یوگندر بالی نے کہا کہ Eroticism کو صلاح الدین نے پہلی بار اردو میں اس طور پر متعارف کرایا ہے۔ انھیں شبدوں کا گیان ہے اور انھوں نے اپنی زبان استعمال کی ہے۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے پروفیسر نصیر احمد خاں نے صلاح الدین پرویز کے آہنگ اور اسلوب کو اردو میں ایک اضافہ قرار دیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر زبیر فاروقی نے کہا کہ اردو شاعری میں مشرق کی تلاش کا جو سلسلہ ہے اس میں صلاح الدین نے گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ معروف افسانہ نگار طارق چھتاری نے کہا کہ پرماتما' آتما اور کہاں خود ان کا کردار الگ ہو رہا ہے اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ دلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر شعیب رضا نے کہا کہ ان کے یہاں وقت ٹھہرا ہوا سا لگتا ہے۔ ان کے الفاظ کردار بن جاتے ہیں۔ کرشن اور رادھا بدلی ہوئی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ صاحب کتاب صلاح ادین پرویز نے اپنی اس کتاب کے حوالے سے کہا کہ یہ میرے بیس سال کے جنون و ریاضت کا ثمرہ ہے۔ اس کے ہزاروں شبدوں کو میں نے مٹی اور ماں سے سیکھا ہے۔

رونمائی کی یہ تقریب عام ادبی تقریبات سے بالکل مختلف نوعیت کی تھی۔ اس کی صدارت شمیم حنفی نے کی اور نظامت کے فرائض منظور ہاشمی نے انجام دیے۔

ابو سعید نور الدین کی نئی اور اہم کتاب

تاریخ ادبیات اردو

شائع ہو گئی۔ یہ کتاب پاکستان اردو اکیڈمی لاہور نے دو جلدوں میں شائع کی ہے۔ صفحات ایک ہزار سے زیادہ ہیں۔

اردو کے ساتھ اردو زبان اور تعلیم بھی مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے دستور میں شامل

بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی جنرل باڈی کی میٹنگ میں بعض اہم دستوری

تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔ ان میں سب سے اہم تبدیلی اکادمی کے دائرہ عمل میں اردو زبان اور اردو تعلیم کی شمولیت ہے۔ اکادمی کا قیام آج سے ۲۲ سال قبل عمل میں آیا تھا اور صرف اردو ادب کو فروغ دینا اسکے اغراض و مقاصد میں شامل تھا۔ موجودہ تبدیلی کے تحت اب ادب کیساتھ اردو زبان اور تعلیم کے فروغ کے لیے اردو اکادمی سرگرم عمل ہوگی۔

پچھلے دنوں اردو اکادمی کے نائب صدر تونت سنگھ کیر وزیر اکادمی اور لوکل سیلف کی صدارت میں منعقد ہونے والی اس میٹنگ میں ڈاکٹر ابو محمد سحر' جناب ابراہیم یوسف' ڈاکٹر عبدالباقی' پروفیسر اظہر راہی' جناب دیوی سرن' شری اگنے سکریٹری ساہتیہ پرشید' شری جیت رائے زادہ سکریٹری محکمہ ثقافت' پرنسپل شاہجہاں غنی' پروفیسر آفاق احمد سکریٹری اردو اکادمی شریک تھے۔

دستور میں ایک اور اہم تبدیلی یہ بھی کی گئی کہ وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش اگر عوامی زمرہ سے کسی کو چیئرمین اور نائب چیئرمین نامزد کرتے ہیں تو وہ خود سرپرست اعلیٰ اور محکمہ اقلیتی بہبود کے وزیر سرپرست ہوں گے۔

اردو اکادمی کے مقاصد میں اردو زبان اور تعلیم کی شمولیت سے اردو والوں کا ایک دیرینہ مطالبہ پورا ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ اکادمی کے اراکین کی تعداد میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ تعداد اب دس سے بڑھ کر بیس ہو گئی ہے۔

داستانوں کو قصہ پارینہ سمجھ کر نظر انداز کرنا ہماری بے بصری کی دلیل ہے۔ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی

26/ فروری 1998ء: شعبۂ اردو۔ دہلی یونیورسٹی میں نظام اردو خطبات کے تحت "داستان' زبانی بیانیہ بیان کنندہ اور سامعین کے موضوع پر اردو کے نامور نقاد اور شاعر پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنا وقیع خطبہ پیش کیا۔

نظام اردو خطبات کا افتتاح کرتے ہوئے دہلی یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر آباد احمد نے نظام خطبات کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی اور شعبۂ اردو کی کارکردگی اور فعالیت کو سراہا اور پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا کہ فاروقی صاحب نے جس طرح اردو ادب کو عالمی معیار عطا کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے اس سے نہ صرف فاروقی صاحب کا بلکہ اردو زبان و ادب کا نام روشن تر ہوا۔

صدر شعبۂ اردو پروفیسر امیر عارفی نے اپنے تعارفی کلمات میں فرمایا کہ فاروقی صاحب نے میر و غالب کی شاعری کے نئے جہات و ابعاد کو انھوں نے روشن کیا ہے اور اکی تفہیم و تعبیر میں جس قدر بصیرت افروزی کا ثبوت فراہم کیا ہے وہ قابل قدر بھی ہے اور زندہ رہنے والا بھی۔ فاروقی صاحب عہد ساز شخصیتوں میں سے ہیں اور انھوں نے میر و غالب کے بعد داستانوں کی عصری معنویت اور افادیت کو منظر عام پر لانے کا عزم ارادہ کیا ہے اور

آج کا خطبہ اسی وقیع کام کا ایک حصہ ہے۔

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ داستان سے بے اعتنائی دراصل ہماری اپنی ہی بے بصیرتی کا غماز ہے ورنہ یہ داستانیں وقیع بھی ہیں اور اہم تہذیبی سرمایہ بھی۔ علم و دانش کے اعتبار سے بھی یہ گراں مایہ ہیں اور اس میں تفریح و تفنن کے وافر سامان موجود ہیں۔ اور ہر طبقے اور ہر عمر کے لوگوں کو ذہنی انبساط بخشتے ہیں۔ اسے عصری علمی و ادبی معیار پر جانچنے پرکھنے اور افہام و تفہیم کی ضرورت ہے۔ اسے محض ماضی کی داستان سمجھنا بے بصری کی دلیل ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے وقیع اور گراں قدر خطبہ کے بعد شعبۂ اردو کی اہم کتاب "غالب' شخصیت اور شاعر" جو پروفیسر رشید احمد صدیقی کا نظام خطبہ ہے' کے نئے ایڈیشن کو جسے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' نئی دہلی نے شائع کیا ہے کی رسم اجراء پروفیسر آباد احمد نے ادا کی۔ بعد ازاں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ اردو کے مشہور ناول نگار اور افسانہ نگار الیاس احمد گدی جنھیں مرحوم کہتے ہوئے آنکھیں نم ہو جاتی ہیں کے نئے اور دلچسپ سفر نامہ' بنگلہ دیش "لکشمن ریکھا کے پار" کی رسم اجراء پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے کی۔

شعبہ' اردو' دہلی یونیورسٹی جو ملک و بیرون ملک کے اہم شعبۂ اردو میں سے ہے اور اس نے تعمیری کام کی ابتدا ہر میدان میں سب سے پہلے کی ہے۔ نظام خطبات سے قبل دہلی یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر آباد احمد اور اردو ادب کے نامور نقاد اور شاعر پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے شعبۂ اردو میں اردو کمپیوٹر کا افتتاح کیا اور اسے ایک مستحسن عمل قرار دیا۔

شعبۂ اردو میں نظام اردو خطبات کے بعد پروفیسر امیر عارفی نے اعلان کیا کہ شعبۂ اردو' دہلی یونیورسٹی کے بانی پروفیسر خواجہ احمد فاروقی مرحوم کی دختر جناب ڈاکٹر فرحت فاطمہ جو شعبۂ اردو میں سینئر ریڈر ہیں اور اور ڈاکٹر نزہت تسنیم کی جانب سے ایم۔ فل اردو سال اوّل میں فرسٹ ڈویژن سے پاس ہونے والے طلبہ کو خواجہ احمد فاروقی یادگاری اسکالر شپ دیا جائے گا۔

خطبہ کے اختتام پر پروفیسر عتیق اللہ تابش نے شکریے کے کلمات ادا کیے اور فرمایا کہ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی آمد نہ صرف شعبہ اردو کے لیے بلکہ دہلی یونیورسٹی کے لیے باعث عزت و افتخار ہے۔ انھوں نے تمام شرکائے مجلس کا شکریہ ادا کیا۔

یہ خطبہ دہلی یونیورسٹی کے بڑے تاریخی ٹیگور ہال میں پیش کیا گیا جس میں شعبۂ اردو کے اساتذہ پروفیسر صادق' ڈاکٹر فرحت فاطمہ' ڈاکٹر شریف احمد' ڈاکٹر ابن کنول' ڈاکٹر ارتضیٰ کریم' ڈاکٹر علی جاوید' ڈاکٹر نجمہ رحمانہ خان' ڈاکٹر توقیر احمد خاں' ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین' ڈاکٹر رضی الرحمٰن کے علاوہ کالجز کے ساتذہ' دیگر شعبوں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جے۔ این۔ یو کے اساتذہ' شہر دہلی کی معتدد علمی و ادبی شخصیتوں' ریسرچ اسکالرز اور طلباء و طالبات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

ڈاکٹر محمد رضی الرحمٰن
سکریٹری سمینار کمیٹی، شعبۂ اردو، دلی یونیورسٹی، دلی

مظہر الحق یونیورسٹی کا قیام بہار کی ثقافتی تاریخ میں ایک خوشگوار باب کا اضافہ ہے

پروفیسر جابر حسین

۱۰/اپریل ۱۹۹۸ کا دن علمی و تعلیمی حلقوں کے لیے انتہائی مبارک و مسعود ثابت ہوا کہ اس دن پٹنے میں مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ گورنر بہار، عزت مآب ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے اس کا افتتاح کیا اور محترمہ رابڑی دیوی، وزیر اعلیٰ بہار، نے تقریب افتتاح میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ معزز لالو پرساد سابق وزیر اعلیٰ بہار اور ممبر پارلیامنٹ بھی اعزازی طور پر جلسے میں شریک ہوئے۔ انھوں نے یونیورسٹی کے قیام پر مسرت کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں پروفیسر جابر حسین، چیرمین بہار قانون ساز کاؤنسل کی خدمات و کوششوں کا خصوصی طور پر ذکر کیا۔ پروفیسر مختار الدین احمد یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر مقرر کیے گئے۔

اپنے اعلان سے تقریباً ڈیڑھ دہائیوں کے بعد، بے باک مجاہد آزادی اور مہاتما گاندھی کے قریبی معاون جناب مظہر الحق کی یاد میں اس یونیورسٹی کے قیام کو پروفیسر جابر حسین نے جناب مظہر الحق کے تئیں پُرخلوص عوامی خراج عقیدت قرار دیتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا ہے۔

غالب کی دوسری صدی تقریبات کا بھوپال میں افتتاح غالب شناس رالف رسل کی تقریر

"بھوپال: غالب ایک بہت اچھے انسان تھے اور ان کے دل میں تمام مذہب کے تئیں احترام کا جذبہ تھا" ان خیالات کا اظہار اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور غالب شناس رالف رسل نے مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقد، غالب کی دوسری صدی تقریبات کے افتتاحی جلسے میں کیا۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی مدھیہ پردیش کے گورنر جناب محمد شفیع قریشی تھے۔ پروفیسر رالف رسل نے اس موقع پر مزید خیالات ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ غالب کی شخصیت میں کہیں بھی بناوٹ یا دکھاوا نہیں تھا۔ غالب کی رائے میں مصیبتیں جھیلنا ایک اچھے انسان کی قسمت میں شامل رہتا ہے۔ اس جلسے کی صدارت جناب عزیز قریشی، چیرمین، اردو اکادمی کررہے تھے۔ اس موقع پر گورنر جناب محمد شفیع قریشی نے کہا کہ اگرچہ مرزا غالب کی پیدائش آگرہ میں ہوئی تھی لیکن ان کا دائرہ عمل خاص طور سے دلی رہا اور وہ دلی جو زوال آمادہ تھی۔ گورنر صاحب نے کہا کہ متعدد پریشانیوں کے باوجود غالب نے اردو اور فارسی کی بیش قیمت خدمات انجام دی اور یہی وجہ ہے کہ وہ آج دنیا میں یاد کیے جاتے ہیں۔ جناب قریشی نے کہا کہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے غالب کو یاد کرنے کے لیے ایک تعمیری پہل کی ہے۔

اس و قفے پر مختلف لوگوں نے رالف رسل سے غالب کے بارے میں سوال کیے جن کا انھوں نے بڑی تفصیل سے جواب دیا۔ ایک انگریز نے اردو میں اتنی اچھی تقریر کی کہ کوئی سننے والا یہ محسوس نہیں کر سکتا تھا کہ ان کی مادری زبان اردو نہیں ہے پروفیسر رسل عام اردو میں بولتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ غالب کا پورا عہد ان کی زبان پر ہے۔

اردو اکادمی کے سکریٹری' پروفیسر آفاق احمد نے بتایا کہ رسل 1942ء میں ہندوستان آئے اور انھوں نے اردو زبان کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے 55 سال تک اردو کے تمام ادب کو گہرائی سے پڑھا اور وہ لندن میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں لیکچرار ہو گئے اور یہیں پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے اردو زبان کے شاعر غالب کو بہت پسند کیا اور اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں غالب کے کلام کا ترجمہ کرکے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ رسل صاحب نے غالب پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔

سابق ممبر پارلیمینٹ کیلاش سارنگ نے پروگرام کے آخر میں شکریہ ادا کیا۔

مرکز ادب و مکتبہ شاداب کا ۲۶ واں سالانہ مشاعرہ

اپنی سابقہ صحت مند روایات کے عین مطابق امسال بھی مرکز ادب اور مکتبہ شاداب حیدر آباد کا ۲۶ واں سالانہ مشاعرہ انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ حیدر آباد کے شاندار ثقافتی ہال "اردو گھر" میں ۲۹ر مارچ ۹۸ء شب ۹ بجے انعقاد پذیر ہوا۔ صدارت معروف شاعر' ادیب اور نقاد ڈاکٹر محبوب راہی نے فرمائی۔ جبکہ سید سعید بھائی پروپرائٹر الفلاح کمپنی اور محترمہ عائشہ بیگم رباب سابق ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ تعلیمات مہاراشٹر نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت فرمائی۔ صدر مشاعرہ ڈاکٹر محبوب راہی کی گل پوشی بھی مدیر شاداب نے کی۔ بعد ازاں مہمان خصوصی ادب نواز جناب سید سعید بھائی کی خدمت میں صدر مشاعرہ ڈاکٹر محبوب راہی کے ہاتھوں شال اور ہار پیش کر کے ان کی ادب نوازی کا اعتراف کیا گیا۔ مشاعرہ میں صدر مشاعرہ کے علاوہ جناب گوہر کریم گوہری جناب حلیم بابر' جناب علیم پرواز' جناب حفیظ انجم' جناب شاخ انور' جناب روشن علی کرنل اور جناب حاجی وجودی نے بطور مہمان شعراء کے کلام سنایا اور داد پائی۔ میزبان شعراء میں حیدر آباد کے نمائندہ شعراء قمر صابری عزیز بھارتی' صادق نوید محترمہ عائشہ بیگم رہا' روف خیر' محبوب علی خان اخگر' مدیر انصاری' داود نصیب' عزیز ناگپوری' ڈاکٹر سید حسن' طاہر گلشن آبادی' مسرور عابدی' فاروق شکیل' ابوالفاروق شعور' روف رحیم' امان علی ثاقب امراللہ خان زاکر' زعیم زومرہ' سرور ہاشمی' تجمل اظہر' خواجہ فریدالدین صادق' ابراہیم خان نیاز' محمد بن محمد قرم رضا' نورالدین میر' اکبر یوسفی اور قطر سے آئے ہوء شاعر یوسف کمال نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ ناظم مشاعرہ مدیر انصاری نے بحسن و خوبی کارروائی چلائی۔

شکیل اعظمی کو گجرات اردو اکادمی کا پہلا انعام

گاندھی نگر، ۵ / مارچ ۹۸ء: گجرات اردو ساہتیہ اکادمی (حکومت گجرات) کے چیرمین پروفیسر وارث علوی نے ایک پریس کانفرنس میں اخباری نمائندوں کو بتایا کہ ۱۹۹۶ء میں چھپنے والی کتابوں میں شکیل اعظمی (سورت) کا مجموعہ کلام "دھوپ دریا" سب سے اہم ہے اور اسے اس سال کا پہلا انعام پانچ ہزار روپے دیا جائے گا۔

اس سال کا دوسرا انعام تین ہزار روپے سید وحید اشرف (بڑودہ) کی کتاب "تجلیات" کو اور تیسرا انعام دو ہزار روپے جوہر رانا (جمبوسر، بھروچ) کے شعری مجموعے "کھلے قفس کی گھٹن" کو دیا جائے گا۔

ایم۔ کے۔ حکیم

وائس چیرمین، گجرات اردو اکادمی

انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام اردو ڈپلوما کورس

نئی دہلی۔ ۲ / جون۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اردو جرنلزم میں ڈپلوما کورس شروع کر رہی ہے اس سلسلے میں انجمن نے مسٹر موہن چراغی کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی ہے۔ کمیٹی کے دوسرے اراکین جی ڈی چندن، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر اسلم پرویز، شہباز حسین اور ڈاکٹر خلیق انجم ہیں آج اس کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں مختلف ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ ڈپلوما کورس کے لیے بہت جلد داخلے شروع ہو جائیں گے۔

رام کرشنا جے دیال ہارمونی ایوارڈز کی تقسیم

ایوارڈ پانے والے صحافیوں میں شاہد علی خاں بھی شامل

نئی دہلی، 13 / مئی (نمائندہ عوام) فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے فروغ کے مقصد سے قائم کردہ ایک رضاکار تنظیم "آرگنائزیشن آف انڈر اسٹینڈنگ اینڈ فریٹرنٹی" کی جانب سے پہلی سال 1996 کے لیے "رام کرشنا جے دیال ہارمونی ایوارڈز" کی تقسیم عمل میں آئی۔ کل شام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی کی ایک پروقار تقریب میں قومی کمیشن برائے انسانی حقوق کے چیرمین وینکٹ چلیا نے یہ ایوارڈ تقسیم کیے۔ ایوارڈ یافتگان میں اردوے پرکاش (ہندی)، ڈیکر کوپل (انگریزی) شاہد علی خاں (اردو) کے علاوہ ملیالم، تمل، مراٹھی اور دوگری زبانوں سے وابستہ صحافی شامل ہیں۔

جناب شاہد علی خاں اردو دنیا کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ ادبی ماہنامہ "کتاب نما" ان کی ادارت میں نہایت کامیابی سے نکلتا ہے جو اردو کے ادبی حلقوں میں اپنا ایک مخصوص مقام رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کا رسالہ "پیام تعلیم" بھی ان کی ادارت میں نکلتا ہے، مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر کی حیثیت سے اردو کے تئیں ان کی گراں قدر خدمات ہیں۔ ان کی خدمات کا اعتراف مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ کمیٹی (1993)، ہریانہ اردو اکادمی قومی ایوارڈ (1992-93) مدھیہ پردیش اردو اکادمی قومی ایوارڈ برائے صحافت (1994-95) وغیرہ کے ذریعے پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔

رام کرشن جے دیال ہارمونی ایوارڈز کے لیے ہر سال تین خاص زبانوں یعنی ہندی، انگریزی

اور اردو کے صحافیوں کے علاوہ باری باری سے چار علاقائی زبانوں کے صحافیوں کو بھی منتخب کیا جاتا ہے۔ ہر ایوارڈ نقد دس ہزار روپے اور چاندی کی زیبائشی تختی پر مشتمل ہوتا ہے۔ کسی معروف رضا کار تنظیم اور الیکٹرانک میڈیا کے لیے بھی ایک ایک ایوارڈ مخصوص ہے۔ رضا کار تنظیم کو پندرہ ہزار روپے نقد دیے جاتے ہیں۔ اس مرتبہ یہ انعام ممتاز علی (رضاکار تنظیم ست سنگ فاؤنڈیشن) کو دیا گیا۔ جب کہ الیکٹرانک میڈیا میں راج دیپ سردیسائی کو ایوارڈ دیا گیا۔ یہ ایوارڈ ان صحافیوں کو دیے جاتے ہیں جو علاقہ پرستی' فرقہ واریت ' ذات پات اور دہشت گردی جیسے علاحدگی پسند رجحانات کے خلاف نبرد آزما رہتے ہیں اور ان رجحانات سے ملک کی سالمیت وقومی یکجہتی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

ہم غم میں برابر کے شریک ہیں

عطا کاکوی نہیں رہے

۱۸/مارچ' ۱۹۹۸ کو ممتاز شاعر' ادیب ونقاد معزز عطاء الرحمن عطا کاکوی کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۹۴ سال تھی۔

مرحوم عطا کاکوی کی پیدائش ۱۷/ ستمبر ۱۹۰۴ کو ہوئی تھی۔ ۱۹۲۴ میں انھوں نے میٹرک' ۱۹۲۸ میں پٹنے کالج سے بی اے اور ۱۹۳۲ میں پٹنے یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا۔ ۱۹۳۲ میں خانقاہ ہائی اسکول رام پور میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے انھوں نے ملازمت شروع کی۔ بعد میں ۱۹۳۶ میں وہ بی این کالج پٹنے میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۸ میں شعبہ فارسی پٹنے یونیورسٹی کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۳ میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

اردو ادب اور شاعری کے لیے مرحوم عطا کاکوی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے اپنی شعری تخلیقات کے ذریعہ نہ صرف کلاسیکی روایات کے فروغ میں اہم حصہ لیا' بلکہ انھیں ایک پروقار مزّج بھی عطا کیا۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور غمزدہ خاندان کو صبر و تحمل کی توفیق سے نوازے۔

بدایوں کے معروف ماہر تعلیم قمر فرشوری کا انتقال

بدایوں ۳۱/ مئی۔ ضلع کے ممتاز علمی گھرانے کے ایک نامور فرد اور مشہور ماہر تعلیم محمد قمر فرشوری کا تقریباً ۶۷ سال کی عمر میں گذشتہ جمعرات کے دن دہلی میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم تقریباً ۲۰ سال فتحپوری اسکول دہلی کے پرنسپل رہے ۱۹۹۱ میں وہ جامع مسجد دہلی اسکول کے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ بحیثیت استاد انکی زندگی کا آغاز دیوبند سے ہوا تھا انھوں نے ابتدائی تعلیم بدایوں سے حاصل کی پھر آگرہ یونیورسٹی کے تحت بریلی کالج سے بی اے اور علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے بی ایڈ کیا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہے جن میں بہت سے ممتاز عہدوں پر فائز ہیں ان کے برادر زادے اکرم فرشوری بھی تعلیم کے میدان میں ممتاز ہیں جن کو دہلی حکومت سے بہترین ٹیچر کا ایوارڈ مل چکا ہے پسماندگان میں بیوی پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں جن میں سے تین

لڑکے اور ایک لڑکی امریکا میں ہیں۔

پروفیسر احمد رضا کا انتقال

رام پور۔ ۳۰ اپریل: رام پور کے ہزاروں لوگوں کو تعلیم دے کر اعلا عہدوں اور اعلا مرتبہ تک پہنچانے میں اہم رول ادا کرنے والے پروفیسر احمد رضا خاں کا ۸۷ سال کی عمر میں پھندہ لگنے سے انتقال ہو گیا۔ مرحوم انتہائی نیک انسان تھے اور ان کی نظر میں ہر طالب علم برابر تھا۔ پروفیسر احمد رضا خاں نے ۱۹۳۳ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا اور سائنس میں اعلا ڈگری حاصل کر کے سرکاری ملازمت حاصل کر لی تھی۔

مرحوم کی نماز جنازہ اندرا جونیئر ہائی اسکول میں ہوئی اور برابر میں انھیں آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کے جنازہ میں ہر مکتبہ فکر کے ہزاروں افراد نے شرکت کی۔

"تعزیتی نشست"

اردو کے مشہور اور معروف شاعر اور ادیب اور گاندھی وادی جناب کرشن لال ادیب لکھنوی کا میور وہار' دلّی میں ۴ مئی ۱۹۹۸ء کو ۹۶ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا' جس کے سلسلہ میں ۲۴ مئی ۱۹۹۸ء کو غازی آباد (یو۔پی) میں واقع جواہر لال نہرو راشٹریہ یوا کیندر میں صبح ساڑھے آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک تعزیتی میٹنگ منعقد کی گئی جس میں مقامی اور بیرونی حضرات نے حصّہ لیا اور ادیب صاحب کی زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ مقررین میں مخصوص حضرات کے نام درج ذیل ہیں۔

جناب نہال ساغر' سابق وائس چانسلر' میرٹھ یونیورسٹی نے ادیب صاحب کے انتقال کو ایک دکھد گھٹنا بتایا۔ میرٹھ سے آئے اردو ہفت روزہ میرٹھ میل کے مدیر اعلیٰ جناب سید اختر الاسلام صاحب نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ جناب تبسم شاداب اورنگ آبادی نے ادیب صاحب کو اسم با مسمّٰی بتاتے ہوئے کہا کہ ایسا عظیم شخص صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ جناب ایس۔ایس۔ بھٹناگر شاداب نے ان کی ادبی خدمات پر تحقیق کرنے اور ان کے درس پر گامزن رہنے کے عزم کو دہرایا۔ انھوں نے ادیب صاحب کی عروض شناسی پر بھی خاص روشنی ڈالی۔ دیگر مقررین میں جناب عشرت کو تپوری' ذکی طارق' شکیل شفائی' ڈاکٹر کنور بے چین' جناب جمیل باپوڑی' جناب معصوم غازی آبادی' جناب گل سرو نگری' جناب برج امبالوی وغیرہ بھی تھے۔ بعد میں ادیب صاحب کے بھتیجے ڈاکٹر دھرمیندر نے سبھی حاضرین کا شرکت کے لیے شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی ردولوی کا انتقال

کراچی سے ملنے والی ایک اطلاع کی بنیاد پر شاہ اقبال احمد ردولوی نے اطلاع دی ہے کہ شبلی نعمانی پر تحقیقی کام کرنے والے اولین محقق ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی کا مختصر علالت کے بعد ۲۲ مارچ ۹۸ء کو رات دس بج کر بیس منٹ پر انتقال ہو گیا۔

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی ردولوی کے تعلقدار چودھری سرفراز احمد مرحوم کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم ردولوی ہی میں مولوی اصغر علی صاحب سے حاصل کی' اس کے بعد گورنمنٹ کالج فیض آباد ہائی اسکول اور کرسچین کالج لکھنو سے انٹر میڈیٹ پاس کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انھوں نے اردو میں ایم اے اور پھر علامہ شبلی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی' وہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔ڈاکٹر شارب ردولوی نے ان کے انتقال کی خبر پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ "اردو رفتہ رفتہ اچھے نثر نگاروں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر آفتاب اس نسل سے تعلق رکھتے تھے' جو تنقید کی زبان میں صرف اصطلاحات کا استعمال کرنے کے بجائے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ "داستان شبلی" اور "گلہائے داغ" اردو تنقید کے ایسے نمونے ہیں جو شخص اور شاعر دونوں کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد کا انتقال اردو دنیا کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے۔

بشمبر ناتھ پانڈے کا انتقال

نئی دہلی۔ یکم جون۔ سرکردہ مجاہد آزادی بی۔این پانڈے کا کل رات دیر گئے انتقال ہو گیا وہ ۹۲ برس کے تھے آج سہ پہر نگم بودھ گھاٹ پر سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں ان کی آخری رسوم ادا کر دی گئی وہ گزشتہ کئی مہینوں سے علیل تھے ان کے انتقال سے ملک ایک گاندھیائی لیڈر جنگ آزادی کے سورما' سرکردہ سماجی کارکن ممتاز مورخ اور عظیم پارلیمنٹیرین سے محروم ہو گیا سماج کے ہر طبقہ اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ شخصیات نے بی این پانڈے کی موت پر دکھ ظاہر کیا ہے اور اسے ملک کے لیے ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر بی این پانڈے ۱۹۰۶ میں مدھیہ پردیش کے جھیورا نرہ ضلع کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ۱۵ برس کی عمر میں ہی ہندوستان کی آزادی کا خواب لے کر وہ اس زمانہ کی چھوٹی چھوٹی تحریکوں سے وابستہ ہوئے اس وقت انھوں نے سابرمتی آشرم جاکر گاندھی جی سے ملاقات کی اس وقت وہ شانتی نکیتن میں پڑھتے بھی تھے اس لیے رو بندر ناتھ ٹیگور سے بھی واقف تھے گاندھی جی کے آشرم میں ان کو صفائی کرنے کا کام ملا جسے انھوں نے بخوشی قبول کیا ۲۰ برس کی عمر کے بعد انھیں الہ آباد بھیج دیا گیا جہاں ان کا رابطہ پنڈت موتی لال نہرو سے ہوا اور پھر ان کی چار نسلوں سے یہ مضبوط رشتہ قائم رہا جنگ آزادی کی جدوجہد میں انھوں نے تقریباً دس برس جیل میں بھی گزارے اور جیل سے قبل اور رہائی کے بعد تک وہ درجنوں مزدور یونینوں کے سربراہ بھی رہے۔

آنجہانی کے سماجی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۷۶ میں انھیں راجیہ سبھا کے لیے نامزد کیا گیا۔ پھر ۱۹۸۲ میں وہ پارلیمنٹ کے رکن تھے ۱۹۸۳ میں اریسہ کے گورنر بنا دیے گئے۔ اس طرح ۱۹۸۳ سے ۱۹۸۸ تک وہ گورنر کے عہدے پر رہے ۱۹۸۸ میں ان کو پھر راجیہ سبھا کے لیے نامزد کیا گیا تو انھوں نے گورنر کے عہدے سے استعفا دے دیا آنجہانی بشمبر ناتھ پانڈے نے پوری زندگی فرقہ پرستی کے خلاف جدوجہد کی اور سیکولر روایات کے علم بردار رہے۔ ان کی انتقال سے ہندوستان ایک اہم ترین ہستی سے محروم ہو گیا۔

[illegible]

[illegible]	شمیم	200/-
[illegible]	شمیم حنفی	100/-
[illegible]	خطبات ڈاکٹر ذاکر حسین	120/-
اردو ادب کے فروغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ		
مرتبہ: [illegible]		75/-
[illegible]	مرتبہ: شمیم حنفی	100/-
[illegible]	اختر سعید خاں	144/-
[illegible]	ڈاکٹر سید حامد حسین	120/-
تعبیر و تفہیم	ڈاکٹر خلیق انجم	135/-
[illegible] مولانا ابوالکلام آزاد		
[illegible]		60/-
[illegible]	مرتبہ: شمیم حنفی	90/-
[illegible]	مرتبہ: شمیم حنفی	40/-
[illegible]	مرتبہ: [illegible]	90/-
[illegible]		150/-
[illegible]	[illegible]	90/-
[illegible]	[illegible]	200/-
[illegible]	سید حامد	75/-
[illegible]		
[illegible]		150/-

[illegible]

[illegible]	ڈاکٹر [illegible]	[illegible]
[illegible] اردو کے [illegible] میں	مالک رام	51/-
[illegible]	مولانا ابوالکلام آزاد	75/-
[illegible] کی تنقید	پروفیسر عنوان چشتی	48/-
[illegible] تنقید	پروفیسر حامدی کاشمیری	45/-
[illegible]	مرتبہ مالک رام	101/-
[illegible] مقالات	مالک رام	60/-
[illegible] نامہ	مجیب رضوی	21/-
[illegible] سرور	مرتبہ شمس الرحمن فاروقی	75/-
[illegible] ے	مرتبہ مظفر حنفی	45/-
[illegible] وری	صدیقہ بیگم	25/-
[illegible] لسانیات	ڈاکٹر محمد حسن	15/-
[illegible] عروج	غلام ربانی	24/-
[illegible] تعبیر	محمد ہدایت اللہ	15/-
[illegible] افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	(زیر طبع)
[illegible] کی حمایت میں	شمس الرحمن فاروقی	(زیر طبع)
[illegible] کا زوال	انتظار حسین	36/-
تذکرۂ معاصرین جلد دوم	مرتبہ مالک رام	14/-
تذکرۂ معاصرین سوم	مرتبہ مالک رام	22/-
تذکرۂ معاصرین چہارم	مرتبہ مالک رام	40/-
[illegible] کے مسائل	مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ	35/-
[illegible] ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	30/-
[illegible] کی تہذیبی معنویت	پروفیسر علی محمد خسرو	8/-
[illegible] کے چھ علم	ڈاکٹر سلامت اللہ	35/-
[illegible] تی	شمس الرحمن فاروقی	40/-
[illegible] ب	پروفیسر ممتاز حسین	48/-
[illegible] کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغرا مہدی	(زیر طبع)
[illegible] ت	ڈاکٹر عابد حسین	(زیر طبع)
[illegible] گزرے	بیگم انیس قدوائی	12/-
[illegible]	[illegible]	12/-

[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
قصہ کہانی کا فن	مرتبہ مالک رام	[illegible]
تاثرات	پروفیسر محمد مجیب	[illegible]
کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	24/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	5/50
جدید ترکی ادب کے ارکان خمسہ	ضیاء الحسن فاروقی	4/-
فکر اور نظریے	آل احمد سرور	
مسرت سے بصیرت تک	آل احمد سرور	75/-
تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	27/-
باتیں کچھ سریلی سی	داؤد رہبر	30/-
اردو امیر	مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی	30/-
روح تہذیب	خواجہ غلام السیدین	6/-
نئی شعری روایت	پروفیسر شمیم حنفی	(زیر طبع)
دراسات	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	15/-
دبستان آتش	شاہ عبدالسلام	21/-

تعلیم

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم	ڈاکٹر سلامت اللہ	51/-
ڈسپلن کی تعلیم و تربیت	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	90/-
الجھنیں	عبدالغنی بخش قادری	60/-
نظریۂ تعلیم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	120/-
استادوں کی تعلیم و تربیت	مسعود الحق	90/-
تعلیم و تعلم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	75/-
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	ضیاء الحسن فاروقی	45/-
مشقی تدریس کیوں اور کیسے	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	45/-
معاشیات کے اصول	[illegible]	21/-
آسان اردو ورک بک	[illegible] فاروقی	20/-
تعلیم و تربیت اور والدین	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	51/-
تعلیم اور [illegible]	ڈاکٹر [illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

تعلیمی ... کے مسائل	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	[illegible]
[illegible] (... کے لیے)	شکیل اختر فاروقی	12/-
تعلیم، فکر اور عمل	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	30/-
تعلیم، فلسفہ اور سماج	ڈاکٹر سلامت اللہ	60/-
بنیادی استاد کے لیے	ڈاکٹر سلامت اللہ	12/-
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	12/-
عبارت کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	18/-
انشا اور تلفظ	رشید حسن خاں	12/-
... کیسے چلائیں	سرور ہاشمی	30/-
بچوں کا آرٹ	عبدالحق	24/-

تذکرہ، سوانح، شخصیتیں

جو رہی سو بے خبری رہی (خودنوشت)	ادا جعفری	200/-
دلی کی ٹکسالی زبان	محی الدین حسن	15/-
دلی والوں کی خوشبو	کشمیری لال ذاکر	30/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں	اشرف صبوحی	51/-
چند تصویر بتاں	مولانا عبدالسلام قدوائی	45/-
ہندوستانی مسلمان اور ... صاحب	پروفیسر آل احمد سرور	8/-
صاحب جی سلطان جی	ڈاکٹر اسلم فرخی	20/-
ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں	ڈاکٹر عابد حسین	75/-
شہید جستجو	ضیاء الحسن فاروقی	75/-
مولانا آزاد کی کہانی	ڈاکٹر ظفر احمد نظامی	18/-
نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیاء)	ڈاکٹر اسلم فرخی	15/-
حیات حالی	مولانا اسلم جیراجپوری	12/-
نقش ذاکر	مرتبہ عبداللطیف اعظمی	51/-
مالک رام ایک مطالعہ	مرتبہ علی جواد زیدی	50/-
عبداللطیف اعظمی حیات و خدمات	مرتبہ انور صدیقی	18/-
[illegible]	مترجم عظیم حق	40/-
[illegible] صاحب ...	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	90/-
[illegible]	ڈاکٹر ...	45/-
[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]	مرتبہ [illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	مولانا عبدالسلام قدوائی
امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری	پروفیسر ... حسین
مکالمات افلاطون	مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین
... حیات اور شاعری	شکیل ...
اب جن کے دیکھنے کو	بیگم انیس قدوائی
شاد عارفی شخصیت اور فن	ڈاکٹر مظفر حنفی
حیات اجمل: حیات و خدمات	ڈاکٹر ...
مفتی صدر الدین آزردہ	عبدالرحمن پرواز اصلاحی
میر انیس سے تعارف	صالحہ عابد حسین
ہمارے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی
اقبال ...	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی
ڈاکٹر ذاکر حسین: سیرت و شخصیت	عبداللطیف اعظمی
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی
کیا خوب آدمی تھا	مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین
قدسیہ زیدی	کرنل بشیر حسین زیدی
[illegible]	مرزا فرحت اللہ بیگ
ذاکر صاحب ...	ضیاء الحسن فاروقی
روسی ادب حصہ اول و دوم	پروفیسر محمد مجیب
مرحوم دلی کی ایک جھلک	[illegible]

طنزیات، مزاحیات

آزار	مجتبیٰ حسین	
[illegible]	یوسف ناظم	
[illegible]	منظور علی ...	150/-
[illegible]	یوسف ناظم	
[illegible]	مجتبیٰ حسین	
[illegible]	رشید احمد صدیقی	
[illegible]	[illegible]	
[illegible]	یوسف ناظم	

[illegible]	شفیقہ فرحت	18/-
[illegible]ل	یوسف ناظم	18/-
[illegible]	شفیقہ فرحت	18/-
[illegible]ت	یوسف ناظم	18/-
[illegible] ایک چھینک کی	وجاہت علی سندیلوی	15/-
[illegible]	یوسف ناظم	21/-
[illegible]ری	حضرت آوارہ	(زیر طبع)
[illegible]	رشید احمد صدیقی	30/-
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	45/-
[illegible] (مزاحیہ شاعری)	محمد یوسف پاپا	15/-
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	15/-

طب. ایلوپیتھی

طب یونانی اور جدید	حکیم مشہور	60/-
فرہنگ اصطلاحات طب	ڈاکٹر اختر احمد قسری	45/-
افادیات طبیب	حکیم محمد سعید	20/-
اشارات قلب	پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم	6/-
مرضیات	حکیم نعیم الدین زبیری	75/-
اسپتال کی حالت کیجیے	ترجمہ عزیز الدین [illegible]	25/-
نئی بیلس	ڈاکٹر محمد شعیب اختر	(زیر طبع)

سفرنامے، رپورتاژ

سیر کر دنیا کی غافل	صغرا مہدی	51/-
وسط ایشیا	آصف جیلانی	51/-
کولمبس کے دیس میں	جگن ناتھ آزاد	45/-
[illegible] کے دیس میں	جگن ناتھ آزاد	25/-
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز	بیگم صالحہ عابد حسین	18/-
سخن دلنواز (خطوط کا مجموعہ)	خواجہ غلام السیدین	30/-
رہ نورد شوق	ڈاکٹر سید عابد حسین	14/50
[illegible] کے سائے	شفیق صدیقی	18/-

شعری مجموعے

فراز دوام	اختر سعید خاں	51/-
کچھ کہا ہے	[illegible]	30/-
رنگ، خوشبو، روشنی	قتیل شفائی	60/-
کاسۂ خیال	عبدالرؤف خاں	51/-
میں سمندر ہوں	فرحان سالم	30/-
اسرار خودی (فراموش شدہ ایڈیشن) شاہد خاں		75/-
بانگ درا	اقبال	12/-
بال جبریل	اقبال	8/-
ضرب کلیم مع ارمغان حجاز	اقبال	8/-
خواب اور خلش	آل احمد سرور	60/-
غبار منزل	غلام ربانی تاباں	45/-
انیس کے	۳۴ غیر مطبوعہ مرثیے	90/-
پرانی بات ہے	زبیر رضوی	30/-
ساز سخن	ادا جعفری	45/-
غزل نما (غزلیات کا انتخاب) مرتبہ ادا جعفری		75/-
دائروں میں پھیلی لکیر	کشور ناہید	30/-
آنکھ میں سمندر	زاہد ڈار	30/-
آنکھ اور خواب کے درمیان	عذرا علی	30/-
رات کے مسافر	انور سجاد	20/-
گداز شب	معین احسن جذبی	40/-
ایک خواب اور	علی سردار جعفری	40/-
حرف حرف روشنی	حمایت علی شاعر	35/-
لفظوں کا آسمان (اڑیا نظمیں)	مترجم کرامت علی کرامت	20/-
[illegible] ہے	جمیل الدین عالی	12/-
کلیات عرش ملسیانی	مرتبہ بالک رام	75/-
راہوار	ساقی فاروقی	20/-
پتھر کی زبان	فہمیدہ ریاض	15/-
شام کا پہلا تارا	[illegible]	21/-
مثنوی نہ سپہر (امیر خسرو)	مترجم [illegible]	20/-
شام شہر یاراں	فیض احمد فیض	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

کتاب	مصنف	قیمت
نواسے آباد	غلام ربانی تاباں	(زیر طبع)
دو گیت	ڈاکٹر [illegible]	(زیر طبع)
انتخاب حالی (ہندی ایڈیشن)	[illegible]	15/-
شہر آشوب مرتبہ	ڈاکٹر نعیم احمد	9/50
ذوق سفر	غلام ربانی تاباں	5/-
کو بہ کو	سلطان جہاں شاد اختر	7/-
دیوار قہقہہ (مزاحیہ شاعری) [illegible]		15/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

کتاب	مصنف	قیمت
تصوف، رسم اور حقیقت	خواجہ حسن ثانی نظامی	90/-
[illegible] اور قرآن	پروفیسر نثار احمد فاروقی	30/-
حضرت عمرؓ اور قرآن	ڈاکٹر رفیق زکریا	(زیر طبع)
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	ضیاء الحسن فاروقی	45/-
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	محمود احمد برکاتی	45/-
فرید و فرد فرید	اسلم فرخی	27/-
اسلام میں [illegible]	ضیاء الحسن فاروقی	8/-
اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سر سید احمد کا مرتبہ	سید مقبول احمد	8/-
فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل	مولانا مجیب اللہ ندوی	14/-
[illegible]	نثار احمد فاروقی	65/-
خطبات عیدین	مولانا تقی امینی	21/-
تاریخ [illegible]	قاسم علی [illegible]	27/-
تقسیم ہندوستان کی سیکولر روایات	ڈاکٹر مجیب اشرف	12/-
مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست	پروفیسر ضمیر الحق	8/-
[illegible] علوم	مولانا اسلم جیراجپوری	18/-
ترجمہ قرآن منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش	پروفیسر ضمیر الحق	8/-
مسلمانان ہند [illegible] کے مطالبات	[illegible]	8/-
دنیا کے بڑے مذاہب	[illegible] آزاد فاروقی	(زیر طبع)
ہندوستان میں [illegible]	[illegible]	40/-
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	(زیر طبع)
اسلام اور عصر حاضر	مترجم پروفیسر ضمیر الحق	30/-
اسلامیات	مالک رام	27/-
[illegible]	مولانا [illegible]	(زیر طبع)
حضرت [illegible]	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	75/-
روح القرآن	مولانا [illegible]	(زیر طبع)
[illegible]	[illegible] آزاد فاروقی	(زیر طبع)
عورت اور اسلامی تعلیم	مالک رام	30/-
مسلمان اور وقت کے تقاضے	عبد السلام قدوائی	[illegible]
عربوں کی [illegible]	محمد الحسن	[illegible]
[illegible] تبدیلیاں مترجم	قاضی [illegible]	[illegible]
مذہب اور جدید ذہن	پروفیسر ضمیر الحق	(زیر طبع)
ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں	ڈاکٹر سالم قدوائی	(زیر طبع)
کتاب و سنت کے جواہر پارے	مولانا [illegible]	(زیر طبع)
مسلمان اور سیکولر ہندوستان	پروفیسر ضمیر الحق	(زیر طبع)
اسلامی [illegible] مسائل مذہب	مولانا [illegible]	(زیر طبع)
اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی)	ڈاکٹر رشید [illegible]	[illegible]
تاریخ امت سیرت رسول حصہ اول	مولانا اسلم جیراجپوری	[illegible]
تاریخ امت خلافت راشدہ حصہ دوم	مولانا اسلم جیراجپوری	[illegible]
تاریخ امت خلافت بنی امیہ حصہ سوم	مولانا اسلم جیراجپوری	[illegible]
تاریخ امت عباسیہ حصہ چہارم	مولانا اسلم جیراجپوری	[illegible]
تاریخ امت عباسیہ حصہ پنجم	مولانا اسلم جیراجپوری	27/-
تاریخ امت عباسیہ حصہ ششم	مولانا اسلم جیراجپوری	[illegible]
تاریخ امت [illegible] حصہ ہفتم	مولانا اسلم جیراجپوری	[illegible]
تاریخ امت عباسیہ حصہ ہشتم	مولانا اسلم جیراجپوری	[illegible]
فکر اسلامی کی تشکیل جدید	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	[illegible]
[illegible]	قاری محمد اسماعیل	[illegible]
[illegible]	قاری محمد اسماعیل	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

ناول

سمندر ہے	انتظار حسین	150/-
[illegible]	عبدالبسم اللہ	75/-
صحرانورد کے خطوط	مرزا ادیب	75/-
...وں کی تلاش	نیاز سیوہاروی	60/-
...لشکر کا آخری سپاہی	کشمیری لال ذاکر	48/-
[illegible]	رابعہ تبسم	27/-
سمندری خزانہ	مادیہ رحمٰن	27/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	ڈاکٹر صغرا مہدی	24/-
مٹی سے ہیرا	سید مقبول احمد	10/-
تذکرہ	انتظار حسین	54/-
ریت کی دیواریں	رفعت سروش	21/-
بکھرا بادل	کشمیری لال ذاکر	33/-
فرار	ظفر پیامی	40/-
ڈوبتے سورج کی کتھا	کشمیری لال ذاکر	36/-
لمحوں میں بکھری زندگی	کشمیری لال ذاکر	18/-
مہکتی بہاریں	کوثر چاندپوری	18/-
راگ بھوپالی	صغریٰ مہدی	15/-
دھرتی سدا سہاگن	کشمیری لال ذاکر	7/50
پروائی	صغرا مہدی	9/50
گوری سوئے سیج پر	صالحہ عابد حسین	(زیر طبع)
انگوٹھے کا نشان	کشمیری لال ذاکر	7/-
ایک جسم دو دل	خالد رحمٰن	10/-
اپنی اپنی صلیب	صالحہ عابد حسین	60/-
پرائی دھرتی اپنے لوگ	جتندر بلو	12/-
ایک مٹھی ہندوستان	سید شمیم اشرف	6/-
ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	18/-

چاند گہنا	سلطان آصف فیضی	3/-
پابہ جولاں	صغرا مہدی	(زیر طبع)
غبن	منشی پریم چند	24/-
گئودان (نیا ایڈیشن)	منشی پریم چند	75/-
میدان عمل (نیا ایڈیشن)	منشی پریم چند	75/-
یودوکیہ ترجمہ	قرۃ العین حیدر	2/-
شکستہ ناتمام	زہرہ [illegible]	2/-
پراسرار مقدمہ کافکا	مترجم محمد علی الہاشمی	12/50

افسانے

صحرانورد کے خطوط	مرزا ادیب	75/-
پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر	75/-
آوازوں کا میوزیم	ساگر سرحدی	45/-
سدا بہار چاندنی	رام لعل	30/-
دل دریا	شرون کمار	25/-
تین چہرے تین آوازیں	صالحہ عابد حسین	18/-
درد دل	ستارہ جعفری	18/-
مکتی بودھ	راجندر سنگھ بیدی	25/50
نیلی ساڑی	خواجہ احمد عباس	(زیر طبع)
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	30/-
کوکھ جلی	راجندر سنگھ بیدی	18/-
ریت سمندر اور جھاگ	ہرچرن چاولہ	12/75
تیوری	امر سنگھ	14/75
قتل نمبر ۳۹۹	وجاہت علی سندیلوی	14/75
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	27/-
اپنے پرائے	اوم پرکاش [illegible]	9/-
نئی دھرتی نئے انسان	خواجہ احمد عباس	(زیر طبع)

[illegible]	[illegible]	[illegible]
وارثات	[illegible]	21/-
راستے اور کھڑکیاں	انور خاں	6/-
جو میرے وہ راجا کے نہیں	صغرا مہدی	10/
اپنے دکھ مجھے دیدو	راجندر سنگھ بیدی	21/-

ڈرامے

بازار میں نیند	شمیم حنفی	60/-
سلام مچھلی شہر ہے	کشمیری لال ذاکر	90/-
الجھاوے	ابراہیم یوسف	51/-
زندگی کی طرف	پروفیسر شمیم حنفی	36/-
زوال کا عروج	مترجم: انور عظیم	36/-
مجھے گھر یاد آتا ہے	پروفیسر شمیم حنفی	21/-
انتی گونی	سوفوکلیز مترجم قیصر زیدی	9/-
خانہ جنگی	پروفیسر محمد مجیب	6/-
حبہ خاتون	پروفیسر محمد مجیب	6/-
تاریخ کے آنچل میں	رفعت سروش	18/-
اداس موڑ	ابراہیم یوسف	12/-
انٹنی اور کلوپطرا	ولیم شیکسپیر	16/50
مٹی کا بلاوا	شمیم حنفی	45/-
سات کھیل	راجندر سنگھ بیدی	(زیر طبع)
غالب کون	سید محمد مہدی	8/50
خیال کی دستک	ساگر سرحدی	12/75
دیا بجھ گیا	کرتار سنگھ دگل	(زیر طبع)
آزمائش	پروفیسر محمد مجیب	6/-
انجام	پروفیسر محمد مجیب	6/-
کھیتی	پروفیسر محمد مجیب	6/-
ہیروئن کی تلاش	پروفیسر محمد مجیب	6/50

[illegible]	[illegible]	[illegible]
سوغات غزل	کرشن چندر	7/50
الم ایام	... مترجم: شفیق احمد	4/50
قتل آخر	اشتیاق حسین قریشی	2/25
فراست اور آل انڈیا ریڈیو	ڈاکٹر اشفاق محمد	10/-

اقبالیات

افکار اقبال	محمد عبدالسلام خاں	125/-
اقبال کا نظریہ خودی	عبدالمغنی	150/-
اقبال جادو گر ہندی نژاد	شفیق صدیقی	(زیر طبع)
اقبالیات کی تلاش	عبدالقوی دسنوی	36/-
فلسفہ اقبال (خطبات کی روشنی میں)	سید وحید الدین	30/-
نقد اقبال	مکیش اکبرآبادی	26/50

غالبیات

ذکر غالب	مالک رام	(زیر طبع)
گفتار غالب	مالک رام	48/-
غالب اور صفیر بلگرامی	مشفق خواجہ	36/-
تلامذۂ غالب	مالک رام	75/-
فسانۂ غالب	مالک رام	16/50
غالب اور شاہان تیموریہ	ڈاکٹر خلیق انجم	9/50

معیاری سیریز

موازنۂ انیس و دبیر	مرتبہ: رشید حسن خاں	24/-
نیرنگ خیال	مالک رام	15/-
یادگار غالب اردو	مالک رام	20/-
یادگار غالب فارسی	مالک رام	[illegible]
انتخاب مضامین سرسید	انور صدیقی	[illegible]
[illegible]	مرتبہ: رشید حسن خاں	[illegible]

[illegible]	عبدالحلیم شرر	16/-
انتخاب مضامین شبلی	مرتبہ: رشید حسن خاں	75/-
انتخاب ناسخ	مرتبہ رشید حسن خاں	51/-
مثنوی بحر المحبت	مرتبہ عبدالماجد دریاآبادی	5/-
شریف زادہ	ڈاکٹر قمر رئیس	20/-
امراؤ جان ادا	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	28/-
فسانۂ عجائب	ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی	45/-
توبۃ النصوح	مالک رام	36/-
باغ و بہار	رشید حسن خاں	27/-
ابن الوقت	ڈاکٹر خلیق انجم	51/-
مجالس النساء	صالحہ عابد حسین	24/-
گذشتہ لکھنؤ	رشید حسن خاں	75/-
قصہ حاتم طائی	اطہر پرویز	75/-
انتخاب ولی	مرتبہ ظہیر الدین مدنی	20/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی	مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن	15/-
انتخاب مراثی انیس و دبیر	رشید حسن خاں	36/-
انتخاب نظیر اکبر آبادی	رشید حسن خاں	45/-
انتخاب اکبر الہ آبادی	صدیق الرحمن قدوائی	21/-
انتخاب کلام میر	ڈاکٹر محمد حسن	(زیر طبع)
دیوان درد	رشید حسن خاں	30/-
انتخاب سودا	رشید حسن خاں	75/-
انتخاب قلی قطب شاہ	محمد اکبر الدین صدیقی	27/-
انتخاب ذوق	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	24/-
مثنوی سحر البیان	رشید حسن خاں	36/-
مثنوی گلزار نسیم	رشید حسن خاں	16/-
افادات سلیم	ڈاکٹر خلیق انجم	30/-
مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ: رشید حسن خاں	27/-

[illegible]

بیاض مریم	سکندر علی وجد	15/-
لہو پکارتا ہے	سردار جعفری	15/-
پتھر کی دیوار	سردار جعفری	15/-
ایک خواب اور	علی سردار جعفری	15/-
آتش گل	جگر مرادآبادی	12/-
پچھلے پہر	جاں نثار اختر	7/50
رومانی غزلیں	ثمینہ حجاب	12/-
انتخاب اکبر الہ آبادی	صدیق الرحمن قدوائی	15/-
ساتواں آنگن	صالحہ عابد حسین	8/-
دھوپ	رابعہ تبسم	5/-
گھر	مدبر رحمٰن	8/-
واپسی کا سفر	عبداللہ حسین	5/-
راگ بھوپالی	ڈاکٹر صغرا مہدی	7/-
نشیب	عبداللہ حسین	5/-
موت کا بازار	آفتاب ہلالی	8/-

کتاب نما کے خصوصی شمارے

محبوب حسین جگر نمبر	مرتبہ پروفیسر نثار احمد فاروقی	75/-
جاں نثار اختر نمبر	مرتبہ: گربچن چندن	90/-
شمس الرحمن فاروقی نمبر	مرتبہ: احمد محفوظ	80/-
اردو افسانہ [illegible]	مرتبہ: الیاس شوقی	51/-
مغیث الدین فریدی نمبر	مرتبہ: ظہیر احمد صدیقی	45/-
خواجہ حسن نظامی نمبر	مرتبہ: نثار احمد فاروقی، ریحان احمد عباسی	75/-
عبدالوحید صدیقی نمبر	مرتبہ: پروانہ ردولوی	51/-
غلام ربانی تاباں نمبر	مرتبہ: اجمل اجملی	75/-
اختر سعید خاں نمبر	مرتبہ: ڈاکٹر سید حامد حسین	51/-
نثار احمد فاروقی نمبر	مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم	51/-

ڈاکٹر خلیل انجم نمبر	مرتبہ: ایم حبیب خاں	[illegible]
خواجہ احمد فاروقی	مرتبہ: خلیق انجم	45/-
عابد علی خاں	مرتبہ: مجتبیٰ حسین	45/-
پروفیسر مسعود حسین خاں	ایم حبیب خاں	45/-
ڈاکٹر اجمل اجملی	مرتبہ: علی احمد فاطمی و مظفر حنفی	45/-
فرمان فتح پوری نمبر	مرتبہ: خلیق انجم	25/-
سردار جعفری نمبر	مرتبہ: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی	45/-
صالحہ عابد حسین نمبر	مرتبہ: عزیز قریشی	45/-
نئی نظم کا سفر	مرتبہ: خلیل الرحمٰن اعظمی	45/-
مشرقی علوم و مسائل	تحقیق حامد حسین	3/-
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر	کرنل بشیر حسین زیدی	16/-
مولانا محمد علی خاں شہاب نمبر	(مکتبہ جامعہ)	1/50
مرزا سلامت علی دبیر نمبر	مرتبہ: عبدالقوی دسنوی	7.50
جگن ناتھ آزاد نمبر	مرتبہ: ایم حبیب خاں	51/-
عرش ملسیانی نمبر	مالک رام	12/50
سکندر علی وجد نمبر	یوسف ناظم	25/-
لغت نویسی کے مسائل نمبر	پروفیسر گوپی چند نارنگ	35/-
عبداللطیف اعظمی نمبر	(مکتبہ جامعہ)	18/-
مشفق خواجہ نمبر	مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم	30/-
جائزے	مرتبہ: مظفر حنفی	45/-

قواعد، محاورے، کہاوتیں اور لغات

ڈکشنری (ہزار الفاظ)	جلیل مانک پوری	75/-
معیار اردو	جلیل مانک پوری	21/-
محاورات ہند	مرتب محبوب الرحمٰن فاروقی	51/-
کہاوت کیسے بنیں		10/-
[illegible]		12/-
[illegible]	[illegible]	24/-

[illegible] ڈکشنری		21/-
پاکٹ انگلش اردو ڈکشنری		15/-
ہمارے محاورے	کمل پرکاش	12/50
کہاوت اور کہانی	کمل پرکاش	9/-

کالج کے طلبہ کے لیے درسی کتب

شعور ادب	(مکتبہ جامعہ)	21/-
نیا اردو نصاب اوّل	محمد ذاکر	10/-
آئینہ ادب	ڈاکٹر مجی الدین رضا، ڈاکٹر آدم شیخ	21/-
انوار ادب	پروفیسر نسیم قادری، ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی	[illegible]

تعلیم بالغان کے سلسلے کی کتابیں

کفن دفن		1/-
حیات اللہ انصاری		1/-
چیک	مشتاق احمد	1/-
آئین کا سانپ	محمد حسین حسان	1/-
چائے	محمد حسین حسان	1/-
دیمک	محمد حسین حسان	1/-
کھیتی زمین	محمد حسین حسان	1/-

ہندی کی دوسری کتابیں

موسموں کا کھیل		1/-
پرماپا		1/-
اپنا گھر		1/-
امریکہ		1/-
دلی		1/-
مزدور محنت اور کام		1/-
[illegible]		1/-

مکتبہ عام تعلیم کی مذہبی کتابیں

پارہ عم مع اردو وانگریزی ترجمہ و تشریح		4/50
سورۂ رحمٰن	مع اردو ترجمہ	6/-
صراط مستقیم		7/50
سورۂ رحمٰن (ترجمہ مع تشریح)		6/-
حضرت شیخ مخدوم علی مہائمی		4/50
اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں		9/-
نماز پڑھیے		4/50
السلام علیکم		7/50
حضرت یوسف علیہ السلام		4/50
حدیث کیا ہے		4/-
حضرت عمر فاروقؓ		6/-
نقوش سیرتؐ	حصہ اوّل	5/-
نقوش سیرتؐ	دوم	5/-
نقوش سیرتؐ	حصہ سوم	5/-
نقوش سیرتؐ	حصہ چہارم	5/-
نقوش سیرتؐ	حصہ پنجم	5/-
رسالہ دینیات	اوّل	3/-
رسالہ دینیات	دوم	4/-
رسالہ دینیات	سوم	5/-
رسالہ دینیات	چہارم	5/-
رسالہ دینیات	پنجم	6/-
رسالہ دینیات	ششم	6/-
رسالہ دینیات	ہفتم	6/-
رسالہ دینیات	ہشتم	6/-
حضرت آدم علیہ السلام		4/-
حضرت یحییٰ علیہ السلام		3/-
بزرگانِ دین		4/-

اسعد کی باتیں	4/50
خوب سیرت اوّل	6/-
خوب سیرت دوم	6/-
اچھی باتیں	4/50
رسول اللہ کی صاحبزادیاں	4/50
سلطان حق	4/50
سیرت پاک مختصر مختصر	3/-
کمسن صحابی	6/-
رحمان کا مہمان	6/-
اسلام کے جاں نثار	5/-
نور کے پھول	9/-
سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	3/50
حضرت ابو بکر صدیقؓ	6/-
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	3/-
حضرت طلحہؓ	3/-
حضرت ابوذر غفاریؓ	3/-
حضرت سلمان فارسیؓ	3/50
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	3/-
حضرت محبوب الٰہیؒ	3/50
حضرت معین الدین چشتیؒ	3/-
حضرت فرید گنج شکرؒ	3/-
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	3/-
نیک بیٹیاں	3/50
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	3/-
حضرت حمزہؓ	3/-
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	4/50
حضرت ابوہریرہؓ	4/-
اللہ کے نبی	2/50

نماز کے مسائل	3/50
رسول پاکؐ کے اخلاق	4/-
قرآن پاک کیا ہے؟	5/-
اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل	6/-
اسلام کے مشہور سپہ سالار دوم	6/-
اسلام کے مشہور امیر البحر	9/-
اسلام کیسے پھیلا حصہ اوّل	7/50
اسلام کیسے پھیلا حصہ دوم	7/50
اسلام کیسے شروع ہوا	7/50
رسول پاکؐ	7/50
دس جنتی	7/50
سرکار کا دربار	7/50
چار یار	9/-
آں حضرتؐ	4/50
ہمارا دین حصہ اوّل	8/50
ہمارا دین حصہ دوم	8/50
ہمارا دین حصہ سوم	8/50
تحسین القرآن	(زیر طبع)
منہاج القرآن	4/50
ائمہ اربعہ	(زیر طبع)
ارکان اسلام	4/-
عقائد اسلام	4/50
خلفائے اربعہ	18/-
نبیوں کے قصے	7/50
اسوۂ رسولؐ	7/50
مسلمان بیبیاں	6/-
ہمارے نبیؐ	4/-

قاعدہ یسرنا القرآن (ہندی)	3/-
قاعدہ یسرنا القرآن (اردو)	8/-

سوانح

بچوں کے خواجہ الطاف حسین حالی	6/-
بچوں کے نظیر اکبر آبادی	6/-
بچوں کے ڈاکٹر انصاری	6/-
بچوں کی آپا جان (گیرا لڈ پیس)	6/-
بچوں کی شفیقہ فرحت	4/50
بچوں کے عابد علی خاں	4/-
بچوں کے علی سردار جعفری	4/-
بچوں کے یوسف ناظم	4/-
چارلی چیپلن اور ہانس اینڈرسن	9/-
بچوں کے مولانا حسرت موہانی	4/-
بچوں کے میر امن دلی والے	4/50
بچوں کے محمد حسین آزاد	4/-
بچوں کے مرزا غالب	4/-
بچوں کے [illegible] خسرو	4/50
بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد	4/-
بچوں کے سلطان جی	4/50
بچوں کے مولانا شبلی نعمانی	4/50
بچوں کی صالحہ عابد حسین	4/-
بچوں کے ڈاکٹر سید عابد حسین	4/-
بچوں کے بابائے اردو مولوی عبدالحق	4/50
بچوں کے میرزا ادیب	4/50
بچوں کے غلام السیدین	5/-
بچوں کے اسمٰعیل میرٹھی	21/-
بچوں کے ذاکر صاحب	7/-

[illegible]	8/-
اندرا گاندھی کی کہانی	6/-
محمد شفیع الدین نیر	7/50
ہمارے عظیم سائنس داں	9/-
چند مشہور طبیب اور سائنس داں	9/-
مولانا آزاد کی کہانی	18/-
جوہر قابل	4/50
بچوں کے چار بزرگ دوست	3/50
گاندھی بابا کی کہانی	10/-
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں	2/-
میر انیس	2/-
امیر خسروؔ	4/50

سائنس، طب اور عام معلومات

باتوں باتوں میں معلومات	10/-
کہانی بھی، معلومات بھی	6/-
چیزوں کی کہانی	7/50
یہ کیسا بخار ہے	6/-
آپ کا جسم	6/-
گندا پانی	4/-
کیوں اور کیسے؟	6/-
سائنس کی دنیا	8/-
کمپیوٹر کیا ہے	8/-
عجائب گھر	10/-
ذرّے کی کہانی	21/-
علاج میرا دشمن	6/-
پرواز کی کہانی	4/50
غذا کی کہانی	3/-
رنگوں کی بستی	5/-

[illegible]	8/-
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں	4/50
صحت کے ۹۹ گُر	3/-
صحت کی الف بے	5/-
سنہرے اصول	5/-
پرندوں سے جانوروں تک	4/50
دہلی	2/50
انوکھا عجائب خانہ (۳ حصے)	1/50
سماجی زندگی حصہ سوم	4/90
بنیادی قواعد اردو طلبہ کے لیے	3/-
بنیادی قواعد اردو (بڑا سائز)	6/-

نظمیں

پھلجھڑیاں	6/-
مولانا اسمٰعیل میرٹھی	21/-
بتاشے (نرسری گیت باتصویر)	7/50
مہکتی کلیاں	(زیر طبع)
ٹوٹے کھلونے	6/50
سہانے ترانے	4/50
بچوں کے افسر	6/-
بچوں کے اقبال	7/50

ننھے منے بچوں کے لیے

بتاشے	(باتصویر)	7/50
جاں نثار دوست	(باتصویر کہانیاں)	7/50
شیر اور بکری	(باتصویر کہانیاں)	9/-
چاند کی بیٹی	(باتصویر کہانیاں)	8/-
بھیڑیے کا گانا	(باتصویر کہانیاں)	7/50
جادو کی ہنڈیا	(باتصویر کہانیاں)	7/50

[illegible]	(باتصویر کہانیاں)	7/50
دم کٹی لومڑی	(باتصویر کہانیاں)	7/50
کوّے کا خواب	(باتصویر کہانیاں)	8/50
گدھے نے بجائی بانسری		7/50

بڑے بچوں کی دلچسپ کہانیاں

الف لیلیٰ کے چار ڈرامے		9/-
ننھی جل پری		7/50
ممتا کی آواز		7/50
جادو نگری		9/-
سنہری جھیل		9/-
خلائی طبیب		8/-
بونوں کا جزیرہ		8/-
جلتا ہوا مکان		5/-
سونے کی چوری		4/-
روشنی ہی روشنی		10/-
خطرناک سگنل	پہلا حصہ	10/-
لاش چل پڑی	دوسرا حصہ	10/-
کالا جنگل نیلی موت	تیسرا حصہ	10/-
خلائی سرنگ	چوتھا حصہ	10/-
وہ خلا میں بھٹک گئے	پانچواں حصہ	10/-
خلائی مخلوق بستی میں	چھٹا حصہ	10/-
موت کی شعاعیں	ساتواں حصہ	10/-
خطرناک فارمولا	آٹھواں حصہ	10/-
تابوت سمندر میں	نواں حصہ	10/-
خلائی مخلوق کا حملہ	دسواں حصہ	10/-
عمران کی زندہ لاش	گیارہواں حصہ	10/-
شیر پتھر بن گیا	بارہواں حصہ	10/-
ایلس کی دنیا		10/50

[illegible]	10/-
مرنا موت	4/50
دنیا کی عجیب و غریب کہانیاں	7/50
انمول کہانیاں	4/50
چتری کی گڑیا	7/50
ریل کے بچے	4/-
افریقہ کی کہانیاں	9/-
۸۰ دن میں دنیا کا چکر	3/-
ہزاروں خواہشیں	9/-
مونٹی کرسٹو کا خواب	9/-
گلیور کے تین حیرت انگیز سفر	6/-
جادوئی چقماق کی ڈبیہ	4/50
گیارہ ہنس اور ایک شہزادی	4/-
دادی اماں کی کہانیاں	6/-
سفر کے قصے	5/-
پہاڑی بم	4/50
تین صندوقچی	10/-
[illegible]	5/-
ایک تھا مرغا گڈو کوں	6/-
پریوں کی کہانیاں	6/-
سمندر کا بادشاہ مر گیا	4/50
چوں چوں بیگم	4/-
ماسٹر شامت	6/-
تھوڑی شرارتیں چاند	4/-
پکڑے گئے	7/50
درویش کا تحفہ	6/-
سورا سے فرار	7/50
بکرے کی تعریف میں	6/-

جنگل کا بادشاہ	6/-	[illegible]	8/-
قصر صحرا اول	7/-	سامری پر کیا گزری	3/50
قصر صحرا دوم	10/-	جنگل کی بلی	3/-
قصر صحرا سوم	8/-	چالاک خرگوش کے کارنامے	9/-
[illegible]	7/50	چور پکڑو	3/50
پہاڑ کا پنچھی	4/-	بہادر علی	8/50
ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش	7/50	خالی ہاتھ	9/-
پادری کی روح	4/-	کھلونا نگر	7/50
ٹھگ نے ٹھگا ٹھگ کو	4/50	حاجی بابا کی ڈائری	7/50
گدھا کہانی	9/-	قصہ اژدھا پکڑنے کا	8/-
خفیہ سرنگ	6/-	ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	6/-
بڑھیا کی بھینس	4/50	ابو علی کا جوتا	6/-
تیس مار خاں	4/50	ننھا سراغ رساں	8/-
چالاک خرگوش کی واپسی	15/-	پُراسرار غار	6/-
غریب لکڑہارے کی کہانی	6/-	ظالم ڈاکو	6/-
نردولی کا آدم خور	6/-	عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	7/50
ہمت کے کرشمے	6/-	دلی کی شادی	4/-
خلائی مسافر	6/-	وحشت شہزادہ	4/50
ابو خاں کی بکری	15/-	اندھے کا بیٹا	4/50
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی	6/-	پانچ جاسوس	10/-
نرالے گویے	4/50	جنگل کی ایک رات	7/50
باتونی کچھوا	4/50	اچھی کہانیاں	3/-
جادو کا کھلا	3/-	ہرن کا دل	3/-
جادو کی سارنگی	3/-	دریا کی رانی	3/-
بدر شہزادی	6/-	گوہر شہزادی	4/50
سمندری طوفان اور تین لڑکے	6/-	شریر شیرا	3/50
خلاسیاح	8/50	پری رانی	3/-
زہریلا	6/-	خطرناک سفر	3/50

[illegible]	3/50	[illegible]	3/50
مرغی کی چھوٹی بچی	4/50	[illegible]	5/-
بابا تاج	3/-	جادو کا گھر	3/50
ساحر و ساحرہ	5/-	[illegible]	3/50
پہاڑ کی چوٹی پر	6/-	[illegible]	3/50
شرارت	4/-	روٹی کس نے پکائی	3/50
ننھا فرشتہ	6/-	گھر میں بچوں کی [illegible]	3/50
ایک کھلاڑی	3/50	پانچ بونے	3/50
مچھیرا اور اس کی بیوی	3/50	بڑی نانی	3/50
بھوتوں کا جہاز	7/50	بچوں کی کہانیاں	3/50
ہار کی تلاش	6/-	پان کھا کر طبلہ بجا کر [illegible]	3/50
خرگوش کی چال	4/-	[illegible]	3/50
آؤ اداکاری کریں	4/-	[illegible] پردیس چلے	3/50
خرگوش کا سپنا	9/-	[illegible]	3/50
ننھا ہیرا	6/50	سرخ جوتے	4/50
ایک کچوری تیل میں	(زیر طبع)	[illegible]	6/-
شیر خاں	4/-	ایک دیس ایک خون	3/50
بھیڑیے کے بچے	3/-	جادو کے کھیل	(زیر طبع)
لومڑی کے بچے	3/-	انعامی مقابلہ	3/25
میاں ڈھینچو کے بچے	4/-	دعوت [illegible]	(زیر طبع)
بہادر	4/50	جیت کس کی؟	4/-
ہرن کے بچے	3/50	[illegible] کی گڑیا	(زیر طبع)
اس نے کیا کرنا چاہا	3/50	بہادر سپاہی	4/-
[illegible]	7/50	ننھا [illegible]	(زیر طبع)
[illegible]	(زیر طبع)	[illegible] خاں	3/-
[illegible] اور ننھا فرشتہ	(زیر طبع)	[illegible] حسن عبدالرحمن، اول، دوم	5/-
سرکس ([illegible])	1/50	چوری کی عادت	3/50
بندر اور مالی	[illegible]	[illegible]	(زیر طبع)

چیونٹا اور ...	(روپے)
...	1/50
گلابو چوہیا اور ...	1/50
لال مرغی	4/-
چڑیاں	3/-
تین لاڑی	6/-
چپاوت کا آدم خور شیر	1/50
ننھا ٹٹو	3/-
چنیلی	1/20

ہماری درسی کتابیں

اردو قاعدہ		5/-
اردو کی پہلی کتاب		8/-
اردو کی دوسری کتاب		11/-
اردو کی تیسری کتاب		13/-
اردو کی چوتھی کتاب		14/-
اردو کی پانچویں کتاب		17/-
اردو کی چھٹی کتاب		18/-
اردو کی ساتویں کتاب		20/-
اردو کی آٹھویں کتاب		22/-
اردو خوش خطی	حصہ اوّل	4/-
اردو خوش خطی	حصہ دوم	4/-
اردو خوش خطی	حصہ سوم	4/-
اردو خوش خطی	حصہ چہارم	4/-
ہمارا ملک بھارت		19/-
بھارت اور سنسار		19/-

PAYAMI
BASIC ENGLISH-URDU
DICTIONARY 16/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

کی نئی کتابیں

لسان الصدق

مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل۔ اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم [illegible] ۶۵/=

نظام رنگ

ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کا ادبی خاکہ — یہ اس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر انسانیت کو وقار بخشا۔ ۱۵/=

شہید جستجو

(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مرد درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مرد مومن تھے۔ ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۶۵/=

پرانی بات ہے

(مسلسل ادوار نظمیں) زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں جن سچائیوں کے روپ بدل گئے ہیں۔ ۳۰/=

غزل نما

تصحیح و ترتیب ادا جعفری

(جلد اول، سیریز نکل رہی ہے)

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کلام کا جامع انتخاب اور تعارف جس کو ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۴۸۰ ۶۵/=

ساز سخن

ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتون اول محترمہ ادا جعفری کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے طرز بیان سے ایک ایسی قوت ادبی مترشح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معیار کا پیام موثر نہیں ہو سکتا۔ ۴۵/=

ترجمۂ قرآن

پروفیسر مشیر الحق

(منشائے الٰہی کو سمجھنے کی انسانی کوشش)

پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۳۰ نومبر ۱۹۸۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔ ۸/=

نذر مختار

مالک رام

مجموعہ مضامین بر نذر محقق اور دانشور پروفیسر مختار الدین احمد کو علیگڑھ سے سبکدوشی پر نائب صدر جمہوریہ ہند کے دست مبارک سے پیش کیا گیا جس میں اردو کے ممتاز چھبیس ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ = ۱۰۱

Regd. With R.N.I. at No 4967/60 JUNE 98
Regd. No. DL 16016/98
Licence No. U[SE]-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

جولائی ۱۹۹۸ء	جلد ۳۸	شمارہ ۷

فی پرچہ 7/:

سالانہ 70/:

سرکاری تعلیمی اداروں سے 100/

غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک) 500/

مدیر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فیکس نمبر 6842574

Tel Cum Fax No (011)-6910191

ٹیلی فون نمبر 6910191

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

طنز و مزاح

انشائیہ

نئی مطبوعات

سیرت مسیح علیہ السلام مؤلف چشون محمد چشون 100/-
دستک (شعری مجموعہ) اختر شاہ جہاں پوری 80/-
آزادی کے بعد اردو زبان و ادب مؤلف سید عبدالباری 110/-
خواجہ نظام الدین اولیاء پروفیسر عبدالرحمٰن مومن 120/-
مطالعہ مذاہب (مذہب) ڈاکٹر محسن عثمانی 100/-
گفتگو ہند جاپانی (رپورتاژ) مترجم طلعت گل 100/-
سمندر (ناول) ابن صفی 40/-
برف کا بھو (ناول) ابن صفی 40/-
سکندر ہے کون (ناول) ڈاکٹر شفیع احمد 60/-
خمار گندم (مزاحیہ) ابن انشا 90/-
اردو کی آخری کتاب (مزاحیہ) ابن انشا 60/-
اوراق پارینہ (تبصرہ، مضامین) وارث علوی 125/-
تشنہ فریاد (افسانے) ضمیر الدین احمد 200/-
درد آشنا چہرے (خاکے) کشمیری لال ذاکر 150/-
وسیلۂ نجات (نعت، سلام) ساحر شیوی 150/-
یونیورسٹی درجات کے اردو نصابات کا تحقیقی، تنقیدی مطالعہ محمد صابرین 75/-
آداب معاملات ابو مسعود اظہر ندوی 60/-
نئی اردو لغات (لغت) نجیب رامپوری 190/-
کشمکش (افسانے) منصور اظہر 70/-
غالبیات (چند مطالعے دو مشاہدے) کالی داس گپتا رضا 100/-
سائنٹسٹ (ڈرامے) مبین صدیقی 151/-
دھڑکن (شعری مجموعہ) نظر جالونی 50/-
زرد پتے (افسانے) شہزاد بدایونی 80/-
نوائے گلبرگہ ادب نمبر ۹۸-۱۹۹۷ مدیر قوم صادق 150/-
انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح سرپرست مولانا ابوالحسن اصلاحی
سہ ماہی سفیر اردو مدیر انور شیخ فی شمارہ 50/-
سہ ماہی دولت (بچوں کے لیے) مدیر توصیف الحسن فی شمارہ 15/-
خوشبو گلابوں کی (شعری مجموعہ) جمال نقوی 100/-
Mysticism in Urdu Poetry by R S Bhatnagar 150/-

سرورق۔ نرگس سلطانہ

[redacted]

ڈاکٹر خلیق انجم

اردو والے گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کے لیے بہت زور اور جوش سے مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر حضرات ان سفارشوں سے قطعی ناواقف ہیں۔ ہمیں اردو کے صف اول کے محقق اور نقاد ڈاکٹر خلیق انجم کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے نہ صرف گجرال کمیٹی بلکہ اس سلسلے میں تشکیل دی جانے والی بعد کی تمام رپورٹوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ قیمت 175/-

[redacted]

افکار و اسالیب

مرتبہ پروفیسر عبدالحق

عصر حاضر کے سب سے محترم انشاپرداز، مزاح نگار، نقاد و دانشور، پر ملک کے معتبر اہل قلم کے مقالات، نگارشات، سب سے معتبر و وقار مجموعہ مقالات۔ قیمت 300/-

ادب کا بدلتا منظر نامہ

اردو مابعد جدیت پر مکالمہ

اردو مابعد جدیت پر نئے پرانے، سینئر اور نوجوان شاعروں اور ادیبوں، تحقیق کاروں اور تنقید نگاروں کے درمیان ایک کھلا مکالمہ

ترتیب و تدوین پروفیسر گوپی چند نارنگ قیمت 180/-

مکتبہ جامعہ کی اہم کتاب

شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام

نظام اردو خطبات کا 19واں خطبہ

[redacted]

"داستان، زبانی بیانیہ، بیان کنندہ اور سامعین"

کے عنوان سے

اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں فروری ۱۹۹۸ء میں پیش کیا۔ اب یہ اہم خطبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شائع کر رہا ہے۔ (زیر طبع)

مہمان مدیر
نرگس سلطانہ
ماہنامہ آج کل اردو
پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

(اشاریہ)

اردو زبان کا مستقبل اور ہماری ذمے داریاں

کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ ہندستان سے فارسی زبان کے ختم ہونے کے اسباب کیا ہیں؟ وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر تقریباً 400 سال تک حکمراں طبقے، عدلیہ اور تمام پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ہونے کے باوجود آج یہ زبان ہندستان کی قدیم کلاسیکی زبان بن گئی ہے جسے مادری زبان کے طور پر اپنا کہنے والا کوئی ایک شخص بھی نہیں بچا ہے۔ گرچہ شعر و ادب وافر مقدار میں موجود تھا، اور احیائے مذہب کی سبھی تحریکیں اسی زبان کی بدولت ہندستان میں فروغ پاتی رہیں۔ آج بھی ہمارا ادب خصوصاً شاعری فارسی کے اثرات سے آزاد نہیں ہو سکا ہے۔

اس کے جواب میں بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ پالی اور سنسکرت زبانوں کی مثال دیتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو زبانیں عوام کی زبان نہیں بن سکیں وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حکومت ختم ہو گئی اشراف کا وہ طبقہ نہیں رہا جو یہ زبان لکھتا پڑھتا تھا۔ ایک نئی زبان وجود میں آ گئی، اور سارا مذہبی لٹریچر، اور ادب بھی اس نئی زبان میں منتقل ہو گیا۔ اب اس زبان کو پڑھنے یا بولنے کی کوئی بھی مادی، سماجی یا مذہبی ضرورت نہیں رہی' اسی طرح سے بعض اور اسباب اور وجوہات بیان کیے جا سکتے ہیں۔

کیا یہی صورت حال جو 18 ویں اور 19 ویں صدی میں فارسی زبان کے ساتھ پیش آئی اب اسی زبان کے بطن سے پیدا ہونے والی اردو زبان کے ساتھ درپیش نہیں ہے؟ آج اردو زبان کی موجودہ صورت حال سے ہر شخص بخوبی واقف ہے۔ شمالی ہند سے زبان رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اس زبان کی تعلیم و تعلم کے سارے مواقع ختم ہو گئے ہیں۔ ہماری نئی نسل اس سے نابلد ہو گئی ہے۔ رفتہ رفتہ گھروں میں بھی اس کا استعمال ختم ہو چکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج شمالی ہند میں مدرسوں کی جو بڑی تعداد پائی جاتی ہے انھیں کی بدولت چند اردو پڑھنے والے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ آج صورت حال یہ ہے کہ

ہمارا سارا مذہبی ادب ہندی رسم الخط میں منتقل ہو رہا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جو تشہیری یا تجارتی ادارے ہیں انھوں نے مذہبی ادب کی تشہیر کے لیے اور تجارتی اداروں کو اپنے منافع کے لیے ایسی ساری کتابوں کو اس زبان میں منتقل کرنا پڑا ہے جو ہندستان کے لوگوں کی رائج الوقت زبان بنتی جا رہی ہے۔ ہمارے ادب کا بیشتر سرمایہ ہندی رسم الخط میں تبدیل ہو چکا ہے۔ وہ سبھی کتابیں جو آج اردو رسم الخط میں موجود نہیں ہیں وہ بھی بہ زبان ہندی آسانی سے ہر جگہ دستیاب ہیں بلکہ کھوج کھوج کر ان کتابوں کا منتقلی کا کام بڑے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت' بڑے پیمانے پر کیا جا رہا ہے اور اس منصوبے کو وہ لوگ ہی فروغ دے رہے ہیں جو اردو کے نامور ادیب ہیں لیکن چند سکوں کے لیے وہ اس کام میں ہر طرح کا تعاون دے رہے ہیں۔ کہنے کے لیے یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آج ملک کے گوشے گوشے میں لوگ ہندی یا علاقائی زبانوں کی بدولت ہمارے سارے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہو رہے ہیں۔ آج میر و غالب سے لے کر ناصر کاظمی تک اور واجد علی شاہ کے پری خانے سے لے کر دستنبو تک لوگ ہندی کے ذریعے پڑھ رہے ہیں۔ اور ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے قدر دانوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن غور کرنے کی بات، ایک لمحہ ٹھہر کر سوچنے کی بات یہ ہے کہ خود اس پروسز میں اردو زبان کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ اب آج جبکہ بہشتی زیور سے لے کر تبلیغی نصاب تک ساری کتابیں ہندی میں منتقل ہو چکی ہیں۔ (جماعت اسلامی تو اس معاملے میں بہت آگے رہی ہے) اور ہمارا سارا ادب بھی اس زبان میں منتقل ہو چکا ہے تو اب اس اردو زبان کو پڑھنے کی ضرورت کیا رہی؟ اور کیوں رہی؟ آج مدرسوں کے نصاب میں تبدیلی کی بات بڑے زور شور سے کی جا رہی ہے لیکن شمالی ہند کے بعض خطوں میں ایسے بھی مدرسے ہیں جہاں ساری دینی تعلیم یا تو مقامی زبانوں میں یا پھر ہندی زبانوں میں دی جا رہی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایسے مدرسوں کی صدقات و زکات کی رسیدیں بھی ہندی میں ہی چھپتی ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اب مختلف تقریبات اور رسومات کے دعوت نامے بھی دوسری زبانوں میں وہ لوگ بھی شائع کرا رہے ہیں جو اردو کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں جانتے۔

اردو زبان تہذیب اور شائستگی کی زبان تھی اور اس زبان کے بولنے والوں کی اکثریت کی مذہبی زبان بھی تھی۔ شعر و ادب کے علاوہ مذہبی ضرورتوں کے تحت بھی لوگ اس زبان کو پڑھتے تھے لیکن جہاں مقامی زبانوں میں ایسے ادب کی منتقلی کا کام بڑے پیمانے پر ہوا وہاں لوگ اردو سے نا آشنا ہو گئے ہیں لیکن کیرل ایک ایسا صوبہ ہے جہاں بہت بڑی

تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو مذہب کے پیروکار ہیں لیکن چونکہ وہاں انھوں نے سارے مذہبی سرمایے کو ملیالی زبان میں منتقل کر لیا ہے اس لیے وہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہونے کے باوجود اردو پڑھنے اور بولنے والوں کی تعداد دس ہزار بھی نہیں رہ گئی۔ یہ مثال ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔

اگر یہی صورت حال رہ گئی تو باوجود عوامی زبان ہونے کے شاید ہماری یہ زبان زندہ نہ رہے۔ زبان زندہ بھی رہ گئی تو بھی تحریری طور پر رسم الخط کے اعتبار سے ہماری یہ پیاری، شیریں اردو زبان باقی نہ رہے، مایوسی کفر ہے، لیکن صورت حال جیسی آج ہے اس سے تو آنکھیں موندنا حقیقت کو جھٹلانا ہوگا۔ اب بھی وقت ہے اگر ہم اس زبان سے محبت کرتے ہیں تو عملی طور پر ہمیں اپنے گھروں میں اسے زبردستی رائج کرنا ہوگا۔

زبانیں چاہے حکمراں طبقے کی سرپرستی سے محروم ہوں لیکن اگر گھروں میں یہ زندہ رہیں تو بچ جائیں گی، رواج پا جائیں گی ورنہ سنسکرت، پالی اور فارسی کی طرح یہ بھی اوراق پارینہ ہو جائے گی۔

ہماری بے حسی یوں ہی جاری رہی تو وہ دن دور نہیں جب شاید اگلے پچاس سالوں میں ہی ہماری یہ زبان زندہ نہ رہے اور اگر بولی کی حد تک یہ زندہ رہ بھی گئی تو بھی تحریری طور پر یہ زبان ختم ہو جائے گی۔ آج بھی اب اردو رسم الخط کو اپنانے والوں کی تعداد میں بتدریج کمی آگئی ہے اور موجودہ نسل کے ختم ہونے پر شاید اسے کوئی جاننے والا یا استعمال کرنے والا بھی نہیں بچے گا۔ میں ان سبھی حضرات سے اپیل کرتی ہوں جن کے دل میں اردو کے لیے خلوص تڑپ، یا محبت باقی ہے وہ اٹھیں اور عملی طور پر جو کچھ بھی وہ کر سکتے ہیں اسے رائج کرنے میں مدد کریں۔ سب سے پہلے ایسے سرپھروں کی ضرورت ہے جو ان تمام لوگوں کے خلاف تحریکیں چلائیں جو مختلف انجمنوں اور اداروں کے چودھری بن کر بیٹھے ہیں لیکن جن کے اپنے بچے اس زبان سے ناواقف ہیں اور اسی طرح یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طالب علموں کو چاہیے کہ وہ ہر اس اردو کے لیکچرر اور پروفیسر کے کلاسوں کا بائیکاٹ کریں جو کھاتے تو ہیں اردو کی روٹی لیکن جن کی اپنی نسلیں اور اولادیں اس زبان سے ناواقف ہیں اور اسے پڑھتی نہیں۔ اسی طرح مدیران رسائل اور اخبارات بھی اب لوگوں کی نگارشات شائع کرنے سے پہلے اس بات کا سرٹیفکٹ حاصل کر لیں یا خود پتہ لگالیں کہ جن لوگوں کی نگارشات جو اردو میں شائع کرنے جا رہے ہیں آیا خود ان کے گھر میں اردو زبان کی کیا حالت ہے۔ ان کے گھروں میں اردو کے اخبارات، رسائل خریدے جاتے ہیں یا

ان کی اپنی اولادیں اردو پڑھ رہی ہیں یا نہیں۔ اس کام میں ہر شخص کو اپنا پر خلوص تعاون دینا چاہیے۔ اب جب تک لوگوں کو مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں اس وقت تک لوگوں میں نہ تو احساس پیدا ہوگا اور نہ ہی ان کے اندر سے منافقت کا جذبہ ختم ہوگا۔ اس کے علاوہ گھروں میں بھی، اور روز مرہ کے کاموں میں بھی، جہاں تک ممکن ہو اردو کا استعمال لازماً کرنا شروع کردیں۔ میرے خیال میں یہ چند ایسے چھوٹے چھوٹے اقدامات ہیں جن پر عمل کر کے اپنی زبان کو زندہ رکھنے میں بھرپور تعاون دے سکتے ہیں۔

جمیل الدین عالی اور آٹھویں سُر کی جستجو

ایک عجیب راگ ہے ایک عجیب گفتگو
سات سُروں کی آگ ہے آٹھویں سُر کی جستجو

اگر 'لاحاصل' کو بیچ میں سے نکال دیا جائے تو 'اے مرے دشتِ سخن' 'غزلیں دوہے گیت' کے تقریباً چار دہائیوں کے بعد شائع ہوا ہے۔ حرفِ آغاز میں وہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے جو کہنا چاہیے تھا، لیکن ذکر نہیں ہے تو 'غزلیں دوہے گیت' کا جس نے جمیل الدین عالی کو جمیل الدین عالی بنایا اور عالی کی شاعری کی وہ پہچان متعین کی جس کے قائل محمد حسن عسکری، ابن انشا، سلیم احمد سب تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ پہچان عالی کے لیے بوجھ بن گئی یا عالی آگے بڑھنے کے لیے اس کو بھلا دینا چاہتے ہیں یا ان کے اندر کی بے سروی کچھ اور کہتی ہے، یا یہ رد تشکیل کا وہ عمل ہے جسے طویل سفر طے کرنے والوں کی تخلیقیت اکثر روا رکھتی ہے۔ عالی میرے دوست ہیں اور دوستوں کے بارے میں بے تعلقی سے قلم اٹھانا بہت مشکل امر ہے، معروضیت تو ویسے بھی ناممکن ہے۔ عالی کے دوہے کے قائل ان کے مخالفین بھی ہوں گے، جس شخص نے ایک قدیم سنسکرت یا پراکرتی صنف کو اردو والیا اور اسے اردو اصناف شعری کا حصہ بنا دیا اور اوائل عمر میں ہی رجحان ساز ہونے کا درجہ بھی پالیا، اس کو شاعری سے اور کیا چاہیے لیکن اگر واقعی ایسا ہوتا تو عالی دوسرے دیوان کا نام 'لاحاصل' نہ رکھتے۔ حاصل اور لاحاصل کا کھیل کیا مکمل ہے؟ کیا ابھی کوئی دائرہ ناتمام ہے جو شاعر کے اندر سلگ رہا ہے۔ شاعر کو اکثر اس کا احساس نہیں

ہوگا کہ اس کی مغفرت کس حوالے سے ہوگی اور ہوگی بھی کہ نہیں۔ جب پہلی بار عالی پر قلم اٹھاتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ عالی کی شہرت دوہے سے ہوئی ہے لیکن عالی کا بنیادی محاورہ غزل ہے۔ تغزل کا جوہر عالی کی سادگی میں جاگزیں ہے، دوہا بھی دہلی اور لوہارو کی روایت سے آیا ہوگا، اور بھگتی اور شرنگار رس کا کھیل غزل کے پہلو بہ پہلو کسی اجنبیت کا حامل نہیں۔ حقیقتاً یہ دونوں ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ کب چت پٹ ہو جاتی ہے اور پٹ چت، شاعری یہ کھیل شاعر کو بتا کر نہیں کھیلتی کیونکہ شاعر جب کہہ چکتا ہے تو اس کا کام ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا عمل شروع ہو جاتا ہے قارئین کا، جسے ہم اردو میں 'زمانہ' یا 'عہد' بھی کہتے ہیں۔ وسط بیسویں صدی میں دوہے میں خلا تھا، اس کی بازیافت اس وقت زمانے کو راس آئی۔ شہرت خوشی دیتی ہے مگر ہر خلش کا علاج نہیں۔ میرا خیال ہے عالی کی طبیعت غزل میں بھی برابر زور مارتی رہی، مگر زمانہ کی قبولیت RECEPTION کا عالم نرالا ہے جس کو توقعات کی جس خراد پر اترے اتارے۔ لگتا ہے عالی کی تشنگی برابر بنی رہی۔ پھر دوہا غزل کے مقابلے میں ہے بھی تو حاشیائی کردار، قلب کی بات ہی کچھ اور ہے۔ عالی کی تشنگی کو بڑھاوا ملا ان کی سماجی مصروفیات' خدمتِ خلق، اردو اداروں کی عہدہ داری اور گلڈ اور انجمن کی سرداری و سربراہی سے، نیز کالم نویسی اور اخبار بازی سے۔ کہاں شاعری اور کہاں شوقِ صحافت کی فراوانی اور آئے دن کا بہتا پانی۔ غرضیکہ ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا، اور تشنگی بنی رہی۔ عالی کی اخبار بازی ہو یا اردو اداروں کی صورت گری یا عہدہ سازی، فن کار اچھا ہو اور اُس سے توقع شاعری کی ہو تو کوئی رعایتی نمبر دے بھی کیوں؟ اردو ویسے بھی اس معاملے میں زیادہ روادار نہیں۔ ادھر عالی نے چاہا تو بہت لیکن نہ اداروں کو چھوڑا نہ اخباروں کو، اور حق شاعری کا بھی ادا کرنا چاہا تو اندر کا تصادم اور اضطراب ایک IRONY میں ڈھلتا چلا گیا جو عالی نسبی اور خاندانی وجاہت کی وجہ سے پالکی سے نیچے پیر بھی رکھنے نہیں دیتی اور طعنۂ نایافت بھی سننے نہیں دیتی۔ چنانچہ وہ پہلے ہی سے خود کو ردِ تشکیل DECONSTRUCT کر دیتی ہے۔ دوہا تو دشتِ امکاں میں فقط ایک نقش پا تھا، عالی کی شاعری ایک اضطراب زدہ روح ہے جو تمنا کا دوسرا قدم اٹھانے کے لیے بے تاب رہی ہے، ایسا نہ ہوتا تو اس مجموعے کا نام 'اے مرے دشتِ سخن' ہی کیوں ہوتا۔ مزید یہ کہ آٹھویں سُر کی جستجو بھی آسان نہ تھی — ایک عجیب راگ ہے ایک عجیب گفتگو، اندر کی آگ برابر جلتی رہی۔ اس نے کیا کیا نظمیہ شکلیں اختیار کیں، اس کا ذکر

ذکر کرتے ہوا، پہلے اس حصہ کا [illegible] ہے جس سے حالی کا ایک خاص فنی [illegible]

کی ہے خود شکنی کی، اپنے آپ کو رد کرنے کی، آگے بڑھنے اور خود پیچھے ہٹ جانے کی، یہ فقط حسن کی تغافل آزمائی نہیں جو بے خودی و ہشیاری کو ایک ہی آن میں نبھا لے جاتی ہے بلکہ جو بلند خوئی کے احساس اور حالات و حوادث کے پیش نظر اس احساس کے شکست ہونے یا تکمیل کے امکان اور رد امکان سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا ذکر میں اس لیے بھی چھیڑ رہا ہوں کہ یہ IRONY حالی کے یہاں ایک شعری محرک بھی ہے کہیں ظاہر کہیں مضمر، ظاہر ان نظموں میں جہاں معاصرین کا ذکر آیا ہے اور مضمر ساری شاعری میں۔ بظاہر کچھ نظمیں سوانحی لگتی ہیں لیکن سوانحی نہیں ہیں،

دلِ دیوانۂ من
کہہ نہ افسانۂ من
سننے والوں کو بھلا کیسے یقیں آئے گا ...
ہر طرف کذب و نمائش کا وہ غلبہ ہے کہ سچ مضحکہ اڑوائے گا
ان کے آگے نہیں چلتی ہے کوئی سعیِ فقیرانۂ من

دلِ دیوانۂ من
کہہ نہ افسانۂ من
جیتے جی میرے کھلے گا نہ ذرا گلشنِ ویرانۂ من ...

دلِ دیوانۂ من
کہہ نہ افسانۂ من
آج تک خشک ہے زر دانۂ من
یوں ہی روئے گا عزا خانۂ من

دلِ دیوانۂ من
کہہ نہ افسانۂ من

(اشہب)

یوں تو 'حبِ ادب' میں بھی یہی کیفیت ہے اور 'نذرِ بابائے اردو' میں بھی، لیکن 'نذرِ مشفق خواجہ'

'ایک سادہ سی تقریب' اور 'گواہی' اس باب کی نظمیں ہیں جہاں [illegible] سرشاری کی سطح کچھ گھٹتا ہے اور شعری لطافت اپنا جواز خود بن جاتی ہے۔ 'نذرِ مشفق خواجہ' مزے کی نظم ہے۔ سلیم و انشا کا احوال برسبیل تذکرہ ہے، اصل معاملہ اپنے دردِ دل کا ہے۔ دوست باقی رہے نہ دوستیاں زماں سیل رواں ہے، گزر رہا ہے۔ دوسرے نہیں رہے تو ایک دن شاعر بھی نہیں رہے گا۔ چنانچہ اس کی خواہش ہے کہ جہاں اس کی شاعری کو یاد کیا جائے وہاں دوسرے کاموں کو بھی نگاہ میں رکھا جائے تاکہ پلڑا سبک نہ ہو :

تم پہ حق نہیں اتنا
مانگتا ہوں میں جتنا
میرے بعد جینا ہے
زہرِ زیست پینا ہے
مجھ کو یاد کر لینا
مختصر ہی کہہ دینا
انجمن کے دفتر میں
کالجوں کے محشر میں
ساٹھ سالہ راہوں میں
صبر میں کراہوں میں
جس قدر بھی دیکھی ہے
وہ جو مجھ پہ گزری ہے

غور طلب ہے کہ 'نذرِ مشفق خواجہ' ہو یا 'ایک سادہ سی تقریب' یا 'گواہی'، ان تینوں نظموں میں تصور اختتامِ سفر یعنی موت کا ہے اور اپنی جمع پونجی یعنی شعری کمائی کا یعنی اثاثہ کیا ہے یا پیچھے کیا سرمایہ چھوڑا ہے؟ ان نظموں میں چونکہ منظر کاری بھی ہے اور جذبے کا فشار بھی، تینوں کی ہیئت مثنوی کی ہے جس میں عالی کی قدرتِ بیان کے جوہر کھلتے ہیں۔ ایک تو درد کی زیریں لہر، پھر بے نیازی اور خود شکنی، ساتھ ہی روانی، سلاست اور گھلاوٹ، ملاحظہ ہو :

چلا جو میں تو ملا جلسۂ وداع ملا
کئی ہزار زبانوں کا اجتماع ملا
پھر اپنے اپنے پھریرے ہوا میں لہرائے
اور ان کے سائے میں لاکھوں مغنّیان آئے
پھر ایک وفدِ زانو و قارئین آیا
اور ایک مجمعِ تنظیمِ ناقدین آیا

(ایک سادہ سی تقریب)

اور اس کے بعد یہ انکسار جو دعویٔ کمال کا پہلو بھی رکھتا ہے اور عالی نفسی کا بھی :

میں ہاتھ جوڑ کر ان سب کے سامنے آیا
حضور کیا ہے جو مجھ پر کرم یہ فرمایا
مجھے کبھی نہ کوئی دعویٔ کمال ہوا
نہ مجھ کو کسی سے تقابل کا ہی خیال ہوا
میں آپ سب کا کہاں تک لگا سکوں کا سراغ
مری متاع بھی ہیں بجھتے بجھتے سے چراغ

(ایک سادہ سی تقریب)

س نظم کا اختتام بھی نہایت عمدگی سے شاعرانہ پیرایے پر ہوا ہے کہ مانا جانا نہ مانا جانا، شہرت پانا
ہ پانا یہ سب اضافی باتیں ہیں، اصل چیز تو جذبۂ شوق اور اندر کی تڑپ ہے اور اس میں سے کتنا
ندہ رہ پاتا ہے، اس کی کسی کو خبر نہیں۔ فن تو اصلاً ہے ہی بابِ ناتمام سے، یہ تو احساس کا زخم ہے
ہرا رہنا جس کا مقدر ہے :

تو کیا ہوا کہ ہر اک سمت سے صدا آئی
اور اپنے ساتھ عجب رنگ اک فضا لائی
چل آ کہ تو بھی اسی بابِ ناتمام سے ہے
یہاں تو سب کو غرض اپنے اپنے کام سے ہے

'گواہی' میں اس تخلص نے ایک اور مسئلہ کو چھیڑا ہے اور جیسے بزرگوں سے حالی وغیرہ گراں میں سے بھی بعضے ایک صنف کے پابند نہیں تھے۔ شاعر چاہتا ہے کہ اس نے جو نثر لکھی ہے اس کا حق بھی اس کو دیا جائے۔ یعنی ذہن انسانی کی کچھ تازہ دریافتیں اور ڈسکوریں ایسے ہیں کہ انہیں عوام کی سطح تک عوام کی زبان میں لے جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ہر کسے را بہر کارے ساختند' حالی نے جگہ جگہ جو شعر نکالے ہیں ان کی شعریت کی داد نہ دینا ظلم ہے:

سنا تھا ذہن میں کچھ خام مال ہوتا ہے
اسی میں صد ورق صد خیال ہوتا ہے
ودیعتِ ازلی، گرد و پیش کے احوال
اگر سلیقے سے آمیز ہوں تو وہی مثال
کبھی وہ آب سے اولہ بنا کے دیتا ہے
کبھی وہ کوئلے کو ہیرا بنا کے دیتا ہے
میں اپنی حد میں غزل دوہے گیت کہتا تھا
خود اپنے سحر گلو میں بھی مست رہتا تھا
سوائے اس کے کوئی نثر کا خیال نہ تھا
غمِ عوام جڑوں سے شریکِ قال نہ تھا
خدا گواہ یہ اقرارِ استفادہ ہے
نہیں کہ اپنا ہی کچھ کیف و کم زیادہ ہے
شگافِ سینہ فقط نظم ہی سے بھر نہ سکا
صغیر تھا کوئی فتح کبیر کر نہ سکا
میں ایک ذرۂ صحرائے بے کرانِ سخن
سوائے حسنِ طبیعت ملا نہ علم نہ فن

(گواہی)

یہ سارے مقامات وہ ہیں جہاں آپ بیتی شاعری بن گئی ہے۔ نظم منظوم نہیں کہ دلیل کی تعمیر

کو دیکھا جائے کہ کلیت کو شاعر کے حق میں بحال ہے کہ نہیں اور [illegible] میں ایسی [illegible] بھی ہیں،
تاہم کون ہے جس پر خود شکنی اور دردمندی میں گندھی اس نظم کا جادو نہ چلے گا اور کون ہے جو اس کی
خستگی کی داد نہ دے گا:

ہزار تفرقے، ناخواندگی، خرد بندی
زمیں پہ قبضہ بنامِ حقِ خداوندی
سو ان سے کشمکشِ صد جہات جاری ہے
بحفظِ علم کہ ایک وہ بھی ذمہ داری ہے
ادھر کچھ ایسے بھی قاری کہ ذہن میں خارش
"خراب کردہ جہلے و فارغ از دانش"
تو میں جو مجلہ گہہ شعر میں ہی رہ نہ سکا
سبب وہی ہے کہ بس اتنے بوجھ سہہ نہ سکا
ملی جنھیں نہ کوئی بات قابلِ تعزیر
وہ قبلِ شعر سے ہی اس کی کر گئے تعبیر
وہ زور جتنا عیوب و صفات پر رکھیں
ذرا سی کلیتِ کار پر نظر رکھیں

اس منظرنامے کے بعد آئیے دیکھیں کہ جس نئے طبیعیاتی سائنسی ڈسکورس پر عالی نے دسترس حاصل کی ہے اور جس کو وہ اردو میں لے آئے ہیں، شاعری میں اس کی ترغیبِ ذہنی کا عمل کیا ہے اور اس سے اثر پذیری کی کیا شکلیں بنتی ہیں۔ اس مجموعے کی خصوصیت خاصہ عالی کی شاعری کی ایک نئی جہت ہے۔ مجموعے میں ایسی نظموں کی اچھی خاصی تعداد ہے، لیکن شعری تشکیل کے اعتبار سے میرے نزدیک 'امکان' اور 'تجمی' بے مثال ہیں۔ 'امکان' خلا کے موضوع پر ہے:

خلا خالی نہیں ہے
اس میں ایسے ایسے عنصر بے حدود اس طرح رہتے ہیں
کہ جیسے بعض شاعر [illegible] کی الجھن کے [illegible] ظاہر کرتے ہیں

[illegible]

ابھر کر رقص کرتے ہیں

عناصر کا یہ رقص بغیر آغاز اور بغیر انجام کے ہے بلکہ زماں یا مکاں کا یہ پیمانہ ہی نہیں ہوگا تو ابھر و وصال کی معنویت بھی بدل جائے گی :

اور اس کے بعد یا جب چاہیں ہم اک ساتھ ہی چھپ جائیں
دوبارہ کوئی قالب لیں نہ واپس آئیں
یہ ممکن ہے وہی وصل مسلسل ہو
ہماری نامکمل زندگی یعنی یہ بعدِ اختلاطِ جسم، آغاز و نشاطِ تشنگی، شاید وہاں
جا کر مکمل ہو

'نجی' خاصی طویل نظم ہے۔ متکلم خداوند سے خطاب کرکے اپنے عجز بیان کی معذرت چاہتا ہے کہ اس کی مشقِ سخن تنگ نکلی کہ اس نے دانش کے مینا سے جب بھی سیراب ہونا چاہا اور جس صنف کو جتنا بھی اپنایا وہ مثالِ دلبر پیماں شکن نکلی۔ وہ گنج گہرہائے بزرگاں کا احترام کرتا ہے کہ ان کے دبستانِ مراتب، صد مناقب، سجدۂ تعظیم کے ارکان واجب اپنا اپنا ایک عالم ہیں وہ ان سے فیض اٹھا کر ان سے اونچا جانا چاہتا ہے لیکن :

کہاں ان کے خزانے اور کہاں میرے یہ بے رس بے تراوش، کشتگانِ جہل اور
محرومِ ایمائیت افسانے
جمال و فن سے بیگانے
مودب ان نقوشِ پا سے اک لمسِ جبیں کو بھی غنیمت جان کر تنہا گزرتا ہوں

یہ خود شکنی ایک شعری تحت بیانی بھی ہے جس کے پردے میں آدم اپنے حوصلوں، امنگوں کی بات کرتا ہے :

خداوندا
مجھے تو کم سے کم اتنی ہی صدیاں اور دے
دیکھوں، پڑھوں، سوچوں، لکھوں، کچھ کام کر جاؤں

اگر الزام ہوتے میری [illegible] لاؤں انعام کر جاؤں
نہیں میں یہ نہیں کہتا کہ اب یا جبر آشفتہ میں کوئی کام کر جاؤں
مگر ممکن تو ہے تیرے کرم سے جرم گاہِ زندگی میں خود کو بے الزام کر جاؤں
یہ صدیاں تو الف بے تھیں

خود کو بے الزام کر جانے کی خواہش عالی کی کلیدی خواہش ہے اور اسی نے عالی سے سائنسی نظموں کی جہت کھلوائی ہے۔ اس کے بعد شاعر کہکشاؤں ماوراؤں کی بات کرتا ہے کہ یہ کیسے بنتے اور خلا میں گھومتے رہتے ہیں، ہماری تھیوریوں میں ان کی ساعتوں صدیوں کے پیمانے آتے ہی نہیں، ان کے سامنے سے روشنی گزر جائے تو اس کو بھی اندر کھینچ لیتے ہیں۔ یہ کھیل صدیوں سے جاری ہے اور صدیاں تو الف بے تھیں، اصل ہجے تو ابھی باقی ہے۔ اس کے بعد جلوۂ حسن کے حوالے سے سنگولیریٹی کا قصہ چھیڑا ہے تو توانائی کا مسئلہ گویا قصوں کا قصہ ہے:

کر دیا ثابت توانائی
سمجھ میں آ کے بھی اب تک نہیں آئی
وہ کیا شے تھی
وہ کیا ہے کیوں متحرک ہوئی کیوں پھیلتی ہی جا رہی ہے
کیا کبھی واپس بھی آئے گی جب آئے گی تو اس کی وجہ کیا اور شکل کیا ہوگی

SINGULARITY

اس نظم میں ثابت و سیار اور پھر انتشار کی پوری داستان سموئی ہے۔ اس موضوع پر اس وضع کی دوسری نظم اردو میں نہ ملے گی۔ شاعر ہر صفحۂ ہستی کو الٹ کر دیکھتا ہے کہ مفہوم سے محروم رہنا تو مقدرِ انسانی ہے۔ اب تک صدیوں کا الٹ پھیر تو پہلی یا دوسری کروٹ تھی، کائنات کے رازوں کو سمجھنے کے لیے مزید وقت چاہیے تاکہ ایسی زبان یا ایسا محاورہ بن سکے جو ہر کون و مکاں کے اسرار کی تعبیر پر قادر ہو۔ اب تک کی صدیاں تو محض الف بے تھیں، انسان کی [illegible] کا سفر جاری ہے [illegible]

خیال ایک [illegible] [illegible] [illegible] ایک [illegible]
[illegible] سمجھا مگر پھر بھی نہیں سمجھا

مجھے تو چند صدیاں دے ہی دے جن میں مجھے جتنے بھی حرف و لفظ آ جائیں
انہی سے ایک زباں، تعبیرِ ہر کون و مکاں، اپنی بنانی ہے
مجھے سب [illegible] زرافشاں جس قدر بھی دے گئے اور جو بھی دیں منظور ہے لیکن
مرے دل [illegible] [illegible] کی جو دنیا ہے وہ ماضی حال مستقبل سے وابستہ ہی پھر بھی ...
مگر اس کا [illegible] [illegible] تو تیری تلاش بے کراں ہی کی کہانی ہے
یہ صدیاں تو الف بے تھیں

طویل نظمیہ 'انسان' بھی شعرِ عالی کی نئی جہت کا حصہ ہے۔ سوال [illegible] [illegible] آزاد نظموں کے ساتھ کرنا مناسب ہے۔ 'اے مرے دشتِ سخن' میں 'انسان' کے چار حصے شامل ہیں جو تقریباً سوا سو صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں تین مسلسل ابواب ہیں اور چوتھا حصہ جس کا عنوان 'محسنہ' ہے اس کی ترتیب ہنوز طے نہیں ہے۔ عالی اس نظمیے کو ایک مدت سے لکھ رہے ہیں اور اس کے اجزا وقتاً فوقتاً رسائل و جرائد میں شائع ہو کر توقعات پیدا کرتے رہے ہیں۔ اس پورے نظمیے میں منظر ناموں، کرداروں وغیرہ کی حرکات و سکنات، حلیے اور ڈرامائی متعلقات کو بقول مصنف قاری کی تفہیم و تصور پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ پہلا اور دوسرا باب تقریباً بیس پچیس صفحوں پر مشتمل ہیں، حصہ والا ٹکڑا بھی تقریباً اتنا ہی ہے، لیکن تیسرا باب پچاس صفحوں کو حاوی ہے۔ مکالمے چونکہ منظوم ہیں، پورے نظمیے کو غنائیے کے طور پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ موضوع و مفاہیم کے اعتبار سے [illegible] نادرالوجود اور بلند حوصلہ کاوش ہے، خصوصاً ایسے دور میں جب طویل نظم پر توجہ [illegible] [illegible] [illegible] رسمی شاعری کی ہوڑ سی لگی ہوئی ہے۔ 'انسان' کا کینوس ہی ایسا ہے کہ بہت سی توقعات کو [illegible] [illegible] ہے، لیکن چونکہ نظمیہ [illegible] نامکمل ہے، اس لیے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] طویل نظم کے مباحث [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

طور پر، کیونکہ اس کی یادیں بار بار لوٹ کر آتی ہیں۔ کئی مقامات پر سیما کی آواز مکالمے کو آگے بھی بڑھاتی ہے اور اس میں مزاحم بھی ہوتی ہے۔ نظمیے میں کئی دوسرے نسوانی اور مرد کردار بھی ہیں جو مباحث اٹھاتے اور سوال و جواب کرتے ہیں۔ اسرار اور چند نوجوان احتجاجی صدائیں ہیں اور کئی آوازیں اور ہیولے بھی ہیں جو بار بار ابھرتے ہیں اور ڈرامائی فضا کی تشکیل کرتے ہیں۔ جمالی اور اسرار ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جمالی اسرار کو ذلیل، سیاہ باطن، مکروہ شکل والا کہتا ہے اور اسرار جمالی کو بیوقوف سمجھتا ہے/کہ بس اتنی سی لونڈیا کے لیے مول لی اپنی بھی پائمالی/لیکن حسینہ اس احتجاجی صدا کے بارے میں کہتی ہے/کہ انھیں بھی جمالی سے کم مت سمجھیے/ر جمالی شاعر کا ALTER EGO بھی ہو سکتا ہے اور نظمیہ 'انسان' اس حوالے سے اولادِ آدم کے عذابوں، ثوابوں، خوابوں، امنگوں، حوصلوں خیالوں اور خلا کے رازوں کی داستان ہے:

کوئی مری داستان لکھے
کوئی مری داستان لکھے
جو میری مانند اور لاکھوں شکست کھائے ہوؤں کی تاریخ بھی رہے گی
جنھوں نے کس کس عذاب کو اک بہشتِ امید کی خوشی میں دبا رکھا تھا

بیچ بیچ میں عالی کی حسِ مزاح اور خود شکنی کے چھینٹے بھی ہیں:

میں کیسی الجھن میں مبتلا ہوں
مجھے یہ کیسی روایتوں اور حکایتوں کے سنپولیے اندر سے ڈس گئے ہیں
یہ میری کم مائگی کے قریوں میں کن بزرگوں کے لاؤ لشکر مجھے ڈرانے کو بس گئے ہیں

تاہم شاعر کی بلند حوصلگی لائقِ داد ہے کہ وہ ایسا بیان چاہتا ہے جو اپنی مثال آپ ہو:

جیسے زمیں کے مظلوم باسیوں کا فسانہ خود آسمان لکھے
کوئی مری داستان لکھے!

پہلے باب میں کون و مکاں اور تسخیرِ طبیعیات کی نئی دریافتوں کی طرف شاعرانہ اشارے ہیں، اس کا موثر ترین حصہ اس کا اختتامیہ ہے جب جمالی کہتا ہے:

چلو بھی اب تم ہی اٹھو سیما
مری توانائی طلب سے تمام پردوں کو چاک کردو
یہ پتھروں کی سلیں مری آتشِ تمنا سے خاک کردو

.....

ہوا اگر اس کے بعد کوئی نیا دھماکہ
تو وہ ہمارے لیے ہو جشن ابد اور اک ساتھ ہی چلیں ہم
زمین، شمس و قمر، سدائم
کوئی سمجھتا ہو ان کو تخلیق کوئی کہتا ہو ان کو دائم
یہ میرے جوش غضب کے آگے نہ رک سکیں گے
ہمیں تو وہ دوسرا دھماکہ عطا کرے گا
ہمارے سُر اور سنگتوں کا اک ایسا شبدھ اور ایک ایسا کامل
عجیب عالم
جو آج ان کہکشاؤں کے رقص میں بھی بے بھاؤ اور مدھم
چھپا ہوا ہے

دوسرے باب کی جان وہ مکالمہ ہے جو نسوانیت پر حسینہ اور معینہ میں قائم ہوا ہے۔ حسینہ اپنا دکھڑا روتی ہے اور معینہ ہمت بندھاتی ہے۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ مفاہیم جب موج در موج آتے ہیں تو مصنف مثنوی کا قالب اپناتا ہے اور مست و بیخود ہو کر داد سخن دیتا ہے :

معینہ

فرقِ طبقات ہی نہیں ہے غضب
شاونیت کا ارتقا ہے عجب
کیا لقب کیا حسین چابک ہے
صنفِ نسواں تو صنفِ نازک ہے

کی مقرونہ راہ سے شوری
جسم کی وضع خاص کمزوری
جبکہ اس میں عمل کی طاقت ہے
بارہا زچگی کی قوت ہے

.....

کم نہ تحقیر میں تھا مشرق بھی
اک مثل مغربی بھی خوب چلی
"شاخ اخروٹ عورتیں کتے
جتنا پیٹا انھیں وہ ٹھیک رہے"
پچھلی صدیوں کا جو بھی ماتم ہے
اس صدی میں بھی روشنی کم ہے
ایک مسز پینکھرسٹ پائی ہے
ایک سیموں دی بوار آئی ہے

.....

اپنے ہاں ایک عصمت چغتائی
ان کے ہاں امرتا پریتم لائی
کچھ ادا جعفری کی سی بیاں
عورتوں کو دی عورتوں کی زباں
پھر بھی افواجِ ظالماں ہیں وہیں
ایک صف بھی نہیں بنی ہے ابھی
جنگ کرنی بہت بڑی ہے ابھی

.....

اور یہ عشق وشق کے ہفوات
یہ جو ہے ایک ادارہ جذبات
کچھ کثافت یہاں بھی ہوتی ہے
ان کی تطہیر بھی تو ہوتی ہے
کیوں رہے یہ چمن مراعاتی
رنگ و بو اس کے ہیں مساواتی
نعرہ یہ ہے رعایتیں مت دو
جو ہمارا ہے ہم کو واپس ہو

حسینہ

سیدھی سادی سی ایک حقیقت ہے
مجھ کو اک شخص سے محبت ہے
وہ کسی اور کا اسیر ہوا
چھوٹنا مجھ سے ناگزیر ہوا
پھر بھی ہر وقت اس کی یاد آئے
اور ہر ہر نفس میں بس جائے
میں کہ خود ایک حسین لڑکی ہوں
پڑھتی لکھتی ہوں اور سوچتی ہوں
اہلِ جاگیر کی نشانی بھی
یعنی معروف خاندانی بھی
کیسے کھو دوں جو اس کو پا نہ سکوں
کیا کروں گر اسے بھلا نہ سکوں
.....
ایسی باتوں کی کیا زباں ہوگی
کیا کچھ آرائش بیاں ہوگی

سیکس کی شرح و داستان ہوگی
یا کوئی اور ایں و آں ہوگی

.....

کیا نہیں میرے دکھ بھی باہمی

یہ اقتباسات قدرے طویل ضرور ہو گئے، لیکن یہ بحثیں کتنوں نے اٹھائی ہیں اور اس حسن معنی اور لطفِ کلام کے ساتھ۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دیگر مباحث بھی کس سطح پر ہوں گے آفرینش کائنات اور ثوابت وسیار کے لامختتم اسرار، انسانی فطرت، آگہی، خالق کون و مکاں، مذاہب عالم کی روایتیں، فلسفوں کے سلسلے، تناسخ، تشکیک اور جیسیوں دوسرے مسائل تیسرے باب میں آئے ہیں۔ یہ سب ایک طرح کی خود کلامیاں بھی ہیں کہ عالی نے یہ سب مباحث سازِ شوق کی دھن پر چھیڑے ہیں،

نہ بھولیو کہ مسلسل ہے سازِ شوق کی دھن
بس ایک تار سے ساری ردائے زیست نہ بُن
سرورِ آگہی دیں گے نہ چند پیمانے
ہزارہا خُم مستی ہزار مے خانے

تاہم اردو نظم میں سائنسی فکر اور خرد افروزی کی بنا ڈالنے کو یہ چند پیمانے ہی بہت ہیں۔ شاعری اس سے زیادہ کی متحمل ہو بھی نہیں سکتی۔ عالی نے جسے عذابِ خرد پرستی کیا ہے، اس آتش کدہ خیال سے نکل کر عالی نے شاعری میں ایک پوری نئی گزرگاہ کو روشن کیا ہے۔ فکر و جذبہ نیز تخیل و تجرید کی اس آمیزش سے شعر کاڑھنا آسان نہ تھا۔ عالی کی جگر کاوی اور سینہ فگاری کی داد آگے چل کر ایک زمانہ دے گا۔ 'انسان' اگر مکمل نہ بھی ہوئی تو بھی ایک مثالی نمونہ کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔

اب آخر میں کچھ ذکر عالی کی مقبول صنف دوہے کا بھی ہو جائے جو عالی کے شعور کی زبان ہے اور پھر چلتے چلاتے ایک جھلک غزل کی جو عالی کے لاشعور کی زبان ہے۔ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ عالی موسیقی سے دوہے کی طرف گئے یا دوہے سے موسیقی کی طرف آئے ان دونوں میں گہرا رشتہ

ہونہ ہو، عالی کی سائیکی میں سنگت کے سُر گھلے ہوئے ہیں۔ اس کی نشانیاں جگہ جگہ 'اے مرے دشتِ سخن' میں بکھری ہوئی ملتی ہیں اور ان کی معنویت جیسی اس مجموعے میں نکھر کر سامنے آئی ہے اس سے پہلے ایسا نہ تھا۔ ویسے تو عالی نے اس کو سربستہ راز رہنے دیا ہے لیکن 'گھنگھرو' سے پتہ چلتا ہے کہ مسلک خواہ یہ رہا ہو کہ ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو، لیکن یہ سلسلے حضرت دہلی سے پونہ اور حیدرآباد تک پھیلے ہوئے تھے / تب سے مری روح میں گھنگھرو / کبھی بجتے ہیں کبھی روتے ہیں / یعنی کچھ ایسی آوازیں بھی ہوتی ہے جو ماورائے سخن ہوتی ہیں:

خود جو میں گے پائل گھنگھرو ٹھمری اور کھماچ
سُر مرے چاکر گت تیری داسی میں گاؤں تو ناچ

ایک نظم راگ 'بجے جے ونتی' پر ہے جسے استاد فیاض خاں مرحوم کی نذر کیا ہے / من جھومے لہرائے / رے شیاما / یاد تمھاری آئے، رے شیاما / سُر بھی ایک سعادت ہے جس کی معنویت فقط اس پر کھلتی ہے جسے یہ دولت نصیب ہو۔ عالی نے یہ مسئلہ 'سُر کیسے بنا' میں چھیڑا ہے۔ اسی طرح 'نذرِ امیر خسرو' اور 'نذر شاہ لطیف' خاص ٹھاٹھ میں ہیں / یہ کافی ٹھاٹھ کی سندر راگنی / مدھم اور کھرج میں گاؤں ــــــ ڈیرے جاؤں / بلاشبہ یہ نغمے وہ ہیں جو ہر روح میں نہیں گونجتے۔ دہلی کے دو تاریخی واقعے میری یادداشت کے ہیں، ایک موقع پر میں شریک تھا دوسرے میں میں شریک نہ تھا۔ عالی کا قیام میرے یہاں تھا، ان کے ایک دوست تھے رجّی (راجندر کمار) بے حد باذوق انسان، زبردست حسِ مزاح کے مالک، باتوں باتوں میں اُڑتی چڑیا کے پر کتر لیتے تھے، جیوتش بدیا کے گُنی، جوہریوں کے جوہری، جیمیات ریجنسی میں ٹھکانہ تھا، امریکی یورپی بالکائیں طواف کرتی تھیں، بہرحال سنگیت کے ایسے رسیا کہ کوئی استاد کیسا کم آمیز ہو، رجّی کی سب سے آشنائی تھی۔ (افسوس آں قدح بشکست و آں ساقی نماند) عالی سے ایسی گاڑھی تھی کہ عالی دہلی میں جہاں ہوں جس جگہ ہوں، یہ کھوج نکالتے اور قدرِ مشترک فقط اتنی تھی کہ راگ انوراگ سنگیت کے دونوں رسیا۔ بہرحال مشہور فلم اسٹار کبیر بیدی کے یہاں محفل تھی جس میں پروتما بیدی تو تھیں ہی، مشہور اداکارہ اور کسی زمانے کی شعلۂ جوالہ وجینتی مالا بھی بھارت ناٹیم کر رہی تھیں۔ انھیں جو پھول بھینٹ ہوئے تھے، جب عالی جی کا تعارف کرایا گیا تو انھوں نے وہ پھول عالی جی کو پیش کر دیے۔

'کالی داس نے شکنتلا کے' والے دوہے اسی موقع کی یادگار ہیں۔ ان دوہوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ باوجود شدائد کے ہندوستان اور پاکستان کی دوستی کی آس سنگیت کی مٹھاس میں کی گئی ہے :

کلا جہاں ہو پیار کریں گے اگر لیا پہچان
کلا کا سورج دیش نہ دیکھے وہ جگ بھر کی جان
ہندوستان اور پاکستان پہ سے کالے کیوں آئے
آج نہ سمجھیں کل سمجھیں گے حالی کے لوجہائے
جنتا بے بس نیتا بے رس کیسے ملے مٹھاس
اے دونوں ہمسایو پھر بھی گھوٹتے رہنا آس

دوسرا موقع وہ ہے جب حالی دہلی کلاتھ مل کے مالک لالہ جنسی دھر کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے، موریہ شیرٹین میں استاد اللہ رکھا اور طبلہ نوازی کے نوجوان جادوگر ذاکر حسین کا پروگرام تھا۔ حالی کی نظم 'یہ خسرو کی ایجاد' جس میں دیولویں، ضربیں، گونجیں، ٹنک جھونک، خالی وغیرہ حالی نے کچھ نہیں چھوڑا، اسی موقع کی نظم ہے جب ذاکر حسین کی انگلیوں کے رقص نے سماں باندھ دیا تھا۔ حالی کی تخلیقیت کا موسیقی سے جو رشتہ ہے، اس بارے میں غزل کے ان دو شعروں میں بھی بہت کچھ کہہ دیا ہے :

اتنی بڑی بزمِ موسیقی میں تیری
اپنی بھی لے مدھم مدھم کافی ہے
جیون راگ کے تان پلٹ کیا سمجھو گے
حالی صاحب تم کو سرگم کافی ہے

سُر سرگم سے حالی کا جو رشتہ ہے اسی کے پیش نظر ذیل کے دوہوں کی لفظیات اور اصطلاحوں اور ضرب سازی پر غور کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔

مجھ میں کچھ سُر کھوئے ہوئے ہیں وہی لگائیں آگ
نا یہ پہاڑی نا بھٹیالی یہ ہے دوہا راگ
سُر اور شبد اور دھیان کی اگنی شعلے جن کے لاکھ
خسرو پر جو جلیں پتنگے حالی ان کی راکھ

ان دوہوں کو مزید دیکھیے کہ اوّل تو عالی نقطے گننے والوں کو کس خوبی سے لاجواب کر رہے ہیں کہ چیزیں جب ایک کلچر سے دوسرے کو منتقل ہوتی ہیں تو نہ صرف وضع قطع بدل جاتی ہے بلکہ جمالیات بھی کیا سے کیا ہوجاتی ہے۔ اور شاعری ہو یا سنگیت سارا کھیل رس یعنی تاثیر کا ہے، یہ نہیں تو خالی لفظوں سے کچھ نہیں ہوتا:

تانپورہ بھی گھر میں رکھا سارنگی بھی لائے
اے بھئی گائک سُر کے بنا سُر کھیل نہ کھیلا جائے
طبلے رے طبلے تیری گمک سے پڑے ہے دل پر چوٹ
پگلے رے پگلے یوں بھی نہ ہو تو ہم دونوں میں کھوٹ
میرے ماترے گننے والے تو سچا پر یار
جب خسرو کے ہاتھ سے گزری وینا ہوئی ستار

یہ تو سنگیت سے رشتے کی بات تھی، ورنہ دوہے میں عالی کی جو حیثیت ہے، وہ ایک ایسی سچائی ہے جس سے کوئی کافر بھی انکار نہیں کرسکتا (ویسے سچی داد دینے والوں میں ایک کافر بھی ہے) عالی کے دوہوں، عشق و عاشقی کے پیراؤں، پریم رس اور بھگتی رس کے بارے میں اتنا لکھا گیا ہے کہ سامنے کی باتوں کی تکرار عبث ہے، یہ فصل کبھی کی کٹ چکی اور اب تو اٹھا چکے ہیں زمیندار ان زمینوں کو، سوائے اس کے کہ سرِ دست زیرِ نظر مجموعے سے میں اپنی پسند کے کچھ دوہے نشان زد کرلوں۔ ان کی معنویت اکہری نہیں، اور اس بارے میں فقط اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میرے نزدیک یہ تمام دوہے اچھے خاصے پولیٹیکل ہیں اور مٹی سے جڑے ہوئے ہیں:

ایسے تجھے بنا کر اتنے خوش تھے اور حیران
تیرے من میں نرمی رکھنا بھول گئے بھگوان

گوری تیری بھینٹ کو شبد اور دھیان کہاں سے لائیں
سندرتا کی سبھی مثالیں خود تجھ سے شرمائیں

جتنا راج بھی راجا جیسا اصل بھی نہ پائے
جو آنکھوں کی سوئیاں نکالے وہی رانی بن جائے

جب تک سمے نہیں دیتا ان پیتاؤں کو چھانٹ
تاش کے ہیں وہی باون پتے جیسے بھی دو بانٹ

دوڑنے والو دوڑو پر یہ دھیان نہ جانے پائے
آخر میں بس وہی جیتے گا جس کو سمے جتائے

میں نہیں کوئی کشٹر پنتھی سنو مرا اودھیائے
مسجد کو مندر کہنے سے خدا نہ بدلا جائے

پھر بھی دوہا دوہا ہے اور غزل غزل۔ اتنا تو پہلے کہہ چکا ہوں کہ غزل عالی کے دل کا چور ہے
منل بیچے ہیں، دوہے کی سندرتاؤں اور راس لیلاؤں کو انھوں نے جوانی ہی میں مار رکھا تھا،
یٹر خوباں سے بھی جاری رہی، گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔ یہ حسرت بھی شاعری میں۔ بڑے
سے کام کرالے جاتی ہے۔ دوہا عالی کی دھرتی ہے تو غزل عالی کی زمین ہے۔ عالی کی درویش
منت قلندری نے دھرتی سے نبھائی ہے تو زمین سے بھی ناتہ نہیں توڑا۔ البتہ آٹھویں سُر کی
اش میں انھوں نے زیادہ خونِ جگر نظم میں کھایا ہے۔ اس کم گھی کے باوجود جب جب غزل
بی ہے، لطف واثر اور آزادگی و بے نیازی کا چشمہ پھوٹ بہا ہے۔ ان شعروں پر کس کی نگاہ
ٹھہرے گی:

ساری رات ستاروں آگے کیا رونا
صبح ہی کرلے گریہ شبنم کافی ہے
ابھی ترے انکار پہ کیوں روؤں مجھ میں
اپنے آپ پہ ہنسنے کا دم کافی ہے

لطفِ نگہ کی خواہش تھی سو کب کرتے
آج تلک وہی چشمِ برہم کافی ہے

اس غزل میں کراچی کا اشارہ نہ بھی آتا تو بھی فضا کہہ رہی ہے کہ کس درد نے یہ شعر کہلوائے ہوں گے،

دوڑو کہ دے کشوں کے شرارِ نفاق سے
اک آگ سی خبر ہے کہ مے خانہ جل گیا

محدود رکھ نہ اپنے سیاق و سباق میں
ہر خواب کی قسم کہ ہر افسانہ جل گیا

مابین والیانِ چمن کیا تپش ہے یہ
ایک ایک میرے پھول کا زردانہ جل گیا

روکو یہ آگ ورنہ کراچی کے ساکنو
جنت سا ایک شہر جمیمانہ جل گیا

آبِ حیات جیسے وہ معمار واپس آئیں
دیکھیں کہ کتنی جلد یہ کاشانہ جل گیا

جس طرح دوہوں کا حصہ میں نے اپنے پسندیدہ دوہوں پر ختم کیا تھا، اب شعروں کے انتخاب سے رسوا ہوتا ہی ہے تو پھر پسندیدہ غزل بھی سہی۔ ملاحظہ ہو عالی نے غالب کی زمین میں بہ تغیر قافیہ کیا گل بوٹے نکالے ہیں، ان اشعار میں برش و روانی اور جزالت و خستگی اس درجہ ہے کہ بہائے لیے جاتی ہے اور پھر انسان سوچتا ہے کہ حسن و لطافت کی جوہر چھائیں سی گزر گئی، اس کی معنویت کے ہجے تو کیے نہیں:

گزر گیا ہے جو وقت اس میں جا کے دیکھتے ہیں
طرحِ قبولِ غزل آزما کے دیکھتے ہیں

دکانِ کم سخنی کی بھی منفعت مت پوچھ
ہم اپنے آپ کو برسوں گنوا کے دیکھتے ہیں

ہر آدمی پہ ہوتی ہے وحی کائنات ارزاں
سب اپنے نور سے جلوے خدا کے دیکھتے ہیں

سنا ہے جب سے کہ تحریر خود کو لکھوائے
مجھے ہٹا، مرا دیوان اٹھا کے دیکھتے ہیں

دلِ تباہ و فسردہ تمھیں قبول نہیں
کہو تو عظمت و اضافت ہٹا کے دیکھتے ہیں

ہم اہلِ بزم کو کیوں اپنے اعتماد میں لیں
کہ وہ بھی تو ہمیں نظریں جھکا کے دیکھتے ہیں

جن اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا
انھیں یہ سسّی و پنہوں سنا کے دیکھتے ہیں

عالی نے بہت پہلے کہا تھا / کوئی نہیں کہ ہو اس دشت میں مرا دم ساز / ہر ایک سمت سے آتی ہے اپنی ہی آواز / عالی کی شاعری کی غالب کیفیت خود کلامی کی ہے، اور اب تو انھوں نے دشت سخن کو آواز دی ہے، ان کی تحت بیانی بھی اسی حوالے سے ہے، مرزا غالب اور خواجہ میر درد دونوں سے ان کا رشتہ ہے، ایک سے ددھیالی دوسرے سے ننھیالی، کلاسکی رچاؤ میں اس روایت سے اثر لینا برحق، لیکن راہ عالی نے ہمیشہ اپنی لی ہے۔ اختر الایمان ان کے دلی کالج کے ساتھی تھے، ان سے دوستی بھی بہت تھی، اور اپنے عہد پر اختر الایمان کا اثر بھی ہے، لیکن نہیں ہے تو عالی پر۔ عالی فیض، راشد، میراجی سب کا احترام کرتے ہیں لیکن وہ مانتے صرف میراجی کو ہیں۔ ایک جگہ کہا ہے / میراجی کو ماننے والے کم ہیں لیکن ہم بھی ہیں / فیض کی بات بڑی ہے پھر بھی اب

ویسا کون آئے گا / لیک اور نظم ' جو بولے مارا جائے ' میں صاف اقرار کیا ہے کہ سب تو میرا جی کو بھول گئے، لیکن مجھ جیسا معتوب زماں میرا جی کو یاد کرتا ہے :

اب فیض بھی ہیں اور راشد بھی
وہ بہت بڑے پر میرا جی !
ہاں میرا جی وہ چمکتے ہیں
کیا کیا ہیرے کیا کیا موتی کس شان کے ساتھ دمکتے ہیں !

میرا جی سے یہ نسبت کس حوالے سے ہے ؟ بقول میر / کرے ہے جس کو ملامت جہاں وہ میں ہی ہوں / اجل رسیدہ، جفادیدہ، اضطراب زدہ / اس ملامتیہ احساس کا کچھ رشتہ (عالی جی کے اشرافیہ سے ہونے کے باوجود) ان کی خود شکنی، بے نیازی اور خستگی سے ہو سکتا ہے، یا پھر میرا جی کا غیر رسمی نرم لہجہ، یا تجربیت یا تازہ کاری، یا پھر دھرتی کا رس جس اور لوک رشتوں کی جڑوں میں اترا ہوا ہوتا، بہر حال مطابقتیں یا جزوی مناسبتیں اتنی سادہ نہیں ہوا کرتیں کہ حتمی طور پر بیان میں آجائیں۔ عالی کا رول ماڈل جو بھی رہا ہو، انھوں نے شعر کی وادی میں اپنی راہ سینے کے بل طے کی ہے اور اپنی ڈگر الگ بنائی ہے۔ دوہا نگاری کو اردو میں اس طرح رچا بسا دینا کہ وہ اردو کی صنف ہو جائے، عالی کا ایسا تاریخی کارنامہ ہے جس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ لیکن انھوں نے اس پر قناعت نہیں کی، غزل تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہے، مثنوی کو بھی انھوں نے بہت نبھایا اور اب نظم میں سائنسی فکری جہت کھول کر ایسا معنی خیز تخلیقی تجربہ کیا جس کے آئندہ امکانات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری میں جو کچھ ہوتا ہے اندر کی آگ سے ہوتا ہے۔ عالی کا کہنا ہے کہ ' سات سروں کی آگ ہے آٹھویں سُر کی جستجو '، آٹھویں سُر کی جستجو گویا ناممکن کو ممکن بنانے کا عمل ہے، اور یہی سچی شاعری کا منصب ہے، جس کا عزم عالی نے کیا ہے۔

محبِ گرامی، آداب!
جناب ضیا جالندھری کی ایک نظم بعنوان "عرضداشت" پیشِ خدمت ہے۔
ہمارے ملک کے معتبر دانشور، جناب الطاف گوہر نے اپنے ایک کالم میں اس نظم کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے ضیا صاحب کی زبانی سماعت فرمائی۔ نظم پڑھی اور جو حزن و ملال کی کیفیت اس حقیر فقیر پر طاری ہوئی تھی چاہا سرمایہ احباب کو بھی اس میں شریک کیا جائے۔ سو نظم پیشِ خدمت ہے۔ التماساً عرض ہے کہ محترم ضیا صاحب سے کبھی ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا اور نہ کبھی خط و کتابت، ان کا ایک ادنا قاری ہوں۔ والسلام۔

نیازمند
ضمیر نیازی
۱۷ جون ۱۹۹۸ء

عرضداشت

اک بھیانک گرج اور اچانک
دھوئیں کے شجر
خاک سے اوجِ افلاک تک چھا گئے
اک دھماکا ہوا
اور زمیں کے پرخچے اڑے
بحر و بر، کوہ و دشت
آگ کے دیو ہیکل پرندوں کی صورت
خلاؤں میں گرتے بھٹکتے ہوئے بجھ گئے
اور آدم کی اولاد کا آخری کارنامہ مکمل ہوا

☆ ☆ ☆

عین اس وقت ابلیس نے عرش پر حاضری دی،
نگاہوں میں شوخی کا موہوم پرتو
لبوں پر تبسم کی ہلکی جھلک تھی
بڑے عجز سے سر جھکائے ہوئے عرض کی
یاد تو ہوگا انکار کے اولیں روز ہی
قدسیوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا
کہ نوعِ بشر فتنہ جو، فتنہ پرداز ہوگی
سو دیکھا کہ یہ خاک زاد آج تک
کیسے کیسے بہانوں سے
اپنی بہیمانہ خصلت کو تسکین دیتا رہا

☆ ☆ ☆

میں تو بدنامِ ترغیب تھا ہی مگر
اس کی ہر طرزِ ایجاد میرے لیے درسِ استاد تھی
خیر کے نام پر
قتلِ انصاف و خونِ عبث
زور و زر کی ہوس
دل کی پُرفن سیاہی
جنگ، وحشت، تباہی
تو اب میری درخواست ہے
پھر کوئی ایسی تخلیق پیشِ مشیت اگر ہو
تو اس جنس کو
کوئی ایسا جوہر ملے
جو مجھے بھی فنا کر سکے

ضیا جالندھری

مطبوعہ: روزنامہ نوائے وقت ۱۴ر جون ۱۹۹۸ء

باقر مہدی
ای/1۔روی درشن' کاٹر روڈ
باندرہ(ویسٹ)'ممبئی۔۵۰

ایٹمی سناٹے میں گونجتی فریاد!

(بھارت رتن عبدل کلام کے نام!)

کتنا ہشیار ہے۔ بے باک ہے تو
"ایٹمی کھیل" میں کوئی نہ بچے گا لیکن
ہندوپاک میں یہ "جشن قیامت" کیوں ہے؟
جانتے ہو کہ کسی جنگ کا خطرہ بھی نہیں۔؟
کب سے ہم دونوں (ہندوپاک)
اپنی بے معنی سی نفرت کا چراغاں ہی کیا کرتے ہیں؟
دشمنی/دوستی۔ لفظوں کے کھلونے تو نہیں؟
ایک وحشت سی ہر اک سمت ہے چھائی لیکن
کون سرگوشی کی بے چینی یہاں سنتا ہے؟
سر پھرے لاکھوں ہیں۔ اتنا تو سنو!
مفلسی ٹھوکریں کھاتی ہوئی پھرتی ہے
ہر اک شہر بہ شہر۔!
بے کسوں کی ابھی تو۔ آواز سنو!
ہم تو بے جان سے سایے ہیں ہمارا کیا ہے؟
کتنے معصوموں کے دل خوف سے تھراتے ہیں
اک ذرا۔ ہوش میں آؤ۔!
تو ہے۔ حکمرانوں کا "اسیر"
پھر بھی۔ بے معنی سی فریاد سنو!
یہ میرا دیش ہے۔ گوتم کی زمیں
اور گاندھی کی بھی کچھ لاج رکھو!
وقت۔ اک دن کہیں "سفاک"
نہ کہیں دے تجھ کو؟
میں ہوں۔ اک شاعر درماندہ
مری بات سنے گا نہ کوئی راہنما۔!

گیان چند
3262 Oakleaf chino Hills
CA 91709 (U S A)

غزل

پھرتا ہوں میں گھاٹی گھاٹی صحرا صحرا تنہا تنہا
بادل کا آوارہ ٹکڑا کھویا کھویا تنہا تنہا

پچھم دیس کے فرزانوں نے نصف جہاں سے شہر بسائے
ان میں پیر بزرگ ارسطو بیٹھا رہتا تنہا تنہا

کتنا بھیڑ بھڑکا جگ میں ' کتنا شور شرابا' لیکن
بستی بستی' کوچہ کوچہ' چپہ چپہ تنہا تنہا

سیر کرو باطن میں اس کے ' کیسا کیسا کمبھ لگا ہے
تاک رہا ہے دور افق کو جو بیچارہ تنہا تنہا

سیر تماشا کرنے والے سیاحو! یہ بھی سوچا ہے؟
گڑیا گھر کو ڈھالنے والا خود ہے کتنا تنہا تنہا

کوئی نہ اس کا حال خبر دے' کوئی نہ اس کی جانب دیکھے
اک بنجارہ گھوم رہا ہے قریہ قریہ تنہا تنہا

ڈار کے اوپر چپ چپ بیٹھا' بچھڑا گرگل کا جوڑا
مانس کی بستی میں آکر خود کو پاتا تنہا تنہا

کیسی جنم مرن کی بھومی' کس کی دنیا' کس کا یہ گھر؟
ریل کا ڈبا' رین بسیرا! آتا جاتا تنہا تنہا

دھوم مچی ہے' چھوٹ رہے ہیں شہر میں رنگوں کے فوارے
بیچ میں اک قصباتی لڑکا سہما سہما تنہا تنہا

دھرتی اور امبر پر دونوں کیا رعنائی بانٹ رہے تھے
پھول کھلا تھا تنہا تنہا' چاند اگا تھا تنہا تنہا

علی سردار جعفری

اردو اور غالب دونوں کو گھر چاہیے

وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے ۵/جون ۱۹۹۸ کو مشہور و معروف اردو شاعر علی سردار جعفری کو ۱۹۹۷ کا گیان پیٹھ انعام پیش کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جعفری صاحب کو یہ انعام دے کر ہم خود اپنی عزت بڑھا رہے ہیں۔ جعفری صاحب نے اپنے خطبے میں اردو شاعری کی سیکولر سرشت٬ ہند اسلامی تہذیب کی تشکیل میں اردو کے کردار٬ تقسیم ہند کے ہاتھوں اردو کو پہنچنے والے نقصان٬ فرقہ وارانہ اتحاد کی اہمیت اردو اور غالبؔ کی بے گھری اور نیوکلیر جنگ کے خطرات جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ اس خطبے کی اہمیت کے پیش نظر اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

سارے ہندستان میں اور ہندستان سے باہر اس فیصلے کا خیر مقدم بہت گرم
سے کیا گیا' صرف بعض حلقوں کی طرف سے یہ شکایت آئی کہ انعام تاخیر سے ملا ہے
میں ان احباب سے متفق نہیں ہوں' جو انعام ہر سال اٹھارہ زبانوں کے درجنوں ادیبو
سے صرف ایک ادیب کو دیا جاتا ہے۔ اس میں بہت سے حق دار تقدیم و تاخیر کا شکار
ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے دس بارہ سال پہلے اتنی مسرت نہ ہوتی جتنی اب
اگر اس انتہائی اہم انعام کو حاصل کرنے کی آرزو اور تمنا ہو تو تاخیر میں لذت انتظار
اگر نہ ہو تو اپنی بے نیازی کے لیے حیرت اور استعجاب کا تحفہ ہے۔

مجھے سب سے بڑی مسرت اس بات میں محسوس ہو رہی ہے کہ ۱۹۹۷ء غالب
دو سو سالہ جشن ولادت کا سال ہے۔ اس قران السعدین کے ساتھ ۱۹۹۷ء کے گیا
انعام سے میرے نام کا وابستہ ہو جانا میری خوش نصیبی ہے۔ دو اچھے ستاروں کے ایک
میں جمع ہونے کو قران السعدین کہتے ہیں جس برج سعادت میں غالبؔ کی پیدا

[illegible]

[illegible] ملک کے محب وطن شاعروں کو [illegible] کے جرم میں [illegible] گرفتار [illegible]

[illegible] حسین اور چلانے والے رسالے (پنجاب) میں غالب کے دو شعروں سے [illegible] گرفتاری کا استقبال کیا:

> گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
> یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
> خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
> ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبراویں گے کیا

اردو نہایت خوب صورت اور دل آویز زبان ہے۔ اس کے پیرایہ بیان [illegible] استعاروں میں اتنی وسعت ہے کہ ان کے اندر ایک دنیائے معنی آباد ہے اور وقت ضرورت ہر موقع، ہر محل، ہر کیفیت، ہر مزاج کا شعر زبان پر آ ہی جاتا ہے اور انسانی جذبات کی کشاکش میں ایک ہی لفظ طرح طرح کے معنی اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے دو عاشقانہ شعر میری گرفتاری پر اسی طرح صادق آئے جیسے اسی موقع کے لیے کہے گئے ہوں۔ اردو شاعری نے اپنے جمالیاتی سفر میں ملک اور قوم کے سیاسی سفر سے بیزاری اور بیگانگی کا انداز کبھی اختیار نہیں کیا۔ اس کے پاس صوفیانہ روایت کا جو ورثہ ہے اس میں مذہبی پیرو کری اور دنیوی پیرو کری دونوں سے اجتناب شامل ہے۔ شیخ، واعظ، زاہد، محتسب، ملا اور اسی قبیل کے دوسرے کردار اردو شاعری کے [illegible] ہیں۔ ان کی تنگ نظری، انتہا پسندی، ظاہر داری، مکاری اور خود پسندی پر خوب طنز کیا ہے۔ ان کے تصورِ مذہب اور تصورِ جنت و دوزخ، عذاب و ثواب سب کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ ان کے مقابلے پر رندوں اور عاشقوں کی دنیا ہے جس کے دل انسانی ہمدردی سے سرشار ہیں۔ خدا تک پہنچنے کے لیے انسان سے محبت کرنا ضروری ہے۔ سب سے بڑا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کا دو [illegible] میں پیدا کیں، کئی تشبیہیں نئے استعارے نئے شعری پیکر، نئی فکر کے لئے [illegible] بیسویں صدی تک اردو زبان ترقی کی اس منزل تک پہنچ گئی تھی کہ اعلا علوم [illegible] ذریعے تعلیم بن سکتے۔ اس کے بعد اقبال اور پریم چند کا زمانہ آجاتا ہے اور اردو زبان و [illegible] بیسویں صدی میں داخل ہو جاتے ہیں۔

میرے نزدیک جدید دور کی ابتدا غالب کی پیدائش سے چالیس سال پہلے ۱۷۵۷ء میں پیدا ہوئی تھی جب پٹنہ کے شاعر راجا رام موزوں نے جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد ایک شعر میں نہایت دل سوز مرثیہ کہا تھا:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

یہ ہندستان کی غلامی کی ابتدا تھی جس کی تکمیل ۱۸۵۷ء میں پہلی جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد ہوئی اور ملکہ وکٹوریا قیصر ہند کا لقب اختیار کر کے ہندستان کی مہارانی بن گئی۔ ۱۷۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ۱۹۰ برس اردو شعر و ادب کے سب سے زیادہ زریں سال ہیں۔ اس زمانے میں اردو نے اپنا جمالیاتی کردار بھی ادا کیا ہے اور سیاسی کردار بھی۔ اردو کے بے شمار ادیب اور شاعر جنگ آزادی کے سپاہی رہے ہیں۔ ان میں بعض ایسے ادیب اور عالم بھی شامل ہیں، جنھیں اخبار شائع کرنے کے جرم میں قتل کیا گیا یا جلا وطنی کی سزا دی گئی۔ ان میں سب سے نمایاں مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین آزردہ کے نام ہیں، جو اپنے وقت کے بڑے عالم اور غالب کے گہرے دوست تھے۔

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آزادی کے پچاس سال بعد بھی غالب اور اردو دونوں بے گھر ہیں۔ اردو فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہو گئی۔ تقسیم ہند نے سب سے زیادہ نقصان اردو زبان کو پہنچایا ہے۔ اگر اس وقت غالب کے دو سو سالہ جشن اور آزادی کے پچاس سالہ جشن کے موقع پر غالب کو گلی قاسم جان میں اپنا گھر مل جائے اور اردو کو شمالی ہندستان میں ایسے علاقے جہاں سے وہ ہندی کے ساتھ دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے زندہ رہ کر ترقی کر سکے تو بہت بڑے نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔ اس کی مثال بہار کی ریاست میں موجود ہے، جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ غالب اور اردو ایک ہی [illegible] کی پیداوار ہیں اور وہ شمالی ہندستان کی مشترک میراث ہیں۔ فرقہ وارانہ سیاست نے [illegible] کو بھی زخمی کر دیا ہے۔

[illegible]
اتحاد کا تصور کر سکتے ہیں اور جب وطن کے باغ میں مختلف تہذیبوں، مختلف مذہبوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔ میرے ذہن میں اتحاد اور دوستی کا جو تصور ہے، وہ بہت حسین ہے۔ میں اس کی جمالیاتی فضا کو ایک کہانی کی شکل میں بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

برسوں پرانی بات ہے، میں نے ایک بنگلہ کہانی پڑھی تھی۔ اب نہ تو کہانی کا نام یاد ہے، نہ اس کا عنوان، صرف کردار یاد ہیں:

درگا پوجا کا زمانہ تھا۔ بنگال کے ایک گاؤں میں دوپہر ڈھلنے کے بعد کچھ لڑکیاں تالاب میں نہانے جا رہی تھیں۔ راستے میں ایک چوڑی والا ملا۔ منیہار کی ٹوکری میں کانچ کی رنگ برنگی چوڑیاں دیکھ کر لڑکیاں تڑپ اٹھیں اور چوڑیاں پہننے کے لیے بیٹھ گئیں۔ منیہار کو پیسے دے کر سب ہنستی، کھیلتی تالاب کی طرف چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد منیہار نے دیکھا کہ ایک بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں والی لڑکی خاموش اور اداس کھڑی ہے۔ اس نے پوچھا کہ تم نے چوڑیاں کیوں نہیں پہنیں، تو لڑکی نے جواب دیا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں، اگر ادھار دے دو تو پہن لوں گی۔ تم گاؤں میں جانا اور مندر کے پجاری سے پیسے لے لینا، کہنا کہ تم نے اس کی بیٹی کو ادھار چوڑیاں پہنائی ہیں۔ وہ اس پر راضی ہو گیا اور لڑکی کی دونوں کلائیوں کو لال لال چوڑیوں سے سجا دیا۔ وہ خوشی خوشی تالاب کی طرف چلی گئی اور منیہار گاؤں کے مندر کی طرف۔ لیکن جب پجاری سے بات کی تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب پجاری نے کہا کہ میرے تو کوئی بیٹی نہیں ہے، میں نے تو شادی بھی نہیں کی ہے۔ لیکن جب منیہار کی زبان سے لڑکی کے حسن کی تعریف سنی تو چیخ اٹھا کہ یہ تو درگا کی تصویر ہے۔ میں نے عمر بھر ان کی پوجا کی لیکن انھوں نے مجھے آج تک درشن نہیں دیے اور ایک اجنبی کو جس نے کبھی ان کی پوجا نہیں کی، درشن دے کر خوش کر دیا۔ وہ کہاں گئی ہیں، جلدی بتاؤ۔

جب دونوں تالاب کے کنارے پہنچے تو وہاں سناٹا تھا۔ لڑکیاں نہا کر جا چکی تھیں۔ پجاری نے پھر شکایت شروع کی۔ درگا ماں! یہ کیسی ناانصافی ہے کہ تم نے اپنے پجاری کو درشن نہیں دیے۔ تھوڑی دیر میں تالاب میں پانی کے اندر سے دو نہایت خوب صورت ہاتھ باہر نکلے، وہ لال لال چوڑیوں سے جگمگا رہے تھے۔

بنگالی کہانی یہاں ختم ہو گئی۔ میں نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ سورج ڈوب گیا اور گاؤں [illegible] کی [illegible] مغرب کی طرف [illegible] کے پیچھے ہاتھ

باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اتر پردیش کے شہر فیروز آباد سے چوڑیاں بیچنے آیا تھا۔ اس کا نام عبداللہ تھا۔

اور مسجد کے گنبد پر کلش کے نیچے شام کی سرمئی اور گلابی روشنی میں کنول کا پھول مسکرا رہا تھا۔ یہ پھول چار پانچ ہزار سال کا سفر طے کر کے مسجد کے گنبد تک پہنچا ہے اور ہندو، بودھ اور مسلم اتحاد باہمی کی خوب صورت علامت ہے۔ زمانہ ماقبل تاریخ میں یہ دھان کے کھیتوں، تالابوں اور جھیلوں میں نظر آتا تھا۔ پھر لکشمی کے بازو کی آرائش بن کر ظاہر ہوا۔ اجنتا کی دیوار پر ایک بودھی ستوا کے ہاتھ میں مسکرا رہا ہے۔ ادب اور آرٹ کی دنیا میں یہ پیروں، ہاتھوں اور آنکھوں کا استعارہ ہے۔ جب کنول کی شکل کے چراغ دان بنے تو کنول چراغ کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ بودھ وہاروں سے ہوتا ہوا یہ صوفیوں کی درگاہوں کے کام آیا۔ ہمایوں کے مقبرے کا گنبد 'جس پر کنول کا پھول نہیں ہے، اتنا خوب صورت نہیں ہے جتنا کہ تاج محل کا گنبد یا دہلی کی جامع مسجد کا گنبد۔ ہندستانی مسجدوں کے گنبد ایران، عراق اور عرب ملکوں کے گنبدوں سے مختلف ہیں۔ ان کا مزاج ہندستانی ہے۔

میں سوچ رہا ہوں کہ یہ کنول کا پھول اپنی لطافت اور نزاکت، پاکیزگی اور شرافت کے ساتھ مسکراتا رہے گا یا نیوکلیر جنگ کے شعلوں میں جھلس کر راکھ کا ڈھیر بن جائے گا۔

میں اس خیال سے خوف زدہ ہوں کہ اگر خدانخواستہ نیوکلیر جنگ ہوئی تو کیا ہوگا۔ میری پرورش اور تربیت ایسے ماحول میں ہوئی ہے جس میں روز قیامت اور یوم حساب پر یقین ایمان کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ قیامت کب آئے گی۔ مگر جب آئے گی تو پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑ جائیں گے اور سورج اپنی بلندی سے نیچے اتر کر سوا نیزے کے فاصلے پر آجائے گا۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا نیوکلیر جنگ اس سے کم بھیانک ہوگی۔

پرانے زمانے کے حکمراں، سنتوں، صوفیوں اور شاعروں سے نصیحت حاصل کرتے تھے۔ ہمارے پردھان منتری کو باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے سینے میں ان کا شاعر دوست بیٹھا ہوا ہے۔ میں اس کی آواز سن رہا ہوں:

ہم جنگ نہ ہونے دیں گے
وشو شانتی کے ہم سادھک ہیں
جنگ نہ ہونے دیں گے
ہتھیاروں کے ڈھیروں پر جن کا ہے ڈیرا

منہ میں شانتی بغل میں بم دھوکے کا پھیرا
کفن بیچنے والوں سے کہہ دو چلا کر
دنیا جان گئی ہے ان کا اصلی چہرہ
ہمیں چاہیے شانتی، زندگی ہم کو پیاری
ہمیں چاہیے شانتی، سرجن کی ہے تیاری
ہم نے چھیڑی جنگ بھوک سے، بیماری سے
آگے آکے ہاتھ بٹائے دنیا ساری
ہری بھری دھرتی کو خونیں رنگ نہ لینے دیں گے
جنگ نہ ہونے دیں گے۔
ساری انسانیت کا مستقبل امن اور شانتی سے وابستہ ہے۔
نیوکلیر جنگ موت کا پیغام ہے۔
میرا نعرہ روٹی اور کتاب ہے۔

[illegible]

کا ممبر بن کر اردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے۔

ہمیں یقین ہے کہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

قواعد و ضوابط

1۔ بک کلب کی فیس رکنیت دس روپے (-/Rs.10) ہے۔ (ممبر بننے کے لیے کسی فارم کی ضرورت نہیں۔ فیس کی رکنیت بھیج دینا کافی ہے۔

2۔ بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ زر تعاون -/70 روپے ہے) صرف -/65 روپے سالانہ زر تعاون لیا جائے گا۔

3۔ ممبر کو مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) 25% اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اردو کی کتابوں کی خریداری پر 10% کمیشن دیا جائے گا (ہر فرمائش پر بک کلب کی ممبری کا حوالہ دینا ضروری ہوگا)

4۔ بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جاسکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کا ممبر نہیں بن سکتی۔

5۔ ممبری کے دوران ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔

6۔ کتابیں بذریعہ وی پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجات روانگی کتب ممبر کے ذمے ہوں گے۔

7۔ گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر پچھلا حساب صاف کرے اور آیندہ کے لیے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔

8۔ بک کلب کی رکنیت کی مدت پوری ہوجانے کے باوجود اگر کسی نے اپنی طرف سے کتابوں کا آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتاب بھیج کر حساب صاف کردیں گے۔

ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یا اس کی کسی بھی شاخ سے حاصل کرسکتے ہیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ 202002

ستیہ پال آنند
606, Adams Street
Herndon,VA.20170-4613

تین مختصر نظمیں

ناگ پھنی

ناگ پھنی کے پھول بہت شوبھا دیتے ہیں
لیکن ناگ پھنی کی سندرتا پر مرنے والو۔ سوچو
اس کے اٹھے ہوئے ہاتھوں پر
کھلی ہوئی آنکھوں کے پیچھے
اس کی کانٹوں والی پلکیں
اپنی چبھن کے زہر کی بھی دعوت دیتی ہیں!

رو لے کبیرا

رو لے کبیرا
نالہ روز و شب میں ہی تیری مکتی ہے
اس جگ میں تو دودھ کو سب "کھویا" کہتے ہیں
رنگ برنگے میٹھے پھل کو "نارنگی" کہنے میں ان کو عار نہیں ہے
اور جو چیز رواں ہے اس کو
"گاڑی" کہنا ان کو سچائی لگتی ہے
رو لے کبیرا
نالہ روز و شب میں ہی تیری مکتی ہے!

جسم کے سوراخ

جسم مرا اک ٹھوس حقیقت
لیکن اک مردہ چٹان
اس میں گر سوراخ نہ ہوتے
وایو، اگنی، جل کا باس کہاں ہو پاتا
میری بقا تو ان سوراخوں میں مخفی ہے
مجھ کو کب مرنے دیتے ہیں
جسم کے میرے یہ سوراخ!

کرامت بخاری
۲۲۳ این سوک سنٹر
میلوڈی، اسلام آباد، پاکستان

غزل

جیسے زہر اب پی رہے ہیں ہم
اک جہنم میں جی رہے ہیں ہم

دامنِ دل دریدہ رہتا ہے
ایک مدت سے سی رہے ہیں ہم

کہیں اک عافیت کا گوشہ تھا
اور اس میں کبھی رہے ہیں ہم

صبح کی تازگی ہمیں سے تھی
رات کی روشنی رہے ہیں ہم

زندگی اور کیا ہمیں دے گی
زندگی بھر دکھی رہے ہیں ہم

بے یقینی ہی بے یقینی تھی
ایسی حالت میں بھی رہے ہیں ہم

عہد سے اعتراف ہو نہ سکا
عہد کی آگہی رہے ہیں ہم

سعید اختر خلش
۴ محلہ نبی گنج۔ گونڈہ، یو۔پی

غزل

منجمد درد کے دریا کو روانی دینا
کتنا دشوار ہے لفظوں کو معانی دینا

خود بخود دل میں دبی آگ بھڑک اٹھے گی
اپنے ہونٹوں کو ذرا شعلہ بیانی دینا

کتنا آسان ہے بے تابیٔ دل کے ہاتھوں
اس کی بے نام نگاہوں کو کہانی دینا

خود ہی لگ جائیں گے ارمانوں کے میلے دل میں
بند پلکوں کو ذرا خوابِ جوانی دینا

آنا تو پیار کی دولت کو لٹاتے آنا
جانے لگنا تو نہ پھر کوئی نشانی دینا

وہ تو روٹھے ہوئے موسم کی طرح ہوتے ہیں
سوکھے پتوں کو جنھیں آتا ہے پانی دینا

کیسے دزدیدہ نگاہی پہ بھروسہ ہو خلش
پاس آکر بھی نہ پیغام زبانی دینا

شمس فرخ آبادی
سحر و منزل، گولا گنج، لکھنؤ

غزل

کہنے کو دل کی دل میں ہے، پر کیا کہے کوئی
سنتا ہی جب کسی کو نہیں، کیوں سنے کوئی

پھر کیوں خموش رہ کے نہ سب کچھ سہے کوئی
سنتا ہے کون کس کی جو شکوہ کرے کوئی

دل میں سمجھ لے غیر مگر سب کے سامنے
چہرے کے آئینے سے تو اپنا لگے کوئی

اک عمر کے طویل تعلق کے بعد اب
کیا کچھ بتا سکیں گے اگر جان لے کوئی

یوں دور، دور، رہ کے ترستے ہوئے کب تک
بن کر چکور چاند، تماشا بنے کوئی

جو قرب چاہتا تھا اسے خاک کر دیا
کیوں شام تا سحر نہ اکیلے جلے کوئی

کیسا بیاں ثبوت ' کہاں کی شہادتیں
اب تو کوئی قصور کرے اور بھرے کوئی

رشتہ ہر اک امید سے بھی توڑ لیں مگر
بے خواب بے خیال کے کیسے جیے کوئی

کیوں آج پوچھتے ہیں کہ کیسے ہیں شمس جی
اب آپ کی بلا سے جیے یا مرے کوئی

ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی
اردو بازار۔ دہلی ۶

غزل

جادۂ الفت کا ہوں راہی عیش و طرب سے کام نہیں
جلتا رہا ہوں آتشِ غم میں، صدیوں سے آرام نہیں

منزل کا گماں جب ہونے لگے پھر راہ نئی کھل جاتی ہے
ایسے سفر پر نکلا ہوں میں جس کا کوئی انجام نہیں

گلشن، بستی، اونچے پربت، بہتے جھرنے، پھول اور کانٹے
کونسی ہے تخلیق کہ جس میں پوشیدہ پیغام نہیں

ایسی ہوئی ہے نفرت ان کو روشنی کے رکھوالوں سے
سایہ بھی پیچھے رہتا ہے آگے نور سے کچھ بھی کام نہیں

آنسو پینا، غم ہے کھانا، درد کا بستر، خواب سہانے
اس دنیا میں جینا قاسم! ہم پہ یونہی الزام نہیں

رفیق جعفر
12/61 مالوانی کالونی
(باندرہ پلاٹ) ملاڈ
ممبئی۔ ۹۵

غزل

میری آنکھ سے موتی ڈھلکے
سن کے قصے تاج محل کے

آج کا پربت کاٹ چکا ہوں
پھر دیکھوں گا سپنے کل کے

شاہ ہوں لیکن دیکھ نہ پایا
دیکھ لوں دنیا بھیس بدل کے

کیچڑ کیچڑ بچے کھیلیں!
آؤ دکھاؤں پھول کنول کے

دکھ کا ماتم باہر بھی ہے
دیکھ لو جعفر گھر سے نکل کے

رؤف صادق
9/78 گیٹ نمبر ۵۔ یو سی سی
مالوانی، ملاڈ، ممبئی۔ ۹۵

غزل

جس میں ہو زندگی کی صداقت کا فلسفہ
وہ خواب تو ہے عین بصارت کا فلسفہ

تکمیل پا گیا ہے لہو سے حسین کے
میدان کربلا میں شہادت کا فلسفہ

ہر شخص سوچتا ہے فقط اپنے ڈھنگ سے
بکھرا ہے فرد فرد جماعت کا فلسفہ

سادہ ورق پہ نام لکھا اور مٹا دیا
اتنا ہے زندگی کی عبارت کا فلسفہ

نیکی بدی کا فیصلہ تو آپ کیجیے
میرا تو ہر عمل ہے عبادت کا فلسفہ

جب بھی لگی ہے چوٹ کسی کے ضمیر پر
بیدار ہو گیا ہے سماعت کا فلسفہ

کردار ہے خلوص ہے عہد وفا بھی ہے
یہ آئینے ہیں میری شباہت کا فلسفہ

پروفیسر شمشاد حسین
وائس چانسلر، نالندہ اوپن یونیورسٹی

غزل

دل کی دھڑکن بھی جو سن لو تم مری آواز میں
تب تمھیں احساس ہوگا درد ہے اس ساز میں

بے وجہ تھک کر نہیں بیٹھے ہیں کچھ طائر یہاں
لگ گیا ہے کوئی گرہن ان کی بھی پرواز میں

رہ گیا بے جان ہو کر رنگِ محفل دوستو
کیوں نہیں اب بن رہی ہے ساز اور آواز میں

اس جہاں کی بزم سے وہ شخص پیاسا جائے گا
فکر ہے انجام کی بس جس کو ہر آغاز میں

راز تھا جو کھل گیا وہ اک اشارے پر یہاں
کیا کشش باقی رہی یارو مرے ہمراز میں

بے سبب کہتا نہیں کوئی غزل شاعر یہاں
کوئی خواہش تو چھپی ہے اس کے اس انداز میں

برتری کا اس قدر شمشاد جن کو ہو بھرم
کمتری کو پاؤ گے تم ان کے ہر انداز میں

الیاس شوقی
17/17۔ ایل آئی جی کالونی
پائپ لائن روڈ کرلا (ویسٹ)
ممبئی۔۷۰

آوارگی

مری آوارگی نے
تمھارے دل کے نازک، نرم گوشوں میں
کہیں اک جذبۂ بے نام کی صورت میں / شاید سر ابھارا ہے
محبت سے پکارا ہے

بڑی مدت سے دل میں پھڑ پھڑاتی
کسی بے چہرہ خواہش کو
حسیں پیکر میں ڈھالا ہے
سکون و کیف بخشا ہے ـــــ تمھارا ہے
تمھاری ان اداس آنکھوں میں رہ رہ کے
یہ ہلکی سی چمک، یہ لَو
یہ ہلکا سا تبسم خشک ہونٹوں پر تمھارے
کتنا پیارا ہے

میری آوارگی شاید
تمھاری غم نصیبی میں
کوئی جھوٹا سہارا ہے!!

ظہیر غازی پوری
ہاشمیہ کالونی، تحصیل ہزاری باغ

غزل

خسارہ جان کا دل کا زیاں وہی کا وہی
ستم کی آگ وہی ہے دھواں وہی کا وہی

ہزار حرف سکوں مشتہر ہوا تو کیا
لبوں پہ ہے ابھی شورِ فغاں وہی کا وہی

تمام دست و گریباں لہو میں ڈوبے ہیں
مگر ہے شہرۂ شیشہ گراں وہی کا وہی

بدل گئی ہے بہت کائنات، پھر بھی ہے
زمیں وہی کی وہی، آسماں وہی کا وہی

ہر ایک دور میں الزام یہ تراشا گیا
کہ ہر غزل میں ہے رنگِ بیاں وہی کا وہی

زمینیں بج گئیں موزیک سے مگر اب تک
نگاہ و فکر کا ہے سائباں وہی کا وہی

شکست و ریخت ہے جس کی سرشت میں داخل
ادب کدے کا ہے روح رواں وہی کا وہی

ظہیر بجھ گئی ہر آتشِ وفا پھر بھی
نواحِ دل میں ہے میرے دھواں وہی کا وہی

منیرہ سورتی
ممبئی

اب بھی

ستم گر وقت کا بہاؤ
مجھے دور لے آیا اس سے
سر اٹھا کر جینے کی شرط،
ان آنکھوں کو او جھل کر گئی مجھ سے
مگر اب بھی
جب کبھی اس گلی سے گزرتی ہوں
تو سوچتی ہوں،
وہ کھڑکی کھلی ہوگی اب بھی
وہ آنکھیں
امید کا کشکول لیے
میری راہ میں بچھی ہوں گی۔ اب بھی!!

ڈاکٹر محمد اکرام خاں
جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

کبھی کبھی ناکامی بھی

کامیابی پر آپ خوش ہوتے ہیں اور ناکامی کی صورت میں منہ لٹکا کر ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ آخر کیوں؟ ہمت ہار بن ایک طرف بیٹھ جانا اچھا نہیں سمجھا جاتا آپ کو اپنی ناکامی کے اسباب پر غور کرنا چاہیے۔ منہ لٹکا کر ایک طرف بیٹھ جانے سے آپ احساس کمتری کا شکار بن جائیں گے اور آپ کے قدم آگے نہیں بڑھیں گے۔ آگے بڑھنے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے آپ کو پہچانیں۔ اپنی صلاحیتوں کو جانیں۔ ناکامی کے اسباب پر غور کریں اور اس اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کریں کہ ناکامی کو کامیابی میں بدل کر ہی دم لیا جائے گا۔

اس دنیا میں کون یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر موڑ پر اور ہر قدم پر کامیاب رہا ہے۔ کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی تو ہر شخص کو ناکامی سے دو چار ہونا ہی پڑتا ہے۔ جہاں ناکامی ہوتی ہے وہاں کامیابی بھی ہوتی ہے اور جہاں کامیابی ہوتی ہے وہاں ناکامی بھی ہوتی ہے۔ ان دونوں میں چولی دامن کا سا ساتھ رہتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں وہ ناکامی کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔ وہ ناکامی کے خوف سے کوئی بھی نیا کام کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ وہ زندگی میں ناخوش رہتے ہیں۔ ان کی زندگی دوسروں کے سہارے گزرتی ہے۔ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو جانتے اور پہچاننے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ اس کے برعکس جو اپنی صلاحیتوں کو پہچانتے ہیں اور جن کو اپنے اوپر بھروسہ ہوتا ہے وہ ناکامی کو کامیابی کا پیش خیمہ مانتے ہیں اپنی محنت اور مسلسل کوشش سے ناکامی کو کامیابی میں بدل کر ہی دم لیتے ہیں۔

مثلاً آپ بیڈمنٹن کھیلنا سیکھنا چاہتے ہیں۔ شروع شروع میں آپ کو ناکامی ہوگی۔ ریکٹ پکڑنے اور اس کے ذریعہ چڑیا کو جال کے اوپر سے پھینکنے میں ناکامی ہوگی۔ تھوڑی دیر

تک ہی بھاگنے دوڑنے اور اچھلنے کودنے سے جسم میں درد محسوس ہونے لگے گا۔اس صورت حال میں اگر آپ یہ سوچ کر کہ کوئی کام یا فن کیوں نہ ہو اس کے سیکھنے کے لیے شروع شروع میں ہر شخص کو پریشانی اور ناکامی ہوتی ہے بالخصوص اس شخص کو جو یہ سمجھ کر سیکھنا شروع کرتا ہے کہ سیکھنا کوئی مشکل کام نہیں' اپنا کھیل سیکھنے کا عمل جاری رکھتے ہیں اور کھیل کے اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے کھیلنے کی مشق کرتے رہتے ہیں تو یقیناً آپ کو وہ مایوسی اور ناکامی نہیں ہوگی جو شروع میں محسوس ہو رہی تھی۔آپ مایوسی اور ناکامی کو بھول کر کھیلنے میں خوشی محسوس کریں گے اور رفتہ رفتہ بیڈمنٹن کے اچھے کھلاڑی بن جائیں گے۔

اگر آپ کو کسی کام میں انتہائی محنت اور مسلسل کوشش کے باوجود ناکامی ہوتی ہے تو مایوس ہونے کے بجائے یہ سوچنا چاہیے کہ شاید آپ میں وہ صلاحیت اور قابلیت نہیں ہے جو اس کام کے لیے ضروری ہے۔اس طرح آپ کو یہ جان لینے میں آسانی ہو جائے گی کہ ہر شخص ہر کام کو کامیابی کے ساتھ نہیں کر سکتا ہے۔ مختلف لوگوں میں مختلف قسم کی صلاحیت اور قابلیت ہوتی ہے اور سب کاموں کے لیے یکساں صلاحیت اور قابلیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنی ناکامی پر کوئی شخص بھی خوش نہیں ہوتا ہے لیکن زندگی میں ناکامی کا منہ ہر شخص کو دیکھنا پڑتا ہے۔اس حقیقت سے دوچار ہونے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ناکامی کا مقابلہ کس طرح کیا جائے اور اس سے کس طرح بچا جائے تاکہ زندگی میں مایوسی اور پست ہمتی کی بلا سے محفوظ رہا جا سکے۔

ناکامی کا مقابلہ:

ناکامی سے بچنے کا بہترین طریقہ تو یہ ہے کہ کسی بھی صورت حال میں مایوس نہ ہوا جائے اور اپنی ناکامی پر ننھے منے بچوں کی طرح آنسوں نہ بہائے جائیں۔اپنی ناکامی کے لیے دوسروں کو ہرگز ہرگز ذمہ دار نہ بنایا جائے۔ اور نہ ہی خود کو خطاوار گردان کر بددل ہوا جائے۔ بددل اور دل برداشتہ ہو کر یہ نہ سوچا جائے کہ "یہ کام اپنے بس کا نہیں ہے'ایسا سوچنے اور کرنے والے عمر بھر مایوسی اور ناکامی کا شکار بنے رہتے ہیں۔انھیں اپنی صلاحیتوں پر بالکل اعتماد نہیں رہتا مثلاً اگر آپ نے کسی بھی امتحان میں ناکام ہونے پر یہ سوچا کہ آپ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں اور نہ ہی آپ کوئی بڑا کام کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہیں تو

بس سمجھ لیجیے کہ آپ خود کو بالکل نکما مان رہے ہیں۔ آپ کو کبھی بھی یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ناکامی سب کو ہوتی ہے اس لیے گھبرانا بری بات ہے۔ اگر آپ نے اپنے امتحان کی دل لگا کر خوب تیاری کی تھی اور ناکام ہو گئے ہیں تو ناکامی پر گھبرانے' بددلی ہونے اور شرمانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ ناکامی کیوں ہوئی اور اس کو کامیابی کا ذریعہ کس طرح بنایا جائے۔

ناکام ہونے پر سب سے پہلے تو مایوسی سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ امید کے خلاف نتیجہ معلوم ہونے پر مایوس نہیں ہونا چاہیے ممکن ہے آپ کو یہ امید رہی ہو کہ سالانہ امتحان میں فرسٹ ڈویژن آئے گی۔ آپ کے ہم جماعت آپ پر رشک کریں گے لیکن اتفاق سے آپ کامیاب ہوتے ہیں سیکنڈ ڈویژن۔ اس ڈویژن کی وجہ سے آپ کے تمام ارادوں اور امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ کا دودھ پیتے بچے کی طرح رونا دھونا یا منہ لٹکا کر ایک طرف بیٹھ جانا غلط ہوگا۔ آپ کو سوچنا چاہیے کہ کاش فرسٹ ڈویژن آجاتی! خیر جو ہوا اچھا ہوا۔ کسی نہ کسی پرچہ میں کچھ غلطیاں ضرور ہوئی ہوں گی۔ آئندہ اور زیادہ توجہ اور محنت سے پڑھا جائے گا اور امتحان کے دنوں ہی میں نہیں بلکہ پورے سال پابندی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ اس طرح سوچنے سے آپ مایوسی کا شکار نہیں ہوں گے اور آپ میں آگے پڑھنے کا شوق پیدا ہوگا اور آپ خود کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے بے وقوف نہیں کہلائیں گے۔

ناکامی کے فوراً بعد احساس ناکامی کو دور کرنے میں آپ کو اپنی مدد آپ ہی کرنا ہوگی۔ کوشش کیجیے گھر میں یا اسکول میں یا محلے میں کوئی ایسا کام کرنے کی جو دوسروں کے لیے مفید ہو اور جسے آپ بہت اچھی طرح کر سکتے ہوں۔ ایسا کرنے سے آپ کو دلی مسرت حاصل ہوگی اور آپ کی ذہنی الجھن ختم ہو جائے گی۔ آپ کی پوشیدہ صلاحتیں اجاگر ہوں گی۔ آپ کی کارکردگی آپ کی ہمت افزائی کا سبب بنے گی۔ پھر اطمینان سے اپنی ناکامی کے اسباب کو جان کر صحیح طرز عمل اختیار کرنے میں مدد ملے گی۔

مثال کے طور پر یہ سمجھیے کہ یوسف کے خراب کھیل کی وجہ سے اس کی بیڈمنٹن ٹیم کھیل کے مقابلے میں ہار گئی ہے۔ اور یوسف کو اپنی غلطی اور کوتاہی کا احساس ہے۔ وہ گھر آتا ہے تو تھوڑا مایوس ہے اور بے حد چڑچڑا۔ اپنے چھوٹے بھائی اختر کی سائیکل کا بریک ٹوٹا ہوا دیکھ کر اختر کو ڈانٹنے ڈپٹنے لگتا ہے۔ ان کی امی یوسف کے موڈ کو پہچان کر یہ کہتی ہیں کہ بیٹا یوسف تم سائیکل کا بریک ٹھیک کرنا جانتے ہو۔ اسے ٹھیک کردو۔ یوسف بریک ٹھیک کر

دیتا ہے۔ امی خوش ہوتی ہیں اور تعریف کرتی ہیں۔ اس طرح یوسف کی ذہنی الجھن اور مایوسی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اس کو ٹھنڈے دل اور اطمینان سے یہ سوچنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ تکمیل میں کیا غلطی ہوئی تھی اور اسے کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔

ہاں تو بات یہ ہوئی کہ مایوسی کو دور کرنے کے بعد ہی ناکامی کے اسباب کو جاننے اور سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اسباب کو جاننے کے بعد آپ کو کامیابی کے لیے پروگرام بنانا چاہیے تاکہ آئندہ شاندار کامیابی حاصل ہو سکے۔ عام طور سے ناکامی کے تین بڑے اسباب ہوتے ہیں:۔

(۱) غلط کام کرنے کی کوشش (۲) صحیح کام کو غلط طریقہ سے کرنے کی کوشش (۳) ایک وقت میں کئی کام کرنے کی کوشش۔

۱۔ غلط کام کرنے کی کوشش:۔

آپ فارسی زبان پر قدرت نہ رکھنے اور فارسی ادب سے ناواقف ہونے کے باوجود کسی سیمنار میں اپنا مضمون فارسی میں پڑھتے ہیں تو ناکامی ہی ہوگی یا گرم کپڑے لیے بغیر سردیوں کے موسم میں گل مرگ (کشمیر) سیر کرنے چلے جاتے ہیں تو ناکام ہی واپس لوٹیں گے۔ ضرورت ہے کہ جو کام کیا جائے اسے سوچ سمجھ کر کیا جائے اور پوری تیاری کے ساتھ کیا جائے۔

۲۔ صحیح کام کو غلط طریقے سے کرنے کی کوشش:۔

آپ اپنے کسی مضمون سے متعلق کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ٹی۔وی پروگرام بھی دیکھا جا رہا ہے تو اس طرح آپ کو مطالعہ سے یقیناً اتنا فائدہ نہیں ہو سکے گا جتنا کہ یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کرنے سے ہوتا۔ یا آپ اپنی قمیص پر پڑے روشنائی کے دھبوں کو دھونا چاہتے ہیں اور آپ کے پاس نہ تو صابن ہے اور نہ ہی کوئی ایسا برتن جس میں قمیص کو بھگو سکیں۔ اس طرح قمیص کی دھلائی کا کام اچھی طرح نہیں ہوگا اور آپ کا قیمتی وقت ضائع ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ کہ آپ کو کام کر کے نہ سکون ملے گا اور نہ ہی خوشی حاصل ہوگی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی اچھے کام کے لیے جتنی محنت درکار ہوتی ہے وہ نہیں کی جاتی۔ آپ جب کبھی اپنی ناکامی کے اسباب پر غور کریں تو یہ ضرور سوچیں کہ کام کے لیے صحیح طریقہ اختیار کیا گیا ہے یا نہیں اور اس کے لیے جتنی

باقاعدہ محنت کی ضرورت تھی وہ کی گئی ہے یا نہیں۔

۳۔ ایک وقت میں کئی کام:۔

عام طور سے ناکامی کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ ایک وقت میں کئی کام کرنا چاہتے ہیں یا آپ کوئی ایسا کام کرنے لگتے ہیں جس کو کرنے کے لیے آپ میں صلاحیت نہیں ہوتی۔ اچھا یہ ہے کہ آپ حتی الامکان ایسے کاموں کی ذمہ داری لیں جن کو آپ خوش اسلوبی اور کامیابی کیساتھ کر سکتے ہوں۔ کسی خوش فہمی میں مبتلا رہنے اور بغیر سوچے سمجھے ہر کام میں ٹانگ اڑا دینے سے ناکامی ہوتی ہے۔ عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ جو ذمہ داری لیں سوچ سمجھ کر لیں اور جو کام کریں وہ آپ کی دلچسپی اور صلاحیت کے مطابق ہو۔

کام شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کا مقصد آپ کے ذہن میں واضح ہو۔ یعنی یہ کہ آپ اسے کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ سوچنا ہوتا ہے کہ اسے کس طرح کیا جائے۔ مقصد کی وضاحت اور صحیح طریقہ کار نیز مستقل مزاجی کے ساتھ کام کرتے رہنے سے کامیابی حاصل ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے خود شناسی اور خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ کسی کام کو کرنے اور اس کا مقصد متعین کرنے سے پہلے آپ کو اپنی قابلیت اور صلاحیت کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ آپ کا مقصد آپ کی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق نہ ہو۔ ایسی صورت میں آپ کو اپنی امید کے مطابق کامیابی نہ ہو سکے گی۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ کو ناکامی ہوگی۔

ناکامی کا تعلق آپ کی ذاتی سوجھ بوجھ سے بھی ہے یعنی یہ کہ آپ اسے کس طرح سوچتے یا دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اگر آپ کی صحیح محنت اور کوشش کے باوجود امتحان میں آپ کی فرسٹ ڈویژن نہیں آسکی ہے تو آپ کو اسے اپنی ناکامی نہیں سمجھنا چاہیے۔ آپ کو تو بس یہ سوچنا چاہیے کہ آپ کا نتیجہ آپ کی امید کے مطابق نہیں رہا ہے۔ اطمینان قلب اور سکون دل کے ساتھ آپ کو ان اسباب کا ضرور جائزہ لینا چاہیے جن کی وجہ سے آپ کی امید پوری نہیں ہو سکی ہے۔ اسباب کو جاننے کے بعد اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کر کے دل لگا کر محنت کیجیے۔ انشاء اللہ آپ کو مستقبل میں کامیابی ہوگی اور آپ کی موجودہ ناکامی مستقبل کی کامیابی کا ذریعہ بن کر آپ کے لیے اطمینان اور خوشی کا سبب بنے گی۔

مجتبیٰ حسین
۲۰۰، اکور لیار منٹس
پٹ پر گنج، دہلی۔ ۹۲

نامی انصاری اور اردو طنز و مزاح نگاری

ایک ہیں نامی انصاری۔ رہتے تو کانپور میں ہیں لیکن وہاں بیٹھے بیٹھے بڑی خاموشی کے ساتھ پورے اردو ادب کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ پان پان سے آدمی ہیں۔ ہم نے انھیں دھان پان سا آدمی اس لیے نہیں لکھا کہ ہمارے حساب سے دھان کا وزن پان سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہوگا۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ لفظوں کی اس ترکیب کا وزن کہیں نامی انصاری کے شخصی وزن سے بڑھ نہ جائے۔ غرض اتنے دبلے ہیں کہ ان میں مزید دبلے ہونے کی اب دور دور تک کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ گویا اپنے جسمانی وجود سے ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے والی کیفیت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ اردو کے کلاسیکی ادب پر چونکہ ان کی نظر بہت گہری ہے اسی لیے وہ 'معاصر ادب' کا ہمیشہ ٹیڑھی نظر سے جائزہ لینے پر مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کام کیا کرتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی کام تو ضرور کرتے ہوں گے۔ کبھی ہم نے ان سے پوچھا نہیں۔ لیکن انھیں جب بھی دیکھا اور پڑھا یہی محسوس کیا کہ وہ یہی کام کرتے رہتے ہیں۔ ایک نوجوان سے کسی نے پوچھا "میاں! تمھارے کتنے بھائی اور کتنی بہنیں ہیں؟" نوجوان نے نظریں جھکا کر جواب دیا "جی میرے نو بھائی اور چھ بہنیں ہیں"۔ سوال کرنے والے کا منہ بڑی دیر تک کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بند ہوا تو آہستہ سے پوچھا "میاں! تمھارے والد کیا کام کرتے ہیں؟" نوجوان نے کہا "جی بس یہی کام کرتے رہتے ہیں"۔ نامی انصاری بھی بس اسی طرح لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے ہیں۔ شاعر ہیں، نقاد ہیں، اور محقق وغیرہ بھی ہیں۔ ان کی جسمانی ساخت جیسی بھی ہو وہ ادب کے معاملہ میں بڑے بڑوں سے ٹکر لینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ پانچ چھ برس پہلے ایک بار دہلی آئے تو ہم سے بھی ملے۔ باتوں باتوں میں ہم سے پوچھا "جناب! یہ طنز و مزاح نگاری کو دوسرے درجہ کا ادب کیوں سمجھا جاتا ہے؟" بہت عرصہ پہلے ہو بہو ایسا ہی سوال کسی نے یوسف ناظم سے پوچھ لیا تھا اور اس کے جواب میں یوسف ناظم نے کہا تھا "ہمارے ہاں چونکہ پہلے درجہ کا ادب لکھا ہی نہیں جاتا اس لیے

طنز و مزاح کو دوسرے درجہ کا ادب سمجھا جاتا ہے"۔ ہم نے بھی یہی جواب نامی انصاری کو دیا تو خفا ہو گئے۔ بولے "آپ جیسے مزاح نگاروں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ کسی بات کو سنجیدہ نہیں لیتے۔ جہاں آپ کو مشتعل ہونا چاہیے وہاں ہنس دیتے ہیں"۔ ہم نے کہا "نامی صاحب! ہمیں تو آج کے آدمی کی ہنسی اور اس کے اشتعال میں بظاہر تو کوئی فرق نظر نہیں آتا کیونکہ دونوں کیفیتیں ایک ہی جذبے کے اظہار کے دو مختلف پیرائے ہیں۔ پھر ہم طنز و مزاح نگاروں کا معاملہ یہ ہے کہ ادب میں ہمارا شمار اقلیتوں میں ہوتا ہے اور اقلیتوں کے مسائل اور دشواریوں سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ ہماری آواز کو کون سنے گا۔ اردو ہی نہیں دنیا کی کسی بھی بڑی زبان کے زندہ طنز و مزاح نگاروں کی گنتی کیجئے تو پتہ چلے گا کہ ان کی گنتی کرنے کے لیے ایک پاؤں کی پانچ انگلیاں بھی کافی ہیں (ہم نے گنتی کے معاملہ میں ہاتھ کی انگلیوں کو اس لیے زحمت نہیں دی کہ یہ انگلیاں عموماً سنجیدہ ادب کے لکھنے والوں کی گنتی کے لیے استعمال کی جاتی ہیں) ہمارے اس جواب سے مطمئن ہونے کی بجائے کچھ اور مشتعل ہو گئے۔ بولے "سوچتا ہوں کیوں نہ آزادی کے بعد اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا ایک سنجیدہ جائزہ لیا جائے۔"

ہم نے کہا "ہمارے ہاں شاعری، افسانہ اور ناول وغیرہ کے ناقد تو بہت سے ہیں لیکن طنز و مزاح کا کوئی ناقد نہیں ہے۔ بہت عرصہ پہلے ڈاکٹر وزیر آغا نے طنز و مزاح پر ایک وقیع اور مبسوط کتاب تو ضرور لکھی تھی جس میں بڑی حد تک آزادی سے پہلے کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا جائزہ لیا گیا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر ایس جے صادق اس کام کو آگے بڑھا کر 1975ء تک لے آئے تھے۔ اسی عرصہ میں یونس نہمی نے بھی اردو شاعری میں طنز و مزاح کے موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ ماشاء اللہ اب تو اکیسویں صدی آرہی ہے۔"

پوچھا "کیا آپ کی مزاح نگاری پر کسی یونیورسٹی میں کام ہو رہا ہے؟"۔ عرض کیا "کام تو تین یونیورسٹیوں میں ہو رہا ہے لیکن اس کام کے سلسلہ میں چونکہ ہم خود کوئی کام کرنا پسند نہیں کرتے اسی لیے یہ معاملہ کھٹائی میں نہیں بلکہ مٹھائی میں پڑا ہوا ہے۔ یوں بھی زندہ ادیبوں کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی کام کے ہم قائل نہیں ہیں۔ تحقیق تو ادیب کے مرنے کے بعد ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ پھر یوں بھی ہوا ہے کہ بعض ادیبوں کے جیتے جی جب ان کے بارے میں کوئی تحقیقی کام شائع ہوا تو وہ اپنی موت آپ مر گئے۔ ہم مرنے سے نہیں ڈرتے لیکن تحقیق اور تنقید کے ہاتھوں مارے جائیں یہ بھی ہمیں منظور نہیں۔ خود عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک ریسرچ اسکالر ہم پر کام کر رہے تھے۔ چونکہ ہم اکثر حیدر آباد آتے جاتے رہتے ہیں اسی لیے ایک بار ہم سے ملنے آگئے۔ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے

ہم سے جو پہلا سوال پوچھا وہ یہ تھا "حضور! آپ نے اپنی ابتدائی تین کتابوں میں مخدوم محی الدین کا یہ شعر نہایت نمایاں طور پر شائع کیا ہے۔

ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکر ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

تو جناب یہ بتائیے کہ ان تینوں کتابوں میں جس "پیکر ناز" کا حوالہ ہے وہ ایک ہی ہے یا ہر کتاب کا "پیکر ناز" الگ الگ ہے۔ اگر یہ ایک نہیں ہے تو ذرا ان پیکران ناز کے محل و قوع اور حدود اربعہ پر روشنی ڈالیے۔ اور ہاں ان پیکران ناز کو تو آپ نے یہ معلوم ہونے نہیں دیا کہ آپ نے ان کی متعلقہ بزم میں ہنس ہنس کر کتنی آہوں کو چھپایا ہے لیکن بحیثیت ریسرچ اسکالر مجھے تو یہ معلوم کرنے کا حق پہنچتا ہے کہ آپ نے اس طرح مجملہ کتنی آہیں چھپائی ہیں۔ پانچ دس آہوں کی کمی بیشی رہ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن تحقیق کو بہر حال معتبر اور مستند ہونا چاہیے"۔ ہم اس سوال کو سن کر بھونچکے رہ گئے۔ انھیں یہ کہہ کر کسی نہ کسی طرح ٹالا کہ آہوں کا یہ حساب کتاب چونکہ خاصا پرانا ہے اس لیے ہمیں کچھ وقت دیجئے کہ ہم پھر سے اپنی نیکیوں کی گنتی کر سکیں۔ چند دن بعد وہ پھر آئے۔ اب کی بار ان کا رویہ سود خوار پٹھانوں کا سا تھا۔ بہر حال نہ انھوں نے ہماری مزاح نگاری کے بارے میں کچھ پوچھا اور نہ ہی ہم نے انھیں اپنی آہوں کا حساب بتایا اور یوں معاملہ بحسن و خوبی رفع دفع ہو گیا۔ دوسرے دو ریسرچ اسکالر چونکہ دور دراز کی یونیورسٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کا حال معلوم نہ ہو سکا"۔ نامی انصاری ہماری ان باتوں کو سن کر اتنا ہی ہنستے رہے جتنا کہ وہ عموماً ہنستے ہیں۔ پھر وہ کانپور واپس چلے گئے۔ بعد میں ایک بار اور دہلی آئے تو ہماری کچھ کتابیں جو انھیں نہیں مل رہی تھیں مانگ کر لے گئے۔ تین برس پہلے "سوغات" میں مشتاق احمد یوسفی پر ان کا ایک بھرپور اور عالمانہ مضمون نظر سے گذرا تو احساس ہوا کہ یہ اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا جائزہ لینے سے باز نہیں آئیں گے۔ پھر اطلاع آئی کہ چار سال کی لگاتار محنت کے بعد انھوں نے بالآخر یہ جائزہ مکمل کر لیا ہے اور جلد ہی ان کی کتاب "آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح" کی رسم اجراء منعقد ہونے والی ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں دہلی میں ان کی اس کتاب کی رسم اجراء پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ہاتھوں انجام پائی۔ ہم نے تو اسی تقریب میں اس کتاب کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے دیکھنے کے فوراً بعد ہمیں یہ جاننے کے لیے آئینہ میں اپنی شکل دیکھنی پڑی کہ کیا واقعی وہ ہم ہی ہیں جس کے ذکر سے اس کتاب کی ضخامت میں اضافہ ہوا ہے۔ جہاں تک اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کے جائزہ کا تعلق ہے یہ ایک اہم، مستند اور مبسوط کتاب ہے لیکن اس میں ہمارا

ذکر جس انداز سے ہوا ہے اور جتنا ہوا ہے اگر یہ نہ ہوتا تو کتاب کی ضخامت اور اس کی قیمت دونوں میں خاصی کمی واقع ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کی قدر و قیمت تو اپنی جگہ برقرار رہے گی۔ اب ہم نامی انصاری کو کیسے بتائیں کہ ہم اصل میں مزاح نگاری کے آدمی ہی نہیں ہیں۔ ہم تو بس ایک لمبے عرصہ تک پیکران ناز کی بزم میں آہوں کو چھپانے کا کام ہی انجام دیتے آئے ہیں۔ اب اگر لوگوں نے اسے مزاح نگاری سمجھ لیا تو اس میں قصور ہمارا نہیں بلکہ پیکران ناز کا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نامی انصاری کے اس ادبی کارنامہ کی تعریف شروع کی تو کرتے ہی چلے گئے۔ البتہ یہ ضرور کہا کہ اس کتاب میں کنہیا لال کپور، مشفق خواجہ، فکر تونسوی اور یوسف ناظم کا ذکر تفصیل کا طلبگار تھا۔ ہم نے بھی ہو بہو یہی بات نامی انصاری سے کہی ہے اور انھوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ اگلے ایڈیشن میں وہ اس کی تلافی کردیں گے (ڈر ہے کہ اس تلافی کی کوشش میں وہ ہمارا ذکر کہیں سچ مچ کم نہ کردیں) ہماری کوشش تو یہی ہوگی کہ اس کتاب کا کوئی اگلا ایڈیشن نہ آئے لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب کا اگلا ایڈیشن جلد از جلد آئے گا کیونکہ موضوع کے اعتبار سے یہ ایک ایسی کتاب ہے جو ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ پروفیسر نارنگ نے اپنی تقریر میں پہلے تو ہندستان اور پاکستان کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو اپنی تنقید کے ترازو میں تولا۔ پھر ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ترازو کے ہندستانی پلڑے میں ہماری موجودگی کی وجہ سے یہ ہم پلہ قرار پاتا ہے۔ جی چاہا ہم پلڑے سے اتر کر بھاگ جائیں۔ یوں بھی نارنگ ہمیں ادب میں کم اور ترازو کے پلڑے میں بیٹھا ہوا دیکھنا ہی زیادہ پسند کرتے ہیں۔

تفنن بر طرف نامی انصاری (جنھیں اب ہم نامی گرامی انصاری کہنے لگے ہیں) نے بڑی لگن، محنت اور عرق ریزی کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کے خد و خال تدریسی نہیں بلکہ تخلیقی ہیں کیونکہ نامی انصاری نے یہ کام یونیورسٹیوں میں ہونے والے ریسرچ کے مروجہ اصولوں کو سامنے رکھ کر نہیں کیا ہے جہاں ریسرچ اسکالر کے ساتھ ایک گائیڈ بھی ہوتا ہے جو عموماً Misguide کرنے کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیتا ہے۔

نامی انصاری نے طنز و مزاح کے معاملہ میں جہاں حیدرآباد کی مرکزیت کو تسلیم کیا ہے وہیں زندہ دلان حیدرآباد اور رسالہ "شگوفہ" کی خدمات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ نامی انصاری نے اس کتاب کو اردو نثر میں طنز و مزاح کے جائزہ تک ہی محدود رکھا ہے اگر وہ لگے ہاتھوں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا جائزہ بھی لے لیتے تو اس کتاب کی وسعت اور وقعت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ امید ہے کہ کتاب کے اگلے ایڈیشن میں وہ اس کی بھی تلافی کردیں گے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں : عبدالقوی دسنوی

اس کتاب میں اردو کے گیارہ شاعر (اکبر، حالی، چکبست: سید سلیمان ندوی، پرویز شاہدی، فراق، ساحر، جاں نثار اختر، فیض احمد فیض اور مجروح) کی شاعری اور فن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

قیمت -/75 روپے

اخلاقیات طبیب حکیم محمد سعید

حقیقت یہ ہے کہ طبیب کے لیے علم میں مہارت جتنی ضروری ہے اتنی ہی ضروری اخلاقی رفعت بھی ہے۔ یہ کتاب اس دور میں طب کے ہر عامل اور ہر طالب علم کے لیے ایک اخلاقی معلم کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر طریق علاج کے حاملین کے لیے مفید اور معتبر۔

قیمت -/20 روپے

تصوف: رسم اور حقیقت خواجہ حسن ثانی نظامی

تصوف کی تاریخ، صوفیہ کے نظام حیات، تعلیمات، ہندستانی سماج پر صوفیہ کے اثرات، اور ایسے بہت سے دوسرے سوالات پر روشنی ڈالنے والی اپنی نوعیت کی پہلی کتاب جس میں برصغیر ہندوپاک میں رائج جملہ صوفی سلسلوں کے مکمل شجرے بھی دیے گئے ہیں۔ قیمت -/90 روپے

مستقبل کی طرف

مرتبین خواجہ محمد شاہد خالد کمال فاروقی

مولانا محمود حسن کے خطبہ جلسہ تقسیم اسناد (جامعہ ملیہ اسلامیہ) سے لے کر آج تک کے ایسے تمام خطبات کا مجموعہ: ایک اہم تاریخی دستاویز۔

قیمت -/150 روپے

قلم اور قدم سید حامد

ہمارے تہذیبی، تعلیمی، لسانی، معاشرتی مسائل کا بے لاگ اور ہمدردانہ تجزیہ۔ ہمارے عہد کے ایک ممتاز دانشور اور سماجی مبصر کے قلم سے۔ ان مضامین کا اہم ترین پہلو جیتی جاگتی زندگی کے مسائل اور معاملات سے ان کا گہرا تعلق ہے۔

قیمت -/75 روپے

مفکرین تعلیم ڈاکٹر محمد اکرام خاں

تعلیم کا کام در حقیقت پیغمبرانہ کام ہے۔ اس اہم اور نیک کام کے لیے جن اہم ۱۴ ملکی وغیر ملکی ماہرانِ تعلیم نے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا ہے اس کتاب میں ان کے خیالات ان کا فلسفہ، ان کی سوانح مختصر مگر جامع انداز میں پیش کی گئی ہے اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب۔

قیمت -/120 روپے

نصرت ظہیر
4/15 گھوری پور کالونی، دہلی ۹۱

روشن چراغی

اردو صحافت، دنیا کی تمام زبانوں کی صحافتوں سے الگ اور سب سے نرالی صحافت ہے اور اس نرالی صحافت میں اگر آپ موجودہ دور کے نرالے صحافیوں کا شمار کریں تو موہن چراغی کا نام ان میں لازمی طور پر آئے گا۔ مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ خود موہن چراغی کو اپنے نرالے پن کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے!

خیر، موہن لال چراغی کی بات تو بعد میں ہوگی، پہلے اردو صحافت سے دو دو ہاتھ ہو جائیں! کئی کہنے والے آج بھی کہتے ہیں کہ اس ملک کو اردو زبان نے تقسیم کرایا ہے۔ اس لیے اردو کو سو جوتے مارنے چاہییں! چنانچہ بے چاری کو اس کے اپنے وطن میں ہر طرف سے لاکھوں جوتے پڑ چکے ہیں اور اب بھی پڑ رہے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ جوتے مارنے والوں میں بہت سے خود اردو کے لشکر میں شامل ہیں جو اتنی ہوشیاری اور چالاکی سے جوتا مارتے ہیں کہ اردو بی بی دیکھتی ہی رہ جاتی ہے!

اردو پر اس الزام کی اصل بنیاد اردو صحافت ہے جو آزادی اور تقسیم دونوں کی لڑائیوں میں سب سے آگے رہی! مگر ایسا سوچنے سمجھنے اور کہنے والوں کی کم علمی پر مجھے ترس آتا ہے۔ صاحب، اردو کی صحافت ملک کو کیا تقسیم کراتی، اسے تو ملا پانڈوں نے پہلے ہی مسلم صحافت اور ہندو صحافت میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک طرف مولوی مولانا تھے، دوسری طرف مہاشے اور مہاراج۔ ایک طرف نعرۂ تکبیر تھا دوسری طرف ہر ہر مہادیو کا جے کارا! لڑائی انگریز سے ہندوستانیوں کی تھی، مگر مسلم صحافت اس میں اسلام کو گھسیٹ لائی اور ہندو صحافت نے اس میں ہندو واد کو جوت دیا۔ چنانچہ ملک کو تقسیم تو کیا ان حضرات سے شہہ پا کر خود سرکار انگلیشیہ نے اپنی غرض کے لیے، اور بدنام ہوئی مردود کہ اسی اردو

نے یہ ہڑبونگ مچائی ہے' لہٰذا اس کا قلع قمع کر دینا چاہیے۔ اور وہ ہو رہا ہے! اسی ہندستان میں ہو رہا ہے جو اس کا ددھیال ننھیال اور میکہ سسرال وغیرہ ہے!

بہر حال' ملک تقسیم ہوا' اور شکر ہے کہ میرے پیدا ہونے سے پانچ سال پہلے ہی تقسیم ہو گیا ورنہ یہ خاکسار بھی تقسیم ہو کر آدھا رہ جاتا' لیکن دونوں ملکوں میں اردو صحافت کا مزاج وہی رہا۔ نعرے اور جے کارے والا! چنانچہ ایک طرف پاکستان تقسیم ہو گیا اور دوسری طرف ہندستان' تقسیم تو خیر نہیں ہوا لیکن پنجابیانہ اردو صحافت اس کے صوبہ پنجاب کو ضرور ٹکڑے ٹکڑے کرا دیا! جو کبھی اردو کا بہت بڑا گڑھ تھا۔

رہ گئی ہندستان کی مسلم صحافت' تو ہر چند کہ ہندستان تقسیم ہو گیا' پاکستان کے دو ٹکڑے ہو گئے مگر اس کے تیور اور لہجے میں تبدیلی نہ آئی۔ مسلم صحافت کا اردو صحافی' اب بھی اسی طرح ہوا میں تلوار گھما رہا تھا جیسے ابھی تک انگریز سے لڑ رہا ہو! وقت گزرنے کے ساتھ کچھ اردو صحافیوں کو تو یہ اطلاع مل گئی ہے کہ انگریز اس ملک سے کبھی کا جا چکا ہے مگر کئی بے چارے اب بھی بے خبر ہیں!

چنانچہ حالات یہ ہیں کہ اکثر اردو اخباروں کے اڈیٹر خود کو قائد ملت سے کم نہیں سمجھتے۔ ان کے یہاں صحافتی غیر جانب داری کا مطلب ہے صرف ان کے موقف کی حمایت صحافت کا مطلب ہے' سنسنی' ہنگامہ' شکوہ شکایت چیختی چلاتی سُرخیاں اور قوم کا مطلب ہے' صرف مسلمان! اسی قومی نظر اور نظریہ کی عینک سے وہ سب کچھ دیکھتے ہیں۔ چنانچہ پولس اگر کہیں ظلم کرتی ہے تو صرف ان کی قوم پر' سرکار تعصب برتتی ہے تو صرف ان کی قوم کے ساتھ' کوئی ناانصافی ہوتی ہے تو صرف ان کی قوم سے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ہماری لائق پولس اور قابل سرکار ایسا سلوک دوسری قوموں کے ساتھ بھی کرتی رہتی ہیں۔ خاص طور پر ان کے ساتھ جو ذہنی جسمانی' اقتصادی اور سیاسی طور پر کمزور ہوں۔ پھر چاہے ایسے لوگ اکثریتی قوم کے ہی کیوں نہ ہوں! ان کے ساتھ ہونے والا کوئی ظلم' ناانصافی اور تعصب ہمارے اردو صحافیوں کو نظر نہیں آتا۔

معاف کیجیے۔ ہم کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئے. لیکن موہن چراغی کو سمجھنے کے لیے اس غیر سنجیدہ پس منظر کا بیان ضروری تھا' سو کر دیا! سرینگر کی شاداب جنت نما وادیوں سے دور' دھوپ اور سیاست کی گرمی سے تپتے ہوئے کنکریٹ کے جنگل دلی میں رہنے والا یہ بے وطن کشمیری پنڈت اسی غیر سنجیدہ ماحول میں اردو صحافت کر رہا ہے۔ حالات کا ستم اس

پر یہ ہے کہ وہ بے وطن ہے مگر مہاجروں میں اس کا شمار نہیں. کیونکہ اس کی ہجرت تو موجودہ مہاجروں کی ہجرت سے پہلے ہی ہو چکی تھی!

موہن چراغی کو سب سے پہلے میں نے 1981 میں اس وقت "قومی آواز" کے دفتر میں دیکھا تھا جب جواہر لال نہرو کے اس اخبار کو لکھنؤ سے دلی میں وارد ہوئے ایک سال بھی نہیں گزرا تھا۔ گورے چٹے کشمیری خدوخال' ناک میں بجلے سے کشمیری خم کے باوجود حسین اور دلکش چہرہ' بولتے وقت اردو لہجہ میں صاف نظر آنے والی کشمیری گھلاوٹ اور پہلی ہی ملاقات میں دل کو چھو جانے والی گرمجوشی! میں ان دنوں روزنامہ "ملاپ" میں رنبیر جی اور فکر تونسوی جیسی اردو صحافت کی نہایت روشن اور بڑی شخصیتوں کے زیر سایہ سب اڈیٹری کر رہا تھا۔ بہادر شاہ ظفر روڈ پر آتے جاتے کبھی انھیں دیکھتا اور سلام کے لیے ہاتھ اٹھاتا تو فوراً رک جاتے' ہاتھ ملاتے اور حال چال اس طرح پوچھتے جیسے مجھے برسوں سے جانتے ہوں حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ مجھے ذرا بھی نہیں جانتے۔ چھے سات سال یوں ہی رہا۔ اس بیچ میری ان کی چھے سات بار ہی ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی چلتے چلتے سرراہ!

ان دنوں اردو صحافت سے دل برداشتہ ہو کر میں ہندی میں چلا گیا تھا اور فری لانسنگ کر رہا تھا۔ "قومی آواز" میرا پسندیدہ اخبار تھا مگر 1986 سے یہ بند تھا اور اخبار کے دوبارہ شروع ہونے کی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ بہر حال میں مطمئن تھا کہ ہندی میں "آزاد" رہ کر اردو ملازمت کی غلامی کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی کمائی ہو رہی تھی۔ ہندی میں اگر میں ایک سطر بھی لکھتا تو اس کے واجب دام مل جاتے تھے۔ خوب مزے میں گزر رہی تھی کہ خبر ملی "قومی آواز" پھر شروع ہو رہا ہے۔ قلم نے بہت دنوں سے اردو نہیں لکھی تھی۔ شدت سے جی چاہا کہ "قومی آواز" کے لیے اردو میں کوئی کالم شروع کروں۔ اس طرح اردو سے کچھ تو تعلق بنا رہے گا۔ تبھی موہن چراغی یاد آ گئے۔ سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ انھوں نے حال پوچھا۔ میں نے کہا مزے میں ہوں مگر اردو سے بالکل ہی ناتا ٹوٹ گیا ہے۔ اس لیے آپ کے یہاں ہفتہ وار کالم لکھنا چاہتا ہوں، دوردرشن کے پروگراموں پر! کہنے لگے کالم کو مارو گولی' سیدھے یہاں آ جاؤ اور فوراً ایک درخواست ملازمت کے لیے لکھ دو' مینیجر سے منظور کرانا میرا ذمہ رہا مگر میں کسی بھی اردو اخبار میں ملازمت نہ کرنے کا عہد کر چکا تھا۔ یہ بات انھیں بتائی تو کہنے لگے بے وقوفی نہ کرو' جو میں کہتا ہوں غور سے سنو

اور فوراً جس عہدے کے لیے چاہو' ایک درخواست لکھ دو۔میں نے ان کے خلوص کو ٹھیس نہ پہنچانے کی نیت سے دو اتنے بڑے عہدوں کے لیے درخواست لکھ دی جو میری اہلیت سے بہت اونچے' اور خود چراغی صاحب کے عہدے سے بس ذرا ہی کم تھے!

ایک دن انٹرویو ہوا۔ جنرل مینیجر نے کہا ان عہدوں کے لیے تقرری ہو چکی ہے لہٰذا آپ نیوز ڈیسک پر آجائیے بہت جلد آپ کو ترقی دے دیں گے۔ مگر میں نیوز ڈیسک پر چھے سال کام کرنے کے بعد اس سے بری طرح بور ہو چکا تھا اس لیے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے پوچھا پھر کیا چاہتے ہو؟ میں نے کالم والی بات دوہرا دی۔ کہنے لگے یہ تو معمولی سا کام ہے' اس کے لیے ملازمت کی درخواست دینے کی کیا ضرورت تھی۔ چراغی صاحب خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا' صاحب ان ہی کے کہنے پر تو درخواست دی ہے۔ میں نے دیکھا چراغی صاحب کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔ مجھے لگا۔ یقیناً سوچ رہے ہوں گے' کس بوژم کی سفارش کر دی!

مگر جنرل مینیجر کا نیوز ڈیسک والا اصرار جاری رہا۔ اور میرا انکار بھی۔ چراغی صاحب اس دوران بالکل خاموش رہے۔ آخر مینیجر نے کہا۔ ہمارے یہاں فی الحال کوئی رپورٹر نہیں ہے' کیا رپورٹر بننا پسند کریں گے۔ اس آفر پر میں نے سوچا بعد میں "ہاں" پہلے کر دی کیوں کہ میں جانتا تھا صحافت میں اڈیٹری کے بعد یہی ایک شعبہ ہے جس میں آزادی سے کام کیا جا سکتا ہے! میں نے دیکھا چراغی صاحب کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھل گئی تھی!

اس کے بعد مجھے چراغی کو قریب سے دیکھنے' سمجھنے کا موقع ملا۔ اور آج جب میں غور کرتا ہوں تو یہ سوچ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ شخص آخر اردو صحافت میں کیوں جھک مار رہا ہے؟

موہن چراغی کی مادری زبان کشمیری ہے اور تعلیمی زبان انگریزی چنانچہ انگریزی سے ہی انھوں نے صحافت کی ابتدا کی' اور پھر وقت کی بوڑھی آنکھوں نے دیکھا' چراغی ایک دن انگریزی صحافت چھوڑ کر اردو میں گئے اور انھوں نے "قومی آواز" کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا! لوگوں نے اردو چھوڑ کر ہندی یا انگریزی کی صحافت میں جاتے ہوئے تو بہتوں کو دیکھا تھا مگر اردو روزناموں کی تاریخ میں یہ شاید پہلا واقعہ تھا کہ ایک شخص نے بہتی گنگا میں سمندر سے پہاڑ کی طرف جانے کے لیے کشتی ڈال دی تھی!

"قومی آواز" سے جب میں جڑا تب تک وہ شمالی ہند میں اردو والوں کا سب سے پسندیدہ اخبار بن چکا تھا۔ عشرت علی صدیقی اس کے (دہلی اور لکھنؤ ایڈیشنوں) کے چیف ایڈیٹر تھے اور چراغی دہلی کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر۔ نور جہاں ثروت جو کبھی اخبار کی جوائنٹ یا شاید اسسٹنٹ ایڈیٹر تھیں' اور اخبار میں اپنے مضامین اور حسن ادارت کی وجہ سے قارئین میں خاصی مقبولیت حاصل کر چکی تھیں' اخبار چھوڑ کر "انقلاب" میں جا چکی تھیں جس کا دہلی اڈیشن' قومی آواز کے بند ہونے کے دنوں میں خاصی جڑ پکڑ چکا تھا اور یوں لگتا تھا کہ "قومی آواز" کا خلا "انقلاب" نے پُر کر دیا ہے۔ مگر قومی آواز میں کچھ ایسی Inherent کشش تھی کہ جیسے ہی جون 87ء میں نیوز اسٹینڈ پر اس کی واپسی ہوئی "انقلاب" کے قدم اکھڑ گئے اور اس کا دہلی ایڈیشن چند ماہ بعد ہی بند ہو گیا۔

عشرت علی صدیقی کی قومی آواز سے طویل وابستگی کے وہ آخری برس تھے' اور وہ اخبار کا ایڈیٹوریل لکھنے کے علاوہ کچھ زیادہ کام نہیں دیکھ پاتے تھے۔ ایسے میں دہلی کی ذمے داری تنہا موہن چراغی کے کندھوں پر آپڑی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس بوجھ سے ان کے کندھے جھک جاتے مگر انھیں کام کرنے والوں کی ایک اچھی ٹیم ملی تھی' اور چراغی کسی جہاز کے تجربہ کار کپتان کی طرح اچھی طرح جانتے تھے کہ کس ملاح سے کس طرح کام لینا چاہیے۔ میرے دماغ سے کالم نویسی کا شوق ان دنوں بھی بھوت کی طرح چمٹا ہوا تھا. چنانچہ رپورٹری کے ساتھ ایک کالم لکھنے کی اجازت مانگی تو انھوں نے بخوشی منظور کر لیا۔ اس کے بعد "دہلی ڈائری' اور "تحت اللفظ" نے مجھے وہ بنا دیا جو میں آج ہوں اور اس میں خاکسار کی محنت مشقت کے علاوہ یقیناً چراغی کی محبت بھی شامل ہے!

اس دوران موہن چراغی نے قومی آواز کو وہ دیا جو ابھی تک کسی اور نے نہیں دیا تھا۔ حیات اللہ انصاری اور عشرت علی صدیقی جیسے بزرگوں نے "قومی آواز" کو سنجیدگی اور متانت بخشی تھی۔ مگر چراغی نے اخبار کی غیر جانبدارانہ روایت کو مضبوطی دے کر اسے صحیح معنوں میں سیاسی / سماجی مکتب فکر کے قاری کی ضرورت بنا دیا! لیکن اس سے بھی بڑا کام چراغی نے یہ کیا کہ سنجیدگی متانت اور غیر جانبداری کے بیچ اپنے دل کی دھڑکنیں بھی رکھ دیں! اور یہ کام جس انداز سے انھوں نے کیا ان سے پہلے کوئی نہیں کر پایا' اور شاید آگے چل کر بھی کوئی نہ کر پائے۔ چراغی جب اڈیٹوریل لکھتے تو' سابقہ روایات کی پوری پاسداری کرتے اور ان کے دل پر دماغ حاوی رہتا مگر جب اپنے نام کے ساتھ الگ کوئی سیاسی

مضمون تبصرہ یا تجزیہ تحریر کرتے تو دماغ کی لگام دل کے ہاتھوں میں ہوتی۔ اور وہ تبصرہ یا تجزیہ صحافت کی تمام تر گھسی پٹی روایتوں وزنی اصطلاحات 'بے حس علامتوں اور بے روح صحافتی محاوروں سے پوری طرح پاک ہوتا۔ جو کچھ لکھتے 'دل سے لکھتے اور یہ دل سے لکھا سیدھا دل میں اتر جاتا۔ یوں دل کی دھڑکنوں سے وہ دماغوں کو روشن کرتے رہے۔ جن لوگوں نے بابری مسجد سانحہ اور حال ہی میں ایٹمی تجربات پر ان کے مضامین پڑھے ہیں' وہ اس بات کو آسانی سے سمجھ پائیں گے کہ 'اردو صحافت کو دل کی شرافت کا یہ لب و لہجہ چراغی کی ہی دین ہے۔

رفتہ رفتہ چراغی کی شخصیت کے کئی دلچسپ پہلو بھی سامنے آئے۔ اڈیٹر ہونے کے ناتے انھیں ایک علاحدہ ایر کنڈیشنڈ کمرہ ملا ہوا ہے مگر اس کمرے میں انھیں بہت ہی کم دیکھا جاتا ہے۔ کبھی کاتبوں کے بیچ لطیفہ بازی چل رہی ہے' کبھی نیوز ڈیسک پر کسی بہت ہی جونیر سب اڈیٹر کے ساتھ ہنسی ٹھٹھا چل رہا ہے' کبھی پروف ریڈنگ ڈیسک پر براجمان ہیں اور کوئی پروف ریڈر غیر حاضر ہے تو اس کی جگہ خود پروف پڑھ رہے ہیں۔ روزانہ اخبار نکالنے کو وہ کرکٹ کا میچ نہیں سمجھتے کہ کپتان پویلین میں بیٹھا دیکھ رہا ہے اور اپنی باری آنے پر ہی بلا اٹھاتا ہے! ان کے لیے یہ ہاکی یا فٹ بال جیسا میچ ہے جس میں کئی بار ریفری کو کھلاڑیوں سے زیادہ بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے۔

دفتر میں کبھی کسی معاملے پر بحث چھڑ جائے تو شکایت کر بیٹھیں گے' یہ کیا شور مچا رکھا ہے' آپ لوگ کام کیوں نہیں کرتے! اور کبھی سب لوگ بڑے سکون اور انہماک سے کام کر رہے ہوں تو اچانک بے چین ہو کر اٹھیں گے اور یہ کہتے ہوئے میدان میں کود پڑیں گے کہ کیوں بھئی کیا ہوا۔ آج بڑی خاموشی چل رہی ہے! بس اس کے بعد پھر وہی چہل بازی اور شور شرابہ! جس میں کئی بار سب سے اونچی آواز خود ان کی ہوتی ہے!!

چراغی کو دو چیزوں سے بڑی چڑ ہے۔ ایک چھٹی مانگنے سے' دوسری شاعری سے مگر یہاں بھی تضاد ہے۔ میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ کسی کارکن نے چھٹی مانگی ہو اور انھوں نے برا سا منہ نہ بنایا ہو مگر اسی چراغی کو میں نے ادنا سے ادنا کارکن کی اپنی یا گھریلو تکلیف کے لیے خود اس سے زیادہ فکر مند ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ یہی حال شاعری کا ہے۔ بڑے سے بڑے شاعر نے بھی (جن میں سے کئی ان کے اچھے دوست بھی ہیں) اگر اپنی تازہ تخلیق اشاعت کے لیے بھیجی ہو اور اس کا لفافہ ان کے ہاتھ آجائے تو سید حامدی کی

نوکری میں کھپ جائے گا۔ چنانچہ ہفتہ وار ضمیمے کے لیے جب شعری تخلیقات کی ضرورت پڑتی ہے تو ضمیمے کا عملہ اسی روی کی نوکری کی طرف دوڑتا ہے لیکن یہی چراغی صاحب خود کوئی مضمون لکھنے بیٹھیں گے تو دس میں سے آٹھ کی سرخی فیض احمد فیض یا کسی اور شاعر کے شعر کی صورت میں ہوگی جس کے لیے کئی بار وہ گھنٹوں شاعری کی کتابیں الٹتے پلٹتے رہتے ہیں اور بیچ بیچ ایک پھڑکتا ہوا شعر ڈھونڈ لیتے ہیں!

چراغی کو اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو نہیں ہے۔ وہ چہرے سے جھوٹ بولنا نہیں جانتے۔ کسی پر غصہ آرہا ہو تو صاف چہرے پر لکھا ملے گا اور پیار آرہا ہو تو وہ بھی چھلکتا نظر آئے گا یہی حال ان کی تحریروں کا ہے۔ ان میں وہ اپنا دل پوری طرح انڈیل کر رکھ دیتے ہیں مگر ان جذباتی صحافیوں کی طرح نہیں' جو اپنی سلگتی ہوئی تحریر میں سے صرف نفرت کی گرمی پھیلانا جانتے ہیں۔ یا جنھوں نے اردو صحافت کو آڑھت کا دھندا اپنا رکھا ہے کہ جدھر سے زیادہ کمیشن ملا ادھر جھک گئے۔ دنیا جانتی ہے کہ "قومی آواز" کانگریس کا اخبار ہے۔ وہ بھی جو کانگریس کے حامی ہیں اور وہ بھی جو نہیں ہیں اور کانگریس کو تو تمام برائیوں کی جڑ سمجھتے ہیں لیکن تماشا یہ ہے کہ اردو والوں تک اگر اپنی بات پہنچانی ہو تو "قومی آواز" کے بغیر نہ جنتا دل والوں کا کام چلتا ہے نہ بی جے پی والوں کا! اور یہی اس اخبار کی سب سے بڑی کامیابی اور Credibility ہے' جسے قائم کرنے میں تو حیات اللہ انصاری اور عشرت علی صدیقی کا ہاتھ تھا' لیکن اسے بچائے رکھنے اور مزید آگے بڑھانے کا سہرا موہن چراغی کے سر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی اخبار یا مشن کی کامیابی میں ٹیم کی اجتماعی کوششوں کا دخل ہوتا ہے اور یہ بات "قومی آواز" پر بھی صادق آتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس اخبار کا کپتان ہی نہیں' سب سے بڑا کھلاڑی بھی خود موہن چراغی ہے! اردو کے کیا ہندی انگریزی کسی بھی اخبار کے دفتر میں جاکر دیکھ لیجیے' سب سے کم کام کرنے والا شخص وہاں کا اڈیٹر ہوگا' اور سب سے زیادہ کام کا بوجھ چپراسی کے سر پر نظر آئے گا۔ لیکن "قومی آواز" میں سب الٹ پلٹ ہے۔ اس میں سب سے زیادہ کام کرنے والا شخص اڈیٹر' موہن چراغی ہے۔ سب اڈیٹر پانچ گھنٹوں میں فارغ ہو جائے گا۔ کاتب چار گھنٹوں میں نمٹ لے گا۔ رپورٹر دو تین گھنٹوں میں اور پروف ریڈر بھی کم و بیش اتنے وقت میں کام کر کے چل دے گا! مگر چراغی' صبح دس بجے سے شام آٹھ بجے تک' لگاتار جٹے رہیں

گے۔ اور رات کو بھی اگر کوئی بڑی خبر مل جائے گی تو گھر سے سیدھے دفتر آکر کام میں جٹ جائیں گے!

میرا چراغی صاحب سے کئی معاملات میں شدید اور بعض اوقات جارحانہ قسم کا اختلاف رہا ہے اور کسی حد تک اب بھی ہے' لیکن یہ ان ہی کا دل گردہ ہے کہ اختلافات کے باوجود وہ کبھی میری ذاتی مشکلوں اور الجھنوں سے غافل اور بے پروا نہیں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی بار میں سمجھنے سے قاصر رہتا ہوں کہ کون زیادہ بڑا ہے۔ اڈیٹر چراغی یا دوست چراغی! مجھے سات برس پہلے' میری پہلی کتاب کے اجرا کے سلسلے میں شائع ہونے والے ایک سوونیئر میں انھوں نے میرے لیے لکھا تھا۔ نصرت میرا دوست ہے۔ میں نہیں جانتا وہ مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے یا نہیں' لیکن مجھے اس کی کوئی فکر نہیں۔۔۔۔" مشکل یہ ہے کہ' آج میں خود چراغی کے بارے میں اپنے جذبات ظاہر کرنے کے لیے اس جملے کو دوہرانے سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا!

آخر میں صرف یہ کہ مجھے نہیں لگتا اردو صحافت کو اب کوئی اور موہن چراغی میسر آئے گا۔ اس لیے میری دعا ہے کہ چراغی کی روشن صحافت کا یہ سفر یوں ہی جاری رہے اور کم سے کم تب تک ضرور جاری رہے جب تک اس چراغ سے اتنی ہی روشنی دینے والے کچھ اور چراغ روشن نہیں ہو جاتے۔ آمین!

سعید اظہر چغتائی

سائنسی فکر

سائنس ایسی واقفیت کو کہتے ہیں جسے ارادی تجربوں اور غیر ارادی مشاہدوں سے خوب پرکھا جاچکا ہو اور مشکل سے مشکل کسوٹیوں پر جانچ کے ضابطوں میں پرو دیا گیا ہو۔ سائنسی کاوش سچائی کی تلاش ہے اور سائنسی فکر حقیقت کی اصل پالینے کی دُھن۔

یوں تو سارے علوم پر یہی فکر طاری ہے مگر ان کے امکانات' میدان عمل لہذا اصولوں' ضابطوں میں فرق ہے۔ سب سے زیادہ پختہ طبیعاتی علوم ہیں۔ جن پر ریاضی اور تجربہ دونوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان کے بعد ایک طرف ریاضیاتی علوم ہیں۔ جن کی جانچ پڑتال تجربوں سے تو کمتر ہوتی ہے مگر جن پر ریاضیاتی ضابطے کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔ تو دوسری طرف حیاتیاتی علم (جن میں معالجہ بھی آتا ہے) اور جن پر ریاضی خال خال اب لگنے لگا ہے مگر تجرباتی جانچ میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی جاتی۔ چوتھے درجہ پر سماجی علوم آتے ہیں۔ ان میں نفسیات خاصی حد تک تجرباتی ہو گیا ہے۔ معاشیات ریاضی کے تحت آگیا ہے۔ لسانیات اور عروض و بلاغت کے ضابطے ایک قسم کی ریاضی میں منسلک ہیں۔ تواریخ کے اپنے نمو پذیر ضوابط ہیں اور ان کی اس لیے بھی بڑی اہمیت ہے کہ وہ بہت سے علوم و فنون پر عائد ہوتے ہیں۔ ادبی تنقید اور سیاسیات میں باقاعدگی پیدا کرنے کی کوشش ہوتی رہتی ہے یا کم از کم ایسے دعوے کیے جاتے رہتے ہیں اور اس اعتبار سے یہ سب ایک نہ ایک قسم کی سائنسی فکر کے تحت آجاتے ہیں۔

پرانے زمانے میں سائنسی فکر کو منطق کہتے تھے اور اس کی تعریف تھی "وہ ضابطہ جو ذہن کو غلطی کرنے سے بچاتا ہے۔" منطق سب سے پہلے استخراجی Deductive تھی' پھر استقرائی Inductive کا اضافہ ہوا اور اب ریاضیاتی' Mathematic Methodology سب سے افضل ہے۔

باقاعدہ فکر جو منطق کہلائی اور اب ہم اسے سائنسی فکر کہہ رہے ہیں اس کی داغ بیل انسانی زندگی کی ابتدا ہی میں پڑ گئی تھی۔ جب کوئی چیز نظر آئی تو سوچا یہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کہاں سے آئی؟ وغیرہ۔ پھر ایسے ضابطوں کی تلاش شروع ہوئی جن میں سے ہر ایک کی

مدد سے زیادہ سے زیادہ مشاہدات کی تشریح ہو جائے۔ پھر اصولوں کی حد بندی ہوئی اور چاہا کہ مختلف قسم کے اصولوں کے بیچ رابطے ڈھونڈے جائیں۔ اس طرح فکر و فہم کے فاصلے کم ہوتے گئے اور ہم ایک اصل الاصول کی بازیافت کی طرف بڑھتے گئے جس سے سبھی اصول نکالے جا سکیں اور سبھی دیکھی سنی محسوس کی ہوئی باتوں کو سمجھا جا سکے۔ آج ہم اس منزل کے خاصے قریب آگئے ہیں مگر اس تک پہنچنا ہنوز باقی ہے اور بار بار ایسے موقع آتے ہیں کہ سوچنا پڑتا ہے۔ اصل الاصول حقیقت میں کوئی ہے بھی یا نہیں۔ اس سوال کا جواب ظاہر ہے کہ آخری سوال کا جواب ہوگا۔

ریاضی کی خوبی یہ ہے کہ وہ حرکت کے اصول مہیا کرنے کے بعد حرکت کرنے والی اکائیوں کے کچھ ایسے رشتے متعین کر دیتی ہے جو گزرتے ہوئے وقت یا پھیلتے مکانی فاصلوں میں بڑی حد تک قائم رہتے ہیں۔ اس لیے ہم جن اصول کی ریاضی لکھ لیں اسے بہت دنوں اور بہت دور تک آزمایا جاتا رہتا ہے اور اس سے اپنے کام کے صحیح نتیجے نکالے جاتے رہتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف دیکھی ہوئی باتوں یعنی مشاہدات کی تشریح ہو جاتی ہے بلکہ ان دیکھے مظاہر کی پیش بینی بھی کی جاتی ہے۔ اگر یہ مظاہر ویسے ہی مل جاتے ہیں جیسے کہ متعلقہ ریاضی نے بتایا تھا تو ریاضیاتی نظریے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اب یہ بات کہ کسی حد تک پیش گوئی اور مشاہدے میں مطابقت ہوئی اس کا فیصلہ پیمائشوں سے ہوتا ہے۔ جن کی صحت کی حدیں انھیں ناپنے والے آلات سے متعین ہوتی ہیں اسی لیے کہا جاتا ہے کہ طبیعی علوم ریاضی کے ماتحت ہوتے ہوئے بھی تجرباتی ہیں۔

نظریے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ کسی مشاہدے کو کئی حصوں میں بانٹ کے حصہ بہ حصہ یوں وضاحت کی جا سکتی ہے کہ میزان میں مشاہدہ اور نظریہ ایک دوسرے کے بہت قریب آجائیں۔ اس طرح کا عمل بطلیموس نے سورج کے گرد زمین کی طرح گھومنے والے سیاروں کی تشریح میں کیا تھا اور اس سے کہیں بڑھ کے آج نیوکلیائی اور برق حرکیات نامی Electromagnetics طبیعات کی شاخوں میں کیا گیا ہے۔ موخر الذکر روشنی کے ذریعہ دریافت کی جانے والی باریک مادی بناوٹ کی تشریح کرتی ہے مگر اس طریقے کو مجبوری درجے ہی اپناتے ہیں۔ اچھا یہ سمجھا جاتا ہے کہ مشاہدے کی کلی طور پر یکمشت وضاحت ہو جائے۔ اسی لیے ستاروں کی گردش کے لیے کوپرنکس کے نظام کو ترجیح دی گئی، جس کے مطابق زمین سمیت سبھی سیارے سورج کے گرد گردش کرتے ہیں اور عطارد و زہرہ کو چھوڑ کر بقیہ سات سیاروں کے چاروں طرف ان کے چاند گھومتے ہیں۔ پھر کپلر نے ان سیاروں کے مدار دائروں سے بدل کر اہلیجی Elliptical کر دیے تو مطابقت زیادہ بہتر ہو گئی مگر پوری

حرکیات کی جگہ کوئی عام اصول نہیں بنایا جاسکا' اور اس بات پر کیمبرج یونی ورسٹی کے محقق اور استاد ڈراک نے جو خود رائج نظریے کی تخلیق میں سب سے آگے رہے ہیں' ناکامی اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔

حیاتیاتی سائنس سالے Molecule کی حد تک کیمیا اور فزکس سے جڑ گئے ہیں اور ان پر ریاضیات بھی لگنے لگی ہے۔ انھیں ایٹمی نظریے سے جوڑنے کی ایک کوشش عبدالسلام مرحوم نے اپنے آخری برسوں میں کی مگر ابھی اس کام کی حقیقی شروعات ہونا باقی ہے۔

تاریخ اب بادشاہوں تک محدود نہ رہ کے انسانی تہذیب کے ارتقا کی روداد بن گئی ہے۔ پھر علوم میں سے ہر علم کی اپنی تاریخ ہے اور مذہبی نوشتے وہی اور اسی حد تک معتبر ہیں جن کی جس حد تک تاریخیت مسلم ہو۔

ان سب طرح کی تاریخوں کے ضابطے ایک دوسرے سے بہت مختلف نہیں۔ ان میں صرف حالات اور کیفیت کا فرق ہے۔ اس لیے تاریخی فکر یا ضابطے کا باقاعدہ یا سائنسی ہونا انسانی تہذیب کے لیے بہت ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ تاریخی ضابطہ اس حد تک معروضی اور قابل یقین نہیں ہو سکتا' جتنا طبیعیاتی علوم کا ہے۔ مگر جس حد تک ممکن ہے اسے تضاد اور انفرادی یا جماعتی عصبیت سے آزاد کرنا ہمارا فرض ہے۔ تاریخ کی حد تک اسی طرز فکر کو سائنسی کہا جاتا ہے۔ اس کی رو سے ٹھوس اعداد و شمار جمع کیے جاتے ہیں اور ان کا تجزیہ ایسے تصورات پر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں اور طبقوں کے لیے قابل قبول ہوں یا کم از کم قابل انکار نہ ہو سکیں۔ یہ کام مشکل ہے اور اس پر اتفاق رائے نہیں ہو پاتا۔ صرف کثرت رائے تک بات پہنچتی ہے۔ مگر یہ بھی غنیمت ہے اور بات آگے بڑھتی رہنی چاہیے۔

سائنسی فکر کا یہ تصور علوم ہی تک محدود نہیں' عام زندگی پر بھی لگتا ہے۔ کوئی بات کوئی بحث کوئی معاملہ ہو اسے ہم اس طرح سمجھ سکیں کہ وہ عصبیت' خواہ مخواہ رائج دقیانوسی خیالات' بے سبب کے نتیجوں سے محفوظ اور مقامی یا وقتی اثرات سے جتنا ہو سکے آزاد ہو۔ ہم یہ سائنسی فکر تلاش اور رائج کرتے رہیں گے کیونکہ یہ انسانیت کی بقا اور مستقبل کے لیے ضروری ہے۔

سائنس کے مختلف شعبوں میں طبیعیات' کیمیا' ارضیات' فلکیات وغیرہ کے الگ الگ اور مشترکہ مطالعوں سے کائنات میں وجود کی سائنسی تاریخ خاصی حد تک مرتب ہو گئی ہے۔ پتا چلتا ہے کہ ارتقا کے عمل میں کئی موقعوں پر بال برابر فرق پڑ جاتا تو ہم نہ ہوتے

ہوتے بھی تو ایسے نہ ہوتے جیسے کہ آج ہیں۔ ہمارے مستقبل پر بھی خطروں کے بڑے بھیانک بادل منڈلا رہے ہیں۔ کاش ہمیں ان کا احساس ہو اور ہم چھوٹے چھوٹے ذاتی اور جماعتی فائدوں کے لیے وقت ضائع کرنے کے بجائے قریب اور دور کے سچے نقصانوں اور خطروں سے بچنے کی کوشش کریں۔

پہلا ضروری کام تو یہی ہے کہ عام زندگی کی حفاظت کی جائے۔ ہم ایک دوسرے کو مٹانے کی کوشش بند کردیں اور ماحول کو صاف رکھیں تاکہ ہوا سانس لینے کے قابل رہے اور آبادی کا بوجھ اتنا نہ بڑھ جائے کہ موجودہ اور ممکن وسائل اسے برداشت نہ کر سکیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس زمین پر زندگی پانچ ارب سال سے زیادہ باقی نہ رہ سکے گی اور ابھی تک کہیں اور زندگی کا سراغ نہیں ملا ہے۔ صرف امکانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہر ستارے کی اپنی عمر ہے اور ارتقا کے مدارج ہیں۔ سورج جس پر ہماری زندگی منحصر ہے پھیلنے لگے گا اور عطارد، زہرہ، زمین اور مریخ چاروں سیاروں کو اپنی دہکتی فضا کی لپیٹ میں لے لے گا۔ ابھی ہمارے پاس اتنا وقت ہے کہ کائنات میں کوئی پناہ ڈھونڈ لیں، جہاں آخری طور پر براوقت آنے سے پہلے نباتاتی اور حیواناتی وجود کے بیج لے جاکے اس طرح محفوظ کردیے جائیں کہ طوفان نوحؑ کے قصے میں آیا ہے۔ ورنہ زندگی کی یہ نعمت جس کا کہیں اور میسر ہونا ابھی تک ثابت نہیں ہے ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی۔ خلائی تحقیق اور کاوشوں کا یہی مدعا ہے۔

سورج جس وقت خشمگیں ہو جائے
مریخ بھی جب اس کے نگیں ہو جائے
اس وقت زمیں کی کوئی رنگیں چڑیا
بتلاؤ کہاں جاکے مکیں ہو جائے

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

پروفیسر بدر الدین الحافظ
13-N-625 ہلہ ہاؤس
جامعہ نگر نئی دہلی۔۲۵

مچھر اور ادیب

مچھروں کی ستم رانی کا بھلا کون شکار نہ ہوا ہوگا اور ہم تو نئی دہلی کے جس علاقہ جامعہ نگر میں رہتے ہیں یہاں ہر سال مارچ سے تقریباً جولائی تک اس یورش کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مچھر تو عوام و خواص سب ہی کو اپنا نشانہ بناتے ہیں، اور عوام بے چارے اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے ظاہری تدبیریں اختیار کر کے تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں مگر خواص میں کسی بھی زبان کا ادیب جب مچھروں کی فوج کشی کو اپنی قلمی جادو بیانی کے سپرد کرتا ہے تو پھر اس سے ایسے ادبی شہ پارے وجود میں آتے ہیں جو نہ صرف اپنے دور کی سیاسی سماجی عکاسی کرتے ہیں بلکہ ایک سبق آموز کہانی بن کر تاریخ ادب میں نقش بن جاتے ہیں، اور برسہا برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی جاذبیت میں کمی نہیں آتی۔

ملاحظہ فرمایئے عربی ادب کے مشہور مصری ادیب مصطفیٰ لطفی منفلوطی کی خامہ فرسائی کا ایک نمونہ۔

منفلوطی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رات کو حسب عادت مضمون لکھنے کا ارادہ کیا تو مچھروں کی یلغار نے قلم کا رخ ہی موڑ دیا اور ہوا یہ کہ وہ مضمون تو نہ لکھا جا سکا مگر مچھر نامہ تیار ہو گیا جس کا عنوان رکھا البعوض و الانسان، یعنی مچھر اور انسان اس میں لکھتے ہیں "کیا بتاؤں میں نے مچھروں سے نجات پانے کے لئے بہت ہاتھ پانو مارے مگر خود کو معذور اور مجبور پایا کیونکہ وہ اڑان کی کیفیت میں مجھ سے کہیں زیادہ طاقتور اور مضبوط تھے پھر کھڑکیاں کھولیں کہ اندر کے مچھر باہر چلے جائیں تو باہر والے اندر آگئے اور میں مقام حیرت میں کھڑا تھا۔ میں نے سوچا یہ ایک جگہ جمع ہوں تو ایک ہی ضرب کاری سے ان کا کام تمام کر دوں مگر وہ تو ایک جگہ جمع ہونے کا نام ہی نہ لیتے تھے، مجھے حیرت تھی کہ مچھروں جیسی تو کوئی قوم ہی دیکھنے میں نہیں آئی جس کی اجتماعی حالت میں موت اور افتراق

میں قوت کا راز پوشیدہ ہو' آخر میں نے ان کمزور مچھروں کے مقابلہ میں اپنی شکست فاش دیکھتے ہوئے صبر کا راستہ اختیار کیا جو عام طور پر کمزور اور ضعیف کا ہتھیار ہوتا ہے پھر خیال آیا کاش ان مچھروں میں انسان جیسی رحم و کرم اور مروت کی صفات ہوتیں تو میرے ساتھ۔ یہی برتاؤ کرتے کہ مجھے مضمون پورا کر لینے دیتے مگر پھر سوچا انسان ہی کون سا رحم و کرم کرتا ہے خون چوسنے کی عادت میں دونوں برابر ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ مچھر تو اجتماعی شکل میں خون چوستے ہیں اور انسانی قاتل تو تنہا ہی مقتول کا خون پیتا ہے ہاں مقصد کے لحاظ سے مچھر انسان سے بہتر پوزیشن میں نظر آتا ہے کیونکہ وہ انسانی جسم کو تکلیف دے کر اپنی زندگی حاصل کرتا ہے اور یہ اس کا ایک قدرتی عمل ہے اس کے علاوہ اس کے لئے کوئی چارہ کار بھی نہیں۔ اگر وہ یہ نہ کرے تو اپنی جان کیسے بچائے جبکہ حضرت انسان کی حیات انسانی خون چوسنے پر موقوف نہیں ہے وہاں صرف مضرت رسانی ہی مقصود ہے۔ پھر مچھر کو دیکھیے اپنے ذریعہ معاش کی تگ و دو میں نکلتا ہے۔ انسان کے خون کی پیاس میں بھنبھناتا ہے تو اس قدر زور شور سے کہ حملہ سے قبل ہی انسان چوکس ہو جائے اور دشمن کا مقابلہ کرنے کی ہر ممکن تدبیر کرے یہ اگر ایک طرف بہادری کی علامت ہے تو دوسری طرف ناعاقبت اندیشی بھی کہ جس کا خون پی کر سیرابی حاصل کرنی ہے اس کو پہلے اچھی طرح بیدار کر دو پھر اس کے بدن کو چھیدنا شروع کرو بالکل ایسے ہی جیسے اس دور کا مصری سیاست داں جب اپنی قوم کی بھلائی یا دشمن سے بچاؤ کی تدبیریں سوچتا ہے تو پہلے اس کا اچھی طرح ڈھنڈورا پیٹ دیتا ہے تاکہ دشمن اچھی طرح تیاری کر لے بھلا یہ کونسی عقلمندی ہے۔

اس کے علاوہ مچھر کے خون چوسنے کی ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ شدت شوق اور لذت میں ناقابل برداشت حد تک خون پی لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا جسم پھٹ جاتا ہے گویا وہ زندگی حاصل کرنے کے لیے موت کا راستہ اختیار کرتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے ایک شرابی شدت شوق میں جام پر جام لنڈھائے جاتا ہے آخر کار یہی کثرت مے خوری اسے موت کے دہانے تک پہنچا کر دم لیتی ہے۔ (النظرات)

اس کے بعد اب ذرا منفلوطی کے ہمعصر اردو کے مایۂ ناز ادیب اور انشا پرداز حضرت خواجہ حسن نظامی رحمتہ اللہ علیہ کے قلم کی جولانی بھی دیکھیں جس نے اپنے مزاج اور ماحول کے مطابق کچھ نرالے ہی انداز سے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ کا یہ مضمون مچھر کے عنوان سے ۱۹۱۰ء میں ماہنامہ صوفی میں شائع ہوا تھا پھر حضرت خواجہ صاحب کے مجموعہ مضامین میں شامل کیا گیا۔ تحریر فرماتے ہیں "انسان کہتا ہے مچھر بڑا کم

ذات ہے کوڑے کرکٹ میل کچیل سے پیدا ہوتا ہے اور گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے اور بزدلی تو دیکھو اس وقت حملہ کرتا ہے جب ہم سو جاتے ہیں۔ صورت تو دیکھو کالا بھتنا لمبے لمبے پانو بے ڈول چہرہ' اس شان و شوکت کا وجود اور آدمی جیسے گورے چٹے خوش وضع پیاری اور اکی دشمنی بے عقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں۔ مچھر کی سنو تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے اور کہتا ہے کہ جناب ہمت ہے تو مقابلہ کیجیے' ذات صفات نہ دیکھیے میں کالا سہی' بد رونق سہی' نیچ ذات اور کمینہ سہی مگر یہ تو کہیے کس دلیری سے آپ کا مقابلہ کرتا ہوں اور کیونکر آپ کا ناک میں دم کرتا ہوں' یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بے خبری میں آتا ہوں اور سونے میں ستاتا ہوں۔ یہ تو تم اپنی عادت کے موافق سراسر ناانصافی کرتے ہو۔ حضرت میں تو کان میں آکر الٹی میٹم دے دیتا ہوں کہ ہوشیار ہو جاؤ اب حملہ ہوتا ہے' تم ہی غافل ہو تو میرا کیا قصور' زمانہ خود فیصلہ کر دے گا کہ میدان جنگ میں کالا بھتنا لمبے لمبے پانو والا بے ڈول کامیاب ہوتا ہے یا گورا چٹا اچھی آن بان والا۔ تم تو ناحق بگڑتے ہو' میں تمھارا مخالف نہیں ہوں' کل ایک شاہ صاحب عالم ذوق میں اپنے ایک مرید سے فرمارہے تھے کہ میں مچھر کی زندگی کو دل سے پسند کرتا ہوں دن بھر بے چارہ خلوت خانہ میں رہتا ہے رات کو جو خدا کی یاد کا وقت ہے باہر نکلتا ہے اور پھر تمام شب تسبیح و تقدیس کے ترانے گایا کرتا ہے آدمی غفلت میں پڑے ہوتے ہیں تو اس کو ان پر غصہ آتا ہے چاہتا ہے کہ یہ بھی بیدار ہو کر مالک کے آگے روئے اس سہانے خاموش وقت کی قدر کرے اور حمد و شکر کے گیت گائے اس لیے پہلے اس کے کان میں جا کر کہتا ہوں کہ اٹھو میاں جاگنے کا وقت ہے سونے کا اور ہمیشہ سونے کا وقت ابھی نہیں آیا جب آئے گا تو بے فکر ہو کر سونا اب تو ہوشیار رہنے کا اور کچھ کام کرنے کا موقع ہے مگر انسان اس سریلی نصیحت کی پروا نہیں کرتا اور سوتا رہتا ہے تو مجبور ہو کر غیظ و غضب میں اس کے چہرہ اور پانو پر ڈنک مارتا ہوں پر واہ رے انسان آنکھیں بند کیے ہوئے ہاتھ پانو مارتا ہے اور بے ہوشی میں بدن کو کھجا کر پھر سو جاتا ہے۔ شاہ صاحب کے یہ عارفانہ کلمات سن کر مجھے بھی تسلی ہوئی کہ غنیمت ہے ان آدمیوں میں بھی انصاف والے موجود ہیں بلکہ میں دل ہی دل میں شرمایا کہ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ یہ شاہ صاحب مصلے پر بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے ہیں اور میں ان کے پیروں کا خون پیا کرتا ہوں۔ یہ تو میری نسبت ایک اچھی رائے دیں اور میں ان کو تکلیف دوں اگرچہ دل نے یہ سمجھایا کہ تو کاٹتا تھوڑی ہے قدم چومتا ہے اور ان بزرگوں کے قدم چومنے ہی کے قابل ہوتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ اسی سے میری ندامت دور نہیں ہوئی اور اب تک میرے دل میں اس کا افسوس باقی ہے۔

مکتبہ پیام تعلیم کی مذہبی کتابیں

کتاب	قیمت
صراط مستقیم	۷/۵۰
سورہ رحمٰن (ترجمہ مع تشریح)	۶/
حضرت شیخ مخدوم علی مہائمی	۴/۵۰
اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں	۹/
نماز پڑھی	۴/۵۰
السلام علیکم	۷/۵۰
حضرت یوسف علیہ السلام	۴/۵۰
حدیث کیا ہے	۴/
حضرت عمر فاروقؓ	۶/
نقوش سیرتؐ اول	۵/
نقوش سیرت حصہ دوم	۵/
نقوش سیرتؐ حصہ سوم	۵/
نقوش سیرتؐ حصہ چہارم	۵/
نقوش سیرتؐ حصہ پنجم	۵/
رسالہ دینیات اوّل	۳/
دوم	۴/
سوم	۵/
چہارم	۵/
پنجم	۶/
ششم	۶/
ہفتم	۶/
ہشتم	۶/
حضرت آدم علیہ السلام	۴/
حضرت یحییٰ علیہ السلام	۳/
بزرگانِ دین	۴/
امت کی مائیں	۴/۵۰
خوب سیرتؐ اوّل	۴/
خوب سیرتؐ دوم	۶/
اچھی باتیں	۴/۵۰
رسول اللہ کی صاحبزادیاں	۴/۵۰
سلطان جیؒ	۴/۵۰
سیرت پاک مختصر مختصر	۳/
کمسن صحابی	۶/
رحمان کا مہمان	۶/
اسلام کے جاں نثار	۵/
نور کے پھول	۹/
سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	۳/۵۰
حضرت ابو بکر صدیقؓ	۶/
حضرت عبداللہ ابن عمرؓ	۳/
حضرت طلحہؓ	۳/
حضرت ابوذر غفاریؓ	۳/
حضرت سلمان فارسیؓ	۳/۵۰
حضرت عبداللہ ابن عباسؓ	۳/۵۰
حضرت محبوب الٰہیؒ	۳/۵۰
حضرت معین الدین چشتیؒ	۳/
حضرت فرید گنج شکرؒ	۳/
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	۳/
نیک بیٹیاں	۳/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	۳/
حضرت حمزہؓ	۳/
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	۳/
حضرت ابوہریرہؓ	۴/
اللہ کے نبی	۲/۵۰
اللہ کا گھر	۴/۵۰
اللہ کے خلیلؑ	۳/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	۴/
قرآن پاک کیا ہے؟	۵/
اسلام کے مشہور سپہ سالار اول	۶/
دوم	۶/
اسلام کے مشہور امیر البحر	۹/
اسلام کیسے پھیلا حصہ اوّل	۷/۵۰
حصہ دوم	۶/
اسلام کیسے شروع ہوا	۷/۵۰
رسول پاکؐ	۶/
دس جنتی	۷/۵۰
سرکار کا دربار	۶/۵۰
چار یار	۷/۵۰
آں حضرتؐ (اردو)	۳/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	-/۴۰
ہمارا دین حصہ اوّل	۸/۵۰
ہمارا دین حصہ دوم	۸/۵۰
ہمارا دین حصہ سوم	۸/۵۰
تحسین القرآن	(زیر طبع)
منہاج القرآن	۴/۵۰
ائمہ اربعہ	(زیر طبع)
ارکان اسلام	۴/
عقائد اسلام	۴/۵۰
خلفائے اربعہ	۱۲/
نبیوں کے قصے	۷/۵۰
ہمارے رسولؐ	۷/

ڈاکٹر نیر جہاں
جی ۷۔۴ ابوالفضل انکلیو
نئی دہلی۔۲۵

بنجارہ نامہ ــــ ایک سرسری جائزہ

نظیر فطرت انسانی کے نقاش بھی ہیں اور انسانی نفسیات کے رازداں بھی! انھوں نے انسان کو ہر روپ میں دیکھا اور ہر رنگ میں برتا ہے۔ نظیر وہیں رچے بستے ہیں جہاں انسان بستے ہیں۔ کھیت میں، کھلیانوں میں، آبادی میں، ویرانوں میں، میلوں ٹھیلوں میں اور گلی کوچوں میں۔ وہ انھیں کے ساتھ روتے اور ہنستے ہیں، چیختے اور شور مچاتے ہیں۔ ان کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے اور ان کے دکھ سکھ کو بانٹتے ہیں۔ نظیر نے انسانوں کے شب و روز کا نظارہ آسمان کی بلندیوں سے نہیں کیا، نہ ایوان کے دریچوں سے انھیں دیکھا۔ وہ تو انسانی سیلاب میں کود پڑے۔

نظیر نہ مفکر تھے نہ فلسفی۔ وہ انسانی جذبات و نفسیات کے ترجمان تھے اور انسانی آبادی ان کی حقیقی عمل گاہ تھی۔ وہ انسان کے خارجی عمل کے آئینے میں اس کی صورت دیکھتے ہیں اور عمل کی راہ سے اس کے گہرے اور حقیقی جذبات کی تہوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور اکثر کامیاب رہتے ہیں۔ نظیر کا یہی تجسس اور قوت مشاہدہ ان کا اصل سرمایہ ہے۔ اور اسی چیز نے انھیں ہر دور میں ممتاز اور منفرد رکھا ہے۔ اور اسی لیے وہ اردو شاعری کے روایتی چوکھٹے میں نہیں سما سکے۔ اکثر شاعروں اور نقادوں نے انھیں بلند مرتبہ شاعر ماننے سے انکار کر دیا اور "پھکڑباز" کہہ کر نظر انداز کر دیا۔ لیکن نظیر اپنی راہ سے کبھی نہیں ہٹے، نہ دوسروں کی راہ چلے، نہ کسی سے سمجھوتہ کیا اور نہ کسی کو اپنا رہبر مانا۔ وہ زندگی کو عیش گاہوں اور طرب کدوں میں نہیں گلیوں اور میدانوں میں تلاش کرتے پھرتے اور سادہ، بے لوث اور بے ریا زندگی کو پاکر مسرور ہوتے اور اپنی شاعری کے سانچے میں ڈھال لیتے۔ عام انسانوں کے جذبات اور تجربات کی ترجمانی نے ہی نظیر کی شاعری کو

قوت و توانائی بخشی، انھیں آج تک زندہ رکھا اور مستقبل کی ضمانت عطا کی۔

جو لوگ نظیر کی شاعری میں فکر و فلسفے کی تلاش کرتے ہیں انھیں مایوسی ہوتی ہے اور وہ نظیر پر تخیلی تضاد کا الزام عائد کر دیتے ہیں۔ وہ جب نظیر کے ہاں عیشِ عالم کے ساتھ ساتھ ترکِ دنیا کا پیغام پاتے ہیں تو اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ زندگی کے دامن میں بے پناہ خوشی کے ساتھ بے پناہ غم بھی ہے۔ زندگی اسی دھوپ چھاؤں کا نام ہے۔ نظیر کا اگر کوئی فلسفہ ہے تو فلسفۂ عمل ہے۔ انسان مسافر ہے اور یہ پوری دنیا عمل گاہ۔ عمل کی راہ میں خوشی اور غم باری باری آتے ہیں۔ ایک آزاد خیال اور صاحبِ عمل انسان ایوانوں اور شبستانوں کی قید میں زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہ زندگی کا اصلی چہرہ دیکھتا اور دکھاتا ہے۔

نظم "بنجارہ نامہ" نظیر کی نمائندہ نظم ہے جس میں نظیر نے انسانی کردار کو اس کے حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے۔ بنجارہ عیش و طرب سے بے پروا اور زندگی کی لذتوں سے ناآشنا، اپنی دھن میں مگن رواں دواں نظر آتا ہے۔ اس کے لیے زندگی جہد مسلسل اور عمل پیہم کے سوا کچھ نہیں۔ وہ ایسا مسافر ہے جو سرگرم سفر تو ہے مگر سامانِ سفر سے بے پروا۔ اور جب سفر ہی زندگی ہے تو قیام گاہ کی ضرورت بھی کیا ہے۔ لہٰذا وہ اقبال کے شاہین کی طرح اپنا آشیانہ نہیں بناتا۔ خود دار ہوتا ہے، ہاتھ نہیں پھیلاتا، محنت کی کمائی کھاتا ہے، دکھ سہتا ہے، سکھ پہنچاتا ہے۔

انسان کی حقیقی زندگی جدوجہد اور جانفشانی سے عبارت ہے۔ نظیر زندگی کے اسی رنگ و آہنگ کے شیدا ہیں۔ جب تیز رفتار سواریاں، موٹر اور ریل گاڑیاں نہ تھیں یا بہت عام نہ ہوتی تھیں۔ اس وقت بنجاروں کی بڑی قیمت تھی اور وہ معاشرے کا نہایت اہم حصہ تھا۔ وہ غلہ اور دوسری اجناس لیے گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، شہر شہر مارا پھرتا اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرتا۔ وہ دشوار گزار راہوں سے گزرتا، سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا، موسم کی سختیاں جھیلتا۔ اور صرف سامانِ تجارت نہیں گھر کا گھر ساتھ ہوتا۔ نہ چلچلاتی دھوپ اس کے قدم روکتی، نہ موسلادھار بارش سدّ راہ بنتی اور نہ کڑاکے کی سردی اس کا حوصلہ پست کر پاتی۔ زندگی کا جوش، مقصد کی لگن اور منزل بہ منزل رواں دواں رہنے کی آرزو ہر میدان سر کرنے کو ہر لمحہ تیار رہتی۔

نظیر کی زندگی اور ان کی صبح و شام جو اس آزاد روی اور صحرا نوردی کی رسیا تھی، بنجارے کی پُر مشقت مگر بے قید زندگی میں بے پناہ کشش محسوس کرتی اور اسے اپنا محبوب

کردار بنالیتی ہے۔ اور جب نظیر کی حقیقت پسند نگاہ انسانوں کی اس بستی پر پڑتی ہے تو انھیں ہر انسان "بنجارہ" نظر آتا' جو اپنی کھیپ لیے بھاگتا جارہا ہے۔ زندگی کی ان راہوں پر جس کا آخری سرا نامعلوم ہے' ایک ایسی منزل کی تلاش میں جو آنکھوں سے اوجھل ہے۔ مگر نہ تو انجان راہیں حوصلہ شکنی میں کامیاب ہوتی ہیں اور نہ ہی نامعلوم منزل اسے ناکامی کا پیغام دیتی ہے۔

لیکن وہ بنجارہ بے چارہ کیا جانے اُس کا سفر کب اور کہاں اچانک ختم ہو جائے' اس کا سامان تجارت کب لٹ جائے اور وہ اپنی زندگی کی پونجی گنوا بیٹھے' تو پھر لازمی طور پر زندگی بھر کی یہ کمائی اور اس کمائی کے لیے ساری تگ ودو' مارا مارا پھرنا' جان جوکھوں میں ڈالنا سعیٔ لاحاصل کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن جب زندگی اور موت کا رشتہ اٹوٹ ہے' راہِ حیات کی منزل موت ہے اور اس عالم فانی سے خالی ہاتھ جانا ہے تو پھر حرص و ہوس میں زندگی گزارنے اور جان کھپانے کی ضرورت کیا ہے۔

نظیر کی یہ نظم ناصحانہ بھی ہے اور حکمت کا خزانہ بھی۔ نظیر کے لیے بنجارے کی خانہ بدوشی خیال انگیز ہے جب وہ گھر اور گھر کا سارا اثاثہ' کل سامان تجارت اور تمام اہل و عیال ساتھ لیے پھرتا ہے تو پھر وہ آشیانہ تعمیر کرکے کیا پائے گا جب کہ آشیانہ ہر لحہ بجلی کی زد میں ہے۔ وہ اپنے سامان تجارت پر کیوں بھروسا کرے جب کہ سب سے بڑا بیوپاری اسے اپنے داموں خریدنے پر بضد ہے:

گر تو ہے لکھی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل' تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر' مصری' قند گری' کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ ' منقے' سونٹھ' مرچ کیا کیسر' لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب بے ثباتی اس دنیا کی تقدیر ہے اور فنا اس کی قسمت۔ تو پھر یہ حرص و ہوس کیسی؟ ملکوں ملکوں مارے پھرنے کی ضرورت کیا ہے؟ جب نہ بدھیا بھینسا کام دے گا اور نہ گیہوں چاول' نہ شکر مصری' نہ لعل و گہر' نہ تاج و تلوار۔ سب کچھ بے کار اور عبث ثابت ہوگا۔ جب اصل ٹھکانہ جنگل اور حقیقی مسکن قبر ہے۔ اہل و عیال کا سہارا کیا جب کہ ہر فرد سہاروں کا محتاج ہے:

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری رہ جاوے گی
اک بدھیا تیری مٹی پر، پھر گھاس نہ چرنے آوے گی
یہ کھیپ جو تونے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھی پوت، جنوائی، بیٹا کیا، بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

لیکن نظیر نظیر ہیں۔ فانی نہیں۔ وہ دنیا کی بے ثباتی اور موت کی تلخ کامی محسوس ضرور کرتے ہیں لیکن زندگی کی مٹھاس سے منہ نہیں موڑتے۔ وہ نہ تو عالم کی بے ثباتی پر آنسو بہاتے، نہ موت کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ امید، حرکت اور عمل کے شاعر ہیں۔ موت ایک اٹل حقیقت سہی، لیکن زندگی کے میسر لمحات میں کچھ کر دکھانے کی آرزو کیوں نہ ہو۔ اس حیاتِ مختصر میں بھی تو صفحۂ ہستی پر ایسے انمٹ نقوش مرتب کیے جا سکتے ہیں جن کی تابندگی تاریخ انسانیت کی پیشانی کو روشن رکھ سکتی ہے۔ بڑے کاموں کے لیے بڑی عمر ضروری نہیں۔ بڑے کام برسوں میں نہیں لمحوں میں بھی انجام پا سکتے ہیں۔

نظیر حسرت کے نہیں امید کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں موت کا سکوت نہیں زندگی کی لہریں دکھائی دیتی ہیں۔ البتہ وہ حرص و ہوس کے خلاف ہیں۔ خواہشات کی غلامی انھیں پسند نہیں۔ اسی لیے انھیں بنجاروں کی زندگی پسند ہے۔ وہ زندگی جو آزاد ہے، خطر پسند ہے، با مقصد ہے، جہد و عمل کا نمونہ ہے۔ اگر موت کا کھٹکا ہے تو زندگی کو زیادہ تیز رفتار ہونا چاہیے۔ جلد سے جلد منزل پر پہنچ جانے اور گوہر مقصود پا لینے کی جستجو اور آرزو ہونی چاہیے۔ جب قزاقِ اجل گھیرا ڈالے بیٹھا ہے تو زندگی کی پونجی لٹنے سے پہلے اسے لافانی کیوں نہ بنا دیا جائے۔

'بنجارہ نامہ' نظیر کی شاہکار نظم ہے۔ حکمت و حقائق کا خزانہ ہے۔ پند و نصیحت کا ترانہ ہے۔ نظیر کے پاس الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ وہ اپنے موضوع، ماحول اور خیال کے مطابق الفاظ چن لیتے ہیں اور سماں باندھ دیتے ہیں۔ اس نظم کے سلسلے میں مخمور اکبر آبادی کا خیال ملاحظہ ہو:

> "بنجارہ نامہ ایک حکیمانہ تمثیل یا ایلیگری اور ناصحانہ نظم ہے۔ یہ معنوی اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہے۔ اس کے پوشیدہ مطالب جس قدر عمیق ہیں، اس کی ظاہری

> دلچسپی اسی قدر نمایاں ہے ۔۔۔ میرے نزدیک اس سے
> زیادہ دقیق و عمیق نظم نظیر کے کلام میں نہیں ہے اور
> اس پر لطف یہ ہے کہ غالباً اس سے زیادہ مقبول بھی ان
> کی کوئی نظم نہیں ہوئی۔" (روحِ نظیر ص ۷۴)

'بنجارہ نامہ' میں نظیر نے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو بہت پُر معنی اور نہایت اثر انگیز ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی' موت کا خوف' سفرِ آخرت کی تیاری۔ پھر زندگی کی تنہائی' بے بسی' درد و غم' سرمایۂ حیات لٹ جانے کا خطرہ۔ اور ان بوجھل خیالات کے لیے الفاظ کے پیکر تراشنا نظیر ہی کا حصہ ہے۔ اس نظم کی بحر عبرت و حسرت کے مضامین کے لیے نہایت موزوں ہے۔ ذکرِ فنا کے لیے یاس انگیز الفاظ کے ساتھ "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا۔۔۔" کی تکرار دل و دماغ کے سارے تار ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ پھر نہ کوئی آرزو باقی رہتی ہے نہ ارمان۔ اور نہ حرص و ہوا کا سودا۔ ساری خواہشات کافور ہو جاتی ہیں۔

نور جہاں عثمانی
ایچ۔جی۔ آئی کالج
الہ آباد، یو۔پی

نظیر اکبر آبادی "آدمی نامہ" کے آئینہ میں

نظیر نے فطری طور پر محبت سے لبریز و معمور دل پایا تھا۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ قدرت کی فیاضی کا یہ ایک بہت بڑا عطیہ تھا جو نظیر کو محبت کی شکل میں عطا ہوا اور اس طرح ملا کہ ان کا پیمانہ دل چھلکا پڑتا تھا اور محبت کی بہتات و فراوانی کوزہ دل میں سما کر کائنات کی ہر چیز پر بہتی اور چھلکتی نظر آتی ہے۔ کون سا موضوع یا کون سی شے ایسی ہے جس نے ان کی شاعری میں جگہ نہ پائی ہو۔

موضوع و بیان کی یہ فراوانی جو ان کی نظمیات کی شکل میں ہے۔ خواہ فنی تقاضوں اور مقصدیت پر پوری نہ اترتی ہوں لیکن مشاہدے کی وسعت اور شعور کی پختگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری کا یہ ذخیرہ خود بتاتا ہے کہ نظیر کی اس فطرت نے ان کو ہر چیز پر غور کرنے سمجھنے اور پرکھنے کا عادی بنا دیا تھا۔ اس سے وہ نتائج اور درس عبرت بھی حاصل کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو ان کا شعور وادراک کے دریچے اس طرح کھولتا ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر فلسفیانہ باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ان کی نظم "آدمی نامہ" اس شعور کی بھرپور طریقہ سے غماز ہے۔

سرسری طور پر نظر ڈالنے سے تو ایسا لگتا ہے کہ نظیر اس نظم میں بھی اپنے عمومی لب و لہجہ کا استعمال کر رہے ہیں۔ اور جزئیاتی حیثیت سے انسان کی مختلف حیثیت و حالت ظاہر کر کے نسل آدم کو آدمیت کے ناتے وحدت کے رشتے میں باندھنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب عمیق نظر کے ساتھ اس نظم کا آغاز کیا جاتا ہے تو اس میں ایک ارتقائی شکل نظر آتی ہے۔ نظم کی ابتدا تو بلاشک و شبہ انھیں خیالات سے ہوتی ہے مثلاً۔

دنیا میں بادشاہ ہے، سو ہے وہ بھی آدمی   اور مفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی   نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ٹکڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ آدمی خواہ کسی بھی حالت میں ہو' بہر حال اپنی
ںسل اور پیدائش کے اعتبار سے آدمی ہی ہے' خواہ وہ بادشاہ و دولت مند ہو یا غریب و نادار'
ت کھا رہا ہو یا ٹکڑے توڑ رہا ہو' وہ آدمی ہی کہلائے گا۔

لیکن دوسرے بند پر آتے ہی پڑھنے والے کے دل و دماغ کے دریچے کھلنے لگتے
یں' مزید تیسرا بند تو باقاعدہ فکر کی عمیق گہرائیوں میں پہنچا دیتا ہے ؎

ابدال و قطب غوث و ولی، آدمی ہوئے — منکر بھی آدمی ہوئے، اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کیے — حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا — شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا — یہ بات ہے سمجھنے کی' آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے' وہ بھی آدمی

بلکہ ان اشعار میں صاف طور پر عرفانِ ذات کی دعوت ملتی ہے۔ کیا اس کی تفسیر
ں طرح نہیں ہو سکتی کہ انسان کو قدرت کی طرف سے خود اس کی ذات میں مخفی طور پر
یک لازوال قوت عطا ہوئی ہے اس کا ادراک اور صحیح استعمال انسان کی شخصیت کا تعین
راتا ہے۔ جب یہ قوت یا صلاحیت روحانیت کی تابع ہو کر پرورش پاتی اور ریاض کرتی ہے
' بڑے بڑے کشف و کرامات انسان سے صادر ہوتے ہیں' اور یہی جسد خاکی رکھنے والا
سان اپنے زہد و تقوا اور روحانی ریاضت کے زور سے اپنے خالق سے جا ملتا ہے۔ پیغمبر' ولی
ر قطب و ابدال جیسی مقدس ہستیاں صفحۂ ہستی پر رونما ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے جب
ِ قوت روحانیت سے عاری ہو کر خالص مادیت کی تابع ہوتی ہے تو بجنسہٖ متوازی انداز میں
ر فروغ پاتا ہے۔ حتیٰ کہ آدمی اس ودیعت کردہ نعمت کے خالق و مالک کی ہستی کا یکسر انکار
ِ کے خود اپنی ذات کو اس کا سرچشمہ محسوس کرنے لگتا ہے اور پھر کبر و نخوت بھیانک
ایقہ سے پرورش پا کر شر کی شکل میں پورے کمال کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔ فرعون'
ر ود اور شداد جیسے خدائی کا دعوا کرنے والے انانیت سے چور صفحۂ ہستی پر ظاہر ہوتے ہیں۔
داد کی بہشت اور فرعون و نمرود کی قہر آلود جبریت اس کی بین مثالیں ہیں۔

نظیر کی فکر عرفانِ ذات کے ساتھ خیر و شر کا منبع بھی انسان ہی کے اندر تلاش کر
تی ہے۔ ان کے ادراک و الہام سے امتزاجی شعور انسان کے کردار و عمل کو پوراؤے دار

شہراتا ہے۔

یاں آدمی ہی نار ہے، اور آدمی ہی نور　　یاں آدمی ہی پاس ہے، اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور　　شیطاں بھی آدمی ہے، جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی، رہ نما ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

حتیٰ کہ اقبال کا یہ شعر اس آواز کی بازگشت معلوم ہونے لگتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اس کے بعد نظیر تفصیل میں چلے جاتے ہیں اور مختلف پیشوں اور صنعت و حرفت کا تذکرہ کر کے جگہ جگہ انسان کی پستی و بلندی اور عزت و ذلت کا حوالہ دیتے ہیں۔

جہاں عقل کا تصرف اور محنت و کاوش ہے وہاں سر بلندی و مرتبے ہیں اور جہاں کاہلی اور کارکردگی کی کمی ہے وہاں انسان پست اور محکوم ہے۔ مثلاً۔

یاں آدمی نقیب ہو، بولے ہے بار بار　　اور آدمی ہی پیادے ہیں، اور آدمی سوار
حقہ، صراحی، جوتیاں دوڑے بغل میں مار　　کاندھے پہ رکھ کے پالکی، ہیں آدمی کہار
اور اس پہ جو چڑھا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا　　کہتا ہے کوئی، لو، کوئی کہتا ہے، لا رے لا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا　　کس کس طرح سے بیچے ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اس طرح یہ نظم "آدمی نامہ" پڑھنے والے کو عمیق گہرائیوں میں پہنچا کر درس عبرت کے ساتھ تعمیر اخلاق و کردار کی بھی دعوت دیتی ہے۔

جائزے

فسانۂ عجائب

مصنف: رجب علی بیگ سرور
تدوین و فرہنگ سید سلیمان حسین
مبصر: صغرا مہدی
قیمت: -/200 ناشر: سید سلیمان حسین
۱۷۵ افضل محل، وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ۔ ۳

فسانۂ عجائب داستانوی ادب میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے اور داستانوی دور کی آخری کڑی ہے۔ یونیورسٹی کے نصاب میں مختلف سطحوں پر شامل ہے۔ اس کی تدوین و توضیح کئی نامور محققوں نے کی ہے مگر ادب میں کوئی نقش آخر نہیں ہوتا! ابھی حال میں لکھنؤ یونیورسٹی کے استاد سید سلیمان حسین نے نہایت کاوش اور محققانہ صلاحیتوں کو کام میں لاکر اس کی تدوین کی ہے۔

موصوف نے فسانہ عجائب کے اس نسخے کو بنیاد بنایا ہے "جس پر سرور نے ناشر کی فرمائش پر باضابطہ نظر ثانی کی ہے اور اس میں اتنی تبدیلیاں یا اصلاحیں کی ہیں کہ ایک بالکل نیا نسخہ تیار ہو گیا۔ مقدمے میں مصنف نے ان تبدیلیوں یا اصلاحوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اس کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ سید سلیمان حسین کو کلاسکی نثر پر عبور حاصل ہے۔ وہ درس تدریس میں مشغول ہیں اس لیے ان کو اس کا اندازہ بلکہ تجربہ بھی ہے کہ آج کل کے طالب علموں کو فسانۂ عجائب کو پڑھانے میں کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور سے نئی پود کے اساتذہ کو جو عربی جانتے ہیں نہ فارسی اور کلاسکی نثر کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ان سب چیزوں کے پیش نظر سلیمان صاحب نے فسانۂ عجائب کی تدوین کی ہے۔ مشکل الفاظ فقروں اور قرآن کریم کی آیتوں کے معنی دیے ہیں۔ قرآن کی آیتیں کس سورہ سے لی گئی ہیں، اس کی وضاحت بھی کردی ہے۔ الفاظ کے صرف وہی معنی

نہیں دیے جن معنی میں فسانۂ عجائب میں استعمال ہوئے ہیں اس کے اور بھی معنی لکھ دیے ہیں ساتھ میں ان کتابوں کی فہرست بھی ہے "جو فسانۂ عجائب کی تنقید اور توضیح میں مفید ہو سکتی ہے۔"

اس کے علاوہ سب سے مشکل اور اہم کام جو سلیمان صاحب نے کیا ہے یہ ہے کہ اس کی ایک مبسوط فرہنگ تیار کی ہے جو تقریباً سو صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس میں فارسی مصرعوں شعروں اور فقروں کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ اس کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے کہ متن میں یہ شعر مصرعے یا الفاظ کس صفحے اور کس سطر پر ہیں۔

سید سلیمان حسین نے کسی محققانہ دعوے کے بغیر نہایت انکساری کے ساتھ طالبانِ علم کے سامنے اپنے اس اہم کام کو پیش کیا ہے مگر اس کتاب کو پڑھ کر ان کی علمی قابلیت اور علمی کاموں سے جو ان کو دلچسپی ہے، اس کو کرنے کا جو سلیقہ ہے اور اس میں انھوں نے جو عرق ریزی کی ہے اس کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ بلا شبہ اس اہم کام کے لیے ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کتاب چھپی بھی اچھی ہے۔ غلطیاں بالکل نہیں ہیں۔

صوتیات اور فونیمیات

مصنف: پروفیسر اقتدار حسین خان
مبصر: ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ
ناشر: ترقیِ اردو بیورو، نئی دہلی
قیمت: ۲۴ روپے　　　صفحات ۱۲۸

لسانیات کا علم اگرچہ کافی فروغ پا چکا ہے، لیکن اردو میں اس موضوع پر لکھنے والے محض انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ پروفیسر اقتدار حسین خاں کا شمار ان ماہرینِ لسانیات میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو کے لسانیاتی ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ "صوتیات اور فونیمیات" ان کی تازہ ترین تصنیف ہے جو ترقی اردو بیورو، نئی دہلی سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ لسانیات کی پہلی دو شاخیں "صوتیات" اور "علم الاصوات" ہیں۔ آخر الذکر کے لیے "تجز صوتیات" کی اصطلاح بھی مستعمل رہی ہے۔ بعض ماہرین لسانیات نے اس کے لیے "صوتیہ یات" کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔

لیکن پروفیسر اقتدار حسین خاں علم الاصوات کے لیے "فونیمیات" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جو انگریزی لفظ فونیم Phoneme (صوتیہ) کی مدد سے صوتیات کی

[illegible]
ان [illegible] تعلیم اور [illegible]
جو لسانی اصطلاحات اختراع کرنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ صوتیات اور فونیمیات۔ صوتیات میں تکلمی آوازوں کی تشکیل اور ان کی اعضائے تکلم کے ذریعے ادائیگی اور درجہ بندی کو مطالعہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اور فونیمیات میں تکلمی آوازوں کو ممیز صوتی اکائیوں یعنی فونیم (صوتیوں) میں ڈھالا جاتا ہے اور ان کی ترتیب و تنظیم سے بحث کی جاتی ہے۔ [illegible] صاحب نے لسانیات کی ان دونوں شاخوں کا بڑی وسعت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا ہے جس سے اس علم سے ان کے گہرے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔

"صوتیات" کے ضمن میں اس کتاب میں چار باب شامل ہیں۔ پہلے باب میں صوتیات سے بحث کی گئی ہے اور اس کی ایک شاخ سمعیاتی صوتیات پر کافی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا باب اعضائے تکلم سے متعلق ہے جس میں تکلمی صوتیات اور اعضائے تکلم سے متعلق تمام ضروری معلومات فراہم کر دی گئی ہیں۔ تیسرے باب میں تکلمی اصوات کی درجہ بندی پیش کی گئی ہے۔ اس باب میں مصوتوں، مصمتوں اور صوت رکن کا تجزیہ بڑی تحقیق اور چھان بین کے بعد کیا گیا ہے۔ چوتھا باب فوق قطعی خصوصیات سے متعلق ہے جس میں بل (زور)، اتصال، سر لہر وغیرہ پر مثالوں کے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کے آخری چار ابواب فونیمیات سے متعلق ہیں جن میں فونیم (صوتیہ) کی تعریف سے لے کر فونیمی تجزیے اور اس کے اصول نیز صوتی نظام اور صوتیاتی [illegible] تحریر سے متعلق تمام مسائل و مباحث کو سمیٹا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں اردو [illegible] اصطلاحات کی ایک مختصر فہرست بھی شامل ہے۔

"صوتیات اور فونیمیات" ایک قابل قدر کتاب ہے اور اردو کے لسانیاتی ادب میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو میں صوتیات پر اکثر کہا جاتا رہا ہے [illegible]
[illegible] کسی باقاعدہ کتاب کی [illegible] شکل میں آگئی ہے۔ اس کتاب [illegible]
[illegible] کو آسان [illegible] کیا گیا ہے۔ اس طرح [illegible]
[illegible]

[illegible] ہیں جن سے علمی نکات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مشکل اور ثقیل اصطلاحات سے [illegible] پرہیز کیا گیا ہے اور انداز بیان بھی نہایت سادہ اور سلجھا ہوا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کتاب کی علمی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور پروفیسر اقتدار حسین خاں کو ان کی اس کاوش کے لیے دل کھول کر داد دی جائے گی۔

افق کی مسکراہٹ
(افسانے)

افسانہ نگار: اسلم جمشید پوری

مبصر: نیر جہاں

قیمت: ۶۰ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی۔۶

صفحات: ۱۱۲

* پریم چند سے افسانے کو حقیقت سے قریب تر کرنے کی جو روایت چلی وہ وقت کے ساتھ نکھرتی اور پختہ تر ہوتی گئی۔ حال کا افسانہ نگار اسی ماحول میں پیدا ہوتا اور اسی فضا میں سانس لیتا ہے۔ وہ آسمان کی نہیں زمین کی بات کرتا ہے۔ اس زمین کی جہاں گوشت پوست کا انسان چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ اپنے مسائل اور مصائب کے ساتھ، سماج کی ناانصافیوں کا شکار۔ لیکن نئی صبح کا منتظر!

فنکار اگر حساس نہیں، حقیقت شناس نہیں تو نہ وہ کامیاب فنکار ہے نہ سچا!! اور افسانہ نگار فنکاروں کے اس کارواں سے الگ نہیں ہے۔

اور افسانہ نگاروں کے اس کارواں میں اسلم جمشید پوری بھی شامل نظر آتے ہیں جو بہت نمایاں نہیں تو اتنے غیر معروف بھی نہیں کہ کوئی شکل نہ پہچانے، نام نہ جانے!

فولاد کے شہر جمشید پور کے رہنے والے ہیں اور فولادی عزائم کے مالک ہیں۔ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں، حرکت و عمل میں طوفاں اور نفس انسانی کے مختلف و متضاد پہلوؤں سے نالاں!

اسلم کے افسانے ملک اور بیرون ملک چھپتے اور پسند کیے جاتے رہے ہیں۔ "افق کی مسکراہٹ" ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں کل تیس افسانے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانے کا مواد عام زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیا ہے۔ سماج کے وہی مسائل جن میں سے زیادہ تر انسانوں کے پیدا کردہ ہیں اور جن سے صدیوں سے انسان دوچار [illegible] آتا ہے [illegible] کا جبر اور انسان کی بے بسی۔ انسانوں کی فریب کاریاں، خود غرضی [illegible]

آگہی کا کرب ان کے افسانوں میں جابجا نظر آتے ہیں۔

مجموعہ کا پہلا افسانہ "ترکیب" ہے اور افسانہ نگار کے گہرے مشاہدہ پر گواہ ہے۔ ہمارے سماجی نظام کے کھوکھلے پن کو اجاگر کرتا ہے جہاں حلال کمائی میں سو رخنے ہیں اور حرام روزی پر کوئی قدغن نہیں۔ جہاں قانون کے محافظ قانون شکنی کا ہنر سب سے زیادہ جانتے ہیں اور سماج دشمن عناصر کی بیخ کنی کرنے کے بجائے ان کی پرورش کرتے ہیں۔

افسانہ "کشمکش" کا عنوان بتاتا ہے کہ یہاں ذہنی کشمکش اور روحانی کرب کا ذکر ہوگا اور ہے بھی کچھ ایسا ہی۔ افسانہ نگار کی نگاہ سماج کے ایک اور پھوڑے پر پڑتی ہے اور اس کو چیرتی ہوئی نیچے تک اتر جاتی ہے۔ یہ عجب تضاد ہے کہ "ٹیوشن" کی اہمیت سے شاید کسی کو انکار نہیں لیکن "ٹیوٹر" کو شاید ہی اہمیت دی جاتی ہو۔ "ممتا" میں افسانہ نگار نے ایک فطری جذبہ کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ "مشورہ" میں سماج کے ایک اہم مسئلہ "بے روزگاری" کو ابھارا گیا ہے۔

افسانہ "بند آنکھوں کا سفر" کھلی آنکھوں کے ساتھ شروع ہوا لیکن پورا افسانہ پڑھنے کے باوجود کہیں پتہ نہیں چلتا کہ آنکھیں بند کب ہوئیں۔ دراصل خواب کا سہارا لے کر افسانہ نگار نے اختتام کو غیر مؤثر اور بہت عام سا بنا کر رکھ دیا ہے جو چونکا دینے کی خوبی سے محروم ہو گیا۔ "افق کی مسکراہٹ" جاہلانہ رسوم و روایت پر ضرب کاری ہے۔ "شکریہ" "سیلزمین" "لبریز ساغر" "میری کتیا" لکھ کر افسانہ نگار نے اپنی ترقی پسندی، روشن خیالی اور ذہنی پختگی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ان افسانوں میں جسم کا ہیجان خیز بیان بھی ہے اور لذت نفسانی کا برملا اظہار بھی لیکن ان میں فنکارانہ چابکدستی کا فقدان ہے۔

اس میں شک نہیں کہ افسانہ نگار میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ سماجی مسائل کا شعور بھی ہے، اس کے بند دریچوں میں جھانکنے کی صلاحیت بھی ہے، انسانی زندگی میں تضاد اور دو عملی پر افسانہ نگار کی نظر بے باکانہ پڑتی ہے اور اس سمندر سے مطلب کے موتی نکال لاتی ہے۔ اب انھیں چمکانے اور تب و تاب دینے کے لیے تو محنت اور صبر لازمی ہے۔ کیونکہ بڑا فنکار وہ نہیں ہوتا جو بہت زیادہ لکھتا ہے بلکہ وہ جو اچھا لکھتا ہے۔ اپنے عرض حال بعنوان "بات کہانی کار کی" میں افسانہ نگار لکھتا ہے:

> "میرے ساتھ اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں نے برسوں جمود کی کیفیت میں گزارے ہیں۔ کئی کئی سال تک قلم نے جنبش نہیں کی اور جب قلم میں حرکت آئی تو پھر رکنے کا نام نہیں لیا۔ ایک نشست میں تین اور چار

کہانیاں میں نے کئی بار لکھی ہیں۔۔۔

اب "برسوں کا جمود" تو سمجھ میں آتا ہے لیکن "ایک نشست میں تین اور چار کہانیاں" لکھنے کا جوش اور عجلت پسندی کا اثر اکثر افسانوں سے آشکارا ہے۔ تیزی سے سفر طے کرنے کی یہ دھن افسانہ نگار کو مقصد سے الگ اور اکثر منزل سے بھی دور کر دیتی ہے۔ افسانہ "بازیافت" بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

اسلم جمشید پوری کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی ان کی اختصار پسندی ہے۔ افسانہ نگار ایک مرکزی خیال کو کبھی دو تین صفحات میں اور کبھی آدھے اور پون صفحے میں بیان کر جاتا ہے اور اکثر اپنا مقصد بھی حاصل کر لیتا ہے۔ ان کے افسانے کی ایک خوبی ان کی حقیقت نگاری ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کی فضا حقیقی ہے۔ ان کے کردار اسی دنیا میں جیتے بستے ہیں اور زمین کے سینے سے لگ کر چلتے ہیں۔ زبان سادہ اور عام فہم ہے لیکن محاوروں کو زیادہ صحت کے ساتھ استعمال کرنے کی ضرورت تھی۔ مثلاً "امیدوں کے چراغ جلائے تھے" (کشمکش، ص ۲۱) کے بجائے امیدوں کے چراغ جلا رکھے تھے یا "مکان کے پردوں کو پھاڑتی ہوئی" (بازیافت، ص ۲۵) کے بجائے چیرتی ہوئی زیادہ بہتر ہوتا۔ کہانی کار اپنی کہانیوں میں جا بجا اپنی جھلک دکھا جاتا ہے۔ اکثر افسانوں میں مقصدیت بے حد نمایاں ہے۔ کہیں کہیں یہ مقصدیت بار بھی بن جاتی ہے۔ اسلم کی افسانہ نگاری کا مقصد محض تفریح طبع نہیں بلکہ وہ اپنے ہر افسانے میں واقعی کچھ کہنا چاہتے ہیں اور ہم بجا طور پر توقع رکھتے ہیں کہ اسلم جمشید پوری کی تیز فہمی، ژرف نگاہی اور بیدار مغزی مستقبل میں اردو ادب کو ایک اچھا افسانہ نگار دے گی!!

•

بازدید — مرتبین: محمد علی صدیقی و سکرتاپال کمار

(ہندستان و پاکستان کے افسانے) — مبصر: شاہینہ تبسم

کتھا' ذوقِ مطالعہ کے فروغ کی خاطر اعلا پیمانے پر عملی خدمات سر انجام دینے والا ایک منفرد ادارہ ہے۔ جو گذشتہ چند برسوں سے غیر منفعتی بنیادوں پر اپنے مخلصانہ ادبی مقاصد کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہے اور اس خصوص میں اپنی ایک واضح شناخت قائم کر چکا ہے۔

حال ہی میں اس ادارے نے یونیسکو کے مالی تعاون سے ہندستان اور پاکستان کے

چند اہم افسانہ نگاروں کی تخلیقات پر مشتمل ایک افسانوی انتخاب "بازدید" نام سے شائع کیا ہے جس میں اردو کو ہندستان اور پاکستان کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے اور اس کے پیش لفظ میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ "برصغیر کی آزادی کی پچاس سالہ زندگی میں ایک طرف دونوں معاشروں کے رہنماؤں کی جانب سے آدرشوں کی بے معنی لن ترانی پر زور ہے۔ اس لن ترانی میں شور ہے زندگی کی موسیقی نہیں ہے۔ دوسری طرف انسانی زندگی کی وہ ساعتیں اور وہ منزلیں ہیں جن کی موجودگی کا احساس ہی ہمیں انسانی زندگی کی رفعتوں سے روشناس کر دیتا ہے۔ ہمیں کسی اجنبی کی آنکھوں میں اپنی تمثال دیکھنے کا خوف نہیں ہے بلکہ اجنبی کی آنکھوں میں اپنی صورت دیکھنے کی واردات ہماری بے پایاں مسرت سے عبارت ہے ایسا ہو پانے کے بعد زندگی زیادہ بامعنی ہو جاتی ہے۔ اس تعلق سے موجودہ اردو افسانے کی وسیع تر موضوعی اور فنی جہات ہمارے قارئین کی خصوصی توجہ کے متقاضی ہیں"

اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں بیک وقت شائع کیے جانے والے اس افسانوی مجموعے کے مرتبین محمد علی صدیقی اور سکر تپال کمار ہیں۔ "بازدید" میں دونوں ملکوں کے ممتاز افسانہ نگاروں کی 1960 کے بعد کی چند نمایندہ تخلیقات شامل کی گئی ہیں جن کے مطالعے سے ابھرنے والی تہذیبی اور ثقافتی تصویریں زمینوں اور زبانوں کی حدود سے بہت بلند نظر آتی ہیں۔ یوں تو اس مجموعے میں شامل تمام افسانے اعلا معیار کے حامل ہیں تاہم پاکستانی افسانہ نگاروں میں انتظار حسین' انور سجاد' بانو قدسیہ' محمد منشایاد' امراؤ طارق و فرخندہ لودھی اور ہندستانی افسانہ نگاروں میں قرۃالعین حیدر' جوگندر پال' غیاث احمد گدی' جیلانی بانو اور سریندر پرکاش وغیرہ کے افسانے قابل ذکر ہیں اور بلاشبہ اردو افسانے کے ہر انتخاب میں جگہ پانے کے قابل ہیں۔

بازدید کا سرورق بے حد معنی خیز اور افسانے دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔ کتاب کی ایک خاص خوبی ہند و پاک کے چار جواں سال مصوروں کی بنائی ہوئی روغنی تصویروں کے عکس ہیں جن کی اشاعت نے کتاب کی معنویت میں اضافہ کیا ہے۔

اتنے اچھے' معیاری اور بامعنی انتخاب کی اشاعت کے لیے محمد علی صدیقی اور سکر تپال کمار کے علاوہ کتھا کی جنرل سیریز ڈائرکٹر گیتا دھرما راجن بھی بجا طور پر اہل اردو کے شکریے کی مستحق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے اچھوتے پن اور گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے یہ افسانوی انتخاب نہ صرف انگریزی اور اردو خواں ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا بلکہ وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرے گا اور دیر تک یاد رکھا جائے گا۔

ماہنامہ　　مدیر اعلیٰ: الحاج مولانا عبد الشکور

مفتاح الجنۃ　　تبصرہ نگار: ڈاکٹر محبوب راہی

بارسی ٹاکلی　　پتہ: مفتاح الجنۃ۔ مدرسہ مصباح العلوم۔ بارسی ٹاکلی ضلع اکولہ

زر تعاون سالانہ ایک سو روپے فی شمارہ دس روپے

صوبہ مہاراشٹر کے اکولہ ضلع کا مردم خیز شہر بارسی ٹاکلی۔ علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور مذہبی سرگرمیوں کی بنیاد پر اپنے کارہائے نمایاں کی روشنی میں بیک وقت کئی میدانوں میں اپنی نمایاں پہچان رکھتا ہے۔ ایک میدان باقی تھا کچھ کر دکھانے کے لیے اور وہ تھا میدان صحافت۔ مقام مسرت ہے کہ بارسی ٹاکلی کے مدرسہ مصباح العلوم کے ارباب کار نے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھلانے کا عزم بالجزم لیے ماہنامہ مفتاح الجنۃ کی شکل میں صحافت کے میدان میں بھی اپنا پہلا قدم رکھ دیا ہے۔ زیر تبصرہ شمارہ اس نوزائیدہ رسالہ کا افتتاحی شمارہ ہے جس کے سرپرست مولانا سید مشتاق مظاہری نیز مجلس ادارت میں الحاج مولانا عبد الشکور قاسمی، مولانا عبد السلام مظاہری اور مولانا محمد ناظم الدین قاسمی کے نام شامل ہیں۔ یہ حضرات مدرسہ مصباح العلوم بارسی ٹاکلی سے متعلق ہیں نیز رسالہ اس مدرسہ کا ترجمان، "ذہنی وفکری انقلاب" عنوان کے تحت اداریے میں اس رسالہ کے اجرا کا مقصد اول وآخر معاشرہ میں جنم لینے اور دن بدن فزوں تر ہونے والی ایمان سوز بیماریوں کے سدباب کے ساتھ مدرسہ مصباح العلوم کی تعمیری سرگرمیوں میں گوشہ تحریر کی تشنگی کو دور کرنا بتلایا گیا ہے۔

مشمولات میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے ملفوظات "رسمیت کے بجائے حقیقت" عنوان کے تحت اقتباس مولانا ابو محمد سالم مظاہری کا "سحری کی اہمیت" پر مضمون۔ مولانا محمد ناظم الدین قاسمی کے "ماہ رمضان اور عصر حاضر اور مسلمان" عنوان کے تحت مضامین۔ مولانا منظور نعمانیؒ کے معارف الحدیث سے ماخوذ "زکوٰۃ کی اہمیت" اور مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ سے "حق اللہ اور حق العباد" پر اقتباسات نیز الحاج سید نورالدین امیر جماعت تبلیغی برار کی سرگرمیوں پر پروفیسر ڈاکٹر سید عبدالرحیم کا تاثراتی مضمون۔ علاوہ ازیں قاضی رؤف انجم کی "حمد" اور ڈاکٹر محبوب راہی کی "مناجاتی نظم" اس رسالے کی اہمیت اور افادیت کی ضامن ہیں۔ مولانا عبد السلام مظاہری نائب مہتمم مدرسہ مصباح العلوم کے مدرسہ مصباح العلوم پر ایک تجزیاتی اور تعارفی مضمون سے اس مدرسہ کے ۱۹۷۷ء میں قیام سے لے کر آج تک اپنے نیک اور تعمیری مقاصد کے حصول کے لیے دن بدن منزل ترقی کی جانب پیش رفت کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے جس سے مدرسہ کی وسیع تر کارگزاریوں اور سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ دیدہ زیب اور

دلکش دو رنگی سرورق میں ملفوف ڈیمائی سائز کے بتیس صفحات پر مشتمل اس رسالہ کی قیمت دس روپے بادی النظر میں زیادہ محسوس ہوتی ہے لیکن یہ رسالہ چونکہ طلب دنیا کسب مال وزر یا حصول شہرت و جاہ کے لیے نہیں بلکہ پاکیزہ اور اعلا وارفع دینی و دنیوی مقاصد کی تکمیل کی غرض سے جاری کیا گیا ہے لہذا اصلاح دین و دنیا کے حصول کے پیش نظر "نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز" کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ویسے بھی بارسی ناگل کی علمی، ادبی، اور صحافتی تاریخ میں مفتاح الجنۃ کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ لہذا دستاویزی اہمیت وافادیت کے حامل اس رسالے کی زندگی اور بقا کے لیے سالانہ زر معاونت ایک سو روپے بھیجنا باعث برکت و ثواب بھی ہوگا اور علم وادب کی خدمت بھی۔

مصنف: ڈاکٹر شعیب رضا وارثی

آزادی کے بعد دہلی میں اُردو — مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں

کے ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ — صفحات: ۳۳۷

قیمت: ۱۵۰روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۰

مذکورہ کتاب ڈاکٹر شعیب رضا وارثی کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر مصنف کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ کتاب کا مقدمہ خود مصنف کا تحریر کردہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ رسائل نے اردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے اس لیے ان کا جائزہ لیا جانا ضروری تھا۔ موضوع کی طوالت اور وسعت کے پیش نظر مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں اردو کے ادبی رسالوں کا تعارف کرایا گیا ہے جس میں دہلی اردو اخبار خیر خواہ ہند، سے لے کر آج کل، تحریک، تحریر اور عصری آگہی وغیرہ کا نہایت مختصر تذکرہ ہے۔ دوسرے باب میں جدید ادبی تحریکات ورجحانات کے فروغ میں رسائل کا حصہ تلاش کیا ہے اور مختصراً بعض تحریکوں کا ذکر بھی ہے۔ تیسرے باب میں دہلی کے ادبی رسائل کے اداریوں کا مطالعہ ہے ان میں شاہراہ۔ تحریک، سطور معیار، محور، تخلیق۔ تلاش۔ شعور۔ تناظر۔ عصری ادب، عصری آگہی۔ ذہن جدید۔ کتاب نما اور ایوان اردو وغیرہ موضوع ہیئت اور اسلوب بیان کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں ادبی رسائل کی نثری اصناف اور ان کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے، جس میں افسانے، انشائیے، خاکے، رپورتاژ، ڈرامے سفرنامے اور خودنوشت وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے۔ چھٹا باب تحقیقی وتنقیدی مضامین کی قدر وقیمت کے لیے رکھا گیا ہے اور اس کام کے آخر میں کتاب کا خلاصہ اور کتابیات کی فہرست بھی درج کی گئی ہے۔ ڈاکٹر شعیب رضا وارثی نے اگلے محقق وناقدین کے لیے مواد فراہم کرلیا ہے۔ وہ اپنے مقالے کی تیاری کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے کتاب زندہ اور عصری موضوع ہونے کی بنا پر پسند کی جائے گی۔

کھلے خطوط

"کتاب نما" بابت ماہ اپریل ۹۸ء نظر نواز ہوا۔ ڈاکٹر جمیل اختر اور مظہر امام کے مضامین اور ڈاکٹر گیان چند کے خط نے خصوصیت سے متوجہ کیا۔ ڈاکٹر جمیل اختر نے حوالہ جاتی کتب جیسے بے حد اہم موضوع پر ایک جامع، پر مغز اور معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ یہ بات صدفی صد صحیح ہے کہ حوالہ جاتی کتب اور وضاحتی کتابیات ہندستان میں بہت کم لکھی گئی ہیں اور جو لکھی بھی گئی ہیں وہ ادھوری ہیں کیوں کہ سال بہ سال ان کی تجدید نہیں ہو پاتی۔ ان کے مضمون سے یہ معلومات بہم پہنچیں کہ تنقیدی مضامین پر مشتمل "اشاریہ تنقید" اردو فکشن کی وضاحتی فہرست اور قاموس الادب وغیرہ مرتب ہوئی ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے اردو ادب کی تمام نثری و شعری اصناف پر باقاعدگی سے یہ کام انجام پائے تو ان اصناف پر اظہار خیال کرنے میں اتنی تگ ودو نہیں کرنی پڑے گی جتنی ایسی کتابوں کی عدم موجودگی میں ہمیں کرنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مضمون سے ہمارے علم میں یہ اضافہ بھی ہوا کہ پاکستان میں اس نوعیت کا کام بہت ہوا ہے اور سلیقے سے ہوا ہے۔ پاکستان میں ایک اور اہم کام ڈاکٹر انور سدید صاحب مدتوں سے انجام دے رہے ہیں۔ وہ ہند وپاک کے اہم مقتدر اور معیاری رسائل میں قسط وار شائع ہوتا ہے اور ہندستان میں بھی "شاعر" اور "ہماری زبان" میں اس کا کچھ حصہ شائع ہوا کرتا ہے۔ ہر سال ڈاکٹر انور سدید صاحب اپنے ادبی جائزے کو کتابی شکل میں بھی شائع کرتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے بر صغیر ہند وپاک میں شائع ہونے والی اہم کتابوں، ادبی سرگرمیوں، تخلیقی کارناموں اور فکر و نظر کی سمت و رفتار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ جناب مظہر امام نے اس جانب توجہ دی ہے اور انھوں نے ۱۹۹۷ء میں شائع ہونے والے شعری مجموعوں کا اختصار کے ساتھ جائزہ پیش کیا ہے مگر افسوس کہ ان کا یہ جائزہ نامکمل بھی ہے اور سخت قابل اعتراض بھی۔ مظہر امام صاحب نے حقیقتاً اس مضمون کے لیے تحقیق و جستجو کی ضرورت ہی نہیں سمجھی ورنہ دہلی جیسی مرکزی جگہ رہ کر وہ متعدد اہم شعری مجموعوں کو نظر انداز نہیں کرتے۔ انھیں دہلی پبلک لائبریری سے بھی کافی معلومات فراہم ہو سکتی تھیں اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے بھی۔ وہ ایک نظر "کتاب نما" بابت ماہ دسمبر ۹۷ء پر نئی مطبوعات کی فہرست بھی دیکھ لیتے تو انھیں علم ہو جاتا کہ میری رُباعیات کا مجموعہ "دعوتِ صد نشتر" ۱۹۹۷ء میں شائع ہو چکا تھا۔ اس فہرست میں مندرجہ ذیل مجموعوں کے نام بھی شامل ہیں۔

۱۔ "خود شناسی" شعری مجموعہ خلیق آفریدی
۲۔ قوس ،، مسعود عثمانی
۳۔ غبار سفر ،، ڈاکٹر سمیع اللہ اسد
۴۔ قندیل ،، احسان جعفری

ان مجموعوں کے علاوہ بھی میرے علم کے مطابق مندرجہ ذیل شعری مجموعے ۱۹۹۷ء

میں شائع ہوئے ہیں، جن کا تذکرہ لازمی طور پر ہونا چاہیے تھا!

۱۔ شاخ لرزیدہ غزلیات اندر سروپ سریواستو
۲۔ بچہ اکیلا ہو گیا منظوم کہانیاں ڈاکٹر ہوم کلی
۳۔ ریگ رواں غزلیات سعید اظفر وسیم
۴۔ روشنی لہو لہو غزلیات ساحل احمد
۵۔ دھوپ کچھ کم تھی غزلیات ساحل احمد
۶۔ مٹھی میں آسمان غزلیات مہتاب پیکر اعظمی

میرے خیال میں اور بھی بہت سے اہم مجموعے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئے ہیں لہذا مظہر امام صاحب کو اس مضمون کی دوسری قسط بھی لکھنی چاہیے۔

ڈاکٹر گیان چند محقق بھی ہیں، ماہر لسانیت بھی اور نقاد ارباب فن انھیں صرف نثر نگار کی حیثیت سے بھی جانتے ہیں مگر وہ بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ خصوصیت سے مجھے اس بات نے بے حد متاثر کیا کہ انھوں نے چار پانچ سو رباعیات بھی کہی ہیں۔ اسی لیے میں نے اپنا مجموعہ "دعوت صد نشتر" ان کے نام بھی معنون کیا تھا۔ ان کا ایک شعر ہے ۔

کس کس دیار و شہر سے نکلے ہوئے ہیں ہم
بے جڑ کے ہیں، زمین سے اکھڑے ہوئے ہیں ہم
(گیان چند)

اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ " میرا مولد بھوپال' جموں' الہ آباد اور حیدر آباد تھے کہ میں کہیں پابہ گل نہیں ہو پایا۔ کتنی ریاستوں اور شہروں سے بدر ہوا۔" مجھے جنوری ۹۸ء کے اوائل میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے ایک خط لکھا تو یہ اطلاع بھی ہم پہنچائی کہ "کل ڈاکٹر گیان چند صاحب کا لاس اینجلز سے فون آیا تھا۔ وہ اب مستقل طور پر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔" یہ پڑھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا تھا کیونکہ جب بھی میں کسی اہم ادبی مسئلے سے متعلق انھیں خط لکھتا تھا وہ فوراً مجھے جواب سے شاد فرمایا کرتے تھے۔ ترک وطن کا سبب تو معلوم نہیں مگر ہندستان سے ان کی ہجرت کسی المیہ سے کم نہیں۔ انھوں نے اردو زبان وادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں مگر انھیں وہ منصب عطا نہیں کیا جا سکا جس کے وہ حق دار تھے۔ انھوں نے برسوں پہلے لکھا تھا ---- " میں نے کبھی انعام کے لیے کتاب داخل نہیں کی۔ کبھی کسی کے ذریعہ کوشش نہیں کی، مجھے زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار کا انعام ملا ہے جو میرے استحقاق سے زیادہ ہے۔ یہ ایک کتاب پر ملا ہے، مجموعی خدمات پر نہیں۔" ان چند سطور میں جو کرب پوشیدہ ہے اسے صرف ادب وشعر کے بے لوث خدمت گار ہی محسوس کر سکتے ہیں اور اپنی ہجرت کی پیش گوئی بھی انھوں نے بہت پہلے کر دی تھی ۔

سب محو طرب ہیں اور مجھے ہے یہ خوف
یہ صحبت نہ ہو جائے درہم برہم
(گیان چند)

ظہیر غازی پوری ہاشمیہ کالونی۔ ہزاری باغ

ادبی تہذیبی خبریں

مضامین گجرال دوم

نئی دہلی' 14/ جون سابق وزیر اعظم مسٹر اندر کمار گجرال کے اردو مضامین کے دوسرے مجموعہ "مضامین گجرال دوم" کی ایک کاپی کل شام نائب صدر جمہوریہ مسٹر کرشن کانت کو ان کی رہائش گاہ پر پیش کی گئی۔ گجرال صاحب نے یہ مضامین حیدر آباد سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ "سیاست" کے لیے لکھے تھے جنھیں اخبار کے اڈیٹر اور مالک مسٹر زاہد علی خاں نے کتاب کی شکل میں شائع کیا ہے۔ اس سے قبل "سیاست" سابق وزیر اعظم کے مضامین کا پہلا مجموعہ "مضامین گجرال اول" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کر چکا ہے۔ اس موقع پر نائب صدر مسٹر کرشن کانت نے مجموعہ کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ گجرال صاحب ایک ایسی شخصیت ہیں جن میں ہندستانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ ہماری مشترکہ تہذیب کے ان عظیم ترین نمایندوں میں سے ایک ہیں جو اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ گجرال صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہماری تہذیب و تمدن' ہمارے فلسفہ' ہماری اخلاقی اقدار اور ہماری اس میراث کی جیتی جاگتی تصویر ہیں جو ہندستان کی پہچان ہے۔ مسٹر کرشن کانت نے کہا کہ "مضامین گجرال" دراصل حالات حاضرہ پر تبصرہ ہیں۔ انھوں نے گجرال کو مشورہ دیا ہے چوں کہ وہ اقتدار کے گلیاروں کے اندر بھی رہے ہیں اور باہر بھی اس لیے انھیں اپنے تجربات و مشاہدات کو سلسلہ وار طور پر قلم بند کرنا چاہیے تاکہ عام ہندستانی کو معلوم ہو سکے کہ ہم کہاں ٹھہرے اور ہم نے کہاں ٹھوکر کھائی۔ اس موقع پر گجرال نے مجموعہ کی اشاعت کے لیے مسٹر زاہد علی خاں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اخبار "سیاست" کے ساتھ اپنے دیرینہ روابط کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم عابد علی خاں سے ان کے تعلقات برادرانہ تھے اور انھوں نے دراصل مضامین لکھنے کی انھیں ترغیب دی تھی۔ سابق وزیر اعظم نے کہا کہ چند سال قبل پنجاب میں خونی آندھی آئی تھی جس کا ہندو و سکھ تعلقات پر جان لیوا اثر پڑا۔ اس کے بعد اندرا گاندھی کا قتل ہوا اور پھر 1984 کے بھیانک فسادات ہوئے۔ ان سب واقعات نے انھیں لکھنے پر مجبور کیا۔ انھوں نے کہا کہ 1990ء میں سوویت یونین کے بکھراؤ نے بھی ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ ہم نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ دنیا کی یہ عظیم ترین طاقت اتنی جلدی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گی۔ گجرال صاحب نے کہا کہ ہندستان فرقہ وارانہ بھائی چارے' آپسی رواداری اور باہمی محبت کے راستے پر چل کر ہی ترقی

کر سکتا ہے۔

خواجہ حسن علی نظامی نے کہا کہ گجرال صاحب نے تاریخ بتانے اور لکھنے کا چمتکار ایک ساتھ دکھلا دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گجرال صاحب ساجھے کی کوشش، ساجھے کی کامیابی اور ساجھے کی ناکامی کی علامت ہیں۔ انھوں نے کہا یہ مضامین جمہوریت کے قیام وفروغ کی تاریخ ہیں۔ خواجہ صاحب نے گجرال کے مضامین کو اسکولوں اور کالجوں کے مضامین میں شامل کیے جانے کا مشورہ دیا انھوں نے کہا کہ گجرال صاحب کا مزاج صوفیوں جیسا ہے، برائی انھیں چھو کر نہیں گئی، ہندو مسلمان، سکھ عیسائی سب ان کے دوست ہیں۔ فروغ اردو کونسل کے نائب چیرمین مسٹر راج بہادر گوڑ نے کہا کہ اردو پر فارسی کا اثر قبول کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن فارسی کا اثر صرف اردو پر ہی نہیں بلکہ بنگالی، مراٹھی، تیلگو ،اور خود ہندی پر بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ گجرال صاحب کے مضامین میں کئی زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں۔ گوڑ صاحب نے ناوابستہ تحریک میں گجرال صاحب کے ادا کردہ حصہ کا ستائشی الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے کہا کہ نہرو جی کے بعد اگر کسی شخص نے بین اقوامی طور پر ہندستان کو عزت دلائی ہے تو وہ گجرال ہیں۔

روز نامہ "سیاست" کے ایڈیٹر اور مضامین گجرال دوم کے ناشر مسٹر زاہد علی خاں نے کہا کہ ان کا ادارہ اب تک 29 مطبوعات شائع کر چکا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس سال 15 اگست کو سیاست اپنی زندگی کے 60 سال پورے کرے گا لہٰذا رواں سال کے دوران مزید 5 مطبوعات شائع کی جائیں گی۔ انھوں نے بتایا کہ گجرال صاحب نے پچھلے 25 برسوں میں سیاست کے لیے 150 مضامین لکھے ہیں۔ گجرال صاحب کے مضامین کا پہلا مجموعہ مضامین گجرال اول پاکستان میں شائع ہوا اور کافی مقبول ہوا۔ اس موقع پر مشہور طنز ومزاح نگار مجتبیٰ حسین نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے کہا کہ گجرال صاحب نے ہمیں غیر جانبداری کے ساتھ سوچنے اور لکھنے کا انداز سکھایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گجرال صاحب سے موجودہ اور آنے والی نسلیں یہ سیکھ سکتی ہیں کہ ملک کے تمام لوگوں کو ساتھ لے کر کس طرح آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ حاضرین جلسہ میں پروفیسر خسرو، خلیق انجم، ڈی آر گوئل پروفیسر اختر الواسع، سوم آنند، بیگم گجرال، بیگم کرشن کانت اور دیگر نمایندے موجود تھے۔

حلقہ ادب جرمنی کا تنقیدی اجلاس

حلقہ ادب جرمنی کا پہلا تنقیدی اجلاس 15 مارچ کو لاہور پیلیس ہوٹل فرینکفرٹ میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت بون میں پاکستانی سفارت خانہ کے قونصل شوکت حیات نے کی۔ مہمان خصوصی برلن

سے آئی ہوئی شاعرہ رخسانہ شیم تھیں۔ نظامت کے فرائض حیدر قریشی نے ادا کیے۔ سب سے پہلے حلقہ کے سکریٹری نے گذشتہ اجلاس کی روداد پڑھ کر سنائی۔ رپورٹ کے بعد میاں ندیم نے اپنا افسانہ "سانحہ" تنقید کے لیے پیش کیا۔ ثریا شہاب نے اسے ایک اچھی ابتدائی کوشش قرار دیا جبکہ رخسانہ شیم نے اسے موضوع کے لحاظ سے کامیاب افسانہ بتایا۔ کوکب اختر نے ارشد کے کردار کو غیر فطری کہا۔ اجمل پاشا کے نزدیک افسانے کا اختتام ادھورا سا لگتا ہے۔ سہیل بھٹی کے بقول تین منفی کرداروں میں سے صرف ارشد کو سزا ملتی ہے جبکہ دوسرے دو کردار صاف بچ جاتے ہیں۔ حسن اختر کیانی کے نزدیک یہ ایک عمدہ افسانہ تھا۔ طارق پرویز اختر نے اسے ایک اچھی کوشش قرار دیا اور اختتام میں تشنگی کے احساس کی نشاندہی کی۔ حیدر قریشی نے افسانے کے موضوع کو عمدہ کہا لیکن ٹریٹمنٹ کی کمزوری کی طرف توجہ دلائی۔ ان کے نزدیک افسانہ کسا ہوا نہیں تھا۔ میاں ندیم نے ذاتی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ میں اس افسانے کو ناول بھی بنا سکتا تھا لیکن میرے نزدیک اسے اسی حد تک نبھانا مناسب تھا۔ اجلاس کے صدر شوکت حیات نے افسانے کو اچھی کوشش کہتے ہوئے اس کی بعض فنی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کی۔ اس کے بعد اجمل پاشا نے ثریا شہاب کے افسانوں کے تازہ مجموعہ "سرخ لباس" پر اپنے تاثرات تبصرے کی صورت میں پیش کیے۔ رخسانہ شیم اور سہیل بھٹی نے کہا کہ تبصرے میں کتاب کے نام والے افسانے یعنی "سرخ لباس" کا خصوصی تذکرہ ہونا چاہیے تھا۔ کوکب اختر نے کہا کہ میں تبصرہ سن کر خوش ہوئی ہوں۔ طارق پرویز اختر نے کہا کہ اتنا اچھا تبصرہ سن کر کتاب پڑھنے کی خواہش ہو گئی ہے اور یہی تبصرے کی خوبی ہے۔ حیدر قریشی نے کہا کہ تبصرہ کا مقصد کتاب کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے سو اس لحاظ سے یہ تبصرہ کامیاب ہے۔ ثریا شہاب نے کہا کہ چونکہ یہ میری کتاب پر تبصرہ ہے اور خلوص کے ساتھ لکھا گیا ہے اس لیے مجھے تو اچھا لگا۔ اجمل پاشا نے کہا کہ میں نے کتاب پر تنقیدی یا تجزیاتی مضمون نہیں لکھا تبصرہ لکھا ہے اور تبصرہ کے لیے زیادہ ضخامت کا تقاضا ٹھیک نہیں ہے۔ صدر جلسہ شوکت حیات نے کہا کہ اجمل پاشا نے ثریا شہاب کی کتاب پر اتنا خوبصورت تبصرہ کیا ہے کہ میں یہ سوچنے لگا ہوں جب تبصرہ اتنا عمدہ ہے تو کتاب کتنی عمدہ ہو گی۔ تبصرے نے کتاب پڑھنے کا اشتیاق پیدا کر دیا ہے۔ آخر میں مہمان خصوصی رخسانہ شیم نے اپنی ایک غزل تنقید کے لیے پیش کی۔ اس غزل کو تمام حاضرین نے بے حد پسند کیا اور خوبصورت غزل قرار دیا غزل کے دو اشعار پیش ہیں:

اپنی سمت آسمان کھینچتا ہے
اور ادھر خاکدان کھینچتا ہے

چھت میسر تو ہے مجھے لیکن
اک نیا سائبان کھینچا ہے

یہ تمہیدی اجلاس جرمنی میں اپنی نوعیت کا پہلا اجلاس تھا جو دو گھنٹے تک جاری رہا۔ ہر ماہ حلقہ ادب جرمنی ایسے اجلاس کا اہتمام کرتا رہے گا۔

امریکہ میں اردو کتابوں کی نمائش

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی زیر نگرانی اردو سے محبت رکھنے والے لوگوں نے امریکہ کی کاؤنٹی (میونسپل) لائبریریوں میں اردو کتب کی نمائش کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس میں "مصنف سے ملیے" اور "شاعری سنیے" کے نہایت دلچسپ پروگراموں کے علاوہ اردو زبان و ادب کی قدیم و جدید تاریخ کے پمفلٹ انگریزی میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ ایک رجسٹر میں لوگ اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہیں، اور اردو کے بارے میں اپنے استفسارات بھی لکھتے ہیں جن کے جواب ڈاک سے ان کو بھیجے جاتے ہیں۔ کسی انجمن کو قیام میں لائے بغیر یہ مہم مختلف شہروں میں کامیابی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔

پہلا شاٹیگن میں یہ نمائش اردو کے شاعر و نقاد ڈاکٹر احمد سہیل کی زیر نگرانی لگائی گئی اور ایک ماہ تک اردو کتابیں لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بنی رہیں۔ اس سے پہلے واشنگٹن ڈی سی، ورجنیا اور میری لینڈ میں یہ نمائشیں لگائی جا چکی ہیں۔

کل ہند سیمینار اور نظیر کی نظموں کا مقابلہ

ڈاکٹر بی۔ آر امبیڈکر یونیورسٹی، آگرہ کے زیر اہتمام "نظیر عہد نو کے آئینے میں" موضوع پر کل ہند سیمینار اور کالج کے طلبہ طالبات کے لیے نظیر اکبر آبادی کی نظموں کے مقابلے کا انعقاد کیا گیا ہے۔ صدارت جناب منظور احمد، وائس چانسلر بی۔ آر۔ اے یونیورسٹی، آگرہ، مہمان خصوصی جناب راجندر یادو، مدیر "ہنس" اور افتتاح جناب نظیر محمد، سابق صدر شعبہ ہندی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے کیا۔

پروفیسر قیوم صادق کو مبارک باد

پروفیسر قیوم صادق صدر شعبہ اردو کو یکم مئی ۱۹۹۸ء سے ڈین آف آرٹس گلبرگہ یونیورسٹی مقرر کیا گیا ہے۔ آپ کی گیارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ شعبہ اردو کا مجلہ "نوائے گلبرگہ" کا خاص نمبر "قدیم و جدید ادب نمبر" کے مدیر اعلا بھی آپ ہیں۔ اساتذہ طلبہ طالبات کی جانب سے مبارک باد۔

مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونی پر سیمینار

بسلسلہ عرس صد سالہ اعلا حضرت تاج الفحول شاہ عبدالقادر قادری بدایونی قدس سرہ آزادی ہند کی پچاسویں سالگرہ پر ایک روزہ سیمینار میں مولانا فیض احمد کی حیات و خدمات پر علمائے کرام اور اہل فضل و طریقت نے روشنی ڈالی

مولانا فیضِ احمد، بدایوں کے مشہور و معزز عثمانی خاندان کی ایک ہستی تھے۔ تقریباً آٹھ سو سال سے آج تک یہ خانوادہ مذہبی اقدار اور دینی رہنمائی کا سرچشمہ' ہدایت بنا ہوا ہے۔ مولانا فیض احمد کی ولادت ۱۸۰۸ء میں ہوئی۔ ان کی طبیعت علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد باطنی علوم کی طرف راغب ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مولانا فیض احمد نے آگرہ، لکھنؤ، دہلی، گرالہ (بدایوں)، شاہجہاں پور میں شاہ احمد اللہ مدراسی، ڈاکٹر وزیر خاں، جنرل بخت خاں، حضرت محل وغیرہ کے دوش بدوش شرکت کی۔ حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کے انگریزوں کے خلاف فتوۂ جہاد پر مولانا فیض احمد نے بھی دستخط کیے تھے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ آل انڈیا حضرت تاج الفحول اکیڈمی بدایونی نے مولانا فیض احمد کے عظیم کارناموں کو منظر عام پر لانے اور وطن کے لیے جان قربان کرنے کی یاد تازہ کرنے کے لیے قدم اٹھایا ہے۔ مولانا فیض احمد کا آج تک سراغ نہ ملا کہ وطن عزیز کے لیے حصولِ آزادی کی راہ میں کس مورچے پر اور کس حالت میں جام شہادت نوش فرمایا۔ امید ہے کہ اکیڈمی ان کے سلسلے میں تحقیقی کام سرانجام دے گی۔ اس سیمینار کی روداد کو آئینہ مقالات' کے عنوان سے ڈاکٹر شاداب ذکی نے ترتیب دیا ہے۔ وہ اور اکیڈمی دونوں اس توجہ کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

حکیم انیس الرحمٰن کو مبارک باد

پندرہ روزہ کارواں دہلی کے اڈیٹر جناب حکیم انیس الرحمٰن جو مختلف سیاسی، اصلاحی، تعلیمی، معاشی اور صحافتی تنظیموں اور انجمنوں کے روحِ رواں ہیں کو گزشتہ دنوں انسار نیوز میڈیا اور ٹی وی کا جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا جو ایک بہت ہی فعال اور متحرک صحافتی تنظیم ہے جس کے تحت ایک نیوز فیچر ایجنسی بھی کام کر رہی ہے اور ہندستان کے مختلف علاقائی زبانوں کے کم و بیش ساڑھے تین سو اخبارات اور اس سے کہیں زیادہ صحافی اس کے رکن اور سرپرست ہیں۔ اس سے قبل وہ اس ادارہ کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ اس تنظیم کے صدر بھوپیندر کمار جین اور نائب صدر ایم آر دنیش ہیں جبکہ خزانچی کے عہدے پر مسٹر این کمار کو نامزد کیا گیا ہے۔

حکیم انیس الرحمٰن دہلی کے مقبول جنتا کوآپریٹو بنک کے چیئرمین بھی ہیں اور بنک ان کی سرپرستی میں روز بروز ترقی کر رہا ہے۔

اگنو کے وی سی عبدالوحید خاں کو

کامن ویلتھ آف لرننگ ایوارڈ

ممتاز بین اقوامی تنظیم کامن ویلتھ آف لرننگ (سی او ایل) نے اندراگاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (اگنو) کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالوحید خاں کو نمایاں خدمات کا ایوارڈ دیا ہے۔ ڈاکٹر خان یہ انعام حاصل کرنے والے

پہلی شخصیت ہیں۔ انھیں یہ ایوارڈ دولت مشترکہ میں مراسلاتی تعلیم کے شعبہ میں نمایاں خدمات انجام دینے کے لیے دیا گیا ہے۔ اگنو میں وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالنے سے قبل ڈاکٹر خان ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۸ء تک سی او ایل میں پرنسپل کیمونیکیشن اسپیشلسٹ تھے۔

جناب محمد نسیم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

جناب محمد نسیم 'یو جی سی ریسرچ فیلو' شعبۂ اردو بھاگلپور یونیورسٹی' بھاگلپور کو ان کے تحقیقی مقالہ بہ عنوان۔ "اردو ناول پر تقسیم ہند کے المیے کے اثرات" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ یہ مقالہ پروفیسر ڈاکٹر سید مظفر اقبال صاحب ' سابق صدر شعبۂ اردو' یونیورسٹی ہذا کی نگرانی میں مکمل ہوا اور اس کے بیرونی ممتحن پروفیسر ڈاکٹر نجم الہدیٰ صاحب و پروفیسر ڈاکٹر جعفر رضا صاحب تھے۔

[illegible]

نامور ادیب ڈاکٹر نذیر احمد انصاری کا انتقال

اردو کے نامور ادیب اور ماہر تعلیم بالغاں ڈاکٹر نذیر احمد انصاری کا کل ہولی فیملی اسپتال میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ وہ ۷۰ برس کے تھے۔ ڈاکٹر نذیر کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ ان کو سینے میں درد کی شکایت کے بعد پرسوں شام اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں کل ان کی وفات ہو گئی۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ ڈاکٹر انصاری نے تعلیم بالغاں پر کئی کتابیں لکھیں جن میں ان کی مشہور کتاب "بھارت میں تعلیم بالغان" ہے اور این سی ای آر ٹی میں تعلیم بالغان کے محکمہ میں بطور جوائنٹ ڈائرکٹر ریٹائر ہوئے۔ ان کی اچانک موت پر اردو ٹیچرز ویلفیئر ایسوسی ایشن کی صدر نکہت شاہین اور جنرل سکریٹری ایم سلطان صدیقی نے اظہار افسوس کیا ہے اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے ایسوسی ایشن کو گراں قدر مشوروں سے فیضیاب کیا تھا۔

اختر بستوی کے انتقال پر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ میں تعزیتی جلسہ

اردو کے شاعر اور ادیب ڈاکٹر اختر بستوی کے سانحہ ارتحال پر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر مظفر حنفی نے کی۔ اس موقع پر جناب مظفر حنفی نے اپنی صدارتی تقریر میں اختر بستوی کے شعر و ادبی کارناموں کا تفصیلی ذکر کیا اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اختر بستوی نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ تخلیقی کاموں کو بھی پابندی سے جاری رکھا۔ پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اختر بستوی کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے انھیں اردو کا ایک نامور شاعر قرار دیا۔ پروفیسر ہاشمی نے اختر بستوی سے اپنے قریبی تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اختر بستوی کے انتقال سے ادبی دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا آسانی سے پُر ہونا مشکل

ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ اختر بستوی جیسے شریف النفس لوگ اب ہمارے درمیان سے اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اختر بستوی کا شمار ان تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جو خاموشی کے ساتھ مستقل انہماک سے اپنی تخلیقی کاوشوں میں مصروف رہے۔ پروگرام کے آخر میں کوثر مظہری نے تعزیتی قرارداد پیش کی جس میں اختر بستوی کی زندگی کے مختلف گوشوں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے مرحوم کے لیے مغفرت کی دعا کی گئی۔ جلسہ کا آغاز محمد یوسف پاپا نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ تعزیتی جلسہ میں شعبہ اردو کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ ملک کی دیگر جامعات اور کالجوں کے اردو اساتذہ کافی بڑی تعداد میں شرکت کی۔

ماہر تعلیم شیخ فرید کا انتقال

مشہور ماہر تعلیم اردو کے دیرینہ خادم ڈاکٹر شیخ فرید کا طویل علالت کے بعد ۴ مئی ۱۹۹۸ء کو ان کے وطن برہانپور (مدھیہ پردیش) میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی عمر تقریباً ۸۱ برس تھی۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ فرید صاحب اردو اور فارسی میں ایم۔اے تھے۔ "برہانپور کی دین فارسی ادب کو" اس موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی تھی۔ بحیثیت استاد اور ممتحن وہ کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۹۳ء تک انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی میں اردو لغت پروجیکٹ کے ڈائرکٹر اور ریسرچ آفیسر رہے۔ مرحوم نے بہت سے تحقیقی مقالے لکھے تھے۔ شیخ بہاء الدین باجن پر ان کا ضخیم مقالہ شائع ہو چکا ہے۔

مشہور مزاح نگار محمد مسیح الدین کا انتقال

حیدرآباد۔ اردو کے مشہور مزاح نگار جناب مسیح انجم (محمد مسیح الدین) کا مختصر سی علالت کے بعد ۳۰ مئی ۱۹۹۸ء کی شام 7:30 بجے انتقال ہو گیا۔ جناب مسیح انجم جو محکمہ تعلیمات سے وابستہ تھے، تلگو زبان پر بھی عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو ادب کی بحیثیت مزاح نگار زبردست خدمت کی۔ ادبی مزاحیہ محفلوں میں ان کی شرکت کو کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ وہ زندہ دلان حیدرآباد کے قدیم رکن تھے اور معتمد عمومی بھی رہ چکے تھے۔ مرحوم کے چار مزاحیہ مجموعے "سائیڈ سے جیلیے"، "درپردہ" "چنانچہ" اور "طرفہ تماشہ" شائع ہوئے اور کافی مقبول ہوئے۔ رہنمائے دکن کے بعد روزنامہ "منصف" سے بھی وابستہ رہے۔ وہ زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان ماہنامہ "شگوفہ" کی مجلس ادارت کے بھی رکن رہے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ چار لڑکے اور دو لڑکیاں شامل ہیں۔ ادارہ "کتاب نما" مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

کی نئی کتابیں

لسان الصدق

مدیر: مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل۔ اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ ضخامت [illegible] ۵۰/=

نظام رنگ

ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کا ادبی خاکہ — یہ اس نامور بزرگ کا تذکرہ ہے جس نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر انسانیت کو وقار بخشا۔ ۱۵/=

شہید جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)

مرتبہ: ضیاء الحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مرد درویش تھے جس کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مرد مومن تھے۔ ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۵۰/=

پرانی باتیں ([illegible] نظمیں)

زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں [illegible] روایات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں [illegible] سچائیوں کے روپ بدل سکتے ہیں۔ ۲۰/=

غزل نما

تصحیح و ترتیب: ادا جعفری

([illegible])

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر [illegible] غالب [illegible] کے کلام کا جامع انتخاب [illegible] جس کو ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ [illegible] ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۴۸۰ [illegible] ۵۰ =

ساز سخن

ادا جعفری

جدید شاعری کی [illegible] کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے [illegible] ایک ایسی قوت [illegible] جس کے بغیر جدید ادب کے [illegible] کا پیام [illegible] ہو سکتا = ۴۵

ترجمہ قرآن

پروفیسر بشیر الحق

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی ایک کوشش)

پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ [illegible] کو [illegible] میں [illegible] تقریب میں پیش کیا گیا۔ ۹ =

نذر مختار

مالک رام

[illegible] وقت، محقق اور [illegible] پروفیسر مختار [illegible] کی خدمت میں [illegible] پیش کیا گیا جس میں اردو کے [illegible] ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ = ۱۰۱

Regd. with R N I at No 4967/60 JULY 98
Regd No. DL 16016/98
Licence No U[SE]-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اردو کے اساتذہ طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم و جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات سے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر نجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ۔ اردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

گول مال — شفیقہ فرحت

"رنگ ترنگ" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱۸/=

فی الفور — یوسف ناظم

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صف اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۳۰/=

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح حیات جو جامعہ میں موصوف کے لائق ستائش اور [illegible] [illegible] نے [illegible] کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۱۹/=

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیّدین — ڈاکٹر [illegible] صدیقی

[illegible] کے علمی [illegible] ۴۰/=

توفیق الحکیم — ڈاکٹر [illegible] الدین الف نظا

ناول نگاری کا [illegible]

اس کتاب میں مصر کی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق الحکیم کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۶/=

نظریاتی تصادموں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

اگست ۱۹۹۸ء — جلد ۳۸ — شمارہ ۸

فی پرچہ 7/:
سالانہ 70/:
سرکاری تعلیمی اداروں سے 100/
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک) 500/

مدیر
شاہد علی خاں

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
فیکس نمبر 6842574
Tel Cum Fax No (011)-6910191
ٹیلی فون نمبر 6910191

شاخیں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ۔ ممبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

طنز و مزاح

جائزے

نئی مطبوعات

اصلاح معاشرہ (ناول) حاجی مرزا نعیم اللہ بیگ زائر -/30
جنگ آزادی میں اردو کا حصہ مرتبہ اقبال بیدار -/50
صحرا کی گونج (شعری مجموعہ) سید قمر منظو -/20
محبوب حسین جگر نمبر مرتبہ مغنی تبسم -/40
نوائے ادب (ششماہی) مدیر ڈاکٹر آدم شیخ سالانہ -/50
قصیدہ حرم للعلمینؐ (منظوم) متین اچلپوری -/10
ماہنامہ "شفق" ٹونک مدیر اعلا ابوالفیض عثمانی -/20
ایک شاعر، ایک شخص، غنی اعجاز (سوانح) فصیح اللہ نقیب -/40
ہندستان اسلام کے سائے میں قاضی سید عابد علی -/70
مضامین خالد مضامین خالد عابدی -/50
اردو غزل گوئی تنقید فراق گورکھپوری -/50
عورت ازدواجی زندگی محمد حکیم آرائیں -/90
تصویر ملت مذہب مولانا وحید الدین خاں -/80
مضامین اسلام مولانا وحید الدین خاں -/60
نشری تقریریں مولانا وحید الدین خاں -/80
اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ ادب ڈاکٹر محمد حسن -/98
حیدر آباد کے اردو روزناموں کی خدمات سید ممتاز مہدی -/92
جنوبی ہند کی تاریخ کے، ایل، نیل کنٹھ شاستری -/114
حاصل کلام شعری مجموعہ عمر انصاری -/200
جھوٹا سچ (یکبابی ڈرامے) شکیل شاہ جہاں -/50
خلجی خاندان (تاریخ) کے، ایس لال -/88
شہیدان آزادی ڈاکٹر بی۔ این جوئیرا -/100

سرورق: مسعود احمد برکاتی

موج در موج ڈاکٹر سید حامد حسین

"موج در موج" چند نگاہیوں، انشائیوں، ایک لطیفی اور ایک مزاحیہ ڈرامے پر مشتمل ہے۔ ان تحریرات میں ایک نہیں کئی رنگ ہیں اور کئی قسم کے تجربے کیے گئے ہیں۔ اپنے طرز کی پہلی دلچسپ کتاب قیمت =/100

شاخ زیتون رمز عظیم آبادی

رمز کی شاعری میں کلاسکی شاعری کی شائستگی بھی ہے اور لفظوں کا رکھ رکھاؤ بھی، ندرت تخیل بھی ہے اور ندرت اظہار بھی، استعاروں کا حسن بھی ہے اور تشبیہوں کی دلکشی بھی۔ انھیں خوبیوں نے رمز کو دنیائے شاعری میں انفرادیت بخشی۔ قیمت =/80

فکر و تحقیق (ششماہی) مدیر اعلا ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ

(جلد۔۲ شمارہ۔۱) مدیران انوار رضوی/بشیر احمد

فکر و تحقیق (ششماہی) قومی کونسل برائے فروغ اردو کا خصوصی شمارہ ہے۔ اس شمارے میں وہ تمام ۳۰ مقالات شامل ہیں جو قومی اردو کونسل کے سیمینار منعقدہ ۱۷ تا ۱۹ نومبر کو پیش کیے گئے تھے۔ قیمت =/50

مطالب الغالب مولفہ مولانا سہا مجددی

غالب کی دوسری صدی کے موقع پر مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے مطالب الغالب کا عکسی اڈیشن شائع کیا ہے۔ دیوان غالب اردو کی اس شرح میں حکمت و فلسفہ کے مسائل مولانا سہا کی جدت طرازی کا ثبوت ہیں۔ قیمت =/150

مجلس ممنون مرتبہ پروفیسر آفاق احمد

علامہ اقبال کے عاشق صادق، ممنون حسن خاں کی یادوں کو تروتازہ رکھنے اور اقبالیات کے فروغ میں ان کی کاوشوں کا اعتراف ملک کے ممتاز اہل قلم نے اپنی نگارشات سے کیا ہے۔ قیمت =/80

پرچھائیوں کا پیچھا ابراہیم یوسف

ابراہیم یوسف کا شمار ملک کے صف اول کے ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے۔ "پرچھائیوں کا پیچھا" آپ کے ڈراموں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ قیمت =/80

مہمان اداریہ
مسعود احمد برکاتی
اڈیٹر: ماہنامہ نونہال
ہمدرد فاونڈیشن۔ کراچی

اشاریہ

بچوں کے رسائل کا کردار

بچوں کے رسالے ان کی ذہنی نشوونما اور تعلیم و تربیت میں جو کردار ادا کرتے ہیں اس پر گفتگو کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تہذیبی زندگی اور ادب میں رسائل کے کردار پر مختصراً بات کرلی جائے۔

رسائل و جرائد کی اہمیت کتابوں سے کم نہیں' زیادہ ہی ہے۔ علم کی ترسیل میں' فکر و خیال کے ابلاغ میں اور معلومات کی اشاعت میں رسائل کتابوں کی طرح کار آمد ہوتے ہیں اور تیز رفتاری میں فوقیت رکھتے ہیں۔ کتاب کی اہمیت تو مسلم اور واضح ہے۔ سنجیدہ فکر' عمیق مطالعہ' معلومات کی نئی ترتیب' نئے پہلوؤں کے اخذ و استنباط اور علمی گہرائی و گیرائی کے نتیجے میں کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سارے عمل میں بلکہ ان تمام اعمال میں وقت لگتا ہے۔ ذہنی عمل مشکل ترین عمل ہے۔ رسائل کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ ان کے ذریعہ سے ادبی معاشرے میں تازہ ہوا آتی ہے۔ بونہ نو افکار و نظریات اور معلومات و اطلاعات کی اشاعت ہوتی ہے۔ چنانچہ میں یہاں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو ادب رسائل ہی کے توسط اور وسیلے سے نئے خیالات' جدید رجحانات' تازہ فکری زاویوں اور نئے اسالیب سے روشناس ہوا۔ ادبی' علمی' ثقافتی اور سماجی میدانوں میں یورپ کی پیش رفت اور مغربی رجحانات کے علاوہ عالم اسلام کی تحریکوں سے متعارف کرانے میں اردو رسائل نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ دوسری زبانوں کے شہ پارے اردو میں منتقل کرنے کے محرک رسائل ہی بنے۔ اس طرح ایک طرف مغربی ادب کے تراجم کی داغ بیل پڑی تو دوسری طرف عربی اور فارسی کے دینی' تاریخی اور ادبی سرمائے کی منتقلی میں پیش رفت ہوئی اور اردو زبان' ترقی یافتہ زبانوں کی ثروت میں حصے دار بنی۔

بعض موضوعات نہایت اہم' غور طلب اور نتیجہ خیز ہوتے ہیں' لیکن ان کے بیان میں اتنی وسعت نہیں ہوتی کہ ان کے لیے کتاب کا پیمانہ مطلوب ہو۔ ان کے لیے رسائل کا تنگنائے ہی کافی اور موزوں ہوتا ہے۔ یہ ذریعہ ابلاغ ان کو میسر نہ ہوں تو ہو سکتا ہے کہ وہ موضوعات

تشنہ اظہار ہی رہ جائیں۔ ایک بار عالم تحریر میں در آنے کے بعد ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ یہ موضوعات مستقل کتابوں پر محیط ہو جائیں اور اجتماعی فکر کی مستقل رو کا حصہ بن جائیں۔

خود اردو ادب کا ذوق پیدا کرنے میں رسائل کا بڑا دخل ہے۔ رسائل نے جہاں ادب کی جدید تحریکوں کو فروغ دیا وہاں اردو کے کلاسیکی سرمائے کی طرف توجہ دلانے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ غالب کی عظمت بحال کرنے میں کتابوں نے جو حصہ لیا وہ اپنی جگہ، لیکن نئی نسل تک غالب کو پہنچانے اور اس کی حیات و شاعری کے نئے گوشے نمایاں کرنے کا کام رسائل ہی نے انجام دیا۔ رسائل ہی کے ذریعے سے غالب اور دوسرے کلاسیکی ادبا و شعرا کے مطالعے کی ضرورت و اہمیت واضح ہوئی۔ علامہ اقبال کے کلام کی اولین اشاعت اردو کے رسائل کی رہین منت کہی جاسکتی ہے۔ اقبال پر کتابوں کی بڑی تعداد حالیہ چند برسوں میں شائع ہوئی، لیکن کلام و پیغام اقبال کی مقبولیت کے لیے اردو رسائل کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مغربی دنیا ہو یا اسلامی دنیا، دینی تحریکیں ہوں یا سماجی رجحانات، سائنسی پیش رفت ہو یا ایجاد و اختراع کی اطلاعات، امن و صلح کی تدابیر ہوں یا تصادم اور محاربات کی تلخ نوائیاں، کتابوں سے پہلے رسائل میں منعکس ہوتی ہیں۔ پھر اردو کے معاملے میں تو رسائل کی خدمات خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ غلامی کی ذلتوں کا احساس دلانے، آزادی کی تڑپ پیدا کرنے اور جدوجہد آزادی کے راہ نماؤں کی شخصیتوں اور کارناموں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ طبقے میں خودی و خود آگہی اور احساس عظمت پیدا کرنے میں اردو رسائل کا حصہ تاریخ وطن کا اہم جزو ہے۔

ظاہر ہے کہ عمومی رسائل کے کردار کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا اطلاق بڑی حد تک بچوں کے رسائل پر بھی ہوتا ہے۔ بچوں کے رسالوں کا سب سے اہم کردار ان میں مطالعے کا شوق پیدا کرنا اور مطالعے کی عادت ڈالنا ہے اور یہ خدمت بڑوں کے رسائل سے بھی زیادہ اہم ہے، کیونکہ مطالعے کی عادت، تہذیب یافتہ ہونے کی علامات میں سے ہے اور یہ عادت اگر بچپن میں پڑ جائے تو عمر بھر انسان کے کام آتی ہے اور زندگی کے ہر مرحلے پر سہارا دیتی ہے۔ بلاشبہ بچوں کی کتابیں بھی عادات مطالعہ کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، لیکن اس شوق کو استقلال بخشنے میں رسالے زیادہ حصہ لیتے ہیں۔ ایک شمارہ ختم کرنے کے بعد دوسرے شمارے کا انتظار بچوں کے شوق مطالعہ کو تازہ کرتا اور ان کو علم و ادب سے وابستہ رکھتا ہے۔ پھر اگر شوق کی لے بڑھ جائے تو مدیر سے مراسلت شروع ہو جاتی ہے، گلے شکوے ہونے لگتے ہیں۔ رسالے کے مندرجات و مشمولات پر اظہار خیال، تنقید و تعریف، تحسین و تعریض کا سلسلہ چل پڑتا ہے جو بعض بچوں میں کہانی یا کوئی اور تحریر لکھنے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح رسالے مطالعے کی

عادات ہی کو فروغ نہیں دیتے بلکہ وہ ادیب سازی بھی کرتے ہیں۔ ہمارے ادیبوں کی خاصی تعداد ایسی ہوگی جنھوں نے بچوں کے رسائل ہی میں لکھنا شروع کیا۔ گویا بچوں کے رسائل نے اردو کو بڑے ادیب بھی دیے۔

ایسے بھی متعدد ادیب ہیں جنھوں نے لکھنے کی ابتدا تو بچوں کے رسائل سے نہیں کی' لیکن بچوں کے لیے لکھنے کی تحریک ان کو بچوں کے رسائل سے ہوئی اور انھوں نے مدیروں کی ترغیب و فرمایش پر بچوں کے لیے نظم ونثر لکھنی شروع کی۔ بچوں کے رسائل کا یہ ایسا کارنامہ ہے جس کو بچوں کی خدمت کے علاوہ خود ادب کی خدمت کے خانے میں بھی رکھا جاسکتا ہے اور رکھا جانا چاہیے۔

انسان ماضی پرست ہوتا ہے' لیکن بچہ ماضی پرست نہیں ہوتا' کیونکہ اس کا اپنا تو کوئی ماضی نہیں ہوتا' اس لیے وہ آگے کی طرف زیادہ دیکھتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جوں جوں آدمی کی عمر بڑھتی جاتی ہے اور وہ بڑھاپے کی طرف بڑھتا ہے وہ ذہنی طور پر ماضی سے زیادہ وابستہ ہوتا جاتا ہے' لیکن بچہ اپنے حال میں مست رہتا ہے۔ اس کو ماضی کی مفید باتوں سے روشناس کرانے میں بھی رسالے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تاریخ کے دل چسپ واقعات اور حکایات کے مطالعے کی ابتدا کتابوں کے بجائے رسائل ہی سے ہوسکتی ہے اور عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ کوئی تاریخی کہانی یا ہلکا پھلکا تاریخی مضمون پڑھ کر بچے میں اس دور یا اس شخصیت کے بارے میں مزید جاننے کی جستجو پیدا ہوتی ہے۔

کلاسیکی ادب کی چاٹ بھی بچوں کو رسالوں کے ذریعہ سے ہی لگتی ہے۔ رسائل میں طویل داستانوں کی تلخیص اور تسہیل بچوں کو ادب عالیہ کے مطالعے کی جانب راغب کرتی ہے۔ اس طرح وہ اپنے تہذیبی ورثے اور کلاسیکی سرمائے سے واقف ہوتے ہیں جو آئندہ زندگی میں اس کے لیے قومی شناخت اور ثقافتی تشخص کی بنیاد بنتا ہے۔

رسائل کی اہم خدمت دوسرے ملکوں اور دوسری زبانوں کے ادب کی اپنی زبان میں منتقلی اور اشاعت ہے۔ اس خدمت میں رسائل کتابوں سے کہیں آگے ہیں اور یہ نہایت اہم خدمت ہے' کیونکہ اس کے بغیر زبان ترقی نہیں کرسکتی اور ادب میں وسعت و تازگی نہیں آسکتی۔ تراجم تازہ ہوا کے جھونکوں کی مانند ہوتے ہیں۔ دنیا کے بہترین دماغ زندگی کا جس طرح مطالعہ و مشاہدہ کررہے ہیں اور جس انداز سے سوچ رہے ان کے مطالعے سے خود اپنی زندگی اور اس کے مسائل کو سمجھنے اور ان مسائل کا حل تلاش کرنے میں مدد ملتی ہے۔ تراجم کے ذریعے سے نہ صرف نئے افکار و خیالات اور رجحانات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے بلکہ زبان کے نئے اسالیب اور اظہار بیان کے نئے پیرایوں سے بھی اردو زبان آشنا اور مانوس ہوتی ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

نظام اردو خطبات کا 19واں خطبہ

داستان امیر حمزہ

"داستان، زبانی بیانیہ، بیان کنندہ اور سامعین"
کے عنوان سے

اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں فروری ۱۹۹۸ء میں پیش کیا۔ اب یہ اہم خطبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شائع کر دیا ہے۔ قیمت -/60

فکر انسانی کا سفر ارتقا

پروفیسر خواجہ غلام السیدین

نظام اردو خطبات کا آغاز شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۲۵ر فروری ۱۹۶۶ء کو ہوا۔ اس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا اور صدارت ڈاکٹر سی، ڈی، دیش مکھ وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے فرمائی۔ ملک کے دیدہ ور ماہر تعلیم پروفیسر غلام السیدین نے مندرجہ بالا عنوان پر دو لیکچر دیے جن کا اب تیسرا اڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔ قیمت -/45

غالب کی شخصیت اور شاعری

پروفیسر رشید احمد صدیقی

یہ نظام اردو خطبات کا چوتھا خطبہ ہے جس کو ملک کے مایہ ناز طنز و مزاح نگار رشید احمد صدیقی صاحب نے پیش کیا۔

(تیسرا اڈیشن) قیمت -/45

پارہ عم

اردو اور انگریزی میں ترجمہ مع تشریح اور عربی متن

حکیم محمد سعید صاحب نے نوجوانوں کے مرتبہ فکر و علم کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن حکیم کے تیسویں پارے کا آسان اردو اور انگریزی ترجمہ اردو تشریح مع عربی متن پیش کیا ہے۔ انگریزی ترجمہ متبحر عالم عبداللہ یوسف علی کا نتیجہ فکر ہے۔ آج کا نونہال خواہ اردو میڈیم کا طالب علم ہو یا انگریزی میڈیم کا 'پارہ عم' کو پڑھنے اور سمجھنے میں اسے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اپنے نونہالوں کو پارہ عم تحفے کے طور پر پیش کیجیے۔

ہدیہ -/45

۱۰۰ ذائقے

شمیم وحید

(نوجوان بچیوں کے لیے)

کھانا پکانا ایک فن ہے اور لڑکیوں کو یہ فن آنا چاہیے۔ کھانا خوش ذائقہ ہو، صحت مند ہو اور خوبصورتی سے پیش کیا جائے تو غذا جزو بدن بن جاتی ہے اس کتاب میں سو کھانے ہیں اور سو ہی ذائقے۔ نوجوان بچیوں کو کھانے پکانے کا فن سیکھنے میں اس سے یقیناً مدد ملے گی۔

قیمت -/60

شمیم حنفی کی نئی کتاب

قاری سے مکالمہ

فکشن، شاعری اور تنقید و تخلیقی مضمرات پر مضامین کا مجموعہ۔ قیمت -/150

انتظار حسین

اردو کا تہذیبی مزاج

اردو کا سن پیدائش کیا ہے؟ کس علاقے میں پیدا ہوئی؟ پہلا شاعر کون ہے؟ محقق ان سوالات پر بحث کرتے رہتے ہیں۔ یہ بحثیں انھیں ہی زیب دیتی ہیں۔ میں محقق نہیں ہوں۔ سو باریک نہیں پیس سکتا۔ میرے موٹے حساب سے اردو زبان کی تاریخ بی چھو سے شروع ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی آمد اور بی چھو کے بیچ کے زمانے میں اس سرزمین بر صغیر پر کیا ہوتا رہا، اس کی تفصیلات مورخوں اور محققوں سے سینے۔ مجھ ایسوں کو تو بس تلواروں کی جھنکاریں اور گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیتی ہیں۔ فاتحین آرہے ہیں، جارہے ہیں۔ طبلِ جنگ بج رہا ہے۔ سنکھ پھونکے جارہے ہیں۔ جنگ کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ مگر شاید اس شور کے پیچھے کوئی خاموش عمل بھی چل رہا تھا۔ آخر ان باہر سے آنے والوں کی کمک ہر ایک عقیدہ بھی تو تھا اور اس کے اثر سے بننے والی ایک پوری تہذیب۔ فاتحین کے ساتھ ساتھ یہ عقیدہ ایسی سرزمینوں پر بھی پہنچا تھا جو قدیم اور عظیم تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہیں، مگر وہاں وہ تہذیبیں قصہ ماضی بن چکی تھیں۔ کوئی بچی کچھی رہ بھی گئی تھی تو اپنے آخری دموں پر تھی۔ مگر اس سرزمین کی قدیم تہذیب اپنے عقائد و تصورات، اپنی دیومالا غرض اپنے سارے تام جھام کے ساتھ زندہ تھی۔ مندروں میں سنکھ بج رہے تھے۔ مورتیاں سجی بنی رکھی تھیں۔ پجاریوں کے ان کے سامنے سر جھک رہے تھے تو میدان جنگ سے ہٹ کر ایک ٹکراؤ تہذیبی سطح پر بھی ہونا ناگزیر تھا۔

مگر جب دو تہذیبیں ٹکراتی ہیں تو اس ٹکراؤ میں کئی پیچ پڑ جاتے ہیں۔ فریقین کی اطلاع کے بغیر آویزش کے ساتھ ساتھ آمیزش کا عمل بھی چل پڑتا ہے تو ادھر میدان جنگ میں تلواریں چل رہی تھیں، گردنیں کٹ رہی تھیں، خون بہہ رہا تھا۔ ادھر خاموشی سے ایک آویزش اور آمیزش کا عمل جاری تھا۔ صدیوں میں پھیلے ہوئے اس عمل کی اپنی تفصیلات ہیں۔ اس وقت مجھے ان تفصیلات سے کچھ نہیں لینا۔ میرے لیے اس سارے عمل میں معنی اس وقت پیدا ہوتے ہیں یا کہہ لیجیے کہ اس وقت نکھر کر سامنے آتے ہیں جب ولی کی ایک گلی میں بیٹھی ہوئی وہ ساقن جو بی چھو کہلاتی تھی۔ طوطی ہند شاعر شیریں مقال امیر خسرو کو اپنی گلی سے گزرتے دیکھتی ہے۔ دم بھر کے لیے چرس اور بھنگ میں دھت اپنے گاہکوں کو فراموش کرتی ہے اور اپنی عقیدت پیش کرتے ہوئے شاعر شیریں مقال سے فرمائش کرتی ہے کہ اے طوطی ہند، تیرے قربان جاؤں تو نے فارسی معانی میں قصیدے، مثنویاں

غزلیں کہہ کہہ کر انبار لگا دیے، کوئی چیز لونڈی کے نام پر بھی بنا دے۔ یہ فرمائش تھی یا چیلنج، چیلنج کس کی طرف سے۔

بی چھو کا زمانہ سلاطین دہلی کا زمانہ ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں کہ مارا مار کرتے ہوئے آئے، مار دھاڑ کی، لوٹا غارت کیا، اور پلٹ گئے۔ اب وہ زمانہ ہے کہ زمین نے آنے والوں کے قدم پکڑ لیے ہیں۔ اب یہیں رہ پڑنے اور بسنے بسانے کی خواہش نے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ سو اب میدان جنگ سے زیادہ تہذیبی میدان میں گہما گہمی نظر آتی ہے۔ تین سو برس میں پھیلے ہوئے اس زمانے کے ایک سرے پر ایک بڑا شاعر دوسرے سرے پر دوسرا بڑا شاعر کھڑا دکھائی دے گا۔ یہ دور شروع ہوتا ہے تو امیر خسرو کے شعر و نغمہ سے مالا مال دکھائی دیتا ہے۔ جب ختم ہونے کو ہے تو کبیر کا انحد راگ سنائی دیتا ہے۔ درمیان میں سلطان حسین شرقی ہیں جنھوں نے سترہ راگ ایجاد کیے۔ کشمیر میں سلطان زین العابدین جو سنسکرت کتابوں کو فارسی میں ترجمہ کرا رہے ہیں اور موسیقاروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے یہاں اکٹھا کر رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ آویزش دھیمی پڑ چکی ہے۔ آمیزش کا عمل تیز ہے۔ مگر مجھے ان سب کے مقابلہ میں چھو کی شخصیت زیادہ اہم نظر آتی ہے۔

دلی کے تخت پر اس وقت جو بھی سلطان بیٹھا تھا وہ تو اپنے اپنے وزرا و امرا کو دیکھ رہا تھا۔ شاعر شیریں مقال کی فارسی سن رہا تھا اور داد سخن دے رہا تھا۔ اسے کب یہ خبر ہوگی کہ دربار سے ذرا ہٹ کر ایک گلی میں ایک ہفت رنگن ساقن بیٹھی ہے جس نے شہر کے لچوں لفنگوں کو نشہ پلاتے پلاتے ایک عجب گل کھلایا ہے کہ شاعر شیریں مقال اپنی ساری فارسی بھول کر اس کی فرمائش کے سحر میں پھنس گیا ہے۔ بی چھو کی فرمائش کے پردے میں ایک نئی حقیقت اپنا اعلان کر رہی تھی۔ ایک تہذیب جس نے لمبے تشکیلی عمل سے گزر کر اب اپنی شکل نکال لی تھی اور طوطی ہند سے پوچھ رہی تھی کہ تم کون سے ہند کے طوطی ہو۔ ہند کی نئی تہذیب نئی بولی تو میں ہوں اور اب امیر خسرو دربار سے نکل کر گلیوں بازاروں میں گھومتے پھر رہے ہیں اور اب فارسی کے سنگھاسن سے اتر کر بی چھو کی فرمائش پر بی چھو کے لیے اور پنہارنوں کی فرمائش پر پنہارنوں کے لیے بول لکھ رہے ہیں۔ بھٹیارن نے کہا کہ میرے پوت کو اللہ رسول کا کچھ پتہ نہیں۔ اس کے لیے کچھ لکھ دو۔ سو اس کے لیے "خالق باری" لکھ دی۔ کسی برہ کی ماری نے کہا کہ ساون لگ گیا اور میرے پیر سے کوئی مجھے لینے نہیں آیا۔ میں اداس ہوں۔ لیجیے اس کے لیے ساون کا گیت لکھ دیا۔ کسی کے لیے برہ کا گیت، کسی کے لیے رخصتی کا گیت۔ کسی کے لیے انمل کہی۔ کسی کو پہیلی سنائی۔ کسی کے لیے دو سخن۔ ساتھ میں آدھا تیتر آدھا بٹیر قسم کی غزلیں۔ تھوڑی فارسی تھوڑی اردو۔ انمل کو ملا کر نئی طرز کی غزل۔

تو مجھے تو اردو کا نقشہ کچھ اس قسم کا نظر آتا ہے۔ایک نئے تہذیبی عمل کے ساتھ اس کی داغ بیل پڑی۔ عمل آویزش اور آمیزش کے مراحل سے گزرتا ہوا جتنا اپنا رنگ نکالتا گیا اتنی یہ زبان اپنی شکل نکالتی گئی اور جلد ہی وہ اس طرح نکھر کر سامنے آئی کہ زبان سے بڑھ کر ایک تہذیب نظر آرہی تھی اور عجب بات ہے کہ اس کی شعری روایت کا رسمی آغاز تو بعد میں ہوا دو بڑے شاعر پہلے ہی پیدا ہو گئے۔ خیر امیر خسرو کے بارے میں تو آپ یہ کہیں گے کہ دو بڑے شاعر اپنے فارسی کلام کے زور پر ہیں مگر کبیر کا تو اوڑھنا بچھونا یہی دیسی زبان تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو کے فارسی گزیدہ مورخوں نے اس سے اجنبیوں والا برتاؤ کیا۔

خیر تو مطلب میرے کہنے کا یہ ہے کہ اردو کی پیدائش اور نشو و نما ایک ایسے تاریخی عمل کے تحت ہوئی ہے جس میں تہذیبی آویزش اور آمیزش جزواعظم کی حیثیت رکھتی ہے۔ سو جب اس نے نکھر کر اپنی ایک صورت نکالی اور ایک نکھری ستھری زبان کی حیثیت سے سامنے آئی تو اس کی شکل اس قسم کی تھی کہ وہ ایک زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پوری تہذیب بھی تھی پھر چونکہ یہ زبان کسی ایک علاقے کے ساتھ بندھ کر نہیں رہی۔ کبھی گہوارہ کبھی دکھن، کبھی دلی، کبھی لکھنؤ، کبھی لاہور، سو اس تہذیب کو کسی ایک علاقے کے ساتھ منسوب نہیں کر سکتے اور یہ جو اس کا علاقہ علاقہ مارے پھرنا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کا چسکا تھا یا تاریخی عمل؟ اسی نے اس میں یہ صفت پیدا کر دی کہ برصغیر کے جن علاقوں میں وہ بولی نہیں جاتی وہاں سمجھی ضرور جاتی ہے اور اسی سے اس میں جذب و قبول کی غیر معمولی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ ذرا ارد گرد دیکھیں کہ اس وقت اردو کس عمل سے گزر رہی ہے۔ محفلوں میں، مباحثوں، مذاکروں میں، ٹی وی، ریڈیو کے پروگراموں میں حصہ لینے والوں کا عالم یہ ہوتا ہے کہ بول رہے ہیں اردو میں اور رواں ہیں انگریزی میں۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ بولنے والا بیچ میں انگریزی ٹانکے بغیر چار فقرے اردو کے سالم بول جائے۔ لاہور کے اسٹیج پر جو ڈرامے ہوتے ہیں ان میں اردو کے ساتھ پنجابی کا گھال میل بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ ادھر ہندستان میں اردو میں ہندی لہجے اور لفظ رام پاتے چلے جا رہے ہیں۔ ویسے تو ہندی اردو کی گھٹی میں پڑی ہے مگر وہ جو انیسویں اور بیسویں صدی میں ابھرنے اور زور پکڑنے والے سیاسی رجحانات کے تحت ہندی نے ایک الگ زبان کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور جسے عام ہندی سے تمیز کرنے کی خاطر ماہرین لسانیات ہائی ہندی کہتے ہیں، اس کا اردو کے ایوان میں گھسے چلا آنا اردو کے بہی خواہوں کو اکھرتا ہے مگر اس سارے گھال میل میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ جن زبانوں کی عملداری کا علاقہ وسیع اور متنوع ہوتا ہے ان کے ساتھ ایسا عمل ناگزیر ہے۔ یہ سارا لسانی گھال میل جائز ہے مگر

اس شرط کے ساتھ کہ بیچ میں ایسے لکھنے والے اور بولنے والے موجود رہیں جن کی زبان یہ بتاتی رہے کہ معیاری زبان کیا ہے اور شائستہ اور مہذب اظہار کون سا ہے۔ سو ایسا ہوتے ہوئے ممکن ہے کہ ایک لمبے لسانی عمل کے بعد ایسے سارے لہجے اور لفظ جو اس وقت انمل اور بے جوڑ نظر آتے ہیں زبان میں شیر و شکر ہو جائیں کہ ان کے اجنبی ہونے کا احساس ہی نہ ہو۔ بہر صورت لسانی کھال میل جیسا بھی ہے اس میں اردو کی شرکت اس سے بہتر ہے کہ وہ پاک صاف رہنے کی کوشش میں الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جائے اور پھر طاق میں بٹھا دی جائے جیسے ظالم زمانے نے سنسکرت جیسی اعلا پائے کی زبان کو اس کے اسی تعصب کی وجہ سے طاق میں بٹھا دیا تھا۔ زبانیں اور تہذیبیں کبھی خالص نہیں رہا کرتیں۔ خالص رہنے میں ان کی موت ہے۔ ان کی لطافت کثافت ہی کے راستے جلا پاتی ہے اور جلوہ دکھاتی ہے۔

وہ کیا تہذیب تھی جس میں بلبل کے پر رگ گل سے باندھے جاتے تھے۔ کیا شائستگی تھی کیا رکھ رکھاؤ۔

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

نہ ہو اس میں کوئی گہرے معنی مگر شعر ایک مخصوص تہذیب کی چغلی تو کھاتا ہے جسے زبان کی شاعری کہا جاتا ہے اسے تہذیب کی شاعری کیوں نہ کہیے ویسے تو یہ بھی زبان ہی کا شعر ہے۔

میں نے پوچھا تھا ہے کوئی اسکوپ
مسکرا کر کہا گیا نو ہوپ

مگر یہ نئی تہذیب کی زبان ہے۔ تہذیب جس کا طور یہ ہے:

میں نے کہا کہ دیکھ یہ میں، یہ ہوا، یہ رات
اس نے کہا کہ میری پڑھائی کا وقت ہے

مگر کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ تہذیب بھی دیکھی، اب یہ تہذیب بھی دیکھ۔ زبان کو اگر زندگی کے بڑے دھارے کے ساتھ چلنا ہے تو ایسے اس کے سارے طور اطوار کے ساتھ نباہ کرنا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ زبان کو آپ تہذیبی عمل سے منقطع نہیں کر سکتے۔ اس کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اپنے زمانے کی فکر و احساس کی ترجمانی کا حق ادا کر سکے اور تہہ در تہہ زندگی کے عمل میں شامل رہے۔ (بہ شکریہ اخبار اردو)

پروفیسر نقی حسین جعفری
صدر شعبہ انگریزی
جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

محرمِ پیغمبرانِ سخن

سردار جعفری

سردار جعفری پیغمبران سخن میں غالب کے نظریہ کائنات اور فکر کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں: "یہ سوال اہم ہے کہ غالب کے سامنے کوئی نظریہ کائنات اور فلسفۂ حیات تھا یا نہیں۔ وہ کسی خاص نظریے کا بانی نہیں ہے، اس لیے اس کے یہاں منظم فکر اور پیام کی جستجو غلط ہوگی۔ لیکن غالب کی شاعری کے فکری عناصر اور فلسفیانہ مزاج سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے رسمی خیالات اور غزل کے روایتی موضوعات کے پیدا کیے ہوئے تضادات کے باوجود کائنات اور انسان کے متعلق غالب کے حاوی رجحانات کا اندازہ کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔"

یہ عبارت قدرے تصرف کے ساتھ خود سردار جعفری کے بارے میں کچھ اس طرح پیش کی جاسکتی ہے: "یہ سوال اہم ہے کہ سردار جعفری کے سامنے کوئی نظریہ تنقید اور فلسفہ ادب ہے یا نہیں۔ ترقی پسند ادب کی روایتی شرح کے علاوہ ان کے ہاں کسی مربوط فکر اور فلسفے کی جستجو غلط ہوگی۔ لیکن سردار جعفری کی تشریح ادب کے فکری عناصر اور انتقادی مزاج سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے خالص تاثراتی تنقید اور انتہائی دقیق ادبی مسئل پر غیر رسمی گفتگو کے پیدا کیے ہوئے تضادات کے باوجود شاعری اور اس کے انسلاکات کے متعلق جعفری کے حاوی رجحانات کا جائزہ لینا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔"

اس تمہید کی روشنی میں سردار جعفری کی تالیف پیغمبرانِ سخن کا مطالعہ زیر غور ہے لہٰذا میں مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ یہ کتاب جو کبیر بانی، دیوان میر اور دیوان غالب کے دیباچوں پر مشتمل ہے، ایک اہم دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ تینوں شعرا کے درمیان جو اقدار مشترکہ طور پر جعفری صاحب کو نظر آتی ہیں اور جن کا شرح وبسط کے ساتھ انھوں نے تجزیہ کیا ہے وہ کئی لحاظ سے ممتاز اور توجہ طلب ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ

ان تفصیلی جائزوں میں جعفری ان شعرا کی انفرادیت اور مختلف النوع کارناموں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ میر اور غالب پر کہ یہ دونوں شعرا اردو کے عظیم ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں، مختلف انداز میں مباحث قائم کیے گئے ہیں۔ کبھی میر کو اولیت حاصل رہی اور کبھی غالب کو اور کبھی بیک وقت دونوں کو۔ لیکن کبیر سے بات شروع کر کے جعفری صاحب نے یقیناً گفتگو کو ایک نئی اور اچھوتی جہت عطا کی ہے۔ اور اس انداز فکر سے میر اور غالب پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ میر پر جعفری صاحب کا مضمون خاصا وقیع اور اچھا ہے۔ آب حیات اور تذکرۂ میر کے حوالوں سے، جسے انھوں نے افسانہ و حقیقت کے نام دیے ہیں، اس مضمون میں میر کے عہد اور ان کی شاعری کی اچھی تصویر سامنے آتی ہے۔ یہاں اُن کا تنقیدی مزاج یقیناً Eclectic ہے اور ترقی پسند ادب کے استدلال اور طریقہ کار سے مختلف اور زیادہ وسیع ہے۔

ابتدا میں جعفری صاحب نے اردو اور ہندی کے تاریخ نگاروں کے جس تضاد اور جانبداری کا ذکر کیا ہے وہ بھی قابل غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "یہ اردو والوں کی کوتاہ نظری تھی کہ انہوں نے قطب شاہی اور اس سے پہلے کی دکنی شاعری کو تو اردو ادب کی میراث کی حیثیت سے قبول کیا لیکن کبیر سے پہلو تہی کی اور ہندی والوں کی تنگ نظری نے کھڑی بولی کی نکھری ہوئی شکل کے دو سب سے بڑے شاعر میر اور غالب کو ہندی کا رتن ماننے سے انکار کر دیا۔ بحث کے لیے اور اردو کی حق تلفی کے لیے کبھی کبھی انھیں ہندی کا شاعر مانا جاتا ہے۔ لیکن جب اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہونے کا سوال اٹھتا ہے تو بڑی شدت سے اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔"

بحث کے آغاز میں اس بات کا ذکر کر کے جعفری صاحب نے اردو ادب کی تاریخ کے مروجہ پیمانوں پر اہم سوال اٹھایا ہے۔ آب حیات نے Canon سازی کی جو روایت بنائی ہے اس سے کبیر ہی نہیں وہ تمام شعرا اردو کی قلمرو سے باہر ہو گئے جنھوں نے کبیر کے طرز پر "دوہے" یا "پد" کہے ہیں۔ چنانچہ اردو کے روایتی طالب علم کے لیے "رحیم" "ملک محمد جائسی یا قاسم شاہ دریابادی کو جاننے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔

کبیر کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں جعفری صاحب نے جو مباحث قائم کیے ہیں اور جس انداز میں انھوں نے ہندی داں اور اردو داں طبقوں کو کبیر سے واقف کرایا ہے وہ دلنشین ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز بھی ہے۔ کبیر کی شخصیت ان کی شاعری کے حوالے سے اپنے پورے جلال اور جمال کے ساتھ ہمارے سامنے منکشف ہوتی ہے۔ اس بابت گیارہویں صدی ہجری میں شیخ عبد الرحمٰن چشتی کا لکھا ہوا رسالہ مراۃ الاسرار ہمارے سامنے کبیر کے بارے میں نئے انداز میں روشنی ڈالتا ہے۔ اس رسالے میں مذکور ہے:

"شیخ بھیک کے تیسرے خلیفہ شیخ کبیر ملامتی ہیں، جو پہلے شیخ رمضان --- کے مرید

تھے، لیکن بعد میں رلا نند بیراگی کی صحبت میں جا پڑے۔ وہاں انھوں نے بہت مجاہدات کیے اور ان پر توحید کا غلبہ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اہل ظواہر کی رعایت کا خیال ان سے ترک ہو گیا اور بے پروا کلمات ان سے سرزد ہونے لگے۔ چنانچہ ظاہر بین لوگوں نے آپ پر کفر کے فتوے صادر کیے لیکن اہل معرفت کے نزدیک آپ صحیح معنوں میں موحد تھے۔ ہاں آپ کا مشرب رندانہ اور ملامتیہ ضرور تھا۔ آخر میں آپ نے حضرت مخدوم بھیک سے سلسلۂ فردوسیہ کا خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ آپ کا طریق صلح کل تھا۔ آپ کا مزار گورکھپور کے علاقے میں قصبہ مگہر میں واقع ہے" (جلد ۱، از حضرت خواجہ معین الدین چشتی تا شیخ حسام الدین مانکپوری)

اس سند کی روشنی میں کبیر سے اردو والوں اور مسلمانوں کی عمومی بے اعتنائی تعجب خیز معلوم ہوتی ہے۔

سردار جعفری نے کبیر کے شاعری کے پیرہن کو مذہبی اور میر اور غالب کی شاعری کے پیرہن کو غیر مذہبی کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کبیر صوفی اور بھگت تھے اور میر اور غالب محض شاعر۔ لیکن اس پیرہن کے باوجود کبیر کا مزاج سیکولر ہے جعفری صاحب کے ان عمومی تاثرات کے بارے میں راقم سطور کا خیال ہے کہ بعد زمانی کے باوجود کبیر، میر اور غالب تینوں عہد وسطی کے تصور حیات و کائنات کو اپنے اپنے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ تینوں کے یہاں سب سے بڑی قدر مشترک وحدۃ الوجود کا تصور ہے۔

ہندستان میں گہری متصوفانہ تہذیب و روایت کے باوصف وحدۃ الوجود کا رنگ اتنا غالب تھا کہ صوفیا کے ملفوظات اور مراسلات میں اس کی جابجا جھلک ملتی ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کو اس تصور کے محرک کہے جاتے ہیں لیکن یہ صحیح ہے کہ اس کے ڈانڈے مغرب میں نو افلاطونیت اور ہندستان میں अद्वैतवाद سے ملتے نظر آتے ہیں یہاں اس بات کا محل نہیں ہے کہ فلسفہ وجوۃ الوجود کے تصور اور ارتقا پر گفتگو کی جائے یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ کبیر سے غالب تک کے عہد میں یہ تصور عین اسلامی تصور کے طور پر جانا جاتا تھا اور اس کے رنگ میں عالم و صوفی سبھی غرق تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے درمیان تکوینی فرق کو سمجھانے کی ضرور کوشش کی لیکن وحدۃ وجودی فلسفہ غالب و مقبول رہا۔ ہندستان کے عہد وسطی کے فکری اجزائے ترکیبی میں فلسفہ 'وحدۃ الوجود'، دین و مذہب کی ظاہری شکل اور رسوم پر اصرار سے ایک درجہ اغماض اور تصوف کے سلاسل کے فروغ کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ امر محض اتفاقی نہیں ہے کہ اسی دور میں ہندستان میں غزل کی شعری روایت کو فروغ حاصل ہوا۔ غزل کے مفاہیم میں حسن و عشق کے موضوعات کے علاوہ دین و مذہب کی رسمی و ظاہری شکل پر اصرار سے اغماض اور وحدہ

الوجودی تصور کی زیریں لہریں پورے شعری سرمائے کو محیط ہے۔ ولی دکنی ہوں کہ عزلت سلونی، سراج اور رنگ بادی ہوں یا مظہر جاں جاناں یا خواجہ میر درد، آتش ہوں کہ ناسخ، مصحفی ہوں کہ سودا اور غالب ہوں کہ میر سبھی کے یہاں دین و مذہب کی رسمی و ظاہری شکل پر اصرار سے بے زارگی، وحدۃ الوجودی فکر اور دل کی کائنات کی گرم بازاری نظر آتی ہے۔ غزل کے اس منظر نامے کے تناظر میں راقم السطور کے لیے سردار جعفری کے اس محاکے کو مانناد شوار ہے کہ میر و غالب کی شاعری کا پیراہن غیر مذہبی ہے۔ میر و غالب کی شاعری کا پیرہن اتنا ہی غیر مذہبی ہے جتنا خواجہ میر درد کی شاعری کا یا ان سے بھی بیشتر سراج اور رنگ بادی کی شاعری کا۔ اور بالمعمول غزل کی پوری روایت کا۔

اردو غزل جو فارسی غزل کی کوکھ سے جنمی ہے، بڑی عجیب تصور حیات پیش کرتی ہے۔ غزل کے کسی شعر میں ریاست واقتدار قشقہ وزنار ، واعظ و محتسب کے لیے کوئی ہمدردانہ جذبہ کوئی مثبت خیال اور طاویل کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔ فارسی اور اردو میں غزل کی صنف اس معاملے میں واقعی اتنی ممتاز اور منفرد ہے کہ عالمی ادب میں اس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ یعنی اتنی ممتاز اور منفرد کہ عالمی ادب میں اس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ یعنی جس میں ریاست اور ظاہری مذہب دونوں کے خلاف بیک وقت شاعر نبرد آزما رہا ہو۔ آدمیت اور آدم کی سرفرازی کا ایسا دلکش اظہار جو تواتر کے ساتھ پوری روایت پر حاوی رہا ہو کسی اور صنف سخن میں نظر نہیں آتا وحدۃ الوجود آدم کی تلاش اور آدمیت کی سربلندی کے احساس کے ساتھ رسمی اور ظاہری شکل سے بیزارگی کا یہ احساس غزل کی روایت میں تو تھا یہ ازمنہ وسطی کی تہذیب کے آب و گل میں بھی رچا ہوا تھا۔ کبیر اس سطح پر میر اور غالب کے پیش رو نظر آتے ہیں۔

یہاں کبیر پر لکھے گئے مضمون کا ایک اقتباس دلچسپی سے لی نہیں ہے۔" میں شونیہ ??? کے آسن پر بیٹھ کر سادھنا کے ناقابل بیان رس کا پیالہ پیا۔ اب میں اسرار کا محرم ہو داور وحدت کے راز کا سمجھنے والا۔ راہ کے بغیر چل کر میں اس شہر میں پہنچ گیا ہوں جہاں کوئی غم نہیں ہے جگ دیو کا رحم اور کرم آسانی سے نصیب ہو گیا ہے۔ میں نے دھیان دھر کے دیکھا تو وہ بغیر آنکھوں کے نظر آگیا۔ جو محدود ہے، جسے لوگ نارسائی کی منزل کہتے ہیں۔ یہ مقام غموں سے آزاد ہے۔ یہاں پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے لیکن جس نے غم پایا وہی بے غم ہو گیا۔ یہاں عجب آرام ہے۔ دانش مند وہ ہے جس نے یہ مقام دیکھا ہے۔ دانش مند ہے جس نے اس کا گیت گایا ہے"------ اسی طرف میر کے مضمون کا یہ اقتباس:

"فطرت سے ہم آہنگی کے جذبے نے کبھی کبھی موت کی خواہش کی شکل بھی اختیار کی ہے۔ یہ بڑی حسین صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ زندگی کے اختصار کو میرے بار بار

بوئے گل اور نوائے بلبل سے تشبیہ دی ہے۔ اس کا ثبات گل کے تبسم کے برابر ہے، دنیا کسی شوخ کی قدم گاہ ہے۔ جس میں گل کے چراغوں سے روشنی ہو رہی ہے۔ (غزل ۷۔ ۱۴ شعر ۴) اس سے منہ پھیر کے چلے جانے کو کس کا جی چاہے گا۔ پھر بھی فطرت سے ہم آہنگی کی خواہش ہے، جس کی تکمیل صرف موت کے ذریعہ ہو سکتی ہے --- پھول چہروں میں بدل جاتے ہیں۔ چہرے پھولوں میں۔ خاک سے آدمی بنتا ہے اور آدمی خاک ہو جاتا ہے۔ اس طرح موت اور زندگی ایک سلسلے کی کڑیاں بن جاتی ہیں اور ساری کائنات ایک وحدت میں تبدیل ہو جاتی ہے ----- میر کی شاعری کے تمام بکھرے ہوئے جلوے ایک صد رنگ گلستاں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی، بلبل بھی اور صیاد بھی نشیمن بھی ہے اور بجلی بھی۔ زندہ رہنے کی امنگ بھی ہے اور مر جانے کا حوصلہ بھی اور یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری آج بھی عظیم ہے۔ اور زمانے کے بدل جانے کے بعد بھی دو سو برس پرانی زبان میں ہمارے جذبات اور احساسات کا ساتھ دے رہی ہے۔" اور آخری اقتباس غالب پر مضمون سے لیا گیا ہے۔

"شوق غالب کا نہایت محبوب لفظ ہے اور اس خاندان کے دوسرے الفاظ تمنا آرزو اور خواہش سے اس کی شاعری جھلک رہی ہے۔ جنون جو شوق کی انتہا ہے۔ اس کو ہمیشہ اکساتا رہتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ شوق انتہائی عاجزی میں بھی انسان کو سربلند کر دیتا ہے اور ذرے کو صحرا کی وسعت اور قطرے کو دریا کا تلاطم عطا کرتا ہے۔ اس لیے شوق اور طلب کی راہ میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی آسودہ نہیں ہونا چاہتا۔ منزل سے کہیں زیادہ لذت منزل کی جستجو میں ہے کیونکہ منزل آسودگی ہے اور آسودگی روح و دل کی موت۔"

مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں کبیر سے غالب کے عہد تک ایک تسلسل نظر آتا ہے۔ یہ تسلسل تصور حیات و کائنات، آدم اور اولاد آدم کی سربلندی اور اور ظاہری رسوم اور قیود کے نتیجے میں اس کی کشمکش اور دل سوزی سے عبارت ہے۔ میر اور غالب کے یہاں یہ ہم آہنگی غزل کے مشترکہ پیرہن اور قرب زمانی کے باوجود عیاں اور روشن ہے لیکن کبیر کے تصور حیات و کائنات کی دنیا مختلف اور منفرد نظر آتی ہے۔ لیکن گہرائی سے دیکھا جائے تو علامتوں کے فرق اور تنوع کے باوجود کبیر اور میر و غالب ایک ہی منزل کی طرف جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس درد مشترک اور تصور حیات کی نشاندہی کرنے میں سردار جعفری نے ہماری غیر معمولی رہبری کی ہے۔ پیغمبران سخن کے دیباچوں کے تجزیاتی مطالعہ سے سردار جعفری کے تشریح ادب کے فکری عناصر اور انتقادی مزاج کی بھرپور نشاندہی ہوتی ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

پانچ جدید شاعر
حمید نسیم

اس مجموعے میں اردو کے پانچ جدید شاعر فیض احمد فیض، میراجی، عزیز حامد مدنی، ن۔م۔راشد اور ضیا جالندھری کا تعارف، شخصیت و کردار کی کچھ جھلکیاں، ان کا مختصر کلام اور کلام پر تبصرہ شامل ہے۔ قیمت -/210

اعلا تعلیم
ڈاکٹر ذاکر حسین

مترجم مسعود الحق

اس کتاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے ایسے ۱۴ خطبات شامل ہیں جو موصوف نے ہندستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں جلسہ تقسیم اسناد کے موقعے پر دیے تھے۔ یہ خطبات تعلیم سے متعلق ہیں۔ یہ خطبات عام لوگوں کے لیے عموماً اور تعلیم کا کام کرنے والوں کے لیے خصوصاً بڑے مفید ثابت ہوں گے۔ قیمت -/120

اردو زبان و ادب کے فروغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ
مرتبہ صغرا مہدی

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ابتدا ہی سے اردو کی تعلیم اور فروغ میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اس مجموعہ مضامین میں جامعہ کے اساتذہ اور قدیم طلبہ نے بتلایا ہے کہ جامعہ نے صحافت، تحقیق، نثر نگاری، ڈراما نگاری اور بچوں کے ادب کے لیے کس پایے کا کام کیا ہے۔ قیمت -/75

ڈسپلن کی تعلیم و تربیت
ڈاکٹر محمد اکرام خاں

اس کتاب کا مرکزی نقطہ بچے کی داخلی ڈسپلن، ہے۔ اس کے لیے والدین اور اساتذہ میں روشن خیالی کے ساتھ ساتھ جس صبر و ضبط کی ضرورت ہے اس کو واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ قیمت: -/90

آخر کار
مجتبیٰ حسین

عہد حاضر کے سب سے زیادہ مقبول مزاح نگار کے مضامین کا نیا مجموعہ جسے ایک بار پڑھنے کے بعد بار بار پڑھنے کو دل چاہے گا۔
قیمت -/60

الجھنیں
عبداللہ ولی بخش قادری

یہ کتاب قاری کو نہ صرف اپنی ذات اور اپنے ماحول کو سمجھنے اور برتنے کے لیے آمادگی پیدا کرے گی بلکہ نفسیاتی تہہ داری نیز ان کی موجودہ الجھنوں کو رفع کرنے اور نئی الجھنوں سے بچانے کا موجب بھی ہو سکتی ہے۔ قیمت -/60

طب یونانی اور چیلنجز
حکیم اشہر قدیر

اس تصنیف کا مقصد یہ ہے کہ حلقہ طب اجتماعی طور پر ان مسائل سے واقف ہو جو طب کے مقابل چیلنج بن کر کھڑے ہیں اور مشترکہ طور پر اس فن کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں۔ اپنی نوعیت کی اہم کتاب۔ قیمت -/60

فراق: دیارِ شب کا مسافر

مرتبین: شمیم حنفی، سہیل اختر فاروقی

فراق کے غیر مطبوعہ مضامین، انٹرویو، شخصیت، شاعری، نثری جائزے۔ معروف ادیبوں کے قلم سے۔ قیمت -/150

ڈاکٹر سید حسن

نذر سردار

(جناب علی سردار جعفری کے گیان پیٹھ ایوارڈ حاصل کرنے کے موقع پر چند اشعار بہ طور تہنیت)

قدم زمیں پہ ہے میرا کہ آسماں پر ہے
یہ کس کا نام خدایا مری زباں پر ہے

نظر جو پیر وجوان زماں پہ تھی میری
وہ اب جمی ہوئی، اک پیر نوجواں پر ہے

جہاں زباں پہ ہے سردار جعفری کا نام
علیؑ کا سایہ بھی سایہ فگن وہاں پر ہے

جو جامعہ سے اٹھا لکھنؤ کی وہ شعلہ
قرار اس کو کہاں ہے، سکوں کہاں پر ہے

فرازِ دار پہ لکھا تھا حرف آزادی
فرازِ دار کی تنویر آسماں پر ہے

"لہو پکارتا ہے" زندگی کی راہوں میں
لکیر خون کی اب امن کے نشاں پر ہے

ادھورے خواب کی تعبیر اک اور خواب بنے
مدار اس کا مگر ہمت جواں پر ہے

یہ سنگ بستہ زمیں کھیتوں میں بدلے گی
جو عزم خارہ شکن اوج آسماں پر ہے

وہ کارخانوں میں گیسوئے یاریوں دیکھے
کہ چمنیوں کا دھواں جیسے آسماں پر ہے

سخنوری ہی نہیں ان کی وجہ سرداری
ز قندِ فکر زمیں جیسے آسمان پر ہے

پدم شری کو مبارک ہو گیان پیٹھ ایوارڈ
صدا یہ شام وسحر قوم کی زباں پر ہے

خیال وفکر کی ان کے حسنؔ ہو کیا توصیف
اڑان ان کی تو دانش کے آسماں پر ہے

احمد صغیر صدیقی
گلشن اقبال۔ کراچی

آٹھواں سمندر

لوحِ وجود پر نہیں
اپنے بغیر نقشِ دہر
پھیلے ہیں اِس بدن میں بھی
اجنبی موسموں کے زہر
ہم پہ بھی رونما ہوئے
کتنے جزیرہ ہائے قہر
سات سمندروں کے ساتھ
ہم بھی بہے ہیں لہر لہر

اپنے گھر پر دستک

روزانہ
شام ڈھلے
باہر آکر
میں، اپنے گھر پر دستک دے دیتا ہوں
چین آجاتا ہے
آخر ایسا کوئی تو ہے
جو دروازہ کھڑکاتا ہے

رفعت صدیقی
ھمایوں نگر۔ حیدر آباد

کبھی ایسا بھی ہو

(اپنے مرحوم بیٹے کی یاد میں)

کبھی ایسا بھی ہو
میں چلتے چلتے اک سڑک پر ٹھہر جاؤں
جس جگہ لڑکوں کا کالج ہو
تبھی چھٹی ہو اور سارے ہی لڑکے۔
/ یک بیک باہر نکل آئیں
اور اس بھگدڑ میں مجھ کو۔ وہ نظر آئے.
مرا مرحوم بیٹا۔
جس کا وہ معصوم چہرا مسکراہٹ سے دمکتا
آج تک آنکھوں میں ہے!
وہ مجھ کو دیکھ لے اور پاس آئے
نہیں! یہہ وہ نہیں ہے!!
یہہ مرا بیٹا نہیں ہے!
یہہ کوئی اور لڑکا ہے۔
جو مجھ کو جانتا تک بھی نہیں ہے
مرا بیٹا تو کب کا کھو گیا ہے!
مگر۔ پھر بھی۔ کبھی ایسا بھی ہو۔
سچ مچ وہ آجائے۔ مری دنیا بسانے
کبھی ایسا بھی ہو!

آفاق حسین صدیقی
صدر شعبہ اردو، مادھو کالج، وکرم یونیورسٹی
اجین۔ایم۔پی

عوامی ذرائع ابلاغ میں زبان کی اہمیت اور اردو

اظہار و ابلاغ انسان کی فطرت بھی ہے، ضرورت بھی اور مجبوری بھی۔ انسان اپنی اس فطرت، ضرورت اور مجبوری کے تحت ابتدا سے ہی اظہار و ابلاغ کے لیے مختلف ذرائع تلاش اور اختراع کرتا رہا ہے۔ جسمانی اعضا کے اشاروں سے علامتوں اور تصویروں تک اور بال کبوتر سے دوش صبا تک ان ذرائع کی ایک طویل اور دلچسپ تاریخ ہے۔

زمانۂ قدیم کے فن کاروں اور شعرا نے انسانی دل کی دھڑکنوں اور ذہن انسانی کی مختلف کیفیات کی ترسیل کے لیے اپنے تصورات سے جو خواب دیکھے تھے دور حاضر کی نئی نشریاتی ایجادات نے انہیں شرمندۂ تعبیر کر دیا ہے۔ آج سائنسی ترقی نے دیواروں میں قوت سماعت پیدا کر دی ہے تو بے جان پتھروں کو گویائی عطا کر دی ہے۔ نشریاتی ذرائع کی ترقی نے اظہار و ابلاغ کی دنیا میں بھی انقلاب بپا کر دیا ہے اور اس کا اثر عوامی ذرائع ترسیل و ابلاغ پر بھی پڑا ہے۔ آج کا دور عوامی ذرائع ترسیل و ابلاغ کی بے پناہ مقبولیت کا دور ہے۔ ساری دنیا اور اس کے شب و روز کے سارے تماشے آج بازیچۂ اطفال کی طرح ہماری بصارت کے دائرے اور سماعت کی حد میں ہیں اور ہماری شب و روز زندگی کے بیشتر معاملات ان ذرائع کی گرفت میں ہیں۔ آج جب مصنوعی سیارے کے ذریعے بیس ہزار میل باہر خلا سے تصاویر اور اطلاعات چند سیکنڈ میں ساری دنیا میں بھیجی جا رہی ہیں، ہماری روز مرہ کی زندگی، ضروریات زندگی، ہمارے تصورات، تخیلات، ہمارے خیالات، ہمارا انداز فکر، ہماری دلچسپیاں، تفریحات، ترجیحات، ہمارا رہن سہن، مسرتیں، بصیرتیں، تہذیب و معاشرت، معیشت، صنعت و حرفت غرض یہ کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے بے حساب پہلو ہیں جو شعوری اور غیر شعوری طور پر عہد حاضر کے ذرائع ترسیل و ابلاغ سے

متاثر ہو رہے ہیں۔

آج جب ذرائع ابلاغ و ترسیل کی مقبولیت اور اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا ہے عوامی ترسیل و ابلاغ کے طریق کار' حربوں اور وسیلوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے ان کے بارے میں سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔

کسی بھی خبر' خیال' اطلاع' معلومات' پیغام یا صورت حال وغیرہ کی ترسیل میں پوری کامیابی اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کا صحیح صحیح ابلاغ ہو سکے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ترسیل و ابلاغ ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں لیکن ان دونوں میں نازک سا فرق بھی ہے ویسا ہی فرق جیسا سکے کے دونوں پہلوؤں کے درمیان میں ہوتا ہے۔ ترسیل کی بات' خیال' شکل یا صورت حال کو پہنچانے کا عمل ہے ابلاغ اس کا نتیجہ ہے۔ ترسیل میں صرف اظہار کرنے والا ہوتا ہے جب کہ ابلاغ میں سامع' قاری یا ناظر کا ردِ عمل بھی شامل ہوتا ہے یعنی عمل + ردِ عمل کو ابلاغ کہا جا سکتا ہے۔ ترسیل میں عمل کو اہمیت حاصل ہے لیکن ابلاغ میں عمل اور ردِ عمل دونوں کی اہمیت ہے۔ ترسیل اور ابلاغ دونوں لازم و ملزوم ہیں چنانچہ صحیح ابلاغ صحیح ترسیل پر منحصر ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ترسیل دلکش و دلچسپ اور مؤثر بھی ہو اور اس میں اصلیت کی روح بھی کار فرما ہو یعنی معنوی تہ داری اور اثر انگیزی کی لہریں موجود ہوں۔ ترسیل اور ابلاغ کی کامیابی اور اثر آفرینی کے تقاضے پیش کش کے مواد کی فن کارانہ تنظیم و ترتیب میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں زبان اہم کردار ادا کرتی ہے۔ زبان خود بھی ترسیل و ابلاغ کا اہم وسیلہ ہے ترسیل و ابلاغ چاہے سماعی ہو یا بصری زبان ایک اہم رول انجام دیتی ہے۔ خصوصاً عوامی ذرائع ابلاغ میں زبان کی حیثیت انسانی جسم کی رگوں میں دوڑنے والے خون کی سی ہے جو جسم کے مختلف حصوں کے درمیان میں رابطہ بھی قائم رکھتا ہے اور طاقت و توانائی بھی فراہم کرتا ہے۔ زبان جو حروف کا مجموعہ ہوتی ہے ایک طرح سے مختلف اصوات کا مجموعہ بھی کہی جا سکتی ہے کیوں کہ حرف کسی نہ کسی صوت ہی کا اسم صفت ہے اور صوت جب قاری یا سامع کے لیے نئے نئے معنی لے کر لفظ یا کلمے کی شکل میں رونما ہوتی ہے تو ترسیل اور ابلاغ کے عمل کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور ان کی تکمیل ہوتی ہے۔ خاص طور پر ابلاغ کے وہ ذرائع جو صرف حرف وصوت کے وسیلے پر ہی منحصر ہیں ان کی تمام تر کامیابی' اثر آفرینی اور پرواز زبانی پر ہی مبنی ہوتی ہے۔ زبان کا خزانہ الفاظ کے جواہرات سے مالامال ہوتا ہے۔ الفاظ اپنی ظاہری شکل میں سادہ سہی لیکن باطنی طور پر یا معنوی سطح پر ایک طلسماتی فضا کے حامل ہوتے ہیں اور

اپنے قرینے' طرز استعمال اور انسلاک سے نئی معنویت اور نئی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ میں گنجینۂ معنی کے طلسم' جزو میں کل کی خوبی' قطرہ میں دریا صفتی جیسی خصوصیات ابلاغ کو معنوی تہ داری' وسعت اور جمالیاتی آہنگ عطا کر کے اسے مختلف سطحوں پر کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ زبان سب سے بڑا سماجی مظہر ہے جو معاشرہ میں قائم ہوتا اور معاشرہ کی مخصوص تہذیبی رو سے معنی کا حامل بنتا ہے یعنی زبان کی معنی آفرینی اور جمالیاتی اثر انگیزی میں ثقافت کی رو کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہر ترقی یافتہ زبان ایک تاریخی و تہذیبی پس منظر اور وسیع فکری وراثت کی بھی حامل ہوتی ہے چنانچہ کوئی بھی طریق اظہار یا ترسیلی مواد جو زبان کے وسیلے سے یا زبان کے تانے بانے پر وجود میں آتا ہے متنوع پہلوؤں کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی اندرونی خصوصیات بھی رکھتا ہے۔ بالالفاظ دیگر نہایت بلیغ ہوتا ہے۔ چنانچہ زبان وہ اہم وسیلہ ہے جو براہ راست طور پر اختیار کیا جائے یا بالواسطہ طور پر کسی بھی خبر کسی بھی صورت حال کو یا پیش کش کو زیادہ سے زیادہ پہلو دار' زیادہ سے زیادہ واضح بناتا ہے اور ابلاغ کے عمل کو تیز سے تیز تر کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

دراصل ترسیل کی سربلندی' اس کا والہانہ پن' اس کی دل نشینی اور کشش ابلاغ کی معنویت اور اثر آفرینی کی ضامن ہوتی ہے اور ترسیل میں مذکورہ تمام خوبیاں بڑی حد تک زبان سے یا زبان کے سلیقہ مندانہ اور فن کارانہ استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ جہاں تک زبان کے استعمال کا تعلق ہے مختلف فنون کے پیرایۂ اظہار اور ٹیکنک میں واضح فرق ہوتا ہے اسی طرح مختلف طریقہ ہائے اظہار میں زبان کے استعمال کے انداز مختلف ہوتے ہیں چنانچہ عوامی ذرائع ابلاغ میں بھی زبان کا استعمال دوسرے ذرائع اظہار سے علاحدہ ہوگا۔

عوامی ذرائع ترسیل و ابلاغ میں ایسی زبان کی ضرورت ہے جو عبارت کی آرائش یا بیان کی لطافت کے بجائے اصل خیال کی ترسیل پر زیادہ زور دیتی ہو اس کے لیے ایسی تراکیب' اصطلاحات اور اظہارات کا استعمال ضروری ہے جو قاری' ناظر یا سامع کے ذہن پر خیال کو من و عن نقش کرنے کی قوت رکھتے ہوں۔ ماس میڈیا میں زبان کی سادگی اور سلامت کے ساتھ صحت بیان' اختصار اور کفایت لفظی کا لحاظ بہت ضروری ہوتا ہے۔ ماس میڈیا میں زبان کی نوعیت اور زبان کا استعمال ایک علاحدہ بحث کا موضوع ہے۔ یہاں عوامی ذرائع ابلاغ اور زبان کے سلسلہ میں صرف یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج جب ہماری زندگی' معاشرت' تہذیب اور ہماری سوچ و فکر پر عوامی ذرائع ابلاغ غیر معمولی اثرات

مرتب کر رہے ہیں ایک طرف تو ضروری ہے کہ عوامی ذرائع ترسیل و ابلاغ کو ہمہ گیر اور مفید سے مفید تر بنایا جائے یعنی آفاقی نوعیت کے معاملات اور مسائل کو اور عام انسانی زندگی کی باریکیوں، برنائیوں، نزاکتوں اور لطافتوں کو اہمیت دی جائے اور تہذیبی، تاریخی، سماجی، معاشی اور سائنسی معاملات کو ملحوظ رکھا جائے۔ ان کے علاوہ ماس میڈیا میں حقیقت، اصلیت اور واقعیت کو بنیادی حیثیت دی جائے دوسری طرف ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے، خاص طور پر برصغیر میں، جو ہر قسم کے خیالات اور مختلف نوعیت کی صورت حال کی مناسب اور مؤثر انداز میں ترسیل کر سکتی ہو اور جو قاری، ناظر یا سامع کے ذہن پر بھرپور انداز میں اثر انداز ہو سکتی ہو۔

عوامی ذرائع ترسیل و ابلاغ کے باب میں زبان کے مذکورہ تقاضوں کے مد نظر جب ہم اردو کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اردو ہندستان کی واحد زبان ہے جو نہ صرف ملک کے مختلف لسانی علاقوں میں بلکہ پڑوسی اور بیرونی ممالک میں بھی بولی، سمجھی اور پسند کی جاتی ہے۔ اس زبان کی کم و بیش سات سو سالہ شاندار تاریخ ہے۔ اس کا وسیع اور وقیع علمی اور ادبی سرمایہ ہے اور یہ غیر معمولی ذخیرہ الفاظ کی مالک ہے۔ متنوع تہذیبی اقدار، معاشرتی روایات اور وسیع فکری وراثت کی وارث ہونے کے ساتھ تاریخی، تہذیبی، سماجی، سیاسی، فلسفیانہ، مذہبی، اخلاقی اور علمی و سائنسی وغیرہ ہر قسم کے موضوعات پر اس زبان کی مضبوط گرفت نے اسے ایک منفرد حیثیت عطا کر دی ہے۔ ان تمام خصوصیات کی بنا پر اردو زبان تمام قسم کے خیالات پیغامات یا اطلاعات یا صورت حال یا کیفیات وغیرہ کے مختلف پہلوؤں کو پوری صداقت، بھرپور توانائی اور ایک جمالیاتی آہنگ کے ساتھ ادا کرنے اور ذہنوں پر مرتسم کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر نوع کے اسالیب بیان اور اظہار کے مختلف انداز کی موجودگی میں یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ عہد حاضر کے آزاد ہندستان میں عوامی ذرائع ترسیل و ابلاغ کو مفید اور موثر بنانے میں اردو زبان غیر معمولی رول ادا کرنے کی خصوصیات رکھتی ہے ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔

پروفیسر شکیل اختر فاروقی
فیکلٹی تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ،

مدرسہ ابتدائی جامعہ میں تعلیمی تجربات

حرفے کی تعلیم اور مادری زبان کی تعلیم جامعہ میں ہمیشہ لازمی رہی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں جامعہ کے پہلے Convocation کے موقع پر پہلے امیر جامعہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے اپنے خطبے میں فرمایا تھا " ... ہم نے ایک غیر زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کے غیر فطری طریقے کا بھی یک قلم سدِ باب کر دیا۔ ...ہندستانی اب تک اس فریب میں مبتلا رہے اور اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ غیر زبان میں تعلیم دے کر قوم کے قوائے ذہنیہ کو کس طرح ضائع کیا جارہا ہے۔۔ بارے الحمدللہ کہ ہمیں ہوش آیا اور اب ہم نے اپنے جدید نظام تعلیم میں اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا ہے۔"

اسی خطبے میں حرفے کی تعلیم کا ذکر بھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ " مجھے بڑی خوشی ہے کہ جامعہ ملیہ کے جدید نظام تعلیم میں تعلیم صنعت و حرفت ہر شخص کے لیے لازمی قرار دی گئی ہے ...."

حکیم صاحب کے یہ الفاظ اس بات کا ثبوت ہیں کہ گاندھی جی کی بنیادی قومی تعلیم سے بہت پہلے جامعہ کے نصاب میں حرفے کی تعلیم اور مادری زبان کے ذریعے تعلیم کو شامل کر لیا گیا تھا۔ جامعہ اگرچہ ایک اعلا تعلیمی ادارے کی حیثیت سے وجود میں آئی تھی لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ جامعہ کو اپنے طالب علموں کی تعلیم و تربیت ابتدا سے خود کرنی چاہیے۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں ہی ابتدائی جماعتوں کا قیام عمل میں آگیا۔ ثانوی مدرسے کا آغاز ۱۹۲۱ء میں ہو چکا تھا۔ مگر ان اسکولوں میں باقاعدگی آئی ذاکر صاحب کے آنے کے بعد۔ ۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب تشریف لائے تو انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ بالخصوص مدرسہ ابتدائی کے بنانے اور سنوارنے میں بقول شخصے جان کی بازی لگا دی، اپنی جوانی لٹا دی اور اپنی صحت خراب کر لی۔ یورپ سے واپسی پر ذاکر صاحب اپنے ساتھ ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کو

بھی جامعہ لے لائے اور وہیں سے ساتھ لائے تعلیم میں ترقی پسندی کے نئے نظریات بھی، ذاکر صاحب جرمن مفکرِ تعلیم اور فلسفۂ تعلیم کے جید عالم جارج کرشن اسٹائیز سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے پستا لوزی اور جان ڈیوی سے بھی اثر لیا
Progressive Education Association Amarican Chuch Mission
Laboratory School اور Training School کے جدید تصورات، نظریات اور تجربات سے فائدہ اٹھا کر بڑے صبر و تحمل، خندہ پیشانی اور وسعت نظر کے ساتھ چند سال میں مدرسہ ابتدائی کو قومی تعلیم کی ایک 'خانقاہ' بنا دیا۔ انھوں نے جامعہ میں تعلیم کو جس اصول کے مطابق چلایا وہ "کام کے ذریعہ سیکھنے" کا اصول تھا۔ اس کا ذہنی عنصر انھوں نے کرشن اسٹائیز سے لیا تھا۔ مغربی مفکرین اور گاندھی جی کے تعلیمی خیالات کے امتزاج سے ذاکر صاحب نے خود اپنے نظریۂ تعلیم کی تشکیل کی تھی۔ ڈاکٹر عابد حسین کے الفاظ میں "اسی نظریے کے سانچے میں انھوں نے بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم ڈھالی تھی جو ذاکر حسین اسکیم کے نام سے مشہور ہوئی۔"

ذاکر صاحب کے تعلیمی تجربات میں اور گاندھی جی کی بنیادی تعلیم کے نظریے میں بہت سی قدریں مشترک تھیں۔ ذاکر صاحب کی جامعہ میں اور گاندھی جی کی بنیادی تعلیم میں معلم کا کام یہ تھا کہ پہلے وہ ان روحانی اور تہذیبی قدروں کو خود اپنائے اور پھر اپنے شاگردوں کو اِن کے حصول میں مدد دے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ 'اس اصول کو مد نظر رکھ کر ذاکر صاحب نے جامعہ کو "کام" کا مدرسہ بنا دیا تھا۔ جہاں کتابی درس کم سے کم ہوتا تھا اور تعلیمی قدر و قیمت کی حامل عملی سرگرمیاں زیادہ سے زیادہ دکھائی دیتی تھیں۔ کام 'مفید و منظم اور ماہرانہ کام' ذاکر صاحب کے نزدیک تعلیم و تعلم کا آلہ ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ بلند مرتبہ شے ہے۔"

مدرسہ ابتدائی کا نصابِ تعلیم ذاکر صاحب کی نگرانی میں تیار ہوا تھا۔ بعض مضامین کا نصاب ذاکر صاحب نے خود تیار کیا۔ اس طرح جو نصاب تیار ہوا وہ جدید تعلیمی افکار اور نظریات کا بہترین نمونہ تھا۔ تعلیم کے میدان میں یہ ایک نیا قدم تھا۔ نصاب میں طریقہ تعلیم سے متعلق ہدایات بھی دی گئی تھیں کہ جہاں تک ممکن ہو سکے کسی مشغلے یا حرفے سے مربوط کر کے نصاب پورا کرانے کی کوشش کی جائے۔ اب ضرورت محسوس ہوئی مدرسہ ابتدائی کا کام چلانے کے لیے اچھے تربیت یافتہ اساتذہ کی۔ لہٰذا ذاکر صاحب نے جامعہ کے چند اساتذہ کو تربیت کے لیے موگا ٹریننگ اسکول بھیجا۔ یہاں کل پیٹرک

کے شاگرد ہارپر کی نگرانی میں کام ہو رہا تھا۔ موگا سے تربیت حاصل کرنے کے بعد ان استادوں نے جامعہ کے ابتدائی مدرسے میں آکر کام کیا، اس طرح مدرسے میں کام کرنے والوں کی ایک اچھی ٹیم بن گئی اور نت نئے تجربے کیے جانے لگے۔ یوں تو مدرسے میں تکلی کتائی اور باغبانی کا کام بھی ہوتا تھا لیکن ان کاموں میں بنیادی تعلیم کے حرفوں جیسی زیادہ مشابہت نہیں تھی۔ نصابِ تعلیم میں حرفے کو نہیں 'کام' کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اسی لیے ان کاموں کے علاوہ بھی بے شمار سرگرمیاں داخل نصاب ہو گئیں۔ یہ سرگرمیاں تعلیمی بھی تھیں، تفریحی بھی، تمدنی بھی اور دستکاری کی بھی۔ چند تفریحی مشاغل کا بھی انتظام تھا اور باقاعدہ لازمی میدانی کھیل بھی مدرسے کی زندگی کا اہم حصہ تھے۔

ابتدائی مدرسے میں پروجیکٹ میتھڈ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس طریقہ تعلیم کی کامیابی نے تقریباً ہر استاد کو اس طرف راغب کر دیا تھا۔ اسی لیے ہر جماعت میں ہر سال کوئی نہ کوئی وقتی پروجیکٹ چلانا ایک معمول سا بن گیا۔ استاد اور طلبہ نئے نئے منصوبوں کے پلان بناتے رہتے۔ مدرسے میں پروجیکٹ چلتے تو چاروں طرف زندگی اور چہل پہل نظر آتی۔ طلبہ اور اساتذہ دن رات لگ کر مقررہ وقت میں اپنے کام کو پورا کر لیتے۔ عموماً تعلیمی میلے کے موقع پر اس کی نمائش ہوتی۔ پروجیکٹ کی نمائش کے ساتھ ساتھ کوئی ڈراما بھی پیش کیا جاتا اور ٹی اسٹال لگایا جاتا۔ ایک ساتھ اتنے کام کرنا معمولی بات نہ تھی۔ مدرسے کا ہر استاد مہینے دو مہینے رات دن اس میں لگا رہتا تب جا کر ان کاموں کی تکمیل ہو پاتی، کام کے اختتام پر استاد اور طلبہ اپنے کام کو دیکھ کر خود ہی خوش ہو لیتے، اور سمجھتے کہ ان کا کام ہی ان کا انعام ہے۔ گاندھی پروجیکٹ، باغبانی پروجیکٹ، صحت و صفائی پروجیکٹ، کپڑا پروجیکٹ، آدمی پروجیکٹ، تہوار پروجیکٹ اور ہمالیہ کی مہمیں پروجیکٹ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ پروجیکٹ ہالینڈ، اٹلی اور جاپان میں بھی نمائش کے لیے بھیجے گئے۔

مدرسہ ابتدائی میں کچھ مستقل قسم کے پروجیکٹ بھی تھے۔ اکثر مستقل پروجیکٹ یوں تو آج بھی مدرسے میں برائے نام موجود ہیں لیکن ان میں اب وہ روح باقی نہیں رہی۔ پہلے ہر جماعت کے لیے ایک مستقل پروجیکٹ بھی مخصوص تھا۔ چڑیا خانہ، بچوں کا خوانچہ، بچوں کی دکان، بچوں کا بینک، مرغی خانہ، میوزیم، رصد گاہ، کتب خانہ مستقل پروجیکٹ تھے اور بڑےSystematic ڈھنگ سے کام کرتے تھے۔ بچے اپنے زائد جیب

خرچ کے پیسے بینک میں جمع کرادیا کرتے تھے۔ اس رقم سے اسٹیشنری کی دکان چلتی تھی۔ خوانچے کو رقم درکار ہوتی تھی تو وہ بھی اسی بینک سے لی جاتی تھی۔ اس کاروبار سے جو آمدنی ہوتی اس سے بینک کے کھاتہ داروں کو منافع بھی دیا جاتا تھا۔ بینک اور دکان کی ظاہری شکلیں بھی مثالی تھیں۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار ذاکر صاحب کو کچھ پیسوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ بچوں کے بینک سے قرض لینے جا پہنچے۔ وہاں جو طالب علم خزانچی تھا اس نے ذاکر صاحب کی آمدنی اور خرچ کا حساب لگایا اور کہا کہ آپ کو بینک سے قرض نہیں مل سکتا کیوں کہ آپ کی آمدنی اتنی نہیں ہے کہ آپ بینک کے قرض کی ادائیگی کر سکیں۔

مرغی خانہ بھی ایسا بنایا گیا تھا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ مرغیوں کی رہائش کے کمرے الگ، انڈے دینے کا مقام جدا، کھانا کھانے کے لیے جگہ علاحدہ، پانی پینے کا انتظام الگ اور چوزے بچوں کے کمرے میں الگ پلتے تھے۔ پھر انڈے بیچنے سے پہلے ان میں بڑی احتیاط کے ساتھ باریک سا سوراخ کر دیا جاتا تھا تاکہ انڈوں کو صرف کھانے کے کام میں ہی لایا جا سکے۔ لیکن بچوں کے لیے اس کو منافع بخش طریقے پر چلانا ذرا مشکل تھا اس لیے مجبوراً مرغی خانہ ختم کر دیا گیا۔

سلور جوبلی کے موقع پر تعلیمی نمائش میں قرب وجوار سے پکڑے ہوئے کچھ سانپ اور دوسرے کیڑے مکوڑے رکھے گئے تھے۔ ان چیزوں کو بعد میں ایک میوزیم کی شکل دے دی گئی تاکہ بچوں میں سائنٹفک رجحان پیدا کرنے میں مدد ملے۔ رفتہ رفتہ میوزیم میں طلبہ کی جمع کی ہوئی اور بازار سے خریدی ہوئی چیزوں کا خاصا اضافہ ہو گیا۔ ۱۹۴۶ء میں ایک اونچے سے ٹیلے پر جہاں آج کل ذاکر صاحب کا مزار ہے عتیق احمد صاحب کی نگرانی میں ایک رصد گاہ (Observatory) بنائی گئی جہاں سورج کا خاندان، چاند کی مختلف شکلیں، موسم کی تبدیلی، دھوپ گھڑی اور دوسرے ماڈل بنائے گئے۔ یہ کام مفید بھی تھا اور بے حد معلوماتی بھی لیکن ہر سال بارش میں تمام ماڈل خراب ہو جاتے۔ فنڈ کی نایابی کے سبب مستقل اور مضبوط رصد گاہ کا بنانا ممکن نہ تھا اس لیے چند برسوں بعد یہ شعبہ بھی ختم کر دیا گیا۔

مدرسے میں بچوں کا کتب خانہ شروع سے ہے، پہلے کسی ایک استاد کی نگرانی میں یہ شعبہ کام کر رہا تھا۔ بچوں کے لیے اتنی کتابیں شاید ہی کسی دوسرے کتب خانے میں

ہوں بچوں کی کتابوں کے علاوہ بچوں کے ادب اور بڑوں کے لیے بھی بے شمار کتابیں اس کتب خانے میں موجود ہیں۔ پہلے یہ کتب خانہ صرف وقفے کے دوران کھلتا تھا لیکن لائبریرین کے آنے کے بعد کتب خانہ مدرسے کے پورے اوقات میں کھلا رہنے لگا اور اس طرح طلبہ اور اساتذہ اس سے خاطر خواہ استفادہ کرنے لگے۔

تعلیمی مرکز قرول باغ میں کاغذ سازی، ابری بھتا اور باغبانی کا کام حرفے کے طور پر کرلیا جاتا تھا۔ ان حرفوں کے علاوہ مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر میں تکلی کا کام بھی ہونے لگا۔ ۱۹۵۳ء میں حرفے کا باقاعدہ نصاب بنایا گیا جس میں کاغذ، گتا اور لکڑی کا کام بھی شامل ہوگیا۔ باغبانی کا حرفہ ہر جماعت کے لیے لازمی قرار دیا گیا۔ چوں کہ باغبانی کا آدھا منافع بچوں کو ملتا تھا اس لیے وہ بڑے شوق اور انہماک سے باغبانی کا کام کرتے۔

۱۹۴۸ء سے قبل مدرسے میں اسکاوٹنگ کا انتظام تھا اور بڑی جماعتوں کے بچے کیمپ کے لیے جایا کرتے تھے۔ بعد میں کھلی ہوا کے مدرسے کے نام سے اس پروگرام کو ایک خاص شکل دی گئی۔ اس کا انعقاد ہر سال کیا جاتا تھا۔ کھلی ہوا کے مدرسے کو تعلیم کی نئی تکنیک میں ایک نیا قدم کہا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے دہلی کے اطراف میں کسی پُر فضا مقام کا انتخاب کرلیا جاتا۔ اس مقام کے چاروں طرف مختلف نوعیت کی اتنی چیزیں ہوتیں جو اس وقت کے تعلیمی نصاب کا بیشتر مواد فراہم کرسکتی تھیں۔ دس دن کے لیے چار پانچ سو بچوں کا خیموں میں زندگی گزارنا اور انھیں سجانا، سنوارنا، پروگرام کے مطابق تمام کام انجام دینا ہنسی مذاق نہ تھا۔ مدرسے کا یہ منصوبہ بہت بڑا اور امتیازی منصوبہ تھا۔ ان دس دنوں میں استاد اور طلبہ مل جل کر ساتھ رہتے اور ایک دوسرے کو سمجھنے سے کام کی جو فضا پیدا ہوتی اور استاد اور طلبہ جس محنت، شوق اور لگن سے تعلیمی اور ہم نصابی سرگرمیوں کو انجام دینے کا کام کرتے اس کی مثال ہمارے ملک میں مشکل سے ہی ملے گی۔ کھلی ہوا کے مدرسے میں قدم قدم پر محنت، لگن اور ایڈونچر کے جذبے کو پیدا کرنے کا موقع ملتا تھا۔ دس دن کے بعد جب بچے کیمپ سے واپس آتے تو وہ واقعی اپنے آپ کو زیادہ تازہ دم اور چاق و چوبند پاتے۔ ۱۹۴۸ء سے پہلے جوہر ٹرافی کے مقابلوں میں مضمون نویسی اور کہانی کے مقابلوں کے علاوہ کھیل کود اور کیمپنگ کے مقابلے شامل تھے۔ ۱۹۵۲ء میں نہرو ٹرافی کے نام سے مقابلے دوبارہ شروع ہوئے۔ دہلی کے اسکول اس میں حصہ لیتے تھے۔ بچوں کے کیمپ کا منظر ایسا ہوتا جیسے بچوں کا ایک شہر آباد ہو۔

مختلف انتظامی دشواریوں کے پیش نظر کیمپنگ اور کھیل کود کے مقابلے موقوف کر دیے گئے اور اسٹیج کے مقابلوں کی تعداد بڑھا دی گئی۔

مدرسے میں کھیل کود اور اسپورٹس کا بہترین انتظام تھا۔ ملک کے شاید ہی کسی ابتدائی مدرسے میں جمنیزیم اور اسپورٹس کا اتنا باقاعدہ انتظام ہو۔ سالانہ اسپورٹس کے بعد تقسیم انعامات کا جو جلسہ ہوتا وہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ اسپورٹس میں نہ صرف پوزیشن لانے والے طلبہ کو بلکہ ہر اس طالب علم کو جو اسپورٹس میں حصہ لیتا انعام دیا جاتا اور اس بات پر زور دیا جاتا کہ مقابلے کا مقصد کسی دوسرے سے سبقت لے جانا نہیں بلکہ خود اپنے آپ سے بازی مار لینا ہے۔

'ایک دن کے مدرسے' کا تو آج بھی چلن ہے۔ لیکن اب اس کی شکل وصورت قطعی بدل گئی ہے۔ پہلے طلبہ کو اس بات کا موقع فراہم کیا جاتا تھا کہ وہ اسکول کا سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیں اور اسے اس انداز سے چلائیں جیسے ان کے استاد اس کو چلاتے ہیں۔ اس طرح بچوں میں احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے میں بڑی مدد ملتی۔ نگران مدرسہ، استاد، چپراسی اور صفائی کرمچاری غرض مدرسے کا ہر کارکن مدرسے کا طالب علم ہوا کرتا۔ کلاس روم اور بورڈنگ ہاؤس سجے سجائے، صاف ستھرے ایسے لگتے جیسے کوئی تہوار ہو۔ مدرسے کو دیکھنے کے لیے سرپرستوں اور مہمانوں کا تانتا سا بندھ جاتا جہاں چھوٹے چھوٹے بچے اپنے ہی ساتھیوں کو پڑھاتے اور دوسرے کام کرتے۔ تمام اساتذہ، کرمچاری اور نگرانِ مدرسہ صبح ہی صبح دور کہیں پکنک پر چلے جاتے۔ اس دن مدرسے کا سارا نظم ونسق کلاس روم اور کلاس روم سے باہر عام دنوں سے زیادہ بہتر ہوتا۔

مدرسے میں بچوں کی مجلس تو پہلے سے تھی۔ ۱۹۵۲ء میں بچوں کی مجلس ختم کر کے بچوں کی حکومت قائم کی گئی۔ اس طرح مدرسے اور دارالاقامہ کی زندگی میں نظم وضبط قایم رکھنے کے لیے طلبہ اپنے استادوں کے ساتھ شریک ہوگئے۔ اس حکومت میں صدر بھی ہوتا، چیف جسٹس بھی اور ان کے علاوہ وزیروں کی کابینہ بھی۔ عام انتخاب صرف صدر کا ہوتا تھا۔ مدرسے کے مختلف کام حکومت کے وزرا سرانجام دیتے تھے۔

ہر سال ۱۳ر اپریل کو مدرسے میں 'قومی ہفتہ' منایا جاتا جو جلیان والا باغ کی یاد دلاتا تھا۔ اس دن بھی تمام کرمچاریوں کو چھٹی دے دی جاتی اور استاد وطلبہ مل کر ساری جامعہ کی صفائی میں جٹ جاتے۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے سپرد بیت الخلا

Toilets کی صفائی کا کام ہوتا اور وہ اپنی ٹیم کے ساتھ صبح سویرے جھاڑو پنجہ لے کر جامعہ کے لیٹرینس میں پہنچ جاتے۔ یہ Toilets ماڈرن انداز کے نہیں ہوتے تھے جن کی صفائی پانی بہادینے سے ہو جاتی ہے بلکہ پرانے طرز کے Dry latrines ہوتے تھے مطبخ کے باورچیوں کو بھی چھٹی دے دی جاتی اور کھانا پکانے کا کام استاد اور طلبہ مل کر کرتے۔ پھر شام کو اپنے خدمت گاروں کے ساتھ مل کر کھاتے۔

ذاکر صاحب اپنی، اپنے گھر کی، اپنے مدرسے اور گردونواح کی صفائی کا درس بھی دیتے تھے لیکن انداز ناصحانہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ نصیحت کم کرتے تھے۔ ان کی ذات ایک نمونہ تھی چھوٹوں کے لیے بھی اور بڑوں کے لیے بھی۔ وہ اپنی شیروانی کے بٹن اوپر تک بند رکھتے اور بچوں کی شیروانی کے بٹن بھی بند کرتے نظر آتے۔ ان کی شیروانی کی دونوں جیبیں کاغذ کے ٹکڑوں اور کچرے سے بھری ہوتیں۔ وہ جس راستے سے گزرتے تھے وہ راستہ صاف ہوتا چلا جاتا تھا۔

غرض ان سرگرمیوں کی بدولت جامعہ کا ابتدائی مدرسہ نمونے کا کام کا مدرسہ (Activity School) بن گیا اور انھیں سرگرمیوں کے سبب مدرسہ ابتدائی دنیا کے بہترین مدرسوں میں گردانا گیا اور ملک میں جامعہ کی شہرت کا باعث بنا۔

۱۹۴۸ء میں ذاکر صاحب علی گڑھ چلے گئے۔ مدرسے کو یہ پہلا دھکا لگا۔ اس کے مجیب صاحب شیخ الجامعہ رہے۔ ان کے زمانے میں بھی جامعہ نے بہت ترقی کی لیکن مدرسے کی طرف توجہ کم ہوتی چلی گئی۔ اعلا تعلیم کے میدان میں ترقیاں ہوئیں۔ نئی نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ نئے نئے کورسز شروع ہوئے اور جامعہ کو ڈیمڈیونی ورسٹی کا درجہ عطا ہوا اور پھر ۱۹۷۳ء میں پروفیسر محمد مجیب کے ریٹائرمنٹ کے بعد تابڑتوڑ کئی وائس چانسلر آئے، شیخ الجامعہ کوئی نہیں آیا۔

۱۹۸۸ء میں جامعہ بھی مرکزی یونی ورسٹی بن گئی۔ غرض اب جامعہ نے اعلا تعلیم کی طرف قدم تو بڑھالیا مگر مدرسوں کی طرف غفلت بڑھتی گئی جس کے نتیجے میں جامعہ کی امتیازی شان بھی معدوم ہوتی جارہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جامعہ کے اس امتیاز کو باقی رکھا جائے اور ان کی طرف اتنی ہی توجہ دی جائے جتنی ان کو پہلے حاصل تھی تاکہ ہمارے اعلا تعلیمی اداروں میں اچھے اور ہونہار طالب علم پہنچ سکیں اور جامعہ پھر سے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرسکے۔

حیدر قریشی
AUF DER ROOS 7
65795 HATTERS HEIMT
GERMANY

ماہیے کے وزن اور مزاج کا مسئلہ

حاصل بحث

گزشتہ پانچ برس کے عرصہ میں ماہیے کی بحث کے نتیجہ میں ماہیے کے خدوخال نمایاں ہوئے ہیں اور اس کے مزاج کے مسئلہ کو سمجھنے کی مخلصانہ کوششیں ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر افتخار احمد، ناصر عباس نیر، پروفیسر عرش صدیقی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، سعید شباب، ریاض احمد، خاور اعجاز، ایم اے تنویر، نثار ترابی اور غزالہ طلعت کے ذریعے ماہیے کی بحث نے جو سفر طے کیا ہے، اس سے صورت حال کافی نکھر کر سامنے آگئی ہے۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی، ڈاکٹر انور سدید اور حمایت علی شاعر کے مختصر مختصر تاثرات نے بھی درست وزن کے ماہیے کو تقویت پہنچائی ہے۔ ماہیے کے وزن کے بارے میں اب پورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ تین یکساں وزن کے مصرعوں والے "ماہیے" حقیقتاً ماہیے نہیں ہیں۔ ماہیے کی پنجابی اور عوامی دھن سے یہ وزن اردو ماہیے کے لیے بالکل واضح ہو چکا ہے۔

فعلن فعلن فعلن
فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فعلن

اس کی رو سے ماہیے کے دوسرے مصرعے میں ایک "سبب" یعنی دو حروف کا کم ہونا ضروری ہے۔ اس وزن میں ماہیا پنجابی دھن کے مطابق پوری طرح رواں دواں ہو جاتا ہے۔ یہ دوسرا وزن بھی ماہیے کے لیے قابلِ قبول ہے:

مفعول مفاعیلن
فعل مفاعیلن
مفعول مفاعیلن

یہ وزن اس لیے روا ہے کیونکہ اپنی روانی میں اگلے حروف میں ضم ہوتا ہوا، یہ وزن بھی اول الذکر وزن میں ڈھل جاتا ہے۔ یعنی:

مفعولفاعیلن
فعلم فاعی لن
مفعولفاعیلن

اس کے باوجود واضح الفاظ میں ہمارا موقف یہی ہے کہ جو اردو ماہیا--- پنجابی ماہیے کی مخصوص دھن پر سہولت اور روانی کے ساتھ گایا رگنگنایا جاسکتا ہے وہ ماہیا ہے اور جسے ماہیے کی دھن پر گاتے رگنگناتے ہوئے جھٹکا لگتا ہے وہ ماہیا نہیں کوئی اور چیز ہے۔ ماہیے کی مخصوص دھن کے سلسلے میں دو ماہیا گیتوں کو بنیادی حوالہ بنایا جاسکتا ہے۔

پنجابی میں مسرت نذیر کے گائے ہوئے غیر فلمی ماہیا گیت:

چٹا ککڑ بنیرے تے
کاسنی دوپٹے والیے
منڈا صدقے تیرے تے

اور اردو میں قمر جلال آبادی کے لکھے، فلم "پھاگن" میں محمد رفیع اور آشا بھونسلے کے گائے ہوئے ماہیا گیت:

تو روٹھ کے مت جانا
مجھ سے کیا شکوہ
دیوانہ ہے دیوانہ

ماہیے کی اصل دھن وہ بنیادی نکتہ ہے جس سے اس کے وزن کو بخوبی اور آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ماہیے کے وزن اور اس کے دوسرے مصرعے میں فرق کی نزاکت پر اردو میں یہ اتنا اہم نوعیت کا کام ہوا ہے جس سے پنجابی ادب کے دانشور بھی بہتر طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔

جہاں تک ماہیے کے مزاج کے مسئلے کا تعلق ہے اس کے بارے میں وزن کی طرح کوئی حتمی اور دوٹوک بات کرنا ممکن نہیں ہے۔ وزن کو ماہیے کا جسم سمجھ لیں تو مزاج اس کی روح ہے۔ جسم کی حد متعین ہوتی ہے جبکہ روح کا مختلف حوالوں سے صرف احساس کیا جاسکتا ہے۔ اس مثال سے قطع نظر مزاج کا معاملہ زیادہ تر قاری یا سامع کے ذوق پر منحصر ہے۔ پنجابی میں کئی ایسے ماہیے ملتے ہیں جنھیں مزاج کی کسی خاص حد میں لانا مشکل ہے۔

باگے وچ رہیاں نیں
اللہ میاں پاس کرے
اساں فیساں بھریاں نیں

حمدیہ، نعتیہ ماہیے، ظلم اور جبر کے خلاف احتجاج والے پنجابی ماہیے بھی ماہیے کے اس عمومی مزاج سے بالکل مختلف ہیں جو عام طور پر پنجابی ماہیے کی شناخت ہے۔ جس طرح ماہیے کے مزاج کا زیادہ تر انحصار قاری یا سامع کے ذوق اور مزاج پر ہے ویسے ہی ماہیا نگار کا ذاتی ذوق اور مزاج بھی اس کے ماہیوں میں فطری طور پر آئے گا۔ کوئی نظم نگار شاعر جب ماہیے کہے گا تو ان میں نظم کے اثرات آئیں گے۔ کوئی غزل گو شاعر ماہیے گا تو اس کے ماہیے میں

غزل کے اثرات کچھ نہ کچھ تو ضرور آئیں گے۔ اسی طرح اردو کے گیت نگار اگر ماہیے کہیں گے تو گیت کی ہندی روایت بھی اپنا اثر دکھائے گی۔ نظم، غزل اور گیت کے اثرات اردو ماہیے کے تشخص کو ختم نہیں کریں گے بلکہ اسے تازہ خون فراہم کریں گے۔ ان اثرات سے ماہیے کا مزاج مزید بہتر ہو گا۔

اس میں شک نہیں کہ پنجاب کی زمین سے تعلق رکھنے والے شعرا جب ماہیے کہیں گے تو ان کے ہاں ماہیے کی مٹھاس اور خوشبو از خود آتی جائے گی بہ نسبت ان شعرا کے جو پنجاب کی زمین سے دور ہیں لیکن گزشتہ پانچ برسوں میں یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ پنجاب کی زمین سے جڑے ہوئے بعض شاعروں نے بڑے ہی بے رس اور پھیکے ماہیے بھی کہے ہیں اور دوسری طرف بہار، کرناٹک، مہاراشٹر اور راجستھان جیسے دور دراز علاقوں کے شعرا نے ماہیے کو محبت کی نظر سے دیکھا، اس کے وزن اور مزاج کو سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کی اور ماہیے سے اپنی گہری وابستگی کے باعث بعض ایسے خوبصورت ماہیے کہے جو پنجابی ماہیے کی روایت سے جڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس تخلیقی عمل کے دوران اردو اور پنجابی کے لسانی سسٹم کا وہ حصہ ان کا لاشعوری طور پر ممد ہوا ہو جو دونوں زبانوں میں مشترکہ طور پر موجود ہے۔ لہٰذا یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ چونکہ فلاں شاعر پنجاب سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کے تمام ماہیے مزاجاً اچھے ہیں اور فلاں شاعر پنجاب سے تعلق نہیں رکھتا اس لیے وہ ماہیے کہہ ہی نہیں سکتا۔ یہ ماہیے سے اپنی اپنی وابستگی پر منحصر ہے قصیدے سے نکلی ہوئی غزل عربی اور فارسی سے ہوتی ہوئی اردو شاعری کی جان بن سکتی ہے تو پنجابی اور اردو میں لسانی قربت کے باعث پنجابی ماہیا بھی کسی تخصیص کے بغیر اردو شاعروں میں مقبول ہو کر اردو شاعری میں اپنا مقام بنا سکتا ہے۔ پھر جس طرح غزل عورتوں کی باتیں کرنے اور عورتوں سے باتیں کرنے کا بنیادی مزاج رکھنے کے باوجود اپنے ارتقا میں کتنے ہی عالمی، کائناتی اور مابعد الطبیعیاتی موضوعات کا خوبصورتی سے ذکر کر چکی ہے اور یوں اپنے دامن کو وسیع تر کر چکی ہے، ویسے ہی یہ ممکن ہے کہ ماہیا محبت اور دھرتی سے منسلک رہتے ہوئے ارتقا کی منزلیں سر کرے اور لگے بندھے موضوعات سے آگے کے موضوعات بھی اس کے دامن میں سماتے جائیں۔ ماہیے کے مزاج کے نام پر اس کے موضوعات کو محدود کر کے اسے تکرار کا شکار بنانے سے بہتر ہے کہ اس کے موضوعات میں وسعت پیدا کی جائے۔ موضوعات میں وسعت کے باعث اگر بعض نئے تجربے کچے رہ جائیں یا نامانوس سے لگیں تو انھیں اس لیے برداشت کر لینا چاہیے کہ آگے چل کر ان ادھورے یا کچے تجربات سے نئے اور کامیاب تجربات کی راہیں ضرور نکلیں گی۔ اپنے تمام محبت کرنے والے اور خوبصورت ماہیا نگاروں کے ساتھ اردو ماہیے کو ایک لمبا سفر کرنا ہے۔ اور ابھی سفر کی ابتدا ہے۔

منظور الامین
حیدر آباد

اردو ہے جس کا نام

(جاپانی پروفیسر اسادا کے تاثرات)

"اردو عوامی زبان ہے اور عوام کی زبان کبھی نہیں مرنی چاہیے' خواہ اس کے قتل کے لاکھ سامان ہی کیوں نہ کیے جائیں' کیونکہ عوام ہمیشہ باقی رہتے ہیں' نسلیں بدل جاتی ہیں۔ لہٰذا عوامی زبان بھی ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اردو شاہی سرپرستی میں دہلی لکھنؤ' اور حیدر آباد میں پروان چڑھی جب شاہی کا خاتمہ ہوا تو جمہوری حکومت نے اس کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اتنا ہی نہیں اس کو بے گھر اور بے خانماں کرنے کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا تھا کیا۔ لیکن سرکاری سرپرستی سے یہ زبان محروم ہونے پر فلمی صنعت نے اس کی ذمے داری سنبھال لی اور اس کے ذریعے اردو کو اس سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی جتنی کہ شاید سرکاری سرپرستی سے بھی نہ ہو سکتی۔ اس کو بے گھر کرنے کی کوشش ہوئی تو یہ غیر ممالک میں اپنے قدم جمانے لگی۔ امریکہ اور خلیجی ممالک میں مشاعروں کی شمعیں روشن ہو گئیں"

ان تاثرات کا اظہار ٹوکیو یونیورسٹی جاپان کے ارو زبان و ادب کے پروفیسر اسادا ایواتا نے راقم الحروف سے ایک ملاقات میں کیا جب وہ حال میں حیدر آباد آئے تھے۔

پروفیسر اسادا بڑی خوبصورت اردو بولتے ہیں۔ گو لہجے پر اہل زبان سی قدرت نہیں ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ہائی اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ان دنوں ان کے والد صاحب ایک مشہور جاپانی الکٹرانک کمپنی توشی با میں ملازمت کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے پاس فنی تربیت حاصل کرنے کے لیے ہندستان' پاکستان' سری لنکا اور بنگلہ دیش سے لوگ آیا کرتے تھے اس وجہ سے ان کے والد کو برصغیر کے ممالک ان کی تہذیب اور زبان سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بیٹے کو مشورہ دیا کہ

اردو سیکھیں۔ ان کے والد کا خیال تھا کہ آنے والا زمانہ ایشیا کا زمانہ ہوگا مغربی ممالک کا نہیں۔ اسادا صاحب کے ساتھ پڑھنے والے طلبہ عموماً یورپ اور امریکہ کا رخ کیا کرتے تھے۔ اب وہ ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ ان کی یونیورسٹی میں اردو اور ہندی کے دو علاحدہ علاحدہ شعبے ہیں۔ پروفیسر اسادا نے ہندی پر اردو کو اس لیے ترجیح دی کہ اردو داں کے لیے دو اور زبانیں فارسی اور عربی سیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ جب کہ ہندی سیکھی تو بس ہندی سیکھی۔ اردو سیکھنے کے بعد برصغیر میں اسلامی ثقافت کے بارے میں بھی بیش بہا معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں جس میں مغلوں کا سنہرا دور حکومت بھی شامل ہے۔ مرزا غالب اپنے فارسی کلام کو اردو کلام پر ترجیح دیتے تھے جس کا ایک پس منظر بھی ہے۔ مگر بہر حال اس پس منظر سے ناواقف کوئی شخص اگر غالب کا یہ شعر پڑھ لے ۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

(میرا فارسی کلام پڑھو کہ تم کو رنگارنگ مرقع نظر آئیں۔ اردو کلام سے احتراز کرو کہ میرا یہ کلام بے رنگ ہے)

تو شاید اردو سیکھنے پر فارسی سیکھنے کو ترجیح دے۔ شاید پروفیسر اسادا بھی یہی کرتے۔ کہ اردو کا اتنا عظیم شاعر اپنے فارسی کلام کو بہتر قرار دے رہا ہے۔ ایک دور وہ بھی تھا جب "جاپانی" کا لفظ 'سستی' 'ناقص اور ناپائیدار شے کا ہم معنی تھا۔ آج صنعتی میدان میں جاپان کی ترقی نے اس لفظ کے معنی بالکل برعکس کر دیے ہیں۔ نصف صدی کے مختصر سے عرصے میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ اس کے سلسلے میں پروفیسر اسادا نے بتایا کہ یہ ان کی نسل کا کارنامہ نہیں بلکہ ان کے والدین کے نسل کا کارنامہ ہے جس نے اپنی انتھک محنت سے اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا جب کہ ان کی قوم جنگ عظیم کی تباہی سے جس طرح متاثر ہوئی تھی کوئی اور قوم ہوئی ہوتی تو شاید صفحۂ ہستی سے مٹ ہی جاتی۔ جن دنوں جاپان میں اولمپک کھیل منعقد ہوئے ان دنوں اس کے لیے شاہراہیں تعمیر ہوئیں۔ بلیٹ ٹرین Bullet train ان ہی اولمپک کی دین ہے۔ مختصر یہ کہ اولمپک کھیلوں سے پہلے اور ان کے بعد کے جاپان میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا۔

یہ بہر حال پروفیسر اسادا کی انکساری اور سعادت مندی ہے کہ وہ جاپان کی ساری ترقی کو اپنے بزرگوں کی دین سمجھتے ہیں۔ اپنی اور اپنے ہم عصروں کی کوششوں سے صرف

نظر کر لیتے ہیں جب کہ وشا کھاپٹنم کی بندرگاہ میں کو ہ پیکر جاپانی بحری جہاز آتے رہتے ہیں۔ جن میں ٹیلیسکوپک پائپ کے ذریعے مدھیہ پردیش کے مقام بیلاڈیلا سے لوہے کی خام دھات (Iron Ore) راست لادی جاتی ہے۔ اس خام دھات کا جاپان میں پہاڑ کھڑا ہو گیا ہے جن سے مختلف مصنوعات تیار ہوتی اور دنیا بھر کے سر برلو کی جاتی ہیں۔ یہ کارنامہ یقیناً جاپان کی موجودہ نسل ہی کا ہے' ان کے بزرگوں کا نہیں۔

جاپانی صنف شعر کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر اساوا نے بتایا کہ ایک مقبول عام شعری صنف "ہائیکو" ہے۔ اس صنف سخن میں منظر نگاری اور موسم سے متعلق کم از کم ایک لفظ کا ہونا لازمی ہے۔ اس کی پہلی اور تیسری سطر میں پانچ' پانچ متحرک حروف ہوتے ہیں جب کہ دوسری سطر میں سات متحرک حروف ہوتے ہیں۔ اس طرح اس تین سطری مصرعوں کی نظم میں بارہ متحرک حروف ہوتے ہیں۔ جاپانی زبان کے مزاج کے مطابق "ہائیکو" نظم میں یہ پابندی اسی طرح کی ہے جیسے اردو غزل میں ردیف اور قافیے کی پابندی ہوتی ہے۔ ہر ساکن حرف کے ساتھ ایک متحرک حرف آتا ہے۔ "ہائیکو" کے بارے میں اس مختصر تفصیل کے بعد پروفیسر اساوا نے ایک "ہائیکو" نظم سنائی

ہو۔رو۔ای۔کے۔یا

کا۔وا۔زو۔بی۔تو۔کو۔سو

(ایک کہنہ تالاب ہے۔ اور ایک مینڈک اس میں چھلانگ لگاتا ہے۔ پانی کی آواز آتی ہے)

اس کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر اساوا نے بتایا کہ لفظ تو بس یہی ہیں لیکن بین السطور میں ایک منظر نظر آتا ہے۔ ایک بہت ہی پرانا تالاب ہے جس کے آس پاس سناٹے کا عالم ہے۔ اس میں ایک مینڈک چھلانگ لگا رہا ہے جس سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے اور سناٹا مجروح ہو جاتا ہے۔ پروفیسر اساوا نے کہا کہ اس "ہائیکو" میں منظر نگاری ہے۔ تالاب کی قدامت جاپانی روایات کا اظہار ہے اور مینڈک' موسم سے متعلق لفظ ہے کیوں کہ مینڈک کا تعلق برسات سے ہے۔ پروفیسر اساوا نے مزید بتایا کہ جاپانی شاعری میں جذباتی باتیں نہیں ہوتیں جیسی کہ اردو شاعری میں ہوتی ہیں۔ مثلاً غالب کا یہ شعر

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں

کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

اس شعر میں جذبات کا اظہار ہو رہا ہے۔ غالب راست سامع سے نہیں بلکہ اپنے معشوق سے مخاطب ہے۔ یہی اردو اور جاپانی شاعری کا فرق ہے۔

راقم السطور نے اس "ہائیکو" کی تشریح اس طرح کی کہ اس نظم میں کہنہ تالاب جاپان کی تشبیہ ہے' جاپان جس کی روایات قدیم ہیں۔ قدیم تہذیب اور قدیم تمدن ہے اور یہ تمام مثبت چیزیں ہیں۔ ان تمام مثبت چیزوں پر سناٹا طاری ہے۔ یہ سناٹا جنگ عظیم کی تباہ کاری کا ہے۔ جاپان شکست خوردہ ہے۔ جاپان تباہ ہو چکا ہے۔ اس کو ایک گوشے میں ڈھکیل دیا گیا ہے۔ یہ سناٹا ایک احساس شکست خوردگی ہے جو ذہنوں میں اتر گیا ہے۔ مینڈک جاپان کی نئی نسل کا نمایندہ ہے جو چھلانگ لگا رہا ہے۔ یہ چھلانگ دراصل جاپان کی صنعتی ترقی کا استعارہ ہے اسے انگریزی میں Leap frogging کہتے ہیں۔

پروفیسر اسادا "ہائیکو" کی اس نئی تشریح سے متاثر ہوئے اور کہا کہ آج کے پس منظر میں بھی اس نظم کی موزوں ترین تشریح ہو سکتی ہے۔ حیدر آباد کے بارے میں اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ وہ پہلی بار اس وقت حیدر آباد آئے تھے جب وہ بی۔ اے (فائنل) کے طالب علم تھے۔ ان دنوں انھوں نے حیدر آباد کی کافی سیر کی تھی اور تمام آثار قدیمہ دیکھے تھے۔ دوسری بار 1977 میں ہنی مون پر آئے تھے اور اپنی شریک حیات کے ساتھ سارے شہر کی سیر تفریح کی تھی۔ حیدر آباد میں کسی سے شناسائی نہیں تھی چنانچہ کوئی ان کی سیر میں حارج نہیں ہوا۔ اب وہ تیسری بار ایک پراجکٹ کے سلسلے میں حیدر آباد آئے ہوئے تھے چنانچہ اتنے معروف تھے کہ اردو کتابوں کی تفصیلات جمع کرنے 'کتب خانے کو جانے اور لوگوں سے گفتگو سے انھیں فرصت نہیں ہو رہی تھی کہ پھر ایک بار شہر گھوم پھر لیں۔ حیدر آباد کے بارے میں لکھی گئی تمام کتابیں ان کے پاس موجود ہیں۔ پروفیسر اسادا کی یونیورسٹی کے ایک وزیٹنگ پروفیسر ہیں حیدر آبادی ہیں لیکن بچپن میں پاکستان منتقل ہو گئے تھے۔ پروفیسر اسادا کو حیدر آباد کے بارے میں اتنی تفصیل بتا چکے ہیں کہ ان کو اب حیدر آباد کے بارے میں کافی معلومات ہیں۔ پروفیسر اسادا اردو ہی پڑھتے ہیں اور پڑھاتے بھی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندستان میں اردو کے تین مراکز دہلی' لکھنؤ اور حیدر آباد ہیں۔ حیدر آباد غیر ملکی اردو داں افراد کے لیے انتہائی اہم جگہ ہے کیونکہ حیدر آباد ابھی تک اپنی تہذیبی اور ثقافتی روایات کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ جب کہ دہلی اور لکھنؤ میں سب کچھ بدل چکا ہے اور پرانی تہذیبی ثقافتی روایات کی جھلک بھی

اب وہاں نظر نہیں آتی۔ یہ اب صرف وہاں کے آثار قدیمہ کی شکل ہی میں محفوظ ہے۔ حیدر آباد آنے سے پہلے لندن میں پروفیسر اساوا کے ایک ملاقاتی نے ان سے حیدر آباد کی حلیم' ہریس' نہاری' پایے اور خوبانی کے میٹھے کھانے کی تاکید کی۔ پروفیسر اساوا نے کہا کہ وہ حلیم' ہریس اور نہاری تو کھا چکے ہیں اور اب جانے سے پہلے خوبانی کا میٹھا بھی ضرور کھائیں گے۔ جاپان میں اردو سے دلچسپی کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ عموماً جاپانی نوجوانوں کو برصغیر سے دلچسپی نہیں ہے۔ ان کا مرکز نگاہ مغربی ممالک ہیں۔ جاپانی نوجوان دوران تعلیم جز وقتی کام کر کے کچھ دولت کما لیتے ہیں اور کسی مغربی ملک کا رخ کرتے ہیں۔ ان کی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے طلبہ برصغیر آتے ہیں۔ آج کل شعبۂ اردو کے طلبہ اور طالبات کی تعداد ترقی پذیر ہے۔ ان کی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں چار جماعتیں ہیں جن میں اسی طلبہ اور طالبات زیر تعلیم ہیں۔ جاپان میں اردو پڑھنے والے طلبہ کے لیے موزوں ملازمتیں نہیں ہیں۔ ایسے نوجوان دوسرے نوجوانوں کی طرح دوسرے شعبہ ہائے حیات اور کمپنیوں میں ملازمت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو پڑھنے کا رجحان جاپانی نوجوانوں میں کم ہے۔ پروفیسر اساوا کا احساس تھا کہ جاپانی نوجوانوں کو اردو کا ماہر بننا چاہیے اور برصغیر کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ان نوجوانوں کو مناسب ملازمتیں فراہم کی جانی چاہییں۔

اردو کے مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر اساوا نے بتایا کہ ہندستان میں اردو اقلیتوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ انھوں نے انیتا دیسائی کے ناول کا ذکر کیا کہ اس ناول میں نور صاحب کے کلیات مرتب کرنے والا ایک ہندو ٹیچر ہے جو طلبہ کو ہندی پڑھاتا ہے۔ ان کو احساس تھا کہ ہندستان میں اردو مر رہی ہے اور ہندی کا غلبہ ہو رہا ہے۔ لیکن یہ بات خوش آیند ہے کہ اردو کے قدردان غیر مسلموں میں بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ لندن کے سنرائز ریڈیو کی نشریات اردو ہی میں ہوتی ہیں۔ جب کہ ان کو ہندی کا نام دیا گیا ہے لیکن یہ ہندی آکاش وانی اور دوردرشن کی طرح کی سنسکرت آمیز ہندی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے پروفیسر اساوا کا خیال ہے کہ اردو مرے گی نہیں بلکہ زندہ رہے گی۔

احمد وصی
پمپ ہاؤس، اندھیری، ممبئی۔ ۹۳

غزل

(یہ غزل غالب کے دوسو سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر 'نہرو سینٹر ممبئی میں منعقد طرحی مشاعرے میں سنائی گئی)

آج کل کی شہر تیں ندیوں کا طوفاں ہو گئیں
جیسے ہی پانی گھٹا' ندیاں بھی ویراں ہو گئیں

جان لیوا ہو رہی تھیں حد سے بڑھتی قربتیں
عمر بھر کی دوریاں' جینے کا ساماں ہو گئیں

اے خدا تُو نے مجھے پیدا کیا اس عہد میں
جس میں تیری نعمتیں' بندوں کا احساں ہو گئیں

اب مشینیں جو کہیں وہ ہے ہمارے دل کا حال
ہم مشینیں ہو گئے ہیں اور یہ انساں ہو گئیں

صبح کے اخبار کی اب سرخیاں ہی یاد ہیں
داستانیں سب پرانی ہو کے، عنواں ہو گئیں

مجھ کو اس کی انگلیوں کا لمس زندہ کر گیا
"سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں"

ہر طرف احمد وصی کے شعر لکھے ہیں یہاں
اس لیے بربادیاں اس گھر کی مہماں ہو گئیں

شاکر رام پوری
۱۰/۶، پارک سائٹ وکرولی
ممبئی۔ ۴۰۰۰۷۹

غزل

مشرق نژاد حسن کہاں بانک پن میں آج
لذت کہاں وہ حلقہ دار ورسن میں آج

عاشق کو حکم ہے کہ جلے پیرہن میں آج
فانوس و شمع کچھ نہ رہے انجمن میں آج

وہ اعتبار جذب محبت نہیں رہا
ہے روح بیقرار بدن میں کفن کے آج

بخیہ کاریٔ فریب سیاست نہ پوچھیے
محسن دکھائی دیتے ہیں قاتل وطن میں آج

کتنے گڑھے ہیں تکوں کی چادر میں منہ چھپائے
آہو کلیلیں بھول گئے ہیں فیستن میں آج

صیاد لے کے بیٹھے ہیں ترکش نئے نئے
بلبل نہ آشیاں نہ ہو نغمہ چمن میں آج

شاکر عجیب وقت کی ہے بے بسی کا حال
کٹ کٹ کے رہ گئی ہیں زبانیں دہن میں آج

رفیق جمال
۱۵۳ مومن پورہ، مالیگاؤں

غزل

کل یار مرے ساتھ عجب بات ہو گئی
سورج تھا سر پہ اور سیاہ رات ہو گئی

راتوں کی نیند دن کا سکوں چھن گیا مرا
اس مہ جبیں سے جب سے ملاقات ہو گئی

افسوس کیوں ہو ماضی کے بیتے خیال پر
ہونی نہ تھی جو بات وہی بات ہو گئی

غصے کو پی کے صاحبِ دوراں بنا ہوا
جیتا بھی وہ کہ جس کی یہاں مات ہو گئی

منصف نے خون کر دیا قاتل کا دیکھئے
کتنی عجیب سرخئ حالات ہو گئی

وہ بھی جمال شہر میں تنہا ہے ان دنوں
کچھ ایسی دوستوں کی عنایات ہو گئی

رباب فاطمہ رباب
۲۵ر ۳ گلشن عالم گول گھر، بھوپال

غزل

بہت تھا ناز جن کو آشتی کے عہد و پیماں پر
کفِ افسوس ملتے ہیں نفاق نسل انساں پر

نہ گل کھلتے ہیں شاخوں پر، نہ خوشبو ہے فضاؤں میں
نہ جانے کس کا سایہ پڑ گیا فصلِ بہا راں پر

صعیب وقت سے ممکن نہیں جن کا مداوا بھی
کچھ ایسے زخم بھی دیکھے گئے ہیں جسم انسان پر

انھیں مل جاتی ہے منزل بھی اپنی رہِ منزل بھی
یقیں ہوتا ہے جن لوگوں کو اپنی سعیٔ امکاں پر

نظر میں پھر گئی پرچھائیاں سی رقص کرتی ہیں
سرِ شام اک دیا سا جل اٹھا پھر طاق نسیاں پر

ربابؔ امید بخشش کی بر آئے گی بروزِ حشر
خدا جو مہربان ہو جائے تیری فردِ عصیاں پر

پرکاش تیواری
بی۔ ۴ر روز لپار ٹمنٹس
روہنی، نئی دہلی۔ ۸۵

غزل

شہر کی تلخیوں سے بہت دور تھی
زندگی گانو میں کتنی مسرور تھی

کھا گئی زندگانی کا امن و سکوں
دولتِ دہر ہستی کا ناسور تھی

دھیان تھا باپ کی بے زری کا اسے
جو دُلھن جل گئی کتنی معذور تھی

میرے ہونٹوں پہ آئی نہ تھی جو ابھی
ساری نگری میں وہ بات مشہور تھی

خود ہمیں ظلمتوں میں بھٹکتے پھرے
ورنہ منزل کی ہر راہ پُر نور تھی

دیکھتے دیکھتے گر پڑی پانو میں
خود پرستی میں گردن جو مغرور تھی

آبلے ریگ زاروں کے لائے ہمیں
ورنہ دل کی یہ منزل بہت دور تھی

زخم دل کے دکھاتے کسے دہر میں
آنکھ ہر اک کی پرکاش بے نور تھی

عبدالرحیم نشتر
ساوتری ودیا مندر، آمبیت
ضلع، رائے گڑھ، مہاراشٹر

غزل

بحرِ خاموش میں طوفان اٹھا دے کوئی
نیند لیتی ہوئی موجوں کو جگا دے کوئی

جو سفینہ کسی طوفاں سے نہیں لڑ سکتا
اس سفینے کو کنارے ہی لگا دے کوئی

روز آنکھوں میں اترتی ہے ملاقات کی شام
روز بچھڑے ہوئے ساتھی کو بھلا دے کوئی

مہر و مہتاب میری چھت پہ اتر آئے ہیں
مجھ کو اس خواب کی تعبیر بتا دے کوئی

موم کی طرح پگھلتے ہوئے جینا کیا ہے
اپنے جیسا ہمیں پتھر ہی بنا دے کوئی

درد تو دولت نایاب ہے نشتر صاحب!
ورنہ کیوں درد کو سینے میں جگہ دے کوئی

یوسف ناظم

تشریحی ادب سے تشہیری ادب کی طرف

تشریحی ادب اب کم لکھا جا رہا ہے ورنہ ایک زمانہ تھا جب تشریحی ادب لکھ کر لوگ خوش ہوا کرتے تھے۔ اس میں محنت زیادہ کرنی پڑتی تھی لیکن یہ ادب ضرورت مند لوگوں میں بے حد مقبول تھا۔ تشریحی ادب کی تشریح کی تو خیر زیادہ ضرورت نہیں پڑتی تھی لیکن شاعری کا مسئلہ واقعی اہم تھا۔ شاعر کا کلام بڑا جان لیوا ہوا کرتا تھا۔ (اب جو کلام پیدا ہو رہا ہے تو وہ بھی جان لیوا لیکن اس میں سہولت یہ ہے کہ اس کی تشریح درکار نہیں ہوتی)۔ کسی بھی شاعر کی تشریح کرنے کے لیے اس کا کلام بار بار پڑھنا پڑتا تھا لیکن کلام میں دقتیں اتنی ہوتی تھیں کہ تین تین چار چار مرتبہ اسے غور سے پڑھنے کے بعد بھی شاعر کا مدعا سمجھ میں نہیں آتا تھا حالانکہ کلام کا مطالعہ کرنے والا شخص نہ صرف تعلیم یافتہ اور اہل ذوق ہوتا تھا بلکہ اس میں اتنی صلاحیت ہوتی تھی کہ وہ چاہتا تو خود بھی شعر کہہ سکتا تھا۔ اس زمانے میں جب ہمارے یہاں سچ مچ کی شاعری ہوتی تھی تشریحی ادب میں شغف رکھنے والے اہل ذوق خاصے پریشان رہا کرتے تھے لیکن ہمت نہیں ہارتے تھے۔ کمال کے لوگ تھے ایک ہی شعر کے ۵ مطلب تو پیدا کر ہی لیتے تھے اور اس ہنر مندی کے ساتھ کہ اصل مطلب جو شاعر کے ذہن یا بطن میں ہوتا اسے بالکل ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ (ہزاروں اشعار کے مطلب اب تک مدفون ہیں)۔ عام طور یہ تشریحی ادب ان شاعروں کے کلام کے بارے میں ہوتا تھا جن کی وفات واقع ہو چکی ہوتی تھی بلکہ یہ تک کہا جاتا ہے بعض صورتوں میں اہل تشریح اپنے ہم عمر اور ہم عصر شاعر کے کلام کا بھی پورا پورا جائزہ لیتے تھے۔ لغات کشوری اور لغات انوری کی مدد سے شاعر کے مستعملہ الفاظ کے لغوی معنی بھی تلاش کر لیتے تھے اور بعد میں غور و خوض کے ذریعے شعر کو بامعنی بنا کر اچھی اور صحیح اردو میں منتقل بھی کر دیتے تھے۔ بقید حیات شاعر کے ساٹھ ستر فی صد اشعار کا مطلب تجویز کرنا ان کے بس میں نہ ہوتا اور وہ اس کا کھلے دل سے اعتراف بھی کر لیتے تھے لیکن احتیاط یہ کرتے تھے کہ شاعر جب تک قید حیات و بند غم سے نجات نہیں پا جاتا تھا یہ اہل تشریح اپنی تحریر کو سورج کی روشنی نہیں دکھاتے تھے۔ انتظار کرتے تھے۔ کہتے تھے (لیکن دل میں کہتے تھے) جلدی کیا ہے

ہمارے بھی دن پھریں گے۔ شاعر کی زندگی میں اپنی تشریح کو منظر عام پر لانے میں جو خطرات مضمر تھے وہ ان سے کماحقہ واقف ہوتے اور آخر کار جب شاعر کے دن بھر جاتے اور اِن کے بکھر جاتے تو ان کی غیر معمولی مشقت سے لکھی ہوئی تشریح کتابی صورت میں چھپ کر پردۂ خفا سے باہر آجاتی۔ لیکن یہ صورت حال جو ہم نے بیان کی وہ صرف مخصوص حالات کی حد تک محدود ہے ورنہ متقدمین کے کلام کی شرحیں مرتب اور مشتہر کرنے میں کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوتا ہے۔ اگر ان کے ورثا بقید حیات ہیں بھی تو وہ سب کے سب انگریزی ذریعۂ تعلیم کے فارغ التحصیل ہیں۔

تشریحی ادب کے مطالعے کا صحیح لطف اس وقت آتا ہے جب ایک تشریح دوسری تشریح سے علی الاعلان ٹکراتی ہے اور اب ڈویل (Duel) سے شروع ہو کر سہ رُخی مقابلے سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس مرحلے پر شاعر کی لسانی کمزوریوں اور شعری معائب کے علاوہ بعض صورتوں میں اس کے خاندانی معائب بھی زیر بحث آجاتے ہیں۔ شاعر کے ساتھ خود تشریح نگار کے لواحقین بھی موجب توجہ قرار پاتے ہیں۔ ان کا شریک جرم ہونا ایک مسلّمہ امر ہوتا ہے۔ ان سبھوں کی خوب خاطر تواضع ہوتی ہے لیکن ادب میں تو یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ اس قسم کے واقعات سے دل برداشتہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

شارحین حضرات کا (خواتین نے ابھی اس شعبۂ حیات میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی طرف توجہ نہیں دی ہے) ایک علاحدہ قبیلہ ہوتا ہے۔ اکثر شارحین کی تو صرف شرحیں ہی پڑھی جاتی ہیں شاعر کے کلام کی حیثیت فروعی ہوتی ہے اور شاعر کے بیشتر اشعار تو شرح کی زد میں آہی جاتے ہیں۔ شرحیں پڑھنے کے ہم بھی شوقین رہے ہیں۔ کسی ایک شاعر کی دو تین مختلف شرحیں پڑھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آپ گھر بیٹھے متضاد سمتوں میں سفر کر سکتے ہیں۔ یہ مطالعہ محکمہ ریلوے کے رعایتی ٹکٹ پر گشتی سیر و سیاحت کی طرح کی چیز ہوتا ہے۔ دو مختلف شارحین کی شرحوں سے فیض یاب ہونے کے بعد ہم نے بصیغۂ راز ایک معزز شارح سے کہ زیادہ معتبر اور بہتر رازداں تھے' دریافت کیا کہ م۔ح۔ نورانی کی شرح کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے جواب میں کسی شاعر کا ایک شعر پڑھ دیا جس میں شاعر نے کہا تھا کہ مجنوں، لیلیٰ کی تلاش میں دوڑتا ہوا اپنے گھر سے نکلا لیکن وفورِ جوش میں لیلیٰ کے گھر سے آگے نکل گیا۔ وہ شعر اس وقت ہمیں یاد نہیں آرہا ہے ورنہ آپ بھی لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ اس نوع کی شرحیں سطح آب پر بیٹھ کر نہیں لکھی جاتیں، ڈوب کر لکھنا پڑتا ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ ہمارا تشریحی ادب! اچھی اور عمدہ شرحوں سے

خالی ہے۔ ہم نے خود کئی ایسی شرحیں پڑھی ہیں جنھیں پڑھ کر ہمارا جی چاہا کہ کاش ان میں سے ایک آدھ شرح ہماری لکھی ہوئی ہوتی اور یقین جانیے ہم نے اس ضمن میں کوشش بھی کی لیکن ہم سے غلطی ہوئی کہ ہم نے فارسی کلام کو نشانہ بنایا۔ کالج سے نئے نئے نکلے تھے۔ فارسی بھی پڑھی تھی۔ نتائج و عواقب کی پروا کیے بغیر ہم نے حافظ شیرازی کی دو تین غزلوں کی اردو شرح لکھی، نہ صرف لکھی بلکہ بزعم خود اپنے آپ کو سید سجاد حسین سے بہتر شارح سمجھنے لگے۔ اس زمانے میں ہمارے یہاں، فارسی داں لوگوں کی تعداد انگریزی جاننے والوں کی تعداد کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ انگریزی کے دو تین شاعروں کے علاوہ کسی اور کا نام انھوں نے سنا بھی نہیں تھا جب کہ فارسی کے ۱۰ شاعروں کے نام تو سبھی کے علم میں تھے۔ خود غالب اور اقبال نے بھی کیا کچھ کم فارسی شعر کہے تھے۔ فرصت اور برکت کے دن تھے اس لیے شعر شاعری کا چرچا بھی ذرا ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ جب ہماری شرح الم نشرح ہوئی جس کے ذمے دار ہم خود تھے تو اس کے فوراً بعد یوں سمجھیے ہم پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا۔ پٹائی تو خیر نہیں ہوئی کیونکہ وہ زمانہ شائستگی کا تھا اور گمراہ لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے تنبیہی کلمات کافی ہوتے تھے۔ ہمارے دوستوں نے جنھوں نے ہماری فارسی شرح پڑھی' ہم سے یہی کہا کہ ہم تمھارے دشمن نہیں، خیر خواہ ہیں اور اگر تم میں فارسی سے اردو ترجمہ کرنے کی تھوڑی سی بھی صلاحیت ہوتی اس کے کچھ جراثیم تم میں ہوتے تو ہم یقیناً تمھاری حوصلہ افزائی کرتے لیکن تم نے جو کچھ کیا ہے وہ ترجمہ نہیں ہے اور اس طور کی طرزِ نگارش ہمارے یہاں ابھی جاری نہیں ہوئی ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ جی چاہے تو تم خود شاعر بن جاؤ لیکن خدا کے لیے کسی دوسرے شاعر اور وہ بھی فارسی کے شاعر کو تباہ نہ کرو۔ گو کہ ہمارے خیر خواہوں کا اندازِ گفتگو جارحانہ یا غیر شریفانہ نہیں تھا لیکن ان کی آنکھیں کہہ رہی تھی کہ اگر ان کی یہ تنبیہ ہم پر کارگر نہیں ہوئی تو اس کا دوسرا باب ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم نے دل ہی دل میں شرح نگاری اور ترجمہ نگاری سے قطع تعلق کرنے کا فیصلہ کر لیا اور رات میں دیوان حافظ سے فال نکالی تو ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ حافظ شیرازی نے ہمیں نئی زندگی کی نوید اور ایک بڑی مصیبت سے نجات پانے اور بچ نکلنے کی مبارکباد دی تھی۔ حافظ شیرازی کا وہ شعر ہم یہاں نقل کر سکتے تھے لیکن شرح اور ترجمہ لکھنے سے تو ہم دستبردار ہو چکے۔

ادب کا چسکا ایک مرتبہ پڑ جائے تو پھر پیاس بجھتی نہیں ہے۔ تشریحی ادب ہمارے مزاج کے عین مطابق تھا۔ اس میں بڑی سہولتیں تھیں۔ تخلیق کسی اور کی لیکن اسے

استعمال آپ کر رہے ہیں۔ آپ رحم دل ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ لکھنے والے کا قلم کس نے پکڑا ہے۔ ادب میں اسی آزادی کی بنا پر ہمارے یہاں ادیبوں کی آمد زیادہ ہے۔ (ادب میں آمد کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ تشریحی ادب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے لیے کسی خاص انداز نگارش کی پابندی نہیں ہے ورنہ تنقید لکھتے وقت تنقیدی زبان لکھنی پڑتی ہے۔ ناول میں بیانیہ زبان، افسانوں میں ابہامی اور انشائیوں میں انشائی زبان، استعمال کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے بس یہ ایک تشریحی ادب ہے جس میں کوئی خاص زبان نہیں لکھنی پڑتی۔ ویسے خشک انداز تحریر زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ سپاٹ زبان اس سے بھی بہتر مانی گئی ہے۔) افسوس یہ میدان ہم سے چھوٹ گیا۔ دو چار تشریحیں بمعہ ترجمہ لکھی اب بھی پڑی ہوئی ہیں ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

تشریحی ادب کی ایک شاخ تبصراتی ادب بھی ہے اور اس شاخ پر کئی ذہین لوگوں نے اپنا بسیرا بنا رکھا ہے۔ تبصراتی ادب خاصا آرام دہ ادب ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ اس میں ایمان داری کا دخل نہ ہو۔ ایک ذاتی لائبریری بنا لینے کی جس پر ذاتی خرچ کچھ نہ ہو۔ یہ سب سے آسان ترکیب ہے۔ اس سے آگے کی منزل تنقید ہے۔ تبصرہ لکھتے وقت تو کتاب کی ضخامت قیمت، اس کے ملنے کے پتے، گردپوش اور جلد وغیرہ ان سب باتوں کی تفصیل لکھنی پڑتی ہے۔ لیکن تنقید میں صرف تنقید ہوتی ہے۔ کسی بھی تنقیدی کتاب سے اگر اقتباسات خارج کر دیے جائیں تو اس میں بچتا کچھ نہیں ہے۔

اعلا درجہ کی تنقید لکھنے کی صلاحیت صرف چند خوش نصیب لوگوں میں ہوتی ہے۔ جہاں تک ان کے ذاتی حلیے کا تعلق ہے ان کی پیشانی کافی فراخ ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں تو اتنی فراخ ہوتی ہے کہ ختم ہونا نہیں جانتی۔ اصلی اور معیاری تنقید لکھنے میں صحت جسمانی کا خسارہ یقینی ہے۔ بینائی تو بہر حال نابینائی سے ملتی جلتی چیز ہو جاتی ہے۔ ہم نے بیشتر تنقید نگار حضرات کو امراض چشم کے ماہرین کا حلقہ بگوش دیکھا ہے۔ خود ان ماہرین کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوتے ہیں لیکن ان کا فن بہر حال عروج پر ہوتا ہے۔ تنقید نگار حضرات، اپنی آنکھوں کی سرجری سے فارغ ہونے کے بعد بھی آنکھوں میں دوائیں ٹپکاتے رہتے ہیں۔ بینائی کے خراب ہونے سے پہلے بھی جو تنقید ان کے قلم سے بر آمد ہوتی تھی وہ بھی ان کی بینائی کی طرح کمزور تھی اور ان کی نظر صرف نقائص پر پڑتی تھی۔ کہیں کوئی اچھی تحریر نظر آتی تو اسے غنیمت کہہ کر آگے بڑھ جاتے تھے۔

بعض تنقید نگار حضرات اپنی انگلیاں فگار ضرور کرتے ہیں لیکن صرف اقتباسات کو

نقل کرنے کے سلسلے میں۔ یہ اقتباسات کسی پیشرو نقاد کی تحریر سے حاصل کیے جاتے ہیں اور پیشرو نقاد کی رائے سے متعلق ان کی رائے یہ ہوتی ہے کہ (۱) مجھے اس رائے سے اتفاق ہے اور (۲) مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ یہ تنقید سرقے کی تعریف میں نہیں آتی کیونکہ ڈاکے اور سرقے میں بہر حال ایک فرق ہوتا ہے۔ ایسی جامع اور نادر تنقیدوں سے ہمارا ادب خالی نہیں ہے۔ جن اہل دانش و بینش لوگوں نے تنقید کی حرمت اور عظمت کو اپنی ذمہ داری سمجھ کر تنقید لکھی ہے پتا نہیں ہماری اکادمیاں انھیں اپنی کتاب کی اشاعت کے لیے جزوی مالی امداد کیوں نہیں دیا کرتیں۔ کبھی کبھی تو کم سے کم منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر اچھی کتابوں کی اشاعت کے لیے بھی جزدی مالی امداد دینی چاہیے۔ اس ضمن میں کوئی ٹیکنیکی دقت حائل ہو تو انھیں امداد نہ دیں لیکن جن کتابوں کی اشاعت کے لیے یہ جزوی امداد دی جاتی ہے اس کے بارے میں ازارہ عنایت یہ بتادیا کریں کہ یہ امداد کتاب کے کس جز پر دی گئی ہے۔ (اس کا فائدہ قارئین کو پہنچے گا اور وہ جب بھی ایسی کوئی کتاب پڑھیں گے اس مخصوص جز کو چھوڑ کر پڑھیں گے)۔

تشریحی ادب سے کنارہ کش ہونے کے بعد بھی اگر کسی شخص کا جی مانتا نہیں ہے اور وہ اردو ادب کی خدمت کرنے پر تلا ہوا ہے تو اسے تشہیری ادب کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ تشہیر کا جذبہ (جو کافی نیک جذبہ ہے) آدمی کی گھٹی میں پڑا ہوتا ہے۔ ہر بچہ ماں کی گود سے جب بھی اترتا ہے یہی سبق سیکھ کر نیچے اترتا ہے۔ ۴۔۶ نو دیدہ مائیں جب کسی محفل میں ایک جگہ جمع ہوتی ہیں تو ہر ماں کا موضوع سخن اس کا مُنّا ہوتا ہے اور ہر ماں اپنے مُنّے کو دوسری ماؤں کے مُنّوں پر ترجیح دیتی ہے۔ اس سلسلے میں گو کہ اس کی زبان کافی حد تک سوکھ جاتی ہے لیکن سلسلۂ کلام جاری رہتا ہے اور پھر یکلخت محفل میں موجود تمام مائیں اپنے اپنے مُنّوں کے واقعات سنانے اور داد حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور یہی ایک مقابلہ ایسا ہوتا ہے جس میں ہارتا کوئی نہیں ہے۔ کسی بھی محفل میں آلودگی پھیلانے یعنی آواز کی آلودگی پھیلانے کے لیے ۴،۶ مائیں بہت ہوتی ہیں۔ انھی کی اولادِ نرینہ و غیر نرینہ میں سے آیندہ چل کر جب کوئی بچہ ادیب بنتا ہے تو وہ تشہیری ادب کا رستم زماں ہوتا ہے۔ بچی اگر ادیبہ بنی تو وہ مادرِ ادب ہوتی ہے۔

یوں تو سبھی بچے، فطرتاً آدمی کے باپ ہوتے ہیں لیکن ان میں جو بچہ ادیب ہوتا ہے وہ باپ نہیں دادا ہوتا ہے۔

ادب میں اس وقت حکومت داداؤں ہی کی ہے۔

مجتبیٰ حسین
۴۰۰ گورا پار ٹمنٹس
پٹ پڑ گنج، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

کُتّو! انسانوں سے خبردار رہو

پچھلے ہفتہ ہم جیسے ہی حیدر آباد سے واپس ہوئے وہاں سے فرقہ وارانہ فسادات کی اطلاعات آنے لگیں۔ ہم نے سوچا تھا کہ ان فسادات کے بارے میں بھی کچھ لکھیں گے لیکن یہ سوچ کر خاموش ہوگئے کہ ہم نے تیس برس پہلے فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں پورا ایک مضمون "سند باد جہازی کا سفر نامہ" کے عنوان سے لکھا تھا۔ جب لوگوں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا، بلکہ بہتوں نے تو اسے پڑھا بھی نہیں، تو اب کیا لیں گے۔ یوں بھی پچھلے تیس برسوں میں اس ملک میں فسادات نے بڑی ترقی کرلی ہے۔ اب تو یہ ہماری روزمرہ زندگی کا معمول سا بن گئے ہیں۔ بعض لوگ تو ان فسادات کو "گھریلو صنعت" کا درجہ بھی دینے لگے ہیں۔ کوئی کام روزمرہ میں شامل ہو جائے تو اس میں کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ لیکن ان فسادات کے فوری بعد ہمیں حیدر آباد سے ہی ایک ایسی دلخراش اور ہیبتناک اطلاع ملی ہے کہ یقین مانئے ہم سے کھانا تک نہیں کھایا جارہا ہے (ہم یہاں دوپہر کے کھانے کی بات کر رہے ہیں کیونکہ اس اطلاع کے ملنے سے پہلے ہی ہم خدا کے فضل سے صبح کا ناشتہ کر چکے تھے) اب رات کے کھانے کا کیا ہوگا اس کے بارے میں ہم ابھی سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پتہ چلا ہے کہ پچھلے دنوں حیدر آباد میں بیس پچیس آوارہ کُتّوں نے مل کر ایک معصوم بچی کو ہلاک کیا۔ پھر اس کا سارا گوشت نوچ نوچ کر کھا گئے۔

جب سے ہم نے یہ خبر پڑھی ہے تب سے "انسانیت" پر سے ہمارا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ ہم نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ کُتّے یوں انسانیت کی سطح سے نیچے گر جائیں گے۔ ہمیں کُتّوں سے بالکل یہ امید نہیں تھی کہ وہ ایسی غیر انسانی حرکت کے مرتکب ہوں گے۔ سچ پوچھیے تو جب سے انسان، انسانیت سے دستبردار ہوا ہے تب سے ہم کتوں میں بچی کھچی انسانیت کو دیکھ دیکھ کر مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔

کہ۔ع ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

مانا کہ زمانہ ما قبل تاریخ میں انسان جب جنگلوں میں رہتا تھا تو کتا بھی وہیں رہتا تھا لیکن بعد میں یہ انسان کے نقش قدم پر چل کر جنگل سے نکل آیا اور انسانی بستیوں میں رہنے لگا۔ انسانی عادات واطوار سیکھے اور بعض معاملات میں تو انسان سے بھی آگے نکل گیا۔ بھلے ہی وفاداری اور سمجھ داری کے معاملہ میں انسان بھی کتوں سے آگے رہا ہو لیکن کیا مجال جو آج کا انسان اس معاملہ میں کتوں سے آگے نکل جائے۔ اب تو وفاداری صرف کتوں کی اجارہ داری بن گئی ہے۔ ہم نے زندگی میں صرف ایک بار ہی کتا پالا تھا اور وہ بھی اس وقت پالا تھا جب ہمیں کتے کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ ان دنوں ہمارے گھر میں کچھ تھا ہی نہیں جس کی یہ کتا حفاظت کر سکتا۔ ایک دن ہم کہیں چلے جارہے تھے کہ راستہ میں کتے کا ایک لاوارث پلہ نظر آیا جس کی آنکھیں بھی ابھی پوری طرح کھلنے نہیں پائی تھیں اور وہ سڑک پر دیوانہ وار دوڑ رہا تھا۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ کہیں کسی بیل گاڑی یا تانگے کے نیچے نہ آجائے اسے اٹھا کر گلی میں ایک محفوظ جگہ پر رکھ دیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد دیکھا کہ یہ تو ہمارے ہی پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے۔ چار و ناچار ہم اس بے یار و مددگار کتے کے پلے کو اپنے گھر میں رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ جو روکھی سوکھی ہم کھاتے تھے وہی اسے بھی کھلادیتے تھے۔ مگر چند دن بعد جب یہ بڑا ہونے لگا تو احساس ہوا کہ یہ تو آلسیشن کتا ہے۔ پھر کچھ ہی دنوں میں اس کی شخصیت ہماری شخصیت سے کہیں زیادہ نکھر آئی۔ مگر چونکہ ہماری صحبت میں رہتا تھا اس لیے عادات واطوار کے معاملہ میں بالکل ہم پر گیا تھا۔ بھونکنا بالکل نہیں تھا۔ بات بات پر دم ہلادیتا تھا۔ گھر کے کسی بھی کونہ میں ایک بے نیاز مرد قلندر کی طرح پڑا رہتا تھا۔ ایک دن ہم گھر واپس ہوئے تو ہماری بیوی نے ہنستے ہوئے کہا "اجی' یہ کتا تو بالکل آپ کی ٹروکاپی (True Copy) ہے۔" ہم نے پوچھا "وہ کس طرح؟" بولیں "آپ تو جانتے ہیں کہ اسے بھونکنا نہیں آتا۔ بالکل گونگا سا کتا ہے لیکن سمجھ دار اتنا ہے کہ سے جب بھی کوئی چور' اچکا یا اوباش قسم کا آدمی گزرتا ہے تو فوراً اس کی اطلاع دے دیتا ہے؟"

ہم نے پوچھا "وہ کیسے" بولیں "فوراً دیوانہ وار بھاگ کر میرے پاس آجاتا ہے اور ڈر کے مارے میرے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ اس کے خوف سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ باہر کوئی مشکوک قسم کا کردار سڑک سے گزر رہا ہے۔"

اس انکشاف کے بعد ہمیں اس کتے پر پیار سا آگیا۔ اس کی طرف دیکھا تو یوں لگا جیسے

آئینہ میں ہم اپنے آپ کو دیکھ رہے ہوں۔ اب ہم اپنے منہ سے اپنی ہی کتنی تعریف کریں، ایسا شریف النفس، حلیم الطبع، منہ مرا، کم گو اور بااخلاق کتا کم از کم آلسیشن نسل کے کتوں میں تو کوئی پیدا نہ ہوا ہو گا۔ یہ سب ہماری صحبت کا فیض جاریہ تھا۔ اگرچہ ہمارے بعض دوست اس کتے پر فقرے بھی کستے تھے کہ "میاں! تمھارا کتا تو بالکل گدھا ہے۔" اور ہماری اعلیٰ ظرفی دیکھئے کہ ہم ان فقروں کو چپ چاپ برداشت کر لیتے تھے کیونکہ ہم جانتے تھے کہ یہ فقرے کتے کے لیے نہیں بلکہ ہمارے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کتا انسان سے ہی سب کچھ سیکھتا ہے۔ عمر کے آخری حصہ میں اسے غالباً یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس نے ہم سے تو بہت کچھ سیکھ لیا ہے لیکن ہماری بیوی سے کچھ نہیں سیکھا۔ لہٰذا اس نے ہماری بیوی کی ایک عادت ضرور سیکھ لی تھی۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب ایک رات ہم دیر سے گھر واپس ہوئے اور ہماری بیوی نے ہم پر برسنا شروع کر دیا تو کتا بھی ہماری بیوی کے برابر بیٹھا لگاتار غراتا رہا۔ بعد میں غرانے کے معاملہ میں وہ خود کفیل ہو گیا تھا۔ بعض اوقات تو یونہی ہمیں دیکھ کر غراتا رہتا تھا۔ ہم نے اپنی بیوی سے تنہائی میں کہا بھی کہ خدا کے لیے وہ ہم پر کتے کے سامنے برسنا بند کر دیں کیونکہ اس سے کتے کے اخلاق پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کتا جو کچھ سیکھتا ہے وہ انسان سے ہی سیکھتا ہے۔ اگرچہ بعد میں انسان پہلے سے سیکھی ہوئی باتوں کو اکثر بھول جاتا ہے لیکن کتا نہیں بھولتا۔

صدیوں پہلے کتے نے انسان سے وفاداری سیکھی تھی۔ انسان تو وفاداری سے کب کا کنارہ کش ہو گیا لیکن کتے نے وفاداری کے جذبہ کو اب تک اپنے سینے سے لگائے رکھا ہے۔ ہمیں اس وقت ٹوکیو کا وہ ریلوے اسٹیشن یاد آ گیا جس کے سامنے کتے کا ایک مجسمہ نصب ہے۔ اس اسٹیشن کا نام بھی اس کتے کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس کتے کی کہانی یہ ہے کہ اس کا مالک جب بھی کام پر جانے کے لیے اسٹیشن آتا تو کتا بھی اس کے ساتھ آتا تھا۔ مالک تو ٹرین میں بیٹھ کر چلا جاتا تھا لیکن شام میں یہ کتا اپنے مالک کی واپسی کے وقت پھر اسٹیشن آ کر اس کا انتظار کرنے لگ جاتا تھا۔ مالک واپس آتا تو یہ اسی کے ساتھ گھر واپس ہوتا تھا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ ایک بار اس کا مالک ٹرین میں گیا تو یوں گیا کہ پھر کبھی واپس نہ ہوا۔ کسی ٹریفک حادثہ میں اس کی موت ہو گئی۔ مگر اس کے مرنے کے دو سال بعد تک یہ کتا لگاتار اسٹیشن کے سامنے اپنے مالک کی واپسی کا انتظار کرتا رہا اور اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ بعد میں یہ خود بھی وہاں چلا گیا جہاں اس کا مالک گیا تھا۔

ہم تو ایسے ہی شریف کتوں کے بارے میں جانتے ہیں جن کا وجود انسانیت سے لبریز ہوتا ہے۔ اب یہ جو حیدر آباد سے چند آوارہ کتوں کی غیر انسانی حرکت کی اطلاع آئی تو ہم انسانیت کے مستقبل سے مایوس ہوتے جارہے ہیں۔ مانا کہ بعض کتے شریر بھی ہوتے ہیں، بھونکتے بھی ہیں بلکہ پطرس بخاری کے لفظوں میں "مشاعرے" بھی منعقد کرتے ہیں لیکن ایسی انسانیت سوز حرکتیں نہیں کرتے۔ ہاں خوب یاد آیا۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ ہم ایک دوست سے ملنے کے لیے ان کے گھر گئے تو ان کے کتے نے صحن میں سے بے تحاشہ بھونکنا شروع کر دیا۔ ہم نے اپنے دوست کو پکارا تو انہوں نے ڈرائینگ روم کی کھڑکی کھول کر ہم سے کہا "اندر آجایئے۔ یہ کچھ بھی نہیں کرے گا۔" ہم نے کہا "ذرا دیکھیے تو سہی کہ کیسی خطرناک آواز میں بھونک رہا ہے۔" بولے "آپ کو تو وہ کہاوت معلوم ہے کہ بھونکنے والے کتے کاٹتے نہیں۔ پھر اس میں ڈر کیسا؟" ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا "بھیا! مجھے تو یہ کہاوت معلوم ہے لیکن اگر یہ کہاوت آپ کے کتے کو معلوم نہ ہو تو میرا کیا ہوگا۔" ہمارے دوست نے کھڑے کھڑے جواب دیا "میاں! اطمینان رکھو۔ میرا کتا تم سے زیادہ پڑھا لکھا اور سمجھ دار ہے۔ صرف ڈگری رکھنے سے کوئی تعلیم یافتہ نہیں ہو جاتا۔"

اور اس دن ہم کتے کے لگاتار بھونکنے کے باوجود ہمت کر کے اپنے دوست کے ڈرائینگ روم میں چلے گئے تھے اور ہمیں پہلی بار پتہ چلا کہ کتے بھی اس کہاوت سے بخوبی واقف ہیں۔

آج ہمیں مندرجہ بالا کتوں کی یاد اس لیے آگئی کہ یہ سب کے سب شرافت، وفاداری، انسانیت، خودداری اور علم کے زیور سے آراستہ تھے۔ حیدر آباد کے کتوں کو نہ جانے کیا ہوگا ہے کہ انہوں نے اچانک انسانیت کا لبادہ اتار پھینکا ہے۔ یہ سب آج کے انسانوں کی صحبت میں رہنے کا نتیجہ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر حیدر آباد میں فسادات نہ ہوتے تو کتوں کو کبھی پتہ نہ چلتا کہ ایک معصوم بچی کو بلاوجہ اس طرح چیرا اور پھاڑا جاسکتا ہے۔ انسانوں کو تو ہم اب کچھ کہنے سے رہے۔ ہماری سنتا بھی کون ہے۔ لہٰذا کتوں سے ہی ہماری گزارش ہے کہ وہ انسانیت کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ ہماری صدیوں پرانی تہذیب کے اب وہ اکیلے امین رہ گئے ہیں۔ اگرچہ انسان اب شہروں میں رہ کر صدیوں پہلے جنگل میں رہنے والے قدیم وحشی انسان کی سی حرکتیں کرنے لگا ہے لیکن کتوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ شہروں میں رہ کر وحشی انسان کی سی حرکتیں کریں۔ کتوں کو ہم صدق دل سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ انسانوں سے خبردار رہیں اور اپنے اسلاف کے کارناموں کی فراموشی نہ کریں۔

نصرت ظہیر
۱۵/۲۴ کھچڑی پور دہلی ۹۱

ملاقات ایک لگڑ بگڑ سے

ایک مرتبہ اخبارات میں یہ خبریں پڑھنے کے بعد کہ شمال مشرقی اترپردیش میں لکڑبگّے سیکڑوں بچے کھا گئے ہیں اور صوبے کے پانچ سَو دیہات پر آج کل لکڑبگوں کی حکمرانی چل رہی ہے۔ ایک روز میں شہر کی ویران سڑک سے گزر رہا تھا کہ راہ میں ایک لکڑبگّے سے ملاقات ہو گئی۔

میں نے سوچا فرسٹ ہینڈ جانکاری کے لیے اس سے اچھا موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا، چنانچہ کیوں نہ لکڑبگّے کا انٹرویو لے لیا جائے۔ لہٰذا اعلیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

"یار یہ کیا چکر ہے؟ آج کل یوپی کے عوام پولس اور نیتاؤں کی بجائے تم لوگوں سے زیادہ خوف کھا رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ شمالی یوپی کے پانچ سو دیہات میں تو ان دنوں بس تمھاری ہی حکمرانی چل رہی ہے۔"

لکڑبگّے نے پہلے تو کھنکار کر گلا صاف کیا، پھر بولا۔ "کیا عرض کروں بھائی جان۔ یہ سب گوش گزار ہونے سے میں خود اس درجہ مستحیر ہوں کہ اکثر متزلزل و متذبذب ہو جاتا ہوں۔ بلکہ ایک مرتبہ میں اس قدر متعجب ہوا کہ متوحش ہونے کی نوبت آ گئی۔ خدا خیر کرے۔"

میں سمجھ گیا۔ لکڑبگا یقیناً لسانیات میں دخل رکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے موقع غنیمت جانا اور اپنی ایک لسانیاتی الجھن دور کرنے کے لیے اس سے پوچھ لیا۔

"باقی باتیں تو بعد میں ہوں گی لکڑبگے بھائی! پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا صحیح نام کیا ہے۔ لکڑبگا، لگڑ بھگّا یا لکڑ بگھا!؟"

یہ سن کر لکڑبگا پہلے مستحیر، پھر متفکر اور پھر متشکک ہوا۔ مگر بالآخر متبسم ہو کر بولا۔ "بات یہ ہے عزیز من کہ پہلے ہم لکڑ بھگّے یا بگھے ہی ہوا کرتے تھے۔ مگر امتداد زمانہ سے گھستے گھستے لکڑبگے رہ گئے۔ تم چاہو تو ہمیں لگڑ بگڑ بھی کہہ سکتے ہو۔ اہل فارس نے تو ہمیں چرخ کا نام دے ڈالا۔ جس کی وجہ سے ہند کے تمام شاعر ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ چنانچہ

ان چرب زبانوں نے، چرخِ پیر، چرخِ بے مہر، چرخِ دریں، چرخِ کبود اور چرخ دولابی کی آڑ میں ہمارے فارسی نام کو اتنا بدنام کیا کہ الاخر الایمان والحفیظ جالندھری!۔۔۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے الامان والحفیظ مگر پلیز بیچ میں بات مت کاٹو۔ میں کہہ رہا تھا کہ فارسی نام چرخ کی آڑ میں ہند کے شاعروں نے ہمیں بہت بدنام کیا ہے اور بڑے کوسنے دیتے ہیں۔ حالانکہ پن چکی یا کنویں کے پہیئے اور کمہار کے چاک کو بھی چرخ کہتے ہیں مگر شاعروں نے انھیں ذہن میں رکھ کر کبھی کوئی شعر نہیں کہا۔ یہاں تک کہ مولوی اسماعیل میرٹھی نے بھی فقط اتنا کہا کہ ؎

نہر پر چل رہی ہے پن چکی

مگر باقی شاعروں نے چرخ کا نام لے کر آسماں، گردوں، اور فلک ناہنجار کو اتنا برا بھلا کہا ہے کہ کبھی کبھی پڑھنے والے کو شبہ ہو جاتا ہے کہ آسمان والا چرخ اتنا برا کیسے ہو سکتا ہے۔ کہیں شاعر کا روئے سخن لکڑ بگڑ کی طرف تو نہیں۔ چنانچہ شعر ہے ؎

آہ سوزاں کی ہوائی نہ گئی تا بہ فلک
چرخ چرخی کی طرح سے شرر افشاں نہ ہوا

ملاحظہ کیا آپ نے؟ یعنی جب محض چرخ سے شاعر کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے ہماری بہو بیٹیوں کو بھی نشانہ بنالیا اور چرخی سے اس کی مشابہت کا امکان پیدا کر دیا۔ وہ تو شکر ہے کہ اول الذکر شرر افشاں نہ ہوا ورنہ موخرالذکر تو کہیں کی نہ رہتی!"

لکڑبگے کی محققانہ تقریر سن کر میں اس درجہ مرعوب ہوا کہ اپنا اگلا سوال ہی بھول گیا۔ پھر بھی، بات آگے بڑھانے کے لیے میں نے کہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اردو شاعروں کا انتقام شمالی یوپی والوں سے لے رہے ہو؟"

میری بات سے غالباً اسے دلی صدمہ پہنچا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہو گئے۔ تاہم دیکھنے میں وہ اب بھی لکڑ بگڑ ہی لگتا تھا۔ وہ اس لہجے میں کہنے لگا۔

"معاف کرنا میرے عزیز! انتقام کی بات کہہ کر آپ نے مجھ پر اور میری قوم پر انسانیت کا جو الزام لگایا ہے وہ کسی تازیانہ سے کم نہیں۔ آہ! ؎

بہار عشق پہ طرہ ہوئی ہوائے بہار
سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

اور ؎

اک تیر میرے سینے پر مارا کہ ہائے ہائے!"

یہ کہہ کر اس نے گردن جھکالی اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔ بہر حال کچھ دیر بعد اس نے گردن اٹھائی اور بولا۔ "کسی کا بدلہ کسی اور سے لینا ہمارا شیوہ نہیں عزیز من! ہم بفضل خدا حیوان ہیں اور ہمیشہ حیوانی جذبہ اور حیوانی ہمدردی سے کام لیتے ہیں۔ حیوانی حقوق کا ہم جانور پورا احترام کرتے ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو ان حقوق کی خلاف ورزی کرتا ہو۔ جب کہ آپ انسان حضرات۔ معاف کیجیے۔

ہے ادب شرط، منہ نہ کھلوائیں!"

اور میں واقعی شرمندہ ہو گیا۔

مگر دوسرے ہی لمحے میری انسانی غیرت و حمیت جاگ اٹھی جو ہم میں سے اکثر کی فطرت ہے۔ میں نے کہا۔

تو تمھارا کیا خیال ہے۔ یوپی کے دیہات میں جو دہشت پھیلی ہوئی ہے وہ دیہاتیوں نے خود پھیلائی ہے۔ اپنے بچوں کو وہ خود ہی اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

"میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" لکڑبگے نے یہ کہہ کر پھر سر جھکالیا۔ "تم نہیں تو تمھارے بھائی بند ہوں گے۔ ہو سکتا ہے یہ بھیڑیوں کی کرتوت ہو۔ آخر بھیڑیے بھی تو تمھاری حیوان برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔"

میرے طنز سے وہ بے چین ہو گیا۔ سر اٹھا کر کہنے لگا۔ "میں نے بھیڑیا بھائی سے پوچھا تھا۔ وہ خود حیران تھے کہ یہ حب کون کر رہا ہے۔ اس کے بعد میں نے بہن لومڑی اور چچا تینڈوے سے بھی دریافت کیا۔ مگر انھوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ہمارا قانون ہے کہ انسان کا گوشت کبھی نہیں کھاتے۔ انسانی گوشت کو ہم حرام تصور کرتے ہیں۔ جو بھی جانور انسانی گوشت کھا لیتا ہے ہم اس سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس کا حقہ پانی بند کر دیتے ہیں۔"

اس نے یہ سب انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ مگر حقے پانی والی بات پر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں تصور میں لومڑی اور تینڈوے کو حقہ پیتے ہوئے دیکھنے لگا۔ بہر حال، میری ہنسی سے وہ تناؤ کسی قدر دور ہو گیا جو اس بیچ ہمارے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ لکڑبگڑ بھی مسکرانے لگا۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ مسکرانے پر بھی وہ لکڑبگڑ یا لکڑبگا ہی لگ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"غالباً جناب اسکن بونڈ کی مشہور کتاب "دی جنگل بک" آپ کے مطالعہ سے نہیں گزری۔ پڑھی تو خیر میں نے بھی نہیں ہے کیونکہ ہم تو ہیں ہی حیوان۔ اس ڈر سے

پڑھنا لکھنا نہیں سیکھتے کہ کہیں انسانوں کی خوبیاں نہ ہم میں پیدا ہو جائے۔ بہر کیف اس کتاب پر بنائی گئی فلم ایک مرتبہ ٹیلی ویژن پر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ دیکھ کر اچھا لگا۔ لائق مصنف نے ہمیں دیکھا تو اسی انسانی نظر سے ہے جس سے ہم حیوان دن رات خوف کھاتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے اس کے سینے میں انسان کا نہیں کسی سچے حیوان کا دل ہے۔ کئی واقعات کی منظر کشی تو مصنف نے اس قدر دل نشیں اور جذباتی پیرایہ میں کی ہے کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور میں سوچنے لگا۔

اب بھی کچھ لوگ ہیں زمانے میں

ورنہ ۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

اور ۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں حیواں ہونا۔"

غالب کے شعر میں جو ترمیم اس نے کی اس سے میں مضطرب ہو گیا۔ پوچھا "آخر تم انسانوں سے اتنے دل برداشتہ کیوں ہو۔ ہم انسانوں نے تو ان تمام جانوروں کے شکار پر پابندی بھی لگادی ہے جو ENDANGERED SPECIES سمجھے جاتے ہیں اور جن کی تعداد اس قدر گھٹ گئی ہے کہ ان کے ناپید ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور ان میں تم بھی شامل ہو۔ اس کے باوجود تم انسانوں کو مسلسل برا کہتے جا رہے ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے؟" "وجہ تو میں بیان کردوں گا بھائی جان۔ مگر آپ سن نہیں پائیں گے۔" اس نے کہا اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ مجھے چیلنج کر رہا ہو۔

"نہیں نہیں، تم بے جھجک کہو۔ انسان سے بڑھ کر وسیع النظر، وسیع القلب اس روئے زمین پر کوئی نہیں۔ تمھارے جو جی میں آئے کہو۔ میں برا نہیں مانوں گا۔"

تو سنئے!" اس نے مقررین کی طرح کھنکار کر کہا۔

"انسان سے زیادہ تنگ نظر، تنگ دل اور متعصب اس کرۂ ارض پر کوئی نہیں ہے۔ اپنے سوا ہر شئے کو معمولی اور ہر ذی روح کو حقیر سمجھتا ہے۔ زمین آسمان ہوا پانی سب پر صرف اپنی حکومت چاہتا ہے۔

اپنے عمل میں کسی کا دخل اسے برداشت نہیں۔ مگر خود قدرت کے ہر قانون میں دخل دیتا رہتا ہے۔ اینڈ ینجرڈ اسپیسیز والی بات آپ نے خوب کہی۔ لیکن شاید اس پر غور

نہیں گیا کہ آپ انسانوں کا ہر معاملے میں ڈبل اسٹینڈرڈ ہے۔ کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔ پندرہ بیس سال پہلے آپ نے شیروں کی گھٹتی تعداد کو بڑھانے کے لیے آپریشن ٹائگر شروع کیا تھا۔ کروڑوں روپے اس کے نام پر آپ کے پاس آئے۔ مگر نتیجہ کیا نکلا؟ شیروں کی تعداد اور گھٹ گئی۔ ایک نسل حیوانی کو بچانے کے لیے جو کروڑوں روپے ملے تھے وہ نسل انسانی خود ڈکار گئی۔ ایک طرف آپ ہماری کھال میں بھس بھروا کر اپنے ڈرائنگ روم سجاتے ہیں۔ دیواروں پر ہمارے سر لٹکاتے ہیں۔ دوسری طرف ہماری نسلوں کو بچانے کا ڈھونگ بھرتے ہیں۔ آپ ہی کی برادری کے کسی نامعلوم شاعر نے حضرت اقبال کے رنگ میں آپ کو تاکید کی تھی۔

دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا
سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا

مگر افسوس صد افسوس آپ نے اس پر دھیان نہیں دیا"۔

اتنا کہہ کر لکڑ بگڑ سانس لینے کے لیے رکا۔ اس نے آسمان کی طرف تھوتھنی اٹھا کر ایک عجیب سی آواز نکالی جو انسانی ہنسی سے مشابہ تھی۔ لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ حیوانی ہنسی طنزیہ تھی یا محض غم کا اظہار کیا گیا تھا کیونکہ بہت زیادہ رونے کو جی چاہے تب بھی آدمی کے منہ سے ایسی آواز نکل جایا کرتی ہے۔ پھر وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"معاف کرنا، میں آپ کا دل دکھانا نہیں چاہتا۔ مگر حقیقت یہی ہے۔ انسان خود کو حیوان ناطق کہہ کر اتراتا ہے اور حیوانوں کو گالیاں دیتا ہے۔ کوئی آدمی بے وقوفی کی حرکت کرے تو اسے الو اور گدھا کہہ کر ڈانٹتا ہے۔ جو دوسروں پر ظلم ڈھائے اسے بھیڑیا کہہ دے گا۔ جس کا کوئی دین ایمان نہ ہو، دن رات دوغلا پن کرتا ہو وہ گرگٹ کہلائے گا۔ جو بے وفا ہو اور ذرا سی دیر میں آنکھیں پھیر لیتا ہو وہ توتا چشم ہو جائے گا۔ جو کمینہ ہو وہ سور بن جائے گا۔ انسان اپنی تمام بری عادتیں اور خراب خصلتیں ہم جانوروں پر تھوپ دیتا ہے۔ ورنہ آپ ہی بتائیے کیا آپ نے کبھی کسی الو کو بے وقوفی اور گدھے کو بے ہودگی کرتے دیکھا ہے؟ کوئی ایسا بھیڑیا آپ کی نظر سے گزرا ہے جو دوسرے بھیڑیوں پر ظلم ڈھاتا پھر رہا ہو۔ کوئی گرگٹ دیکھا ہے جو بے ایمان ہو اور قول دے کر پھر جاتا ہے۔ کوئی ایسا توتا آپ کو ملا ہے جو دوسرے توتوں سے توتا چشمی کر رہا ہو۔ کوئی ایسا سور آپ مجھے دکھا سکتے ہیں جو بہت کمینہ ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ اپنے ہر عیب کو آدمی جانوروں کا جامہ پہنا کر خوش ہو لیتا ہے۔ اس کی ہر بات میں حیوان گھسے رہتے ہیں۔ کوئی شخص آزاد روی کا قائل ہو تو اسے شتر بے

مہار کہہ دیں گے۔ کسی شاعر کے غزلیہ شعر کے دونوں مصرعوں میں اسم یا فاعل سے مخاطب کے صیغے مختلف ہوں تو کہہ دیں گے کہ اس میں شتر گربہ ہے۔ اور محاورے دیکھیے تو عجیب احمقانہ تصور پیش کرتے ہیں۔ کوئی حیران پریشان ہو جائے تو کہیں گے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔

کیوں صاحب! یہ ہاتھوں کے توتے کیا چیز ہوتی ؟ کیا پیروں کے بھی توتے ہوتے ہیں۔ معاف کیجیے ہوتے ہیں آفسوس۔ آپ لوگوں میں لفظ طوطے کے املا پر بھی اتفاق نہیں۔ کوئی توتا لکھتا ہے کوئی طوطا بلکہ بعض لوگوں کو تو میں نے طوتا اور توطا لکھتے ہوئے بھی سنا ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ چور کو پڑ گئے مور۔ اب جناب کہاں چور اور کہاں مور۔ دونوں میں سوائے ہم قافیہ ہونے کے کوئی مسابقت و مطابقت نہیں۔ چور کے گھر اگر چوری ہو جائے تو کہنا چاہیے چور کو پڑ گئے چور۔ مگر نہیں۔ حیوانات کو ذلیل کرنا جو ٹھیرا۔ لہٰذا دوسرے چور کی جگہ بے چارے مور کو پکڑ کر کھڑا کر دیں گے۔ جو اتنا شریف النفس پرندہ ہے کہ پرندہ ہو کر بھی زیادہ نہیں اڑتا۔ اور بیشتر زندگی یہ پرندہ چرندوں کی طرح زندگی گزار دیتا ہے۔ ایسے حیوان سے آپ چوری کی امید کر سکتے ہیں؟ اور وہ بھی چور کے گھر میں؟ اور پھر ذرا یہ بھی تو دیکھیے کہ آپ نے کبھی کسی جانور کو کسی کی جیب کاٹتے چوری کرتے، نقب لگاتے، ڈاکہ ڈالتے اغوا کرتے یا زنا بالجبر کرتے دیکھا ہے۔ یہ بے چارے تو کوئی اسکینڈل بھی نہیں کرتے۔ آپ انسان حضرات کے ظلم سے تنگ آکر کوئی جانور کسی آدمی کو کاٹ کھائے تو دنیا بھر کا شور مچ جاتا ہے۔ اور آپ لوگ جو لاکھوں جانور روزانہ کاٹ کھا جاتے ہیں اس کا کوئی حساب نہیں۔ معاف کیجیے، آپ تو کیکڑے اور مینڈک بھی نہیں چھوڑتے۔ سب کاٹ پیٹ کر چٹ کر جاتے ہیں۔ اور ہم صبر سے سب کچھ دیکھتے رہتے ہیں۔ علامہ اکبر الہ بادی کیا خوب کہہ گئے ہیں ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا!

اس لیے میرے عزیز، ہم حیوانوں کو انسانیت کا سبق نہ پڑھائیے۔ زندگی کا درس ہم سے لیجیے۔ ہماری تو دن رات بس یہی دعا ہے کہ کاش آپ لوگوں کے دلوں میں تھوڑا سا دماغ اور دماغوں میں تھوڑا سا دل ہوتا! اور کاش خدا آپ کو تھوڑی سی حیوانیت دے دے!"

اتنا کہہ کر وہ پلٹا، اور واپس جنگل کی طرف چل دیا۔

اور میں اس ویران سڑک پر کھڑا رہ گیا جس کے دونوں سرے بستیوں کی طرف جاتے تھے۔

فضل حسنین
اے۔۷ پتر کار کالونی
اشوک نگر۔الہ آباد ۲۱۱۰۰۱

کاروبارِ ادب

جب گرتے پڑتے کسی طرح ہم نے ایم۔اے پاس کر ہی لیا تو کچھ کر گزرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ چونکہ ہم نے اردو ادب میں ڈگری حاصل کی تھی اس لیے کوئی ادبی کام کرنے کی خواہش کچھ زیادہ غیر فطری نہ تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہم نے اپنے ایک دوست نما استاد سے مشورہ لینا چاہا۔ استاد کا مختصر تعارف اتنا ہی کافی ہے کہ موصوف نے دنیا دیکھ ہی نہیں رکھی ہے بلکہ کافی ٹھونک بجا کر دیکھی ہے اس لیے زندگی کا اچھا تجربہ رکھتے ہیں۔ مطالعہ بھی کافی وسیع ہے البتہ دورانِ گفتگو جب ترنگ میں آجاتے ہیں تو مقامی زبان کے ایسے فصیح و بلیغ الفاظ کا استعمال کر جاتے ہیں کہ مخاطب ان کے تعلیم یافتہ ہونے میں شک کرنے لگتا ہے۔

بہر حال! موصوف نے ہمارا عندیہ سننے کے بعد ہماری جانب اس طرح دیکھا جیسے کوئی ماہر نباض نبض دیکھنے کے بعد مریض کو اس کے جملہ امراض سے آگاہ کرنے کی پوزیشن میں آتا ہے۔ پھر فرمایا۔ دیکھیے حضرت! آپ پہلی بھول تو یہی کر رہے ہیں کہ لکھنے پڑھنے کا دھندہ اپنانے کی سوچ رہے ہیں جبکہ زمانہ ایسا آگیا ہے جس میں قلم اور کتاب جیسی چیزوں کے لیے قطعی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ خیر! کوئی ادبی کاروبار کرنا ہی ہے تو پھر وہ کام پکڑیے جس کا بازار کچھ چڑھا ہو، "عرض کیا۔" اسی غرض سے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں کچھ رہنمائی فرمائیں، ارشاد ہوا۔ بھئی نقادی (تنقید نگاری) کا کام ہی کر سکتے ہو۔ "عرض کیا" حضور! نقاد بننے کے لیے تو خاصا علم درکار ہے۔ ایم۔اے تو خیر اساتذہ کے آگے پیچھے گھوم کر کسی طرح نکال لیا لیکن نقاد بننے کے لیے تو بہت پڑھنا پڑے گا۔ پھر نقادی سیکھ جانے کے بعد پریکٹس جمنے میں بھی خاصا وقت لگ جاتا ہوگا۔" استاد نے قدرے ناگواری کے ساتھ ہمیں ٹوکا، برخوردار! ابھی تم بالکل کچے لگتے ہو اس معاملے میں پہلی بات تو یہ جان لو کہ نقادی سیکھی نہیں جاتی۔ پہلے کچھ اور بننے کی کوشش کرتے ہیں لوگ۔ مثلاً

افسانہ نگار۔ڈرامانگار،ناول نگاریاکم ازکم نثری شاعر۔پھر جب کچھ نہیں بن پاتے تو نقاد اپنے آپ بن جاتے ہیں۔یوں بھی ایم۔اے کرنے کے بعد ادب کا طالب علم جس دن ریسرچ جوائین(JOIN) کرتا ہے،نقادی کی داغ بیل تو اسی دن پڑجاتی ہے۔ہاں تمہیں کس قسم کا نقاد بننا ہے،اس پر ذرا سا دھیان دینا ضروری ہے۔" دریافت کیا"کیا نقادی بھی متعدد قسم کی ہوتی ہے؟ ارشاد ہوا"لو اور سنو ! بھئی صابن، شیمپو وغیرہ بغیر کسی لیبل(LAB LE) کے چلا سکتا ہے کوئی؟ہم نے کام بھر کو چونکتے ہوئے کہا۔"حضور!ادب کا موازنہ صابن،شیمپو سے کر رہے ہیں آپ" ارشاد ہوا۔"برخوردار!وہ بھی ایک کاروبار ہے اور یہ بھی ایک دھندہ۔اس لیے کوئی نہ کوئی ٹریڈ مارک تو ضروری ہی ہے اور سیدھی سی بات ہے جتنے قسم کا ادب ہوگا اتنے قسم کے تنقید نگار ہوں گے۔"ہم نے ہمت ہارتے ہوئے کہا۔"استاد!یہ تو کافی لمبا چکر لگتا ہے۔شاید میں اس میں چل نہ پاؤں گا۔" فرمایا۔"کوئی کام شروع کرنے سے قبل ہی ہتھیار ڈال دینا بزدلی ہے۔ اور پھر میں تو ہوں ہی تمہارے ساتھ۔ موٹے طور پر شروعات کرادوں گا۔چلا لے گئے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کام میں تمہارا کچھ ڈوبنے کا خطرہ تو ہے ہی نہیں۔"ہم نے ایک بار پھر ہمت باندھتے ہوئے کہا۔" ٹھیک ہے۔ آپ رہنمائی آگے بڑھائیں۔استاد مصنوعی فلسفیوں کی طرح نظریں خلا میں لے گئے پھر چند لمحے بعد زمین پر اترتے ہوئے بولے۔ہاں،تو پہلے یہ طے کرلیں کہ تمھیں کس طرح کی تنقید پکڑنی ہے، ہمارے منھ سے جلدی سے نکل گیا۔"حضور!ترقی پسند ادب کا تو خاصا زور رہا ہے: ارشاد ہوا۔ "تم بیک ڈیٹ BACK DATE میں بولنے لگے۔اب اس کا بازار گر چکا ہے بلکہ سمجھ لو ایک طرح سے ختم ہی ہو رہا ہے۔پھر بھی ریفرنس(REFERENCE) کے لیے اتنا جان لو کہ کسی تخلیق میں اگر کسان، مزدور اور انقلاب وغیرہ کا ذکر نہیں ہے تو تخلیق کتنی ہی معیاری کیوں نہ ہو، وہ ترقی پسند ادب میں تو نہیں سما سکتی، باقی جہاں چاہے جائے۔ ہاں، ایک بات اور... تخلیق میں تناظر، ساختیات اور پس ساختیات وغیرہ جیسے بھاری بھرکم الفاظ کا جتنا زیادہ استعمال ہوگا، وہ اتنی ہی معیاری تخلیق گردانی جائے گی۔ہاں،ادھر کچھ دنوں سے ایک اور لفظ فیشن میں آگیا ہے۔وہ لفظ ہے مابعد جدلی...... اچھا چھوڑو!یہ بہت زیادہ گاڑھا ہے۔ جب میں پھنس رہا ہوں تو تم بھلا کیا سنبھال پاؤ گے اسے استاد نے سانس لینے کی غرض سے کچھ توقف فرمایا تو ہم نے پھر جلدی سے سوال داغ دیا۔ حضور یہ عملی تنقید کیا ہوتی

ہے: "میاں! یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ جیسے کسی چیز کی مارکٹ جب کچھ گرنے لگتی ہے تو اسی پروڈکٹ کے نام میں کچھ ادھر ادھر کر دیا جاتا ہے تاکہ لوگ مغالطے میں آجائیں کہ یہ کوئی نئی چیز ہے۔ اسے بھی آزمانا چاہیے۔ بس اتنی سی بات ہے اور کہتے ہیں کہ ترقی پسند ادب کا تو باقاعدہ ایک ہیڈ کوارٹر ہوا کرتا تھا۔ وہاں جو فارمولہ تیار ہوتا تھا ان کے آدمی اسی کی مارکٹنگ میں لگ جایا کرتے تھے لیکن اب تو خلیل خاں فاختہ اڑا چکے۔" ہم نے استاد کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش میں اپنی بھی قابلیت جتاڈالی۔ "استاد! ادھر جدید ادب کچھ زیادہ زور مارنے لگا ہے ٹھیک خیال ہے تمھارا۔ استاد قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولے لیکن بھیا ایک بات ہے۔ جدید نقاد بننے کے لیے مغربی ادب نہ سہی لیکن کم از کم مغربی ادیبوں کے نام جاننا تو لازمی ہے ہم نے گھبرا کر جلدی سے عرض کیا لیکن حضور! مجھے تو ابھی اردو کے بیشتر قلمکاروں کے نام ہی نہیں معلوم! ارشاد ہوا۔ "کوئی بات نہیں۔ اردو ادب کے نقاد کے لیے اردو جاننا اتنا ضروری نہیں جتنا کہ مغربی ادیبوں کے نام۔ تم نے انگریزی ادب کے ان پروفیسروں کا نام نہیں سنا جنھوں نے مغربی ادیبوں کے نام کے بل بوتے پر جب ہاتھ میں ڈنڈا اٹھایا تو پھر اردو کے کسی قلمکار کو شاید ہی بخشا ہو۔ نقادوں کو تو بالکل بھیگی بلی بنا کر رکھ دیا تھا۔ اردو کے ادیب اور نقاد اس قدر احساسِ کمتری کے شکار ہو گئے تھے کہ کسی نے بھول کر بھی ان مغرب زدہ نقادوں پر لگام لگانے کا خیال تک دل میں نہ آنے دیا۔" "لیکن استاد اب تو ان نقادوں کا نام... ، ہماری بات درمیان میں ہی اچکتے ہوئے موصوف بول اٹھے یار" جیتے جی تو شیر کی طرح غراتے ہی رہے ...، ہاں، دیکھو! بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہم جدید ادب کی بات کر رہے تھے۔ تو فی الحال کام چلانے کے لیے اتنا سمجھ لو کہ اگر کوئی تخلیق پڑھ چکنے کے بعد معاً غالب کا یہ شعر ذہن میں عود کر آئے کہ ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

تو سمجھ لو کہ وہ تخلیق جدید ادب کے لیے کوالیفائی (Qualify) کر جائے گی اور اگر تخلیق پڑھتے وقت یا فارغ ہونے کے بعد اس میں کچھ مقصد کی جھلک بھی نظر آ جائے تو اس تخلیق کے لیے جدید ادب میں گنجایش مشکل سے نکل پائے گی کیونکہ جدید ادب "ادب کے لیے ہوتا ہے، دنیاداری کے لیے تو تمام شعبے ہیں ادب کو بھی اگر دنیاوی مایا جال میں پھنسا دیا

جائے تو کیا بات ہوئی بھلا؟ ویسے اس ادب میں ایک سہولت تو بہر حال ہے ہی۔ آپ کچھ بھی لکھیے۔ وہ شعری تخلیق معلوم ہو یا نثر نما لگے، بس اس کا مطلب کچھ نہ نکلتا ہو تو اسے آنکھ بند کر کے جدید ادب کے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر اسے کٹ بیٹھی کی طرح بوجھتے رہیے۔ آپ کی اڑان جہاں تک جا سکے، اڑتے رہیے۔ تھک جائیں تو اتر آئیے۔" اس کڑ جال سے گھبرا کر ہم نے جلدی سے ایک نیا شوشہ چھوڑ دیا۔ حضور! یہ لبصری (تبصرہ نگاری) کیسی رہے گی: یہ خیال بھی کوئی خاص برا نہیں: استاد نے قدرے حوصلہ افزائی کی. لیکن اچانک ہمیں کچھ یاد آگیا اور ہم نے تشویش کے ساتھ عرض کیا۔ "اس میں تو یوں موٹی موٹی کتابیں خواہ مخواہ پڑھنا پڑیں گی؛" استاد نے معنی خیز تبسم کے ساتھ فرمایا۔ برخوردار! یہ ایک عام غلط فہمی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کتاب پڑھے بغیر تبصرہ کرنا زیادہ آسان اور سیف محفوظ ہوتا ہے۔ اگر آپ نے کتاب پڑھ کر تبصرہ کرنے کی حماقت کی تو پھر شاید ہی کوئی فنکار آپ سے خوش رہ سکے کیونکہ حقیقت بہر حال تلخ ہوتی ہے، اس لیے محتاط طریقہ یہی ہے کہ صرف شوکیس (SHOW CASE) یعنی گٹ اپ، کتابت و طباعت تک ہی محدود رہیے۔ اندر جھانکنے کی کوشش کی تو پھر مسائل و مصائب سے مفر نہیں...... یا رکسی کو جنرل قسم کی تعریف کے دو بول میں کیا لگ جائے گا۔ تبصرے میں سلاست، بلاغت اور غلاظت...... معاف کرنا، سچ بات منہ میں روکے رہنا بھی اتنا آسان نہیں خیر! قصہ مختصر یہ کہ اسی طرح کے چند الفاظ لکھ دینے میں کچھ چلا نہیں جائے گا اور فی الوقت ادب میں یہ کاروبار ایسا ہے کہ ہڑے لگے نہ پھٹکری اور رنگ آئے چوکھا۔ اگر آپ فرضی تبصرے میں ماہر ہو گئے تو پھر ادباء اور شعراء آپ کے آگے پیچھے گھومنے لگیں گے یا اس حوصلہ افزائی پر تو ہم خوشی سے جھوم اٹھے اور عرض کیا حضور! اس کاروبار میں تو فائدہ یقینی ہے کیونکہ اتنی ڈھیر کتابیں مفت ہمارے ہاتھ لگتی رہیں گی جنھیں اپنے دوست کتب فروش کی مدد سے فروخت کر کے اچھی کمائی کی جا سکتی ہے ارشاد ہوا آپ تو بالکل کورے نکلے اس معاملے میں۔ ارے میاں! اگر وہ بکنے والی کتابیں ہوں تو اتنی فراخدلی سے تبصرے کے لیے کیوں بھیجی جائیں؟ مصنف تو کتابیں تبصرے کے لیے بھیج بھیج کر گھر میں خواہ مخواہ پھنسی جگہ خالی کرتا ہے۔

استاد کی زبان مبارک سے یہ کلمات سنتے ہی ہمارا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور ہم تقریباً نارمل (NORMAL) ہوتے ہوئے کسی اور کاروبار کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

معصوم عزیز کاظمی
آئی۔پی۔ایس
لہریا سرائے۔ دربھنگہ

پروفیسر عبدالمغنی۔ دیدہ و شنیدہ

محبت اور عقیدت میں ایک نازک فرق ہے۔ محبت دل کو سرشاری عطا کرتی ہے اور عقیدت تعظیم کا درس دیتی ہے۔ محبت ابتدا ہے اور عقیدت انتہا۔ محبت شناسائی کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور عقیدت تقلید کی طرف گامزن کرتی ہے۔ استاد سے شاگرد کے رشتے کی ابتدا محبت سے ہوتی ہے اور عموماً اسکا اختتام عقیدت پر ہوتا ہے۔ محبت سے عقیدت کا سفر خوش کن تو ہے لیکن جب کوئی شخص عقیدت کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو اس پر کچھ لکھنا ایک مشکل امر بن جاتا ہے۔ عبدالمغنی صاحب میرے استاد رہے ہیں اور کثیرالجہت شخصیت کے مالک ہیں۔ مجھ جیسے کم علم کے لیے ایک مختصر مضمون میں ان کے اوصاف کا احاطہ شاید ممکن نہیں ہے لیکن میرا یہ یقین ہے کہ اگر شخصیت دل نواز ہو تو اس کے نقش ہر حال میں ابھر ہی آتے ہیں۔

بیسوی صدی کی ساتویں دہائی میں تعلیمی فضا کچھ مختلف تھی۔ استاد اور طالب علم کا رشتہ گرو اور شِسیہ کا تو نہ تھا لیکن استاد کے دل میں شاگرد کے لیے شفقت اور شاگرد کے دل میں استاد کا احترام باقی تھا۔ ان دنوں پٹنہ کالج کا شمار بہار کے چند بہترین کالجوں میں ہوا کرتا تھا۔ اس کالج کے طالب علموں کے متعلق یہ عام خیال تھا کہ اگر قسمت نے وفا کی تو ڈپٹی کلکٹری کہیں نہیں گئی ہے۔ مجھے اس کالج میں داخلہ ۱۹۶۲ء میں ملا۔ مجھ جیسے اوسط درجے کے طالب علم کو پٹنہ کالج کی بلند عمارتیں اور اس کے شہرت یافتہ اساتذہ مرعوب کرنے کے لیے کافی تھے۔ میں کچھ دنوں تک اپنے آپ کو اس کالج کے ماحول میں صحیح طور پر ڈھال نہ سکا اور ذہنی پس و پیش کی بنا پر کلاسوں سے غائب رہنے لگا۔ جن مضامین کے کلاسوں سے میں غائب رہنے لگا تھا ان میں انگریزی بھی شامل تھا۔ عبدالمغنی صاحب انگریزی ادب کے استاد تھے لیکن ان کا انداز جداگانہ تھا۔ وہ اپنے لباس، رکھ رکھاؤ، طرز

گفتگو سے مشرقی تہذیب کے نمایندہ نظر آتے تھے۔ پہلی نظر میں میں نے انھیں اردو ادب کا استاد سمجھا۔ گٹھیلا بدن' میانہ قد' گندمی رنگ' کتابی چہرہ' روشن آنکھیں اور چہرے پر شرعی داڑھی کے ساتھ جب وہ کلاس لینے کمرے میں داخل ہوئے تو کچھ لڑکے سرگوشیوں میں ان کے لیے "مولانا" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ نظریں نیچی کیے ہوئے وہ طلبا کی حاضری کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد درس کی ابتدا کرتے اور اختتام تک اسی انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ ان دنوں بھی عبدالمغنی صاحب کا شہرہ اردو ادب میں تھا۔ بہار میں اس وقت جمیل مظہری کی شاعری قاضی عبدالودود کی تحقیق' کلیم الدین کی تنقید اور حسن عسکری کی تاریخ نویسی کے ساتھ اختر اورینوی کی شعلہ بیانی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ان باکمال ہستیوں کی موجودگی میں اپنا چراغ روشن کرنا سہل نہ تھا۔ عبدالمغنی صاحب مدرسے کے سند یافتہ تھے۔ مدرسہ اسلامیہ اورنگ آباد سے فوقانیہ کا امتحان درجہ اول میں پاس کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۵۳ء میں مدرسہ شمس الہدا پٹنہ سے عالم کی سند حاصل کی اور مدرسہ ایجوکیشن بورڈ بہار کے اس امتحان میں سارے بہار میں اول آئے تھے۔ مدرسہ شمس الہدا میں طالب علمی کے دوران مدرسہ کے انتظامیہ کے طریقہ کار پر عبدالمغنی صاحب نے کچھ آواز اٹھائی جس کی پاداش میں پہلے ان کے امتحان کے نتیجے اور بعد میں وظیفے کی رقم پر روک لگادی گئی تھی۔ شرط یہ تھی کہ عبدالمغنی صاحب اپنی غلطی تسلیم کر کے معافی کے خواستگار ہوں لیکن انھوں نے آزمایش کے اس وقت میں بھی اصولوں سے سمجھوتہ کرنا صحیح نہیں سمجھا۔ اس واقعہ نے بقول ان کے ان کی تعلیمی راہ کا رخ موڑ دیا۔ عالم کی سند حاصل کرنے کے بعد مدرسہ کی تعلیم کو خیر باد کہہ کر انھوں نے ۱۹۵۴ء میں میٹرک کا امتحان ضلع اسکول گیا سے درجہ اول میں پاس کیا۔ پٹنہ کالج میں داخلہ لے کر ۱۹۵۶ء میں آئی اے اور ۱۹۵۸ء میں امتیاز کے ساتھ انگریزی امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۰ء میں ایم اے کرنے کے بعد بہار پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ انگریزی کے لیکچرار کی حیثیت سے منتخب کیے گئے۔ مدرسہ کی تعلیم نے انھیں اردو' فارسی اور عربی زبان پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ اسلامی تاریخ کے مطالعہ کا موقع فراہم کیا۔ انھیں اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر ہے اور وہ کسی بھی طرح کی ذہنی احساس کمتری سے مبرا ہیں۔ ان کی نظر میں مشرق کو مغرب پر فوقیت حاصل ہے۔ مشرق کو یہ ادب اور تہذیب کا گہوارہ مانتے ہیں اور دنیا کی رہنمائی کا حق انھوں نے مشرق کو دے رکھا ہے۔ ۱۹۵۱ء کے بعد عبدالمغنی صاحب کے مضامین بہ کثرت ہندو پاک کے مختلف جرائد میں شائع ہونے لگے۔ ان مضامین میں وہ اپنے نقطۂ نظر کا برملا اظہار کرتے تھے جن کی پذیرائی ہوتی تھی۔ غالب صدی

کے موقع پر عبدالمغنی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں غالب کو اسلامی تہذیب کا نوحہ گر ثابت کرنے کی کوشش کی جس پر کافی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ اسلامی ادب کے نظریے پر بھی ان پر کافی اعتراضات ہوئے لیکن وہ اپنی رائے پر ثابت قدم رہے اور ان میں کسی طرح کی تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

تقسیم ہند بالخصوص بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں پاکستانی رسائل کی حصولیابی ایک مشکل امر تھی۔ رسالہ 'نگار' اور 'نقوش' کا ان دنوں کافی شہرہ تھا اور ادب کا ہر سنجیدہ طالب علم ان کی حصولیابی کا مشتاق نظر آتا تھا۔ کتب و جرائد کی حصول یابی میری بھی ایک کمزوری تھی اور میں ان کی تلاش میں سبزی باغ پٹنہ کے کتب فروشوں کے پاس حاضری دیا کرتا تھا۔ کتاب منزل میں نقوش کے کچھ شمارے تبادلے کی شکل میں آیا کرتے تھے لیکن ان شماروں کو حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ ایک دن کتاب منزل کے خلیل خاں صاحب نے یہ مژدہ سنایا کہ نقوش عارینا جمیل مظہری، اختر اورینوی، کلیم الدین احمد، اور عبدالمغنی صاحب کے پاس بھی آتا ہے۔ کلیم الدین احمد کے پاس جانے کی جراءت ان دنوں مجھ میں نہیں تھی اور میرے ہمراز ممتاز حسین اشرف اس رسالے کو اختر صاحب کے پاس سے حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہ کر سکے کیونکہ اس عمل میں انھیں اپنا فرسٹ کلاس خطرے میں نظر آنے لگا تھا۔ جمیل مظہری صاحب کے پاس نقوش کا جو شمارہ آتا تھا اسے پٹنہ کالج کے ہیڈ کلرک غلام یحییٰ صاحب اپنی تحویل میں لے لیا کرتے تھے اس لیے منصوبہ یہ بنایا گیا کہ کسی کے توسط سے یہ رسالہ عبدالمغنی کے پاس سے حاصل کیا جائے۔ مصلح الدین صاحب (مرحوم) جن سے میرا دور کا رشتہ تھا عبدالمغنی صاحب کے رشتے میں سالے تھے، میں نے انھیں عبدالمغنی صاحب سے رسالہ حاصل کرنے کی ترغیب دی اور ان کے توسط سے رسالہ جب مجھے مل گیا تو پوری ادبی بددیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں وہ رسالہ ہضم کر گیا۔ رسالہ ہضم کرنے کا یہ طریقہ کار زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ بی اے۔ کے دو سال مکمل ہونے کے بعد امتحانات کے فارم پُر کرنے کا وقت جب آیا تو یہ معلوم ہوا کہ انگریزی کے کلاس میں لیکچر کم ہیں اور اس بنا پر مجھے امتحان میں شامل ہونے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ اس صورت حال نے مجھے ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا اور میں نے کالج کے ہیڈ کلرک غلام یحییٰ صاحب سے اس مشکل کا کچھ حل نکالنے کی گزارش کی۔ یحییٰ صاحب نے میری باتیں گوش گزار کرنے کے بعد اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بے نیازانہ انداز میں فرمایا کہ اگر کوئی انگریزی کا استاد مجھے دس لکچر عطا کر سکتا ہے تو امتحان میں شامل ہونے کی اجازت مل جائے گی۔ میں نے اپنے ذہن میں انگریزی کے سبھی

اساتذہ کا جائزہ لیا اور میری نظر انتخاب عبدالمغنی صاحب پر ٹھہری۔ ندیمؔ یحیٰی صاحب نے مجھے ایک تعارفی خط دے دیا اور میں ایک شام عبدالمغنی صاحب کے در پر دست سوال لیے حاضر تھا۔ ان دنوں عبدالمغنی صاحب محلہ لال باغ کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ انھوں نے مجھے اندر بلایا اور یحیٰی صاحب کا خط پڑھ کر بغیر کچھ پوچھے دس لکچر مجھے عطا کر دیے۔ کچھ لمحے تک میں حیران کھڑا رہا کیونکہ مجھے یہ امید تھی کہ استاد سے ڈانٹ پھٹکار سنی پڑے گی لیکن جس انداز سے میری پذیرائی ہوئی اس کا نقش آج بھی میرے ذہن میں برقرار ہے۔ عقل اس بے نیازی پہ حیران تھی اور دل اس مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے آمادہ تھا لیکن خود پر طاری شرمساری نے مجھے مفلوج کر رکھا تھا اور میں کچھ کہے بغیر ہی زینہ سے نیچے اتر آیا۔

عبدالمغنی صاحب ان دنوں اردو تحریک سے بھی وابستہ تھے۔ ظہور آزادی کے بعد اردو پر جو عتاب نازل ہوا اور اس زبان کو ہر سطح پر جس بے اعتنائی کا سامنا کرنا پڑا اس کی روداد طویل ہے۔ عبدالمغنی صاحب اس صورت حال سے مغموم تھے لیکن وہ مایوس نہیں تھے۔ انھیں یقین تھا کہ عوامی سطح پر بولی جانے والی یہ زبان جو مشترکہ تہذیب کی نمایندگی کرتی ہے آزاد ہندستان میں اپنا جائز حق ضرور حاصل کرے گی۔

انجمن ترقی اردو ہند سے وابستگی کے بعد انھوں نے اس کی ممبر سازی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اسے ایک فعال ادارہ بنایا۔ بہار میں انجمن ترقی اردو کے دو دھڑوں میں بٹ جانے کے بعد بھی عبدالمغنی صاحب اردو کے کارواں کو آگے لے جانے کے لیے برسرپیکار رہے۔ پورے وسائل فراہم نہ ہونے کے بعد بھی انھوں نے انجمن ترقی اردو ہند کا کل ہند اجلاس پٹنہ میں منعقد کیا۔ ممبر سازی کے ساتھ چندے کی مہم بھی شروع کی گئی اور یہ کل ہند سہ روزہ اجلاس جب بحسن و خوبی اختتام تک پہنچا تو سبھوں کی زبان پر ان کے لیے مرحبا اور آفریں کا لفظ تھا۔ اس اجلاس کے ایک جلسے میں اردو کے مستقبل پر خلیق انجم، گوپی چند نارنگ اور دیگر حضرات اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر چکے تھے۔ ان کی تقاریر کا انداز مؤدبانہ اور خطاب گزارشانہ تھا لیکن جب عبدالمغنی صاحب اپنی بات کہنے کے لیے ڈائس پر آئے تو انھوں نے مختصر الفاظ میں جارحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں یہ کہا کہ بہار کی دوسری سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہو سکتی ہے اور بہار کا اردو داں طبقہ اس سے کچھ کم قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ عبدالمغنی صاحب کے اس اعلان پر خوب تالیاں بجیں لیکن کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ خدشہ بھی ابھرا کہ کہیں ان پر کوئی عتاب نازل نہ ہو۔ عبدالمغنی صاحب ان باتوں سے بے نیاز ہر مجلس، ہر محفل، ہر

جلسہ اور نجی گفتگو میں اپنے اس دعوے کو دہراتے رہے اور بالآخر ۱۹۸۰ء میں اردو کو بہار میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے میں کامیاب ہوئے۔ اس کامیابی کا سہرا اگر کسی ایک کے سر پر باندھا جاسکتا ہے تو وہ واحد شخصیت عبدالمغنی صاحب ہیں۔ اردو زبان سے دیوانگی کی حد تک محبت نے ان سے یہ کام کروالیا۔ زبان کے سہ لسانی فارمولے کو عمل میں لانے کے وقت عبدالمغنی صاحب نے یہ آواز اٹھائی کہ تین زبانوں کی تعلیم کو لازمی قرار دیتے وقت اردو کو ہی اس میں شامل کیا جائے۔ عصمت چغتائی اور کچھ دیگر حضرات نے جب اردو کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کی آواز اٹھائی تو عبدالمغنی نے بلا تامل یہ کہا کہ اردو اپنے موجودہ رسم الخط میں ہی برقرار رہ سکتی ہے۔ اردو کا رسم الخط تبدیل کرنے کی وکالت کرنے والے اسے برہنہ کرکے اس کی پسپائی کی سازش کر رہے ہیں اور ایسے لوگ اردو دوست نہیں ہیں۔ دیوناگری رسم الخط میں اردو کی پہچان ختم ہو جائے گی اور ایک دن یہ زبان فنا ہو جائے گی۔

عبدالمغنی صاحب انگریزی کے استاد رہے ہیں لیکن اردو کو انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا ہے بحیثیت تنقید نگار۔ انھوں نے اپنی الگ راہ نکالی اور اپنی تخلیقات میں اسلامی اقدار کی تلاش انھوں نے جاری رکھی۔ انھیں اس بات کا کامل یقین ہے کہ انسان کے ذہن اور شخصیت کی تعمیر میں اس کی تہذیبی روایات بہت اہم رول کرتی ہیں۔ کسی بھی مصنف کی تخلیق میں اس کے علاقائی اور تہذیبی عوامل کا اثر انداز ہونا لازمی ہے۔ کلیم الدین احمد نے اقبال پر جب اپنی کتاب "اقبال کا ایک مطالعہ" لکھی تو اردو ادب بالخصوص شائقین اقبال میں کہرام مچ گیا۔ کلیم الدین احمد ایک بت شکن نقاد تھے اور انھوں نے اقبال پر کاری ضرب لگائی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت میں میرا بھی کچھ دخل تھا اور اس کا عرضِ ناشر' میں نے لکھا تھا۔

عبدالمغنی صاحب سے ملنے جب میں وارثی کنج' پہنچا تو انھوں نے کلیم صاحب کے خیالات اور نظریات کو رد کرتے ہوئے کہا کہ کلیم صاحب نے پہلی بار کسی شاعر کی شاعری کے پرکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی فکر پر نظر ڈالی ہے لیکن وہ اس کا حق ادا نہیں کرپائے ہیں۔ اس نشست میں سہیل عظیم آبادی نے عبدالمغنی صاحب کی بات سن کر یہ کہا کہ کلیم الدین احمد نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کا حق ہے اور وہ اس کے لیے گردن زدنی کے قابل نہیں ٹھہرائے جاسکتے۔ عبدالمغنی صاحب نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہ انھیں اس بات پر اعتراض نہیں ہے کہ کلیم الدین احمد نے اقبال پر کیوں اعتراض کیا بلکہ انھیں یہ

شکایت ہے کہ کلیم الدین احمد نے شہرت کی طلب میں حقیقتوں کو توڑ مڑوڑ کر پیش کیا ہے۔ عبدالمغنی صاحب کی بات سن کر سہیل عظیم آبادی نے یہ رائے دی کہ اگر وہ ایسا سمجھتے ہیں تو کلیم الدین صاحب کے اعتراضات کا مفصل جواب دیں۔ میں نے سہیل عظیم آبادی کی رائے کی تائید کی اور کہا کہ کری سینٹ پبلیشنگ ہاؤس اس کتاب کو بھی شائع کرے گا۔ عبدالمغنی صاحب نے دو مہینے کے وقفے کے بعد "اقبال اور عالمی ادب" کا مسودہ مرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا کہ اسے جلد سے جلد شائع کرانے کی کوشش کی جائے۔ میں نے "اقبال اور عالمی ادب" کے مسودے پر ایک نگاہ ڈالی تو پایا کہ سارے صفحات بغیر کسی کانٹ چھانٹ، ترمیم و اضافے کے لکھے گئے ہیں۔ میں نے عبدالمغنی صاحب سے پوچھا کہ یہ مسودہ صاف کیا ہوا ہے یا اس میں کسی اضافے کی گنجائش ہے۔؟ میری بات سن کر انھوں نے کہا کہ جب وہ لکھتے ہیں تو ان کے ذہن میں موضوع کے لیے بھرپور مواد موجود رہتا ہے اور وہ بغیر کسی تذبذب کے اپنے خیالات کو صفحے پر اتار دیتے ہیں جس میں کانٹ چھانٹ اور ترمیم و اضافے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ "اقبال اور عالمی ادب" جب شائع ہوئی تو کچھ لوگوں نے اسے ایک مناسب جواب بھی گردانا لیکن کچھ لوگوں کی نظر میں عبدالمغنی صاحب نے اس کتاب میں دفاعِ اقبال سے آگے بڑھ کر ذاتِ کلیم تک پہنچ گئے تھے۔ اس کتاب میں عبدالمغنی صاحب نے اقبال کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر گردانا تھا۔ پروفیسر ادیب حسن ادیب کو ان کے اس خیال سے اتفاق نہیں تھا۔ انھوں نے ایک نشست میں مجھ سے یہ سوال کیا کہ کیا عبدالمغنی صاحب سنسکرت، تامل، جرمن، فرنچ، روسی، چینی و دیگر زبانیں جانتے ہیں اور اگر نہیں جانتے ہیں تو پھر انھوں نے یہ فیصلہ کیسے صادر کر دیا کہ اقبال دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہے؟۔ آگہی کے بغیر فیصلہ دینے کا حوصلہ بقول ادیب حسن ادیب بجا نہیں ہے۔

قرآن مغنی صاحب کا ایمان ہے اور اقبال عشق۔ دورانِ سفر بھی قرآن اور کلیات اقبال ان کے ساتھ رہتا ہے۔ قرآن کے احکامات کی پیروی ان کی زندگی کا نصب العین ہے اور اقبال کی شاعری ان کے ذہن کو جلا بخشتی ہے۔ قرآن کا انگریزی ترجمہ اور تفسیر سے مغنی صاحب مطمئن نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی زبان میں جن لوگوں نے قرآن کا ترجمہ کیا اور تفسیر لکھی ان میں سے کچھ جذبۂ ایمانی سے سرشار تھے لیکن انھیں انگریزی زبان پر پوری قدرت نہ تھی اور کچھ جنھیں انگریزی زبان پر قدرت حاصل تھی وہ ایمان کی روشنی سے محروم تھے عبدالمغنی صاحب ان دنوں قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ کرنے میں

معروف ہیں۔ بارہ پارے کا ترجمہ مکمل کرنے کے بعد وہ مطمئن ہیں اور انھیں یقین ہے کہ پہلی بار دنیا کے سامنے قرآن کا صحیح انگریزی ترجمہ سامنے آئے گا۔ اسلامی دنیا بالخصوص انگریزی داں حضرات عبدالمغنی صاحب کے "The Quran- An Authentic Modern Idiomatic English Translation" کی اشاعت کی منتظر ہے۔ اقبال کو وہ ایک آفاقی اور دنیا کا سب سے منظم شاعر مانتے ہیں۔ اقبالیات پر چھ ضخیم کتابیں تصنیف کرنے کے بعد بھی ان کا یہ خیال ہے کہ ان سے اقبال کا حق ادا نہیں ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج تک اقبال کی فارسی شاعری پر بہت کم لکھا گیا ہے اور اس بیش قیمت سرمایے کی خوبیاں اجاگر نہیں ہو پائی ہیں اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عنصر پر بھی اب تک کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ یہ دونوں موضوع ان کے خیال میں آج بھی تشنہ ہیں جن پر وہ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ادب اور مذہب کے ساتھ سیاست بھی ان کی دلچسپی کا خاص موضوع ہے۔ ادب' مذہب اور سیاست کو وہ ایک مہذب سماج کے تین بنیادی عناصر گردانتے ہیں۔ ادبی مذاکرے کے ساتھ میلاد خوانی کی مجلس میں خضوع و خشوع کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ عملی سیاست میں اپنے پسندیدہ امیدوار کے لیے بہ نفس نفیس پرچار کرنے میں انھیں کوئی عار نہیں ہے۔ علامہ شبلی' علامہ اقبال' مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ان کی نظر میں مشرق سے ابھرنے والے عصر حاضر کے بہترین دماغ ہیں۔ ان شخصیات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ بات ابھر کر سامنے آئے گی کہ یہ بھی مختلف نظریات کے حامل تھے لیکن ان میں ایک قدر مشترک تھی کہ ان سبھوں نے صالح انسانی قدروں کو فروغ دیا اور مختلف نہج پر اردو ادب کی آبیاری کی ہے۔

عبدالمغنی صاحب عالم با عمل ہیں۔ اللہ نے انھیں درد مند دل عطا کیا ہے۔ خالق کی اطاعت کے ساتھ مخلوق کی بقا اور سلامتی کے وہ آرزو مند ہیں۔ لیکچرر سے وائس چانسلر تک کا سفر انھوں نے شان بے نیازی کے ساتھ طے کیا ہے اور ہر گام پر ثابت قدم رہے ہیں۔ آج کے اس دور میں جہاں انسان کی پہچان علم کے بجائے اس کے نصب سے کی جا رہی ہے عبدالمغنی صاحب نے اپنی شناخت اپنے عمل سے بنائی ہے۔ وہ اصول مرتب نہیں کرتے ہیں بلکہ صالح اصولوں پر عمل پیرا ہیں زندگی کا سفر انھوں نے طمطراق سے طے نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے اپنی ذات کی وہ شمع روشن کی ہے جو مینارۂ نور ہے۔ اللہ اس شمع کو تادیر روشن رکھے تاکہ تاریکی کا حوصلہ کم ہو۔

خالد عرفان
(نیویارک)

شہنشاہ ظرافت دلاور فگار

ایک شاگرد کا خراج عقیدت

جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے حضرت دلاور فگار کو پہلی مرتبہ اس وقت سنا جب میرا فکری رجحان بلوغت کو نہیں پہنچا تھا۔ دلاور فگار آل انڈیا ریڈیو سے ہر ہفتہ اپنی مزاحیہ نظم سنایا کرتے تھے اور میں پانچویں جماعت کے طالب علم کی حیثیت سے شعر سے ناواقفیت کے باوجود ان کی شاعری کو غور سے سنا کرتا تھا۔ ان کی نظمیں اگرچہ سمجھ میں نہیں آتی تھیں لیکن ان کی روانی اور دلاور فگار کے انداز بیان کی وجہ سے میں ان کی شاعری کی طرف کھنچا چلا گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت دلاور فگار کی شخصیت اور شاعری کی سماعت میری شعری تربیت کی پہلی درس گاہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ پھر یہ ہوا کہ وہ پاکستان آگئے اور ان کی شاعری کا منبع اگرچہ بھارت سے پاکستان منتقل ہو گیا لیکن ان کی شہرت میں پاکستان ٹی وی کی وجہ سے چار چاند لگتے چلے گئے۔ جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو وہ "کے ڈی اے" میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدہ پر فائز تھے۔ اس کے علاوہ فیض کے عبداللہ ہارون کالج میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے کام کررہے تھے۔ نوکری کہیں کی بھی ہو درس وتدریس کی یا سرکاری ادارے کی انھوں نے اچھی شاعری میں کبھی بھی مصلحت سے کام نہیں لیا۔

ان کے اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ دلاور فگار نے وہی کچھ لکھا جس کے لیے ان کے دل نے گواہی دی۔

ان کی زندگی سادہ مگر پُروقار تھی۔ انھوں نے برسر اقتدار لوگوں کے قصیدے نہیں لکھے۔ افسروں کی خوشامد نہیں کی۔ یہ ضرور ہے کہ اپنے فقیرانہ مزاج کی وجہ سے انھیں بہت سے نقصانات بھی ہوئے لیکن انھوں نے برداشت کر لیے۔ ہندستان میں جب وہ رہائش پذیر تھے تو مہندر سنگھ بیدی سے لے کر صدر مملکت تک ان کے فن کے

مداح تھے ۔ کوئی مشاعرہ ان کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ ہندستان میں مستقل ملازمت اور انھوں مداحوں کی محبت کو چھوڑ کر وہ پاکستان کی محبت میں ہجرت کر کے آگئے تھے لیکن حالات کو لوہیں وہ آخری وقت تک ایک معمولی سے مکان میں کرایے دار کی حیثیت سے مقیم رہے۔ معلوم ہوا ہے کہ انتقال سے چند یوم قبل ان کے مالک مکان نے مکان خالی کرنے کے لیے کہا ہوا تھا۔ خیال ہے کہ یہی فکر ان کی موت کا سبب بنی اور اس طرح ظرافت کا شہنشاہ کرایے کے مکان میں انتقال کر گیا۔

ان کے مزاج میں ایک عجیب قسم کی بے چینی اور تجسس پایا جاتا تھا۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں شعراء میں سب سے زیادہ ان سے قریب رہا ہوں۔ نارتھ کراچی میں قیام کے دوران وہ ہر جمعہ کی صبح کو میرے غریب خانے پر تشریف لاتے تھے۔ ان کی گفتگو ادب، سیاست اور حالات حاضرہ پر محیط ہوتی تھی۔ پاکستان میں جب سے طنزیہ مزاحیہ مشاعروں کے فروغ میں جہاں ضیاء الحق قاسمی کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا وہاں جناب دلاور فگار کی شخصیت نے بھی ان تقریبات کو اپنی شاعری سے زینت بخشی۔ انھوں نے مشاعروں میں کبھی کسی کے کہنے پر شرکت نہیں کی۔ وہ وہی کرتے تھے جو ان کا دل چاہتا تھا۔ حیدر آباد دکن میں مشاعرہ ہو یا دبئ میں، اسلام آباد ٹی وی پر مزاحیہ مشاعرہ ہو یا، امریکہ میں، اگر وہ اپنی سہولیات، آرام اور سفر سے مطمئن نہیں ہوتے تو جانے سے صاف انکار کر دیتے تھے۔ وہ کبھی مشاعروں کے پیچھے نہیں بھاگے بلکہ وہ مشاعروں کی ضرورت سمجھے جاتے تھے۔ مشاعروں میں ان کی کامیابی یقینی سمجھی جاتی تھی۔ ہندستان کے معروف مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے مشاعروں میں ان کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ "دلاور فگار مشاعرہ لوٹ رہے تھے اور پولیس تماشا دیکھ رہی تھی۔" ان کا نازک مزاجی کا یہ عالم کہ ایک مرتبہ مجتبیٰ ضیاء الحق قاسمی انھیں کمشنر کراچی کے پاس ملاقات کی غرض سے لے کر گئے۔ سکریٹری نے کہا پانچ منٹ انتظار کرنا ہوگا۔ آپ اس بات پر فوراً واپس آگئے۔ اس کے بعد ضیاء الحق قاسمی کو کبھی ان سے اس قسم کی بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کئی مرتبہ ٹی وی اور ریڈیو کے دعوت ناموں کو یہ کہہ کر ضائع کر دیا کہ پروڈیوسر خود نہیں آیا۔ اسی طرح امریکہ جانے والے ایک دعوت نامے اور ٹکٹ کو ضائع کر دیا۔ وہ دنیاداری کے معاملات سے قطعی ناواقف تھے۔ مجھے دبئ کے علاوہ پاکستان کے بہت شہروں میں ان کے ساتھ مشاعروں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ بازار میں خریداری کرنا ہو یا ریل ٹکٹ کا حصول یہ سب کام ان کے لیے ناممکن تھے

کیونکہ انھیں تو خدا نے کسی اور ہی کام کے لیے پیدا کیا تھا۔ کراچی میں شائع ہونے والی کتابوں پر سب سے زیادہ دلاور فگار نے نظمیں لکھی ہیں۔ یہ انھیں کا کمال تھا کہ نوائے وقت میں کئی برس تک روزانہ حالات حاضرہ کے موضوعات پر نظمیں لکھتے رہے۔

ہندستان سے پاکستان کے سفر تک تازہ ترین خبروں پر نظمیں لکھنے کا آغاز بھی انھوں نے کیا۔ انھوں نے طنز و مزاح میں جس اسلوب کی بنیاد رکھی وہ انھیں کا حصہ ہے۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کے حوالے سے سب سے زیادہ متنوع موضوعات دلاور فگار کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ان کی نظمیں کراچی کا قبرستان، شاعر اعظم، گدھے کا قتل، عشق کا پرچہ، معرکتہ لآرا نظمیں ہیں جن کی مزاحیہ شاعری میں مثال نہیں ملتی۔ مجھے ان کی شاعری کے بارے میں کوئی دعوا نہیں لیکن میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب شاید ہی طنز و مزاح میں کوئی دوسرا دلاور فگار پیدا ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب پہلی مرتبہ میں نے ان کے سامنے اپنی غزل اصلاح کے لیے پیش کی تو انھوں نے لاپروائی سے اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔ شاید یہی ان کا سکھانے کا کوئی انداز ہو۔ ان کے اس عمل سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید میں آج اس قابل نہ ہوتا۔

مجھے افسوس ہے میں دلاور فگار کا آخری دیدار بھی نہ کر سکا جب مجھے پاکستان سے اشرف قریشی نے فون پر بتایا کہ دلاور فگار کا انتقال ہو گیا تو مجھے افسوس ہوا کہ میں یتیم ہو گیا، میرا سرپرست اس دنیا سے چلا گیا۔ طنز و مزاح کا باب بند ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب جناب حنیف اخگر نے دلاور فگار کو امریکہ آنے کی دعوت دی تھی تو انھوں نے کہا تھا کہ میرے ساتھ خالد عرفان بھی جائے گا۔ پھر یہ ہوا میں امریکہ آ گیا، میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہی رہا اور وہ راہی ملک عدم ہو گئے۔ انھیں میری کتنی فکر تھی۔ یہ تو صرف ضیاء الحق قاسمی ہی بتا سکتے ہیں یا پھر میرے گھر والے جنھیں فون کر کے وہ میری خیریت دریافت کرتے رہتے تھے۔ برادرم ارشد عثمانی سے جب ان کی دبئی میں ملاقات ہوئی تو انھوں نے جس محبت سے میرے بارے میں دریافت کیا اس جذبہ کو صرف میں ہی محسوس کر سکتا ہوں۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ میں ان کی کوئی خدمت نہ کر سکا لیکن یہ ان کی محبت کا ثبوت ہے کہ وہ مجھے جاتے جاتے خالد عرفان بنا گئے۔

دلاور فگار برصغیر پاک و ہند کے ممتاز اور مقبول طنز و مزاح نگار شاعر تھے۔ منفرد شگفتہ انداز بیان رکھتے تھے۔ ان کے کلام سے محظوظ ہونے کے لیے ذہن پر زور نہیں

ڈالنا پڑتا۔

۸ر جولائی ۱۹۲۹ کو بدایوں (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے معاشیات اور ایم اے اردو کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ابتدائی دور میں غزلیں کہتے رہے۔ آٹھ دس برس تک غزل کے کوچہ میں راہ نوردی کرنے کے بعد طنز و مزاح کی طرف مائل ہوئے اور مزاحیہ شاعری میں قد آور شخصیت بن گئے۔۱۹۶۶ء میں ہندستان سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں سکونت اختیار کرلی۔ سرکاری ملازمت بھی کی اور پرائیوٹ نوکری بھی۔ لیکن ان کا اصل میدان مزاحیہ شاعری ہی رہا جس میں وہ منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے دس دیوان شائع ہوچکے ہیں جن میں "ستم ظریفیاں" "شامت اعمال،، آداب عرض "، "انگلیاں فگار اپنی "، "از سر نو"، "مطلع عرض ہے"، "سنچری" مزاحیہ مجموعے ہیں۔ ان کا تازہ ترین مجموعہ "خدا جھوٹ نہ بلوائے" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں منتخب کلام پیش کیا گیا ہے۔

شاعری کے حوالے سے دلاور فگار، اکبر الہ آبادی اور رئیس امروہوی سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ سماجی اور قومی مسائل پر بہت کچھ کہا ہے اور خوب کہا ہے۔ طنز کی بجائے مزاح کی طرف طبیعت زیادہ مائل ہے لیکن طنز بھی جہاں کہیں کیا ہے اپی مثال آپ ہے مثلاً "لے کے رشوت پھنس گیا ہے دے کے رشوت چھوٹ جا" ایک ضرب المثل بن چکا ہے۔

روز مرہ کے مسائل کے علاوہ ادبی موضوعات پر بھی بے شمار نظمیں لکھی ہیں اور ایسے پہلوؤں پر کہ بقول مشفق خواجہ "اہل ادب کی تمام بے ادبیاں سامنے آجاتی ہیں۔ شاعر کیا کرتے ہیں۔ مشاعرہ کسے کہتے ہیں۔ شاعری کس طرح وجود میں آتی ہے۔ مشاعروں میں شعرا کی گت کیسے بنتی ہے۔ اس قسم کے بہت سے موضوعات ہیں۔

[illegible]

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

[illegible]

گجرال کمیٹی اور اس سے متعلق دیگر کمیٹیوں کا جائزہ

مصنف: ڈاکٹر خلیق انجم
تبصرہ نگار: ڈاکٹر سلمیٰ شاہین
سنہ اشاعت: ۱۹۹۸ء
قیمت: ۷۵ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

ڈاکٹر خلیق انجم کی ادبی شخصیت اردو ادب کی دنیا میں ایک ایسا روشن مینارہ ہے جس کی ضیاپاشی سے اردو زبان کو ہمیشہ توانائی اور تابندگی حاصل رہی ہے بقول پروفیسر جگن ناتھ آزاد، خلیق انجم صاحب صف اول کے ماہر غالب، محقق، نقاد، ادیب اور ماہر آثار قدیمہ ہیں۔ ایسی شخصیتیں جو مختلف علوم وفنون سے آشنا رہی ہیں ہر دور میں کامیاب رہی ہیں۔ برسبیل تذکرہ یہ کہنا ضروری ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی مختلف موضوعات پر تقریباً چھیالیس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ زیر نظر تصنیف "گجرال کمیٹی اور اس سے متعلق دیگر کمیٹیوں کا جائزہ" ایک ایسا تاریخی کارنامہ ہے جو اردو ادب کے لیے ایک سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو زبان کی ارتقا اور اس کی ترویج وترقی کو تاریخی حیثیت دینے کے لیے مورخین نے اپنی اپنی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے لیکن زیر نظر تصنیف اپنی نوعیت کی ایک انوکھی ادبی تاریخ ہے جس میں اردو سے متعلق مرکزی اور صوبائی حکومت کی تمام تر تعمیری اور تخریبی پالیسیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کو یکجا کرنا اور اس کو کتابی شکل میں پیش کرنا راہ پُر خار سے گزرنے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی بے لوث خدمت اور اردو نوازی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے انتہائی جانفشانی اور دیدہ ریزی سے پورے ہندستان میں اردو کے مسائل کا جائزہ لے کر گجرال کمیٹی اور اس سے متعلق مختلف کمیٹیوں کی رپورٹ تیار کی جو اردو کے پرستاروں کے لیے انتہائی نفع بخش ہے۔ چونکہ ڈاکٹر خلیق انجم کو گجرال کی قدم قدم پر رہنمائی حاصل تھی اس لیے اس نوعیت کی ان سے بہتر اور معلوماتی کتاب پیش کرنا کسی

اور کی دسترس سے باہر ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے "ہندستان میں اردو کی موجودہ صورت حال" پر سیر حاصل تبصر کرتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ مردم شماری کے اعداد و شمار ملک کی اہم دستاویز ہوتی ہے لیکن افسوس کہ ہندستان میں مردم شماری کے اعداد و شمار دیانتداری اور ایمانداری سے مرتب کیے جاتے تو اردو کو ہندستان کی دوسری یا تیسری زبان کا درجہ حاصل ہوتا، اس طرح اردو سے متعلق اور بہت سارے مسائل کو ڈاکٹر خلیق انجم نے جرات رندانہ کے ساتھ پیش کر کے اپنی اردو نوازی کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔

آج کے دور میں جب عصبیت کا دیو، استبداد جمہوری کا لباس پہنے ہوئے اردو زبان کو پے درپے کچوکے لگا رہا ہو۔ اس کے عمل پر نکتہ چینی ہونا کوئی معمولی جگر کا کام نہیں۔ یہ جگر وہی پیدا کر سکتا ہے جس کی رگ وپے میں اردو زبان کا خون موجزن ہو۔ خلیق انجم صاحب نے اس میدان عمل میں خود کو ایک مجاہد کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ان کی متذکرہ تصنیف اردو کے جھلے مسائل سے متعلق معلومات کا ایک ایسا خزانہ ہے جسے ہر اردو نواز کے گھر میں موجود ہونا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس زبان کے ساتھ کیا کیا ناروا سلوک کیا گیا ہے اور کیا جارہا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے گجرال کمیٹی کا مقصد آئینہ کی طرح سامنے آجاتا ہے ساتھ ہی ساتھ اس بات کا خاطر خواہ علم بھی ہو جاتا ہے کہ محترم گجرال صاحب ایک محب وطن ہیں، ایک شریف انسان ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی مخلص، سیکولر، اردو کے زبردست حامی اور عاشق ہیں آپ اپنی گوناگوں مشغولیات کے باوجود کمیٹی کی دیکھ ریکھ میں دلچسپی کے ساتھ وقت صرف کرتے رہے اور اب بھی دلچسپی اسی شباب پر ہے جسے اردو داں طبقہ سراہتا ہے۔

خلیق انجم صاحب نے اپنی کتاب میں جہاں گجرال صاحب کو توصیفی کلمات سے نوازا ہے وہیں حکومت کی طرف سے اردو سے متعلق بے توجہی پر افسوس ظاہر کیا ہے اور اس بات کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ اردو کے ساتھ تعلیمی محکموں اور اسکولوں کے ذمہ داروں کا جو مخلصانہ رویہ ہے اس سے والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو اس ڈر سے اردو کی جانب سے بے توجہی نہ برتیں کہ ان کے بچوں کو نوکری نہیں ملے گی اور دوسرے بچوں کے مقابلے میں ان کا مستقبل تاریک رہے گا۔ اردو کی تعلیم دوسرے مضامین کی طرح اشد ضروری ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے ہندستان کے تمام صوبوں کا اردو سے متعلق موازنہ پیش کرتے ہوئے یوپی کو کم تر درجہ دیا ہے۔ آندھرا پردیش، بہار، ہماچل پردیش، کرناٹک، مہاراشٹر، مغربی بنگال میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو پڑھائی جاتی ہے لیکن یوپی میں تعلیمی نصاب اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ سائنس اور کامرس کا طالب علم اردو پڑھنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔

گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے اردو داں طبقہ کو اس بات سے گوش گزار کیا ہے کہ اور صوبائی حکومت نے گجرال کمیٹی کی شفارشات کو زیادہ تر نظر انداز کر دیا چونکہ کمیٹی نے تقریباً ساڑھے تین سال تک ہندستان کی بیشتر ریاستوں کا دورہ کر کے سفارشات مرتب کی تھیں اس لیے ان میں سے کچھ پر عمل کیا گیا۔

اس کتاب میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ گجرال صاحب نے وزیر اعظم کی حیثیت سے انجمن ترقی، اردو ہند، کے ذریعہ گجرال کمیٹی کی کچھ سفارشات پر فوری طور سے عمل کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس کمیٹی کو پیش کرتے ہوئے بائیس سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے اس لیے اگر کچھ مسائل حل ہوئے ہیں تو بہت سارے نئے مسائل ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اس میں ان تمام باتوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اردو کے تحفظ اور اس کے جائز حق کا احساس دلایا گیا ہے۔ اردو قومی وراثت کا جز ولاینفک ہے اور ہندستانی تہذیب کو مالا مال کرنے میں اس کا اہم رول رہا ہے۔ گجرال کمیٹی کو مد نظر رکھتے ہوئے جو سست روی برتی گئی ہے اس کا ذکر جگہ جگہ مختلف عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔

پروفیسر نورالحسن سابق مرکزی وزیر تعلیم کی افتتاحی تقریر اور جناب آئی کے گجرال سابق اطلاعات ونشریات کا صدارتی خطبہ اس کتاب کی افادیت میں چار چاند لگاتے ہیں۔ پروفیسر نورالحسن نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا ہے کہ لوک سبھا میں اس کمیٹی کی تشکیل کا اعلان ہوا تھا جس سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت ہند اردو کا جو دستور کے آٹھویں شیڈول کی زبان ہے کتنا خیال رکھتی ہے اور اس کی ترقی وفروغ کو کتنی اہمیت دیتی ہے۔ قومی تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک سماج کے تمام طبقوں کو اس عمل میں پوری طرح شرکت کا احساس نہ ہو۔ ہمارا سماج کثیر لسانی سماج ہے اس لیے تمام بڑی زبانوں کے مسائل کی طرف مرکزی اور صوبائی حکومتوں کا توجہ دینا

بالکل فطری بات ہے۔ اردو کا تعلق کسی خاص صوبے سے نہیں۔ بلا امتیاز مذہب وملت بڑی تعداد میں لوگ یہ زبان بولتے ہیں۔ اس کی ادب وراثت بہت ثروت مند ہے، سیکولر اور آفاقی ہے۔ جناب آئی کے گجرال صاحب بحیثیت چیرمین گجرال کمیٹی نے اپنے صدارتی خطبہ میں اس بات کا انتہائی وسیع النظری اور وسیع القلبی کے ساتھ اظہار خیال کیا کہ تقسیم ہند سے پہلے سیاست کو ہماری زندگی میں بہت زیادہ دخل تھا اور تقسیم ہند کے بعد کچھ عرصے تک سیاست ہمارے ذہنوں کو زہر آلود کرتی رہی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خالص لسانی اور ادبی مسئلہ سیاست دانوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا۔ اردو کی ترقی اور فروغ کا کام مرکزی اور صوبائی حکومتوں دونوں کا کام ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو ایک ایسی اہم ہندستانی زبان ہے جس نے ہمارے ملک کی تہذیب اور سیاسی زندگی کے فروغ میں ایک نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر خلیق انجم نے سرور کمیٹی، سردار جعفری کمیٹی، سید حامد کمیٹی، عزیز قریشی کمیٹی، اقلیتوں کی تعلیم کے لیے قومی سطح کی نگران کمیٹی کی تفصیل کے ساتھ رپورٹ پیش کر کے قارئین کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔

اس کتاب کا انتساب ان محبان اردو کے نام کیا گیا ہے جو اردو زبان کی بقا اور فروغ کے لیے کام کرتے رہے ہیں۔ میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کو اس مسلسل سعی عمل کی شاندار کامیابی پر تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتی ہوں مجھے کامل یقین ہے کہ یہ کتاب نہ صرف مقبول عام ہوگی بلکہ اردو نواز حضرات کے دل ودماغ کو جلا بخشے گی۔

مصنفہ: ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان

تنقید کے مثبت رویے مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں

قیمت: ۲۵۰ روپے صفحات: ۱۹۶

تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

تنقید کے مثبت رویے۔ ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان کی تازہ ترین کتاب ہے جس میں ان کے ایک درجن تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ان کا خصوصی میدان مطالعہ افسانوی تنقید ہے۔ اس سے قبل ان کی کتاب "مختصر افسانہ۔ فنی وتکنیکی مطالعہ" منظر عام پر آچکی ہے۔ وہ ایک عرصہ دراز سے اردو افسانہ کا مطالعہ کرتی رہی ہیں اور برابر اس پر تنقیدی نظر ڈالتی رہی ہیں۔ ان کے اس عمیق مطالعہ نے ان کی نظر میں گہرائی اور اپنا ایک خاص انداز پیدا کر دیا ہے۔ "تنقید کے مثبت رویے۔" ان کے اس دوران لکھے گئے مختلف

مضامین ہیں۔ جو افسانے کے فنی مطالعہ کے علاوہ اس کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اردو افسانے کے موضوعات اور اس کے فکری رجحانات کا جائزہ پیش کرتی ہے۔ اور اس اعتبار سے یہ افسانوی دنیا کی تنقید سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے معاون ثابت ہوگی۔ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے حصہ اول میں جو چھے مضامین شامل ہیں ان کے عنوان اس طرح ہیں (۱) بیسویں صدی کے نصف اوّل کا افسانہ : رجحانات و موضوعات (۲) اردو افسانہ فسادات کے زیر اثر (۳) جدید اور متوازن افسانہ کی تخلیق کے محرکات (۴) ہم عصر افسانہ فنی و تکنیکی تجربات (۵) اردو افسانہ کی نئی جہات اور (۶) افسانہ کی تنقید۔ سمت و افتار، کتاب کے اس حصہ کا نام "تنقیدی تناظر" رکھا گیا ہے اور حصہ اوّل کی طرح حصہ دوئم میں بھی چھے مضامین شامل ہیں اور اس حصہ کا نام "بزم افسانہ؛ چند شناسا چہرے" رکھا گیا ہے۔ حصہ دوم کے اولین دو مضامین دو ممتاز ناول اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس حصہ کا پہلا مضمون عصمت فن اور شخصیت ہے جس میں عصمت چغتائی کی قلمی تصویر پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے اس طرح یہ مضمون ایک تنقیدی مضمون ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر نکہت ریحانہ خاں کا تخلیقی کارنامہ بھی ہے۔ دوسرا مضمون "گردش رنگ سخن" کے عنوان پہ لکھا گیا ہے اور ملک کی باوقار ناول نگار محترمہ قرۃ العین حیدر کے ناول گردش رنگ چمن "کا تنقیدی مطالعہ پیش کرتا ہے۔ اس حصے کے باقی چار مضامیں اردو دنیا کے چار بڑے ادیبوں کی افسانہ نگاری کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ یعنی یہ چار اشخاص وہ ہیں جو اردو زبان وادب میں ممتاز مقام رکھتے ہیں اور کسی زمانے میں افسانہ نگاری کے طرف مائل ہوئے تھے لیکن بعد میں اس رجحان کو قائم نہ رکھ سکے۔ ڈاکٹر نکہت ریحانہ خان نے بڑی کاوش سے ایسے افسانہ نگاروں کی تحقیق کی اور انھیں ایک افسانہ نگار کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اور اس طرح پروفیسر محمد حسن کی بچی کہانیوں کا مطالعہ "حقیقت مجاز کے آئینے میں" علی سردار جعفری کے افسانوں کا مجموعہ "منزل" کا مطالعہ ہر منزل اک منزل ہے نئی" کے عنوان سے 'سید احتشام حسین کے افسانوی مجموعہ ویرانے کا تنقیدی مطالعہ "نقاد کا ذہن اور افسانہ کی تخلیق" کے عنوان سے شامل ہے اور اس حصے کا چھٹا اور آخری مضمون "مصور کا تصور اور تخلیقی افسانہ" ڈاکٹر صادق کے افسانوی مجموعہ کا جائزہ پیش کرتا ہے اور اس لحاظ سے حصہ دوم ڈاکٹر نکہت ریحانہ خان کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے جو افسانوی دنیا کے بعض تخلیق کاروں کی بازیافت کرتا ہے اور افسانوی ادب کے ایک کھوئے ہوئے سرمایہ

کو واپس دلاتا ہے ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان کی زبان شائستہ دلکش اور پُر اثر ہے جس میں منفی تنقید کا کہیں بھی نام نہیں ہے انھوں نے ادب کے کار آمد پہلوؤں کو تلاش کرنے اور اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کتابت طباعت اور کاغذ سبھی عمدہ ہے جلد بھی نہایت مضبوط اور خوشنما بندھی ہوئی ہے سرورق سادہ اور جاذب نظر ہے۔ امید ہے ان کی یہ کتاب افسانوی دنیا میں اہم مقام حاصل کرے گی۔

معرکۂ تیغ وگلو
مجموعۂ مراثی

شاعر: شہزاد معصومی
مبصر: ڈاکٹر طاہر حسین کاظمی
ناشر: ڈاکٹر سید ارشاد حسن معصومی۔ پٹنہ
قیمت: ۲۵۰ روپے سائز: ۲۳x۳۶x۸
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

زیر نظر کتاب "معرکۂ تیغ وگلو" کے مصنف شہزاد معصومی اپنے شعری مجموعہ "شعلۂ تشنگی" کی مقبولیت نیز انجمن ترقی پسند مصنفین بہار سے بحیثیت مندوب وابستگی کی بنا پر تعارف کے محتاج نہیں ہے۔ شاعری سے ان کا شغف اپنے گھر اور ارد گرد کے علمی اور ادبی ماحول کی بنا پر عہد طفلی سے ہی رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ایک کامیاب نظم نگار کی حیثیت سے ابھرے اور شعر گوئی میں اپنا مقام پیدا کیا۔ تقریباً تین دہائی قبل کے ان کے بعض اشعار آج بھی خصوصیت سے پڑھے اور پسند کیے جاتے ہیں۔

بارہ مراثی پر مشتمل "معرکۂ تیغ وگلو" ان کے مزاج میں پختگی اور ٹھہراو کا پتہ دیتا ہے۔ مرثیہ کے تقریباً سبھی عناصر پر انھوں نے قابل لحاظ طبع آزمائی کی ہے۔ ترقی پسندی کے پیش نظر ان کے مراثی میں تخیل آفرینی اور ندرت کاری کے ساتھ اجتہادِ فکر، تنقیدی بصیرت اور مضامین میں تنوع کی کار فرمائی ہے۔ عصری حیثیت کے تعلق سے یہ بند دیکھیے۔

دیکھیے اس دور میں قوموں کا مقدر کوئی خالی از نشۂ تخریب نہیں سر کوئی
عافیت گھر میں بھی جب ہو نہ میسّر کوئی کیا کرے فکرِ سخن آج سخنور کوئی
ایک انجانی سی دہشت میں گرفتار ہے زیست
اپنے ہی سر پہ لٹکتی ہوئی تلوار ہے زیست

گھر میں کچھ اور تو باہر میں ہے صورت کچھ اور ظاہری رنگ ہے کچھ اور طینت کچھ اور
شروع کی بات ہے اب پر تو ہے نیت کچھ اور دین وایمان ہے کچھ اور سیاست کچھ اور

آئینہ دیکھ کے پڑجائے نہ کیوں حیرت میں
خود کو پہچاننا دشوار ہے اس صورت میں

ایک دہریہ دوست کے اس دلیل کی رد میں کہ اللہ کا بھی کوئی خالق ضرور ہوگا، فلسفیانہ نقطۂ نظر سے ایک مرثیہ میں "صفر" اور "ایک" کے ہندسوں کی انفرادیت کی علمی بحث کے ذریعہ اللہ کی وحدت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ مذکورہ بحث کو مسلسل کئی بند میں علم الحساب کے جواز کے ساتھ قلم بند کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

پہلا عدد ہے گنتی کا کیوں ایک بولتے ہوتی شروع اس سے ہے گنتی وہ بول اٹھے
اس سے ہی کیوں شروع ہے گنتی بتا یئے؟ بولے عدد ہی کوئی نہیں پہلے ایک کے
اے دوست پہلے ایک کے جب دوسرا نہیں
سمجھیں خدا کے پہلے بھی کوئی خدا نہیں

پوچھا کہ صفر ایک کے پہلے اگر لکھا بولے کہ کچھ نہیں فقط اس ایک کے سوا
میں بولا ہے یہ کلمہ حق لا الہ کا یعنی نہیں سوائے خدا کے کوئی خدا
آنکھوں سے جو حقیقتیں کل تک نہاں رہیں
سائنس کی نظر سے چھپی وہ کہاں رہیں

اس قسم کی مثالیں جس میں شاعر نے فکر وشعور سے کام لے کر کچھ نئے اور اہم گوشوں کی تلاش کی ہے وافر تعداد میں موجود ہیں۔ عرفان وحکمت اور عصری تقاضوں کو ان کے مراثی میں خصوصی جگہ حاصل ہے۔ یہ بند دیکھیے جس سے اخوت اور انسانی ہمدرد کا درس ملتا ہے۔

اقدار زندگی کا صدا احترام ہو ہمدردیاں ہوں پیار ہو الفت مدام ہو
آپس میں اتحاد و سلام وکلام ہو نیکی کا اور خیر سگالی کا نام ہو
کچھ امتیاز رنگ وجماعت نہیں رہے
نفرت نظر میں دل میں کدورت نہیں رہے

ساقی نامہ، بہار، تاریخ، روایات، احادیث، حسینی اور فوج مخالف کے کردار، صورت اور سیرت کی نقشہ کشی بھی نہایت حسنِ خوبی کے ۔ کی گئی ہے۔ منظر کشی، پیکر تراشی جذبات ونفسیات نگاری، ازم اور بزم میں روز مرہ اور محاوروں کی آمیزش سے خاص لطف پیدا کیا ہے۔ وقت عصر امام حسینؑ زخمی حالت یں شہدائے کربلا سے مخاطب ہیں اس کے بیان میں محاکاتی انداز ملاحظہ ہو۔

یہ کہہ کے قبلہ رو ہوئے ساہنشہ حجاز پڑھنے لگا امام زماں عصر کی نماز
سجدہ میں اس طرح سے جھکا سر بعد نیاز تھی وجد میں مشیتِ حق ، تھا خدا کو ناز
کیا نفس مطمئن تھا عبادت گزار کا
ایسا بھی شاہکار ہے پروردگار کا

امام حسینؑ شبِ عاشور اپنے رفقا اور اصحاب کو آگاہ کرتے ہیں کہ فوج اشقیا صرف اور صرف میرے خون کی پیاسی ہے۔ میری جانب سے بخوشی اجازت ہے کہ آپ لوگ وطن لوٹ جائیں اس موقع پر اصحاب کی حالت کی نقشہ کشی میں شعری حسن کاری ملاحظہ ہو۔

کہہ پائے تھے اتنا ہی شہنشاہِ حجازی ناگاہ اٹھے اپنے مصلوں سے نمازی
ماتھوں پہ ابھر آئے خط غم، متوازی جذبات کی حدّت سے پگھلنے لگے غازی
آنکھوں میں اتر آیا لہو کھنچ کے جگر سے
موتی سے ٹپکنے لگے دامانِ نظر سے

دربارِ یزید میں یزید اور جناب زینب کا مکالمہ معنویت اور بلاغت کی اچھی مثال ہے۔

یوں مخاطب ہوا زینب سے یزید بدکار سر کٹا کس کا ، ہوا کون اسیر دربار
اب بھی کیا آپ نہیں مانتیں شبیر کی ہار بولیں، بیعت تو نہیں لے سکا، اے ظلم شعار
قتل ہو جانے کو ہم صرفِ نظر کرتے ہیں
اپنا سر دے کے بھی ہم معرکہ سر کرتے ہیں

دیگر شعری خوبیوں کے ساتھ ساتھ شاعرانہ تعلّی اور حسب موقع مبالغہ آرائی جو خصوصاً تلوار اور گھوڑے کی تعریف میں ناگریز ہے کے استعمال سے بھی شاعر نے اپنے کلام کی حیثیت منوائی ہے۔ اس طرح یہ کتاب مرثیہ کے باب میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ سرورق حسب موضوع ہے جو پہلی نظر میں کربلا کے خونچکاں واقعہ کی طرف اذہان کو مبذول کرتا ہے۔ کتابت اور طباعت عمدہ اور جاذب نظر ہے۔ کتاب میں شامل درگاہ، امام بارگاہ، تعزیہ خانہ، ضریح مبارک کے علاوہ دیگر خصوصی مقامات اور شخصیتوں کی رنگین تصاویر خصوصی کیف اور کشش پیدا کرتی ہیں۔ یقیناً یہ مجموعہ اہل ادب و شعور اور اہل نظر حضرات کے لیے قابلِ دید اور مطالعہ ہے۔

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کی اہم مطبوعات

شاعر از: تارا شنکر بندوپادھیائے مترجم: پریمیش کمار ڈے

اس ناول میں محبت اور فرقت کی داستان بڑی وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔ بنگلہ زبان میں اس ناول کی شہرت آج بھی ماند نہیں پڑی ہے۔
قیمت: 8/75

اڑیا افسانے از: پٹھانی پٹ نایک مترجم: مظفر حنفی

یہ اڑیا زبان کے ۲۱ منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے۔ قیمت: 11/25

آدھی گھڑی از: پارپرتو مترجم: سیفی پریمی

یہ ناول ملیالم زبان کے نامور قلم کار شری پارپرتو کی تخلیقات میں سب سے زیادہ پر اثر اور مقبول عام ناول ہے۔
قیمت: -/15

آئینہ از: کیشودیو مترجم: کنہیالال گاندھی

ملیالم زبان کے ناول نگار کیشودیو کی تخلیقی کارناموں کا مقصد سماج کی تعمیر نو ہے۔ یہی مقصد اس ناول کا بھی ہے۔
قیمت۔ 9/50

بادل چھٹ گئے از یوگیش داس مترجم: رضوان احمد

بادل چھٹ گئے' آسامی زبان کا وہ ناول ہے جو آسام کے عوامی اندولن کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔
قیمت: 10/50

بنگرواڑی از وی-ماڈگولکر مترجم: عرش ملسیانی

ایک ایسا عظیم ناول جس میں مہاراشٹر کی دیہاتی زندگی اپنی تمام دلچسپیوں اور تلخیوں کے ساتھ موجود ہے۔
قیمت: 5/25

پنجابی کے یک بابی ڈرامے از: عطر سنگھ مترجم: ایس-ایم-شاہنواز

پنجابی زبان میں ہر صنف ادب میں بھرپور مواد موجود ہے۔ یہ انتخاب یک بابی ڈراموں کی نمائندگی کرتا ہے۔
قیمت۔ -/12

پورن کمبھ از: رانی چند مترجم: شانتی رنجن بھٹاچاریہ

پورن کمبھ ایک تیر تھی (زیارتی) سفر نامہ ہے جس میں ہمالیہ اور اس کے مقدس مقامات کی ایک اعلیٰ تصویر پیش کی گئی ہے۔
قیمت: 8/75

پہلا راجا اور آدھے ادھورے از: جگدیش چندر ماتھر اور موہن راکیش مترجم: قیصر قلندر

اس مجموعے میں دو ناٹک شامل ہیں۔ جگدیش چندر ماتھر کا پہلا راجا' ویدک زمانے کا مطالعہ ہے اور جبکہ موہن راکیش کے 'آدھے ادھورے' میں عصری زندگی کے تضاد کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح آدھے ادھورے' عورت مرد کے تعلقات' ان کی ضرورتوں اور اختلاط کو پہچاننے کی دلچسپ روداد ہے۔ قیمت۔ -/11

گجراتی کے یک بابی ڈرامے مرتبہ: اے۔ایم۔ روال مترجم: مظفر حنفی

اس مجموعے میں گجراتی زبان کے منتخب یک بابی ڈرامے یکجا کردیے گئے ہیں۔ قیمت: 12/25

گنگا چیل کے پنکھ از: ایل۔این۔ بورا مترجم: رضیہ سجاد ظہیر

آسام کی بدلتی ہوئی زندگی اور معاشرے کے بارے میں ایک بہت ہی دلچسپ ناول ہے' جس میں تہذیب بھی ہے اور رومان بھی۔ قیمت: 6/75

لہروں کی آواز از: کلکی' را' کرشنا مورتی مترجم: راج نرائن راز

کلکی تامل زبان کے ایک مقبول ترین قلم کار تھے اور لہروں کی آواز' آپ کا ایک بے حد کامیاب ناول ہے۔ قومی تاریخ کے بعض اہم اجزا اس ناول کے پس منظر کا جزو خاص ہیں اور اس میں ہماری جدوجہد آزادی کا زمانہ بھی شامل ہے۔ قیمت: 19/50

ماہم کی کھاڑی از: مدھو منگیش کرنک مترجم: سلام بن رزاق

ماہم کی کھاڑی' بمبئی کی ایک خاص جنگلی بستی کی حقیقت پسندانہ عکاسی ہے۔ مدھو منگیش کرنک مراٹھی کے ایک مشہور اور مقبول قلم کار ہیں اور آپ نے اپنے اس ناول کے توسط سے ایک ایسی غلیظ دنیا کی باریک سے باریک تفصیل پیش کی ہے جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قیمت: 11/75

نیل کنٹھ پاکھی کی ٹوہ از: اتین بندھوپادھیائے مترجم: راشد سہسوانی

بٹوارے سے پہلے اور اس کے بعد مشرقی بنگال کی دیہاتی زندگی پر اس ناول کی بنیاد ہے۔ انسانی زندگی کے تعلقات اور رابطوں کے شاعرانہ بیان کے سبب یہ ناول جدید بنگلہ ادب میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ قیمت: -/15

نئی فصل از: بجن بھٹاچاریہ مترجم: سید الابرار

یہ ڈراما بنگال کے اس بھیانک قحط کی کہانی ہے جسے نسل انسانی نے دوسری جنگ عظیم کے بعد خود پیدا کیا تھا۔ اس ڈرامے کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس نے مکمل تھیٹر کے لوازمات اس وقت پورے کیے تھے جب تھیٹر محض فیشن میں داخل تھا۔ قیمت: 8/25

یہ ہماری زندگی اور آدھے چاند کی رات از. دلیپ کور ٹوانہ اور گردیال سنگھ مترجم: عرش ملسیانی

اس کتاب میں پنجابی زبان کے دو شاہکار ناولٹ شامل ہیں۔ یہ ہماری زندگی' دلیپ کور ٹوانہ کی تخلیق ہے اور آدھے چاند کی رات' گردیال سنگھ کے فن کا نمونہ۔ یہ دونوں ناولٹ نہ صرف پنجابی تہذیب و زندگی کے عکاس ہیں بلکہ اپنے المیہ اختتام کی وجہ سے بے حد تاثراتی بھی ہیں۔ قیمت: 14/25

سردار ولبھ بھائی پٹیل از: وشنو پربھاکر مترجم: نشاط قیصر

سردار پٹیل ہندستان میں مرد آہن کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے کچھ جانے انجانے گوشوں کا انکشاف ہندی کے مشہور ادیب وشنو پربھاکر نے نہایت پرکشش زبان و اسلوب میں کیا ہے۔ قیمت: 7/50

ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

کھلے خطوط

☆ مجیر احمد آزاد، پنڈوری بازار، سمستی پور (بہار)

ماہ مارچ اور اپریل ۹۸ء کے شمارے میں شامل چند مکاتیب کے سلسلے میں آپ سے گفتگو کرنی ہے۔

فروری ۹۸ء کے شمارے میں مہمان مدیر کی حیثیت سے جمال اویسی کے مضمون پر بلقیس ظفیر الحسن دہلی، حکیم حسین خاں رام پور، ڈاکٹر ثوبان فاروقی حاجی پور، تسیط احمد پٹیالہ اور احتشام حسین دربھنگہ کے خطوط بالترتیب مارچ اور اپریل کے شمارے میں دیکھنے کا موقع ملا۔ بلقیس ظفیر الحسن اور حکیم حسین صاحب نے "نیا شاعر۔ محرم رموز حیات" کی تعریف کی ہے جبکہ ثوبان فاروقی، تسیط احمد اور احتشام کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مذکورہ تینوں حضرات نے جانب داری سے کام لیا ہے۔ پتہ نہیں کیوں یہ حضرات نئی نسل کے قلم کاروں سے اتنا برہم ہیں۔ ثوبان فاروقی صاحب نے مکتوب میں لفظ "ٹٹول" پر کافی زور لگایا ہے۔ انھوں نے جس طرح لفظ ٹٹولنا کو لیا ہے اس کے علاوہ بھی اور کئی معنی ہیں۔ لغت دیکھ لیں تو شاید قلم کار کے استعمال لفظ پر سے اعتراض ختم ہو جائے۔ خط کی ابتدا میں جس جارحانہ فورم کو اپنایا گیا ہے آخر میں ثوبان صاحب کو ڈیفنس کرنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی؟ تسیط صاحب کے لیے اتنا کہوں گا کہ "بات کرنے کا سلیقہ چاہیے۔" انھوں نے جس طرح کے پتھر مار جملے کا استعمال فراوانی سے کیا ہے ان کی قابلیت اور مضمون فہمی مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ ان کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دوسرے پیراگراف کے علاوہ بھی مضمون میں کئی پیراگراف ہیں جس کو پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ احتشام صاحب نے گوتم بدھ کے حوالے سے استقلال و صبر کی نصیحت کی ہے۔ لیکن وہ بھول گئے کہ مہاتما بدھ نے وانی سینہ کو عالمی اخوت کے لیے کتنا ضروری قرار دیا ہے۔ وہ کالج میں اردو کے استاد ہیں بخوبی جانتے ہیں کہ مضمون نویسی/مقالہ نگاری کس قدر جانفشانی کا مستحق ہے۔ اور مقالہ لکھنے کا حق صرف اونچی پیٹھ والے ادب کے ٹھیکیداروں کو ہی حاصل نہیں ہے اس لیے اظہار رائے کے وقت صبر و استقلال اور ذاتیات سے انحراف کی ضرورت ہے۔ ہاں کسی کے عیوب کو گنا دینا آسان ضرور ہے۔ ان کے مکتوب کا یہ جملہ "مجتبیٰ حسین نے سردار جعفری کی ۸۵ برسوں کی --- گیان پیٹھ ایوارڈ ملا۔ یہ کس رابطہ کا جملہ ہے۔

ایڈیٹر صاحب میں کتاب نما کا پرانا قاری ہوں۔ میں آج بھی خط نہیں لکھتا مگر لگاتار ایک مضمون پر اس طرح کے جملوں کو دیکھ کر افسوس ہوا۔ قلم کار کوئی بھی ہو اس کی پذیرائی ہونی چاہیے۔ ہاں میں تنقید کو ادب کو نکھار کے لیے لازم گردانتا ہوں مگر تنقیص کو تنقیص نگار

کی شخصیت کی کمزوری سے تعبیر کرتا ہوں۔
جمال اویسی کا مضمون فکر کے نئے گوشے کی طرف اشارہ ہے نہ کہ قد اونچا دکھانے کی کوشش۔

مارچ ۹۸ء کے شمارہ میں انور کا سالک لکھنوی پر مقالہ جامع ہے اشعار کا انتخاب اور اس کی وضاحت قابل تعریف ہے۔ سالک لکھنوی پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ تازہ شمارے میں فانی بدایونی کے حوالے سے شاداب ذکی کا مضمون اور مظہر امام کے ذریعہ ۱۹۹۷ء کے چند پسندیدہ شعری مجموعوں کا احاطہ پسند آیا۔

☆ آفاق عالم صدیقی

جون ۹۸ء کا شمارہ پڑھ چکا ہوں، اداریہ نے اس بار قلم اٹھانے کی خواہش پیدا کر دی ہے اس لیے لکھ رہا ہوں،

ہمارے یہاں ایک کہاوت مشہور ہے کہ (جب کوئی شخص بار بار یہ کہنے لگے کہ میں کمزور نہیں ہوں، میں کسی سے دبتا نہیں ہوں، تو جان لیجیے کہ وہ اپنے تئیں کمزور ہے اور کہیں نہ کہیں اس کی کوئی نہ کوئی کور ضرور دب رہی ہے) اس لیے ۸۰ء کے بعد والی نسل کا بار بار یہ کہنا کہ ہمیں ناقدوں کی ضرورت نہیں ہے مشکوک لگ رہا ہے، آج دنیا کے کسی فنکار کے بارے میں یہ نہیں سنا گیا ہے کہ انھیں اپنی تعریف اور دیانتی تنقید سے خوشی نہیں ہوئی ہو۔
جناب کوثر مظہری صاحب ۸۰ء کے بعد والی نسل کو نمایاں کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ اگر دوٹوک لفظوں میں کہنا ہو تو ہم کہیں گے کہ یہ لوگ اپنی پیٹھ اپنے آپ تھپتھپا رہے ہیں (گرچہ یہ بالکل حق بجانب ہے) مظہری صاحب نے بڑی فراخ دلی سے گزشتہ رجحانات کے اثرات کا اعتراف کیا، اس لیے انھوں نے جدیدیت نوازوں کے جو چند شرارتی اشعار کو چن کر ہدف بنایا ہے وہ محل نظر ہے، اس قسم کے اشعار ہر نسل کے یہاں مل جائیں گے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہنا چاہتا کہ جدیدیت سے الگ ہو کر متذکرہ نسل نے ادب تخلیق نہیں کیا ہے؟ کیا ہے بلکہ بعضوں نے تو اس سے بھی بہتر تخلیق سے اردو شعر و ادب کو نوازا ہے۔ اس کے باوجود بزرگ فن کا احترام لازمی ہے۔ مظہری صاحب نے جن عوامل کے تحت ۸۰ء کے بعد والی نسل کو ممتاز بتایا ہے وہ عوامل تقریباً تمام اردو شاعری کا مشترک ورثہ ہیں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ مظہر صاحب ضبط سے کام لینے کے باوجود کہیں کہیں جذباتی ہو گئے ہیں۔ اس سے قبل جناب جمال اویسی صاحب کا اداریہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا، البتہ ان کے اداریہ نے ۸۰ء کے بعد والی نسل سے متعلق جو ذہنی اور فکری انجماد تھا اس کو توڑنے میں کافی معاونت کی ہے، اور اگر سیدھے سادھے لفظوں میں کہنے کی اجازت ہو تو میں کہوں گا کہ مظہر صاحب کا اداریہ اویسی صاحب کے اداریہ کی گونج ہے۔ ۸۰ء کے بعد والی نسل کو کئی مسائل سے بیک وقت جوجھنا

پڑرہا ہے اس لیے وہ منظر نظر نہیں آرہے ہیں۔ جدیدیت کی طرح "شبخون" جیسا کوئی رسالہ بھی ان کے پاس نہیں ہے جو ان کا بھرپور تعارف کراسکے، پھر ایک المیہ یہ کہ ان کے یہاں انتشار ہے۔ اس نسل میں بعض مظہری صاحب کے ہم خیال ہیں جو مابعد جدیدیت کو بالکلیہ تسلیم کرنے کے مخالف ہیں تو بعض ایسے ہیں جو اب بھی "شب خون" میں اپنی شمولیت کو نشانِ امتیاز سمجھتے ہیں، دوسری طرف جناب خالد عبادی صاحب جیسے دانشورانہ صلاحیت رکھنے والے لوگ بھی ہیں جو مابعد جدیدیت، کی حمایت میں مقالہ پڑھ کر پورا سیمینار لوٹ لیتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ بعض ایماندار ناقد اس انتشار کی وجہ سے خاموش ہیں۔ شاید وہ شش و پنج میں پڑے ہوئے ہیں کہ دیکھیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، ویسے اس نسل کے قدموں کی آہٹ ہر کوئی شدت سے محسوس کررہا ہے۔ بعض سہمے ہوئے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے ان کی اپنی شناخت دھندلا نے ہی والی ہے۔ بعض کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے کہ یہ جو آج اتنے قد آور ہیں وہ ہمارے اپنے ہیں اور بعض بزرگ ان کو گلے لگانے کے لیے بے قرار ہیں کیونکہ وہ جان چکے ہیں کہ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو آیندہ نسلیں ہماری ایمانداری پر شک کریں گی اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ۸۰ء کے بعد والی نسل کو جذباتی انداز کے مضامین و تجزیہ سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ اس قسم کی جارحیت جدیدیے پہلے ہی اپنا چکے ہیں۔ البتہ یہ وقت ۸۰ء کے بعد کی شاعری پر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کے لیے نہایت موزوں ہے۔

☆ضیاء الدین اصلاحی ،دار المصنفین، اعظم گڑھ

جون کا کتاب نما موصول ہوا، دو تین نشستوں میں پورا پڑھ لیا، مشمولات پسند آئے، اس دور میں اردو کا ایسا باوقار، معیاری اور بلند پایہ رسالہ نکالنا آپ ہی جیسے عزم وہمت والے شخص کا کام ہے، اس سے آپ کی غیر معمولی قوت عمل اور اردو سے بے پناہ محبت کا پتہ چلتا ہے۔

مراسلات کے کالم میں میرے کرم فرما جناب عبد اللطیف صاحب نے میرے ایک خط سے یہ غلط نتیجہ نکالا ہے کہ "مرحوم سید شہاب الدین دسنوی صاحب کے صاحبزادے جناب امتیاز دسنوی ابو ظہبی سے ۱۰ر اپریل کو تشریف نہ لا سکے اور ان کے والد مرحوم کی جملہ کارروائیاں ان کی عدم موجودگی میں ہوئیں۔"

واقعہ یہ ہے کہ وہ انتقال کے بعد پٹنہ آگئے تھے اور تجہیز و تکفین میں شریک تھے۔ اتفاقاً لکھنؤ میں ۱۶ر مئی کو امتیاز دسنوی صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ والد صاحب کی وصیت تھی کہ میری وفات کی خبر تین جگہ ضرور کردی جائے۔ دہلی میں حکیم عبد الحمید صاحب کو۔ لکھنؤ میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کو اور اعظم گڑھ میں تم کو۔ پٹنہ سے مجھے تاخیر سے تار ملنے میں امتیاز دسنوی صاحب

کی کوتاہی کو دخل نہیں تھا بلکہ یہ ہمارے موجودہ نظام مواصلات کا کرشمہ ہے۔

خطوط کے کالم مجھے کچھ غلطیاں نظر آئیں، ممکن ہے ان میں سے اکثر کتابت وطباعت کی وجہ سے ہوں، ان کا ایک نقشہ بھیج رہا ہوں تاکہ کتاب نما میں آیندہ یہ داغ دھبا بھی نہ رہے۔ اس کا مقصد خوردہ گیری نہیں ہے ،

☆جمال اویسی، لکچرر ملت کالج، دربھنگہ۔ ۴

میرے مہمان اداریہ (مطبوعہ فروری۹۸) پر کئی ماہ تک تاثرات چھپتے رہے۔ لوگوں نے اتفاق بھی کیا اور اختلاف بھی۔ یہ سب چلتا رہتا ہے۔ جون ۹۸ء کے شمارہ میں کوثر مظہری کا اداریہ پڑھا۔ مجھے لگتا ہے انھیں مہمان اداریہ لکھنے کی تحریک مجھ ناچیز کی تحریر پڑھنے کے بعد ہی ہوئی۔ مضمون ذرا مربوط اور مدلل ہونا چاہیے تھا۔ نئی شاعری روایت کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت تھی اور نئی شعریات سازی کی طرف پہل کرنی چاہیے تھی۔ میں ان دنوں یہ کام کر رہا ہوں۔ جن لوگوں نے مابعد جدیدیت کے حوالے سے مضامین لکھے ہیں انھوں نے نئی شعریات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی ہے کیونکہ انھیں اس کام سے کوئی فائدہ نہیں مل سکتا۔ نئے شاعروں کے بہت سے Key Points ہیں جن کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ میں مابعد جدیدیت کے نقادوں سے اس کام کی توقع نہیں رکھتا۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ نئے شاعروں سے سفر شروع کرتا ہوا ساختیات اور لاتشکیل وغیرہ تک پہنچ جاؤں۔ تب زبان اور نشانیات وغیرہ بھی زیر بحث آئیں گی۔ یہی صحیح طریق کار بھی ہوگا۔ صرف تھیوری کے حوالے سے ادب کو لکھا یا پرکھا نہیں جا سکتا۔ موجودہ ادب میں محمد حسن، شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ تین بڑے نام ہیں۔ پورے ادبی ماحول کو یہی Deal بھی کرتے ہیں لہٰذا ان کا رد کرتے ہوئے آگے بڑھنا کچھ اتنا آسان بھی نہیں۔ ہمارے پاس نئے تنقیدی تصورات کا پیدا ہونا نہایت ضروری ہے۔ کوثر مظہری وغیرہ کو بھی اس طرف سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔

☆جعفر ساہنی

جون ۹۸ء کے "کتاب نما" میں مہمان اداریہ کے تحت "جواز ـ ۸۰ء کے بعد کی شاعری کا" کوثر مظہری کی ایک معقول اور مدلل تحریر ہے۔ موصوف کا یہ کہنا بجا ہے کہ ادب میں کسی بھی رجحان کی مکمل موت نہیں ہوتی بلکہ وہ کسی نہ کسی عنوان سے ہر دور میں منعکس ہوتا رہتا ہے۔ دیگر مضامین بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے لائق مطالعہ ہیں۔ منظومات کے حصے میں۔مخمور سعیدی اور محسن احسان کی غزلیں اچھی لگیں۔

☆عالم خورشید، پٹنہ

کوثر مظہری کے اشاریہ کے توسط سے ایک بار پھر آپ نے نئے ادب کو بحث کا موضوع بنادیا ہے۔ کوثر مظہری نے اپنے مضمون میں نئی نسل کے حوالے سے کچھ اہم کلیدی باتیں سامنے رکھی

ہیں جو اہل ادب کو متوجہ کریں گی۔ ان کی اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ کسی بھی رجحان کی بالکلیہ موت نہیں ہوتی البتہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ حالات کے پیش نظر رجحانات اور فکر میں تبدیلیاں ضرور پیدا ہوتی رہتی ہیں، ان کی شاخوں میں نئی نئی کونپلیں ضرور پھوٹتی رہتی ہیں۔ انھیں تبدیلیوں کے سبب ہی ادب میں بھی جدت اور تازگی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس طرح ادب اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔ اگر یہ سچ نہیں تو ادیبوں کو صفحات کے صفحات سیاہ کرنے کا کام بند کر دینا چاہیے۔ تحقیق کے لیے ہمارے پاس کافی سرمایہ موجود ہے۔ جناب یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، نصرت ظہیر اور فیاض احمد فیضی کی تخلیقات نے طنز و مزاح کے گوشے کو اہم بنادیا ہے۔ مضامین کا حصہ بھی غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ آخر میں ایک بار پھر یہ شکایت کروں گا کہ پٹنے میں "کتاب نما" (تقریباً ایک ماہ) تاخیر سے پہنچتا ہے جو بہت گراں گزرتا ہے۔

. . . . . .

☆ شاغل ادیب، صدیق نگر، حیدر آباد۔ ۴۸

کتاب نما کا تازہ شمارہ ۷/۹۸ باصرہ نواز ہوا۔ اب کی بار محترمہ نرگس سلطانہ کا مہمان اداریہ واقعی حقائق پر مبنی ہے اور ہم اردو والوں کو دعوت فکر و عمل دیتا ہے۔ اردو رسم الخط کی بہتری میں تشکیلی کا مسئلہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب نے بھی ماہنامہ گل کدہ، سہسوان میں اٹھایا تھا اور اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ اردو کے چند پیشہ ور ادیب اور مفاد پرست پبلشرز اردو تصانیف کو دیوناگری رسم الخط میں شائع کر کے اپنی دنیا تو سنوار رہے ہیں لیکن انھیں کیا پروا کہ اردو کی آخرت بنے کہ بگڑے۔ مہمان مدیرہ نے آخر میں جو تجاویز پیش کی ہیں اگر ان پر شدت سے عمل کیا جائے تو اردو کے دوست نما دشمن ادیب، مفاد پرست پبلشرز اور یونیورسٹیوں کے اجارہ دار اردو اساتذہ جو ریسرچ کے نام پر تجارت کر رہے ہیں واقعی منہ کی کھا جائیں گے اور اردو کا مستقبل یقیناً روشن و تابناک ہوگا۔ مضامین میں گوپی چند نارنگ صاحب نے جمیل الدین عالی کی شاعری کا بھرپور اور مدلل جائزہ لیا ہے۔ علی سردار جعفری صاحب کا خطبہ اور نظیر اکبر آبادی کی نظموں پر دونوں مضامین بھی خوب ہیں۔ حصہ شاعری میں ضیا جالندھری، باقر مہدی، گیان چند، ستیہ پال آنند، کرامت بخاری، رفیق جعفر اور ظہیر غازی پوری کی تخلیقات نے متاثر کیا۔ طنز و مزاح کے دونوں مضامین اچھے ہیں۔ جناب نصرت ظہیر کے روشن چراغی نے بین اقوامی شہرت یافتہ اردو اخبار روزنامہ سیاست کے بانی مدیر جناب عابد علی خاں مرحوم اور حضرت محبوب حسین جگر مرحوم کی یاد تازہ کر دی۔ ان دونوں حضرات نے سیاست کو ہندو صحافت اور مسلم صحافت سے پاک رکھا اور اسے غیر جانبدارانہ رجحانات کا آئینہ روشن بنایا۔ موہن چراغی قومی آواز کے لیے صبح دس تا رات آٹھ بجے تک لگاتار کام کرتے ہیں لیکن حضرت جگر مرحوم نے تو سیاست کو اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔

. . . . . .

☆ ضیا حسنی، ۳۵۰۔ چھوٹا بازار، فتح پور

میری گزارش پر آپ نے "کتاب نما" کے تازہ شمارے میں میرے افسانوی مجموعہ "سایہ دار

درخت" کو نئی مطبوعات کی فہرست میں شامل تو کیا ہے لیکن اس کی قیمت میں سہو ہو گیا ہے۔ اس کی قیمت ساٹھ (۶۰) روپے ہے اور اس میں -/220 درج ہو گئی ہے۔ اس کی تصحیح ضروری ہے کیونکہ زیادہ قیمت کے سبب سے آرڈر نہ موصول ہو سکیں گے۔ توقع ہے آپ قیمت کی تصحیح کرا دیں گے کتاب کی قیمت ساٹھ روپے ہے۔

....

☆ شہاب اختر، کپڑا پٹی، جھریا

"کتاب نما" کافی دنوں بعد ملا۔ رسالہ اپنے ہی رنگ میں رنگا ہے۔ اس بار مظہر امام صاحب کا مضمون خاصے کی چیز ہے۔ انھوں نے تمام شعری مجموعوں کا حوالہ دے دیا۔ گیان چند جین صاحب امریکہ چلے گئے یہاں تنقید کا نقصان ہوا۔ وہاں سے اردو کے تار ذہ جوڑنے میں کافی مشکلیں برداشت کر رہے ہیں۔ خدا کرے ان کی کتابوں کی پیٹیاں انھیں جلد پہنچ جائیں۔

....

☆ رشید الدین، حیدر آباد

"کتاب نما" مئی ۹۸ء کا شمارہ ملا قبل ازیں "پیام تعلیم" بھی ملا تھا۔ شکر گزار ہوں کہ دیر سے سہی مگر آپ نے میرا مضمون "مصطفےٰ کمال۔ اردو کے آدمی" شائع کیا اشاعت میں تاخیر کی وجہ سے اس میں کچھ ترمیمات ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ اب زندہ دلان حیدر آباد کے صدر نریندر لوتھر صاحب نہیں رہے بلکہ راج بہادر گوڑ ہیں دوسری یہ کہ اب شگوفہ کو شائع ہوتے ہوئے ۲۹ کی بجائے ۳۰ سال ہو رہے ہیں۔ مضمون میں کچھ کمپیوٹر کی غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں۔ مثلاً حسندر سر یواستو اس کے معتقد عمومی ہیں۔ عمومی کا لفظ چھوٹ گیا ہے۔ آپ کو جو صحافت کا ایوارڈ ملا ہے اس کی مبارک باد قبول کیجیے۔

....

☆ عاقل زیاد، سستی پور، بہار

اب تو یہ بھی بتانا مشکل ہے کہ کتاب نما کا مطالعہ میں کب سے کر رہا ہوں اور کیوں کر رہا ہوں۔ بس سب کچھ اچھا لگتا ہے، پھر بھی ... فی الحال میرے سامنے یہ دو اداریے ہیں۔ فروری ۹۸ء جمال اویسی کا اور جون ۹۸ء کوثر مظہری کا۔ پھر کچھ لکھنے سے پہلے میں اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں مجھے کبھی کسی سے کوئی اختلاف نہیں رہا۔ ہو بھی کیوں؟ سب تو اپنے ہیں۔ لیکن ایک بات ہے جو کھٹکتی ہے۔ یہ کہنا تو خیر ذرا دشوار ہے کہ بعد والا اداریہ پہلے والے اداریے کا چربہ ہے لیکن یہ کہنا دونوں قدرے مشترک ہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں، جیسے ایک ہی شخص کی دو تصویریں۔ ایک سیدھا سامنے سے کھینچی گئی ہے جس کو جہاں سے بھی دیکھا جائے اپنی ہی طرف کو دیکھتی نظر آتی ہے اور دوسری، وہ سائڈ پروفائل جو ہمیشہ اپنی ہی سمت میں دیکھتا نظر آتا ہے۔ شعری بساط کا دس دس سالوں کے خانوں میں تقسیم کیا جانا بھی خوب ہے۔ ۷۰ء والی ۶۰ء والی نسل کا، ۸۰ء والی ۷۰ء والی نسل کا اور ۹۰ء والی نسل ۸۰ء والی نسل کا خاتمہ کر دے گی۔ میں تو کہتا ہوں لگے ہاتھ ۱۰۰ء والی نسل کا ۹۰ء والی نسل سے خاتمہ کرا ہی دیتے تو بہتر تھا مگر سمجھنے والی بات یہ ہے کہ ایسا کریں گے کون، جناب شوکت حیات یا جناب کوثر مظہری ...؟ "خامہ بگوش" پھر کب سے آرہا ہے، جناب ....؟

ادبی تہذیبی خبریں

ملک کی اردو اکادمیوں کے
دوروزہ اجلاس کا افتتاح

لکھنو: ریاست کے وزیر برائے شہری ترقی مسٹر لال جی ٹنڈن نے آج یہاں اعتراف کیا کہ جنگ آزادی میں اردو اخبارات، صحافیوں، ادباء نے انتہائی اہم رول ادا کیا تھا اور ریاستی حکومت اردو کے ان اخبارات جنھوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا ان اخبارات کے اشتہار کی رقوم کی ادائی پہلے کرنے کے احکام جاری کر دے گی۔

مسٹر لال جی ٹنڈن نے آج یہاں زور دے کر کہا کہ اردو قطعی تقسیم یا بٹوارہ کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ اس ملک کی زبان ہے اور بی جے پی حکومت اس زبان کی ترقی و ترویج کی خواہش مند ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان پر ہمیں ناز ہے۔

مسٹر ٹنڈن نے یہ بات آج یہاں اتر پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام اردو اکادمیوں کے عہدہ داروں کی دو روزہ کانفرنس کی افتتاحی تقریب میں کہی۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک بی جے پی کا تعلق ہے اس کی بابت عوام بالخصوص اردو والوں میں بڑی غلط فہمیاں تھیں لیکن بی جے پی حکومت آنے کے بعد یہ غلط فہمیاں از خود دور ہوتی جا رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے قانون پر عمل در آمد کا سوال ہے اس سے اردو والوں کو کوئی بہت زیادہ فائدہ نہیں پہنچے گا لیکن پھر بھی بی جے پی حکومت یہ بھی کر سکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کے قانون میں کوئی نئی بات نہیں ہے اور جب اردو بل اسمبلی میں پیش کیا جا رہا تھا تو انھوں نے اس وقت کے وزیر اعلا سے اس مسئلہ پر بات کی تھی تو بل پیش کرنے والے وزیر اعلا نے خود انھیں یقین دلایا تھا کہ جب تک وہ وزیر اعلا ہیں اردو دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہیں لے سکتی۔ انھوں نے یہ بل کیوں پیش کیا اس پر انھوں نے کہا تھا کہ ٹنڈن جی یہ آپ بھی جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ چودھری چرن سنگھ نے اردو کو تقسیم کی زبان کہہ دیا تھا جس پر انھوں نے باقاعدہ ان سے بحث کی تھی۔

مسٹر لال جی ٹنڈن نے شاعر مشرق علامہ اقبال کو اپنا بھرپور خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال نے اپنے ترانہ میں ہندستان کے کلچر کی صحیح معنی میں عکاسی کی ہے اور یہی عکاسی ہندستان کی ترقی کی ضامن ہے۔ اور اس کے برعکس کا راستہ تباہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج ملک ایک ایسے دور سے گزر رہا ہے جہاں ووٹوں کی طاقت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ ہندستان میں سیکولرزم محض ایک تماشا بن گیا ہے۔ انھوں نے اردو اکادمی کی چیئرپرسن ڈاکٹر شمیم رضوی کی اب تک کی کارکردگی کی زبردست تحسین کی اور انھیں یقین دلایا کہ اردو اکادمی کی گرانٹ اور دیگر مسائل کو حل کرانے میں وہ ان کی پوری مدد

کریں گے۔

انھوں نے کہا کہ بی جے پی حکومت نے عزاداری کے مسئلہ کو بات چیت سے حل کرادیا۔ انھوں نے کہا کہ تمام مسائل گفت و شنید سے حل کیے جا سکتے ہیں بشرطیکہ اس سے دونوں کی سیاست کا تزاز ونہ ہو۔

اس موقع پر ڈاکٹر شیمہ رضوی نے اردو اکادمی کی اب تک کی کارکردگی اور اکادمی کے درپیش مسائل کی طرف ریاستی وزرا کو متوجہ کیا۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ اگر کسی اسکول، کالج میں اردو پڑھنے والوں کو کسی قسم کی کوئی پریشانی ہو تو وہ اکادمی سے رجوع کر سکتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے جنگ آزادی میں اہم رول ادا کرنے والے اخبارات کی بدحالی کی جانب حکومت کو متوجہ کیا انھوں نے بی جے پی حکومت کی جانب سے سہ لسانی فارمولہ میں اردو شامل کیے جانے کی تحسین کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اکادمی کی چیئر مین ڈاکٹر شیمہ رضوی کی بھرپور تعریف کی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے کونسل کے اغراض و مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اردو اکادمی کی کارکردگی کی ستائش کی۔

پانچ اردو صحافیوں کو اعزازات

لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی کی ایک اطلاع کے مطابق اکادمی سلور جبلی برس کے موقع پر ریاست کے ۵ اردو صحافیوں کو ان کی خدمات کے عوض اعزاز دینے کا اعلان کیا گیا تھا اس کا اعلان آج مجلس منتظمہ کی توثیق کے بعد کر دیا گیا ہے۔ ان صحافیوں میں مسٹر عابد سہیل (صحافت) مسٹر حفیظ نعمانی (ان دنوں) مسٹر اسلوب احمد انصاری کامسٹر ضیاء الدین اصلاحی (المعارف) اور مسٹر قطب اللہ (قومی آواز) شامل ہیں۔ آئندہ ۱۷/ اگست کو اکادمی صحافت پر سیمنار کر رہی ہے۔ اسی تقریب میں مذکورہ صحافیوں کو اعزازات دیے جائیں گے۔ ادارہ "کتاب نما" اتر پردیش اردو اکادمی اور انعام یافتگان کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

اردو اکیڈمی مدھیہ پردیش مشاورتی کمیٹی کی تشکیل

بھوپال، چیئر مین: مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے ایک مشاورتی کمیٹی کی تشکیل کی ہے۔ جو مدھیہ پردیش اردو اکادمی کو وقتاً فوقتاً اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید کرتی رہے گی کہ اردو زبان وادب کو عوامی اور میدانی طور پر فروغ دینے کے لیے کیا اقدام کیے جائیں۔ جس سے کہ اردو کی جڑیں مضبوط ہو سکیں اور یہ ایک مزید طاقت ور زبان اس صوبے میں بن سکے۔ مشاورتی کمیٹی میں مسعود صدیقی چیئر مین، ڈاکٹر اخلاق اثر وائس چیئر مین۔ جہاں قدر چغتائی صاحب ممبر ارشد صدیقی صاحب، ممبر، اے طاہر صاحب ممبر، علی عباس امید صاحب ممبر، مظہر سعید صاحب، (رائسین) ممبر، ڈاکٹر حیدر شاہین (سیہور) ممبر،

محترمہ کوثر جہاں صاحبہ ممبر، ڈاکٹر محمد نعمان ممبر، کامل بہزادی ممبر، ایم وقیع احمد ممبر سکریٹری شامل ہیں۔

مولانا آزاد یونیورسٹی کو دو سو ایکڑ زمین حاصل

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو آندھرا پردیش کے ضلع رنگاریڈی میں منی کونڈا کے مقام پر دو سو ایکڑ زمین کا قبضہ مل گیا ہے۔ ریونیو منڈل افسر اور دیگر متعلقہ حکام نے یونیورسٹی کے رجسٹرار پروفیسر سلیمان صدیقی کو قانونی طور پر اس قطعہ اراضی کا قبضہ دیا جو حیدر آباد سنٹرل یونیورسٹی کے قریب ہی واقع ہے۔

محمد اظہر حیات کو پی ایچ ڈی کی سند تفویض

ناگپور: ناگپور یونیورسٹی نے محمد اظہر حیات کو ان کے تحقیقی مقالہ "مولوی نذیر احمد کے ناولوں میں ان کے تعلیمی تصورات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" پر پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی ہے۔ یہ مقالہ انھوں نے ڈاکٹر عبدالرب عرفان صاحب سابق صدر شعبۂ اردو فارسی ناگپور یونیورسٹی کی نگرانی میں مکمل کیا۔ ڈاکٹر اظہر حیات مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے رکن ہیں اور یشوداگرلز آرٹس اینڈ کامرس کالج ناگپور میں لکچرار ہیں۔

"وسط ہند میں معیاری اردو صحافت کا فقدان"

مہاراشٹر اردو اکادمی کی محفل مذاکرہ میں شرکاء کا اظہار خیال

ناگپور: "وسط ہند سے اردو روزنامہ جاری کرنا میرا خواب ہے اور میری آرزو ہے کہ یہاں سے ایک معیاری اخبار شائع ہو۔ اس قسم کے عزائم کا اظہار روزنامہ اردو سماچار کے پبلشر، ٹریڈ یونین لیڈر جناب ایس کیو زماں نے کیا۔ وہ ۲۰ جون بروز سنیچر ۱۰ بجے شب کامٹی کے لکشمی نارائن ہال میں منعقدہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے زیر اہتمام اردو محفل کے تحت "ناگپور ضلع میں اردو صحافت، مسائل اور حل" کے موضوع پر ایک مذاکرہ میں صدارتی تقریر کر رہے تھے۔ اس مذاکرے میں تمام شرکاء نے اس بات سے اتفاق کیا کہ وسط ہند میں معیاری اخبار کا فقدان ہے۔ اس کی مختلف وجوہات پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ شرکاء نے صحافت کی تکنیک پر اردو میں کتاب یا گائڈ کی کمی اور نایابی پر افسوس کا اظہار کیا۔ اس مذاکرے میں ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر (ادیب و شاعر) جناب بشر کی نصرت (مدیر سنگ میل) جناب وکیل احمد عارف (مدیر اخوت) جناب نظام الدین انصاری (مدیر المیزان) جناب حفظ الرحمن (قاری) جناب کمار جعفری (صحافی) جناب سہیل اختر ثانی (نیوز پیپر ایجنٹ) نے شرکت کی۔ جناب ہارون رشید عادل اور جناب غیور جعفری نے سامعین کی طرف سے کئی سوالات اٹھائے۔ یہ مذاکرہ پہلی مرتبہ Group Discussion کی شکل میں کیا گیا جسے کافی پسند کیا گیا۔

اردو محفل کا آغاز تلاوت کلام پاک سے کیا گیا۔ اس کے بعد محفل کے کنوینر اور اردو اکادمی کے ممبر ڈاکٹر محمد اظہر حیات نے محفل کی غرض و غایت بیان کی اور مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ یہ

محفل کامٹی کے اولین نامہ نگار (انقلاب بمبئی، الجمعیۃ دہلی) اور بزرگ شاعر مرحوم صدیق احمر بیڑھب کے نام منسوب کی گئی تھی۔ ڈاکٹر اظہر حیات نے مرحوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کی۔ اس مذاکرے کی نظامت فیروز حیدری نے کی۔

مذاکرے کے فوراً بعد ایک مشاعرہ ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشا کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر، ڈاکٹر فداء المصطفی فدوی (صدر شعبۂ اردو ساگر یونیورسٹی) جناب کیفی اسماعیلی، جناب خلش قادری، ڈاکٹر یونس افسر، جناب غیور جعفری، جناب تابش حلیمی، جناب ظہیر عالم، جناب روش جعفری، جناب منظور شاکر، جناب عارف جمالی، جناب ہارون رشید عادل، جناب جیلانی خالد، جناب اشفاق قریشی، جناب ظہیر حیدری جناب جمال انصاری اور جناب توقیر حسین نے کلام سے نوازا۔ سامعین نے پوری دلچسپی اور ذوق و شوق کا مظاہرہ کیا۔ تم تو ٹھہرے پردیسی" کے گیت کار جناب ظہیر عالم سے حاضرین نے بار بار فرمائش کر کے کلام سنا۔ آخر میں صدر مشاعرہ نے اپنے کلام سے نوازا۔ مشاعرہ کی نظامت مشہور اناؤنسر جناب اشفاق نجمی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کی۔ جس سے مشاعرہ میں چار چاند لگ گئے۔ رات ۳ بجے مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔ اس اردو محفل کو کامٹی کے اہل ذوق حضرات کافی دنوں تک یاد رکھیں گے۔

اردو فاؤنڈیشن کے جلسے میں "رنگ منچ کے پانچ رنگ" کا اجرا اور کہانی، گیت اور غزلیں

نوئیڈہ: حسب معمول اردو فاؤنڈیشن، کا ماہانہ جلسہ رفعت سروش کے مکان پر منعقد ہوا جس میں اردو ہندی کے پچیس سے زیادہ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ محفل میں دونوں زبانوں کی یگانگت کی فضا تھی۔ صدارت کے فرائض ہندی کے مشہور ادیب سوم دت دکشت نے انجام دے۔ پروفیسر ماجدہ اسد نے گھروں میں اوپر کا کام کرنے والی ایک ملازمہ "حمیدن" کے بارے میں ایک کہانی پڑھی جس میں اس طبقہ کی عورتوں کی زندگی، ان کے مسائل اور زندگی سے جوجھنے کے جذبہ کو نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا تھا۔ کہانی کو مجموعی طور پر پسند کیا، خاص طور پر عام فہم زبان اور تحقیق پسندانہ بیان کو۔ بحث میں ناھرہ شرما، ڈاکٹر رضیہ حامد، ڈاکٹر شبانہ نذیر، تسیم چشتی اور راج منی تواری نے نمایاں حصہ لیا۔ اس موقع پر رفعت سروش کی تازہ کتاب "رنگ منچ کے پانچ رنگ" کا اجرا شری سوم دت دکشت نے کیا۔ اس کتاب میں ہندی ڈرامے ہیں۔ پنڈت راج تواری نے سیر حاصل مقالہ پڑھا اور کتاب میں شامل پانچوں ڈراموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ شعرائے کرام نے اپنے کلام سے نوازا۔ گذشتہ ماہ طے کیا گیا تھا کہ نوئیڈہ کے مقامی شعرا اپنا تازہ کلام ہی پڑھیں گے۔ چنانچہ گلزار دہلوی، پی پی رندسری

واستو، ملک زادہ جاوید، سید ضمیر حسن دہلوی، کرشن بہار، اور رفعت سروش کی تازہ غزلیں سننے کو ملیں اور سوم دت اور پربود مشر زمل کے گیت۔ مہمان شعرا میں عشرت تیواری، ذکی طارق، سیدہ تسیم چشتی، ڈاکٹر شبانہ نذیر، سویش چند وسوئی، وصی احمد وصی اور وارث وارثی کا کلام ذوق و شوق سے سنا گیا۔ مجموعی طور پر نثر و نظم اور ہندی اردو تخلیقات پر مبنی یہ محفل نہایت کامیاب قرار دی گئی۔

پروفیسر عبدالغفار شکیل دوبارہ کرناٹک اردو اکادمی کے چیئر مین

حکومت کرناٹک نے پروفیسر عبدالغفار شکیل کو ان کی شاندار اور تعمیری خدمات اردو زبان کے پیش نظر دوبارہ تین سال کے لیے کرناٹک اردو اکادمی بنگلور کا چیئر مین نامزد کیا ہے۔ پروفیسر شکیل صاحب نے جون ۱۹۹۵ تا جون ۱۹۹۸ تین برسوں میں کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے تقریباً ایک سو پروگرام کروائے۔ پروفیسر عبدالغفار شکیل کو قومی کونسل برائے فروغ اردو حکومت ہند دہلی کی کل ہند ریاستی اردو اکادمیوں کی کو آرڈی نیشن کمیٹی کا ممبر بھی منتخب کیا گیا جس کے پانچ ممبروں میں سے شکیل صاحب ایک ممبر ہیں۔ مشہور ناول نویس و افسانہ نگار کشمیری لال ذاکر اس سب کمیٹی کے چیئر مین ہیں۔ پروفیسر شکیل صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات میں بھی دوبار چیئر مین رہ چکے ہیں۔ کرناٹک کے علمی و ادبی حلقوں نے شکیل صاحب کی خدمات کو سراہا ہے۔

سحر اکبر آبادی کے شعری مجموعہ آبشار خیال کی تقریب رونمائی

حال ہی میں کارلٹن ٹاور ہوٹل میں کویت بزم سخن کے زیر اہتمام پروفیسر فرید قریشی سحر اکبر آبادی کے چوتھے شعری مجموعہ آبشار خیال" کی تقریب رونمائی صدر محفل جناب عبداللہ حسن سفیر بنگلہ دیش کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی بزم کے دوسرے مہمان خصوصی ناگجر (جنوبی امریکہ) کے نصیر محمد وسینی کے علاوہ ہند کے کونسلر عزیز عثمانی تھے۔ سفیر پاکستان مشتاق احمد مہر کی نمایندگی قائم مقام سفیر جناب جی۔ آر۔ بلوچ نے کی اور جے سالک سابق وزیر پاکستان اور بزم کے سرپرست اعلا سوداگر حسین شجاع بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ بزم کے صدر پروفیسر سحر اکبر آبادی نے تمام خصوصی مہمانوں کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی اور انھوں نے بیگم جمیلہ قریشی بیگم ظفر احسن بیگم سعید اور اپنے بچے نظیر فرید سے کہا کہ وہ صدر محفل اور مہمانان خصوصی حضرات کو پھول پیش کریں۔ تقریب کی نظامت پاک وہند کے معروف شاعر و مصنف جناب نور پرکار صاحب نے انجام دیے۔ تقریب کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے کیا گیا۔ حافظ انجینئر انکسار احمد صدیقی نے تلاوت قرآن

پاک کے بعد بارگاہ رسولؐ میں نعت کا ہدیہ عقیدت کے طور پر پیش کیا۔ سب سے پہلے ناظم نے طاہرہ بانو کا نام پکارا کہ وہ مائک پر آئیں۔ انھوں نے انگریزی میں تقریب کا پس منظر بیان کیا انھوں نے باقاعدہ بنگلہ دیش کے سفیر نائجر (جنوبی امریکہ) کے سفیر ہند کے کونسلر چین کے کونسلر، چین کے کلچرل سکریٹری ژینگ محمد اسمٰعیل بنگلہ دیش کے کونسلر انڈونیشیا کے کلچرل سکریٹری توفیق رجال۔ ملیشیا کے سفارت کار عرفان خاں' نائجر کے کونسلر محمد یعقوب کو خوش آمدید کہا اور ان کا تعارف کرایا اور آبشار خیال کے اجرا کا مقصد بھی بیان کیا۔ بزم کے نائب صدر عرفان محمد خاں نے بزم کی پچھلی روداد پیش کی اس کے بعد آبشار خیال اور بزم کے سوئنیر کی رونمائی کا اعلان کیا۔ صدر محفل سفیر بنگلہ دیش نے باقاعدہ رونمائی کی رسم ادا کی۔ اور پھر قائم مقام سفیر پاکستان جی آر بلوچ نے بزم کے سوئنیر کا افتتاح کیا۔

ناظم نور پرکار نے مقاریر کا سلسلہ اپنے مقالہ سے شروع کیا۔ انھوں نے سحر کی ادبی کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے زبردست خراج تحسین ادا کیا۔ سحر نے اپنے دیوان شام و سحر میں کویت کے تمام شعرائے کرام کا ایک ایک شعر شائع کرکے ادب نوازی کا ثبوت فراہم کیا۔ سحر خود تو ادبی سفر کررہے ہیں مگر وہ اپنے ساتھ دوسرے شعرائے کرام کو بھی لے کر چل رہے ہیں۔ اگلے مقرر جناب رانا اعجاز کمل نے تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ اس کے بعد عبدالمجید پروانہ نے سحر اکبرآبادی کی شخصیت کے بارے میں جامع گفتگو کی۔ پروانہ کے بعد پروفیسر مرزا قدوس نے کہا کہ سحر کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے۔

مرزا قدوس کے بعد اردو کے ایک اور اسکالر جناب سلہری صاحب نے انگریزی میں نپے تلے الفاظ میں اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ سلہری صاحب کے بعد بزم کی جنرل سکریٹری غزالہ بانو نے اپنی تقریر میں منظوم تبصرہ کیا جو سامعین نے بہت پسند کیا۔

تقریب کے مہمان خصوصی ہندستان کے کونسلر عزیزالدین عثمانی نے مختصر اور پرمغز تقریر کی۔ انھوں نے سحر اکبرآبادی کو برصغیر کا بڑا شاعر کہا ہے۔ عثمانی صاحب کے بعد منیر فراز نے اپنے مقالہ میں سحر کو دور حاضر کا بڑا شاعر کہا منیر فراز کے بعد پاکستان اسکول و کالج کی پرنسپل محترمہ خالدہ رفیق نے خطاب کیا۔ انھوں نے فرید قریشی کی شخصیت و فن پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی۔

خالدہ رفیق کے بعد سحر کے ایک دوست سید احمد رضا شاہی جو محمد علی کلے کے سکریٹری ہیں عارضی طور پر کویت آئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ تقریب مقامی نہیں بلکہ عالمی

ہے کیونکہ اس تقریب میں میں بہت سے سفارت کار دیکھتا ہوں۔

شاہی کے بعد قائم مقام سفیر پاکستان جی۔ آر۔ بلوچ نے کہا سحر اکبر آبادی ادبی ثقافتی حلقوں کا ایک معتبر نام ہے۔ناظم محفل نے سحر اکبر آبادی کو اظہار خیال کے لیے مائک پر بلایا۔ انھوں نے مختصراً اپنی ادبی کاوشوں کا ذکر کیا۔ سامعین کی فرمائش پر انھوں نے "آبشار خیال" کے چند خوبصورت اور پر اثر اشعار سنا کر محفل کو زعفران زار بنادیا۔ سحر اکبر آبادی کے بعد بزم کے سرپرست اعلا سوداگر حسین شجاع نے اپنی تقریر میں کہا کہ سحر اکبر آبادی تقریباً بیس سال سے کویت میں ہندوپاکستان میں ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ادبی حلقوں کی مقبول شخصیت ہیں ان کو ادبی و سوشل آٹھ ایوارڈ مل چکے ہیں۔

ناظم نے ایوارڈ کی تقریب کا اعلان کیا۔ انھوں نے نائجیریا (جنوبی امریکہ) کے سفیر عبدوسینی سے درخواست کی وہ سحر اکبر آبادی کو ادبی خدمات کے سلسلے میں تمغہ لگائیں۔ اس کے بعد سفیر عبدوسینی نے فرانسیسی میں تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ آج میں ادبی عظیم تقریب میں شریک ہوا ہوں۔ جس کے لیے میں سحر کا شکر گزار ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ادب میں دیواریں نہیں ہوتی۔ آخر میں محفل کے صدر سفیر بنگلہ دیش کو تقریر کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا اس تقریب میں سات ممالک کے سفارت کار موجود ہیں۔ میں آج کی تقریب کو عالمی تقریب کا نام دیتا ہوں۔ فرید قریشی سحر ایک اچھا انسان اور ایک اچھا آرگنائزر ہے جس کو تقریب سجانے کا فن آتا ہے۔ میں بزم کے صدر اور اراکین کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے آج کی محفل میں عزت دی۔ آخر میں بزم کے صدر سحر اکبر آبادی نے تمام سفارت کاروں تمام دوستوں پریس اور حاضرین محفل کا شکریہ ادا کیا۔

غزالہ بانو' جنرل سکریٹری' بزم سخن' کویت

صحرا کی گونج کی رسم رونمائی

پٹنہ ۱۴؍جولائی کل شام مقامی اردو بھون میں حلقہ ادب بہار کی جانب سے ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب کی صدارت بہار یونی ورسٹی سروس کمیشن کے سابق چیرمین ڈاکٹر وہاب اشرفی نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے اطلاعات و تعلقات عامہ کے وزیر ڈاکٹر عبدالمالک نے شرکت کی۔ اس موقع پر محمد قمر مثنو کے شعری مجموعہ "صحرا کی گونج" کی رسم اجرا اقلیتی فلاح کے وزیر ڈاکٹر لطف الرحمن کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ نظامت کے فرائض حلقہ ادب بہار کے جنرل سکریٹری جناب فخرالدین عارفی نے انجام دیے۔ اس موقع پر جناب شفیع مشہدی' ڈاکٹر عبدالصمد' جناب فخرالدین عارفی'

ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی اور جناب ہارون رشید کے علاوہ ڈاکٹر عبدالمالک ڈاکٹر لطف الرحمٰن اور صدر جلسہ ڈاکٹر وہاب اشرفی نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ صدر جلسہ ڈاکٹر وہاب اشرفی نے کہا کہ آج کی مشینی اور کاروباری زندگی میں ادب کا کام کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے لوگوں کے اندر اب زبان کی خدمت کا جذبہ ہی نہیں رہ گیا۔ پھر بھی جو لوگ زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ مبارک باد کے مستحق ہیں موصوف نے اس موقع پر قمر منظو صاحب کو مجموعہ کی اشاعت اور اجرا کے لیے مبارک باد بھی پیش کی۔ اس موقع پر رسم اجرا کے بعد ایک مشاعرے کا بھی انعقاد کیا گیا جس کی صدارت اقلیتی ولسانی کمیشن حکومت بہار کے سابق چیرمین جناب ہارون رشید نے کی۔ مشاعرے میں صابر آروی، شفیع مشہدی، سہیل اختر، نارائن شکیب لیاز، عالم خورشید اور ظفر صدیقی رضوی خورشید اکبر رشید عارف، اسرار جامعی وغیرہ نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔

نظامت کے فرائض حلقہ ادب بہار کے جنرل سکریٹری جناب فخرالدین عارفی نے انجام دیے اور شکریہ کی رسم ڈاکٹر جاوید حیات سکریٹری حلقہ ادب بہار نے ادا کی۔

مشاعرہ عالمی یوم اردو

بزم احباب سخن عرعر نے اردو کا عالمی دن ایک شاندار مشاعرہ اردو منزل میں منایا۔ اس طرح اردو دنیا میں جگہ جگہ یہ دن منانے والوں کا ساتھ دے کر اردو سے محبت کرنے والوں میں اس عظیم زبان کی ترویج و ترقی کے لیے نئے ولولے اور جوش کو بیدار کیا۔ اسی محفل میں سعودی عرب سے نوکری کو خیر آباد کرنے والے معروف شاعر جناب خواجہ مسرور حسین خواجہ کو بحیثیت مہمان خصوصی اور بزم کے رکن جناب ڈاکٹر غیاث الدین خاں کو صدارت کے اعزاز سے نوازتے ہوئے استقبالیہ بھی دیا گیا۔ پروگرام کی ابتدا تلاوت قرآن پاک سے جناب ریاست علی صاحب نے کی جس کے بعد حمد باری تعالیٰ راقم الحروف نے پیش کی اور پروگرام کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیے۔ اس بار نعت رسولؐ پاک کی سعادت جناب شکیل احمد صاحب اور مہدی حسن مجور کے حصے میں آئی۔

اردو کے عالمی دن کو منانے کی ضرورت اور اہمیت پر بولنے والوں میں نسیم احمد، جناب امتیاز اعظمی، ڈاکٹر غیاث الدین خاں اور راقم نے اپنے اپنے پیغامات پڑھ کر سنائے جن میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا کہ "اردو کی بقا کے لیے ہمیں اب حکومت (ہند) کی طرف نہ دیکھ کر اپنی اپنی ذمہ داری (ہر فرد کو جس کی مادری زبان اردو ہے) نبھاتے ہوئے اپنے بچوں کو کسی بھی طرح اردو کی تعلیم دیں۔ اس کے بعد کوئی ساڑھے بارہ

یے مشاعرہ شروع ہوا جس میں میرے اور محمد عطاء اللہ عطا کے علاوہ سب شاعروں نے غزلیں پڑھیں۔ محمد عطاء اللہ عطا نے تین نثری نظمیں اور ایک پابند نظم پڑھی جس کو سامعین نے بہت دھیان سے سنا اور داد سے نوازا۔ اس بار بھی کلام پر لحن چھایا رہا اور یوں امتیاز اعظمی اور رئیس لکھنوی کے ساتھ رئیس احمد میرٹھی نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ جن شعرا کے شعر داد و تحسین سے رنگین ہوگئے ان کے نام ہیں۔ حنیف ترین امتیاز اعظمی، رئیس لکھنوی، خواجہ سرور حسین خواجہ، محمد رئیس میرٹھی، محمد ناصر نوح، ذاکر حسین ذاکر، وصی اللہ بستوی، مہدی حسن مجبور، رحمت اللہ جری، ان کے علاوہ جن اور شعرا نے حصہ لیا ان کے نام ہیں جناب دلاور خاں دلاور، محمد نسیم اعظمی، محمد احمد احمد، ہارون رشید ہارون، محمد منیر امجد اور نسیم احمد۔

بزم کے ارکان جناب شمشاد احمد، محمد امتیاز اعظمی، محمد رئیس لکھنوی، محمد شکیب، رئیس میرٹھی، محمد مختار، محمد نعیم بیگ، ذاکر حسین، محمد نایاب، ناصر نوح اور جناب شوکت مہوی نے اس پوری محفل کو آراستہ کرنے میں شروع سے آخر تک ساتھ دیا اور جناب ڈاکٹر منیر احمد شریف بنگلوری اس محفل میں اعزازی مہمان کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ آخر میں یہ عرض کردوں کہ بزم احباب سخن عرعر نومبر ۱۹۸۸ء میں راقم اور محترمی رحمت اللہ جری صاحب نے ساتھ مل کر قائم کی تھی۔ رحمت اللہ جری صاحب ایک استاد اور بہت بڑے و معروف شاعر ہیں وہ ہمارے لیے ہر مشاعرے پر اپنی غزل بھیجتے ہیں جسے ہم تبرک کے طور پر کسی سے محفل میں پڑھواتے ہیں۔ اس طرح کراچی میں رہ کر ہمیشہ ہمارے درمیان ہر مشاعرے میں چلے آتے ہیں۔

حنیف ترین صدر بزم سخن احباب عرعر (سعودی عرب)

احمد صغیر کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

شعبہ اردو گدھ یونی ورسٹی بودھ گیا سے اردو کے مشہور افسانہ نگار اور صحافی (احمد صغیر) احمد صغیر کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ موصوف کے تحقیقی مقالے کا موضوع تھا "جدید اردو افسانے میں احتجاج کی بازگشت ۱۹۷۰ء تا ۱۹۹۰ء" احمد صغیر نے اپنا تحقیقی مقالہ پروفیسر تاج انور صدر شعبہ اردو مرزا غالب کالج گیا کی نگرانی میں مکمل کیا۔ ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی صدر شعبہ اردو ایل ایس کالج مظفر پور اور ڈاکٹر عبدالمنان کلکتہ یونی ورسٹی۔ ان کے ممتحن تھے۔

پروفیسر ممتاز احمد کے انتقال پر جامعہ ملیہ میں تعزیتی نشست

نئی دہلی ۱۴ر جولائی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جامعہ اردو ریسرچ اسکالرز ایسو سی ایشن کی جانب سے ادیب و نقاد اور شاعر پروفیسر ممتاز احمد کے سانحہ ارتحال پر تعزیتی نشست ہوئی۔ اس موقع

پر ایسوسی ایشن کے صدر کوثر مظہری نے پروفیسر ممتاز احمد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے ادبی وعلمی کارناموں کا تفصیلی ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر احمد ایک شفیق استاد کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں ہمیشہ انہماک کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ ایسوسی ایشن کے نائب صدر تحسین عثمانی نے پروفیسر ممتاز احمد کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری اسلم جمشید پوری نے پروفیسر موصوف کے علمی کارناموں میں پروفیسر کلیم الدین احمد کے ساتھ انگریزی اردو لغت کی تیاری میں معاون کی حیثیت سے شامل رہنے کا ذکر کیا۔ تعزیتی نشست میں ابوالکلام عارف عبدالستار، شاہ عالم، نجمہ انجم، شاہانہ ارم، فرزانہ خلیل اور سیدہ خاتون نے شرکت کی۔

واضح ہو کہ پروفیسر ممتاز احمد کا گذشتہ ۲۶رجون کو پٹنہ میں انتقال ہو گیا۔ موصوف ایک عرصہ تک شعبہ اردو پٹنہ یونی ورسٹی کے صدر رہے۔ آپ پٹنہ کالج کے پرنسپل اور فیکلٹی آرٹس کے ڈین کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ آپ کی تصنیفات میں مثنویات راسخ اردو شعرا کا تنقیدی شعور، کلیم الدین احمد کی شاعری پر ایک نظر، مثنوی حدیث سخن، مکاتیب شہباز اور تحلیل نفسی وادبی تنقید (ترجمہ) قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ سیکڑوں مضامین مختلف جرائد ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

ایک تعزیتی جلسہ

انجمن ترقی اردو جبل پور کا ایک تعزیتی جلسہ ۵رمئی ۱۹۹۸ء کو انجمن کی لائبریری میں منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر ڈاکٹر شیخ فرید سابق صدر شعبہ اردو وفارسی مہاکوشل آرٹس کالج کی وفات پر اظہار غم وافسوس کیا گیا۔ ڈاکٹر شیخ فرید صاحب ۱۹۵۴ء سے دسمبر ۱۹۷۴ء تک مہاکوشل کالج میں اردو اور فارسی کے پروفیسر رہے۔ ۳رمئی ۱۹۹۸ء کو ان کے وطن برہان پور میں ان کا انتقال ہوا۔ اراکین نے مرحوم کی خوبیوں کو یاد کیا اور دعائے مغفرت کی۔ جلسہ کی صدارت محترمہ مسز پروین حق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج نے فرمائی۔

Regd. with R.N.I at No 4967/60 August, 98
Regd. No. DL 16016/9 8
Licence No. U[SE]-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025

ماہنامہ کتاب نما



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ۔ اردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

ٹول مال — شفیقہ فرحت

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱۸/=

فی الفور — یوسف ناظم

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۳۰/=

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۱۸/=

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیّدین — مرتبہ: ڈاکٹر حلیم شان صدیقی

ممتاز ماہر تعلیمات خواجہ غلام السیدین کے علمی، ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔ ۴۰/=

توفیق الحکیم — ڈاکٹر بدر الدین الحافظ

ناول نگاری کا جائزہ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق الحکیم کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۷/=

نظریاتی تلاطموں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

ستمبر ۱۹۹۸ء   جلد ۳۸   شمارہ ۹

فی پرچہ 7/:

سالانہ 70/:

سرکاری تعلیمی اداروں سے 100/

غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک) 500/

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فیکس نمبر: 6842574

Tel Cum Fax No (011)-6910191

ٹیلی فون نمبر: 6910191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ۔ ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

اس شمارے میں

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

نئی مطبوعات

کمال با کمال (خطوط و کلام) کالی داس گپتا رضا -/100

غالب (مختصر حالات اور انتخاب کلام مع شرح)

کالی داس گپتا رضا -/60

اردو غزل کا استعارتی نظام (از ابتدا تا غالب)

ڈاکٹر مظفر شہ میری -/120

عہد نامہ (سہ ماہی) مدیر شمیم حنفی سالانہ -/80

ہندوستانی زبان (سہ ماہی تحقیقی رسالہ) ڈاکٹر سشیلا گپتا -/10

ماہنامہ حجاب رامپور (خواتین و طالبات کا رسالہ) ام صہیب -/12

استاد شاعری (عروض) لالہ جگن ناتھ کمال کرتارپوری -/60

علی گڑھ سے دیوبند تک (تعلیمی سفر نامہ) ڈاکٹر اکبر رحمانی -/60

سائبان (سوانح محبوب حسین جگر) صلاح الدین نیر -/50

مبادی سیاسیات محمد محمود فیض آبادی -/250

اردو غزل کی روایت (تنقید)

اور ترقی پسند غزل ڈاکٹر ممتاز الحق -/200

یہ تنگ زمین (افسانے) ترنم ریاض -/150

چل چنبیلی باغ میں (سفر نامہ) مظفر حنفی -/200

ہماری عادتیں ہمارے جذبات (نفسیات) دیانند -/80

لغات ابجد شماری (جلد اول تا دوم) سید احمد -/129

خوابوں میں سنہری جالی ہے (نعتیہ کلام) صبیح رحمانی -/15

قصص الانبیاء و اصحاب الصالحین (تلخیص قصص القرآن)

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی -/125

سیدنا حضرت عمر فاروقؓ (مکمل سوانح) محمد حسین ہیکل -/175

نور سے نور تک (مذہب) عبدالسلام انصاری -/75

شاہراہ عاقبت (تاریخی نصیحتیں) محمد بشیر -/15

شعور حدیث (احادیث کی تشریح) محمد عبداللہ حنیف -/65

[illegible]

علامہ عبدالصمد صارم الازہری -/125

شعور نماز (مذہب) محمد عبداللہ حنیف -/50

زہر گل (شعری مجموعہ) عالم خورشید -/90

آتش و نم (شعری مجموعہ) نشور واحدی -/60

جو اماں ملی تو کہاں ملی (ناول)

اچھوتے موضوع پر محمد علیم کے تازہ اور تیز ڈکشن سے تخلیق شدہ ناول منظر عام پر۔ ناول نگار نے دور از کار تشبیہات اور منطق لفظیات سے عبارت کو بچائے رکھا ہے۔ قیمت:-/150

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی کتابیں

نظام اردو خطبات کا 19 واں خطبہ

داستان امیر حمزہ

"داستان، زبانی بیانیہ، بیان کنندہ اور سامعین"

کے عنوان سے جو خطبہ

اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں فروری ۱۹۹۸ء میں پیش کیا تھا۔ اب یہ اہم خطبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شائع کر دیا ہے۔ قیمت -/60

فکر انسانی کا سفر ارتقا

پروفیسر خواجہ غلام السیدین

نظام اردو خطبات کا آغاز شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۲۵ فروری ۱۹۷۶ء کو ہوا۔ اس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا اور صدارت ڈاکٹر سی۔ ڈی۔ دیش مکھ وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے فرمائی۔ ملک کے دیدہ ور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین نے مندرجہ بالا عنوان پر دو لیکچر دیے جن کا اب تیسرا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔ قیمت:-/45

مہمان اداریہ
ڈاکٹر جلال السعید الحفناوی
قاہرہ یونیورسٹی، مصر

اشاریہ

مصر میں اردو زبان

اس بات کا تعین کرنا تو دشوار ہے کہ مصر میں اردو اول اول کب داخل ہوئی، البتہ تخمیناً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی کے شروع میں مصر میں اردو ان ہندستانیوں کے ذریعہ داخل ہوئی جو یہاں یا تو تجارت و سکونت کے لیے آئے تھے یا وہ لوگ جو انگریزی لشکروں سے منسلک تھے۔ اور دن بدن ان کی تعداد بڑھتی رہی یہاں تک کہ ایک بہت بڑی کالونی بن گئی اور باوجود یکہ، وہ ہندستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تھے اور ہر علاقہ کی اپنی خاص زبان تھی لیکن انھوں نے اردو کو عام زبان بنایا جس کے ذریعہ وہ آپس میں بات کرتے اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتے، پھر اخبار بھی نکالنا شروع کر دیا تاکہ ان چیزوں و شائع کیا جا سکے جن کے ذریعے ان کا اپنے وطن سے ربط و تعلق برقرار رہے اور اس کے ذریعہ قومیت کے شعلے اور انگریز مخالفت کو یاد دلاتے رہیں۔ ابو سعید نے عربی جریدہ "جہان اسلامی" نکالا اور اس پرچہ کا آزادی ہند میں کارنامہ رہا ہے اور اردو، عربی اور ترکی زبان میں شائع ہوتا اور ہندستان تک پہنچ جاتا تھا یہاں تک کہ انگریزی حکومت متنبہ ہو گئی اور اس کو بند کر دیا پھر اس کا نکلنا بند ہو گیا۔ ۱۹۳۰ء میں قاہرہ سے ایک ہفتہ وار پرچہ نکلنا شروع ہوا جو پنی نوعیت کا پہلا پرچہ تھا اس کو محمود احمد عرفانی نے نکالا اور اس کا مقصد عالم اسلام کو ہندستانی مسلمان سے متعارف کرانا تھا۔

جب اقبال ۱۹۳۱ء میں مصر آئے تو یہاں کے بڑے بڑے نامور لوگ ان سے متعارف ہونا شروع ہوئے، یہاں تک کہ قاہرہ اقبال کے تعارف کا مرکز بن گیا اور عبدالوہاب عزام کے ذریعہ عربوں نے علامہ اقبال کو پہچانا اور اہل مصر نے اردو سے دلچسپی لینا شروع کی، ۷ مارچ ۱۹۳۹ء میں قاہرہ یونیورسٹی میں اردو زبان کی تعلیم شروع ہوئی اور اس کے بعد جامع ازہر کے "مجلہ اصول الدین" میں ۱۹۴۸ء میں اور پھر ۱۹۷۹ء میں "کلیہ

اللغات والترجمہ" میں اردو کے شعبے کا افتتاح ہوا اور اسی سال جامعہ عین شمس میں بھی اردو کا شعبہ کھولا گیا اور اب اسکندریہ یونیورسٹی میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے' شروع شروع میں اس کی تدریس کا کام کچھ ہندستانی اساتذہ ہی انجام دیتے تھے اور ان میں سرفہرست حسن اعظمی اور مولانا ابوالحسنات اور شیخ لقمان صدیقی ہیں' شیخ لقمان نے اردو نحو کے قواعد کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف فرمائی جو قاہرہ یونیورسٹی پریس میں ۱۹۶۱ء میں چھپی اور جو اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے' ایک عرصہ تک ڈاکٹر امجد حسن قاہرہ یونیورسٹی میں اردو کی تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں اور پھر اس کے بعد مصری اساتذہ کی ایک نسل نے یہ کام شروع کیا جن میں پہلا نام ڈاکٹر سمیر عبدالحمید ابراہیم کا ہے جنھوں نے اردو شاعری پر مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۷۸ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے' نیز مقالہ نگار نے "فن سیرت نگاری اور شبلی نعمانی" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر قاہرہ یونیورسٹی سے ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ پھر اس کے بعد کچھ مصری اساتذہ نکلے جنھوں نے مصری یونیورسٹیوں میں اردو زبان کی تعلیم دینا شروع کی اور زبان و ادب کے تعارف میں حصہ لیا، لیکچرز کی تالیف و تصنیف کے ذریعہ' نیز مصری ریڈیو روزانہ اردو زبان میں ایک پروگرام نشر کرتا ہے اور اسی کے ذریعہ مصر مشرق وسطیٰ جزیرہ عرب میں اردو کا مرکز بن گیا ہے' اور مصر ہی کی بدولت عربی دنیا کو عظیم شاعر علامہ محمد اقبال سے متعارف ہونے کا موقع ملا کیوں کہ مصر کے تعلیم یافتہ مہذب لوگوں نے جو اردو جانتے تھے اقبال کے اشعار کا عربی میں ترجمہ کیا اور ان میں سرفہرست ڈاکٹر عبدالوہاب عزام اور شیخ صاوی شعلان ہیں باوجودیکہ وہ نابینا ہیں لیکن انھوں نے اقبال کی شاعری کا ترجمہ کرنے میں کمال دکھایا یہاں تک کہ بہت سی جگہوں پر یہ ترجمہ اصل سے زیادہ اچھا ہوا ہے۔

۱۹۲۹ء میں قاہرہ سے اردو کا پہلا ہفتہ واری مصور رسالہ شائع ہوا۔ اس کے نگراں اور ایڈیٹر محمود احمد عرفانی تھے۔ جیسا کہ عرفانی نے بیان کیا ہے ان کا قاہرہ آنے کا مقصد اس رسالے کی معرفت ہندستانی مسلمانوں کو عالم اسلامی سے متعارف کرنا تھا۔ عرفانی اس کے ایڈیٹر تھے جبکہ ان کے سب سے چھوٹے بھائی اس کے ڈائرکٹر اور طباعت کے نگراں کا کام انجام دیتے تھے۔ اس رسالے کا دفتر ۱۴۱' محمد علی روڈ پر تھا۔ عرفانی اس رسالے "اسلامی دنیا" کی اشاعت کے علاوہ ایک تجارتی ادارہ بھی چلاتے تھے' جس کا نام "بیت السنہ" تھا،

جس کی آمدنی سے رسالے کی اشاعت بھی کرتے تھے اور یہ ادارہ ہند و مصر کے درمیان تجارتی تعلقات مستحکم کرنے میں بھی مددگار ثابت ہو رہا تھا۔

عرفانی کے متعلق یہ سبھی معلومات میں نے ہندستانی شخصیات کی معرفت حاصل کی ہیں۔ جنھوں نے ہندستان سے نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ پہلے مصر ہجرت کی۔ مصر میں سکونت اختیار کی اور مختلف تجارت سے جڑ گئے خاص طور پر گرم مسالے کی تجارت سے جس کے لیے ہندستان مشہور ہے۔ واضح رہے کہ جب نپولین بوناپارٹ مصر آیا اور اس پر قابض ہو گیا تو وہ ہندستانی گرم مسالے کی تجارت پر کنٹرول کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ بے شک یہ معلومات اس رسالے کے متعلق حکم صادر کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں اس لیے کہ مجھے اس کے کچھ ہی نسخے فراہم ہوئے ہیں جس کے مضامین کے تحلیلی مطالعے سے اس رسالے اور اس کے نگراں کے متعلق معلومات حاصل کی جا سکی ہیں۔

اس رسالے کا پہلا شمارہ ۱۱ر مئی ۱۹۲۹ء کو شائع ہوا۔ اس تاریخ کا ذکر اردو رسالہ نظام گزٹ "میں بھی ملتا ہے جو حیدر آباد دکن سے شائع ہوا تھا۔ "اسلامی دنیا" اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا جبکہ اس کے آخری نمبرات صرف سولہ صفحات کے ملتے ہیں۔ اس کی طباعت عربی رسم الخط میں ہوا کرتی تھی جبکہ بعض حروف میں تھوڑی تغیرات لا کر پ، چ، گ، ژ، ٹ، ڈ، ڑ، وغیرہ حروف بھی چھپتے تھے جو اردو کی صوتیات اور خصوصیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

رسالہ باریک اور ملائم کاغذ پر چھپتا تھا جس کا رنگ ہلکا پیلا تھا۔ پہلے صفحے کے نصف اوپری حصے پر دو دائرے ہوتے تھے جو کرۂ ارض کی تصویر کشی کرتے تھے اور اس کے اوپر رسالے کا نام "اسلامی دنیا" نستعلیق رسم الخط میں لکھا ہوتا تھا اور اسی نام کے اوپر محمد اقبال کے "قومی ترانہ" کا دوسرا مصرع "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" بھی ہوتا تھا۔

اردو نثر نگار مولانا محمد علی جوہر اہل مصر کی نظر میں: ایک مرثیہ

مقدمہ

ہند و مصر کے تعلقات اتنے ہی قدیم ہیں جتنے کہ ہندستانی اور مصری تمدن اور جتنے اچھے ظہور اسلام کے پہلے تھے اتنے ہی آج بھی ہیں جس کا پتہ ہمیں تواریخ کی کتابوں

سے چلتا ہے۔ دور جدید میں دونوں ممالک کے ساتھ یکساں حالات پیش آئے۔ انگریزوں نے مصر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تاکہ ہندستان سے تجارت کا راستہ ہموار ہوسکے اور پھر انیسویں صدی کے نصف سے دونوں ہی ملکوں میں انگریزی استعمار سے آزادی کے لیے ایک لمبی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ اب جبکہ دونوں ملکوں میں مقصد ایک تھا اور دونوں کے دشمن بھی مشترک تھے تو یہ بات قدرتی تھی کہ دونوں ہی ملکوں کے قائدین بین اقوامی محفلوں اور کانفرنسوں میں ایک دوسرے سے ملیں۔ اس طرح ہند و مصر کے درمیان قائدین اور عوام کی سطح پر تعلقات کشادہ اور مضبوط ہوئے اور یہ مشترک جدوجہد رنگ لائی اور ہندستان ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد مصر کو آزادی ملی۔

ہندستان اور مصر کے انگریزی استعمار سے آزادی کے پچاس سال پورے ہونے کے موقع پر میں اس انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی تاریخ کے ایک نئے پہلو پر اظہار خیال کروں گا جس میں ادیب' دینی مصلح اور سیاسی شخصیت مولانا جوہر کا کافی کردار رہا ہے۔ واضح رہے کہ عام طور پر اسلامی ممالک اور خاص طور پر مصر میں ان کو کافی اہمیت دی جاتی تھی' مولانا محمد علی جوہر کی سیرت پڑھنے پر یہ بات اور صاف ہو جاتی ہے کہ ان کے تعلقات مصری علما' ادبا' اور سیاسی قائدین سے کافی قوی رہے تھے اور ان میں سر فہرست امیر الشعرا احمد شوقی اور ڈاکٹر احمد ذکی کا نام آتا ہے۔

یہ کسی مصری اور عربی باحث کا محمد علی جوہر کے اوپر پہلا مقالہ شمار کیا جائے گا جو عالم عربی اور مصر میں ان کی دینی' ادبی اور سیاسی اہمیت کے اعتبار سے لکھا جا رہا ہے۔ ان کی عام طور پر مسلمانوں کے مسائل اور خاص طور پر عربوں کے مسائل کے متعلق بے باک آرا ہیں۔ اس موضوع میں ہم دیکھیں گے کہ جوہر کے مصر کے حزب الوطنی کے لیڈران مصری حزب الوفد کے قائد مصطفےٰ النحاس، ڈاکٹر عبدالحمید سعید' ڈاکٹر احمد فواد اور شیخ عبدالعزیز جاویش وغیرہ سے کافی مضبوط تعلقات تھے۔

ان کی اس اہمیت کا اندازہ مولانا کے جنازے کی تفصیل' تعزیتی پیغامات اور عرب شعرا کے مرثیے سے اور واضح ہو جائے گا۔ ان مرثیوں میں سر فہرست احمد شوقی کا بائیس اشعار پر مشتمل ایک طویل مرثیہ ہے۔ اسی طرح ہم اس مقالے میں مصری اخبارات کے ان رپورٹوں کا بھی جائزہ لیں گے جس میں اس سانحہ کی خبر چھپی تھی۔ اس کے علاوہ محمود عرفانی کے قاہرہ سے شائع ہونے والے ایک ہفتہ واری اردو اخبار "اسلامی دنیا" میں اس جنازے سے متعلق شائع خبر کا بھی ذکر کریں گے اور میں یہاں اس کا خاص ذکر اردو کے

چاہنے والوں کے لیے کروں گا تاکہ ان کو اس بات کا علم ہو سکے کہ یہ اخبار آج سے تقریباً ستر سال پہلے قاہرہ سے شائع ہوتا تھا۔

میں امید کرتا ہوں کہ یہ مقالہ ہند و مصر کے مشترکہ جدوجہد کی تاریخ کے کھوئے ہوئے صفحات کو کھوجنے کی ایک شروعات ثابت ہوگی۔

مولانا محمد علی جوہر کی زندگی کے کچھ صفحات

مولانا محمد علی ایسی ہی ایک انقلابی شخصیت اور عظیم رہنما تھے۔ وہ بہ یک وقت دلوں کو مسخر کر لینے والے شعلہ نو مقرر۔ قلم سے تلوار کا کام لینے والے ادیب و صحافی۔ سر بکف مجاہد اسلام، مسلمانوں اور وطن کے فدائی ایثار و قربانی کے پیکر حق گو۔ حق شعار، نڈر جری۔ دل گرمئی نگاہ پاک بینے جان بیتانے کا مظہر ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کا مولد و وطن ریاست رام پور تھا لیکن ان کے اجداد عرصہ دراز سے نجیب آباد میں رہتے چلے آرہے تھے۔ مولانا کے بڑوں میں تفصیلی حالات ان کے پردادا محبوب بخش اور دادا علی بخش کے ملتے ہیں۔(۱)

ولادت ۱۵ر ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۸ء کو منگل کے دن ہوئی۔ بمقام ریاست رامپور (یو۔پی)، محمد علی کے والد عبدالعلی خاں کا انتقال ۱۸۸۰ء بریلی میں

قیام ۱۸۹۰ء تک رہا وہاں کے ہائی اسکول میں جماعت ششم تک تعلیم پائی۔ ۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۴ء تک اسکول میں پڑھا اور ۱۸۹۴ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۸ء تک ایم۔اے او کالج علی گڑھ میں تعلیم پائی اور ۱۸۹۸ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ آکسفورڈ میں قیام ۱۸۹۸ء تا ۱۹۰۰ء آئی سی ایس کے امتحان کی تیاری اور اس میں ناکامی۔ رام پور کی ملازمت ۱۹۰۰ء تا ۱۹۰۱ء اسی زمانہ میں شادی ہوئی ۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۳ء دوبارہ آکسفورڈ میں قیام وہاں سے بی اے کیا، ۱۹۰۴ء تا ۱۹۱۱ء بڑودہ میں محکمہ افیون کے افسر رہے۔ ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے کامریڈ اخبار جاری ہوا اور ستمبر ۱۹۱۲ء تک وہیں سے نکلتا رہا ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۲ء سے کامریڈ اخبار دہلی سے نکلنا شروع ہوا اور ۱۹۱۴ء کے آخر میں پریس ایکٹ کے تحت بند ہو گیا۔ اور کامریڈ کا پہلا دور ختم ہوا۔ فروری ۱۹۱۳ء سے آخر مئی ۱۹۱۳ء تک نقیب ہمدرد نکلا۔ جون ۱۹۱۳ء سے اصلی ہمدرد نکلنا شروع ہوا اور کامریڈ کے کچھ عرصہ بعد تک نکلتا رہا اور اس کے کچھ دنوں بعد یہ بھی بند ہو گیا، اس طرح ہمدرد کا بھی دور اول اختتام کو پہنچا۔(۲)

فروری ۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی کی طرف سے ایک وفد یورپ بھیجا گیا جس کی قیادت محمد علی نے کی۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں وفد ناکام واپس آیا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان' ۱۹۲۱ء میں کراچی میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ کامریڈ کا دوسرا دور نومبر ۱۹۲۴ء تا فروری ۱۹۲۶ء۔ ہمدرد کا دوسرا دور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک۔ ۱۹۲۶ء میں مؤتمر عالم اسلامی کا اجلاس مکہ میں ہوا۔ محمد علی نے اس میں شرکت کی اور فریضہ حج ادا کیا۔ ۱۹۲۸ء میں محمد علی بغرض علاج یورپ گئے۔ گول میز کانفرنس کا اجلاس دسمبر ۱۹۳۰ء میں ہوا۔ ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا محمد علی کا انتقال ہوا۔ (۳)

مولانا محمد علی جوہر اور عرب ممالک

مولانا محمد علی ان چند مسلمان مشاہیر میں سے ایک ہیں جن پر امت مسلمہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ان کا تعلق اس نسل سے ہے جو جدید تعلیم کی گہرائیوں تک پہنچنے کے بعد بھی اس سے مرعوب نہیں ہوئی اور جس نے ایک بڑا حصہ جدید ماحول میں گزارنے کے باوجود اس کا رنگ اپنے اوپر نہیں چڑھنے دیا۔ انھوں نے علی گڑھ اور آکسفورڈ کی جامعات میں رہ کر اعلا تعلیم حاصل کی لیکن ان کا مذہبی سانچہ خالص اسلامی طرز پر تیار ہوا۔ شیکسپیر اور ملٹن وغیرہ کی تحریروں میں غوطے لگائے لیکن ان پر رنگ چڑھا تو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا۔ (۴)

جنگ عالمگیر اول کے بعد شام، عراق، فلسطین شرق اردن وغیرہ ترکوں کے قبضے سے نکل کر انگریزوں اور فرانسیسیوں کے زیر اثر آگئے تھے۔ شریف مکہ کی سازش سے حجاز بھی ٹکڑے ہو گیا اور جزیرۃ العرب میں صرف نجد اور یمن دو ایسے حصے رہ گئے تھے جو یورپی اثر سے آزاد تھے لیکن انگریز شریف حسین کی مدد سے ان علاقوں کو بھی اپنے زیر اثر لانا چاہتے تھے۔ یہ دیکھ کر عبدالعزیز ابن سعود نے حجاز پر حملہ کر دیا۔ جدہ کی بندرگاہ لڑائی کی وجہ سے بند ہو گئی۔ اسی زمانہ میں اس سال کے حج کے مہینے آگئے۔ انگریزی حکومت نے ہندستانی مسلمانوں کو حج کے لیے جانے سے منع کیا لیکن مولانا محمد علی جوہر نے اس کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ ضرور جائیں۔ ادھر حکومت سعود نے رابغ وغیرہ کی بندرگاہیں کھول دیں اور مسلمان کافی تعداد میں حج کے لیے گئے۔

مولانا محمد علی شریف حسین کے سیاسی موقف کی وجہ سے اس کے مخالف اور ابن سعود

کے طرف دار ہو گئے تھے۔ ابن سعود سے ان کا یہ معاہدہ ہو گیا تھا کہ وہ شریف مکہ کو بے دخل کر کے حکومت حجازیوں کو اور سیادت عالم اسلام کو سپرد کر دے گا۔ اس نے بھی اس بات کا وعدہ کرلیا تھا اور یقین دلایا تھا کہ میرا ارادہ وہاں شخصی حکومت قائم کرنے کا نہیں ہے۔ اس کے اس وعدہ پر بھروسہ کر کے محمد علی نے اپنی ہمدردیاں اس کے ساتھ وابستہ کر دیں۔ اگرچہ اس طرز عمل کی بدولت انھیں بہت سے لوگوں کی مخالفت مول لینی پڑی اور وہابیت کے طعنے سننے پڑے۔

ان وعدوں کے علی الرغم ابن سعود نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اس کے لیے یہ عذر پیش کیا کہ میں نے حجاز کے باشندوں کے اصرار پر ایسا کیا ہے لیکن محمد علی نے اس کے اس عذر کو نہیں مانا اور وہ اس کے مخالف ہو گئے۔(۵)

مولانا محمد علی جوہر اور مصر

مولانا محمد علی جوہر اور اہل مصر کے درمیان شدید تعلق تھے۔ جب گول میز کانفرنس میں ہندستان کی آزادی کے مسئلہ میں بحث کے لیے لندن جاتے ہوئے سویز (مصر میں ایک بندرگاہ) پہنچے اور سویز میں ان کا جہاز پھر پورٹ سعید میں رکا اور یہ مختصر عبوری زیارت تھی جس میں انھوں نے بعض مصری دوستوں سے ملاقات کی تھی۔ اس اثنا میں انھوں نے کچھ علما، صحافی اور سیاست داں سے ملاقات کی' ان میں شیخ الازہر ظواہری اور سابق وزیر اوقاف محمد علی پاشا اور "السیاسۃ" کے اڈیٹر ڈاکٹر محمد حسین ہیکل اور "المنار" کے اڈیٹر شیخ محمد رشید رضا سے ملاقات کی۔

اودھ خلافت کانفرنس ۲۵ فروری ۱۹۲۱ء کو بمقام لکھنو صدر کی حیثیت سے مولانا محمد علی صاحب نے ایک زبردست خطبہ صدارت زبانی ارشاد فرمایا:۔

مولانا جوہر نے انگریزی قبضہ مصر کے اصلی سبب کی طرف اشارہ کیا کہ "نہر سویز" میں ہندستان کا راستہ ہے۔ اس کے بعد اہل مصر کی اسی جدوجہد کا حوالہ دیا جو وہ بغرض حصول آزادی کر رہے ہیں اور جس میں اب یہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ہے کہ لارڈ ملنر نے مصر کو حکومت خود مختاری دیے جانے کی سفارش کی ہے مگر انگلستان کو ہندستان کا راستہ اپنے قبضہ میں رکھنے کی فکر ہے اور اس غرض سے وہ مصر کے نہر کے علاقہ میں اپنی کچھ فوج رکھنا چاہتا ہے تاہم چونکہ مصریوں کی طرف سے اندیشہ لگا ہوا ہے' اس لیے اس نے نہر کی دوسری سمت (٦) مورچے بنانے اور فوجیں رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس

غرض سے وہ فلسطین میں اپنا اقتدار چاہتا ہے"۔

مولانا محمد علی جوہر نے "ہمدرد" ۲۶ر نومبر ۱۹۲۵ء میں "زعمائے مصر کا تعارف" ایک مقالہ لکھا جس میں وہ لکھتے ہیں۔

ا۔ "شیخ عبدالعزیز جاویش کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ شاید آج عالم اسلام میں ان سے بہتر نظام اسلام کی حقیقت اور ضرورت کا جاننے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اسی حقیقت کو جمال الدین افغانی رحمتہ اللہ علیہ نے پہچانا تھا اور عین اس وقت جبکہ اسلامی سلطنتوں کی طرف پھر یورپ کا دستِ حرص و آز بڑھ رہا تھا، انھوں نے مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کیا مگر افسوس کہ مسلمان پوری طرح نہ چونکے اور ادھر افریقہ میں مصر و تونس' طرابلس و مراکش یکے بعدِ دیگرے دشمنانِ اسلام کے قبضہ میں آگئے۔۔۔۔ ہندستان اور دیگر ممالک کے مسلمانوں میں کیا جارہا ہے، اس پر کوئی ذی عقل اور صاحب فہم و ادراک مطلق اعتماد نہیں کرسکتا۔ آج ترکی میں نہ شیخ جاویش کی پہلی سی قدر ہے نہ خود مصر میں جہاں وہ پھر قیام فرمارہے ہیں' نہ مصطفیٰ کامل پاشا مرحوم کی قائم کردہ حزب الوطنی کی اگلی سی حالت کہ وہی شیخ موصوف کی کماحقہ قدر کرے"۔

۲۔ اور ایک مصری ڈاکٹر عبدالحمید سعید کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"آپ مصر کے ایک متمول زمیندار سعید پاشا کے صاحبزادے ہیں اور مصر کے مولانا شوکت علی ہیں۔ ماشاءاللہ آپ کا تن و توش ایسا ہے کہ دشمنانِ مصر و اسلام آپ کو دیکھ کر اگر لرزہ براندام ہو جائیں تو محل استعجاب نہیں۔ آپ کا دلی جوش و خروش آپ کی تقریر اور آپ کے تمام حرکات و سکنات سے صاف پایا جاتا ہے۔ آپ پیرس کی قدیم اور مشہور ترین یونیورسٹی ساربوں کے ڈاکٹر آف لا ہیں۔ آج مصر میں حزب الوطنی میں بہت کم لوگ شریک ہیں اور سعد پاشا زغلول کی سحر کلامی نے جو گویا مصری کی "سوراج پارٹی" کے لیڈر ہیں"۔

۳۔ اور مولانا جوہر ڈاکٹر احمد فواد کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"حزب الوطنی کے ایک سرگرم رکن ہیں اور ان محبانِ وطن میں سے ہیں جن کی زندگی ملک اور اسلام کے لیے وقف ہے اور اکثر معرض خطرے میں رہی ہے۔ جب ڈاکٹر انصاری کا طبی وفد جنگ بلقان میں ترکی گیا تو ترکی "ہلال احمر" نے ڈاکٹر احمد فواد کو مددگار اور مترجم کی حیثیت سے وفد کے ساتھ کردیا تھا"۔(۷)

محمد سرور لکھتے ہیں "میں ۱۹۳۰ء کے اوائل میں بغرض تعلیم مصر روانہ ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ مجھے مولانا محمد علی کے پاس لے گئے تاکہ ان سے ان کے کسی مصری دوست کے نام تعارفی خط مل جائے۔ مولانا نے اپنے ایک قدیم دوست ڈاکٹر محمد فواد کے نام خط دیا جو ان کی طرح ایک زمانہ میں انور پاشا کے بڑے حامی تھے بلکہ ان کے ساتھ کام بھی کیا تھا۔ اس وقت مولانا بہت مضمحل تھے، اور ان کی بصارت بھی کافی کمزور ہو چکی تھی' مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔

اکتوبر ۱۹۳۰ء میں قاہرہ میں اطلاع ملی کہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے لندن جاتے ہوئے قاہرہ آرہے ہیں' اس زمانے میں سمندری جہاز کے ذریعہ برصغیر سے برطانیہ جانے والے مسافروں کا یہ عام معمول ہوتا تھا کہ سویز کی بندرگاہ پر جہاز سے اتر جاتے' اور کاروں میں صبح صبح قاہرہ پہنچ جاتے۔ اکتوبر کی کوئی تاریخ تھی اور مولانا محمد علی کے مصری دوست اور "ہندستانی" مسلمان طالب علم قاہرہ میں مولانا کے لیے چشم براہ تھے کہ سویز سے آنے والی کاروں سے صرف مولانا شوکت علی' ان کے صاحبزادے اور بیگم مولانا محمد علی اتریں۔ اور ان سے پتہ چلا کہ مولانا محمد علی کی صحت ایسی نہیں رہی کہ وہ کار کا سفر کر سکیں۔ (۸)

مولانا محمد علی جوہر کی وفات اور تجہیز و تکفین

مولانا محمد علی جوہر ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو ۹:۳۰ بجے صبح ہائڈ پارک ہوٹل لندن میں اس دار فانی سے ہمیشہ کے لیے کوچ فرما گئے۔ (۹) سخت ترین علالت کے زمانہ میں ناقابل برداشت بار دماغ پر پڑنے کے سبب خون کی رگیں پھٹ گئیں اور جسم پر سیدھی طرف فالج کا اثر سا ہو گیا جو مولانا کی موت کا سبب ہوا۔ خود محترمہ بیگم صاحبہ مرحوم کا خیال تھا کہ آپ کو دہلی میں مرحومہ بی اماں کی قبر کے پاس دفن کیا جائے لیکن سید امین الحسینی مفتی اعظم بیت المقدس کی یہ درخواست کہ انبیا کا مولد و مسکن مجاہدین عظام و شہدائے کرام کی آرام گاہ مسجد اقصیٰ میں آپ کی تدفین قوم مسلم کے لیے فخر و مباہات کا باعث ہو گی منظور کی گئی۔ مرحوم نے مقامات مقدسہ کی بے نظیر خدمات انجام دی تھیں اور اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بیت المقدس کا ذکر رو رو کر کرتے تھے۔ اپنی زندگی میں بھی وہاں رہنا

چاہتے تھے اور آپ کی مرنے وقت وصیت بھی یہی تھی کہ آپ کی نعش مبارک مسجد عمرؓ کے احاطہ میں دفن کی جائے۔ جس ہوٹل میں مولانا مقیم تھے وہاں سے نعش رات کے بارہ بجے لفٹ سے نیچے اتاری گئی۔ نعش ایسی معلوم ہوتی تھی کہ جیسے کوئی شخص سکون و آرام سے میٹھی نیند سو رہا ہے۔ مرحوم کا چہرہ ایسا خوبصورت نظر آرہا تھا کہ اس کے قبل کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ نعش کو دوا کا انجکشن دے کر ایسا کر دیا گیا کہ دس برس بھی نہ بگڑے نعش پر شب و روز قرآن خوانی ہوتی تھی۔ ۵ جنوری کی فجر کو مولانا شوکت علی، عبدالرحمٰن صدیقی اور مظفر نے نعش کو غسل دیا اور شام کو ۶ بجے حسب اعلان لیڈ لکٹن ہال میں نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں اراکین گول میز کانفرنس، سفرا ایران، مصر، کابل وغیرہ اور ممتاز افسران حکومت برطانیہ شریک تھے۔ سب نے مولانا شوکت علی صاحب کی درخواست پر اپنے اپنے مذہب کے مطابق اس بہادر اور تھکی ہوئی روح کے لیے طمانیت ابدی کی دعائیں مانگیں۔ تین روز تک نعش کفن دوزوں کے یہاں رہ کر بذریعہ نار کنڈا جہاز ٹیلری بندر لندن سے بجانب بیت المقدس روانہ کی گئی۔

پی اینڈ او کمپنی کے جہاز نار کنڈا پر مولانا مرحوم کی نعش مبارک ۲۱ر جنوری کو پورٹ سعید پہنچی۔ شاہ مصر کے نمایندے وزیر اعظم، ہائی کمشنر، مشائخین اور اکابر شہر پورٹ سعید شامل جلوس رہے۔ مسجد عباس میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ مصری پولیس نے سلامی دی اور جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ یہ شاندار جلوس خاص خاص سڑکوں سے گزرتا ہوا ریلوے اسٹیشن پہنچا اور نعش قنطرہ کے راستہ سے فلسطین کو روانہ ہو گئی۔ تابوت کی گاڑی رودبار پر سے ایک خاص پل کے ذریعہ گزری اور قنطرہ سے فلسطین کی ٹرین سے جوڑ دی گئی۔ (۱۰)

شہزادہ، محمد علی نے مرحوم محمد علی کے لیے غلاف کعبہ کا ایک ٹکڑا تابوت پر رکھنے کے لیے مرحمت فرمایا۔ تابوت ایک صندلی لکڑی کا قبر نما بنا ہوا تھا جس میں ایک شیشہ لگا ہوا تھا مرحوم کا کفن خالص کھدر کا بنا ہوا تھا جس کو انھوں نے حج کے موقع پر پہنا تھا۔

اسماعیلیہ میں نہر سوئز کو پار کر کے دوسری طرف کے ریلوے اسٹیشن پر جہاں سبھی لوگ تعزیت کرنے جمع ہوتے۔ مولانا شوکت علی انگریزی زبان میں ان سے خطاب کرتے جس کا بڑا رواں، فصیح و بلیغ اور پر اثر عربی ترجمہ عمامے او جبے میں ملبوس ایک شیخ طریقت تفتازانی نام کے بزرگ کرتے، بہت سے مصری تعزیت کرنے والوں کے ساتھ ساتھ میں

بھی پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ گاڑی چلی اور سب کی نظروں سے او جھل ہو گئی تو ہم غم و حسرت میں ڈوبے ہوئے مولانا محمد علی مرحوم کو الوداع کہہ کر واپس قاہرہ روانہ ہوئے۔(۱۱)

بیت المقدس میں دو لاکھ سے زائد مردوں اور عورتوں کا مجمع تھا جو شاندار جلوس کی شکل میں اسٹیشن سے حرم شریف تک گزرا۔ عیسائی و دیگر فرقوں کے پیشوا برطانوی حکومت کا نمایندہ اور امیر عبداللہ و شاہ حسین کے کونسل، قاہرہ، عمان، تیونس، الجزائر مصر و سوڈان، حجاز، نجد، شام کے ممتاز اصحاب اور مجلس اعلا اسلامیہ فلسطین کے اراکین شریک جلوس تھے۔ جلوس میں مولانا شوکت علی صاحب اور مفتی اعظم پیش پیش جا رہے تھے جو البنی اسکوائر اور باب دمشق سے ہوتا ہوا حرم شریف تک گیا۔ تمام لوگ سر جھکائے ہوئے تھے۔ سڑکوں کی آمد و رفت بند تھی۔ پولیس کا انتظام معقول تھا۔ شہر میں عام ہڑتال تھی۔ تمام کارخانہ جات بند تھے۔ بیگم صاحبہ مرحوم بھی جنازہ کے ساتھ تھیں۔ جلوس کے خاتمہ پر تابوت قبہء صخرہ کے سامنے رکھ کر ممتاز مسلمانوں نے تقریریں کیں، مولانا شوکت علی نے فرمایا کہ "میرے بھائی کا بیت المقدس میں دفن ہونا مشرقی ممالک کے ابدی استحکام پر دلالت کرتا ہے" اس کے بعد مسجد عمرؓ کے مغربی دالان کے شمالی حصہ میں (جو خطیب خاندان کی ملکیت تھی) بروز جمعہ ۲۳ر رمضان المبارک بوقت چار بجے اسلام کا یہ زبردست مجاہد سپرد خاک کر دیا گیا"۔(۱۲)

سید نظر ہندی نے بیت المقدس میں مولانا جوہر کی قبر کی زیارت کی اور اس کی تفصیل انھوں نے اپنی کتاب میں درج کی ہے "جمعہ ۲۵ر نومبر ۵۵ء کو حرم کے اتنے وسیع رقبے میں تلاش کیا مگر جوہر مرحوم کی قبر نہیں ملی۔ آخر ایک مقامی عرب سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کی قبر برآمدے میں ہے۔ کھلے صحن میں انھیں برآمدے کی دیوار پر لکھا ہوا تھا کہ یہ مجاہد اعظم جوہر مرحوم کی قبر ہے جو ۱۰ر شعبان کو لندن میں وفات پاگئے اور رمضان کی پانچویں جمعہ کو بیت المقدس میں دفن ہوئے (۱۳۴۹ھ) مولانا کے پہلو میں مجاہد اعظم عبدالقادر الجزائری کی قبر ہے۔ جوہر مرحوم کی قبر شمس تبریزی کے حجرے سے بھی اونچی ہے۔ سبز رنگ کے غلاف اور ان پر آیات قرآنی کڑھی ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں دیوار پر اردو عربی ادبیات کے طغرے بھی"(۱۳)

مصر میں مولانا محمد علی کے مراثی

قاہرہ کے اخبارات و رسائل میں بہت دنوں تک مولانا مرحوم کے متعلق کچھ نہ

کچھ لکھا جاتا رہا۔ مجھے آج بھی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا وہ مفصل مکتوب یاد ہے جو قاہرہ کے روز نامہ "البلاغ" میں جس کے وہ کلکتہ میں نمایندے تھے۔ (۱۴) اس کے علاوہ اخبارات نے بھی ان پر بہت کافی معلومات جمع اور شایع کیں۔ مصر وغیرہ کے تمام اخبارات نے بڑے بڑے مقالات سیاہ جدولوں میں شائع کیے۔ اخبارات نے اس حادثۂ فاجعہ پر اپنے دلی تاسف کا اظہار کیا۔ المساء مصر کی قوم پرور پارٹی "وفد" کا ارگن اخبار لکھتا ہے:۔

"دو دن ہوئے ہندستان کے قلب و جگر پر ایک گہرا زخم لگا ہے، ایسا زخم جو مدتوں مندمل نہ ہو سکے گا۔ یہ زخم مولانا محمد علی کی انتہائی افسوسناک موت کی وجہ سے لاحق ہوا ہے۔ مرحوم ہندستان کے ایک نہایت ہی جلیل القدر اور شاید سب سے زیادہ جری رہنما تھے' خدمت وطن میں انھوں نے بے شمار مصائب برداشت کیں اور بالآخر میدان جہاد ہی میں جام شہادت نوش کیا۔

محمد علی فطرتاً انقلابی تھے اور جب ہم کسی کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ انقلابی ہے تو پھر یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ وہ برطانیہ کا دشمن ہے کیونکہ یہ برطانیہ ہی سب سے بڑی ملک گیر طاقت ہے۔ محمد علی کی پوری زندگی برطانیہ کے خلاف جہاد میں گزری، یقیناً ہندستان انھیں مدتوں یاد رکھے گا۔ اے مجاہد اعظم فردوس میں لازوال زندگی حاصل کر اور پروردگار سے التجا کر کہ تیرا وطن اور سارا مشرق جلد جلد آزاد ہو جائے، وہ مقصد جس کے لیے تو نے جان دی ہے" (۱۵)

اور اخبار المقطم لکھتا ہے:۔

"لندن سے ہمیں یہ جانکاہ خبر پہنچی ہے کہ مولانا محمد علی کا انتقال ہو گیا، مولانا محمد علی ہندستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے رہنما اور دنیا کے مسلم رہنماؤں میں ایک بلند رتبے کے ملک تھے' انھوں نے اسلام ہندستان اور پورے مشرق کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی"۔ (۱۶)

۱۹۲۹ء میں قاہرہ سے اردو کا پہلا ہفتہ واری مصور اخبار شائع ہوا۔ اس کے نگران اور اڈیٹر محمود احمد عرفانی تھے۔ جیسا کہ عرفانی نے بیان کیا ہے، ان کا قاہرہ آنے کا مقصد اس رسالے کی معرفت ہندستانی مسلمانوں کو عالم اسلامی سے متعارف کرنا تھا۔

اس اخبار میں کئی رپورٹیں شائع ہوئیں، ان میں سب سے اہم اور مفصل رپورٹ

مولانا محمد علی جوہر کے جنازے کے متعلق تھی۔ جب ان کا جنازہ قدس لے جاتے ہوئے مصر پہنچا تھا' یہ رپورٹ اسی وقت نہیں شائع ہوئی بلکہ اسی سال ۷ر فروری کے شمارے میں چھپی، اس جنازے میں خود عرفانی اور ان کے احباب شامل ہوئے تھے۔ اس لیے یہ رپورٹ ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے اور اسی لیے یہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔(۱۷)

مولانا محمد علی کی وفات ایک ایسا سانحہ کبریٰ تھا کہ ہر طبقہ اور ہر جماعت نے ان کے غم والم میں نمایاں حصہ لیا، چنانچہ ان کی وفات پر جہاں تقریریں ہوئیں، جلسے ہوئے، تجویزیں پاس ہوئیں مضامین و مقالات لکھے گئے، اکابرین ملک نے بیانات کی صورت میں اپنے غم والم کا اظہار کیا، وہاں شعرا نے اپنے جذبات کو اشعار کی صورت میں مدون کیا اور محمد علی کے حضور میں اپنا یہ خراج عقیدت، بصد رنج و تعب پیش کرنے کا افتخار حاصل کیا۔

ان محدود صفحات میں شوقی امیر الشعرا مصر کا مرثیہ جس کے اشعار کا ترجمہ کرتا ہوں اور یہ اشعار اس وقت اخبار 'الشوریٰ" مصر میں احمد شوقی کا بلند پایہ مرثیہ شائع ہوا تھا ان کے بعد یہ مرثیہ شوقیات میں شائع ہوا تھا۔ مرثیہ کے مقدمہ میں یہ بات لکھی کہ "وہ یعنی مولانا محمد علی جوہر ہندستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا رہنما اور قائد تھا جس نے ۱۹۳۱ء میں انتقال فرمایا اور یہ ہندستان کے گوشے گوشے میں جاکر مسلمانوں کی خدمت کرنے سے نہیں تھکتا تھا۔ اور قاہرہ میں ان کے لیے ایک تعزیتی جلسہ کا انتظام کیا گیا جس میں یہ قصیدہ پڑھا گیا۔

۱۔ بیت علی أرض الهدیٰ وسمائهِ　　　الحق حائطه و أس بنائهِ

بیت المقدس ہدایت کی زمین اور آسمان پر واقع ہے، اس کی دیوار مضبوط ہے اور اس کی بنیاد بھی پائیدار ہے۔

۲۔ الفتح من اعلامه والطهر من　　　أو صافه والقدس من أسمائهِ

فتح ان کی نشانی اور طہارت ان کی صفت ہے، ان کا نام مقدس ہے۔

۳۔ تحنو مناكبه علی شعب الهدیٰ　　　وتطل سدته علی سینائهِ

اس کے کندھے مؤمنین کے اوپر جھکے ہیں اور جس کے دروازے سینا کے طرف کھلے ہیں۔

۴۔ من ذا ینازع عنا مقالید ابه　　　و جلال سدته وطهر فنائهِ

کون ہے جو اس دروازے کی چابی، اس کی عظمت اور اس کے اطراف کی پاکی کے لیے جھگڑتا ہے۔

۵۔ ومحمدٌ صلی علی جنباته واستقبل السمحات فی أرجائهِ

یہ وہ جگہ ہے جہاں محمدؐ نے ہر جگہ عبادت کی ہے اور جس کے ہر گوشے میں ان پر وحی نازل ہوئی ہے۔

۶۔ والیوم ضم الناس مأتم ارضه وحوى الملائك مهرجان سمائهِ

آج اس زمین کی قائم نے لوگوں کو اکٹھا کیا ہے، ساتھ ہی اس کی فضا کے میلے میں فرشتے بھی جوق در جوق آئے ہیں۔

۷۔ یا (قدس) هیّئ من ریاضك ربوة لنزیل تربك واحتفل بلقائهِ

اے قدس تو اپنی تربت کے مہمان کی وجہ سے قابل مبارکباد ہے، آج تو اس کی ملاقات سے سرفراز ہو۔

۸۔ هو من سیوف الله جل جلاله اومن سیوف الهند عند قضائهِ

وہ اللہ جل جلالہ کے مجاہد ہیں، یا موت کے بعد بھی ہندستان کی تلوار ہیں۔

۹۔ فتح النبی له مناخ براقه و معارج التشریف من اسرائهِ

نبیؐ نے اس کے لیے اپنے براق کے بیٹھنے کی جگہ کھول دی اور اس کے آنے کا مقام وہ ہے جہاں سے نبیؐ معراج کو گئے تھے۔

۱۰۔ بطل حقوق الشرق من أحماله وقضیة الا سلام من أعبابهِ

مشرق کے حقوق کے لیے لڑنا اس کا کام تھا اور اسلام کا قضیہ اس کی عبا۔

۱۱۔ لم تنسه الهند العزیزه رقة للشرق أو سهرا علی أشیائهِ

مشرق کے لیے جو اسے تڑپ تھی یا ہندستان کے واقعات کے اس کی بے خوابی اسے عزیز ہندستان فراموش نہیں کر سکتا۔

۱۲۔ وقباؤه نسج الهنود فهل تری دفنوالزعیم مکفنا بقبائهِ

ان کے لباس ہندستانیوں نے بنے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ وہ قائد کو اپنے ہی کپڑے سے بنے کفن میں دفن کریں۔

۱۳۔ (النیل) یذکر فی الحوادث صوته والترك لاینسون صدق بلائهِ

نیل اپنی مصیبتوں میں اس کی آواز کو یاد کرے گا، اور ترک اس کی ہچکی تڑپ کو فراموش نہیں کریں گے۔

۱۴۔ قل للزعيم محمد نزل الأسى (بالنيل) واستولى على بطحانهِ
قائد عظیم محمد کو کہہ دو کہ نیل اور اس کی زمین پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا

۱۵۔ فمشى إليك بجفنه وبد معه وإلى أخيك بقلبه وعزائهِ
تو لوگ آپ کی طرف روتے ہوئے اور افسردہ حال چلے آئے اور آپ کے بھائی کو (شوکت علی) تعزیت پیش کی۔

۱۶۔ اجتزته فحواك في اطرافه ولو انتظرت حواك في احشائهِ
آپ ان کی طرف بڑھے تو سینے سے لگالیا اور اگر آپ نے انتظار کیا تو دل میں چھپا لیا۔

۱۷۔ ولقدتعود ان تمربأ رضه مرّ الغمام بظله و بمائهِ
لوگوں میں یہ بات عام ہے کہ آپ ان گنت بار اس سرزمین سے گزرے ہیں جیسا کہ بادل سایہ اور بارش کے ساتھ گزر جاتا ہے۔

۱۸۔ نم في جوار الله مابك غربة في ظل بيت أنت من ابنائهِ
تو آپ اللہ کے قریب ابدی نیند میں سوئے رہیں، یہ آپ کا ہی گھر ہے کیونکہ آپ اس کے سایے میں ان کے ہی اہل واقارب میں سے ہیں۔

۱۹۔ الفتح وهو قضية قدسية يا طالمانا ضلت دون لوائهِ
فتح تو ایک مقدس مسئلہ اور آپ نے اس کے لیے جھنڈے کے نیچے لمبی لڑائی لڑی۔

۲۰۔ أفتى بد فنك عند سيدة القرى مُفتِ أراد الله في افتائهِ
آپ کو بیت المقدس میں دفن کرنے کا مفتی (امیں الحسینی) نے فتویٰ دیا اور وہ اپنے اس فتوے میں حق پر تھے۔

۲۱۔ بلد بنوه الأكرمون قصور هم وقبور هم وقف على نزلائهِ
یہ وہ شہر ہے جس کے محلوں کو عظیم شخصیات نے بنایا ہے اور وہاں کی قبران ہی لوگوں کی آل واولاد کے لیے مخصوص ہے۔

قدعشت تنصره و تمنح أهله عوناً فکیف تکون من غربائه (۱۸)
آپ زندگی میں یہاں کے لوگوں کی مدد کرتے رہے پھر آپ یہاں کیسے اجنبی ہو سکتے ہیں۔

نماز جنازہ ادا ہوئی تو مشرق کے چند بڑے بڑے بزرگوں نے تابوت کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے احساس قلب کا اظہار کیا تھا جن میں سے دو مصری کے تاثرات مختصراً ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں:۔

ا۔ احمد زکی پاشا:۔ آپ نے مسجد اقصیٰ میں کھڑے ہو کر فرمایا:۔

"اے بزرگان مسجد اقصیٰ! اے ابنائے عرب! اور اے امت اسلام! مولانا محمد علی کی زندگی جہاد کی ایک مسلسل کڑی تھی' زمانہ نے اُسے دیکھا اور تاریخ نے اسے محفوظ کیا اور یہی نہیں بلکہ آج کے بعد لوگ ہمیشہ یہ دیکھیں گے کہ ہمیشہ کے لیے وہ قربانی کی انمٹ یادگار رہے گا۔ وہ اس امر کا عنوان رہے گا کہ وہ شخصیت کا سخت دشمن تھا۔

ہم اس کے گواہ ہیں کہ شہید اپنے ہمعصروں میں لسان صدق تھا اور ہمارے دل اس ایمان سے پُر ہیں کہ خدا نے اس پر انعام کیا اور اس کو آخر میں بھی لسان صدق بنا دیا۔ اس ہندستانی لیڈر نے اپنی زندگی ملک کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس نے اپنے ملک کی آزادی کے لیے وہ جہاد کیا کہ جہاد کا حق ادا کر دیا۔ فقیہہ علم اور خادم اسلام پر خدا کی سلامتی۔

۲۔ شہزادہ محمد علی پاشا:۔ سابق وزیر اوقاف وزعیم جماعت احرار مصر نے کھڑے ہوکر فرمایا:۔ "جنگ بلقان میں، جنگ عظیم میں، ترکوں اور یونانیوں کی لڑائی میں محمد علی نے جو کچھ کیا وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا اور اس غرض کے لیے جو کچھ اسے جیل خانوں اور مالی تکلیفوں کا مقابلہ کرنا پڑا وہ بھلایا نہیں جا سکتا، اس کا شعور اس کا خیال سے اس پر حاوی تھا کہ "قوت حق نہیں، لیکن حق قوت ہے"؟ اے معزز مسافر، یہ مصیبت بڑی ہے۔ تکلیف بھاری ہے، لیکن ہم صبر کے اجر سے برداشت کرلیں گے، میں اس لیے آیا ہوں کہ تم کو سلام کہوں، تم مرے نہیں بلکہ زندہ ہو، ہماری تسلی تمھارے بعد تمھارے کام ہیں جو ہمیشہ رہیں گے، تیرے جانے سے قبل تیرے اعمال آگے چلے گئے، انھوں نے جنت کے دروازے تیرے لیے کھول دیے اور اقربا کے لیے بزرگی کو چھوڑ گئے۔(۱۹)

حواشی و مآخذ

۱۔ ثناء الحق صدیقی: مولانا محمد علی جوہر: حیات اور تعلیمی نظریات۔ ایجوکیشنل پریس طبع اول، کراچی۔ ۱۹۷۵ء: ۱۲۔۱۷

۲۔ محمد سرور: مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ سندھ ساگر اکادمی چوک مینار، انار کلی، لاہور۔ ۱۹۶۲ء: ۴۹ اور ۷۰۔۸۷

۳۔ ثناء الحق صدیقی: مولانا محمد علی جوہر: حیات اور تعلیمی نظریات: ۱۶۔۱۷

۴۔ ایضاً: ۸۳

۵۔ ایضاً: ۷۵۔۷۷

۶۔ رئیس احمد جعفری: اوراق گم گشتہ۔ محمد علی اکیڈمی۔ لاہور۔ ۱۹۶۸ء۔ ۱۰۲

۷۔ محمد سرور: مضامین محمد علی۔ حصہ دوم۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ ۱۹۴۰ء: ۴۷۹۔۴۸۲

۸۔ محمد سرور: مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے: ۱۹۔۲۱

۹۔ حبیب احمد ندوی: رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر آخری مشورہ۔ کتابی مرکز لمیٹڈ۔ کراچی۔ ۱۹۶۰ء۔ ۱۷

۱۰۔ گل شیر خان: مولانا محمد علی کی یاد۔ بمبئی۔ ۱۹۶۹ء: ۱۴۔۱۷
رئیس احمد جعفری: سیرت محمد علی: مکتبہ جامعہ ملیہ۔ دہلی۔ ۱۹۳۲ء: ۱۶۱۔۱۶۲

۱۱۔ ثناء الحق صدیقی: مولانا محمد علی جوہر: ۸۲۔۸۳

۱۲۔ رئیس احمد جعفری: سیرت محمد علی: ۱۸۔۱۹

۱۳۔ سید نظر ہندی: مولانا محمد علی شخصیت اور خدمات۔ اشاعت اول۔ کوہ نور پریس۔ دہلی ۱۹۷۶ء: ۴۸۔۴۹

۱۴۔ محمد سرور: مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاخ ساز کے ۲۳۰

۱۵۔ المساء (اخبار کا نام) ۷ جنوری۔ قاہرہ۔ ۱۹۳۱ء
رئیس احمد جعفری: سیرت محمد علی: ۱۶۶۔۱۶۷

۱۶۔ المقطم (اخبار کا نام) ۱۰ جنوری قاہرہ ۱۹۳۱ء

۱۷۔ جلال الحفناوی: "اسلامی دنیا" مصر سے شائع شدہ اردو کا اخبار۔ خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ۔ شمارہ نمبر ۱۱۰۔ ۱۹۹۷ء: ۱۳۵۔۱۴۰

۱۸۔ احمد شوقی: الشوقیات: ۳/۱۲۔۱۳

۱۹۔ رئیس احمد جعفری: سیرت محمد علی: ۱۸۱
ثناء الحق صدیقی: مولانا محمد علی جوہر: حیات اور تعلیمی نظریات: ۱۲۶

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کی اہم مطبوعات

مترجم: راشد سہوانی

کنڑ زبان کے ممتاز قلم کار شری نواس کا یہ تاریخی ناول ہے جو جنوبی ہندستان کی میسور ریاست کے ایک چھوٹے سے حصے 'کوڈگو' کی تاریخ سے متعلق ہے۔ چک ویر راجندر کے دور حکومت میں ہی انگریزوں نے اس پر قبضہ جمایا تھا۔ اس ناول کے سب کردار تاریخی ہیں جو اس دور کے زندگی پیش کرتے ہیں۔

قیمت 22/50

دود چراغ محفل   از بچی بابو

مترجم: ابوالفیض سحر

انجہانی بچی بابو تیلگو زبان کے ان کامیاب قلم کاروں میں تھے جنھوں نے تیلگو ادب کو نکھارا اور فن کو بلندی عطا کی ہے۔ دود چراغ محفل، بچی بابو کا ایک نفسیاتی ناول ہے جس میں ایک نوجوان ڈاکٹر کی زندگی پیش کی گئی ہے۔

قیمت. 16/25

دیمک   از. شریشندر مکھوپادھیائے

مترجم رفعت سروش

آج کا نوجوان زندگی سے بری طرح خوف زدہ ہے۔ اس کی امید، سوچ، درد اور صلاحیت اس خوف سے بے حد متاثر ہوئی ہیں۔ اس ناول میں ایک عظیم شہر میں انسانی زندگی کے اتار چڑھاؤ منفرد اسلوب اور بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

قیمت 7/75

راگ درباری   از. شری لال شکل

مترجم راشد سہوانی

جدید ہندستانی سماج پر تیکھا طنز 'راگ درباری' کو ہندی میں بامقصد طنز نگاری کی شروعات بھی کہا گیا ہے۔

قیمت 15/50

ریل گاڑی   از چندرودن چمن لال مہتہ

مترجم: سید آل رسول

ریل گاڑی ۱۹۶۰ء میں لکھا گیا گجراتی زبان کا ایک کامیاب ناٹک ہے۔ اس کا ہیرو ریل گاڑی کے انجن میں کوئلہ جھونکنے کا کام کرتا ہے۔ اس کی خطرات سے بھرپور زندگی اور اونچے عہدیداروں کا ظلم و ستم ہی اس ناٹک کی اساس ہے۔

قیمت 7/75

سفر تمام ہوا   از: نیل پدمنابھن

مترجم: مخمور سعیدی

سفر تمام ہوا، ایک ہندستانی گھر کے ٹوٹنے کی بڑی جذباتی کہانی ہے اور ساتھ ہی تریوندرم شہر کی بڑی بھرپور تصویر کشی بھی ہے۔ اس ناول کے مصنف شری نیل پدمنابھن تامل زبان کے ان قلم کاروں میں سے ہیں جنھوں نے تامل ادب کو نئی وسعتوں سے روشناس کرایا ہے۔

قیمت 11/75

سورٹھ تیرا بہتا پانی

از. جھویر چند میگھانی   مترجم. مظہر الحق علوی

سوراشٹر کے ایک خاص حصے کو سورٹھ کہتے ہیں۔ اسی حصے کی یہ داستان ہے جو اپنے اندر زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ لیے ہوئے ہے۔

قیمت -/13

گجراتی کے یک بابی ڈرامے

مرتبہ اے۔ ایم۔ روال   مترجم: مظفر حنفی

اس مجموعے میں گجراتی زبان کے منتخب یک بابی ڈرامے یکجا کر دیے گئے ہیں۔

قیمت 12/25

گنگا چیل کے پنکھ   از ایل۔ این۔ بورا

مترجم: رضیہ سجاد ظہیر

آسام کی بدلتی ہوئی زندگی اور معاشرے کے بارے میں ایک بہت ہی دلچسپ ناول ہے، جس میں تہذیب بھی ہے

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

احمد ندیم قاسمی
45-A, Mozaug Raod
Lahore (Pakistan)

ایک شعر کہنا ہے

نصف شب کا عالم ہے
ہر طرف خموشی کا
بے حدود پہرا ہے
جیسے وقت پل بھر کو
سانس لینے ٹھہرا ہے
اک مہین سرگوشی
جی لگا کے سنتا ہوں
ایک شعر کہنے کو
ایک خواب بنتا ہوں

نرم رو ہوا کا ہاتھ
پتلے پتلے پیڑوں کا
پالنا ہلاتا ہے
اک بلیغ سناٹا
اک لطیف لہجے میں
لوریاں سناتا ہے

بدلیوں کے روزن میں
چاند مسکراتا ہے
اک خیال آتا ہے

کائنات پر طاری
ایک عالمِ ہو ہے
اک طلسم ہر سو ہے
اور اس کی وسعت میں
سوندھی سوندھی خوشبو ہے
ذہن کے دھندلکے میں
ایک چراغ جلتا ہے
ایک پھول کھلتا ہے
ایک شعر ڈھلتا ہے!

ادا جعفری
43/8/B.Block 6
P.E.C.H. Society
Karachi - 75400
(Pakistan)

اس نے کہا

جب سورج
خاک پہ آن گرا
جب اندھی، بہری کالی دھول آئی
جب آنکھیں دھند غبار ہوئیں
آئینے چکنا چور تھے سب
جو پاس تھے وہ بھی دور تھے جب
میں کھو جاتی،
ایسے میں اسی نے تھام لیا
جو آنکھ اوجھل
ہر لمحہ میرے ساتھ رہا
کسی خوشبو میں
مرے آنسو میں
کہیں خوابوں سا، کہیں وعدوں سا
جسے نیند نہیں
جسے اونگھ نہیں
پھر اس نے کہا:
یہ دنیا کے سب
چاند، ستارے، سورج تو
آتے جاتے ہی رہتے ہیں
تم کیا جانو، تم کیا سمجھو
ہے کون کہاں، کب مل جائے
کن رستوں، کون گلی آئے
تم حرف کی بات سنو نہ سنو
تم جی کے بھید کہو نہ کہو
اب اِن مٹ دھیان جگا رکھو
تمھیں ایک دیا ہی کافی ہے
ہاں اس کی لو اونچی رکھنا!

ابو محمد سحر
۳۹۔مالویہ نگر، بھوپال

غزل

دل جواں رہتا تو موسم بھی جواں رہتا تھا
اس کی زلفوں پہ گھٹاؤں کا گماں رہتا تھا

رہ چکی ہے کسی ساقی کی نظر ہم پر بھی
اپنے ہاتھوں میں بھی اک رطل گراں رہتا تھا

وہ بھی کیا دن تھے کہ پیمان وفا سے پہلے
چشم بیتاب سے کوئی نگراں رہتا تھا

خواب تو خواب تھے لیکن نہ تھے ٹوٹے جب تک
ہر گھڑی دشتِ تمنا میں سماں رہتا تھا

کر دیا سرد زمانے کی ہوا نے ورنہ
عشق کی آگ میں یہ دل بھی تپاں رہتا تھا

یاد آیا تو مگر آج بڑی مشکل سے
وہ جو اک نام کبھی وردِ زباں رہتا تھا

کھد گئے اگلے مکاں بن گئے ایواں نئے
اب کسے یاد ہے یہ کون کہاں رہتا تھا

میرا گھر دیکھ کے بولے وہ سحر میرے بعد
ایک ہشیار سا دیوانہ یہاں رہتا تھا

باقر مہدی

ایک ناری گیت

(میڈھا پاٹکر کے نام!)

روپ ہیں کتنے ناری کے
کون بھلا سمجھائے !
موم کی مریم جان کے کوئی
روز جلاتا جائے !
اور کوئی غزلوں میں اپنی
درپن کے گن گائے !
وہ اک ننھی بچی بن کر
سب کا من بہلائے !
بھنورے اس کا پیچھا کرتے
تتلی اڑتی جائے !
لیکن اس کے چاہنے والے
کچھ بھی سمجھ نہ پائے!
مول لگائے والے آخر
اس کا کھیل رچائے!

کتنے اس کی چھب دکھلا کر
سرکس میں نچوائے!
وہ بھی ہم جیسی بے کس ہے
کون یہ بھید بتائے؟
یگ یگ کی یہ بات نہیں ہے
صدیوں سے اپنائے!
ہر کوئی ہمراہی بن کر
چوٹ لگاتا جائے!
دکھ کے بادل گرج گرج کر
دھرتی پر پھر چھائے!
میڈھا جیل سے باہر آکر
شور مچاتی جائے
ایسے کالے یگ میں باقر
کوئی نہ بچنے پائے!

پروفیسر عبدالستار دلوی
سابق صدر شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی ممبئی

گہوارۂ تمدن

(سفر ایران پر منظوم تاثر)

یہ انقلابوں کی زمیں
ہے علم و حکمت کی امیں
افسانہائے دلنشیں
سب اس کے خاتم کے نگیں
دارا و کیخسرو کا گھر
مسکن ہے ذوالقرنین کا
یہ کشور جنت نشاں
خوشبو جہاں ہے پرفشاں
شاید یہ ہے باغ جناں
رہتے ہیں یاں کروبیاں
یہ اصفہاں 'نصف جہاں'
حسن و جمال اس میں نہاں
پربت ہیں اس کے پاسباں
برفیلی جن کی چوٹیاں
اک استعارہ زیست کا
آغوش میں جن کی رواں
یعنی وہ جوئے دلنشیں
وہ زندہ رود جاوداں
اقبال جس کے مدح خواں
ہاں یہ زمین اصفہاں!

شیراز شہر دلبراں
یا ہے گلستاں بوستاں
سعدی تھے جس میں نغمہ خواں
وہ چہچہے عطار کے
جیسے بجیں شہنائیاں
فردوسی و خیام سے
شیریں سخن شیریں بیاں
جو فکر و فن کی خوشبوئیں
چاروں طرف بکھرا گئے
اور علم و حکمت سے بھرے
ساغر یہاں چھلکا گئے
باغ ارم، باغ عدن
حافظ کا یہ پیارا وطن
ہر دم کنارِ آب جو
وہ ہاؤ حق کی گفتگو
اور بادۂ عرفان کے
چلتے ہوئے جام و سبو
وہ مے کشی، ساقی گری
وہ عاشقی، وہ دلبری
وہ نغمگی وہ شاعری
تاریخ کا وہ آئینہ
تہذیب کی ہے ساحری
اے شاہ نامے کی زمیں!

سچ سچ کہوں، سن لے ذرا
جس دم قدم میں نے رکھا
تجھ پر، تو دل نے یہ کہا
جنت کے دو ٹکڑے ہیں یہ
ایران اور ہندوستاں
دیدوں کی اک تصویر ہے
اور دوسری پاژند کی
قرآن کے احکام کی
پھیلی ہوئی ہے روشنی
اے انقلابوں کی زمیں!
اے علم و حکمت کی امیں!
سو انقلاب آئے گئے
کتنے سراب آئے گئے
قائم مگر ہے آج بھی
تیری ہماری دوستی
چاہے چلیں سو آندھیاں
کب ٹوٹ سکتا ہے بھلا
رشتہ ہمارے پیار کا

○

ڈاکٹر گیان چند
3262,OAKLEAF Ct
CHINO HILLS,CA 91709
U.S.A

خدائے تدوین کا چوتھا صحیفہ: مثنویاتِ شوق

یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ رشید حسن خاں اردو کے خدائے تدوین ہیں۔ فسانۂ عجائب، باغ و بہار اور مثنوی گلزارِ نسیم کے بعد ان کا چوتھا شاہکار مثنویاتِ شوق ۱۹۹۸ء میں انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا۔ اسے بابائے اردو مولوی عبدالحق سیریز۔ ۴ کہا گیا ہے۔ اس سیریز کی پہلی تین کتابیں کون سی ہیں مجھے معلوم نہیں۔ تدوین کے اس کارنامے کو مولوی عبدالحق سیریز کیوں کہا گیا، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ مولوی صاحب نے بلاشبہ اردو کی غیر معمولی خدمات کیں، قدیم ادب کو متعدد کتابوں کو ترتیب دیا لیکن ان میں کوئی بھی کام غیر معمولی نہیں۔ رشید حسن خاں کے معیار کی کوئی تدوین ہے تو وہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ہے۔ اس سیریز کو مولانا عرشی کے نام سے معنون کیا جاتا تو بہتر ہوتا لیکن حقیقت سے آنکھیں چار کرنے میں تامل کیوں؟ اس سیریز کو سیدھا سادہ رشید حسن خاں سیریز کہا جاتا تو ایک حقیقت جلی کا اعتراف ہوتا۔

"مثنویاتِ شوق" کے مختصر تعارف میں ڈاکٹر خلیق انجم کہتے ہیں۔

"متنی تنقید پر میری تھوڑی بہت نظر ہے، اس لیے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو میں رشید حسن خاں کے پایے کا کوئی اور متنی نقاد ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔ وہ متن کا جس طرح تنقیدی اڈیشن تیار کرتے ہیں، وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔"

مجھے اس فیصلے سے کامل اتفاق ہے، اتفاق نہیں ہے تو ان کی اصطلاحوں: متنی تنقید، متنی نقاد اور تنقیدی اڈیشن سے۔ آپ چاہیں نہ چاہیں اردو میں تحقیق اور تنقید میں فرق کیا جاتا ہے۔ کیا ضرور ہے کہ انگریزی اصطلاح Textual Criticirm کا لفظی ترجمہ متنی تنقید کیا جائے، اسے تدوینِ متن اور یہ کام کرنے والے کو مدوّنِ متن کہنا چاہیے۔ تنقیدی اڈیشن کو تحقیقی اڈیشن کہا جائے تو صحیح تر ہوگا۔ میں نے ایک یونیورسٹی میں امتحان کے ایک پرچے کو

موڈریٹ کرتے ہوئے دیکھا کہ ممتحن نے سوال کیا تھا کہ ذیل کی عبارت کی (یاشاید اشعار کی) متنی تنقید کیجیے۔ یہ نتیجہ ہے غلط اصطلاح ڈھالنے کا۔

رشید حسن خاں کے جملہ تدوینی کام مولانا عرشی کی تدوینات سے بھی بھاری ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مستقبل میں بہت عرصے تک خاں صاحب کے پائے کا دوسرا مدون سامنے نہ آسکے گا، اسی لیے میں انھیں خدائے تدوین کہتا ہوں، کوئی آزردہ ہو تو ہوا کرے۔

رشید حسن خاں کلاسکی علوم کے ماہر ہیں۔ ان کے پہلے تین کارناموں کے بعد چوتھے کام کے لیے مثنویاتِ شوق کے انتخاب کی اطلاع پاکر میں سوچتا تھا کہ خاں صاحب نے غلط انتخاب کیا۔ ان کے جیسے علم و فضل والے عالم کے لیے شوق کی مثنویاں ہلکی ہیں۔ ان میں تدوین کے جوہر دکھانے کا کہاں موقع ہے، لیکن کہتے ہیں کہ استاد کاریگر کے ہاتھ میں جو بھی خام مادہ آجائے وہ اپنی چابک دستی سے اس کو شاہکار بنادیتا ہے۔ مثنویاتِ شوق کی تدوین کو دیکھ کر اس پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ میرے پاس وہ نظم نہیں کہ میں اس تدوین کا تنقید و تجزیہ کرسکوں۔ اس کے محض تعارف پر اکتفا کروں گا۔

انھوں نے تین مثنویوں: فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق کے متن سے پہلے ۱۵۶ صفحوں کا عالمانہ مقدمہ لکھا ہے۔ متن کے بعد ۱۴۲ صفحات کے چار ضمیمے اور ایک فرہنگ ہے۔ مقدمے میں ۱۵ ذیلی عنوانات ہیں۔ پہلا عنوان ہے تمہید جو مثنویوں کے تہذیبی اور ادبی پس منظر پر مشتمل ہے۔ جو لوگ خاں صاحب کو محض محقق سمجھتے ہیں وہ اس تمہید کی گلگشت کریں تو ان کی تنقیدی نظر کے قائل ہو جائیں گے محض ۱۳ صفحوں میں حق ادا کر دیا ہے۔ اس کے بعد حالاتِ زندگی ہیں۔ چونکہ شوق کے حالات تفصیل سے نہیں ملتے اور رشید حسن خاں صرف مستند بات ہی کرتے ہیں اس لیے انھوں نے شوق پر لکھنے والوں کے بیانات اور جملہ روایتوں کو چھانا پھٹکا اور سب ضروری باتیں سات آٹھ صفحوں میں لکھ دیں۔

اگلا عنوان "مثنویاتِ شوق کی تعداد" ہے جس میں جملہ مثنویات کا جائزہ لے کر الحاقات کو رد کیا۔ ان بے بنیاد انتسابات کے راوی ہمارے بعض زعمائے ادب ہیں۔ یہ عام طور سے مانا جاتا ہے کہ شوق نے محض تین مثنویاں لکھیں: فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق۔ رشید حسن خاں بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اس کے بعد مقدمے کا نہایت اہم حصہ آتا ہے "مثنویات کا زمانۂ تصنیف"۔ یہاں رشید حسن خاں کے تحقیقی جوہر کھلتے ہیں۔ انھوں نے بطورِ خاص تین پیش رو مورخوں کے بیانات کا تجزیہ کیا:

۱۔ عطاءاللہ پالوی کا تذکرۂ شوق۔ ۲۔ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام کی کتاب دبستانِ آتش نیز

کلیاتِ شوق۔ ۳۔ڈاکٹر سید محمد حیدر کا تحقیقی مقالہ حیاتِ شوق (۱۹۹۱ء)
پالوی صاحب نے لکھا تھا کہ فریبِ عشق شوق کی پہلی مثنوی ہونی چاہیے کیونکہ اس میں شوق نے اپنے لڑکپن کا ذکر کیا ہے۔ خاں صاحب نے دکھایا کہ پالوی صاحب کے مطابق شوق ۱۱۹۷ء میں پیدا ہوئے اور فریبِ عشق ۱۲۶۳ء میں لکھی گئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت شوق کی عمر ۶۶ برس کی تھی جسے لڑکپن نہیں کہا جاسکتا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجنوں گورکھپوری کے بارے میں بڑے مزے کی بات کہی۔

"مجنوں صاحب کے رومان زدہ مزاج کو تحقیق کی مشکل پسندی سے دور کی بھی مناسبت نہیں تھی" (ص ۴۳) میں نے بہارِ عشق کی طبعِ اول ۱۲۶۶ھ کی ایک نثر خاتمہ کی بنا پر لکھا تھا۔

"چوں کہ یہ مثنوی ایک ذی اقتدار نواب کی فرمایش پر لکھی گئی اور شائع کی گئی، کوئی وجہ نہیں کہ تصنیف کے بعد طباعت میں دیر ہوئی ہو، اس لیے اس کی تاریخ ۱۲۶۶ھ تسلیم کی جاسکتی ہے۔"

(اردو مثنوی شمالی ہند میں، جلد دوم ص ۱۲۰)

اب دیکھیے کہ تحقیق میں حزم واحتیاط کسے کہتے ہیں۔ خاں صاحب کا موقف ہے:
"جین صاحب کی بات قرینِ قیاس تو ہے، دل کو لگتی ہوئی بھی معلوم ہوتی ہے، مگر اس قیاس کو حتمی حیثیت نہیں دی جاسکتی یعنی قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی تصنیف اور طباعت کا درمیانی وقفہ کتنا تھا۔" (ص ۴۵)

ویسے وہ عام طور سے میرے بیانات سے اتفاق کرنے پر مائل ہیں۔ بہارِ عشق کی تاریخ صفر ۱۲۶۳ھ (جلوسِ واجد علی شاہ) اور شوال ۱۲۶۶ھ کے بیچ طے کی۔ شوق کے مقالہ نگار ڈاکٹر حیدر کے بیانات کی انھوں نے بڑی کھنچائی کی۔ حیدر نے دعویٰ کیا تھا کہ شوق کی تینوں مثنویاں نصیر الدین حیدر کے عہد کی ہیں۔ بہارِ عشق میں واجد علی شاہ کی مدح کے اشعار کے لیے انھوں نے مفروضہ پیش کیا۔

"بہت ممکن ہے کہ واجد علی شاہ سے متعلق تمام اشعار بعد میں ضرورتاً یا مصلحتاً جوڑ دیے گئے ہوں"

ایسے بیان پر رشید حسن خاں جیسے سخت گیر محقق کے ردِ عمل کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر حیدر کے دلائل کے پرخچے اڑا دیے۔ تینوں مثنویوں کی تاریخ تصنیف کے بیانات میں زہرِ عشق کی بحث شاہکار ہے۔ میں نے اپنی کتاب "اردو مثنوی" میں لکھا تھا کہ

زہر عشق کا مادّہ، تاریخ "غم دلربا" ہے جسے سب سے پہلے راس مسعود نے انتخاب زریں میں درج کیا۔ عشرت رحمانی نے دیباچہ زہر عشق میں ذاکر بدایونی کا پورا قطعہ درج کر دیا جس میں یہ مادّہ نظم کیا گیا ہے۔ میں رشید حسن خاں کی طرح جستجو کہاں کرتا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ راس مسعود اور عشرت رحمانی دونوں نے اپنے ماخذ کو چھپا کر یہ تاثر دیا جیسے یہ ان کی دریافت ہے۔ دراصل یہ سب نظامی بدایونی کے دیباچہ زہر عشق (۱۹۱۹ء) سے لیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں ایک ایک جملے اور فقرے پر وکیل کی طرح بحث کر کے محتاط ترین نتیجہ نکالتے ہیں۔ انھوں نے اطلاع دی کہ اب تک کی معلومات کے مطابق اس مثنوی کا قدیم ترین ایڈیشن مطبع شعلۂ طور کانپور کا جنوری ۱۸۶۲ء کا ہے۔ ۱۲۷۷ھ مطابق ہے ۶۱-۱۸۶۰ء کے۔ وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۷۷ھ ہی ہو۔

مثنویات کی تاریخ کے بعد اگلا عنوان ہے "منع اشاعت۔" پورے مقدمے میں تحقیق کے شاہکار یہی دو بیانات ہیں۔ امتناع اشاعت کے بارے میں انھوں نے جملہ روایات کا اس عمق نظر سے جائزہ لیا ہے جیسے کوئی شرلاک ہومز چھان بین کرے۔ خاں صاحب کے تجزیے سے یہ بھی درس ملتا ہے کہ سُنی سنائی روایات کا کس طرح تجزیہ کرنا چاہیے۔ ص ۶۵ تا ۸۷ کو محیط اس جائزے میں انھوں نے متعدد ایسی روایتوں اور بیانات کی نشان دہی کی ہے جن سے میں واقف نہ تھا۔ مثلاً سر رضا علی کی اعمال نامہ (دسمبر ۱۹۴۳ء)، امیر احمد علوی کی مثنویات (دسمبر ۱۹۴۳ء)، نظامی بدایونی کا نسخۂ زہر عشق (۱۹۱۹ء) جس میں انھوں نے ۱۹۱۹ء کے ایک گورنمنٹ آرڈر کا حوالہ دیا، ڈاکٹر اکبر حیدری کی روایت کہ زہر عشق میں میر مونس کی داستان محبت کو بیان کیا ہے (۱۹۸۹ء) ڈاکٹر اظہر فاروقی کی روایت، ضیا فتح آبادی شاگرد سیماب کی روایت وغیرہ۔ روایتوں کو پرکھنے کے لیے خاں صاحب کے حسب ذیل مشاہدے کو تحقیق کے اصولوں میں جگہ دینی چاہیے۔

"میں یہاں ایک بات پر خاص کر زور دینا چاہتا ہوں۔ مثنوی گلزار نسیم کی تدوین کے دوران اس سے متعلق زبانی روایتیں میرے سامنے آئیں مثلاً یہ لکھا گیا کہ میں نے بزرگوں سے سنا ہے، یا یہ کہ فلاں صاحب کے بھائی، شاگرد یا داماد نے خود مجھ سے یہ کہا تھا، یا میرے سامنے یہ بیان کیا تھا؛ جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ ایسی سبھی روایتیں خانہ ساز تھیں۔ ایسی روایتوں کے بیان کرنے والے کون تھے؟ مولانا عبدالحلیم شرر اور پنڈت برج نراین چکبست جیسے لکھنؤ کے محترم حضرات تھے، خصوصاً آخرالذکر۔ تب سے میں زبانی روایتوں کے سلسلے میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا ہوں، خاص کر ایسی روایتیں جن پر کسی واقعے کے ہونے یا نہ

ہونے کا دارومدار ہو۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ روایت کی کچھ اصل تو ہے، لیکن نقل کی روایت کے نتیجے میں اس کا چہرہ مہرہ بدل گیا ہے یا بگڑ گیا ہے۔" (ص ۷۷-۷۶)

اگر میری زندگی میں میری کتاب "تحقیق کا فن" کا نیا ایڈیشن نکلا تو میں ان کے مشاہدے کو رہنما اصولوں میں ضم کر کے درج کروں گا۔ ان کا یہ مشاہدہ بھی گرہ میں باندھ کر رکھنے کے قابل ہے۔

" یہ بات ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ ہمارے بہت سے معروف اہلِ قلم تحقیقی مزاج نہیں رکھتے تھے، اس لیے ایسے اقوال پر نہ تو تعجب ہونا چاہیے اور نہ انھیں لازماً قابلِ قبول سمجھنا چاہیے۔ جو حضرات اپنے آپ کو نقاد کہتے ہیں ان میں سے بیشتر کے مزاج کو تحقیق سے دور کی مناسبت بھی نہیں ہوتی، اس لیے وہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے حضرات کو یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ کیا لکھنا ہے، لیکن عموماً یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا نہیں لکھنا ہے۔"

(ص ۸۶-۸۵)

مقدمے کے امتناعِ اشاعت والے تجزیے کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

اگلا جزو مطبوعہ نسخے ہے جس میں تینوں مثنویوں کے قدیم ترین اور اہم ایڈیشنوں کی تفصیل ہے۔ یہ یاد رہے کہ رشید حسن خاں جس متن کو مرتب کرتے ہیں اس کے تمام اہم مخطوطوں اور مطبوعہ ایڈیشنوں کو فراہم کر کے کام کرتے ہیں، ایسے ایڈیشن کہ میں نے انھیں کبھی دیکھا سنا بھی نہیں۔ رشید حسن خاں نے واضح کیا کہ مثنویاتِ شوق کا کوئی اہم خطی نسخہ نہیں ملتا، تمام مفید نسخے مطبوعہ ہیں۔ انھوں نے ان کی تفصیل دیتے ہوئے بعض ایڈیشنوں کے اہم ترقیمے بھی نقل کر دیے ہیں۔ مثلاً بہارِ عشق کا مطبع محمدی لکھنؤ کا ۱۲۶۸ھ کا ایڈیشن جو مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد چھپا۔ اس کی نثر خاتمہ میں یہ اہم اطلاع ہے۔

"(مصنف نے) حسبِ استدعاے "بعضے دوستان لطیف کچھ خیال انجام اندیشی کر دنیائے فانی کو ناچیز سمجھ کر اصل حقیقت کو بیان کیا تا کہ عارفانِ صافی دل اس کو ملاحظہ کر کے لذتِ حسنِ حقیقی اٹھادیں۔ لہٰذا دوبارہ بحرِ تفکر میں غواصی کر کے اس درِ شاہوار اور گوہر آبدار کو رشتۂ نظم میں منسلک کیا اور بہارِ عشقِ صادق نام رکھا۔"

انگریزی کہاوت ہے کہ وطن پرستی ہر بدمعاش (scoundrel) کی آخری پناہ گاہ ہے۔ ہندستان میں کہنا چاہیے کہ دینداری ہر اوباش کی آخری پناہ گاہ ہے۔ شوق، بہارِ عشق میں بہت کھل کھیلے۔ جب ان پر زمانے کی پھٹکار پڑی ہوگی تو گھبرا کر عشقِ صادق کے اشعار کا اضافہ کر کے معلم العارفین بن گئے۔ کام کی بات یہ ہے کہ نئے جنم میں انھوں نے مثنوی کا

نام "بہار عشق صادق" رکھ دیا۔ حیرت ہے کہ فاضل مرتب نے اس نکتہ پر کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ اطلاع دیتے ہیں کہ ۱۲۶۸ھ کا ایڈیشن مصنف کی نظر سے گزرا آخری ایڈیشن ہے۔ اگر اس میں بہار عشق کا نام بدل کر "بہارِ عشق حقیقی" رکھ دیا گیا ہے تو اسی کو مستند نام مان کر مثنوی کا یہی نام زیب عنوان کرنا چاہیے۔

گارساں دتاسی نے اپنے اٹھارویں خطبے میں زہر عشق کے نسخے کے موصول ہونے کا ذکر کیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں عطاالله پالوی نے اپنی طرف سے اس نسخے کو ۱۸۶۲ء کا چھپا ہوا کہہ دیا، شاہ عبد السلام نے بغیر حوالے کے اسی بیان کو نقل کر دیا۔ خاں صاحب نے اصل خطبے میں دیکھا تو کسی سنہ کا اندراج نہیں (ص۱۰۱)۔ خاں صاحب نے زہر عشق کے قدیم ترین دستیاب ایڈیشن کو حاصل کیا لیکن فرطِ احتیاط سے اسے طبع اول کہنے سے پرہیز کیا۔ تینوں مثنویوں کے قدیم ایڈیشنوں کی تلاش میں انھوں نے کیا کیا پاپڑ بیلے، کن کن کنوؤں میں بانس ڈالے، ان کی تفصیل دوسرے تحقیق کاروں کے سامنے تلاشِ مواد کا مثالی نمونہ پیش کرتی ہے۔

اگلا جزو "ذیلی عنوانات" ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ تینوں مثنویوں میں سے کسی مثنوی کے کسی معتبر نسخے میں کوئی ذیلی عنوان نہیں بجز بہار عشق کے "ترغیب عشق حقیقی" کے، اس لیے بعد والوں کے یہ اضافے قابلِ قبول نہیں۔ ہیروئنوں کے نام کے عنوان کے تحت فاضل مرتب نے واضح کیا ہے کہ ان کے جو نام مشہور ہیں دراصل وہ ان کی صفت ہیں، علم کے طور پر نام نہیں۔ دو عنوانات میں اشعار کی کمی بیشی اور تکرار کی نشان دہی کی ہے۔ "مثنویات شوق کے مآخذ" کے تحت انھوں نے میرے ایک بیان کے پیش نظر یہ تو مانا ہے کہ واجد علی شاہ کی مثنوی بحر الفت اور شوق کی بہار عشق میں کئی اشعار اس حد تک مماثل ہیں کہ ایک نے دوسرے سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن مرتب اس امر میں مذبذب ہیں کہ واجد علی شاہ نے یہ مثنوی شوق سے پہلے لکھی تھی کہ بعد میں (ص۱۲۷)

اس کے آگے انھوں نے دو عنوانات کو ایک ساتھ لیا ہے۔

الف۔ کیا یہ مثنویاں شوق کی سرگذشت ہیں۔ ب۔ وجہ تصنیف

انھوں نے یہ درست نتیجہ نکالا ہے کہ یہ شوق کی سرگذشت نہیں۔ انھوں نے بہار عشق کے بارے میں یہ نادر نکتہ دریافت کیا کہ بہارِ عشق میں جس خاتون سے انھوں نے زنا بالجبر کیا، بعد میں اسی سے شادی کی۔ "نواب مرزا شوق ہوں یا ویسا ہی کوئی دوسرا شخص، اس کا اعلان کرنا کبھی پسند نہیں کرے گا کہ اس کی بیوی وہی ہے جس کے ساتھ زنا بالجبر کیا جا چکا ہے۔" (ص۱۳۵)

واقعی حیرت ہے کہ اس پہلو پر میرے لیا کسی دوسرے کا دھیان نہیں گیا، انھوں نے نتیجہ

نکالا ہے کہ "شاعر کا اصل مقصد صرف خواتین کی زبان وبیان کی بہار دکھانا تھا۔"

اردو محققوں میں خود رشید حسن خاں زبان وبیان کی جو بہار دکھاتے ہیں ویسا کسی دوسرے نے نہ ہوسکا۔ ایک مثال:

"یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ شوق نے یہ مثنویاں لکھنوی معاشرے کی اصلاح کے لیے لکھی تھیں۔ شوق اگر زندہ ہوتے اور ان پہ الزام لگایا جاتا، تو مجھے یقین ہے کہ وہ ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ ضرور دائر کردیتے۔ وہ اس طبقۂ اشرافیہ کے ایک فرد تھے جو ایسے جلسوں کو اور ایسی لطف اندوزیوں کو اور ایسی جنسی کامیابیوں کو تہذیبی زندگی کا جز مانتا تھا.... رلو نجات لکھنے والے اور فریبِ عشق اور بہار عشق لکھنے والے الگ الگ راہوں کے راہی ہوتے ہیں۔"

(ص ۱۴۶)

خط کشیدگی سے ظاہر ہے کہ راوِ نجات کسی کتاب کا نام ہے۔ میں اس سے واقف نہیں۔

"زبان وبیان" کے عنوان کے تحت انھوں نے تفصیلی، عالمانہ اور دلچسپ جائزہ لیا ہے۔ یہ صحیح لکھتے ہیں کہ زہر عشق میں محاوراتِ صاحباتِ محل" کی وہ کیفیت نہیں جو پہلی دو مثنویوں میں ہے۔ "کہیں کہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شوق نے اپنی زبان ہیروئن کے منہ میں رکھ دی ہے۔" (ص ۴۴۔ ۱۴۳)

ہیروئن کے منہ میں زبان رکھنے کی بات سے کہیں قاری کے منہ میں پانی نہ بھر آئے۔ اس سے قطعِ نظر انھوں نے زندگی کے فناپذیر ہونے کے اشعار درج کیے ہیں جو "ایک الھڑ لڑکی کی زبان نہیں، یہ شوق کی آواز ہے۔"

مقدمے کا آخری عنوان "طریق کار" موجودہ ایڈیشن کے متن کی پیش کشی کے بارے میں ہے۔ انھوں نے یہ بہت اچھا کیا کہ مثنویوں کے اشعار پر مسلسل نمبر شمار ڈال دیے جس سے حوالہ دینے میں بہت آسانی ہوگئی۔ لیکن انھوں نے عرشی صاحب کی طرح مختلف ایڈیشنوں کے لیے جو حرفی مخففات طے کیے ہیں ان سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کے بجائے یک لفظی اشارہ طے کرلیتے تو ذہن کی اس طرف آسانی سے رسائی ہوجاتی یعنی مطبع کے نام کا ابتدائی حرف ف، س، م وغیرہ لکھنے کے بجائے پورا لفظ فیضی، سلطان، محمدی لکھا جاتا تو لفظی تصویر سامنے آجاتی۔

انھوں نے مقدمے میں بہت سے اہم مطالب فٹ نوٹ میں دیے ہیں۔ میرے نزدیک ہر اہم تبصرہ متن میں آنا چاہیے، یہ نہیں کہ کچھ متن میں لکھ دیا اور اسی سے متعلق، اتنی ہی اہم بات حاشیے میں ٹانک دی۔ حاشیے کا استعمال حوالے کے علاوہ کم سے کم کرنا چاہیے۔

آگے متن ہے جو زیادہ سے زیادہ معتبر اور صحیح ہے۔ اس فن پر خاں صاحب کے برابر کس کو دسترس ہوگی۔ متن کے بعد کے ضمیمے معلومات کے ایسے گنجینے ہیں کہ میں ان کی تفصیلات میں نہ جاکر صرف ان کا موضوع درج کرنے پر اکتفا کروں گا۔ پہلا ضمیمہ

تشریحات ہے، دوسرا تلفظ اور املا، تیسرا اختلاف نسخ، چوتھا الفاظ اور طریق استعمال۔ آخری جزو فرہنگ ہے۔ ان سب کو دیکھ کر مرتب کے غیر معمولی علم و فضل اور ان کی وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہیں کہیں ان سے اختلاف کرنا بھی ممکن ہے مثلاً:

ا۔ وہ اشک کی لغت کا نام "نفس اللغتہ" لکھتے ہیں (ص ۳۰۹، ۳۱۰)۔ اس کا نام تاریخی ہے جو "نفس اللغہ" ہے۔ اس سے تاریخ تصنیف ۱۲۵۶ھ بر آمد ہوتی ہے۔ اگر آخری حرف کو ت لکھا جائے تو ۱۶۵۱ھ تاریخ نکلے گی جو صحیح نہیں۔ ویسے انھوں نے اس لغت کے بارے میں بہت بیش بہا معلومات دی ہیں۔

۲۔ ۱۲۲۳ ناک میں دم ہے، اشک باری ہے زندگی سے جان آری ہے (ص ۲۳۷)

اس کے لفظ آری" کا حاشیہ ص ۱۲۔۳۱۱ پر ہے اس میں خبر دیتے ہیں کہ دو اور اشعار میں "عاری" آیا ہے۔ وہاں سب مستند نسخوں میں "عاری" ملتا ہے اس لیے وہی لکھا۔ موجودہ شعر میں "آری" ملتا ہے اس لیے اسے اس املا سے لکھا۔ اس کے بعد وہ امیر مینائی کے ایک خط کا اقتباس دیتے ہیں۔

"آری" میرے نزدیک ہندی ہے اس لیے کہ "عاری" زچ و تنگ و عاجز کے معنوں میں فارسی عربی میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ ہندی میں تو عین سے لکھنا خلاف اصول ہے۔ ہندی میں "عین" کہاں۔ (ص ۳۱۱)

اس لفظ کے سلسلے میں خاں صاحب نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے لیکن میں ان سے اور امیر مینائی سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اردو میں عربی کے متعدد الفاظ ان معنوں میں استعمال ہوتے ہیں جو عربی کے لیے اجنبی ہوں گے۔ مثلاً عوصہ، عربی میں بہ معنی میدان، اردو میں مدت، عربی صلوات عربی میں بہ معنی نماز اردو میں بہ معنی گالی۔ کیا ہم ان سب کو ہندی کے پلے منڈھ کر "ارسا" "سلوات" لکھیں گے۔ عاجز کے معنی میں "آری" کوئی ہندی لفظ نہیں، اس املا کے ساتھ ایک مہمل لفظ ہے۔ مختلف لغات، امیر مینائی کے مشاہدے اور نسخوں میں "آری" لکھا ہونے کے باوجود میں اصرار کروں گا کہ اس شعر میں "عاری" ہی لکھا جائے۔

ایک تحقیقی کتاب میں اشاریے اور کتابیات کی بھی توقع کی جاتی ہے۔ اگر اشاریہ بنانا بار ہوتا تو کم از کم کتابیات تو ضروری تھی۔

آخر میں یہی کہوں گا کہ رشید حسن خان کی ان تدوینات کو دیکھ کر یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ صحت کے ساتھ عمر دراز پائیں تاکہ اردو کا دامن مالا مال کرتے رہیں۔ ان کی طبیعت ماندی رہتی ہے، اس کے باوجود وہ جس تن دہی کے ساتھ کام میں لگے رہتے ہیں وہ قابل تعریف و قابل تقلید ہے۔

ڈاکٹر سید حامد حسین
۵۔ سلور لائن اپارٹمنٹس۔ اے سیکٹر (بی ڈی اے)
کوہ فضا۔ بھوپال۔ ۴۶۲۰۰۱

عددوں کا نظام

عدد کہیں دو اور دو چار جیسی اٹل سچائی اور نا قابل تغیر صورت حال کے اظہار کا اچوک وسیلہ ہیں تو کہیں جب ہم "دو چار ہاتھ لب بام" رہ جانے کا ذکر کرتے ہیں تو بات تخمین اور اندازے کے حدود میں آجاتی ہے۔ پھر وہ موقع بھی آتا ہے جب جادو ٹونے طلسم و تعویذ، فال و شگون، قسمت کے حال اور پیشین گوئی کے کاروبار میں بھی عددوں کی کرشمہ سازی دیکھنے کو ملتی ہے۔ زبان و محاورے، رواجوں اور روایات، اطوار و عادات کی دنیا پر نظر ڈالیں تو وہ بھی عددوں سے اچھوتی نظر نہیں آتی اور پھر اشاروں اور علامتوں کا تو ایک پورا نظام ہے جو عددوں پر منحصر ہے۔

گنتی انسانی ذہن کا اختراع کیا ہوا ایک ایسا دل فریب جال ہے جسے انسان نے اپنے شعوری ارتقا کے ساتھ ساتھ درجہ بدرجہ بُنا ہے۔ انسانی ذہن میں جب شعور و امتیاز کی صلاحیتیں پیدا ہوئیں تو اُس کی قوت مشاہدہ نے اس پر واضح کیا کہ جب کہ اس کے جسم میں صرف ایک ناک، ایک منہ، ایک سر ہے، قدرت نے اسے دو ہاتھ، دو پیر، دو آنکھیں اور دو کان دیے ہیں۔ اس طرح اسے یکساں چیزوں کے جوڑے کا احساس ہوا، لیکن جلد ہی تجربے نے اسے مخالف چیزوں کے جوڑوں سے متعارف کرایا جیسے مرد اور عورت، دن اور رات، چاند اور سورج، روشنی اور اندھیرا، ٹھنڈا اور گرم۔

جوڑوں کے اس شعور نے انسان کو اشیاء اور کیفیات کو دو دو پہلوؤں میں رکھ کر سمجھنے کے لیے بنیاد فراہم کی۔ چینیوں نے کائنات کو "ین اور یانگ" (YIN AND YANG) کی شکل میں سمجھا۔ "ین" کی حیثیت ایک منفی اصول کی تھی جو نسوانی خصوصیات کی مالک تھی۔ چینیوں کے مذہبی نظریے تاؤازم میں "ین" کو دھر، ظلمات اور اثر پذیری سے وابستہ کیا گیا، جب کہ "یانگ" کی حیثیت اس میں توازن پیدا کرنے والے نظریے کی تھی جس کے بارے میں یہ مانا گیا کہ وہ ایسا مثبت اور فعال اصول ہے جو اپنے اندر مردانہ خصوصیات رکھتا ہے اور جسے فلک، نور اور اثر اندازی سے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ پارسیوں نے تخلیق کائنات کو یزداں

یعنی خدائے خیر اور اہر من یعنی خدائے شر کی کشاکش کے مظہر کی شکل میں سمجھا۔ ہندو دیومالا میں شو اور پاروتی، مصری دیومالا میں آسرس (OSIRIS) اور آئی سس (ISIS) اور ان کے مثل کئی قدیم روایات اور دیومالاؤں میں تخلیق کائنات کو دو موافق طاقتوں کے اشتراک عمل یا دو مخالف طاقتوں کی آویزش کی شکل میں تصور کیا گیا۔

جوڑوں کی شکل میں چیزوں کو مرتب کر کے دیکھنے کے نتیجے میں طاق اور جفت کا تصور ابھرا۔ یہ سمجھا گیا کہ جس کا جوڑا بن جاتا ہے، جو جفت ہے، وہ محدود ہے، وہ اصول کا تابع ہے، وہ تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اثر ڈالتا نہیں، اثر قبول کرتا ہے۔ وہ فعالیت کا نہیں، انفعال کا مظہر ہے۔ اس کے مقابلے میں طاق، منفرد و یکتا ہے۔ کہیں وہ جوڑے سے زیادہ ہے یعنی محدود کی حدود کو توڑ کر اپنے اندر لا محدود کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ طاق اور جفت عددوں کی خصوصیات مقرر کر لی گئیں۔ چینیوں نے طاق عدد کو روشنی، دن، سورج، گرمی اور آگ سے منسلک کر دیا، جب کہ جفت عدد کو اندھیرے، رات، چاند، سردی اور پانی سے۔ فیثاغورس (PYTHAGORAS) نے عددوں کے ساتھ روحانیت کے تصوارت وابستہ کیے اور اس کے نزدیک طاق عدد، ناقابل عمل، مردانہ اور آسمانی خصوصیات کے مالک تھے جب کہ جفت عدد قابل حل اور اسی لیے وہ عارضی تھے اور نسوانی اور دنیاوی خصوصیات رکھتے تھے۔ چنانچہ رومن لوگ جفت عددوں کو منحوس سمجھنے لگے اور عام عقیدہ یہ بن گیا کہ طاق عددوں میں نیک بختی ہے۔ چنانچہ آج بھی ہمارے ملک میں شادی اور دوسری تقریبات کے موقعوں پر یا چندہ وغیرہ دیتے وقت اکیس، اکاون، ایک سو ایک روپے دینے کا رواج ہے۔ فال نکالتے وقت بھی طاق عدد کو اکثر خوش قسمتی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ فال بد نکلنے کے خوف سے، ظہور اسلام کے قریب، بعض عرب قبائل، تیر وغیرہ جن سے فال نکالی جاتی تھی، ان کی پرستش کرنے لگے تھے۔ قرآن حکیم کی سورۂ الفجر کی ابتدائی آیات میں اللہ جل شانہ جن چیزوں کی قسم کھاتا ہے ان میں "والشفع والوتر" یعنی جفت اور طاق کی قسم بھی شامل ہے۔ مفسرین کرام نے اس قسم میں مضمر جو حکمتیں واضح کی ہیں وہ تو اپنی جگہ ہیں ہی، ہمیں یہ بھی لگتا ہے کہ خدا نے جفت اور طاق کی ایک ساتھ قسم کھا کر جفت اور طاق عددوں کے ساتھ وابستہ نیک و بد کے وہم کو بھی باطل قرار دیا ہے اور اس کا مل حقیقت کی قسم کھائی ہے جس میں جفت بھی شامل ہے اور طاق بھی۔

قدیم انسان کے لیے اس طرح جوڑے کا تصور ایک محدود تعداد کا تصور تھا جو بعض

حالات میں (اکثر اپنے تضاد کی شکل میں) لازم وملزوم تھا۔ چنانچہ اس کے واسطے کثرت کا تصور وہاں سے شروع ہوتا تھا جو دو سے زیادہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عربی اور سنسکرت جیسی بعض قدیم زبانوں اور لیتھونیائی جیسی جدید زبانوں میں تعداد کے لحاظ سے اسماء کو دکھانے کے لیے تین شکلیں ملتی ہیں: واحد، تثنیہ اور جمع جیسے رجل (ایک مرد) رجلان (دو مرد) اور رجال (بہت سے یعنی دو سے زیادہ مرد)۔ بتایا جاتا ہے کہ آسٹریلیا کی بعض قبائلی بولیوں میں تو تعداد بتانے کے لیے ہی کل تین الفاظ ہیں: ایک، دو اور تین۔ "تین" کا لفظ ان کے لیے "کثیر" کا مفہوم رکھتا ہے۔ انڈمان کے قبائلیوں کی بولیوں میں چار تک گنتی کے عدد ہیں۔ اس کے بعد وہ حسب ضرورت اپنی انگلیاں اٹھا کر بتاتے ہیں کہ "چار اور اتنے" جب تعداد بتانے کے لیے ہاتھ اور پانو کی انگلیاں بھی پوری ہو جاتی ہیں تو باقی گنتی کو بتانے کے لیے ناک کو چھو کر بتاتے ہیں کہ "اور یہ"۔

گننے کے لیے سب سے آسان طریقہ انسان کے لیے اپنی انگلیوں کا استعمال تھا۔ لیکن اس کے لیے بھی مختلف علاقوں میں مختلف رواج رہے۔ جاپانی انگلیاں کھلی رکھتے ہیں اور گنتے وقت ایک ایک انگلی بند کرتے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف چینی شروع میں مٹھی بند رکھتے ہیں اور ایک ایک کر کے انگلیاں کھولتے جاتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے دوران ایک جاپانی لڑکی، جو خود کو چینی بتا کر چین میں جاسوسی کر رہی تھی، جاپانی طریقے سے گننے کی وجہ سے پکڑی گئی۔

اعشاری نظام کی اہمیت کا تو بہت بعد میں علم ہوا، لیکن قدرت نے جس طرح انسان کو ایک ہاتھ میں پانچ، دونوں ہاتھوں میں دس اور ہاتھوں اور پیروں میں کل ملا کر بیس انگلیاں دی ہیں اس کی بنا پر گننے کے ابتدائی طریقوں میں پانچ، دس اور بیس کی خاص اہمیت رہی۔ آج بھی ہندستان کے بعض دیہاتی علاقوں میں تین بیسی (یعنی ساٹھ) یا چار بیسی (یعنی اسّی) کی بات سننے کو ملتی ہے۔ کبھی کبھی بیس چیزوں کے ڈھیر کو کوڑی کہا جاتا تھا کیونکہ بیس چیزیں گن لینے کے بعد یاد رکھنے کے لیے ایک کوڑی الگ رکھ دی جاتی تھی اور آگے گنتی پھر ایک سے شروع کر دی جاتی تھی۔ کہیں کہیں بجائے کوڑی کے گننے والی چیزوں میں سے ہی انیس گننے کے بعد بیسویں چیز کو الگ رکھتے جاتے تھے۔

بیس سے زیادہ گننے یا جوڑنے کے لیے انگلیوں کے پوروں پر مٹھی کے اندر کی طرف جو نشانات بنے رہتے ہیں ان سے مدد لی جاتی۔ چنانچہ جب گنتی کو لکھنے کی ضرورت پڑی تو اکثر

عددوں کی شکل انگلیوں یا اس کے پوروں کی طرح بنائی گئی۔ ہندی میں ایک کے لیے جو شکل بنائی جاتی ہے اس میں ناخن سمیت انگلی کا پوروا دکھایا جاتا ہے۔ (اس کی بعد میں اس لیے بھی ضرورت باقی رہی کہ الف جیسی سیدھی شکل نہ صرف "آ" کی ماترا کے طور پر استعمال ہوتی ہے بلکہ رقمیں لکھنے میں بھی ہندی میں اس نشان کو چار آنے کی رقم کو بتانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا)۔ انگریزی میں ہندسے کو DIGIT کہتے ہیں۔ یہ لفظ دراصل انگلی کے پوروے کے لیے ہے۔ ہندستان میں ورد و وظیفہ میں گننے کے لیے بزرگوں نے ایک طریقہ ایجاد کیا تھا جسے "عقدِ انامل" (پوروں کا جوڑ) کہا جاتا تھا۔ اس طریقے سے بغیر تسبیح وغیرہ کی مدد کے انگلیوں اور انگلیوں کے پوروں پر ایک ہزار تک شمار کرلیا جاتا تھا۔ اس طریقے میں داہنے ہاتھ کی انگلیوں پر اکائیوں اور دہائیوں اور بائیں ہاتھ پر سیکڑے اور ہزار کا حساب رکھا جاتا تھا۔

عددوں کو لکھ کر بتانے کے لیے جو علامتیں اختیار کی گئیں ان میں اردو، ہندی اور انگریزی میں تین کے عدد تک انگلیوں کو بتانے والے نشان واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ عربی میں چار کا ہندسہ اس طرح بنایا جاتا تھا "عو" جو کہ چار انگلیوں کی مشترکہ شکل میں داہنی طرف باہر نکلے ہوئے انگوٹھے کے ساتھ ایک نشان بنایا گیا تھا۔ انگوٹھے کی اس علامت کو اس لیے شامل کیا گیا تھا کہ "چار" کا عدد "دو" سے مختلف دکھائی دے۔ عربی میں "پانچ" پہلے اس طرح لکھتے تھے " B " جو دراصل بند مٹھی کو ظاہر کرتا تھا یعنی پانچوں انگلیاں ایک ایک کرکے بند کرلی گئی ہیں۔ خطاطوں نے اب "پانچ" کے اس عدد (یعنی ۵) کو گنبد کی طرح بنانے کا رواج ڈال دیا ہے۔ انگریزی میں جو رومن عدد استعمال کیے جاتے ہیں ان میں پانچ کے لیے "وی" (V) کی شکل بنائی جاتی ہے۔ یہ بھی پانچ انگلی والی پوری ہتھیلی کا خاکہ ہے۔ دس کے لیے "ایکس" (X) کو اختیار کیا گیا جو کہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ دونوں ہاتھوں کی کلائیوں کو ملا کر انگلیوں کو باہر کی طرف پھیلا دیا گیا ہے۔ یعنی دس انگلیوں کی طرف اشارہ ہے۔ رومن عددوں میں پچاس کے لیے حرف "ایل" (L) ، ہ استعمال ہوتا ہے۔ ابتداً یہ ایک تیر کا "نشان" ↓ تھا جو گننے والا پچاس تک شمار کرنے کے بعد الگ رکھ دیتا تھا۔ بعد میں کیونکہ باقی علامات میں حروف کے ساتھ مماثلت پیدا کرلی گئی، اس لیے تیر کے نشان کو بھی "ایل" کی شکل میں لکھا جانے لگا۔ رومن عددوں میں "سو" کے لیے "سی" (C) اور ہزار کے لیے "ایم" (M) حروف تہجی کی ایجاد کے بعد جوڑے گئے ان عددوں کے لیے بول چال میں آنے والے الفاظ کو ظاہر کرتے ہیں۔ "سو" کے لیے (CENTUM) سے حرف "سی" (C) لیا گیا، اور ہزارے کے

لیے لاطینی لفظ "مائل" (MILLE) سے "ایم" (M) اختیار کیا گیا۔

قدیم انسان نے تعداد کو یاد رکھنے کے لیے عام طور پر لکڑی یا پتھر پر نقطے، لکیریں یا دوسرے نشانات لکھنے کا طریقہ اپنایا۔ کبھی یہ نشانات لکڑی یا پتھر میں کاٹ یا کھود دیے جاتے تھے۔ سنسکرت لفظ "انک" کے، جو "ہندسہ" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اصل معنی لکھنے یا کاٹ کر نشان بنانے کے ہیں۔ انگریزی کا لفظ "اسکور" (SCORE) بھی بنیادی طور پر کاٹنے کا مفہوم رکھتا ہے۔ اردو میں عربی لفظ "رقم" روپیہ پیسہ کی تعداد کے لیے اختیار کیا گیا اور ہم جانتے ہیں کہ "رقم" کے اصل معنی بھی "تحریر کرنے" کے ہیں۔

حروف تہجی کی ایجاد کے بعد بعض رسوم خط میں کفایت کے مد نظر یہ بھی رواج پڑا کہ حروف کو آوازوں کے ساتھ ساتھ تعداد بتانے کے لیے بھی استعمال کیا جائے۔ یہ مانا جاتا ہے کہ سب سے پہلے کلدانیوں (CHAL DEANS) نے حروف تہجی کی قیمت مقرر کی۔ لیکن ابجد کی ترتیب کے مد نظر، عددوں کو منظم کرنے کا واضح نظام عبرانی زبان کے حروف تہجی کی مدد سے مقرر کیا گیا۔ اس ابجد میں کل ۲۲ حروف تھے اور آخری حرف کی قیمت ۴۰۰ تھی۔ عربی میں چھ حروف کا اور اضافہ کیا گیا جس سے حروف تہجی کی کل تعداد ۲۸ ہو گئی جن میں۔

(اول) پہلے نو حروف سے اکائی کے عدد یعنی الف (۱)، ب (۲)، ج (۳)، د (۴)، ہ (۵)، و (۶)، ز (۷)، ح (۸)، ط (۹)۔

(دوم) اگلے نو حروف سے دہائی کے عدد یعنی ی (۱۰)، ک (۲۰)، ل (۳۰)، م (۴۰)، ن (۵۰)، س (۶۰)، ع (۷۰)، ف (۸۰)، ص (۹۰)

(سوم) اس کے بعد کے نو حروف سیکڑے یعنی ق (۱۰۰)، ر (۲۰۰)، ش (۳۰۰)، ت (۴۰۰)، ث (۵۰۰)، خ (۶۰۰)، ذ (۷۰۰) ض (۸۰۰) ظ (۹۰۰)

(چہارم) اور آخری حرف "غ" سے ایک ہزار کو ظاہر کرنے کا ایک واضح طریقہ وجود میں آیا۔ فارسی اور اردو زبانوں میں جو زائد حروف شامل تھے انھیں بھی ابجد کے قریب ترین حروف کی قیمت دے کر اس نظام میں داخل کر لیا گیا۔ یعنی پ (۲)، چ (۳)، گ (۲۰)، ٹ (۴۰۰)، ڈ (۴) اور ڑ (۲۰۰) کے برابر مان لیے گئے۔ اس طرح عبارت کو عددوں اور عددوں کی عبارت کو شکل دینے کا طریقہ ایجاد ہوا۔ جیسے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو

۷۸۶ لکھ کر عددوں کی شکل دی گئی اور کسی واقعے کی تاریخ کے عدد حاصل کرنے کے لیے کوئی عبارت جیسے تاریخی نام یا مصرعہ تاریخ وغیرہ تیار کرنے کا رواج ہوا۔

ہندستان میں رقمیں تحریر کرنے کا ایک طریقہ عددوں کو الفاظ میں لکھنے کی ضرورت سے وجود میں آیا۔ لین دین کے کاموں میں جہاں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اصل عدد میں کاٹ چھانٹ کر کے کوئی نیا عدد بنانے کا جعل کیا جاسکتا ہے، رقم الفاظ میں بھی لکھ دی جاتی ہے۔ ہندستان میں فارسی میں تحریر کی جانے والی دستاویزوں کے اندر لفظوں میں رقم لکھنے کے لیے عربی گنتی کے الفاظ لکھنے کا رواج پڑا۔ بعد میں منشیوں نے عربی کے ان الفاظ کو تحریر کی سہولتوں کے مد نظر نقطوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اور حروف کے درمیان ایسی خلا کو ختم کرتے ہوئے جس کی وجہ سے قلم کو بار بار اٹھانا پڑے، مختصر علامتیں وضع کیں جنھیں رفتہ رفتہ رقموں کے نظام تحریر کی حیثیت سے قبولیت حاصل ہوئی۔ جیسے "ایک عدد" کے "عدد" کو "عہ" کر لیا گیا۔ چار کے لیے عربی لفظ "اربعہ" نے "للعہ" کی شکل اختیار کر لی۔ پانچ کے لیے خمسہ "صہ" سات کے لیے سبعہ "معہ" نو کے لیے تسعہ "لعہ" بن گئے۔ تین کے لیے ثلاثہ کو "سہ"، چھ کے لیے ستہ کو "سے"، آٹھ کے لیے ثمانیہ کو "ے" لکھا جانے لگا۔ سو کے لیے ماءتہ "ما" رہ گیا۔ جن عربی الفاظ میں آخر میں "نون" آتا تھا اس کے لیے علامتوں کو ایک حلقہ بنا کر ختم کیا جاتا۔ ۱۰، ۲۰، ۳۰، ۴۰، ۵۰ وغیرہ کے لیے رقمیں اسی طرح لکھی جاتیں۔ مثلاً ۴۰ کے لیے اربعین کی علامت للعہ کے آخر میں اسی قسم کا حلقہ شامل ہے۔ عربی میں دو کے لیے استعمال ہونے والے تثنیہ کے لیے آخر میں جو "نون" آتا ہے اس کو بھی علامت کے آخری حصے کو اوپر اٹھا کر دکھایا جاتا جیسے دو روپیہ کے لیے "عددان" کی علامت عہ۔ اور دو سو روپیہ کے لیے "ماتین" کی علامت اختیار کی گئی۔ ۱۱، ۲۱، ۳۱، ۴۱ وغیرہ میں احد عشر (گیارہ) کی طرح "احد" شامل ہوتا۔ اس کو پہلے ملا کر "طہ" اور پھر "طہ" اور بالآخر "لہ" کی شکل دی گئی اور گیارہ پیہ لہ عہ لکھا جانے لگا۔

عددوں کو گنتی کرنے کے علاوہ پیمائش کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ پیمائش کے لیے بعض اوقات زاویے کی کشادگی کو بھی مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ یہ مانا جاتا ہے کہ سب سے پہلے بابلیوں نے اس اصول کو دریافت کیا کہ کسی دائرے کے محیط (CIRCUMFERENCE) کو اس کے نصف قطر (RADIUS) سے چھ بار کاٹا جاسکتا ہے۔ اس بنیاد پر انھوں نے پورے دائرے کو ۳۶۰ درجوں میں تقسیم کیا۔ ان کے نزدیک

پورا سال بھی ۳۰، ۳۰ دن کے ۱۲ مہینوں پر مشتمل تھا اور اس طرح سال کے ۳۶۰ دنوں اور دائرے کے کل زاویوں کے ۳۶۰ درجوں میں ایک ایسی مماثلت تھی جسے وہ اسی طرح ایک روحانی مطابقت گردانتے تھے جس طرح دائرے کے محیط کو نصف قطرے سے چھ بار کاٹا جانا۔ اس کے نتیجے میں چھ کے عدد کو ان کے طریقہ شمار میں ایک خاص اہمیت حاصل ہوئی اور اس کے اثرات آج بھی زاویوں، طول البلد اور عرض البلد وغیرہ کی پیمائش میں ہی نہیں بلکہ وقت کی پیمائش میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس طریقے سے بڑی اکائیوں کو ساتھ چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کرنے کا طریقہ رائج ہے، جیسے ایک گھنٹے میں ۶۰ منٹ اور ہر منٹ میں ۶۰ سیکنڈ۔

بابلیوں نے اس طرح عددوں کا تعلق دنوں کے ساتھ پیدا کرنے کے علاوہ دنوں کا تعلق ستاروں اور ستاروں کے دنیائے اسباب پر پڑنے والے اثرات کی بات بھی کی اور اس کے ساتھ ساتھ عدد، علم نجوم اور جادو ٹونے کے ساتھ بھی جڑ گئے۔ بابلیوں کے اثرات مصریوں اور یونانیوں نے بھی قبول کیے اور فیثاغورس نے تو عددوں کی شماریاتی خصوصیات اور روحانی اثرات کو ملا کر ایک نظام فکر میں کھڑا کر دیا۔

اس سے قبل کہ ہم فیثاغورس کے نظام میں مختلف عددوں کی خصوصیات کا ذکر کریں، مختصراً اس پنتھ (مذہبی عقیدے) کا تعارف دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو اس نے تیار کیا تھا۔ فیثاغورس روحوں کے آواگون کو مانتا تھا اور اس نے اپنے چیلوں کو اس کی ممانعت کی تھی کہ وہ مٹر جیسی کسی قسم کی پھلیاں نہ کھائیں۔ سفید مرغے کو ہاتھ نہ لگائیں۔ جو چیز گر جائے اسے نہ اٹھائیں۔ کسی جانور کا دل نہ کھائیں۔ آگ کو لوہے سے بنی چیز سے الٹ پلٹ نہ کریں۔ پھاٹک کی لکڑی کو الانگھ کر نہ جائیں۔ آگ پر سے جب برتن اُٹھائیں تو راکھ میں اس برتن کا نشان باقی نہ رہنے دیں بلکہ راکھ کو اوپر نیچے کر کے نشان مٹا دیں اور جب بستر پر سے اُٹھ جائیں تو چادر لپیٹ دیں اور بستر پر جسم کا نشان نہ رہنے دیں۔

آج تو یہ باتیں محض پاگل پن معلوم ہوتی ہیں، لیکن چھٹی صدی قبل مسیح میں جب فیثاغورس زندہ تھا، اس کا ایک مفکر اور دانشور کی حیثیت سے زبردست اثر تھا۔ برٹرینڈ رسل نے تو اپنی تصنیف "مغربی فلسفے کی تاریخ" میں اسے قدیم و جدید زمانے کے اہم ترین فلسفیوں میں مانا ہے۔ خاص طور پر ریاضی کے میدان میں اس کی خدمات کو بنیادی اہمیت کا بتایا ہے۔ فیثاغورس کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ اس نے عددوں کو روحانی علامت کی حیثیت سے

استعمال کرتے ہوئے اس کے لیے ایک فلسفیانہ بنیاد فراہم کی۔ جیسے اس کا کہنا تھا کہ "ایک" عدد وحدت کو بتاتا ہے۔ وہ خالق کی نمائندگی کرتا ہے جو ناقابل تقسیم ہے۔ "دو" کو اس نے ضد کی شکل میں پیش کیا اور اسے انتشار، آویزش اور شر کی علامت کے طور پر لیا۔ "تین" کو اس نے تکمیل سے وابستہ کیا جو وحدت (یعنی "ایک") اور متضاد پہلوؤں (یعنی "دو") کی خصوصیات جمع کرنے سے بنتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ "تین" کا عدد ابتدا، وسط اور انتہا پر مشتمل کامل حقیقت کی عضویاتی وحدت کو ظاہر کرتا ہے۔ "چار" کیونکہ "دو" کا مربع ہے اس لیے فیثاغورس نے اسے مکمل جامعیت سے تعبیر کیا۔ "پانچ" کو اس نے فطرت اور فن کا عدد بتایا جب کہ "چھ" کو انصاف اور "سات" کو مذہب کا۔

اس کے بعد عددوں کو سعد و نحس کے تصور سے منسلک ہوتے دیر نہیں لگی۔ قدیم رومن لوگوں کے نزدیک "دو" کا عدد سب سے زیادہ منحوس تھا۔ بابل اور اسیریا میں ہفتے کے دنوں کے عدد اور ستاروں میں مطابقت پیدا کی گئی اور ستاروں کے سعد اور نحس اثرات کے مد نظر عددوں کے سعد اور نحس ہونے کے بارے میں فیصلہ کیا جانے لگا اور علم نجوم اور جادو ٹونکے اور تعویذ و طلسم کے لیے بھی عددوں کا استعمال ہونے لگا۔ حروف کے نمبر مقرر کیے جانے کے بعد سحر و طلسم میں عددوں کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ طلسمی مربع (MAGIC SQUARE) کی دریافت کے بعد تو دعاؤں، آیتوں، منتروں اور طلسمی عبارت کو نقش یا تعویذ کی شکل میں پیش کرنا ایک مہارت بن گئی۔

طلسمی مربع میں خانوں میں عددوں کو اس طرح رکھا جاتا ہے کہ آڑی لائنوں، کھڑی لائنوں یا ترچھی لائنوں میں دیے ہوئے عددوں کو جوڑا جائے تو سب سے ایک ہی عدد حاصل ہو۔ مثلاً تین خانے والے اس مربع کو دیکھیے۔

۶	۷	۲
۱	۵	۹
۸	۳	۴

اس میں ہم اگر آڑی لائنوں (۶+۷+۲) یا (۱+۵+۹) یا (۸+۳+۴) کو جوڑیں تو ۱۵ حاصل ہوگا۔ اسی طرح کھڑی لائنوں (۶+۱+۸) یا (۷+۵+۳) یا (۲+۹+۴) کا جوڑ بھی ۱۵ ہوگا۔ دو ترچھی لائنوں (۶+۵+۴) یا (۲+۵+۸) میں سے ہر ایک کا جوڑ ۱۵ ہی ہوتا ہے۔ اس مربع کو آپ نمونے کا مربع مانیں کیونکہ یہ "ایک" سے شروع ہونے والی ترتیب کو بتاتا ہے۔

کسی آیت وغیرہ کو اس طرح کے نقش میں جمانے کو تکسیر کا یعنی توڑنے کا عمل کہتے ہیں کیونکہ پوری عبارت کے عددوں کو توڑ کر الگ الگ خانوں میں جمایا جاتا ہے۔ اس طرح جمانے کے لیے پہلے عبارت کے، ابجد کے طریقے کے مطابق، عدد حاصل کیے جاتے ہیں اور پھر انھیں ٹکڑوں میں بانٹ کر خانوں میں درج کیا جاتا ہے۔ جیسے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ۷۸۶ عدد حاصل ہوئے۔ تین خانوں کے مربع نقش تیار کرنے کے لیے پہلے ۷۸۶ کو تین سے تقسیم کیا جس سے ۲۶۲ حاصل ہوگا۔ اب خالی نقش کے بیچ والے خانے میں ۲۶۲ لکھیں گے اور اس کے ترچھے خانوں میں ایک کم اور ایک زیادہ عدد تحریر کریں گے۔

		۲۶۳
	۲۶۲	
۲۶۱		

اس کے نمونے کے مربع میں دی گئی ایک سے نو تک کی ترتیب کے مد نظر خالی خانوں کو بھر کر نقش کو اس طرح پورا کریں۔

۲۵۹	۲۶۴	۲۶۳
۲۶۶	۲۶۲	۲۵۸
۲۶۱	۲۶۰	۲۶۵

آپ دیکھیں گے کہ ہر لائن کا جوڑ ۷۸۶ آئے گا۔ اسی طرح چار، پانچ اور چھ خانوں کے مربعوں میں عددوں کی ترتیب اس طرح ہو گی:۔

چار خانے کا مربع جس کی ہر لائن کا جوڑ ۳۴ ہے۔

۱	۱۶	۱۱	۶
۱۳	۴	۷	۱۰
۸	۹	۱۴	۳
۱۲	۵	۲	۱۵

پانچ خانے کا مربع، جس کی ہر لائن کا جوڑ ۶۵ ہے۔

۱۷	۲۴	۱	۸	۱۵
۲۳	۵	۷	۱۴	۱۶
۴	۶	۱۳	۲۰	۲۲
۱۰	۱۲	۱۹	۲۱	۳
۱۱	۱۸	۲۵	۲	۹

چھ خانے کا مربع، جس کی ہر لائن کا جوڑ ۱۱۱ ہے۔

۱	۳۵	۴	۳۳	۳۲	۶
۳۰	۸	۲۷	۲۸	۱۱	۷
۲۴	۲۳	۱۵	۱۶	۱۴	۱۹
۱۳	۱۷	۲۱	۲۲	۲۰	۱۸
۱۲	۲۶	۱۰	۹	۲۹	۲۵
۳۱	۲	۳۴	۳	۵	۳۶

ان سے زیادہ خانوں کے بھی مربع بنائے جاسکتے ہیں۔ جیسے ایک سے شروع ہونے والے سات خانوں کے مربع کی ہر لائن کا جوڑ ۱۷۵ اور آٹھ خانوں کے مربع کی ہر لائن کا جوڑ ۲۶۰ ہوگا۔

عددوں سے اس طرح تعویذ اور زائچے وغیرہ بنائے جانے لگے اور پھر دھیرے دھیرے عددوں کی بنیاد پر قسمت کا حال بتانے کے لیے ایک الگ ہی علم NUMEROLOGY اُبھر آیا اور اس میں عددوں کو دنوں، مہینوں، سالوں، بُرجوں، عناصر، اعضائے جسمانی، نگوں، سمتوں، ملکوں، پیشوں، وغیرہ سے منسلک کر کے سعد عددوں (LUCKY NUMBERS) اور منحوس عددوں کو طے کیا جانے لگا۔ ابجد کی مدد سے عربی، اردو، فارسی میں تو ناموں کے عددوں کا تعین کرنے کا رواج بہت پرانا ہے۔ لیکن رومن حروف تہجی کے ساتھ عربی حروف تہجی کی طرح شروع سے عدد وابستہ نہیں تھے۔ لہٰذا رومن حروف تہجی کی بنیاد بنا کر ناموں وغیرہ کے عدد نکالنے کا طریقہ پیشین گوئی کرنے والوں نے خود وضع کیا۔ اس کے تحت رومن حروف کو ایک سے آٹھ تک عدد اس طرح دیے گئے۔

ایک: A, J, I, Q, Y

دو: B, K, R

تین: C, G, L, S

چار: D, M, T

پانچ: E, H, N, X

چھ: U, V, W

سات :O,Z

آٹھ :f,p

نو کا عدد خدا کا مانا گیا اور اسے کسی حرف سے منسلک نہیں کیا گیا۔ اس طریقے میں دہائی یا سینکڑے والے عددوں کی گنجائش نہیں۔ اس لیے اکائی اور دہائی یا اکائی، دہائی اور سینکڑے سے بننے والے یا اس سے بڑے عددوں کے ہندسوں کو اس وقت تک باہم جوڑا جاتا رہتا ہے جب تک ایک ہندسہ حاصل نہ ہو جائے۔ جیسے ۱۹۹۸ کو (۱+۹+۹+۸) یعنی ۲۷ اور پھر (۲+۷) یعنی ۹ بنالیا جائے گا۔ ناموں کو عدد کی شکل دینے میں بھی یہی طریقہ استعمال ہو گا۔ جیسے سید حامد حسین کے لیے۔

SYED HAMID HUSAIN

(۵+۱+۱+۳+۶) + (۴+۱+۴+۱+۵) + (۴+۵+۱+۳)

ان کا جوڑ ۴۹ ہوا۔ جو کہ (۴+۹) ۱۳ بنا۔ اس سے (۱+۳) ۴ حاصل ہوا۔ اس طرح سید حامد حسین کا عدد "چار" ہے اور "چار" کے عدد کی جو خصوصیتیں ہیں ان کا اثر پڑے گا۔

زبان اور محاورے میں عددوں نے الگ ہی طریقے سے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ جب کہ حساب کتاب اور ریاضی کے علم میں عددوں کی بنیادی خصوصیت ان کی مقررہ قیمت (EXACT VALUE) ہے، زبان اور محاورے میں عددوں کو اکثر محض ایک غیر عددی اندازے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جیسے چار پانچ صفحے پڑھے ہیں یعنی تھوڑے سے صفحے پڑھے ہیں۔ دس پانچ لوگ ہی چندہ دیں گے یعنی بہت زیادہ لوگ چندہ نہیں دیں گے۔ انیس بیس کا فرق ہے یعنی بہت معمولی فرق ہے۔ سولہ آنے سچ ہے یعنی بات پوری پوری سچ ہے۔

بعض عدد مثلاً ۷، ۱۰، ۴۰، ۱۰۰ محض تکمیل کا مفہوم ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں جیسے ساتوں آسمان، چودہ طبق، دسیوں تدابیر، چلہ کھینچنا، ننانوے کے پھیر میں پڑنا۔ ان سب فقروں میں عدد کے استعمال سے ٹھیک ٹھیک تعداد اس حد تک مراد نہیں جس حد تک اس کے لیے تکمیل یا عدم تکمیل کا کوئی مفہوم۔ جس زمانے میں چالیس کے اوپر گننے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، اس زمانے میں چالیس کو ہی تعداد کی انتہا سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں سو پر پہنچ جانا آخری حد کی حیثیت رکھنے لگا۔ ایک زمانے میں عربوں کے پاس ایک ہزار سے زیادہ گنتی کے لیے لفظ نہیں تھا اس لیے ہزار یا ہزار سے زیادہ "بے شمار" کو ظاہر کرتا تھا۔ "سند باد

جہازی " اور علی بابا وغیرہ کہانیوں کا عربی نام "الف لیلہ ولیلہ" یعنی THOUSAND AND ONE NIGHTSصرف بے شمار کہانیوں کا مفہوم ظاہر کرتا ہے۔ حالانکہ ان کہانیوں کے بعض مرتبین نے باقاعدہ ایک ہزار راتوں میں بیان کی جانے کے لیے کہانیوں کو تقسیم کیا ہے اور اس کے نتیجے میں بعض راتوں کے حصے میں محض چند سطریں آئی ہیں۔ زمانۂ قدیم میں بعض تہذیبوں میں بڑی زبردست تعداد کا تصور ملتا ہے، جیسے قدیم مصر کے تصویری رسم الخط میں کندہ اطلاعات میں ہزار، دس ہزار، لاکھ اور دس لاکھ تک کے لیے علامات ملتی ہیں اور ہندستان کے فلسفیوں نے کروڑ، ارب، کھرب، سنکھ اور مہا سنکھ کا تصور پیش کیا ہے، لیکن یہ صرف قیاسی عمل ہے۔ مغرب کی زبانوں میں بلین (BILLION) لفظ کے صحیح معنی میں ابھی بھی اختلاف ہے۔ امریکہ اور فرانس میں ایک بلین، ایک ہزار ملین کے برابر مانا جاتا ہے، جب کہ جرمنی اور برطانیہ میں ایک ملین کے ملین گنا کو بلین کہا جاتا ہے۔

ہماری زبان میں قابلتاً زیادہ کے لیے پورے عدد کے ساتھ کوئی کسر بھی جوڑ کر بولی جاتی ہے جیسے سیر لو سواسیر۔ سو سواسو۔ سواسولہ آنے سچ۔ سال ڈیڑھ سال کی بات، اونے پونے بیچ دینا وغیرہ۔ محاوروں اور کہاوتوں میں تو عددوں کے ساتھ طرح طرح کی کھلواڑ دیکھی جاسکتی ہے، جیسے ایک اور ایک گیارہ ہونا، نو دو گیارہ ہونا، تین میں نہ تیرہ میں وغیرہ۔

اس کے علاوہ عدد کہیں کوڈ بنانے کے کام آتے ہیں تو کہیں معمے اور پہیلیاں تیار کرنے میں، کہیں انھیں دماغی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو کہیں ان سے منطقی مسائل کو سلجھانے میں مدد لی جاتی ہے۔ کاروباری زندگی میں اب شخصیت دھیرے دھیرے ایک عدد بنتی جا رہی ہے۔ اور ایک فرد اس کے بینک کھاتے نمبر، ڈرائیونگ لائسنس نمبر، پکانے کی گیس کے گاہک نمبر، انشورنس پالیسی نمبر اور پتا نہیں کتنے قسم کے نمبروں کے قالب میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ کمپیوٹروں کے اس عہد میں عددوں کا بول بالا ہے اور ہر شعبے میں عددی تکنیک (DIGITAL TECHNIQUE) کو ترجیح مل رہی ہے۔ باریک ترین گنتی کے آلات (PRICISION INSTRUMENTS) کے وسیع عددوں کا پھیلاؤ خلا کے نہایت پیچیدہ رازوں تک رسائی ممکن بنا رہا ہے۔ اس طرح انسانی فکر و عمل کے پوری طرح عددوں کی گرفت میں چلے جانے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

نبی حسین
۲۰ انکور اپارٹمنٹس
ی پڑ گنج۔ دہلی۔ ۹۲

ذکرِ شرِ انجم عثمانی کا

1972ء ختم ہو رہا تھا اور انجم عثمانی میرے لیے شروع ہو رہے تھے۔ میں نیا نیا دہلی
یا تھا اور کمیٹی برائے فروغ اردو میں کام کرتا تھا۔ انجم عثمانی ان دنوں اس وقت کے وزیر
علیم مسٹر نورالحسن کے ذاتی عملے میں تھے اور اس حوالہ سے مسٹر نورالحسن اور کمیٹی برائے
روغ اردو دونوں کو اپنی "ذاتی ملکیت" ہی سمجھتے تھے۔ شاستری بھون میں ان سے اکثر
ا قاتیں ہو جاتی تھیں اور وہ کمیٹی کے دفتر میں ہی زیادہ پائے جاتے تھے۔ کمیٹی میں ایک
یکشن افسر جگن ناتھ ماتھر بھی تھے۔ میں اپنے مزاج اور مزاج دونوں کی وجہ سے ان میں
لچھ زیادہ ہی دلچسپی لیا کرتا تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ایم اے کر رکھا تھا اور
بالغہ دن میں دس بارہ مرتبہ وہ اپنی مذکورہ بالا ڈگریوں کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ آزادی کے
عد اردو کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے اس پر دکھ کا اظہار تو کرتے ہی تھے لیکن اردو کے
ساتھ ہونے والی اس عمومی ناانصافی کے پس منظر میں خود ان کے ساتھ جو خصوصی اور
شخصی ناانصافی ہوئی تھی اس کا ذکر کرتے تو سننے والے کو خون کے آنسو رلا دیتے تھے۔ ان
کے بیان کے مطابق تدریس کے پیشہ سے وابستہ ہونے کی انھوں نے تین مرتبہ مخلصانہ
لوشش بھی کی تھی لیکن دشمنوں نے عین وقت پر بھانجی ماردی تھی۔ ایک بار پروفیسر گوپی
چند نارنگ نے انھیں لکچرر بننے نہیں دیا کیونکہ نارنگ بھی اتفاق سے امیدواروں کی فہرست
میں شامل تھے۔ سلیکشن کمیٹیوں کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہے چنانچہ جگن ناتھ ماتھر کی جگہ
گوپی چند نارنگ کا انتخاب عمل میں آگیا۔ دوسری بار ڈاکٹر قمر رئیس خم ٹھونک کر ان کے
مقابلہ پر آگئے اور جگن ناتھ ماتھر کے ساتھ دوسری ناانصافی کے مرتکب ہوئے۔ حد ہو گئی
کہ تیسری مرتبہ تو ان کا فائنل مقابلہ خود ڈاکٹر خلیق انجم سے بھی ہوا جو ان دنوں اتفاق سے

کمیٹی برائے فروغ اردو کے ڈپٹی ڈائرکٹر تھے کہتے تھے تیسرے اور فائنل راونڈ میں اگر ان کے ساتھ ناانصافی نہ کی گئی ہوتی تو ہو سکتا ہے آج وہ خود کمیٹی برائے فروغ اردو کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہوتے اور خلیق انجم سیکشن آفیسر۔ پھر اپنی کنپٹی پر شہادت کی انگلی کو رکھتے ہوئے کہتے "سب نصیب کا کھیل ہے۔ ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے"۔ میں ان سے اتفاق کرتا تو فوراً چائے اور سموسوں سے میری خاطر تواضع کرتے۔ کمیٹی کی ملازمت کے دوران میں بلاشبہ میں نے اس معاملہ میں سینکڑوں دفعہ ان سے اتفاق کیا اور ان سے اتنے ہی سموسے کھائے۔ اور بات ہے کہ جب بھی علی جواد زیدی (جو کمیٹی کے سکریٹری تھے) جگن ناتھ ماتھر سے کسی مراسلہ کا مسودہ اردو میں روانہ کرنے کو کہتے تو وہ عموماً انجم عثمانی اور حامد ربانی کے ساتھ کینٹین میں دکھائی دیتے تھے جہاں کاغذات اور مسودوں کا تبادلہ یوں عمل میں آتا جیسے ڈیفنس کے بعض خفیہ راز منتقل کیے جا رہے ہوں۔ ایک دن انجم عثمانی اور حامد ربانی دونوں چھٹی پر تھے کہ جگن ناتھ ماتھر کسی اردو لفظ کے املا پوچھتے ہوئے میرے پاس آئے' میں نے دست بستہ عرض کی" ماتھر صاحب! اصل میں آج انجم عثمانی چھٹی پر ہیں۔ اگر وہ ہوتے تو ان سے پوچھ کر آپ کو ضرور بتاتا۔ میں خود صبح سے ایک لفظ کے املا کے بارے میں پریشان ہوں" حیرت سے بولے "تو کیا آپ بھی اپنی اردو انجم عثمانی سے ٹھیک کرواتے ہیں؟ "میں نے کہا" ماتھر صاحب! اصل میں انجم عثمانی نے دیوبند کے مدرسہ میں چٹائی پر بیٹھ کر اردو سیکھی ہے۔ انسان کو اچھی اردو اس وقت آتی ہے جب وہ چٹائی پر بیٹھ کر اسے سیکھتا ہے اور اگر خدانخواستہ چٹائی میسر نہ ہو تو کم از کم استاد ایسا میسر آجائے جو اردو سکھانے کے دوران میں بار بار اپنے شاگرد کی پٹائی کرے۔ چٹائی اور پٹائی کے بغیر صحیح اردو کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا"۔ میری بات کو سن کر رازدارانہ انداز میں پوچھا "اچھا یہ بتایئے' یہ خلیق انجم کی اردو چٹائی والی ہے یا بنا چٹائی والی"۔ میں نے کہا "ماتھر صاحب! آپ بھی کس کا ذکر لے بیٹھے۔ خلیق انجم کا اردو سے کیا تعلق مجھے تو خود ان کی اردو بنی پٹائی لگتی ہے"۔ یہ سنتے ہی فوراً چائے اور سموسے کا گھسا پٹا آرڈر دیتے ہوئے بولے "مجتبیٰ صاحب! کئی معاملوں میں آپ میرے ہم خیال لگتے ہیں اور یہی آپ کی بڑائی ہے" اور میں ان کی ذرہ نوازی کا شکریہ ادا کر کے خاموش ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد آنکھ کا جو پانی مر گیا تو جگن ناتھ ماتھر علی الاعلان' کھلم کھلا سب کے سامنے انجم عثمانی سے بعض اردو لفظوں کے املا اور معنی پوچھنے لگے اور میں بھی ماتھر صاحب پر اپنی جہالت کا بھرم قائم رکھنے کے لیے موقعہ بے موقعہ بعض لفظوں کے املا اور معنی انجم عثمانی سے پوچھنے لگا۔ غرض یہ ماحول تھا جس میں انجم عثمانی

سے میری ابتدائی ملاقاتیں ہوئی تھیں ان ملاقاتوں میں پتہ چلا کہ وہ اپنے آپ کو میرا پرانا مداح اور عقید تمند سمجھتے ہیں۔ معلوم نہیں دیوبند کے بند ماحول سے وہ دہلی کب آئے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ دہلی کی روشن خیالی اور خیالی روشنی دونوں سے متاثر نظر آنے لگے تھے۔ کافی ہاؤس میں سگریٹوں کے دھوئیں کی دھند میں بھی وہ واضح طور پر دکھائی دینے لگے۔ ایسی جگہوں پر بھی نظر آنے لگے جہاں دیوبند والے عموماً نہیں جاتے اسی زمانہ میں رسالہ "سیکولر ڈیموکریسی" میں ان کے دو تین مضامین "فارغین دیوبند کے مسائل" کے بارے میں شائع ہوئے تھے۔ اس طرح انجم عثمانی نے ان مضامین کے ذریعہ جانے یا انجانے طور پر "علم بغاوت" بلند کرنے کی کوشش کی تھی۔ یوں بھی ہمارے ہاں علم بغاوت بلند کرنے کا ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ بالآخر علم بغاوت بلند کرنے والا خود اپنے "علم" سے زیادہ بلند ہو جائے۔ چنانچہ انجم عثمانی جب خود اپنے علم بغاوت سے بھی کچھ زیادہ بلند ہو گئے تو مضامین کے اس سلسلہ کو روک دیا۔

پھر 1947ء میں جب میں نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں اردو شعبہ کا سربراہ بن کر چلا گیا تو کچھ عرصہ بعد انجم عثمانی بھی میرے شعبہ میں آگئے۔ انجم عثمانی شروع ہی سے مجھے "سر" کہہ کر مخاطب کرتے رہے ہیں۔ ٹھیک سے کہہ نہیں سکتا کہ ان کے اس طرز تخاطب کے پیچھے ان کے جذبہ کی حرارت پوشیدہ ہے یا شرارت، تاہم میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جب جب میں دانستہ یا نادانستہ طور پر کوئی غلط بات کہتا ہوں تو ان کے "سروں" کی تعداد اور تکرار میں اتنا اضافہ ہو جاتا ہے کہ ان کی بات کا کوئی مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسے موقعوں پر وہ سراسر "سر" بن جاتے ہیں۔ این سی ای آر ٹی میں آنے تک انجم عثمانی دہلی کی روشن خیالی میں بہت دور تک چلے گئے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے ان کے ہاں آنے والوں اور خاص طور پر آنے والیوں سے کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ ایک شام میں کرشی بھون کے بس اسٹاپ پر اترا تو دیکھا کہ بوٹ کلب کے لان میں ایک صاحب انجم عثمانی کو پیٹ رہے ہیں اور انجم عثمانی چپ چاپ پٹتے چلے جا رہے ہیں اور لوگ ہیں کہ کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے زندگی بھر مظلوم کا ساتھ دیا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میرے دفتر کا ساتھی پٹتا رہے اور میں اوروں کی طرح خاموش تماشائی بنا رہوں۔ چنانچہ لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا میں تیر کی طرح اس شخص کے پاس پہنچا جو انجم عثمانی کو پیٹ رہا تھا میں نے آو دیکھا نہ تاو اس شخص کا گریبان پکڑ لیا اور اُسے جھنجھوڑنے لگا۔ اس پر انجم عثمانی نے گڑگڑا کر مجھ سے کہا "سر! مجھے پٹنے دیجیے سر! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے سر!"

اب جو مجھے انجم عثمانی کے گاندھیائی اخلاق کا اندازہ ہو گیا تو میں اور بھی شیر ہو گیا۔ میں اس شخص کے ایک زوردار گھونسہ رسید کرنا ہی چاہتا تھا کہ ایک لڑکی مجھے پکڑ کر برابر میں لے گئی اور بولی "حضور! یہ ہمارا نکڑ ناٹک Street Play ہو رہا ہے۔ اس میں آپ کے دوست کا رول پٹنے والے کا ہے۔ ہم ہر روز اسے کھیلتے رہتے ہیں اور آج آپ ہمارے کھیل میں بلاوجہ بادھا ڈال رہے ہیں" اس لڑکی کے سمجھانے کے دو چار دن بعد میں بس میں جا رہا تھا کہ ایک خاتون نے مسکراتے ہوئے میری طرف اشارہ کر کے اپنے شوہر سے کہا "دیکھئے یہی وہ شخص ہے جو پرسوں نکڑ ناٹک میں بلاوجہ کود پڑا تھا"۔ میں اور بھی شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ پھر بھی نہ تو میں نے انجم عثمانی سے اس نکڑ ناٹک کے بارے میں کچھ پوچھا اور نہ ہی انجم عثمانی نے اس بارے میں مجھے کچھ بتانا ضروری سمجھا۔ تاہم اب جو میں انجم عثمانی کی کہانیاں پڑھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ان کی کہانیوں کے بیشتر کردار بھی خود انجم عثمانی یا سماج کے ہاتھوں چپ چاپ پٹتے ہی رہتے ہیں اور پٹنے کو ہی زندگی کا واحد نصب العین سمجھتے ہیں۔ انجم عثمانی کی افسانہ نگاری کے عروج کا زمانہ بھی وہی تھا جب وہ این سی ای آر ٹی میں ملازم تھے۔ میں یہ بات بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انجم عثمانی کی بیشتر ابتدائی کہانیاں این سی ای آر ٹی کی اسٹیشنری کی مدد سے ہی لکھی گئیں۔ میں نے ابتدا میں انجم عثمانی کو بھی مزاح نگار بنانے کی حتی المقدور کوشش کی تاکہ ادب میں میرے علاوہ ایک اور بیوقوف کا اضافہ ہو سکے۔ لیکن وہ حسب معمول "سروں" کی تکرار کے ساتھ میری بات کو ٹال گئے۔ کچھ برس بعد وہ آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام ایکزیکیٹو بن گئے اور پھر دوردرشن سے وابستہ ہو گئے۔ ان اداروں میں جانے کے بعد سے میں نے دانستہ طور پر انجم عثمانی سے ایک خوشگوار دوری اختیار کر لی کیونکہ میں کسی بھی ریڈیو اسٹیشن یا ٹی وی سنٹر پر کنٹراکٹ کے بغیر جانے کا عادی نہیں ہوں اور پروگرام ایکزیکیٹوز قسم کی مخلوق سے ملنے سے کتراتا ہوں۔ عمیق حنفی مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود میں کبھی ان سے یونہی ملنے کے لیے ریڈیو اسٹیشن نہیں گیا۔ البتہ شردت میرا اکلوتا ایسا بے تکلف دوست ہے جو ہے تو دوردرشن کا عہدیدار مگر جس سے میرے برسوں کے "برائے دوردرشن" مراسم ہیں اور میں بلا تکلف اس کے ہاں چلا جاتا ہوں۔ دوردرشن سے وابستہ ہونے کے بعد اچانک انجم عثمانی کی پرسنالٹی بھی نکل آئی۔ وہ چشمہ جسے اصولاً آنکھوں پر ہونا چاہیے وہ اب ان کی پیشانی کے اوپر اور دماغ سے قریب ٹکا ہوا رہتا ہے تاکہ دماغ کی مدد سے چیزوں کو دیکھنے میں آسانی پیدا ہو سکے۔ ایک زمانہ میں شردت کے کمرہ تک جانے کے لیے پہلے مجھے انجم عثمانی کی میز کے

سامنے سے گزرنا پڑتا تھا۔ انجم عثمانی موجود ہوتے تو میں علیک سلیک کے بعد آگے کو نکل جاتا تھا۔ البتہ جب وہ نہیں ہوتے تھے تو ان کی میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر کچھ دیر کے لیے ضرور بیٹھ جاتا تھا۔ ایک بار بیٹھا تو دیکھا کہ میز پر رکھے ہوئے شیشہ کے نیچے اردو کے بعض نامی گرامی شاعروں، ناقدوں اور پروفیسروں کے لکھے ہوئے پرزے رکھے ہوئے تھے۔ یہ بے چارے آفت کے مارے کسی زمانے میں انجم عثمانی سے ملنے کے لیے آئے تھے اور شومئی قسمت سے ان کی ملاقات انجم عثمانی سے نہ ہو سکی تھی۔ نتیجہ میں اپنی حاضری ڈلوانے کی خاطر وہ ان پرزوں کو اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آوے۔ ان میں سے بیشتر پرزوں میں انجم عثمانی کے لیے ایسے القاب و آداب استعمال کیے گئے تھے جو ہم اپنے ادب میں ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد اور سر سید احمد خاں وغیرہ کے لیے روا رکھتے ہیں۔ انجم عثمانی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ شیشے کے نیچے ان یادگار پرزوں کی نمایش لگا رکھی تھی۔ ان پرزوں کو دیکھ کر میرا جی للچایا تو میں نے بھی ایک قلم توڑ پرزہ انجم عثمانی کے نام لکھا اور شیشہ کے نیچے رکھ دیا۔ دو تین دن بعد میں پھر شردت کے ہاں گیا تو انجم عثمانی کی میز پر رکھے ہوئے شیشہ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ میرا پرزہ غائب تھا۔ میں شرد کے کمرہ میں بیٹھا ہی تھا کہ انجم عثمانی آگئے۔ کچھ جھنجھلائے ہوئے سے تھے، پھر حسب معمول "سروں" کی تکرار کے ساتھ بولے "سر! پرسوں آپ ایک پرزہ چھوڑ گئے تھے مجھے اچھا نہیں لگا سر! ایمان سے۔ میں آپ کو ان شاعروں، ادیبوں اور پروفیسروں کی صف میں شامل نہیں رکھتا سر جن کے پرزوں کے ساتھ آپ اپنا پرزہ بھی چھوڑ گئے تھے۔ آپ کی جگہ میز پر رکھے ہوئے شیشے کے نیچے نہیں ہے سر۔ میرے دل میں ہے۔ برسوں پہلے نکڑ ناٹک میں مجھے پٹتے ہوئے دیکھ کر جس طرح آپ بے خطر آتش نمرود میں کود پڑے تھے وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں سچے دل سے آپ کی عزت کرتا ہوں سر! میں نے یہ پرزہ وہاں سے ہٹا دیا ہے"۔ مجھے پتہ نہیں انجم عثمانی کے ان جملوں میں ان کے جذبہ کی حرارت پوشیدہ تھی یا شرارت۔ تاہم میں نے جب انجم سے اس پرزے کی واپسی کا مطالبہ کیا تو انھوں نے اسے واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ کم از کم اس خاکہ کے بعد وہ اس پرزے کو واپس کر دیں گے تاکہ سند رہے اور وقت نہ آنے پر کام آوے۔

میں انجم عثمانی کو بے حد عزیز رکھتا ہوں اور مجھے ان کی کہانیاں بھی بے حد پسند ہیں۔ کیونکہ ان کی کہانیوں کے کردار اب بھی چپ چاپ پٹنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہ بے حد مختصر ہوتی ہیں، ان کی بڑی سے بڑی کہانی بھی

پانچ صفحات سے آگے نہیں جاتی۔ اس سے لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کے وقت کا زیاں نہیں ہوتا۔ پھر کاغذ اور اسٹیشنری کی بچت بھی الگ ہوتی ہے۔ انجم عثمانی کو میں سراسر دہلی والا سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی کہانیوں میں ہمیشہ اپنے آبائی قصبہ دیو بند کو بھی ساتھ لے کر آتے ہیں۔ ایک شاعر صہبا چھریٹوی کے بارے میں سنا تھا کہ ایک محفل میں کسی نے ان سے شکایت کی کہ "قبلہ! پہلے تو آپ ہی کا ادب میں آنا مشکل ہے۔ اوپر سے آپ اپنے "چھریٹے" کو بھی ساتھ لے کر آنا چاہتے ہیں"۔ انجم عثمانی نے شہر اور قصبوں کے بیچ بڑھتے ہوئے جذباتی فاصلوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں جابجا دیو بند کی چھوٹی انیٹ والے بڑے مکانوں کا ذکر ملتا ہے لیکن میں خود انجم عثمانی کو "چھوٹے اسکرین کا بڑا آدمی" بنتے ہوے دیکھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے ٹیلی ویژن نشریات پر بھی ایک مبسوط کتاب لکھی ہے جو اس موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے۔ سنا ہے کہ دوردرشن کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے ان کی کتاب کی روشنی میں ٹیلی ویژن نشریات کو بہتر بنانے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ میں انھیں دوردرشن کی خدمات سے ہٹانے کی خبریں ان دنوں خاصی گرم ہیں۔

میں انجم عثمانی کو ان کی کتاب "ٹھہرے ہوئے لوگ" کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں۔

نصرت ظہیر
۱۵/۴۔ بھجن پورہ
دہلی ۹۱

اُف، یہ دردِ ملّت کا!

(زیر نظر مضمون میں شامل کردار، واقعات، مقامات اور تنظیموں کے نام فرضی ہرگز نہیں ہیں لہٰذا، اصل کردار، واقعات، مقامات اور تنظیموں سے ان کی مطابقت کو اتفاقیہ بالکل نہ سمجھا جائے۔ البتہ غیر مطابقت کو محض ایک اتفاق سمجھیں اور مصنف کو معاف فرمائیں کہ اس غیر مطابقت کے لیے کلّی طور پر وہی ذمہ دار ہوگا!

فقط مصنف!)

قارئین کرام! بندہ آج کل سخت پریشانی میں ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہاہے کہ کیا کرے۔ چند روز پہلے اچانک سینے میں بڑے زور سے ملت کا درد اٹھا، تب سے نہ دن کو سو سکتا ہوں، نہ راتوں کو جاگ سکتا ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے، لیٹتے، ہر وقت بس یہی خیال ستاتا رہتا ہے کہ ہائے ملت کا کیا ہوگا۔

درد تو یہ پہلے بھی اٹھتا تھا۔ خاص طور سے اس وقت جب پان میں قوام کھایا ہو، یا ناشتے میں سامنے ابلے ہوئے انڈے رکھے ہوں۔ قوام کی وجہ سے قوم کا اور انڈے دیکھ کر ملت بیضا کا خیال آجانا ویسے بھی ایک فطری سی بات ہے۔

ملت بیضا پر یاد آیا، چند ماہ پہلے، اکبر الہ آبادی کے بعد اردو کے اب تک کے سب سے بڑے مزاحیہ شاعر جناب دلاور فگار کا انتقال ہوگیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) ہندستان میں اپنے مزاح کے جھنڈے گاڑ کر وہ پاکستان فتح کرنے چلے گئے تھے، اور اس میں کسی قدر کامیاب بھی ہوگئے تھے۔ میرے ایک دوست کئی بار بھول سے انھیں دلاور فگار کی بجائے فلاور دگار کہہ جاتے تھے، اور میں سوچتا رہ جاتا تھا کہ کامیاب مزاح شاید وہی ہے جسے الٹ پلٹ بھی دو تو بے معنی نہ ہو۔ چنانچہ دلاور فگار کا نام بھی ایسا تھا کہ اسے بگاڑ کر فلاور دگار کردو، تب بھی خوشبو دیتا تھا۔ یہ مصرع ان کی ایک نظم میں تھا کہ ع

ملت بیضا کے معنی لکھ دیے انڈے کی قوم!

لیکن اس مرتبہ جو ملت بیضا کر درد اٹھا ہے تو نہ سامنے انڈے تھے نہ منہ میں قوام کا پانی۔ بلکہ اقوام متحدہ کی جانب بھی دھیان نہیں گیا تھا، جس کا ون پوائنٹ پروگرام آج کل صرف یہ سوچنا رہ گیا ہے کہ امریکہ کو خوش رکھنے کے لیے صدام حسین کو ٹھکانے لگانے کی نئی ترکیب کیا ہونی چاہیے!

اور درد بھی جناب ایسا اٹھا ہے کہ سوچتا ہوں، ملت کے لیے کچھ کر ہی ڈالوں۔ چنانچہ ایک دن پیٹ بھر نہاری، قورمہ اور بریانی کھا کر معدے اور دماغ پر زور ڈالا تو خیال آیا کیوں نہ ڈاکٹر خلیل اللہ سے مل کر ای سی جی کرالی جائے۔ مگر پھر یاد آیا کہ وہ بے چارے تو خود آج کل ملت کے درد میں مبتلا ہیں، اور قوم کو دن رات گوشت اور مرغن غذائیں نہ کھانے کی تلقین کرتے پھر رہے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کے مانے ہوئے ہارٹ سرجن ہیں۔ کہیں میرے دل کی چیر پھاڑ کر کے اس میں سے لذت کام و دہن کے غدود نہ باہر نکال دیں، اور یہ حقیر فقیر مومن مسلمان، ساگ سبزی کے پھیر میں نہ پڑ جائے۔

لہٰذا ڈاکٹر خلیل اللہ کا خیال دل سے نکال کر میں نے سوچا، کیوں نہ اس درد کا علاج ایلوپیتھی کی بجائے طب یونانی میں ڈھونڈا جائے، جس میں خمیروں، معجونوں اور مربّوں کی ایک لذیذ اور ہر دلعزیز دنیا مہکتی رہتی ہے لیکن فوراً ہی یاد آ گیا کہ اس گلشن پُر بہار میں کہیں کہیں کانٹے بھی ہیں۔ چنانچہ منقیٰ کی بجائے املتاس کے بیج عرق منڈی بوٹی جگہ تر پھلا اور خمیرۂ گاؤزباں کے بدلے میں ایلوا نہ پلّے پڑ جائے یا پھر شربت روح افزا کی بجائے صافی نہ پینی پڑے!

مجھے یاد ہے بچپن میں ایک مرتبہ فساد خون کی وجہ سے، جو اس وقت کے جن سنگھیوں، بلکہ ہم بچوں نے املی اور کٹارے کھا کھا کر خود اپنے اندر پھیلایا تھا، ہمیں ہمدرد کی صافی پینی پڑی تھی، جو اس قدر کڑوی تھی کہ میں پیالہ بھر چینی سامنے رکھ کر بس ایک گھونٹ پیا کرتا تھا، اور چینی بھرے پیالے کو اس قدر قریب رکھتا تھا کہ گھونٹ بھرتے ہی جھٹ چینی کی پھنکی مار سکوں۔ سنا ہے اب یہ مشہور دوا اور بھی بہتر بننے لگی ہے۔ اس کی تصدیق کے لیے میں نے ایک دن صافی کا آدھا قطرہ انگلی کی نوک پر رکھ کر نوک زبان سے مس کیا اور جھٹ دو چمچ چینی منہ میں بھر لی، پتہ چلا لوگ واقعی ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ پہلے سے زیادہ کڑوی تھی! بلکہ سنا ہے ایک یونانی طبی کارخانے نے تو اس سے بھی خوفناک "صافی" تیار کرلی ہے جس کا نام "خون صفا" ہے اور اس کے مقابلے میں "صافی" والے اپنی دوا کو اور کڑوی بنانے پر غور کررہے ہیں چنانچہ یوں دونوں کارخانوں میں کڑوے پن کا مقابلہ چل رہا ہے۔ دیکھنا ہے کہ ملت کے خون پر اس تلخ مقابلہ کا کیا اثر پڑتا ہے!

بہر حال، ایک دن کچھ ڈھنگ کا خیال آہی گیا۔ کیوں نہ ملت کے درد کا علاج کرنے کے لیے ایک اخبار جاری کر دیا جائے، جس میں سب سے نمایاں طور پر مسلمانوں کے ماضی کی روح پرور داستانیں چھاپی جائیں۔

ماضی کی اس لیے کہ مسلمان دنیا کی غالباً واحد قوم ہے جس کے پاس سوائے ماضی کے کچھ نہیں ہے۔ اور امریکن دنیا کی دوسری واحد قوم ہیں جن کے پاس ماضی کے سوا سب کچھ ہے۔ تاریخ کا یہ عجب مذاق ہے، جن قوموں کا ماضی شاندار ہو ان کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ اور جن کا ماضی داغدار ہو ان کا مستقبل تو کیا حال بھی شاندار بن جاتا ہے۔

بہر کیف میں نے سوچا، پہلے تو اخبار میں مسلمانوں کے ماضیوں اور غازیوں کے قصے چھاپ کر ان کی غیرت وحمیت کو جگایا جائے، پھر انھیں احساس دلایا جائے کہ اس ملک میں ان کے ساتھ قدم قدم پر کیسی ناانصافیاں ہو رہی ہیں۔ اس کے بعد جھگڑا فساد کرانے والی خبریں چھاپ کر نام پیدا کروں اور آخر میں کسی پارٹی سے ملت کا مول تول کر کے لوک سبھا یا راجیہ سبھا میں پہنچ جاؤں۔ بس پھر نہ آئے گا قوم کا خیال نہ اٹھے گا ملت کا درد!

مگر پھر اس طرح کی صحافت کرنے والے کچھ ایڈیٹروں کے عبرتناک انجام کا خیال آگیا، جن میں سے ایک ناجائز اسلحے کے مقدمے میں جیل کی ہوا کھا رہا ہے، دوسرا کسی ایسی پارٹی کے چکّر میں دردر کی خاک چھان رہا ہے جو اس کے لیے پھر سے دال روٹی کا انتظام کر دے، اور تیسرے نے سیاست اور صحافت دونوں کشتیوں میں پانوں رکھنے کی کوشش میں دونوں ٹانگیں گنوا دی ہیں۔۔۔ میں نے ڈر کے مارے اخبار کا خیال دل سے نکال دیا۔

لیکن ملت کا درد بدستور باقی تھا۔

آخر ایک بزرگ نورانی صورت ملے۔ انھوں نے بڑے پتے کی بات بتائی۔ کہنے لگے، اردو کا اخبار نکالو گے تو گھر کے برتن بھانڈے سب بک جائیں گے۔ اس کے برعکس ملت کے درد کے علاج کی جو ترکیب میں بتا رہا ہوں اس میں ہینگ لگے گی نہ پھٹکری اور مزا وہ آئے گا جو، نہ ماش کی دال میں پاؤ گے نہ نائی سے شیو بنوانے میں جو علی الترتیب ہینگ اور پھٹکری کے ساتھ ہی لطف دیتی ہیں۔

اس کے بعد وہ میرے کان میں کچھ دیر تک کھس پھس کرتے رہے جس کے ختم ہوتے ہی میں جوش اور خوشی کے مارے بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔

بزرگ موصوف نے فرمایا کہ سب سے پہلے ملت کے نام پر ایک تنظیم کا نام سوچو۔ پھر اس کے صدر بن جاؤ اور تنظیم کے لیٹر پیڈ چھپوالو۔ اس کے بعد روزانہ صبح کے

اخبار صرف اور صرف ملت کی عینک اور ملت کے زاویے سے پڑھو اور جس خبر میں بھی ملت کے لیے کچھ علت پاؤ اس کے بارے میں اپنا بیان لیٹر پیڈ پر لکھ کر اخباروں کے پاس بھیجتے رہو۔ دو چار بیان چھپتے ہی تم لیڈر بن جاؤ گے اور تمھیں محسوس ہوگا کہ ملت کا درد کچھ کم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد جیسے جیسے تم بڑے لیڈر بنتے جاؤ گے ملت کا درد کم ہوتا جائے گا اور بالآخر بالکل مفقود ہو جائے گا جس کے بعد تمھیں اپنے سینے سے ملت کے درد کی "دھوں دھوں" اور "ہوں ہوں" کی بجائے فلمی گیتوں کے پروگرام سنائی دینے لگیں گے۔

مثلاً ؎

سن بیری بلم کچھ بول رے اب کیا ہوگا

یا پھر ؎

بڑے ارمانوں سے رکھا ہے بلم تیری قسم

پیار کی دنیا میں یہ پہلا قدم

اور اگر تمھیں نئے گیت زیادہ پسند ہیں تو ہو سکتا ہے اس قسم کے گانے سنائی دینے لگیں۔ ؎

ایک دو تین چار پانچ چھ، سات آٹھ نو دس گیارہ . .

اور ؎

دھک دھک کرنے لگا......

یا ؎

کہتے ہیں مجھ کو ہوا ہوائی . . .

لیکن موخرالذکر صورت میں خطرہ یہ ہے کہ کچھ ایسے بھی گیت سنائی دے سکتے ہیں جیسے ؎

ایکسیڈنٹ ہو گیا ربا ربا

اور ؎

کھمبے جیسی کھڑی ہے

یا ؎

جب بھی کوئی لڑکی دیکھوں

میرا دل دیوانہ بولے، اولے اولے اولے۔

اور تم سوچنے لگو کہ ایسے گانوں سے اچھا تو ملت کا درد ہی تھا۔ کم سے کم اس کی کوئی کل سمجھ میں تو آتی تھی۔

خیر فدوی چونکہ نئے گیتوں سے پہلے ہی بے زار ہے اس لیے موخرالذکر خطرے کا تو

کوئی خطرہ نہ تھا، لیکن سوال یہ تھا کہ تنظیم کا نام کیا رکھا جائے؟
اس سلسلے میں بزرگ سے جو دراصل گرگ باراں دیدہ سے کم نہ تھے، صلاح لی تو ایک ہاتھ لمبی سفید داڑھی کو دونوں ہاتھوں سے اوپر سے نیچے تک سہلاتے ہوئے بولے۔
نام چاہے جو بھی رکھنا، اور تنظیم کا دفتر چاہے کھجڑی پور میں ہی بنانا مگر نام سے پہلے، آل انڈیا۔ یا کل ہند ضرور لگانا۔ بلکہ عالمی یا انٹرنیشنل لگا سکو تو اور بھی اچھا ہے۔ مثلاً آل انڈیا مسلم مورچہ، کل ہند مسلم محاذ، انٹرنیشنل مسلم لیگ، عالمی اسلامی رابطہ وغیرہ۔
مگر مشکل یہ تھی کہ ان ناموں سے کئی تنظیمیں پہلے سے موجود ہیں چنانچہ کچھ اور نام سوچے گئے۔ مثال کے طور پر۔
مسلم یوتھ فرنٹ، مسلم متحدہ محاذ، فدائیان مسلم فیڈریشن، اسلامی رابطہ کنفیڈریشن۔
لیکن بزرگ بارہ دیدہ، بلکہ تیرہ دیدہ نے شک ظاہر کیا کہ یہ نام بھی کچھ سنے ہوئے سے لگتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم جس نام سے تنظیم بناؤ اس کا کوئی بانی، سرپرست یا صدر پہلے سے ہی جعفر اباد، گھونڈہ چوک یا چتلی قبر میں چھپا بیٹھا ہو، اور تمہارا اعلان چھپتے ہی وہ تم پر دھوکا دہی یا ہرجانہ دینے کا دعوٰا دال دے یا تمہیں چھ سال کے لیے پارٹی سے باہر نکال دے!
اتفاق سے اس وقت سامنے سے حلیم والے کی ریڑھی گزر رہی تھی چنانچہ ہم دونوں نے خوب سیر ہو کر سوا سیر حلیم کھایا اور حلیم کھا کر پھر نام سوچنے بیٹھ گئے۔ کئی نام ذہن میں آئے۔ جیسے۔
ملی کونسل، ملی مشاورت، ملی پارلیمنٹ، ملی اسمبلی، ملی کارپوریشن، کاروان ملت، ترجمان ملت، حامیان ملت درمیان ملت وغیرہ وغیرہ۔
مگر بزرگ نورانی نے ہر نام پر نفی میں سر ہلا دیا۔ کہنے لگے، ان میں سے کوئی بھی نام نیا نہیں ہے۔ کوئی نیا نام سوچو۔
تبھی، اچانک، ایک خیال بجلی کی طرح دماغ میں کوند گیا۔ میں نے موصوف سے کہا۔ جناب من، اگر ان تمام ناموں سے ملت کی تنظیمیں پہلے سے موجود ہیں اور اب ملت کی تنظیم کے لیے کوئی نیا نام باقی نہیں رہ گیا ہے تو مجھے ملت کی علت میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟
کہنے لگے۔ بالکل صحیح سوچا آپ نے۔ چلیے اسی بات پر حلیم کی ایک پلیٹ اور ہو جائے!
لیکن ایک سوال اب بھی موجود تھا!
ملت کی خدمت کے لیے جب اتنی ساری تنظیمیں پہلے سے موجود ہیں تو مجھے ملت کا درد اٹھتا ہی کیوں ہے؟
میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ کیا آپ کے پاس ہے؟ کیا آپ کو کبھی ملت کا درد اٹھتا ہے؟

پروفیسر شکیل اختر فاروقی
فیکلٹی تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ

خبر لیجیے دہن بگڑا

تلفظ کی فکر نہ کی جائے تو زبان رفتہ رفتہ اپنی خوبصورتی اور حسن سے محروم ہوتی جاتی ہے، زبان کی باریکیوں کو سمجھ کر صحت الفاظ کے ساتھ بولنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں لیکن پڑھنے پڑھانے کا کام کرنے والوں کو صحیح تلفظ اور صحت الفاظ کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ اردو میں شین، قاف، کا درست ہونا صحیح تلفظ کی معراج ہے۔ اس کے باوجود تلفظ کی غلطیاں عام ہیں؟ پتا چلا کہ اصل میں ہندی والے اس فکر سے بالکل آزاد ہیں۔ وہاں ایک ہی لفظ کے کئی کئی تلفظ رائج ہیں اور سب قابل قبول ہیں۔ اس کے بھی کئی اسباب نظر آئے۔ ایک تو یہ کہ ہندی میں بیشتر آوازیں سرے سے مفقود ہیں۔ ان آوازوں کی بالجبر کوشش ہو بھی تو زیادہ سے زیادہ حرف کے نیچے ایک 'بندی' کا اضافہ دیجیے۔ لیکن "ہندی میں بندی کیوں" کی تحریک نے ان تمام لوگوں کا تلفظ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ جو بذریعہ ہندی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان دنوں تو بہت سی مخصوص ہندی آوازوں کا فرق بھی مٹتا جا رہا ہے۔ 'ع' اور 'ئے' کی آوازیں سننے میں ایک سی محسوس ہوتی ہیں۔ '[illegible]' کو 'راون' '[illegible]' کو 'پران' [illegible] کو 'بھمن' کہنا تلفظ کے سدھار کی صورت ہے یا بگاڑ کی؟ بولتے وقت اچھے خاصے لوگوں کا [illegible] کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ اب تو [illegible] کہنے والے بھی بکثرت پائے جاتے ہیں اور ستم ظریفی یہ کہ کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ یہ تو تھا ان الفاظ اور آوازوں کا معاملہ جن پر ہندی کا اپنا اجارہ ہے لیکن ہندی میں اردو آوازوں کی طرف بھی ایسی غفلت برتی گئی کہ مختلف الفاظ کا نہ صرف تلفظ بدل گیا ہے بلکہ ان کے معنی بھی بدل چکے ہیں۔ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا جب خ، غ اور ق کی آوازیں سننے کے لیے سرحد پار جانا پڑے گا۔ اگرچہ سنا ہے کہ سرحد کے اُس پار والے ان آوازوں کو سننے جلد ہی سرحد کے اِس پار آیا کریں گے۔

اردو میں لفظ 'خلاصہ' اختصار کے معنی میں مستعمل ہے اور مفرد لفظ سمجھا جاتا ہے۔ ہندی والوں نے اسے 'کھلا سا'، سمجھا اور تفصیل کے معنوں میں دھڑ ادھڑ استعمال کرنے لگے۔ اسی طرح 'خانہ' اب 'کھانا' بن کر پک رہا ہے 'غم' چپک کر 'گم' ہو گیا۔ 'قلم' کو ہندی میں باقاعدہ 'ڈھنگ' (بندی) کے بغیر سے لکھا جانے لگا ہے۔ 'مدعا' 'مدّا' بن کر غلط استعمال ہو رہا ہے۔ اچھے خاصے 'خان' اب 'کھان' بن کر اترا رہے ہیں۔ سب سے زیادہ 'قدوائیوں' نے اثر قبول کیا۔ وہ اپنے آپ کو 'کدوائی' کہلا رہے ہیں اور غیر تو غیر خود بھی 'KIDWAI لکھ رہے ہیں۔ 'مزاج' کو اکثر 'مجاج' کہا جاتا ہے، بہت سنبھلے تو 'مجاز' بولنے لگے۔ ان آوازوں کے غائب ہونے کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ہندی سے 'بندی' کا چلن تقریباً ترک ہو چکا ہے مگر یہ کام صرف تحریر میں ہوا ہے بول چال میں یہ 'بندی' اکثر ایسی جگہوں پر لگا دی جاتی ہے کہ ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ 'پھل' کو 'سفل' کرنا یا پھل کو 'فل' بنا دینا قابل برداشت ہے۔ لیکن 'پھول' جیسی چیز کو 'فول' کہنے والے مانو اپنا نام بتا رہے ہیں۔ سبزی' ہندی میں جاکر 'سبجی' کہلائی۔ 'ذلیل' کی قسمت جاگی اور وہ 'جلیل' ہو گئے۔ 'غزل' کی جگہ 'گجل' گائی جانے لگی۔ 'بزاز' اپنا پیشہ چھوڑ کر 'بجاج' بنے اور ملک کے چند اہم صنعت کاروں میں گنے جاتے ہیں۔

اردو الفاظ کے تلفظ پر ہندی اور پنجابی لب و لہجے کے اثرات نئے نہیں ہیں لیکن خدا جانے کیوں اردو والے خود بھی اعراب کا استعمال معیوب سمجھتے ہیں۔ مخارج اور مصادر سے عام لوگوں کی ناواقفیت نے اکثر اردو الفاظ کا تلفظ بدل دیا۔ 'مشعل' کے میم کے نیچے زیر کا استعمال کیا ترک ہوا کہ یہ لفظ پہلے زبر کے ساتھ 'مَشعل' بنا اور اب 'مشال' بن چکا ہے۔ پنجاب میں 'غ' اور 'ق' کی وہ درگت بنی کہ اقبال بھی اپنے آپ کو 'اکبال' کہنے لگے۔ 'غالیچہ' 'گلیچہ' کے نام سے جانا جاتا ہے اور 'باغان' کو 'بگان' کہنے والوں کی بھی کمی نہیں۔

لب و لہجہ درست کرنا تو واقعی ناممکن ہے۔ مقامی اور علاقائی اثرات اتنے گہرے اور شدید ہوتے ہیں کہ ان کا اثر ختم کرنے کے لیے ایک زمانہ چاہیئے۔ بنگال ہو، بہار ہو یا پنجاب اور دکن ہو پہلے ہر جگہ اردو الفاظ کے تلفظ پر زور دیا جاتا تھا۔ ہندی اور اردو میں یہی نمایاں فرق تھا کہ ایک طرف تلفظ سے عدم توجہی اور دوسری طرف تلفظ کے سدھار پر

زور۔ اس کے باوجود اردو میں اکثر غلط تلفظ رواج پاگئے ہیں اور غلطُ العام فصیح کہہ کر ان کا خوب استعمال کیا جارہا ہے۔ دراصل یہ 'غلط العام فصیح' کی بات نہیں بلکہ اردو زبان سے ناواقفیت ہے، اس کو 'چلن' نہیں 'بد چلنی' کہنا چاہیے۔ جہاں "پون کرے شور" کہنے والے کو مجبور کردیا جائے کہ وہ 'پون کرے سور' کہے وہاں تلفظ سدھرے تو کیسے سدھرے۔

سرسید کے مضمون 'بحث و تکرار' میں ایک لفظ 'عنف' استعمال ہوا ہے۔ سرسید کے مضمون سے پہلے یا بعد میں بھی اس لفظ کا استعمال کہیں دیکھا نہ پڑھا۔ لفظ سے ناواقفیت کے سبب بعض جگہ اس کا املا بھی غلط لکھ دیا گیا۔ املا غلط ہوا تو تلفظ پر بھی اثر پڑا۔ بعض کتابوں میں یہ لفظ 'نحیف' لکھا گیا، بعضوں نے اس کا تلفظ۔ 'نحیف' کر دیا۔

عربی کا ایک لفظ 'قمیص' ہے جو اب 'قمیض' بن کر غلطُ العام کی حدود کو چھو رہا ہے۔ 'قلفی' 'قُفلی' کا مُعرّب ہے، جس کے معنی ہیں ڈھکنے دار ڈبیا، اب یہ بازار میں 'قلچھی' کے نام سے فروخت ہو رہی ہے۔ اسی طرح 'سرگئی' جو 'سحر گہی' کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور ہم اسے 'سحری' کے نام سے جانتے ہیں۔ 'مِن و عَن' کا تلفظ بھی بہت سے لوگ 'مَن و عَن' کرتے ہیں۔

ایک مشہور شعر ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

اکثر 'کرّوبیاں' کا 'کرُوبیاں' تلفظ کیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ مرکب لفظ ہے جب کہ یہ لفظ کرّوبی' کی جمع ہے۔

غالب کا یہ شعر بھی خوب گنگنایا جاتا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اس شعر میں 'خواہش' کو 'واؤ' کے ساتھ پڑھنا صحیح نہیں ہے۔ یوں تلفظ کی غلطی بھی ہوتی ہے اور وزن کی بھی، اسی طرح اکثر کہا جاتا ہے:

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا"

یہاں 'خواب' بھی بغیر 'واؤ' کے دیکھیے اور پڑھیے۔

تنخواہ 'خواجہ' 'خوار' 'خواہ مخواہ جیسے الفاظ میں 'واؤ' کی آواز صحیح نہیں ہے۔

'زندہ' سے 'زندگی' 'بندہ' سے 'بندگی' اور 'درندہ سے 'درندگی' بننا تو قواعد کی رو سے درست ہے لیکن 'ناراض' سے 'ناراضگی' بنا کر بولنا کم علمی کی دلالت ہے۔ 'ناراض' سے 'ناراضی' بنے گا۔

محبت اور مسرت کے میم بھی مفتوح ہیں جو عموماً بالضم بولے جاتے ہیں، 'موسم' کے سین کے نیچے اصل میں 'زیر' ہے لیکن اب وہ زمانہ آلگا ہے کہ اسے 'زیر' کے ساتھ بولیں تو چھینکیں آنے لگیں۔

آپ نے ایک مصرع بار بار سنا ہوگا اور استعمال بھی کیا ہوگا:

'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'۔

'مرَض' کو اگر 'مرْض' پڑھا گیا تو مصرع صحیح نہیں پڑھا جا سکتا۔ اسی طرح ورق اور عرق کے 'ر' بھی مفتوح ہیں، 'عطر' اور 'حلق' کا معاملہ بالکل برعکس ہے، ان کے 'ط' اور 'ل' دونوں ساکن ہیں، 'عِطر' اور 'حَلق'۔

یہ ممکن نہیں کہ تلفظ کی بات ہو اور رشید حسن خاں صاحب کا ذکر نہ آئے۔ انھوں نے محض لفظوں کے املا کی طرف ہی توجہ نہیں دلائی ہے بلکہ اکثر الفاظ کا صحیح تلفظ بھی بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'سرِ ورق' کہنا غلط ہے کیوں کہ اس کے معنی ہوں گے، ورق کے اوپر۔ اضافت کے بغیر 'سرورق' کہا جائے تو اس کا مطلب ہوگا، کتاب کا پہلا ورق۔" عموماً 'سرورق' ان ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ 'تیز رَو' (رے پر زبر) کے معنی ہوتے ہیں تیز چلنے والا تو 'خود رو' کے معنی ہوں گے 'اپنے آپ چلنے والا'۔ لہٰذہ 'لالہ خود رو' نہیں 'لالۂ خودرُ' ہوگا۔ 'خودرُ' کے معنی 'اپنے آپ اُگنے والا' کے ہوں گے۔ 'رُ' فارسی کے مصدر 'رُوئیدن' سے مشتق ہے۔

'مصوِّر' تصویر بنانے والے کو کہتے ہیں اور 'مُصوَّر' اسم مفعول ہے۔ یعنی 'وہ تصویر جسے بنایا گیا ہے۔" 'اوراقِ مُصوَّر' کے مطلب ہیں 'باتصویر اوراق'۔ اتنی بات سمجھ لینے کے بعد میر تقی میر کے اس شعر کو صحیح صحیح پڑھا جا سکتا ہے۔

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مُصوَّر تھے　　جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی 'فراق' کا یہ شعر لوگوں کو غلط پڑھتے ہی سنا:

تم 'مخاطب' بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

اس شعر میں 'مخاطب' کا 'ط' زبر کے ساتھ ہے، جس کے معنی ہیں 'جسے خطاب کیا جائے۔' رشید حسن خاں نے فیض کی نظم 'آج بازار میں پابہ جولاں چلو' کے بارے میں بتایا ہے کہ لوگ اکثر 'پابہ جولاں' کے جیم کو زبر کے ساتھ پڑھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ 'جولاں' کے جیم کو زبر کے ساتھ پڑھنے سے مطلب بدل جاتا ہے۔ اس لیے کہ 'جولاں' کے لفظی معنی 'گھوڑا دوڑنا' یا 'کدانا' کے ہیں۔ اگر 'جولاں' تلفظ کیا جائے تو معنی ہوں 'جس کے پیروں میں بیڑی پڑی ہو۔ اب تک جو ہوا سو ہوا آئندہ ایسی غلطی نہ ہو اور 'پابہ جولاں' پڑھا جائے۔

'جَیب' اور 'جیب' کے فرق کو بھی سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ جیب تو وہی جو ہماری قمیص، کرتے، کوٹ اور پتلون وغیرہ میں ہوتی ہے مگر 'جیب' کے معنی 'گریبان' کے ہیں 'جیب' یا 'جیب' کے استعمال میں غلطی نہیں ہونی چاہیے ورنہ 'جیب' کو 'جیب' سمجھ کر اس میں کچھ رکھ لیا تو رکھی ہوئی چیز سے ہاتھ دھونا پڑ جائے گا۔

ماش کی دال کون نہیں کھاتا۔ اس کے آٹے سے تو خدا بچائے۔ اینٹھتا ہی چلا جاتا ہے پنجاب میں اس دال کو کا شین کھا لیا گیا اور اب یہ دال 'ما' کی دال کہلاتی ہے۔ اسی طرح 'راج ماش' کو 'راج ما' کر دیا گیا ہے۔

'اُفُق' کو 'اُفق' کہنا بھی صحیح نہیں۔ صحیح لفظ 'اُفُق' ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کا لقب صدیق' تھا۔ 'صِدیق' کے معنی ہیں 'نہایت سچا'۔ دوسرا لفظ 'صدیق' ہے یعنی 'ص' پر زبر اور 'د' غیر مشدد۔ 'صدیق' کے معنی 'دوست' کے ہیں، اب 'صدیق الرحمان' پڑھیے۔ یقیناً آپ اسے 'ص' 'دیق' پڑھیں گے۔

سارا الزام دوسروں کے سر تھوپ کر ہم بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ غلطیاں ہم نے بھی کی ہیں اور خوب کی ہیں۔ کتاب کا انتساب کرتے وقت لفظ 'معنون' کا املا تو صحیح لکھ دیا جاتا ہے لیکن پوچھنے پر اس کا تلفظ بگاڑ دیا جاتا ہے۔ یہ لفظ 'معنون' نہیں 'م' 'عن ون' ہے۔ پتا نہیں مسودہ کا تلفظ کن لوگوں نے خراب کیا ہے۔ آج کل زیادہ تر تو 'مسودہ' سننے میں آرہا ہے۔ کچھ اسے 'مس ود 'دہ' بھی کہتے ہیں جب کہ اس لفظ کو 'م' 'سو' 'دہ' کہنا چاہیے۔

آیئے اب 'عید الاضحیٰ' کی بات کریں۔ عرف عام میں اسے بقر عید کہا جاتا ہے کچھ پڑھے لکھے 'لوگ' 'عید الضحیٰ' بولتے اور لکھتے ہیں۔ اصل میں 'ضحیٰ' چاشت کے وقت کو کہتے

ہیں اور 'اضحیٰ' اسم کے طور پر استعمال ہو تو معنی ہوں گے 'قربانی' مصدر کی صورت میں 'ضحیٰ' مطلب 'چاشت کا وقت ہو جاتا ہے۔ لہٰذہ عربی قاعدے کی رو سے صحیح لفظ عید الاضحیٰ ہے۔

کہنے والے بیٹے اور بیٹی کو 'نور چشمی' کہتے ہیں۔ 'نور چشمی' لکھنا اور کہنا دونوں مہمل ہیں صحیح لفظ 'نور چشم' ہے۔ اسی طرح لفظ 'ہمشیرہ' بھی بہت سننے میں آتا ہے۔ شاید مونث بنانے کے چکر میں 'ہمشیر' کے آگے 'ہ' کا غیر ضروری اضافہ کر دیا گیا ہے۔ 'ہمشیر' بغیر 'ہ' کے معنی ہیں 'دودھ شریک بھائی یا بہن'۔ اردو میں 'ہمشیر' صرف بہن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اب مزید دو لفظوں کے بارے میں بھی سُن لیجیے۔ بولنے میں بد احتیاطی کے سبب ان کا بھی غلط استعمال ہوتا ہے۔ ایک لفظ ہے۔ 'علاقہ' جس کے معنی ہیں 'تسمہ' یا 'رشتہ'۔ دوسرا لفظ 'عِلاقہ' ہے جو حلقے 'حدود یا تعلقہ' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عام طور سے اس لفظ کا استعمال دوسرے معنی میں ہوتا ہے پر بولتے ہیں پہلا لفظ۔

بات علاقائی اثرات کی ہورہی تھی۔ آپ بخوبی واقف ہوں گے کہ اہل دکن حرف 'ق' کی ادائیگی سے قاصر ہیں اور اس کی جگہ 'خ' کا استعمال کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے تلفظ میں بعض مضحکہ خیز تبدیلیاں ہو جاتی ہیں، مجاز رودولوی کا لطیفہ آپ نے بھی سنا ہو گا کہ ان کے ایک عقیدت مند نے انھیں اپنی بیٹی کی شادی میں مدعو کیا اور عرض کی کہ 'خبلہ! مجھے بڑی خوشی ہو گی اگر آپ میری بیٹی کی تخریب (تقریب) میں تشریف لائیں۔ مجاز بولے "بھائی میں کسی بیٹی کی تخریب نہ دیکھ سکوں گا مجھے تو آپ معاف ہی رکھیں۔"

صحیح تلفظ کی ادائیگی میں خواہ کتنی ہی دشواریاں پیش آئیں، الفاظ کے صحیح تلفظ کی برابر کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اس ضمن میں زبان کے استادوں کی ذمے داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ علاقائی اور مقامی اثرات سے دامن بچانا یقیناً مشکل ہے۔ دکنی اور پنجابی تلفظ کے اثرات نے سنبھلنے نہ دیا تھا کہ اب بہاری تلفظ کا سامنا ہے، پھر بھی درست تلفظ کی کوشش ضرور کرتے رہیے۔ ورنہ اردو کی روایتی تہذیب 'مٹھاس اور شیرینی کی باتیں خواب و خیال ہو کر رہ جائیں گی۔

Mr BADAR IQBAL
UNIVERSITY OF ILLINOIS MEDICAL CENTER
CHICAGO-Il,USA

۳/ جنوری ۲۰۰۰ کو دنیا کے سارے کمپیوٹر یا تو بڑی بڑی غلطیاں کریں گے یا کام کرنے سے انکار کردیں گے

بیسویں صدی کا آخری سال اس ہفتہ / اتوار کی نصف شب کو شروع ہوگا جو کہ آج سے کوئی ۲۸ مہینے دور ہے ساری دنیا تو اس کے جشن منانے میں معروف ہوگی مگر کمپیوٹر کی دنیا میں اس دن کے تعلق سے کافی تشویش ہے۔ ڈر یہ ہے کہ نئے سال آتے ہی اور خصوصاً اس کے پہلے دوشنبہ (۳/ جنوری ۲۰۰۰) کو جب کہ دنیا کے سرکاری، تجارتی اور دوسرے دفتری کام اس نئے سال پہلی مرتبہ شروع ہوں گے، بعض پرانے کمپیوٹرز جو اس وقت تک تو ٹھیک کام کر رہے تھے اب (سن 1999 کے 2000 میں تبدیلی کے بعد) بڑی بڑی غلطیاں کریں گے یا کام کرنے سے انکار کردیں گے، بشرطیکہ ان میں قبل از وقت خاطر خواہ ترمیم نہ کی جائے۔ یہ مسئلہ دنیا کے تمام کمپیوٹرز کو درپیش ہوگا چونکہ آج شاید ہی کوئی ایسی جگہ دنیا میں باقی ہے جہاں پر کمپیوٹرز استعمال میں نہ ہوں یا پھر ان کے ذریعہ بر اہ internet دنیا کے دوسرے کمپیوٹرز سے تعلق نہ ہو۔ یہ مسئلہ اب Y2K کے نام سے مشہور ہے (year=y یا سن، kilo=k یا ایک ہزار) اگرچہ کہ y2k کچھ سال پہلے منظر عام پر آیا ہے، اس کی ابتداء دراصل کوئی 50,40 سال پہلے ہوئی تھی جب کمپیوٹر کے استعمال کے بنیادی اصول ڈھالے گئے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس زمانے میں کمپیوٹر کی Cobol زبان استعمال میں تھی، جس کا رواج اب عرصے سے نہیں ہے اور نہ ہی اس زبان کے ماہر اب اتنی آسانی سے مل سکتے ہیں جو اس مسئلہ کی جڑ تک پہنچ کر اس کی ترمیم کر سکیں۔ یہ نقص ان تمام کمپیوٹرز میں کسی نہ کسی حد تک موجود ہے جو آج سے دو تین سال پہلے تیار اور فروخت کیے گئے تھے۔ حال میں تیار کیے گئے کمپیوٹرز میں اس نقص کو خاص طور پر دور کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کمپیوٹرز کے ماہرین نے حال ہی میں یہ بھی بتایا ہے کہ کن پرانے کمپیوٹرز میں ترمیم ممکن ہے (اور اس کو کس طرح کیا جاسکتا ہے) اور دوسرے جو بیکار ہو جائیں گے۔

مسئلہ دراصل یہ ہے کہ چونکہ ابتدائی کمپیوٹرز میں یادداشت (Memory) مقابلتاً

بہت محدود تھی۔ اس کی کفایت کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ تاریخ کو مکمل طور پر درج اور محفوظ کرنے کے بجائے اس کو مختصراً استعمال کیا جائے اور یہ طریقہ 50,40 سال سے ابھی تک جاری ہے۔ مثلاً 31/دسمبر 1999 کو کمپیوٹرز میں 12\31\99 کی طرح درج اور Store کرتے ہیں۔ جس میں پہلے نمبر (بائیں سے دائیں) مہینے کے لیے، دوسرے نمبر دن کے لیے اور اس کے بعد اس سال کے آخری دو نمبر اور ان تینوں نمبرات کے درمیان ایک لائن یا Slash تاکہ یہ نمبرات علاحدہ رہیں۔ گوکہ گذشتہ 50 سال میں یادداشت (Memory) میں کئی کئی گنا اضافہ ہوا ہے اور اب کمپیوٹرز میں اس کفایت کی ضرورت نہیں ہے مگر گذشتہ کے کفایتی طریقے آج اتنا بڑا مسئلہ بن گئے ہیں۔ نصف شب 31/دسمبر 1999 کے بعد کمپیوٹرز یکم جنوری 2000 کو اس طرح محفوظ کریں گے 01\01\00۔

سوال کمپیوٹر کے لیے یہ ہے کہ اب یکم جنوری 1900 اور 2000 میں کس طرح سے تمیز کی جائے کیونکہ یہ دونوں تاریخ "01\01\00" کی طرح محفوظ ہوں گی۔ اگر آج سے 100 سال قبل کمپیوٹرز ہوتے تو اس وقت بھی یہ مسئلہ درپیش ہوتا۔ ایسی غلط فہمی اور گڑبڑ کمپیوٹرز کے لیے دوسری تواریخ میں بھی ہو سکتی ہے جو ایک دوسرے سے 100-200 سال علاحدہ ہوں۔ مثلاً 3/جون 1800، 1900 اور 2000 سبھی کمپیوٹرز کے موجودہ طریقہ کے تحت "06/03/00" کی شکل میں محفوظ ہوں گے۔

آج کل چونکہ تقریباً تمام ممالک میں قدیم حکومتی، تجارتی اور ذاتی دستاویز اور ریکارڈز کمپیوٹرز کے سپرد ہیں، یہ پیچیدگیاں اور سنگین اور وسیع ہو سکتی ہیں اگر کمپیوٹرز کا قبل از وقت امتحان کرواکر ترمیم نہ کروائی جائے۔ وہ تمام کام جن میں ایک تاریخ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ y2k کے شکار ہو سکتے ہیں اور متاثر ہونے والے کام میں یہ تمام شامل ہیں مثلاً بینک اکاونٹس، انشورنس پالیسیز، ٹیلی فون بلس، تنخواہ اور ملازمتی ریکارڈز، Credit Cards، جائدادی دستاویز، قرضے، ٹریفک لائنس، میڈیکل کام، ایر ٹریفک کنٹرول وغیرہ۔

ریسرچ وغیرہ کے لیے پیچیدہ حسابی اقدام جن میں تاریخ کی ضرورت ہو، وہ بھی متاثر ہو سکتے ہیں۔ خاص مقصد کے لیے Customized کمپیوٹرز پروگرامس کو بڑی احتیاط سے امتحان کروانا پڑے گا۔ چونکہ ان کے Code کے ہر 50 لائن میں تقریباً ایک دفعہ تاریخ کا ذکر ہوتا ہے اور کئی پروگرامر Code اوسطاً لاکھوں، کروڑوں لائین پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور اگر ایسے کمپیوٹر میں بڑے Main Frame کمپیوٹرز سے لگے ہوں تو مسئلہ اور پیچیدہ ہو جاتا

ہے۔ کمپیوٹرز میں وقت اور تاریخ محفوظ کرنے میں کم از کم 3 مختلف حصوں کا دخل ہوتا ہے۔ ایک اصل ٹائم رکھنے کی بیٹری سے چلتی گھڑی Real Time clock یا (RTC) دوسرا BIOS کا CHIP اور تیسرا جس کو DOS کہتے ہیں۔ وقت اور تاریخ کو ٹھیک رکھنے کے لیے ان تینوں کو مسلسل یکساں اور باہمی طور پر ہمیشہ ٹھیک کام کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ ان تینوں میں BIOS کا Microchip سب سے زیادہ غلطی پر مائل ہو سکتی ہے چونکہ BIOS کمپیوٹر کے HARD WARE اور SOFTWARE کے درمیان تعلق برقرار رکھنے میں اہم حصہ لیتی ہے اسی لیے گزشتہ دو تین سال میں تیار کردہ کمپیوٹرز میں ایک نئی ٹائپ کی BIOS چپ لگائی گئی ہے جو y2k سے پیدا مسائل سے متاثر نہیں ہوگی۔ پرانے HARD WARE چلتے رہیں گے مگر پرانے MS. DOS سن 2000 میں ٹھیک کام نہیں کر سکیں گے۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ کمپیوٹر جس میں پرانے INTEL 386 MICRO PROCESSORS اور ابتدائی INTEL 486 اب Y2K کے مقابلے کے قابل نہ ہوں۔ مگر DOS کے Version 4.0 یا Windows 3.1 اور اس کے بعد کے Versions کو نئے سال کے مرحلے کے عبور کرنے میں رکاوٹ نہ ہوگی۔ بعض وقت پرانے کمپیوٹرز کو Y2K کے لیے چیک بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر پرانے کمپیوٹرز کو نئے سال سے پہلے بند کر دیا جائے اور نئے سال کے شروع ہونے کے بعد پھر سے on کیا جائے تو شاید 80 /01/01 یا 01 /04/80 کی تاریخ نظر آئے۔ اس کو Dos-Date کی Command کے ذریعہ صحیح تاریخ میں بدلا جا سکتا ہے۔ جس کے بعد وقت اور تاریخ صحیح طور پر پابندی سے بدلتے رہیں گے۔ اور اگر کوئی پرانا کمپیوٹر نئے سال کی تبدیلی کے دوران on رہے اور تاریخ صحیح طور پر بدل بھی دے تو جب بھی یہ کمپیوٹر بند اور پھر on ہوگا پھر شاید 01/01/80 تاریخ سامنے آئے، جس کو پہلے بتائے طریقے سے سیدھا کیا جا سکتا ہے۔ Windows 95 کافی حد تک (اور Windows 98 مکمل طور پر) Y2K کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

ذاتی کمپیوٹرز یا PC's کو مارکٹ میں (IBM کے ذریعہ) آئے کوئی 17 سال ہوئے ہیں۔ اس دوران ٹیکنالوجی کی ترقی اور عام پبلک میں اس کے استعمال کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ سے آج دنیا میں کوئی 36 کروڑ سے زیادہ کمپیوٹرز کام کر رہے ہیں جن کی تعداد سن 2000 میں 58 کروڑ سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ (کمپیوٹر انڈسٹری کے Almanac1998 کے مطابق) کمپیوٹر دنیا کے کونے کونے میں پہنچ چکے ہیں۔ سب سے زیادہ کمپیوٹر امریکہ میں ہیں

(دنیا کے 30% اور فی 1000 امریکی میں کوئی 580 کمپیوٹرز) اس کے مقابلے، ہندستان میں اب کوئی 2.8 کروڑ کمپیوٹرز ہیں جن کی تعداد سن 2000 میں دوگنے سے زیادہ ہو کر 67 کروڑ 80 لاکھ ہو سکتی ہے (یعنی فی 1000 ہندستانیوں میں کوئی 6 کمپیوٹرز) ان کی تعداد کے علاوہ Internet کے استعمال سے بھی پتہ چلتا ہے کہ دنیا اب کتنی مختصر اور قریب ہو گئی ہے۔ آدھے سے زیادہ دنیا کے Internet کا استعمال امریکہ میں ہے۔(55%) اگر چہ کہ ہندستان میں اب کوئی 1501 کے قریب انٹرنٹ استعمال کرنے والے ہیں۔ ان کی تعداد سن 2000 میں دس گنا سے زیادہ (یا 1575) اندازاً ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس ٹیکنالوجی دور میں انٹرنٹ کا استعمال بڑھتا ہی رہے گا اور استعمال کو بآسانی چلتے رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کمپیوٹر کے Y2k مسئلہ کو قبل از وقت حل کیا جائے اور وہ بھی ساری دنیا میں تاکہ جلد از جلد مضر اثرات کو کنٹرول کیا جاسکے۔

اس سے یہ اندازہ لگانا غلط ہوگا کہ امریکی حکومت اور تجارت وغیرہ کمپیوٹرز سبھی اب Y2k کے لیے تیار ہیں۔ صدر کلنٹن نے دو ماہ پہلے یہ بتایا کہ امریکی حکومت کے اہم کمپیوٹرز کے صرف 40% سن 2000 کے لیے اب تیار ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ بعض اہم حکومتی شعبے ابھی کافی پیچھے ہیں۔ ان میں ڈفنس، ٹیکس (Tax) ایجنسی، ہلتھ اور تعلیمات اور Environment وغیرہ کے شعبے شامل ہیں۔ چونکہ Y2k ایک عالمگیری مسئلہ ہے کلنٹن نے کوئی 12 Million ڈالر ورلڈ بینک کو دینے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ Y2k کے حل کرنے کو اب بے شمار WEBSITES اور پرگرامس وغیرہ Internet سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ Y2k پر قابو پانا دنیا کے معاشرہ کے لیے نہ آسان ہے اور نہ سستا۔ y2k کے ماہر ایک ہزار ڈالر فی دن (یا تقریباً دو ڈالر فی لائین) چارج کر رہے ہیں اور ایک ایک Code میں لاکھوں لائین بھی ہو سکتی ہیں۔ بعض چھوٹی چھوٹی کمپنیز شاید اس کو برداشت بھی نہ کر سکیں اور اندازاً 1-5% شاید فیل بھی ہو جائیں گے۔

بعض ممالک اس پر کافی توجہ دے رہے ہیں۔ امریکہ کے علاوہ برطانیہ، جاپان، جنوبی کوریا، کینیڈا، جرمنی وغیرہ میں اس تعلق سے کافی تیاری ہو رہی ہے۔ ہندستان اور دوسرے ایسے ممالک جن میں کمپیوٹرز کا زیادہ استعمال عام روزمرہ زندگی میں نہیں ہوتا ہے، ان میں y2k کا اثر کم ہوگا۔ اس سے بچا رہنا مشکل ہوگا اگر اس کی تیاری قبل از وقت نہ کی جائے۔

تبصرے نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

[redacted]

مصنف: قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی مرحوم
تبصرہ نگار: ڈاکٹر فرحت فاطمہ
سنہ اشاعت: ۱۹۹۸ء
قیمت: ستر روپے
ناشر: بھول پال بک ہاؤس بدھوارہ بھوپال (ایم پی)

"ہندوستان اسلام کے سائے میں"

زیر نظر کتاب "ہندستان اسلام کے سائے میں" قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی مرحوم کی مشہور و مقبول تصنیف کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس کتاب کے علاوہ وہ ایک اور قابل قدر یادگار "تاریخ بزرگانِ بھوپال کے مصنف بھی ہیں۔

بھوپال عرصۂ دراز سے اربابِ علم و کمال کی سرگرمیوں اور علم و فن کا مرکز رہا ہے۔ علم و فن کے کتنے ہی آبدار گوہر اسی سرزمیں سے اُبھرے اور یہیں خاک نشین ہوگئے۔

مولانا وجدی الحسینی بھوپال کے اسی مردُم خیز خطے اٹھے اور بھوپال کے مشہور اسلامی ادارہ دار القضاء میں سال ہا سال منسلک رہ کر اپنی علمی قابلیت، خلوص و جانکاہی سے اس ادارے کے علم و فن کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچادیا۔

علمی دنیا پر مولانا وجدی کا احسان عظیم ہے کہ انھوں نے عہد گزشتہ کی یادوں، کہانیوں اور منتشر داستانوں کو تاریخ اور تحقیق کی روشنی میں از سر نو زندہ اور تازہ کردیا ہے۔

پیشِ نظر کتاب "ہندستان کے سائے میں" ایک دیباچہ تھا جس نے ایک مستقل کتاب کی شکل اختیار کرلی۔ یہ کتاب مولانا وجدی کی سالہا سال کی ذہنی کاوشوں اور تحقیقی جدوجہد کا معلومات افزا ثمرہ ہے۔

اس کتاب کو تین بابوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(ا) پہلے باب میں بتایا گیا ہے کہ تمدن انسانی کے بانی مبانی کون تھے اور یہ کہ ہند

عرب کا رشتہ کتنا قدیم ہے۔ عرب و ہند کے قدیمی تعلق کی روشنی میں ہندستان سے اسلام کے چودہ سو سالہ دیرینہ رشتے کو ایک تحقیقاتی وروایاتی خاکے کے ساتھ واقعیت کے فریم میں نمایاں کیا گیا ہے۔

برطانوی حکمرانوں اور برطانوی مورخوں نے ہند و مسلم تعلقات کے اہم رشتہ میں قصداً غلط فہمیاں پیدا کر کے جو گتھیاں اور گرہیں لگادی ہیں ان کو علمی طریقہ پر کھولنے اور سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲) دوسرے باب میں مالوہ میں اسلام کی شروعات کب اور کیسے ہوئی اور اسلام نے اس علاقے میں کس طرح اپنے اثرات قائم کیے، اس کے علاوہ راجا بھوج کے اسلام کو تاریخی روشنی میں ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

تیسرے باب میں معجزہ شق القمر کی تاریخی ومذہبی اور سائنسی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ جو اس کتاب کا خاص موضوع ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب نیم مذہبی اور نیم تاریخی ہو گئی ہے۔

پیغمبر اسلام کے معجزۂ شق القمر کے مشاہدے سے ہمارے ملک میں جو مذہبی لہریں رونما ہوئیں تھیں ان کو تحریر میں لاکر اس آسمانی معجزہ کی جلالت وعظمت کے ذریعے وحدت اقوام کی عالمگیر دعوت کو اس کتاب کا نقطۂ اختتام بنایا گیا ہے۔

اس علمی، تحقیقی وتاریخی کتاب کے ذریعہ مصنف کا اصل مقصد انسان دوستی، ہندستانی قوموں کے درمیان صلح وآشتی اور تمام انسانوں میں عالمگیر پیغام محبت کو عام کرنا ہے۔

مولانا وجدی کی یہ تصنیف "ہندستان اسلام کے سائے میں" ان کی جامعیت علم اور فراوانیٔ کمال کا عمدہ نمونہ ہے۔ مولانا وجدی کا اسلوب بڑا موثر اور دل پذیر ہے انداز بیان کی سادگی، شگفتگی اور دلچسپی شروع سے آخیر تک قائم رہتی ہے یہ کتاب معلومات کا ایک بحر ذخار ہے جو قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیے رہتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ایک مشہور مقبول یادگار ثابت ہوگی اور علمی حلقوں میں ہمیشہ قدرو منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور اسلامی تاریخ کے طالب علموں، استادوں اور تاریخ کے شائقین کے لیے ایک دلچسپ نایاب تحفہ کے طور پر پیش کی جائے گی۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب ہے اس لحاظ سے کتاب کی قیمت بھی کم ہے۔

سائنس اور زندگی

مصنف: ڈاکٹر اعظم شاہ خاں
مبصر: صابر حسن رئیس
قیمت: ایک سو پچاس روپے
صفحات: ۱۶۰
پبلشر: نازش بک سینٹر، دہلی، ٹونک

بیسویں صدی میں سائنس نے جس سرعت کے ساتھ ترقی کی اس سے ہر شعبے میں Specialization کو بہت فروغ ملا۔ نتیجتاً ایک ہی مضمون کے مختلف شعبوں یا شاخوں میں پہلے کی نسبت زیادہ وسعت اور گہرائی سے مطالعہ کرنے اور مہارت حاصل کرنے کے رجحان نے ہمیں پہلے سے بہتر ماہرین تو مہیا کیے لیکن مختلف شعبہ ہائے حیات میں اس Specialization کا منفی اثر بھی شدت سے محسوس کیا جانے لگا۔ وہ یہ کہ اپنے اپنے مضمون کے ماہرین اپنی اعلا سطح کی معلومات کو اسی مضمون کے سنجیدہ اور معیاری قاری تک پہنچانے کے کام میں اس حد تک مشغول و منہمک ہوگئے کہ ان کو ابتدائی اور بنیادی معلومات کی ترسیل ایک غیر اہم سا کام لگنے لگا۔ ایسے حالات میں ایک تمام آدمی کو سائنس کی نعمتوں سے متعارف کرانے اور ہمارے روز مرہ میں سائنس کی اہمیت اور دافادیت کا ادراک کرانے کا کام کون کرتا۔ لیکن یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ ہمارے اردو داں طبقے میں بھی ایسے بیدار مغز لوگ موجود ہیں جو اپنے اپنے مضمون کے ایکسپرٹ ہونے کے باوجود اپنے مخصوص مطالعہ کے لیے وقف قیمتی وقت میں سے وقت بچا کر عام آدمی تک سائنس کی بنیادی معلومات کی ترسیل کا نیک کام انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر اعظم شاہ خان زولوجی میں ایم ایس سی اور Radiation Biology میں پی ایچ ڈی ہیں۔ لیکن بالعموم سائنس میں ان کی دلچسپی ہمہ جہت ہے اور ان کے سائنسی علم کا ذخیرہ سائنس کے مختلف شعبوں میں کی گئی جدید ترین تحقیقات اور ان کے نتائج کی معلومات سے پُر ہے۔ اردو زبان سے ان کے فطری لگاؤ نے انھیں اپنے اس علم کو اردو داں طبقے تک پہنچانے کی ترغیب دی۔۔ وہ گزشتہ کئی سال سے بچوں سے لے کر بڑوں تک کے لیے لکھ رہے ہیں۔ "سائنس اور زندگی" ان کے اسی طرح کے سائنسی مضامین میں سے ۲۳ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی پہلی خصوصیت موضوعات کا تنوع

ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ زیادہ تر مضامین ہماری روز مرہ زندگی کے عام مسائل سے متعلق معلومات سے پُر ہیں جن کی اہمیت اور افادیت عام ہے۔ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ مضامین ہر معیار کے قاری کو اس کی ضرورت کے مطابق مواد فراہم کرتے ہیں۔ان مضامین کو پڑھ کر بآسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنف نے جدید ترین سائنسی تحقیقات کے بارے میں مواد جمع کرنے سے لے کر موضوعات کے انتخاب اور مضامین کو بیک وقت خواص اور عوام کی دلچسپی کا مرکز و محور بنانے کی منصوبہ بندی میں کتنی عرق ریزی کی ہوگی۔

کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے تحریر کیا ہے۔پیش لفظ کے پہلے پیراگراف میں موصوف نے اس عام خیال کو ایک پروپیگنڈہ بتایا ہے اور اس کی مدلل تردید کی ہے کہ اس دور میں اردو کے لکھنے اور پڑھنے والوں کا فقدان ہے۔ان کے تمام تر دلائل حقیقت پر مبنی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی انھوں نے اس بات پر تشویش کا اظہار بھی کیا ہے کہ اردو میں سائنسی اور تکنیکی مواد کی دستیابی بہت دشوار ہے ۔ بقول ان کے ""اگر اردو زبان میں علمی اور معلوماتی مواد کی تلاش میں نکلیں تو یہ کام جوئے شیر لانے سے کم نہ ہوگا۔اور اگر کہیں ـــ سائنسی مواد کی تلاش ہو تو یہ تلاش مزید دشوار ہو جائے گی۔" ڈاکٹر پرویز خود ماہنامہ "سائنس" کے بانی اور مدیر کی حیثیت سے اردو میں معلوماتی مواد کی فراہمی کا کام بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ان کے ایک ایک جملے سے ایک باشعور اور باعمل شخص کا سچا خلوص مترشح ہوتا ہے۔پیش لفظ کے آخری پیراگراف میں انھوں نے ڈاکٹر اعظم شاہ خاں کی مساعی جمیلہ کو سراہنے کے ساتھ ساتھ یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ مصنف اپنے مضامین میں زبان کو مزید سادہ اور عام فہم بنائیں تو بہتر ہوگا۔
اس سلسلے میں میرا عرض کرنا یہ ہے کہ متذکرہ مضامین میں زبان کی دو سطحیں ہیں۔ پہلی سطح پر وہ سادہ اور عام فہم اسلوب بیان ہے جس کے ذریعے مصنف نے ایک عام قاری کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔دوسری سطح پر خالص تکنیکی انداز میں موضوع سے متعلق سائنسی معلومات کی ترسیل کی گئی ہے۔جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان کا دامن اتنا وسیع ہے کہ اس میں کسی بھی مضمون سے متعلق اصطلاحات کی نہ تو کمی ہے نہ مزید اصطلاح سازی کے تنگی داماں ۔ یہ تمام

اصطلاحات ہندو پاک کے سائنس اور اردو زبان کے ماہرین نے وضع کی ہیں اور مصنف نے ان کو لغات سے ہی اخذ کیا ہے۔ قاری کے آسانی کے لیے قوسین میں ان کا انگریزی ترجمہ بھی دے دیا ہے۔ اس طرح یہ مضامین اس طرح کے موضوعات پر عام رسائل میں چھپنے والے مضامین کی سطح سے کافی بلند ہو کر مجموعے کو ایک ایسی Txet Book کے معیار کا حامل بناتے ہیں جو ہر معیار کے قاری کے ذوق و تجسس کی تسکین کرتی ہے۔ اسی لیے جہاں ایک طرف خواتین کے اہم مسائل، بلڈ پریشر۔ ذیابیطس۔ غذائی سمیت، الرجی، امراض قلب، چائے، آیوڈین نمک جیسے عوامی دلچسپی کے موضوعات ہیں وہیں "حیاتی تنوع" "اوزن پرت میں شگاف" "گرین ہاؤس اثر" "فیرومونس" اور "ٹیسٹ ٹیوب بچے" جیسے موضوعات پر بھی جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے۔ اچھے قسم کا کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔ گیٹ اپ نہایت خوبصورت ہے۔

عارفہ سلطان

افسانے راجستھان کے

وتبصرہ نگار: ابوالکلام عارف، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ

ضخامت: ۲۱۴ صفحات قیمت: سو روپے

ناشر: راجستھان اردو اکادمی

زیر تبصرہ کتاب "افسانے راجستھان کے" ایک افسانوی مجموعہ ہے جس کی مرتب عارفہ سلطان ہیں۔ اس مجموعہ میں راجستھان کے ۲۶ معروف افسانہ نگاروں کے افسانے شامل ہیں جن کے مطالعے سے راجستھان میں افسانے کی ترقی اور علم وادب کی خدمات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دنیا میں ہر خطے کی اپنی انفرادی خصوصیات ہوتی ہیں جن کی بنا پر اس علاقے کی پہچان ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ایسے علاقے اچانک شہرت پاکر عالمی نقشے پر ابھر جاتے ہیں۔ یہ شہرت کبھی قدرتی عطیات کی وجہ سے تو کبھی اہم شخصیات، نیز ادبی، علمی اور فنی اعتبار سے بھی ہوا کرتی ہے۔ جہاں تک راجستھان کا سوال ہے، یہ ریاست بھی زمانۂ قدیم سے تہذیب وتمدن اور علم وادب کا گہوارہ رہی ہے۔ جب دہلی اور لکھنؤ کے دبستان اُجڑ رہے تھے، راجستھان کا ایک شہر ٹونک تہذیب وتمدن اور علم وادب کی ایک نئی تاریخ مرتب

کر رہا تھا، کیونکہ ان دبستان کے شاعروں اور ادیبوں کو ٹونک میں پناہ دی جارہی تھی۔ اس طرح اس خطے میں علم وادب کی روشنی پھیلی اور پھیلتی گئی اور آج اس کی لو پورے آب وتاب کیے ساتھ جلوہ گر ہے۔

دورِ حاضر میں وقت کی کمی نے انسان کو مصروفیت کی زندگی گزارنے پر مجبور کردیا ہے۔ آج اس کے پاس فرصت بالکل نہیں ہے۔ اس کا اثر زندگی کے ہر شعبہ پر پڑا ہے۔ ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ادب میں زمانے کے اس نئے مزاج کا مظہر افسانہ بنا۔ یہ زمانے کے مزاج کا مظہر بھی ہے اور انسان کی جذباتی اور نفسیاتی ضرورتوں اور تقاضوں کی تسکین کا وسیلہ بھی۔

پیش نظر مجموعہ کی پہلی کہانی پروین خان کی "گل بلبل اور نیہا" ہے جو داستانوی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس میں بلبل ایک بچی سے اس ظالم اور بے رحم صیاد کی کہانی سُنا رہی ہے جو چڑیوں کی آزادی ختم کردیتا ہے۔ اس کارنامے پر شکاری کو فخر اور خوشی تو ہوتی ہے لیکن چڑیوں پر کیا گزرتی ہے، اس کا احساس اُسے ذرا بھی نہیں ہوتا۔ دراصل موصوفہ نے اس کہانی کے ذریعے اس غیر انسانی فعل پر چوٹیں کی ہیں جو آج کے انسانوں کا خاصہ بن گیا ہے۔ حبیب کیفی کا افسانہ "فساد اور بچے" دلدوز مناظر کا نقشہ پیش کرتی ہے جو انسان فعل کیے منافی ہے۔ افسانہ "مراجعت" میں ایک دوسرے کے جذبات کو نہ سمجھنے کے سبب ازدواجی زندگی کس طرح درہم برہم ہوجاتی ہے، اسے بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ محترمہ عارفہ سلطان کی "رشتے درد کے" ایک نفسیاتی کہانی ہے جو ہمیں کافی متاثر کرتی ہے۔ ممتاز شکیب کا افسانہ "خوشبو کا گیت" ایک معاشرتی افسانہ ہے جس میں غلط رسم ورواج اور جہیز کی لعنت پر نشتر زنی کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس مجموعہ میں دیگر اور بھی بہترین افسانے شامل ہیں جن میں دور حاضر کے انسانوں کی کشمکش، تذبذب، بے چارگی، محرومی، خود سکستگی، خلش اور بے چینی کا احساس پایا جاتا ہے۔

اس مجموعہ میں خلیل تنویر اور نذیر فتحپوری کی منی کہانیاں بھی شامل ہیں۔ منی کہانیاں اتنی مختصر ہوتی ہیں کہ پڑھنے والے کو ایک نیا درس تو دیتی ہیں لیکن اس کے لیے تفریح کا سامان فراہم نہیں کرسکتی۔ طویل افسانے کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ قابلِ فہم ہیں۔ موجودہ دور میں منی کہانیاں صرف چند جملوں میں مکمل کی جارہی ہیں۔ مثال کے طور

پر خلیل تنویر کی ایک منی کہانی "سزا" ملاحظہ کریں۔ "ہجرات ہمیں ایک ریگستان میں بھٹکنا پڑتا ہے اور ہماری پیاس نہیں بجھتی۔ جانے کب یہ لعنت سفر ختم ہو؟ جانے یہ کس دن کی سزا ہے۔ "نذیر فتحپوری کی منی کہانیاں بھی موثر انداز میں لکھی گئی ہیں جن "خون کا رشتہ" انسانیت اور انسان دوستی کی مظہر ہے۔

محترمہ عارفہ سلطان مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے نہ صرف اس کتاب کو ترتیب دیا ہے بلکہ ایک جامع مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں اردو افسانے کی ابتداء ارتقاء اور اس کے تکنیک اور فن سے تفصیلی بحث کی ہے نیز راجستھان کی ادبی سرگرمیوں اور علمی کارناموں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ یہ مقدمہ قارئین اور طالب علموں کے لیے بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ کتاب کے اخیر میں تمام افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف کرایا گیا۔

مدیر: ثریا ہاشمی

مہمان مدیر: رحمت امروہوی

رسالہ گلبن گجرات نمبر

مبصر: خلیل تنویر

ضخامت: ۱۹۲ صفحات قیمت: ۲۵ روپئے

۹۔ شاہ عالم ہاؤسنگ سوسائٹی۔ چنڈولہ۔ا۔ احمد آباد

گلبن سرزمین گجرات سے شائع ہونے والا ایسا واحد ادبی رسالہ ہے جو محدود وسائل کے باوجود بیس سال سے شائع ہو رہا ہے جب کہ گجرات اردو اکاڈمی کا ترجمان 'سابر نامہ' کے اب تک چار پانچ شمارے ہی شائع ہوئے ہیں۔

ہندستان میں وہ علاقے یا شہر جو اردو زبان وادب کے نمایاں مرکز رہے ہیں جیسے دہلی لکھنؤ رام پور، حیدر آباد، عظیم آباد، بھوپال اور ٹونک وہاں کی علمی، ادبی اور ثقافتی تاریخ کا جائزہ مفصل طور پر لیا جا چکا ہے لیکن وہ علاقے جو اردو مراکز سے دور رہے ہیں؛ جہاں مقامی زبانوں کے اثرات بڑے گہرے رہے ہیں وہاں اردو زبان وادب کا فروغ کس طرح ہوا اور وہاں ادبی، علمی اور ثقافتی سرگرمیاں کس طرح جاری رہیں اس کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ گلبن کا گجرات نمبر اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

گجرات جہاں عہد وسطیٰ میں ایک سلطنت کا قیام تھا وہاں فارسی اور عربی ادب کا بڑا چرچا رہا۔ پھر جب اردو زبان نے فارسی کی جگہ لے لی اس وقت سے گجرات، خاص

ور پر احمد آباد شہر میں اردو زبان وادب کا فروغ ہوتا رہا۔ اردو کا پہلا اہم غزل گو شاعر
لی گجراتی کا تعلق بھی احمد آباد سے رہا۔ اس طرح دوماہی گلبن نے گجرات نمبر شائع
کے اس علاقے کی علمی، ادبی اور ثقافتی تاریخ کی ایک ایسی دستاویز پیش کی ہے جو اردو
تے میں مقبول ہوگی۔ اس نمبر کی تیاری میں رحمت امروہوی نے بہت محنت کی ہے اس
ر میں تقریباً اٹھارہ مضامین میں سب ہی مضمون نگاروں نے اپنی جانب سے ایماندارانہ
شش کی ہے۔

گجرات کے شہروں میں سورت، احمد آباد، اور پالن پور کی ادبی اور ثقافتی
رگرمیوں کا جائزہ خصوصی طور پر لیا گیا ہے اس میں سب سے بھرپور اور قابل تعریف
ضمون اردو کے مشہور محقق ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی مرحوم کا ہے کاش ایسا ہی مضمون
سلاطین گجرات کی راجدھانی احمد آباد پر ہوتا۔

قرون وسطی میں گجرات کے کتب خانے بھی ایک معلوماتی مضمون ہے اردو میں
یسرچ کرنے والوں کے لیے یہ مضمون نہایت کارآمد ثابت ہوگا۔

اختر جونا گڑھی پر سید مسعود حسن کا مضمون نہایت مختصر ہے۔ اختر جونا گڑھی
ردو زبان وادب میں ایک نابغۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے ان کے علمی اور ادبی
ارناموں کا تفصیل سے ذکر ہونا چاہیے تھا۔

دلی گجراتی پر ایک الگ سے مضمون ہوتا تو بہتر ہوتا۔ نظیری نیشاپوری جو احمد
آباد میں مدفون ہیں۔ نظیری فارسی زبان کا وہ طرحدار شاعر ہے جس سے غالب جیسا نا
ہند شاعر بھی متاثر تھا۔ اس پر بھی ایک مضمون شامل ہونا چاہیے تھا۔ گلبن کے اس
ستاویزی نمبر کی قیمت بہت مناسب رکھی گئی ہے جسے اردو کا عام قاری بھی آسانی سے
زید کر محفوظ کر سکتا ہے۔

مصنف: مولانا حبیب ریحان خاں ندوی ازہری

مغربی تہذیب، انحطاط اور علاج

تبصرہ نگار: ظہور الاسلام

قیمت: ستر روپے

ناشر: دار التصنیف والترجمہ ۲۷ رفیعیہ اسکول روڈ، بھوپال

مولانا حبیب ریحان خاں ندوی ازہری، بھوپال کے اس خانوادے سے
علق رکھتے ہیں جس کا تقریباً ہر فرد خدا کے فضل سے عالم وفاضل ہے، گویا ہمہ خانہ
فتاب است کا معاملہ ہے۔ اس گھرانے کا ایک قابل ذکر امتیاز یہ بھی ہے کہ اللہ تعالی

نے جہاں اسے دولت علم سے مالا مال کیا ہے، وہیں خدمت دین وملت کے جذبے سے بھی نوازا ہے۔ موصوف بھوپال اور بیرون بھوپال میں اپنی علمی ودینی، ادبی وصحافتی اور تدریسی سرگرمیوں کی وجہ سے نہ صرف بخوبی متعارف ہیں بلکہ ایک ممتاز ومنفرد مقام کے مالک ہیں۔

مولانا کے والد بزرگوار نے اسلام کی تبلیغ وتشہیر اور تعلیم وتدریس کا جو مشن بھوپال میں شروع کیا تھا، اس کو آگے بڑھانے میں آپ ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے معتمد اعلا کی حیثیت سے اس کے تمام انتظامی امور کی ذمہ داری، درس وتدریس کی خدمات اور طلبہ کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف اور تحقیق ومطالعہ میں ان کا انہماک اور استغراق قابل رشک ہے۔ مولانا حبیب ریحان نے کتابوں کی اشاعت کی غرض سے بھوپال میں دار التصنیف والترجمہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ ان کی تین تصانیف "تخلیق انسانی کا مقصد، دین وشریعت کا قیام" "مسلم پرسنل لا" اور "اسلام خصوصیات وعقائد" اسی ادارے سے شائع ہوکر صاحب نظر حلقوں میں مقبولیت کی سند حاصل کرچکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اس طباعتی سلسلے کی چھٹی کڑی ہے۔

کتاب پر گفتگو کرنے سے پہلے مذکورہ ادارے کے مقاصد کو نقل کرنا اس لیے ضروری محسوس ہوا کہ اس صاحب کتاب کی فکری جہات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

"ایسے پمفلٹ اور کتابوں کی تالیف وطباعت جو عصر نو کے تقاضوں کو پورا اور اسلامی اصولوں کی حقانیت کو آشکارا کرتی ہوں اور یہ ثابت کرتی ہوں کہ علوم انسانی اور سائنس کی ترقیاں اسلام کے مخالف نہیں ہیں بلکہ جوں جوں کائنات کی آیات کا انکشاف ہوتا جائے گا دنیا پر یہ ثابت ہوتا جائے گا کہ اسلام ہی ہر زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے والا مذہب ہے"

زیر تبصرہ کتاب بشمول ٹائٹل کور ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے سات ابواب ۱۔ اسلام اور مغربی تہذیب کا بنیادی فرق ۲۔ اسلام اور کیمونزم ۳۔ مغرب کا نسلی امتیاز ۴۔ اسلام اور مغربی تمدن ۵۔ مغربی تہذیب، تنقید وتجزیہ ۶۔ اسلام نسخہ شفا ۷۔ مغربی تہذیب، نمونے اور تبصرے کو ۸۰ سے زائد ذیلی عنوانات کے تحت منقسم کیا گیا ہے۔ جن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی کتاب کی نوعیت اور اس کی افادیت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ پہلے مضمون میں اسلامی اور مغربی دونوں تہذیبوں کے بنیادی فروق

پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے دوسرے باب میں کیمونزم کا موضوع زیر بحث ہے۔ مولانا نے اس نظریے کے کھوکھلے پن، اس کی تنگ دامنی اور ناکامی کا مدلل انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے۔۔ اسلام اور مغربی تمدن کے موضوع پر مصطفیٰ سباعی کے ایک انٹرویو کے متن کا ترجمہ پیش کر کے، اس کے ساتھ مبسوط حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے جو مفید اور معلومات افزا ہیں۔ ایک باب میں مغربی تہذیب پر چند مغربی دانشوروں کے حوالے سے مولانا حبیب ریحان نے بلیغ تبصرے پیش کیے ہیں۔۔ اسی ضمن میں ایک مسیحی عربی شاعر خلیل جبران کے قصیدے کا آزاد ترجمہ دے کر اس کے نظریہ عزلت نشینی کی تردید کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ مغربی تہذیب کی پروردہ اخلاقی انحطاط اور روحانی ناآسودگی کی تمام بیماریوں کا علاج صرف اسلامی تعلیمات کے سایے میں ہی ممکن ہے۔ کتاب کے آخر میں سماج بالخصوص مغربی سماج میں وقوع پذیر بے دینی اور بد اخلاقی کے چند واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے اسلام کے محاسن بڑے موثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تبصرے اخبارات و رسائل میں پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ غرض پوری کتاب میں دین و دنیا کے بہت سے موضوعات اور مسائل زیر بحث آئے ہیں جن کا مسکت حل اسلام اور قرآن کی روشنی میں پیش کر کے ثابت کر دیا گیا ہے کہ بنی نوع انسان کے تمام مقاصد ظاہری و باطنی کا مداوا صرف اسلام کے دامن میں ہی ممکن ہے۔ مولانا نے مغربی تہذیب کی برائیوں کو صرف ہدف ملامت ہی نہیں بنایا بلکہ ان کا علاج بھی بتایا ہے اور وہ ہے دین حق اور کلام اللہ کی طرف مراجعت۔ مصنف نے تمام مباحث میں اسلام کے خصائص اور اس کے امتیازات کو بخوبی اجاگر کیا ہے اور ہر بات کو عالمانہ طرز استدلال کے ساتھ منطقی انداز میں پیش کیا ہے۔

اس کتاب کا انتساب دنیائے علم و ادب کے ایک مینارۂ نور علامہ شبلی نعمانی کے نام ہے۔ مصنف کے عم محترم مولانا محمد نعمان خاں ندوی کا تحریر کردہ ان کا مختصر مگر جامع تعارف، خود مصنف کا "پیش لفظ" اور ان کے صاحبزادے اور منیجر دار التصنیف والترجمہ مولانا اطہر حبیب ریحان ندوی کا "عرض ناشر" زینت کتاب ہیں۔ اس کی کتابت و طباعت اطمینان بخش اور قیمت بھی مناسب ہے۔ ترتیب کتاب میں اگر فہرست کو انتساب سے پہلے رکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔ یہ تصنیف اپنی نوعیت کے اعتبار سے بلا تخصیص مذہب و ملت ہر جویائے علم کے لیے قابل مطالعہ ہے۔

سارے کام ضروری تھے

شاعر: حارث خلیق
اشاعت اول: ۱۹۹۷ء
قیمت: ۵۰ روپے
تبصرہ نگار: عبداللہ ولی بخش قادری
ناشر و طابع: فضلی سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ، اردو بازار، کراچی

حارث خلیق کراچی میں پیدا ہوئے اور انجینرنگ و ٹیکنالوجی کے طالب علم رہے وہ اردو اور انگریزی دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ، آج جب باش ہوئی، جو بیں پچیس سال کی عمر پر ۱۹۹۱ء میں منظر عام پر آیا اور انگریزی زبان میں Lt wisfer wor Horsi عنوان سے انھوں نے اپنے کلام سے پانچ سال بعد متعارف کرلیا۔ ان کی شاعری 'ذہن جدید' کی نمایندگی کرتی ہے۔ اس میں فکر تازہ اور شدت احساس کی جلوہ نمائی ہوتی ہے۔ اس مجموعے میں اردو کی ۳۸ نظمیں شامل ہیں اور ۱۳ انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے موجود ہیں جو ان کے مذکورہ بالا انگریزی نظموں کے مجموعے کی دین ہیں۔ ان کی اردو نظمیں بیشتر مختصر اور مختصر تر ہیں جن میں بعض آزاد بھی ہیں۔

حارث خلیق کی دو اشعار پر مشتمل نظم ملاحظہ فرمائیں، عنوان ہے زندگی:

کچھ کام تھے اپنی مرضی کے
کچھ کام فقط مجبوری تھے
پھر وقت بہت ہی تھوڑا تھا
اور سارے کام ضروری تھے

ایسی سادگی و پرکاری ان کی اکثر بیشتر نظموں میں نمایاں ہے۔ وہ شکوہ الفاظ کا جادو نہیں جگاتے اور نہ تراکیب و اضافات کی ارزوانی کے قائل ہیں۔ تاہم ان کے لہجے کا آہستہ پن اور سلامت گفتار چونکاتی ہے اور ندرت خیال متوجہ کرتی ہے۔ ان کی اسی نظم نے اس مجموعہ کلام کو نام دیا ہے۔ اس مجموعے کی پہلی نظم معروفیت ، بھی دو اشعار ہی رکھتی ہے اور ذرا دیکھیے کہ اس میں کیا کچھ نہیں ہے:

نوکری کی الجھنیں اور گھر چلانے کا وبال　　دوستوں کی ناز برادری، عزیزوں کا خیال
اور اس پر عادتاً اک بے سبب سی جستجو　　آتے جاتے ہر کسی سے بے سر وپا گفتگو

بلا شبہ اس معروفیت سے آج کا سماج دوچار ہے لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں بلکہ یہ خیال بھی آتا ہے کہ ہماری تگ و دو بھی صرف ہجر و وصل تک ہی محدود تھی، پھر

ایک وقت وہ آیا جب کہ احساس جاگا کہ "اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا" اور آج جب کہ صارفیت، تیز رفتاری، فشار آبادی ، ہمارا مقدر ہے ، اردو کا یہ جواں سال شاعر اپنے دور کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے جو اردو میں عصری تقاضوں سے آگاہی پر دلالت کرتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ فکر شاعر کی غمازی اس کے تیسرے مصرعے سے ہوتی ہے جو اقبال کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ اقبال کی رباعی ہے:

دریں گلشن پریشاں مثل بوئیم نمی دانم چہ می خواہم چہ جوئیم
بر آمد آرزو یا بر نہ آید شہید سوزد ساز آرزوئیم

دراصل یہ بے سبب سی جستجو، یہ شہید آرزو، ہونے کا شرف ہی بیداری فرد وملت کی علامت اور ضمانت ہے۔

ان کی نظم کل رات کی پارٹی، ہمارے معاشرے کے سیر شکم طبقے کی اتھلی اور کھوکلی صحبتوں کی عکاسی کرتی ہے، خواہ سرحد کے اس پار دیکھیں یا اس پار۔ ذرا غور فرمایئے کہ ان چار اشعار کی نظم میں ژرف بینی اور حقیقت نگاری دونوں کی جلوہ گری کیوں کر ہوتی ہے:

پھیکے چہرے میٹھا کھانا یونہیں سی بے کیف شراب
ایک اک جسم سے چھوٹ رہا تھا لیا بنا بے رنگ شباب
کچے علم کی ساری باتیں منہ پر ڈالے پھٹی نقاب
گھر لوٹا اور آنکھ لگی جب دیکھ نہ پایا کوئی بھی خواب

ایک طرف نظموں کے عنوان پیڈ گری چارم، باربی کیو، ورلڈ بینک ، ان کی انگریزی زبان وشاعری سے وابستگی اور اعلا طبقے سے ربط و تعلق کی غمازی کرتے ہیں تو دوسری طرف تھکن، پختہ عمر لڑکی کا دکھ ،نوحہ جیسی نظمیں اپنے سماج کی عوامی سطح سے وابستگی پر دلالت کرتی ہیں اور " آج جب ہوئی بارش ،(شمسہ کے ہجر میں کہی گئی) نظم، انسانی زندگی اور اردو شاعری دونوں کی نمایندگی کرتی ہے۔

بہر کیف یہ مختصر سا مجموعہ کلام اپنی اردو نظموں کی دل آویزی و برجستگی اور سادگی و کفایت الفاظ کی بنا پر توجہ کا موجب ہوتا ہے اور ان کا زاویۂ نگاہ چونکاتا ہے۔ حارث خلیق سے توقعات وابستہ ہوتی ہیں کہ اردو کو تابدار بنانے میں ان کا حصہ ہوگا ان کی انگریزی نظموں کا اردو ترجمہ ان کے ایک اور وصف کی طرف رجوع کرتا ہے جو اس وقت نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ کلام اپنی کتابت وطباعت کے اعتبار سے بھی ایک صاف ستھری اور دیدہ زیب اشاعت کی حیثیت رکھتا ہے۔

ادبی تہذیبی خبریں

ایس ایس سی امتحان میں مہاراشٹرا میں دوسرا مقام حاصل کرنے پر زرّین انصاری پر انعامات کی بارش

ایس ایس سی امتحان میں مہاراشٹرا میں دوم نمبر حاصل کرنے پر ہونہار طالبہ زرین مسعود احمد انصاری کے اعزاز میں جلسہ یعقوب بیگ ہائی اسکول پنویل میں منعقد ہوا جس کی صدارت عارف پٹیل صاحب نے کی۔ انھوں نے اپنی جیب سے ہونہار طالبہ کو ایک لاکھ روپے عطیہ دینے کا اعلان کیا جبکہ کوکن مسلم یوتھ فیڈریشن نے ۵۰۰۰، پنویل ایجوکیشن سوسائٹی ۲۵۰۰ اور آئیڈیل ایجوکیشن موومنٹ نے ۲۰۰۰ روپے عطیہ دیا۔ اس جلسہ میں امتیازی نمبرات حاصل کرنے پر نیشنل ہائی اسکول تلوجہ، اینگلو اردو ہائی اسکول بارہ پاڑا اور یعقوب بیگ ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج کے طلباء و طالبات کو انعامات سے نوازا گیا۔ جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ ہائی اسکول کے پرنسپل مشتاق شلوتری نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ یہ جلسہ پنویل ایجوکیشن سوسائٹی اور کوکن مسلم یوتھ فیڈریشن کے باہمی تعاون سے منعقد ہوا تھا۔ سوسائٹی کے صدر خالد چوا اور فیڈریشن نے صدر ایڈوکیٹ فقیر محمد ٹھاکور نے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ مبارک کاپڑی نے دلچسپ انداز میں اسٹڈی کرنے کے طریقوں پر روشنی ڈالی۔

قومی آواز کے اڈیٹر عثمان غنی کو مولانا آزاد ایوارڈ

آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے سلسلے میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کی جانب سے اردو کے ممتاز صحافی اور روزنامہ "قومی آواز" کے اڈیٹر جناب عثمان غنی کو مولانا ابوالکلام آزاد اردو صحافت ایوارڈ اور روزنامہ قومی آواز کے سابق نیوز اڈیٹر جناب مسیح الزماں کو راجیندر سنگھ بیدی اردو افسانہ ایوارڈ دیا جائے گا۔ اس کا فیصلہ لکھنؤ کی مجلس منتظمہ کے ایک جلسے میں کیا گیا جس کی صدارت کمیٹی کے چیرمین جناب نہال رضوی نے کی۔

فخر صحافت ایوارڈ اشرف عثمانی اور ایس ایس سینی کو

کلیر شریف سنی وقف بورڈ کمیٹی کی جانب سے اس سال فخر صحافت ایوارڈ اشرف عثمانی دیوبندی کو اور ہندی صحافت کے لیے ایس ایس سینی کو دیا گیا۔

کرشن بہاری نور کا بائی پاس ہارٹ سرجری کا آپریشن

اردو کے مشہور شاعر کرشن بہاری نور ؍ ۲۵؍ جولائی کو یہاں بترا اسپتال میں بائی پار

ہارٹ سرجری کا آپریشن کیا گیا۔ اسپتال کے ڈاکٹروں کے مطابق آپریشن کامیاب رہا۔ انھیں پانچ دن تک انتہائی نگہداشت والے کمرہ میں رکھا گیا اور اس کے بعد ان سے ملاقات کی اجازت دی گئی۔ آپریشن کے موقع پر پی پی سری واستو رند اور طفیل چترویدی موجود تھے۔

سدھارتھ کالج میں شعبۂ اردو کا قیام

جنوبی ممبئی میں واقع متعدد کالجوں نے شعبۂ اردو ختم کر دیا تھا مگر سدھارتھ کالج آف آرٹس، سائنس اور کامرس کے پرنسپل ڈاکٹر ایس ایس ڈھاکتوڑے کے ایک اعلامیہ کے مطابق کالج میں امسال اردو میڈیم سے ایس ایس سی پاس کرنے والے طلبہ کو اردو بحیثیت اختیاری مضمون لینے کا اختیار ہوگا۔ داخلے کے وقت انھیں داخلہ فارم کے ساتھ ایک انڈر ٹیکنگ دینا ہوگا جس کا فارم کالج کے رجسٹرار سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اردو کلاسس انجمن اسلام اردو ریسرچ سینٹر کی نگرانی میں چلائی جائیں گی۔ جنوبی ممبئی کے دیگر کالجوں نے بھی رضامندی ظاہر کی ہے۔

بہار قانون ساز کونسل میں اردو سے متعلق اعلانات کا خیر مقدم

گزشتہ دنوں بہار قانون ساز کونسل میں وزیر تعلیم جناب جے پرکاش نرائن یادو نے جلد ہی پانچ ہزار نئے پرائمری اسکول کھولے جانے کا اعلان کیا اور کہا کہ سترہ ہزار پرائمری سطح کے اساتذہ کا تقرر عمل میں لایا جائے گا۔ بہار کے تمام مدارس میں جدید تعلیم کا نظم، 148 اردو ٹیچروں کی التوا میں پڑی بحالی بلا تاخیر یقینی بنائی جائے گی۔ دس اردو داں طلبہ پر ایک اردو معلم کی تقرری کی جائے گی وغیرہ۔ اور اعلیٰ تعلیم کے وزیر جناب رام چندر پوربے کا تمام یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں کو اردو کے خالی عہدوں کی نشاندہی کرنے کی ہدایت اور مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کو الگ سے بجٹ دینے کے فیصلے پر اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے جناب افتخار عظیم چاند، ڈاکٹر حبیب مرشد خاں، جناب محمد نسیم احمد قریشی، جناب ایس ایم فیض، جناب محمد شہزاد عالم اور جناب محمد محمود عالم نے اعلا تعلیم کے وزیر جناب چندر پوربے اور وزیر تعلیم جناب جے پرکاش نرائن یادو کو اپنی دلی مبارکباد پیش کی۔ نیز وزیر موصوف سے گزارش بھی کی ہے کہ اپنے ان اعلانات کو صرف اعلانات تک محدود نہ رکھیں بلکہ انھیں عملی جامہ بھی پہنائیں۔

مجتبیٰ حسین کا فون نمبر تبدیل

مزاح نگار مجتبیٰ حسین (دہلی) کا فون نمبر تبدیل ہو گیا ہے جو درج ذیل ہے۔

2723653

احباب اور ادب دوست حضرات فون کی تبدیلی نوٹ فرمالیں۔

اردو تدریس کے سلسلے میں ورکشاپ کا انعقاد

بھوپال۔ یہاں ریجنل انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن اردو تدریس میں نئی تکنیک اور تقاضوں کے مد نظر اساتذہ کو ہدایات کے موضوع پر ایک دو روزہ ورکشاپ کا انعقاد عمل میں آیا۔ ورکشاپ کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر فاروق انصاری تھے۔ اس ورکشاپ میں جن ماہرین تعلیم اور مصنفین نے حصہ لیا ان میں جناب ابراہیم یوسف، پروفیسر آفاق احمد، پروفیسر شفیقہ فرحت، ڈاکٹر انیس سلطان، پروفیسر اظہر راہی، پروفیسر حیدر عباس رضوی، جناب خالد قریشی، جناب مسعود حسن، محترمہ یاسمین خاں شامل تھے۔ اختتامی جلسے میں کالج کے پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر جی رونڈرا نے اردو کو عوام سے قریب تر کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ پروفیسر بھگوت راوت اور کالج کے ڈین پروفیسر من جیت سین گپتا نے اظہار خیال کیا۔ اس تقریب کی مجلس صدارت میں جناب ابراہیم یوسف اور پروفیسر آفاق احمد شامل تھے۔ مجلس صدارت نے اردو تدریس کو جدید تکنیک سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیا۔ اور نئے تقاضوں کے تحت سائنسی ذہن تیار کرنے کی ضرورت کی اہمیت کو واضح کیا۔

کیفی اعظمی کو گیا نیشور اور گوپی چند نارنگ کو قومی ایوارڈ

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے امسال کا گیا نیشوری ایوارڈ معروف شاعر کیفی اعظمی اور قومی ایوارڈ گوپی چند نارنگ کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ گیا نیشوری ایوارڈ میں ایک لاکھ روپے نقد اور نیشنل ایوارڈ کی رقم اکیاون ہزار روپے ہوتی ہے۔ ذرائع نے مزید بتایا کہ نئے باصلاحیت فنکاروں کو دیے جانے والے ساحر لدھیانوی ایوارڈ کے لیے اس بار ڈراما نویس اقبال نیازی اور اردو ٹائمز کے فاروق سید کا انتخاب کیا گیا ہے۔ انھیں ۲۵۔۲۵ ہزار روپے دیے جائیں گے۔ صحافت کے لیے اردو ٹائمز کے م۔ناگ، فوزان (تھانے) کے اڈیٹر سلمان ماہمی اور منترالیہ میں پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے سب اڈیٹر عثمان خاں کو منتخب کیا گیا ہے۔

ذرائع نے بتایا کہ مراٹھی اور اردو کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور دونوں زبانوں کے فروغ کے لیے خدمات کرنے والوں کو ایوارڈ دینے کے بارے میں ناگپور کے ڈاکٹر اسد اللہ اور ممبئی کے انجم عباسی کے ناموں پر اتفاق ہوا ہے۔ انھیں ۲۵۔۲۵ ہزار روپے کی رقم دی جائے گی۔ بہترین اردو ٹیچر کا ایوارڈ باندرہ میونسپل پرائمری اسکول کی ٹیچر محترمہ رشیدہ قاضی کو دیا جائے گا۔

حلقہ ادب جرمنی کا ماہانہ اجلاس

یکم اگست کو حلقہ ادب جرمنی کا ماہانہ اجلاس ' لاہور پیلیس ریستوران" فرینکفرٹ میں منعقد ہوا۔ نظامت کے فرائض حلقہ کے

سکریٹری حیدر قریشی نے انجام دیے۔ پہلے ثریا شہاب نے اپنا تازہ افسانہ "آخری ملاقات" پڑھ کر سنایا۔ ایک پاکستانی اور ایک ترکی کردار کو لے کر اس میں جرمنی میں مقیم تارکین وطن کے حالات کو بڑے تخلیقی انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ حاضرین نے افسانے کو سراہا اور اسے ثریا شہاب کے افسانوی مجموعہ "سرخ لباس" کے بعد ان کی افسانہ نگاری میں ایک بڑی جست قرار دیا گیا۔ بحث میں حصہ لینے والوں میں طارق پرویز اختر کوکب اختر، سید مرغوب حسن، نزہت حسن، عزیز الدین، عبدالصمد، چوہدری فاروق احمد، ارشاد ہاشمی اور حیدر قریشی کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ ثریا شہاب کے افسانے کے بعد ارشاد ہاشمی نے اپنے ماہیے سنائے۔ ان ماہیوں کو اس بنا پر سراہا گیا کہ یہ شاعر کی پہلی کاوش تھی۔ ایک ماہیا بطور نمونہ حاضر ہے۔

پھولوں پر شبنم ہے
چاہے ملے نہ ملے
دل میں تو وہ ہر دم ہے

حلقہ کا یہ اجلاس دو گھنٹے تک جاری رہا۔

☆ارشاد ہاشمی، Romer str 65, Germany

مولانا ابوالکلام آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک

ٹونک کے مشہور علمی و ادبی نیز تحقیقی ادارہ قصر علم، معروف بہ اے پی آر آئی کی حسین و خوشنما عمارت میں (جو مشہور تاریخی سیر گاہوں کوہ رسیا اور انپورنا وادی کے درمیان ایک پُر فضا مقام ہے) ایک آل انڈیا مشاعرہ بہ تقریب جشن زرین آزادی ہند زیر صدارت استاد الشعراء حضرت ابن احسن بزمی مورخہ ۱۵/ اگست ۹۸ء کی رات میں منعقد ہوا۔ مشاعرہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں بنارس، دہلی، لکھنؤ، بھوپال، اجمیر، جے پور اور مدھیہ پردیش کے نمائندہ شعراء کرام جناب مخمور سعیدی، حیات لکھنوی، امیر آغا قزلباش، قیصر بنارسی، ضیاء الرحمٰن ضیاء، خلیل ادیب اور قمر آصف، اجمیر نے شرکت فرمائی۔

مشاعرہ کے مہمان خصوصی عالی جناب آر۔ ایس اگروال صاحب ضلع کلکٹر ٹونک اور ان کے ہمراہ جناب بترا صاحب ایڈیشنل کلکٹر، نیز جناب ایڈیشنل ایس۔ پی صاحب ضلع نے بھی مشاعرہ کی محفل کو رونق بخشی۔ دوسرے مہمان محترم مولانا محمد عبدالحیٔ فائز نے بھی اپنی پیرانہ سالی کے باوجود مشاعرہ کی بزم میں خاص طور پر شرکت فرمائی۔ نظامت کے فرائض جناب مخمور سعیدی صاحب سکریٹری اردو اکادمی دہلی نے بحسن و خوبی سر انجام دیے۔ مشاعرہ کا آغاز انسٹی ٹیوٹ کے محترم ڈائریکٹر جناب صاحبزادہ عبدالمعید خاں نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ سے فرماتے ہوئے تاریخ آزادی ہند کے پچاس سالہ جشن پر اظہار

مسرت کیا اور کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ آج کی شب آزادی کی تاریخ میں ایک زرین شب کی حیثیت سے یادگار رہے گی۔ جس میں ایسی ایسی عظیم علمی و ادبی شخصیات اس محفل میں شریک ہیں جن کی شعری و ادبی حیثیت ملک بھر میں مسلّم ہے۔ میری حقیر دعوت پر یہ شعراء کرام سفر کی تکالیف برداشت کرتے ہوئے ٹونک تشریف لائے اور ایک علمی تحقیقی ادارہ کی اس تقریب میں شرکت کی، میں خلوص دل سے ان کی اس قدم رنجہ فرمائی کا شکر گزار ہوں۔ ٹونک کے مقامی شعراء کی کثیر تعداد ہمارے درمیان ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ آزادی وطن کے متوالے اور شیدائی ہیں، کیوں نہ ہوں جبکہ ان کے اسلاف نے جنگ آزادی کی مہم میں حصہ لیا تھا۔ بہر حال میں شعراء اور معززین شہر کے اس تعاون کو اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں اور خاص طور پر اپنے ضلع کے تمام افسران خصوصاً چیف گیسٹ جناب آر۔ایس اگروال ضلع کلکٹر کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان تمام حضرات (جس میں محترم بترا صاحب، ایڈیشنل ایس پی صاحب شامل ہیں) نے مشاعرہ کے کامیاب انعقاد میں میرا بھرپور تعاون کیا۔ اور بذات خود اس سے دلچسپی لی۔

محترم حضرات یہ مشاعرہ جو آزادی کے نام ہے، ایک یادگار مشاعرہ ثابت ہوگا۔ ماضی قریب میں ایسے شاندار مشاعرہ کی مثال شاید نہ مل سکے۔

ڈائریکٹر صاحب کی تقریر کے بعد جناب مخمور سعیدی نے مسند نظامت سنبھالتے ہوئے اپنی تمہیدی تقریر میں آزادی ہند کی تقریب پر مبارکباد دیتے ہوئے ٹونک سے اپنے وطنی تعلق کا اظہار کیا اور کہا کہ ٹونک کی ادبی و شعری عظمتیں اور یہاں کے علماء و فضلاء، حکما، ادباء، شعراء چار دانگ عالم میں مشہور ہیں۔ اسی پس منظر میں یہاں ایک ادنیٰ شہری ہونے کی حیثیت سے ڈائریکٹر صاحب کے حکم کی تعمیل کرنے حاضر ہو گیا ہوں ورنہ میں عرصۂ دراز سے باہر رہنے کی وجہ سے نئی نسل کے لوگوں سے کم واقف ہوں۔ اچھا ہوتا نظامت کا بار مجھ پر نہ ڈالا جاتا، تاہم میں مشاعرہ کا آغاز کرتا ہوں۔ میرے سامنے جو فہرست ہے وہ بہت طویل ہے اور مقامی شعراء کرام کی تعداد ۶۵ ہے اور بیرونی مہمان شعراء کی تعداد آٹھ ہے۔ اس طویل فہرست کے مطابق میں شعراء کرام کو کلام سنانے کی دعوت دیتا ہوں۔ تقدیم و تاخیر میں کوئی فروگزاشت ہو جائے تو معاف فرمائیں۔ اس تمہید کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔

مشاعرہ گاہ کو مشرقی آداب کے مطابق بڑی چابکدستی سے سجایا گیا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کے اس ہال میں مختلف تاریخی کتابوں اور شخصیتوں کے تذکروں پر مشتمل چارٹ آویزاں تھے۔ قدیم شعراء اور ادباء کی تصاویر بھی جابجا

کی ہوئی تھیں۔ ہزاروں قلمی مخطوطات کے شوکیس اور آزادی کی کہانی مخطوطات کی زبانی کے عنوان سے نمائش ڈسپلے ہال میں سجے ہوئے تھے۔ چھت میں خوشنما جھاڑ فانوس جھلملا رہے تھے۔ روشنی کا اہتمام اس سلیقہ سے کیا گیا تھا کہ چاندنی چھٹکتی محسوس ہوتی تھی۔ اسٹیج کا منظر دل فریب اور نظر افروز تھا۔ شمع بظاہر کہیں جلوہ ریز نہ تھی لیکن شمع ادب کے پروانے شعراء کے گرد حلقہ بنائے موجود اور داد سخن دیتے نظر آرہے تھے۔ سامعین باذوق تھے۔ شعراء کرام کو ان کے کلام پر مناسب انداز میں داد و تحسین کے گلہائے محبت پیش کرنے میں سبقت لیے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر بیرونی شعراء کرام ٹونک کے عوام و خواص کے ذوق سخن کے قائل نظر آرہے تھے۔

مشاعرہ کی یہ تقریب ۴ بجے رات تک بڑی کامیابی کے ساتھ جاری رہی۔ شعراء کرام نے آزادی سے متعلق قطعات، نظمیں خاص طور سے سنائیں اور اس طرح مشاعرہ کی مقصدیت کو واضح کیا۔ اس کے بعد سلسلہ وار جن شعراء کرام نے اپنا کلام بلاغت نظام پیش کیا۔ ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں:

بیرونی شعراء میں جناب مخمور سعیدی، جناب امیر آغا قزلباش، جناب حیات لکھنوی، جناب خداداد خاں مونس، محترمہ ملکہ نسیم بانو، جناب قمر آصف، جناب قیصر بخاری، جناب ضیاء سرونجی، جناب خلیل ادیب۔ مقامی شعراء میں جناب ساگر ٹونکی، جناب شعیب احمد شعیب، جناب عزت علی عزت، جناب شاعر ٹونکی، جناب کاجل ٹونکی، جناب محمد ایوب جام، جناب خلل ٹونکی، جناب شوق احسنی، جناب شریف احمد شریف، جناب ناظر ٹونکی، جناب ضیاء، محترمہ آرزو صاحبہ، جناب برکت ٹونکی، جناب لطفی، جناب خاموش، جناب حسن اقبال، جناب شاد کیفی، جناب ابن صولت، جناب انجم احسنی، جناب مولانا محمد عمر ندوی، جناب انور علی خاں انور، عابد عاقل، جناب محمد علی گلزار، جناب قاری محمد علی بیگ عارف، جناب عبدالقوی، صاحب قوی، جناب صاحبزادہ شوکت علی خاں شوکت اور ٹونک کے بزرگ استاد شاعر جناب ابن احسن بزمی نے جب مسند صدارت سے اپنا کلام بلاغت نظام ارشاد فرمایا تو پورا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا۔

آخر میں مشاعرہ کے اختتام کا اعلان فرماتے ہوئے ڈائریکٹر صاحب نے شکریہ ادا کیا اور انسٹیٹیوٹ کے تمام اسٹاف کی محنت اور لگن کی تعریف کی اور یہ یادگار محفل بخیر و خوبی ختم ہوئی۔ مشاعرہ کا پُر لطف سماں آنکھوں میں اور لذت کیف و سرور دل میں لیے باذوق سامعین جب اپنے گھروں کو پہنچے تو مرغان سحر کی زمزمہ خوانی سے فضا پر نور تھی۔

☆ سید اقبال حسن ہاشمی

ڈاکٹر گیان چند گولڈ میڈل برائے ایم فل (اردو)

ڈاکٹر محمد انورالدین صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کے پریس نوٹ کے مطابق یونیورسٹی آف حیدرآباد کی اکیڈمک کونسل نے تعلیمی سال (۹۹۔۱۹۹۸ء) سے ڈاکٹر گیان چند جین گولڈ میڈل برائے ایم فل (اردو) دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ گولڈ میڈل جو اردو کے شہرہ آفاق محقق و ماہر لسانیات پروفیسر گیان چند جین کے نام سے موسوم ہے، ہر سال شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد سے ایم فل کے دونوں سمسٹروں میں مجموعی طور پر سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے والے ریسرچ اسکالر کو دیا جائے گا۔

سید احمد قادری کو خواجہ احمد عباس ایوارڈ

ساہتیہ کار سنسد بہار کی جانب سے اردو کے نامور اور مقبول افسانہ نگار جناب سید احمد قادری کو ان کے افسانوی مجموعہ "دھوپ کی چادر" کے لیے خواجہ احمد عباس ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

کلیم عاجز اور بیکل اتساہی کو ایوارڈ

جشن سرکار دو عالمؐ کے موقع پر اس سال ملک کے دو ممتاز شعرا کلیم عاجز اور بیکل اتساہی کو بالترتیب مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی ایوارڈ اور قاری صدیق احمد باندوی ایوارڈ دیے جائیں گے۔ یہ نعتیہ ایوارڈ جلسہ سیرت النبی کے موقع پر ان کے نعتیہ کلام کے اعتراف میں پیش کیا جائے گا۔

یاد رہے کہ جشن سرکار دو عالم گزشتہ کئی برس سے لکھنؤ مسلم ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام سنّی انٹر کالج میں منعقد ہو رہا ہے جو مختلف پروگراموں پر مشتمل ہے، اس ایسوسی ایشن کے روح رواں سابق ممبر اسمبلی الحاج محمد رفیع صدیقی ہیں۔

مولانا آزاد یونیورسٹی کے بنگلور علاقائی دفتر کے لیے زمین کی منظوری

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو بنگلور میں علاقائی دفتر قائم کرنے کے لیے دو ایکڑ زمین کی منظوری مل گئی ہے۔ یہ قطعہ اراضی بنگلور یونیورسٹی فراہم کرے گی۔ کرناٹک کے گورنر جناب خورشید عالم خاں نے وائس چانسلر پروفیسر شمیم جیراجپوری کو بذریعہ فیکس یہ اطلاع دیتے ہوئے اظہار مسرت کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بنگلور یونیورسٹی کے حکام مولانا آزاد یونیورسٹی کو دو ایکڑ زمین دینے پر رضامند ہو گئے ہیں۔

اردو اکادمی دہلی کا جلسۂ تقسیم انعامات برائے اردو ٹاپرز

اردو اکادمی دہلی کے جلسۂ تقسیم انعامات برائے اردو ٹاپر پروگرام میں دہلی سرکار کے

وزیر سیاحت سریندر پال راتناوال نے کہا کہ اردو اس ملک میں پیدا ہوئی ہے اور یہ ہر اس شخص کی زبان ہے جو اسے بولتا ہے۔ یہ ملک کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مشاعرہ و سمینار کرنے اور ادبی کتابیں شائع کرنے کے ساتھ ساتھ اردو میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کو بھی عام کرے، سائنسی مضامین کی کتابیں شائع کرے اور اس ترقی پذیر دور میں اردو کے طالب علموں کو سب سے آگے لے جائے۔ مسٹر راتناوال نے انعام پانے والے طالب علموں کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ یہ چھوٹا سا انعام آپ کو زندگی میں بہت بڑا بننے کا حوصلہ دے گا۔

مدرسوں کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے سکریٹری اردو اکادمی مخمور سعیدی نے اپیل کی کہ سرکار دہلی کے اردو مدارس کو یہ یقین دلائے کہ وہ ان کے یہاں سے کامیاب طالب علموں کو سرکاری اسکولوں میں بغیر کسی شرط ٹیسٹ کے داخلہ دلائے گی۔ آج جن طالب علموں کو انعامات، شیلڈز اور اسناد دی گئیں، ان میں درجہ ہفتم، نہم اور یازدہم میں اردو مضمون کے ساتھ اول پوزیشن حاصل کرنے والے طالب علم اور ایم۔اے۔بی اے اور بورڈ کے امتحانات کے ٹاپرز شامل تھے۔ اکادمی کی طرف سے قائم اردو سرٹیفکیٹ اور ڈپلومہ کورس کے امتحانات میں اول دوم سوم آنے والے اور اردو ٹائپ شارٹ ہینڈ و کتابت کورس میں اول، دوم، سوم آنے والوں کو بھی انعامات پیش کیے گئے۔ اس کے علاوہ امنگ پینٹنگ مقابلوں کے کامیاب طالب علموں کو بھی انعامات پیش کیے گئے۔ ان تمام انعامات کی کل رقم ایک لاکھ پانچ ہزار روپے تھی جو ۱۵۴ طالب علموں میں تقسیم کی گئی۔ اردو اکادمی جلد ہی اردو کمپیوٹر تربیتی کورس کا آغاز کرنے والی ہے۔

پروفیسر آفاق احمد شمالی امریکہ میں غالب صدی تقریب کے مہمان خصوصی

پروفیسر آفاق احمد نے اپنے غیر ملکی دورے کے درمیان ٹورانٹو (شمالی امریکہ) میں رائٹرز فورم کی غالب صدی تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ غالب اپنی صدی کے ہی نہیں، آنے والی صدیوں کے بھی شاعر تھے۔ آپ نے کہا کہ غالب کی فکر کی رسائی زندگی کے ہر مسئلہ تک تھی اور اسے انھوں نے اپنے اشعار اور تحریروں میں برت کر دوام بخش دیا ہے۔ ابتدا میں غالب اکادمی کے صدر مسٹر اطہر رضوی نے پروفیسر صاحب کو خوش آمدید کیا۔ اس جلسے کی صدارت ممتاز محقق شان

الحق مخفی فرمارہے تھے۔ فورم کے صدر عابد جعفری نے شکریہ ادا کیا۔

پروفیسر آفاق احمد نے برطانیہ کے دورے کے درمیان ممتاز ماہر غالبیات پروفیسر رالف رسل سے ملاقات کی۔ نیز مانچسٹر "حلقہ ارباب ذوق" کے غالب صدی مشاعرے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنا کلام سنایا۔ آپ نے بریڈ فورڈ میں بزم علم و فن انٹر نیشنل کے ایک جلسہ میں ہندستان میں اردو کی صورت حال پر اظہار خیال کیا۔ اس جلسہ کی صدارت ڈاکٹر مختار الدین احمد کر رہے تھے جبکہ ڈاکٹر صفات علوی نے شکریہ ادا کیا۔ آپ نے اس یقین کا اظہار کیا کہ اردو کو نامساعد حالات سے مقابلہ کرنے اور اپنے بل پر جینے کا سلیقہ آتا ہے۔ اس طرحدار زبان کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ یہ نہ صرف زندہ رہے گی بلکہ اپنے موجودہ رسم الخط کے ساتھ ترقی بھی کرے گی۔

محترمہ رلما تیواری کو ایوارڈ

شریمتی رتن شرما یادگار ٹرسٹ کے صدر تارک ناتھ بالی نے چوتھے "بچوں کا ادب ۱۹۹۸ء" کے انعام کا اعلان کیا ہے جو امسال جے پور (راجستھان) میں مقیم محترمہ رلما تیواری کو ان کا شعری مجموعہ "ننھی اور نانی" پر دیا جائے گا۔ اس بیش بہا تخلیق کا تعین بچوں کے ادب کے سلسلے سے جاننے والے ہندی ادب کے نامور تخلیق کار ڈاکٹر ویریندر سکسینہ، شری پرتاپ سہگل اور ڈاکٹر کمل کمار نے کیا ہے۔

اس انعام کی رقم بارہ ہزار مع سند اور ایک مومنٹ ایک خصوصی جلسہ میں پیش کیا جائے گا جس کا انعقاد چھ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو ہوگا۔ محترمہ رلما تیواری نے خود کو بنیادی طور پر بچوں کے ادب کے لیے وقف کر دیا ہے اور اس میدان میں انھوں نے اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔

☆ڈاکٹر رتن لال شرما، جنرل سکریٹری

ماسٹر قریب خان کا انتقال

۲۳/اگست فتحپوری مسلم سینئر سیکنڈری اسکول کے فارسی کے ریٹائرڈ استاذ اور ایک مقبول عام شخصیت محمد قریب خان کا آج صبح ان کی رہائش گاہ واقع نیا محلہ بلی ماران میں طویل علالت کے بعد بعمر ۷۱ سال انتقال ہو گیا۔ مرحوم کو ہزاروں سوگواروں کے درمیان دہلی گیٹ کے قبرستان میں شام کے وقت دفن کر دیا گیا۔ پسماندگان میں بیوہ، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔

صائمہ خیری کا انتقال

ممتاز شاعرہ، ماہنامہ "عصمت" کی مدیرہ اور رازق الخیری کی صاحب زادی محترمہ صائمہ خیری کا گزشتہ دنوں کراچی میں انتقال ہو گیا۔ ان کا مجموعہ کلام "میری نظمیں اور میرے گیت" تین سال قبل شائع ہوا جسے ادبی حلقوں نے کافی پسند کیا ہے۔

معروف شاعر عبید اللہ علیم کے انتقال پر اردو مرکز انٹرنیشنل کا اظہار تعزیت

اردو کے مشہور شاعر، ادیب اور فن کار جناب عبید اللہ علیم کی وفات پر اردو مرکز انٹرنیشنل کے ارکان کا سیلا مونیکا کیلی فورنیا میں ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا جس میں مرحوم کی ناگہانی وفات سے اردو کو جو نقصان پہنچا ہے، اس پر رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور دعا کی گئی کہ خدائے بزرگ و برتر مرحوم کے متعلقین کو اس ناقابلِ تلافی نقصان کو برداشت کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے، آمین!

شفیق میموریل اسکول کے سابق استاد نہال احمد قیصر کا انتقال

دہلی کے شفیق میموریل سکنڈری اسکول باڑہ ہندو راؤ کے سابق استاد نہال احمد قیصر کا آج صبح طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔

مرحوم دہلی کے اردو اساتذہ میں بہت ہی ہر دل عزیز شخصیت کے مالک، ملنسار اور اپنے شاگردوں کے بھی خواہ تھے وہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۸۴ء تک مسلسل شفیق میموریل اسکول میں درس و تدریس کے فرائض دیتے رہے۔ ان کے جنازے میں طلباء اور ٹیچروں کی ایک بڑی تعداد نے بھی شرکت کی۔

قومی آواز کے کارکن کو صدمہ بچی کالرا سے فوت ہو گئی

روزنامہ قومی آواز کے خوشنویس مجاہد صدیقی کی ۸ سالہ بچی کا انتقال ہو گیا۔ بچی کو رات میں الٹی اور دست آنے شروع ہوئے تھے اور اس کا علاج ایک مقامی ڈاکٹر سے کرایا گیا جو والدین کو تسلیاں دیتا رہا اور بچی چند گھنٹے میں چٹ پٹ ہو گئی۔ اسی کے ساتھ دوسری بچی کو بھی کالرا ہو گیا جس کو گورو تیغ بہادر اسپتال میں داخل کرایا گیا ہے۔

الحاج حافظ محمود الحسن کا انتقال

۱۲ر جون ۱۹۹۸ء الحاج حافظ محمود الحسن صاحب انتقال کر گئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۷۲ سال تھی۔ ان کی پیدائش ۱۹۲۶ء میں بھاگلپور کے ایک مردم خیز گاؤں، کورو ڈیہ میں ہوئی تھی۔ یہ گاؤں اپنے علم و فضل کی وجہ سے کافی معروف و مشہور ہے۔ بھاگلپور ہی کے

ایک قدیم ادارہ مدرسہ اسلامیہ اعزازیہ سے فراغت حاصل کی اور اس کے بعد اسکول کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۸۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی زندگی کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اسکول کی ملازمت کے دوران درجنوں حفاظ اور سیکڑوں صاحب کردار شاگرد پیدا کیے۔ وہ تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی خصوصی توجہ دیتے تھے۔ معاشرہ کی اصلاح ان کا ایک اہم مشن تھا۔ وہ علم و عمل کے سراپا نمونہ تھے۔ علاقہ میں وہ ایک ممتاز حافظ اور قابل قدر استاد کی حیثیت سے معروف تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہ درس و تدریس سے جڑے رہے اور آخر وقت تک اس میں مشغول رہے۔ علم و ادب کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

☆محمد ارشد جمیل، دربھنگہ

خراج عقیدت

برصغیر کے ممتاز ترقی پسند ادیب و مفکر اور مجاہد آزادی ہنس راج رہبر کی چوتھی برسی پر ہنس راج میموریل سوسائٹی نے گورکھپور میں ایک تقریب منعقد کی جس کی صدارت عالی جناب محمد صابر خاں ایڈوکیٹ نے فرمائی۔ جناب رہبر کی زندگی اور تصانیف پر مقالے پیش کیے گئے۔ عبدالباقی خاں حاصل جرنلسٹ نے کہا کہ رہبر صاحب کے قول اور فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا اس پر عمل بھی کیا۔ پربھو نندن شری واستو نے کہا کہ رہبر جی نے موقع پرستوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا کہنے میں کبھی نہیں جھجکے۔ دلشاد ولاری نے کہا کہ اردو ادب میں زندہ رہنے کے لیے ان کی شاہکار کتاب "پریم چند" کافی ہے جو اردو ادب میں پریم چند پر اولین تصنیف ہے۔ صدر تقریب جناب محمد صابر خاں ایڈوکیٹ نے کہا کہ ادیب اور شاعر تو برابر پیدا ہوتے رہیں گے، مگر انسان اور انسان کا قدر شناس صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ آخر میں سوسائٹی کے جنرل سکریٹری محمد عباس نے مقررین و حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

حاجی انیس دہلوی کو صدمہ

حاجی انیس دہلوی کے برادر کلاں منشی عظمت اللہ کا بعمر ۹۰ سال طویل علالت کے بعد ۲۵ر جولائی کی صبح دس بجے کراچی شہر میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم نہایت نیک خصلت، خوش گفتار اور ملنسار شخص تھے۔ لواحقین میں دو لڑکے اور چھے لڑکیاں شامل ہیں۔

ادارہ "کتاب نما" مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)۔

دیگر اداروں کے شعری مجموعے

امرونہی	ڈاکٹر محمد مشتاق الرحمٰن خشا	30/-
ایک سخن اور	مظفر مجاز	80/-
اردو ہے جس کا نام	ضیا ہانی	6/-
آتش پارے	سرفراز افسر	-/50
احساس کی صلیب	رابعہ سلطانہ ناشاد	10/-
آسماں کا پیرہن	یوسف اعظمی	20/-
اجنبی پرندے	اسلم عمادی	10/-
آکاش	راجندر بہادر موج	30/-
اوتار	دیپک قمر	40/-
انمول	دیپک قمر	40/-
ایک چراغ اور	دھرم پال عاقل	35/-
آئینہ حسن	عزیز شاداں	100/-
افکار سوداگر	عبدالقادر سوداگر	20/-
ارمغان آلام	سید محمود	20/-
آنچل اور پرچم	سروش شیروانی	22/-
ایک ہی رنگ لہو کا	شرر فتحپوری	15/-
ارمغان کندن	کندن لال کندن	30/-
بے زبانی کا ہنر	ڈاکٹر سجاد سید	80/-
انگبین	قیصر زیدی	20/-
ایک چٹکی آگ	قوی سیف	80/-
ارمغان شیدا	مرزا کمال الدین شیدا	35/-
ارمان نبیؐ	ارمان قادری	2/-
اعراض	رئیس مالیگانوی	10/-
بادۂ مخمور	مخمور دہلوی	30/-
باقیات شہباز	ڈاکٹر سید صابر حسن	25/-
بارہ ماسہ نہیہ	مولوی حفظ اللہ قادری	2/50
بحر بیکراں	اختر بستوی	5/-
برگ زرد	طالب چکوالی	15/-
پیمانہ امروز	نعیم صدیقی	20/-
پرواز	وہریندر روش	150/-
پیراہن جار	منظر شہاب	50/-
پاک زمیں ناپاک قدم	عشرت کرتپوری	5/-
پرچھائیں	آصف علی	4/-
پنچھی رخصت ہوئے	جاوید ندیم	40/-
پس دیوار شب	سکندر محسن	50/-
پرواز غبار	غبار بھٹی	50/-
پیوند خستہ بادباں	خمار قریشی	30/-
پنکھڑی گلاب کی	تبسم سحر	2/50
ثبات	محبوب راہی	10/-
تعارف	طلعت عرفانی	40/-
ترکش بشر	افتخار احمد بشر	22/-
تنویر اختر	صوفی اختر قدیری	50/-
ترنگیں	رانا پرتاپ سنگھ رانا	2/-
شیشے کا سفر	رضا اشک	15/-
تصویر وفا	حکیم احمد خاں وفا	5/-
تشنہ تشنہ	محمد خلیب اللہ حمیدی	100/-

تحفۂ اصغر	امیر خسرو	80/-
ٹوٹا ہوا آئینہ	عارف خورشید	10/-
جامِ فروزاں	سید بشیر حسین بشیر	35/-
جلوۂ نمو	حرمت الاکرام	15/-
جسارت	عزیز وارثی	10/-
چپ کی داد اور چپ کی فریاد	رفیق مارہروی	1/-
چمن چلو	علامہ انور صابری	1/-
چکبست اور انکی منتخب نظمیں		6/-
حرف مکرر	یعقوب راہی	3/-
حرف وصدا	ہیرالال فلک دہلوی	20/-
حرف حرف	شرر فتحپوری	24/-
خط غبار	قیصر حیدری	30/-
خیمۂ خواب	اسعد بدایونی	30/-
خوشبو	بدیع الزماں خاور	4/-
خرام حرف	مرحوم دلکش ساگری	48/-
خونِ جگر	دھرم پال عاقل	30/-
دیوان لامی	ابو عبداللہ محمد بن ابو بکر عثمان لامی	60/-
دواوین غزلیات	محمد جعفر خاں راغب	5/-
دست نارسا	ڈاکٹر یعقوب عامر	5/-
دل و نظر	ناظم میواتی سہسرامی	15/-
دشتِ نوا	وقار رومانی	25/-
دھنک رنگ	نوبہار صابر	22/-
دل کی آواز	سید صادق علی ٹونکی	30/-
دھول کی شال	عارف خورشید	25/-

دھوپ لہو سفر	حفیظ آتش	25/-
دیوان رضا عظیم آبادی	قاضی عبدالودود	10/-
دیوان حضور	مختار الدین احمد	10/-
دیوان آقا محمد کاظم والہ اصفہانی		15/-
دست زلیخا	سلمٰی جاوید	12/-
دھنک احساس کی	راج نارائن راز	45/-
دستِ گل	زبیدہ تحسین	16/-
زنجیر وزنار	محمد شمس الدین تاباں	12/-
زنجیر نغمہ	محمد حسن	30/-
زخموں کے سلسلے	عبدالصمد تپش	28/-
زخموں کے پھول	فیضی نظام پوری	10/-
زخم کے پھول	ڈاکٹر محمد محسن	25/-
رباعیات اختر	بخشی اختر امرتری	40/-
تبلیغ نو	امر بن انصاری	10/-
ریختہ ولی	دیوان ولی کا انتخاب	5/-
ریزہ ریزہ کائیاں	مشتاق علی شاہد	15/-
رنگ تماشہ	حمید الماس	40/-
رباعیات	زیڈ ایچ خان زاہد	20/-
رحل نظر	مہدی نظمی	5/-
رت سنگھار	عرفان صدیقی	15/-
روشن جزیروں کا سفر	انور سینائی	15/-
سلسبیل		30/-
سب رنگ		50/-
سطح آئینہ	سہیل واسطی	12/-
سوگوار یاد	رحم علی الہاشمی	2/25

سیپیاں	صبیح اللہ نقیب	50/-
سنگ دشمن	خالد شفائی	3/-
سورج کی آنکھ	کیف احمد صدیقی	10/-
کائنات روشن	روشن بنارسی	35/-
سرابوں کی فصل	جمنا پرشاد راہی	40/-
سلکِ لآلی	حزیں کاشمیری	35/-
سخن نامی	نامی نظامی شاہ پوری	10/-
شعلہ گل	سردار الہام	40/-
شہر سراب	انیس انصاری	15/-
شعلہ آواز	جوالا پرشاد شاہی	15/-
شب گزیدہ سحر	رفعت شمیم	40/-
شرار نغمہ	گوپال متل	25/-
شمع محفل	مظہر عظیم آبادی	30/-
عظمت وطن	عظمت عبدالقیوم	3/50
ضرب آگہی	محمد آفاق صدیقی	48/-
عکس تمنا	کمال جعفری	15/-
عکس عاشقی	تلک راج بے نام	10/50
عکس در عکس	شاہد ساگری	40/-
غائب متکلم	راجہ غضنفر علی	50/-
فرمودات	حمید الماس	50/-
فانوس حرم	حسامی کرودی	50/-
فردوس تخیل	ز۔خ۔ش خلد آشیانی	100/-
لمحہ لمحہ پیاس	کیلاش ماہر	50/-
کن	افتخار اعظمی	10/-
کاغذی حکم	علیم جہانگیر	20/-

کاویم	کاوش بدری	24/-
کاروانِ خیال	عطا کاکوی	18/-
کالے کاغذ کی نظمیں	باقر مہدی	4/50
گلنواں	حیا لعل دت رفیق	30/-
گلہائے ادب		3/50
گرد سفر	غنی اعجاز	50/-
گردش رنگ	مختار ہاشمی	10/-
لازوال	مائل ملیح آبادی	30/-
لالہ زار صبح	ناشر نقوی	40/-
لہو پکارے گا	اندر سروپ دت نادان	40/-
لمحہ لمحہ جاگی رات	یعقوب راہی	45/-
میدان	انور ندیم	80/-
مطلع حیات	احسن رضوی	45/-
منظر پس منظر	شاہد ماہلی	15/-
مثنوی محشر اعجاز		7/-
مری صدا کا غبار	رفعت سروش	50/-
میری کائنات	انجم نجمی	5/-
موسموں کا وطن	تسنیم فاروقی	30/-
مجور شمسی کی شاعری	ڈاکٹر محمد اقبال وارث	40/-
میری درس گاہ	نارائن سروے	50/-
مختلف	اسلم آزاد	30/-
مضراب	فیضی نظام پوری	4/-
مانیلنہ	بمل کرشن اشک	15/-
مثنوی جہیز کی لعنت	قمر واحدی	30/-
میٹھی میٹھی بولیاں	نادم بلخی	35/-

موج تسنیم	تسنیم فاروقی	15/-
وقت کی بانہوں میں	اختر انصاری	3/50
نگار حکمت	محمد فضل الرحمٰن	6/-
نئی روشنی	نور جہاں نور	20/-
نفس نفس	ناصر کرنولی	15/-
نصاب دل	رشید عبدالسمیع جلیل	12/-
نگدھ	شری کانت ورما	30/-
نغمہ حیات	دھرمیندر ناتھ سرمست	60/-
نوائے حیات	سیدہ فرحت	20/-
نقوش ذکی	ذکی وارثی	17/-
نوائے بلبل	سردار علی احمد خان	8/-
نگار سحر	جوہر ہاشمی	12/-
نسیم بہار	اے۔ سی۔ بہار	7/50
نور فرداں	عتیق احمد عتیق	3/-
نیلا آکاش	احتشام اختر	25/-
نگاہ	اختر سعید خان	20/-
ندی کے پار کا منظر	حیات لکھنوی	30/-
نئی دنیا۔ نیا آدم	شرر فتحپوری	24/-
نذر خسرو	شان الحق حقی	30/-
نوائے راز	خلیل الرحمٰن راز	60/-
روشنی بے چراغ راتوں کی	انجم رومانی	100/-
یادوں کی مہک	نسیم بیگم نسیم	40/-
یادوں کے گلاب	سلمان عباسی	10/-
دلاس یاترا	کمار پاشی	10/-
ہند نامہ	بلدیو راج سود	50/-

وقت کی صدیاں	داؤد غازی	4/-
انگاروں کے پھول	صادق نواب سحر	50/-
الہام	ابراہیم اشک	40/-
حرف حرف	ستیہ پال سلہوترہ عارف	60/-
متاع ہنر	محمود سروش	120/-
خودرو	سید بشارت علی	80/-
قریہ فکر	اسلم عمادی	60/-
پتہ پتہ بوٹا بوٹا	شکیب بنارسی	75/-
وقت لاوقت	ستیہ پال آنند	120/-
ہمہ رنگ	کرشن موہن	100/-
نقش کارواں	نہال رضوی	10/-
عالم علم	حسن فرخ	10/-
آرپار کا منظر	ظفر گورکھپوری	200/-
لاشریک	ف۔ س۔ اعجاز	50/-
گوہربار	واسدیو طالب	50/-
کفیفین	صلاح الدین پرویز	60/-
سحر نما	عشرت قادری	15/-
سوز حیات	ڈاکٹر ملک اسمٰعیل خاں	00/-
سورج نما	محمد علی تاج	12/-
رنگ برنگ	کرشن مراری	50/-
دیدہ نم	وحید انساء	15/-
دھڑکنیں	رشید انصاری	51/-
دیوان	سیماب امروہوی	00/-
داستان در داستان	احسنی	30/-
دیوان نوازش	نوازش لکھنوی	50/-

دھڑکن	نظر جالنوی	50/-
دبستان	حسن نعیم	90/-
حرف خودی	انیس امام	15/-
جواہرات انیس	سوم	25/-
تلاش حق	انور سلطان	35/-
بکھرے بکھرے خواب	گلشن کھنہ	60/-
بیاض فطرت	شبر احمد راہی	100/-
انتخاب قصائد	سید سرسوی	150/-
آتش سیال	ساجدہ زیدی	10/-
باقیاتِ شاد		22/-
عرش محبت	میکش اترولوی	100/-
متاع فکر و نظر	محمد آفاق صدیقی	30/-
دستخط	صادق	10/-
دشتِ آرزو	غنی اعجاز	20/-
دامان فطرت	ڈاکٹر مظفر حسین عالی	125/-
ملن کی آس	شمس فرخ آبادی	15/-
منارہ فلک بوس	ساقی توزیلوی	100/-
لمحوں کی خوشبو	ڈاکٹر تنویر علوی	45/-
مافی الضمیر	ضمیر کاظمی	40/-
لہو لمس چنار	حکیم منظور	30/-
لمحوں کا لمس	مہر گیرا	20/-
لہریں	راجندر بہادر موج	30/-
گلہائے فکر	ڈاکٹر اسا سعیدی	50/-
آتش خاموش	مضرب نظامی	8/-
ارج	ذکی ٹھاکور	3/50
میں اور تو	مظفر احمد لاری	2/50
آل انڈیا مشاعرہ		10/-
مسدس عالی	سر بر کابری	8/-
لہو ترنگ	اوم کرشن راحت	40/-
مجالس رنگین	سعادت یار خان رنگین	35/-
نقش اول	نور جہاں نور	25/-
چمن چمن	مہتہ ورد	15/-
سخن	وقار خلیل	30/-
سانجھ بھئی	چودلیس ساحر لکھنوی	5/-
سوز اقبال	منور لکھنوی	3/-
ایک سو غزلیں	شفیق اللہ	8/-
ایک چراغ اور	دھرم پال عاقل	35/-
کھنڈر میں چراغ	ملک زادہ جاوید	60/-
کلام ابی طالبؑ	مولانا علی سفینہ	20/-
کلام نصیر الدین حیدر بادشاہ		15/-
کارواں خیالوں کے	نومہار صابر	6/-
کلام انجم مانپوری		15/-
جسموں کا بن باس	آزاد گلاٹی	8/-
جپ جی صاحب	خواجہ دل محمد صاحب	22/50
باقیات شہباز		25/-
بزم خیال	سیدہ فرحت	1/-

ریزہ ریزہ	ظفر حمیدی	10/-
زنجیر کا نغمہ	وحید اختر	25/-
زخموں کے گلاب	صلاح الدین نیر	2/50
زمزمہ ساقی	راج بھادیہ ساقی	3/50
زمزمہ	صفدر آہ	2/-
روی کی کرنیں	روی بھاردواج	6/-
جنگل	صلاح الدین پرویز	25/-
چمن جاگے	نقوی مصطفےٰ آبادی	10/-
عکس دوراں	نثار الرحمٰن خان نشاہ	5/-
غبار رنگ	اندر سروپ دت نادان	3/-
تکون کا کرب	آزاد گلاٹی	5/-
پنچھی رخصت ہوئے	جاوید ندیم	40/-
برق تبسم	تبسم علیپوری	10/-
شجر آواز	حمید الماس	30/-
آئینہ حیرت	حیرت شملوی	2/-
اثاثہ منصورؔ	سید نذر الحسن قادری	12/50
لامکاں	غلام مرتضیٰ راہی	3/-
شرح انتخاب غزلیات	نظام احمد	10/-
خواب زار	حسنیٰ سرور	4/50
سچے بول	گوپال متل	30/-
سوچ سمندر	جمال قریشی	30/-

شہر مدفون	مرزا عزیز جاوید	6/-
شرح انتخاب قصائد و مراثی	نظام احمد	10/-
سبزہ شرر	نعمان امام	35/-
سنگ جاں	زاہدہ دیدی	45/-
سورج کا شہر	شہاب جعفری	6/-
نشاط غم	زار عظیم آبادی	15/-
شاہنامۂ ہند	سریر کابری	25/-
نشاط نظر	ہدایت محسنی	2/25
نئی روشنی	نور جہاں نور	20/-
نوائے دل		1/50
شاہنامہ رسالت	خضر برنی	12/-
نامہ گل	مختار شمیم	5/-
نکہت و خلش	محمد صدر الدین رضا	7/-
نوائے اردو	معروف شریفی	5/-
صحرا صحرا اجنبی	رؤف خلش	25/-
نذر نانک	مہدی نظمی	5/-
وجود شہود	عطا کلیانوی	4/-
نوائے بلبل	سروجنی نائیڈو	8/-
نقش نوا	مبارک شمیم	10/-
نوائے حیات	سیدہ فرحت	20/-
ویرانیاں	دور آفریدی	3/-

ملنے کا پتا۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ناکہ جے جے ہسپتال ممبئی۔ ۳

ٹیلی فون نمبر: 3774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

لسان الصدق — مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل، اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ =/۷۵

نظام رنگ — ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کا ادبی خاکہ — یہ اس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا انسانیت کو وقار بخشا۔ =/۱۵

پیکر جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مرد درویش تھے جس کا انداز سروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مرد مومن تھے۔ ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ =/۷۵

پرانی بات ہے (سلسلہ وار نظمیں) زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں۔ ان سچائیوں

کے روپ بدل گئے ہیں۔ =/۳۰

غزل نما — تصحیح و ترتیب ادا جعفری

(طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے)

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کلام کا جامع انتخاب اور تعارف جس کو ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۴۸۰ =/۷۵

ساز سخن — ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتون اول محترمہ ادا جعفری کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے انداز بیان سے ایک ایسی قوت ارادی مترشح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام موثر نہیں ہو سکتا۔ =/۴۵

ترجمہ قرآن — پروفیسر بشیر الحق

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش)

یہ پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔ =/۸

نذر مختار — مالک رام

مجموعہ مضامین جو ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر مختار الدین احمد کو عالیجناب ڈاکٹر شنکر دیال شرما نائب صدر جمہوریہ ہند کے دست مبارک سے پیش کیا گیا جس میں اردو کے ممتاز چھبیس ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ =/۱۰۱

SEP, 98
Regd with R.N.I at No 4967/60
Regd No. DL 16016/98
Licence No. U[SE)-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025

ماہنامہ

نئی دہلی

کتاب نما



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ۔ جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور محققوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/-

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں ۴۰/-

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر نجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہد قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/-

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ۔ اردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/-

گول مال — شفیقہ فر

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ /-

فی الفور — یوسف نا

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صف اوّ کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ /-

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظا

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوا جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈ اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک ا تاریخی دستاویز۔ /-

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیدین — مرتبہ: ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

ممتاز ماہر تعلیمات خواجہ غلام السیدین کے علمی ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔ /-

توفیق الحکیم — ناول نگاری کا جائزہ — ڈاکٹر بدرالدین الحافظ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق الحکیم کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ /-

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

اکتوبر ۱۹۹۸ء	جلد ۳۸	شمارہ ۱۰

فی پرچہ	7/-
سالانہ	70/-
سرکاری تعلیمی اداروں سے	100/
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک)	500/

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فیکس نمبر۔ 6842574

Tel Cum Fax No (011)-6910191

ٹیلی فون نمبر۔ 6910191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ۔ ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرے کے ذمے دار خود مصنفین ہیں ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مہمان مدیر نجمہ رحمانی

مضامین

نظمیں / غزلیں

طنز و مزاح

جائزے

نئی مطبوعات

[illegible] (ڈرامے) شمیم حنفی -/80

اسلام اور سائنس (اسلامیات) ڈاکٹر محمد رفیع الدین -/40

حضرت ابو ایوب انصاریؓ (سوانح) طالب ہاشمی -/75

سیرۃ نبویؐ (سیرت) ترجمہ نثار احمد فاروقی -/80

نقوش راہ (اسلامیات) مولانا جلیل احسن ندوی -/50

دو آتشہ لالہ طور (شاعری) پروفیسر غلام دستگیر -/30

سلام مچھلی شہری شخصیت اور فن (سوانح) عزیز اندوری -/200

لفظوں کا پل دوسرا اڈیشن (شاعری) ندا فاضلی -/100

فراق گورکھپوری، ذات و صفات (سوانح) مخمور سعیدی -/60

گجرات کے مشاہیر علماء (سوانح) ڈاکٹر محمد زبیر قریشی -/75

قادیانیت (مذہب) ادارہ -/75

جو اماں ملی تو کہاں ملی (ناول) محمد علیم -/150

اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں

ترسیل اور ابلاغ (ماس میڈیا) کمال احمد صدیقی -/200

آزادی کے بعد اردو زبان و ادب (ادب) سید عبدالباری -/110

مثنویات شوق (مثنویات) ترتیب رشید حسن خاں -/350

تشنۂ فریاد ضمیر الدین احمد -/200

مولانا ابوالکلام آزاد (سوانح) ضیاء الدین اصلاحی -/110

ٹھگ ۱ (ناول) ابن آدم -/50

ٹھگ ۲ (〃) 〃 -/50

ٹھگ ۳ (〃) 〃 -/50

رقاصہ (ناول) ابن صفی -/40

راہزن (〃) 〃 -/40

پجاری (〃) 〃 -/40

کالے پھول (ناول) علیم الحق حقی -/45

قرابادین قادری (طب) حکیم محمد اکبر رزالی -/150

درد کی آنچ (شاعری) ثریا رحمٰن -/200

جنت سے نکالی ہوئی حوا (خود نوشت) نفیس بانو شمع -/150

تاریخ تہذیب اسلامی حصہ دوم یٰسین مظہر صدیقی -/95

مولانا عبید اللہ سندھی کا انقلابی منصوبہ

مرتبہ ابو سلمان شاہجہانپوری -/100

حسرت موہانی اور انقلاب آزادی

ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی -/300

شعلۂ آزادی مترجم: تقی احمد ارشاد -/150

سرود رفتہ (300 شعرا کا منظوم تعارف)

امیر چند بہار -/200

سرورق ______ ڈاکٹر [illegible]

مہمان اداریہ
ڈاکٹر نجمہ رحمانی
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو،
دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

(اشاریہ)

تانیثی شاعری کا باغیانہ لہجہ

یہ سچ ہے کہ فن کا تعلق کسی صنف خاص سے نہیں ہے۔ خدا نے ہر انسان کو اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ وقت اور حالات ان کی صلاحیتوں کو منظر عام پر لاتے ہیں لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مناسب ماحول نہ ملنے کے سبب یہ صلاحیتیں انسان کے اندر گھٹ کر دم توڑ دیتی ہیں۔ یہی صورتِ حال ہمارے معاشرے کی خواتین کے ساتھ بھی پیش آئی۔ حالانکہ آج حالات کافی بدل گئے ہیں۔ آج کی عورت گھر کی چار دیواری سے نکل کر دنیا کا تجربہ حاصل کر رہی ہے۔ اسے اپنی شخصیت کو سنوارنے اور صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے مواقع حاصل ہیں لیکن عرصۂ دراز تک مشرق کا سماجی ڈھانچہ کچھ اس قسم کا رہا جس میں عورت کو دوسرے درجے کی مخلوق سمجھا جاتا رہا۔ اس کی وجہ وہ معاشرتی و سماجی ضابطے اور قوانین ہیں جنھوں نے اس کی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے اور بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ کلاسیکی اردو شاعری میں بہت سے شاعروں کے نام ابھر کر سامنے آئے لیکن بحیثیت فنکار کسی خاتون کا نام اعتبار حاصل نہ کر سکا۔ کلاسیکی اردو شاعری کے موضوعات عام طور پر تصوف اور عشق سے ہی عبارت رہے اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس وقت اردو ایک نئی زبان تھی لہٰذا اس نے اپنا تمام شعری سرمایہ فارسی سے لیا جو ایک لمبے عرصے تک ہندستان کی سرکاری زبان رہ چکی تھی۔ فارسی شاعری میں اظہارِ عشق کی آزادی صرف مرد کے لیے مخصوص تھی۔ اس شاعری کی ہیروئن بے پناہ خوبصورت، باحیا لیکن بے زبان تھی جسے صرف چاہا جا سکتا تھا مگر یہ اجازت نہیں دی جا سکتی تھی کہ وہ بھی اپنے جذبات واحساسات کا مکمل اظہار کر سکے گویا اسکی حیثیت ان کاغذی پھولوں کی تھی جو خوشبو سے محروم ہوتے ہیں۔ اسے اپنی ذات اور وجود کا احساس نہ تھا حالانکہ اٹھارویں صدی کی چند شاعرات کے نام ہمارے کلاسیکی سرمائے میں ملتے ہیں مگر ان کی شاعری میں وہ شگفتگی نہیں جو دوسرے شاعروں کے یہاں پائی

جاتی ہے۔ موضوعات کے معاملے میں بھی وہ مردوں کی تقلید کرتی نظر آتی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر شاعرات طوائف طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دراصل اس عہد میں شریف عورتوں کے لیے شاعری ایک عیب اور گناہ تصور کی جاتی تھی۔ سماجی اعتبار سے عورت دو درجوں میں تقسیم تھی، وہ یا تو طوائف تھی یا پھر بیوی۔ بیوی کا مقام گھر کی چار دیواری تھی۔ باہر کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ معاشرہ بنیادی طور پر مرد کا معاشرہ تھا جہاں عورت کی حیثیت گھر کی ذمے داری سنبھالنے والی اور بچوں کی پرورش کرنے والی بیوی کی تھی یا پھر مرد کو جنسی لذت فراہم کرنے والی طوائف کی۔ پردہ نشین خواتین میں بھی شعروشاعری سے دلچسپی کا رجحان موجود تھا لیکن سماج کے خوف نے ان کی صلاحیتوں کو سامنے آنے کا موقع نہیں دیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں جہاں غزل میں عورت کا ایک بے جان اور پیشہ ورانہ تصور ابھرتا ہے وہیں اس دور کی مثنویوں کے نسوانی کردار، مرد کرداروں کے مقابلے زیادہ باعمل اور باہمت نظر آتے ہیں۔ مثنوی سحر البیان میں قصے کا ہیرو پری کے ہاتھوں قید ہوتا ہے لیکن اس قید سے آزاد ہونے کے لئے کسی طرح کی کوشش کرنے کے بجائے ایک کونے میں بیٹھ کر آنسو بہاتا ہے جبکہ نجم النساجو ہیروئین کی سہیلی ہے، ہیرو کو آزاد کرانے کے لئے جوگن کا بھیس بنا کر جنگل جنگل گھومتی ہے اور بالآخر مشکلات سے گزر کر ہیرو کو قید سے رہائی دلاتی ہے اسی طرح زہر عشق کی ہیروئین مہ جبین ہیرو کے مقابلے زیادہ ہمت اور حوصلے کا ثبوت دیتی ہے اور حالات سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیتی ہے۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب سیاسی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ سماجی نقطۂ نظر سے بھی ہندستان کی تاریخ کا اہم موڑ ثابت ہوا۔ ہندستانیوں کو ایک نئے سرے سے اپنی کمزوریوں کے بارے میں سوچنے کا موقع ملا۔ بہت سی اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں جنہوں نے عوام کے ذہن اور ان کی فکر کو متاثر کیا۔ ساتھ ہی وہ شاعری جو اب تک مضامین عاشقانہ کا آئینہ تھی اس سے اصلاحی کام لیا جانے لگا۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں چند ایسی نظمیں پڑھی گئیں جن میں سماج میں عورت کی خستہ حالی کی جانب اشارے کئے گئے مگر سنجیدگی سے اس جانب توجہ نہیں دی گئی اب تک خود عورت کے ذہن میں اپنے حالات کو بدلنے اور سمجھنے کا بھی کوئی خیال نہ آیا تھا۔ مسلمانوں میں سرسید اور حالی جیسے روشن خیال افراد بھی تعلیم نسواں کی مخالفت کر رہے تھے البتہ اس وقت چند ایسے لوگ موجود تھے جو عورتوں کو تعلیم دلانے کے حق میں تھے مگر سماج میں اس کی انفرادیت کو تسلیم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور تعلیم کے ساتھ یہ پابندی

عائد کردی گئی کہ ؂

تعلیم عورتوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

اب چند روشن خیال گھرانوں کی لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے گھروں سے باہر نکلنا شروع ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی مغربی تہذیب نے ہندستانی ذہنوں کو متاثر کرنا شروع کیا۔ جہاں دوسری تبدیلیاں رونما ہوئیں وہیں پردے کی سختی بھی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی مسلم علما کے یہاں خاص طور سے اس کی شدید مخالفت ہوئی اکبر نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں اسے مشرق کی پاکیزہ تہذیب پر ایک وار قرار دیا اور اس کا ذمے دار بجائے عورتوں کے مردوں کو ٹھہرایا۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اکبر اور ان کے ہم خیال لوگوں کے لیے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا رُخ موڑنا ممکن نہ تھا لہٰذا آہستہ آہستہ عورت نے عملی میدان میں قدم رکھنا شروع کر دیا مگر یہ تعداد ابھی تک اتنی کم تھی کہ اسے آزادی کا نام دینا مناسب نہ ہوگا البتہ نقطۂ آغاز ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔

۳۶۔۱۹۳۵ میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ ہندستان میں جدوجہدِ آزادی کے شباب کا زمانہ ہے۔ تحریکِ آزادی کو طاقتور بنانے میں اس تحریک کا ایک اہم رول رہا ہے۔ فیض، مجروح، جذبی، مجاز اور ان کے ساتھی فکشن نگاروں میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، وغیرہ کے نام منظر عام پر آئے (اس کے علاوہ بھی ناموں کی ایک طویل فہرست ہے) فیض کو ترقی پسند تحریک کا ایک اہم شاعر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اپنی تمام ترقی پسندی کے باوجود جب وہ عورت کے تعلق سے بات چیت کرتے ہیں تو اپنے قلم کی تمام دلکشی محبوب کے سراپا کے لئے مناسب تشبیہات، استعارات ڈھونڈنے میں غرق کر دیتے ہیں۔ ؂

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

گویا عورت سے صرف محبت کی جاسکتی ہے۔ جہدِ زندگی میں محبوب کے ساتھ کی انھیں ضرورت نہیں۔ ایسے موقعوں پر نہایت مجبور لہجے میں معذرت کر لیتے ہیں۔ البتہ مجاز اور ساحر

[illegible] یہاں صورت حال بالکل مختلف ہے خاص طور سے مجاز کے لیے [illegible] کہ انھوں نے پوری ادبی تاریخ میں پہلی مرتبہ عورت کے وجود اور اس کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اسے دعوت دی کہ وہ مرد کے قدم سے قدم ملا کر زندگی کی سچائیوں کا مقابلہ کرے نظم "نوجوان خاتون سے خطاب" میں کہتے ہیں۔

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا۔

اسی کے ساتھ ہی شرم، پاکیزگی، حجاب کے روایتی تصور پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔

سر رہ گزر چھپ چھپا کر گزرنا
خود اپنے ہی جذبات کا خون کرنا
حجابوں میں جینا حجابوں میں مرنا
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

لیکن عورتوں نے آزادی اور مساوات کی اس کھلی دعوت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور مجاز نے آزادیٔ نسواں کے نام پر جو نظمیں لکھیں کچھ شاعرات نے ان کے جواب لکھ کر مجاز کے خیالات کو رد کیا ان میں تنقید کا سب سے بڑا نشانہ مجاز کی نظم "نوجوان خاتون سے خطاب" بنی۔

ساحر کے یہاں تصویر کا دوسرا رُخ پیش کیا گیا وہ عورت کے ساتھ مساوات کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ اس پر ہونے والے مظالم کا ذکر تلخ لہجے میں کرتے ہیں۔ اسے حوصلے سے زندگی گزارنے کی تلقین کرتے ہیں سماج سے مطالبہ کرتے ہیں کہ عورت کو انسان کی طرح جینے کی اجازت دی جائے۔

عمر بھر رینگتے رہنے سے کہیں بہتر ہے
ایک لمحہ جو تری روح میں وسعت بھر دے
ایک لمحہ جو ترے گیت کو شوخی دے دے
ایک لمحہ جو تری لے میں مسرت بھر دے

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس، رادھا کی بیٹی

[illegible]

عورتیں تلاش مشرق کہاں ہیں

۱۹۴۷ء ہندوستان کی تاریخ کا ایک وقت روشن اور تاریک باب تھا جب ہندوستانیوں کی آنکھوں نے آزادی کا سورج دیکھا وہ سورج جس کی سرخی میں تقسیم وطن کے نتیجے میں قتل کیے جانے والے ہزاروں بے گناہوں کا خون شامل تھا سرحد کے دونوں جانب انسانوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی اور ہجرت کرنے والوں پر عرصہء حیات تنگ ہو گیا۔ جس کا بڑا شکار عورتیں بنیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ شعری سطح پر ان حالات کا اظہار کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتا البتہ نثر میں ان فسادات کو لے کر بہت سے زندہ رہنے والے افسانے تخلیق کیے گئے۔

اردو ادب کی تقریباً دو سو سالہ تاریخ میں عصمت کے علاوہ ایک بھی فنکار نہیں (یہ بات woman writers کے حوالے سے کہہ رہی ہوں) جس نے پُر اثر انداز میں عورت کے مسائل پر قلم اُٹھایا ہو۔

آزادی کے بعد ملک تقسیم ہوا تو ہندوستان نے سیکولر ڈھانچہ اپنایا اور پاکستان جس کی بنیاد ہی مذہب پر رکھی گئی اسلامی ملک کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس برِ صغیر میں پاکستان واحد ملک ہے جہاں feminism نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی حالانکہ دوسرے ممالک میں بھی مسائل بہت زیادہ مختلف نہیں لیکن باقی ممالک میں ادبی سطح پر عورت کی منفرد شناخت یا پہچان ویسی نظر نہیں آتی جیسی پاکستان میں ہے۔ ہندوستان میں آزادی کے بعد اُبھرنے والی نمائندہ شاعرات میں ممتاز مرزا، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، جمیلہ بانو، مسعودہ حیات وغیرہ نے اپنی شاعری میں اس روایتی عورت کی تصویر کشی کی جو اپنی زباں بندی کو سماج کی ایک قدر کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ قبول کرتی ہے بلکہ اس پر فخر بھی کرتی ہے۔

ہر چند مہ فضا ہے نیا راستہ حیات
کھینچے ہے اپنی سمت پرانی ڈگر ہمیں

اس نئے سماجی تناظر میں عورت ہونے کی حیثیت سے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کسی بھی شاعرہ کے یہاں نہیں ملتا۔

اس طرح جدید شاعری میں feminist trend کا پورا سرمایہ ہمیں پاکستان سے ملتا ہے جس کی بڑی وجہ وہاں کی سیاسی صورت حال رہی جولائی ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاالحق نے بھٹو سرکار کا تختہ اُلٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا وائیں بازو کی حمایت حاصل کرنے کے لئے سخت قوانین

وضع کے جن کو سیاسی مقاصد اور ذاتی مفادات کیلئے مکمل کر استعمال کیا گیا۔ سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کی وجہ سے خواتین کا مکمل کر استحصال کیا گیا جس کے خلاف woman organ-isations نے آواز اُٹھائی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پاکستان میں جہاں ایک جانب روایتی معاشرہ اور سخت قوانین ہیں۔ وہیں دوسری جانب westren culture کا اثر بھی ہے لہذا دو مختلف تہذیبوں کے ٹکراؤ نے اس movement کو جنم دینے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ پاکستانی شاعری میں اس صورتِ حال کی نمائندگی فہمیدہ ریاض کشور ناہید، زہرا نگاہ، عشرت آفریں، یاسمین حمید اور سارا شگفتہ وغیرہ نے کی۔

زہرا نگاہ کے یہاں یوں تو ذاتی تجربات و احساسات بھی ہیں۔ سیاست کی گھات بھی اور محبت کا جذبہ بھی۔ انہوں نے ہر رنگ کو خوبصورتی اور ہنر مندی سے نبھایا ہے لیکن جب ان موضوعات سے ہٹ کر وہ صرف ایک عورت بن کر سوچتی ہیں تو آزادی، نسواں کا دل فریب جادو ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے اکثر مشرقی ممالک میں عورتوں کی تعلیم پر زور دیا گیا۔ ان کے تحفظ کے قوانین بنائے گئے۔ سرکاری نوکریوں میں فوقیت دی گئی مرد کے احساس برتری نے عورت کو کبھی برابری کا درجہ نہیں دیا جھوٹی آزادی کے نام پر اسے استعمال کیا گیا۔ خود عورت اپنے گرد کے رواجوں کے بندھن کو نہیں توڑ سکی۔ لہذا اس نے مرد کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ زندگی کو جینے کا ایک ایسا سمجھوتہ جس نے اس کی شخصیت کو مسخ کر دیا۔ "سوچتی ہوں اپنے راستے لوٹ جاؤں"، "ہمارے اور تمہارے راستے"، "بن باس"، "تراشیدم شکستم"، "جرمِ وعدہ" اور "سمجھوتہ" وغیرہ زہرا نگاہ کے انہیں جذبوں کی نمائندہ نظمیں ہیں:

ملائم گرم سمجھوتے کی چادر

یہ چادر میں نے برسوں میں بنی ہے
اسی سے میں بھی تن کو ڈھانک لوں گی
اسی سے تم بھی آسودہ رہو گے
نہ خوش ہو گے نہ پژمردہ رہو گے

مرے بچے
کہانی میں تھکی ہاری جو لڑکی تھی
وہ شہزادی نہیں تھی میں تھی
وہ جادو کا محل جو اک پل میں جل کے راکھ ہو گیا وہ مرا گھر تھا
جہاں آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی تھیں

خواب میرے تھے
میں جن میں گھر گئی تھی
غیر کیا سب میرے اپنے تھے

مرا احساس اور اقرار دونوں آج مجرم ہیں
اپنا سر جھکائے اپنی فردِ جرم سنتی ہوں
تمہیں معلوم ہے الزام کیا ہے
وہی وعدہ جو انسانوں کی تقدیر میں لکھا ہے
تحفظ کا، تمہاری آبرو کا، سربلندی کا (جرمِ وعدہ)

کشور ناہید کے اسلوب اور ذہنی رویے میں تلخی، غم و غصہ، احتجاج و انقلاب کا عنصر غالب ہے۔ کشور نے اپنی شاعری کا آغاز لبِ گویا سے کیا جو غزلیات پر مشتمل ہے لیکن انہوں نے اپنی شاعری کی بنیادیں بغاوت پر استوار کیں اور ہمیں مشرق کی اس نئی عورت سے واقف کرلیا جس کے یہاں محبت فنا ہو جانے والے جذبے کے بجائے اپنی ذات کا عرفان ہے اپنے زمانے کا درد ہے جو چاہت کو دیوانگی کا رنگ دے کر مرد کی ذات میں فنا ہونا نہیں چاہتی بلکہ اپنی پہچان اپنی ذات کے حوالے سے چاہتی ہے وہ زندگی کو صرف اور صرف اپنی نظر سے دیکھنا چاہتی ہے ۔

میں نظر آؤں ہر اک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اک آئینہ گر سے چاہوں
میں بدل ڈالوں وفاؤں کی جنوں سامانی
اسے چاہوں تو میں اپنی ہی خبر سے چاہوں

یہ شعر اس جدید عورت کی ترجمانی کر رہے ہیں جو زندگی کے بارے میں مرد کے ذہن سے نہیں بلکہ اپنے ذہن سے سوچ رہی ہے موجودہ صنعتی سماج میں ایک جاندار اور متحرک رول ادا کر رہی ہے۔ جس کے اندر زندگی کے تاریک اور روشن دونوں پہلوؤں کو جاننے اور سمجھنے کی جستجو ہے وہ صدیوں سے سسکتے ہوئے نسوانی وجود کو ایک پائیدار و جاندار پیکر اور حوصلہ وہمت عطا کرنا چاہتی ہے۔ اور فرسودہ نظامِ زندگی کو بدل کر ایک نئے اور مساوی سماج کی تشکیل کی آرزومند ہے۔ کشور کی شاعری اس طوفان کی آمد کا اعلان ہے جو سماج کے ضابطوں کو توڑ دینا چاہتا ہے۔ شرم و حیا کے پردے میں عورت کے استحصال اور مرد کی بالادستی پر ان کا قلم کھل کر چلتا ہے۔ علاوہ ازیں ازدواجی الجھنیں، شریکِ حیات کے ساتھ بھی تنہائی کا خوف اور تشنگی کا احساس صرف ان کی اپنی زندگی کا بیان نہیں ہے بلکہ ان جیسی بہت سی عورتوں کا قصہ ہے جو ان کے قلم سے درد

تو کہ جس کی مُنکوحہ ہے ایک بدن کے پاس بھرے
وہ اپنی دھوپ میرے آنگنوں میں پھیلا کر
سمجھ رہا ہے کہ میں حدت قرار میں ہو

کشور کا فن اور بغاوت دونوں ان کی نظموں میں بھرپور انداز میں ابھرتے ہیں۔ ان کی سر کشی اور خود آگہی ایک حساس عورت کو تقدیر پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنی قوت پر اعتبار کرنا سکھاتی ہے جو ہر ظلم کے آگے سر بلند رکھنا جانتی ہے جس کی نگاہیں اور سر کسی صاحبِ اقتدار کے آگے خم نہیں ہوتا۔

یہ ہم گنہ گار عورتیں ہیں
کہ سچ کا پرچم اٹھا کے نکلیں
تو جھوٹ سے شاہراہیں اٹی ملی ہیں
جو بول سکتی تھیں وہ زبانیں کٹی ملی ہیں
یہ ہم گنہ گار عورتیں ہیں
کہ اب تعاقب میں رات بھی آئے
تو یہ آنکھیں نہیں بجھیں گی۔
کہ اب جو دیوار گر چکی ہے
اسے اٹھانے کی ضد نہ کرنا

جدید شہری معاشرے میں مرد کا ہاتھ بٹانے کے لئے عورت بھی گھر کے باہر قدم نکال چکی ہے۔ لیکن کیا اس کی دوہری ذمہ داری اس کے وجود کو منوانے میں کامیاب رہی ہے دراصل یہ عورت گھر اور دفتر کے درمیان اس طرح بٹ گئی ہے کہ نہ تو خاندان کو مطمئن کر پاتی ہے اور نہ گھر کے باہر دوسرے لوگوں کو، اپنی انا اور خودداری کو رہن رکھنے کے باوجود تحقیر آمیز نظروں کا سامنا اس کا معمول بن چکا ہے۔ پروین شاکر نے اس صورتِ حال کو کشور سے ذرا ممتاز انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے لہجے میں وہ کاٹ نہیں جو سماجی ضابطوں کو تہس نہس کر دینا چاہتی ہے بلکہ بیانیہ اسلوب ہے جو گہرائی تک سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔

ہر صبح میرے شانوں پر
ذمہ داری کا بوجھ لیکن
پہلے سے بھی بھاری ہوتا ہے
پھر بھی میری پشت پہ

روز بروز نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔

نئی تانیثی شاعری کا یہ تیز و تند لہجہ اپنی انتہائی شکل میں فہمیدہ ریاض کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ ابتدائی کلام میں یہ انحرافی لہجہ کسی قدر دبا دبا تھا مگر آہستہ آہستہ انہوں نے کھل کر معاشرے کی ان اقدار کو ماننے سے انکار کر دیا جو زمانہ قدیم سے عورت کے استحصال کی وجہ بنی ہوئی تھیں۔ ان کا مجموعہ "بدن دریدہ" معاشرے کی اخلاقی اقدار پر ایک کاری ضرب ثابت ہوا جس نے اس دیمک زدہ سماج کی عمارت کو ہلا کر رکھ دیا یہ لہجہ اتنی خطرناک حد تک فہمیدہ ریاض سے قبل کسی کے یہاں دکھائی نہیں دیتا۔ لہٰذا اسی لئے ان کی شاعری کے حوالے سے ادبی حلقوں میں کافی لے دے ہوئی۔

عورت کے جنسی مسائل اور گھٹن کے جیتے جاگتے مرقعے ان کے کلام میں بکھرے نظر آتے ہیں۔ ان نظموں میں سیدھے سادے جنسی تجربات بھی ہیں اور مرد بنیاد معاشرے میں عورت کی بے وقعتی پر گہرے طنز کے ساتھ مردوں کے لئے ایک چیلنج بھی۔ اظہار میں یہ جسارت آمیز رویہ فہمیدہ ریاض ہی کا حصہ ہے ایک ایسے سماج میں جہاں احساس اور اظہار کی پرواز پر مذہب اور اخلاق کے جال پڑے ہوں فہمیدہ نے اپنی آواز تمام لوگوں تک پہنچا کر ان کے خوابیدہ شعور کو جھنجوڑنے کی کوشش کی ہے۔ "چادر اور دیواری" اور "باکرہ" یہ دونوں نظمیں اس رواج پر گہرا طنز ہیں جن میں پاکیزگی اور Virginity کا مطالبہ صرف عورت سے کیا جاتا ہے۔ اس پل صراط سے صحیح سلامت گزر جانے کے باوجود وہ مقام نہیں دیا جاتا جس کی وہ مستحق ہے۔

پاکستان کی جدید تانیثی شاعری میں یہ رجحان ایک باقاعدہ تحریک بن کر اُبھرا ہے۔ اس کے باوجود کہ موضوعاتی سطح پر اس کا کینوس محدود ہے۔ یہ رجحان اس لحاظ سے منفرد اور اہم ہے کہ اردو شاعری میں یہ اولین تجربہ ہے جس کے ذریعے عرصہ دراز سے نظر انداز کیے جانے والے مسائل کو نہ صرف شعری سطح پر قبول کیا گیا بلکہ اس کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی حالانکہ مخالفت کا پلڑا پھر بھی بھاری رہا چند ادبی حلقوں نے یا تو سرے سے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی یا پھر حقی تنقید کا سہارا لیا جو تنقید کم اور تنقیص زیادہ رہی۔

لغات

جیبی اردو انگریزی ڈکشنری 21/-
جیبی بیسک انگلش اردو ڈکشنری 15/-
آکسفورڈ پکچر ڈکشنری انگلش اردو ترتیب خواجہ احمد فاروقی 40/-
اردو ہندی لغت (ترجمہ کاری کے لیے مفید لغت) ابو محمد امام الدین رام نگری 35/-
ہندی اردو لغت ،، ،، ،، 35/-
بہار اردو لغت مکمل جلد فرہنگ نظمی سید یوسف الدین احمد نظمی 15/-
لغات کشوری یا مخزن عربی فارسی ترکی اور ہندی الفاظ نولکشور پریس مجلد، غیر مجلد 110/-
فیروز اللغات فارسی اردو الحاج مولوی فیروز الدین 300/-
بہار اردو لغت خدا بخش لائبریری احمد یوسف 100/-
عصری لغت اردو مرتبہ پروفیسر عبد الحق 500/-
لغات ابجد شماری جلد اول حصہ دوم سید احمد 129/-
اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری (عام ایڈیشن) مولوی عبد الحق 300/-
اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری (ڈی لکس) مولوی عبد الحق 400/-
اردو ہندی ڈکشنری انجمن ترقی اردو (ہند) 130/-
ایڈوانس ٹوینٹیتھ سنچری (انگلش اردو) بشیر احمد قریشی 180/-
اسٹینڈرڈ ٹوینٹیتھ سنچری (اردو انگلش) بشیر احمد قریشی 180/-
کنسائز ٹوینٹیتھ سنچری (انگلش اردو) بشیر احمد قریشی 75/-
کنسائز ٹوینٹیتھ سنچری (اردو انگلش) مخدوم صابری 85/-
جیم پاکٹ انگلش اردو ڈکشنری رضاء الحق بدخشانی 30/-
جیم پاکٹ اردو انگلش ڈکشنری رضاء الحق بدخشانی 35/-
جامع فیروز اللغات اردو مولوی فیروز الدین 325/-
فیروز اللغات جدید اردو مولوی فیروز الدین 85/-
جیبی تعلیم اللغات اردو مولوی فیروز الدین 35/-
منتخب تعلیمی عربی لغت (عربی اردو) سید جلال شاہ جعفری 50/-
قومی انگریزی اردو لغت (عام ایڈیشن) جمیل جالبی 1200/-
آسان لغات القرآن عبد الکریم پاریکھ 60/-
ایزی ڈکشنری آف دی قرآن عبد الکریم پاریکھ 100/-

فرہنگ عامرہ (عربی فارسی) مولوی محمد عبد اللہ خویشگی 90/-
القاموس الجدید (عربی اردو) وحید الزماں کیرانوی 175/-
،، ،، اردو عربی 200/-
لغات ابجد شماری جلد اول حصہ اول سید احمد 85/-
مصباح اللغات (عربی اردو) مولانا عبد الحفیظ 250/-
المنجد (عربی اردو) 300/-
ڈکشنری (ہندوستانی / انگریزی / انگریزی / ہندی) ڈاکنن فاربس 112/-
فرہنگ ادبی اصطلاحات کلیم الدین 27/-
فرہنگ اصطلاحات انسانیات (انگریزی اردو) قومی کونسل 4/50
فرہنگ اصطلاحات تاریخ وسیاسیات ،، 38/-
فرہنگ اصطلاحات حیوانیات (انگریزی اردو) ،، 12/-
فرہنگ اصطلاحات ریاضیات (انگریزی اردو) ،، 5/-
فرہنگ اصطلاحات فلسفہ، نفسیات اردو تعلیم (انگریزی اردو) ،، 30/-
فرہنگ اصطلاحات کیمیا (انگریزی اردو) ،، 8/-
فرہنگ اصطلاحات لسانیات (انگریزی اردو) ،، 20/-
فرہنگ اصطلاحات معاشیات (انگریزی اردو) ،، 10/-
فرہنگ اصطلاحات نباتیات (انگریزی اردو) ،، 15/-
فرہنگ سیاسیات محمد محمود فیض حسن علی جعفری 38/-
انگلش فارسی ڈکشنری (حصہ اول۔ دوم) ڈاکٹر عباس آریانپور کاشانی 800/-
جامع انگلش اردو ڈکشنری (اول) کلیم الدین احمد 400/-
جامع انگلش اردو ڈکشنری (دوم تا ششم) کلیم الدین احمد (فی جلد) 600/-
نور اللغات اول تا چہارم مولوی نور الحسن نیر 1095/-
مختصر اردو لغت قومی اردو کونسل 260/-
اردو انسائیکلوپیڈیا اول تا سوم پروفیسر فضل الرحمن 1200/-
اردو تصویری لغت شیاملا کاری 30/-
فرہنگ آصفیہ (اول تا سوم) مولوی سید احمد دہلوی (فی جلد) 750/-
ماڈرن پرشین اردو انگلش الف ہذی برازی 70/-
کریم اللغات فارسی اردو نولکشور پریس 38/-

اختر سعید خاں
اندرون اتوارہ بھوپال

غزل

مرنے نے روز روز کے جینا سکھا دیا
آج اس کا غم بھی ہم نے ہنسی میں اڑا دیا

ہم اس کے التفات کو سمجھے ہوئے تھے کیا
جھونکا تھا ایک نیند کا جس نے جگا دیا

کچھ میرے زخم دل نے کچھ اس کے سلوک نے
اک حرف آرزو کو فسانہ بنا دیا

ہوں شکوہ سنج زیست مگر اس کا کیا جواب
پوچھے جو زندگی کہ مجھے تو نے کیا دیا؟

جب اور کچھ نہ حسن خود آرا سے بن پڑا
ہر نقش اعتبار دلوں سے مٹا دیا

ہر چہرہ اجنبی نظر آنے لگا مجھے
کیا سوچ کر یہ دل نے کسی کو بھلا دیا

لے جا رہا ہے پھر وہیں اک شوق منفعل
پھر اک چراغ راہ میں اس نے جلا دیا

اختر اب اور چاہتی ہے کیا یہ زندگی
ہر سانس کا حساب تو میں نے چکا دیا

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ ۱، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶ فون: 6103381, 6103938 فیکس: 6108159

قومی اردو کونسل کی نئی مطبوعات کی فہرست

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
1	اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ	پروفیسر محمد حسن	۹۸/=
2	اردو ڈراموں کا انتخاب	پروفیسر محمد حسن	۱۵۰/=
3	اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	۲۰۰/=
4	اردو زبان کی تدریس	معین الدین	۴۰/=
5	تامل ناڈو میں اردو	علیم صبا نویدی	۳۵/=
6	جنت سنگار	پروفیسر سیدہ جعفر	۱۸۰/=
7	چکبست	رام لال نابھوی	۱۸/=
8	فکر و تحقیق (جنوری تا جون، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷، جنوری تا جون، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۸)	قومی اردو کونسل	۱۰۰/=
9	فیودور دستوئفسکی	ظ۔ انصاری	۸/۵۰
10	قومی تہذیب کا مسئلہ	پروفیسر سید عابد حسین	۵۴/=
11	لمعات بصیرت	رگھوناتھ کمی	۴۰/=
12	مسدود راہیں	زاہدہ زیدی	۳۶/=
13	لغات ایجر شماری ۱۹۹۷ جلد اول، حصہ دوم	سید احمد	۳۹/=
14	ہندوستان کا شاندار ماضی	اے۔ ایل۔ باشم / غلام سمنانی	۳۲۵/=
15	ہندوستانی مسلمان	پروفیسر محمد مجیب	۲۵۸/=
16	سفرنامہ فرہنگ سیر طالبی فی بلاد افرنجی	مرزا ابو طالب اصفہانی / ثروت علی	۳۲/=
17	اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ اول، دوم، سوم)	پروفیسر فضل الرحمن	۳۰۰/=
18	جامع انگریزی اردو لغت (H-S) (حصہ سوم، چہارم، پنجم)	پروفیسر کلیم الدین احمد	۱۸۰۰/=
19	جامع انگریزی اردو لغت (T-Z) (حصہ ششم)	پروفیسر کلیم الدین احمد	زیر طبع
20	نور اللغات (حصہ اول، دوم، سوم، چہارم) (پیپر ایڈیشن)	مولوی نور الحسن نیر	۱۰۴۵/=
21	ابتدائی سماجیات	ڈاکٹر محمد عبدالقادر قادری	۲/۲۵
22	تاریخ فلسفہ سیاست	پروفیسر محمد مجیب	۱۸/=
23	حیاتیات (حصہ دوم)	قومی اردو کونسل	۵/=
24	ہندوستان کی معاشی تاریخ (وکٹوریہ کے عہد حکومت میں 1837 تا 1900) (حصہ دوم)	رمیش دت / غلام ربانی تاباں	۲۱/=
25	سائنس کی تدریس (تجرباتی)	ڈی۔ این۔ شرما / آر۔ سی۔ شرما، غلام محی الدین	۸۰/=
26	سائنسی شعاعیں	ڈاکٹر اطہر حسین	۱۵/=
27	فن قلم تراشی	کیلاش چندر / افتخار خان	۲۲/=
28	کرلیو سائنس	طاہر عابدین	۲۵/=
29	شمسی نظام کے خلا و خوشبوئیں	امیر حسن نورانی	۳۲/=
30	قدرتی بجلی	ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی	۱۵/=
31	ننھی کہانیاں	قاضی مشتاق احمد	۱۲/=
32	[illegible]	جمیل اختر [illegible]	۹/=
33	[illegible]	ڈاکٹر اطہر حسین	۱۸/=
34	ننھے منے گیت	کیدار ناتھ کومل	۱۲/=
35	[illegible] کی مزید کہانیاں	[illegible]	۱۰/=
36	ہندوستان کی بزرگ ہستیاں	منظور حسین	۱۵/=
37	اصول طب	سید کمال الدین حسین ہمدانی	۴۲/=
38	[illegible] کی کہانیاں	رشید الدین خان	۷/۵۰
39	ذاتی حفظان صحت	مترجم [illegible] / [illegible]	۲۰/=
40	[illegible]	[illegible]	۴۰/=
41	حشریات	[illegible]	۱۲/=
42	عرب لوک کہانیاں	ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی	۲۳/=
43	[illegible]	اے۔ سی۔ [illegible]	۵۴/=
44	[illegible]	ظ۔ انصاری	۲۰/=
45	درسی لغت	قومی اردو کونسل	۲۵/=
46	[illegible]	[illegible]	۲۰/=

ڈاکٹر گیان چند
3262 OAK LEAF
CHINO HILLS - CA 91709
U S.A
E mail: gianchand@e-ol.com

خود نوشتہ دیوان غالب اور الزامِ جعل سازی

رسالہ کتاب نما دہلی بابت فروری ۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ کا ایک مضمون "بیاضِ غالب کی بحث" آیا ہے جس میں موصوف نے رسالہ غالب نامہ دہلی، عرشی نمبر، بابت جنوری ۱۹۹۲ء میں شامل میرے مضمون "بیاض غالب تحقیقی جائزہ، کا تحقیقی جائزہ" کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ مضمون اصلاً رسالہ اردو ادب شمارہ ۳، ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد میرے مجموعہ، مضامین رموزِ غالب (۱۹۷۶ء) میں شامل ہوا۔ تیسری بار یہ ۱۹۹۲ء میں رسالہ غالب نامہ میں آیا۔ میں ایک بار پھر واضح کر دوں کہ مجھ سے کسی نے غالب نامے کے اس خصوصی شمارے کے لیے لکھنے کی فرمائش نہیں کی۔ یہ مضمون میرے علم کے بغیر شامل کیا گیا اور مجھے پرچے کی ایک کاپی بھی نہ بھیجی گئی۔ کئی سال بعد مجھے غالب نامے کا یہ شمارہ دیکھنے کو ملا۔

میری رائے میں عرشی نمبر میں اس مضمون کی شمولیت کا کوئی جواز نہیں۔ یہ مضمون ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کی ایک کتاب کے بارے میں ہے، عرشی صاحب کی کسی کتاب پر نہیں۔ اگر غالب نامے کا کمال احمد صدیقی نمبر نکل رہا ہوتا تو میرے مضمون کو شامل کرنا مناسب تھا، یہ صورت موجودہ نہیں۔ میرے مضمون کا موضوع دیوانِ غالب کا وہ مخطوطہ ہے جو ۱۹۶۹ء میں بھوپال میں نمودار ہوا۔ چونکہ اس مخطوطے کو عرشی صاحب نے مرتب نہیں کیا، انھوں نے اس کے بارے میں بحث میں حصہ نہیں لیا، اس لیے اس نمبر سے متعلق مضمون کو عرشی نمبر میں شائع کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ رموزِ غالب میں شامل میرے دو مضامین دیوانِ غالب نسخۂ عرشی سے متعلق ہیں، ان میں سے کسی کو لیا جاسکتا تھا، لیکن ایسا ہی کیوں، مجھ سے کوئی نیا مضمون کیوں نہ لکھایا جاتا۔ نسخۂ عرشی کی ترتیب سے متعلق کچھ معمولی علمی اختلافات کے باوجود میں عرشی صاحب کو نہ صرف ایک عظیم محقق اور عظیم ماہرِ غالبیات مانتا ہوں بلکہ اپنے معاصر اہلِ اردو میں انھیں شریف ترین انسان قرار

دیتا ہوں۔ ان کے خوردوں میں سید احتشام حسین ایک نہایت شریف انسان تھے اور ان سے پہلے کی نسل میں مولانا حالی۔ اردو میں حالی اور عرشی جیسے نیک انسان زیادہ نہ ملیں گے۔
مجھے عرشی صاحب سے جو عقیدت وارادت ہے وہ ع دل من داند و من دانم و داند دل من
نسخۂ دیوان غالب کی بحث ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۲ء تک زوروں سے چلی۔ اس کے ہر پہلو کو اچھی طرح دُھن لیا گیا۔ معلوم نہیں ڈاکٹر انصار اللہ کیوں اس مردہ گھوڑے کو درّے لگا کر چلانا چاہتے ہیں۔ میرے پاس اس موضوع سے متعلق کہنے کو کوئی نیا نکتہ نہیں۔ پھر بھی چونکہ وہ مجھے مہمیز کر رہے ہیں اس لیے پہلے کی کہی ہوئی دو ایک باتوں کو تفصیل سے کہوں گا۔ ۲۹ سال بعد اس بحث میں پڑنے کو میں اپنے لیے تضیع اوقات سمجھتا ہوں۔ جب تک کوئی مجبوری نہ ہو، مزید نہ لکھوں گا۔
میں نے غالبیات کے بڑے محققین کی تقلید میں نسخۂ ۱۹۶۹ء کو غالب کا کلام اور غالب کی تحریر قرار دیا تھا۔ انصار اللہ اسے غالب کا کلام نہیں مانتے۔ پہلی بار انھوں نے کمال احمد صاحب کی کتاب پر میرا مضمون پڑھنے پر کوئی شدید ردّ عمل ظاہر نہیں کیا، اب کی بار ان کا لہجہ بدلا ہوا ہے۔ ان کے فروری ۱۹۹۸ء کے مضمون کے بعد میں نے اپنے مراسلے میں کہا تھا کہ امریکہ میں ابھی میری کتابیں نہیں آئیں اس لیے کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ چونکہ اب آگئی ہیں اس لیے عرض کرنا فرض ہے۔ میں اشعار کا جزیاتی تجزیہ کرنے کے بجائے دو تین موٹی باتوں پر اکتفا کروں گا۔
اس مخطوطے کو غالب کا کلام نہ ماننےوالوں کا شدومد سے اصرار ہے کہ اسے ۱۹۶۹ء سے کچھ ہی پہلے کسی جعل ساز نے تیار کیا۔ آیئے اس کو دریافت کرنے والوں اور دریافت کی توقیت کی یاد تازہ کرلیں۔ ۱۹۶۹ء میں مجھے یہ تفصیلات نوکِ زبان پر تھیں۔ امریکہ میں بہت کم کتابیں اور رسالے لاسکا ہوں اس لیے دوستوں سے مراسلت کے ذریعے اس کی تلافی کی۔ نسخۂ عرشی زادہ کے ابتدایئے میں اکبر علی خاں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا طویل اقتباس شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے مجھے انٹر نیٹ کی ای میل کے ذریعے بھیجا۔ نقوش بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء بیاض غالب میرے پاس ہے۔ اس میں نثار احمد فاروقی نے تفصیل دی ہے، عجیب بات ہے کہ دونوں حریفوں: عرشی زادہ اور نثار احمد نے دوسرے کا نام بالکل غائب رکھا ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے ہماری زبان بابت یکم جولائی ۱۹۶۹ء میں بھوپال سے معلومات حاصل کرکے ایک مراسلہ لکھا۔ اس کا ضروری اقتباس عزیزی آفاق احمد نے بھوپال سے بھیجا۔ شمس الرحمٰن فاروقی اور آفاق احمد صاحبان کا ممنون ہوں۔ تینوں ماخذ کو

سو کر دریافت کی کہانی کچھ یوں ملتی ہے۔

بھوپال کے تاجر کتب قاری شفیق الحسن خان فضلی نے حیدر شیر خاں عرف پٹھان کباڑی سے ایک قلمی جلد ڈھائی روپے میں خریدی۔ ان سے امروہے کے قدیم کتب کے تاجر حافظ توفیق احمد چشتی قادری نے ۲؍ اپریل ۱۹۶۹ء کو (بقول نثار صاحب ۵؍ اپریل) گیارہ روپیوں میں خریدی۔ اس جلد میں غالباً تین کتابیں تھیں: دیوان غالب، قصہ لیلیٰ مجنوں اور فارسی مکتوبات۔ قصہ لیلیٰ مجنوں کے آخر میں تاریخ کتابت ۱۸۲۵ء درج تھی۔ مخطوطے کو لے کر توفیق احمد دہلی روانہ ہو گئے اور ۷؍ اپریل ۱۹۶۹ء کے اخبار الجمعیۃ میں اشتہار دیا کہ میرے پاس غالب کے اپنے قلم سے لکھا ہوا نسخۂ دیوان موجود ہے ...... اس کی قیمت کم از کم چھ ہزار روپے ہوگی۔ کسی نے توفیق احمد کے دعوے پر اعتبار نہ کیا کہ ان کا نسخہ بخط غالب ہے۔

۱۳؍ اپریل ۱۹۶۹ء کو اسٹیٹ آرکائوز الہ آباد کے ایک افسر جلال الدین اپنے کسی نجی کام سے امروہہ آئے اور توفیق احمد سے مل کر اس نادر نسخے کو بھی دیکھا۔ چونکہ ترقیمے کی عبارت سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ مخطوطہ بخطِ غالب ہے اس لیے وہ مخطوط کے اول و آخر کے دو صفحوں کے عکس لے کر ۱۴؍ اپریل کو مولانا عرشی سے تصدیق چاہنے کی غرض سے رام پور پہنچے۔ مولانا عرشی نے فرمایا مخطوطہ بخط غالب ہی معلوم ہوتا ہے مگر صحیح قدر و قیمت، زمانۂ ترتیب و نقل اور تاریخی اہمیت کے بارے میں اس وقت تک کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی جب تک اصل سامنے نہ ہو اور اس کا تفصیلی جائزہ نہ لیا گیا ہو" (نسخہ عرشی زادہ، ستمبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۲)

جلال الدین نے ۱۶؍ اپریل کو اس نسخے کی دریافت کی خبر پریس ٹرسٹ آف انڈیا کو بھیج دی جو ۱۷؍ اپریل کے انگریزی، اردو، ہندی اور دوسری زبانوں کے اخباروں میں چھپی اور اسی دن ریڈیو سے نشر ہوئی۔ نثار احمد فاروقی امروہے کے توفیق احمد کے ہم وطن ہیں۔ نثار صاحب کے بقول انھوں نے ۱۶؍ اپریل کو توفیق احمد کو خط لکھا کہ وہ نسخہ لے کر دہلی آجائیں یا انھیں امروہہ بلا لیں۔ ۱۷؍ اپریل کو توفیق دہلی پہنچے اور نثار صاحب کو مخطوطہ دکھایا۔ انھوں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ غالب ہی کے قلم سے ہے۔ توفیق احمد نے انھیں اس نسخے سے استفادے کی اجازت دی۔ نثار صاحب نے نسخے کے بخط غالب ہونے کی تصدیق ہماری زبان (علی گڑھ) بابت ۲۲؍ اپریل میں چھپوائی اور لوح اور ترقیمے کی عبارت بھی دے دی۔ ایک اور مراسلہ ۲۳؍ اپریل کے الجمعیۃ میں دیا۔ اکبر علی خاں اپنے ایڈیشن کے

ابتدائیے میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ مالک مخطوطہ خود اسے عرشی صاحب کے ملاحظے کے لیے رام پور لانے کی اطلاع دے چکے تھے مگر کسی ذاتی مجبوری کی بنا پر نہ جا سکے۔ یکم مئی کو پروفیسر آل احمد سرور کے حسب حکم وار شاد عرشی زادہ امروہے گئے اور مخطوطے کو اپنے ساتھ رام پور لے آئے۔ یہاں دس بارہ روز میں اس کا مطالعہ کیا اور اس کے نتیجے میں حاصل شدہ معلومات مولانا عرشی کے حضور میں ملاحظے کے لیے پیش کیں۔ چونکہ مالک مخطوطہ کی درخواست تھی کہ مولانا عرشی نسخے کے بارے میں اظہار خیال کریں اس لیے ان معلومات کے پیش نظر مولانا نے ایک مضمون بھی سپرد قلم فرمایا۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ توفیق احمد کا نثار احمد فاروقی اور اکبر علی خاں سے کوئی معاہدہ ہوا یا آخر الذکر دونوں حضرات نے توفیق کی اجازت کے بغیر یہ نسخہ چھاپ دیا۔ میرا خیال ہے کہ نثار احمد فاروقی نے اس کی کئی فوٹو کاپیاں بنوالیں۔ اس زمانے میں غالباً زیراکس مشین نہیں آئی تھی، کیمرے سے فوٹو بنوانا کافی مہنگا پڑتا ہوگا۔ جولائی ۱۹۶۹ء میں میں دہلی میں نثار صاحب سے ملا۔ انھوں نے ازراہِ لطف خاص اس کبریت احمر کی ایک کاپی مجھے لاگت کی رقم خطیر کے عوض عنایت کی، اس شرط کے ساتھ کہ جب تک یہ نسخہ شائع نہ ہو جائے میں اس کے بارے میں کچھ بھی کہیں شائع نہ کروں۔ اشاعت سے پہلے چونکہ میں کچھ لکھ تو سکتا نہ تھا اس لیے اطمینان سے نسخے کا ایک ایک لفظ پڑھا اور اس کا نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ عرشی سے مقابلہ کیا۔

عرشی زادہ صاحب نے ستمبر ۱۹۶۹ء کے وسط میں "دیوانِ غالب بخط غالب، نسخۂ عرشی زادہ" کے نام سے شائع کر دیا۔ پروفیسر سرور ۲۵ر ستمبر ۱۹۶۹ء کو یا اس کے ایک آدھ دن ادھر ادھر اس کی ایک کاپی لے کر امریکہ پہنچے۔ نثار صاحب کا مرتبہ نسخۂ نقوش لاہور میں "بیاض غالب بخط غالب" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے طویل عالمانہ مقدمے کے آخر میں اپریل ۱۹۶۹ء درج ہے۔ نقوش کے شمارے پر اکتوبر ۱۹۶۹ء کا مہینہ لکھا ہے۔ مجھے مدیر نقوش طفیل صاحب نے جو کاپی اپنے دستخط سے بھیجی ہے اس پر ۲۶ر فروری ۱۹۷۰ء کی تاریخ درج ہے۔ میرا خیال ہے کہ نثار صاحب کا اتنا گہرے مطالعہ والا مقدمہ اپریل میں مکمل نہیں ہو سکتا، کافی عرصے کے بعد ہوا ہوگا۔ طفیل صاحب نے بھی شمارے کی طباعت کے ساتھ مجھے جلد از جلد عنایت کیا ہوگا، اس لیے اس کی طباعت فروری ۱۹۷۰ء یا جلد از جلد جنوری ۷۰ء میں ہوئی ہوگی۔

نسخۂ عرشی زادہ کی اشاعت کی خبر ملنے پر میں نے ہماری زبان بابت ۸ر نومبر ۱۹۶۹ء

میں اپنا مضمون "غالب کا خود نوشت دیوان" چھپوایا۔ اس طرح اس نسخے کی طباعت سے قبل اس کا مفصل مطالعہ کرنے والوں میں مولانا عرشی، اکبر علی خاں عرشی زادہ اور نثار احمد فاروقی کے بعد میں چوتھا آدمی ہوں۔ دونوں ایڈیشنوں کی اشاعت کے بعد میں نے اپنے پاس والی فوٹو کاپی جموں یونیورسٹی لائبریری کو اسی قیمت پر دے دی جو میں نے ادا کی تھی۔ مجھے علم نہیں کہ توفیق احمد کو دونوں ناشروں سے کوئی رقم ملی کہ نہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ بھوپال کے شفیق الحسن نے توفیق احمد پر مقدمہ دائر کردیا جس کے نتیجے میں تا حکم ثانی نسخے کی اشاعت اور فروخت پر امتناع کردیا گیا۔ آخر کار مقدمے میں شفیق اور توفیق کے بیچ نسخے کی پانسو روپے قیمت پر تصفیہ ہوا۔ توفیق نے یہ قیمت ادا کردی۔ اس کے بعد توفیق احمد نے مولانا عرشی کے خلاف سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے ایک پوسٹر نکالا جس میں ایک الزام یہ تھا کہ ان کے گھر سے نسخہ واپس نہیں مل رہا ہے۔ آخر کار نسخہ غائب ہو گیا۔ عدالت کے حکم کی وجہ سے نسخۂ عرشی زادہ بھی بازار سے اٹھ گیا۔ نقوش چونکہ ملک غیر میں تھا اس لیے دستیاب ہوتا رہا۔

اس کے کچھ عرصے بعد میں نے اکبر علی خاں عرشی زادہ کو لکھا کہ جموں یونیورسٹی کے لیے کہیں سے نسخۂ عرشی زادہ کی ایک کاپی دلوا دیجیے۔ انھوں نے عدالتی حکم کو نظر میں رکھ کر جواب دیا کہ میرے پاس تو ہے نہیں، میں کہیں سے تلاش کروں گا۔ اس کے بعد غالباً دلی کے کسی ماخذ سے یونیورسٹی کو ایک جلد ۳۰۰ روپیوں میں دلادی۔ اس پر انھوں نے دستی تحریر میں مجھے خطاب کرکے مصرع لکھا ع

خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دینا

اور واقعی اس تدوین کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ اس نسخے میں مرتب نے مقدمے اور حواشی میں بھی دستی تحریر میں اضافے کیے ہیں۔ کاش اس وقت میں اپنے لیے بھی ایک جلد خرید لیتا، آخر اتنی ہی رقم میں میں نے کچھ سال پہلے اس کی فوٹو کاپی حاصل کی تھی۔

چونکہ جلال الدین نے نسخے کی دریافت کا دعوا کیا تھا، اس لیے نثار احمد فاروقی نے ان کے خلاف ایک سخت مراسلہ شائع کیا۔ اسی طرح اکبر علی خاں عرشی زادہ کے خلاف ہماری زبان میں ایک سخت مضمون "چور جاتے رہے کہ اندھیاری" کے عنوان سے لکھا۔ اس میں یہ مصر کے کا شعر بھی جڑ دیا تھا۔ ہمیں پر حضرت واعظ کی برق وعظ گرتی ہے بھبرستے ہیں فقط فرہاد پر، خسرو سے ...... یہ سب میں یادداشت کے بل پر لکھ رہا ہوں۔

میں اس نسخے کے لیے اصرار نہیں کر سکتا کہ یہ غالب ہی کے قلم سے ہے۔ میں غالب کے خط کا عارف نہیں۔ ماہرین غالبیات کی تحریروں اور پرتھوی چند کے مرقع غالب میں شامل خطوں کو دیکھ کر کچھ شد بد ہو گئی ہے۔ چونکہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور جناب مالک رام جیسے ماہرین غالبیات نے شہادت دی کہ یہ غالب کی تحریر ہے اس لیے میں اس کا قائل ہو گیا۔ مجھے ایک لفظ کا املا بڑے کام کا دکھائی دیا۔ نقوش ص ۲۸۰ پر ایک لفظ "کسافتہا" لکھا ہے۔ نثار احمد فاروقی اس کے بارے میں حاشیہ لکھتے ہیں "غالب نے کثافت کی جگہ کسافت لکھا ہے" (ص ۳۱۲) یہ غالب کا سہو نہیں، شعوری تحریر ہے۔ کاتب نسخہ اس لفظ کا صحیح املا جانتا تھا جیسا کہ ص ۴۷ پر 'لطافت بے کثافت' والے شعر میں لکھا ہے۔ املا کسافتہا سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے کا مکتوبہ ہے۔ قدیم مخطوطوں میں لفظ مثنوی کو زیادہ تر "مسنوی" لکھا جاتا ہے، مثنوی لکھنا بہت شاذ ہے اور یہ املا جاہل کاتب کا نہیں، عالموں کا بھی ہے۔ میرے پردادا حکیم پدم سین طب کی درس و تدریس کے سلسلے میں تین سال افغانستان میں مقیم رہے۔ ان کی ۱۸۵۱ء کی کتابت کی ہوئی مثنوی اہل شیرازی کے ترقیمے میں اس لفظ کو "مسنوی" لکھا ہے۔

میں نے ایک بزرگ عالم سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ انھوں نے تاویل کی کہ اگلے زمانے میں س، ش کی طرح درمیانی ث کو بھی شوشوں کے بجائے طویل کشش سے لکھ دیتے تھے اور چونکہ اس زمانے میں نقطے لگانے کی پابندی نہیں کی جاتی تھی اس لیے ث کو بھی لمبی کشش کے ساتھ نقطے حذف کر کے لکھ دیا جاتا تھا۔ اس لفظ میں م اور ث کے جوڑ میں شوشہ نہ لگا کر "مسنوی" ہی ملتا ہے "معنوی" نہیں۔ "کسافتہا" کو "کسافتہا" نہ لکھنے سے ظاہر ہے کہ کاتب نے اسے س سے نہیں ث کشیدہ سے لکھا ہے۔ صرف اس خصوصیت کی وجہ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کی کتابت غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے کی ہے۔ یہ غالب کا خط ہو کہ نہ ہو لیکن اس کا کلام غالب ہی کی تخلیق ہے، اس پر میں اطمینان رکھتا ہوں۔ اس کی دو خصوصیتیں طالب توجہ ہیں۔

(۱) اس میں بلا مبالغہ سیکڑوں مصرعوں کا متن اس کے فوراً بعد کے قدیم ترین نسخے، نسخۂ حمیدیہ کی اصل سے مختلف ہے یعنی بیشتر صورتوں میں فرسودہ ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کا متن غالب کے ذہنی ارتقا کے اعتبار سے ترقی یافتہ ہے۔ اس سلسلے میں پاکستان کے ماہر غالبیات سید قدرت نقوی کا مضمون "غالب کا ذہنی ارتقا" ملاحظہ ہو جو ان کے فاضلانہ مجموعے "نسخۂ شیرانی اور دوسرے مقالات" (مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۸۸ء) میں شامل

ہے۔ اس میں انھوں نے متعدد جگہ خود نوشت نسخے اور حمیدیہ کی اصل میں بھی فرق دکھلایا ہے۔ اس تقابل کی پوری تفصیل نقوش بیاض غالب میں متن کے بعد کی تعریفات میں ملاحظہ ہو (ص ۲۹۹ تا ۳۱۲) جس میں کئی سو مثالیں ہیں۔ میں ان میں سے محض چند کو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ اس میں پہلے کالم میں نقوش کے شمارے کا نمبر اور دوسرے کالم میں مرتب بیاض کی تقلید میں نسخۂ عرشی کا نمبر دے رہا ہوں۔ دم تحریر میرے سامنے نسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی انوار الحق، طبع اول موجود ہے لیکن چونکہ نسخہ عرشی کا متن صحیح تر ہے، اس لیے اسے ترجیح دیتا ہوں۔ واضح ہو کہ نیا شعر کہنے کے مقابلے میں اصلاح دینے کا عمل دشوار تر اور غالب کے رنگ میں اصلاح معکوس (تخریب؟) دشوار ترین ہے۔

نسخہ بخط غالب	نسخۂ عرشی
ص ۵۱ آتشیں پا ہوں، گداز وحشتِ زنداں نہ پوچھ	ع ۱۳۲ بلکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یہاں زنجیر کا	موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا
۵۱ نعل در آتش ہے تیغ یار سے نخچیر کا	ع ۱۱ نعل آتش میں ہے تیغ یار سے نخچیر کا
۵۳ خرام ناز برق حاصل سعی سپند آیا	ع ۱۲ خرام ناز برق خرمن سعی سپند آیا
۵۳ تغافل بد گمانی ہا، نظر بر سخت جانی ہا	ع ۱۱ تغافل، بد گمانی، بلکہ میری سخت جانی سے
۵۵ اسد خاک درِ میخانہ ہا بر فرق پاشیدن	ع ۲۲ اسدِ خاک درِ میخانہ اب سر پر اڑاتا ہوں
خوشا روزے کہ آب از ساغرِ تا بزانو تھا	گئے وہ دن کہ پانی جام سے زانو زانو تھا
۵۹ غریبی (غریبے) بہر تسکین ہوس درکار ہے ورنہ	ع ۲۳ غریبی بہر تسکین ہوس درکار ہے ورنہ
بوہم زر گرہ میں باندھتے ہیں برق حاصلہا	بوہم زر..... حاصلہا
۵۹ نہیں در پردہ حسن از کوشش مشاطگی غافل	ع ۲۳ کرے ہے حسن خوباں پردے میں مشاطگی اپنی
۶۷ انتظار زلف میں شمشاد ہم دست چنار	ع ۲۵ انتظار جلوۂ کاکل میں ہر شمشاد باغ
تقلیدِ شکل مژگاں از نمودِ شانہ تھا	صورت مژگان عاشق صرف عرضِ شانہ تھا
۲۵۵ عبادت بلکہ تج سے گرمی بازار بستر ہے	ع ۲۱۲ خوشا اقبال رنجوری، عیادت کو تم آئے ہو
فروغ شمع بالیں طالع بیدار بستر ہے	فروغ شمع..... بستر ہے
۲۷۱ عزیزاں گرچہ بہلاتے ہیں ذکر وصل سے لیکن	ع ۸۴ عزیزو ذکر وصل غیر سے مجھ کو نہ بہلاؤ
مجھے افسون خواب، افسانۂ خواب زلیخا ہے	کہ یاں افسون خواب..... زلیخا ہے
۲۷۱ کہ یہاں کف بر لب پیمانۂ [illegible] تقاضا ہے	ع ۸۴ کہ جام بادہ کف بر لب بہ تکلیف تقاضا ہے

۱۷۷ نہ ہو گر جوشِ اشک، آئینہ در آبلہ خفتن — ۱۸۵ نہ سووے آبلوں میں گر سرشکِ دیدۂ نم سے
بجولاں گاہِ مطلب ہا نگاہِ عاجزاں پا ہے — بجولاں گاہِ نومیدی نگاہِ عاجزاں پا ہے

(۲) دوسری خصوصیت اس کے ۱۸۸ غیر مطبوعہ شعر ہیں: ۱۶۴ اردو کے اور ۲۴ فارسی کے۔ نمونے کے طور پر میں ضرورت سے زیادہ اشعار درج کر رہا ہوں جس کا مقصد ان کا انتخاب پیش کرنا بھی ہے۔ ان کا لطف لینے کے لیے بہتر ہو گا کہ میری شرح تفسیر غالب میں ان کا مطلب پیش نظر رکھا جائے۔

جن اشعار کے پہلے میں نے صحیح کا نشان لگایا ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ میری رائے میں یہ اشعار بہتر ہیں۔ شعروں کے شروع میں صفحے کا نمبر نقوش کی بیاض غالب کا ہے۔

ص ۷۳	خیالِ شربتِ عیسیٰ گدازِ تر جبینی ہے	اسدا ہوں مست، دریا بخشی ساقی کوثر کا
۸۱	خوشا عیدے کہ عاشق جل بجھے جوں شعلۂ خامش	کہ کم از سرمہ اس کا مشتِ خاکستر نہیں ہوتا
۹۱✓	شب کہ وہ گل باغ میں تھا جلوہ فرما اے اسد	داغِ مہ جوشِ چمن سے لالۂ مہ ہو گیا
۹۷✓	عیاں کیفیت مے خانہ ہے جوئے گلستاں میں	کہ مے عکسِ شفق ہے اور ساغر ہے حباب اس کا
۹۹	نہ دیجے پاسِ ضبطِ آبرو وقتِ شکستن بھی	تجمل پیشۂ تمکین رہیے آئنہ آسا
۱۱۹	ہر چند امید دور تر ہو	اے حوصلہ، سعی بیشتر کر
۱۱۹✓	افسانہ، اسد! بایں درازی	اے غم زدہ قصہ مختصر کر
۱۶۵✓	ادب نے سونپی ہمیں سرمہ سائیِ حیرت	زبانِ بستہ و چشمِ کشادہ رکھتے ہیں
۱۷۷✓	ضمانِ جادہ ردیا ندن ہے خطِ جامِ مے نوشاں	وگرنہ منزلِ حیرت سے کیا واقف ہیں مدہوشاں
۱۷۷✓	بہ ہنگامِ تصور ساغرِ زانو سے پیتا ہوں	مے کیفیتِ خمیازہ ہائے، صبحِ آغوشاں
۱۷۷✓	پریشانی، اسد! در پردہ ہے سامانِ جمعیت	کہ ہے آبادیِ صحرا، ہجومِ خانہ بر دوشاں
۱۷۷	خراب آبادِ غربت میں عبث افسوس ویرانی	خوشا، اے غفلت آگاہاں! نفس دزدین و مردن
۱۷۷✓	دریغا بستنِ رختِ سفر سے ہوئے ہیں غافل	رہا پامالِ حسرت ہائے، فرشِ بزمِ گستردن
۱۷۹	بسکہ شرمندہ بوئے خوشِ گل رویاں ہے	نکہتِ گل کو ہے غنچے میں نفس دزدیدن
۱۷۹✓	چمنِ دہر میں ہوں سبزۂ بیگانہ اسد	وائے اے بے خودی و تہمتِ آرامیدن
۱۸۱✓	رہنے دو گرفتار بہ زندانِ خموشی	چھیڑو نہ مجھ افسردۂ دزدیدہ نفس کو
۱۸۱	پیدا ہوئے ہیں ہم الم آبادِ جہاں میں	فرسودنِ پائے طلب و دستِ ہوس کو
۱۸۷✓	کرے کیا دعویِ آزادیِ عشق	گرفتارِ الم ہائے زمانہ

۱۸۹✓ اسد اندیشہ ششدر شدن ہے — نہ بگڑے ہے مہرہ ساں خانہ بہ خانہ

۱۹۵ کرے ہے رہرواں سے خضرِ راہِ عشق جلادی — ہوا ہے موجِ ریگِ رواں، شمشیر فولادی

۱۹۵ چنار آسا عدم سے بادلِ پُر آتش آیا ہوں — تہی آغوشیِ دستِ تمنا کا ہو فریادی

۱۹۵ اسد از بسکہ فوجِ درد و غم سرگرم جولاں ہے — غبارِ راہِ ویرانی ہے ملکِ دل کی آبادی

۲۰۱ آنکھوں میں انتظار ہے، جاں پُر شتاب ہے — آتا ہے آ، وگرنہ یہ پا در رکاب ہے

۲۰۳ دیکھ اے اسد! بہ دیدۂ باطن کہ ظاہرا — ہر ایک ذرہ غیرتِ صد آفتاب ہے

۲۱۷✓ از دلِ ہر دردمندے جوشِ بے تابی زدن — اے ہمہ بے مدعائے! یک دعا ہو جایئے

۲۶۳ اس قامتِ رعنا کی جہاں جلوہ گری ہے — تسلیم فروشی روشِ کبکِ دری ہے

۲۶۳ ہم آئے ہیں غالب رہِ اقلیمِ عدم سے — یہ تیرگیِ خاک، لباسِ سفری ہے

۲۷۱✓ وہ نہا کر آبِ گل سے سایۂ گل کے تلے — بال کس گرمی سے سکھلاتا تھا سنبل کے تلے

۲۷۳ ہے پرافشانِ طپیدن ہا بہ تکلیفِ ہوس — ورنہ صد گلزار ہے یک بالِ بلبل کے تلے

۲۷۷ ہے بسملِ ادائے چمن عارضاں بہار — گلشن کو رنگِ گل سے ہے درخوں طپیدگی

۲۸۱ اسد! ہنستے ہیں میرے گریہ ہائے زار پر مردم — بھرا ہے دہر بے دردی سے، دل کیجیے کہاں خالی

۲۸۵✓ تماشائے جہاں مفتِ نظر ہے — کہ یہ گلزارِ باغِ رہگذر ہے

فارسی رباعیات

۲۸۹ اے رونقِ مدعائے تمکیں! مددے
اے قبلہ و قبلہ گاہِ ایماں! نظرے
جان و دل خاتم النبیین! مددے
وے خانہ خدائے کعبۂ دیں! مددے

۲۹۱✓ ندرت کشش بہ کارگاہِ ایماں! نظرے
گردد ز تحیر فسوں پردازی
گر خوابِ دمد نقش، بیالد تعبیر
بالِ قلمش، نگہ بہ چشمِ تحریر

۲۹۱ ایں بادہ کہ از میکدۂ جم آمد
بہر چہرہ نامِ خویش صاد بے کردم
پیمانۂ عشرتِ دو عالم آمد
یعنی ایں جا بہ چشم خواہم آمد

۲۹۲✓ گفتم: کہ اسد؟ گفت: دلِ آشفتۂ من
گفتم: سخنش، بایں نزاکت، گفتن؟
گفتم: نقش اے؟ گفت: بخوں خفتۂ من
گفت: ایں ہمہ مدعائے ناگفتۂ من

جو حضرات اس دیوان کو کسی جعل ساز کا کام قرار دیتے ہیں وہ کھل کر سامنے آئیں۔

---

1 مرتب نے نقش ص [illegible] ص ۸ [illegible] پر اس لفظ کو نقش لکھا ہے لیکن نسخے کے عکس میں ص ۲۹۲ پر صاف
[illegible]

اور بتائیں کہ ان کے قیاس میں یہ کس کلاکار کا کارنامہ ہے۔ اس کی ابتدائی دریافت سے شفیق احمد، توفیق احمد، جلال الدین اور نثار احمد فاروقی صاحبان کا تعلق ہے۔ بعد میں عرشی صاحب اور عرشی زادہ بھی اس سے متعلق ہو گئے۔ ان چھے حضرات میں اول الذکر دو ادبی شخصیتیں نہیں۔ جلال الدین آرکاوز کے افسر تھے، انھیں اردو ادب کا کتنا عرفان ہے، مجھے معلوم نہیں: عرشی صاحب، عرشی زادہ اور نثار احمد فاروقی تینوں ادیب ہیں، محقق ہیں، ماہر غالبیات ہیں۔ اگر نسخہ جعلی ہے تو اس کارنامے کی دو منزلیں ہوں گی۔: اول یہ کہ دیوان تخلیق کرنا، دوسرے یہ کہ تخلیق کار کا دوسرے ایک دو آدمیوں کی مدد سے اسے برآمد کرنا۔

یہ طے ہے کہ نسخے کا کلام ایک شخص کی تخلیق ہے۔ اس کے تخلیق کار میں دو خوبیاں ہونی چاہیں (۱) وہ ماہر غالبیات ہو، (۲) وہ فکر و فن کے لحاظ سے غالب جیسا شاعر ہو۔ شفیق، توفیق اور جلال الدین شاعر نہیں۔ نثار احمد فاروقی پہلے شاعر نہ تھے، اب کچھ برسوں سے شعر کہنے لگے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اکبر علی خاں عرشی زادہ بھی برائے نام شاعر تھے۔ میں نے کبھی ان کا کلام تو نہیں دیکھا لیکن تین چار سال پہلے میرے زمانہ قیامِ لکھنؤ میں وہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے اور میرے غریب خانے پر بھی تشریف لائے تھے۔ مولانا امتیاز علی خاں کے پاس عرشی تخلص ہے لیکن وہ فعال شاعر نہ تھے۔ ان کا کلام تلاش کرنا بڑا تحقیقی کارنامہ ہوگا۔ اس کے علاوہ ان جیسے فرشتہ منش سے میں جعل سازی کی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔ پھر بھی یہ کہتا ہوں کہ نثار احمد فاروقی، اکبر علی خاں بلکہ مولانا عرشی کا بھی کیا منہ ہے کہ ایسا کلام کہہ سکیں اور غالب کے سیکڑوں مصرعوں کا فرسودہ تر متن گھڑ سکیں اور فارسی کی ۱۲ غیر مطبوعہ رباعیاں کس نے کہی ہیں، شفیق احمد نے کہ توفیق احمد نے؟

میرے کرم فرما ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کا خیال ہے کہ ایسے اشعار کہنا بچوں کا کھیل ہے اور وہ ایسے اشعار کہہ سکتے ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ وہ مفت کرم داشتن کی زحمت اٹھا کر انھیں غالب کے نام سے کیوں شائع اور ضائع کریں، خود اپنے نام نامی سے اس رنگ اور معیار کا پورا دیوان کیوں نہ کہہ دیں۔ میں نے غالب کے منسوخ کلام کی شرح تفسیر غالب کے نام سے لکھی ہے۔ میری پیش کش ہے کہ میں کمال صاحب کے نوزائیدہ دقیق دیوان کی شرح لکھوں گا (بہ شرط حیات)۔ تفسیر غالب کے وزن پر وہ اس کا نام تفسیر کمال رکھوانا پسند کریں گے کہ تفسیر کی تانیث کے پیش نظر تفسیر کمالیہ؟ اودھ پنچ میں حالی کا جو

خاکہ اڑایا گیا تھا اس میں کسی کا شعر تھا۔

سید کی سرگزشت کو حالی سے پوچھیے   بالے میاں کا حال ڈفالی سے پوچھیے

میں پہلے مصرع کے متن کی صحت پر وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ فروغ اردو لکھنو کے حالی نمبر میں پڑھا تھا۔ اب میں نے اس رسالے کو اپنی دوسری کتب کے ساتھ حیدر آباد یونیورسٹی لائبریری کو دے دیا ہے۔ بالے میاں سے مراد سید مسعود سالار غازی ہیں۔ کمال صاحب اگر میری تجویز مان لیں تو میں ان کے لیے ڈفالی کا کام کر کے نہ صرف ان کے دیوان کی شرح لکھوں گا بلکہ مغرب سے مشرق تک تحریک و غوغا کروں گا کہ انھیں اس پر ساہتیہ اکادمی کا انعام دیا جائے۔ غالبِ اول اس انعام سے محروم رہے تو غالب ثانی کو اس سے پیراستہ کر کے تلافی کر دی جائے۔

اب لیجیے جعل کی دوسری منزل۔ شفیق اور توفیق کی مقدمہ بازی نیز نثار احمد فاروقی اور اکبر علی خاں کی رقابت کو دیکھ کر یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ یہ لوگ مل کر کوئی ملی بھگت کر سکتے ہیں۔ اگر نثار احمد فاروقی یا عرشی زادہ نے یہ دیوان تصنیف کیا ہے تو اس کے انکشاف کے لیے کیا شفیق احمد بھوپالی بہترین وسیلہ تھے۔ اگر ان علما میں سے کسی نے شفیق کو یہ نسخہ دیا تو آخر الذکر نے اسے محض گیارہ روپیوں میں کیوں فروخت کیا۔ جعل سازی اور سازش کے دو مقاصد ہو سکتے ہیں (۱) علمی شہرت (۲) روپیہ کمانا۔ اس نسخے کو شفیق کی معرفت توفیق تک پہچانے سے اس کے درپردہ واضع مصنف کو کون سی علمی شہرت ملی۔

جلبِ زر کا مجھے علم نہیں۔ عرشی زادہ نے نسخۂ عرشی زادہ کی بھاری قیمت سے کچھ کمانے کا خواب دیکھا ہوگا لیکن عدالت نے بیچ میں آکر رنگ میں بھنگ کر دیا۔ امتناعِ فروخت سے انھیں الٹے لینے کے دینے پڑے ہوں گے۔ نثارِ فاروقی صاحب کو جو کچھ ملا ہوگا وہ ادارہ نقوش کی دین ہوگی۔ انھوں نے یہ کلام مع نستعلیق قرات کے اردو دنیا کو فراہم کر کے بڑا احسان کیا ہے۔ اسے انھوں نے جس عالمانہ ڈھنگ سے مرتب کیا ہے اس کے پیشِ نظر انھیں کچھ رائلٹی ملی تو وہ اس کے مستحق ہیں۔ میں ملا اس کی طرح اردو دنیا کو تقسیم نہیں کرتا۔ میری رائے میں نثار صاحب نے مخطوطے کی نقل اور اپنی تدوین کو لاہور بھیج کر کچھ غلط کام نہیں کیا، اردو کی خدمت کی ہے۔

غرضیکہ جعل سازی اور سازش کی بات پر جتنا بھی غور کیا جائے، بات سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے اوپر اس گھٹیا حرکت کے سلسلے میں جن شرفا کے نام لیے ہیں میں ان سے عفو کا طالب ہوں۔ بے محابا ان کے نام اس وجہ سے لیے کہ میرے نزدیک ان سے اس

کا تعلق نہیں۔ میں تو اس کلام کو غالب کی تخلیق مانتا ہوں۔ جو اسے جعلی کہتے ہیں وہ سامنے آ کر بتائیں کہ یہ کارستانی کس ہنر مند کی ہے اور اس میں دوسرے کون کون شامل تھے۔ کم از کم میں نہیں تھا۔ میں بھوپال ۱۹۶۵ء میں چھوڑ چکا تھا۔ میں نے آج تک شفیق کو نہیں دیکھا۔ سنا ہے اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

میں علمی معاملات میں اختلاف کو ذاتی تعلقات سے الگ خانے میں رکھتا ہوں۔ میرے نزدیک دوستی کی یہ شرط نہیں کہ تمام مسائل کے بارے میں نقطۂ نظر یکساں ہو۔ کسی سے علمی و ادبی اختلاف ہو تو اس کے ساتھ ترک موالات، مادر پدر یا فوجداری کرنا ذہن بالغ، بلکہ پیر نابالغ کو بھی زیب نہیں دیتا۔ اگر میری یہ رائے ہے کہ نودریافت مخطوطہ دیوان غالب خود غالب کی تصنیف ہے اور میرے کسی کرم فرما کا عقیدہ ہے کہ یہ وضعی ہے تو اس اختلاف کی وجہ سے میں مخالف کی ذات پر حملہ کرنا تو در کنار، ذاتی مراسم کی شیرینی میں ذرا سی بھی ترشی کا شائبہ نہ آنے دوں گا۔ مخطوطے کو وضعی ماننے والوں میں کمال احمد صدیقی، اکبر حیدری اور محمد انصار اللہ نظر پیش پیش ہیں۔ ان میں کمال احمد صدیقی اور میرے بیچ گہرے اختلافات ہیں۔ انھوں نے میری کتاب "اردو کا اپنا عروض" پر بھی کوئی اختلافی تبصرہ کیا ہے جو خوش قسمتی سے میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کے باوجود ان کے اور میرے مراسم جتنے خوشگوار اور شیریں ہیں، اس کی بہتر مثال کوئی نہ ہو گی۔ تین چار سال ہوئے ہیں وسنت وہار نئی دہلی میں اپنے لڑکے کے پاس ٹھہرا تھا۔ کمال صاحب مجھ بے کمال سے ملنے صاحب آباد، ضلع غازی آباد سے قدم رنجہ کر کے آئے اور مجھے دیر تک مستفیض کیا۔

اس مخطوطے کے معاملے اور نہ جانے کن معاملوں میں ڈاکٹر اکبر حیدری سے اختلاف کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے کی قدر کرتے ہیں۔ مرکزی حیدر آباد یونیورسٹی میں جس سلیکشن کمیٹی نے انھیں شعبۂ اردو میں پروفیسر مقرر کیا، میں بھی اس کا رکن تھا۔ اس کے بعد وہ میرے رفیق کار رہے۔ میری رائے میں وہ راہ مستقیم سے قدرے ہٹے ہوئے آدمی ہیں لیکن ان کا جنونِ تحقیق مسلم ہے۔

اردو اساتذہ میں تین ایسے اہل علم ہیں جو کبھی میرے شاگرد نہیں رہے لیکن مجھے اپنا استاد مان کر سرفراز کرتے ہیں۔ مان نہ مان میں تیرا شاگرد۔ میں ان تینوں عالموں میں سے کسی کا بھی استاد ہوتا تو میرے لیے باعث فخر ہوتا۔ یہ تین حضرات ہیں: ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی اور ڈاکٹر انصار اللہ نظر۔ عنوان صاحب کی زندگی ہے کہ جب وہ

آگرے میں ملازم تھے، انھوں نے آگرہ یونیورسٹی میں میری نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرایا تھا۔ حسنِ اتفاق سے وہ آگرے سے دہلی منتقل ہو گئے اور یہ دفتر گاؤ خورد ہو گیا۔ مجاور صاحب کا ارشاد ہے کہ جب وہ اور میں دونوں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تھے، انھوں نے میری نگرانی میں ڈی لیٹ میں داخلہ لیا تھا۔[1] ڈاکٹر انصار اللہ کس رشتے سے میرے شاگرد بنتے ہیں، مجھے علم نہیں۔ انھوں نے رسالہ شاعر بمبئی ۱۹۸۱ء گوشہ گیان چند میں میری ذات و اسفال صفات پر ایسا توصیفی مضمون لکھا ہے کہ میں لجاجت محسوس کرتا ہوں۔ اعتراف کرتے ہیں۔

"میں براہِ راست ان کا شاگرد نہیں ہوں، اس کے باوجود وہ میرے معاملات کی وجہ سے اسی طرح فکر مند رہتے ہیں جس طرح کوئی بزرگ اپنے عزیز قریب یا رشتہ دار کے لیے"[2]

انھوں نے یکم جنوری ۱۹۸۱ء کو مجھے اپنی کتاب تاریخ اقلیم ادب کا دوسرا حصہ عطا کیا تو اس پر پھر رشتہ استادی و شاگردی کی توثیق کرتے ہوئے لکھا۔

استاذی پروفیسر گیان چند صاحب کی نذر۔

محمد انصار اللہ ۱/۱/۸۱ء

رسالہ شاعر کے اپنے مضمون میں مخطوطہ دیوان غالب کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"میں نے ایک مخطوطے سے متعلق بعض معروضات پیش کی تھیں۔ انعام یہ ملا کہ ایک معتدین (کذا) پدم شری نے اپنے رسوخ کے سبب یہ چاہا کہ مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔ ہاں ایک ڈاکٹر گیان چند نے ضرور لکھا......

ڈاکٹر گیان چند بھی تحقیق کے مردِ میدان ہیں۔ بھوپال سے حیدر آباد تک اعلان کلمۃ الحق کے سلسلے میں انھیں بھی بہت تجربے ہوئے۔ چنانچہ ع

جتنے عاشق ہیں بہم، ایک کا ہے ایک عزیز

اس لحاظ سے گوشہ گیان چند کے لیے کچھ لکھنا میرے اوپر واجب ہے۔

انھوں نے اپنے مضمون میں غالب کے زیرِ بحث مخطوطے سے متعلق میرے ایک مضمون کا اقتباس دیا ہے۔ نظریے کے اختلاف کے باوجود انھوں نے میرے موقف پر ناخوشی کا نہیں، خوشی کا اظہار کیا ہے، چند سال قبل حکم چند نیر کی وفات سے آٹھ دس دن

---

[1] رسالہ شاعر بمبئی شمارہ ۶-۵ ۱۹۸۱ء گوشہ گیان چند ص ۱۷

[2] مضمون "گیان چند صاحب کے علمی معاملات" رسالہ شاعر ۱۹۸۱ء شمارہ ۶-۵ ص ۲۰

پہلے میں ان کی عیادت کر کے آگرے سے علی گڑھ آیا تو وہاں میں جن تین چار کرم فرماؤں سے ملا ان میں انصار اللہ بھی تھے۔ میں شعبہ اردو میں ان کے کمرے میں گیا تو انھوں نے حسبِ معمول میرا احترام کیا۔ میں بھی انھیں نظر انداز نہیں کرتا گو علمی اختلاف روا رکھتا ہوں۔ میں نے اپنی زیرِ طبع کتاب "اردو کی ادبی تاریخیں" میں ان کی "تاریخ اقلیم ادب" کے دونوں حصوں کا ایک مکمل باب میں جائزہ لیا ہے۔

کتاب نما فروری ۱۹۹۸ء کے مضمون میں انھوں نے مجھ سے جس عدم اعتماد اور بے زاری کا اظہار کیا ہے، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کمال احمد کی کتاب پر میرا مضمون ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ تب سے ۱۹۸۱ء تک (رسالہ شاعر) انھیں میرے اختلافی موقف پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہی مضمون، وہی اس کا مصنف میں، وہی اس کے قاری انصار اللہ، ۹۷-۱۹۹۶ء میں ۱۹۸۱ء سے مختلف رد عمل کیوں۔ فرق صرف ہے تو اس بات میں کہ تب میں ایک مقتدر پروفیسر تھا، اب مرذک نام ہوں، لیکن اس سے مضمون کے مطالب میں تو فرق نہیں پڑتا۔ پچھلے ۲۵ برسوں میں میں نے اپنی یادداشت کی حد تک ان کے بارے میں موافق مخالف کچھ بھی نہیں شائع کیا۔ کسی کو ذاتی خط میں ان کے خلاف کچھ نہیں لکھا۔ ایک کرم فرما کو ان کے بارے میں لکھا ضرور تھا لیکن وہ توصیفی تھا۔ بات ہلکی ہے لیکن اتمام حجت کے لیے میں اسے لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یوں بھی تحقیق کی یبوست کو توڑنے کے لیے کچھ تر زبانی ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔

تقریباً دو سال پہلے شمس الرحمٰن فاروقی نے مجھے اپنا مجموعۂ کلام آسماں محراب (۱۹۹۶ء) تفویض کیا۔ اس میں ان کی نظم شہر آشوب میں درس گاہوں کے حالِ زار کے سلسلے میں ایک شعر ہے۔

ہو پوچ کوئی سوا کام کیا جولاہوں کو ۔۔۔ کریں بھی کیا جو عمل عنکبوت سانہ کریں (ص ۵۸)

میں نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے انھیں ایک ذاتی خط میں لکھا کہ درس گاہوں میں متعدد اساتذہ جولاہوں کے فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں کئی بڑے اہل علم ہیں جیسے ڈاکٹر محمود الٰہی، ڈاکٹر انصار اللہ نظر۔ آپ کو جولاہوں کا لفظ نہیں لکھنا چاہیے تھا"۔ اس پر انھوں نے جواب میں کچھ ایسا لکھا کہ وہ بھی محمود الٰہی اور انصار اللہ دونوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ اس شعر میں جولاہوں سے مراد کوئی مخصوص قوم نہیں بلکہ ایک معیار کی طرف اشارہ ہے۔ اس نظم کے حواشی میں اس شعر کے سلسلے میں میر کے پہلے دیوان کا یہ شعر درج کیا ہے۔

کہاں سے تم کریں پیدا یہ ناملائم حال کہ پونچی پانی ہی ہے کام ان جولاہوں کا

اس طرح ظاہر ہو گیا کہ فاروقی کی تحریک میر سے ہوئی۔ میر کے زمانے کی بات دوسری ہے، ہمارے زمانے میں کسی قوم (ذات یا جاتی) کا نام لینا مناسب نہیں۔ میں خود جولاہوں کی قوم میں کوئی برائی نہیں دیکھتا۔ کبیر جیسے عظیم انسان کا تعلق اسی برادری سے تھا۔ بہر حال میں نے جن دو اہل علم کے نام لکھے تھے، ان میں ایک انصار اللہ بھی تھے۔ ان کے تازہ مضمون کے باوجود ان کی علم دوستی کے بارے میں میری وہی رائے ہے کہ جو تھی۔ اب میں ان کے مضمون پر اپنے مشاہدات پیش کرتا ہوں۔ ابتدا میں وہ کہتے ہیں۔

"استاد مرحوم قاضی عبدالودود صاحب فرماتے تھے کہ مضمونوں اور کتابوں کے چھپنے پر پابندی عائد کر دینی چاہیے۔ اب خیال ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کی یہ رائے بالکل صحیح تھی۔ ہمارے زمانے کا حال یہ ہے کہ ذاتی تاثرات، مفروضات اور تعصبات کو تحقیق کے نام سے شائع کرنے کا چلن سا ہوتا جا رہا ہے بلکہ بڑی بڑی بدعنوانیاں بعض بڑوں کے قلم سے ظاہر ہوتی ہیں"۔ (ص ۲۸)

میرے متعلق مضمون کی ابتدا اس مشاہدے سے کر رہے ہیں جس سے واضح ہے کہ مجھے ان بڑوں میں شامل کیا ہے۔ انھیں اس کا حق ہے۔ وہ قاضی صاحب کی رائے کو صحیح ٹھہراتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ انھوں نے یہ بات کس سیاق میں اور کن الفاظ میں کہی تھی۔ میں بہر حال آزادیٔ اظہار میں یقین رکھتا ہوں اور کتابوں اور مضامین کے چھپنے پر پابندی عائد کرنے کو آمریت قرار دوں گا۔ غالباً قاضی صاحب اور ان کے مویدین دوسروں کے لیے یہ پابندی چاہتے ہوں گے، اپنی تحریروں کے لیے نہیں۔

انصار اللہ صاحب آگے لکھتے ہیں:

ذاتی طور پر میں پروفیسر گیان چند صاحب کے نیاز مندوں میں ہوں اور ان کا نہایت احترام کرتا ہوں۔ (ص ۲۸)

اس کے ادعا اور اظہار کی کیا ضرورت تھی۔ ان کے مضمون کی ہر سطر ان کے ان جذبات سے سرشار ہے۔ میں ان کے التفات خاص کے لیے ممنون ہوں۔ مزید لکھتے ہیں

"مخطوطے کو سب سے پہلے امتیاز علی خاں عرشی صاحب نے (بغیر دیکھے) اس کے لانے والے کو "جبرئیل" اور اسے بخط غالب فرما دیا تھا۔ کسی نے بھی اس کے بخط غالب ہونے یا نہ ہونے پر علمی اور تحقیقی اعتبار سے غور نہیں کیا تھا۔ پہلی مرتبہ اس بحث کا آغاز انصار اللہ نظر نے کیا تھا۔ کچھ لوگوں نے تائید کی اور کچھ نے بڑے زور شور سے انصار اللہ

کی تردید کی۔ تردیدی (کذا) کرنے والوں میں زیادہ جوش و خروش انھوں نے دکھایا تھا جن کے اس نسخے سے براہ راست اور بالواسطہ مفادات وابستہ تھے"۔ (ص ۲۹۔۲۸)

میں نے مضمون کی ابتدا میں نسخۂ عرشی زادہ کے ابتدائیے سے یہ اقتباس درج کیا ہے کہ عرشی صاحب نے بغیر دیکھے رائے نہیں دی۔ جلال الدین مخطوطے کے پہلے اور آخری صفحے کا عکس لے کر گئے تھے، اسے دیکھ کر عرشی صاحب نے محتاط طور پر کہا کہ مخطوطہ بخط غالب ہی "معلوم ہوتا ہے" صحیح قدر و قیمت کے بارے میں اس وقت تک کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی جب تک اصل نسخے کا تفصیلی جائزہ نہ لیا گیا ہو۔

انصار اللہ اپنی اوّلیت منوانے کے لیے کہتے ہیں "کسی نے بھی اس کے بخط غالب ہونے یا نہ ہونے پر علمی اور تحقیقی اعتبار سے غور نہیں کیا تھا"۔ کیا عرشی زادہ اور نثار احمد فاروقی کے ایڈیشنوں کے مقدمے علمی اور تحقیقی نہیں ہیں۔ اس کی بحث میں حصہ لینے والے سب لوگ (انصار اللہ اور مجھ سمیت) ان عالمانہ تدوینات کی اشاعت کے بعد ہی سامنے آتے ہیں اور جملہ بحث مخطوطے کو دیکھے بغیر صرف اس کے عکس کی بنا پر کر رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ انھوں نے اس نسخے کو بخط غالب تسلیم کرنے والوں کی نیت کو کسی ذاتی مفاد سے وابستہ کیا، اسے انصار اللہ کی مخالف کا اظہار قرار دیا۔ یہ کلام غالب کا ہے کہ نہیں، یہ خاص علمی معاملہ ہے، اسے انصار اللہ کے موقف تک کیسے محدود کیا جا سکتا ہے۔ مجھے مزید افسوس یہ ہے کہ انھوں نے عرشی صاحب جیسے فرشتہ منش آقائے غالبیات کو بھی نہیں بخشا۔

انصار اللہ کو مجھ سے شکایت ہے کہ میں نے مخطوطے کو جعلی قرار دینے والوں کی تعداد کم کر کے پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں

"ایک بہت اہم نام پروفیسر لطیف الزماں خاں صاحب کا بھی جو اس نسخے کو جعلی قرار دینے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے بلکہ سچ یہ ہے کہ ان کے تائیدی خطوں نے ہی اس بحث میں جان ڈال دی تھی"

اب مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں نے اس زمانے میں لطیف الزماں خاں کی کوئی تحریر پڑھی تھی کہ نہیں۔ بہت بعد میں اس سلسلے میں ان کا ایک طویل مضمون نثار احمد فاروقی صاحب کے خلاف آیا۔ مخطوطے کے تعلق سے لطیف الزماں خاں صاحب کا موقف ذاتیات میں الجھا ہوا ہے۔ میں ان کی ذات کو درمیان میں نہیں لانا چاہتا تھا لیکن چونکہ انصار اللہ انھیں اپنی حملِ متین سمجھتے ہیں اس لیے ان کے بارے میں لکھنے پر مجبور ہوں۔

پاکستان میں غالبیات کا ایک اہم نام ڈاکٹر سید معین الرحمٰن پروفیسر اردو گورنمنٹ کالج لاہور کا ہے۔ انھوں نے مجھے کالج کا رسالہ "تحقیق نامہ" شمارہ ۱۔۷ بابت ۹۸۔۱۹۹۷ء امریکہ بھیجا۔ اس میں ان کا ایک طویل مضمون "تراجم غالب۔ ایک جائزہ" شامل ہے۔ جس میں لطیف الزماں خاں کا مفصل ذکر ہے۔ ہندستان میں فارسی کے عالم سید اکبر علی ترمذی نے ۱۹۶۹ء میں "نامہائے فارسی غالب" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا۔ معین الرحمٰن لکھتے ہیں۔

"[لطیف الزماں خاں نے] نامہائے فارسی غالب کا ایک شرمندہ کن اردو ترجمہ مکتوبات غالب کے نام سے ۱۹۹۵ء میں لاہور سے شائع کیا۔ اس ترجمے کا ماتمی تذکرہ خامہ بگوش نے اپنے ...... کالم سخن در سخن میں بڑی دردمندی سے کیا ہے۔ میں اس معاملے میں ان کا ہم آواز ہوں اور اپنے کرب واکراہ کا اظہار خامہ بگوش ہی کے الفاظ میں کرتا ہوں" (تحقیق نامہ ص ۶۲ تا ۶۸)

خامہ بگوش (مشفق خواجہ) کا کالم ہفت روزہ تکبیر انٹرنیشنل کراچی بابت ۱۹ اردسمبر ۱۹۹۶ء میں آیا۔ معین الرحمٰن نے اسے تفصیل سے نقل کیا ہے اور ساتھ ہی اپنے مشاہدات کا اضافہ کیا ہے۔ میں اس کی تلخیص پیش کرتا ہوں۔

کتاب کے سرورق پر محض ایک نام لطیف الزماں خاں درج ہے بغیر اس صراحت کے کہ وہ مصنف ہیں یا مرتب یا مترجم۔ اندرونی سرورق پر نام خلیق الزماں لکھا ہے جو تخریب ہے لطیف الزماں کی۔ اگر اتنے بڑے سہو کتابت کی تصحیح نہیں کی گئی تو مترجم کی لاپروائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اکبر علی ترمذی نے نامہائے فارسی غالب پر ایک مختصر دیباچہ اور قاضی عبدالودود نے پیش لفظ انگریزی میں لکھا ہے۔ واضح ہو کہ لطیف الزماں خاں ۳۰ برس تک ملتان کے ایک کالج میں انگریزی کے استاد رہے ہیں۔ ترمذی نے مقدمے کی پہلی سطر میں خطوط کے solitary manuscript کا ذکر کیا تھا۔ مترجم نے ڈکشنری دیکھی۔ پہلے لفظ کے بہت سے معنوں میں سے "بے یارومددگار" کو پسند کیا۔ مینو سکرپٹ کا ترجمہ ہر جگہ مسودہ کیا ہے یعنی انھیں مخطوطے اور مسودے کا فرق معلوم نہیں۔ اس طرح مترجم نے solitary manuscript کا ترجمہ "بے یارومددگار مسودہ" کیا ہے۔ ترمذی نے ایک مقام کا نام انگریزی میں Kara درج کیا ہے۔ مترجم نے اسے اردو میں "کارا" لکھا ہے۔ حالانکہ اس سے الہ آباد کے پاس کا مشہور تاریخی شہر کڑا مراد ہے۔ اکبر الہ آبادی کے استاد وحید کڑوی وہیں کے تھے۔ ترمذی نے ایک جگہ غالب کے سفر کلکتہ

کی روایت میں circa mid 1825 لکھا ہے۔ مترجم نے اس کا ترجمہ "بہر سال وسط ۱۸۲۵ء" کیا ہے۔ Circa مختلف ہوتا ہے Circumstancial کا۔ یعنی مبنی بر قرائن۔

خامہ بگوش لکھتے ہیں کہ فارسی خطوط کا تو یہ حال ہے کہ ترجمے کا شاید ہی کوئی صفحہ ہو جو غلطیوں سے پاک ہو (ص ۶۳)۔ انگریزی مقدمے میں ایک جگہ قاضی عبدالودود کی کتاب مآثر غالب کا ذکر ہے۔ مترجم نے اسے اردو میں "معاصر غالب" لکھا ہے۔ خامہ بگوش لکھتے ہیں "غالب کے خطوط کا ترجمہ کرنے والے کو اگر غالب سے متعلق ایک مشہور کتاب کا صحیح نام بھی معلوم نہ ہو تو اسے غالب کا پیچھا چھوڑ کر کوئی آبرومندانہ کام کرنا چاہیے"۔

ترمذی کی کتاب کے آخر میں متن کا غلط نامہ ہے۔ مترجم نے غلط نامے سے تصحیح کیے بغیر غلطیوں کا ترجمہ کر لیا۔ کتاب کے اصل مرتب اور مقدمہ نگار سید اکبر علی ترمذی کی تصنیف کا مناسب طریقے سے اعتراف نہیں کیا، نہ سرورق پر، نہ اندرونی سرورق پر (تکبیر ص ۴۲۔۴۱)

معین الرحمٰن مطلع کرتے ہیں کہ کتاب کے ص ۱۹۸ پر ترمذی صاحب کے خط مورخہ ۲۴ر فروری ۱۹۹۴ء کا عکس شامل ہے جس میں انھوں نے لطیف الزماں خاں کو لکھا ہے

"امید ہے کہ آپ مقدمے کی تصنیف اور متن کی تدوین میں مصنف کا نام شامل کریں گے اور آپ کا نام بحیثیت مترجم ہوگا"

معین الرحمٰن قوسین میں لکھتے ہیں "(سنتا ہوں کہ اب مترجم یہ عکس خط کتاب سے نکلوانا چاہتے ہیں)"۔ ۱۸ر فروری ۱۹۹۷ء کو ترمذی نے معین الرحمٰن کو لکھا کہ میں نے شرط رکھی ہے کہ میرا نام مرتب اور مقدمہ نگار کی حیثیت سے اور ان کا نام بطور مترجم چھپے گا۔ لیکن انھوں نے سرورق پر اپنا نام کسی صراحت کے بغیر لکھا ہے جس سے وہ مکتوبات غالب کے مصنف معلوم ہوتے ہیں۔ ترمذی کا نام غائب ہے۔ کتاب کا پیش لفظ قاضی عبدالودود نے لکھا ہے۔ ترجمے میں ان کا نام فہرست سے حذف ہے۔ دیباچہ سید اکبر علی ترمذی کے قلم سے ہے۔ فہرست میں اسے قاضی عبدالودود سے منسوب کر دیا ہے۔ کتاب کا بہت مفصل مقدمہ سید ترمذی کا تحریر کردہ ہے۔ فہرست میں ان کا نام حذف ہے۔ ترمذی کی اصل کتاب کے حقوق غالب اکیڈمی دہلی کے نام ہیں لیکن مترجم نے ہندستان میں اس کے حقوق علی گڑھ کے ایک صاحب کے نام کر دیے ہیں۔ آخر میں معین الرحمٰن لکھتے ہیں کہ پوری کتاب ترجمے کے نام پر اسی درجے کے جہل اور جعل کا شاہکار ہے۔

یہ جہاں وہ لطیفہ اُبھرتا جہاں جنھیں انصار اللہ حزبِ غالب کا نہایت اہم رکن قرار دیتے ہیں۔ وہ غالب کے فارسی خطوط کا ترجمہ کر رہے ہیں لیکن غالب کے فارسی خطوط والی دوسری کتاب ناثر غالب کے نام سے بھی واقف نہیں۔

اپنے مضمون میں انصار اللہ آگے لکھتے ہیں

مذکورہ دو جملوں کے بعد جین صاحب کا تیسرا جملہ یہ ہے کہ "ڈاکٹر انصار اللہ اور اس کے مندرجات کو کلام غالب ہی تسلیم کرتے ہیں"۔ اس جملے کی ساخت اور صحت کے بارے میں کچھ عرض کرنا غیر ضروری ہے جین صاحب خود ملاحظہ کر لیں۔ (کتاب نما ص ۲۹)

انھوں نے اس جملے کی ناقص ساخت کی گرفت کر کے مجھے بہت شرمندہ کیا۔ میں نے غالب نامہ عرشی نمبر میں دیکھا۔ جملہ اسی طرح لکھا ہے جیسا انصار صاحب نے نقل کیا ہے۔ غالب نامہ کے کاتب نے رسالہ اردو ادب شمارہ ۳، ۴ ۱۹۷۲ء سے نقل کیا ہے۔ اردو ادب میرے سامنے نہیں لیکن وہاں بھی کاتب نے اسی طرح لکھا ہوگا۔ اردو ادب کے کاتب نے میرے مسودے سے نقل کیا ہے اور میں نے بھی یوں ہی لکھا ہوگا۔ شرمسار ہوں کہ مجھے اردو کا ایک صحیح جملہ لکھنے کی تمیز نہیں۔ میں نے اپنی کتاب رموز غالب (۱۹۷۶ء) میں شامل اپنے اس مضمون کو دیکھا تو جملے کو یوں لکھا پایا

"ڈاکٹر انصار اللہ اس کے مندرجات کو کلام غالب ہی تسلیم کرتے ہیں"

اس ستار عیوب کاتب نے محض ایک لفظ "اور" خارج کر کے میری اصلاح کر دی اور مجھے سکھا دیا کہ صحیح اردو کس طرح لکھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر انصار اللہ نے میری (غالب نامہ کے کاتب کی نہیں) غلط نویسی کی نشان دہی کی، ان کا مشکور ہوں۔ انھیں اس کا سخت شکوہ ہے کہ میں نے یہ کیونکر کہا کہ وہ مخطوطے کے مندرجات کو کلام غالب تسلیم کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں میرے پاس ہماری زبان کی فائل تھی۔ اب وہ میری دسترس میں کہاں جو میں بتا سکوں کہ میں نے ان کی کن تحریروں کی بنا پر یہ تاثر قائم کیا۔ میرا خیال ہے کہ شروع شروع میں وہ نسخے کے کلام کو غالب کا مانتے ہوں گے، تحریر کو نہیں، بعد میں وہ کلام کے انتساب سے بھی انکار کرنے لگے ہوں گے۔

انصار اللہ لکھتے ہیں کہ میں نے عبدالباری آسی کے دریافت کردہ غیر مطبوعہ کلام کو جعلی مانا حالانکہ آسی کے موین (کذا، سہو کتابت، صحیح موید ین) میں مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری جیسے صاحب نظر تھے لیکن زمانہ بعد میں جلیل قدوائی صاحب نے آسی کے پیش کردہ کلام منسوب بہ غالب سے متعلق "اعتراف" شائع کر دیا تھا۔ (کتاب نما ص ۳۰)

ہمارے معاصر معتبر ترین محقق رشید حسن خاں اپنی مرتبہ "مثنویات شوق" کے مقدمے میں لکھتے ہیں "مجنوں صاحب کے رومان زدہ مزاج کو تحقیق کی مشکل پسندی سے دور کی بھی مناسبت نہیں" (دہلی ۱۹۹۰ء ص ۴۲)

نیاز بھی رومان زدہ تھے اور محقق نہیں تھے۔ یہ دونوں اصحاب بہر حال ماہر غالبیات نہ تھے۔ مجھے علم نہیں کہ جلیل قدوائی نے کیا اعتراف کیا تھا لیکن میں نے آسی کی غزلوں کو مولانا عرشی کی شہادت پر وضعی مانا تھا۔ چونکہ ان غزلوں میں معروف اور حافظ عبدالرحیم حقیر عظیم آبادی کی ایک ایک غزل شامل تھی، اس لیے عرشی صاحب نے لکھا

"میں اس کلام کو غالب کے یقینی کلام کا درجہ اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک کوئی اور مستند شہادت سامنے نہ آجائے" (نسخۂ عرشی طبع اول ۱۹۵۸ء ص ۳۸۶)

انصار اللہ رسالہ شاعر میں مجھ کم سواد پر لکھے مضمون میں انکشاف کرتے ہیں

"میں نے ایک مخطوطے سے متعلق بعض معروضات پیش کی تھیں۔ انعام یہ ملا کہ ایک متدین (کذا؟) پدم شری نے اپنے رسوخ کے سبب یہ چاہا کہ مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے"۔

کتاب نما فروری ۱۹۹۸ء کے مضمون میں بھی اس کوشش کا ذکر کرتے ہیں۔ "شاید جین صاحب نے انھی بزرگ کے حلقے سے شائع ہونے والا وہ مضمون نہیں دیکھا کہ جس کے خاتمے میں کہا گیا تھا کہ اگر اس فتنے (محمد انصار اللہ) کو اسی وقت کچل نہ دیا گیا تو کل بڑی مشکل ہوگی" (کتاب نما ص ۳۱)

علی گڑھ میں اہل اردو میں دو پدم شری ہیں: ڈاکٹر قاضی عبدالستار اور ڈاکٹر نذیر احمد۔ میرے علم کی حد تک انھوں نے دیوان غالب کی بحث میں حصہ نہیں لیا۔ ان میں نذیر احمد غالب کے فارسی پہلو کے عارف ہیں لیکن وہ یا عبدالستار کسی کی ملازمت یا جان لینے والے بزرگ نہیں۔ نہ میں ان کے کسی حلقے اور اس کے کسی بھیانک مضمون سے واقف ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر کوئی مخطوطہ ۱۹۶۹ء کو غالب کا کلام نہ مانے تو دہشت گرد اس پر کیوں مشتعل ہوں گے۔ اس معاملے میں کمال احمد صدیقی انصار اللہ سے زیادہ گرم جوش تھے۔ ان کے بارے میں تو کسی پدم شری یا پدم بھوشن نے کسی دادا کو سپاری نہیں دی۔

اپنے مضمون کے آخر میں انصار اللہ نے رنگِ کلام وغیرہ کی شناخت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے مجھے اس سے اتفاق ہے۔ عرشی صاحب آسی کی دریافت کردہ غزلوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں

"رنگِ کلام کو شہادت میں پیش کرنا بے حد خطرناک ہے" (نسخہ عرشی طبع اول ص ۳۸۵-۸۶)

غرض یہ ہے کہ دس میں اشعار یا دس پانچ غزلیں تو غالب کے انداز کا دھوکا دے سکتی ہیں لیکن ایک پورا دیوان اس دقیق انداز میں کون تصنیف کر سکتا ہے۔ اسے جعل قرار دینے والے کھل کر بتائیں کہ ان کے نزدیک یہ جعل کس طرح عمل میں آیا۔ میری درخواست ہے کہ نثار احمد فاروقی اور جلال الدین اعلان کر دیں کہ اگر کوئی حدود علم میں رہتے ہوئے مخطوطۂ غالب کو ان کی تصنیف قرار دینے کے ثبوت لائے گا تو وہ کچہری میں اس کے خلاف ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ درج نہیں کرائیں گے۔ مجھے ایسا تجربہ ہو چکا ہے۔

رشید حسن خاں فسانۂ عجائب کی تاریخ ساز تدوین کر کے برسوں اس کی اشاعت کو ٹالتے رہے۔ میرے دریافت کرنے پر انھوں نے مجھے لکھا کہ دلی یونیورسٹی کے پے بہ پے کئی صدورِ شعبہ اردو یہ اصرار کرتے تھے کہ بطورِ مرتب ان کا نام (شاید تنہا ان کا یا ان کے بعد رشید حسن خاں کا بھی) درج کیا جائے۔ میں نے فسانۂ عجائب سے متعلق رسالہ آج کل میں اپنے ایک مضمون میں یہی بات لکھ دی بغیر کسی صدر کا نام لیے۔ اس پر تین سابق صدورِ شعبہ اردو: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر فضل الحق اور ڈاکٹر شریف صاحب نے ایک وکیل کی معرفت مجھے ایک قانونی نوٹس بھیج دیا اور معافی کا مطالبہ کیا۔ رسالہ آج کل نے ادارے اور میری طرف سے اظہار افسوس رسالے میں شائع کر دیا۔ بات ختم ہوئی۔ ہمارے جو محقق نسخے کو جعلی قرار دینے کے ثبوت لانا چاہیں انھیں بھی پیشگی ضمانت مل جائے تو وہ آزادی سے لکھ سکیں گے۔

میں نے اس مضمون کے سلسلے میں دوبار مشفق خواجہ کو کراچی فون کیا، کئی بار شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے انٹرنیٹ کی ای میل (e-mail) کے ذریعے استفادہ کیا۔ ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں مضمون نویسی کو وقت نہیں دے سکتا کیونکہ مجھے کچھ کتابوں کو مکمل کرنا ہے۔ اپنی زیرِ طبع کتاب "اردو کی ادبی تاریخیں" میں دو نئی تواریخ ادب سے متعلق اضافے کرنے ہیں، قاضی عبدالودود پر ایک کتاب کی تصنیف کا کام آگے بڑھانا ہے۔ آیندہ مخطوطہ غالب سے متعلق کوئی نئی بات نہ کہہ سکوں گا کیونکہ میرے پاس حوالے کی جملہ کتابیں نہیں۔

کام کرنے کو بہت ہیں، زندگی محدود ہے
اس کام میں کوئی چھوٹا راستہ مفقود ہے

[illegible] صدیقی

نئی شاعری کی تلاش

شاعر ظفر اقبال کا ایک مضمون ہے 'نئی نظم اور بوڑھے لفظوں کی شاعری'۔ اس میں انھوں نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ نئی شاعری کو نئی زبان کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے انھوں نے پبلو نرودا کی نظم سے متاثر ہو کر یہ تمام مضمون لکھا ہے جس میں اس نے لکھا تھا:

"کہ میں لفظ کی سب حدوں، سرحدوں سے دور، بہت دور ایسی لغت کی تلاش میں ہوں جو کبھی ان کہی داستانوں کو کہے گی۔"

میں اس وقت بیٹھا ہوا سوچ رہا ہوں کہ نئے لفظ یا نئی زبان والی بات درست نہیں البتہ بات یوں کہی جائے تو شاید زیادہ درست ہو گی کہ نئی شاعری کو نئے طرزِ بیان اور نئے خیالات کی ضرورت ہے۔

یہاں طرزِ بیان کی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ اسے بدلا جا سکتا ہے مگر یہ نئے خیالات والی بات ضرور بعید از فہم لگتی ہے۔ نیا خیال کہیں سے نہیں آسکتا۔ زیادہ سے زیادہ ہم کسی پرانے خیال میں ہی کوئی نیا کونا بنا سکتے ہیں اور بس۔ کیونکہ خیالات تو انسان کی طرح پرانے ہیں اور انھیں کسی بھی طرح آسمان سے توڑ کر نہیں لایا جا سکتا۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ شعرا نے پرانے اندازِ بیان سے بہت الگ ہو کر شاعری شروع کر رکھی ہے۔ لفظیات کا بھی تغیر و تبدل ہوا ہے اور غزل اور نظم کے ڈھانچوں میں تبدیلی لائی گئی ہے مگر خیالات گھوم گھام کر ایک ہی جیسے مل رہے ہیں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میری نظر سے اکثر ایسے اشعار گزرتے رہتے ہیں جو ایک سے معنی کے ہوتے ہیں بس ذرا سے لفظوں کا الٹ پھیر ہوتا ہے۔ اب تو صورت یہ ہے کہ کسی بھی رسالے کو اٹھا لیں، یوں لگتا ہے جیسے ساری غزلیں نظمیں کسی ایک ہی شاعر کی کہی ہوئی ہیں۔ چند مخصوص کھانچوں کے اندر وہی ساری باتیں جو پہلے کہی جا چکی ہیں۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ یہ نئی شاعری کیا ہے یہ تو وہی پرانی شاعری ہے تو کچھ غلط نہ ہو گا۔

خود شاعر ظفر اقبال کو لیجیے جو خود شاعری کو بدلنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان

کے ہاں خود ان کی اپنی تکرار لفظوں کے الٹ پھیر کے ساتھ صاف نظر آتی ہے۔ جہاں وہ لسانی توڑ پھوڑ کرتے ہیں وہاں وہ شاعری نہیں رہتے۔ وہ گلاب کو الگاب لکھ کر کچھ نہ پا نہیں سکے۔

آخر اس شاعری کے موجودہ موسم کو کس طرح بدلا جائے کہ احساس ہو کہ شاعری واقعی اب یکسر تبدیل ہو کر سامنے آئی ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اگر غزل لکھی جائے تو ہر حال میں غزل ہی لگے۔ اس کا فارمیٹ بھی وہی ہو جو چلا آرہا ہے مگر اُس کی شیرازہ بندی ایسی ہو کہ وہ لگے کچھ اور طرح کی۔

یہاں میری سمجھ میں ایک بات آتی ہے کہ اب شاعری کو ابہام کے پردے میں لپیٹ دیا جائے۔ ابلاغ کے معاملے میں خاصی رکاوٹ کھڑی کر دی جائے۔ بات اِس طرح کہی جائے کہ سننے والے کو محسوس یہی ہو کہ وہ ایک اچھا سا شعر سن رہا ہے۔ مگر معنی مطالب اس کی سمجھ میں جلد نہ آئیں۔ الفاظ ایسے پُر کشش ہوں کہ زبان کے حسن کا احساس ہو، البتہ خیال اتنا غیر واضح ہو کہ ذہن اس کے تعاقب میں ہانپنے لگے۔ ویسے بھی یہ کہا جاتا ہے کہ اچھا شعر وہی ہوتا ہے جو اپنے اندر معنوں کی بہت تہیں رکھتا ہو۔ یک رخانہ ہو۔ اکہرا نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آرام سے اس کی نثر بنالی جائے اور کلاس روم میں اطمینان سے لڑکوں کو سمجھایا جاسکے۔

ایسا شعر وہی ہوسکتا ہے جہاں شاعر نے لفظوں کو اس طرح یکجا کیا ہو کہ نفس مضمون پڑھنے والے کے ذہن پر کسی پرچھائیں کی طرح بار بار گزرے اور غائب ہو جائے۔ اسے ہلکان کر دے۔ حیران کر دے مگر کدر نہ کرے۔ اسے اس احساس کی گرفت میں رکھے کہ اس نے بہر حال شعر پڑھا ہے۔ آپ بتائیں اس قسم کے اشعار آپ کتنی بار اور کتنی جگہ پڑھیں گے۔

ہم اپنے رفتگاں کو یاد رکھنا چاہتے ہیں — دلوں کو درد سے آباد رکھنا چاہتے ہیں
زمیں کی دھوپ زمانے کی دھوپ ذہن کی دھوپ — ہم ایسی دھوپ میں بھی سائباں بناتے ہیں
قیامت کے اسباب کرتے رہے — مری شب کو بے خواب کرتے رہے
عدم میں رکھ مجھے یا حیطۂ وجود میں رکھ — یہ ہے نہیں کی کشاکش نہ ہو جہاں میں ہوں
خوف و دہشت کی محمل داری میں — سخت پہرا ہے ہمارے آگے
ہجر اور وصل سے آگے بھی کوئی منزل ہو — دل کی دنیا نئے خوابوں کا گھر چاہتی ہے

فراق، وصال، گھر، مکان، دکان، جنوں، صحرا، دریا، وغیرہ وغیرہ، انھی کے درمیان تمام شاعری ناچ رہی ہے۔ درجنوں شعرا اُس چھ صدی میں شعر کہہ رہے ہیں۔ اور

ہر لفظ پرانا لگنے لگا ہے۔ اوپر سے مستزاد یہ ہے کہ سیکڑوں کے حساب سے ہمارے اندر ایسے شاعر بھی ہیں جو نہایت پرانے مضامین کو نہایت پرانے انداز سے اپنی اپنی توپوں میں رکھ کر داغ رہے ہیں اور بے مزہ اور بے کیف اشعار کا اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ہم سفر ڈھونڈو نہ غیروں کا سہارا چاہو ٹھوکریں کھاؤ گے تو خود ہی سنبھل جاؤ گے
پھرا جنگلوں جنگلوں، گانو گانو پریشاں رہا آشیانے کے بعد
دل میں آباد ہیں جو برسوں سے ان بتوں کو کہاں خدا لے جائے
رنگ برنگے رنگ ہیں کتنے جن سے یہ پربستہ ہے کنج چمن میں تتلی کیا ہے خود بھی اک گلدستہ ہے
(یہ شعر کسی بچوں کے رسالے سے نہیں اتار آگیا ہے۔)

بات یہیں تک محدود نہیں کہ بے مزہ، بے کیف اشعار کہے جا رہے ہیں بلکہ ان میں اب کثرت سے توارد خیال اور توارد بیان نظر آنے لگا ہے کیونکہ اب شعرا کے پاس کوئی گھر نہیں رہ گیا ہے جو انھیں اس یکسانی سے بچا سکے۔ اس قسم کی یکسانی کا منظر ان اشعار میں دیکھیں۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
میں دنیا اپنے اندر دیکھتا ہوں یہیں سے سارا منظر دیکھتا ہوں
مصرع: ہٹ کر رہے ہمیشہ دیگر کے راستے سے
مصرع: آؤ قدموں کے نشانوں سے ذرا بچ کے چلیں
مصرع: ہمارا گھر بھی کسی کہکشاں کا حصہ ہے
مصرع: یہ کہکشاں بھی مری ہی نظر کا حصہ ہے
اور لے میں ہے مخاطب دنیا اور میں اور ہی آہنگ میں ہوں
تھا اُدھر اور ہی اک دُھن میں زمانہ سارا اور ادھر رنگ دگر فکر دگر میں ہم تھے
زندگی ہے تو بہر حال بسر بھی ہوگی شام آئی ہے تو آئے کہ سحر بھی ہوگی
شام تو ہوگی سحر تو ہوگی زندگی ہے تو بسر تو ہوگی

میرا ایک شعر ہے
سوچا ہے کہ اب کے کوئی دیوار گرا دیں اس گھر کو ذرا اور ہوادار کیا جائے

ابھی حال میں ایک جگہ ایک نوجوان شاعر کا شعر دیکھا جو مزاح کے شاعر ہیں۔ آپ بھی دیکھیں۔

ہر روز جہاں اک نئی دیوار کھڑی ہو رکھ پاؤ گے اس گھر کو ہوادار کہاں تک

ان اشعار کے کوٹ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بتا سکوں کہ اب یکسانیِ خیال سے کسی

بھی طرح بچنا ممکن نہیں رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اب کوئی اور لہجہ اختیار کیا جائے اور خیالات کو از سر نو تراشا جائے۔ اس کے لیے سرّیت، ابہام اور ایہام وغیرہ کا سہارا لیا جائے۔ بے شک ایسے اشعار آسانی سے نہیں کہے جا سکیں گے اور یہ ابتدا میں بے معنی سے بھی لگیں گے مگر یہ سب کچھ اجنبیت کی وجہ سے ہوگا۔ صرف ابتدا میں۔ اگر ان کا چلن چل پڑا تو اور کچھ ہو یا نہ ہو شاعری کا موجودہ موسم ضرور بدل جائے گا۔۔۔ آگے اللہ مالک ہے۔

اپنی بات واضح کرنے کے لیے میں مثالیں دینا چاہوں گا۔ دراصل اس نوعیت کی کوششیں شروع ہو چکی ہیں مگر عام نہیں ہیں۔ یہ بہت سے شعرا اس ضمن میں مصروف ہیں کبھی کامیاب کبھی ناکام۔ میں جس قسم کے اشعار کا ذکر کر رہا ہوں ان میں اور مہمل اور بے تکے اشعار میں بال برابر کا فرق ہے اور صورت وہی ہے کہ ذرا سا چوکے اور شعر مبہم کے بجائے مہمل ہو جائے گا مگر اب شاعری کے قافلے کو اسی پل صراط پر چلنا ہے۔ اس وقت شاعری کو ایسے ہی RADICAL CHANGE کی ضرورت ہے۔

اس نوعیت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رات لغاتِ عمر سے میں نے چنا تھا ایک لفظ لفظ بہت عجیب تھا یاد مجھے رہا نہیں
(انور شعور)

ذہن کے تاریک گوشوں سے اٹھی تھی اک صدا میں نے پوچھا کون ہے اس نے کہا کوئی نہیں (شہزاد احمد)
نشاطِ نارسا میں خواب گم ہیں کسے منظور ہے ابہام کرنا (احسن سلیم)
کبھی دکھیں سونے کے ذرے، کبھی جھلکے مرغابی کا لہو گئی پیاسے کب سے کھڑے ہیں گر پانی شفاف نہیں ہوتا (محمد اظہار الحق)
ابھی کوئی سایہ نکل آئے گا ذرا جسم کو روشنی تو دکھا (محمد علوی)
تھا کے ہاتھ میں میرے وہ ایک کھلتا گلاب تماشا دیکھ رہا تھا میرے بکھرنے کا (بانی)
کوئی آغاز ابد سے بھی پرے کوئی انجام کہانی کے بغیر (ظفر اقبال)
کہیں کوئی مچان ہے نہ کوئی اپنی تاک میں کمال احتیاط سے شکار ہو رہے ہیں ہم (محمود شام)
قرائن ہی سے ہو جاتا ہے ثابت جرم تیکے پر عدالت آنکھ اور شہتیر تک آنے نہیں پاتی (سحر انصاری)
تماشے بحر کی سطحوں پر موجوں کے بھی کیا کم ہیں کہ اوپر سے ہواؤں کی اداکارہ اتر آئے (ذکا شاہان)
میں پانیوں کے پہلے مرحلے تک جہاں پہ وہ تھا تیسرا کنارہ تھا (جمال احسانی)

ان اشعار کو پڑھ کر آپ کو اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ میں کس قسم کی شاعری پر توجہ دینے کی بات کر رہا ہوں۔ آپ دیکھیں کیا ان اشعار میں برہنہ گفتاری کہیں ہے۔ سارے کے سارے شعر شعریت سے بھرپور ہیں۔ کہیں بھی غزل کو ہزل بنانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ کہیں آپ کو ان میں یہ بات بھی دکھائی دے گی کہ یہ معنوی سطح

پر آسانی کھلتی ہیں۔ دور افتادہ سے مضامین ہیں کچھ، ایک تجریدی گہر سی چھا رہی ہے ان پر ان اشعار کی یہ تحیر و کیفیت ہی ان کا حسن ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے مضامین کو اس طرح دوسرا کوئی بہ آسانی اُڑا کر کہیں لے جا سکتا جیسا کہ آپ نے اُن اشعار میں دیکھا جو میں نے خیال کی تکرار کے باب میں لکھے ہیں۔ یہ اشعار ردیف اور قافیوں کی قید میں بھی آزاد آزاد سے ہیں۔ تو میں دراصل کچھ ایسی ہی شاعری کی بات کر رہا ہوں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ ان کی تجریدیت کی فضا اور بھی گھمبیر کرنے کی ضرورت ہے۔ اب ہمیں ایسے شعر کہنے میں جن کے نفس مضمون کو ہم خود بھی REPEAT نہ کر سکیں۔ ماضی میں آپ نے دیکھا کسی نے ہوا اور چراغ کے استعاروں سے شعر بنایا تو جناب جدھر دیکھیے اُدھر ہوا تھی اور چراغ تھے۔ مگر اس خوب صورت شعر کے مضمون کو آپ REPEAT نہیں کر سکتے۔

ذہن کے تاریک گوشوں سے اٹھی تھی اک صدا
میں نے پوچھا کون ہے اُس نے کہا کوئی نہیں

خود حضرت شہزاد احمد بھی اسی مضمون کو اب کسی اور شعر کے ذریعے دُہرانا پسند نہیں کریں گے۔ تو میں دراصل کچھ ایسی شعری فضا شعروں میں چاہتا ہوں جو بس ایک بار کہیں ملے اور پھر کسی کے ہاتھ نہ لگے۔

میری ان معروضات سے یہ مطلب نکالنا بھی دُرست نہیں ہوگا کہ میں مہمل اور بے معنی شاعری کی طرف داری کر رہا ہوں۔ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ مہمل اور مُبہم میں فرق کرنا لازمی ہے۔ ابہام ہمیں کسی نہ کسی بامعنی نتیجے پر اس طرح پہنچاتا ہے کہ عقل اور شعور کی سند اسے حاصل ہوتی ہے جبکہ مہمل ہمیں کسی ایسے مقام پر لا کر کھڑا کرتا ہے جسے شعور اور دلائل رد کرتے ہیں اور یہ کسی روحانی مسرت کا باعث بننے کے بجائے تکدر پیدا کرتا ہے۔ مہمل شعر Clue-Less ہوتا ہے مبہم شعر میں Clue موجود ہوتا ہے۔ تاہم تفہیم کی سطح کو قاری کا اپنا ذہن متعین کرتا ہے اور ہر شخص کی فہم کی سطح الگ ہوتی ہے۔

اب یہ سب کچھ کیسے ہوگا۔ یہ میں نہیں جانتا۔ ہمارے شعرا کے ہاں ایسے اشعار مل رہے ہیں اور یہ صورت حوصلہ افزا ہے۔ ہمیں اس وقت سمت کے تعین کی ضرورت ہے کہ شاعری کو کدھر سفر کرنا ہے جہاں وہ نئے ذائقے سے آشنا ہو سکے۔

میں یہ بھی نہیں جانتا کہ میری باتیں کس حد تک VALID ہیں تاہم میں کہتا ہوں کہ اگر اس باب میں ہمارے دوسرے ساتھی شعرا بھی کچھ اظہار خیال کریں تو اس سے تجربوں کے کچھ نئے در ضرور باز ہو سکتے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد

حبِّ آدم سے بھری اک داستاں پیدا ہوئی

اُردو کی ابتدا متحدہ ہندستان کے کس علاقے میں ہوئی۔ اس موضوع پر ڈاکٹر مسعود حسین خاں، نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر گیان چند، حافظ محمود شیرانی، گریرسن اور سنیتی کمار چٹرجی کی تحریریں پڑھنے کے بعد یہ اشعار موزوں ہوئے۔

یا الٰہی! اس زمیں کو شاد رکھ آباد رکھ
جس زمیں کی کوکھ سے اُردو زباں پیدا ہوئی

مجھ کو کیا اس سے کہ یہ میری زبانِ دلنشیں
کون سے سن میں ہوئی پیدا کہاں پیدا ہوئی

میں تو اے آزادؔ! بس اس بات سے دلشاد ہوں
ہم فقیروں کے لیے تسکینِ جاں پیدا ہوئی

ابتدا جس کی محبت انتہا جس کی خلوص
حبِّ آدم سے بھری اک داستاں پیدا ہوئی

دہلی و لاہور سے دنیائے امریکا تلک
اک زبانِ فتح یاب و کامراں پیدا ہوئی

مشرق و مغرب میں جس نے ربطِ نو پیدا کیا
جس کو کہیے نازشِ بزمِ جہاں پیدا ہوئی

آسماں پر اختران علم و فن کے درمیاں
شاعری کی، نغمگی کی کہکشاں پیدا ہوئی

میرے تہذیب و تمدن کی حفاظت کے لیے
نرم دل، فولاد بازو پاسباں پیدا ہوئی

جن دنوں پانی کے قطروں کو ترستی تھی نظر
ایک موجِ بے اماں و بے کراں پیدا ہوئی

جن دنوں حسنِ بیاں الفاظ کا محتاج تھا
ان دنوں وانندہ لفظ و بیاں پیدا ہوئی

دل کو عرفیؔ نے زباں لکھا، زباں کو دل کہا [1]
جو دلوں کی ترجماں تھی وہ زباں پیدا ہوئی

اک پری پہنے ہوئے سورج کی کرنوں کا لباس
بن کے حسن رونقِ ہندوستاں پیدا ہوئی

دیکھ تو بھی اے گرفتارِ مقامِ نفس و طبع
پایۂ ہفتم پہ راحت گاہ جاں پیدا ہوئی

فیضِ عرفاں روح میں ملبوس سادہ جسم پر
اک زبانِ نکتہ بین و نکتہ داں پیدا ہوئی

تاکہ اپنے سامنے والوں کا دل کر لے شکار
زلفِ مشکیں طرۂ عنبر فشاں پیدا ہوئی

وہ بیاں کہیے جسے زیبِ بیاں، پیدا ہوا
وہ زباں، کہیے جسے حسنِ زباں، پیدا ہوئی

[1] زباں نفس میں دل یافی دل نفس میں زباں بینی (عرفی)

ستیہ پال آنند
606 ADAM STREET
HERNODON V.A 20070
U.S.A

موت کا فنکار[1]

(بھارت اور پاکستان کے سربراہوں کے نام جو جوہری ہتھیاروں کی دوڑ میں مصروف ہیں)

وہ کھڑا ہے
وہ کھڑا ہے خالی کینوس اپنے ایزل پر لگائے
اور بہت سے برش اپنی انگلیوں میں یوں دبا کر
جیسے اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا تو گر پڑیں گے

وہ کھڑا ہے کور آنکھوں سے افق پر دیکھنے میں محو
شاید اک نوشتہ، یا کوئی پیغام، اک تصویر
جس کو اس کی آنکھیں (جب کھلیں گی)
دور افق پر دیکھ کر پہچان لیں گی

وہ کھڑا ہے اپنے گرد و پیش سے غافل
بہت سے رنگ اس کے گرد یوں بکھرے ہوئے ہیں
جیسے اس نے نیند کی حالت میں
رنگوں کی پٹاری کھول کر بکھرا دیے ہوں

رنگ سارے موت کے ہیں
میلے، کالے، مرگھٹوں کی راکھ کی رنگت کے
مردہ کوڑھ جیسے

کچے زخموں کے کھرونڈوں کی طرح
قبروں پہ اڑتی استخوانی دھول کی مانند
سارے رنگ جو بکھرے ہوئے ہیں
موت کے ہیں!

کون سا ایسا نوشتہ ہے افق پر
کون سا پیغام ہے، جو اس کی آنکھیں
(جب کھلیں گی) دیکھ کر پہچان لیں گی؟
کس نئی تصویر کی تخلیق میں یہ
موت کا فنکار تب مصروف ہوگا؟

رنگ سارے موت کے ہیں
رنگ سارے منتظر ہیں!!

---

[1] یہ نظم پہلے انگریزی میں لکھی گئی اور The Doomsday Painter کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اسے واشنگٹن ڈی سی کی انگریزی شاعروں کی انجمن "دی فیڈرل پوئیٹس" نے رول آف آنرز پوئمز کے مقابلے میں دوسرے نمبر پر رکھے جانے کا اعزاز دیا۔ س پ ا

عشرت قادری
ایم۔ایل۔بی۔کالج روڈ، بھوپال

شمع مجلس اقبال

(بیادِ ممنون حسن خاں)

مجلس اقبال سے اک شمع ہم تک آئی تھی
نام سے ممنون کے تادیر جو روشن رہی
آہ وہ شمع فروزاں بھی اچانک بجھ گئی
چھا گئی شہر غزل پر چاروں جانب تیرگی
وہ سراپا علم، تہذیب مجسم ذی وقار
پیکر ظرف و متانت درد مند و غم گسار
جاں نثاری جس کا شیوہ جسکی طینت انکسار
خوش مزاج و خوش لباس و خوش خصال
نرم خو، گرم عمل، صاحب نظر، شیریں مقال
مل نہیں سکتی جہاں میں حشر تک اس کی مثال
عاشق اقبال ارادت مند محبوبِ خدا
حافظ "ضرب کلیم" و ناظر "بانگ درا"
اس کے پہلو میں دھڑکتا تھا دل درد آشنا
قدردانِ علم و فن، گرویدہ شعر و سخن
خلوت و جلوت میں یکساں دیکھا اس کا بانکپن
در حقیقت وہ تھا اپنی ذات میں اک انجمن
زندگی اس کی ادب تھی، روشنی اس کا وجود
اس کی نظروں میں تھا مثل آئینہ غیب و شہود
چھو کے بھی لیکن نہ گزری شہرت و نام و نمود
ذہن و دل مفلوج ہیں کس طرح میں نوحہ لکھوں
لب سے پہلے کب رواں تھی آنکھوں سے یہ جوئے خوں
خاک میں جو مل گیا اک گوہر نایاب تھا
آسماں بھی اس کے غم میں دیدہ پر آب تھا

کاوش پرتاپ گڑھی
ڈی/۱۹۰، بلجیت نگر، نئی دہلی ۸

دوہے

حاصل کرنے کے لیے، اف یہ کیسا شور
ایک کھلونے کے لیے، دو بچوں میں زور

کہاں کہاں گھومے نہیں، بدل بدل کے بھیس
ہم نے اپنے آپ کو، ڈھونڈا دیس بدیس

پنجرہ ابھی جوان تھا، ہر سلاخ میں جان
پنچھی پنجرہ توڑ کر، کیسے بھری اڑان

دنیا پتھر ہو گئی، مانو تا بھی مون
آگ لگی ہے شہر میں، شور مچائے کون

چیونٹی نے گجراج کو، کیسے دیا پچھاڑ
اک ذرے کے سامنے، چت ہو گیا پہاڑ

آنکھوں میں طاقت کہاں، دیکھیں اس کا روپ
اس کے اک اک روم سے، پھوٹ پڑی وہ دھوپ

آج مرے ہی ساتھ کیا، سدا رہی یہ بات
جیتے جی فنکار کے، بچے رہے اناتھ

ڈاکٹر یعقوب یاور
ڈپارٹمنٹ آف اردو
وسنت کالج، راج گھاٹ، بنارس

غزل

لکھوں اک ایسی غزل عہد اجتہاد کے نام
ترے فراق کے غم میں اور اپنی یاد کے نام

نہ بنت لوط سے ہمدردیاں نہ عاد کے نام
جو اپنے آپ میں چھیڑا ہے اس جہاد کے نام

یہ داستانچہ محتاج الف لیل نہیں
یہ شہریار کا قصہ ہے شہرزاد کے نام

حسینیت کی شہادت بھی کارنامہ ہے
جو کربلا نہیں پہنچا تھا اس زیاد کے نام

خلاف جنگ بھی خاموش عہد امن پہ چپ
طلسم صوت ابھی قرار داد کے نام

گرفت خواب نہ چھوٹی فریب خواب کے بعد
یہ شعر ہے اسی مرحوم اعتماد کے نام

غزل کے نام ہے یہ دل کا مرثیہ یاور
نہ اپنی فکر کے حق میں نہ تیری داد کے نام

شمس تبریزی
ہریانہ اردو اکادمی
۵۱۷، سیکٹر ۱۲، پنچکولہ

غزل

کوئی موسم ہو ہُوا اس کا بھی پانا مشکل
پہلے حالات نہ تھے، اب کے، زمانہ مشکل

چپ جو رہتا ہوں تو زخموں کا پتہ ملتا ہے
آہ کرتا ہوں تو پھر ظرف چھپانا مشکل

کیا کہوں اس کو، وہ خوشبو ہے ہولے کیا ہے؟
دیکھنا بھی جسے مشکل ہے دکھانا مشکل

زندگی ہے تو یہ کٹ جائے گی کیسے بھی مگر
اک قصیدہ نیا ہر روز سنانا مشکل

ہم وہ فنکار جو مٹی کی محبت میں لٹے
اپنی تعریف میں تاریخ بتانا مشکل

پہلے وقتوں کے عجب لوگ تھے مرجاتے تھے
اک محل عشق میں وہ جان اپنی گنوانا مشکل

ذکی طارق
۵۶۴، کیلا روڈ، گئوشالہ پھاٹک
غازی آباد۔ ۹

غزل

ہم نے خود دے کے لہو، خشت وقار رکھی ہے
آپ فرمائیں کہ کیا اس کی سزا رکھی ہے

وقت کی دھوپ سے پونچی یہ بچا رکھی ہے
ماں نے پھولوں پہ دعاؤں کی ردا رکھی ہے

شمع احساس سر فکر جلا رکھی ہے
ہم نے ہر کھڑکی سدا ذہن کی وا رکھی ہے

ہے یقیں نیند سے جاگیں گے کبھی تو منصف
ہم نے انصاف کی زنجیر ہلا رکھی ہے

خیر خواہوں کے خیالات پرکھنے کے لیے
خود ہی مرنے کی خبر میں نے اڑا رکھی ہے

میں کہ اردو کا قلم کار ہوں خوابوں کا اسیر
ذہن میں صبح کی تعبیر سجا رکھی ہے

کیوں نہ ہر طاق کھنڈر کا ہو اجالوں کا گواہ
اس نے سوغات سیاہی کی بچا رکھی ہے

ایک گھر بے در و دیوار کا کر کے تعمیر
میں نے آنگن کی کھلی آب و ہوا رکھی ہے

پاس تو رکھا ہے دیرینہ روایت کا ذکی
اپنی پہچان مگر ہم نے جدا رکھی ہے

شاکر سوپاروی
۳۵۸ شاکر منزل پوسٹ
سوپارہ ضلع تھانے ۴۰۱۲۰۳

غزل

فاصلہ مٹانے کی کتنی کوششیں کی ہیں
ہم نے تم کو پانے کی کتنی کوششیں کی ہیں

رات کے اندھیرے میں دل جلا کے بیٹھے ہیں
روشنی میں آنے کی کتنی کوششیں کی ہیں

تم نہ سن سکے ورنہ آنسوؤں کے ہونٹوں سے
داستاں سنانے کی کتنی کوششیں کی ہیں

آندھیاں سمجھتی ہیں یا کہ ہم سمجھتے ہیں
شمع دل جلانے کی کتنی کوششیں کی ہیں

شکوۂ نامرادی کا سب بجا مگر شاکر
آپ نے ٹھکانے کی کتنی کوششیں کی ہیں

ملک زادہ جاوید
ٹی ۲۵/ ٹیگور اللو نیڈا

غزل

موسموں کی ترجمانی اور ہے
سوکھے پتوں کی کہانی اور ہے

میں گھٹاؤں کا نہیں ہوں منتظر
میرا ساغر میرا پانی اور ہے

وہ مروت وہ رواداری کہاں
عہد حاضر کی نشانی اور ہے

کھل اٹھے پھر اس کے ہونٹوں کے گلاب
ان دنوں کچھ مہربانی اور ہے

مفلسوں کو ڈھونڈ لو مل جائیں گے
اک گھرانا خاندانی اور ہے

جانے کیا کیا سوچ کر آیا تھا میں
گھر بلا کر میزبانی اور ہے

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن
مدھوبن-A-267، سادھو نگری
گوڑگاؤں۔(ہریانہ)

"سفر ستارہ" کا شاعر

"سفر ستارہ" پرکاش فکری کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ کسی شاعر کی سو غزلیں اس کے مزاج، رویے، رجحان اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو سمجھانے کے لیے بہت ہیں۔ پرکاش فکری نئی غزل کے ایک نمائندہ شاعر ہیں جو اپنے منفرد رجحان اور تجربوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ خوابوں کی شکست و ریخت اور زندگی کی خوشبوؤں کی شہادت کے بعد جو پُراسرار حیرت انگیز اور اذیت ناک منظر نامہ مرتب ہو سکتا ہے اس کا ایک نمایاں پہلو پرکاش فکری کی غزلوں میں موجود ہے دکھ ایسا ہے جس کی گہرائی کو محسوس کرتے ہوئے وجود میں ایک عجیب سنسناہٹ سی پیدا ہو جائے۔ طنز اور زہرناکی سے تجربے اکثر گرم ہو جاتے ہیں اور تناؤ کو محسوس بناتے ہیں غزلوں کے یہ اشعار بھی جبر و تشدد اقدار کی شکستگی اور فرد کے زیاں کو سینے میں دبائے ہوئے ہیں، انھیں صاف طور پر نمایاں یا ظاہر نہیں کرتے۔ بہت صاف عام واضح لفظوں کی مدد سے اندھیرے میں اتار دیتے ہیں اذیت ناک اور حیران کن فضاؤں کا صرف احساس دیتے ہیں۔ قاری خود تجربے سے آشنا اور آگاہ ہو جاتا ہے اور اس طرح شاعر کا تجربہ قاری کا تجربہ بن جاتا ہے۔ پرکاش فکری کے کلام کی یہ ایک بہت بڑی خصوصیت ہے جو ان کے ہم عصر شاعروں کے یہاں موجود نہیں ہے۔ "سفر ستارہ" کی غزلیں ایک ہی اندھیرے کے کئی گوشوں اور پہلوؤں کو مخصوص بناتی ہیں لیکن کہیں یک رنگی پیدا نہیں ہوتی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

رات آتی ہے تو روتی ہیں بلائیں ہر سو سب کے سینوں میں اترنے کو ہے خنجر اب کے
میں جو پہنچوں گا سر آب ڈبونے خود کو مجھ کو آواز مری پیاس کا صحرا دے گا
جن میں لرزاں ہو کوئی عکس ہمارے غم کا کیوں نہ ڈھونڈیں کسی چہرے پہ وہ آنکھیں بولو
خوف آسا جنگلوں کی کانپتی پرچھائیاں بستیوں کی خامشی میں سر چھپانے آگئیں
کشتیاں تنہا سمندر کی اُداسی جھیل کر ساحلی شہروں کو اپنا دکھ سنانے آگئیں
وہ خوابوں کی بستی ملے گی کہاں کہ بھوتوں نے ڈیرا جمایا وہاں
سر شام شعلے لپکنے لگے سلگنے لگیں جسم کی ہڈیاں
وہاں تک رہے گا یہ خوف و خطر جہاں تک یہ جنگل ہے پھیلا ہوا
دھند لکے دھندلے آئینوں میں عکس ڈر کر دیکھنا اپنا حصہ رہ گیا ہے اجڑے منظر دیکھنا

اسرار حسین

کہیں چھپکے میں ناگن خون ہو گی انگلیاں ۔۔۔ اے رستے میں [illegible] آؤ اب واپس چلیں
[illegible] جنائیں، سانپ اندھیرا، تنہائی کالی ۔۔۔ پیچھے لوٹ کے جانا مشکل آگے اندھی کھائی
گرد سیہ نے ڈھانپ دیا شہر کا بدن ۔۔۔ روحوں پہ ایک عذاب ہے ذلت کی چبھن
تحلیل میں میرا جسم تو تحلیل ہو گیا ۔۔۔ باقی مگر ہنوز ہے لمحات کی دُکھن
اپنے ہی سائے سے ڈر کے لوگ جب چھپنے لگے ۔۔۔ رات بھر خامشی کے درد سے چلائے گا
گھروں کی روح میں بھوتوں کے ڈیرے ۔۔۔ صدا کا شہر بھی صحرائے ہو ہے
ستارے بھی لگتے ہیں سہمے ہوئے ۔۔۔ گھنی شب ہے سورج بھی اندھا ہوا
وہ آسیب باہر نکل آیا تو ۔۔۔ اکیلے ہیں گھر میں دہل جائیں گے
گزر چکے ہیں مہ و سال قافلے بن کر ۔۔۔ لہو میں شور وہی [illegible] سمندر سا

خوابوں کی شکست و ریخت کے منظر نامے کا یہ پہلو شاعر کے اپنے منفرد مشاہدات اور تجربات کے مرتب ہے یہ اعصابی اور ذہنی تناؤ کی بھی شاعری ہے۔ زندگی ادھر سے گزری ہے اور گزرتی جا رہی ہے۔ روح کا کرب و غم منتہا پر پہنچ کر دم بخود ہے، حیرت زدہ ہے۔ مشاہدات ہیں جو ابھرتے جا رہے ہیں۔ اجڑا ہوا منظر ہے، لوٹ کر پیچھے جانا مشکل ہے اور سامنے اندھی کھائی ہے، گھروں کی روح میں بھوتوں کے آسیبوں نے ڈیرے ڈال لیے ہیں، صدا کا شہر صحرائے ہو بن گیا ہے۔ ہر لمحہ خوف ہے کہ آسیب باہر نکل آئے گا۔ شہر کا بدن گرد سیہ سے ڈھانپ دیا گیا ہے لوگ خود اپنے سایے سے ڈر رہے ہیں، رات کے آتے ہی ہر جانب بلائیں روتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے سب کے سینوں میں اب کے خنجر ضرور اتر جائے گا، ایک جنگل اچانک پھیل گیا ہے اور خوف و خطر اس کے ساتھ بڑھتا گیا ہے، جنگلوں کی پرچھائیاں اس قدر خوف زدہ ہیں کہ مسلسل کانپ رہی ہیں، سفر ستارہ، کی عمدہ خوبصورت غزلوں کی یہ اذیت ناک، پراسرار اور حیرت انگیز فضا ہے جس سے جمالیاتی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ پرکاش فکری بڑے حساس شاعر ہیں۔ اس عہد کے سانحے جو ان کے موضوعات بنے ہیں وہ خود شاعر کے مزاج اور رویے کو واضح کر دیتے ہیں۔ ماحول کی حد درجہ اُداسی اور بے چینی پرکاش فکری کے تجربوں میں جذب ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے مشاہدات کو ایسے پیکروں پر منتقل کر دیتے ہیں جو عام جانے پہچانے تو ہیں لیکن ان مشاہدات کو پا کر بصیرت افروز بن جاتے ہیں۔ پیڑ، جنائیں، سانپ اندھیرا کائی، تنہائی، روحیں، الاؤ، سوکھی بیل، گرد سیہ خاموشی، دھوپ، اندھیرا، درد، خواب، آگ، سایے، لہر، آہٹ، آسیب، بھوت، روتی بلائیں، پرچھائیں، جنگل، طلسم، سمندر یہ سب تحسیلی پیکر شاعر کے اپنے مشاہدوں کی وہ شعاعیں لیے ہوئے ہیں کہ جن سے جمالیاتی انبساط حاصل ہوتا ہے۔ ان پیکروں کے پیچھے شاعر کے جذباتی اور حسی اضطراب کی پہچان مشکل نہیں ہوتی، جذباتی اور حسی اضطراب میں شدت نہ ہوتی تو ایسے شعری تجربے سامنے نہیں آتے۔

اب رگوں میں روشنی بھرتا نہیں ان کتابوں کا طلسم باطنی
بتاتی ہے یہ لوگوں کی خوشی ہوا ہے قتل جس میں یہ گلی ہے
خواب رنگیں کسی مصور کا ایسا کوچہ یہاں نہیں کوئی
وہ رات میرے خون کی پیاسی تھی کس قدر کیسے کروں بیان کہ سب کو یقین ہو
تمہارے عہد کا قصہ بھلا کر ہم اپنے وقت کی ڈھونڈیں نشانی
پرندوں کی اڑانیں تھم گئی ہیں کہ موسم پھر عجب سا ہو رہا ہے
بنے وہ عنواں کہانیوں کے ہمارے زخموں کے جو نشاں تھے
جم گیا ہونٹوں پہ قصہ درد کا رک گیا آنکھوں میں دریا کیا کریں

پرکاش فکری کے ہر شعر میں جذبے کا خلوص ہے درد مندی اور سوز و گداز ہے۔ آسیب، بھوت اور رات اور اندھیرے وغیرہ شاعر کے خاص استعارے ہیں جو زندگی کی المناک فضاؤں کا گہرا تاثر بخشتے ہیں۔ خود اپنے شہر میں وہ جن المناک حالات واقعات سے دوچار ہیں اور ان حالات سے جو گہرے تاثرات ابھرتے ہیں انہوں نے زندگی کے پھیلے ہوئے تجربوں میں جذب کر دیا، شہر کی دہشت انگیزی، زندگی کی دہشت انگیزی اور شہر کا المیہ پوری زندگی کے المیہ کا استعارہ بن گیا ہے۔

اکیلی شب کا اندھیرا تو کھائے جاتا ہے مجھے تو اپنے ہی سائے کے ساتھ مرنا تھا
ہراساں شام ہے تنہائیوں کی سیاہی چار سو پرچھائیوں کی
لرزاں ہے کسی خوف سے جو شام کا چہرہ آنکھوں میں کوئی خواب سمونے نہیں دیتا
ہم ایسے دشت میں فکری بھٹک رہے ہیں اب درندے خوف کے مارے جہاں نہیں رہتے
رات آئی تو یہ لگا جیسے دور پیڑوں میں کوئی گریاں ہو

جبر اور عذاب کے لمحوں کے شعری تجربوں کو ذرا اس حدیث نبوی کی روشنی میں دیکھیے:

"جبر اور عذاب کے حالات پرندوں کو بھی ان کے گھونسلوں میں مار دیتے ہیں" انسان پر حالات کے جبر اور عذاب کی وجہ سے فرد کے لہجے میں جو زہرناکی پیدا ہوئی ہے اس کی ایک انتہائی لطیف صورت پرکاش فکری کے کلام میں ملتی ہے۔ اندھیرے کے مختلف خانوں اور پہلوؤں میں اتار ہوئے بھی تجربے اور بیان کی لطافت اپنی جانب کھینچتی ہے۔

پرکاش فکری کی غزلیں سورج کی بشارت نہیں دیتیں خوشبوؤں کی شہادت کے مناظر کے شدید احساس کو پیش کرتی ہیں۔ نئی اردو شاعری میں خوابوں کی شکست و ریخت کا یہ اپنے رنگ کا منفرد منظرنامہ ہے۔

روشنی پرچھائیوں کے جنگلوں میں گم ہوئی خوف آسا تیرگی میں رات کی نبضیں ٹٹول
روح سے گرد سفر کا بوجھ ہے چھٹا ہوا ہر کنواں خالی ملا ہے ہر جگہ ڈالا ہے ڈول

ڈاکٹر شفیقہ فرحت
۲-۴ تاپتی، لیارٹ منٹس
روشن پورہ، ٹی ٹی نگر، بھوپال

ڈاکٹر حامد حسین کی طنز و مزاح سے چھیڑ چھاڑ

حسِ مزاح ہر ذی روح میں ہوتی ہے خصوصاً جب وہ انگریزی کا پروفیسر ہو۔ اردو کا ادیب، محقق اور نقاد ہو اور عربی زبان سے بھی دلچسپی اور واقفیت رکھتا ہو۔ اور یہ شخص ہے پروفیسر سید حامد حسین۔ ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی۔ اب تک ان کی چند ایسی تصانیف سامنے آچکی ہیں جو ان کی ڈگری اور عہدے کی طرح ہی بھاری بھر کم اور سنجیدہ ہیں۔ مثلاً:

"اردو شاعری میں مستعمل تلمیحات اور مصطلحات"۔ "مشرقی علوم والسنہ پر تحقیق "تحقیق اور حاصلِ تحقیق" وغیرہ وغیرہ۔ تمام تصانیف کے "اسمائے گرامی" دینے لینے کی مجھے زحمت نہیں کرنی ہے۔ کیونکہ مکمل فہرست خود 'صاحبِ کتب' دے چکے ہیں اور ان کا کہا زیادہ مستند ہے۔

لیکن صاحب ایک اچھا خاصا انسان کتنی دیر تک سنجیدگی کا نقاب اوڑھ سکتا ہے۔ حامد حسین تو ویسے ہی مجلسی آدمی ہیں، کلاس روم میں وہ لطیفے سنایا کرتے تھے یا نہیں (کہ اب وہ بخیر و عافیت ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔) لیکن عام محفلوں میں ان کے ذہانت سے بھرے لطیفوں' معیاری Comments اور روشن چمکتی پھلجھڑیوں کی کمی نہیں۔ آپ کی جملے بازی کبھی مجلس کو قہقہہ زار بھی بناتی ہے اور کبھی تیر نیم کش کی طرح خلش بھی پہنچاتی ہے۔

جب سنجیدہ مضامین لکھتے لکھتے ان کا سر بھاری اور قلم وزنی ہو چکا تو انھوں نے ایک ادبی نشست میں بڑی سی جیب سے مختصر سا مضمون نکالا۔ "قصہ منہ بولی بھاوجوں کا" اور سامعین بے ساختہ مسکرانے اور ہنسنے پر مجبور ہو گئے۔

اور حامد حسین کی ادبی شخصیت کا ایک نیا پہلو سامنے آیا۔

پھر تو اکثر رسائل میں حامد حسین کے طنزیہ، مزاحیہ، انشائیہ مضامین نظر آنے لگے اور پسند کیے جانے لگے۔ داد تو آپ سب کتاب پڑھ کر دینے پر مجبور ہوں گے ہی۔ جھلکیاں ہم آپ کو ابھی دکھائے دیتے اور چند پھڑکتے ہوئے جملے نظر نواز کیے دیتے ہیں۔

"گویل کے دروازے پر پہنچ کر بڑے اشتیاق کے ساتھ دستک دینے ہی والے تھے کہ اندر سے گویل اور مسز گویل کے ایسے خوفناک مکالمے بلند ہوتے سنائی دیے کہ ہمیں یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دونوں باہمی خلوص کے امتحان کے ہفتہ وارانہ فریضے کی ادائیگی میں مصروف ہیں۔" (قصہ منہ بولی بھاوجوں کا)

آگے چل کر اسی مضمون میں وہ شوہروں کے "بین الاقوامی کردار" کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔

"ہم چاہے اپنی بیوی کے تابعدار ہوں یا نہیں، لیکن دوسروں کی بیویوں کی تابعداری اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔"

'ردی کی دہشت گردی' میں انسانی فطرت کا مطالعہ جس گہرائی سے کیا گیا ہے اور اسے جس خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کا لطف آپ بھی اٹھائیے۔

"انسان کو جو بات حیوان سے امتیاز بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ اسے فضول سامان کو سینے سے لگا کر رکھنے کا خداداد ملکہ حاصل ہے۔ یہ انسان ہی ہے جو عام زندگی میں کام نہ آنے والے کاٹھ کباڑ کا سرمایہ، تاریخی وراثت اور نہ جانے کیا کیا خوبصورت نام دے کر محفوظ رکھتا ہے۔ کسی انسان کے تہذیبی مقام کا پتا اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ردی سامان کو اپنے گھر کے دیوان خانے اور ذہن کے نہاں خانوں میں جگہ دینے کے کتنے کتنے خوبصورت بہانے تراش لیتا ہے۔"

جیسے جیسے مضمون آگے بڑھتا ہے، مزاح کا رنگ شوخ ہوتا جاتا ہے۔

"ہماری بیگم صاحبہ کو نوادرات کا ایک بکس ہاتھ لگ گیا تھا اور با آواز بلند رواں تبصرے کے ساتھ ایک ایک آئیٹم کو اس طرح پیش کر رہی تھیں

جیسے کوئی نیلام والا حاضرین کا دل جیتنا چاہ رہا ہو ـــــ دیکھو یہ تین انگلیوں والی اس گڑیا کا ہاتھ ہے جو ہم نے تین سال کی عمر میں بنایا تھا۔"
شوہر اور بچے بھی پیچھے رہنے والے نہ تھے۔

"حال یہ تھا کہ ہر ایک اپنی اپنی تاریخ پر سے گرد جھاڑ کر ماضی کی اندھیری سرنگ میں داخل ہو چکا تھا۔ اور اسے پتا نہ تھا کہ دوسرا کیا کہہ یا کر رہا ہے۔"

'جیب کا درد' میں ایک بہت ہی معمولی بظاہر غیر ضروری چیز ہے کہ جسے جیب کہا جاتا ہے' اس سے حامد حسین نے ملک کے پورے سماجی اور اقتصادی ڈھانچے پر بھرپور وار کیا ہے۔

'میری قمیص میں جیب نہیں لگائی گئی؟'
'ضرورت نہیں تھی۔'
'لیکن کیوں؟'
'اوپر کا حکم ہے۔'
'کتنے اوپر کا؟'
'بہت اوپر کا'
کس وجہ سے؟
'تاکہ جمع خوری کی روک تھام ہو سکے۔'
کیسے؟
'جتنی جیبیں ہوں گی، اتنی ذخیرہ اندوزی ہو گی۔'
'لیکن میں تو اپنی جیبوں میں ضروری چیزیں رکھتا ہوں؟'
یہ آپ کا وہم ہے'
'یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟'
'یہ اس وقت اس مسئلے پر بیٹھے ہوئے اوپر تلے سات کمیشنوں کی رائے ہے'
'کیا سرکار نے ہماری جیب کاٹنے کا کام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے؟'
'یہ مذاق کی بات نہیں، یہ نہایت ٹھوس معاشی مسئلہ ہے۔'

بجٹ کا زمانہ عام آدمی کے لیے قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ ہر بجٹ میں خواہ اس کی 'رونمائی' سال میں چھ مرتبہ بھی کیوں نہ کی جاتی ہو، نئے نئے ٹیکس لگائے جاتے ہیں اور قیمتیں بڑھتی ہیں۔ ایک ذمے دار شہری اور باشعور مصنف کی طرح حامد حسین بھی اس کی چوٹ محسوس کرتے ہیں، مگر چوٹ کھانے اور چوٹ لگانے سے پہلے وہ پس منظر کے طور پر چند فلسفیانہ مزاحیہ جملے اچھالتے ہیں۔

"بابو جی کا عقیدہ ہے کہ نشہ اور نشہ کرنے والا جتنا پرانا پڑجاتا ہے اتنا ہی لطف زیادہ ہوتا ہے۔ اس وقت ان کے پاس ایسے بہت سے سگریٹ ہیں جن میں لطف ہی لطف کی دولت ہے۔"

مزاح کی ان گنت قسمیں ہیں۔ اس پر ریسرچ اسکالرس، نامی گرامی نقاد اور محقق مع وزیر آغا اور خواجہ عبدالغفور آنکھوں کو چکاچوند کردینے والی روشنی ڈال چکے ہیں۔ لہٰذا اس کا اعادہ یہاں غیر ضروری ہے۔ صرف یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ ایک مزاح واقعات، کردار اور مکالموں سے پیدا کیا جاتا ہے، اور ایک محض موضوع سے۔ واقعات سے پیدا کیے جانے والا مزاح قدرے ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ شگفتگی، ہنسی قہقہے کے ساتھ کبھی کبھی پھکڑ پن بھی شامل ہو جاتا ہے۔ موضوعاتی مزاح زیادہ بصیرت، ذہانت اور زبان و بیان پر قدرت کا متقاضی ہوتا ہے۔ کاٹ بھی اس کی تیز، وار بھی اس کا بھرپور ہوتا ہے۔ حامد حسین کے یہاں مزاح کے یہ دونوں رنگ نظر آتے ہیں۔ کہیں الگ الگ کہیں ملے جلے۔ جس سے ان کے سماجی شعور کا بھی احساس ہوتا ہے اور ہنسنے ہنسانے کی صلاحیت اور حالات پر react کرنے کی طاقت کا بھی۔

موضوعاتی مزاح کی اچھی مثال ہے۔ "وہ پوچھتے ہیں کہ قوم کیا ہے۔" قوم کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قوم کے معنی نہیں ہوتے۔ اس کی صرف صورت حال ہوتی ہے۔ اس طرح سے کہ جہاں چار آدمی کھڑے ہوں ان میں سے تین قوم ہوتے ہیں۔"

اور یہ کہ۔

"جو قوم قوم والوں کو درد نہ دے وہ قوم نہیں ہوتی، صرف نظریہ

ہوتی ہے۔"

انعامی اسکیمیں کس طرح عقل پر موٹے موٹے پردے ڈال کر اچھے خاصے انسان کو احمق بنا دیتی ہیں اور اسے تباہ کرتی ہیں، اس سے کون واقف نہیں۔ حامد حسین مع اہل و عیال اس سنہری جال میں گرفتار "دیدۂ عبرت نگاہ" کو "دعوت نظارہ دیتے ہیں۔"

اور جناب قاضی کامیاب، شہر شہر، گلی گلی جلوہ افروز ہیں۔

فارم بھرنے کے جاں گسل، تجربے سے ہر ڈگری یافتہ اور نراکشر شہری گزر چکا ہے اس لیے مصنف کے لکھے کو جھٹلانا مشکل ہے۔

"فارموں سے ہمارا تعلق ہماری طبعی عمر سے طویل تر ہے۔ ہماری پیدائش سے کئی ماہ قبل سے ہمارے لیے فارم بھرے جانے لگتے ہیں اور ہماری موت کے کئی کئی سال بعد تک بھرے جاتے رہتے ہیں۔"

"راجا پھر سے لوٹ کے آیا رے" کو مصنف نے 'لوک کتھا کے روپ میں ایک طنزیہ فینٹسی' کہا ہے۔ کسی دور میں بھی لوک کتھائیں محض وقت گزاری اور دل بہلاوے کے لیے نہیں کہی گئیں۔ جس وقت کہنے والے کو صرف زبان ملی تھی، قلم نہیں اس وقت بھی کہی سنی اور یاد رکھی جانے والی ان کہانیوں میں قبیلے، اس کے رسم و رواج، اس کی ناہمواریوں اور ان ناہمواریوں کو دور کرنے کی تمنا جیسی باتیں چھپی ہوتی تھیں۔ فینٹسی میں تخئیل کی آمیزش زیادہ ہو جاتی ہے لیکن اصلاح کی تمنا کا واضح اظہار بھی ہوتا ہے۔ یہ فینٹسی تو ہمارے آج کے دور کی جیتی جاگتی بولتی تصویر ہے۔

"بیوپاریوں کے پکے مکان بننے لگے۔ سپنوں کا بیوپار پھیلتا رہا۔ بستی کے باشندوں کے انگوچھے پسینے سے پہلے بھی تر تھے۔ اب اور بھی تر رہنے لگے۔ پر جب انوکھے نگوں سے جڑی انگوٹھیاں پہنے بیوپاری بستی والوں کو ہاتھ جوڑ کر 'مالک' کہتے تو بستی والوں کا کلیجہ ایسا ٹھنڈا ہوتا کہ پیشانی کے پسینے کا ایک ایک قطرہ سوکھ جاتا"۔

جس طرح سے کسی ایک غزل میں ایک دو اچھے شعر ہی غزل کو قابل تعریف شاعری کے دائرے میں شامل کر دیتے ہیں، اسی طرح یہ چبھتے جملے، تیر کی طرح پیوست ہونے والے الفاظ حامد حسین کے مزاحیہ سرمایے کو قابل قدر بنانے کے لیے کافی ہیں۔

یوسف ناظم
۱۹۔ "الہلال" ۔ باندرہ
ریکلیمیشن، ممبئی ۵۰

غالب کان پر رکھ کر قلم نکلے

مرزا اسد اللہ خاں غالب کے تعلق سے جو غلط فہمیاں اردو دنیا اور اس کے مختلف جریدوں میں پھیلی ہوئی ہیں ان کا ازالہ اب ممکن نہیں ہے۔ یہ ڈیڑھ پونے دو سو سال پرانی غلط فہمیاں ہیں اور اندر ہی اندر اتنی زیادہ جڑ پکڑ چکی ہیں کہ ان کی بیخ کنی کے بارے میں سوچنا یا ان کی تصحیح کرنا خود غالب سے دشمنی کرنا ہے۔ یہ کام صحیح وقت پر ہونا چاہیے تھا۔ یوں تحقیق کا کام لامتناہی مدت تک جاری رہ سکتا ہے اور غالب سے منسوب لطیفوں کے موضوع پر بھی مزید محنت کی جا سکتی ہے کیونکہ جو محنت اس پر کی گئی وہ محنت تو تھی لیکن محنت نہیں تھی۔ اس کی گنجائش باقی ہے۔ غالب کی ازدواجی زندگی کے بارے میں بھی غیر شرعی باتیں کہی گئیں ہیں لیکن بردباری اور کشادہ دلی کا تقاضا ہے کہ انھیں فراموش کر دیا جائے لیکن ایک غلط فہمی کا دور کیا جانا اس لیے ضروری ہے کہ یہ غالب کے حق میں نہیں ہے۔ اس لیے خاکسار اس وقت صرف ان سے منسوب ایک شعر کے بارے میں معروضات پیش کرے گا اور چاہے گا کہ آپ ان معروضات کو انصاف کی ترازو پر تولنے کی کوشش نہ کریں بلکہ صرف جائز فیصلہ فرمائیں۔ شعر درج ذیل ہے۔

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط   بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

میرا پہلا معروضہ تو یہ ہے کہ یہ شعر اتنا آسان اور عام فہم ہے کہ غالب کا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ان کی افتاد طبع اور ان کے فطری رجحان سے قطعی میل نہیں کھاتا۔ جو شعر تشریح طلب نہ ہو وہ سوائے غالب کے کسی بھی شاعر کا ہو سکتا ہے۔ مانا کہ موصوف نے آسان شعر بھی کہے ہیں لیکن وہ سب سہل ممتنع کے عنوان سے مشہور ہیں اور یہ سب الگ ہی نوعیت کے شعر ہیں۔ زیر بحث شعر صرف سہل ہے ممتنع نہیں ہے۔

غلط فہمی جو عام ہوئی وہ یہ ہے کہ مرحوم کے سامان سے جو تصویریں برآمد ہوئیں وہ خود

انھوں کی بھیجی ہوئی تھیں اور جو خطوط پائے گئے وہ "حسینوں" نے بقلم خود لکھے تھے۔ سب جانتے ہیں کہ غالب کے عہد تک حسینوں میں خطوط نگاری کا نہ تو ذوق پیدا ہوا تھا اور نہ ان میں اتنی ہمت نمودار ہوئی تھی کہ وہ بقلم خود خط لکھیں اور غالب جیسے مشہور و معروف شخص کے نام جس کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ لفافے پر پتہ لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ صرف نام لکھ دینا کافی ہوتا تھا اور غالب جنھیں بار بار مکان بدلنے کی عادت تھی ڈاکیوں میں اتنے مقبول تھے کہ مکان بدلنے۔ سے پہلے ڈاکیوں کو ان کے گھر کے پتے کا پتا چل جاتا تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر کوئی حسینہ، خط لکھ کر انھیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا اور اس کی بھنک بھی کسی کے کان میں پڑ جاتی تو پوری دلی خیر اجڑتی تو نہیں لیکن اس شہر میں ایک زلزلہ ضرور آجاتا۔ اور تصویروں کا معاملہ تو اور بھی نازک ہوتا۔ ایسی تصویروں کی ترسیل آتش فشاں پہاڑ کے پھٹ پڑنے کے حادثے سے بھی بڑا سانحہ ہوتا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ غالب اپنی زندگی میں ہی مکتوب نگاری کے فن پر اتنا عبور حاصل کر چکے تھے کہ شہر دلی کے سارے عشاق انھی سے اپنے خط لکھوانے کے لیے بے چین و مضطرب رہتے تھے۔ شروع شروع میں تو خود غالب صبح سویرے اپنے داہنے کان پر قلم رکھ کر نکل جاتے تھے۔ اس بات کی انھوں نے تشریح بھی کی تھی۔ وہ شعر تو آپ کو یاد ہی ہوگا جس میں انھوں نے ضرورت مند لوگوں کو ان سے رجوع ہونے کا مشورہ دیا تھا وہ شعر خاکسار کو بھی حفظ ہے۔

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

اس تشہیر کا نتیجہ ان کے حق میں کچھ زیادہ اچھا نہیں نکلا۔ لوگ جوق در جوق ان کے گھر کے چکر کاٹنے لگے یعنی ہوئی صبح اور غالب صاحب گھر کے اندر ہی لوگوں میں گھر گئے۔ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں خط لکھنے میں ماہر تھے اور عشق تو ان کا خاص موضوع تھا۔ خط کسی کے نام ہو ایسا غضب کا عشق نامہ لکھتے تھے کہ محبوب اپنی محبوبیت کو بھول بھال کر خود مکتوب نگار پر عاشق ہو جانے میں دیر نہیں کرتے تھے۔ مکتوب نگاری نے غالب کو یہ فائدہ پہنچایا کہ انھیں صلہ بھی ملا اور ستائش تو اتنی ہوئی کہ خود غالب پریشان ہو گئے اور انھیں کہنا پڑا۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

اس شعر کی شانِ نزول یہ ہے کہ وہ لوگ جو ان سے اپنے محبوب کے نام خط لکھوانے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ان میں سے چند اتنے گستاخ ہوتے کہ اپنے صنم کی تصویر بھی

ساتھ لے جاتے تاکہ غالب تصویر کے سراپا کو ذہن نشین کرلیں اور اپنے خط میں اپنے تاثرات تفصیل سے بیان کریں۔ ان میں سے بعض تصویریں تو اتنی ہوشربا ہوتیں کہ غالب کے دل میں پہلے ہی سے موجود اور زیر پرورش خواہشوں کے علاوہ ایک خواہش اور پیدا ہو جاتی اور وہ خود مصوری سیکھنے کے درپے ہو جاتے۔ حوالے کے لیے دیکھیے ان کا شعر

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری   تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

غالب جب کسی تصویر کو سامنے رکھ کر خط لکھتے تو ان کی آنکھوں کے سامنے وہ چہرہ آجاتا جو فروغ مئے سے گلا کیا ہوا ہوتا یا جسے آئینے میں دیکھ کر "صاحب" خود دل دے بیٹھنے پر آمادہ ہو جاتے۔ کسی تصویر میں زلفوں کا جمال و جلال دیکھ کر ان کے دل میں خیال آتا کہ کیا زلفیں ہوں گی جو کسی کے شانے پر پریشان ہو کر اسے گہری نیندیں سلا دیتی ہوں گی۔ غالب نے، قیاس کہتا ہے ایسی تصویروں میں سے چند اپنے پاس رکھ لی ہوں گی جو ان کی وفات کے بعد ان کے گھر سے برآمد ہوئیں۔ یہ تصویریں ظاہر ہے ان کے لیے نہیں تھیں۔

حسینوں کے جو خط ان تصویروں کے ساتھ برآمد ہوئے ان کا معاملہ بالکل ہی الگ نوعیت کا ہے۔ یہ خط غالب کے موسومہ نہیں تھے بلکہ وہ فرضی خط تھے جو غالب نے فاضل اوقات میں لکھ کر رکھ چھوڑے تھے کہ جب اہل ضرورت آئے گا اسے اس کی حاجت روائی کے بعد فی الفور واپس کردیں گے محبوباؤں کے نام خط لکھنے کی انھیں اتنی مشق ہو گئی تھی کہ وہ جاننے لگے تھے کہ کس کے دل میں کیا ہے۔ ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے۔ غالب جب بھی کسی دوسرے کے محبوب کو خط لکھتے اسی نظریے کے تحت لکھتے اور ان کے خطوں کی بنا پر اکثر و بیشتر معاشقے ٹریجیڈی پر نہیں طربیے پر ختم ہوئے۔

غالب نے اردو ادب میں مختلف اسالیب کی داغ بیل ڈالی جیسے کہ سہرا نویسی۔ ان سے پہلے کسی شاعر نے سہرا کہا کسی نے نہیں۔ اسی طرح غالب ہی نے خطوط نگاری میں درپردہ نویسی کی گھوسٹ ازم کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس سے پہلے سب لوگ اپنے اپنے خط خود ہی لکھ لیتے تھے ان خطوط میں زبان و بیان کی بیشتر غلطیاں ہوتیں لیکن انھیں کون سا انشا پردازی کا مظاہرہ کرنا تھا۔ مطلب براری کے لیے ٹوٹی پھوٹی زبان بھی کافی ہوتی ہے۔

غالب کے گھر سے حسینوں کے جو خطوط برآمد ہوئے وہ خود غالب کے ہی زور قلم کا نتیجہ تھے۔ یہ خط فروخت ہونے سے بچ گئے تھے جیسا مفروضہ ہے کیونکہ غالب مصحفی تو تھے نہیں کہ خطوں کو آمدنی کا ذریعہ بناتے۔ جہاں تک خطوط کا تعلق ہے اس میں ہماری اردو زبان

کی بھی اونچ نیچ کا دخل ہے۔ گھر پر ڈاکیہ آتا ہے تو کہتا ہے آپ کا خط آیا ہے حالانکہ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ آپ کے لیے خط آیا ہے۔ یہ خطِ من کا ذکر ہو رہا ہے ہر طرح سے اور ہر زاویے سے غالب ہی کے تھے یعنی تھے انھی کے لکھے ہوئے لیکن ان کے موسومہ نہیں تھے اسی لیے انھوں نے اپنی وفات سے بہت پہلے کہہ دیا تھا ع

شاعر تو وہ اچھا ہے یہ بدنام بہت ہے

اور یہ بدنامی شاعری کی وجہ سے قطعی نہیں تھی خطوط نگاری کی وجہ سے تھی۔ ایسی خطوط نگاری جس میں مرسلہ الیہ کوئی نہیں تھا۔

کہا جاتا ہے کہ غالب کے ساتھ اس خطوط نگاری کے سلسلے میں ایک ناگوار واقعہ یہ ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے کسی پرستار کی فرمائش پر محبوبہ کے نام ایک نہایت ہی ولولہ انگیز خط لکھا اور محبوبہ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے اور کچھ ایسی باتیں بھی لکھ دیں جو "پردہ نشین خواتین" سے دبی زبان سے بھی نہیں کہی جاتیں۔ کسی وجہ سے مذکورہ پرستار اپنا خط لینے دوبارہ غالب کے ہاں جا نہیں سکا اور پتہ نہیں غالب ایک دن کس خیال میں کھوئے ہوئے تھے کہ جب ان کا اپنا قاصد اپنے کام پر آیا تو غالب نے بھی ناشدنی خط اس کے حوالے کر دیا کہ لو میاں یہ خط فوراً انھیں پہنچا دو۔ انھیں سے مراد وہی جن کے دہن مبارک سے گالیاں سن کر بھی ان کے رقیب بے مزا نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے خط کھول کر پڑھا تو قاصد کی گردن خطرے میں پڑ گئی۔ وہ تو اچھا ہوا اس وقت تلوار "انھوں" کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ غالب کو اس سلسلے میں بھی ایک شعر کہنا پڑا جس میں انھوں نے گزارش کی تھی کہ موصوفہ قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریں۔ وہ اتنے پریشان تھے کہ خط پر نظر ثانی بھی نہیں کی اور زبان کی صحت مشتبہ ہو گئی۔ غالب نے اس ناگوار واقعے کے بعد کئی خطوط لکھے اور سابقہ قاصد کی بجائے ایک نئے 'نامہ بر' کے ذریعے "انھوں" تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن غالب کی طرح عجب وقت آن پڑا تھا۔ انھوں نے عالمِ طیش میں ان کا خط نہ پڑھنے کی قسم کھا رکھی تھی اور وہ قسم کسی مے خوار کی توبہ تو نہیں تھی کہ بار بار ٹوٹ جاتی۔

وہی غالب جن کی خطوط نگاری کی اس وقت بھی دھوم تھی اور آج بھی ہے۔ انھیں کہنا پڑا۔

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

مجتبیٰ حسین
۲۰۰، اکور اپارٹمنٹس
پٹ پڑ گنج، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

آم اب عام نہیں رہے

(حکومت ہند کے ثقافتی مرکز برائے شمالی و وسطی ہندستان کی جانب سے ۴؍ جولائی کو الہ آباد میں آموں کے بارے میں ایک انوکھی محفل منعقد کی گئی تھی اس محفل میں پڑھی گئی ایک تحریر)

قدرت کے کھیل بھی بڑے نرالے ہیں۔ اس نے آم کو ہندستان میں پیدا کیا بہت اچھا کیا۔ لیکن اس کو کھانے کا طریقہ امریکہ اور یوروپ کے باسیوں کو سکھادیا۔ آم کو ہم بچپن سے کھارہے ہیں لیکن جب تک ہم نے ہالی ووڈ کی فلمیں نہیں دیکھی تھیں، جن میں ہیروئنیں اور ہیرو بات بات پر ایک دوسرے کو آم سمجھ لیتے ہیں اور سلوک بھی ایسا ہی کرتے ہیں، تب تک ہمیں بھی معلوم نہیں تھا کہ آم کھانے کا اصل طریقہ کیا ہے۔ بعد میں جب ہم یوروپ اور امریکہ گئے تو ہم نے وہاں آم کھانے کی باضابطہ ٹریننگ بھی حاصل کی۔ کیا کریں ہم ہندستانیوں کی مجبوری یہ ہے کہ آم کھانے سے لے کر انجینیرنگ اور میڈیسن کی اعلا تعلیم حاصل کرنے تک ہر کام کو سیکھنے کے لیے ہمیں امریکہ اور یوروپ جانے کی عادت سی پڑ گئی ہے بہر حال ہم نے وہاں آم کھانے میں وہ مہارت حاصل کی کہ آج ہم کبھی آم کھاتے ہیں تو ہمارے ایک دوست جو ہماری ہی عمر کے ہیں اکثر کہتے ہیں کہ "میاں جب تم دسہری اور چوسہ کھاتے ہو تو نہ جانے کیوں مجھے جینا لولو بریجیدہ اور صوفیہ لارین کی بے ساختہ یاد آجاتی ہے۔" اپنی عمر کے حساب سے وہ ہمیشہ پچھلے موسموں کے پھلوں کو ہی یاد کرتے ہیں۔ ہم نے ایک امریکی دوست سے کہا بھی تھا۔ "بھیا یہ جو تمہاری فلموں میں بات بات پر ندیدہ پن نظر آجاتا ہے تو اس کی جگہ تم لوگ سیدھے سیدھے آم کیوں نہیں کھالیتے؟"

بولے "میاں! پہلی بات تو یہ ہے کہ آم ہمارے ملک میں نہیں ملتا اور اگر ملتا بھی ہے تو بہت مہنگا ملتا ہے۔ ہم ٹھہرے کاروباری لوگ۔ ہم تو سستی چیز کے پیچھے ہی بھاگتے ہیں۔"

ہم نے کہا "مگر ذائقہ بھی تو ایک چیز ہے۔"

بولے "جن ملکوں میں آم نہیں ہوتا وہاں کے لوگ اپنا ذائقہ آپ بنالیتے ہیں۔ آپ بھی کس چکر میں پڑ گئے۔ آپ آم کھانے سے مطلب رکھیے۔ پیڑوں کو کیوں گنتے ہیں۔"

حضرات! معاف کیجیے ہم خواہ مخواہ ہی پیڑوں کو گننے میں لگ گئے۔ ہمیں تو آموں کے

بارے میں کچھ کہنا تھا اور ہم بلاوجہ ہی اس کے کھانے کے طریقوں میں الجھ گئے۔ جب ہالی وو
میں فلمیں نہیں بنتی تھیں تو تب بھی اس ملک میں لوگ جیسے تیسے آم کھالیا کرتے تھے، یہ اور
بات ہے کہ نا تجربہ کاری کی وجہ سے آموں کا رس پوری طرح چوسا نہیں جاسکتا تھا لیکن اس کی
کس کو پروا تھی کیونکہ اس زمانہ میں آم بھی تو بہت ہوتے تھے اور میٹھے بھی ہوتے تھے۔

دوستو! آم ہمارا قومی پھل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیا بچہ اور کیا بوڑھا ہر کوئی اسے پیڑ سے گرانے کے لیے پتھر مارتا رہتا ہے۔ ہم ہندستانیوں کی عادت ہے کہ جس چیز کو بھی "قومی" بنادیتے ہیں اسے مارنے کو دوڑتے ہیں۔ آم تو خیر "راشٹریہ پھل" ہے۔ ہم نے تو اپنے "راشٹر پتا" کو بھی نہیں چھوڑا۔ آپ نے ہمیں آموں کے سلسلہ میں ہونے والی اس محفل میں بلا کر بیچ ہمارے سینہ پر ایک تیر مارا ہے کیونکہ ہم اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے آموں کے باغ کسی زمانہ میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ پھر زندگی نے ہمیں کچھ ایسے سبز باغ دکھائے کہ ان باغوں کو چھوڑ کر شہروں میں رہنے لگے۔ آموں کا موسم آتا تھا تو آم کے پیڑوں پر آم کم لٹکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور ہم ہی ان کی ٹہنیوں پر زیادہ لٹکتے ہوئے پائے جاتے تھے۔
غرض جب سے ہمارے آموں کے باغ چھن گئے ہیں تب سے ہمارا شمار بھی عوام میں ہونے لگا ہے۔ یوں بھی آم میں اور عوام میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا کیونکہ دونوں ہی چوسنے کے کام آتے ہیں۔ سرکار، افسر، بیوپاری، پونجی پتی کون ہے جو عوام کو نہیں چوستا۔ آم کو چوسنے کے بعد کم از کم اس کی گٹھلی تو چھوڑدی جاتی ہے مگر عوام کو ایسی بیدردی سے چوسا جاتا ہے کہ بعض اوقات تو ان کی استھیاں بھی نہیں مل پاتیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عوام کا ذائقہ بھی آم کی طرح لذیذ ہوتا ہے۔ جو لوگ عوام کو چوستے ہیں وہ جانتے ہیں کہ عوام کا ذائقہ پانچ سال میں ایک مرتبہ اُس وقت تلخ ہوجاتا ہے جب عوام ووٹ دینے کے لیے آتے ہیں لیکن جب سے ووٹوں اور نوٹوں میں ایک تال میل پیدا ہوگیا ہے تب سے عوام کے ذائقہ کی تلخی بھی کم ہوتی جارہی ہے اس لیے تو کہاوت مشہور ہے کہ "عوام کے عوام ووٹوں کے دام"
چاہے کچھ بھی ہو ہر کوئی آم کا رسیا ہے، آدمی تو پھر آدمی ہے مرزا غالب بھی آموں کے دیوانے تھے۔ ایک ریسرچ اسکالر نے تو یہاں تک کہا ہے کہ غالب آم کے موسم میں شعر نہیں کہتے تھے، صرف آم ہی کھاتے رہتے تھے۔ ایسے میں کوئی انھیں ڈسٹرب کرتا تو اس پر اپنے شعروں سے حملہ نہیں کرتے تھے گٹھلی پھینک کر مارتے تھے۔ آم ہی ایک ایسا پھل ہے جس میں ایک ہتھیار بھی چھپا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں غالب کے ایک دوست کو آموں سے چڑ تھی۔ ایک دن دونوں بازار سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ گلی میں پڑے ہوئے ایک آم کو ایک گدھے نے پہلے

سونگھا، کچھ سوچا، پھر اسے کھائے بغیر آگے کو نکل گیا۔ یہ منظر دیکھ کر مرزا غالب کے دوست نے کہا۔ "دیکھیے غالب صاحب! گدھا بھی آم نہیں کھاتا۔" اس پر غالب نے کہا "حضور! میں جانتا ہوں کہ گدھا ہی آم نہیں کھاتا۔"

مگر یہ پرانی بات تھی جب گدھے کسی وجہ سے آم نہیں کھاتے تھے۔ مگر آج حالات اتنے بدل گئے ہیں کہ ہم جس آدمی کو بھی آم کھاتا ہوا دیکھ لیتے ہیں تو اسے گدھا سمجھنے لگتے ہیں۔ پچھلے دنوں ہمارے ایک دوست نے ہماری آنکھوں کے سامنے پورے سو روپیوں میں ایک بڑا الفانسو آم خرید لیا تو ہمیں اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ گدھا بڑا ہوشیار جانور ہے۔ اس نے ایک صدی پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ ایک دن آم پینتالیس پچاس روپے فی کلو کے حساب سے بکے گا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی ہی سب سے بڑا گدھا ہے اور گدھا ہی سب سے بڑا انسان ہے۔ آموں کی مہنگائی کی وجہ سے ہی ہم آم تو نہیں خریدتے لیکن ان کے دام ضرور پوچھ لیتے ہیں۔ ایک فروٹ مرچنٹ سے ہم لگاتار چھ دنوں تک آم کے دام پوچھتے رہے۔ ساتویں دن ہم اس کی دکان پر گئے تو اس سے دام تو نہیں پوچھا البتہ بڑی دیر تک للچائی نظروں سے صرف آموں کو دیکھتے رہ گئے۔ اس پر دکاندار نے پہلے تو اپنے آموں کو کپڑے سے اچھی طرح سے ڈھک لیا۔ پھر بولا "آپ دام پوچھیں گے یا میں ہی آپ کو بتادوں؟"

ہم نے کہا "میاں! ہمیں تو ایک ایسے پھل کی تلاش ہے جس کے بارے میں سنا ہے کہ بہت میٹھا ہوتا ہے۔ لوگ اسے صبر کا پھل کہتے ہیں۔ مل جائے گا تمھارے پاس؟"

دکاندار بولا "اب تمھیں زیادہ دن صبر نہیں کرنا پڑے گا۔ ساٹھ پینسٹھ کے تو لگتے ہی ہو۔ دو چار برس اور صبر کر لو تو صبر کا یہ پھل تمھیں دوسری دنیا میں جلد ہی ملے گا۔ اس دنیا میں تو یہ نہیں ملتا۔ اس وقت تو لنگڑے سے کام چلا لو ورنہ اپنا راستہ ناپو۔"

اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ ایک زمانہ میں آم صرف دو قسم کے ہوتے تھے۔ کاٹنے کے اور چوسنے کے۔ اب دیکھنے کے آم بھی ہونے لگے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ذائقہ اور صورت شکل کے اعتبار سے آموں کی بھی اتنی ہی قسمیں ہوتی ہیں جتنی کہ عورتوں کی ہیں۔ پھر لطف کی بات یہ کہ دونوں میں بہت سی باتیں ایک جیسی بھی پائی جاتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض بہت خوبصورت اور حسین عورتیں اندر سے بہت تلخ، ترش اور کڑوی کسیلی ہوتی ہیں۔ صورت اور سیرت میں جو فرق ہوتا ہے اس کا اندازہ ہمیں آم کھانے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ جو لوگ آم اور عورت کی خوبی کا اندازہ اس کی صورت سے لگاتے ہیں وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی آم کی صورت تو ہمیں بہت خراب لگی لیکن جب کھایا تو طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ یہ بات ہم ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ رہے ہیں کیونکہ پچھلے چالیس برسوں سے ہم ایک ایسے

ہی آم کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔

یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہم چوسنے کے آم ہی کھانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کاٹنے والے آم اس لیے نہیں کھاتے کہ تین آم کھانے ہوں تو ڈیٹول کی پوری ایک شیشی خرچ کرنی پڑتی ہے۔ آموں کے سیکڑوں نام بھی ہوتے ہیں۔ بڑے کیوٹ (Cute) اور مزیدار۔ بعض نام تو ان آموں کے قلمی نام (Pen Name) معلوم ہوتے ہیں لیکن ہمیں تو لنگڑا بہت پسند ہے۔ کسی نے اس کی شکل و صورت کو دیکھ کر مذاق مذاق میں اس کا نام لنگڑا رکھ دیا تھا لیکن اس آم نے الٹا نام رکھنے والے کا مذاق اڑانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ اب یہ آم جتنا چلتا ہے کوئی اور آم نہیں چلتا بلکہ اسے تو آموں کا ملکھا سنگھ بھی کہا جا سکتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض قصبے صرف آموں کی وجہ سے ہی بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ ملیح آباد کو ہی لیجئے۔ اگر یہاں آم نہ ہوتے تو بھلا بتایئے ملیح آباد کو کون جانتا۔ یہ ضرور ہے کہ ایک زمانہ میں جوش ملیح آبادی نے یہ چاہا تھا کہ ملیح آباد کی شہرت ان کے نام کی وجہ سے بھی ہو۔ لیکن زمانہ کی دوڑ میں ملیح آباد کے آم پھر آگے کو نکل گئے اور حضرت جوش ملیح آبادی پیچھے رہ گئے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جوش ملیح آبادی جب پاکستان گئے اور وہاں ان کا تعارف پاکستان کے اس وقت کے صدر اسکندر مرزا سے کرایا گیا کہ ان سے ملیے یہ حضرت جوش ملیح آبادی ہیں تو اسکندر مرزا نے چھوٹتے ہی کہا "اچھا آپ ملیح آباد کے رہنے والے ہیں جہاں کے آم بڑے مشہور ہیں۔" اس کے بعد اسکندر مرزا نے جوش ملیح آبادی سے ملیح آباد کے آموں کے بارے میں تو بہت کچھ پوچھا لیکن ان کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔

آخر میں ہم الٰہ آباد کے حوالہ سے ہی اپنی بات کو ختم کرنا چاہیں گے۔ پچپن برس پرانی بات ہوگی جب جواہر لال نہرو الٰہ آباد کے آنند بھون میں رہا کرتے تھے۔ یہی گرمیوں کے دن تھے بلکہ مہینہ بھی شاید یہی تھا۔ ہو سکتا ہے تاریخ بھی یہی رہی ہو۔ اندرا گاندھی، فیروز گاندھی سے شادی کرنے کے بعد ہنی مون منانے کے لیے کشمیر گئیں تو وہاں کی ٹھنڈی ہواؤں نے انھیں مسحور کر دیا۔ ایسے میں انھیں اچانک نہرو جی کا خیال آیا کہ وہ تو الٰہ آباد کی سخت گرمی میں پریشان ہوں گے، لہٰذا انھوں نے ہمدردی کے طور پر نہرو جی کو لکھا کہ کاش میں آپ کے لیے کشمیر کی کچھ ٹھنڈی ہوائیں الٰہ آباد بھیج سکتی۔ اس پر جواہر لال نہرو نے اندرا جی کو لکھا "بیٹی! مجھے تم پر ترس آ رہا ہے۔ کشمیر میں بھلے ہی ٹھنڈی ہوائیں تمہارے ساتھ ہوں گی لیکن تمھارے پاس دسہری اور ثمر بہشت تو نہیں ہیں۔"

اور یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آدھی صدی گزر جانے کے بعد آج نہ تو کشمیر میں ٹھنڈی ہوائیں ہیں اور نہ ہی الٰہ آباد میں دسہری اور ثمر بہشت نظر آتے ہیں۔

لیہ خان
M A ,MD
52,Brent Way London, N3 1AP
0181-3493015

اولادِ نرینہ

ایک دن ہماری دوست ایلیسن جب ہم سے ملنے آئیں تو ہم ان کی جگمگاتی ہوئی نئی مرسڈیز کو دیکھتے رہ گئے کیونکہ چند مہینے پہلے تک تو ان کے پاس بھی ہماری ہی جیسی ایک گھٹیا قسم کی کار تھی۔

جب ہم لوگ ہندستان سے لندن آئے تو اس سے چند ماہ قبل ایلیسن اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ سے آئی تھیں۔ جس پرانی عمارت میں ہمیں کرائے پر فلیٹ ملا اسی میں سامنے والے فلیٹ میں ایلیسن رہتی تھیں۔ باقی سب فلیٹوں میں بوڑھے انگریز مرد اور عورتیں پرانے کرائے دار تھے اور ان سے مکان مالک کوئی فلیٹ خالی نہیں کرا سکتا تھا۔ ہم دو غیر ملکی خاندانوں کو یہ فلیٹ اس لیے مل گئے تھے کہ ان کے سابق رہنے والے دوسری دنیا میں جا بسے تھے۔ دوسرے فلیٹوں میں رہنے والے انگریز اس زمانے میں پیدا ہوئے تھے جب برطانوی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا اس لیے اپنے آپ کو سب سے برتر قوم سمجھتے تھے۔ دو پرانی کالونیوں سے آکر یہاں بسنے والے ہم دونوں خاندانوں کو وہ بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے اور ہمارے ساتھ اچھوتوں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔

عمر اور حالات کی یکسانیت کی وجہ سے ہماری ایلیسن سے بہت گہری دوستی ہو گئی اور یہ دوستی اس وقت بھی قائم رہی جب ہم لوگ اپنے اپنے مکان خرید کر مختلف سمتوں میں جا بسے۔ ان کے کرسمس ڈنر پر ہم ہمیشہ مدعو ہوتے اور ہماری عید کی پارٹی میں وہ ضرور شرکت کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی جب موقع ملتا وہ ہم سے ملنے آجاتیں یا ہم ان کے گھر چلے جاتے۔ اپنی نئی مرسڈیز کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ ان کے اکلوتے ماموں کا چند ماہ قبل انتقال ہو گیا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اور بیوی بھی چند سال پہلے فوت ہو چکی تھیں اس لیے وہ اپنی وصیت میں اپنی ساری دولت اپنی دونوں بھانجیوں کے نام چھوڑ گئے۔ ایلیسن اور

ان کی بہن کے حصے میں ڈھائی ڈھائی لاکھ پونڈ آئے تھے۔ ایلیسن کو جب یہ رقم ملی تو انھوں نے سب سے پہلے یہ کار خرید کر اپنی دیرینہ خواہش پوری کی۔ ہمیں خاموش دیکھ کر انھیں یہ خیال آیا کہ ہماری اور ان کی حیثیت میں اچانک جو یہ ڈھائی لاکھ پونڈ کا فرق آگیا ہے اس سے شاید ہمارے اندر احساس کمتری پیدا ہو جائے۔ ہمیں تسلی دینے کے لیے بولیں "ایک دن تمھارے بھی کوئی انکل اسی طرح اپنی وصیت میں تمھارے لیے پیسے چھوڑ جائیں گے۔"

"اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہمارے انکلس کے پاس ہمیشہ دولت کم ہوتی ہے اور بچے زیادہ" ہماری یہ بات سن کر وہ اس طرح ہنسیں جیسے ہم نے انھیں کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

ایلیسن سے اتنی پرانی دوستی سے ایک بات ہمارے ذہن میں واضح ہو چکی تھی کہ مشرق اور مغرب کے لوگ آپس میں دوستی تو کر سکتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکتے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتی تھیں کہ ہمارے یہاں شادی کرنا اور وارث یعنی لڑکے پیدا کرنا سب سے ضروری کام سمجھا جاتا ہے خواہ ورثے میں چھوڑنے کے لیے کچھ ہو یا نہ ہو۔ ہر شخص اپنا نام اور خاندان چلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ لڑکے پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ اکثر حضرات تو ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کا خاندان نہ ہی چلے تو اس سے سماج کی بہتری ہو۔

ہندستان کی آبادی دن دونی اور رات چوگنی ہونے کی وجہ ہر امیر و غریب کی یہی خواہش ہے کہ اس کا نام چلانے کے لیے دو چار لڑکے ضرور پیدا ہوں۔ غریبوں کو لڑکوں کی ضرورت یوں ہوتی ہے کہ وہ انھیں بڑھاپے کی لاٹھی سمجھتے ہیں، اور دولت مند اس لیے لڑکوں کو ضروری سمجھتے ہیں کہ لڑکیوں کے ذریعے دولت خاندان سے باہر نہ جائے۔ ہندستان تقسیم ہونے سے پہلے پورے ملک کی آبادی چالیس کروڑ تھی۔ اب صرف تقسیم شدہ ہندستان کی آبادی ایک ارب ہونے والی ہے۔ ہندستان کے مشرق و مغرب میں جو کم عمر ممالک ہیں وہاں بھی اولاد نرینہ کی اتنی ہی اہمیت ہے اس لیے آبادی وہاں کی بھی سب سے بڑی پیداوار ہے۔ انسانی پیداوار کی اس کثرت کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر وقت ہر طرف مجمع نظر آتا ہے۔ مغربی ممالک میں پرورش پانے والے بچے جب اپنے والدین کے ساتھ ہندستان جاتے ہیں تو سڑکوں پر بھیڑ دیکھ کر پوچھتے ہیں۔ "یہ جلوس کیوں نکل رہے ہیں۔؟"

ایک دن ہم اپنی ایک دوست کے گھر بیٹھے تھے کہ ایک بوڑھی عورت اپنے مریل سے پوتے کو گود میں لٹکائے ہوئے آئی کہ جاڑے کے موسم گزارنے کے لیے کچھ گرم

کپڑے مل جائیں۔ اس کے جانے کے بعد پتہ چلا کہ پیچھے جو ٹوٹے پھوٹے مکان ہیں یہ وہیں رہتی ہے۔ اس کا بیٹا رکشا چلاتا ہے جس کی چھ بیٹیاں ہیں۔ انھیں پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن ہر بار جب بیٹی پیدا ہوتی تو یہ بڑھیا اور اس کا بیٹا بہو سے ناراض ہو کر اسے مارتے پیٹتے۔ بہو ہر سال بچے پیدا کرتے کرتے بالکل سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی اور اس لڑکے کی پیدائش میں ختم ہو گئی لیکن بڑھیا خوش ہے کہ اس لڑکے سے اس کے خاندان کا نام چلتا رہے گا۔ یہ اس طبقے میں اولاد نرینہ کی خواہش کی مثال ہے جہاں دو وقت پیٹ بھرنے کا انتظام بھی نہیں ہوتا اور ہندستان میں اس طرح کے بے شمار لوگ ہیں جنھیں دیکھ کر دلاور فگار کا یہ شعر بے اختیار یاد آجاتا ہے۔

جنھیں روٹی نہیں ملتی وہ دس بچوں کے والد ہیں یہ غربت اور یہ جوش جوانی دیکھتے جاؤ

پڑھے لکھے متوسط طبقے کے لوگوں کا بھی یہی حال ہے کہ دولت پیدا کرنے کی کوشش کم اور بیٹے پیدا کرنے کی کوشش زیادہ کرتے ہیں۔ ایک بار ایک بزرگ خاتون سے ملاقات ہوئی وہ زار و قطار رو رہی تھیں کیونکہ ان کی بہو اسپتال میں تھی۔ اس کی ہسٹر یکٹمی ہونا لازمی تھا ورنہ جان کا خطرہ تھا۔ ہم نے ان خاتون کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا کہ انھیں اپنی بہو سے اتنی محبت ہے کہ اس کی بیماری کی وجہ سے اس طرح رو رہی ہیں۔ ہم نے انھیں دلاسا دیا کہ فکر کی بات نہیں ان کی بہو جلد ٹھیک ہو کر گھر آجائے گی۔

"بہو تو ٹھیک ہو جائے گی مگر بچہ تو اب نہیں ہوگا"

"تو کیا ہوا ماشاء اللہ تین بیٹیاں تو ہیں" ہم نے ان کے پاس بیٹھی ہوئی تینوں پوتیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اولاد نرینہ تو نہیں ہے" انھوں نے بڑے سخت لہجے میں کہا" بیٹے کو اتنا سمجھایا کہ آپریشن نہ کراؤ لیکن آج کل کے لڑکے ایسے سر پھرے ہوتے ہیں کہ بیویوں کے پیچھے خاندان کا بھی خیال نہیں کرتے۔ جب ان کی بات پوری طرح ہماری سمجھ میں آئی تو ہماری روح کانپ گئی۔ اولاد نرینہ کے لیے یہ خاتون اپنی بہو کو موت کے گھاٹ اتار کر بیٹے کی دوسری شادی کرانا چاہتی تھیں۔

اپنا نام چلانے کی خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ ہر شخص خواہ صاحب حیثیت ہو یا نہ ہو، صاحب علم ہو یا نہ ہو، صاحب عقل ہو یا نہ ہو، صاحب اولاد ضرور بنا چاہتا ہے اور صرف صاحب اولاد ہونا کافی نہیں۔ صاحب اولاد نرینہ ہونا ضروری ہے اور اس کوشش میں اکثر

لڑکیوں کی قطار لگ جاتی ہے۔ ایک مرتبہ محلے کی ایک خاتون ہم سے ملنے آئیں دوران گفتگو انھوں نے اپنا مقصد بیان کیا کہ ان کی آٹھ بیٹیاں ہیں۔ دو کی شادی ہو گئی ہے اگر ہم ان کی کچھ مدد کر دیں تو ثواب ہو گا۔ جی تو چاہا بہت کچھ کہنے کا لیکن مروّت کی وجہ سے صرف یہ پوچھا کہ آج کل کے زمانے میں آٹھ لڑکیاں پیدا کرنے کی ضرورت کیا تھی، جس کا انھوں نے انتہائی غمزدہ لہجے میں جواب دیا "میرے شوہر کو بیٹے کی بڑی خواہش تھی لیکن افسوس کہ میں ان کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکی۔ ان کے شوہر کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ کسی ڈگری کالج میں لیکچرر تھے۔

جب تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ عالم ہے تو جاہلوں کے بارے میں کیا کہا جائے۔ ہر بار جب ہم ہندستان جاتے ہیں تو محلے کی گلیوں میں نالیوں پر بیٹھے حوائج ضروری سے فارغ ہوتے ہوئے ننگے دھڑنگے بچوں کی تعداد میں اضافہ نظر آتا ہے۔ ہماری بھتیجی جو خاندانی منصوبہ بندی کے محکمے میں ڈاکٹر ہے اس سے ہم نے کہا "یہ محلے کی غریب عورتیں ہندستان کے ننگے بھوکوں کی تعداد بڑھانے کے لیے جان دیے دیتی ہیں، تم ان کے لیے کچھ نہیں کرتیں؟"

"میں ان کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ آپ انھیں میرے پاس آنے کے لیے تیار کر لیجیے۔ مجھے تو وہ بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ میں ان کے خیال میں سرکار کی ایجنٹ ہوں اور ان کے خاندان کا نام مٹانا چاہتی ہوں۔"

بیٹوں کے والدین سماج میں اکڑ کر چلتے ہیں۔ بڑے فخر سے بیٹوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اولاد نرینہ سے محروم ہیں وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اس طرح سر جھکا کر اپنی بیٹیوں کا ذکر کرتے ہیں جیسے جرم کا اقرار کر رہے ہوں۔ ہمارے سماج میں لڑکیوں کو سر کا بوجھ سمجھنے کی روایت ہو گئی ہے۔ پیدا ہوتے ہی والدین کو ان کی تعلیم و تربیت سے زیادہ ان کے جہیز کی فکر ہو جاتی ہے۔ اور جب وہ سسرال جاتی ہیں تو والدین کی ساری دولت سمیٹ کر لے جاتی ہیں۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے لڑکے کام آتے ہیں۔ ان کی شادی کے وقت والدین کے علاوہ خود صاحبزادے کی بھی بڑی بڑی فرمائشیں ہوتی ہیں۔ بیٹا اگر کماؤ پوت نہ بھی ہو تو بھی اچھا خاصا جہیز مل جاتا ہے اور اگر منہ مانگا جہیز نہ ملا تو وہ بہو گھر کیا دنیا ہی سے باہر کر دی جاتی ہے۔ بہویں عام طور پر پھوہڑ ہوتی ہی ہیں اور جو بہویں خاطر خواہ جہیز نہ لائی ہوں وہ اور بھی زیادہ پھوہڑ ہوتی ہیں اور مفت کھانا

پکاتے وقت ان کے پھوہڑپن سے ان کے کپڑوں میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ بری طرح جل کر ختم ہو جاتی ہیں۔ اور بیٹا پھر شادی کے بازار میں واپس آجاتا ہے۔ مختصر یہ کہ بیٹا ایک ایسا چیک ہے جسے بار بار کیش کرلیا جاسکتا ہے۔

اولاد نرینہ کی خواہش مشرق کے مسکینوں کو مغرب میں آکر بس جانے کے بعد بھی کم نہیں ہوتی، خواہ ورثے میں چھوڑنے کے لیے بے روزگاری، سوشل سیکورٹی اور کونسل کے فلیٹ کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ ہمارے بوڑھے پڑوسی کے انتقال کے بعد جب مکان بکا تو ایک نوجوان جوڑا اس میں آیا۔ یہاں کے رواج کے مطابق ہم ان سے اپنا تعارف کرانے گئے۔ نوجوان خاتون نے ہمیں بتایا کہ اپنا فلیٹ بیچ کر یہ مکان اس لیے خریدا ہے کہ اب وہ فیملی شروع کرنے والے ہیں اس کے چند ماہ بعد انھوں نے ہمیں بتایا کہ اپنے پروگرام کے مطابق وہ ماں بننے والی ہیں اور ملازمت چھوڑنے کے لیے نوٹس دے دیا ہے۔

ایک دن موسم خوشگوار تھا۔ دھوپ پھیلی ہوئی تھی جو بادلوں میں ڈھکے ہوئے اس ملک کے باشندوں کو کبھی کبھار ہی نظر آتی ہے۔ ہماری پڑوسن اپنے باغ میں غسل آفتابی کے لیے لیٹی تھیں۔ بارش رکی ہو ہوا اور دھوپ نکلی ہو تو لوگ گھر سے باہر نکل پڑتے ہیں ہماری ایک دوست بھی موسم سے فائدہ اٹھا کر ہم سے ملنے آگئیں۔ ہم نے ان کے لیے چائے بنائی اور پکوڑیاں تلیں، وہ دھوپ میں بیٹھنا چاہتی تھیں اس لیے باغ میں ہم لوگ چائے پی رہے تھے کہ ہمارے اور پڑوسن کے باغ کے درمیان کی لکڑی کی دیوار پر پڑوسن کا چہرہ ابھرا

"SOME THING SMELLS NICE"

وہ ماں بننے والی تھیں اور اس حالت میں کسی چیز کی خوشبو اچھی لگے تو بے اختیار کھانے کی خواہش ہوتی ہے یہ تو ہم جانتے ہی تھے اس لیے ہم انھیں اپنے ساتھ چائے میں شریک ہونے کی دعوت دینے والے تھے لیکن انھیں صرف چار گرہ کپڑے کی بکینی میں ملبوس دیکھ کر ادھر بلانے کے بجائے ایک پلیٹ میں پکوڑیاں رکھ کر دیوار کے اوپر ہی سے ان کی طرف بڑھا دیں اور بتایا کہ انھیں پکوڑیاں کہتے ہیں۔ انگریزی طریقے کے مطابق اس کو انھوں نے فوراً "پھکریاں" کر دیا۔

دوسرے دن وہ پلیٹ واپس کرنے آئیں تو ہم نے اخلاقاً چائے کے لیے پوچھا وہ فوراً شکریہ کے ساتھ چائے پینے کو تیار ہو گئیں اور بولیں اگر کل والی "پھکریاں" بچی ہوں تو وہ بھی چائے کے ساتھ لے آئیں۔ ہم سمجھ گئے کہ اس حالت میں اکثر عورتوں کو بعض

چیزیں کھانے کا بڑا شوق ہو جاتا ہے۔ انھیں پکوڑیاں کھانے کا شوق ہو گیا ہے۔ ہم نے ایک اچھے پڑوسی کی طرح ان کے لیے فوراً تازی پکوڑیاں تلیں جو انھوں نے خوب مزے لے لے کر کھائیں۔ وہ پہلی بار ماں بننے والی تھیں۔ اس حالت میں ہمارے وطن میں خاندان کی بزرگ خواتین کتنے نخرے اٹھاتی ہیں انھیں یاد کر کے ہم ان سے کہہ بیٹھے کہ جب بھی انھیں پکوڑیاں کھانے کی خواہش ہو وہ ہمارے پاس آجایا کریں۔

ایک دن پکوڑیاں کھاتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اگلے روز انھیں الٹرا ساونڈ ٹسٹ کے لیے اسپتال جانا ہے۔ اس کے بعد انھیں پتہ چل جائے گا کہ ہونے والا بچہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ جب یہ معلوم ہو جائے گا تو اسی حساب سے وہ اس کا کمرہ سجائیں گی۔ سارا گھر تو خریدنے کے فوراً بعد ہی سجا لیا تھا صرف ایک کمرہ بچے کے لیے چھوڑ دیا تھا کہ اگر لڑکا ہو گا تو اس کے لیے نیلے پردے اور قالین وغیرہ خریدے جائیں گے اور اگر لڑکی ہوئی تو گلابی رنگ کی سب چیزیں ہوں گی۔

دوسرے دن اسپتال سے واپسی پر وہ انتہائی غصہ میں بھری ہوئی ہمارے پاس آئیں۔
"آپ کے لوگوں کی وجہ سے اسپتال نے یہ پالیسی بنالی ہے کہ ہونے والے بچے کی جنس نہیں بتاتے۔ اب ہم اپنے بچے کے لیے پہلے سے کوئی تیاری نہیں کر سکتے۔"

پہلے تو ہمیں بھی ان کے غصہ پر بہت غصہ آیا کہ اتنا نمک کھانے کے بعد بھی ذرا سی مروّت نہیں لیکن پھر اپنے لوگوں کے بارے میں سوچا کہ واقعی انھیں جب پتہ چلتا ہے کہ ان کی ہونے والی اولاد نرینہ نہیں ہے تو اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی لیے جن علاقوں میں ایشیائیوں کی تعداد زیادہ ہے وہاں کے اسپتال یہ پالیسی اختیار کر لیتے ہیں کہ پیدائش سے پہلے بچے کی جنس نہ بتائی جائے اور جمہوریت میں جو پالیسی بنتی ہے اس کا اطلاق سبھی پر ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر ہمیں خود بھی شرم آئی اور ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ہم نے پھر چائے اور پکوڑیوں کی پیش کش کی، لیکن وہ اس قدر ناراض تھیں کہ پہلی بار پکوڑیاں کھانے سے انکار کر کے غصہ میں بھری ہوئی باہر چلی گئیں اور پھر ہم سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ پیچھے کے باغ میں جہاں وہ لکڑی کی دیوار کے پاس کھڑی ہو کر ہم سے باتیں کیا کرتی تھیں اب اگر ہمیں دیکھ بھی لیتیں تو فوراً منہ پھیر لیتیں۔ شاید انھیں ہم سے اس لیے نفرت ہو گئی تھی کہ ہمارا تعلق اس ظالم قوم سے ہے جو اپنے پیدا ہونے والے بچوں کا قتل اس لیے کر دیتی ہے کہ وہ لڑکیاں ہیں۔

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

الجھنیں (نفسیاتی مطالعہ)

مصنف: عبداللہ ولی بخش قادری
تبصرہ نگار: پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی
اشاعت: پہلی بار دسمبر ۱۹۹۷ء
قیمت: ۶۰/روپے
شائع کردہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو میں طباعت واشاعت کی سرگرمی میں کمی کی شکایت اب نہیں کی جاسکتی۔ ہر ماہ کچھ نہ کچھ سامان اہل مذاق کی تسکین بہم پہنچانے کا ہو ہی جاتا ہے۔ معیار کی اونچ نیچ کے باوجود چند کتابیں یقیناً ایسی ہوتی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً ہمارے جانے پہچانے ادیبوں کی طرف سے اگر کوئی نئی تصنیف آئے اور وہ اس ڈگر سے ذرا ہٹ کر ہو جس کے لیے مصنف نے پہلے شہرت حاصل کی ہے تو بات اور بھی دلچسپ ہو جاتی ہے۔

"الجھنیں" نفسیات سے متعلق کتاب ہے اور عبداللہ ولی بخش قادری صاحب کی تصنیف ہے جو تعلیم وتدریس کی دنیا میں جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ اردو میں علمی مضامین کی جو روایت جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اس کے اشاعتی ادارہ مکتبہ جامعہ نے اس صدی میں قائم کی ہے، وہ اردو میں ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ ہر سال متعدد کتابیں مختلف علوم سے متعلق شائع ہوتی ہیں جو یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اردو میں اعلا تعلیمی سطح پر استعمال ہونے والی کتابیں لکھنے کے وسائل کی کمی ہے۔ قادری صاحب کی یہ کتاب نہ صرف نفسیات کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش ہے بلکہ اردو کے ذریعے اس مضمون کی تعلیم وتدریس کو آسان کردیتی ہے۔ قادری صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں برسوں استادوں کی تعلیم وتربیت کا کام کرتے رہے ہیں۔ یہ محض تعلیم وتدریس ہی نہیں بلکہ ایک

مسلسل تجربہ گاہ بھی ہے جہاں استاد اپنے نظریات کا دوسروں کے نظریات کے ساتھ تقابل کرکے عمل میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں تعلیم و تعلم محض کلاس روم میں روزانہ معمول کے مطابق ایک لکچر دے کر فرض ادا کر دینا نہیں بلکہ ایک طرز فکر' ایک طرز زندگی ہے جو اس میدان میں سرگرم لوگوں کے درمیان باہمی رابطے اور تبادلہ خیال پر منحصر ہے۔ آنے والی نسلوں کے ذہن و کردار کی تشکیل کا دارومدار بھی اسی بات پر ہے کہ وقت کے بدلتے ہوئے دھارے کے ساتھ ابھرنے والے ذہنوں کی پہچان کی جائے اور ہر زمانے میں اپنے نظریوں اور اصولوں کو نئے سرے سے پرکھنے اور آزمانے کے لیے تیار بھی رہا جائے۔ اس کے لیے صرف پڑھنا لکھنا ہی کافی نہیں بلکہ ذہن و فکر کی جرات بھی لازم ہے۔ تعلیمی اداروں سے اسی بات کی توقع کی جاتی ہے خصوصاً وہ ادارے جن کے ذمے اساتذہ کی تربیت ہو' اس سے صرف نظر کر ہی نہیں سکتے۔

عبداللہ ولی بخش قادری کی یہ تصنیف اسی سمت کو روشن کرتی ہے اور اس کو پڑھنے والے یقیناً غور و فکر پر مائل ہوں گے۔ اس کتاب کا سب سے نمایاں اور پرکشش پہلو' مصنف کا اسلوب ہے۔ ایک ٹھوس علمی موضوع پر اس قدر خوشگوار انداز تحریر اپنانا معمولی بات نہیں۔ اس کے لیے ایک تخلیقی ادبی مزاج بھی لازم ہے جس کا یہاں پر ہر صفحے پر اظہار ہوتا ہے۔ مضامین کے عنوانات ہی ایک مقناطیسیت رکھتے ہیں اور پھر ہر مضمون شروع سے آخر تک پڑھنے والے کی توجہ کو محو کیے رہتا ہے۔ "یہ خطا جان کر نہیں ہوتی" "اس نے چھلانگ کیوں لگائی" "دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں" "اپنی دنیا آپ پیدا کر" وغیرہ ایسے عنوانات ہیں جو مضامین کی طرف خود بخود ہمیں مائل کرتے ہیں۔ کتاب میں اصطلاحات کی بھرمار تو کیا' اس قسم کے گورکھ دھندوں سے بالکل آزاد' عالمانہ رعب جتانے والا کوئی حربہ نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ نفسیات کے اساتذہ' طلبہ اور سنجیدہ کتابیں پڑھنے والوں میں اس اضافے کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

مصنف: ڈاکٹر وہاب قیصر
تبصرہ نگار: ڈاکٹر حمیرا جلیلی

سائنس کے نئے افق

قیمت: ۸۰ روپے
ناشر: شگوفہ پبلی کیشنز' حیدرآباد

کسی بھی زبان کی ترقی اور اس کی روز افزوں قبولیت کا مدار اس کی ہمہ گیر اور وسعت بیانی پر انحصار کرتا ہے۔ دنیا میں ان ہی زبانوں نے زمان و مکاں کی قید سے بالاتر ہو کر اپنی

اہمیت منوائی ہے جن زبانوں میں شعر و ادب کی دلفریب وادیوں میں نغمہ سنجی کے علاوہ دیگر علوم و فنون کی سنگلاخ زمینوں میں بھی گل ہائے سر سبد کھلانے کی صلاحیت موجود ہو۔ ویسے اہل اردو نے بھی زمانے اور وقت کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے سائنس ٹکنالوجی، طب، ساجیات، معاشیات کے میدان میں بھی اپنے قلم کا زور آزمایا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں جو ذخیرہ بالآخر ہمارے سامنے آتا ہے اس میں تراجم کی تعداد بہت زیادہ اور اصل تصانیف بہت ہی کم نظر آتی ہیں۔ اب کم یابی کی دھندلی فضاء میں ڈاکٹر وہاب قیصر کے سائنسی مضامین کا مجموعہ "سائنس کے نئے افق" جب سامنے آتا ہے تو امکانات وامیدوں کی کئی راہیں روشن ہو جاتی ہیں۔

زیر نظر کتاب جو بیس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا افق کے تحت خود ڈاکٹر وہاب قیصر بتاتے ہیں کہ یہ مضامین ان کی پچیس سالہ جانفشانی اور عرق ریزی کا ثمرہ ہیں۔ ویسے اس کتاب کی اشاعت کے پس منظر میں ایک استاد کا وہ جذبہ فیض رساں بھی شامل ہے جو باران علم کو دور دور تک تشنگان علم تک پہنچانا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پیشہ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ زیر نظر کتاب کا پہلا حصہ طبعی سائنس کا احاطہ کرتا ہے۔ اس لیے اس میں ایسے مضامین شامل کیے گئے ہیں جو سائنسی ضوابط ان کی بازیافت اور افادیت سے متعلق ہیں۔ چنانچہ اس حصے میں رنگ اور بینائی غیر مدئی شعاعیں شمع اور پروانہ سائنسی نقطہ نظر سے بالا سمعی موجیں، تابکاری قدرتی اور مصنوعی کائناتی شعاعیں اور لاشعاعیں عنوانات کے تحت نہایت عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ اسی حصے میں قارئین کے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ رنگ کے دکھائی دینے میں کتنی چیزیں کار فرما ہوتی ہیں، سورج اور برقی بلب کی روشنی جو سفید روشنی کہلاتی ہے یہ کتنے رنگوں پر مشتمل ہے اور پھر ٹی وی فوٹو گرافی فوٹو آفسیٹ پرنٹنگ میں مختلف رنگوں کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ مختلف رنگوں کی شعاعوں کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ سرخ رنگ کی شعاعیں دوران خون کو بڑھانے اور فالج کے علاج میں مفید ہوتی ہیں جب کہ نارنجی شعاعیں حلق، پھیپھڑوں اور طحال کی بیماریوں کے علاج میں سودمند ہوتی ہیں زرد رنگ کی شعاعیں جلد اور پٹھوں کے لیے مفید ہیں جبکہ سبز شعاعیں امراض قلب کے لیے اور نیل مائل بنفشی شعاعیں نمونیہ: آنکھ، کان اور ناک کی تکالیف دور کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ غیر مدئی شعاعیں بالا سمعی شعاعیں، تابکاری، قدرتی اور مصنوعی کائناتی شعاعیں انکی دریافت اور دور حاضر میں ان کی اہمیت اور افادیت پر نہایت بیش قیمت معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

دوسرے حصے میں ٹکنالوجی کے تحت ایسے آلات پر مضامین سپرد قلم کیے گئے ہیں جو آج ہماری زندگی کی ضرورت بلکہ زندگی کا ایک اہم حصہ بن گئے ہیں۔ جیسے الکٹرانکس' کمپیوٹر' زیراکس' ٹیلکس' فیکس' راڈار' فائبر آپٹکس' موبائل اور سیلولر' ریڈیائی دوربین اور علم فلکیات' برقیاتی خوردبین اور فوٹو ٹیوبس یہ سارے مضامین نہایت تفصیل کے ساتھ اپنے موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے جہاں مادی آسائش وراحت کا سامان فراہم کیا ہے وہیں کئی ایک مسائل سے بھی ہمیں دوچار کردیا ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں ایسے ہی مضامین شامل کیے گئے ہیں جو تصویر کا دوسرا رخ پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ماحولیاتی سائنس کے تحت فضائی ماحولیاتی آلودگی' تیزابی بارش اور اوزان کی پرت عنوانات پر نہایت فکر انگیز مضامین لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ ماحولیاتی آلودگی کے ضمن میں ڈاکٹر وہاب قیصر بتاتے ہیں کہ ہمارے ملک کے بڑے شہروں میں رہنے والے لوگ اتنی زہریلی فضا میں سانس لیتے ہیں جیسے کہ روزانہ دس تا بیس سگریٹ پینے کا اثر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فضا اگر گرد آلود ہو تو سردی اور کھانسی کی شکایت پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اگر فضا میں جست کے ذرات بھی شامل ہوں تو بچوں میں ذہنی معذوری کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے۔ جبکہ کاربن مانو آکسائڈ فضا میں شامل ہو کر امراض قلب کے مریضوں کے لیے ایک بڑا خطرہ بن جاتی ہے اور جب نائٹروجن ڈائی آکسائڈ فضا میں شامل ہو جاتی ہے تو یہ فلو' سانس کی نالیوں اور پھیپھڑوں میں ورم پیدا کرنے کا باعث بن جاتی ہیں۔

اسی مضمون کے آخری حصے میں ڈاکٹر صاحب نے ان تجاویز کو بھی شامل کردیا ہے جو فضائی آلودگی کو کم کرنے کے لیے ماہرین ماحولیات نے پیش کی ہیں۔

اس کتاب کے سلسلہ میں ایک اور قابل ذکر بات مصنف کا انداز بیاں ہے۔ موضوعات اور عنوانات کے لحاظ سے اندیشہ تھا کہ کہیں طرز بیاں خشک اور غیر دلچسپ نہ ہو جائے۔ لیکن بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہاب قیصر صاحب نے اس مرحلہ کو بڑی سادگی وپرکاری سے طے کرلیا ہے۔ شاعرانہ انداز اور لطف بیاں ہر صفحے پر بکھرا نظر آتا ہے۔ یکے بعد دیگرے مضامین پڑھتے جایئے کہیں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی بلکہ قاری کا ذہن ہر لحظہ ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر وہاب قیصر کے حسن بیاں کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"رنگ اور بینائی کا تعلق اتنا ہی گہرا ہے جتنا کہ نظر اور منظر کا یہاں تک کہ تصور

بھی چاہے وہ فطرت کے نظاروں کا ہو یا حسن کے سراپا کار نگوں میں بسا ہوتا ہے۔ ہم یہ کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ہم ایک رنگین دنیا میں رہتے ہیں۔" (صفحہ۔۱۱)

جہاں تک ان مضامین میں شامل اصطلاحات کا تعلق ہے لگتا ہے کہ اکثر اصطلا حیں تو وہی استعمال کی گئی ہیں جو مروجہ ہیں اور کچھ مصنف نے خود تراشی ہیں جو کہ بار خاطر نہیں ہوتیں۔ بہرحال "سائنس کے نئے افق" بیش قیمت معلومات کا ایک ایسا گنجینہ ہے جس کا ہر تعلیمی ادارے اور ہر گھر میں موجود ہونا ضروری ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہاب قیصر صاحب کی تقلید میں ہمارے دوسرے اہل قلم بھی ایسے ہی مفید اور کارآمد موضوعات پر قلم اٹھائیں تاکہ اردو زبان کو ایک نئی توانائی ملے اور اس کے دامن کو عالمی وسعت حاصل ہو۔

زرد پتے (افسانے)

مصنف: شہزاد بدایونی

تبصرہ نگار: عبداللہ ولی بخش قادری

اشاعت: ۱۹۹۷ء صفحات: ۲۱۶ مجلد

قیمت: ۸۰ر روپے

تقسیم کار: بزم قلم پبلی کیشنز، مٹی چوک، بدایوں

زرد پتے، شہزاد بدایونی کے بارہ افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان کا ایک ناول مسکراتے آنسو ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ پھر وہ خاموش سے ہوگئے۔ ان کی میدان ادب میں اس طور واپسی خوش آئند ہے۔ وہ ہماری اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو حصول آزادی کے بعد پروان چڑھی ہے۔ احوال واقعی کے تحت انھوں نے لکھا ہے کہ "زیر مطالعہ مجموعے کے افسانے "کالیا" میں جذبات کے شعلوں کو احساس کی شبنم سے سرد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے حالات حاضرہ میں سماج کی بیگانہ روی کو اپنے قلمی نشتر سے کرید کر میں نے کالیا کے کردار سے بہت کچھ کہلوانا چاہا ہے۔ "کالیا" اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے: "کالیا" بے حد کالا تو تھا ہی لیکن جسم پر چڑھی ہوئی میل کی تہوں نے اسے اور بھی کالا کر دیا تھا۔ جسم پر ایک پرانا نیکر، وہ بھی مٹی کی رنگت اور اس کے سوا کبھی کوئی لباس اس کے جسم پر نہیں رہتا تھا۔۔۔۔۔ پوری کالونی میں دو کچرا گھر تھے اور دونوں کا مالک کالیا تھا۔ کالیا انھیں کریدتے ہوئے اپنے لیے غذا مہیا کرتا تھا۔ سوکھی روٹی، بسکٹ اور ڈبل روٹی کے ٹکڑے، کچی سبزی کے چھلکے یا پھر سیب، امرود، چیکو اور آلو بخارے سڑے گلے، تھوڑے یا بہت، اس کے پیٹ کی آگ کو سرد کرنے کے لیے اس میں مل ہی جاتے۔" کالیا کا کردار بڑا جاندار

اور حسی سا ہے۔ آج کی روز افزوں آبادی اور گندگی پر فضائی آلودگی مستزاد ہے۔ کچرا گھر اور کالیا کی ذات، ہماری شہری زندگی کے کھوکھلے پن کے مظہر ہیں۔ یہ افسانہ بیرونی غلاظت کے علاوہ اندرونی گراوٹ کو بھی نمایاں کرتا ہے: "آج کئی دن بعد کالیا آدمی رات کے وقت کچرے کے ڈھیر کو ٹٹول رہا تھا۔ شاید بھوک کی شدت نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ پیٹ میں بھڑکتی ہوئی آگ کو سرد کرنے کے لیے وہ بے چین تھا کہ اس کے سیاہ اور کھردرے ہاتھ کسی نرم و نازک چیز سے ٹکرائے۔ کالیا نے غور سے دیکھا تو وہ ایک خوب صورت سنہرے بالوں والی نوزائیدہ بچی تھی۔" کالیا کی اس 'یافت' یا دریافت پر کالونی کے نواسیوں کا ردعمل ہماری ملمع زندگی کی قلعی کھولتا ہے: "صبح اول وقت وہ دین دیال کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔ دین دیال کی دادی کی نظر اس پر پڑی تو چیخ کر بولی: ہائے کمبخت تو اسے کہاں سے اٹھا لایا' اور کالیا نے پرسکون انداز میں کچرے کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر دیا۔ دین دیال کی ماں بھی باہر نکل آئی۔ پھر بچوں نے شور کیا کہ کالیا کسی کے بچے کو اٹھا لایا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک بھیڑ جمع ہو گئی۔ "کسی کل مونہی نے اپنے پاپ کی نشانی کوڑے کے ڈھیر پر ڈال دی ہے۔" دین دیال کی دادی نے سب کو آگے بڑھ کر بتایا۔ 'ہائے لڑکی ہے اور بہت خوبصورت ہے' آشا نے بڑھ کر شال اٹھا کر بچی کو دیکھتے ہی زور سے کہا۔ 'ہٹ پرے' حرام کی اولاد خوب صورت ہی ہووے ہے' آشا کی ساس نے بازو پکڑ کر آشا کو بچی کے پاس سے کھینچ لیا۔ 'کوئی اسے پال نہ لے' انوری بیگم پان چباتے ہوئے سب سے مخاطب ہوئیں۔ 'اے بہن' تم بھی سٹھیا گئی ہو' لڑکی ذات کون پالے' بڑے ہو کر اپنی ماں کے ہی نقش قدم پر چلے گی' نظیرا کی بہن بولی۔ 'ارے یہ غور کرو' یہ کس کمبخت کے پاپ کی نشانی ہے۔ ضرور کوئی اس کالونی کی ہی شریف زادی ہو گی۔' جگو موچی کی بہو نے طنز کیا۔ اور کالیا اسے گھور کر رہ گیا۔" تھوڑی دیر بعد کالیا وہاں سے چل دیا۔ افسانے کے اختتام پر کالیا کسی سے مخاطب تھا: "اگر تم نے اس بچی کو مارنے کی کوشش کی یا اس سے ارچنا کو جدا کیا تو قسم سب کے مالک کی یہ کالیا ساری کالونی کے سامنے سب کچھ بولے گا اور بار بار بولے گا ورنہ کالیا بے زبان ہے اور ہمیشہ بے زبان ہی رہے گا۔ کالیا کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ اس نے بے ساختہ اس بچی کو ارچنا کی گود میں ڈال دیا۔"

بلاشبہ یہ افسانہ ایک اہم عصری تقاضے ماحولی کثافت و آلودگی اور ہماری معاشی واخلاقی پستی کی موجودہ کیفیت کی موثر طور پر عکاسی کرتا ہے۔ وہ اپنی طوالت کے باوجود وحدت فکر اور دلچسپی برقرار رکھتا ہے۔ دوسرے افسانے کا عنوان ہے "آنکھیں" یہاں بھی

اور جھوٹی دونوں طرح کی محبت اپنا رنگ دکھاتی ہے اور خاطر خواہ اپنا تاثر چھوڑتی ہے۔ تیسرا افسانہ ہے 'زرد پتے' یہاں ہر ایک کردار اپنے اپنے طور پر محبت کی بھینٹ چڑھ گیا لیکن مسرت کی سرشاری کسی کو نصیب نہ ہوئی اور اس صورت حال کی اہم وجہ ایک نوجوان بیوی کی عیش و عشرت کی ہوس قرار پاتی ہے۔ افسانے کے نام کی معنویت اس کے انجام سے وابستہ ہے۔ اگلے افسانے کا عنوان 'صبر ووفا' اپنے موضوع کا شاہد ہے۔ پانچویں افسانے کے بارے میں افسانہ نگار نے 'احوال واقعی' میں تحریر کیا ہے کہ "وہ میری ہے' میں سچی اور پاک محبت کرنے والے دلوں کی دھڑکنوں کو میں نے کاغذ پر سجایا ہے۔ محبت ایک نور ہے جو ذہن ودل کو منور کرتا ہے۔ محبت ایک احساس ہے جسے روح کی گہرائیاں ہی محسوس کر سکتی ہیں اور محبت وہ جذبہ ہے جو کسی رشتے کا محتاج نہیں۔ یہی ثابت کرنے کی کوشش میں وہ میری ہے نے جنم لیا۔" اور قاری سے دریافت بھی کیا ہے: "لیکن میں کیا یہ سب کچھ ثابت کر سکا ہوں؟" چھٹا افسانہ 'پیار کی منزل' حقیقت سے دور نہیں ہے۔ دو نوجوان دلوں کی صورت وصال یہ ہے: "سیما ہذیانی انداز میں دیوانوں کی طرح چیخ رہی تھی اور سلمان کے سینے سے خنجر نکالنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اچانک چند فسادی اس کی چیخوں پر لاٹھی بلم اور چھریوں سے مسلح ہو کر گھر میں گھس آئے۔ ارے سلمان بھیا کو سیٹھ کی لڑکی نے قتل کر دیا۔ ان میں سے کوئی چیخا: 'دم توڑ دیا۔" ساتواں افسانہ 'پل صراط' محبت کی عظمت اور نامرادی دونوں کو پیش کرتا ہے اور آٹھواں 'ریشم کی ڈوری' پورے طور پر جاسوسی تانا بانا رکھتا ہے جس میں محبت کی کارفرمائی بھی شامل ہے۔ آٹھواں افسانہ 'سب سے مختلف اور مختصر ہے۔ مختلف اس لیے نہیں کہ اس کا اصل موضوع الگ ہے بلکہ اس لیے کہ وہ ایک عورت کا نقطہ نظر پیش کرتا ہے جس کا کہنا ہے کہ "محبت کسی جنسی رشتے کی محتاج نہیں۔ محبت تو صرف دو روحوں کا ملن ہے' جسموں کا نہیں۔ محبت تو ایک ایسا پاک جذبہ ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے' چھو کر نہیں دیکھا جاتا۔۔۔" اس کے بیان کو پرکھنے کے لیے افسانے کے سیاق وسباق میں اسے دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ 'دھند' میں بلندی کردار کا مظاہرہ ہوتا ہے جس کی اساس محبت ہی ہے۔ نویں افسانے 'زہر' میں طلاق کے زہر کی طرف رجوع کیا گیا ہے جو بے راہ روی اور مخلوط نظام کی بدولت آسان حربہ بن گیا ہے۔ آخری افسانہ 'قیامت در قیامت' ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک فقیرنی اپنے بیمار بچے کو سر راہ چھوڑ کر اپنے گود والے بچے کے ساتھ ایک بے اولاد امیر عورت کی طرف دست

طلب پھیلاتی ہے اور وہ ایک بڑی رقم کے عوض اس کا گود والا بچہ لے کر چلی جاتی ہے لیکن واپسی پر اپنے بیمار بچے کو مردہ پاتی ہے جس کی خاطر اس نے اپنے چھوٹے بچے کو گنوایا تھا۔

اس طور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بارہ افسانوں کا مجموعہ ہمارے گرد وپیش کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے کردار جانے پہچانے سے لگتے ہیں اور اکثر وبیشتر ہمارے درمیانی طبقے کے نمائندہ ہیں۔ ان کے مسائل روزمرہ زندگی کے انسانی روابط سے تعلق رکھتے ہیں لیکن محور محبت ہی ہوتا ہے جس کی نمائندگی مختلف کردار اپنے اپنے مخصوص تعلق اور حدود کے اندر جیتے جاگتے انداز میں کرتے ہیں۔ اس طرح محبت کے مختلف پہلو اور جلوے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ سچی اور پاک محبت کا نقش گہرا ہوتا چلا جاتا ہے مگر مسرت کی آسودگی سے زندگیاں محروم رہتی ہیں۔ قربانی اور ایثار کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ یہ اور اک واحساس او پورے مجموعے کی معنویت اس کے نام زرد پتے سے بخوبی جھلکتی ہے البتہ افسانہ نگار نے سماجی کمزوریوں اور بے اعتدالیوں پر جگہ بہ جگہ روشنی ڈالی ہے' عام انسانی زندگی کے تا حقائق کو اجاگر کیا ہے اور عصری مسائل سے بھی روگردانی نہیں کی ہے مگر وہ کسی مسلک زندگی یا فلسفہ حیات کے مبلغ یا پیروکار رول ادا نہیں کرتے ہیں۔ ان کے انداز بیان او قدرت زبان کے نمونے سامنے آچکے ہیں۔ وہ اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی پر کماحقہ قدرت رکھتے ہیں۔ اپنی عبارت کو ابہام اور پیچیدگی سے بچاتے ہیں اور لفاظی کو اپنا وطیرہ نہیں بناتے۔ ان کے بعض افسانے غیر ضروری طور پر طول پکڑ گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ قاری کو ان کے تصورات و مقصودات گردانتے میں دشواری نہ ہو۔ امید ہے کہ 'زرد پتے' اپنے شرف قبول سے بہت جلد شہزاد کی اپنے آپ سے یہ بدگمانی دور کرنے کا موجب ہوں گے کیونکہ ان کے افسانوں میں اخلاقی رمق بھی ہے اور معاشرے کو بہتر بنانے کی امنگ بھی۔ وہ قاری کی دلکشی برقرار رکھتے ہیں اور ان کی عبارت سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔

مصنف: خورشید اکبر

سمندر خلاف رہتا ہے مبصر: کوثر مظہری

صفحات: ۱۱۲

قیمت: ۸۰ روپے

اس کتاب کا انتساب کچھ یوں ہے۔ "ترقی پسندی اور جدیدیت سے انحراف کرنے والی اس نسل کے نام جس کی آزادانہ شناخت پر بعض تخت نشین ناقدین کو اعتراض ہے۔

ظاہر ہے کہ خورشید اکبر جس ادبی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اس کا تیور 'لب ولہجہ' انداز گفتگو اور رگوں کا لہو' سب کچھ منفرد ہے' باوقار ہے' گرم ہے۔

خورشید اکبر کی آنکھیں کائنات کی دروں بینی میں مصروف ہیں۔ ان کے شعروں میں جو جستی رچاؤ اور فکر کی بلندی ملتی ہے وہ انھیں اپنے ہم عصروں میں بلند کرتی ہے' ممتاز کرتی ہے۔ مذہبی افکار سے گہرا رشتہ اور عصری مسائل میں الجھا ہوا ذہن' یہ دونوں جب باہم متصادم ہوتے ہیں تو یہ رنگ پیدا ہوتا ہے

میں دانے دانے کو محتاج ہو کے بھٹکوں گا اسی ملال پر پروردگار ٹوٹے گا
پشیماں ہے کیوں تیری پروردگاری میں بھوکا رہوں تجھ کو رب کہہ نہ پاؤں

خورشید اکبر مشرقی شعریات اور مشرقی تہذیب دونوں کے دلدادہ ہیں۔ اس لیے تہذیب نو کی رنگارنگی سے متعلق ان کا زاویہ فکر یوں مترشح ہوتا ہے

چمکتے شہر کی تہذیب کتنی پاک دامن ہے
یہاں پر ماں بہن کے جسم سے کپڑا اترتا ہے
ماں بہنوں کو کون بچائے' شہر یہ شہوت زادوں کا ہے
ہوتی ہے نیلام یہاں پر ساڑی اور شلوار کی خوشبو

اسی بگڑی ہوئی اور اوڑھی ہوئی نقلی تہذیب کا دوسرا پہلو سیاسی رہنماؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے

سمٹتے بستروں پر عیش کا دھبہ بھی رہتا ہے
نواب شہر کو شطرنج کا نشہ بھی رہتا ہے

خورشید اکبر کے سامنے بولہب کی سازشیں اور اس پر اللہ کی وعیدیں سب روشن ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی تاریخ کے دوسرے نکتے بھی ملتے ہیں اور غزل کے پیکر میں یہ کام اہمیت کا حامل ہے مثلاً

گلے میں وہی مونج کی رسیاں ہیں وہی سر پہ بار حطب کہہ نہ پاؤں
زباں کلمہ حق پہ نازاں ہے لیکن ہے اندر کوئی بولہب' کہہ نہ پاؤں
اپنے ہی گھر میں مہاجر کی طرح جینا ہے
اب کوئی شہر مدینہ نہیں ہونے والا

خورشید اکبر ایک بیباک غیر مصلحت پسند شاعر ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں وہی تمسار کھتے ہیں

جو اپنی زندگی میں رکھتے ہیں۔ ان کے کھلے پن کا لہجہ کہیں انھیں ملعون و مطعون بھی کرتا ہے اور کہیں وقار بھی بخشتا ہے۔ انھوں نے خوددارانہ زندگی جینے کا ڈھب سیکھا ہے ع

کم ظرف مصلحت کو ملی مسند عظیم خوددار حوصلوں کی نوازش نہ ہو سکی

غریبی جھانکتی ہے تہ بہ تہ پیوند سے باہر
مگر ہم جیب پر احسان کا بخیہ نہیں رکھتے

وہ لکیر کے فقیر نہیں۔ ان کا پختہ اور بالیدہ ذہن تنوعات اور امکانات کی طرف رواں دواں ہے۔ اس سفر میں مصیبت کا نیا ٹھسا' جبریل آگہی' نوٹ کا پہیہ جیسی ترکیبیں خود بخود وضع ہوتی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں ترکیب بے وقعت بھی ہو جاتی ہے اور بہت ہی اٹ پٹا سا لگتا ہے ع "کرشمہ کند احساسی کا دیکھو" کند احساسی کی ترکیب بوجھل اور نامناسب ہے۔ ایک اور شعر

رکابی میں بلائیں ڈال دو سب
کوئی بھوکا قلندر چیختا ہے

فقیر یا قلندر کے لیے رکابی کے بدلے زنبیل یا کشکول کا لفظ ہی موزوں ہوتا ہے۔

خورشید اکبر نے ترش اور شیریں مضامین کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ کبھی کبھی غیر اہم موضوع کو بھی شعری پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے جہاں بات بگڑ گئی ہے

دلہن سے قیمتی رنگین ٹی۔وی
دعاؤں کی رہے ڈولی سلامت

کوئی ضروری نہیں کہ ہر مضمون کو شعری قالب عطا کریں۔ والیری کے بقول That Which Must be Said Cant Be Said in Poetry لہذا ان باتوں کا لحاظ ضروری ہے کہ موضوعات کی بھیڑ سے غزل جیسی نازک صنف کے لیے موزوں موضوع کا انتخاب کیا جائے۔ خورشید اکبر پھر بھی بچ بچا کر نکل آتے ہیں۔ اگر وہ لفظیات کے برتاؤ میں نرم روی اور کلاسکی مزاج کا پاس رکھیں تو ان کی غزلوں میں اور بھی نشتریت اور الوہیت کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ اردو شاعری کے نئے منظر نامہ (خصوصاً ۱۹۸۰ء کے بعد) پر خورشید اکبر کا نام بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ دو تین اشعار

میں ریگزار کی دریادلی سے واقف ہوں ٹھہر! یہاں سے سمندر نکلنے والا ہے
کسی کا قرب کبوتر کے پنکھ جیسا تھا بدن کی آگ بھی پانی ہوئی سلیقے سے
سلگتی پیاس نے کر لی ہے مورچہ بندی اسی خطا پہ سمندر خلاف رہتا ہے

کھلے خطوط

اگرچہ کتاب نما کا اگست ۱۹۹۸ء کا شمارہ بہت تاخیر سے دست یاب ہوا (باوجودیکہ علی گڑھ میں مکتبہ جامعہ کی شاخ موجود ہے) تاہم بہت پسند آیا بلکہ سچی بات یہ ہے کہ کتاب نما کا کوئی شمارہ بہت مدت کے بعد اتنا پسند آیا۔ انتظار حسین کا مضمون اردو کا تہذیبی مزاج (جو منقول ہے) اور پروفیسر نقی حسین جعفری کا محرم پیغمبران سخن اس شمارے کی جان ہیں۔

انتظار حسین صاحب نے بی چھو کو بنیاد بنا کر اردو کے آغاز اور ارتقا کی جو داستان لکھی ہے اور اس میں ایک طرف امیر خسرو اور دوسری طرف کبیر کے کارناموں کو جس طرح اجاگر کیا ہے وہ نہایت قابل تعریف ہے۔ اردو بلا شبہ ایک زبان ہی نہیں، ایک تہذیب بھی ہے۔ ابتدا میں مختلف تہذیبوں کی آویزش اور آگے چل کر ان کی آمیزش پر اس مضمون میں بہت اچھے اشارے کیے گئے ہیں اور انھوں نے بالکل درست لکھا ہے کہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے لیکن اب آویزش کی جگہ آمیزش نے زیادہ لے لی ہے جو ایک خوش آیند تجربہ ہے۔ آویزش اب مصنوعی اور غیر منطقی محسوس ہوتی ہے اور آمیزش حقیقی اور تقاضائے وقت کے مطابق۔ اگر یہ آمیزش ہندستان میں ہندی اور اردو (اور بعض علاقائی زبانوں) کے تناظر میں محسوس کی جا سکتی ہے تو پاکستان میں اردو اور پنجابی وغیرہ کے سیاق میں اور پورے برصغیر میں مغرب سے درآمد کی ہوئی زبان اور تہذیب کے تعلق سے۔ انتظار حسین صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں دو دلچسپ شعر نقل کیے ہیں جن میں سے پہلا شعر ہماری قدیم تہذیب کی نمایندگی کرتا ہے اور دوسرا جدید تہذیب کی۔ نئی تہذیب کا جو "طور" انھوں نے اس شعر سے واضح کیا ہے۔

میں نے کہا کہ دیکھ یہ میں، یہ ہوا، یہ رات
اس نے کہا کہ میری پڑھائی کا وقت ہے

مبنی بر حقیقت ہے اور کوئی نئے زمانے کی لڑکی ہی یہ جواب دے سکتی ہے۔ پرانے زمانے کی لڑکی میاں مجنوں کو ٹالنے کے لیے کوئی اور بہانہ تراشتی۔ انتظار حسین صاحب کے مضمون کے یہ جملے خاص طور سے لائق توجہ ہیں۔ زبانیں اور تہذیبیں کبھی خالص نہیں رہا کرتیں۔ خالص رہنے میں ان کی موت ہے۔" خالص یا شدھ زبانوں اور تہذیبوں کا تصور سوائے تنگ نظری کے اور کچھ نہیں ہے۔

پروفیسر نقی حسین جعفری نے سردار جعفری کے پیغمبران سخن کے تجزیے کے تقریباً آغاز ہی میں یہ واضح کردیا ہے "کہ یہ کتاب ــــ کبیر بانی، دیوان میر اور دیوان غالب کے دیباچوں پر مشتمل ہے۔" اس طرح وہ "ایک اہم دستاویز" تو ہو سکتی ہے،

اس کا ایک مربوط کتاب ہونا مشکوک ہو جاتا ہے۔ تقی حسین صاحب سردار جعفری کے اس قول پر کہ کبیر کی شاعری کا پیرہن مذہبی اور میر اور غالب کی شاعری کا غیر مذہبی ہے بجا طور پر محاکمہ کیا ہے۔ مذہب کی سرحد کہاں ختم ہوتی ہے اور غیر مذہب کی سرحد کہاں سے شروع ہوتی ہے یہ بہت متنازعہ فیہ مسئلہ ہے، علم وادب میں بھی اور سیاست میں بھی۔ سیاست میں ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ اس مسئلے کی غیر تسلی بخش تعریف و توضیح نے ہمارے سماج میں کتنے الجھاوے پیدا کر دیے ہیں۔ مولانا عبد الماجد دریابادی تو غالب کو بھی مذہب پسند شاعر قرار دیتے تھے کیوں کہ وہ موحد تھا اور اس نے نعت بھی لکھی تھی۔ تقی حسین صاحب نے ان تینوں شاعروں کے درمیان "سب سے بڑی قدر مشترک وحدۃ الوجود کا تصور" بیان کیا ہے۔ انھوں نے فلسفہ وحدۃ الوجود کے تصور کی تشریح سے یہ کہہ کر اجتناب کیا ہے کہ "یہاں اس بات کا محل نہیں ہے۔" تاہم ہم سمجھتے ہیں کہ اگر وہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے فلسفوں کے تصور کی طرف چند اشارے ہی کر دیتے اور ان تینوں شاعروں کے کلام سے اس کی چند ایک مثالیں پیش کر دیتے تو ان کی رائے کی صحت یا عدم صحت کی بابت فیصلہ کرنا زیادہ آسان ہو جاتا۔

اس شمارے میں رفعت صدیقی صاحب کی نظم "کبھی ایسا بھی ہو" دل کے تاروں کو چھو لیتی ہے اور مجھ پر تو اس کا اتنا اثر ہوا کہ میں نے انھیں براہ راست بھی خط لکھا ہے۔ جب انھوں نے یہ لکھا ہوگا کہ نہیں / یہ وہ نہیں ہے / یہ میرا بیٹا نہیں ہے / یہ کوئی اور لڑکا ہے / جو مجھ کو جانتا تک بھی نہیں ہے / میرا بیٹا تو کب کا کھو گیا۔ تو ان کے دل پر کیا گزر گئی ہوگی کہ قاری کی آنکھوں سے بھی بے ساختہ آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

معلوم نہیں آپ افسانوں سے کیوں اتنے خفا ہیں کہ کتاب نما میں کبھی کوئی افسانہ مشکل ہی سے بار پاتا ہے۔ البتہ اس کی کمی آپ طنز و مزاح سے کسی حد تک پوری کر دیتے ہیں اور غزلوں کی بھرمار تو ہر اردو رسالے کا مقدر ہی ہے۔ مراسلہ کی طوالت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی، حبیب منزل، علی گڑھ

آپ کا کتاب نما پابندی سے مل رہا ہے۔ آپ کے رسالے میں کافی فکر انگیز اداریے ہوتے ہیں۔ اب کی مرتبہ کسی نو عمر ادیبہ نرگس سلطانہ کا انشاریہ "اردو زبان کا مستقبل اور ہماری ذمے داریاں" پڑھنے کو ملا۔ اچھا لگا لیکن ان کی شرائط اور پابندیاں ذرا ہم کو کھل گئیں۔ محترمہ، معلوم ہوتا ہے پڑھی لکھی تو بہت ہیں اور غالباً ماہنامہ آج کل اردو سے منسلک ہیں لیکن بچوں کی ماں نہیں معلوم ہوتی

ہیں نہ چہرے سے نہ تحریر سے۔ گو انھوں نے ہمارے ضمیروں کو جھنجوڑا ہے کہ ان پروفیسروں کا بائیکاٹ کر دیا جو کھاتے تو ہیں اردو کی روٹی لیکن ان کی نسلیں اردو نہیں پڑھ رہی ہیں ۔۔ میں اس زمرے میں تو نہیں آتی جو اردو سے روٹی کماتی ہے، میں تو جغرافیہ یا انگریزی زبان پڑھاتی ہوں اور دوسرے غریب الوطن ہوں۔ چار دہائیوں سے یہاں انگریزی کھانا پینا اوڑھنا اس میں شامل ہے۔ میرے بچے سب روانی سے اردو بولتے ہیں لیکن پڑھ نہ پائے بڑی کوشش کی، گو کہ گھر میں اردو کی لائبریری ہے۔ اپنے شوق کی وجہ سے شرمندگی کا احساس تو ہے لیکن دیار غیر میں بہت مشکل ہے۔ حق بگو گرچہ تلخ باشد۔ نرگس نے بہت اچھی بات کہی ہے لیکن کیا عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے اس کو، یہ ایک سوالیہ نشان ہے؟ اس سے پہلے بھی آپ کے رسالے کے اداریے مجھے بہت پسند آئے علمیت اور حقائق سے بھرپور ہوتے ہیں۔

آپ کے رسالے میں جو خبریں ہوتی ہیں وہ میرے لیے بہت کارآمد ہوتی ہیں یعنی ادبی تہذیبی خبریں ۔ میں آپ کو اپنی کتابیں اگلی مرتبہ روانہ کروں گی، شاید وہ ہونا چاہیے ۔ میری کتاب کا نام ہے "بانو کے افسانے" جو ۱۹۹۶ء میں چھپی ہے ۔ دوسری کتاب "بانو کی کہانیاں" عنقریب شائع ہو رہی ہے وہ بھی بھیجوں گی ۔ مجھے آپ کا پرچہ پسند ہے۔ Small Is Beutiful

بانو ارشد 12-Camrose Avenue,Edgware,
Middlesex,U.K. HA8 EG

☆لفظ طوطا ر توتا کا صحیح املا کیا ہے، اس پر اردو والوں میں عرصے سے اختلاف رہا ہے چنانچہ اردو لغات میں یہ 'ط' اور 'ت' دونوں کے تحت ملتا ہے ۔ میں نہیں جانتا کہ اس تنازعہ کا آخری فیصلہ کیا ہوا ہے ،اور فائنل ورڈکٹ 'ط' کے حق میں گیا ہے یا 'ت' کے ۔ میری ذاتی رائے بہر حال یہ ہے کہ اسے 'طوطا' مان لیا جانا چاہیے کیونکہ 'ط' کی شکل 'طوطے' سے خاص مشابہ ہے، اور جب بھی ہم طوطا لکھتے ہیں تو لگتا ہے ہم نے اس کی چونچ اور پر بنا دیے ہیں۔ تاہم میرے مضمون "ملاقات ایک لکڑ بگڑ" سے (اگست ۹۸) کے ایک حصہ کا جو حشر آپ کے کاتب صاحب یا پروف ریڈر صاحب نے کیا ہے اس سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ ان میں سے کم از کم ایک صاحب ضرور اس سے اختلاف رکھتے ہیں اور وہ 'طوطے' کے معاملے میں نظریہ 'ط' کے نہیں بلکہ نظریہ 'ت' کے پُرزور حامی ہیں۔ مضمون کے اس حصہ میں میں نے 'طوطے' کے املا سے متعلقہ اختلاف کا ذکر کیا تھا اور اس سے کچھ مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی تھی مگر کاتب ۔ پروف ریڈر صاحب نے بحسن وخوبی اس کوشش کو ناکام

بتادیا۔ اس خط کے ذریعہ میں وہ کوشش دوہرانا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں اس مرتبہ مجھے آپ کا تعاون اور تحفظ حاصل رہے گا۔ مضمون کے اس حصہ میں لکڑ بگڑ، اردو محاورہ " ہاتھوں کے طوطے اڑ جانا" کا ذکر کرتا ہے، جس کا اصل متن یوں ہے۔

"... اور محاورے دیکھیے تو عجیب احمقانہ تصور پیش کرتے ہیں۔ کوئی حیران پریشان ہوجائے تو کہیں گے۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ کیوں صاحب! یہ ہاتھوں کے طوطے کیا چیز ہوئی؟ کیا پیروں کے بھی طوطے ہوتے ہیں۔ معاف کیجیے ہوتے ہیں۔ افسوس آپ لوگوں میں لفظ طوطے کے املا پر بھی اتفاق نہیں۔ کوئی توتا لکھتا ہے کوئی طوطا۔ بلکہ بعض لوگوں کو تو میں نے طوتا اور توطا لکھتے ہوئے بھی سنا ہے۔"

اس میں کاتب / پروف ریڈر صاحب نے شروع میں ہر جگہ 'طوطے' کو 'توتے' یا 'توتا' لکھ دیا ہے، جس سے تمام گفتگو غیر مربوط ہوگئی اور یہ بھی تب کیا گیا جب احتیاطاً ہر جگہ 'طوطا' یا 'توتا' لکھتے وقت ہر لفظ کے نیچے 'احتیاطی خط' بنا دیا تھا۔ پھر بھی انھوں نے کہیں احتیاط برتی کہیں نہیں برتی۔

خیر، یہ بھی دلچسپ اتفاق رہا یا پھر یہ آپ کا حسن ادارت، ہے کہ اس شمارے میں مجتبیٰ حسین صاحب کا مضمون بھی انسانوں اور حیوانوں کے تعلق سے ہے۔ مگر کہاں وہ، کہاں یہ طفل مکتب! مجتبیٰ صاحب نے واقعی موضوع لوٹ لیا!

نصرت ظہیر ۹/۱۵ کھچڑی پور کالونی دہلی ۹۱

☆ کتاب نما کے جولائی کے شمارے میں جمیل الدین عالی کی شاعری کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کا مضمون، ضیا جالندھری کی نظم، پروفیسر گیان چند جین کی نظم اور سید اختر غلش گونڈوی کی غزل کے علاوہ کئی دلچسپ مشمولات ہیں جو داد طلب ہیں، تاہم اس شمارے کا حاصل پروفیسر نارنگ کا مضمون ہے۔ اس میں عالی کے ہاں طبیعاتی سائنسی ڈسکورس، ان کی طویل نظم انسان کے ضمن میں اٹھائے گئے سوالات اس کی ڈرامائیت اور فن کاری، دوہے اور غزلوں میں ہندستانی سنگیت کے گہرے اور دل نشیں اثرات اور دوسرے مضمرات کے جائزے میں، جس حیرت انگیز باخبری، ذہنی رسائی، قدرت کلام اور تنقیدی ژرف نگاہی کا استعمال ہوا ہے اس کی مثالیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں، اس مضمون کے توسط سے عالی کی ہمہ جہت فنی شخصیت کا نقشہ بہ تمام و کمال نمایاں ہوکر سامنے آجاتا ہے۔

قاضی عبدالرحمان ہاشمی، صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ

☆ کتاب نما جلد ۲۸ شمارہ ۸ پڑھا "کھلے خطوط" پڑھ کر لگا کہ ایک خاص گروپ کے لوگ ایک دوسرے کو سہرا رہے ہیں۔ ذہن جدید شمارہ ۲۵ میں وارث علوی نے اپنے

مکتوب کے ذریعہ اس قسم کی ذہنیت کے لوگوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ عاصم شہنواز شبلی "اثبات نفی" شمارہ ۵ میں "اپنی بات" میں یہ بتایا ہے کہ آج کل کے نوجوان چند رسائل میں چھپ جانے کے بعد خود کو عہد ساز سمجھنے لگتے ہیں۔ چند مضامین کی بیساکھی پر کھڑے ہو کر ایک نئی فکر کے پیش رو ہونے کا دعوا کرنے لگتے ہیں۔ یہ کون سا مقام ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے نظریات کا "ڈھنڈھورچی" بنا پھر رہا ہے۔

ان نئے لکھنے والوں کے پاس ایسا لگتا ہے کچھ ہے ہی نہیں۔ کوثر مظہری نے جمال اویسی کا اثر لیا اور جمال اویسی کے یہاں سہ روزہ سیمینار ۱۹۸۴ء "غزل فن اور فنکار" میں نئی غزل سے متعلق سید عقیل رضوی، ابو الکلام قاسمی اور قاضی افضال حسین کے پڑھے گئے مقالے کے اثرات نمایاں ہیں۔ دسمبر ۸۵ میں ہند وپاک سیمینار ہوا تھا اگر یہ لوگ اسے پڑھے ہوتے تو کچھ اور وسعت ان لوگوں کے یہاں آجاتی۔

مجیر احمد آزاد صاحب بڑے جذباتی لگے۔ سید احتشام اللہ کو احتشام حسین بنا دیا۔ ان کا دعوا ہے......احتشام کا بھی بغور مطالعہ کیا، لیکن آگے جس قسم کی باتیں کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے انھوں نے غور کرنے کے باوجود لکھی ہوئی بات کو نہیں سمجھ سکے۔ "لونجی بیٹھ" "بنجی بیٹھ اور" ٹھیکیداری" کی بات لے بیٹھے۔ مجیر احمد آزاد صاحب گیلی لکڑی کو "اتررانی" ا۔ پر رگڑنے سے آگ پیدا نہیں ہوتی، اسی طرح سے کم استعداد کے لوگ بغیر محنت اور تپسا کے علم الحقائق تک نہیں پہنچ سکتے۔ ادب میں سارا کچھ محنت اور ایمانداری سے ہوتا ہے۔ یہاں کھتری، برہمن، ویش اور شودر نہیں ہوتا لیکن لکڑی کی آگ، اوپلوں کی آگ، چھال اور پھوس کی آگ میں اور اس کے ٹھہراؤ میں فرق ہوتا ہے۔

اب آپ خود طے کرلیں کہ کس آگ میں اپنے ادب کی روٹی سیکنا چاہتے ہیں۔ اس بات کو نظر انداز نہ کریں کہ یہ دور گیس کا ہے۔ ایک چھوٹے سے سیلنڈر میں ایک مخصوص تکنیک کے ذریعہ ایندھن جمع کر لیتے ہیں۔ یہاں اپنی پھونک کا دعوا کیا معنی۔ ہم اپنی ہوا سے ایک غبارہ بھی نہیں اڑا سکتے۔

دلشاد خرم کیلا روڈ۔ پورب سرائے۔ مونگیر

☆کتاب نما، کے تازہ شمارے میں جمیل الدین عالی پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نہایت عالمانہ اور فکر انگیز مضمون نے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ چند لمحوں کے لیے مجھ پر ایک سحر ساطاری ہو گیا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مطالعے میں جب ذہن اس سطح اور بلندی سے اچانک دوچار ہوتا ہے جس سے وہ آشنا تو ہے مگر جو اسے نہیں ملتی تو فرط انبساط سے اس کیفیت کا نمو دغیر قدرتی نہیں

ا۔ وہ لکڑی جس کے گھسنے سے آگ پیدا ہوتی ہے۔

ہوتا۔

یہ ناچیز نارنگ صاحب کے بے پایاں علمی تبحر اور فکر و نظر کی گہرائی اور بلندی کا ہمیشہ قائل رہا ہے مگر اظہار و بیان کی جو قوت بلکہ ندرت اور جدت طرازی اس مضمون میں نظر آئی اس سے نارنگ صاحب میری نظر میں دوسرے چوٹی کے نقادوں سے کندھوں اور سر سے اوپر نکل گئے۔ اظہار کی یہ لطافت اور نیرنگی تو انگریزی ادب میں بھی کمیاب ہے۔ ان اشعار میں جزالت و شستگی اس درجہ ہے کہ بہائے لیے جاتی ہے اور پھر انسان سوچتا ہے کہ حسن و لطافت کی جو پرچھائیں سی گزر گئی، اس کی معنویات کے پیچھے تو کیے نہیں۔"

کاش جمیل الدین عالی 'انسان' جیسی طویل نظم کو ڈرامائی شکل نہ دیتے۔ آپ اس میں فکر واحساس اور غنائیت کے اوصاف نہ ڈھونڈتے! اردو میں منظوم ڈراما ایک فرسودہ روایت سے تعبیر کیا گیا ہے اگرچہ اختر الایمان جیسے شاعر بھی اس بسیار گوئی کی کمزوری سے نہ بچ سکے۔

جانے جمیل الدین عالی نے اپنے کردار معتبہ کے ذریعے یہ بات کیا کہی۔ "اپنے ہاں ایک عصمت چغتائی ان کے ہاں ایک امرتا پریتم ..... گویا ہم نے قلم کاروں کو بھی ملک اور مذہب میں بانٹ لیا۔ عصمت چغتائی صرف پاکستان کی کیسے ہو گئی۔

م۔م۔ راجندر، چتر دہار، دہلی ۹۲

جولائی ۱۹۹۸ء کا کتاب نما کا شمارہ ۱۸ جولائی ۱۹۹۸ء کو موصول ہوا۔ یہ محکمہ ڈاک کی ہڑتال کی کارفرمائی ہے۔ تعجب ہے کہ بالائی آمدنی کے باوجود انھیں عوام کو اس قدر شدید اذیت دینے کی ضرورت پیش آگئی۔

اس بار محترمہ نرگس سلطانہ کے مہمان اداریے نے خصوصیت کے ساتھ متوجہ کیا۔ اردو کے سلسلے میں ان کے جذبات قابل اعتراف ہیں۔ طبقہ اشراف کی روش یقیناً انتہائی غلط اور ناعاقبت اندیشانہ ہے۔ یہی طبقہ ہمیشہ اپنی قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ اس کے ساتھ صرف زبان ہی نہیں تہذیب و ثقافت بھی فنا ہو جاتی ہے اس لیے اس کا ماتم کرنے سے کیا فائدہ۔

پورا اداریہ پڑھنے سے یہ اندازہ ہوا کہ محترمہ نرگس سلطانہ بھی اردو کو مسلمانوں کی زبان تصور کرتی ہیں۔ پورے اداریے میں انھوں نے صرف مسلمانوں اور ان کی جماعتوں کے اردو کے سلسلے میں رویہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ ہماری تمام سیاسی جماعتوں کا اردو کے ساتھ برتاؤ ہے۔ وہ جب اپنے انتخابی منشور شائع کرتی ہیں تو اردو پر نظر کرم کا اعلان اقلیتوں کو دلائی جانے والی موعودہ مراعات کی فہرست میں کرتی ہیں اور یہ ذکر بھی خاص طور سے مسلمانوں کو دلائی جانے والی موعودہ مراعات کی فہرست میں ہوتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج تک کبھی اردو کے

"ایوارڈان" "یا" "بھی خواہ" نے اس امتیازی سلوک کے خلاف ایک کلمہ تک ادا نہ کیا۔

محترمہ نرگس بانو نے تمہیدی مثال میں ایک بنیادی غلطی کی ہے۔ وہ یہ کہ فارسی کبھی بھی اردو کی طرح عوام کی بول چال کی زبان نہیں رہی ہے۔ یہ صرف دربار سرکار تک محدود تھی۔ جب حاکم بدلے تو دربار سرکار کی زبان بھی بدل گئی۔ عوام کی زبان اشراف پر منحصر نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ قائم بالذات ہوتی ہے۔ اسے عوام ہی زندہ رکھتے ہیں یا مار دیتے ہیں۔ مثلاً جیسے سنسکرت زبان جس کا برہموں نے گلا گھونٹ دیا۔ اسے انھوں نے عوام تک پہنچنے ہی نہیں دیا اس لیے وہ تازہ ہوا نہ پاکر دم توڑ گئی۔ اردو کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اب آر ایس ایس کی موجودہ مہم یہ ہے کہ سنسکرت کو عوام تک پہنچایا جائے تاکہ یہ عوامی زبان بن سکے۔ یہ مہم بہت زوروں پر چل رہی ہے اس کے نتائج بالکل وہی ہیں جو اسرائیل میں عبرانی کو عوامی زبان بنانے کی مہم کے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت کو عوامی زبان بنانے کی مہم کا منصوبہ ہی صیہونی ہے۔ خیر، بہر حال یہ ہمارا موضوع بحث ہی نہیں ہے۔

ایک بحث محترمہ نرگس سلطانہ نے غیر ضروری چھیڑی ہے۔ تبلیغی جماعت کسی لٹریچر، زبان یا مشتہری کی قائل نہیں ہے۔ ان کے لاکھوں کے اجتماعات ہوتے ہیں لیکن آج تک کسی نے ان کے کسی پوسٹر کو کسی دیوار پر اور کسی پمفلٹ کو کسی کے ہاتھ میں نہ دیکھا ہوگا۔ کسی نے اگر تبلیغی نصاب لکھی تو اپنی مرضی سے۔ اسے مقبولیت حاصل ہوئی تو مصنف سے عقیدت کی وجہ سے! اب اسے ہندی میں منتقل کیا گیا تو مترجم کی اپنی پیش قدمی کی بنا پر! تبلیغی جماعت اس کی ذمے داری قبول نہیں کرتی۔ ایسی صورت میں اس کی ٹانگ کھینچنے کی کیا ضرورت ہے۔ جماعت اسلامی ضرور لٹریچر کو خاصی اہمیت دیتی ہے۔ اس نے صرف ہندی ہی نہیں، آسامی، بنگالی، اڑیا، تیلگو، کنڑ، ملیالم، گجراتی، مرہٹی اور دوسری بہت سی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کا ترجمہ کرلیا ہے اور تصنیفات بھی شائع کی ہیں۔ اب وہ بغیر دعوے کے جو کچھ اردو کے لیے کررہی ہے اس سے بھی آگاہ ہو جایئے۔ ادارہ اشاعت اسلام کے تین مرکزی اشاعتی ادارے ہیں جو ہندی اور انگریزی کے ہیں۔ ان کے اشاعت کے اعداد و شمار بڑے دلچسپ ہیں۔ اردو کا اشاعتی ادارہ سب سے بڑا ہے۔ یہ صرف ان تینوں میں ہی سب سے بڑا نہیں ہے بلکہ بھارت میں اردو کا سب سے بڑا اشاعتی ادارہ ہے۔ ہندی کا اشاعتی ادارہ دوسرے نمبر پر ہے لیکن اس کی اشاعتی استعداد اردو کے ادارہ کے مقابلہ میں شاید دس فی صد سے بھی کم ہے۔ انگریزی کے اشاعتی ادارے کی نوعیت بس "برائے بیت" کی سی ہے۔ جماعت اسلامی کے تعلیمی نصاب اور نظام تعلیم کے مطابق طلبہ کے لیے الگ اور

طالبات کے لیے الگ جو تعلیمی ادارے قائم ہیں ان کی تعداد ہزار سے اوپر ہے۔ ان میں (علاقائی زبانوں میں قائم ایک محدود تعداد کو چھوڑ کر) ذریعہ تعلیم اردو ہی ہے۔ وہ آبادیاں جو ارتداد سے دوبارہ اسلام کی طرف واپس آرہی ہیں ان کے لیے جو مکاتب اور مدارس قائم ہو رہے ہیں ان کا ذریعہ تعلیم بھی اردو ہی ہے۔ ہم آپ کیا کر رہے ہیں؟ لمحہ فکریہ ہے!

ان دونوں جماعتوں اور دوسری دینی جماعتوں کا مشن اردو زبان کا فروغ نہیں، دین کا فروغ ہے۔ زبان کی سرپرستی وہ اس لیے کرتی ہیں کہ اس میں ان کا بہت بڑا علمی سرمایہ محفوظ ہے۔ اس سوال کی اصل مخاطب تمام اردو اکیڈمیاں اور انجمن ترقی اردو کی تمام شاخوں کو ہونا چاہیے کہ ان کا اصل مشن ہی اردو ہے۔ ان کے بس کا کون سا روگ ہے؟

محترمہ نرگس سلطانہ کچھ تھوڑی سی قنوطی معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے وہ دور نہیں دیکھا ہے جب راتوں رات لکھنؤ کی تمام سڑکوں کے نام بدل دیے گئے، چھ مہینے کے اندر اندر تمام سرکاری اسکولوں اور کالجوں سے اردو خارج از نصاب کر دی گئی، تمام ریلوے بک اسٹالوں سے اچانک اردو رسائل و کتب غائب ہو گئیں اور ریل میں سفر کرنے والے مسافر اردو کی کتاب یا رسالہ پڑھنے سے گھبرانے لگے کیونکہ یہ ایک خاص قوم کی شناخت بن چکی تھی۔ جب صورت حال یہ ہے کہ اردو کے لیے مطالبات کیے جانے لگے ہیں، تمام سیاسی پارٹیاں اسے مسلمانوں کا حق (چہ طرفہ تماشہ است) قرار دے کر اس کے لیے بہت کچھ کرنے کے بلند بانگ دعوے کر رہی ہیں۔ (ان سب کے منہ میں گھی شکر) پہلے اردو کا کوئی اخبار اگر پانچ ہزار چھپ جایا کرتا تھا تو کثیر الاشاعت تصور کیا جاتا تھا۔ اب دس پندرہ ہزار معمولی تعداد تصور کی جاتی ہے۔ ہمارے نئی دہلی کے ایک قنوطی کرم فرمانے تاویل کی تھی کہ آبادی کا تناسب بھی تو پیش نظر رہے۔ میں نے عرض کیا، لیکن آپ کے اعلان کے مطابق تب اردو زندہ تھی، اب مر چکی ہے۔ نئی دہلی ہی کے ایک اور ذی اثر عالم دین اور مذہبی رہنما نے مجھ سے اردو میں کہا کہ اردو مر چکی ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا، اردو کی موت کا اعلان آپ اردو ہی میں کر رہے ہیں۔

مجھے یہ امر بھی خاصا دلچسپ لگتا ہے کہ ہندی کے فروغ کے لیے اردو کی مخالفت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ آخر کیوں؟ میں ایک بار پھر عرض کروں گا کہ اردو قائم بالذات ہے۔ اسے کسی زبان سے کوئی خطرہ نہیں ہے، اسی لیے اسے ہندی سے بھی کوئی کد نہیں ہے۔ ہندی والوں کو اردو سے ڈرنا چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ بڑی بے ضرر اور سخت جان زبان ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ جس دن اردو کی مخالفت کی مہم کمزور پڑے گی اسی دن سے اردو پھر توانا ہو کر تیز رفتاری سے پیش قدمی کرے گی۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ جب تک وہ

مرحلہ آئے اردو کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش کیجیے۔

سخن گستری سہی، لیکن میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اردو ہمارے گھروں سے ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ ہماری نئی نسل کو غلط فہمی میں مبتلا کردیا گیا ہے۔ میں جب ایسے خاندانوں کے ربط میں آتا ہوں جن کے بچوں کے بارے میں مجھے بتایا جاتا ہے کہ یہ اردو نہیں جانتے تو میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ یہ اردو سنتے ہیں، سمجھتے ہیں، بولتے ہیں، لیکن لکھتے نہیں۔ انھیں لکھنا سکھا دیجیے۔ ان کی یہ کمی پوری ہو جائے گی۔ اس انداز سے میں نے کم از کم سو خاندانوں کو دوبارہ اردو داں بنایا ہے۔ اپنی عمر وصحت کی معذوری کے باوجود میں یہ مہم جاری رکھے ہوئے ہوں۔

موضوعات گفتگو اور بھی ہیں لیکن آیندہ پھر کسی اور مہمان اداریے کے موقع پر!

ابن فرید، رامپور

☆کتاب نما کا تازہ شمارہ ملا۔ نرگس سلطانہ کا اداریہ پسند آیا۔ گو کہ باتیں تلخ ہیں لیکن حقیقت پر مبنی ہیں۔ کاش کہ اردو والے اس اداریے کو سنجیدگی سے پڑھیں اور اس پر عمل کریں۔ اس اداریے کے لیے نرگس سلطانہ کو مبارکباد۔

نامی انصاری پر مجتبیٰ حسین صاحب نے بہت ہی خوبصورتی سے خاکہ لکھا ہے۔ ساری باتیں واضح ہو گئی ہیں۔

ناصر محمود شبلی، گورنمنٹ کالج دوراجلنگ۔

ادبی تہذیبی خبریں

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی غالب انعامات سب کمیٹی نے اردو کے دس اہم اور مقتدر اہل قلم غالب انعامات برائے ۹۷-۱۹۹۶ء اور ۹۸-۱۹۹۷ء منتخب کیا ہے، جن کے اسمائے گرامی اور انعامات کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

۹۷-۱۹۹۶ء

۱۔ فخرالدین علی احمد انعام برائے تحقید و تحقیق۔ ڈاکٹر خلیق انجم

۲۔ غالب انعام برائے اردو نثر پروفیسر شکیل الرحمن

۳۔ غالب انعام برائے اردو شاعری جناب وامق جونپوری

۴۔ ہم سب غالب انعام برائے اردو ڈرامہ پروفیسر زاہد زیدی

۵۔ ہلس غالب انعام برائے مجموعی ادبی خدمات ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

۹۸-۱۹۹۷ء

۱۔ فخرالدین غالب انعام برائے تحقید و تحقیق پروفیسر مظفر حنفی

۲۔ غالب انعام برائے اردو نثر پروفیسر محمود الہی

۳۔ غالب انعام برائے اردو شاعری جناب مظہر امام

۴۔ ہم سب غالب انعام برائے اردو ڈرامہ جناب اے۔ آر۔ کاردار

۵۔ ہلس غالب انعام برائے مجموعی ادبی خدمات ڈاکٹر شیام لال کالڑا (عابد پشاوری)

یہ انعامات مبلغ ۲۵ ہزار روپے نقد، ایک تمغہ اور سند پر مشتمل ہے۔ یہ تمام انعامات بین اقوامی غالب سیمنار کے افتتاحی اجلاس میں ۱۱ر دسمبر ۱۹۹۸ء کو تقسیم کیے جائیں گے۔

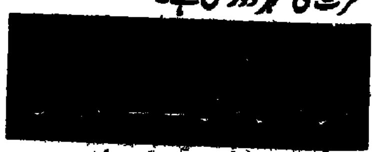
مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادیمی نے صحافت کا پہلا انعام ہفتہ وار "فوزان" کے مدیر سلمان ماہی صاحب کو دینے کا اعلان کیا ہے۔ صحافت کے اس ایوارڈ کو معروف صحافی ڈاکٹر ذ انصاری (مرحوم) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔

ریاست کے وزیر ثقافتی امور اور صدر اردو اکادیمی شری پور مو د نولکر جو خود بھی ایک صحافی ہیں منتر الیہ میں طلب کی گئی پریس کانفرنس میں ۹۷-۱۹۹۶ء سال کے مختلف انعامات کا اعلان کیا اس موقع پر اردو اکیڈمی کے نائب صدر اور ریاستی وزیر انیل دیشکھ، اکادیمی کے ممبر مشتاق انتولے اور ممبر سکریٹری ڈاکٹر یامین اختر فاروقی موجود تھے۔

سلمان ماہی صاحب کی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۶۰ء میں روزنامہ انقلاب کے نامہ نگار کی حیثیت سے ہوا، بعد میں روزنامہ اردو ٹائمز اور روزنامہ قومی آواز میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا ۱۹۸۲ء میں قومی آواز کے بند ہونے پر یکم مئی ۸۳ء کو فوزان جاری کیا۔ جو اس وقت اپنی صحافتی زندگی کے پندرہ سال مکمل کر کے ۱۶ویں سال میں قدم رکھ چکا ہے۔ فوزان میں بارہ سال کے دوران لکھے گئے منتخب "اداریوں" کا مجموعہ "سمت سفر" کے نام سے مئی ۹۵ء میں شائع ہوا ہے۔

ہماری زبان دہلی) کتاب نما (دہلی) ایوان اردو (دہلی) اخبار صداقت (پونے) اخبار عالم (ممبئی) اور نقش کوکن (ممبئی) جیسے موقر جرائد میں تبصرے شائع ہوئے ہیں جس میں اداریوں کو سراہا گیا ہے۔ ست سفر میں جناب م افضل (مدیر اخبار نو۔ اور صدر آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس) ہارون رشید علیگ (مدیر روزنامہ انقلاب، سابق صدر مہاراشٹر اردو اکادمی) ڈاکٹر یونس اگاسکر (انچارج شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی) رضوان احمد (مدیر عظیم آباد ایکسپریس)(پٹنہ) اور یوسف ناظم (جنرل سیکریٹری انجمن ترقی اردو مہاراشٹر ا) جیسے نامور صحافیوں اور ادیبوں کے مضامین اور تاثرات شامل ہیں۔

سلمان ماہی صاحب کو صحافتی خدمات کے پیش نظر تھانے میئر، پتر کار سنگھ، لائنس کلب اور دیگر اداروں کی جانب سے ایوارڈ اور توصیفی سرٹیفکٹ دیئے جاچکے ہیں اردو اکادمی کی جانب سے صحافت کا پہلا ایوارڈ حاصل ہونے پر قارئین فوزان کے مداحوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ہے۔



کویت میں کوکن لٹریری سرکل جو ایک طویل عرصہ سے خالص ادبی ثقافتی تنظیم ہے۔

کے زیر اہتمام برسوں سے مختلف پروگراموں کا انعقاد کیا جاتا رہا ہے جن میں اختر الایمان اور رام لعل کی یاد میں منعقدہ یادگار شاموں کے علاوہ افریقہ سے آئے عبداللہ ساجد کے برادر نسبتی عبدالرزاق پرکار کی لیے منعقدہ مشاعرہ کا ذکر بزبان خاص وعام ہے۔ گزشتہ ہفتہ انور قادری کی رہائش گاہ پر خصوصی اجلاس میں کوکن لٹریری سرکل کے نئے عہدیداران کا تقرر عمل میں آیا جن میں کویت میں کوکنی برادری کے سربراہ سوشل ورکر اور معروف تاجر محمد صالح برودکا سرپرست اعلا کی حیثیت سے اور کویت میں مقیم اردو کے معروف ادیب وشاعر اور مراٹھی کے پہلے مترجم نور پر کار کو سرپرست کی حیثیت سے منتخب کیا گیا جنھیں ادبی وعلمی پروگراموں کے انعقاد کی ذمہ داری سونپی گئی اسی طرح کویت میں مقیم اردو کے مستند معروف شاعر عبداللہ ساجد کو سرکل کے صدر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا جبکہ ابھرتے فنکار انور قادری کو بحیثیت جنرل سکریٹری چنا گیا۔ اسی طرح دیگر ممبران میں مشہور ڈراما نگار عارف قاضی، نعیم چوگلے، سمیر کاپڑی، خلیل مقادم، مسز متین صدیقی اور مسز نفیسہ کاپڑی کا تقرر عمل میں آیا۔ کوکن لٹریری سرکل کا اکتوبر کے پہلے عشرہ میں ادبی اور کلچرل پروگرام منعقد کیا جائے گا۔

انور قادری جنرل سکریٹری۔ کوکن لٹریری سرکل، کویت

[redacted]

غالب اکیڈمی ہر مہینے کے دوسرے سنیچر کو ایک ماہانہ ادبی میٹنگ کا اہتمام کرتی ہے۔ ۱۲ر ستمبر کو اس سلسلے کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں سکندر عاقل، وجدی برہانی، متین امروہوی، انیس احمد انیس، محمد ظہیر برنی، ڈاکٹر رنجنا اگروال اور ترنم ریاض نے اپنا کلام پیش کیا۔ اسلم جمشید پوری نے "تاکا قیدی"، ذکیہ ظفر نے "درد کا رشتہ" ترنم ریاض نے "مٹی" کے عنوان سے افسانہ پیش کیا۔ میٹنگ کی صدارت جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر نصیر احمد خاں نے فرمائی۔

[redacted]

نوئڈا گزشتہ دنوں مشہور ادیب و دانشور پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نوئڈا تشریف لائے جن کا استقبال کرتے ہوئے اردو فاؤنڈیشن کے روح رواں جناب رفعت سروش نے کہا کہ ملک زادہ منظور احمد اگرچہ محقق ہیں، پروفیسر ہیں، شاعر ہیں مگر ان کی شہرت ملکی اور عالمی مشاعروں میں ان کی نظامت کے باعث ہے جو بجائے خود ایک فن ہے۔ ان کی نظامت مشاعر کے 'ایڈیٹوریل' کا درجہ رکھتی ہے۔ اس حوالے سے وہ اردو کی عالمی مقبولیت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ جلسے کی صدارت فرماتے ہوئے ملک زادہ صاحب نے ان گراں قدر خیالات کا اظہار کیا کہ اردو کا کردار آفاقی ہے۔ وہ کسی ایک ملک یا براعظم میں محدود نہیں۔ اس مقبولیت میں مشاعروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ مشہور افسانہ نگار ناصرہ شرما کی کہانی کالا سورج، پر اپنے خیالات کا اظہار فرما رہے تھے جو تنقیدی پروگرام میں پڑھی گئی تھی۔ اس کہانی کے بارے میں رفعت سروش نے کہا کہ کالا سورج، براعظم افریقہ کے سیاہ فام اور غریب لوگوں کی زندگی کو پیش کرتی ہے اور رجائیت اس کہانی کی روح ہے۔ ناصرہ شرما کے فن پر ترقی پسند تحریک کی چھاپ ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک نے ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اس کہانی پر بحث میں ولا بخش اسیر ابوالفیض سحر اور ڈاکٹر رضیہ حامد نے حصہ لیا۔

اردو ہندی کے ادیبوں کے اس جلسے میں مقامی اور بیرون شعراء اور کویوں کی خاصی تعداد تھی۔ گلزار دہلوی، ابوالفیض سحر، بی۔ پی سریواستو رند، طفیل چترویدی، ملک زادہ منظور احمد نے اپنا اپنا کلام سنایا۔

[redacted]

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی مشاورتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں جو سفارشات عزت مآب چیرمین، اردو اکادمی کو پیش کی تھیں

عزت مآب چیر مین صاحب نے اردو اکادمی کے اختیار کی حدود والی تقریباً سبھی سفارشوں کو جوں کا توں مان لیا ہے۔

(۱) مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ہائی اسکول، ہائر سیکنڈری اسکول، بی اے فائنل اور ایم اے فائنل اردو کا امتحان پاس کرنے والے طلبہ میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والوں کو ہر سال گولڈ میڈل دیا کرے گی۔

(۲) اس طرح پانچویں بورڈ اور آٹھویں بورڈ کے امتحانات میں سب سے زیادہ اردو میں نمبرات پانے والے طلبہ کو سلور میڈل دیے جائیں گے۔

(۳) اس طرح اکادمی نے فیصلہ بھی کیا ہے کہ غیر اردو داں حضرات کو اردو سکھانے یا تعلیم بالغاں کے لیے شبینہ کلاسیز کا انتظام کیا جائے گا اور کامیاب طلبہ کو سارٹیفکٹ دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ موسم گرما تعطیلات میں اردو کوچنگ کلاسیز کا اہتمام کیا جائے گا۔

(۴) اکادمی نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ طلبہ کی صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لیے مختلف موضوعات مثلاً خوشخطی، مضمون نگاری، نظم خوانی، نثر خوانی، لطیفہ گوئی، بیت بازی اور تحریری و تقریری مقابلوں کا انعقاد کیا جائے گا اور کامیاب طلبہ کو انعامات دیے جائیں گے۔

(۵) بھوپال میں قائم ہونے والے حکیم ضیاء الحسن طبیہ کالج یا اس طرح کے دوسرے اداروں جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہوگی اور جو طلبہ اس میں داخلہ لیں گے ان کی خواہش پر اور اگر ایک معقول تعداد طلبہ کی چاہے گی تو ان کے لیے فوری طور پر ایک مختصر مدتی تربیتی کورس کا بھی انتظام کیا جائے گا۔

(۶) اکادمی نے یہ بھی طے کیا ہے کہ اردو طلبہ اساتذہ اور دوسرے تعلیمی مسائل جاننے اور ان کا حل تلاش کرنے کے لیے مدھیہ پردیش کے ہر اہم ضلع میں جہاں اردو بولنے والوں کی معقول تعداد ہو اردو اساتذہ کانفرنس بلائی جائے گی۔

(۷) اکادمی نے یہ بھی فیصلہ لے لیا ہے کہ ایک معیاری ادبی رسالے کا جتنی بھی جلد ممکن ہوسکے اجراء کیا جائے جس میں بچوں کے لیے بھی صفحات مخصوص ہوں اسکے ساتھ خبر نامہ کی اشاعت بھی پابندی کے ساتھ کی جائے۔

(۸) اکادمی نے ایک جدید آفسیٹ پریس قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے اور اس سلسلے میں حکومت سے مالی تعاون کی کوشش کی جاری ہے۔

(۹) اکادمی نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ جن نامور ادیبوں کی کتابیں ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہیں انھیں اولیت دی جائے اور اکادمی انھیں شائع کرے۔

(۱۰) یہ بھی طے کیا ہے کہ نامور مصنفین کو ادبی خدمات کے اعتراف میں ان پر تہنیتی کتابیں شائع کی جائیں۔

(۱۱) اکادمی نے یہ بھی طے کیا ہے کہ اکادمی کی تقاریب میں دوسری زبانوں کے چوٹی کے قلمکاروں کو مدعو کیا جائے۔

(۱۲) اکادمی کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ اردو کی اہم اور کامیاب کتب کی دوبارہ اشاعت کا انتظام کیا جائے۔

(۱۳) اکادمی نے یہ بھی طے کیا ہے کہ اردو اکادمی کی عمارت میں غیر اردو داں حضرات کو اردو سکھانے کا انتظام کیا جائے۔

یہ ساری سفارشات چیر مین، اردو اکادمی کو تشکیل "مشاورتی کمیٹی" نے اپنی رپورٹ میں عزت مآب چیر مین کو پیش کی تھیں۔ جنھوں نے اردو اکادمی کے اختیار کی حدود والی لگ بھگ ساری سفارشوں کو جوں کا توں مان لیا ہے۔

ایم وقیع احمد سکریٹری، مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی، بھوپال

اُپکار سالانہ مشاعرہ

کویت میں ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے معروف ہندستانی تنظیم "اُپکار" کے زیر اہتمام ہندستانی سفارت خانے کے خوبصورت آڈیٹوریم میں آزادی کی اکیاونویں سالگرہ کی مناسبت سے ۲۱ ستمبر ۹۸ء کو ایک شاندار معیاری مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت ڈوگری کے معروف شاعر ڈاکٹر اروند رینا نے کی۔ مہمان خصوصی ہندستانی سفارت کار جناب مکھیجا نے اپنے خطاب میں اس قسم کی محفلوں کے انعقاد کی ضرورت پر زور دیا اور یکجہتی کی فضا قائم کرنے کی سعی پر اُپکار کی کاوشوں کو سراہا۔ گیسٹ آف آنرس محمد حوشدار خان جو سماجی اور اصلاحی کاموں میں پیش پیش ہیں، نے مشاعرہ کی افادیت پر روشنی ڈالی اور قلم اور قلمکار کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے مکمل تعاون کا وعدہ کیا۔ اُپکار کے صدر جے، کے، اگروال نے مہمانوں کا استقبال کیا نائب صدر سید منظر عالم منظر نے اردو کے مستند قلمکاروں کی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ قلم کی قوت سب سے بڑی قوت ہے۔ اس کے بعد انھوں نے نظامت کے لیے کویت میں مقیم اردو کے معروف شاعر وادیب نور پرکار کو دعوت دی جنھوں نے مشاعرہ کی کامیابی میں چار چاند لگائے۔ شاعروں کا بھرپور تعارف، صوتی آہنگ، الفاظ کی روانی و نشست وبرخاست اور شعری حوالوں سے ادبی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے گاہے بہ گاہے مشاعرے کو آگے بڑھانے کے لیے وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی ان کاوشوں کی داد نہ دینا یقیناً ناانصافی کی بات ہوگی۔ مشاعرہ کے صدر ڈاکٹر اروند رینا نے اس خوبصورت تقریب

کے انعقاد پر اکبار کے صدر اور نائب صدر کے علاوہ رمیش چندر، پنچ اور شعراء حضرات کو مبارک باد پیش کی۔ سبھی شعراء نے اپنے تازہ کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے میں ہر مکتبہ ٔ فکر کے لوگ موجود تھے۔ فکر انگیز کلام اور باذوق سامعین کی کثیر تعداد نے ونیز نظم وضبط نے اسے ایک یادگار مشاعرہ کا روپ دے دیا۔ نائب صدر سید منظر عالم منظر نے شکریہ ادا کرتے ہوئے حاضرین کو ڈنر کے لیے مدعو کیا۔ جن شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا ان میں جوہر چھوٹی، نور پرکار، ایوب قاسم کرجیکر، سید روشن، مسز وجے ورما، مسز ریتا سبروال، مسز اندرا شرما، نظر اکبر بریلوی، سید نظر کڑپوی، حسین عالم رضوی، ابو شاہد، ظہیر راشد، سید قمر منو، اومیش شرما، چتی فرید آبادی اور برج موہن کے نام قابل ذکر ہیں۔



ممبئی۔ وزیر ثقافتی امور اور صدر مہاراشٹر اردو اکادمی شری پرمود نولکر نے ۹۷ اور ۹۸ء کے تمام انعامات کا اعلان کرتے ہوئے انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس سال سے مثالی مدرس کا ایوارڈ جاری کیا گیا ہے۔ اس ایوارڈ کو سر سید احمد خاں ایوارڈ کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اکادمی کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے مفید تجاویز پر عمل ضرور کیا جائے گا۔ البتہ کمیٹی کو تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔ پرمود نولکر نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ اردو اکادمی کے تعلق سے اردو والوں میں اتنے اختلافات ہیں جو کسی اور اکادمی میں نظر نہیں آتے۔

اعلانات کی تفصیل درج ذیل ہے:

۹۷-۹۶ء کے انعام یافتہ کا نام ہے ان کو ۹۸-۹۷ کا نام دیا گیا ہے۔

(۱) سنت گیا نیشور ایوارڈ کیفی اعظمی پچاس ہزار روپے

(۲) ولی دکنی ایوارڈ۔ ڈاکٹر نعیم الدین۔ گوپی چند نارنگ (تیس ہزار روپے)

(۳) سراج اورنگ آبادی ایوارڈ۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل، ڈاکٹر منشاالرحمٰن خان منشا (۲۵ ہزار روپے)

(۴) ستھو مادھو راو پگڑی ایوارڈ۔ ڈاکٹر اسعد اللہ، انجم عباسی (۱۵ ہزار روپے)

(۵) ساحر لدھیانوی ایوارڈ۔ اقبال نیازی۔ فاروق سید (۵ ہزار روپے)

(۶) ظ انصاری ایوارڈ برائے صحافت۔ پہلا انعام۔ سلمان ماہی (مدیر فوزان) م ناگ (۵ ہزار روپے)

دوسرا انعام۔ شریمتی ریحانہ بستی والا۔ ضمیر قادری (اورنگ آباد) ۴ ہزار روپے

تیسرا انعام۔ عثمان خان ملک بزمی (۳ ہزار روپے)

(۷) خوش نویسی: پہلا انعام جمیل شاہ نوری۔ خلیق الاسعدی (۵ ہزار روپے)
خوش نویسی: دوسرا انعام فروز حسن۔ سید ابو ستار (۴ ہزار روپے)
خوش نویسی: تیسرا انعام۔ جمیل ہاشم۔ شیخ اعجاز (۳ ہزار روپے)
(۸) طغرا نویسی۔ پہلا انعام غیاث الدین (انقلاب) سلام وفا (ناگپور) محمد محفوظ (۴ ہزار روپے)
(۹) لے آوٹ ڈیزائن۔ محمد ضمیر راجوری اور آصف سبحانی (مالیگاؤں) (۴ ہزار روپے)
(۱۰) مثالی مدرس کا ایوارڈ (فی کس ۵ ہزار روپے)
(۱) شیخ قمر الدین (جامیز) (۲) شریمتی رشیدہ تاج الدین قاضی (ممبئی) (۳) ہارون خان (وردھا) (۴) عظیم خان (ناگپور) (۵) عزیزہ شیخ

•

(۱) شمیم طارق۔ (اشرف محنت و کفالت) غلام رسول ساجد (اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ) ۷ ہزار روپے
(۲) انور ظہیر خان (مت سہل ہمیں جانو) انصاری محمد مصطفیٰ (شرعی وزن اور پیمانے (۵ ہزار روپے)
(۳) ڈاکٹر اعجاز مدنی (اردو غزل میں تصوف۔ محسن علی (علم سیاسیات) (۴ ہزار روپے) اور سلیم شہزاد (متن و معنی کا تجزیہ) ۴ ہزار روپے
(۴) شریمتی فاطمہ قمر (یوگا ہزار نعمت ہے)
شریمتی بانو سرتاج (جنگل میں منگل) (سات ہزار روپے)
(۵) حیدر بیابانی (ننھی منی باتیں) سات ہزار روپے
(۶) ڈاکٹر وحید خان (اسلام اور منشیات) انور احمد خان (انوارات اقبال) ۵ ہزار روپے
(۷) میر رحمٰن (فن کی قیمت) عبدالعزیز عرفان (ہمارے نبیؐ) (۴ ہزار روپے)
(۸) ڈاکٹر داؤد کاشمیری (بس) خیر النساء مہدی (مجھے بھی کچھ کہنا ہے) ۷ ہزار روپے
(۹) عبدالرحیم نشتر (کوکن میں اردو) ۵ ہزار روپے (۱۰) محسن مالیگانوی (شاعر اعظم) ۴ ہزار روپے۔
(۱۱) عظیم راہی (اگلی صدی کی موڑ پر) مقصود اظہر (کشتن) سات ہزار روپے
(۱۲) طفیل سیمابی (نیم کے پتے) رشید انور (روپے کا پیڑ) ۵ ہزار روپے
(۱۳) شریمتی عیلاگ گل (دیکھ سکھ اپنے) (۴ ہزار روپے)
(۱۴) ندا فاضلی (کھویا ہوا سا کچھ) قیصر الجعفری (چراغ حرا) سات ہزار روپے
(۱۵) فیاض رفعت (بیتی رتوں کا منظر نامہ) ظفر گھور کھپوری (آر یا پار کا منظر) ۵ ہزار روپے
(۱۶) بشیر احمد شکیب بنارسی (پتہ پتہ بوٹا بوٹا) سید یونس (انصاف) ۴ ہزار روپے

[redacted]

وادی کشمیر کے سرکردہ شاعر، کہنہ مشق ادیب اور قلم کار جناب سید اکبر جے پوری صاحب کا ۱۸ر مارچ ۱۹۹۸ء کو انتقال ہو گیا۔ اکبر جے پوری ۲۳ر اکتوبر ۱۹۲۸ کو جے پور میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ابھی اکبر صاحب مہاراجہ کالج جے پور میں بی۔اے کے درجہ سوم میں زیر تعلیم تھے کہ بعض ناساعد حالات کے سبب ان کے والد ماجد جناب آغا سید علی عابدی صاحب کو اپنے آبائی وطن کشمیر آنا پڑا۔ کشمیر میں آکر صاحب درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے اور "گورنمنٹ اورینٹل کالج سری نگر" کے پرنسپل کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ اکبر جے پوری نے اردو زبان کی تعلیم و تدریس کے علاوہ وادی کشمیر میں اس کی ترویج و ترقی کے لیے اہم خدمات انجام دی ہیں۔

[redacted]

ناگپور۔ اردو حلقے میں یہ خبر انتہائی افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ناگپور کی مشہور و معروف شخصیت "حنیف بکڈپو مومن پورہ" ناگپور کے مالک و بانی حاجی محمد حنیف صاحب کی اہلیہ محترمہ حجن صالحہ بی بروز جمعرات ساڑھے گیارہ بجے دن بتاریخ ۳ ستمبر ۱۹۹۸ء کو انتقال فرما گئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

مرحومہ بہت نیک خاتون تھیں۔ ۲ ستمبر کی شب میں انھیں بے چینی محسوس ہوئی اور ساری رات وہ سو نہ سکیں۔ ۳ ستمبر کی صبح اچانک طبیعت بگڑ گئی اور اسپتال لے جاتے ہوئے راستے میں ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ اُسی شب بعد نماز عشا انھیں مسلم قبرستان مومن پورہ ناگپور میں سپرد خاک کیا گیا۔ جنازے میں سیکڑوں افراد شریک تھے۔ مرحومہ اپنے پیچھے ایک بھرا پرا خاندان چھوڑ گئی ہیں۔

[redacted]

تاخیر سے موصولہ اطلاع کے مطابق سہارنپور کے مشہور ترقی پسند شاعر حسین نواز کا (۷ ستمبر کو) تقریباً ۵۵ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ پسماندگان میں ان کی بیوہ کے علاوہ دو بیٹے ہیں۔ حسین نواز ضلع سہارنپور میں ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے اور دہرہ دون کے ایک کالج میں انگریزی کے لکچرر تھے۔ کلاسیکی اردو اور انگریزی ادب کے علاوہ جدیدیت پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

[redacted]

ہر سال اردو کے ایک صحافی کے لیے ایک لاکھ روپے کے انعام کا بھی اعلان

ممبئی، ستمبر جمعہ ساڑھے سات بجے اکبر پیر بھائی ہال، وی ٹی پر ممتاز اردو صحافی جناب خلش جعفری کو خراج عقیدت پیش کرنے

کے لیے آل انڈیا مسلم فیڈریشن، انجمن اسلام
اور اردو جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام
تعزیتی نشست کا اہتمام ہوا۔ اس تعزیتی
نشست کی صدارت ادارہ انجمن اسلام کے
چیئرمین ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا نے کی۔ ڈاکٹر
اسحاق جمخانہ والا نے خلش جعفری سے اپنے
دوستانہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ
جیسے ہی انھیں جعفری صاحب کی علالت کی
خبر ملی وہ بھوپال پہنچے لیکن ان سے بات نہ
ہو سکی کیونکہ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں
تھے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ انجمن اسلام نے
جرنلزم کورس کی منظوری کے لیے حکومت
سے اجازت طلب کی ہے۔ اگر ہمیں اجازت
دی جاتی ہے تو انجمن اسلام سے خلش جعفری
انسٹی ٹیوٹ آف جرنلزم (اردو) کے نام سے
شروع کرے گا۔ سینئر صحافی شہریار عابدی نے
اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ خلش
جعفری جس وقت ممبئی کی صحافت میں داخل
ہوئے اس وقت اردو صحافت پروفیشنل نہیں
تھی۔ انھوں نے اردو صحافت کو پروفیشنل
بنانے کے لیے تگ و دو کی۔ انھوں نے کبھی
اپنے قلم اور شخصیت کو آلودہ ہونے نہیں دیا۔
خلیل زاہد نے خراج عقیدت پیش
کرتے ہوئے کہا کہ خلش جعفری کی موت
سے اردو صحافت یتیم ہو گیا ہے۔ علی ایم شمسی
نے کہا مرحوم خلش جعفری کے یہاں محرومیاں
آئیں مگر ان کی عظمت اور بلندی کو کبھی
شرمسار نہیں ہونے دیا۔
مولانا ظہیر عباس نے کہا کہ خلش
صاحب نے ناساعد حالات میں بھی اپنے
ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ وہ اردو صحافتی تہذیب
کے جیتے جاگتے نمونے تھے۔ سرفراز آرزو نے
کہا کہ مرحوم خلش جعفری کی تحریریں Pro
Establishment تھیں اس لیے میں ذہنی
طور پر ان سے ہم آہنگ نہیں ہوتا تھا۔ اس
تقریب میں اعلان کیا گیا کہ روزنامہ انقلاب
کے مالک عبدالحمید انصاری کی یاد میں ایک
ایوارڈ عبدالحمید میموریل ایوارڈ خلش جعفری
کے وصال کے دن اردو صحافت میں بہترین
خدمات کے اعتراف میں کسی ایک صحافی کو دیا
جائے گا جو ایک لاکھ کی رقم پر مشتمل ہوگا۔

مطبوعات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک نظر میں

ادب، تنقید، انشاء

پانچ جدید شاعر — حمید نسیم — 210/-

قاری سے مکالمہ — شمیم حنفی — 150/-

اعلیٰ تعلیم — خطبات ڈاکٹر ذاکر حسین — 120/-

اردو زبان ادب کے فروغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ
مرتبہ پروفیسر صغرا مہدی — 75/

فراق دیار شب کا مسافر — مرتبہ پروفیسر شمیم حنفی — 150/-

بیاں اور — اختر سعید خاں — 144/-

لفظوں کی انجمن میں — ڈاکٹر سید حامد حسین — 120/-

تعبیر و تفہیم — ڈاکٹر خلیق انجم — 135/-

معاصرین و متعلقات مولانا ابوالکلام آزاد
عبدالقوی دسنوی — 60/-

سرسید سے اکبر تک — مرتبہ شمیم حنفی — 90/-

سیاہ فام ادب — مرتبہ شمیم حنفی — 40/

خامہ بگوش کے قلم سے — مرتبہ مظفر علی سید — 80/
مجلد 150/-

الجھیں (نفسیاتی مضامین) — عبداللہ ولی بخش قادری — 60/-

جو رہی سو بے خبری رہی خود نوشت — ادا جعفری — 200/-

قلم اور قدم — سید حامد — 75/-

مستقبل کی طرف
(خطبات جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ اسلامیہ) 150/-
مرتبہ خواجہ محمد شاہد، خالد کمال فاروقی

مولانا ابوالکلام آزاد — فکر و نظر کی چند جہتیں
پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — 60/-

جدید ادبی تحریکات — ڈاکٹر سید حامد حسین — 51/-

[illegible] — فضیل جعفری — 90/-

فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ — ڈاکٹر مومن محی الدین — 45/-

[illegible] تاریخ، تحریک — انجم عثمانی — 90/-

انشائے غالب — مرتبہ رشید حسن خاں — 60/-

اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ — ابراہیم یوسف — 45/-

تاریخ نگاری قدیم و جدید رجحانات — ڈاکٹر سید جمال الدین — 51/-

اردو غزل کیا ہے — شمس الرحمٰن فاروقی — 75/-

دستک اس دروازے پر — ڈاکٹر وزیر آغا — 51/-

سرسید یادگاری خطبات — مونس رضا، مسعود حسین خاں — 10/-

تفہیم — رشید حسن خان — 75/-

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں — عبدالقوی دسنوی — 75/-

کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے — تقی حسین جعفری — 51/-

شناس و شناخت — انور صدیقی — 60/-

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج — ڈاکٹر سید ظہور قاسم — 10/-

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم — اختر الواسع — 10/-

آزمائش کی گھڑی — سید حامد — (زیر طبع)

[illegible] — مالک رام — 75/-

جام جہاں نما — گربچن چندن — 75/-

اردو ناول میں عورت کا تصور — فہمیدہ کبیر — 45/

اسرار خودی (فراموش شدہ ایڈیشن) — شایستہ خان — 75/-

جائزے کی تنقید — صدیق الرحمٰن قدوائی — 51/-

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے — طاہر مسعود — 66/-

تحریریں — ڈاکٹر اسلم پرویز — 51/-

انشائیہ کے خدوخال — وزیر آغا — 35/-

افکار اقبال — عبدالسلام خان — 125/-

تذکرہ ماہ و سال — مالک رام — 125/-

تحقیق نامہ — مشفق خواجہ — 125/-

سحر کے پہلے اور بعد — سعید اظفر چغتائی — 51/-

پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور — 51/-

اقبال کا نظریہ خودی — عبدالمغنی — 150/-

قلندر بخش جرأت — جمیل جالبی — 10/-

جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث علوی — 38/-

[illegible]	[illegible]	27/-	[illegible]	[illegible]	21/-
جدید اردو ادبی سفر	[illegible]	33/-	مشاہیر کے خطوط	مرتبہ [illegible]	12/50
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	60/-	حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	7/50
مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں	مالک رام	51/-	مسالک و دلائل	ضیاء احمد بدایونی	22/-
لسان الصدق	مولانا ابوالکلام آزاد	75/-	[illegible]	مرتبہ مالک رام	4/50
اردو میں کلاسیکی تنقید	پروفیسر حنیف چشتی	48/-	افکار شاعر	پروفیسر محمد مجیب	16/-
تفہیم و تنقید	پروفیسر حامدی کاشمیری	48/-	کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	24/-
[illegible]	مرتبہ مالک رام	101/-	ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	5/50
تحقیقی مضامین	مالک رام	80/-	جدید ترکی ادب کے ارکان خمسہ	ضیاء الحسن فاروقی	4/-
خسرو نامہ	مجیب رضوی	21/-	نظر اور نظریے	آل احمد سرور	
[illegible]	مرتبہ شمس الرحمٰن فاروقی	75/-	مسرت سے بصیرت تک	آل احمد سرور	75/-
جائزے	مرتبہ مظفر حنفی	45/-	تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	27/-
نقد بجنوری	صدیقہ بیگم	25/-	باتیں کچھ سریلی سی	داؤد رہبر	36/-
ادبی سماجیات	ڈاکٹر محمد حسن	15/-	[illegible]	مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی	30/-
[illegible] کا عروج	غلام ربانی	24/-	روح تہذیب	خواجہ غلام السیدین	6/-
تقریر و تعبیر	محمد ہدایت اللہ	15/-	نئی شعری روایت	پروفیسر شمیم حنفی	(زیر طبع)
اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	(زیر طبع)	دراسات	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	15/-
افسانے کی حمایت میں	شمس الرحمٰن فاروقی	(زیر طبع)	داستانِ آتش	شاہ عبدالسلام	21/-
[illegible]	انتظار حسین	30/-	**تعلیم**		
تذکرہ معاصرین جلد دوم	مرتبہ مالک رام	14/-	ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم	ڈاکٹر سلامت اللہ	51/-
تذکرہ معاصرین جلد سوم	مرتبہ مالک رام	22/-	ڈسپلن کی تعلیم و تربیت	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	90/-
تذکرہ معاصرین جلد چہارم	مرتبہ مالک رام	40/-	انجمنیں	عبداللہ ولی بخش قادری	60/-
لغت نویسی کے مسائل	مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ	35/-	مفکرین تعلیم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	120/-
معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	30/-	استادوں کی تعلیم و تربیت	مسعود الحق	60/-
اردو کی تہذیبی حیثیت	پروفیسر علی محمد خسرو	6/-	تعلیم و تعلم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	75/-
تحلیل نفسی کے [illegible]	ڈاکٹر سلامت اللہ	35/-	مسلمانوں کا تعلیمی نظام	ضیاء الحسن فاروقی	45/-
اثبات و نفی	شمس الرحمٰن فاروقی	40/-	مشقی تدریس کیوں اور کیسے	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	45/-
نقد حرف	پروفیسر ممتاز حسین	48/-	معاشیات کے اصول	[illegible]	21/-
اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغرا مہدی	(زیر طبع)	آسان اردو ورک بک	شکیل اختر فاروقی	24/-
انشائیات	ڈاکٹر عابد حسین	(زیر طبع)	تعلیم و تربیت اور والدین	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	51/-
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	12/-	تعلیم اور رہنمائی	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	35/-
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	12/-	ہم اردو کیسے پڑھائیں	معین الدین	54/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	11/-	ہم کیسے پڑھائیں	ڈاکٹر سلامت اللہ	33/-

تعلیمی خطبات	[illegible]	[illegible]
سرسید کی تعلیمی تحریک	اختر الواسع	60/-
تعلیم اور اس کے وسائل	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	30/-
آسان اردو (ہندی کے ذریعے)	شکیل اختر فاروقی	12/-
تعلیم، نظریہ اور عمل	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	36/-
تعلیم فلسفہ اور سماج	ڈاکٹر سلامت اللہ	60/-
بنیادی استاد کے لیے	ڈاکٹر سلامت اللہ	12/-
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	12/-
عبارت کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	18/-
انشا اور تلفظ	رشید حسن خاں	12/-
تاریخ کیسے پڑھائیں	مسرور ہاشمی	36/-
بچوں کا آرٹ	عبد الحق	24/-

تذکرہ، سوانح، شخصیتیں

جو رہی سو بے خبری رہی (خودنوشت)	ادا جعفری	200/-
دلی کی بیگماتی زبان	محی الدین حسن	15/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو	کشمیری لال ذاکر	30/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں	اشرف صبوحی	51/-
چند تصویر بتاں	مولانا عبد السلام قدوائی	45/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	پروفیسر آل احمد سرور	8/-
صاحب جی، سلطان جی	ڈاکٹر اسلم فرخی	20/-
ہندستانی مسلمان آئینہ ایام میں	ڈاکٹر عابد حسین	75/-
شہید جستجو	ضیاء الحسن فاروقی	75/-
مولانا آزاد کی کہانی	ڈاکٹر ظفر احمد نظامی	18/-
نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیا)	ڈاکٹر اسلم فرخی	15/-
حیات جامی	مولانا اسلم جیراجپوری	12/-
نقش ذاکر	مرتبہ عبد الحق خاں	51/-
مالک رام ایک مطالعہ	مرتبہ علی جواد زیدی	50/-
عبد اللطیف اعظمی حیات و خدمات	مرتبہ انور صدیقی	18/-
یادوں کا اجالا بھگوان سنگھ	مترجم شمیم حنفی	40/-
مجیب صاحب احوال و افکار	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	90/-
حیات عابد (خودنوشت ڈاکٹر عابد حسین)	ڈاکٹر صغرا مہدی	45/-
سلسلہ روز و شب (خودنوشت)	صالحہ عابد حسین	66/-

[illegible]	مرتبہ یوسف ناظم	[illegible]
شہر کارواں	حکیم شمس قدوائی	27/-
[illegible] نقش و شاعر	مرتبہ شمیم حنفی	(زیر طبع)
حیات حافظ	اسلم جیراجپوری	15/-
افکار دلی	مولانا عبد السلام خاں	40/-
امیر خسرو کی حیات اور شاعری	پروفیسر ممتاز حسین	(زیر طبع)
مکالمات افلاطون	مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین	[illegible]
[illegible] حیات اور شاعری	شکیل [illegible]	[illegible]
شب ساتھی کے دیکھے خواب	حکیم شمس قدوائی	[illegible]
شاد عارفی شخصیت اور فن	ڈاکٹر مظفر حنفی	[illegible]
حیات اسماعیل: حیات و خدمات	ڈاکٹر [illegible]	[illegible]
مفتی صدر الدین آزردہ	عبد الرحمن پرواز اصلاحی	12/-
میر انیس سے تعارف	صالحہ عابد حسین	7/-
ہمارے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی	25/-
اقبال اور افکار	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	1/50
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	عبد اللطیف اعظمی	6/50
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	45/-
کیا خوب آدمی تھا	مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین	15/-
قدسیہ زیدی	کرنل بشیر حسین زیدی	25/-
انشاء	مرزا فرحت اللہ بیگ	4/-
ذاکر صاحب اپنے اقوال کی روشنی میں	ضیاء الحسن فاروقی	45/-
روسی ادب اوّل دوم	پروفیسر محمد مجیب	60/-
مرحوم دلی کی ایک جھلک	سلیم احمد	10/-

طنزیات، مزاحیات

آخر کار	مجتبیٰ حسین	60/-
تکلف	یوسف ناظم	51/-
خامہ بگوش کے قلم سے	مظفر علی سید	150/- غیر مجلد، 80/-
فی البدیہہ	یوسف ناظم	45/-
چہرہ در چہرہ	مجتبیٰ حسین	51/-
طنزیات و مضحکات	رشید احمد صدیقی	60/-
گوشے میں قفس کے	دلیپ سنگھ	45/-
فی الحقیقت	یوسف ناظم	45/-

[illegible]	شگفتہ فرحت	18/-
[illegible]	یوسف ناظم	18/-
رنگ نمبر	شگفتہ فرحت	18/-
باقیات	یوسف ناظم	18/-
[illegible] ایک چھینک کی	وجاہت علی سندیلوی	15/-
[illegible]	یوسف ناظم	21/-
[illegible]	حضرت آوارہ	(زیر طبع)
[illegible]	رشید احمد صدیقی	30/-
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	45/-
[illegible] قہقہہ (مزاحیہ شاعری)	محمد یوسف پاپا	15/-
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	15/-

طب. ایلوپیتھی

طب یونانی اور [illegible]	حکیم [illegible]	60/-
فرہنگ اصطلاحات طب	ڈاکٹر اختر [illegible]	45/-
اخلاقیات طبیب	حکیم محمد سعید	20/-
اشارات قلب	پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم	6/-
مرضیات	حکیم نعیم الدین زبیری	75/-
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	ترجمہ [illegible]	25/-
ذیابیطس	ڈاکٹر محمد شعیب اختر	(زیر طبع)

سفرنامے، رپورتاژ

سیر کر دنیا کی غافل	صغرا مہدی	51/-
وسط ایشیا	آصف جیلانی	51/-
کولمبس کے دیس میں	جگن ناتھ آزاد	45/-
پشکن کے دیس میں	جگن ناتھ آزاد	25/-
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز	بیگم صالحہ عابد حسین	18/-
سخن دلنواز (خطوط کا مجموعہ)	خواجہ غلام السیدین	30/-
رہ نورد شوق	ڈاکٹر سید عابد حسین	14/50
پادلوں کے سائے	شفیق صدیقی	18/-

شعری مجموعے

[illegible] دوام	اختر سعید خاں	51/-
کس سے کہا ہے	رولینڈ لارنس	30/-
رنگ و خوشبو روشنی	قتیل شفائی	80/-
کاسۂ خیال	عبدالمعروف خاں	51/-
میں سمندر ہوں	فرحان سالم	30/-
اسرار خودی (فراموش شدہ [illegible]) شاہد خاں		75/-
بانگ درا	اقبال	12/-
بال جبریل	اقبال	8/-
ضرب کلیم مع ارمغان حجاز	اقبال	8/-
خواب اور خلش	آل احمد سرور	66/-
[illegible]	غلام ربانی تاباں	45/-
[illegible]	۳ [illegible] مرثیے	90/-
پرانی بات ہے	زبیر رضوی	30/-
ساز سخن	ادا جعفری	45/-
غزل نما (غزلیات کا انتخاب) مرتبہ ادا جعفری		75/-
دائروں میں پھیلی لکیر	کشور ناہید	30/-
آنکھ میں سمندر	زاہد ڈار	30/-
آنکھ اور خواب کے درمیان	ندا فاضلی	30/-
رات کے مسافر	انور سجاد	28/-
گداز شب	معین احسن جذبی	40/-
ایک خواب اور	علی سردار جعفری	40/-
حرف حرف روشنی	حمایت علی شاعر	35/-
لفظوں کا آسمان ([illegible])	مترجم کرامت علی کرامت	20/-
دوہے	جمیل الدین عالی	12/-
کلیات عرش ملسیانی	مرتبہ مالک رام	75/-
[illegible]	ساقی فاروقی	20/-
پتھر کی زبان	فہمیدہ ریاض	15/-
شام کا پہلا تارا	زہرا نگاہ	21/-
[illegible] (امیر خسرو)	مترجم محمد رفیق [illegible]	28/-
شام شہر یاراں	فیض احمد فیض	6/-
[illegible]	خورشید الاسلام	18/-

[illegible] — [illegible]

کرب آگہی — آنند نرائن ملا — 10/50

نوائے آوارہ — غلام ربانی تاباں — (زیر طبع)

اردو گیت — ڈاکٹر قیصر جہاں — (زیر طبع)

انتخاب حالی (نیاز فتح) — عادل حسین رضوی — 15/-

شہر آشوب — مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد — 8/50

ذوق سفر — غلام ربانی تاباں — 5/-

کو بہ کو — سلطان جہاں نثار اختر — 7/-

دیوار قہقہہ (مزاحیہ شاعری) مجموعہ یوسف پاپا — 15/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

تصوف۔ رسم اور حقیقت — خواجہ حسن ثانی نظامی — 90/-

انوار قرآن — پروفیسر نثار احمد فاروقی — 30/-

حضرت محمد اور قرآن — ڈاکٹر رفیق زکریا — (زیر طبع)

مسلمانوں کا تعلیمی نظام — ضیاء الحسن فاروقی — 45/-

شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان — محمود احمد برکاتی — 45/-

فرید و فرد فرید — اسلم فرخی — 27/-

اسلام میں راسخ الاعتقادی بغاوت کی رو — ضیاء الحسن فاروقی — 8/-

اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سر سید احمد کا مرتبہ — سید مقبول احمد — 8/-

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل — مولانا مجیب اللہ ندوی — 14/-

نقد ملفوظات — نثار احمد فاروقی — 65/-

خطبات عیدین — مولانا تقی امینی — 21/-

تاریخ اودھ — قاسم علی [illegible] — 27/-

قدیم ہندوستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف — 12/-

مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست — پروفیسر مشیر الحق — 8/-

ہمارے دینی علوم — مولانا اسلم جیراجپوری — 18/-

ترجمہ قرآن منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش — پروفیسر مشیر الحق — 8/-

مسلمانان ہند سے وقت کے مطالبات — مولانا حبیب الرحمن شیروانی — 8/-

دنیا کے بڑے مذاہب — عماد الحسن آزاد فاروقی — (زیر طبع)

ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات — عماد الحسن آزاد فاروقی — 40/-

ہندوستانی مسلمانوں کی آزادی تعلیمی تحریک — شمس الرحمن محسنی — 50/-

رسول اکرم [illegible] — [illegible] — 40/-

محجوب الارث — مولانا اسلم جیراجپوری — 4/-

ہند اسلامی تہذیب کا نقطہ — عماد الحسن آزاد فاروقی — (زیر طبع)

اسلام دور حاضر میں — مترجم پروفیسر مشیر الحق — 38/-

اسلامیات — مالک رام — 27/-

عمر دین عامل — مولانا اسلم جیراجپوری — (زیر طبع)

حضرت جنید بغدادی — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — 75/-

روح القرآن — مولانا عبدالسلام قدوائی — (زیر طبع)

عشق اور بجلی — عماد الحسن آزاد فاروقی — (زیر طبع)

عورت اور اسلامی تعلیم — مالک رام — 30/-

مسلمان اور وقت کے تقاضے — عبدالسلام قدوائی — 8/-

عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا — محمود الحسن — 15/-

سماجی تبدیلیاں — مترجم قاضی عبیدالرحمن — 2/-

مذہب اور جدید ذہن — پروفیسر مشیر الحق — (زیر طبع)

ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں — ڈاکٹر سالم قدوائی — (زیر طبع)

کتاب و سنت کے جواہر پارے — مولانا جلال الدین اعظمی — (زیر طبع)

مسلمان اور سیکولر ہندوستان — پروفیسر مشیر الحق — (زیر طبع)

اسلامی عقائد و مسائل مذہب — مولانا جلال الدین اعظمی — (زیر طبع)

اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی) ڈاکٹر رشید الوحیدی — 25/-

تاریخ الامت، سیرت رسول حصہ اول — مولانا اسلم جیراجپوری — 21/-

تاریخ الامت، خلافت راشدہ حصہ دوم — مولانا اسلم جیراجپوری — 24/-

تاریخ الامت، خلافت بنی امیہ حصہ سوم — مولانا اسلم جیراجپوری — 18/-

تاریخ الامت، عباسیہ حصہ چہارم — مولانا اسلم جیراجپوری — 18/-

تاریخ الامت، عباسیہ حصہ پنجم — مولانا اسلم جیراجپوری — 27/-

تاریخ الامت، عباسیہ مصر حصہ ششم — مولانا اسلم جیراجپوری — 27/-

تاریخ الامت، آل عثمان حصہ ہفتم — مولانا اسلم جیراجپوری — 18/-

تاریخ الامت، عباسیہ حصہ ہشتم — مولانا اسلم جیراجپوری — 28/-

فکر اسلامی کی تشکیل جدید — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — 30/-

قاعدہ یسرنا القرآن (خورد سائز) — قاری محمد اسماعیل — 3/-

قاعدہ یسرنا القرآن (کلاں سائز) — قاری محمد اسماعیل — 6/-

فکر کے ورق — سنیتی کمار چٹرجی — 4/-

تاریخ انگلینڈ ([illegible]) — سید محمد عزیز الدین حسین — 9/-

ناول

آگے سمندر ہے	انتظار حسین	150/-
جھینی جھینی بینی چدریا	عبدل بسم اللہ	75/-
صحرا نورد کے خطوط	مرزا ادیب	75/-
جڑوں کی تلاش	نیاز سیوہاروی	60/-
بہتے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	کشمیری لال ذاکر	48/-
سفر	رابعہ تبسم	27/-
سمندری خزانہ	ماریہ رحمٰن	27/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	ڈاکٹر صغرا مہدی	24/-
مٹی سے ہیرا	سید مقبول احمد	10/-
تذکرہ	انتظار حسین	54/-
ریت کی دیواریں	رفعت سروش	21/-
گھر بادل	کشمیری لال ذاکر	33/-
فرار	ظفر پیامی	40/-
ڈوبتے سورج کی کتھا	کشمیری لال ذاکر	36/-
لمحوں میں بکھری زندگی	کشمیری لال ذاکر	18/-
مہکتی بہاریں	کوثر چاند پوری	18/-
داگ بھوپالی	صغری مہدی	15/-
دھرتی سدا سہاگن	کشمیری لال ذاکر	7/50
پُروائی	صغرا مہدی	9/50
گوری سوئے سیج پر	صالحہ عابد حسین	(زیر طبع)
انگوٹھے کا نشان	کشمیری لال ذاکر	7/-
ایک گھر دو دل	خالدہ رحمٰن	10/-
اپنی اپنی صلیب	صالحہ عابد حسین	60/-
پرائی دھرتی اپنے لوگ	جتندر بلو	12/-
ایک عظیم ہندوستان	سید شمیم اشرف	6/-
ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	18/-

[illegible] کے گیت	مترجم قرۃ العین حیدر	3/-
چند کہانیاں	سلطان آصف فیضی	3/-
پابہ جولاں	صغرا مہدی	(زیر طبع)
ودہ	منشی پریم چند	24/-
گئودان (نیا ایڈیشن)	منشی پریم چند	75/-
میدان عمل (نیا ایڈیشن)	منشی پریم چند	75/-
یودو کیہ ترجمہ	قرۃ العین حیدر	2/-
شکستہ ناتمام	زہرہ سید بن	2/-
پراسرار مقدمہ کافکا	مترجم محمد علی الہاشمی	12/50

افسانے

صحرا نورد کے خطوط	مرزا ادیب	75/-
پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر	75/-
آوازوں کا میوزیم	ساگر سرحدی	45/-
سدا بہار چاندنی	رام لعل	30/-
دل دریا	شروان کمار	25/-
تین چہرے تین آوازیں	صالحہ عابد حسین	18/-
درد دل	ستارہ جعفری	18/-
مکتی بودھ	راجندر سنگھ بیدی	25/50
نیلی ساڑی	خواجہ احمد عباس	(زیر طبع)
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	30/-
کوکھ جلی	راجندر سنگھ بیدی	18/-
ریت سمندر اور جھاگ	ہرچرن چاولہ	12/75
تیوری	امر سنگھ	14/75
گلی نمبر ۳۹۹	وجاہت علی سندیلوی	14/75
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	27/-
اپنے پرائے	یوم پرکاش بجاج	9/-
نئی دھرتی نئے انسان	خواجہ احمد عباس	(زیر طبع)

ہاتھ ہمارے قلم ہوئے	راجندر سنگھ بیدی	30/-	[illegible]	ڈاکٹر سید عابد حسین	9/-
واردات	پریم چند	21/-	دروازے کھول دو	کرشن چندر	7/50
راستے اور کھڑکیاں	انور خاں	6/-	ایک پیام	ہم سفر مترجم: خلیق انجم	4/50
جزیرے اور اجالے کے قفس	صغرا مہدی	10/-	نقش آخر	اشتیاق حسین قریشی	2/25
اپنے دکھ مجھے دیدو	راجندر سنگھ بیدی	21/-	نشریات اور آل انڈیا ریڈیو	ڈاکٹر اخلاق اثر	10/-

ڈرامے

بازار میں نیند	شمیم حنفی	60/-
سلاخ تو ٹوٹتی ہے	کشمیری لال ذاکر	90/-
الجھاوے	ابراہیم یوسف	51/-
زندگی کی طرف	پروفیسر شمیم حنفی	36/-
زوال کا عروج	مترجم: انور عظیم	36/-
مجھے گھر یاد آتا ہے	پروفیسر شمیم حنفی	21/-
انتی گونی	سوفوکلیز مترجم قیصر زیدی	9/-
خانہ جنگی	پروفیسر محمد مجیب	6/-
حبہ خاتون	پروفیسر محمد مجیب	6/-
تاریخ کے آنچل میں	رفعت سروش	18/-
اداس موڑ	ابراہیم یوسف	12/-
انتھنی اور کلوپیٹرا	ولیم شیکسپیر	16/50
مٹی کا بلاوا	شمیم حنفی	45/-
سات کھیل	راجندر سنگھ بیدی	(زیر طبع)
غالب کون	سید محمد مہدی	8/50
خیال کی دستک	ساگر سرحدی	12/75
دیا بجھ گیا	کرتار سنگھ دگل	(زیر طبع)
آزمائش	پروفیسر محمد مجیب	6/-
انجام	پروفیسر محمد مجیب	6/-
کھیتی	پروفیسر محمد مجیب	6/-
ہیروئن کی تلاش	پروفیسر محمد مجیب	5/50

اقبالیات

افکار اقبال	محمد عبدالسلام خاں	125/-
اقبال کا نظریہ خودی	عبدالمغنی	150/-
اقبال جادوگر ہندی نژاد	عتیق صدیقی	(زیر طبع)
اقبالیات کی تلاش	عبدالقوی دسنوی	35/-
فکر اقبال (خطبات کی روشنی میں)	سید وحید الدین	30/-
نقد اقبال	میکش اکبر آبادی	25/50

غالبیات

ذکر غالب	مالک رام	(زیر طبع)
گفتار غالب	مالک رام	48/-
غالب اور صفیر بلگرامی	مشفق خواجہ	38/-
تلامذۂ غالب	مالک رام	75/-
فسانۂ غالب	مالک رام	16/50
غالب اور شاہان تیموریہ	ڈاکٹر خلیق انجم	9/50

معیاری سیریز

موازنۂ انیس و دبیر	مرتبہ: رشید حسن خاں	24/-
نیرنگ خیال	مالک رام	15/-
یادگار غالب اردو	مالک رام	30/-
یادگار غالب فارسی	مالک رام	9/-
انتخاب مضامین سرسید	انور صدیقی	16/-
حیات سعدی	مرتبہ: رشید حسن خاں	36/-

[illegible]	ڈاکٹر قمر رئیس	75/-
فردوس بریں	عبدالحلیم شرر	16/-
انتخاب مضامین شبلی	مرتبہ: رشید حسن خاں	75/-
انتخاب ناسخ	مرتبہ رشید حسن خاں	51/-
مثنوی بحرالمحبت	مرتبہ عبدالماجد دریاآبادی	5/-
شریف زادہ	ڈاکٹر قمر رئیس	20/-
امراؤ جان ادا	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	28/-
فسانۂ مبتلا	ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی	45/-
توبۃ النصوح	مالک رام	36/-
باغ و بہار	رشید حسن خاں	27/-
ابن الوقت	ڈاکٹر خلیق انجم	51/-
مجالس النساء	صالحہ عابد حسین	24/-
گذشتہ لکھنؤ	رشید حسن خاں	75/-
قصہ حاتم طائی	اطہر پرویز	75/-
انتخاب ولی	مرتبہ ظہیر الدین مدنی	20/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی	مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن	15/-
انتخاب مراثی انیس و دبیر	رشید حسن خاں	36/-
انتخاب نظیر اکبر آبادی	رشید حسن خاں	45/-
انتخاب اکبر الٰہ آبادی	صدیق الرحمن قدوائی	21/-
انتخاب کلام میر	ڈاکٹر محمد حسن	(زیر طبع)
دیوان درد	رشید حسن خاں	30/-
انتخاب سودا	رشید حسن خاں	75/-
انتخاب قلی قطب شاہ	محمد اکبر الدین صدیقی	27/-
انتخاب ذوق	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	24/-
مثنوی سحر البیان	رشید حسن خاں	36/-
مثنوی گلزار نسیم	رشید حسن خاں	16/-
افادات سلیم	ڈاکٹر خلیق انجم	30/-
مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ: رشید حسن خاں	27/-

جیبی کتابیں

بیاض مریم	سکندر علی وجد	5/-
لہو پکارتا ہے	سردار جعفری	15/-
پتھر کی دیوار	سردار جعفری	15/-
ایک خواب اور	علی سردار جعفری	15/-
آتش گل	جگر مرادآبادی	12/-
پچھلے پہر	جاں نثار اختر	7/50
رومانی غزلیں	ثمینہ حجاب	12/-
انتخاب اکبر الہ آبادی	صدیق الرحمن قدوائی	15/-
ساتواں آنگن	صالحہ عابد حسین	8/-
دھوپ	رابعہ تبسم	5/-
گھر	ماریہ رحمن	8/-
واپسی کا سفر	عبداللہ حسین	5/-
راگ بھوپالی	ڈاکٹر صغرا مہدی	7/-
نشیب	عبداللہ حسین	5/-
موت کا بازار	آفتاب ہلالی	8/-

کتاب نما کے خصوصی شمارے

محبوب حسین جگر نمبر مرتبہ پروفیسر نثار احمد فاروقی	75/-
جاں نثار اختر نمبر مرتبہ: گرچن چندن	90/-
شمس الرحمن فاروقی نمبر مرتبہ: احمد محفوظ	80/-
اردو افسانہ ممبئی میں مرتبہ: الیاس شوقی	51/-
مغیث الدین فریدی نمبر مرتبہ: ظہیر احمد صدیقی	45/-
خواجہ حسن نظامی نمبر مرتبہ: نثار احمد فاروقی و ریحان احمد عباسی	75/-
عبدالوحید صدیقی نمبر مرتبہ: پروفیسر شارب ردولوی	51/-
غلام ربانی تاباں نمبر مرتبہ: اجمل اجملی	75/-
اختر سعید خاں نمبر مرتبہ: ڈاکٹر سیدہ عابد حسین	51/-
نثار احمد فاروقی نمبر مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم	51/-

پروفیسر گوپی چند نارنگ نمبر مرتبہ: [illegible]

ڈاکٹر خلیق انجم نمبر مرتبہ: ایم حبیب خاں 80/-

خواجہ احمد فاروقی مرتبہ: خلیق انجم 45/-

عابد علی خاں مرتبہ: کاظمی حسینی 45/-

پروفیسر مسعود حسین خاں ایم حبیب خاں 45/-

ڈاکٹر اجمل اجملی مرتبہ: علی احمد فاطمی و منظر امیب 45/-

زمان فتح پوری نمبر مرتبہ: خلیق انجم 25/-

سردار جعفری نمبر مرتبہ: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی 45/-

صالحہ عابد حسین نمبر مرتبہ: عزیز قریشی 45/-

نئی نظم کا سفر مرتبہ: خلیل الرحمٰن اعظمی 45/-

مشرقی علوم و السنہ پر تحقیق حامد حسین 3/-

ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر کرنل بشیر حسین زیدی 16/-

مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر (مکتبہ جامعہ) 1/50

مرزا سلامت علی دبیر نمبر مرتبہ: عبدالقوی دسنوی 7.150

جگن ناتھ آزاد نمبر مرتبہ: ایم حبیب خاں 51/-

عرش ملسیانی نمبر مالک رام 12/50

سکندر علی وجد نمبر یوسف ناظم 25/-

لغت نویسی کے مسائل نمبر پروفیسر گوپی چند نارنگ 35/-

عبداللطیف اعظمی نمبر (مکتبہ جامعہ) 18/-

مشفق خواجہ نمبر مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم 30/-

جائزے مرتبہ: مظفر حنفی 45/-

قواعد، محاورے، کہاوتیں اور لغات

تذکیر و تانیث (7 ہزار الفاظ) جلیل مانک پوری 75/-

معیار اردو جلیل مانک پوری 21/-

محاورات ہند مرتب محبوب الرحمٰن فاروقی 51/-

عبارت کیسے لکھیں 18/-

انشا اور خط 12/-

بیاک قواعد اردو [illegible] 3/-

بیاک [illegible] [illegible] 6/-

بیاک اردو انگریزی ڈکشنری 21/-

بیاک انگلش اردو ڈکشنری 15/-

ہمارے محاورے سنگل پرکی 12/50

کہاوت اور کہانی سنگل پرکی 9/-

کالج کے طلبہ کے لیے درسی کتب

شعور ادب (مکتبہ جامعہ) 21/-

نیا اردو نصاب اوّل محمد ذاکر 10/-

آئینہ ادب ڈاکٹر محی رضا / ڈاکٹر آدم شیخ 21/-

انوار ادب پروفیسر فصیح الدین / ڈاکٹر عابد حسین حسنی 8/50

تعلیم بالغان کے سلسلے کی کتابیں

کفن دفن 1/-

حیات اللہ انصاری 1/-

چیک مشتاق احمد 1/-

آستین کا سانپ محمد حسین حسان 1/-

چاند محمد حسین حسان 1/-

دیمک محمد حسین حسان 1/-

کھیتی زمین محمد حسین حسان 1/-

ہندی کی دوسری کتابیں

موسموں کا کھیل 1/-

پرم پرا 1/-

اپنا گھر 1/-

امریکہ 1/-

دلی 1/

منور محمن اور کام 1/-

چاندی کا چمچہ 1/-

مکتبہ پیام تعلیم کی مذہبی کتابیں

کتاب	حصہ	قیمت
پارہ عم مع اردو و انگریزی ترجمہ و تشریح		45/-
سورۂ رحمٰن	مع اردو ترجمہ	6/-
صراط مستقیم		7/50
سورۂ رحمٰن (ترجمہ مع تشریح)		6/-
حضرت شیخ مخدوم علی مہائمی		4/50
اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں		9/-
نماز پڑھیے		4/50
السلام علیکم		7/50
حضرت یوسف علیہ السلام		4/50
حدیث کیا ہے		4/-
حضرت عمر فاروقؓ		6/-
نقوش سیرتؐ	حصہ اول	5/-
نقوش سیرتؐ	دوم	5/-
نقوش سیرتؐ	حصہ سوم	5/-
نقوش سیرتؐ	حصہ چہارم	5/-
نقوش سیرتؐ	حصہ پنجم	5/-
رسالہ دینیات	اول	3/-
رسالہ دینیات	دوم	4/-
رسالہ دینیات	سوم	5/-
رسالہ دینیات	چہارم	5/-
رسالہ دینیات	پنجم	6/-
رسالہ دینیات	ششم	6/-
رسالہ دینیات	ہفتم	6/-
رسالہ دینیات	ہشتم	6/-
حضرت آدم علیہ السلام		4/-
حضرت یحییٰ علیہ السلام		3/-
[illegible]		4/-

[illegible]

[illegible]/50

کتاب	قیمت
خوب سیرت اول	8/-
خوب سیرت دوم	6/-
اچھی باتیں	4/50
رسول اللہ کی صاحبزادیاں	4/50
سلطان حق	4/50
سیرت پاک مختصر مختصر	3/-
کمسن صحابی	6/-
رمضان کا مہمان	6/-
اسلام کے جاں نثار	5/-
قرآن کے پھول	9/-
سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	3/50
حضرت ابوبکر صدیقؓ	6/-
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	3/-
حضرت طلحہؓ	3/-
حضرت ابوذر غفاریؓ	3/-
حضرت سلمان فارسیؓ	3/50
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	3/-
حضرت محبوب الٰہیؒ	3/50
حضرت معین الدین چشتیؒ	3/-
حضرت فرید گنج شکرؒ	3/-
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	3/-
نیک بیٹیاں	3/50
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	3/-
حضرت حمزہؓ	3/-
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	4/50
حضرت ابوہریرہؓ	4/-
قطرے کے موتی	2/50

[illegible]کر	4/50
[illegible] کے خلیج	3/50
رسول پاکؐ کے اخلاق	4/-
قرآن پاک کیا ہے؟	5/-
اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل	6/-
اسلام کے مشہور سپہ سالار دوم	6/-
اسلام کے مشہور امیر البحر	9/-
اسلام کیسے پھیلا حصہ اوّل	7/50
اسلام کیسے پھیلا حصہ دوم	7/50
اسلام کیسے شروع ہوا	7/50
رسول پاکؐ	7/50
دس جنتی	7/50
سرکار کا دربار	7/50
چار یار	9/-
آں حضرتؐ	4/50
ہمارا دین حصہ اوّل	8/50
ہمارا دین حصہ دوم	8/50
ہمارا دین حصہ سوم	8/50
تحسین القرآن	(زیر طبع)
منہاج القرآن	4/50
ائمہ اربعہ	(زیر طبع)
ارکان اسلام	4/-
عقائد اسلام	4/50
خلفائے اربعہ	18/-
نبیوں کے قصے	7/50
ہمارے رسولؐ	7/50
مسلمان بیبیاں	6/-
ہمارے نبیؐ	4/-

سرکار دو عالم	9/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد)	3/-
قاعدہ یسرنا القرآن (کلاں)	6/-

سوانح

بچوں کے خواجہ الطاف حسین حالی	6/-
بچوں کے نظیر اکبر آبادی	6/-
بچوں کے "ظ" انصاری	6/-
بچوں کی آپا جان (گیرڈا فلپس)	6/-
بچوں کی شفیقہ فرحت	4/50
بچوں کے عابد علی خاں	4/-
بچوں کے علی سردار جعفری	4/-
بچوں کے یوسف ناظم	4/-
چارلی چیپلن اور ہینز اینڈرسن	9/-
بچوں کے مولانا حسرت موہانی	4/-
بچوں کے میر امّن دلی والے	4/50
بچوں کے محمد حسین آزاد	4/-
بچوں کے مرزا غالب	4/-
بچوں کے امیر خسروؒ	4/50
بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد	4/-
بچوں کے سلطان جی	4/50
بچوں کے مولانا شبلی نعمانی	4/50
بچوں کی صالحہ عابد حسین	4/-
بچوں کے ڈاکٹر سید عابد حسین	4/-
بچوں کے بابائے اردو مولوی عبدالحق	4/50
بچوں کے میرزا ادیب	4/50
بچوں کے غلام السیدین	5/-
بچوں کے اسمٰعیل میرٹھی	21/-
بچوں کے ذاکر صاحب	7/-

جواہر نہرو	8/-
اندرا گاندھی کی کہانی	8/-
محمد شفیع الدین نیر	7/50
ہمارے عظیم سائنس داں	9/-
چند مشہور طبیب اور سائنس داں	9/-
مولانا آزاد کی کہانی	18/-
جوہر قابل	4/50
بچوں کے چار بزرگ دوست	3/50
گاندھی باپا کی کہانی	10/-
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں	2/-
میر انیس	2/-
امیر خسرو	4/50

سائنس، طب اور عام معلومات

باتوں باتوں میں معلومات	10/-
کہانی بھی، معلومات بھی	6/-
چیزوں کی کہانی	7/50
یہ کیسا بخار ہے	6/-
آپ کا جسم	6/-
گندا پانی	4/-
کیوں اور کیسے؟	6/-
سائنس کی دنیا	8/-
کمپیوٹر کیا ہے	8/-
عجائب گھر	10/-
ذرّے کی کہانی	21/-
علاج میرا دشمن	6/-
چرواہے کی کہانی	4/50
غذا کی کہانی	3/-
رنگوں کی بستی	5/-

فراق گورکھپوری	8/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں	4/50
صحت کے ۹۹ گُر	3/-
صحت کی الف بے	5/-
سنہرے اصول	5/-
پرندوں سے جانوروں تک	4/50
دہلی	2/50
انوکھا عجائب خانہ (حصہ ۳)	1/50
سماجی زندگی حصہ سوم	4/90
ابتدائی قواعد اردو طلبہ کے لیے	3/-
ابتدائی قواعد اردو (برائے اساتذہ)	6/-

نظمیں

پھلجھڑیاں	6/-
مولانا اسمٰعیل میرٹھی	21/-
تماشے (نرسری گیت باتصویر)	7/50
مہکتی کلیاں	(زیر طبع)
توتے کھلونے	6/50
سہانے ترانے	4/50
بچوں کے اکبر	6/-
بچوں کے اقبال	7/50

ننھے منے بچوں کے لیے

تماشے	(باتصویر)	7/50
جاں نثار دوست	(باتصویر کہانیاں)	7/50
شیر اور بکری	(باتصویر کہانیاں)	9/-
چاند کی بیٹی	(باتصویر کہانیاں)	8/-
بھیڑیے کا بابا	(باتصویر کہانیاں)	7/50
جادو کی پڑیا	(باتصویر کہانیاں)	7/50

چالاک بلی		[illegible]
دم کٹی لومڑی	(تصویری کہانیاں)	7/50
سوئے کا خواب	(تصویری کہانیاں)	8/00
گدھے نے بجائی بانسری		7/50

بڑے بچوں کی دلچسپ کہانیاں

الف لیلیٰ کے چار ڈرامے		9/-
ننھی جل پری		7/50
ممتا کی آواز		7/50
جادو نگری		9/-
سنہری جھیل		9/-
خلائی طبیب		8/-
بونوں کا جزیرہ		8/-
جلتا ہوا مکان		5/-
سونے کی چوری		4/-
روشنی ہی روشنی		10/-
خطرناک سگنل	پہلا حصہ	10/-
لاش چل پڑی	دوسرا حصہ	10/-
کالا جنگل نیلی موت	تیسرا حصہ	10/-
خلائی سرنگ	چوتھا حصہ	10/-
وہ خلا میں بھٹک گئے	پانچواں حصہ	10/-
خلائی مخلوق بستی میں	چھٹا حصہ	10/-
موت کی شعاعیں	ساتواں حصہ	10/-
خطرناک فارمولا	آٹھواں حصہ	10/-
تابوت سمندر میں	نواں حصہ	10/-
خلائی مخلوق کا حملہ	دسواں حصہ	10/-
عمران کی زندہ لاش	گیارہواں حصہ	10/-
شہر پتھر بن گیا	بارہواں حصہ	10/-
ایلس کی دنیا		10/50

[illegible]	10/-
مرغ کی موت	4/50
دنیا کی عجیب و غریب کہانیاں	7/50
انمول کہانیاں	4/50
چتر کی کٹیا	7/50
ریل کے بچے	4/-
افریقہ کی کہانیاں	9/-
۸۰ دن میں دنیا کا چکر	3/-
ہزاروں خواہشیں	9/-
مونٹی کرسٹو کا خواب	9/-
گلی ور کے تین حیرت انگیز سفر	6/-
جادوئی چقماق کی ڈبیہ	4/50
گیارہ ہنس اور ایک شہزادی	4/-
دادی اماں کی کہانیاں	6/-
سفر کے قصے	5/-
پہاڑی مہم	4/50
تین بندوقچی	10/-
ہم بنے کمانڈو	5/-
ایک تھا مرغا ککڑوں کوں	6/-
پریوں کی کہانیاں	6/-
سمندر کا بادشاہ ہار گیا	4/50
چوں چوں بیگم	4/-
ماسٹر شامت	6/-
تھوڑی تارے لاتے چاند	4/-
پکڑے گئے	7/50
درویش کا تحفہ	6/-
حوراسے فرار	7/50
بکرے کی تعریف میں	6/-

[illegible]	6/-	[illegible]	6/-
قصر صحرا اول	7/-	ساہوکار کی نوکری	3/50
قصر صحرا دوم	10/-	جگو کی بلی	3/-
قصر صحرا سوم	8/-	چالاک خرگوش کے کارنامے	9/-
محنتوں کی تباہی	7/50	چور پکڑو	3/50
بہار کا پنچھی	4/-	بہادر علی	8/50
ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش	7/50	خالی ہاتھ	9/-
چاندی کی روح	4/-	کھلونا گھر	7/50
ٹھگ نے ٹھگا ٹھگ کو	4/50	حاجی بمبا کی ڈائری	7/50
گدھا کہانی	9/-	قصہ اژدھا پکڑنے کا	6/-
خفیہ سرنگ	6/-	ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	6/-
بڑھیا کی بھینس	4/50	ابو علی کا جوتا	6/-
تیس مار خاں	4/50	ننھا سراغ رساں	6/-
چالاک خرگوش کی واپسی	15/-	پُر اسرار غار	6/-
غریب لکڑہارے کی کہانی	6/-	ظالم ڈاکو	6/-
نرودی کا آدم خور	6/-	غریب دیسوں کی عوامی کہانیاں	7/50
ہمت کے کرشمے	6/-	ولی کی شادی	4/-
خلائی مسافر	6/-	رحمت شہزادہ	4/50
ابو خاں کی بکری	15/-	اندھے کا بیٹا	4/50
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی	6/-	پانچ جاسوس	10/-
نرالے گویے	4/50	جنگل کی ایک رات	7/50
باتونی کچھوا	4/50	اچھی کہانیاں	3/-
جادو کا کھٹولا	3/-	ہرن کا دل	3/-
جادو کی سارنگی	3/-	دریا کی رانی	3/-
بدر شہزادی	6/-	گوہر شہزادی	4/50
سمندری طوفان اور تین لڑکے	6/-	شریر شیرا	3/50
ننھا سیاح	8/50	پری رانی	3/-
زیور	6/-	خطرناک سفر	3/50

ننھا جیرہ	[illegible]	[illegible]	3/50
مرغی کی چار ٹانگیں	4/50	[illegible]	5/-
بابا سچ	3/-	جادو کا گھر	3/50
سلامہ و صمامہ	5/-	بی مینڈکی اور کوا	3/50
پہاڑ کی چوٹی پر	6/-	تاک دھن تا کے سے	3/50
شرارت	4/-	روٹی کس نے پکائی	3/50
ننھا فرشتہ	6/-	پھر میں چکوں کیا خاک	3/50
ایک کھلا راز	3/50	پانچ بونے	3/50
مچھیرا اور اس کی بیوی	3/50	چیونٹی رانی	3/50
بھوتوں کا جہاز	7/50	بچوں کی کہانیاں	3/50
ہار کی تلاش	6/-	پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	3/50
خرگوش کی چال	4/-	پکڑو دم کتے کو	3/50
آؤ اداکاری کریں	4/-	مدو رانا پردیس چلے	3/50
خرگوش کا سپنا	9/-	چونچو	3/50
نیلا ہیرا	6/50	سرخ جوتے	4/50
ایک پکوڑی تیل میں	(زیر طبع)	پلک شہزادہ	6/-
شیر خاں	4/-	ایک دیس ایک خون	3/50
بھیڑیے کے بچے	3/-	جادو کے کھیل	(زیر طبع)
لومڑی کے بچے	3/-	انعامی مقابلہ	3/25
میاں ڈھینچو کے بچے	4/-	دعوت سلامی	(زیر طبع)
بہادر	4/50	جیت کس کی؟	4/-
ہرن کے بچے	3/50	چینی کی گڑیا	(زیر طبع)
اس نے کیا کر نہ جانا	3/50	بہادر سیاح	4/-
کتا ہوا ہاتھ	7/50	چچا غالب	(زیر طبع)
میکی گھر کا راجا	(زیر طبع)	تا نیکل خاں	3/-
جی دار اور ننھا فرشتہ	(زیر طبع)	جن حسن عبدالرحمن ۔ اول، دوم	5/-
سرکس (ناولٹ)	1/50	چوری کی عادت	3/50
بندر اور نائی	4/50	غیر ذمہ دار لڑکا	(زیر طبع)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

لسان الصدق
مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل۔ اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ =/۷۵

نظام رنگ
ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کا ادبی خاکہ — یہ اس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہوکر انسانیت کو وقار بخشا۔ =/۱۵

شہید جستجو
(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مرد درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مرد مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ =/۷۵

پرانی بات ہے
(سلسلہ وار نظمیں) زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں، بس سچائیوں کے روپ بدل گئے ہیں۔ =/۳۰

غزل نما
تصحیح و ترتیب

(طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے) ادا جعفری

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کلام کا جامع انتخاب اور تعارف جس کو ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۴۸۰ =/۵۰

ساز سخن
ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتون اول محترمہ ادا جعفری کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے انداز بیان سے ایک ایسی قوت ارادی مترشح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہوسکتا۔ =/۴۵

ترجمۂ قرآن
پروفیسر مشیر الحق

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش)

پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔ =/۸

نذر مختار
مالک رام

مجموعۂ مضامین جو ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر مختار الدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما نائب صدر جمہوریۂ ہند کے دست مبارک سے پیش کیا گیا جس میں اردو کے ممتاز چھبیس ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ =/۱۰۱

Regd. with R N.I at No 4967/60 Oct. 1998,
Regd. No. DL 16016/98
Licence No. U(SE)-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025

ماہنامہ

کتاب



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

عربی زبان کے دور میں ایک

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

نومبر ۱۹۹۸ء جلد ۳۸ شمارہ ۱۱

فی پرچہ	7/
سالانہ	70/
سرکاری تعلیمی اداروں سے	100/
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک)	500/

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فیکس نمبر 6842574

Tel Cum Fax No (011)-6910191

ٹیلی فون نمبر 6910191

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ۔ ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

مانگے کا اجالا

طنز و مزاح

جائزے

کھلے خطوط / ادبی تہذیبی خبریں

مہمان مدیر
قیصر تمکین
لندن

(اشاریہ)

کچھ ترقی پسندی کی حمایت میں

غیر منقسم ہندستان کے ادب میں ترقی پسندی کی تحریک محض اردو کے حوالے سے نہیں شروع ہوئی۔ تحریک کے بانیوں نے دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہی نو آبادیاتی ممالک میں ذہنی اضطراب اور فکری تذبذب کی پرچھائیاں دیکھ لی تھیں' انھوں نے ادب وفن کی کاوشوں کو کسی ایسے نئے سماج کی تعمیر کے لیے وقف کرنے کا عزم کیا جس میں انسانیت کے پنپنے کے امکانات ہوں اور ایک ایسی متحد اور متفق دُنیا وجود میں آسکے جہاں کسی فنکار کا دامن شیخ و برہمن کے تنازعات سے ملوث نہ ہو۔ یہ کہنا کسی طرح کا مبالغہ نہ ہوگا کہ ونڈل وکلی کی ایک دنیا One World کا جو تصور لے کر سان فرانسسکو کانفرنس میں ادارہ متحدہ اقوام کی نیو ڈالی گئی۔ (۱۹۴۶ء) اس کی داغ بیل بر صغیر کے ادب دوست اور انسانیت دوست فنکار ۱۹۳۶ء میں ہی ڈال چکے تھے۔

ترقی پسند ادب کے بانیوں نے بر صغیر کی تمام زبانوں اور ادیبوں سے رابطہ قائم کر کے شروع میں اس کو پورے ایشیا اور پھر بعد میں تیسری دنیا کے تمام پسماندہ عوام کی تحریکات حریت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اب یہ ایک طرح کی بد قسمتی بھی رہی کہ دوسری زبانوں کے ادیب خاص طور پر ہمارے ہندی زبان کے ہم سفر متعدد غیر ادبی وجوہ سے ہماری صفوں سے الگ ہوگئے۔ تاہم یہ امتیاز اردو کے ترقی پسند ادیبوں کو ہمیشہ حاصل رہا کہ وہ فسطائی قومیت' مذہبی تعصبات اور علاقائیت کے تفرقات سے دامن بچا کر اعلا ادبی تخلیقات کی کوشش میں منہمک رہے۔ اردو کا ہر ترقی پسند ادیب یہ بات فخر سے کہہ سکتا ہے کہ وہ وقتی مصالح اور مبتذل عصبیتوں سے انتہائی وحشتوں کے دور میں بھی پاک رہا۔ اردو کے فنکار کے لیے کوئی بُرا آدمی اس وجہ سے بُرا نہیں ہے کہ وہ سکھ' ہندو یا مسلمان ہے۔ وہ بُرا اس وجہ سے ہے کہ ذاتی محرومیوں کی بنا پر بہ آسانی نفسیاتی پیچیدگیوں اور مصلحت کیش رہنماؤں کی شعلہ سامانیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک قاتل بہر حال قاتل

ہے۔ اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اردو کے ترقی پسند ادیب کسی کو ہندو قاتل یا مسلمان قاتل کہہ کر اس کے مذہب کو مطعون نہیں کر سکتے۔ یہ غلطی یورپی ادیبوں نے ہمیشہ کی۔ اس کا نتیجہ بھی دنیا نے آشوز، بیلسن اور تربلنکا کے آتش خانوں کی صورت میں دیکھ لیا۔

ترقی پسند تحریک اور تنظیم ایک بڑی مدت تک فعال اور سرگرم عمل رہنے کے بعد تھکی تھکی سانسیں لینے لگی۔ بہت سے ساتھی چھوٹی موٹی سرکاری ملازمتیں حاصل کر کے تنظیم کی صفوں سے ہی نہیں بلکہ تحریک کے مقاصد تک سے الگ ہو گئے (یہ دوسری بات ہے کہ عوام دشمن اداروں سے عہدے، خطابات اور خلعتیں حاصل کرنے کے بعد اب وظیفہ یاب ہو کر پھر اپنی ترقی پسندی کی نوبت بجا رہے ہیں) لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ تحریک (یا خود تنظیم) محض گمراہ کن رجحانات 'شدت پسندی یا "نقصان مایہ" کی نقیب رہی۔ بہر حال دور ایک ایسا بھی آگیا کہ بہت سے حضرات جن کے فکر و عمل کے ارتقا میں ترقی پسند تحریک ہی نہیں بلکہ انفرادی طور پر ادیبوں کا حصہ تھا، پوری تحریک کو مطعون کرنے میں مصروف ہو گئے اور اس کے نتیجے میں وہ شبخون مارے گئے کہ ادبی صفحوں میں پورا ایک دبستان ہی سب و شتم کا قائم ہو گیا۔ وہ طرز تحریر جس میں فیض کو چوتھے درجے کا شاعر، مجاز کو گھٹیا اور فراق کو کم سواد کہا جانے لگا اصل میں اردو میں Punk Writing یا لفنگی تنقید کا غماز بن گیا۔

سیاسی طور پر ۱۹۷۰ء کے اواخر اور ۱۹۸۰ء کی پوری دہائی میں مغربی دانش کدوں میں ریگن، بش اور تھیچر کے "بازاری نظریات" ہی کھرے سکوں کی طرح رواں رہے۔ اسی کے زیر اثر ہمارے ادبی حلقوں اور رفیقوں کی ایک بڑی تعداد بھی مالی کامیابی ہی کو ادب کا معیار سمجھنے لگی چونکہ زیادہ تر آدرش وادی جوان نچلے متوسط طبقے سے آتے ہیں اس لیے ان کا ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو جانا بھی ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ ادب و علم کے شبستانوں میں داخلے کے متمنی طوق زریں سے مرصع ہو کر آنے لگے۔ فحاشی اور ابتذال کے اداروں "بینکوں کی عمارات" اور جمہوریت کش تحریکوں میں یہ بھی گونج سنائی دینے لگی کہ ترقی پسند تحریک ایک فضول اور بے تکا موڑ تھی۔ سیدھا راستہ تو وہی ہے جو عہدوں، انعامات، خطابات اور منفعت بخش اداروں تک لے جاتا ہے۔ مجاز، جعفری، نیاز حیدر، سجاد ظہیر اور منٹو وغیرہ نے محض جھک ماری۔۔۔ ان کو ملا کیا؟

یہ "ملا کیا۔۔۔؟" ایک ایسا مکروہ تصور ہے جس کا ذکر ہی ادب و فن کی دنیا میں ناشائستگی اور ابتذال کی دلیل ہے۔ اگر عصری تقاضوں کا رجحان اور جدیدیت کا میلانِ طبع

گیا ہے کہ کس نے کتنی منفعت حاصل کی تو ایسا سوال یہ بھی اٹھ سکتا ہے کہ سقراط، مسیح اور حسینؓ کو کیا ملا؟

ادب چھوٹے بجتورے کا ڈھابہ نہیں ہے کہ کام ختم ہوتے ہی نفع نقصان کے لحاظ سے پونجی گنی جائے۔ یہاں تو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کون کس درجے سے سردار پہنچا۔ مال، مناصب، تمغے، اور خلعتیں ہی اگر مقصد اولا ہیں تو ہزاروں اور بھی پیشے ہیں۔ اسی مغرب میں ایسے ایسے "مستشرقین" اور مفکرین موجود ہیں جو عصمت فکر و نظر بیچ کر مرسیڈیس سوار بنے ہوئے ہیں۔ یہ آن تو میر وفائی کی رہی کہ ٹوٹ جاؤ مگر جھکو نہیں۔

آج امریکا، برطانیہ اور یورپ کے کئی قابل ذکر ممالک میں قدامت پسند اور رجعت پسند جماعتوں کی عملداری ختم ہو چکی ہے۔ جنوبی افریقہ تک میں نسل پرستی کی تنسیخ ہو چکی ہے۔ تو کیا یہ امید بے جا ہے کہ ہندستان و پاکستان، اردو، ہندی اور مشرق و مغرب کے علمی و فکری حلقوں میں پیسہ پرستی، عہدوں اور مال و منال کی گرم بازاری ختم نہیں ہوگی۔ وہ کارواں جو، ہومر، کالی داس، شیکسپیئر، غالب، میر، فراق، مجاز اور فیض سے ہوتا ہوا نئی صدی اور نئے ہزارے میں داخل ہو رہا ہے ہمیشہ تو جعلی ترقی پسندی اور مبتذل جدیدیت، لفظی تنقید اور معتبر ادیبوں اور شاعروں کی ٹوپی اچھالنے کے خارزاروں میں نہیں بھٹکتا رہے گا۔

کیوں نہ ہم سب نئے سال، نئی صدی اور نئے ہزارے کی آمد آمد کے موقع پر ادب کو ایک بار پھر جذبہ تعمیر اور عرفانِ انسانیت کے تصورات سے ہم آہنگ کرنے کی کوششوں میں ہاتھ بٹائیں۔ ایک ترقی پسند شاعر کا ہی شعر مد نظر رکھیے

جو آج اوج پر ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

(بہ شکریہ افکار)

کا ممبر بن کر اردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے۔

ہمیں یقین ہے کہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

قواعد و ضوابط

1۔ بک کلب کی فیس رکنیت دس روپے (-/Rs.10) ہے۔ (ممبر بننے کے لیے کسی فارم کی ضرورت نہیں۔ فیس کی رکنیت بھیج دینا کافی ہے۔

2۔ بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ زر تعاون -/70 روپے ہے) صرف -/65 روپے سالانہ زر تعاون لیا جائے گا۔

3۔ ممبر کو مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) 25% اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اردو کی کتابوں کی خریداری پر 15% کمیشن دیا جائے گا (ہر فرمائش پر بک کلب کی ممبری کا حوالہ دینا ضروری ہوگا)

4۔ بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جا سکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کا ممبر نہیں بن سکتی۔

5۔ ممبری کے دوران ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔

6۔ کتابیں بذریعہ وی پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجات روانگی کتب ممبر کے ذمے ہوں گے۔

7۔ گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر پچھلا حساب صاف کرے اور آیندہ کے لیے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔

8۔ بک کلب کی رکنیت کی مدت پوری ہو جانے کے باوجود اگر کسی نے اپنی طرف سے کتابوں کا آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتاب بھیج کر حساب صاف کر دیں گے۔

ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یا اس کی کسی بھی شاخ سے حاصل کر سکتے ہیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ 202002

ادا جعفری

43/8/B Block 6
P E C H. Society
Karachi-75400
(Pakistan)

نظمیں تمھارے نام

نظمیں تمھارے نام
میں نے لکھی ہیں لفظ کا احساں لیے بغیر
ہجر و وصال سے کوئی پیماں کیے بغیر
تم جانتے تو ہو
کہ میں نغمہ سرا رہی
نغمہ جو میرے دل میں رچا
اور جسے تم ہی سُن سکے
دیکھو کہ نقشِ پا مرے
ہر رہ گزر میں ہیں
تم وقت ہو تو وقت کا چہرہ مجھی سے ہے
تم عشق ہو تو عشق کا لہجہ مجھی سے ہے
اور دیکھتے تو ہو مجھے
حیران تو میں بھی ہوں
تم آئینہ ہو، آئینہ ساماں تو میں بھی ہوں
میں پاس آ نہ پاؤں
مگر دور بھی نہیں
یہ کیوں کہوں کہ دستِ صبا نامہ بر نہیں
گل نے سنی ہے قطرۂ شبنم کی گفتگو
تم ہر نگر ملے ہو
کہ ہر سو تو میں بھی ہوں
میں بھی تو ایک راز ہوں، خوشبو تو میں
بھی ہوں!

O

باقر مہدی
ای۔ا، روی درشن، کارٹر روڈ
باندرہ (ویسٹ) ممبئی۔۵۰

کیا ہم دلدل سے نکل آئے ہیں؟

(خیری کے نام!)

کتنی راہوں سے گزر کر
منزلوں کو چھوڑ کر
اپنی پگڈنڈی پہ ہم چلتے رہے
اور آخر بچ گئے۔ غربت کی دلدل سے مگر
بے نوائی کا سہارا ہے ابھی
کوئی صدمہ، کوئی غصہ، کوئی الجھن بھی نہیں
ہر طرف لیکن وہی غربت کی دلدل ہے مگر۔!
ہم جزیرے پہ بھلا۔ اب کیا کریں؟
دور تک۔ طوفان کی موجوں کا شور
یا غریبوں کی صدائے الاماں۔!
کوئی منزل ہے، نہ رہبر ہے کہیں!
زندگی۔ تجھ سے شکایت کیا کریں؟
جی لیے۔ بس جی لیے
بے نام "مجرم" کی طرح!

پروفیسر آفاق احمد
گل کدہ، ۸ عید گاہ ہلز
بھوپال

مناجات

خدایا ترا شکر تو نے
میرے چہرے کو آنکھوں سے روشن کیا
ان آنکھوں کو نورِ بصارت سے اُجلا کیا
اُجلے جلووں سے اُن کو منور کیا
انھیں اعتبارِ چشمِ بینا دیا
مگر اب وہی میری آنکھیں
وہ سب دیکھتی ہیں
جو نہیں دیکھنا چاہتی ہیں

خدایا ترا شکر تو نے
مجھ کو سننے کی طاقت عطا کی
مجھے کان بخشے
گوشِ بر آواز رہنے کا ان کو سلیقہ دیا
مگر آوازوں کے جنگل میں اے میرے مالک
میرا دم گھٹ رہا ہے

خدایا ترا شکر تو نے
زبانِ گویا کی دولت سے مجھ کو نوازا
حوصلہ اس کو حق بات کہنے کا بخشا
(تکلم پہ پھولوں کی خوشبو کو صدقے کیا)
مگر اب یہی کلمۂ حق کی خوگر زباں
مصلحت کا عذاب سہتی ہے

اے خدا میری بصارت کے مالک
اے خدا میری سماعت کے مالک
خداوندِ قدوس میری زباں کے

مجھے اس بصارت سے محروم کر دے
مجھے اس سماعت سے محروم کر دے
مجھے اس طلاقت سے محروم کر دے
جسے وہ کچھ دیکھنے، بولنے اور سننے پہ
آمادہ کرنے کی کوشش ہے جاری
جو میں دیکھنا نہیں چاہتا ہوں
جو میں سننا نہیں چاہتا ہوں
جو میں کہنا نہیں چاہتا ہوں

اگر یہ نہیں تو پھر
مجھ کو وہ طاقتِ گفتار دے
وہ گوشِ بر آواز دے
وہ چشمِ بینا عطا کر
جو مصلحت کے سارے پہرے ہٹا کر
زمانے کے رخ کو بدل دے

صابر دت
پرچھائیاں، اے۔ بی نائر روڈ
جوہر چرچ، ممبئی۔ ۴۰۰۰۴۹

بس ایک دن کے لیے

میرے بھگون
نہ پتہ ٹھکانہ
نہ رین بسیرا
مندر، مسجد، گردوارے
کونا کونا چھان رہا ہوں
مٹی پتھر پھانک رہا ہوں
من کے اندر جھانک رہا ہوں
تجھ کو اپنا مان رہا ہوں
ڈھونڈ رہا ہوں جانے کب سے
تیرا نمبر
آج لگا ہے موبائل پر
تجھ سے کچھ باتیں کرنی ہیں
بھلے نہ ہم سے بولو بھگون
راز نہ اپنے کھولو بھگون
بات مری پر دھیان سے سننا
جس پرانی کو دھرتی پہ بھیجا
وہ گیانی بن بیٹھا ہے
انتریامی بن بیٹھا ہے
پاؤں اپنے پھیلائے اُس نے
کیا کیا گل نہ کھلائے اُس نے
سائنس کے کھیل رچائے اس نے
بجلی کا ایک جال بچھایا
رات کو دن جیسا چمکایا
موٹر، ریل، جہاز بنایا
مشرق مغرب ایک کیا ہے

ٹیلی فون پہ دھرتی سمٹی
فیکس مشین پہ حرف اڑے
ٹی وی تیرے گن گاتا ہے
انساں کے بہروپ میں تجھ کو
بستی بستی پہنچاتا ہے
دودھ پلاتا ہے سانپوں کو
پیپل پیپل پانی چھڑکے
پتھر پتھر پھول چڑھائے
منگل کو بھوکا رہتا ہے
بے مطلب ہی دکھ سہتا ہے
بھگون! بس اک دن کے لیے تم
اپنی دھرتی پر آجاؤ
بنگلہ میں آرام سے رہنا
فریج کا پانی کتنا ٹھنڈا ہے
پھر مت کہنا
ٹیلی فون پہ باتیں کرنا
فیکس پہ اپنا میسج دینا
جتنی دیر زمیں پہ رہنا
اور اپنے پرانی سے ملنا
جس کا تجھ کو گیان نہیں ہے
جو تیرا انسان نہیں ہے
تو جس کا بھگوان نہیں ہے

سید قدرت نقوی
۱۰۴/۱۵۔اے۔۱، باقر زون
کراچی (پاکستان)

اصول تدوین کتب

قدیم کتابوں کے مدونہ مطبوعہ نسخوں کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی کہ ان کتابوں کو صحیح انداز میں مدون نہیں کیا گیا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مدون حضرات نے اصول تدوین کو پیش نظر نہیں رکھا۔ تساہل سے کام لے کر کتاب مرتب کی اور چھپوا دی۔ ایسی کتابیں مغالطے پیدا کرنے کا سبب ہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ جب ان کتابوں کو سامنے رکھ کر تنقیدی مضامین لکھے گئے تو ان میں مزید غلطیاں در آئیں۔ غلط نتائج اخذ کیے گئے، اس لیے کتاب کا صحیح طور پر مدون ہونا ضروری ہے تاکہ مغالطے پیدا نہ ہوں، اور غلطیوں کا سد باب ہو جائے۔

کتابوں کی تدوین بڑا کٹھن کام ہے نمونہ کے طور پر ہماری مرتبہ کتابیں ہنگامہ دل آشوب، رانی کیتکی، گل رعنا مطبوعہ انجمن ترقی اردو اور نسخہ شیرانی مطبوعہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور دیکھیے نیز عاشور نامہ جو کتاب میں شامل ہے۔ ان سب میں اصول تدوین کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ عاشور نامہ میں اصولی تسامحات اور غلطیوں کی نشاندہی کی گئی۔

کسی مخطوطے کی تدوین و ترتیب کے لیے کچھ اصول و ضوابط کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے، ان میں سے کچھ کا تعلق مرتب و مدون کی ذات سے اور کچھ کا تعلق مصنف، کاتب اور کتاب کے متن سے ہے، امور ذیل کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

۱۔ کسی مخطوے کی تدوین و ترتیب میں سب سے پہلی بات مخطوطے کی کیفیت و حالت بتائی جائے۔

الف۔ مکمل ہے یا ناقص ہے۔ ناقص ہے، تو ابتدا میں، درمیان میں یا آخر میں نقص ہے۔ وضاحت کی جائے۔

ب۔ کرم خوردہ ہے تو اس کا متن پر کیا اثر ہے؟
ج۔ آبزدہ ہے، تو آبزدگی سے متن کس حد تک متاثر ہے؟
د۔ کاغذ کیسا ہے؟ کتنا خستہ ہے؟ خستگی کی وجہ سے متن پر کیا اثر ہوا ہے؟
ہ۔ شکستگی کے آثار کہاں کہاں ہیں؟ کتنے اوراق شکستہ حالت میں ہیں؟
و۔ کتاب کا سائز کیا ہے؟
ز۔ متن کی پیمائش کیا ہے؟
ح۔ فی صفحہ کتنی سطریں ہیں؟ پورے مخطوطے کا ایک ہی مسطر ہے، یا مختلف ہے؟
ط۔ کتنے اوراق ہیں؟
ی۔ ورق شماری یا صفحہ شماری کی گئی ہے؟
ک۔ ورق کے جفت صفحہ کی رکاب میں صفحہ آیندہ کے لیے ترک ہے یا نہیں؟
ل۔ مخطوطے میں جدول، حاشیہ، لوح اور اس کی گلکاری اور تصاویر وغیرہ ہوں تو ان کی وضاحت کی جائے۔
م۔ حاشیے میں جہاں جو کچھ لکھا گیا ہو، وہ بھی ظاہر کیا جائے۔ اصلاح ہے، یا الفاظ کے معنی لکھے ہوئے ہیں۔ یا چھوٹے ہوئے الفاظ یا جملے۔
ن۔ بین السطور جو کچھ اور جہاں تحریر ہو ظاہر کیا جائے اصلاح، معنی وغیرہ میں جو بھی ہو۔
ص۔ آبزدگی کرم خوردگی، شکستگی اور خستگی کی زد میں آنے والے لفظوں، جملوں، مصرعوں، شعروں کی نشاندہی کی جائے۔
۲۔ کاتب کے متعلق بھی مخطوطے کی روشنی میں بتایا جائے کہ:
الف۔ پڑھا لکھا ہے یا کم سواد ہے۔
ب۔ خوشخط ہے یا بدخط ہے؟
ج۔ خط نسخ ہے یا نستعلیق یا شکستہ؟
د۔ غلط نویس ہے تو املا کی کس قسم کی غلطی کرتا ہے؟
۳۔ نسخۂ زیر تدوین کی نوعیت کیا ہے؟ امور ذیل بیان کرنے اور پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔
الف۔ مخطوطہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، تو یہ سب سے بہتر ہے۔

ب۔ نسخہ مصنف کا دیکھا ہوا یا صحیح کیا ہوا ہو تو کن دیگر نسخوں سے زیادہ وقیع و معتبر ہے۔
ج۔ متعدد نسخوں کی موجودگی میں جو نسخہ بلحاظ کتابت سب سے مقدم ہو اور مکمل ہو تو اسے بنیادی نسخہ قرار دیا جائے۔
د۔ بنیادی نسخے کے علاوہ دوسرے نسخوں کو ذیلی نسخہ رکھا جائے۔ ان کے ضروری اختلافات ظاہر کیے جائیں۔

ہ۔ بنیادی نسخے کی خصوصیات و ترجیحات بیان کی جائیں کہ ان وجوہ کی بنا پر اس کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

۴۔ مصنف کے متعلق امور ذیل بیان کیے جائیں:
الف۔ جہاں تک ممکن ہو سکے اس کے جامع اور مفصل حالات زندگی بیان کیے جائیں۔
ب۔ مصنف کی علمی استعداد بتائی جائے۔
ج۔ فنی صلاحیتیں بیان کی جائیں۔
د۔ مصنف کا انداز و اسلوب واضح کیا جائے۔
ہ۔ مصنف کے دور کی خصوصیات بتائی جائیں۔
و۔ معاصرین و معاصرانہ چشمک کا بقدر ضرورت ذکر کیا جائے۔
ز۔ مصنف کا اپنے عہد میں کیا مرتبہ رہا۔ ادب و معاشرے کی روشنی میں اس کا مرتبہ متعین کیا جائے۔
ح۔ مصنف نے یہ کتاب کس پس منظر میں لکھی؟ کون محرک ہوا؟ یا کن محرکات کی وجہ سے لکھی۔
ط۔ مصنف کے پیش نظر اس کتاب کی افادیت کیا تھی؟
ی۔ مصنف مقصد تصنیف میں کس حد تک عہدہ بر آ ہوا ہے؟

۵۔ متن کتاب سے متعلق مدوّن و مرتب کو حسب ذیل امور انجام دینے فرض ہیں:
الف۔ سب سے پہلے کتاب کا متن درست کیا جائے۔
ب۔ کتاب میں تقسیم ابواب نہ ہو تو تقسیم ابواب کرے۔
ج۔ عنوانات نہ قائم کیے گئے ہوں، تو عنوانات قائم کرے۔
د۔ مخطوطے کی خواندگی کے لیے کاتب کے روش قلم و املا کا ایک نقشہ تیار کرے، تاکہ قرأت میں آسانی رہے۔

ہ۔ اکثر کاتب اپنی صوابدید سے لفظوں، جملوں کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ یہ اضافہ متعدد نسخے میں ہوں تو بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ مقابلہ کرنے سے پتہ چل جاتا ہے، ورنہ تسلسل عبارت و ربط مضمون و نفس مضمون سے عدم مطابقت اضافوں کو ظاہر کر دیتی ہے۔ ان کی نشاندہی کی جائے۔

و۔ یہ کاتب لفظوں کی املا اپنی روش کے مطابق لکھتا ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی کاتب ایک ہی لفظ کی املا میں خود بھی فرق کر لیتا ہے۔ ایسے مقالات کی نشاندہی کر دینی چاہیے بلکہ ان میں یکسانیت کر دینی چاہیے۔

ز۔ قدیم مخطوطہ میں نقاط لگانے کی روش کا علم ہونا چاہیے جو مخطوطے کے چند اوراق کا غائر مطالعہ سے حاصل ہو جاتا ہے۔

ح۔ گ، گھ کو بیک مرکز لکھا جاتا تھا، یہ بھی تمیز کرنے کی ضرورت ہے کہ کہاں "گ"، "گھ" ہے؟

ط۔ یائے معروف (ی) اور یائے مجہول (ے) کی بھی پہچان ضروری ہے، کیونکہ قدیم عہد میں ان میں کوئی امتیاز روا نہیں تھا، معروف مجہول کو ایک ہی طرح لکھتے تھے۔

ی۔ ہائے ہوز اور ہائے مخلوط التلفظ یعنی دو چشمی ہا(ھ) میں کوئی تمیز نہیں تھی۔ ان میں تمیز قائم کی جائے۔

ک۔ قدیم میں ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ، ڑ، ڑھ میں علامت ط نہیں لگاتے تھے۔ ان کے لیے نقاط کے ذریعہ کبھی کبھی تمیز کر دیتے تھے۔ اس کا جاننا اور سمجھنا ضروری ہے کہ کاتب نے کیا روش اختیار کی ہے۔

ل۔ کتابت کی غلطیوں کی نشاندہی کرے۔

م۔ غائب اوراق کی نشاندہی کرنی چاہیے۔

ن۔ اکثر ترتیب اوراق بدل جاتی ہے اس کا علم رکاب میں ترک کے لفظ سے چل جاتا ہے۔ اس تبدیلی کا اظہار ضرور ہونا چاہیے۔

٦۔ ایک مرتب کے پیش نظر امور ذیل کا ہونا ضروری ہے بلکہ اس میں یہ صلاحیت و اوصاف بھی ہوں۔

الف۔ کتاب یا مخطوطے کا جس زبان سے تعلق ہے مرتب و مدون کو اس زبان پر کلی عبور حاصل ہونا چاہیے، وہ اس زبان کی خصوصیات بھی جانتا ہو۔

ب۔ تصنیف کے اسلوب، انداز علمی و فنی لوازمات و خصوصیات سے کماحقہ واقفیت

حاصل ہو۔

ح۔ مصنف کی افتاد طبع، رجحانات و میلانات سے بھی آگاہی رکھتا ہو۔ یہ مصنف کی زیر تدوین کتاب یا اس کی دوسری تصانیف سے حاصل ہو سکتی ہے۔

د۔ زیر تدوین کتاب کا مطالعہ اس نہج سے کیا جائے کہ جملہ مباحث و مطالب اس کے ذہن نشین ہو جائیں۔

ہ۔ کتاب کے مضامین میں ربط و تسلسل قائم رکھنے کی صلاحیت ہو۔

و۔ کتاب میں الحاقی عناصر کو داخل متن نہ ہونے دے، ان کی نشاندہی کرے۔ بہ دلائل بتائے کہ یہ الحاقی ہیں۔

ز۔ کتاب میں آبزدگی، شکستگی اور خستگی کی وجہ سے نفس مضمون میں جو خلا واقع ہو اسے دور کرنے کی کوشش و نشاندہی کرے۔

ح۔ اگر کتاب میں کچھ ورق غائب ہیں، تو ان کی نشاندہی کرے۔ ان غائب اوراق کے خلا کو ممکنہ ذرائع بروئے کار لا کر پُر کرے۔

ط۔ اکثر ترتیب اوراق بدل جاتی ہے کہیں کا ورق کہیں لگ جاتا ہے۔ ایسے اوراق کو تلاش کر کے، ان کو صحیح مقام پر لے آئے اس میں رکاب میں ترک کے لفظ سے مدد لی جائے۔

ی۔ متن سے غائب لفظوں، جملوں مصرعوں اور شعروں کے خلا کو پر کرنے کی کوشش کرے۔ اصل دستیاب نہ ہونے کی صورت میں قیاس سے یہ کام نکالا جا سکتا ہے۔ مگر یہ قیاسی عمل زبان و بیان اور اسلوب کے لحاظ سے تصنیف کے مطابق ہونا چاہیے۔

ک۔ کتاب کی زبان، مطالب اور مفاہیم پر اتنا عبور حاصل کرے کہ متن کی صحت کما حقہ کر سکے۔

ل۔ کتاب کے زمانے تحریر کے رسم الخط اور املائی خصوصیات کا علم ہو، اختلاف خطی و املائی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی نشاندہی کرے۔

م۔ اختلاف نسخ مختلف نسخوں کو سامنے رکھتے ہوئے بتائے۔ مگر ضروری اور اہم اختلافات پیش کرے۔

ن۔ زیر تدوین کتاب کے ہم موضوع دوسرے مصنفوں کی کتب سے مقابلہ و موازنہ کر کے صحیح نتائج اخذ کر کے پیش کرے۔

س۔ عروض سے واقف ہو، تاکہ کوئی شعر یا مصرع ساقط الوزن شامل نہ ہو جائے،

شعر کو شعر کے انداز میں لکھا جائے۔ باذوق بھی ہو کہ شعر کی مختلف جہات کو سمجھ سکے۔

ع۔ قدیم کتب میں لفظوں کے عوامی تلفظ بھی اشعار میں نظم ہوئے ہیں، لفظ کی املا تو مروجہ لکھی جاتی ہے مگر تلفظ عوامی ہوتا ہے، جو آج کے تلفظ سے جدا اور مختلف ہوتا ہے۔ ایسے لفظوں کا عوامی تلفظ بنایا جائے تاکہ شعر الوزن نہ ہو جائے۔

ف۔ متن میں وہ الفاظ اور جملے جو بنیادی نسخے میں نہیں، تو جس نسخے سے ماخوذ ہیں ان کی نشاندہی کی جائے اور نسخے کا حوالہ بھی دیا جائے۔

ص۔ بنیادی نسخے سے غائب الفاظ وغیرہ کی جگہ ربط و تسلسل مضمون کے مطابق مرتب نے جو کچھ خود متعین کیا ہے تو اس کا اظہار کیا جائے۔

ق۔ مشکل، نامانوس، غیر مروج الفاظ کی فرہنگ بنائی جائے، تلمیحات اور کہاوتوں کی تشریح کی جائے۔

ر۔ دوسری زبانوں کے اقوال (اشعار) ضرب الامثال وغیرہ کی تشریح و ترجمہ لکھا جائے

ش۔ رموز اوقات، پیرابندی وغیرہ کا التزام رکھا جائے۔

ف۔ کتاب کی تدوین و ترتیب کے لیے جو اصول و ضوابط اختیار کیے جائیں، ان پر آخر تک کاربند رہنا چاہیے۔

مندرجہ بالا امور میں حسب ضروری اور بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کا انحصار کتاب کی نوعیت اور ضرورت پر ہے۔ مرتب کی اپنی صوابدید جس کی متقضی ہو، اس کو اختیار کیا جائے۔ یہ اصول اور ضوابط صرف رہنمائی کی غرض سے بتائے گئے ہیں۔

مذکورہ اصول کا تعلق بظاہر مخطوطات سے ہے مگر یہ قدیم مطبوعہ کتب کی تدوین و ترتیب میں بھی رہنمائی کریں گے۔ بیشتر امور کا تعلق ایسی کتب سے بھی ہے جو اب سے پچاس سال پہلے تک طبع ہوئی ہیں ان میں سے بعض کتب کی کتابت میں وہی قدیم طرز اختیار کیا گیا ہے، جو اس زمانے یا اس سے پیشتر مخطوطات میں مروج تھا۔ بلا توقف عبارت لکھتے چلے جاتے تھے حتیٰ کہ اشعار تک نثری انداز میں لکھنے کا رواج پڑ گیا تھا۔ قدیم مطبوعہ کتاب کو دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق مدوّن و مرتب کرنا چاہیے۔

یہ مجمل اشارات ہیں اگر ان کو بالتفصیل، امثلہ و شواہد کے ساتھ لکھا جاتا تو ایک مبسوط کتاب ہوتی۔ آیندہ بالتفصیل و بالتشریح عہد قدیم و جدید سے مثالیں دے کر بالتوضیح پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ خدا سے ہمت و توفیق کی استدعا ہے۔

(بہ شکریہ "اخبار اردو")

ڈاکٹر اسلم فرخی

درویش خدامست......

محمد احمد سبزواری

۱۹۳۹ کا سال عالمی تاریخ میں یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سال دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہوا جس میں اتحادیوں نے جوہری توانائی کی دریافت سے فائدہ اٹھا کر محوری طاقتوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایٹم بم کا تجربہ مشرق میں کیا گیا تھا۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر ۱۹۳۹ ہی کا دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ ایک ہونہار، ذہین، محنتی اور لائق طالب علم نے جامعہ عثمانیہ سے معاشیات میں ایم اے اول بدرجہ اول پاس کر لیا مگر چونکہ وہ ملکی نہیں تھا اس لیے جامعہ عثمانیہ میں مسند استادی پر سرفراز نہ ہو سکا۔ البتہ پی ایچ ڈی کے لیے اس کو جامعہ سے وظیفہ منظور ہو گیا۔ اس طالب علم کا قدیم تر تعلق سبزوار (ایران) قدیم تعلق دیوبند / تھانہ بھون اور جدید تعلق بھوپال سے تھا اور ع "کیسا یہ تعلق ہے کہ جانوں یہ نہیں ہے"۔ یہ غریب طالب علم حصول علم کے شوق میں اپنی کم مائیگی کی وجہ سے اورنگ آباد کالج میں داخلہ لے کر مسجد میں ٹھہرنے کے خیال سے برتن بھانڈا بھی ساتھ لے کر گھر سے نکلا تھا لیکن قسمت نے یاوری کی، ذاتی محنت اور لیاقت کام آئی، وظیفہ پر وظیفہ ملتا گیا، نوجوان اور حوصلہ مند محمد احمد سبزواری اساتذہ کی آنکھ کا تارا بن کر علم کے افق پر چمکتا مگر ٹوٹے ہوئے تارے کے مہ کامل بننے کا موقع آیا تو ملکی اور غیر ملکی کا سوال پیدا ہو گیا۔ شاید یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا ورنہ عین ممکن تھا کہ مسند استادی پر فائز ہونے کے بعد سبزواری صاحب کی مہم جو طبعیت کو سکون مل جاتا اور ایک بے قرار روح جامعہ عثمانیہ کی عظیم راہ واریوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتی۔

انسانی زندگی جہد مسلسل اور مقابلے سے نکھرتی ہے، محمد احمد سبزواری نے ساری زندگی جدوجہد میں گزاری، اگر وہ تیسری دنیا کے باشندے نہ ہوتے تو ان کے کارناموں کو سراہنے کے لیے اکیڈمیاں اور ادارے بنتے۔ ان کی تحقیق کی روشنی میں مزید تحقیق ہوتی۔

کسی من چلے کو خیال نہیں آیا ورنہ شاید اکیڈمی تو یہاں بھی بن جاتی مگر اس وقت اس اکیڈمی کے سبزہ زار میں نغمہ شادی کی گونج، ریشم کی سرسراہٹ، چوڑیوں کی کھناکھن اور دیگوں کی ٹھناٹھن میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی، گنہ گار آنکھیں یہ تماشہ شب و روز دیکھتی رہتی ہیں، بقول مرزا غالب ع

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوس زر
کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آوے

یقین نہ ہو تو بنیا چورنگی پر ایک مایۂ ناز درویش مصور کے نام سے موسوم ہونے والی آرٹ گیلری میں شادیوں کی بہار دیکھ لیجیے۔

سبزواری صاحب تعلیم سے فارغ ہوئے تو بھوپال میں خدمت انجام دینے لگے، بڑے کامیاب رہے۔ سات برس مسلسل بھوپال سے غیر حاضر رہے تھے مگر واپس آئے تو ماحول سے اس طرح ہم آہنگ ہو گئے جیسے کبھی باہر گئے ہی نہیں تھے، ملازمت میں بھی بڑے کامیاب رہے، علم کا وفور تھا، جہدِ مسلسل کا شعور تھا، ہمت تھی، حوصلہ تھا، صلاحیت ذاتی کا نور تھا جس محکمے میں رہے اجالا پھیلاتے رہے۔ چراغ بزم دیدہ وراں رہے، دو اور دو چار کے ماہر تھے مگر مشاعروں میں شریک ہی نہیں رہے صدارت بھی کرتے رہے۔ اس صدارت کے عمل سے مجھے اکثر یہ شبہ بھی ہوا کہ زندگی کے کسی نہ کسی دور میں سبزواری صاحب شاعروں کے خارزار سے بھی گزرے ہوں گے مگر سارے فسانے میں اس بات کا ذکر نہیں اور ذکر ہو بھی کیسے، انھوں نے اس سلسلے میں بڑی احتیاط اور رازداری سے کام لیا ہے۔ صرف سکندر علی وجد، فانی بدایونی مخدوم محی الدین اور اختر سعید خان جیسے شاعروں پر مضامین اور فہمی ترمذی کے شعری مجموعے کے مقدمے سے اس ذوق کا ثبوت ملتا ہے مگر یہ داستان بعد میں بیان ہوگی پہلے میں ان کے اس اہم کارنامے کا ذکر کروں گا جو ان کی اوّلیات میں ہے مگر انھوں نے از راہ انکسار اسے بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے ایک بار مجھے والد مرحوم کے ساتھ امپریل بینک کی مقامی شاخ میں جانے کا اتفاق ہوا، دولت خانے کے عجائبات دیکھے مگر سب سے بڑا اعجوبہ یہ تھا کہ ایجنٹ سے لے کر چپراسی تک سارا عملہ غیر مسلم تھا، چند دن بعد ایک روز سنٹرل بینک میں بھی یہی کیفیت دیکھی، کانپور، لکھنؤ، آگرہ، دلّی جہاں گیا یہی نظر آیا کہ کسی بینک میں کوئی مسلمان کارکن نہیں ہے۔ سارے کے سارے غیر مسلم ہیں۔ یہ بھی خیال آیا کہ جس طرح ریاضی مسلمانوں کے لیے شجر ممنوعہ کا حکم رکھتی ہے اسی طرح

ساہوکارے کا حساب کتاب بھی "طریقہ راسخہ مسلمانان" سے الگ تھلگ ہے "ہٹاؤ میاں! کیا روپے پیسے کا حساب کتاب، شرفا میں اسے مرتبے سے گرا ہوا سمجھا جاتا ہے، ہاتھ کے میل کو سر نہیں چڑھانا چاہیے" خیال کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا مگر کچھ عرصے بعد ایک کتاب نظر سے گزری، نام تھا "ہمارے بینک" مؤلف تھے محمد احمد سبزواری تو سمجھ میں آیا کہ بینکاری کوئی ایسا ہوّا نہیں کہ مسلمان خواہ مخواہ اس سے بد ظن ہوں اور ساہوکارے کی حقیقت بھی سمجھ میں آئی۔ "ہمارے بینک" اردو زبان میں بینکاری پر پہلی کتاب تھی، بینکاری کی معلومات فراہم کرنے، شوق پیدا کرنے اور اسے ذہن نشین کرانے میں سبزواری صاحب کی اولیت اور اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس کتاب کی وجہ سے لوگ بینکاری سے واقف ہوئے اور اس کی افادیت واضح ہوئی۔ یہ سبزواری صاحب کا بڑا اہم کارنامہ ہے، اس طرح جو بینکاری ان کا اختصاص بنی تو آج تک انھیں کے ساتھ وابستہ چلی آرہی ہے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد بینک دولت پاکستان کے گورنر زاہد حسین مرحوم نے بابائے اردو مولوی عبدالحق سے اردو میں اصطلاحات بینک کاری کے ایک مجموعے کی فرمائش کی۔ مولوی صاحب نے یہ کام سبزواری صاحب کے سپرد کر دیا، وہ ان دنوں انجمن کے اہتمام میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے "معاشیات" کے مدیر بھی تھے، ان سے بہتر آدمی کون ملتا، انھوں نے کم سے کم مدت میں ایک مجموعہ تیار کر دیا جو شائع ہوا، یہ اصطلاحات بینکاری کی اولین فرہنگ تھی، وقت کے ساتھ ساتھ صنعتی ترقی ہوتی رہی، صنعتی ترقی ہوئی تو بینکاری کا افق بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، انجمن ترقی اردو نے ایک بار پھر بینک دولت پاکستان کے تعاون سے بینکاری کی ایک مبسوط فرہنگ کا منصوبہ بنایا، پھر وہی سبزواری صاحب، اس دفعہ بھی انھوں نے کم سے کم مدت میں ایک مبسوط فرہنگ مرتب کر دی، میں ان دنوں انجمن کا مشیر علمی و ادبی تھا لہٰذا سبزواری صاحب سے دن رات واسطہ رہا اور قدم قدم پر استفادے کا موقع ملا۔ اس فرہنگ کی دو اشاعتیں شائع ہو چکی ہیں، جس کا جی چاہے دیکھ لے اور سبزواری صاحب کی محنت اور دیدہ وری کی داد دے۔ اصطلاحات کے تراجم اور اصطلاحات سازی میں انھیں بڑا کمال حاصل ہے، ایسا برجستہ ترجمہ کرتے ہیں اور ایسی موزوں اصطلاح تجویز کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، اصطلاحیں تراشنے میں انھیں فطری ملکہ حاصل ہے۔ ان دنوں بینکاری کی جدید ترین اصطلاحوں کی ایک توضیحی لغت کی ترتیب و ترجمے کا کام ان کی سربراہی میں ہو رہا ہے۔ انھوں نے از راہ شفقت بزرگانہ مجھے

بھی اس کام میں شریک کر رکھا ہے اور استفادے کا موقع دیا ہے۔ اصطلاحات عمرانیات اور ماحولیات کی فرہنگوں کے ترجمے میں بھی ان کا ساتھ رہا اور اندازہ ہوا کہ انھیں ان موضوعات پر غیر معمولی دسترس حاصل ہے، انھوں نے قانونی اصطلاحوں اور نجانے کون کون سی اصطلاحوں کے ترجمے کر دیے ہیں۔

سبزواری صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ادب و شعر سے لے کر بینکاری ،معاشیات، معاشرتی جائزے، مختلف ملکوں کے تاریخی، معاشی، معاشرتی احوال، تبصرے، ترجمے رپورٹیں ۱۹۳۵ سے ۱۹۹۶ تک اکسٹھ برس کی مدت ہوتی ہے' اس ساری مدت میں وہ جہاد بالقلم میں مصروف رہے ہیں اور آج بھی مصروف ہیں، روزنامہ جنگ میں ان کا معاشی جائزہ بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے اور علمی انداز سے ماہرانہ انداز کا حامل ہوتا ہے۔ کاش ان کی خود نوشت کتابی صورت میں شائع ہو جاتی، یہ بھی ایک بڑا کارنامہ ہے، سادہ، برجستہ، دلچسپ، ایک خاموش مجاہد کی روداد حیات، بھوپال حیدر آباد اور پاکستان کے علمی ادبی اور ثقافتی ماحول کی سچی جھلک، ایک سچے انسان کی جدوجہد کا مرقع مگر آداب مشرق کی پابندی نے کہیں کہیں پہلو بچانے پر بھی مجبور کیا ہے۔ مثلاً اپنی شادی اور بیگم کے حوالے سے یہ تو لکھا ہے کہ میری والدہ ابو سعید بزمی سے اپنی پسندیدہ بیٹی کے سلیقے اور صورت شکل کی بہت تعریف کرتی تھیں مگر یہ نہیں لکھا کہ اس تعریف کے بین السطور میں خود ان کی پسند اور تعریف کو کتنا دخل تھا، بیگم کی رفاقت سے ان کی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوئے انھیں بھی گول کر دیا ہے۔ میں نے بھی صرف ایک مرتبہ ان کی زبان سے بیگم کی سادگی اور معصومیت کا تذکرہ سنا۔ ہوا یہ کہ ایک دوپہر جبکہ گھر اور گلی میں سناٹا تھا ایک ٹھگ بشکل ڈاکٹر گھر میں داخل ہوا اور بہلا پھسلا کر بیگم سبزواری کے دونوں ہاتھوں سے سونے کے بھاری کڑے اتروا کر چمپت ہو گیا۔ سبزواری صاحب نے یہ واقعہ جب مجھے سنایا تو ان کے لہجے اور انداز بیان سے بیگم کی سادگی اور معصومیت کا بھی پورا اظہار ہو رہا تھا، نقصان کا کوئی شکوہ یا پچھتاوا نہیں تھا، سبزواری صاحب کے مزاج میں بڑا تحمل ہے۔ انھوں نے اپنی بیگم کے سانحۂ وفات کو بھی بڑے صبر اور تحمل سے برداشت کر لیا، اپنے غم کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا، یہ بڑے حوصلے اور ظرف کی بات ہے۔

حوصلے کی بات تو یہ ہے کہ آنکھوں میں موتیا کا پانی اتر آیا، نظر کمزور ہو گی مگر محدب شیشے سے لکھتے اور پڑھتے رہے۔ آنکھیں بن گئیں تو پھر تندہی سے کام میں لگ گئے، بیکار نہیں بیٹھے۔ ہار نہیں مانی۔ وہ اس وقت بحمداللہ ۸۳ برس کے مرد پختہ کار ہیں۔ اللہ تعالی انھیں ہزاری عمر عطا فرمائے۔ جوانوں سے زیادہ محنت کرتے ہیں، مستعد اور حوصلہ

مند ہیں، ہمہ جہت ہیں، علمی سربلندی اور سرفرازی کے باوجود سادہ مزاج ہیں، وقت کے پابند ہیں، میں نے ان میں جھوٹی انا یا تال مٹول کرنے کا کوئی شائبہ بھی کبھی محسوس نہیں کیا۔ پیرالٰہی بخش کے ایک بوسیدہ مکان میں خوش و خرم رہتے ہیں۔ مصنوعی بڑائی اور تکلف کے قائل نہیں۔ بھوپال میں، حیدر آباد میں، کراچی میں، پشاور میں، امریکہ میں ہر جگہ مقبول اور ممتاز رہے۔ مزاج میں سادگی تو ہے مگر عزتِ نفس کا احساس بھی ہے۔ حیدر آباد میں سکندر علی وجد صاحب سے صاحب سلامت تھی مگر سبزواری صاحب نے یہ محسوس کیا کہ وہ سلام کرنے میں کبھی سبقت نہیں کرتے، متمنی رہتے ہیں کہ انھیں سلام کیا جائے، چنانچہ ان سے سلام کے بغیر ملتے رہے، مگر ان کی شخصیت اور فن پر دو مضمون لکھ کر ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بھی کر لیا۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ انھیں بعض اوقات ایسے بڑ توفیقوں سے بھی واسطہ پڑا جنھوں نے ان کی محنت کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کی، لیکن وہ ان اوچھے ہتھکنڈوں سے دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ اپنا کام کرتے رہے۔ جس زمانے میں وہ پشاور میں تھے تو ایک فنی کتاب کی تالیف شروع کی، محکمے کے سربراہ ہی زبردستی شریک ہو گئے، زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ سبزواری صاحب کام کرتے رہے۔ جب کتاب چھپ کر آئی تو انھوں نے دیکھا کہ مؤلف کی حیثیت سے اس افسر کا نام جگمگا رہا ہے اور ان کے نام کا کوئی ذکر نہیں۔ انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے اپنی محنت کے زیاں کو برداشت کر لیا اور کوئی شکایت نہیں کی۔

سبزواری صاحب ملنسار اور دوست نواز ہیں، تنہا خوری کے عادی نہیں، کاموں میں بھی دوسروں کو شریک کرتے ہیں، اپنی رائے مسلط نہیں کرتے، نرمی سے مشورہ دیتے ہیں، مناسب اصلاح کو خوش دلی سے قبول کر لیتے ہیں۔ حد درجہ ذمہ دار ہیں، ان کی ذمہ داری اکثر میرے لیے آزمایش بھی ثابت ہوئی کہ ادھر "فرہنگ اصطلاحات بینکاری" کا کوئی پروف آیا اور اگلے ہی دن تصحیح شدہ پروف واپس ہو گیا، اب ٹائپسٹ کو ڈھونڈیے، بلائیے، وہ بھی حیران کہ اس برق رفتاری سے کس طرح نمٹا جائے۔

سبزواری صاحب کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی حق پسندی اور استقلال مزاج ہے۔ انھوں نے اپنی طالب علمی ہی کے دور سے حق کے لیے سینہ سپر ہونے کا کامیاب مظاہرہ کیا ہے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد بھوپال کے عبید اللہ خاں ٹرسٹ کی غلط بخشیوں کے خلاف انھوں نے قلمی جہاد کیا اور یہ جہاد اس وقت تک جاری رہا جب تک ٹرسٹ نے ان کا حق تسلیم نہیں کیا، دلچسپ بات یہ ہے کہ بھوپال میں انھیں "سبزواری" سمجھ کر تعلیم

وظیفے سے محروم رکھا گیا۔ حیدر آباد میں بھوپالی قرار دیے گئے اور ملازمت کے لیے نا اہل گردانے گئے۔ بھوپال چھوٹ گیا۔ مدتیں ہو گئیں لیکن بھوپال کی یادیں آج بھی تر و تازہ اور شگفتہ ہیں۔ انھوں نے بھوپال کی ادبی شخصیتوں اور منظر نامے کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ بھوپال کی ثقافتی تاریخ کا مستند سرمایہ ہے۔

سبز واری صاحب کو بھوپال سے بے پناہ محبت ہے، بھوپال کے حوالے سے انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت بر صغیر میں ان سے بڑا بھوپال شناس کوئی اور نہیں ہے۔ پچھلے دنوں بھوپال کے حوالے سے ایک رسالے نے بڑا ضخیم نمبر شائع کیا۔ اس میں سبز واری صاحب کے پانچ مضامین ہیں اور یہی مضامین سارے رسالے کی جان ہیں۔ اگر یہ مضامین اس رسالے میں شائع نہ ہوتے تو اس کی کوئی علمی یا معلوماتی حیثیت نہ ہوتی۔ حق یہ ہے کہ سبز واری صاحب نے بھوپال کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان مضامین سے عبدالحلیم شرر کے "گزشتہ لکھنؤ" کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اگر سبز واری صاحب بھوپال کے حوالے سے ایک پوری کتاب لکھ دیں تو یہ بڑا مفید کام ہوگا۔

سبز واری صاحب ہمسایۂ خدا ہیں، مسجد کے عقب میں رہتے ہیں اور اپنے ہمدم دیرینہ صہبا لکھنوی کے ساتھ پابندی سے نماز با جماعت ادا کرتے ہیں۔ صہبا سے انھیں تعلق خاطر ہی نہیں، محبت ہے۔ اسی محبت کی وجہ سے سبز واری صاحب نے اپنی خود نوشت لکھ ڈالی۔ لکھوانے والے صہبا صاحب تھے لکھنے والے سبز واری صاحب، دونوں برابر کے شریک ہیں۔ سبز واری صاحب کی زندگی کا آئینہ بڑا شفاف (آج کل کے سیاسی عمل اور الیکشنوں کی طرح نہیں) اور روشن ہے، ان کی عبادت اور ریاضت کے حوالے سے مجھے حضرت سلطان جیؒ کا ایک بیان یاد آتا ہے۔ حضرت والا نے فرمایا "عبادت کی دو قسمیں ہیں لازم اور متعدی' لازم تو یہی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ، اس کا فائدہ عبادت گزار کو پہنچتا ہے۔ متعدی عبادت وہ جس سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ داد و دہش، خیر خیرات اور خدمت خلق، عبادت لازمی میں ثواب، اسی وقت حاصل ہوگا جب آدمی کی نیت نیک ہو، لیکن عبادت متعدی میں نیت کی شرط نہیں، اس کا ثواب ہر حال میں پہنچتا ہے" سبز واری صاحب جو کام کر رہے ہیں' علم کو فروغ دے رہے ہیں۔ آگاہی میں اضافہ کر رہے ہیں، ذہنوں میں اجالا پھیلا رہے ہیں۔ وہ سب عبادت متعدی میں داخل ہیں اور اس فیضِ جاریہ سے انھیں لحہ بہ لحہ ثواب حاصل ہو رہا ہے۔ خوش نصیب ہیں سبز واری صاحب۔

(بھوپال نواز انٹر نیشنل فورم کی تقریب تقسیم انعامات منعقدہ کراچی میں پڑھا گیا)

ڈاکٹر سید حامد حسین
۵۔ سلور لائن اپارٹمنٹس
اے سیکٹر (بی ڈی اے)
کوہ فضا، بھوپال

کچھ ناموں اور عرفیتوں کے بارے میں

جیسے ہی کسی فرد کا سماجی شعور بیدار ہوتا ہے، سب سے پہلے اس کی نگاہ کا مرکز اس وقت موجود سماج کی تہذیبی سیڑھی بنتی ہے اور فرد کسی تہذیبی گروہ کو اعلاترین مان کر اس کی اشکال و خصوصیات کو اپنا ماڈل بنالیتا ہے اور اس کی تقلید کو اپنی زندگی کا خاص مقصد سمجھتا ہے۔ اس کا اثر اس کی زبان، اس کے پہناوے، اس کے اطوار پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ مغل شاہزادے، منصب دار، زمیندار، نواب اور راجا کی زندگی بڑی شان و شوکت کی مالک اور بھڑکیلی اور پُرکشش معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بعد انگریزوں نے حکمرانی سنبھالی اور یوروپین طرز زندگی نے اپنا اثر ڈالنا شروع کیا۔ اب انگریز رخصت ہو چکے ہیں مگر امریکہ دنیا کی ایک بڑی سیاسی اور معاشی طاقت کی شکل میں ہی نہیں ابھرا ہے لوگ اب اسے جدید طرزِ حیات کے لیے مثالی نمونہ ماننے لگے ہیں۔

تہذیبی معاملات میں کسی گروہ کا اثر سب سے آسانی کے ساتھ ان ناموں پر دیکھا جا سکتا ہے جو لوگ اپنے بچوں کے رکھتے ہیں یا جن عرفیتوں سے وہ بچوں اور اپنے دوسرے چہیتوں کو بلاتے ہیں۔ اب ''بے بی'' کو ہی لے لیجیے۔ کون سا گھر ہے جو بے بیوں اور باباؤں سے خالی ہو بلکہ ہم تو ایک بے بی خالہ کو بھی جانتے ہیں۔ یہ معزز خاتون جب شیر خوار بچی تھیں تب ان کے والدین انھیں بے بی کہا کرتے تھے۔ اسکول والے بھی والدین کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے رپورٹ بی بی زرینہ کے نام سے بھیجنے لگے۔ لیکن کچھ سال بعد انھیں اسکول والوں کو بے بی کہنے میں کچھ تکلیف ہونے لگی۔ ادھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اسکول کے آخری سالوں میں انھوں نے ایک ڈرامے میں پارٹ کیا، جس کو پسند کیا گیا اور

نئی خواہشوں کے ساتھ ایک بار پھر "بے بی" بیدار ہوئی اور اس شدت سے بیدار ہوئی کہ دنیا ان کے اصل نام اور سال پیدائش دونوں کو بھول گئی۔ لیکن وقت نے ان کی اصلیت کو فراموش نہیں ہونے دیا اور بالآخر ایک دن جب وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھیں عکس نے ہاتھ بڑھا کر ان کے چہرے پر سے اطمینان کو نوچ لیا۔ ابھی تک ان کے چہرے پر تین شکنیں نمودار ہوتی تھیں: غصے کی شکن، ساری کائنات کو حقیر سمجھنے کی شکن اور نخرے کی شکن لیکن اب کئی شکنیں، چھوٹی بڑی ادھر ادھر پڑنے لگیں۔ ان کا کوئی نام نہیں تھا۔ لیکن تھیں دشمن شکنیں۔ اور پھر ہماری بے بی نے ہتھیار ڈال دیے اور دنیا کو اجازت دے دی کہ انھیں "بے بی آپا" کہا جائے۔ اس کے بعد عمر کی ڈھلوان پر ان کا مقدر اتنی تیزی کے ساتھ پھسلا کہ بالآخر ،،بے بی آنٹی" اور "بے بی خالہ" کہلانے لگیں لیکن اب بھی "بے بی" کی آواز سن کر ان کے کانوں کے اندر جل ترنگ بجنے لگتا ہے۔

"بابا" کا معاملہ دوسرا ہے۔ جب انگریز عہدیداروں اور ہندستانی تعلقہ داروں کے یہاں اینگلو انڈین آیائیں رکھی جانے لگیں تو انھیں خاندان کے ولی عہدوں، شاہزادوں اور صاحبزادوں کو لڑکیوں کی طرح "بے بی" کہنا ایک نہایت افسوسناک گستاخی محسوس ہوا اور انھوں نے "بے بی" کی جگہ اس کا مذکر لفظ "بابا" خود ایجاد کر لیا۔ ہندستان میں اس لفظ نے جلد ہی جڑیں پکڑ لیں۔ اب بازار میں "باباسوٹ" بھی ملتا ہے اور "باباگاڑی" بھی اور گلیوں میں "بابالوگ" دھوم مچاتے دیکھے جا سکتے ہیں۔

اب بابا لوگوں اور بے بی لوگوں کے کچھ ناموں پر نظر ڈال لیجیے۔ کچھ لاڈلے بڑے پیار کے ساتھ "چیکو" کہلاتے ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہم نے خوبانی چھوڑ دی، آلو بخارا چھوڑا، سارے خوبصورت اور خوشنما پھل چھوڑے اور اپنے لاڈ پیار کے اظہار کے لیے چنا تو سیاہ فام چیکو کا نام جسے ہمارے پسندیدہ وزیر لو بھی رام جی کی وہ پیاری بھینس بھی منہ نہیں لگاتی جس کے لیے ہر ماہ سوپر مارکیٹ سے ڈیڑھ کلو چیون پراش آتا ہے۔ لیکن جناب والا راز کچھ اور ہی ہے۔ اس کا تعلق بھی فیشن کی دنیا سے ہے جہاں ہر دل کو لبھانے والی چیز "شک" (Chic) ہوتی ہے۔ پھر نام میں ولایتی خوشبو بھی ہے۔ اسپینی زبان بولنے والے اپنے ننھے لاڈلوں کو Chico کہہ کر بلاتے ہیں۔

جب ہمارے پاس مسٹر اوبرائے نے اپنے دو سالہ بیٹے کا اپنے انگریز مہمان سے اس بچے کو "وکی" پکارتے ہوئے تعارف کرایا تو انگریز مہمان نے حیرانی سے پوچھا: "Is it so" دراصل "وکی" مختصر شکل ہے وکٹوریا کی اور یہ بات کہ وکٹوریا ایک بھاری بھرکم اور ناقابل

فراموش خاتون تھیں، تاریخ نے ہمارے ذہن میں اور اس کی بھرپور تصویروں نے ہماری نظروں میں محفوظ کر دیا لیکن ہم ایک آزاد ملک کے شہری ہیں اور دوسرے ملک کی خاص طور پر برطانیہ جیسے ملک کی جس نے صدیوں ہمیں غلام بنا کر رکھا' تاریخ کو انتقاماً بدل بھی سکتے ہیں اور تاریخی وکٹوریا کو فراموش کر کے اپنے نازک بدن لاڈلوں کو "وکی" کے نام سے پکار سکتے ہیں۔

"بن ٹی" ہمیں Buntings کی یاد دلاتا ہے جس کا مطلب وہ چھوٹی جھنڈیاں جو کسی تقریب کے موقع پر سجاوٹ کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ بولی ٹھولی میں "بن ٹی" کسی چھوٹے قد اور گٹھیلے بدن کے شخص کے لیے بولا جاتا ہے، خاص طور پر چھوٹے قد کی کسی ادھیڑ عمر کی عورت کے لیے۔ ہمارے یہاں "بن ٹی" زیادہ تر لڑکوں کے تعارف کے لیے ہی آتا ہے۔

ایک اور نام ہے "چنکی"۔ اصل میں یہ نام ایک عام چینی شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے، ایک ایسا شخص جو چھوٹے قد کا ہو اور اس کی آنکھیں ادھ کھلی ہوں۔ بچے بھی چھوٹے قد کے ہوتے ہیں اس لیے انھیں ننھے، چھوٹے، چنکی کہنے لگے۔

"پنکی" یوں تو صحت مند، گلابی رنگ جلد والے کے لیے ہوتا ہے، لیکن اس سے کوئی چھوٹی چیز بتائی جاتی ہے، جیسے ہاتھ کی چھوٹی انگلی۔ ہمارے یہاں بچے اور بچیاں دونوں "پنکی" ہوتے ہیں۔

"مکی" کے نام نے والٹ ڈسنی کے کارٹون کردار مکی ماؤس کی وجہ سے مقبولیت حاصل کی۔ اس کردار کو سب سے پہلے نومبر ۱۹۲۸ء میں "اسٹیم بوٹ ولی" نامی کہانی میں استعمال کیا گیا تھا جو پہلا متحرک کارٹون تھا۔ اب یہ بچوں کا سب سے زیادہ پسندیدہ کردار بن چکا ہے۔ خود لفظ "مکی" مائیکل نام کی مختصر شکل ہے اور مائیکل کو فرشتوں کا معزز سردار مانا جاتا ہے۔ انگریز شاعر ورڈزورتھ نے مائیکل کو ایک سادہ لوح دہقان کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ نام آئرلینڈ میں بھی کافی مقبول ہے اور انگریز، اپنے پڑوسیوں کے ساتھ رقابت کے جذبے کے تحت عام آئرش باشندے "مک" کے نام سے حوالہ دیتے ہیں اور "مک" کا مفہوم "بدھو" جیسا لیتے ہیں۔ کناڈا میں "مکی" شراب کی بوتل اور آسٹریلیا میں جنگلی بچھڑے کو کہتے ہیں۔

ہمارے یہاں "نِکی" بھی پائے جاتے ہیں، جب کہ اسے سن کر یوروپ والے تو لاحول پڑھیں گے کیونکہ وہاں شیطان کو "نِک" یا "اولڈ نِک" کہا جاتا ہے۔ انگلستان کی بولی ٹھولی نے "نِک" حوالات یا پولس اسٹیشن کو بھی کہتے ہیں لیکن ہمارے یہاں یہ نام "مِکی" سے ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے پسند کیا جاتا ہے۔

"سینڈی" کی عرفیت انگلستان میں کسی اسکاٹ لینڈ کے باشندے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ انگریز اسکاٹ لوگوں سے زبردست رقابت رکھتے ہیں اور حالانکہ یہ نام الیگزنڈر

کا مخفف ہے، اس کے اندر حقارت کی بو محسوس کی جا سکتی ہے۔ خود الیگزنڈر کا نام سکندر کے لیے آتا ہے اور الیگزنڈر کے معنی بنی نوع انسان کے محافظ کے ہوتے ہیں۔

"سنی" ہمارے یہاں تو ایک نام کی حیثیت سے بھی استعمال کیا جاتا ہے مگر انگلستان اور امریکہ اسے عام تخاطب یعنی "بیٹے" کی طرح بول چال میں لایا جاتا اور اس کے استعمال میں ایک قسم کی غیریت کا احساس ہوتا ہے۔

"راکی" کا تعلق چٹان سے نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن لفظ Rock کا ایک مفہوم جھولا جھلانا بھی ہوتا ہے اور اس معنی میں "راکی" کی کسی بچے کے نام یا عرفیت کی حیثیت سے کوئی مناسبت ہو سکتی ہے یعنی وہ بچہ جسے جھولے میں ڈال کر جھلایا جائے لیکن عام استعمال میں اسے لڑکھڑاتے ہوئے، شرابی، بدمزاج اور ناقابل اعتبار شخص کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔

"بابی" کو ہمارے یہاں اس نام کی فلم سے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ شروع میں "بابی" کی عرفیت کسی پولس والے کو بتانے کے لیے بولی جاتی تھی اور یہ "بابی" رابرٹ کا اختصار تھا۔ رابرٹ سے مراد رابرٹ پیل تھے جو ۱۸۲۸ء میں جب پولس ایکٹ پاس ہوا' انگلستان کے ہوم سکریٹری تھے' لیکن اس نام کا تعلق پولس کے سپاہی سے معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن "باب" کا لفظ بال کاٹنے کے ایک ایسے اسٹائل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جس میں بالوں کو چھوٹا کر کے اس طرح چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ گردن پر لٹکتے رہیں۔ چھوٹی بچیوں کے بال اکثر اس اسٹائل میں کٹوا دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح فیشن کے مارے اور بھڑکتے لباس میں ملبوس لوگوں کو Bobby - Dazzler کہا جاتا ہے اور "بابی" کا نام اس فیشن کی چمک بھڑک کو ظاہر کرتا ہے۔

کبھی نام جب دوسرے ملکوں خاص طور پر یورپ اور امریکہ کے ملکوں کا دورہ کر کے واپس اپنے ملک کو لوٹتے ہیں تو ان کو خاص اعتبار حاصل ہوتا ہے۔ چند سال قبل لوگ ایک فلم ایکٹرس کو دیکھ کر اور اس کا نام سن کر چونک پڑے تھے۔ نام تھا "عائشہ جلکا" شروع میں تو بات ایک معمہ لگی۔ لیکن جلد ہی پتا چلا کہ یہ نام امریکہ ہو کر لوٹا ہے جہاں کی سیاہ فام لڑکیوں کے درمیان یہ نام بہت مقبول ہے اور تقریباً ایک درجن شکلوں میں لکھا جاتا ہے۔ جیسے۔ AISHA, AESHA, AIESHA, AISIA, AYESHA, AYEISHA,

IEASHA, IEASHIA, IESHA, IEESHA, IEESHIA, YIESHA

ایسا ہی ایک نام "شیلا" ہے۔ یہ ایک پرانا ہندی نام ہے لیکن بعد میں یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ نام گھروں میں کھانا پکانے والی اور صفائی کرنے والی عورتوں کا ہوتا ہے۔ پھر یہ دیکھنے میں آیا کہ یہ نام تو یورپ کی لڑکیاں بھی رکھتی ہیں جو کہ سینٹ سیسیلیا

(St. Cecilia) کے نام پر ہے۔ لفظ سیسلیا کا تعلق اندھے پن سے ہے۔ سیسلیا ایک اندھی رومن خاتون تھیں جن کو موسیقی میں بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اسی وجہ سے انھیں بعد میں موسیقاروں کے سرپرست کی حیثیت سے جانا گیا۔ تیسری صدی عیسوی میں انھیں ہلاک کر دیا گیا انھیں سینٹ بنایا گیا۔ اس طرح اس وقت یہ نام اس عصمت و عفت کے تصور سے مقبولیت حاصل نہیں کر رہا جو اس کے اصل سنسکرت معنی ظاہر کرتے ہیں بلکہ اسے ایک اندھے مسیحی سینٹ سے نسبت کی بنا پر قبول کیا جا رہا ہے۔

"انیتا" کے سنسکرت معنی ہیں جس میں فریب نہ ہو اور یہ لفظ رہنما کا مفہوم بھی اپنے اندر رکھتا ہے لیکن اس نام کو پسند کرنے والے یورپ میں بھی ہیں جہاں یہ نام اپنی زبان میں "این" (ANNE) کی چھوٹی شکل (تصغیر) پیش کرتا ہے۔ نام "این" یورپ میں مقبول ترین مسیحی ناموں میں سے ہے اور الگ الگ زبانوں میں الگ الگ شکلوں میں ملتا ہے۔ انھی شکلوں میں سے ایک "نی نا" (Nina) ہے۔ لیکن سب کی اصل عبرانی نام "حنا" (Hannah) ہے جس کے معنی "برکت اور رحمت" کے ہوتے ہیں۔ سنسکرت میں "نینا" کا مفہوم "مرصع" اور "نازک" ہوتا ہے۔

"سارہ" بھی بنیادی طور پر ایک عبرانی لفظ ہے۔ اس کا مطلب "شہزادی" ہوتا ہے اور یہ نام اس وقت یورپ اور امریکہ میں بھی اسی طرح مقبول ہے جس طرح "ایشیا اور افریقہ میں۔ مسلمان لڑکیوں کا بھی یہ نام ہوتا ہے اور مسیحی لڑکیوں کا بھی۔

"ریتا" بھی یورپ سے در آمد کیا گیا ہے اور یہ "مارگریتا" (Margarita) کا اختصار ہے۔ جب کہ خود "مارگریٹ" کے معنی "موتی" ہوتے ہیں۔

"مونیکا" کے نام نے صرف مونیکا لے ونسکی کی وجہ سے شہرت حاصل نہیں کی۔ برسوں پہلے ہندستان کے ایک ہر دل عزیز گلوکار نے گلا پھاڑ پھاڑ کر "مونیکا" مائی ڈارلنگ کی پکار لگائی تھی۔ دراصل "مونیکا" نام ایک یونانی لفظ پر مبنی ہے جس کا مطلب ہوتا ہے "ایک فرد، تنہا" "مونا" کا مطلب سنسکرت میں بھی تنہا ہے' لیکن یورپ میں خاص طور پر آئرلینڈ میں یہ نام اسی نام کے ایک سینٹ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے متبرک سمجھا گیا۔ خود یہ نام "شریف" کے معنی رکھنے والے ایک آئرش لفظ سے نکلا ہے۔

"سونیا" نے ظاہر ہے سونیا گاندھی کی وجہ سے تعارف حاصل کیا۔ لیکن خود لفظ "سونیا" نام "صوفیہ" کی تصغیر کی ہوئی روسی شکل ہے اور "صوفیہ" میں اصل بنیاد وہی ہے جو لفظ "فلسفہ" میں ہے۔ اس طرح "سونیا" کا مطلب عقل و فراست کے ہیں۔ "روبینہ" کا تعلق (Ruby) یعنی لعل (لال قیمتی پتھر) سے ہے۔

عبدالقوی ضیاعلیگ

جمیل الدین عالی
دشتِ سخن کے دشت نورد

ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ایک اچھا شاعر بڑے شاعر سے بہتر ہے" اب آپ اس کو کیا کیجیے گا۔ کہ جمیل الدین عالی جو عالی جی کے نام سے زیادہ جانے پہچانے جاتے ہیں' وہ نہ صرف ایک اچھے بلکہ ایک بڑے شاعر بھی ہیں۔ میں پورے یقین کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت بھی کر دوں گا کہ وہ اس دور کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں۔ دوسرے معنوں میں وہ ایک ایسا کریلا ہیں جو کڑوا ہونے کے ساتھ ساتھ نیم چڑھا بھی ہے اور اس نیم چڑھا ہونے کی وجہ سے اس کریلے کا ذائقہ ہی کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔

اسی پر بس نہیں اجمل دہلوی کی یہ رائے ان کے متعلق بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں' اعلا فکری و ذہنی تربیت' علمیت' ادبیت کی وجہ سے وہ ایک بہت بڑے آدمی ہیں۔ ان کا دل محبتوں سے سرشار ہے۔ وہ ایک بڑے انسان ہی نہیں ایک بہت ہی اچھے دوست بھی ہیں۔ ایسے کم لوگ ہوں گے جن کے اندر بیک وقت اتنے بہت سے اوصاف جمع ہو گئے ہوں' سچ پوچھیے تو عالی جی پوری اردو دنیا جو آئس لینڈ اور اسکینڈی نیوین ممالک سے لے کر آسٹریلیا اور تسمانیہ اور برطانیہ سے لے کر شمالی امریکہ تک پھیلی ہوئی ہے وہ اس کے ایک ماہ درخشاں ہیں اور ہمارے شعری ادب کی ایک عظیم علامت۔ انھوں نے ہمارے بہت سے سیاسی' معاشی اور معاشرتی مسائل کی نشاندہی اپنے شعروں کے ذریعہ کی ہے۔ ان کا دل چونکہ سچائیوں سے لبریز ہے اس لیے یہ سچائیاں پوری طرح ان کے اشعار ہی کا حصہ بھی بن گئی ہیں۔ انھوں نے اردو ادبی تاریخ کو بنتے، سنورتے اور بگڑتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور اس ادبی تاریخ کی تعمیر میں نمایاں اور مثبت کردار بھی ادا کیا ہے اور بقول مشفق خواجہ "انھوں نے (عالی جی) ہر لکھے جانے والے لفظ کی حرمت' عظمت اور اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا ہے اور اسے تحفظ فراہم کرنے میں پوری کوشش کی ہے"[1]

[1] مشفق خواجہ حرفے چند۔ دیباچہ

قصہ کوتاہ عالی جی ایک ایسی ہمہ صفت ہمہ جہت شخصیت ہیں جس کا چرچا دور دور ہے حالانکہ وہ خود اس صورت حال سے متفق نہیں ہیں، جانتے ہیں تمام لوگ، گو کوئی مانتا نہیں۔

سن تو رکھا ہے تم نے بھی عالی دہلوی کا نام، ان کے نزدیک جاننا ماننے سے مختلف ہے جو واقعی ہے مگر میں ان کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جتنا وسیع حلقہ ان کے جاننے والوں کا ہے اسی قدر وسیع ماننے والوں کا بھی ہے۔ وہ کتابوں خصوصیت سے اچھی کتابوں کے عاشق ہیں اور پڑھنا لکھنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ انھوں نے بڑائی کی بہت سی منزلیں بڑی محنت سے طے کی ہیں اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ "وہ جہاں بینی کو جہاں بانی سے زیادہ مشکل سمجھتے ہیں"۔ [۱]

راقم الحروف کی عالی جی سے یاد اللہ اس زمانے سے ہے جب انھوں نے حکومت پاکستان کی وزارت تجارت میں پہلا قدم رکھا۔ اس ساڑھے چار دہائی کی مدت میں ان سے میری دوستی کا رشتا مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ اس میں افراط ہوئی تفریط نہیں۔ اضافہ ہوا تخفیف نہیں۔ استحکام ہوا انحطاط نہیں۔ میں ان سے آئے دن ملوں یا برسوں بعد ملنے جلنے کے آداب و اطوار وہی رہے جو پہلے دن تھے۔ میں نے ان کے علم و دانش سے استفادہ بھی کیا اور استفاضہ بھی' انھوں نے پچھلے سال کے اندر ہماری نثر و نظم کو اتنا بہت کچھ دیا اور اتنا مالا مال کیا جس کی قدر و قیمت آنکنا مشکل ہے۔ انھوں نے سفر نامے بھی لکھے' انشائیے بھی۔ بینکاری کے متعلق اطلاعات بھی فراہم کیں۔ اقتصادیات کے بعض موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ کالم نگاری بھی کی۔ تراجم بھی کیے۔ تنقید و تبصرہ بھی ان کے دائرہ ادبی عمل میں شامل رہا۔ تاحال ان کی ۱۹ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ان میں بیشتر کئی کئی بار چھپ چکی ہیں۔ ان میں سات صرف شعری مجموعے بھی شامل ہیں جو ان کی شاعرانہ عظمت اور منزلت کی دھاک بٹھا چکے ہیں۔ سات تصانیف زیر طبع ہیں اور نہ جانے کتنے مسودے تیاری کی آخری مراحل میں ہیں۔

جن لوگوں نے عالی جی کی تخلیقات پڑھی ہیں اور آج اردو سے دلچسپی رکھنے والا کون ہوگا جس نے ان کو نہ پڑھا ہو، ان کے نیہ علم میں ہے کہ ان کی شاعری نہ کسی مخصوص

---

[۱] وسیم سجاد چہار سو ۷-۶

تحریک کی مرہون منت ہے اور نہ ہی کسی خاص سیاسی' سماجی' مذہبی رجحانات کی پابند۔ وہ مختلف النوع نظریاتی اور اعتقادی رجحانات سے متاثر ہونے کے باوجود ان کے نہ گرہ گیر ہوئے اور نہ ہی ان کے دام سے اسیر۔ وہ محض ذوق سلیم اور اعلا فکر کے سہارے اپنی شعری کائنات کو آرائش زیبائش، حسن و جمال رنگ و نیرنگ دیتے رہتے ہیں اس دور میں ان کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے امیر خسرو' تلسی داس عبدالرحیم خانخاناں، ملک محمد جائسی، کبیر اور میرا بائی کے دوہے نگاری کو حیات نو بخشی۔ اس صنف کو آگے بھی بڑھایا اس میں اضافے بھی کیے، تجربے بھی۔ دوہے نگاری کی روایت کو اردو شاعری اور ادبی تاریخ کا قابل قدر حصہ بھی بنایا اور اسے جلا بھی بخشی اور وہ بھی اس حد تک کہ ان کے دوہوں کے مجموعے اردو' دیوناگری اور دوسری کتنی ہی زبانوں میں چھپ چکے ہیں' بقول گوپی چند نارنگ "وہ خود جب دوہے نگاری میں چل نکلے اور انھیں اس ضمن میں ایک رجحان ساز شاعر کی حیثیت حاصل ہو گئی تو پھر انھوں نے نہ جانے کیوں غزل کے پلڑے کو سبک کر دیا۔" [1]

وہ اگر اردو شاعری کو اور کچھ نہ بھی دیتے تو بحیثیت دوہا نگاری ان کی ادبی شخصیت مسلّم اور مستحکم تھی۔ وہ ہمارے ادب میں امر ہو چکے تھے۔ اس صنف میں انھوں نے موضوعات کے علاوہ ہیئت کے بھی تجربے کیے۔ گاہ بگاہ مروجہ تکنیک سے انحراف کر کے خود اپنی تکنیک اختراع کی جسے عالی جاہی کا لقب اور حسب و نسب ملا۔ اس کے باوجود عالی جی نہ تو اپنی غزل گوئی سے مطمئن ہیں اور نہ ہی دوہا نگاری سے۔ ان کا ارشاد ہے۔

بول ہزاروں روپ بھرے پر دھرم ہے میرا بیت
نامری بانی غزل ہے پیارے۔ نا دوہے نہ گیت

ان کا اصل دھرم بیت ہے۔ باقی سب اضافی چیزیں ہیں۔

ادب سے عالی جی کی دلچسپی متنوع قسم کی ہے اس لیے گیت سے مراد ملی نغمہ بھی ہو سکتا ہے۔ ملی نغمات تو بہت سے لکھے گئے اور بہتوں نے لکھے لیکن جو مقبولیت اور شہرت جیوے جیوے پاکستان کو ملی دوسرے ترانوں کا مقدر نہ بن سکی۔ اگر دوہا عالی جی کا دوسرا نام ہے تو جیوے جیوے پاکستان ان کی وکنیت ہے۔ وہ آج بھی ان کی پہچان ہے اور کل بھی رہے گی۔ وہ آج بھی بچے بچے کی زبان پر ہے اور کل بھی رہے گا۔

دوہوں اور ترانوں سے ہٹ کر اگر عالی جی کی غزلوں پر نظر ڈالیے تو ان میں جمالیاتی

---

[1] گوپی چند نارنگ: عالی جی کے من کی آگ۔ چہار سو ۶۰

عناصر بھی ملیں گے۔ ماحول کی عکاسی بھی نظر آئے گی۔ عصری حسیت اور آگاہی بھی کار فرما دکھائی دے گی۔ لہجے میں بانکپن۔ تیکھاپن کے علاوہ سریلا پن بھی ملے گا۔ شعر و ادب کی میزان میں جو انھوں نے مثبت طرز فکر کو اپنایا وہ ان کی غزلوں میں بھی جھلکتا نظر آئے گا۔ تعمیری رجحانات جو ان کی فکر کا اہم حصہ بھی ہیں اور سرمایہ بھی ان کا پلڑا غزلوں میں بھی بھاری ہے۔ بذاتِ خود عالی جی سچائیوں سے سرشار اور حقیقتوں کے طلب گار ہیں اور یہی حقیقتیں ان کی غزلوں میں رچ بس گئی ہیں۔ ان میں نہ تو یاس انگیزی ہے نہ ظاہری رنج و غم کی رنگ آمیزی۔ وہ رجائیت سے مامور، فکری توانائی سے بھرپور ہیں۔ جدت فکر نے ان کی غزلوں کو سادگی کے ساتھ پُرکاری بھی بخشی۔ ان کے اشعار نہ صرف ان کے قارئین یا سامعین کا دامن دل اپنی طرف کھینچتے ہیں بلکہ انھیں یہ محسوس کراتے ہیں کہ جیسے وہ جلتی تپتی دھوپ کی زد سے نکل کر کسی سایہ دار گھنے درخت کے نیچے رک کر دم لے رہے ہیں اور کچھ دیر ستانے کے بعد نئے زماں و مکاں کی تلاش میں آگے چل پڑیں گے۔

عالی جی نے اپنا تازہ ترین شعری مجموعہ "اے میرے دشت سخن" جس کی اس وقت یہاں رونمائی ہو رہی ہے۔ اِبہ تلطفِ خاص اور بہ نگاہ محبت اس حقیر فقیر کو بھجوایا اور اپنے قلم سے اس پر تحریر فرمایا۔

برادرم عبدالقوی ضیا کے لیے

معاصر حاسدوں کے قافلوں کو دیکھنے کے لیے

کراچی اور سڈبری کا فاصلہ دیکھیے۔ محبت اس کو کہتے ہیں

جمیل الدین عالی کراچی یکم ستمبر ۱۹۹۶ء

میں نے اپنے تاثرات کتاب کے بارے میں لکھ کر فوری طور پر عالی جی کو روانہ کر دیے۔ اس وقت مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ اس انمول موتی کو کینیڈا میں بھی کسوٹی پر پرکھا جائے گا لیکن اشفاق حسین جو اس ملک کی ایک فعال ادبی شخصیت ہیں ان کی ضد اور اصرار پر وہ یہاں تشریف لائے اور ان کے پرستاروں کو آج ایک بار پھر ان سے ملنے کا موقع ان کے کلام سننے کا تحفہ اور ان کی کتاب کے بارے میں آراء کو پرکھنے کا ذریعہ ہاتھ آیا۔ ان کا یہ تازہ شعری مجموعہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے جاذب نظر، دل کش، دلآویز اور دلپذیر

یہ رونمائی ٹورنٹو۔ اونٹاریو۔ کینیڈا۔ بروز اتوار۔ پانچ مئی ۱۹۹۷ء بمقام RAMADINN ان ویلی پارک کے ایک پر تکلف اور شاندار ہال میں اشفاق حسین اور رفقاء کی کوشش اور انتھک محنت کا نتیجہ تھی۔ اس کی صدارت گوپی چند نارنگ نے کی۔ عالی جی مہمان خصوصی تھے۔ راقم الحروف اور اشفاق مقالہ نگار

ہے۔ سر ورق شاہد رسا کی فنی صلاحیتوں کا نتیجہ اور مصورانہ جگر کاوی کا کرشمہ ہے۔ اس کا انتساب ان کی اپنی تین من پسند دیرپا اور لازوال محبتوں کے نام ہے۔ انجمن ترقی اردو، انجمن کے زیر اثر اردو کالجوں اور درسگاہوں اور رائٹرز گلڈ۔ میں نے بغور خاص قلبی لگاؤ اور ذہنی قربت کے ساتھ اسے پڑھا۔ غزلوں میں تازگی بھی پائی۔ شادابی اور شگفتگی بھی۔ نظموں میں معنی آفرینی، نکتہ سنجی، فکر انگیزی اور خرد افروزی کے اجزا پوری طرح سموے نظر آئے۔ ابھی پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ اچانک میری نظر ان کی نظم تجھی پر جم کر رہ گئی۔ اس پر جو ٹھہری تو پھر ٹھہری ہی رہی۔

تجھی بے انتہا خیال انگیز نظم ہے۔ اس میں معنویت ہے، ادبیت ہے، رمزیت ہے۔ ایمائیت ہے۔ فرسودگی سے انحراف اور روایات سے اختلاف ہے۔ ان کی تفہیم کے لیے ادراک و آگہی۔ شعور وذوق سلیم کے علاوہ بہت سے فلسفیانہ نکات سے بھی واقفیت لازم ہے۔ خصوصیت سے اسٹیفن اسپلنڈر STEPHEN SPLINDER ہیگل، گوئٹے اور کسی قدر آئن سٹائن کے نظریات سے روشناسی کے علاوہ انسانی شعور کی پختگی، بلندیٔ فکر اور اس کے ارتقائی منازل اور مدارج سے شناسائی بھی ضروری ہے۔

نظم خداوند تعالی سے عجز بیان کی معذرت سے شروع ہوتی ہے۔ پھر شکایت کا پہلو ابھرتا ہے اور پھر دیکھتے دیکھتے وہ احتجاجی اور اس کے بعد اجتہادی روپ اختیار کر لیتی ہے مگر یہ احتجاج کسی سیاست کار کا نہیں ہے اور نہ یہ اجتہاد کسی مجتہد کا بلکہ ایک شاعر کا ایک مفکر کا ایک دانشور کا ہے۔ اس میں خدا کے وجود کا اعتراف اور اس پر مکمل اعتماد AFFIRMATION, CONFIRMATION OF ALMIGHTY کے بھرپور تاثرات ملتے ہیں۔ لہجہ میں ملائمت ہے۔ لجاجت نہیں۔ اس میں وجاہت ہے تمکنت نہیں۔ نہ وہ اکھڑ پن یا کھردرا پن ہے جو لگانہ چنگیزی کے یہاں اس صورت میں نظر آتا ہے۔ خدا بنے تھے گیانہ خدا بنا نہ گیا۔ یا جب بے تحاشا جوش یہ کہہ اٹھتے ہیں۔ "شبیر حسن خاں سے بھی چھوٹا ہے خدا" اس کا انداز کچھ اس طرح کا ہے کہ خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

یا شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو۔

نظم کی ابتدا اس عنوان سے ہوتی ہے۔

خداوندا / مرے عجز بیاں کی معذرت / جس آگ کی بھٹی میں برسوں بعد پھر جلنے لگا ہوں

وہ بجھانے میں / وہ سارے بحر و دریا نقش ہائے رنگ رنگ

اک تنگنائے بن گئے ہیں / ان میں رہ کر اپنے افکار دبیاں کا حاصل بے حوصلہ ہی
آزمانے میں مری مشق سخن تنگ سخن نکلی
جس صنف کو جتنا بھی اپنایا / مثال دلبر پیا شکن نکلی
اس کے بعد بے چارگی کا احساس یوں نمایاں ہوتا ہے۔
یہ فرسودہ یہ تازہ جنت افکار
ظہور و بے ظہوری کا وجوب واختیار
اس وقت تک کیا ہو اور کیا کہلائے
یہ وہ جانے جو اس کو پائے
نظم جب آگے بڑھتی ہے تو اس کا روپ انوپ کچھ اس نوعیت کا ہوتا ہے
دبستان / مراتب، جید مناقب، سجدۂ تعظیم کے ارکان واجب
اپنا اپنا ایک عالم ہیں
میں ان کی خوشہ چینی سے نہیں تقلید میں امکان گستاخی سے ڈرتا ہوں
جمال و فن سے بیگانے
مودب ان نقوش پا سے اک لمس حسیں کو بھی غنیمت جان کر تنہا گزرتا ہوں
اور اپنی آرزو کی کھردری 'اور بے روایت یعنی اپنی ہی زبان میں عرض کرتا ہوں
اور پھر وہ خدا سے بصد عجز وانکسار
کچھ اور صدیاں مانگتے ہیں
تاکہ دیکھوں، پڑھوں، سوچوں، لکھوں، کچھ کام کر جاؤں
مگر ممکن تو ہے تیرے کرم سے جرم گاہ زندگی میں خود کو بے الزام کر جاؤں
یہ صدیاں تو بے الف تھیں
رہی وہ عشق کی تقویم
شاید کوئی کیفیت جو ہوتا قابل تقسیم
رہا وہ جوہر تفہیم / کبھی کوئی جلوہ معنی بھی دکھلائے گا یا تا عمر
اسی آشوب گاہ جستجو کی فضا ہوگی
خیال آیا
جو چلایا۔ تھی
تبھی۔ کہکشائیں۔ مادرائیں۔ دائرے۔ غار۔ ان کے اسرار کشش۔

تقویم عشاقی
تر اوریوزہ گر اب تڑپتا ہے۔ برائے منصب تفہیم خلاقی
خداوندا!
خداوندا!
خیال آیا اور اب کی بار جھلایا
ابھی اتنا ہی بتلاؤ۔
تجھی بھی تجوید ہی کے زیر و بم میں صوت بالا کی صدا بندی
تمھیں آئی نہ اب تک حرف اول کی نوامندی

اور پھر اچانک وہ اس صورت حال سے بھی دوچار ہوتے ہیں کہ جب وہ خدا کے بارے میں انکار کرتے ہیں اور جھلا جھلا اٹھتے ہیں۔

ہزاروں صدیاں چلتی جائیں پھر بھی مختصر اور نامکمل اک کہانی ہے۔

ان تمام منازل سے گزرنے کے بعد عالی جی خود اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ شور دغل۔ یہ غوغا یہ چلانا یہ جھلانا اس سے کیا فائدہ۔

آخر تمھاری ہی اجارہ داری تو نہیں اس جستجو اور گفتگو پر"
کہ آخر کار
"نہ جانے کتنے ہی کشتگان بے زباں و خوش بیاں آتے ہیں اور پھر آتے رہیں گے۔"

اور پھر اگر عالی جی "سارا پانی تمھیں پی گئے تو آنے والے بھلا اپنی پیاس کس طرح بجھا پائیں گے"۔ گویا یہ نتیجہ کار ہے یہ انجام

نظم پڑھنے کے بعد پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ یہ ڈرامائی انداز کا ایک شکایت نامہ ہے مگر اسے آپ بار بار پڑھیے تو تجھی تجوید کے زیر و بم میں صوت بالا کی صدا بندی بھی سنائی دیتی ہے۔ اس میں نامیاتی کیفیت اور مربوط وحدت بھی نظر آنے لگتی ہے۔ پھر روح' مادہ' جسم' توانائی سب اپنی قوتوں کو جمع اور مرتکز کر کے زمانوں اور خلاؤں میں بکھر جانے کی کوشش کرتے ہیں اور تخلیق کار خود مصلحت آمیزی کے تحت اس نکتہ سے مفاہمت کرتا نظر آتا ہے۔

"مجھے سب ہوشمندان زر افشاں جس قدر بھی دے گئے اور جو بھی دیں گے منظور ہے لیکن
میرے دل میں سوالوں کی جو دنیا ہے وہ ماضی' حال' مستقبل سے وابستہ سہی پھر بھی

مری اپنی لگن میں اور جلن ہی میں یونہی مقید رہے گی"

قاری پر یہ حقیقت بھی واہو جاتی ہے کہ یہ نظم ایک ہی وقت میں نہیں لکھی گئی بلکہ مختلف اوقات میں اور متفرق MOODS میں۔ کہیں اس کا لہجہ بیانیہ ہے کہیں مکالماتی کہیں شکایتی کہیں مفاہمتی۔ کبھی یہ اپنے قاری کو جزویت سے کلیت کی طرف لے جاتی ہے اور کبھی کل سے جزو کی طرف راغب کرتی ہے۔ کہیں یہ مطالبہ ہے کہ سزا و جزا' ماہ و سال' زماں و مکاں ابتدا و آخر۔ تشکک و تجسس ان سب کا از سر نو RE EVALUATION اور RE INTERPRETATION ہو اور پھر اس کا RE CONFIRMATION ہو۔

اس نظم کی تنظیم اور تہذیب کا انداز ہی جداگانہ ہے اسے تھوڑا سا ماورائیت اور مابعد الطبیعیات عناصر سے ہٹ کر حقیقی تناظر میں جانچیے تو اس کا نظام خود اپنی جگہ ایک مکمل تدوین اور ایک جامع ترتیب نظر آئے گا اور پھر اگر بات مابعد الطبیعیات اور مثالیت پسندی تک پہنچنے لگتی ہے تو پھر ان کی ایک اور نمایندہ نظم جو اس مجموعہ کا اہم جزو ہے "چھپکلی کا دماغ" پڑھیے۔

چھپکلی کا دماغ پر نظر ڈالنا شروع ہی کیا تھا کہ بے ساختہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنے معقولات اور منقولات کی روشنی میں نظروں کے سامنے آگئے۔ یہ ان کا ارشاد ہے کہ فلسفہ میں کوئی بھی نکتہ کوئی بھی چیز خلا سے نہیں آتی۔ ہر نئی بات خواہ کتنی ہی نئی کیوں نہ ہو یا تو کسی مقام سے انحراف کا نتیجہ ہوتی ہے یا اس پر اضافہ اور اسے سابق کے حوالے سے ہی سمجھا جائے گا۔ اس کے باوجود ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ذہن انسانی اختراع پسند ہے اور ذہن کی رسائی کو معانی و مطالب کا سرچشمہ سمجھنا چاہیے اور پھر معنی کی تفریقیت کی بنیاد پر مابعد الطبیعیاتی روایات اور اسناد کو چیلنج کرنا چاہیے۔ حکما۔ فلسفی اور ماہرین نفسیات کے تحت چھپکلی کا دماغ کو REPTILIAN COMPLEX سے مشابہت دیتے ہیں۔

ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ آخر عالی جی کو چھپکلی کا دماغ کہاں سے یاد آگیا اور وہ کون سا REPTILIAN COMPLEX تھا جس نے انھیں اس ننھے منھے چھے پیروں والے گھنونے جانور کے دماغ کو اپنا محبوب موضوع سخن بنانے پر مجبور کیا۔

کیوں نہ ان کی نظم ہی میں اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔ ان کے نزدیک انسانی دماغ کے کسی نہ کسی حصہ میں ریپٹالین کامپلیکس کسی نہ کسی طور ضرور موجود ہے۔ ملاحظہ ہو!

. ہمارے مغز میں شامل ہے چھپکلی کا دماغ

شرار بولہبی؟
بہت قدیم دماغ
وہ کہتے ہیں کہ وہ جو رینگنے والے تھے ان کا ورثہ ہے
مگر کچھ ایسے بھی، ہمارے ذہن کا اک ناگزیر حصہ ہے
وہی کہوں گا جو کہتے ہیں یعنی ورثہ ہے
سبھی طبیب اسے ریپٹالین کامپلیکس کہتے ہیں
اگر چہ اس میں مقید بہت سے دوسرے کچھ مرکزے بھی رہتے ہیں
ہے میرا آج کا موضوع چھپکلی کا دماغ
کہ مجھ کو آج میسر نہیں ہے اپنے ہی شہر وطن میں غارت و دہشت کی آندھیوں سے فراغ
یہ جارحیت و سفلی مرکبات کا ایک زندہ و عجیب قفس
یہ ظلم و جبر کی مسموم گرم گرم ہوا
یہ ملکیت کی ہوس

بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس شہر یا جس وطن سے ان کا رابطہ ہے وہاں نہ امن وامان ہے' نہ محبت و رفاقت کا چرچا' نہ انسانیت' نہ انسان دوستی کا تذکرہ، غارت گری اور ستمگری کا سامنا، حیوانیت کا دور دورہ۔ دہشت گردی کا عالم ہے۔ شر و فساد کی جلوہ گری ہے جو شرار بولہبی کی نمایندگی کرتی ہے اور یہ بولہبیت ہر انسانی دماغ کا حصہ ہوتی ہے اسی لیے یہ اس نظم کا محبوب موضوع سخن بنی کہ انسان کے اندر جو درندگی اور شیطنت چھپی ہوئی ہے اس کو اجاگر کر سکے۔

یہ نظم جب ارتقائی منزلوں سے گزرتی ہے تو وہ انسانی ارتقا کے مختلف منازل اور مدارج میں اپنا ناتہ حیوانیت سے بھی جوڑتی ہے خصوصیت سے بندر' لنگور اور گوریلا سے اور بقول ڈارون ہم سب کو یہ یاد دلاتی ہے کہ ہم CHIMPANZEE کی اولاد ہیں۔ ذرا ایک نظر ڈالیے!

وہ کہتے ہیں کہ یہ ساری درندگی جو ہے انسان میں اسی سے ہے
کہ ارتقا کے مدارج میں اک تعلق باہم بہت سے جانوروں کا بھی آدمی سے ہے۔

کوئی ثبوت مکمل نہیں کہ آدم ایک الگ شئے ہے یا کہ سلسلہ ہے۔ یہاں پھر مجھے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی یہ بات یاد آنے لگتی ہے کہ ردِ تشکیل یا پس ساختیاتی فکر کی خوبی یہ ہے کہ وہ معنی کی سمتوں اور طرفوں کو کھول دیتی ہے اور روایاتی نقاد اپنے اپنے تصورات کے اسیر

ہونے کی وجہ سے وہ معنی و مطالب یا ان کی حسیت یا اس میں ایک سے زائد رُخ ہو سکتے ہیں اس اہمیت کو نہیں سمجھ پاتے ہیں۔ چھپکلی کا دماغ کئی رخی نظم ہے۔ پہلے تو درندگی سے انسانی زندگی تک پہنچنے میں کن کن دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑتا ہے اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پھر ارتقا نے انسان کو جو احسن تقویم کا مقام اور ہزار احترام کے لائق بنایا اس کی نشاندہی کرتی ہے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب انسان پر کائنات کے بہت سے اسرار اور ان گنت رموز ہویدا ہونے لگے اور وہ تمام حجابات جو سماوی تھے ارضی مخلوق پر ظاہر ہونے لگے اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ ارضی مخلوق اشرف المخلوقات ہو کر تسخیر کائنات کے منصوبے بنانے لگی۔ نظم میں GENEOLOGY کی کار فرمائی بھی نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو۔

یہ جنسیات کے حیرت فزا حقائق نو
یہ صد جہات فتوحات کی ہر لحہ پھیلتی ہوئی رو
یہ تخم و بیضہ میں پیوند صد صفات کے امکان
جن کی تیز ہے لو
تو کیا ان اگلے کروڑوں برس میں ہم کو نہیں مل سکے گا کوئی سراغ
کہ اپنے مغز میں مفلوج و بالحروج ہی کر دیں یہ چھپکلی کا دماغ
جو ختم کریں ازل کی ستیزہ کاری تاب شرار بولہبی
جو آدمی کو دیں انساں کی بھی خوش لقبی

یہ عقیدہ کہ انسان ابتدا ہی سے خدا کے روپ میں اس کرۂ ارض پر اترا اور پھر مختلف قوتوں سے برسر پیکار ہوا اب بڑی حد تک متنازع ہے۔ اس کا ظہور AMOEBA کی شکل میں ہوا اور پھر ہوتے ہوتے آگے بڑھتے بڑھتے بندر اور چمپانزی کی شکل اختیار کر گیا اور اس ارتقائی منازل کی آخری شکل و صورت انسان تھی۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ انسان اور بندر کا 99 9%DNA یکساں ہے اور انسان اور سور کا DNA اسی فیصدی ایک ہے۔

یہ نظم ایک طرف تو GENES کی کرشمہ سازی کا مجملاً ذکر کرتی ہے۔ دوسری طرف ارتقا کی حد آخر حیوان ناطق تک پہنچنے کے بعد اس تشکک کا اظہار بھی کر دیتی ہے کہ کوئی ثبوت مکمل نہیں کہ آدم ایک الگ شے ہے یا کہ سلسلہ ہے اور اگر ہے تو ازل ازل ہے ابد تو نہیں کہ دونوں کے مابین یہ سفر جو ہوا اس قدر عجیب و طویل

کوئی خیال کوئی شے نہ اس میں ہو تبدیل"

اور اس کے بعد اس نکتہ کے بیان کر دینے سے بھی گریز نہیں کرتی کہ

خدا رحیم ہے وہ کیوں یہ چاہے گا اے جان
کہ تا ابد رہے انساں سے اس طرح منسلک شیطاں
کہ اس پر حاوی کبھی بھی نہ ہو سکے ایماں

'چھپکلی کا دماغ' میں موضوع کی امکانیت۔ محدودیت اور لامحدودیت۔ لمعاتی واقعیت اور ابدی حقیقت کی مناسبت اور تفریقیت کی بہت سی گرہیں کھلتی نظر آتی ہیں جو بر سہا برس کی تخلیق کائنات کی روایات اور طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی اعتقادات کو بھی چیلنج کرتی دکھاتی ہیں اور پھر حیات و کائنات کے بہت سے لاینحل عقائد اور نکات کے بارے میں اظہار تجسس و تفکر کرنے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔

ان نظموں کے علاوہ "اے میرے دشت سخن" میں اور بہت سی بڑی دلنواز اور دل پزیر قسم کی نظمیں ہیں مثلاً امکان، گواہی' بے یقینی' حد ادب' نذر مشفق خواجہ، نذر بابائے اردو مولانا عبدالحق، نذر امیر خسروؒ، نذر شاہ لطیف، تلاش، یہ خسرو کی ایجاد (طبلہ) وغیرہ، ان سب کے بارے میں اظہار رائے کسی تفصیل سے ممکن نہیں البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ سب ان کی بلندئ فکر، ندرت خیال اور رفعت تخیل کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں جمالیاتی عناصر کے ساتھ ساتھ عصری حسیت کا عکس ہے۔ کہیں کہیں ان نظموں میں علامتی انداز کار فرما ہے مگر اس طور پر نہیں کہ ابہامیت سے منسلک ہے۔ ان میں نہ تھکا دینے والی یکسانیت ہے نہ سطحیت۔ نہ بے کیفی نہ بے رنگی۔ رہ گئی بات دوہوں کی تو وہ عالی جی کی پسندیدہ صنف ہے۔ ان تمام دوہوں کو بار بار پڑھیے اور سر دھنیے۔ ایک بار پھر نظر جہاں جاکر رک جاتی ہے وہ ان کی طویل ہی نہیں طویل ترین نظم "انسان" کے تین ابواب جو اس میں شامل ہیں پوری نظم دس ہزار (اور اب بقول عالی جی چودہ ہزار) مصرعوں پر مشتمل ہے اور یہ نظم انھوں نے ۱۹۵۴ سے لکھنا شروع کی تھی۔ اس کے مختلف حصے اردو کے بہت سے رسائل و جرائد میں گاہ بگاہ چھپ چکے ہیں۔ یہ پوری نظم انسان کی ابتدا، ارتقا اور انتہا کی منظوم داستان ہے۔ جو بصورت منظر نامے ڈرامائی انداز میں نظمانے کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔

انسان کے تین ابواب دراصل مکمل نظم کے جزوی نقوش ہیں جن میں انسان اپنے مختلف پہلوؤں' جہتوں' اور زاویوں کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے آتا ہے اور ارتقا انسانی جن جن مختلف ادوار سے گزر کر نشیب و فراز سے دو چار ہوکر مسائل و مراحل، شکست ریخت، رنگ و آہنگ سے نبرد آزما ہو کر اس منزل پر پہنچی جہاں انسان آج اشرف المخلوقات نظر آتا ہے۔ یہ پوری نظم اس انسان کی دلسوز اور دلدوز کہانی ہے جو بڑی نکہت و نفاست' ندرت' سلاست اور فصاحت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ اس کے تخلیقی اظہار

میں انفرادیت ہے۔ وجدان پر عقلیت کا قبضہ ہے۔ احساسات پر ادراک و آگہی کا غلبہ ہے روحانیت پر ماورائیت کے اثرات حاوی ہیں۔ اس میں جابجا تمثیلیت، استعارہ سازی' پیکر تراشی کے اچھوتے اور دل لگتے نمونے ملتے ہیں یہ تینوں ابواب نہ صرف ارتقا کے مختلف تصورات' امکانات' مفروضات اور معتقدات کا احاطہ کرتے ہیں بلکہ انسان کی جبلت، فطرت سیرت' اس کے نظریات اور رجحانات کا بھی شاعرانہ انداز میں تجزیہ کرتے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

جمالی
کوئی میری داستان لکھے
جو میری مانند اور لاکھوں شکست کھائے ہووں کی تاریخ بھی رہے گی
جنھوں نے کس کس عذاب کو اک بہشت امید کی خوشی میں دبا رکھا تھا۔
یہاں کوئی امتحاں نہیں ہے
یہ شاعری کی زباں نہیں ہے
یہ لب جو سوکھے ہوئے ہیں اتنے
جنھیں کوئی تجربہ نہیں ہے
جنھیں نہ مشق سخن کی مہلت ملی نہ لذت
جنھوں نے اک لفظ ہی تو سیکھا تھا اتنے دن میں
وہی / محبت / وہ ان کراہوں کو کیا علوئے جمالیات و کمال دیں گے
تمھیں میری ہی قسم ہے اسرار
مجھ سے اس وقت کچھ نہ بولو
تمھاری یہ فلسفہ طرازی
یہ تجزیے۔ طنزیے یہ نشتر
میری رگوں میں بھی چبھ رہے ہیں
فضا میں پھیل پھیل کر اس کو مسموم کر رہے ہیں
خدارا بتادو اگر وہ کہیں ہے
کہ اب اس سے محروم رہنا کسی مکتب دوستی میں بھی ممکن نہیں ہے
وہی ہزاروں خیال
وہیں سوال وہ تقلید و اجتہاد کے آشوب میں رموز سے بھرے
شرحوں سے معمور

مشاہدوں سے دلائل سے تجربات سے چور
کبھی اصول و وصول اور کبھی فضول و خلل
طلسم و خواب سوالوں نے گھیر رکھا ہے
ہمارا علم مکمل نہیں تو کیا معلوم
ہمارے فیصلے کتنے درست ثابت ہوں
اگر یقین ہو ری سائیکلنگ پر تم کو
کوئی مصر ہو تو آواگون سے کہہ دو
تو یوں سمجھ لو کہ تم بھی کچھ اور بن کر آئے
اور اپنے کرموں کے جو پھل نصیب میں تھے وہ کھائے
اور اس کے بعد وہی مرگ بعد مرگ آجائے
جو بے الف کے پڑھے میم نون کرتے ہیں
وہ صرف و نحو و معانی کا خون کرتے ہیں
میں اتفاق و مشیت کو کیسے پہچانوں
میں ابتدا کے بغیر آج کیا ہے کیا جانوں
ہر ایک دلیل مقابل دلیل رکھتی ہے

اس طویل نظم کے جو اجزائے ترکیبی ہیں ان کا اجتماعی تجزیہ اس لیے ممکن نہیں کہ یہ بہت سی جہتوں اور سمتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور اس کا کینوس بہت ہی وسیع و عریض ہے اس میں جو فلسفیانہ نکات اور مذہبی عقائد جابجا مختلف انداز سے موضوع سخن بنے ہیں ان کے بارے میں کسی ایک رائے پر قائم ہونا اور ایک عقیدے پر لبیک کہنا بھی آسان نہیں کہ مختلف مذاہب کے عقیدوں کو معرض بحث میں لایا گیا ہے۔ بس اتنی بات کہنا ممکن ہے کہ باوجود ثقالتِ موضوع نظم گراں محسوس نہیں ہوتی۔ اظہار بیان میں شگفتگی اور بے ساختگی ہے۔ پیرایہ اظہار میں حسن و لطافت، آہنگ و نغمگی ہے۔ یہ کار دشوار تھا اور ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں تھی مگر عالی جی اپنی کشادہ نظری اور فکری توانائی کے بل بوتے پر اس بوجھ کو اٹھا لے گئے اور یہ کام سلیقہ سے انجام دے گئے۔ فن کارانہ چابکدستی کے سہارے بہت سے اجزا بکھرے بکھرے نظر نہیں آتے ہیں بلکہ ان میں اکائی کی صورت نظر آتی ہے۔ متوازن اور متناسب انداز فکر و نظر نے اس نظم کو ایک امتیازی حیثیت بخش دی ہے۔ مجھے یقین ہے عالی جی کی دوسری تصنیفات کی طرح یہ مجموعہ شعری بھی ادب میں ایک اہم اضافہ سمجھا جائے گا اور اس کی قدر و منزلت وہی ہوگی جو ان کی دوسری کتابوں کا مقدر بنی۔

پروفیسر عبد الستار دلوی
الہلال باندرہ ریکلیمشن۔ ممبئی ۵۰

ڈاکٹر عالی جعفری۔۔۔ایک عالی مرتبت اُستاد اور عالم

مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ مجھے اسکول اور کالج میں بہت اچھے اساتذہ ملے۔ عالم شفیق، دوست اور قدم قدم پر ہمدرد و غمگسار۔ احمد سیلر ہائی اسکول ممبئی میں مرحوم پرنسپل انصار علی، مرحوم مولوی عبد اللطف چورگھے، مولانا عباس مرحوم (جو بھوپال کے پروفیسر عبید عرب کے بھانجے تھے) استاذی محمد بشیر اور محترم اسد اللہ صاحب (مشہور شاعر عظمت اللہ خان کے بیٹے) وغیرہ، میرے استاد تھے۔ اس زمانے میں ممبئی کے اردو میڈیم کے اسکولوں کا معیار تعلیم بہت اونچا تھا۔ اساتذہ نہ صرف اسکول کی حد تک طلبہ کی تعلیمی زندگی سے دلچسپی لیتے تھے بلکہ اعلا تعلیم کے لیے بھی رہنمائی کرتے تھے۔ ۵۴ء میں ایس ایس سی کے زمانے میں کالجوں کی گفتگو ہونے لگی تھی اور غائبانہ طور پر کالجوں کے جن اساتذہ سے ہم متعارف ہو چکے تھے، ان میں اسمٰعیل یوسف کالج اور یہاں کے قابل اساتذہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر ابراہیم ڈار، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کے نام خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ دیگر کالجوں کے اساتذہ میں جن کے نام سے ہم متعارف تھے وہ الفنسٹن کالج کے عالی جعفری تھے۔ گھر میں ان اساتذہ کے اکثر تذکرے رہتے، چونکہ اسکول کے زمانے سے ہی زبان وادب کا شوق تھا، لہذا جے۔ جے۔ اسپتال کے نکڑ پر محمدی کتب خانے ضرور جاتے تھے، یہاں علمی وادبی کتابیں دیکھنے اور ان پر سرسری نظر ڈالنے کے مواقع ملتے تھے، ہندستانی اور پاکستانی رسائل بھی یہاں آتے تھے، عالی جعفری صاحب جو اس کتب خانہ سے قریب یعقوب گلی میں رہتے تھے، وہ بھی "عین صاحب" کی اس دکان پر شام یا اتوار کی صبح ضرور تشریف لاتے تھے، ہم انھیں دور سے دیکھا کرتے تھے، ہمیں یہ معلوم تھا کہ یہ الفنسٹن کالج ممبئی کے قابل پروفیسر عالی جعفری صاحب ہیں، جو وسیع مطالعہ کے مالک ہیں، اعلا پائے کے استاد اور اقبال و غالب اور اردو شعر وادب کے ذہین اسکالر ہیں، اسکول

میں جن اساتذہ کا میں نے ذکر کیا وہ بھی صاحب علم اساتذہ تھے، مگر اسکول اور کالج کے فرق سے کالج کے اساتذہ کے بارے میں ایک خاص طرح کا جذبہ احترام ہوا کرتا تھا۔ جعفری صاحب کا تعلق ترقی پسند تحریک سے بھی تھا جو اس زمانے میں ادب پر چھائی ہوئی تھی، شاید یہ بھی وجہ تھی کہ عالی جعفری صاحب ہمارے لیے زیادہ محترم بن گئے تھے۔ یہ ۵۲۔۵۱ء کا زمانہ تھا۔

جب ایس ایس سی پاس کرنے کے بعد پرنسپل انصار علی مرحوم کی سفارش پر اسمٰعیل یوسف کالج میں داخلہ لیا تو یہاں پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور عربی وفارسی میں پروفیسر ڈاؤد باد گیر، پروفیسر احمد نہاد الدین وادر کر، ڈاکٹر بی۔ ایم، گائے اور ڈاکٹر ابراہیم قاضی سے واقفیت رہیں۔ نجیب اشرف ندوی صاحب اور پروفیسر ابراہیم ڈار اس کالج میں چندے آفتاب وچندے ماہتاب کی حیثیت رکھتے تھے، مگر ڈار صاحب کا دسمبر ۵۳ء ہی میں انتقال ہوگیا تھا، لہٰذا ان کی شاگردی نصیب نہیں ہو سکی مگر پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی جن کا شمار اردو کے ممتاز محققین میں ہوتا تھا، ان کی شاگردی ہمارے لیے باعث افتخار تھی، ندوی صاحب بہت جلد وظیفہ یاب ہونے والے تھے، اس کا قلق تھا، جب ۱۹۵۶ء میں ندوی صاحب ملازمت سے سبکدوش ہوکر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے، تو ان کی جگہ پر عالی جعفری صاحب کا تبادلہ اسمٰعیل یوسف کالج میں ہوا، عالی جعفری صاحب میں ہمیں ایک استاد اور دوست ملا، وہ طلبہ میں بہت جلد مقبول ہوگئے۔ وہ کلاس میں بہترین استاد اور کلاس سے باہر استاد اور دوست تھے، ندوی صاحب اور مدنی صاحب کے رعب اور دبدبہ میں ادب اور احترام ضرور تھا، شفقت سے وہ بھی پیش آتے تھے، ندوی صاحب تو زندہ دلی کا بے مثال نمونہ تھے، مگر عالی جعفری صاحب شفیق استاد اور شفیق دوست تھے، ان کی بے تکلفی اور بے تکلفی میں طلبہ کی ذہنی تربیت اور علم وادب سے متعلق رہنمائی ان کا ایک ایسا وصف تھا، جو دوسرے اساتذہ میں مفقود تھا، ان کی قہقہہ نما ہنسی، سگریٹ اور چائے نوشی فقرے بازی، زبان وبیان سے متعلق ان کی گرفت اور سب سے زیادہ ان کی بے تکلفی۔ ان ساری باتوں کے پیش نظر وہ طلبہ میں بے حد مقبول تھے۔

اسمٰعیل یوسف کالج کا ماحول، شاید دوسرے کالجوں سے بالکل مختلف تھا، اساتذہ چاہے وہ کسی مضمون کے ہوں، آپس میں ایک خاندان کی حیثیت رکھتے تھے، سارے طالب علم چاہ وہ کسی بھی مضمون کے ہوں، اسی خاندان کے فرد ہوا کرتے تھے، ہندو، مسلمان یا

عیسائی اردو، مراٹھی، گجراتی، سنسکرت، عربی و فارسی یا کسی دوسرے مضمون کی اس بارے میں کوئی قید نہ تھی۔ اسمٰعیل کالج کا ہر استاد، کسی مضمون کی تخصیص کے بغیر سب کا استاد تھا، آپس میں پیار و محبت کا گہرا رشتہ تھا، جعفری صاحب اس پیار و محبت کے رشتے میں شاید سب سے الگ اور سب سے نمایاں تھے۔ انگریزی کے پروفیسر مہیشی اور جعفری صاحب کا شمار کالج کے مقبول ترین اساتذہ میں ہوتا تھا، طلبہ ان کے لیکچروں کے منتظر ہوا کرتے تھے، ان لیکچروں میں شرکت سے ایک طرح کی فرحت اور خوشی حاصل ہوتی تھی، ان کے دلچسپ لیکچر سننے کے لیے طلبہ بے چین رہا کرتے تھے، پروفیسر مہیشی بلا کے مقرر تھے، اونچی پاٹ دار آواز تھی اور اسٹیج پر ٹہل ٹہل کر لیکچر دیتے تھے، جعفری صاحب کا لہجہ دھیما اور سبک تھا، آواز قدرے باریک تھی، لیکن ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ لیکچر کے ساتھ تدریس (Teaching) کے اصول پر کاربند تھے۔ پھر وقفہ وقفہ سے ان کا طالب علموں سے سوال کرنے کا انداز اور پھر مختلف انداز سے خود ہی جواب دینے کی بجائے انھیں سے جواب حاصل کرنا یا اگلوانا ـــــ یہ ایک عجیب ماہرانہ انداز تھا۔

جب انٹر پاس کرنے کے بعد بی۔ اے۔ میں داخلہ لیا تو اردو ہی ہمارا خصوصی مضمون تھا، اب ہم جعفری صاحب اور مدنی صاحب کے زیادہ قریب آگئے تھے، ڈاکٹر مدنی صاحب کا انداز گفتگو کڑا تھا، پاٹ دار آواز تھی شفقت و محبت تو ان کے ہاں بھی تھی مگر انداز میں ڈانٹ ڈپٹ بھی تھی، وہ ایک چھوٹے موٹے نواب تھے، لہٰذا ان سے قرب کلاس کے لیکچر تک ہی رہتا، یا پھر جب بھی وہ بلاتے ہم ان کے پاس جاتے، مگر جعفری صاحب کے حلقۂ شاگردی کے علاوہ حلقۂ ارادت مندی میں بھی شامل تھے، اکثر کالج سے واپسی میں جعفری صاحب کا راستے میں اور ٹرین میں ساتھ رہتا اور راستے بھر ان کی عنایتوں کی بارش سے ہم لطف اندوز ہوتے، دو ایک بار چائے خانوں میں چائے بھی پلاتے اور زبان و ادب کی گفتگو ہوتی، نئی نئی کتابوں کے تذکرے رہتے، ادبی دنیا کی صورت حال پر باتیں ہوتیں۔ اس طرح کی گفتگو کا حال یہ ہوتا کہ جن کتابوں اور رسائل سے متعلق باتیں ہوتیں، دوسرے روز وہ پوچھتے کہ کیا آپ کو وہ کتابیں دیکھنے کا موقع ملا؟ اگر جواب "نہیں" میں ہوتا تو بہت ہی نرم لہجے میں اور اپنے پن کے ساتھ کہتے کہ آج نہ سہی کل دیکھ لیجیے۔ کچھ بر بنائے شوق اور کچھ جعفری صاحب کی Good Books میں رہنے کے لیے ہم کوشش کرتے کہ جلد از جلد وہ کتابیں حاصل کریں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ خود کالج لائبریری سے یا خود اپنی ذاتی کتابوں سے ہمیں استفادہ کا موقع دیتے ۵۷۔۱۹۵۶ء میں مکتبہ جامعہ، ایک بھرا

پُرا مکتبہ تھا، ہندستان کے علاوہ پاکستانی مطبوعات بھی آیا کرتی تھیں۔ چنانچہ کئی مطبوعات جو نیا ادارہ لاہور سے آتی تھیں، ہم نے خریدی تھیں جو آج بھی ہماری الماریوں کی زینت ہیں۔ کالج کے زمانے میں ممبئی میں میونسپل کارپوریشن کی متعدد لائبریریاں تھیں جن میں نایاب اردو کتابوں اور رسائل کے ذخیرے تھے، سوہانی لائبریری دوٹانکی پر تھی، جالی محلّہ کی لائبریری، تیلی محلّہ کی لائبریری، مینارہ مسجد کی لائبریری اردو کتابوں اور قدیم رسائل کے لیے مشہور تھیں۔ ان کتب خانوں کا سب سے پہلی بار تعارف جعفری صاحب نے کیا۔ کتابوں کے علاوہ ان کا ہمیشہ اصرار رہتا کہ ہم ادبی دنیا عالمگیر، ہمایوں، نگار، ادب لطیف کے پرانے فائل دیکھیں، حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کچھ طلبہ میں ذاتی دلچسپی ہی ان کی ذہنی تربیت اور ذوق و شوق تلاش و تجسس کا باعث بنتی ہے، جعفری صاحب نے محض استاد بن کر نہیں بلکہ دوست بن کر علم و ادب کی ان دشوار گزار وادیوں کی سیر کرائی۔

عالی جعفری صاحب زمانۂ طالب علمی میں ہر منزل پر ہمارا سہارا تھے، وہ اپنے طالب علموں کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف ان کے علم و ادب سے متعلق گفتگو کرتے تھے بلکہ ہر طالب علم کے گھریلو حالات سے بھی واقف ہونے کی کوشش کرتے تھے اور نا مساعد حالات میں شفقت و محبت سے رہنمائی کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے طالب علموں کو کبھی صرف اردو ادب تک محدود نہیں ہونے دیا بلکہ ان کا ہمیشہ اصرار رہتا تھا کہ وہ بحیثیت زبان و ادب کے طالب علم ہونے کے، انگریزی اور دوسری زبانوں کے ادبیات سے متعلق بھی بنیادی معلومات حاصل کریں جو اس کے لیے اردو ادب کے مطالعہ میں بھی کار آمد ثابت ہوگی۔ بی۔ اے کے زمانے میں James Scott کی کتاب اور رچرڈس کی Principles of Literary Criticism بھی پڑھی، اگرچہ یہ نہیں معلوم اس زمانے میں اپنی کمزور انگریزی کے ساتھ ہم نے کیا پڑھا اور کیا سمجھا، مگر میں سمجھتا ہوں کہ غیر شعوری طور سے اس سے ہم نے کچھ پایا ضرور ہوگا۔ بی۔اے۔ ہی کے زمانے کا ذکر ہے، صفیہ اختر کے خطوط کا مجموعہ "زیر لب" شائع ہوا تھا، اس مجموعۂ مکاتیب کا بڑا شہرہ تھا، مکتبہ جامعہ سے میں نے یہ کتاب خریدی بھی تھی۔ اس زمانے میں باقر مہدی صاحب کا مقالہ بھی زیر لب پر، بنگلور سے نکلنے والے رسالے "گجر" میں چھپا تھا۔ "زیر لب" کا اثر یہ ہوا کہ مجھے بھی خطوط نگاری پر لکھنے کا شوق پیدا ہوا، جعفری صاحب سے جب ذکر ہوا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ اس سے قبل کہ میں مضمون لکھوں ایلیزابتھ ڈریو Elizabeth Drew کی کتاب Enjoyment of Literature پڑھوں، میں نے اس وقت کوئی مقالہ تو نہیں لکھا مگر یہ کتاب

ضرور پڑھی اور اس کتاب کے ایک باب Gossip literature کے نوٹس بھی لیے، جو خطوط نگاری کے تعلق سے بہت اہم ہیں، یہ نوٹس آج بھی میری فائل میں محفوظ ہیں۔ جعفری صاحب کی طبیعت میں طنز و مزاح کا عنصر بہت تھا، ان کے فقرے، اسی مزاح کی نمایاں مثال ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنے حریفوں سے بھی لڑتے جھگڑتے نہیں تھے، لیکن اپنے تیز و تند فقروں سے انھیں خاموش کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے فقرے بہت دلچسپ ہوتے تھے، ایک مرتبہ بی۔ اے کی کلاس میں وہ مشہور ڈراما "انار کلی" پڑھا رہے تھے، حسن و عشق کے تذکرے تھے، ہمارے ایک ہم جماعت جو عمر میں کافی بڑے تھے اور اور تجربہ کار بھی تھے۔ نئے نئے ہندی پڑھ کے الہ آباد سے آئے تھے اور اردو میں بی۔ اے کر رہے تھے، کلاس میں وہ کچھ غائب دماغ سے تھے، جعفری صاحب نے ان سے پوچھا "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "میں سوچ رہا ہوں کہ حُسن کیا ہوتا ہے، رات بھر میں یہی سوچتا رہا"۔ جعفری صاحب مسکرائے اور نہایت نرم اور شفقت آمیز لہجے میں کہا جناب یہ مسائل بہت نازک ہیں، آپ اس طرح رات رات بھر "حسن" کے بارے میں سوچتے رہیں گے تو آپ کی صحت پر اس کا برا اثر پڑے گا، آپ اپنی صحت کا زیادہ خیال رکھا کیجیے۔" جعفری صاحب کی اس بات پر ساری کلاس زعفران زار بن گئی۔

ایک مرتبہ بی۔ اے کا کلاس تھا۔ ہم کل چار طلبہ تھے، پنڈت دتا تریہ کیفی کی کتاب "کیفیہ" ہمارے نصاب میں تھی جس کا موضوع زبان اور زباندانی ہے۔ کلاس میں انھوں نے بتایا کہ صاحب کی تانیث صاحبہ غلط ہے۔ ہم اس سے محظوظ ہوتے اور یہ نکتہ ہم نے گرہ میں باندھ لیا۔ دوسرے روز ہم پھر جعفری صاحب کی کلاس کا انتظار کر رہے تھے، کلاس سے باہر جعفری صاحب نے پوچھا کیا سبھی لوگ آگئے؟ میں نے اپنی ایک ساتھی کا نام لے کر کہا نہیں ابھی "مرجان صاحب نہیں آئے۔ زوردار قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے "آپ نے کل کا سبق خوب یاد رکھا"۔

جعفری صاحب جیسے کہ اس سے قبل میں نے کہا ہے، جے۔ جے اسپتال کے قریب یعقوب گلی میں رہتے تھے۔ پھر خود ہمارے کالج کے زمانے میں چند سال ماہم میں رہے، بعد میں کئی سال وہ محمد علی روڈ پر لبرٹی مینشن میں رہے، ان کے دوستوں اور شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، اتوار کے دن خصوصاً دوست احباب اور شاگرد جعفری صاحب کے یہاں سویرے ہی پہنچ جاتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں اکثر میں بھی جعفری صاحب سے ملاقات کے لیے جاتا، وہیں ان کے استاد دوست اور مشہور اسکالر جناب جالب مظاہری صاحب بھی تشریف لائے، جالب صاحب سے میری ملاقات اور تعارف بھی یہیں ہوا۔ جالب صاحب ان دنوں

ہندستانی پرچار سبھا سے بھی وابستہ تھے اور "قابل" اور "وِدوان" کی کلاسوں میں اردو پڑھاتے تھے، یہیں پر میں نے بھی جالب صاحب سے اردو سیکھی، وہ یہاں اردو شاعری کا درس دیتے تھے، زبان و ادب کے بلند پایہ استاد تھے، شعر فہمی اور اس کی تدریس کا انھیں ملکہ حاصل تھا، اس لحاظ سے جعفری صاحب کی طرف سے تعارف میرے لیے باعث فخر تھا، کبھی کبھی محمود سروش صاحب بھی جعفری صاحب سے ملنے یہیں آجایا کرتے تھے۔ محمود سروش صاحب جعفری صاحب کے کالج کے دوستوں میں سے تھے اور ان دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ سروش صاحب بھی علم و ادب کے شیدائی تھے۔ نایاب کتابوں کا ایک ذخیرہ ان کے پاس تھا جب میں ڈاکٹریٹ کے لیے کام کر رہا تھا، تو جعفری صاحب نے ان کے (محمود سروش) کے وڈالا والے گھر میں لے جاکر تعارف کرایا تھا اور سفارش کی تھی، وہ میرے تحقیقی کاموں میں تعاون فرمائیں۔ ضلع بلڈانہ کے ایک باذوق اور ادب نواز اور شاعر رشید کیفی بھی جعفری صاحب کے دوستوں میں سے تھے، وہ مہکر، ضلع بلڈانہ کے رہنے والے تھے اور غالباً فلموں میں قسمت آزمائی کے لیے ممبئی آئے تھے اور برسوں ان کا قیام لبرٹی مینشن میں جعفری صاحب کے یہاں رہا۔ رشید کیفی مرحوم بہت اچھا شعر کہتے تھے، انھیں رباعیاں اور قطعات کہنے میں خصوصی مہارت تھی۔ وہ بہت اچھے غزل گو بھی تھے۔ انھوں نے ناگپور یونیورسٹی سے بی۔اے کیا تھا اور ایم۔اے کی ڈگری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ وہ مشہور شاعر جاں نثار اختر کے ایم۔اے میں ہم جماعت تھے، وہ ایک رئیس زادے تھے، ممبئی میں وہ بیگ محمد ہائی اسکول میں ملازمت کرتے تھے۔ جعفری صاحب، جالب صاحب اور رشید کیفی میں بڑی دوستی تھی۔

جعفری صاحب ہر قدم پر میرے رہنما تھے، ۱۹۶۰ء میں ایم۔اے کے بعد میں نے جب ڈاکٹر مدنی کی زیر نگرانی ڈاکٹریٹ کے لیے کام شروع کیا اس وقت بھی مجھے ان کی رہنمائی حاصل رہی اور جب ۱۹۶۲ء میں میرا تقرر الفنسٹن کالج، ممبئی میں بحیثیت اسسٹنٹ لیکچرر ہوا تو اس زمانے میں بھی وہ میری رہنمائی کرتے رہے۔ الفنسٹن کالج میں اردو فارسی کی ایک ادبی بزم "بزم حیرت" کے نام سے تھی، اس بزم کا اس سال افتتاحی جلسہ تھا۔ اس جلسہ کے لیے میں نے مشہور شاعر اختر الایمان صاحب کو مدعو کیا تھا، لیکن جس روز جلسہ ہونا تھا، اختر الایمان نے معذرت کی کہ وہ جلسہ میں نہیں آسکتے۔ ایسے مواقع منتظمین کے لیے بڑے مسائل پیدا کرتے ہیں، غیر اردو والوں میں یہ بڑی بے عزتی کی بات بھی تھی، میں پریشان تھا۔ میں نے جعفری صاحب سے جب اس کا ذکر کیا تو انھوں نے میری ہمت بندھائی اور کہا کہ آپ باقر مہدی صاحب کو بلا لیجیے۔ میں بھی ان سے بات کروں گا، عین موقع پر کسی کو جلسہ کے لیے مدعو

کرنا بڑی معیوب بات بھی تھی مگر جعفری صاحب ہی کی سفارش پر جب میں نے باقر مہدی صاحب کو مدعو کیا تو انھوں نے ازراہِ نوازش میری دعوت قبول فرمائی۔ وقت مقررہ پر وہ کالج تشریف لائے اور "بزم حیرت" کا افتتاح فرمایا، اس وقت باقر صاحب کی تقریر کا موضوع "اس یگانہ چنگیزی اور ان کی شاعری" تھا۔ اس نازک موقع پر میں باقر مہدی صاحب کا شکر گزار تو تھا ہی، مگر ساتھ ہی میں جعفری صاحب کا شکر گزار بھی تھا کہ باقر صاحب انھیں کی سفارش پر کالج تشریف لائے تھے۔ باقر مہدی صاحب سے بھی جعفری صاحب کے دوستانہ اور عزیزانہ مراسم تھے اور وہ ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کے معترف تھے۔

ڈاکٹر عالی جعفری صاحب ضلع اعظم گڑھ کے ایک گانو شمس پور کے رہنے والے تھے، ان کی پیدائش ان کے ننہیال موضع فتن پور میں ۲۰ر دسمبر ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم غالباً شمس پور ہی میں حاصل کی مگر بعد میں وہ ممبئی منتقل ہوئے اور پھر ممبئی ہی کے ہو رہے۔ ممبئی میں ابتدائی تعلیم انھوں نے ناگ پاڑہ کے میونسپل کارپوریشن اسکول میں حاصل کی، اس زمانے میں میونسپل اردو اسکولوں میں جید اساتذہ ہوا کرتے تھے، چنانچہ تذکرۃً کئی بار انھوں نے مجھ سے اس بات کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ جناب حفیظ الدین صاحب کے شاگرد ہیں، جو اس اسکول کے ایک ذی علم اور باوقار ہیڈ ماسٹر بھی تھے۔ ممبئی میونسپل کارپوریشن کے اساتذہ میں حفیظ الدین شیخ صاحب ایک باصلاحیت اور قابل استاد تھے۔ وہ ایک اچھے منتظم بھی تھے، مجھے بھی ان سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا ہے ۱۹۴۶ء میں جب میں بھی ایک سال کے لیے اس اسکول میں زیر تعلیم تھا، حفیظ الدین شیخ صاحب ہی اس کے ہیڈ ماسٹر تھے، بعد میں وہ میونسپل کارپوریشن میں کارپوریٹر بھی رہے۔ بائکلہ برج کے پاس حفیظ الدین روڈ انھیں کے نام پر ہے۔

ڈاکٹر عالی جعفری صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، وہ ایک کامیاب استاد اور رہنما تو تھے ہی، اسی کے ساتھ شاعری، تنقید اور تحقیق سے انھیں گہری دلچسپی تھی، یہ ساری دلچسپیاں ان کے لیکچرس میں ظاہر ہوتی تھیں، وہ علمی طور سے عالی ہوگئے تھے اور اپنے اسی تخلص سے پہچانے جاتے تھے، ان کے اصل نام سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ لیکن شعر گوئی کے باوجود ان کی غزلیں یا نظمیں بہت کم شائع ہوتیں، ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں، جس سے وہ فکری طور پر وابستہ تھے، ان کی تخلیقات "نیا ادب" میں شائع ہوئیں۔ یہ زمانہ ممبئی کے تعلق سے ادبی و علمی صحافت کا زمانہ تھا، مصور، شاہد، ایشیا، جیسے رسالے ممبئی سے شائع ہوتے تھے۔ جعفری صاحب کی غزلیں ان رسائل میں بھی شائع ہوتی تھیں، مگر جعفری صاحب عموماً اپنے مضامین یا کلام کی اشاعت کے معاملہ میں نہ صرف سست رفتار تھے، بلکہ یہ

رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان کی چند غزلیں بصد اصرار میں نے اس سے حاصل کر کے نقش کوکن (ممبئی) میں شائع کی تھیں، ان غزلوں سے ان کے شعری ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا کلام اگر دستیاب ہو تو اس کی اشاعت بہت مفید ہوگی۔

جعفری صاحب کو تحقیق سے بھی دلچسپی تھی، وہ زبان وبیان، اس کے لسانی ارتقا مختلف زبانوں کے اردو پر اثرات، لفظ و معنی کے رشتے اور اسی طرح کے مختلف لسانی مباحث بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ اسمٰعیل یوسف کالج میں انھیں ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن (بانی پرنسپل) پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور پروفیسر محمد ابراہیم ڈار جیسی بلند قامت علمی شخصیتوں سے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف حاصل تھا۔ وہ کالج کے مجموعی ماحول سے بے حد متاثر تھے، لیکن وہ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار صاحب کے نہ صرف شاگرد تھے بلکہ حلقہ ارادت مندوں میں شامل تھے، ڈار صاحب بھی اپنے شاگردوں سے محبت کرتے تھے اور قدم قدم پر ان کی رہنمائی فرماتے تھے، طلبہ جتنے ڈار صاحب سے قریب تھے، شاید اتنے قریب دوسرے پروفیسروں سے نہیں ہوئے۔ پروفیسر ڈار فارسی، عربی اور اردو کے جید عالم اور مورخ تھے، وہ پروفیسر محمود شیرانی کے دوستوں میں سے تھے۔ پروفیسر شیرانی کی اعلا پایہ کی تحقیقات سے وہ بے پناہ متاثر تھے، ڈار صاحب کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ "مضامین ڈار" ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ مقدار میں کم ہے لیکن ان کا معیار تحقیق پروفیسر شیرانی سے کم نہیں تھا۔ جعفری صاحب کی اردو کے قدیم ادب سے دلچسپی انھیں بزرگوں کے فیضانِ نظر کا نتیجہ تھی۔ جعفری صاحب کی دکنی اردو اور گجری اردو اور ان دونوں قدیم اردو اسالیب کے تعلق سے لسانی دلچسپی ہی کا اثر تھا کہ انھوں نے دکنی اور گجری ادب کی تحقیق کو اپنا خصوصی موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں ان کے دو مضامین بہت اہمیت رکھتے ہیں:

"گجرات کی ایک غیر معروف مثنوی: موسیٰ سہاگ" پر ان کا تحقیقی مقالہ بابائے اردو مولوی عبد الحق کے رسالہ اردو میں ۱۹۵۱ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اس مقالہ میں جعفری صاحب نے قدیم اردو میں گجری کی لسانی اہمیت پر عالمانہ بحث کی ہے، پھر موسیٰ سہاگ" کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے۔ اس مثنوی کی ادبی اور لسانی حیثیت پر محققانہ انداز سے بحث کرتے ہوئے اسے مرتب بھی کیا ہے۔ اس طرح یہ مقالہ صرف مقالہ نہ ہوتے ہوئے ان کی ایک باضابطہ تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے اور گجری ادب کو سمجھنے میں سنگ میل ہے۔ گجری اور دکنی ادب اردو زبان وادب کی تاریخ میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، جعفری صاحب کو گجری اور دکنی دونوں اسالیب سے دلچسپی تھی، لہذا اسی دلچسپی کے پیش نظر ایک دوسرا تفصیلی مضمون،

اردو کے سب سے پہلے بڑے شاعر ولی دکنی سے متعلق ہے ولی کی پیدائش چاہے گجرات ہو یا دکن یا مہاراشٹر (اورنگ آباد) ہو، یہ بات بہت اہم ہے کہ شہر ممبئی میں دیوان ولی کے متعدد بنیادی حیثیت کے قلمی نسخے یہاں کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ ولی کی تاریخ وفات سے تعلق رکھنے والا مشہور مخطوطہ بھی مولی عبدالحق کو کتب خانہ محمدیہ، جامع مسجد، ممبئی ہی میں دستیاب ہوا تھا، اس کے متعدد قلمی نسخے ممبئی کی دیگر لائبریریوں میں بھی محفوظ ہیں۔ پروفیسر عالی جعفری صاحب نے تلاش و جستجو کے بعد ان مخطوطات کا پتہ لگایا اور نہایت عالمانہ و محققانہ مقالہ "ممبئی کے کتب خانوں میں دیوان ولی کے قلمی نسخے" لکھا۔ یہ مقالہ بھی مولوی عبدالحق نے اپنے رسالے اردو کراچی میں شائع کیا۔

جعفری صاحب کی گجری اور دکنی سے یہ دلچسپی قائم رہی اور انھوں نے گجرات کے مشہور صوفی شاعر خوب محمد چشتیؒ کی نادر و نایاب متصوفانہ شعری تصنیف "خوب ترنگ" کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے مرتب کیا "خوب ترنگ" لسانی اور ادبی اعتبار سے اردو کی ایک بنیادی کتاب ہے۔ مختلف مخطوطات کی مدد سے اس کا صحیح متن تیار کرنا، نظم کا ادبی اور لسانی تجزیہ پیش کرنا اور پھر اس میں درج متصوفانہ مسائل پر بحث کرنا ایک مشکل ترین کام تھا۔ جعفری صاحب نے دس بارہ سال کی محنت کے بعد اسے مرتب کیا۔ اس میں انھوں نے خوب محمد چشتیؒ کے حالاتِ زندگی بھی معاصر کتابوں اور تذکروں کی مدد سے حاصل کیے اور اس طرح ایک بڑی علمی و ادبی خدمت انجام دی۔ خوب محمد چشتیؒ اور خوب ترنگ سے متعلق ان کے مضامین اولاً انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی کے مجلہ "نوائے ادب" میں جناب عبدالرزاق قریشی مرحوم نے اور راقم الحروف نے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کے تحقیقی مجلہ ہندستانی زبان میں شائع کیے۔ خوب ترنگ کی لسانی خصوصیات پر جعفری صاحب کا مقالہ راقم الحروف کی مرتبہ کتاب "دکنی اردو" میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ "حکایات رومی" کے انداز پر جعفری صاحب "حکایات خوبی" کے عنوان سے خوب ترنگ میں شامل حکایات کو بھی مرتب کر چکے تھے، اگر یہ کتاب شائع ہو جائے تو یہ ایک اہم اضافہ ہوگا۔ "خوب ترنگ" دو سال قبل گجرات اردو اکیڈمی، احمد آباد نے مشہور محقق اور جعفری صاحب کے کالج کے دوست ڈاکٹر ضیاءالدین ڈیسائی کی کوششوں سے شائع کی ہے۔ جعفری صاحب کا ممبئی کے علمی و ادبی نیز تعلیمی زندگی میں ایک اہم رول رہا ہے۔ "خوب ترنگ" کی تدوین اور ترتیب اردو تحقیق میں ایک گرانقدر کارنامہ تو ہے ہی، اس کے علاوہ ایک عالی مرتبت استاد اور ایک عالی ظرف انسان بھی تھے۔

شرف الہنار
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو
علی گڑھ

مراٹھی شاعری میں نسوانی پیکر: کل اور آج

کلاسیکی مراٹھی شاعری تین حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔

(۱) سنت شاعری (مذہبی اور اخلاقی ورس پر مبنی)

(۲) پنت شاعری (وہ شاعری جس میں سنسکرت کی طرز پر راماین، مہا بھارت اور پرانوں کے قصوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

(۳) (شیواجی اور پیشواؤں کے عہد کی شاعری جو پوواڑوں اور لاونیوں پر مبنی ہے)

عہد قدیم کی شاعری میں عورت کے پیکر کی بھی عام طور سے تین قسمیں ملی ہیں سنت شعرا کی نظر میں عورت یا تو مرد کی راہ نجات کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے یا پھر ایک دیوی اور مقدس وجود ہے لیکن "دیوی کم اور بیری" زیادہ ہے۔

اس کے برعکس پنت شاعری میں عورت راج کنیا یا سنسکرت کے رزمیوں کی نایکا (ہیروئن) کی حیثیت سے اپنی تمام تر نسوانی خوبیوں کی جلوہ گری کے ساتھ سامنے آئی ہے۔

اس کے برعکس تنت شعرا کے یہاں عورت محض سامان تعیش ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کی شوخ بیانیوں اور اداؤں کو نزاکت کے ساتھ پیش کرنے ہی کو پنت شاعروں نے اپنے فن کی عظمت تصور کیا ہے۔

غرض یہ کہ قدیم مراٹھی شاعری میں عورت کا پیکر پاؤں کی بیڑی، دیوی، راج کنیا، جسمانی واخلاقی خوبیوں سے آراستہ ہیروئن اور سامان تعیش کی صورت میں ملتا ہے۔

انیسویں صدی میں بھکت مارگ، کلاسیکیت اور نام نہاد تفریح پسندی سے الگ ہو کر مراٹھی شاعری نے واضح طور پر جس رومانیت کو اپنایا اس کا سہرا کوئی کیشو ست کے سر جاتا ہے۔ کیشو ست نے رومانیت کے سارے اجزا مثلاً بغاوت، حریت پسندی،

پرستی، جمال پسندی، فطرت پرستی اور خیال انگیزی کو الگ الگ برتتے ہوئے آزادانہ شعری تخلیقات کے ذریعہ مراٹھی شاعری میں انقلاب پیدا کیا۔ ایک بار رومانویت پر ایمان لانے کے بعد کیشو ست اس عقیدے پر اٹل رہے اور ان کی شاعری میں عورت کا رومانی تصور ابھر آیا۔ اپنی نظم "تصور معشوق" میں ایک جگہ وہ کہتے ہیں۔

"عورت مرد کی طاقت ہے، عزت ہے اور اس کے من مندر کی دیوی ہے"

کیشو ست کے خیالات تنت شاعروں کے عورت کو محض ایک سامان تعیش سمجھنے کے رجحان سے قطعی مختلف ہیں۔ حالانکہ نسواں پرستی کا رجحان مراٹھی شاعری کے لیے غیر مانوس نہ تھا لیکن کیشو ست کی نسواں پرستی قدیم سے جدید خیالات کی طرف سفر کا نقطہ آغاز ہے۔ چنانچہ قدیم مراٹھی شاعری میں عورت کا جو مقام تھا انھوں نے اس سے انحراف برتتے ہوئے بالکل مختلف قسم کے احساس و خیال کو پیش کیا ہے۔

میں نے دیکھی حسین دوشیزہ، اس ثروت مند کا ذکر کس طرح کروں؟
شجر پر بجلی گرنے سے اس کی جو حالت ہوتی ہے، وہی میری بھی ہو رہی ہے[1]

پریم پنڈت

کیشو ست کی شاعری میں تخیل آمیزی اور کتابی نسواں پرستی کو دیکھ کر انھیں کے خطاب سے نوازا گیا۔ ان کے ہم عصروں میں ریورنڈ تلک، شری نارائن مرلی دھر گپتے (جنھوں نے انگریزی تخلص "بی" اختیار کرتے ہوے مراٹھی میں نظمیں تخلیق کیں) وغیرہ کی شاعری میں عورت خاص طور پر بیوی یا پنڈت کا دیہ کی ہیروئن ہی کے روپ میں سامنے آئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ راج کوی تانبے کی شاعری میں عورت کے محبوبہ، بیوی اور ماں تین روپ آئے ہیں مگر ان تینوں شایستہ پیکروں میں وہ عورت کی پرستش ہی کرتے رہے ہیں۔ ان کے مزاج کی رومان پرستی موت جیسے لرزہ براندام کر دینے والے تصور کو بھی بڑے عاشقانہ انداز میں اس طرح سامنے لاتی ہے۔

"موت اسے ایسے لے جائے جیسے کوئی عاشق اپنی شرمیلی دلہن کو لے جاتا ہے۔"[2]

دیگر رومانی شاعروں گووندا گرج، اٹل اور مادھو جولین نے جذبہ عشق کو گناہ نہیں

۱۔ مراٹھی ساہتیہ پریچے (پرارمبھ سے ۱۹۲۰ء تک) ترتیب و ترجمہ۔ پرلہاد نرہر جوشی ۶۱۔
۲۔ ہسٹری آف مراٹھی لٹریچر (انگریزی) از دلیش پانڈے و راجیاد ھیکش ص ۱۳۵۔

سمجھا۔ گوونداگرج تو پریم کے شاعر" مانے جاتے تھے۔ان کی خواب ناک دنیا میں عورت کا پر تعیش و پر سوز روپ بسا تھا۔ مادھوجولین کو "کعبہ عشق کا زائر" کہا جاتا تھا لیکن ان کی عشقیہ شاعری میں عورت سماجی بندھنوں میں جکڑی ہوئی ہے۔۔ کوی انل کی شاعری میں ایثار ذات اور داخلیت کے سبب جذبۂ عشق اور عورت کا کردار دونوں والہانہ پن سے عاری ہیں۔

جدید مراٹھی شاعری کے پہلے دور میں کتابی رومانیت کے سبب پرستش نسواں کا رجحان غالب رہا اور عورت بہت دھیرے دھیرے اپنے اصل روپ میں سامنے آسکی۔ اس وقت تک عورت ایک بیوی ایک مظلوم ہستی یا رومانوی باغی کے روپ میں ہی نمایاں رہی۔

سات سو سال بعد مراٹھی شاعری میں عورت اپنا اصل روپ پانے میں اگر کسی حد تک کامیاب ہوئی تو وہ رومان پسند شاعروں کی تخلیقات میں۔ لیکن اس کا یہ روپ بھی حقیقت پسندانہ شاعری کے سیاق میں نہیں بلکہ رومانیت پسندانہ شاعری ہی کے سیاق میں تھا۔ نئی رومانیت پسندانہ شاعری میں عورت کا دل ہے، جذبات ہیں، امیدیں اور آرزوئیں ہیں، اس میں کچھ خامیاں بھی ہیں، کبھی وہ بے خوف محبت کی حامل ہے تو کبھی محبت کے اندیشوں میں گرفتار ہے، کبھی خود غرض بھی ہے، اسے مانگنے کی خوبیوں کی ضرورت نہیں وہ اپنے اصلی روپ میں شاعری میں موجود ہے۔اس کے باوجود اس کا پیکر حقیقت پسندانہ نہیں ہے کیوں کہ شاعروں نے اسے ہم دم و دمساز سمجھ کر اس سے اظہار محبت نہیں کیا ہے۔

مراٹھی کی رومانی شاعری کے بارے میں انگریزی اور مراٹھی کے مشہور نقاد پروفیسر منکیش وٹھل راجیادھیکش فرماتے ہیں۔

"لاونی (شاہیری کاویہ) کی جنس زدگی سے زیادہ تر لوگ واقف تھے لیکن جدید شاعری میں وہ بے باکی تو دور رہی ذرا سا کھلا پن بھی کسی کو منظور نہ تھا۔ جب جوش محبت کو روکا نہ جاسکا تو اسے دور از فہم امیجوں میں بیان کرنے، مہین جامع اور پختہ سنسکرت ترکیبوں میں ڈھالنے کا سلسلہ شروع ہوا لیکن شاعری میں محبت کے کھلے اظہار پر پابندی لگی رہی۔" [1]

۱۔ ہسٹری آف مراٹھی لٹریچر۔ ص۔ ۴

جذبہ اور شائستگی کی غیر مرئی جنگ میں شاعر فطری اظہار کرنے میں کمزور پڑتے رہے اور مراٹھی شاعری عورت کے حقیقت آمیز روپ کو دیکھنے کے لیے ترستی رہی۔

آج کے نامور شاعر کسماگرج کی عشقیہ شاعری بھی جذباتی عورت اور جوشیلے مرد کا کردار پیش کرتی ہے۔ ان کے عشقیہ اشعار سے جذبات کی شدت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جاگتی ہے میرے سینے میں دبی چنگاری
اور شدت سے مجھے تیرا خیال آتا ہے
سرد ہے وصل کے لمحات کی وہ آگ، مگر
تیری یادوں سے میرا جسم لرز جاتا ہے

با۔ بھ۔ بورکر کی شاعری متنوع امیجری کے سہارے حقیقی عورت کو ہشت پہلو جمالیات کے اظہار کا ذریعہ بناتی ہے۔ انھوں نے تمام قدرتی مناظر کے ساتھ عورت کے حسن و جمال کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

شاعرہ سنجیونی مراٹھے نے اپنے جذبات کا اظہار تو کیا لیکن سماجی ڈھانچے اور تہذیبی روایات سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش نہیں کی۔ درحقیقت عورت ایسی ہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ آج بھی ہندستانی عورت اپنے جذبات کا اظہار پوری طرح نہیں کرتی ہے۔ پھر بھی اندرا سنت اور پدما جیسی شاعرات نے اپنی اپنی تخلیقات میں قدرے ہمت کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اندرا سنت کی "رنگ باوری" اور پدما کی "آکاش ویڈی" دراصل عورت کی جذباتیت، محبت پہ قناعت، والہانہ شیفتگی اور صبر و ضبط کے حامل روپ ہیں۔

شاعرنا۔ گھ۔ دیش پانڈے (ناگوراو گھنشیام دیش پانڈے) کی شاعری میں بھی عورت کا یہی روپ ملتا ہے۔ اس کا اظہار عشق آزادانہ اور بےباکانہ ہے۔ یہ عورت پریم کی نمایش کرنے سے گھبراتی ضرور ہے لیکن پریم کو پاک سمجھ کر پیار کرنے سے ڈرتی نہیں ہے۔ یہاں صنف نازک کی امیج ایک ڈھیٹ عورت کی ہے۔

جدید مراٹھی شاعری کے زیر نظر دور میں پرستش نسواں کی بے معنیت واضح ہو کر رومانیت پسندانہ شاعری میں عورت انسانی روپ میں نازل ہوئی ہے۔ دیوی یا محض ایک مادہ، گناہ کی جڑ اور راہ نجات کی رکاوٹ یا ناقابل حصول ہیروئن کے انتہا پسندانہ روپ میں نہیں یہاں حوصلہ آور اور قابل پرستش شخصیت کا کتابی تصور بھی بے جوڑ اور

غیر موزوں ثابت ہوا ہے۔ عورت اب عورت روپ میں اپنی خوبیوں اور خامیوں، امیدوں اور آرزوؤں، ہمت، نرم دلی اور صبر و ضبط لے کر مراٹھی شاعری میں اپنا جائز مقام حاصل کرنے کے لیے مستعد نظر آتی ہے۔ شاعرات نے اپنے اظہار جذبات سے اسے اصل حقیقت کا نمائندہ ثابت کردیا ہے۔

جدید مراٹھی شاعری کا امام با۔ سی۔ مرڈھیکر (بال سیتارام مرڈھیکر) کی ابتدائی شاعری رومانیت پسندی کے رجحان کے تحت پروان چڑھی تھی لیکن ان کے دوسرے دور کا شعری سرمایہ اپنی فنکارانہ تحلیل نفسی کے سہارے مراٹھی شاعری کو ایک نئی تلاش پر مجبور کرنے لگا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد نئی سماجی تشکیل، مشینی دور کا آغاز، تلاش ذات کا رجحان جیسے عناصر کے زیر اثر مراٹھی شاعری کا کردار گویا نئی کروٹ لے رہا تھا۔ اس دور میں رومانیت پسندی فطری طور پر استہزا کا نشانہ بن گئی اور وقت کے تقاضے کے عین مطابق حقیقت پسندانہ شاعری وجود میں آگئی۔

رومانیت پسندی سے انحراف کے میلان اور حقیقت پسندی سے لگاو کے نتیجے میں مراٹھی شاعری میں عورت کا بھی پیکر بدلا عورت سچ مچ بدل گئی تھی یا بدل رہی تھی کہ نہیں یہ ایک الگ سوال ہے جس کا جواب دینا میرا مقصد نہیں۔ نئی شاعری کے منظر نامہ میں قاری اس کا جواب خود ہی پائے گا۔

"ایسی ہی تھی ایک نکٹی
ترچھی بھویں اور زلفیں الٹی
ٹھک ٹھک کے دکھائے جوبن
جیسی کھلی تیلی کے گھر کی"

(مرڈھیکر کی شاعری۔ ص۔۸۶)

دوسی طرف عورت کا ذکر اس انتہا تک کیا گیا کہ وندا کرندیکر کی تحریر کردہ وروپکاوں ہندی پر لوگوں نے سخت اعتراض کیا۔ سری گنیش جی کی سونڈ کو دیکھ کر جس حسین عورت کے من میں جنسی خواہش بیدار ہوئی ایسی عورت کی بد تخیلی عوام کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

آزادی کے بعد کی شاعری میں عورت کی حقیقت پسندانہ تصویر گہرے رنگوں سے کھنچی گئی اور ابھر کر سامنے آئی۔ واشنا، حسد، بے بسی، انفرادی بغاوت، آزادی کی امید، اکتاہٹ، تھکن، فرد اور حالات کے بیچ کا تناؤ، فرد اور سماج کی رسا کشی اور سمجھوتے

بازی، مہانگر سے شکست کھانے کا احساس، گاؤں میں بھی تہذیبی ڈھانچے کی شکست و ریخت کا دکھ، یہ سب تجربات / محسوسات نہ صرف عام طور پر شاعری میں برتے گئے بلکہ عورت کی حقیقی تصویر کشی میں بھی معاون ہوئے۔

"کر کر کیسے ، مر مر مر یے
کڑھ کڑھ کر جیے، چڑ چڑ چڑ یے
گھس گھس گھسیے، پکایئے اور پلیے"

(وندا کر ندیکر۔ آدمی مایا۔ ص۔ ۱۳۰)

ایک نمایندہ نظم کی مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"کل سے اس کے لیے بھی کام ڈھونڈ بیٹا"
چکرایا اور پھر غش کھا کر سنبھل گیا۔

(نارائن سروے "ماڑھے ودیا پیٹھ" ص۔ ۱۸)

نارائن سروے جب ایسا کہتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ عورت کس موڑ پر کھڑی ہے اور مرد کی محبت، اس کی سنسکرتی اور حقیقی معاشی مشکلات می باہم کیسی رسا کشی چل رہی ہے۔۔۔ اب عورت شاہیروں کا سامان تعیش نہیں رہی لیکن مرد کی طرح مشین بنتے جارہی ہے گویا کام کی چیز بن رہی ہے۔

اس نقطے پر "اشونی گھونگڑے" کے "استری سوکت" نسوانیت نواز (feminist) شاعری کے روپ میں بغاوت کراٹھتے ہیں۔ یہ سوال پھر سے ابھرنے لگتا ہے کہ۔۔ "کیا عورت کو محض عورت کی حیثیت سے اب بھی کوئی مقام / وقار حاصل نہیں؟ ملکہ امر شیخ عورت اور مہانگر کے درمیان کے تناؤ کو دکھانے کو شش کرتی ہے۔ وہ حالات حاضرہ کے تمام نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی عورت کو مایوس نہیں ہونے دیتی اور کہتی ہے،

"یہ اداسی موت ہے
موت کی پہلی نشانی کی طلب
مجھ کو ہرگز بھی نہیں۔"[۱]

مہانگر کے وسیع ماحول میں عورت کا وجود کیا ہے؟ پہلے ہی سے عورت کی شناخت گم یا پوشیدہ تھی اور اب تو مہانگر اسے شوکیس کی گڑیا یا روزی روٹی کا وسیلہ بنا رہا

عصری مراٹھی ادب کا انتخاب (امکان حصہ اول) مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی ممبئی ص ۵۲۱۔

ہے۔ کوی مرڈھیکر نے بہت پہلے اپنی شاعری کے ذریعہ ہمیں اس صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔ موجودہ دور میں دلت عورت، دیہی عورت کے الگ الگ امیج منعکس ہو رہے ہیں۔

پرشوتم شورام ریگے، (پ۔ شی۔ ریگے) منگیش پاڈگاونکر، وسنت باپٹ، سریش بھٹ، میری کرشن پووے، آرتی پربھو، دلیپ چترے وغیرہ نامور شاعروں نے اور شانتا شیلکے جیسی شاعرات نے اپنی قوت تخلیق سے عورت کے الگ الگ پیکر تراشے ہیں۔

مرڈھیکر کی نظموں نے سب سے پہلے مراٹھی قاری کو رومانیت پسندی کے خلاف حقیقت پسندی کے مظہر عورت کے امیج سے متعارف کرایا تھا۔ بعد کی نظموں میں ایک طرف یہ عورت زیادہ بدہیت (وروپ) بنتی گئی تو دوسری طرف مزید ایثار پسند ہوتی چلی گئی لیکن اس میں معروضیت پسندی بھی آنے لگی۔

روایتی شاعری میں عورت کے رومانیت پسندانہ روپ محبت اور عشق ہی کے جذبات کو ظاہر کرتے تھے لیکن کچھ شاعرات نے باغیانہ نظمیں لکھ کر اپنا الگ راستہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ مراٹھی شاعری میں عورت اکثر کس روپ میں جلوہ گر ہوئی ہے؟

اس مقالے کے گذشتہ بیانات کو سامنے رکھتے ہوئے مراٹھی شاعری میں عورت کے تصور کا خلاصہ تیار کیا جا سکتا ہے۔

(الف) رومانی شاعری میں عورت اپنا عورت پن لے کر جلوہ گر ہوتی ہے۔

(ب) حقیقت پسندانہ شاعری میں حقیقی عورت کا عکس کسی حد تک نظر آتا ہے۔

(ج) کلاسیکیت پسند شاعری میں عورت اپنے رنگ اور روپ اور اپنی انفرادی خصوصیتوں کے ساتھ امنگوں کا سرچشمہ بن کر سامنے آتی ہے۔

(د) سوریئلی (مابعد حقیقت پسندانہ) شاعری میں عورت ایک پیغامبر بن کر موجود ہے۔

ان رجحانات کی تقسیم ادوار کے مطابق نہیں ہے لیکن اس تقسیم کے سیاق وسباق میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ مراٹھی شاعری میں عورت کس حد تک کھری اتری ہے۔

پاپ پر آمادہ کرنے والی، پاپ میں گھری ہوئی، راہ نجات کی رکاوٹ، راج کنیا، دیوی، نایکا، جنسی تعیش، قابل پرستش ہستی، آرزومندی کا سرچشمہ، بیوی، ابلا، مادہ اور

بے حقیقت شے جیسے نت نئے روپ میں جلوہ گر ہو کر عورت نے مراٹھی شاعری کو وسیع کیا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ عورت کی قوت ذات، عورت کی تخلیقی اڑان، عورت کے حدود، عورت کی قوت برداشت، عورت کی توانائی، عورت کا جذبہ قہر، عورت کی بے رحمی، عورت کی ممتا اور عورت کے حساس جذبہ ایثار کے توسط سے اس کے اس ہمہ گیر روپ کو سمجھنا مراٹھی شاعری کے لیے مشکل ثابت ہوا ہے۔ شعرا کی شخصی بالا شخصی ردا خلی یا معروضی شاعری میں عورت کو دی گئی ثانوی حیثیت اور اس کے سچے روپ کو سمجھنے میں شاعرات کی ناکامی کے سبب چند مُتثنیات سے قطع نظر مراٹھی شاعری میں عورت کا روپ حقیقت سے دور ہی رہا ہے۔

جدید مرد شاعروں سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ عورت کے جوہر کو سمجھ لیں اور اسے اپنے شعری مزاج میں ڈھال لیں۔ شاعرات سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے سچے حقیقی تصورات کو تلاش کریں یہ حقیقت ہے کہ جدید مراٹھی شاعری میں عورت کا تصور دل خوش کن، تحیر انگیز، لبھاونا اور سماجی شعور کو اجاگر کرنے والا ہونے پر بھی ہمارا ذوق ادب اس کے مشاہدے سے آسودہ نہیں ہو پاتا۔

سید بشارت علی
لکچرر، شعبہ انگریزی، سری وینکٹیشور ڈگری کالج
سوریہ پیٹ، نلگنڈہ، آندھرا پردیش

غزل

ہر ایک لفظ پہ طاری یہ بیکسی کیوں ہے
ہر اک زبان پہ یہ مُہر خامشی کیوں ہے

ملے نہ آب تو تیزاب بھی گوارا تھا
لبوں پہ ٹھہری ہوئی پھر یہ تشنگی کیوں ہے

ہر ایک سمت سے یلغار ہے اندھیروں کی
یہ درمیاں میں سسکتی سی روشنی کیوں ہے

سبھی نے عافیتیں پائیں خوابِ غفلت میں
ہمارے واسطے آشوبِ آگہی کیوں ہے

ہم اپنے مالک و مختار ہیں، بجا، لیکن
ہر اختیار کا سر چشمہ بے بسی کیوں ہے

الیاس شوقی

وہ آنکھیں

ہاں اسی اک پل میں
جب ہوا رک سی گئی
خوش کلامی کے سلیقے سے سجی سب باتیں
ایک خاموشی کے پیکر میں ڈھلیں
تیری آنکھیں،
وہ محبت پاش آنکھیں
مجھ سے مل کے جو بہت دیر تلک
کیسے وحشت زدہ سی
ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہیں
اور شرما کے پھر ایسے جھک گئیں
جیسے
ایک پل میں اپنا سب کچھ ہار چکی ہوں
لیکن
ہاں اسی اک پل میں
ساری دنیا کو جیت چکی تھیں

آنند اختر
اوتا چوک، مینا بازار
جمیا (بہار)

غزل

بچا کے پُرکھوں کی شان رکھنا
یہ فلسفہ ہے دھیان رکھنا

پلٹ نہ جائے وہ آکے در سے
ذرا سی آہٹ پہ کان رکھنا

لہو برسنے کو ہے فلک سے
چھپا کے مٹھی میں جان رکھنا

لطیف لفظوں کو سر چڑھانا
غزل میں سادہ زبان رکھنا

لباس تن کے پھٹے ہوں لیکن
انا کے حق میں بیان رکھنا

لپٹ نہ جائے زوال تجھ سے
حدوں سے آگے اڑان رکھنا

گزر ہو تازہ ہوا کا اختر
کھلی جگہ پہ مکان رکھنا

معین مظفر
۲/۸۸ گدیانہ۔ اُناؤ

دوہے

سورج لہو لہان ہے، قاتل بنی ہے شام
ڈھونڈ رہی ہے روشنی، اب اپنا انجام

برف کے اک پیکر نے، سر پر رکھ کر دھوپ
پانی پانی کر لیا، اپنا سارا روپ

وحشی چڑیاں کھا گئیں، پیڑ کے سارے پھل
ہوگا کیا انجام اگر پی گئیں گنگا جل

جینے کا احساس بھی، جس نے لیا ہے چھین
وہ بھی اب یہ سوچ رہا، جرم کیا سنگین

قوم کے رہبر ہو گئے، سب کے سب دلال
کوشش کرتے بس یہی، آئے کہاں سے مال

لہو بدن کا چاٹ کر، فکریں ہیں خوش رنگ
لفظوں کے اس کھیل سے، عقل و خرد ہیں دنگ

کھیل نہیں ہے شاعری، یہ تو ہے سوغات
پڑھے لکھے بھی بیٹھ گئے، ہاتھ پہ رکھ کر ہات

سید انوار حسین محور
رائل ہوٹل، بس اسٹینڈ، چھولا روڈ
بھوپال۔ ۴٦۲۰۰۱

غزل

الجھنوں میں میری اس درجہ اضافہ کر دیا
وقت سے پہلے مجھے بچوں نے بوڑھا کر دیا

یوں تو میرے چار سو رہتا ہے رشتوں کا ہجوم
درد نے لیکن مجھے اندر سے تنہا کر دیا

سر جھکا دیتا ہے اب بازیگروں کے سامنے
آدمی کو خواہشوں نے کتنا اندھا کر دیا

کس نے پایا ہے وفاؤں کا صلہ یہ سوچ کر
ہم نے اپنی نیکیوں کو نذرِ دریا کر دیا

اپنی قیمت کا مجھے کل تک تو اندازہ نہ تھا
وقت کے سوداگروں نے آج سستا کر دیا

اک سیاسی ذہن نے اس حق نوا کے ہاتھ پر
رکھ کے اک سونے کا سکہ آج گونگا کر دیا

ڈاکٹر حنیف ترین
ص۔ب ۳۷۸
عرعر۔ سعودی عربیہ

غزل

تھی زندگی کو کھلے سائبان کی خواہش
زمیں پہ رہتے ہوئے آسمان کی خواہش

یہ خود سے اُوب کے، اک اور جہان کی خواہش
ہے کہکشاؤں سے آگے، اُڑان کی خواہش

شبِ زمستاں میں یادوں کے دانت بجتے ہوئے
تھی خامشی کے دِرا کو اذان کی خواہش

بدن کی آگ کے نادیدہ ذائقے چکھ کر
لہر لہر تھی، کسی بے زبان کی خواہش

مجھے خریدنا چاہا تھا مفت میں اس نے
مکاں سے پہلے تھی جس کی دُکان کی خواہش

حنیف کھو گئے بے معنی استعاروں میں
غزل کو جن سے رہی آن بان کی خواہش

عطا عابدی
ایڈمنسٹریٹیو آفیسر
شعبہ، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ-۱۵

غزل

میرا مَیں مجھ سے مخاطب ہے ورنہ تو کیا ہے؟
خیال و خواب ہے تفہیم گفتگو کیا ہے؟

اُسی کی ذات بنی اپنی آرزو کا ہدف
وہی سوال ہے جس کا کہ آرزو کیا ہے؟

زمانہ میر کا ہے اور نہ دور غالب کا
مگر وہ فن کہ جو گویا ہے چار سو' کیا ہے؟

ہمیشہ محو سفر میں رہا مگر اس طرح
یہ مسئلہ نہ ہوا حل کہ جستجو کیا ہے؟

نہیں وہ تو نہ تیرا غم نہ تیری یاد، اگر
کسک جو ہوتی ہے دل میں کبھو کبھو، کیا ہے؟

بہت اشارے کیے فن کے تاجروں نے عطا
نہ جانا میں نے کہ ابہام کیا، غلو کیا ہے؟

تاج پیامی
"دارالادب" مہادیوا محلہ' آرہ، بہار

غزل

ہُنر اپنا سیاسی دار پر ہے
مگر مسند نشیں ہر بے ہنر ہے

ہے ان کی بے حِسی سفاک لیکن
سیاسی بے حسی سفاک تر ہے

مکاں نکلا وہ تیرے شہر میں بھی
جسے سمجھا تھا میں نے اپنا گھر ہے

وہ شاید پتھروں کی بات سمجھے
صدا اس پر ہماری بے اثر ہے

محرم بن گیا ہے عید کا دن
میری تنخواہ کتنی مختصر ہے

مخالف سمت میں ہم جا رہے ہیں
مگر اک چیزاب بھی ہمسفر ہے

سمندر کتنا بھی انکار کر لے
اُسے لیکن تباہی کی خبر ہے

ثبوت اپنی وفا کا اور کیا دوں
خطا اس کی پیامی میرے سر ہے

ظفر نسیمی
۵۵۔ عقب ڈاک خانہ
بازار شاہجہاں آباد، بھوپال

غزل

جادۂ زیست، پُل صراط سہی
دو قدم اور احتیاط سہی
کچھ میسر نہیں غموں کے سوا
یہی سامانِ انبساط سہی
پھول کانٹوں کے ساتھ چین سے ہیں
غیر مانوس ارتباط سہی
خون رُلوائے گی یہ نادانی
بے حسی باعثِ نشاط سہی
ارتقا چاہیے زمانے کو
آدمیت کا انحطاط سہی
کچھ اثاثہ تو ہے ظفر اپنا
ایک اُجڑی ہوئی بساط سہی

ایس۔اے۔ فہیم
بافنا بلڈنگ۔ روبرو جہانگیر پلازا
کنگ کوٹھی روڈ۔ حیدر آباد

غزل

سر مژگاں نہ اگر جلتے ستاروں کے چراغ
پھر کہاں ملتا شبِ غم مجھے منزل کا سراغ
جن سے روشن ہیں تری بزمِ محبت کے چراغ
کیا قیامت ہے اٹھاتے ہیں وہی داغ پہ داغ
سرد، آہوں سے ہوئے ہیں نہ سلگتے شعلے
گرم سانسوں نے جلائے نہ کبھی کوئی چراغ
زلفِ جاناں کو سنواروں گا بہ عنوانِ دگر
اک ذرا تلخیٔ حالات سے مل جائے فراغ
اپنے دامن کی ہواؤں کو ذرا روک تو، لو
آندھیوں نے تو جلائے یہ بجھادیں گے چراغ
جن کو ہمت کی ہے توفیق وہ پی سکتے ہیں
دست امروز سے لے کر مئے فردا کا ایاغ
میرے خوابوں کو نئے دور کی تعبیر نہ دو
دل کے ہمراہ نہ ہو جائے پریشان دماغ

پی۔پی۔سریواستو رند ساغری
R-16 سیکٹر ۱۱، نوئیڈا

غزل

ہو گیا طے زندگی کا مسئلہ جو مجھ میں تھا
خامشی سے اک پرندہ اڑ گیا جو مجھ میں تھا
عکس اندر عکس خود کو دیکھتا رہتا تھا کون
آئینہ در آئینہ وہ کون تھا جو مجھ میں تھا
اپنے کاندھے پر اٹھائے بے کراں غم کی صلیب
چل دیا بے سمتیوں میں قافلہ جو مجھ میں تھا
وقت کے خیمے سے باہر کون آکر دیکھتا
موسموں کا وہ سلگتا سلسلہ جو مجھ میں تھا
جس کا سایہ دور کر دیتا تھا دن بھر کی تھکن
وہ شجر پہلے تو سوکھا پھر جلا جو مجھ میں تھا
مضطرب لمحات کو تسکین دینے کے لیے
میں نے خود ہی توڑ ڈالا آئینہ جو مجھ میں تھا
کس نے سوچا تھا وہی کڑوا دھواں بن جائے گا
سبز پیڑوں کا وہ لمبا سلسلہ جو مجھ میں تھا
شب کے سناٹے میں سنتا تھا جسے میں صبح تک
رند وہ کرب انا کا شور تھا جو مجھ میں تھا

ڈاکٹر خاور خان سرحدی
سرائے میاں، علی گڑھ

غزل

شعر کیا کہتا میں تیری انجمن کے درمیاں
رقص پر تھی جب اداسی اپنے من کے درمیاں
خواب، تتلی پھول، آوارہ پرندے ہیں یہ سب
ہوتے ہیں آباد آکر اپنے فن کے درمیاں
چاند تاروں کی نظر ان کو نہ لگ جائے کہیں
تیر چھوڑا ہے فضا میں یوں گگن کے درمیاں
پھول کی پتی پہ لکھ بیٹھا غزل سی بات کو
شبنمی انداز تھا اپنا بھی من کے درمیاں
آج خود انصاف کہتا ہے کہ تم رکھو قدم
شیش محلوں میں نہیں دار و رسن کے درمیاں
شاخ سے اس پھول کو خاور جدا ہونا ہی تھا
روح اپنی بھی نہیں ہوگی بدن کے درمیاں

خامہ بگوش

مانگے کا اُجالا

خامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوب صورت جملوں کا مزہ لیجیے

سوختنی نہ فروختنی

ڈاکٹر جمیل جالبی کے بلند پایہ علمی وادبی کاموں کی وجہ سے ہم ان کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ ان کی ہر بات آنکھیں بند کرکے تسلیم کرلیتے ہیں۔ ثقیل قسم کی علمی تحریریں ہم پڑھتے ہی نہیں، اور اگر بادل ناخواستہ پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو آنکھیں بند ہونے کی وجہ سے ان کی ثقالت کا احساس نہیں ہوتا، اس لیے اختلاف رائے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن اب کے خلاف معمول ایسا ہوا کہ ہم نے ڈاکٹر صاحب کا اک مضمون آنکھیں کھول کر پڑھ لیا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لاہور سے ایک نہایت عمدہ ادبی رسالہ "علامت" شائع ہوتا ہے۔ اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی ہر مہینے "ادبی زاویے" کے عنوان کے تحت کسی ادبی مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہیں یا کسی ادبی کتاب کا تعارف کراتے ہیں۔ یہ ویسا ہی سلسلۂ مضامین ہے جیسا کسی زمانے میں محمد حسن عسکری رسالہ "ساقی" میں "جھلکیاں" کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ "علامت" کے تازہ شمارے میں ڈاکٹر صاحب نے ایک امریکن شاعرہ جس کی عمر ۸۳ برس ہے اور یہ اس کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ موصوفہ چھ برس کی عمر سے شاعری کررہی ہیں۔ شاعری کرتے ہوئے ۷۷ برس گزر چکے تو باسی کڑھی میں ابال آیا یعنی انھیں اپنا مجموعہ شائع کرنے کا خیال آیا۔ اس ضعیفہ کے صبر وضبط کی داد دیتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

"ہمارے ہاں یہ عالم ہے کہ شاعر میں ابھی شعر کہنے کا سلیقہ اور شعور بھی پیدا نہیں ہوتا کہ مجموعوں پر مجموعے آنے لگتے ہیں۔ مروت، لحاظ اور حوصلہ افزائی کرنے والے نقاد

جن میں میرا نام بھی شامل ہے اور میں بھی اس گناہ کبیرہ میں شریک ہوں' نئے' خام اور 'بچہ شاعر" کی شان میں وہ قصیدہ پڑھتے ہیں کہ زمین اور آسمان ایک ہو جاتے ہیں۔ شاید یہ کام شاعر کو جلد شہرت سے سرفراز کر کے اس کی تخلیقی قوتوں کو یرقان میں مبتلا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے جیسے ہمارے حریص زر پرست معاشرے میں لوگ رات بھر میں کروڑپتی بننے کے خواب دیکھتے ہیں' اس طرح ہمارے ادیب 'شاعر' فنکار 'محنت' مطالعے اور تربیت کے بغیر' راتوں رات مشہور ہو جانا چاہتے ہیں۔"

افسوس کہ ڈاکٹر صاحب کے ان ارشاداتِ عالیہ سے اتفاق کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلی بات یہ کہی ہے کہ جب تک کسی شاعر میں شعر کہنے کا سلیقہ اور شعور پیدا نہ ہو اسے اپنے کلام کے مجموعوں کی اشاعت سے گریز کرنا چاہیے۔ یہ شرط نہایت سخت ہی نہیں' نامناسب بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر مذکورہ دونوں خصوصیات کسی شاعر میں بوجوہ پیدا نہ ہو سکیں تو اسے تمام عمر اپنے شعری مجموعوں کو محرومِ اشاعت رکھنا پڑے گا۔ یہ صریحاً ناانصافی ہے۔ اگر اس کڑی شرط پر عمل کیا جائے تو مستقبل میں اردو شاعری کے ننانوے فیصد مجموعے بطنِ شاعر ہو کر رہ جائیں گے اور اگر اس شرط کا اطلاق زمانۂ ماضی سے ہوا تو ننانوے فیصد مجموعوں کو سمندر میں پھینکنا پڑے گا۔ ظاہر ہے اتنی بڑی تعداد میں شعری مجموعے سمندر میں پھینک دیے گئے تو آبی مخلوق کی صحت ہی نہیں' زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

ممکن ہے ہمارے استدلال کو کمزور سمجھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب ہماری گزارشات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھیں' لہٰذا ہم اس مسئلے پر ایک اور رخ سے روشنی ڈال کر اپنے موقف کی صداقت واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شعر کہنے کا سلیقہ اور شاعرانہ شعور خداداد صفات ہیں۔ کوئی انسان ان صفات کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا جب کہ شعری مجموعے شائع کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ جو شخص چاہے' اور جب چاہے یہ کام انجام دے سکتا ہے۔ یہ کہاں کی دانائی ہے کہ جن کاموں کو انجام دینے پر انسان قادر نہیں ہے' ان کی خاطر وہ ان کاموں کو بھی انجام دینے سے دستبردار ہو جائے جو اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ یہ تو ویسی ہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص چھلانگ لگا کر قطب مینار کی چوٹی پر نہ چڑھ سکے تو اس پر چھلانگ لگا کر کسی کنوئیں کی تہ تک پہنچنے کی بھی پابندی لگا دی جائے۔ اس طرح تو انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کے سوا کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اس سے تو بہتر ہے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر مجموعۂ کلام چھپوا دیا جائے۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو نقاد مروت، لحاظ اور حوصلہ افزائی کے خیال سے نوجوان شاعروں کی تعریف کرتے ہیں، وہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ گویا اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ مروت، لحاظ اور حوصلہ افزائی کا شمار گناہوں میں ہونے لگا ہے اور وہ بھی چھوٹے گناہوں میں نہیں، بڑے گناہوں میں۔ ایک زمانہ تھا کہ بزرگ، نوجوانوں کو پورے پورے دیوان لکھ کر دے دیا کرتے تھے اور احسان نہیں جتاتے تھے اور آج یہ حال ہے کہ آٹھ دس سطروں کے فلیپ اور ڈیڑھ دو صفحوں کے دیباچے لکھنے والے اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتے ہیں۔ اگر فلیپ نگاری اور دیباچہ نویسی کو محاورۃً "گناہِ بے لذت کہا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن ان کاموں کو سنجیدگی سے گناہ کے مترادف سمجھنا ستم ظریفی کی انتہا ہے۔ یہ رویّہ ان نقادوں کو مشکل میں ڈال دے گا جن کی فردِ عمل میں فلیپوں، دیباچوں اور تقاریب رونمائی کے لیے لکھے گئے مضامین کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

گذشتہ پچیس برسوں میں اردو میں جو تنقید لکھی گئی ہے، اس کا بڑا حصہ تعریفاتی تحریروں پر مشتمل ہے۔ اگر ان تحریروں کو نظر انداز کر دیا جائے تو جو کچھ بچے گا، وہ کلیم الدین احمد کے لفظوں میں اقلیدس کے خیالی نقطے یا معشوق کی موہوم کمر کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم فرضی اور خیالی چیزوں پر قناعت کر کے اردو تنقید کے اصل سرمائے کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔

تعریفاتی اور تقریباتی تحریروں کو اگر دائرۂ تنقید سے خارج کر دیا گیا تو اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ہمارے بیشتر نقادوں کی گرہ میں صرف وہ قلم رہ جائے گا جو کسی معقول موضوع پر رواں نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ نقاد اکادمی ادبیات کی رائج کردہ اصطلاح کے مطابق "دانشور" بن کر رہ جائیں گے اور وہ بھی دادین میں۔ واضح رہے کہ اس اصطلاح کا اطلاق ان چیزوں پہ ہوتا ہے جو سو گفتنی ہوں نہ فرو گفتنی۔

تعریفاتی اور تقریباتی تنقید لکھنے والوں میں استاد لاغر مراد آبادی سرفہرست ہیں، وہ ڈیڑھ سو سے زیادہ کتابوں پر دیباچے اور فلیپ لکھ چکے ہیں۔ ان کی اس قسم کی تحریروں کو ہم کتابی صورت میں مرتب کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب اردو تنقید کی تاریخ میں سنگِ میل ثابت ہوگی اور اس چراغ سے بے شمار چراغ جلائے جائیں گے۔ ذیل میں استاد گرامی کے ایک خطبۂ صدارت کا ابتدائی حصہ بطور نمونہ کلام درج کیا جاتا ہے تاکہ یہ اندازہ کیا جاسکے کہ ان کے قلم کی موجِ خرام کیسے کیسے گل کترنے پر قادر ہے۔ مکمل خطبہ ہم آئندہ کسی موقع پر شائع کریں گے۔

"صاحبو: رسم دنیا تو یہ ہے کہ جب کسی کو کوئی اعزاز دیا جاتا ہے تو وہ سب سے پہلے اعزاز دینے والے کا شکریہ ادا کرتا ہے، مگر میں اپنی تقریر کا آغاز ایک شکایت سے کر رہا ہوں۔ آج کی تقریب میں مجھے کرسیٔ صدارت پر بٹھا کر جو اعزاز بخشا گیا ہے، وہ عمر بھر کی رسوائی کے لیے کافی ہے۔ عزیزی شہتیر مراد آبادی کو میں نے بہت سمجھایا کہ تمھارے مجموعۂ کلام میں جو شاعری ملتی ہے، وہ میرے مزاج سے یکسر مختلف ہے۔ اس لیے تم کسی ایسے شخص کو یہ اعزاز بخشو جو پیدائشی طور پر ناموزونی طبع کا شکار ہو اور اس وجہ سے نثری نظمیں لکھنے پر قدرت رکھتا ہو۔ اس عزیز نے جواب دیا، میرا ہر پانچواں مصرع موزوں ہوتا ہے، ان موزوں مصرعوں کی قدردانی آپ سے بڑھ کر کون کر سکتا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا، تمھارے جو مصرعے عروضی نقطۂ نظر سے موزوں ہیں، وہ شاعری کے اعتبار سے تمھارے ناموزوں مصرعوں سے بھی زیادہ خراب ہیں کیونکہ ان میں معنی نہ ہونے کی وجہ سے بے وزنی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ میری ان باتوں پر اس عزیز نے توجہ نہ دی۔ خاندانی تعلقات کے حوالے سے اپنی خردی اور میری زندگی کا رقت انگیز نقشا کھینچا۔ عزیز موصوف کے والد مرحوم میرے بچپن کے دوست تھے اور مشاعروں میں میرے مصرعے اٹھایا کرتے تھے۔ میں نے ان جیسا جفاکش انسان نہیں دیکھا۔ ۲۵، ۳۰ برس کی دوستی میں انھوں نے بلا مبالغہ میرے ہزاروں مصرعے اٹھائے ہوں گے۔ چونکہ میرا ہر مصرع وزن میں ہوتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کتنا وزن انھوں نے ڈھویا ہو گا۔ افسوس کہ ایسے باوزن شخص کا بیٹا اور بے وزن شاعری کرے! میں نے عزیزی شہتیر مراد آبادی سے کہا، اگر اس کے والد زندہ ہوتے تو اس کا مجموعۂ کلام دیکھ کر اسے عاق کر دیتے کیونکہ وہ اس زمانے کے آدمی تھے جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ بے وزن مصرعے کہنے والے کا اخلاق بھی درست نہیں ہوتا۔

اس عزیز نے جب دیکھا کہ میں کسی طرح تقریب کی صَدارت کرنے پر راضی نہیں ہوں تو اس نے مجھے وہ کلاشنکوف دکھائی جسے وہ حصولِ مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس نے بتایا کہ اسی آلۂ تسخیر قلوب کے ذریعے اس نے اپنے بروشیر کے لیے اشتہارات حاصل کیے ہیں۔ یہ بروشیر آج کی تقریب میں تقسیم کیا جائے گا۔ اس میں شامل درجنوں اشتہارات سے برخوردار خوش اطوار کی غیر شاعرانہ سعی و کاوش کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر مجھ پیر فرتوت میں اتنی ہمت نہ رہی کہ دوبارہ حرف انکار زبان پر لاتا، لہٰذا مجبوراً یہاں موجود ہوں۔

بہر حال اب جبکہ میں یہاں آ ہی گیا ہوں تو صاحب تقریب کی تعریف میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑے گا۔ آج کل کے دیباچہ نگاروں اور فلیپ نویسوں سے الفاظ مستعار لیتے ہوئے عرض کروں گا کہ عزیزی شہتیر مرادآبادی کی صورت میں میر تقی میر نے دوبارہ جنم لیا ہے۔ پچھلے جنم میں میر صاحب سے ضرور کوئی خطا ہوئی ہوگی جس کی یہ سزا انھیں ملی ہے۔ میر اور شہتیر کی شاعری میں مماثلتیں تو بہت ہیں مگر ایک فرق بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ میر صاحب کی طبیعت میں یاس پسندی تھی اسی لیے وہ اپنے کلام میں روتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن عزیزی شہتیر خود نہیں روتے' ان کا قاری روتا ہے۔ قاری کو رونا اس لیے نہیں آتا کہ اس عزیز کے کلام میں سوز و گداز پایا جاتا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام سے استفادہ کرتے ہوئے اردو زبان کی کسمپرسی پر دل دکھتا ہے اور جب دل دکھے گا تو آنکھوں میں آنسو بھی آئیں گے۔ کسی شاعر کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے آنسوؤں سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔

عزیز موصوف کا ایک قابل ذکر وصف یہ بھی ہے کہ کم عمری ہی میں انھیں لفظوں کے استعمال پر وہ قدرت حاصل ہو چکی ہے جو میر صاحب کو ایک عمر کی ریاضت کے بعد بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ لفظوں کو ان کے معانی سے جدا کر کے استعمال کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور یہ کام اس عزیز نے جس مہارت سے انجام دیا ہے' اس کی داد دینے کے لیے بھی ان لفظوں کی ضرورت ہے جو اپنے معانی سے جدا ہو چکے ہوں۔

مگر میں ایسے الفاظ کہاں سے لاؤں۔۔۔۔

مجتبیٰ حسین
۲۰۰، انگور اپارٹمنٹس
پٹ پڑ گنج، دہلی ۔ ۱۱۰۰۹۲

سردار جعفری کا کلام پھر ناچا گیا

پچھلے ہفتہ دہلی کے سری رام سنٹر میں اردو کے بزرگ، ممتاز اور منفرد شاعر سردار جعفری کا کلام پھر ناچا گیا اور اس بار "اوڈیسی" میں ناچا گیا۔ اردو کے بیشتر شاعر ایسے ہیں جن کے کلام کو مشہور گلوکاروں نے نہ صرف گایا ہے بلکہ ان کی بعض غزلیں تو ان گلوکاروں سے ہی منسوب ہو کر رہ گئی ہیں۔ فیض کی اکثر غزلوں کو لوگ مہدی حسن کی غزلیں سمجھتے ہیں بلکہ دہلی کے ایک مشاعرہ میں تو ایک سامع نے فیض سے فرمائش کی تھی کہ وہ مہدی حسن والی کوئی غزل سنائیں اور فیض اس فرمائش پر مسکرا کے رہ گئے تھے۔ ہمارے ایک دوست ہیں جو موجودہ دور میں غالب کی از سر نو مقبولیت کا سہرا کے۔ ایل۔ سہگل کے سر باندھتے ہیں۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ایک زمانہ میں داغ کا کلام طوائفوں کا من بھاتا کھاجا رہا ہے بلکہ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ داغ کا کلام گانے کے چکر میں اچھی بھلی بیبیاں طوائفیں بن بیٹھیں۔ احمد فراز بھی اپنے کلام سے کہیں زیادہ مہدی حسن، غلام علی وغیرہ کی گائی ہوئی غزلوں کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ اقبال بانو نے قتیل شفائی کا کلام کچھ اس ڈھنگ سے گایا ہے کہ اب جو کوئی بھی الفت کی نئی منزل کی طرف جاتا ہے تو اسے اپنے آپ ہی دیکھ کر چلنے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے کیونکہ راہوں میں اور بھی تو لوگ پڑے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے الفت کے راستے میں ٹریفک کے جیم ہو جانے کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ دوسری طرف یہ بات قابل غور ہے کہ ہمارے بعض شاعروں اور شاعرات نے ماشاء اللہ اتنا اچھا گلا پایا ہے کہ اگر وہ شاعری کی بجائے موسیقی کے میدان میں چلے جاتے تو ان کا شمار نامی گرامی استادوں میں ہوتا۔ بُری شاعری کے عیوب کو محاسن میں بدلنے کے لیے اچھی اور مترنم آواز ہمیشہ مددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے جو ہماری آج کی بات چیت کا موضوع نہیں ہے۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے بعض گانے والوں اور گانے والیوں نے

بعض شعرا کے کلام کو اس خوبصورتی سے گایا ہے کہ اس کی داد نہ دینا بدذوقی ہوگی لیکن شاعری کو رقص کے ذریعہ پیش کرنے کا سلسلہ کچھ نیا سا ہے۔ یہ ضرور کہ بعض کتھک رقاص جیسے برجو مہاراج اور اوما شرما نے غالب کی غزلوں کو رقص کی مدد سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں بھی کتھک اور اردو غزل دونوں کا علاقائی مسکن ایک ہی رہا ہے۔ لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ جو اختر پیا کے نام سے پہچانے جاتے تھے، خود کتھک کے بہت اچھے رقاص رہے ہیں۔ وہ امور سلطنت میں اتنی دلچسپی نہیں لیتے تھے جتنی کہ رموز کتھک میں لیا کرتے تھے۔ رقص اور شاعری کے امتزاج کی ان چھٹ پُٹ مثالوں کے علاوہ ہمیں ایسی کوئی اور مثال نہیں ملتی جہاں شاعری کو رقص میں پیش کرنے کی باضابطہ اور منظم کوشش کی گئی ہو۔ کتھک کی بین اقوامی شہرت یافتہ رقاصہ شووبھنا نارائن کو بلاشبہ یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے سردار جعفری کی نظم "میرا سفر" پر مبنی رقص کا ایک ایسا پروگرام ترتیب دیا ہے جو پورے دو گھنٹوں تک جاری رہتا ہے۔ شووبھنا نارائن نے تین چار سال قبل جب یہ پروگرام پہلی بار پیش کیا تھا تو ہم نے اس کی نزاکتوں اور لطافتوں پر پورا ایک کالم لکھا تھا۔ اس کے بعد اس پروگرام کے جو تین چار شوز ہوئے تو ہم نے انھیں بھی بنظر غائر دیکھا بلکہ ان کے حالیہ ایک پروگرام کو دیکھ کر ایک صاحب نے کہا تھا "بھئی ان کا یہ پروگرام تو اب سردار جعفری کی نظم کو بھی "اوور ٹیک" کرنے لگا ہے"۔ اس پروگرام میں ہماری دلچسپی کا ایک سبب تو یہ ہے کہ سردار جعفری سے ہمیں عقیدت ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اس پروگرام کو شووبھنا نارائن جیسی فنکارہ پیش کرتی ہیں۔ تیسرا سبب یہ کہ اس میں شووبھنا کے بعد جو سب سے اہم رقاصہ حصہ لیتی ہے وہ ہمارے عزیز ترین دوست ڈاکٹر جے۔ سی۔ رائے کی کمسن بیٹی اتریہ رائے ہے۔ ماشاء اللہ اس بچی کو ملک کی سب سے کم عمر رقاصہ ہونے کا قومی اعزاز بھی حاصل ہو چکا ہے۔ پھر "میرا سفر" میں جو تین زمانے ماضی، حال اور مستقبل کے پیش کیے گئے ہیں انھیں ہم نے اپنی سہولت کی خاطر علی الترتیب سردار جعفری، شووبھنا نارائن اور اتریہ رائے سے منسوب کر رکھا ہے۔ ہم نے اس پروگرام کا ذکر ضمنی طور پر یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ سردار جعفری غالباً اردو کے واحد شاعر ہیں جن کے کلام کے ترجمہ یا ترجمانی کی گنجایش رقص میں بھی نکلنے لگی ہے۔ رقص کو ادب میں تو بیان کیا جاسکتا ہے لیکن ادب کو رقص میں پیش کرنا مشکل کام ہے۔ یاد ش بخیر! ایک فن کو دوسرے فن میں پیش کرنے کے سلسلہ میں ہمیں ایک پرانی بات یاد آگئی۔ سلیمان اریب مرحوم جب حیدر آباد معظم جاہی مارکیٹ کے مکان

میں رہا کرتے تھے تو ایک شام مخدوم محی الدین اور مشہور مصور سعید بن محمد نقش میں اس بات پر بحث ہو گئی کہ شاعری بڑا فن ہے یا مصوری۔ سعید بن محمد نے ترنگ میں آکر کہہ دیا" میں تو پوری اردو شاعری کو مصوری کے ذریعہ پیش کر سکتا ہوں"۔ مخدوم نے ہنستے ہوئے کہا "پوری اردو شاعری تو بہت دور کی بات ہے۔ تم صرف میر کے ایک مصرع "پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے" کو پینٹ کرکے دکھا دو" سعید بن محمد نے کہا" یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں کینوس پر گلاب کی ایک پنکھڑی بنادوں گا" مخدوم نے کہا پہلی بات تو یہ کہ مصرع میں گلاب کی پنکھڑی ہے ہی نہیں۔ یہاں جو پنکھڑی ہے وہ "گلاب کی سی" ہے بذات خود گلاب کی پنکھڑی نہیں۔ مصرع کی ساری خوبی " سی " میں مضمر ہے۔ اور تم "سی "کو کیسے پینٹ کروگے؟" مخدوم کے اس شریر استدلال پر سعید بن محمد پہلے تو سٹپٹائے۔ پھر اپنے سٹپٹانے کو غصہ کا روپ دیا اور ہماری آنکھوں کے سامنے بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

یہی حال شاعری کو رقص میں پیش کرنے کا ہے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اردو شاعروں کے کلام کو گانے کی روایت تو بہت پرانی ہے مگر اب اسے ناچا بھی جانے لگا ہے تو کچھ غلط نہیں کہتے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ پچھلے ہفتہ "اوڈیسی "کی مشہور رقاصہ چندریما سرکار نے سردار جعفری کی ایک اور مشہور نظم "عشق اور موسم" (جو اصل میں کالیداس کی سنسکرت نظم کے انگریزی ترجمہ کا اردو ترجمہ ہے) کو رقص میں پیش کرنے کا کامیاب تجربہ کیا۔ "اوڈیسی "اڑیسہ کا قدیم اور مشہور رقص ہے۔ لوگ اس بات پر حیران تھے کہ کتھک اور اردو شاعری کا تو خیر ایک رشتہ بنتا ہے لیکن اوڈیسی اور اردو شاعری کا رشتہ کیسے بن پائے گا۔ سردار جعفری نے، جو خود اس پروگرام کو دیکھنے کے لیے بطور خاص ممبئی سے براہ حیدر آباد آئے تھے، یہ اعتراف کیا کہ عمر کے پچاسی برس گزارنے کے باوجود انھوں نے آج تک اوڈیسی رقص نہیں دیکھا۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کم از کم ایک معاملہ تو ایسا ہے جس میں ہم سردار جعفری پر فوقیت رکھتے ہیں کیونکہ ہم سونل مان سنگھ کے اوڈیسی رقص کے کئی پروگرام دیکھ چکے ہیں، یوں بھی اڑیسہ سے ہمارا ایک شخصی تعلق اور انجانا سا ربط بھی رہا ہے۔ ہماری مزاح نگاری پر جب اردو والوں نے بھی ہمیں کوئی انعام نہیں دیا تھا بلکہ اب تک بھی نہیں دیا ہے، تو اڑیسہ کے ادیبوں کی ایک تنظیم نے ۱۹۸۰ء میں ہمیں "ہاسیہ رتن" کے خطاب سے نوازا تھا اور اڑیا زبان میں ہماری ایک کتاب بھی چھاپی تھی۔ خیر چندریما سرکار سردار جعفری کی نظم "عشق اور موسم" کے حوالہ سے ایک گھنٹہ

تک ناچتی رہیں اور اس ناچ میں جملہ چھے موسموں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ کالیداس نے اپنی نظم میں جملہ چھے موسم ہی پیش کیے ہیں۔ ہو سکتا ہے کالیداس کے زمانہ میں ہندستان میں چھے موسم ہوا کرتے ہوں لیکن ہم اردو والوں کے ہاں تو عملاً دو ہی موسم ہوتے ہیں۔ بہار کا موسم یا پھر خزاں کا موسم۔ شاعری کی زبان میں ان دونوں موسموں کو آپ "وصل کا موسم" اور "ہجر کا موسم" بھی کہہ سکتے ہیں۔ پھر ہمارے ہاں وصل کا موسم تو اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہی ہوتا ہے البتہ ہجر کے موسم کو آپ زیرے کے منہ میں اونٹ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ چونکہ اس نظم پر چندریما سرکار کا پہلا پروگرام تھا اسی لیے وہ بعض موسموں کی باریکیوں اور تفصیلات میں نہیں گئیں بلکہ جب گرمی کے موسم کی شدت کو پیش کرنے کی غرض سے وہ رقص کے بھاو میں منہ پر پانی کے چھپا کے مارنے لگیں اور غسل کی جگہ غسل کا تیمم فرمانے لگیں تو ہمارے برابر بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا "حضرت! یہ اچانک گرمی کے موسم سے برسات کے موسم میں کس طرح چلی آئیں"۔ ہم نے انھیں چپ کرانے کی غرض سے کہا "قبلہ! کبھی کبھی گرمی کے موسم میں بھی تو بارش ہو جاتی ہے جسے ہمارے دکن میں "اوکالی بارش" بھی کہتے ہیں۔" بہر حال یہ موقع نہیں ہے کہ ہم ان کے رقص پر تفصیل سے روشنی ڈالیں تاہم ان کی یہ پہلی کوشش نہایت قابل تحسین تھی۔ اس تقریب میں شوبھنا نارائن بھی موجود تھیں اور انھوں نے چندریما سرکار کو اپنا آشیر واد وغیرہ بھی دیا۔ سردار جعفری نے بھی اظہار خیال کیا۔ سردار بھائی کی عمر میں جوں جوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور جب سے انھیں گیان پیٹھ ایوارڈ ملا ہے تب سے وہ اور بھی وجیہہ اور باوقار نظر آنے لگے ہیں۔ بہت عرصہ پہلے سردار جعفری نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ "میاں ذرا اپنی عمر کا احترام کرو۔ یہ عمر تم نے یونہی نہیں کمائی ہے۔ بڑی محنت سے کمائی ہے" آج احساس ہوتا ہے کہ سردار جعفری سچ مچ اپنی عمر کا احترام کرتے ہیں۔

تقریب کے بعد ہمارے ایک منچلے دوست پریس کلب میں مل گئے تو ہم نے اس پروگرام کا ذکر کیا۔ بولے یار جب غزلوں کو گایا جاتا ہے اور اب نظموں کو ناچا جا رہا ہے تو کیوں نہ دوسرے فنون سے بھی اردو شاعری کا رشتہ جوڑا جائے۔ مثلاً جوش کی شاعری کو "فن پہلوانی" کے ذریعہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ جان نثار اختر کی گھر آنگن والی شاعری کو پیش کرنے کے لیے "فن پکوان" کو بھی زحمت دی جا سکتی ہے۔ بہر حال یہ ایک ایسی تجویز ہے جس پر اردو شعرا اپنی بساط کے مطابق غور کریں۔

نصرت ظہیر
۱۵ار ۴ کھچڑی پور دہلی۔۹۱

دل بھی یارب! کئی دیے ہوتے

چند ماہ پہلے مُلک میں گُردوں کی چوری کا معاملہ گرم تھا اور ہم کئی مہینوں سے سوچ رہے تھے کہ اس خوبصورت، دل نشیں اور روح پرور موضوع پر دو چار باتیں ہو جائیں لیکن کیا کیجیے۔ ایٹمی دھماکوں نے کسی اور بات کا موقع ہی نہیں دیا۔ جہاں دیکھیے ہندستان اور پاکستانی بموں کی بات چل رہی تھی یہاں تک کہ آج کل بھی ہر چیز میں بم نظر آرہا ہے۔

بجٹ آیا تو اس پر بھی بم کا سایہ پڑا رہا۔ یہاں تک کہ سرکار اعلا مدار نے پٹرول کے دام بڑھائے تو ایک دل جلے کارٹونسٹ نے اسے بھی بم کہہ دیا اور اپنے کارٹون میں یہ دکھایا کہ پہلے ہم نے ہائڈروجن بم چھوڑا اب پٹرول چھوڑ رہے ہیں۔

پھر، بابری مسجد کو مندر بنانے کی جو تیاریاں ان دنوں چل رہی ہیں اسے بھی ایک بم کہا جارہا ہے۔ یہ غالبًا بابری بم کہلائے گا (ویسے بھی بابری اور مسجد کے پہلے حروف ملائیں تو بم ہی بنتا ہے۔ جس راجستھان میں پوکھرن کے دھماکے ہوئے تھے اسی کے ایک شہر میں رام مندر کے دروازے بنائے جارہے ہیں۔ ستون تراشے جارہے ہیں اور لطف کی بات دیکھیے، اسی راجستھان کی راجدھانی (جے پور) میں ایک اجتماعی زناشدہ (Raped) خاتون کے ساتھ مکرر ارشاد کے طور پر ایک اور ریپ کرلیا گیا۔

اب یہ ہماری اور غالبا خود اٹل جی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہاہے کہ بم چھوڑ کر ہم سُرخ رو ہوئے ہیں یا روسیاہ!

بہر کیف بات ہو رہی تھی گُردوں کی جن کی چوری آج کل دھڑا دھڑ چل رہی ہے۔ ظاہر ہے بم کی طرح یہ بھی ہماری سائنسی ترقی کی ہی ایک نشانی ہے کہ ہم نے انسان کو بردہ فروشی کے دور سے گردہ فروشی کے دور میں پہنچادیا ہے۔ انسانی اعضا تبدیل کرنے میں اب ہم نے اس درجہ مہارت حاصل کرلی ہے کہ اسے تجارت بنادیا ہے۔ اور چوری چونکہ تجارت کا جزولا ینفک ہے اس لیے بات اب اعضا کی چوری تک پہنچ گئی ہے اور خدا نے چاہا تو ایک دن وہ بھی آجائے گا جب یہ چوری ڈکیتی کی شکل اختیار کرلے گی اور معاملہ دن دہاڑے چھینا جھپٹی تک پہنچ جائے گا۔

یعنی لوگ گھروں سے نکلیں گے تو راستے میں موٹر سائیکل پر سوار نقاب پوش نوجوان آدمی کو روک کر اس کا ایک کان کاٹ لیں گے، آنکھ چرالیں گے یا ناک صاف کردیں گے۔ بچارا صبح کا بھولا آدمی گھر سے دونوں ہاتھ ہلاتا، منہ سے سیٹی بجاتا نکلے گا اور شام کو صرف ایک ہاتھ ہلاتا منہ لٹکائے واپس آئے گا۔

اصل میں اس تمام صورت کے لیے، خاکم بدہن، بڑی حد تک اللہ میاں بھی ذمے دار ہیں جنھوں نے دوسرے جانوروں کی مانند انسان کو بھی اپنی فیاضی سے نواز دیا ہے جبکہ انسان کی فطرت کو دیکھتے ہوئے انھیں اس کے ساتھ اپنے رویہ میں ذرا احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔

اب دیکھیے اچھا خاصا ایک گردے سے کام چل سکتا تھا مگر اللہ میاں نے ایک فاضل گردہ اسٹپنی کے طور پر دے دیا کہ جاؤ ایک خراب ہووے تو دوسرے سے کام چلائیو! چنانچہ دیکھ لیجیے۔ جو لوگ غریب ہیں وہ اپنا ایک گردہ بیچنے کے چکر میں لگے رہتے ہیں اور جو ان سے بھی زیادہ غریب ہیں ان کے گردے آپریشن کے ماہر ڈاکٹر چوری کر لیتے ہیں۔

اسی طرح آدمی کے لیے ایک آنکھ کافی تھی۔ مگر قدرت نے ایک کی جگہ دو دے دیں اور یوں نہ صرف ایک آنکھ کا کارنیا بیچنے کے لالچ کی گنجایش پیدا کر دی بلکہ بہت سے لوگوں کو کانا یا بھینگا ہونے کی خواری میں بھی مبتلا کر دیا۔ اگر آدمی کو صرف ایک آنکھ دی گئی ہوتی تو نہ اس کے دماغ میں کارنیا والا لالچ پیدا ہوتا نہ کوئی بھینگا ہوتا کہ آپ اس سے ٹھیک طرح آنکھیں بھی نہ ملا سکیں۔

تاہم ایک آنکھ ہونے سے سب سے اچھی بات یہ ہوتی کہ لیڈر اور منسٹر حضرات اپنے تمام ووٹروں کو، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، امیر یا غریب، اونچی ذات کے یا نیچی ذات کے، سب کو ایک نظر سے دیکھتے اور آدمی کا چشمہ یک چشمی ہوا کرتا۔ اس کے علاوہ آدمی اور دجال میں بھی کوئی فرق نہ ہوتا جو فطرتاً ویسے بھی نہیں ہے۔ چنانچہ ہمارے دوست شجاع خاور کو یہ مشہور شعر بھی نہ کہنا پڑتا کہ ع

جو دل سے بُرا ہے وہ بہر حال بُرا ہے
دو آنکھیں بھی رکھتا ہو تو دجال بُرا ہے

اور ہاں، آنکھیں چار ہونے کا محاورہ بھی ایجاد نہ ہوتا۔ لوگ صرف آنکھیں "دو" کر کے کام چلا لیا کرتے۔

یہی معاملہ کانوں کا ہے۔ آدمی کے دو کان ہونے سے ایک مشکل تو یہ ہے کہ اردو میں دوکان لکھو تو پڑھنے والا خواہ مخواہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ٹھیک سے سمجھ میں

نہیں آتا کہ یہ آدمی کے کانوں کا ذکر ہو رہا ہے، اس کی دو کان کا جس میں ایک دروازہ ہوتا ہے اور جو قانوناً صبح کھلنی اور شام کو بند ہو جانی چاہیے۔

اللہ میاں نے شاید سوچا ہوگا کہ آدمی کو ایک کی جگہ دو عدد کان دے دیے تو وہ دوسروں کی باتیں زیادہ اچھی طرح اور زیادہ توجہ سے سنے گا۔ جبکہ یہ مقصد صرف ایک کان دینے سے زیادہ بہتر طور پر حاصل ہوتا کیونکہ اس صورت میں آدمی کو کسی کی بات ایک کان سے سننے اور دوسرے سے نکال دینے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔

پھر ایک کان ہوتا تو دنیا میں کن میلئے بھی آدھے ہوتے، کان کے ڈاکٹروں کا کام بھی آدھا رہ جاتا اور شریر بچوں کو بزرگوں کے ہاتھوں کان اینٹھے جانے پر تکلیف بھی آدھی جھیلنی پڑتی۔ کیونکہ وہ صرف ایک کان اینٹھ سکتے تھے دو نہیں! دو کان اینٹھنے کے لیے دو بچوں کو تکلیف پہنچانا پڑتی! ہمارا خیال ہے دو کان ہونے سے صرف امریکہ کی ڈولبی (Dolby) کمپنی اور جاپان کے اسٹیریو بنانے والے کارخانوں کو فائدہ ہوا ہے کیونکہ آدمی کا ایک کان ہوا کرتا تو ڈولبی ساؤنڈ اور اسٹیریو فونک ساؤنڈ کسی کام کی نہ ہوتی اور الیکٹرانک انڈسٹری کھربوں ڈالر کے کاروبار سے محروم رہ جاتی۔

اس کے برعکس قدرت کی بوالعجبی یہ ہے کہ آدمی کو کان تو دو دے دیے مگر ناک صرف ایک عطا کی ہے۔ جبکہ ہمارے حساب سے ناک دو عدد ہونا چاہیے تھیں۔ اس طرح آدمی کی کئی مشکلیں کم ہو جاتیں۔

میاں عبد القدوس کہتے ہیں کہ قدرت نے آدمی کو ناک ایک عدد اور کان دو عدد اس لیے دیے ہیں کہ وہ عینک ٹھیک سے لگا سکے۔ اگر کان صرف ایک اور ناک دو عدد ہوتیں تو خاصی مشکل پیدا ہو جاتی، خاص طور سے عینک ایجاد کرنے والے کے لیے!

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ عینک جس بصارت اور بصیرت کو درست کرنے کے لیے لگائی جاتی ہے اس سے زیادہ اہم چیز ہے انسان کی عزت آبرو۔ آپ نے دیکھا ہوگا کئی معاملوں میں ذرا ذرا سی بات پر آدمی کی ناک کٹ جاتی ہے۔

ان ایٹمی دھماکوں کو ہی لے لیجیے۔ ہم نے کیے تو پاکستان کی ناک کٹ گئی اور جب اس نے کیے تو ہماری کٹ گئی۔ چنانچہ دونوں نکٹے اب اس چکر میں ہیں کہ کسی طرح ان پانچ عظیم نکٹوں کے کلب میں شامل ہو جائیں جنھوں نے اپنی ناکوں کے چکر میں ساری دنیا کو ناک آؤٹ کر رکھا ہے۔ اگر آدمی کی دو ناکیں ہوتیں تو آج پیاز چالیس روپے کلو نہ بک رہی ہوتی جی۔ کیا فرمایا۔ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کوئی بات نہیں۔ آپ نے وہ شعر تو سنا ہی ہوگا ع

کسی کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

بس یہی معاملہ ناک اور پیاز کا ہے۔ جس کی قیمت اول الذکر کو بچانے کے چکر میں کیے گئے ایٹمی دھماکوں، اقتصادی پابندیوں اور ممبئی سین سیکس میں مسلسل گراوٹ کے بعد بڑھی ہے۔ چنانچہ نہ کٹتی ناک نہ مہنگی ہوتی پیاز۔

دو عدد ناک ہوا کرتیں تو ایک کے کٹنے کی صورت میں کم از کم دوسری تو بچی رہتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض شیلنت سے بھرے لوگ دونوں ناکیں ایک ساتھ کاٹ دیا کرتے اور اس صورت میں ہمیں پانچ کی بجائے دس ایٹمی دھماکے کرنے پڑتے مگر یہ بھی دھیان میں رکھیے کہ ایک ناک کے مقابلے میں دو عدد ناک کاٹنا دوگنی محنت کا کام ہو جاتا۔ چنانچہ پاکستان کو بھی جواباً دوگنے ایٹمی دھماکے کرنے پڑتے اور امریکہ کو بھی اس پر دوگنی پابندیاں لگانی پڑتیں جس کے بعد نواز شریف دوگنی خود انحصاری کے بعد دوگنی ایمرجنسی لگا کر غریب پاکستانیوں سے دوگنی رقم خود انحصاری فنڈ کے لیے مانگنے پر مجبور ہو جاتے۔

یہی معاملہ ہاتھوں کا ہے۔ آدمی کو دو ہاتھ دے کر قدرت نے دوہری مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ سب سے بڑی مصیبت تو دو ہاتھ ہونے کی وجہ سے یہ ہوئی کہ دنیا میں قوال پیدا ہوگئے۔ قوالی کے لیے تالی ضروری ہے اور تالی دو ہاتھوں سے بجتی ہے۔ ایک ہاتھ ہوتا تو نہ آدمی تالی بجاتا نہ قوالی گاتا، نہ قوال پیدا ہوتے، اور ہوتے بھی تو وہ ننھے قوال ہوتے۔ اور تب کم از کم یہ تو ہرگز نہ ہوتا کہ بے سُرے قوال نے ایک ہاتھ ہارمونیم پر اور دوسرا اپنے کان پر رکھ کر خود کو تو اپنی کرخت آواز سے آدھا محفوظ کر لیا ہے اور منہ پھاڑ کر اپنے سوا باقی سب کے کان کھا رہا ہے۔

ننھے قوال کو ہر حالت میں اپنا واحد ہاتھ ہارمونیم پر رکھنا پڑتا اور دو تین قوالیاں خود اپنی آواز میں سننے کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے قوالی سے تائب ہو جاتا اور یوں دنیا قوالیوں سے نجات پا جاتی، جن کا واحد فائدہ یہ ہے کہ رات کو کھلے میدان میں کی جائیں تو چند مچھر ضرور کم ہو جاتے ہیں۔

لیکن بات قوالیوں تک محدود نہ رہتی۔ تالی اور بھی کئی معاملوں میں دخیل ہے چنانچہ وہ بھی نہ ہوتے جن سے ہم سب پریشان ہیں یعنی یوں سمجھ لیجیے کہ تالیاں نہ بجتیں تو جلسوں، تقریروں اور لیڈروں میں بھی کافی کمی آ جاتی اور عوام، عوامی رہنماؤں کے بغیر کافی سکون سے زندگی گزارا کرتے۔ پھر تالی بجانے والی وہ مخلوق بھی نہ ہوتی جو نہ "ہیوں" میں ہے نہ "شیوں" میں (نہ HE میں نہ SHE میں)

لیکن ... سب سے بڑا جو مسئلہ دو ہاتھوں سے پیدا ہوا ہے وہ ہے دائیں بازو اور بائیں بازو کا۔ بچپن میں ہم سمجھتے تھے کہ جو شخص دائیں ہاتھ سے قلم اور نوالہ پکڑتا ہو وہ دائیں بازو کا ہوتا ہے اور جو یہ دونوں کام بائیں بازو سے اور طہارت دائیں سے کرتا ہو وہ بائیں بازو کا۔ یعنی کھبوں ہوا۔

لیکن جیسے جیسے عمر بڑھی، من پر تن کا میل چڑھا، بات صاف ہوتی گئی۔ انگلینڈ میں رواج تھا کہ بادشاہ شاہی دربار میں اپنے دائیں ہاتھ پر وزیروں اور خاص چہیتوں کو اور بائیں ہاتھ پر انھیں بٹھاتا تھا جنھیں وہ اپنا مخالف سمجھتا تھا، یہاں سے رائٹسٹ اور لیفٹیسٹ یعنی دائیں بازو اور بائیں بازو کا چکر چل پڑا اور بیسویں صدی میں تو یہ چکر ایسا چلا کہ روسیوں اور چینیوں نے دنیا کے آدھے لوگوں کو بائیں بازو والا بنا ڈالا اور امریکہ اور اس کے سامراجی حواری دائیں بازو والے بن گئے۔ البتہ جن کے دونوں بازو ٹھیک تھے، جیسے ہم تو انھیں ناوابستہ تحریک اور تیسری دنیا میں پناہ لینی پڑی۔

اب ذرا سوچیے، آدمی کو قدرت نے اگر صرف ایک ہاتھ دیا ہوتا تو نہ دلیاں بازو ہوتا نہ بایاں۔ ہاں، مسلمانوں اور یہودیوں کو ضرور خفت اٹھانی پڑتی ـــ بے چارے نماز کے بعد صرف ایک ہاتھ سے دعا مانگتے ہوئے کچھ عجیب سے لگتے۔

لیکن سب سے بڑا فائدہ ایک ہاتھ ہونے کا آدام زاد کو یہ ہوتا کہ اس نے جتنی ترقی اب تک کی ہے، اُس سے آدھا ترقی یافتہ ہوتا اور بے روزگاروں کی تعداد بھی گھٹ کر آدھی رہ گئی ہوتی! بلکہ شاید بالکل ہی نہ ہوتی۔

ہاتھوں کے علاوہ بھی انسان کو کئی چیزیں قدرت نے جوڑوں کی شکل میں عطا کی ہیں۔ مثلاً ٹانگیں دو عدد۔ پھیپھڑے دو عدد۔ اور گردے بھی دو عدد جن کی چوری کے واقعات اپنے دیش میں کافی بڑھ گئے ہیں۔ منظم گروہ فٹ پاتھ پر پڑے کسی غریب مریض کو، علاج کے بہانے پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں لے جاتے ہیں اور وہاں بے ہوشی کی دوا دے کر اس کا گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ پھر غریب آدمی کا یہ گردہ کسی امیر بے گردہ کو لاکھ دو لاکھ میں بیچ دیا جاتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معاملے میں حکومت ڈاکٹروں کے کیوں پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ آخر وہ غریبوں کے گردے کے سرکاری ریٹ کیوں مقرر نہیں کردیتی۔ تاکہ یہ دھندا بھی دوسرے غیر قانونی دھندوں کی طرح قانونی شکل اختیار کرلے۔ ویسے بھی کسی غیر قانونی دھندے سے نجات کا واحد راستہ یہی تو ہے کہ اسے قانونی قرار دے دیا جائے۔

اور پھر گردہ ہی کیوں؟ باقی اعضا کے لیے بھی ریٹ مقرر کیے جاسکتے ہیں۔ جراحتی

سائنس روز بروز ترقی کرتی جا رہی ہے۔ گردے اور آنکھ بدلنے کی بات پرانی ہوئی۔ اب تو کان، ناک، ہاتھ پیر اور دل دماغ بدلنے کی طرف پیش رفت ہے اور یہ بات بھی انسانوں تک محدود نہیں رہی۔ جانوروں تک جا پہنچی ہے۔

افریقہ میں ایک ڈاکٹر نے آدمی کے جسم میں بندر کا دل لگا دیا تھا اور حال ہی میں آپ نے سنا ہوگا ایک ہندستانی ڈاکٹر نے سور کا دل آدمی کے سینے میں فٹ کر دیا جس کے بعد وہ (آدمی) کچھ عرصہ زندہ رہ کر مر گیا، اور ڈاکٹر ان دنوں جیل میں ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں۔ اس ڈاکٹر نے خواہ مخواہ سور کو تکلیف دی۔ اگر اسے سور کے دل کی ہی ضرورت تھی تو انسانوں میں ڈھونڈتا۔ کئی لوگوں کے سینوں میں اسے اصلی سور سے بھی زیادہ اچھی کوالٹی کا دل مل جاتا۔

اصل میں قدرت بھی اپنے آپ میں ایک زبردست پیوند کار ہے۔ کئی بار وہ اتنی عمدگی اور صفائی سے آدمی کے دماغ میں لومڑی کا مغز اور آنکھوں میں طوطے کی آنکھ لگا دیتی ہے اور مزاج میں گرگٹ کے رنگوں کی ایسی پیوند کاری (Grafting) کرتی ہے کہ بڑے سے بڑا ماہر بھی پتہ نہیں لگا سکتا۔ (اور جب پتہ لگ جاتا ہے تب تک کافی دیر ہو چکی ہوتی ہے)

چنانچہ اگر تمام انسانی اعضا کے عام ریٹ مقرر کر دیے جاتے جیسے کہ مزدوروں کو جسمانی حادثہ پیش آنے کی صورت میں معاوضہ دینے سے متعلق قوانین میں درج ہیں تو غریب آدمی، اور خاص طور سے وہ غریب آدمی جسے کوئی مزدوری بھی نہیں ملتی؛ اپنی غریبی ہٹانے کے لیے سیدھا کسی اسپتال پہنچتا اور اپنے کان آنکھ یا گردے کلیجی کی ریٹ لسٹ ڈاکٹر کو تھما کر پہلے حضرت داغ دہلوی کا یہ شعر سناتا کہ ع

ہم نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا

پھر گا کر کہتا

چاہے تو مورا جیا لے لے۔ سانوریا...

یہ اور بات ہے کہ بعض غریب، یعنی غریب الغربا، ہوتے ہیں کہ اتنا سب کرنے پر بھی ان کی غربت دور نہ ہوتی۔ اس صورت میں بچارے وہی دعا کرتے جو مرزا غالب نے ڈیڑھ سو برس پہلے واضح طور پر نہیں کہا تھا ع

میری قسمت میں گر یہ غربت تھی
دل بھی یارب! کئی دیے ہوتے

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

ڈاکٹر فرمان فتحپوری احوال و آثار

ترتیب و تہذیب: ڈاکٹر طاہر تونسوی
صفحات ۲۹۶ قیمت ۱۹۵ روپے
سنہ اشاعت ۱۹۹۸ء
تبصرہ نگار خلیق انجم
ناشر: الوقار پبلیکیشنز۔ ۵لوئر مال لاہور

فرمان صاحب اردو کے ان ادیبوں میں ہیں جو ہندستان میں پیدا ہوئے اور پاکستان ہجرت کر گئے۔ زندگی کا بڑا حصہ پاکستان میں گزرا، لیکن آج بھی ہندستان اور پاکستان کے لوگ انھیں اپنا سمجھتے ہیں۔ یہ بات ذہن میں نہیں آتی کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری پاکستانی ادیب ہیں۔ جب بھی وہ ہندستان آتے ہیں تو ہندستان کے لوگ انھیں اس طرح گلے لگاتے ہیں جیسے وہ کچھ ہی دن کے لیے باہر گئے تھے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب نے اردو تحقیق اور تنقید میں نمایاں امتیاز حاصل کیا ہے۔ اب تک وہ لگ بھگ پچاس کتابیں تصنیف اور تالیف کر چکے ہیں۔ ان میں دو تین کتابیں انگریزی کی بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب نے ۱۹۶۲ء سے ایک زبردست ادبی خدمت انجام دی ہے۔ نیاز فتح پوری مرحوم کا جب ماہانہ "نگار" لکھنؤ سے شائع ہونا بند ہو گیا تو فرمان فتح پوری صاحب نے اسے کراچی سے جاری کیا جو آج تک پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ انھوں نے "نگار" کے اب تک تیس پینتیس خاص نمبر شائع کیے ہیں۔ ہر سال ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب نیاز فتح پوری مرحوم کی یاد میں ایک بین اقوامی سیمینار منعقد کرتے ہیں، جس میں ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے ادیب شرکت کرتے ہیں۔ فرمان فتح پوری صاحب نے غالب، اقبال، انیس، نیاز فتح پوری، مرزا شوق لکھنوی، مولانا حسرت موہانی، اور مولانا محمد علی جوہر جیسے عظیم المرتبت شاعروں اور ادیبوں کی شخصیت اور فن پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ان تمام حضرات پر وہ اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے بعض اصناف سخن مثلاً اردو رباعی،

مثنویاں، اردو شاعری، اردو نثر، غزل، اردو کی نعتیہ شاعری اور اردو شعرا کے تذکرے وغیرہ جیسے موضوعات پر بھی کتابیں لکھ کر اپنے اعلاترین ادبی ذوق کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس کے علاوہ فرمان فتح پوری صاحب کو زبان کے لسانی مسائل سے غیر معمولی دل چسپی ہے۔ ان کی دو کتابیں "اردو املا و رسم خط" اور "اردو زبان" غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی اور کتابیں ہیں "ہندی اردو تنازع"۔ اس موضوع پر ہندی، اردو، انگریزی اور بعض دوسری زبانوں میں خاصی بڑی تعداد میں کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ فرمان فتح پوری صاحب کی یہ کتاب سر فہرست ہے۔ انھوں نے ہندی اردو تنازع کے بارے میں بہت اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ اس کتاب پر مجھے اعتراض صرف یہ ہے کہ ان کا نکتۂ نظر پاکستانی ہے اس لیے بعض مسائل کے ساتھ وہ انصاف نہیں کر سکے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کی شخصیت بڑی دل نواز ہے۔ انھوں نے اپنے کام اور اپنی پیاری شخصیت سے پرانی اور نئی نسل کے ادیبوں اور نقادوں کے دل جیت رکھے ہیں اس لیے اب تک ان کی ادبی شخصیت اور ادبی کارناموں پر کم سے کم پونے دو سو محقق اور نقاد مضامین لکھ چکے ہیں۔ اگر ایک طرف میرزا ادیب، رشید حسن خاں، مشفق خواجہ، مالک رام مرحوم، احمد ندیم قاسمی، شان الحق حقی، ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر وقار عظیم اور ڈاکٹر وزیر آغا اور جوگندر پال نے ان پر مضامین لکھے ہیں تو دوسری طرف نئی نسل کے ممتاز ترین ادیب مثلاً امراؤ طارق اور ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری پر کتابیں مرتب کی ہیں۔ امراؤ طارق صاحب کی کتاب "ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و ادبی خدمات" تو تین جلدوں میں ہے، جس میں پچاسی ادیبوں، نقادوں اور ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں پچیس حضرات نے فرمان فتح پوری صاحب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فرمان فتح پوری صاحب کا امریکہ اور کناڈا میں ایک جشن منایا گیا تھا، جس کے پہلے دو اجلاس نیویارک میں، تیسرا شکاگو، میں چوتھا واشنگٹن میں، پانچواں اور چھٹا ٹورنٹو اور کناڈا میں منعقد ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس انداز کا جشن پہلی بار کسی ادیب کا منایا گیا ہے۔ میں نے بھی فرمان فتح پوری صاحب پر ایک کتاب مرتب کی ہے جو ۱۹۹۱ء میں "ڈاکٹر فرمان فتح پوری.. شخصیت و ادبی خدمات" کے نام سے دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ زکریا یونیورسٹی (ملتان) محمد نذیر انور علوی، گورنمنٹ کالج

(لاہور) نورین فردوس نے گورنمنٹ (لاہور) ہی سے سہیل سرور نے، اسی کالج سے وحید، سیدہ افصح نے فرمان فتح پوری صاحب کی ادبی خدمات پر ایم۔ اے کے لیے مقالے لکھے ہیں جو ابھی شائع نہیں ہوئے۔

میں طاہر تونسوی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے فرمان فتح پوری صاحب پر ایسی شان دار کتاب مرتب کی۔ خود ڈاکٹر طاہر تونسوی ہمارے اعلا درجے کے لکھنے والوں میں ہیں۔ ادب میں ان کا صاف ستھرا مذاق ہے، وہی اس کتاب کے مضامین اور طباعت میں نظر آتا ہے۔ میں اس شان دار کتاب کے لیے طاہر تونسوی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

جنت سے نکالی ہوئی حوا

مصنفہ: نفیس بانو شمع
مبصر: ہیرانند سوز
ضخامت: ۲۵۰ صفحات قیمت: ۱۵۰/- روپے
ناشر: آبشار پبلی کیشنز۔ای ۱۶۲ ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر نئی دہلی
تقسیم کار (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ، جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
(۲) سانت پرکاشن ۹۲۲ کوچہ روح اللہ خاں، دریا گنج نئی دہلی ۲

کتاب کا نام "جنت سے نکالی ہوئی حوا" پڑھ کر سب سے پہلے یہ خیال ذہن میں ابھرا کہ نفیس بانو شمع صاحبہ کی یہ آپ بیتی ضرور۔ معاشرے میں بنتِ حوا کی کم تر شخصی حیثیت، اس کے سماجی استحصال اور مظلومیت کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کے اندرونی کرب سے بھی عبارت ہوگی، مگر نہ جانے کیوں اس کے ساتھ یہ سوال بھی ذہن میں اٹھا کہ مرد طبقہ بھی تو جنت سے نکالے گئے حضرت آدمؑ کے شجرۂ نسب سے جڑا ہوا ہے۔ اپنی جلاوطنی پر اُسے بھی تو شاکی ہونا چاہیے، مگر کتاب پڑھنے کے بعد جو سچائیاں سامنے آئیں انھوں نے سوچوں کے زاویے ہی بدل ڈالے اور اس حقیقت کو قبول کرنا پڑا کہ ابن آدم اب کرۂ ارض پر اپنا معتبر مقام بنا چکا ہے اور اس نے معاشرے میں بھی اپنا درجہ اونچا کرلیا ہے۔ بس بنتِ حوا ہی جنت سے نکالے جانے کے بعد اس دھرتی پر اپنے پانو نہیں جما پائی اور ابھی تک ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہے۔ محتاجی اور دربدری اس کا مقدر بن گئی ہے اور وہ عدم تحفظ کے خوف سے سہی، زندگی بھر سہارے کی تلاش میں بھٹکتی رہتی ہے مگر سب سہارے کمزور اور کھوکھلے ثابت ہوتے ہیں۔ ماں باپ اور خاوند سے لے کر اولاد تک...... پیغمبر آئے، صحیفے اترے مگر کہیں سے بھی عورت کو اپنے تحفظ کی گارنٹی نہیں

ملی۔ شمع صاحبہ نے حضرت عائشہؓ حضرت خدیجہؓ اور مغیرہؓ بن شعبہ کی احادیث کے حوالے دے کر عورت کے حقوق کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر کون دھیان دیتا ہے۔ شمع صاحبہ کے نزدیک مرد کے سارے نظریات صرف اپنی مطلب براری تک محدود ہیں۔

مصنفہ نے اپنی آپ بیتی لکھ کر اپنے گم شدہ ماضی سے اپنے اٹوٹ رشتے کی تجدید کی ہے اور یوں ارتقا کی کڑیوں کو جوڑا ہے جو وقت کی بے رحم گردش میں ٹوٹ کر زندگی کے مواج سمندر میں ڈوبتی چلی جارہی تھیں۔ شمع صاحبہ کا بیانیہ اتنا دردناک ہے کہ پڑھتے پڑھتے ایک خوش طبع آدمی بھی اداس ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کے بیشتر اوراق خود مصنفہ کے ان بے شمار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہیں جو زندگی بھر ان کی آنکھوں کا مقدر رہے۔

نفیس بانو شمع حساس ذہن کی مالک ہیں۔ ایک چھوٹا سا واقعہ ان کی روح کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے اور جب وہ اسے اپنے شعور و فکر کی بھٹی میں تپا کر نوک قلم سے سطح قرطاس پر لے آتی ہیں تو الفاظ نہ صرف جلتے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ روشنی بھی دے رہے ہوتے ہیں۔ انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ والدین نے میری شناخت کے لیے نفیس نام دیا تھا لیکن جب میرے ماضی اور حال کے جلتے تپتے شب و روز نے مجھے اپنے وجود میں بوند بوند اترتی آگ کا احساس دلایا تو میں نے اپنے نام کے ساتھ شمع کا اضافہ کرلیا۔ شمع نے اپنی اندر کی تپش کا واضح اظہار ایک اور جگہ بھی ان الفاظ میں کیا ہے "سورج کی ساری آگ میرے ہی حصے میں آئی ہے مگر مجھے دُکھ نہیں، فخر ہے اور احترام کرتی ہوں اس آگ کا جس نے میرے باطن سے غم کے سوا تمام چیزیں جلا کر خاکستر کردی ہیں"۔ موصوفہ نے اس کتاب میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ اس نے تین بار خودکشی کی کوشش کی مگر قدرت کو شاید اس کی موت منظور نہیں تھی وہ بچ گئی۔

زندگی کی تلخیوں سے نجات پانے کے لیے دوسرا راستہ انھیں تصوف میں نظر آیا۔ ایک بار تو وہ گھر چھوڑ کر دلی ساؤتھ ایکسٹنشن میں عورتوں کے ایک آشرم میں چلی گئیں جہاں ہر ذات اور مذہب کی عورتیں قیام کرتی تھیں مگر اس کے بعد انھوں نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ میں پناہ ڈھونڈی، پھر ضلع رامپور کے گاؤں بھینوڑی کے سجادہ نشین صوفی لیاقت حسین عرف منے میاں کے ہاتھ پر بیعت ہوئیں اور ہمیشہ ان کے ہاں بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ حاضری دیتی رہیں۔ اس کے علاوہ شمع صاحبہ کی راہ معرفت میں ایک اسّی سالہ بزرگ درویش سید صاحب کا بھی عمل دخل رہا ہے جس کے طفیل موصوفہ کے سامنے تصوف کے اور بھی کئی پہلو روشن ہوئے ہیں۔

یہ شاید نفیس بانو شمع کی سیمابی طبیعت کا نتیجہ تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی سوچوں کے زاویے اور طرز زندگی بھی بدلتا رہا۔ درویشوں سے وابستگی کے دور میں انھوں نے کئی کرامات کا بھی ذکر کیا ہے۔ خاص طور پر ان خوابوں کا جو کسی وقوع پذیر ہونے والے سانحہ کی پیش بینی ہوا کرتے تھے۔ "باب کرم" میں ان کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اس کتاب میں ایسے عجوبے بھی بیان کیے گیے ہیں جن پر کوئی منطقی دماغ شاید یقین نہ کرے۔ ممکن ہے یہ اتفاقات وقتی طور پر مصنفہ کی اپنی ذہنی کیفیت کی دین ہوں مگر ایک بار تو قاری چونک کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اپنی سوانح حیات کے علاوہ نفیس بانو شمع نے اور بھی کتنی ہی مظلوم اور ستم رسیدہ عورتوں کی داستانیں بیان کی ہیں جن سے کبھی ان کا تھوڑا بہت رابطہ رہا ہے۔ یہ داستانیں کہیں کہیں تو دل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ شمع صاحبہ کی یہاں تک بھی رسائی رہی ہے۔ قصوروار میں ثروت بیگم کا ذکر پڑھ کر اور "جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو" میں امجد اور ادریس کے کرداروں سے روشناس ہو کر شمع صاحبہ کی بے باکی اور جرات اظہار کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ امجد اور ادریس تو بذات خود عصمت چغتائی کی کہانی لحاف میں مذکورہ لحاف کے اندر کا منظر نامہ ہیں جس کے بارے میں عصمت نے لکھا تھا کہ کوئی مجھے لاکھ روپے دے تو بھی میں نہیں بتاؤں گی کہ لحاف کے اندر کیا تھا مگر شمع صاحبہ نہایت صفائی سے پوری صورت حال کی منظر کشی کر گئی ہیں۔ سارا شگفتہ کی زندگی کے المیے سے متعلق بھی مصنفہ نے سارا شگفتہ کے ہیجان خیز اعترافات کو نہایت سہل انداز میں بیان کر دیا ہے۔ یہاں اگر منٹو ہوتا تو ایسا کرنے سے پہلے ضرور کئی بار سوچتا۔ سارا شگفتہ کے کردار سے مطابقت رکھنے والی اپنی کہانی کھول دو میں بھی منٹو احتیاط کے دائروں سے باہر نہیں نکلا مگر شمع صاحبہ شاید اس لیے نڈر ہو کر یہ سب کچھ کہہ گئی ہیں کہ ان کا بیان حقیقت پر مبنی تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ بے باکی اور صاف گوئی میں نفیس بانو شمع کہیں کہیں تو واجدہ تبسم اور عصمت چغتائی سے بھی دو قدم آگے نکل گئی ہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ نفیس بانو شمع بنیادی طور پر شاعرہ ہیں۔ ان کی نثر میں بھی شاعر جیسا رنگ و آہنگ ہے۔ خیال آرائی، فکری اسلوب، الفاظ کی بندش، جملوں کی ترکیب اور انداز بیان میں لطافت اور غنائیت اس بات کی شاہد ہیں۔ اس ضمن میں ان کے چند جملوں کا حوالہ دینا چاہوں گا۔

"آگے چل کر ایک چٹان نما پتھر ملا جس پر صرف سن اور تاریخ لکھی تھی۔ اس

سے آگے سوالیہ نشان تھا۔ نس تھکن سے نڈھال ہو کر اس پتھر پر بیٹھ گئی۔ اب سوالیہ نشان کی جگہ پر میں تھی۔ "کتاب میں شمع صاحبہ نے شعروں کے حوالے بھی جی بھر کر دیے ہیں۔ ہر شعر نہ صرف متعلقہ سچوایشن کی پوری نمائندگی کرتا ہے بلکہ فنی لحاظ سے بھی بلند پایہ ہے۔ یہ اشعار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کانپتے ہونٹ بجھا چہرہ سلگتی آنکھیں
ایک تصویر مری اور مصوّر کتنے
دھوکے سے مجھ کو کچے گھڑے پھر دیے گئے
اس بار بھی میں پاریہ دریانہ کر سکی

نفیس بانو شمع کی یہ آپ بیتی اپنے بے باک انداز' بیان حق گوئی اور منفرد طرز نگارش کے ساتھ ساتھ اپنے صفحات پر عورتوں کی بیداری اور حقوق کی بازیابی کا پیغام لیے ایک یادگار دستاویز ثابت ہوگی۔

ناگپور کا مسلم معاشرہ

مولف: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
صفحات ۲۲۰ قیمت ۷۵ روپے
ملنے کا پتہ رحیم اسٹورس۔ حیدری روڈ مومن پورہ ناگپور

یہ کتاب ناگ پور مسلم معاشرہ کی جلد دوم ہے جس میں ۱۹۰۴ء سے ۱۹۴۷ء تک عہد برطانیہ میں معاشرتی اور تاریخی جائزہ ہے۔ جلد اول کی طرح اس کو بھی مسلم معاشرہ کے مختلف حصوں میں بانٹا گیا ہے اور معاشرہ کے ہر ممکن پہلو پر روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔ کتاب تقریباً سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ مثلاً برادریوں کا تذکرہ بوہرہ برادری، مومن برادری، شیعہ برادری، میمن برادری، رائین برادری، منصوری برادری، قریش برادری، چونے والے، چوڑی والے، تمباکو والے، عطر والے، بوریے والے ملازمت پیشہ، محلّے قبرستان اور مساجد وغیرہ اس طرح تہذیبی جھلکیوں کے لیے الگ ایک باب ہے۔ سیاسی سرگرمیوں، تعلیمی اداروں، علماء صلحا کے حالات شہیدان آزادی، نامور شعرا اور ناگپور میں اردو کے ارتقائی سفر وغیرہ کو الگ الگ ابواب میں تقسیم کر کے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں پر اس کا ایک باب تعلیمی سرگرمیاں بطور خاص قابل ذکر ہے جس کے پڑھنے سے علم ہوتا ہے کہ وہاں تعلیم کی کئی تحریکیں کام کر رہی تھیں اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس بھی منعقد ہوئے حتیٰ کہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تجویز بھی پاس ہوئی اس

طرح شرف الدین ساحل صاحب نے ناگپور کی تمام معاشرتی تاریخ کو سمیٹا ہے اور کچھ نتیجہ خیز باتیں بھی بر آمد کی ہیں۔ کتابت وطباعت صاف ستھری ہے۔ کاغذ عمدہ اور سفید ہے۔ جلد بہت مضبوط اور دبیز گتے کی باندھی گئی ہے اس لحاظ سے قیمت بہت کم معلوم ہوتی ہے۔

آتشی چنار

مصنف: شام بارک پوری
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
صفحات: ۱۲۸ قیمت: پچاس روپے

"آتشی چنار" شام بارک پوری کا ناولٹ ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ ناولٹ کشمیر سے متعلق ہے۔ انھوں نے اس ناولٹ میں اپنے کشمیری سفر اور مشاہدے کو سمویا ہے اور جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اسے ایک خوبصورت اور دلکش پیرایے میں پیش کیا ہے۔ کشمیر جنت نظیر کا حسن، مناظر فطرت اور خوشنما فضاؤں کے ساتھ شام بارک پوری کی نظریں کشمیر کے مجبور و مفلس عوام کی نکبت اور فلاکت کی طرف بھی گئی ہیں اور انھوں نے ان کا بڑے ہی موثر انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔ ان کی زبان سادہ، سلجھی ہوئی اور دلچسپ ہے۔ اردو کی نو مطبوعہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ بنگلہ دیش میں رہ کر وہ اردو کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں وہ بے حد قابل تحسین ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو والوں کا دھیان بنگلا دیش کی طرف کم ہے جیسا "آتشی چنار" کے "حرف اول" میں ڈاکٹر کلیم سہسرامی نے لکھا ہے لیکن اس سے اردو کے بقا اور مستقبل کا سراغ بھی ملتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ

"برصغیر ہند وپاک کے بعض اردو داں حلقوں میں اب بھی یہ غلط فہمی باقی ہے کہ بنگلا دیش میں اردو ادب کا مستقبل روشن نہیں لیکن اس کے مختلف گوشوں میں کبھی کبھی ادبی زندگی کروٹ لیتی ہوئی نظر آتی ہے جس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ اردو بڑی سخت جان زبان ہے اور اس کے خدمت گزار آج بھی اس کو زندہ رکھنے کی کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں۔"

ہم شام بارک پوری کو ایک بار پھر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ توقع ہے ان کی یہ تصنیف قدرو منزلت کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ کتابت۔ طباعت اور کاغذ نفیس ہیں۔

"موج در موج"　مصنف: ڈاکٹر سید حامد حسین
تبصرہ نویس: یوسف ناظم

صفحات: ۱۳۸۔ مجلد لیکن غیر مجلد معلوم ہوتی ہے۔ قیمت ۔/۱۰۰ روپے
پتا: ۵۔ سلور لائن اپارٹمنٹس۔ سیکٹر اے، کوہ فضا، بھوپال
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۔ ۲۵

ڈاکٹر سید حامد حسین، ام اے، پی۔ ایچ۔ ڈی، انگریزی زبان کے پروفیسر، ادیب کامل، روسی اور جرمن زبانوں کے طالب علم، سنسکرت زبان کے پارکھ، "اردو تلمیحات و مصطلحات" کے مصنف، محقق، تنقید نگار اور ہر لحظہ متحرک وفعال رہنے والے 'سیماب صفت' شخص ہیں۔ بے مقصد سیر و تماشا کے شوقین نہ ہونے کے باوجود، سفر بے شرط کے عادی رہے ہیں۔ اتنا گھومے کہ اگر گھومنے کے سارے دن گھر میں رہے ہوتے تو مضامین نو کے کوہ ہمالانہ سہی، کوہ قراقرم کی بلندی کو چھو ہی لیتے۔ (گھر بھی بنایا ہے تو کوہ فضا میں) کہستانی فضا نے انھیں ہمیشہ اوپر ہی اوپر رکھا۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تنقید نگار، محقق، معلم، مترجم اور مولف قسم کے ذی علم حضرات نے طنز و مزاح کو کمتر درجے کی شے سمجھ کر ہمیشہ نقصان اٹھایا (دوسروں کا بھی نقصان اس میں شامل تھا) ڈاکٹر سید حامد حسین کے بارے میں میں وہی رائے دوں گا جو ایک مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نے دوران گفتگو محترم سید حامد صاحب کے بارے میں دی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب محترم سید حامد صاحب کا ایک مقالہ جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی بارات" کے عنوان پر ممبئی کے "شاعر" میں شائع ہوا تھا (اور لوگوں کی آنکھیں کھل گئی تھیں) دلی کی ایک تقریب میں سید حامد صاحب کی موجودگی میں ڈاکٹر گوپی چند نے فرمایا تھا کہ اگر حامد صاحب تنقید کی طرف آتے تو ہم سب کی چھٹی کر دیتے۔ (اس مقالے کا ذکر میں نے ہی چھیڑا تھا) آج ڈاکٹر سید حامد حسین کی کتاب، "موج در موج" پڑھنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اگر یہ حامد صاحب مزاح کے میدان میں ٹکے رہتے تو سب کی چھٹی تو خیر نہیں کرتے لیکن ہلچل ضرور مچادیتے۔ ان کا 'امیج' مزاح نگار کا ہے نہیں، لیکن موصوف کو اس کا افسوس نہیں ہونا چاہیے۔ شبلی نعمانی کی مزاح گوئی کا ذکر کرو تو لوگ تعجب کرتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کی غزل گوئی کی تعریف کی جائے تو لوگ حیرت کرتے ہیں۔ اور تو اور ابو الکلام آزاد کا امیج (موجودہ امیج) ایک مدبر کا ہے، جب کہ ان کا صحیح مقام مفسر کا ہے۔ کرشن چندر کو صف اول کے مزاح نگاروں میں بھی جگہ دی جاسکتی ہے لیکن وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے دست

بردار ہونا پسند نہیں کریں گے۔

ڈاکٹر سید حامد حسین نے دیر آید درست آید کے مقولے کو پیش نظر رکھا اور اپنی زیر نظر کتاب "موج در موج" بڑے اہتمام کے ساتھ پیش کی۔ میں تو اُسے اے آمدنت باعث آبادی کا، کہہ کر قبول کروں گا لیکن شکایت بھی کروں گا کہ یہ تاخیر نہیں، اس کے آگے کی کوئی چیز ہے۔

کتاب کی ترتیب یعنی فہرست تو ۱۸مضامین پر مشتمل ہے لیکن (۱) اپنی بات (۲)نامۂ اعمال اور (۳) فیصلہ ایک نفری جیوری کا:ڈاکٹر شفیقہ فرحت سے قطع نظر مصنف کے ۱۵ مضامیں فرحت وانبساط کی ایک ایسی فضا پیدا کردیتے ہیں جو، خندہ ہائے گل، کے لیے مہمیز اور بجائے خود عطر بیز ہے۔ سید حامد حسین واقعہ نگاری کے ماہر ہیں۔ جس سے بھی ملتے ہیں، اس کی خامیوں کا محقق کے انداز میں جائزہ لیتے ہیں اور مرکز توجہ کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اگر یہ خود درمیان میں حائل نہ ہوں تب بھی آپ ان اطوار و اوصاف کو بچشم خود دیکھ لیں۔ مصنف نے "اپنی بات" میں کہا ہے کہ ان کے مضامین میں کہا اور خوب کہا ہے۔ "ضروری نہیں کہ اچھا مزاح وہی کہلائے جو سوچنے پر مجبور کرے، جو اپنی مقصدیت ثابت کرے۔ اس مجموعے کے بیشتر مضامین میں آپ کو ایسے ہی خالص مزاح کے نشانات ملیں گے"۔ کمال کرتے ہیں ڈاکٹر حامد حسین۔ انھیں یاد ہوگا کہ حالی نے مزاح کو ہوا کا جھونکا کہا ہے۔ کیا اس 'جھونکے' کو صرف جھونکا کہہ کر ٹال دیں گے۔ اس کا مقصد اور ما حصل وہی جانتے ہیں جو 'نعمت' کے معنی سمجھتے ہیں۔

ان کا مضمون "قصہ منہ بولی بھاوجوں کا" اگر بھاوجوں نے نہیں پڑھا ہے تو 'زبان یار من تُرکی' میں لکھ کر پڑھوانا چاہیے اور وہ بحث کریں تو تُرکی بہ تُرکی جواب دینا چاہیے تاکہ اغلاط کی ٹھیک سے پروف ریڈنگ اور اصلاح ہوسکے۔ لیکن مزاح کے نتائج مزاح نگار کے سامنے آتے نہیں ہیں کیونکہ یہ مدرسوں اور کالجوں کے سالانہ امتحانات کے نتائج نہیں ہوتے۔ سوئفٹ نے جب عورتوں کے سر کے بالوں کے فیشن کے بارے میں لکھا تھا تو کیا اس کے نتائج دیکھنے کے لیے وہ زندہ رہے تھے۔ مزاح کبھی بے مقصد نہیں ہوتا (میں ادبی مزاح کی بات کررہا ہوں) اور کیا کسی کے خشک ہونٹوں پر تبسم کی ہلکی سی لکیر کا نمودار ہوجانا کوئی بے مصرف بات ہے۔ ان کے پندرہ کے پندرہ مضامین، کڑی کمان کا تیر نہ ہوں لیکن خلش تو بہر حال پیدا کرتے ہیں۔ یہ خلش وہی ہے جو تیر نیم کش میں ہوتی ہے۔ وہ کہیں کہیں بے محابا ضرور ہوجاتے ہیں لیکن یہ سب "کھیل کا حصہ" ہے جسے انگریزی داں

لوگ یہ کہہ کر بہت پسند کرتے ہیں کہ یہ پارٹ آف گیم ہے۔(انگریزوں کا ایک خاص رویہ ہے کہ وہ ہر بات کو کھیل سمجھ کر سہہ لیتے ہیں)۔

راقم السطور، فاضل مصنف کی تحریرات سے ہمیشہ مرعوب رہا ہے۔ جیسا کہ شفیقہ فرحت نے لکھا ہے ان کی تصانیف غیر معمولی سنجیدہ ہیں لہٰذا ان کی ڈگریوں کی طرح بھاری بھرکم ہیں۔ "موج در موج" پڑھ کر جی خوش ہوا اور ایسا محسوس ہوا ڈاکٹر سید حامد حسین 'پروفیسری' کے جامے سے نکل کر یک لخت مخلا بالطبع ہوگئے۔ اس کتاب کے مصنف ہی کے نہیں، ناشر ہو کر بھی وہ خود بھی دعوے گئے اتنے کہ پاک ہوگئے۔ شفیقہ فرحت صاحبہ نے اپنے "فیصلے" میں "لہٰذا" کا لفظ نہیں لکھا' ورنہ وہ لکھ سکتی تھیں کہ لہٰذا حکم ہوا کہ ڈاکٹر سید حامد حسین انگریزی زبان کے پروفیسر ہونے کے باوجود اردو زبان کے ایک شریف مزاح نگار ہیں۔

مزاح نگاری، خاص طور پر وہ مزاح جو "سچویشن" سے متعلق ہو، گہرے مشاہدے کی متقاضی ہوتی ہے (یاد آیا کہ مضامین کی فہرست میں "قاضی کامیاب" بھی ایک مضمون ہے۔ لیکن یہ قاضی، لفظ "متقاضی" سے الگ ہوتا ہے)۔ "موج در موج" میں آپ کو ہر چوتھی سطر کے بعد ایک مشاہدہ ضرور ملے گا۔ خاص طور پر "تنقید گائیڈ" اور "جیب کا درد" آپ پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ مزاح نگار کے لیے کس قسم کا مشاہدہ، لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اختیاری مضمون بھی ہو سکتا ہے لیکن اس میں 'بے اختیاری' کے عناصر ہیں جو 'بے ساختگی' کے نام سے ادب میں رائج ہیں۔ ڈاکٹر سید حامد حسین کی تحریر میں یہی اختیاری مضمون بے ساختگی کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ "فارم بھرنے کا فن" بھی پڑھیے اور داد دیجیے مشاہدے کی۔ برکت بھائی کی داڑھی جب ان کے مشاہدے میں آتی ہے تو ڈاکٹر سید حامد حسین کو دوسروں کی رائے کا سہارا لینا پڑا اور یوں رقم طراز ہوئے:

"داڑھی کی اس برق رفتاری کو دیکھتے ہوئے معترین کا یہاں تک خیال تھا کہ جلد ہی برکت بھائی کی داڑھی ان کی ستر پوشی کا کام بھی کرنے لگے گی۔"

سید حامد حسین بڑے انشاپرداز نہیں، لیکن ان کی 'سادہ اردو' ہی کچھ کم غضب نہیں ڈھاتی ہے، ان کی تحریر میں خود ان کے مزاج کی سادگی ہے اور سادگی کے لیے اسلحہ ضروری نہیں ہوتے۔ لڑائی کا فن اصل میں کراٹا کا فن ہے اور مزاح نگاری میں یہی فن 'ضرب کاری' کا باعث ہوتا ہے۔

"موج در موج" میں ضرر شدید کا خطرہ نہیں۔ یہ پھولوں کی چھڑی ہے جو شادی کے بعد "چوتھی" کے موقع پر استعمال کی جاتی ہے۔

کھلے خطوط

محمود احمد عرفانی کون تھے؟

جناب ڈاکٹر جلال السعید الحفناوی نے "کتاب نما" بابت ستمبر ۱۹۹۸ء کے مہمان اداریہ بعنوان "مصر میں اردو زبان" میں محمود احمد عرفانی کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے ۱۹۳۰ء میں قاہرہ سے اردو ہفتہ وار "اسلامی دنیا" جاری کیا تھا۔ ڈاکٹر جلال ان کے بارے میں مزید معلومات مہیا نہیں کر سکے۔ میں نے بچپن میں محمود احمد عرفانی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور مجھے آج بھی ان کی کالے پھندنے والی سرخ طربوش یاد ہے۔ آپ میرے خالو جان مولوی غلام نبی مصری کے شاگرد تھے اور ان سے ملنے کے لیے ہمارے گھر پر آئے تھے۔ خالو جان کے ساتھ ان کو یہ نسبت بھی تھی کہ خالو جان ان کی طرح مصر میں رہے تھے، جہاں پر انھوں نے ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک الازہر یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور مفتی محمد عبدہ کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔

محمود احمد عرفانی ایک نامور اردو صحافی اور انشا پرداز شیخ یعقوب علی تراب عرفانی الاسدی کے فرزند تھے، جن کا تعلق "پیسہ اخبار" اور دوسرے مجلوں سے رہا تھا۔ آپ مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار تھے۔ چنانچہ جماعت احمدیہ کا پہلا ہفتہ وار آرگن "الحکم" جو ابتدا میں امرتسر سے اور بعد میں قادیان سے نکلتا تھا، ان کا ذاتی اخبار تھا۔ ان کے بیٹے محمود احمد عرفانی کو، جو پنجاب یونیورسٹی کے فاضل عربی تھے، جماعت احمدیہ کی طرف سے مصر بھیجا گیا تھا تاکہ وہاں سے اردو اور عربی میں اخبار نکالیں۔ بادی النظر میں مقصود اسلامی دنیا کے اتحاد کے لیے تحریک جاری کرنا تھا مگر شاید اس کے پیچھے یہ خواہش کام کر رہی تھی کہ اسلامی دنیا میں جماعت احمدیہ کی قبولیت کے لیے راستہ ہموار کیا جائے۔

محمود احمد عرفانی نے بیک وقت دو مجلے جاری کیے تھے، جن میں "اسلامی دنیا" اردو میں اور "العالم الاسلامی" عربی میں چھپتا تھا۔ دونوں مجلے صرف چند ماہ تک شائع ہو سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصری حکومت نے رسالہ جات مذکورہ کی اشاعت روک دی تھی اور محمود احمد عرفانی کو ملک سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ اس بارے میں ایک نوٹ جماعت احمدیہ کی تاریخ میں موجود ہے۔

"قاہرہ سے اخبار "اسلامی دنیا" کا اجرا۔ اس سال (۱۹۳۰ء ناقل) جناب شیخ محمود احمد عرفانی نے قاہرہ میں آنریری مبلغ کے فرائض سرانجام دینے کے علاوہ "اسلامی دنیا" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ مسلمانوں کا باہمی

تعارف اور انھیں ان کے مصائب تی سے آگاہ کر کے اتحاد کی دعوت اس اخبار کی پالیسی تھی۔ اس کی دو ایڈیشن نکلتے تھے۔ ایک اردو میں دوسرا عربی میں۔ یہ اخبار مصور تھا اور اردو دنیا کی خبریں نہایت شرح و بسط سے شائع ہوتی تھیں۔ افسوس ہے کہ بعض ناگزیر مجبوریوں نے یہ اخبار زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہنے دیا اور اس کی اشاعت بند ہو گئی اور جناب عرفانی صاحب قاہرہ سے قادیان آگئے۔" ("تاریخ احمدیت" مؤلف دوست محمد شاہد۔ جلد ششم۔ صفحہ ۲۷۶)۔

محمود احمد عرفانی نے قادیان لوٹنے کے بعد اپنے والد کے مجلّہ "الحکم" کو دوبارہ شائع کرنا شروع کیا، جسے وہ جنوری ۱۹۳۴ء سے اپنی زندگی کے آخری لمحات (جولائی ۱۹۴۳ء) تک چھاپتے رہے۔ اس دوران میں "جان پدر" کے عنوان سے ان کی ایک کتاب شائع ہوئی، جس میں ان کے والد شیخ یعقوب علی عرفانی کے ۲۷ خطوط شامل ہیں۔ جو انھوں نے اپنے بیٹے کو مصر بھیجے تھے۔ البتہ ایک خط اس میں سید ولی اللہ شاہ، جو جماعت احمدیہ کے ناظر امور عامہ تھے، کے خط کے جواب میں ہے، جس میں انھیں اطلاع دی گئی تھی کہ جماعت احمدیہ ان کے بیٹے کو مصر بھیج رہی ہے۔ شیخ یعقوب علی عرفانی اپنے بیٹے کو التزام کے ساتھ ہر ہفتہ ایک خط لکھا کرتے تھے۔ کتاب میں شامل کردہ ۲۷ خطوط سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شیخ محمود احمد عرفانی ایک سال سے کچھ کم عرصہ تک مصر میں قیام پذیر رہے تھے۔

عرفانی خاندان کے افراد آج بھی پاکستان میں مقیم ہیں اور ان سے یقیناً رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ "اسلامی دنیا" اور "العالم الاسلامی" کی مکمل فائل جماعت احمدیہ کی لائبریری قادیان میں موجود ہونی چاہیے۔

☆ حسیر الدین احمد، Deutsches Orient-Institut
Mittelweg 150, 20148 Hamburg-Germany

"کتاب نما" کے جولائی کے شمارہ میں جناب نرگس سلطانہ صاحبہ کا اشاریہ نہایت اہم اور دعوتِ فکر دینے والا ہے۔ انھوں نے اردو زبان کے موجودہ حالات کا صحیح جائزہ لیا ہے۔ "شمالی ہند سے زبان رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اس زبان کی تعلیم و تعلم کے سارے مواقع ختم ہو گئے ہیں۔ ہماری نسل اس سے نابلد ہو گئی ہے۔ مایوسی کفر ہے لیکن صورت حال جیسی آج ہے، اس سے آنکھیں موندنا حقیقت کو جھٹلانا ہوگا۔"

اور انھوں نے یہ وارننگ بھی دی ہے۔ ہماری بے حسی یوں ہی جاری رہی تو وہ دن دور نہیں جب شاید اگلے پچاس سالوں میں ہی ہماری یہ زبان زندہ نہ رہے۔ اگر بولی کی حد تک زندہ رہ بھی گئی تو بھی تحریری طور پر یہ ختم ہو جائے گی۔ آج بھی اردو رسم الخط اپنانے

والوں کی تعداد میں بتدریج کمی آگئی ہے۔ اور موجودہ نسل کے ختم ہونے پر شاید اسے کوئی جاننے والا یا استعمال کرنے والا بھی نہیں بچے گا۔" انھوں نے جو ہندی میں ترجموں کی بھرمار کا ذکر کیا ہے اس سے بھی اردو کی وہی نقصان ہونے کا خدشہ ہے جو اردو کے لیے دیوناگری رسم الخط اپنا لینے سے ہوگا۔ اردو رسم خط سیکھنے کی تحریک Motivation ہی ختم ہو جائے گی۔

جناب ہاشم علی اختر سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بھی مجھے اپنے مکتوب میں لکھا تھا کہ "میرے دوستوں رشتہ داروں میں تقریباً ایک ہزار افراد میں سے چالیس سال کی عمر سے کم عمر والا کوئی بھی فرد اردو رسم الخط نہیں جانتا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ میں ستر فیصدی اردو رسم الخط سے بے بہرہ ہیں۔"

کچھ اسی طرح کے خیالات جناب سید ظفر ہاشمی مدیر گلبن احمد آباد نے بھی "گلبن" کے جولائی، اگست کے شمارہ کے اداریہ میں ظاہر کیے ہیں۔ "آج کے بچے جن کے والدین کی مادری زبان اردو تھی۔ وہ اردو سے نابلد ہو رہے ہیں۔ چند سال اور اسی طرح گزر گئے تو مگرمچھ کے آنسو بہانے والے لوگ یہ کہتے ہوئے بھی شرمائیں گے کہ اردو کبھی ان کی مادری زبان تھی۔"

اسی طرح کے اداریے کچھ اور ادبی رسالو میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

میں فطرتاً رجائیت پسند ہوں اور اردو کے روشن مستقبل کے ہی خواب دیکھا رہتا تھا۔ کوئی بھی روشنی کی کرن نظر آتی تھی تو مجھے بہت خوشی ہوتی تھی۔ ۱۹۷۵ء میں کلکتہ میں منعقد آل انڈیا اردو اڈیٹرس کانفرنس میں جناب حیات اللہ انصاری کے صدارتی خطبہ کو پڑھ کر ہماری بہت حوصلہ افزائی ہوئی تھی اور ہمیں دلی راحت ملی تھی۔ انھوں نے کہا تھا "وہ ملک جس نے اس زبان کو چھے سات سو سال میں ایک بے حقیقت اور نظر نہ آنے والے بیج سے پیدا کیا، پھر بڑی ممتا سے گوشوں گوشوں سے لاکر اسے دودھ پلایا۔ بڑے چاؤ سے اسے اپنے سبزہ زاروں، ریگستانوں، ساحلوں اور کوہساروں کی گود میں کھلایا۔ اس کی بیماریوں کا علاج کیا۔ جب یہ ذرا بڑی ہوئی تو اس کو کشمیر کے پھلوں، سمندر کی لہروں، ریگستانوں کی چمک دمک اودھ کی تراش خراش، دکن کی صنعت گری، اور پنجاب کی توانائی سے مالا مال کیا اور یہ جو کچھ کیا اپنے فطری مزاج سے مجبور ہو کر کیا، اور اب جبکہ یہ زبان جوانی پر آئی ہے تو پال پوس کر بڑا کرنے والی ماں کیوں ایسی کٹھور ہو جائے گی کہ اپنی بیٹی کا گلا گھونٹ دے گی۔"

اسی طرح جب جنوری ۱۹۹۵ء کے

"کتاب نما" میں ہم نے جناب مظفر حسین غزالی کا مضمون "بھارت میں اردو کا مستقبل"۔ پڑھا تو ہمیں دلی مسرت حاصل ہوئی۔ انھوں نے لکھا تھا۔ "اردو کا مستقبل روشن ہے اور روشن امکانات اسے تاریکی میں نہیں جانے دیں گے۔"

ان کے اس مضمون کی تائید اور تعریف کرتے ہوئے میں نے بھی آپ کو ایک مکتوب لکھا تھا جو "کتاب نما" کے مارچ ۱۹۹۵ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ میں نے لکھا تھا۔ "ہندستان میں اردو کا مستقبل اتنا تاریک نہیں جتنا اوپر سے نظر آتا ہے، میں اردو کے مستقبل کے بارے میں مایوس نہیں ہوں۔" حالانکہ آنجہانی جناب شمس کنول صاحب نے اپنے رسالہ افق تا افق میں لکھ دیا تھا۔ "مظفر حسین غزالی کا مضمون قطعی طور پر جھوٹ کا پلندہ ہے۔ غزالی صاحب اپنے خدا سے کچھ تو ڈرے ہوتے۔"

اور جب کوئی مجھ سے اردو کے زوال اور غیر یقینی مستقبل کے بارے میں بات کرتا تھا تو میں اسے یہی جواب دیتا تھا کہ "اینٹی اردو لابی کی اردو دشمنی، گورنمنٹ کی لاپرواہی اور خود اہل اردو کی غفلت اور بے حسی کے باوجود یہ اردو کا اپنا معجزہ ہے کہ باد مخالف کے تیز و تند جھونکوں میں بھی وہ زندہ رہی اور آج بھی زندہ ہے۔ پردۂ سیمیں پر درخشندہ ہے۔ فلمی نغموں اور غزل گانے والوں کی محفلوں میں تابندہ ہے۔ ملک کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان کی حیثیت سے پائندہ ہے، اور اس مظلوم زبان اردو کو یہ زندگی یہ تابندگی کس نے بخشی؟۔ اس کی اپنی مٹھاس دلفریبی اور عوامی اپیل نے اس کے ان متوالوں جیالوں اور جنونیوں نے جو اسے اس کی عمر کے ہر دور میں میسر رہے، اور کوئی وجہ نہیں کہ ایسے "سر پھرے" اسے حال اور مستقبل میں بھی میسر نہ ہوں۔"

لیکن حال ہی میں کچھ ایسے مشاہدات دیکھنے میں آئے ہیں اور تجربات ہوئے ہیں جن سے میں سخت فکرمند ہو گیا ہوں۔ میری ساری رجائیت پسندی کافور ہو گئی ہے کیونکہ سارا منظرنامہ ہی بدل گیا ہے۔

نوکری کے دوران دو تین سال میں ایک بار میں دلی۔ یو۔پی جایا کرتا تھا۔ اور یوپی کے مختلف شہروں کو بس میں جانا ہوتا تھا۔ سارے بس اڈوں پر کولڈ ڈرنک کے اسٹالوں پر اردو کے اخبار رسالے جاسوسی اور ادبی ناول اور دیگر کتابیں عام ملتی تھیں۔ ان کی تعداد ہندی اور انگریزی کی کتابوں اور رسالوں کی تعداد سے زیادہ ہوتی تھی لیکن ۱۹۹۶ء میں کافی عرصہ بعد اس طرف جانے کا اتفاق ہوا تو سارا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ شاید یہ تبدیلی آہستہ آہستہ بتدریج آئی ہو، لیکن میں کافی عرصہ بعد گیا تھا، اس لیے مجھے یہ اچانک اور حیران

کن گئی، اور میں اس کے لیے تیار نہ تھا۔ بس اڈوں کے اسٹالوں پر اردو کوئی اخبار یا رسالہ نہیں تھا۔ کوئی کتاب نہیں تھی۔ اور مراد آباد اور رام پور جیسے شہروں میں بھی، جہاں اہل اردو کی اکثریت آباد ہے۔ دکانوں کے نام اور سائن بورڈ جو پہلے اردو میں ہوتے تھے، اب انگریزی یا ہندی میں تھے۔ دلی میں دریا گنج میں ہر اتوار کو سیکنڈ ہینڈ کتابوں کا جو بازار لگتا ہے، وہاں بھی اب اردو کتابیں اور رسالے غائب تھے۔ میں نے کئی بار اس بازار سے کچھ نایاب کتابیں اور رسالوں کے پرانے نمبر خریدے تھے۔ اردو کی کتابوں اور رسالوں کے اسٹال ہندی اور انگریزی کے اسٹالوں سے زیادہ ہوتے تھے، لیکن اس بار اردو کی کتابوں کا ایک بھی اسٹال نہیں تھا۔ صرف ایک ہندی کتابوں کے اسٹال پر کچھ بہت پرانے قلمی رسائل اردو کے نظر آئے۔ کتاب صرف ایک ہی نظر آئی اور وہ تھی تسلیمہ نسرین صاحبہ کے بنگالی ناول "لجا" کا اردو ترجمہ۔ سخت ذہنی کوفت ہوئی۔ لگتا تھا اردو پڑھنے والے ہی نہیں رہے۔ اردو جیسی عظیم زبان بولی بن کر رہ گئی ہے۔ جناب نرگس سلطانہ صاحبہ اور جناب سید مظفر ہاشمی کے شکوک و خدشات صحیح ثابت ہو رہے ہیں۔

اگر اردو والوں نے فوری کوئی قدم نہیں اٹھائے اور نرگس سلطانہ صاحبہ کی نصیحت "اب بھی وقت ہے اگر ہم اس زبان سے محبت کرتے ہیں، تو عملی طور پر ہمیں اپنے گھروں میں اسے زبردستی رائج کرنا ہوگا۔" پر خلوص سے عمل نہ کیا تو اردو بھی ہندستان میں فارسی کی طرح محدود ہو کر رہ جائے گی۔

اہل اردو کی بے حسی اور لاپرواہی کی ایک اور مثال دینا چاہتا ہوں۔ بھلائی، درگ کے زیادہ تر اہل اردو (جن کی یہاں کافی بڑی تعداد ہے) جانتے ہیں کہ میں بغیر فیس لیے گھر پر اردو پڑھاتا ہوں۔ اس بارے میں میں نے مقامی اخباروں میں اشتہار بھی دیے تھے اور اسی سلسلے میں میرا ایک مکتوب ۵ر جنوری ۱۹۹۱ء کے اردو بلٹز میں بھی نمایاں طور پر شائع ہوا تھا لیکن آج تک صرف ایک لڑکی میرے پاس اردو پڑھنے آئی وہ بھی ہندو تھی۔

اردو والے اپنے سکھ بھائیوں سے سبق لے سکتے ہیں۔ آج پنجاب، ہریانہ، دہلی کے باہر کتنے اسکول ہیں جہاں گورمکھی پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن ہر سکھ بھائی چاہے وہ ہندستان میں رہتا ہے یا کسی بیرونی ملک میں (سکھ دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں) وہ گورمکھی جانتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی مادری زبان کا رسم الخط بچپن میں گھر کی چہار دیواری کے اندر اپنی ماں کی گود میں سیکھتا ہے اور چاہے وہ دانشور ہو، صنعت کار ہو، بیوپاری، کامگار یا پیشہ ور اور نوکری پیشہ وہ اپنے گھر والوں سے خط و کتابت اسی زبان اور رسم الخط میں کرتا ہے۔ (پاکستان میں پنجابی کا رسم الخط اردو رسم الخط ہی ہے)

کیا اردو پڑھانے جانے کی کوئی ایسی تحریک شروع نہیں کی جاسکتی؟ اہل اردو

دھیان دیں۔

نرگس سلطانہ صاحبہ کا اداریہ پڑھتے وقت مجھے جناب رضوان احمد کے کسی رسالہ میں شائع شدہ اداریہ کے الفاظ شدت سے یاد آئے، جو میں نے آٹھ دس سال پہلے پڑھے تھے اور دماغ کے کسی کونے میں محفوظ رہ گئے تھے، اور میں ان کا حوالہ اکثر اپنے مضامین و مکتوبات میں دیتا رہتا ہوں۔ یہاں بھی لکھ رہا ہوں۔ ع

چھوڑ دو تم بھی مجھے سب کی طرح
راستو! میری کوئی منزل نہیں

اردو کی لڑائی مسلمانوں کی لڑائی نہیں ہے۔
صرف ہندستانیوں کی لڑائی نہیں ہے۔
حکومت سے لڑائی نہیں ہے۔
کسی دوسری زبان سے مقابلے کی لڑائی نہیں ہے۔
تو پھر کیا ہے۔ جس کو ہم اردو کی لڑائی کا نام دیتے ہیں؟

اردو کی لڑائی خود ان لوگوں سے ہے، جو اردو بولتے ہیں۔ اردو کے مشاعرے پڑھتے ہیں۔ اردو کی مجالس میں شریک ہوتے ہیں۔ اگر دو کے نام پر روٹی کھاتے ہیں۔ اردو کے کارواں کو چلاتے ہیں اور کبھی کبھی اردو کو دوسری زبان بنانے کی مانگ بھی کرتے ہیں اور عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔ اردو میں فلمیں لکھ کر ہندی نام سے بیچتے ہیں۔ اردو کے گانوں پر ہندی سرٹیفکیٹ برداشت کرتے ہیں۔ ان تمام بڑے بڑے حضرات کے بچے اردو نہیں پڑھتے، نہیں بولتے، نہیں سمجھتے اور نہ خود یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اردو جیسی زبان سیکھیں۔ ان کے گھروں میں اردو کے اخبار و رسائل نہیں آتے۔ اگر آتے ہیں تو مفت، ہاں انگریزی و ہندی کے اخبار خرید کر آتے ہیں۔ انگریزی میں چھپی خبر ان کی سمجھ میں آتی ہے۔ اردو کے اخبار میں چھپی خبر کو گھٹیا، پرانی و بکواس کہتے ہیں۔ ایسے تمام اصحاب سے میری دست بستہ گزارش ہے کہ اردو اخبار و رسائل خرید کر اور صرف خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیے اور چاہے آپ کسی علاقہ میں رہتے ہوں اردو کے اخبار و رسائل اپنے ہاکر سے کہہ کر طلب کریں، اور سب سے ضروری بات اپنے بچوں کو اردو پڑھنے پر مجبور کریں۔ اب ہمارا یہی نعرہ ہونا چاہیے۔

"اپنے بچوں کو اردو پڑھنے پر مجبور کیجیے۔"

☆رام پرکاش کپور، 718کم۔ آئی جی پدم نابھ پور، دُرگ

"کتاب نما" ستمبر ۹۸ء کا شمارہ میرے خیال سے اس سال کا بہترین پیش کش ہے۔ سبھی مضامین خاصے فکر انگیز اور معلوماتی ہیں۔ تنقید اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کے لیے یہ مضامین موضوعاتی اور تکنیکی سطح پر بہت مفید ثابت ہوں گے۔ خاص طور پر ڈاکٹر سید حامد حسین صاحب نے عددی نظام پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس موضوع کو وسعت دیا جانا ضروری ہے۔ جب یہ کہ ہندستان کی سبھی زبانیں علاقیت سے محروم ہوتی جارہی ہیں اور پڑھا لکھا طبقہ جس میں ادیب و فنکار

بھی شامل ہیں مغرب کی اندھی تقلید میں مبتلا ہو کر اپنی انفرادیت کھو چکے ہیں۔ انگریزیت کو اب صرف اردو سے خطرہ ہے۔ لہٰذا میڈیا کا تمام زور اس پر ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اردو زبان و ادب کے واقف کاروں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا جائے۔ ڈاکٹر جلال السعید کا اشاریہ آزادی میں اردو کے کردار کو واضح کر تا ہے۔ اردو نے ہندستان اور ہندستان کے باہر بھی جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، ارباب وطن اسے بالکل فراموش کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند اور بدر اقبال کے مضامین خاصے متنوع اور دلچسپ ہیں۔

☆ڈاکٹر محمد شیخ، ۵۹۲ نیا محلہ، جبل پور

جون ۹۸ء کے "کتاب نما" کی مہمان مدیر محترمہ نرگس سلطانہ نے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، واقعی بہت ہی سنگین ہے۔ خاص کر ان کا یہ جملہ اردو کے ان دانشوران و پروفیسر ان کی بے حسی اور کم ظرفی کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔

"سب سے پہلے ایسے سر پھروں کی ضرورت ہے جو ان تمام لوگوں کے خلاف تحریکیں چلائیں جو مختلف انجمنوں اور اداروں کے چودھری بن کر بیٹھے ہیں لیکن جن کے اپنے اس زبان سے ناواقف ہیں اور اسی طرح یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طالب علموں کو چاہیے کہ وہ ہر اس اردو کے لیکچرر اور پروفیسر کے کلاسوں کا بائکاٹ کریں جو کھاتے تو ہیں اردو کی روٹی لیکن جن کی نسلیں اور اولادیں اس زبان سے ناواقف ہیں اور اسے پڑھتی نہیں۔"

مذکورہ بالا اقتباس میں محترمہ نے جن حقائق پر روشنی ڈالی ہے وہ نہایت ہی سنگین ہیں اور ان پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

آج ہمارے صوبہ بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان ہے لیکن کتنے اردو کے پروفیسر یا لیکچرر ہیں جو سرکاری محکموں میں اردو رسم الخط میں درخواست دیتے ہیں۔ وہ تو اپنی Ph.D (پی۔ایچ ڈی) کی دکانیں کھولے بیٹھے ہیں اور دس پندرہ ہزار روپیوں کے عوض جاہلوں کے درمیان ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں فروخت کرنے میں مصروف ہیں۔ چند ہی اشخاص ایسے ہیں جو اس لعنت سے محفوظ ہیں۔

میں اردو کے ادبا، شعرا، محققین اور نقادان سے صرف ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ نام تو خوب کمایا، بڑے بڑے ایوارڈ حاصل کیے اور اپنی جھولیاں موٹی موٹی رقموں سے بھر لیں کیا۔ انھوں نے ایماندارانہ طور پر ایسے پانچ پانچ افراد کو ہی سہی جو اس زبان و رسم الخط سے ناواقف ہیں ان کو اس سے روشناس کرایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جواب نفی میں آئے گا۔

سچ پوچھا جائے تو چھوٹے چھوٹے مدارس کے غریب و مفلس مدرسین کی مخلصانہ خدمات ہی کی بدولت آج اردو زبان و رسم الخط زندہ ہے۔

☆ندیم انور، آزاد روڈ، چندوارہ، مظفر پور (بہار)

ادبی تہذیبی خبریں

[illegible]

دلی اردو اکادمی نے گزشتہ دس برس کے دوران ۱۰ ہزار سے زائد غیر اردو داں افراد کو اردو کی تعلیم دی اور اب اس طبقہ میں اردو کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے ایڈوانس ڈپلومہ کورس شروع کرنے کا منصوبہ بنا لیا گیا ہے جس پر اگلے تعلیمی سال سے عمل در آمد شروع ہو جائے گا۔

آج یہاں یو این آئی اردو سروس سے بات چیت کرتے ہوئے اکادمی کے سکریٹری مخمور سعیدی نے بتایا کہ دلی یونیورسٹی سے منظور شدہ سرٹیفکٹ کورس اور ڈپلومہ کورس کے ۸ مراکز چل رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان مراکز میں ہر سال تقریباً ایک ہزار افراد داخلے لیتے ہیں جن میں ڈاکٹر، وکیل، انجینیر اور دیگر طبقات کے لوگ شامل ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان مراکز پر تقریباً ٦ لاکھ روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔

پروفیسر خسرو کی خدمت سے آنے والی [illegible] منموہن سنگھ

مالیاتی کمیشن کا چیئرمین مقرر ہونے پر تہنیتی جلسہ

سابق مرکزی وزیر مالیات ڈاکٹر منموہن سنگھ نے پروفیسر علی محمد خسرو کے مرکزی مالیاتی کمیشن کے چیئرمین مقرر ہونے پر آج یہاں ایک تہنیتی جلسہ میں کہا کہ ملک کی معاشی حالت سدھارنے کے لیے پروفیسر خسرو نے بہت کچھ کیا ہے۔

ڈاکٹر منموہن سنگھ نے اس موقع پر انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ۷۴-۱۹۷۳ میں جب مسز اندرا گاندھی وزیر اعظم تھیں تو ملک معاشی بحران سے دو چار ہوا تھا اور قیمتیں آسمان پر پہنچ گئی تھیں تو مسز اندرا گاندھی نے ماہرین معاشیات کے ایک گروپ کو بلایا تھا۔ اس میں پروفیسر خسرو بھی تھے اور ان سے کہا تھا کہ وہ ایسے اقدامات کریں جن سے قیمتیں نہ گریں تاکہ عوام کو راحت پہنچے۔ اس وقت پروفیسر خسرو نے جو منصوبہ پیش کیا اسے حکومت نے پوری طرح اپنایا اور بڑھتی ہوئی قیمتوں پر قابو پایا۔ ان کی اس دور کی خدمات کی تاریخ کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر خسرو گونہ گوں خصوصیات کے مالک رہے ہیں۔ جس وقت وہ جرمنی میں ہندستان کے سفیر تھے اس وقت انھوں نے کہا کہ آج بھی ملک معاشی بحران سے دوچار ہے اور ایسے نازک حالات میں ایک غیر سیاسی تقرر کر کے حکومت نے ایک اہم کام کیا ہے اور حکومت و عوام دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھیں ایک باصلاحیت شخص ملا۔ انھوں نے کہا کہ ملک

کے عوام کی امنگوں کو پروفیسر خسرو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ عوام کی توقعات پر وہ پورے اتریں گے۔

تقریب کی صدارت [illegible] نے کی اس موقع پر [illegible] ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر [illegible] فاروقی، پروفیسر اختر واسع، مسٹر حمید اللہ بھٹ، مسٹر جواد احمد صدیقی، مسٹر موسیٰ رضا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ڈاکٹر غزالی نے نظامت کی۔ عباسی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

نسیم اختر انصاری کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض

مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا (بہار) نے جناب نسیم اختر انصاری کو ان کے مقالے "دہلی کالج کی تاریخ اور اس کی علمی و ادبی خدمات" پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ یہ مقالہ آپ نے پروفیسر سید حلیم اللہ حالی کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ پروفیسر احمد سجاد اور پروفیسر امیر عارفی ان کے ممتحن تھے۔

عبدالمعبود کو پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری

ال۔ ان۔ متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ، بہار کے اعلانیہ کے مطابق "حسن امام درد حیات اور ادبی خدمات" کے عنوان سے مبسوط تحقیقی مقالہ سپرد قلم کرنے پر عبدالمعبود خلف محمد عمر مرحوم، موضع دیورا بندھولی ضلع دربھنگہ کو پی ایچ ڈی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر منصور عمر کی نگرانی میں جمع کیا گیا۔ اس کے ممتحن پروفیسر سید عبدالباری سلطان پوری اور پروفیسر ابوذر عثمانی تھے۔

سید حسین احمد زاہدی کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

کلکتہ کے جواں سال ادیب اور طنز و مزاح نگار سید حسین احمد زاہدی کو کلکتہ یونیورسٹی نے ان کے تحقیقی مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا "اردو طنز و مزاح پر یورپی طنز و مزاح کے اثرات"۔ یہ مقالہ ڈاکٹر (پروفیسر) ظفر اوگانوی کے زیر نگرانی قلمبند کیا گیا۔ ان کے انتقال کے بعد کلکتہ یونیورسٹی نے ڈاکٹر مظفر حنفی، پروفیسر اقبال جیر کو اس مقالے کا نگراں مقرر کیا۔ مقالے کی جانچ کے لیے یونیورسٹی نے بیرون اور اندرون ملک کی یونیورسٹیوں کو بھیجا جہاں سے محقق سید حسین احمد زاہدی کو سند دینے کی سفارش کی گئی۔ اس مقالے کے زبانی امتحان (Viva) کے ممتحن ڈاکٹر عبدالرؤف اور ڈاکٹر مظفر حنفی تھے۔

یوم انجم فوقی

بدایوں۔ انجمن فروغ ادب کے زیر اہتمام یوم انجم فوقی کا اہتمام شیخ پرویز عارف بدایونی کی رہائش گاہ "پیکر نور" پر کیا گیا۔ اس موقع پر پروفیسر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کو "اعزاز انجم" ۱۹۹۷ء سے سرفراز کیا گیا۔ اس کی صدارت پروفیسر عبداللہ ولی بخش قادری نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کو شال حضرت

رکی تالگانوی نے، میڈل حضرت رونق بدایونی اور اعزازی سند پروفیسر ولی بخش قادری نے عنایت فرمائی۔ اس موقع پر ایک شعری نشست کا بھی اہتمام کیا جس کی صدارت حضرت ذکی تالگانوی اڈیٹر سہ ماہی "ابر" نے اور نظامت حضرت قاضی الیاس رشید نے فرمائی۔

[illegible]

شہر ممبئی کے قدیم سینٹ، زیوئرس کالج نے ممبئی یونیورسٹی کی منظوری سے ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر کی تدریس و تحقیقاتی نگرانی کے پیش نظر ان کو اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے برقرار رکھا ہے۔ خواہش مند طلبہ کالج کے دفتر سے معلومات فراہم کر سکتے ہیں اور گوریکر صاحب سے بھی رابطہ قائم کر کے مزید تفصیل حاصل کر سکتے ہیں۔ کالج ہذا کے صد سالہ جشن (۷۰-۱۹۶۹ء) کے موقع پر اردو اور فارسی سرٹیفکٹ اور ڈپلوما کورسیز کا اجرا ۱۹۷۰ء میں کیا اور آج تک جاری ہے۔ ڈاکٹر گوریکر صاحب اس کے ڈائرکٹر ہیں۔

[illegible]

بمقام پارپیا اسکول (کرسنٹ ہال) ثریا کیمپن بوقت شام کے ساڑھے چھے بجے حلقہ ارباب ذوق کے زیر اہتمام ایک جلسہ کا انعقاد ہوا جس کی صدارت پروفیسر سید صفی اللہ نے فرمائی۔ رسم اجراء عالی جناب پروفیسر محبوب پاشا صاحب محبوب کے ہاتھوں میں عمل میں آئی۔ "رخ روشن" کی پہلی کاپی جناب سید فضل اللہ صاحب مدیر "مسلمان" نے حاصل کی۔ چائے نوشی کے بعد مشاعرہ زیر صدارت نوابنے میر خلیم صبانویدی صاحب منعقد ہوا۔ عالی جناب اصغر ویلوری صاحب اس محفل شعر کے مہمان خصوصی تھے مشاعرہ کی نظامت عالی جناب سید سجاد حسین صاحب ظہیر نے کی۔

[illegible]

مہاراشٹر اردو اکیڈمی ممبئی کی جانب سے مذاکرہ، رسم اجراء اور مشاعرہ کا اہتمام ورود میں کیا گیا۔ مذاکرہ کا عنوان اردو و مراٹھی زبان و ادب پر بداری بولی کے اثرات تھا۔ اس میں ڈاکٹر سید عبدالرحیم، ڈاکٹر آغا غیاث الرحمن، ڈاکٹر صفدر، نیل شنحہ منیذ تھے وغیرہ نے اپنے مقالات پڑھے اس کی صدارت پروفیسر میر اظہر علی نے فرمائی۔ رات میں عارج میر کے شعری مجموعہ "ناشنیدہ" کی رونمائی ڈاکٹر سید عبدالرحیم کے ہاتھوں کی گئی۔

[illegible]

بھوپال۔ مورخہ ۳ اور ۴ اگست کو ریجنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن بھوپال میں "اردو تدریس میں نئی تکنیک اور تقاضوں کے مدنظر اساتذہ کے لیے ہدایات" موضوع پر دو روزہ ورک شاپ منعقد کیا گیا۔ اس کا مقصد اساتذہ کے لیے ایسا ہدایتی مواد مہیا کرانا تھا جس سے

اردو تدریس کو نئے تقاضوں اور جدید تکنیک سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔ اس ورک شاپ میں صوبے کے مایہ ناز ادیبوں اور ماہر تعلیمات نے شرکت کی۔ جن میں جناب ابراہیم یوسف، پروفیسر آفاق احمد، پروفیسر حیدر، حامد رضوی، پروفیر اظہر راہی، ڈاکٹر انیس سلطان، ڈاکٹر شفیقہ فرحت، جناب خالد قریشی، جناب مسعود حسین اور محترمہ یاسمین خان کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اس پروجکٹ کے انچارج ڈاکٹر فاروق انصاری ہیں۔

خدابخش لائبریری اور جامعہ ہمدرد کے زیر اہتمام دہلی میں سہ روزہ قومی سمینار

خدابخش لائبریری سال گزشتہ سے آزادی کی پچاسویں سالگرہ بڑے اہتمام سے منا رہی ہے۔ جامعہ ہمدرد کے تعاون سے اس نے ہمدرد نئی دہلی میں ایک قومی سمینار کا انعقاد ۲۹۔۳۱ اگست ۹۸ء میں کیا جس کا موضوع "آزاد ہندستان ماضی و مستقبل" تھا۔ اس میں ملک کے مشاہیر اور دانشوروں نے شرکت کی۔ اس کے کئی ذیلی عنوانات تھے (۱) اکیسویں صدی میں داخلہ جنگ یا امن کے ساتھ (۲) فرقہ واریت اور قومی ترقی (۳) ذرائع ابلاغ اور اخلاقی پستی (۴) تعلیم کی نئی جہات (۵) ہندستانی مسلمان اور ان کا مستقبل (۶) اردو آزادی سے پہلے اور بعد میں (۷) ہندستانی وفاق مسائل اور امکانات (۸) ہندستانی تاریخ میں تحریف و تنسیخ۔

سمینار کا افتتاح ۲۹ر اگست صبح گیارہ بجے ہوا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد خدابخش لائبریری کے ڈائرکٹر جناب حبیب الرحمٰن چغانی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے سمینار کے بنیادی مقصد سے روشناس کرایا۔ پروفیسر علاء الدین احمد، وائس چانسلر جامعہ ہمدرد نے اپنے تعارفی کلمات میں جامعہ ہمدرد کی سرگرمیوں اور حکیم عبدالحمید صاحب کی بے لوث خدمات کا تذکرہ کیا۔ حکیم صاحب نے اپنا ذہن و جسم اور اپنی جائداد ملک کے لیے وقف کر دیے۔ سابق وزیراعظم شری اندر کمار گجرال نے اپنے افتتاحی خطبے میں خدابخش لائبریری اور جامعہ ہمدرد کی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کو سراہا۔ آپ نے حکیم عبدالحمید صاحب کے ایثار، خلوص اور غیر معمولی کارہائے نمایاں کا اعتراف کیا۔ آپ نے ملک کی روایت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی وحدت پر زور دیا لیکن اس کے تنوع اور نیرنگی کو اس کی ایک اہم خصوصیت تسلیم کیا۔ زبان، مذہب، ذات پات کا اختلاف ملک کا ایک اہم وصف ہے، اسے برقرار رہنا چاہیے مگر اس کے باوجود اتفاق و اتحاد اس کی فلاح و بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ آپ نے اپنی تقریر میں ہر پہلو کا بھرپور جائزہ لیا۔ مرکز اور صوبائی حکومت کا تعلق، مسلمانوں کے حقوق،

خواتین کے حقوق، غذا اور تعلیم کی فراہمی، خارجہ پالیسی، مستحکم حکومت، معاشی کفالت، زرعی پیداوار صنعتی ترقی اور دیگر امور پر بھرپور روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے ملک نے ان پچاس سالوں میں سائنس اور ٹکنالوجی میں نمایاں ترقی کی ہے۔

مذاکرے کی پہلی نشست میں ہندستانی مسلمانوں کے موضوع پر مقالات پیش کیے گئے۔ سید حامد نے ہندستانی مسلمانوں کے حوالے سے مختلف جہت سے گفتگو کی اور ان کے مجموعی مسائل کا احاطہ کیا۔ ان کی تعلیم، تشخص اور ریزرویشن پر زور دیا۔ ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی، ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین، ڈاکٹر نور محمد اور ڈاکٹر مجیب اشرف نے مسلمانوں کے موضوع پر اپنے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر محمد علی کشور نے انسانی حقوق پر جبکہ پروفیسر ڈی۔ ان ملک نے خارجہ پالیسی پر بحث کی۔ دونوں مقالہ نگاروں نے اکیسویں صدی میں داخلہ کے لیے امن کو ضروری قرار دیا۔ ۳۰ر اگست کو صبح کی نشست میں تعلیم، ذرائع ابلاغ اور فرقہ واریت کے موضوعات پر مقالے پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر آمنہ کشور نے عورتوں کی تعلیم و تربیت پر گفتگو کی جبکہ جناب شفیع مشہدی نے خواندگی کے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے تعلیم کا جائزہ لیا۔ جناب حبیب قدوائی نے تعلیمی درس گاہوں اور جامعات کی شماریات پیش کرتے ہوئے فاصلاتی نظام تعلیم کی اہمیت وافادیت پر زور دیا۔ ڈاکٹر امجیلاشا کماری نے خاص کر الیکٹرانک میڈیا پر گفتگو کی۔ انھوں نے ٹی۔ وی کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ ڈاکٹر مسعود عالم قاسمی نے ذرائع ابلاغ کے متعصبانہ کردار پر افسوس کا اظہار کیا۔ جناب اختر الواسع نے قومی ہم آہنگی اور یکجہتی کی ضرورت پر زور دیا جبکہ جناب یسین مظہر صدیقی نے قومی ترقی میں فرقہ واریت کو سدراہ بتایا۔

سہ پہر کی نشست میں ہندستانی وفاقی مسائل اور امکانات پر شری آر۔ ڈی۔ ڈکشت، اے۔ ایس۔ نارنگ، عبدالرحیم وجاپور، عرشی خان، کمار سریش اور اے کے شکلا نے اپنے مقالے پیش کیے۔ مرکز اور صوبائی حکومت کے تعلقات کا جائزہ لیا اور مرکز کی بیجا مداخلت کو نقصان دہ بتایا۔ ساڑھے سات بجے شب میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں معروف شعرا نے شرکت فرمائی۔ بیکل اتساہی، مظہر امام، رفعت سروش، حمید صدیقی، شفیع مشہدی، جمیلہ بانو، ثروت جہاں، انجمن آرا انجم، ظفر احمد نظامی، رشید الظفر، نظر برنی، نظمی اور تابش نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ اس شعری نشست کی نظامت مشہور شاعر اور اردو اکیڈمی کے سکریٹری جناب مخمور سعیدی نے کی۔

آخری نشست ۳۱ر اگست صبح کو ہوئی جس میں اردو اور ہندستانی تاریخ میں تحریف کے عنوانات پر مختلف مقالے پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر محمد عمر، ڈاکٹر محمود مصطفےٰ صدیقی، ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی اور شری جمناداس اختر نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ سب مقالہ نگار اس پر متفق تھے کہ حکومت نے اردو زبان کے ساتھ جانب داری کا ثبوت دیا اسے ایک مخصوص فرقہ کی زبان قرار دے کر اس کے ساتھ ناانصافی کی۔ ڈاکٹر صفی احمد اور ڈاکٹر رضاء اللہ انصاری نے ہندستانی تاریخ میں تنسیخ اور سائنسی ورثے پر مقالات پڑھے۔

سہ پہر میں الوداعی تقریب ہوئی جس میں جناب سید حامد نے خصوصی مقالہ پیش کیا جس میں ماضی اور موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا اور مسلمانوں کے مسائل کا احاطہ کیا۔ سابق چیف جسٹس احمدی صاحب نے اپنے خطبے میں آئین کا بھرپور تجزیہ کیا۔ بنیادی حقوق پر بحث کی اور جمہوریت کے وسیع تناظر پر گفتگو کی۔ پروفیسر علاء الدین احمد نے صدارتی ارشادات پیش کیے اور جناب حبیب الرحمٰن چغانی نے اختتامی تقریر کی۔ ڈاکٹر سلیم الدین احمد اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے سب شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

مذاکرے کی ابتدائی تقریب پر شری اندر کمار گجرال نے آزادی سے متعلق خدابخش لائبریری کی تازہ ترین مطبوعات حسرت موہانی اور انقلاب آزادی، شعلۂ آزادی، مولانا عبید اللہ سندھی کا انقلابی منصوبہ اور Partition And Product of the Trend کا اجرا فرمایا۔

شہر ممبرا میں ۳۰ ویں عالمی اسلامی نمائش

اسلامیات سے دلچسپی رکھنے والے تمام احباب کو یہ سن کر بڑی مسرت ہوگی کہ "آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر" کی شہرہ آفاق عالمی اسلامی نمائش کا ۳۰واں عظیم الشان اجلاس اب بمبئی کے مضافاتی شہر ممبرا میں "اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن" ولغریب بارہ آرٹ گیلریوں کے ساتھ اب تک ملک کے ۲۹ بڑے بڑے شہروں میں منعقد ہو کر ہر مکتبہ فکر و نظر کے علماء و فضلا اور لاکھوں عوام سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔

اس مرتبہ ہندستان کے دیگر متعدد ثقافتی اداروں کے تعاون لے کر جلوہ فاران کے نام سے اسلامی ثقافت کے ۱۲۵ اہم پہلوؤں کو مسجد اقصیٰ نما ایک وسیع و عریض نمائش گاہ میں پیش کیا جا رہا ہے جس کا دیکھنا انسانی بصارت اور بصیرت دونوں کے لیے باعث راحت ہوگا۔ یہ نمائش ہر شہر میں پیش کرنے کا منصوبہ ہے۔ رابطہ کے لیے لکھیے۔ منظور الحسن، بانی و ناظم عالمی اسلامی نمائش، ہمدرد لائبریری، کھڑکی، پونہ۔ ۴۱۱۰۰۳

[illegible]

ایک اطلاع کے مطابق کل رات جنگ پورہ ایکسٹینشن میں بزرگ صحافی جی ڈی چندن کے گھر پر ڈاکہ پڑا چور قیمتی سامان چوری کر کے فرار ہو گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ چور باہری دیوار کو پھلانگ کر مکان کے بالائی حصے میں داخل ہو گئے اور وہاں رکھے ٹرنکوں اور صندوقوں کے تالے توڑ کر قیمتی سامان لے کر بھاگ گئے۔ معلوم ہوا ہے کہ جن صندوقوں میں کتابیں اور اسی طرح کا سامان تھا اس کو باہر پھینک دیا گیا۔ صبح ۵ بجے جی ڈی چندن نے چوری کی اطلاع پولیس کو دی جس نے موقعہ پر پہنچ کر حالات کا جائزہ لیا۔

[illegible]
مکتبہ جامعہ کے کارکن [illegible] صدمہ

مکتبہ جامعہ کے کارکن محمد محفوظ عالم کے چچا زاد بھائی، انیس الرحمٰن مرحوم کے صاحبزادے محمد مظفر حسین ۱۷ ستمبر ۱۹۹۸ء کو اس دار فانی سے رحلت کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم گھر کے واحد چشم و چراغ ہی نہیں بلکہ بی، ایس، سی فائنل ایئر کے ذہین طالب علم بھی تھے۔ تقریباً چار مہینے سے ٹیومر میں مبتلا تھے، علاج و معالجہ بھی کافی ہوا۔

ادارہ کتاب نما و پیام تعلیم دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین

[illegible]

قاتل کی گولیوں سے نائب حکیم عبدالقادر اور محافظ بھی مارے گئے۔

حکیم محمد سعید ہندستان کے مایۂ ناز حکیم اور ملک میں اپنی نوعیت کی واحد یونانی تعلیمی یونیورسٹی جامعہ ہمدرد کے بانی حکیم عبدالحمید صاحب مدظلہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ظالموں نے انھیں بعد نماز فجر اس وقت اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا جب وہ کراچی کے اپنے مطب میں مریضوں کو دیکھنے کے لیے داخل ہو رہے تھے۔ حکیم صاحب پشاور، اسلام آباد اور کراچی میں مطب کرتے تھے۔ حکیم محمد سعید جنرل ضیاء الحق کے زمانہ میں وزیر صحت تھے اور بعد میں صوبہ سندھ کے گورنر مقرر کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ حکیم محمد سعید کا ادبی دنیا میں بھی اپنا ایک الگ مقام تھا۔ انھوں نے متعدد سفرنامے لکھے۔ حکیم محمد سعید بچوں کے لیے بھی مستقل کالم لکھتے رہے۔ ماہنامہ پیام تعلیم میں حکیم صاحب کے مقبول ترین کالم "جاگو جگاؤ" اور "حکیم صاحب کے مشورے" نہایت پابندی سے ہر ماہ شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ کالم بچوں اور بڑوں کے پسندیدہ کالم تھے۔ ادارہ مکتبہ جامعہ' ماہنامہ پیام تعلیم، ماہنامہ کتاب نما قبلہ حکیم عبدالحمید صاحب

اور اہل خاندان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور مرحوم کی مغفرت کے لیے دعاگو ہے۔

خواجہ مہدی حسن نظامی کا انتقال

شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم کے صاحبزادے اور خواجہ حسن ثانی نظامی کے چھوٹے بھائی خواجہ سید مہدی نظامی کا مختصر علالت کے بعد رات دو بجے انتقال ہو گیا بعد نماز عصر ساڑھے چار بجے درگاہ حضرت نظام الدین میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور ان کے آبائی قبرستان احاطہ خواجہ ہال میں تدفین ہوئی۔ تدفین میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی جن میں دہلی کے علمی و ادبی حلقوں کی تمام اہم شخصیتیں موجود تھیں۔ مرحوم 10 ستمبر 1935ء کو پیدا ہوئے تھے انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے گریجویشن کیا تھا۔ مرحوم درویش صفت مخلص اور ملنسار انسان تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی اور تین بیٹے ہیں۔

بہار کے مشہور شاعر شہزاد معصومی کا انتقال

بہار کے مشہور و معروف شاعر، ادیب، مرثیہ گو اور مرثیہ خواں شہزاد معصومی کا مختصر علالت کے بعد ۲۳ر اکتوبر کو پٹنہ میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۷۰ برس کے تھے۔

وہ محکمہ آب پاشی بہار سرکار سے سبکدوشی کے بعد بہار شیعہ وقف بورڈ کے سکریٹری بھی مقرر ہوئے تھے۔ لیکن خرابی صحت کی وجہ کر مستعفی ہو گئے تھے، موصوف کا پہلا شعری مجموعہ "شعلہ تشنگی" ۱۹۸۰ء میں بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی، اس پر بنگال اردو اکادمی نے ۱۹۸۱ء میں انعام سے بھی نوازا۔ دوسری کتاب "معرکہ تیغ گلو" جو بارہ مراثی پر مشتمل ہے، ۱۹۹۷ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ مرحوم کو مرثیہ نگاری کے ساتھ ساتھ مرثیہ خوانی پر بھی عبور حاصل تھا۔ کئی کتابیں ابھی زیر ترتیب تھیں۔ ادارہ کتاب نما اور پیام تعلیم مرحوم کے لیے دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

[illegible]

دھام پور (بجنور) کے سلسلۂ عالیہ قادریہ کے بزرگ خواجہ عبدالرب عرف بادشاہ صاحب جن کی عمر ۱۰۵ سال تھی افسوس ہے ان کا انتقال ہو گیا۔ ادارہ مرحوم کے لیے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

ان کے صاحبزادے محمد قاسم صاحب کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا۔ (رئیس احمد)

اہل قلم سے درخواست

خبریں، خطوط اور جائزے صرف مختصر ہی شائع کیے جائیں گے۔

(ادارہ)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

لسانُ الصدق — مُدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل، اس کا مقدمہ نیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ =/٦٥

نظامِ رنگ — ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہی کا ادبی خاکہ — یہ اُس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہوکر انسانیت کو وقار بخشا۔ =/١٥

شہیدِ جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مردِ درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مردِ مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ =/٦٥

پُرانی بات ہے (سلسلہ ادوار طمینؑ) زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں۔ بس سچائیوں

کے روپ بدل گئے ہیں۔ =/٣٠

غزل نُما — تصحیح و ترتیب ادا جعفری

(طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے)

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کلام کا جامع انتخاب اور تعارف جس کو ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ٤٨٠ =/٦٥

سازِ سخن — ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتونِ اوّل محترمہ ادا جعفری کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے اندازِ بیان سے ایک ایسی قوتِ ارادی مترشح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہو سکتا۔ =/٤٥

ترجمۂ قرآن — پروفیسر مشیر الحق

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش)

پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ٣٠ اکتوبر ١٩٨٨ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔ =/٨

نذرِ مختار — مالک رام

مجموعۂ مضامین بر تہنیت: محقق اور دانشور پروفیسر مختار الدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما نائب صدر جمہوریۂ ہند کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا جس میں اُردو کے ممتاز چھبیس ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ =/١٠١

Regd. with R.N.I at No 4967/60 Nov, 1998.
Regd. No. DL 16016/98
Licence No. U[SE]-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025

کتاب



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ، اُردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

گول مال — مجتبیٰ

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔

فی الفور — یوسف

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صف کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جا جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظا بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک تاریخی دستاویز۔

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیدین — مرتبہ ڈاکٹر عظیم الشان

ممتاز ماہر تعلیمات خواجہ غلام السیدین کے ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔

توفیق الحکیم — ڈاکٹر بدرالدین ا

ناول نگاری کا جائزہ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اس شمارے میں

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

دسمبر ۱۹۹۸ء | جلد ۳۸ | شمارہ ۱۲

فی پرچہ 7/:
سالانہ 70/:
سرکاری تعلیمی اداروں سے 100/
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک) 500/

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
فیکس نمبر: 6842574
Tel Cum Fax No (011)-6910191
ٹیلی فون نمبر: 6910191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، ممبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرے کے ذمے دار خود مصنفین ہیں ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

طنز و مزاح

جائزے

کھلے خطوط / ادبی تہذیبی خبریں

[illegible]

اعلیٰ تعلیم (خطبات)	ڈاکٹر ذاکر حسین	120/-
[illegible]م	سید حامد	75/-
[illegible]وب کے فروغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ	مرتبہ: صغرا مہدی	75/-
ڈسپلن کی تعلیم و تربیت	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	90/-
[illegible] سو بے خبری رہی	ادا جعفری	200/-
[illegible]نقوش کے قلم سے	مرتبہ: مظفر علی سید	80/-
	(مجلد)	150/-
طب یونانی اور چیلنجز	حکیم [illegible] قدیر	60/-
محبوب حسین جگر (کتاب نما کا خصوصی شمارہ)	مرتبہ: پروفیسر نثار احمد فاروقی	75/-
فراق: دیار شب کا مسافر	مرتبہ: [illegible] حنفی	150/-
بیاں اور	اختر سعید خاں	144/-
لفظوں کی انجمن میں	ڈاکٹر سید حامد حسین	135/-
فرہنگ اصطلاحات طب	مسعود احمد برکاتی	45/-
تعبیر و تفہیم	خلیق انجم	135/-
معاصرین و متعلقات مولانا آزاد	عبدالقوی دسنوی	60/-
منجملہ	یوسف ناظم	51/-
تصوف: رسم اور حقیقت	خواجہ حسن ثانی نظامی	90/-
اخلاقیات طبیب	حکیم محمد سعید	20/-
سلاخ ٹوٹتی ہے	کشمیری لال ذاکر	90/-
مفکرین تعلیم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	120/-
تاثر نہ کہ تنقید	صدیق الرحمٰن قدوائی	51/-
چہرہ در چہرہ	مجتبیٰ حسین	51/-
کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے	ڈاکٹر تقی حسین جعفری	51/-
فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر مومن محی الدین	45/-
سیاہ فام ادب	مرتبہ: شمیم حنفی	40/-

سرورق ______ پروفیسر عبدالحق

چند مجبوری کی بنا پر نئی مطبوعات کا صفحہ نہیں شائع کیا جارہا ہے اگلے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (ادارہ)

مہمان مدیر
پروفیسر عبدالحق
شعبہ اردو۔ دہلی یونیورسٹی

(اشاریہ)

اردو، اساتذہ اور انتخاب

اس مضمون کا مقصد نہ اساتذہ کا عدم احترام ہے اور نہ طریقہ انتخاب کی عیب جوئی اور نہ ہی طالب علموں کی ہمت شکنی۔ میرا معروضہ یہ ہے کہ ہم اور ہماری ثقافت زیست کی کشاکش سے دوچار ہیں۔ ان حالات میں معمولی کوتاہی بھی ہمارے عدم وجود کے لیے سبب بن سکتی ہے اسی لیے ذی اختیار اساتذہ اور احباب کی خدمت میں بہ صد ادب چند معروضات پیش کر رہا ہوں۔ ہم ان کی توجہ اور التفات چاہتے ہیں کہ بعض ممنوعات کو مسترد کرنے میں سب لوگ معاون ہوں۔ یہ حقیقت بھی تسلیم ہے کہ معاشرے کی کثافتوں سے محفوظ رہنا آسان نہیں ہے۔ ہم اسی میں پرورش پا رہے ہیں اس کے موثرات سے دامن کشاں نہیں گزر سکتے۔ آلودگی ہم پر اثر انداز ہوگی۔ ہاں جس قدر ہم اپنے کو بچا سکیں وہی ہمارا آدرش ہوگا۔ ہمارا جینا مرنا سب کچھ اسی نصب العین کے نفاذ سے وابستہ ہے اس لیے کہ ہم ہی اقدار، ادب اور ثقافت کے امین سمجھے جاتے ہیں اور علم و دانش کے محافظ بھی۔ استاد کردار و گفتار کی تمثال میں نایاب ندرت رکھتا ہے اور پھر اردو زبان و ادب کا استاذ تو منزہ باالذات بھی ہے اور منبع صفات بھی۔ اس زبان کی اپنی منفرد تخصیص ہے جس میں اس کے جوہر آشکار ہوتے ہیں کیونکہ اردو صرف ایک زبان یا اظہار کا محض وسیلہ ہی نہیں ہے۔ یہ عظیم ثقافتی سرمایہ ہے جس کی نگہداشت کے لیے تمام پہلو توجہ طلب ہیں۔ خاص طور پر نامساعد حالات میں ہماری ذمے داریاں بڑھ جاتی ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہم پر واجبات عائد ہوتے ہیں۔ ان سے اعراض ہماری ہلاکت کا موجب بن سکتی ہے۔ ثقافتی سرگرمیوں اور ان کی یافت سے ہی تخلیقی قوتیں تاب کار ہوتی ہیں اور فنونِ لطیفہ کو فروغ بخشتی ہیں۔ تخلیقی قوتوں کا سب موثر وسیلہ زبان ہے۔ اور زبان کے ذریعہ ہی تہذیب اور انسانی فکر کو میزان فراہم ہوتا ہے۔ غرض تہذیب کی ساخت اور تربیت میں زبان کا بنیادی کردار سب تسلیم کرتے ہیں۔ زبان اجتماعی احساس و اظہار کا مجموعہ ہے جسے ان گنت افراد مل کر شعور کی وحدت یا محسوسات کی مرکزیت کو معمور کرتے ہیں۔ اردو

فلسفہ لسان اور تاریخ ثقافت کا مجموعہ ہے۔ شاید اسی لیے اس کے تقاضے بھی مختلف ہیں۔ ہر ہر قدم پر اس کے محافظ اور محبوب جاننے والوں کی آزمائش ہوتی رہتی ہے جس میں سرخ روئی سے زیادہ رسوائی ہاتھ آتی ہے۔ آزادی کے بعد کا منظر نامہ دیکھیے تو محسوس ہوگا کہ حوادث سے گزرنا زبان کے پرستاروں کا مقدر بن گیا ہے۔ اس آشوب میں کسی بھی فرد کی کج روی نا قابل تلافی نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اجتماعی احتساب کے چراغ کو روشن رکھیں اور تجربہ کے غیر مناسب فیصلہ کا اعادہ نہ ہونے دیں۔ کسی پر شبہ نہ کریں اور نہ بغیر تصدیق کے الزام لگائیں۔ یہ اخلاقیات کے منافی ہے کہ بد عنوانی کی باتیں کسی سے منسوب کی جائیں اور شکوک کو راہ دی جائے۔ بعض ذمہ دار اساتذہ پر پیسے کے لین دین کی باتیں اخبارات میں بھی شائع ہونے لگی ہیں۔ یہ اردو برادری کے لیے اہانت ہے جس کی ہر پہلو سے مذمت کی جانی چاہیے۔ الزام تراشنے والوں کو کاذبوں کی صف میں کھڑا کر کے باز پرس ہونی چاہیے۔ ممکن ہو سکے تو غلط فیصلوں کے احتساب کے لیے ایک رضاکارانہ عدلیہ کا قیام ہو اور کوتاہی کے لیے باز پرس بھی کی جائے۔ احتسابی قوت کی کمی یا کم مائیگی سے ہی ہماری صفوں میں موجود اردو کے بد خواہ یا بد نیت لوگ اپنے لیے سود و سودا کا جتن کر کے اعزاز و اکرام کے مالک بن جاتے ہیں اور ہم دم نہ کشیدن کے مصداق تسلیم کر لیتے ہیں اور شرافت کے مارے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔

آزادی کے بعد بدلتے ہوئے بعض ناگزیر حالات کی برکتیں بھی سامنے آئیں۔ اردو والوں کے مطالبات بھی بڑھتے رہے۔ مصلحتاً مرکزی نیز صوبائی حکومتوں نے کالجوں اور دانش گاہوں میں محدود آسامیوں کے لیے بادل ناخواستہ ہی سہی سہولتیں پیدا کیں اور جمہوری نظام کے خوش آیند پہلوؤں سے استفادے کی عام صورت بھی سامنے آئی۔ اگر چہ یہ تناسب غیر تشفی بخش ہے پھر بھی ۱۹۴۷ء کے بعد آسامیوں میں تقریباً تین گنا اضافہ ہوا ہے۔ تعلیم میں عام تنوع کو دیکھتے ہوئے یہ اعداد و شمار بہت کم ہیں۔ گذشتہ چند برسوں سے نئی اور تشویش ناک صورت حال پیدا ہو رہی ہے جس کا ازالہ فی الفور کیا جانا چاہیے۔ جو آسامیاں موجود ہیں ان پر کام کرنے والے اساتذہ کی سبک دوشی کے بعد انھیں پُر نہیں کیا جا رہا ہے۔ طرح طرح کے عذر بے جا سے کام لے کر ٹالنے کی عام عادت بن گئی ہے، کالج کے سربراہوں یا دانش گاہوں کے وائس چانسلران آسامیوں پر خرچ ہونے والی رقم دوسرے مدوں میں صرف کر رہے ہیں۔ اردو محروم روزگار ہو رہی ہے۔ خود ہمارے ہی شعبہ کا تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہر ماہ دوسری مدوں پر صرف ہو رہا ہے۔ آٹھ آسامیاں خالی ہیں۔ پورے ملک میں تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد جگہیں خالی پڑی ہیں اور سالہا سال سے پُر نہیں کی جا رہی ہیں۔

[illegible] خالی آسامیوں کی فہرست بھیجی اور صوبے کے [illegible]
وائس چانسلر صاحبان کو یادداشت بھیجی۔ پھر انھیں یاد دہانی بھی کراتا رہا۔ بعض جلسوں میں گورنر صاحبان سے دو بدو بات کی اور درخواست کی صرف ایک گورنر نے جواب دیا۔ مدھیہ پردیش میں خالی آسامیوں کی فہرست پیش کی۔ جناب محمد شفیع قریشی صاحب گورنر کے دفتر نے اطلاع دی کہ تمام یونیورسٹیوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ صرف تین آسامیاں خالی ہیں۔ حالاں کہ یہ قطعی طور پر غلط ہے۔ جب کہ پورے صوبے میں 28 جگہیں خالی ہیں۔ مرکزی یونی ورسٹیوں کے وائس چانسلر صاحبان کو بار بار متوجہ کیا۔ علی گڑھ میں تو سنوائی ہوئی مگر بنارس ہندو یونیورسٹی کے سلسلے میں چھے خطوط لکھنے پر بھی جنبش نہ ہوئی۔ میں نے صدر جمہوریہ ہند سے گزارش کی۔ شاید ان کی بات سنی گئی اور اسی سال دو پروفیسروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ اسی طرح دہلی، حیدر آباد این ' سی ' آر ' ٹی غرض خالی آسامیوں کے پُر کرنے کی جدوجہد ہماری مساعی کا حصہ ہے۔ اداروں کے سربراہوں کی بے نیازی سمجھ میں آتی ہے مگر اردو اساتذہ کی بے توجہی بہت ہی تشویش ناک صورت اختیار کر رہی ہے۔ دو یونیورسٹیوں کے لیکچرر و صدر نے بڑی بے باکی سے بتایا کہ جب تک وہ پروفیسر شپ کے اہل نہیں ہو جاتے تب تک پروفیسر کی جگہ پُر نہیں ہونے دیں گے۔ ہوا بھی یہی۔ دو سال بعد وہ ریڈر ہوئے اور چار سال تک ریڈر و صدر رہے پھر پروفیسر کی جگہ بھری گئی۔ ایک جگہ پُر کی گئی دوسری پروفیسر کی جگہ اب بھی خالی پڑی ہے جب کہ ان سے زیادہ قابل حضرات امیدوار تھے۔ کارشناسوں نے بھی اس سازش کا ساتھ دیا اور مشتہر جگہ پُر نہیں کی گئی۔

اس ذہنیت کو کیا کیجیے۔ ہمارے بزرگ بڑی نرمی اور سہولت سے اغیار کی بڑی سازش میں ملوث ہو کر اردو کو نقصان پہنچانے میں غیر ارادی طور پر معاونت کر رہے ہیں۔ اس رجحان سے خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔ ہم نیاز مندی میں بااختیار افسروں سے متواتر مات کھا رہے ہیں اور اپنے ہی خنجر سے اپنی ہلاکت کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ میں اپنے ہی شعبے کی مثال دے رہا ہوں۔ دو سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد یونیورسٹی نے پروفیسر شپ کی انتخابی کمیٹی طلب کی جس میں ہمارے چار باوقار پروفیسر شریک ہوئے۔ یونیورسٹی کے صرف ایک آفیسر کی انتہائی نامناسب بات نے ان چار مہار تھیوں کو دم بخود کیا اور اپنا موید بنالیا۔ انھیں باور کرایا گیا کہ تمام امیدواروں میں کوئی اہل نہیں اور دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے شایانِ شان نہیں جب کہ اس صف میں ایک بہت ہی لائق پروفیسر بھی امیدوار تھے۔ آج تک وہ جگہ خالی پڑی ہے۔ اس سے قبل ہمارے ہی شعبہ میں ایک ریڈر کے لیے چار بار انٹرویو ہوا اس وقت کے

دو معتبر اساتذہ شعبے کے ساتھیوں کو مسترد کرتے رہے۔ اس وقت یہ لوگ بھی ریڈر تھے مگر دوسروں کو ریڈر دیکھنا شاید پسند نہیں کرتے تھے۔ اس قسم کی ذہنیت کا سدِ باب ہونا چاہیے۔ یہ ایک مبینہ کوشش ہے کہ اردو کی آسامیاں خالی رہیں۔ وہ پیسے دوسرے شعبوں میں کام آئیں اور اردو دو نیا ٹنگ نائیوں میں ڈوبتی جائے۔ ہم سادہ لوحی میں آلہ کار بن کر ان کی ہم نوائی بھی کر رہے ہیں۔ علمی معیار و میزان کے پیمانے بدل گئے ہیں۔ آسمان سے اب اچھے اساتذہ کا نزول نہیں ہوگا۔ جو حلقہ موجود ہے اس میں سے بہتر سے بہتر صلاحیت کا انتخاب ہو۔ یہ ہمارا دستور العمل ہونا چاہیے۔ ہاں کہیں کہیں معروضیت سو فیصد نہیں ہو پاتی مگر ذاتی پسند و ناپسند کی خاطر کم تر لیاقت کو ترجیح دے کر اچھے اور ہونہار طلبہ سے اردو کو محروم کیا جا رہا ہے۔ یہ سب سے زیادہ مضرت رساں ہے۔ اس کی تمام ذمہ داری با اختیار اور بزرگ اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔ پتہ نہیں ان کا ضمیر کتنا کثیف ہو چلا ہے۔ مثالیں بہت ہی دل خراش ہیں۔ راقم کچھ اپنے تجربے بڑی کوفت سے قلم کے حوالے کر رہا ہے۔ اردو کی ایک معتبر ریاست کے اہم یونیورسٹی میں ریڈر کے تقرر کے لیے ایک بزرگ پروفیسر اس حد تک کوشاں تھے کہ انھوں نے امیدوار کے نام سے ایک کتاب خود ہی تیار کر کے شائع کرائی۔ امیدوار صرف بی اے پڑھانے کا تجربہ رکھتا ہے۔ وہ مستقل کتاب کے مالک بھی نہ تھے۔ سفارشات کا ایک غیر مختتم سلسلہ جاری تھا۔ ظاہر ہے کہ ان سے بہتر امیدوار کے حق میں فیصلہ ہوا۔ ہاں اگر وائس چانسلر اردو قبیلے کے ہوتے تو شاید ہم بھی سپر انداز ہو گئے ہوتے۔

یہ عام تجربہ ہے کہ جس کالج یونیورسٹی کا وائس چانسلر اردو نہیں جانتا وہاں اردو کار شناسوں یا صدر ہائے شعبہ کی حکمتِ عملی کارگر ہو جاتی ہے اور جہاں صورتِ حال برعکس ہو وہاں ہماری شکست لازمی ہوتی ہے۔ ایک اہم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہمارے ہی حلقے سے لائے گئے ہیں۔ ان کے کروفر کا ایسا دبدبہ کہ اردو کے چار نامی گرامی پروفیسر خوف خوردہ ہو کر امنّا و صدقنا کہنے پر مجبور ہوئے۔ بیسیوں ڈاکٹریٹ اور کتابوں کے مصنف نیز ایم اے درجات کا تعلیمی تجربہ رکھنے کے باوجود ایک ایم فل امیدوار سے سب مات کھا گئے۔ میرا اختلافی نوٹ انچ کے مقابلے ایک بے توقیر ٹھہرا۔ ایسے ہی ایک کالج کے پرنسپل اور چیرمین کے نمائندہ، جو اردو سے سروکار رکھتے ہیں ایک ایسے امیدوار کے انتخاب میں ضد کر کے کامیاب ہو گئے جسے اردو غزل، قصیدہ، مثنوی کا ایک مطلع نہ یاد آیا۔ فارسی کا ایک شعر بھی نہ سنا سکا۔ اگرچہ وہ فارسی میں بھی ایم اے تھے۔ بہت پہلے کی بات ہے کہ پروفیسر محمد مجیب اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی مرحومین جیسے ذی قدر حضرات بھی ایک اردو ادیب پرنسپل کے حق میں مجبور ہوئے۔ پی ایچ

ڈی اور ایم اے فرسٹ کلاس کے مقابلے ایک سیکنڈ کلاس ایم اے کا تقرر ہوا۔ خاکسار کا بہت ہی مخلصانہ معروضہ ہے کہ اردو اساتذہ تقررات میں دیانت داری کے ساتھ اپنی ذمے داری کا ثبوت پیش کریں اور کم سے کم تعلیمی محاذ پر اردو کو مضبوط بنائیں۔ غلط انتخاب پر اتفاق نہ کریں اور حتی المقدور اس سے محفوظ رہیں۔ دہلی کے ایک سینئر سیکنڈری اسکول کا طریقہ انتخاب پسند آیا۔ ایم اے کے مقابلے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھنے والے دو امیدواروں کے درمیان زور آزمائی تھی۔ طے پایا کہ ان سے پڑھوایا جائے اور کلاس میں ان کی کارکردگی دیکھ کر فیصلہ کیا جائے۔ اس بنیاد پر ایم اے کی سند رکھنے والے امیدوار کو بہت بہتر جان کر منتخب کیا گیا۔ کیا ہی بہتر ہو کہ امیدواروں سے متن پڑھوا کر اور کچھ لکھوایا بھی جائے۔ ایک ناخوش گوار کیفیت سے ہم سب دوچار ہیں۔ بڑی تعداد فکشن سے فارغ شدہ ڈاکٹریٹ رکھنے والوں کی ہے۔ یہ کردار نگاری، مکالمہ اور نفس موضوع پر سحر آفریں تقریر تو کر لیتے ہیں مگر ایک معمولی شعر کا مطلب ان کی ذہنی رسائی میں نہیں ہوتا۔ اس وقت بڑی ضرورت متون کی تدریس ہے جس سے پوری نسل بری الذمہ ہو گئی ہے بلکہ اسے تحقیر سے دیکھتی ہے۔ دوسرا طبقہ جدید شاعری یا شعری رجحانات پر زمین و آسمان کے قلابے ملا سکتا ہے مگر متن کی یادداشت یا شعری صنائع کو فرسودہ سمجھ کر خاطر میں نہیں لاتا۔ ایک کالج کے انتخاب میں یہ معیار مقرر کیا گیا ہے کہ صرف انشا، املا ہی غلط نہ ہو بلکہ وہ بھی برخود غلط ہو اور امیدواروں میں سب سے کم زور ہو۔ جب یہ آئینہ اندر نقاب ہو تو اچھے اساتذہ کہاں سے آئیں گے۔ یہ استاد سادگی کو صادگی ہی لکھتے ہیں۔

آج بہت ضروری ہے کہ ہم انتخاب کے معائر بدلیں۔ ذاتی مراسم سے قطع نظر انتخابی عمل میں نظریہ اور مسلک کو قطعی دخل نہ دیں۔ عدل و انصاف کے ساتھ علمی دیانت داری کو پیش نظر رکھا جائے۔ بہار سروس کمیشن کے انتخاب میں پروفیسر محمد حسن نے رانچی کی مسجد کے امام کا انتخاب کیا کیونکہ وہ سب سے بہتر تھے۔ گزشتہ دنوں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے بیسویں صدی میں اپنی خودنوشت کے کالم میں پروفیسر محمد حسن صاحب کی تحسین کی ہے کہ پروفیسر موصوف نے صدر شعبہ اردو کی تنقیدی آرا کی پروا کیے بغیر ڈاکٹر ملک زادہ صاحب کی حمایت کی تھی کیونکہ وہ مستحق تھے۔ اس عبرت بینی کو بھی ملاحظہ کیجیے کہ وہی صدر شعبہ پروفیسر گیان چند جین جیسی قد آور شخصیت کے مقابلے میں منتخب کیے گئے جب کہ وہ پانچ سال کے ریڈر بھی نہیں رہے اور پروفیسر جین کئی برسوں سے پروفیسری حاصل کر چکے تھے۔ ایک انتخابی کمیٹی میں کسی امیدوار کے کردار، چال چلن اور ذاتی زندگی کے متصور رکیک پہلوؤں کو سامنے لا کر انھیں نہ لیے جانے کی سازش رچی گئی تھی مگر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے علمی

بنیادوں پر ان کی تردید کی اور امیدوار کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ ایسا ہی ایک واقعہ علی گڑھ میں پیش آچکا تھا۔ ثقہ صدر شعبہ کی ایما پر پروفیسر نعیم احمد کا انتخاب ہونے کے باوجود وائس چانسلر راضی نہ تھے۔ چنانچہ مرحوم کو سالوں [illegible] کی آزمائش میں رکھا گیا۔ بھلا ہو پروفیسر خواجہ احمد فاروقی مرحوم کا اور پروفیسر محمد حسن کا جن کی مستحکم مداخلت سے مرحوم کو پروفیسر شپ پر بحال کیا گیا۔ چند برسوں قبل یوپی ہائر ایجوکیشن سروس کمیشن کے تحت تین کارشناسوں نے مل کر خاص نظریہ کے اساتذہ کا انتخاب کیا۔ چند ماہ قبل ایسا ہی ایک ناخوش گوار حادثہ اور پیش آیا۔ ایک خاص نظریہ کے حامل اساتذہ نے عصر حاضر کے لائق ترین پروفیسر استاذ کو دوسرے نمبر پر رکھنا پسند کیا۔ ان سے کہیں جونیر اور کم علم کو ان پر فوقیت بخشی گئی۔ یہ واقعات مجبور کرتے ہیں کہ ایسے غلط فیصلوں کے خلاف اجتماعی احتساب کی آواز کو صلیب دار تک پہنچایا جائے اور ہوسکے تو ان کے قلم کی روشنائی کو خشک کر دیا جائے تاکہ ابتلا اور آزمائش کے اس دور میں وہ منہ دکھانے کے لائق نہ رہیں۔

اس امر کو بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ اساتذہ جو کسی جگہ اپنا قدم جما چکے ہیں انھیں دوسری جگہ کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ بہ صورت دیگر ان خالی شدہ جگہوں کو التوا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ہاں لائق اساتذہ کو ترقی کے لیے موقع بھی ملنا چاہیے۔ بہار سروس کمیشن کی انتخابی کمیٹی میں اردو کے ایک موقر پروفیسر نے مجھ پر اور دوسرے ارکان پر دباؤ ڈالا کہ ایک امیدوار کو منتخب کیا جائے کیونکہ اسے روزانہ تیرہ کیلو میٹر کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہ دباؤ تسلیم نہیں کیا گیا۔ ان کی ناراضگی بخوشی قبول کی گئی۔ لیکچرر سے ریڈر اور ریڈر سے پروفیسر کے لیے انھیں موقع ضرور دیا جانا چاہیے اور نیچے سے اچھے ذی علم نوجوانوں کو موقع میسر ہو تاکہ ان کی تربیت ہوتی رہے اور آیندہ کے لیے وہ اپنے کو مسلح کرتے رہیں۔ پروموشن کی اسکیم نے سب سے زیادہ اردو کو نقصان پہنچایا ہے۔ اردو کی خاطر ہم مروتوں میں آکر غیر مستحق کے حق میں فیصلے صادر کرتے ہیں۔ ایک مرحوم پروفیسر کا تکیہ کلام تھا کہ پڑھنے لکھنے سے کچھ نہیں ہوتا مجھے دیکھو لکچرر، ریڈر اور پروفیسر سب کچھ ہو گیا۔ انھیں پر موقوف نہیں، اب تو بہت سے لوگ فخریہ اسے دہراتے رہتے ہیں۔ ہاں انتخاب سے پہلے سو سو غیر علمی، جتن ضرور کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے دو مثالیں ایسی ہیں جن میں کارشناسوں نے دو پروفیسروں کو پہلے انتخاب میں ان کو نااہل قرار دیا مگر چند ماہ میں وہ شیشے میں ایسے اتارے گئے کہ دوسری سلیکشن کمیٹی میں ان اساتذہ کا نام ورد زبان کرتے ہوئے واپس نکلے۔ راتوں رات معائب کا محاسن میں تبدیل ہو جانا یا نقطہ نظر کا بدل جانا عجوبہ ہے اور علم و دانش کی تکذیب بھی۔ ایسے ترقی یافتہ اساتذہ کے ضمیر

[illegible] کو ان امیدواروں سے ترجیح طلب کرتا ہے، چنانچہ اب کثرت سے ایسے ہی لوگ میدان مارنے کی مساعی میں پیش پیش ہیں۔

اچھے تقررات کے سلسلے میں ہمیں من و تو کی تفریق سے بھی دست بردار ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ وبا نظر کی تنگی ہے یا فراست سے گریزپائی کہ ایک یونیورسٹی کا طالب علم خواہ وہ کتنا ہی لائق کیوں نہ ہو' دوسری یونیورسٹی میں پسند نہیں کیا جائے گا۔ اس رجحان سے بھی نقصان پہنچ رہا ہے۔ ایک صدر شعبہ نے تو دوسری دانش گاہ کے طلبہ کی درخواستیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک علاقہ کے لوگ ہی وہاں کی آسامیوں کے لیے سزاوار ہو سکتے ہیں۔ یہ رجحان بھی مہلک ہے۔ شمال و جنوب میں جاری یہ سلسلہ موقوف ہونا چاہیے۔ اس کی بھی مذمت ہو کہ استاد اپنے ہی طالب علموں کو فضیلت دینے پر اصرار نہ کرے۔ تمام طلبہ یکساں حق رکھتے ہیں۔ صلاحیت اور لیاقت کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے۔ اپنی یونیورسٹی کے طلبہ کے مقابلے میں دوسری یونیورسٹی کے امیدوار کی ترجیح دیے جانے کے جرم میں مجھے آج تک معاف نہیں کیا گیا اور ہدف بنا ہوں جب کہ منتخب شدہ امیدوار کی صلاحیتیں بہت سے اساتذہ سے بہت بہتر ہیں۔ ایک اور گھن ہمیں بہت ہی خاموشی سے کھوکھلا کر رہا ہے۔ جنسی موثرات کی انتہائی مذموم صورت بھی سامنے آ رہی ہے۔ طبقہ اناث کی تعداد میں بوجوہ اضافہ ہو رہا ہے۔ اساتذہ مرعوب و متاثر بھی ہو رہے ہیں۔ ان میں محنتی اور باصلاحیت بھی ہیں مگر بڑی تعداد حروف شناسی سے بھی محروم ہے۔ تقررات میں ایسے لوگوں کی ہمت افزائی سے ایک الم ناک منظر نامہ نگاہوں کے سامنے ہے۔ تحقیق و تدریس تو کجا انھیں کلاس یا کتاب کے درمیان بیٹھنا بھی منظور نہیں ہے۔ میرا استفسار تمام اردو اساتذہ سے ہے۔ آخر پروفیسر سیدہ جعفر جیسی خاتون کیوں جنم نہیں لے رہی ہیں؟ ہمارے اساتذہ اب شعر گوئی اور مشاعروں کی زینت پر نظر رکھنے لگے ہیں۔ اگر یہ طبیعت کو راس نہیں آتی تو افسانہ نگاری میں پناہ لیتے ہیں۔ خواتین اساتذہ بھی ہرگز پیچھے نہیں ہیں بلکہ دو قدم آگے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ تقرر کے وقت اس پر ضرور نظر رکھی جائے ان امیدواروں کو ترجیح نہ دی جائے۔ تجربہ کہتا ہے کہ ایسے شاعر نما اساتذہ نے اپنے شعبوں کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ ان کے شعبے ہی خانہ خراب ہو گئے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے مجھے ٹوکا اور کہا کہ شاعر استاد غنیمت ہے کہ شعر تو کہتا ہے ان اساتذہ کو کیا کہیں گے جو کچھ نہیں کرتے؟ ایک رجحان عقب دروازے کے تقررات کا ہے۔ اکثر کم تر درجے کی لیاقت رکھنے والے امیدوار کو عارضی اور ایڈہاک خدمت کا موقع دیا جاتا ہے پھر ان کی بحالی پر اصرار ہوتا ہے۔ یہ صورت حال دہلی اور دہلی سے باہر عام ہے۔ ایسے کئی

اودے پور، قریب تر جگہ ہوئی جہاں ایسے سبک دوشی کے بعد اساتذہ جز وقتی اور گھنٹے کے حساب سے پڑھاتے ہیں اور منفعت حاصل کرتے ہیں۔ دانستہ طور پر اس آسامی کو پر نہیں ہونے دیتے۔ ایک مرکزی یونیورسٹی میں امیدواروں میں جب کوئی مستحق نظر نہیں آیا تو کارشناس حضرات اپنے لیے ہی کوشاں ہوئے کیونکہ وہ سبک دوش ہو چکے ہیں۔ غالباً ۱۹۸۰ء میں انجمن اساتذہ اردو کی کانفرنس منعقدہ ٹونک میں راجستھان کے گورنر نے وعدہ کیا تھا کہ کم سے کم پورے صوبے میں ایک پروفیسر شپ کی جگہ منظور کی جائے۔ چنانچہ اودے پور میں یہ جگہ منظور کی گئی۔ بد قسمتی دیکھیے کہ آج تک وہ جگہ بھری نہیں گئی۔ میٹنگ بھی ہوئی مگر ماہرین کچھ نہ کر سکے۔ چند صوبوں میں پروفیسر کی ایک بھی آسامی نہیں ہے۔ جیسے پنجاب، راجستھان، گجرات، مدھیہ پردیش، ہریانہ، اڑیسہ وغیرہ۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ ہر ریاست میں جہاں کالج یا یونیورسٹی کی سطح پر اردو تدریس کا بندوبست ہے کم سے کم ایک پروفیسر شپ قائم کی جائے۔ پنجاب میں نواب علی شیر خاں انسٹی ٹیوٹ میں ایک پروفیسر کی آسامی بہت پہلے مشتہر ہوئی تھی، آج تک کھٹائی میں پڑی ہوئی ہے۔ مدھیہ پردیش میں کئی یونیورسٹیاں ہیں مگر کسی بھی جگہ اردو کا نہ تو شعبہ ہے اور نہ پروفیسر ہی موجود ہے۔ صرف کالجوں میں اردو کے شعبے ہیں۔ ایک دو کے علاوہ۔ جیسے ساگر میں شعبہ ہے مگر پروفیسر شپ نہیں۔ ریڈر کی موجودہ آسامی بھی التوا میں ہے۔ برکت اللہ یونیورسٹی کا نیا کیمپس بنا اور شعبہ کے قیام کی بات آئی مگر بے بصری دیکھیے کہ وہاں کے کالجوں کے سربر آوردہ اساتذہ نے یونیورسٹی میں شعبہ نہ کھلنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ خود دہلی میں دو کالجوں کے اساتذہ اردو میں توسیع کے منکر ہیں، کیونکہ دو چار جگہیں پیدا ہوں گی اور ان کی خودرائی پر ضرب لگے گی۔ آخر اس طرز فکر کے خلاف کب آواز اٹھے گی اور کیسے نجات حاصل ہوگی؟ اردو نسل کو اپنے رویوں میں تبدیلی لانی پڑے گی ورنہ احتساب کی آگ ہم سب کو راکھ کا ڈھیر بنا دے گی۔ نوجوان مچل رہا ہے اور وہ مضطرب بھی ہے۔ بزرگوں کا احترام بہت دیر تک باقی نہیں رہے گا۔ صرف پروفیسر شپ کی خالی آسامیوں کو ملاحظہ فرمائیں۔ اگر ان پر تقرر ہو جائے تو لکچرر کی مزید جگہیں خالی ہوں گی۔ دہلی، علی گڑھ، جموں، اُودے پور، بمبئی، حیدر آباد، ترو پتی، پنجاب، الہ آباد، لکھنو، گورکھپور، پٹنہ، مظفر پور، ہزاری باغ، رانچی وغیرہ۔ مقامی حضرات کی مدد سے اساتذہ اردو کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ یہ جگہیں جلد سے جلد پُر ہوں۔ اسی طرح ریڈر اور لکچرر آسامیاں بھی بھری جائیں اور خلوص نیت کے ساتھ لائق اور باصلاحیت اساتذہ کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔ تاکہ تدریسی سطح پر اردو کو ایک نئی قوت حاصل ہو۔ وہ قوت جو علم و دانش کے مقدر کی محافظ ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن
ڈی۔ ۷، ماڈل ٹاؤن، دہلی

شجاع خاور اور "مصرعِ ثانی"

ایک جملے میں کہنا ہو تو شجاع خاور کی شاعری کو مانوس اجنبیتوں کی شاعری کہا جا سکتا ہے۔ ہر لفظ مانوس جانا پہچانا ہے مگر شجاع خاور کو کچھ ایسا گر یاد ہے کہ یہی مانوس جانے پہچانے لفظ انوکھے بانکے ترچھے اجنبی سے ہو جاتے ہیں اور ان میں طرفگی اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان مانوس اجنبیتوں کے سہارے شاعر نے ست رنگی دنیا سجائی ہے۔

غزل میں یہ کام جتنا دشوار ہے وہ کچھ کرن ہار ہی جانتے ہیں۔ ہر لفظ پر فرسودگی کی مہر، ہر طرز ادا پر کسی اور کا اجارہ، ہر انداز بیان اس زمین کی مانند جسے زمیندار پہلے ہی اٹھا چکے ہیں اور جس میں تردّد بے جالا حاصل ہے حتیٰ کہ محبوب کی ایک ایک ادا پر دوڈھائی سو سال سے بڑے بڑے قادر الکلام اور صاحبِ طرز شاعر زور کلام صرف کر چکے ہیں۔ ادھر دور حاضر میں تشبیہ و استعارے کے کلاسیکی دروبست سے بچ کر نکلے تو نئے شاعروں کی بر ملا گوئی بھی اب کچھ نئی نہیں رہی، اور کچھ کھردرے پن کچھ برجستگی میں بھی اب کچھ تازگی باقی نہیں رہی۔

ایسے میں سب سے بچ بچا کر اپنی نئی راہ نکال لینا بڑی جرات کی بات ہے جس میں محض ہنر مندی کو دخل نہیں، احساس کی طرفگی اور شخصیت کے بانکپن کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان کے کرارے پن کا بھی حصہ ہے۔

شجاع خاور کو پڑھتے وقت بار بار میر کی شیوہ بیانی کا دھیان آتا ہے وہ میر نہیں جو شام ہی سے بجھے سے رہتے تھے بلکہ وہ میر جو خود اپنے کو بھی "اور بستی نہیں یہ دلّی ہے" کی یاد دہانی کرا کے اپنے کو دونوں ہاتھوں سے دستار تھامنے کی صلاح دیتے تھے، شجاع خاور کی خود کلامی افسردگی اور اداسی کی نہیں کچھ طنز اور شوخی کی ہے اور گو اس کا تخاطب شاعر کی ذات سے ہے مگر اس کی زد میں اس کا پورا دور آ گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پرانی دلّی کی کسی پرانی حویلی میں موسم سرما کی شام پڑ رہی ہے، یاروں کا مجمع ہے، قہوے کا دور چل رہا ہے اور

زمانے سنسار کی بات نکل نکل ہے۔ یاروں کی شکلیں سب ایک جیسی ہیں اور یہ شخصیتیں شجاع خاور ہی کے کئی روپ ہیں۔ بیچ میں خود شاعر ہے جو کبھی اپنے پر کبھی دوسروں پر کبھی دور پر پھبتی کستا' طنز کرتا چلا جاتا ہے اور دور آسمان پر ستارے خاموشی سے اپنا سفر طے کر رہے ہیں، یہ چار یار نہ خود سے غافل ہیں' نہ آسمان سے' نہ ستاروں کی خاموش چال سے، مگر قلندری کی چادر اوڑھے، فرش پر پھسکڑا مارے بیٹھے ہیں اور بقول انشا کسی اور ہی دھن میں بیٹھے ہیں۔ یہ گفتگو کا لہجہ، یہ شیوہ بیانی، یہ تخاطب یہ دوستی کی گرمی یہ مشورے اور صلاح کا لہجہ، یہ زمانے کی اونچ نیچ سمجھنے کا انداز سبھی اسی مجلسی رفاقت کی جھلکیاں ہیں جو تنہائی سے ابھرتی ہیں اور اپنی شخصیت کو کئی شخصیتوں کے روپ میں ڈھال کر دیکھنے سے پیدا ہوتی ہیں:

منہ پر ہر ایک بات کو لاتا ہے کیوں شجاع
دو ایک باتیں دل میں بھی بندے خدا کے رکھ

O

گرمیوں میں اب کے ٹھنڈک ہے تو حیرت کس لیے
کس قدر گرمی تھی پچھلی سردیوں کی بات ہے

O

پرانے فن کے ماہر شہر میں پہلے ہی عنقا تھے
نئے فن کے بھی اب معقول کاریگر نہیں ملتے

O

آج بات خوشبو پر صاف صاف ہو جائے
اک طرف فقط وہ ہو اک طرف عدن سارا

O

ہر کس و ناکس کو زندہ کرنے والو
کیا مسیحائی کا دھندہ کر لیا ہے

O

یہ حقیقت بھی بڑی ظالم ہے بھائی
جرم خوابوں کا تھا، ہم کو دھر لیا ہے

O

ذرا سوچو تو تنہائی کا مطلب جان جاؤگے
اگرچہ دیکھنے میں کوئی بھی تنہا نہیں لگتا

اس محفل میں پہلی بات چلی رفاقت کی، باہمی رشتوں اور تعلقات کی کہ ہمارے دور نے سب سے پہلے انھیں کو درہم برہم کیا ہے۔ نہ کوئی کسی کی بات سمجھے نہ کوئی کسی کو پہچانے۔ مگر خاور نے یہ شکوہ بھی قربت کے احساس اور بڑی محبتوں کے ساتھ مجلسی لہجے میں کیا ہے:

زباں کوئی بھی سمجھا نہ استعاروں کی
اسی لیے تو میاں اور دل جلا میرا!

O

میں دوستوں کی عنایت کی بات کیا چھیڑوں
کہ دشمنوں سے ہوا کون سا بھلا میرا

O

بہت سے دوستوں کے چہرے گھر بیٹھے نظر آئے
بڑا اچھا رہا دشمن کے گھر کے سامنے رہنا

O

اوّل تو ہم اَب کہتے نہیں کچھ بھی کسی سے
اور ہم نے کہا بھی تو یہاں کون سنے گا

O

کچھ دوستوں کو پوچھتی پھرتی ہے پھر ہوا
کہہ دو شجاع چھوڑ چکے وہ تو کب کے ساتھ

O

گھر بھی محفل بھی بستی بھی
تنہائی کے نام بہت ہیں

O

ستارے چاند سورج آسماں سب خیریت سے ہیں
وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا، یہاں پر مر رہے ہیں لوگ

کبھی اظہار کی بے مائگی ایسی نہیں دیکھی
پریشاں گرچہ اس سے پہلے بھی اکثر رہے ہیں لوگ

o

کون آپ کی باتوں میں آئے گا شجاع صاحب
اشعار سے کیا دنیا بدلے گی، اماں چھوڑو

o

شجاع موت سے پہلے ضرور جی لینا
یہ کام بھول نہ جانا بڑا ضروری ہے

o

کہاں سے ابتدا کیجیے بڑی مشکل ہے درویشو
کہانی عمر بھر کی اور جلسہ رات بھر کا ہے

شعر کچھ زیادہ ہوگئے مگر ان سے شجاع خاور کے لہجے اور تیور دونوں کا اندازہ ہو جائے گا۔ کہانی واقعی عمر بھر کی ہے اور درویشوں کا جلسہ صرف رات بھر کا ہے مگر اس کہانی پر درویشوں کے اسی رات بھر کے جلسے کا لہجہ اور فضا مستولی ہے جس نے شجاع خاور کی شاعری کو بھی رنگ و آہنگ بخشا ہے اور تازگی عطا کی ہے۔

اس مجلسی لب و لہجہ میں مستی اور قلندری تو ہے ہی عشق و عاشقی کے رنگ ڈھنگ بھی ہیں، عشقیہ مضامین میں شجاع نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے شاید فراق گورکھپوری کے بعد وہ تنہا غزل گو شاعر ہیں جنھوں نے سیدھی سادی واردات کو کیفیت میں ڈھال دیا ہے، نہ روایتی محبوب کی جفا اور غمزۂ جاں ستاں کا ذکر، نہ وہ تڑپ اور اضطراب کا تذکرہ جو راتوں کی نیند حرام کر دے مگر ایک ایسی باوقار اور سنجیدہ دردمندی ضرور ہے جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے اور جس کا والہانہ پن دلوں کو چھوتا ہے:

حالانکہ اس کے بعد ملاقات بھی ہوئی
دل سے تری جدائی کا منظر نہیں گیا۔

o

دنیا کی بات چھوڑیے دنیا تو غیر تھی
تم نے بھی کچھ خیال ہمارا نہیں کیا

O

خیر اس کی بے نیازی تو تسلیم ہے مگر
اس کے بغیر میں بھی کوئی مر نہیں گیا

O

تمھارا ذکر تو دو چار دن سے نکلا ہے
مرے دماغ میں ہے انتشار برسوں سے

O

بات سب ترکِ تعلق کی کیا کرتے ہیں
سوچتا کوئی نہیں ہے کہ یہ ہوگا کیسے

اور وہ نازک لطیف سا شعر:

نہ آئے کوئی تو لگتا ہے جیسے وہ نہیں آیا
وہ آجاتا ہے تو انداز ہی اس کا نہیں لگتا

یہ ایک ایسے شخص کا عشق ہے جو عشق کی کیفیات کو زندگی کے سبھی کیفیات اور جہات سے ملا کر دیکھتا، برتتا اور جھیلتا ہے نہ اسے کابوس کی طرح سر پر سوار کرتا ہے نہ اسے محض عیش و نشاط بناتا ہے بلکہ شخصیت کی واردات کا حصہ سمجھ کر ذات میں اتارتا جاتا ہے:

ہم اپنے آپ میں ہی رہتے مست وہ تو یوں کہو
وجود کا سرا ترے خیال میں اٹک گیا

اسی مستی کا ایک رخ یہ بھی ہے

سامان میرا عرشِ بریں پر پڑا رہا
میں بد دماغ اور کہیں پر پڑا رہا

بلاشبہ شجاع خاور نے ذاتی مسئلوں میں آفاقی مسئلے بھی ملائے ہیں، زمانے کے پست

وبلند اور مصلحت پرستی سے دورِ حاضر میں اور خود اپنے ملک میں انسان کا قد جس طرح گھٹتا ہے اور جس طرح وہ حق پرستی کے بجائے ذاتی نفع نقصان کے چکر میں دل میں اٹھتے ہوئے طوفانوں کو لب پر مہر سکوت یا منافقانہ قصیدہ خوانیوں کے ذریعہ انگیز کرنے کا عادی ہوتا جارہا ہے اس پر بڑی طنز بھری چوٹیں شجاع خاور کے اشعار میں موجود ہیں مگر ایسی جیسے کوئی دوست جو خود بھی اس محفل میں شریک ہو، کسی ہم جلیس کی منافقت کی چوری پکڑ لے اور خاموشی سے چٹکی کاٹ لے:

اب یہ بھی قتل و خون کے بالکل خلاف ہیں
زندہ ہیں اپنے شہر کے جانباز، دیکھیے

O

کرتے رہتے ہیں سمندر کی قصیدہ خوانی
حشر میں خود کو بچائیں گے یہ دریا کیسے

O

کچھ شرم اب تجھے بھی تو آئے گی شاہِ وقت
لے ہم بھی آگئے ہیں تری بارگاہ میں

بعض جگہ اس طرزِ کلام نے بڑا لطف دیا ہے، اور شعر میں کچھ ایسی تہہ داری پیدا کر دی ہے کہ دیر تک سوچتے رہیے اور لطف لیتے رہیے حیات کے نئے نئے پہلو سامنے آتے رہیں گے:

دیکھیے تاثیر خالی زہر میں ہوتی نہیں
زندگی سو کھی ملا کر کھایئے گا زہر میں

O

فلسفے دھوپ ہیں، جلاتے ہیں
دل کو جذبوں کی چھاؤں میں رکھنا

O

کچھ نہیں ہوتا کتابوں پہ کتابیں لکھ دو
اگلے وقتوں میں تو دو لفظ اثر رکھتے تھے

O

ذرا دیکھو کہانی میں بھی یہ منظر نہیں ملتے
بڑا انبار ہے جسموں کا لیکن سر نہیں ملتے

O

سبھی طوفان کی زد پر ہیں جب اور صاف ہے نقشہ
تو پھر کیا دیکھنا یارو ہوا کا رخ کدھر کا ہے

اس عجیب و غریب معاشرے کے عجیب و غریب بدلے ہوئے تیوروں نے جیسے سبھی باتوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ جانے پہچانے راستے اور منزلیں بے معنی سی ہو گئی ہیں اور صحیح راستوں پر قدغنیں ہیں شاعر اسی الٹ پلٹ سے پریشان ہے کہ جن کے پاس تخیل ہے ان کی نظر کمزور ہے اور جن کی آنکھیں درست ہیں انھیں تخیل میسر نہیں ہے، اسی لیے وہ ان کا راستہ کچھ اس طرح تجویز کرتا ہے کہ:

وہ راستے ملیں جو منزلوں سے بھی عظیم ہوں
کبھی اٹھا کے دیکھیے تو ایک دو قدم غلط

O

امید کے سفر میں خیریت ہی خیریت ہے بس
اب اس سفر پہ روز کون جائے، میں تو تھک گیا

اسی بھٹکنے والی راست گفتاری کا نام ہے شجاع خاور کی غزل جو دو چار قدم دوسروں کے نزدیک غلط چل کر بھی منزلوں سے عظیم تر راستوں کی طرف گامزن ہے۔ اس سفر میں دو کام شجاع خاور کے جانے انجانے معرکے کے ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ موسموں کا اور زمین آسمان کا جو روپ اس شاعری میں ہے وہ خصوصیت سے توجہ کا طالب ہے اور موسم کے ایسے پیش پاافتادہ عناصر جیسے ہوا، سورج، پانی، چاندنی وغیرہ عجیب و غریب معنویتیں اختیار کر گئے ہیں۔ صرف لہجے اور فضا ہی کی نہیں نت نئی علامتوں کی حیثیت سے بھی یہ جانے پہچانے الفاظ انوکھے ہو گئے ہیں، مانوس سے اجنبی مگر دل نواز اجنبی جنھیں ابھی دریافت کرنا باقی ہے اور جن کی شخصیت کا ہر گوشہ ابھی تک ہماری واقفیت کی گرفت میں نہیں آیا ہے، ثبوت کے لیے پانی، سورج، ہوا، پتھر ردیف والی غزلیں دیکھ ڈالیے یا پھر ان اشعار کو سامنے رکھیے جن میں ہوا کا تذکرہ ہے اور کس کس زاویے سے ہے:

یہ تیز چلتی ہوئی ہوائیں یہ برف باری
پھر آج برباد کر دی یادوں نے شام ساری

O

موسم بدل جاتے ہیں خود ہی خود شجاع
بس بیٹھے بیٹھے رخ ہوا کا دیکھیے

O

باقی موسم منہ چھپائے پھر رہے ہیں
پڑ رہا ہے خوب بے ہنگام پانی

اب یہاں 'ہوا' اور 'پانی' کی علامتوں میں کیسی کیسی بسیط حقیقتیں لپٹی ہوئی ہیں ان کا بیان تحصیل لاحاصل ہے۔ وہ صرف مذاق سلیم کے سوچنے اور محسوس کرنے والی کیفیات کی نشان دہی کے لیے ہیں۔

آسمان بلکہ آسمان سے اوپر عرش تک سے بھی شجاع خاور کا رشتہ کچھ اسی طرز کا ہے کہ زندگی پوری کائنات پر مستولی نظر آتی ہے اور اس کے دروبست کا کچھ حصہ حضرت انسان کی خام کاریوں کی بھی نذر ہوا ہے۔ اس کے روپ بہتیرے ہیں اور نت نئے ہیں مثلاً ایک تو وہی زمین اور اس کی وہ سرگرمیاں ہیں جنھیں ورڈزورتھ نے The world is too much with us کہہ کے مطعون کیا تھا۔ شجاع خاور نے بڑے مزے میں کہا ہے:

زمیں اب چاندنی سے مجھ کو ملنے ہی نہیں دیتی
میں ہر شب جاگتا رہتا ہوں، پر موقع نہیں لگتا

دوسری جہت اس کی وہ ہے جسے اقبال نے "کارِ جہاں دراز ہے" سے تعبیر کیا تھا:

فلک پر روز کوئی کام پڑ جاتا ہے دنیا کا
جبھی تو رات کو ہم اپنے بستر پہ نہیں ملتے

O

سامان میرا عرشِ بریں پر پڑا رہا
میں بد دماغ اور کہیں پر پڑا رہا

عرش سے معاملت نئے طرز کی ہے اور شجاع خاور کے فکر و احساس کے کینوس کی

وسعت کا پتہ دیتی ہے جس میں انسان محض ایک معاشرے کی چوحدی میں سکڑا ہوا فرد نہیں ہے بلکہ پورے کائناتی نظام کا ایک پرزہ (مہرہ یا اوزار) ہے اور وہ اپنے طور پر ہی سہی کائنات کی آرائش وزیبائش یا شکست وریخت میں مبتلا ہے، نتیجہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔

آخر میں شجاع خاور کی اس کاوش کا ذکر ضروری ہے کہ اردو غزل کو اس انداز بیان نے اکثر بیساکھیوں سے نجات دلائی ہے۔ پڑھنے والے نئے ہوں یا پرانے، رجعت پسند، ترقی پسند ہوں جدیدیے، ان کو یہ ضرور احساس ہوگا کہ یہ شاعری کلیشے سے آزاد شاعری ہے نہ تو اس میں پیلا ریت، نیلا چاند قسم کی مہملات ہیں نہ تشبیہہ واستعارے کی مدد سے منظر آفرینی اور کیفیت آفرینی کی کوششیں ہیں۔ نہ اس میں نئے پرانے کرتبوں سے قاری کو متاثر اور مرعوب کرنے کی خلش ہے بلکہ ایک خاص قسم کی راست گفتاری ہے، کھلے ڈلے پن سے اور صاف صاف سیدھے سادے ڈھنگ سے ہم جلیسی اور ہمنشینی کے طرز سے باتیں کہی گئی ہیں اور یہ شیوہ گفتار دامن دل کو کھینچتا ہے۔

غزل میں سہل ممتنع کی شاعری کو اعلا ترین سطح کی شاعری سمجھا جاتا رہا ہے اور سہل ممتنع کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ اس کی نثر نہ ہو سکے اور شعر میں نثر کا سا بلکہ بول چال کا سا دروبست قائم رہے، یہ ایسی خصوصیت ہے جو شجاع خاور کے کلام میں موجود ہے، اردو غزل روایتی انداز بیان ہی کا نہیں روایتی لفظیات کا بھی شکار رہی ہے۔ نئے برملا اور راست باز لفظوں کو جوں کا توں قبول کرنا غزل کے لیے خاصا مشکل مرحلہ رہا ہے، کھڑکی کو اردو غزل میں کھپانا مشکل ہے اسے دریچہ کہنا ضروری ہے۔ یہاں شجاع خاور نے اسے بولی ٹھولی کی مٹھاس نرمی اور برجستگی دینے کی کوشش کی ہے، 'چارپائی' اور 'بان' جیسے لفظ خوبی سے کھپ گئے ہیں۔

مگر اصل کارنامہ یہ ہے کہ اکثر اشعار تشبیہ واستعارے کی بیساکھی کے بغیر کھڑے ہیں اور اس کے باوصف دلوں میں کھبے جاتے ہیں، ان میں نہ فلسفے کی گرمی نہ سستے عشق کا نشہ نہ جسم وجسمانیات، مگر احساسات کی رنگارنگی اور طرز کلام کی شیوہ بیانی دل جیتے لیتی ہے اور یہ اردو غزل کے لیے بھی فال نیک ہے اور شجاع خاور کے لیے بھی۔

اتنا سب کچھ لکھ لینے کے بعد شجاع خاور کی شاعری پر ایک بار پھر نظر ڈالتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ اس کی شعری کیفیت اب بھی گرفت میں نہیں آئی۔ ابھی کئی رنگینیاں ایسی ہیں جو اس شاعری کے پیرہن سے پھوٹی پڑتی ہیں مگر شاید ان کیفیات کو گرفت میں لانا پوری طرح ممکن بھی نہیں اور ممکن ہو بھی تو پڑھنے والوں کو خود اپنے کو ملبس اور خود اپنے رابن سن کروسو ہونے کی مسرت سے محروم کرنا بھی تو بے انصافی ہے۔

انوار رضوی
10-C/A 28 کالکاجی
نئی دہلی۱۹

غالب کے تین شعر

مرزا غالب کا متداول دیوان (اردو) ان کی زندگی میں ہی شائع ہو گیا تھا۔ یہ حقیقت بھی معلوم تھی کہ انھوں نے اپنے دوستوں اور مداحوں کے اصرار پر ابتدائی کلام کا ایک بڑا حصہ رد کر دیا تھا۔ ان کے انتقال کے پچاس برس بعد ریاست بھوپال کی لائبریری میں دیوان غالب کا وہ قلمی نسخہ بھی بمعہ ترمیمہ دریافت ہوا جس پر محققین متفق ہوئے کہ یہی وہ سالم دیوان ہے جس کا دو تہائی حصہ رد کر دیا گیا تھا اور بقیہ ایک تہائی بعض ترمیمات کے ساتھ متداول دیوان کا حصہ بنا۔ اس کو عبدالرحمٰن بجنوری کے مبسوط و عالمانہ مقدمہ کے ساتھ مفتی انوار الحق کی تدوین کے ساتھ نسخۂ حمیدیہ کے عنوان سے شائع کر دیا گیا۔ یہ تمام اردو ادب کی تاریخ کا حصہ ہے۔

یہاں محض ان تین اشعار کے متعلق عرض کرنا مقصود ہے کہ جو یادگار غالب میں تو ہیں مگر مرزا غالب کے متداول دیوان میں نہیں ہیں اور نسخہ حمیدیہ میں بھی ان کا اندراج نہیں ہے۔

یادگار غالب (مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۹۷ء اڈیشن) میں مولانا الطاف حسین حالی رقم طراز ہیں:

"ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہ اور امیر خسروؒ کی خصوصیت کا ذکر دربار (بہادر شاہ ظفر) میں ہو رہا تھا۔ مرزا (غالب) نے اسی وقت یہ شعر انشا کر کے پڑھا:

ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب
نظام الدینؒ کو خسروؒ، سراج الدین کو غالب

(صفحہ ۸۸)

یہ شعر متداول دیوان میں نہیں ہے اور نہ ہی اس زمین میں کوئی غزل بشمول اس شعر

کے نسخہ حمیدیہ میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ محفل گرمانے کے لیے فی البدیہہ یہ شعر ضرور کہا گیا مگر بعد میں اس پر غزل نہیں کہی گئی۔ بہر حال اس شعر کو دیوان میں شامل نہیں کیا گیا۔ حالانکہ متداول دیوان غالب میں ۷ افردیات ہیں۔ ان فردیات کی کیفیت یہ ہے کہ بہ استثنا ایک دو کے 'بقیہ کی غزلیں نسخہ حمیدیہ میں موجود ہیں یعنی پوری غزل میں سے محض ایک شعر ہی انتخاب میں آیا۔

یہ شعر دیوان میں کیوں نہیں آیا، یہ بھی پے چیدہ نہیں ہے۔ غالب، سراج الدین بہادر شاہ سے کبھی زیادہ خوش نہیں رہے اور بادشاہ سے تعلق کو محض پیٹ پالنے کا ذریعہ جانتے تھے۔ دوسری جانب بہادر شاہ سے تعلق انگریز حکمرانوں میں بدگمانی کا باعث تھا جس کا خطرہ وہ کسی قیمت پر مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ تیسرے نظام الدینؒ اور خسروؒ میں جو روحانی اور جذباتی تعلق تھا وہ ظفر اور غالب میں قطعی مفقود تھا۔ شعر بھی اکہرا اور بیانیہ ہے۔ دیوان میں شامل نہیں تو کچھ حرج نہیں ہے۔

دوسرے شعر کی کیفیت میں مولانا حالی لکھتے ہیں:

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر (مرزا غالب کے) وردِ زبان رہتا تھا:

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

(یادگار غالب، مکتبہ جامعہ اڈیشن، ۱۹۹۷، صفحہ ۱۱۲)

مرزا غالب کی زندگی کا آخری زمانہ حد درجہ علالت اور اذیت میں گزرا اور وہ موت کی آرزو بھی شدت سے کرتے تھے۔ وفات سے چند دن بیشتر ہی شعر موزوں کیا تھا جس کو بار بار پڑھتے رہتے تھے۔ اس شعر سے ان کی راسخ العقیدگی کا بھی نشان ملتا ہے۔ وقتِ آخر میں وہ یقیناً راضی برضائے الٰہی تھے۔ اس شعر کو ان کے متداول دیوان میں شامل کر دینا چاہیے۔

مذکورہ بالا دو اشعار کے علاوہ ایک اور شعر بھی ہے جس کی کیفیت مولانا حالی نے قدرے تفصیل سے بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں

" بعض اسلوب بیان خاص مرزا (غالب) کے مخترعات میں سے تھے، جو نہ ان سے پہلے اردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں۔ مثلاً ان کے موجودہ اردو دیوان میں ایک شعر ہے:

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے۔ فرمایا کہ "اے" کی جگہ "بجز" پڑھو۔ معنی خود سمجھ میں آجائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفسِ عنصری سے زیادہ نہیں، ان کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف ان کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے "اے" کا لفظ استعمال کیا ہے، ظاہرا یہ انھیں کی اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سن کر کہا کہ "اگر اے کی جگہ جز کا لفظ رکھ دیتے، یا دوسرا مصرع اس طرح کہتے: اے نالہ! نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے تو مطلب صاف ہو جاتا۔ اس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے مگر مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے بمقدور بچتے تھے، اور شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے وہ بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہو جائے، اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرزِ خیال اور طرزِ بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے۔

(یادگار غالب، مکتبہ جامعہ دہلی ۷۹ء، صفحہ ۱۲۸)

یہ شعر غالب کے منفرد اسلوب کا نمایندہ شعر ہے۔ حالی نے ان کے اسلوب کی انفرادیت ذہن نشین کرانے کو اس کو بطور خاص منتخب کیا ہے۔ پھر بھی متداول دیوان سے یہ غائب ہو گیا۔ قیاس کہتا ہے کہ سہوِ کتابت سے یہ بعد کے اڈیشن میں چھوٹ گیا اور پھر نقل در نقل میں یہ شامل نہیں کیا گیا۔ متداول دیوان میں جہاں ۷ افردیات ہیں، اس کا بھی اضافہ کرلینا چاہیے۔ دیوان غالب کے بعض اڈیشنوں میں متداول کے ساتھ ضمیمہ کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں نسخہ حمیدیہ کے چندہ اشعار دے دیے جاتے ہیں کم از کم اس ضمیمہ میں ہی اس کو شامل کرلینا چاہیے، ایک دلکش اضافہ ہو گا۔

انیس احمد چشتی
۱۹۷، گنج پیٹھ، پونہ

غالب کی شاعری میں طنز و مزاح

غالب کی تعریف میں ایک بہت حسین جملہ ایک مزاح نگار کے قلم سے نکلا ہے۔ اس جملے میں غالب ہیرو ہے، باقی دو اجزا سین اور مکالمے کا کام دیتے ہیں۔ مزاح نگار کا نام ہے رشید احمد صدیقی اور جملہ ہے، "مغلوں نے ہندستان کو تین چیزیں دی ہیں، تاج محل، اردو اور غالب"۔

تاج، اردو اور غالب کو ہم تک پہنچنے کے لیے صدیوں کے تھپیڑے سہنے پڑے، قطرے کو گوہر بننے کے لیے یہ سب کچھ سہنا پڑتا ہے۔ اس لیے یہ محض تین استعارے نہیں، بھارت کی گنگا جمنی تہذیبی روایت کا طویل سفر ہے جو مرمر کے کنول، لفظوں کے تاج محل، اور غالب کی غزل کے روپ میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

"تہذیبی روایات" کی اصطلاح کو ادا کرنا بہت آسان ہے۔ دراصل اس عمل میں شیشے کو پگھلا کر ساغر میں انڈیلنا پڑتا ہے اور ماہِ رمضان میں اپنے کوٹھے پر شیطان کو قید کرنے کی نوبت آتی ہے۔

غالب، بادشاہ کے وظیفہ خوار، استاد، مداح اور مصاحب ہیں، لیکن رعب داب کا یہ عالم ہے کہ قلعۂ معلیٰ میں حاضری کے وقت نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے کی تاب نہیں۔ کوئی پوچھتا تو یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ قلعے کی دیواروں کا رنگ کیسا ہے۔ مومن خان مومنؔ دیوان خانہ ادب و احترام کے مارے بجائے خود ایک دربارِ شاہی سے کم نہیں۔ اس زمانے میں شاعروں نے کارٹون بنانے کا فن نہیں سیکھا تھا اور تحریر و تقریر کی آزادی کے مسودے پر ابھی آزاد انسانوں کے دستخط ثبت نہیں ہوئے تھے، ایسے ماحول میں غالب نے شاعری میں طنز و مزاح کے ذریعے تپتی ریت پر برف جمانے کا کارنامہ انجام دیا ہے:

گرم فریاد رکھا، شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

جس دور میں غالب نے زندگی جی ہے اور جس طرح غدر مچا ہے، اور جس طرح یوسف مرزا مرا ہے اور جس طرح فاقہ مست غالب پھانسی کے پھندے سے لطیفہ سنا کر چھوٹ آئے ہیں، ایسے دور میں دو ہی کام ہو سکتے تھے۔ یا تو غالب شاعری کرتے یا پھر مرثیوں کے دفاتر کی جلد بندی کا اہتمام کرنا پڑتا۔

طنز "کرنا" بہت آسان ہے لیکن طنز "کہنا" بہت مشکل ہے۔ اس میں لہو رونا پڑتا ہے اور مقدور نہ ہونے پر بھی نوحہ گر کو ساتھ رکھنا پڑتا ہے۔ طنز کرنے میں وسعتِ امکاں سمٹ کر ایک مٹھی میں بند ہو جاتا ہے اور کبھی کبھار یہ مٹھی ایک گھونسے کا کام بھی کرتی ہے، لیکن طنز "کہنے" میں شاعر کو تمنا کا دوسرا قدم اٹھانے سے پہلے ایک "نقشِ پا" کی طرح سمٹ کر شرافت، عزت، اقدار، معاشرت اور اپنی معاشیات کا پوری طرح جائزہ لے کر پینترا اڈالنا پڑتا ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ جسے وہ سب کچھ کہنا چاہتے ہیں اس سے وہ کچھ نہیں کہتے۔ مثلاً غالب شناسوں کا متفقہ فتوا ہے کہ:

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

غالب کے اس تیرِ نیم کش کی خلش کسی سے پوچھنا چاہو تو استاد ابراہیم ذوق کے دل سے پوچھو۔

مزاح کے معاملے میں لوگوں کا ذوق صرف عجیب ہی نہیں بلکہ غریب بھی ہے۔ لوگ لطیفوں کو مزاح سمجھ بیٹھے ہیں اور جب تک ہنستے ہنستے ان کے پیٹ کا کس بل نہ نکل جائے اور آنکھوں سے آنسو نہ چھلک پڑیں لوگ مزاح کو مزاح ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ اب غالب کا دیوان "اودھ کے پنچ" اور "سرکس کے جوکر" جیسی کوئی چیز تو نہیں کہ ہر لمحے دھما چوکڑی مچی رہے۔ غالب کی شاعری میں مزاح ایک ہوک کی طرح اندر ہی اندر اٹھتا ہے اور طنز بن کر ٹپکتا ہے:

حال آنکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

یہی وجہ ہے کہ غالب کے طنز کو مزاح سے الگ کرنا گوشت کو ناخن سے جدا کرنے

کے برابر ہے۔ غالب میں جس بادشاہ کے درودیوار تک دیکھنے کی تاب نہ تھی اسی بادشاہ کے لیے کہتے ہیں:

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا   وہ دن گئے جو کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

غالب نے دربار سے سیم کے بیج، آم کی بہنگی، بیسن کی روغنی روٹی، خلعت اور تنخواہ سے لے کر تو دال تک ہدیے میں پائی تھی۔ "ارمغانِ دال" کا ہدیہ تشکر ملاحظہ فرمائیں

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال   ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال   ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

بادشاہ سلامت نے مسہل (جلاب) لیا ہوا ہے۔ نتیجہ غالب کا ٹیوشن بند چار مصرعے سنیے اور سر دُھنیے:

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل، تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے؟

غالب اپنے آپ کو شاہ کا خانہ زاد یعنی غلام، مرید اور مداح سمجھتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اب نوکر بھی ہو گئے ہیں۔ یعنی اب "نسبتیں ہو گئیں مشخص چار" لیکن تنخواہ کا دستور کیا ہے دیکھیے:

میری تنخواہ جو مقرر ہے   اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک   خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات   اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

پتہ ہے اس کا نتیجہ کیا ہوا:

بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض   اور رہتی ہے سود کی تکرار!
میری تنخواہ میں تہائی کا   ہو گیا ہے شریک ساہوکار

اس سود کے نتیجے میں غالب کی غربت اور بڑھی، وہ کپڑوں سے محتاج ہو گئے لیکن

بات کا لطف دیکھیے:

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی وَقِنا رَبَّنَا عذاب النّار

غالب جب کسی کو "تو" کہنا چاہتے ہیں تو اسے "آپ" کہہ کر مار ڈالتے ہیں۔ یہاں بادشاہ سے مخاطب ہیں۔

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد! قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
میری تنخواہ کیجیے ماہ بہ ماہ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

غالب کی اس بے باکی اور سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا۔ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔ غالب زخموں کی مرہم پٹی کے آداب سے بھی خوب واقف ہیں۔ کہتے ہیں:

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام شاعری سے نہیں مجھے سروکار

اور اس کے فوراً بعد غالب کا وہ شہرۂ آفاق دعائیہ شعر ہے جو اب ضرب المثل بن چکا ہے:

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

غالب کے طنز و مزاح کا تیر سہ رخی (Three Dimensional) ہے۔ وہ اپنی ذات، خدائی صفات اور سماجی آفات پر وار کرتے ہیں۔ کبھی وہ خود اپنے آپ سے باہر آکر سماج کا جز بن جاتے ہیں۔ ان کا محبوب تو "قابل گردن زدنی سماج" کا فرد ہے ہی پھر یہ کہ غالب پورے سماج کو کب بخشنے والے تھے۔ اشعار سنیے اور طنز و مزاح کا لطف اٹھائیے:

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

لے تو لوں سوتے میں اس کے پانو کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

غالب کے اردو دیوان میں ایک غزل ہے جس کی ردیف ہے "پانو"۔ یہ غزل مرصع ہی نہیں بلکہ طنز و مزاح کا حسین مرقع ہے: چند عام فہم اشعار سنیے:

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے، کھینچ کے باہر لگن کے پانو
بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہ زن کے پانو
اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پانو

غالب کے اشعار میں ایک مستقل داستان یا کہانی ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ یہ کہانی خود اپنے آپ میں مزاح کا سامان رکھتی ہے۔ مثلاً غالب کا ایک شعر ہے:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

مطلب یہ کہ شاعر محبوب سے ملنے روز اس کے مکان کے چکر لگاتا ہے۔ باپ کو خبر ہو جاتی ہے۔ وہ خود ۲۴ گھنٹے لڑکی کی نگرانی کرنے سے رہا۔ اس نے بنگلے کے دروازے پر

ایچ مین مقرر کر دیا اور اس کے ایک ہاتھ میں غالب کی تصویر اور دوسرے میں ڈنڈا تھما دیا
کہ "دیکھو یہی ہے وہ رومیو۔ گھر میں سب آئیں، لیکن یہ نہ آنے پائے"۔ غالب کو پتہ چل
گیا۔ وہ فقیر کا بھیس بنا کر عین پھاٹک کے سامنے تماشائے اہل کرم دیکھنے آن موجود
ہوئے۔ ممکن ہے بولی لگانے والے مرشدوں کی طرح دھرنا ہی دیا ہو۔ دیوار پھلانگنے کی
بھی تاک میں رہے ہوں لیکن چوکیدار ہے کہ ٹلتا ہی نہیں۔ انتظار کی حد ہو گئی۔ غالب نے
آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ رشوت کے طور پر یا پاسبان کو رجھانے کے لیے انھوں نے قریب پہنچ کر
س کے چرن چھو لیے۔ ظاہر ہے چوکیدار، فقیر کی اس اضطراری حرکت پر ہڑبڑا گیا۔ جب
ذرا سنبھلا تو دیکھا کہ ارے! یہی تو وہ اشتہاری مجرم ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ غالب کے کتنے
پرزے اڑے ہوں گے، بیان سے باہر ہے۔ غالب کا کلام ایسے لا تعداد اشعار سے مزین
ہے۔ ایک ہی غزل کے صرف تین اشعار سنیے، ان میں کہانی بھی ہے اور مزاح بھی جو بالآخر
طنز پر مختتم ہوتا ہے:

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

مزاح سے بھرپور ایک اور شعر سنیے:

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

ایک سن رسیدہ جریدے کے جواں سال مراسلہ نگار نے غالب کے بہت مشہور
شعر

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

کے مطلب کو سمجھانے کی کوشش کی تھی جیسا کہ اربابِ حل و عقد اب تک اس شعر کے

حق میں کرتے آئے ہیں کہ اس شعر میں اگر متکلم فاعل ہے تو وہ غالب ہے اور مخاطب مفعول ہے اور ظاہر ہے کہ وہ مجنوں ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سر کس کا یاد آیا؟ متکلم فاعل کا یا مخاطب مفعول کا؟ اس شعر کا زمانہ کیا ہے؟ سنگ کس کے لڑکپن میں اٹھایا گیا تھا؟ آیا مجنوں کے یا غالب کے؟ کہیں یہ لڑکپن لاابالی پن کے معنوں میں تو نہیں لیا جارہا ہے؟ تشریح کے لیے اتنی بڑی مصیبت میں پڑنے کی بجائے مراسلہ نگار نے لکھا تھا کہ، "جب مجنوں لڑکا تھا تبھی سے وہ جنونِ عشق کے پھندے میں گرفتار تھا اور گلی کے لڑکے اکثر اسے پتھر مارا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ غالب نے بھی اسے تنہا پا کر مارنے کے لیے پتھر اٹھایا ہی تھا کہ اچانک سامنے سے "سریاد" آگیا۔ "سریاد" دراصل مجنوں کے باپ کا نام تھا۔ غالب کی نظر جیسے ہی سریاد پر پڑی انھوں نے مجنوں پر پتھر بازی کا ارادہ ملتوی کر دیا اور پتلی گلی پکڑ کر اپنی راہ لی۔ پہلے زمانے میں 'فرہاد' یا "شہزاد" کے وزن پر "سریاد" بھی نام ہوا کرتا تھا۔"

تیس سال پہلے غالب صدی تقریبات کا ایک سہ روزہ جشن ہم نے بھی بڑے بڑوں کے شریک کار کی حیثیت سے منایا تھا۔ سارے شہر میں کپڑے کے بڑے بڑے بینر لگائے گئے تھے۔ معمول کے مطابق جشن کے اختتام تک اکثر بینر یا تو ہواؤں یا شب رووں (چوروں) کی نذر ہو گئے تھے۔ اب ہم کہاں داغ دل کی طرح ان کے نقش قدم کا سراغ لگاتے۔ دو تین بینر ادارے کے احاطے میں لگے رہ گئے جو بارش کے پانی سے کچھ ایسے دھوئے گئے تھے کہ بس پاک ہو گئے۔ ایک دن ایک غریب چپراسی نے نہایت ہی رازدارانہ انداز میں ہم سے پوچھا، "سر! اگر اجازت ہو تو لٹکے ہوئے یہ چیتھڑے اپنے گھر لیتا جاؤں"؟ ہم سمجھے یہ شاید غالب کو ولی سمجھ بیٹھا ہے اور تبرک کے طور پر انھیں اپنے گھر لے جانا چاہتا ہے۔ ڈپٹ کر پوچھا، "کیا کرو گے"؟ اس نے نہایت لجاجت سے جواب دیا۔ "سر! ان میں میری ایک دو بچیوں کی یونیفارم نکل آئیں گی"۔ مجھے ایک دھچکا سا لگا اور بے ساختہ میری زبان پر غالب کا یہ شعر جاری ہو گیا۔ چپراسی کیا خاک سمجھتا۔ آپ کی نذر کرتا ہوں:

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

جمال اُویسی
شعبۂ اردو ملت کالج
در بھنگہ ۸۴۶۰۰۴

مابعد جدیدیت

(ردِّ تعمیریت کے حوالے سے)

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں (محمد تقی میر)

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں (مرزا غالب)

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی (ڈاکٹر محمد اقبال)

یہ دور ردِّ تعمیریت (DECONSTRUCTION) کا ہے۔ پرانی اور بوسیدہ عمارتوں کو ڈھادو۔ کمزور دیواروں کو گرادو۔ پھر انہی اینٹوں اور پتھروں کی نئے گارے، گلابے، اور مسالے کی مدد سے نئی تعمیر کی جائے۔ ہر زمانہ میں DECONSTRUCTION موجود رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حالی، سرسید اور اقبال پیدا نہ ہوتے۔ تنقید میں پروفیسر آل احمد سرور، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر محمد حسن اور پروفیسر گوپی چند نارنگ پیدا نہ ہوتے۔ سوال یہ ہے کہ اب اردو میں ردِّ تعمیریت کو کس طرز پر برتا جائے، کیونکہ موجودہ صورت حال میں یہ ایک خطرناک چیز ہے۔ مجھے بلا جھجک کہنا چاہیے کہ تمام ادبی روایات کو پلٹ دیا جائے اور ادبی بساط کو الٹ دیا جائے۔ جن تصورات پر ادب کی بنیادیں استوار ہیں انھیں ختم کر کے نئے تصورات پیدا کیے جائیں۔ سب کچھ ختم ہو سکتا ہے مگر ادب کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ ادب کی شریانوں

میں ہر زمانہ میں نیا خون دوڑایا جاتا ہے۔ تو طے ہونا چاہیے کہ آج کے ادب کے لیے یا مابعد جدیدیت کے لیے قربانی کون دے گا، بلکہ کون نہیں دے گا، اور نہیں دے گا تو کیوں نہیں دے گا؟ تب تو قربانی نہیں دینے والے کا قتل واجب ہے۔ رد تعمیریت ہمیں یہی سکھاتی ہے۔

ان دنوں اردو میں مابعد جدیدیت کا غلغلہ بلند ہے۔ کہنا چاہئے کہ مابعد جدیدیت ابھی یہاں محض ایک صورت حال کے بطور ابھری ہے۔ ابھی اس کی قلعہ بندی نہیں کی گئی ہے۔ ابھی اس کے دائرۂ عمل سے سب کچھ باہر ہے۔ مابعد جدیدیت کو حقیقت میں جو ہونا چاہیے نہیں ہے اور نہ اس کے پوری طرح نموپذیر ہونے کا بہت امکان ہی مجھے نظر آتا ہے۔ ہاں کچھ کچھ نظری گفتگو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی ہے اور ایک مستقل کتاب بھی تھیوری سے متعلق لکھ چکے ہیں جس میں مابعد جدیدیت سے کچھ بحث ہے، مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ مابعد جدیدیت کا سوال ہنوز حل طلب ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ کسی بھی ادب کی تعریف تبھی متعین ہوتی ہے جب اس کے تخلیق کار اس میں حصہ لیتے ہیں اور جب ادیبوں کی تخلیقات ادب کے کسی خاص مفہوم کی نشان دہی کرنے لگتی ہیں، جیسا کہ ہمارے پیش رووں نے جدیدیت اور ترقی پسند ادب کی نشان دہی کی، لیکن کیا ہمارے یہاں صحیح معنی میں جدیدیت اور ترقی پسند ادب پیدا ہوئے؟ یا ان پچھلوں کے یہاں بھی ان کا ادب محض ایک صورت حال بن کر رہ گیا؟ کلیم الدین احمد نے جدید شاعری پر بحث کرتے ہوئے بہت صحیح سوال اٹھایا تھا کہ اردو کا کون سا جدید شاعر ایسا ہے جس نے تنہائی، مایوسی، علاحدگی وغیرہ کو داخلی طور پر محسوس کر کے اعلا تخلیق پیش کی ہو۔ ان کے نزدیک اردو ادب میں جدیدیت خام تھی ورنہ جدید شاعر آرنلڈ کی نظم DOVER BEACH کی طرح کوئی شاہکار نظم لکھ کر دیتا۔ آرنلڈ کی نظم Dover Beach میں تنہائی یا محزونی کے احساس کو جس طرح لہروں، لہروں کے تھپیڑوں، سنسناتی ہوئی ہواؤں، ایستادہ چٹانوں اور رات کے گہرے پن کے ذریعہ متشکل کیا گیا تھا، اردو کے کس شاعر نے اتنی مربوط اور مکمل جدید نظم لکھ کر دی، بس ایک فیض کی نظم "تنہائی" کا حوالہ دیا جاتا ہے جو میری نظر میں اتنی پاور فل نہیں جتنی Dover Beach ہے۔ فیض کی "تنہائی" سے زیادہ موثر نظم میراجی کی نظم "تنہائی" ہے یا پھر اختر الایمان کی نظم "محبت" میں تنہائی اور سونے پن کا احساس کتنا شدید ہو گیا ہے، نظم کی لفظیات اور ساخت پر توجہ دیں تو پتہ چلے گا۔

میں کہہ رہا تھا کہ اردو میں مابعد جدیدیت ایک صورت حال کے بطور ابھری ہے اور نارنگ صاحب نے مابعد جدیدیت کی شناخت تھیوری اور اس کے ڈسکورس کے حوالے سے کی ہے، مگر ہمارے تخلیق کار حضرات مابعد جدیدیت کی آگہی سے کافی فاصلہ پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے ذہنی تحفظات اور تکلفات اب تک قائم ہیں۔ وہ حد درجہ روایتی ہیں۔ جی ہاں وہ فن کار بھی جنھوں نے جدیدیت کے خاتمہ یعنی ۸۰۔۱۹۷۸ کے بعد لکھنا شروع کیا۔ اگر ۸۰ کے بعد لکھنے والے سارے مابعد جدید

ادیب ہیں تو کہنا چاہیے کہ مابعد جدید کوئی نہیں۔ کیونکہ ان کی تخلیق میں ایسی کوئی چنچالی عنصر نہیں جو روایات پر حملہ کرتی ہو یا اسے Deconstruct کرتی ہو۔ مابعد جدید غزل پوری طرح مابعد جدید نہیں ہے کیونکہ اس نے جدید غزل سے خود کو آزاد نہیں کیا ہے۔ یہاں بھی عشق، جنون، صحرا، بسمل، محمل، لیلیٰ، فرہاد، شیریں، خسرو، کربلا، کوفہ، تیشہ، صراحی، جام، طشت، فلک، زمین، سمندر وغیرہ کے لفظی معنی وہی ہیں جو جدید غزل کے تھے۔ مابعد جدید غزل کے لیے ضروری تھا کہ ان کے معنی کو الٹ دیا جاتا۔ نئے تصورات پیدا کیے جاتے اور مابعد جدید غزل کے لیے نئی عقبی زمین تیار کی جاتی، مگر ایسا کچھ نہیں ہو سکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ردِ تعمیریت کی طرف قدم کون بڑھائے گا؟ میں نے اپنی شاعری کے ذریعہ یہ قدم بڑھا دیا ہے۔ یقین نہ ہو تو ثبوت کے لیے میری یہ نظم ملاحظہ فرمائیں۔

"خانقاہوں میں پناہ لینے والے دوستوں کے نام ایک نظم"

مری رات میں
مری عظمتوں کے نشان ہیں
مری ظلمتوں میں عجیب لذت آگہی کے پیام ہیں
تری خانقاہ میں روشنی کی برات ہے
تری رات نور کی رات ہے
تہہ آسماں مری آگہی کا مغز نہ دیکھ سکے گا تو
یہ رات اس کی امین ہے
تری آنکھیں روشنی کھا کے
دل کی تمام شمعیں بجھا گئیں
تجھے اک غلام بنا گئیں
تری خانقاہ نے تجھ کو اندھا بنا دیا
تجھے روشنی کا فریب ہے!

میں ایک شاعر کو جانتا ہوں جو مزاج سے نئے نئے دکھتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ نئی بات کہیں اور نئی بات کہنے کے چکر میں ان کی پول کھل جاتی ہے۔ وہ ادب میں مابعد جدیدیت کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ نوآبادیاتی ذہن سے چھٹکارا حاصل کیا جائے اور مشرقیت میں پناہ لی جائے لیکن حقیقت میں ان کی مشرقیت پوری مشرقیت بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مشرقیت سے پوری طرح آگاہ بھی نہیں ہیں۔ وہ خانقاہی مزاج رکھتے ہیں اور کبھی کبھی مابعد جدید بننے کے چکر میں اس مزاج سے انحراف بھی کر سکتے ہیں۔ شاید انھیں علم نہیں کہ مابعد جدیدیت کے عالمی تصور میں کسی بھی

ازم، خانقاہیت یا رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ صرف مغربیت سے نو آبادیاتی ذہنیت سے نجات حاصل کر لینے کو مابعد جدیدیت نہیں کہیں گے کیونکہ ایسا کرنے سے ہم ایک بڑی انسانی روایت سے نہ صرف محروم ہو جائیں گے بلکہ خود کو بھی پہچاننا مشکل ہو جائے گا۔ مابعد جدیدیت صحیح معنوں میں ردِ تعمیریت (Deconstruction) سے عبارت ہے۔ یہ مشرقیت کا بھی رد ہے اور مغربیت کا بھی۔ بلکہ یہ اس ڈکٹیٹر مزاج کا رد ہے جس نے ہر زمانہ میں انسانوں کو گروہوں، نسلوں اور قوموں میں تقسیم کیا۔ ردِ تعمیریت کلیسائی نظام فکر کا رد ہے تو اسلامی نظام فکر سے بھی انکار کرتی ہے۔ ردِ تعمیریت کا اعلا منصب اعلا انسانی اقدار کی بازیافت ہے۔ ان قدروں کی تلاش ہے جن کے ذریعہ انسان اپنے آپ میں عظیم ہوتا ہے اور اس کی صحیح شناخت ہوتی ہے۔ اب تک انسان کی شناخت The Other سے کی گئی۔ اس کو محکوم کیا گیا۔ بادشاہت کی روایت نے مذہبیات کو فروغ دیا۔ مذاہب نے انسانوں کا استحصال کیا۔ زبانوں کے ذریعہ انسان مختلف قوموں اور تہذیبوں میں تقسیم ہوا۔ تاریخ کے جبر نے انسان کو پلٹ پلٹ کر ماضی کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا لیکن اب دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہو چکی ہے۔ ایک ایسے انسانی سماج کی تشکیل عالمی پیمانہ پر ہو چکی ہے جس کی ہر ضرورت یکساں ہے اور یکساں سطح پر ہے۔ کیونکہ اب صلاحیتوں کا زمانہ آگیا ہے۔ نئے علوم کی چھاپہ ماری نے دماغوں کو منطقی اور استدلالی خطوط پر ڈال دیا ہے اس لیے ممکن نہیں کہ تاریخ اور تہذیب کے جبر کو دہرایا جا سکے۔

نظم لکھتے وقت ایک مرتبہ میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ میں ویسا لکھنا کیوں چاہتا ہوں جیسا اقبال اور راشد نے نہیں لکھا۔ میں اقبال کی "شکوہ" و "جواب شکوہ"، "خضر راہ"، "لینن" جیسی نظمیں لکھنا نہیں چاہتا اور نہ ہی "سلیماں سر بہ زانو اور سبا ویراں۔ سبا آسیب کا مسکن" جیسی نظم لکھنا چاہتا ہوں، تو کیا لکھنا چاہتا ہوں۔ میرے ذہن کے لاشعور میں یہ بات پنہاں تھی کہ تمام عمارتوں کا انہدام ضروری ہے کیونکہ یہ عمارتیں ہمارے کسی کام کی نہیں۔ تبھی ایک لفظ ذہن کے پردہ پر ابھر کر آیا DECONSTRUCTION، اس لفظ میں تمام معنویت پنہاں تھی۔ تب میں نے ردِ تعمیریت سے بھرپور ابتدائی خد و خال لیے ایک مختصر سی نظم "زوال زوال" لکھی۔

میری آنکھوں میں طلسمات زوال

دیکھتا ہوں میں افق کے اس پار

زندگی اب بھی ذرا خود کو سنبھال

اور جب ردِ تعمیریت کی میرے اندر توسیع ہوئی تو "زوال امکاں" اور "میں یعنی بس میں" جیسی نظمیں ظہور میں آئیں۔ کیا مابعد جدید ادبی صورت حال میں ایسی غزل بھی ملتی ہے جس میں ایسے

اشعار کہے گئے ہوں۔

گل ہوئیں شمعیں دیارِ شب کی　　بجھ گئیں آنکھیں ہماری کب کی
ہم نے سب نام مٹا ڈالے ہیں　　دوستو خیر مناؤ رب کی
آسماں تاروں کا ماتم کر لے　　روشنی گل ہوئی ہر کوکب کی

میں تیرے خرابہ کا نگہباں نہیں ہوتا　　جو میرے لیے ایسا گلستاں نہیں ہوتا
آواز میری لوٹ کے آتی ہے مجھی تک　　یہ شہر میرا کاش بیاباں نہیں ہوتا

تری خانقاہ میں گم شعور ہوا مرا　　میری دسترس سے خدا ہی دور ہوا مرا
مرے ہوش گم ہیں ترے سوال پہ کیا کہوں　　مجھے خود پتہ نہیں کیوں ظہور ہوا مرا
نہیں لامکان ومکاں سے کوئی غرض مجھے　　کوئی بات ایسی ہے دل غیور ہوا مرا

جینے کے واسطے پیدا ہو غرور　　ورنہ یہ رسم اٹھا دی جائے
بھول کر ساری حکایات قدیم　　اک نئی داستاں لکھی جائے

اگر ان اشعار کی کیفیات کی تہہ تک پہنچا جائے تو عین ممکن ہے بوسیدہ عمارتیں متزلزل ہوتی ہوئی نظر آئیں۔ غزل کی عقبی زمین دکھائی دے جائے مگر ابھی ان باتوں کو کافی پھیلانے کی ضرورت ہے۔ مابعدِ جدید غزل کو نئی شعریات کی ضرورت ہے۔ میں نے اپنے پچھلے دو مضامین میں نئی شعریات کی طرف واضح اشارے کیے ہیں لیکن پہلے شعریات سازی کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ابھی ایسی تخلیقات کے سیلاب کی ضرورت ہے جو ہر سطح پر ہماری فرسودہ روایات، تصورات، رسومیات کی عمارات کو اپنی آغوش میں بہا کر لے جائے۔ اس مختصر مضمون میں تصورات کو پلٹنے کی پہل بھی نہیں کر سکتا کیونکہ بات بہت تفصیل طلب ہے۔ بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ہم روزمرہ زندگی میں جن عادات وخصائل کے غلام ہیں انہیں ترک کرنے کی ضرروت ہے۔ ضرورت نئی طرح سے اٹھنے، بیٹھنے، سوچنے، سمجھنے، سمجھانے، پڑھانے، معاملہ کرنے کی ہے۔ ہماری زبان میں ایک لامتناہی سلسلہ رسومیات کا ہے جو ہر موقع اور ہر حالت میں کام آتی ہے۔ محاوروں کی طویل راہداریاں ہیں۔ ان سب کو گرا دو کہ یہ مابعد جدیدیت کی راہ میں حائل ہیں۔ ردِ تعمیریت کے بعد ایک نئی تعمیر کا کام ضروری ہے، انسانی اقدار کی بازیافت ضروری ہے کیونکہ یہ باتیں انسان کی آزادی سے عبارت ہیں۔ نئی روایت کی بنیاد اس شعر سے بھی پڑ سکتی ہے۔

سجدہ کرتے ہیں روایت کے غلام
دل جھکا ہے تو جبیں کچھ بھی نہیں

شاکر رامپوری
اے ۱۰/۶ اپارک سائٹ وکرولی بمبئی ۷۹

شہید وطن --- ٹیپو سلطان

(۱)

زورِ پرواز لکھوں عشق کی تاثیر لکھوں
محرمِ راز لکھوں شوکتِ تدبیر لکھوں
شعلہ تند لکھوں برق کی تنویر لکھوں
مردِ میدان لکھوں فتح کی جاگیر لکھوں
شیر میسور لکھوں دیش کی تقدیر لکھوں
غیرتِ ہند لکھوں جوہر شمشیر لکھوں

(۲)

بات آسان لکھوں یا ذرا گمبھیر لکھوں
دانشِ قوم لکھوں نسخہ اکسیر لکھوں
روحِ پیغام لکھوں نعرۂ تکبیر لکھوں
محسنِ ملک لکھوں عظمتِ دلگیر لکھوں
شیر میسور لکھوں دیش کی تقدیر لکھوں
غیرتِ ہند لکھوں جوہر شمشیر لکھوں

(۳)

نقش تاریخ لکھوں وقت کی تحریر لکھوں
انجمِ وقت لکھوں دشمن تقصیر لکھوں
جیت کو ہار لکھوں ہار کو توقیر لکھوں
سطوتِ ہند لکھوں عزم اساطیر لکھوں
شیر میسور لکھوں دیش کی تقدیر لکھوں
غیرتِ ہند لکھوں جوہر شمشیر لکھوں

(۴)

ملّتِ ہند لکھوں رشتہ زنجیر لکھوں
حوصلہ ساز لکھوں عزم کی توقیر لکھوں
رونقِ بزم لکھوں تیغ وسناں تیر لکھوں
رہبرِ ملک لکھوں تاج سر میر لکھوں
شیر میسور لکھوں دیش کی تقدیر لکھوں
غیرتِ ہند لکھوں جوہر شمشیر لکھوں

(۵)

طوطیٔ ہند لکھوں زلف گرہ گیر لکھوں
زیب محراب لکھوں یا دہن شیر لکھوں
جذب ایثار لکھوں دشمن بے پیر لکھوں
شان تکریم لکھوں اوج ہمہ گیر لکھوں
شیر میسور لکھوں دیش کی تقدیر لکھوں
غیرتِ ہند لکھوں جوہر شمشیر لکھوں

(۶)

حکم مختار لکھوں نالۂ شبیر لکھوں
قول خود دار لکھوں جبر کی تعذیر لکھوں
یادِ اسلاف لکھوں سنت شبیر لکھوں
حق کی آواز لکھوں ظلم کی تسخیر لکھوں
شیر میسور لکھوں دیش کی تقدیر لکھوں
غیرتِ ہند لکھوں جوہر شمشیر لکھوں

ڈاکٹر شہپر رسول
شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

غزلیں

تیری آہٹ پہ ترا نام و نشاں بھی کیا ہو
ان فریبوں میں حقیقت کا گماں بھی کیا ہو
اشک آئیں تو نظاروں کی تپش سے جھلسیں
ایسے موسم میں کوئی گریہ کناں بھی کیا ہو
سب کی تریف کہاں کرتے ہیں دنیا والے
اس کے ہونٹوں سے مری بات بیاں بھی کیا ہو
میں تو جھونکا ہوں فضاؤں میں غلط فہمی کا
کوئی خوشبو مری جانب نگراں بھی کیا ہو
کچھ سسکتی ہوئی شامیں بھی، جھلستے دن بھی
جب وہاں کچھ بھی نہیں ہے تو یہاں بھی کیا ہو
کون رہتا ہے تغافل کے خرابے میں سدا
ایسے ویران جزیرے میں مکاں بھی کیا ہو

کہاں کوئی جو زباں بھی، جگر بھی رکھتا ہو
پھر اپنے ہاتھ بھی، گردن بھی، سر بھی رکھتا ہو
خموش ہونٹ بھی، عرضِ ہنر بھی رکھتا ہو
تغیرات پہ گہری نظر بھی رکھتا ہو
کبھی تو ہجر محور میں قید ہو جائے
کبھی وصال کا لمبا سفر بھی رکھتا ہو
کئی امیدیں بجھاتا ہو ایک جنبش میں
کئی چراغ سر رہگزر بھی رکھتا ہو
لہو میں پلتی ہوں آزادیاں بھی اس کے مگر
قفس میں خوش بھی ہو اور بال و پر بھی رکھتا ہو
وہی جو شام ڈھلے بے گھری سے جڑتا ہے
کہیں خیال کے گوشے میں گھر بھی رکھتا ہو
سفر کا شوق بھی رکھتا ہو، اپنے سینے میں
عذاب ہم سفری سے مفر بھی رکھتا ہو

عبدالاحد ساز

عندلیب گلشن نا آفریدہ......!

(غالب کی نذر)

مضموں۔ کہ جن کو دیکھ نہ پاتی تھی چشم فہم
آئینۂ سخن میں ہوئے اس کے جلوہ گر
وہ پیکرانِ راز، جو تھے دست رس سے دور
اس نے سجا دیے سر بت خانۂ ہنر

پیرایہ ہائے "بادۂ و ساغر" میں اس نے کی
اس ڈھنگ سے "مشاہدہ حق" کی گفتگو
روئے غزل پہ دانش و بینش کا نور ہے
نفسِ غزل میں جذبہ و احساس کی نمو

لفظوں کے پیچ، بندش و اوقاف کی گرہ
بین السطور میں کئی عقدہ کشائیاں
ترسیل میں لطافتِ اظہار کا عمل
تشکیک سے یقیں کی نبرد آزمائیاں

طرزِ بیاں! شگفتہ و دلکش، جمیل و شوخ
نایاب استعارے، اچھوتی علامتیں
اشعار کے طلسمِ دروبست میں اسیر
اک صد جہت جہانِ معانی کی وسعتیں

منزل شناسِ بے خودی و کوچہ گردِ ہوش
رسوائے بزمِ یار، وہ سودائی سخن
وحشت کو اس کے نوکِ قلم پر تھا ارتکاز
خوش ربطی تضاد وتنوع ہے اس کا فن

شاعر وہ اپنے عصر کا، فردا کا نکتہ داں
اسرار آشنا تھا، مفاہیم دیدہ تھا
تھا گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
وہ "عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ تھا"

ظفر محیبی
شاستری نگر، موتیہاری، بہار

غزل

چھلکے ہے تیری آنکھ سے یوں بادۂ شباب
کھنکے غزل میں جیسے کوئی نغمۂ رباب

ہے کون جس کے دم سے ہے بوجھل شبِ وصال
آنچل میں تیرا چہرہ کہ بدلی میں ماہتاب

سوئے شفق نگاہ بھلا کوئی کیوں کرے
رنگِ حیا سے ہیں ترے عارض بھی آفتاب

مانا کہ میں ہی تنہا خطاوارِ عشق ہوں
فرطِ حیا سے آپ کا چہرہ ہے کیوں گلاب

تو سامنے رہے تو کروں مئے کی بات کیوں
آنکھوں کو مل رہی ہے تری آنکھ کی شراب

گم ہو گیا زمانے سے یوں جذبۂ خلوص
میری کتابِ زیست سے جیسے خوشی کا باب

انسان ہے ظفر نہ بہک جائے یہ کہیں
آیا کرو نہ خوابوں میں تم اس کے بے حجاب

فصیح اللہ نقیب
لکچرر، کے،ایم،اصغر حسین کالج، آکولہ

غزل

حضور مل کے آپ سے میں آج مسکرا دیا
تبسم آپ کا جو اک ادھار تھا چکا دیا

بجا! کہ سرکشی غلط، قبول انکسار بھی
مگر یہ کیا کہ ہر کسی کے آگے سر جھکا دیا

میں تلخیوں میں جی گیا، میں تلخیوں کو پی گیا
مگر کسی نے پیار سے صدا جو دی رُلا دیا

نہ ڈر مرے ضمیر میں، نہ شر مرے ضمیر میں
تمام ظالموں کے نام میں نے خط کھلا دیا

ترا نہیں وہ کل جو تھا ترا نہیں وہ کل جو ہے
یہ آج ایک پل جو ہے اگر اسے گنوا دیا

جو ہم زباں نہ مل سکا تو پھر غزل نقیب کیا
کہ جیسے اندھے آدمی کے ہاتھ آئینہ دیا

سلیم انصاری
۵۵۹۔ موتی نالہ، جبل پور

یہ وقت کیا ہے

یہ وقت کیا ہے
کہ اپنے معمول سے گریزاں ہر ایک شے ہے
ہر ایک لمحہ
گذشتہ لمحات کی نفی ہے
عجب وہم و یقیں کا امتزاج سوچوں میں گھل گیا ہے
جو خواب دیکھو
تو زندگی پر یقین آئے
دیے بجھا دو تو
روشنی پر یقین آئے
سراب۔ دریا ہے
اور ریگ رواں۔ سمندر
بدن پہ زخموں کا جال ہے
جگنوؤں سے لکھی ہوئی عبارت
یقین وہم و گمان کی حد
شکستگی۔ امتحان کی حد
یہ وقت کیا ہے؟
کہ اپنے معمول سے گریزاں ہر ایک شے ہے

شمیم انجم وارثی
ماڈل ڈانگہ روڈ۔ گارولیا۔ ۲۴ پرگنہ (شمالی)

غزل

رگ رگ میں لہو بن کے اتر کیوں نہیں جاتے
سیلاب کی مانند گزر کیوں نہیں جاتے
ہر روز ہی جاتے ہو مگر کیوں نہیں جاتے
احباب کا اصرار ہے گھر کیوں نہیں جاتے
کچھ لوگ ابھی جہدِ تعاقب میں ہیں مصروف
منزل ہے ابھی دور ٹھہر کیوں نہیں جاتے
بیٹھا ہے سر راہ کوئی آنکھ بچھائے
اس راہ سے اک بار گزر کیوں نہیں جاتے
اے چاند! میرے بچوں کے اصرار پہ اک دن
آنگن میں کسی شام اتر کیوں نہیں جاتے
جب کوئی بھی صورت نہیں تکمیلِ وفا کی
یکبارگی وعدے سے مکر کیوں نہیں جاتے
پھولوں سے اگر دادِ وفا کی ہے تمنا
جس راہ میں کانٹے ہیں ادھر کیوں نہیں جاتے

اظہر الہادی امروہوی
۴۷ا۔ گلی ۳، مولا نگر
شاہدرہ، دہلی۔ ۹۴

غزل

دور آتے ہیں دور جاتے ہیں
وقت رکتا ہے کب کسی کے لیے!
درد، رنج و الم سبھی آئے
کتنے مخلص ہیں زندگی کے لیے
اب تو جینا ہی بس ضرورت ہے
کون جیتا ہے اب کسی کے لیے
یوں جو ویران بستیاں ہوں گی
موت روئے گی زندگی کے لیے
مصلحت نے دکھائیں زنجیریں
حق نہ کہہ پائے ہم کسی کے لیے
جسم کے سر پہ خواب کا لاشہ
کیسی مشکل ہے آدمی کے لیے
کتنے ہی خواب خاک میں سوئے
موت چادر ہے بیکسی کے لیے

جعفر ساہنی
۲۶۔ زکریا اسٹریٹ۔ کلکتہ۔ ۷۳

جگنو

بڑا سفاک موسم ہے
ستارے، چاند، سورج
آسماں سے ٹوٹ آئے ہیں
زمیں میں منہ چھپائے ہیں
جہاں میں کالی راتوں کا
بڑا ہی بول بالا ہے
نہ کوئی پو ہی پھٹتی ہے
نہ ہی مہتابی ہالہ ہے
ہوا کے دوش پر اونچا
اندھیرے کا شوالا ہے
چلو چل کر
کوئی جگنو
شوالے کے دریچے میں
سجا آئیں
بہت ممکن نہیں لیکن
ذرا کچھ ہم تو کر آئیں!

عبدالرحیم نشتر
ساوتری مادھیامک ودیا مندر
امیٹ ضلع رائے گڑھ

غزل

نیند ٹوٹی نہیں ابھی میری
ہے وہی خواب دیدنی میری

کہیں لے جائے اب یہ سیلِ رواں
نہ کنارا ہے نہ ندی میری

پھول پتوں کو تکتا رہتا ہوں
ہے کوئی شاخِ سبز بھی میری

بھر گیا ہے غبار آنکھوں میں
کون دیکھے بھلا چھبی میری

زرد سورج چھپائے بیٹھا ہوں
اب یہی شامِ بےحسی میری

صاف وشفاف بن کے نکلا تھا
جامہ زیبی کہاں رہی میری

اپنی مٹی اڑائے جاتا ہوں
تان ٹوٹی نہیں ابھی میری

پروفیسر حفیظ بنارسی
مٹی محلہ آرہ

غزل

سرتا بقدم نازو ادا اوڑھے ہوئے ہے
ہر شخص یہاں اپنی انا اوڑھے ہوئے ہے

اے درد کے مارو کسی دھوکے میں نہ آنا
قاتل بھی مسیحا کی قبا اوڑھے ہوئے ہے

غنچہ دہنو گل بدنو! خیر تمھاری
موسم بڑی زہریلی ہوا اوڑھے ہوئے ہے

اس شخص کے سینے میں ذرا جھانک کے دیکھو
خوشیوں کی جو گلرنگ ردا اوڑھے ہوئے ہے

ہے چاندنی اس کے لیے راہوں کی کڑی دھوپ
وہ مادرِ مشفق کی دعا اوڑھے ہوئے ہے

سب کے لیے پیغام ہے کچھ اس کی ادا میں
سب کے لیے کچھ موجِ صبا اوڑھے ہوئے ہے

اپنا نہیں مہتاب کا یہ پیکر نوری
مہتاب تو مانگے کی ضیا اوڑھے ہوئے ہے

مسعود احمد برکاتی

[illegible]

حکیم محمد سعید مجسم عمل تھے

[illegible]

حکیم صاحب چلے گئے!

ان کی موت بھی ان کی زندگی کا ثبوت ہے۔ کیا اتنا زندہ 'اتنا متحرک 'اتنا اولوالعزم 'اتنا جاندار 'اتنا دلیر 'اتنا پر محبت انسان بھی کسی مردہ شخص سے مات کھا سکتا ہے؟ کوئی زندہ شخص موت کا سوداگر نہیں ہو سکتا۔ کیا کوئی زندہ قوم یہ گوارا کر سکتی ہے کہ وہ اپنے محسن تک ظالموں' جاہلوں اور قاتلوں کے ہاتھ پہنچنے دے؟ نہیں' ہر گز نہیں۔ کسی زندہ معاشرے میں جابر سے جابر کی بھی یہ ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی سعید روح کی طرف میلی نگاہ سے بھی دیکھ سکے کیونکہ زندہ معاشرہ حیات بخش ہوتا ہے' حیات کش نہیں۔ زندہ معاشرہ خیر پسند ہوتا ہے، خیر خواہ کش نہیں۔ زندہ معاشرہ احسان مند ہوتا ہے، محسن کش نہیں۔ زندہ معاشرہ محافظ شرافت ہوتا ہے 'شریف کش نہیں تو پھر حکیم صاحب کی زندگی کس نے چھین لی؟ جواب دینے کی ضرورت نہیں' اپنے گریبان میں منہ ڈالوں تو مجھے معلوم ہو جائے گا کہ میں جس معاشرے کا فرد ہوں وہی معاشرہ اس کا ذمہ دار ہے۔ اسی معاشرے کو حکیم صاحب جھنجھوڑ رہے تھے۔

جدوجہد تو وہ نوجوانی سے ہی کر رہے تھے' ۴۷ سال سے میں گواہ ہوں کہ وہ زندگی کی ہر دلچسپی سے بڑھ کر کام سے دلچسپی رکھتے تھے۔ کام کا مطلب ان کے ذہن میں صرف تعمیر و تہذیب تھا' صرف ترقی تھا' صرف بلندی تھا' علم کی' اخلاق کی' صحت کی ترقی اور بلندی اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ ان کے اعضا پر تو عمر کا اثر محسوس ہوتا تھا' لیکن قوتِ کار پر بالکل نہیں بلکہ قوتِ کار تو بڑھ ہی رہی تھی۔ جو بے شمار کام اور منصوبے انھوں نے شروع کر رکھے تھے' جو ادارے وہ قائم کر چکے تھے، ان کو حکیم صاحب نے کبھی منزل نہیں سمجھا۔ ان کا دماغ ہمہ وقت

جاگتا رہتا تھا' وہ صحیح معنی میں بیدار مغز تھے۔ میرے خیال میں بیدار مغز صرف وہ نہیں ہوتا جس کا دماغ سوچتا رہے بلکہ وہ بھی ہوتا ہے جو اپنے دماغ کے دروازے بند نہ کرے' اپنے حواس کو بیدار رکھے اور ہر اچھی بات کو چن لے' ہر معمولی سے معمولی آدمی میں جوہر تلاش کرتا رہے' ہر نئے خیال کو قبول کرنے پر آمادہ رہے۔ حکیم محمد سعید جس انسان کا نام ہے وہ اسی معنی میں بیدار مغز تھا۔ حکیم صاحب ہر نئے مفید اور نتیجہ بخش کام کو شروع کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ کسی نئی تجویز کو قبول کرنے میں دیر نہیں کرتے تھے اور عمل کے تو دھنی تھے ہی۔ واقعی حکیم صاحب مجسم عمل تھے۔ بے عمل آدمی سے تو ان کی بنتی ہی نہیں تھی۔ کبھی کبھی میں ان کے کسی نئے ارادے سے اختلاف کرتا تو کہتے: "پارٹنر تم تو ڈرپوک ہو، فکر نہ کرو، دیکھنا کتنا مزہ آئے گا۔" یہ حکیم صاحب کا پیار سے بولنے کا مخصوص انداز تھا۔

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو پایندہ ایم

حکیم صاحب تخلیق مقاصد کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ نئی نئی باتیں سوچنا' نئے نئے میدان تلاش کرنا' نئے نئے دائرے ڈھونڈنا' ان کی زندگی تھی۔ ان کو زندہ رہنے کے لیے ایک نشہ درکار تھا۔ مصروف رہنے اور تگ و دو کرنے اور ہر منصوبے کو کامیاب کرنے کا نشہ۔ یہ نشہ ان کی رگ و پے میں اترا ہوا تھا۔ اپنے عمل سے' اپنے استقلال سے وہ اس نشے کو اترنے نہیں دیتے تھے۔ استقلال بھی کس غضب کا استقلال تھا! جو کام شروع کر دیا' اب اس کو چھوڑنا تو بڑی چیز ہے اس میں ڈھیل دینا بھی ممکن نہ تھا۔ شاید ۱۹۶۵ء میں علمی ادبی محفلوں کی بنا ڈالی۔ اپنے گھر پر ایک شام ایک ماہر کے ساتھ' ایک شام ایک عالم کے ساتھ' ایک شام ایک سائنس دان کے ساتھ منانے لگے۔ پھر کراچی سے نکل کر یہ شامیں لاہور تک جا پہنچیں اور ان کا نام "شامِ ہمدرد" ہو گیا۔ یہ نام جسٹس ایس اے رحمان نے تجویز کیا تھا۔ ہم اب جانتے ہیں کہ اب برسوں سے کراچی اور لاہور کے علاوہ پنڈی اور پشاور میں بھی شام ہائے ہمدرد ہوتی ہیں اور بلاناغہ ہر مہینے ہوتی ہیں۔ اس میں حکیم صاحب خود بہ نفس نفیس شریک ہوتے تھے۔ موضوع اور مقرر کا تعارف کراتے تھے۔

پھر ۱۹۸۵ء میں بزم ہمدرد نونہال شروع کی جو اب ہمدرد نونہال اسمبلی میں بدل گئی ہے۔ استقلال کی یہ بھی ایک مثال ہے کہ یہ اسمبلی بھی باقاعدگی سے چاروں شہروں میں ہو رہی ہے اور اس میں بھی وہ ہمیشہ شریک ہوتے تھے۔ بچوں کی تربیت کا یہ ایک ایسا فورم ہے جس میں بچوں کے پوشیدہ جوہروں کو اجاگر ہونے کا موقع ملتا ہے۔ پابندیِ وقت کی مثالیں ہم

نے کتابوں میں پڑھی ہیں' لیکن واقعی پابندی دیکھی تو حکیم صاحب کے مزاج میں۔ یہ اس حد تک تھی کہ حکیم صاحب کو کسی جگہ وقت سے پہلے پہنچنا بھی گوارا نہیں تھا۔ راہ کی رکاوٹوں کا لحاظ کر کے وقت میں تھوڑی سی گنجایش رکھ کر گھر سے نکلتے تھے' اگر اتفاقاً چند منٹ پہلے منزل پر پہنچنے کا امکان ہوتا تو ڈرائیور سے کہتے کہ ذرا چکر دے کر چلو تاکہ وقت سے پہلے نہ پہنچیں۔ نظم او قات (Time Management) کے بادشاہ تھے۔ کوئی لمحہ ضائع ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اگر کسی موقع پر سواری میں چند منٹ انتظار کے گزارنے پڑتے تو اس میں بھی لکھنا شروع کر دیتے۔ ایک چھوٹی سی نوٹ بک ہر وقت جیب میں رہتی۔ جو بات ذہن میں آتی اسے ایک جملے میں اشارہ لکھ لیتے۔ چھوٹا سا پیڈ بھی گاڑی میں رہتا تھا' اس میں رفقائے کار کو ہدایات لکھنی شروع کر دیتے۔

۱۹۵۳ء میں بچوں کے لیے رسالہ ہمدرد نونہال نکالنا شروع کیا۔ کیا مجال کہ ایک مہینہ بھی ناغہ ہو جائے۔ آج ۴۶ سال ہو گئے' ہمدرد نونہال باقاعدگی اور پابندی سے نکلتا ہے اور اب اس کو تیسری نسل پڑھ رہی ہے۔ بچوں کے لیے صحت مند لٹریچر کی فراہمی کا یہ سلسلہ حکیم صاحب کی بچوں سے محبت کا ریکارڈ ہے۔ جن لوگوں نے بچپن میں یہ رسالہ پڑھا تھا وہ آج قومی زندگی کے مختلف میدانوں میں سرگرم کار ہیں۔ بچوں کی خدمت کا ایک اور پہلو نکال لیا۔ ایک شعبہ قائم کیا۔ نونہال ادب اس کا نام رکھا اور نونہالوں کے لیے مفید' معیاری' دلچسپ اور معلوماتی لٹریچر کی تیاری و اشاعت اس کے سپرد ہوئی لیکن کوئی کام کسی کے سپرد کر کے اس سے لاتعلق نہیں ہو جاتے تھے۔ اچھے کارکنوں اور رفقا سے ان کو اطمینان تو ہوتا تھا' لیکن وہ خود کو علاحدہ نہیں کرتے تھے۔ ذہناً و عملاً شریک رہتے تھے۔ نونہال ادب کے لیے خود بھی کتابیں لکھنے میں پیش پیش تھے۔ ۳۸ سفر نامے تو بچوں کے لیے خود لکھ ڈالے۔ جس ملک میں جاتے، واپس آتے تو سفر نامہ یا کم سے کم اس کے نوٹس ساتھ ہوتے اور اب کچھ عرصے سے نوجوان ادب لکھ رہے تھے۔ اس زمرے میں بھی شاید دس کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ غرض بچوں کے لیے حکیم صاحب کی تصانیف سو سے اوپر ہو چکی ہیں۔

سفر میں بھی پابندیِ وقت بہت مشکل ہوتی ہے۔ ہزاروں ایسی رکاوٹیں پیش آجاتی ہیں کہ جن کا پہلے اندازہ نہیں ہوتا، لیکن حکیم صاحب وقت پر سفر میں بھی حاوی رہتے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں پیرس میں یونیسکو کوریئر کے اڈیٹروں کی میٹنگ تھی۔ ہم یونیسکو کے صدر دفتر سے قریب ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ پیدل کا راستہ تھا۔ صبح ۹ بجے میٹنگ میں پہنچنا تھا۔ پونے نو بجے حکیم صاحب تیار ہو کر نیچے لاؤنج میں پہنچ گئے۔ میں بھی کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ نیچے

سے حکیم صاحب نے فون کیا "دیر ہو گئی ہے" میں شرمندہ ہوتا ہوا لپکا۔ وہ چل پڑے تھے۔ قدم بڑھا کر میں نے ان کو جا لیا۔ فکرمندی سے بولے کہ ہم لیٹ نہ ہو جائیں، لیکن الحمد للہ ہم وقت پر پہنچ گئے۔ یہ اور بات کہ خود چیف اڈیٹر صاحب تاخیر سے پہنچے۔ یونیسکو کوریئر کا اردو اڈیشن "پیامی" کے نام سے حکیم صاحب نے بڑی کوشش کے بعد یونیسکو سے اور حکومت پاکستان سے منظور کرلیا تھا۔ فروری ۱۹۷۷ء سے پیامی کی اشاعت کا آغاز ہوا اور مسلسل پابندی سے ۱۴ سال تک یہ عالمی علمی خالص علمی رسالہ حکیم صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ مجھے اس میں بھی معاونت کا شرف حاصل تھا۔ ۱۴ سال تک حکومت نے تعلیم، سائنس اور ثقافت پر اس بین اقوامی مجلے کو برداشت کیا، پھر اس کی "دانش پروری" اس کو برداشت نہ ہو سکی اور اس نے ہمدرد فاؤنڈیشن سے اس کی ادارت و اشاعت کی اجازت واپس لے کر ایک دوسرے ادارے کو دے دی جو اسے ایک سال بھی نہ کھینچ سکا اور اردو کی ثروت میں اضافے کا یہ ذریعہ دم توڑ گیا۔ اس رسالے کے ۳۱ اڈیشن دنیا کے مختلف ملکوں سے نکلتے تھے۔ ۱۴واں اڈیشن اردو پیامی کے نام سے حکیم صاحب نے نکالا تھا۔ اس کے تمام مضامین ترجمہ ہوتے تھے۔ اس کام کے لیے مترجمین کی ایک اچھی ٹیم تیار کرلی گئی تھی۔ حکیم صاحب اس سے بہت خوش تھے۔ ان کا مقصد کاموں میں لوگوں کو شریک کرنا اور ان کو کام پر لگانا بھی ہوتا تھا۔

وہ ادبا، شعرا اور صحافیوں سے دلی تعلق رکھتے تھے۔ ان سے تعاون کو اولیت دیتے تھے۔ جو ادیب یا شاعر حکیم صاحب سے ایک بار مل لیتا تھا وہ ان کو اپنا دوست سمجھتا تھا اور حکیم صاحب واقعی دوستی کا ثبوت دیتے تھے۔ حکیم صاحب کی شخصیت بڑی پہلودار شخصیت تھی۔ مختلف شعبوں میں ان کے کاموں کے احاطے کے لیے بڑا وقت چاہیے۔ انھوں نے ہمدرد طبیہ کالج ۱۹۵۸ء میں قائم کیا اور مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح سے اس کا افتتاح کرایا۔ آج اس کالج کے فارغ التحصیل ہزاروں حکما طب اور مریضوں کے خدمت گزار ہیں۔ ہمدرد پبلک اسکول، بیت الحکمت اور ہمدرد یونیورسٹی کے تحت کئی شعبے حکیم محمد سعید کے خوابوں کی تعبیر ہیں۔ جو خیر پسند، صحت مند اور تعلیم آراستہ معاشرہ وہ تعمیر کرنا چاہتے تھے وہ بن جائے تو سمجھو کہ حکیم محمد سعید زندہ ہیں۔ وہ انشاءاللہ قائم ہوگا اور حکیم صاحب دلوں میں زندہ رہیں گے۔

حکیم صاحب نفیِ ذات کے بھی مبلغ تھے۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی آدمی اس وقت تک کوئی اجتماعی کام بلکہ کوئی اہم کام نہیں کر سکتا جب تک وہ ذات کی نفی نہ کرے۔ اپنی ذات کے نقطۂ نظر سے نہ سوچے، بلکہ دوسروں کے فائدوں کو اپنا مفاد سمجھے اور اسی طرح جد و جہد کرے۔ حکیم صاحب نے اپنی زندگی میں بڑی حد تک اس پر خود عمل بھی کیا اور شہید ہو کر تو مکمل نفیِ ذات ہی کر ڈالی۔

ڈاکٹر خاور ہاشمی

حکیم محمد سعید دہلوی... شخصیت اور فکر

اس بات پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے کہ دنیا میں محدود اور معاندانہ قومیت کے منفی تصور نے علم و حکمت کو بھی خود ساز جغرافیائی حدود میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان میں حکیم محمد سعید کی شہادت پر وہ شدید اور عظیم رد عمل نہ ہوا جو پاکستان میں ہوا۔۔۔ حکیم محمد سعید کے چاہنے والوں کی ہندستان میں بھی کمی نہیں ہے خاص طور پر ان کے برادر محترم حکیم عبدالحمید صاحب کے تعلق سے صاحبان علم و فن ان سے بخوبی آشنا ہیں۔ تاہم ہندستانیوں کو حکیم محمد سعید صاحب کو قریب سے دیکھنے، ان کے فکر و عمل کو سمجھنے کے مواقع نہیں ملے۔ ان کا مرکز عمل پاکستان تھا۔ ہندستان اور پاکستان دو عظیم ملکوں کے عام باشندوں کو باہمی روابط اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت کی آزادی آج تک نصیب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکیم محمد سعید صاحب ہندستان میں اتنے ہی اجنبی رہے جتنا کہ ان کے برادر بزرگ حکیم عبدالحمید صاحب پاکستان میں اجنبی ہیں۔ ان دونوں عظیم بھائیوں کے تاریخ ساز کارناموں کو وطنیت میں محدود کر دیا گیا۔

علم، بصیرت اور ایمان کا عدم اتحاد موجودہ عہد کی دانش وری کا سب سے بڑا المیہ ہے۔۔۔ جہاں علم اور بصیرت ہے وہاں ایمان نہیں ہے اور جہاں ایمان ہے وہاں علم اور بصیرت کا فقدان ہے۔۔۔ علم، بصیرت کے بغیر اور ایمان علم کے بغیر نامکمل اور خام ہے۔ علم، بصیرت اور ایمان کامل کے اتحاد سے پیغمبر پیدا ہوتے ہیں، تاریخ ساز جنم لیتے ہیں، مصلحین اور انقلابی پیدا ہوتے ہیں۔۔۔ یہی معاملہ علم و عمل کے ساتھ ہے۔ ان دونوں کا اتحاد ہی انھیں بامعنی اور انسانی زندگی کے لیے مفید بناتا ہے۔ حکیم محمد سعید صاحب کی تحریروں اور تقریروں میں ان کے فکر و عمل کے بڑے گہرے اور قائم اور دائم رہنے والے نقوش ملتے ہیں۔ ایسے جیتے جاگتے نقوش جن سے ان کی پوری شخصیت ابھر کر سامنے آتی

ہے۔۔۔ حکیم محمد سعید صاحب کی زندگی اور ان کے عمل میں علم بصیرت اور ایمان کا جتنا حسین اور متوازن امتزاج ملتا ہے وہ عہد حاضر میں بہت کم نظر آتا ہے۔ حکیم صاحب کی فکری اساس قرآن حکیم اور سیرت رسولؐ ہے۔ ان کے لیے قرآن حکیم سرچشمہ ہدایت ہی نہیں پیغام عمل بھی ہے۔ علم و فن کی عظمت اور اہمیت کو انھوں نے قرآن کے وسیلے سے سمجھا اور اس کا مکمل عکس سیرت رسولؐ میں پایا۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات کو علامہ اقبال اور مولانا آزاد کی طرح نہایت وسیع تر تناظر میں اور صحیح سیاق و سباق کے ساتھ سمجھا اور اپنی زندگی میں برتا ہے۔ ان کے یہاں اسلامی تعلیمات سے جن کا مجموعہ قرآن حکیم ہے ایک وسیع تر اور بامعنی انسانی دوستی کے دھارے پھوٹتے ہیں۔ قرآن حکیم، اقبال اور مولانا آزاد جیسے روشن دماغ مفکرین اسلام کے زیر اثر حکیم محمد سعید نے نسل، خاندان، برتری اور کمتری کے روایتی بتوں کو توڑا ہے اور عمر بھر اپنی تحریروں، تقریروں اور اپنے پورے فکر و عمل کے ذریعے اس کی نفی کرتے رہے کہ انسان کی عظمت اور برتری کا دار و مدار اس کی نسل و خاندان پر ہے۔ اپنے برادر محترم کے بارے میں انھوں نے اپنے ایک مضمون میں اسلامی تاریخ کے ٹھوس دلائل کے ساتھ نسل و خاندان پر غرور باطل کی نفی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"باور کرنا چاہیے اور یقین کہ فطری ترقی اور قدرتی حقوق کی راہ میں امتیاز باطن اور غرور خاندانی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس پر بند باندھنا چاہیے اور گوہر مقصود کا تعلق توفیق عمل میں تلاش کرنا چاہیے اور اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ یہ فرشتہ عمل ہے جس نے کتنے ہی بڑوں کو چھوٹا کر دیا اور کتنے ہی چھوٹوں کو بڑا کر دیا ہے۔ فاروق اعظمؓ کی نماز جنازہ کی جب صف بندی ہوئی تو ہزاروں قریشی اور ہاشمی مقتدی تھے اور صہیب رومیؓ امام۔"

مذہب کو بدلتی ہوئی دنیا اور زندگی کی روشنی میں سمجھنے اور برتنے سے گریز، ہماری دنیا کے انتشار، بدامنی اور لاقانونیت کا اہم سبب ہے۔۔۔ انسانوں کی اصلاح اخلاقیات سے ہی ممکن ہے، قانون سے نہیں۔ بقول رشید احمد صدیقی "اللہ نے انسانوں کی رہنمائی اور اصلاح کے لیے پیغمبر بھیجے، پولس اور فوج نہیں بھیجی۔ ہر مذہب اپنے ماننے والوں کو ایک ایسے قادر مطلق کا تصور دیتا ہے جس کا خوف اور جس کے سامنے جواب دہی انسانوں کو ان کی گمراہیوں سے روکتی ہے۔" حکیم محمد سعید مرحوم نے اس راز کو قرآن حکیم کے حوالے سے سمجھا۔ لکھتے ہیں۔

"خوف الٰہی کے بغیر انسان مکمل نہیں ہو سکتا۔ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں ہے وہ بڑے سے بڑا گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیئت

[illegible]

انسانوں کی تنظیم میں معاون ضرور ثابت ہوتے ہیں اور تعزیرات کی وجہ سے بڑی حد تک معاشرہ فتنہ و شر سے محفوظ [illegible] ہے۔ لیکن قوانین کی موجودگی کے باوصف جرائم نہ صرف سرزد ہوتے ہیں بلکہ آج کی دنیا میں تو ہر طرح کی بے راہ روی اور لاقانونیت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

خوف الٰہی کا ایک بڑا تقاضہ قلب کو ان خواہشوں سے محفوظ رکھنا ہے جو خلاف حق ہیں ۔۔۔ معاملات و عبادات کے تمام شعبوں میں احکامِ خداوندی اور سنت رسولؐ کا اتباع خشیت کے نتائج اور ثمرات ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ مومن اپنے ہر قول و عمل کے سلسلے میں یہ خوف محسوس کرتا رہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں کیا جواب دے گا۔ اس طرح وہ اپنا احتساب خود کرتا ہے۔"

تصوف طریقت میں خوف الٰہی سے زیادہ عشق الٰہی پر زور دیا جاتا ہے چنانچہ انسان کو گمراہیوں سے روکنے میں یہاں خوف سے زیادہ عشق کام آتا ہے۔ ظاہر ہے انسان جس ذات سے عشق کرتا ہے اس کی مرضی اور منشا کے خلاف کسی عمل کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا۔ مذاہب عالم کے پیشواؤں کے ہاتھوں میں قوتِ نافذہ کبھی نہیں رہی۔ اخلاقی اصلاح کے لیے اس کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ انھوں نے اپنے بے لوث فکر و عمل سے براہ راست انسانی ضمیر یعنی انتر آتما کو متاثر کیا ہے۔ حکیم محمد سعید صاحب کی شخصیت اور فکر و عمل میں ذہن و ضمیر کی پاکیزگی، خیالات کی طہارت، انسانی خدمت کا جذبہ، علم کا احترام، صاحبان علم و فن سے محبت اور عقیدت، حکیم محمد سعید کی شخصیت اور فکر عمل کے اہم اجزا ہیں ۔۔۔ انھوں نے دوسروں کی عظمت کا اعتراف ہمیشہ کیا جو خود ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ دنیا کے بلند سے بلند مقام، منصب اور مرتبہ کو اپنی رسائی سے باہر کبھی نہیں سمجھتا۔۔۔ ایمان کامل احساس کمتری کو مٹا کر احترام خودی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اقبال نے انسان کے اس مقام کو خودی سے تعبیر کیا ہے۔ حکیم محمد سعید صاحب کی تحریروں اور تقریروں میں جو شخصیت جھلکتی ہے اس میں کہیں احساس کمتری نہیں ملتا، بے باکی اور حوصلہ مندی ملتی ہے۔ انھوں نے قومی اور بین اقوامی پلیٹ فارموں پر اظہار و اعلان جس بے باکی اور اعتماد سے کیا وہ ان کے ایمان کامل کی دلیل ہے۔

تعلیم اور طب، حکیم محمد سعید کے دو بڑے میدان عمل رہے۔ انھوں نے کراچی میں "مدینۃ الحکمت" کی شکل میں ایک ایسی عظیم الشان یونی ورسٹی قائم کی جو اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے مشرقی دنیا کی عدیم المثال یونی ورسٹی ہے۔ علوم جدید و قدیم کی تعلیم و تحقیق کا یہ

مرزا اپنے بانی کے بے لوث جذبہ ایثار کی یاد دلاتا رہے گا۔۔۔ یونی ورسٹی سے زیادہ اس کے بانی کا وہ نظریہ تعلیم ہے جو سراسر اخلاقیات پر مبنی ہے جس کا مقصد انسان کے کردار کی تعمیر و تشکیل ہے۔ کام کے اچھا برا یا چھوٹا بڑا ہونے کا تعین اس کے بنیادی مقصد کے پیش نظر کیا جاتا ہے تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ مختلف دانش ور، ماہرین تعلیم اور مختلف قومیں اس سوال کا جواب بھی مختلف دیتی رہی ہیں۔ موجودہ دور میں تعلیم کا بنیادی مقصد روزگار قرار دیا جا چکا ہے۔ چنانچہ تعلیم کو "جاب اورینٹڈ" بنانے پر اس قدر زور دیا گیا کہ جاب ہی جاب رہ گیا تعلیم غائب ہو گئی۔ حکیم محمد سعید صاحب کے نزدیک جاب تعلیم کا بنیادی مقصد نہیں رہا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

"مقاصد تعلیم پر بڑی بڑی خامہ فرسائیاں ہوتی ہیں۔ ماہرین نے تعلیم کے مقاصد متعین کرنے میں بہت کاوشیں کیں صفحات کے صفحات سیاہ کیے ہیں۔۔۔ لیکن اگر صاف ذہن سے غور کریں اور غیر ضروری بحثوں میں نہ الجھیں تو علم کا مقصد ایک ہے اور وہ ہے انسان بنانا۔ اگر تعلیم انسان کو انسان یعنی سچا اور اچھا انسان نہ بنا سکے تو وہ اپنے مقصد میں ناکام ہے۔ انسان سازی میں جو نظام تعلیم ناکام ہو اور متعلم میں انسانیت نہ پیدا کر سکے وہ تعلیم ناقص ہے، لاحاصل ہے بلکہ ضرر رساں ہے۔ قرآن حکیم کے نقطۂ نظر سے وہ انسان ہے جو اللہ کا اچھا بندہ ہو۔ گویا قرآن کے نقطۂ نظر تعلیم کا مقصد عباد صالح اور نیک بندے تیار کرنا ہے۔ ایک اچھی تعلیم کی یہ خصوصیت بھی ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے سے علم و عمل، قول اور فعل کی دوری ختم ہو جاتی ہے۔

جہاں تک جائیے گا اخلاق، کردار اور ایمان۔۔۔۔ یہ تین چیزیں تھیں جنھیں نئی زندگی میں عام کرنے اور استحکام عطا کرنے میں حکیم محمد سعید نے اپنی پوری زندگی گزار دی۔ ان کی تعلیمی، طبی، اخلاقی اور قومی سرگرمیوں پر غور کیجیے تو ان کی بنیاد میں یہی تین چیزیں نظر آتی ہیں۔۔۔ علم کے ساتھ بصیرت اور ایمان کا تذکرہ ابتدائی سطور میں آچکا ہے۔ حکیم محمد سعید نے بصیرت کو حکمت کا نام دیا ہے جو زیادہ جامع اور بامعنی ہے۔ اس کی حدود میں دانش وری کا ہر پہلو آجاتا ہے۔ چونکہ ان کا مزاج اور شخصیت علم اور حکمت سے مل کر بنے ہیں اس لیے وہ عمر بھر علم و حکمت کے اتحاد پر زور دیتے رہے، لکھتے ہیں:

"علم و حکمت جب دونوں ساتھ ہوتے ہیں تو قسمتیں بدل جاتی ہیں اور دین و دنیا کی ساری راہیں روشن ہو جاتی ہیں۔ جب علم و حکمت اکٹھے ہوتے ہیں تو انسان کا ضمیر آلودگیوں سے پاک ہونے لگتا ہے اور یہی تزکیہ ہے۔"

حکیم محمد سعید کو پاکستان کی قومی زندگی میں اونچے سے اونچے مناصب پیش کیے گئے انھیں صوبہ سندھ کی گورنری تفویض ہوئی لیکن وہ اپنی زندگی کے بنیادی مقاصد کو ہمیشہ اولیت دیتے رہے۔ انھوں نے گورنر ہاؤس میں رہنا پسند نہیں کیا۔ امور منصبی کی ادائیگی کے لیے گورنر ہاؤس جاتے رہے اور باقی وقت اپنے منصوبوں کی تکمیل پر صرف کیا۔ ان کی گورنری کے زمانے میں تعلیمی اداروں میں سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ سندھ میں چار نئی جامعات کا قیام سندھ کے عوام کے لیے ایک بیش بہا تحفہ اور حکیم محمد سعید کا ایسا کارنامہ ہے جو تاریخ پاکستان میں سنہرے حرفوں میں رقم ہوگا۔ تعلیمی گول میز کانفرنس کا انعقاد گورنر سندھ حکیم محمد سعید کی صدارت میں گورنر ہاؤس میں ہوا۔ اسی گورنر ہاؤس میں تعلیمی کانفرنس سے ایک ماہ پہلے گورنر محترم نے ایک پُر وقار تقریب میں چار جامعات کے قیام کی منظوری دی۔

حکیم محمد سعید بنیادی طور پر ایک طبیب تھے۔ وہ اپنی تمام تر سرگرمیوں پر اپنے مطب کو اولیت دیتے تھے۔ ہزاروں مریض روزانہ ان کے دستِ شفا سے فیضیاب و صحت یاب ہوتے رہے۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں وہ مطب کرتے تھے۔ حکیم محمد سعید طبی دنیا کی پہلی شخصیت تھے جنھوں نے برصغیر کی حدود سے نکل کر پوری دنیا کے گوشے گوشے تک فن طب یونانی کو نہایت موثر طریقہ سے روشناس کرایا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کی نصف عمر سفر میں گزری۔ وہ اکثر خود کو "سعید سیاح" کہتے اور لکھتے تھے۔ انھوں نے دنیا کے مختلف ملکوں میں رائج مقامی طبوں کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ کیا تھا جس سے خود ان کے فن میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی۔ انھوں نے سرکاری و غیر سرکاری سطح پر طب یونانی کو موثر بنانے کے لیے اور اسے ترقی دینے کے لیے پُر زور تحریک پیدا کی تھی۔ انھوں نے پاکستان ہی نہیں پورے برصغیر کے طبیبوں کے مزاج، ان کے رجحان طبع اور ان کے طریقہ کار کا گہرا مشاہدہ کیا اور اس پر غور فکر کیا تھا۔ وہ عمر بھر صرف فن طب کے لیے ہی نہیں بلکہ حاملین فنِ طب کی اصلاح کے لیے بھی بے تاب رہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"شاید یہ یاد کرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک قیادت، ایک مرکزیت، یک جہتی یک جماعتی، یک فکری، یک نظری کے بغیر نہ طب کا احیا ہو سکتا ہے اور نہ طبیب کا وقار بلند ہو سکتا ہے۔ ایسی بلندیٔ فکر صرف اور صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ ہر انسان اپنے مبلغ علم و فکر کا صحت و دیانت داری سے جائزہ لے اور اگر دوسرے اس سے آگے کی منزل پر ہیں تو ان کو اپنے سے نیچی منزل تک گھسیٹ لانے کی بد اخلاقی میں مبتلا نہ ہوں۔"

حکیم محمد سعید صاحب پاکستان کے اطبا کے کردار و عمل کا جائزہ لے کر جس نتیجہ پر پہنچے

وہ من و عن ہندستانی طبیبوں کے لیے بھی صحیح ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

☆ مقصد کے باب میں ایمان و ایقان اور اعتقاد ضعیف ہے۔

☆ جماعت اطبا ایثار کے اعلا وصف سے صرف نظر کرکے ذاتی تشخص پر کمربستہ ہے۔

☆ اتحاد و اتفاق کی برکات پر جماعت اطبا کو یقین نہیں رہا ہے۔

☆ تشخص ذاتی یقینی طور پر احساس کمتری کی صورت میں جنم لیتا ہے اور اس کا علاج اظہار برتری سمجھا جانے لگتا ہے مگر وہ کبھی سامان شفا نہیں رہا ہے۔

☆ مسابقت کے میدان میں کم ہمتی کی بنی پر جب شکست ہوتی ہے تو ردِ عمل کے طور پر فتح مندی کا عنوان اظہار ذات ہو جایا کرتا ہے۔

☆ عدم قناعت نے اطبا کو ہوس زر میں مبتلا کر دیا ہے اور زر مقصد حیات بن گیا ہے۔ ہوس اور جہل کو علم سے بدل دینے کا جذبہ یا صلاحیت مفقود ہو جائے تو ذات کا اظہار لازمی ہو جاتا ہے۔

☆ احترام باہمی کا جب فقدان ہو جایا کرتا ہے تو توہینِ آدم کو راہ مل جایا کرتی ہے اور انسان دوسرے انسان کو کھا جانے کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

☆ قیادت کی جب صلاحیت نہ ہو اور دنیا کے علم و فن میں انقلابات برپا ہوں تو انسان شکست کھا کر ایک جماعت کو تشکیل دے کر قیادت کے خبط میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

☆ شیطانی طاقتیں جب فکر انسانی پر قابو یافتہ ہو جایا کرتی ہیں تو وہ خیر کی ہر ادا مسمار کر دینے کا راستہ اختیار کر لیتی ہیں اور پھر انسان حسد اور بغض کے ہتھیار استعمال کرنے لگتا ہے اور یہ فراموش کر دیتا ہے کہ اس راہ سے منزلِ مراد تک نہیں پہنچ سکتا۔"

حکیم محمد سعید مرحوم نے صحت کو قومی زندگی کی کلید قرار دیا ہے۔ صحت و توانائی ہی ترقی اور خوش حالی کی بنیادی شرط ہے۔ حکیم صاحب نے اقوام عالم کے عروج و زوال کا تفصیل اور گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، اس پر غور و فکر کیا اور محسوس کیا کہ زوال کا ایک سبب صحت کی خرابی بھی رہی ہے۔ صحت ہی آزادی کی ضمانت ہے۔ کمزور قومیں اور افراد آزادی حاصل کرنے میں ہمیشہ ناکام رہے ہیں۔ آزادی بنی نوع انسان کا فطری حق ہے۔ وہ لکھتے ہیں "تاریخ عالم میں جو اقوام اپنے انتہائے کمال کو پہنچیں۔ ان کی کامیابیوں، کامرانیوں اور ان کے کمالات سے صحت کو کسی طرح خارج نہیں کیا جا سکتا۔ ماشاء ان کامیاب و کامران اقوام و ملل نے صحت سے اپنا رشتہ مضبوط و مربوط رکھا ہے اور صحت ہی سے مضبوط رشتے کی بدولت وہ سرفراز و سربلند رہی ہیں۔ وہ اقوام و ملل جن کی آزادیاں سلب اور ضبط ہوئیں انحطاط میں نقص

صحت سر فہرست ہے۔ آزادی کی ضبطی اور غلامی اپنے ساتھ اور اپنے جلو میں جہالت لاتی ہے اور یہ جہالت حسن و قبح میں فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتی ہے۔"

حکیم صاحب نے بر صغیر کے صحتی مسائل کو بڑی خوبی کے ساتھ سمجھا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ محض مغربی طب سے دنیا کے صحتی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے تمام ملکوں میں رائج و مقبول مقامی طبوں کو ترقی دینا بے حد ضروری ہے۔

انسان کی تمام تر سرگرمیوں اور اعمال کا سر چشمہ اس کا اپنا کردار اور اخلاق ہوتا ہے۔ حکیم محمد سعید اس تہذیب کے پروردہ تھے جہاں اخلاق و انسان دوستی زندگی اور سماج میں شانِ امتیاز سمجھے جاتے تھے۔ اخلاقی قدروں اور سماجی روایتوں سے انحراف کفر سمجھا جاتا تھا۔ حکیم محمد سعید کی والدہ محترمہ اخلاقیات کے معاملے میں نہایت سخت گیر تھیں۔ ان کی تربیت کے اثر سے ان کے بچوں میں اخلاقیات کا صحت مند تصور رچ بس گیا تھا۔ اپنی والدہ محترمہ کے بارے میں سعید صاحب نے لکھا ہے:

"انھوں نے کبھی اخلاق کی کسی کوتاہی کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا۔ اس بات میں وہ بڑی سخت گیر تھیں۔ توازن ان کا ہنر تھا۔ وہ اس توازن اور عدل کی وجہ سے پورے خاندان پر حکمرانی کرتی تھیں۔"

خواجہ حسن نظامی نے "مادرِ ہمدرد" کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں حکیم محمد سعید اور حکیم عبدالحمید کی والدہ کے کردار اور اخلاق کی مصوری کی گئی تھی۔ ماں کی تربیت کا اثر انسان میں عمر بھر باقی رہتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:

"حکیم صاحب کی والدہ محترمہ 'اللہ بخشی' بہت غیر معمولی خاتون تھیں۔ ان دونوں بھائیوں کی صلاحیتیں والدہ کی تربیت کا نتیجہ ہیں اور رہیں۔ سنتے ہیں کہ دونوں بھائیوں کے گھر میں کوئی نوکر نہیں رکھا گیا۔ دونوں بہوئیں سارا کام خود کرتی تھیں۔"

بزرگی اور عظمت اور انسانی خدمت کا جذبہ خلا میں پیدا نہیں ہوتا' تہذیبی ماحول سماجی زندگی کے اثرات سے پیدا ہوتے ہیں اور انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتے ہیں۔

جمیل الدین عالی نے لکھا ہے:

"شہید حکیم محمد سعید کی شخصیت میں' میری دانست میں شہر دلی کی ایک آخری روایت اٹھ گئی جو پاکستانی اقدار کی امین بھی تھی۔ بے غرضانہ خدمت' علم و جستجو کو پھیلانا' شائستگی' شریف پروری۔"

۵ ستمبر ۱۹۸۹ء

آپ کا
مجتبیٰ حسین
۲۰۰، انگور پلاز منشنس
پٹ پڑ گنج، دہلی-۹۲

گجرال کمیٹی پر عمل ہو تو ہم حیدرآباد جائیں

صاحبو! ہمارے احباب اکثر ہم سے پوچھتے رہتے ہیں کہ میاں تمھیں تو ملازمت سے ریٹائر ہوئے چار پانچ برس بیت گئے۔ اب دہلی میں تمھارا کیا کام۔ تم حیدرآباد واپس کیوں نہیں جاتے؟۔ اس سوال کا جواب ہم ہمیشہ گول کر جاتے ہیں۔ سوچا کہ آج اس سوال کا جواب دے ہی دیں تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آوے۔ آپ میں سے بہت سوں کو پتا ہوگا کہ نومبر ۱۹۷۲ء میں ہم اردو کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے قائم کردہ کمیٹی (جس نے بعد میں اس کے صدر نشین اندر کمار گجرال کے نام کی رعایت سے گجرال کمیٹی کی حیثیت سے شہرت پائی) کے شعبہ ریسرچ میں کام کرنے کے لیے حیدرآباد سے دہلی آئے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ سفارشات کے ساتھ حکومت ہند کو پیش کر دی تھی۔ ہمیں اصولاً کمیٹی کی رپورٹ کی پیشکشی کے بعد ہی حیدرآباد واپس چلے جانا چاہیے تھا مگر سوچا کہ دو سال کی شبانہ روز محنت کے بعد جب ہم نے اس رپورٹ کی تیاری میں اپنا بھی ایک حقیر سا حصہ ادا کیا ہے تو کیوں نہ اس رپورٹ کی عمل آوری تک دہلی میں ہی قیام کیا جائے۔ ایک بار اس پر عمل ہو جائے تو حیدرآباد واپس چلے جاتے ہیں۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے کیا ہم اپنی پیاری زبان اردو کے لیے اتنی بھی قربانی نہیں دے سکتے۔ اس خیال کے آتے ہی ہم نے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں نوکری ڈھونڈ لی اور اس دن کا انتظار کرنے لگے جب گجرال کمیٹی رپورٹ پر عمل ہوگا۔ اب یہ ایک اتفاق ہے کہ چار پانچ برس تک اس رپورٹ پر کوئی عمل نہیں ہوا۔ سرکاری کاموں میں ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس عرصہ میں ہمیں حیدرآباد بہت یاد آتا رہا لیکن اردو سے محبت نے ہمیں دہلی میں روکے رکھا۔ پھر یوں ہوا کہ اس کمیٹی کے صدر نشین اندر کمار گجرال خود ماسکو میں ہندستان کے سفیر بن کر چلے گئے۔ ایک لمحہ کے لیے ہم نے سوچا کہ جب اس کمیٹی کے صدر نشین ہی دہلی چھوڑ کر ماسکو چلے گئے تو ہم کیوں بلاوجہ دہلی میں رکے ہوئے ہیں مگر آپ تو جانتے ہیں کہ ہم بے حد حساس، ذمہ دار اور فرض شناس آدمی ہیں۔ ہمیں اپنے فرائض

خیر کسی کا ہر دم خیال رہتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ جہاں آج دس برس بیت گئے ہیں وہاں دو چار برس اور انتظار کر لینے میں کیا قباحت ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ ہم نے جس نئے دفتر میں ملازمت شروع کی تھی وہاں اس عرصہ میں ہماری پروموشن بھی ہو گئی تھی۔ خیر ہمیں پروموشن وغیرہ سے کیا مطلب کیونکہ ہم تو فطرتاً قلندر آدمی واقع ہوئے ہیں۔ ہم نے پیسہ کو ہمیشہ دوسروں کے ہاتھ کا میل سمجھا۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ دفتر میں یہ جو ہماری پروموشن ہوئی ہے وہ قدرت کی جانب سے ہوئی ہے تاکہ ہم دہلی میں ذرا اطمینان سے رہ سکیں اور اس دن کا انتظار کریں جب گجرال کمیٹی کی رپورٹ پر عمل ہوگا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ گجرال کمیٹی کی رپورٹ برسوں حکومت کے سرد خانے میں پڑی رہی حالانکہ اس عرصہ میں کئی سرکاریں بدلیں مگر ہم کب ہمت ہارنے والے تھے سو دہلی میں رکے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن ہم اپنی ملازمت سے بھی ریٹائر ہو گئے۔ آس کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو ایک عرصہ بعد اس پر اوس پڑ ہی جاتی ہے۔ ہم نے سوچا کہ اب دہلی میں رکنا بیکار ہے۔ آخر ہم کب تک گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کے انتظار میں دہلی میں اپنے بچے کھچے بڑھاپے کے دن ضائع کرتے رہیں۔ مگر ادھر ہم نے حیدرآباد کو واپسی کے منصوبے بنانے شروع کیے اور ادھر دیکھتے ہی دیکھتے جناب اندر کمار گجرال خود وزیر اعظم بن گئے۔ ہم بے حد خوش ہوئے اور اپنے حیدرآبادی احباب کو اطلاع دی کہ میاں اب جدائی کی گھڑیاں ختم سمجھو۔ للہ ہماری یاد میں آنسو نہ بہاؤ۔ ہم انشاءاللہ بہت جلد گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل کروا کے حیدرآباد واپس ہو جائیں گے۔ جس کام کے لیے دہلی آئے تھے اسے پورا کر کے ہی آئیں گے۔ مگر کیا بتائیں۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ جب گجرال صاحب کی وزارت عظمی کے زمانہ میں بھی بہ وجوہ اس رپورٹ پر عمل نہ ہو سکا تو ہم نے تہیہ کر لیا کہ اب ہم اپنے ذاتی حشر سے ہی مطلب رکھیں گے اور گجرال کمیٹی کی رپورٹ کے حشر کے بارے میں سوچنا بالکل چھوڑ دیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی ہمیں اصولاً اپنا "سامان سفر" باندھنا شروع کر دینا چاہیے تھا مگر دیکھا کہ ہمارے پاس تو سامان ہے ہی نہیں باندھیں تو کیا باندھیں سوچا کہ کمر ہی باندھ لیں لیکن اب یہ بھی خمیدہ رہنے لگی ہے۔ بہت دن اس ادھیڑ بن میں بیت گئے۔ اس اثنا میں یہ اطلاع ملی کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو کا اجلاس لگ بھگ دو سال کے وقفہ کے بعد ۲۶؍اکتوبر کو منعقد ہونے والا ہے۔ اس میں شرکت کرو۔ اطلاعاً عرض ہے کہ پچھلے دو برسوں سے ہم فروغ اردو کونسل کے رکن ہیں جس کے نائب صدر نشین ہمارے بزرگ کرم فرما ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہیں اور مرکزی وزیر تعلیم اس کے صدر نشین ہوا کرتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ جاتے جاتے لگے ہاتھوں کیوں نہ اس اجلاس میں شرکت کر لی جائے اور اس کے دو ایک دن

بعد دلی کو خیر باد کہہ کر حیدر آباد واپس چلے جائیں۔ یوں بھی مرکزی وزیر تعلیم مرلی منوہر جوشی اس کونسل کے صدر نشین ہیں۔ گویا اب حیدر آباد کو ہماری واپسی پکی ہو چکی ہے۔

صاحبو! پچھلے ہفتے ہم نے فروغ اردو کونسل کے اجلاس میں شرکت کی جس کی وجہ سے ہمیں حیدر آباد واپس ہونے کے اپنے فیصلے کو پھر سے معرض التوا میں ڈال دینے پر مجبور ہو جانا پڑا ہے۔ کیونکہ اس اجلاس میں مرلی منوہر جوشی جی نے بڑے طمطراق کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ ان کی حکومت بہت جلد گجرال کمیٹی کی سفارشات کو روبہ عمل لانے کے بارے میں اعلان کرے گی۔ اس طرح گجرال کمیٹی نے پھر سے ہمارے پانو میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔ کیا کریں گجرال کمیٹی ہمارے حق میں ایک ایسا کمبل بن گئی ہے جسے ہم بھلے ہی چھوڑ دیں لیکن وہ ہمیں چھوڑنے کا نام نہیں لیتی۔ آس بھی کیا بری چیز ہے۔ کونسل برائے فروغ اردو کو دو سال پہلے تک مرکزی حکومت کے ایک محکمہ "بیورو فار پروموشن آف اردو" کی حیثیت حاصل تھی مگر اب اسے ایک خود مختار ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ جب تک شہباز حسین شارب ردولوی اور شمس الرحمٰن فاروقی اس محکمہ کے سربراہ رہے تب تک اس ادارہ میں کام بھی ہوا کرتا تھا مگر ادھر دس بارہ برسوں سے اس ادارہ کی حیثیت ایک زندہ لاش کی سی ہو گئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں سے سڑنے کی بو بھی نہیں آ رہی تھی، لیکن ادھر جب سے حمید اللہ بھٹ اس ادارہ کے ڈائرکٹر بن کر آئے ہیں تب سے اس میں سرگرمی دکھائی دینے لگی ہے۔ اخباروں میں رپورٹیں آ رہی ہیں۔ بجٹ میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مستقبل کے منصوبے بن رہے ہیں۔ لگ بھگ دو برس پہلے کونسل کا پہلا اجلاس اس وقت کے وزیر تعلیم ایس آر بومائی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ موجودہ مرکزی وزیر تعلیم مرلی منوہر جوشی جی نے ٹھیٹ، خالص اور نہایت فصیح و بلیغ اردو میں جو تقریر کی اس نے ہمارے سوائے کونسل کے سارے ارکان کو حیرت میں ڈال دیا۔ مرلی منوہر جوشی نے اردو کے ثقیل سے ثقیل لفظ کا تلفظ بھی اس طرح ادا نہیں کیا جس طرح ہمارے آج کے اردو اساتذہ کرتے ہیں جو دس جملے بھی بولتے ہیں تو اس میں گرامر اور تلفظ کی کم از کم بیس غلطیاں تو ضرور کر جاتے ہیں۔ ہمیں ان کے صحیح تلفظ پر حیرت اس لیے نہیں ہوئی کہ دو چار سال پہلے ہم اردو کی دو ایک محفلوں میں انھیں بولتے ہوئے سن چکے ہیں۔ پھر وہ الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں جب ہندستان میں گیری بالڈی کی کتاب پر پابندی عائد تھی اور وہ انھیں انگریزی اور ہندی میں دستیاب نہ ہو سکی تو انھوں نے راست طور پر اس کے اردو ایڈیشن کا مطالعہ کیا تھا۔ بہر حال ان کی تقریر کے دوران میں ہمارے برابر بیٹھے ہوئے ایک رکن نے کہا بھئی لکھی ہوئی اردو تقریر کو پڑھنا ایک الگ بات ہے لیکن فی البدیہہ اردو بولنا دوسری بات ہے۔"

مگر جب انھوں نے تقریر کے بعد فی البدیہہ اردو بولنی شروع کی تو ویسی ہی اردو بولی جیسی کہ ان کی لکھی ہوئی تقریر میں تھی۔ ہمیں تب بھی حیرت نہیں ہوئی۔ البتہ حیرت اس وقت ضرور ہوئی جب انھوں نے گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل کرنے کا اعلان کیا۔ اب ہم پھر اس مخمصہ میں گرفتار ہیں کہ حیدر آباد واپس چلے جائیں یا پھر گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کے انتظار میں دہلی میں مزید رک جائیں۔ مرلی منوہر جوشی جی نے بڑی آسانی سے یہ اعلان تو کر دیا لیکن ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ ان کا تعلق اس پارٹی سے ہے جو بابری مسجد کے انہدام کے وقت اتر پردیش میں برسر اقتدار تھی اور جس نے حکومت ہند سے لے کر سپریم کورٹ تک کو یہ تیقن دیا تھا کہ وہ بابری مسجد کو گرنے نہیں دے گی۔ مگر اس نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بابری مسجد کو اس طرح منہدم ہوتے دیکھا جیسے مسجد گرائی نہ جا رہی ہو بلکہ اپنے آپ ہی گرتی چلی جا رہی ہو۔ سیاسی جماعتیں بہت سے کام کرنے کے وعدے تو کرتی ہیں لیکن کر نہیں پاتیں مگر بھارتیہ جنتا پارٹی وہ واحد پارٹی ہے جو کام نہ کرنے کا وعدہ کرتی ہے تو پھر اس کام کو ضرور پورا کر دیتی ہے۔ اگر مرلی منوہر جوشی جی اردو کے تعلق سے کچھ نہ کرنے کا اعلان فرماتے تو شاید ہم مان لیتے کہ وہ اردو کے تعلق سے ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔ بہر حال اس تضاد کے باوجود ہم نے گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کی آس پھر سے اپنے دل میں پیدا کر لی ہے۔ بہت عرصہ پہلے ہم نے کہیں لکھا تھا کہ جو آدمی صحیح اردو جانتا اور بولتا ہے اور جو اردو کلچر سے گہری واقفیت رکھتا ہے وہ متعصب ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے اس خیال کو پھر ایک بار آزمائش کا سامنا ہے۔ دیکھتے ہیں مرلی منوہر جوشی کیا کرتے ہیں۔

یاد ش بخیر! مرلی منوہر جوشی جی سے ہماری ایک تفصیلی ملاقات دو برس پہلے اس وقت ہوئی تھی جب انھوں نے ہمارے شاعر دوست امیر قزلباش کے مجموعہ کلام کی رسم اجرا انجام دی تھی۔ اس محفل میں ہم نے بھی امیر کا ایک خاکہ پڑھا تھا۔ کونسل کے اجلاس کے بعد جب مرلی منوہر جوشی جانے لگے تو ہمیں دیکھ کر رک گئے۔ بولے "جناب! میں آپ سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ اس دن تو آپ کا کمال دیکھا ہی تھا۔ ہندی میں آپ کی چیزیں پڑھتا رہتا ہوں"۔ لوگوں کی بھیڑ ان کے اطراف بہت تھی ورنہ ہم ان سے ضرور پوچھتے کہ حضور! اگر آپ سچ مچ گجرال کمیٹی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے والے ہوں تو ہم دہلی میں رک جاتے ہیں ورنہ ہمیں حیدر آباد واپس چلے جانے کی اجازت دیجیے۔ آخر ہم کب تک یہاں رہیں۔ حیدر آباد میں ہماری مٹی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔

نصرت ظہیر
4/15 کیجری پور کالونی، دہلی ۹۱

قصّہ مولانا انجم عثمانی کا

نو دس برس پہلے اس ہال (غالب اکیڈمی اڈیٹوریم) میں اسی جگہ سے جب میں نے پہلی بار اپنا ایک مزاحیہ مضمون ایک ادبی محفل میں پڑھ کر سنایا اور مضمون پڑھ کر نیچے اترا تو پتلے دبلے سے ایک صاحب میرے پاس آئے اور کچھ پراسرار سے انداز میں کہنے لگے "ذرا ادھر آیئے"۔

میں ان کے ساتھ ذرا ادھر آگیا۔ تب انھوں نے اور بھی پراسرار انداز میں کہا "میں دوردرشن سے آیا ہوں اور آپ کا انٹرویو ریکارڈ کرنا چاہتا ہوں۔ کیا مجھے کچھ وقت دیں گے"؟ سن کر کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ان دنوں سیٹلائٹ ٹی وی نٹ ورک میدان میں نہیں آیا تھا۔ ٹیلی ویژن پر اکیلے دوردرشن کی حکمرانی تھی اور اس کے پردے پر اپنے آپ کو دیکھنے کا مجھ جیسے نووارد ین ادب صرف خواب ہی دیکھ سکتے تھے۔ نئے ادیب اور فن کار منڈی ہاؤس اور پارلیمنٹ اسٹریٹ کے چکر لگا کر رہ جاتے تھے، مگر کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ چھوٹے موٹے پروڈیسروں کے نخرے بھی اتنے اونچے ہوتے تھے کہ ریسپشن سے ہی لوگوں کو ٹرخا دیا جاتا تھا اور یہاں ایک پروڈیسر خود مجھ سے آکر ریکارڈنگ کے لیے وقت مانگ رہا تھا۔ یہ صاحب تھے انجم عثمانی۔ "بزم" اور "کہکشاں" کے پروڈیوسر اور تھے کیا بفضل خدا اب بھی ہیں۔ ان کا نام تو بہت سنا اور پڑھا تھا مگر خود ان سے ملنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ انجم جس وارفتگی کے ساتھ مجھ سے ملے اس سے اپنے بارے میں کئی خوش گمانیاں ہو گئیں۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ جلد ہی عقل آگئی اور معلوم ہو گیا کہ وہ مجھ سے ہی نہیں ہر بڑے چھوٹے، اہم غیر اہم اور آشنا ناآشنا سے اسی طرح ملتے ہیں اور اسے خوش فہمیوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

بس پھر تو ان سے ملاقاتیں ہوتی ہی رہیں۔ افسانہ نگار انجم عثمانی کو میں جانتا ہی تھا۔ اب نقاد انجم عثمانی بھی کھل کر سامنے آنے لگا۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا جب استاد انجم عثمانی اور مولوی انجم عثمانی سے ملاقات ہوئی۔ استاد سے تب جب ٹیلی ویژن نشریات پر ان کی ایک کتاب سامنے آئی اور اسے دہلی یونیورسٹی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی دونوں نے اپنے تدریسی نصاب

میں شامل کر لیا۔

اور مولوی سے تب، جب یہ پتہ چلا کہ جناب دارالعلوم دیوبند سے باقاعدہ مولویت کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں اور مولانا مفتی عتیق الرحمان جیسے بلند پایہ دینی عالم کے محترم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملتے ہوئے کچھ ڈر سا لگنے لگا۔ احتیاط برتی جانے لگی کہ منہ سے کوئی بات خلاف شرع نہ نکل جائے۔

مولویت سے افسانہ نگاری، افسانوں سے فلمی ہدایت کاری اور ہدایت کاری سے ٹی وی نشریات کی تدریس۔ یہ طویل سفر انجم عثمانی نے کوئی شور شرابہ کیے بغیر اتنی خاموشی سے طے کیا کہ حیرت ہوتی ہے اور ہر چند کہ منزلیں بھی مختلف تھیں، راستے بھی جدا تھے لیکن سفر میں جو کچھ ملا اسے سینت کر سنبھال کر رکھا، گرد راہ کی طرح پیچھے نہیں چھوڑ دیا۔

میرے ایک واقف کار ہیں۔ عملی زندگی انھوں نے اردو کتابت سے شروع کی مگر جب وہ صحافی بنے تو کتابت چھوڑ دی۔ پھر صحافی سے نقاد اور صاحب کتاب ہوئے تو صحافت کو خیر باد کہہ دیا اور جب ایک اعلا سرکاری عہدے پر فائز ہوئے تو ادب کی طرف سے منہ پھیر لیا چنانچہ آج وہ بڑی شان سے گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

لیکن انجم نے ایسا نہیں کیا۔ وہ آج بھی افسانے لکھتے ہیں۔ ادبی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں۔ دوردرشن پر جی جان لگا کر اپنی ڈیوٹی نبھاتے ہیں۔ کوئی ٹیلی ویژن نشریات کے مسئلوں اور تکنیکی رموز پر بات کرے تو ایک ہی موضوع پر بے تکان بولتے جاتے ہیں اور یوں ہی نہیں بولتے، اچھا خاصا معلومات کا دریا بہا دیتے ہیں۔

اور اس دوران مولوی انجم عثمانی بھی مسلسل سرگرم عمل رہتا ہے۔ نماز روزہ تراویح تلاوت، سب جاری! آپ دیوبند کے رہنے والے ہیں جہاں گردش شام و سحر کی پیمائش نمازوں کے وقت سے ہوتی ہے۔ ملاقات پر انجم عموماً دیوبندیوں کی ہی طرح گفتگو کرتے ہیں جو کچھ اس طرح ہوتی ہے۔

انجم: یار کہاں ہو تم اتنے دنوں سے۔ کل مغرب کے بعد تمھیں فون کیا تھا مگر تم گھر پر نہیں تھے۔

میں: جی ہاں ٹھیک ہے۔ میں اس وقت پریس کلب میں تھا۔
انجم: مگر تم تو عشا کے بعد بھی گھر نہیں لوٹے تھے۔ خدا تمھیں عقل سلیم دے۔
میں: ہاں ذرا دیر ہو گئی تھی۔ اور سنایئے کیسے ہیں۔
انجم: یوں تو ٹھیک ہوں مگر طبیعت ذرا خراب سی ہے۔ ظہر کے بعد کچھ امرود کھا لیے

اب پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔
میں: تو کوئی چورن کھالیجیے۔
انجم: عصر میں کھایا تھا۔ سوچتا ہوں آج رات عشا کے بعد دودھ پی کر فاقہ کرلوں شاید کچھ افاقہ ہو جائے۔

دیوبند میں لوگ اسی طرح آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ ان کا ہر کام کسی نماز کے بعد یا پہلے شروع ہوتا ہے۔ ہاتھ میں گھڑی بندھی ہو اور کوئی وقت پوچھ لے تو سیدھے سیدھے یہ نہیں بتائیں گے کہ سوا چار بجے ہیں۔ کہیں گے عصر کی اذان میں دس منٹ باقی ہیں۔ یہ سب لوگ تمام نمازیں پڑھتے ہیں یا صرف دکھاوا کرتے ہیں۔ یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن انجم عثمانی کے بارے میں یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ وہ سچ مچ پانچ وقت کے نمازی ہیں۔ اس کا یقین مجھے تب آیا جب میں نے ایک دن ان سے پوچھا کہ دوردرشن کی ڈیوٹی، ادبی تقریبات، افسانہ نگاری اور کتابوں کی تصنیف۔ اس سب کے لیے آپ کیسے وقت نکال لیتے ہیں؟

ان کا جواب کچھ اس قسم کا تھا۔ "بھئی فجر پڑھ کر پہلے تلاوت کرتا ہوں۔ پھر بچوں کو اسکول چھوڑنے جاتا ہوں۔ اس کے بعد ناشتہ۔ پھر دفتر اور ظہر کے بعد عصر۔ لیکن مغرب عموماً گھر آکر پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد کھانا اور پھر عشا۔ آخر میں تلاوت کر کے پھر سو جاتا ہوں۔ بس اسی دوران کچھ لکھنا پڑھنا ہو جاتا ہے۔!" اس روز میں نے جانا کہ انجم کے لیے عبادت ایک عادت بن گئی ہے۔ اور جب عبادت عادت بن جائے تو وہ کچھ اور ہو جاتی ہے۔ ان کا نماز پڑھنا، روزے رکھنا اور تراویح سننا، سب عبادت سے آگے کی چیزیں ہیں۔

گذشتہ سال ان کی کتاب "ٹیلی ویژن نشریات، تاریخ تحریر اور تکنیک" کی بڑی دھوم رہی۔ جناب اندر کمار گجرال سے لے کر جناب گوپی چند نارنگ تک سبھی بڑے لوگوں نے کہا، یہ اس موضوع پر اردو کی پہلی کتاب ہے۔ اس سے الیکٹرانک میڈیا کو سمجھنے سمجھانے میں بڑی مدد ملے گی۔ اس سے یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ اخبارات میں اس کتاب پر خوب تبصرے چھپے۔ سب نے صاحب کتاب کی بھرپور تعریف کی۔ تاہم مجھے کچھ اختلاف رہا، کیونکہ میرا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ ان کی کتاب پڑھ کر ایک طالب علم اچھا ٹیوی پروڈیوسر یا ڈائرکٹر تو بن سکتا ہے مگر کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ کتاب میں کامیابی کے اصل گر بتائے ہی نہیں گئے ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے یہ تو بتایا ہے کہ اسکرپٹ کیسے بنتا ہے لیکن یہ ذکر نہیں کیا کہ اس اسکرپٹ کو منظور کرانے کے لیے منڈی ہاؤس کے کس کلرک سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ اسی طرح اسکرپٹ کی چوری کیسے کی جاتی ہے۔ نقل اور چربہ کس طرح اتارا جاتا ہے اس کے گر بھی

نہیں سمجھائے گئے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ کتاب کے آخر میں دوردرشن کے ڈائریکٹر، پروڈیوسروں اور منڈی ہاؤس کے وفادار کلرکوں کے پتے اور گھروں کے ٹیلی فون نمبر بھی شائع کر دیتے۔

اس کے علاوہ انجم صاحب نے پروگرام پلاننگ، اسٹوڈیو کے طریقۂ کار، فلور مینجمنٹ ویژن مکسنگ، اور ایڈیٹنگ وغیرہ کے بیان میں بھی حقیقت پسندانہ انداز اختیار نہیں کیا۔ کیمرہ مینوں کے نخرے کس طرح جھیلنے چاہئیں، ریکارڈنگ اور شوٹنگ کے لیے جس شخص کو بلایا گیا ہے اسے آتے ہی میک اپ کر کے باندھ دینے کے کیا فوائد ہیں، ایڈیٹنگ میں اپنوں کے کلوزاپ بار بار کس طرح لائے جائیں اور غیروں کے شاٹ کیسے کاٹے جائیں۔ یہ سب بھی نہیں بتایا گیا ہے۔ پوری کتاب انھوں نے کسی دینی عالم کی طرح ایمانداری سے لکھ ڈالی ہے چنانچہ ٹی وی نشریات پر یہ کچھ "فضائلِ ٹی وی" جیسی کتاب معلوم ہوتی ہے۔

اور اب جوان کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ سامنے آیا ہے تو ان کی دینداری اور دیانت داری کے ساتھ ان کی تہ دار شخصیت کی بہت سی دیکھی ان دیکھی پرتیں بھی نظر آنے لگی ہیں۔ انجم عثمانی کے اندر کی دنیا مختلف کرداروں اور منظروں کے حوالوں سے سامنے آ رہی ہے اور ہمیں خود اپنے اندر کی دنیاؤں کو دیکھنے اور سمجھنے میں مدد دے رہی ہے۔ ان کی کتاب میں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے بھرپور تبصرے سے لے کر آخری کہانی ورثہ تک پوری کی پوری پڑھی ہے اور صرف دو نشستوں میں پڑھی ہے اور انجم کے ان نئے افسانوں کے بارے میں میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ ہم لوگوں میں اندر ہی اندر جو ایک خلا پنپ رہا ہے اور روز بروز جس کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے، یہ افسانے اسی خلا کو بھرنے کی تڑپ سے اُپجے ہیں اور یہ کہ ان کے بیشتر افسانے منظروں اور وارداتوں کی بہترین ایڈیٹنگ اور خوبصورت ویژن مکسنگ کے نمونے ہیں اور یہ کہ بہت کم لفظوں اور بہت ہی کم جگہ میں انجم اتنا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ میں نے ان کے کئی افسانے دو تین مرتبہ پڑھے اور ہر مرتبہ نئے پہلوؤں تک میری رسائی ہوئی اور یہ بھی کہ ان افسانوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ڈھلکے ہوئے کندھوں پر سر کو اونچا اٹھا کر چلنے والا یہ منکسر المزاج انجم عثمانی، اصل میں کتنا گہرا اور سہارنپور کی زبان میں کتنا ڈھونگا آدمی ہے!

مگر میں یہ سب نہیں کہوں گا کیونکہ میں تنقید کے نکتوں سے ناواقف ہوں۔ یہ بھی ٹھیک سے نہیں جانتا کہ افسانے اور کہانی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ افسانہ میں کہانی پن اور کہانی میں افسانہ پن کیسے آتا ہے، اس کا بھی مجھے علم نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ انجم عثمانی ایک اچھے ادیب ہیں، اور انھیں مزید اچھا اور بڑا ادیب بننے سے نہ آپ روک سکتے ہیں اور نہ میں!

(انجم عثمانی کے افسانوی مجموعہ کے اجرا کی تقریب میں پڑھا گیا)

ڈاکٹر وہاب قیصر
وائس پرنسپل ممتاز کالج، ملک پیٹ
حیدر آباد۔ ۵۰۰۰۳۶

شور

شور آج کی شہری زندگی کا ایک لازمی جز بن گیا ہے۔ شور کہاں نہیں ہے! گھروں میں برقی اشیا کا شور، سڑکوں پر ٹریفک شور، دفتروں میں کام کا شور، تعلیم اداروں میں طالب علموں کا شور، کارخانوں میں مشینوں کا شور اور ورک شاپوں میں ہتھوڑوں کا شور رہتا ہے۔ اس کے علاوہ شہر میں کہیں لاؤڈ اسپیکر کا شور ہے تو کہیں بینڈ باجوں کا شور اور کہیں پٹاخوں کے دھماکوں کا شور۔ غرض ہر طرح شور ہی شور ہے اور سارا ماحول شور کی آلودگی میں ڈوبا ہوا ہے، چنانچہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرزا غالب کا یہ مصرع ہر ایک کی دلی آرزو بن گیا ہے۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ہر جگہ پایا جانے والا یہ شور شہروں میں بسنے والوں پر کئی ایک مضر اثرات کا موجب بنتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی سماعت متاثر ہوتی ہے۔ سانس پھولنے لگتی ہے۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ نبض تیز چلنے لگتی ہے۔ عضلاتی کھنچاؤ، ہائی بلڈ پریشر، ہائپر ٹنشن ہارٹ اٹیک اور السر جیسی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ دوسرے اثرات میں متلی، چکر، تھوک بہنا اور آنکھوں کی پتلیوں کا پھیلنا شامل ہیں۔ ایسا شور جس سے ہم مانوس ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی عضویاتی تبدیلی لے آتا ہے۔ جس میں قلبی نالیوں، کان، ناک اور حلق کی خرابیاں قابل ذکر ہیں۔ زیادہ شور کی وجہ سے ذہنی کھنچاؤ، بے خوابی، اداسی اور ڈر جیسے نفسیاتی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ اس بات کا مشاہدہ بھی کیا گیا ہے کہ ٹربوجیٹ سے نکلنے والی بلند آواز، ایرپورٹ پر کام کرنے والے گراونڈ انجینئروں کے سینے میں سخت درد پیدا کرتی ہے۔ ضعیف، بیمار، ذہنی توازن کھوئے ہوئے لوگ اور چار چھ سال تک کی عمر کے بچے شور کے لیے بہت حساس ہوتے ہیں۔ جب وہ سو رہے ہوں تو شور ان کی نیند میں مسلسل خلل انداز ہوتا ہے۔ حاملہ عورتوں پر کیے گئے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ بلند آواز کا شور نہ صرف پیٹ میں بچوں کے دل کی دھڑکن بڑھاتا ہے بلکہ ان کو ناقابل تلافی

نقصان بھی پہنچاتا ہے۔ شدت کا شور صحت کو نقصان پہنچانے کے علاوہ ہمارے معمولات میں بھی خلل انداز ہوتا ہے۔ یہ ہمیں بے چین کر دیتا ہے اور ہمارے کام کرنے کی صلاحیت کو گھٹا دیتا ہے۔ جانوروں پر بھی اس کے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ غیر متوقع بلند آواز، مرغیوں کے انڈے دینے کی شرح کو کم کر دیتی ہے۔ شور جانداروں کے ساتھ ساتھ تعمیر کیے گئے بے جان اسٹر کچرس کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔

بے سُری اور بے ہنگم بلند آوازوں کی وجہ سے شور پیدا ہوتا ہے جب کے سُر تال والی دھیمی آواز موسیقی کہلاتی ہے۔ موسیقی بھی اگر بلند آواز کی ہو تو وہ شور کا باعث بنتی ہے۔ آواز کی حدت یعنی آواز دھیمی ہے یا بلند، معلوم کرنے کے لیے اس کی پیمائش Deci Bel اکائیوں میں کی جاتی ہے۔ جس کو DB سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ Bel کے دسویں حصے dB کو ٹیلی فون کے موجد Graham Bel کے نام سے اخذ کیا گیا ہے۔ ایک dB دھیمی سے دھیمی اس آواز کی حدت کو کہتے ہیں جو ہمیں سنائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر سرگوشی میں 20dB بات میں 40dB، دفتروں کے شور میں 60dB موٹر کے ہارن بجانے پر 95dB، بجلی کی کڑک میں 110dB پٹاخوں کے دھماکے میں 130dB جیٹ طیارے کی اڑان بھرنے میں 140dB اور اسپیس شٹل کی لانچنگ میں 170dB کی آواز پیدا ہوتی ہے۔

شور ہماری سماعت پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا یہ اثر تین طرح کا ہوتا ہے (۱) وقتی طور پر بہرا پن (۲) مستقل طور پر بہرا پن اور (۳) کانوں کے پردے پھٹنا۔ شور کی وجہ سے وقتی طور پر بہرے پن کا شکار ہونے والے جب شور شرابے سے دور کہیں پُر سکون ماحول میں چلے جاتے ہیں تو کچھ عرصہ بعد ان کی سماعت لوٹ آتی ہے لیکن جب شور کا اثر سماعت پر مستقل طور پر ہوتا ہے تو ایسی صورت میں پھر وہ لوٹ کر نہیں آتی۔ 90dB تا 110dB کا شور وقتی طور پر سماعت کو نقصان پہنچاتا ہے لیکن سالہا سال تک اتنی آواز پیدا کرنے والے شور میں رہنے سے سماعت کی قابلیت مستقل طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے کان 120dB تک کی آواز برداشت کر سکتے ہیں۔ جب آواز کی حدت اس سے بلند ہو جاتی ہے تو یہ کان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے یہاں تک کہ اس سے کان کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ شور کی وجہ سے سماعت کے متاثر ہونے کا انحصار جن باتوں پر ہوتا ہے ان میں شور پیدا کرنے والی آواز کی فریکوینسی، اس کے دباؤ کا معیار، اس کا [illegible] Band Width شور کے ماحول میں رہنے کا وقت اور اس کا عرصہ شامل ہے۔ اس بات کا پتا چلا ہے کہ [illegible] کے [illegible] لوگ جب 30dB والی آواز کے غیر آباد علاقوں میں رہا

کرتے تھے تو ان کی سماعت کی صلاحیت بر قرار تھی لیکن جب یہ قبائلی بڑے شہروں کا رخ کرنے لگے تو نہ صرف ان کی سماعت متاثر ہوئی بلکہ ان میں قلبی امراض کا بھی اضافہ ہوا۔

بلند آواز کے مسلسل سنتے رہنے کے بارے میں اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی رہتی ہے کہ جب کان اس آواز کے عادی ہو جاتے ہیں تو سماعت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جب کہ حقیقت میں ہوتا یہ ہے کہ اسی آواز میں مسلسل رہنے کی وجہ سے ضعیفی میں لوگ بہرے پن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ماحول کا شور 50dB سے زیادہ ہو جائے تو وہ لوگوں کی گفتگو میں خلل کا باعث ہوتا ہے اور اگر یہ شور 70dB تک پہنچ جائے تو گفتگو کرنا محال ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ کام کے دوران مخصوص شور کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ جب تک شور نہ ہو وہ اپنے کام حسن و خوبی سے انجام نہیں دے سکتے۔ جیسے کچھ لوگ کام کے وقت ریڈیو یا موسیقی سننا پسند کرتے ہیں۔ کام کے وقت ماحول میں اس طرح کا شور مستقلاً جاری رکھیں تو مستقبل میں صحت پر اس کے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

مختلف شہروں میں پیدا ہونے والا شور مختلف سطحوں کا ہوتا ہے۔ بڑے شہروں میں ٹریفک کا شور بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ حالیہ عرصے میں جرمنی میں کیے گئے ایک مطالعہ سے پتا چلا ہے کہ وہاں ۲۵ لاکھ لوگ ایسے مقامات پر گزر بسر کر رہے ہیں جہاں شور کی سطح بہت اونچی ہے اور یہ شور ان کے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہو رہا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے علاقوں کے لوگ شور سے متاثر نہیں ہیں۔ نیند کے دوران کم سطح کا شور بھی بڑی تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ اس طرح یہ تکلیف بڑھتے بڑھتے صحت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے یہاں تک کہ کتوں کا بھونکنا اور بلیوں کا لڑنا بھی نیند کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ چاہے وہ گانو کے ماحول ہی میں کیوں نہ ہو۔

فرانس میں کیے گئے فیکٹری مزدوروں کے ایک سروے میں اس بات کا پتا چلا ہے کہ شور کی وجہ سے ۸۰ فیصد مزدور سر درد کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ اور Neurosis جیسی اعصابی بیماری کے ہر تین مریضوں میں ایک مریض ایسا تھا جو شور کی وجہ ہی سے اس مرض کا شکار ہوا تھا۔ امریکہ کے لیبر ڈپارٹمنٹ نے 1973ء میں اس بات کا پتا لگایا تھا کہ صنعتی شہروں میں بسنے والوں کا ۲۶ فیصد حصہ بہرے پن کا شکار ہو گیا ہے اور اس بات کا اندازہ بھی لگایا گیا ہے کہ اکیسویں صدی میں صنعتی شہروں کی 30 فیصد آبادی بہری ہو گی۔

ہندستان میں انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ (ICMR) اور ڈپارٹمنٹ آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی (DST) نے 1977ء سے 1982ء تک ملک کے شہروں اور دیہاتوں کے

مطالعہ کے لیے ایک مشترکہ پروگرام بنایا تھا جس کے نتیجہ میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ شور کی وجہ سے شہروں کی 10 فیصد اور دیہاتوں کی 7 فیصد آبادی کی سماعت متاثر ہو چکی ہے۔ مشاہدات سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی ہے کہ کوئی شخص 580دن تک ڈسکو موسیقی سنتا ہے تو وہ 50 فیصد کی حد تک بہرا ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ پاپ موسیقی بھی سماعت پر بُرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ جو لوگ روزانہ بہت زیادہ وقفہ تک Rocd and Roll موسیقی سنتے ہیں انھیں Noise Trauma یا مرض لاحق ہونے کا امکان رہتا ہے۔

شور کی آلودگی کو کم کرنے کے لیے تین طرح کے جتن کیے جاسکتے ہیں۔

(۱) شور پیدا کرنے والی مشینوں میں تکنیکی طور پر تبدیلی لاتے ہوئے آواز پر کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

(۲) ماحول میں آواز کو جذب کرنے والے یا علاحدہ کرنے والے آلات کی شمولیت سے شور پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

(۳) اپنے کانوں پر Ear Plugs یا Ear Muffs کے استعمال سے شور کے اثر کو گھٹایا جاسکتا ہے۔

عمارتوں میں اور کام کی جگہوں پر آرکیٹکٹ کی خدمات حاصل کرتے ہوئے شور کم کرنے والے Interior Decorations کیے جاسکتے ہیں۔ کھلے میدانوں میں درخت اور جھاڑیاں فضائی آلودگی کی طرح ماحول کے شور کو کم کرتے ہیں۔ درختوں اور جھاڑیوں میں آواز کا کچھ حصہ جذب ہوتا ہے اور کچھ حصہ منتشر ہو جاتا ہے، جو شور کم کرنے کا باعث بنتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ امریکہ میں Minneopolis st Paul کے ایرپورٹ پر لگایا گیا Green Belt نے شور کی سطح کو قابل قدر حد تک کم کر دیا ہے۔

شور کو کم کرنے کے اثرات کی تحقیق سے اس بات کا پتا چلا ہے کہ دفتروں کے شور میں 20dB کی کمی کام کی صلاحیت کو ۹ فیصد کی حد تک بڑھاتی ہے اور عملے کی 29 فیصد املا کی غلطیوں کا تدارک کرتی ہے۔ ماہرین ماحولیات نے بہت زیادہ آواز پیدا کرنے والی صنعتوں میں کام کرنے والوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ مشینوں پر روزانہ صرف 8 گھنٹے کام کریں اور بقیہ وقت میں بہت زیادہ آرام کریں۔ صنعتوں کے مالکین اور انجینئروں کو بھی انھوں نے یہ ذمے داری سونپی ہے کہ وہ مشینوں اور اوزاروں میں جہاں تک ہو سکے Sound Proofing کا انتظام کریں۔

نرگس سلطانہ
ماہنامہ "آج کل" اردو
نئی دہلی۔۱

شادی کی تقریبات اور مختلف رسومات

جب کہیں سلک کی ساڑھیوں کی سرسراہٹ اور جگمگاتے ہوئے زیورات کی چمک کے ساتھ لذیذ کھانوں کی مہک، دھوئیں کی مہک کے ساتھ شامل ہو اور زور زور سے آوازیں آرہی ہوں تو سمجھ لیجیے کہ یہ کسی شادی کی تقریب ہے اور اس ساری افراتفری کے درمیان دولہا اور دُلھن متبرک آگ کے سامنے خصوصی طور پر بنائے گئے منڈپ میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیں گے۔ انھیں بہت سی رسومات سے گزرنا ہوتا ہے جسے برہمن ویدک عہد سے ہی ایک جیسے منتر پڑھتے ہوئے انھیں ان رسموں سے گزارتا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ رگ وید کے زمانے میں شادیاں بہت سادگی سے منائی جاتی تھیں۔ اس میں پانی گرھنا کی رسم بہت اہم ہوا کرتی تھی لیکن اس زمانے میں آگ کے گرد چکر لگانے کی کوئی رسم نہیں ملتی لیکن رگ وید کے تقریباً پانچ سو سال کے بعد اتھر وید نے شادی کی مختلف رسموں کو منظم کیا۔ اتھر وید نے خوبصورتی اور دوسرے رسم ورواج کو بہت تفصیل سے بیان کیا جو آج بھی ہندو شادی کی تقریبات میں اسی طرح منائی جاتی ہیں۔ ہاں علاقے کے اختلاف کے ساتھ ساتھ کچھ رسموں میں تھوڑی بہت تبدیلی ضرور ہو گئی ہے، یہ تبدیلی اس لیے بھی ہوئی کہ مختلف Shakya میں یہ رسمیں تھوڑے بہت اختلافات کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ اس لیے ساتھ ہی زمانہ گزرنے اور مختلف قوموں کے ہندستان میں آنے کے سبب تھوڑے بہت اثرات ان لوگوں کے بھی آگئے، لیکن اس کے باوجود جو بنیادی نظریہ اور ویدک شادی کا سسٹم تھا وہ ویسے ہی برقرار رہا۔

اچھے گھرانوں کے دولہا دلھن کا انتخاب اور متبرک ساعت کے انتخاب کے وقت سے ہی شادی کی مختلف رسمیں شروع ہو جاتی ہیں۔ پھر ایک بچولیا تحفے تحائف، پھلوں اور اناج کے ساتھ ایک دوسرے کے گھروں میں بھیجا جاتا ہے۔ لڑکی کا انتخاب اس کی خصوصیت اور کردار کی جانچ گرہ سوتر Grih Sutre میں دیے گئے بھاؤ کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ ایک بار یہ ابتدائی بات چیت اور دیکھ پرکھ کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد پھر شادی کی دیگر رسمیں پوری کی جاتی ہیں۔ علاقے کے اختلاف کے ساتھ ان میں کون سی رسم ادا کی جائے اس ترتیب میں تھوڑی تبدیلی تو ہو سکتی ہے لیکن

اصل رسموں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ سبھی گرہ سوتروں میں غسل طہارت کا ذکر کیا گیا ہے جس کے کرنے سے سبھی برے اثرات دُھل جاتے ہیں لیکن ہر گرہ سوتر میں یہ غسل الگ الگ مراحل میں بتایا گیا ہے۔ Mahu Grih Sutra میں کہا گیا ہے کہ غسل کا پانی کسی سوراخ دار چیز سے اوپر گرایا جائے۔ ان میں ایک حوالہ Upala کا بھی ہے کہ جس کا کوڑھ کا مرض اندرا دیوی کے تین نالی دار پائپوں سے پانی گرانے سے دور ہو گیا تھا۔ اس علامت کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب عورت مرد کی محکوم ہو گئی۔ اس کے بعد شادی کی اصل رسم متبرک آگ کے سامنے بہت سے سوتروں کی مدد سے پوری کی جاتی ہے۔ زیادہ تر شادیاں پانی گرھنا سے شروع ہوتی ہیں جن میں دولہا دلھن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر یہ دعا کرتا ہے کہ جس طرح سے ہاتھ میں ہاتھ ملا ہے اسی طرح سے دل سے دل اور خیال سے خیال مل جائے۔ پھر یہ جوڑا ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے متبرک آگ کے سامنے تین بار طواف کرتا ہے۔ اس دوران منتر پڑھے جاتے ہیں ہر طواف کے پورا ہونے پر دولھا پاس میں رکھے ہوئے ایک پتھر پر چڑھتا ہے اور یہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ دلھن بھی شادی شدہ زندگی میں پتھر کی طرح جمی رہے۔ سپ تاپادی گا ما Sapta Padi Gamana کا مطلب وہ سب سے اہم رسم ہوتی ہے جب دولھا دلھن کا ہاتھ پکڑے ہوئے شمال مشرق کی سمت میں سات قدم چلتا ہے۔ اس دوران وہ منتر بھی پڑھتا رہتا ہے جس میں ہر قدم کی اپنی اہمیت جتائی گئی ہے۔ لاجاہو ماتیا کل میں ایک اہم رسم اس وقت پوری کی جاتی ہے جب دلھن کا بھائی اس کے ہاتھ میں تلا ہوا اناج اور گھی تین اشلوک پڑھ کر دیتا ہے۔ پھر دلھن کے بالوں میں اون کی دو چوٹیوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا جاتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے کہ دلھن اب اپنے ماں باپ یعنی میکے سے جدا ہو گئی۔ اب اس کے باپ نے اس کے شوہر کو بطور تحفہ عطا کر دیا۔ ان رسموں کے پورا ہونے کے بعد ایک حکم یہ ہے کہ شام کا جھٹپٹا ہونے تک دونوں بالکل خاموش رہیں اور دولھا اس خاموشی کو اس وقت توڑتا ہے جب وہ دلھن کو کھلے صحن میں لا کر انورادھا ستارے کو دکھاتا ہے کیونکہ یہ ستارہ وفاداری اور مضبوطی کی علامت ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ ویدوں نے اس جوڑے کی ازدواجی زندگی کو ہر طرح سے تحفظ دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔

اس طرح شاستروں میں بیان کی گئی رسموں کے علاوہ کچھ اور رسمیں بھی ہیں جو جادو کے تحت اپنائی گئی ہیں۔ ان میں منگل سوتر کی رسم بھی ہے جس میں ایک متبرک دھاگا لڑکی کے گلے میں پہنایا جاتا ہے۔ یہ رسم زیادہ تر جنوبی ہند میں پائی جاتی ہے۔ پھر دولھا دلھن ایک دوسرے کو ہار پہناتے ہیں۔ بنگال، بہار، اڑیسہ، میں دلھن کے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس میں سیندور بھرا جاتا ہے۔ شمالی ہند میں شادی کی جو رسمیں منائی جاتی ہیں وہ سب ویدک نہیں ہوتیں بلکہ ان علاقوں میں

رفتہ رفتہ رواج پاگئی ہیں جنھیں بعد میں شادی کی رسم کا ضروری حصہ مان لیا گیا ہے۔

جنوب کے کچھ علاقوں خصوصاً تامل ناڈو میں کچھ ذاتوں میں ایک رسم یہ بھی پائی جاتی ہے کہ شادی سے پہلے دولھا سے ایک بڑا پتھر اٹھانے کے لیے کہا جاتا ہے۔ اگر اس نے پتھر اٹھالیا تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ سخت سے سخت مصیبتوں کا سامنا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ بعض جگہوں پر دولھا سے سانڈ کو سینگ سے پکڑ کر قابو پانے کے لیے کہا جاتا ہے۔ اگر اس نے ایسا کرلیا تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ عروس کو اپنے قابو میں رکھے گا۔ کہیں کہیں شادی کے طے ہوتے ہی دولھا اپنے گھر سے کہیں بھی چلا جاتا ہے جسے کاشی یاترا بولتے ہیں۔ پھر جب دلھن کے گھر والے اس کے پاس پہنچتے ہیں اور اس سے منت سماجت کرتے ہیں کہ تم گھر واپس چلے چلو' ہم تمھیں اپنی بیٹی دے دیں گے، تو وہ اپنے گھر واپس آتا ہے اور دیگر رسموں کے ساتھ شادی کی تقریب پوری ہوتی ہے۔

اس طرح کی رسمیں صرف ہندو گھرانے کی شادیوں میں ہی نہیں پائی جاتیں گرچہ یہ اس طرح کی پیچیدگی کی حامل نہیں ہوتیں لیکن وہ ہندستان کے دوسرے مذاہب کی شادیوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

مسلم شادیاں اس طرح کی مذہبیت سے بھرپور جذبہ نہیں رکھتیں کیونکہ یہ ایک طرح سے لڑکی کے درمیان معاہدے کی شکل میں ہوتی ہیں جسے مذہب کی اجازت سے کیا جاتا ہے۔ ان شادیوں میں گرچہ شرعی حصہ بہت سیدھا اور معمولی اور اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہوتا ہے لیکن سماج کے اثر سے ان شادیوں میں بھی بہت سے رسم و رواج جگہ پاگئے ہیں۔ نکاح کی تقریب پوری ہونے کے بعد آرسی مصحف کی رسم ادا کی جاتی ہے جس کا مطلب ہوتا ہے کہ قرآن کے سایے کے نیچے اور ایک آئینے کو دولھا اور دلھن کے درمیان رکھ کر جس میں وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھتے ہیں، اس طرح کی رسم ادا کرتے وقت ان دونوں کے سر چادر یا شال سے ڈھک دیے جاتے ہیں گرچہ یہ بہت ہی نجی قسم کا لمحہ ہوتا ہے تاہم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ہر قدم پر بڑے بوڑھوں کی دعائیں لی جاتی ہیں۔ رخصتی سے پہلے دولھا کی سلامی ہوتی ہے۔ جس میں دولھا، دلھن کی والدہ اور دوسری رشتے کی عورتوں کو سلام کرتا ہے۔ اس سلامی پر اسے کچھ رقم یا تحفہ ساس کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے جس میں دلھن اپنا چہرہ سب کو دکھاتی ہے۔ نکاح کے دوسرے دن دولھا کی طرف سے دوستوں، عزیزوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے جسے دعوت ولیمہ کہا جاتا ہے۔

مختلف مسالک کے تحت بعض علاقوں میں یہ رسمیں کچھ تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ منائی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں سلامی کے ساتھ جوتے چرانے کی رسم بھی منائی جاتی ہے تو کہیں آرسی مصحف کے وقت دولھا سے قرآن کی کچھ سورتوں کو پڑھوا کر دلھن پر دم کرلیا جاتا ہے۔ تو کہیں آرسی

مختلف کے وقت دولہا دلہن سے کہتا ہے کہ تم اپنا چہرہ دکھاؤ میں تمہارا غلام ہوں۔ ایک رسم اور ہوتی ہے جس میں لڑکی کے گھر والے دولہا کو سبزیوں اور پھلوں سے مارتے ہیں نیز رخصتی کے بعد جب لڑکی گھر آتی ہے تو دولہا کے گھر والے ایک تھالے میں پانی ڈال کر اس میں چند سکے گراتے ہیں اور پھر دولہا اور دلہن کے ساتھ آئی خاتون میں مقابلہ شروع ہو جاتا ہے کہ وہ سکہ پہلے کون نکالتا ہے۔ اسی دن دولہا، جس دوپٹے کو دلہن اوڑھے ہوتی ہے۔ اس کا کچھ حصہ زمین پر بچھا کر اس پر دو رکعت نماز ادا کرتا ہے۔ غالباً یہ اس بات کی علامت ہے جس میں دولہا دلہن کے سامنے اپنی غلامی کا اعلان کرتا ہے یا یہ بھی ہے کہ دلہن کا آنچل اتنا پاکیزہ ہوتا ہے کہ جس پر نماز پڑھی جا سکے۔ دوسرے دن صبح دولہا عروس کے بالوں میں پڑی ہوئی سات گانٹھوں کو کھولتا ہے۔ یہ بھی ایک علامت ہے اس بات کی کہ دولہا ہر طرح کی دشواریوں پر قابو پا چکا ہے۔ اسی طرح کی ایک رسم اور ہوتی ہے جسے دروازہ چھیکنا کہتے ہیں جس میں دولہا کی بہنیں دلہن کو اس وقت تک گھر کے اندر داخل نہیں ہونے دیتیں جب تک انھیں مطلوبہ رقم نہیں مل جاتی۔ اسی طرح بعض جگہوں پر عروس کو دولہا کی طرف سے منہ دکھائی کی رسم پر کچھ تحفہ یا رقم دینی پڑتی ہے۔ یہ رسمیں حسب نسب اور علاقوں اور عقائد کی بدولت تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

عیسائی شادیوں میں خدا کے فضل اور رحم و کرم کی دعا ہوتی ہے۔ گرچہ ہندستان کے مختلف علاقوں میں بسنے والے عیسائیوں میں ان جگہوں کے رسم و رواج بھی داخل ہو گئے ہیں تاہم چرچ میں ہوئی شادی جس میں پادری خدا سے فضل و کرم کی دعا کرتا ہے خاص بات ہوتی ہے۔ زیادہ رسمیں مختلف علامتوں کا اظہار کرتی ہیں۔ پادری لڑکا اور لڑکی کے داہنے ہاتھ کو ایک دوسرے سے ملا دیتا ہے۔ جو علامت ہے کہ اب یہ دونوں ایک ہو گئے ہیں جب کہ انگوٹھی کی تبدیلی یعنی لڑکی لڑکے کو انگوٹھی پہناتے ہیں جو اس بات کی علامت ہے کہ دونوں میں بے پناہ محبت پائی جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کی کمی پوری کریں گے۔

سکھ اور پارسی شادیوں میں مقدس آگ کا بہت اہم رول ہے۔ سکھ شادیوں میں دولہا اور دلہن مقدس آگ کے سامنے بیٹھتے ہیں تب گرنتھی لڑکی کے اوپر پڑی ہوئی چادر کو لڑکے کے کندھے پر پڑے ہوئے کپڑے سے گانٹھ باندھ دیتا ہے اور پھر وہ دونوں چار مرتبہ آگ کا پھیرا کرتے ہیں۔ اس دوران گرنتھی گرو گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتا رہتا ہے۔ چکر کے پورا ہونے پر شادی کی رسم پوری ہو جاتی ہے۔

ابتدا میں پارسیوں کے یہاں بھی شادی ایک منڈپ میں کی جاتی تھی جہاں آگ جلائی جاتی تھی لیکن اب وہ فائر ٹمپل میں جانے لگے ہیں جہاں وہ مقدس آگ سے آشیرواد لیتے ہیں۔ اس سے

پہلے آپس میں شادی [illegible]

اسی طرح بدھ مذہب کے ماننے والوں کی شادیوں میں بھی جو کہ کچھ مختلف اور سیدھی سادی سی ہوتی ہیں خصوصاً ناگپور کے علاقے میں، شادی کے دن دولہا اور دلہن بودھ مٹھ میں جاکر آمنے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مٹھ کا پجاری آکر ان کا نام اور پتا پوچھتا ہے۔ پھر منتر پڑھ کر دونوں کا ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور پھر دولہا دلہن ایک دوسرے کو مالا پہناتے ہیں۔ ان کے ہاں شادی میں جہیز یا رقم کا کسی بھی طرح کا کوئی لین دین نہیں ہوتا بلکہ شادی کے دن دوست احباب، عزیز و اقارب ملنے جلنے والے جو بھی شادی میں شرکت کرتے ہیں اپنی اپنی پسند کا تحفہ جو ازدواج کی گرہستی سے جڑا ہوا ہوتا ہے، لاتے ہیں اور ایک طرف پنڈال میں جمع کرتے جاتے ہیں۔ اس وقت جو کچھ بھی مل جائے وہ ان دونوں کا مشترکہ تحفہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد لڑکی کے گھر والوں کی طرف سے کھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے پھر دوسرے دن لڑکے کے گھر والے بھی اسی طرح کا اہتمام کرتے ہیں۔

ویدوں میں شادی کے جو طریقے بتائے گئے ہیں وہ بہت سے یورپین ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ویدک رسم کے تحت پانی گرھنا کی رسم سب سے اہم ہے جس میں دلہن کے ہاتھ میں دولہا کا ہاتھ دیا جاتا ہے۔ اس طرح کی رسم رومن رواجوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ جہاں اس کا نام Dexterum Junctio ہے۔ قدیم ایران میں مذہبی پیشوا ان کے داہنے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے جسے ہاتھاوار وکہتے ہیں۔ عیسائیوں کی شادی میں بھی ایک دوسرے کے داہنے ہاتھ جوڑنے کی رسم پائی جاتی ہے۔ اسی طرح شادی سے پہلے نہانے کی رسم بھی دوسرے ملکوں میں پائی جاتی تھی۔ قدیم یونان میں ایک خاص قسم کے برتن میں لڑکا کسی چشمے کا پانی لاتا تھا اور پھر اس سے نہاتا تھا جبکہ روم میں دلہن کے گھر میں داخلے سے پہلے اس پر پانی چھڑک کر دلہن کو پاک کیا جاتا تھا۔ اسی طرح سے کچھ اور بھی رسمیں ہیں جو ایک دوسرے سے مماثلت رکھتی ہیں۔ ویدک روایتوں میں کہا گیا ہے کہ شادی کے وقت دلہن کو کسی کھال پر بٹھایا جائے۔ ایتھنز میں بھی دلہن کو کھال پر بٹھایا جاتا تھا جس طرح سے ویدک رواجوں میں سپ تاپادی گامانا کی رسم پائی جاتی تھی جس میں دولہا دلہن کو شمال مشرق کی طرف سات قدم چلاتا تھا۔ یہی رسم یہودیوں کے یہاں بھی پہلے ہوتی تھی جس میں دلہن دولہا کے گرد سات بار چکر لگاتی تھی۔

ہندستان میں شادیوں میں طرح طرح کی رسمیں ضرور پائی جاتی ہیں لیکن اس معاملے میں ہندستان اکیلا نہیں ہے۔ مختلف ممالک میں شادی کی بہت سی رسمیں پائی جاتی ہیں جن کے بیان کے لیے پوری کتاب بھی ناکافی ہے۔ عورت اور مرد کو کسی ایک بندھن میں باندھ کرتا کہ وہ نسل انسانی کی افزائش کر سکیں، کی ضرورت کے تحت شادی کا ادارہ قائم ہوا لیکن اسے رنگین اور تفریح کا ذریعہ بنانے کے لیے مختلف طرح کی رسومات جوڑی گئی ہیں۔ اس تقریب سے عام آدمیوں کی زندگیاں بھی تھوڑی دیر کے لیے خوشیوں سے بھر جاتی ہیں اور وہ زندگی کے تلخ حقائق سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں

جائزے

داستان امیر حمزہ
زبانی بیانیہ، بیان کنندہ اور سامعین

مصنف : شمس الرحمٰن فاروقی
صفحات : ۱۴۴
قیمت : ۶۰ روپے
پبلشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی
مبصر : احمد محفوظ

یہ کتاب دراصل ان خطبات پر مشتمل ہے جنھیں شمس الرحمٰن فاروقی نے دہلی یونیورسٹی شعبہ اردو کے زیر اہتمام "نظام خطبات" کے سلسلے میں ۲۶؍ فروری ۱۹۹۸ء کو پیش کیا تھا۔ علاوہ ازیں اس کتاب کے مشمولات فاروقی کی زیر تصنیف مفصل کتاب، "داستان کی شعریات" کا حصہ بھی ہیں جس کے چند مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ البتہ زیر تبصرہ کتاب شمس الرحمٰن فاروقی کے مطالعہ داستان کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے جو باقاعدہ کتابی صورت میں منظر عام پر آئی ہے۔

اگر یہ سوال پوچھا جائے کہ ایسے دور میں جب کہ ہمارے یہاں داستان سننے سنانے کا رواج بالکل ختم ہو چکا ہے اور اس فن کے امکانات بھی مٹ چکے ہیں فاروقی نے ۴۶ ضخیم جلدوں (یعنی بڑے سائز کے کئی ہزار صفحات) پر مشتمل داستان امیر حمزہ کے غائر مطالعہ کا درد سر کیوں مول لیا اور کیوں یہ ضروری سمجھا کہ داستان کے فنی اصولوں کو مرتب و منظم صورت میں سامنے لایا جائے؟ تو بظاہر یہ سوال بہت مناسب معلوم ہوگا اور فاروقی کی اس سلسلے میں غیر معمولی محنت بہت زیادہ سود مند نظر نہ آئے گی لیکن سطح پر یہ سوال جتنا برمحل اور مناسب معلوم ہوتا ہے، اگر وسیع تناظر میں اس پر غور کیا جائے تو یہ اتنا ہی بے محل اور گمراہ کن بھی ثابت ہوگا۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ کوئی بھی ادبی روایت پوری طرح از کار رفتہ کبھی نہیں ہوتی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ عملی صورت میں اس کا چلن بہت کم ہو جائے یا ختم بھی ہو جائے جیسا کہ ہمارے یہاں قصیدہ، مثنوی اور داستانوں کے ساتھ ہوا۔

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان روایتوں سے اب ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے یا نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگر ایسا ہے تو ہم نہ صرف اپنی قدیم ادبی روایت سے باغی ہوں گے بلکہ اپنے تہذیبی ماضی سے بغاوت کے بھی مرتکب ٹھہریں گے۔

داستان کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی نے جو اتنا بڑا کام اپنے ذمہ لیا ہے اس کے کئی اسباب ہیں۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ اس کام کے ذریعہ وہ ہماری قدیم ادبی روایت کے اس بڑے اور قابل ذکر حصہ کی اس طرح تنقیدی بازیافت کرنا چاہتے ہیں جس سے موجودہ نسل اور آیندہ نسلیں بھی داستان کو قدر اور تحسین کی نظر سے دیکھنے پر مائل ہوں اور ساتھ ہی ہمارے اندر اپنے ادبی و تہذیبی ماضی کے تئیں جو غلط اور بے بنیاد تصورات جڑ پکڑ چکے ہیں ان کا ازالہ بھی ہو۔ یہاں کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ صدی میں داستان کے تعلق سے جو تنقیدی کام ہوئے ہیں ان کا مقصد بھی نئے زمانے میں داستان کی قدیم ادبی روایت کی خوبیوں کے احساس کو عام کرنا تھا لہٰذا اس سلسلے میں فاروقی کا کوئی خاص Credit نہیں ہے۔ یہ بات ایک حد تک صحیح ہے اور اس کا اعتراف خود فاروقی نے بھی کیا ہے کہ داستان کے بیشتر نقادوں مثلاً گیان چند جین، کلیم الدین احمد اور محمد حسن عسکری وغیرہ نے داستان کا تنقیدی مطالعہ خلوص کے ساتھ کیا لیکن چونکہ اکثر نقادوں نے مطالعہ داستان میں جو تنقیدی طریق کار اختیار کیا وہ نہ صرف غلط تھا بلکہ حد درجہ گمراہ کن بھی تھا اس لیے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تنقیدوں سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ یا تو ناکافی تھے یا ایسے تصورات کے حامل تھے جن کی روشنی میں داستان کا فن خوبیوں کے بجائے بے شمار خامیوں سے مملو قرار پایا۔ لہٰذا داستان امیر حمزہ کے تنقیدی مطالعے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اس کے ذریعہ فاروقی اپنے پیش رو نقادوں کی ان کوتاہیوں کو نشان زد کرنا چاہتے ہیں جن سے فاروقی کے خیال میں داستان کے فن کو فائدہ تو کم ہوا البتہ نقصانات بہت زیادہ ہوئے۔ چنانچہ انھیں ضروری معلوم ہوا کہ ان فنی اصولوں اور طور طریقوں کو مرتب شکل میں سامنے لائیں جن کی روشنی میں ہماری داستانیں تخلیق کی گئی ہیں اور جن کے پیش نظر ہی یہ داستانیں مہتم بالشان ادبی وجود کا درجہ حاصل کرتی ہیں۔

فاروقی کا خیال ہے کہ داستان کی تنقید میں ہمارے نقادوں سے جو سب سے بڑی اور بنیادی کوتاہی ہوئی وہ یہ تھی کہ انھوں نے داستان کو بھی بیانیہ کے ان اصولوں کی روشنی میں پڑھا جن پر عام طور سے ناول کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ یعنی انھوں نے داستان اور ناول دونوں کے بیانیہ کو ایک ہی طرح کا سمجھ لیا جبکہ دونوں میں بنیادی فرق ہے داستان زبانی بیانیہ ہے اور ناول تحریری بیانیہ اور چونکہ ہر دو بیانیہ یعنی زبانی اور تحریری کی حرکیات Dynamics ایک

دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا زبانی بیانیہ پر مبنی صنف کو اگر تحریری بیانیہ پر مبنی صنف کے اصولوں پر پرکھا جائے گا تو کبھی صحیح نتائج سامنے نہ آئیں گے۔ فاروقی داستان کو زبانی بیانیہ کی صنف قرار دیتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ "زبانی بیانیہ کے اپنے ضوابط اور اپنے رسومیات ہوتے ہیں۔ ان رسومیات میں بعض ایسے ہیں جو کسی اور صنف میں نہیں ملتے لہٰذا داستان کا مطالعہ بنیادی طور پر ایک آزاد علومیہ Disciplineکا حکم رکھتا ہے۔" (صفحہ ۱۵)

زیرِ نظر کتاب کے پہلے باب میں جو "زبانی بیانیہ" کے عنوان سے ہے فاروقی نے بڑی تفصیل سے ان عناصر کا جائزہ لیا ہے جو زبانی بیانیہ میں موجود ہوتے ہیں۔ دیگر دو ابواب جو "بیان کنندہ" اور "سامعین" کے عنوان سے ہیں پہلے باب کے آدھے صفحات پر ہی مشتمل ہیں۔ اس اختصار کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیان کنندہ اور سامعین سے متعلق باتیں دراصل زبانی بیانیہ کے سلسلے کی ہی ضمنی کڑیاں ہیں۔ راوی کے بجائے "بیان کنندہ" کی ترکیب کا استعمال فاروقی نے غالباً اس لیے کیا ہے کہ داستان کے زبانی بیانیہ کا تصور پوری طرح مستحکم ہو جائے۔ چونکہ کسی بھی بیانیہ میں Narrator کے لیے عام طور سے "راوی" کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے اس لیے راوی کے بجائے بیان کنندہ کے لفظ سے زبانی بیانیہ کا امتیاز بھی قائم ہو جاتا ہے۔ اس طرح "بیان کنندہ" لفظ کا استعمال بھی ایک خاص مقصد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ داستان کے زبانی سنائے جانے کے سبب اس میں سامعین کا وجود بھی خاصی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ فاروقی نے ان پہلوؤں کی طرف بھی نہایت کارآمد اشارے کیے ہیں جن کی بنا پر سامعین کا وجود اور ان کی نوعیت داستان پر اثرانداز ہوتی ہے۔ داستان کے تعلق سے زبانی بیانیہ کا تصور چونکہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اسی تصور کو نقادوں نے عام طور سے نظرانداز بھی کیا اس لیے زیرِ نظر کتاب میں فاروقی نے زبانی بیانیہ کا باب قائم کر کے اس پر نہایت تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے داستان امیر حمزہ کے مختلف نسخوں کے اقتباسات کا تقابل بھی کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ داستان کے ایک ہی واقعہ کو جب الگ الگ داستان گو بیان کرتے ہیں تو ان کے بیان میں طرح طرح کے فرق بھی واقع ہو جاتے ہیں۔ فاروقی نے زبانی بیانیہ پر بحث کرتے ہوئے داستان امیر حمزہ کے فارسی اور اردو نسخوں سے متعدد مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ بعض جگہ حد درجہ طویل اقتباسات گراں بھی گذرتے ہیں۔

آج جبکہ دنیا کی بیشتر قومیں اپنے ماضی کی روایات سے دوبارہ رشتہ قائم کرنے میں مصروف ہیں، ہمارے لیے یہ امر باعث مسرت ہے کہ اردو کے حوالے سے بھی یہ کام شروع ہو چکا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ کتاب بھی دراصل اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ فاروقی کے

داستان سے متعلق زیر تکمیل بڑے منصوبے کی اس کڑی کو سب سے پہلے کتابی صورت میں شائع کر کے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے یقیناً نمایاں خدمت انجام دی ہے کیونکہ یہ کتاب داستان کے فن کو بالکل نئے تنقیدی تناظر عطا کرتی ہے۔

آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح

مصنف : نامی انصاری

مبصر : صغرا مہدی

شائع کردہ : معیار پبلی کیشن، دہلی

قیمت : ۱۵۰ روپے

نامی انصاری نے تنقید کے موضوع پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں اور ان کا شمار اچھے نقادوں میں ہوتا ہے۔ زیر نظر تصنیف "آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح" ان کی تازہ تصنیف ہے۔

موصوف کا مقصد اس کتاب کے ذریعے طنز و مزاح کی افادیت اور اہمیت کو ثابت کرنا ہے۔ ابتدا سے آزادی تک اردو نثر میں طنز و مزاح کی تلاش و جستجو اس کتاب کا پس منظر ہے اور پیش منظر میں آزادی کے بعد کی مجموعی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے اور موصوف اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ "طنز و مزاح کے اس نئے منظر نامے میں شوخ و شنگ لہروں کی وسعت و توانائی اور ان کے دائرہ کار میں اضافہ ہوا ہے لیکن اس کے مستقبل پر سوالیہ نشان اب بھی قائم ہے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ طنز و مزاح کی آیندہ منزل کہاں ہو گی بلکہ کوئی منزل ہو گی بھی یا نہیں۔"

پہلے باب میں رشید احمد صدیقی کے مضامین میں طنز و مزاح کا جائزہ لیا گیا ہے اور اب تک بعض نقادوں نے رشید صاحب کے طنز و مزاح کے بارے میں رائیں قائم کی ہیں۔ ان سے اختلاف کیا گیا ہے اور یہاں نامی انصاری صاحب ان نقادوں سے زیادہ متفق ہیں جو رشید احمد صدیقی کو بڑا طنز و مزاح نگار نہیں مانتے، جن کا خیال ہے کہ ان کا کینوس محدود ہے یہاں تک کہ ان کے زبان و بیان میں بھی بہت سقم ہیں اور مصنف نے اپنی رائے کو آج کے جید نقاد اور زبان داں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے مستحکم کیا ہے۔ "ان کی زبان بھی بہت ہموار بہت سبک اور بہت رواں نہیں ہے۔ وہ عربی فارسی تراکیب استعمال کرنے کے بڑے شائق ہیں لیکن ان کے جملوں میں اکثر اغلاق پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی ان کی اردو بھی نحوی اعتبار سے ساقط نظر آنے لگتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے نمبر وار گیارہ جملوں میں ان کے غلط

زبان لکھنے کی نشاندہی کی ہے۔"

اس کے بعد جو اہم مزاح نگار ہیں وہ تو پاکستان کے ہیں کرنل محمد خاں اور مشتاق احمد یوسفی۔ اس کے علاوہ احمد جمال پاشا اور مجتبیٰ حسین۔ نامی انصاری نے ظرافت کے اس عہد کو مشتاق احمد یوسفی کے نام کر دیا ہے اور ہندستان میں مجتبیٰ حسین کو ہر میدان کا مرد ٹھہرا لیا ہے۔
اس کے بعد کالم نگاری، خاکہ نگاری اور مزاحیہ سفرناموں میں طنزیہ اور مزاحیہ عناصر کی تلاش کی گئی ہے اور ان پر رائے قائم کی گئی ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ اردو نثر میں طنز و مزاح کا جب جائزہ لیا جائے تو یہ توقع ہوتی ہے کہ اس میں سب نثری اصناف کو موضوع بحث بنایا جائے گا ورنہ اس کی وضاحت ہونی چاہیے تھی کہ صرف کالم نگاری، خاکہ نگاری اور سفرناموں میں طنز و مزاح کا جائزہ لیا جائے گا۔ ایک جگہ مصنف نے قرۃ العین حیدر کے "ناولوں میں طنز و مزاح عناصر کا ذکر کیا ہے وہ بھی اس معذرت کے ساتھ "شاید یہ غیر روایتی معلوم ہو۔" مصنف نے اس موضوع پر کچھ کتابیں اور بہت سے اہم ناموں کو نظر انداز کر دیا ہے، کچھ کا ذکر بہت سرسری ہے اور کچھ مزاح نگاروں کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا ہے مثلاً یوسف ناظم، مزاحیہ کالم نگاری میں ڈاکٹر عابد حسین کی کالم نگاری کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔

بات ہے یوں کہ اردو نثر میں طنز و مزاح اس قدر وسیع موضوع ہے کہ اس کا احاطہ کرنا اور اس کے ساتھ پورا انصاف کرنا کار دارد ہے۔

اس کتاب کی یہ افادیت ہے کہ آج کل کے پاپولر مزاح نگاروں کے بارے میں مواد کی کمی کے باعث طلبہ کو جو پریشانی ہوتی ہے، یہ کتاب اس کو دور کر دے گی اور آزادی کے بعد کالم نگاری، سفرناموں اور خاکوں میں طنز و مزاح کا ادھورا ہی سہی مگر ایک خاکہ سامنے آجاتا ہے۔
کتاب کی کتابت اور طباعت بہت خوب ہے۔

	افسانہ نگار:	انل ٹھکر
	مبصر :	ڈاکٹر فرحت فاطمہ
موسمی پرندے	قیمت :	۱۰۰ روپے
(افسانوی مجموعہ)	ناشر :	موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی
	سال اشاعت:	۱۹۹۸ء

"موسمی پرندے" انل ٹھکر کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ ۱۴۴ صفحات کے اس مجموعے میں انل ٹھکر کے نو افسانے شامل ہیں۔ انل ٹھکر غیر معروف افسانہ نگار نہیں ہیں، وہ

ایک مانے ہوئے ڈراما نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے ڈراموں کے دو مجموعے اور افسانوں کا ایک مجموعہ "گرم برف" اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ اتل ٹھکر ہندی میں بھی لکھتے ہیں لیکن اردو سے ان کا ذوق و شوق ان کی اردو تحریروں میں پوری طرح نمایاں ہے۔

"موسمی پرندے" کے شروع میں پیش لفظ کے طور پر ڈاکٹر حامدی کاشمیری کا مضمون ہے۔ مقدمہ انور خان نے لکھا ہے۔ ان دونوں مضامین سے اتل ٹھکر کی افسانہ نگاری کے ذہنی و فکری رویے اور تخلیقی عمل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ان کے موضوع اور اسلوب میں بڑی تازگی اور دلکشی ہے۔ ان کے افسانوں میں یکسانیت نہیں بلکہ خیالات کی ندرت پائی جاتی ہے۔ افسانے کے فن اور ٹیکنیک پر بھی ان کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔ اتل ٹھکر کے افسانے روزمرہ کی زندگی کی ان کمزوریوں اور خامیوں کی عکاسی کرتے ہیں جن سے اس عہد کی زندگی عبارت ہے۔ ان کے افسانوں میں رشتوں سے بے تعلقی، بے یقینی اور ناقدری کا درد پوری طرح نمایاں ہے۔ ان کے کرداروں کا رشتہ عام انسانی زندگی، سماج اور اقدار سے بڑا گہرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے پڑھتے ہوئے ساری فضا، ماحول، واقعات، سانحات، ہمیں اجنبی نہیں لگتے بلکہ جانے پہچانے لگتے ہیں۔ اتل ٹھکر نے اپنے افسانوں کے ذریعے ہمارے شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ حقیقت پسند روایت کے امین ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں نئے تخلیقی زاویے کے ساتھ آج کی عصری حیثیت کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ طویل بیانیہ یا منظر نگاری سے کام نہیں لیتے بلکہ اشارے کنایے سے پورے ماحول کی تصویر کھینچتے ہیں۔ اتل ٹھکر نے سماج کے مختلف طبقوں، خاص کر نچلے طبقے کی زندگی کے درد و کرب کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے۔

ان کے افسانوں میں ناآسودہ خواہش، بے وطنی کا درد، معصوم انسانوں کا استحصال، مجروح انا کی اذیتیں موت کی الم ناکی، انسان کی ناتمام آرزوؤں کا دکھ، بڑی شدت سے قاری پر اثرانداز ہوتا ہے۔ افسانے "گونگی چیخ" اور "ابھی نریندر مرا نہیں" آج کے سیاسی ماحول کی تلخ سچائیوں کا کامیاب اظہار ہے۔ "سانسیں اپنی قبروں میں" جگی جھونپڑیوں میں رہنے والی ماں بیٹی کی حیوانوں سے بدتر زندگی کے درد و کرب کی بڑی موثر کہانی ہے۔ افسانہ "آرائش" میں کچلی ہوئی انا کا المیہ قاری کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ "تنہا شہسوار" میں شاعر کا کردار اس لیے فکرمند اور پریشان ہے کہ اس کے گھر میں اس کی زبان "اردو" سمجھنے والا کوئی نہیں اور جب اس کا پوتا اس کی سند پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچ کر کہتا ہے کہ وہ اردو لکھ رہا ہے تو وہ خوش ہو کر اسے گلے لگا لیتا ہے۔

"موری کا پر تمہید" کے سب ہی افسانے کہانی پن کی اچھی مثال ہیں۔ ان افسانوں کی زبان سادہ اور مکالمے فطری اور رواں ہیں۔ توقع ہے کہ افسانوی دنیا میں یہ کتاب مشہور اور مقبول ہوگی اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

کتابت اور طباعت بھی خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ ٹائٹل جاذب نظر اور دلکش ہے۔ قیمت بھی نہایت مناسب ہے۔

مصنف: ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی
مبصر : کوثر مظہری

حسرت موہانی اور انقلاب آزادی صفحات: ۵۶۱

قیمت : تین سو روپے
ناشر : خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

مولانا حسرت موہانی کی حیثیت کئی جہتوں سے مسلّم ہے۔ وہ ایک محب وطن اور تحریک آزادی کے سچے سپاہی تھے۔ وہ ایک بے باک صحافی تھے۔ وہ حسن و عشق سے سرشار شاعری میں نقش دوام کے مالک تھے۔ "تھے" سے یہ مراد نہیں کہ اب یہ حیثیتیں ماند پڑ چکیں، بلکہ اب بھی مسلم ہیں۔

ڈاکٹر نفیس احمد خود چونکہ گوناگوں اور بوقلموں شخصیت کے مالک ہیں اس لیے انھوں نے حسرت موہانی کی شخصیت کی بوقلمونی بجا طور پر ظاہر کی ہے۔ نفیس صاحب نے بڑی دیدہ ریزی اور مشقتوں سے حسرت موہانی سے متعلق Documents اور References جٹائے ہیں۔ چونکہ مصنف کا سیاسی اور تاریخی Vision بہت واضح ہے اس لیے انھوں نے حسرت موہانی کی سیاسی بصیرت کا تجزیہ بھی بڑی دانائی اور سچائی کے ساتھ کیا ہے۔ حسرت موہانی سے انھیں خاص اُنس رہا ہے۔ اس کتاب سے پہلے ان کا ایک مقالہ "حسرت موہانی کی شاعری میں احتجاج" منظر عام پر آچکا ہے جس کا ذکر انھوں نے زیر مطالعہ کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے۔

اس کتاب کو مصنف نے چھے مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول میں پیدائش، تعلیم، شادی، عادات و خصائل اور عملی زندگی کا آغاز وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر نفیس نے ڈاکٹر احمر لاری اور ڈاکٹر خلیق انجم کے ذریعے وضع کردہ حسرت موہانی کی دو محبوباؤں "ن"

بسر اور "ح" بسر کو غلط ثابت کیا ہے۔ انھوں نے اس کی وضاحت کی ہے کہ "ن" اور "ح" لکھ کر پُر اسرار موضوع بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ورنہ "ن" تو برائے نشاط النسا ہے جو ان کی بیگم ہی تھیں اور "ح" حسرت کی دوسری بیگم یعنی حبیبہ بیگم۔ اس طرح اس باب میں کئی اہم معلوماتی گوشے ہیں۔ اس باب سے حسرت موہانی کی زندگی کے تاریک گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

باب دوم میں "۱۹۰۸ کا مقدمہ" کے عنوان سے جو انکشافات ہوئے ہیں وہ دلچسپ ہیں۔ جس مضمون کے سلسلے میں حسرت موہانی کو دو برسوں کی سزا ہوئی تھی اس کے پیچھے کیا اسرار تھے، ڈاکٹر نفیس نے اپنی محنت سے انھیں طشت از بام کیا ہے بلکہ مصنف نے نیشنل آرکائیوز سے وہ متنازعہ مضمون بھی حاصل کر کے اس کتاب میں شامل کر دیا ہے جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ واضح ہو کہ اس وقت حسرت موہانی "اردوئے معلی" کے اڈیٹر تھے۔ اس باب میں اس کی بھی وضاحت ملتی ہے کہ حسرت کے سیاسی گرو بال گنگا دھر تلک تھے اور مسلمانوں میں سب سے پہلے سیاسی قیدی حسرت ہی تھے۔ اس وقت جیل جانے کے بعد حسرت کی بیوی نے جو خط لکھا اس کا تیور بھی لائق توجہ ہے:

"تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔ خبردار، تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔" (ص ۱۱۹)

اس باب میں اردوئے معلی کی پالیسی، مسجد مچھلی بازار کانپور اور ۱۹۱۶ء کی نظربندی اور قید سے متعلق نفیس صاحب نے حقائق فراہم کیے ہیں۔

باب سوم میں حسرت کے سیاسی افکار، سودیشی اور حسرت موہانی، عدم تعاون اور بائیکاٹ، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں خلافت کمیٹی کا قیام، خلافت کانفرنس، مزدوروں کی تحریک اور حسرت موہانی اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ کے ذیل میں نفیس صاحب نے تاریخی Notes جمع کر کے اپنی رائے بھی پیش کی ہے۔ کئی دوسرے ادیبوں اور تاریخ نگاروں کے حوالے سے اس امر کی توثیق کی ہے کہ حسرت موہانی نے ہی "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ سب سے پہلے دیا تھا۔ اس باب میں یہ بھی ذکر ہے کہ گاندھی جی علی برادران اور حسرت موہانی تینوں کو "رتن" کہا ہے۔ گاندھی جی کے اقتباس کو نفیس صاحب نے Quote کیا ہے۔ اسی سے دو سطریں: "مسلمان سماج کے پاس یہ تین رتن ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ ان تینوں میں

حسرت موہانی سب سے عظیم ہیں۔" (ص۲۲۵)

باب چہارم مکمل آزادی کی قرارداد، حسرت موہانی کی قرارداد کی تائید میں تقریر، مہاتما گاندھی کی مخالفت، حسرت موہانی کا جواب، مہاتما گاندھی اور حسرت کی گرفتاری کی تیاریاں، حسرت موہانی کال کوٹھری میں، مہاتما گاندھی نے حسرت کے استقبال کا اعلان کیا جیسے موضوعات پر مواد کی فراہمی کی گئی ہے۔

باب پنجم کے ذیل میں کچھ اہم عنوانات اس طرح ہیں:

کانگریس سے بیزاری اور گاندھی جی سے اختلافات عروج پر، انقلابی مجاہدین کی سرپرستی، اشتراک، قومی یکجہتی اور سیکولرزم، اہانت رسول کرنے والے کے بری ہو جانے پر جلسہ اور احرار پارٹی کا قیام، حسرت لندن میں، حسرت موہانی کا سفر یورپ، تقسیم ہند کی مخالفت، حسرت کا دستور ہند وغیرہ۔

باب ششم میں جن عناوین کے تحت گفتگو کی گئی ہے، ان میں کچھ یوں ہیں:

دستور ساز اسمبلی، آئین کے رہنما اصول، خارجہ پالیسی کی تشکیل میں حصہ، ہندستانی اردو اور تعلیم، گاندھی جی کی اردو تعلیم کا انتظام حسرت نے کیا، پرسنل لاء، آئین ہند پر حسرت موہانی کے دستخط نہیں، وجیٹیرین، جلوس، وفات، حسرت کی ادبی خدمات، حسرت کی شاعری میں سیاسی عنصر، تجزیہ وغیرہ۔

ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی نے اپنی اس ضخیم کتاب کی تیاری میں جتنی مشقتیں اٹھائی ہوں گی، اس کا اندازہ اس کتاب میں جمع کردہ حقائق اور حوالوں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا آخری جملہ لکھ کر بات ختم کی جاتی ہے:

"حسرت موہانی اگر چاہتے اور ذرا سی تبدیلی اپنے آپ میں کرتے تو ملک کی بڑی سے بڑی مسندِ اقتدار پر قابض ہو سکتے تھے لیکن وہ وطن کے بے لوث سپاہی تھے...... یہ تو عوام ہی اپنی رائے سے طے کریں گے کہ حسرت موہانی کہاں کھڑے ہیں۔ اور ان کا Militant Nationalisim تحریک آزادی میں کہاں تک موثر رہا اور اس کو کیا کریڈٹ دینا چاہیے؟" (ص۵۴۸)

کتاب نہایت عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ یہ کتاب حسرت اور سیاسی اور تاریخی پس منظر کی تفہیم کا اہم ذریعہ بنے گی۔

وقار قادری
203-C-76 سیکٹر 9
شانتی نگر۔ میرا روڈ (ایسٹ)
(ضلع تھانے)

مراٹھی ادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت وشرام بیڈیکر

وشرام بیڈیکر اس دنیا میں نہیں رہے۔ انھوں نے ۱۹۰۶ء میں ایک پنجاری گھرانے میں جنم لینے کے بعد بڑی غربت کے دن دیکھے تھے یہاں تک کہ اپنے محبوب شاعر رام گنیش گڑکری کا مجموعہ کلام خریدنے تک کی بھی ان میں استطاعت نہیں تھی۔ اپنے مطالعے کا شوق وہ عوامی لائبریریوں میں جاکر پورا کیا کرتے تھے۔ قانون تو پڑھا مگر وکالت کرنے کے بجائے تھیٹر اور فلم میڈیا سے وابستہ ہوگئے۔

اپنے کالج کے زمانے میں برنارڈ شاہ کے ڈرامے "سینٹ جان" سے متاثر ہو کر ایک ڈراما "برہما کماری" تحریر کیا جس میں عورتوں کے دکھ درد کو ایک نئے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ ڈرامے کا نام تو اوپر اٹھا مگر جس ڈراما "منڈلی" (کمپنی) کے لیے ڈراما لکھا گیا تھا وہ بیٹھ گئی۔

"برہما کماری" کے علاوہ "واٹرے پاول آپلے" (اپنے قدموں کی چاپ) "ٹلک آنی آگرکر" (تلک اور آگرکر) جیسے ڈرامے بھی لکھے۔ پہلا پالنا (پہلا گہوارہ) "رام شاستری" "شیزاری" (پڑوسی) "کرشن ارجن بدھ" "ٹھکی ہے لگن" (ٹھکی کی شادی) اور "چول آنی مول" (چولھا اور بچہ) جیسی مراٹھی زبان میں فلمیں لکھیں یا ان کی ہدایات دیں۔ ایک فلم بنائی تھی "لاکھارانی" جس میں ہندی فلموں کے ممتاز و باصلاحیت ہدایت کار گرودت۔ معاون ہدایت کار تھے گرودت ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ وی شانتا رام کی فلم "پڑوسی" کی کہانی اور مکالمے بیڈیکر صاحب ہی کے زور قلم کا نتیجہ تھے۔ ان کا اصل نام وشوناتھ تھا مگر اپنے ایک دوست شری رام سے گہری دوستی کے سبب اپنے نام کے "وش" کو شری رام کے "رام" سے جوڑ کر "وشرام" بن گئے۔

وشرام بیڈیکر نے بہت کم لکھا مگر جو کچھ لکھا وہ مراٹھی ادب میں حد درجہ پسند کیا گیا۔ ان کی سوانح حیات "ایک زھاڑ دون پکشی" (ایک درخت دو پرندے) کو ۱۹۸۵ء میں

ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔وہ ۱۹۸۶ء میں ممبئی میں منعقد ہونے والے ساہتیہ سمیلن کے صدر بھی رہ چکے تھے۔

اپنی شادی کے دو ماہ بعد کنگ ایڈورڈ سوسائٹی کے تعاون سے فلم سازی کی تربیت حاصل کرنے وہ لندن چلے گئے ابھی سات ماہ ہی ہوئے تھے کہ دوسری عالمی جنگ چھڑنے کے آثار رونما ہونے لگے لہٰذا ہندستان لوٹ آئے۔واپسی کے سمندری سفر میں جو کچھ دیکھا اسے اپنے یورپ کے قیام کے دنوں اور واقعات کے ساتھ جوڑکر ایک کہانی کا روپ دے کر "رن آنگن" (میدانِ جنگ) نامی ناول پیش کیا۔ ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا یہ ناول مراٹھی ناولوں میں اپنے اچھوتے موضوع' نئے اسلوب اور چست طرزِ تحریر کے سبب اہمیت کا حامل بن گیا۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی سابق صدر شعبہ' اردو ممبئی یونیورسٹی نے اسے ۱۹۸۷ء میں ترجمہ کرکے شعبہ اردو کی جانب سے شائع کروالیا۔اردو ادب کے سنجیدہ قارئین کو شاید یہ ناول پسند آئے۔

یہ ایک مراٹھی نوجوان چکردھر کی ایک جرمن یہودن ہرٹا سے ناکام محبت کی کہانی ہے۔ چکردھر دوسری عالمی جنگ کے بڑھتے سایے دیکھ یورپ سے ہندستان آرہا ہے۔ سمندری سفر میں جہاز پر اس کی ملاقات ہرٹا سے ہوئی ہے۔ہرٹا یہودی ہونے کے سبب ملک بدر کردی گئی ہے۔ کئی یہودی اس جہاز پر سفر کررہے ہیں۔یہ لوگ شنگھائی (چین) میں روزی روٹی کی تلاش میں جارہے ہیں۔ گیارہ دنوں میں ہرٹا اور چکردھر کی محبت جیون کے بندھن میں بندھ جانے پر رضامند ہوئی ہے مگر ہندستان میں ممبئی کی بندرگاہ پر ہرٹا کو اترنے کی اجازت نہیں دی جاتی کیونکہ جرمن یہودیوں کو انگریزوں کا دشمن قرار دیا جاچکا ہے۔ ہرٹا کا سفر جاری رہتا ہے مگر ہانگ کانگ کی بندرگاہ میں پہنچ کر وہ خودکشی کرلیتی ہے۔

انسانی رشتوں کے نازک بندھنوں کو اجاگر کرنے والا یہ ناول جنگ کی تباہ کاریوں کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتا ہے اور ساحر کی نظم "اے شریف انسانو" کے یہ مصرعے ذہن میں ابھر آتے ہیں۔ جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے۔جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی؟

ناول "رن آنگن" کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

"اسلحہ سازی کے کارخانوں کے متعلق کچھ خفیہ راز کسی انگریز نے جو بےروزگار تھا۔ پینتیس پاونڈ کے عوض جرمن جاسوس کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ وہ اسکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا اور گزشتہ جنگ میں زخمی ہوکر معذور ہوگیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک بیس سال کا یہ زمانہ اس نے ملازمت کے بغیر بہت بری حالت میں گزارا۔ کسی وقت انگلینڈ کی جانب سے جرمنوں کے خلاف لڑنے والا یہ نوجوان کمزوری کا شکار ہوگیا اور برطانوی کارخانوں کے خفیہ راز اس نے جرمنوں کو بیچ ڈالے۔" (مترجم پروفیسر عبدالستار دلوی)

ہیں۔

میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے محترم رفعت سروش نے کہا کہ راج نارائن راز نے بحیثیت صحافی، ادیب و شاعر ادب کی بڑی خدمت کی ہے انھوں نے اردو شاعری میں ایک نیا رنگ بھرا اور منفرد لب ولہجے سے اپنی شناخت قائم کی۔ بزم ہم قلم کی متاثر کن محترمہ انور نزہت نے راج نرائن راز کو ایک اچھا شاعر اور ایک مخلص انسان بتایا۔ محترمہ نگار عظیم نے اس موقع پر اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ راج نرائن راز کے انتقال سے ایک ادبی خلا پیدا ہوگیا ہے۔ آپ کی ادبی اور صحافتی خدمات ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔ ڈاکٹر نگار عظیم جذبات سے اس قدر مغلوب ہوگئیں کہ اپنی بات پوری نہ کر سکیں ارر آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرکے رخصت ہوگئیں۔

جلسے کی نظامت اسلم جمشید پوری نے۔ انھوں نے راز کی ایک نظم اور غزل بھی سنائی۔ عبدالعظیم صدیقی نے ان کا ایک مختصر افسانہ سنایا۔ نجمہ خاں اور کوثر مظہری نے بھی شرکت کی۔

[illegible]

اردو کے معروف شاعر اور ادیب جناب اوم پرکاش اگروال زار علامی اس جہان فانی سے رحلت فرماگئے۔

جناب زار علامی کی شخصیت بہت ہر دل عزیز تھی۔ آپ اردو حلقوں میں ایک سنجیدہ ادیب کے طور پر جانے جاتے تھے۔ آپ نے اردو ادب و تہذیب کی اعلا روایتوں کی پاسداری کی اور ادب برائے زندگی پر عمل پیرا رہے۔ موصوف کو شعری و نثری خدمات کے علاوہ عروضی معاملہ جات میں مستند عالم تسلیم کیا جاتا تھا۔ انھوں نے اپنے علم و فن سے ہند و پاک میں اپنے سیکڑوں شاگردوں کو فیض پہنچایا۔ ان کی فن عروض پر لکھی دو کتابوں "کلید عروض" اور "مسلمات فن" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

زار علامی صاحب اپنی مصروفیتوں کے باوجود ہریانہ اردو اکادمی کے مشاعروں اور دوسری ادبی تقریبوں میں خصوصیت کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ ہریانہ اردو اکادمی کے اردو مراکز میں پڑھایا جانے والا ابتدائی اردو قاعدہ بھی زار علامی صاحب کا تیار کیا ہوا ہے۔ زار علامی صاحب کی اعلا ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ہریانہ اردو اکادمی نے ان کو برنی ایوارڈ سے نوازا۔ انھیں بہت سی اکادمیوں اور اردو اداروں کی جانب سے انعام و اعزازات بھی حاصل ہوئے۔

آپ کے انتقال پر ہریانہ اردو اکادمی میں ایک تعزیتی میٹنگ ہوئی جس میں جناب زار علامی صاحب مرحوم کے ادبی کاموں کو یاد کیا گا اور دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی نیز پس ماندگان سے اظہار ہمدردی کیا گیا۔

[illegible]

پٹنہ۔ تاخیر سے موصول اطلاع کے مطابق گزشتہ ۲۷ر اگست ۱۹۹۸ء کو برصغیر کے نامور اور ممتاز مورخ و محقق ڈاکٹر قیام الدین احمد ریٹائرڈ پروفیسر شعبہ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی کا ۶۸ سال کی عمر میں ان کے آبائی مکان واقع خواجہ کلاں، پٹنہ سیٹی میں انتقال ہوگیا۔ تدفین ۲۹ر اگست کو جامع مسجد تموہیا سے متصل قبرستان میں ہوئی۔ پروفیسر یوسف خورشیدی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا

یہ کس کا جنازہ ہے بولو ذرا
بڑی بھیڑ ہے اور بڑا اژدحام
نظر جس کی پڑتی ہے تابوت پر
عقیدت سے کرتا ہے جھک کر سلام

[illegible]

اردو ماہنامہ 'آج کل' کے سابق مدیر

ممتاز ادیب وشاعر جناب راج نرائن راز کی وفات پر آج بزم ہم قلم کے جلسے میں شدید رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت جناب رفعت سروش نے کی۔ راز کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات اور ان کی شخصیت کا سیر حاصل تعارف کراتے ہوئے سید منصور آغا نے کہا کہ مرحوم راج نرائن راز کی زندگی ہمارے لیے ایک مثال اور نمونہ ہے وہ نہایت پختہ عزم وبلند حوصلہ کے مالک تھے ذہن کے پکے، نظم وضبط اور اصولوں کے پابند۔ ان کی زندگی کا آغاز بلوچستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہوا اور اختتام کے لیے دیکھیے دنیا کے ایک بہت بڑے شہر تک اس کا دست قدرت نے انتخاب کیا۔

راج نرائن ۲۷ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو بلوچستان (پاکستان) کی ایک چھوٹی سی غیر معروف بستی میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم کوئٹہ میں پائی۔ تقسیم وطن کے بعد ان کا خاندان جھانسی میں آباد ہوگیا۔ ایم اے (اردو) انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے کیا۔ کچھ عرصہ اخباروں میں کام کیا اور جلد ہی انڈین انفارمیشن سروس میں آگئے۔ مختلف عہدوں پر کام کرتے ہوئے اردو کے مشہور ومعروف رسالے 'آجکل' کے مدیر بنے اور اسی منصب سے ریٹائر ہوئے۔ ادارت کے فرائض انھوں نے بڑی خوش اسلوبی اور خود اعتمادی سے نبھائے۔

ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ جدید شاعری میں انھوں نے اپنی آواز کی ایک پہچان قائم کی۔ ان کے تین شعری مجموعے "چاندنی اسارہ کی" "لذت لفظوں کی" "اور دھنک احساس کی" شائع ہوئے۔ کتاب کے ان ناموں میں الفاظ کی ترتیب ان کی سرشت کی ترتیب کی غماز ہے۔ ان کی کئی کتابوں کو مختلف اداروں نے انعامات دیے جن میں اردو اکیڈمی بہار اور دہلی بھی شامل

کوثر مظہری کا نیا پتا

شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی
جامعہ نگر نئی دہلی۔ ۲۵

[illegible]

[illegible]

جون پور کے مشہور ترقی پسند شاعر وامق جونپوری کا گزشتہ شب ان کے آبائی گانوں کجگاؤں میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۸۹ برس تھی۔

ان کا پہلا مجموعہ کلام "چیخیں" تھا اور دوسرا مجموعہ "شب چراغ" ۱۹۷۸ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ ان کا تیسرا مجموعہ سفر ناتمام ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کی شاعری احساس کی شدت اور انسانیت کے درد اور ناتمام آرزوؤں کی خلش سے عبارت تھی۔ ان کی خود نوشت سوانح "گفتنی ناگفتنی" خدا بخش لائبریری نے شائع کی۔

[illegible]

اتر پردیش کے قصبہ سلون، ضلع رائے بریلی کی خانقاہ کریمیہ کے سجادہ نشین مولانا شاہ احمد حسین جعفری اصلاحی اور شعبہ انگریزی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر نقی حسین جعفری کی والدہ بی بی عائشہ بنت شاہ محمد علیم عطا کا گزشتہ ہفتے اچانک انتقال ہو گیا مرحومہ کی تدفین روضۂ اشرفی کے شمال مشرق کے اس احاطہ میں ہوئی جہاں اس خاندان کی بعض بزرگ خواتین محو خواب ہیں وہ حافظ قرآن ہونے کے علاوہ حصن حصین کی عامل تھیں۔

[illegible]

۲۳ر نومبر ۱۹۹۸ء کو شعبہ اردو مانسا گنگوتری، میسور یونی ورسٹی میسور میں پروفیسر سید اقبال قادری کی رحلت پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا۔ جلسے میں شعبے کے اساتذہ محترمہ برجیس سلطانہ صاحبہ، ڈاکٹر رفعت النساء بیگم، ڈاکٹر محمد ضیاء اللہ اور طلبا وطالبات شریک رہے۔ جلسہ کی صدارت پروفیسر مسعود سراج، صدر شعبہ اردو نے کی۔ صدارتی تقریر میں پروفیسر مسعود سراج صاحب نے پروفیسر سید اقبال قادری کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے موصوف کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ پروفیسر موصوف غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ شعبۂ صحافت، میسور یونیورسٹی سے ۳۳ سال تک وابستہ رہے۔ انھوں نے کئی انجمنوں کی بنا ڈالی، کئی اداروں سے وابستہ رہے۔ وہ مختلف اخباروں میں مختلف موضوعات پر تقریباً نصف صدی تک مسلسل لکھتے رہے۔ صحافت پر ان کی ایک کتاب جسے اردو بیورو نے شائع کیا ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ایک اچھے مقرر بھی

میں اس بات پر زور دیا کہ غالب کی سچی سوانح عمری اس کے فارسی خطوط کے مطالعے کے بغیر نامکمل رہے گی۔ غالب کے اردو خطوط اور شعری حوالوں کی مدد سے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی مکمل عکاسی ممکن نہیں۔ سوائے غلام رسول مہر کے کسی اور محقق نے اس پر توجہ نہیں دی ہے۔ اس سمپوزیم کے مہمان خصوصی جناب یوسف ناظم نے غالب کے اشعار کے حوالوں سے ان کے کردار کی متنوع اور دلچسپ تصویر پیش کی جس سے ان کی مزاحیہ تحریر کا عکس جھلکتا تھا۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

غالب کے اس شعر کے حوالے سے شرکائے مجلس نے اس بحث میں حصہ لیا کہ غالب نے بیدل کی تقلید کی ہے کہ نہیں پروفیسر علوی کا خیال تھا کہ غالب کے اس شعر سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ بیدل کے مقلد تھے' غلط ہوگا۔ اس بحث میں جناب یوسف ناظم' پروفیسر معین الدین جینا بڑے اور وحید اختر نے بھی حصہ لیا۔ اس مجلس میں پروفیسر میمونہ دلوی اور پروفیسر خورشید نعمانی کو یو۔جی۔سی فیلو شپ تفویض ہونے پر گلدستوں کی صورت میں ہدیہ تبریک پیش کیا گیا۔ سمپوزیم کا آغاز صدر شعبہ ڈاکٹر یونس اگاسکر اور پروفیسر معین الدین جینا بڑے کے تمہیدی کلمات سے ہوا۔ ڈاکٹر صاحب علی نے شکریے کی رسم ادا کی۔

ڈاکٹر صغریٰ عالم کو ایوارڈ اور ان کے تیسرے مجموعہ کلام "صف ریحاں" کا اجرا

بنگلور۔ ادارہ زرین شعاعیں کے زیر اہتمام انجمن ترقی فن کاران اردو کرناٹک کے زیر اہتمام ۱۳ ستمبر ۱۹۹۸ء کو دارالسلام بنگلور میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں ریاست کے منتخب اردو قلم کاروں کو ایوارڈ دیے گئے۔ ڈاکٹر صغریٰ عالم (گلبرگہ) کو ایک شال اور توصیفی سند عطا کی گئی۔ اس تقریب میں ڈاکٹر صغریٰ عالم کے تیسرے مجموعہ کلام "صف ریحاں" کی رسم اجرا محترمہ فہمیدہ بیگم صدر اردو بیورو نے انجام دی۔

حیات اللہ انصاری حالی قومی ایوارڈ سے سرفراز

چنڈی گڑھ۔ ہریانہ اردو اکادمی نے امسال کا قومی حالی ایوارڈ ممتاز ادیب حیات اللہ انصاری کو دینے کا اعلان کیا ہے۔ انھیں یہ اعزاز اردو فکشن کے لیے ان کی نمایاں خدمات کے صلے میں دیا جائے گا۔ یہاں اس بات کا اعلان کرتے ہوئے ہریانہ کے وزیر تعلیم رام بلاس شرما نے بتایا کہ اردو اکادمی نے اس انعام کی رقم پچاس ہزار سے بڑھا کر ایک لاکھ روپے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ امسال کا حالی اعزاز پانے والے انصاری صاحب متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ان کا مشہور ناول "لہو کے پھول" شامل ہے۔ پانچ جلدوں پر مشتمل یہ ناول مسلسل فلم کے طور پر دوردرشن پر بھی دکھایا گیا تھا۔

بیگ نے فرائض نظامت ادا کیے۔ تقسیم تحائف کے بعد اساتذۂ کرام کے مسائل کے بارے میں بحث ہوئی ان کے مسائل حل کرنے کے لیے انسپکٹر آف اسکول سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ آخر میں جناب مسعود بیگ صاحب نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا۔

عبدالرحیم نشتر کی خدمات کا اعتراف

۱۳ر ستمبر ۱۹۹۸ء کو انجمن اسلام جنجرہ مروڈ کے دفتر واقع گولڈن ہال اپارٹمنٹ ناگپاڑہ ممبئی میں نقش کوکن ٹیلنٹ فورم کی جانب سے ایک شاندار جلسہ تہنیت منعقد کیا گیا جس کی صدارت مشہور محب اردو عالی جناب غلام محمد پیش امام صاحب (ال ہمت انٹر پرائزس) نے فرمائی۔ اس موقع پر "کوکن میں اردو تعلیم" کے مصنف ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ انڈین کونسل آف نیشنل ہیلتھ کے صدر ڈاکٹر عبدالکریم نائیک صاحب نے نشتر صاحب کو نقش کوکن ٹیلنٹ فورم کی جانب سے ایک شال اور سرٹیفکٹ آف آنر پیش کیا۔ کیپٹن فقیر محمد مستری' علی ایم شمسی (سابق چیئرمین کوکن مرکنٹائل بینک) اور لائق اقبال کوارے نے نشتر صاحب کی ادبی اور تعلیمی خدمات کی تحسین کرتے ہوئے اس بات پر فخر و مسرت کا اظہار کیا کہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے سال گذشتہ کی مطبوعات کے لیے ان کی تصنیف "کوکن میں اردو تعلیم" کو اپنے گرانقدر انعام سے سرفراز کیا۔ ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر ساوتری بائی دھیانک ودیامندر ابیت ضلع رائے گڑھ میں اردو کے استاد ہیں۔ نمایاں تعلیمی خدمات کے صلے میں انھیں نقش کوکن ٹیلنٹ فورم نے ۱۹۸۹ء میں اور مہاراشٹر اردو اکادمی نے ۱۹۹۰ء میں بہترین مدرس کا ایوارڈ عطا کیا تھا۔

گلِ نغمہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

برکت اللہ یونی ورسٹی بھوپال نے گل نغمہ کو اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ ان کے تحقیقی مقالے کا موضوع تھا "ہندستانی موسم' تہوار اور میلے (شمالی ہند کی شاعری میں)"۔ گل نغمہ نے یہ مقالہ پروفیسر آفاق احمد کی زیر نگرانی مکمل کیا۔ آپ ان دنوں انجمن اسلام کے پی۔ ڈی گرلز ڈگری کالج جبل پور میں کارگزار پرنسپل ہیں۔ اس مقالے کے ممتحن ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (علی گڑھ) اور ڈاکٹر مختار شمیم (اندور) تھے۔

ممبئی یونی ورسٹی میں غالب پر سمپوزیم

گذشتہ دنوں شعبہ اردو' ممبئی یونی ورسٹی کے زیر اہتمام غالب کے دوسو سالہ جشن ولادت کی تقریبات کی ایک کڑی کے طور پر غالب اور غالبیات کے زیر عنوان ایک قومی سمپوزیم کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس میں مشہور اسکالر اور محقق ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے بطور صدر شرکت کی۔ صدر موصوف نے اپنی تقریر

اختر جمال' راحت بانو (حیدر آباد) کے نام شامل ہیں۔ نیجنگ ٹرسٹی کے مطابق ایوارڈ کی رقم اور سرٹیفکٹ متعلقہ طلبہ اور طالبات کو بھیج دیئے گئے ہیں اور اسکالر شپ ہر مہینہ بھیجنے کے بجائے سال بھر کی رقم یک مشت بھیجی جارہی ہے۔

شبد آکار کے زیر اہتمام جلسہ

"شبد آکار ساہتیہ سنگم جھانسی" کے زیر اہتمام یکم نومبر ۱۹۹۸ء بروز اتوار شام کے ۴ بجے مرزا غالب کی دو صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں ڈاکٹر خلیق انجم' شری سوم ٹھاکر' شری کمل بھٹ' شریمتی ششی تیواڑی' شری اشوک راوت' جناب سید مبارک نسیم' جناب احسان آوارہ اور متعدد اکابرین ادب نے شمولیت کی اور غالب کی شاعری اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ تقریب پانچ گھنٹہ تک چلی۔ غالب کی غزلوں کی نواسرائی بھی کی گئی۔ کلکٹر جھانسی اور دوسرے ممتاز افسروں کے علاوہ بھاری تعداد میں لوگوں نے شمولیت کی۔

اندر ڈین کیف "صدر شبد آکار جھانسی"

انجمن ترقی اردو بھلائی درگ میں نشست

انجمن ترقی اردو (ہند) بھلائی درگ کی مجلس عاملہ کی ۳۰ راگست ۱۹۹۸ء کو ہوئی ماہانہ نشست میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس سال یوم اساتذہ کے موقع پر انجمن کی طرف سے بھلائی درگ کے اردو اساتذہ کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی جائے اور اساتذہ کرام کی خدمت میں انجمن کی جانب سے کچھ تحائف پیش کیے جائیں۔ اس سلسلے میں اساتذہ کو مدعو کرنے اور تحائف و تقریب کی دوسری تفصیلات کے بارے میں فیصلہ کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی' جس کے ممبران ہیں۔ جناب نواب رونق جمال صاحب' جناب مرزا محبوب بیگ صاحب' جناب راج کمار شرما صاحب' جناب عبدالحفیظ صاحب' جناب مرزا مسعود بیگ صاحب' جناب محمد جمیل ناصر صاحب۔ اس کمیٹی کے طے کردہ پروگرام کے مطابق ۷ ۲ر ستمبر ۱۹۹۸ء کو جناب راجکمار شرما صاحب کے دولت خانہ پر یہ تقریب منعقد کی گئی جس میں بھلائی ودرگ کے بزرگ شاعر جناب انعام اشرف صاحب مہمان خصوصی تھے۔ مندرجہ ذیل اساتذہ کرام کو انجمن جانب سے گلدستے الیکٹرانک ٹائم پیس پیش کیے گئے اور اردو زبان میں سپاس نامہ بھی دیا گیا۔ جناب محمد ابو ظفر صاحب' جناب محمد ابو بکر' جناب مرزا محبوب بیگ' جنابہ عطیہ سلطانہ' رضیہ بیگم' احمدی خان' الیاس بیگم' رخسانہ فاطمہ' تنویر تبسم' فرزانہ اشرف شہناز۔ انجمن کے صدر جناب رام پرکاش کپور نے اپنی تقریر میں مہمان خصوصی جناب انعام اشرف اور اساتذہ کرام کا خیر مقدم کیا اور انتظامیہ کمیٹی کے ممبران کا شکریہ ادا کیا۔ جناب راجکمار شرما اور جناب محبوب بیگ نے بھی خیر مقدم کی تقریریں کیں اور جناب مرزا مسعود

کانگریس کمیٹی نئی دہلی کے مرکزی دفتر میں شعبہ اردو سے منسلک ہو گئے جہاں سے آپ کی نگرانی میں ایک سو سے زائد پمفلٹ کتابچے اور کتابیں شائع ہوئیں۔ کانگریس کے پہلے اردو ترجمان "سب ساتھ" کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔

۱۹۷۸ء سے غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے وابستہ ہیں جہاں اشاعتی، تنظیمی اور دیگر ذمے داریوں کے علاوہ ایک ادبی تحقیقی مجلہ "غالب نامہ" کی مجلس ادارت میں بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر ساحل کو ریاستی ایوارڈ

ناگپور کے مشہور و معروف محقق مورخ، شاعر اور نقاد جناب ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے ۹۷-۱۹۹۶ء کا ریاستی ایوارڈ (سراج اورنگ آبادی ایوارڈ) دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ایوارڈ پچیس ہزار روپے نقد اور ایک توصیفی سند پر مشتمل ہوگا۔ یہ اعلان ریاست مہاراشٹر کے کلچرل منسٹر جناب پرمود نولکر نے ممبئی میں ایک پریس کانفرنس میں کیا۔

۳۶ ہونہار طلبہ کو شعاع فاطمہ ایوارڈ

شعاع فاطمہ تعلیمی و افلاحی ٹرسٹ نے تعلیمی سال ۹۹-۱۹۹۸ء کے لیے ملک بھر سے منتخب ۳۶ ہونہار اور حاجت مند طلبہ و طالبات کو اسکالر شپ اور ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ اپنے اعلان نامے میں ٹرسٹ کے منیجنگ ٹرسٹی پروفیسر شارب ردولوی نے کہا ہے کہ اپنے محدود وسائل کے باوجود ٹرسٹ زیادہ سے زیادہ حاجت مند طلبہ اور طالبات کی مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ گذشتہ سال صرف ایک درجن طلبہ کو ٹرسٹ اسکالر شپ دے سکا تھا اس سال ۳۶ طلبہ اور طالبات کو ایوارڈ اسکالر شپ دیے جا رہے ہیں۔ شعاع فاطمہ ایوارڈ طالب علم کے کلاس اور نمبروں کے مطابق ۵۰۰ روپے سے لے کر ایک ہزار روپے تک ہے اور اسکالر شپ ۵۰ روپے، ۷۵ روپے اور ۱۰۰ روپے ماہانہ پر مشتمل ہے۔ جن طلبہ وطالبات کو یہ ایوارڈ اور اسکالر شپ ملے ہیں ان میں دہلی کے عمران احمد، محمد عارف اور سعدیہ انور۔ اتر پردیش کے جاوید عالم (لکھنو) روحینہ مہتاب اور سیما فاخر (دیوبند) شعیب مصطفیٰ (علی گڑھ) صبیحہ سلطانہ (کرتپور) ابوتراب (بجنور) کرناٹک کے محمد تنویر (پیراج پیٹ) فوزیہ فرحانہ (میسور) تحسینہ، محمد رفیق، محمد قادر، رفاقن نساء، تحسینہ بانو (تعلقہ گنگی) بہار کے محمد فیاض عالم (پٹنہ) محمد عاشق حسین (مدھوبنی) نرجس بانو (مظفر پور) سنجیدہ فردوس (اورنگ آباد) مغربی بنگال کے آفتاب عالم، افسر جہاں، فوزیہ زینب، محمد زبیر، قطب الدین، شاہینہ مرتضیٰ، اے این سعود (کلکتہ) محمد معراج الحق (ہگلی) افضل حسین (۲۴ پرگنہ) مہاراشٹر کے اشفاق احمد محمد اسمعیل، زین العابدین، عزیز اللہ (ناسک) قمر الدین (دھولے) محمد عابد الرحمٰن (واڈنر بھولجی) آندھرا کے زینت قمر،

نے تقریباً تمام تخلیقات پر فرداً فرداً تبصرہ کیا اور حیرت اور خوشی کے ساتھ کہا مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جرمنی میں ایسی ادبی تقریب بھی ہو سکتی ہے جس میں اتنا تنوع بھی ہے اور ایک کم از کم ادبی معیار بھی ہے۔ حلقہ ادب کا یہ پہلا اجلاس تھا جس میں مردوں کے ساتھ خواتین بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئیں لیکن حلقہ کی پرانی رکن نزہت حسن کی غیر حاضری محسوس ہوتی رہی۔ سید مرغوب حسن نے ان کی عدم شرکت کی مجبوری بتادی تھی لیکن کمی بہرحال محسوس ہوئی۔ اس تقریب کی ریکارڈنگ کے لیے لوفز کنال ٹی وی چینل والے آئے تھے۔ اس پروگرام کو مذکورہ چینل پر دوبارہ دکھایا جاچکا ہے۔

عرعر (سعودی عرب) میں یوم سرسید اور ہندوپاک مشاعرہ

امسال سرسید کا ۱۸۱واں جشن ولادت علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن عرعر نے بزم احباب سخن کے تعاون سے اردو منزل میں جوش و خروش سے منایا' جس میں اس علاقے میں مقیم ہندستانی اور پاکستانی معروف ہستیوں نے ذوق و شوق سے حصہ لیا۔ ڈاکٹر حنیف ترین جن کی تعلیمی زندگی کا بیشتر حصہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں گزرا ہے اس تقریب کے چیف گیسٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ڈاکٹر اقبال' ڈاکٹر فاروقی' ڈاکٹر آفتاب' ڈاکٹر خطیب' ملک ذاکر' امتیاز اعظمی' نعیم بیگ' محمد باشا' محمد رئیس میر ٹھی' محمد شریف مہوی اور محمود مسرور نے اس کو کامیاب بنانے میں اپنا پورا تعاون دیا۔

تلاوت قرآن پاک کے بعد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ترانہ روایت کے مطابق امتیاز اعظمی' محمد نسیم' ذاکر حسین' ظفر احمد اور رئیس میرٹھی نے مل کر پیش کیا۔ مجاز لکھنوی کا لکھا یہ ترانہ جب اپنے آخری عروج ان مصرعوں پر پہنچا

جو ابر یہاں سے اٹھا ہے
وہ سارے جہاں برسا ہے

اور پھر بالکل آخری حصے۔۔۔برسے گا۔۔۔برسے گا۔۔۔برسے گا تک جیسے پہنچا اس وقت تمام حاضرین جوش و مستی میں اپنی اپنی نشستوں پر تالیاں بجاتے ہوئے کھڑے ہوگئے اور یہ پرجوش سماں ان لوگوں کے ذہنوں میں دنوں تک محفوظ رہے گا جن لوگوں نے یہ پہلی بار یہاں سنا ہوگا۔ اس کے بعد سرسید احمد خان اور علی گڑھ تحریک پر ملک ذاکر' بدر زماں بابر' عابد خان' محمد نسیم اور ڈاکٹر حنیف ترین نے تفصیلی روشنی ڈالی۔

شاہد ماہلی۔۔۔ایوان غالب کے نئے ڈائرکٹر

نئی دہلی' ۲۳رنومبر شاہد ماہلی ایوان غالب کے نئے ڈائرکٹر مقرر کیے گئے۔ شاہد ماہلی (پورا نام شاہد حسین) ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ ماہل میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ گورکھپور یونی ورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد آگرہ یونی ورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ پھر بی ایل جے کالج مرزاپور میں اردو کے لکچرر ہوگئے۔

۱۹۷۰ء میں دہلی آئے اور آل انڈیا

ادبی تہذیبی خبریں

حلقۂ ادب جرمنی

نومبر کے مہینے میں حلقہ ادب جرمنی کی دو تقریبات ہوئیں۔ پہلی تقریب یکم نومبر کو حلقہ کے ایک اہم شاعر اور جرمنی میں پاکستانی سفارت خانہ کے منسٹر شوکت حیات کے گھر پر بون میں ہوئی۔ یہ غیر رسمی تقریب تھی جس میں جرمنی میں پاکستان کے سفیر گل حنیف ان کی بیگم ملکہ حنیف' ثریا شہاب' ان کے میاں جس بریمر' پرویز اختر اور بیگم پرویز اختر' رفیق احمد بٹ اور ان کی ڈچ بیگم عائشہ رفیق' طارق پرویز اختر اور ان کی بیگم کوکب اختر' حیدر قریشی' ظہیر الدین بٹ اور کارین مریم بٹ' سید رفیق احمد' آئی ڈی چوہدری کے ساتھ میزبان جوڑی شوکت حیات اور ساجدہ حیات شامل تھے۔ اس تقریب میں حاضر شعرا سے ان کا کلام بھی سنا گیا لیکن سب سے اہم وہ گفتگو رہی جو ادب کی عمومی صورت حال سے گزر کر ساختیات تک پہنچی۔

گل حنیف صاحب نے دریدا اور سائیر کی باتیں شروع کیں تو اہل ادب محتاط ہو گئے۔ ذکر ساختیاتی قیامت کا چھڑا تو بات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی جولانی تک پہنچنا ہی تھی سو پہنچی۔ پھر کہیں بیچ میں میر کی بات ہوئی اور پھر موضوع گفتگو بن گئے شمس الرحمٰن فاروقی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ بیشتر باتیں گل حنیف صاحب کر رہے تھے جو بظاہر ادب سے اتنے وابستہ معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان کی ادب سے اس خاموش محبت کو دیکھتے ہوئے حلقہ ادب جرمنی کے نومبر کے باضابطہ اجلاس میں انھیں شرکت کی دعوت دی گئی تو وہ سفیر کی حیثیت سے نہیں بلکہ اردو ادب کے ایک عام قاری کی حیثیت سے اور ایک پاکستانی کی حیثیت سے اس تقریب میں چل کر فرینکفرٹ آگئے۔ انھیں مہمان خصوصی کی کرسی پر بٹھایا گیا۔ نظامت کے فرائض حیدر قریشی نے ادا کیے۔ سب سے پہلے حکیم محمد سعید مرحوم کے ناگہانی قتل پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے جناب اقبال الدولہ نے ان کے بارے میں اپنا مضمون پڑھ کر سنایا۔ نیر اقبال نے حکیم سعید کی وفات پر تعزیتی قطعہ پڑھ کر سنایا۔ اور ثریا شہاب نے ان کے قتل پر تعزیتی قرارداد پیش کی جسے متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ اس کے بعد طارق پرویز اختر نے ایک غزل ارشاد ہاشمی نے تازہ اردو ماہیے' شوکت حیات نے ایک مسلسل غزل اور ایک نظم "وطن کی محبت" سنائی۔ ثریا شہاب نے بھی ایک نظم اور ایک غزل سنائی۔ جاوید خاں نے اپنا ایک بے حد شگفتہ افسانہ "اے سی آر" (سالانہ کنفیڈنشل رپورٹ) سنایا اور حیدر قریشی نے اپنی خود نوشت "کھٹی میٹھی یادیں" کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا (یہ خود نوشت انڈیا کے ایک ادبی رسالہ میں قسط وار چھپ رہی ہے)۔

پیش کی جانے والی تمام تخلیقات کو حاضرین نے بہت پسند کیا اور کھل کر داد دی۔ جرمنی میں پاکستان کے سفیر جناب حنیف گل

عروج واپس لانے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ کمزوریاں کس تحریک میں نہیں ہوتیں۔ ترقی پسند تحریک میں بھی تھیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ترقی پسند تحریک میں کچھ بھی مثبت نہیں رہا۔ سب کچھ منفی ہی تھا جیسا کہ کچھ جدیدیے ہم کو بتانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ترقی پسند ادبا و شعرا نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور شاعری سے عوام کے خونِ جگر کو گرمایا اور روح کو تڑپایا۔ انھوں نے اپنی شاعری و تخلیقات کی شعلہ فشانی سے غلامی کی زنجیروں کو پگھلایا۔ آزادی کے بعد بھی ترقی پسند تحریک نے نیشنلزم، سوشلزم اور انسانی اقدار کو عوام تک پہنچانے اور مزدوروں کسانوں کو جدوجہد کو بڑھاوا دینے میں نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ اپنی تمام خامیوں کے باوجود ترقی پسندوں نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ اردو قاری کو زبان و بیان کے لہجے اور پرکشش گلکاریوں سے متعارف کرایا ہے۔ یہ لوگ اردو کے محسنوں میں سے ہیں۔ اب اگر طبقاتی جدوجہد اور معاشرتی شوونزم کے اس دور کے تاریخی پس منظر میں ادب کو کمیٹ (Commit) کرنے کی کوشش اگر انھوں نے کی تو کیا غلطی کی۔ ادب برائے ادب والے کچھ بھی کہیں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جتنی بڑی تعداد میں عظیم شاعر و نثر نگار (all-time great) ترقی پسند تحریک نے دیے اتنے کسی اور تحریک نے نہیں دیے۔ خواہ وہ جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت اور ایک اور بات جدیدیے اپنی تمام عالمانہ رعونت اور خود نمائی کے باوجود کوئی فیض یا کرشن چندر نہ دے سکے۔ نہ ہی کوئی جوش ملیح آبادی فراق گورکھپوری ساحر لدھیانوی، یا مجاز دے سکے۔ اس سلسلے میں میں مشہور امریکی ادیب آنجہانی ہارورڈ فاسٹ کے الفاظ دہرانا چاہتا ہوں جو انھوں نے چالیس کی دہائی میں ترقی پسند تحریک کے پورے عروج کے زمانے میں اپنے ایک پمفلٹ Literature and Reality میں لکھے تھے۔

"To be a good writer it is not necessary to be a Communist, but it is necessary to love mankind"

میرا اپنا عقیدہ ہے کہ جس ادب میں انسانی درد کی آواز نہیں وہ زیادہ سے زیادہ ذہنی عیاشی کے لیے مواد فراہم کر سکتا ہے لیکن دل و دماغ کی تربیت نہیں کر سکتا۔ تخلیق میں تاثیر خلوص سے پیدا ہوتی ہے۔ اور عظمت انسانی درد کی آواز شامل کرنے سے۔

آخر میں میں پورے وثوق سے کہنا چاہتا ہوں کہ ترقی پسند ادیبوں شاعروں نے پورے خلوص اور جرأت کے ساتھ عوام کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا لازمہ اختیار کیا۔ صرف ذمہ ہی نہیں بلکہ جیالے ادیب و شاعر اپنے قول کے اس قدر صادق رہے ہیں کہ انھوں نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے بڑھ چڑھ کر قربانیاں دی ہیں اور آئندہ بھی دیتے رہیں گے اور میرے خیال میں یہی ادیب کا فرض ہے۔

☆رام پرکاش کپور، ۱۸۷، ایم آئی جی، پدم نابھ پور، درگ

چاہتا ہوں: میں کوئی ادیب یا دانشور نہیں ہوں۔ میں ایک معمولی قاری ہوں اور شروع سے ہی ترقی پسند تحریک کا مداح اور معتقد رہا ہوں۔ ۱۹۳۶ء میں شروع ہونے والی اس تحریک نے سوشلزم، سیکولرازم اور آزادی کی لڑائی کو بڑھاوا دینے میں نہایت اہم رول ادا کیا ہے، اور تقسیم ملک کے فوراً البعد فرقہ وارانہ فسادات اور تقسیم کے نتائج پر متعدد ناول افسانے اور نظمیں، غزلیں شائع ہوئیں، جو اردو ادب میں ہمیشہ کے لیے یادگار ثابت ہوئیں۔ خاص کر منٹو کرشن چندر، بیدی عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، اپندر ناتھ اشک وغیرہم کے اُس دور کے ناول و افسانے نہایت اہم ہیں، اور اردو ادب کے کلاسکس میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن ترقی پسند ادیبوں کی بھیمڑی کانفرنس ۱۹۴۸ کے بعد ترقی پسند تحریک کے لیڈروں نے پارٹی کا جھنڈا اٹھا لیا تھا اور سیاسی قائدوں کے پیچھے ہو لیے تھے۔ اور منٹو اور خواجہ احمد عباس جیسے ادیبوں کو معتوب کیا گیا تھا۔ یہ تحریک کی کمزوری تھی اور اِس نے ترقی پسند تحریک کو کافی نقصان پہنچایا اور اردو ادب کی اپنی ترقی پسند لابی کو پروپیگنڈا کا ہتھیار دیا، اور "ادب برائے ادب" والی تحریک کو اہمیت ملی۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس جدیدیت کے رجحان کے زیر اثر ترقی پسندی کی نفی کرنے کے زعم میں متفقہ اور متحدہ طور پر اردو کے کئی ادیبوں نے انفرادی آزادی کی بازیافت کے نام پر سماج مخالف ادب تخلیق کرنا اپنا بنیادی فریضہ تصور کیا، نہ صرف یہ بلکہ ترقی پسند ادیبوں کے خلاف بھی انفرادی اور مجموعی طور پر لکھنا اور بولنا شروع کر دیا۔ ان لوگوں نے منشی پریم چند جیسے عظیم ادیب کو بھی نہیں بخشا۔ جدیدیت کے علم بردار ایک نقاد نے ایک بحث میں یہ بات کہی تھی۔

"زیادہ تر سماجی حقیقتوں کو ڈھونڈنے والے ادیب اور افسانہ نگار متوسط اور نچلے طبقے سے آتے ہیں، اس لیے ایک طرف تو بڑے لوگوں سے یعنی دولت مندوں سے حسد کرتے ہیں کہ وہ خود اس منزل تک نہیں پہنچ سکے۔ اس لیے ان کے خلاف لکھتے ہیں۔ دوسری طرف اپنی معاشی اور تہذیبی پستی کو عظمت بخشنے (glorify کرنے) کے لیے ایسا کرتے ہیں، ورنہ کیا حقیقتیں بازکلاس کی زندگی میں نہیں ہیں۔ یا زندگی کی حقیقتیں نالی میں بجبجاتے کیڑوں میں ہی ملتی ہیں اور قلیوں کباڑیوں کی زندگی میں ہی ہیں۔ یہ سب خرافات پریم چند کی لائی ہوئی ہیں۔ ہندستانی کہانیوں کا ڈھانچہ پریم چند نے ہی بگاڑا تھا۔ جس پر بے عمل ترقی پسند افسانہ نگاروں نے "دنیا بھر کے مزدورو ایک ہو جاؤ" کا نعرہ لگا کر کہانی کے حسین خواب دیکھنے والے عمل (Process) کا قلع قمع کر دیا"

اس رجحان نے اردو ادب کو بڑا نقصان پہنچایا۔ یہ صورت ۱۹۷۰ء کے بعد تک قائم رہی۔ اس دوران ترقی پسندوں نے بھی اپنی غلطیاں سدھارنے کی کوشش کی لیکن وہ تحریک کا پہلا والا

کے خیال پر پابندی لگ گئی۔ اب عورتوں نے صدیوں سکوت کو توڑا ہے اور سچائی کی فراموش کردہ زبان بولنے لگی ہیں تو یقیناً یہ خوشی کی بات ہے۔ معاصر ادبی منظرنامہ پر بہت ساری خواتین فن کاروں نے اپنی فکری و فنی عظمت کا نقش ثبت کیا ہے اور مرد شاونزم کے خلاف بغاوت کا علم بھی لہرلیا ہے مگر اب بھی مجھے تانیثی شاعری میں زردی رخسار کا ہی عکس نظر آتا ہے۔ کاش تمام خواتین گرمی رخسار سے آتش اظہار کو کچھ اور ہوا دیتیں تو آج کا سماجی منظرنامہ بدل چکا ہوتا۔ پھر بھی باشعور اور بیدار خواتین، فیمنزم، کے نام پر جو کچھ کر رہی ہیں اس سے نسوانی معاشرہ کا ایک نیا چہرہ طلوع ہوگا اور یقیناً اکیسویں صدی عورتوں کی صدی ہوگی۔

ڈاکٹر نجمہ رحمانی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ایک اچھے سلسلے کی شروعات کی ہے۔ کاش یہ سلسلے دراز ہو جائیں اور پاکستانی شاعرات کی طرح ہندستانی خواتین بھی ادبی سطح پر اہم تحریر پیش کریں۔

☆حقانی القاسمی، بی ۱۰۴، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

نومبر کے "کتاب نما" میں مہمان مدیر جناب قیصر تمکین صاحب کا اشاریہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اطمینان بھی ہوا کہ آج کے اس خود غرضی کے Mercenary دور میں جب کہ ترقی پسند ادیبوں پر نکتہ چینی اور ترقی پسند تحریک پر فاتحہ پڑھنے کا چلن عام ہو گیا ہے۔ ہماری طرح اور بھی "سر پھرے" ہیں جو آج بھی ترقی پسند تحریک کے نہ صرف مداح ہیں بلکہ "نئے سال، نئی صدی اور نئے ہزارے کی آمد آمد کے موقع پر ادب کو ایک بار پھر جذبہ تعمیر اور عرفان انسانیت کے تصورات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں" ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں۔

انھوں نے ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادیبوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں ہم کو اپنے جذبات کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ خاص طور پر ان الفاظ میں: "ادب چھوٹے بورے کا ڈھابہ نہیں ہے کہ کام ختم ہوتے ہی نفع نقصان کے لحاظ سے پونجی گنی جائے۔ یہاں تو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کون کس دھج سے سر دار پہنچا یہ آن تو میر وفا کی رہی کہ ٹوٹ جاؤ مگر جھکو نہیں۔" ان کی اس امید پر بھی ہم آمین کہتے ہیں۔: "ہندستان پاکستان اردو ہندی اور مشرق مغرب کے علمی و فکری حلقوں میں پیسہ پرستی عہدوں اور مال منال کی گرم بازاری ختم ہوگی اور وہ کارواں جو ہومر، کالی داس شیکسپیر، غالب، فراق، مجاز اور فیض سے ہوتا ہوا نئی صدی اور نئے ہزارے میں داخل ہو رہا ہے، ہمیشہ جعلی ترقی پسندی اور مبتذل جدیدیت، لفظی تنقید اور معتبر ادیبوں شاعروں کی ٹوپی اچھالنے کے خارزاروں میں بھٹکتا نہیں رہے گا"

جناب قیصر تمکین کی تائید میں اور "ترقی پسندی کی حمایت میں" میں بھی کچھ عرض کرنا

کی صحت کا خود ہی کوئی علم نہیں ہے۔ اردو کے بہی خواہان اس طرف توجہ دیں تو یقیناً وہی اردو جس کے نیم جاں ہونے کا ماتم کیا جا رہا ہے ایک بار پھر سے تناور درخت بن سکتی ہے، لیکن یہ سب کرے گا کون؟ کیونکہ ہمیں تو عادت سی پڑ گئی ہے کہ جب بھی ہم پر اردو زبان کی بقا اور تحفظ کا دورہ پڑتا ہے تو ہم کسی فربہ تنخواہیافتہ اردو رئیس کے محلوں میں اردو زبان و تہذیب کی روایت کو تلاش کرنے نکل پڑتے ہیں اور ان کے بچوں کو انگلش بولتے پڑھتے دیکھ کر اپنا سر پیٹ لیتے ہیں اور اردو کی اس زبوں حالی پر ایک دو سطری کا مرثیہ لکھ کر خود کو اردو کا سچا بہی خواہ سمجھنے لگتے ہیں۔

یہ وقت زبانی جمع خرچ کرنے کا نہیں ہے، اگر کوئی واقعی اردو کا بہی خواہ ہے تو اسے چاہیے کہ وہ شہر کی رنگینیوں سے نکل کر دیہات کی گلیوں میں جھانک کر دیکھے۔ اسے اتنا بڑا میدان ملے گا کہ وہ سچ مچ اردو کی بہی خواہی کا حق ادا کر سکے گا۔

• نقی حسین صاحب نے سردار جعفری صاحب کی کتاب کا اچھا مطالعہ پیش کیا ہے۔ معصوم عزیز کاظمی صاحب نے عبدالمغنی صاحب کے متعلق اپنے خیالات کو قلم زد کرنے میں بڑی معصومیت کا ثبوت دیا ہے۔ شہنشاہ تو شہنشاہ ہی ہوتا ہے (چاہے وہ ظرافت کا ہی کیوں نہ ہو) اس کے آگے تو بڑے بڑے لوگوں کو نظریں اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی، تو پھر خالد عرفان صاحب سے ہمیں کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ آفاق صاحب نے کام کی باتیں کہی ہیں مگر ان کی تعریف سے تو مجھے گریز ہی کرنا پڑے گا۔ "جزل کمیٹی اور اس سے متعلق دیگر کمیٹیوں کا جائزہ" پر سلمیٰ شاہین صاحبہ کا تبصرہ قاری کو کتاب خریدنے اور پڑھنے کی طرف راغب کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔

☆ آفاق عالم صدیقی، پورا، کہاریہ، دور بھنگہ

ستمبر کے کتاب نما میں "اف یہ درد ملت کا" اور "مصر میں اردو زبان" یہ مضامین ہمارے سبھی ساتھیوں نے بے حد پسند کیے۔ اف یہ درد ملت کا تو واقعی ایک حقیقی نمونہ ہمارے سامنے آئے دن آرہا ہے۔ میں نصرت ظہیر کو اپنی جانب سے لاکھوں بار مبارکباد کا حقدار سمجھتا ہوں۔ آپ میری جانب سے انھیں مبارکباد بھیجیے۔

☆ محمد لقمان قریشی، ایم اے، نگر، لونار، بلڈانہ

اکتوبر ۹۸ء کی شمارے میں مہمان اداریہ "تانیثی شاعری کا باغیانہ لہجہ" پڑھا۔ نجمہ رحمانی کے قلم کی جولانی تمہید طولانی میں کھو گئی ورنہ موضوع تو اتنا بھیانک تھا کہ ظالم مردوں کے پرزے اڑ جاتے اور پھر بہت "باحجاب" لکھا ہے اس لیے تشنگی باقی رہ گئی۔

یہ حقیقت ہے کہ صدیوں سے رائج جنسی استحصالی نظام نے عورت کو یخ بستہ وجود بنا کر رکھ دیا تھا، اس کے سینے میں درد کی آگ جلتی رہی مگر اسے اظہار کی زبان دینا ناممکن تھا۔ یہ عجیب ستم تھا کہ جن کے تصور سے رعنائی خیال پیدا ہو انہی

کا مضمون "اردو زبان کا مستقبل اور ہماری ذمہ داریاں" دیکھا۔ اردو زبان کے سلسلے میں پہلی بار ایک حقیقت پسند اور سنجیدہ مضمون پڑھنا نصیب ہوا۔

نرگس سلطانہ کا یہ جملہ "زبانیں چاہے حکمراں طبقے کی سرپرستی سے محروم ہوں، لیکن اگر گھروں میں یہ زندہ رہیں تو بچ جائیں گی رواج پائیں گی ورنہ سنسکرت، پالی اور فارسی کی طرح یہ بھی اوراق پارینہ ہو جائے گی"۔ ہمارے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اردو ایک مرتی ہوئی زبان ہے پہلے دفتروں سے پھر کالجوں اور اسکول سے رخصت ہوئی اور اب گھروں سے بھی رخصت ہونے کو ہے۔

اردو ہمیشہ موقع پرستوں کا شکار رہی ہے۔ جب تک اس نفع بخش گائے سے فائدہ حاصل ہوتا رہا اس سے چپٹے رہے پھر الگ ہو گئے۔ آج بھی ایک بڑی ٹولی یہ کام کر رہی ہے۔ اردو کی بقا یا فنا سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نرگس سلطانہ کی تحریر اردو کے سلسلے میں ان کے کرب کا اظہار ہے۔ ان کے مشورے اس مرتی ہوئی زبان کے سلسلے میں ان کے درد مند فکر کا نتیجہ ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پر عمل کیا جائے اور ان پر عمل کر باتیں کی جائیں۔

☆ کلیم محمد جان، شعبہ انگریزی، منشی سنگھ کالج، موتی ہاری

جولائی ۹۸ء کے شمارہ کے مقابلہ میں اگست ۹۸ء کا شمارہ ہر اعتبار سے زیادہ وقیع ہے۔ انشائیوں نے اس شمارہ کو بہت ہی دلچسپ بنا دیا ہے۔ مسعود احمد برکاتی صاحب کا اداریہ (بچوں کے رسالے کا کردار) بہت مناسب وقت پر سامنے آیا ہے۔ اس وقت اردو کی زبوں حالی کا جو رونا رویا جا رہا ہے اور اردو کے قارئین کی جو قلت محسوس کی جا رہی ہے اس کی ایک وجہ بچوں کے رسائل کی کمی اور اس کی محدود پہنچ ہے۔

بچ مچ رسالوں کی اہمیت و افادیت اکثر معاملوں میں کتابوں سے زیادہ ہے۔ اس لیے رسائل کے ترسیل و ابلاغ پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے، کیونکہ اس کی پہنچ کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا اس کی اہمیت اسی حساب سے بڑھتی چلی جائے گی۔

ہمارے یہاں اکثر دیہاتوں میں بچے اردو تو پڑھ لیتے ہیں مگر اردو کی دو چار دینی کتابوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں پڑھ پاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ پڑھنا ہی نہیں چاہتے ہیں یا یہ کہ وہ جتنی اردو جانتے ہیں اس کے توسط سے اپنے اردو زبان و ادب سے آگاہ ہونے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ وہ پڑھنا چاہتے ہیں بہت کچھ اپنی اردو دانی کے توسط سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر نہ تو خود اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ کیا پڑھیں نہ والدین کی سمجھ میں آتا ہے کہ اس کی جانکاری میں مزید اضافہ کس طرح ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں دیہاتوں میں اکثر والدین اَن پڑھ اور جاہل ہیں۔ انھیں اپنی تہذیب اپنی زبان اپنے معاشرے

کھلے خطوط

شہر آشوب ہے تو بڑی دلچسپ چیز، اور اس میں زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ بھی شعر کے آئینے میں دیکھے جا سکتے ہیں، لیکن معنوی گہرائی نہ ہونے کے باعث اس کے بارے میں زیادہ کہنا یا اس کے تجزیے میں بیان اور مضمون کی باریکیاں نکالتے جانا ممکن نہیں۔ امیر عارفی کی کتاب "شہر آشوب ایک تجزیہ" میرے اس خیال کو بڑی حد تک غلط ثابت کرتی ہے۔ امیر عارفی نے اپنی کتاب میں تحقیق اور تجزیہ دونوں کا حق ادا کیا ہے۔ انھوں نے بہت سی نئی معلومات فراہم کی ہے۔ نئے شہر آشوب دریافت کیے ہیں، معاصر عہد کے شہر آشوب بھی ان کے دائرہ بحث میں آئے ہیں اور اس طرح ان کی داستان کوئی تین سو برس کی شہر آشوبی شاعری کو محیط ہو گئی ہے۔ انھوں نے شہر آشوب کو سماجی تنقید کا ایک طریقہ اور نقد حیات کا ایک انداز قرار دیا ہے۔ اس بات میں بڑی صداقت ہے لیکن شہر آشوب کے رسومیات کو ذہن میں رکھیں تو کچھ نئی باتیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ ان کا یہ سوال بہر حال دلچسپ اور خیال انگیز ہے کہ شہر آشوب کی صنف کیوں وجود میں آئی؟ اس کا جواب جو انھوں نے دیا ہے وہ اختلافی لیکن امکانات سے پر ہے۔

شہر آشوب پر گنتی کے اچھے کام ہوئے ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب اور سید عبداللہ کے مضامین اور نعیم احمد کی کتاب کے سوا اردو تنقید کا دامن اس صنف کی تنقید و تعین قدر کی کوششوں سے خالی نظر آتا ہے۔ امیر عارفی کی کتاب اس خلا کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے۔ اسی طرح قاضی عبدالغفار کے دو ناول "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" ہیں کہ یہ پڑھے تو بہت گئے اور اپنے زمانے میں بااثر بھی رہے لیکن اردو ناول کی تاریخ میں ان کے مقام کا مفصل جائزہ اب تک نہ لیا گیا تھا۔ ان ناولوں میں عورت، عشق اور عورت مرد کے تعلقات کے بارے میں اوائل بیسویں صدی کے ہندستانی مسلمان کا رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ خاص کر ایسے مسلمان کا جو مغربی تعلیم حاصل کر چکا ہے اور جو انیسویں صدی کے اواخر کی انگریزی ناول نگاری کو اس فن کی معراج قرار دیتا ہے۔ امیر عارفی کی کتاب میں اس ثقافتی کشمکش کا تو ذکر نہیں ہے جس کی بنا پر اردو میں "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" جیسے ناول وجود میں آئے، لیکن خود ان ناولوں میں مضمر تہذیبی رویوں اور ان کے ادبی سرچشموں پر بہت اچھی بحث اس کتاب میں ملتی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے امیر عارفی نے اردو ناول کی تاریخ کے ایک نسبتاً گم نام باب کو مرکز داستان بنا دیا ہے۔ وہ ہمارے شکریے اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔

☆ شمس الرحمٰن فاروقی، C29، ہاسٹنگ روڈ، الہ آباد

جولائی ۹۸ء کے کتاب نما میں نرگس سلطانہ

ہندستان آکر بیڈیکر صاحب اس ناول کو خاموشی کے ساتھ تحریر کرتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے یہ بات اپنی بیگم مالتی بائی سے بھی چھپائے رکھی۔ وہ جب کام پر چلی جاتیں تو یہ بیٹھ کر لکھتے۔ ناول ختم ہونے پر مسودہ اپنے ایک دوست کے سپرد کیا اس سے قبل ان کا نام وی۔ جی بیڈیکر کے نام سے چلتا تھا لہذا جب ناول چھپ کر آیا تو اس میں ان کا نام وشرام چھپا تھا۔ مالتی بائی نے یہ ناول پسند کیا اور اپنے شوہر کو پڑھنے کی صلاح دی۔

"میرا لکھا مجھی سے پڑھواؤ گی۔۔؟"

"کیا۔۔ یہ تم نے لکھا ہے؟"

"ہاں۔ تم ہمیشہ کہتی ہو نا پہلے کر کے دکھاؤ پھر بولو، بس میں نے کر دکھایا ہے۔"

بیڈیکر صاحب بڑے منہ پھٹ مشہور تھے ایک واقعہ اس تعلق سے یوں ہے کہ ایک خاتون ان کا انٹرویو لینے آگئیں۔

"جیمس جوائس کی "یولیسس" پڑھی ہے؟

خاتون فرماتی ہیں کہ ان کے پسینے چھوٹ گئے اور ڈرتے ڈرتے انھوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کوئی بات نہیں آئندہ ملاقات میں "ہاں" کہنے کا وعدہ کرو تو انٹرویو دوں گا۔"

محترمہ نے مزید لکھا ہے کہ انٹرویو ختم کر کے جب وہ ان کے گھر سے نکلیں تو پہلی فرصت میں "یولیسس" حاصل کر کے اس کا مطالعہ کیا۔

بیڈیکر صاحب نے بہت کم لکھا۔ کسی چاہنے والے نے اس جانب توجہ دلائی تو کہنے لگے۔

"بہت لکھا ہے مگر سارا کچرا بکسے میں دھرا پڑا ہے۔ میں لکھ کر دو سال کے لیے اسے ایک بکسے میں بند کر دیتا ہوں۔ ڈیڑھ دو سال بعد اسے نکال کر دوبارہ پڑھتا ہوں اگر اپنی وہ تحریر Out Dated نہ لگے تو دوبارہ تحریر کر کے اسے شائع کرواتا ہوں۔ مجھے رشک آتا ہے ادیبوں پر جو آج لکھتے ہیں کل اسے شائع کرواتے ہیں اور پرسوں ان کی یہ کتاب کسی نہ کسی ادارے کی جانب سے انعام کی حقدار قرار دی جاتی ہے۔ نہ جانے مجھ سے یہ کیوں نہیں ہو پاتا!

وہ اپنی تخلیق کے لیے ہمیشہ نئے موضوع اور نئی تکنیک کی تلاش میں لگے رہتے تھے۔ سیکولر خیالات رکھنے والے اس فنکار کی ایک تقریر کا یہ حصہ شاید ہمارے لیے بھی کوئی اہمیت چھوڑ جائے۔

"ظلم چاہے دنیا کے کسی حصے میں ہو، خاموش نہ رہو بلکہ اس کے خلاف آواز بلند کرتے رہو۔ ذات پات اور مذہب کے نام پر عوام کو لڑوانے والے ابن الوقتوں سے عوام کو آگاہ کرتے رہو۔ انسانیت کا پرچار کرنے کی ذمہ داری ہر زبان کے ادیب شاعر اور فنکاروں کی ہے، اس سے چشم پوشی کرنے والا کبھی سچا فنکار نہیں ہو سکتا۔"

مطبوعات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک نظر میں

ادب، تنقید، انشاء

پانچ جدید شاعر — حمید نسیم — 210/-

قاری سے مکالمہ — شمیم حنفی — 150/-

اعلیٰ تعلیم — خطبات ڈاکٹر ذاکر حسین — 120/-

اردو زبان و ادب کے فروغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ

مرتبہ پروفیسر صغرا مہدی — 75/

فراق دیار شب کا مسافر — مرتبہ پروفیسر شمیم حنفی — 150/-

بیاں اور — اختر سعید خاں — 144/-

لفظوں کی انجمن میں — ڈاکٹر سید حامد حسین — 120/-

تعبیر و تفہیم — ڈاکٹر خلیق انجم — 135/-

معاصرین و متعلقات مولانا ابوالکلام آزاد

عبدالقوی دسنوی — 60/-

سرسید سے اکبر تک — مرتبہ شمیم حنفی — 90/-

سیاہ فام ادب — مرتبہ شمیم حنفی — 40/

خامہ بگوش کے قلم سے — مرتبہ مظفر علی سید — 80/

مجلد 150/-

الجھنیں (نفسیاتی مضامین) — عبداللہ ولی بخش قادری — 60/-

جو رہی سو بے خبری رہی خودنوشت — ادا جعفری — 200/-

قلم اور قدم — سید حامد — 75/-

مستقبل کی طرف

(خطبات جلسہ تقسیم اسناد جامعہ اسلامیہ) 150/-

مرتبہ خواجہ محمد شاہد، خالد کمال فاروقی

مولانا ابوالکلام آزاد — فکر و نظر کی چند جہتیں

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — 60/-

جدید ادبی تحریکات — ڈاکٹر سید حامد حسین — 51/-

صحرا میں لفظ — فضیل جعفری — 90/-

فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ — ڈاکٹر مومن محی الدین — 45/-

ٹیلی ویژن نشریات: تاریخ، تحریر، تکنیک — انجم عثمانی — 90/-

انشائے غالب — مرتبہ رشید حسن خاں — 60/-

اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ — ابراہیم یوسف — 45/-

تاریخ فارسی ادب قدیم و جدید رجحانات — ڈاکٹر سید عال عابدین — 51/-

انداز گفتگو کیا ہے — شمس الرحمن فاروقی — 75/-

دستک اس دروازے پر — ڈاکٹر وزیر آغا — 51/-

سرسید یادگاری خطبات — مونس رضا، مسعود حسین خاں — 10/-

تفہیم — رشید حسن خان — 75/-

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں — عبدالقوی دسنوی — 75/-

کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے — تقی حسین جعفری — 51/-

شناس و شناخت — انور صدیقی — 60/-

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج — ڈاکٹر سید ظہور قاسم — 10/-

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم — اختر الواسع — 10/-

آزمائش کی گھڑی — سید حامد — (زیر طبع)

سوریائی اور بابلی تہذیب و تمدن — مالک رام — 75/-

جام جہاں نما — گربچن چندن — 75/-

اردو ناول میں عورت کا تصور — فہمیدہ کبیر — 45/

اسرار خودی (فراموش شدہ اڈیشن) — شائستہ خان — 75/-

تاثر نہ کہ تنقید — صدیق الرحمن قدوائی — 51/-

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے — طاہر مسعود — 66/-

تحریریں — ڈاکٹر اسلم پرویز — 51/-

انشائیہ کے خدوخال — وزیر آغا — 35/-

افکار اقبال — عبدالسلام خان — 125/-

تذکرہ ماہ و سال — مالک رام — 125/-

تحقیق نامہ — مشفق خواجہ — 125/-

سحر کے پہلے اور بعد — سید اظفر چغتائی — 51/-

پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور — 51/-

اقبال کا نظریہ خودی — عبدالمغنی — 150/-

قلندر بخش جرأت — جمیل جالبی — 10/-

جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث علوی — 30/-

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	21/-
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible] کے خطوط	مرتبہ [illegible]	12/50
[illegible] تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	60/-	حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	7/50
[illegible] کے بارے میں	مالک رام	51/-	مسائل [illegible]	[illegible]	22/-
[illegible]	مولانا ابوالکلام آزاد	75/-	[illegible]	مرتبہ مالک رام	4/50
[illegible] کی تنقید	پروفیسر [illegible]	48/-	[illegible] شناسی	پروفیسر محمد مجیب	16/-
[illegible] تنقید	پروفیسر حامدی کاشمیری	48/-	کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	24/-
تذکرہ	مرتبہ مالک رام	101/-	ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	5/50
[illegible]	مالک رام	80/-	جدید ترکی ادب کے ارکان خمسہ	ضیاء الحسن فاروقی	4/-
[illegible]	[illegible] رضوی	21/-	نظر اور نظریے	آل احمد سرور	
[illegible] السرور	مرتبہ شمس الرحمن فاروقی	75/-	مسرت سے بصیرت تک	آل احمد سرور	75/-
[illegible]	مرتبہ مظفر حنفی	45/-	تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	27/-
[illegible] بجنوری	صدیقہ بیگم	25/-	باتیں [illegible]	[illegible]	36/-
ادبی سماجیات	ڈاکٹر محمد حسن	15/-	[illegible]	مرتبہ [illegible] صدیقی	36/-
[illegible] مزاج	[illegible]	24/-	[illegible]	خواجہ غلام السیدین	6/-
تحریر و تعبیر	[illegible]	15/-	نئی شعری روایت	پروفیسر شمیم حنفی	(زیر طبع)
اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	(زیر طبع)	[illegible]	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	15/-
افسانے کی حمایت میں	شمس الرحمن فاروقی	(زیر طبع)	داستان [illegible]	شاہ عبدالسلام	21/-
[illegible]	انتظار حسین	30/-	**تعلیم**		
ذکر معاصرین دوم	مرتبہ مالک رام	14/-	ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم	ڈاکٹر سلامت اللہ	51/-
ذکر معاصرین سوم	مرتبہ مالک رام	22/-	[illegible] کی تعلیم و تربیت	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	90/-
ذکر معاصرین چہارم	مرتبہ مالک رام	40/-	[illegible]	[illegible]	60/-
لغت نویسی کے مسائل	مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ	35/-	مفکرین تعلیم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	120/-
معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	30/-	استادوں کی تعلیم و تربیت	مسعود الحق	60/-
اردو کی تہذیبی حیثیت	پروفیسر علی محمد خسرو	6/-	تعلیم و تعلم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	75/-
تحلیل نفسی کے پیچ و خم	ڈاکٹر سلامت اللہ	35/-	مسلمانوں کا تعلیمی نظام	ضیاء الحسن فاروقی	45/-
اثبات و نفی	شمس الرحمن فاروقی	40/-	مشقی تدریس کیوں اور کیسے	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	45/-
نقد حرف	پروفیسر ممتاز حسین	48/-	معاشیات کے اصول	[illegible]	21/-
اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر [illegible] مہدی	(زیر طبع)	آسان [illegible]	شکیل اختر فاروقی	24/-
انشائیات	ڈاکٹر عابد حسین	(زیر طبع)	تعلیم و تربیت [illegible]	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	51/-
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	12/-	تعلیم اور [illegible]	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	35/-
[illegible]	علی جواد زیدی	12/-	ہم [illegible] کیسے پڑھائیں	معین الدین	54/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	11/-	ہم کیسے پڑھائیں	ڈاکٹر سلامت اللہ	33/-

علمی خطبات	[illegible]	[illegible]
سرسید کی تعلیمی تحریک	[illegible]	[illegible]
تعلیم اور اس کے مسائل	ڈاکٹر محمد اکرم خاں	30/-
آسان اردو (ہندی کے ذریعے)	کلیل الرحمٰن	12/-
تعلیم، نظریہ اور عمل	ڈاکٹر محمد اکرم خاں	30/-
تعلیم فلسفہ اور سماج	ڈاکٹر سلامت اللہ	60/-
بنیادی استاد کے لیے	ڈاکٹر سلامت اللہ	12/-
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	12/-
عبارت کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	18/-
انشا اور تلفظ	رشید حسن خاں	12/-
تاریخ کیسے پڑھائیں	سرور ہاشمی	36/-
بچوں کا آرٹ	عبدالحق	24/-

تذکرہ، سوانح، شخصیت

[illegible] (خودنوشت)	[illegible] جعفری	200/-
دلی کی بیگماتی زبان	محی الدین حسن	15/-
اپنی اوروں کی خوشبو	کشمیری لال ذاکر	30/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں	اشرف صبوحی	51/-
چند تصویر بتاں	مولانا عبدالسلام قدوائی	45/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	پروفیسر آل احمد سرور	8/-
صاحب جی سلطان جی	ڈاکٹر اسلم فرخی	20/-
ہندستانی مسلمان آئینۂ ایام میں	ڈاکٹر عابد حسین	75/-
شہید جستجو	ضیاء الحسن فاروقی	75/-
مولانا آزاد کی کہانی	ڈاکٹر ظفر احمد نظامی	18/-
نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیاء)	ڈاکٹر اسلم فرخی	15/-
حیات حالی	مولانا اسلم جیراجپوری	12/-
نقش ذاکر	مرتبہ عبدالحق خاں	51/-
مالک رام ایک مطالعہ	مرتبہ علی جواد زیدی	50/-
عبداللطیف اعظمی حیات و خدمات	مرتبہ اطہر صدیقی	18/-
یادوں کا چراغ [illegible]	مترجم شمیم حنفی	40/-
مجیب صاحب احوال و آثار	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	90/-
حیات عابد (خودنوشت ڈاکٹر عابد حسین)	ڈاکٹر منظر مہدی	45/-
سلسلۂ روز و شب (خودنوشت)	صالحہ عابد حسین	65/-
[illegible]	مرتبہ یوسف ناظم	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	مرتبہ شمیم حنفی	(زیر طبع)
حیات حافظ	اسلم جیراجپوری	15/-
[illegible]	مولانا عبدالسلام خاں	40/-
[illegible]	پروفیسر [illegible] حسین	(زیر طبع)
مکالمات افلاطون	ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین	30/-
[illegible]	شکیل [illegible] بیگم	10/-
اب جن کے دیکھنے کو	حکیم عبدالقوی	12/50
شاد عارفی شخصیت اور فن	ڈاکٹر مظفر حنفی	24/-
[illegible] حیات و خدمات	ڈاکٹر [illegible]	18/-
[illegible]	عبدالرحمٰن [illegible]	12/-
میر انیس سے تعارف	صالحہ عابد حسین	7/-
ملیے ذاکر صاحب سے	رشید احمد صدیقی	25/-
[illegible]	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	1/50
ڈاکٹر ذاکر حسین [illegible]	عبداللطیف اعظمی	6/50
گنج ہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	45/-
کیا خوب آدمی تھا	مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین	15/-
[illegible] زیدی	کرنل بشیر حسین زیدی	25/-
[illegible]	مرزا فرحت اللہ بیگ	4/-
ذاکر صاحب [illegible] میں	ضیاء الحسن فاروقی	45/-
روسی ادب (جلد اول و دوم)	پروفیسر محمد مجیب	60/-
مرحوم دہلی کی ایک جھلک	شمیم احمد	10/-

طنزیات، مزاحیات

آخر کار	مجتبیٰ حسین	60/-
[illegible]	یوسف ناظم	51/-
خامہ بگوش کے قلم سے	مظفر علی سید	150/- غیر مجلد 80/-
فی البدیہہ	یوسف ناظم	45/-
چہرہ در چہرہ	مجتبیٰ حسین	51/-
طنزیات و مضحکات	رشید احمد صدیقی	60/-
گوشے میں قفس کے	دلیپ سنگھ	45/-
فی الحقیقت	یوسف ناظم	45/-

[illegible]	یوسف ناظم	[illegible]
گول مال	شفیقہ فرحت	18/-
[illegible]	یوسف ناظم	18/-
رانگ نمبر	شفیقہ فرحت	18/-
بالکلیات	یوسف ناظم	18/-
برکت ایک چھینک کی	وجاہت علی سندیلوی	15/-
ذکر خیر	یوسف ناظم	21/-
بے پر کی	حضرت آوارہ	(زیر طبع)
خنداں	رشید احمد صدیقی	30/-
گنجہائے گراں مایہ	رشید احمد صدیقی	45/-
دیوار قہقہہ (مزاحیہ شاعری)	محمد یوسف پاپا	15/-
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	15/-

طب. ایلوپیتھی

طب یونانی اور [illegible]	حکیم اشہر قدیری	60/-
فرہنگ اصطلاحات طب	ڈاکٹر اختر امر تسری	45/-
اخلاقیات طبیب	حکیم محمد سعید	20/-
اشارات قلب	پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم	6/-
مرضیات	حکیم نعیم الدین زبیری	75/-
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	ترجمہ نذیر الدین مینائی	25/-
ذیابیطس	ڈاکٹر محمد شعیب اختر	(زیر طبع)

سفرنامے، رپورتاژ

سیر کر دنیا کی غافل	صغرا مہدی	51/-
وسط ایشیا	آصف جیلانی	51/-
کولمبس کے دیس میں	جگن ناتھ آزاد	45/-
لنکن کے دیس میں	جگن ناتھ آزاد	25/-
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز	بیگم صالحہ عابد حسین	18/-
سخن دلنواز (خطوط کا مجموعہ)	خواجہ غلام السیدین	30/-
رہ نورد شوق	ڈاکٹر سید عابد حسین	14/50
بادلوں کے سائے	شفیق صدیقی	18/-

شعری مجموعے

طرز دوام	اختر سعید خاں	51/-
[illegible]	[illegible]	30/-
رنگ خوشبو روشنی	قتیل شفائی	60/-
کاسۂ خیال	عبدالمعروف خاں	51/-
میں سمندر ہوں	فرحان سالم	30/-
[illegible] (فراموش شدہ نظمیں) مسعود خاں		75/-
بانگ درا	اقبال	12/-
بال جبریل	اقبال	8/-
ضرب کلیم مع ارمغان حجاز	اقبال	8/-
خواب اور خلش	آل احمد سرور	60/-
غبار منزل	غلام ربانی تاباں	45/-
[illegible]	[illegible]	90/-
پرانی بات ہے	زبیر رضوی	30/-
ساز سخن	ادا جعفری	45/-
غزل نما (غزلیات کا انتخاب) مرتبہ ادا جعفری		75/-
دائروں میں پھیلی لکیر	کشور ناہید	30/-
آنکھ میں سمندر	زاہد ڈار	30/-
آنکھ اور خواب کے درمیان	عذرا عباس	30/-
رات کے مسافر	انور سجاد	28/-
گداز شب	معین احسن جذبی	40/-
ایک خواب اور	علی سردار جعفری	40/-
حرف حرف روشنی	حمایت علی شاعر	35/-
لفظوں کا آسمان (نظمیں)	مترجم کرامت علی کرامت	20/-
وہ ہے	جمیل الدین عالی	12/-
کلیات عرش ملسیانی	مرتبہ مالک رام	75/-
راہوار	ساقی فاروقی	20/-
پتھر کی زبان	فہمیدہ ریاض	15/-
شام کا پہلا تارا	زہرا نگاہ	21/-
مثنوی نہ سپہر (امیر خسرو)	مترجم محمد رفیق مارہروی	28/-
شام شہر یاراں	فیض احمد فیض	6/-
جستہ جستہ	خورشید الاسلام	18/-

گل باداں کتھا	ظفر زاہدی	8/-
کرب آگہی	آغا قزلباش	10/50
نوائے آوارہ	شاہدہ جہاں	(زیر طبع)
درد و گیت	ڈاکٹر قیصر جہاں	(زیر طبع)
انتخاب حالی (نیا ایڈیشن)	سلام مچھلی شہری	15/-
شہر آشوب مرتبہ	ڈاکٹر نعیم احمد	8/50
ذوق سفر	شاہدہ جہاں	5/-
رک رک کر	سلطانہ جہاں اختر	7/-
دیوار قہقہہ (مزاحیہ شاعری)	[illegible]	15/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

تصوف، رسم اور حقیقت	خواجہ حسن ثانی نظامی	90/-
انوار قرآن	پروفیسر نثار احمد فاروقی	30/-
حضرت محمد اور قرآن	ڈاکٹر رفیق زکریا	(زیر طبع)
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	ضیاء الحسن فاروقی	45/-
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	محمود احمد برکاتی	45/-
فرید و فرد فرید	اسلم فرخی	27/-
اسلام میں رواداری کی راہ	ضیاء الحسن فاروقی	8/-
اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سر سید احمد کا مرتبہ	سید طفیل احمد	8/-
فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل	مولانا مجیب اللہ ندوی	14/-
نقد ملفوظات	نثار احمد فاروقی	65/-
خطبات عیدین	مولانا تقی امینی	21/-
تاریخ اودھ	نجم الغنی رامپوری	27/-
تذکرہ ہندوستان کی سیکولر روایات	ڈاکٹر مجیب اشرف	12/-
مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست	پروفیسر مشیر الحق	8/-
ہمارے دینی علوم	مولانا اسلم جیراجپوری	18/-
ترجمہ قرآن نفاذ شریعت کی انسانی کوشش	پروفیسر مشیر الحق	8/-
مسلمانان ہند سے وقت کے مطالبات	مولانا حبیب الرحمن شیروانی	8/-
دنیا کے بڑے مذاہب	عماد الحسن آزاد فاروقی	(زیر طبع)
ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات	عماد الحسن آزاد فاروقی	40/-
ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک	شمس الرحمن محسنی	50/-
رسول اکرم اور یہود حجاز	سید برکات احمد	40/-
مکتوب الارشاد	مولانا اسلم جیراجپوری	4/-
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء	عماد الحسن آزاد فاروقی	(زیر طبع)
اسلام دور حاضر میں	مترجم پروفیسر مشیر الحق	38/-
اسلامیات	مالک رام	27/-
قرون ماضی	مولانا اسلم جیراجپوری	(زیر طبع)
حضرت جنید بغدادی	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	75/-
روح القرآن	مولانا عبدالسلام قدوائی	(زیر طبع)
عشق اور بھگتی	عماد الحسن آزاد فاروقی	(زیر طبع)
عورت اور اسلامی تعلیم	مالک رام	30/-
مسلمان اور وقت کے تقاضے	عبدالسلام قدوائی	8/-
عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا	محمود الحسن	15/-
سماجی تبدیلیاں مترجم	قاضی عبید الرحمن	2/-
مذہب اور جدید ذہن	پروفیسر مشیر الحق	(زیر طبع)
ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں	ڈاکٹر سالم قدوائی	(زیر طبع)
کتاب و سنت کے جواہر پارے	مولانا ضیاء الدین اعظمی	(زیر طبع)
مسلمان اور سیکولر ہندوستان	پروفیسر مشیر الحق	(زیر طبع)
اسلامی عقائد و مسائل مذہب	مولانا ضیاء الدین اعظمی	(زیر طبع)
اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی)	ڈاکٹر رشید الوحیدی	25/-
تاریخ الامت، سیرت رسول حصہ اول	مولانا اسلم جیراجپوری	21/-
تاریخ الامت، خلافت راشدہ حصہ دوم	مولانا اسلم جیراجپوری	24/-
تاریخ الامت، خلافت بنی امیہ حصہ سوم	مولانا اسلم جیراجپوری	18/-
تاریخ الامت، عباسیہ حصہ چہارم	مولانا اسلم جیراجپوری	18/-
تاریخ الامت، عباسیہ حصہ پنجم	مولانا اسلم جیراجپوری	27/-
تاریخ الامت، عباسیہ مصر حصہ ششم	مولانا اسلم جیراجپوری	27/-
تاریخ الامت، آل عثمان حصہ ہفتم	مولانا اسلم جیراجپوری	18/-
تاریخ الامت، عباسیہ حصہ ہشتم	مولانا اسلم جیراجپوری	28/-
فکر اسلامی کی تشکیل جدید	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	30/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد سائز)	قاری محمد اسماعیل	3/-
قاعدہ یسرنا القرآن (کلاں سائز)	قاری محمد اسماعیل	6/-
بکھرے اوراق	سنیتی کمار چٹرجی	4/-
تاریخ فلسطین (1948ء)	سید محمد عزیز الدین حسین	9/-

ناول

آگے سمندر ہے	انتظار حسین	150/-
[illegible]	عبدالصمد	75/-
صحرا نورد کے خطوط	مرزا ادیب	75/-
نوٹوں کی تلاش	[illegible]	60/-
[illegible]	کشمیری لال ذاکر	48/-
سفر	رابعہ تبسم	27/-
سمندری فرشتہ	ہادیہ رحمن	27/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	ڈاکٹر صغرا مہدی	24/-
مٹی سے ہیرا	سید مقبول احمد	10/-
تذکرہ	انتظار حسین	54/-
ریت کی دیواریں	رفعت سروش	21/-
بنجر بادل	کشمیری لال ذاکر	33/-
فرار	ظفر پیامی	40/-
ڈوبتے سورج کی کتھا	کشمیری لال ذاکر	36/-
لمحوں میں بکھری زندگی	کشمیری لال ذاکر	18/-
مہکتی بہاریں	کوثر چاندپوری	18/-
راگ بھوپالی	صغری مہدی	15/-
دھرتی سدا سہاگن	کشمیری لال ذاکر	7/50
پروائی	صغرا مہدی	9/50
گوری سوئے سیج پر	صالحہ عابد حسین (زیر طبع)	
انگوٹھے کا نشان	کشمیری لال ذاکر	7/-
[illegible]	خالدہ رحمن	10/-
اپنی اپنی صلیب	صالحہ عابد حسین	60/-
پرانی دھرتی اپنے لوگ	جتندر بلو	12/-
ایک مٹی ہندوستان	سید شمیم اشرف	6/-
ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	18/-

آلسی کے گیت ترجمہ	(قرۃ العین حیدر)	3/-
چاند کا	سلطانہ آصف فیضی	3/-
پاپڑ والاں	صغرا مہدی	(زیر طبع)
[illegible]	[illegible]	24/-
کوردان (تیلو اکش)	[illegible]	75/-
میدان گل (تیلو اکش)	[illegible]	75/-
پودوکیہ ترجمہ	قرۃ العین حیدر	2/-
شکستہ پیالہ	زہرہ [illegible]	2/-
[illegible]	ترجمہ [illegible]	12/50

افسانے

صحرا نورد کے خطوط	مرزا ادیب	75/-
پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر	75/-
آوازوں کا میوزیم	ساگر سرحدی	45/-
سدا بہار چاندنی	رام لعل	30/-
دل دریا	شرون کمار	25/-
تین چہرے تین آوازیں	صالحہ عابد حسین	18/-
درد دل	ستارہ جعفری	18/-
مکتی بودھ	راجندر سنگھ بیدی	25/50
نیلی ساڑی	خواجہ احمد عباس	(زیر طبع)
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	30/-
کوکھ جلی	راجندر سنگھ بیدی	18/-
ریت سمندر اور جھاگ	ہرچرن چاولہ	12/75
تیوری	امر سنگھ	14/75
قلی نمبر ۳۹۹	وجاہت علی سندیلوی	14/75
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	27/-
اپنے پرائے	اوم پرکاش بجاج	9/-
نئی دھرتی نئے انسان	خواجہ احمد عباس	(زیر طبع)

ہاتھ ہمارے قلم ہوئے	راجندر سنگھ بیدی	30/-
واردات	پریم چند	21/-
راستے اور کھڑکیاں	انور خاں	6/-
جو میرے وہ راجا کے نہیں	صغرا مہدی	10/
اپنے دکھ مجھے دے دو	راجندر سنگھ بیدی	21/-

ڈرامے

بازار میں نیند	شمیم حنفی	60/-
سلاخوں کی ہے	کشمیری لال ذاکر	90/-
اجالے	ابراہیم یوسف	51/-
زندگی کی طرف	پروفیسر شمیم حنفی	36/-
زوال کا عروج	مترجم: انور عظیم	36/-
مجھے گھر یاد آتا ہے	پروفیسر شمیم حنفی	21/-
اینٹی گونی	سوفوکلیز مترجم: قیصر زیدی	9/-
خانہ جنگی	پروفیسر محمد مجیب	6/-
حبہ خاتون	پروفیسر محمد مجیب	6/-
تاریخ کے آنچل میں	رفعت سروش	18/-
اداس موڑ	ابراہیم یوسف	12/-
انٹنی اور کلوپیٹرا	ولیم شیکسپیئر	16/50
مٹی کا بلاوا	شمیم حنفی	45/-
سات کھیل	راجندر سنگھ بیدی	(زیر طبع)
غالب کون	سید محمد مہدی	8/50
خیال کی دستک	ساگر سرحدی	12/75
دیا بجھ گیا	کرتار سنگھ دگل	(زیر طبع)
آزمائش	پروفیسر محمد مجیب	6/-
انجام	پروفیسر محمد مجیب	6/-
کھیتی	پروفیسر محمد مجیب	6/-
ہیروئن کی تلاش	پروفیسر محمد مجیب	5/50

پردۂ غفلت	ڈاکٹر سید عابد حسین	9/-
دروازے کھول دو	کرشن چندر	7/50
آئینۂ ایام	بے بریشٹ مترجم: خلیق انجم	4/50
نقش آخر	اشتیاق حسین قریشی	2/25
تحریکات اور آل انڈیا ریڈیو	ڈاکٹر اخلاق اثر	10/-

اقبالیات

افکار اقبال	محمد عبدالسلام خاں	125/-
اقبال کا نظریۂ خودی	عبدالمغنی	150/-
اقبال جاوید گر ہندی نژاد	شفیق صدیقی	(زیر طبع)
اقبالیات کی تلاش	عبدالقوی دسنوی	35/-
فلسفۂ اقبال (خطبات کی روشنی میں)	سید وحیدالدین	30/-
نقد اقبال	میکش اکبر آبادی	25/50

غالبیات

ذکر غالب	مالک رام	(زیر طبع)
گفتار غالب	مالک رام	48/-
غالب اور صفیر بلگرامی	مشفق خواجہ	36/-
تلامذۂ غالب	مالک رام	75/-
فسانۂ غالب	مالک رام	16/50
غالب اور شاہان تیموریہ	ڈاکٹر خلیق انجم	9/50

معیاری سیریز

موازنۂ انیس و دبیر	مرتبہ: رشید حسن خاں	24/-
نیرنگ خیال	مالک رام	15/-
یادگار غالب اردو	مالک رام	30/-
یادگار غالب فارسی	مالک رام	9/-
انتخاب مضامین سرسید	انور صدیقی	16/-
حیات سعدی	مرتبہ: رشید حسن خاں	36/-

تحفۃ الاحرار (تحقیق)	ڈاکٹر قمر رئیس	75/-
فردوس بریں	عبدالحلیم شرر	16/-
انتخاب مضامین شبلی	مرتبہ: رشید حسن خاں	75/-
انتخاب ناسخ	مرتبہ رشید حسن خاں	51/-
مثنوی [illegible] مرتبہ	عبدالماجد دریاآبادی	5 / -
شریف زادہ	ڈاکٹر قمر رئیس	20/-
امراؤ جان ادا	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	28/-
فسانۂ [illegible]	ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی	45/-
توبۃ النصوح	مالک رام	36/-
باغ و بہار	رشید حسن خاں	27/-
ابن الوقت	ڈاکٹر خلیق انجم	51/-
مجالس النساء	صالحہ عابد حسین	24/-
گذشتہ لکھنؤ	رشید حسن خاں	75/-
قصہ حاتم طائی	اطہر پرویز	75/-
انتخاب ولی	مرتبہ ظہیر الدین مدنی	20/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی	مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن	15/-
انتخاب مراثی انیس و دبیر	رشید حسن خاں	36/-
انتخاب نظیر اکبر آبادی	رشید حسن خاں	45/-
انتخاب اکبر الہ آبادی	صدیق الرحمٰن قدوائی	21/-
انتخاب کلام میر	ڈاکٹر محمد حسن	(زیر طبع)
دیوان درد	رشید حسن خاں	30/-
انتخاب سودا	رشید حسن خاں	75/-
انتخاب قلی قطب شاہ	محمد اکبر الدین صدیقی	27/-
انتخاب ذوق	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	24/-
مثنوی سحر البیان	رشید حسن خاں	36/-
مثنوی گلزار نسیم	رشید حسن خاں	16/-
افادات سلیم	ڈاکٹر خلیق انجم	30/-
مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ: رشید حسن خاں	27/-

جیبی کتابیں

بیاض مریم	سکندر علی وجد	15/-
لہو پکارتا ہے	سردار جعفری	15/-
پتھر کی دیوار	سردار جعفری	15/-
ایک خواب اور	علی سردار جعفری	15/-
آتش گل	جگر مرادآبادی	12/-
پچھلے پہر	جاں نثار اختر	7/50
رومانی غزلیں	ثمینہ حجاب	12/-
انتخاب اکبر الہ آبادی	صدیق الرحمٰن قدوائی	15/-
ساتواں آنگن	صالحہ عابد حسین	8/-
دھوپ	رابعہ تبسم	5/-
گھر	ماجدہ رضوی	8/-
واپسی کا سفر	عبداللہ حسین	5/-
راگ بھوپالی	ڈاکٹر صفدر اسعدی	7/-
نشیب	عبداللہ حسین	5/-
موت کا بازار	آفتاب ہلالی	8/-

کتاب نما کے خصوصی شمارے

محبوب حسین جگر نمبر	مرتبہ پروفیسر نثار احمد فاروقی	75/-
جاں نثار اختر نمبر	مرتبہ: گربچن چندن	90/-
شمس الرحمٰن فاروقی نمبر	مرتبہ: احمد محفوظ	80/-
اردو افسانہ [illegible]	مرتبہ: الیاس شوقی	51/-
مغیث الدین فریدی نمبر	مرتبہ: تسنیم احمد صدیقی	45/-
خواجہ حسن نظامی نمبر	مرتبہ: نثار احمد فاروقی، ریحان احمد عباسی	75/-
عبدالوحید صدیقی نمبر	مرتبہ پروانہ ردولوی	51/-
غلام ربانی تاباں نمبر	مرتبہ: اجمل اجملی	75/-
اختر سعید خاں نمبر	مرتبہ: ڈاکٹر سید حامد حسین	51/-
نثار احمد فاروقی نمبر	مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم	51/-

...گوپی چند نارنگ نمبر	مرتبہ: شہزاد منظر	60/-
...خلیق انجم نمبر	مرتبہ: اسلم حبیب خاں	90/-
...احمد فاروقی	مرتبہ: خلیق انجم	45/-
...علی خاں	مرتبہ: آفاقی حسینی	45/-
...فیسر مسعود حسین خاں	اسلم حبیب خاں	45/-
...کٹر اجمل اجملی	مرتبہ: علی احمد فاطمی / مظفر ادیب	45/-
...ان فتح پوری نمبر	مرتبہ: خلیق انجم	25/-
...ردار جعفری نمبر	مرتبہ: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی	45/-
...اجہ عابد حسین نمبر	مرتبہ: عزیز قریشی	45/-
...ی قلم کا سفر	مرتبہ: خلیل الرحمٰن اعظمی	45/-
مشرقی علوم و السنہ پر تحقیق	حامد حسین	3/-
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر	کرنل بشیر حسین زیدی	16/-
مولانا محمد خاں شہاب نمبر	(مکتبہ جامعہ)	1/50
مرزا سلامت علی دبیر نمبر	مرتبہ: عبدالقوی دسنوی	7/50
جگن ناتھ آزاد نمبر	مرتبہ: اسلم حبیب خاں	51/-
عرش ملسیانی نمبر	مالک رام	12/50
سکندر علی وجد نمبر	یوسف ناظم	25/-
لغت نویسی کے مسائل نمبر	پروفیسر گوپی چند نارنگ	36/-
عبداللطیف اعظمی نمبر	(مکتبہ جامعہ)	18/-
مشفق خواجہ نمبر	مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم	30/-
جائزے	مرتبہ: مظفر حنفی	45/-

قواعد، محاورے، کہاوتیں اور لغات

تذکرۂ دتاسید (یعنی بزم اندلاف)	جلیل مانک پوری	75/-
معیار اردو	جلیل مانک پوری	21/-
محاورات ہند	مرتب محبوب الرحمٰن فاروقی	51/-
عبارت کیسے لکھیں		18/-
انشا اور تلفظ		12/-
بنیادی قواعد اردو	طلبہ کا ایڈیشن	3/-
بنیادی قواعد اردو	کلاں	6/-
بنیادی اردو انگریزی ڈکشنری		21/-
بنیادی ہندی انگلش اردو ڈکشنری		15/-
ہمارے محاورے	کنول پریمی	12/50
کہاوت اور کہانی	کنول پریمی	9/-

کالج کے طلبہ کے لیے درسی کتب

شعور ادب	(مکتبہ جامعہ)	21/-
نیا اردو نصاب اوّل	محمد ذاکر	10/-
آئینۂ ادب	ڈاکٹر محمد رضا / ڈاکٹر آدم شیخ	21/-
انوارِ ادب	پروفیسر فصیح الدین / ڈاکٹر عابد حسین حیدری	8/50

تعلیم بالغان کے سلسلے کی کتابیں

کفن دفن		1/-
حیات عابدہ انصاری		1/-
چیک	مشتاق احمد	1/-
آستین کا سانپ	محمد حسین حسان	1/-
چائے	محمد حسین حسان	1/-
دیمک	محمد حسین حسان	1/-
کھیتی زمین	محمد حسین حسان	1/-

ہندی کی دوسری کتابیں

موسموں کا کھیل		1/-
پرم پرا		1/-
اپنا گھر		1/-
امریکہ		1/-
دہلی		1/
منور بھی اور کام		1/-
چاول کا کیچ		1/-

1

مکتبہ پیام تعلیم کی مذہبی کتابیں

پارہ عم مع اردو و انگریزی ترجمہ و تشریح		45/-
سورۂ یٰس	مع اردو ترجمہ	6/-
صراط مستقیم		7/50
سورۂ یٰس (ترجمہ مع تشریح)		6/-
حضرت شیخ مخدوم علی فقیہ مہائمی		4/50
اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں		9/-
نماز پڑھئے		4/50
السلام علیکم		7/50
حضرت یوسف علیہ السلام		4/50
حدیث کیا ہے		4/-
حضرت عمر فاروق		6/-
نقوش سیرتؐ	حصہ اوّل	5/-
نقوش سیرتؐ	دوم	5/-
نقوش سیرتؐ	حصہ سوم	5/-
نقوش سیرتؐ	حصہ چہارم	5/-
نقوش سیرتؐ	حصہ پنجم	5/-
رسالہ دینیات	اوّل	3/-
رسالہ دینیات	دوم	4/-
رسالہ دینیات	سوم	5/-
رسالہ دینیات	چہارم	5/-
رسالہ دینیات	پنجم	6/-
رسالہ دینیات	ششم	6/-
رسالہ دینیات	ہفتم	6/-
رسالہ دینیات	ہشتم	6/-
حضرت آدم علیہ السلام		4/-
حضرت یحییٰ علیہ السلام		3/-
بزرگانِ دین		4/-

وصیت کی باتیں	/50
محبوب سیرتؐ اوّل	/-
محبوب سیرتؐ دوم	/-
اچھی باتیں	4/50
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں	4/50
سلطان حق	4/50
سیرت پاک مختصر مختصر	3/-
کمسن صحابی	6/-
رحمان کا مہمان	6/-
اسلام کے جاں نثار	5/-
نور کے پھول	9/-
سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	3/50
حضرت ابو بکر صدیقؓ	6/-
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	3/-
حضرت طلحہؓ	3/-
حضرت ابوذر غفاریؓ	3/-
حضرت سلمان فارسیؓ	3/50
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	3/-
حضرت محبوب الٰہیؒ	3/50
حضرت معین الدین چشتیؒ	3/-
حضرت فرید گنج شکرؒ	3/-
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	3/-
نیک بیٹیاں	3/50
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	3/-
حضرت حمزہؓ	3/-
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	4/50
حضرت ابوہریرہؓ	4/-
اللہ کے نبی	2/50

اللہ کا گھر	4/50
اللہ کے خلیل	3/50
رسول پاکؐ کے اخلاق	4/-
قرآن پاک کیا ہے؟	5/-
اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل	6/-
اسلام کے مشہور سپہ سالار دوم	6/-
اسلام کے مشہور امیر البحر	9/-
اسلام کیسے پھیلا حصہ اوّل	7/50
اسلام کیسے پھیلا حصہ دوم	7/50
اسلام کیسے شروع ہوا	7/50
رسول پاکؐ	7/50
دس حق	7/50
سرکار کا دربار	7/50
چار یار	9/-
آں حضرتؐ	4/50
ہمارا دین حصہ اوّل	8/50
ہمارا دین حصہ دوم	8/50
ہمارا دین حصہ سوم	8/50
تحسین القرآن	(زیرِ طبع)
منہاج القرآن	4/50
ائمہ اربعہ	(زیرِ طبع)
ارکانِ اسلام	4/-
[illegible] اسلام	4/50
خلفائے اربعہ	18/-
نبیوں کے قصے	7/50
ہمارے رسولؐ	7/50
مسلمان بیبیاں	6/-
پیارے نبیؐ	4/-

سرکارِ دو عالم	9/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد)	3/-
قاعدہ یسرنا القرآن (کلاں)	6/-

سوانح

بچوں کے خواجہ الطاف حسین حالی	6/-
بچوں کے نظیر اکبرآبادی	6/-
بچوں کے "تا" انصاری	6/-
بچوں کی آپا جان (گیرڈا فلپس)	6/-
بچوں کی شفیقہ فرحت	4/50
بچوں کے عابد علی خاں	4/-
بچوں کے علی سردار جعفری	4/-
بچوں کے یوسف ناظم	4/-
چارلی چیپلن اور کیتھو ایڈرسن	9/-
بچوں کے مولانا حسرت موہانی	4/-
بچوں کے میر انّ دلی والے	4/50
بچوں کے محمد حسین آزاد	4/-
بچوں کے مرزا غالب	4/-
بچوں کے رنگارنگ خسرو	4/50
بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد	4/-
بچوں کے سلطان حق	4/50
بچوں کے مولانا شبلی نعمانی	4/50
بچوں کی صالحہ عابد حسین	4/-
بچوں کے ڈاکٹر سید عابد حسین	4/-
بچوں کے بابائے اردو مولوی عبدالحق	4/50
بچوں کے میرزا ادیب	4/50
بچوں کے غلام السیدین	5/-
بچوں کے اسمٰعیل میرٹھی	21/-
بچوں کے ذاکر صاحب	7/-

[illegible]		[illegible]	
قصر صحرا اول	7/-	سانپ کی انگوٹھی	6/-
قصر صحرا دوم	10/-	جنگل کی بلی	3/50
قصر صحرا سوم	8/-	چالاک خرگوش کے کارنامے	3/-
[illegible]	7/50	چور پکڑو	9/-
[illegible]			3/50
[illegible]	4/-	بہادر علی	8/50
ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش	7/50	خالی ہاتھ	9/-
[illegible]کی روح	4/-	کھلونا نگر	7/50
ٹک نے ٹماٹک کو	4/50	حاجی بابا کی ڈائری	7/50
گدھا کہانی	9/-	قصہ اژدھا پکڑنے کا	6/-
خفیہ سرنگ	6/-	ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	6/-
بڑھیا کی بھینس	4/50	ابو علی کا جوتا	6/-
تیس مار خاں	4/50	ننھا سر لمبو سال	6/-
چالاک خرگوش کی واپسی	15/-	پر اسرار غار	6/-
غریب لکڑہارے کی کہانی	6/-	ظالم ڈاکو	6/-
نزدونی کا آدم خور	6/-	عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	7/50
ہمت کے کرشمے	6/-	ولی کی شادی	4/-
خلائی مسافر	6/-	رحمت شہزادہ	4/50
ابو خاں کی بکری	15/-	اندھے کا بیٹا	4/50
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی	6/-	پانچ جاسوس	10/-
نرالے گویے	4/50	جنگل کی ایک رات	7/50
باتونی کچھوا	4/50	اچھی کہانیاں	3/-
جادو کا محل	3/-	ہرن کا دل	3/-
جادو کی سارنگی	3/-	دریا کی رانی	3/-
بدر شہزادی	6/-	گوہر شہزادی	4/50
سمندری طوفان اور تین لڑکے	6/-	شریر شیرا	3/50
ننھا سیاح	8/50	پری رانی	3/-
زیور	6/-	خطرناک سفر	3/50

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
مرغی ... [illegible]	4/50	گلابو چوہیا اور پری ڈولو	5/-
بابا مچ	3/-	جادو کا گھر	3/50
سلامہ و صمامہ	5/-	بی مینڈکی اور کوا	3/50
پہاڑ کی چوٹی پر	6/-	تاک دنادن تا کے سے	3/50
شرارت	4/-	روٹی کس نے پکائی	3/50
ننھا فرشتہ	6/-	پھر میں چکھوں کیا خاک	3/50
ایک کلاکار	3/50	پانچ بونے	3/50
مچھیرا اور اس کی بیوی	3/50	چیونٹی رانی	3/50
بھوتوں کا جہاز	7/50	بچوں کی کہانیاں	3/50
ہار کی تلاش	6/-	پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	3/50
خرگوش کی چال	4/-	پکڑو دم کتے کو	3/50
آؤ اداکاری کریں	4/-	مدو رانا پردیس چلے	3/50
خرگوش کا سپنا	9/-	چھچو	3/50
نیلا ہیرا	6/50	سرخ جوتے	4/50
ایک چوری ریل میں	(زیر طبع)	پلک نہ مارو	6/-
شیر خاں	4/-	ایک دیس ایک خون	3/50
بھیڑیے کے بچے	3/-	جادو کے کھیل	(زیر طبع)
لومڑی کے بچے	3/-	انعامی مقابلہ	3/25
میاں ڈھینچو کے بچے	4/-	دعوت ملائی	(زیر طبع)
بہادر	4/50	جیت کس کی؟	4/-
ہرن کے بچے	3/50	چنی کی گڑیا	(زیر طبع)
اس نے کیا کرنہ چاہا	3/50	بہادر سیاح	4/-
کٹا ہوا ہاتھ	7/50	چچا غالب	(زیر طبع)
سنکو نگر کا راجا	(زیر طبع)	تاجیل خاں	3/-
بگی پوار اور ننھا فرشتہ	(زیر طبع)	جن حسن عبدالرحمٰن اول، دوم	5/-
سرکس (ناول)	1/50	چوری کی عادت	3/50
بندر اور بلی	4/50	غیر ذمہ دار لڑکا	(زیر طبع)

[illegible]	(زیر طبع)
[illegible]	1/50
[illegible] اور ہمارے	1/50
لال مرغی	4/-
[illegible]	3/-
[illegible]	6/-
بھارت کا آدم خور شیر	1/50
[illegible]	3/-
چینی	1/20

ہماری درسی کتابیں

اردو قاعدہ		5/-
اردو کی پہلی کتاب		8/-
اردو کی دوسری کتاب		11/-
اردو کی تیسری کتاب		13/-
اردو کی چوتھی کتاب		14/-
اردو کی پانچویں کتاب		17/-
اردو کی چھٹی کتاب		18/-
اردو کی ساتویں کتاب		20/-
اردو کی آٹھویں کتاب		22/-
اردو خوش خطی	حصہ اوّل	4/-
اردو خوش خطی	حصہ دوم	4/-
اردو خوش خطی	حصہ سوم	4/-
اردو خوش خطی	حصہ چہارم	4/-
ہمارا ملک بھارت		19/-
بھارت اور سنسار		19/-

PAYAMI
BASIC ENGLISH-URDU
DICTIONARY 16/-

Regd with R.N.I at No 4967/60 DECEMBER-98
Regd No. DL 16016/98
Licence No. U[SE]-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025